جنگ اور امن

(War and Peace)

لیو طالسطائی | شاہد حمید

ریڈنگز | کلاسکس

عظمت ڈرانے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف بلاتی بھی ہے، اس کشش سے کون بچ سکتا ہے۔ ''جنگ اور امن'' وھیل مچھلی کی جسامت اور شان وشوکت کی حامل ہے۔ پر شکوہ، آزاد، خوں آشام مگر انسانی ذہن کو ایک مہم پر اکساتی ہوئی۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے کسی کو تند برفانی طوفان کی یاد آئی، کسی کو سمندری طغیانیوں کی اور کسی نے آتش فشاں سے لاوے کو ابلتا ہوا دیکھا۔ ''جنگ اور امن'' کا موضوع نپولین کا حملہ، روسیوں کی شکست، ماسکو کا خالی ہونا اور پھر روسیوں کی فتح مگر اس حاشیے میں تو زندگی کا پورا میلہ کیا زندگی کا طوفان ہے۔ گھریلو زندگی، خواب گاہیں، بگھیاں، برف باری، برف گاڑیاں، مکان، سڑکیں، لوگ، دعوتیں، تاش کی بازیاں، تھیٹر، ناچ گھر، انسانی تعلقات کے رنگوں کی دھنک، موسموں کی شدت اور فطری مناظر کا بیان، روسی سماج کے مختلف طبقے، فری میسن، پھر جنگی مہمات، فوجیوں کی زندگی، جنگی حکمت عملی کا بیان... پھر تاریخی کردار غرضیکہ زندگی کے اس طوفان کی کس کس لہر کو دیکھا جائے، روسی سماج کی زندگی اتنی وسعتوں کے ساتھ کسی ناول میں کب سما سکی تھی۔

ڈاکٹر سہیل احمد خان

جنگ اور امن

جنگ اور امن

لیو طالسطائی

ترجمہ

شاہد حمید
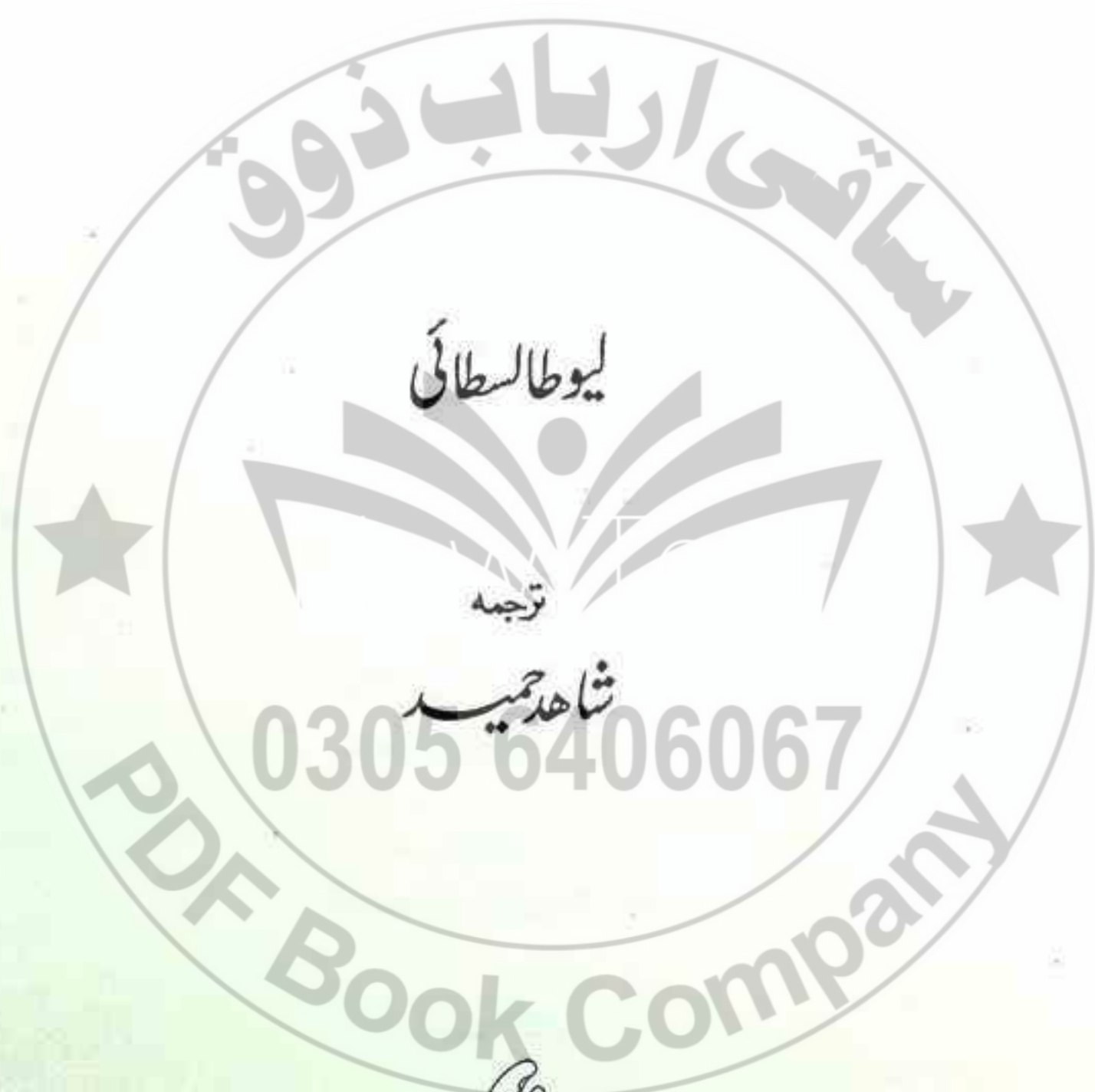
القا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ

لاہور

اشاعتِ اوّل
القا پبلیکیشنز 2021

'القا پبلیکیشنز' اور 'ریڈنگز' الان و تال پرائیویٹ لمیٹڈ کے ذیلی ادارے ہیں۔

سرورق: مہدی تابی

خطاطی: نوری نستعلیق

انٹرنیشنل سٹینڈرڈ بک نمبر (ISBN)
978-9-69-640174-2

طباعت
مکتبہ جدید پریس، ایمپرس روڈ، لاہور

القا پبلیکیشنز

12-K، مین بلیوارڈ، گلبرگ 2، لاہور 54660
پاکستان

فون: 92 42 3575 7877
publications@readings.com.pk
www.readings.com.pk

فہرست

چوتھی کتاب 1235

تتمہ 1483

ضمیمہ 1599

حیات طالسطائی

اجمالی خاکہ

نوٹ: تمام تاریخیں جولین کیلنڈر کے مطابق ہیں۔ دیگر اہم واقعات قوسین میں تحریر کیے گئے ہیں۔

1825ء (نکولس اول کی تخت نشینی۔ چودہ دسمبر کو دسمبری تحریک کچل دی گئی اور طالسطائی کے ایک رشتے دار پرنس سرجی گریگوریوچ ولکونسکی کو بغاوت میں حصہ لینے کے جرم میں سائبیریا بھیج دیا گیا)۔

1828ء 28 اگست کو یاسنایا پولیانا صوبہ تولا میں کاؤنٹ نکولائی طالسطائی کے چوتھے بیٹے لیونکولائیوچ طالسطائی کی پیدائش۔

1830ء والدہ کا انتقال۔

1837ء والد کا انتقال۔ (پوشکن کی ڈوئیل میں ہلاکت)

1838ء دادی کا انتقال۔

1841ء خالہ الیکساندرا (کاؤنٹس اوتساکن) کا انتقال (طالسطائی کی والدہ کے انتقال کے بعد وہی بچوں کی دیکھ بھال کرتی تھی)۔ طالسطائی کو اپنے بھائیوں اور اکلوتی بہن کے ساتھ پھوپھی پیلاگیا یشکوا کے پاس قازان بھیج دیا جاتا ہے۔ (لرمنتوف کی ڈوئیل میں ہلاکت)

1842ء طالسطائی کا بھائی ورغلا کر اسے بازارِ حسن لے جاتا ہے اور طالسطائی اپنی ''دوشیزگی'' سے محروم ہو جاتا ہے۔ اسی سال وہ روسو کا مطالعہ کرتا ہے (مقدس سنود کا سربراہ کاؤنٹ این اے پراتاسوف ماسکو کے اسقف اعظم کو انجیل کی روسی زبان میں تفسیر لکھنے سے منع کر دیتا ہے)۔

1844ء طالسطائی قازان یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کرتا ہے۔ (روسی فوج کا چیچنیا پر قبضہ)

1847ء یونیورسٹی میں عربی اور فارسی زبان کا مطالعہ، طالسطائی کا مرض خبیثہ میں مبتلا ہونا، آبائی ورثے میں حصہ ملنا اور یاسنایا پولیانا واپسی۔

(ہرزن کا روس چھوڑنا اور کبھی واپس نہ آنا)

1848ء طالسطائی سینٹ پیٹرز برگ پہنچتا ہے، یونیورسٹی سے قانون کے دو امتحان پاس کرتا ہے اور تولا میں مجسٹریٹ مقرر ہوتا ہے۔ (روس کا ہنگری پر حملہ۔ دستوئیوفسکی کو سزائے موت اور پھر معافی ملتی ہے، اور سائبیریا بھیج دیا جاتا ہے۔)

1850ء طالسطائی کا ماسکو میں قیام، ایک ننھیالی رشتے دار سے جزوی محبت اور ''تاریخ دیروز'' کی اشاعت۔

1851ء کاکیشیا روانگی۔ طفلس میں ''بچپن'' تحریر کرتا ہے۔

1852ء فوج میں بھرتی۔ ایک رسالے میں کہانی Raid کی اشاعت۔

(8 اکتوبر: روس اور ترکی کے مابین جنگ کا آغاز۔)

1854ء طالسطائی کو فوج میں کمشن ملتا ہے اور اسے بخارسٹ بھیج دیا جاتا ہے۔ (مارچ: فرانس اور برطانیہ کا روس کے خلاف اعلان جنگ اور سیبستاپول کا محاصرہ۔) نومبر: طالسطائی سیبستاپول پہنچتا ہے۔ (دستوئیوفسکی کی رہائی)

1855ء سیبستاپول میں جنگی خدمات۔ (سیبستاپول پر اتحادیوں کا قبضہ) Sebastopol in May اور Sebastopol in December کی اشاعت۔ طالسطائی بہت بڑی رقم جوئے میں ہار جاتا ہے۔ (زار نکولس اول کا انتقال اور مصلح زار الیکسانڈر دوم کی تخت نشینی۔) نومبر: طالسطائی کی پیٹرز برگ واپسی۔ فیت، نیکراسوف، تورگنیف اور دوسرے ادیبوں سے ملاقاتیں اور فیت سے تاحیات دوستی کا آغاز۔ (تورگنیف کے ناول Rudin کی اشاعت۔)

1856ء (21 جنوری: طالسطائی کے بھائی دمیتری کا انتقال۔) ''طوفان برف'' ''دو ہوزار'' اور ''روسی جاگیردار'' کی اشاعت۔ (مارچ: روس، ترکی، برطانیہ اور فرانس کے مابین صلح۔) 26 نومبر: طالسطائی کا فوج سے استعفیٰ۔

1857ء Youth کی اشاعت۔ تورگنیف اور نیکراسوف کی معیت میں دورۂ فرانس۔ سوئٹزرلینڈ کی سیر۔

1858ء اپنے ایک زرعی غلام کی بیوی اکیسیا بازیکسنا کے ساتھ طویل المدت تعلقات کا آغاز۔ (گنچاروف کے ناول Oblomov کی اشاعت۔)

1859ء ''تین اموات'' اور ''خاندانی مسرت'' کی اشاعت۔ یاسنایا پولیانا میں سکول کی تاسیس۔

1860ء طالسطائی کا دوسرا اور آخری غیر ملکی دورہ۔ جرمنی میں بے اولاد بھائی نکولائی سے ملاقات۔ نکولائی کا تپ دق سے انتقال۔ طالسطائی اپنا بیشتر مال متاع جوئے میں ہار چکا تھا، اب بھائی کا ورثہ کام آتا ہے۔ (''جنگ اور امن'' میں پرنس آندرے کا کردار جزوی طور پر اسی بھائی کی زندگی سے ماخوذ ہے۔) دسمبر: دورۂ روم اور اپنے رشتے دار پرنس سرجی ولکونسکی سے ملاقات۔

1861ء دورۂ پیرس ولندن۔ میتھیو آرنلڈ اور ہرزن سے ملاقاتیں۔ براستہ برسلز روس واپسی۔
(19 فروری: زرعی غلاموں کی جاگیرداروں کے تسلط سے آزادی۔)
26 اپریل: تورگنیف کو ڈوئیل کا چیلنج۔ وجہ؟ طالسطائی کی ہمشیرہ ماریا سے تورگنیف کے تعلقات۔ (تورگنیف کے ناول ''باپ بیٹے'' کی اشاعت)۔ طالسطائی کے ناجائز بیٹے اور مستقبل کے کوچوان تیموفی کی پیدائش۔

1862ء یاسنایا پولیانا میگزین کی اشاعت۔ پولیس کا چھاپا۔ 23 ستمبر: ماسکو کے معالج بیرس کی دختر سوفیا سے شادی۔ (دونوں کے تیرہ بچے پیدا ہوئے، صرف آٹھ سن بلوغ کو پہنچے۔)

1863ء ''قازق'' کی اشاعت اور ''جنگ اور امن'' کی تحریر شروع۔ پہلے بیٹے کی پیدائش۔

1864ء بیٹی تاتیانا کی پیدائش۔ (لندن میں مارکس کی فرسٹ انٹرنیشنل کا قیام)

1865ء ''جنگ اور امن'' کے حصہ اول کی اشاعت۔ (دستوئیفسکی کے ''جرم وسزا'' اور لیسکوف کے ''لیڈی میکبتھ آف متسینک'' کی اشاعت)

1866ء کورٹ مارشل میں ایک فوجی جوان کی وکالت اور ناکامی۔

1867ء طالسطائی کی سالی تانیا بیرس (''جنگ اور امن'' کی نتاشا) کی شادی۔

1869ء ''جنگ اور امن'' کی تکمیل۔ (دوستووسکی کے ناول Idiot کی اشاعت۔)

1870ء فلسفے، ڈرامے اور یونانی زبان کا مطالعہ (ہرزن کا انتقال اور ولادی میر ایلچ یولیانوف (لینن) کی پیدائش۔)

1871ء (دستوئیفسکی کے ناول Devils کی اشاعت۔)

1872ء God Sees the Truth but Waits اور ''کاکیشیا کا قیدی'' کی اشاعت۔ (مارکس کے ''سرمایہ'' کی روسی زبان میں پہلی اشاعت۔) گھر میں نظر بندی۔

1873ء اپنے خاندان کے ساتھ سمارا میں اپنی نئی جاگیر کا دورہ۔ سمارا کے قحط زدگان کے لیے چندے کی اپیل۔

1875ء ''آنا کارنینا'' کی ابتدائی اقساط کی اشاعت۔ موت کا خوف۔ خودکشی کی خواہش۔
(روس میں مزدوروں کی اولین انجمن کا قیام اور اودیسہ کی زبردست ہڑتال۔)

1876ء (سربیا کا ترکی کے خلاف اعلان جنگ۔ پیٹرزبرگ میں انقلابی طلبا کے مظاہرے۔)

1877ء ''آنا کارنینا'' کی تکمیل۔ ناشر کا آخری حصہ چھاپنے سے انکار۔ طالسطائی کا آرتھوڈوکس مذہب میں اعتقاد متزلزل۔ (24 اپریل: روس کا ترکی کے خلاف اعلان جنگ۔ دستوئیفسکی جیسے محب الوطنوں کا نعرہ کہ قسطنطنیہ پر آرتھوڈوکس روس کا حق بنتا ہے۔)

1878ء پیوتروپاول قلعے میں دسمبری تحریک کے رہنماؤں سے ملاقات۔ آرتھوڈوکس عقیدے سے دست برداری۔

تورگنیف سے صلح۔ (روس اور ترکی کے مابین معاہدہ صلح۔ بلغاریہ کا قیام۔)

1879ء What I Believe لکھنے کے کام کا آغاز۔ (زار کو قتل کرنے کی متعدد کوششیں۔)
[اوسپ وساری آنووچ دَجوگاشویلی (سٹالن) کی پیدائش۔]

1880ء (امپراطورہ کا انتقال۔ زار کی اپنی داشتہ سے شادی۔ آذربائی جان میں تیل کی تلاش کا آغاز۔ دستوئیفسکی کے ''کراما زوف برادران'' کی اشاعت۔

1881ء زار کے نام خط۔ What Men Live by کی تحریر۔ خانقاہ اپتینا کا دورہ۔
(دستوئیفسکی کا انتقال۔ زار کا قتل۔ الیکساندر سوم کی تخت نشینی۔ رجعت پسندوں کا عروج اور اصلاح پسندوں کی پسپائی۔)

1882ء بیوی کے اصرار پر ماسکو میں مکان کی خرید۔ عبرانی کا مطالعہ۔ خطاب سے دست بردار ہونے کی کوشش اور گھر سے بھاگنے کی دھمکی۔ (پیٹرزبرگ اور قازان یونیورسٹیوں میں ہنگامے اور سنسر شپ کے شکنجے میں مزید سختی۔)

1883ء What I Believe کی اشاعت۔ اپنی تمام جائیداد کے لیے بیوی کے نام مختار نامہ۔ (پلیخانوف کے ''سوشلزم اور سیاسی جدوجہد کی اہمیت کی اشاعت'' اور اس کی جماعت ''مارکسسٹ لبریشن گروپ'' کا جنیوا میں قیام۔ تورگنیف کا انتقال اور موت سے قبل اپنی آخری تحریر میں طالسطائی سے فن کی دنیا میں واپس آنے کی اپیل۔)

1884ء طالسطائی کا بُوٹ بنانے کا دھندا۔ What I Believe پر پابندی۔ سوفیا کتابوں کی، جواب خاندان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہیں، اشاعت کا کام سنبھال لیتی ہے۔ (اخبار ''مادرِ وطن'' کی بندش۔)

1885ء کریمیا کا دورہ۔ گوشت خوری، شراب نوشی، تمبا کو نوشی اور شکار سے توبہ۔ چیلے اور ناک کے بال چرتکوف کے تعاون سے جریدہ Interymediary کی تاسیس۔ ''جہاں محبت ہے، خدا ہے'' کی اشاعت۔

1886ء What then Must We Do? اور ''ایوان ایلیچ'' کی اشاعت۔ خرساں کا اسقف اعظم طالسطائی کو مرتد قرار دیتا ہے۔ (چیخوف کی کہانیوں کے پہلے مجموعے کی اشاعت۔)

1887ء on Life کی اشاعت۔ (لینن کے بھائی سمیت پانچ طالب علموں کو زار کو قتل کرنے کی کوشش کے الزام میں پھانسی۔)

1888ء طالسطائی کا ڈرامہ ''اندھیرے کی قوت'' پیرس سٹیج پر۔ آخری بیٹے کی پیدائش۔ The Kreutzer Sonata کی تحریر اور بندش۔

1890ء زار سے درخواست اور محولہ بالا ناولٹ کی اشاعت کی اجازت۔

1891ء تمبا کو نوشی اور شراب نوشی کے خلاف مہم۔ کتابوں کے کاپی رائٹ سے دست برداری اور خاندان میں

جائیداد کی تقسیم۔ ملک میں قحط اور طالسطائی کی امدادی سرگرمیاں۔

1892ء قحط زدگان کی امداد کا کام جاری۔ سبزی خوری کے حق میں مقالے کی اشاعت (فیت کا انتقال)

1893ء Kingdom of God is within You کی بیرون ملک اشاعت۔

1894ء Christianity & Pacifism کی اشاعت۔ (الیکساندر سوم کی وفات۔ نکولس دوم اور اس کی غیر مقبول جرمن بیوی (ملکہ وکٹوریہ کی نواسی) کی تخت نشینی۔ کسانوں کو پاسپورٹ دینے کی ممانعت اور ان پر پرمٹ کے بغیر امپراطوریہ کے اندر سفر کرنے کی پابندی۔ سٹالن کا ایک مذہبی درسگاہ میں داخلہ۔)

1895ء (نکولس دوم کا نمائندہ حکومت کے قیام کے تصور کو لایعنی خواب قرار دینا۔ لینن اور اس کے ساتھیوں کی گرفتاری اور نظر بندی۔ لینن کا نمونیے سے مرتے مرتے بچنا، سوئٹزرلینڈ میں جلاوطنی اور پلیخانوف سے ملاقات، روس واپسی اور سائبیریا میں جلاوطنی۔)

1896ء زار سے طالسطائی کی گرفتاری کا مطالبہ۔

1897ء ''حاجی مراد'' کا آغاز۔ (طالسطائی کے مستقبل کے سوانح نگار بریوکوف اور چرت کوف کی گرفتاری۔)

1898ء What Is Art کی اشاعت۔ بیٹے سرجی کی کینیڈا روانگی۔

1899ء Resurrection کی تکمیل۔ (طلبا کے ہنگامے۔ تمام یونیورسٹیاں عارضی طور پر بند۔) (سٹالن کا مذہبی درسگاہ سے نکلنا اور انقلابی گروپوں سے ملاقاتیں کرنا۔)

1900ء (فن لینڈ میں روسی زبان کی لازمی تعلیم۔ مارکسی جماعت کے پہلے جریدے Iskra (شعلہ) کا اجرا۔ سائبیریا سے لینن کی واپسی اور بیرون ملک روانگی)

1901ء طالسطائی کا آرتھوڈوکس چرچ سے اخراج اور سنود کے فتویٰ کے خلاف اس کا جواب۔ گورکی اور چیخوف سے ملاقاتیں۔ (چیخوف کا ڈرامہ ''تین بہنیں'' سٹیج پر۔)

1902ء ''مذہب کیا ہے'' کی تکمیل۔ شیکسپیئر کا دوبارہ مطالعہ۔ (گورنر خارکوف، وزیر داخلہ اور بعض دیگر اہم شخصیات کا قتل)

1903ء میشویکوں اور بولشویکوں کے مابین پھوٹ۔

1904ء (جاپان کے ساتھ جنگ۔ پورٹ آرتھر پر حملہ اور روسی بیڑے کی تباہی۔) طالسطائی کا جنگ کے خلاف احتجاجی رسالہ۔ (لینن کے اخبار V peryod (Forward!) کا اجرا۔)

1905ء پولیس کا چھاپہ اور مختلف مضامین پر قبضہ۔ (جنوری۔ عام ہڑتال۔ زار کے چچا گرینڈ ڈیوک سرجی کا قتل۔ جنگ کا اختتام۔ مینی فیسٹو۔ ''انقلاب'' 1905۔ وت (Witte) عملاً روس کا پہلا وزیر اعظم بن جاتا ہے۔ نکولس دوم اور امپراطور کی 'اللہ لوگ' راسپوتین کی خدمت میں حاضری۔)

1906ء بیوی کی شدید بیماری اور چہیتی بیٹی ماشا کا انتقال (دوما — پارلیمنٹ — کا رسمی افتتاح۔)

1907ء پولیس کا یاسنایا پولیانا پر چھاپہ اور طالسطائی کی کتابوں پر قبضہ۔ بندرگاہ کے ہڑتالی مزدوروں کے ہاتھوں بھائی کا قتل۔ لٹیروں کا یاسنایا پولیانا پر حملہ اور پولیس کی مدد سے بیوی کے جائیداد کو بچانے کی کوشش پر طالسطائی کا اظہار تاسف۔ کاپی رائٹ، مسودوں، ڈائریوں وغیرہ کے سلسلے میں میاں بیوی کا جھگڑا۔

1908ء سزائے موت کے خلاف رسالے ''میں خاموش نہیں رہ سکتا'' کی اشاعت۔ 28 اگست: اسّی ویں سالگرہ کی تقریبات۔ سیکرٹری این این گوسیف کی گرفتاری اور جلاوطنی۔

1909ء کاپی رائٹ، مسودوں، ڈائریوں وغیرہ کے متعلق مزید جھگڑے۔ سوفیا کے پاگل پن میں اضافہ۔

1910ء گھر سے فرار۔ 7 نومبر: آستاپاوا ریلوے سٹیشن پر انتقال۔ خاندانی جاگیر یاسنایا پولیانا میں تدفین۔ روس کے عیسائیت قبول کرنے کے بعد یہ پہلا جنازہ تھا جس میں کوئی مذہبی رسوم ادا نہ کی گئیں۔ (راسپوتین کی امپراطورہ کو پارلیمنٹ کو توڑنے کی تلقین۔)

ماخذ

اے این ولسن: طالسطائی۔ (ہمیش ہملٹن، لندن)

ایلمر ماڈ: لائف آف طالسطائی۔ (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس)

ہنری گفرڈ: دیباچہ ''وار اینڈ پیس'': ترجمہ ایلمر ولوئیز ماڈ (اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس)

”جنگ اور امن“: ایک تعارف

طالسطائی کے عظیم ناول کا تعارف تحریر کرتے ہوئے جے بی پریسٹلی کا ایک جملہ یاد آیا۔ پریسٹلی نے بیسویں صدی کے ناول نگار جان کوپر پوویس (John Cowper Powys) کی آپ بیتی کا ایک تعارف تحریر کیا ہے۔ پوویس اپنے دور کے بعض دوسرے ناول نگاروں کے مقابلے میں کم شہرت یافتہ تھا لیکن اس کی تحریروں میں وسعت بہت ہے۔ یہی کیفیت اس کی آپ بیتی کی بھی ہے۔ اس شکوہ کے پیش نظر پریسٹلی نے کہا کہ اس آپ بیتی کے ساتھ میرے تعارف کی حیثیت ایسے ہے جیسے نیاگرا آبشار کے سامنے پانی کا نل۔ اگر پوویس کی دنیا کی وسعتوں کے سامنے پریسٹلی جیسے صاحب طرز کو یہ احساس ہوا تو طالسطائی کے عظیم الجثہ ناول کے سامنے اردو کے ایک مضمون نگار کے لیے کون سی مثال دی جائے؟ پھر بھی عظمت ڈرانے کے ساتھ ساتھ اپنی طرف بلاتی بھی ہے، اس کشش سے کون بچ سکتا ہے۔ ”جنگ اور امن“ وھیل مچھلی کی جسامت اور شان و شوکت کی حامل ہے۔ پرشکوہ، آزاد، خوں آشام مگر انسانی ذہن کو ایک مہم پر اکساتی ہوئی بھی۔ اس ناول کو پڑھتے ہوئے کسی کو تند برفانی طوفانوں کی یاد آئی، کسی کو سمندری طغیانیوں کی، کسی نے آتش فشاں سے لاوے کو ابلتے ہوئے دیکھا اور کوئی ٹی ای لارنس کی طرح پکار اٹھا، ”طالسطائی، یہ شخص تو کل کی مشرقی ہوا جیسا ہے۔ جس کے مقابل آنکھیں کھولیں تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں اور انسان کچھ دیر کے لیے گونگا ہو جاتا ہے۔“ ”جنگ اور امن“ پر تبصرہ کرتے ہوئے اس وسعت کو نقادوں نے شدت سے محسوس کیا، کچھ دیر کے لیے گنگ ہو کر رہ گئے مگر پھر بولے بھی اور اب یہ بول متعدد تصانیف اور مضامین میں ڈھل چکے ہیں۔ روسی ادیبوں کے ابتدائی تاثرات سے یورپی ادیبوں اور ناقدین کی تحریروں تک اور اردو میں پروفیسر محمد مجیب اور ظ۔ انصاری جیسے روسی ادب کے ہمارے اپنے مزاج شناسوں کے جائزوں تک۔ انگریزی زبان کے ناول نگار اے این ولسن نے طالسطائی کی ایک نئی ضخیم سوانح عمری لکھی ہے جو 1988ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کے آغاز میں اس نے اس امر کی طرف توجہ دلائی ہے کہ روس کی جدید ریاست دنیا کے نقشے کا تقریباً چھٹا حصہ گھیرے ہوئے ہے مگر لگ بھگ یہی رقبہ اس سلطنت کا بھی تھا جس پر ملکہ کیتھرائن دی گریٹ نے 1762ء سے 1796ء تک حکومت کی۔ پیٹر دی گریٹ کو جائز طور پر جدید روسی ریاست کا معمار اول قرار دیا جاتا ہے مگر سلطنت کی صحیح معنوں میں

حد بندی ملکہ کیتھرائن کے دور میں ہوئی۔ پولینڈ پر قبضہ کیا گیا، جنوب کی طرف سلطنت بحیرۂ اسود کی سمت اور وسیع ہوئی۔ سلطنت کی یہ وسعت بہت سی انتظامی مشکلات بھی پیدا کرتی تھی: چنانچہ حکمران طبقوں اور نوکر شاہی کا شکنجہ فرد کی زندگی اور اداروں کو بری طرح کستا گیا۔ گوگول کی تحریروں میں اس حقیقت کی مختلف شکلیں دیکھی جاسکتی ہیں۔ کیتھرائن کے دور کی اس مخصوص فضا نے اشرافیہ کے ایک مضبوط طبقے کو جنم دیا اور کسانوں کی زندگی جاگیروں کے مالکان کے رحم وکرم پر ہوگئی۔ یوں ایک ایسا درجہ بند سماج بننے لگا جس میں اقتدار اشرافیہ طبقے کے ہی ہاتھوں میں تھا۔ یہ نظام اپنے اندر ایسی جکڑ بندی رکھتا تھا کہ ایک اینٹ نکلنے سے پوری عمارت کے دھڑام سے گر جانے کا خوف تھا؛ چنانچہ انیسویں صدی میں بادشاہ، نئے خیالات، یورپ سے ابھرنے والے نئے انقلابی اور جمہوری تصورات، حتیٰ کہ کسی قسم کی اصلاح سے بھی خوف کھاتے رہے۔ نئے تصورات اور مروجہ خیالات کا ٹکراؤ، روسی ناولوں میں اتنی بار یہ موضوع ابھرا ہے کہ یاد دلانے کی بھی ضرورت نہیں۔ ولسن کا کہنا ہے کہ کیتھرائن جو اصل میں جرمن شہزادی تھی سلطنت کی اس غیر معمولی وسعت کی وجہ سے اسے باقی دنیا سے کٹا ہوا بھی بنا گئی۔ باہر کے خیالات یا باہر کی دنیا سے تعلق تو ایک طرف، بہت سے روسیوں کو تو خود اسی سلطنت میں سفر کا اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ مگر ہوا بدل رہی تھی، نپولین کی جنگیں اس سلسلے میں محرک ثابت ہوئیں۔ روسی فوجی دستے پولینڈ، جرمنی، فرانس اور آسٹریا گئے، نپولین کے دور کا روسی حکمران الیکسانڈر اول نسبتاً آزاد خیال سمجھا جاتا تھا مگر معمولی اصلاح کے تصور سے بھی لرزاں تھا۔ اب جنگوں نے باہر کی دنیا کے تصورات روس کے اندر لا کر پھینک دیے اور گھر آنے والے فوجیوں کی زبان پر سیاسی اور سماجی مساوات کا تذکرہ بھی رہنے لگا۔ دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں کی ٹولی تو نئی ہواؤں کو بہت پہلے محسوس کرلیتی ہے پھر بھی انیسویں صدی کے شروع میں جہاں جرمنی میں گوئٹے اور شلر کا وقیع تخلیقی سرمایہ منظر عام پر آرہا تھا، انگلستان میں بائرن اور شیلی کے پرجوش نغمے ابھر رہے تھے، سکاٹ کے ناول شائع ہو رہے تھے، روس کی ادبی فضا بوجھل تھی مگر پھر دیکھتے ہی دیکھتے موسم بدلا اور رت گدرائی۔ لرمنتوف، گوگول، بلیسکی اور بعض دوسرے ادیب، سب سے بڑھ کر پشکن جس کے بارے میں اے این ولسن کا کہنا ہے کہ ایسے ادیب کے ظاہر ہونے کے بعد روسی ادب کیا خود روس کا بدل جانا بھی ناگزیر تھا۔ پشکن نے روسی ادیبوں کو سکھایا کہ عام روسی تعلیم یافتہ طبقے کے تصور کے برخلاف فرانسیسی زبان پر عبور ہی اجتہاد اور ذکاوت کو جنم نہیں دیتا۔ پھر اس کی مثال سے یہ بھی ثابت ہوا کہ پور پور میں روسی ہوتے ہوئے بھی روسی نظام حکومت کے مظالم اور اس کی بے معنویت کی مزاحمت کیسے کی جاسکتی ہے۔ اس نے کل اڑتیس سال کی عمر پائی اور 1837ء میں ایک ڈوئیل میں مرنے سے پہلے روسی ادب کو ایک نئے شعور سے آشنا کر گیا۔ اے این ولسن کو تو یہ سارا دور ملکہ الزبتھ اول کے دور میں انگریزی ادب میں ظاہر ہونے والے تحرک کے مماثل دکھائی دیا ہے۔ پشکن کے بعد روسی شاعروں اور ناول نگاروں کے نئے قافلے خیمہ فگن ہوئے۔ انھیں میں کاؤنٹ لیو نکولائی وچ طالسطائی بھی تھا جو اپنی پیدائش 28 اگست 1828ء اور وفات 7 نومبر 1910ء کے درمیان بیاسی سالہ دور حیات میں اتنا تحریری سرمایہ چھوڑ گیا جو نوے جلدوں میں سما سکا۔ اس نے ''جنگ اور امن''

جیسے عظیم رزمیے کے ساتھ ''آنا کارنینا'' جیسا ناول بھی اپنی یادگار چھوڑا جسے دنیا کی بہترین پریم کہانیوں میں شمار کیا گیا۔ اس کی کہانیاں، چھوٹے ناول، پھر ناول نگاری کو ترک کرنے کے بعد بطور مصلح اور نظریہ ساز اس کی تحریروں کا دفتر، سب اس داستان کے مختلف اجزاء ہیں جنھیں جوڑنے سے ایک ایسے شخص کی تصویر ابھرتی ہے جو اپنے تمام تر تضادات اور بوالعجبیوں سمیت آدمیوں میں جن کی سی طاقت کا مظہر تھا۔ جورج سٹائنر نے اپنی تصنیف ''طالسطائی یا دستوئیوفسکی'' میں دونوں کو ناول نگاری کے دو ایسے قطب بنا دیا ہے جو انسانی تخیل کی دو سمتوں کی عظیم تر ترجمانی کرتے ہیں۔ سٹائنر نے ای ایم فورسٹر کا ایک جملہ نقل کیا ہے: ''کوئی انگریزی ناول نگار اتنا عظیم نہیں جتنا کہ طالسطائی۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی نے انسانی زندگی کی گھریلو اور سورمائی جہت، دونوں کی ایسی مکمل تصویر نہیں دکھائی''۔ دوسری طرف کوئی انگریزی ناول نگار ایسا نہیں جس نے روح میں ایسی سیاحت کی جو دستوئیوفسکی کا وصف خاص ہے۔ سٹائنر کا کہنا ہے کہ فورسٹر کی رائے کو انگریزی ادب تک کیوں محدود رکھا جائے۔ طالسطائی عظیم رزمیہ نگار ہے اور دستوئیوفسکی عظیم المیہ نگار۔

طالسطائی اپنے دور کے بڑے ادیبوں میں اس لحاظ سے ممتاز تھا کہ وہ اعلیٰ ترین سماجی طبقے سے تعلق رکھتا تھا۔ اشرافیہ سے تو بہت سے دوسرے ادیبوں کا بھی تعلق تھا مگر طالسطائی کے خاندان کا تو دربار سے بھی ربط تھا۔ تاہم وہ دو سال کا تھا کہ اس کی ماں فوت ہو گئی اور نو سالہ طالسطائی باپ کے سائے سے بھی محروم ہو گیا۔ پروفیسر محمد مجیب نے اپنی تصنیف ''روسی ادب'' (پہلی اشاعت 1940ء) میں طالسطائی کی ابتدائی زندگی کی الجھنوں کی طرف اشارہ کیا ہے: ''حساس اور جوشیلی طبیعت جیسی کہ طالسطائی کی تھی تربیت اور تعلیم کو بڑی مشکل سے قبول کرتی ہے۔''''جن رشتے داروں نے اس کی اور اس کے بھائی بہنوں کی پرورش کی وہ اس سے محبت تو کرتے تھے مگر اس کی طبیعت کو سمجھنے کی صلاحیت نہ رکھتے تھے۔''''...کورس ختم کیے بغیر یونیورسٹی کو چھوڑ کر جائیداد کا انتظام کرنے کے بہانے گھر چلا آیا۔'' مجیب صاحب طالسطائی کے روزنامچے اور اس کی یادداشتوں کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ اس کی ''طبیعت کی کلی'' 1851ء میں قفقاز جا کر ''کھلی''۔ جہاں وہ فطرت کی گود میں بچے کی طرح تھا۔ غالباً قفقاز ہی کے قیام نے اسے اپنی زندگی کے افسانوی بیان پر نظر ثانی کے لیے مائل کیا۔ ''سرگزشت کی یہ نئی ترتیب تاریخی نہ تھی اس وجہ سے اس کو افسانہ کہا گیا'' یہ پروفیسر مجیب طالسطائی کی ابتدائی تصنیف ''بچپن'' کے بارے میں بتاتے ہیں۔ ''بچپن'' کے بعد ''لڑکپن'' اور ''جوانی'' کا تذکرہ ہے۔ ابتدائی تحریروں ہی سے طالسطائی کی قوت مشاہدہ پوری طرح ظاہر ہو رہی تھی۔ نومبر 1853ء میں روس اور ترکی کی جنگ ہوئی۔ انگلستان اور فرانس اس وقت ترکوں کی طرف تھے۔ کریمیا کے جزیرہ نما پر حملہ ہوا۔ طالسطائی بھی وطنیت کے جوش میں اس جنگ میں شامل ہوا۔ جنگ نے بھی اسے کچھ قصے دیے۔ کریمیا سے واپسی پر اس کا شمار اہم ادیبوں میں ہونے لگا مگر اس کے مخصوص مزاج کو پیترو گراد کے ادبی حلقوں میں زیادہ کشش نظر نہ آئی۔ اس کے منصوبہ ساز ذہن کی بے چینی اسے کسانوں کی طرف لے گئی، اپنے تعلیمی نظریات کے تحت اپنے کسانوں کے لیے ایک درسگاہ بھی قائم کی۔ ان نظریات کے تحت اس کے بقول رسمی تعلیم کے برعکس

ایسی آزاد شخصیت پیدا ہو سکتی تھی، جس میں خدا اور انسانی ہمدردی کا شعور ہو۔ پھر ''گھر کے سکھ'' جیسا قابل توجہ ناول لکھا، اس عرصے میں طالسطائی کی شادی بھی ہوئی۔ ان مرحلوں سے گزرنے کے بعد ''جنگ اور امن'' جیسے بڑے ناول کی بنیاد پڑی۔ ''جنگ اور امن'' جیسا ناول طویل ریاضت چاہتا تھا۔ طالسطائی کے سوانح نگار آنری تویا (Henri Troyat) کی تصنیف 1965ء میں فرانس میں شائع ہوئی اور 1967ء میں اس کا انگریزی ترجمہ ہوا۔ یہ سوانح عمری تحقیق اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے ممتاز ہے۔ تویا نے ''جنگ اور امن'' کی تخلیق، اس کی اشاعت اور ابتدائی ردعمل کا قصہ کچھ یوں سنایا ہے۔ طالسطائی دراصل 1825ء کی اس بغاوت پر کتاب لکھنا چاہتا تھا جس میں فوجی افسر اور مثالیت پسند شرفا شامل تھے۔ اس بغاوت کی ناکامی کے بعد اس کے قائدین کو نکولس اول نے سائبیریا بھجوا دیا اور زار الیکسانڈر دوم کے زمانے میں کہیں 1856ء میں انھیں واپس آنے کی اجازت مل سکی۔ طالسطائی عسکری زندگی کے تجربے اور اپنی مثالیت پسندی کی وجہ سے ان سے ذہنی تعلق محسوس کرتا تھا لیکن جب اس نے ان کی تاریخ پر غور کرنا شروع کیا تو اس پر یہ حقیقت منکشف ہونے لگی کہ ان میں سے اکثر نپولین کے خلاف مہمات میں شامل تھے اور ان کے آدرش اور ان کی آزاد خیالی میں فرانس میں قیام کا بڑا دخل تھا۔ چنانچہ اپنے موضوع کی مکمل تفہیم کے لیے 1812ء تا 1814ء کے زمانے کو سمجھنا پڑا مگر روس کی فتح کا یہ دائرہ 1805ء کی تباہی سے بھی متعلق تھا۔ بوناپارٹ کے خلاف فتح سے پہلے اس کے ہاتھوں شکست اور ذلت بھی تو قومی تاریخ کا اہم باب تھی۔
اس موضوع کو پھیلاتے ہوئے طالسطائی اس کے افق کی وسعت سے حیرت زدہ ہو گیا۔ 1825ء کی بغاوت اب ضمنی مسئلہ رہ گئی اور ناول کا منصوبہ اب کچھ یوں ہو گیا کہ اس میں تاریخ کے بڑے واقعات اور سماج کے بالائی طبقوں کی خاندانی زندگی کا ٹکراؤ بیان ہوگا۔ اس میں نپولین، الیکسانڈر جیسے تاریخی کردار بھی ہوں گے اور تخیلی کردار بھی۔ تخیلی کرداروں کے لیے وہ حربہ استعمال ہوا جو ناول نگاروں کا مقدر ہے یعنی اپنے جانے پہچانے کرداروں کی شخصیتوں کو تخیلی رنگ کی آمیزش سے پیش کرنا، چنانچہ طالسطائی کے سوانح نگار بتاتے ہیں کہ نتاشا کا کردار دراصل اس کی سالی تانیا کا ہے البتہ اس میں کچھ عناصر اس کی بیوی سوفیا کے بھی شامل کیے گئے ہیں۔ نکولس رستوف کا کردار اس کے والد کے کردار سے مماثلت رکھتا ہے۔ اسی طرح مختلف کرداروں کے بارے میں تحقیق کی گئی۔ خیر، طالسطائی نے ناول پر کام شروع کیا، یا تویا کے لفظوں میں ''عظیم ریاضت'' کا آغاز کیا۔ وہ نپولین کے حملے کے متعلق کتابیں پڑھنے لگا۔ بہت سے بوڑھے جو اس حملے کے شاہد تھے ان سے بات چیت ہوئی۔ 1863ء اور 1864ء میں طالسطائی نے اس عہد کی فضا سے شناسائی کے لیے ریاضت کی۔ تحریر کا مرحلہ آیا تو مسلسل تراش خراش مسودے میں سات سات بار تبدیلیوں تک پہنچی، اسی دوران میں شکار کرتے ہوئے وہ گھوڑے سے گرا، بے ہوش ہوا، بازو ٹوٹا، ہوش آیا تو گھوڑا بھاگ چکا تھا، خیر وہ کسی طرح گھسٹتا ہوا سڑک تک پہنچا۔ کچھ لوگوں نے اٹھایا، علاج کا مرحلہ شروع ہوا۔ بستی کا طبیب پھسڈی نکلا، بار بار بازو جوڑنے پر بھی ٹھیک نہ بیٹھا۔ آخری بار بازو جڑنے کے بعد جب طالسطائی نے رائفل چلائی تو درد کی ٹیس پورے بازو میں پھیل گئی، آخر اس کے سسر نے اسے ماسکو بلایا اور سسر اور اس کے

دوسرے ڈاکٹر دوستوں نے علاج کیا۔ طالسطائی کا مطالعہ جاری رہا، بعد میں اس نے جنگ کے میدانوں کا بھی مشاہدہ کیا۔ فروری 1865ء میں کتاب کا پہلا حصہ شائع ہوا مگر لوگ پوری طرح اس کی کاوشوں کی وسعت کو سمجھ نہ پائے۔ بھانت بھانت کی بولیاں تھیں۔ آزاد خیال دانش ور تو اسی چیز پر معترض تھے کہ اس نے ''زندہ'' بحثوں کو چھوڑ کر ساٹھ سال پہلے کے عہد کو ناول کا موضوع کیوں بنایا۔ تورگنیف کے ردعمل کا طالسطائی کو بے چینی سے انتظار تھا مگر وہ بھی اس حصے کو پسند نہ کر سکا۔ طالسطائی اس ردعمل سے مایوس نہیں ہوا، کام جاری رہا، بعد میں خود تورگنیف کی رائے کچھ بدلی۔ ادھر طالسطائی کا مطالعہ بھی جاری تھا۔ وکٹر ہیوگو کا ''لامزرایبل''، شوپن ہار کا فلسفہ، پرودھون کے اشتراکی نظریات جس میں پرتشدد انقلاب کی بات تھی مگر نجی ملکیت کو یکسر ختم کرنا مقصود نہ تھا۔ اسی قسم کے کتنے ہی افکار تھے جن سے طالسطائی کا شعور ٹکرا رہا تھا۔ پھر وہ تاریخ دان جن کے نظریات ناول میں خاص وضعوں میں ڈھلے اور جن کے اثرات کی نشان دہی ایسیاہ برلن نے اپنے ایک اہم مضمون میں کی ہے۔ 1869ء میں یہ دھیل جیسی کتاب مکمل ہوئی۔ اب چھ جلدوں کے مکمل ایڈیشن پر ردعمل مختلف تھا۔ پرجوش مداح اس ناول کی خوبیاں گنانے لگے، تورگنیف ناول کے فلسفے کو تو قبول نہ کر سکا بلکہ اس نے کہا کہ جن ادیبوں کی تعلیم ادھوری ہو اور وہ اپنی کوشش سے اسے پورا کرنے کی کوشش کریں، ان کا فلسفہ ہمیشہ کچا ہوتا ہے، مگر طالسطائی کے مشاہدے کا وہ قائل ہو گیا۔ رات کا منظر، شکار کا منظر، ایسے کتنے ہی حصے تھے جن کی داد دیے بغیر کون رہ سکتا تھا۔ غرضیکہ ناول اپنے پیچھے روشنی کی طویل لکیریں بکھیر گیا۔ ناول کو روس کا ''قومی رزمیہ'' تصور کیا گیا حتیٰ کہ اشتراکی روس میں بھی قومی افتخار کے نشان کے طور پر اس کو اہمیت دی گئی۔ خود لینن نے انقلاب سے پہلے طالسطائی کے بارے میں کچھ مضامین لکھتے ہوئے طالسطائی کی بورژوائیت کے باوجود بنیادی سوال اٹھایا، ''طالسطائی سے پہلے روسی ادب میں کسان کہاں تھے؟'' لینن کے اس سوال نے ہنگری کے مشہور مارکسی نقاد لوکاچ سے ایسے تنقیدی تبصرے تحریر کرائے جو طالسطائی کے بارے میں مارکسی تنقید کا اعلیٰ ترین اظہار کہلا سکتے ہیں مگر مارکسی نقاد کے لیے مشکلات بھی تھیں مثلاً ایک روسی نقاد نے پرودھون کے افکار سے اس ناول کی مماثلتوں پر کتاب لکھی تو اسے دبا دیا گیا۔ پرودھون اشتراکی نظریات تو رکھتا تھا مگر مارکسیت سے الگ، اس لیے یہ کتاب اس دور کی فضا میں قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ خیر یہ بعد کے قصے ہیں۔ ادھر ناول کی تکمیل کے بعد سچے فنکار کی طرح طالسطائی کے دل میں ایک سناٹا بھر گیا۔ ''کیا میں کبھی اور بھی کچھ لکھ سکوں گا؟'' یہ سوال اسے ستانے لگا۔ طالسطائی کا اضطراب آسا دل کہاں ہار مانتا تھا پھر ''آننا کارینینا'' کی داغ بیل پڑی۔ 1878ء میں اس ناول کی اشاعت نے لوگوں کو اور بھی چونکایا۔ یہ دوسرے انداز کی کہانی تھی اور بطور ناول کئی نقادوں کے نزدیک 'جنگ اور امن'' سے بھی عظیم اور روسی ثقافت کی حقیقی ترجمان۔ پھر طالسطائی کی تحریروں کا رخ ہی مڑ گیا اور وہ ''مہاتما'' ظاہر ہوا جس کی اصلاحی تحریروں کے اثرات ہمارے ادب میں پریم چند کے زمانے سے شروع ہوتے ہیں۔ طالسطائی کے مذہبی اور تعلیمی نظریات، 'جنگ اور امن'، ''آننا کارینینا' جیسے ناولوں کے خالق کا ادب سے منحرف ہونا جسے ہمارے مجنوں گورکھپوری نے ''ادبی ارتداد'' کہا ہے، حکومتی نظام سنسر اور کلیسا سے اس کا ٹکراؤ،

اپنی بیوی اور خاندان سے اس کے تعلقات کا اتار چڑھاؤ، اس کے جنازے پر مداحوں کا ہجوم، کتنی ہی باتیں ہیں جو اس کے سوانح نگاروں نے تفصیل سے بیان کی ہیں مگر ''جنگ اور امن'' کے ایک مختصر تعارف میں ان کا سمانا مشکل ہے۔

''جنگ اور امن'' کا موضوع وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے یعنی نپولین کا حملہ، روسیوں کی شکست، ماسکو کا خالی ہونا اور پھر روسیوں کی فتح مگر اس حاشیے میں تو زندگی کا پورا میلہ کیا زندگی کا طوفان ہے۔ گھریلو زندگی، خواب گاہیں، بگھیاں، برف باری، برف گاڑیاں، مکان، سڑکیں، لوگ، دعوتیں، تاش کی بازیاں، تھیئٹر، ناچ گھر (کسی نقاد نے کیا خوب لکھا ہے کہ روسی ناولوں میں کرداروں کی نفسیاتی کیفیات کے بیان میں ناچ گھر کی کیا اہمیت ہے اس پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے)۔ انسانی تعلقات کے رنگوں کی دھنک، موسموں کی شدت اور فطری مناظر کا بیان، روسی سماج کے مختلف طبقے، فری میسن، پھر جنگی مہمات، فوجیوں کی زندگی، جنگی حکمت عملی کا بیان جس کے بارے میں معترضین بھی سامنے آئے اور فوجی تجربہ رکھنے والوں نے طالسطائی کا دفاع بھی کیا۔ پھر تاریخی کردار غرضیکہ زندگی کے اس طوفان کی کس کس لہر کو دیکھا جائے، روسی سماج کی زندگی اتنی وسعتوں کے ساتھ کسی ناول میں کب سما سکی تھی، ایسا ہی وسیع طالسطائی کا ذخیرۂ الفاظ بھی تھا۔ روسی ادب کے ایک امریکی مزاج دان ایڈمنڈ ولسن نے تو لکھا ہے کہ ''اگر کوئی روسی زبان سے کچھ شناسائی کے بعد صرف اس ناول کو پڑھ لے تو تقریباً تین چوتھائی روسی زبان کا ماہر ہو چکا ہوگا۔''

''جنگ اور امن'' میں طالسطائی نے تاریخی واقعات اور گھریلو زندگی کے تقابل سے آتش گیر کیفیات پیدا کی ہیں جن کا سرا انسانی مقدر سے جا ملتا ہے۔ طالسطائی کا فلسفہ، کہانی سے ہٹ کر بار بار تاریخ کے فلسفے پر طویل اظہار خیال بڑے بڑوں کی ہمت پست کر دیتا ہے اور لوگوں کو اس میں بالخصوص آخری حصوں میں وہ کیفیت محسوس ہوئی ہے جو عظیم سلطنت کی انتشار کے زمانے میں ہوتی ہے۔ جارج سٹائنر نے لکھا ہے کہ ''لوگ اس چیز کو فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ ناول رزمیہ انداز لیے ہوے ہے اور رزمیے کسی جگہ ختم نہیں ہوتے، یہ دھارا تو بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ طالسطائی کا تقابل تو ہومر جیسے لافانی رزمیہ نگاروں ہی سے ہو سکتا ہے۔'' بہرحال طالسطائی کے تاریخی نظریات کا بیان طویل کیوں نہ ہو اور کہانی کا سرا پکڑ کر چلنے والا قاری کتنا ہی مضطرب کیوں نہ ہو کہانی بھی تو ان سے بندھی ہوئی ہے۔

طالسطائی کا خیال تھا کہ مورخین ''بھولے بادشاہ'' ہیں جو کسی جنگ کے آغاز کے بارے میں کسی واقعہ یا چند واقعات کو اس کا حتمی سبب سمجھ لیتے ہیں۔ کسی بادشاہ یا فاتح کے گرد واقعات کو اکٹھا کر دیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ واقعات کا الجھاؤ کتنا گہرا ہے اور عام لوگوں کی زندگیاں کیسے اس ڈور سے بندھ جاتی ہیں اور کیسے لاکھوں انسان اس بربادی کے دائرے میں آ جاتے ہیں۔ تاریخی واقعات کا ایک سرا غیر عقلی سطحوں اور جبریت کے حصار میں ہوتا ہے۔ ان واقعات کی جتنی عقلی توجیہات کی جاتی ہیں اسی تناسب سے یہ غیر عقلی دکھائی دیتے ہیں۔ تاریخ یعنی بنی آدم کی غیر شعوری، عالم گیر اجتماعی زندگی بادشاہوں اور فاتحین کی زندگی کے ایک ایک پل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔ مورخ یا تو چند واقعات کو من مانے طریقے سے چن لیتے ہیں یا کسی فرد واحد — بادشاہ یا سپہ سالار کے

افعال کا جائزہ لیا جاتا ہے جیسے اس کے افعال بے شمار افراد کے عزائم کے حاصل کل کے مساوی ہوں۔ طالسطائی کا کہنا ہے کہ انیسویں صدی کے پہلے پچاس سالوں میں کروڑوں انسانوں کی غیر معمولی حرکت، ان کا روایتی اشغال کو ترک کر کے یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچنا، ایک دوسرے کو لوٹنا، خون میں نہلانا، زندگی کے چلن کا منقلب ہو جانا، کامرانیوں اور مایوسیوں سے دوچار ہونا، کیا یہ سب پیچیدہ عناصر فرد واحد کے افعال کے ذریعے سمجھے جاسکتے ہیں، کیا کمزور ترا شیا کو عظیم اشیا کا سبب قرار دیا جاسکتا ہے؟ طالسطائی کے لفظوں میں ''تاریخ کے قوانین کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے مشاہدے کا موضوع تبدیل کرنا ہوگا۔ ہمیں بادشاہوں، وزیروں اور جرنیلوں کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے اور ان متجانس اور خردترین عناصر کا، جو عام لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں مطالعہ کرنا چاہیے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ کے قوانین کی تفہیم کے لیے اس طرف پیش رفت کرنا انسان کے لیے کہاں تک ممکن ہے لیکن یہ بالکل عیاں ہے کہ صرف اسی ذریعے تاریخ کے قوانین کی دریافت ممکن ہے۔''

ان تاریخی مباحث سے الجھن ہو تو طالسطائی کے بیانیے کی طرف پلٹا جاسکتا ہے مگر یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ طالسطائی جیسے بڑے ناول نگاروں کا بیانیہ جہاں ظاہری سطح پر سادہ نظر آئے وہاں بھی بڑی گہرائی ہوتی ہے اور ان گہرائیوں کا ادراک بھی فلسفے سے کم مشکل میں نہیں ڈالتا، ہاں سطح کو دیکھ کر جی خوش کر لینے کو بہت سمجھ لینے کی آزادی قاری کا اپنا حق ہے۔ بیانیے کے سلسلے میں طالسطائی کی منظر کشی ہے جس میں بھیڑیے کے شکار جیسے وہ مناظر بھی ہیں جن سے نقادوں کو ہومر کی یاد آئی ہے، کرداروں کے احساسات کا بیان بھی ہے مگر فی الحال ان بہت سی مثالوں کو چھوڑ کر صرف دو ٹکڑوں کی مدد سے دیکھتے ہیں کہ طالسطائی کا تخلیقی تخیل متضاد چیزوں کو جوڑ کر کیسے کیسے نتائج اخذ کرنے پر قدرت رکھتا تھا۔ پہلا منظر وہ ہے جہاں پیئر اپنی زندگی اور دم دار تارے میں مشابہت محسوس کرتا ہے۔

''یور ایکسی لینسی کدھر چلیں؟'' کوچوان نے دریافت کیا۔

''کدھر؟'' پیئر نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''میں کہاں جاسکتا ہوں؟ کلب تو یقیناً نہیں جاسکوں گا اور نہ لوگوں سے ملنے ان کے گھر۔'' محبت اور شفقت کے جن جذبات کا اسے تجربہ ہوا تھا۔ نتاشا نے اپنے اشکوں کے بیچ میں سے اسے جن ملائم اور متشکر نگاہوں سے آخری مرتبہ دیکھا تھا، ان چیزوں کے مقابلے میں اسے تمام انسان قابل رحم اور بدنصیب دکھائی دے رہے تھے۔

''گھر،'' پیئر نے کہا اور اس بات کے باوجود کہ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے دس درجے نیچے گر چکا تھا اس نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر ریچھ کی پوستین کے کوٹ کے بٹن کھول دیے اور مسرت کے احساس سے سرشار تازہ ہوا پھیپھڑوں میں کھینچنے لگا۔

مطلع صاف تھا اور پالا پڑ رہا تھا۔ گندی غلیظ سڑکوں، جن پر روشنی ناکافی تھی اور سیاہ چھتوں کے اوپر تاریک اور ستاروں بھرا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ پیئر نے جب ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی طرف دیکھا، جب وہ

آرباط سکوائر میں داخل ہوا اس کی نگاہوں کے سامنے ستاروں سے معمور فلک کی لامحدود وسعتیں سماگئیں۔ اس آکاش کے تقریباً مرکز میں پری چستینسکی خیابان کے اوپر 1812ء کا جسیم تاباں اور درخشاں دم دار ستارہ جگمگا رہا تھا۔ یہ چاروں اطراف سے دوسرے ستاروں میں، جو آسمان پر بکھرے چمک رہے تھے، محصور تھا، لیکن یہ باقی ستاروں سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ یہ ان کی نسبت زمین سے کہیں زیادہ قریب تھا۔ اس کی روشنی سفید براق اور اس کی بے حد طویل دم اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دمدار ستارہ اپنے جلو میں ہر قسم کے مصائب اور آفات لے کر آیا ہے اور قرب قیامت کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن اس درخشاں اور تاباں دمدار ستارے نے جس کی لمبی اور خیرہ کن دم تھی، پیئر کے دل میں کسی نوع کے خوف کا جذبہ نہ ابھارا، اس کے برعکس وہ مسرت و شادمانی سے سرشار اور اشکوں سے بھرپور آنکھوں سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ ستارہ لامحدود خلا میں ناقابل تصور تیز رفتاری سے اپنے محور کے گرد سفر کرنے کے بعد سیاہ آسمان میں اپنی منتخب جگہ اس طرح گڑا نظر آ رہا تھا جیسے کوئی زمین میں کھمبا کھڑا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بڑی جانفشانی سے اپنی دم سیدھی اوپر اٹھائے ہوئے تھا اور لاتعداد دیگر چمکتے ستاروں کے مابین جگمگا رہا اور اپنی سفید روشنی کی نمائش کر رہا تھا۔ پیئر کو یوں لگا کہ یہ ستارہ اس کی اپنی روح سے، جو نرم و گداز ہو چکی تھی اور بلندیوں کی طرف اٹھ چکی تھی، پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ (ترجمہ شاہد حمید)

اندرونی احساسات اور فطری منظر کا ایسا گمبھیر تال میل آسانی سے ممکن نہیں۔ روح کے ایک مخصوص تجربے کے بعد گداز ہونے کی کیفیت بظاہر منحوس ستارے کو بھی کتنا قابل قبول بنا رہی ہے۔ تطہیر کی یہ کون سی شکل ہے؟ زندگی کے اثبات کا یہ کون سا مرحلہ ہے؟ دوسری مثال کسی فرد کی نہیں، یہاں شہر کی تصویر ہے، ماسکو خالی ڈھنڈار پڑا ہے، اس وقت ملکہ کے بغیر شہد کی مکھیوں کے چھتے کا مفصل بیان ہوا ہے۔ حیاتیاتی علم اور حشرات کے عالم کو کس طرح انسانی زندگی سے ملا دیا ہے، ایسی فنکاری ہی تو بیانیے میں جادو جگاتی ہے، کہانیاں تو بچے بھی سنا دیتے ہیں۔

''دریں اثنا ماسکو خالی ڈھنڈار بن چکا تھا۔ یوں شہر میں لوگ اب بھی موجود تھے۔ غالباً آبادی کا پچاسواں حصہ پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن شہر خالی تھا اور یہ اسی طرح خالی تھا جس طرح شہد کی مکھیوں کا چھتا ملکہ کی عدم موجودگی کے سبب خالی اور مرگ پذیر ہو جاتا ہے۔ بے ملکہ چھتا روح حیات سے یکسر عاری ہوتا ہے، بے شک سطحی نظروں سے دیکھنے میں دوسرے چھتوں کی طرح زندگی سے بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ دوپہر کی حدت میں شہد کی مکھیاں بغیر ملکہ کے چھتے کے اوپر اس خوش دلی سے منڈلاتی پھرتی نظر آتی ہیں جس طرح وہ ذی حیات چھتوں کے اوپر منڈلاتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اسی انداز سے اڑتی اور اس کے اندر آتی اور باہر جاتی ہیں اور دور سے شہد کی مہک بھی محسوس ہوتی ہے لیکن آدمی کو اس کا ذرا احتیاط سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے اور

اسے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس میں زندگی کی رمق باقی نہیں رہی۔ مکھیوں کے اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کا انداز وہ نہیں ہوتا جو پہلے تھا اور مکھیاں پالنے والے شخص کو اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے کہ آواز اور مہک دونوں میں پہلے کی نسبت نمایاں فرق آ گیا ہے۔ جب وہ بیمار چھتے کی دیوار کو کھٹکھٹاتا ہے تو ہزاروں مکھیاں بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح آناً فاناً متفقہ ردعمل کا اظہار کریں، بھنبھناتی ہوئی آئیں، تہدیدی انداز سے اپنے پروں کو پھیلائیں اور انھیں بہ سرعت جھلاتے کنکناتی اور زندہ و توانا گنگناہٹ پیدا کریں، ان کی کھوکھلی اور بے ربط بھنبھناہٹ جو اجاڑ چھتے کے مختلف حصوں سے آتی ہے، اس کا استقبال کرتی ہے۔" (ترجمہ شاہد حمید)

یہ مفصل بیان جو چھتے کے جلائے جانے پر ختم ہوتا ہے حیرت انگیز مشاہداتی قوت کے ذریعے شہر کے مقدر کی عجیب اور گہری تمثیل بن جاتا ہے۔ ناول میں طالسطائی کے تخلیقی تخیل کے ایسے حیرت انگیز کرشمے تو جگہ جگہ ملیں گے۔

روس میں پچھلے چند برسوں میں ایسی زبردست تبدیلیاں آئی ہیں جن کی جتنی عقلی تفسیریں آ رہی ہیں طالسطائی کے فلسفے کے مطابق وہ اور غیر عقلی محسوس ہوتی ہیں۔ کیا کسی نظام کی ناکامی یا ان تبدیلیوں کو افراد کے حوالے سے سمجھا جائے یا کوئی طالسطائی کی طرح واقعات کو دور تک جا کر سمجھنے کی کوشش کرے گا۔ "جنگ اور امن" کو روس کا قومی رزمیہ سمجھا گیا، اب روس مختلف ریاستوں کی دولت مشترکہ بن چکا ہے۔ یہ دولت مشترکہ کتنی کسی ہوئی ہو گی، کتنی ڈھیلی، ابھی کیا کہا جا سکتا ہے۔ طالسطائی کا رزمیہ اب روسی فیڈریشن سے متعلق ہے یا باقی ریاستیں بھی مشترکہ ورثے کا کوئی گہرا احساس پیدا کریں گی؟ خیر ان مسائل کے بارے میں جو بھی کہیں طالسطائی کا ناول تو اب عالمی ادب کا کلاسیک بن چکا ہے۔ ہر زبان کو اس سے رابطہ پیدا کرنا ہے۔ طالسطائی نے مخصوص صورت حال میں روسی انسان کا ردعمل دکھایا ہے مگر اس کے ہاں مسئلہ تو انسانی مقدر کا ہے۔

سہیل احمد خان

معروضات وتصریحات

متن

طالسطائی نے اپنے ناول ''جنگ اور امن'' کو جسے روس کی ''نیشنل ایپک'' (قومی رزمیہ) کہا جاتا ہے، 1863ء
میں لکھنا شروع کیا۔ اکتوبر 1863ء میں اس کی شریک حیات سوفیا نے اپنے روزنامچے میں تحریر کیا: '' آج کل وہ نئی
کتاب لکھنے میں مصروف ہیں۔ انھیں وہ ''تاریخِ 1812ء'' (History of 1812) کہتے ہیں۔ تاہم ''1865ء
میں یہ ''1805ء'' کے نام سے قسط وار منصۂ شہود پر آئی اور بعد میں یہی ''جنگ اور امن'' کا پہلا حصہ بنی۔

لکھنے کا کام چلتا رہا۔ 1866ء کے اواخر میں اس نے سوفیا کے مشورے پر کان دھرا اور پورے ناول کو خود
کتابی شکل میں شائع کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ ایک دوست سے ایک ہزار روبل ادھار لیے (اس نے ان میں سے
اچھی خاصی رقم جوتوں اور سموری ہیٹوں کی خریداری پر صرف کردی) اور ایک آرٹسٹ سے مختلف کرداروں کی تصاویر
بنوائیں۔ 1876ء میں کتاب کے نام کا فیصلہ ہوا۔ ''1805ء'' کے نسخے میں کافی کانٹ چھانٹ ہوئی، متعدد نئے
ابواب کا اضافہ کیا گیا یا انھیں از سرِ نو لکھا گیا اور کتاب کے چار حصوں میں چھپنے کا اعلان کردیا گیا۔ مگر کتاب کا حجم
بڑھتا جارہا تھا اور 1868ء میں اخباروں میں اعلان شائع ہوا کہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہوگی، تاہم جو لوگ چار
حصوں کی پیشگی قیمت ادا کرچکے ہیں، انھیں پانچواں حصہ مفت فراہم کیا جائے گا!

دریں اثنا پہلے تین حصے چھپ چکے تھے اور دھڑا دھڑ بک رہے تھے لیکن طالسطائی کا قلم کہیں رکتا ہی نہیں تھا۔
چوتھا حصہ شائع ہوا۔ 1869ء میں پہلے پانچویں اور پھر چھٹے حصے کی اشاعت عمل میں آئی۔ یوں خدا خدا کرکے کتاب
تکمیل تک پہنچ ہی گئی۔

''جنگ اور امن'' کا جو حصہ ''1805ء'' کے نام سے قسط وار شائع ہوا تھا، طالسطائی کے سوانح نگار اور نقاد اسے
پہلا ایڈیشن قرار دیتے ہیں۔ اس میں مصنف نے فرانسیسی کا (بالخصوص مکالموں میں) دل کھول کر استعمال کیا تھا
(فرانسیسی روسیوں کا اوڑھنا بچھونا بن چکی تھی۔ بعض لوگوں کو تو اپنی زبان آتی ہی نہیں تھی، وہ صرف فرانسیسی بولتے
اور لکھتے تھے)۔ دوسرے ایڈیشن میں اس نے اکثر و بیشتر مقامات پر فرانسیسی کو روسی قالب پہنا دیا۔

طالسطائی خوش خط نہیں تھا۔ وہ باریک لکھنے کے ساتھ ساتھ حروف بھی ایک دوسرے کے قریب جوڑ جوڑ کر لکھتا تھا۔ اوپر سے وہ مسودے میں بار بار ترامیم کرتا رہتا تھا۔ یوں ایک قسم کی کھچڑی سی بن جاتی تھی اور اسے سمجھنا خاصا دشوار امر تھا۔ اس مشکل کا ایک حل یہ نکالا گیا کہ طالسطائی جو کچھ دن کے اوقات میں لکھتا، سوفیا رات کو مصنوعی اور ناکافی روشنی میں اس کی نقل تیار کرتی اور یہی نقل پریس میں بھیجی جاتی۔ مہارت اور پوری کوشش کے باوجود سوفیا بھی اغلاط سے بچ نہ سکی۔ کہا جاتا ہے کہ طالسطائی کے اصل مسودے اور سوفیا کی نقل میں 1885 تناقضات (discrepancies) ہیں۔

جب کتاب چھپ کر آئی، اس نے سوچا کہ یہ تو بہت برا ہوا۔ ایک تو وہ ان اغلاط کی اصلاح کرنا، دوسرے بعض مقامات پر فرانسیسی مکالمات کو دوبارہ داخل کرنا اور تیسرے کہیں کہیں اسلوب بیان کو بہتر بنانا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ پکڑا، قلم اٹھایا اور اس میں ترمیم و تنسیخ شروع کر دی۔ (اس مرتبہ اس نے کتاب کو چھ کی بجائے چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔) جب یہ کام مکمل ہو گیا، اس نے اصلاح شدہ نسخہ اپنے معتمد دوست• نکولائی نکولائیوچ ستراخوف کو بھیج دیا کہ وہ اپنی نگرانی میں کتاب چھپوا دے۔ کتاب کی طباعت کے دوران میں دونوں کے مابین خط کتابت ہوتی رہی۔ ستراخوف اسے سب کچھ بتاتا رہا لیکن اس نے یہ کہیں اقرار نہیں کیا کہ وہ طالسطائی کا (خود ساختہ) ایڈیٹر بن گیا ہے اور اس میں مزید ترامیم کر رہا ہے۔ چنانچہ جب 1873ء میں ناول کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا تو اس میں طالسطائی اور ستراخوف دونوں کی ترامیم شامل تھیں۔ اسی ایڈیشن سے ملتا جلتا پہلے چوتھا اور 1886ء میں پانچواں ایڈیشن زیور طباعت سے آراستہ ہوا۔

ستراخوف کی بیشتر ترامیم ایک ایک دو دو یا تین تین الفاظ پر مشتمل ہیں۔ مثلاً طالسطائی نے لکھا: ''کہیں ایک سوداگر رہتا تھا۔'' ستراخوف نے اسے ''نزشھنی میں ایک سوداگر رہتا تھا'' میں تبدیل کر دیا۔ طالسطائی نے ایک شخص کے متعلق لکھا کہ اسے قید بامشقت کی سزا ہوئی، ستراخوف نے اسے قید بامشقت ہی نہیں دی، اسے سائبیریا بھی بھیج دیا۔ طالسطائی نے لفظ ''تصادم'' تحریر کیا، ستراخوف نے اسے ''ناخوشگوار تصادم'' بنا دیا۔ طالسطائی نے لکھا: ''وہ گانا گانے لگا۔'' ستراخوف نے اسے ''وہ پھٹی پھٹی آواز میں گانا گانے لگا۔'' بنا دیا۔ اس قسم کی ترامیم ہر صفحے اور اکثر جگہ تقریباً ہر جملے میں موجود ہیں۔ میں دو سو گننے کے بعد تھک گیا اور آگے ہاتھ اٹھا لیا۔

یہ ترامیم بذات خود قابل ستائش نہیں۔ کسی بھی تخلیقی مصنف کے ساتھ اس طرح کی دل لگی کو پسند نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ستراخوف نے ان ادنیٰ ترامیم پر ہی اکتفا نہیں کیا۔ اس کے ہاتھ میں قلم تھا۔ کہیں وہ سطروں کی سطریں قلم زد کرنے (ویسے اس نے یہ کام نسبتاً کم کیا ہے) اور کہیں سطروں کی سطریں اپنی طرف سے بڑھانے (یہ کام اس نے فراخ دلی سے کیا ہے) لگا اور ایک جگہ تو اس نے آدھا صفحہ خود لکھا اور ناول میں شامل کر دیا۔

• طالسطائی کو ستراخوف پر کتنا اعتماد تھا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اپنے پہلے وصیت نامے میں تحریر کیا کہ ''اس کے جتنے بھی کاغذات ہیں انہیں ستراخوف، چرت خوف اور کاؤنٹس سوفیا طالسطائی، جس طرح چاہیں، ٹھکانے لگا دیں۔'' (اے این ولسن)

ستراخوف کی بیشتر تبدیلیاں، جن کے متعلق روز میری ایڈمنڈز کا کہنا ہے کہ ان کا ترجمے پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا، اسلوب اور زبان و بیان کی باریکیوں سے متعلق ہیں۔ یہ تبدیلیاں کس قسم کی ہیں جب تک اصل روسی متن تک رسائی حاصل نہ ہو، ان کے متعلق کوئی رائے زنی نہیں کی جاسکتی، مگر یہ ترامیم اور اضافے خواہ کتنے ہی متاثر کن کیوں نہ ہوں، بہرحال تحریفات کے زمرے میں ہی شمار ہوں گے۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ جو ایڈیشن اس کی زیرنگرانی شائع ہوئے وہی قابل اعتبار ٹھہرے کیونکہ کسی کو خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ طالسطائی کی کوئی دوسرا شخص بھی اصلاح کرسکتا ہے۔

1930ء کی دہائی میں جب طالسطائی کی تمام تحریروں (یہ تحریریں نوے جلدوں میں سمائیں) کو جوبلی ایڈیشن کے نام سے شائع کرنے کا پروگرام بنا تو این آ کاپووا، این کے گدزی، این این گوسیف اور ایم بی خراپ چنکو پر مشتمل ایڈیٹروں کا بورڈ یہ فیصلہ نہ کرپایا کہ وہ ''جنگ اور امن'' کے کون سے ایڈیشن کو اپنے متن کی بنیاد بنائیں۔ انھوں نے اپنی 1930-1933ء کی طباعت کے لیے پانچویں (مطبوعہ 1886ء) اور 1937ء کی طباعت کے لیے دوسرے ایڈیشن (مطبوعہ 1868-1869ء) کو منتخب کیا۔ لیکن ذہنوں میں جو الجھن تھی، وہ دور نہ ہوسکی۔

1937ء کی اشاعت کے چند سال بعد ہی انتہائی اہم دستاویزات کا انکشاف ہوا۔ طالسطائی نے 1873ء میں تیسرے ایڈیشن کی تیاری کے لیے جو خطوط لکھے تھے، وہ سارے کے سارے ڈھونڈ نکالے گئے اور دوسرے ایڈیشن کے جس نسخے پر طالسطائی اور بعد میں ستراخوف نے ترامیم کی تھیں، وہ بھی مل گیا۔ اب مستند نسخے کی تیاری کا کام مادام ای زیدین شنور کے سپرد ہوا۔

مادام زیدین شنور لکھتی ہیں: ''اب ہمیں اس امر کے کہ طالسطائی نے کیا ترامیم کی تھیں اور ستراخوف نے کیا، ناقابل تردید شواہد مل گئے ہیں۔ خطوط سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ ستراخوف نے جو ترامیم کی تھیں، وہ اس نے طالسطائی کو دکھائے بغیر ہی کتاب کا نظرثانی شدہ مسودہ پریس میں بھیج دیا۔ چنانچہ طالسطائی کو یہ ترامیم دیکھنے کا کبھی موقع نہ مل سکا اور نہ اس نے کبھی ان کی صحت کی تصدیق کی۔ ان نودریافت دستاویزات سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہوجاتی ہے کہ ناول کی بیشتر تبدیلیاں طالسطائی کے بجائے ستراخوف کے قلم کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ 1873ء اور 1886ء کے ایڈیشنوں کی بنیاد پر بعد میں جتنے بھی ایڈیشن شائع ہوئے، وہ صحیح نہیں ہیں کیونکہ ان دونوں کی ترتیب میں طالسطائی کا کوئی ہاتھ نہیں تھا۔''

چنانچہ مادام زیدین شنور نے اس نودریافت مواد کی روشنی میں ''جنگ اور امن'' کی ازسرنو تدوین کا کام شروع کیا۔ اب کے اس نے اپنے نسخے کی بنیاد 1868-1869ء کے ایڈیشن کو بنایا، کیونکہ اس میں سب حک و اضافے طالسطائی کے اپنے تھے اور اس نے 1873ء کے ایڈیشن کی صرف وہی ترامیم، جو طالسطائی نے اپنے ہاتھ سے کی تھیں، شامل کیں۔ مادام زیدین شنور کا مرتب کردہ نسخہ، جسے مستند قرار دیا جاسکتا ہے، سٹیٹ پبلشنگ ہاؤس فار لٹریچر ماسکو نے چار حصوں میں 1963ء میں شائع کیا۔

یہ ترجمہ اسی نسخے کے انگریزی ترجمے پر مشتمل ہے۔

انگریزی تراجم

سوچا تو راقم الحروف نے بھی یہی تھا کہ ''جنگ اور امن'' کا اردو ترجمہ براہ راست روسی زبان سے کیا جائے۔ اس مقصد کے لیے راقم الحروف نے روسی زبان سیکھنا بھی شروع کر دی۔ کچھ شد بد ہو بھی گئی لیکن بیچ میں کچھ ایسی مشکلات کا، جو استاد کے بغیر حل نہیں ہو سکتی تھیں، سامنا کرنا پڑا (اور استاد کہیں ملتا نہیں تھا) کہ مجبوراً کوشش ترک کرنا پڑی اور انگریزی تراجم کا سہارا لینا پڑا۔

جہاں تک راقم الحروف کی معلومات کا تعلق ہے، انگریزی میں ''جنگ اور امن'' کے پانچ مختلف تراجم شائع ہوے ہیں اور ان میں پہلے چار 1885ء کے ایڈیشن پر مبنی ہیں۔

1- گمنام ترجمہ: خاصا پرانا ترجمہ ہے۔ پہلی بار کب شائع ہوا، معلوم نہیں ہو سکا، البتہ جے ایم ڈینٹ اینڈ سنز نے اسے پہلی بار EveryMan's Library Series میں 1911ء میں چھاپا اور 1932ء میں اس پر نظر ثانی کرائی۔ خاصا گنجلک ترجمہ ہے۔ بعض مقامات پر مترجم سے سنگین غلطیوں کا ارتکاب ہوا ہے۔ (مثلاً ایک جگہ دلوخوف اپنے قازقوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ فرانسیسیوں پر حملہ کرنے سے پہلے پیادہ دستے کا انتظار کر لیں، اس مترجم نے پیادہ دستوں کو گھڑسوار دستہ بنا دیا ہے۔) بعض مقامات پر، جہاں بات سمجھ میں نہیں آئی، مترجم جملوں کے جملے چھوڑ دیتا ہے یا پھر ایسا پیچیدہ طرز بیان اختیار کرتا ہے کہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔

2- گارنیٹ (Constance Garnett): گارنیٹ بہت ذہین خاتون تھی۔ زبان بھی بہت خوبصورت لکھتی تھی اور روسی مصنفین کے سب سے زیادہ تراجم بھی اسی نے کیے ہیں مگر اس نے روسی زبان اور معاشرت کو سمجھنے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں۔ نقادوں نے اس کے تراجم میں لاتعداد اغلاط کی نشان دہی کی ہے۔ مشہور روس نژاد امریکی ناول نگار اور نقاد نابوکوف نے تو اسے خاص طور پر تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ اس کے ایک نقاد کا کہنا ہے: ''گارنیٹ شاید اس لیے غلطیاں کرتی تھی کیونکہ اس زمانے میں اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے روسی انگریزی لغت شائع نہیں کی تھی۔ اوکسفرڈ کی لغت، جو بعد میں شائع ہوئی، بذات خود ناقص ہے۔ گارنیٹ نے جو لغات استعمال کیے ہوں گے، وہ تو بالکل ہی گئے گزرے ہوں گے۔'' (کریگ رین: لنڈن ریویو آف بکس، 13 جون 1991ء)

3- ماڈ (Louise & Aylmer Maude): یہ دونوں مترجم میاں بیوی تھے۔ اگرچہ دونوں انگریز تھے لیکن انھیں دوسرے مترجمین پر یہ فوقیت حاصل تھی کہ لوئیز ماسکو میں پیدا ہوئی اور چالیس سال وہیں مقیم رہی۔ ایلمر نے دو سال ماسکو میں تعلیم پائی اور 23 برس روس میں قیام پذیر رہا۔ دونوں کو روسی زبان پر عبور حاصل تھا اور وہ روسی معاشرت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اس کے علاوہ دونوں طالسطائی کے حلقے میں شامل تھے۔ (ایلمر ماڈ تو اس کا دوست اور کسی حد تک مرید بھی تھا۔) پھر انھوں نے اپنے ''گرو'' کے ناولوں کے جو تراجم کیے، طالسطائی نے انھیں جستہ جستہ دیکھا اور پسندیدگی کی سند عطا کی۔ راقم الحروف کے خیال میں ''جنگ اور امن'' کا بہترین اور قابل اعتماد ترجمہ یہی ہے، اگلی دونوں مترجمین اس کی محض خوشہ چیں معلوم ہوتی ہیں۔ تاہم ماڈ کے ترجمے میں ایک گڑ

بڑا تو یہ ہے کہ اس نے روسیوں کے مسیحی (یا ذاتی) ناموں کو انگریزی قالب پہنا دیا ہے، مثلاً آندرے کو اینڈری، لیسا کو الزبتھ اور پیوتر کو پیٹر بنا دیا ہے۔ اس سے ناولوں کی روسی فضا متاثر ہوئی ہے۔ دوسری خرابی یہ ہے کہ یہ ترجمہ بھی 1885ء ہی کے ایڈیشن پر مبنی ہے لیکن اس میں مترجمین کا کوئی قصور نہیں کیونکہ اس وقت 1885ء کا ایڈیشن ہی صحیح سمجھا جاتا تھا۔

ماڈ کے ترجمے کی اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں تاریخی واقعات و شخصیات اور روسیوں کے رہن سہن اور رسم و رواج پر حواشی بھی شامل ہیں۔ شروع میں یہ حواشی مترجمین نے ہی تحریر کیے تھے لیکن ماسکو میں ''جنگ اور امن'' کے مستند نسخے کی اشاعت کے بعد جب 1983ء میں اس ترجمے کے پبلشر اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس نے کتابت کی ترتیب میں تبدیلی کی، اسے چھ کی بجائے چار حصوں (یا کتب) میں تقسیم کیا اور تین کی بجائے دو جلدوں میں شائع کرنے کا منصوبہ بنایا، تو اس کے ایڈیٹر ہنری گفرڈ نے نئی معلومات کی روشنی میں حواشی پر نظر ثانی کی، کچھ خارج کر دیے، کچھ میں ترامیم کیں اور کچھ بالکل نئے سرے سے لکھے۔ راقم الحروف نے ان حواشی سے خاصا فائدہ اٹھایا ہے لیکن الجھاؤ سے بچنے کے لیے حوالہ صرف ماڈ کا دیا ہے۔

4- روز میری ایڈمنڈز (Rosemary Edmonds): ایڈمنڈز انگریزی، روسی، فرانسیسی، اطالوی اور قدیم سلاوی زبانوں کی عالم ہے۔ اس کا ترجمہ پہلی بار ''پینگوئن کلاسیکس'' سیریز میں 1957ء میں شائع ہوا۔ اگرچہ اس نے ماڈ کی خاصی خوشہ چینی کی ہے، اس کا اپنا اسلوب نگارش شستہ، سلیس اور سیدھا سادا ہے، کہیں کوئی خاص الجھاؤ نہیں۔ جو بات دوسرے تراجم سے واضح نہیں ہوتی، وہ یہاں اکثر صاف ہو جاتی ہے۔ اپنے ترجمے کے 1973ء کے ایڈیشن میں اس نے دعویٰ کیا کہ ماسکو میں ''جنگ اور امن'' کے مستند ایڈیشن کی اشاعت کے بعد اس نے اپنی کتاب میں ترامیم کر دی ہیں لیکن یہ دعویٰ زبانی معلوم ہوتا ہے، عملاً کہیں نظر نہیں آتا۔ پھر اگر ماڈ نے روسیوں کے مسیحی ناموں کو انگریزی قالب پہنا دیا ہے، ایڈمنڈز نے پیچھے رہنا مناسب نہ سمجھا اور اس نے روسی مردوں اور عورتوں کے خاندانی نام انگریزی انداز سے ایک ہی طرح لکھ دیے ہیں۔ مثلاً وہ رستوف کی نسوانی صورت رستووا نہیں لکھتی، رستوف ہی تحریر کرتی ہے۔ اس سے بھی ناول کی روسی فضا متاثر ہوتی ہے۔

5- این ڈونیگن (Ann Dunnigan): یہ امریکی ترجمہ ہے اور غالباً اکلوتا امریکی ترجمہ ہے۔ اسے نیو امیریکن لائبریری نے پہلی مرتبہ 1968ء میں شائع کیا تھا۔ روز میری ایڈمنڈز کی طرح این ڈونیگن نے بھی روسی مصنفین کی کتابوں کے مترجم کی حیثیت سے خاصی شہرت حاصل کی ہے۔ روز میری ایڈمنڈز کی طرح وہ بھی ماڈ کی خاصی خوشہ چینی کرتی نظر آتی ہے اور بعض مقامات پر اس کا طرز نگارش خاصا ژولیدہ اور لفاظی سے پر ہے تاہم انگریزی میں یہ واحد ترجمہ ہے جو مستند روسی ایڈیشن سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگرچہ راقم الحروف نے ماڈ اور ایڈمنڈز کے تراجم سے خاصا استفادہ کیا ہے لیکن اس نے متن این ڈونیگن کا ہی اختیار کیا ہے۔

میرے اس ترجمے کے بعد انگریزی میں ''جنگ اور امن'' کے دو مزید تراجم شائع ہوئے ہیں۔ 2005ء میں روسی زبان کے پروفیسر انتھنی برگز (Briggs) کا ترجمہ طبع ہوا۔ اسے اختلافی ترجمہ قرار دیا گیا ہے کیونکہ اس میں

روسی سپاہیوں کی سلینگ کا ترجمہ انگریزی سلینگ میں کیا گیا ہے۔

2007 میں رچرڈ پیور (Peaver) اور اس کی اہلیہ لاریسا ولخونسکی کا ترجمہ اشاعت پذیر ہوا۔ پیور امریکی ہے جب کہ لاریسا ولخونسکی روسی النسل۔ لاریسا ولخونسکی روسی ناولوں کا لفظی ترجمہ کرتی ہے کیونکہ اسے انگریزی زبان پر اتنا عبور حاصل نہیں۔ پیور اس کے ترجموں کی تراش خراش کرتا اور نوک پلک سنوارتا ہے۔ دونوں کو ''آننا کارنینا'' اور ''کراماز وف برادران'' کے ترجموں پر انعامات بھی مل چکے ہیں۔ ان کے ''جنگ اور امن'' کے ترجمے کو بھی بہت سراہا گیا ہے۔

ترجمے کی مشکلات

غالب کی طرح طالسطائی اشکال پسند بھی ہے اور اس کی تحریریں سہل ممتنع کا شاہکار بھی ہیں، بلکہ بعض مقامات پر اس کی آسان عبارتیں مترجم کے لیے زیادہ مشکلات کھڑی کرتی ہیں۔ There is a There, and There is a Someone. There is the future life. The Someone is — God. بظاہر بہت آسان عبارت ہے لیکن ترجمہ کرنے بیٹھیں تو دن میں تارے نظر آنے لگتے ہیں۔ ''جنگ اور امن'' تو بالکل نرالی دنیا ہے۔ مہد سے لحد تک انسان کی کون سی مصروفیت (activity)، ذہنی اور جذباتی کیفیت، معاشرت کا کون سا گوشہ اور کون سا علم ہے جسے مصنف نے کسی نہ کسی طرح اس میں گھسیٹ نہ لیا ہو۔ بعض اشغال (مثلاً تیراندازی) اور علوم کی یورپی اصطلاحات کے اردو مترادفات ملتے ہی نہیں اور اگر خود گھڑے جائیں تو کوئی انھیں سمجھے گا نہیں۔ مجبوراً انھیں یا تو یوں کا توں لکھ دیا گیا ہے اور تشریح حواشی میں کر دی گئی ہے یا پھر وضاحتی فقروں سے کام چلایا گیا ہے۔ بعض اوقات پنجابی میں بالکل صحیح مترادفات مل جاتے ہیں لیکن پنجابی کا استعمال بعض لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس سے زیادہ تر احتراز ہی کیا ہے۔

مغربی زبانیں ساخت اور مزاج کے اعتبار سے ہماری زبانوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ان زبانوں میں رموز اوقاف (punctuations) کا خاص خیال رکھا جاتا ہے*۔ اس لیے طویل سے طویل جملہ لکھنا ممکن ہے (اور ڈیٹیل

* انگریزی میں رموز اوقاف سے بڑے بڑے کام لیے گئے ہیں۔ اس کی ایک دلچسپ مثال اے جے ٹامسن Thomson اور اے وی مارٹینیٹ (Martinet) نے اپنی کتاب ''اے پریکٹیکل انگلش گرامر'' (مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی) میں دی ہے۔

His brother who is an artist is my friend.

His brother, who is an artist, is my friend

بظاہر دونوں فقرے ایک جیسے ہیں لیکن ان کے معانی میں بہت فرق ہے۔ پہلے فقرے میں بھائیوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے اور یہاں مراد وہ بھائی ہے جو کہ آرٹسٹ ہے۔ دوسرے فقرے میں بھائی صرف ایک ہے اور Commas کے درمیان میں جو بات کہی گئی ہے اس کی حیثیت محض اضافی ہے۔ چنانچہ پہلے فقرے میں اگر brother کی جگہ father لکھ دیا جائے، تو نہ صرف فقرہ غلط ہو جائے گا بلکہ اس سے بڑی بدتمیزی کا تصور بھی ناممکن ہے۔

ایک اور مثال دیکھیں:

بقیہ اگلے صفحے پر

ڈیفو نے تو پورے پورے صفحہ کا جملہ لکھ دیا ہے)۔ (قرآن مجید میں بھی رموز اوقاف کا خصوصی مقام ہے اور اسی لیے لاتعداد طویل آیات موجود ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ عربی، فارسی اور اردو کے ادیبوں اور مصنفوں نے اس اہم شعبے کو کیوں نظر انداز کر رکھا ہے۔ اردو اخبار پڑھیں تو اکثر اوقات پورے پورے کالم میں کہیں کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی اور پتا ہی نہیں چلتا کہ فقرہ کہاں سے شروع ہوا اور کہاں ختم ہوا۔) اردو ترجمے میں طویل فقروں کو توڑ کر متعدد چھوٹے فقروں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ میں نے بھی یہ کام کیا ہے لیکن بعض اوقات اس توڑ پھوڑ کا نتیجہ اچھا برآمد نہیں ہوتا، عبارت کی روانی میں بہت فرق آ جاتا ہے۔ چنانچہ متعدد مقامات پر میں نے ایسا کرنے سے احتراز برتا ہے اور انگریزی کی طرح ذیلی جملے (کلاز) کو اس کے مرجع (antecedent) سے ملا کر اور اوقاف کو استعمال کر کے ذرا طویل فقرے لکھے ہیں۔ یہ شعوری کوشش ہے، پتا نہیں قارئین اور ناقدین کا ردعمل کیا ہو۔

اوقاف کے ضمن میں ایک اور بات جو آپ کو ترجمے میں نظر آئے گی، وہ نقطوں کا استعمال ہے۔ اس کتاب میں جہاں بھی نقطے لگائے گئے ہیں، انگریزی کی طرح ایک مقام پر صرف تین ہی لگائے گئے ہیں، ان کا ڈھیر نہیں لگایا گیا۔ مکالمات میں میں نے این ڈونیگن کا تتبع کیا ہے۔ نقطے اس امر کی علامت ہیں کہ متکلم بات کہتے کہتے رک گیا ہے اور جہاں کوئی دوسرا شخص قطع کلامی کرتا ہے، وہاں (لکیر) ڈیش استعمال کی گئی ہے۔

ترجمہ فی نفسہٖ اصل کی محض نقالی یا بھونڈا چربہ ہوتا ہے، لاکھ کوشش کے باوجود مولوی مدن کی بات پیدا نہیں ہوتی۔ لفظ اپنے مخصوص ماحول کی پیداوار ہوتا ہے اور اس کے اپنے تلازمات* (connotations) ہوتے ہیں۔ (آپ "سلفے کی لاٹ" اور "تنیاز" کا کیا ترجمہ کریں گے؟) پھر زبان و بیان کی اپنی لطافتیں اور باریکیاں (nuances) اپنی جگہ۔ "جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی، حق تو یوں ہے کہ حق ادا نہ ہوا" کا آپ ترجمہ تو کر لیں گے لیکن اصل کا مزہ کہاں سے لائیں گے۔ لیکن ترجمے در ترجمے میں تو بات اور بھی بگڑ جاتی ہے۔ اصل کا کچھ پتا نہیں ہوتا، بس اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنا پڑتی ہیں۔ روسی زبان کی اپنی انفرادیت ہے۔ یہ کئی لحاظ سے انگریزی سے خاصی مختلف اور اردو سے ملتی جلتی ہے۔ انگریزی کے برعکس اس میں آرٹیکل the, an, a نہیں ہوتے۔ چنانچہ روسی لفظ dom کا مطلب موقع محل کی مناسبت سے house (مکان)، a house یا the house ہو سکتا ہے۔ دوسرے روسی is,am,are جیسے الفاظ حذف کر دیتے ہیں۔ جب وہ یہ کہنا چاہیں گے کہ "آنتن ڈاکٹر ہے"، وہ صرف یہ کہیں گے:

Ahtoh — doktor. (روسی زبان میں h کا تلفظ ن ہوتا ہے۔)

بقیہ پچھلے صفحے سے But there is plenty of evidence that the young, who matter most, are certainly not content to sit back and listen all the time.

But there is plenty of evidence that the young, who matter most, are certainly not content to sit back and listen all the time.

پہلے جملے میں نوجوانوں سے مراد تمام نوجوان ہیں اور انھیں معاشرے کا اہم ترین طبقہ گردانا گیا ہے لیکن دوسرے جملے میں نوجوانوں سے مراد وہ چند گنے چنے نوجوان ہیں جن کی اپنی کوئی حیثیت ہے۔

• مجھے اس سے بہتر لفظ نہیں ملا۔

تیسرے روسی میں سوالیہ یا ندائیہ جملے نہیں ہوتے، صرف لہجے یا مفہوم سے پتا چلتا ہے کہ سوال پوچھا جارہا ہے یا محض سیدھی سادی بات کہی جارہی ہے۔ ہمارے ہاں بھی بعض اوقات یہی انداز اختیار کیا جاتا ہے۔ مثلاً ''آپ آگئے؟'' میں نے ''جنگ اور امن'' کے پانچوں انگریزی تراجم دیکھے ہیں اور اس قسم کے جملوں میں ان میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے، کوئی انھیں سوالیہ، کوئی ندائیہ اور کوئی بیانیہ بنا دیتا ہے۔ اس کے علاوہ روسی کا انگریزی کے وسیلے سے ترجمہ کرتے وقت ایک اور دقت پیش آتی ہے۔ طالسطائی کے واجب الاحترام مفسر، لتویا نژاد برطانوی فلسفی اور مورخ سر آئی زائیا برلن (Berlin) نے تورگنیف کے ڈرامے "A Month in the Country" کا ترجمہ کرتے وقت اس طرف اشارہ کیا ہے یعنی اردو کی طرح روسی میں بھی اپنے سے بڑے کی تعظیم کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوتا ہے۔ تورگنیف کے مذکورہ بالا ڈرامے میں نوکر اپنے آقا کے بارے میں کہتا ہے: ''وہ کمرے میں ہیں۔'' اگر اس کا انگریزی میں ترجمہ "They are in their room" کیا جائے تو مضحکہ خیز معلوم ہوگا۔ اس لیے جب انگریزی ترجموں کو بنیاد بنا کر کسی روسی ناول یا کہانی کو اردو کا قالب پہنایا جائے تو قطعاً معلوم نہیں ہوتا کہ کہاں تعظیم کے لیے جمع کا صیغہ استعمال ہوگا، صرف تکا چلانا پڑتا ہے۔

پھر انگریزی مترجمین اتنے بھی منزہ عن الخطاء نہیں جتنا کہ شاید ہم انھیں سمجھتے ہیں۔ ''جنگ اور امن'' میں بعض ایسے مقامات بھی آئے ہیں جہاں وہ بھی صحیح مفہوم اخذ کرنے سے قاصر رہے ہیں اور انھوں نے ژولیدہ، اور بعض اوقات بے معنی فقروں میں بات الجھانے کی کوشش کی ہے۔ بعض مقامات پر میں اور محمد سلیم الرحمٰن گھنٹوں سر جوڑ کر بیٹھے رہے لیکن دونوں کو سر ملا نہ پیر۔

اپنی طرف سے میں نے پوری ایمانداری سے کوشش کی ہے کہ طالسطائی نے جو کچھ (مستند روسی ایڈیشن مطبوعہ 1962-1963ء کی ایڈیٹر کے مطابق) خود تحریر کیا تھا، اسے بعینہٖ قارئین تک پہنچادوں۔ اپنی جانب سے میں نے کوئی تحریف نہیں کی (صرف بعض مقامات پر جہاں مناسب الفاظ نہیں ملے، تشریحی جملوں میں ترجمہ کردیا)، نہ کوئی چیز ایزاد کی ہے اور نہ عمداً کوئی جملہ یا عبارت چھوڑی ہے، میں اس کا ابلاغ کرسکا ہوں یا نہیں، یہ الگ بات ہے۔ مجھے اپنی کوتاہیوں کا احساس ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ میرا ترجمہ کوئی مثالی ترجمہ نہیں۔ قارئین غلطیاں تلاش کرنا چاہیں، ایک نہیں، شاید کئی مل جائیں۔ غالباً یہ زبان و بیان کی خامیوں سے بھی مبرا نہیں۔ یہ ترجمہ مجھ سے کسی زیادہ باصلاحیت شخص کو کرنا چاہیے تھا۔ میں نے اس اوکھلی میں سر اس لیے دے دیا کیونکہ سوا سو سال گزرنے کے باوجود اردو اس عظیم فن پارے سے محروم تھی۔ انگریزی کا محاورہ Fools rush in where angels fear to tread شاید میرے ہی جیسے لوگوں کے لیے وضع کیا گیا تھا۔

ترجمے کے دوران میں اگرچہ میں اپنے بے شمار دوستوں سے صلاح مشورہ کرتا رہا اور اکثر اوقات انھیں تنگ بھی کرتا رہا (میں ان سب کا ممنون ہوں) لیکن جس شخص نے پیشانی پر شکن لائے بغیر قدم قدم پر میری رہنمائی کی بلکہ بعض پورے پورے جملوں کا ترجمہ خود کیا، وہ محمد سلیم الرحمٰن ہیں۔ (ویسے انھوں نے یہ ترجمہ پڑھا نہیں۔ اس لیے اس

کے صحیح یا غلط ہونے کی ذمہ داری ان پر قطعاً عائد نہیں ہوتی) میرے پاس الفاظ نہیں جن سے میں ان کا شکریہ ادا کر سکوں۔ میں ڈاکٹر سہیل احمد خاں کا بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے اس ترجمے کے لیے عالمانہ اور بصیرت افروز دیباچہ ہی تحریر نہیں کیا بلکہ ترجمہ (جستہ جستہ) پڑھا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اس ترجمے کی تکمیل کا سہرا بھی اگر کسی کے سر بندھتا ہے تو انھیں کے۔ ایک موقع ایسا بھی آیا تھا کہ مجھے یہ کام اپنی بساط سے بڑھ کر معلوم ہوا اور میں تقریباً اختتام پر پہنچ کر اس سے ہاتھ اٹھا لینا چاہتا تھا۔ یہ صرف سہیل احمد خاں ہی تھے جن کی متواتر حوصلہ افزائی (اور بعض اوقات ڈانٹ ڈپٹ بھی) نے مجھے اس میں مصروف رکھا اور یوں میں اسے برا بھلا مکمل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

طالسطائی (اس کے اپنے نام کا روسی تلفظ طلسطہ ہے) نے اپنے اس ناول میں تقریباً ساڑھے تین سو روسی، ایک سو فرانسیسی، ستر جرمن اور متعدد دیگر یورپی اقوام کے کردار شامل کیے ہیں۔ ان سب کی حتی الامکان صحت کے ساتھ اردو میں منتقلی (transliteration) خاصا ٹیڑھا کام تھا۔ اگرچہ میں نے ان ناموں کی مروجہ صورتوں کو، جو کسی نہ کسی وجہ سے ہمارے ہاں مقبول ہو گئی ہیں، نہیں چھیڑا اور انھیں جوں کا توں رہنے دیا ہے مثلاً میں نے پیرس کو پاغی، ماسکو کو مسکوا اور نپولین کو ناپولیوں نہیں بنایا۔ حالانکہ روسی ملائم زبان ہے اور اس میں ٹ اور ڈ نہیں ہوتے، میں نے پیٹر اعظم کو پیوتر اعظم نہیں لکھا، صرف پیٹر اعظم اور پیٹرزبرگ کو پیوتربرگ نہیں بلکہ پیٹرزبرگ ہی رہنے دیا ہے۔) جہاں تک باقی ناموں کا تعلق ہے، میں نے ان کے صحیح تلفظ تحریر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے جن دوستوں اور کرم فرماؤں کا تعاون حاصل رہا، ان میں خالد احمد مدیر ''فرنٹیئر پوسٹ'' لاہور (روسی)، محمد اکرام چغتائی اردو سائنس بورڈ (جرمن) اور خالد مسعود صدیقی پروفیسر آف انگلش، گورنمنٹ کالج لاہور (فرانسیسی) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سب کا شکریہ مجھ پر واجب ہے۔ تاہم اگر میں نے کوئی نام غلط لکھا ہے، تو اس کا الزام مجھ پر آئے گا، ہو سکتا ہے میں غلط سمجھا ہوں۔

ناول میں حواشی دینا اور دیگر تصریحات لکھنا عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ میں نے یہ اس لیے تحریر کیے ہیں تاکہ عام قاری کو کچھ آسانی رہے۔ روسی تاریخ کا مختصر جائزہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کیونکہ ''جنگ اور امن'' اس میں پوری طرح گندھا ہوا ہے اور اس کے بغیر اس کی تفہیم مشکل ہے۔

لاہور
شاہد حمید
3 اپریل 1992

زمانی و مکانی پس منظر

روسی تاریخ

نوٹ: اس تحریر میں تاریخیں موجودہ یعنی گریگورین کیلنڈر کے مطابق دی گئی ہیں۔ طالسطائی کے ناول میں یہ تاریخیں پرانے یعنی جولین کیلنڈر کے مطابق ہیں۔ دونوں میں بارہ دن کا فرق ہے۔ موجودہ کیلنڈر کی رو سے بارودینو کی لڑائی سات ستمبر 1812 کو جب کہ روسی حساب سے 26 اگست 1812 کو ہوئی تھی۔

25 دسمبر 1991 کو سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے روس کا کل رقبہ دنیا کے چھٹے حصے پر محیط تھا لیکن دسویں صدی سے قبل اس نام کا کوئی ملک روئے زمین پر موجود نہیں تھا۔ تقریباً ایک ہزار سال قبل سکینڈے نیویا (سویڈن، ناروے، ڈنمارک وغیرہ) کے باشندوں کا، جنھیں عام طور پر وائی کنگ (Vikings) کہا جاتا ہے، خروج شروع ہوا۔ کچھ لوگ برطانوی جزائر اور مغربی یورپ کے دیگر ممالک کی طرف چلے گئے اور کچھ نے مشرق کا رخ کیا اور اس علاقے میں، جسے بعد میں روس کا نام دیا گیا، آباد ہو گئے۔ ان لوگوں کو قدیم روسی تذکروں میں Varangians یا Rus (اسی لیے اس ملک کا نام Russia یا روس پڑا) کہا گیا ہے۔ نو واردوں میں ایک شہزادہ، جس کا نام رورک (Rurik) تھا، شامل تھا۔ (طالسطائی کا نانا پرنس نکولائی سرجی وچ ولکونسکی — ناول میں پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی — اپنا سلسلۂ نسب اسی شہزادے رورک سے جوڑتا تھا اور اپنے آپ کو زار سے بہتر سمجھتا تھا کہ اس کا تعلق رومانوف خاندان سے تھا۔) شہزادہ رورک نے مقامی سلاو باشندوں کی امداد سے یوکرین کے موجودہ دارالحکومت کیف کے اردگرد اپنی ریاست قائم کی اور یہی ریاست پھیلتے پھیلتے عظیم سلطنت کا روپ دھار گئی۔ روسی مورخین کے مطابق نئی ریاست کا قیام 862 میں عمل میں آیا تھا۔ بعدازاں شہزادہ رورک کو روس کے شاہی خاندان کا بانی قرار دیا گیا۔

صدیوں تک روس مختلف چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر مشتمل ڈھیلی ڈھالی فیڈریشن میں منسلک رہا۔ ان ریاستوں کے بادشاہ اور شہزادے آپس میں بھی الجھتے رہے اور مل جل کر بیرونی حملہ آوروں کے خلاف اپنا دفاع بھی کرتے

رہے۔ جب تیرھویں صدی میں منگولوں، بالخصوص ان کے تاتاری قبیلے نے چنگیز خاں اور بعدازاں ہلاکو خاں کی سربراہی میں شمالی چین، وسط ایشیا اور خلافت عباسیہ میں مار دھاڑ شروع کی، تو ان کی ایک شاخ جنوبی روس بھی پہنچ گئی اور اس نے 1223 میں روسیوں کو عبرت ناک شکست دی۔ تاہم تاتاری واپس لوٹ گئے۔ 1237 میں وہ دوبارہ حملہ آور ہوے۔ اب کے انھوں نے نہ صرف روسیوں کو ناکوں چنے چبوائے بلکہ 1237 اور 1241 کے درمیان میں جرمنی، پولینڈ اور ہنگری کی افواج کو بھی تہس نہس کر دیا۔ لیکن قبلائی خاں (والیٔ چین) کی وفات (1294) کے بعد وہ متحد نہ رہ سکے اور زیادہ تر کاکیشیا (قفقاز) اور گردونواح کے علاقوں میں آباد ہو گئے۔ تاہم انھوں نے روسیوں کو دبائے رکھا۔ وہ دو صدیوں تک ان سے خراج وصول کرتے رہے اور روس کی مختلف ریاستوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑاتے رہے۔

دریں اثنا ریاست ماسکو نے، جس نے اپنی مرکزی حیثیت کی وجہ سے آئندہ اہم کردار ادا کرنا تھا اور جس کا نام پہلی مرتبہ 1147 میں سننے میں آیا تھا، اپنی اہمیت جتانا شروع کر دی تھی۔ یہاں کے حکمران ایوان (اول) کالیتا (یعنی منی بیگ یا کیسۂ زر) (1328 تا 1340) نے تاتاریوں سے وعدہ لیا کہ وہ روس کے اندرونی معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے اور اس کے عوض اس نے دوسری روسی ریاستوں کے حکمرانوں سے خراج وصول کرنے کا فریضہ اپنے ذمے لے لیا۔ تاہم اس کے پوتے دمیتری کی تاتاریوں سے ان بن ہو گئی اور اس نے 8 ستمبر 1380 کو تاتاریوں کو زبردست شکست دی۔ تاتاری پٹ تو گئے لیکن وہ روس پر برابر حملے کرتے رہے اور کئی بار ماسکو کے دروازوں تک پہنچ گئے۔ تاہم ان کے وقار کو سخت دھچکا لگ چکا تھا اور ان کے ناقابل مفتوح ہونے کی شہرت داغ دار ہو چکی تھی۔

ادھر دوسری ریاستوں کے مقابلے میں ریاست ماسکو کے وقار اور اہمیت میں اضافہ ہوتا رہا۔ یہاں کے حکمران ایوان سوم (یا ایوان عظیم) (1462 تا 1505) نے بتدریج دوسری روسی ریاستوں کو اپنا مطیع بنانا اور انھیں ہڑپ کرنا شروع کر دیا اور 1478 میں اس نے کیف کی آزادی بھی ختم کر دی۔ تاتاریوں کا خطرہ بھی ٹل چکا تھا۔ لاتعداد تاتاری روس میں آباد ہو چکے اور مقامی سلاو باشندوں کے ساتھ باہمی شادیاں کر کے ان میں گھل مل چکے تھے۔ یوں آہستہ آہستہ روسی سلطنت وجود میں آنے لگی لیکن صحیح معنوں میں اسے پہلی بار عروج ایوان سوم کے پوتے ایوان چہارم کے عہد میں حاصل ہوا۔ یہ پہلا روسی حکمران تھا جس نے اپنے لیے تسار (زار) کا لقب استعمال کیا۔ اس زمانے کے اشراف کی بیشتر تعداد اس کے خلاف تھی۔ مختلف حکمرانوں کو تاتاریوں کے خلاف اپنی جدوجہد میں افراد اور وسائل کی ضرورت پڑتی تھی۔ وہ ہندوستان کے مغلوں کی طرح بڑے بڑے قطعات اراضی مختلف اشخاص کو بخش دیتے تھے اور اس کے معاوضے میں اپنی سپاہ کے لیے نفری، ہتھیار اور دوسری ضروریات حاصل کرتے تھے۔ ان مالکان اراضی کو بویار یا روسی اشراف کہا جاتا تھا۔ یہ لوگ دھیرے دھیرے اتنی قوت پکڑ گئے کہ

ان کے کسانوں کی حیثیت محض غلاموں• کی رہ گئی اور خود زار کے لیے بھی خطرے کا باعث بننے لگے۔ ایوان چہارم سے ان کی ٹکر ہوئی اور انھوں نے پرنس کربُسکی کی قیادت میں علم بغاوت بلند کر دیا۔ ایوان چہارم کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ وہ مخالفین سے نپٹنا جانتا تھا۔ اس نے نہ صرف باغیوں کو شکست دی بلکہ چن چن کر انھیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی سبب اسے تاریخ میں خوف ناک ایوان (Ivan the terrible) کہا جاتا ہے۔ ایوان چہارم روس کا بلاشرکت غیرے حکمران بن گیا لیکن کسانوں کی حالت میں کوئی تبدیلی نہ آئی، وہ بدستور غلام کے غلام رہے۔

ایوان چہارم نے راستہ دکھا دیا تھا۔ اگرچہ اس کے بعد متعدد ضعیف الارادہ اور عقل سے کورے زار بھی تخت نشین ہوے لیکن ان کی مطلق العنانی اور مستبدانہ اختیارات میں کبھی کمی واقع نہ ہوئی۔ تاہم ایوان چہارم کے بعد جس زار نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی وہ پیٹر (پیوتر) اعظم تھا لیکن اس کی تخت نشینی سے پہلے روسی تاریخ کا ایک اہم واقعہ رونما ہو چکا تھا۔ 1584 میں ایوان چہارم کی موت کے بعد اس کا بیٹا فیودر اول تخت نشیں ہوا۔ یہ انتہائی نالائق اور کمزور حکمران تھا۔ اصل اختیارات ایک بار پھر بویاروں، بالخصوص ایوان چہارم کی پہلی بیوی اناستاشیا کے بھائی نکیتا رومانوف کے ہاتھ آ گئے۔ فیودر اول یوں توں کر کے اپنا وقت گزار گیا۔ وہ لاولد تھا اور 1605 تک اس کا بھائی بورس تخت نشین رہا۔ اس کے انتقال پر حکومت اس کے بیٹے فیودور دوم کو ملی ضرور لیکن بویاروں نے اسے تخت نشینی کے پہلے ہی سال معزول کیا اور بعد میں قتل کر دیا۔ اس پر بویاروں اور نچلے طبقے کے، جس کی رہنمائی قازق کر رہے تھے، مابین ٹھن گئی اور تخت کے مختلف جھوٹے سچے دعوے دار برسراقتدار آتے اور معزول وقتل ہوتے رہے۔ 1613 میں ایوان چہارم کے برادر نسبتی نکیتا رومانوف کے پوتے میخائیل نے ملیشیا اکٹھی کی، مخالفوں کو شکست دی اور گیارہ جولائی کو خود روس کا زار بن گیا۔ اب تک روس پر پرنس رورک کا خاندان حکمرانی کرتا چلا آیا تھا، میخائیل کے تخت نشیں ہونے پر حکومت کی باگ ڈور رومانوفوں کے ہاتھ آ گئی اور 1917 کے انقلاب تک وہی روس کے سیاہ وسپید کے مالک بنے رہے۔

1645 میں میخائیل کی وفات کے بعد اس کا بیٹا الیکسی اول تخت نشیں ہوا۔ اس کے عہد حکومت میں قومی اسمبلی نے نیا آئین، جس کی رو سے کسانوں کی غلامی کو قانونی حیثیت حاصل ہو گئی (اور جو 1823 تک نافذ العمل رہا) منظور کیا۔ اسی دور میں پولینڈ سے جنگ ہوئی اور یوکرین دوبارہ روس میں شامل کر لیا گیا۔ لیکن روس کو اصل عروج الیکسی اول کے بیٹے پیوتر اول (پیٹر اعظم) کے عہد حکومت (1689 تا 1725) میں حاصل ہوا۔ اب تک روس تعلیم وتمدن کے اعتبار سے پسماندہ ملک تھا۔ پیٹر اعظم پہلا روسی حکمران تھا جس نے (گمنامی کے پردے میں) غیر ممالک (فرانس، انگلستان اور ہالینڈ) کا دورہ کیا اور اپنے ملک کو "مغربی" بنانے کا عزم لے کر واپس آیا۔ اس نے آتے ہی بویاروں کی اسمبلی ختم کر دی اور اس کی جگہ نو ارکان پر مشتمل سینیٹ قائم کی۔ انتظامیہ کی ازسرِنو تنظیم کی اور اسے کالجوں (colleges) کا نام دیا، اشراف کے لیے مملکت کی خدمات سرانجام دینا لازمی قرار دیا اور اس مقصد

• Serfs: Serf لاطینی لفظ Servus (=غلام) سے مشتق ہے۔

کے لیے مناصب کا سلسلہ وار نظام (hierarchy) قائم کیا۔ کلیسائی نظام میں بطریق (patriarch) کا عہدہ اڑا یا اور اس کی جگہ اساقفہ (bishops) پر مشتمل مقدس سنود (Synod) یا مجلس قائم کی اور غیر مذہبی شخصیت (layman) کو اس کا سربراہ (procutor) مقرر کیا۔ اس نے تجارت، صنعت اور تعلیم کو بھی فروغ دیا۔ (اکیڈمی آف سائنس نے اس کے انتقال کے ایک سال بعد کام شروع کیا۔) پیٹر اعظم نے اپنی سلطنت کو بھی وسعت دی۔ اگرچہ مغرب میں ترکوں کے خلاف لڑائیوں میں اسے خاص کامیابی نہ ہوئی لیکن جنوب میں سویڈن سے معاہدے کے بعد اسے بحیرۂ بالٹک کی بعض ریاستوں (بشمول استونیا) اور جزیروں پر قبضہ مل گیا اور یوں اسے سمندر کے راستے مغربی یورپ تک رسائی حاصل ہوگئی۔ کہا جاتا ہے کہ پیٹر اعظم نے بحرِ ہند کے گرم پانیوں تک پہنچنے کا خواب بھی دیکھا تھا لیکن اس کا یہ خواب شرمندہ تکمیل نہ ہوسکا اور سوویت یونین کے حصے بخرے ہونے کے بعد اس کے حقیقت کا روپ دھارنے کے امکانات شاید بالکل ہی معدوم ہوگئے ہیں۔ پیٹر اعظم نے خلیج فن لینڈ کے کنارے نیا شہر بھی آباد کیا۔ اس کا نام سینٹ پیٹرز برگ• رکھا اور اسے ملک کا صدر مقام قرار دیا۔

پیٹر اعظم کے بعد مختلف حکمران آئے اور گئے لیکن اس کی بیٹی لساوتا کا دورِ حکومت (1741 تا 1762)، جسے اشراف کے ''عہدِ زریں'' کے نام سے جانا جاتا ہے، اس لیے یادگار ہے کہ اشراف نے اپنے آپ کو مملکت کی لازمی خدمات سرانجام دینے کے بوجھ سے آزاد اور اپنے حقوق و مراعات میں بے پناہ اضافہ کرالیا۔ روس کی پہلی یونیورسٹی اسی زمانے میں (1755) میں ماسکو میں قائم ہوئی اور جدید روسی ادب کے بانی بارتولومیو ریسترلی (Restrelli) کی اصل کاوشیں منظرِ عام پر آئیں۔

روسی بہت عرصہ پہلے ہی مشرق کی طرف بڑھنے لگے اور سارے سائبیریا پر قبضہ کرچکے تھے، تاہم پیٹر اعظم کے بعد روس کی عظیم ترین حکمران کیتھرین اعظم (1762 تا 1796) تھی۔ کیتھرین جرمن شہزادی تھی اور اس کا اصل نام سوفیا تھا۔ اس نے پیٹر اعظم کے نواسے پیوتر سوم سے، جو اپنی خالہ لساوتا کے انتقال پر 1762 میں تختِ نشیں ہوا، شادی کی تھی۔ پیوتر سوم کی اپنی کوئی شخصیت نہیں تھی۔ اس کی بیوی نے اسے اسی سال آرلوف برادران کی مدد سے ہلاک کرادیا اور کیتھرین دوم کے نام سے خود تخت سنبھال لیا۔ اس کے عہدِ حکومت میں مملکت کی سرحدوں میں بے حد توسیع ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ سوویت یونین کا شیرازہ بکھرنے سے پہلے روس کی جو سرحدیں تھیں، وہ کم و بیش اسی کی قائم کردہ تھیں۔ اس نے سویڈن سے آدھا پولینڈ چھینا، ترکوں سے کریمیا ہتھیایا اور متعدد دوسرے علاقوں پر قبضہ کیا۔ کیتھرین ایک طرف فرانسیسی مفکر والتیر سے متاثر تھی اور اس نے ''فلاحی'' آمرانہ نظام قائم کرنے کی کوشش کی اور

• سینٹ پیٹرز برگ 1917ء تک روس کا دارالسلطنت رہا۔ 'برگ' جرمن لفظ ہے۔ پہلی جنگِ عظیم میں جب روسی جرمنی کے خلاف برسرِ پیکار ہوئے، انھوں نے اس کا نام پیوترگرات (پیٹروگراڈ = پیٹر کا شہر) رکھ دیا۔ کمیونسٹوں کے برسرِاقتدار آنے کے بعد اسے لینن گراڈ میں بدل دیا گیا۔ کمیونزم کے زوال کے بعد اس کا سابقہ نام سینٹ پیٹرز برگ دوبارہ بحال کردیا گیا ہے۔ ''جنگ اور امن'' میں طالسطائی سینٹ کا لفظ کہیں استعمال نہیں کرتا، صرف پیٹرز برگ لکھتا ہے۔

دوسری طرف اشراف کو، جن کی وہ حکومت پر قبضہ کرنے کے لیے مرہون منت تھی، خوش کرنے کے لیے یوکرین کے کسانوں کے، جواب تک نسبتاً آزاد تھے، گلوں میں غلامی (serfdom) کا پٹا ڈال دیا۔ طالسطائی کا نانا پرنس نکولائی ولکونسکی اور پیئر (''جنگ اور امن'' کا ہیرو) کا باپ کاؤنٹ بزوخوف اس کی حکومت کے اہم ستون تھے۔

الیکساندر اول

کیتھرین اعظم کا پوتا الیکساندر اول (1801 تا 1825) اپنے باپ پاول اول کی موت پر تخت نشیں ہوا۔ طالسطائی کے ناول ''جنگ اور امن'' کا تعلق اسی کے عہد حکومت سے ہے۔ الیکساندر اول نے اپنی حکمرانی کا آغاز قیدیوں اور جلاوطنوں کو عام معافی دے کر کیا۔ اس نے ایذا رسانی کی ممانعت کی، غیر ملکی مطبوعات پر سے پابندیاں اٹھائیں اور اپنے معتمد درباریوں تسارتورسکی، کوچوبی، ناووسلت سیف اور پیوتر گنافف کی مدد سے اصلاحات اور نئے آئین کا خاکہ تیار کیا۔ نیا آئین تو نافذ نہ ہوسکا لیکن انتظامیہ میں پرانے ''کالجوں'' کی جگہ جدید وزارتیں ضرور قائم ہوگئیں۔ سب سے بڑی بات اس نے یہ کی کہ اس نے ان جاگیرداروں کو، جو اپنے زرعی غلاموں کے حالات میں تبدیلیاں لانا چاہتے تھے، ایسا کرنے کی اجازت دے دی (پرنس آندرے اور پیئر دونوں نے اس رعایت سے فائدہ اٹھا کر اپنے غلاموں کو آزادی دینے کی کوشش کی۔ پرنس آندرے تو کامیاب رہا لیکن پیئر کے عزائم اس کے سٹیوارڈ نے ناکام بنا دیے) اور اس کا یہ اقدام بالآخر غلامی کی تنسیخ پر منتج ہوا۔

لیکن الیکساندر مختلف جنگوں میں الجھ گیا۔ پہلے اس نے جارجیا پر قبضہ کیا۔ اس پر اس کی ایرانیوں سے جنگ ہوئی۔ ایرانیوں نے زک اٹھائی اور انھیں داغستان اور شیماخ روس کے حوالے کرنا پڑے۔ اسی زمانے میں روسیوں نے الاسکا (جس پر وہ اٹھارویں صدی میں قبضہ کر چکے تھے) میں قلعے تعمیر کیے اور شمالی کیلیفورنیا کو بھی اپنے حملوں کا نشانہ بنایا۔ مگر اس کے عہد کا سب سے بڑا واقعہ روس اور فرانس کی جنگ ہے (اور یہی جنگ ''جنگ اور امن'' کا موضوع ہے)۔

فرانسیسیوں اور روسیوں کی چپقلش کا پہلا دور 1805 سے 1807 تک کے سالوں پر محیط ہے۔ روسیوں اور اس کے اتحادیوں کو پے در پے شکستوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان کے نتیجے کے طور پر ''معاہدۂ ٹلزٹ'' وجود میں آیا اور الیکساندر و نپولین دوست بن گئے۔

1806 سے 1812 تک روسی ترکوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔ 1812 میں دونوں کے مابین بخارسٹ میں معاہدۂ صلح طے پایا۔ ترکوں نے دریائے ڈینیوب کے اردگرد بہت سے علاقے روسیوں کے حوالے کر دیے۔ 1808 اور 1809 میں روس سویڈن سے بھی پنجہ آزمائی کرتا رہا اور سویڈن سے فن لینڈ چھیننے میں کامیاب ہوگیا۔

ان جنگوں سے فراغت پانے کے بعد الیکساندر نے میخائیل سپے رانسکی کو اپنا مشیر اعلیٰ مقرر کیا اور اصلاحات کے مسودے پر از سر نو کام شروع ہوا۔ نئے قوانین مرتب کرنے کے لیے کونسل آف سٹیٹ قائم ہوئی (طالسطائی نے

ناول میں نئے قوانین کا مسودہ تیار کرنے کا کام پرنس آندرے بلکونسکی کے سپرد کیا ہے)، وزارتوں کی تنظیم نو کی گئی اور اولیں بار با قاعدہ بجٹ پاس ہوا۔ سپے رانسکی نے نئے آئین کا خاکہ بھی پیش کیا لیکن قدامت پسندوں کی مخالفت اور زار سے اختلافات کے باعث اسے مستعفی ہونا پڑا اور 1812 میں اسے (عارضی طور پر) شہر بدر کر دیا گیا۔

الیکسانڈر کے عہد کے بارے میں اوپر جو کچھ تحریر کیا گیا ہے، ''جنگ اور امن'' میں اس کا تفصیلی ذکر موجود ہے لیکن اس ناول میں جس تاریخ ساز واقعے کی گہری چھاپ لگی ہے، وہ نپولین کا روس پر حملہ ہے۔

نپولین

نپولین 1769 میں کارسیکا میں پیدا ہوا۔ وہ بچپن میں ہی فوجی افسر بننے کے خواب دیکھتا تھا، چنانچہ وہ بعمر دس سال ملٹری سکول میں داخل ہو گیا اور تعلیم مکمل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی ہو گیا۔ چونکہ اس کا قد چھوٹا تھا، اس کے ہم درسوں نے اسے ''لٹل کارپورل'' پکارنا شروع کر دیا اور یہ خطاب تاحیات اس کے ساتھ چپکا رہا۔ 1789 میں فرانس میں انقلاب برپا ہوا۔ نپولین نے بھی اس میں حصہ لیا اور کارسیکا میں جمہوری تحریک کی بڑھ چڑھ کر مدد کرتا رہا۔ 1793 میں اسے کیپٹن بنا دیا گیا۔ اس نے اسی سال انگریزوں کو بحیرۂ روم کے ساحل پر فرانسیسی بندرگاہ تولون سے نکلنے پر مجبور کر دیا اور اسے مختصر عرصے میں بریگیڈیئر جنرل بنا دیا گیا۔

دو سال بعد وہ دارالسلطنت پیرس واپس آیا۔ یہاں اس نے ہجوم پر گولی چلوا کر حکومت کے خلاف بغاوت فرو کر دی اور پہلی بار نپولین کا نام عوام کے کانوں تک پہنچا۔ 1796 میں اس نے مشہور فرانسیسی نواب دبوآغنے کی بیوہ، جوزیفین سے، جس کے پہلے ہی دو بچے تھے، شادی کی، مگر شادی کے دو روز ہی بعد اسے فرانسیسی فوج کی، جو اطالیہ پر چڑھائی کر رہی تھی، کمان سنبھالنے کا حکم ملا۔ نپولین نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ وہ ذہین وفطین جرنیل ہے، اپنی سپاہ میں جوش وخروش پیدا کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے اور انھیں اپنے لیے اپنی جانیں قربان کرنے کے لیے آمادہ کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ کامیاب سفارت کار بھی ہے۔ اس نے اپنی حکومت کے عمال کی خواہشات کے علی الرغم اپنی شرائط پر اطالیہ سے صلح کی اور اپنی حکومت کو فن کے نادر نمونے اور مال غنیمت بھیج کر ٹھنڈا کر دیا۔

اس کی ان اطالوی اور دیگر ابتدائی فتوحات کے بعد مقبوضہ علاقوں کے باشندے اس کا والہانہ استقبال کرتے تھے، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ وہ انھیں مستبد حکمرانوں سے نجات دلائے گا اور انھیں انقلاب فرانس کی نئی آزادیوں سے روشناس کرائے گا۔ وہ جو حکومتیں قائم کرتا تھا، وہ شروع کے سالوں میں واقعی لوگوں کے لیے بہتر ثابت ہوئیں لیکن کچھ عرصے کے بعد وہ اپنے انقلابی خیالات بھول گیا اور اب اس کی فتوحات کا مقصد مزید علاقے ہتھیانا اور اپنے آپ کو طاقتور بنانا رہ گیا تھا۔

نپولین صرف 26 سال کی عمر میں جرنیل بن چکا تھا اور ''نپولیائی جنگوں'' کا آغاز اس کی اوائل عمری میں ہی

شروع ہو گیا تھا۔ 1796 اور 1797 میں اس نے اطالیہ اور آسٹریا کو پے در پے شکستوں سے دوچار کیا اور تقریباً سارے اطالیہ پر قبضہ کر لیا (بعد میں اس نے اطالیہ کو چھوٹی چھوٹی بادشاہتوں اور ڈچیوں میں تقسیم کر دیا اور اسی تقسیم کے نتیجے میں اس کی فوج کا جرنیل اور اس کا برادر نسبتی ایک وقت میں نیپلز کا نام نہاد ''بادشاہ'' بنا)۔ اس نے مصر فتح کرنے کی کوشش کی کیونکہ وہ اس راستے سے برصغیر پہنچنا چاہتا تھا لیکن انگریزوں نے رنگ میں بھنگ ڈال دی اور اسے مجبوراً اپنا منصوبہ ترک کرنا پڑا۔ اس کی سب سے بڑی آرزو انگلستان کو فتح کرنا تھا لیکن اس کی یہ آرزو کبھی پوری نہ ہو سکی۔

1799 میں اس نے فرانسیسی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور اپنے دیگر دو ساتھیوں کے ساتھ مل کر اپنی حکومت تشکیل دی۔ یہ لوگ اپنے آپ کو ''قونصل'' (Consul) کہتے تھے۔ نپولین رفتہ رفتہ اپنے اختیارات بڑھاتا رہا۔ پہلے وہ فرسٹ قونصل بنا اور پھر 1804 میں اس نے اپنے امپراطور ہونے کا اعلان کر دیا۔ پوپ بنفس نفیس اسے تاج پہنانے آیا۔ تقریب میں پوپ نے تاج اٹھایا اور اس کے سر پر رکھنا چاہا، لیکن نپولین نے ہاتھ بڑھا کر تاج پکڑ لیا اور خود اپنے سر پر سجا لیا۔ اس سے وہ یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ گو پوپ اس کو امپراطور تسلیم کرتا ہے لیکن وہ امپراطور اپنی ہی ہمت اور کوشش سے بنا ہے۔ بعد میں اس نے اپنی بادشاہت کے بارے میں ریفرنڈم کرایا۔ اس کے حق میں 329،72،35 اور خلاف 2569 ووٹ آئے۔

نپولین نے اپنے عہد حکومت میں تعلیمی اصلاحات نافذ کیں، ناپ تول کا اعشاری نظام رائج کیا اور سب سے بڑھ کر تعزیرات کا نیا نظام، جسے ''قوانین نپولین'' کہا جاتا ہے، متعارف کرایا۔

چند سال یورپ میں امن رہا لیکن 1805 میں نپولین کے سر میں ایک بار پھر فتوحات کا سودا سما گیا۔ اس نے آسٹریا پر ہلہ بول دیا اور متعدد کامیابیاں حاصل کیں لیکن اصل معرکہ اوسٹرلٹس میں (''جنگ اور امن'' کی پہلی کتاب میں پوری تفصیل موجود ہے) 2 دسمبر 1805 کو پیش آیا۔ یہاں اس نے آسٹریا اور روس کی متحدہ فوج کو شکست فاش دی۔ نپولین کی یہ کامیابی اس کے عظیم ترین کارناموں میں شمار ہوتی ہے۔ شکست کے بعد روسی تو روس واپس چلے گئے اور آسٹریا نپولین کے قدموں میں بچھ گیا۔ اس لڑائی کے نتیجے میں یورپ کا نقشہ تبدیل ہوا۔ آسٹریا اور پرشیا کو بہت سے علاقوں سے محروم ہونا پڑا۔ نپولین کا بڑا بھائی جوزف بوناپارٹ نیپلز اور چھوٹا بھائی لوئی بوناپارٹ ہالینڈ کا بادشاہ مقرر ہوا۔ نپولین کے برادر نسبتی موغا کو ڈیوک اور مارشل بیخ تیئے کو پرنس کا خطاب ملا۔ لیکن اسی سال نپولین کی بحریہ کو زک اٹھانا پڑی اور وہ ٹریفالگر کی لڑائی میں انگریز ایڈمرل ہوریشو نیلسن کے ہاتھوں پٹ گئی۔

1806 میں نپولین پرشیا کے خلاف نبرد آزما رہا۔ اس نے 14 اکتوبر کو جینا اور شٹٹ کے مقامات پر پرشیا کی فوجوں کی دھنائی کر دی اور 27 اکتوبر کو برلن پر قبضہ کر لیا۔ اس نے برطانیہ کا محاصرہ کرنے کے لیے 21 اکتوبر کو برلن سے فرمان جاری کیا۔ اس فرمان کی رو سے براعظمی نظام (Continental System) وجود میں آیا اور اس نظام کے تحت اکثر یورپی ممالک نے عہد کیا کہ وہ آپس میں تو تجارت کریں گے لیکن برطانیہ اور اس کے اتحادیوں کا بائیکاٹ کریں

گے۔روس نے اس نظام کو ماننے سے انکار کر دیا اور بعد میں اس کا یہی انکار نپولین کے روس پر حملے کا سبب بنا۔

اس عرصے کے دوران میں فرانسیسی سپاہ مختلف مقامات پر خلافت عثمانیہ اور برطانیہ کے خلاف لڑتی بھڑتی رہی۔تاہم چودہ جون 1807 کو اس کا ایک بار پھر فریڈلانٹ کے مقام پر روسیوں سے تصادم ہوا۔روسیوں کو شکست ہوئی اور زار الیکسانڈر نپولین اور شاہ پرشیا کے ساتھ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا۔یہ معاہدہ ٹلزٹ کے مقام پر ہوا۔اس کی رو سے روسیوں نے نپولین کو امپراطور تسلیم کر لیا، اس کی اکثر شرائط مان لیں اور خفیہ طور پر یہ وعدہ بھی کیا کہ وہ برطانیہ کے خلاف فرانس کا ساتھ دیں گے۔

1808 کے دوران میں فرانسیسی ہسپانیہ اور پرتگال میں انگریزوں اور ان کے حلیفوں کے خلاف برسرپیکار رہے۔ادھر آسٹریا میں قوم پرستی کی تحریک چل پڑی۔نپولین کو انگریزوں کے خلاف جو مشکلات پیش آ رہی تھیں، ان سے اہالیان آسٹریا کے حوصلے بڑھ گئے۔انھوں نے اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کر لیا اور وہ ایک لاکھ ستر ہزار کی فوج لے کر بوریا پر چڑھ دوڑے۔نپولین بھاگا بھاگا ہسپانیہ سے بوریا پہنچا۔اس نے 19 اور 23 اپریل کے مابین ایک موہل اور کئی دوسرے مقامات پر آسٹرویوں کو پیٹا اور 13 مئی کو ویانا پر قبضہ کر لیا۔ 22،21 مئی کو اسپرن اور ایسلنگ کے مقامات پر نپولین کو شکست ہوئی اور وہ پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔لیکن اس نے اپنی فوجیں دوبارہ مجتمع کیں، ایک بار پھر دریائے ڈینیوب عبور کیا اور پانچ چھ جولائی کو واگرام کی لڑائی میں آسٹرویوں کو فیصلہ کن شکست دی۔آسٹرویوں کو نہ صرف بہت سے علاقوں سے محروم ہونا پڑا بلکہ اپنے امپراطور فرانٹس کی دختر آرچ ڈچس ماری لوئیز اس کے عقد میں دینا پڑی۔(نپولین اپنے حساب سے اپنی پہلی بیوی جوزیفین کو طلاق دے چکا تھا کیونکہ وہ ولی عہد پیدا کرنے میں ناکام رہی تھی۔) آسٹروی شہزادی سے اس کی شادی اپریل 1810 میں ہوئی۔

معاہدۂ ٹلزٹ کی رو سے زار الیکسانڈر کو فن لینڈ پر قبضہ کرنے کا اختیار مل چکا تھا اور اس کی فوج نے 1808 میں اسے عملی شکل بھی دے دی۔ادھر نپولین اور پوپ کے مابین اختلافات بڑھنے لگے (پوپ نے طلاق کی منظوری دینے سے انکار کر دیا تھا)۔17 مئی 1809 کو نپولین نے پوپ کے زیرنگیں ریاستوں کو فرانس میں شامل کر لیا۔پوپ نے اس کے جواب میں 10 جون کو اسے رومن کیتھولک مذہب سے نکال دیا۔نپولین نے اس کا حساب یوں چکایا کہ خود پوپ کو گرفتار کر لیا اور اسے نظر بند کر دیا۔

1812 میں خود نپولین تو روس میں الجھ گیا لیکن اس کی جو سپاہ ہسپانیہ میں انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھی، وہ 12 اگست کو انگریز کمانڈر ڈیوک آف ولنگٹن سے فیصلہ کن شکست کھا گئی۔

روس پر فرانسیسی حملہ

فرانس نے روس پر کیوں حملہ کیا، مغربی مورخین نے اس کی متعدد وجوہ گنوائی ہیں۔چند ایک درج ذیل ہیں:

(1) نپولین اور الیکسانڈر دونوں یورپ کی قیادت کے دعویدار تھے۔(2) نپولین کی آسٹروی شہزادی سے

شادی سے الیکساندر کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ سمجھنے لگا کہ فرانس اور آسٹریا اس کے خلاف متحدہ محاذ بنا رہے ہیں۔ (3) روس نپولین کے نافذ کردہ براعظمی نظام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ (4) نپولین روس کو خلافت عثمانیہ میں اپنی من مانی کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھا اور الیکساندر اس بات پر اس سے خفا تھا۔ (5) آسٹریا کے خلاف فیصلہ کن فتح حاصل کرنے کے بعد نپولین نے گرینڈ ڈچی آف وارسا میں، جو معاہدۂ ٹلزٹ کے تحت بحال ہوئی تھی، مغربی گلیشیا کا علاقہ شامل کر دیا۔ الیکساندر سمجھا کہ اس طرح وہ شاید پولینڈ کی مملکت از سر نو قائم کرنا چاہتا ہے۔ (6) نپولین نے براعظمی نظام کی خلاف ورزی کرنے پر الیکساندر کے ایک قریبی قرابت دار ڈیوک آف اولڈن برگ کو گدی سے محروم کر دیا تھا اور اس کا علاقہ اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔

دونوں فریقوں نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نپولین نے آسٹریا (جس نے تیس ہزار) اور پرشیا (جس نے بیس ہزار افراد مہیا کرنے کا عہد کیا) سے سمجھوتہ کر لیا۔ سویڈن نے، جسے نپولین نے برطانیہ کا مقاطعہ کرنے پر مجبور کر دیا تھا، اپنے نئے حکمران برناڈوٹ کی قیادت میں فرانسیسی جُوا اتار پھینکا اور اپریل 1812 میں روس کے ساتھ معاہدۂ پیٹرز برگ طے کر لیا۔ اس کی رو سے اسے ناروے، جو پہلے ڈنمارک کے ماتحت تھا، قبضہ کرنے کا اختیار مل گیا اور وہ شمالی جرمنی میں فرانسیسیوں کے خلاف محاذ کھولنے پر رضامند ہو گیا۔ 18 مئی کو روسیوں نے بخارسٹ میں ترکوں سے صلح کر لی اور جون میں برطانیہ نے روس اور سویڈن کے ساتھ اپنے اختلافات طے کر لیے۔

ادھر نپولین کی روس پر حملہ کرنے کی تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔ ابتدا میں اس کی سپاہ چار لاکھ بیس ہزار افراد پر مشتمل تھی۔ بڑھتے بڑھتے اس کی تعداد چھ لاکھ تک پہنچ گئی اور یہ غالباً اس زمانے کی سب سے بڑی فوج تھی۔ یہ صرف جزوی طور پر فرانسیسی تھی، بیشتر نفری اطالیہ، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ، ہالینڈ، آسٹریا اور جرمنی کی متعدد ریاستوں کے بھانت بھانت کے باشندوں پر مشتمل تھی۔

جون 1812 میں نپولین نے اپنی افواج کی معیت میں دریائے نیمین، جو روس اور باقی یورپ کے مابین حدفاصل قائم کرتا تھا، عبور کیا اور ولنا پر قبضہ کر لیا۔ روسی فوج کی قیادت بارکلے دِتولی (Barclay de Tolly) کے ہاتھ میں تھی۔ روسیوں نے کہیں بھی جم کر مقابلہ نہ کیا، وہ لڑے بغیر پیچھے ہٹتے رہے تا آنکہ وہ سمولنسک پہنچ گئے۔

سترہ اور اٹھارہ اگست کو فرانسیسیوں نے سمولنسک کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بارکلے دِتولی کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اس کی جگہ فیلڈ مارشل کوتوزوف کو نیا کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا۔ سات ستمبر کو دونوں افواج کے مابین دریائے مسکوا کے کنارے بارودینو میں گھمسان کا رن پڑا اور ہزاروں آدمی کھیت رہے۔ روسی پسپا ہو گئے۔ انھوں نے ماسکو کے دفاع کا خیال ترک کر دیا اور مزید جنوب کی طرف چلے گئے۔

ماسکو قریب قریب خالی ہو گیا اور چودہ ستمبر کو فرانسیسیوں نے اس پر قبضہ کر لیا۔ پندرہ اور انیس ستمبر کے مابین شہر میں جگہ جگہ آگ بھڑک اٹھی۔ اگرچہ طالسطائی کو اس سے اتفاق نہیں لیکن یورپی اور روسی مورخین اصرار کرتے

ہیں کہ روسیوں نے یہ آگ طے شدہ منصوبے کے تحت لگائی تھی تاکہ ماسکو میں فرانسیسیوں کا جینا دوبھر کر دیا جائے۔ نپولین نے الیکساندر کو صلح کی پیشکش کی لیکن زار نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ نپولین بڑی مشکل میں پھنس گیا۔ وہ اپنے ٹھکانوں سے بہت دور پہنچ چکا تھا اور اس کے لیے اپنی فوج کو مطمئن کرنا ناممکن ہو گیا۔ اس نے واپسی کی ٹھانی اور وہ 19 اکتوبر کو ماسکو سے کوچ کر گیا۔ راستے میں اس کا یاروسلاوتس (24 اکتوبر) اور ویازما (3 نومبر) میں روسیوں سے تصادم ہوا۔ ادھر قازقوں اور دوسرے بے قاعدہ دستوں نے گوریلا کارروائیوں سے اس کی فوج کا ناطقہ بند کر دیا اور اس پر مستزاد یہ کہ شدید جاڑوں کا موسم شروع ہو گیا۔ ناکافی خوراک، موسم کی سختیاں اور گوریلا کارروائیاں سبھی فرانسیسی سپاہ کا کھرکس نکال رہی تھیں۔ رہی سہی کسر کراسنایا اور بیریزینا کی لڑائیوں نے پوری کر دی۔ نپولین پیرس بھاگ گیا اور اس کی فوج کے بمشکل ایک لاکھ افراد اپنی جان بچا کر واپس جا سکے۔

اس کے بعد نپولین پر کیا بیتی یا روس کی تاریخ میں کیا واقعات پیش آئے، ان کا ناول کے موضوع سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ چند باتیں حواشی میں آئیں گی۔ البتہ ایک واقعے کا ذکر خالی از دلچسپی نہیں کیونکہ اس کا طالسطائی کی ذات سے گہرا تعلق ہے اور اس نے "جنگ اور امن" سے پہلے اسی کے متعلق ناول لکھنے کا سوچا تھا۔

دسمبری یا دیکابری تحریک

فرانسیسیوں کے فرار کے بعد الیکساندر اول نے ایک بار پھر داخلی امور پر توجہ دی اور وہ کہنے کو آئینی اصلاحات کے بارے میں اپنے مشیروں کے ساتھ مشورے کرنے لگا لیکن عملاً اس کا ہر قدم رجعت پسندی کی سمت میں اٹھ رہا تھا اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے اصلاحات کے کٹر مخالف جنرل آراک چیف کو اپنا مشیر اعلیٰ مقرر کیا۔ اس کے اس اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام الناس، بالخصوص نوجوان فوجی افسروں میں، جو مغرب کی لبرل ازم سے آشنا ہو چکے تھے، اس کی مخالفت بڑھنے لگی۔ 1817 میں فوج میں متعدد خفیہ سوسائٹیاں قائم ہو گئیں۔ ان سوسائٹیوں نے بالآخر پیٹرز برگ میں شمالی سوسائٹی (یہ آئینی بادشاہت کے حق میں تھی اور زرعی غلامی کا نظام ختم کرنا چاہتی تھی، وغیرہ) اور کیف میں جنوبی سوسائٹی (یہ ملک میں جمہوری نظام قائم کرنا اور زمین کسانوں میں تقسیم کرانے کی خواہش مند تھی، وغیرہ) کا روپ دھار لیا۔

الیکساندر لاولد تھا۔ اس کے دو بھائی تھے، کونستانتن اور نکولس۔ الیکساندر نے 1822 میں اعلان کیا کہ اس کا جانشین گرینڈ ڈیوک نکولس ہوگا کیونکہ اس کا ایک بیٹا بھی تھا اور وہ روس کے آرتھوڈوکس مذہب کا کٹر حامی بھی تھا۔ مخالفین کونستانتن کے حق میں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مغربی ممالک میں کافی عرصہ جلاوطنی کی زندگی گزارنے کے بعد اس کے خیالات لبرل ہو چکے ہیں (غالباً یہ محض مفروضہ تھا)۔ 19 نومبر 1825ء کو الیکساندر انتقال کر گیا۔ شمالی اور جنوبی دونوں سوسائٹیوں نے کوشش کی کہ کسی طرح کونستانتن کو زار بنوا دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے ان کے پاس صرف ایک ماہ تھا تاہم چودہ دسمبر کو گرینڈ ڈیوک نکولس اول کے نام سے ملک کا

حکمران بن گیا۔ پیٹرز برگ میں مقیم فوج دو گروہوں میں بٹ گئی۔ تین ہزار افراد انقلاب کے حق میں اور نو ہزار نئے زار کے وفادار تھے۔ فریقین میں دن بھر رسہ کشی ہوتی رہی۔ آخر کار زار کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور اس نے اپنے وفاداروں کو باغیوں پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ باغی مقابلہ کیے بغیر فرار ہو گئے اور نکولس تیس سال کے لیے روس کا انتہائی ظالم اور جابر حکمران بن گیا۔

باغی، جنھیں دسمبر کی رعایت سے دسمبری (روسی میں دیکابری) کہا جاتا ہے، پکڑے گئے۔ چھ سوسے پوچھ گچھ ہوئی، ایک سو بیس پر مقدمہ چلا، پانچ کو سزائے موت ملی اور اکتیس کو تاحیات سائبیریا بھیج دیا گیا۔ جن لوگوں کو سائبیریا جلا وطن کیا گیا، ان میں طالسطائی کی والدہ کا قریبی عزیز میجر جنرل پرنس سرجی گریگوریوچ ولکونسکی بھی شامل تھا۔ اسے اس کی جاگیروں اور خطاب سے محروم کر دیا گیا اور پابجولاں زار کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ زار نے اسے طنز و تشنیع کا نشانہ بنایا اور اسے ''بیوقوف'' کہا۔ تاہم اس کی نوجوان رفیق حیات اسے ''بیوقوف'' نہیں سمجھتی تھی۔ اس نے اپنا شیر خوار بچہ چھوڑا اور از خود اپنے شوہر کے ساتھ سائبیریا چلی گئی۔

نکولس اول نے 1855 میں انتقال کیا اور الیکساندر دوم تخت نشین ہوا۔ اس نے تمام باغیوں کو معافی دے دی۔ پرنس ولکونسکی سائبیریا سے واپس آ گیا لیکن روس میں قیام کرنے کے بجائے اطالیہ چلا گیا۔ طالسطائی نے اس سے وہیں ملاقات کی۔ وہ اس کے نزدیک ہیرو تھا اور وہ اس کی پرستش کرتا تھا۔ طالسطائی دسمبری تحریک سے بہت متاثر تھا اور جانتا تھا کہ اگر یہ کامیاب ہو جاتی تو روس کی تاریخ کا دھارا بدل جاتا۔ اسے ہمیشہ یہ احساس ستاتا رہا کہ وہ بعد از وقت پیدا ہوا ہے اور یوں اس تحریک میں شامل ہونے کی سعادت سے محروم رہا ہے۔ اس نے یہ کمی اس تحریک کے متعلق ناول لکھ کر پوری کرنے کی کوشش کی۔ اصل میں وہ ''جنگ اور امن'' کی بجائے یہی ناول لکھنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے اس تحریک کے متعلق مواد اکٹھا کرنے کا کام شروع کیا (اس نے چند ابواب لکھ بھی لیے تھے) اسے اندازہ ہوا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا ہے، وہ اس تحریک کے حوالے سے نہیں کہہ سکتا۔ چنانچہ اس نے مزید پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ نپولین کا روس پر حملہ اس کے خیالوں کا مرکز بن گیا اور یوں دنیا کا عظیم ترین ناول وجود میں آیا۔

روسی مذہب

مسلمانوں کی طرح عیسائی بھی مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ شروع میں کچھ فرقے، بالخصوص اسکندریہ کے پادری آریوس (Arius) (عام عیسائی اسے بدعتی کہتے ہیں) کے پیروکار، خدا کی وحدانیت اور بعض تثلیث (باپ، بیٹا اور روح القدس) میں یقین رکھتے تھے۔ 325 میں ترکی کے ایک قصبے نیقایہ (Nicaea) میں تقریباً تین سو اساقفہ کا اجتماع ہوا اور اس میں کثرت رائے سے تثلیث کو عیسائیت کا بنیادی ستون قرار دیا گیا۔ اسے نیقایہ کی رعایت سے ''نقاوی عقیدہ'' کہا جاتا ہے۔

اس زمانے میں رومی سلطنت کا، جو یورپ کے اکثر ممالک، شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا پر مشتمل تھی، ڈنکا بج رہا تھا۔ عیسائیت کو فروغ بھی اسی سلطنت میں حاصل ہوا۔ ایشیا، افریقہ اور یونان کے لوگ نسبتاً زیادہ راسخ العقیدہ تھے، چنانچہ وہ آرتھوڈوکس (Orthodox) کہلائے۔ یورپی عیسائیوں کا مسلک لاطینی کہلایا اور بعد میں یہی رومن کیتھولک مذہب بنا۔ (سولھویں صدی میں رومن کیتھولک مسلک میں دراڑیں پڑیں۔ مارٹن لوتھر کے حامیوں نے بغاوت کردی اور وہ پروٹسٹنٹ کہلائے۔ ان پروٹسٹنٹوں کی ایک شاخ کلیسائے انگلستان ہے۔)

رومن کیتھولک فرقے کا سربراہ پوپ کہلاتا ہے۔ وہ خود مختار بادشاہوں کی طرح روم کے ایک علاقے میں، جسے ویٹیکن (یا Holy See) کہا جاتا ہے، رہتا ہے۔ اس کی معاونت کارڈینل (cardinal)، جو ایک طرح سے اس کے وزیر ہوتے ہیں، کرتے ہیں اور یہی پہلے پوپ کی وفات پر نئے پوپ کا انتخاب کرتے ہیں۔ علاقائی نظام چلانے کے لیے آرچ بشپ (اسقف اعظم) اور بشپ مقرر کیے جاتے ہیں۔ بشپ کا علاقہ اسقفیہ (diocese) کہلاتا ہے، اس کا کلیسا اپنے علاقے کا سب سے بڑا گرجا ہوتا ہے اور جس شہر میں وہ رہتا ہے، اسے See کہتے ہیں۔ بشپ کے نیچے پادری ہوتے ہیں۔ پادری کا اپنا علاقہ (parish) اور گرجا ہوتا ہے۔ اس کی معاونت ڈیکن (deacon) (مہتمم صدقات وغیرہ) اور نائب ڈیکن کرتے ہیں۔ یہ بعد میں ترقی کر کے خود پادری بن جاتے ہیں۔ دوسرے فرقوں میں پوپ اور کارڈینل نہیں ہوتے، باقی نظام اسی طرح کا ہے۔

447 میں ہسپانیہ میں ایک نئی تحریک اٹھی۔ اس نے "نقاوی عقیدے" میں نیا اضافہ کردیا اور قرار دیا کہ روح القدس باپ سے ہی نہیں، بیٹے سے بھی منبثق ہے۔ اسے انبثاق* روح القدس (Procession of Holy Spirit) بھی کہتے ہیں۔ رومن کیتھولک مذہب نے سرکاری طور پر اس اضافے کو گیارھویں صدی میں صحیح تسلیم کرلیا۔ آرتھوڈوکس مسلک نے اس کی مخالفت کی۔ رومی سلطنت پہلے ہی دو حصوں — مشرقی اور مغربی — میں تقسیم ہوچکی تھی۔ دونوں کا مذہب بھی علیحدہ علیحدہ ہوگیا۔ مشرقیوں نے پوپ کی سیادت بھی قبول کرنے سے انکار کردیا۔ انھوں نے اپنے مذہب کے چار حلقے بنائے۔ ہر حلقے کا سربراہ بطریق (patriarch) کہلایا اور یروشلم، انطاکیہ، سکندریہ اور قسطنطنیہ ان کے صدر مقام قرار پائے۔ (بعد میں روسیوں نے ماسکو میں اپنا بطریقی صدر مقام بنالیا۔ پھر جارجیا، سربیا، بلغاریہ اور رومانیہ میں بھی بطریق مقرر ہوے۔) آرتھوڈوکس مسلک کے پیروکار زیادہ تر مغربی ایشیا، یونان، روس، قبرص، البانیہ، رومانیہ، چیکوسلواکیا، سربیا، پولینڈ اور بلغاریہ میں پائے جاتے ہیں۔ روسی تارکین وطن نے بعض دوسرے ممالک میں بھی شاخیں قائم کرلی ہیں۔

آرتھوڈوکس کلیسائی نظام میں اصل اختیارات اساقفہ کے، جن کا غیر شادی شدہ ہونا ضروری ہوتا ہے، ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ ان کے معاونین پادری، جو عہدے کا حلف اٹھانے کے بعد شادی کرسکتے ہیں، ہوتے ہیں۔ ڈیکن اور نائب ڈیکن لطوریا (آداب رسوم وعبادات) میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ آرتھوڈوکس کلیسا اپنے آپ کو واحد سچا

* یعنی روح القدس کا ظہور صرف خدا کا نہیں بلکہ اس کے "بیٹے" یعنی حضرت عیسیٰ کا بھی مرہونِ منت ہے۔

کلیسا تصور کرتا ہے اور صرف نقادی عقیدے کو مانتا ہے۔ اس کی عبادت کا طریق کار ساکرامنٹی (sacramental) ہے اور عشائے ربانی اور قدیم لطوریا (liturgy) کے گرد گھومتا ہے۔ عشائے ربانی کی رسم بڑے رکھ رکھاؤ اور سنجیدگی سے ادا کی جاتی ہے اور حمد سازوں کے بغیر گائی جاتی ہے۔ ایقونے کی تعظیم اس مسلک کی مابہ الامتیاز خصوصیت ہے، مجسموں، مورتیوں اور دیگر سہ ابعادی شبیہوں کی ممانعت ہے۔ سب سے بڑا تہوار ایسٹر ہے اور جولین کیلنڈر کی وجہ سے اس کی تاریخیں مغربی ایسٹر سے مختلف ہیں۔

روس میں عیسائیت قسطنطنیہ سے آئی۔ فطرتاً روسی آرتھوڈوکس اسی مسلک کے پیروکار بنے۔ سب سے پہلا روسی حکمران، جو عیسائی بنا، ولادی میر (980) تھا۔ وہ سینٹ ولادی میر کہلاتا ہے۔ اس کے بعد اس کی رعایا جوق درجوق عیسائیت اختیار کرنے لگی۔ روس کو قسطنطنیہ کے بطریق کے علاقے میں شامل کرلیا گیا۔

پندرھویں صدی میں مشرقی اور مغربی کلیسا میں اتحاد کی بات چلی۔ روسی حکمران باسل دوم (1425تا1492) نے اس میں شامل ہونے سے انکار کردیا۔ روسی کلیسا قدرے آزاد ہوگیا اور روسی مطران (metropolitan) یا اسقف اعظم، جو ایوان کالیتا کے عہد میں ماسکو منتقل ہو چکا تھا، آہستہ آہستہ روسی کلیسا کا سربراہ بن گیا۔ فیودر اول (1554تا1598) کے دور حکومت میں روسی بطریقیت (partriarchate) کا قیام عمل میں آیا اور روسی کلیسا مطلقاً آزاد ہوگیا۔ پیٹر اعظم نے مذہب پر حکومتی گرفت مضبوط کرنے کے لیے بطریقیت کا ادارہ ختم کردیا۔ اس نے اساقفہ پر مشتمل مقدس سنود یا مجلس قائم کی اور اس کا سربراہ (procutor) غیر پادری مقرر کردیا۔

خطابات

رومی سلطنت کے بعد جب یورپ مختلف ممالک میں تقسیم ہوا، مقامی بادشاہوں اور شہزادوں نے اپنے اقتدار کو مستحکم کرنے اور اسے دوام بخشنے کے لیے بڑے بڑے قطعات اراضی امرا اپنے منظور نظر افراد اور اپنی جائز و ناجائز اولاد میں بانٹنا اور انھیں مختلف خطابات سے نوازنا شروع کردیا۔ بتدریج یہ خطابات پانچ طبقوں بیرن، وائی کاؤنٹ، کاؤنٹ (برطانیہ ارل)، مارکوئیس اور ڈیوک کی شکل اختیار کرگئے۔ عام طور پر ایک شخص کے پاس صرف ایک خطاب ہوتا تھا۔ برطانیہ میں بعض اوقات ایک شخص ایک سے زیادہ خطابات کا مالک بھی ہوتا ہے (ڈیوک آف لینسٹر مارکوئیس آف کنڈیر، ارل آف اوفالی اور وائی کاؤنٹ آف لینسٹر بھی ہے) لیکن وہ پہچانا صرف بڑے خطاب سے ہی جاتا ہے اور ایک وقت میں اصل خطاب صرف ایک ہی شخص کے پاس ہوتا ہے اور اس شخص کو دارالامراء (ہاؤس آف لارڈز) میں بیٹھنے کی اجازت ہوتی ہے۔

جہاں تک برطانوی خطاب یافتہ اشخاص کی اولاد کا تعلق ہے، انھیں سرکاری طور پر نہ کوئی خطاب اور نہ کوئی استحقاق حاصل ہوتا ہے، البتہ وہ تکریمی (courtesy) خطابات استعمال کرسکتی ہے۔ ڈیوک کا بڑا بیٹا مارکوئیس اور مارکوئیس کا ارل (باقی بیٹے بیٹیاں لارڈ اور لیڈی)، ارل کا بڑا بیٹا وائی کاؤنٹ اور وائی کاؤنٹ کا لارڈ اور باقی بیٹے

بیٹیاں اور بیرن کے سارے بیٹے بیٹیاں اپنے ناموں کے ساتھ آنریبل کا دم چھلا لگا سکتی ہیں۔ (انگریزی ادب کے ایک جانے پہچانے نقاد لارڈ (ڈیوڈ) سیسل اور ڈوروتھی سیرز (Sayers) کے ناولوں کے سراغ رساں ہیرو لارڈ (پیٹر) ومزی کو اسی قسم کے خطابات حاصل تھے۔) بعض اوقات ان تکریمی خطابات کے استعمال میں بڑی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ڈیوک آف بک لوخ کا بڑا بیٹا ارل اور چھوٹے بیٹے لارڈ کہلاتے ہیں جب کہ ارل آف مار اینڈ کیلی کا بڑا بیٹا لارڈ اور چھوٹے آنریبل ہیں لیکن بیٹی آنریبل کی بجائے لیڈی ہے۔ ڈیوک کی بیوی ڈچس، ارل کی کاؤنٹس اور لارڈ کی لیڈی کہلاتی ہے لیکن بیوہ کے نام کے ساتھ لفظ Dowager کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

پوتے پوتیوں کے سلسلے میں یہ نظام اور بھی پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ 1976ء میں ڈیوک آف لینسٹر کے خودکشی کرنے سے پہلے اس کی تین پشتیں موجود تھیں۔ ایک تصویر میں سربراہ خاندان کو ڈیوک آف لینسٹر، بڑے بیٹے کو مارکوئیس آف کنڈیر، بڑے پوتے کو ارل آف اوفالی اور بڑے پڑپوتے کو وائی کاؤنٹ آف لینسٹر لکھا گیا ہے۔ عجیب گورکھ دھندا ہے خود انگریزوں کی سمجھ میں بھی مشکل سے ہی آتا ہے۔

پھر برطانیہ میں ایک عجیب وغریب قانون، جسے Law of Primogeniture کہا جاتا ہے، مروج ہے۔ اس کی رو سے خطاب اور ساری جائیداد کا مالک بڑا بیٹا بنتا ہے (اگر صرف بیٹیاں ہوں، تو قریب ترین عزیز اور اگر دور پار کوئی بھی مرد عزیز نہ ہو، پھر چھٹی، خطاب اور جائیداد دونوں بحق سرکار ضبط قرار پاتے ہیں) جہاں تک باقی بچوں کا تعلق ہے، باپ کی مرضی ہے انھیں کچھ نقد رقم دے دے ورنہ جوتیاں چٹخاتے پھریں، اپنے لیے روزگار تلاش کریں (لارڈ ڈیوڈ سیسل کو تدریسی ملازمت اختیار کرنا پڑی) یا پھر شادی کے لیے کسی موٹی اسامی کو پھانسیں (جین آسٹن کے ناول Pride & Prejudice میں ایک ارل کا بیٹا فٹز ولیم ہیروئن الزبتھ بینٹ کو پسند کرنے کے باوجود اس سے اس لیے شادی نہیں کر سکتا کیونکہ وہ متمول نہیں ہے)۔

برطانیہ (اور پہلے فرانس میں بھی) میں امرا کے خطابات کے ساتھ کوئی نہ کوئی مقام ضرور وابستہ ہوتا ہے مثلاً ڈیوک آف سمرسٹ، ارل آف کرافرڈ۔ لیکن ان کی جو اولاد خطابات سے محروم رہتی ہے، وہ اپنا خاندانی نام استعمال کرنے لگتی ہے۔ مثلاً ڈیوک آف بیڈفرڈ کے بھائی بندرسل اور مارکوئیس آف سالسبری کے سیسل کہلاتے ہیں۔ اگر خطاب یافتہ شخص کا پورا نام لکھنا ہو تو خاندانی نام کے ساتھ لارڈ، پھر اصل خطاب آئے گا۔ مثلاً لارڈ ماؤنٹ بیٹن، ارل آف برما۔

برطانوی خطاب یافتگان کو مخاطب کرنا یا خطوط پر ان کا پتا لکھنا بھی پیچیدہ عمل ہے۔ تمام تفصیلات کئی صفحوں پر آتی ہیں، تاہم ڈیوک کو یوئر (یا غیر موجودگی میں ہز) گریس اور باقیوں کو لارڈ کہا جا سکتا ہے۔

برطانوی خطابات کے مقابلے میں روسی خطابات کا نظام بہت سادہ اور سہل تھا۔ اس کے صرف تین مدارج تھے: بیرن، کاؤنٹ اور پرنس۔ (روس میں ڈیوک کا نعم البدل "پرنس" اور زار کی اولاد پرنس نہیں بلکہ آرچ ڈیوک یا گرینڈ ڈیوک کہلاتی تھی۔) خطاب یافتہ اشخاص کی تمام اولاد اور اولاد کی اولاد پیدا ہوتے ہی بلا تخصیص خاندانی

خطاب کی مستحق ہو جاتی تھی۔ ناول میں پرنس نکولائی بلکونسکی کا بیٹا اور پوتا دونوں ہی پرنس اور بیٹی پرنس کہلاتی ہے۔ خود طالسطائی بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہونے کے باوجود کاؤنٹ تھا۔ پھر یہ خطاب خاندانی اور ذاتی دونوں ناموں سے پہلے لکھا جاسکتا ہے اور کسی مقام سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

انگریزوں کے برعکس روسی خطاب یافتہ اشخاص کو مخاطب کرنا بھی مشکل کام نہیں تھا۔ کبھی کو یور (اور غیر حاضری میں ہز) ایکسی لینسی کہا جاسکتا تھا۔ صرف کوتوزوف کے لیے، جب وہ کاؤنٹ سے پرنس بنایا گیا، یور (اور غیر حاضری میں ہز) سیرین ہائی نس استعمال ہوتا تھا۔ اس کی کوئی وجہ نہیں بتائی گئی۔

روسیوں میں جائیداد صرف بڑے بیٹے کے حصے میں نہیں آتی تھی، بلکہ یہ بلا تخصیص جنس سب اولاد میں تقسیم ہوتی تھی اور بعض اوقات اس شخص کا مسکن بھی چھوٹے بچوں کو مل جاتا تھا۔ ناول میں پرنس ماریا اپنے باپ کے مسکن ''بالڈ ہلز'' اور حقیقی زندگی میں طالسطائی اپنی والدہ کے مسکن ''یاسنایا پولیانا'' کا مالک بنتا ہے۔

برطانیہ کے ماسوا تمام یورپ میں امرائی خطابات کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے لیکن جن لوگوں کو ان کے استعمال کا چسکا ہے، وہ اب بھی انھیں اپنے ناموں کے ساتھ لگانا نہیں بھولتے۔ برطانیہ میں طالسطائی خاندان کا ایک تارک وطن، نکولائی طالسطائی، جو خیر سے تاریخی ناول بھی لکھتا ہے، اب بھی اپنے آپ کو کاؤنٹ نکولائی طالسطائی کہتا ہے۔ (خود ہمارے ہاں انگریز کے رخصت ہونے کے باوجود بعض لوگ اپنے ناموں کے ساتھ خطابات لکھنا فخر کی بات سمجھتے ہیں۔ مشہور ''محاذ ساز'' سیاست دان ''نوابزادہ'' نصر اللہ جیتی جاگتی مثال ہیں۔ ''سرکار پرست'' مسلم لیگی خطابات سے دست کش ہو چکے ہیں لیکن ''انگریز دشمن'' احراری ہونے کے باوجود نصر اللہ خاں آخر دم تک چمٹے رہے۔)

ہوزار

رومی سلطنت کے عروج کے زمانے میں وسطی یورپ میں دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر اس علاقے میں جسے آج کل ہنگری کہا جاتا ہے، ایک قوم گلیار آباد تھی۔ گلیار بنیادی طور پر مویشی پالتے تھے لیکن وہ غضب کے گھڑ سوار بھی تھے۔ ایک رومی جرنیل نے ان کے متعلق لکھا ہے: ''انھیں اپنے دشمنوں پر اچانک حملے کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ برق رفتاری سے ادھر ادھر سے آتے، بے قاعدہ صفیں بناتے اور اپنے مخالفوں پر ٹوٹ پڑتے، انھیں بھاری نقصان پہنچانے کے بعد تتر بتر ہو جاتے اور واپس لوٹ جاتے۔'' صدیوں تک یہ لوگ رومی سلطنت کے لیے عذاب بنے رہے۔

جب 1453 میں ترکوں نے سلطان محمد دوم کی قیادت میں قسطنطنیہ سر کر لیا، یورپی حکمرانوں میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ اس نئے خطرے سے نپٹنے کے لیے 1458 میں ہنگری کے بادشاہ متھائیس کارونتیس نے حکم دیا کہ باقاعدہ فوج کی مدد کے لیے گلیاروں کا ہر گاؤں ہر بیس میں سے ایک شخص لازماً بے قاعدہ سپاہ میں بھرتی کرائے۔ ہنگروی زبان میں بیس کے لیے لفظ husz استعمال ہوتا ہے، چنانچہ ''ہوزار'' (huszar) کا مطلب بیسواں ہوا۔ انگریزی

میں یہ hussar بنا اور روسی میں چونکہ h نہیں ہوتا اس لیے وہاں اس نے ''گسار'' (gusar) شکل اختیار کر لی۔
مشرقی یورپ میں ترکوں کی فتوحات کا سلسلہ جاری رہا۔ 1683 میں تین ہزار ترکوں نے ویانا کا محاصرہ کر لیا۔ یہ محاصرہ دو ماہ جاری رہا۔ پھر ایک روز بوقت طلوع آفتاب عجیب وغریب منظر دیکھنے میں آیا۔ نیزوں پر پر لہراتے، بظاہر پروں پر اڑتے، جھلملاتی رنگارنگ وردیاں پہنے گھڑسوار نمودار ہوئے اور ترکوں پر ٹوٹ پڑے۔ یہ حملہ اتنا اچانک اور اتنی بے خبری کے عالم میں کیا گیا تھا کہ ترک سنبھل نہ سکے اور ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ مغربی ممالک اسلامی یلغار سے بچ گئے۔

نو وارد گھڑسوار بادشاہ پولینڈ کے ہوزاروں پر مشتمل ہراول دستے تھے۔ بہت جلد ہوزاروں کا تصور دوسرے یورپی ممالک میں پھیل گیا اور مختصر عرصے میں روس، آسٹریا، فرانس، اطالیہ، برطانیہ اور متعدد دیگر ممالک نے بھی ہوزار دستے بھرتی کر لیے اور ان کے مخصوص لباس۔ پشمینی ٹوپیوں (شاکو)، بھیڑوں کی کھالوں کے چغوں، تنگ برجسوں اور گھٹنوں تک بوٹوں۔ کو وردی کی شکل دے دی۔ ہوزار آزاد رو تھے، معمول کی جکڑ بندیاں ناپسند کرتے تھے، ہتھیاروں کے استعمال میں مہارت کے دلدادہ تھے اور غیر معمولی جرأت ودلیری کے کاموں کی دل کھول کر داد دیتے تھے۔ چنانچہ عام فوج انھیں پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتی تھی۔

فرانسیسی کا استعمال

طالسطائی کے ناول ''جنگ اور امن'' کا تعلق جس زمانے سے ہے، اس میں روس کے پڑھے لکھے اور اونچے طبقوں میں فرانسیسی بہت مقبول تھی۔ عام لوگ تو مادری زبان استعمال کرتے تھے لیکن امرا اور تعلیم یافتہ لوگوں کا اوڑھنا بچھونا فرانسیسی تھی۔ وہ بولتے بھی فرانسیسی اور لکھتے بھی فرانسیسی ہی تھے، بعض لوگوں کو تو اپنی زبان آتی ہی نہیں تھی۔ جب روس کا فرانس کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، ان لوگوں کی رگ حمیت جاگی اور وہ روسی کی طرف پلٹنے لگے۔ جیسا کہ ناول میں جولی کاراگینا اپنی سہیلی پرنسس ماریا بلکونسکی کے نام اپنے ''فرانسیسی زدہ'' (Frenchified) خط میں بتاتی ہے، بعض لوگوں کو اپنی زبان سیکھنے کے لیے باقاعدہ ٹیوٹروں کی خدمات حاصل کرنا پڑیں۔ یہی وجہ ہے کہ ''جنگ اور امن'' میں فرانسیسی کا بکثرت استعمال ہوا ہے۔

روسی تقویم

مغربی یورپ میں (موجودہ) گریگورین کیلنڈر سترھویں صدی میں مروج ہو گیا تھا لیکن روسی موجودہ صدی کے آغاز تک (پرانے) جولین کیلنڈر پر کاربند رہے۔ چنانچہ طالسطائی نے ''جنگ اور امن'' میں تمام تاریخیں جولین کیلنڈر ہی کے حساب سے دی ہیں۔ دونوں کیلنڈروں میں بارہ ایام کا فرق ہے۔ بارودینو کی لڑائی روسی حساب سے

26 اگست اور مغربی تقویم کے مطابق 7 ستمبر 1812 کو ہوئی تھی۔

روسی فاصلے

روس میں فاصلے ناپنے کے لیے ورست (verst) استعمال ہوتا تھا۔ ایک ورست تقریباً دو تہائی میل کے برابر ہوتا ہے۔ طالسطائی نے فاصلے ورست کے حساب سے دیے ہیں۔ چونکہ ہم میل سے زیادہ آشنا ہیں، میں نے روز میری ایڈمنڈز کے تتبع میں ورست میلوں میں تبدیل کر دیے ہیں۔ (ناول کے ساتھ یہ میری واحد چھیڑ خانی ہے۔)

ناول کا عنوان

ابتدا میں جس وقت یہ ناول قسط وار ''دی رشین میسنجر'' نامی رسالے میں شائع ہو رہا تھا تو اس کا نام "1805" رکھا گیا تھا۔ لیکن جب ناول شاخ در شاخ پھیلتا ہوا آگے بڑھا اور ایک پورے دور پر محیط ہوتا نظر آیا تو وسعت بیان سے نباہ کی خاطر ناول کے نام میں تبدیلی ناگزیر ہو گئی۔ چنانچہ جب بالآخر وہ کتابی صورت میں سامنے آیا تو پرانا عنوان "1805" مسترد کر کے اسے ''جنگ اور امن'' کا نام دیا گیا۔ اس نئے نام کا حسن یہ ہے کہ روسی زبان میں ''امن'' کے لیے جو لفظ (Mir) مستعمل ہے اس کے معنی بہت وسیع ہیں۔ امن کے علاوہ اس سے نہ صرف دنیا مراد ہے بلکہ یہ کائنات اور کمیونٹی کا مطلب بھی ادا کرتا ہے۔ جنگ کے لیے روسی لفظ Voina ہے اور بقول جون بیلی روسی میں ان دونوں لفظوں کی یکجائی سے مابعد الطبیعاتی آن بان رکھنے والے وسیع طیف کے جو معانی وجود میں آتے ہیں ان کو کسی دوسری زبان میں جوں کا توں منتقل کرنا امر محال ہے۔ غالباً معانی کی اسی تہہ داری کے پیش نظر طالسطائی نے ناول کے لیے یہ نام پسند کیا۔

فرہنگ

عسکریت

امپیریل گارڈز: یہ روسی فوج کے بہترین سپاہیوں اور افسروں پر مشتمل ہوتے تھے۔ ان کا کام فرماں روائے وقت کی حفاظت کرنا اور بوقت ضرورت جنگی خدمات سرانجام دینا ہوتا تھا۔ ان میں شامل ہونا باعث فخر سمجھا جاتا تھا۔

اولان (Uhlans): پولینڈ اور پرشیا کے نیزہ بردار گھڑسوار۔

ڈریگون (Dragoons): یہ شروع میں پیادہ سپاہی ہوتے تھے۔ انھیں مریل گھوڑے فراہم کیے جاتے تھے اور یہ ان پر سوار ہو کر میدان جنگ میں پہنچتے تھے، وہاں گھوڑوں سے نیچے اترتے اور پیادہ لڑائی میں شریک ہوتے۔ بعد ازاں انھوں نے گھڑسواروں کی طرح لڑنا سیکھ لیا۔ سترھویں اور انیسویں صدی تک وہ بھاری اسلحہ سے لیس ہوتے تھے۔

سٹاف: فوجی کمانڈر کا عملہ۔ اس کا کام جنگی منصوبے بنانا، انتظامی امور نپٹانا اور لڑاکا فوج کے ساتھ رابطہ قائم رکھنا ہوتا تھا۔ اس کے جونیئر ارکان ایجوٹنٹ، ایڈی کانگ اور اردلی افسر کہلاتے تھے۔

شاسرز (Shasseurs): فرانسیسی فوج کے بعض گھڑسوار اور پیادہ دستے۔ یہ ہلکے ہتھیاروں سے مسلح ہوتے تھے اور تیزی سے ادھر ادھر جا سکتے تھے۔

کوارٹر ماسٹر: فوج کا وہ شعبہ، جس کا کام خوراک، وردیاں، اسلحہ اور دیگر سامان رسد فراہم کرنا ہوتا ہے۔

گجنال (cannon): ایک قسم کی پرانی توپ، گھوڑا گاڑی پر لدی ہوتی تھی۔

گریپ شاٹ (grapeshot): لوہے کی گولیوں کا گچھا۔ گجنال میں رکھ کر چلاتے تھے۔

گرینیڈیرز (grenadiers): دستی بم پھینکتے تھے۔

ملیشیا: بے قاعدہ فوج۔ عام شہریوں اور فارغ شدہ فوجیوں پر مشتمل ہوتی تھی۔ ہنگامی حالات میں فوجی خدمات سرانجام دیتی تھی۔

نوٹ: عام افواج کی طرح روسی افواج بھی کوروں (corps)، ڈویژنوں، رجمنٹوں وغیرہ پر مشتمل ہوتی تھی۔ آج

کل کور کی نفری عام طور پر بیس پچیس ہزار ہوتی ہے لیکن زاروں کی کور تقریباً دس ہزار افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔

مذہب

ایقونہ: حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، فرشتوں اور مقدس ہستیوں کی تصاویر۔ عموماً چوبی تختوں پر کندہ کی جاتی ہیں۔ صرف آرتھوڈوکس مسلک کے پیروکار استعمال کرتے ہیں۔ رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ ان کے مخالف ہیں۔ آرتھوڈوکس گرجوں میں کم از کم دو ایقونے ضرور ہوتے ہیں۔ دروازے کی دائیں جانب عیسیٰؑ اور بائیں جانب مریمؑ کا ایقونہ سجایا جاتا ہے۔ اکثر لوگ اپنے گھروں میں بھی رکھتے ہیں۔

اعتراف گناہ (confession): عیسائیت میں ارتکاب گناہ بندے اور خدا کے مابین معاملہ نہیں، موت سے پہلے کم از کم ایک بار پادری کے سامنے اپنے گناہوں کا اعتراف کرنا پڑتا ہے، ورنہ بخشش کی امید نہیں کی جا سکتی۔

اناجیل اربعہ (Gospels): متی، مرقس، لوقا اور یوحنا کی روایت کردہ انجیلیں۔ ان میں حضرت عیسیٰؑ کے حالات زندگی اور تعلقات مندرج ہیں اور نئے عہد نامے میں شامل ہیں۔

ساکرامنٹ / سرِ مقدس (Sacrament): عیسائیت کی مقدس رسم۔ عیسائیت میں سات ساکرامنٹ ہیں: اصطباغ، شراکت پاک، تصدیق، کفارہ، آخری مسح، پاک درجات اور نکاح۔

اصطباغ یا بپتسمہ (baptism): کسی شخص کے گناہ دھونے کے لیے اس پر مقدس پانی چھڑکا جاتا ہے۔ بعض مسالک اسے پانی میں نہلاتے ہیں۔ بچوں کو ان کی پیدائش کے بعد بپتسمہ دیا جاتا ہے اور اس کا مسیحی نام رکھا جاتا ہے۔ ایسے مواقع پر اس کے دینی باپ اور دینی ماں، جو اس کی مناسب مذہبی تعلیم کی ذمے داری اٹھاتے ہیں، موجود ہوتے ہیں۔

شراکت پاک یا رفاقت مسیحی (Communion): مسیحی روایات کے مطابق عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کے ساتھ جو آخری کھانا کھایا، وہ "روٹی" اور "مے انگور" پر مشتمل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب عیسیٰؑ نے روٹی توڑی تو کہا: "یہ میرا جسم ہے۔" اور جب حواریوں میں مے تقسیم کی تو کہا: "یہ میرا خون ہے۔" رومن کیتھولک عقیدے کے پیرو کہتے ہیں کہ اس رسم کی ادائیگی کے دوران میں مسیح واقعی حاضر ناظر ہوتے ہیں کیونکہ گرجے میں میز پر رکھی ہوئی روٹی اور مے ان کے "جسم" میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ گرجے میں ادائیگی رسم کے دوران میں روٹی اور مے "مقدس میز" پر رکھی ہوتی ہے۔ عبادت کنندگان میز کے سامنے دو زانو ہو جاتے ہیں اور پادری ہر ایک کی زبان پر لقمہ (host) رکھتا جاتا ہے۔

تصدیق (confirmation): ہر عیسائی کو رسمی طور پر گرجے میں اپنے مذہب کی تصدیق کرانا پڑتی ہے۔

کفارہ (penance): عیسائی مذہب کا ایک عمل، جس میں اعتراف گناہ، توبہ، عقوبت نفس وغیرہ کئی منزلیں شامل ہوتی ہیں۔

آخری مسح یا تدہین آخر (extremeunction): شدید بیمار یا قریب المرگ شخص کو مسح دینے کی رسم۔

پاک درجات یا درجات قسوست (Holy Orders): پادری بنانے کی رسم۔

نکاح (matrimony): رسم نکاح۔

سینٹ (Saint): مقدس ہستی یا ولی۔ عیسائیت میں صرف مرحوم شخص ہی سینٹ بنایا جا سکتا ہے اور جس شخص کو اس کے نیک اعمال کی وجہ سے یہ درجہ دیا جاتا ہے، وہ عام عقیدے کے مطابق ''جنت نصیب'' ہوتا ہے اور اسے خداوند سے مخصوص اشخاص کی شفاعت کا اختیار ہوتا ہے۔ رومن کیتھولک مسلک میں کسی شخص کو سینٹ قرار دینے (Canonization) کا اعلان پوپ کرتا ہے۔ ایسے موقع پر وکیل خداوند (advocatus Dei) اور وکیل شیطان (advocatus) diaboli) پیش ہوتے ہیں۔ وکیل شیطان اسے سینٹ قرار دینے کی مخالفت کرتا ہے اور اس کے اعمال میں کیڑے نکالتا ہے۔ وکیل خداوند اس کی صفائی پیش کرتا ہے۔ اگر وکیل خداوند جیت جائے تو پھر اسے سینٹ کا درجہ دے دیا جاتا ہے۔

ہر سینٹ کا اپنا یوم ضیافت ہوتا ہے۔ اس موقع پر اسے دعاؤں میں یاد کیا جاتا ہے۔ اکثر عیسائی اپنے بچوں کے نام کسی نہ کسی سینٹ (سینٹ مرد اور عورتیں دونوں ہوتے ہیں) کے نام پر رکھتے ہیں شاید ان کا بچہ ان جیسا ہو جائے۔ پروٹسٹنٹوں میں سینٹ نہیں ہوتے۔

مزمور (جمع مزامیر) (Psalms): پرانے عہدنامے میں ڈیڑھ سو کے قریب نغمے یا حمدیں (hymns) ہیں، انھیں مزامیر کہا جاتا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے نزدیک، جو انھیں معبدوں اور گرجوں میں گاتے ہیں، یہ دنیا کے بہترین نغمے ہیں۔

مکتوبات (Espistles): نئے عہدنامے میں اکیس ابواب مختلف اشخاص کے خطوط پر مشتمل ہیں، انھیں ''مکتوبات'' کہا جاتا ہے۔ مشہور ترین خطوط سینٹ پال (پولوس) کے ہیں اور اس رعایت سے انھیں (Pauline Epistles) مکاتیب پولوس) کہا جاتا ہے۔

مائدہ یا میز مقدس یا الطار (Altar): گرجے کے مقدس ترین مقام پر ایک میز یا بلند سنگی چبوترہ۔ اس پر ''روٹی'' اور ''مے'' رکھی جاتی ہے۔

یوخرستی قربانی یا عبادت (mass): رومن کیتھولک اور آرتھوڈوکس مسالک میں عبادت کا اجتماعی طریقہ۔ اس عبادت میں لوگ مل جل کر دعائیں مانگتے ہیں اور ان کی عبادت کا یہ انداز عیسیٰؑ کے آخری کھانے کی یاد دلاتا ہے۔ پروٹسٹنٹ مسلک میں اسے ''سنڈے سروس'' (عبادت اتوار) کہا جاتا ہے۔

نوٹ: مذہبی اصطلاحات کے ترجمے English - Urdu Dictionary of Christian Terminology مطبوعہ کرسچین سٹڈی سنٹر راولپنڈی سے لیے گئے ہیں۔

موسیقی

اوپیرا(opera): غنائی تمثیل: اس ڈرامے میں اداکار گفتگو کرنے کے بجائے نغمات گاتے ہیں۔
اریا(aria): ایک قسم کا پیچیدہ نغمہ۔اسے اوپیرا میں صرف ایک اداکار گاتا ہے۔
اورچر (overture): موسیقی کا خاصا چھوٹا ٹکڑا۔ یہ اوپیرے یا ڈرامے کے تعارف کے طور پر تحریر کیا جاتا ہے اور آرکسٹرا پر بجایا جاتا ہے۔
کنڈکٹر(conductor): کنڈکٹر آرکسٹرا کے سامنے کھڑا ہوتا ہے اور سازندوں کی رہنمائی کرتا ہے۔
سوناٹا(sonata): کلاسیکی راگ۔ پیانو، وائیلن یا بعض دوسرے آلات موسیقی کے لیے ترتیب دیا جاتا ہے۔اس کی کئی لَیں یا گتیں ہوتی ہیں لیکن سُر سب کا ایک ہی ہوتا ہے۔

متفرقات

بیلف (bailiff): زمینوں کا منتظم۔ یہ اعتبار عہدہ سٹیوارڈ سے کم تر ہوتا تھا۔
نمائندہ(delegate): کسانوں کے مسائل زمیندار تک پہنچاتا تھا۔
نمبردار (elder): گاؤں میں زمیندار کا نمائندہ۔
سٹیوارڈ(steward): زمیندار کی جاگیر اور دیگر املاک کا منتظم۔
بٹلر (butler): بڑے گھرانوں کا سب سے اہم نوکر۔ عام طور پر شرابوں اور دستر خوان کا انچارج ہوتا ہے۔اس کے اصل فرائض کیا ہیں، کوئی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ پرنسس ڈیانا نے ایک مرتبہ یہی سوال اپنے بٹلر سے کیا۔ اس نے جواب دیا: ''مالک کو خوش رکھنا۔''
ڈنر (dinner): دن کا اہم ترین کھانا (chief meal)۔اس کے وقت کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ملکہ وکٹوریہ کے زمانے میں دوپہر کے کھانے کو ڈنر کہتے تھے اور آج کل عموماً شام کے کھانے کو۔اس ناول میں جہاں بھی اس کا ذکر آیا ہے، اس کے کھانے کا وقت چار اور پانچ کا درمیانی وقت قرار دیا جاسکتا ہے۔ کاؤنٹس رستووا کے ہاں یہ چار بجے شروع ہوتا تھا۔ (پہلی کتاب، حصہ اول باب 11)
سپر (supper): رات کو سونے سے پہلے کھایا جاتا تھا اور عام طور پر ہلکی پھلکی اشیائے خورونوش پر مشتمل ہوتا تھا۔ ویسے آج کل بعض لوگ شام کے بڑے کھانے کو بھی سپر کہتے ہیں۔

اہم کردار

بزُوخوف

کاؤنٹ ،کرِل ولادی مرِوچ	باپ
پیوتر ،کرلووِچ (پیئر ،پیتروشکا)	بیٹا
پرنس کاترینا سمیونوونا مامونتووا (کاتش)	کاؤنٹ بزوخوف کی بھانجیاں
پرنس اولگا سمیونوونا مامونتووا	
پرنس سوفی سمیونوونا مامونتووا	

گوراگن

پرنس واسیلی سرگییوچ	باپ
پرنس اناطول	بیٹا
پرنس اپولیت	بیٹا
پرنس ہیلین (ایلین، ایلینا) واسیلیونا کوراگینا	بیٹی۔ پیئر سے شادی کرتی ہے۔

بلکونسکی

پرنس نکولائی آندریوچ	باپ
پرنس آندرے نکولائیوچ	بیٹا
پرنس ماریا (ماری، ماشا) نکولائیونا بلکونسکایا	بیٹی
پرنس لِسا (لسے ،لساوتا) کارلوونا بلکونسکایا بنت مینین	پرنس آندرے کی بیوی
پرنس نکولُشکا (نکولینکا)	پوتا

رستوف

کاؤنٹ الیا آندریچ	باپ
کاؤنٹس نتالیا (نتالی) رستووا بنت شن شن	کاؤنٹ الیا کی بیوی
کاؤنٹ نکولائی الیچ (نکولاس، کولیا)	بیٹا
کاؤنٹ پیتا (پیتروشکا)	بیٹا
کاؤنٹس ویرا الینچنا	بیٹی
کاؤنٹس نتالیا (نتاشا، نتالی)	بیٹی
سوفیا الیکساندرؤنا (سونیا، سونیوشکا، سوفی)	کاؤنٹس نتالیا کی بھانجی

درُوبیتسکوئے

پرنس آنا میخائیلوونا دروبیتسکایا	ماں
پرنس بورس (بوریکا، بوریا)	بیٹا

دیگر

آل پاچ	پرنس بلکونسکی کا سٹیوارڈ
ماریا دمتریونا آخروسیموِوا	''خوف ناک'' خاتون
الیکسی وچ آئی اوسف بازدیف	فری میسن تحریک کا رہنما
بلبین	سفارت کار
الفانسے (اڈولف) کارلک برگ	جرمن نژاد فوجی افسر، ویرا سے شادی کرتا ہے۔
تیخون	پرنس بلکونسکی کا ملازم خاص
تمو خن	پیادہ فوج کا افسر
ٹوشن	توپ خانے کا افسر
فیدیا دلوخوف	فوجی افسر۔ ایک قسم کا غنڈا
واسیلی دمترچ (واسکا) دینی سوف	فوجی افسر
کاؤنٹ رستوپ چن	گورنر ماسکو۔ (نقلی نہیں، اصل آدمی تھا)
شن شن	کاؤنٹس نتالیا رستووا کا رشتے دار

آننا (آنیت) پاولوونا شیرر	سابقہ امپراطورہ ماریا کی مصاحبہ
پلاتون کاراتائیف	کسان فوجی
جُولی (لوونا) کاراگینا	متمول دوشیزہ، بورس سے شادی کرتی ہے۔
لاوروشکا	دینی سوف کا اردلی

چند تاریخی کردار

الیکساندر اول	زارِ روس
میخائیل اِلاری اوناوِچ کُوتوزوف	روسی افواج کا کمانڈر انچیف
نپولین بوناپارٹ	شہنشاہِ فرانس۔

تشریحات

1- روسی نام عام طور پر تین اجزا پر مشتمل ہوتے ہیں۔ پہلا جزو ذاتی یا مسیحی نام کہلاتا ہے۔ دوسرے جزو سے عربوں کی طرح ولدیت کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً آندرے نکولا ئیوچ کا مطلب آندرے ابن نکولائی ہے۔

2- تیسرا جزو خاندانی نام (sur name) ہوتا ہے لیکن مردوں اور عورتوں کو ایک ہی لاٹھی سے نہیں ہانکا جاتا۔ عورتوں کی انفرادیت برقرار رکھنے کے لیے، خاندانی نام کے آخر میں عام طور پر حرف a کا اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مثلاً Karenin سے Karenina (کارینینا)۔

3- کسی بھی دوسری قوم کے مقابلے میں روسی مختصر نام یا عرف استعمال کرنے کے زیادہ شوقین ہیں، مثلاً میخائیل ماشا اور ماریا ماری یا ماشا بن جاتے ہیں۔ ہماری طرح بعض لوگوں کی پوری زندگی ان کا اصل نام پکارے بغیر گزر جاتی ہے۔ پتروشکا رستوف کو کبھی کسی نے پتروشکا نہیں کہا، آخر دم تک پیتیا ہی رہا۔

4- روسی زبان میں ح یا ہ (h) نہیں ہوتی۔ پیئر کی بیوی کا اصل نام ایلینا واسیلیونا بزوخووا (شادی سے قبل کوراگینا) اور مختصر نام ایلین (Ellen = یونانی ہیلن) ہے۔ میں نے انگریز مترجمین کے تتبع میں ہیلین (Helene) کو ترجیح دی ہے کیونکہ ہیلن آف ٹرائے کی وجہ سے اس سے ہمارے کان زیادہ آشنا ہیں۔

5- حرف V اگر روسی ناموں کے آخر میں آئے تو اس کا تلفظ (F) ہوتا ہے، لیکن اگر درمیان میں آئے پھر واؤ ہی رہتا ہے۔ مثلاً Rostov کو رستوف اور Rostova کو رستووا لکھا اور پڑھا جائے گا۔

6- مغرب میں عام آدمیوں کو عموماً ان کے خاندانی نام سے پکارا اور لکھا جاتا ہے۔ مگر بادشاہوں کو ان کے مسیحی ناموں سے جانا جاتا ہے جیسے شاہ جارج ششم، نہ کہ شاہ ونڈسر۔ نپولین کا خاندانی نام بوناپارت (Buonaparte) تھا۔ اس کے آباء واجداد نسلاً اطالوی تھے اور پندرھویں صدی میں بحیرۂ روم کے جزیرے کارسیکا میں آباد ہو گئے تھے۔ نپولین کی پیدائش سے ایک سال پہلے کارسیکا پر فرانس نے قبضہ کر لیا اور یوں وہ فرانسیسی شہری کی حیثیت سے تولد ہوا اور ہوش سنبھالنے کے بعد اس نے اپنا نام فرانسیسی انداز میں Bona parte (بوناپارت) لکھنا شروع کر دیا۔ جب نپولین نے اپنے آپ کو فرانس کا امپراطور قرار

دے دیا، فطری طور پر وہ امپراطور نپولین بن گیا۔ روسیوں نے اس کی شاہی حیثیت کو کبھی تسلیم نہ کیا، وہ اسے ہمیشہ اس کے خاندانی نام بوناپارت سے پکارتے رہے اور جب اس سے شدید نفرت کا اظہار کرنا مقصود ہوتا، وہ اسے بواناپارت کہتے (کہ امپراطور تو ایک طرف، وہ فرانسیسی بھی نہیں ہے)۔

-7 میں نے Emperor کا ترجمہ ''شہنشاہ'' نہیں کیا بلکہ ایرانیوں کے تتبع میں ''امپراطور'' (ای ایچ پامر نے اپنی ڈکشنری آف پرشین لینگویج مطبوعہ 1876ء میں ''امپراطور'' لکھا ہے) کو ترجیح دی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ''شہنشاہ'' کا لقب ہر بادشاہ اختیار کر لیتا تھا جب کہ امپراطور اپنے ہی ملک کا نہیں، بلکہ ایمپائر (Empire) کا سربراہ ہوتا تھا۔ محمد سلیم الرحمٰن کے خیال میں اس کا صحیح ترجمہ ''سلطان'' ہوسکتا ہے (سلطان کی بیوی سلطانہ ہوگی)۔ لیکن سلطان اور سلطانہ دونوں مسلمانوں کے لیے مخصوص ہو چکے ہیں، چنانچہ ان کا استعمال مناسب نہ سمجھا گیا۔ اسی طرح ''ایمپرس'' کے لیے ''امپراطورہ'' اور ''ایمپائر'' کے لیے ''امپراطوریہ'' استعمال کیا گیا ہے۔

-8 اگرچہ زاریوچ (tsarevitch) کے معانی ''زار کا بیٹا'' ہیں، لیکن یہ لفظ ''ولی عہد'' کے لیے، خواہ وہ زار کا بیٹا ہو یا نہ ہو، استعمال ہوتا تھا۔ الیکساندر اول لاولد تھا، اس کا ولی عہد اس کا بھائی تھا اور اس رعایت سے زاریوچ کہلاتا تھا۔

-9 انگریزی کے برعکس روسی الفاظ میں کوئی حرف شاذ ہی ساکت ہوتا ہے۔ چنانچہ روسی tsar کو زار نہیں بلکہ تسار کہتے ہیں۔ زار اور اس کی مختلف صورتیں (Tzar, Czar وغیرہ) سب انگریزوں اور امریکیوں کی اختراع ہیں۔ تاہم عام رجحان کے پیش نظر اور الجھاؤ سے بچنے کے لیے میں نے بھی ''زار'' ہی استعمال کیا ہے۔

چیدہ چیدہ واقعات کی تاریخیں

نوٹ: تمام تاریخیں جولین کیلنڈر کے مطابق ہیں۔ انہیں موجودہ کیلنڈر کے مطابق بنانے کے لیے ہر تاریخ میں 12 دن کا اضافہ کر دیا جائے۔

1805

11 اکتوبر	کوتوزوف براؤناؤ کے نزدیک رجمنٹ کا معائنہ کرتا ہے۔ بدقسمت میک کی آمد۔
23 اکتوبر	روسی فوج دریائے اینس عبور کرتی ہے۔
24 اکتوبر	ام سٹیٹن میں لڑائی۔
28 اکتوبر	روسی فوج دریائے ڈینیوب عبور کرتی ہے۔
4 نومبر	نپولین شون برن سے موغا کے نام مراسلہ تحریر کرتا ہے۔
	شون گرابرن کی لڑائی۔
19 نومبر	اوسٹرلٹس میں جنگی کونسل کا اجلاس۔
20 نومبر	اوسٹرلٹس کی لڑائی

1807

27 جنوری	پروئے شش آئی لاؤ کی لڑائی۔
2 جون	فریڈلانٹ کی لڑائی۔
13 جون	ٹلزٹ میں نپولین اور الیکساندر کی ملاقات۔

1812

17 مئی	نپولین کی ڈریسڈن سے روانگی

12 جون — نپولین دریائے نیمین عبور کرتا ہے اور روس میں داخل ہو جاتا ہے۔

14 جون — الیکساندر بالاشیف کو نپولین کے پاس بھیجتا ہے۔

13 جولائی — پاولوگرات ہوزاروں کی استروونا میں کارروائی

4 اگست — آل پاچ سمولنسک پہنچتا ہے اور فائرنگ کی آوازیں سنتا ہے۔

5 اگست — سمولنسک پر بم باری

7 اگست — پرنس نکولائی بلکونسکی بالڈ ہلز سے باگوچارافو روانہ ہوتا ہے۔

8 اگست — کوتوزوف کمانڈر انچیف مقرر کیا جاتا ہے۔

10 اگست — پرنس آندرے کی رجمنٹ بالڈ ہلز کے برابر سے گزرتی ہے۔

17 اگست — کوتوزوف تساریوو زائمش چے پہنچتا ہے اور فوج کی کمان سنبھال لیتا ہے۔

24 اگست — شیواردینو مورچے کی لڑائی

26 اگست — بارودینو کی لڑائی

27 اگست — روسی فوج کی پسپائی

یکم ستمبر — روسی فوج ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑ دیتی ہے۔

2 ستمبر — فرانسیسی فوج ماسکو میں داخل ہوتی ہے۔
ماسکو میں جگہ جگہ آگ بھڑکنے لگتی ہے۔

12 اکتوبر — فرانسیسیوں کے خلاف گوریلا کارروائیوں کا آغاز

6 اکتوبر — نپولین اور فرانسیسیوں کا ماسکو سے فرار

10 اکتوبر — نپولین قازقوں کے ہتھے چڑھنے سے بال بال بچتا ہے۔

5 نومبر — نپولین اپنی فوج کو کراسنایا چھوڑ کر خود مغرب کی طرف چل پڑتا ہے۔

6 نومبر — کراسنایا میں فرانسیسیوں کا قتل عام
دریائے بیریزینا عبور کرنے کے دوران لاتعداد فرانسیسی ڈوب جاتے ہیں۔

29 نومبر — کوتوزوف ولنا پہنچتا ہے اور 1812 کی مہم ختم ہو جاتی ہے۔

پہلی کتاب

نوٹ: اس ترجمے میں War کے لیے ''جنگ'' اور battle کے لیے ''لڑائی'' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

حصہ اول

1

''اخاہ، مائی ڈیئر پرنس، گویا جنیوا اور لوکا[1] کی حیثیت اب بونا پارتوں[2] کی ذاتی جاگیروں سے زیادہ نہیں رہی۔ نہیں، نہیں، میں تمھیں خبردار کیے دیتی ہوں کہ اگر تم اب بھی یہ نہ مانے کہ اس کا سیدھا سادا مطلب جنگ ہے، اور یہ کہ یہ دجال — اور میرا یہ ایمان ہے کہ یہ شخص واقعتاً دجال ہے — جس جس نوع کی نابکاریوں، خباثتوں اور ظالمانہ کارروائیوں کا مرتکب ہوا ہے، اگر تم پھر بھی انھیں درگزر کرنے کے روادار ہوئے، پھر سمجھ لو کہ آئندہ سے میری اور تمھاری کٹی ہوگئی۔ پھر میں تمھیں نہ تو اپنا دوست تصور کروں گی اور نہ اپنا وفادار غلام، جس کا تم ہر وقت ڈھول پیٹتے رہتے ہو۔ خیر چھوڑو، یہ بتاؤ اب تمھاری طبیعت کیسی ہے؟ حال چال کیا ہے؟ اوہو، میں سمجھ گئی، میں خواہ مخواہ تمھارے اوسان خطا کیے دے رہی ہوں۔ اچھا، بیٹھو، مجھے اس بارے میں سب کچھ بتاؤ۔''

یہ قصہ 1805ء کی جولائی کی ایک شام کا ہے اور جو خاتون مصروف کلام تھی، اس کا نام آننا پاولوونا شیرر (Anna Pavlovna Scherer) تھا۔ وہ خاصی جانی پہچانی ہستی کی مالک تھی۔ کیوں نہ ہوتی آخر وہ مادرِ ملکہ ماریا فیودَروناَ (Marya Fyodorovna) کی مصاحبہ اور محرم و دمساز تھی۔ جو کلمات اوپر تحریر کیے گئے ہیں، وہ ان کے ساتھ پرنس وِاسِلی (Vasily) کا، جو صاحب رسوخ اور مدبر سیاست دان تھا، اور جو اس کی محفل شب[3] میں حاضر ہونے والا اولین مہمان تھا، خیر مقدم کر رہی تھی۔

آننا پاولوونا چند دنوں سے کھانسی میں مبتلا تھی۔ اس کی یہ کھانسی بقول اس کے اپنے فلُو[4] (فلو، نیا لفظ تھا اور محض اونچے طبقے میں استعمال ہوتا تھا) کا شاخسانہ تھی۔ اسی صبح اس کے ذاتی خدمت گار نے، جو گہرے سرخ رنگ کی وردی میں ملبوس تھا، فرانسیسی زبان میں تحریر مختصر رقعات مختلف گھروں میں تقسیم کیے تھے۔ ان تمام رقعات میں بلا تخصیص ایک ہی قسم کی زبان استعمال کی گئی تھی:

> Monsieur le Comte (or mon prince)*، اگر کوئی خاص مصروفیت مانع نہ ہو اور اگر ایک لاچار و ناتواں مریضہ کی صحبت میں شام کے چند لمحات گزارنا آپ کے لیے بارِ خاطر نہ ہو، پھر

---

* ڈیر کاؤنٹ (یا پرنس)۔

راقمہ کو سات بجے شام اور دس بجے شب کے مابین اپنے غریب خانے پر آپ کی تشریف آوری پر بے پایاں مسرت ہو گی۔

آنیت شیرر

"Mon Dien، خدا خیر کرے، کیا زبردست چڑھائی ہے!" پرنس نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ وہ اس طرزِ تخاطب اور اندازِ خیر مقدم سے مطلق پریشان نہیں ہوا تھا۔ وہ درباری یونیفارم میں، جس پر کشیدہ کاری کی ہوئی تھی، ملبوس تھا۔ اس کی پتلون برجس نما تھی اور اس کے جوتے نیچی ایڑی کے تھے۔ اس کے سینے پر مختلف اعزازی فیتے اور ستارے آویزاں تھے اور اس کے سپاٹ چہرے پر طمانیت رقصاں تھی۔ وہ نہایت شستہ اور پاکیزہ فرانسیسی (کیونکہ یہی وہ زبان تھی جس میں ہمارے دادے پردادے نہ صرف اظہارِ خیال کرتے تھے بلکہ سوچتے بھی اسی میں تھے) میں باتیں کر رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ایسے سربرآوردہ شخص کا پرسکون اور مربیانہ انداز جھلک رہا تھا جس کی عمر طویل شاہی دربار اور فیشن ایبل طبقے کے مابین اٹھتے بیٹھتے گزری ہو۔ وہ آننا پاولوونا کے قریب آیا، اپنا چمکتا دمکتا گنجا سر، جو خوشبو سے معطر تھا، اس کے آگے کیا تاکہ وہ اسے اچھی طرح دیکھ سکے، اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور پھر بہ اطمینان قلب صوفے پر بیٹھ گیا۔

"Chere amie**، پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ نصیب دشمناں، تمھاری طبیعت کیسی ہے؟ اس بارے میں میری تشویش دور کرو۔" اس نے اپنی آواز اور لہجے میں کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر کہا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس روایتی ہمدردی اور تشویش کے نیچے ایک نوع کی بے نیازی ہی نہیں، تمسخر بھی پوشیدہ تھا۔

"اگر کوئی شخص اخلاقی کشمکش میں مبتلا ہو، پھر اس کی طبیعت درست کیسے رہ سکتی ہے؟ اگر کوئی بھلا مانس ذرا بھی ذی حس ہو، وہ بھلا اس زمانے میں کیسے پرسکون رہ سکتا ہے؟" آننا پاولوونا نے کہا۔ "میرا خیال ہے آج پوری شام تم یہیں گزارو گے۔"

"انگریزی سفیر جس ضیافت کا اہتمام کر رہا ہے، اس کا کیا بنے گا؟ آج چہار شنبہ ہے۔ مجھے وہاں اپنی شکل دکھانا ہوگی،" پرنس نے جواب دیا۔ "میری بیٹی ادھر ہی آ رہی ہے، وہ مجھے وہاں پہنچا دے گی۔"

"میرا خیال تھا کہ آج کی ضیافتیں اور جشن منسوخ ہو گئے ہیں۔ مجھے یہ کہنے میں ذرا باک نہیں کہ یہ دعوتیں، جشن اور آتش بازیاں اب اعصاب پر سوار ہونے لگی ہیں۔"

"اگر انھیں معلوم ہوتا کہ تمھاری یہی خواہش ہے، تو وہ آج کی ضیافت لازماً ملتوی کر دیتے،" پرنس نے مشینی انداز سے کہا۔ وہ ایک ایسی گھڑی کی مانند گفتگو کر رہا تھا جس کو چابی دی جا چکی ہو (اور اب وہ آپ ہی آپ

* مائی ڈیر۔
** ڈیر فرینڈ۔

ٹک ٹک کیے جارہی ہو)۔ وہ اپنی عادت سے مجبور تھا اور ایسی باتیں کہتا رہتا تھا جن کے متعلق اسے مطلق توقع نہیں ہوتی تھی کہ کوئی ان کا یقین کرے گا۔

''مجھ سے دل لگی مت کرو، مائی ڈیئر۔ نوواسلت سیف (Novosiltsev) کے مراسلے[5] کے متعلق کیا فیصلہ ہوا ہے؟ تم تو سب کچھ جانتے ہو۔''

''اس میں بھلا بتانے کی کیا بات ہے؟'' پرنس نے کہا۔ اس کے لہجے میں اکتاہٹ اور سردمہری تھی۔

''کیا فیصلہ ہوا ہے؟ نتیجہ یہ اخذ ہوا ہے کہ نپولین اپنی کشتیاں جلاچکا ہے اور مجھے یقین ہے کہ ہم بھی اپنی کشتیاں جلانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔''

پرنس ہمیشہ اکتائے اکتائے لہجے میں بات کرتا تھا، بالکل اس اداکار کی طرح جو کسی بھولے بسرے ڈرامے میں اپنا پارٹ دہرا رہا ہو۔ اس کے برعکس اگرچہ آنا پاولوونا چالیس کے پیٹے میں داخل ہوچکی تھی، اس کی گفتگو ہمیشہ چٹخارے، جذبے اور توانائی سے بھرپور ہوتی تھی۔ اپنے جوش وجذبے کا پوری قوت سے اظہار کرنا اس کا مجلسی رویہ بن چکا تھا اور بعض اوقات جب اس کی طبیعت مائل بہ افسردگی ہوتی تھی، تب بھی وہ اپنے جوش وجذبے کے اظہار میں پوری شدت اور توانائی بروئے کار لاتی تھی تاکہ ان لوگوں کو، جو اسے جانتے تھے، کسی قسم کی مایوسی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ مصنوعی تبسم، جو ہر آن اس کے لبوں کے اڑوس پڑوس رقصاں رہتا تھا، اگرچہ اس کے تھکے تھکے اور مضمحل چہرے سے میل نہیں کھاتا تھا، لیکن اس امر کی غمازی ضرور کرتا تھا کہ اسے اپنے اس دل آویز عیب کا احساس ہے تو سہی، تاہم بگڑے بچے کی طرح وہ اپنے اس عیب کی اصلاح نہ تو کرنا چاہتی تھی، نہ کرسکتی تھی اور نہ کرنا ضروری سمجھتی تھی۔

گفتگو سیاست کے بارے میں ہورہی تھی کہ بیچ میں آنا پاولوونا پھٹ پڑی۔

''اونہہ، آسٹریا کے متعلق تو مجھ سے بات ہی نہ کرو۔ ممکن ہے اس بارے میں میرا علم بالکل صفر ہو لیکن آسٹریا نے نہ تو کبھی جنگ کی خواہش کی ہے اور نہ کبھی وہ جنگ چاہے گا۔ وہ ہمارے ساتھ بے وفائی کررہا ہے۔ روس کو تن تنہا یورپ کے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنا ہوگا۔ کاتبِ تقدیر نے اسے ہمارے شفیق محسن اور مربی کے بارے میں رقم کردیا ہے۔ اس کا انھیں پورا پورا احساس ہے اور اس پر وہ پورا بھی اتریں گے۔ یہی ایک بات ہے جس کا مجھے سو فیصد یقین ہے۔ ہمارے نیک سیرت اور عظیم تر امپراطور کے کندھوں پر اس روئے زمین پر عظیم ترین ذمے داری آن پڑی ہے اور وہ اتنے پاکیزہ اخلاق اور شریف النفس انسان ہیں کہ (مجھے یقین ہے کہ) خود خداوند بھی ان کا ساتھ نہیں چھوڑے گا۔ جس فریضے کو نبھانے کی ذمے داری مقدر نے انھیں سونپ دی ہے، وہ اس سے پہلوتہی نہیں کریں گے بلکہ اسے بہ انداز احسن سرانجام دیں گے اور انقلاب کے نوسرے سانپ[6] کا، جو اس قاتل اور مفسدہ پرداز بدعتی کی ذات کے حوالے سے پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک صورت اختیار کرچکا ہے، سرکچل کر رکھ دیں گے۔ بھلے مانس اور نیک لوگوں کا جو خون بہا ہے، اس کا کفارہ بھی ہمیں ادا کرنا ہوگا اور اس کا انتقام بھی ہمیں کو لینا ہوگا۔ میں تم سے

پوچھتی ہوں کہ ہم کس پر اعتبار کر سکتے ہیں؟... انگلستان، جس کی نس نس میں تجارتی جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے، امپراطور الیکساندر (Aleksandr) کی روح کامل کی بلندی اور رفعت کو نہ تو سمجھ سکتا ہے اور نہ کبھی سمجھ پائے گا۔ اس نے مالٹا[7] خالی کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ تو یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہم (روسی) کر رہے ہیں، اس کے پس پردہ لازماً ہمارے کوئی خود غرضانہ مقاصد کار فرما ہیں اور اگر یہ مقاصد اوپر کی سطح پر نظر نہیں آتے، تو کہیں نہ کہیں زیریں سطح ضرور پوشیدہ ہوں گے۔ انھوں نے نوواسلت سیف سے کیا کہا؟ کچھ بھی نہیں۔ یہ انگریز نہ تو یہ سمجھ پائے ہیں اور نہ ان میں اتنی عقل و فراست ہے کہ وہ یہ سمجھ سکیں کہ ہمارے امپراطور اتنے بے غرض اور عالی ظرف ہیں کہ وہ دوسروں کی خاطر اپنے تمام مفادات کی بھینٹ دے سکتے ہیں۔ وہ اپنی ذات کے لیے کچھ نہیں چاہتے لیکن عالم اور انسانیت کی بھلائی کے لیے وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہیں۔ انھوں (انگریزوں) نے آخر وعدہ کس بات کا کیا ہے؟ کسی کا بھی تو نہیں۔ اور جو تھوڑا بہت وعدہ کیا بھی ہے، اسے وہ نبھائیں گے نہیں۔ پرشیا (Prussia)[8] پہلے ہی یہ ڈھنڈورا پیٹ چکا ہے کہ بوناپارت ناقابلِ تسخیر ہے اور سارا یورپ متحد ہو کر بھی چاہے، پھر بھی اس کا مقابلہ کرنے کی سکت پیدا نہیں کر سکتا... اور ہارڈن برگ (Hardenberg) یا ہوگ وٹس (Haugwitz)[9] جو کچھ کہتے ہیں، مجھے ان کے ایک لفظ پر بھی اعتبار نہیں۔ اہلِ پرشیا کی یہ مشہور زمانہ غیر جانبداری پھندے سے بڑھ کر کچھ نہیں۔ مجھے صرف خداوند کی ذات اور اپنے محبوب، فیض گنجور امپراطور کے عالی مرتبت مقدر پر اعتبار ہے۔ ہمارے حضور یورپ کا دفاع کریں گے!'' وہ اچانک خاموش ہو گئی۔ جس جوش اور ولولے کے ساتھ وہ تقریر کر رہی تھی، اس کی تندی پر اس کے اپنے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔

''میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے ڈیرونٹ ٹسنگے روڈے (Wintzenge rode) کی بجائے تمھیں اپنا سفیر بنا کر بھیجتے'' پرنس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ''تو اپنے تیز و طرار حملوں سے تم پرشیا کے بادشاہ کو آسانی سے مسخر کر لیتیں۔ تم فصاحت و بلاغت کے کیا دریا بہاتی ہو! مجھے چائے کا نہیں پوچھو گی؟''

''بس ایک منٹ۔'' وہ اب پرسکون ہو چکی تھی اور اس نے مزید کہا: ''ہاں، چلتے چلتے میں تمھیں یہ بھی بتا دوں کہ آج رات میرے ہاں دو مزے دار ہستیاں آ رہی ہیں۔ ان میں سے ایک کاؤنٹ موخت ماغ (Mortemart) ہے۔ روغاں[10] خاندان کے وسیلے سے اس کی رشتے داری مونت موغینسی[11] خاندان سے، جس کا شمار فرانس کے سرکردہ گھرانوں میں ہوتا ہے، بھی ہے۔ جو لوگ (فرانس سے) ہجرت کر کے یہاں آئے ہیں، موخت ماغ ان میں سچا اور کھرا شخص ہے۔ دوسرا آدمی صدر راہب موریو (Morio) ہے۔ تم اس نابغۂ روزگار شخصیت سے تو واقف ہی ہو گے؟ امپراطور اسے اپنے دربار میں باریابی کا شرف عطا کر چکے ہیں۔ تمھیں اس بارے میں کوئی اطلاع ملی؟''

''مجھے ان سے مل کر بہت خوشی ہوگی،'' پرنس نے جواب دیا ''لیکن یہ تو بتاؤ'' اب کے اس کا اندازِ گفتگو ایک قسم کی دانستہ لاپروائی اختیار کر چکا تھا گویا اس وقت جو سوال وہ پوچھنا چاہتا تھا، وہ بیٹھے بٹھائے اتفاقاً اس کے ذہن

میں در آیا تھا جب کہ اصل حقیقت یہ تھی کہ اس کی آمد کا بڑا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ اس سوال کی ٹوہ لگا سکے۔ ''کیا یہ بات درست ہے کہ مادر ملکہ بیرن فنک (Funke) کو ویانا میں فرسٹ سیکرٹری مقرر کرانا چاہتی ہیں؟ عام تاثر یہ ہے کہ اس شخص میں کوئی خاص خوبی نہیں۔''

پرنس واسیلی یہ عہدہ اپنے بیٹے کے لیے حاصل کرنے کا متمنی تھا لیکن دوسرے لوگ امپراطورہ ماریافیودرونا کی وساطت سے اس پر بیرن کا تقرر کرانا چاہتے تھے۔

آنا پاولوونا نے اپنی آنکھیں میچ لیں۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ امپراطورہ جو کام مناسب سمجھتی تھی، اس کی یا کسی دوسرے شخص کی یہ مجال نہیں کہ اس پر حرف گیری کر سکے۔

''مادر امپراطورہ سے بیرن فنک کی سفارش خود ان کی اپنی ہمشیرہ محترمہ نے فرمائی تھی،'' اس نے خشک اور پرحزن لہجے میں بس یہی کہنے پر اکتفا کیا۔

جونہی آنا پاولونا کی زبان پر امپراطورہ کا نام آیا، اس کے چہرے پر نہایت عمیق اور پرخلوص جان سپاری، پرجوش عقیدت اور عزت واحترام کے جذبات امنڈ آئے۔ ان جذبات میں افسردگی کی آمیزش بھی تھی۔ امپراطورہ اس کی مربیہ تھی اور جب بھی وہ اپنی اس عالی نسب اور نامور مربیہ کا نام لیتی، اس کے چہرے کی یہی کیفیت ہو جاتی۔ اس نے بتایا کہ امپراطورہ نے بہ کمال لطف وکرم بیرن فنک پر بے حد شفقت فرمائی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر حزن وملال کے بادل دوبارہ چھا گئے۔

پرنس نے اپنی بے اعتنائی کا رویہ برقرار رکھا اور خاموش رہا۔ آنا پاولونا نے اسے ہلکی سی ڈانٹ یوں پلا دی تھی کہ اس نے ایک ایسے شخص کا ذکر، جس کی سفارش امپراطورہ سے کی گئی تھی، غیر محتاط اور پرتحقیر انداز سے کرنے کی جرأت کی تھی۔ لیکن وہ ایسی خاتون تھی جس نے ساری عمر شاہی دربار کی چوکھٹ پر جبیں سائی کرتے بتائی تھی۔ چنانچہ اس میں عیاری، حاضر جوابی اور موقع محل کے مطابق بات کرنے کا سلیقہ فطرتاً کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اس کی دل جوئی کرنا چاہتی تھی۔

''کیوں نہ چلتے چلتے تمھارے خاندان کا کچھ ذکر ہو جائے؟'' وہ گویا ہوئی۔ ''تم جانتے ہو کہ جب سے تمھاری بیٹی نے محفلوں میں آنا جانا شروع کیا ہے،[12] اس نے سب کے دل موہ لیے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس کا حسن چاند کو شرماتا ہے۔''

شکریے اور احترام کا اظہار کرنے کے لیے پرنس جھک کر آداب بجالایا۔

کچھ دیر خاموشی رہی۔ ''میں اکثر سوچتی ہوں،'' آنا پاولونا نے پھر کہنا شروع کیا۔ وہ پرنس کے ذرا قریب کھسک آئی اور ازراہ التفات مسکرا دی گویا وہ اس بات کا عندیہ دینا چاہتی ہو کہ اب سیاست اور سماجی موضوعات کے بارے میں مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں رہی بلکہ خلوت میں بے تکلفانہ اور رازدارانہ گفتگو کرنے کا وقت آ گیا ہے۔ ''میں اکثر سوچتی ہوں کہ بعض اوقات زندگی کی نعمتیں کیوں غیر منصفانہ انداز سے تقسیم ہو جاتی ہیں۔

(خود اپنے آپ کو دیکھو) مقدر نے آخر تمھیں ہی کیوں دو۔۔ میں تمھارے سب سے چھوٹے بیٹے اناطول کا ذکر گول کر رہی ہوں کیونکہ وہ مجھے پسند نہیں ہے۔۔'' اس نے یہ الفاظ اپنی بھویں سکیڑتے اور کچھ اس لہجے سے کہے گویا اس کی بات حرف آخر ہے اور سننے والا اسے بلا چون و چرا صحیح تسلیم کرلے گا۔'' دو پیارے اور من موہنے بچوں سے نوازنے کے لیے چن لیا ہے؟ اور سچی بات تو یہ ہے کہ تم ان کی وہ قدر نہیں کرتے جتنی کہ دوسرے کرتے ہیں۔ چنانچہ تم اس بات کے مستحق نہیں کہ ان کے باپ کہلواؤ۔''

اور ایک بار پھر اس کے لبوں پر وجد آور تبسم لہرانے لگا۔

''تم چاہتی کیا ہو؟ لاواتر[13] کے الفاظ میں شاید مجھے بچوں سے لاڈ پیار کرنا نہیں آتا،'' پرنس نے بھنا کر جواب دیا۔

''یہ مسخرگی چھوڑو۔ میں تمھارے ساتھ انتہائی سنجیدہ گفتگو کرنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ میں تمھارے چھوٹے بیٹے سے بے حد ناخوش ہوں اور ہاں، یہ بات باہر نہ نکلے۔'' (اس کے ساتھ اس کے چہرے پر وہی حزن وملال کے بادل چھا گئے۔) ''چند دن ہوئے، کچھ لوگ امپراطور کی موجودگی میں اس کے متعلق باتیں بنا رہے تھے۔۔۔ اور ہر شخص تم پر ترس کھا رہا تھا۔''

پرنس چپ سادھے بیٹھا رہا۔ وہ بھی ذرا کی ذرا خاموش ہوگئی۔ تاہم جواب کے انتظار میں وہ معنی خیز انداز میں اسے دیکھتی رہی۔ پرنس واسیلی کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔

''میں اس کے متعلق کیا کر سکتا ہوں؟'' آخر کار وہ گویا ہوا۔ ''تم جانتی ہو کہ باپ اپنے بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں جو کچھ کر سکتا ہے، وہ سب کچھ میں نے کیا لیکن وہ دونوں ہی گھامڑ نکلے۔ اپولیت (Ippolit) کم از کم بھلا مانس احمق ہے۔ لیکن اناطول (Anatole) احمق بھی ہے اور کبھی نچلا بھی نہیں بیٹھ سکتا۔ دونوں میں یہی واحد فرق ہے۔'' اس نے کہا اور مسکرانے لگا لیکن اب کے اس کی مسکراہٹ میں معمول سے ہٹ کر غیر فطری پن اور گرما گرمی تھی۔ نتیجتاً اس کے دہانے کے گرد و پیش کی لکیریں غیر متوقع طور پر بھدی اور مکروہ دکھائی دینے لگیں۔

''لیکن تم جیسے مردوں کے ہاں بچے پیدا ہی کیوں ہوتے ہیں؟ اگر تم باپ نہ ہوتے، تو مجھے تمھاری ذات میں کیڑے ڈالنے کا موقع دستیاب نہ ہوتا،'' آنا پاولوونا نے سر اٹھا کر جواب دیا۔ وہ غور و فکر میں ڈوبی معلوم ہوتی تھی۔

''میں تمھارا وفادار غلام ہوں اور صرف تمھارے سامنے ہی اس بات کا اعتراف کر سکتا ہوں کہ میرے بچے۔۔ میرے بچے میری زندگی کا سب سے بڑا روگ ہیں۔ یہ وہ صلیب[14] ہے جو اٹھائے بنا بن نہیں پڑتی۔ میں اس مخمصے کی توجیہہ اسی طرح کرتا ہوں۔ خیر، تم چاہتی کیا ہو؟'' وہ چپ ہو گیا۔ اس کے وتیرے سے یہ دکھائی پڑتا تھا جیسے اس نے ظالم مقدر کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا ہو۔

آنا پاولوونا گہری سوچ میں کھو گئی۔

''کیا تم نے کبھی اپنے شاہ خرچ بیٹے اناطول کی شادی کے بارے میں سوچا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''لوگ

کہتے ہیں کہ جن بوڑھی بیبیوں کی اپنی شادی نہیں ہوئی ہوتی، انھیں رشتے ناتے کرانے کا خبط ہوتا ہے۔ خود مجھ میں یہ کمزوری ہے یا نہیں، اس کا مجھے کبھی شعور نہیں ہوا۔ تاہم میں ایک ننھی منی گڑیا سی دوشیزہ کو جانتی ہوں۔ وہ ہماری عزیزہ ہے اور اپنے باپ سے بے حد آزردہ۔ اس کا نام پرنس بلکونسکایا (Bolkonskaya) ہے۔"

پرنس واسیلی نے کوئی جواب نہ دیا لیکن جس پھرتی اور عجلت کے ساتھ وہ اپنے حافظے پر زور دے کر بھولی بسری باتیں یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا، وہ صرف گھاگ دنیادار شخص ہی کا خاصہ ہوتا ہے۔ پھر اس نے جس انداز سے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی، وہ اس امر کی علامت تھی کہ اسے جو معلومات فراہم کی گئی ہیں، وہ ان کی نوعیت اور اہمیت سمجھ گیا ہے اور ان پر سوچ بچار کر رہا ہے۔

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ اس صاحب زادے پر میرا سالانہ چالیس ہزار روبل خرچ ہو رہا ہے؟" بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ اسے اپنے خیالات کی افسردہ رو پر قابو پانے میں سخت دشواری کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر گویا ہوا: "اگر اس کے یہی لچھن رہے، پھر پانچ سال میں یہ رقم کہاں سے کہاں تک پہنچ جائے گی؟... یہ ہیں باپ بننے کے فوائد! خیر، یہ پرنس امیر کبیر ہے؟"

"اس کا باپ بے پناہ دولت کا مالک ہے اور کنجوس بھی پرلے درجے کا ہے۔ وہ شہر سے دور دیہات میں رہتا ہے۔ تمھیں معلوم ہوگا کہ یہ وہی مشہور و معروف پرنس بلکونسکی (Bolkonsky) ہے جسے اس زمانے میں فوج سے ریٹائر کر دیا گیا تھا جب مرحوم امپراطور ابھی بقید حیات تھے۔ یاروں نے اسے 'شاہ پرشیا' کا لقب دے رکھا تھا۔ وہ بے حد ہوشیار اور سیانا آدمی ہے اور اس کے ساتھ ہی ذرا سنکی بھی ہے۔ آسانی سے قابو میں نہیں آئے گا۔ بیچاری لڑکی کتنی دکھی ہے، اس کا تم اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ اس لڑکی کا ایک بھائی بھی ہے۔ وہ کوتوزوف کا ایڈی کانگ ہے اور اس نے حال ہی میں لسا مینین (Lisa Meinen) سے شادی کی ہے۔ وہ آج شام یہاں آئے گا۔"

"ڈیئر آنیت (Annette)، سنو،" پرنس نے کہا۔ اس نے اچانک اپنی دمساز کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور پتا نہیں کیوں، اسے نیچے جھکا دیا۔ "میری خاطر یہ معاملہ طے کرا دو۔ پھر سمجھ لو کہ میں عمر بھر کے لیے تمھارا غلامِ بے دام بن گیا۔ بلکہ 'گلام' جیسا کہ میرا دیہاتی کارندہ میرے نام اپنی رپورٹوں میں اپنے متعلق لکھتا ہے ــ وہ سلجھے ہوئے اور متمول خاندان کی دوشیزہ ہے۔ میں بھی یہی کچھ چاہتا ہوں۔"

پھر اس نے نہایت بے تکلفی اور پر اعتماد رعنائی کے ساتھ، جو صرف اسی کا خاصہ تھی اور یوں اسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی، امپراطورہ کی مصاحبہ کا ہاتھ اپنے ہونٹوں تک بلند کیا اور اس پر اپنے بوسے کے نشانات ثبت کرنے کے بعد اسے ہلکے ہلکے آگے پیچھے جھلانے لگا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ کرسی میں دھنس گیا اور ٹکٹکی باندھ کر اوپر خلا میں دیکھنے لگا۔

"صبر اور انتظار کرو،" آنا پاولوونا نے سوچتے ہوئے کہا۔ "میں آج شام ہی نوجوان بلکونسکی کی اہلیہ لسا سے بات کروں گی۔ شاید یہ بیل کسی طور سرے چڑھ جائے۔ شاید تمھارا خاندان پہلا خاندان ہوگا جس میں میں کنواری

بڑھیا کے طور طریقے سیکھنے کی ابتدا کروں گی۔"

2

آنناپاولوونا کے ڈرائنگ روم کی رونق میں بتدریج اضافہ ہونے لگا۔ پیٹرز برگ[15] کے بالائی طبقے کے سرکردہ اصحاب وہاں موجود تھے۔ عمر اور کردار کے اعتبار سے ان میں بھانت بھانت کے لوگ شامل تھے۔ ان میں صرف ایک قدر مشترک تھی کہ ان سب کا تعلق معاشرے کے ایک ہی طبقے سے تھا۔ پرنس واسیلی کی دختر نیک اختر، چندے آفتاب چندے ماہتاب، ہیلین (Helene)، اپنے والد کو سفیر کی ضیافت میں پہنچانے کے لیے آئی تھی۔ اس نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بال (ball) میں شریک ہونے کی تیاری کر کے آئی تھی۔ اس نے اپنے ملبوسات پر امپراطورہ کی مصاحبہ کا امتیازی نشان بھی ٹانک رکھا تھا۔ کوچک پرنس بلکونسکایا بھی، جس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ پیٹرز برگ کی عظیم ترین سحر آفریں خاتون ہے، رونق افروز تھی۔ اس کا گزشتہ سرما کے دوران میں بیاہ ہوا تھا۔ چونکہ اس کا پاؤں بھاری تھا، اس لیے وہ بڑے پیمانے کی تقریبات میں شرکت کرنے سے احتراز برتنے لگی تھی لیکن چھوٹی موٹی محفلوں میں اب بھی پہنچ جاتی تھی۔ پرنس واسیلی کا بیٹا اپولیت موخت ماغ کی، جس کا تعارف بھی اس نے خود ہی کرایا، معیت میں آیا۔ صدر راہب موریو اور متعدد دیگر افراد بھی حاضر تھے۔

"تم ابھی تک ma tante* سے نہیں ملے؟" یا "کیا تم ma tante سے واقف نہیں؟" آنناپاولوونا ہر نئے آنے والے مہمان سے یہی سوال پوچھتی اور نہایت سنجیدہ اور پروقار انداز سے اسے ایک کوتاہ قامت بزرگ خاتون کے پاس لے جاتی۔ اس خاتون نے اپنے سر پر جو ٹوپی اوڑھی ہوئی تھی، اس پر ربن کی اونچی اونچی کلغیاں لگی ہوئی تھیں اور جونہی مہمان پہنچنا شروع ہوئے، وہ دوسرے کمرے سے نکل کر یہاں آ گئی تھی۔ آنناپاولوونا اس کے قریب پہنچنے پر اپنی نگاہیں مہمان کے جسم سے ma tante کے چہرے پر منتقل کرتی، اسے مہمان کا نام بتاتی اور واپس چلی جاتی۔

ہر مہمان اس غیر معروف، غیر دلچسپ اور غیر ضروری ma tante سے علیک سلیک کی رسم پوری کرتا جبکہ آنناپاولوونا سنجیدہ اور پرملال توجہ سے علیک سلیک کی یہ کارروائی دیکھتی اور بزبان خاموشی اس پر صاد کرتی۔ ma tante ہر شخص سے اس کی، اپنی اور امپراطورہ کی صحت کے بارے میں ایک جیسے الفاظ کہتی۔ البتہ امپراطورہ کے بارے میں وہ اتنا اضافہ کرتی: "خداوند کا شکر ہے کہ آج ان کی طبیعت بہتر ہے۔" ہر مہمان کی یہ کوشش ہوتی کہ وہ اس بڑھیا سے جلد از جلد پنڈ چھڑائے لیکن شائستگی کے تقاضے کے پیش نظر وہ اپنی بے قراری کو علانیہ ظاہر نہ ہونے دیتا تاہم جونہی علیک سلیک کا صبر آزما فریضہ پورا ہوتا، وہ اطمینان کی سانس لیتا، پرے ہٹتا اور پوری شام ایک بار بھی اس کے قریب نہ پھٹکتا۔

---

* مائی آنٹ

نوعمر پرنس بلکونسکایا اپنا کشیدہ کاری کا سامان، جو اس نے مخملیں تھیلے میں، جس پر سنہری تاروں سے کڑھائی کی گئی تھی، رکھا ہوا تھا، اپنے ساتھ لائی تھی۔ اس کا پتلا نفیس بالائی ہونٹ، جس پر باریک سبزے نے ہلکا ہلکا سا سایہ بنا رکھا تھا، اتنا چھوٹا تھا کہ اس کے دانت چھپائے نہ چھپتے۔ یہ ہونٹ جب اوپر اٹھتا، بہت خوبصورت معلوم ہوتا لیکن جب یہ زیریں ہونٹ سے ملنے نیچے گرتا، تو اس کی خوبصورتی اور دل کشی میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ جیسا کہ انتہائی دل کش خواتین کے ساتھ ہمیشہ ہوتا ہے، اس کی یہی خامی ــ بالائی ہونٹ کا چھوٹا پن اور نیم وا دہن ــ ایک خاص قسم کی خوبصورتی بن گئی تھی جو محض اسی سے مخصوص تھی۔ اس نازک اندام، چھوئی موئی حسین گڑیا کو، جس کا انگ انگ تندرستی اور توانائی سے بھرپور تھا، جو عنقریب ماں بننے والی تھی اور جو اپنے بوجھ کو یوں اٹھائے پھر رہی تھی، جیسے یہ کوئی نہایت ہلکی پھلکی چیز ہو، جو شخص بھی دیکھتا، اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ بوڑھوں اور افسردہ دل اور لاابالی نوجوانوں کو، جب اس کی صحبت میں چند لمحات گزارنے اور اس سے چند باتیں کرنے کا موقع میسر آتا، یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے رگ و پے میں نیا جوش اور ولولہ سرایت کر گیا ہو۔ اس کے ساتھ گفتگو کے دوران میں جب آدمی کو ہر ہر لفظ پر اس کی درخشاں مسکراہٹ اور اس کے صاف شفاف سپید دانتوں کی چمک دمک نظر آتی، تو اسے کچھ اس قسم کا احساس ہوتا جیسے اس کی جُون بدل گئی ہو اور آج شام وہ خاص طور پر خوشی سے نہال ہو گیا ہو۔ بلا تخصیص یہ بات ہر شخص کے بارے میں درست تھی۔

کوچک پرنس کا تھیلا اس کے بازو میں لٹک رہا تھا۔ اس نے جھومتے جھامتے، ننھے ننھے قدم اٹھاتے، میز کے گرد چکر کاٹا اور نقرئی سماوار کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ یوں پرمسرت انداز سے اپنے لباس کی شکنیں درست کر رہی تھی جیسے کام خواہ کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن جب وہ اس میں ہاتھ ڈالتی ہے، وہ نہ صرف خود بلکہ اس کے گرد و پیش دیگر تمام لوگ بھی اس سے یکساں مسرور ہوتے ہیں۔

''میں اپنا کھکھیڑ ساتھ لے آئی ہوں،'' اس نے اپنا بیگ کھولتے اور حاضرین محفل پر عمومی نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو، آنیت،'' اس نے اپنی میزبان کی جانب مڑتے ہوئے کہا: ''میرا خیال ہے کہ تم نے میرے ساتھ کوئی چکر وکر نہیں چلایا ہوگا۔ تم نے لکھا تھا کہ یہ بالکل مختصر سی محفل ہوگی۔ دیکھ لو، میں کوئی خاص بن سنور کر نہیں آئی۔'' اور اس نے اپنے بازو آگے بڑھا دیے تاکہ وہ اپنے انتہائی نفیس اور دیدہ زیب ڈریس[16] کی، جسے لیس کی خوبصورت جھالر سے آراستہ کیا گیا تھا اور جس پر ربن کی خاصی چوڑی پیٹی بندھی تھی، نمود کر سکے۔

''لسا، گھبراؤ نہیں، تم دوسروں کی نسبت سدا زیادہ حسین نظر آؤ گی،'' آنتا پاولوونا نے جواب دیا۔

''آپ کو شاید معلوم ہے کہ میرے شوہر مجھ سے پیچھا چھڑا رہے ہیں،'' لسا نے اسی لہجے اور حسب معمول فرانسیسی میں ایک جرنیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''وہ موت سے ہم کنار ہونا چاہتے ہیں۔ آپ بتائیں،'' اب کے اس نے پرنس واسیلی سے بات کرتے ہوئے کہا، ''کہ یہ غلیظ اور واہیات جنگ کیوں برپا کی جا رہی ہے؟'' اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اس کی حسین و جمیل بیٹی ہیلین کی جانب متوجہ ہو گئی۔

''یہ ننھی منی پرنس کتنی خوبصورت اور دلکش ہے، جی چاہتا ہے کہ آدمی اس کی پرستش کرتا رہے،'' پرنس واسیلی نے زیرلب آنا پاولوونا سے کہا۔

اس کے بعد جو لوگ آئے، ان میں ایک تندرست و توانا اور بھرے بھرے جسم کا مالک نوجوان تھا۔ اس کے سر کے بال خاصے باریک کٹے ہوئے تھے۔ آنکھوں پر چشمہ، جسم پر ہلکے رنگ کی برجس، جس کا اس دور میں عام چلن تھا، بھوراڈریس کوٹ اور قمیص کے بٹنوں کے اوپر سفید جھالر تھی۔ یہ تومند نوجوان کاؤنٹ بزوخوف کا، جو امپراطورہ کیتھرین کا نامی گرامی مصاحب تھا اور اب ماسکو میں بستر مرگ پر دراز تھا، غیر صحیح النسب بیٹا تھا۔ اس نوجوان کا نام پیئر (Pierre) تھا۔ چونکہ وہ حال ہی میں دساور سے، جہاں وہ بغرض تعلیم مقیم تھا، لوٹا تھا، اس لیے وہ ابھی تک کسی سرکاری منصب پر فائز نہیں ہوا تھا۔ اونچے طبقے کی محافل میں بھی یہ اس کا اولین ورود تھا۔

آنا پاولوونا نے محض سر کی جنبش سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس کا یہ انداز صرف ان اشخاص کے لیے مخصوص تھا جو اس کے ڈرائنگ روم میں آنے والوں میں حفظِ مراتب کے اعتبار سے نچلی ترین سطح پر ہوتے۔ اس برائے نام علیک سلیک کے باوجود، جب اس نے پیئر کو اندر آتے دیکھا، اس کے چہرے پر بے چینی اور وسوسوں کے سائے لہرانے لگے جیسے وہ کوئی مہیب درندہ ہو اور اس کے ڈرائنگ روم کے ماحول کے لیے قطعی اجنبی۔ یہ درست ہے کہ ڈیل ڈول کے اعتبار سے وہ محفل میں موجود کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت قدرے جسیم تھا لیکن اسے دیکھ کر آنا پاولوونا کے اوسان جس طرح خطا ہوئے، اس کی صرف یہی توجیہہ ہو سکتی تھی کہ شرمیلی اور انتہائی فطری وضع قطع کے باوجود وہ ذہین اور باریک بین شخص تھا اور یہی چیز اسے ڈرائنگ روم میں موجود ہر دوسرے شخص سے ممیز کرتی تھی۔

''موسیو پیئر، یہ آپ کی بڑی نوازش ہوگی کہ آپ ایک عاجز اور لاچار مریضہ سے ملنے تشریف لے چلیں،'' آنا پاولوونا نے اپنی آنٹی کے ساتھ، جب وہ اسے اس کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے لے جا رہی تھی، بے چین نگاہوں کا تبادلہ کرتے ہوئے کہا۔

جواب میں پیئر بڑبڑایا لیکن اس نے کیا کہا، یہ کسی کے پلے نہ پڑا اور وہ کمرے میں چاروں اطراف متجسس نگاہیں دوڑاتا رہا۔ جب وہ معمر آنٹی کی جانب جا رہا تھا، ننھی منی پرنس کو یوں وفورِ مسرت سے جھک کر آداب بجالایا جیسے وہ اس کی بے تکلف دوست ہو۔ آنا پاولوونا کے اندیشے بالکل صحیح ثابت ہوئے۔ پیئر سے اتنا بھی نہ ہوا کہ وہ امپراطورہ کی صحت کے بارے میں ادھیڑ عمر خاتون کی تقریر ختم ہونے کا انتظار ہی کر لیتا۔ یہ تقریر ابھی جاری تھی کہ پیئر دوسری طرف چل دیا۔ آنا پاولوونا اس کی اس حرکت پر ششدر رہ گئی۔ اس نے اس کا بازو پکڑا اور اس سے پوچھنے لگی:

''تم صدر راہب موریو سے واقف ہو؟ انتہائی دلچسپ شخص ہیں...''

''ہاں، مستقل امن کے بارے میں ان کا منصوبہ میرے علم میں آیا ہے۔ بظاہر بہت دلکش منصوبہ ہے لیکن قابلِ عمل نہیں۔''

''نہیں، تم ایسا نہیں کہہ سکتے،'' آنا پاولوونا نے جواب دیا۔ اس نے یہ الفاظ محض اس لیے کہے کیونکہ کچھ کہنا اس کا فرض بنتا تھا اور وہ میزبان کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں دوبارہ سنبھالنا چاہتی تھی۔ لیکن پیئر سے ایک مزید بدتمیزی سرزد ہوگئی۔ پہلے تو اس نے یہ کیا کہ ایک خاتون کو اپنی بات مکمل کرنے کا موقع نہ دیا بلکہ اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ چلتا بنا اور اب یہ حرکت کی کہ دوسری خاتون کو، جو اس سے پنڈ چھڑانے کی فکر میں تھی، روک لیا۔ اس نے گردن جھکائی، اپنے دونوں پاؤں ایک دوسرے سے خاصے دور دور فرش پر جمائے اور آنا پاولوونا کو سمجھانے لگا کہ اس کے خیال میں صدر راہب کا منصوبہ کیوں خیالی اور ناقابل عمل ہے۔

''ہم اس کے متعلق بعد میں گفتگو کریں گے،'' آنا پاولوونا نے چہرے پر مسکراہٹ بکھیر کر کہا۔

اور اس نوجوان سے، جو نہ آداب محفل سے آشنا تھا اور نہ جسے بات کرنے کا سلیقہ آتا تھا، جان چھڑا کر آنا پاولوونا نے میزبان کی ذمے داریاں دوبارہ سنبھال لیں۔ وہ اپنے مہمانوں کی باتیں کان لگا کر سن رہی تھی اور ہر چیز کا بغور جائزہ لے رہی تھی تاکہ گفتگو کے دوران میں جونہی کوئی رخنہ آئے، وہ جھپک کر مدد فراہم کر سکے۔ دھاگہ کاتنے کی مل کے سپروائزر کی طرح، جو اپنے ماتحت مزدوروں کو کام پر لگانے کے بعد مشینوں کے مابین گھومنے پھرنے لگتا ہے تاکہ اگر کہیں کسی تکلے میں کوئی خرابی نظر آئے جو چلتے چلتے بند ہو گیا ہو، معمول سے زیادہ شور کرنے لگا ہو یا دستور کے برعکس چیں چیں کی آوازیں پیدا کرنے لگا ہو، تو جھٹ پٹ لپک کر جاتا ہے، مشین کی رفتار ڈھیلی کرتا ہے، اس کا نقص دور کرتا اور اسے دوبارہ درست طریقے سے چلا دیتا ہے، آنا پاولوونا بھی بعینہ اسی طرح اپنے ڈرائنگ روم میں گھوم پھر رہی تھی۔ کبھی وہ اس گروپ کے پاس پہنچتی جو باتیں کرتے کرتے خاموش ہو جاتا یا اس گروپ کے پاس جو شائستگی کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر اونچے اونچے لہجوں سے بولتا چھت سر پر اٹھا رہا ہوتا۔ وہ ایک آدھ لفظ کہتی اور یوں گفتگو کی مشین کو دوبارہ صحیح ڈگر پر ڈال دیتی۔ ان تفکرات کے مابین بھی پیئر کے متعلق اس کی پریشانی خاص طور پر ہویدا تھی۔ جب کبھی وہ یہ سننے کے لیے کہ موخت ماغ کے حلقے میں کیا موضوع زیر بحث ہے اور یا صدر راہب موریو کے اردگرد جن لوگوں نے گھیرا ڈال رکھا ہے، وہ ان سے کیا کہہ رہا ہے، پہنچتا، وہ اندیشہ ناک نظروں سے اسے بغور دیکھنے لگتی۔

پیئر نے ممالک غیر میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آنا پاولوونا کی محفل روس میں اس کی اولین محفل تھی۔ وہ جانتا تھا کہ پیٹرزبرگ کے تمام دانشور یہاں جمع ہیں۔ یہاں جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ چاہتا تھا کہ اس کا ایک ایک لفظ اس کے کانوں تک پہنچ جائے۔ اس بچے کی طرح، جسے کھلونوں کی دکان میں کھلا چھوڑ دیا گیا ہو کہ وہ جو کھلونا چاہے، چن لے اور جس کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ کیا منتخب کرے اور کیا نہ کرے، اسے بھی یہ خوف دامن گیر تھا کہ وہ کوئی اہم بات سننے سے نہ رہ جائے۔ چنانچہ کبھی وہ ایک گروپ کی طرف لپکتا اور کبھی دوسرے کی طرف۔ جب اسے وہاں موجود حضرات کے چہروں پر خود اعتماد اور نستعلیق تاثرات نظر آتے، اسے ہر دم توقع ہوتی کہ اب کوئی انتہائی سیانی بات سننے کو ملے گی۔ آخر کار وہ موریو کے حلقے میں پہنچ گیا۔ یہاں جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ اسے دلچسپ معلوم ہوئی۔ وہ یہیں جم گیا

اور جیسا کہ نوجوانوں کا وتیرہ ہوتا ہے، وہ انتظار کرنے لگا کہ موقع ملے تو وہ بھی اپنے خیالات کا اظہار کرے۔

3

آنناپاولوونا کی محفل پورے جوبن پر تھی۔ چاروں اطراف تکلے مستقلاً اور متواتر بھنبھنارہے تھے۔ ma ante اور اس کی واحد ہم نشین خاتون کے علاوہ، جس کا چہرہ متفکر اور غم آلود تھا، اور جو اس ذہین وفطین محفل میں اپنے آپ کو اجنبی محسوس کررہی تھی، حاضرین تین گروہوں میں منقسم ہوچکے تھے۔ ایک ٹولی صدر راہب موریو کے گرد جمع ہوگئی تھی۔ یہ زیادہ تر مرد حضرات پر مشتمل تھی۔ نوجوانوں کا گروپ پرنس واسیلی کی پری جمال دختر ہیلین اور کوچک پرنس کے، جس کا چہرہ گلاب کی طرح تروتازہ اور جس کا حسن چاند کو شرماتا تھا لیکن جس کا جسم عمر کے اعتبار سے نسبتاً پھولا ہوا تھا، آس پاس بیٹھا تھا۔ تیسرے حلقے نے موخت ماغ اور آنناپاولوونا کو اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔

وائی کاؤنٹ موخت ماغ نوجوان اور اس کی شخصیت سحر انگیز تھی۔ اس کے چہرے مہرے پر شائستگی اور خوش خلقی نمایاں تھی اور اس کے اطوار پسندیدہ تھے۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو نامور ہستی تصور کرتا ہے لیکن تہذیب وشرافت کے تقاضوں کے پیش نظر اس نے اپنے آپ کو ان لوگوں کے رحم وکرم پر، جن کی صحبت میں اسے بیٹھنا پڑرہا تھا، چھوڑ دیا ہے۔ ادھر آنناپاولوونا اسے اپنے مہمانوں کے سامنے صریحاً ایسی لذیذ شے کے طور پر پیش کررہی تھی جسے دیکھ کر منہ میں پانی بھر آئے۔ جس طرح کسی ہوٹل کا چالاک ہیڈ ویٹر گوشت کے پارچے کو، جسے کوئی بھی شخص، جو اسے غلیظ باورچی خانے میں دیکھ چکا ہو، کھانے پر مائل نہ ہو، خاص طور پر منتخب پکوان بنا کر پیش کرے اور کہے کہ "واہ واہ، اس سے عمدہ کھانے کی چیز آج تک نہیں پکی"، بعینہ اس شام آنناپاولوونا بھی پہلے وائی کاؤنٹ کو اور پھر صدر راہب موریو کو اپنے مہمانوں کے سامنے انتہائی لذیذ اور چٹخارے دار کھانوں کے طور پر پیش کررہی تھی۔ وہ لوگ جو موخت ماغ کے گرد حلقہ بنائے بیٹھے تھے، فوراً ہی ڈیوک آف آں غیاں[17] کی سزائے موت کے متعلق بحث کرنے لگے۔ وائی کاؤنٹ نے خیال ظاہر کیا کہ ڈیوک کو اس کی اپنی عالی ظرفی لے ڈوبی اور بوناپارٹ کو اس کے ساتھ جو عناد تھا، اس کے پیچھے خاص اور ذاتی وجوہ تھیں۔

"اخاہ، وائی کاؤنٹ، آپ ہمیں ان کے بارے میں ضرور آگاہ کریں،" وہ خوشی سے یوں سرشار ہورہی تھی جیسے اس کے منہ سے نہایت زبردست فقرہ نکل گیا ہو۔ "وائی کاؤنٹ، آپ ہمیں ان کے بارے میں ضرور آگاہ کریں۔"

وائی کاؤنٹ خوش اخلاقی سے مسکرایا اور یہ جتانے کے لیے کہ وہ تعمیل ارشاد کے لیے تیار ہے، اس نے اپنی گردن کو خم دیا۔ آنناپاولوونا نے اس کے گرد جمگھٹا لگادیا اور ہر شخص سے کہتی پھری کہ وہ آئے اور اس کی کہانی سنے۔

"وائی کاؤنٹ ڈیوک کو ذاتی طور پر جانتے تھے،" آنناپاولوونا نے فرانسیسی میں اپنے مہمان کے کان میں کہا۔ "وائی کاؤنٹ کو کہانی سنانے کے فن میں ید طولیٰ حاصل ہے،" اس نے دوسرے مہمان سے سرگوشی کی۔ "بڑے مہذب اور سلجھے ہوئے انسان ہیں،" تیسرے سے کہا۔ یوں وائی کاؤنٹ کو حاضرین کے سامنے نہایت نفیس، شستہ

اور سودمندانہ انداز سے پیش کیا گیا، بالکل اسی طرح جس طرح مصالحوں میں خوب بھنے ہوئے گوشت کے پارچے طشتری میں سجا بنا کر مہمانوں کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔

وائی کاؤنٹ کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ تیرنے لگی۔ مطلب یہ کہ وہ اپنی کتھا سنانے کے لیے تیار ہے۔

"chere* ہیلین، تم بھی ادھر آجاؤ۔" آنا پاؤلوونا نے پری تمثال پرنس سے کہا جو کچھ ذرا پرے دوسرے گروپ کے مرکز میں بیٹھی تھی۔

پرنس ہیلین مسکرائی۔ اس کی یہ مسکراہٹ کامل حسین عورت کی مسکراہٹ تھی۔ وہ اسے ہر دم اپنے چہرے پر سجائے رکھتی تھی اور اس میں کبھی کسی تبدیلی کی روادار نہیں ہوتی تھی۔ یہ اس وقت بھی اس کے چہرے پر موجود تھی جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی تھی اور اب بھی وہاں رقص کناں تھی۔ وہ اٹھی اور آنا پاؤلوونا کی جانب چل پڑی۔ اس کا جسم رقص کے سفید گاؤن میں، جو گہرے سبز رنگ کی جھالروں سے مزین تھا، ملبوس تھا۔ اس کے ہیرے جواہرات جگمگا رہے تھے، اس کی بالوں کی آب و تاب دیدنی تھی اور اس کے صاف شفاف سپید شانوں کی چمک دمک نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی۔ چلنے میں اس کے گاؤن سے ہلکی ہلکی سی سرسراہٹ کی گونج پیدا ہو رہی تھی۔ مردوں کے بیچوں بیچ گزرتے، جو اپنے آپ اسے راستہ دیتے جا رہے تھے، کسی خاص شخص کو اپنی نگاہوں کا مرکز بنائے بغیر وہ سبھی پر اپنی مسکراہٹیں نچھاور کرتی جا رہی تھی گویا کہ از رہ تلطف و عنایت وہ ہر مرد کو یہ استحقاق عطا کر رہی تھی کہ وہ اس کی حسین و جمیل صورت، اس کے خوش وضع اور سڈول شانوں، پشت اور سینے کی — جو اس زمانے کے رواج کے مطابق اس کے گاؤن میں خاصے آشکار ہو رہے تھے — تحسین کر سکیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بال روم کا سارا گلیمر اپنی ذات میں سمیٹ کر لے آئی ہے۔ ہیلین اتنی حسین و دل آویز تھی کہ نہ صرف اس میں عشوہ گری کی نام کو بھی جھلک نہیں تھی بلکہ اس کے برعکس کچھ یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے حسن و جمال پر، جس پر کسی انگشت نمائی کی گنجائش نہیں تھی اور جو لاریب تسخیرِ جہاں کی خوبی سے بہرہ ور تھا، قریب قریب نادم و مجوب ہے۔ اس کا یہ حسنِ جہاں سوز اپنے عقب میں جو قیامت ڈھا رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی شدت کو کم کرنا چاہتی ہے لیکن اس معاملے میں اپنے آپ کو قطعاً بے بس پا رہی ہے۔

"واہ واہ، کیا حسنِ بلاخیز ہے!" جو بھی اسے دیکھتا، دیکھتا ہی رہ جاتا اور حیرت کے عالم میں پکار اٹھتا اور جب وہ وائی کاؤنٹ کے سامنے نشست پر بیٹھ گئی اور اپنے غیر متغیر تبسم کی کرنیں اس پر بکھیرنے لگی، اس کے کندھے اچک گئے اور نگاہیں نیچے جھک گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لیے یہ نظارہ غیر معمولی ہے اور اسے دیکھنے کی اس میں تاب نہیں ہے۔

"مادام، اس قسم کے حاضرین کے سامنے مجھے اپنی لیاقت اور مہارت پر اعتبار نہیں رہا۔" اس نے مسکراتے اور

* ڈیر

اپنی گردن کو خم دیتے ہوئے کہا۔

پرنس نے اپنا گداز برہنہ بازو تپائی پر ٹکا دیا اور جواب دینے کی زحمت سے بے نیاز محض تبسم بکھیرنے اور انتظار کرنے پر اکتفا کیا۔ جب تک کہانی چلتی رہی، وہ تن کر سیدھی بیٹھی رہی۔ ہاں، کبھی کبھار وہ اپنے خوش وضع اور مدور بازو پر، جو نہایت قرینے اور نفاست سے تپائی پر ٹکا ہوا تھا اور کبھی اس سے بھی بڑھ کر اپنے روپ ونت سینے پر، جسے ہیروں سے مرصع نیکلس نے ڈھانپ رکھا تھا اور جسے وہ بار بار درست کر رہی تھی، نگاہ غلط انداز ڈال لیتی۔ وقتاً فوقتاً اس کا دھیان اپنے گاؤن کی طرف پلٹ جاتا اور وہ اس کی شکنیں درست کرنے لگتی۔ جب کبھی کہانی میں کوئی ولولہ انگیز موڑ آتا اور وہ سامعین کے دلوں پر گہرے نقوش ثبت کرنے لگتی، وہ پلٹ کر آننا پاولوونا پر اچٹتی نظر ڈالتی اور جس نوع کا تاثر اسے امیر اطورہ کی مصاحبہ کے چہرے پر دکھائی دیتا، ویسا ہی اپنے چہرے پر نمایاں کر لیتی۔ اس کے بعد اس کی روشن و تابندہ مسکراہٹ دوبارہ لوٹ آتی۔

کوچک پرنس بھی ہیلین کے تعاقب میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ٹھہرو۔ میں اپنا کاٹھ کباڑ سنبھال لوں،'' اس نے کہا۔ ''ارے، تم کن سوچوں میں گم ہو؟ ادھر آؤ،'' وہ بولتے بولتے پرنس اپولیت کی جانب متوجہ ہوئی اور اس سے کہنے لگی: ''میرا بیگ اٹھا لاؤ۔''

جب کوچک پرنس ہر شخص کو دیکھ کر مسکراتی اور اس سے ایک آدھ لفظ کہتی آگے بڑھی، کمرے میں ہل چل پیدا ہو گئی۔ وہ یونہی ہنستی مسکراتی اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔

''اب میں بالکل ٹھیک ہوں،'' اس نے اعلان کیا۔ پھر اس نے اپنی کڑھائی اٹھائی اور وائی کاؤنٹ سے بولی کہ وہ اپنی کہانی شروع کر دے۔

پرنس اپولیت نے اس کا بیگ اسے تھمایا، کرسی کھسکائی اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

پرکشش اپولیت کو دیکھ کر جس چیز کا شدت سے احساس ہوتا تھا وہ یہ نہیں تھا کہ اس کے اور اس کی حسین و جمیل ہمشیرہ کے مابین غیر معمولی مشابہت پائی جاتی ہے بلکہ یہ تھا کہ مشابہت کے باوجود وہ اتنا بدصورت تھا کہ آدمی حیران رہ جاتا۔ اس کے خدوخال بعینہٖ وہی تھے جو اس کی ہمشیرہ کے تھے۔ تاہم جہاں تک بہن کا تعلق تھا، اس کا چہرہ روشن و تابندہ، آسودہ و مطمئن اور نوخیز جوانی سے بھرپور جاوداں مسکراہٹ سے ہمہ وقت منور و تاباں رہتا اور تناسب کے اعتبار سے اس کا جسم غیر معمولی طور پر کلاسیکی حسن کا شاہکار تھا۔ ادھر بھائی کا یہ حال تھا کہ جو شخص بھی اسے دیکھتا، اسے رہ رہ کر یہی خیال آتا کہ یہ شخص سدا کا مورکھ، ہونق، تنک مزاج اور ڈھٹائی کی حد تک خود بین و خود آرا ہے۔ اس کا بدن لاغر اور کمزور تھا۔ اس کی آنکھیں، ناک اور دہن کچھ یوں سکڑے رہتے کہ اس کی شکل مضحک نظر آنے لگتی اور وہ دنیا جہاں سے بیزار شخص دکھائی پڑتا۔ رہے اس کے بازو اور ٹانگیں، وہ کبھی سیدھے نہ رہتے، ہمیشہ غیر فطری پوزیشن اختیار کیے رہتے۔

''یہ بھوت پریت کی کہانی تو نہیں؟'' اس نے کوچک پرنس کے قریب بیٹھتے اور بہ عجلت لمبی کمانی کا چشمہ

یوں درست کرتے ہوئے فرانسیسی میں پوچھا جیسے اس کے بغیر اس کے منہ سے بات نہیں نکل سکتی تھی۔

''ارے، مائی ڈیئر، بالکل نہیں،'' کہانی گو نے کندھے اچکا کر ترت جواب دیا۔ اس سوال نے اس کی سٹی گم کر دی تھی۔

''دراصل مجھے بھوتوں کی کہانیوں سے شدید نفرت ہے۔'' پرنس اپولیت نے یہ الفاظ کچھ اس انداز سے کہے کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس پر اپنے ہی الفاظ کا مفہوم اس وقت واضح ہوتا ہے جب وہ انھیں ادا کر چکا ہوتا ہے۔

اس نے ایسی کامل خود اعتمادی سے بات کی کہ کوئی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ اس نے غضب کی بذلہ سنجی دکھائی ہے یا بالکل احمقانہ جملہ کہا ہے۔ وہ گہرے سبز رنگ کا ڈریس کوٹ، برجس، جس کا رنگ بقول اس کے ڈری سہمی پری کی ران کے رنگ سے مشابہ تھا، لمبی ریشمی جرابیں اور نیچی ایڑیوں کے جوتے پہنے ہوئے تھا۔

وائی کاؤنٹ نے خوش بیانی اور چابک دستی سے ڈیوک آف آن غیاں کا قصہ سنایا۔ اس زمانے میں یہ عام سنا سنایا جاتا تھا۔ اس کے مطابق ہوا یہ کہ ڈیوک ایک روز چھپتا چھپاتا پیرس چلا گیا۔ پیرس میں اس نے مادام یوغینی[18] سے ملاقات کرنا تھی۔ اچانک وہاں اس کی مڈھ بھیڑ نپولین سے ہو گئی جو خود بھی اس مشہور و معروف اداکارہ کے غمزوں اور اداؤں سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ نپولین نے جب ڈیوک کو وہاں دیکھا، اس پر غشی طاری ہو گئی (اس پر غشی کے یہ دورے اکثر پڑا کرتے تھے)۔ یوں وہ ڈیوک کے قبضۂ قدرت میں آ گیا۔ ڈیوک نے اس موقع سے کسی قسم کا فائدہ اٹھانے سے احتراز کیا تاہم بوناپارٹ نے ڈیوک کی اس عالی ظرفی کا حساب یوں چکایا کہ اسے بعدازاں گولیوں سے بھنوا دیا۔

یہ کہانی دلچسپ اور پرلطف تھی، خاص طور پر اس کا وہ حصہ جہاں دونوں رقیب اچانک ایک دوسرے کو پہچان لیتے ہیں، خاصا چٹخارے دار تھا۔ خواتین کے قلوب پر اس کا بالخصوص گہرا اثر ہوا۔

''بہت خوب! بے حد مزے دار!'' آنا پاولوونا نے داد دی اور تمسخرانہ انداز سے کوچک پرنس کو دیکھنے لگی۔

''بہت خوب! بہت پرلطف!'' کوچک پرنس نے زیرِ لب کہا۔ پھر اس نے سوئی کڑھائی میں یوں ٹانک دی جیسے کہانی کی دلچسپی اور لذت نے اس کے لیے اپنا کام جاری رکھنا ناممکن بنا دیا ہو۔

محفل پر عمومی خاموشی چھائی رہی۔ وائی کاؤنٹ نے اسے داد و تحسین محمول کیا۔ وہ اپنی جگہ مطمئن و مسرور تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنا سلسلۂ کلام پھر سے جوڑنا چاہتا تھا کہ آنا پاولوونا نے دیکھا کہ وہ نوجوان جس کی آمد پر وہ اتنا سٹپٹائی تھی اور جسے اس نے ایک لحظے کے لیے بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیا تھا، بڑے جوش و جذبے اور زور شور سے صدر راہب سے باتیں کر رہا ہے۔ وہ جھٹ پٹ خطرے کے مقام کی طرف لپکی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ پیئر نے صدر راہب کو توازنِ قوت کے متعلق گفتگو میں الجھا لیا تھا۔ صدر راہب اس نوجوان کے خلوص اور جوش و جذبے سے بہت متاثر ہو چکا تھا اور اس موضوع میں اس کی دلچسپی پوری طرح بیدار ہو گئی تھی۔ چنانچہ اب وہ اپنے پسندیدہ نظریے کی بالتفصیل وضاحت کر رہا تھا۔ دونوں آدمی جس ذوق و شوق اور فطری انداز سے ایک دوسرے سے باتیں کر اور سن رہے تھے، وہ آنا پاولوونا کو بالکل نہیں بھا سکتا تھا۔

''ذرائع — یورپی قوت کا توازن اور حقوقِ اقوام،'' صدر راہب کہہ رہا تھا۔ ''ضرورت اس بات کی ہے کہ روس جیسی صرف ایک طاقت — وہ بربریت کے لیے بھلے بدنام ہو — بے غرضی سے ایک ایسے اتحاد کی سربراہ بن جائے جس کا مقصد وحید یورپ میں قوت کے توازن کو برقرار رکھنا ہو، پھر بیڑا پار ہو جائے گا اور دنیا تباہی کے غار میں گرنے سے بچ جائے گی۔''

''لیکن آپ اس قسم کا توازن قائم کیسے کریں گے؟'' پیئر نے اپنی بات کا آغاز کیا۔

عین اس لمحے آنا پادلوونا وہاں پہنچ گئی۔ اس نے پیئر کو درشت نظروں سے گھورا اور صدر راہب سے پوچھنے لگی کہ وہ روسی آب و ہوا سے کس طرح نپٹ رہا ہے۔ اطالوی کے چہرے کا رنگ آناً فاناً تبدیل ہو گیا۔ وہاں مکروہ قسم کی منافقت اور حلاوت جھلکنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جب بھی خواتین سے مخاطب ہوتا ہے، وہ عادتاً اپنے چہرے پر اسی قسم کا خول چڑھا لیتا ہے۔

''یہ میری خوش نصیبی ہے کہ شرفا نے مجھے اپنی محفلوں میں شرف باریابی بخشا ہے۔ ان کی — خاص طور پر خواتین کی — خیرہ کن بذلہ سنجی اور تہذیبی رکھ رکھاؤ نے مجھ پر اتنا طلسم طاری کر دیا ہے کہ مجھے اتنا موقع ہی نہیں مل سکا کہ میں یہاں کی آب و ہوا کے بارے میں کچھ سوچ سکوں،'' اس نے جواب دیا۔

آنا پاولوونا قطعاً یہ نہیں چاہتی تھی کہ صدر راہب اور پیئر اس کی نظروں سے اوجھل ہو جائیں۔ چنانچہ اس بات کو یقینی بنانے کے لیے کہ وہ ہر دم اس کی نگاہوں میں رہیں، وہ انھیں بڑے حلقے میں گھسیٹ لائی۔

عین اسی وقت ایک نیا چہرہ ڈرائنگ روم میں نمودار ہوا۔ نو وارد کوچک پرنس کا شوہر پرنس آندرے بلکونسکی تھا۔ وہ درمیانی قامت کا انتہائی خوش شکل نوجوان تھا۔ اس کے خدوخال نمایاں لیکن جذبات سے عاری تھے۔ اس کی تھکی تھکی اور مضمحل صورت سے لے کر آہستہ رو، نپے تلے قدموں تک، ایک ایک چیز بانگ دہل اعلان کر رہی تھی کہ وہ اپنی چنچل، زندہ دل اور شوخ رفیقۂ حیات سے قطعی مختلف ہے۔ یہ بالکل واضح تھا کہ کمرے میں جو لوگ موجود ہیں، وہ ان سے محض واقف ہی نہیں بلکہ وہ ان سے اتنا اکتا چکا ہے کہ اس کے لیے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا اور ان کی باتیں سننا بھی دوبھر ہو رہا ہے۔ ان تمام چہروں میں سے، جن سے اسے اتنی بیزاری ہو رہی تھی، سب سے بیزار کن چہرہ اس کی اپنی من موہنی ننھی منی بیوی کا تھا۔ جونہی اس کی نظر اس پر پڑی، اس کے خوبصورت چہرے کی شکل کچھ اس طرح بگڑ گئی جیسے اس نے کڑوی کسیلی گولی چکھ لی ہو۔ اس نے جھٹ پٹ اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، آگے بڑھا، آنا پاولوونا کے ہاتھ پر بوسہ ثبت کیا اور نیم وا آنکھوں سے مجمع کا جائزہ لینے لگا۔

''پرنس، لام پر جا رہے ہو؟'' آنا پاوولونا نے اس سے فرانسیسی میں پوچھا۔

''جنرل کوتوزوف نے'' اس نے فرانسیسیوں کی طرح نام کے آخری حصے پر زور دیتے ہوئے کہا، ''بکمال شفقت مجھے اپنا ایڈی کانگ مقرر کر لیا ہے۔''

''اور لسا؟''

''وہ گاؤں چلی جائے گی۔''

''تمھیں شرم نہیں آتی کہ تم ہمیں اپنی پرکشش رفیقۂ حیات کی صحبت سے محروم کر رہے ہو؟''

''آندرے،'' اس کی بیوی نے اسی غمزہ وادا سے، جو وہ دوسروں کے ساتھ اختیار کر لیتی تھی، اپنے شوہر سے مخاطب ہو کر کہا: ''وائی کاؤنٹ ہمیں مادام یوغیئی اور بوناپارٹ کا مزے دار قصہ سنا رہے ہیں۔''

پرنس آندرے نے بھویں سکیڑیں اور وہاں سے پرے ہٹ گیا۔

جب سے پرنس آندرے کمرے میں داخل ہوا تھا، پیئر مسلسل اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھ رہا تھا جن میں مسرت بھی تھی اور پیار بھی۔ اب وہ اس کے پاس پہنچا اور اس کا بازو اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ جب پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ کوئی شخص اس کا جسم چھو رہا ہے، غصے سے اس کی بھویں تن گئیں لیکن جب اس نے مڑ کر دیکھا اور اس کی نظر پیئر کے ہنستے مسکراتے چہرے پر پڑی، اس کا اپنا چہرہ غیر متوقع طور پر دوستانہ اور مشفقانہ تبسم سے کھل اٹھا۔

''ارے، تم!... ان چنچل اور بے فکر لوگوں کی محفل میں؟ کہاں راجہ بھوج، کہاں گنگا تیلی،'' اس نے پیئر سے کہا۔

''مجھے معلوم تھا کہ تم یہاں مل جاؤ گے،'' پیئر نے کہا۔ ''رات کا کھانا میں تمھارے ساتھ کھاؤں گا۔ ٹھیک ہے؟'' اس نے دھیمی آواز میں کہا تاکہ وائی کاؤنٹ کی کہانی میں، جو وہ دوبارہ شروع کر رہا تھا، خلل نہ پڑے۔

''نہیں، بالکل نہیں!'' پرنس آندرے نے یوں ہنستے اور پیئر کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا کہ بھلا پوچھنے کی کیا بات ہے۔

ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتا تھا کہ اس لمحے پرنس واسیلی اور اس کی بیٹی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ رخصت ہونا چاہتے تھے۔ مرد حضرات بھی اپنی اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے تاکہ انھیں گزرنے میں دقت نہ ہو۔

''مائی ڈیئر وائی کاؤنٹ، معافی چاہتا ہوں،'' پرنس واسیلی نے فرانسیسی سے کہا۔ اس نے شفقت سے اس کا بازو تھام لیا تاکہ وہ اٹھنے کی زحمت سے بچ سکے۔ ''بدقسمتی سے مجھے سفیر محترم کی ضیافت میں شریک ہونا ہے ورنہ کس بھلے مانس کا جی چاہتا ہے کہ آپ کی تقریر دلپذیر کے درمیان اٹھ کر چلا جائے۔ آپ کی گفتگو میں جو خلل پڑا ہے، اس پر میں شرمندہ ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے۔'' پھر وہ آننا پاولوونا کی طرف مڑا اور بولا: ''افسوس، صد افسوس کہ مجھے تمھاری اس شاندار محفل سے یوں اٹھ کر جانا پڑ رہا ہے۔''

اس کی بیٹی پرنس ہیلین اپنا تہ در تہ گاؤن سنبھالتی ہوئی کرسیوں کے بیچوں بیچ چلنے لگی اور اس کے حسین چہرے پر اس کی درخشاں مسکراہٹ اور بھی درخشاں نظر آ رہی تھی۔ جب وہ پیئر کے قریب سے گزری، تو خوشی کے عالم میں اس پر نہ صرف وجد آور کیفیت بلکہ رعبِ حسن سے ایک قسم کی ہیبت بھی طاری ہو گئی۔

''واہ واہ، کیا حسن ہے!'' پرنس آندرے نے کہا۔

''دریں چہ شک،'' پیئر نے کہا۔

چلتے چلتے پرنس واسیلی نے پیئر کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا اور آننا پاولوونا سے مخاطب ہو کر کہنے لگا:
''اس ریچھ کے بچے کو میری خاطر تمیز و تہذیب سکھا دو۔ یہ پورے ایک ماہ سے میرے گھر میں پڑا ہے اور میں آج پہلی مرتبہ اسے شرفا کی محفل میں دیکھ رہا ہوں۔ کسی نوجوان کے لیے تیز طرار عورتوں کی صحبت سے بڑھ کر اور کوئی چیز ضروری نہیں ہوتی۔''

4

آننا پاولوونا مسکرائی اور اس نے قول دیا کہ وہ پیئر کو اپنی سپرداری میں لے لے گی۔ اسے معلوم تھا کہ پرنس واسیلی سسرال کے حوالے سے اس کے باپ کا قرابت دار تھا۔

جو بزرگ خاتون ma tante کے پاس بیٹھی تھی، لپک جھپک اٹھی اور اس نے انتظار گاہ میں پرنس واسیلی کو روک لیا۔ اس نے اپنے مشفق اور غم آلود چہرے پر مصلحتاً جس دلچسپی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا، وہ اب مطلقاً ناپید ہو گیا۔ اب وہاں اندیشوں، وسوسوں اور پریشانیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

''پرنس، آپ میرے بُورس کے بارے میں کیا خبر لائے ہیں؟'' اس نے انتظار گاہ میں پرنس واسیلی سے دریافت کیا۔ (اس نے جب بورس کا نام لیا، حرف ''واؤ'' پر خاص طور پر زور دیا۔) ''اب پیٹرز برگ میں میرے لیے مزید قیام کرنا ممکن نہیں رہا۔ آپ صرف اتنا فرما دیں کہ میں اسے کیا بتاؤں؟''

اگرچہ پرنس واسیلی نے اس کی بات بڑی بے دلی سے، جس کے ڈانڈے بدتمیزی سے جا ملتے تھے، سنی اور اس نے اپنی بے قراری چھپانے کی مطلق کوشش نہ کی، لیکن وہ بھی اپنی دھن کی پکی تھی۔ وہ دل آویز لیکن لجاجت سے بھرپور انداز سے مسکرانے لگی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا تاکہ اسے جانے سے روک سکے۔

''امپراطور سے کچھ عرض کرنا آپ کے لیے مطلق دشوار نہیں ہے۔ بس اتنی سی بات ہے کہ اس کا تبادلہ فوراً گارڈز[19] میں ہو جائے،'' اس نے ملتجیانہ لہجے سے کہا۔

''پرنس، خاطر جمع رکھو، مجھ سے جو کچھ بن پڑا، ضرور کروں گا،'' پرنس واسیلی نے جواب دیا۔ ''لیکن امپراطور سے اس قسم کی سفارش کرنا آسان کام نہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ پرنس گالت سین (Golitsyn) کی وساطت سے رومانتسیف (Rumyantsev) تک رسائی حاصل کریں۔ عقل مندی کا یہی بہترین راستہ ہے۔''

یہ بزرگ خاتون پرنسس دروبیتسکایا (Drubetskaya) تھی۔ اگرچہ اس کا تعلق روس کے ایک سربرآوردہ خاندان سے تھا لیکن چونکہ وہ مفلوک الحال تھی اور مدتوں سے گوشۂ تنہائی میں زندگی کے ایام بِتا رہی تھی، یوں اس کا اپنے سابقہ بارسوخ دوستوں سے رابطہ منقطع ہو چکا تھا۔ پیٹرز برگ میں اس کی آمد کی غرض یہ تھی کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو گارڈز کے دستوں میں تعینات کرا سکے۔ اس نے آننا پاولوونا کی دعوت میں شریک ہونے کا دعوت نامہ محض اس لیے حاصل کیا تھا کہ پرنس واسیلی سے ملاقات کر سکے۔ اور صرف اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ وائی کاؤنٹ

کی کہانی سنتی رہی۔ پرنس واسیلی نے جب اسے ٹکا سا جواب دے دیا، وہ بہت پریشان ہوئی۔ اور اس کے چہرے پر، جو کبھی خوبصورت تھا، آزردگی کے بادل سایہ فگن ہو گئے۔ لیکن اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس کی یہ کیفیت صرف چند ثانیے رہی۔ وہ ایک بار پھر مسکرائی اور اس نے پرنس واسیلی کا بازو پہلے سے بھی زیادہ مضبوطی سے تھام لیا۔

''پرنس، سنیں،'' وہ گویا ہوئی۔ ''میں نے اس سے قبل آپ سے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا اور نہ آئندہ کبھی کروں گی۔ میں نے کبھی آپ کو یہ نہیں جتایا کہ آپ کی میرے والد کے ساتھ دوستی تھی۔ لیکن اب میں خداوند کے نام پر آپ سے التجا کرتی ہوں کہ آپ میرے بیٹے کا کام کرا دیں،'' اس نے بہ عجلت مزید کہا۔ ''میں آپ کو ہمیشہ اپنا محسن گردانوں گی۔ نہیں، نہیں، آپ غصہ نہ کریں بلکہ مجھ سے وعدہ کریں۔ میں نے گالت سین سے بات کی تھی لیکن انھوں نے انکار کر دیا۔ آپ جب چھوٹے تھے، بڑی مروت اور نیکی کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، ایک بار پھر وہی مروت اور دریا دلی دکھا دیں۔'' اس نے یہ الفاظ فرانسیسی میں کہے۔ اگرچہ اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملا رہے تھے، وہ مسکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''پاپا، ہمیں دیر ہو جائے گی،'' پرنس ہیلین نے جو دہلیز پر کھڑی انتظار کر رہی تھی، اپنی خوبصورت گردن گھما کر اپنے کلاسیکی انداز کے حسین شانوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا۔

لیکن اثر ورسوخ ایسا سرمایہ ہے جو بینت بینت کر رکھنا پڑتا ہے ورنہ وہ چشم زدن میں پار ہو جائے گا۔ پرنس واسیلی اس حقیقت سے خوب آگاہ تھا۔ جب ایک مرتبہ وہ اس حقیقت کی تہ تک پہنچ گیا کہ اگر وہ ہر کہ ومہ کی، جو منہ اٹھائے اس کے پاس چلا آتا تھا، سفارشیں کرتا رہا، پھر وہ دن دور نہیں جب وہ اپنے لیے کچھ بھی نہیں مانگ سکے گا، چنانچہ وہ اپنا اثر ورسوخ شاذ ونادر ہی استعمال کرتا تھا۔ تاہم پرنس دروبیتسکایا جب دوبارہ اس سے ملتجی ہوئی، ضمیر سے ملتی جلتی چیز نے اسے ٹھوکا دیا۔ وہ اسے جو کچھ یاد دلا رہی تھی، مبنی بر حقیقت تھا۔ ملازمت کے ابتدائی دور میں اس نے ترقی کی جو منازل طے کی تھیں، ان کے لیے وہ اس کے باپ کا مرہونِ منت تھا۔ مزید برآں، وہ اس کے اطوار سے صاف بھانپ گیا کہ یہ خاتون ان عورتوں میں شمار کی جا سکتی ہے جو اگر کسی چیز کا تہیہ کر لیں — خاص طور پر اگر وہ مائیں بھی ہوں — پھر جو ہو، سو ہو، ان کے قدم اس وقت تک پیچھے نہیں ہٹیں گے جب تک ان کا مدعا حاصل نہیں ہو جاتا۔ اور اگر ان کی بات نہ مانی جائے تو، پھر وہ روز روز بلکہ گھڑی گھڑی آپ کا تعاقب کرتی اور آپ کو فریاد سناتی رہیں گی اور اگر ضروری ہوا، پھر ہنگامہ کھڑا کرنے سے بھی دریغ نہیں کریں گی۔ اس آخری سوچ نے اس کے قدم ڈگمگا دیے۔

''مائی ڈیئر آننا میخائیلوونا،'' اس نے حسب معمول بے تکلفی اور مداہنت برتتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن میرے لیے اس کی تعمیل ناممکن ہے۔ تاہم محض یہ جتانے کے لیے کہ میں آپ کا کتنا گرویدہ ہوں اور آپ کے والد کی یادوں کی میرے دل میں کتنی قدر ہے، میں یہ ناممکن بھی کر گزروں گا۔ آپ کے صاحب زادے کا تبادلہ گارڈز میں ہو جائے گا۔ میں یہ ذمے داری نبھانے کا عہد کرتا ہوں۔ اب آپ کی تسلی ہو گئی؟''

''میرے عزیز، آپ میرے محسن ہیں! مجھے آپ سے یہی توقع تھی — مجھے معلوم تھا کہ آپ کتنے شفیق ہیں۔''

وہ جانے کے لیے مڑا۔

''ذرا ٹھہریں — میں صرف ایک اور گزارش پیش کرنا چاہتی ہوں۔ جب اس کا تبادلہ گارڈز میں ہو جائے''۔ یہاں وہ قدرے ہچکچائی، ''آپ کی میخائیل الاری اوناوچ کوتوزوف[20] کے ساتھ بڑی دوستی ہے۔ آپ ان سے سفارش کر دیں کہ وہ بورس کو اپنا ایجوٹنٹ مقرر کر لیں۔ پھر میں مطمئن ہو جاؤں گی۔ اس کے بعد دوبارہ کبھی ...''

پرنس واسیلی مسکرا دیا۔

''میں اس کا وعدہ نہیں کرتا۔ آپ کو پتا نہیں کہ جب سے کوتوزوف کمانڈر انچیف مقرر ہوئے ہیں، لوگوں نے کیسے ان کا ناطقہ بند کر رکھا ہے۔ انھوں نے خود مجھے بتایا ہے کہ ماسکو کی تمام ماؤں نے یہ سازش کر لی ہے کہ وہ اپنے اپنے سپوت اس کی تحویل میں دے دیں گی تا کہ وہ انھیں اپنے ایجوٹنٹ مقرر کر سکے۔''

''نہیں، میرے عزیز محسن، مجھ سے وعدہ کریں — ورنہ میں آپ کو جانے نہیں دوں گی۔''

''پاپا'' اس کی مہ جبین دختر نے اپنے سابقہ لہجے کا اعادہ کرتے ہوئے کہا: ''ہمیں دیر ہو جائے گی۔''

''اچھا، خدا حافظ، آپ دیکھ رہی ہیں کہ معاملہ دگرگوں ہو رہا ہے ...''

''پھر آپ امپراطور سے کل بات کریں گے؟''

''بالکل، پکی بات ہے۔ لیکن کوتوزوف کے متعلق میں کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔''

''نہیں، واسیلی، وعدہ کرو — وعدہ۔'' آنا میخائیلوونا نے اسی بناوٹی پرشباب عشوہ طراز مسکراہٹ سے کہا جو کسی زمانے میں، جب وہ جوان تھی، اسے پھبتی تھی لیکن اب جب کہ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں، اسے بالکل زیب نہیں دیتی تھی۔

لگتا تھا کہ اسے یہ مطلق یاد نہیں رہا کہ وہ عمر کی کس منزل پر پہنچ چکی ہے اور محض عادت کے بل بوتے پر ان تمام عشووں اور غمزوں کو بروئے کار لا رہی تھی جو ازل سے صنف نازک کا خاصہ رہے ہیں۔ لیکن جونہی وہ نظروں سے اوجھل ہوا، اس کے چہرے نے سرد مہری اور تصنع کے وہی سابقہ تیور اختیار کر لیے۔ وہ دوبارہ اس گروپ میں لوٹ آئی جس میں وائی کاؤنٹ ابھی تک داستان طرازی میں مصروف تھا۔ وہ ایک بار پھر جھوٹ موٹ ظاہر کرنے لگی کہ اس سے زیادہ کسی کو اس داستان میں دلچسپی نہیں حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ اب جب کہ اس کا الو سیدھا ہو چکا تھا، وہ محض اس تاڑ میں تھی کہ جونہی موقع ملے، وہاں سے کھسک جائے۔

''یہ جو میلان میں تاج پوشی کا تازہ ترین ناٹک رچایا گیا ہے، اس کے متعلق آپ لوگوں کا کیا خیال ہے؟'' آنا پاولوونا نے فرانسیسی میں پوچھا۔ ''ذرا تصور کریں کہ موسیو بوناپارت تخت پر متمکن ہے اور جنیوا اور لوکا کے باشندے اس کی بارگاہ میں عرضیاں پیش کر رہے ہیں۔ کیسا مضحکہ خیز منظر ہوگا؟ سحر انگیز؟ انسان سوچے تو پاگل ہو جائے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ساری دنیا اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھی ہے۔''

پرنس آندرے کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ سیدھا آنا پاولونا کے چہرے پر نگاہیں گاڑے

ہوئے تھا۔

"Dieu me la donne, gare a qui la touche!"* (یہ الفاظ نپولین نے تب کہے تھے جب تاج اس کے سر پر رکھا جا رہا تھا۔) ''سنا ہے کہ اس نے جب یہ الفاظ کہے، وہ بہت پر وقار نظر آ رہا تھا۔'' پرنس آندرے نے کہا اور اس نے یہ جملہ اطالوی زبان میں دہرایا:

"Dio mi la donna, quai a chi la toccal"

''مجھے امید ہے کہ یہ آخری تنکا ثابت ہوگا،'' آنا پاولوونا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''خود مختار حکمران اس شخص کو، جو ہر کسی کے لیے جیتا جاگتا خطرہ بن چکا ہے، مزید برداشت نہیں کر سکیں گے۔''

''خود مختار حکمران؟'' وائی کاؤنٹ نے شائستہ لیکن بجھے بجھے لہجے سے کہا۔ ''مادام، میرا اشارہ روس کی طرف نہیں۔ آخر ان حضرات نے لوئی شانزدھم[21]، ملکہ عالیہ یا مادام الزبتھ کے لیے کیا کیا؟ کچھ بھی تو نہیں۔'' اب وہ جوش و خروش سے تقریر کر رہا تھا۔ ''اور یقین مانیں کہ ان لوگوں نے فرانس کے شاہی خاندان بوغ بوں سے جو غداری کی تھی، اب یہ اسی کی سزا بھگت رہے ہیں۔ خود مختار حکمران؟ اخ تھو! یہ غاصب کو مبارک باد پیش کرنے اپنے اپنے سفیر بھیج رہے ہیں۔'' اس نے نفرت و حقارت سے آہ بھری اور ایک مرتبہ پھر پہلو بدل لیا۔

پرنس اپولیت نے، جو یہ کچھ مدت سے عینک لگائے وائی کاؤنٹ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھے جا رہا تھا، ان الفاظ پر اچانک اپنے جسم کو پوری طرح کوچک پرنسس کی جانب گھمایا اور اس سے ایک سوئی طلب کی۔ اس سے وہ میز پر کاندے[22] خاندان کا نشان نقش کرنے لگا اور نہایت سنجیدگی سے اسے سمجھانے لگا کہ یہ کن کن چیزوں سے عبارت ہے۔

''یہ سرخ عصا ہے، اس پر لاجوردی دندانے کھدے ہوئے ہیں—''

پرنسس سنتی رہی اور مسکراتی رہی۔

''اگر بوناپارت مزید ایک برس فرانس کے تخت پر متمکن رہا،'' وائی کاؤنٹ نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس کا بات کرنے کا انداز ایک ایسے شخص کا تھا جو اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہے کہ زیرِ بحث موضوع پر اسے دوسروں سے زیادہ دسترس حاصل ہے، اس لیے وہ اس چیز کی قطعاً پروا کیے بغیر کہ دوسروں کی اس معاملے میں کیا رائے یا سوچ ہے، اپنی ہی ہانکے چلا جاتا ہے۔ ''معاملات حد سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ اگر سازشوں، جبر و استبداد، جلاوطنیوں اور پھانسیوں کا یہ سلسلہ یونہی رہا، پھر میں یہ پیش گوئی کر سکتا ہوں کہ اعلیٰ طبقے — فرانسیسی اعلیٰ طبقے — کا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے گا۔ اور پھر—'' اس نے کندھے اچکائے اور یوں ہاتھ پھیلائے جیسے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہو کہ اسے مشیت ایزدی کے سامنے دم مارنے کی مجال نہیں ہے۔

پیئر کچھ کہنے کے لیے زبان کھولنا چاہتا تھا کیونکہ اس گفتگو میں اسے بہت دلچسپی ہو رہی تھی لیکن آنا پاولوونا، جو مسلسل اس پر چوکس نگاہیں جمائے ہوئے تھی، بیچ میں بول پڑی۔

---

* یہ تاج خداوند کی دین ہے۔ اب جو شخص اسے ہاتھ لگانا چاہتا ہے، سوچ سمجھ کر لگائے۔

''امپراطور الیکساندر،'' اس نے اسی اداس اور پرملال لہجے میں کہا جو بادشاہی خاندان کا ذکر آنے پر وہ اختیار کرلیتی تھی: ''یہ اعلان فرما چکے ہیں کہ فرانسیسی جس قسم کا چاہیں طرز حکومت اختیار کرلیں، انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اور میں سمجھتی ہوں کہ جونہی غاصب سے نجات ملی، پوری قوم جائز بادشاہ کی آغوش میں چلی جائے گی،'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ شاہ پسند تارک وطن (emigre) کی دل جوئی کرنے کی پوری کوشش کررہی تھی۔

''مجھے اس بارے میں شک ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''موسیو وائی کاؤنٹ نے بالکل بجا کہا ہے کہ معاملات بہت آگے نکل چکے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ سابق حکومت بحال کرنا امر محال ہے۔''

''جو کچھ میں نے سنا ہے،'' پیئر نے شرماتے لجاتے دوبارہ گفتگو میں دخل دیتے ہوئے کہا: اُس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ فرانس کے تقریباً تمام امرا پہلے ہی نپولین کا دم بھرنے لگے ہیں۔''

''یہ محض بوناپارت کے حمائیتیوں کا پراپیگنڈہ ہے،'' وائی کاؤنٹ نے پیئر کی طرف دیکھے بغیر ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''فی الحال یہ معلوم کرنا کہ فرانس کی رائے عامہ کیا چاہتی ہے، ناممکن ہے۔''

''بوناپارت نے بھی یہی کہا ہے،'' پرنس آندرے نے طنزیہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

یہ بات بالکل عیاں تھی کہ اس نے وائی کاؤنٹ کو پسند نہیں کیا تھا اور وہ اس کی جانب دیکھے بغیر اسے اپنے حملوں کا نشانہ بنا رہا تھا۔

''میں نے انھیں شان و شکوہ کا راستہ دکھایا لیکن وہ اسے اختیار کرنے کے لیے تیار نہ ہوئے،'' اس نے مختصر وقفے کے بعد ایک بار پھر نپولین کے الفاظ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے دیوان کے دروازے وا کردیے اور لوگ ہجوم در ہجوم اندر چلے آئے۔' اس نے یہ جو دعویٰ کیا، مجھے نہیں معلوم کہ اس میں وہ حق بجانب تھا یا نہیں۔''

''بالکل نہیں،'' وائی کاؤنٹ نے تراخ سے جواب دیا۔ ''ڈیوک آف آں غیاں کے قتل کے بعد اس کے کٹر حمائیتیوں نے بھی اسے ہیرو سمجھنا ترک کردیا ہے، اگر چند لوگوں کی نگاہوں میں وہ ہیرو تھا بھی،'' اس نے آنناپاولوونا کی جانب مڑتے ہوئے کہا: ''تو جب سے ڈیوک کا قتل ہوا ہے، آسمانوں پر ایک اور شہید کا اضافہ ہوگیا ہے اور اسی نسبت سے روئے زمین پر ایک ہیرو کم ہوگیا ہے۔''

وائی کاؤنٹ کے اس جملے پر داد و تحسین نچھاور کرنے کے لیے آنناپاولوونا اور دوسرے اصحاب کو ابھی خندہ رو ہونے کا موقع بھی نہ ملا تھا کہ پیئر ایک بار پھر بے دھڑک میدان میں کود پڑا۔ اور اگرچہ آنناپاولوونا کا ماتھا ٹھنک رہا تھا کہ وہ کوئی احمقانہ بات ہی کہے گا لیکن وہ اسے لب کشائی سے باز نہ رکھ سکی۔

''ڈیوک آف آں غیاں کی سزائے موت سیاسی ضرورت تھی،'' پیئر نے کہا۔ ''اور میں سمجھتا ہوں کہ نپولین نے اس واقعے کی ذمے داری قبول کرنے میں جو معمولی سی بھی ہچکچاہٹ نہیں دکھائی، وہ اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ نہایت عالی ظرف اور شریف النفس انسان ہے۔''

''خداوندا! میرے خداوندا!'' آننا پاولوونا نے دہشت زدہ ہو کر زیر لب کہا۔

''اجی، موسیو پیئر، آپ کے خیال میں کسی شخص کو قتل کرنا عالی ظرفی اور شرافت النفس کا ثبوت ہے؟'' کوچک پرنس نے مسکراتے اور اپنا بیگ اپنے قریب کھسکاتے ہوئے کہا۔

''اخ، اخ!... اوہ، اوہ!'' بیک وقت متعدد آوازیں سنائی دیں۔

''بہت خوب!'' پرنس اپولیت نے انگریزی میں کہا اور اپنی ران کو ہتھیلی سے پیٹنے لگا۔

وائی کاؤنٹ نے محض کندھے اچکانے پر اکتفا کیا۔ پیئر نے نہایت سنجیدگی اور متانت سے اپنے چشمے کے اوپر سے سامعین پر نگاہ ڈالی۔

''میں نے جو کچھ کہا ہے، اس کی وجہ یہ ہے'' اس نے جلد بازی سے کام لیتے ہوئے کہا: ''کہ جب انقلاب آیا، بوغ بون خاندان کے افراد دم دبا کر بھاگ گئے اور عامۃ الناس کو انارکی (نراجیت) کے حوالے کر گئے۔ نپولین واحد شخص تھا جو اس انقلاب کو سمجھتا بھی تھا اور اس پر قابو پانے کی صلاحیت سے بھی بہرہ ور تھا۔ چنانچہ جب اس کے سامنے عام بھلائی کا مسئلہ آیا، اسے فرد واحد کو موت کے سپرد کرنے میں ذرا بھی ضمیر کی خلش محسوس نہ ہوئی۔''

''کیا تم یہاں دوسری میز پر آنا پسند کرو گے؟'' آننا پاولوونا نے اس سے پوچھا۔

پیئر نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی اور اپنی تقریر جاری رکھی۔

''ہاں، بالکل۔'' اس نے وجدانی کیفیت کے زیر اثر بلند آہنگ لہجے سے کہا: ''نپولین عظیم ہے کیونکہ وہ انقلاب سے بہت اونچا اٹھ گیا ہے۔ اس نے اس کے منفی اور برے پہلوؤں کو مٹا دیا اور اس کے مثبت اور اچھے پہلوؤں — شہریوں کے مابین مساوات، اخبارات اور تقریر کی آزادی — کو برقرار رکھا۔ اور محض یہی وجہ ہے کہ وہ اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکا۔''

''جی، بجا فرمایا۔ لیکن میں کہوں گا کہ جب اس نے اقتدار پر قبضہ کیا، اگر وہ قتل کا ارتکاب کرنے کے بجائے اسے جائز اور قانونی وارث سلطنت کے حوالے کر دیتا،'' وائی کاؤنٹ نے کہا: ''میں اسے عظیم انسان قرار دینے سے دریغ نہ کرتا۔''

''وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ عوام الناس نے اقتدار اس کے حوالے ہی اس لیے کیا تھا کہ وہ انھیں بوغ بونوں کے تسلط سے نجات دلائے اور اس لیے بھی کیونکہ وہ اسے عظیم انسان تصور کرتے تھے۔ انقلاب پر شکوہ چیز تھا،'' پیئر نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے اس ناعاقبت اندیش اور اشتعال انگیز بیان سے یہ ظاہر کر رہا تھا کہ ابھی وہ نوعمر اور ناتجربہ کار ہے، اور اس کی بس یہی خواہش ہے کہ جو کچھ اس کے دل میں ہے، اسے بلاکم وکاست تڑاک پڑاک اگل دے۔

''انقلاب برپا کرنا اور شاہی خاندان کے افراد کو موت کے گھاٹ اتارنا کوئی بہت ارفع، اعلیٰ کام ہے؟ اس کے بعد؟ — خیر، تم اس میز پر آنا پسند نہیں کرو گے؟'' آننا پاولوونا نے اپنی بات دہرائی۔

''Contrat Social'' وائی کاؤنٹ نے خوش اخلاقی اور ملائمت سے کہا۔
''میں شاہی خاندانوں کے افراد کے قتل کا ذکر نہیں کر رہا، میں تصورات کی بات کر رہا ہوں۔''
''بجا فرمایا! لوٹ مار، غارت گری، قتل عام، شاہی افراد کی ہلاکت کے تصورات،'' طنزیہ آواز نے پھر دخل دیا۔
''اس میں شک نہیں کہ چیرہ دستیوں کے واقعات ضرور ہوئے لیکن یہ باتیں اتنی اہم نہیں۔ اہمیت جن باتوں کو حاصل ہے وہ انسانوں کے حقوق، تعصبات سے چھٹکارا اور شہریوں کے مابین مساوات ہیں۔ اور نپولین نے ان تمام اصولوں کو ملحوظ خاطر رکھا ہے اور انھیں ضائع نہیں ہونے دیا۔''

''حریت اور مساوات،'' وائی کاؤنٹ نے یوں ناک بھوں چڑھا کر کہا جیسے آخر کار اس نے یہ تہیہ کر لیا ہو کہ وہ اس نوجوان پر یہ ثابت کر دے گا کہ اس کے دلائل کتنے بودے اور احمقانہ ہیں۔ ''حریت اور مساوات، محض بلند آہنگ الفاظ ہیں، اونچی دکان پھیکا پکوان۔ انھیں اپنی وقعت کھوئے مدتیں بیت چکی ہیں۔ حریت اور مساوات کسے پسند نہیں؟ خود ہمارے نجات دہندہ یسوع مسیح، ان کا پرچار کر چکے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جب سے انقلاب آیا ہے، کیا لوگوں نے مسرت و شادمانی کی زندگی گزارنا شروع کر دیا ہے؟ بالکل نہیں۔ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ ہم نے آزادی کی تمنا کی تھی اور بوناپارٹ نے اسے ملیامیٹ کر دیا۔''

پرنس آندرے مسکرا رہا تھا۔ وہ کبھی پیئر، کبھی وائی کاؤنٹ اور کبھی آنا پاولوونا کو دیکھنے لگتا۔ اپنے تمام تر مجلسی تجربے کے باوجود آنا پاولوونا پیئر کی دھما کہ خیز تقریر کے ابتدائی کلمات سن کر ہی دہشت زدہ ہو گئی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ پیئر کی بے ادبی، بے حرمتی اور زندیقی پر مبنی باتیں بھی وائی کاؤنٹ کو طیش دلانے میں ناکام رہی ہیں تو اسے پختہ یقین ہو گیا کہ اس کو یوں دبانا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ اس نے اپنی تمام صلاحیتیں مجتمع کیں اور وائی کاؤنٹ کی حمایت میں پیئر پر پل پڑی۔

''لیکن مائی ڈیئر موسیو پیئر، تم کسی ایسے عظیم شخص کی حمایت کس طرح کر سکتے ہو جو نہ کوئی جواز ڈھونڈتا ہے، نہ مقدمے کے جھنجھٹ میں پڑتا ہے، آؤ دیکھا نہ تاؤ، ڈیوک کو بھی اور عام آدمی کو بھی، موت کے گھاٹ اتروا دیتا ہے؟''
''موسیو، میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اٹھارہ بغومیر[23] کو جو کچھ پیش آیا، اس کی آپ کیا توجیہہ کریں گے؟ کیا یہ سراسر فریب نہیں تھا؟ ایسا قانونی حیلہ جو کسی لحاظ سے بھی کسی عظیم انسان کے طرز عمل سے لگا نہیں کھاتا۔''
''پھر وہ اسیران جنگ جن کا اس نے افریقہ میں قتل عام کیا![24] بڑی بھیانک حرکت تھی اس کی!'' کوچک پرنس نے کہا اور اس کا بدن کپکپانے لگا۔
''آپ مانیں یا نہ مانیں، اس شخص کا شرفاء سے کوئی تعلق نہیں، بالکل کمین ہے،'' پرنس اپولیت نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

• عمرانی معاہدہ: روسو اور اٹھارھویں صدی کے بعض فلسفیوں کا نظریہ تھا کہ انسانی معاشرت کی بنیاد ایک معاہدے پر ہوئی تھی جو انسانوں نے مل کر طے کیا تھا۔

پیئر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کس کس کی بات کا جواب دے۔ اس نے پہلے ایک، پھر دوسرے کی جانب دیکھا اور مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ دوسرے لوگوں کی نیم دلانہ مسکراہٹ سے قطعی مختلف تھی۔ جب وہ مسکرایا، اس کا سنجیدہ، بلکہ کسی قدر راکل کھرا اور روکھا چہرہ آناً فاناً غائب ہو گیا اور اس کی جگہ نیا چہرہ نمودار ہو گیا جو بچوں کے چہروں کی طرح معصوم، شفیق بلکہ کسی حد تک احمقانہ بھی تھا جو پکار پکار کر اعلان کرتا نظر آرہا تھا کہ بھائی مجھے معاف کر دو۔

وائی کاؤنٹ پر، جو پہلی مرتبہ اس کی شکل دیکھ رہا تھا، یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو گئی کہ اس حریت و جمہوریت کے دلدادہ اور انقلاب فرانس کے کٹر حامی نوجوان کی شخصیت کسی طور پر بھی اتنی مرعوب کن نہیں جتنا کہ اس کی گفتگو سے مترشح ہوتا تھا۔

ہر شخص خاموش تھا۔

''آپ لوگوں نے یہ کیسے امید باندھ لی کہ وہ آپ سب کے سوالوں کا بیک وقت جواب دے سکے گا؟'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''اس کے علاوہ قابل غور نکتہ یہ ہے کہ جب ہم کسی مدبر سیاستدان کے افعال و اعمال کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس کے ان اعمال کے، جو اس سے نجی حیثیت سے سرزد ہوتے ہیں اور ان اعمال کے، جو وہ جرنیل یا امپراطور کی حیثیت سے سرانجام دیتا ہے، مابین حد فاصل کھینچنا ہوگی۔ میرے خیال میں درست طریقہ یہی ہے۔''

''بالکل، بالکل!'' پیئر جھٹ بول پڑا۔ تائید کے اس مظاہرے نے اس کی باچھیں کھلا دی تھیں۔

''ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا'' پرنس آندرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''کہ آرکول[25] کے پل پر بحیثیت انسان نپولین کا رویہ عظیم تھا۔ جافہ کے ہسپتال میں وہ جس طرح طاعون کے مریضوں سے ہاتھ ملاتا رہا، وہ بھی اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ لیکن ... اس کی کچھ دیگر حرکات ایسی ہیں کہ ان کا جواز تلاش کرنا کارے دارد ہے۔''

پیئر کی باتوں نے لوگوں کو جس طرح شش و پنج میں ڈال دیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ پرنس آندرے اس کیفیت کی شدت میں تخفیف کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور ہاتھ سے اپنی زوجہ کو اشارہ کیا کہ اب انھیں اجازت طلب کرنا چاہیے۔

اچانک پرنس اپولیت اٹھا، اس نے دونوں بازو لہرائے اور لوگوں کو جانے سے روک دیا۔ اس نے انھیں دعوت دی کہ وہ دوبارہ اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں اور اس کی بات سنیں۔

''واہ!'' اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ ''دوستو، آج میں نے ایک نہایت دلچسپ اور لذیذ قصہ سنا تھا۔ یہ قصہ ایک واقعے کے بارے میں ہے جو ماسکو میں پیش آیا تھا۔ میرے دل میں کھد بد ہو رہی ہے کہ میں یہ قصہ آپ لوگوں کو ضرور سناؤں۔ جناب وائی کاؤنٹ، معافی چاہتا ہوں۔ مجھے یہ قصہ روسی میں سنانا ہوگا ورنہ اس کا سارا مزہ کرکرا ہو جائے گا۔''

اور پرنس اپولیت کچھ اس قسم کی روسی زبان بولنے لگا کہ کوئی بھی فرانسیسی، جو بارہ ماہ روس میں گزار چکا ہو، باآسانی بول سکتا ہے۔ تمام حاضرین ہمہ تن گوش تھے، آخر پرنس نے پیہم اور پرزور اصرار کیا تھا کہ وہ اس کی کہانی

سننے کے لیے رک جائیں۔

"ماسکو میں ایک خاتون رہتی ہے une dame۔ یہ خاتون بے حد کنجوس بلکہ مکھی چوس ہے۔ یہ خاتون دو وردی پوش ملازم رکھنا چاہتی تھی۔ ان کا کام اس کی گاڑی میں پچھلی جانب کھڑے ہونا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے یہ دونوں خدمت گار لمبے تڑنگے ہوں۔ اپنے اپنے ذوق کی بات ہوتی ہے اور اس کا ذوق یہی تھا۔ اس کی ایک خادمہ (femme de chambre) تھی اور یہ بھی بہت لمبی تڑنگی تھی۔ اس خاتون نے کہا—"

یہاں پرنس اپولیت رک گیا اور کچھ سوچنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اپنے خیالات مجتمع کرنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔

"اس نے کہا— ارے، ہاں، اس نے کہا: لڑکی، (femme de chamber)، livree (وردی) پہن لو۔ گاڑی کے عقب میں کھڑی ہو جاؤ اور میرے ساتھ چلو I fairedes visites (مجھے کچھ لوگوں سے ملاقاتیں کرنا ہے۔")

یہاں پرنس اپولیت پر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور پیشتر اس کے کہ حاضرین میں سے کوئی شخص خندہ زن ہوتا، وہ خود ہی زور زور سے قہقہے پر قہقہہ لگانے لگا۔ بدقسمتی سے سامعین پر اس کا الٹا اثر ہوا۔ تاہم چند اشخاص، جن میں آنا پاولوونا اور معمر خاتون شامل تھیں، اخلاقاً مسکرا دیے۔

"وہ گاڑی میں روانہ ہو گئیں۔ اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور خادمہ کا ہیٹ اڑا لے گیا۔ اس کے لمبے بال پریشان ہو گئے..." اب اس کے لیے مزید ضبط کرنا مشکل ہو گیا اور اپنے طویل اور فلک شگاف قہقہوں کے مابین اس نے کہا: "اور سارے شہر میں اس واقعے کی دھوم مچ گئی..."

اور اس کے ساتھ ہی اس کی کہانی ختم ہو گئی۔ اگرچہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اس نے یہ کہانی کیوں سنائی تھی پھر روسی میں ہی کیوں سنانے پر اصرار کیا تھا، آنا پاولوونا اور دوسرے اصحاب اس کی معاملہ فہمی کے قائل ہو گئے کہ موسیو پیئر نے جس منہ پھٹ انداز سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس حکایت نے نہایت خوشگوار طریقے سے اس کے اثرات زائل کر دیے ہیں۔

جب کہانی ختم ہو گئی، گفتگو کا رخ تبدیل ہو گیا۔ گزشتہ اور آئندہ بال اور تھیئٹر موضوع بحث بنے اور حاضرین آپس میں طے کرنے لگے کہ کون کس سے کہاں ملے گا۔

5

مہمانوں نے آنا پاولوونا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے نہایت charmante soiree* کا اہتمام کیا اور رخصت ہونے لگے۔

* دل آویز محفل

پیئر کی کیفیت یہ تھی کہ اونٹ رے اونٹ تیری کون سی کل سیدھی۔ اس کا جسم کڈھب، بے ہنگم، لحیم شحیم اور عام انسانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ لمبوترا تھا۔ اس کے ہاتھوں کی رنگت سرخ اور وہ بھاری بھرکم تھے۔ لوگ کہتے تھے کہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے کا سلیقہ کیا ہے، اس سے وہ بالکل بے بہرہ تھا اور جہاں تک وہاں سے رخصت ہونے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں وہ اور بھی کودن تھا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ اجازت چاہنے سے قبل اپنی میزبان کے ساتھ چند خوشگوار کلمات کا تبادلہ کیسے کیا جاتا ہے۔ ستم بالائے ستم، حضرت غائب دماغ بھی تھے۔ اب جب وہ جانے کے لیے اٹھا، اس نے اپنی ٹوپی اٹھانے کے بجائے کسی جرنیل کی تکونی ٹوپی اٹھالی اور اس کے پھندنے مروڑنے لگا تا آنکہ جرنیل نے اس سے یہ نہ کہہ دیا: ''جناب، میری ٹوپی مجھے لوٹا دیں۔'' یہ ٹھیک ہے کہ وہ غائب دماغ تھا، اور ڈرائنگ روم میں داخل ہونے اور گفتگو کرنے کے سلیقے سے نا آشنا تھا لیکن اس کی ان تمام کوتاہیوں کی تلافی یوں ہو جاتی تھی کہ وہ شفیق، نرم خو، سیدھا سادا اور منکسر المزاج انسان تھا۔ آنناپاولوونا اس کی جانب متوجہ ہوئی اور مسیحی مسکنت سے گردن کو خم دیا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ اس نے اس کی لغزش معاف کر دی ہے۔

''مائی ڈیئر موسیو پیئر، مجھے امید ہے کہ تم سے پھر ملاقات ہوگی اور مجھے یہ بھی امید ہے کہ تم اپنے خیالات تبدیل کر لو گے۔''

پیئر نے کوئی جواب نہ دیا، صرف جھک کر آداب بجالیا۔ ایک بار پھر انھیں اس کے چہرے پر جو تبسم نظر آیا وہ یہ کہتا معلوم ہوتا تھا: ''میرے خیالات بدلیں نہ بدلیں، آپ یہ دیکھیں کہ میں کتنا نفیس، بھلا اور نیک طینت انسان ہوں۔'' اور ہر شخص، بشمول آنناپاولوونا، کو جبلی طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔

پرنس آندرے استقبالیہ کمرے میں جا چکا تھا۔ اس نے اپنے کندھے خدمت گار کے سامنے جھکا دیے تا کہ وہ اسے اس کا اوورکوٹ اڑھا دے۔ وہ اپنی شریک حیات اور پرنس اپولیت کی، جو ان کے پیچھے پیچھے وہاں آ گیا تھا، بے معنی گفتگو لاتعلقی سے سن رہا تھا۔ پرنس اپولیت خوبصورت حاملہ کوچک پرنس کے بالکل قریب کھڑا تھا اور اپنی عینک میں سے اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

''آنیت، اب تم اندر چلی جاؤ ورنہ تمھیں زکام ہو جائے گا،'' کوچک پرنس نے آنناپاولوونا سے اجازت لیتے ہوئے کہا۔ ''سمجھو کہ بات پکی ہو گئی ہے،'' اس نے مدھم آواز سے کہا۔

آنناپاولوونا کوچک پرنس کی نند کے ساتھ اناطول کا رشتہ کرانے کے لیے جو کھچڑی پکا رہی تھی، اس کے متعلق وہ لسا سے پہلے ہی بات کر چکی تھی۔

''مائی ڈیئر، میں اس معاملے میں بالکل تمھارے رحم و کرم پر ہوں،'' آنناپاولوونا نے بھی زیر لب کہا۔ ''بس اسے خط لکھ دینا اور پھر مجھے بتانا کہ اس کے باپ کا اس بارے میں کیا ردعمل ہے۔ اچھا، au revoir*'' اور وہ

* خدا حافظ

استقبالیہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

پرنس اپولیت کوچک پرنس کے نزدیک ہو گیا اور اس کے چہرے کے قریب سر جھکا کر سرگوشیوں میں کچھ کہنے لگا۔

دو خدمت گار، ایک اس کا اپنا اور دوسرا پرنس کا، ان کی گفتگو کے ختم ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ ایک کے ہاتھوں میں شال تھی اور دوسرے کے مردانہ اوور کوٹ۔ گفتگو فرانسیسی میں ہو رہی تھی اور ان کی سمجھ سے بالاتر۔ لیکن وہ یوں کان لگائے سن رہے تھے جیسے ایک ایک لفظ سمجھ رہے ہوں لیکن ظاہر نہیں کرنا چاہتے کہ وہ سب کچھ سمجھ رہے ہیں۔ کوچک پرنس اپنی عادت کے مطابق جب بات کرتی تھی، مسکرانے لگتی تھی اور جب سنتی تھی، ہنس پڑتی تھی۔

''میں بے حد خوش ہوں کہ سفیر کی پارٹی میں نہیں گیا۔ کتنی بوریت ہوتی... یہاں شام بہت پر لطف گزری۔ پر لطف تھی نا؟''

''لوگ کہتے ہیں کہ بال بہت زبردست ہوگا'' پرنس نے اپنا زیریں لب سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''تمام حسین و جمیل خواتین اس میں شریک ہوں گی۔''

''ساری نہیں — تم وہاں کہاں ہوگی — پھر ساری کیسے؟'' پرنس اپولیت نے ہنستے اور باچھیں کھلاتے کہا۔ اس نے جھپٹ کر خدمت گار سے شال چھین لی اور اسے قدرے ایک طرف دھکیل دیا تاکہ وہ اپنے ہاتھوں اسے پرنس کو اڑھا سکے۔ جب وہ شال اڑھا چکا، اس نے اپنے بازو اس کے جسم کے گرد لپٹے رہنے دیے (اس نے یہ حرکت دانستہ کی تھی یا اناڑی پن کا اس میں دخل تھا، کوئی بھی یقین سے نہیں بتا سکتا تھا) جیسے وہ اس سے ہم آغوش ہونے کی کوشش کر رہا ہو۔

پرنس ابھی تک مسکرا رہی تھی اور مسکراتے مسکراتے نہایت شائستگی سے پیچھے ہٹ گئی۔ پھر وہ مڑی اور اس نے ایک نظر اپنے خاوند پر ڈالی۔ پرنس آندرے کی آنکھیں بند تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ تھکاوٹ سے اس کا جسم چور ہو رہا ہے اور اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی ہیں۔

''چلیں؟'' اس نے اپنی بیوی سے پوچھا لیکن اس کی نگاہیں کہیں اور تھیں۔

پرنس اپولیت نے بہ عجلت اپنا اوور کوٹ، جو اس زمانے کے فیشن کے مطابق اس کی ایڑیوں تک پہنچتا تھا، پہنا اور اس میں الجھتا اور ٹھوکریں کھاتا کوچک پرنس کے پیچھے پیچھے پورچ کی طرف بھاگا جہاں خدمت گار اسے گاڑی میں بیٹھنے میں مدد دے رہا تھا۔

''پرنس! au revoir۔'' اس کی زبان بھی اسی طرح لڑکھڑا رہی تھی جیسے کہ اس کے پاؤں۔

پرنس نے اپنی سکرٹ سنبھالی اور تیرہ و تار گاڑی میں بیٹھنے لگی۔ اس کا خاوند اپنی شمشیر درست کر رہا تھا۔ اور پرنس اپولیت مدد کے بہانے دونوں کے لیے رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

''محترم، اجازت ہے؟'' پرنس آندرے نے پرنس اپولیت کو روسی میں ترش روئی سے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''پیئر، میں تمھارا انتظار کروں گا۔'' اب اسی آواز میں پیار اور یگانگت کی چاشنی تھی۔

اسپ سوار کوچوان نے گھوڑوں کو چابک دکھایا۔ پہیے کھڑکھڑائے اور گاڑی چلنے لگی۔ پرنس اپولیت سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ وقفے وقفے کے بعد اس کی ہنسی چھوٹنے لگتی۔ وہ وائی کاؤنٹ کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے اس کے گھر پہنچا دے گا۔

✦

''واہ بھائی واہ، تمھاری کوچک (little) پرنس بڑے ٹھسے کی خاتون ہے۔ چہ خوب!'' وائی کاؤنٹ نے گاڑی میں پرنس اپولیت کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''واقعتاً نہایت نفیس اور پر رفعت!'' اس نے اپنی انگلیوں کی پوروں کو چوما۔ ''اور بالکل فرانسیسی ہے!''

اپولیت کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تم بنتے تو بہت بھولے ہو لیکن تمھیں معلوم ہے کہ تم ہو بہت خوف ناک شخص،'' وائی کاؤنٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بے چارے خاوند پر بہت ترس آتا ہے۔ ہے تو چھوٹا سا افسر لیکن بنتا یوں ہے جیسے سلطنت کا ولی عہد وہی ہو۔''

اپولیت پھر دانت نکوس کر ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے اس نے جواب دیا:

''اور تم کہتے تھے کہ ہماری روسی عورتیں تمھاری فرانسیسی خواتین سے لگا نہیں کھا سکتیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ آدمی کو ان سے نپٹنے کا سلیقہ آنا چاہیے اور بس۔''

✦

پیئر دوسروں سے پہلے پہنچ گیا۔ پرنس آندرے سے اس کی بے تکلفی تھی، یوں وہ سیدھا اس کے سٹڈی روم میں چلا گیا اور حسب عادت صوفے پر ٹانگیں پسار کر لیٹ گیا۔ اس نے شیلف سے جو پہلی کتاب (یہ جولیس سیزر کی یادداشتوں پر مشتمل تھی) اس کے ہاتھ آئی، اٹھالی اور کہنی پر سر جھکا کر اسے درمیان میں سے پڑھنے لگا۔

''یہ تم نے مادموزیل شیریر سے کیا سلوک کر دیا؟ اب واقعی اس کی طبیعت ناساز ہو جائے گی،'' پرنس آندرے نے کہا۔ وہ اپنے ننھے منے سفید ہاتھ مسلتا سٹڈی روم میں داخل ہو چکا تھا۔

پیئر نے کچھ اس طرح صوفے پر کروٹ بدلی کہ وہ چرچرانے لگا۔ اس نے اپنا پر اشتیاق چہرہ اٹھا کر آندرے کی جانب دیکھا، مسکرایا اور ہاتھ کے اشارے سے اس کے سوال کو گول کر دیا۔

''تم جانتے ہو کہ وہ صدر راہب بہت دلچسپ شخص ہے لیکن وہ حالات کا صحیح زاویے سے جائزہ نہیں لیتا۔ میری رائے میں مستقل امن ممکن ہے لیکن — سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اپنا مدعا کس طرح بیان کروں — لیکن طاقت کا

توازن قائم کر کے نہیں۔"
یہ بالکل عیاں تھا کہ آندرے کو اس قسم کے مجرد مسائل میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
"mon cher، آدمی جو کچھ سوچتا سمجھتا ہے، اس کا جگہ جگہ اظہار ممکن نہیں۔ خیر، چھوڑو، اب یہ بتاؤ کہ تم نے فیصلہ کیا کیا ہے؟ ہارس گارڈز میں بھرتی ہو گے یا سفارت سنبھالنے کا ارادہ ہے؟" مختصر خاموشی کے بعد آندرے نے پوچھا۔
پیئر آلتی پالتی مار کر صوفے پر بیٹھ گیا۔
"اگر میں یہ کہوں کہ ابھی تک میرا ذہن صاف نہیں ہوا، تو تم مان لو گے؟ سچ پوچھو تو مجھے دونوں میں سے ایک بھی پسند نہیں۔"
"لیکن تمھیں کسی نہ کسی کے بارے میں فیصلہ تو کرنا ہی ہوگا۔ تمھارے والد انتظار کر رہے ہیں۔"
پیئر ابھی دس برس کا تھا کہ اسے ایک راہب کی معیت میں، جو اس کا ٹیوٹر مقرر ہوا تھا، ملک سے باہر بھیج دیا گیا۔ وہ وہیں مقیم رہا تا آنکہ اس کی عمر بیس سال ہوگئی۔ جب وہ واپس ماسکو پہنچا، اس کے باپ نے راہب کی چھٹی کر دی اور نوجوان سے کہا: "اب تم پیٹرز برگ چلے جاؤ۔ وہاں حالات کا جائزہ لو اور اپنے لیے کوئی ملازمت منتخب کر لو۔ تمھیں جو کچھ پسند آئے گا، میں اس سے اتفاق کر لوں گا۔ میں نے پرنس واسیلی کے نام خط تحریر کر دیا ہے۔ یہ رہا وہ اور کچھ رقم بھی۔ مجھے ہر چیز کے بارے میں مطلع کرتے رہنا اور میں ہر طرح تمھاری مدد کروں گا۔" پیئر تین مہینوں سے اس ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ وہ یہ فیصلہ کر سکے کہ اسے کون سی ملازمت اختیار کرنا ہے۔ لیکن وہ ابھی تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا تھا۔ آندرے اس سے اسی انتخاب کے بارے میں دریافت کر رہا تھا۔ پیئر اپنی پیشانی مسلنے لگا۔
"وہ غالباً فری میسن ہے،" اس نے صدر راہب کے بارے میں، جس کے ساتھ اس کی اسی شام ملاقات ہوئی تھی، اظہار خیال کرتے ہوئے کہا۔
"یہ نری بکواس ہے،" پرنس آندرے نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ "ہمیں سنجیدہ معاملات کے بارے میں گفتگو کرنا ہے۔ تم ہارس گارڈز کے دفتر گئے تھے؟"
"نہیں، میں وہاں نہیں گیا۔ لیکن مجھے ایک بات سوجھی ہے — اور میں اس کے متعلق تمھارے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ یہ جنگ نپولین کے خلاف ہے۔ اگر یہ جنگ آزادی کی جنگ ہوتی، تو بات میرے پلے پڑ جاتی اور میں سب سے پہلے فوج میں بھرتی ہوتا۔ لیکن دنیا کی عظیم ترین ہستی کے خلاف انگلستان اور آسٹریا کی مدد کرنا۔ یہ چیز غلط ہے۔"
پیئر کے بچگانہ بیان پر پرنس آندرے محض کندھے اچکا کر رہ گیا۔ اس کے رویے سے مترشح ہوتا تھا کہ اس

• مائی ڈیئر

قسم کی احمقانہ گفتگو کا جواب دینا اس کے بس کی بات نہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ پیئر کے بھولے کلمات کا جواب اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا جو پرنس آندرے نے اسے دیا:

''اگر ہر شخص محض اپنے عقائد کی خاطر جنگ کرے، پھر کوئی جنگ نہیں ہوگی۔''

''اور یہ تو بہت ہی اعلیٰ بات ہوگی!'' پیئر کا جواب تھا۔

پرنس آندرے ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی طنزیہ تھی۔

''ممکن ہے یہ بہت اعلیٰ بات ہو لیکن ایسا کبھی ہوگا نہیں...''

''تم کیوں جنگ کرنے جا رہے ہو؟'' پیئر نے سوال کیا۔

''کیوں؟ پتا نہیں۔ اس لیے کہ مجھے جانا چاہیے۔ علاوہ ازیں، میں اس لیے جا رہا ہوں — اس نے توقف کیا، ''میں اس لیے جا رہا ہوں کہ میں یہاں جس قسم کی زندگی گزار رہا ہوں — یہ زندگی — میری پسند کی نہیں۔''

6

ملحقہ کمرے میں کسی عورت کے لباس کی سرسراہٹ سنائی دی۔ پرنس آندرے یوں اچھلا جیسے وہ نیند سے بیدار ہوا ہو اور اس کے چہرے پر وہی تیور نمایاں ہو گئے جو آننا پاولوونا کے ڈرائنگ روم میں نظر آئے تھے۔ پیئر نے اپنے پاؤں صوفے سے نیچے اتار لیے۔ پرنس اندر آئی۔ وہ اپنا لباس تبدیل کر چکی تھی۔ اس کی پوشاک اب نسبتاً سادہ تھی لیکن تازگی اور نفاست میں پہلے سے کم تر نہیں تھی۔ پرنس آندرے اٹھا اور اس نے نہایت شائستگی سے اس کے بیٹھنے کے لیے کرسی بچھا دی۔

''میں اکثر سوچتی ہوں،'' اس نے حسب معمول فرانسیسی میں اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ تیزی سے آگے بڑھی اور دیکھتی بھالتی خواہ مخواہ کی احتیاط برتتی کرسی پر فروکش ہوگئی، ''کہ آخر آنیت نے آج تک شادی کیوں نہیں کی؟ آپ تمام مرد حضرات بھی کتنے احمق ہیں کہ کسی نے اس سے عقد نہیں کیا۔ بات ذرا سخت ہے اور اس کے لیے میں معافی چاہتی ہوں لیکن میں اتنا ضرور کہوں گی کہ عورتوں کے بارے میں تم لوگ بالکل پیدل ہو۔ موسیو پیئر، تم بڑے کٹ حجتی ہو۔''

''میری ابھی تک آپ کے شوہر سے بحث چل رہی ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر یہ جنگ میں کیوں شریک ہونا چاہتے ہیں،'' پیئر نے کہا۔ اس کے انداز میں وہ جھجک قطعاً مفقود تھی جس کا نوجوان خاتون کی موجودگی میں نوجوان مرد شکار ہو جاتے ہیں۔

پرنس اچھل پڑی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پیئر نے اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہے۔

''آہ! بالکل یہی بات میں کہتی ہوں۔ مجھے بالکل سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مردوں کا جنگ کے بغیر گزارہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ ہم عورتوں کو اس کی خواہش کیوں محسوس نہیں ہوتی، ضرورت ہی پیش نہیں آتی؟ خود انصاف

کرو۔ میں انھیں اکثر کہتی رہتی ہوں! یہ ٹھہرے انکل کے ایڈی کانگ۔ کتنا زبردست عہدہ ہے! کتنی شہرت ہے ان کی! کتنی عزت حاصل ہے انھیں۔ پچھلے دنوں کی بات ہے۔ اپراکسنوں (Apraksins) کے ہاں میں نے ایک خاتون کو یہ پوچھتے سنا: 'ہائیں، یہی مشہور و معروف پرنس آندرے ہیں، میں جھوٹ نہیں کہتی، سچ عرض کر رہی ہوں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''یہ جہاں بھی جاتے ہیں، ان کی اسی طرح آؤ بھگت ہوتی ہے۔ یہ چاہیں تو نہایت آسانی سے امپراطور کے بھی ایڈی کانگ مقرر ہو سکتے ہیں۔ تمھیں معلوم ہے کہ امپراطور نے ان کے ساتھ نہایت شفقت سے کلام کیا تھا۔ میری اور آنیت کی بات ہوئی تھی۔ ہم دونوں کا خیال ہے کہ انھیں یہ عہدہ کسی دقت کے بغیر مل سکتا ہے۔ آپ کی کیا رائے ہے؟''

پیئر نے اچٹتی نگاہوں سے پرنس آندرے کو دیکھا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ اس گفتگو سے ناخوش ہے۔ چنانچہ اس نے جواب دینے سے احتراز کیا۔

''کب جا رہے ہو؟'' وہ اس سے پوچھنے لگا۔

''ان کی روانگی کے متعلق کوئی بات نہ کریں۔ اس کا ذکر بھی اپنی زبان پر نہ لائیں! مجھے اس بارے میں ایک لفظ بھی سننا گوارا نہیں!'' پرنس نے اسی من موجی، کھلنڈرے، شوخ اور طناز لہجے میں کہا جو اس نے آنا پاولوونا کی محفل میں اولیت کے ساتھ اپنایا تھا لیکن جو اس کے خاندانی دائرے سے، جس کا پیئر عملاً رکن بن چکا تھا، صریحاً کوئی مطابقت نہ رکھتا تھا۔ ''آج جب مجھے یہ خیال آیا کہ ان کی روانگی کے بعد ان تمام خوشگوار وابستگیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ پھر آندرے، تمھیں پتا ہے کہ۔'' اور وہ اپنے خاوند کی طرف متوجہ ہوئی، اسے معنی خیز نگاہوں سے دیکھا اور اس کے سر سے سر جوڑ کر بولی: ''مجھے اندیشہ ہے، مجھے اندیشہ ہے...'' اور اس کا جسم بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔

اس کے خاوند نے اسے یوں دیکھا جیسے اسے اچنبھا ہو رہا ہے کہ اس کے اپنے اور پیئر کے علاوہ کمرے میں یہ تیسرا شخص کون آ گیا ہے۔ اس نے یخ بستہ شائستگی سے دریافت کیا:

''لِسا، تمھیں کس بات کا اندیشہ ہے؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔''

''تمھیں معلوم ہے کہ مرد کتنے خود پسند ہوتے ہیں، سب کے سب، خود پسند، انا کے مارے ہوئے، محض اپنے کسی خبط کی، خدا معلوم یہ کیا ہے، تسکین کی خاطر یہ مجھے چھوڑ کر جا رہے ہیں، گاؤں میں مجھے اکیلی بند کر رہے ہیں۔''

''یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میرے ابا جان اور بہن بھی وہیں ہیں،'' پرنس نے ملائمت سے کہا۔

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ میں تو وہاں تن تنہا ہوں گی۔ نہ کوئی دوست نہ کوئی سنگی... اور پھر بھی یہ مجھ سے امید رکھتے ہیں کہ میں کسی قسم کا خوف دل میں نہ لاؤں۔''

اب اس کے لہجے میں چڑچڑاپن در آیا تھا اور اس کے اوپر کی جانب اٹھے ہوئے ہونٹ سے کسی قسم کی مسرت ٹپکتی نہیں دکھائی دے رہی تھی بلکہ اس نے اس کے چہرے کی شکل یوں بگاڑ دی تھی کہ اب وہ خوبصورت دوشیزہ کا نہیں کسی اجڈ گلہری کا چہرہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خاموش ہو گئی جیسے اسے یہ بات نازیبا نظر آ رہی ہو کہ وہ اپنا کچا چٹھا

پیئر کی موجودگی میں بیان کر رہی ہے۔

''میں اب بھی یہ سمجھ نہیں سکا کہ آخر تمھیں اندیشہ کس بات کا ہے؟'' پرنس آندرے نے طیش میں آئے بغیر ہموار لہجے میں اپنی بات دہرائی۔ اس کی نگاہیں مسلسل اپنی بیوی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔

پرنسس شرما گئی، اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی اور وہ عالم مایوسی میں اپنے باز وفضا میں لہرانے لگی۔

''ہائے آندرے، تم کتنے بدل گئے ہو! بالکل بدل گئے ہو!...''

''ڈاکٹر نے تمھیں ہدایت کی تھی کہ تمھیں جلدی سو جانا چاہیے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''بہتر ہے کہ اب تم جاؤ اور آرام کرو۔''

پرنسس خاموش رہی لیکن اس کا مہین ہونٹ، جس پر باریک سبزہ اگ رہا تھا، اچانک تھرتھرانے لگا۔ پرنس آندرے نے کندھے اچکائے، اپنی نشست سے اٹھا اور کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

بھولا بھالا پیئر حیرانی اور پریشانی کے عالم میں عینک میں سے جھانک جھانک کر دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں کبھی پرنس پر پڑتیں اور کبھی اس کی رفیقۂ حیات پر۔ بے چینی اسے کسی کل چین سے بیٹھنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا جیسے اٹھنا چاہتا ہو لیکن اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا۔

''اگر موسیو پیئر یہاں موجود ہیں، تو میں کیوں برا مانوں؟'' کوچک پرنسس اچانک پھٹ پڑی۔ اس کا خوبصورت چہرہ بدہیئت ہوگیا اور وہ مضحک دکھائی دینے لگا۔ وہ رونکھی ہو رہی تھی۔ ''آندرے، میں بہت دنوں سے تم سے یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ میرے ساتھ تمھارے رویے میں اتنی تبدیلی کیوں آگئی ہے؟ مجھ سے کیا گناہ سرزد ہوا ہے؟ تم جنگ پر جا رہے ہو اور تمھیں مجھ پر ذرا بھی ترس نہیں آتا — آخر کیوں؟''

''لسا!'' پرنس نے صرف یہی کہا لیکن اس ایک لفظ میں منت سماجت تھی، دھمکی تھی اور سب سے بڑھ کر یہ خود اعتمادی کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، اس پر اسے پچھتانا پڑے گا۔

''تم مجھ سے یوں پیش آتے ہو جیسے میں روگی ہوں یا دودھ پیتی بچی۔'' وہ سانس روکے بغیر اپنی ہی ہانکے چلی گئی۔ ''میں سب سمجھ گئی ہوں۔ چھ ماہ قبل تمھارا یہ وتیرہ نہیں تھا جو آج ہے، یا تھا؟''

''لسا، میں تمھارے پاؤں پڑتا ہوں کہ اب تم بس کرو،'' پرنس آندرے نے اور بھی واضح انداز سے کہا۔

اس گفتگو کے دوران میں پیئر کی بے چینی اور اضطراب میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا گیا۔ وہ اٹھا اور پرنسس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ لگتا تھا کہ اس سے آنسوؤں کا یہ منظر برداشت نہیں ہو سکے گا بلکہ اس کے اپنے آنسو چھلک پڑیں گے۔

''پرنسس، اپنے آپ کو یوں ہلکان نہ کرو، تمھیں وہم ہو گیا ہے کیونکہ — میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، مجھے خود تجربہ ہو چکا ہے — وجہ یہ ہے — اس کا سبب یہ ہے — نہیں، معافی چاہتا ہوں۔ میں ٹھہرا باہر کا آدمی، میرا یہاں کیا کام۔ آپ خواہ مخواہ پریشان نہ ہوں... خدا حافظ۔''

پرنس آندرے نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔
''نہیں، پیئر، ذرا ٹھہرو۔ پرنس اتنی شفیق ہیں کہ وہ یہ قطعاً نہیں چاہیں گی کہ مجھے تمھاری صحبت میں جو ایک شام گزارنے کا موقع ملا ہے، وہ مجھے اس سے محروم کر دیں۔''
''ہونہہ۔ یہ بس اپنے بارے میں ہی سوچتے ہیں!'' پرنس نے چلا کر کہا۔ اب اسے اتنا شدید غصہ آ چکا تھا کہ وہ بے اختیار رونے لگی۔
''لسا!'' پرنس آندرے نے اتنی بلند آواز سے پکارا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کے صبر کا پیمانہ چھلک چکا ہے۔
اور پرنس کا خوبصورت ننھا منا چہرہ، جو گلہری کے چہرے سے مشابہ ہو گیا تھا، اچانک تبدیل ہو گیا۔ اب وہاں وحشت اور خوف کے سائے لہرا رہے تھے، اس کی حالت رقت انگیز تھی اور کہہ رہی تھی کہ مجھ پر ترس کھاؤ۔ اس کی خوش نما آنکھیں اپنے شوہر کی جانب یوں دیکھ رہی تھیں جیسے اس پر اس کا اعتبار اٹھ گیا ہو۔ اور اس کے چہرے پر وہی ڈر اور ندامت چھا گئی جس کا مظاہرہ وہ کتا کرتا ہے جو اپنی مضمحل دم تیزی لیکن ناتوانی سے گھمانے لگتا ہے۔
"Mon Dieu, mon Dieu"* وہ بڑبڑائی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنی سکرٹ سنبھالی، اپنے خاوند کی طرف بڑھی اور اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔
''لسا، bon soir!*'' وہ بولا، اٹھا اور اس نے یوں نستعلیق انداز سے اس کے ہاتھ کو چوما جیسے وہ اس کی بیوی نہیں، پرائی عورت ہو۔

❖

دونوں دوست خاموش رہے۔ ان میں سے کوئی بھی مہر سکوت توڑنا نہیں چاہتا تھا۔ وقتاً فوقتاً پیئر پرنس آندرے پر چھچھلتی نظر ڈال لیتا۔ پرنس اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی پیشانی سہلاتا رہا۔
''چلو چلیں اور کچھ کھا پی لیں،'' اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور دروازے کی جانب چل پڑا۔

وہ ٹھاٹ دار ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ اس کی حال ہی میں از سر نو تزئین ہوئی تھی اور اس پر پانی کی طرح روپیہ بہایا گیا تھا۔ رومالوں (napkins) سے لے کر چاندی، چینی اور بلور کے ظروف تک، ہر چیز پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ میں بالکل تازہ وارد ہوں اور بالکل ویسی ہوں جیسی نوبیاہتا جوڑوں کے گھر ہونا چاہیے۔ کھانا ابھی جاری تھا کہ پرنس آندرے نے کہنی میز پر ٹکائی اور وہ ایک ایسے شخص کی طرح، جو مدتوں سے جل بھن رہا ہو اور اب اچانک اپنے شکوے شکایتوں کا دفتر کھولنے پر تل گیا ہو، بولنے لگا۔ اس کے لہجے میں اعصابی چڑچڑا پن تھا اور یہ

* میرے آقا، میرے دیوتا!
* شب بخیر!

ایک ایسی چیز تھی جو اس سے قبل پیئر کے مشاہدے میں نہیں آئی تھی۔

''میرے دوست، کبھی شادی کا نام نہ لینا۔ میرا تمھیں یہ مشورہ ہے کہ کانوں کو ہاتھ لگا لو اور اس وقت تک شادی کے قریب بھی نہ پھٹکو جب تک اپنے آپ سے یہ نہ کہہ سکو کہ جو کچھ مجھ سے ہو سکتا تھا، میں نے کر لیا ہے۔ اور اس وقت کا انتظار کرو جب اس عورت کے لیے، جسے تم نے اپنا جیون ساتھی بنانے کے لیے منتخب کیا ہے، تمھارے دل میں پیار نام کی کوئی چیز باقی نہ رہے اور اس کا ظاہر و باطن پوری طرح تم پر عیاں نہ ہو جائے۔ بصورت دیگر تم اتنی زبردست اور اذیت ناک غلطی کا ارتکاب کر بیٹھو گے کہ اس کا مداوا تمھارے بس میں نہیں رہے گا۔ جب تم بوڑھے ہو جاؤ، تمھارے قواء مضمحل ہو جائیں، کام کے رہو نہ کاج کے، پھر بے شک شادی کر لو۔ ورنہ تم میں جتنی بھی خوبیاں، صلاحیتیں اور اعلیٰ خصوصیات ہیں، ضائع ہو جائیں گی۔ معمولی معمولی باتیں ان کا کچومر نکال دیں گی۔ یہ ٹکر ٹکر میرے منہ کی طرف کیوں دیکھ رہے ہو؟ میں سچ عرض کر رہا ہوں، قطعاً کسی مبالغے سے کام نہیں لے رہا۔ اگر تم سمجھتے ہو کہ مستقبل میں تم کوئی معرکہ سرانجام دے سکتے ہو، تو قدم قدم پر تمھیں یہ احساس ہوگا کہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے، ہر دروازہ بند ہو گیا ہے، صرف ایک دروازہ کھلا رہ گیا ہے اور وہ ڈرائنگ روم کا دروازہ ہے۔ وہاں تم اپنے آپ کو کسی درباری چمچے یا کسی گھامڑ کی سطح پر پاؤ گے... خیر، اس معاملے میں مزید کیا کہا جا سکتا ہے؟...'' اور اس نے زور زور سے اپنے بازو فضا میں لہرائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چھوڑو، اس مسئلے پر مٹی ڈالو۔

پیئر نے اپنا چشمہ اتار دیا۔ اس سے اس کے چہرے کی شکل تبدیل ہو گئی اور اب وہ پہلے سے بھی زیادہ شفیق اور نیک طینت دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنے دوست کو بہ نگاہ تعجب دیکھ رہا تھا۔

''میری بیوی،'' پرنس آندرے نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ''میری بیوی نہایت نفیس خاتون ہے۔ اس کا شمار ان محدودے چند خواتین میں کیا جا سکتا ہے جن کے متعلق یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاتھوں میں ان کے مردوں کا ناموس محفوظ ہے لیکن میں خداوند کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اس وقت میری سب سے بڑی آرزو یہ ہے کہ کاش میں شادی شدہ نہ ہوتا! اس مقصد کے لیے میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں۔ تم پہلے اور واحد شخص ہو جس کے سامنے میں نے اپنا سینہ کھول کر رکھ دیا ہے اور وہ بھی اس لیے کیونکہ میں تمھیں پسند کرتا ہوں۔''

جب وہ یہ باتیں کر رہا تھا اس کے اور اس بلکونسکی کے مابین مشابہت کم سے کم تر ہوتی جا رہی تھی، جو نیم بند آنکھوں کے ساتھ آنا پاولونا کی کرسی پر آرام سے پاؤں پسارے بیٹھا اور نیم والیوں سے فرانسیسی کلمات کی جگالی کر رہا تھا۔ اب اس کے پچکے ہوئے گالوں کا رواں رواں اعصابی توانائی کے ساتھ تھرتھرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں، جن میں ازاں پیشتر زندگی کی حرارت بجھی ہوئی نظر آتی تھی، اب خیرہ کن روشنی سے معمور نظر آ رہی تھیں۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ عام حالات میں چاہے وہ کتنا ہی بے جان کیوں نہ نظر آئے، لیکن جب چڑچڑاپن اس پر سوار ہوتا ہے، وہ بے حد قوی اور توانا دکھائی دینے لگتا ہے۔

''میں اس قسم کی گفتگو کیوں کر رہا ہوں، تم نہیں سمجھ سکو گے،'' اس نے اپنے سلسلۂ کلام کو آگے بڑھاتے

ہوئے کہا، ''لیکن تم سمجھو تو جانو کہ یہی میری زندگی کی کہانی ہے۔ تم بونا پارٹ اور اس کے عروج کی باتیں کرتے ہو۔'' (حالانکہ پیئر نے بونا پارٹ کا بالکل ذکر نہیں کیا تھا) ''تم بونا پارٹ کی باتیں کرتے ہو— جب وہ اپنے حصول مقصد کے لیے جدوجہد میں مصروف تھا، وہ قدم بہ قدم آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں نہیں بندھے تھے، وہ آزاد تھا۔ اپنے مقصد کے علاوہ اسے کسی اور چیز کی بابت سوچنا نہیں ہوتا تھا اور اس نے اپنا مقصد حاصل کر لیا۔ لیکن ایک مرتبہ تم اپنے آپ کو کسی عورت کے ساتھ نتھی کر لو، پھر سمجھ لو کہ تمھارے ہاتھ پاؤں زنجیروں میں جکڑ گئے۔۔ تمھاری آزادی چھن گئی۔ تمھاری آرزوئیں اور امنگیں، تمھارے جذبے اور صلاحیتیں، تمھارے لیے بھاری بوجھ بن جاتی ہیں اور تمھیں ہلکان کیے دیتی ہیں، تمھیں زندہ درگور کر دیتی ہیں اور تم محض کفِ افسوس ملتے رہتے ہو کہ ہائے یہ میں نے کیا کیا۔ ڈرائنگ روم، اناپ شناپ باتیں، بال، خود بینی و خود پسندی، بے ہودگیاں اور ہرزہ سرائیاں— یہ ہے وہ طلسمی حلقہ جس نے میرے اردگرد حصار قائم کر رکھا ہے اور جس سے رہائی پانا میرے لیے امر محال ہے۔ اب جب کہ میں جنگ — عظیم ترین جنگ جو کبھی برپا ہوئی ہے— میں شرکت کے لیے پر تول رہا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ میں جاہلِ مطلق ہوں اور میں کسی کام کے لیے موزوں نہیں۔ اس وقت میری شہرت یہ ہے کہ میری شخصیت دل آویز ہے، میں نکتہ رس اور بذلہ سنج ہوں، میرے کاٹ دار جملوں کا جواب نہیں۔'' پرنس آندرے کی زبان قینچی کی طرح رواں دواں تھی۔ ''اور آنّا پاولونا کے ڈرائنگ روم میں ہر کس و ناکس میری باتیں غور سے سنتا ہے۔ اور یہ عقل سے کورا اعلیٰ طبقہ جس کے بغیر میری بیوی زندہ نہیں رہ سکتی اور یہ خواتین— کاش تمھیں علم ہوتا کہ یہ نازک مزاج اور نفیس الطبع خواتین، بلکہ عمومی اعتبار سے تمام عورتیں، کیا ہوتی ہیں! میرے والد بالکل بجا فرماتے ہیں کہ عورتیں ہر معاملے میں خود غرض، خود بین و خود پسند، کند ذہن اور گھٹیا ذہنیت کی مالک ہوتی ہیں— جب یہ اپنی اصلی فطرت سے پردہ اٹھاتی ہیں تو ان کا یہی روپ سامنے آتا ہے۔ جب یہ محافل میں اٹھتی بیٹھتی ہیں تو احساس ہوتا ہے کہ ان میں کچھ نہ کچھ گہرائی اور گیرائی ضرور ہے لیکن حقیقتاً وہ بالکل خالی، تہی اور کوری ہوتی ہیں۔ نہیں، میرے عزیز دوست، شادی مت کرو،'' پرنس آندرے نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے یہ بات بہت عجیب بلکہ خلاف عقل معلوم ہوتی ہے،'' پیئر نے جواب دیا۔ ''کہ تم— تم اپنے آپ کو نااہل گردانتے ہو اور اپنے بارے میں یہ تصور کرنے لگے ہو کہ تمھاری زندگی تباہ و برباد ہو گئی ہے۔ ابھی تو تمھارے سامنے سارے راستے کھلے ہیں، سارے راستے اور تم—''

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی لیکن اس کا لہجہ غمازی کر رہا تھا کہ اپنے دوست کی اس کے دل میں کتنی قدر ہے اور وہ مستقبل میں اس کی ذات سے کتنی امیدیں وابستہ کیے ہوئے ہے۔

''یہ اس قسم کی گفتگو کیوں کر رہا ہے؟'' پیئر ورطۂ حیرت میں گم تھا۔ چونکہ اسے اس کی ذات ان تمام خوبیوں سے، جنھیں ایک لفظ میں قوت ارادی کہا جا سکتا ہے، بدرجہ اتم متصف نظر آتی تھی جب کہ وہ خود ان سے تہی دامن تھا، اس لیے وہ اسے نمونۂ کامل تصور کرتا تھا۔ اسے سب سے زیادہ تعجب اس بات پر ہوتا تھا کہ پرنس آندرے ہر قسم

کے لوگوں میں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی شعبۂ حیات سے ہو، با آسانی اور بلا جھجک گھل مل جاتا ہے، اس کا حافظہ غضب کا ہے، اس کی علمیت مسلمہ ہے (وہ سب کچھ پڑھ چکا تھا، سب کچھ جانتا تھا اور ہر چیز کے بارے میں اپنی رائے رکھتا تھا) اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اسے کام کرنے اور مطالعے میں جت جانے کا ہنر بھی آتا ہے اور اس کے لیے ہمت و حوصلے سے بھی بہرہ ور ہے۔ اور اگر کبھی اس کے ذہن میں یہ بات آئی بھی کہ جس قسم کی فلسفیانہ موشگافیوں اور خیال آرائیوں کی خود اسے خاص طور پر لت پڑی ہوئی تھی، آندرے کو ان میں کوئی درک نہیں، تو وہ اسے کوئی بڑی خامی نہیں سمجھتا تھا بلکہ قوت کی علامت تصور کرتا تھا۔

جس طرح مشین کے پہیوں کو صحیح اور ہموار طریقے سے چلانے کے لیے انھیں تیل دینا ضروری ہوتا ہے، اس طرح کسی شخص کے ساتھ آپ کے تعلقات خواہ کتنے ہی دوستانہ اور الجھاؤ سے پاک کیوں نہ ہوں، خوشامد و تملق اور تعریف و توصیف کے بغیر کام نہیں بنتا۔

''میرا بیڑا تو غرق ہو ہی چکا ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''پھر میرے متعلق ہی گفتگو کیوں؟ آؤ، اب تمھارے بارے میں باتیں کریں۔'' اس نے خاموشی کے مختصر لمحے کے بعد پھر کہنا شروع کیا۔ اپنے اطمینان بخش خیالات پر وہ مسکرا رہا تھا۔

اس کی مسکراہٹ آناً فاناً پیئر کے چہرے پر منعکس ہوگئی۔

''میرے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے ہے ہی کیا؟'' پیئر نے بے فکر اور پر مسرت انداز سے مسکراتے اور اپنے ہونٹ نیم وا کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کیا ہوں؟ یہی نا کہ تخم حرام!'' اچانک اسے شرم محسوس ہوئی اور اس کا چہرہ عنابی ہوگیا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اسے یہ کلمہ ادا کرنے کے لیے بڑی ہمت سے کام لینا پڑا تھا۔ ''نہ نام نہ مال۔ اور سچی بات یہ ہے۔۔۔'' لیکن اس نے یہ بتانے سے گریز کیا کہ سچی بات کیا تھی۔ ''فی الحال میں آزاد ہوں اور خوب لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ صرف اتنی بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر میں کروں کیا۔ اور اسی بارے میں تم سے سنجیدگی سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔''

پرنس آندرے نے اسے شفقت آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ اگرچہ اس کی نظریں محبت اور مروت سے معمور تھیں لیکن وہ یہ غمازی بھی کر رہی تھیں کہ اسے اپنی برتری کا بخوبی احساس ہے۔

''تم مجھے بہت عزیز ہو، خاص طور پر اس لیے کیونکہ ہمارے حلقۂ احباب میں تم واحد جیتے جاگتے انسان ہو۔ ہاں، تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ تم میں کوئی کمی نہیں۔ تم جو (پیشہ) چاہے، منتخب کر لو، کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ تم ہر جگہ پورے اترو گے۔ ہاں، صرف ایک کام کرو۔ صرف ان کوراگنوں (Kuragins) سے ملنا جلنا اور ان کے طور طریقے برتنا چھوڑ دو۔ یہ لہو و لعب، بدکاری، بے اعتدالی، غیر معمولی شراب نوشی اور اس قسم کی دیگر باتیں تمھیں زیب نہیں دیتیں۔۔۔''

''عزیز دوست، کیا یہ میرے بس کی بات ہے؟'' پیئر نے کندھے اچکاتے ہوئے فرانسیسی میں کہا۔ ''عورتیں،

مائی ڈیئر، عورتیں!"

"میں سمجھا نہیں۔" پرنس آندرے نے ترت جواب دیا۔ "اگر عورتیں مہذب اور عزت مآب ہوں، تو اور بات ہے لیکن جن عورتوں۔۔ عورتیں اور شراب۔۔ کے ساتھ کوراگن کا میل جول ہے، لاحول ولاقوۃ، میری سمجھ سے وہ بالا ہیں۔"

پیئر پرنس واسیلی کے ہاں مقیم تھا اور اس کے بیٹے اناطول کی عیاشیوں میں برابر کا شریک ہوتا تھا۔ یہ وہی اناطول تھا جسے سدھارنے کے لیے وہ اس کی شادی پرنس آندرے کی ہمشیرہ کے ساتھ طے کرانے کے منصوبے باندھ رہے تھے۔

"تمھیں معلوم ہے؟" پیئر نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے ابھی ابھی اسے کوئی بہت عمدہ خیال سوجھا ہو۔ "میں بہت سنجیدہ ہوں، ہنسنے کی بات نہیں۔ میں بہت دیر سے سوچ رہا ہوں کہ اس قسم کی زندگی (جو میں اور اناطول گزار رہے ہیں) میں مناسب طریقے سے سوچنا اور کسی نتیجے پر پہنچنا ناممکن ہے۔ میرا سر چکرانے لگا ہے اور میرے پاس جو رقم تھی، وہ ضائع ہو چکی ہے۔۔ اس نے مجھے آج شام بھی مدعو کیا تھا لیکن میں جاؤں گا نہیں۔"

"کیا تم اپنی عزت کی قسم کھا کر وعدہ کرتے ہو کہ تم نہیں جاؤ گے؟"

"عزت کی قسم۔"

❖

جب پیئر اپنے دوست سے رخصت ہوا، رات کا ایک سے زیادہ بج چکا تھا اور یہ جون کی ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب پیٹرزبرگ کا آسمان تاباں و درخشاں ہوتا ہے۔ اس نے گھوڑا گاڑی پکڑی۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سیدھا گھر جائے گا لیکن جوں جوں وہ مکان کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا، اس خیال کی شدت اتنی ہی تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئی کہ اس قسم کی رات میں آدمی کو نیند آئے، قطعی ناممکن۔ رات رات نہیں تھی، معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی سورج غروب ہوا ہے یا صبح انگڑائی لے کر بیدار ہو رہی ہے۔ مطلع اتنا روشن تھا کہ اجاڑ گلی کوچوں میں دور دور تک سب کچھ صاف نظر آ رہا تھا۔ راستے میں اسے یاد آیا کہ اناطول کوراگن نے آج رات اپنے دوستوں کو تاش کی بازی لگانے کے لیے مدعو کیا ہے۔ اس کے بعد حسبِ معمول مے نوشی کا دور چلے گا اور انجام کار پیئر کے پسندیدہ مشغلے سے دل بہلایا جائے گا۔

اس نے سوچا۔ "چلو، کوراگن کے ہاں چلتے ہیں، مزہ آئے گا۔"

اچانک اسے یاد آیا کہ اس نے پرنس آندرے کو قول دیا تھا کہ وہ دوبارہ وہاں نہیں جائے گا۔ لیکن جیسا کہ عام طور پر ان لوگوں کی، جن کا کردار بودا ہوتا ہے، عادت ہوتی ہے، اسے بھی اس شدید خواہش نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا کہ چلو آج آخری بار عیاشی، جس کی لت میں وہ گرفتار ہو چکا تھا، کر لیں، پھر توبہ کر لیں گے۔ چنانچہ اس نے

اناطول کے ہاں جانے کا فیصلہ کرلیا۔ پھر اسے یہ خیال آیا کہ اس نے پرنس آندرے کے ساتھ جو وعدہ کیا ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں کیونکہ اس سے قبل وہ اناطول کو یہ قول دے چکا تھا کہ ''میں ضرور آؤں گا'' ''علاوہ ازیں'' وہ آپ ہی آپ دلائل دینے لگا، ''عزت کی قسم کھا کر اس قسم کے جو قول و قرار کیے جاتے ہیں، وہ محض رسمی باتیں ہوتی ہیں، ان کے کوئی خاص معنی نہیں ہوتے، خاص طور پر جب آدمی یہ سوچ کہ ہوسکتا ہے کہ کل میری روح قفس عنصری سے پرواز کر جائے یا کوئی ایسا غیر معمولی واقعہ پیش آجائے کہ عزت یا بے عزتی کا مسئلہ دھرے کا دھرا رہ جائے۔'' اس قسم کی حجت بازی، جو تمام عزائم اور فیصلوں پر لکیر پھیر دیتی ہے، پیئر کو اکثر سوجھتی رہتی تھی۔ وہ کوراگن کے ہاں چلا گیا۔

جب پیئر ہارس گارڈز کی بیرکوں کے قریب اس کشادہ مکان میں پہنچا جہاں اناطول رہائش پذیر تھا، وہ پورچ میں، جہاں روشنی ہورہی تھی، چلتا، سیڑھیاں پھلانگتا، اور دروازے میں سے، جو کھلا تھا، گزرتا مکان کے اندر داخل ہوگیا۔ استقبالیہ کمرے میں کوئی متنفس نہیں تھا۔ خالی بوتلیں، اوورکوٹ اور ربر کے بالائی جوتے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ چاروں اطراف انگوری شراب کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ پرے دور لوگوں کے باتیں کرنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

تاش کی بازی ختم ہو چکی تھی اور رات کا آخری کھانا بھی کھایا جا چکا تھا، تاہم مہمان ابھی رخصت نہیں ہوئے تھے۔ پیئر نے اپنا اوورکوٹ اتار کر ایک طرف پھینکا اور پہلے کمرے میں داخل ہوگیا۔ وہاں ابھی تک میز پر کھانے کی بچی کھچی اشیا پڑی تھیں اور باوردی خدمت گار یہ سمجھ کر کہ اب اسے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے، چوری چوری گلاسوں کی تلچھٹ پینے میں مصروف تھا۔ اس سے اگلے کمرے میں ہنگامہ ہائے وہو برپا تھا۔ جانی پہچانی آوازوں کے شور وغل، فلک شگاف قہقہوں اور ایک ریچھ کے غرانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ تقریباً آٹھ نو نوجوان جوش وخروش کے عالم میں ایک کھلے دریچے کے قریب ہجوم کیے ہوئے تھے۔ تین دوسرے ایک ریچھ کے ساتھ چہلیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک اس کی زنجیر کھینچ رہا اور دوسروں کو ڈرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''میں سٹیونز (Stevens) پر سو روبل لگاتا ہوں!'' ایک نے چلا کر کہا۔

''یاد رہے کہ کسی چیز کا سہارا نہیں لیا جاسکے گا!'' دوسرے نے رگیں پھلا کر کہا۔

''میں اپنی رقم دلوخوف (Dolokhov) پر لگاؤں گا،'' تیسرے کی گرج دار آواز سنائی دی۔ ''کوراگن، تم ان شرطوں کے گواہ ہو!''[26]

''بروئن* (Bruin) کو چھوڑ دو۔ شرط بندھ گئی۔''

''اسے ایک ہی سانس میں پوری بوتل چڑھانا ہوگی ورنہ وہ شرط ہار جائے گا۔''

''یاکوف (Yakov)، بوتل لاؤ! یاکوف!'' میزبان نے کہا۔ وہ دراز قد خوش شکل نوجوان تھا اور گروپ کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔ اس نے اپنا کوٹ اتارا ہوا تھا اور اس کی بڑھیا سوتی قمیص کے بٹن کھلے تھے۔ ''حضرات، ذرا

* بچوں کی اور لوک کہانیوں میں ریچھ کا نام۔

توقف کریں۔ وہ آ گیا ہے۔ ہیلو، پتر وشکا (Petrushka)، میرے پیارے دوست!'' اس نے پیئر کو آواز دی۔

ایک اور شخص کی۔ اس شخص کا قد درمیانہ اور اس کی آنکھیں نیلی اور صاف شفاف تھیں۔ آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز دوسرے اشخاص کی آوازوں سے قطعی مختلف تھی۔ جہاں باقی لوگ نشے میں دھت تھے، یہ شخص اپنے آپ میں تھا۔

''ادھر آؤ اور شرطوں کے گواہ بنو!'' وہ دریچے میں سے پکارا۔

اس شخص کا نام دلوخوف تھا۔ وہ سمیونووسکی (Semyonovsky) رجمنٹ میں کپتان تھا۔ وہ بدنام جواری اور بات بے بات ڈوئیل لڑنے کا شوقین تھا۔ وہ اناطول کے ہاں قیام پذیر تھا۔ پیئر نے چاروں اطراف نظریں گھما کر دیکھا۔ خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

''میں کچھ سمجھا نہیں۔ یہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''ٹھہرو۔ ابھی اس پر نشہ نہیں چڑھا۔ بوتل لاؤ۔'' اناطول نے میز پر سے ایک گلاس اٹھاتے اور پیئر کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

''سب سے پہلے کچھ پیو!''

پیئر ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا گلاس غٹاغٹ چڑھانے لگا۔ وہ نظریں چرا کر نشے میں دھت مہمانوں کو، جنھوں نے دریچے کے گرد و پیش دوبارہ جمگھٹا لگا لیا تھا، دیکھ رہا اور ان کی اناپ شناپ باتیں سن رہا تھا۔ اناطول بار بار اس کا گلاس بھرتا اور اس کے ساتھ ساتھ اسے بتاتا جا رہا تھا کہ دلوخوف نے بحریہ کے ایک انگریز افسر سٹیونز کے ساتھ شرط بدی ہے کہ وہ چوتھی منزل کی کھڑکی کی بیرونی چوکھٹ پر ٹانگیں نیچے لٹکا کر رم شراب کی پوری بوتل پی جائے گا۔

''میرے شیر، پیو، سب پی جاؤ، ختم کر دو،'' اناطول نے پیئر کے گلاس میں بقیہ بوتل انڈیلتے ہوئے کہا، ''ورنہ میں تمھیں بخشوں گا نہیں۔''

''نہیں، اب میں مزید نہیں پی سکتا،'' پیئر نے اناطول کو ایک طرف دھکیلتے اور دریچے کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

دلوخوف انگریز کا بازو تھامے واضح اور صحیح صحیح انداز سے شرائط کے قواعد گنوا رہا تھا۔ اس کے مخاطب زیادہ تر پیئر اور اناطول تھے۔

دلوخوف کا قد درمیانہ، بال گھونگریالے اور آنکھیں نیلی اور روشن تھیں۔ اس کی عمر تقریباً پچیس برس تھی۔ پیادہ فوج کے تمام افسروں کی طرح اس نے بھی اپنی مونچھیں صفاچٹ کرا رکھی تھیں۔ چنانچہ اس کا دہانہ، جو اس کے چہرے مہرے کا نمایاں ترین حصہ تھا، واضح انداز سے نظر آ رہا تھا۔ اس کے دہن کے خطوط نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ اس کے بالائی ہونٹ کے نوک دار درمیانی حصے نے اس کے مضبوط زیریں ہونٹ کو فیصلہ کن انداز سے بھینچ رکھا تھا اور دو مسکراہٹوں سے ملتی جلتی کوئی شے مسلسل اس کے منہ کے دونوں کناروں پر کھیل رہی تھی۔ اس

کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں سے شجاعت، جسارت، حقارت اور ذہانت ٹپک رہی تھی اور ان دونوں چیزوں نے مل کر اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کا نقش ابھار دیا تھا کہ اس کی طرف دھیان نہ دینا ناممکن تھا۔ دلوخوف کے پاس نہ دھن دولت تھی، نہ اثر ورسوخ، اور نہ سفارش۔ اور اس امر کے باوجود کہ اناطول ہزاروں روبل بے دریغ خرچ کر دیتا تھا، دلوخوف نے اس کے ساتھ رہنے کی کچھ ایسی راہ ڈھونڈ لی تھی کہ وہ تمام لوگ، جوان دونوں کو جانتے تھے۔ اور جن میں خود اناطول بھی شامل تھا۔ اناطول سے زیادہ اس کی عزت کرتے تھے۔ دلوخوف کو بھی قسم کے کھیل کھیلنا آتا تھا اور تقریباً ہمیشہ جیت بھی اسی کی ہوتی تھی۔ شراب وہ خود کتنی ہی کیوں نہ پی جائے، رہتا ہمیشہ اپنے ہوش میں تھا۔ اس زمانے میں پیٹرزبرگ کے جو لوگ اپنی شاہ خرچیوں، خرمستیوں اور تماش بینیوں کے طفیل بدنام تھے، ان میں دلوخوف اور کوراگن سرفہرست تھے۔

رم کی بوتل لائی گئی۔ دو خدمت گار کھڑکی کی چوکھٹ، جس نے بیرونی دہلیز پر کسی کے لیے بیٹھنا محال کر دیا تھا، اکھاڑ رہے تھے۔ ان کے چاروں اطراف لوگ غل غپاڑا کر رہے اور انھیں طرح طرح کے احکام دے رہے تھے۔ یوں وہ بے چارے خاصی گھبراہٹ اور خوف زدگی کا شکار ہو رہے تھے اور انھیں اپنا کام کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔

اناطول نے حسب عادت گردن اکڑائی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا کھڑکی کی جانب چل پڑا۔ اس کا شدت سے جی چاہ رہا تھا کہ جو چیز بھی اس کے ہاتھ آئے، اسے وہ توڑ کر کرچی کرچی کر دے۔ اس نے خدمت گاروں کو دھکا دے کر ایک طرف کر دیا اور خود کھڑکی کے پٹ پر ہاتھ ڈال دیا لیکن پٹ تھا کہ اکھڑتا ہی نہیں تھا۔ اس نے پٹ کے ایک خانے پر بھرپور وار کیا اور اس کے پرخچے اڑا دیے۔

''سموں[27]، اب تم زور لگاؤ،'' اس نے پیئر سے مخاطب ہو کر کہا۔

پیئر نے کھڑکی کی افقی سلاخ پکڑی، زور سے کھینچی اور بلوط کا چوکھٹا دھڑام دھڑام نیچے آ گرا۔

''اسے باہر پھینک دو ورنہ لوگ کہیں گے کہ میں نے اس کا سہارا لیا تھا،'' دلوخوف نے کہا۔

''تو یہ انگریز ڈوں کی لے رہا ہے؟ ہونہہ؟... سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟'' اناطول نے پوچھا۔

''بالکل،'' پیئر نے جواب دیا۔ اس کی نگاہیں دلوخوف پر جمی ہوئی تھیں جس نے رم کی بوتل اٹھائی تھی اور کھڑکی کی جانب جا رہا تھا جس میں فلک کی روشنی، جو صبح کے دھندلکے اور طلوع آفتاب کی سرخی کا آمیزہ تھی، نظر آ رہی تھی۔

ہاتھ میں رم کی بوتل تھامے دلوخوف نے جست لگائی اور کھڑکی کی اندرونی چوکھٹ پر پہنچ گیا۔

''سنو!'' اس نے کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑے ہوتے اور کمرے کی جانب منہ کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

سب لوگ خاموش ہو گئے۔

''میں شرط لگاتا ہوں،'' وہ فرانسیسی میں تقریر جھاڑ رہا تھا تا کہ انگریز اس کی بات سمجھ سکے لیکن اس کی

فرانسیسی واجبی سی تھی۔ ''میں شرط لگاتا ہوں پچاس شاہی — یا تم اسے سو کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے انگریز سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

''نہیں۔ پچاس،'' انگریز نے جواب دیا۔

''بہت اچھا! پھر پچاس ہی سہی — کہ میں کھڑکی کے باہر اس جگہ (وہ نیچے جھکا اور اس نے ڈھلوان چوکھٹ کی جانب اشارہ کیا) بیٹھ کر اور کسی چیز کا سہارا لیے بغیر رم کی یہ پوری بوتل منہ سے ہٹائے بغیر پی جاؤں گا.. ٹھیک ہے؟''

''بالکل ٹھیک،'' انگریز نے جواب دیا۔

اناطول انگریز کی طرف مڑا، اس نے اس کے کوٹ کا بٹن پکڑا اور اس کی جانب نیچے (انگریز کوتاہ قد تھا) دیکھتے ہوئے انگریزی میں شرط کے قواعد دہرانے لگا۔

''ٹھہرو!'' دلوخوف نے چلا کر کہا۔ اس نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے بوتل کھڑکی کے ایک جانب ٹکرا دی۔ ''ٹھہرو، کوراگن، میری بات غور سے سنو۔ اگر کوئی اور شخص یہ کام کر دکھائے گا، میں اسے پورے سو دوں گا۔ سمجھ گئے؟''

انگریز نے اپنے سر کو محض جنبش دینے پر اکتفا کیا لیکن اس نے یہ بالکل ظاہر نہ ہونے دیا کہ اسے یہ شرط قبول ہے یا نہیں۔ اناطول ابھی تک اس کے کوٹ کا بٹن پکڑے ہوئے تھا اور اس امر کے باوجود کہ انگریز اپنے سر کی جنبش سے بار بار یہ واضح کر رہا تھا کہ وہ سمجھ گیا ہے، دلوخوف نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کا انگریزی میں ترجمہ کرتا رہا۔

چھریرے بدن کا ایک نوجوان، جو لائف گارڈز میں ہوزار افسر تھا اور جو ساری شام جوئے میں رقم ہارتا رہا تھا، کھڑکی کی اندرونی چوکھٹ پر جا چڑھا، اس نے اپنا سر باہر نکالا اور نیچے جھانکنے لگا۔

''او...ہوا!'' جب اس نے نیچے پتھریلی گزرگاہ پر نظر دوڑائی، اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

''بکواس بند کرو!'' دلوخوف دھاڑا اور اس نے اسے یوں دھکا دیا کہ اس کے پاؤں اس کے مہمیزوں کی خاردار پھرکیوں میں پھنس گئے اور اس نے نہایت بے ہنگم انداز سے کمرے میں چھلانگ لگا دی۔

دلوخوف نے بوتل کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھ دی جہاں سے اسے اٹھانا آسان ہوگا۔ پھر وہ نہایت آہستگی اور احتیاط کے ساتھ دریچے کے اندر رینگنے لگا۔ وہ نیچے بیٹھا، اپنی ٹانگیں لٹکائیں اور اس نے اپنے ہاتھوں سے کھڑکی کے دونوں پہلوؤں کو مضبوطی سے تھام کر اپنی پوزیشن درست کی۔ پہلے وہ قدرے دائیں، پھر بائیں گھوما۔ اس کے بعد اس نے اپنے ہاتھ چھوڑے اور بوتل اٹھالی۔ اناطول دو موم بتیاں لے آیا اور اس نے انھیں چوکھٹ پر جما دیا حالانکہ وہاں پہلے ہی کافی روشنی تھی۔ سفید قمیص میں لپٹی ہوئی دلوخوف کی پشت اور اس کا گھونگریالا سر دونوں اطراف سے روشن ہو گئے۔ سبھی لوگ کھڑکی کے گرد ہجوم بنا کر کھڑے ہو گئے اور انگریز اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ پیئر

مسکرا رہا تھا لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ ایک شخص، جو عمر میں دوسروں سے بڑا تھا، آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر خفگی اور خوف کے آثار ہویدا تھے۔ وہ دلوخوف کی قمیص پر ہاتھ ڈالنا چاہتا تھا۔

''حضرات، یہ نرا پاگل ہے!'' اس قدرے سمجھدار شخص نے باآواز بلند کہا۔ ''یہ آدمی اپنے آپ کو موت کے کنوئیں میں دھکیل رہا ہے۔''

اناطول نے اسے روک لیا۔

''اسے مت چھوؤ۔ تم اسے گھبرا دو گے۔ وہ نیچے گر پڑے گا اور ہلاک ہو جائے گا۔ پھر کیا ہو گا؟ — ہونہہ؟''

دلوخوف نے چاروں اطراف نظریں دوڑائیں۔ اس نے ایک بار پھر اپنے دونوں ہاتھوں کا سہارا لیا اور ٹھیک ہو کر بیٹھ گیا۔

''اگر پھر کسی نے دخل در معقولات دیا'' اس نے اپنے پتلے اور بھینچے ہوئے ہونٹوں سے الفاظ چبا چبا کر اور آہستہ آہستہ ادا کرتے ہوئے کہا، ''میں پلک جھپکنے میں اسے اٹھا کر نیچے پھینک دوں گا۔ سمجھے؟''

ان الفاظ کے ساتھ اس نے دوبارہ اپنا جسم گھمایا، ہاتھ نیچے گرائے، بوتل اٹھائی اور اسے اپنے لبوں تک لے گیا۔ تب اس نے اپنا سر پیچھے کی طرف جھٹکا اور اپنا توازن درست کرنے کے لیے اپنا خالی ہاتھ اوپر اٹھایا۔ ایک وردی پوش خدمت گار، جو شکستہ شیشے کے ٹکڑے اکٹھا کرنے نیچے جھکا ہوا تھا، اپنی نگاہیں کھڑکی اور دلوخوف سے ہٹائے بنا، اسی حالت میں کھڑا رہا۔ اناطول تن کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حیرت و تعجب سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ انگریز ہونٹ بھینچے ایک جانب کھڑا یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ آدمی، جو اس معاملے کو ختم کرنا چاہتا تھا، کمرے کے ایک کونے میں بھاگ گیا، دھم سے صوفے پر گرا اور اس نے اپنا منہ دیوار کی طرف کر لیا۔ پیئر نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ اگرچہ اس کے چہرے پر خوف اور دہشت کی لکیریں صاف پڑھی جا سکتی تھیں، لیکن ہلکی پھلکی مسکراہٹ یا اس سے ملتی جلتی چیز اب بھی وہاں موجود تھی۔ کمرے میں مکمل سکوت چھایا ہوا تھا۔ پیئر نے ہاتھ آنکھوں سے اٹھائے۔ دلوخوف ابھی تک بعینہٖ اسی حالت میں بیٹھا تھا تاہم اس کا سر اتنا پیچھے کی طرف ڈھلک گیا تھا کہ اس کے گھونگریالے بال اس کی قمیص کے کالر کو چھونے لگے تھے۔ جس ہاتھ میں وہ بوتل پکڑے ہوئے تھا، وہ بتدریج اوپر، مزید اوپر اٹھنے لگا۔ اعصابی تناؤ کی وجہ سے اس کا ہاتھ کانپنے لگا۔ جوں جوں بوتل اوپر اٹھتی گئی، توں توں اس کا سر پیچھے ڈھلکتا گیا۔ دیکھنے والے دیکھ رہے تھے کہ بوتل خالی ہوتی جا رہی ہے۔

''اس کام میں اتنی دیر کیوں ہو رہی ہے؟'' پیئر سوچ رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ نصف سے زیادہ گھنٹہ بیت چکا ہے۔

دلوخوف کی پشت پر اچانک جھرجھری آ گئی اور وحشت کے عالم میں اس کا ہاتھ کپکپانے لگا۔ جس ڈھلوان چوکھٹ پر وہ بیٹھا تھا، اس پر اپنے تمام جسم کو آگے پیچھے کھسکانے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ چنانچہ وہ کھسکنے لگا۔ اعصابی تناؤ سے اس کا سر اور بازو پہلے سے بھی زیادہ کپکپانے لگے۔ اس کا ایک بازو یوں گھوما جیسے وہ کھڑکی کی

چوکھٹ پکڑنا چاہتا ہو لیکن وہ دوبارہ پیچھے ہٹ گیا۔ پیئر نے ایک بار پھر اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں اور تہیہ کرنے لگا کہ اب وہ انھیں دوبارہ نہیں کھولے گا۔ اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کے چاروں اطراف ہل چل برپا ہے۔ اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ دلوخوف کھڑکی کی چوکھٹ پر کھڑا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا لیکن اس کے روم روم سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔

''خالی!''

اس نے بوتل انگریز کی طرف اچھال دی جس نے بہت صفائی کے ساتھ اسے پکڑ لیا۔ دلوخوف نے نیچے چھلانگ لگا دی۔ اس کے منہ سے رم کی سخت بو آ رہی تھی۔

''واہ، واہ! شاباش!... دل گردے والا بچہ ہے!... شرط جیتنے کا مزہ آ گیا!... اب بھی مزہ نہ آیا، پھر لعنت ہے!'' چاروں اطراف سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

انگریز نے اپنا بٹوا نکالا اور رقم گننے لگا۔ دلوخوف کی بھویں تن گئیں لیکن اس نے اپنی زبان بند رکھی۔ پیئر لپک کر کھڑکی پر چڑھ گیا۔

''حضرات، ہے کوئی مائی کا لال، جو مجھ سے شرط لگانا چاہتا ہو! میں بھی یہ کر دکھاؤں گا!'' اس نے اچانک چلا کر کہا۔ ''چلیں، شرط ورط چھوڑیں۔ میں ویسے ہی کیے دیتا ہوں۔ ان سے کہو کہ بوتل لائیں۔ میں کروں گا۔ بوتل منگائیں!''

''آنے دو۔ اسے کرنے دو!'' دلوخوف نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟... تمھیں یہ کام کرنے کون دے گا؟... سیڑھیوں پر کھڑا ہوا نہیں جاتا، بے چارے کا ویسے ہی سر گھومنے لگتا ہے!'' یک بارگی مختلف آوازیں سنائی دیں۔

''مجھے رم کی بوتل پکڑائیں۔ میں اسے غٹا غٹ پی جاؤں گا!'' پیئر نے چلا کر کہا۔ وہ ایک میز کی طرف آیا اور شرابیوں کی طرح اسے دھڑا دھڑ پیٹنے لگا۔ اس کے بعد وہ دوبارہ چوکھٹ پر چڑھنے لگا۔

انھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا لیکن وہ اتنا تگڑا تھا کہ کسی کے بھی قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ جو بھی اس کے قریب گیا، اس نے اسے اٹھا کر دور پھینک دیا۔

''ٹھہرو۔ تم لوگ یوں اسے لگام نہیں دے سکو گے،'' اناطول نے کہا۔ ''ٹھہرو۔ صرف میں اسے الو بنا سکتا ہوں... سنو!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''یہاں ہم تمھیں ضرور چڑھائیں گے لیکن آج ہم سب۔ کے گھر جا رہے ہیں۔''

''پھر انتظار کس بات کا؟ چلو، ابھی چلو!'' پیئر نے چلا کر کہا۔ ''آؤ چلیں۔ اور بروعن کو بھی اپنے ساتھ لے چلتے ہیں۔''

اس نے ریچھ کو اپنے بازوؤں میں پکڑا اور اس کے ساتھ کمرے میں ناچنے لگا۔

7

آنناپاولوونا کی محفل میں پرنس واسیلی نے پرنس دروبتیسکایا کے ساتھ، جس نے اس سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے التجا کی تھی، جو وعدہ کیا تھا، وہ اس نے ایفا کر دیا۔ معاملہ امپراطور کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ استثنا کی اجازت مل گئی اور بورس کو جونیئر کمشنڈ افسر کی حیثیت سے سمیونووسکی گارڈز میں تبدیل کر دیا گیا۔ تاہم آننا میخائیلوونا کے تمام حیلے اور کوششیں اسے کوتوزوف کا ایجوٹنٹ یا اس کے عملے کا رکن مقرر کرانے میں ناکام رہیں۔ جس شام آنناپاولوونا کے ہاں محفل منعقد ہوئی تھی، اس کے چند روز بعد آننا میخائیلوونا ماسکو لوٹ آئی اور سیدھی اپنے کھاتے پیتے رشتے داروں رستوفوں[28] کے ہاں جا دھمکی۔ وہ جب بھی ماسکو وارد ہوتی، اس کا قیام لامحالہ انھیں کے ہاں ہوا کرتا تھا اور اس کا لخت جگر اور نور چشم بوریزکا، جو حال ہی میں عام فوج میں بھرتی ہوا تھا اور جس کا جونیئر کمشنڈ افسر کی حیثیت سے پچھلے دنوں گارڈز میں تبادلہ ہوا تھا، انھیں رستوفوں کے ہاں پل بڑھ کر جوان ہوا تھا کیونکہ وہ چھٹ پنے سے ہی ان کے ہاں مقیم تھا۔ گارڈز ازاں پیشتر ہی دس اگست کو پیٹرز برگ روانہ ہو چکے تھے لیکن اس کا صاحب زادہ ابھی تک ماسکو میں قیام پذیر تھا کیونکہ اس نے اپنی ضروریات کی اشیا خریدنا تھیں۔ اس نے بعد میں گارڈز کے دستوں میں شامل ہونا تھا جب انھوں نے رادزیوی لوف[29] کی طرف کوچ کرنا تھا۔

رستوف ماں اور چھوٹی بیٹی — دونوں کا نام نتالیا تھا — کا یوم نام[30] منا رہے تھے۔ صبح ہی سے ان کی گھر کی طرف، جو پوارسکایا سٹریٹ پر واقع تھا اور جس سے ماسکو کا بچہ بچہ واقف تھا، گھوڑا گاڑیوں کا ایسا تانتا بندھا تھا کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا۔ دوست احباب ماں بیٹی کو ہدیہ تہنیت پیش کرنے جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ کاؤنٹس اور اس کی خوش شکل بڑی بیٹی ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں اور مہمانوں کا خیر مقدم کر رہی تھیں۔

کاؤنٹس کی عمر تقریباً پینتالیس برس تھی۔ اس کا دبلا پتلا چہرہ شرقی قسم کا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بچے جن جن کر — وہ ایک درجن بچوں کو جنم دے چکی تھی — تھک چکی ہے۔ اس کے ٹھہر ٹھہر کر باتیں کرنے اور چلنے پھرنے کے — اس کا بنیادی سبب اس کی جسمانی کمزوری تھی — انداز نے اسے ایسا وقار عطا کر دیا تھا کہ دوسرے اس کا احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ پرنس آننا میخائیلوونا دروبتیسکایا خاندان کی رکن ہونے کی حیثیت سے مہمانوں کا استقبال اور ان کی خاطر مدارت کرنے میں ہاتھ بٹا رہی تھی۔ لڑکے لڑکیاں اس کارروائی میں شریک ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے اور عقبی کمروں میں بیٹھے تھے۔ رخصتی پر کاؤنٹ مہمانوں سے ہاتھ ملاتا، ان کے ساتھ دروازے تک آتا اور ان سب کو ڈنر میں شریک ہونے کی دعوت دیتا۔

"ma chere" یا "mon cher"* میں آپ کا بے حد ممنون ہوں، شکر گزار ہوں۔" اس بات سے قطع نظر کہ نو آمد مہمان سماجی مرتبے کے لحاظ سے اس سے چھوٹا ہے یا بڑا، وہ سب کو بلا تفریق و امتیاز ایک ہی

* دونوں کا مطلب "مائی ڈیئر" ہے۔ اول الذکر سے خواتین اور موخر الذکر سے مردوں کو مخاطب کیا جاتا ہے۔

انداز سے مخاطب کیے جار ہا تھا اور تو اور اس کے لہجے میں بھی کسی قسم کی تبدیلی نہیں آتی تھی۔ ''میں اپنی طرف سے اور اپنی دو عزیز از جان ہستیوں کی طرف سے، جن کا آج ہم نام دن منا رہے ہیں، آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ ہاں، mon cher، کھانا کھانے ضرور واپس آنا۔ اگر آپ تشریف نہ لائے تو سمجھ لیں کہ میری آپ سے ناراضی ہو گئی... ma chere، میں تمام افراد خانہ کی طرف سے آپ کو کھانے کی دعوت دیتا ہوں۔''

جب وہ یہ الفاظ دہراتا تھا، اس کے گول مٹول، ہنس مکھ، گداز اور صفا چٹ چہرے کے تیوروں میں کسی نوع کی تبدیلی نہ آتی۔ وہ سب کے ساتھ ہاتھ یکساں مضبوط انداز سے دبا کر ملاتا تھا اور ایک ہی طرح بار بار خمیدہ ہو جاتا تھا۔ جونہی وہ ایک مہمان کو رخصت کرنے کے بعد ڈرائنگ روم میں واپس آتا، کرسی کھینچ کر کسی دوسرے مہمان کے قریب، جو ابھی تک ڈرائنگ روم میں موجود ہوتا، بیٹھ جاتا۔ وہ ایک ایسے شخص کے انداز میں، جو زندگی سے پیار کرتا اور اس سے بھر پور لطف اٹھانا جانتا ہو، ہشاش بشاش اپنی ٹانگیں پسارتا، ہاتھ گھٹنوں پر رکھتا، بڑی سنجیدگی سے اپنے سر کو آگے پیچھے جھلاتا، اور کبھی روسی میں اور کبھی واجبی، لیکن خود اعتمادی سے پُر، فرانسیسی میں موسم کے بارے میں قیاس آرائی کرتا یا از خود صحت کے متعلق مشورے دینے لگتا۔ تب اس آدمی کی مانند، جو اپنا فرض نبھاتے نبھاتے خاصا تھک چکا ہو لیکن اس سے جان چھڑانے کے بجائے اسے مسلسل ادا کیے جا رہا ہو، وہ کسی اور مہمان یا مہمانوں کو دروازے تک رخصت کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا۔ وہ اپنے سر کو، جہاں صرف خال خال بال، اور وہ بھی سفید ہو چلے تھے، رہ گئے تھے، ہلکے ہلکے سہلاتا اور انھیں دوبارہ کھانے کی دعوت دیتا۔ کبھی کبھار وہ مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد استقبالیہ کمرے سے سیدھا ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے پودگھر اور نعمت خانے میں سے گزرتا، وسیع وعریض ڈائننگ روم میں، جس کا فرش سنگ مرمر کا تھا، جہاں اسی (80) مہمانوں کے لیے دسترخوان بچھایا جا رہا تھا، آ جاتا۔ وہ وردی پوش ملازموں کو چاندی اور چینی کے ظروف لاتے، انھیں میزیں آگے پیچھے کرتے اور ریشمی چادریں بچھاتے دیکھتا اور دمتری واسیلی وچ کو، جو خود بھی طبقہ شرفا سے تعلق رکھتا تھا اور اس کے تمام امور کی نگہداشت کرتا تھا، بلا بھیجتا۔

''متنکا، دھیان رکھنا، ہر چیز ویسی ہی ہونا چاہیے جیسا کہ اسے ہونا چاہیے۔ ہاں یہ ٹھیک ہے۔''

وہ طویل و عریض میز پر، جو پوری کی پوری کھولی اور بچھائی جا رہی تھی، اطمینان کی نگاہیں دوڑاتے کہتا: ''اصل چیز یہ ہے کہ آپ مہمانوں کو خدمت کس قسم کی بہم پہنچاتے ہیں۔ خیر، تمھیں پتا ہی ہے...'' اور وہ چہرے پر مطمئن مسکراہٹ سجائے واپس ڈرائنگ روم میں چلا جاتا۔

''ماریا لوونا کاراگنا (Karagina) اور ان کی دختر نیک اختر!'' کاؤنٹس کے عظیم الجثہ وردی پوش خدمت گار نے دروازے سے دھیمی آواز میں اطلاع دی۔

کاؤنٹس نے نسوار کی طلائی ڈبیا میں سے، جس پر اس کے خاوند کی تصویر نقش تھی، چٹکی بھر نسوار نکالنے سے پہلے ایک لحظہ سوچا:

''ان مہمانوں نے میرا کچومر نکال دیا ہے۔ یہ آخری مہمان ہوگی جس سے میں ملوں گی۔ یہ عورت بلا کی ملمع ساز اور ظاہر دار ہے۔'' پھر اس نے خدمت گار سے کہا: ''اسے اندر بھیج دو۔'' اس کے لہجے میں کچھ اتنی بھرپور پژمردگی تھی جیسے وہ یہ کہہ رہی ہو: ''اس سے تو بہتر تھا کہ تم مجھے شکنجے میں کس دیتے۔''

ایک بلند قامت اور تنومند خاتون، جس کے انداز میں بڑی رعونت تھی، اپنی سکرٹ سرسراتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی بیٹی تھی۔ اس کا چہرہ بیضوی اور لب متبسم تھے۔

"chere comtese!*، صدیاں بیت گئیں... آپ سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی... ادھر یہ چارپائی سے لگ گئی، بے چاری بچی... رازوموو سکیوں (Razumovskys) کے بال میں... اور کاؤنٹس اپراکسنا... میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا...''

جوشیلی اور شگفتہ نسوانی آوازیں، جو ایک دوسری کو کاٹ رہی تھیں اور ریشمی لباسوں کی سرسراہٹ اور کرسیوں کی گھس گھساہٹ میں گھل مل رہی تھیں، سنائی دیں۔ پھر اس قسم کی گفتگو شروع ہوگئی جو ایک ہی ڈگر پر چلتی رہتی ہے تاآنکہ جونہی اولین وقفہ آتا ہے، مہمان خواتین اٹھ کر کھڑی ہو جاتی ہیں، اپنی سکرٹیں سرسراتی ہیں اور کہتی ہیں: ''کتنا مزہ آیا... اماں کی طبیعت... اور کاؤنٹس اپراکسنا...'' اور وہ ایک بار پھر اپنی سکرٹیں سرسراتی، کھنکھناتی استقبالیہ کمرے کا رخ کرتی، اپنے سموری کوٹ یا چغے پہنتی اور رخصت ہو جاتی ہیں۔ گفتگو ان دنوں کے اہم ترین موضوع — امیر کبیر معمر کاؤنٹ بزوخوف (Bezukhov) کی، جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ امپراطورہ کیتھرین کے عہد کے خوش شکل ترین انسانوں میں سے تھا، علالت اور اس کے ناجائز بیٹے، پیئر کے بارے میں تھی جس نے آنناپاولوونا کی محفل شب میں بڑی ناشائستگی کا مظاہرہ کیا۔

''مجھے بے چارے کاؤنٹ پر بڑا ترس آرہا ہے،'' ایک مہمان خاتون نے کہا۔ ''ان کی صحت پہلے ہی قابل رشک نہیں تھی۔ ادھر صاحب زادے جو حرکتیں فرما رہے ہیں، ان کا صدمہ الگ! یہ باتیں ان کے لیے جان لیوا ثابت ہوں گی!''

''بھلا ہوا کیا تھا؟'' کاؤنٹس نے انجان بن کر پوچھا، حالانکہ کاؤنٹ کو جس بنا پر صدمہ اٹھانا پڑا تھا، وہ اس کے متعلق اس روز کم از کم پندرہ مرتبہ سن چکی تھی۔

''نئی تعلیم کا یہی نتیجہ نکلتا ہے!'' اس کی مہمان سہیلی نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ نوجوان ممالک غیر میں مقیم تھا، اس وقت بھی اسے کھلی ڈھیل دی گئی۔ اب میں نے سنا ہے کہ اس نے پیٹرزبرگ میں ایسی ایسی ناشدنی حرکات کی ہیں کہ توبہ ہی بھلی! اسے پولیس کی نگرانی میں شہربدر کر دیا گیا ہے۔''

''واقعی؟'' کاؤنٹس نے پوچھا۔

''بات یہ ہے کہ وہ بری صحبت میں پھنس گیا ہے،'' پرنس آننامیخائیلوونا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

* ڈیر کاؤنٹس

''لوگ کہتے ہیں کہ پتا نہیں کہ وہ، پرنس واسیلی کا فرزند اور ایک اور نوجوان، جس کا نام دلوخوف بتایا جاتا ہے، کیا قیامت برپا کرنے والے ہیں! ان میں سے دو کو اپنے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ دلوخوف کی تنزلی ہوگئی ہے، اس کی افسری چھن گئی ہے اور اب اسے فوج میں معمولی عہدے پر لگا دیا گیا ہے۔ بزوخوف کے صاحب زادے کو یہاں ماسکو بھیج دیا گیا ہے۔ جہاں تک اناطول کوراگن کا تعلق ہے، اس کے باپ نے معاملہ ٹھپ ٹھپا دیا ہے۔ تاہم اسے بھی پیٹرزبرگ سے باہر بھیجنا پڑا۔''

''یہ بہت بدذات اور لفنگے ہیں، خاص طور پر دلوخوف۔'' مہمان خاتون نے حاشیہ آرائی کی۔ ''وہ ماریا اوانوونا دلوخوا کا بیٹا ہے۔ وہ خود بہت معزز خاتون ہیں لیکن نگوڑی کے ساتھ قسمت نے کیا ہاتھ کیا! کیا آپ کبھی یہ تصور کرسکتی ہیں کہ انھوں نے حرکت کیا کی تھی؟— یہ تینوں کہیں سے ایک ریچھ پکڑ لائے، اسے انھوں نے گاڑی میں سوار کیا اور ایکٹرسوں سے ملنے چل دیے۔ پولیس کو سُن گُن ہوگئی۔ اس نے انھیں روکنا چاہا، انھوں نے الٹا پولیس مین کو ریچھ کے اوپر باندھ دیا اور دونوں کو موئیکا نہر میں دھکیل دیا۔ ریچھ، جس کے اوپر پولیس مین بندھا تھا، پانی میں تیرنے لگا۔''

''مائی ڈیئر، کیا زبردست نقشہ ہوگا اس پولیس والے کا!'' کاؤنٹ نے ہنسی سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

''اونہہ، بہت بری حالت تھی بے چارے کی! کاؤنٹ، بھلا اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

لیکن خود خواتین بھی اپنی ہنسی پر قابو نہ پاسکیں۔

''لوگوں نے بڑی مشکل سے پولیس مین کی گلوخلاصی کرائی،'' مہمان خاتون نے اپنا سلسلۂ کلام دوبارہ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''کرل ولادی مروچ بزوخوف کے صاحب زادے نے دل بہلانے کے لیے خوب طریقہ تلاش کیا!'' اس نے مزید کہا۔ ''اور لوگ کہتے ہیں کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ہوشیار ہے۔ ممالک غیر میں تعلیم دلانے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ بے شک بہت متمول ہے لیکن مجھے امید ہے کہ یہاں ماسکو میں کوئی اسے منہ نہیں لگائے گا اور کبھی اپنے ہاں مدعو نہیں کرے گا۔ کچھ لوگ میرا اس سے تعارف کرانا چاہتے تھے لیکن میں نے کورا جواب دے دیا۔ نا بابا نا! میری بیٹیاں ہیں، مجھے ان کا برا بھلا سوچنا ہے۔''

''آپ نے یہ کیوں کہا کہ وہ بہت متمول ہے؟ کاؤنٹ کے تمام بچے ناجائز ہیں،'' کاؤنٹس نے نوجوان لڑکیوں کو، جو جھٹ پٹ جھوٹ موٹ یوں بن گئیں جیسے انھوں نے کچھ سنا ہی نہیں، پرے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ پیئر بھی ولدالزنا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کے اس قسم کے بچوں کی تعداد بیس کے لگ بھگ تو ہوگی،'' مہمان خاتون نے ناک سکوڑتے ہوئے کہا۔

پرنس آنا میخائیلوونا نے گفتگو میں پھر مداخلت کی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ جتانا چاہتی تھی کہ اس کے تعلقات کا سلسلہ بہت دراز ہے اور اونچے طبقے میں جو کچھ ہوتا تھا، اس سے وہ پوری طرح باخبر ہے۔

''حق بات یہ ہے،'' اس نے معنی خیز نیم سرگوشی میں کہا۔ ''کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کی کرتوتوں سے ایک زمانہ واقف ہے۔ اسے بھی یہ معلوم نہیں کہ اس کے بچوں کی کل تعداد کتنی ہے، لیکن یہ پیئر اس کا چہیتا ہے۔''

''صرف ایک برس پہلے بڑے میاں کتنے خوش شکل تھے!'' ''کاؤنٹس نے اظہار خیال کیا۔ ''اس سے زیادہ خوش شکل مرد میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

''لیکن اب وہ بہت بدل گیا ہے،'' آنا میخائیلوونا نے کہا۔ ''لیکن جیسا کہ میں عرض کر رہی تھی، اپنی بیوی کے حوالے سے پرنس واسیلی ساری جائیداد کا واحد وارث ہے۔ تاہم کاؤنٹ کو پیئر سے، بہت لگاؤ ہے۔ اس نے اسے تعلیم دلانے کے لیے بڑے جوکھم اٹھائے بلکہ امپراطور کو بھی اس کے بارے میں درخواست ارسال کی۔ چنانچہ کسی کو یہ معلوم نہیں کہ اگر اس کا انتقال ہو گیا (اور اس کی حالت اتنی غیر ہے کہ ہر دم یہی خیال آتا ہے کہ وہ اب گیا، کہ اب گیا۔ انھوں نے پیٹرزبرگ سے ڈاکٹر لوغین (Lorrain) کو بلا بھیجا ہے)، تو اس کی بے حساب جائیداد کسے ملے گی، پیئر کو یا پرنس واسیلی کو؟ چالیس ہزار تو اس کے زرعی غلام ہیں اور لاکھوں کروڑوں روبل مستزاد! مجھے ان باتوں کا خوب علم ہے کیونکہ پرنس واسیلی نے خود مجھے بتایا تھا۔ علاوہ ازیں کرل ولادی مروچ میری امی کے چچازاد بھائی کا بیٹا ہے۔ اور وہ میرے بوریا کا دینی باپ ہے۔'' اور اس نے یہ آخری بات کچھ یوں کہی جیسے اس کے نزدیک اس کی کائی برابر بھی اہمیت نہ ہو۔

''پرنس واسیلی کل ماسکو تشریف لائے تھے،'' مہمان خاتون نے کہا۔ ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ کسی معائنے کے سلسلے میں یہاں آئے ہیں،'' مہمان خاتون نے کہا۔

''ہاں، تاہم یہ بات باہر نہیں نکلنا چاہیے،'' پرنس آنا میخائیلوونا نے کہا۔ ''معائنہ محض بہانہ ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کی حالت بہت دگرگوں ہے، وہ اسے دیکھنے چلا آیا۔''

''ma chere، آپ جو چاہیں کہتی رہیں، لیکن اس مذاق کا جواب نہیں!'' کاؤنٹ نے کہا اور جب اس نے دیکھا کہ بزرگ مہمان خاتون اس کی بات پر کوئی توجہ نہیں دے رہی، وہ نوجوان لڑکیوں سے مخاطب ہوا اور کہنے لگا: ''اس پولیس مین کی جوگت بنی ہوگی، اس کا میں خوب تصور کر سکتا ہوں۔''

اور اس کے ساتھ ہی یہ دکھانے کے لیے کہ پولیس مین کا کیا نقشہ بنا ہوگا، وہ اپنے بازو لہرانے لگا۔ اس پر ایک بار پھر ہنسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ فلک شگاف قہقہے لگانے لگا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم اس شخص کے جسم کی طرح لرزنے لگا جو ہمیشہ کھاتا بھی خوب ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یقیناً پیتا بھی ڈٹ کر ہے۔

''آپ ضرور بالضرور تشریف لائیں اور ہمارے ساتھ کھانا تناول فرمائیں،'' اس نے کہا۔

8

خاموشی چھا گئی۔

کاؤنٹس نے اپنی مہمانوں پر نظر دوڑائی۔ وہ خوش اخلاقی سے مسکرا رہی تھی لیکن اس نے یہ حقیقت چھپانے کی ذرا بھی کوشش نہ کی کہ اگر اس کی مہمان اٹھ کھڑی ہوں اور رخصت ہو جائیں، اسے قطعاً کوئی افسوس نہیں ہوگا۔ مہمان خاتون کی بیٹی پہلے ہی اپنے ڈریس کی شکنیں سیدھی کرنے لگی تھی اور وہ استفہامیہ انداز سے اپنی ماں کی جانب دیکھ رہی تھی کہ اچانک ملحقہ کمرے سے لڑکوں لڑکیوں کی دروازے کی طرف بھاگنے اور ایک کرسی کے نیچے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اتنے میں ایک تیرہ سالہ دوشیزہ، جس نے اپنی چھوٹی سی ململ کی سکرٹ کی تہوں میں کچھ چھپایا ہوا تھا، اندھا دھند بھاگتی دوڑتی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی اور کمرے کے عین درمیان میں آرکی۔ یہ بالکل عیاں تھا، وہ جس طرح سرپٹ بھاگی آئی تھی، اس کا حاصل یہ ہوا کہ وہ اپنے ارادے اور خواہش کے علی الرغم کافی دور نکل آئی۔ عین اس لمحے ایک طالب علم، جس کے کوٹ کے کالر کا رنگ قرمزی تھا، گارڈز کا ایک افسر، ایک پندرہ سالہ لڑکی اور ایک ننھا منا لڑکا، جس کا جسم بھرا بھرا اور گلابی تھا اور جو چھوٹے کوٹ میں ملبوس تھا، دروازے پر نمودار ہوئے۔

کاؤنٹ اچھل پڑا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور وہ لہراتے بل کھاتے آگے بڑھا تا کہ وہ ننھی منی دوشیزہ کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ سکے۔

''اور یہ رہی ہماری وہ گڑیا،'' اس نے ہنستے مسکراتے کہا، ''جس کا آج ہم نام دن منا رہے ہیں۔''

''ma chere، ہر کام کا وقت ہوتا ہے،'' کاؤنٹس نے مصنوعی رعب سے کہا۔ ''الیا، آپ ہمیشہ اسے بگاڑتے رہتے ہیں،'' اس نے اپنے خاوند سے مزید کہا۔

"Bon jour, ma chere, je vous felicite"* مہمان خاتون نے کہا۔

"Quelle delicieuse enfant!"** اس نے ماں سے مخاطب ہو کر کہا۔

ننھی منی دوشیزہ اتنی حسین تو نہیں تھی لیکن اس کی نس نس زندگی کی حرارت سے معمور تھی۔ اس کی آنکھیں سیاہ اور دہن فراخ تھا۔ اندھا دھند دوڑنے کے دوران میں اس کا شلوکا اس کے بچگانہ شانے سے ڈھلک گیا تھا۔ افراتفری میں کالی زلفیں پریشان ہو رہی تھیں۔ اس کے مہین بازو برہنہ تھے اور اس کی ننھی منی ٹانگیں لیس سے آراستہ پتلون میں ملفوف تھیں اور وہ اپنے پاؤں میں نیچی ایڑی کے سلیپر پہنے ہوئے تھی۔ وہ عمر کے اس دلکش دور میں سے گزر رہی تھی جب لڑکی بچی نہیں رہتی لیکن بچی ابھی نوخیز لڑکی کے روپ میں نہیں ڈھلی ہوتی۔ اپنے باپ کی بانہوں سے چھوٹ کر وہ اپنی ماں کی طرف بھاگی اور اس کی ڈانٹ ڈپٹ کی پروا کیے بغیر اس نے اپنا تمتماتا چہرہ اپنی ماں کے لیس کے کالر میں چھپالیا اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے اس نے گڑیا کے بارے میں، جو اس نے اپنی سکرٹ کی تہوں سے برآمد کی تھی، کچھ بتانے کی کوشش کی۔

''آپ دیکھتی ہیں نا؟... میری گڑیا... میمی... دیکھتی ہیں نا، وہ...''

---

* ''مائی ڈیر، تم کیسی ہو، نام دن مبارک۔''

** کتنی پیاری بچی ہے!

لیکن نتاشا سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ اسے ہر چیز بہت پر مذاق معلوم ہو رہی تھی۔ وہ بے اختیار اپنی ماں کی گود میں گر پڑی اور کچھ اس طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگی کہ متین و مہذب مہمان خاتون اس کا ساتھ دیے بغیر نہ رہ سکی۔

''اب اٹھو اور بھاگ جاؤ۔ اور ہاں، یہ اپنی ننھی منی چڑیل بھی اپنے ساتھ لیتی جاؤ'' اس کی ماں نے اسے جھوٹ موٹ کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری سب سے چھوٹی بیٹی ہے،'' اس نے مہمان خاتون کی جانب مڑ کر کہا۔

نتاشا نے اپنی ماں کے کالر سے سر باہر نکالا، اپنی ہنسی کے آنسوؤں کے بیچ میں سے اسے دیکھا اور دوبارہ اپنا چہرہ چھپالیا۔

مہمان خاتون نے، جو اس خاندانی تماشے کی تحسین کرنے پر مجبور تھی، یہی مناسب خیال کیا کہ وہ خود بھی اس میں شریک ہو جائے۔

''مائی ڈیئر، یہ تو بتاؤ'' اس نے نتاشا سے کہا، ''یہ میمی تمھاری کیا لگتی ہے؟ میرا خیال ہے کہ بیٹی ہو گی؟''

نتاشا کو اپنے بچگانہ مشغلوں کے متعلق خاتون کا سرپرستانہ لہجہ پسند نہ آیا۔ اس نے جواب تو نہ دیا، البتہ فکر مندی سے اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی۔

دریں اثنا نئی نسل کے دیگر ارکان ــ آننا میخائیلوونا کا بیٹا بورس (افسر)، کاؤنٹ کا بڑا صاحب زادہ نکولائی (طالب علم)، اس کی پندرہ سالہ بھانجی سونیا اور اس کا چھوٹا بیٹا پتروشا ــ سبھی ڈرائنگ روم میں اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ چکے تھے اور اس کوشش میں تھے، جو ان کے چہروں سے صاف عیاں ہو رہی تھی کہ ان کے جسموں کی بوٹی بوٹی سے جو شگفتگی، زندہ دلی اور بشاشت پھوٹی پڑ رہی تھی، اسے تہذیب و آداب کے دائروں میں رکھ سکیں۔ عقبی کمروں میں، جہاں سے وہ مانند آندھی بھاگتے چلے آ رہے تھے، ان کی جو گفتگو ہوتی رہی تھی، اس گفتگو سے جو یہاں ہو رہی تھی، کہیں زیادہ دلچسپ اور پر لطف تھی کیونکہ یہاں انھیں مجبوراً شہر کی گپیں اور افواہیں، موسم اور اپراکسنا کے بارے میں گفتگو سننا پڑ رہی تھی۔ چنانچہ انھیں جب بھی آپس میں نظریں ملانے کا موقع ملتا، ان کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔

دونوں نوجوان ــ افسر اور طالب علم ــ بچپن ہی سے ایک دوسرے کے دوست تھے، اور باوجود یکہ دونوں ہم عمر تھے اور دونوں خوش شکل تھے، ایک دوسرے سے قطعاً مشابہ نہیں تھے۔ بورس دراز قامت تھا اور اس کا رنگ صاف تھا۔ اس کے خدوخال ملائم اور متناسب تھے۔ نکولائی کا قد چھوٹا، بال گھونگھریالے اور وہ چہرے مہرے کے اعتبار سے صاف گو اور راست باز تھا۔ اس کے بالائی ہونٹ پر سبزہ نمودار ہونا شروع ہو چکا تھا۔ اس کی شکل و صورت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ شخص جوش و ولولہ سے معمور ہے، جلد باز ہے اور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے زیادہ سوچ بچار نہیں کرتا۔ نکولائی جب ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، وہ شرما گیا اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کچھ کہنے کے لیے سوچنے کی کوشش کی تھی لیکن ناکام رہا۔ اس کے برعکس بورس کو اس قسم کی کوئی دشواری پیش نہ

آئی اور وہ نہایت آسانی سے کمرے کے ماحول میں گھل مل گیا۔ وہ نہایت پرسکوں لہجے میں مزے لے لے کر بتانے لگا کہ وہ میمی یعنی گڑیا کو اس وقت سے جانتا ہے، جب یہ ابھی نوعمر تھی، اس کی ناک شکست وریخت کی شکار نہیں ہوئی تھی۔ ان پانچ برسوں کے دوران میں، جب سے وہ اسے جانتا ہے، وہ کس طرح عمر کی منازل طے کرتی رہی اور کبرسنی کی طرف بڑھتی رہی۔ اور اب بیچاری کی کھوپڑی میں دراڑیں پڑ گئی ہیں۔ جب اس نے یہ الفاظ کہے، اس نے آنکھ اٹھا کر نتاشا کی جانب دیکھا لیکن اس نے اپنا منہ دوسری طرف کرلیا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کو، جس نے اپنی آنکھیں بھینچی ہوئی تھیں اور جس کا خاموش ہنسی سے بدن کپکپانے لگا تھا، دیکھنے لگی۔ نتاشا کو مزید ضبط کا یارا نہ رہا۔ اس نے کدکڑا لگایا اور اپنی سبک رفتار ننھی ننھی ٹانگوں سے جتنا تیز بھاگ سکتی تھی، بھاگتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ بورس نے اپنے اوسان بحال رکھے اور مطلق پریشان نہ ہوا۔

''میرا خیال ہے، اماں، کہ آپ کہیں باہر جانا چاہتی تھیں۔ ٹھیک کہا میں نے؟'' اس نے اپنی والدہ کی جانب مڑ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ فرمائیں تو گاڑی لے آؤں؟''

''ہاں بیٹا، جاؤ، انھیں کہو کہ تیار ہو جائیں،'' وہ اس کے جواب میں مسکراتے ہوئے بولی۔

بورس چپ چاپ کمرے سے باہر نکل گیا اور نتاشا کو ڈھونڈنے لگا۔ گداز جسم چھوٹا لڑکا بھی خفگی کے عالم میں ان کے پیچھے بھاگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے غصہ اس لیے آرہا ہے کہ جیسے اس کے سارے پروگرام کا ستیاناس ہو گیا ہو۔

9

نوخیز مہمان دوشیزہ اور کاؤنٹس کی بڑی صاحب زادی (جو اپنی ہمشیرہ سے چار سال بڑی تھی اور بالغوں کے طور طریقے اپنانے لگی تھی) کے علاوہ کمرے میں جو نوجوان رہ گئے، وہ نکولائی اور بھانجی سونیا تھے۔ سونیا دبلی پتلی اور نازک اندام تھی۔ اس کا قد چھوٹا، رنگ صاف اور بال بھورے تھے۔ اس کی آنکھیں، جن پر لانبی اور گھنی پلکیں سایہ فگن تھی، نرم و گداز تھیں۔ سیاہ بالوں کی دوہری موٹی پٹی اس کے سر کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے جسم اور خاص طور پر اس کی گردن اور اس کے دبلے پتلے لیکن خوش وضع اور مضبوط برہنہ بازوؤں پر چمپئی رنگت کی جھلک نمایاں تھی۔ اس کی خوش خرام اور دل ربا چال، اس کے مہین اعضا کی ملائمت اور لچک، اور اس کے اطوار میں خاصی نوع کی لجاوٹ، اس کا رکھ رکھاؤ اور اس کی کم گوئی، ان سب باتوں کو دیکھ کر آدمی کو یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ من موہنی، بھولی بھالی اور نیم بالیدہ بلونگڑی ہے۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ وہ کسی روز پھل پھول کر ننھی منی حسین و جمیل بی مانو بن جائے گی۔ وہ جس انداز سے مسکرا رہی تھی، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ ڈرائنگ روم میں عمومی نوعیت کی جو گفتگو ہو رہی ہے، اس میں اسے بہت دلچسپی ہے لیکن کوشش کے باوجود اس کی آنکھیں، جو لانبی اور گھنی پلکوں میں مستور تھیں، اپنے خالہ زاد کی طرف، جو عنقریب فوج میں شمولیت کے لیے روانہ ہونے والا تھا، اٹھ جاتیں اور اسے کچھ اس قدر بچگانہ پرستش کے انداز سے دیکھنے لگتی کہ وہ ایک لحظہ کے لیے بھی کسی کو فریب نہ دے سکی۔ اور یہ بات اظہر من الشمس

تھی کہ بلونگڑی محض اس لیے ذرا آرام سے بیٹھی ہے کیونکہ وہ اس تاک میں تھی کہ جونہی موقع ملے وہ پھرتی سے چھلانگ لائے اور بورس اور نتاشا کی طرح اپنے خالہ زاد کے ساتھ ڈرائنگ روم سے کھسک جائے اور اس کے ساتھ چہلیں کرے۔

''جی ہاں، ma chere،'' کاؤنٹ نے اپنی مہمان کو مخاطب کرتے اور نکولائی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔''اب چونکہ اس کا دوست بورس افسر بن چکا ہے، یہ بھی پیچھے نہیں رہنا چاہتا اور دوستی نبھانے کے لیے یونیورسٹی کو خیر باد کہہ رہا ہے اور مجھے، اپنے بوڑھے باپ کو بھی، بے سہارا چھوڑے جا رہا ہے۔ ma chere، اسے فوج میں خدمات سرانجام دینے کا شوق چرایا ہے حالانکہ محکمہ دستاویزات سرکار میں اچھا بھلا عہدہ اس کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ کے خیال میں دوستی اسے کہتے ہیں؟''

''لیکن سنا ہے کہ جنگ کا اعلان ہو چکا ہے،'' مہمان خاتون نے کہا۔

''اس قسم کے اعلانوں کے متعلق ہم مدتوں سے سنتے چلے آرہے ہیں،'' کاؤنٹ نے جواب دیا،''اور اس طرح کے اعلان بار بار ہوتے رہیں گے لیکن ہوگا ہوا گا کچھ نہیں اور حالات جوں کے توں ہی رہیں گے... ma chere، آپ اسے دوستی کہیں گی؟'' اس نے اپنی بات کا اعادہ کرتے ہوئے کہا۔''وہ ہوزاروں[31] میں شامل ہو رہا ہے۔''

مہمان خاتون کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اس نے محض اپنا سر ہلا دیا۔

''اس میں دوستی کو کوئی دخل نہیں،'' نکولائی نے شعلہ بھبوکا ہوتے اور اپنا یوں دفاع کرتے کہا جیسے اس پر کسی نے شرمناک الزام لگا دیا ہو۔''اس میں دوستی کا قطعاً کوئی دخل نہیں۔ سیدھی بات یہ ہے کہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ طبعاً میرا رجحان فوجی ملازمت کی طرف ہے۔''

اس نے اپنی خالہ زاد اور نوخیز مہمان دوشیزہ پر نظر ڈالی۔ دونوں اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھ رہی اور مسکرا رہی تھیں۔

''ہوزاروں کی پاولوگراٹ رجمنٹ کا کرنل شوبرٹ آج شام ہمارے ہاں کھانے پر آرہا ہے۔ وہ ان دنوں چھٹی پر آیا ہوا ہے اور واپسی پر نکولائی کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے یوں اپنے کندھے اچکائے، جیسے اسے اس معاملے کی، جو بظاہر اس کے اعصاب پر سوار ہو چکا تھا، کوئی پروا نہ ہو۔

''پاپا، میں آپ سے پہلے بھی یہ عرض کر چکا ہوں کہ اگر آپ کو میرا جانا گوارا نہیں، میں نہیں جاؤں گا۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ میں فوج کے علاوہ کسی اور شعبے کے لیے موزوں نہیں۔ میں نہ سفارت کا اہل ہوں اور نہ کلرکی کر سکتا ہوں۔ میں جو کچھ محسوس کرتا ہوں، مجھے اس پر پردہ ڈالنا نہیں آتا۔'' وہ یہ باتیں بھی کرتا جاتا تھا اور سونیا اور نوخیز مہمان دوشیزہ کو خوش شکل نوجوان کی طرح ایسی نظروں سے دیکھتا جاتا تھا جیسے وہ ان سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہو۔

چھوٹی بلونگڑی، جو اسے دیکھ دیکھ کر اپنی آنکھیں سینک رہی تھی، یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ ابھی ابھی

کد کڑے لگانا اور پھر سے اپنی کامل بلونگڑیانہ فطرت کا اظہار کرنا شروع کر دے گی۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے!'' معمر کاؤنٹ نے کہا۔ ''یہ ہمیشہ اسی طرح بھڑک اٹھتا ہے۔ اس بوناپارٹ نے ان سب کے دماغ گھما دیے ہیں۔ یہ سب انھی سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہتے ہیں کہ وہ معمولی لیفٹیننٹ تھا، ترقی کر کے امپراطور کیسے بن گیا۔ خیر، کیوں نہ سوچیں؟'' کاؤنٹ، یہ دیکھے بغیر کہ اس کی مہمان کے لبوں پر تمسخرانہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی ہے، اپنی ہانکتا چلا گیا۔

بزرگ بوناپارٹ کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ادھر مادام کاراگنا کی دختر جولی نوجوان رستوف پر ڈورے ڈالنے لگی۔

''بڑے افسوس کی بات ہے کہ جمعرات کو آپ آرخاروفوں (Arkharovs) کے ہاں تشریف نہ لائے۔ آپ مجھے بے حد یاد آئے'' اس نے ملائمت سے مسکراتے ہوے اس سے کہا۔

اس آپ آپ پر نوجوان پھولا نہ سمایا۔ وہ کھسک کر اس کے قریب ہو گیا اور خنداں دہن جولی کے ساتھ رازدارانہ گفتگو کرنے لگا۔ وہ اپنے ماحول سے اتنا بیگانہ ہو چکا تھا کہ اسے یہ احساس ہی نہ ہوا کہ اس کی غیر شعوری پیار بھری مسکراہٹ نے سونیا کے قلب حاسد میں خنجر پیوست کر دیا ہے۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ زبردستی مسکرانے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ گفتگو کے دوران میں نکولائی کی نظر اس پر پڑی۔ جواب میں اس نے اسے ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ اسے ابھی کچا چبا جائے گی۔ اس کے لیے اپنے آنسوؤں کو روکنا اور اپنے چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجانا ناممکن ہوتا جا رہا تھا۔ آخر اس سے نہ رہا گیا، وہ اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ نکولائی کا سارا جوش و خروش جھاگ کی مانند بیٹھ گیا۔ جونہی گفتگو میں ذرا وقفہ آیا، وہ اٹھا اور سونیا کی تلاش میں باہر نکل گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

''یہ آج کے نوجوان بھی خوب ہیں! کھلے بندوں اپنی محبتوں کا اظہار کرتے پھرتے ہیں۔ نہ چھپاتے ہیں، نہ شرماتے ہیں،'' آنا میخائیلوونا نے نکولائی کی طرف، جب وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا، اشارہ کرتے ہوے کہا۔ ''عم زادوں کا یوں ایک دوسرے کے قریب رہنا بڑے خطرناک نتائج کا حامل ہو سکتا ہے،'' اس نے فرانسیسی میں مزید حاشیہ آرائی کی۔

''ہاں'' جب روشنی کی کرنیں، جو یہ نوجوان اپنے ساتھ لائے تھے، ان کے جاتے ہی نظروں سے اوجھل ہو گئیں، تو کاؤنٹس نے لب کشائی کی۔ پھر ایک سوال کے جواب میں، جو کسی نے اس سے پوچھا نہیں تھا لیکن جو مسلسل اس کے ذہن میں گردش کر رہا تھا، وہ گویا ہوئی: ''ہم کتنے مصائب جھیلتے ہیں، کتنے جوکھم اٹھاتے ہیں، تب کہیں خوشی کا منہ دیکھنا نصیب ہوتا ہے! اور حق بات یہ ہے کہ اب بھی مسرت کے مقابلے میں تشویش کا پلڑا زیادہ بھاری ہے۔ دل پر ہمیشہ خوف سوار رہتا ہے، ہر وقت ڈر چمٹا رہتا ہے! لڑکے ہو یا لڑکیاں، عمر کا یہ دور دونوں کے لیے اندیشوں اور خطرات سے پُر ہوتا ہے۔''

''اس کا تمام تر انحصار اس بات پر ہوتا ہے کہ ان کی تربیت کیسے ہوئی ہے،'' مہمان خاتون نے حاشیہ آرائی کی۔
''جی، آپ درست فرماتی ہیں،'' کاؤنٹس نے اپنا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''خداوند کا شکر ہے کہ اب تک میرا بچوں کے ساتھ رویہ دوستوں کا رہا ہے اور مجھے ان کا مکمل اعتماد حاصل رہا ہے،'' وہ کہے جا رہی تھی۔ لیکن وہ بھی اسی مغالطے کی مرتکب ہو رہی تھی جس کا ارتکاب اکثر والدین کرتے رہتے ہیں جو یہ مفروضہ گھڑ لیتے ہیں کہ ان کے بچے اپنا کوئی راز ان سے نہیں چھپاتے۔ ''میں جانتی ہوں کہ میں ہمیشہ اپنی بیٹیوں کی خاص الخاص confidante* رہوں گی اور وہ کبھی اپنے دلوں کے بھید مجھ سے نہیں چھپائیں گی۔ اور اگر میر انکولائی اپنی جلد بازی یا ناعاقبت اندیشی کی وجہ سے کبھی کوئی حماقت کر بیٹھا (لڑکے لڑکے ہی ہوتے ہیں، ان سے ایسی حرکت بعید نہیں)، وہ بہرحال اس قسم کی نہیں ہوگی جیسی پیٹرزبرگ کے نوجوانوں سے سرزد ہوئی تھی۔''
''بالکل، بالکل۔ یہ بھی کے بھی نوجوان قابل تعریف ہیں،'' کاؤنٹ نے اس کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ اس نے ان تمام سوالات کا، جو الجھاؤ اور پریشانیوں کا سبب بنتے ہیں، جواب اس بات میں ڈھونڈ لیا تھا کہ ہر چیز نفیس اور بہت عمدہ ہے۔ ''خیر، اب کیا کیا جا سکتا ہے؟ اس کے سر میں یہ خناس سما گیا ہے کہ وہ ہوزاروں کی رجمنٹ میں ہی افسر بنے گا۔ ان حالات میں 'ma chere' میں کیا کر سکتا ہوں؟''
''آپ کی چھوٹی بیٹی کتنی پیاری ہے!'' مہمان خاتون نے کہا۔ ''ننھی منی، آتش کی پرکالہ!''
''جی ہاں۔ بالکل ننھی منی آتش کی پرکالہ!'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''مجھ پر گئی ہے۔ اس کی آواز کتنی دلکش ہے! اگرچہ وہ میری بیٹی ہے لیکن جب میں یہ کہتا ہوں کہ وہ کسی روز گلوکارہ بنے گی، تو میں کوئی مبالغہ نہیں کرتا۔ وہ سالومونی ثانی ہوگی۔ ہم نے اس کی تربیت کے لیے اطالوی اتالیق کی خدمات حاصل کی ہیں۔''
''اتنی کم سنی میں؟ میں نے سنا ہے کہ اگر کم سنی میں گانا گانے کی تربیت دی جائے، تو آواز خراب ہو جاتی ہے۔''
''کم سن! نہیں، بالکل نہیں!'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''کیا ہمارے زمانے کی ماؤں کی بارہ تیرہ سال کی عمر میں شادیاں نہیں ہو جاتی تھیں؟''
''اور وہ ابھی سے بورس کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے! اس کے متعلق آپ کیا کہیں گی؟'' کاؤنٹس نے بورس کی ماں کو دھیمی مسکراہٹ سے دیکھتے ہوئے کہا۔ اور اس نے ایک ایسے تصور کا، جو بظاہر ہمیشہ اس کے ذہن میں سوار رہتا تھا، تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ ''دیکھیں نا، اگر میں اس کے ساتھ سختی برتوں اور اسے ایسا کرنے سے منع کر دوں — خدا جانتا ہے کہ وہ میری پشت پیچھے تنہائی میں کیا کرتے ہیں۔ (کاؤنٹس کہنا یہ چاہتی تھی کہ وہ شاید بوس و کنار کرتے ہیں) لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ منہ سے جو لفظ بھی نکالتی ہے، مجھے اس کا علم ہوتا ہے۔ وہ شام کو دوڑی دوڑی میرے پاس آتی ہے اور از خود ایک ایک بات مجھے بتا دیتی ہے۔ شاید میں اس کی عادتیں بگاڑ رہی ہوں لیکن خدا شاہد ہے کہ میرے خیال میں بہترین طریقہ یہی ہے۔ میں نے اپنی بڑی بیٹی کے معاملے میں ذرا سختی برتی تھی۔''

---
* رازدان

''جی ہاں، میری تربیت بالکل مختلف طریقے سے ہوئی تھی،'' خوبرو کاؤنٹس ویرا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیکن ویرا جب مسکراتی تھی، تو جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، اس کی مسکراہٹ سے اس کے حسن میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا تھا، اس کے برعکس اس سے اس کے چہرے کی صورت غیر فطری اور چنانچہ ناگوار ہو جاتی۔ ویرا خوب رو تھی، اس کی تربیت بہت اچھی ہوئی تھی، وہ اچھی طالبہ تھی اور احمق تو بالکل نہیں تھی۔ اس کی آواز میں دلکشی تھی اور اس نے جو کچھ ابھی ابھی کہا تھا، وہ صحیح بھی تھا اور موقع محل کے مطابق بھی۔ لیکن عجیب بات یہ تھی کہ مہمانوں نے بھی اور کاؤنٹس نے بھی، اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ آخر اس نے اس قسم کی بات کہی ہی کیوں۔ اور ان سب کی حالت یہ تھی کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔

''یہ تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے کہ لوگ اپنا سارا زور اپنے پہلوٹھی کے بچوں پر لگا دیتے ہیں۔ وہ انھیں غیر معمولی ہستیاں بنا دینا چاہتے ہیں،'' مہمان خاتون نے رائے زنی کی۔

''ma chere، ہمیں اس سے انکار نہیں۔ ہماری پیاری کاؤنٹس نے ویرا پر کچھ زیادہ ہی محنت کی،'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''خیر، اس سے کیا بگڑا؟ بہرحال وہ قابل تعریف بیٹی ہے،'' اس نے ویرا پر پسندیدگی کی نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

مہمان خواتین اٹھ کھڑی ہوئیں اور اجازت چاہی۔ جانے سے پہلے انھوں نے وعدہ کیا کہ وہ عشائیے پر ضرور آئیں گی۔

''کیا آداب پائے ہیں! میرا خیال تھا کہ یہ کبھی جانے کا نام نہیں لیں گی!'' کاؤنٹس نے انھیں رخصت کرنے کے بعد کہا۔

10

جب نتاشا بھاگتی دوڑتی باہر گئی تھی، وہ صرف پودگھر تک پہنچی تھی کہ رک گئی اور وہاں کھڑے ہو کر وہ گفتگو سننے لگی جو ڈرائنگ روم میں ہو رہی تھی۔ دراصل اسے بورس کا انتظار تھا کہ وہ کب باہر آتا ہے۔ جلد ہی وہ بے تاب ہو گئی اور زور زور سے پاؤں زمین پر پٹخنے لگی۔ اس کے آنسو تھے کہ اب نکلے کہ اب نکلے کیونکہ وہ بلا توقف اس کے پیچھے پیچھے نہیں آیا تھا۔ لیکن جب اس نے نوجوان شخص کے، جو درمیانی چال چلتا آ رہا تھا، دبے پاؤں آنے کی آہٹ سنی، اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ چھلانگ لگائی، پھولوں کے مابین گھسی اور وہاں چھپ گئی۔

بورس کچھ دیر پودگھر میں کھڑا ہچکچاتا رہا اور اپنے گرد و پیش نظریں دوڑاتا رہا۔ گرد کا ایک ذرہ اس کی وردی سے گستاخی کر بیٹھا، اس نے اسے جھاڑ کر الگ کیا۔ پھر وہ آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا اور اپنے خوش شکل چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ نتاشا نے اپنی جگہ سے، جہاں وہ چھپی کھڑی تھی، مطلق جنبش نہ کی۔ وہ صرف یہ دیکھنا چاہتی تھی کہ اب وہ کیا کرتا ہے۔ وہ کچھ دیر آئینے کے روبرو کھڑا رہا، اپنا عکس دیکھ کر مسکراتا رہا اور پھر مخالف سمت چل پڑا۔ نتاشا

اسے آواز دیا چاہتی تھی لیکن اس نے اپنا ارادہ بدل لیا۔

''وہ خود مجھے تلاش کرے،'' اس نے سوچا۔

بورس ابھی باہر نکلا ہی تھا کہ دوسرے دروازے سے سونیا اندر آ گئی۔ غصے سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔ عالم غیظ و غضب میں وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ پہلے تو نتاشا کے جی میں آیا کہ بھاگ کر اس کے پاس پہنچ جائے، تاہم اس نے اپنی اس اضطراری خواہش کو بے لگام نہ ہونے دیا اور جہاں چھپی تھی، وہیں چھپی رہی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس نے سلیمانی ٹوپی پہن رکھی ہے، وہ خود تو کسی کو نظر نہیں آ رہی، لیکن دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، خود وہ سب دیکھ رہی ہے۔ اسے بالکل نئی اور انوکھی قسم کی راحت محسوس ہو رہی تھی۔ سونیا ابھی تک بڑبڑا رہی تھی اور بار بار پیچھے مڑ کر ڈرائنگ روم کے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھی۔ دروازہ کھلا اور نکولائی اندر آیا۔

''سونیا، کیا بات ہے؟ تمھیں کیا ہوا؟'' نکولائی نے اس کی جانب دوڑ لگاتے ہوئے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کچھ نہیں، مجھے تنہا چھوڑ دو!'' اس نے ہچکیوں کے مابین کہا۔

''ارے! مجھے معلوم ہے کہ تمھیں کیا ہوا ہے۔''

''اچھا، اگر تمھیں معلوم ہے، پھر تو اور بھی اچھی بات ہے!... تم واپس اسی کے پاس چلے جاؤ!''

''سو۔نی۔آ! میری بات سنو! موہوم چیز کے پیچھے مجھے اور اپنے آپ کو کیوں اذیت دے رہی ہو؟'' نکولائی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا۔

''سونیا نے اپنا ہاتھ تو نہ چھڑایا، البتہ رونا دھونا بند کر دیا۔

نتاشا اپنی جگہ سے مطلق ادھر ادھر نہ ہوئی، وہ سانس روکے انھیں دیکھے جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔

''اب کیا ہوگا؟'' تجسس کے مارے اس کی جان نکلی جا رہی تھی۔

''سونیا، میں دنیا جہان کی کسی دوسری چیز کو پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہیں دیتا! میرا سب کچھ تمھیں ہو،'' نکولائی نے کہا۔ ''میں تمھیں یہ ثابت کر کے دکھاؤں گا۔''

''تمھاری اس قسم کی باتیں مجھے بالکل زہر لگتی ہیں۔''

''اچھا، تو پھر میں نہیں کروں گا۔ سونیا، بس مجھے معاف کر دو۔'' اس نے اسے اپنی طرف گھسیٹا اور اسے چوم لیا۔

''واہ، کیا مزے ہیں!'' نتاشا سوچ رہی تھی۔ جب سونیا اور نکولائی پودگھر سے باہر نکل آئے، وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑی، اور بورس کو پکارنے لگی۔

''بورس، ادھر آؤ'' اس کے چہرے پر عیاری اور شرارت رقصاں تھی۔ ''مجھے تمھیں کچھ بتانا ہے۔ یہاں،

ادھر...'' اور وہ پودگھر میں اسے عین اس جگہ لے گئی جہاں وہ گملوں کے درمیان چھپی ہوئی تھی۔

''یہ 'کچھ' کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

وہ ہڑبڑا گئی اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ اتنے میں اسے وہ گڑیا نظر آ گئی، جو اس نے کسی گملے میں پھینک دی تھی۔

''اس گڑیا کو بوسہ دو!''

بورس نے اس کے پر اشتیاق چہرے کو بڑی توجہ اور پیار سے دیکھا لیکن جواب دینے سے محترز رہا۔

''تم یہ کام نہیں کرنا چاہتے۔ خیر، پھر ادھر آؤ۔'' اس نے اپنی گڑیا پھینک دی اور پودوں کے اندر خاصا دور چلی گئی۔ ''اور قریب، اور قریب۔'' وہ کانا پھوسی کر رہی تھی۔

اس نے نوجوان افسر کی آستینیں پکڑیں اور اس کے تمتماتے چہرے پر خوف اور مسرت کے جذبات امڈ آئے۔

''تم میرا بوسہ لینا چاہو گے؟'' اس نے اتنا آہستگی سے کہا کہ اس کی آواز بمشکل سنائی دی۔ وہ اسے دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہی اور مسکرا رہی تھی لیکن جوش وجذبے نے اسے اتنا ہلکان کر دیا تھا کہ اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔

بورس شرما گیا اور اس کے رخسار سرخ ہو گئے۔

''تم نری احمق ہو!'' اس نے کہا۔ وہ اس کے قریب دوزانو ہو گیا، اس کے رخسار سرخ سے سرخ تر ہوتے جا رہے تھے لیکن اس نے کیا کرایا کچھ نہ، بس انتظار کرتا رہا۔

اچانک وہ جست لگا کر ایک گملے پر چڑھ گئی تا کہ وہ اس سے اونچا ہو سکے۔ پھر وہ اس سے یوں بغل گیر ہو گئی کہ اس کے مہین برہنہ بازو اس کی گردن کے اوپر کے حصے کے گرد حمائل ہو گئے۔ اس نے اپنے بالوں کو پچھلی جانب جھٹکا اور اس کے لبوں پر بھرپور بوسہ ثبت کر دیا۔ پھر وہ نیچے اتری اور دوسری سمت گملوں کے بیچ میں کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور انتظار کرنے لگی۔

''نتاشا، تم جانتی ہو کہ میں تمھیں چاہتا ہوں لیکن...''

''کیا تمھیں واقعی مجھ سے محبت ہے؟'' نتاشا نے اس کی بات کاٹتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں، مجھے تم سے محبت ہے لیکن میری... میری تم سے التجا ہے کہ ہمیں آئندہ ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے... چار سال گزر جانے دو پھر میں تمھیں شادی کی تجویز پیش کروں گا۔''

نتاشا گہری سوچ بچار میں کھو گئی۔

''تیرہ، چودہ، پندرہ، سولہ...'' وہ اپنی پتلی پتلی انگلیوں پر گننے لگی اور بولی:

''ٹھیک ہے! پھر طے ہو گیا؟''

''بالکل طے!'' بورس نے جواب دیا۔

''ہمیشہ ہمیشہ کے لیے؟'' ننھی منی لڑکی نے استفسار کیا۔ ''تا آنکہ ہمیں موت نہیں آ جاتی؟''

اور اس کے چہرے پر مسرت و شادمانی دوڑ گئی۔ اس نے اس کا بازو تھاما اور آہستہ آہستہ چلتی اس کے ساتھ نشست گاہ میں داخل ہو گئی۔

11

مہمانوں کا استقبال کرتے کرتے کاؤنٹس اتنا عاجز آ گئی کہ اس نے حکم دیا کہ اب کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے، تاہم استقبالیہ کمرے میں تعینات دربان کو یہ ہدایت کردی گئی کہ جو مہمان بھی ہدیہ تبریک پیش کرنے آئیں، انھیں رات کے کھانے کی لازماً دعوت دی جائے۔ کاؤنٹس کی اپنی بچپن کی سہیلی پرنس آنا میخائیلونا کے ساتھ بالمشافہ گفتگو کرنے کی خواہش شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی کیونکہ جب سے وہ پیٹرز برگ سے لوٹی تھی، اس کی اس کے ساتھ باقاعدہ نشست نہیں ہوئی تھی۔ آنا میخائیلونا کا چہرہ غم آلود لیکن دل آویز تھا۔ اس نے اپنی کرسی گھسیٹی اور کاؤنٹس کے بالکل قریب بیٹھ گئی۔

''میں نے کبھی تم سے کوئی چیز نہیں چھپائی اور نہ چھپاؤں گی،'' آنا میخائیلونا نے کہا۔ ''اب ہماری پرانی سہیلیاں رہ ہی کتنی گئی ہیں! اس لیے میں تمھاری دوستی کی قدر کرتی ہوں۔''

آنا میخائیلونا نے ویرا کی طرف دیکھا اور رک گئی۔ کاؤنٹس نے اپنی سہیلی کا ہاتھ دبایا۔

''ویرا'' اس نے اپنی بڑی بیٹی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کی چہیتی نہیں۔ ''تم میں ذرا بھی عقل نہیں؟ آخر تمھاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ تمھاری یہاں ضرورت نہیں۔ دوسری بچیوں کے پاس چلی جاؤ یا...''

خوش شکل ویرا حقارت سے مسکرائی لیکن یہ قطعاً ظاہر نہ ہوا کہ اس کے جذبات کو کوئی ٹھیس پہنچی ہے۔

''اماں، اگر پہلے فرما دیتیں، میں فوراً چلی جاتی،'' اس نے جواب دیا اور اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

جب وہ نشستی کمرے میں سے گزر رہی تھی، اسے دونوں کھڑکیوں کے سامنے دو جوڑے نظر آئے۔ وہ رک گئی اور مسکرانے لگی۔ اس کی مسکراہٹ میں حقارت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ سونیا نکولائی کے بالکل قریب بیٹھی تھی اور وہ اس کے لیے چند اشعار نقل کر رہا تھا۔ یہ اس کی اولیں شعری کوشش تھی۔ بورس اور نتاشا دوسری کھڑکی کے روبرو بیٹھے تھے۔ جونہی انھوں نے ویرا کو اندر آتے دیکھا، وہ باتیں کرتے کرتے خاموش ہو گئے۔ سونیا اور نتاشا نے مجرمانہ لیکن پرمسرت نگاہیں اٹھا کر ویرا کی جانب دیکھا۔

اگر کوئی شخص ان دو ننھی منی بچیوں کو یوں محبت میں سرشار دیکھتا، وہ خوش بھی ہوتا اور متاثر بھی، لیکن معلوم ہوتا تھا کہ جب ویرا نے انھیں اس کیفیت میں دیکھا، اس کے قلب و ذہن میں اس قسم کے خوشگوار احساسات بیدار نہ ہوئے۔

''میں نے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ میری اشیا کو ہاتھ نہ لگایا کرو؟ تمھارا اپنا کمرا ہے،'' اس نے نکولائی کے ہاتھ

سے دوات چھینتے ہوے کہا۔

''صرف ایک منٹ، صرف ایک منٹ،'' اس نے دوات میں قلم ڈبوتے ہوے کہا۔

''تم لوگ ہمیشہ غلط وقت پر کام کرنے کے اسلوب ڈھونڈ لیتے ہو،'' ویرا نے کہا۔ ''جس طریقے سے تم کدکڑے لگاتے ڈرائنگ روم میں آئے، اس پر ہر شخص کو بہت شرمندگی محسوس ہوئی۔''

اس حقیقت کے باوجود کہ جو کچھ اس نے کہا تھا، وہ صحیح تھا یا پھر اس لیے کہ اس نے یہ بات کہہ دی تھی، کسی نے جواباً کچھ نہ کہا۔ چاروں نے محض نگاہوں کا تبادلہ کرنے پر اکتفا کیا۔ دوات ہاتھ میں پکڑے ویرا کمرے میں کھڑی رہی۔

''نتاشا اور بورس، ذرا اپنی عمریں دیکھو۔ بھلا اس عمر میں تم دونوں کے مابین کیا راز ہو سکتے ہیں؟ یا تم دونوں کے مابین؟ یہ نری حماقت نہیں، تو اور کیا ہے؟''

''ویرا؟ تمھارا اس سے کیا تعلق واسطہ ہے؟'' نتاشا نے نرمی سے مداخلت کرتے ہوے کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ اس روز وہ معمول سے کہیں بڑھ کر ہر شخص کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ کر رہی تھی۔

''تمھاری حرکتیں اتنی احمقانہ ہیں کہ مجھے تم لوگوں کو دیکھ کر شرم محسوس ہونے لگی ہے،'' ویرا نے کہا۔ ''راز، ہونہہ!''

''ہر شخص کے اپنے راز ہوتے ہیں۔ ہم نے تو کبھی تمھارے اور برگ کے معاملات میں دخل نہیں دیا،'' نتاشا نے ذرا گرم ہو کر کہا۔

''اور میرا خیال ہے کہ تمھیں دینا بھی نہیں چاہیے،'' ویرا نے جواب دیا۔ ''کیونکہ جو کچھ میں کرتی ہوں، اس کا کوئی پہلو معیوب نہیں ہوتا۔ لیکن بورس کے ساتھ تمھارا جو رویہ ہے، میں اس کے بارے میں اماں کو ضرور بتاؤں گی۔''

''نتالیا الی نچنا میرے ساتھ بہت اچھی طرح پیش آتی ہے،'' بورس نے کہا۔ ''مجھے اس سے کوئی شکایت نہیں۔''

''بورس، تم چپ رہو۔ تم بڑے سفارت کار ہو۔'' (لفظ 'سفارت کار' ان خاص معنوں میں جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں، بچوں میں بہت مقبول تھا۔)

''مجھے سخت کوفت ہو رہی ہے،'' نتاشا نے کہا۔ ذہنی اذیت سے اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ ''آخر یہ میرے پیچھے ہی کیوں ہاتھ دھو کر پڑی رہتی ہے۔'' اس کے بعد وہ ویرا کی جانب متوجہ ہوئی اور بولی: ''تم کبھی نہیں سمجھ پاؤ گی کیونکہ تم نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی ہے۔ تمھارے سینے میں دل نہیں۔ تم کچھ نہیں ہو، بس مادام ژ گانلی ہو۔ (ویرا کو یہ لقب نکولائی نے دیا تھا اور بہت ہتک آمیز سمجھا جاتا تھا۔) ''تمھاری سب سے بڑی راحت یہ ہے کہ دوسروں کی راہ میں روڑے اٹکائے جائیں اور انھیں پریشان کیا جائے۔ جاؤ اور جتنا جی چاہے، برگ کے ساتھ محبت کی جھوٹی سچی پینگیں بڑھاؤ،'' اس نے تیزی سے اپنی بات ختم کرتے ہوے کہا۔

''خیر، میں مہمانوں کی موجودگی میں لڑکوں کا پیچھا نہیں کرتی...''

''چھوڑو، اس کا مطلب حل ہو گیا ہے،'' نکولائی نے دخل انداز ہوتے ہوے کہا۔ ''یہ ہر شخص کو کڑوی کسیلی سنا

چکی اور پریشان کر چکی ہے۔ آؤ، نرسری چلتے ہیں۔"
چاروں خوف زدہ پرندوں کے جھنڈ کی طرح اٹھے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔
"کڑوی کسیلی باتیں تو مجھے کہی گئی ہیں،" ویرا نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ "میں نے کسی سے کڑوی کسیلی بات نہیں کہی۔"
"مادام دَ گانلی! مادام دَ گانلی!" دروازے میں قہقہہ بار آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔
خوش شکل ویرا، ہر شخص کو ہراساں و پریشاں کرنے کے بعد مسکرانے لگی۔ اسے جو کچھ کہا گیا تھا، بظاہر اس کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اور اپنے بال اور سکارف درست کرنے لگی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اپنے حسین وجمیل چہرے کو دیکھ کر وہ پہلے سے بھی کہیں زیادہ سرد مہر اور پرسکون ہو گئی ہے۔

✦

ادھر ڈرائنگ روم میں ابھی گفتگو جاری تھی۔
"آہ، مائی ڈیئر،" کاؤنٹس نے کہا۔ "میری زندگی بھی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ آپ کے خیال میں کیا مجھے یہ نظر نہیں آرہا کہ اگر ہمارے لچھن اسی طرح جاری رہے، تو ہماری جمع جتھا بہت جلد ٹھکانے لگ جائے گی؟ ایک تو ہمیں ان کا کلب لے بیٹھا ہے اور اوپر سے ان کی نرم طبیعت اور سخاوتیں۔ جب ہم گاؤں جاتے ہیں، پھر بھی کوئی سکون نہیں ملتا۔ تھیئٹر شکار اور خدا جانے اور کیا کچھ! خیر، میرا ذکر چھوڑو اور اب تم بتاؤ کہ تم ان تمام امور سے کیسے نپٹ لیتی ہو؟ آنیت، تمھیں دیکھ کر مجھے اکثر حیرت ہوتی ہے۔ اتنی عمر ہو گئی ہے، پھر بھی تم تن تنہا گھوڑا گاڑی میں کبھی ماسکو آرہی ہو اور کبھی پیٹرز برگ جا رہی ہو۔ اتنے ڈھیر سارے وزیروں اور بارسوخ لوگوں سے ملتی ہو اور تمھیں انھیں اپنے انگوٹھے کے نیچے رکھنے کا گر بھی آتا ہے — یہ سب باتیں آدمی کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیتی ہیں۔ یہ بتاؤ، تم یہ سب کچھ کیسے کر لیتی ہو؟ مجھ سے تو شاید کچھ بھی نہ ہو سکے۔"
"آہ، میری پیاری سہیلی!" آننا میخائیلوونا نے جواب دیا۔ "خدا نہ کرے کہ تمھیں زندگی کے کسی بھی مرحلے پر یہ علم ہو کہ تم بیوہ ہو گئی ہو اور تمھارے ہاتھ پلّے بھی کچھ نہیں رہا۔ تمھارا صرف ایک ہی بیٹا ہو، جس سے تم ٹوٹ کر پیار کرتی ہو اور جسے تم اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتی ہو۔ جب آدمی ایسی صورت سے دوچار ہوتا ہے، پھر سب کچھ سیکھ جاتا ہے۔" اس نے قدرے فخر و افتخار سے اپنی بات جاری رکھی۔ "مقدمے بازی نے مجھے سب کچھ سکھا دیا ہے۔ اب جب کبھی مجھے کسی بڑی توپ سے ملاقات کی ضرورت پیش آتی ہے، میں رقعہ تحریر کرتی ہوں: 'پرنسس فلاں فلاں مسٹر فلاں فلاں سے ملاقات کی متمنی ہے۔' پھر میں گاڑی پکڑتی ہوں اور چکر لگانا شروع کر دیتی ہوں۔ کبھی دو، کبھی تین اور بعض اوقات چار مرتبہ بھی جانا پڑتا ہے تا آنکہ میرا مقصد حل ہو جاتا ہے۔ اور میں اس بات کی مطلق پروا نہیں کرتی کہ وہ میرے بارے میں کیا سوچتے ہوں گے۔"

''خیر، یہ بتاؤ کہ تم نے بوریزکا کے بارے میں کس سے بات کی تھی؟'' کاؤنٹس نے پوچھا۔ ''تمھارا بیٹا، ماشاء اللہ، پہلے ہی گارڈز میں افسر بن چکا ہے جب کہ میرا بیٹا صرف کیڈٹ کی حیثیت سے بھرتی ہو رہا ہے۔ کوئی نہیں جو اس کے لیے اتنی دوڑ دھوپ کر سکے۔ تم نے کس سے بات کی تھی؟''

''پرنس واسیلی۔ انھوں نے بے حد مہربانی فرمائی۔ وہ فوراً سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ انھوں نے سارا معاملہ امپراطور کے گوش گزار کر دیا۔'' پرنسس میخائیلوونا کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ یہ بھی بھول گئی کہ اپنا الو سیدھا کرانے کے لیے اسے کتنی ذلت اور خواری اٹھانا پڑی تھی۔

''کیا پرنس واسیلی اب بہت عمر رسیدہ ہو گئے ہیں؟'' کاؤنٹس نے دریافت کیا۔ ''رومانتسیفوں نے ایک مرتبہ اپنے ہاں ڈرامہ کرایا تھا۔ اس میں ہم سب نے اداکاری کی تھی۔ تب سے میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ وہ مجھے بھول گئے ہوں گے۔ اس زمانے میں تو وہ میرے آگے پیچھے پھرا کرتے تھے۔'' کاؤنٹس بھولی بسری باتیں یاد کر رہی تھی اور مسکرا رہی تھی۔

''وہ بالکل ویسے کے ویسے ہیں،'' آنا میخائیلوونا نے جواب دیا۔ ''ہمیشہ کی طرح دوسروں پر شفقت فرمانے میں پیش پیش۔ اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے باوجود ان کا دماغ خراب نہیں ہوا۔ 'پرنسس، مجھے بے حد افسوس ہے کہ میں آپ کی صرف معمولی سی خدمت کر سکا،' انھوں نے مجھ سے فرمایا۔ 'آپ جب چاہیں، مجھے حکم دیں، میں حاضر ہوں۔' اس میں قطعاً کسی شبے کی کوئی گنجائش نہیں کہ وہ نہایت نفیس انسان اور قابل اعتبار قرابت دار ہیں... نتالی، تم جانتی ہو کہ مجھے اپنے بیٹے سے کتنی محبت ہے۔ اس کی خوشی کے لیے میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن میرے حالات اتنے دگرگوں ہو چکے ہیں،'' آنا میخائیلوونا نے اپنی آواز دھیمی کر لی لیکن وہ بولتی گئی۔ ''اتنے دگرگوں، کہ میری حالت بالکل سقیم ہو گئی ہے۔ اس ملعون مقدمے پر میرا سب کچھ اٹھ چکا ہے اور اس میں پیش رفت نام کو بھی نہیں ہوئی۔ کیا تم یقین کرو گی کہ میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں رہی۔ اور اب تو یہ سوچ سوچ کر میرے دماغ کے پرخچے اڑ گئے ہیں کہ بورس کی وردی اور دیگر فوجی لوازمات کے لیے رقم کہاں سے آئے گی۔'' اس نے اپنا رومال نکالا اور رونے لگی۔ ''مجھے پانچ سو روبل چاہئیں اور میرے پاس ہے کیا، پچیس روبل کا صرف ایک نوٹ... اب کاؤنٹ کرل ولادی مروچ بزدخوف میری واحد امید رہ گئے ہیں۔ اگر انھوں نے اپنے دینی پسر کی — تم جانتی ہو کہ وہ بوریا کے دینی باپ ہیں — مدد کرنے میں رضامندی کا اظہار نہ کیا اور اس کی ضروریات پورا کرنے کے لیے کچھ رقم نہ دی، تو میری ساری کوششوں پر پانی پھر جائے گا... مجھ میں قطعاً اتنا بل بوتا نہیں کہ میں اس کی وردی خرید سکوں اور اس کی دیگر ضروریات پوری کر سکوں۔''

کاؤنٹس اس کتھا سے اتنا متاثر ہوئی کہ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں اور وہ گہرے سوچ بچار میں کھو گئی۔

''میں اکثر سوچتی ہوں،'' پرنسس نے کہا۔ ''شاید ایسا کرنا غلط ہے لیکن میں اکثر سوچتی ہوں کہ ایک کاؤنٹ کرل

ولادی مروچ بزدخوف ہیں... قارون کے خزانے کے مالک... اور تن تنہا... اور وہ زندہ کس کی خاطر ہیں؟ زندگی ان کے لیے بوجھ بن چکی ہے جب کہ بوریا ابھی اپنی زندگی کی شروعات کر رہا ہے۔"

"وہ اپنے ترکے میں بورس کے لیے یقیناً کچھ نہ کچھ چھوڑ جائیں گے،" کاؤنٹس نے کہا۔

"خدا جانے، Chere amie*، یہ دھن دولت والے بڑے خودغرض ہوتے ہیں۔ بہرحال میں بورس کو پکڑتی ہوں اور ابھی اسی وقت ان سے ملنے چلی جاتی ہوں۔ میں انھیں لگی لپٹی رکھے بغیر صاف صاف بتا دوں گی کہ میرے حالات کیسے ہیں۔ میرے بیٹے کا مقدر داؤں پر لگا ہوا ہے۔ ایسے میں لوگ میرے متعلق کیا سوچتے ہیں، مجھے اس کی مطلق پروا نہیں۔" پرنسس اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ "ابھی دو بجے ہیں اور تمھارا کھانا چار بجے ہوگا۔ میں وقت پر واپس آجاؤں گی۔"

اور پیٹرزبرگ کی عملی خاتون کی طرح، جو یہ جانتی ہے کہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ فائدہ کس طرح اٹھایا جا سکتا ہے، آنا میخائیلونا نے اپنے بیٹے کو بلایا اور اس کو ساتھ لے کر استقبالیہ کمرے کی طرف چل دی۔

"خدا حافظ، مائی ڈارلنگ۔" اس نے کاؤنٹس سے کہا جو دروازے تک اس کے ساتھ آئی تھی اور سرگوشی کے انداز میں، تا کہ اس کا بیٹا نہ سن سکے، اس سے کہا: "میری کامیابی کی دعا کرنا!"

"ma chere، کیا تم واقعی کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کے ہاں جا رہی ہو؟" کاؤنٹ نے ڈائننگ روم سے استقبالیہ کمرے میں پہنچ کر پوچھا۔ "اگر ان کی طبیعت بہتر ہو، پھر پیئر سے کہیے گا کہ وہ کھانا ہمارے ساتھ کھائے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ پہلے بھی ہمارے ہاں آیا کرتا تھا — اور بچوں کے ساتھ رقص کیا کرتا تھا۔ ma chere، اسے مدعو کرنا نہ بھولنا، ہم نے طارس باورچی کی خدمات حاصل کی ہیں، آج ہم دیکھیں گے کہ وہ کیا کرتب دکھاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ کاؤنٹ ارلوف نے کبھی کاہے کو ایسی دعوت کی ہوگی جیسی کہ ہم کر رہے ہیں۔"

12

"mon cher بورس،" پرنسس آنا میخائیلونا نے اپنے بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ان کی گاڑی، جس میں وہ سوار تھے، بھوسی سے ڈھکی سڑک پر گزرتی کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کے محل نما مکان کے وسیع و عریض احاطے میں داخل ہو چکی تھی۔ "mon cher بورس،" اس نے اپنے بوسیدہ کوٹ میں سے اپنا ہاتھ نکالتے اور اسے جھینپتے، جھجکتے، پیار سے اپنے بیٹے کے بازو پر رکھتے ہوئے کہا۔ "ان کے ساتھ ادب سے پیش آنا اور ان کی باتیں توجہ سے سننا۔ کاؤنٹ کرل ولادی مروچ بہرحال تمھارے دینی باپ ہیں اور تمھارے مستقبل کا انحصار سراسر ان پر ہے۔ mon cher، تم دوسروں کے دل موہنا جانتے ہو۔ بس ان کے ساتھ بھی ایسا ہی برتاؤ کرنا کہ وہ تمھارے گرویدہ ہو جائیں۔"

---

* مائی ڈیر

''اگر اس کا نتیجہ ہماری تذلیل کی صورت میں نہیں، بلکہ کسی اور انداز میں برآمد ہوا، تبھی میں صحیح معنوں میں آپ کے حکم کی تعمیل کر سکوں گا'' اس کے بیٹے نے سرد مہری سے جواب دیا۔ ''بہرحال، میں آپ سے وعدہ کر چکا ہوں، میں اپنی طرف سے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کروں گا۔ آپ خاطر جمع رکھیں۔''

اگرچہ استقبالیہ کمرے میں تعینات دربان یہ دیکھ چکا تھا کہ کسی کی گاڑی دروازے پر کھڑی ہے، اس نے ماں اور بیٹے (ان دونوں نے کسی سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ ان کی آمد کی اندر اطلاع کر دے، بلکہ وہ خود ہی بلوری غلام گردش میں سے، جس کی دونوں اطراف طاقچوں میں مجسمے سجے ہوئے تھے، گزرتے استقبالیہ کمرے میں داخل ہو گئے تھے) کا بغور جائزہ لیتے اور خاتون کے بوسیدہ کوٹ کو گھورتے ہوئے پوچھا: ''آپ محترم کاؤنٹ سے ملنے تشریف لائے ہیں یا محترمہ پرنسس سے؟'' اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ کاؤنٹ سے ملاقات کرنے کے ارادے سے آئے ہیں، اس نے کہا: ''ہز ایکسی لینسی کی طبیعت آج بہت زیادہ خراب ہو چکی ہے اور وہ کسی بھی مہمان سے نہیں مل سکتے۔''

''بہتر ہے کہ ہم واپس چلے چلیں،'' بیٹے نے فرانسیسی میں کہا۔

"mon cher"، ماں نے منت سماجت کے انداز میں کہا اور اس نے ایک بار پھر اپنا ہاتھ اس کے بازو پر رکھ دیا گویا یہ کوئی جادو کی چھڑی تھی جس کے چھوتے ہی اس کا پارہ نیچے آ جائے گا اور اس کے اندر نیا ولولہ بیدار ہو جائے گا۔

بورس نے لب کشائی سے احتراز کیا تاہم اپنا اوورکوٹ اتارے بغیر وہ استفہامیہ انداز سے اپنی ماں کی جانب دیکھنے لگا۔

''میرے محترم،'' آننا میخائیلوونا نے استقبالیہ میں تعینات دربان کی چاپلوسی کرتے ہوئے کہا، ''مجھے معلوم ہے کہ کاؤنٹ کرل ولادی مروچ کی حالت خاصی خراب ہے — اسی لیے میں حاضر ہوئی ہوں — میں ان کی عزیز ہوں — محترم، میں انھیں پریشان نہیں کروں گی۔ مجھے صرف پرنس واسیلی سرگیویچ سے ملنا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ یہیں مقیم ہیں۔ بس اتنی مہربانی کرو کہ انھیں میری آمد کے بارے میں اطلاع دے دو۔''

دربان نے بڑی بیزاری سے گھنٹی کی رسی کھینچی۔ گھنٹی اوپر کی منزل پر بجی۔ دربان نے اپنا دھیان دوسری طرف کر لیا۔

''پرنسس دروبتیسکایا پرنس واسیلی سرگیویچ سے ملنے تشریف لائی ہیں،'' اس نے ایک وردی پوش ملازم کو، جو برجس، نچلی ایڑی کے جوتے اور مارننگ کوٹ پہنے ہوئے تھے اور جو دوڑتا دوڑتا سیڑھیوں کے اوپرے سرے پر پہنچا تھا اور نیچے جھانک رہا تھا، پکار کر بتایا۔

ماں نے اپنے ریشمی ڈریس کی، جس پر نیا رنگ چڑھایا گیا تھا، شکنیں درست کیں، استقبالیہ کمرے میں ساختہ وینس قدِ آدم دیواری آئینے کے سامنے اپنے حلیے پر نظر ڈالی اور اپنے نچلی ایڑی کے جوتوں میں تیز تیز قدم اٹھاتی، سیڑھیوں پر، جن پر قالین بچھے ہوئے تھے، چڑھنے لگی۔

''mon cher، اپنا وعدہ یاد رکھنا،'' اس نے اپنے بیٹے کے بازو پر ایک بار پھر تھپکی دے کر اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا۔

بیٹا سرد مہرانہ انداز سے ماں کے پیچھے چل پڑا۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔

وہ خاصے بڑے کمرے میں داخل ہوئے۔ اس کا ایک دروازہ اس اپارٹمنٹ میں کھلتا تھا جس پر پرنس واسیلی قابض تھا۔ جب ماں بیٹا ہال کمرے کے درمیان میں پہنچے اور ایک معمر وردی پوش ملازم سے، جو ان کی آمد پر اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا، راستہ دریافت کرنے کا ارادہ کر رہے تھے، ایک دروازے کی کانسی کی چٹخنی گھومی اور پرنس واسیلی، مخملیں کوٹ، جن پر صرف ایک ستارہ آویزاں تھا (اس کی عادت تھی کہ وہ گھر میں اسی قسم کا لباس پہنتا تھا)، زیب تن کیے، ایک خوش شکل شخص کی، جس کے سر کے بال سیاہ تھے، معیت میں باہر آیا۔ یہ شخص پیٹرز برگ کا نامی گرامی معالج لوغین تھا۔

''پھر یہ بات یقینی ہے؟'' پرنس پوچھ رہا تھا۔

''محترم پرنس، غلطی بشری تقاضا ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس سے کبھی کوئی غلطی سرزد نہیں ہوئی۔ لیکن...'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ وہ حرف رکھنکتی آواز میں ادا کر رہا تھا اور لاطینی الفاظ فرانسیسی لہجے میں لڑھکا رہا تھا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے...''

اتنے میں پرنس واسیلی کی نظر آنا میخائیلوونا اور اس کے بیٹے پر پڑی۔ اس نے سر کی جنبش سے ڈاکٹر کی چھٹی کر دی اور خود ان کی جانب بڑھا۔ اس کے چہرے پر سوالیہ نشان تھا۔ بیٹے نے دیکھا کہ اس کی ماں کی نگاہوں میں اچانک حزن و ملال آ گیا ہے۔ وہ قدرے مسکرایا۔

''اف، پرنس، ہماری دوبارہ ملاقات کن افسوس ناک حالات میں ہو رہی ہے۔ ہمارے محترم عزیز کی اب نصیب دشمناں، طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے اسے ان نگاہوں کا، جن سے سرد مہری اور توہین ٹپک رہی تھی اور جو اسے گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں، کوئی علم ہی نہ ہو۔

پرنس واسیلی نے پہلے اسے گھور کر دیکھا اور پھر کچھ اس قسم کی استفہامیہ نظریں بورس کے چہرے پر جمائیں جیسے اسے سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ یہ کون شخص ہے اور کیوں آیا ہے۔ بورس نے شائستگی سے جھک کر سلام کیا۔ پرنس واسیلی نے اس سلام کا کوئی جواب نہ دیا۔ وہ آنا میخائیلوونا کی جانب متوجہ ہوا، اپنے سر اور لبوں کو جنبش دی اور اشارتاً بتایا کہ مریض کے بچنے کی کم ہی امید رہ گئی ہے۔

''واقعی؟'' آنا میخائیلوونا نے واویلا کیا۔ ''کتنی بھیانک خبر ہے! سوچ کر دل دہل جاتا ہے — یہ میرا بیٹا ہے،'' اس نے بورس کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''یہ ذاتی طور پر آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔''

بورس نے دوبارہ جھک کر شائستگی سے سلام کیا۔

''پرنس، یقین کریں کہ آپ نے ہمارے لیے جو کچھ کیا ہے، ماں کی حیثیت سے میں اسے کبھی فراموش نہیں

کر سکوں گی۔"

"مائی ڈیئر آنا میخائیلوونا، مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے لیے کچھ کر سکا،" پرنس واسیلی نے اپنی قمیص کے بٹنوں کے اوپر جھالر درست کرتے ہوئے کہا۔ وہ آنا میخائیلوونا کے سامنے، جو اس کی زیر بار احسان تھی، جس لہجے اور انداز سے بات کر رہا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ آنا پاولوونا کی محفل شب کی نسبت یہاں ماسکو میں اپنے آپ کو کہیں زیادہ اہم بنا کر پیش کر رہا ہے۔

"ملازمت کے دوران میں اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھانے اور اپنے آپ کو اپنے عہدے کا اہل ثابت کرنے کی پوری کوشش کرو،" اس نے بورس کے ساتھ سخت لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "میں خوش ہوں... یہاں چھٹی پر آئے ہو؟" اس نے حسب عادت سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

"یوئر ایکسی لینسی، میں نئی رجمنٹ میں اپنی تقرری کے احکام کا انتظار کر رہا ہوں،" بورس نے جواب دیا۔ اس کے لہجے سے نہ تو یہ مترشح ہو رہا تھا کہ اسے پرنس کے کڑوے کسیلے انداز گفتگو سے کوئی رنج پہنچا ہے اور نہ یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ گفتگو مزید آگے بڑھانے کا متمنی ہے، بلکہ وہ اتنے تحمل، بردباری اور احترام سے بات کر رہا تھا کہ پرنس اسے ٹٹولنے پر مجبور ہو گیا۔

"تم اپنی والدہ کے ہاں قیام پذیر ہو؟"

"میں کاؤنٹس رستووا کے ہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔" اور اس کے ساتھ اس نے دوبارہ "یوئر ایکسی لینسی" کا اضافہ کر دیا۔

"یہ وہی الیا رستوف ہیں جنھوں نے نتالی شن شن سے شادی کی تھی،" آنا میخائیلوونا نے کہا۔

"مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے،" پرنس واسیلی نے حسب معمول یک سُرے لہجے میں کہا۔ "میں یہ کبھی نہیں سمجھ سکا کہ نتالی نے اس ناپختہ اور ناکندہ تراش پلّے کے ساتھ شادی کرنے کا فیصلہ کیسے کر لیا،" اس نے فرانسیسی میں اضافہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ تو بالکل ہی احمق اور فضول آدمی ہے اور اس پر طرّہ یہ کہ لوگوں کے بقول جواری بھی ہے۔"

"لیکن، mon prince*، وہ بہت شفیق انسان ہیں!" آنا میخائیلوونا نے رقت انگیز مسکراہٹ سے کہا۔ اس کا یہ انداز چغلی کھا رہا تھا کہ اس کی رائے میں کاؤنٹ رستوف کی جو بھد اڑائی گئی ہے، اس کا وہ پوری طرح مستحق ضرور ہے لیکن بہر حال اس کی یہ التجا ہے کہ پرنس کو معمر کاؤنٹ کے بارے میں اتنا سخت رویہ نہیں اختیار کرنا چاہیے۔ "ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟" اس نے کچھ توقف کے بعد دریافت کیا۔ اس کے متفکر چہرے پر دوبارہ رنج و محن کے بادل چھا گئے۔

"کوئی خاص امید نہیں رہ گئی،" پرنس نے جواب دیا۔

"انکل نے مجھ پر اور بوریا پر جو عنایات اور نوازشات فرمائی ہیں، میری شدید خواہش تھی کہ میں ان کے بارے میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کر سکتی۔ بورس ان کا دینی بیٹا ہے۔" اس نے یہ آخری جملہ کچھ اس انداز سے

* مائی پرنس

کہا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ توقع کر رہی ہے کہ اس اطلاع کے ملتے ہی پرنس کی باچھیں کھل جائیں گی۔

پرنس واسیلی کی بھویں سکڑ گئیں اور وہ سوچ بچار میں غرق ہو گیا۔ آنا میخائیلوونا تاڑ گئی کہ اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ کاؤنٹ بزوخوف کی وراثت میں وہ اس کی حریف ہے۔ چنانچہ وہ باتعجیل اسے اطمینان دلانے لگی۔

''اگر مجھے انکل کے ساتھ سچی محبت اور لگاؤ نہ ہوتا،'' اس نے لفظ ''انکل'' بڑے تیقن اور بے اعتنائی سے ادا کیا۔ ''میں ان کے کردار سے خوب آگاہ ہوں — وہ شریف، عالی منش اور راست باز ہیں — لیکن آپ جانتے ہیں کہ ان کے پاس پرنسوں کے علاوہ اور کوئی نہیں اور یہ پرنسسیں بھی اتنی ناعمر اور ناتجربہ کار ہیں...'' اس نے اپنا سر جھکا لیا اور زیر لب بولی: ''پرنس، کیا انھوں (بزوخوف) نے اپنے آخری فرائض[32] ادا کر دیے ہیں؟ یہ آخری لمحات بہت قیمتی ہیں۔ اگر کوئی شخص ان سے یہ آخری فرائض نبھوانے کے لیے ان کے پاس چلا جائے، تو ان کی جو حالت ہے، اس سے بدتر نہیں ہو گی۔ اور اگر وہ واقعی شدید بیمار ہیں، پھر انھیں (آنے والے وقت کے لیے) تیار کرانا ہو گا۔ پرنس، ہم عورتوں کو،'' اور وہ شیریں انداز سے مسکرائی ''ہمیشہ علم ہوتا ہے کہ ان مواقع پر کیا کہلوانا ہے اور کیا نہیں کہلوانا۔ مجھے لازماً ان کے پاس جانا ہو گا۔ اس بات سے قطع نظر کہ ایسا کرنے سے مجھے کتنی تکلیف، کتنا دکھ برداشت کرنا ہو گا... لیکن میں دکھ جھیلنے اور مصائب برداشت کرنے کی عادی ہو چکی ہوں۔''

بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ پرنس واسیلی اچھی طرح سمجھ گیا ہے جیسا کہ آنا شیرر کے ہاں یہ بات اس کے ذہن نشین ہو گئی تھی کہ آنا میخائیلوونا سے اتنی آسانی سے جان نہیں چھڑائی جا سکے گی۔

''مائی ڈیئر آنا میخائیلوونا، اس قسم کی ملاقات ان پر بھاری بوجھ نہیں بنے گی؟'' اس نے پوچھا۔ ''ہمیں شام تک انتظار کر لینا چاہیے۔ ڈاکٹروں کا خیال ہے کہ ان کی حالت نازک سے نازک تر ہوتی جا رہی ہے۔''

''لیکن پرنس، ایسے موقع پر تاخیر کرنا ناممکن ہے۔ ذرا سوچیں، ان کی نجات داؤں پر لگی ہوئی ہے۔ بڑی بھیانک صورت حال ہے! عیسائیت کے پیروکار کے فرائض...''

اندرونی کمروں کا دروازہ کھلا اور ایک پرنسس، جو رشتے کے اعتبار سے کاؤنٹ کی بھانجی تھی، ہال کمرے میں آئی۔ اس کے چہرے پر سرد مہری اور بے مروتی نمایاں تھی۔ اس کی لانبی کمر کی اس کی ٹانگوں کی جسامت سے قطعاً کوئی مناسبت نہیں تھی۔

پرنس واسیلی اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''اب ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''بالکل جوں کی توں۔ اس غل غپاڑے میں آپ اور کس بات کی توقع کر سکتے ہیں۔'' اس نے پرنس آنا میخائیلوونا کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ کوئی پرائی خاتون ہو۔

''اخاہ، ma chere، میں تو آپ کو پہچان ہی نہ سکی،'' اس نے مسرت سے مسکراتے اور کاؤنٹ کی بھانجی کی طرف تقریباً بھاگتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کو اپنی خدمات پیش کرنے اور انکل کی تیمارداری میں آپ کا ہاتھ

بتانے آئی ہوں۔ آپ کو جو جو کھکھیڑیں برداشت کرنا پڑی ہیں، مجھے ان کا خوب اندازہ ہے،'' اس نے اپنی آنکھوں کی پتلیاں گھماتے ہوئے ہمدردانہ انداز میں کہا۔

پرنس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس سے اتنا بھی نہ ہوا کہ ذرا سی مسکراہی دیتی بلکہ وہ پھرتی سے باہر نکل گئی۔ آنا میخا ئیلو ونا نے میدان مار لیا تھا۔ اس نے اپنے دستانے اتارے اور آرام کرسی پر جم کر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پرنس واسیلی کو دعوت دی کہ وہ بھی اس کے قریب بیٹھ جائے۔

''بورس،'' اس نے اپنے بیٹے سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں اپنے انکل، کاؤنٹ، سے ملنے جا رہی ہوں۔ میری جان، تم یوں کرو کہ پیئر کے پاس چلے جاؤ اور ہاں، رستوفوں کی طرف سے اسے مدعو کرنا نہ بھولنا۔ انھوں نے اسے کھانے پر بلایا ہے،'' اس نے پرنس سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ شاید اس کا جانا ممکن نہ ہو۔''

''اس کے برعکس،'' پرنس نے جھلا کر جواب دیا۔ ''اگر تم اس نوجوان سے میرا پنڈ چھڑا سکو، مجھے قلبی مسرت ہوگی۔ وہ یہاں سے ہلنے کا نام تک نہیں لیتا اور ادھر کاؤنٹ نے اس سے ایک دفعہ بھی ملنے کو نہیں کہا۔'' اور پرنس اپنے کندھے اچکانے لگا۔

ایک باوردی خدمت گار بورس کو نیچے لے گیا۔ وہاں سے وہ سیڑھیاں چڑھتے پیوتر کرلووچ کے کمرے میں چلے گئے۔

13

پیٹرز برگ میں پیئر اپنے لیے کوئی ملازمت منتخب کرنے میں ہی ناکام نہیں رہا تھا، ستم بالائے ستم، اسے واقعی ہنگامہ آرائی کے الزام میں شہر بدر کر دیا گیا اور واپس ماسکو بھیج دیا گیا تھا۔ کاؤنٹس رستووا کے ہاں اس کے متعلق جو کہانی بیان کی گئی تھی، وہ سولہ آنے درست تھی۔ پیئر پولیس مین کو ریچھ کی پشت پر باندھنے کے فعل میں برابر کا شریک تھا۔ وہ گزشتہ کئی دنوں سے ماسکو میں تھا اور حسب معمول اپنے باپ کے گھر میں مقیم تھا۔ اگرچہ اس نے یہ مفروضہ بنا لیا تھا کہ اس کی داستان ازاں پیشتر ہی ماسکو کے ہر کہہ ومہ کی زبان پر آ چکی ہوگی اور ان خواتین نے — جنھوں نے اس کے باپ کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا اور جو کبھی بھلے وقتوں میں بھی اس کی حمایت پر مائل نہیں ہوئی تھیں — اس سنہری موقع سے لازماً فائدہ اٹھایا ہوگا اور کاؤنٹ کو اس کے خلاف بھڑکایا ہوگا، پھر بھی وہ جس روز ماسکو پہنچا، سیدھا مکان کے اس حصے کی طرف، جہاں اس کا باپ رہا کرتا تھا، چلا گیا۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں، جہاں عام طور پر پرنسسوں کا قبضہ رہتا تھا، داخل ہوا، اس نے خواتین کو آداب کہا۔ ان میں سے دو اپنے اپنے کشیدہ کاری کے فریم لیے بیٹھی تھیں اور تیسری با آواز بلند کتاب پڑھ رہی تھی۔ کتاب سب سے بڑی پڑھ رہی تھی۔ وہ انتہائی صاف ستھرے اور بے داغ لباس میں ملبوس تھی۔ اس کی کمر لمبی تھی اور اس کے چہرے پر درشتی جھلک رہی تھی۔ یہ وہی دوشیزہ تھی جس کی آنا میخائیلو ونا سے ملاقات ہوئی تھی۔

جہاں تک اس سے چھوٹی دونوں دوشیزاؤں کا تعلق تھا، وہ دونوں ہی قبول صورت تھیں اور ان کی رنگت سرخ و سپید تھی۔ ان کے مابین فرق صرف یہ تھا کہ ایک کے ہونٹ پر تل تھا جس نے اس کے حسن میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وہ دونوں کڑھائی میں مصروف تھیں۔ پیئر کا استقبال یوں کیا گیا جیسے وہ کوئی بھوت پریت ہو یا جذام کا مریض۔ بڑی پرنس پڑھتے پڑھتے رک گئی۔ اس کی سٹی گم ہوگئی اور وہ اسے گھور گھور کر دیکھنے لگی۔ دوسری کا رویہ بھی اپنی بہن جیسا تھا۔ لیکن جہاں تک تیسری کا تعلق ہے، وہ جس کے ہونٹ پر تل تھا، بہ اعتبار مزاج خوش باش اور مسخرگی کی دلدادہ تھی۔ وہ اپنے کشیدہ کاری کے فریم پر جھک گئی۔ لاریب وہ اپنا تبسم چھپانے کی تگ ودو کر رہی تھی کیونکہ اس نے یہ بھانپ لیا تھا کہ بڑا پرتفنن منظر دیکھنے کو ملے گا۔ اس سے اپنی ہنسی چھپائے نہیں چھپتی تھی۔ چنانچہ وہ نیچے جھکی، فریم میں سے اون نکالی اور یوں ظاہر کرنے لگی جیسے وہ نمونے کا بغور جائزہ لینے کی کوشش کر رہی ہو۔

"Bon jour, ma cousine,"* پیئر نے کہا۔ ''آپ لوگوں نے مجھے پہچانا نہیں؟''

''میں تمھیں خوب اچھی طرح، بلکہ ضرورت سے زیادہ اچھی طرح، پہچانتی ہوں۔''

''کاؤنٹ کی طبیعت کیسی ہے؟ کیا ان سے ملاقات ہو سکتی ہے؟'' پیئر نے حسب معمول بے ہنگم انداز سے پوچھا لیکن وہ شرمایا مطلق نہیں۔

''کاؤنٹ جسمانی اور ذہنی، دونوں اقسام کے عوارض میں مبتلا ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم نے ان کے ذہنی عوارض میں اضافہ کرنے میں کوئی کسر روا نہیں رکھی۔''

''کاؤنٹ سے میری ملاقات ہو سکتی ہے؟'' پیئر نے اپنا سوال دہرایا۔

''ہونہہ... اگر تمھارا انھیں ہلاک کرنے، انھیں سیدھے موت کے گھاٹ اتارنے کا ارادہ ہے، پھر ان سے ملاقات کر سکتے ہو۔ اولگا، جاؤ اور دیکھ کر آؤ کہ ان کا سوپ تیار ہوا یا نہیں۔ ان کے کھانا تناول فرمانے کا وقت ہوا چاہتا ہے،'' اس نے مزید کہا۔ اس قسم کی باتوں سے وہ دراصل پیئر کو یہ تاثر دینا چاہتی تھی کہ وہ مصروف ہیں اور مصروف بھی اس کے باپ کی تکالیف کم کرنے میں۔ ایک وہ ہے جو اسے محض پریشان کرنے پر تلا ہوا ہے۔

اولگا باہر چلی گئی۔ پیئر کچھ دیر کھڑا اور اپنی بہنوں کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ جھکا اور بولا:

''میں اپنے کمرے میں جا رہا ہوں۔ مجھے بتا دینا کہ میں ان سے کب ملاقات کر سکتا ہوں۔''

وہ باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کی اس بہن کی، جس کے ہونٹ پر تل تھا، دبی دبی لیکن کھنکھناتی ہنسی کی آواز آ رہی تھی۔

اگلے روز پرنس واسیلی پہنچ گیا اور اس نے کاؤنٹ کے گھر میں ڈیرا جما لیا۔ اس نے پیئر کو بلایا اور کہا:

''عزیزم، اگر یہاں بھی تمھارا وہی رویہ رہا جو پیٹرز برگ میں تھا، تو تمھارا انجام قطعی خوش کن نہیں ہوگا۔

---

* پھوپھی زاد بہنو، آداب عرض۔

مجھے تم سے بس یہی کہنا تھا۔ کاؤنٹ سخت بیمار ہیں۔ تمھارا ان سے ملاقات کرنا قطعی ناممکن ہے۔''

سو وہ دن اور یہ دن، پیئر کو کسی نے نہیں چھیڑا تھا۔ وہ اپنا وقت اوپر اپنے کمرے میں گزار رہا تھا۔

جب بورس اس کے دروازے پر پہنچا، وہ اپنے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ کسی کونے میں رک جاتا اور تخویف آمیز انداز سے جانب دیوار باز و لہرانے لگتا جیسے وہ کسی نادیدہ دشمن کے سینے میں شمشیر گھونپ رہا ہو۔ وہ چشمے کے اوپر سے شعلہ بار نگاہوں سے گھورتا اور دوبارہ کمرے کے چکر کاٹنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس اثنا کے دوران میں وہ مسلسل اپنے کندھے اچکاتا، بازو لہراتا اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جاتا۔

''انگلستان کا بیڑا غرق ہو گیا،'' اس نے غراتے اور اپنی انگلی کسی نادیدہ شے کی جانب گھماتے ہوئے کہا۔ ''پٹ کو،[33] جس نے اپنے وطن سے بھی غداری کی ہے اور اقوام کے حقوق سے بھی، اپنے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔''

لیکن پیشتر اس کے کہ پیئر، جو اس وقت اپنے آپ کو نپولین تصور کر رہا تھا اور جس نے ابھی ابھی خیالوں ہی خیالوں میں رودبار انگلستان کو عبور کرنے کا خطرناک مرحلہ ہی طے نہیں کر لیا تھا بلکہ لندن کو بھی تسخیر کر لیا تھا، پٹ کو اپنے کیے کی سزا سناتا، اس نے ایک خوش شکل اور متناسب الاعضاء نوجوان افسر کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا۔ پیئر کے قدم رک گئے۔ دونوں کی آخری ملاقات تب ہوئی تھی جب بورس ابھی چودہ سال کا طفل نوخیز تھا۔ اگرچہ پیئر کو بالکل یاد نہیں آ رہا تھا کہ نووارد کون ہے، اس نے پھر بھی اپنی عادت کے موافق فی البدیہہ اور ہنس مکھ طریقے سے اس کا خیر مقدم کیا۔ وہ دوستانہ انداز سے مسکرایا اور اس سے ہاتھ ملایا۔

''آپ نے مجھے پہچانا؟'' بورس نے خوشگوار انداز سے مسکراتے لیکن کسی قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ کیے بغیر پوچھا۔ ''میں اپنی اماں کے ساتھ کاؤنٹ سے ملنے آیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت بالکل ٹھیک نہیں ہے۔''

''جی ہاں۔ آثار سے کچھ یہی نظر آتا ہے۔ اور لوگ ہیں کہ انھیں ایک منٹ آرام نہیں کرنے دیتے،'' پیئر نے جواب دیا۔ ''یا اللہ یہ کون شخص ہے؟'' اسے مطلق یاد نہیں آ رہا تھا۔

بورس بھانپ گیا کہ پیئر اسے پہچان نہیں سکا۔ تاہم اس نے اپنا تعارف کرانا تضیع اوقات تصور کیا۔ وہ قطعاً گھبرائے شرمائے بغیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پورے انہماک سے اسے دیکھنے لگا۔

''کاؤنٹ رستوف نے آج شام آپ کو کھانا تناول کرنے کی دعوت دی ہے،'' اس نے خاصے طویل وقفے کے بعد، جس کے دوران میں پیئر بڑی بے چینی محسوس کرتا رہا، کہا۔

''اوہ، کاؤنٹ رستوف!'' پیئر نے وفور مسرت سے مغلوب ہو کر کہا۔ ''پھر تم ان کے صاحب زادے الیا ہو گے؟ میں بھی کتنا احمق ہوں کہ تمھیں ایک نظر پہچان ہی نہ سکا۔ تمھیں یاد ہے۔ بہت پرانی بات ہے۔ کہ ہم سیر سپاٹا کرنے مادام یاکووا کے ہمراہ کنجشکوں کی پہاڑی پر گئے تھے۔''

''آپ غلط فہمی کا شکار ہو رہے ہیں،'' بورس نے جان بوجھ کر گردن اکڑا کر اور قدرے پر تحقیر انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں بورس ہوں۔ آنا میخائیلونا دروبتسکایا کا بیٹا۔ الیا سینئر کاؤنٹ رستوف کا اسم گرامی

ہے۔ان کے صاحب زادے کا نام نکولائی ہے۔اور میں کسی مادام یا کوواکو کونہیں جانتا۔''
پیئر نے اپنے سر کو جنبش دی اور اپنے بازو یوں گھمانے پھرانے لگا جیسے شہد کی مکھیوں یا مچھروں نے اس پر یلغار کر دی ہو۔
''ارے، میں کیا سوچ رہا ہوں — میں نے ہر چیز گڈمڈ کر دی ہے! ماسکو میں اتنے عزیز و اقارب ہیں کہ گننا ناممکن! تم بورس ہو... ہاں، اب معلوم ہوا کہ ہم کہاں ہیں۔خیر تمھارا بولاں[34] مہم کے بارے میں کیا خیال ہے؟ میرے خیال کے مطابق یہ سراسر قابل عمل ہے، بشرطیکہ ویلنیو[35] سے کوئی حماقت سرزد نہ ہو جائے۔''
بورس کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ بولاں مہم کسی چڑیا کا نام ہے۔اس نے کبھی اخبارات کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔اور رہا ویلنیو، اس کا نام وہ پہلی مرتبہ سن رہا تھا۔
''یہاں ماسکو میں ہم سیاست کی بجائے ڈنر پارٹیوں اور جھوٹی سچی افواہوں کا زیادہ تعاقب کرتے ہیں،'' اس نے اپنے پرسکون استہزائی انداز سے کہا۔''اس مہم کے بارے میں نہ میں کچھ جانتا ہوں اور نہ میں نے اس کے بارے میں کبھی سوچا ہے۔ماسکو کے باشندے زیادہ تر گپ شپ میں مصروف رہتے ہیں،'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔''فی الحال ان کی گفتگو کے موضوعات آپ اور کاؤنٹ ہیں۔''
پیئر حسب معمول نیک طینتی سے مسکرا دیا گویا اسے اس چیز کا اندیشہ لاحق ہو کہ کہیں اس کے رفیق کے منہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جس پر اسے بعد میں پشیمانی ہو۔لیکن بورس جو بات کہہ رہا تھا، ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا تھا۔اس کا لہجہ اگرچہ خشک تھا لیکن اس کا ایک ایک لفظ صاف سمجھ میں آ رہا تھا اور وہ کسی قسم کے ہیر پھیر سے کام نہیں لے رہا تھا۔اس کی نگاہیں پیئر کی نگاہوں میں پیوست تھیں۔
''ماسکو میں لوگوں کو گپیں ہانکنے اور افواہیں اڑانے کے علاوہ اور کام نہیں۔'' وہ بولتا چلا گیا۔''ہر شخص یہ سوچ سوچ کر پاگل ہوا جا رہا ہے کہ کاؤنٹ اپنے قارون کے خزانے کا والی وارث کسے بنا جائیں گے، حالانکہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ ہم سب سے زیادہ عمر پائیں اور میں پورے خلوص سے یہ امید کرتا ہوں کہ وہ تادیر زندہ رہیں گے—''
''لیکن یہ رویہ قابل افسوس ہے،'' پیئر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔''واقعتاً قابل افسوس۔''
پیئر کو مسلسل یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ اس نوجوان افسر نے نادانستہ اس قسم کی جو گفتگو شروع کر دی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ بعد میں اس کے لیے شرمساری اور خجالت کا باعث بن جائے۔
''اور یہ بات تو آپ کو بھی معلوم ہو ہی گئی ہو گی،'' بورس نے قدرے تمتماتے لیکن اپنے لہجے یا انداز میں کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر کہا۔''اور یہ بات آپ نے بھی محسوس کر لی ہو گی کہ ہر شخص اس دولت مند آدمی سے کچھ نہ کچھ ہتھیانے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔''
''لگتا تو ایسا ہی ہے،'' پیئر نے سوچا۔
''میں آپ کو صرف یہی بتانا چاہتا تھا تا کہ کسی غلط فہمی کی گنجائش نہ رہے کہ اگر آپ نے مجھے اور میری ماں کو

بھی اس زمرے میں شمار کیا، تو یہ آپ کی بڑی بھول ہوگی۔ ہم مفلس ضرور ہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، محض اس لیے کہ آپ کے والد ماجد بے حد متمول ہیں، میں انھیں اپنا قرابت دار تسلیم نہیں کرتا۔ اور چلتے چلتے یہ بھی عرض کیے دیتا ہوں کہ نہ میں اور نہ میری ماں کبھی ان کے سامنے گڑگڑائیں گے یا ان سے کچھ وصول کریں گے۔''

بورس جو کچھ کہہ رہا تھا، خاصی دیر تک وہ پیئر کی سمجھ میں نہ آیا لیکن جب بات اس کے پلے پڑ گئی، اس نے صوفے سے جست لگائی، اضطراری اور بے ہنگم انداز سے بورس کی کلائی پکڑی اور اس سے زیادہ شرماتے اور تمتماتے ہوئے، ایک ایسے جذبے کے ساتھ جس میں خفت اور جھلاہٹ کی آمیزش تھی، بولنے لگا:

''ہونہہ، عجیب بات کر رہے ہو! تمھارا خیال ہے کہ میں — لیکن کوئی شخص ایسا سوچ بھی کیسے سکتا ہے — میں خوب جانتا ہوں —''

بورس نے دوبارہ اس کی بات کاٹ دی۔

''مجھے خوشی ہے کہ میں نے سب کچھ صاف بیان کر دیا ہے۔ اگر آپ کو میری باتیں پسند نہ آئی ہوں، تو میں معذرت خواہ ہوں۔'' بجائے اس کے کہ پیئر اس کا اضطراب دور کرتا، اس نے الٹا پیئر کو اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ ''اور مجھے امید ہے کہ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس سے آپ کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچی ہوگی۔ میں ہمیشہ اس اصول پر عمل کرتا ہوں کہ بات ہیر پھیر کے بغیر کہنا چاہیے... خیر، آپ یہ فرمائیں کہ میں انھیں کیا جواب پہنچاؤں؟ آپ رستوفوں کے ڈنر میں شرکت فرمائیں گے؟''

بھاری اور ناخوشگوار فریضے سے فراغت پانے اور اپنی جگہ دوسرے شخص کو کڈھب صورت حال میں پھنسانے کے بعد بورس ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگا اور اس کی زندہ دلی دوبارہ لوٹ آئی۔

''پر سنو،'' پیئر نے دوبارہ پرسکون ہونے کے بعد کہا۔ ''تم بڑے عجیب آدمی ہو۔ ابھی ابھی تم نے جو باتیں کہی ہیں، وہ اچھی، بلکہ بہت اچھی ہیں۔ البتہ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ طویل عرصے سے ہماری کوئی ملاقات نہیں ہوئی — بلکہ یوں کہو کہ بچپن کے بعد ہم کبھی ایک دوسرے سے نہیں ملے — تم شاید سوچ رہے ہو کہ میں — میں سمجھ گیا ہوں، خوب اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ خود مجھ سے یہ کبھی نہ ہوتا، مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں لیکن یہ بات ہے، بہت زبردست۔ میں بے حد خوش ہوں کہ تمھارے ساتھ تعارف ہو گیا... کتنی عجیب بات ہے،'' اس نے کچھ توقف کرنے اور مسکرانے کے بعد کہا، ''کہ تم میرے بارے میں اس طرح سوچتے ہو!'' وہ ہنسنے لگا۔ ''خیر چھوڑو، مجھے امید ہے کہ ہم ایک دوسرے کو بہتر طور پر سمجھنے لگیں گے۔'' اس نے بورس کا ہاتھ دبایا۔ ''تمھیں معلوم ہے کہ کاؤنٹ سے میری ایک بھی ملاقات نہیں ہوئی۔ انھوں نے مجھے بلایا ہی نہیں۔ بحیثیت انسان مجھے ان پر ترس آتا ہے — لیکن میں کیا کر سکتا ہوں؟''

''تو آپ کے خیال میں نپولین اپنی فوجیں پار لے جانے میں کامیاب ہو جائے گا؟'' بورس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

پیئر سمجھ گیا کہ بورس موضوع تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ وہ خود بھی یہی چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ بولاں مہم کے مثبت اور منفی پہلوؤں کی وضاحت کرنے لگا۔

وردی پوش خدمت گار بورس کو بلانے آ گیا۔ پرنسس آنا میخائیلوونا واپس جا رہی تھی۔ پیئر نے وعدہ کیا کہ وہ ڈنر میں ضرور شرکت کرے گا اور اس طرح اسے بورس کو زیادہ بہتر انداز میں جاننے کا موقع مل جائے گا اور اس نے اپنے چشمے کے اوپر سے جھانکتے اور دوستانہ انداز سے اس کی نگاہوں سے نگاہیں ملاتے گرم جوشی سے اس سے مصافحہ کیا۔

بورس کی روانگی کے بعد پیئر مزید کچھ دیر کمرے کے چکر لگاتا رہا لیکن اب وہ اپنے کسی خیالی دشمن پر تلوار نہیں لہرا رہا بلکہ اس قابل پسند، ذہین اور پرعزم نوجوان کو یاد کر کے مسکرا رہا تھا۔

جیسا کہ اوائل عمری میں، خاص طور پر اگر اس دور میں آدمی تنہائی کی زندگی گزار رہا ہو، اکثر ہوتا ہے، پیئر بھی اس نوجوان کے بارے میں رقیق القلب ہو گیا۔ وہ رقیق القلب کیوں ہوا، اس کی تشریح کرنا ناممکن ہے۔ اس نے جی میں ٹھان لیا کہ وہ اس نوجوان کے ساتھ بلا تاخیر دوستی کے مراسم استوار کرے گا۔

پرنس واسیلی نے پرنسس کو رخصت کیا۔ پرنسس کی آنکھوں پر رومال تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے آنسو اب گرے کہ اب گرے۔

''ان کی حالت تشویش ناک ہے، بہت تشویش ناک!'' اس نے کہا۔ ''لیکن میں اپنا فرض ہر حال میں نبھاؤں گی۔ میں واپس آؤں گی اور ساری رات ان کے سرہانے گزار دوں گی۔ انھیں ہرگز یوں نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ایک ایک لمحہ قیمتی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر پرنسسیں کس بات کا انتظار کر رہی ہیں! انشاء اللہ، میں انھیں تیار کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقہ ڈھونڈ نکالوں گی... Adieu, mon prince*، خدا آپ کا حامی و ناصر ہو...''

"Adieu, ma bonne"** پرنس نے اس سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔

''اوہ، ان کی حالت بے حد تشویش ناک ہے،'' ماں نے اپنے بیٹے سے کہا۔ وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ ''وہ شاید ہی کسی کو پہچانتے ہوں گے۔''

''اماں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ پیئر کے بارے میں ان کا کیا رویہ ہے؟'' بیٹے نے پوچھا۔

''مائی ڈیئر، وصیت سے سب معلوم ہو جائے گا۔ ہمارے مقدر کا انحصار بھی اسی پر ہے...''

''آپ نے یہ کیسے سوچ لیا کہ وہ ہمارے لیے کچھ چھوڑ جائیں گے؟''

''آہ، مائی ڈیئر، وہ اتنے امیر اور ہم اتنے غریب ہیں!''

''لیکن اماں، یہ تو کوئی خاص وجہ نہ ہوئی۔''

---

* پرنس، خدا حافظ۔

** خدا حافظ، مائی ڈیئر۔

''اوہ، میرے خدایا! میرے خدایا! وہ کتنے شدید بیمار ہیں!'' ماں نے بین کرتے ہوئے کہا۔

14

جب آننا میخائیلوونا اپنے بیٹے کے ہمراہ کاؤنٹ کرل ولادی مروچ بزدخوف سے ملاقات کرنے کی غرض سے گاڑی میں بیٹھ کر روانہ ہوگئی، کاؤنٹس رستووا کافی دیر اکیلی بیٹھی رہی۔ وہ بار بار رومال سے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ آخر کار اس نے گھنٹی بجائی۔

''مائی ڈیئر، تمھیں کیا تکلیف ہے؟'' اس نے خادمہ سے جس نے چند منٹوں کے لیے اسے انتظار میں رکھا تھا، ترش روئی سے پوچھا۔ ''اگر تمھیں میری خدمت کرنا پسند نہیں، میں تمھیں کوئی دوسرا کام سونپ دیتی ہوں۔''

اپنی سہیلی کی بدنصیبی اور شرم ناک مفلوک الحالی نے کاؤنٹس کی طبیعت بہت مکدر کر دی تھی اور جب بھی اس کی یہ کیفیت ہوتی تھی، وہ اس کا اظہار اپنی خادمہ کو 'مائی ڈیئر' جیسے رسمی کلمات سے مخاطب کر کے کیا کرتی تھی۔

''مادام، میں شرمندہ ہوں اور معافی چاہتی ہوں،'' ملازمہ نے جواب دیا۔

''جاؤ، اور کاؤنٹ کو بلا لاؤ۔''

کاؤنٹ بطخ کی بھدی چال چلتا پلک جھپکنے میں حاضر ہوگیا۔ وہ حسب معمول اپنی اہلیہ کے سامنے یوں محسوس کر رہا تھا جیسے وہ کسی چھوٹے موٹے جرم کا ارتکاب کر بیٹھا ہو۔

''اخاہ، ننھی منی کاؤنٹس، مرغی کی کیا غضب کی بھنائی ہوئی ہے! رہی مدیرا[36]، تو اس کا کوئی جواب ہی نہیں۔ میں نے خود چکھ کر دیکھا ہے۔ میں نے اس طارس باورچی کو بلانے کے لیے ایک ہزار روبل صرف کیے تھے۔ یہ رقم بیکار نہیں گئی۔ وہ اس کا پوری طرح مستحق ہے!''

وہ اپنی بیوی کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے خوشگوار انداز سے کہنیاں گھٹنوں پر جما لیں اور اپنے سفید بالوں میں انگلی پھیرنے لگا۔

''ننھی منی کاؤنٹس، میرے لیے کیا حکم ہے؟''

''مائی ڈیئر، بات یہ ہے ــ ارے، یہ داغ کہاں سے آ گیا؟'' وہ اس کی واسکٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''ہونہ ہو یہ مرغی کا داغ ہے،'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''کاؤنٹ، دیکھیں، مجھے کچھ رقم درکار ہے۔''

اس نے یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر اداسی اور ملال کے بادل چھا گئے۔

''اوہ، ننھی منی کاؤنٹس!...'' وہ بولا اور اپنی پاکٹ بک ٹٹولنے لگا۔

''کاؤنٹ، مجھے اچھی خاصی رقم کی ضرورت ہے۔ مجھے پانچ سو روبل درکار ہیں۔'' اور وہ اپنا سوتی رومال نکال کر اپنے خاوند کی واسکٹ پونچھنے لگی۔

''ابھی لیں، اسی وقت حاضر ہیں! ارے بھئی، ادھر کون ہے؟'' اس نے ایک ایسے شخص کے لہجے میں پکار کر

کہا جسے یہ یقین ہوتا ہے کہ وہ جس شخص کو بھی آواز دے گا، دوڑتا دوڑتا اس کی خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔
''متنکا کو میرے پاس بھیج دو۔''

متنکا کا تعلق اونچے گھرانے سے تھا۔ اس کی پرورش کاؤنٹ کے گھر میں ہوئی تھی اور اب وہ اس کے تمام امور کی نگہداشت کرتا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔

''مائی ڈیئر نوجوان، سنو...'' کاؤنٹ نے مؤدب نوجوان سے، جو کمرے میں آ چکا تھا، کہا۔ ''جاؤ اور میرے لیے...'' اس نے کچھ دیر سوچا۔ ''ہاں، سات سو روبل لے آؤ۔ ارے ہاں، پچھلی بار کی طرح نوٹ تڑے مڑے، کٹے پھٹے اور گندے وندے نہ ہوں بلکہ کرارے اور کھنکتے ہوں۔ کاؤنٹس کو پیش کرنا ہیں۔''

''ہاں، متنکا، صاف ستھرے۔ مہربانی ہوگی،'' کاؤنٹس نے اداس آہ بھرتے ہوئے کہا۔

''حضور، آپ کو یہ نوٹ کب چاہئیں؟'' متنکا نے پوچھا۔ ''یور ایکسی لینسی، میں آپ کو مجبوراً مطلع کر رہا ہوں کہ...'' تاہم جب اس نے کاؤنٹ کو لمبی لمبی اور تیز تیز سانسیں لیتے دیکھا جو اس امر کی علامت تھی کہ کاؤنٹ کا پارہ چڑھنے والا ہے، وہ جھٹ پٹ گویا ہوا، ''مجھے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ کیا یہ نوٹ ابھی آپ کی خدمت میں حاضر کر دیے جائیں؟''

''بالکل، ابھی اور اسی وقت۔ جن قدموں جاؤ، انھی قدموں واپس آؤ اور نوٹ کاؤنٹس کی خدمت میں پیش کر دو... یہ متنکا کتنا انمول شخص ہے،'' نوجوان شخص کے کمرے سے نکل جانے کے بعد کاؤنٹ نے مسکرا کر کہا۔ ''کبھی کوئی چیز ناممکن نہیں ہوتی۔ بس یہی بات مجھ سے برداشت نہیں ہوتی۔ ہر چیز ممکن ہے۔''

''آہ، روپیہ، کاؤنٹ، روپیہ۔ یہ دنیا میں کتنے ہی دکھوں اور غموں کا سبب بنتا ہے،'' کاؤنٹس نے کہا۔ ''لیکن مجھے اس رقم کی شدید ضرورت ہے۔''

''میری ننھی منی کاؤنٹس، آپ کی شاہ خرچیوں کے گھر گھر چرچے ہیں،'' کاؤنٹ نے کہا۔ اس نے اپنی بیوی کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور واپس اپنے سٹڈی روم میں چلا گیا۔

جب آنا میخائیلونا کاؤنٹ بزوخوف کے ہاں سے واپس لوٹی، رقم بالکل نئے کھنک دار نوٹوں کی شکل میں کاؤنٹس کی چھوٹی میز پر رومال کے نیچے دھری تھی۔ وہ تاڑ گئی کہ کاؤنٹس کو کوئی چیز پریشان کر رہی ہے۔

''خیر، مائی ڈیئر، ان کی کیا خبر لائی ہو؟''

''اف، ان کی حالت بے حد تشویش ناک ہے! وہ اتنے بیمار ہیں — اتنے بیمار ہیں کہ ان کی صورت پہچانی نہیں جاتی! میں صرف چند منٹ وہاں ٹھہری اور ایک آدھ لفظ کے علاوہ کچھ نہ کہہ سکی —''

''آنیت، خدا کے لیے مجھے انکار نہ کرنا،'' کاؤنٹس اچانک اس کی بات کاٹ کر بولی۔ اس کے رخساروں پر سرخی نمودار ہو گئی جو اس کے مہین، دبلے پتلے، باوقار اور بزرگانہ چہرے پر کچھ عجیب معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے رومال کے نیچے سے رقم نکالی۔

آنا میخائیلوونا پلک جھپکنے میں اس کے عزائم بھانپ گئی۔ وہ دوزانو ہو گئی تا کہ مناسب وقت پر اس سے بغل گیر ہو سکے۔

''یہ میری طرف سے بورس کے لیے ہے۔ اس کی وردی کے لیے۔''

آنا میخائیلوونا نے جھٹ پٹ اپنے بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کر دیے اور ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔ کاؤنٹس کی آنکھیں بھی اشک بار ہو گئیں۔ وہ رو رہی تھیں کیونکہ وہ سہیلیاں تھیں، کیونکہ وہ دونوں دل کی نرم تھیں، کیونکہ بچپن سے وہ ایک دوسرے کی دوست تھیں، تو کیا پھر انھیں روپے پیسے جیسی گھٹیا چیز کے بارے میں مشوش ہونا چاہیے تھا! اور کیوں کہ ان کی جوانی کی رت بیت چکی تھی... لیکن ان کے آنسو دونوں کو راحت پہنچا رہے تھے۔

15

کاؤنٹس رستووا اپنی بیٹیوں اور کثیر تعداد مہمانوں کے ساتھ ڈرائنگ روم میں ڈیرا جمائے ہوئے تھی۔ شرفا کو کاؤنٹ اپنے سٹڈی روم میں لے گیا تھا۔ وہاں ان کی تواضع چنیدہ اور بڑھیا ترین تمباکو کے پائپوں سے کی جا رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً وہ باہر جاتا اور دریافت کرتا۔ ''کیا وہ ابھی تک نہیں آئیں؟'' انھیں ماریا دمتریونا آخروسیموا (Akhrosimova)[37] کا انتظار تھا۔ اونچے طبقے میں یہ خاتون مہیب اژدھن کہلاتی تھی۔ اس کی شہرت کا سبب اس کی دولت یا مرتبہ نہیں بلکہ اس کی صاف گوئی اور کھرے اور بے لاگ اطوار تھے۔ ماریا دمتریونا سے شاہی خاندان بھی شناسا تھا اور ماسکو اور پیٹرز برگ کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔ دونوں شہروں کے باشندے اس کے بارے میں اظہار استعجاب بھی کرتے تھے، دل ہی دل میں اس کی بدتمیزیوں پر ہنستے بھی تھے اور اس کے متعلق ایک دوسرے کو لطیفے اور قصے کہانیاں بھی سناتے تھے۔ تاہم بلا استثنا سب اس سے ڈرتے اور اس کا احترام کرتے تھے۔

کاؤنٹ رستوف کا ڈرائنگ روم دھوئیں سے تاریک ہو رہا تھا۔ گفتگو کا موضوع وہ سرکاری اعلان نامہ تھا جس میں جنگ کا اعلان کیا گیا تھا اور لوگوں سے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے کہا گیا تھا۔ ابھی تک کسی نے بھی اعلان نامے کا بذات خود مطالعہ نہیں کیا تھا لیکن اس کا علم سبھی کو تھا۔ کاؤنٹ دو مہمانوں کے مابین، جو پائپ کے کش لگا رہے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے، گدے دار چوکی پر بیٹھا تھا۔ وہ خود نہ پائپ پی رہا اور نہ باتیں کر رہا تھا لیکن وہ ان دونوں کو ایسی مسرت سے، جو چھپائے چھپتی نہیں تھی، دیکھ رہا تھا اور ان کے دلائل کو (خود اسی نے انھیں ایک دوسرے کے خلاف بھڑکایا تھا) غور سے سن رہا تھا۔

ان دونوں حریفوں میں ایک عام شہری تھا۔ اس کی داڑھی اور مونچھیں صفاچٹ تھیں۔ اس کا چہرہ دبلا پتلا اور جھریوں زدہ تھا۔ شکل وصورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ خاصا چڑچڑا آدمی ہے۔ اگرچہ وہ ادھیڑ عمر میں داخل ہو چکا تھا لیکن جہاں تک اس کے لباس کا تعلق ہے، وہ انتہائی فیشن زدہ نوجوانوں سے کم نہیں تھا۔ اس نے گدے دار چوکی پر یوں پاؤں ٹکائے ہوئے تھے جیسے یہ اس کا اپنا گھر ہو۔ اس نے پائپ کا عنبرین دہانہ اپنے منہ کے ایک کونے کے اندر

دور تک گھسیڑ رکھا تھا۔ وہ گاہے بگاہے کش لیتا اور آنکھیں سکیڑ لیتا۔ وہ کاؤنٹس کا چچازاد بھائی شن شن (Shinshin) تھا اور ابھی تک تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ ماسکو کے ڈرائنگ روموں میں اس کے متعلق جو باتیں بنائی جاتی تھیں، ان کے مطابق اس کی زبان خاصی زہریلی تھی۔ اپنے ہم جلیس کے ساتھ اس کے مشفقانہ رویے سے یہ احساس جھلک رہا تھا کہ اس کا مخاطب کم تر حیثیت کا مالک ہے اور وہ اسے گفتگو کا موقع فراہم کر کے اس پر بڑی نوازش کر رہا ہے۔ اس کا یہ ہم جلیس گارڈز میں افسر تھا۔ اس کا چہرہ تازہ اور گال گلابی تھے۔ اس نے جس طرح رگڑ رگڑ کر اپنے جسم کی صفائی کی تھی، بالوں کی کنگھی چوٹی کی تھی اور جس قسم کا لباس پہنا ہوا تھا، اس میں کوئی عیب نہیں ڈھونڈا جا سکتا تھا۔ اس نے پائپ کا عنبرین دہانہ اپنے خوش وضع منہ کے عین درمیان میں ٹکایا ہوا تھا۔ وہ بہت نفاست سے سرخ ہونٹوں سے دھواں اندر کھینچتا اور چھوٹے چھوٹے مرغولوں کی صورت میں باہر نکال دیتا۔ یہ لیفٹیننٹ برگ (Berg) تھا اور سیمیونووسکی رجمنٹ میں افسر تھا۔ بورس نے اپنے رجمنٹ میں شمولیت کے لیے اسی کے ساتھ سفر پر روانہ ہونا تھا اور یہی وہ شخص تھا جس کے بارے میں نتاشا نے اپنی بڑی بہن کو طعنہ دیا تھا کہ وہ اس کا منگیتر ہے۔
کاؤنٹ ان دونوں کے درمیان بیٹھا تھا اور ان کی باتیں دھیان سے سن رہا تھا۔ اس کا دل پسند مشغلہ تاش کا کھیل بوسٹن، جس کا وہ بے حد شوقین تھا، کھیلنا اور دوسروں کی خاص طور پر اس وقت جب وہ گفتگو کے فن سے آشنا دو اشخاص کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑانے میں کامیاب ہو جاتا، باتیں سننا تھا۔

''چنانچہ برادر، mon tres honorable* الفانسے کارلووچ،'' شن شن نے طنزیہ ہنسی ہنستے اور اپنی گفتگو میں روسی بول چال کے نہایت معمولی الفاظ و تراکیب میں فرانسیسی کی نہایت خوبصورت اور دلکش تراکیب کی آمیزش کرتے ہوئے کہا جو اس کے انداز کی نمایاں خصوصیت تھی، Vous Comptezvous faire des rentes sur l'etat** – اپنی ہی کمپنی سے منافع کمانے کی ترکیبیں لڑا رہے ہیں۔''

''بالکل نہیں، قطعاً نہیں، محترم پیوتر نکولائی وچ، میں تو صرف یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ پیادہ فوج کے مقابلے میں گھڑ سوار فوج کی نوکری گھاٹے کا سودا ہے۔ چنانچہ محترم پیوتر نکولائی وچ، اگر آپ میری پوزیشن کے متعلق غور فرمائیں...''

برگ کی عادت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ دھیمے لہجے میں اور نہایت شائستگی سے بات کرتا تھا اور جو بات کہتا تھا وہ اتنی جچی تلی ہوتی تھی کہ اس کا کوئی دوسرا مفہوم اخذ کرنا ناممکن ہوتا تھا۔ اس کی گفتگو کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہمیشہ اپنے ہی بارے میں باتیں کرتا تھا اور اگر گفتگو کا موضوع تبدیل ہو جائے اور وہ کسی ایسی چیز کے بارے میں ہونے لگے جس کا اس کی ذات سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہو، وہ منہ میں گھنگھنیاں ڈال کر بیٹھ جاتا اور لب کشائی سے احتراز کرتا۔ وہ ایک وقت میں گھنٹوں چپ چاپ بیٹھ سکتا تھا۔ اس دوران میں نہ وہ خود شرمسار ہوتا اور نہ کسی

* میرے پیارے عزت مآب۔
** تو آپ یوں حکومت سے رقم بٹورنے کی سوچ رہے ہیں۔

دوسرے کو شرمسار ہونے دیتا۔ لیکن جونہی گفتگو کا رخ پلٹتا اور اسے محسوس ہوتا کہ اس کا تعلق براہ راست اس کی ذات سے ہے، اس کے منہ کا قفل کھل جاتا۔ وہ بے تکان اور جی بھر کر باتیں کرتا اور دیکھنے والوں کو نظر آتا کہ وہ اپنی ہی باتوں سے خوب لطف اندوز ہو رہا ہے۔

''محترم پیوتر نکولائی وچ، ذرا میری پوزیشن پر غور فرمائیں۔ اگر میں گھڑ سوار فوج میں نکا رہتا، مجھے ہر چار ماہ بعد دوسو روبل سے زیادہ کچھ نہ ملتا، حالانکہ میرا عہدہ لیفٹیننٹ کا ہے۔ لیکن موجودہ حیثیت میں مجھے دوسو تیس روبل کی یافت ہوتی ہے،'' اس نے شن شن اور کاؤنٹ پر مسکراہٹ کی کرنیں بکھیرتے ہوئے کہا جیسے اسے اس بارے میں مطلق شک وشبہ نہ ہو کہ جس قسم کی کامیابی کے خواب وہ دیکھتا ہے، وہی ہر شخص کی زندگی کا مقصد اولیٰ اور منتہائے آرزو ہے۔ ''اس کے علاوہ، جناب پیوتر نکولائی وچ، گارڈز میں تبادلے کا فائدہ یہ ہوگا کہ مجھے وہاں ایسی جگہ مل سکے گی جہاں میں لوگوں کی نگاہوں میں آسکوں گا،'' برگ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور پیادہ گارڈز میں جلدی جلدی اور تواتر سے اسامیاں خالی ہوتی رہتی ہیں۔ پھر یہ بھی سوچیں کہ دوسو تیس روبل سے کیا کچھ نہیں کیا جا سکتا۔ میں کچھ رقم پس انداز بھی کر لیتا ہوں اور کچھ پیسے اپنے والد محترم کو بھی بھیج دیتا ہوں،'' وہ دھوئیں کے کش اڑاتا بولتا چلا گیا۔

''La balance y est[38]... کہاوت کہتی ہے کہ جرمن دھیلا بچانے کے لیے پتھر بھی نچوڑ سکتے ہیں،'' شن شن نے پائپ منہ کے دوسرے کونے میں گھسیڑتے اور کاؤنٹ کو آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

کاؤنٹ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ جب دوسرے مہمانوں نے دیکھا کہ گفتگو شن کر رہا ہے، وہ بھی اس کی باتیں سننے اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ برگ پر نہ دل لگی اثر انداز ہوئی اور نہ اسے یہ احساس ہوا کہ اس کی باتیں بے اعتنائی سے سنی جا رہی ہیں۔ وہ ان چیزوں سے بے نیاز یہ بتانے میں مشغول ہو گیا کہ گارڈز میں تبادلہ ہو جانے کے بعد وہ کس طرح اپنے کیڈٹ کور کے ساتھیوں سے ایک قدم آگے نکل گیا ہے، پھر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنگ کے دوران میں کمپنی کا کمانڈر ہلاک ہو جائے، اس صورت میں سینئر افسر کی حیثیت سے وہ نہایت آسانی سے اس کی جگہ پر مقرر ہو سکتا ہے۔ پھر اس نے یہ بتایا کہ رجمنٹ میں ہر شخص اسے بنظر پسندیدگی دیکھتا ہے اور اس کے پاپا اس سے بے حد خوش ہیں۔ صاف ظاہر تھا کہ برگ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس سے خوب لطف اندوز ہو رہا تھا اور غالباً یہ بات اس کے ذہن وگمان میں بھی نہ آئی ہوگی کہ لوگوں کو اور چیزوں میں بھی دلچسپی ہو سکتی ہے لیکن اس کے اطوار اتنے پسندیدہ تھے، جو بات وہ کہتا تھا اتنی سنجیدگی سے کہتا تھا اور اس کی طفلانہ انا پرستی کی معصومیت اتنی واضح تھی کہ اس نے اپنے سامعین سے ہتھیار ڈلوا لیے۔

''خیر، صاحب زادے، آپ جہاں بھی جائیں — پیادہ فوج میں یا گھڑ سوار رجمنٹوں میں — میری پیشین گوئی یہ ہے کہ آپ بہت ترقی کریں گے!'' شن شن نے گدے دار چوکی سے پاؤوں ہٹاتے اور برگ کے کندھے

• آپ نے بالکل صحیح فرمایا۔

پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔
برگ خوشی سے پھولا نہ سمایا اور مسکرانے لگا۔ کاؤنٹ اپنے مہمانوں کو دوبارہ ڈرائنگ روم میں لے گیا۔

کھانے سے پہلے یہ وہ وقفہ تھا جب مہمانوں کو یہ توقع بندھنے لگتی ہے کہ طعام کا بلاوا اب آیا ہی چاہتا ہے اور یوں وہ طویل گفتگو سے اجتناب برتنے لگتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ کمرے میں ادھر ادھر گھومنا اور کچھ نہ کچھ بولتے رہنا اپنا فرض گردانتے ہیں تاکہ وہ یہ جتا سکیں کہ وہ دسترخوان پر پہنچنے کے لیے قطعاً بے چین نہیں ہیں۔ میزبان میاں بیوی مسلسل دروازے کی جانب دیکھتے رہتے ہیں اور کبھی کبھار آپس میں نگاہوں کا تبادلہ بھی کر لیتے ہیں۔ اس سے مہمان یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتے ہیں کہ کس شخص یا کس چیز کا انتظار ہو رہا ہے: شاید یہ کوئی بہت قریبی عزیز ہے یا پھر کوئی ڈش ابھی تیاری کے مراحل میں سے گزر رہی ہے۔

پیئر ڈنر کے آغاز سے چند ہی منٹ پہلے پہنچا اور اس کی نظریں جس اولین کرسی پر پڑیں، وہ بے ہنگم انداز سے اس پر بیٹھ گیا۔ یہ کرسی کمرے کے عین درمیان میں پڑی تھی اور یوں وہ ہر آنے جانے والے کے لیے رکاوٹ بن گیا۔ کاؤنٹس نے اسے باتوں میں لگانا چاہا لیکن اس کی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف گھومتی رہیں۔ وہ اپنے چشمے میں سے یوں ادھر ادھر جھانک رہا تھا جیسے وہ کسی شخص کو تلاش کر رہا ہو۔ کاؤنٹس اس سے جو کچھ بھی پوچھتی، وہ اس کا جواب ''ہوں، ہاں'' میں ہی دینے پر اکتفا کرتا۔ وہ سب کے لیے زحمت کا باعث بنا ہوا تھا لیکن وہ واحد شخص تھا جسے اس کا کوئی احساس نہیں تھا۔ ریچھ کا واقعہ اکثر و بیشتر مہمانوں کے علم میں تھا اور وہ اس لحیم شحیم، ہٹے کٹے اور بظاہر مسکین شخص کو متجسس نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ انھیں تعجب اس بات پر تھا کہ یہ چپ چپیتا، خاموش طبع اور آرام طلب آدمی پولیس مین کے ساتھ اس قسم کی شرارت کیسے کر سکتا ہے۔

''ماسکو میں تم حال ہی میں آئے ہو گے؟'' کاؤنٹس نے اس سے پوچھا۔

''جی، مادام،'' اس نے اپنے گرد و پیش جھانکتے ہوئے کہا۔

''ابھی تم میرے میاں سے تو نہیں ملے ہو گے؟''

''نہیں، مادام،'' اس نے بے تکے انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ کچھ عرصہ قبل تم پیرس میں مقیم تھے۔ بڑی دلچسپ جگہ ہو گی؟''

''بہت دلچسپ۔''

کاؤنٹس نے آنا میخائیلوونا سے نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ آنا میخائیلوونا کو احساس ہوا کہ اس سے یہ توقع کی جا رہی ہے کہ وہ اس نوجوان کا دل بہلائے۔ چنانچہ وہ اس کے قریب بیٹھ گئی اور اس سے اس کے باپ کے بارے میں باتیں کرنے لگی لیکن پیئر نے اس کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا جو وہ کاؤنٹس کے ساتھ کر چکا تھا، وہ اس کی

باتوں کا جواب بھی محض ہوں، ہاں ہی میں دیتا رہا۔ دیگر مہمان آپس میں باتیں کرنے میں مشغول تھے۔

''رازدموو سکی... بے حد پرکشش تھا... آپ کی بڑی عنایت ہے... کاؤنٹس اپراکسنا...'' اس قسم کے الفاظ اور فقرات چاروں اطراف سنائی دے رہے تھے۔

کاؤنٹس اٹھی اور استقبالیہ کمرے کی طرف چل دی۔

''ماریا دمترویونا؟'' اسے کہتے سنا گیا۔

''جی ہاں، میں ہی ہوں۔'' کرخت نسوانی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی ماریا دمتریونا کمرے میں داخل ہوگئی۔

بالکل ہی معمر خواتین کے علاوہ باقی تمام عورتیں، کیا کنواری، کیا شادی شدہ، سبھی اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ ماریا دمتریونا دروازے میں رک گئی۔ وہ دراز قد اور قدرے فربہ اندام عورت تھی اور پچاس کے پیٹے میں تھی۔ اس کے بال گھونگھریالے تھے اور وہ تن کر سیدھی کھڑی تھی۔ وہ ظاہر یہ کر رہی تھی کہ وہ اپنے ڈریس کی آستینیں، جو خاصی فراخ تھیں، درست کر رہی ہے لیکن حقیقتاً وہ مہمانوں کا بنظر غائر جائزہ لے رہی تھی۔ ماریا دمتریونا ہمیشہ روسی زبان میں گفتگو کرتی تھی۔

''میں اپنی پیاری بہن کے نام دن پر اسے اور اس کے بچوں کو ہدیہ تبریک پیش کرتی ہوں،'' اس نے بلند آہنگ اور گمبھیر آواز میں کہا جس کے شور میں باقی تمام آوازیں ڈوب گئیں۔ ''اور پرانے پاپی، تم؟ تمھارا کیا حال ہے؟'' اس نے کاؤنٹ سے، جو اس کے ہاتھ کو بوسہ دے رہا تھا، مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم یہاں ماسکو میں بالکل بور ہو رہے ہوگے؟ کتوں کے ساتھ شکار پر جانے کا موقع نہیں ملتا ہوگا؟ لیکن میرے دوست، کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ — یہ نوخیز پرندے پر پرزے نکال رہے ہیں۔'' اور اس نے ہاتھ سے لڑکیوں کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم چاہو یا نہ چاہو، بہر حال تمھیں ان کے لیے بر تلاش کرنا ہی ہوں گے۔ خیر، میری قازق[39] (ماریا دمتریونا نتاشا کو ہمیشہ قازق کہتی تھی) کیسی ہے؟'' اس نے لڑکی کے، جو خوش خوش اور بلا جھجک اس کے ہاتھ پر بوسہ دینے کے لیے آگے آ رہی تھی، بازو پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ یہ بچی آفت کی پرکالہ ہے۔ لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ مجھے یہ بہت عزیز ہے۔''

اس نے اپنے بھاری بھرکم ہینڈ بیگ میں سے ناشپاتی کی شکل کے دو آویزے، جن میں قیمتی جواہر جڑے تھے، نکالے اور انھیں نتاشا کو، جس کا نام دن پر چہرہ خوشی سے چمک دمک رہا تھا، پہنانے کے بعد وہ ایکا ایکی دوسری جانب متوجہ ہوئی اور اس نے پیئر کو اپنے نشانے کی زد میں لے لیا۔

''اخاہ، مائی ڈیئر، ذرا ادھر آنا!'' اس نے ملائم اور دھیما لہجہ، جو بالکل جعلی تھا، اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''مائی ڈیئر، ذرا ادھر آنا!'' اور اس نے دھمکی آمیز انداز سے اپنی آستینیں ذرا اوپر چڑھا لیں۔

پیئر آگے آگیا اور بھولے بچوں کی طرح چشمے میں سے اسے دیکھنے لگا۔

''مائی ڈیئر، آگے آؤ نا، ذرا اور آگے! جس زمانے میں تمھارا باپ دربار کا چہیتا تھا، میں واحد شخص تھی جو بچی

بات اس کے منہ پر کہہ دیا کرتی تھی اور اب میرا یہ مقدس فرض بنتا ہے کہ تمھارے ساتھ بھی وہی سلوک کروں۔''

اس نے توقف کیا۔ سب لوگ دم سادھے خاموش بیٹھے رہے۔ وہ سب محسوس کر رہے تھے کہ یہ تو ابھی شروعات ہے، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔

''بڑے مزے کے آدمی ہو تم، یقیناً مزے کے آدمی! اسے دیکھو، اس کا باپ بستر مرگ پر پڑا ہے اور اسے انکھیلیاں سوجھ رہی ہیں۔ پولیس کے آدمی کو ریچھ کے اوپر بٹھاتا ہے اور اپنا دل پشوری کرتا ہے! شرم چہ کتی ایست کہ پیش مرداں بیائد! بڑے ڈھیٹ ہیں حضور! پانی میں ڈوب مرو۔ لام پر کیوں نہیں چلے جاتے؟ کچھ تو بھلا ہوگا۔''

وہ ایک طرف ہٹی اور اپنا ہاتھ کاؤنٹ کے ہاتھ میں دے دیا جس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔

''اچھا، چھوڑو۔ میرا خیال ہے کہ اب ہمیں کھانا شروع کر دینا چاہیے۔ درست؟'' ماریا دمتریونا نے کہا۔

کاؤنٹ ماریا دمتریونا کی معیت میں آگے آگے چل پڑا۔ ان کے پیچھے پیچھے ہوزار دستوں کے کرنل کا بازو تھامے کاؤنٹس آ رہی تھی۔ یہ کرنل ان کے لیے بہت اہم تھا کیونکہ نکولائی نے اسی کے ساتھ جانا اور اپنی رجمنٹ میں شامل ہونا تھا۔ آننا میخائیلوونا کا ساتھ شن شن نے دیا۔ برگ نے اپنا بازو ویرا کو تھما دیا۔ متبسم جولی کاراگنا نے نکولائی کے ساتھ دسترخواں کا رخ کیا۔ ان کے بعد دوسرے جوڑے چل پڑے۔ ان کی لمبی قطار ڈائننگ روم کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکی تھی۔ سب سے آخر میں بچوں کی باری آئی۔ وہ اپنے اتالیقوں اور گورنسوں کے ساتھ آ رہے تھے۔ ملازمین کا جم غفیر ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ کرسیاں رگڑیں کھا رہی تھیں۔ جب مہمان اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے، اوپر گیلری میں کاؤنٹ کا نجی آرکسٹرا موسیقی کی دھنیں بکھیرنے لگا۔ تاہم ثانیوں کے اندر اندر چھری کانٹوں کی کھٹکھٹاہٹ، آوازوں کی بھنبھناہٹ اور بیروں کے قدموں کی دبی آہٹ میں موسیقی کی تانیں دب گئیں۔ میز کے ایک سرہانے کاؤنٹس فروکش تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ ماریا دمتریونا اور بائیں ہاتھ آننا میخائیلوونا بیٹھی تھیں۔ باقی خواتین کو میز کی لمبائی کے رخ نشستیں ملیں۔ میز کا دوسرا سرا کاؤنٹ نے سنبھال لیا۔ اس کے دائیں جانب شن شن اور بائیں ہوزاروں کی رجمنٹ کا کرنل متمکن تھا۔ باقی حضرات خواتین کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھ گئے۔ نوجوان لڑکے لڑکیاں میز کی ایک طرف، ویرا برگ کے ساتھ اور پیئر بورس سے اگلی کرسی پر، ان کے اتالیق اور گورنسیں دوسری جانب تھیں۔

کاؤنٹ بڑی مستعدی سے اپنے پڑوسی کا گلاس بھرتا جاتا، (وہ اپنا گلاس بھرنا نہ بھولتا) اور بلوری صراحیوں اور فروٹ کے پیالوں کے عقب سے اپنی بیوی کو، جس نے نیلے ربنوں سے مزین اونچی ٹوپی پہنی ہوئی تھی، دیکھتا جاتا۔ میزبان کی حیثیت سے اپنے فرائض نظر انداز کیے بغیر کاؤنٹس بھی اناناسوں کے ڈھیر کے عقب میں بار بار اپنے شوہر پر معنی خیز نظریں ڈال رہی تھی۔ آج اسے اپنے خاوند کے رخساروں کی لالی اور قلیل بالوں کے مقابلے میں اس کے سر کا گنجاپن کچھ زیادہ ہی کھل رہا تھا۔

میز کی جس جانب خواتین بیٹھی تھیں، ادھر سے آوازوں کی بھنبھناہٹ مسلسل سنائی دے رہی تھی۔ ادھر

مردوں کی آوازیں بھی بلند سے بلند تر ہوتی جارہی تھیں۔ خاص طور پر ہوزاروں کی رجمنٹ کا کرنل خاصا باؤلا ہوتا جارہا تھا۔ اس کے رخسار سرخ سے سرخ تر ہوتے جارہے تھے اور وہ کھانے پینے کی اشیا اتنی زیادہ مقدار میں اپنے حلق کے اندر انڈیل رہا تھا کہ کاؤنٹ کو اسے دوسرے مہمانوں کے سامنے بطور نمونہ پیش کرنا پڑ رہا تھا کہ وہ بھی اس کی تقلید کریں۔ برگ ویرا پر ملائم مسکراہٹ نچھاور کررہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ محبت ارضی نہیں بلکہ سماوی جذبہ ہے۔ بورس اپنے نئے دوست پیئر کو مہمانوں کے حسب نسب سے آگاہ اور نتاشا کے ساتھ، جو اس کی مخالف سمت بیٹھی تھی، نگاہوں کا تبادلہ کررہا تھا۔ پیئر کا دھیان باتوں کی طرف کم اور کھانے کی طرف زیادہ تھا۔ وہ بڑھ بڑھ کر ہاتھ مار رہا تھا اور ساتھ ساتھ مہمانوں کے چہروں کا بنظر غائر جائزہ لیتا جاتا تھا۔ طعام کے آغاز میں جو دو سوپ پیش کیے گئے، اس نے ان میں سے جنگلی فاختہ کے سوپ کو ترجیح دی۔ اس کے بعد اللہ دے اور بندہ لے، مچھلی کی پائیوں سے لے کر مرغی کے گوشت تک، کوئی ڈش ایسی نہیں تھی جسے اس نے کھانے کی ہامی نہ بھری ہو اور نہ اس نے کسی قسم کی شراب رائیگاں جانے دی۔ بٹلر انواع واقسام کی شراب کی بوتلیں، جن کے گرد رومال لپٹے ہوئے تھے، پراسرار طریقے سے پڑوسی کے کندھے کے اوپر سے دھکیلتا اور اس کے سامنے کردیتا۔ "کڑوی مدیرا... ہنگری کی مے انگور... رائن لینڈ کی مے سرخ۔" وہ اسے زیرلب بتاتا جاتا۔ ہر مہمان کے آگے چار بلوری گلاس، جن پر کاؤنٹ کا مونوگرام منقش تھا، دھرے تھے۔ پیئر ان میں سے ایک انکل پچو اٹھاتا، اسے بھرتا اور مزے لے لے کر پینے لگتا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مہمانوں کو، جن میں ہر آن اضافہ ہورہا تھا، بہ نگاہ لطف وکرم دیکھتا جاتا۔

نتاشا بورس کے بالمقابل بیٹھی تھی۔ وہ اسے ایسے ہی دیکھ رہی تھی جیسے تیرہ سالہ لڑکی اس لڑکے کو، جس کے دام الفت میں وہ گرفتار ہو چکی ہو اور جس کا وہ اولیں بار بوسہ لے چکی ہو، دیکھتی ہے۔ کبھی کبھار اس کی نگاہ بھٹک جاتی اور پیئر پر جا ٹکتی۔ اور جب پیئر کو یہ احساس ہوتا کہ یہ دلچسپ اور ننھی منی کھلنڈری لڑکی اسے دیکھ رہی ہے، اس کا جی چاہتا کہ وہ قہقہے لگاتا چلا جائے۔ لیکن کیوں؟ اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔

نکولائی سونیا سے کچھ دور جولی کاراگنا کے قریب بیٹھا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پھر وہی لاشعوری مسکراہٹ اپنے چہرے پر سجائے باتیں کررہا تھا۔ کہنے کو سونیا بھی اس مسکراہٹ کا جواب دے رہی تھی لیکن صاف نظر آرہا تھا کہ وہ حسد کے انگاروں پر لوٹ رہی ہے۔ کبھی اس کا چہرہ تمتمانے لگتا اور کبھی اس کی رنگت پیلی پڑ جاتی۔ اس کا انگ انگ یہ ٹوہ لگانے کے لیے بے تاب ہورہا تھا کہ کسی طرح اسے اس گفتگو کی، جو جولی اور نکولائی کے مابین ہو رہی تھی، سن گن مل سکے۔

ایک گورنس عالم اضطراب میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بات کا تہیہ کر چکی ہے کہ جونہی کسی شخص نے بچوں کو ذرا بھی گھور کر دیکھا، وہ اس کی چمڑی ادھیڑ دے گی۔ جرمن ٹیوٹر انواع واقسام کے سالنوں، میٹھوں اور شرابوں کے نام اپنے ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کررہا تھا تاکہ جونہی موقع ملے، وہ ان کی تفصیلات اپنے خاندان کو جرمنی بھیج سکے۔ اسے اس وقت شدید غصہ آیا جب بٹلر ایک رومال میں لپٹی بوتل پکڑے اس کی

طرف دیکھے بغیر آگے نکل گیا۔ اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ یہ ظاہر کرنے کی تگ و دو کرنے لگا کہ اسے اس مخصوص شراب کی خاص طلب نہیں ہے لیکن اذیت اس لیے ہو رہی ہے کہ کوئی بھی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وہ مے ناب کا اس لیے طلب گار نہیں ہے کہ وہ پیاسا یا حریص ہے بلکہ وہ تو اسے اس لیے حاصل کرنے کا خواہش مند ہے کیونکہ وہ ایمانداری سے اپنے علم میں اضافہ کرنے کا متمنی ہے۔

16

میز کے جس کنارے مرد حضرات بیٹھے تھے، وہاں گرمی گفتار میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہونے لگا، کرنل انھیں بتا رہا تھا کہ پیٹرز برگ میں جنگ کا اعلان نامہ پہلے ہی منظر عام پر آ چکا ہے اور جس نقل کا اس نے مطالعہ کیا تھا، وہ خاص ایلچی کے ذریعے کمانڈر انچیف تک پہنچائی گئی تھی۔

''آخر ہمیں کس کتے نے کاٹا ہے کہ ہم بونا پارت کے خلاف طبل جنگ بجا رہے ہیں؟'' شن شن نے سوال اٹھایا۔ ''وہ پہلے ہی آسٹریا کی گچی دبا چکا ہے۔ اب ہماری باری ہے؟''

کرنل لانبے قد اور تگڑے جسم کا مالک خوش باش اور پر اعتماد جرمن تھا۔ وہ روس سے ٹوٹ کر محبت کرتا تھا اور قرائن بتا رہے تھے کہ اسے جنگوں کا خاصا تجربہ ہے۔ شن شن کی بات سن کر وہ غصے سے کھولنے لگا۔

''ہم جنگ میں کیوں کود رہے ہیں، اس کی وجہ، میرے محترم، وہی ہے جس کا ذکر امپراطور اعلان نامے میں کر چکے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ روس کے سر پر جو خطرہ منڈلا رہا ہے، سلطنت کی سلامتی، اس کے وقار، اس کے معاہدوں کو، جو ضعف پہنچنے کا اندیشہ ہے، اس سے وہ اغماض نہیں برت سکتے۔'' اس نے جرمن لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ اس نے لفظ ''معاہدوں'' پر خاص طور پر زور دیا گویا سارے مسئلے کی روح اسی ایک لفظ میں سمٹی ہوئی تھی۔ جہاں تک سرکاری امور کا تعلق ہے، اس کا حافظہ بلا کا تھا۔ اس کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ انھیں بلا کم و کاست یاد رکھتا تھا اور اس معاملے میں کبھی کسی غلطی کا مرتکب نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ اب اس نے اسی حافظے کی مدد سے اعلان نامے کے تعارفی کلمات دہرائے:

''اور امپراطور کی خواہش، جو ان کا واحد اور ناقابل تنسیخ مقصد ہے، یہ ہے کہ یورپ میں مستحکم اور دیرپا بنیادوں پر امن قائم کیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ ہماری افواج کا کچھ حصہ سرحد پار پہنچا دیا جائے تاکہ اس مقصد کے حصول کے لیے نئی کوششیں روبہ عمل لائی جا سکیں... تو جناب عالی، یہ ہیں وہ وجوہ۔ آیا کچھ خیال شریف میں؟'' اس نے مقصدی انداز سے اپنی بات ختم کرتے اور شراب کا گلاس پورے کا پورا چڑھاتے ہوئے کاؤنٹ کی طرف دیکھا کہ وہ اس کے بیان کو پسندیدگی کی سند عطا کرے۔

''آپ نے وہ پرانی کہاوت سنی ہے کہ موچی رے موچی، موچی کیوں باہر ٹکریں مارتے پھرتے ہو۔ تمھاری خیر اسی میں ہے کہ اپنے ہی گھر میں رہو اور اپنی ہی باڑوں کی مرمت کرو؟'' شن شن نے بھویں سکیڑتے اور چہرے

پر مسکراہٹ بکھیرتے دریافت کیا۔ ''یہ کہاوت ہم پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ خود سواروف[40] کا بھی کچومر نکل گیا تھا اور آج ہم دوسرا سواروف کہاں سے لائیں گے؟ میں پوچھتا ہوں۔'' وہ مسلسل روسی سے فرانسیسی اور فرانسیسی سے روسی کی طرف پلٹتا جاتا تھا۔

''ہمیں اپنے خون کے آخری قطرے کے بہ جانے تک لڑنا ہوگا،'' کرنل نے میز پر مکا مارتے ہوئے کہا۔ ''اور اپنے امپراطور کی خاطر اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا ہوگا۔ تب کہیں معاملات صحیح رخ اختیار کرسکیں گے۔ اس ضمن میں ہمیں حجت بازی حتی الامکان کم سے کم'' ۔اس نے لفظ ''حتی الامکان'' رک رک کر دہرایا۔ ''حتی ۔۔ الامکان کم سے کم کرنا ہوگی۔'' پھر اس نے کاؤنٹ کی جانب اپنی توجہ مبذول کرتے ہوئے اپنی بات یوں ختم کی: ''ہم بوڑھے ہوزار اسی انداز سے سوچتے ہیں۔ ہماری نگاہوں میں معاملے کی بس یہی نوعیت ہے اور اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور ہاں نوجوان، تم نوعمر بھی ہو اور ہوزاروں میں بھی نئے نئے شامل ہوئے ہو، تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟'' اس نے نکولائی کی طرف مڑتے ہوئے اس سے پوچھا، جس نے جب یہ دیکھا کہ گفتگو کا رخ جنگ کی طرف پلٹ گیا ہے، اپنی توجہ اپنی ہم جلیس سے ہٹالی تھی اور بڑے دھیان کے ساتھ کرنل کی باتیں سن رہا تھا۔

''مجھے آپ سے پورا پورا اتفاق ہے،'' نکولائی نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ اپنی پلیٹ کو یوں تروڑ مروڑ اور اور اپنے گلاس کو یوں آگے پیچھے دھکیل رہا تھا جیسے اسے یہ اندیشہ ہو کہ اس لمحے وہ خطرۂ عظیم میں پھنس گیا ہے اور اب اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مرنے مارنے پر تل جانے کا تہیہ کر رہا ہے۔ ''مجھے یقین ہے کہ ہم روسیوں کو یا فتح سے ہم کنار ہونا چاہیے یا موت کو گلے لگالینا چاہیے،'' اس نے کہا۔ لیکن جب الفاظ اس کے منہ سے نکل چکے، دوسروں کی طرح اسے بھی یہ محسوس ہوا کہ یہ (الفاظ) ضرورت سے کچھ زیادہ ہی جوشیلے اور بلند آہنگ ہیں، چنانچہ وہ بے تکے اور بے محل ہیں۔

''ابھی آپ نے جن خیالات کا اظہار کیا، وہ بہت خوبصورت اور دیدہ افروز تھے،'' جولی نے تبصرہ کیا اور ساتھ ہی اس کی آہ نکل گئی۔

جب نکولائی تقریر کر رہا تھا، سونیا سر سے پاؤں تک کانپ رہی تھی۔ اسے اتنی شرم محسوس ہو رہی تھی کہ اس کا چہرہ ہی نہیں، کانوں کی لویں، بلکہ ان سے نیچے گردن اور کندھے بھی سرخ ہو گئے۔

پیئر نے کرنل کی تقریر سنی اور اظہار پسندیدگی کے لیے اپنی گردن ہلادی۔

''بہت اعلیٰ جذبات ہیں،'' اس نے کہا۔

''یہ نوجوان سچا اور کھرا ہوزار ہے!'' کرنل نے ایک بار پھر میز پر زور سے مکا مارتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

''آپ لوگ اتنا شور و غل کیوں کر رہے ہیں؟'' اچانک میز کے دوسرے سرے سے ماریا دمتریونا کی گمبھیر آواز سنائی دی۔ ''یہ تم میز پر مکے کیوں مار رہے ہو؟'' اس نے ہوزار کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔ ''آخر اس طرح چیخ چیخ کر چھت سر پر اٹھانے کی کیا تک ہے؟ تمھارا خیال ہے کہ یہاں تم فرانسیسیوں سے بھڑ رہے ہو؟''

''میں خدا لگتی بات کہہ رہا ہوں،'' ہوزار کرنل نے مسکرا کر کہا۔

''ہم جنگ کے بارے میں گفتگو کر رہے ہیں،'' کاؤنٹ نے گلا پھاڑ کر کہا تا کہ اس کی آواز میز کے دوسرے کنارے پہنچ سکے۔ ''آپ جانتی ہیں کہ میرا لخت جگر بھی، ماریا دمتریونا، میرا لخت جگر بھی محاذ جنگ پر جا رہا ہے۔''

''ہونہہ، میرے چار بیٹے فوج میں ہیں لیکن میں تو کوئی واویلا نہیں کر رہی۔ یہ سب کچھ خداوند کے اختیار میں ہے۔ موت نے آنا ہے، تو بستر پر بھی اس سے کوئی مفر نہیں اور اگر خداوند نے تمھیں بچانا ہے، پھر میدان جنگ میں بھی تمھارا بال بیکا نہیں ہو سکتا،'' ماریا دمتریونا نے کہا۔ اس کی کھنک دار آواز بے ساختہ میز کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ رہی تھی۔

''آپ نے بجا ارشاد فرمایا۔''

گفتگو میں ایک بار پھر ٹھہراؤ آ گیا۔ یہ زیادہ تر میز کے کناروں پر مرکوز تھی، جہاں ایک طرف مرد اور دوسری طرف خواتین ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مشغول تھے۔

''تم پوچھ سکو گی!'' نتاشا کا چھوٹا بھائی کہہ رہا تھا۔ ''دیکھ لیا، تم نہیں پوچھ سکتیں!''

''پوچھ سکتی ہوں، بالکل پوچھوں گی!'' نتاشا نے تڑاخ سے جواب دیا۔

مسرت بخش اور ناعاقبت اندیش عزم سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ وہ اپنی کرسی سے اٹھی اور نیم ایستادہ کھڑی ہو گئی۔ اس نے پیئر کی طرف، جو اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے اسے دعوت دے رہی ہو کہ جو کچھ پیش آنے والا ہے، وہ بھی اس کا مشاہدہ کرے۔ پھر اس نے مڑ کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔

''ماما!'' اس کی کھنکتی، گونج دار بچگانہ آواز کمرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سنائی دی۔

''کیا بات ہے؟'' کاؤنٹس نے گھبرا کر پوچھا۔ لیکن جب اس نے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا، تو اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی شرارت کرنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنی گردن کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ اپنی بیٹی کو سرزنش کر رہی ہو اور اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی ہو۔ اس نے اپنی انگلی بھی درشت انداز سے اس کی طرف لہرائی۔

کمرے میں مرگ آسا سکوت طاری ہو گیا۔

''ماما، آج میٹھا کیا بنا ہے؟'' نتاشا کی نوخیز آواز اور بھی واضح اور کھنک دار لہجے سے گونجی۔

کاؤنٹس نے ماتھے پر تیوریاں چڑھانے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ ماریا دمتریونا نے اپنی موٹی انگلی اس کی طرف لہرائی۔

''قازق!'' اس نے دھمکی آمیز انداز سے کہا۔

اکثر مہمانوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس شوخی اور شرارت پر کس طرح کا ردعمل ظاہر کریں۔ چنانچہ وہ اس کے والدین کی سمت میں دیکھنے لگے۔

''خبردار!'' کاؤنٹس نے کہا۔

''ماما، آج میٹھا کیا بنا ہے؟'' نتاشا نے دریدہ دہن اور منہ پھٹ انداز سے پوچھا۔ اس کے انگ انگ سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی اور اسے پورا اعتماد تھا کہ اس کی اس شوخی کا برا نہیں منایا جائے گا۔

سونیا اور فربہ مائل ننھا پیتا ہنستے ہنستے دوہرے ہو گئے۔

''دیکھا، میں نے پوچھ لیا'' نتاشا نے اپنے چھوٹے بھائی اور پیئر کے، جس پر ایک بار پھر اس نے اچٹتی نگاہ ڈالی تھی، کان میں کہا۔

''آئس کریم۔ لیکن تمھیں کچھ نہیں ملے گا'' ماریا دمتریونا نے کہا۔

نتاشا بھانپ گئی کہ ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ چنانچہ اس نے ماریا دمتریونا کو بھی للکار دیا۔

''ماریا دمتریونا، کون سی آئس کریم؟ مجھے ونیلا بالکل پسند نہیں'' اس نے کہا۔

''گاجر کی آئس کریم۔''

''نہیں، کون سی، ماریا دمتریونا، کون سی؟'' اس نے چلا کر کہا۔ ''میں جاننا چاہتی ہوں۔''

ماریا دمتریونا اور کاؤنٹس کھلکھلا کر ہنس پڑیں اور باقی مہمان بھی اس ہنسی میں شریک ہو گئے۔ انھیں ہنسی ماریا دمتریونا کے جواب پر نہیں آئی تھی بلکہ انھیں اس ننھی منی لڑکی کی ناقابل یقین دلیری اور فراست نے ہنسایا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کوئی شخص ماریا دمتریونا کے ساتھ اتنی جرأت، بے باکی اور بذلہ سنجی سے پیش آ سکتا ہے۔

نتاشا اس وقت خاموش ہوئی جب اسے بتایا گیا کہ آئس کریم اناناس کی ہوگی۔ آئس کریم سے پہلے مہمانوں کی تواضع شمپین سے کی گئی۔ سازینہ دوبارہ بجنے لگا۔ کاؤنٹ اور کاؤنٹس نے ایک دوسرے کو بوسہ دیا اور تمام مہمان کاؤنٹس کو مبارک سلامت پیش کرنے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میز پر موجود ہر شخص اپنا گلاس کاؤنٹ، بچوں اور دوسرے لوگوں کے گلاسوں سے ٹکرانے لگا۔ ایک بار پھر بیرے ادھر ادھر بھاگنے پھرنے لگے، کرسیاں گھسیٹی جانے لگیں اور وہ جس ترتیب سے ڈائننگ روم میں داخل ہوئے تھے، اسی ترتیب سے لیکن پہلے کی نسبت زیادہ سرخ چہروں کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم اور کاؤنٹ کے سٹڈی روم میں چلے گئے۔

17

تاش کی میزیں بچھا دی گئیں اور بوسٹن[41] کے کھیل کے لیے پارٹیاں ترتیب دے دی گئیں۔ اور کاؤنٹ کے مہمان دونوں ڈرائنگ روموں، سٹڈی روم اور نشست گاہ میں ڈٹ گئے۔

کاؤنٹس کی تحریک پر نوجوان لڑکے لڑکیاں کلاوی کارڈ (Clavi Chord) اور ہارپ (harp) (آلات موسیقی) کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ حاضرین کی مشترکہ درخواست پر سب سے پہلے جولی نے ہارپ پر ہلکی پھلکی دھن طرز بدل بدل کر بجائی۔ اس کے بعد اس نے دوسری نوجوان خواتین کے ساتھ مل کر نتاشا اور نکولائی سے، جو اپنی غنائی صلاحیتوں کی بنا پر خاصے جانے پہچانے تھے، درخواست کی کہ وہ کوئی نغمہ سنائیں۔ نتاشا نے جب یہ دیکھا کہ

اس کے ساتھ ایسا سلوک ہو رہا ہے، جیسے وہ بالغ خاتون ہو، وہ بظاہر اس پر بہت نازاں معلوم ہو رہی تھی، لیکن اس کے باوجود شرما رہی تھی۔

''کون سا نغمہ گائیں؟'' اس نے پوچھا۔

''چشمہ،'' نکولائی نے سمجھایا۔

''اچھا، پھر جلدی کرو۔ بورس ادھر آؤ،'' نتاشا نے کہا۔ ''سونیا کہاں ہے؟''

اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی لیکن جب اسے اپنی سہیلی کمرے میں نظر نہ آئی، وہ اس کی تلاش میں بھاگتی دوڑتی باہر نکل گئی۔

''نتاشا بھاگتی، چھلانگیں لگاتی، سونیا کے کمرے میں پہنچی لیکن جب اس نے دیکھا کہ سونیا وہاں نہیں ہے، وہ برق رفتاری سے نرسری کی طرف دوڑنے لگی۔ لیکن سونیا وہاں بھی نہیں تھی۔ نتاشا کو خیال آیا کہ سونیا اس صندوق پر، جو راہداری میں پڑا تھا، بیٹھی ہوگی۔ رستوف گھرانے میں یہ دستور بن گیا تھا کہ جو لڑکیاں آنسو بہانا چاہتیں، وہ اسی صندوق پر بیٹھ کر بہایا کرتیں۔ سونیا واقعی وہاں موجود تھی۔ صندوق کے اوپر آیا کا غلیظ دھاری دار بستر، جس میں پر بھرے ہوئے تھے، رکھا ہوا تھا۔ وہ اس پر سر نہوڑائے لیٹی ہوئی تھی۔ اس کا مہین جالی دار ڈریس تر مڑ ہو رہا تھا۔ وہ اپنا چہرہ اپنی باریک انگلیوں میں چھپائے یوں ہوکے لے کر رو رہی تھی کہ اس کے ننھے منے کندھے کپکپا رہے تھے۔ نتاشا کا چہرہ، جو نام دن کے موقع پر صبح سے چمک دمک رہا تھا، یک دم متغیر ہو گیا۔ اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں، اس کا گلا سکڑ گیا اور اس کے منہ کے کنارے لٹک گئے۔

''سونیا، کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟ — کیا بات ہے؟، او — ہو! کچھ تو بولو!''

نتاشا کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ سونیا رو رہی ہے۔ نتاشا کا لمبا چوڑا منہ کھل گیا اور یوں وہ خاصا بدصورت نظر آنے لگا۔ وہ بھی دودھ پیتے بچے کی طرح رونے لگی لیکن کیوں؟ اس کی وجہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھی۔ سونیا نے اپنا سر اٹھانے اور جواب دینے کی کوشش کی تاہم ناکام رہی اور اس نے اپنا چہرہ مزید بستر کے اندر کر لیا۔ نتاشا دھاریوں والے بستر کے اوپر بیٹھ گئی، اس نے اپنے بازو اپنی سہیلی کے گلے میں لٹکائے اور رونے لگی۔ سونیا نے ہمت کر کے اپنے آپ کو سنبھالا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ وہ اپنے آنسو پونچھنے اور اسے سب کچھ بتانے لگی۔

''نکولینکا ہفتے عشرے میں چلے جائیں گے۔ ان کے — ان کے کاغذات — پہنچ گئے ہیں۔ انھوں نے خود مجھے بتایا ہے... تاہم مجھے رونا نہیں چاہیے تھا۔'' اور اس نے کاغذ کا پرزہ نکالا۔ اس پر نکولائی نے اشعار تحریر کیے تھے۔ ''مجھے رونا نہیں چاہیے۔'' لیکن تم — تم کیا، کوئی بھی — یہ نہیں سمجھ پاؤ گی کہ وہ کتنے اچھے اور نیک ہیں۔''

جب اسے خیال آیا کہ وہ کتنا اچھا اور نیک ہے، اس کے دوبارہ ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔

''تمھارا معاملہ بالکل ٹھیک ٹھاک ہے — میں جلتی نہیں ہوں — مجھے تم سے، اور بورس سے بھی، محبت ہے،'' اس نے کوشش کر کے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے کہا۔ ''وہ نفیس انسان ہیں۔ تمھارے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں

ہے۔لیکن نکولائی میرے خلیرے ہیں۔اور ہمیں شادی کے لیے۔اجازت لینا ہوگی — اور یہ اجازت[42] صرف اسقف اعظم سے مل سکتی ہے۔ورنہ ناممکن۔اس کے علاوہ اگر ویرا نے ماما (سونیا کاؤنٹس کو ماما کہا کرتی تھی) کو بتا دیا کہ میں نکولائی کا کیریر برباد کر رہی ہوں، کہ میں کٹھور، سنگ دل اور ناشکری ہوں جب کہ حقیقت یہ ہے۔خدا شاہد ہے۔''اور اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔''کہ میں ان (کاؤنٹس) سے اور تم سب سے، سوائے ویرا کے، اتنی شدید محبت کرتی ہوں۔لیکن وہ (ویرا) ایسی کیوں ہے...میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟ میں تمھاری اتنی احسان مند ہوں کہ میں اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔لیکن میرے پاس ہے کیا جو میں قربان کر سکوں...؟''

سونیا سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔اس نے دوبارہ اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا اور پروں کے بستر پر گر پڑی۔نتاشا نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے کے تاثرات سے واضح طور پر دکھائی دے رہا تھا کہ وہ اپنی سہیلی کی مشکلات کی گمبھیرتا کو پوری طرح سمجھتی ہے۔

''سونیا!'' اس نے اچانک گڑگڑا کر کہا جیسے ابھی ابھی اسے الہام ہوا ہو اور اسے اپنی خلیری کے مصائب کی صحیح نوعیت کا ادراک ہو گیا ہو۔''مجھے یقین ہے کہ کھانے کے بعد ویرا نے لازماً تمھیں کچھ کہا ہوگا۔ٹھیک؟''

''ہاں، یہ اشعار، جو کچھ نکولائی نے اپنے ہاتھ سے تحریر کیے تھے اور کچھ میں نے نقل کیے تھے، — اسے میری میز پر پڑے مل گئے اور اس نے مجھ سے کہا کہ وہ انھیں ماما کو دکھا دے گی۔اس نے یہ بھی کہا کہ میں ناشکری ہوں، یہ کہ ماما کبھی میری ان سے شادی نہیں ہونے دیں گی اور یہ کہ وہ جولی سے شادی کریں گے۔اور یہ تو تم نے بھی دیکھا ہوگا کہ وہ کس طرح سارا دن اس کا دم چھلا بنے رہے ہیں...اوہ، نتاشا! کیوں؟''

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔اب کے اس کے آنسو روکے رکتے نہیں تھے۔نتاشا نے اسے اٹھا کر بٹھایا، اپنے بازو اس کے گلے میں ڈالے اور خود اپنے آنسوؤں کے بیچ مسکراتے ہوئے اسے تسلی دلاسا دینے لگی۔

''سونیا ڈارلنگ، اس کی باتوں پر مت جاؤ! مت جاؤ اس کی باتوں پر! تمھیں یاد ہے کہ ہم تینوں — تم، میں اور نکولائی — چند روز قبل نشست گاہ میں کیسی گفتگو کر رہے تھے؟ اور ہم نے یہ بھی طے کیا تھا کہ ہر مسئلہ کیسے نپٹایا جائے گا؟ مجھے صحیح صحیح تو یاد نہیں کہ فیصلہ کیا ہوا تھا لیکن تمھیں اتنا تو یاد ہوگا کہ ہمیں حالات اتنے گمبھیر نظر نہیں آئے تھے بلکہ سازگار ہی دکھائی دیے تھے اور ہر بات ممکن معلوم ہوتی تھی۔یہ بھی تو دیکھو کہ ماموں شن شن کے بھائی کی شادی پہلی پیڑھی کی چچیری سے ہوئی تھی اور ہم تو دوسری پیڑھی کے خلیرے ہیں۔اور بورس کا کہنا ہے کہ کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا ہے۔وہ اتنے سمجھدار اور نیک خصلت ہیں!'' نتاشا نے کہا۔''سونیا، مائی ڈارلنگ، میری جان، سونیا، مت رو!'' اس نے اسے چومتے اور ہنستے ہوئے کہا۔''ویرا کینہ پرور ہے! مت پروا کر اس کی! سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔اور وہ امی سے کچھ نہیں کہہ سکے گی، نکولائی خود ہی انھیں بتا دے گا۔اور جولی کو تو وہ جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔''

اور نتاشا نے اس کی پیشانی چوم لی۔سونیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ننھی بلونگڑی کے تن مردہ میں پھر سے جان پڑ گئی۔

اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ ابھی ابھی پھریری لے گی، اچھل کر اپنے پنجوں پر کھڑی ہو جائے گی اور جیسا کہ بلونگڑیوں کی عادت ہوتی ہے، اپنی دم زور سے لہرائے گی، سڑاک کی آواز آئے گی اور وہ گیند کے ساتھ کھیلنے لگے گی۔

''تمھارے خیال میں یونہی ہوگا؟... سچ مچ، بالکل ایسے ہی؟'' اس نے پھرتی سے اپنے ڈریس کی شکنیں اور بالوں کی الجھی لٹیں درست کرتے ہوئے کہا۔

''سچ مچ، بالکل ایسے ہی،'' نتاشا نے اپنی سہیلی کے بالوں کی ایک لٹ، جو ڈھیلی ہو گئی تھی اور قابو میں نہیں آ رہی تھی، اس کے جوڑے میں دوبارہ اٹکاتے ہوئے کہا۔

اور وہ دونوں ہنس پڑیں۔

''اچھا، پھر چلتے ہیں اور 'چشمہ' گاتی ہیں۔''

''چلو، چلیں!''

''تمھیں معلوم ہے کہ وہ موٹا پیئر، جو میرے سامنے بیٹھا تھا، بڑا اہنسوڑ ہے؟'' نتاشا نے اچانک رک کر کہا۔
''آج، خدا کی قسم، بڑا لطف آ رہا ہے!''

اور اس نے راہداری میں دوڑ لگا دی۔

سونیا اپنے ڈریس پر روئیں دار پر، جو وہاں چمٹ گئے تھے، جھاڑتے اور اشعار کا کاغذ چولی کے نیچے اپنے دبلے پتلے سینے پر چھپاتے تمتماتے چہرے اور ہلکے پھلکے پرمسرت قدموں کے ساتھ راہداری میں نتاشا کے پیچھے پیچھے بھاگتے دوڑتے نشست گاہ میں داخل ہو گئی۔

مہمانوں کی درخواست پر نوجوان لڑکے اور لڑکیاں ''چشمہ'' گانے لگے۔ اس گیت نے، جسے چار اشخاص مل کر گاتے تھے، سامعین کے دل موہ لیے۔ پھر نکولائی نے ایک نغمہ چھیڑ دیا۔ یہ اس نے حال ہی میں سیکھا اور یاد کیا تھا۔

ایک حسین شب چاند کی مدھم روشنی کے نیچے
یہ جان کر طبیعت پر وجد طاری ہونے لگتا ہے
کہ اس (بھری پری) دنیا میں کوئی تو ہے
جو صرف تیرے ہی بارے میں سوچتا ہے!
اور حسین و نازک انگلیاں
جو کبھی تھکنے کا نام نہیں لیتیں
زریں بربط کے تاروں پر آہستہ آہستہ پھر رہی ہیں
اور بے خود کر دینے والا نغمہ الاپ رہی ہیں

یہ نغمہ تجھے، اور صرف تجھے پکار رہا ہے!
ایک روز جب فردوس کی ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی
تیرا دوست، افسوس، صد افسوس، اس دنیا سے کوچ کر چکا ہوگا!

اس نے اپنا یہ نغمہ ابھی بمشکل مکمل کیا تھا، کہ نوجوان لڑکے اور لڑکیاں بال روم میں رقص کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے اور ادھر گیلری میں سازندوں کے کھنکارنے اور ان کے قدموں کے کھٹکھٹانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

پیئر ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ چونکہ وہ ابھی حال ہی میں ممالک غیر سے لوٹا تھا، شن شن نے اسے اپنے اڑنگے میں کس لیا اور اسے سیاسی بحث میں الجھا لیا۔ متعدد دیگر افراد بھی اس بحث میں شریک ہو گئے لیکن خود پیئر کو اس سے اکتاہٹ ہونے لگی۔ جب موسیقی کی دھنیں بجنے لگیں، نتاشا ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ سیدھی پیئر کے پاس پہنچی اور شرماتے لجاتے لہجے میں اس سے بولی:

''ماما نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں آپ سے درخواست کروں کہ آپ بھی رقص میں شریک ہوں۔''

''مجھے اندیشہ ہے کہ رقص کی معینہ چلت پھرت میں کہیں مجھ سے گڑبڑاہٹ نہ ہو جائے،'' پیئر نے جواب میں کہا۔ ''لیکن اگر تم میری رہنمائی کرنے کی ہامی بھرو...'' اور دبلی پتلی نرم و نازک دوشیزہ کے سامنے جھک کر اس نے اپنا بھاری بھرکم بازو اسے تھما دیا۔

جب دوسرے جوڑے اپنی صفیں درست کر رہے تھے اور سازندے دھنیں درست کر رہے تھے، پیئر اپنی ننھی منی رفیقہ کے ساتھ نیچے بیٹھ گیا۔ نتاشا خوشی سے بے حال ہو رہی تھی۔ اسے ایک بالغ مرد کے ساتھ، جو ابھی حال ہی میں پرائے دیس سے واپس آیا تھا، رقص کرنا تھا۔ وہ اس کے قریب کچھ اس انداز سے بیٹھی ہوئی تھی کہ سب کی نگاہیں اسی پر پڑ رہی تھیں۔ وہ اس کے ساتھ کچھ اس طرح گفتگو کر رہی تھی، جیسے وہ بچی نہ ہو، بلکہ بالغ عورت ہو۔ اس کے ایک ہاتھ میں پنکھیا تھی جو ایک خاتون نے اسے تھما دی تھی۔ اس نے تجربہ کار اور جہاں دیدہ خاتون کے اطوار اپنا لیے (خدا جانے اس نے یہ اطوار کہاں سے سیکھے تھے) اور اپنے آپ کو پنکھیا جھلنے لگی۔ وہ اپنے ساتھی کے ساتھ باتیں بھی کرتی جاتی تھی اور پنکھے کی اوٹ میں کنکھیوں سے اسے دیکھتی بھی جاتی تھی۔

''ارے، اس لڑکی کے بارے میں کیا خیال ہے؟ ذرا اس پر نگاہ تو ڈالیں!'' کاؤنٹس نے بال روم میں سے گزرتے اور متحیر نگاہوں سے نتاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

نتاشا کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ ہنسنے لگی۔

''اچھا، واقعی ماما؟ پر آپ نے یہ کہا کیوں؟ آخر اس میں اچنبھے کی کون سی بات ہے؟''

❦

رقص کے تیسرے دور کے دوران میں، ڈرائنگ روم سے، جہاں کاؤنٹ اور ماریا دمتریونا نسبتاً معمر اور نامور مہمانوں کے ساتھ تاش کھیلنے میں مصروف تھے، کرسیوں کے گھسٹنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ان میں سے بیشتر اصحاب اٹھ کر کھڑے ہو گئے، وہ اپنے اعضا سیدھے کرنے لگے کیونکہ اتنا طویل عرصہ بیٹھے بیٹھے وہ اکڑ گئے تھے۔ پھر انھوں نے اپنے اپنے پرس اور پاکٹ بکیں ایک طرف رکھیں اور بال روم کا رخ کرنے لگے۔ سب سے پہلے کاؤنٹ اور ماریا دمتریونا اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں خوشی سے باؤلے ہوئے جا رہے تھے۔ کاؤنٹ کو دل لگی سوجھی۔ اس نے بیلے ڈانسر کے انداز میں اپنا بازو خمیدہ کیا اور جیسے وہ رسم نبھا رہا ہو، اسے ماریا دمتریونا کے ہاتھ میں دے دیا۔ وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا۔ بانکے شجاعوں کی طرح مسرت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا اور جب رقص کی آخری چلت پھرت اختتام پذیر ہوئی، اس نے تالی بجا کر اور گیلری میں سازندوں کو اشارہ کیا اور پہلے وائلن نواز سے چلا کر دریافت کیا:

''سیمی اون، تمھیں ڈینیل کوپر کی دھن آتی ہے؟''

یہ کاؤنٹ کا پسندیدہ رقص تھا۔ اپنے شباب کے زمانے میں وہ یہی رقص کرتا تھا۔ (اگر صحیح انداز سے دیکھا جائے تو ڈینیل کوپر مکمل رقص نہیں تھا، بلکہ انگریزی لوک رقص اینگلیز[43] کی ایک چلت پھرت یا نرت تھا۔)

''ذرا پاپا کو دیکھیں!'' نتاشا نے تمام حاضرین سے پورے زور سے چلا کر کہا۔ وہ یہ بھول گئی تھی کہ بچی ہونے کے باوجود وہ خود بھی بالغ مرد کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ وہ ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی اور اس کا سر، جس پر گھونگریالے بال تھے، اس کے گھٹنوں کو چھونے لگا۔ پورا کمرہ اس کی ہنسی سے گونج اٹھا۔

اور خدا لگتی بات یہ ہے کہ جب حاضرین نے اس ہنسوڑ اور خوش طبع معمر شریف زادے کو اپنی باوقار اور پرشکوہ ساتھی (ماریا دمتریونا اس سے لانبی تھی) کے پاس کھڑے دیکھا، وہ مسرت کے عالم میں مسکرانے لگے۔ اپنے شانوں کو پیچھے جھٹکتے، خمیدہ بازوؤں کو آگے بڑھاتے اور اس کے ساتھ موسیقی کے سروں کا ساتھ دیتے، پاؤں کی انگلیاں ذرا آگے نکالتے، ایک پاؤں سے ہلکے ہلکے تھاپ دیتے اور اپنے گول مٹول چہرے پر تبسم کی کرنیں بکھیرتے، جس سے اس کے خدوخال اور بھی پھیل گئے، کاؤنٹ نے اشارتاً ناظرین کو یہ جتا دیا کہ انھیں آئندہ لمحات میں کن چیزوں کی توقع کرنا چاہیے۔ جونہی ڈینیل کوپر کی تیز، جوشیلی اور متوالی دھنیں کانوں میں رس گھولنے لگیں (یہ دھنیں بہجت آفریں دیہاتی رقص کی دھنوں سے مشابہ تھیں)، بال روم کے تمام دروازوں پر گھریلو ملازمین کی بھیڑ لگ گئی۔ مرد ایک طرف کھڑے تھے اور عورتیں دوسری طرف۔ ان سب کے چہرے دمک رہے تھے اور وہ اپنے آقا کو رنگ رلیاں مناتے دیکھنے آئے تھے۔

''آقا کو دیکھو، بالکل عقاب ہیں عقاب!'' ایک دروازے پر بوڑھی آیا کی بلند آہنگ آواز سنائی دی۔

کاؤنٹ خوبصورت رقص کر رہا تھا اور اسے اپنے رقص کی رعنائی کا خود بھی احساس تھا۔ لیکن اس کی رفیقہ نہ رقص کر سکتی تھی اور نہ اسے اس کی پروا تھی۔ اس کا بھاری بھرکم تن و توش الف سیدھا کھڑا تھا اور اس کے فربہ وگداز بازو اس کے پہلوؤں پر ڈھلکے ہوئے تھے۔ (اس نے اپنا چشمہ کاؤنٹس کے سپرد کر دیا تھا۔) اس کا صرف درشت لیکن خوش شکل چہرہ رقص میں مصروف تھا۔ جو کچھ کاؤنٹ کے دل و دماغ میں تھا، اس کا اظہار سرتاپا اس کے گول مٹول جسم سے ہو رہا تھا۔ اس کے برعکس ماریا دمتریونا اپنا مفہوم صرف اپنی ہر لحظہ پھیلتی مسکراہٹ اور اپنی پھڑپھڑاتی ناک کے ذریعے ادا کر رہی تھی۔ لیکن ایک طرف اگر کاؤنٹ نے حاضرین کے دل اپنے صبا رفتار پاؤوں کی پھرتی اور غیر متوقع طور پر اپنی دل ربا کلیلوں سے جیت لیے، تو دوسری طرف ماریا دمتریونا نے، ہینگ لگے نہ پھٹکری رنگ بھی چوکھا آئے، زور بھی خاص نہ لگایا لیکن حاضرین کے قلوب پر وہی نقوش ثبت کر دیے جو کاؤنٹ نے کیے تھے۔ وہ صرف اپنے کندھے ہلا رہی تھی، یا موڑ کاٹتے ہوئے بازو جھکا لیتی اور یا پھر پاؤوں کی تھاپ سے موسیقی کی لے کا ساتھ دے دیتی۔ چونکہ وہ خاصی لحیم شحیم عورت تھی اور عادتاً مزاج کے اعتبار سے بھی بڑی سخت اور درشت۔ اس لیے اس کی ان چھوٹی چھوٹی اداؤں پر ہی لوگوں نے جی کھول کر داد دی۔ رقص تیز اور تیز سے تیز تر ہوتا گیا۔ دوسرے جوڑے بھی مصروف رقص تھے لیکن کسی نے ان کی طرف توجہ نہ دی اور نہ انھوں نے ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی۔ تمام حاضرین کاؤنٹ اور ماریا دمتریونا کو دیکھنے میں منہمک تھے۔ نتاشا کبھی اس کا ڈریس کھینچتی اور کبھی اس کی آستین گھسیٹتی اور زور دے کر انھیں کہتی، "دیکھیں، پاپا، کیا کر رہے ہیں!" لیکن اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ سبھی کی نگاہیں رقصاں جوڑے پر مرکوز تھیں اور کوئی بھی انھیں ادھر ادھر ہٹانے کا روادار نہیں تھا۔ رقص کے دوران میں جو وقفے آتے، ان میں ہانپتا، زور زور سے سانس لیتا، کاؤنٹ سازندوں کی طرف اشارہ کرتا اور انھیں با آواز بلند پکار کر کہتا کہ وہ دھن تیز، اور تیز بجائیں۔ کاؤنٹ، تیز، تیز تر، تیز ترین پھرکی کی طرح گھومے جا رہا تھا۔ اس کی حرکات میں سبک رفتاری ہی نہیں بلکہ سلیقہ اور ہنر مندی بھی تھی۔ وہ اپنی ساتھی کے گرد دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ کبھی وہ پاؤوں کی انگلیوں پر اور کبھی ایڑیوں پر رقص کرنے لگتا تا آنکہ اس نے اپنی رفیقہ کو اٹھایا، گھمایا اور اپنی جگہ پر لا کھڑا کیا، اور یوں اپنے رقص کی آخری حرکات پایہ تکمیل کو پہنچا دیں۔ پھر اس نے اپنے پاؤوں کو ذرا سا پچھلی جانب جھٹکا دیا، اپنے پسینے سے تر سر کو خمیدہ کیا، اپنے بازو کو دور تک لہرایا اور مسکرانے لگا۔ قہقہوں کا شور بلند ہوا اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسنے لگے — اور سب سے اونچی آواز نتاشا کی تھی۔ دونوں ساکت و خاموش کھڑے تھے۔ وہ دھونکنی کی طرح ہانپ رہے تھے اور سوتی رومالوں سے اپنے چہرے پونچھ رہے تھے۔

"تو یہ تھا ڈینیل کوپر!" ماریا دمتریونا نے گہری سانس لیتے اور اپنی آستین اندر گھسوڑتے ہوئے کہا۔

18

ادھر جب روستوفوں کے بال روم میں موسیقی کی تھاپ پر، جسے دیتے دیتے تھکاوٹ سے نڈھال سازندے بے سرے

ہو رہے تھے، چھٹا اینگلیز رقص ہو رہا تھا اور جب خستہ و درماندہ باورچی اور وردی پوش ملازمین سپر تیار کر رہے تھے، عین انھی لحات کے دوران میں کاؤنٹ بزوخوف پر فالج کا چھٹا حملہ ہوا۔ ڈاکٹروں نے اعلان کر دیا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی۔ بستر مرگ پر دراز شخص خود تو کچھ بول نہیں سکتا تھا، اس لیے اس کی جانب سے کسی دوسرے شخص نے گناہوں کا اعتراف نامہ پڑھا، عشائے ربانی کی رسم کی ادائیگی عمل میں لائی گئی اور مقدس روغن سے اس کا مسح کرنے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ اس قسم کے حالات میں عام طور پر گھروں میں ہل چل اور امید و بیم کی جو کیفیت دیکھنے میں آتی ہے، اس کا اظہار یہاں بھی ہونے لگا۔ باہر سڑک پر تجہیز و تکفین کرنے والوں[44] کا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں توقع تھی کہ کاؤنٹ کا جنازہ خوب دھوم سے اٹھے گا اور ان کے وارے نیارے ہو جائیں گے۔ تاہم کاؤنٹ کے محل نما مکان میں گاڑیوں کا جو مسلسل تانتا بندھا تھا، ان میں سوار لوگوں کی نگاہوں سے بچنے کے لیے وہ پھرتی سے ان کی اوٹ میں ہو جاتے۔ ماسکو کا گورنر جنرل، جو کاؤنٹ کی صحت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مسلسل اپنے ایجوٹنٹ بھیجتا رہا تھا، امپراطورہ کیتھرین کے دربار کے نامی گرامی مصاحب کو آخری الوداع کہنے کے لیے اس شام بذات خود آ گیا۔

آراستہ و پیراستہ استقبالیہ کمرے میں ملاقاتیوں کا ہجوم اتنا بڑھ گیا تھا کہ تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ اور جب گورنر جنرل مریض کے پاس تقریباً آدھ گھنٹہ تنہا بیٹھنے کے بعد باہر نکلا، تو ہر شخص احتراماً اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تمام ملاقاتی جھک کر تسلیمات بجالائے لیکن گورنر جنرل نے ان کے سلام پر خاص دھیان نہ دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ حتی الامکان جلد از جلد وہاں سے کھسک جائے تاکہ وہ ڈاکٹروں، پادریوں اور رشتے داروں کی نگاہوں سے، جو اس پر مرکوز ہو گئی تھیں، بچ سکے۔ پرنس واسیلی، جو گزشتہ چند دنوں کے دوران میں خاصا دبلا اور پیلا ہو گیا تھا، اسے دروازے تک چھوڑنے آیا۔ وہ سرگوشیوں میں بار بار کوئی بات اس کے سامنے دہرا رہا تھا۔

جب پرنس واسیلی گورنر جنرل کو باہر پہنچا آیا، وہ واپس آیا اور استقبالیہ ہال میں دوسروں سے الگ تھلگ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر دھری، کہنی گھٹنے پر ٹکائی اور دونوں ہاتھوں سے آنکھیں چھپا لیں۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا، پھر اٹھا، خوف زدہ نگاہوں سے دائیں بائیں جھانکا اور اپنی عادت کے برعکس تیز تیز قدم اٹھاتا اس طویل راہداری میں چلنے لگا جو مکان کے عقبی حصے میں پرنسوں کے اپارٹمنٹ میں جاتی تھی۔

جو لوگ نیم روشن استقبالیہ کمرے میں بیٹھے تھے، وقفوں وقفوں سے آپس میں سرگوشیاں کرنے لگتے اور جب کسی شخص کے اندر جانے یا باہر نکلنے پر وہ دروازہ چرچراتا، جو کاؤنٹ کے، جس پر نزع کا عالم طاری تھا، اپارٹمنٹ میں کھلتا تھا، وہ خاموش ہو جاتے اور ایسی نگاہوں سے، جن میں تجسس یا بیم و رجا کی کیفیت سمائی ہوتی، دیکھنے لگتے۔

''حیات انسانی کی گھڑیاں معین ہیں،'' ایک بزرگ پادری نے ایک خاتون سے کہا، جو اس کے پاس بیٹھی اور معصومانہ انداز سے اس کی گفتگو سن رہی تھی۔ ''یہ گھڑیاں معین ہیں۔ ان سے کوئی مفر نہیں۔''

''آپ کے خیال میں مقدس روغن سے مسح کرنے میں تاخیر نہیں ہو گئی؟'' خاتون نے پادری کو اس کے

عہدے سے مخاطب کر کے یوں کہا جیسے اس معاملے میں اس کی اپنی کوئی رائے نہ ہو۔

''مادام، مسح کی یہ رسم بہت پر جلال ہوتی ہے۔ بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے،'' پادری نے، اپنے گنجے سر پر، جس پر چند گنے چنے بال رہ گئے تھے اور جنھیں اس نے کنگھی کی مدد سے ساری کھوپڑی پر پھیلا لیا تھا، ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

''وہ کون تھا؟ خود گورنر جنرل؟'' کمرے کے دوسرے کونے میں بیٹھے ایک شخص نے دریافت کیا۔ ''دیکھنے میں بالکل نوجوان نظر آتا تھا!''

''وہ ساٹھ سے اوپر نکل چکے ہیں۔ سنا ہے کہ اب کاؤنٹ کسی کو نہیں پہچانتے۔ کیا وہ مقدس روغن سے ان کا مسح کرنے کی تیاریوں میں مصروف ہیں؟''

''میں ایک ایسے شخص کو جانتا ہوں جس کا یہ مسح سات مرتبہ کیا گیا۔''

منجھلی پرنس مریض کے کمرے سے باہر آئی۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سرخ ہو چکی تھیں۔ وہ ڈاکٹر لوغین کے پاس بیٹھ گئی جو خود میز پر کہنی ٹکائے، بڑے ٹھسے سے امپراطورہ کیتھرین کی تصویر کے نیچے بیٹھا تھا۔

''خوبصورت!'' ڈاکٹر نے موسم کے متعلق ایک سوال کے جواب میں کہا۔ ''پرنس، موسم بہت سہانا ہے! علاوہ ازیں، یوں بھی ماسکو پہنچ کر یہی محسوس ہوتا ہے کہ آپ دیہات میں آ گئے ہیں۔''

''واقعی؟'' پرنس نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''پھر انھیں پینے کو کچھ دیا جا سکتا ہے؟''

لوغین سوچنے لگا۔

''انھوں نے دوا پی لی ہے؟''

''ہاں۔''

ڈاکٹر نے سرسری نگاہ گھڑی پر ڈالی۔

''ابلے ہوئے پانی کا گلاس بھرو۔ اس میں چٹکی بھر (اس نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے اشارہ کر کے سمجھایا کہ چٹکی سے اس کی کیا مراد ہے) کریم آف ٹارٹر[45] ڈال دو...''

''ایسا مریض کبھی دیکھا یا سنا نہیں،'' ایک جرمن ڈاکٹر ایک ایجوٹنٹ سے کہہ رہا تھا، ''جو فالج کے تیسرے حملے کے بعد جان بر ہو گیا ہو۔''

''کتنا صحت مند تھا یہ شخص!'' ایجوٹنٹ نے کہا۔ ''اور اس کی ڈھیروں دولت کس کے حصے میں آئے گی؟'' اس نے زیر لب اضافہ کیا۔

''کوئی نہ کوئی امیدوار مل ہی جائے گا،'' جرمن نے خندہ روئی سے جواب دیا۔

''ایک بار پھر دروازہ چرچرایا اور سب کی نگاہیں اس جانب اٹھ گئیں۔'' منجھلی پرنس وہ مشروب، جو اس نے لوغین کی ہدایات کے مطابق تیار کیا تھا، مریض کے کمرے میں لے جا رہی تھی۔

جرمن ڈاکٹر لوغین کے پاس آیا۔

''کیا خیال ہے وہ آج رات گزار جائیں گے؟'' جرمن نے گھٹیا فرانسیسی میں پوچھا۔

لوغین نے ہونٹ بھینچ لیے اور سخت نفی کے اظہار کے لیے اپنی انگلی اس کی ناک کے سامنے لہرانے لگا۔

''زیادہ سے زیادہ آج رات،'' اس نے زیر لب کہا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ وہ خوش سلیقگی سے مسکرا رہا تھا۔ کیونکہ اسے یہ اطمینان تھا کہ اس نے نہ صرف مریض کی حالت کا صحیح صحیح ادراک کر لیا تھا بلکہ اس کا اظہار کرنے پر بھی اسے قدرت حاصل تھی۔

❖

دریں اثنا پرنس واسیلی پرنسس کے نیم تاریک کمرے کا دروازہ کھول چکا تھا۔ ایقونات[46(الف)] کے نیچے صرف دو ایقونی لیمپ جل رہے تھے۔ سوختہ لوبان اور پھولوں کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔ کمرے میں فرنیچر کی کوتاہ اشیا از قسم میزیں، خانہ دار الماریاں اور دوسری الم غلم چیزیں بھری پڑی تھیں۔ سکرین کے عقب میں اونچے پلنگ کی، جس کے اندر پرندوں کے مہین پر بھرے ہوئے تھے، سفید چادریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک چھوٹا سا کتا بھونکنے لگا۔

''اوہ، بھائی جان، آپ؟''

پرنسس اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اپنے بال سنوارنے لگی۔ اس کے بال ہمیشہ ہی اور اب بھی غیر معمولی طور پر اتنے ہموار تھے کہ وہ اور اس کی کھوپڑی ایک ہی چیز لگتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ ان پر کسی نے وارنش کر دیا ہے۔

''کیا بات ہے؟ ــ کچھ ہو تو نہیں گیا؟'' اس نے پوچھا۔ ''مجھ پر ہر وقت خوف سوار رہتا ہے۔''

''نہیں، حالت جوں کی توں ہے، کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کاتش، میں تم سے کچھ باتیں کرنے آیا ہوں... کاروباری باتیں۔'' پرنس واسیلی نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور اس کرسی پر، جو پرنسس نے خالی کی تھی، یوں بیٹھ گیا جیسے تھکن سے اس کا برا حال ہو۔ ''تم اس کمرے کو خاصا گرم رکھتی ہو!'' اس نے حاشیہ آرائی کی اور بولا، ''اچھا، بیٹھو، کام کی باتیں ہو جائیں۔''

''میرا خیال تھا کہ شاید کچھ ہو گیا ہے،'' پرنسس نے کہا۔ وہ پرنس کے بالمقابل بیٹھ گئی اور اس کی باتیں سننے کے لیے تیار۔ اس کے چہرے پر کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، ہمیشہ کی طرح پتھریلا، سخت گیر اور متمرد۔ ''بھائی جان، میں کوشش کر رہی تھی کہ کچھ نیند آ جائے لیکن بے سود۔''

''خیر، مائی ڈیئر، کیا حال ہے؟'' پرنس واسیلی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے اور حسب عادت اسے نیچے جھکاتے ہوئے کہا۔

یہ بالکل واضح تھا کہ اس نے جس انداز سے سوال کیا تھا، وہ ان باتوں کی طرف اشارہ کرتا تھا جو وہ دونوں بخوبی سمجھتے تھے اور انھیں الفاظ میں بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے۔

پرنس، جس کی کمر اس کی ٹانگوں کے مقابلے میں غیر متناسب طور پر لمبی تھی، جسم اکڑائے بیٹھی تھی۔ اس کی ملگجی متورم آنکھیں، جو ہر قسم کے جذبات سے عاری تھیں، سیدھی پرنس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے سر کو ہلکا سا جھٹکا دیا، لمبی سانس لی اور ایقونات دیکھنے لگی۔ اس کی ان حرکات کی دو طرح توجیہ کی جا سکتی تھی۔ وہ یا تو اس انداز سے اپنے ملال اور لگن کا اظہار کر رہی تھی یا پھر وہ یہ جتانا چاہتی تھی کہ وہ بہت تھک چکی ہے اور اب امید کر رہی ہے کہ مصیبت سے چھٹکارا زیادہ دور نہیں۔

"تمھارے خیال میں میرے لیے یہ کوئی آسان کام ہے؟" پرنس نے کہا۔ "میں ڈاک گاڑی کے گھوڑے کی طرح تھک کر چور ہو چکا ہوں۔ میرا بند بند درد کر رہا ہے۔ تاہم، کاتش، مجھے تم سے کچھ گفتگو کرنا ہے، بے حد سنجیدہ گفتگو۔"

پرنس واسیلی سے مزید کچھ نہ کہا گیا۔ زود حسی اور اضطراب کے عالم میں پہلے اس کا ایک طرف کا اور پھر دوسری طرف کا رخسار پھڑ پھڑانے لگا اور اس کے چہرے پر ناگواری کا احساس ابھر آیا۔ اس کی یہ کیفیت ڈرائنگ روموں میں کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی مختلف نظر آ رہی تھیں۔ ایک لمحے وہ بڑی ڈھٹائی سے چھچھل بازی کرتی دکھائی دیتیں اور دوسرے لمحے وہ گھبراہٹ اور خوف زدگی سے ادھر ادھر دیکھنے لگتیں۔

پرنس اپنے دبلے پتلے اور خشک ہاتھوں سے ایک چھوٹا سا کتا، جو اس کی گود میں لیٹا ہوا تھا، تھامے بڑے انہماک سے پرنس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھی لیکن یہ بات بالکل واضح تھی کہ خواہ اسے صبح تک یونہی بیٹھنا پڑے، وہ مہر سکوت ہرگز نہیں توڑے گی۔

"مائی ڈیئر پرنس اور ہمشیرہ، کاترینا سمیونوونا، تمھیں معلوم ہی ہے،" پرنس نے گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے نوک زبان پر لانے کے لیے اسے باطنی کشمکش میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ "تمھیں معلوم ہی ہے کہ اس قسم کے مواقع پر، جن کا آج ہمیں سامنا کرنا پڑ رہا ہے، ہمیں سب باتوں کے بارے میں سوچنا پڑے گا۔ ہمیں مستقبل کے بارے میں اور آپ سب کے بارے میں غور و فکر کرنا ہوگا... میں تم سب کو اس طرح عزیز رکھتا ہوں جیسے کہ تم سب میری اپنی بیٹیاں ہو— یہ تم بھی اچھی طرح جانتی ہو۔"

پرنس کی جذبات سے عاری نگاہیں بدستور اسی طرح پرنس پر جمی ہوئی تھیں، ان میں مو برابر تبدیلی نہیں آئی تھی۔

"اور پھر مجھے اپنے خاندان کے بارے میں بھی سوچنا ہوگا،" پرنس واسیلی نے تنک مزاجی سے ایک چھوٹی میز کو ایک طرف دھکیلتے اور اس کی نگاہوں سے گریز کرتے ہوئے کہا۔ "کاتش، تم جانتی ہو کہ ہم— تم ماموتوف ہمشیرگان اور میری اہلیہ— کاؤنٹ کے واحد بلا واسطہ وارث ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ اس قسم کے امور کے بارے میں باتیں کرنے یا سوچنے سے تمھیں کتنی اذیت میں سے گزرنا پڑ رہا ہے۔ میرے لیے بھی یہ آسان معاملہ نہیں۔ لیکن میری عزیز دوست، میں پچاس کی دہائی میں داخل ہو چکا ہوں اور مجھے ہر قسم کی صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ تمھیں معلوم ہے کہ میں نے پیئر کو بلا بھیجا ہے؟ کاؤنٹ نے سیدھا اس کی تصویر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے واضح عندیہ دیا تھا کہ وہ اس سے ملاقات کرنے کا مطالبہ کر رہا ہے۔"

پرنس نے استفہامیہ نگاہوں سے پرنس کی جانب دیکھا لیکن وہ یہ فیصلہ نہ کرسکا کہ ابھی اس نے جو کچھ کہا تھا، وہ اس کے متعلق سوچ رہی ہے یا محض اسے گھور گھور کر دیکھ رہی ہے۔

''بھائی جان، ایک دعا جو میں کبھی مانگنا نہیں بھولتی،'' اس نے جواب دیا،''یہ ہے کہ خداوند ان پر اپنی رحمت نازل فرمائیں اور ان کی قابلِ تکریم روح کو امن وسکون کے ساتھ اس دنیائے دوں سے رخصت ــ''

''ہاں، بالکل، بالکل!'' پرنس واسیلی نے بے صبری سے اس کی بات کاٹ دی۔ وہ اپنے گنجے سر کو سہلانے اور جس میز کو اس نے ابھی ابھی پرے دھکیلا تھا، برہمی کے عالم میں اپنی طرف کھینچنے لگا۔''لیکن ... درحقیقت ... اصل میں ... جیسا کہ تمھیں خود بھی معلوم ہے کہ کاؤنٹ نے پچھلی سردیوں کے دوران میں وصیت نامہ تیار کرایا تھا۔ اس میں انھوں نے ہمیں، جو ان کے بلاواسطہ وارث ہیں، نظر انداز کر دیا تھا اور اپنی تمام جائیداد پیئر کے نام کر دی تھی۔''

''وصیت جو چاہے، کہتی رہے،'' پرنس نے خاطر جمعی سے جواب دیا،''اس کی ہمیں قطعاً کوئی پروا نہیں۔ پیئر جائیداد کا وارث نہیں بن سکتا، وہ تخم حرام ہے۔''

''لیکن ma chere،'' پرنس واسیلی اچانک پھٹ پڑا۔ وہ مغلوب الغضب ہو رہا تھا اور تیز تیز بولنے لگا تھا۔ اس نے میز مضبوطی سے پکڑی اور کہنے لگا:''فرض کریں کہ کاؤنٹ نے امپراطور کے نام درخواست تحریر کر دی ہو کہ پیئر کو ان کی جائز اولاد تسلیم کر لیا جائے، پھر کیا ہوگا؟ کیا تمھیں معلوم ہے کہ کاؤنٹ نے جو خدمات سرانجام دی ہیں، ان کے پیشِ نظر اس کی خواہش کو قبولیت کی سند مل سکتی ہے۔''

پرنس ان لوگوں کی طرح، جو یہ سمجھتے ہیں کہ زیرِ بحث موضوع کے بارے میں ان کی معلومات ان اشخاص سے جن سے وہ گفتگو کر رہے ہوتے ہیں، کہیں زیادہ ہیں، مسکرا دی۔

''میں تمھیں کچھ اور بھی بتانا چاہتا ہوں،'' پرنس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا،''اگرچہ درخواست تحریر ہو گئی تھی لیکن ارسال نہیں کی گئی تھی۔ تاہم امپراطور کو اس کا علم ضرور ہے۔ مسئلہ صرف یہ ہے: اسے تلف کر دیا گیا ہے یا نہیں؟ اگر نہیں، پھر جونہی ... قصہ ختم ہو جائے گا۔'' اس نے لمبی سانس لی اور آہ بھری۔ اس طریقے سے وہ اسے یہ سمجھانا چاہتا تھا کہ اس کا''جب قصہ ختم ہو جائے گا'' کے الفاظ سے مفہوم کیا ہے۔''اور کاؤنٹ کے کاغذات کھولے جائیں گے، وصیت نامہ اور اس کے ساتھ منسلک یہ درخواست امپراطور کی خدمت میں پیش کر دیے جائیں گے۔ تب یہ درخواست یقیناً منظور کر لی جائے گی۔ پیئر اس کا جائز بیٹا تسلیم کر لیا جائے گا اور اس کا تمام مال ومتاع وراثت میں اسے منتقل ہو جائے گا۔''

''اور ہمارا حصہ؟'' پرنس نے دریافت کیا۔ اور وہ یوں طنزیہ انداز سے مسکرا دی جیسے دنیا میں ہر چیز ممکن ہے، لیکن انھیں''ان کے حصے'' سے محروم کیا جانا ناممکن ہے۔

''Mais, ma pauvre Katish! یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ وہ ایک ایک پائی کا واحد

• لیکن بے چاری کاتش!

جائز وارث ہوگا۔ اور تمھیں۔ تمھیں ایک دمڑی بھی نہیں مل سکے گی! عزیزۂ من، تمھیں لازماً علم ہونا چاہیے کہ وصیت نامہ اور درخواست تحریر ہوئے تھے یا نہیں؟ اور اگر ہوئے تھے، پھر انھیں تلف کر دیا گیا تھا یا نہیں؟ اگر وہ کہیں ادھر ادھر ہو گئے ہوں، پھر تمھیں لازماً یہ معلوم کرنا ہوگا کہ وہ کہاں ہیں۔ تمھیں انھیں ضرور بالضرور ڈھونڈنا ہوگا ورنہ۔"

"یہ تو حدود سے تجاوز کرنے کے مترادف ہوگا!" پرنسس نے زہر خند کرتے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی چتون جو کچھ کہہ رہی تھی، اس میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ "میں عورت ہوں اور اگرچہ آپ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم سب فاتر العقل ہیں، میں اتنا ضرور جانتی ہوں: تخم حرام تخم حرام ہی رہتا ہے، وہ جائیداد کا وارث نہیں بن سکتا!" اس نے تخم حرام کا ترجمہ بھی فرانسیسی میں "Un batard" کر دیا۔ گویا کاؤنٹ جو دلیل دے رہا تھا، اس فرانسیسی ترجمے سے باطل قرار پائے گی۔

"کاتش، آخر تم سمجھتی کیوں نہیں؟ تم اتنی ذہین ہو۔ تم سمجھتی کیوں نہیں کہ اگر کاؤنٹ نے امپراطور کے نام یہ درخواست تحریر کر دی ہے کہ ان کے بیٹے کو ان کا جائز وارث تسلیم کر لیا جائے، اس کا مفہوم یہ بنتا ہے کہ پیئر پیئر نہیں بلکہ کاؤنٹ بزوخوف بن جاتا ہے اور وصیت نامے کی شرائط کے مطابق ہر چیز کا وارث ٹھہرایا جائے گا؟ اور اگر وصیت نامہ اور درخواست تلف نہیں ہوتے، تمھارے ہاتھ پلّے کچھ نہیں آئے گا۔ البتہ تم اپنے دل کو تسلی ضرور دے سکو گی کہ تم نے اپنا فرض ایمانداری سے نبھایا اور کوئی کوتاہی نہیں کی، وغیرہ وغیرہ، باقی اللہ اللہ خیر سلا۔"

"یہ تو مجھے معلوم ہے کہ وصیت نامہ تیار کیا گیا تھا لیکن مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ قانونی اعتبار سے یہ بے ضابطہ اور ساقط ہے اور آپ بھائی جان، مجھے یہ دکھائی دیتا ہے کہ آپ مجھے بالکل ہی کودن سمجھتے ہیں۔" پرنسس نے کہا اور اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کے تاثرات ہویدا ہو گئے جو عام طور پر خواتین کے چہروں پر اس وقت نمودار ہوتے ہیں، جب وہ یہ سمجھتی ہیں کہ انھوں نے کوئی بے حد ظریفانہ یا کاٹ دار بات کہہ دی ہے۔

"مائی ڈیئر پرنسس کاترینا سمیونونا!" پرنس واسیلی نے قدرے جھلا کر کہا۔ "میں یہاں تمھارے ساتھ تو تکار کرنے نہیں آیا۔ میری آمد کا مقصد تمھارے ساتھ تمھارے مفادات کے بارے میں گفتگو کرنا تھا، جیسے ایک عزیز اپنے کسی دوسرے عزیز، مہربان، نیک خصلت اور سچے کھرے عزیز، کے ساتھ کرتا ہے۔ میں دسیوں مرتبہ تمھیں بتا چکا ہوں اور ایک بار پھر بتائے دیتا ہوں کہ اگر کاؤنٹ کے کاغذات میں امپراطور کے نام درخواست اور پیئر کے حق میں وصیت نامہ پایا گیا، پھر، میری پیاری بٹیا، نہ تم اور نہ تمھاری ہمشیرگان وراثت میں حصے دار بن سکیں گی۔ اگر تمھیں میری بات پر اعتبار نہیں آتا، پھر ماہرین کی بات کا یقین کر لو۔ میری ابھی ابھی دمتری انوف ریچ" (وہ خاندان کا قانونی مشیر تھا) "سے گفتگو ہوئی ہے اور اس کی رائے بھی بعینہٖ وہی ہے، جو میری ہے۔"

بظاہر پرنسس کے خیالات میں اچانک تبدیلی رونما ہوئی۔ اس کے مہین ہونٹوں کی رنگت پیلی ہو گئی (اس کی آنکھیں جوں کی توں رہیں) اور وہ ایسی شد و مد کے ساتھ پھٹ پڑی کہ وہ خود بھی حیرت زدہ رہ گئی۔

"چلو، یہ بھی اچھا ہوا!" اس نے کہا۔ "میں نے نہ پہلے کسی چیز کی تمنا کی تھی اور نہ مجھے اب کسی چیز کی تمنا ہے!"

اس کی گود میں جو چھوٹا کتا بیٹھا تھا، اس نے اسے پرے دھکیل دیا اور خود اپنے ڈریس کی شکنیں درست کرنے لگی۔

''تو یہ ہے ان کی احسان مندی! جن لوگوں نے ان کی خاطر دن رات ایک کر دیا، ہر چیز، ہر آرام تج دیا، اس کا بدلہ انھیں یہ ملا!'' اس نے کہا۔ ''بہت خوب! بہت اعلیٰ! پرنس، مجھے کچھ نہیں چاہیے!''

''بجا، لیکن تم اکیلی نہیں ہو۔ تمھاری بہنیں بھی ہیں،'' پرنس نے کھٹاک سے جواب دیا۔

لیکن پرنسس اس کی بات نہیں سن رہی تھی۔

''ہاں، مجھے کافی عرصہ پہلے اس کا علم ہو گیا تھا لیکن میں بھول گئی تھی... میں جانتی ہوں کہ مجھے اس گھر میں کمینگی، دجل و فریب، حسد، سازباز، لگائی بجھائی اور احسان ناشناسی، بدترین احسان ناشناسی، کے علاوہ اور کچھ نہیں ملے گا، مجھے کسی چیز کی توقع ہی نہیں کرنا چاہیے تھی...''

''تمھیں معلوم ہے کہ وصیت نامہ کہاں ہے یا نہیں معلوم،'' پرنس نے پوچھا۔ اس کے رخسار پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پھڑ پھڑا رہے تھے۔

''ہاں، میں احمق تھی! میں لوگوں کی باتوں میں آ گئی، ان کی ذات پر اعتماد کرتی رہی، ان سے محبت کرتی رہی، ان کے لیے قربانیاں دیتی رہی۔ لیکن مجھے کیا ملا؟ کامیابیاں صرف کمینوں اور رذیلوں کے حصے میں آتی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ یہ سب کس کا کیا دھرا ہے!''

پرنسس نے اٹھنا چاہا لیکن پرنس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے دوبارہ نیچے بٹھا دیا۔ وہ کوئی ایسی ہستی دکھائی دے رہی تھی جس کا اچانک تمام بنی نوع انسان سے اعتماد اٹھ گیا ہو۔ اس نے اپنے ہم نشیں کو یوں گھور کر دیکھا جیسے وہ اسے کچا ہی چبا جائے گی۔

''میری دوست، ابھی کچھ نہیں بگڑا، اب بھی ہمارے پاس وقت ہے۔ یاد رکھو، کاتش، یہ سب کچھ اتفاقاً، بلا قصد ہوا۔ غصے اور بیماری کے عالم میں ہوا اور اس کے بعد ذہن سے نکل گیا۔ مائی ڈیئر، ہمارے ذمے یہ فرض عاید ہوتا ہے کہ غلطی کا مداوا کریں، انھیں اس ناانصافی کا مرتکب نہ ہونے دیں اور یوں ان کے آخری لمحات کو آسان بنا دیں۔ اب جب کہ ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کیا چاہتی ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم انھیں اپنے ساتھ یہ احساس لے کر نہ جانے دیں کہ انھوں نے ان لوگوں کی زندگی میں ڈس گھول دیا ہے جنھوں نے—''

''جنھوں نے ان کی خاطر تن من دھن، سب کچھ قربان کر دیا،'' پرنسس نے اس کا جملہ مکمل کر دیا۔ پرنسس دوبارہ اٹھ کھڑی ہوتی لیکن پرنس نے مضبوطی سے اس کا ہاتھ تھامے رکھا۔ ''لیکن انھوں نے اس کی رتی برابر قدر نہ کی۔ نہیں، بھائی جان،'' اس نے آہ بھری اور پھر بولی: ''مجھے یہ بات ہمیشہ یاد رہے گی کہ اس دنیا میں آدمی کو کبھی کسی صلے کی توقع نہیں کرنا چاہیے۔ اس دنیا میں عزت، انصاف نام کی کوئی شے نہیں، اس دنیا میں صرف مکاری اور بدی کا سکہ چلتا ہے۔''

''چھوڑو، جانے دو۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ میں جانتا ہوں کہ تم طبعاً کتنی نیک خصلت ہو!''

''نہیں، میں بد خصلت ہوں۔''

''میں تمھاری خصلت جانتا ہوں،'' پرنس نے اپنی بات دہرائی۔ ''تمھاری رفاقت کی قدر کرتا ہوں اور میری خواہش ہے کہ تمھاری بھی میرے متعلق یہی رائے ہو۔ اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو۔ ہمیں عقل سے کام لینا چاہیے۔ ابھی ہمارے پاس وقت ہے ــ شاید ایک دن یا ایک گھنٹہ۔ تمھیں وصیت نامے کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، مجھے سب بتا دو اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ جاننا نہایت ضروری ہے کہ یہ ہے کہاں۔ ہم اسے فوراً اٹھائیں گے اور کاؤنٹ کے پاس لے چلیں گے۔ اس میں شک وشبے کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ اس کے متعلق بھول چکے ہوں اور اسے تلف کرنا چاہیں گے۔ تمھیں سمجھ لینا چاہیے کہ میری صرف ایک ہی آرزو ہے کہ ان کی خواہشات پر لفظاً اور معناً عمل کیا جائے۔ صرف یہی ایک وجہ تھی کہ میں یہاں چلا آیا۔ میں صرف تمھاری اور ان کی مدد کرنے آیا ہوں۔''

''اب میں سب کچھ سمجھ گئی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کے پیچھے کس کا سازشی ذہن کام کر رہا ہے۔ مجھے معلوم ہے،'' پرنس نے کہا۔

''جان من، اس وقت مسئلہ یہ نہیں۔''

''یہ وہی ہے جس کے آپ مربی بنے ہوئے ہیں، یہ وہی جادوگرنی آنا میخائیلوونا ہے۔ میں اسے جوتی کی نوک پر نہ رکھوں، اس سے جھاڑو بھی نہ دلاؤں۔ مردود، بدذات، کمینی!''

''ہم وقت ضائع کر رہے ہیں ــ''

''اوہ، مجھ سے مت کلام کریں! پچھلی سردیوں میں یہ چوروں کی طرح یہاں گھس آئی۔ اس نے وہ وہ لگائی بجھائی کی اور خاص طور پر سوفی کے متعلق ایسے ایسے غلیظ اور شرم ناک قصے کہانیاں سنائیں ــ میں انھیں دہرا بھی نہیں سکتی ــ کہ کاؤنٹ کی طبیعت واقعتاً ناساز ہو گئی۔ وہ دو ہفتے ہم سب سے ناراض رہے اور ہماری شکل دیکھنے کے بھی روادار نہ ہوئے۔ مجھے معلوم ہے کہ کاؤنٹ نے انھیں ایام کے دوران میں یہ مکروہ، غلیظ اور نجس دستاویز تحریر کی تھی اور میں یہی سمجھتی رہی کہ یہ بے معنی ہے، اس کی کوئی وقعت نہیں۔''

''اب ہوئی نا صحیح بات ــ لیکن تم نے اس کے متعلق مجھے پہلے کیوں نہ بتایا؟''

''یہ اس چرمی تھیلے میں بند ہے جس پر نقش ونگار بنے ہوئے ہیں اور جسے وہ ہر وقت اپنے تکیے کے نیچے دھرے رکھتے ہیں۔ اب میں سمجھ گئی ہوں۔'' پرنس نے اس کے سوال کو نظر انداز کر دیا اور بولتی چلی گئی۔ ''اگر مجھ سے کوئی گناہ سرزد ہوا ہے، بہت بڑا گناہ، جس کا مجھے حساب کتاب دینا ہوگا، تو وہ گناہ یہ ہے کہ مجھے اس رذیل عورت سے سخت نفرت ہے۔'' وہ تقریباً چلا رہی تھی اور اس کی اتنی کایا پلٹ ہو چکی تھی کہ وہ بالکل مختلف عورت بن چکی تھی۔ ''یہ عورت ہر وقت یہاں چوروں کی طرح کیوں گھسی آتی ہے؟ میں اس سے برابر کا حساب چکاؤں گی، اس کی پوری طرح خبر لوں گی! اب اس کا وقت آ پہنچا ہے!''

19

جس دوران میں استقبالیہ کمرے اور پرنس کے اپارٹمنٹ میں یہ مختلف اقسام کی گفتگوئیں ہو رہی تھیں، کاؤنٹ بزوخوف کے محل نما مکان کے صحن میں ایک گاڑی، جس میں پیئر (جسے بلا بھیجا گیا تھا) اور آننا میخائیلوونا (جس نے پیئر کے ساتھ آنا ضروری تصور کیا تھا) سوار تھے، داخل ہوئی۔ جب گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ بھوسے میں دب گئی جو دریچوں کے نیچے بچھایا گیا تھا، آننا میخائیلوونا کو، جس نے پیئر سے ہمدردی اور تسلی کے چند کلمات کہنے کے لیے اپنا رخ اس کی طرف کر لیا تھا، احساس ہوا کہ وہ اپنے کونے میں سویا ہوا ہے۔ اس نے اسے جگا دیا۔ پیئر نے اپنی خمار آلود آنکھیں کھولیں اور آننا میخائیلوونا کے پیچھے پیچھے گاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اچانک اسے خیال آیا کہ اسے اپنے باپ سے، جس کا دم واپسیں تھا، ملاقات کرنا ہے۔ اس نے دیکھا کہ ان کی گاڑی مین گیٹ میں سے نہیں، بلکہ عقبی دروازے میں سے اندر آئی ہے۔ جونہی اس نے گاڑی سے پاؤں نیچے دھرا، دو آدمی، جو لباس سے دکاندار دکھائی دیتے تھے، فوراً پوقدے بھاگے اور دروازے سے نکل کر دیوار کی اوٹ میں دبک کر کھڑے ہو گئے۔ پیئر کچھ دیر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے دیکھا کہ وہاں صرف یہی دو اشخاص ہی نہیں بلکہ ان جیسے متعدد دیگر افراد بھی مکان کی دونوں جانب دیواروں کے سایوں میں کھڑے ہیں۔ لیکن نہ آننا میخائیلوونا اور نہ وردی پوش ملازموں اور کوچوانوں نے، جنھوں نے انھیں لازماً دیکھ لیا ہوگا، ان کی طرف قطعاً کوئی دھیان دیا۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اگر یہ لوگ کوئی دھیان نہیں دے رہے، پھر خیر خیریت ہی ہوگی۔ وہ آننا میخائیلوونا کے، جو تنگ اور نیم روشن سیڑھیاں چڑھ رہی تھی اور بار بار مڑ کر پیچھے دیکھ رہی اور اسے تیز قدم اٹھانے کی تلقین کر رہی تھی، پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اگرچہ پیئر کی مطلق سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا عقبی زینے سے اوپر جانا کیوں ضروری ہے، تاہم آننا میخائیلوونا جس اعتماد اور عجلت کا مظاہرہ کر رہی تھی، اس سے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ بلاشک وشبہ یہ ضروری ہے۔ جب وہ زینے کے درمیان میں پہنچے، چند اشخاص، جو بالٹیاں اٹھائے اور بوٹ کھٹکھٹاتے نیچے بھاگے جا رہے تھے، ان سے ٹکرا گئے اور انھیں قریب قریب گرا دیا۔ وہ لوگ سمٹ کر دیوار کے ساتھ لگ گئے تاکہ پیئر اور آننا میخائیلوونا آسانی سے گزر جائیں۔ انھوں نے ان دونوں کو وہاں دیکھ کر قطعی کسی قسم کی حیرت کا اظہار نہ کیا۔

''پرنسوں کے اپارٹمنٹ کو یہی راستہ جاتا ہے؟'' آننا میخائیلوونا نے دریافت کیا۔

''جی ہاں۔ ادھر،'' ایک وردی پوش ملازم نے بے دھڑک بلند آواز سے جواب دیا۔ اس کے اس رویے سے یہ ظاہر ہوتا تھا جیسے ہر چیز کی کھلی چھٹی مل گئی ہو۔ ''مادام، بائیں جانب کا دروازہ۔''

''شاید کاؤنٹ نے مجھے بلایا ہی نہیں،'' پیئر نے اوپر پہنچ کر کہا۔ ''بہتر ہے میں اپنے کمرے میں چلا جاؤں۔''

آننا میخائیلوونا رک گئی تھی۔ وہ اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''آہ، mon ami'' اس نے اسی انداز سے اس کے بازو پر ہاتھ رکھا جس طرح چند گھنٹے پیشتر اس نے اپنے بیٹے کے بازو پر رکھا تھا۔ ''تمھیں شاید یقین نہ آئے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں بھی اسی کرب میں سے، جس میں سے تمھیں گزرنا پڑ رہا ہے، گزر رہی ہوں۔ لیکن تم مرد ہو، مرد بنو!''

''واقعی، کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ میں واپس چلا جاؤں؟'' اس نے اپنے چشمے میں سے اس پر پُر شفقت نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''آہ، mon ami، تمھارے ساتھ جو بھی زیادتیاں ہوئی ہوں، انھیں بھلا دو۔ صرف اتنا یاد رکھو کہ وہ تمھارے والد محترم ہیں... وہ شاید موت کے بے رحم ہاتھوں میں ہیں،'' اس نے لمبی سانس لی اور بولی، ''میں تمھارے بچپن سے ہی تمھارے ساتھ اسی طرح پیار کرتی رہی ہوں جیسے تم میرے اپنے لخت جگر ہو۔ پیئر، مجھ پر بھروسہ کرو۔ میں تمھارے مفادات آنکھ سے اوجھل نہیں ہونے دوں گی۔''

وہ کیا کہہ رہی تھی، پیئر مطلق سمجھ نہ سکا۔ لیکن اسے محسوس ہوا اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ شدید طور پر، کہ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا اور وہ آننا میخائیلوونا کے، جو پہلے ہی دروازہ کھولنے میں مصروف تھی، پیچھے پیچھے بھیگی بلی بنا چل پڑا۔

یہ دروازہ ایک عقبی پیش دالان میں کھلتا تھا۔ پرنسوں کا معمر ملازم وہاں ایک کونے میں بیٹھا تھا اور جرابیں بن رہا تھا۔ پیئر مکان کے اس حصے میں کبھی نہیں آیا تھا۔ اسے تو کبھی شبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ ادھر بھی کوئی عمارت موجود ہوگی۔ آننا میخائیلوونا نے ایک ملازمہ سے، جو ٹرے پر پانی کا گلاس سجائے بھاگم بھاگ ان کے قریب سے گزر رہی تھی، پرنسوں کی صحت کے بارے میں دریافت کیا۔ اس نے نوکرانی کو ''مائی ڈیئر'' جیسے بے تکلفانہ القابات سے پکار کر اسے ذرا الجھن بھی لگا دیا تھا، اور پھر کی راہداری میں اپنے ساتھ پیئر کو آگے گھسیٹ لیا۔ بائیں طرف کا پہلا دروازہ پرنسوں کے اپارٹمنٹ میں کھلتا تھا۔ جلد بازی میں ملازمہ کو اسے بھیڑنے کا خیال نہ رہا (اس وقت محل میں تمام کاموں میں جلد بازی کا مظاہرہ ہو رہا تھا) اور جب پیئر اور آننا میخائیلوونا ادھر سے گزرے، ان کی نظریں بے اختیار کمرے کے اندر جھانکنے لگیں جس میں پرنس واسیلی اور بڑی پرنس محو گفتگو تھے۔ انھیں دیکھ کر پرنس واسیلی گڑبڑا گیا اور اپنی کرسی میں پیچھے کی جانب دھنس گیا۔ پرنس نے جست لگائی، متشددانہ انداز سے بازو لہرایا اور پورا زور لگا کر دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔

اس کا یہ فعل اس کے معمولاً پرسکون رویے کے اتنا برعکس، اور پرنس واسیلی کے چہرے پر وحشت کے آثار اس کی عام آن بان اور وجاہت سے اس قدر مختلف تھے کہ پیئر کے قدم رک گئے اور وہ چشمے میں سے اپنی رہبر کی جانب دیکھنے لگا۔ آننا میخائیلوونا نے کسی تعجب کا اظہار نہ کیا، صرف ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر نمودار ہوئی اور اس نے یوں آہ بھری جیسے وہ جتانا چاہتی ہو کہ اسے صرف اسی بات کی توقع تھی۔

''mon ami، مرد بنو۔ تمھارے مفادات کی نگہبانی اب میں کروں گی،'' اس نے اس کی استفہامیہ نظروں

• عزیزم۔

کے جواب میں کہا اور وہ راہداری میں اور بھی تیز تیز قدم اٹھانے لگی۔

پیئر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے اور یہ بات تو مطلق اس کے پلے نہیں پڑ رہی تھی کہ اس کے مفادات کی نگرانی کا کیا مفہوم بنتا ہے۔ تاہم اسے محسوس ہوا کہ یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ راہداری سے وہ کاؤنٹ کے پیش دالان سے ملحق کمرے میں چلے گئے۔ یہ ان سرد اور پرشکوہ کمروں میں سے تھا جہاں پیئر ہمیشہ سامنے کے دروازے میں سے اندر آیا کرتا تھا۔ لیکن اب اس کمرے میں بھی ایک خالی باتھ ٹب پڑا تھا اور کسی نے پانی قالین پر اچھال دیا تھا۔ ایک ملازم اور ایک نائب پادری عود دان اٹھائے دبے پاؤں ان کے قریب سے گزر گئے۔ انھوں نے ان کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ یہ دونوں استقبالیہ کمرے میں داخل ہو گئے۔ یہ کمرہ پیئر کا دیکھا بھالا تھا۔ اس میں دو اطالوی طرز کے دریچے تھے جو پودگھر کی طرف کھلتے تھے، امپر اطورہ کیتھرین کے بالائی دھڑ کا مجسمہ تھا اور اس کی قد آدم تصویر آویزاں تھی۔ یہاں وہی اشخاص انھیں کرسیوں پر تقریباً اسی طرح بیٹھے ابھی تک ایک دوسرے سے سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ان کی نظریں آنا میخائیلونا کے زرد اور پرملال چہرے پر پڑیں اور انھوں نے دراز قد اور بھاری بھرکم نوجوان کو مسکین صورت بنائے اس کے پیچھے جاتے دیکھا، تو مکمل سکوت طاری ہو گیا۔

آنا میخائیلونا کا چہرہ پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ اسے اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی ہے۔ پیٹرز برگ کی مستعد خاتون کا انداز اپنائے اور پیئر کو اپنے پہلو سے چمٹائے وہ سہ پہر کی نسبت اور بھی زیادہ دلیری سے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ چونکہ وہ اس شخص کو اپنے ہمراہ لائی ہے جس سے قریب المرگ آدمی ملنے کا متمنی ہے، اس لیے اس کی اپنی آمد پر بھی کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی۔ اس نے سرعت سے کمرے کے چاروں اطراف نگاہیں دوڑائیں اور فوراً اندازہ لگا لیا کہ کاؤنٹ کا روحانی مشیر وہیں موجود ہے۔ وہ لپک جھپک اس کی طرف بڑھی اور اس کے سامنے دوزانو ہو گئی لیکن وہ جھکی اتنی زیادہ نہیں جتنا کہ بظاہر رعب کے زیر اثر اس کا جسم سمٹ اور سکڑ گیا۔ اس نے مؤدب ہو کر پہلے ایک اور پھر دوسرے پادری کی دعائیں لیں۔

''خدا کا شکر ہے کہ ہم وقت پر پہنچ گئے،'' اس نے ایک پادری سے کہا۔ ''ہم گھر والوں پر سخت خوف طاری تھا۔ یہ نوجوان... محترم کاؤنٹ کے فرزند دلبند ہیں،'' اس نے زیر لب مزید کہا۔ ''کتنا اذیت ناک لمحہ ہے!''

جب وہ یہ کچھ کہہ چکی، اس نے ڈاکٹر کی طرف رخ کیا۔

''ڈاکٹر صاحب،'' اس نے اس سے کہا، ''یہ نوجوان محترم کاؤنٹ کا فرزند دلبند ہے... کوئی امید ہے؟''

ڈاکٹر نے منہ سے کچھ نہ کہا۔ اس نے سرعت سے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور کندھے اچکا دیے۔ آنا میخائیلونا نے بھی بالکل اسی انداز سے اپنی نگاہیں اور کندھے اوپر اٹھا دیے۔ اس نے اپنی آنکھیں تقریباً بند کر لیں، لمبی سانس لی اور پیئر کی جانب متوجہ ہو گئی۔ اس نے پیئر کو برملا عزت و تکریم دی، اسے نرم و داس لہجے سے مخاطب کیا اور بولی:

''خداوند سے رحم و کرم کی امید رکھو!'' اور ایک چھوٹے صوفے کی طرف، جہاں اسے بیٹھنا اور اس کا انتظار کرنا تھا، اشارہ کیا، بالکل دبے پاؤں اس دروازے کی جانب بڑھی جس پر سب کی نگاہیں لگی ہوئی تھیں، اسے اتنا

آہستگی سے کھولا کہ نام کو بھی کوئی آواز سنائی نہ دی اور اس کے پیچھے روپوش ہو گئی۔

پیئر چونکہ یہ ٹھان چکا تھا کہ وہ تمام امور میں اپنی مرشد کی ہدایات پر عمل کرے گا، چنانچہ وہ اس صوفے کی طرف، جس کی جانب اشارہ کیا گیا تھا، چل پڑا۔ اسے اندازہ ہوا کہ جونہی آننا میخائیلوونا نظروں سے اوجھل ہوئی، کمرے میں موجود تمام لوگوں کی نگاہیں، جن میں تجسس سے کچھ زیادہ ہی بھرا ہوا تھا، اس پر مرکوز ہو گئی ہیں۔ اس نے دیکھا کہ وہ بھی ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیاں کر رہے ہیں اور اسے ہیبت زدہ بلکہ خوشامدانہ نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس کے ساتھ کچھ اس قسم کی عزت و تکریم کا برتاؤ کیا جا رہا تھا جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ وہ محترمہ، جو پادریوں سے گفتگو میں مصروف تھی، اگرچہ اس کے لیے بالکل اجنبی تھی، پھر بھی وہ اپنی نشست سے اٹھی اور اپنی کرسی اسے پیش کر دی۔ اس کا ایک دستانہ نیچے گر پڑا تھا، ایک ایجوٹنٹ نے اسے اٹھایا اور اسے تھما دیا۔ جب وہ ڈاکٹروں کے قریب سے گزرا، وہ نہ صرف احتراماً خاموش ہو گئے بلکہ ایک طرف بھی ہٹ گئے تا کہ اسے گزرنے میں دقت نہ ہو۔ ابتداً پیئر خاتون کو تکلیف دینے کے بجائے کسی دوسری کرسی پر بیٹھنا، اپنا دستانہ خود اٹھانا اور ڈاکٹروں کے، جو ہرگز اس کے راستے میں رکاوٹ نہیں تھے، گرد مختصر چکر کاٹ کر گزرنا چاہتا تھا لیکن اچانک اسے محسوس ہوا کہ اس کی یہ حرکات بالکل بھونڈی متصور ہوں گی۔ اس کی رگ رگ میں یہ احساس سما گیا کہ آج کی رات اسے ایک ایسے شخص کے قالب میں ڈھلنا ہے جسے ضرورت سے زیادہ سنجیدہ رسوم ادا کرنا ہیں اور یہ وہ باتیں ہیں جن کی ہر آدمی اس سے امید کر رہا ہے۔ چنانچہ اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ ان کی ان خدمات سے استفادہ کرے۔ اس نے ایک لفظ بھی کہے بغیر ایجوٹنٹ سے دستانہ قبول کر لیا اور خاتون کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے بھاری بھرکم ہاتھ اپنے گھٹنوں پر، جو اس نے متناسب انداز سے ٹکائے ہوئے تھے، رکھ لیے۔ اس کے بیٹھنے کے انداز میں اتنی معصومیت اور بھولپن تھا کہ وہ آدمی نہیں، مصری مجسمہ معلوم ہوتا تھا۔ اپنے دل میں وہ پوری طرح یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے، بالکل ویسے ہی ہو رہا ہے، جیسے کہ اسے ہونا چاہیے۔ آج کی رات اسے اپنے خیالات کی رو میں بہنا چاہیے نہ ان کے مطابق عمل کرنا چاہیے مبادا کہ اس کا ذہن گڑبڑا جائے اور کوئی احمقانہ حرکت اس سے سرزد ہو جائے۔ اسے چاہیے کہ وہ ان لوگوں کی، جنھوں نے اس کی رہنمائی کا بیڑا اٹھایا ہے، ہدایات پر پورا پورا عمل کرے۔

ابھی دو منٹ بھی نہ گزرے تھے کہ پرنس واسیلی گردن اکڑائے اور اوورکوٹ، جس پر تین ستارے آویزاں تھے، پہنے بہ انداز شاہانہ اندر داخل ہوا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ صبح کی نسبت زیادہ دبلا ہو گیا ہے۔ وہ اپنی آنکھیں، جو معمول سے زیادہ بڑی دکھائی دے رہی تھیں، گھما پھرا کر کمرے کا جائزہ لینے لگا تا آنکہ اسے پیئر نظر آ گیا۔ وہ اس کے پاس پہنچا، اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھاما (یہ کام اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا) اور اسے نیچے کی جانب کھینچا جیسے وہ پوری طرح تحقیق کر لینا چاہتا ہو کہ وہ مضبوطی سے اپنی جگہ جڑا ہوا ہے یا نہیں۔

"عزیزم، حوصلہ، حوصلہ۔ انھوں نے تمھیں ملاقات کے لیے بلایا ہے۔ چلو، اچھا ہی ہوا..."

وہ جانے ہی والا تھا کہ پیئر نے اضطراری طور پر اس سے پوچھ لیا:

''ان کی طبیعت —'' وہ ہچکچانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ قریب المرگ شخص کو ''کاؤنٹ'' کہنا مناسب رہے گا یا نہیں۔ اور اسے ''باپ'' کہتے اسے شرم آ رہی تھی۔

''آدھ گھنٹہ قبل ان پر ایک اور حملہ ہوا تھا۔ عزیزم، حوصلہ...''

پیئر ذہنی طور پر اتنا گڑبڑا چکا تھا کہ اسے لفظ ''حملہ'' پوری طرح سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے یہ مفہوم اخذ کیا کہ کاؤنٹ کو شاید کسی مادی چیز سے ضرب لگائی گئی ہے۔ وہ بالکل بوکھلا گیا اور پرنس واسیلی کو دیکھنے لگا۔ یہ اسے بعد میں احساس ہوا کہ ''حملے'' سے مراد ''حملۂ مرض'' تھا۔ پرنس واسیلی نے چلتے چلتے چند الفاظ لوغین سے کہے اور پنجوں کے بل دروازے کے اندر داخل ہو گیا۔ پنجوں کے بل چلنا اس کے لیے آسان نہیں تھا اور ہر قدم پر اس کا سارا جسم بے ڈھنگے انداز سے ڈولنے لگتا تھا۔ سب سے بڑی پرنس، اس کے بعد پادری، نائب پادری اور متعدد نوکر چاکر اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ کمرے سے مختلف اشیا کے ادھر ادھر کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آخر کار آننا میخائیلوونا بھاگتی دوڑتی باہر آئی۔ اس کا چہرہ ابھی تک زرد تھا لیکن اپنے فرائض کی ادائیگی کے لیے وہ بہت الوالعزم دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے اپنا ہاتھ پیئر کے بازو پر رکھا اور بولی:

''رحمت خداوندی بے پایاں ہے، بے کنار ہے! مقدس تیل سے مسح کرنے کی رسم شروع ہوا چاہتی ہے۔ چلو!''

پیئر کمرے کے اندر چلا گیا۔ اس کے پاؤں نرم و گداز قالین میں دھنسے جا رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ اجنبی خاتون، ایجوٹنٹ اور چند نوکر چاکر اس کے پیچھے پیچھے چلے آ رہے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اب کمرے میں داخل ہونے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں رہی۔

20

پیئر اس وسیع و عریض کمرے سے اچھی طرح واقف تھا۔ ستونوں اور ایک محراب نے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا تھا اور اس کی دیواروں پر ایرانی قالین لٹک رہے تھے۔ کمرے کا وہ حصہ جو ستونوں کے عقب میں تھا، جہاں ایک طرف مہاگنی درخت کی لکڑی کا خاصا اونچا پلنگ، جس کے اوپر اور چاروں اطراف ریشمی پردے تنے ہوئے تھے، دھرا تھا اور دوسری طرف الیقونات کا بھاری بھرکم صندوق رکھا تھا، قرمزی روشنیوں سے خوب منور تھا جیسے شام کی عبادت کے وقت گرجا روشن ہوتا ہے۔ الیقونات کے صندوق کے چمکتے دمکتے ریشمی غلافوں کے نیچے والتیر کرسی[46(ب)] پڑی تھی۔ اس کرسی پر پیئر کو اپنے والد، کاؤنٹ بزخوف، کی جانی پہچانی اور پرشکوہ شکل نظر آئی۔ کاؤنٹ کے نیچے دودھیا سفید ہموار تکیے، جنھیں ابھی ابھی تبدیل کیا گیا تھا، پڑے تھے۔ کمر سے پاؤں تک اس کا جسم لشکارے مارتی سبز رلائی سے ڈھنپا ہوا تھا۔ اس کی اونچی پیشانی کے اوپر اس کے سفید گھنے بال تھے جنھیں دیکھ کر شیر کی ایال کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ اس کے خوش شکل شربتی چہرے پر روسا کی مخصوص جھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ

الیقونات کے نیچے سیدھا لیٹا ہوا تھا اور اس کے لحیم شحیم ہاتھ لحاف سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں، جس کی ہتھیلی الٹی کر دی گئی تھی، انگوٹھے اور انگشت شہادت کے درمیان باریک موم بتی پھنسا دی گئی تھی اور ایک بزرگ ملازم صوفے کے اوپر جھکا اسے اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔

صوفے کے اردگرد پادری کھڑے تھے۔ ان کے لمبے لمبے بال ان کے بھڑکیلے چمچماتے چغوں پر لٹک رہے تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھوں میں باریک موم بتیاں، جو جل رہی تھیں، تھام رکھی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ باوقار سنجیدگی اور متانت سے مذہبی رسوم ادا کر رہے تھے۔ ان سے ذرا پیچھے اپنی آنکھوں پر رومال رکھے دونوں چھوٹی پرنسسیں کھڑی تھیں اور ان سے ایک آدھ آنچ آگے سب سے بڑی کاتش تھی۔ اس کے چہرے پر عزم اور انتقامی سوچ نمایاں تھی۔ اس نے ایک لحظے کے لیے بھی اپنی نگاہیں الیقونات سے نہ ہٹائیں۔ وہ گویا یہ جتانا چاہتی تھی کہ اگر اس کی توجہ ہٹ گئی اور اس کی نظریں ادھر ادھر بھٹک گئیں تو اس کی ذمہ داری اس پر عاید نہیں کی جا سکے گی۔ آنا میخائیلووناددروازے کے قریب اجنبی خاتون کے پاس کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکینی اور رنج وملال ٹپک رہے تھے اور کچھ اس قسم کا تاثر ابھرتا تھا جیسے وہ آج سب کو معاف کر دینے کا تہیہ کر چکی ہو۔ پرنس واسیلی دروازے کے دوسری جانب مریض کے صوفے کے بالکل ساتھ جڑا کھڑا تھا۔ اس نے اپنا بازو صوفے کی پشت پر، جس پر نقش ونگار کندہ تھے اور جو مخمل کے غلاف میں لپٹا ہوا تھا، ٹکا رکھا تھا۔ صوفے کو اس نے اپنی سہولت کے پیش نظر گھسیٹ کر ذرا آگے پیچھے کر لیا تھا۔ وہ بائیں ہاتھ میں باریک موم بتی تھامے ہوئے تھا اور دائیں ہاتھ سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔ صلیب کا نشان بنانے کے دوران میں جب اس کی انگلیاں اس کی پیشانی کو چھوتیں، وہ اپنی نگاہیں اوپر اٹھا لیتا۔ وہ اپنے چہرے پر متین پارسائی کا نقاب اوڑھے ہوئے تھے اور یہ تاثر دے رہا تھا کہ وہ خدا کی مرضی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر رہا ہے۔ اس کے اس انداز سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کو یہ باور کرانا چاہتا ہے کہ ''اگر تم میرے جذبات واحساسات کا ادراک نہیں کر سکتے تو میں تم پر خدا کی پھٹکار بھیجتا ہوں۔''

اس کے عقب میں ایجوٹنٹ، ڈاکٹر اور مرد ملازمین کھڑے تھے۔ جس طرح کلیسا میں مرد اور خواتین الگ الگ نشستوں پر بیٹھتے ہیں، بعینہٖ یہاں بھی وہ علیحدہ علیحدہ ٹکڑیوں میں بٹ گئے تھے۔ سبھی خاموشی سے اپنے اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنا رہے تھے۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا، صرف مناجات پڑھے جانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور ان مناجات کا ورد بھی بہت دھیمے آہنگ سے ہو رہا تھا۔ ورد کے دوران میں جب کبھی وقفہ آتا، تب بھی کوئی شخص اپنی زبان نہ کھولتا۔ حاضرین یا تو آہیں بھرنے لگتے یا بے چینی کے عالم میں اپنے پاؤں آگے پیچھے گھسیٹنے لگتے۔

آنا میخائیلوونا کچھ اس انداز سے، جس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ وہ بہت اہم ہستی ہے اور جانتی ہے کہ وہ کیا کر رہی ہے، آگے بڑھی اور چلتے چلتے کمرے کی دوسری جانب عین اس جگہ پہنچی جہاں پیئر کھڑا تھا۔ وہاں پہنچنے کے بعد اس نے ایک باریک موم بتی اسے تھما دی۔ پیئر نے اس موم بتی کو جلایا۔ پیئر ان لوگوں کو، جو اس کے اردگرد

کھڑے تھے، دیکھنے میں محو تھا۔ اس نے موم بتی جلا تو لی لیکن جس ہاتھ میں وہ اسے تھامے ہوئے تھا، اسی سے وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگا۔

سب سے چھوٹی پرنس، جس کا نام سوفی تھا، جس کے رخسار گلابی اور جس کے ہونٹ پر تل کا نشان تھا اور جو کھیل تماشے اور ہنسی مذاق کی دلدادہ تھی، اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تیرنے لگی تاہم اس نے اسے رومال سے ڈھانپ لیا اور کافی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ تاہم جب اس نے دوبارہ نظریں اٹھائیں اور پیئر کی جانب دیکھا، وہ ایک بار پھر ہنسنے لگی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ جونہی وہ اس کی طرف دیکھے گی، اپنی ہنسی پر قابو نہیں پا سکے گی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ وہ اس کی جانب دیکھے ہی نہ۔ چنانچہ پیئر کو بار بار دیکھنے اور اس پر ہنسنے کی ترغیب سے بچنے کے لیے وہ چپکے سے ایک ستون کے پیچھے کھسک گئی۔

مناجات کے ورد کے دوران میں پادریوں کی آوازیں یک دم خاموش ہو گئیں اور وہ آپس میں سرگوشیاں کرنے لگے۔ بزرگ ملازم، جس نے کاؤنٹ کا ہاتھ تھام رکھا تھا، خواتین کی جانب متوجہ ہوا اور اس نے انھیں کچھ کہا۔ آنا میخائیلوونا آگے بڑھی، مریض کے سامنے جھکی اور اپنے عقب میں ہاتھ کے اشارے سے لوغین کو بلایا۔ فرانسیسی ڈاکٹر ایک ستون کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں موم بتی تو نہیں تھی لیکن اس کے احترامی انداز سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ بھلے وہ غیر ملکی اور پیروکار بھی مختلف مسلک کا ہے، تاہم اس کے سامنے جو مذہبی رسوم ادا کی جا رہی ہیں، وہ نہ صرف ان کی اہمیت سے پوری طرح آگاہ ہے بلکہ انھیں بنظر تحسین بھی دیکھتا ہے۔ وہ آگے بڑھا اور اگرچہ اس کے قدموں کی چاپ خاصی دھیمی تھی، لیکن اس کی چال ایک ایسے شخص کی تھی جس کا شباب اپنے پورے جوبن پر ہو۔ اس نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے مریض کا وہ ہاتھ اوپر اٹھایا جو سبز لحاف پر پڑا تھا، اسے الٹا کیا، نبض کا معائنہ کیا اور کچھ دیر سوچتا رہا۔ مریض کو کوئی مشروب پلایا گیا۔ وقتی طور پر مریض کے اردگرد لوگوں کا جمگھٹا بن گیا تھا لیکن کچھ ہی دیر میں یہ ہجوم چھٹ گیا اور لوگ اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔ مناجات کا ورد دوبارہ شروع ہو گیا۔

اس وقفے کے دوران میں پیئر نے دیکھا کہ پرنس واسیلی نقش و نگار سے مزین صوفے سے، جس کے ساتھ وہ ٹیک لگائے کھڑا تھا، عین اسی انداز سے کہ مجھے معلوم ہے کہ میں کیا کرنے والا ہوں اور جسے نہیں معلوم، اس پر خدا کی پھٹکار، آگے بڑھا لیکن اس مرتبہ وہ مریض کے قریب نہیں گیا بلکہ اس کے صوفے سے آگے نکل گیا اور سیدھا بڑی پرنس کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں سے وہ دونوں کمرے کے انتہائی سرے کی طرف، جہاں ریشمی پردوں کے نیچے اونچا پلنگ پڑا تھا، چل دیے۔ وہ وہاں رکے نہیں بلکہ عقبی دروازے سے باہر نکل گئے۔ تاہم مناجات کے ختم ہونے سے پہلے وہ دونوں الگ الگ واپس آ گئے اور دوبارہ اپنی اپنی جگہوں پر کھڑے ہو گئے۔ پیئر نے دوسری باتوں کی طرح، جو وہاں پیش آ رہی تھیں، اس واقعہ پر بھی کوئی خاص توجہ نہ دی۔ وہ تو دل میں بھی یہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اس شام جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہے، وہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا۔

مناجات کا ورد ختم ہو گیا۔ ایک پادری نے مریض کو ہدیہ تہنیت پیش کیا کہ اسے اصطباغ مل گیا ہے۔ کاؤنٹ

نے کوئی جنبش نہ کی، وہ حسب سابق ساکت اور بے جان پڑا رہا۔ اس کے ارد گرد ہنگامے کی فضا پیدا ہو گئی تھی۔ لوگ ادھر ادھر بھاگے دوڑے پھر رہے تھے اور سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ بلند ترین آواز آننا میخائیلوونا کی تھی۔

پیئر نے اسے کہتے سنا:

"انھیں لازماً یہاں سے اٹھا کر بستر پر لٹانا ہوگا۔ یہاں یہ ناممکن ہوگا!"

ڈاکٹروں، نوکروں چاکروں اور نرسوں نے مریض کے ارد گرد کچھ اس طرح گھیرا ڈال رکھا تھا کہ پیئر کے لیے اس کا شربتی چہرہ اور اس کے اوپر اس کے گھنے بالوں کا چھتا دیکھنا ممکن نہیں رہا تھا جب کہ مناجات کے ورد کے دوران میں اسے بے شک دوسرے چہرے بھی نظر آتے رہے تھے لیکن یہ چہرہ ایک ثانیے کے لیے بھی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوا تھا۔ جن لوگوں نے صوفے کے ارد گرد گھیرا ڈال رکھا تھا، ان کی محتاط حرکات وسکنات سے اس نے یہ اندازہ لگایا کہ وہ قریب المرگ شخص کو اٹھا چکے ہیں اور اب اسے پلنگ کی جانب لے جا رہے ہیں۔

"میرا بازو پکڑلو، نہیں تو تم انھیں نیچے گرادو گے!" اس نے ایک ملازم کو خوف زدگی کے عالم میں کانا پھوسی کرتے سنا۔ "ذرا نیچے!... ایک اور یہاں آ جائے!..." دو دوسرے اشخاص نے دہائی دی۔ اور جن لوگوں نے مریض کو اٹھا رکھا تھا، وہ یوں ہانپ رہے تھے اور یوں اپنے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر چل رہے تھے، جیسے وہ بوجھ، جو وہ اٹھائے ہوئے تھے، ان کی ہمت سے کہیں زیادہ ہے۔

مریض کو اٹھانے والوں میں آننا میخائیلوونا بھی شامل تھی۔ جب وہ پیئر کے برابر سے گزرے، اسے ان کے سروں اور پشتوں کے اوپر سے قریب المرگ شخص کے چوڑے چکلے، مضبوط وتوانا اور عریاں سینے اور اس کے لحیم شحیم شانوں، جو اس لیے اوپر اٹھ گئے تھے کہ اٹھانے والوں نے اس کی بغلوں کے نیچے ہاتھ دے رکھے تھے، اور اس کے سفید، گھونگریالے اور شیر کی طرح کے گھنے بالوں کی عارضی جھلک دکھائی دی۔ موت کی آمد بھی اس کے اس سر، غیر معمولی طور پر اونچی پیشانی، رخساروں کی ابھرویں ہڈیوں، خوش شکل اور شہوانی دہن اور سرد مہر اور شاہانہ وقار کی حامل آنکھوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکی تھی۔ اس کا حلیہ، اس کا چہرہ مہرہ اور خدوخال بعینہٖ وہی تھے جو اس نے تین ماہ قبل، جب کاؤنٹ نے اسے پیٹرز برگ کے سفر پر روانہ کیا تھا، دیکھے تھے۔ لیکن اب یہ سر، جب اسے اٹھانے والوں کے ناہموار قدم فرش پر پڑتے تھے، بے چارگی کے عالم میں ہلکورے کھانے لگتا اور اس کی سرد اور بے حس آنکھیں کسی چیز پر ٹکنے سے قاصر تھیں۔

اونچے پلنگ کے ارد گرد کئی منٹ کھلبلی مچی رہی اور پھر وہ لوگ، جو مریض کو اٹھا کر وہاں لائے تھے، ادھر ادھر ہو گئے۔ آننا میخائیلوونا نے پیئر کا بازو چھوا اور کہا: "آؤ۔" پیئر اس کی معیت میں پلنگ کے قریب آیا جہاں مریض کو ان رسوم کی مناسبت سے، جو چند ثانیے قبل سرانجام دی گئی تھیں، ابھی ابھی پرشکوہ انداز سے لٹایا گیا تھا۔ تکیوں کے سہارے اس کا سر اونچا کر دیا گیا تھا۔ اس کے ہاتھ، جن کی ہتھیلیاں الٹے رخ تھیں، موزوں انداز سے سبز لحاف پر رکھے ہوئے تھے۔ جب پیئر قریب آیا، کاؤنٹ نے سیدھا اس کی جانب دیکھا لیکن اس کی نگاہوں کا مفہوم اور

اہمیت کیا تھی، کوئی بھی شخص اس کی تہہ تک پہنچنے سے قاصر تھا۔ یا تو یہ ہر قسم کے مفہوم سے خالی تھیں اور دیکھ اس لیے رہی تھیں کیونکہ آنکھوں کا کام دیکھنا قرار پایا ہے۔ یا پھر یہ مطالب ومفاہیم سے بھرپور تھیں۔ پیئر متامل تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس نے استفہامیہ نگاہوں سے اپنی رہنما کی جانب دیکھا۔ آنا میخائیلوونا نے عجلت سے آنکھوں ہی آنکھوں سے بیمار آدمی کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنے ہونٹ یوں پچکائے جیسے وہ بوسہ لے رہی ہو۔ پیئر نے نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ اپنی گردن آگے بڑھائی تاکہ کہیں لحاف کی اکاڑ پچھاڑ نہ ہو جائے اور آنا میخائیلوونا کی ہدایات کے مطابق بڑی بڑی ہڈیوں والے لحیم شحیم ہاتھ پر اپنے ہونٹ پیوست کر دیے۔ کاؤنٹ کا ہاتھ تو کجا، اس کے جسم کے ایک روم نے بھی مطلق کوئی حرکت نہ کی۔ اب اسے کیا کرنا تھا، یہ جاننے کے لیے اس نے ایک بار پھر سوالیہ نظروں سے آنا میخائیلوونا کی طرف دیکھا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک بازوؤں والی کرسی کی جانب، جو اونچے پلنگ کے قریب پڑی تھی، اشارہ کیا۔ پیئر تعمیل حکم کے جذبے کے ساتھ اس پر بیٹھ گیا لیکن اس کی نگاہیں اب بھی یہ دریافت کر رہی تھیں کہ آیا وہ صحیح سمت عمل کر رہا ہے۔ آنا میخائیلوونا نے پسندیدگی سے اپنی گردن کو خم دے دیا۔ پیئر نے دوبارہ مصری مجسمے کا بھولا اور متناسب انداز اختیار کر لیا۔ اسے بظاہر اس چیز سے کوفت ہو رہی تھی کہ اس کے بے ہنگم، بے ڈول، مضبوط اور بھاری بھرکم جسم نے اتنی زیادہ جگہ گھیر رکھی ہے۔ اپنی طرف سے بطور تلافی وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ اتنا سکڑ کر بیٹھے کہ حتی الامکان چھوٹے سے چھوٹا نظر آئے۔ اس نے اچٹتی سی نگاہ کاؤنٹ پر ڈالی۔ کاؤنٹ کی نظریں اب بھی اسی مقام پر گڑی ہوئی تھیں جہاں بیٹھنے سے پہلے پیئر کا سر تھا۔

آنا میخائیلوونا کے تیور بتا رہے تھے کہ باپ بیٹے کے مابین ان آخری لمحات کی رقت انگیز گمبھیرتا سے وہ بخوبی آگاہ ہے۔ یہ کیفیت دو منٹ رہی لیکن پیئر کو یہ دو منٹ ایک گھنٹہ محسوس ہوئے۔ اچانک کاؤنٹ کے چہرے کے توانا عضلات اور لکیریں پھڑکنے لگیں۔ پھڑکنے کے اس عمل میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ خوش شکل دہن مسخ ہونے لگا (صرف اب پیئر کو یہ احساس ہوا کہ اس کا باپ بالکل قریب المرگ ہے) اور اس مسخ شدہ دہن سے گلوگرفتہ اور کسی کی سمجھ میں نہ آنے والی آواز برآمد ہوئی۔ آنا میخائیلوونا نے نہایت انہماک سے مریض کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور یہ معلوم کرنے کے لیے کہ وہ کیا چاہتا ہے، اس نے پہلے پیئر اور پھر اس کے مشروب کی طرف اشارہ کیا۔ اس کے بعد اس نے استفہامیہ سرگوشی میں پرنس واسیلی کا نام لیا اور آخر کار لحاف کی جانب انگلی اٹھائی۔ مریض کی آنکھوں اور چہرے سے بے تابی ٹپک رہی تھی۔ اس نے اس ملازم کی طرف، جو مسلسل اس کے سرہانے کھڑا تھا، دیکھنے کی کوشش کی۔

''وہ دوسری طرف کروٹ بدلنا چاہتے ہیں،'' ملازم نے کاؤنٹ کے بھاری بھرکم جسم کو موڑنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔

اس کی مدد کے لیے پیئر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جب کاؤنٹ کو کروٹ دلائی جا رہی تھی، اس کا ایک بازو یوں پچھلی جانب گرا جیسے اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہ رہی ہو۔ اس نے اسے آگے کھینچنے کے لیے جدوجہد کی لیکن بے سود۔ اس بے جان بازو کو دیکھ کر پیئر پر دہشت طاری ہوگئی۔ کاؤنٹ نے پیئر کے چہرے پر یہ دہشت پڑھ لی یا اس کے قریب المرگ دماغ میں بجلی کی طرح کوئی دوسرا خیال کوندا، اس نے بہر حال پہلے اپنے سرکش بازو، اس کے بعد پیئر کے دہشت زدہ چہرے اور آخر ایک بار پھر اپنے بازو پر نظر دوڑائی۔ اس کے چہرے پر مریل اور دل دوز مسکراہٹ نمودار ہوئی، جس کی اس کے خدوخال سے قطعی کوئی مناسبت نہیں تھی۔ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ اس کی یہ مسکراہٹ اس کی بے بسی اور لاچارگی کی تضحیک کر رہی ہے۔ جب پیئر نے اس مسکراہٹ کو دیکھا، اسے اپنے سینے میں غیر متوقع کپکپاہٹ اور اپنی ناک میں کھنکھناہٹ کا احساس ہوا۔ اس کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں اور ان میں دھندلاہٹ آ گئی۔ مریض کو کروٹ دلا دی گئی۔ اب اس کے چہرے کا رخ دیوار کی سمت تھا۔ اس کی آہ نکل گئی۔

''ان پر غنودگی طاری ہو رہی ہے،'' آنا میخائیلونا نے ایک پرنس کو، جو اپنی باری لینے پلنگ کی جانب آ رہی تھی، دیکھ کر کہا۔ ''آؤ چلیں۔''

پیئر کمرے سے باہر نکل گیا۔

21

استقبالیہ کمرے میں پرنس واسیلی اور بڑی پرنس کے علاوہ اور کوئی متنفس نہیں تھا۔ دونوں امپراطورہ کیتھرین کی تصویر کے نیچے بیٹھے تھے اور آپس میں بڑے اشتیاق سے باتیں کر رہے تھے۔ جونہی ان کی نظریں پیئر اور اس کی ہمراہی پر پڑیں، وہ مہر بلب ہوگئے۔ پیئر کو خیال آیا کہ مجھے دیکھ کر پرنس نے کچھ چھپانے کی کوشش کی ہے۔ ویسے پرنس اس وقت زیر لب کہہ رہی تھی:

''مجھے یہ عورت ایک آنکھ نہیں بھاتی۔ یہ میری برداشت سے باہر ہے۔''

''کاتش نے چھوٹے ڈرائنگ روم میں چائے کا انتظام کر دیا ہے،'' پرنس واسیلی نے آنا میخائیلونا سے کہا۔ ''میری بے چاری آنا میخائیلونا، جاؤ اور جا کر کچھ کھا پی لو، ورنہ تمھاری ہمت جواب دے جائے گی۔''

پیئر سے اس نے کچھ نہ کہا، محض ازرہ ہمدردی کندھے کے نیچے اس کے بازو کو ذرا دبا دیا۔ پیئر اور آنا میخائیلونا چھوٹے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔

''اگر آپ رات بھر سو نہ سکے ہوں، تو تازہ دم ہونے کے لیے اس عمدہ روسی چائے کی صرف ایک پیالی کافی ہے، اس سے بڑھ کر آپ کو اور کوئی چیز نہیں مل سکے گی۔'' لوغین دبے دبے جوش و خروش سے تقریر جھاڑ رہا تھا۔ وہ چھوٹے گول ڈرائنگ روم میں ایک میز کے سامنے، جس پر پیپر کی سرد اشیا پڑی تھیں، کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چین کی ساختہ دستے بغیر نفیس و نازک پیالی تھی اور وہ چائے کی چسکیاں لے رہا تھا۔

اس اداس رات کاؤنٹ بزوخوف کے گھر میں جتنے اشخاص موجود تھے، وہ سبھی اس وقت میز کے گرد ہجوم کیے ہوئے تھے تاکہ کچھ کھا پی کر اپنی توانائی مجتمع کر سکیں۔ پیئر کو یہ چھوٹا گول ڈرائنگ روم، جس میں آئینے نصب تھے اور چھوٹی چھوٹی میزیں پڑی تھیں، خوب اچھی طرح یاد تھا۔ پیئر کو چونکہ رقص کرنا نہیں آتا تھا، چنانچہ جب کبھی اس حویلی میں بال کا اہتمام ہوتا، وہ آئینوں سے مزین اس گول ڈرائنگ روم میں بیٹھنا پسند کرتا اور بال گاؤنوں میں ملبوس خواتین کو دیکھتا رہتا جو اپنے برہنہ شانے ہیروں، جواہرات اور موتیوں سے سجائے کمرے میں آتیں، چکا چوند آئینوں میں اپنی صورتوں کا جائزہ لیتیں اور آگے گزر جاتیں۔ اب جب کہ نیم شب کا وقت تھا، وہی کمرہ محض نیم روشن تھا کیونکہ یہاں صرف دو موم بتیاں جل رہی تھیں۔ چائے کے لوازمات ایک چھوٹی میز پر بے ترتیب پڑے تھے۔ بھانت بھانت کے متین لوگوں کا ہجوم کرسیوں پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے ایک ایک لفظ اور ایک ایک حرکت سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ بیڈ روم میں جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا تھا اور جو وقوع پذیر ہونا تھا، وہ اس سے قطعاً غافل نہیں ہیں۔

پیئر کا دل تو بہت للچا رہا تھا لیکن اس نے کھانے کی کسی شے کو ہاتھ نہ لگایا۔ اس نے اپنی مرشد پر استفہامیہ نگاہیں ڈالیں اور دیکھا کہ وہ پنجوں کے بل کمرے سے باہر نکل رہی ہے اور استقبالیہ کمرے کی طرف، جہاں پرنس واسیلی اور بڑی پرنس بیٹھے تھے، واپس جا رہی ہے۔ پیئر نے فرض کر لیا کہ ایسا بھی ہونا تھا۔ وہ کچھ دیر شش و پنج میں پڑا رہا، پھر اٹھا اور اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس نے دیکھا کہ آنا میخائیلوونا پرنس کے قریب کھڑی ہے۔ دونوں مشتعل تھیں اور دھیمے لہجوں میں آپس میں تو تو میں میں کر رہی تھیں۔

''مادام، یہ فیصلہ مجھے کرنے دیں کہ کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا،'' پرنس کہہ رہی تھی۔ بظاہر اس کا پارہ اسی طرح چڑھا ہوا تھا، جس طرح اس وقت چڑھا تھا جب اس نے دھماکے سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا تھا۔

''لیکن، مائی ڈیئر پرنس،'' آنا میخائیلوونا نے شیریں اور دل میں گھر کر جانے والے لہجے کے ساتھ جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بیڈ روم کے دروازے کی راہ میں سد سکندری بن کر کھڑی ہو گئی اور یوں اس نے پرنس کو اندر داخل ہونے کے موقع سے محروم کر دیا۔ ''ایسے وقت جب کہ انکل کو آرام کی شدید ضرورت ہے، انھیں یوں پریشان کرنا ان کے لیے باعث آزار نہیں ہوگا؟ اب جب کہ ان کی روح سفر آخرت کے لیے تیار کر دی گئی ہے، ان کے ساتھ دنیاوی امور کے بارے میں گفتگو کرنا کچھ بچتا نہیں...''

پرنس واسیلی بازوؤں والی کرسی پر حسب عادت لات پر لات دھرے بیٹھا تھا۔ اس کے رخسار بے طرح پھڑک رہے تھے اور جب کبھی ان میں ٹھہراؤ آتا، کچھ یوں لگتا جیسے ان پر گوشت کی تہیں چڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن اس نے انداز کچھ اس قسم کا بنا رکھا تھا جیسے اسے اس گفتگو سے، جو ان دو خواتین کے مابین ہو رہی تھی، کوئی تعلق واسطہ نہ ہو۔

''مائی ڈیئر، آنا میخائیلوونا، چھوڑو، جانے دو، کاتش جو کچھ کرنا چاہتی ہے، اسے کرنے دو۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ کاؤنٹ اس سے کتنا پیار کرتے ہیں۔''

''مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اس دستاویز میں ہے کیا،'' پرنس نے نقش و نگار سے مزین تھیلے کی طرف، جو اس نے ہاتھ میں پکڑ رکھا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ ان کا اصل وصیت نامہ ان کی میز کی دراز میں پڑا ہے اور یہ محض کاغذ ہے جو کہیں بھول وول گیا تھا۔''

اس نے آننا میخائیلوونا سے آگے نکلنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ آننا میخائیلوونا نے جست لگائی اور ایک بار پھر اس کے راستے میں دیوار بن کر کھڑی ہوگئی۔

''میری عزیز، مہربان پرنس، مجھے معلوم ہے —'' اور آننا میخائیلوونا نے جھپٹ کر تھیلے پر ہاتھ ڈال دیا اور اسے یوں کس کر پکڑ لیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے آسانی سے نہیں چھوڑے گی۔ ''ڈیئر پرنس، میں آپ سے التجا کرتی ہوں، آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں، ان پر رحم کریں، ترس کھائیں۔ Je vous en Conjure.*''

پرنس خاموش تھی۔ جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ دونوں میں تھیلے پر قبضہ جمانے کے لیے زور آزمائی ہو رہی ہے۔ لیکن اس امر کے متعلق شک و شبے کی کوئی گنجائش نہ تھی کہ اگر پرنس نے لب کشائی کی ہوتی، وہ اور تو سب کچھ کہہ سکتی تھی لیکن آننا میخائیلوونا کی تحسین بالکل نہ کرتی۔ اگرچہ تھیلے پر مؤخر الذکر کی گرفت نہایت مضبوط تھی لیکن اس کے لہجے میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ اس نے بدستور اپنے شیریں اور نرم انداز سے کہا:

''پیئر، میرے عزیز بچے، ادھر آنا۔ میرا خیال ہے کہ خاندانی اجلاس میں اس کا موجود ہونا بے محل نہیں۔ کیوں پرنس، میں نے ٹھیک کہا نا؟''

''بھائی جان، آپ کیوں نہیں بولتے؟'' پرنس اچانک چیخ پڑی۔ اس کی چیخ اتنی بلند تھی کہ وہ لوگ، جو ڈرائنگ روم میں موجود تھے، انھوں نے بھی سن لی اور وہ گھبرا گئے۔ ''آپ چپ کیوں بیٹھے ہیں؟ ادھر ایک غیر عورت خواہ مخواہ ہمارے گھریلو معاملات میں ٹانگ اڑا رہی ہے اور قریب المرگ شخص کی عین چوکھٹ پر کھڑی ہو کر ادھم مچا رہی ہے۔ سازش!'' وہ سفاکانہ انداز سے غراتے ہوئے چلائی اور پورا زور لگا کر تھیلا کھینچنے لگی۔

آننا میخائیلوونا ایک دو قدم مزید آگے بڑھ آئی اور اس نے تھیلے پر اپنی گرفت اور بھی مضبوط کر دی۔

''افوہ C'est ridicule!**'' پرنس واسیلی نے متعجب اور علامت انگیز انداز سے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''چھوڑ دو، جانے دو۔ میں کہتا ہوں چھوڑ دو!''

پرنس نے تھیلا چھوڑ دیا۔

''اور تم بھی!''

آننا میخائیلوونا نے اس کے حکم کی تعمیل نہ کی۔

''میں کہتا ہوں چھوڑ دو! میں ساری ذمے داری اپنے سر لے لوں گا۔ میں خود جا کر پوچھ لیتا ہوں۔ میں—

* میں آپ کی منت کرتی ہوں۔

** یہ کیا بے ہودگی ہے!

تسلی ہوگئی؟''

''لیکن Mon prince*،'' آنا میخائیلوونا نے پھٹ جواب دیا۔ ''اب جب کہ انھیں متبرک اصطباغ مل چکا ہے، انھیں کچھ دیر سکون ملنا چاہیے! پیئر ادھر آؤ، تمھاری کیا رائے ہے؟'' اس نے نوجوان کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا۔ وہ اب ان کے قریب آ چکا تھا اور ہکا بکا ہو کر پرنس کے، جس نے آن بان اور وجاہت کا لبادہ پھینک دیا تھا، غضب آلود چہرے اور پرنس واسیلی کے پھڑکتے ہوئے رخساروں کو دیکھ رہا تھا۔

''یاد رکھو تمھیں اس کے نتائج بھگتنا پڑیں گے،'' پرنس واسیلی نے بڑی درشتی سے کہا۔ ''تمھیں پتا ہی نہیں کہ تم کیا کر رہی ہو۔''

''رذیل عورت!'' پرنس نے اچانک آنا میخائیلوونا پر جھپٹتے اور اس کے ہاتھوں سے تھیلا چھینتے ہوئے چلا کر کہا۔

پرنس واسیلی نے سر جھکا لیا اور اپنے ہاتھ آگے پھیلا دیے۔

عین اسی لمحے، وہی ہیبت ناک دروازہ، جسے پیئر اتنی مدت سے دیکھتا چلا آیا تھا اور جسے ہمیشہ نہایت آہستگی اور خاموشی سے کھولا جاتا تھا، اچانک زبردست دھماکے سے کھلا اور دیوار کے ساتھ جا ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی منجھلی پرنس ہاتھ ملتی اور تیز تیز بھاگتی باہر آئی۔

''یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے رونکھی ہو کر کہا۔ ''وہ آخری سانس لے رہے ہیں اور آپ نے مجھے اکیلا ان کے پاس چھوڑ دیا ہے!''

بڑی پرنس نے تھیلا نیچے گرا دیا۔ آنا میخائیلوونا تیزی سے نیچے جھکی، اس نے فساد کی جڑ — تھیلے — پر جھپٹا مارا، اسے بہ عجلت اٹھایا اور بیڈروم میں بھاگ گئی۔ بڑی پرنس اور پرنس واسیلی نے اپنے حواس درست کیے اور اس کے پیچھے ہو لیے۔ چند ثانیوں کے بعد پرنس دوبارہ باہر آئی۔ اس کا رنگ فق اور چہرہ سخت ہو چکا تھا۔ وہ اپنا زیریں ہونٹ چبا رہی تھی۔ جب اس کی نظر پیئر پر پڑی، اس کے چہرے پر ایسی شدید نفرت ہویدا ہوگئی کہ اس پر قابو پانا اس کے بس کی بات نہ رہی۔

''اب تم جشن منا سکتے ہو،'' اس نے کہا، ''تمھیں تو اسی وقت کا انتظار تھا!''

اور وہ سسکیاں لے کر رونے لگی۔ اس نے اپنا چہرہ رومال میں چھپا لیا اور کمرے سے بھاگ گئی۔

اس کے بعد جو شخص کمرے میں آیا، وہ پرنس واسیلی تھا۔ جس صوفے پر پیئر بیٹھا تھا، وہ لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا اس کی طرف بڑھا اور بے اختیار اس پر گر پڑا۔ اس نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔ پیئر نے دیکھا کہ اس کے چہرے کا رنگ زرد ہو چکا ہے اور اس کا جبڑا یوں پھڑک اور کانپ رہا ہے جیسے اسے جھلسا دینے والا بخار ہو گیا ہو۔

''آہ، میرے دوست،'' اس نے پیئر کی کہنی اپنے ہاتھ میں پکڑتے زیر لب کہا۔ اس کی آواز میں اتنی ملائمت

---

* مائی پرنس۔

اور خلوص تھا کہ پیئر کو اس سے پہلے کبھی اس کا مشاہدہ نہیں ہوا تھا۔ ''ہم کتنے مہیب گناہوں کا ارتکاب کرتے ہیں، کیسے کیسے مکر اور فریب کرتے ہیں۔ یہ سب کس لیے؟ میرے دوست، میں ساٹھ کے پیٹے میں داخل ہوا چاہتا ہوں۔ میں، میں بھی۔ ہر چیز کا انجام فنا ہے۔ موت بے حد دہشت ناک چیز ہے۔'' اور وہ رونے لگا۔

آنا میخائیلوونا سب سے آخر میں باہر آئی۔ وہ آہستہ آہستہ، دبے پاؤں چلتی پیئر کے قریب آئی۔

''پیئر!'' اس نے کہا۔

''پیئر نے استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ آنا میخائیلوونا نے نوجوان شخص کی پیشانی چومی اور اسے اپنے آنسوؤں سے بھگو دیا اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولی:

''وہ اس دنیا میں نہیں رہے...''

پیئر نے چشمے میں سے اس کی طرف دیکھا۔

''آؤ، میں تمھارے ساتھ چلتی ہوں۔ کوشش کرو کہ تمھیں رونا آجائے۔ آنسوؤں سے بڑھ کر کسی چیز میں راحت نہیں ملتی۔''

وہ اسے تاریک ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ پیئر خوش تھا کیونکہ یہاں اندھیرے میں کوئی شخص اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آنا میخائیلوونا نے اسے وہیں چھوڑ دیا اور جب وہ واپس آئی وہ اپنا سر بازو پر رکھے گہری نیند سویا ہوا تھا۔

اگلی صبح آنا میخائیلوونا نے پیئر سے کہا:

''*oui, mon cher, یہ صرف تمھارا ہی نہیں، ہم سب کا نقصان ہوا ہے۔ لیکن خداوند تمھیں حوصلہ اور ہمت دیں گے۔ تم نوجوان ہو اور مجھے یقین ہے کہ اب تم بے پناہ دولت کے مالک ہو۔ وصیت نامہ ابھی کھولا نہیں گیا۔ میں تمھیں اتنی اچھی طرح جانتی ہوں کہ میں پورے اعتماد سے کہہ سکتی ہوں کہ اس (دولت) سے تمھارا دماغ نہیں پھر جائے گا۔ تاہم تمھاری ذمے داریوں میں زبردست اضافہ ہو جائے گا۔ تمھیں اب مرد بننا ہوگا!''

پیئر خاموش رہا۔

''mon cher، میں شاید بعد میں تمھیں بتا سکوں گی کہ اگر میں یہاں نہ ہوتی، پھر خدا معلوم یہاں کیا ہو جاتا! انکل نے پرسوں ہی مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ بورس کو نہیں بھولیں گے لیکن انھیں (اپنا وعدہ ایفا کرنے کا) وقت ہی نہ ملا۔ mon cher، مجھے امید ہے کہ اب تم اپنے باپ کی خواہشات کا احترام کرو گے اور انھیں پایہ تکمیل تک پہنچاؤ گے۔''

پیئر کی خاک سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ وہ شرما رہا تھا اور اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔ وہ چپ چاپ آنا میخائیلوونا کی جانب دیکھتا رہا۔

* ہاں، مائی ڈیئر۔

پیئر کے ساتھ اس گفتگو کے بعد آنا میخائیلووناواپس روستوفوں کے ہاں چلی گئی اور سوگئی۔ جب وہ بیدار ہوئی، اس نے روستوفوں اور اپنے تمام واقف کاروں کو کاؤنٹ بزوخوف کے انتقال کی تفصیلات بتائیں۔ اس نے بتایا کہ کاؤنٹ وہی موت مرا ہے، جیسی موت وہ خود مرنا پسند کرے گی، یہ کہ اس کا انجام نہ صرف رقّت انگیز تھا بلکہ ایسا کہ دیکھ کر انسان کا ایمان تازہ ہو جائے۔ پھر باپ بیٹے کے مابین جو آخری ملاقات ہوئی، وہ منظر اس قدر رلا دینے والا تھا کہ جب بھی وہ اسے یاد آتا ہے، اس کے لیے اپنے آنسوؤں پر قابو پانا مشکل ہو جاتا ہے اور وہ یہ بتانے سے قاصر ہے کہ ان ہول ناک لمحات کے دوران میں کس کا۔ باپ کا یا بیٹے کا۔ رویہ زیادہ قابل تعریف تھا۔ باپ کو اس آخری وقت میں ایک ایک چیز اور ایک ایک شخص یاد تھا۔ رہا پیئر، اگر چہ اس نے پوری کوشش کی تھی کہ وہ اپنے غم پر قابو پائے رکھے تا کہ اس کے قریب المرگ باپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، پھر بھی اس کی حالت اتنی غیر تھی کہ آدمی سے دیکھا نہیں جاتا تھا، بے چارے پر خواہ مخواہ ترس آتا تھا۔

''ایسے مناظر تکلیف دہ ضرور ہوتے ہیں،'' اس نے اپنی بات فرانسیسی میں ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن معمر کاؤنٹ اور ان کے لائق فائق صاحب زادے کو دیکھ کر انسان کی روح سرشار ہو جاتی ہے اور بلندیوں پر پرواز کرنے لگتی ہے۔''

اس نے بڑی پرنس اور پرنس واسیلی کے رویے کا تذکرہ بھی کیا لیکن اس بارے میں اس کی گفتگو میں ناپسندیدگی جھلکتی تھی اور وہ یوں نیچے لہجے میں بات کر رہی تھی جیسے سننے والوں سے حلف لے رہی ہو کہ وہ اس معاملے کو اچھالیں گے نہیں، بلکہ راز داری برتیں گے۔

22

پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی[47] کی جاگیر *بالڈ ہلز پر نوجوان پرنس آندرے اور اس کی رفیقۂ حیات کا روزانہ انتظار کیا جاتا لیکن کہن سال پرنس کے گھرانے میں جو معمول مروج تھا، اس پر جوں کا توں عمل ہو رہا تھا، اس انتظار سے اس میں کوئی خلل نہیں پڑا تھا۔ سابق زار پاول کے عہد حکومت میں جنرل انچیف پرنس نکولائی آندریوچ (اونچے طبقے میں وہ ''شاہِ پرشیا'' کے لقب سے پہچانا جاتا تھا) کو شہر بدر کر دیا گیا تھا اور اسے حکم ملا تھا کہ وہ واپس اپنی جاگیر پر چلا جائے۔ چنانچہ وہ دن اور یہ دن، وہ بالڈ ہلز سے کبھی باہر نہیں نکلا اور اپنی دختر پرنس ماریا اور اس کی جلیس مادموزیل بوغین (Bourienne) کے ساتھ وہیں رہا۔ اگر چہ نئی حکومت کے عہد میں اس پر سے یہ پابندی اٹھالی گئی تھی اور اسے مملکت کے دونوں دارالسلطنتوں میں آنے جانے کی اجازت مل گئی تھی، وہ گاؤں میں ہی مقیم رہا۔ اس کا کہنا تھا کہ اگر کسی شخص کو اس سے ملنے کا شوق ہے، وہ ماسکو سے سو میل کا فاصلہ بآسانی طے کر کے بالڈ ہلز آ سکتا ہے اور جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے، وہ ہر شخص اور ہر شے سے مستغنی ہے۔ اس کا یہ دعویٰ تھا کہ انسانی خباثت کے صرف دو سرچشمے

* لفظی ترجمہ: بے آب و گیاہ پہاڑیاں۔

ہیں: کاہلی اور توہم۔ اور انسان صرف دو خوبیوں سے مالا مال ہیں: توانائی اور ذہانت۔ اپنی بیٹی کی تعلیم و تدریس وہ خود کرتا تھا۔ اور اس میں ان دونوں بنیادی خوبیوں کا نفوذ کرنے کی غرض سے وہ اسے الجبرا اور جیومیٹری کے اسباق دیا کرتا تھا۔ اس نے اس کی زندگی کا لائحہ عمل کچھ اس طور ترتیب دیا تھا کہ وہ ہمہ وقت مصروف رہتی تھی اور اسے فراغت کا ایک لمحہ بھی میسر نہیں آتا تھا۔ وہ خود بھی مسلسل کام میں جتا رہا کرتا تھا: اپنی یادداشتیں تحریر کرتا، اعلیٰ ریاضی کے مسائل حل کرتا، خراد پر نسوار کی ڈبیاں بناتا، باغیچہ سینچتا، یا عمارت سازی کی جو اس کی جاگیر پر متواتر جاری رہتی، نگرانی کرتا۔ چونکہ کام کی بنیادی شرط باقاعدگی ہے، پرنس کے طرز حیات میں باقاعدگی پر اتنی صحت سے عمل کیا جاتا تھا کہ اس میں مین میکھ نکالنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی تھی۔ طعام کے اوقات بھی انھی شرائط کے تابع تھے۔ وہ عین مقررہ ساعت پر پہنچتا اور اس میں ایک آدھ منٹ کی کمی بیشی کا بھی روادار نہ ہوتا۔ بیٹی سے لے کر ملازمین تک، جتنے بھی لوگوں کا اس سے واسطہ پڑتا تھا، ان سب کے ساتھ اس کا رویہ درشت اور سخت گیر ہوتا اور فرائض کی ادائیگی میں وہ ذرہ برابر کوتاہی برداشت نہ کرتا۔ چنانچہ سفاکی اور سنگ دلی کا مظاہرہ کیے بغیر اس نے ان کے دلوں پر ایسی دہشت اور دھاک بٹھادی تھی کہ متمرد سے متمرد شخص کی یہ مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے چوں چرا کرتا۔

اس امر کے باوجود کہ اب وہ ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہا تھا اور مملکت کے امور میں اس کا کوئی اثر و رسوخ باقی نہیں رہا تھا، اس صوبے کا ہر اہلکار، جس میں اس کی جاگیر واقع تھی، اس کی خدمت میں حاضر ہونا اپنا فرض منصبی تصور کرتا اور اس کے بلند و بالا استقبالیہ کمرے میں عین اسی طرح انتظار کرتا جس طرح ماہر تعمیرات، باغبان اور پرنسس ماریا کرتی تا آنکہ وہ ملاقات کے عین معینہ وقت پر وہاں پہنچ جاتا۔ جب سٹڈی روم کا انتہائی اونچا دروازہ کھلتا اور نسبتاً پست قامت بزرگ شخص، اپنے چھوٹے چھوٹے پژمردہ ہاتھوں، پاؤڈر چھڑکی وگ اور سفید گھنے ابروؤں (جب کبھی خفگی کے عالم میں اس کے ماتھے پر بل پڑتے، اس کے یہ گھنے ابرو اس کی زیرک اور جوانوں کی طرح کی چمکتی آنکھوں کی چمک دمک چھپا لیتے) کے ساتھ استقبالیہ کمرے میں داخل ہوتا، تو اس سرکاری اہلکار پر بھی وہی رعب، بلکہ ایک قسم کا خوف بھی، طاری ہو جاتا جو دوسرے لوگوں پر ہوتا تھا۔

جس روز نوجوانوں نے آنا تھا، پرنسس ماریا روزمرہ کے معمول کے مطابق عین معینہ وقت پر صبح کا سلام عرض کرنے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ خوف سے کپکپا رہی تھی اور اپنے سینے پر صلیب کے نشانات بنا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دل میں دعائیں بھی مانگتی جا رہی تھی۔ وہ ہر روز اپنے باپ سے ملاقات کرنے جاتی اور ہر روز ہی دعائیں کرتی کہ اپنے والد سے اس کی ملاقات بخیر و خوبی سرانجام پا جائے۔

ایک بوڑھا خدمت گار، جس نے اپنے بالوں پر خوشبودار پاؤڈر چھڑک رکھا تھا اور جو استقبالیہ کمرے میں بیٹھا تھا، چپ چاپ اٹھا اور دھیمی آواز میں بولا:

''برائے مہربانی اندر تشریف لے چلیں۔''

دروازے میں سے خراد کی یک رنگی آواز سنائی دے رہی تھی۔ پرنسس نے ڈرتے جھجکتے دروازہ کھولا۔

دروازہ آسانی سے اور بغیر چرچرائے کھل گیا۔ پرنس نے کچھ دیر وہیں توقف کیا۔ پرنس نے، جو اپنے خراد پر مصروف کار تھا، نگاہ اوپر اٹھائی لیکن اپنے کام میں مشغول رہا۔

وسیع وعریض سٹڈی روم ایسی اشیا سے اٹا پڑا تھا، جو بظاہر مسلسل استعمال میں آتی رہتی تھیں۔ ایک خاصی بڑی میز تھی، یہ کتابوں اور نقشوں سے پٹی ہوئی تھی۔ کتابوں کی اونچی اونچی الماریاں تھیں۔ ان کے پٹ شیشے کے تھے اور ان کے تالوں میں چابیاں لٹک رہی تھیں۔ ایک اور میز تھی۔ یہ اتنی اونچی تھی کہ آدمی کھڑا ہو کر اس پر لکھائی کا کام کر سکتا تھا اور اس پر ایک کھلی کاپی پڑی تھی۔ ایک خراد تھا۔ اس کے قریب مختلف اوزار ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ داڑھی مونڈنے کا سامان بھی ادھر ادھر پڑا تھا۔ ان تمام اشیا پر ایک نظر ڈالنے سے یہ احساس ہوتا تھا کہ یہاں مختلف النوع سرگرمیاں منظم انداز سے مسلسل جاری رہتی ہیں۔ پرنس اپنے چھوٹے چھوٹے پاؤں کو، جن میں اس نے کارچوبی تاتاری بوٹ پہنے ہوئے تھے، جس انداز سے حرکت دے رہا تھا اور اپنے دبلے پتلے لیکن قوی ہاتھوں سے جس طرح دباؤ ڈال رہا تھا، اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس میں جفاکش بڑھاپے کی توانائی بدرجہ اتم موجود ہے، وہ سخت سے سخت حالات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور ناقابل تسخیر ہے۔ اس نے اپنے خراد کو چند مزید چکر دیے، اس کے بعد پیڈل سے پاؤں ہٹایا، چھینی کو صاف کیا، اسے تھیلی میں، جو خراد کے ساتھ لٹک رہی تھی، ڈالا، میز کی طرف بڑھا اور بیٹی سے آگے آنے کو کہا۔ وہ اپنے بچوں کو دعائیں دینے یا ان کے سروں پر ہاتھ پھیرنے کا قائل نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنا محض رخسار، جس پر بال اگے ہوئے تھے کیونکہ اس نے ابھی تک شیو نہیں بنائی تھی، اپنی بیٹی کے آگے کر دیا تاکہ وہ اسے بوسہ دے سکے اور درشت لہجے (لیکن اس کی نگاہوں میں شفقت اور توجہ تھی) سے گویا ہوا:

''تم ٹھیک ہو؟ بہت خوب، بیٹھو۔''

اس نے ایک کاپی اٹھائی۔ اس پر اس نے اپنے ہاتھ سے جیومیٹری کے اسباق تحریر کیے تھے، اور پاؤں سے کرسی گھسیٹ کر آگے کر لی۔

''کل کا کام،'' اس نے عجلت سے مطلوبہ صفحہ پلٹتے اور اس پر ایک پیرے سے دوسرے پیرے تک اپنے خارنما ناخنوں سے نشانات بناتے ہوئے کہا۔

پرنسس میز پر رکھی کاپی پر جھک گئی۔

''ٹھہرو، تمھارے لیے خط بھی ہے،'' معمر شخص نے اچانک کہا اور تھیلی سے، جو میز کے ساتھ لٹک رہی تھی، خط نکالا اور اسے میز پر پھینک دیا۔ مکتوب پر پتا نسوانی ہاتھوں کا تحریر کیا ہوا تھا۔

پرنسس کی نظر جب خط پر پڑی، اس کے گالوں پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے۔ اس نے جھپا جھپ خط اٹھایا اور اس کے اوپر اپنا سر جھکا دیا۔

''ایلواز[48] کا ہے؟'' پرنس نے سرد مہر تبسم سے پوچھا۔ مسکرانے سے اس کے دانت نمایاں ہو گئے۔ ان پر کریز اجما ہوا تھا لیکن وہ ابھی تک صحت مند تھے۔

''جی ہاں، جولی کا ہے،'' پرنس نے ڈرتے جھجکتے دیکھتے اور پھسپھسے انداز سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''میں دو اور خطوط یونہی تمھارے سپرد کردوں گا لیکن تیسرا لازماً پڑھوں گا،'' پرنس نے درشتی سے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم ڈھیروں واہیات باتیں لکھتی رہتی ہو۔ میں تیسرا ضرور پڑھوں گا۔''

''mon pere•، اگر آپ چاہیں تو بے شک یہ بھی پڑھ لیں،'' پرنس نے خط آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اس کے گال پہلے سے بھی زیادہ تمتمارہے تھے۔

''میں نے کہا تھا کہ تیسرا، صرف تیسرا،'' پرنس نے ترش روئی سے جواب دیا۔ اس نے خط پرے دھکیل دیا، اپنی کہنیاں میز پر ٹکادیں اور وہ کاپی، جس پر جیومیٹری کی شکلیں بنی ہوئی تھیں، اپنی طرف گھسیٹ لی۔

''دیکھو، مادام،'' بوڑھے نے اپنی بیٹی کے بالکل قریب کاپی پر جھکتے اور اپنا بازو اس کی کرسی کی پشت پر رکھتے ہوئے کہا۔ ماریا کو محسوس ہوا کہ وہ تمباکو اور بڑھاپے کی تلخ و ناگوار بو میں، جسے اس نے مدتوں سے اپنے باپ کے ساتھ ساتھ وابستہ کررکھا تھا، گھر گئی ہے۔ ''دیکھو، مادام، یہ تکونیں برابر ہیں۔ زاویہ اب ج کو بغور دیکھو...''

پرنس نے اپنے باپ کی چمچماتی آنکھوں کی سمت، جو اس کے بالکل قریب تھیں، ڈرتے کانپتے دیکھا۔ سرخ دھبے اس کے رخساروں پر ابھرنے اور غائب ہونے لگے۔ یہ بالکل عیاں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اس کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا اور وہ اتنی ہراساں اور خوف زدہ تھی کہ اس کا باپ بعدازاں خواہ کتنی ہی بار اور کتنی ہی وضاحت سے اسے سمجھانے کی کوشش کرے، اس کا ڈرا سے کچھ سمجھنے نہیں دے گا۔ اس سے قطع نظر کہ خطا استاد کی تھی یا شاگرد کی، ہوتا ہر روز یہی تھا۔ پرنس کی آنکھیں ڈبڈبانے لگتیں، اسے نہ کچھ نظر آتا اور نہ سنائی دیتا۔ اسے صرف اپنے باپ کے درشت اور خشک چہرے کی قربت کا، اس کی سانس کا اور اس کی تلخ اور ناگوار بو کا احساس ہوتا۔ اس کے ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار رہتی کہ وہ جتنی جلد ہو سکے، سٹڈی روم سے فرار ہو جائے اور اپنے کمرے کی تنہائی اور خاموشی میں مسئلہ حل کرنے کی کوشش کرے۔ پیر مرد کا پارہ چڑھ جاتا، وہ کھنکھناہٹ سے اپنی کرسی پیچھے دھکیل دیتا اور اسے کھینچ کر پھر میز کے قریب کرلیتا۔ اگرچہ اس کی پوری کوشش ہوتی کہ وہ ضبط سے کام لے، غیظ و غضب کو اپنے اوپر سوار نہ ہونے دے لیکن ہوتا اس کے برعکس۔ وہ تقریباً ہمیشہ ہی جوش میں آجاتا، اسے سخت سست کہتا اور بعض اوقات کاپی اٹھا کر دور پھینک دیتا۔

پرنس نے جواب غلط دیا۔

''کیسی احمق لڑکی ہے!'' پرنس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ اس نے کاپی ایک طرف دھکیل دی اور غصے کے عالم میں منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

تاہم وہ جھپاکے سے اٹھ کھڑا ہوا، کمرے میں ایک آدھ چکر لگایا، دوبارہ واپس آیا، ہلکے سے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھا، کرسی آگے گھسیٹی، نیچے بیٹھا اور دوبارہ تشریح کرنے لگا۔

• اباجان۔

''پرنس، یوں کام نہیں چلے گا، یوں کام نہیں چلے گا،'' اس نے پرنس سے کہا، جو کاپی اٹھا چکی اور واپس جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ ''مادام، ریاضی بڑا زبردست شغل ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم بھی دوسری ناقص العقل عورتوں کی طرح نظر آؤ۔ مستقل مزاجی سے جتی رہو۔ تم اسے پسند کرنے لگو گی۔'' اس نے اس کے گالوں پر تھپکی دی۔ ''یہ تمھارے دماغ کے تمام جالے صاف کر دے گی اور اس میں سے تمام فضول باتیں نکال دے گی۔''

اس نے جانے کی کوشش کی لیکن اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک لیا۔ اس نے اپنی دراز میں سے ایک بالکل نئی کتاب، جس کے ابھی صفحات بھی کاٹے نہیں گئے تھے، نکالی۔

''اور یہ لو۔ تمھاری ایلواز نے کسی قسم کی 'کلید اسرار'[49] بھیجی ہے۔ مذہبی موضوع ہے۔ لیکن میں کسی کے عقائد میں دخل نہیں دیتا... میں نے اس پر سرسری نظر ڈالی ہے۔ پکڑو اور اب چلتی بنو۔''

پرنس ماریا واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے چہرے پر اداسی اور خوف کے جو تاثرات تھے، وہ شاید ہی کبھی اس کا پیچھا چھوڑتے ہوں گے۔ انھوں نے ایک غضب یہ ڈھایا تھا کہ انھوں نے اس کی شکل و صورت، جو پہلے ہی معمولی اور پیلی تھی، اور بھی معمولی اور پیلی بنا دی تھی۔ وہ اپنے لکھنے کی میز کے سامنے جس پر بے شمار تصویریچے[50]، کتابیں اور کاغذات ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، بیٹھ گئی۔ باپ جتنا قرینے اور ترتیب کا دلدادہ تھا، بیٹی اتنی ہی بدترتیبی اور عدم قرینے کی شوقین تھی۔ اس نے جیومیٹری کی کاپی نیچے رکھی اور بڑی بے صبری سے خط کھولنے لگی۔ یہ اس کی بچپن کی بے تکلف ترین سہیلی، جولی کاراگنا کا، جو رستوفوں کے نام دن کی ضیافت میں شریک تھی، تحریر کردہ تھا۔

جولی نے یہ خط فرانسیسی میں لکھا تھا۔

میری عزیز از جان اور قابل قدر سہیلی۔

یہ مفارقت بھی کتنی بھیانک اور اذیت ناک چیز ہے! اگرچہ میں اپنے آپ کو جتاتی رہتی ہوں کہ میری نصف زندگی اور مسرتیں تمھاری ذات کے ساتھ منسلک ہیں اور یہ کہ ان فاصلوں کے باوجود، جنھوں نے ہمارے مابین دوریاں حائل کر رکھی ہیں، ہمارے قلوب نادیدہ رشتوں میں ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہیں، پھر بھی میرا دل تقدیر کے خلاف مائل بغاوت رہتا ہے اور ان راحتوں اور تفریحات کے باوصف، جنھوں نے میرے گرد و پیش حصار بنایا ہوا ہے، میں خاص قسم کی پوشیدہ اداسی پر غالب نہیں آسکتی جو اس وقت سے میرے کلیجے کو مسوس رہی ہے جب سے ہم دونوں کے درمیان جدائی کی خلیج حائل ہوئی ہے۔ گزشتہ گرمیوں کی طرح، جب ہم تمھارے وسیع و عریض سٹڈی روم میں نیلے صوفے — ''ہمارا رازدان صوفہ'' — پر بیٹھا کرتی تھیں، اس مرتبہ بھی ہم کیوں یک جا نہیں ہو سکتیں؟ جس طرح آج سے تین ماہ قبل مجھے تمھاری آنکھوں — جھیل کی طرح گہری، پرسکون اور دل آویز آنکھوں — سے اخلاقی قوت ملا کرتی تھی، دوبارہ کیوں نہیں مل

سکتی؟ کتنا پیار تھا مجھے تمھاری ان آنکھوں سے اور اب جب کہ میں یہ مکتوب تحریر کررہی ہوں، مجھے یوں محسوس ہورہا ہے جیسے وہ آنکھیں اب بھی میرے سامنے موجود ہیں۔

یہاں تک پڑھنے کے بعد پرنس ماریا نے ٹھنڈی سانس بھری اور دائیں طرف دیواری آئینے میں جھانکنے لگی۔ آئینے میں دبلے پتلے چہرے اور کمزور وناتواں اور بدزیب جسم کا عکس نظر آرہا تھا۔ اس کی آنکھیں، جو ہمیشہ اداس رہا کرتی تھیں، آئینے میں عکس کو خاص طور پر یاس وناامیدی سے دیکھنے لگیں۔ ''وہ مجھے پھسلا رہی ہے، خواہ مخواہ میری تعریفوں کے پل باندھ رہی ہے،'' پرنس نے دوبارہ خط پڑھتے ہوئے سوچا۔ لیکن جولی نے اس کی خواہ مخواہ تعریف نہیں کی تھی۔ پرنس کی آنکھیں غزالی، گہری اور تابناک (بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا تھا کہ ان میں سے گرم روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہیں) تھیں اور واقعتاً اتنی خوبصورت تھیں کہ اس امر کے باوجود کہ اس کی شکل و شباہت بالکل معمولی تھی، انھوں نے اس میں وہ کشش پیدا کردی تھی جو حسن و جمال سے کہیں بڑھ کر تھی۔ لیکن خود پرنس کو اپنی آنکھوں کی خوبصورتی کا کبھی اندازہ نہیں ہوا تھا۔ یہ خوبصورتی اس وقت نمایاں ہوکر سامنے آتی تھی جب وہ اپنے بارے میں سوچ نہیں رہی ہوتی تھی۔ جیسا کہ عام طور پر ہر شخص کے ساتھ ہوتا ہے، وہ جونہی آئینے میں اپنی شکل دیکھتی، اس کے چہرے پر غیر فطری تناؤ اور بدصورتی سایہ فگن ہوجاتی۔

پرنس دوبارہ خط پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔

ماسکو میں جنگ کے علاوہ اور کسی موضوع پر گفتگو نہیں ہوتی۔ میرا ایک بھائی پہلے ہی پردیس سدھار چکا ہے اور دوسرا گارڈز میں، جو سرحد کی طرف کوچ کرنے کے لیے پر تول رہے ہیں، بھرتی ہوگیا ہے۔ ہمارے محبوب امپراطور پیٹرزبرگ سے روانہ ہوچکے ہیں اور سنا ہے کہ وہ اپنی ذات بابرکات کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے کا عزم کرچکے ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ہمارے فرشتہ خصلت امپراطور، جنھیں خداوند نے ازرہ لطف وکرم ہمارا حکمران بنایا ہے، کارسیکا کے اس عفریت کو، جس نے یورپ کے امن وسکون کو غارت کررکھا ہے، شکست فاش سے دوچار کرسکیں۔ بھائیوں کا تو ذکر ہی کیا، اس جنگ نے مجھے ایک ایسی ہستی سے بھی، جو مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز ہے، محروم کردیا ہے۔ میری مراد نوجوان نکولائی رستوف سے ہے۔ وہ اپنے ولولے اور جوش وخروش کے پیش نظر نچلے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔ چنانچہ انھوں نے فوج میں بھرتی ہونے کے لیے یونیورسٹی کو خیرباد کہہ دیا ہے اور ہاں، خواہر عزیز، مجھے تمھارے سامنے یہ اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں کہ ان کی اٹھتی جوانی کے باوجود فوج میں بھرتی ہونے کے لیے ان کی روانگی میرے لیے ناقابل برداشت رنج والم کا سبب بنی ہے۔ یہ نوجوان، جن کا ذکر میں نے گزشتہ گرمیوں کے دوران میں تم سے کیا تھا، اتنے شریف ونجیب اور صحیح معنوں میں اتنے نوخیز ہیں کہ ڈھونڈا کرو چراغ رخ زیبا لے کر، پھر بھی ان

کا مثیل نہ ملے کیونکہ حال یہ ہے کہ فی زمانہ بیس برس کے چھوکرے بھی سن رسیدہ بزرگ دکھائی دیتے ہیں!
ان کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ جو بات کہتے ہیں، صاف صاف کہتے ہیں، کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے۔
پھر کیا دل پایا ہے انھوں نے! وہ اتنے پاک دامن اور شاعر مزاج ہیں کہ ان کے ساتھ مجھے جو راہ و رسم،
اس کی نوعیت خواہ کتنی ہی عارضی اور ناپائیدار کیوں نہ ہو، بڑھانے کا موقع ملا، اس نے میرے اس قلب
حزیں کو، جو پہلے ہی اتنی گہری چوٹ کھا چکا اور زخم زخم ہو چکا ہے، سچی خوشیوں اور مسرتوں کا گہوارہ بنا دیا
ہے۔ ایک دوسرے سے کیسے جدا ہوے اور اس موقع پر ہم نے ایک دوسرے سے کیا کہا، کیا سنا، کسی روز
تمھیں اس کی پوری تفصیل سناؤں گی، ابھی گھاؤ تازہ ہیں، ان کا نہ چھیڑنا ہی بہتر ہے۔ آہ، میری عزیز
سہیلی، تم خوش نصیب ہو کہ ابھی تمھیں ان دل پذیر مسرتوں اور دل فگار آلام سے پالا نہیں پڑا! تم خوش
نصیب ہو کیونکہ مؤخرالذکر کی کسک بہت شدید اور گہری ہوتی ہے۔ میں جانتی ہوں کہ کاؤنٹ نکولائی ابھی
اتنے نوخیز ہیں کہ وہ میرے لیے ہمدم سے بڑھ کر اور کچھ نہیں ہو سکتے لیکن اس شیریں رفاقت، اس پاکیزہ
اور شاعرانہ بے تکلفی نے میرے قلب ناشاد کی تمام حسرتوں کی تکمیل کر دی ہے۔ اب اس کے متعلق مزید
کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔ اتنا ہی کافی ہے۔

عظیم ترین خبر امروز، جس کی صدائے بازگشت سارے ماسکو میں سنائی دے رہی ہے، معمر کاؤنٹ بزدخوف
کا انتقال پر ملال اور ان کی میراث ہے۔ مقام حیرت ہے کہ تینوں پرنسسوں کو ترکے کا انتہائی قلیل حصہ ملا
ہے اور رہے پرنس واسیلی، ان کی تو لٹیا ہی ڈوب گئی ہے، دھیلا ہاتھ نہیں آیا۔ اور یہ موسیو پیئر ہیں جنھیں
ورثے میں سب کچھ مل گیا ہے ــ اور مزید برآں، انھیں صحیح النسب بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ ان تمام باتوں کا
ماحصل یہ ہے کہ موسیو پیئر محض پیئر ہی نہیں رہے بلکہ کاؤنٹ بزدخوف بن گئے ہیں اور مملکت روس کی وسیع
تریں جائیداد اور دولت ان کے قدموں پر ڈھیر ہو گئی ہے۔ افواہوں کے مطابق پرنس واسیلی نے اس
معاملے میں نہایت گھٹیا کردار کا مظاہرہ کیا۔ وہ اب منہ لٹکائے اور سر نیہوڑائے واپس پیٹرز برگ چلے گئے
ہیں۔ مجھے اقرار ہے کہ ترکوں اور وصیتوں کے بارے میں میرا علم صفر ہے۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ یہ
نوجوان، جنھیں ہم سب محض موسیو پیئر کے نام سے موسوم کرتے تھے، اب کاؤنٹ بزدخوف کا روپ دھار
چکے ہیں اور مملکت روس کی وسیع تریں جائیداد اور دھن دولت ان کے قبضے میں آ گیا ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر
بہت تعجب ہوتا ہے کہ وہ مائیں، جن کی بچیاں شادی کی عمر کو پہنچ گئی ہیں، اور خود یہ نوخیز دوشیزائیں بھی، اس
فرد واحد کے بارے میں ایکا ایکی اپنے لب و لہجے اور رویے میں تبدیلی لے آئی ہیں۔ (ویسے آپس کی بات
ہے کہ یہ شخص کبھی میرے جی کو نہیں بھایا، مجھے یہ ہمیشہ گھٹیا نمونہ ہی نظر آیا۔) جس طرح گزشتہ سالوں کے
دوران میں ماسکو کے لوگ مجھے ایسے ایسے اشخاص سے، جن میں سے اکثر کو میں جانتی تک نہیں، منسوب کر
کے محظوظ ہوتے رہے ہیں، اسی طرح اب ان خدا واسطے رشتہ کرانے والیوں نے مجھے کاؤنٹس بزدخوا بنا دیا

ہے۔ لیکن تم خود سمجھ دار ہو، مجھے اس کی رتی برابر خواہش نہیں۔

شادی کا ذکر چل ہی نکلا ہے تو پھر لگے ہاتھوں یہ بھی سنتی چلو کہ جگت خالہ آننا میخائیلوونا نے مجھے سخت رازداری کی تلقین کر کے تمھاری شادی کے بارے میں ایک منصوبے سے آگاہ کیا تھا۔ جانتی ہو کہ تمھاری یہ شادی کس کے ساتھ ہوگی؟ بھلا متوقع امیدوار پرنس واسیلی کے لخت جگر اناطول کے علاوہ اور کون ہو سکتا ہے! ان لوگوں کا منصوبہ یہ ہے کہ اناطول کا بیاہ کسی صاحب حیثیت اور نامور دوشیزہ کے ساتھ کر دیا جائے تاکہ وہ کسی طور سدھر جائے۔ اس کے عزیز و اقارب کے حساب سے قرعہ فال تمھارے نام نکلا ہے۔ تمھاری اس سلسلے میں کیا رائے ہوگی، مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں تاہم اس بارے میں تمھیں آگاہ کرنا میں نے اپنا فرض گردانا۔ سنا ہے کہ وہ بے حد خوش شکل ہے لیکن لاابالی اور بے لگام بھی حد سے زیادہ ہے۔ میں اس کے بارے میں بس اتنی ہی معلومات اکٹھی کر سکی ہوں۔

خیر گپ شپ کافی ہو چکی۔ میں کاغذ کا دوسرا ورق بھی ختم کیا چاہتی ہوں۔ ادھر ماما حکم دے رہی ہیں کہ میں اپراکسنوں کی ضیافت میں شرکت کروں۔

میں تصوف* کی جو کتاب تمھیں بھیج رہی ہوں، اسے ضرور پڑھنا۔ آج کل یہاں ہر شخص اس کا دیوانہ ہو رہا ہے۔ اگرچہ اس میں بعض باتیں مشکل ہیں اور وہ کمزور ذہنوں کی دسترس میں نہیں آسکتیں، پھر بھی یہ تصنیف بہت عمدہ اور قابل ستائش ہے۔ اس کے پڑھنے سے روح کو شانتی ملتی ہے اور وہ بلندیوں پر پرواز کرنے لگتی ہے۔ خدا حافظ۔ آپ کے ابا جان کو آداب عرض کرتی ہوں اور مادام بوغین کو سلام پیش کرتی ہوں۔ میں دل کی گہرائیوں سے تمھارے ساتھ معانقہ کرتی ہوں۔

جولی

پس تحریر : اپنے بھائی اور ان کی ننھی منی پرکشش بیگم کے متعلق مجھے ضرور لکھنا۔

پرنس کچھ دیر گہرے سوچ بچار میں مستغرق رہی۔ حسرت انگیز مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر کھیلتی رہی اور اس کے چہرے کی، جسے اس کی تابدار آنکھوں نے روشن و منور کر دیا تھا، مکمل کایا پلٹ ہو گئی۔ اچانک وہ اٹھی اور بھاری قدموں کمرے کی دوسری جانب میز کے قریب پہنچی۔ اس نے کاغذ کا ورق اٹھایا اور اس کا ہاتھ بہ سرعت اس پر چلنے لگا۔ اس نے فرانسیسی میں مندرجہ ذیل جواب تحریر کیا:

میری گرانقدر اور عزیز سہیلی۔

تمھارے تیرہ تاریخ کے مکتوب نے میرا دل باغ باغ کر دیا۔ میری شاعر صفت جولی، گویا تمھیں اب بھی

---

* mysticism

1805 کی مہم
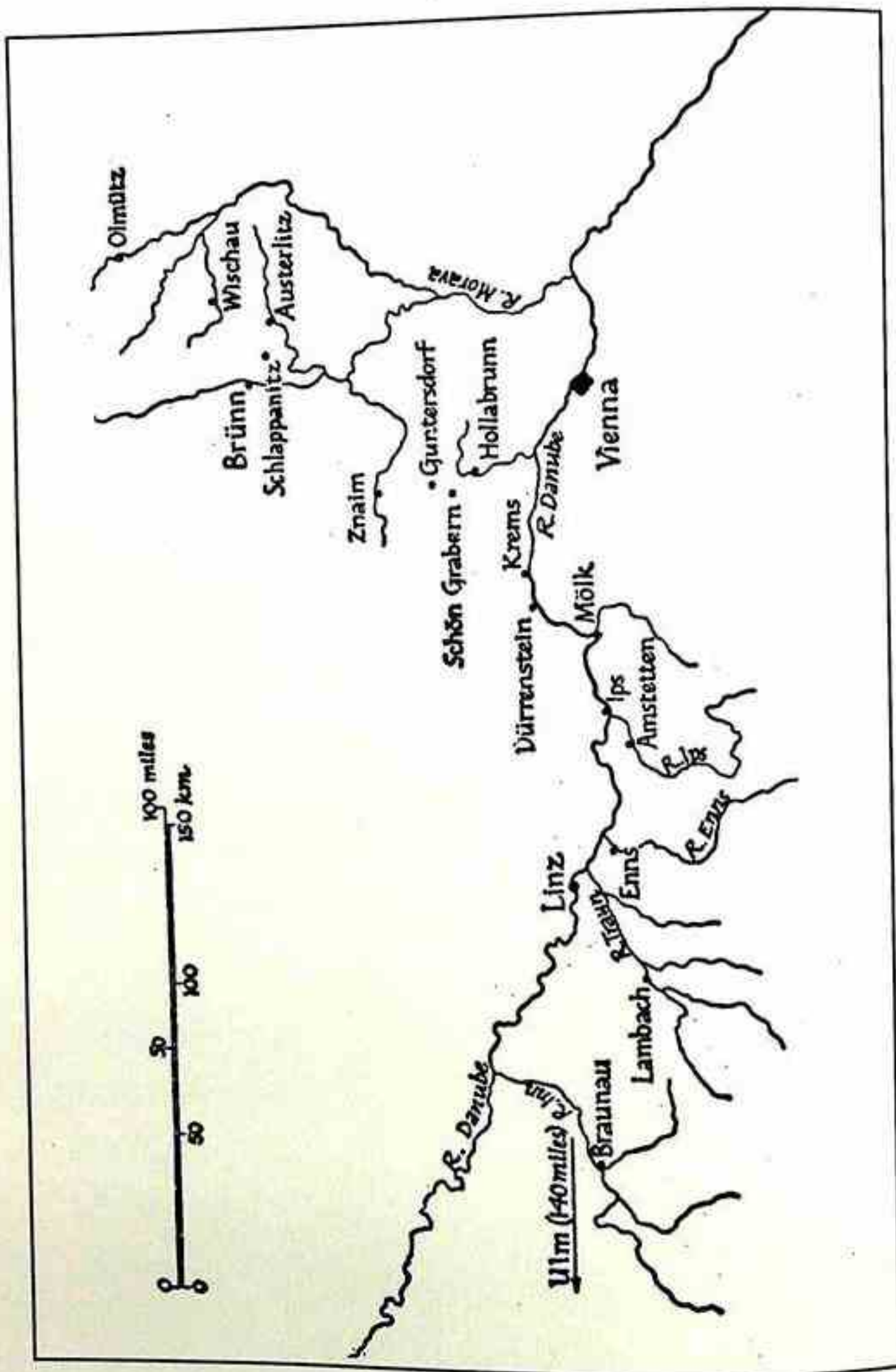
مجھ سے پیار ہے، جس مفارقت کو تم نے جی بھر کر کوسنے سنائے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تم پر اپنا روایتی اثر نہیں دکھایا۔ تم عدم موجودگی کی شکایات کرتی ہو — اگر میں، ہاں میں، جس سے وہ تمام اعزہ و احباب چھن گئے جن سے مجھے بہت لگاؤ ہے، شکوہ زبان پر لانے کا حوصلہ کروں، پھر مجھے کیا پیرایہ بیان اختیار کرنا ہوگا؟ آہ، اگر ہمیں تسکین قلب کے لیے مذہب کا سہارا حاصل نہ ہو، زندگی محض مرقع غم و آلام بن جائے۔

تم نے یہ کیسے فرض کر لیا کہ میں اس نوجوان کے ساتھ تمھاری دل بستگی کو بنظر تحسین نہیں دیکھوں گی اور تمھیں تلخ ترش سنانے سے باز نہیں رہوں گی؟ میں اس قسم کے معاملات میں اپنے ماسوا کسی دوسرے کو سان پر چڑھانے کی قائل نہیں ہوں۔ میں دوسروں کے ان جذبات کو سمجھتی ہوں اور چونکہ مجھے ابھی اس قسم کا کوئی حقیقی تجربہ نہیں ہوا، اس لیے اگر میں انھیں پسندیدگی کی سند نہیں دے سکتی، میں انھیں ملامت کے سزاوار بھی نہیں ٹھہرا سکتی۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تم جیسی شاعر مزاج اور محبت شناس دوشیزہ کے دل میں کسی نوجوان کی خوبصورت اور پرکشش آنکھیں جو جذبات ابھارتی ہیں، ان کی نسبت وہ محبت جو ہم عیسائی ہونے کے ناتے عام انسانوں، اپنے ہمسایوں اور اپنے دشمنوں سے کرتے ہیں، کہیں ارفع، قابل قدر، شیریں اور نفیس ہے۔

کاؤنٹ بزوخوف کی وفات حسرت آیات کی خبر ہمیں تمھارا خط موصول ہونے سے پہلے ہی مل چکی تھی اور میرے ابا جان کی طبیعت اس سے سخت مکدر ہوئی تھی۔ وہ فرماتے ہیں کہ کاؤنٹ بزوخوف اور وہ ایک عظیم عہد کے آخری نمائندے تھے، کاؤنٹ چل بسے اور اب ان کی باری ہے۔ تاہم ان کی یہ کوشش ہوگی کہ وہ اپنی باری کو حتے الامکان زیادہ سے زیادہ عرصے تک ٹالتے رہیں۔ خداوند سے دعا ہے کہ وہ ہمیں اس ہولناک سانحے سے محفوظ فرمائے۔

جہاں تک پیئر کا تعلق ہے، میں تمھاری رائے سے اتفاق نہیں کر سکتی۔ میں انھیں بچپن سے ہی جانتی ہوں۔ مجھے ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ وہ غیر معمولی طور پر نیک دل انسان ہیں اور یہ وہ خوبی ہے جو انسانوں میں مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ جہاں تک ان کے ترکے اور پرنس واسیلی کے کردار کا تعلق ہے، یہ بات دونوں کے لیے الم ناک ہے۔ آہ، میری پیاری سہیلی، ہمارے پاک نجات دہندہ نے بالکل صحیح فرمایا ہے کہ اونٹ سوئی کے ناکے میں سے با آسانی گزر سکتا ہے لیکن دولت مند شخص کے لیے جنت میں داخل ہونا مشکل ہے۔ مجھے پرنس واسیلی پر ترس آ رہا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ مجھے پیئر کی حالت قابل رحم نظر آتی ہے کہ ابھی بے چارے نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا ہی تھا کہ اتنی بھاری دولت کے بوجھ تلے دب گیا! کیسی کیسی ترغیبات اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جائیں گی! اگر مجھ سے کوئی پوچھے کہ میری اس دھرتی پر سب سے بڑی خواہش کیا ہے، میرا جواب ہوگا کہ کاش میں غریب ترین بھکاری سے بھی غریب تر ہو جاؤں!

میری پیاری سہیلی، میں تمھارا ہزار بار شکریہ ادا کرتی ہوں کہ تم نے مجھے وہ کتاب بھیجی جو ماسکو میں اتنی

قبولیت عامہ حاصل کر چکی ہے کہ ہر شخص اس کا شیفتہ ہو چکا ہے۔ چونکہ تم نے خود ہی مجھے بتا دیا ہے کہ اس میں اگرچہ بعض بہت اچھی باتیں ہیں لیکن اس میں بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ وہ کمزور ذہنوں کی دسترس میں نہیں آسکتیں۔ میری ناقص رائے میں ایک ایسی کتاب پر، جو نا قابل فہم ہو اور چنانچہ اس سے حاصل بھی کچھ نہ کیا جا سکتا ہو، وقت ضائع کرنا فضول ہے۔ میں یہ بات کبھی سمجھ نہیں سکی کہ آخر بعض لوگوں کو سرّیت کی کتابیں پڑھنے کا اتنا جنون کیوں ہوتا ہے حالانکہ یہ کتابیں ان کے دماغوں میں محض شکوک وشبہات کے بیج بوتی، ان کے راہوار تخیل کو بھڑکاتی، ان میں مبالغہ آرائی کے رجحان کو ہوا دیتی ہیں اور اس طرح انھیں پراگندہ خیالی کا شکار بناتی ہیں۔ یہ سارے شاخسانے مسیحی دین کی سادگی کی نفی کرتے ہیں۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ ہم محض اناجیل اور مکتوبات کا مطالعہ کرتے رہیں۔ ان میں جو اسرار و رموز پوشیدہ ہیں، ہمیں انھیں کھنگالنے کی سعی نہیں کرنا چاہیے۔ آخر ہم اور ہماری حیثیت ہے ہی کیا؟ یہی نا کہ ہم بدبخت گنہگار ہیں۔ پھر جب تک ہم اس فانی پوست میں، جس نے ہمارے اور لایزال (خدا) کے مابین غیر متداخل نقاب حائل کر رکھا ہے، ملبوس ہیں، ہم یہ کیسے توقع کر سکتے ہیں کہ ہمیں پروردگار عالم کے گمبھیر اور مقدس رموز کا محرم بنا لیا جائے گا؟ ہمارے لیے احسن تربات یہ ہے کہ اس دنیائے دوں میں ہمارے پاک نجات دہندہ نے ہماری رہنمائی کے لیے جو رفیع و برتر اصول چھوڑے ہیں، ہم اپنے آپ کو ان کے مطالعے تک محدود کر لیں، ان پر عمل کریں اور اپنے آپ کو ان کے مطابق ڈھال لیں۔ آئیں، ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہم اپنے ضعیف و ناتواں انسانی اذہان کی باگیں جتنی کم ڈھیلی چھوڑیں گے، اتنی ہی زیادہ ہم اپنے خداوند کی رضا حاصل کر سکیں گے، جو اس تمام علم کو، جس کا منبع اس کی ذات نہیں، مسترد کر دیتا ہے۔ اس نے اپنی رحمت کے پیش نظر جس علم کو ہماری نگاہوں سے پوشیدہ رکھا ہے، اس کی تہہ تک پہنچنے کے لیے ہم جتنے کم ہاتھ پاؤں ماریں گے، اتنی ہی عجلت سے وہ اسے اپنی الوہی روح کی وساطت سے ہم پر آشکار کر دے گا۔

ابا جان نے مجھ سے کسی امیدوار کا ذکر نہیں کیا، انھوں نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا ہے کہ انھیں ایک خط موصول ہوا ہے اور انھیں توقع ہے کہ پرنس واسیلی عنقریب ملنے آئیں گے۔ جہاں تک میرے متعلق شادی کے اس منصوبے کا تعلق ہے، تو میری عزیز اور گراں قدر سہیلی، میں صرف اتنا ہی عرض کر سکتی ہوں کہ میری رائے میں شادی حکم خداوندی ہے اور ہم سب کو اس حکم کی لازماً پابندی کرنا چاہیے۔ اگر قادر مطلق نے کبھی مجھ پر بیوی اور ماں کی ذمے داریوں کا بوجھ ڈالا، اور ان فرائض کی انجام دہی کا کام خواہ کتنا ہی کٹھن اور دشوار کیوں نہ ہو، میری حتے المقدور یہی کوشش ہوگی کہ میں انھیں احسن اور ایماندارانہ انداز سے نبھاؤں اور جس شخص کو وہ میرا شوہر بنائے گا، میں کبھی اس کے بارے میں اپنے جذبات کی نوعیت کی چھان پھٹک کر کے اپنے آپ کو پریشانیوں اور تفکرات میں مبتلا نہیں کروں گی۔

مجھے اپنے بھائی جان کا محبت نامہ موصول ہوا ہے۔ اس میں انھوں نے یہ اطلاع ارسال کی ہے کہ وہ اور ان

کی شریک حیات بالڈ ہلز تشریف لارہے ہیں۔ ان کی آمد سے جو خوشی ہوگی، وہ بالکل عارضی نوعیت کی ہوگی
کیونکہ وہ اس ناپسندیدہ جنگ میں، جس نے، خدا جانے کیوں اور کیسے، ہم سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا
ہے، حصہ لینے کے لیے دوبارہ واپس چلے جائیں گے۔ جنگ کی باتیں صرف وہیں نہیں، جہاں تم ہو—
دنیاوی امور اور اعلیٰ طبقے کا مرکز— ہوتیں بلکہ یہاں چراگاہوں اور قدرتی طور پر پرسکون فضاؤں میں محبت
مشقت— شہروں کے باسی دیہاتی زندگی کا یہی نقشہ کھینچتے ہیں — کے مابین بھی جنگ کی افواہوں کے
چرچے ہوتے ہیں اور وہ نہایت کرب ناک انداز سے اپنے وجود کا احساس دلاتی ہیں۔ ابا جان کی گفتگو کا
موضوع بھی فوج کشی اور جوابی فوج کشی ہی ہوتا ہے۔ ان کی باتیں میرے فہم و ادراک میں نہیں آتیں۔
پرسوں کا واقعہ ہے۔ میں اپنی عادت کے مطابق گاؤں میں گھوم رہی تھی کہ مجھے انتہائی دل خراش منظر نظر آیا۔
یہ رنگروٹوں کا قافلہ تھا۔ انھیں ہمارے لوگوں میں سے لازمی بھرتی کے قانون کے تحت بھرتی کیا گیا تھا اور
اب انھیں فوج میں شمولیت کے لیے روانہ کیا جارہا تھا۔ جو لوگ رخصت ہو رہے تھے، ان کی ماؤں، بیویوں
اور بچوں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ ان لوگوں کا رونا دھونا کلیجے میں تیر بن کر اتر رہا تھا! کچھ یوں محسوس
ہوتا تھا کہ انسان اپنے پاک نجات دہندہ کے فرامین فراموش کر چکے ہیں۔ انھوں نے تبلیغ کی تھی کہ آدمی آدمی
سے محبت کرے اور ایک دوسرے کی زیادتیاں معاف کردے لیکن آج کے انسان کا سب سے بڑا وصف یہ
تصور کیا جاتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے فن پر کتنا عبور حاصل ہے۔
پیاری اور اچھی سہیلی، خدا حافظ۔ میری دعا ہے کہ ہمارے پاک نجات دہندہ اور ان کی پاک ترین ماں ہمیں
اپنے مقدس اور جلیل القدر حفظ و اماں میں رکھیں!

ماریا

''پرنسس، آپ خط لکھ رہی ہیں؟ میں تو فارغ ہو چکی ہوں۔ میں نے اپنی بے چاری ماں کے نام عریضہ تحریر کیا
ہے۔'' متبسم مادموزیل بوغین نے اپنے شیریں اور حلاوت آمیز لہجے میں کہا۔ وہ بہت تیز تیز گفتگو کرتی تھی اور پرنسس
جس گھٹے گھٹے، افسردہ اور بوجھل ماحول میں سانس لے رہی تھی، اس میں وہ بالکل نئی قسم کا ذہنی رویہ— چنچل،
شوخ، زندہ دل اور شاد و مطمئن — لے کر آئی تھی۔
''پرنسس، میں یہ بتانا اپنا فرض سمجھتی ہوں،'' اس نے اپنی آواز دھیمی کرتے ہوئے کہا، ''کہ پرنس کی میخائیل
ایوانچ سے تکرار— تکرار' اس نے لفظ 'تکرار' پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے اسے دہرایا اور (فرانسیسیوں کی طرح)
حرف 'ر' کو یوں کھنکتے ہوئے لہجے سے ادا کیا جیسے وہ اپنی ہی آواز سن کر خوشی سے پھولی نہ سما رہی ہو۔ ''ہو گئی ہے۔
ان کا مزاج بے حد برہم ہو رہا ہے اور وہ بہت کبیدہ خاطر نظر آرہے ہیں۔ ذرا ہوشیار رہنا... تمھیں معلوم ہے...''
''آہ، میری پیاری سہیلی،'' پرنسس ماریا نے جواب دیا۔ ''میں آپ سے پہلے بھی یہ درخواست کر چکی ہوں

کہ آپ مجھے کبھی پیشگی نہ بتایا کریں کہ ابا جان کے مزاج کیسے ہیں۔ میں نے ان کا کبھی محاکمہ نہیں کیا اور نہ میں دوسروں کو یہ اجازت دے سکتی ہوں کہ وہ ان کا محاکمہ کریں۔''

پرنس نے اپنی گھڑی پر اچٹتی سی نظر ڈالی۔ اسے احساس ہوا کہ کلاوی کارڈ پر مشق کرنے کا جو وقت مقرر ہے، اس میں پہلے ہی پانچ منٹ کی تاخیر ہو چکی ہے۔ وہ فوراً ہی نشست گاہ کی طرف لپکی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ روزمرہ کے نظام الاوقات کے مطابق پرنس دن کے بارہ اور دو بجے کے دوران میں قیلولہ کرتا تھا اور یہی وقت پرنس کے لیے کلاوی کارڈ پر موسیقی کی مشق کے لیے مقرر تھا۔

23

سفید بالوں والا وردی پوش خدمت گار استقبالیہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ اگرچہ اس پر غنودگی طاری تھی، پھر بھی اسے پرنس کے، جو اپنے بے حد کشادہ سٹڈی روم میں قیلولہ کر رہا تھا، خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ مکان کے دوسرے حصے سے، بند دروازوں میں سے، موسیقار ڈوسک کے ترتیب شدہ راگ، سوناٹا، کے مشکل قطعات ــــ جنھیں بیس بیس مرتبہ دہرایا جا رہا تھا ــــ بجائے جانے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

دریں اثنا پورچ میں ایک کوچ[51] اور ایک برتسکا[52] آ کر رکیں۔ پرنس آندرے کوچ سے نیچے اترا، اس نے اپنی کوچک اہلیہ کا ہاتھ پکڑا، اسے نیچے اترنے میں مدد دی اور اسے مکان میں پہلے جانے دیا۔ بوڑھے تخون (Tikhon) نے، جس کے سر پر سفید بالوں کی وگ سجی تھی، استقبالیہ کمرے کے دروازے میں سے اپنی گردن باہر نکالی، اس نے انھیں دبے لفظوں بتایا کہ پرنس آرام فرما رہے ہیں اور شتابی سے دروازہ بند کر دیا۔ تخون جانتا تھا کہ خواہ بیٹا آئے یا کوئی دوسرا کتنا ہی غیر معمولی واقعہ پیش آ جائے، روزمرہ کے معمول میں کسی قسم کا خلل برداشت نہیں کیا جائے گا۔ تخون کی طرح بظاہر پرنس آندرے بھی اس سے آگاہ تھا۔ اس نے اپنی گھڑی پر نظر دوڑائی جیسے وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہو کہ اس کی عدم موجودگی کے دوران میں اس کے باپ کی عادات میں کوئی تبدیلی تو نہیں آ گئی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں، وہ اپنی اہلیہ کی جانب متوجہ ہوا اور بولا:

''وہ بیس منٹ میں بیدار ہو جائیں گے۔ آؤ، پرنس ماریا کے پاس چلتے ہیں۔''

اس عرصے کے دوران میں کوچک پرنس قدرے فربہ ہو گئی تھی لیکن جب وہ بات کرتی تھی، اس کی آنکھیں اور روئیں دار چھوٹا بالائی ہونٹ، جو تبسم کرنے سے اوپر اٹھ جاتا تھا، اب بھی ہمیشہ کی طرح ہشاش بشاش اور دلفریب نظر آتے تھے۔

''ارے، یہ تو پورا محل ہے،'' اس نے اپنے گردوپیش نگاہیں دوڑاتے ہوئے فرانسیسی میں اپنے خاوند سے کہا۔ اس کے چہرے پر بالکل اس قسم کے تاثرات نمایاں ہو رہے تھے جس قسم کے ان لوگوں کے چہروں پر ظاہر ہوتے ہیں جو بال کے انعقاد پر اپنے میزبان کو ہدیۂ تحسین پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ ''چلیں، آئیں، ذرا تیز قدم اٹھائیں،'

تیز،'' اس نے پیچھے مڑ کر اپنے خاوند، تیخون اور ایک وردی پوش ملازم کی طرف، جو ان کے ساتھ ہو لیا تھا، دیکھتے اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''موسیقی کی مشق ماریا کر رہی ہے؟ ہم دبے پاؤں چلیں گے اور اسے بے خبری میں جا لیں گے۔''

پرنس آندرے اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کا انداز شائستہ تھا لیکن اس کے چہرے پر اداسی ٹپک رہی تھی۔

''تیخون، معلوم ہوتا ہے کہ تم بڑھاپے کی زد میں آ گئے ہو،'' اس نے چلتے چلتے بوڑھے ملازم سے، جو اس کا ہاتھ چوم رہا تھا، کہا۔

پیشتر اس کے کہ وہ اس کمرے تک، جس میں سے کلاوی کارڈ کے بجنے کی آوازیں آ رہی تھیں، پہنچتے، ایک بغلی دروازے میں سے خوش شکل فرانسیسی خاتون، مادام بوغین، جس کے سر کے بال سنہری تھے، باہر آ گئی۔ بظاہر وہ خوشی سے نہال ہو رہی تھی۔

''اخاہ، پرنس کی تو خوشی سے باچھیں کھل جائیں گی!'' اس نے کہا۔ ''مجھے انھیں اطلاع کر دینا چاہیے۔''

''نہیں، بالکل نہیں، نوازش ہو گی — آپ مادموزیل بوغین ہیں؟'' کوچک پرنس نے اس کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ''اپنی نند کی دوستی کے حوالے سے میں پہلے ہی آپ کو جانتی ہوں۔ اسے آج ہماری آمد کی توقع نہیں!''

وہ نشست گاہ کے دروازے کی جانب، جہاں سے موسیقی کے ایک ہی قطعے کے بار بار دہرائے جانے کی آواز آ رہی تھی، چل پڑیں۔ پرنس آندرے وہیں رک گیا۔ اس کی بھویں تن گئیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں کوئی ناگوار صورت نہ پیدا ہو جائے۔

کوچک پرنس اندر چلی گئی۔ موسیقی قطعہ مکمل ہونے سے پہلے ہی بیچ میں رک گئی۔ پہلے چیخ کی آواز سنائی دی۔ اس کے بعد پرنس ماریا کے بھاری قدموں اور بوس و کنار کی آوازیں آنے لگیں۔ جب پرنس آندرے اندر آیا، دونوں پرنسسیں، جن کی واحد ملاقات اس کی شادی کے موقع پر ہوئی تھی، ایک دوسرے کے بازوؤں میں لپٹی ہوئی تھیں اور اضطراری طور پر لیکن بڑی گرم جوشی سے ایک دوسرے کی بلائیں لے رہی تھیں۔ مادموزیل بوغین سینے پر ہاتھ رکھے ان کے قریب کھڑی تھی اور مسرور ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ وہ خوشی کے عالم میں بلند آہنگ قہقہے لگائے یا رونا شروع کر دے۔ پرنس آندرے نے کندھے اچکا دیے اور کچھ اس طرح ناک بھوں چڑھانے لگا جس طرح موسیقی کا دلدادہ شخص غلط سر سننے پر چڑھاتا ہے۔ دونوں خواتین نے ایک دوسرے کو چھوڑ دیا اور ایک بار پھر، جیسے انھیں اندیشہ ہو کہ کہیں ان سے کوئی کوتاہی نہ ہو گئی ہو، ایک دوسرے کے ہاتھ چومنے لگیں، الگ ہوئیں اور دوبارہ ایک دوسرے کے رخساروں پر بوسوں کی بارش کرنے لگیں اور یہ دیکھ کر تو پرنس آندرے بالکل سٹپٹا گیا کہ دونوں رونے لگ گئی ہیں اور ان کی چوما چاٹی از سرِ نو شروع ہو گئی ہے۔ مادموزیل بوغین کی آنکھیں اشک بار ہو چلی تھیں۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ پرنس آندرے بے حد مضطرب اور بے چین ہو رہا ہے لیکن دونوں خواتین کو گلے مل کر رونا بالکل فطری معلوم ہو رہا تھا اور یہ بات تو وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اس موقع پر انھیں اس سے مختلف رویہ اپنانا چاہیے تھا۔

"...Ah, ma chere ... Ah, Marie"*، دونوں بیک وقت بولنے اور پھر ہنسنے لگیں۔
"کل رات میں نے خواب دیکھا تھا۔"
"تو تمھیں ہمارے آنے کی امید تھی۔ ارے، ماری، تم تو بالکل سوکھ ہوگئی ہو۔"
"اور تم، تم اتنا پھیل گئی ہو!"
"میں نے پرنس کو فوراً پہچان لیا تھا۔" مادموزیل بوخین نے بیچ میں اپنی ٹانک دی۔
"اور میں نے تو سوچا بھی نہیں تھا!..." پرنس ماریا نے با آواز بلند کہا۔ "ارے، آندرے، میں نے آپ کو تو دیکھا ہی نہیں۔"

پرنس آندرے اور اس کی ہمشیرہ نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے اور ایک دوسرے کو بوسہ دیا۔ پرنس نے اپنی ہمشیرہ سے کہا۔ "تمھاری عادتیں بالکل تبدیل نہیں ہوئیں۔ اب بھی بچوں کی طرح روتی ہو۔" پرنس ماریا کی گرم جوش، محبت بھری اور حلیم نگاہیں اپنے بھائی کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ اس لمحے اس کی غزالی، تابناک اور اشکبار آنکھیں بے حد خوبصورت تھیں۔

کوچک پرنس لگاتار بولے جارہی تھی۔ اس کا روئیں دار کوتاہ بالائی ہونٹ مسلسل اوپر نیچے رقص کر رہا تھا۔ جب یہ ملائمت سے زیریں گلابی ہونٹ کو چھونے کے بعد تیزی سے اوپر اٹھتا، اس کی ہنستی مسکراتی آنکھیں اور دانت موتیوں کی طرح جگمگا اٹھتے۔ راستے میں انھیں سپاسکی پہاڑی پر چھوٹا موٹا حادثہ پیش آیا تھا لیکن جو اس کی موجودہ حالت کے پیش نظر سنگین صورت بھی اختیار کرسکتا تھا۔ اب وہ اس کی تفصیلات بیان کر رہی تھی۔ پھر دم لیے بغیر اس نے انکشاف کیا کہ وہ اپنے تمام ڈریس پیٹرزبرگ بھول آئی ہے اور اب خدا جانے وہ یہاں کیا پہنا کرے گی، آندرے بالکل بدل گیا ہے، کٹی اودنت سوا نے کسی بوڑھے کھوسٹ سے شادی کرلی ہے اور یہ کہ اس کی نظروں میں پرنس ماریا کے لیے موزوں بر، جیتا جاگتا بر، ہے۔ لیکن اس کے متعلق وہ بعد میں باتیں کریں گی۔

پرنس ماریا مہر بلب بیٹھی مسلسل اپنے بھائی کو دیکھے جارہی تھی۔ اس کی خوبصورت آنکھیں محبت اور اداسی سے لبریز تھیں اور اس کے نہاں خانۂ دماغ میں اپنے ہی خیالات کی رو بہہ رہی تھی جس کا اس کی بھاوج کی گفتگو سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اس کی بھاوج جب پیٹرزبرگ کی تازہ ترین ضیافت کا ذکر کر رہی تھی، وہ بیچ میں بول پڑی اور اپنے بھائی سے مخاطب ہو کر کہنے لگی:

"آندرے، آپ واقعی جنگ پر جارہے ہیں؟"
لسا کی بھی آہ نکل گئی۔
"سچ پوچھو تو کل،" اس نے جواب دیا۔
"یہ مجھے یہاں چھوڑے جارہے ہیں۔ خدا جانے کیوں؟ حالانکہ انھیں یہیں ترقی..."

* مائی ڈیر، ماری۔

پرنسس ماریا نے اس کی بات ختم ہونے کا انتظار نہ کیا بلکہ اپنے خیالات کی رو کا تعاقب کرتے ہوئے وہ اپنی بھاوج کی طرف متوجہ ہوئی، اس کے سراپے پر پیار بھری نظر ڈالی اور بولی:

''یقینی بات ہے؟''

کوچک پرنس کا چہرہ متغیر ہو گیا۔

''ہاں، بالکل یقینی!'' اس نے جواب دیا اور آہ بھری۔ ''یہ سب کچھ کتنا بھیانک ہے...''

اس کا ہونٹ لٹک گیا۔ اس نے اپنا چہرہ اپنی نند کے قریب کیا اور خلاف توقع اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

''اسے آرام کی ضرورت ہے،'' پرنس آندرے نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''کیوں لسا؟ میں نے ٹھیک کہا یا نہیں؟ اسے اپنے کمرے میں لے جاؤ۔ اتنے میں میں ابا جان سے مل لیتا ہوں۔ کیسے ہیں وہ؟۔ بالکل ویسے ہی؟''

''جی ہاں، بالکل ویسے ہی۔ معلوم نہیں کہ آپ کو کیسے دکھائی دیں،'' پرنسس نے خوش ہو کر جواب دیا۔

''وہی لگا بندھا دستور العمل، وہی خیابانوں کی سیر؟'' پرنس نے پوچھا اور اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس کی یہ مسکراہٹ غمازی کر رہی تھی کہ اپنے باپ سے محبت اور اس کا احترام کرنے کے باوجود وہ اس کی کمزوریوں سے ناآشنا نہیں ہے۔

''وہی دستور العمل، خراد۔ نیز ریاضی اور میرے جیومیٹری کے اسباق،'' پرنسس ماریا نے مسرت سے جواب دیا جیسے اس کے جیومیٹری کے اسباق اس کی زندگی کی عظیم ترین راحتوں میں سے ہوں۔

جب بیس منٹ گزر گئے اور معمر پرنس کے بیدار ہونے کا وقت آ گیا، تیخون نوجوان پرنس کو بلانے آ گیا تا کہ وہ اپنے باپ سے ملاقات کر سکے۔ بوڑھے باپ نے اپنے بیٹے کی آمد کے احترام میں لگے بندھے معمول میں یہ تبدیلی کی کہ اس نے حکم دیا کہ ''میں ڈنر کے لیے لباس تبدیل کر رہا ہوں۔ اس دوران میں وہ مجھ سے ملنے میرے اپارٹمنٹ میں آ سکتا ہے۔'' پرنس پرانی وضع کا لباس زیب تن کرتا تھا۔ وہ خفتان پہنتا اور بالوں پر پاؤڈر چھڑکتا تھا۔ جب پرنس آندرے (اب اس کے چہرے پر نہ اس قسم کی جھلاہٹ تھی اور نہ اس کا رویہ وہ تھا جو وہ ڈرائنگ روموں میں اختیار کر لیا کرتا تھا بلکہ اب وہاں وہی شگفتگی اور خوش طبعی جھلک رہی تھی جس کا مظاہرہ اس نے پیئر سے اپنی ملاقات کے دوران میں کیا تھا) اپنے باپ کے کمرے میں پہنچا، مرد بزرگ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس کرسی پر بیٹھا تھا (اس کرسی پر قیمتی اور نفیس مراکشی چمڑا چڑھا ہوا تھا) اور تیخون اس کے بال سنوار رہا تھا۔

''اخاہ، سورما بہادر! تو تم بوناپارت سے دو دو ہاتھ کرنا چاہتے ہو؟'' اس نے اپنے سر کو، جس پر پاؤڈر چھڑکا ہوا تھا، حتی المقدور گھماتے ہوئے پوچھا۔ (اس کے گندھے ہوئے بالوں کا سرا تیخون کے ہاتھوں میں تھا اور یوں وہ اپنی مرضی سے سر نہیں گھما سکتا تھا)۔ ''اس سے ذرا دھیان سے نپٹنا، ورنہ وہ دن دور نہیں جب وہ ہمیں بھی اپنے

محکوموں کی فہرست میں شامل کرلے گا۔ تمھاری طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے اپنا گال آگے بڑھا دیا۔

قیلولے کے بعد بوڑھا ترنگ میں آچکا تھا۔ (اس کا قول تھا کہ ڈنر کے بعد قیلولہ نقرہ ہے لیکن اس سے پہلے کا نرا سونا ہے۔) اس نے گھنے ابروؤں کے نیچے سے اپنے بیٹے کو پر مسرت تیکھی نگاہوں سے دیکھا۔ پرنس آندرے نے اپنے باپ کو اس مقام پر، جس کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، بوسہ دیا۔ اس نے گفتگو کے لیے اپنے باپ کے محبوب موضوع — عہد موجود کے لشکریوں، بالخصوص بوناپارٹ کا مذاق اڑانا — کے متعلق لب کشائی کرنے سے احتراز کیا۔

''جی ابا جان، میں آپ کی خدمت میں حاضری دینے آیا ہوں۔ میری اہلیہ بھی میرے ساتھ آئی ہے۔ وہ امید سے ہے،'' پرنس آندرے نے اپنے باپ کے چہرے کی ایک ایک حرکت کا پر شوق اور مؤدبانہ نگاہوں سے تعاقب کرتے ہوئے کہا۔ ''نصیب دشمناں، آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

''میرے بیٹے، طبیعت صرف احمقوں یا اوباشوں کی خراب ہوتی ہے اور مجھے تم جانتے ہی ہو کہ میں کس کینڈے کا آدمی ہوں۔ صبح سے شام تک محنت مشقت کرتا ہوں، اکل و شرب میں اعتدال برتتا ہوں۔ چنانچہ، میری طبیعت بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''خدا کا شکر ہے،'' اس کے بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خدا کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب مجھے بتاؤ،'' اس نے اپنے دل پسند موضوع کی طرف گریز کرتے ہوئے کہا۔ ''جرمنوں نے اس نئی سائنس کے ذریعے، جسے تم سٹریٹجی کہتے ہو، تمھیں نپولین کے خلاف نبرد آزما ہونے کی کیسی تربیت دی ہے؟''

پرنس آندرے مسکرایا۔

''ابا جان، مجھے اپنے حواس مجتمع کرنے کا موقع عنایت فرمائیں،'' اس نے کچھ اس طرح مسکرا کر یہ الفاظ کہے جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کے باپ میں جو نظر انداز کیے جانے کے قابل ادنیٰ کمزوریاں ہیں، ان کے باوجود وہ اس سے محبت اور اس کا احترام کرتا رہے گا۔ ''ابھی مجھے آرام کرنے کا موقع نہیں ملا۔''

''فضول، واہیات!'' بوڑھے آدمی نے باآواز بلند کہا۔ اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ اس کے بال خوب کس کر گوندھ دیے گئے ہیں یا نہیں، انھیں زور سے جھٹکا اور پھر اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بولا: ''تمھاری بیوی کے لیے ہر چیز سجا بنا دی گئی ہے۔ ماریا اس کی ضروریات کا خیال رکھے گی اور اسے سب کچھ دکھا دے گی۔ وہ طوطوں کی طرح ٹیں ٹیں بھی خوب کیا کریں گی۔ خیر، اس کا خیال رکھنا عورتوں کا کام ہے۔ میں بہت خوش ہوں کہ وہ یہاں آگئی ہے۔ آؤ، بیٹھو اور باتیں کریں۔ مک ہیل زین (Michelsen)[53] کی فوج کیا کر رہی ہے، اس کی سمجھ مجھے آرہی ہے اور طالسطائی کی فوج کی بھی — دونوں اکٹھے ہی میدان جنگ میں اتریں گے — لیکن یہ جنوبی فوج کیا کر رہی ہے؟ پرشیا غیر جانبدار ہے — اس کا مجھے معلوم ہے۔ آسٹریا کے کیا عزائم ہیں؟'' اس

نے پوچھا۔ وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ تیخون اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا اور اسے مختلف ملبوسات تھما رہا تھا۔ ''سویڈن کے متعلق کیا خیال ہے؟ کیا وہ دریائے پومرانیا کے پار آ جائے گا؟''

پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ اس کے باپ نے جو سوالات اٹھائے ہیں، وہ ان کے فوری جوابات پر مصر ہے، چنانچہ وہ مجوزہ مہم کی حربی تدابیر پر روشنی ڈالنے لگا۔ شروع میں وہ قدرے متامل تھا، پھر جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا، اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا گیا اور جیسا کہ اس کی عادت تھی، وہ غیر شعوری طور پر فرانسیسی میں اپنا مافی الضمیر ادا کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ کیسے نوے ہزار سپاہ پرشیا کو دھمکانے کے لیے تیار کھڑی ہے تاکہ اسے غیر جانبداری ترک کرنے پر مجبور کیا جائے اور جنگ میں گھسیٹ لیا جائے، کیسے اس سپاہ کا ایک حصہ سٹراس لنڈ کے مقام پر سویڈن کی فوجوں سے جا ملے گا، کیسے دو لاکھ بیس ہزار آسٹروی لشکری ایک لاکھ بیس ہزار روسی فوجیوں کے دوش بدوش اطالیہ میں اور دریائے رائن کے کنارے برسرپیکار ہوں گے، کیسے پچاس ہزار روسی اور اتنے ہی انگریز نیپلز میں داخل ہوں گے اور یوں پانچ لاکھ افراد پر مشتمل یہ سپاہ کیسے مختلف مقامات پر فرانسیسیوں پر حملہ آور ہو گی۔ معمر پرنس نے اس منصوبے میں ذرا بھی دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔ وہ بس کمرے میں چکر کاٹنے اور اپنا لباس تبدیل کرنے میں مشغول رہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے کان بند کر رکھے ہیں تاہم اس نے غیر متوقع طور پر تین مرتبہ آندرے کی بات میں مداخلت کی اور ایک بار جب اس نے اسے روکا تو یہ کہا:

''سفید، سفید!''

اس کا مطلب یہ تھا کہ تیخون نے اسے اس کی مطلوبہ واسکٹ نہیں دی تھی۔ دوسری مرتبہ جب اس نے اسے ٹوکا تو پوچھا:

''زچگی عنقریب ہو گی؟'' اور ملامت کن انداز سے اپنا سر جھٹکتے ہوئے بولا: ''یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر، تم اپنی بات جاری رکھو، جاری رکھو۔''

تیسری مداخلت تب ہوئی جب آندرے اپنا بیان ختم کیا چاہتا تھا۔ بوڑھا گنگنانے لگا۔

"Malbrouk s,en va-t-en guerre. Dieu sait quand reviendra."*

اس کا بیٹا مسکرا دیا۔

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ میں اس منصوبے کے حق میں ہوں،'' اس نے کہا۔ ''میں تو محض آپ کو یہ بتا رہا تھا کہ یہ ہے کیا۔ نپولین بھی اس وقت تک کوئی منصوبہ وضع کر چکا ہو گا اور وہ اس سے زیادہ خراب نہیں ہو گا۔''

''خیر، تم نے مجھے کوئی نئی بات نہیں بتائی،'' بوڑھے نے کہا۔ اور وہ بے دھیانی میں لپک جھپک پھر زیر لب گانے لگا:

"Dieu sait quand reviendra"

* مال بروک جنگ پر جا رہا ہے۔ خدا جانے یہ کہاں ہو گی۔ (غالباً یہ فرانس کا کوئی لوک گیت ہے۔)

اور بولا: ''اچھا، اب ڈائننگ روم میں پہنچ جاؤ۔''

24

شیو کرنے اور پاؤڈر لگانے کے بعد پرنس مقررہ وقت پر ڈائننگ روم میں داخل ہوا۔ وہاں پرنس ماریا، اس کی بہو اور مادموزیل بوغین اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ پرنس کا میر تعمیرات بھی وہیں موجود تھا۔ اس کے آجر کے دل میں پتا نہیں کیا موج آئی کہ اسے بھی دسترخوان پر بلایا جانے لگا حالانکہ اپنے بے حیثیت مرتبے کے پیش نظر اسے یہ توقع نہیں تھی کہ اس کی اس طرح عزت افزائی کی جائے گی۔ پرنس معاشرتی حفظ مراتب پر سختی سے عمل کرنے کا قائل تھا۔ چنانچہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ صوبائی اہلکاروں کو بھی شاذ و نادر ہی اپنے دسترخوان پر مدعو کرتا۔ لیکن ایکا ایکی یہ جتانے کے لیے کہ اس کی نظروں میں تمام انسان برابر ہیں، اس نے میخائیل ایوانووچ (وہ ہمیشہ کمرے کے ایک کونے میں جا کر دھاری دار رومال میں ناک سڑکا کرتا تھا) کو اپنے دسترخوان پر بٹھانا شروع کر دیا۔ اور وہ ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی بیٹی کو سمجھا چکا تھا کہ میخائیل ایوانووچ ''مجھ سے یا تم سے رتی برابر بھی بدتر نہیں ہے۔'' پرنس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ وہ دسترخوان پر کسی دوسرے شخص کی نسبت کم گفتار میر تعمیرات کو زیادہ مخاطب کیا کرتا تھا۔

ڈائننگ روم میں، جس کی چھت بھی مکان کے دوسرے کمروں کی طرح بے انتہا بلند تھی، گھر کے افراد اور وردی پوش ملازمین، جو ہر کرسی کے پیچھے کھڑے تھے، پرنس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے، بازو پر نیپکن ٹکائے بٹلر میز کی آراستگی کا جائزہ لے رہا اور اشاروں ہی اشاروں میں وردی پوش ملازمین کو ہدایات دے رہا تھا۔ وہ بے چینی کے عالم میں کبھی دیواری کلاک کو اور کبھی اس دروازے کو، جس میں سے پرنس کے اندر آنے کی توقع تھی، دیکھنے لگتا۔ پرنس آندرے ایک لمبے چوڑے سنہری فریم پر نظریں جمائے کھڑا تھا۔ یہ فریم اس کے لیے نیا تھا۔ اس میں پرنس بلکونسکی کا شجرۂ نسب پیوست تھا۔ اس کے بالمقابل دوسری دیوار پر اتنا ہی بڑا ایک اور فریم لٹک رہا تھا۔ فریم میں ایک والئی ریاست کی بھدی تصویر (معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی گھریلو فنکار کی کاوش کا نتیجہ تھی) آویزاں تھی۔ والی کے سر پر تاج رکھا ہوا تھا اور دعویٰ کے مطابق وہ رورک[54] کے اخلاف میں سے تھا اور بلکونسکی خاندان کا مورث اعلیٰ تھا۔ پرنس آندرے، شجرۂ نسب پر غور کرتا اور اپنا سر جھٹکتا رہا۔ پھر وہ اس شخص کی طرح، جو کسی ایسی تصویر کو دیکھ کر جو اس حد تک اصل سے مشابہ ہو کہ پر تفنن معلوم ہو، ہنس پڑتا ہے، ہنسنے لگا۔

''بالکل ان سے مشابہ ہے،'' اس نے پرنس ماریا سے، جو اس کے قریب آن کھڑی ہوئی تھی، کہا۔

پرنس نے بہ نگاہ حیرت اپنے بھائی کی جانب دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر وہ مسکرا کس چیز پر رہا ہے۔ اس کا باپ جو کچھ بھی کرتا تھا، وہ اس کے اندر احترام کا ایسا جذبہ موجزن کر دیتا تھا جو اسے اس پر کسی قسم کی بھی نکتہ چینی کرنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔

''مانا کہ ہم سب میں سے کوئی بھی کمزوریوں سے مبرا نہیں،'' آندرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے

کہا۔ ''لیکن اتنا بھی کیا؟ وہ اتنے ذہین وفطین شخص ہیں، پھر ان خرافات کا مطلب؟''

جس بے باکی اور دیدہ دلیری سے پرنس ماریا کے بھائی نے نکتہ چینی کی تھی، وہ اس کا کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ احتجاج کیا ہی چاہتی تھی کہ انھیں سٹڈی روم سے ان قدموں کی، جس کے وہ اتنی دیر سے منتظر تھے، چاپ سنائی دی۔ پرنس حسب معمول اپنی پھرتیلی، چاق چوبند اور البیلی چال چلتا یوں اندر داخل ہوا جیسے وہ عمداً اپنے سیمابی انداز کا گھر کے جامد اور بے لوچ معمول سے تقابل کر رہا ہو۔ جونہی اس نے پاؤں اندر رکھا، جسیم کلاک نے دو بجائے اور ڈرائنگ روم کے کلاک نے اس سے بھی اونچی آواز میں اس کا جواب دیا۔ پرنس پتھر کا بت بن کر کھڑا ہو گیا۔ گھنے اور نیچے لٹکتے ہوئے ابروؤں کے زیر سایہ اس کی تیز اور چمکیلی نگاہوں نے کمرے میں موجود تمام لوگوں کا عمیق جائزہ لیا اور وہ کوچک پرنس پر ٹھہر گئیں۔ اس موقع پر پرنس کو وہی کچھ محسوس ہوا جو زار کی آمد پر اس کے درباریوں کو ہوتا ہے۔ اسے بھی ہیبت اور احترام کے انھیں جذبات کا، جو بوڑھے نے اپنے گردوپیش کے لوگوں کے دلوں میں ابھار دیے تھے، تجربہ ہوا۔ پرنس نے اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور بے ڈھنگے انداز سے اس کی گردن کو سہلایا۔

''میں خوش ہوں کہ تم یہاں آ گئی ہو،'' اس نے کہا۔ وہ کچھ دیر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا، پھر تیزی سے مڑا اور میز کے سامنے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ ''بیٹھو، بیٹھو، میخائیل ایوانووچ، بیٹھو!''

اس نے اپنی بہو کو اپنے نزدیک ایک کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ایک وردی پوش ملازم نے لپک کر کرسی پیچھے دھکیل دی تاکہ وہ اس پر باآسانی بیٹھ سکے۔

''خوب! خوب!'' اس نے اس کی گول مٹول صورت دیکھ کر کہا، ''تم نے بہت جلد بازی سے کام لیا ہے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے!''

وہ حسب معمول خشک، سرد مہر اور ناخوشگوار انداز سے ہنسا لیکن اس کی مسکراہٹ اس کے لبوں تک ہی رہی، اس کی آنکھیں اس سے تہی رہیں۔

تمھیں سیر کرتے رہنا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ سیر کرو، زیادہ سے زیادہ۔''

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، کوچک پرنس کو یا تو وہ سنائی نہیں دیا یا پھر وہ سننا ہی نہیں چاہتی تھی۔ وہ مہر بلب بیٹھی رہی اور بظاہر بدحواس ومضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ پرنس نے اس سے اس کے باپ کی خیریت دریافت کی۔ تب وہ مسکرائی اور باتیں کرنے لگی۔ اور جب اس نے باہمی دوستوں اور واقف کاروں کے بارے میں سوالات کیے، اس کے جوش وخروش میں اور بھی اضافہ ہو گیا اور اس کی زبان قینچی کی طرح چلنے گی۔ وہ اسے مختلف لوگوں کے سلام اور پیغامات پہنچانے اور شہر کی گپ شپ سنانے لگی۔

''بے چاری کاؤنٹس اپراکسنا کا شوہر چل بسا ہے۔ اس نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجا لی ہیں،'' وہ کہہ رہی تھی۔ اس کی شگفتہ مزاجی اور بشاشت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جوں جوں اس کی چلبلاہٹ بڑھتی گئی،

توں توں پرنس کا پارہ چڑھتا گیا اور وہ درشت تر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اچانک، جیسے وہ اس کا کافی مطالعہ کر چکا ہو اور اس کے بارے میں اپنے ذہن میں واضح رائے قائم کر چکا ہو، اس نے اپنا دھیان دوسری جانب ہٹایا اور میخائیل ایوانووچ سے مخاطب ہو کر بولا:

''خیر، میخائیل ایوانووچ، ہمارے دوست بوناپارٹ کی شامت آ گئی ہے۔ پرنس آندرے'' (وہ اپنے بیٹے کا ذکر ہمیشہ بدیں الفاظ ہی کرتا تھا) مجھے ان افواج کے بارے میں بتا رہے تھے جو اس کے خلاف نبرد آزما ہونے کے لیے مجتمع کی گئی ہیں۔ ادھر تم اور میں ہمیشہ یہی کہتے رہے کہ یہ شخص دھیلے کا ہے نہ پاؤ کا۔''

میخائیل ایوانووچ یہ سمجھنے سے قطعی قاصر تھا کہ اس ''تم اور میں'' نے بوناپارٹ کے متعلق اس قسم کی گفتگو کب کی تھی۔ تاہم اسے جھٹ پٹ یہ اندازہ ہو گیا کہ اس کا آقا اسے اپنی دُھر بنا کر اپنے دل پسند موضوع کو زیرِ بحث لانا چاہتا ہے۔ اس کا دماغ چکرا گیا اور وہ ہراساں و سراسیمہ ہو کر نوجوان پرنس کی جانب دیکھنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ دیکھیں، پردۂ غیب سے کیا ظہور پذیر ہوتا ہے۔

''شاطر عظیم،'' پرنس نے میر تعمیرات کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔

اور گفتگو دوبارہ جنگ، بوناپارٹ، اس عہد کے دوسرے جرنیلوں اور مدبر سیاستدانوں کے متعلق ہونے لگی۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ پرنس کو نہ صرف اس بات کا پختہ یقین ہے کہ نہ صرف ان تمام شخصیات میں سیاسی اسرار و رموز اور عسکری امور کی اتنی بھی سوجھ بوجھ نہیں جتنی کہ ایک بچے میں ہوتی ہے، بوناپارٹ حقیر فرانسیسی بونا ہے اور اس کی دھوم محض اس لیے مچ گئی ہے کیونکہ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پاتومکن[55] اور سواروف جیسے لوگ نہیں رہے بلکہ وہ بڑے وثوق سے یہ دعویٰ بھی کر سکتا ہے کہ یورپ کو کسی نوع کی سیاسی مشکلات درپیش نہیں، نہ اسے کسی جنگ و نگ کا خطرہ لاحق ہے، لوگوں نے خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنا لیا ہے۔ پتلیوں کا ایک تماشا ہو رہا ہے، عہد موجود کے یہ (نام نہاد عظیم) لوگ اس تماشے میں حصہ لے رہے ہیں اور ظاہر یہ کر رہے ہیں کہ وہ واقعی حقیقی کھیل کھیل رہے ہیں۔ ان لوگوں پر اس کا باپ طنز و تعریض کے جو تیر برسا رہا تھا، پرنس آندرے خندہ پیشانی سے ان کے وار سہہ رہا تھا اور بظاہر اس کی گفتگو سے لطف اندوز بھی ہو رہا تھا۔

''ماضی[56] ہمیشہ سہانا دکھائی دیتا ہے،'' اس نے کہا۔ ''لیکن کیا یہی سواروف اس پھندے میں، جو موغو نے اس کے لیے تیار کیا تھا، پھنس نہیں گیا تھا اور پھر اسے اس میں سے نکلنے کی کوئی صورت سجھائی نہیں دیتی تھی؟''

''تمھیں کس نے بتایا؟ کس نے؟'' پرنس نے چلا چلا کر پوچھا۔ ''سواروف!'' اور اس نے اپنی پلیٹ اٹھا کر ایک طرف پھینک دی لیکن تیخون نے بڑی پھرتی اور ہوشیاری سے اسے راستے ہی میں دبوچ لیا۔ ''سواروف!... غور کرو، پرنس آندرے! دونوں، فریڈرک[57] اور سواروف... موغو! ہونہہ، اگر سواروف کے ہاتھ بندھے نہ ہوتے، تو یہ موغو قیدی بنایا جا چکا ہوتا۔ لیکن سواروف کے ہاتھ تو Hofs-kriegs-wurst-schnapps-Rath[58] نے باندھ رکھے تھے۔ اس صورت حال میں تو خود ابلیس بھی اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے۔ عنقریب تم خود دریافت کر لو گے

کہ یہ Hofs-Kriegs wurst-schnapps-Rath کیا ہیں۔ اگر سواروف ان سے نہ نپٹ سکا تو یہ مائخل کو تو زوف کس کھیتی کی مولی ہے کہ وہ انھیں سنبھال لے گا؟ نہیں، برخوردار، بالکل نہیں،'' اس نے اپنا سلسلۂ کلام آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''تم اور تمھارے جرنیل بوناپارٹ کو مات نہیں دے سکیں گے۔ تمھیں چند فرانسیسیوں کو بلانا پڑے گا — چور کو پکڑنا ہو تو اس کے پیچھے چور لگا دو۔ انھوں نے فرانسیسی موغو کو واپس لانے کے لیے جرمن پاہلن[59] کو نیویارک روانہ کیا۔'' (وہ اس تجویز کی طرف اشارہ کر رہا تھا جس کے مطابق موغو کو روس میں ملازمت کی پیشکش کی گئی تھی۔) ''خوب معاملہ ہے! کیا تمھارے خیال میں پاتومکن، سواروف، ارلوف[60] اور ان کے بھائی بند جرمن تھے؟ نہیں، برخوردار، بالکل نہیں۔ یا تو تمھاری عقل گھاس چرنے نکل گئی ہے یا پھر میں ہی سٹھیا گیا ہوں۔ خداوند تم پر رحم کرے! — خیر، دیکھا جائے گا۔ اللہ اللہ، بوناپارٹ عظیم سپہ سالار بن گیا ہے! ہونہہ، تھو، اخ تھو!...''

''میں یہ نہیں کہتا کہ یہ تمام منصوبے بے عیب ہیں۔ البتہ یہ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ نے بوناپارٹ کے متعلق اس قسم کی رائے کیسے قائم کر لی۔ آپ کا جتنا جی چاہے، ہنسیں، مذاق اڑائیں لیکن حقیقت حقیقت ہے، بوناپارٹ عظیم جرنیل ہے۔''

''میخائیل ایوانووچ!'' بوڑھے پرنس نے میر تعمیرات کو، جو بھنا ہوا گوشت کھانے میں مصروف تھا اور اپنے تئیں سمجھ بیٹھا تھا کہ اسے فراموش کر دیا گیا ہے، دہاڑتے ہوئے پکارا۔ ''میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا کہ نپولین شاطر عظیم ہے، زبردست جنگی چالیں چلتا ہے؟ اور یہ صاحب زادے صاحب بھی یہی فرماتے ہیں۔''

''یقیناً، یور ایکسی لینسی،'' میر تعمیرات نے جواب دیا۔

ایک بار پھر پرنس بر فیلی ہنسی ہنس دیا۔

''بوناپارٹ منہ میں چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا تھا۔ اس کی سپاہ اول درجے کی ہے۔ علاوہ ازیں، اس نے اپنا آغاز جرمنوں پر حملوں سے کیا تھا اور یہ جرمن کیا چیز ہیں؟ نیم بیدار اور نیم خفتہ آدمی بھی ان کے چھکے چھڑا سکتا ہے۔ ابتدائے آفرینش سے ہر ایرا غیرا جرمنوں کی پٹائی کر چکا ہے۔ اور وہ خود؟ بیچارے کسی کی بھی دھنائی نہیں کرتے۔ بس ایک دوسرے کی مار کٹائی کرتے رہتے ہیں۔ تو یہ ہیں وہ لوگ، جن کے خلاف اس نے برسرپیکار ہو کر اپنی شہرت کو چار چاند لگائے ہیں۔''

اور پرنس ان تمام فاش غلطیوں کا تجزیہ کرنے لگا جن کا اس کے خیال کے مطابق نپولین نے اپنی مہموں اور سیاست کاریوں میں ارتکاب کیا تھا۔ اس کے بیٹے نے اسے جھٹلانے کی کوشش نہ کی لیکن اتنی بات واضح تھی کہ جس طرح وہ اپنی کسی بھی دلیل سے اپنے باپ کو قائل نہیں کر سکا تھا، اس کے باپ کے دلائل بھی اسے کسی طرح بھی متاثر نہیں کر سکے تھے۔ وہ اپنے باپ کی تقریر سنتا رہا لیکن کوئی جواب دینے سے احتراز کرتا رہا۔ تاہم اسے حیرت اس بات پر تھی کہ اس بوڑھے شخص کو، جو کئی برسوں سے تن تنہا گاؤں میں زندگی بسر کر رہا تھا، یورپ کے ان تمام حالیہ سیاسی اور عسکری واقعات کا علم کیسے ہو گیا کہ وہ ان کے بارے میں نہ صرف پوری تفصیلات سے آگاہ تھا بلکہ

ان پر اتنی صحت کے ساتھ بحث بھی کر سکتا تھا۔

''تم سمجھتے ہو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور موجودہ حالات و واقعات سمجھنے سے معذور ہوں،'' اس نے اپنی تقریر سمیٹتے ہوئے کہا، ''لیکن یہ چیزیں ہر دم میرے ذہن پر سوار رہتی ہیں اور مجھے اندر ہی اندر گھن کی طرح کھا رہی ہیں۔ مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو۔ یہ بتاؤ کہ تمھارے اس عظیم سپہ سالار نے کہاں کہاں اپنے آپ کو منوایا ہے؟''

''یہ بڑی لمبی داستان ہے،'' اس کے بیٹے نے جواب دیا۔

''پھر اپنے بوناپارت کے پاس چلے جاؤ! مادام بوغین، تمھارے اس ٹھگنے (پاؤڈر مونکی)[61] امپراطور کے ایک اور مداح!'' اس نے نستعلیق فرانسیسی میں کہا۔

''محترم پرنس، آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں بوناپارت کی طرفدار نہیں ہوں۔''

"Dieu sait quand reviendra ..." پرنس بے سرے انداز سے گنگنانے لگا۔ پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا (اس کی ہنسی سماعت کے لیے اور بھی بار گراں تھی)۔ وہ دستر خواں سے اٹھا اور باہر نکل گیا۔

کوچک پرنس اس بحث اور بقیہ ڈنر کے دوران میں بالکل چپ چاپ بیٹھی رہی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے کبھی اپنے خسر اور کبھی پرنس ماریا کو دیکھنے لگتی۔ جب سب لوگ دستر خوان سے اٹھ گئے، اس نے اپنی نند کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے کی طرف چل دی۔

''تمھارے ابا کتنے تیز طرار اور سیانے آدمی ہیں!'' اس نے کہا۔ ''شاید یہی وجہ ہے کہ انھیں دیکھ کر مجھ پر لرزہ طاری ہونے لگا ہے۔''

''اور وہ مہربان بھی بہت ہیں،'' پرنس ماریا نے جواب دیا۔

25

پرنس آندرے نے اگلی شام روانہ ہونا تھا۔ معمر پرنس نے اپنے معمولات میں کوئی فرق نہ آنے دیا بلکہ وہ روز کی طرح ڈنر کے بعد اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کوچک پرنس اپنی نند کے پاس تھی۔ پرنس آندرے سفری کوٹ، جس کے شانوں پر عہدے کے امتیازی نشانات کی پٹیاں آویزاں نہیں تھیں، پہنے، اپنے ذاتی خدمت گار کے ساتھ ان کمروں میں، جو اس کے استعمال کے لیے مخصوص کر دیے گئے تھے، سامان باندھنے بندھوانے میں مصروف تھا۔ جب وہ گاڑی کا خود معائنہ کر چکا اور اس میں اپنے ٹرنک رکھوا چکا، اس نے گھوڑے جوتنے کا حکم دیا۔ اب کمرے میں صرف وہی اشیا پڑی تھیں جنھیں وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھتا تھا۔ ان اشیا میں اس کا گولک (منی باکس)، بوتلیں رکھنے کا خاصا بڑا نقرئی صندوقچہ، دوترکی پستول اور شمشیر — یہ شمشیر اسے اس کے باپ نے تحفے میں دی تھی، وہ اسے اچاکوف[62] کے محاصرے سے لایا تھا — شامل تھی۔ پرنس آندرے کا یہ سارا سفری سامان بالکل صحیح حالت میں

تھا: نیا نکور، صاف ستھرا، غلافوں میں بند، جن کے اوپر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

وہ لوگ، جو سوچ بچار کے اہل ہوتے ہیں، جب سفر پر روانہ ہوتے ہیں یا اپنے طرز حیات میں کوئی تبدیلی لاتے ہیں، ان کے اذہان پر سنجیدگی غلبہ پالیتی ہے۔ ایسے مواقع پر عام طور پر آدمی اپنے ماضی کا جائزہ لیتا ہے اور مستقبل کی منصوبہ بندی کرتا ہے۔ پرنس آندرے کے چہرے بشرے پر شفقت، فکرمندی اور دل گرفتگی کے احساسات نمایاں ہورہے تھے۔ کمر پر ہاتھ باندھے وہ کمرے میں تیز تیز چکر کاٹ رہا تھا۔ وہ بالکل سامنے دیکھ رہا تھا اور سوچ بچار میں ڈوبا بار بار اپنا سر جھٹک رہا تھا۔ کیا اسے محاذ جنگ پر جانے کی بنا پر ضمیر کی کسک محسوس ہورہی تھی؟ اپنی شریک حیات سے بچھڑنے کا دکھ ہورہا تھا؟ یا شاید یہ دونوں ہی باتیں تھیں؟ لیکن صریحاً وہ یہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس کیفیت میں دیکھے۔ چنانچہ جونہی اسے راہداری میں قدموں کی آہٹ سنائی دی، اس نے بہ سرعت اپنے ہاتھ کھول لیے اور میز کے قریب یوں کھڑا ہوگیا جیسے وہ اپنے گولک کا ڈھکن بند کررہا ہو۔ اس کا چہرہ حسب معمول پرسکون تھا اور اس کے جذبات کا اندازہ کرنا ناممکن۔ جن بھاری قدموں کی چاپ اسے سنائی دی تھی، وہ پرنس ماریا کے تھے۔

''مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ نے گھوڑے جوتنے کا حکم دے دیا ہے،'' اس نے ہانپتے کانپتے کہا۔ (بظاہر یہی نظر آرہا تھا کہ وہ دوڑتی آئی ہے۔) ''اور میری کتنی تمنا تھی کہ مجھے تنہائی میں آپ سے کچھ باتیں کرنے کی فراغت مل جاتی۔ صرف خداوند جانتے ہیں کہ اس مرتبہ ہم کتنی دیر ایک دوسرے سے بچھڑے رہیں گے۔ میرے یہاں آنے پر آپ ناراض تو نہیں ہوئے؟ اندروشا، آپ بالکل بدل گئے ہیں،'' اس نے مزید کہا جیسے وہ اپنے سوال کی وضاحت کررہی ہو۔

جیسے ہی اس نے اسے اندروشا کہا، وہ مسکرا پڑی۔ جب وہ یہ سوچتی کہ یہ روکھا، سخت گیر اور خوش شکل شخص وہی اندروشا ہے، جو کبھی دبلا پتلا شرارتی لڑکا ہوا کرتا تھا اور بچپن میں اس کے ساتھ کھیلا کرتا تھا، تو اسے بظاہر یہ بہت عجیب معلوم ہوتا۔

''لسا کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔ اس کے سوال کے جواب میں اس نے محض مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''وہ اتنی نڈھال ہوچکی تھی کہ وہ میرے کمرے میں صوفے پر ہی سوگئی۔ اخاہ، آندرے، کیا شاندار بیوی ملی ہے آپ کو!'' اس نے اپنے بھائی کے رخ صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''بالکل بچی معلوم ہوتی ہے، من موہنی، شگفتہ رو، شگفتہ مزاج۔ میں تو اس پر فدا ہوگئی ہوں۔''

پرنس آندرے چپ رہا۔ تاہم اس کے چہرے پر جو طنز اور تحقیر نمودار ہوئی تھی، پرنس ماریا نے اسے بھانپ لیا۔

''آندرے، ہمیں ادنیٰ کمزوریوں سے درگزر کرنا چاہیے۔ کون ہے جو ان سے مبرا ہے؟ یہ مت بھولیں کہ اس کا تعلق پیٹرزبرگ کے اعلیٰ ترین طبقے سے ہے، وہیں وہ گھومی پھری ہے اور وہیں اس کی تعلیم و تربیت ہوئی ہے۔ اب وہ

جس ماحول میں آئی ہے، وہ اس کے لیے اتنا خوش کن نہیں ہے۔ ہمیں ہمیشہ یہ سوچنا چاہیے کہ دوسروں کی جگہ ہم ہوتے، تو ہم کیا کرتے۔ Tout comprendre, C'st tout pardonner* ۔ ذرا سوچیں، جس قسم کی زندگی بسر کرنے کی وہ عادی تھی، وہ تو گئی چھوٹ، خاوند سے وہ بچھڑ رہی ہے، دیہاتی فضا میں اسے تنہا رہنا ہوگا۔ اور وہ بھی اس حالت میں، کیا حال ہوگا بے چاری کا! کتنا مشکل ہوگا اس کے لیے یہ سب کچھ!''

پرنس آندرے نے اپنی ہمشیرہ پر ایک نظر ڈالی اور یوں مسکرایا جس طرح ہم ان لوگوں کو دیکھ کر مسکراتے ہیں جن کے متعلق ہمیں یہ گمان ہوتا ہے کہ ہم انھیں پوری طرح سمجھتے ہیں۔

''تم گاؤں میں رہتی ہو۔ تمھیں تو یہ زندگی اتنی بھیانک نظر نہیں آتی،'' اس نے کہا۔

''میں ــ میرا معاملہ مختلف ہے۔ آپ میری بات کیوں کرتے ہیں؟ مجھے کسی دوسری قسم کی زندگی کی کوئی تمنا نہیں بلکہ میں تمنا کر ہی نہیں سکتی کیونکہ مجھے کسی اور طرز حیات کا علم ہی نہیں۔ لیکن آندرے، ذرا سوچیں: اگر اعلیٰ شہری طبقے کی کسی نوجوان خاتون کو اس کی زندگی کے بہترین برسوں کے دوران میں دیہات میں رہنے پر مجبور کر دیا جائے اور وہ بھی تن تنہا ــ تن تنہا اس لیے کیونکہ آپ کو معلوم ہے کہ ابا جان ہمہ وقت مصروف رہتے ہیں اور رہی میں، تو آپ جانتے ہی ہیں کہ مجھ میں اتنی صلاحیت کہاں کہ میں ایک ایسی خاتون کو، جو شہروں کے اعلیٰ ترین طبقوں میں گھومنے پھرنے کی عادی ہو، صحیح معنوں میں اس کے شایان شان صحبت فراہم کر سکوں۔ لے دے کے صرف مادام بوغین ــ''

''مجھے تمھاری یہ مادام بوغین ایک آنکھ نہیں بھاتی،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''اف، ایسا نہ کہیں۔ وہ بہت نفیس اور مہربان خاتون ہیں۔ اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ ان کی حالت قابل رحم ہے۔ ان کا کوئی بھی نہیں، کوئی بھی نہیں۔ خدا لگتی کہوں تو مجھے ان کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ ایک لحاظ سے وہ میرے لیے خواہ مخواہ کی رکاوٹ ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں سدا کی تنہائی پسند ہوں اور میری یہ عادت روز بروز پختہ سے پختہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ مجھے تنہا رہنا پسند ہے... ابا جان کو وہ بہت پسند ہیں۔ ایک مادام بوغین اور دوسرے میخائیل ایوانووچ، ان دو اشخاص کے ساتھ ان کا رویہ ہمیشہ دوستانہ اور مشفقانہ رہا ہے ــ کیونکہ وہ ان دونوں کے محسن ہیں۔ جیسا کہ (انگریز ناول نگار) سٹرن (Stern) نے کہا ہے: 'ہم لوگوں سے محبت اس لیے نہیں کرتے کہ انھوں نے ہمارے ساتھ بھلائی کی ہوتی ہے بلکہ وہ ہمیں اس لیے اچھے لگتے ہیں کہ ہم نے ان سے بھلائی کی ہوتی ہے۔' ابا جان نے جب ان کے سر پر دست شفقت رکھا، وہ بے گھر اور بے در بچی تھیں۔ وہ بے حد نیک مزاج خاتون ہیں اور ابا جان کو ان کا خواندگی کا بلند آہنگ انداز پسند ہے۔ وہ انھیں شام کو کتابیں پڑھ کر سناتی ہیں اور پڑھتی بھی بہت خوبصورت انداز سے ہیں۔''

''ماریا، میں لگی لپٹی رکھے بغیر یہ کہوں گا کہ ابا جان نے جو مزاج پایا ہے، وہ بعض اوقات تمھارے لیے خاصا

---

* سب کچھ جاننا سب کچھ معاف کرنا ہے۔

روح فرسا ہوتا ہوگا۔ ٹھیک ہے؟'' پرنس آندرے نے اچانک پوچھا۔

اس سوال پر پرنس ماریا پہلے تو متحیر ہوئی اور پھر بالکل ہی ہکا بکا۔ اس کا منہ کھلے کا کھلے رہ گیا۔

''روح فرسا؟... میرے لیے... روح فرسا میرے لیے!'' اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔

''وہ کرخت تو سدا کے تھے لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ ان کا رویہ بھی تکلیف دہ ہوتا جا رہا ہے۔'' وہ اپنے باپ کا ذکر جس اکھڑ انداز سے کر رہا تھا، اس کا بظاہر مقصد یا تو یہ تھا کہ وہ اپنی بہن کو الجھن میں ڈالنا چاہتا تھا یا پھر یہ کہ وہ اس کا امتحان لینا چاہتا تھا۔

''آندرے، آپ بہت اچھے آدمی ہیں لیکن آپ کو اپنی عقل و دانش پر ایک طرح کا گھمنڈ ہے،'' پرنس نے کہا۔ اس نے یہ نہیں دیکھا کہ گفتگو کس نہج پر جاری ہے بلکہ وہ اپنے ہی خیالات کی رو میں بہے جا رہی تھی۔ ''اور یہ گناہ عظیم ہے۔ ہم اپنے والد ماجد کا کیسے محاکمہ کر سکتے ہیں اور ہمیں یہ حق کس نے دیا ہے؟ پھر اگر ہم یہ محاکمہ کرنے پر تل بھی جائیں، تو جس طرح کے والد میرے ہیں، وہ محاکمے کی صورت میں بھی عزت و احترام کے جذبات ہی ابھاریں گے اور کچھ نہیں۔ مجھے تو ان کے ساتھ زندگی بسر کرنے سے اطمینان قلب اور حقیقی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ میری تو صرف یہی آرزو ہے کہ کاش آپ سب لوگ بھی اتنے ہی دل شاد اور مسرور ہوتے جتنی کہ میں ہوں!''

آندرے نے یوں سر ہلایا جیسے اسے اس کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

''مجھے جس واحد چیز سے کوفت ہوتی ہے — آندرے، میں آپ کو سچ سچ بتاؤں گی — وہ مذہب کے بارے میں ابا جان کا رویہ ہے۔ میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ان جیسا زبردست فہم و فراست کا مالک شخص روز روشن کی طرح عیاں اشیا کا ادراک کرنے میں کیوں ناکام رہتا ہے اور کس طرح راہ راست سے بھٹک جاتا ہے۔ صرف یہ چیز ہے جس سے مجھے واقعی دکھ ہوتا ہے۔ تاہم اس معاملے میں بھی مجھے حالیہ دنوں میں بہتری کی کرن دکھائی دینے لگی ہے۔ وہ ان باتوں کا جس طرح تمسخر اڑاتے تھے، اب اس میں وہ کاٹ نہیں رہی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ اور ایک روز تو انھوں نے کمال کر دکھایا، انھوں نے ایک راہب کو شرف ملاقات بخشا اور اس کے ساتھ طویل گفتگو فرمائی۔''

''خیر، مائی ڈیئر، میرا خیال ہے کہ تم اور تمھارا راہب اپنا بارود بیکار ضائع کر رہے ہیں،'' پرنس آندرے نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا لیکن اس کے لہجے میں بہت مٹھاس تھی۔

''اف، بھائی جان، میں خداوند سے صرف دعا کر سکتی ہوں کہ وہ میری امیدیں بر لائیں۔ آندرے،'' اس نے کچھ دیر ہچکچانے کے بعد ڈرتے ڈرتے کہا: ''مجھے آپ سے کچھ درخواست کرنا ہے۔''

''مائی ڈیئر، کیا چاہیے؟''

''نہیں، پہلے آپ وعدہ کریں کہ آپ انکار نہیں کریں گے۔ میں جو کچھ کرنا چاہتی ہوں، اس سے آپ کو کوئی تکلیف نہیں ہوگی اور نہ وہ کسی بھی اعتبار سے آپ کی شان سے بعید ہوگا۔ وعدہ کریں، اندروشا!'' اس نے کہا اور

اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال دیا۔ لیکن اس کے اندر جو کچھ اس کے ہاتھ میں تھا، وہ اسے باہر نکالتے جھجک رہی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ تھامے ہوئے ہے، وہ وہی چیز ہے جس کی وہ اپنے بھائی سے التجا کر رہی تھی اور صرف اسی صورت میں دکھائی جا سکتی تھی کہ اس کی درخواست کو پیشگی قبولیت حاصل ہو جائے۔

وہ شرمائے لجائے اپنے بھائی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں التجا تھی۔

''خواہ یہ میرے لیے اچھی خاصی مصیبت کا باعث بن جائے''... پرنس آندرے نے جواب دیا۔ وہ کچھ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے اسے اندازہ ہو گیا ہو کہ اس کی ہمشیرہ کے ہاتھ میں کیا ہے۔

''آپ کا جو جی چاہے، سوچیں، میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ آپ میرے لیے باپ کی مانند ہیں۔ لیکن یہ کام میری خاطر کر دیں۔ ضرور، بالضرور، میں آپ سے التجا کرتی ہوں! ہمارے ابا جان کے ابا جان، دادا حضور، جس جنگ میں بھی شریک ہوئے، اسے پہن کر ہوئے۔'' ہینڈ بیگ میں جس چیز پر اس کا ہاتھ تھا، وہ اس نے ابھی تک باہر نہیں نکالی تھی۔ ''تو آپ وعدہ کرتے ہیں؟''

''بالکل۔ یہ ہے کیا؟''

''آندرے، میں آپ کو یہ مقدس ایقونہ دینے کی سعادت حاصل کر رہی ہوں۔ آپ وعدہ کریں کہ آپ اسے کبھی اپنے جسم سے علیحدہ نہیں کریں گے... آپ وعدہ کرتے ہیں؟''

''یہ نہ کوئی منوں بھاری چیز ہے اور نہ اس کے پہننے سے میری گردن کا منکا ٹوٹے گا... چونکہ تمھاری خوشی ہے۔'' پرنس آندرے نے کہا۔ لیکن جونہی اسے احساس ہوا کہ اس کے اس بھونڈے مذاق سے اس کی بہن کو بہت دکھ ہوا ہے، اسے ندامت ہوئی اور اس نے بلا تاخیر کہا: ''مائی ڈیئر، لاؤ، میں پہن لیتا ہوں، مجھے خوشی ہوگی، سچی خوشی۔''

''آپ چاہیں یا نہ چاہیں، وہ بہرحال آپ کا تحفظ فرمائیں گے اور آپ کو اپنے رحم و کرم سے نوازیں گے۔ وہ آپ کو اپنے حضور لے جائیں گے کیونکہ صرف وہی صداقت اور امن کے امین ہیں،'' اس نے کہا۔ جذبات سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔ اس نے نہایت عقیدت و احترام کے ساتھ اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے بھائی کو نجات دہندہ کا قدیم الوضع بیضوی تصویرچہ پیش کیا۔ تصویرچے میں چہرے کا رنگ سانولا تھا۔ یہ نقرئی فریم میں آویزاں تھا اور اس کے ساتھ چاندی کی زنجیر، جس پر نہایت مہارت اور صفائی سے نقش و نگار بنائے گئے تھے، لٹک رہی تھی۔

اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، ایقونے کو بوسہ دیا اور آندرے کو تھما دیا۔

''آندرے، نوازش ہوگی، میری خاطر...''

اس کی بڑی بڑی ڈری سہمی آنکھیں ملائم روشنی سے چمک رہی تھیں۔ ان آنکھوں نے اس کے دبلے پتلے چہرے کو بھی تابانی بخش دی اور اسے خوبصورت بنا دیا۔ اس کے بھائی نے ایقونہ لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا لیکن اس نے اسے روک دیا۔ آندرے سمجھ گیا۔ اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور ایقونے کو بوسہ دیا۔

اس کے چہرے سے محبت بھی ٹپک رہی تھی کیونکہ اس کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا اور ساتھ ہی اس پر طنز بھی ہویدا تھی۔

''شکریہ، مائی ڈیئر!''

اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ دیا اور دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔

''آندرے، جیسا کہ میں عرض کر چکی ہوں آپ نے ہمیشہ ہی شفقت اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اب بھی اسی شفقت اور دریا دلی سے کام لیں۔ لسا کے ساتھ کڑا رویہ اختیار نہ کریں۔'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ بہت پیاری، بہت اچھی ہے اور فی الحال اس کی پوزیشن بڑی نازک ہے۔''

''ماشا، میرا خیال ہے کہ میں نے تم سے کوئی ایسی بات نہیں کہی جس سے میری بیوی کی تضحیک کا کوئی پہلو نکلتا ہو۔ میں نے اس پر نہ تو کوئی نکتہ چینی کی ہے اور نہ یہ کہا ہے کہ میں اس سے مطمئن نہیں۔ پھر تم یہ سب کچھ مجھ سے کیوں کہہ رہی ہو؟''

پرنسس ماریا کے چہرے پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے اور وہ یوں گم صم بیٹھی رہی جیسے وہ اپنے آپ کو مجرم گردان رہی ہو۔

''میں نے تو تم سے کچھ نہیں کہا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ کوئی دوسرا شخص تمھارے ضرور کان بھرتا رہا ہے۔ اس سے مجھے رنج پہنچا ہے۔''

پرنسس ماریا کے رخساروں، پیشانی اور گردن پر سرخ دھبے اور بھی گہرے ہو گئے۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ اس کے بھائی نے ٹھیک اندازہ لگایا تھا۔ کوچک پرنسس ڈنر کے بعد روتی رہی تھی، زچگی کے سلسلے میں اسے جو اندیشے لاحق تھے، خوف سے جس طرح اس کی جان نکلی جا رہی تھی، اس نے ان کا تذکرہ کیا تھا اور اس نے اپنے خسر اور خاوند کے متعلق بھی بہت کچھ کہا تھا۔ رونے دھونے کے بعد وہ سو گئی تھی۔ پرنس آندرے کو اپنی بہن سے ہمدردی ہو رہی تھی۔

''ماشا۔ ایک بات پلے باندھ لو۔ میری بیوی نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی جس پر میں اسے ملامت کر سکوں۔ میں نے اسے نہ کبھی ملامت کی ہے اور نہ کبھی کروں گا۔ اور نہ میں نے اس کے ساتھ کبھی ایسا سلوک کیا ہے جس پر میں اپنے آپ کو ملامت کر سکوں۔ حالات خواہ کیسا ہی رخ کیوں نہ اختیار کر لیں، میرے اس رویے میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لیکن اگر تم سچائی معلوم کرنا چاہتی ہو۔ اگر تم یہ جاننا چاہتی ہو کہ میں خوش ہوں؟۔ نہیں! کیا وہ خوش ہے؟ نہیں! ایسا کیوں ہے؟ مجھے نہیں معلوم...''

اس نے یہ کہا، اپنی جگہ سے اٹھا، اپنی بہن کے پاس پہنچا، نیچے جھکا اور اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔ مروت، محبت اور شفقت کے ملے جلے جذبات کی غیر معمولی لو نے اس کی حسین آنکھوں کو منور کر دیا تھا لیکن وہ اس کی طرف نہیں بلکہ اس کے سر کے اوپر کھلے دروازے کی تاریکی کی جانب دیکھ رہا تھا۔

''آؤ، اس کے پاس چلیں، خدا حافظ کہنے کا وقت آ گیا ہے۔ یا۔ تم اکیلی ہی چلی چلو اور اسے جگا دو۔ میں

ابھی آتا ہوں۔ پترو شکا!'' اس نے اپنے خدمت گار کو آواز دی۔ ''ادھر آؤ۔ یہ سامان اٹھا کر لے چلو۔ اسے سیٹ کے اوپر رکھ دینا اور یہ دائیں طرف۔''

پرنس ماریا اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف چل پڑی۔ پھر وہ رک گئی اور بولی:

''آندرے، اگر آپ یقین کی دولت سے مالا مال ہوتے، آپ خداوند سے دعا کرتے کہ جو محبت آپ محسوس نہیں کرتے، وہ اسے آپ کی جھولی میں ڈال دیں، اور آپ کی دعا قبول ہو جاتی۔''

''ہاں... ایسا ہو سکتا تھا،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''ماشا، جاؤ، میں ایک آدھ منٹ میں پہنچتا ہوں۔''

جب پرنس آندرے مکان کے دونوں حصوں کو ملانے والی غلام گردش میں سے گزرتا اپنے ہمشیرہ کے کمرے کی طرف جا رہا تھا، اس کا سامنا مادموزیل بوغین سے ہو گیا۔ وہ شیریں انداز سے مسکرا رہی تھی۔ الگ تھلگ راہداریوں میں وہ اس روز تیسری بار اسے ملی تھی اور ہر بار اس کے چہرے پر وہی بھولی بھالی اور وجد آفریں مسکراہٹ تیرتی رہی تھی۔

''اوہ! میرا خیال تھا کہ آپ اپنے کمرے میں ہوں گے،'' وہ بولی۔ کوئی خاص ہی وجہ ہو گی کہ شرم سے اس کے رخسار سرخ ہو گئے اور اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں۔

پرنس آندرے نے اسے درشتی سے گھور کر دیکھا۔ اچانک اس پر جھلاہٹ سوار ہو گئی۔ اس نے نہ تو اپنی زبان ہلائی اور نہ اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا، وہ بس اس قدر حقارت سے اس کی پیشانی اور اس کے بالوں کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا کہ فرانسیسی خاتون کے گال تمتمانے لگے اور وہ ایک لفظ کہے بغیر وہاں سے کھسک گئی۔

جب وہ اپنی ہمشیرہ کے کمرے میں داخل ہوا، اس کی بیوی بیدار ہو چکی تھی اور اس کی ننھی منی ہشاش بشاش غوں غاں کھلے دروازے سے باہر سنائی دے رہی تھی۔ وہ حسب معمول فرانسیسی میں چہچہا رہی تھی اور ایسی رفتار سے جا رہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ طویل زباں بندی کے بعد اس کے منہ کا قفل کھل گیا ہے اور وہ اگلی پچھلی ساری کسر پوری کرنا چاہتی ہے۔

''نہیں، ذرا بوڑھی کاؤنٹس زوب واکو اپنے تصور میں لاؤ۔ سر پر مصنوعی زلفیں اور منہ میں مصنوعی دانت۔[63] یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کو شکست دینے کی کوشش کر رہی ہے۔ ہا، ہا، ہا، ماریا!''

پرنس آندرے اس سے پہلے ہی پانچ مرتبہ دوسروں کی صحبت میں اپنی بیوی کو کاؤنٹس زوب وا کے متعلق بعینہٖ یہی باتیں کرتے اور اسی قسم کا قہقہہ لگاتے سن چکا تھا۔ وہ دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔ گل رنگ اور فربہ اندام کوچک پرنس آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ کشیدہ کاری کا سامان اس کے ہاتھوں میں تھا اور وہ دم لیے بغیر باتیں کیے جا رہی تھی۔ وہ وہی گھسی پٹی یادداشتیں دہرا رہی تھی، یہاں تک کہ جملے اور الفاظ تک وہی تھے۔ پرنس آندرے اس کے پاس پہنچا، اس نے اس کے بالوں کو سہلایا اور اس سے دریافت کیا: ''سفر کی تھکاوٹ دور ہوئی؟'' اس نے اس کے سوال کا جواب دیا اور دوبارہ اپنی ٹرٹر میں مصروف ہو گئی۔

پورچ میں چھ گھوڑوں والی گاڑی کھڑی تھی۔ یہ خزاں کی رات تھی اور اتنی تاریک کہ کوچوان کو گھوڑے کے بم نظر نہیں آ رہے تھے۔ ہاتھوں میں لالٹینیں پکڑے نوکر ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے۔ وسیع و عریض مکان کے بلند دریچوں میں روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ گھریلو ملازمین (جن کی حیثیت غلاموں سے زیادہ نہ تھی) بیرونی ہال میں ہجوم کیے ہوئے تھے تاکہ وہ پرنس کو الوداع کہہ سکیں۔ انتظار گاہ میں افراد خانہ ــ میخائیل ایوانووچ، مادموزیل بوغین، پرنس ماریا اور کوچک پرنسس ــ منتظر کھڑے تھے۔ بوڑھا پرنس تنہائی میں اپنے بیٹے کو رخصت کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے اسے اپنے سٹڈی روم میں بلا بھیجا تھا۔ باقی سب لوگ ان کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

جب پرنس آندرے سٹڈی روم میں داخل ہوا، اس کا باپ دقیانوسی چشمہ لگائے اور سفید ڈریسنگ گاؤن، جس میں وہ اپنے بیٹے کے سوا کسی اور سے ملاقات نہیں کرتا تھا، پہنے، میز کے سامنے بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے نظریں اوپر اٹھائیں:

''جا رہے ہو؟'' اور وہ لکھتا رہا۔

''میں اجازت لینے حاضر ہوا ہوں۔''

'مجھے یہاں بوسہ دو،'' اس نے اپنے گال کی طرف اشارہ کیا۔ ''شکریہ، شکریہ!''

''آپ میرا شکریہ کیوں ادا کر رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ تم نے کسی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا، اس لیے کہ تم کسی عورت کے ازار بند سے بندھے نہیں رہے۔ تم نے ہر چیز پر فرض کو ترجیح دی ہے۔ شکریہ، شکریہ!'' اور وہ لکھتا رہا۔ اس کا قلم کاغذ پر گھسٹ رہا اور سیاہی کے چھینٹے اڑا رہا تھا۔ ''تم نے کچھ کہنا ہے تو کہہ ڈالو، میں بیک وقت دو کام کر سکتا ہوں۔''

''اپنی بیوی کے متعلق ــ میں شرمندہ ہوں کہ اسے آپ کے پلے باندھے جا رہا ہوں... ان حالات میں۔''

''کیا فضول باتیں کر رہے ہو؟ یہ بتاؤ! تمھیں چاہیے کیا؟''

''جب زچگی کا وقت آئے، ماسکو سے کسی accoucheur* کو بلا لیں... اسے یہیں ٹھہرائیں...''

پرنس لکھتے لکھتے رک گیا اور اس نے اپنی خشم گیں نگاہیں یوں اپنے بیٹے پر گاڑ دیں جیسے وہ سمجھ نہ سکا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''میں جانتا ہوں کہ اگر قدرت مہربان نہ ہوئی، پھر کوئی کچھ نہیں کر سکتا،'' پرنس آندرے نے کہا۔ وہ بظاہر اتنا گڑبڑا گیا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ ''میں جانتا ہوں کہ زچگی کے دس لاکھ کیسوں میں صرف ایک ایسا ہوتا ہے جب صورت حال مشکل ہو جاتی ہے۔ لیکن اسے وہم ہو گیا ہے اور مجھے بھی۔ لوگ اسے طرح طرح کی کہانیاں سناتے رہتے ہیں۔ اس نے خواب بھی دیکھ لیا ہے اور وہ خوف زدہ ہے۔''

''اخوں... اخوں...'' معمر پرنس منہ ہی منہ میں بڑبڑایا اور جو کچھ وہ لکھ رہا تھا، اسے ختم کرتے ہوئے بولا:

* ماہر وضع حمل۔

''میں انتظام کردوں گا۔''

اس نے خوبصورت دائرے بناتے ہوئے اپنے دستخط کیے، پھر اچانک اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہوا اور ہنسنے لگا۔

''گڑ بڑ گھوٹالا، ہونہہ؟''

''ابا جان، گڑ بڑ گھوٹالا کیا؟''

''بیگم،'' معمر پرنس نے منہ پھٹ لیکن پر معنی انداز سے کہا۔

''میں سمجھا نہیں،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''ہاں، برخوردار، اب کچھ نہیں ہوسکتا،'' معمر پرنس نے کہا۔ ''یہ سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ لیکن اب تم غیر شادی شدہ بننے سے رہے۔ فکر نہ کرو۔ میں کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ لیکن تمھیں خود اس کا علم ہے۔''

اس نے اپنے بیٹے کا ہاتھ اپنی چھوٹی چھوٹی استخوانی انگلیوں کی آہنی گرفت میں جکڑ لیا اور اسے زور سے جھنکا دیا اور اپنی نگاہیں سیدھی اس کے چہرے پر نگادیں۔ اس کی نظروں میں اتنی تیزی اور حدت تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسرے شخص کی باطنی کیفیت بھی بھانپ سکتا ہے۔ اور وہ ایک مرتبہ پھر اپنی سرد مہرانہ ہنسی ہنسنے لگا۔

اس کے بیٹے کے منہ سے آہ نکل گئی اور اس کی یہ آہ اس بات کا اقرار تھی کہ اس کے باپ نے اسے سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی تھی۔ بوڑھے نے خط تہہ کیا اور اسے لفافے میں بند کردیا۔ اس نے اپنی روایتی پھرتی سے جھپٹ کر لاکھ اٹھائی، لفافے پر رکھی اور اس پر مہر ثبت کردی۔

''تم کر بھی کیا سکتے ہو؟ وہ ملکہ حسن ہے! خیر، فکر نہ کرو، میں ہر چیز کا خیال رکھوں گا،'' اس نے خط پر مہر لگاتے اچانک اپنے واضح اور پرزور انداز سے کہا۔

آندرے خاموش رہا۔ یہ احساس کہ اس کا باپ اسے سمجھتا ہے، طرب انگیز بھی تھا اور کرب ناک بھی۔ بوڑھا اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور اس نے خط اپنے بیٹے کے ہاتھ میں تھما دیا۔

''آؤ،'' اس نے کہا۔ ''تمھیں بیوی کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ مجھ سے جو کچھ بن پڑا، ضرور کروں گا۔ اب سنو۔ خط میخائیل الاری اوناوچ[64] کو دے دینا۔ میں نے اسے لکھا ہے کہ وہ تمھیں صحیح جگہوں پر استعمال کرے اور تمھیں زیادہ عرصے تک ایجوٹنٹ نہ بنائے رکھے۔ یہ بڑا گھٹیا عہدہ ہے! اسے بتانا کہ وہ مجھے یاد ہے اور میں اسے پسند کرتا ہوں۔ وہ تمھارے ساتھ کس طرح پیش آتا ہے، مجھے اس کے بارے میں ضرور لکھنا۔ اگر اس نے تمھارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا، پھر بے شک اس کی ماتحتی میں کام کرتے رہنا، نکولائی آندریوچ بلکونسکی کے بیٹے کو محض اس لیے دوسروں کا دبیل نہیں بننا چاہیے کہ یہ خوش اخلاقی کا تقاضا ہے۔''

وہ اتنی سرعت سے باتیں کر رہا تھا کہ آدھے الفاظ بیچ ہی میں کھا جاتا تھا لیکن اس کا بیٹا اس کا عادی تھا اور جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، اسے باآسانی سمجھ جاتا تھا۔ وہ اسے ڈیسک کے قریب لے گیا، اس کا ڈھکنا اٹھایا، دراز کھولی اور ایک کاپی نکالی۔ پوری کاپی شروع سے آخر تک پر تھی اور اس کے اپنے ہاتھ سے لکھی ہوئی تھی۔ اس کا خط خاصا

موٹا تھا لیکن سطور ایک دوسرے سے جوڑ جوڑ کر تحریر کی گئی تھیں۔

"میں غالباً تم سے پہلے ملک عدم کے سفر پر روانہ ہو جاؤں گا۔ یاد رکھو کہ یہ میری یادداشتیں ہیں۔ انھیں میرے انتقال کے بعد امپراطور کی خدمت اقدس میں پیش کیا جانا ہے۔ یہ لمبارڈ ہاؤس کا بانڈ[65] اور خط ہے۔ یہ دراصل انعام ہے اور اس شخص کو دیا جائے گا جو ان جنگوں کی، جو سواروف کی سپہ سالاری میں لڑی گئی تھیں، تاریخ مرتب کرے گا۔ اسے اکادمی بھیج دینا۔ یہ چند تحریریں میں نے تمھارے لیے قلم بند کی ہیں، انھیں میرے انتقال کے بعد پڑھ لینا، تمھارے لیے یہ کارآمد ہوں گی۔"

آندرے نے اپنے باپ سے یہ نہیں کہا کہ وہ لاریب عمر نوح پائیں گے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس قسم کی بات کہنے کی ضرورت نہیں۔

"اباجان، آپ نے جو کچھ فرمایا ہے، میں وہ سب کچھ کروں گا۔"

"خوب، پھر الوداع،" اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تاکہ وہ اسے چوم سکے اور اس کے ساتھ بغل گیر ہو گیا۔ "پرنس آندرے، ایک بات یاد رکھنا۔ اگر تم زندہ نہ بچے، تو بڑھاپے میں یہ میرے لیے بڑا دھچکا ہوگا۔۔۔" اچانک اس نے اپنی بات بیچ میں چھوڑ دی اور پھر ایکا ایکی چڑچڑے انداز سے کہنے لگا: "اگر کل کلاں مجھ تک یہ اطلاع پہنچی کہ تمھارا رویہ اور کردار نکولائی بلکونسکی کے فرزند کے شایانِ شان نہیں تو مجھے۔۔۔ شرمندگی ہوگی!" وہ چیخ رہا تھا۔

"اباجان، آپ کو مجھ سے یہ کہنے کی ضرورت نہیں تھی،" بیٹے نے مسکرا کر جواب دیا۔

بوڑھا خاموش رہا۔

"میں ایک اور درخواست بھی آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا تھا،" پرنس آندرے نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر میں زندہ نہ بچا اور اگر میرے ہاں بیٹا تولد ہوا، اسے کسی کو یہاں سے لے جانے نہ دیں، اپنے پاس ہی رکھیں اور جیسا کہ میں نے کل عرض کیا تھا، اس کی یہیں پرورش کریں اور اسے یہیں تعلیم دلائیں۔۔۔ یہ میری التجا ہے!"

"تمھاری بیوی کو اسے لے جانے نہ دوں؟" بوڑھے نے دریافت کیا اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

وہ دونوں چپ چاپ روبرو کھڑے تھے۔ معمر آدمی کی تیز نگاہیں اپنے بیٹے کی آنکھوں پر مرکوز تھیں۔ اس کے چہرے کے زیریں حصے پر کپکپی طاری تھی۔

"ہم ایک دوسرے کو الوداع کہہ چکے ہیں۔۔۔ جاؤ!" اس نے اچانک کہا۔ "جاؤ!" اس نے سٹڈی روم کا دروازہ کھولتے اور غصیلی آواز میں چلا کر کہا۔

"کیا ہوا، کیا ہوا؟" دونوں پرنسسوں نے پرنس آندرے کو دیکھتے ہوئے بیک آواز پوچھا۔ دونوں کو معمر پرنس کی عارضی جھلک دکھائی دی تھی۔ وہ سفید ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا۔ اس کی آنکھوں پر چشمہ بھی تھا لیکن اس

کے سر پر وگ نہیں تھی اور وہ قہر آلود آواز میں چلا رہا تھا۔

پرنس آندرے نے لمبی سانس لی لیکن خاموش رہا۔

''خیر!'' اس نے اپنی اہلیہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا لیکن اس کی یہ ''خیر'' کانوں کو اتنی ہی بر فیلی اور تمسخر انگیز محسوس ہوئی جیسے اس نے یہ کہا ہو، ''خیر، تمھیں جو اداکاری کرنا ہے، کر لو!''

''آندرے۔ ابھی سے؟'' کوچک پرنس نے کہا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ بے بسی سے اپنے شوہر کو تکے جا رہی تھی۔

آندرے نے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ کوچک پرنس نے چیخ ماری اور عالم بے ہوشی میں اس کے کندھے پر گر پڑی۔

وہ جس کندھے پر جھکی ہوئی تھی، اس نے بڑی احتیاط سے اسے چھڑایا، اس کے چہرے پر نظر دوڑائی اور اسے آرام کرسی پر لٹا دیا۔

''ماری، الوداع،'' اس نے ملائم آواز سے اپنی بہن سے کہا، اس کا ہاتھ پکڑا، اسے چوما اور تیز تیز قدم اٹھاتا باہر نکل گیا۔

کوچک پرنس کرسی پر لیٹی اور مادموزیل بوغین اس کی کنپٹیاں سہلاتی رہی۔ پرنس ماریا نے اپنی بھاوج کو سہارا دے رکھا تھا۔ اس کی خوبصورت آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں اور وہ پیہم اس دروازے کی جانب دیکھے جا رہی تھی جس میں سے اس کا بھائی رخصت ہوا تھا۔ اس نے اس کی جانب صلیب کا نشان بنایا۔ سٹڈی روم سے بوڑھے پرنس کے غیظ و غضب سے بار بار ناک سڑکنے کی آوازیں یوں آ رہی تھیں جیسے پستول کی گولیاں چل رہی ہوں۔ پرنس آندرے ابھی بمشکل گھر سے باہر گیا ہوگا کہ دھماکے سے سٹڈی روم کا دروازہ کھلا اور سفید ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس بوڑھے کی گمبھیر صورت دکھائی دی۔

''چلا گیا؟ خوب!'' اس نے کہا، بے ہوش کوچک پرنس پر غضب آلود نگاہ ڈالی، ناپسندیدگی سے اپنی گردن جھٹکی اور دھماکے سے دروازہ بند کر دیا۔

حصہ دوم

1

اکتوبر 1805 کے دوران میں روسی فوجیں آرچ ڈچی آف آسٹریا[1] کے قصبات اور دیہات میں پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں اور روس سے مسلسل تازہ دم دستے بھی آ رہے تھے۔ وہ براؤناؤ[2(الف)] کے قریب ڈیرے ڈال رہے تھے اور جن مقامی باشندوں کے قریب مقیم ہو رہے تھے، ان پر بھاری بوجھ بن رہے تھے۔ براؤناؤ کمانڈر انچیف کوتوزوف کا ہیڈکوارٹر تھا۔

گیارہ اکتوبر 1805 کو ایک پیادہ رجمنٹ براؤناؤ پہنچی۔ وہ شہر سے آدھ میل ادھر رک گئی۔ یہاں اس نے کمانڈر انچیف کا انتظار کرنا تھا تاکہ وہ اس کا معائنہ کر سکے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس علاقے اور اس کے گرد و پیش کی فضا۔ یہاں پھلوں کے باغات، پتھروں کی باڑیں، ٹائلوں والی چھتیں اور دور فاصلے پر پہاڑیاں تھیں۔ قطعاً غیر روسی تھی اور جو باشندے فوجیوں کو بہ نگاہ تجسس گھور گھور کر دیکھتے تھے، وہ بھی روسی نہیں تھے۔ لیکن ان تمام حقائق کے باوجود یہ رجمنٹ کسی بھی دوسری رجمنٹ کے، جو قلب روس میں واقع کسی مقام پر پڑاؤ ڈالے معائنہ کا انتظار کر رہی ہو، بالکل مماثل تھی۔

کوچ کے آخری روز بوقت شام حکم موصول ہوا کہ کمانڈر انچیف اس رجمنٹ کا معائنہ بحالت کوچ کریں گے۔ اگرچہ حکم کی عبارت پوری طرح رجمنٹل کمانڈر کی سمجھ میں نہیں آئی تھی اور سوال پیدا ہوا تھا کہ آیا انھیں پوری وردیاں پہن کر پیش ہونے کی ہدایت کی گئی ہے یا کچھ رعایت برتی گئی ہے۔ تاہم مختلف بٹالینوں کے کمانڈروں کے ساتھ صلاح مشورے کے بعد طے پایا کہ انھیں پوری وردیاں ہی پہننا چاہئیں۔ ان کے اس فیصلے کا محرک یہ اصول تھا: ''کافی حد تک نہ جھکنے کی نسبت کافی سے زیادہ جھکنا بہتر ہوتا ہے۔'' چنانچہ بیس میل کی مسافت طے کرنے کے بعد بھی جوانوں کو پلک تک جھپکنے کا موقع میسر نہ آیا اور ان کی ساری رات مختلف اشیا کی صفائی ستھرائی اور مرمتیں کرتے گزر گئی۔ رہے ایجوٹنٹ اور کمپنی کمانڈر، وہ مختلف طریقوں سے جمع تفریق کرتے رہے۔ ان احتیاطی تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب صبح طلوع ہوئی، رجمنٹ کے دو ہزار جوان اور افسر۔ جنھوں نے کوچ کے آخری روز گھسٹتے پسٹتے اور بے مہار ہجوم کی صورت اختیار کر لی تھی۔ اپنے اپنے مقام پر اپنے اپنے فرائض سنبھالے

باترتیب کھڑے تھے۔ ایک ایک بٹن اور ایک پیٹی وہیں تھیں جہاں اسے ہونا چاہیے تھا اور اس کی اتنی صفائی ہو چکی تھی کہ جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔ سب کچھ محض خارجی طور پر باترتیب نہیں تھا بلکہ اگر کمانڈر انچیف وردیوں کے نیچے بھی جھانکنا مناسب خیال کرتا، اسے نظر آتا کہ بلا تمیز و تفریق تمام جوانوں نے صاف ستھری قمیصیں پہنی ہوئی ہیں اور ان سب کے تھیلوں میں، عام فوجیوں کے بقول ''آر، صابن، الا بلا، سب کچھ'' موجود تھا۔ صرف ایک چیز ایسی تھی جس کے بارے میں کوئی بھی مطمئن نہیں تھا اور وہ تھی ان کے جوتے۔ نصف سے زیادہ جوانوں کے بوٹ تار تار ہو رہے تھے لیکن اس میں رجمنٹ کے کمانڈر کا کوئی قصور نہیں تھا کیونکہ متعدد یاد دہانیوں کے باوجود آسٹریا کے حکام نے رسد مہیا نہیں کی تھی اور رجمنٹ لگ بھگ سات سو میل پیدل چل کر آئی تھی۔

رجمنٹل کمانڈر ادھیڑ عمر جرنیل تھا۔ اس کا چہرہ خوں رنگ، بدن گٹھا ہوا اور اس کے ابروؤں اور مونچھوں میں چاندی کے تار تھے۔ اس کا جسم شانوں کے آر پار اتنا فراخ نہیں تھا جتنا کہ اس کے سینے اور کمر کے مابین تھا۔ اس نے بالکل نئی نویلی وردی زیب تن کر رکھی تھی لیکن اسے جہاں جہاں سے تہہ کیا گیا تھا، وہاں اب بھی شکنیں نمایاں تھیں۔ اس کے بھاری بھرکم کندھوں پر طلائی آرائشی پٹیاں لیٹی ہوئی نہیں تھیں بلکہ کھڑی دکھائی دیتی تھیں۔ جب وہ کسی صف کے سامنے سے گزرتا، اس کی کمر قدرے کمان بن جاتی، قدم قدم پر اس کا جسم کپکپانے لگتا اور اس کا انداز ایک ایسے شخص کا بن جاتا جو اپنی زندگی کے مقدس ترین فرائض بغایت خوشی سرانجام دے رہا ہو۔ یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں تھا کہ کمانڈر کو اپنی رجمنٹ پر ناز تھا۔ وہ اسے دیکھ کر جیتا تھا اور اس کے دماغ میں صرف اسی کا سودا سمایا ہوا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس کی پر شکوہ مور چال اس امر کی غمازی کرتی تھی کہ فوجی دلچسپیوں کے علاوہ سماجی زندگی اور صنف نازک خاصی زیادہ حد تک اس کے خیال میں رچی بسی ہے۔

''خیر، میخائیل مترخ، حضور،'' اس نے ایک بٹالین کمانڈر سے، جو مسکراتا مسکراتا (صاف نظر آ رہا تھا کہ دونوں بہت خوش ہیں) صف سے آگے نکل آیا تھا، کہا، ''رات واقعی ہمیں بہت مصروفیت رہی۔ تاہم میرا خیال ہے کہ رجمنٹ کا نک سک درست ہو گیا ہے۔''

''جی ہاں، اگر ہمیں ماسکو کی تسارتسن چراگاہ میں بھی سلامی دینا پڑے تو کوئی ہمیں وہاں سے نکال نہیں سکے گا۔''

عین اس لمحے سڑک پر، جہاں سنتری متعین کر دیا گیا تھا، دو گھڑ سوار — ایک ایجوٹنٹ اور اس کے پیچھے پیچھے اس کا قازق — نمودار ہوئے۔ ایجوٹنٹ کو جنرل سٹاف نے گزشتہ یوم کے حکم کی توثیق کے لیے بھیجا تھا۔ یہ حکم پہلے واضح الفاظ میں تحریر نہیں کیا گیا تھا۔ حکم کا اصل منشا یہ تھا کہ کمانڈر انچیف رجمنٹ کا بالکل اسی کیفیت میں جس میں — اوورکوٹ پہنے، تھیلے کمروں پر لٹکائے اور کسی قسم کی تیاری کے بغیر — وہ کوچ کرتے آئی تھی، معائنہ کرنے کے خواہش مند ہیں۔

ویانا سے ہوف کریگزراٹ* (Hofkriegsrat) کا ایک رکن یہ تجاویز و مطالبات لے کر پہنچا تھا کہ

* وسیع تر جنگی کونسل۔

کوتوزوف اپنی سپاہ کو لے کر بہ عجیل آرچ ڈیوک فرڈی ننڈ اور جنرل میک کے زیر کمان افواج کے ساتھ جا ملے۔ کوتوزوف کے خیال میں یہ اتحاد قرین مصلحت نہ تھا اور اپنے نقطۂ نظر کو منوانے کے لیے دوسرے دلائل کے علاوہ اس کا ارادہ آسٹروی جرنیل کو یہ بھی دکھانا تھا کہ روسی فوجیں جس حالت میں روس سے پہنچی ہیں، وہ انتہائی خستہ اور قابل رحم ہے۔ وہ رجمنٹ کا معائنہ اسی مقصد کے پیش نظر کرنا چاہتا تھا۔ رجمنٹ کی خستہ حالت جتنی زیادہ خستہ و خراب ہوتی، کمانڈر انچیف کو اتنی ہی زیادہ خوشی ہوتی۔ اگرچہ ایجوٹنٹ کو ان حالات کا علم نہیں تھا، تاہم اس نے رجمنٹل کمانڈر کو یہ بین حکم پہنچا دیا کہ جوانوں کے اجسام پر اوورکوٹ اور ان کی کمروں پر تھیلے ہونے چاہئیں ورنہ کمانڈر انچیف ناراض ہوں گے۔

یہ سن کر رجمنٹل کمانڈر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس کا سر جھک گیا۔ کندھے پچک گئے اور وہ بے بسی سے اپنے بازو ہوا میں لہرانے لگا۔

''ستیاناس!'' وہ دہاڑا۔ ''میخائیل مترخ، میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا کہ 'پوری وردی' سے مراد یہ تھا کہ اوورکوٹ پہنے جائیں،'' اس نے بٹالین کمانڈر کی سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''اف، میرے خدایا!'' اس کے منہ سے مزید نکلا۔ اس کے ساتھ وہ پرعزم انداز سے آگے بڑھا۔ ''کمپنی کمانڈر صاحبان!'' اس نے ایک ایسی آواز میں چلا کر کہا جو حکم دینے کی عادی تھی۔ ''سارجنٹ میجر صاحبان!...وہ کب تک تشریف لے آئیں گے؟'' اس نے ایسے احترام کے ساتھ ایجوٹنٹ سے یہ سوال دریافت کیا جو واضح طور پر اس شخصیت کے وقار کے عین مطابق تھا جس کی طرف وہ اشارہ کر رہا تھا۔

''میرا خیال ہے، ایک گھنٹے میں۔''

''ہمیں وردیاں تبدیل کرنے کے لیے وقت مل جائے گا؟''

''جنرل، میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔''

رجمنٹل کمانڈر خود جوانوں کی صفوں میں گھس گیا اور حکم دینے لگا کہ وہ اوورکوٹ پہن لیں۔ کمپنیوں کے کمانڈر منتشر ہو گئے اور اپنی اپنی کمپنیوں میں چلے گئے۔ سارجنٹ میجر ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے لگے (اوورکوٹوں کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی)۔ اس ترت پھرت کا نتیجہ یہ ہوا کہ نوجوانوں میں، جو ابھی ابھی منظم اور باترتیب صفیں بنائے خاموش کھڑے تھے، کھلبلی مچ گئی، وہ دائیں بائیں، آگے پیچھے دھکم دھکا کرنے اور بھانت بھانت کی بولیاں بولنے لگے۔ وہ کندھوں کو جھٹکتے، کمروں میں تھیلے اوپر اچھالتے، ان کی پٹیاں کھولتے، جلد بازی سے اپنے اوورکوٹ نکالتے اور الٹا سیدھا جس طرح بھی ہو سکتا، انھیں پہننے کی کوشش کرتے پھر رہے تھے۔ کسی کے بازو اوپر اٹھ رہے تھے اور کوئی انھیں آستینوں میں گھسیڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔

آدھ گھنٹہ اسی تگ ودو میں صرف ہو گیا لیکن بہرحال وہ اپنی صفیں دوبارہ منظم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فرق صرف یہ آیا کہ پہلے وہ سیاہ منظر پیش کر رہے تھے، اب اس منظر کا رنگ تبدیل ہو گیا اور وہ سرمئی ہو گیا۔ رجمنٹل

کمانڈر ایک مرتبہ پھر اکڑتا اور پھوندنے کی چال چلتا صفوں کے بالکل سامنے آ گیا اور دور سے ان کا معائنہ کرنے لگا۔

''ہونہہ! یہ کیا ہے؟ اس نے رکتے ہوئے چلا کر کہا۔ ''تیسری کمپنی کا کمانڈر!''

''تیسری کمپنی کے کمانڈر جنرل کے پاس پہنچ جائیں!... تیسری کمپنی کے کمانڈر جنرل کے پاس... تیسری کمپنی کے کمانڈر...''

معاً حکم صف بہ صف گردش کرنے لگا۔ ایک ایجوٹنٹ صفوں میں گھس گیا اور خود ماتھے افسر کو تلاش کرنے لگا۔ ادھر وہ لوگ جو حکم صف بہ صف پہنچا رہے تھے، اگرچہ وہ بڑے ذوق وشوق اور ولولے کے ساتھ آوازیں بلند کر رہے تھے، لیکن آخری صف تک پہنچتے پہنچتے پیغام کی نوعیت بالکل تبدیل ہو گئی۔ اصل حکم کے مطابق تیسری کمپنی کے کمانڈر نے جنرل کی خدمت میں حاضر ہونا تھا لیکن معاملہ جب گڑبڑا یا تو پیغام یہ پہنچا: ''جنرل صاحب تیسری کمپنی کے کمانڈر کے پاس آ رہے ہیں۔'' دریں اثنا مفقود الخبر افسر اپنی کمپنی کے عقب سے نمودار ہو چکا تھا۔ اگرچہ وہ ادھیڑ عمر کو پہنچ گیا تھا اور اسے بھاگنے دوڑنے کی عادت بھی نہیں رہی تھی، اس نے دلکی لگا دی۔ وہ پاؤں رکھتا کہیں اور وہ پڑتا کہیں تھا۔ یوں وہ ہانپتا کانپتا جنرل کی طرف چل پڑا۔ کیپٹن کی حالت اس بچے کی ہو رہی تھی جس نے اپنا سبق یاد نہ کیا ہو اور اسے سبق سنانے کا حکم ملا ہو۔ اس کے سرخ چہرے (اس کے چہرے کی سرخی لاریب کثرت شراب نوشی کا ثمر تھی) پر دھبے نمودار ہو گئے اور گھبراہٹ سے اس کے ہونٹ پھڑکنے لگے۔ کیپٹن کی سانس پھول رہی تھی اور جوں جوں وہ منزل کے قریب ہوتا جا رہا تھا، اس کی رفتار سست پڑتی جا رہی تھی۔ جنرل نے اس کا عمیق نظروں سے سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔

''چند روز میں تم اپنے جوانوں کو پیٹی کوٹ پہنانے لگو گے! یہ کیا ہے؟'' اس نے چلا کر پوچھا۔ اس کا نچلا جبڑا آگے کو لٹک گیا اور اس نے تیسری کمپنی کی صفوں میں ایک جوان کی طرف، جس نے دوسروں کے برعکس بڑھیا کپڑے کا اوور کوٹ پہنا ہوا تھا اور یوں ان سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور تم خود کہاں تھے؟ کمانڈر انچیف صاحب تشریف لایا ہی چاہتے ہیں اور تم اپنی جگہ سے غائب ہو! ایں چہ بوالعجبی ایست؟ ادھر رجمنٹ کا معائنہ ہو رہا ہے اور ادھر تم اپنے جوانوں کو چھیل چھبیلے لباس پہنا رہے ہو۔ تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ کیا کہتے ہو؟''

کمپنی کمانڈر نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی نگاہیں اپنے افسر اعلیٰ کے چہرے سے نہ ہٹائیں۔ اس کی دو انگلیاں اس کی ٹوپی کے سامنے کے حصے پر تھیں اور وہ لحظہ بہ لحظہ اس پر اپنی گرفت سخت کرتی جا رہی تھیں جیسے اس کی یہ کوشش اس کی نجات کی واحد امید رہ گئی ہو۔

''خیر، تم منہ سے کچھ پھوٹتے کیوں نہیں؟ یہ کون ہے جسے تم نے ہنگری والوں کی طرح بنا سنوار کر کھڑا کیا ہوا ہے؟'' اس نے طنز کے تیکھے تیر چلاتے ہوئے پوچھا۔

''یور ایکسی لینسی۔''

''یہ کیا یور ایکسی لینسی، یور ایکسی لینسی لگا رکھی ہے؟ ہونہہ، یور ایکسی لینسی! — تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

''یور ایکسی لینسی، وہ دلوخوف ہے، وہی دلوخوف جسے کیپٹن سے سپاہی بنا دیا گیا تھا،'' کیپٹن نے دھیمے لہجے سے جواب دیا۔

''ہونہہ! اس کی تنزلی ہوئی تھی یا ترقی؟ وہ فیلڈ مارشل مقرر ہوا تھا یا عام سپاہی؟ اگر وہ سپاہی ہے، پھر وہ عام سپاہیوں کی وردی پہنے۔''

''یور ایکسی لینسی، آپ نے کوچ کے دوران میں خود ہی اسے اجازت مرحمت فرمائی تھی۔''

''میں نے اجازت دی تھی؟ یہ تم نوجوان ہمیشہ اسی قسم کی ہانکتے رہتے ہو،'' جنرل نے قدرے ٹھنڈے پڑتے ہوئے کہا۔ ''ہونہہ، اجازت! ذرا ڈھیل دے دو اور تم لوگ...'' جنرل کا پارہ پھر بلند ہونے لگا۔ ''اور تم... جاؤ، مہربانی فرماؤ اور اپنے جوانوں کو صحیح وردی پہناؤ۔''

جرنیل نے مڑ کر ایجوٹنٹ کی طرف دیکھا اور ایک بار پھر کپکپاتا اور پھوندنے کی چال چلتا رجمنٹ کی جانب چل پڑا۔ اس نے جس غیظ وغضب کا مظاہرہ کیا تھا، بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس پر بہت مسرور ہے۔ اب وہ جوانوں کی صفوں کے درمیان میں سے گزر رہا تھا اور اپنے غیظ وغضب کے اظہار کے لیے مزید بہانے تلاش کر رہا تھا۔ اس نے ایک افسر کو محض اس لیے جھاڑ پلا دی کیونکہ اس نے اپنے عہدے کے نشان کو چمکایا نہیں تھا اور دوسرے کو اس لیے ڈانٹ دیا کہ اس کی صفیں قدرے بے ترتیب تھیں۔ یوں چلتے چلاتے وہ تیسری کمپنی کے قریب پہنچ گیا۔

''یہ تم کھڑے کیسے ہو؟ یہ تمھاری ٹانگ کو کیا ہوا؟ تمھاری ٹانگ!'' وہ کرب ناک آواز میں چلا رہا تھا۔ ابھی اس کے اور دلوخوف کے، جس نے نیلا اوورکوٹ پہنا ہوا تھا، مابین پانچ آدمی حائل تھے۔

دلوخوف نے اپنی خمیدہ ٹانگ سیدھی کی۔ اس کی شفاف نیلی آنکھیں گستاخانہ انداز سے جرنیل کے چہرے کو گھور رہی تھیں۔

''یہ نیلا کوٹ کیوں؟ اتار واسے!... سارجنٹ میجر، اس کا کوٹ بدل دو — یہ —'' وہ اپنا جملہ ختم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

''جنرل، احکام کی تعمیل کرنا میرا فرض ہے لیکن کوئی میری —''

''یہاں جوانوں کے مابین کوئی گفتگو نہیں ہو سکتی! میں اس کی اجازت نہیں دے سکتا، بالکل نہیں!''

''کوئی میری توہین کرے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا اور نہ کوئی مجھے مجبور کر سکتا ہے،'' دلوخوف نے بلند اور گونج دار آواز میں اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

جرنیل اور جوان کی آنکھیں چار ہوئیں۔ جرنیل کی زبان گنگ ہوئی اور اس نے طیش میں آ کر، اپنا سکارف جو اس کی گردن کے گرد اچھی طرح کسا ہوا تھا، نیچے گھسیٹ لیا۔

''جناب، اپنا کوٹ تبدیل کر لیں، نوازش ہو گی۔ میری آپ سے یہی درخواست ہے،'' اس نے یہ الفاظ

کہے اور وہاں سے چل دیا۔

2

''وہ آرہے ہیں!'' عین اسی لمحے ایک سنتری نے چلا کر کہا۔

رجمنٹل کمانڈر کا چہرہ تمتمانے لگا، وہ اپنے گھوڑے کی طرف بھاگا، کانپتے لرزتے ہاتھوں سے رکاب پکڑی، زین پر چھلانگ لگائی، سیدھا ہوا، اپنی شمشیر پر ہاتھ ڈالا، چہرے پر عزم صمیم اور مسرت وشادمانی کے تاثرات نقش کیے، اپنے منہ کا ایک کنارہ کھولا اور چلا کر حکم دینے کے لیے تیار ہوگیا۔ رجمنٹ یوں پھڑپھڑا رہی تھی جیسے پرندہ چونچ سے پر سنوارتے انھیں پھڑپھڑاتا ہے۔ اس کے بعد کامل سکوت طاری ہوگیا۔

''اٹین۔شن!'' جنرل روح کو لرزا دینے والی آواز سے دہاڑا۔ اس کی اس آواز سے یہ مترشح ہورہا تھا کہ وہ خود بہت خوش ہے، اسے اپنی رجمنٹ کے نظم وضبط پر ناز ہے اور وہ تازہ وارد کمانڈرانچیف کو ''جی آیاں نوں'' کہہ رہا ہے۔

کشادہ دیہاتی سڑک پر، جس کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ شجر ہائے سایہ دار کھڑے تھے، ویانا کی کبودی کالاش[2(ب)] نمودار ہوئی۔ اس میں چھ گھوڑے جتے ہوئے تھے اور وہ خراماں خراماں چلی آرہی تھی۔ اس کے سپرنگ قدرے کھڑکھڑا رہے تھے۔ کالاش کے عقب میں کمانڈرانچیف کے عملے کے ارکان اور کروشیائی[3] باشندوں پر مشتمل حفاظتی دستے کے جوان بھاگے آرہے تھے۔ گاڑی میں کوتوزوف کے ساتھ جو آسٹروی جرنیل بیٹھا تھا، وہ سفید وردی میں، جو روسیوں کی سیاہ وردیوں کے مابین عجیب معلوم ہورہی تھی، ملبوس تھا۔ جب گاڑی رجمنٹ کے قریب پہنچی، وہ رک گئی۔ کوتوزوف اور آسٹروی جرنیل آپس میں زیرلب باتیں کررہے تھے۔ کوتوزوف مسکرا رہا تھا۔ مسکراتے مسکراتے اس نے اپنا پاؤں پائیدان پر رکھا اور یوں بھاری بھرکم انداز سے اترا جیسے ان دو ہزار جوانوں کا، جو سانس روکے اسے اور رجمنٹل کمانڈر کو بغور دیکھ رہے تھے، کوئی وجود ہی نہ ہو۔

حکم کے الفاظ گونجے اور ایک بار پھر رجمنٹ کی صفوں میں ہلچل سی پیدا ہوگئی۔ جوانوں نے ہتھیار بلند کیے، کھنکھناتی آوازیں ابھریں اور سلامی دی گئی۔ اس کے بعد جو مرگ آسا سکوت طاری ہوا، اسے کمانڈرانچیف کی نحیف آواز نے توڑا۔

''ہزایکسی۔سی۔لین۔سی۔زندہ باد،'' رجمنٹ نے فلک شگاف نعرہ بلند کیا۔ اس کے بعد پھر وہی سکوت چھا گیا۔

ابتدا میں جب رجمنٹ سلامی پیش کرنے کے لیے متحرک تھی، کوتوزوف ایک ہی جگہ بت بنا کھڑا رہا۔ پھر وہ سفید وردی میں ملبوس جرنیل اور اپنے عملے کے ارکان کے ساتھ صفوں کے مابین پیدل چلنے لگا۔

جس انداز سے رجمنٹل کمانڈر نے کوتوزوف کو سلیوٹ کیا تھا (وہ یوں سیدھا تن کر کھڑا تھا جیسے وہ بالکل ہی

حکم کا غلام ہو اور اس کی نگاہیں مسلسل اپنے چیف کے چہرے پر مرکوز رہیں) اور جس انداز سے وہ جرنیلوں کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا (اس کے لیے اپنے ڈگمگاتے قدموں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا اور اس نے اپنا جسم کافی آگے جھکا رکھا تھا تاکہ وہ کمانڈر انچیف کا ایک ایک لفظ سن سکے اور اس کے معمولی سے معمولی اشارے پر دھیان رکھ سکے)، اس سے صاف مترشح ہو رہا تھا کہ کمانڈنگ افسر کی حیثیت سے اپنے فرائض نبھاتے اسے وہ خوشی نہیں ہوتی ہوگی جتنی کہ ماتحت افسر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرتے اسے ہو رہی تھی۔

یہ اس کمانڈر کی محنت شاقہ اور سخت نظم وضبط کا صدقہ تھا کہ یہ رجمنٹ ان باقی رجمنٹوں کے مقابلے میں، جو اس کے ساتھ ساتھ براؤناؤ پہنچی تھیں، نسبتاً بہت بہتر حالت میں تھی۔ جو لوگ بیمار ہو گئے تھے یا اپنی سست رفتاری کے سبب پیچھے رہ گئے تھے، ان کی تعداد صرف دو سو بنتی تھی۔ بوٹوں کے علاوہ ہر چیز ٹھیک ٹھاک تھی۔

کوتوزوف صفوں کے مابین گھومتا پھرتا رہا۔ کبھی کبھار وہ رک جاتا اور افسروں اور بعض اوقات جوانوں سے بھی، جنھیں وہ ترکوں کے خلاف مہم کے زمانے سے جانتا تھا، ہمدردی اور شفقت کے چند کلمات کہتا۔ جب اس کی نظر ان کے بوٹوں پر پڑتی، اسے بہت افسوس ہوتا اور وہ اپنی گردن جھٹکنے لگتا۔ پھر وہ کچھ اس انداز سے آسٹروی جرنیل کی توجہ ان کی طرف مبذول کراتا جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو: ’’میں کسی کو الزام نہیں دیتا لیکن آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ان بے چاروں کی حالت کتنی خستہ وخراب ہے!‘‘ جتنی مرتبہ بھی یہ واقعہ پیش آیا، رجمنٹل کمانڈر لپک کر آگے آتا تاکہ اس کی رجمنٹ کے بارے میں کمانڈر انچیف کے منہ سے جو کچھ نکلے، کہیں وہ اس کا ایک لفظ بھی سننے سے محروم نہ رہ جائے اور یوں اس کی شامت آ جائے۔

کوتوزوف کے عقب میں اس کے عملے کے ارکان آ رہے تھے۔ ان کی تعداد لگ بھگ بیس تھی۔ ان کے اور کوتوزوف کے مابین اتنا معمولی فاصلہ تھا کہ بات خواہ کتنے ہی دھیمے لہجے میں کی جاتی، وہ اسے بخوبی سن سکتے تھے۔ یہ افسر آپس میں باتیں کر رہے تھے اور کبھی کبھی ان کی ہنسی بھی نکل جاتی تھی۔ کمانڈر انچیف کے نزدیک ترین ایک خوش شکل ایجوٹنٹ تھا۔ یہ پرنس بلکونسکی تھا۔ اس کے برابر اس کا رفیق نیس وتسکی (Nesvitsky) تھا۔ دراز قد نیس وتسکی کا جسم نہایت قوی اور خوب گٹھا ہوا تھا۔ اس کا خوش وضع اور ہنستا مسکراتا چہرہ طبعی نیک نیتی کا آئینہ دار تھا۔ اس کی آنکھیں دھلی دھلائی، صاف شفاف اور روشن روشن تھیں۔ نیس وتسکی کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی اس ہنسی کا سبب ایک سانولا سلونا ہوزار افسر، جو اس کے دوش بدوش چلا آ رہا تھا، بنا تھا۔ یہ افسر اپنے چہرے پر سنجیدگی سجائے اور اپنی آنکھیں بغیر جھپکائے رجمنٹل کمانڈر کی پشت پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا اور اس کی ایک ایک حرکت کی نقل اتار رہا تھا۔ ہر بار جب جرنیل چلتا اور آگے جھکتا، ہوزار افسر بعینہٖ چلتا اور آگے جھک جاتا۔ نیس وتسکی ہنسے جا رہا تھا اور دوسروں کو ٹھوکے دے رہا تھا کہ وہ بھی اس مسخرے کی حرکات کو دیکھیں اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

کوتوزوف دھیرے دھیرے، ہولے ہولے، آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ ہزاروں لوگ دیدے پھاڑے

کھڑے تھے تا کہ انھیں اپنے چیف کی ایک جھلک نظر آ جائے۔ جب وہ تیسری کمپنی کے قریب پہنچا، وہ یک دم رک گیا۔ اس کے عملے کے ارکان یہ اندازہ نہ لگا سکے کہ وہ یوں رک جائے گا، چنانچہ وہ بمشکل اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچے۔

''ارے، تموخن (Timokhin)!'' اس نے سرخ ناک والے کیپٹن کو، جس کی نیلے کوٹ کی وجہ سے اچھی خاصی ڈانٹ ڈپٹ ہوئی تھی، پہچانتے ہوئے کہا۔

جب رجمنٹل کمانڈر تموخن کو جھاڑ پلا رہا تھا، کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس طرح وہ تن کر مؤدب کھڑا ہوا تھا، جھاڑ کے دوران میں کوئی اس سے زیادہ مؤدب تن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ لیکن اب جب کمانڈر انچیف اس سے مخاطب ہوا، تو کہنے کو تو وہ سیدھا تن کر کھڑا ہو گیا لیکن جلد ہی نظر آنے لگا کہ وہ زیادہ دیر تک اسی انداز میں کھڑا رہا، اس کا ذہن اتنے زبردست تناؤ کا شکار ہو جائے گا کہ اس کے لیے برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا اور اس کا بولو رام ہو جائے گا۔ کوتوزوف کو اس کی اس کیفیت کا اندازہ ہو گیا، اس نے اس کی خیر خیریت دریافت کی، نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور تیزی سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پھولے پھولے چہرے پر، جسے ایک زخم کے نشان نے داغ دار بنا دیا تھا، نحیف مسکراہٹ جو بمشکل نظر آتی تھی، نمودار ہوئی۔

''ایک اور اسماعیلی[4] کامریڈ،'' اس نے کہا۔ ''جی دار افسر ہے! تم اس سے مطمئن ہو؟'' اس نے رجمنٹل کمانڈر سے پوچھا۔

اور جرنیل، اس امر سے بالکل بے آگاہ، کہ ہوزار افسر جس طرح اس کی نقل اتار رہا تھا کہ اگر وہ آئینے میں اپنی شکل دیکھتا تو اسے اپنے عکس اور افسر کے مابین بال برابر فرق نظر نہ آتا، تیزی سے آگے لپکا اور بولا:

''بالکل، بالکل، یور ایکسی لینسی!''

''ہم سب میں چھوٹی موٹی کمزوریاں ہوتی ہیں،'' کوتوزوف نے مسکراتے اور اس سے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ بس ذرا شراب کباب کا رسیا ہے۔''

کمانڈنگ افسر کو اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں اس کا الزام اس کے سر نہ دھر دیا جائے، چنانچہ اس نے خاموش رہنا ہی بہتر سمجھا۔ عین اس وقت ہوزار افسر کی نگاہ سرخ ناک والے کیپٹن کے، جس نے اپنا پیٹ اندر کی جانب کھینچ رکھا تھا، چہرے پر پڑی۔ اس نے اس کے انداز اور چہرے مہرے کی اتنی مکمل نقل اتاری کہ نیس وتسکی کی خواہ مخواہ ہنسی نکل گئی۔ کوتوزوف نے مڑ کر پیچھے دیکھا، ہوزار افسر نے کسی نہ کسی طرح اپنے اوپر قابو پا لیا، اس کی شکل پہلے تو قدرے مضحک ہو گئی اور جب کوتوزوف کی نگاہ اس پر پڑی، تو وہ یوں نظر آنے لگا جیسے اس سے زیادہ معصوم، سنجیدہ اور مؤدب آدمی کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسری کمپنی سب سے آخر میں تھی۔ کوتوزوف وہیں رک گیا۔ وہ کچھ یوں اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا جیسے کچھ یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پرنس آندرے آگے بڑھا اور اس سے فرانسیسی میں سرگوشی کرنے لگا۔

''آپ نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں آپ کو افسر دلوخوف کے، جسے کیپٹن سے عام سپاہی بنا دیا گیا ہے،

بارے میں یاد دہانی کرادوں،'' اس نے کہا۔

''کہاں ہے یہ دلوخوف؟''

دلوخوف، جو اپنا اوورکوٹ اتار کر عام سپاہی کا سرمئی اوورکوٹ پہن چکا تھا، کب چونکنے والا تھا۔ متناسب جسم، سنہری بالوں اور نیلی آنکھوں والے سپاہی نے بلائے جانے کا انتظار تک نہ کیا۔ وہ اپنی صف سے آگے نکل آیا، کمانڈر انچیف کی طرف قدم بڑھایا اور بندوق اٹھا کر اسے سلامی دی۔

''کوئی شکایت؟'' کوتوزوف نے بھویں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔

''یہی دلوخوف ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''مجھے امید ہے کہ تم نے سبق سیکھ لیا ہوگا۔ اپنے فرائض نبھاتے رہو۔ زار رحم دل ہیں۔ اور اگر تم نے استحقاق ثابت کر دکھایا، میں تمھیں نظر انداز نہیں کروں گا۔''

صاف شفاف نیلی آنکھیں اس دلیری اور جرأت سے کمانڈر انچیف کو دیکھنے لگیں جس سے انھوں نے رجمنٹل کمانڈر کو دیکھا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ نگاہیں روایت کے اس پردے کو، جس نے کمانڈر انچیف اور عام سپاہی کے مابین اتنا طویل فاصلہ تان دیا تھا، تار تار کردیں گی۔

''یوئر ایکسی لینسی، میں ایک درخواست گوش گزار کرنا چاہتا ہوں،'' دلوخوف نے سوچے سمجھے انداز سے اپنی محکم اور کھنکتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''میری گزارش یہ ہے کہ مجھے اپنے قصور کی تلافی کرنے اور ہز میجسٹی امپراطور اور روس کے ساتھ اپنی وفاشعاری جتانے کا موقع عنایت کیا جائے۔''

کوتوزوف نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہی جگمگاہٹ جو اس وقت اس کی آنکھوں میں نمودار ہوگئی تھی جب اس نے تموخن کی طرف پشت کی تھی، دوبارہ عود کر آئی۔ پھر اس نے اپنی بھویں یوں سکیڑیں جیسے وہ یہ اعلان کررہی ہیں کہ دلوخوف نے جو کچھ کہا ہے یا جو کچھ وہ کہہ سکتا ہے، اس کا اسے مدتوں سے علم ہے، وہ اس قسم کی باتوں سے تنگ آچکا ہے اور یہ وہ نہیں ہیں، جن کی ضرورت ہے۔

رجمنٹ مختلف کمپنیوں میں منقسم ہوگئی اور اپنے پڑاؤ کے اگلے مقام کی طرف، جو براؤناؤ سے زیادہ دور نہیں تھا، چل پڑی۔ انھیں امید تھی کہ وہاں انھیں جوتے اور وردیاں بھی مل جائیں گی اور جان لیوا سفر کے بعد پاؤں پسارنے کا موقع بھی میسر آجائے گا۔

''پراخور اگناتچ، تمھارے دل میں میرے خلاف کوئی بغض تو نہیں ہوگیا ہے؟'' گھوڑے پر سوار رجمنٹل کمانڈر نے تیسری کمپنی کے، جو اپنی جائے قیام کی طرف کوچ کر رہی تھی، برابر آتے ہوئے کیپٹن تموخن سے، جو سب سے آگے آگے پیدل جارہا تھا، کہا۔ اب جب کہ معائنہ کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہو چکا تھا، جرنیل جامے میں پھولا نہ سما رہا تھا، اس کی یہ بے پناہ مسرت اس کے روم روم سے ٹپک رہی تھی کیونکہ کوشش کے باوجود وہ اسے چھپا نہیں سکا تھا۔ ''زار کی ملازمت میں... آپ کچھ نہیں کرسکتے... سلامی کے دوران میں بعض اوقات...

آدمی کی طبیعت بجھ جاتی ہے... سب سے پہلے میں تم سے معذرت خواہ ہوں، تم تو مجھے جانتے ہی ہو... وہ بہت خوش گئے ہیں!'' اور اس نے اپنا ہاتھ کیپٹن کی طرف بڑھا دیا۔

''چھوڑیں جنرل، میں بھلا اتنی بڑی گستاخی کیسے کرسکتا ہوں؟'' کیپٹن نے جواب دیا۔ اس کی ناک پہلے سے بھی زیادہ سرخ ہوگئی اور وہ مسکرانے لگا۔ جب وہ مسکرایا اور اس کا منہ کھلا، تو یہ انکشاف ہوا کہ اس کے سامنے کے دو دانت غائب ہیں۔ اصل میں اس کے یہ دونوں دانت اسماعیل کے قصبے میں بندوق کا کندا لگنے سے ٹوٹ گئے تھے۔

''اور تم دلوخوف کو بھی بتا سکتے ہو کہ میں اسے فراموش نہیں کروں گا، اسے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ، میں اس کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا۔ اب اس کا رویہ ٹھیک ہے؟ عمومی طور پر کیا وہ...''

''یور ایکسی لینسی، جہاں تک سرکاری امور کی انجام دہی کا تعلق ہے، وہ بے حد فرض شناس ہے، چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا پورا خیال رکھتا ہے... لیکن اس کا مزاج...''

''کیا ہوا اس کے مزاج کو؟'' رجمنٹل کمانڈر نے پوچھا۔

''مختلف ایام میں اس کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ ایک روز وہ اچھی خاصی معاملہ فہمی، خردمندی اور بھلمنساہٹ کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن اس سے اگلے روز بالکل جنگلی حیوان بن جاتا ہے۔ آپ یقین نہیں کریں گے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس نے پولینڈ میں ایک یہودی کو تقریباً ہلاک کر دیا تھا۔''

''خیر، خیر،'' رجمنٹل کمانڈر نے کہا۔ ''پھر بھی اگر کوئی نوجوان کسی مصیبت میں پھنس جائے، اس پر ترس کیا جانا چاہیے۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس کے بارسوخ لوگوں کے ساتھ تعلقات ہیں... چنانچہ تمھیں صرف...''

''جی، یور ایکسی لینسی،'' آپ نے بجا فرمایا۔ تموخن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ کمانڈر کا مدعا سمجھ گیا ہے۔

''اخ، ہاں۔''

رجمنٹل کمانڈر نے عام سپاہیوں کے مابین دلوخوف کو ڈھونڈ نکالا۔ اس نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی باگیں کھینچ لیں اور اس سے مخاطب ہو کر بولا:

''پہلی جھڑپ کے بعد۔ عہدے کی پٹیاں۔''

دلوخوف نے نظریں اوپر اٹھائیں لیکن اس نے زبان بند رکھی۔ اس کے چہرے پر جو طنزیہ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی، اس میں بھی کسی قسم کی تبدیلی رونما نہ ہوئی۔

''سب معاملہ ٹھیک ٹھاک بھگت گیا،'' رجمنٹل کمانڈر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمام جوانوں کے لیے ووڈکا درکار ہوگی،'' اس نے خاصی بلند آواز میں کہا تاکہ سپاہی بھی اس کی بات سن سکیں۔ ''میں تم سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں! ہم سب خداوند کے شکرگزار ہیں!'' اور اس نے اپنا گھوڑا اگلی کمپنی کی طرف بڑھا دیا۔

''بہت بھلا آدمی ہے۔ اس کی ماتحتی میں کام کرنا اتنا مشکل نہیں،'' تموخن نے اپنے ایک ماتحت افسر سے،

جو اس کی اردل میں سفر کر رہا تھا، کہا۔

''دوسرے الفاظ میں — پان کا بادشاہ!'' ماتحت افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ (یار لوگ رجمنٹل کمانڈر کو 'پان کا بادشاہ' کہتے تھے۔)

معائنے کے بعد افسروں کی خوشگوار ذہنی کیفیت کا اثر جوانوں میں بھی سرایت کر گیا۔ کمپنیاں ہشاش بشاش منزل کی طرف گامزن تھیں۔ مختلف سپاہی آپس میں جو باتیں کر رہے تھے، ان کی گونج چاروں اطراف سنائی دے رہی تھی۔

''کچھ سنا کہ کوتوزوف کانا ہے؟''

''بالکل درست ہے کانا ہی نہیں، پورا اندھا ہے۔''

''نہیں بھائی، اس کی بینائی تمھاری بینائی سے زیادہ تیز ہے۔ بوٹ، ٹانگوں کی پٹیاں[5] — سالے کی نظروں سے کچھ بھی نہیں بچا۔''

''یار، جب اس نے میرے پاؤں کی طرف دیکھا — میرے جی میں آیا...''

''اور اس کے ساتھ جو آسٹروی آیا تھا، سالا، یوں دکھائی دیوے تھا جیسے کسی نے اس کے بدن پر چاک رگڑ دیا ہو۔ بالکل آٹے کی طرح چٹا تھا! میں شرط لگاتا ہوں کہ جیسے ہم اپنی بندوقیں چمکاوے ہیں، وہ رگڑ رگڑ کر اپنے بدن چمکاوے ہے۔''

''بھیا فیدیشو! اس نے یہ نہیں بتایا کہ جنگ کب شروع ہووے ہے؟ سنا ہے کہ بوناپارت آپے برونو وو پہنچ گیا ہے۔''

''بوناپارت؟ اس کوڑھ مغز کی بھی سنو! اس بیچارے کو کچھ پتا ہی نہیں؟ پرشیا والوں نے ہتھیار اٹھا لیے ہیں اور آسٹریا والے لٹھ لیے ان کے پیچھے پھر رہے ہیں۔ جب وہ ان کی ٹھکائی کر لیں گے، بوناپارت کے ساتھ جنگ شروع ہو جائے گی... اور یہ کہے ہے کہ بوناپارت برونو وو میں ہے۔ اسی سے پتا چل جاوے ہے کہ سالے کا بھیجا خالی ہووے! تمھارا بھلا اسی میں ہووے کہ اپنے کان کھول کر رکھا کرو!''

''یہ کوارٹر ماسٹر[6] نرے گاؤدی ہیں! ان کی کرنیاں دیکھو، پانچویں کمپنی گاؤں میں پہنچ بھی گئی ہے — جب تک ہم وہاں پہنچیں گے، وہ اپنا کھانا وانا پکا بھی چکے ہوں گے۔''

''کتے کے پلے، ہمیں کوئی رس وس ہی کھلا دو۔''

''تم نے کل مجھے تمبا کو دیا تھا؟ بالکل نہیں، خیر، برپشم قلندر — ہم تمھاری طرح تھڑدلے تھوڑے ہیں، یہ لو اور موج کرو!''

''یہ ہمیں یہیں رکنے کا حکم کیوں نہیں دیتے؟ خالی پیٹ ابھی چار میل اور چلنا ہوگا۔''

''خاطر تو جرمنوں نے ہماری کی کہ ہمیں اپنی گاڑیوں[7] میں بٹھا لائے۔ کیا آرام سے سفر کٹا! — مزا آ گیا!''

''یار، یہاں کے لوگوں میں عقل وقل نہیں۔ ادھر پیچھے سارے پولستانی معلوم ہوویں تھے لیکن تھے تو روسی

تاج کے ماتحت — یہاں تو، بھیا، جرمن ہی جرمن نظر آ دیں ہیں۔''

''گویے، آگے آجائیں،'' کیپٹن کا حکم سنائی دیا۔

اور مختلف صفوں سے کوئی بیس اشخاص بھاگتے دوڑتے آگے آ گئے۔ ان کا لیڈر ایک نقارچی تھا۔ اس نے گویوں کے سامنے اپنا باز و لہرایا اور ایک طویل عسکری گیت شروع ہو گیا۔ اس کا ابتدائی بول تھا: ''صبح طلوع ہوئی اور سورج بلند ہونے لگا،'' اور اس کے اختتامی الفاظ یہ تھے: ''دوستو، فادر کامینسکی (Kamensky) کے ساتھ ساتھ شان وشکوہ کی منزل کی طرف قدم بڑھاتے چلو...'' اس گیت کے الفاظ اور دھنیں ترکی کے خلاف جنگ کے دوران میں ترتیب دی گئی تھیں۔ اب جب کہ یہ گیت آسٹریا میں گایا جا رہا تھا، ''فادر کامین سکی'' کو ''فادر کوتوزوف'' میں تبدیل کر دیا گیا۔

آخری الفاظ عسکری انداز میں گج بجا کر ادا کرتے اور فضا میں اپنا باز و یوں لہراتے جیسے وہ کوئی چیز اٹھا کر نیچے پٹک رہا ہو، نقارچی نے، جس کا بدن چھریرا، چہرہ خوش شکل اور عمر چالیس سال تھی، اپنی آنکھیں سکیڑیں اور کڑی نگاہوں سے اپنے گویوں کا جائزہ لیا۔ جب اسے اطمینان ہو گیا کہ ان سب کی نظریں خود اس پر جمی ہوئی ہیں، اس نے یوں اپنے باز و بلند کیے جیسے وہ کسی نادیدہ لیکن بیش بہا چیز کو نہایت احتیاط سے اپنے سر کے اوپر اٹھا رہا ہو۔ وہ اپنے باز و کئی سیکنڈ فضا میں تھامے رہا اور پھر آندھی کی طرح انھیں نیچے پٹک دیا۔

''اف، کاشانۂ من، کاشانۂ من...'' اس نے ابتدا کی۔

اور بیس آوازیں ٹیپ کا مصرعہ دہرانے لگیں۔ اور وہ شخص جو چوبی آلات بجا رہا تھا، اپنے آلات کے بوجھ کے باوصف کمپنی کے روبرو اپنے کندھے جھٹکاتا اور پھرتی سے کلیلیں بھرتا کبھی آگے نکل آتا اور کبھی لپک کر پیچھے ہٹ جاتا۔ وہ اپنے آلات یوں کھنکھٹا رہا تھا جیسے کسی کو دھمکا رہا ہو۔ سپاہی موسیقی کی لے کے ساتھ اپنے باز و لہراتے آگے بڑھنے لگے۔ ان کے قدم آپ ہی آپ تان کے ساتھ تھرک رہے تھے۔ کمپنی کے عقب میں پہیوں کی گڑگڑاہٹ، سپرنگوں کی چرچراہٹ اور گھوڑوں کے سموں کی رپ رپ سنائی دے رہی تھی۔ کوتوزوف اور اس کے عملے کے ارکان واپس شہر جا رہے تھے۔ کمانڈر انچیف نے ہاتھ کے اشارے سے یہ عندیہ دیا کہ جوان تسلی اور اطمینان سے اپنا سفر جاری رکھیں جب کہ وہ خود اور اس کے حالی موالی یوں شکلیں بنا رہے تھے جیسے وہ گانے بجانے کی آوازوں، سپاہیوں کی اچھل کود اور خوش باش اور تھرکیلے جوانوں کے انداز سفر سے، بہت محظوظ ہو رہے ہوں۔ میمنے کی دوسری صف میں، جدھر سے کوتوزوف کی گاڑی گزر رہی تھی، نمایاں ترین شخص، نیلی آنکھوں والا سپاہی دلوخوف تھا۔ وہ نہایت نفاست اور قرینے سے اپنا جسم لہرا رہا تھا اور تھرکتے میں موسیقی کا پورا پورا ساتھ دے رہا تھا۔ وہ کوتوزوف اور اس کے ہمراہیوں کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے ان پر ترس کھا رہا ہو کہ وہ ایسے سے کمپنی کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت سے محروم ہو رہے ہیں۔ کوتوزوف کے عملے میں شامل جس ہوزار لیفٹیننٹ نے رجمنٹل کمانڈر کی نقلیں اتاری تھیں، وہ پیچھے رہ گیا اور اپنا گھوڑا بھگاتا دلوخوف کے پاس پہنچا۔

ہوزار لیفٹینینٹ ژرکوف (Zherkov) کسی زمانے میں پیٹرزبرگ کے ان شوریدہ سروں کے گروہ میں شامل تھا جس کا سرغنہ دلوخوف تھا۔ جب اس نے دیارِ غیر میں دلوخوف کو، جس کی حیثیت اب عام سپاہی کی تھی، دیکھا، اس نے اس سے ملنا مناسب نہ سمجھا لیکن اب جب کہ کوتوزوف دلوخوف سے ہم کلام ہو چکا تھا، اس نے مطعون افسر کو پرانے دوستوں کے بے تکلفانہ انداز سے مخاطب کیا۔

''یار، کیسے ہو؟'' اس نے اپنا گھوڑا کمپنی کے عین برابر لا کر گانے بجانے کے شور میں سوال کیا۔

''میں کیسا ہوں؟'' دلوخوف نے سرد مہری سے جواب دیا، ''جیسا تمھیں نظر آرہا ہوں۔''

ژرکوف نے کھلے ڈھلے اور بے تکلف لہجے سے سوال کیا تھا۔ دلوخوف نے اس کا عمداً سرد مہری سے جواب دیا تھا لیکن موسیقی کی جوشیلی لے نے اس سوال و جواب کو خاص لطف بخش دیا۔

''اور تمھاری اپنے افسروں کے ساتھ کیسے نبھ رہی ہے؟''

''بالکل ٹھیک۔ وہ بھلے لوگ ہیں۔ تم نے کمانڈر انچیف کے سٹاف میں شامل ہونے کے لیے کون سا چور دروازہ ڈھونڈ لیا؟''

''مجھے شامل کیا گیا تھا۔ میں اس وقت ڈیوٹی پر ہوں۔''

دونوں چپ ہو گئے۔

''وہ جو تھی اس نے اپنی دائیں کلائی اوپر اٹھائی اور شاہیں فضا میں اچھال دیا...'' گیت چل رہا تھا۔ ان الفاظ نے بے ساختہ جوانوں کی روحیں گرما دیں اور ان کے اندر نیا ولولہ بیدار کر دیا۔ اگر گیت اثر انگیز کیفیت کا حامل نہ ہوتا، ان کی گفتگو شاید مختلف ہوتی۔

''یہ سچ ہے کہ آسٹرو ی شکست کھا گئے ہیں؟'' دلوخوف نے پوچھا۔

''سننے میں تو یہی آیا ہے لیکن حقیقت کیا ہے، خدا ہی جانے!''

''میں خوش ہوں،'' گیت کے تقاضے کے مطابق دلوخوف نے غیر مبہم اور پھرتیلے انداز سے جواب دیا۔

''کسی روز شام کو آؤ، تاش کی بازی ہو جائے گی۔ کیا خیال ہے؟''

''کیوں؟... فالتو پیسے آ گئے ہیں؟''

''ضرور آنا۔''

''میں نہیں آسکتا۔ میں قسم کھا چکا ہوں کہ جب تک ترقی نہیں مل جاتی، جوئے اور شراب کے قریب بھی نہیں پھٹکوں گا۔''

''لیکن یہ اولیں معرکے سے پہلے نہیں ہوگی۔''

''دیکھا جائے گا۔''

وہ ایک بار پھر خاموش ہو گئے۔

"خیر، اگر کسی چیز کی ضرورت ہو، آجانا۔ آدمی اگر سٹاف میں شامل ہو تو کچھ نہ کچھ کام آ ہی سکتا ہے۔"
دلوخوف کی ہنسی نکل گئی۔
"تم کیوں پریشان ہوتے ہو۔ اگر مجھے کسی چیز کی ضرورت محسوس ہوئی، میں مانگوں گا نہیں، ۔اٹھا کر لے آؤں گا۔"

"اف، خیر، 'میں صرف' بھی۔"

"اور 'میں صرف' بھی۔"

"خدا حافظ۔"

"نیک تمنائیں۔"

"اور اوپر بلند فضا میں اور دور، بہت دور
سرزمین وطن کی جانب..."

ژرکوف نے گھوڑے کو مہمیز لگایا۔ گھوڑا جوش میں آ گیا اور اچھل کود کرنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کون سا قدم پہلے بڑھائے۔ پھر وہ سرپٹ بھاگتا کمپنی سے آگے نکل گیا اور گاڑی کے ساتھ جاملا۔ دوڑتے میں اس کے قدم آپ ہی آپ موسیقی کا ساتھ دے رہے تھے۔

3

معائنے سے واپسی کے بعد کوتوزوف آسٹروی جرنیل کو اپنے پرائیویٹ کمرے میں لے گیا۔ اس نے اپنے ایجوٹنٹ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ وہ کاغذات، جن پر نو آمد دستوں کی خستہ حالی کے کوائف درج ہیں اور وہ خطوط، جو ہراول افواج کے کمانڈر آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ کی جانب سے موصول ہوئے ہیں، لے آئے۔ پرنس بلکونسکی مطلوبہ کاغذات سمیت حاضر ہو گیا۔ کوتوزوف اور جنگی کونسل کا آسٹروی رکن میز کے سامنے بیٹھے تھے۔ میز پر ایک منصوبہ بچھا ہوا تھا۔

"اخاہ!..." کوتوزوف نے نگاہیں اوپر اٹھاتے اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اسے فرانسیسی میں بیان کرتے ہوئے کچھ اس انداز سے یہ ندائیہ لفظ ادا کیا جیسے اس کے ذریعے اس نے اپنے ایجوٹنٹ کو وہیں ٹھہرنے کی دعوت دی ہو۔
"جنرل، مجھے صرف ایک بات عرض کرنا ہے،" کوتوزوف نے کہا۔ اس کی ادائیگی اور لہجے کے اتار چڑھاؤ میں کچھ ایسی پرلطف شستگی اور نفاست تھی کہ سامع مجبور ہو جاتا تھا کہ وہ اس کے ایک ایک لفظ کو، جو خوب سوچ سمجھ کر ادا کیا جاتا تھا، پوری توجہ اور دھیان سے سنے۔ بظاہر وہ خود بھی اپنی آواز سن کر مسحور ہو جاتا تھا۔ "مجھے صرف ایک

بات عرض کرنا ہے اور وہ بات یہ ہے کہ اگر معاملے کا انحصار میری ذاتی خواہشات پر ہوتا، تو ہز میجسٹی امپراطور فرانٹس (Franz) (حکمران آسٹریا) کی آرزو کبھی کی پوری ہو چکی ہوتی۔ میں بہت پہلے آرچ ڈیوک کے ساتھ جا ملا ہوتا اور آپ میری بات پر اعتبار کریں کیونکہ میں یہ اپنی عزت کی قسم کھا کر کہہ رہا ہوں کہ ذاتی طور پر مجھے بہت خوشی ہوتی کہ فوج کی اعلیٰ کمان ایک ایسے جرنیل کے حوالے کر دی جاتی — اور آسٹریا میں ایسے اشخاص بکثرت موجود ہیں — جو مجھ سے زیادہ باخبر اور زیادہ چابک دست ہوتا اور یوں میں ان بھاری ذمے داریوں کے بوجھ سے آزاد ہو جاتا، لیکن جنرل، کیا کیا جائے، حالات بعض اوقات اتنی نازک صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ وہ ہمارے بس میں نہیں رہتے۔''

اور کوتوزوف یوں مسکرایا جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو: ''آپ کو پورا اختیار حاصل ہے کہ آپ بے شک میری بات کا اعتبار نہ کریں اور آپ میری بات کا اعتبار کرتے ہیں یا نہیں، مجھے اس کی مطلق پروا نہیں ہے۔ لیکن تمھارے پاس مجھے بتانے کی معمولی سی وجہ بھی نہیں۔ اور سارا نکتہ بس یہی ہے۔''

معلوم ہوتا تھا کہ آسٹروی جنرل مطمئن نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کے پاس کوتوزوف کو ترکی بہ ترکی جواب دینے کے ماسوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

''اس کے برعکس،'' اس نے ایسے چڑچڑے اور غصیلے لہجے میں جواب دیا کہ اس کے الفاظ میں جس طرح کی چاپلوسی پائی جاتی تھی، یہ لہجہ اس کی تردید کر رہا تھا۔ ''اس کے برعکس مشترکہ کارروائی کے ضمن میں یورَ ایکسی لینسی نے جو حصہ لیا ہے، ہز میجسٹی اس کی بے پناہ قدر کرتے ہیں۔ لیکن ہمیں یہ یقین ہے کہ روسی افواج اور ان کے کمانڈر انچیف جنگوں میں جس قسم کی کامیابیوں کا سہرا اپنے سر باندھنے کے عادی ہو چکے ہیں، موجودہ تاخیر انھیں اس سے محروم کر رہی ہے۔'' اس نے اپنی بات کی تان ایک ایسے جملے پر توڑی جو صاف معلوم ہوتا تھا کہ پہلے سے سوچا ہوا ہے۔

کوتوزوف نے اپنا سر خم کر دیا لیکن اس کی مسکراہٹ میں کوئی فرق نہ آیا۔

''لیکن مجھے اتنا پختہ یقین ہے،'' اس نے کہا۔ ''اور ہز ہائی نس آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ نے میری جس تازہ ترین خط سے عزت افزائی کی ہے، اس کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد مجھے یہ فرض کرنا ہی پڑتا ہے کہ جنرل میک جیسے سیانے اور قابل کمانڈر کی سرکردگی میں آسٹروی فوج نے فیصلہ کن فتح حاصل کر لی ہوگی اور اب انھیں ہماری امداد کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہوگی۔''

جنرل کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اگرچہ آسٹروی شکست کے متعلق کوئی واضح خبر نہیں آئی تھی لیکن واقعاتی شہادتیں اتنی زیادہ تھیں کہ ناموافق افواہوں کی، جو ادھر ادھر پھیل رہی تھیں، خواہ مخواہ تصدیق ہو جاتی تھی۔ چنانچہ کوتوزوف نے آسٹروی فتح کا جو مفروضہ قائم کیا تھا، اس کی حیثیت طنز سے زیادہ نہیں رہ جاتی تھی۔ لیکن کوتوزوف بڑے سکون اور خوش اخلاقی سے مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے مہرے سے اس امر کا عندیہ مل رہا تھا کہ اسے یہ مفروضہ گھڑنے کا حق حاصل ہے اور حقیقتاً اسے جنرل میک کی جانب سے جو آخری خط موصول ہوا تھا، اس میں واقعی فتح کا مژدہ سنایا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ حرب وضرب کے قواعد کے مطابق اس کی فوج غنیم کی فوج کے مقابلے میں بہتر پوزیشن میں ہے۔

''مجھے وہ خط دکھانا،'' کوتوزوف نے پرنس آندرے سے مخاطب ہوکر کہا۔ ''ذرا مہربانی فرمائیں اور توجہ سے سنیں۔'' کوتوزوف کے دہن کے کناروں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہو رہی تھی۔ وہ آرچ ڈیوک فرڈی ننڈ کے مراسلے سے آسٹروی جرنیل کے سامنے جرمن زبان میں مندرجہ ذیل عبارت پڑھنے لگا:

ہم نے ستر ہزار افراد پر مشتمل سپاہ مجتمع کر لی ہے تا کہ اگر غنیم دریائے لیخ عبور کرنے کی کوشش کرے، تو اس پر حملہ کیا جا سکے اور اسے شکست سے دوچار کیا جا سکے۔ چونکہ ہم قصبہ اُلم پر پہلے ہی قابض ہو چکے ہیں، اس لیے دریائے ڈینیوب کے دونوں کناروں پر تسلط حاصل ہونے کی وجہ سے ہمیں جو فائدہ دستیاب تھا، اسے برقرار رکھنے میں اب ہمیں ناکامی کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔ چنانچہ اگر دشمن نے دریائے لیخ کو عبور نہ کیا، پھر ہم ترت اس کے رسد و رسائل کے سلسلے کو اپنے حملے کی زد میں لے سکیں گے، زیریں جانب دریائے ڈینیوب دوبارہ عبور کریں گے اور غنیم نے ہمارے وفا شعار اتحادی کے خلاف اپنی پوری فوج جھونکنے کا فیصلہ کیا، تو اس کے عزائم پر پانی پھیر دیں گے۔ چنانچہ ہم اعتماد و تیقن کے ساتھ اس وقت کا انتظار کریں گے جب روس کی شاہی فوج پوری طرح کیل کانٹے سے لیس ہو جائے گی۔ پھر ہمیں مشترکہ طور پر ایسا گڑھا کھودنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی جس میں ہم غنیم کو دھکیل سکیں گے کیونکہ وہ اسی کا مستحق ہے۔

جب کوتوزوف اس عبارت کا آخری جملہ پڑھ چکا، اس نے گہری اور لمبی سانس لی اور جنگی کونسل کے رکن کو توجہ اور بہ نگاہ لطف و کرم دیکھنے لگا۔

''لیکن، یور ایکسی لینسی، آپ اس دانا مقولے سے اچھی طرح آگاہ ہیں جو ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ہمیں بدترین صورت حال کے لیے تیار رہنا چاہیے،'' آسٹروی جنرل نے کہا۔ نظر بظاہر اس کی یہی خواہش تھی کہ ہنسی مذاق سے احتراز کیا جائے اور سنجیدگی سے کام کی بات کی جائے۔

وہ آزردہ اور برہم نظروں سے ایجوٹنٹ کو دیکھنے لگا۔

''جنرل، معذرت چاہتا ہوں،'' کوتوزوف نے مداخلت کرتے اور پرنس آندرے کی جانب توجہ مبذول کرتے ہوئے کہا۔ ''برخوردار، ذرا لپک کر جاؤ اور کزلووسکی (Kozlovsky) سے، وہ تمام اطلاعات، جو ہمارے مخبروں سے موصول ہوئی ہیں، لے آؤ۔ یہ دو مراسلے کاؤنٹ نوسٹیٹس (Nostitz) کے ہیں اور یہ خط آرچ ڈیوک فرڈی ننڈ کا ہے۔ انھیں اٹھاؤ اور یہ بھی'' اس نے متعدد کاغذات اسے تھماتے ہوئے کہا۔ ''ان سب کی مدد سے فرانسیسی میں مختصر لیکن جامع محضر نامہ تیار کر دو۔ آسٹروی فوج کی حرکات و سکنات کے بارے میں ہمیں جتنی معلومات حاصل ہوئی ہیں، اس میں ان سب کا احاطہ ہو جانا چاہیے۔ جب یہ مکمل ہو جائے، اسے ہز ایکسی لینسی کے حوالے کر دینا۔''

پرنس آندرے نے اپنا سر کچھ اس طرح خم کیا جیسے وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ شروع سے آخر تک جو کچھ وہاں کہا گیا تھا، وہ نہ صرف اسے سمجھ چکا ہے بلکہ اسے یہ عندیہ بھی مل چکا ہے کہ کوتوزوف اسے کیا بتانا چاہتا ہے۔ اس نے کاغذات سمیٹے، ایک ہی بار جھک کر دونوں جرنیلوں کو سلام کیا اور خاموشی سے قالین کے فرش پر چلتا باہر انتظار گاہ میں چلا گیا۔

اگرچہ پرنس آندرے کو روس چھوڑے زیادہ مدت نہیں گزری تھی، لیکن اتنے عرصے ہی کے دوران میں اس میں معتدبہ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ اس کے چہرے کی کیفیات، آنکھوں اور ہاتھوں کی حرکات و سکنات، چال ڈھال، غرضیکہ اس کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس میں اس کے سابقہ دکھاوے، تصنع، سہل انگاری یا آرام طلبی کا شائبہ تک نظر آتا ہو۔ اب وہ شکل و صورت سے ایسا شخص نظر آتا تھا جس کے پاس یہ سوچنے کی فرصت نہیں تھی کہ وہ دوسروں کو کس طرح اور کس حد تک متاثر کر رہا ہے۔ وہ ہر وقت اپنے کام سے، جو اسے دلچسپ اور خوشگوار معلوم ہوتا تھا، کام رکھتا تھا۔ اس کے چہرے بشرے سے یہ واضح ہوتا تھا کہ وہ جن لوگوں کے بیچ میں ہے، ان سے اور اپنے آپ سے بے حد مطمئن ہے۔ اس کی مسکراہٹ روشن تر اور دلکش تر اور اس کی نظر دل نواز تر ہوتی جا رہی تھی۔

کوتوزوف نے، جس کے ساتھ وہ پولینڈ میں آ کر ملا تھا، اسے گرم جوشی سے خوش آمدید کہا تھا اور اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسے طاق نسیاں کی زینت نہیں بنائے گا۔ وہ اسے دوسرے ایجوٹنٹوں پر ترجیح دیتا تھا، اسے اپنے ساتھ ویانا لے گیا تھا اور انتہائی اہم امور اس کے سپرد کرتا تھا۔ ویانا سے کوتوزوف نے اپنے سابق رفیق اور پرنس آندرے کے والد کے نام ایک خط میں تحریر کیا تھا:

> آپ کے صاحب زادے نے اپنی قابلیت، محنت شاقہ اور مضبوطیٔ کردار کے ذریعے یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ وہ لازماً زبردست ترقی کرے گا اور ممتاز افسر بنے گا۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے ایسا ماتحت ملا ہے۔

کوتوزوف کے سٹاف افسروں اور فوج میں بالعموم پرنس آندرے کو، جیسا کہ پیٹرزبرگ کے اعلیٰ حلقوں میں اس کے ساتھ ہوا تھا، دو مختلف اور متضاد قسم کی شہرتیں حاصل ہوئی تھیں۔ بعض افسران، اور یہ لوگ اقلیت میں تھے، اسے اپنے آپ سے اور ہر دوسرے شخص سے مختلف سمجھتے تھے، انھیں توقع تھی کہ وہ کارہائے نمایاں سرانجام دے گا، وہ اس کی بات توجہ سے سنتے تھے، اس کی تحسین کرتے تھے اور اس کے نقش قدم پر چلتے تھے۔ ان کے ساتھ اس کا رویہ فطری اور خوش گوار ہوتا تھا۔ جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے، وہ اسے ناپسند کرتی تھی، اسے سرد مہر، متکبر اور بد مزاج تصور کرتی تھی۔ لیکن ان لوگوں کے مابین پرنس آندرے ایک ایسی بارعب شخصیت کا روپ دھار لیتا تھا کہ وہ اس کا احترام بھی کرتے تھے اور اس سے خوف بھی کھاتے تھے۔

کاغذات ہاتھ میں تھامے جب پرنس آندرے انتظار گاہ میں داخل ہوا، وہ سیدھا ڈیوٹی افسر اور اپنے رفیق کار کزلووسکی کے، جو کتاب پکڑے دریچے کے قریب بیٹھا تھا، پاس پہنچا۔

''پرنس، کیا بات ہے؟''

''مجھے ایک محضرنامہ تیار کرنے کا حکم ملا ہے۔ اس میں وہ وجوہات، جن کے پیش نظر ہم پیش قدمی نہیں کر رہے، گنوائی جانا ہیں۔''

''اور ہم یہ پیش قدمی کیوں نہیں کر رہے؟''

پرنس آندرے نے اپنے کندھے اچکا دیے۔

''منیک کی کوئی خبر؟'' کزلووسکی نے پوچھا۔

''کوئی نہیں۔''

''اگر یہ سچ ہے کہ وہ شکست کھا گیا ہے، ہمیں اس کی اطلاع مل جانا چاہیے تھی۔''

''غالباً'' پرنس آندرے نے باہری دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

عین اس وقت ایک بلند قامت آسٹروی جرنیل، اپنے سر کے گرد سیاہ رومال باندھے، بدن پر اوورکوٹ پہنے اور اوورکوٹ پر آرڈر آف ماریا ٹریسا (تمغہ) سجائے، تیز تیز چلتا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اپنے پیچھے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ پرنس آندرے چلتے چلتے رک گیا۔

''کمانڈر انچیف کوتوزوف ہیں؟'' جرنیل نے بہ عجلت کرخت جرمن لہجے میں دریافت کیا۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور رکے بغیر سیدھا کوتوزوف کے پرائیویٹ کمرے کی طرف بڑھنے لگا۔

''جناب کمانڈر انچیف مصروف ہیں،'' کزلووسکی نے تیزی سے نامعلوم جرنیل کی طرف لپکتے اور اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ ''میں انھیں کیا بتاؤں کہ کون صاحب تشریف لائے ہیں؟''

جرنیل کا چہرہ مکدر ہو گیا اور اس کے ہونٹ پھڑکنے اور کپکپانے لگے۔ اس نے نوٹ بک نکالی، جلدی سے اس پر پنسل سے گھسیٹ کر کچھ لکھا، ورق پھاڑا، اسے کزلووسکی کے حوالے کیا اور خود تیزی سے دریچے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں وہ بے اختیار کرسی پر گر پڑا اور افسران کو یوں دیکھنے لگا جیسے بزبان حال پکار رہا ہو ''تم لوگ مجھے یوں گھور گھور کر کیوں دیکھ رہے ہو؟'' پھر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا، گردن آگے بڑھائی گویا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہو اور فوراً ہی بناوٹی بے نیازی کے ساتھ زیر لب کچھ گنگنانے لگا۔ اس کے منہ سے کچھ عجیب و غریب آواز برآمد ہوئی لیکن دیکھتے ہی دیکھتے بند ہو گئی۔

پرائیویٹ کمرے کا دروازہ کھلا اور دہلیز پر کوتوزوف کی شکل نمودار ہوئی۔ سر کے گرد پٹی لپیٹے جرنیل یوں کوتوزوف کی جانب لپکا جیسے وہ کسی خطرے سے بھاگ رہا ہو۔ اس کا جسم آگے جھکا ہوا تھا اور اس کی دبلی پتلی ٹانگیں تیز اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی جا رہی تھیں۔

''آپ اپنے سامنے بدقسمت میک کو دیکھ رہے ہیں؛'' وہ فرانسیسی میں بولا اور اس کا گلا رندھ گیا۔

کوتوزوف ایک لمحے کے لیے دروازے میں بت بنا کھڑا رہا۔ اس کا چہرہ بالکل سپاٹ تھا۔ پھر وہاں لہروں کی طرح بل پڑنے لگے لیکن اس کی پیشانی صاف اور ہموار تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں، احتراماً اپنا سر جھکا دیا اور ایک لفظ کہے بغیر میک کو پہلے کمرے کے اندر جانے دیا اور دروازہ خود بند کرنے لگا۔

الم کے مقام پر آسٹرویوں کے شکست کھانے اور ان کی ساری فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بارے میں جو افواہ گردش کر رہی تھی، وہ صحیح ثابت ہوئی۔ آدھ گھنٹے کے اندر اندر ایجوٹنٹوں کو ان احکام کے ساتھ مختلف سمتوں میں روانہ کر دیا گیا کہ روسی فوجوں کو، جو اب تک ہاتھ میں ہاتھ دھرے بیٹھی تھیں، عنقریب غنیم کا سامنا کرنا ہوگا۔

پرنس آندرے ان محدودے چند سٹاف افسروں میں شامل تھا جن کی زیادہ تر دلچسپی کا محور جنگ کی عمومی رفتار تھی۔ جب اس نے میک کو دیکھا اور اسے اس کی شکست فاش کی تفصیلات معلوم ہوئیں، اسے احساس ہوا کہ وہ آدھی جنگ ہار چکے ہیں۔ روسی فوج جن مشکلات میں گھر گئی تھی، ان کا اسے پورا ادراک ہو چکا تھا۔ اس فوج نے جن مصائب کا سامنا کرنا تھا اور خود اسے اس ضمن میں جو کردار ادا کرنا تھا، اس کا پورا نقشہ واضح طور پر اس کے ذہن میں گھوم گیا۔ متکبر آسٹرویوں کو جو شرم ناک ہزیمت اٹھانا پڑی تھی، اس پر اسے اپنی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑتے محسوس ہوئی۔ اسے مسرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ سواروف کے زمانے کے بعد پہلی مرتبہ روسی فوجیں فرانسیسیوں کے خلاف صف آرا ہو رہی تھیں اور خود اسے بھی اس معرکے میں شریک ہونے کا موقع مل رہا تھا۔ یہ وقوعہ شاید ایک ہفتے کے اندر اندر ظہور پذیر ہو جائے۔ اگرچہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں نپولین کی غیر معمولی ذہانت روسیوں کی شجاعت پر بازی نہ لے جائے لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کے لیے یہ امر بھی ناقابل برداشت تھا کہ اس کا ہیرو کسی قسم کی رسوائی سے دوچار ہو۔

انھی خیالات میں، جنھوں نے اس کے اندر نیا جوش پیدا کر دیا تھا اور اسے پریشانیوں میں بھی مبتلا کر دیا تھا، غلطاں و پیچاں وہ اپنے باپ کو خط لکھنے اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔ یہ فریضہ وہ روزانہ سرانجام دیا کرتا تھا۔ راہداری میں اس کی ملاقات نیس وتسکی، جس کے ساتھ وہ ایک ہی کمرے میں رہتا تھا، اور نقال ژرکوف سے ہو گئی۔ وہ حسب معمول قہقہے لگا رہے تھے۔

''یہ تم نے منہ کیوں بنا رکھا ہے؟'' نیس وتسکی نے پرنس آندرے کے پژمردہ چہرے اور جگمگاتی آنکھوں کو دیکھ کر کہا۔

''قہقہے لگانے کی بھی کوئی وجہ نہیں!'' بلکونسکی نے ترت جواب دیا۔

ادھر جب پرنس آندرے کا نیس وتسکی اور ژرکوف سے آمنا سامنا ہو رہا تھا، راہداری کی دوسری سمت سے ایک آسٹروی جرنیل، سٹروخ، (Strauch) جو روسی فوجوں کو رسد پہنچانے کے کام کی نگرانی کے لیے کوتوزوف کے سٹاف میں شامل تھا اور جنگی کونسل کا رکن، جو کل شام یہاں پہنچا تھا، نمودار ہوئے۔ راہداری خاصی کشادہ تھی اور اس میں اتنی جگہ ضرور تھی کہ آسٹروی جرنیل تینوں افسروں کے برابر سے کسی مشکل کے بغیر گزر جاتے لیکن ژرکوف نے

نیس وتسکی کوایک طرف دھکیلتے ہوئے ہانپتے کانپتے نعرۂ مستانہ بلند کیا:

''وہ تشریف لا رہے ہیں! وہ تشریف لا رہے ہیں! ہٹو، بچو، راستہ دو!''

جرنیلوں نے پہلو بچا کر چپکے سے گزر جانا چاہا۔ ان کے چہروں بشروں سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ اس تکلیف دہ احترام سے گریز کرنا چاہتے ہیں۔ ژرکوف کے چہرے پر احمقانہ تبسم پھیل گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لیے اسے چھپانا ناممکن ہو گیا ہے۔

''یوئر ایکسی لینسی،'' اس نے آگے بڑھتے ہوئے اور آسٹروی جنرل سے جرمن میں مخاطب ہو کر کہا۔ ''میں بصد ادب واحترام آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔''

اس نے تعظیماً اپنا سر جھکا دیا اور پھر کسی مدرسۂ رقص کے نوعمر بچے کی طرح بے ڈھنگے پن سے پہلے اپنا ایک پاؤں اور پھر دوسرا گھسیٹ لیا۔

جنگی کونسل کے رکن نے اسے گھور کر دیکھا لیکن جب اس کی احمقانہ مسکراہٹ میں سنجیدگی نظر آئی، وہ اسے توجہ دینے پر مجبور ہو گیا۔

''جنرل، میں بصد ادب واحترام آپ کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔ جنرل میک تشریف لے آئے ہیں۔ وہ بھلے چنگے ہیں، صرف معمولی خراشیں آئی ہیں — یہاں،'' اس نے اپنے سر کی طرف اشارہ کرتے اور مسکراتے ہوئے مزید کہا۔

جرنیل کی پیشانی شکن آلود ہو گئی، وہ ایک طرف ہٹا اور آگے چلنے لگا۔

"Gott, wie naiv!"* وہ چند قدم آگے جا کر غصے سے پکارا۔

نیس وتسکی کھلکھلا کر ہنس پڑا اور اس نے اپنے بازو پرنس آندرے کے گلے میں حمائل کر دیے۔ لیکن بلکونسکی نے، جس کا چہرہ مزید پژمردہ ہو چکا تھا، اسے دھکیل کر ایک طرف کر دیا۔ وہ غصے سے پھنکار رہا تھا اور اسی عالم میں وہ ژرکوف کی طرف متوجہ ہوا۔ میک کی آمد، شکست کی خبر اور روسی فوجوں کو جو مسائل و مشکلات درپیش تھیں، ان کے بارے میں اس کے خیالات نے اس کے اندر جو جھنجھلاہٹ پیدا کر دی تھی، اس نے اس کا اظہار ژرکوف کے مذاق پر اپنے غیظ و غضب کے ذریعے کیا۔

''حضور، اگر آپ کو مسخرہ بننے کا اتنا ہی شوق ہے،'' اس نے طنز کے تیر چلاتے ہوئے کہا، (اس کا جبڑا قدرے کپکپا رہا تھا) ''تو میں آپ کو روک نہیں سکتا۔ لیکن میں آں جناب کو متنبہ کیے دیتا ہوں کہ اگر آپ نے آئندہ میری موجودگی میں اس قسم کی کوئی احمقانہ حرکت فرمائی تو میں آپ کو چھٹی کا دودھ یاد دلا دوں گا اور آپ کو یہ ذہن نشین کرا دوں گا کہ آپ کو کس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔''

اس کے اس طرح پھٹ پڑنے پر نیس وتسکی اور ژرکوف دونوں بھونچکے رہ گئے اور وہ چپ چاپ

* میرے خدایا! کیا احمق شخص ہے!

دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگے۔

''یار، میں نے تو اسے محض ہدیۂ تبریک پیش کیا تھا۔''

''میں آپ کے ساتھ مذاق نہیں کر رہا۔ برائے مہربانی خاموش رہیں!'' بلکونسکی نے چلا کر کہا۔ اس نے نیس وتسکی کو بازو سے پکڑا اور وہاں سے چل پڑا۔ ژرکوف وہیں کھڑا رہا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

''یار، یہ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟'' نیس وتسکی نے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''کیا ہو گیا ہے؟'' پرنس آندرے نے با آواز بلند کہا۔ اس کے جذبات میں اتنی ہلچل مچی ہوئی تھی کہ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ ''تمھاری سمجھ میں کیوں نہیں آرہا؟— ہم یا تو افسر ہیں جو اپنے زار اور اپنی مادر وطن کی خدمت پر مامور ہیں، جو اپنے دوستوں کی کامرانیوں پر خوش ہوتے اور ان کی ناکامیوں پر خون کے آنسو بہاتے ہیں یا پھر ہم بھاڑے کے ٹٹو ہیں جنھیں اپنے آقائے ولی نعمت کے امور میں کوئی دلچسپی نہیں، بس اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔ چالیس ہزار اشخاص فنا کے گھاٹ اتار دیے گئے، ہمارے اتحادی کی فوج ملیامیٹ کر دی گئی اور تمھیں اس میں دل لگی کا پہلو نظر آتا ہے!'' اس نے فرانسیسی میں کہا جیسے جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس زبان کے استعمال سے اس میں زور پیدا ہو جائے گا۔ ''اس اڑھائی کوڑی کے آدمی کو، جسے تم نے اپنا دوست بنا رکھا ہے، شاید اس قسم کی حرکتیں زیب دیتی ہوں لیکن تمھیں، تمھیں نہیں، بالکل نہیں! صرف گلی کوچوں میں آوارگی کرنے والے لونڈے اس نوع کی خرافات سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں!'' اس نے دوبارہ روسی زبان میں اپنا مدعا ادا کرتے ہوئے کہا۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ ژرکوف ابھی اتنا قریب ہے کہ ان کی باتیں اس تک پہنچ سکتی ہیں، اس نے اپنے ان الفاظ کے لیے بھی فرانسیسی لہجہ اختیار کر لیا۔

وہ کچھ دیر رک کر انتظار کرتا رہا کہ شاید لیفٹیننٹ جواب میں کچھ کہے گا لیکن ژرکوف دوسری جانب مڑ گیا اور راہداری سے باہر نکل گیا۔

4

پاولوگرات ہوزار رجمنٹ براؤناؤ سے دو میل دور مقیم تھی۔ جس سکواڈرن میں نکولائی رستوف بحیثیت کیڈٹ خدمات سرانجام دے رہا تھا، اس کا قیام ایک جرمن گاؤں سالزے نیک میں تھا۔ گاؤں کا بہترین مکان سکواڈرن کمانڈر کیپٹن دینی سوف کی، جسے ساری گھڑسوار ڈویژن میں واسکا دینی سوف کے نام سے جانا جاتا تھا، تحویل میں دے دیا گیا تھا۔ جب سے کیڈٹ رستوف پولینڈ میں رجمنٹ میں شامل ہوا تھا، وہ اور دینی سوف ایک ہی مکان اور خیمے میں رہتے چلے آرہے تھے۔

آٹھ اکتوبر کو یعنی جس روز میک کی شکست کی خبر نے فوجی ہیڈ کوارٹر میں کھلبلی مچا دی تھی، اس سکواڈرن کے

• ماڈ اور روز میری ایڈمنڈز کے مطابق گیارہ اکتوبر

افسروں کی پڑاؤ میں زندگی حسب معمول پرسکون انداز سے رواں دواں تھی۔ رستوف، جسے گھوڑوں کے لیے چارہ اور چبینا اکٹھا کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، صبح سویرے جب واپس آیا، دینی سوف، جو ساری رات جوئے میں رقوم ہارتا رہا تھا، ابھی اپنی رہائش گاہ پر لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ کیڈٹ کی وردی پہنے اور گھوڑے پر سوار رستوف پورچ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو لگام دی، نوجوانوں کی لچک دار پھرتی کے ساتھ زین کے اوپر سے اپنی ٹانگ گھمائی، رکاب میں پاؤں رکھے، کچھ سوچا جیسے اسے گھوڑے سے اترتے دُکھ ہو رہا ہو، پھر نیچے جست لگائی اور ایک اردلی کو پکارا۔

''اخاہ، بندارینکو، میرے عزیز دوست!'' اس نے ہوزار سے، جو سر پر پاؤں رکھے گھوڑے کی جانب بھاگا آرہا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ ''لو بھئی، سنبھالو اسے۔ ذرا اسے ٹہلا دُو ہلاؤ'' اس نے اس برادرانہ گرم جوشی سے کہا جو نیک طینت نوجوان سرخوشی کے عالم میں ہر کہہ و مہ کے لیے اختیار کرتے ہیں۔

''بہت اچھا، یور ایکسی لینسی،'' یوکرینی نے بشاشت سے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، اسے ذرا ٹھیک ٹھاک طریقے سے ٹہلانا۔''

ایک اور ہوزار گھوڑے کی طرف بگٹٹ بھاگا آرہا تھا لیکن بندارینکو پہلے ہی اکہری لگام، جس میں کانٹے کے بغیر دانہ تھا، گھوڑے کے سر پر ڈال چکا تھا۔ بالکل عیاں تھا کہ کیڈٹ بخشیش کے معاملے میں دریا دل تھا اور جو شخص بھی اس کی خدمت کرتا تھا، اس کے وارے نیارے ہو جاتے تھے۔ رستوف کچھ دیر پورچ کی سیڑھیوں پر کھڑا گھوڑے کی گردن اور اس کے پہلو تھپکتا رہا۔

''بہت شاندار، بہت اعلیٰ! بہت زبردست گھوڑا ثابت ہوگا!'' اس نے مسکراتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے اپنی شمشیر پکڑی اور بھاگم بھاگ پورچ کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔ اس کے مہمیز کھنکھنا رہے تھے۔ تنگ واسکٹ اور نوکیلی ٹوپی اوڑھے، اور دو شاخہ ہاتھ میں پکڑے اس کے جرمن مالک مکان نے گائیوں کے چھپر کے پیچھے سے، جہاں وہ گوبر سمیٹ رہا تھا، جھانک کر باہر دیکھا۔ رستوف کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ اس نے آنکھ ماری اور کہا:

"Schon, gut Morgen! Schon, gut Morgen!"* ۔ صاف ظاہر تھا کہ نوجوان شخص سے علیک سلیک کر کے اسے قلبی مسرت ہو رہی تھی۔

''ابھی سے مصروف ہو گئے؟'' رستوف نے اس کے سلام کا جواب دیتے جرمن میں پوچھا۔ اس کے پر اشتیاق چہرے پر ہمیشہ کی طرح پر مسرت اور برادرانہ مسرت کھیل رہی تھی۔ ''آسٹروی زندہ باد! روسی زندہ باد! امپراطور الیکساندر زندہ باد!'' جرمن مالک مکان بار بار جو نعرے لگایا کرتا تھا، وہ بھی اس کی زبان میں وہی نعرے بلند کر رہا تھا۔

---

* جناب، صبح بخیر

جرمن ہنس پڑا، وہ چھپر سے باہر نکلا، اس نے اپنی ٹوپی اتاری، اسے اپنے سر کے اوپر بلند کرتے اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگاتے پکارا:

''کل عالم زندہ باد!''

اگر چہ نہ تو جرمن کے پاس، جو گائیوں کا چھپر صاف کر رہا تھا اور نہ رستوف کے پاس، جو اپنی پلٹن کے ساتھ چارہ اور چبینا اکٹھا کرنے میں مصروف رہا تھا، خوشی منانے کی کوئی خاص وجہ تھی، تاہم انھوں نے ایک دوسرے کی جانب برادرانہ اخوت اور کامل مسرت وانبساط سے دیکھا، باہمی پیار ومحبت کی علامت کے طور پر اپنے اپنے سروں کو گھمایا اور اپنی اپنی راہ چل پڑے۔ جرمن واپس اپنے چھپر میں چلا گیا اور رستوف نے اپنی قیام گاہ کا، جس میں وہ دینی سوف کے ساتھ رہ رہا تھا، رخ کیا۔

''تمھارے آقا کہاں ہیں؟'' اس نے دینی سوف کے اردلی لاوروشکا سے پوچھا۔ لاوروشکا کو ساری رجمنٹ جانتی تھی اور اسے چھٹا ہوا بدمعاش تصور کرتی تھی۔

''وہ شام سے گھر نہیں آئے۔ لازماً ہار رہے ہوں گے،'' لاوروشکا نے جواب دیا۔ ''اب میں بھی سمجھ گیا ہوں — اگر وہ جیت جائیں، پھر جلدی لوٹ آتے ہیں، ڈینگیں جو مارنا ہوتی ہیں۔ لیکن اگر وہ صبح تک واپس نہ آئیں، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ حضور پٹ چکے ہیں — پھر جب ان کی واپسی ہوگی، غصے سے ان کا خون کھول رہا ہوگا۔ کافی بناؤں؟''

''بالکل اور ابھی۔''

دس منٹ بعد لاوروشکا کافی لے آیا۔

''لیں، وہ بھی آ گئے ہیں،'' اس نے کہا۔ ''آئی شامت!''

رستوف نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا۔ اسے دینی سوف واپس گھر آتے نظر آیا۔

دینی سوف کوتاہ قامت تھا۔ سرخ چہرہ، سیاہ اور روشن آنکھیں، کالے اور ژولیدہ بال۔ اس نے ہوزاروں کا چغہ، جس کے بٹن کھلے تھے، پہنا ہوا تھا۔ اس کی پتلون کشادہ اور ڈھیلی ڈھالی تھی۔ اس کے سر پر شاکو[8] تھی اور وہ پیچھے کو ڈھلک رہی تھی۔ وہ سر نیہوڑائے اور منہ لٹکائے پورچ میں داخل ہوا۔

''لاوروشکا!'' اس نے بلند اور غصیلی آواز میں چلا کر کہا۔ ''ابے، الو کی دم، یہ اتارو!''

''جی اتار رہا ہوں،'' لاوروشکا کا جواب سنائی دیا۔

''ارے، تم اٹھ بھی گئے؟'' دینی سوف نے کمرے میں آتے ہوئے پوچھا۔

''مدتیں ہو گئیں،'' رستوف نے جواب دیا۔ ''میں گھاس اور چبینا لانے گیا تھا۔ مادام ماٹلڈے سے بھی مل چکا ہوں۔''

''واقعی؟ برادر، اپنی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ ساری رات ہارتے گزری، کتے کے پلے کی طرح،'' دینی سوف

نے چلا چلا کر کہا۔ ’’واہ ری قسمت! جب مقدر ہی کھوٹا ہو، پھر آدمی کیا کر سکتا ہے، جونہی تم رخصت ہوئے، ہمارے ساتھ یہ چکر شروع ہو گیا اور ساری رات جاری رہا۔ ابے، چائے!‘‘

اپنا منہ سکیڑتے اور اپنے مہین اور مضبوط دانت یوں نکوستے، جیسے وہ کھسیانی ہنسی ہنس رہا ہو، وہ اپنے ہاتھوں کی معمول سے نسبتاً چھوٹی لیکن موٹی انگلیاں اپنے گھنے سیاہ بالوں میں، جو جنگل کے درختوں کی طرح آپس میں الجھے ہوئے تھے، پھیرنے لگا۔

’’مجھے کس شیطان نے بہکایا کہ میں اس چوہے،‘‘ (ایک افسر جس کا عرف ’چوہا‘ تھا) ’’کے پاس چلا گیا،‘‘ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی اور گالوں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ’’کیا تم سوچ سکتے ہو کہ اس نے مجھے ایک بھی پتا — ہاں ایک بھی پتا — نہیں دیا؟‘‘

اس نے سلگتا ہوا پائپ، جو اس کی طرف بڑھایا گیا تھا، مضبوطی سے اپنی مٹھی میں پکڑا، اسے اتنی قوت سے فرش پر دے مارا کہ اس میں سے شرارے نکلنے لگے اور خود چلا چلا کر باتیں کرتا رہا۔

’’وہ سنگل تو دوسروں کو جیتنے دیتا ہے لیکن اگر شرط دگنی کر دی جائے، پھر خود ہاتھ مار جاتا ہے۔ سنگل آپ کو دے دیتا ہے اور ڈبل خود ہتھیا لیتا ہے۔‘‘

اس نے شرارے ادھر ادھر بکھیر دیے، پائپ کرچی کرچی کر دیا اور اسے پرے پھینک دیا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا، پھر اس نے اچانک رستوف پر نگاہ دوڑائی، اس کی سیاہ آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں اور بولا:

’’کاش یہاں چند خواتین ہی ہوتیں! ایسے میں تو یہاں پینے پلانے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ کاش جنگ ونگ ہی شروع ہو جائے!... ابے، کون ہے؟‘‘ اس نے دروازے کے باہر کسی کے بھاری بوٹوں کے کھٹکھٹانے اور مہمیزوں کے کھنکھنانے کی آواز سن کر چلا کر پوچھا۔ آواز بند ہوئی اور کوئی شخص مؤدبانہ انداز سے کھنکارا۔

’’کوارٹر ماسٹر،‘‘ لاوروشکا نے کہا۔

دینی سوف کے ماتھے کی لکیریں اور بھی گہری ہو گئیں۔

’’کیا مصیبت ہے!‘‘ وہ بڑبڑایا اور اس نے اپنا پرس، جس میں چند طلائی سکے تھے، نیچے پٹک دیا۔ ’’رستوف، بھیا، ذرا گننا کہ اس میں کتنی رقم بچی ہے۔ پھر اسے تکیے کے نیچے دھکیل دینا،‘‘ اس نے کہا اور خود کوارٹر ماسٹر سے ملنے باہر چلا گیا۔

رستوف نے رقم نکالی، مشینی انداز سے نئے اور پرانے سکوں کی علیحدہ علیحدہ ڈھیریاں بنائیں اور انھیں گننے لگا۔

’’اخاہ، تلیانن! آداب عرض۔ کیا حال ہے؟ اپنا تو رات کباڑا ہو گیا، انھوں نے سب کچھ ہتھیا لیا!‘‘ ملحقہ کمرے سے دینی سوف کی آواز سنائی دی۔

’’کہاں؟ بائیکوف کے ہاں؟ چوہے کے ہاں؟... مجھے معلوم تھا۔‘‘ سیٹی کی سی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی کوتاہ قامت لیفٹیننٹ تلیانن، جو اسی سکواڈرن میں تھا، کمرے میں داخل ہوا۔

رستوف نے پرس تکیے کے نیچے دھکیل دیا اور ایک ننھے منے مرطوب ہاتھ کو، جو اس کی طرف بڑھایا گیا تھا، اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پتا نہیں کیا وجہ ہوئی لیکن ہوا یہ کہ مہم پر روانگی سے ذرا قبل تلیانن کا گارڈز سے تبادلہ کر دیا گیا۔ رجمنٹ میں اس کی کارکردگی اطمینان بخش تھی لیکن اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا اور جہاں تک رستوف کا تعلق ہے، اسے اس سے اللہ واسطے کی منافرت تھی۔ وہ اپنی اس منافرت پر نہ قابو پا سکا تھا اور نہ اسے چھپانے میں کامیاب ہوا تھا۔

''اچھا، جوان، میرے رخ کا کیا حال ہے؟'' (رخ نوخیز گھوڑے کا نام تھا اور اسے تلیانن نے رستوف کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔)

لیفٹیننٹ جب بھی کسی شخص سے مخاطب ہوتا، وہ کبھی اس کے چہرے کی طرف نہ دیکھتا۔ اس کی نگاہیں مسلسل ایک شے سے دوسری شے کی طرف منتقل ہوتی رہتیں۔

''میں نے آج صبح تمھیں اس پر سواری کرتے دیکھا تھا...''

''اوہ! وہ بالکل ٹھیک ہے۔ اچھا گھوڑا ہے،'' رستوف نے جواب دیا۔ حالانکہ گھوڑا سات سو روبل کی خطیر رقم کے، جو اس نے ادا کی تھی، نصف کے برابر بھی نہ تھا'' اس کی اگلی بائیں ٹانگ کچھ کچھ لنگڑانے لگی ہے،'' اس نے مزید کہا۔

''سُم تڑخ گیا ہے؟ ارے، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں تمھیں بتا دوں گا کہ کیا کرنا چاہیے۔ کون سا نعل استعمال کرنا ہے۔''

''ضرور، عنایت ہوگی،'' رستوف نے کہا۔

''میں بتاؤں گا، ضرور بتاؤں گا۔ اس میں۔۔ راز کی کوئی بات تو ہے نہیں۔ تم میرا شکریہ ادا کرو گے کہ میں نے یہ گھوڑا تمھیں دے دیا۔''

''پھر میں گھوڑا منگوا لوں،'' رستوف نے کہا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کسی طرح تلیانن سے خلاصی ہو اور وہ باہر نکل گیا تاکہ گھوڑا لانے کا حکم دے سکے۔

غلام گردش میں دینی سوف بیٹھا تھا۔ وہ پائپ پر جھکا ہوا تھا۔ اس کے سامنے کوارٹر ماسٹر بیٹھا تھا۔ وہ اسے کوئی رپورٹ دے رہا تھا۔

رستوف کو دیکھ کر دینی سوف نے اپنا منہ سکیڑ لیا اور اپنے کندھے کے اوپر انگوٹھے سے اس کمرے کی طرف، جس میں تلیانن بیٹھا تھا، اشارہ کرتے ہوئے اپنے ماتھے پر شکن ڈال لیے اور کراہت سے اس کا جسم تھرتھرانے لگا۔

''اخ تھو! مجھے وہ شخص ایک آنکھ نہیں بھاتا،'' اس نے کوارٹر ماسٹر کی بھی پروا نہ کی۔

رستوف نے یوں کندھے اچکائے جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو! ''پسند تو مجھے بھی نہیں لیکن آدمی کر بھی کیا سکتا ہے؟'' اس نے اپنا حکم دیا اور دوبارہ تلیانن کے پاس چلا گیا۔

تلیانن اسی سہل انگار انداز میں، جس میں رستوف اسے چھوڑ کر گیا تھا، بیٹھا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے سفید ہاتھ مسل رہا تھا۔

''بعض لوگ واقعی قابل نفریں اور کریہہ ہوتے ہیں،'' رستوف نے کمرے میں داخل ہوتے وقت سوچا۔

''اچھا، تم نے گھوڑا لانے کا حکم دے دیا؟'' تلیانن نے اٹھتے ہوئے اور بے دھیانی سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔''

''آؤ، چلیں۔ میں تو محض اس لیے آیا تھا کہ میں دینی سوف سے، اس حکم کے بارے میں جو کل دیا گیا تھا، دریافت کر سکوں۔ دینی سوف، تمھیں یہ احکام مل گئے ہیں؟''

''نہیں، ابھی نہیں۔ تم لوگ کہاں جا رہے ہو؟''

''میں اس نوجوان کو سمجھانا چاہتا ہوں کہ نعل کیسے لگایا جاتا ہے،'' تلیانن نے کہا۔

وہ پورچ میں سے گزرتے اصطبل میں پہنچ گئے۔ لیفٹیننٹ نے رستوف کو دکھایا کہ گھوڑے کو نعل کیسے لگایا جاتا ہے اور اپنے مسکن کی طرف چل دیا۔

جب رستوف واپس آیا، دینی سوف ایک میز کے سامنے، جس پر ووڈکا کی بوتل اور ایک ساسیج (sausage) دھرا تھا، بیٹھا تھا۔ وہ اپنے سامنے کاغذ رکھے اس پر قلم گھسیٹ گھسیٹ کر کچھ لکھ رہا تھا۔ اس نے اداس نگاہوں سے رستوف کو دیکھا اور بولا:

''میں اسے لکھ رہا ہوں،'' اس نے کہا۔

کلائیاں میز پر جھکائے اور قلم ہاتھ میں تھامے، وہ بظاہر بہت خوش تھا، کیونکہ وہ جو کچھ خط میں لکھنا چاہتا تھا، اسے اب زبانی بیان کرنے کا موقع دستیاب آ گیا تھا کیونکہ لکھنے کی نسبت گفتگو زیادہ تیزی سے کی جا سکتی ہے۔

''دوست، تمھیں معلوم ہے!'' اس نے کہا، ''جب تک ہم کسی کی زلف گرہ گیر کا اسیر نہیں ہوتے۔۔ ہم نیند میں کھوئے رہتے ہیں۔ ہمارا خمیر مٹی سے اٹھا ہے۔ لیکن ایک مرتبہ محبت میں گرفتار ہو جاؤ۔۔ تم دیوتا بن جاؤ گے، پاک، صاف اور پوتر، بالکل اس دن کی طرح، جس روز ہماری پیدائش عمل میں آئی ہوتی ہے... اب کون آ ٹپکا؟ اس سے کہہ دو کہ جہنم میں جائے، میں مصروف ہوں...'' اس نے چلا کر لاوروشکا سے کہا۔ لاوروشکا اس کے پاس آ ٹپکا اور اس سے مطلق خوف زدہ نہ ہوا۔

''بوجھیں تو بھلا کون ہے یہ؟ آپ نے خود ہی تو انھیں بلایا تھا۔ کوارٹر ماسٹر پیسے لینے آئے ہیں؟''

دینی سوف کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ وہ چلا کر کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

''کیا مصیبت ہے!'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ''پرس میں کتنی رقم بچی ہے؟'' اس نے رستوف سے پوچھا۔

''سات نئی اور تین پرانی اشرفیاں۔''

''اخ! خانہ خراب! یہ تم مٹی کی مورت بنے کیوں کھڑے ہو؟ جاؤ اور اسے بلا لاؤ!'' اس نے چلا کر لاوروشکا سے کہا۔

''دینی سوف، بھائی جان، اگر آپ برا نہ منائیں تو میں آپ کو کچھ رقم ادھار دے سکتا ہوں — آپ جانتے ہی ہیں کہ میرے پاس کچھ پیسے ہیں،'' رستوف نے کہا۔ شرم سے اس کا چہرہ لال سرخ ہو رہا تھا۔

''مجھے دوستوں سے ادھار لینا پسند نہیں۔ بالکل پسند نہیں،'' دینی سوف نے کہا۔

''لیکن اگر دوستوں کی طرح آپ نے مجھ سے بھی پیسے نہ لیے تو میں آپ سے ناراض ہو جاؤں گا۔ میں جھوٹ نہیں کہہ رہا، میرے پاس واقعی پیسے ہیں،'' رستوف نے اپنی بات دہرائی۔

''کہہ جو دیا کہ نہیں۔''

دینی سوف تکیے کے نیچے سے پرس اٹھانے پلنگ کی طرف چل پڑا۔

''کہاں رکھا تھا، رستوف؟''

''زیریں تکیے کے نیچے۔''

''لیکن یہاں تو نہیں ہے۔''

دینی سوف نے دونوں تکیے اٹھا کر فرش پر پٹک دیے۔ پرس وہاں نہیں تھا۔

''یہ تو بڑی عجیب بات ہے!'' اس نے کہا۔

''ٹھہریں۔ آپ نے کہیں اسے نیچے تو نہیں گرا دیا؟'' اس نے ایک ایک کر کے تکیے اٹھائے اور انھیں خوب اچھی طرح جھاڑا۔

اس نے لحاف گھسیٹ کر کھینچا اور اسے بھی خوب اچھی طرح جھاڑا۔ پرس نہ ملا۔

''کہیں میں ہی تو نہیں بھول گیا؟ نہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میں یہی سوچ رہا کہ آپ اسے ہمیشہ تکیے کے نیچے رکھا کرتے تھے، بالکل دفینے کی طرح،'' رستوف نے کہا۔ ''میں نے اسے بالکل یہیں رکھا تھا۔ یہ گیا کہاں؟'' اس نے لاوروشکا کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔

''میں تو کمرے میں آیا ہی نہیں۔ وہیں ہو گا جہاں آپ نے رکھا تھا۔''

''لیکن وہ نہیں ہے!''

''تم ہمیشہ یہی کرتے ہو۔ ہمیشہ چیزیں ادھر ادھر پھینکتے رہتے ہو اور پھر بھول جاتے ہو۔ اپنی جیبوں میں دیکھو،'' دینی سوف نے کہا۔

''نہیں۔ اگر دفینے کا تصور میرے ذہن میں نہ آتا...'' رستوف نے کہا۔ ''لیکن مجھے یاد ہے کہ میں نے اسے وہیں رکھا تھا۔''

لاوروشکا نے پلنگ کی ایک ایک چیز کھنگال ڈالی۔ اس کے نیچے بھی جھانک کر دیکھا اور میز کے نیچے بھی۔

ایک ایک چیز کی تلاشی لینے کے بعد وہ کمرے کے عین درمیان میں ساکت کھڑا ہو گیا۔ دینی سوف خاموشی سے اس کی تمام حرکات کا جائزہ لیتا رہا۔ اور جب لاوروشکا نے جھنجھلا کر اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے، دینی سوف رستوف کی جانب دیکھنے لگا۔

''رستوف، تم نے سکول کے بچوں کی طرح کوئی شرارت تو نہیں کی؟''

رستوف کو محسوس ہوا کہ دینی سوف کی نگاہیں اس پر گڑی ہوئی ہیں۔ اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں لیکن جھٹ پٹ نیچے گرالیں۔ وہ سارا خون، جو اسے یوں لگا تھا جیسے اس کے نرخرے میں جمع ہو گیا ہو، باڑھ مار کر اس کے چہرے اور آنکھوں میں گھس گیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

''آپ کے اور لیفٹیننٹ کے علاوہ اور کوئی شخص اس کمرے میں نہیں آیا۔ یہ یہیں کہیں ہوگا'' لاوروشکا نے کہا۔

''ابلیس کی اولاد! جلدی کرو اور اسے تلاش کرو،'' دینی سوف نے اچانک دہاڑتے ہوئے کہا۔ اس کا رنگ لال سرخ ہو گیا اور وہ دھمکی آمیز انداز سے مکے لہراتا اردلی کی طرف بھاگا۔ ''اگر وہ پرس نہ ملا تو میں مار مار کر تمھارا بھرکس نکال دوں گا! میں کسی کو نہیں بخشوں گا، سب کی پٹائی کر دوں گا۔''

دینی سوف کی نظروں سے بچتا بچاتا رستوف اپنے کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ پھر اس نے اپنی شمشیر نیام میں ڈالی اور ٹوپی سر پر رکھ لی۔

''پرس لازماً ڈھونڈنا ہوگا، یہ میرا حکم ہے!'' دینی سوف نے اپنے اردلی کے کندھے جھنجھوڑتے اور اسے زور سے دیوار کے ساتھ ٹکراتے ہوئے چلا کر کہا۔

''دینی سوف، اسے چھوڑ دیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اسے کون اٹھا کر لے گیا ہے،'' رستوف نے نظریں اٹھائے بغیر دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

دینی سوف رک گیا، اس نے کچھ دیر سوچا اور جب اسے اندازہ ہو گیا کہ رستوف کے الفاظ کا کیا مفہوم بنتا ہے، تو اس نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیا۔

''بالکل واہیات!'' وہ اتنے زور سے دہاڑا کہ اس کی گردن اور پیشانی کی رگیں رسیوں کی طرح نمایاں ہو گئیں۔ ''میرا خیال ہے کہ تمھارا دماغ چل گیا ہے! میں یہ نہیں ہونے دوں گا۔ پرس یہیں ہے! میں اس لفنگے کی چمڑی ادھیڑ دوں گا، پھر یہ خود بخود مل جائے گا۔''

''مجھے معلوم ہے کہ اسے کون اٹھا لے گیا ہے،'' رستوف نے دروازے کی جانب بڑھتے ہوئے لڑکھڑاتی زبان سے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

''اور میں تمھیں بتائے دیتا ہوں ــــ اس قسم کی حرکت کا نام بھی نہ لینا،'' دینی سوف کیڈٹ کو روکنے کے لیے اس کی طرف بھاگتے ہوئے چلایا۔

''رستوف نے جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا اور دینی سوف کی نگاہوں میں نگاہیں ڈال کر دیکھنے لگا۔ وہ اتنا

غضب ناک اور پرعزم نظر آرہا تھا جیسے دینی سوف اس کا بدترین دشمن ہو۔

''آپ کو اندازہ ہے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' اس نے کپکپاتی آواز میں پوچھا۔ ''کمرے میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں آیا۔ چنانچہ اگر میں نہیں... پھر...''

اس سے اپنی بات ختم نہ کی جا سکی اور وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''ارے تمھارا بیڑا غرق — تم سب کا بیڑا غرق!'' یہ آخری الفاظ تھے جو رستوف کے کانوں تک پہنچے۔

رستوف تلیانن کی قیام گاہ پر چلا گیا۔

''مالک گھر پر نہیں۔ ہیڈ کوارٹر گئے ہوئے ہیں،'' تلیانن کے اردلی نے اسے اطلاع دی۔ ''کچھ ہو گیا؟'' اس نے پوچھا۔ کیڈٹ کے متوحش چہرے نے اسے دغدغے میں ڈال دیا تھا۔

''نہیں۔ کچھ نہیں۔''

''آپ کو بس ذرا سی تاخیر ہو گئی،'' اردلی نے کہا۔

سٹاف ہیڈ کوارٹر سالزے نیک سے تقریباً دو میل دور تھا۔ رستوف واپس گھر نہ گیا۔ اس نے گھوڑا پکڑا اور ادھر چل دیا۔ گاؤں میں ریستوران تھا۔ افسران یہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ جب رستوف اس کے قریب پہنچا، اسے دروازے کے قریب تلیانن کا گھوڑا نظر آ گیا۔

ریستوران کے دوسرے کمرے میں تلیانن بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے میز پر ساسیج کی پلیٹ اور شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔

''اخاہ، جوان، تو تم یہاں بھی پہنچ گئے،'' اس نے مسکراتے اور اپنی بھویں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔

''ہاں،'' رستوف نے یوں کہا جیسے یہ ایک لفظ بھی ادا کرتے ہوئے اسے خاصی تکلیف ہو رہی ہو۔

وہ اگلی میز پر بیٹھ گیا۔ دونوں آدمی خاموش تھے۔ کمرے میں ایک روسی افسر اور دو جرمن باشندے بھی تھے۔ نہ کسی نے کچھ کہا اور نہ کچھ سنائی دے رہا تھا۔ صرف لیفٹیننٹ کے مچاچچ کھانے اور پلیٹوں پر چھری کانٹوں کے کھنکھنانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ جب تلیانن اپنا لنچ ختم کر چکا، اس نے جیب سے ڈبل پرس نکالا، اسے اپنی چھوٹی چھوٹی سفید ٹیڑھی میڑھی انگلیوں سے کھولا، ایک اشرفی اٹھائی، اپنی بھویں بلند کیں اور اسے بیرے کو پکڑا دیا۔

''ذرا جلدی کرنا،'' اس نے کہا۔

سکہ نیا نکور تھا۔ رستوف اٹھا اور تلیانن کے قریب جا کھڑا ہوا۔

''ذرا یہ پرس دکھانا،'' اس نے مدھم، اتنی مدھم کہ بمشکل سنائی دیتی آواز میں کہا۔

تلیانن کی بھویں ابھی تک اوپر کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں کوٹ کوٹ کر عیاری بھری ہوئی تھی۔ تاہم اس نے پرس اسے تھما دیا۔ ''بہت عمدہ پرس ہے... بالکل... بالکل...'' اس نے کہا۔ اچانک اس کا رنگ فق ہو گیا۔ ''جوان، ذرا دیکھو تو سہی،'' اس نے مزید کہا۔

رستوف نے پرس پکڑ لیا، اس کا بغور جائزہ لیا۔ اس کے اندر جو رقم تھی، اس نے اس پر بھی نظر ڈالی اور اس کے بعد وہ تلیانن کو دیکھنے لگا۔ لیفٹیننٹ کی نگاہیں حسب معمول ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس پر شگفتگی طاری ہو گئی۔

''جب ہم ویانا جائیں گے، میں سب کچھ وہاں لٹا دوں گا۔ لیکن ان ننھے منے گندے مندے قصبوں میں ایک بھی کام کی چیز نہیں کہ آدمی پیسہ خرچ کرے،'' اس نے کہا۔ ''لاؤ، جوان، یہ مجھے واپس کر دو۔ میں جا رہا ہوں۔''

رستوف چپ رہا۔

اور تم؟ تمھارا کیا ارادہ ہے؟ لنچ کر رہے ہو؟ یہاں کا کھانا بہت اچھا ہوتا ہے،'' تلیانن نے مزید کہا۔ ''لاؤ، یہ مجھے دے دو۔''

اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا اور پرس پکڑ لیا۔ رستوف نے چھوڑ دیا۔ پرس پکڑنے کے بعد تلیانن اسے اپنی برجس کی جیب میں ڈالنے لگا۔ اس نے اپنی بھویں لاابالی انداز سے اوپر اٹھائی ہوئی تھیں اور اس کا منہ ادھ کھلا تھا جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو۔ ''ہاں، ہاں، یہ میں اپنی جیب میں ڈال رہا ہوں۔ سیدھا سادا معاملہ ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے، کسی دوسرے کو اس میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔''

''اچھا، جوان،'' اس نے آہ بھرتے ہوئے اور دزدیدہ نظروں سے رستوف کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ برقی شعلے کی طرح تلیانن کی آنکھوں سے چنگاری نکلی، رستوف کی آنکھوں کی طرف لپکی، واپس ہوئی، پھر لپکی۔ متعدد بار یہی ہوا لیکن پلک جھپکنے میں ختم ہو گیا۔

ادھر آؤ،'' رستوف نے تلیانن کا بازو پکڑتے اور اسے کھڑکی کی طرف تقریباً گھسیٹتے ہوئے کہا۔ ''یہ مال دینی سوف کا ہے— یہ تم اڑا لائے ہو،'' اس نے چپکے سے اس کے کان میں کہا۔

''کیا؟ کیا؟ تمھیں اتنی جرأت کیسے ہوئی؟ کیا؟'' تلیانن بڑبڑایا۔

لیکن اس کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے تھے، ان سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص مایوسیوں میں گھرا ہوا ہے، اس کی حالت قابل رحم ہے اور وہ معافی کی بھیک مانگ رہا ہے۔ جونہی رستوف کے کانوں نے اس کا یہ انداز تکلم سنا، اسے محسوس ہوا کہ اس کے سینے سے بھاری بوجھ اتر گیا اور اس کے تمام شکوک رفع ہو گئے ہیں۔ اس کا جی باغ باغ ہو گیا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اس بدنصیب شخص پر، جو اس کے سامنے کھڑا تھا، ترس آنے لگا۔ تاہم اس نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اس نے اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا تھا۔

''خدا جانے، یہاں لوگ کیا سوچیں،'' تلیانن جھپٹ کر ٹوپی اٹھاتے اور بے آباد چھوٹے کمرے کی طرف لپکتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''تمھیں اپنی اس حرکت کا جواز پیش کرنا ہوگا۔''

''مجھے معلوم ہے اور میں ثابت کر دوں گا،'' رستوف نے کہا۔

''میں—''

تلیانن کے زرد اور خوف زدہ چہرے کی ایک ایک رگ پھڑکنے اور کانپنے لگی۔ اس کی نگاہیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں لیکن وہ ایک مرتبہ بھی رستوف کی نگاہوں کا سامنا نہ کر سکیں۔

''کاؤنٹ رستوف... مت بیڑا غرق کرو... ایک نوجوان کا! یہ رہا خانہ برباد روپیہ! اٹھالو!'' اس نے میز پر اشرفیاں پھینکتے ہوئے کہا۔ ''میرا بوڑھا باپ ہے، ماں ہے!...''

رستوف نے اشرفیاں اٹھالیں۔ وہ تلیانن کی نظروں سے نظریں نہ ملا سکا اور ایک لفظ کہے بغیر باہر چل پڑا۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا، وہ رک گیا اور اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

''خدایا!'' اس کے منہ سے نکلا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ''تم نے یہ کیوں کیا؟''

''کاؤنٹ ــ'' تلیانن نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

''مت چھوؤ مجھے!'' رستوف نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمھیں پیسے چاہئیں، تو یہ لو۔''

اس نے پرس اس کے منہ پر دے مارا اور خود ریستوران سے باہر بھاگ گیا۔

5

اسی شام دینی سوف کے مکان پر سکواڈرن کے افسروں کے مابین گرما گرم بحث ہو رہی تھی۔

''رستوف، میرا خیال ہے کہ تمھیں کرنل سے معذرت کرنا چاہیے،'' ایک دراز قد کیپٹن نے، جس کے نقوش موٹے، چہرہ جھریاں زدہ، بال کھچڑی اور مونچھیں بھاری بھرکم تھیں، رستوف کو، جو جوش و خروش سے لال سرخ ہو رہا تھا، مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کچھ ایسا پیچ آن پڑا کہ دو مرتبہ کیپٹن کرسٹن کو ڈوئیل لڑنا پڑی، دونوں مرتبہ اس کی تنزلی عمل میں آئی اور دونوں ہی بار اسے دوبارہ اپنے عہدے پر بحال کر دیا گیا۔

''میں کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ مجھ کو دروغ گو کہے!'' رستوف نے تیکھی آواز میں چلا کر کہا۔ ''انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں اور میں نے ان سے کہا کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں اور معاملہ یہاں ختم ہو گیا۔ ان کا جی چاہے تو ہر روز میری ڈیوٹی لگا دیں اور جی چاہے تو مجھے گرفتار کرا دیں۔ لیکن کوئی شخص مجھے معافی مانگنے پر مجبور نہیں کر سکتا کیونکہ اگر وہ رجمنٹل کمانڈر کی حیثیت سے میری تشفی کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے ہیں پھر ــ''

''بیٹے، ذرا صبر۔ میری بات کان کھول کر سنو،'' سٹاف کیپٹن نے اپنی مونچھوں کو تاؤ دیتے اپنے مدھم لیکن بھرپور لہجے میں اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم نے دوسرے افسروں کی موجودگی میں رجمنٹل کمانڈر کو بتایا کہ ایک افسر نے چوری کا ارتکاب کیا ہے اور اس نے ــ''

''یہ میرا قصور نہیں کہ گفتگو دوسرے افسروں کی موجودگی میں شروع ہو گئی۔ شاید مجھے ان کے سامنے بات نہیں

کرنا چاہیے تھا لیکن میں ڈپلومیٹ نہیں۔ اسی لیے میں ہوزاروں میں بھرتی ہوا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہاں باریک بینیوں اور موشگافیوں کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ لیکن وہ فرماتے ہیں کہ میں کذب بیانی کر رہا ہوں۔ سو انھیں چاہیے کہ وہ میری تشفی کریں۔"

"یہ تو سب ٹھیک ہے۔ کوئی یہ نہیں کہتا کہ تم بزدل ہو لیکن اصل مسئلہ یہ نہیں۔ کیڈٹ افسر سے رجمنٹل کمانڈر معذرت طلب کرے، ناممکن۔ دینی سوف سے پوچھ لو۔"

دینی سوف اکل کھرے پن سے اپنی مونچھیں چبا رہا اور گفتگو سن رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اس گفتگو میں کوئی حصہ لینا نہیں چاہتا۔ اس نے سٹاف کیپٹن کے سوال کا جواب اپنا سر نفی میں ہلا کر دیا۔

"تم نے دوسرے افسروں کی موجودگی میں اس ناگوار واقعے کا ذکر کیا،" سٹاف کیپٹن نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "باگدانچ (رجمنٹل کمانڈر) نے تمھیں چپ کرا دیا۔"

"انھوں نے مجھے چپ نہیں کرایا۔ انھوں نے یہ کہا کہ میں سچ نہیں بول رہا۔"

"بہت اچھا۔ چنانچہ تم ان کے سامنے جی بھر کر واہیات باتیں کرتے رہے۔ اور تمھیں معذرت کرنا ہی ہوگی۔"

"ہرگز نہیں،" رستوف نے چلا کر کہا۔

"مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی،" سٹاف کیپٹن نے سنجیدہ اور سخت انداز اپناتے ہوئے کہا۔ "تم معذرت کرنے سے انکار کر رہے ہو۔ لیکن برخوردار، سنو، تم ان کے سامنے ہی نہیں، بلکہ ہم سب کے سامنے، ساری رجمنٹ کے سامنے، سراسر قصوروار ہو۔ بات کچھ یوں بنتی ہے: تمھیں چاہیے تھا کہ سوچ بچار کرتے، کسی سے صلاح مشورہ کرتے کہ اس معاملے سے کس طرح نپٹنا چاہیے۔ لیکن تم نے اس قسم کی زحمت اٹھانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ تم سیدھے وہاں گئے اور سب کچھ افسروں کے سامنے اگل دیا۔ کرنل کیا کرتے؟ افسر کا کورٹ مارشل کرتے اور ساری رجمنٹ کے منہ پر سیاہی مل دیتے؟ چونکہ اس میں ایک لفنگا آ گیا ہے، اس لیے ساری رجمنٹ کو بدنامی کے اتھاہ غار میں پھینک دیتے؟ تمھاری یہی سوچ ہے؟ ہوگی۔ لیکن ہم اس طرح نہیں سوچتے۔ اور باگدانچ نے بہت اچھا کیا کہ یہ کہہ دیا کہ تم سچ نہیں بول رہے۔ یہ صورت حال خوشگوار تو نہیں لیکن اس کے علاوہ اور چارۂ کار بھی کیا تھا؟ برخوردار، تم نے خود بیل کو دعوت دی ہے کہ آؤ اور مجھے مارو۔ لیکن اب جب کہ وہ اس معاملے پر مٹی ڈال دینا چاہتے ہیں تم اکڑفوں دکھاتے ہو اور کہتے ہو کہ میں معذرت نہیں کروں گا اور اس مسئلے کو چاروں دانگ پھیلاؤں گا۔ تمھیں ذرا ڈیوٹی دے دی گئی تو تم سمجھنے لگے کہ تمھاری توہین ہوئی ہے۔ لیکن اگر تم ایک بزرگ اور واجب التعظیم افسر سے معذرت کر لو، تو تمھارا کیا بگڑ جائے گا؟ باگ دانچ میں لاکھ خامیاں ہیں لیکن وہ دلیر اور واجب التعظیم بزرگ کمانڈر ضرور ہیں۔ تم اپنی ناراضگی کا اظہار کرنے میں تو ذرا بھی تاخیر کے روادار نہیں ہو لیکن پوری رجمنٹ کی توہین کرنے میں تمھیں قطعاً کوئی عار محسوس نہیں ہوتی،" سٹاف افسر کی آواز کپکپانے لگی۔ "برخوردار، تمھیں رجمنٹ میں آئے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہوئے ہیں۔ تم آج یہاں ہو کل کہیں ایجوٹنٹ بن کر چلے جاؤ گے۔ اگر کل کلاں لوگوں

نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ 'پاولوگرات افسروں میں چور بھی موجود ہیں'! تو تمھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لیکن ہمارا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ کیوں دینی سوف؟ میں نے ٹھیک کہا نا؟ ہمارے لیے لازماً فرق پڑے گا۔"

دینی سوف خاموش رہا۔ وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ البتہ وقتاً فوقتاً اپنی دغدغاتی نگاہیں رستوف پر ضرور ڈال لیتا۔

"تمھیں اپنی خودداری عزیز ہے اور تم معذرت نہیں کرنا چاہتے لیکن ہم عمر رسیدہ لوگوں کو جو اس رجمنٹ میں پلے بڑھے، جنھوں نے اس میں اپنی جوانیاں بتا دیں اور جو انشاء اللہ اسی میں موت کو گلے لگائیں گے، اس کا عزووقار عزیز از جان ہے۔ اور باگ داچ یہ بات جانتا ہے۔ صاحب زادے، تمھیں کیا معلوم کہ یہ رجمنٹ ہمیں کتنی عزیز ہے! اور تم، تم غلطی پر ہو، بالکل غلطی پر ہو۔ تم برا مناتے ہو، تو مناتے پھرو لیکن میں اپنے دل کی بات ضرور زبان پر لاؤں گا۔ تم غلطی پر ہو!"

اور سٹاف افسر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"انھوں نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ لعنت بھیجو!" دینی سوف نے اچھلتے ہوئے کہا۔ "رستوف، جانے دو، غصہ تھوک دو!"

رستوف کے چہرے کا رنگ کبھی سرخ ہو رہا تھا اور کبھی زرد۔ اس نے پہلے ایک افسر کی طرف دیکھا اور پھر دوسرے کی طرف۔

"نہیں، دوستو نہیں — آپ کو اس طرح سوچنا بھی نہیں چاہیے — میں بالکل سمجھ گیا ہوں — لیکن باتیں بنانے کا فائدہ؟ میں اپنے اعمال سے ثابت کر دوں گا کہ اس رجمنٹ کا عزووقار — خیر، بہرحال، قصور میرا ہی ہے!" اس کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ "قصوروار سراسر میں ہوں۔ اچھا، اب آپ اور کیا چاہتے ہیں؟"

"کاؤنٹ، یہ ہوئی نہ بات!" سٹاف کیپٹن نے رستوف کی طرف مڑتے اور اپنے بھاری ہاتھ سے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے با آواز بلند کہا۔

"میری سنیں۔" دینی سوف نے کہا۔ "یہ بہت اچھا آدمی ہے!"

"کاؤنٹ، یہ اور بھی اچھا ہوا ہے،" سٹاف کیپٹن نے ایک بار پھر اسے یوں اس کے خطاب سے پکارتے ہوئے کہا جیسے وہ اس کے اعتراف پر صاد کر رہا ہو۔ "یور ایکسی لینسی، جائیں اور معذرت کر لیں۔ جی ہاں، جائیں۔"

"دوستو، میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ اب آپ میری زبان سے ایک لفظ تک نہیں سنیں گے،" رستوف نے ملتجیانہ لہجے سے کہا۔ "لیکن میں معافی نہیں مانگ سکتا۔ خدا کی قسم نہیں مانگ سکتا — آپ جو جی چاہے، کریں، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں کسی ننھے منے بچے کی طرح جاؤں اور گڑگڑا کر معافی مانگوں؟"

دینی سوف ہنسنے لگا۔

"اگر تم نے معذرت نہ کی، تو یہ تمھارے حق میں اور بھی برا ہوگا۔ باگ داچ دل میں رکھے گا۔ وہ تمھیں

تمھاری ہٹ دھرمی کا مزہ چکھادے گا،'' کرسٹن نے کہا۔
''خدا کی قسم، یہ ہٹ دھرمی نہیں۔ میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں، اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ قاصر ہوں۔''
''خیر، جیسے تمھاری مرضی،'' سٹاف کیپٹن نے کہا۔ ''اور وہ لفنگا کہاں گیا؟'' اس نے دینی سوف سے پوچھا۔
''اس نے ناسازیٔ طبع کی بنا پر رخصت کی درخواست بھیج دی ہے اور کل ویسے بھی اس کی ڈیوٹی نہیں ہے،'' دینی سوف نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔
''ناسازیٔ طبع ہی ہونا چاہیے۔ اور کوئی بہانہ نہیں چل سکتا،'' سٹاف کیپٹن نے کہا۔
''بھلے وہ بیمار ہو یا چنگا، میرے سامنے بالکل نہ آئے ۔ میں اس کا گلا گھونٹ دوں گا!'' دینی سوف نے خونخوار لہجے سے چلاتے ہوئے کہا۔
عین اسی وقت ژرکوف کمرے میں داخل ہوا۔
''آپ کیسے آئے؟'' متعدد افسروں نے بیک آواز اس سے دریافت کیا۔
''حضرات، ہمارا میدان جنگ کی طرف کوچ ہو رہا ہے۔ میک نے اپنی تمام فوج سمیت ہتھیار ڈال دیے ہیں۔''
''یہ صحیح نہیں ہے!''
''میں خود اس سے مل چکا ہوں۔''
''کیا؟ آپ نے جیتے جاگتے میک کو دیکھا ہے؟ بازوؤں اور ٹانگوں سمیت؟''
''میدان جنگ کی طرف! جنگ! یار، اتنی زبردست خبر لائے ہیں، انھیں تو پوری بوتل پلانا چاہیے! لیکن آپ یہاں کیسے آ گئے؟''
''اس ابلیس میک کی وجہ سے مجھے دوبارہ رجمنٹ میں بھیج دیا گیا ہے۔ ایک آسٹروی جرنیل نے میری شکایت کر دی تھی۔ میں نے میک کی آمد پر اسے ہدیۂ تبریک پیش کیا تھا۔ رستوف، تمھیں کیا ہوا؟ معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی کھولتے ہوئے حمام سے باہر آئے ہو۔''
''یار، ہم گزشتہ دو روز سے عجیب چکر میں پھنسے ہوئے ہیں۔''
ایک ایجوٹنٹ اندر آیا۔ ژرکوف جو خبر لایا تھا، اس نے اس کی تصدیق کر دی۔ انھیں حکم ملا۔ ''کل کوچ ہوگا۔''
''حضرات، ہم محاذ پر جا رہے ہیں!''
''اچھا، خداوند کا شکر ہے! ہم مدتوں سے بیکار بیٹھے تھے!''

6

''کوتوزوف واپس ویانا کی جانب[10] چل پڑا۔ اس نے اپنے عقب میں براؤناؤ کے مقام پر دریائے ان (Inn) کا

اور لنٹس کے مقام پر دریائے ٹراؤن (Traun) کا پل تباہ کر دیا۔ 23 اکتوبر کو روسی فوجیں دریائے اینس (Enns) عبور کر رہی تھیں۔ دوپہر کے وقت روسیوں کی ساز و سامان سے لدی پھندی گاڑیاں، توپ خانہ اور افواج کے پرے پل کے دونوں اطراف اینس قصبے میں سے گزر رہے تھے۔

اس روز موسم قدرے گرم تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ مہینہ خریف کا تھا۔ پل کی حفاظت کے لیے پہاڑیوں پر روسی توپ خانہ متعین کر دیا گیا تھا۔ ان پہاڑیوں سے چاروں اطراف کا وسیع و عریض منظر صاف دکھائی دے رہا تھا لیکن کبھی کبھار آڑی ترچھی بارش مکڑی کے جالے کی طرح باریک چادر تان دیتی اور یوں یہ منظر دھندلا جاتا۔ پھر اچانک دھوپ نکل آتی، ایکا ایکی سارا منظر دوبارہ وسعت اختیار کر لیتا اور دور دور کی اشیا یوں واضح طور پر نظر آنے لگتیں جیسے ان پر ابھی ابھی رنگ و روغن پھیرا گیا ہو۔ ان پہاڑیوں کے نیچے ننھا سا قصبہ، اپنے سرخ و سپید چھتوں والے مکانات، عظیم گرجے اور پل (جس کے دونوں کناروں پر روسی فوجوں کے جتھے موجود تھے) سمیت دکھائی دے رہا تھا۔ دریائے ڈینیوب کے موڑ پر، جہاں دریائے اینس اس میں شامل ہوتا ہے، چند بحری جہاز، ایک جزیرہ اور ایک قلعہ اپنا منظر دکھا رہے تھے۔ قلعے کے اردگرد پارک تھا جو دریائے اینس اور دریائے ڈینیوب کے، جس کا سنگستانی اور ناہموار مغربی کنارہ صنوبر کے جنگلات سے ڈھکا ہوا تھا، مشترکہ پانیوں میں محصور تھا۔ جنگلے کے عقب میں سبز چوٹیوں اور نیلگوں وادیوں کا پراسرار پس منظر تھا۔ اس سے بھی آگے خودرو صنوبر کے درختوں کا، جو بظاہر آج تک انسانوں کی دست برد سے محفوظ رہے تھے، ایک اور خودرو جنگل تھا۔ وہیں کہیں عیسائی راہبوں کی خانقاہ تھی جس کے بلند و بالا میناران صنوبر کے درختوں سے بھی اونچے تھے۔ وہیں دریائے اینس کے پار بہت دور پہاڑی پر دشمن کی گھڑ سوار فوج کے گشتی سپاہی دیکھے جا سکتے تھے۔

عقبی سپاہ کا کمانڈنگ جرنیل اپنے ایک سٹاف افسر کے ساتھ پہاڑی پر ہلکی جنگی توپوں کے مابین کھڑا تھا۔ وہ دوربین میں سے عسکری نقطۂ نگاہ سے علاقے کے خدوخال کا جائزہ لے رہا تھا۔ ان کے ذرا پیچھے نیسوتسکی، جسے کمانڈر انچیف نے عقبی فوج میں بھیج دیا تھا، ایک توپ گاڑی کے دنبالے پر بیٹھا ہوا تھا۔ جو قازق اس کے ہمراہ آیا تھا، وہ اسے تھیلا اور صراحی پیش کر چکا تھا اور وہ پیسٹیوں* اور اصلی Doppel kummel** سے بعض افسروں کی خاطر مدارت کر رہا تھا۔ یہ افسران بہ طیب خاطر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان میں سے بعض گیلی گھاس پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے اور بعض محض دوزانو ہو رہے تھے۔

''جی، جس آسٹروی شہزادے نے یہاں قلعہ تعمیر کرایا تھا، وہ کوئی احمق شخص نہیں تھا۔ یہ بہت خوبصورت اور پرشکوہ مقام ہے لیکن حضرات، آپ کھا کیوں نہیں رہے؟'' نیسوتسکی نے کہا۔

''پرنس، آپ کا بہت، بہت شکریہ،'' ایک افسر نے جواب دیا۔ وہ اسی بات پر خوش تھا کہ اسے ایک اہم

* پیسٹی (Pasty) ایک قسم کا سموسہ جس میں مصالحے دار گوشت، سبزیاں، جام یا پھل بھرے ہوتے ہیں۔

** Dop pel kummel: جرمن شراب۔ اس میں زیرے کی چاشنی ہوتی ہے۔

سٹاف افسر کے ساتھ بات کرنے کا موقع مل رہا ہے۔ ''یہ واقعی خوبصورت جگہ ہے۔ ہم پارک کے بالکل قریب سے گزرے تھے اور وہاں ہمیں دو ہرن بھی دکھائی دیے تھے۔ اور یہ محل کتنا پر شکوہ ہے!''

''پرنس، ملاحظہ فرمائیں،'' ایک اور افسر نے کہا۔ اس کا جی تو بہت چاہتا تھا کہ وہ ایک اور پیسٹی کھائے لیکن اسے مزید کھاتے شرم محسوس ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ جھوٹ موٹ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے وہ بنظر غائر گرد و پیش کے منظر کا جائزہ لے رہا ہو۔ ''ہماری پیادہ فوج پہلے ہی وہاں پہنچ چکی ہے۔ وہ ادھر، گاؤں کے پار چراگاہ میں ہمارے تین جوان کوئی چیز گھسیٹ رہے ہیں۔ وہ منٹوں میں اس قلعے کا صفایا کر دیں گے،'' اس نے صریحاً پسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''بالکل کر دیں گے، شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں،'' نیس وتسکی نے کہا۔ ''لیکن میں چاہتا ہوں،'' اس نے اپنے خوش شکل اور مرطوب ہونٹوں میں پیسٹی دباتے ہوئے مزید کہا، ''کہ میں کھسکتا کھسکتا وہاں پہنچ جاؤں۔'' اس نے پہاڑی پر واقع خانقاہ کے میناروں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکرا رہا تھا، اس کی آنکھیں سکڑ گئیں اور ان میں روشنی جھلملانے لگی۔ ''حضرات، واقعی بڑا لطف آئے گا۔''

افسران ہنس پڑے۔

'ذرا راہباؤں کو ڈرائیں گے۔ سنا ہے کہ ان میں چند نوخیز اطالوی حسینائیں ہیں۔ میں اپنی زندگی کے پانچ سال ان کے قدموں پر نچھاور کر دوں گا۔ یقین مانیں، بالکل کر دوں گا!''

''وہ خود بھی بہت بور ہو رہی ہوں گی،'' ایک افسر نے جو دوسروں کی نسبت ذرا زیادہ جرأت مند تھا، ہنستے ہوئے کہا۔

دریں اثنا سٹاف افسر، جو پیش منظر میں کھڑا تھا، ہاتھ کے اشارے سے جرنیل کی توجہ کسی چیز کی جانب دلا رہا تھا۔ جرنیل نے اپنی دوربین سے دیکھا۔

''ہاں، تم نے ٹھیک کہا، ٹھیک کہا،'' اس نے دوربین نیچے کرتے اور کندھے اچکاتے برافروختگی سے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ وہ پل پر انھیں فائرنگ کی زد میں لینا چاہتے ہیں۔ لیکن وہ وہاں بیکار وقت کیوں ضائع کر رہے ہیں؟''

مخالف سمت دشمن ننگی آنکھ سے بھی نظر آ رہا تھا۔ اس کے توپ خانے سے دودھیا سفید دھواں بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی کہیں دور سے گولی چلنے کی آواز آئی اور ہمارے لشکری پل کی جانب بھاگتے دکھائی دیے۔

نیس وتسکی دانت نکوستا توپ سے نیچے اترا اور مسکراتا جرنیل کے پاس پہنچا۔

''یور ایکسی لینسی، آپ ایک آدھ لقمہ لینا پسند فرمائیں گے؟'' اس نے دریافت کیا۔

''بڑی خرابی ہو رہی ہے،'' جرنیل نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر کہا۔ ''ہمارے جوان ضرورت سے زیادہ سست رو ہیں۔''

''یور ایکسی لینسی، حکم فرمائیں تو میں گھوڑے پر وہاں چلا جاتا ہوں،'' نیس وتسکی نے پوچھا۔

''ضرور، مہربانی ہوگی،'' جرنیل نے جواب دیا۔ اور اس نے ایک حکم، جو پہلے ہی بالتفصیل جاری کیا جا چکا تھا، دہرا دیا۔ ''ہوزاروں سے کہہ دو کہ انھیں سب سے آخر میں دریا عبور کرنا ہے جیسا کہ میں حکم دے چکا ہوں، انھیں پل کو نذر آتش بھی کرنا ہے اور پل پر آتش گیر مادے کا بھی دوبارہ معائنہ کرنا ہے۔''

''بہت اچھا،'' نیس وتسکی نے کہا۔

اس نے قازق کو، جو گھوڑے کی لگام پکڑے کھڑا تھا، بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ تھیلا اور صراحی سمیٹ لے۔ اگرچہ اس کا جثہ بھاری بھرکم تھا لیکن وہ نہایت پھرتی سے اچھلا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

''میرا خیال ہے کہ اب مجھے راہبات سے ملاقات کا موقع میسر آ ہی جائے گا،'' اس نے خندہ دہن افسروں سے، جو اسے ٹیڑھے میڑھے پہاڑی راستے پر جاتے دیکھ رہے تھے، کہا۔

''کیپٹن، آؤ ذرا دیکھیں کہ یہ کہاں تک مار کرتی ہیں۔ ذرا انھیں آزماؤ تو سہی!'' جرنیل نے توپ خانے کے افسر سے کہا۔ ''وقت بھی گزر جائے گا اور کچھ تفریح بھی ہو جائے گی۔''

''توپوں پر پہنچ جاؤ!'' افسر نے حکم دیا۔

پلک جھپکنے میں توپچی بغلیں بجاتے اور نعرے لگاتے پڑاؤ کے الاؤوں سے توپوں کے پاس پہنچ گئے اور گولے بھرنے لگے۔

''نمبر ایک!'' حکم سنائی دیا۔

نمبر ایک نے پھرتی سے ایک طرف چھلانگ لگا دی۔ توپ دغی، گوش خراش آواز سنائی دی، پہاڑی کے نیچے جو ہمارے سپاہی تھے، ان کے سروں کے اوپر ایک گولہ سنسناتا اور دشمن سے خاصا دور ادھر ہی گر پڑا۔ دھوئیں کا مرغولہ بلند ہوا اور یہ نشان دہی کر گیا کہ گولہ کہاں گرا اور پھٹا تھا۔

آواز کی سماعت پر افسروں اور جوانوں کے چہروں پر رونق آ گئی۔ وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پہاڑی کے دامن میں اپنے فوجیوں کی، جو صاف دکھائی دے رہے تھے، اور دشمن کی، جو ادھر آ رہا تھا لیکن ابھی خاصا دور تھا، حرکات و سکنات بغور دیکھنے لگے۔ عین اسی لمحے بادلوں کی اوٹ سے سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ برآمد ہوا۔ توپ کی واحد پرشکوہ آواز اور درخشندہ و تابندہ دھوپ یوں گلے ملیں کہ شگفتگی و فرحت ساری فضا پر محیط ہو گئی۔

7

غنیم کی توپوں کے دو گولے پل کے، جہاں جوانوں کا جم غفیر تھا، اوپر سے گزرتے دریا کی دوسری سمت گر چکے تھے۔ پرنس نیس وتسکی گھوڑے سے اتر چکا تھا اور پل کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم بھیڑ اور جنگلے کے درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے ہنستے مسکراتے پیچھے مڑ کر اپنے قازق کی، جو دونوں گھوڑوں کی لگامیں تھامے اس سے کئی قدم دور کھڑا تھا، جانب دیکھا۔ جونہی پرنس نیس وتسکی آگے بڑھنے کی کوشش کرتا، انسانوں اور گاڑیوں کا ریلا اسے

پیچھے دھکیل دیتا۔ وہ دوبارہ جنگلے کے ساتھ چپک جاتا اور مسکرانے کے علاوہ اور کچھ نہ کرسکتا۔

''برخوردار، ذرا سنبھل کر،'' قازق نے ایک گاڑی بان فوجی سے، جو سامان سے لدی پھندی گاڑی پیادہ سپاہیوں کے، جو بار بار اس کے پہیوں اور گھوڑوں سے ٹکرا رہے تھے، بیچ میں سے گزارنے کی تگ و دو کررہا تھا، چلا کر کہا۔ ''کیسے آدمی ہو؟ ایک منٹ صبر نہیں ہوتا؟ دیکھتے نہیں جرنیل گزرنا چاہتے ہیں؟''

لیکن گاڑی بان پر لفظ ''جرنیل'' کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ بدستور ان فوجیوں کو، جو اس کے راستے کی دیوار بنے ہوئے تھے، چلا چلا کر متنبہ کررہا تھا:

''ہٹو بچو، دوستو، بائیں طرف رہو! رک جاؤ!''

لیکن ''دوست'' تھے کہ کندھے سے کندھا بھڑائے، ایک دوسرے کی سنگینوں میں سنگینیں پھنسائے، دھکم پیل کرتے ہجوم در ہجوم، انبوہ در انبوہ، آگے بڑھے جارہے تھے۔ پرنس نیس وتسکی جنگلے کے اوپر جھکا دریائے اینس کی تیز رفتار، شوریدہ سر اور پایاب موجوں کو ستون سے ٹکراتے، جھاگ اڑاتے، غیر مختتم دائرے اور بھنور بناتے دیکھ رہا تھا۔ جب اس نے سر اٹھا کر پیچھے دیکھا تو اسے پل کے اوپر بھی ویسی ہی لہریں نظر آئیں لیکن یہ لہریں زندہ اور جیتی جاگتی تھیں اور انھیں فوجی، جھالردار رسیاں، پھجے دار مخروطی ٹوپیاں، فوجی تھیلے، دستی بندوقیں، سنگینیں، مخروطی ٹوپیوں کے نیچے چوڑی ہڈیوں اور پچکے ہوئے گالوں والے تھکے ماندہ اور بے رونق چہرے اور لیس دار کیچڑ میں، جس نے پل کو ڈھانپا ہوا تھا، لتھڑے پاؤں بنا رہے تھے۔ جس طرح نیچے دریائے اینس کی لہروں پر سفید جھاگ کے گالے نمودار ہو رہے تھے، ایسے ہی پل کے اوپر انسانوں کی یک رنگی اور بے کیف لہروں کے مابین زبردستی راستہ بناتا فوجی چغے میں ملبوس کوئی افسر، جس کا چہرہ عام فوجی چہروں سے قطعی مختلف دکھائی دیتا، آنکلتا۔ جس طرح بعض اوقات کوئی تختہ، دریائی موجوں کے ساتھ بہتا چلا جاتا، بعینہٖ کوئی ہوزار، جو پیدل آرہا ہوتا، کوئی اردلی یا کوئی شہر کا باشندہ، پیادہ فوجیوں کی لہروں کے ساتھ بہتا گزر جاتا۔ پھر جس طرح بعض اوقات کوئی چوبی شہتیر دریا کی سطح پر تیرتا آگے نکل جاتا، بالکل اسی طرح سامان سے لدی پھندی اور چمڑے سے ڈھکی گاڑی چاروں اطراف سے لوگوں کے ہجوم میں گھری نمودار ہوتی اور پل پر کھسکتی چلی جاتی۔

''انھیں دیکھو، کیا جوق در جوق چلے آرہے ہیں!۔ معلوم ہوتا ہے کہ بند پھٹ گیا ہے!'' قازق نے کہا۔ وہ ہجوم میں یوں پھنسا کھڑا تھا کہ اسے باہر نکلنے کی کوئی امید نظر نہیں آرہی تھی۔ ''ابھی کتنے اور آئیں گے؟''

''ایک کم دس لاکھ!'' پھٹا پرانا کوٹ پہنے ایک خوش مزاج جوان نے جواب دیا۔ اس نے آنکھ ماری اور نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

اس کے پیچھے پیچھے ایک سن رسیدہ شخص آرہا تھا۔

''اگراس'' (اس کی مراد غنیم تھا) ''نے پل پر گولوں کی بارش کردی،'' اس نے آزردہ لہجے سے کہا، ''تو تمھیں اتنا موقع بھی نہیں ملے گا کہ ذرا رک کر اپنے جسم کو ہی کھرچ سکو۔''

وہ گزر گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک اور سپاہی آ رہا تھا۔ وہ چھکڑے پر سوار تھا۔

''خدا کی مار، یہ ٹانگوں کی پٹیاں کہاں گھسیڑ دی ہیں؟'' ایک اردلی نے، جو گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگا آ رہا تھا اور اس کے عقبی سامان کی الٹ پلٹ کر رہا تھا، چلا کر پوچھا۔

وہ اور گاڑی دونوں گزر گئے۔ اس کے بعد ایک فوجیوں کا گروہ آیا۔ یہ لوگ ترنگ میں تھے اور زور زور سے قہقہے لگا رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ ڈٹ کر پیتے رہے ہیں۔

پھر، یار، اس نے کیا کیا، اپنی بندوق اٹھائی اور اس کا کندا اس کے دانتوں میں گھسیڑ دیا...'' ان میں سے ایک، جس نے اوورکوٹ کی آستینیں اوپر چڑھائی ہوئی تھیں، اپنا ہاتھ لہرا کر مسرت وانبساط سے کہہ رہا تھا۔

''ہاں، یار، سالی پٹھ بہت مزیدار تھی،'' دوسرے نے فلک شگاف قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

وہ بھی آگے نکل گئے۔ چنانچہ پرنس نیس وتسکی کو یہ کبھی معلوم نہ ہو سکا کہ کندا کس کے دانتوں میں گھسیڑا گیا تھا اور اس کے ساتھ پٹھ کا کیا تعلق تھا۔

''کیا بھگدر مچی ہوئی ہے! اگر اس نے ایک بھی گولی چلا دی، تو دل میں یہی خیال آئے گا کہ یہاں قتل عام ہو رہا ہے،'' ایک سارجنٹ نے غصیلے اور ملامت آمیز انداز سے کہا۔

''جب گولی میرے کان کے قریب سے سنسناتی گزری، میں یہی سمجھا کہ اب خیر نہیں،'' ایک نوجوان سپاہی نے جس کا بُو تھا سا نڈ موافق تھا، کہا۔ اس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ ''واقعی، میں یہی سمجھا۔ ڈر کے مارے میری روح فنا ہوتی جا رہی تھی — بڑی پتلی حالت تھی،'' اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنے خوف پر شیخی بگھار رہا ہو۔

وہ بھی گزر گیا۔ اس کے پیچھے ایک چھکڑا آ رہا تھا۔ سامان کی جتنی گاڑیاں گزری تھیں، یہ ان سے بالکل مختلف تھا۔ یہ جرمن چھکڑا تھا، اسے دو گھوڑے کھینچ رہے تھے، یہ ٹھسا ٹھس لدا ہوا تھا اور اس پر جو کچھ لدا ہوا تھا، وہ بظاہر کسی گھر کا پورا ساز و سامان تھا۔ اس چھکڑے کو ایک جرمن ہانک رہا تھا۔ چھکڑے کے عقب میں ایک عمدہ نسل کی چتکبری گائے، جس کا ایک تھن پہاڑ کا پہاڑ تھا، بندھی ہوئی تھی۔ سامان کے عین اوپر پروں کے بیڈ پر ایک عورت، جس کی گود میں ایک دودھ پیتا بچہ تھا، ایک بڑھیا اور ایک سرخ وسپید گالوں والی صحت مند جرمن لڑکی بیٹھی تھی۔ لاریب ان اجڑے بچڑے کسانوں کو خاص پرمٹ دیا گیا تھا۔ تمام سپاہیوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جب چھکڑا بہت دھیمی رفتار سے چل رہا تھا، ان کی تمام باتوں کا موضوع یہی نو عمر خواتین تھیں۔ ہر چہرے پر تقریباً ایک ہی قسم کی مسکراہٹ رقصاں تھیں اور یہ مسکراہٹ ان بیہودہ خیالات کی آئینہ دار تھی جو وہ ان عورتوں کے بارے میں اپنے قلوب میں پال رہے تھے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ جرمن بھی بھاگ رہے ہیں!''

''یہ میمیں ہمیں بیچ دو،'' ایک اور سپاہی نے جرمن سے، جو غصہ بھی کھا رہا تھا اور ڈر بھی رہا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ جرمن آگے چلتا رہا۔

''دیکھو، کیسی گڑیا بنی بیٹھی ہیں، بالکل شیطان کی بچیاں ہیں!''

''فیاداتوف، کیا خیال ہے تمھیں ان کے پاس نہ ٹھہرا دیا جائے؟''

''یار، اپنی ایسی قسمت کہاں!''

''کہاں جا رہے ہو؟'' پیادہ فوج کے ایک افسر نے پوچھا۔ وہ سیب کھاتا جاتا تھا اور جب خوبرو لڑکی پر اس کی نظر پڑتی، اس کی باچھیں کھلنے لگتیں۔

جرمن نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ سوال اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔

''پسند ہے تو لے لو،'' افسر نے لڑکی کو سیب پکڑاتے ہوئے کہا۔

وہ مسکرا دی اور اس نے سیب پکڑ لیا۔ پل پر موجود دوسرے لوگوں کی طرح پرنس نیس وتسکی بھی اس وقت تک عورتوں کے چہروں سے اپنی آنکھیں اٹھا نہ سکا جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو گئیں۔ جب وہ گزر گئیں، وہی سپاہی اور وہی ان کی گفتگو باقی رہ گئی۔ آخر کار وہ سب چلتے چلتے اچانک رک گئے۔ جیسا کہ اکثر ایسے مواقع پر ہوتا ہے، یہاں بھی وہی ہوا۔ ایک کمپنی کے چھکڑوں کے گھوڑے اچانک پل کے اختتام پر رک گئے اور یوں سارے ہجوم کو مجبوراً انتظار کرنا پڑا۔

''ہم رک کیوں گئے ہیں؟ یہاں کوئی نظم و ضبط ہونا چاہیے،'' سپاہی کہہ رہے تھے۔ ''الو کی دم، دھکے کیوں دے رہے ہو؟ ذرا صبر نہیں کر سکتے؟ اگر اس نے پل کو آگ لگا دی، صورت حال بد تر ہو جائے گی۔ دیکھو، یہاں ایک افسر بھی پھنسے ہوئے ہیں۔'' رکے ہوئے ہجوم سے بھانت بھانت کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ سبھی لوگ آپس میں دھکم دھکا ہو رہے تھے اور ایک دوسرے کو پل کے سرے کی جانب دھکیل رہے تھے۔

پل کے نیچے دریائے اینس کے پانیوں پر نظریں دوڑاتے دوڑاتے، اچانک پرنس نیس وتسکی کو ایک ایسی آواز سنائی دی جو اس نے پہلے نہیں سنی تھی... یہ آواز کسی ایسی چیز کی تھی جو خاصی بڑی تھی اور پانی میں ہچکولے کھاتی بہ سرعت آگے بڑھی چلی آ رہی تھی۔

''دھیان رکھنا، کتنی دور جاتی ہے!'' قریب کھڑے سپاہی نے گمبھیر لہجے سے کہا۔

''یہ شاید ہمیں ہمت دلا رہی ہے کہ ہم بھی ذرا تیز چلیں،'' دوسرے نے بے چین ہو کر کہا۔

ہجوم پھر آگے بڑھنے لگا۔

پرنس نیس وتسکی کو احساس ہوا کہ یہ تو توپ کا گولہ ہے۔

''قازق، ابے، میرا گھوڑا؟ اس نے با آواز بلند کہا۔ ''ارے، تم نے راستہ کیوں روک رکھا ہے؟ ایک طرف ہٹ جاؤ، ایک طرف ہٹ جاؤ!''

وہ بڑی مشکلوں سے اپنے گھوڑے تک پہنچا۔ وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ ''ہٹو، ہٹو'' چلاتا جاتا تھا۔ سپاہی پچک کر ایک طرف ہٹنے لگے تاکہ اس کے لیے راستہ بن سکے لیکن وہ معاً آگے بڑھ آئے اور یوں اس کی

ٹانگیں ان کے بیچ پھنس کر رہ گئیں۔ تاہم جو لوگ اس کے قریب ترین تھے، الزام انھیں نہیں دیا جا سکتا تھا کیونکہ خود انھیں عقب سے زبردست دھکے پڑ رہے تھے۔

''نیس وتسکی! نیس وتسکی! ابے لعنتی!'' اسے عقب سے کرخت آواز سنائی دی۔

نیس وتسکی نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کوئی پندرہ قدم دور اسے واسکا دینی سوف کا سرخ چہرہ دکھائی دیا۔ دونوں کے مابین پیادہ فوج کے پرہجوم ریلے نے، جو آگے کی جانب بڑھ رہا تھا، دیوار کھڑی کی ہوئی تھی۔ دینی سوف نے اپنے ژولیدہ بالوں پر پچھلی جانب ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور اس نے اپنا چغا بانکے انداز سے کندھے پر ڈالا ہوا تھا۔

''ان شیطان کے چیلوں، ان ابلیس کے تخموں، سے کہو کہ مجھے گزرنے دیں،'' واسکا دینی سوف نے چلا کر کہا۔ وہ غیظ وغضب سے کانپ رہا تھا۔ اس کی کوئلوں سے بھی زیادہ سیاہ آنکھیں، اپنی خونخوار پتلیوں سمیت، چمک اور گھوم رہی تھیں جب کہ وہ خود اپنی نیام میں بند شمشیر کو اپنے ہاتھ میں، جو اتنا ہی سرخ تھا جتنا کہ اس کا چہرہ، پکڑے فضا میں لہرا رہا تھا۔

''اخاہ! واسیا!'' نیس وتسکی نے، جس نے اسے دیکھ کر دلی مسرت کا اظہار کیا، کہا۔ ''یہاں کیا کر رہے ہو؟''

''ہمارے سکواڈرن کے لیے آگے بڑھنا ناممکن ہو گیا ہے!'' دینی سوف نے غصے سے لال پیلا ہوتے، اپنے سفید دانت نکوستے اور اپنے اصیل بدوی گھوڑے کو مہمیز لگاتے چلا کر جواب دیا۔ دائیں بائیں گھوڑے کے جسم پر سنگینیں چبھ رہی تھیں۔ وہ اپنے کان پھڑ پھڑا، نتھنے پھلا اور دہانے سے جھاگ اڑا رہا تھا۔ جب وہ اپنے سم پل کے تختے پر پٹختا، تو گونج کی آواز پیدا ہوتی۔ بظاہر معلوم ہو رہا تھا کہ اگر اس کے سوار نے اسے اجازت دے دی، وہ جنگلے کے پار چھلانگ لگا دے گا۔

''یہ کیا ہے؟ آدمی ہیں یا بھیڑیں؟ بالکل بھیڑیں! ہٹو، راستہ دو! ابے جھگڑے والے! ابے شیطان کی اولاد! رک جاؤ! میں اس تلوار سے تمھاری تکا بوٹی کر دوں گا!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''اس نے واقعی اپنی تلوار نیام سے نکال لی اور اسے فضا میں لہرانے لگا۔

سپاہیوں کے چہروں پر مردنی چھا گئی اور وہ گھبرا کر پیچھے کی جانب سکڑ گئے۔ دینی سوف نیس وتسکی سے جا ملا۔

''یہ کیا؟ آج تم نشے میں نہیں ہو؟'' پرنس نیس وتسکی نے اس کے قریب آنے پر اس سے پوچھا۔

''پینے پلانے کا موقع ہی نہیں ملتا،'' واسکا دینی سوف نے جواب دیا۔ ''یہ سارا دن رجمنٹ کو ادھر ادھر بھگائے پھرتے ہیں۔ اگر ہمیں لڑنا ہی ہے۔۔ پھر آئیں، لڑیں، دیر کس بات کی؟ لیکن خدا جانے یہ سب کھٹ راگ کیا ہے؟''

''واہ، آج تو تم بالکل بانکے بنے ہوئے ہو!'' پرنس نیس وتسکی نے اس کے نئے چغے اور اس کی کاٹھی کے نئے غلاف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

دینی سوف مسکرانے لگا۔ اس نے اپنے چرمی کیسے سے معطر رومال نکالا اور اسے پرنس نیس وتسکی کی ناک تلے دھکیل دیا۔

''بالکل! میں میدان کارزار میں جا رہا ہوں! میں نے شیو بنالی ہے، دانت صاف کر لیے ہیں اور اپنے جسم پر خوشبو مل لی ہے۔''

ایک تو پرنس نیس وتسکی کی اپنی شخصیت بارعب تھی، پھر اس کے ساتھ اس کا قازق تھا اور اوپر سے دینی سوف کا، جو اپنی شمشیر لہرا رہا تھا اور پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چلا رہا تھا، عزم آہنی تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہجوم میں پھنستے پھنساتے اور گھسٹتے گھسٹاتے پل کے دوسرے کنارے پر پہنچ ہی گئے اور وہاں انھوں نے پیادہ فوج کو روک لیا۔ وہیں پرنس نیس وتسکی کو وہ کرنل بھی، جسے اس نے پیغام پہنچانا تھا، مل گیا۔ جب اس کا فریضہ مکمل ہو گیا، وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور واپس چل پڑا۔

راستہ صاف کر چکنے کے بعد دینی سوف پل کے کنارے پر ٹکا رہا۔ وہ اپنے ناآختہ گھوڑے[11] کی، جو زمین پر پاؤں پٹخ رہا تھا اور رسہ تڑا کر اپنے ساتھیوں کے قافلے کے ساتھ جا ملنے کی کوشش کر رہا تھا، لگام ڈھیلے ڈھالے انداز سے پکڑے اپنے سکواڈرن کو اپنی جانب آتے دیکھ رہا تھا۔ سموں کے پل کے تختوں سے ٹکرانے سے کچھ ایسا غلغلہ بلند ہو رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ بے شمار گھوڑے سرپٹ بھاگے آ رہے ہیں۔ آگے آگے افسران تھے اور ان کے پیچھے پیچھے جوان، جو چار چار کی ٹولیاں بنائے ایک دوسرے کے برابر برابر چلے آ رہے تھے۔ سکواڈرن سارے پل پر پھیل چکا تھا اور اس کا ہراول دوسرے سرے کو چھونے لگا تھا۔

فوج کی مختلف یونٹوں کی جب ایک دوسرے سے مڈھ بھیڑ ہوتی ہے، ان کا باہمی رویہ کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے انھیں ایک دوسرے سے کوئی تعلق واسطہ نہ ہو، بلکہ وہ اس سے بھی ایک قدم آگے نکل جاتی ہیں، ایک دوسرے کے خلاف بغض کا مظاہرہ کرتی ہیں اور ایک دوسرے پر آوازے کستی ہیں۔ کچھ اسی قسم کے احساسات و جذبات کا اظہار پیدل فوج کے وہ سپاہی کر رہے تھے جنھیں پل پار کرنے سے روک دیا گیا تھا اور جو روندی مسلی کیچڑ میں دھنسے گھوڑوں پر سوار صاف ستھرے اور چھیل چھبیلے ہوزاروں کو منظم انداز سے گزرتے دیکھ رہے تھے:

''واہ بھائی واہ، کیا رنگ نکالا ہے سالوں نے، معلوم ہوتا ہے بن ٹھن کر میلے جا رہے ہیں!'' ایک نے آوازہ کسا۔

''کام کے نہ کاج کے، سو من اناج کے۔ انھیں پالا ہی اس لیے جاتا ہے کہ ان کی نمائش کی جا سکے،'' دوسرے نے لقمہ دیا۔

''ابے پیدل چلنے والو، دھول مت اڑاؤ!'' ایک ہوزار نے ایک پیدل سپاہی کا، جس پر اس کے اچھلتے کودتے گھوڑے نے ابھی ابھی کیچڑ کے چھینٹے برسائے تھے، مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔

''میرے بس میں ہوتا تو میں تمھاری کمر پر فوجی تھیلا لاد کر تمھیں دو دن کی مشقت پر بھیج دیتا۔ تمھارا یہ طلائی فیتہ کچھ تو گھستا!'' پیدل سپاہی نے آستین سے کیچڑ آلود چہرہ پونچھتے ہوئے کہا۔ ''جس طرح تم وہاں بیٹھے ہو، مردم، کبوتری زیادہ معلوم ہوتے ہو۔''

''ذکن، افسروں کو چاہیے کہ تمھیں بھی گھوڑے پر بٹھا دیں۔ بہت اچھے دکھائی دو گے۔ ہونہہ، کیا خیال

ہے؟'' ایک کارپورل نے ایک کوتاہ قامت دبلے پتلے سپاہی سے، جو اپنے تھیلے کے بوجھ تلے دوہرا ہوا جا رہا تھا، دل لگی کرتے ہوئے کہا۔

''اپنی ٹانگوں میں لاٹھی پھنسا لو — سمجھ لو کہ گھوڑے پر سوار ہو گئے'' ایک ہوزار نے چلا کر کہا۔

8

پیادہ فوج کے بقایا سپاہیوں نے صفیں درست کر لیں۔ یوں وہ با آسانی اور بہ عجلت پل عبور کر گئے۔ آخر کار جب سامان سے لدے پھندے تمام چھکڑے گزر گئے، بھیڑ چھٹ گئی اور آخری بٹالین پل پار کرنے لگی۔ دینی سوف کے سکواڈرن کے بعض ہوزاروں کو دشمن کا سامنا کرنے کے لیے دریا کے دوسرے کنارے پر رہنے دیا گیا۔ اگرچہ مخالف سمت کی پہاڑیوں سے دشمن دور فاصلے پر دیکھا جا سکتا تھا لیکن نیچے پل سے وہ ابھی نظر نہیں آ رہا تھا کیونکہ اس وادی کا، جس میں دریا بہہ رہا تھا، افق صرف آدھ دور میل دور بلند گھاٹی کی وجہ سے محدود ہو گیا تھا۔ اس گھاٹی کے سامنے ویرانہ تھا جس میں ہمارے قازق گھڑسوار دستے کے گشتی پہرے دار یہاں وہاں گھومتے پھرتے دیکھے جا سکتے تھے تاکہ وہ دشمن کی نقل و حرکت پر نظر رکھ سکیں۔ مخالف ڈھلوان کی چوٹی پر جو سڑک بنی ہوئی تھی، اچانک اس پر نیلی وردیوں میں ملبوس فوجی بمعہ توپ خانہ نمودار ہوئے۔ یہ فرانسیسی تھے۔ قازق گشتی سپاہی بھاگتے دوڑتے پہاڑی سے نیچے اتر آئے۔ اگرچہ دینی سوف کے سکواڈرن کے تمام افسروں اور جوانوں نے یہ عندیہ دینے کی پوری کوشش کی تھی کہ ان کا دھیان کہیں اور ہے اور وہ آپس میں محض چہلیں کر رہے ہیں لیکن درحقیقت ان کی توجہ ہمہ وقت پہاڑی کی چوٹی پر مرکوز تھی اور وہ یہ سوچ رہے تھے کہ وہاں کیا ہو رہا ہوگا۔ اتنے میں انھیں افق پر دھبے ابھرتے دکھائی دیتے۔ انھوں نے انھیں پہچان لیا کہ یہ دشمن کے سپاہی ہیں۔

سہ پہر کے وقت موسم نکھر گیا اور دریائے ڈینیوب اور اس سے ملحقہ پہاڑیوں کے اوپر آفتاب، جو آہستہ آہستہ مغرب کی جانب بڑھ رہا تھا، اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ ہوا بالکل بند تھی اور وقفے وقفے کے بعد پہاڑی کی چوٹی سے دشمن کے زور شور سے باتیں کرنے اور بگل بجانے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگتی تھیں۔ اب گھڑسوار فوج کے محدودے چند گشتی پہریداروں کے ماسوا سکواڈرن اور دشمن کے مابین اور کچھ نہیں تھا۔ ان دونوں کے درمیان صرف سات سو گز وسیع ویرانہ حائل تھا۔ دشمن فائرنگ بند کر چکا تھا اور وہ سنگین، مہیب، ناقابل رسائی غیر مرئی حد فاصل، جو دو فوجوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتی ہے، اور بھی واضح طور پر محسوس کی جانے لگی تھی۔

''اس حد فاصل سے، جو زندگی اور موت کے درمیان باریک پردہ حائل کرتی ہے، ایک قدم بھی ادھر پڑا، تو سمجھ لو کہ اب تم بے یقینی، کرب و اذیت اور اجل کی وادی میں داخل ہو گئے اور وہاں کیا ہے؟ — وہاں، اس کھیت کے پار، اس درخت کے پیچھے، اس چھت کے نیچے؟ یہ سب چیزیں دھوپ میں چمک رہی ہیں لیکن کوئی نہیں جانتا کہ وہاں کون ہے لیکن کون ہے جو جاننا نہیں چاہتا؟ اس حد فاصل کو عبور کرنے کا تصور ہی دل پر ہول طاری کر دیتا

ہے لیکن اسے عبور کرنے کو جی للچاتا بھی ہے۔ تم خوب جانتے ہو کہ تمھیں اس کے پار جانا ہی ہوگا اور یہ معلوم کرنا ہی ہوگا کہ دوسری طرف کیا ہے بالکل اسی طرح جس طرح کسی دن تمھیں لازماً یہ دریافت کرنا ہوگا کہ موت سے آگے کیا ہے۔ لیکن تم توانا ہو، قوی ہو، صحت مند ہو، تمھارے اندر جوش بھرا ہوا ہے، تمھارا خون کھول رہا ہے اور تم ان لوگوں میں محصور ہو جو تمھاری ہی طرح توانا ہیں اور جوش و جذبے سے معمور۔" ہر وہ شخص، جو اپنے سامنے اپنے دشمن کو دیکھتا ہے، اس طرح سوچتا نہیں، تو کم از کم اس طرح محسوس ضرور کرتا ہے۔ اور ایسے مواقع پر جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے، اس کے بارے میں اس کے ذہن میں جو تاثرات مترتب ہوتے ہیں، انھیں یہ احساسات ایک خاص قسم کی تجلی اور مسرت بخش چٹخارا عطا کر دیتے ہیں۔

اس گھاٹی سے، جس پر دشمن قابض تھا، دھوئیں کا مرغولہ فضا میں بلند ہوا اور ایک توپ کا آہنی گولہ ہوزار سکواڈرن کے سروں کے اوپر سے سنسناتا گزر گیا۔ افسران، جو اکٹھے کھڑے تھے، بکھر گئے۔ ہوزاروں نے نہایت احتیاط سے اپنے گھوڑوں کی صف بندی شروع کر دی۔ پورے سکواڈرن پر خاموشی طاری تھی۔ سبھی کی نگاہیں سامنے اپنے دشمن پر اور حکم کے انتظار میں اپنے سکواڈرن کمانڈر پر جمی ہوئی تھیں۔ توپ کا دوسرا اور پھر تیسرا آہنی گولہ آیا اور سروں کے اوپر سے گزر گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ حریف ہوزاروں کو اپنا نشانہ بنا رہا تھا لیکن گولے تھے کہ ایک ہی رفتار سے آتے، ان کے سروں کے اوپر سے گزرتے اور ان کے عقب میں کہیں جا گرتے۔ ہوزاروں نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہ دیکھا لیکن جونہی گولہ آتا، سروں کے اوپر ہی اوپر اس کے گزرنے کی صدا سنائی دیتی، وہ سب کے سب، جن کے چہرے اتنے مماثل لیکن اتنے مختلف تھے، اپنی سانسیں روک لیتے، اپنی رکابوں میں اچھل پڑتے اور دوبارہ نیچے گر پڑتے۔ کچھ یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ کسی حکم کے تحت ہو رہا ہو۔

اپنی گردنیں گھمائے بغیر سپاہی ایک دوسرے کو ترچھی نگاہوں سے دیکھتے۔ سبھی کو یہ تجسس تھا کہ ان کے ساتھی کس طرح متاثر ہوئے ہیں۔ دینی سوف سے بگلچی تک، ہر شخص کے چہرے اور ٹھوڑی پر کشمکش، گھبراہٹ اور بے چینی کی یکساں لکیریں نمودار ہو چکی تھیں۔ سارجنٹ سپاہیوں کو یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا جیسے وہ انھیں کچا چبا جانے کی دھمکی دے رہا ہو۔ جب بھی گولہ اوپر ہی اوپر گزرتا، کیڈٹ مرانوف پھرتی سے سر نیچے جھکا لیتا۔ رخ پر۔ اپنی لنگڑی ٹانگ کے باوجود رخ خوبصورت گھوڑا تھا۔ سوار رستوف میسرے میں شامل تھا۔ اس کے چہرے پر مدرسے کے اس طالب علم کا، جسے ایک ایسا امتحان دینے کے لیے، جس کے متعلق اسے کامل یقین ہو کہ وہ اس میں سرخرو ہوگا، حاضرین کی کثیر تعداد کے سامنے بلایا گیا ہو، احساس طمانیت و مسرت جھلک رہا تھا۔ اس کا چہرہ روشن اور پرسکون تھا اور وہ ہر شخص کی جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے انھیں یہ سمجھا رہا ہو کہ "دیکھو، میں اس گولہ باری میں بھی کتنا آسودہ اور مطمئن ہوں۔" لیکن اس کے چہرے پر بھی غیر ارادی طور پر دہن کے قریب وہی قدرے نئی اور درشت لکیر ابھر آئی تھی۔

"یہ اوپر نیچے کون اچھل رہا ہے؟ کیڈٹ مرانوف! بری بات ہے۔ میری طرف دیکھو!" کیپٹن دینی سوف

نے، جو آرام سے ایک جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا اور سکواڈرن کے سامنے ادھر ادھر گھوڑا دوڑائے پھر رہا تھا، چلا کر کہا۔
دینی سوف کا روئیں دار، سانولا اور چپٹی ناک والا چہرہ اور اس کا پورے کا پورا کوتاہ لیکن گٹھیلا جسم اپنے بال دار نسلے ہاتھوں اور چھوٹی چھوٹی لیکن موٹی انگلیوں سمیت بالکل ویسا ہی جیسا کہ وہ عموماً لیکن خصوصاً شام کے وقت جب کہ وہ دو بوتلیں چڑھا چکا ہوتا تھا، نظر آتا تھا، دکھائی دے رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ معمول سے زیادہ سرخ ہو رہا تھا۔ اپنے جھبرے سر کو یوں پچھلی جانب جھٹکتے، جس طرح پرندے پانی پیتے وقت جھٹکتے ہیں اور اپنے عمدہ اور اصیل عربی گھوڑے کو بے رحمی سے مہمیز لگاتے وہ سرپٹ سکواڈرن کے دوسرے بازو کی جانب بھاگنے لگا۔ وہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے ابھی ابھی زین کی عقبی جانب گر پڑے گا۔ اس بھاگ دوڑ کے دوران میں وہ جوانوں کو چلا چلا کر کرخت آواز سے حکم دے رہا تھا کہ وہ اپنے اپنے پستولوں کا خیال رکھیں۔ گھوڑے پر سوار وہ کرسٹن کے پاس پہنچا۔ سٹاف کیپٹن جس گھوڑی پر سوار تھا، اس کی کاٹھی چوڑی اور طبیعت مسکین تھی۔ اس کی اپنی مونچھیں لمبی اور چہرہ حسب معمول سنجیدہ تھا لیکن اس کی آنکھیں معمول سے بڑھ کر روشن اور فروزاں تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا دینی سوف کی جانب آیا۔

''خیر،'' اس نے دینی سوف سے کہا۔ ''لڑائی کی نوبت نہیں آئے گی۔ آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہم پیچھے ہٹ جائیں گے۔''

''خدا جانے کیا ہو رہا ہے!'' دینی سوف نے غرا کر کہا۔ ''اخاہ، رستوف!'' وہ کیڈٹ کے مسرور و شاداں چہرے کو دیکھ کر چلایا، ''خیر، تمھیں زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑے گا!''

اور وہ بہ انداز پسندیدگی مسکرانے لگا۔ اس میں شک نہیں تھا کہ کیڈٹ کو دیکھ کر وہ واقعی خوش ہوا تھا۔ رستوف سر سے پاؤں تک نہال ہو گیا۔ عین اسی لمحے کمانڈر پل پر نمودار ہوا۔ دینی سوف گھوڑا سرپٹ دوڑاتا اس کی جانب چل پڑا۔

''یور ایکسی لینسی، ہمیں حملہ کر دینا چاہیے! میں انھیں بھگا دوں گا!''

''حملے کا کوئی حکم موصول نہیں ہوا،'' کمانڈر نے اکتاہٹ سے جواب دیا اور اپنا منہ یوں سکیڑ لیا جیسے کسی مکھی نے اس کا ناک میں دم کر رکھا ہو۔ ''تم یہاں کیوں رکے ہوئے ہو؟ دیکھتے نہیں کہ مخبر بھی پیچھے جا رہے ہیں؟ اپنا سکواڈرن پیچھے لے جاؤ۔''

سکواڈرن پل عبور کر گیا۔ ایک بھی آدمی ضائع کیے بغیر وہ گولہ باری کی زد سے باہر نکل گیا۔ دوسرے سکواڈرن نے، جو اس جگہ تھا جہاں جھڑپ کا امکان ہو سکتا تھا، اس کی تقلید کی اور آخری قازق بھی دریا کے کنارے سے ادھر آ گیا۔

پل عبور کرنے کے بعد پاولوگراد رجمنٹ کے دونوں سکواڈرن پہاڑی پر چڑھ گئے۔ رجمنٹل کمانڈر کارل بوگدانووچ شوبرٹ گھوڑا بھگاتا دینی سوف کے سکواڈرن کے ساتھ آ ملا اور مزے مزے سے چلتا آگے نکل گیا۔ اس

کا راستہ رستوف سے زیادہ دور نہیں تھا اور اگرچہ تلیانن کے واقعے کے بعد یہ ان کی پہلی ملاقات تھی، اس نے اس کی جانب مطلق توجہ نہ دی۔ رستوف کو محسوس ہوا کہ وہ میدان کارزار میں ہے اور اس شخص کے رحم و کرم پر۔ اب اس پر یہ انکشاف ہوا کہ اس آدمی کے ساتھ اس کا جو تنازعہ ہوا تھا، اس میں قصور سراسر اس کا اپنا تھا۔ چنانچہ جب رجمنٹل کمانڈر اس کے قریب سے گزرا، وہ اس کے کسرتی جسم، صحت مند کمر اور گردن سے، جس پر سرخ خوبصورت بال لہلہا رہے تھے، اپنی توجہ ہٹا نہ سکا۔ اسے خیال آیا کہ ''کمانڈر جو مجھ سے یوں ہم کلام ہوئے بغیر گزر گیا ہے، ظاہر یہ کر رہا ہے کہ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں اور معلوم یہ ہوتا ہے کہ اس کا اصل منشا میری جرأت اور دلیری کا امتحان لینا ہے۔'' چنانچہ وہ اپنے گھوڑے پر تن کر بیٹھ گیا اور اپنے گردوپیش یوں دیکھنے لگا جیسے وہ بہت خوش ہو۔ اس کے ذہن میں ایک خیال یہ آیا: ''کمانڈر میرے قریب سے اس لیے گزرا ہے تاکہ وہ اپنی بہادری کی نمائش کر سکے۔'' پھر اچانک ایک اور خیال بجلی کے کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکا کہ اس کا دشمن عمداً اسکواڈرن کو ایک ایسی مہم پر بھیج دے گا جس کا حاصل تو کچھ نہ ہو، لیکن اصل مقصد اسے، یعنی رستوف کو، سزا دینا ہو۔ اس نے دل ہی دل میں تصور کیا کہ ''حملے کے بعد بوگ دانووچ اس جگہ پہنچ جائے گا جہاں میں زخمی حالت میں پڑا ہوں گا اور بڑی دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری طرف صلح کا ہاتھ بڑھا دے گا۔''

اونچے کندھے والا ژرکوف، جسے پاولوگرات رجمنٹ کے تمام ہوزار اچھی طرح جانتے تھے کیونکہ اسے اس رجمنٹ کو چھوڑے زیادہ دن نہیں بیتے تھے، گھوڑے پر سوار رجمنٹل کمانڈر کے پاس آیا۔ جنرل ہیڈکوارٹرز سے نکالے جانے کے بعد وہ رجمنٹ میں واپس نہیں آیا تھا بلکہ اس نے کچھ اس قسم کا چکر چلایا کہ وہ پرنس باگ راتیان کا اردلی افسر مقرر ہو گیا۔ اس کا کہنا یہ تھا: ''میں بے وقوف تھوڑے ہی ہوں کہ محاذ پر اپنی جان کھپاؤں، جب کہ سٹاف میں شامل ہونے سے ہاتھ پاؤں بھی خاص ہلانا نہیں پڑتے اور یافت بھی کہیں زیادہ ہوتی ہے۔'' اب وہ عقبی سپاہ کے کمانڈر کا حکم لے کر اپنے سابق چیف کے پاس جا رہا تھا۔

''کرنل،'' اس نے رستوف کے دشمن کو گمبھیر سنجیدگی سے مخاطب کرتے اور اس کے ساتھیوں پر سرسری نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''حکم یہ ہے کہ یہاں رکا جائے اور پل کو نذر آتش کر دیا جائے۔''

''یہ حکم کسے دیا گیا ہے؟'' کرنل نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کرنل، میں وثوق سے تو نہیں کہہ سکتا کہ حکم کسے دیا گیا ہے،'' لیفٹیننٹ نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''پرنس نے مجھے صرف یہ حکم دیا تھا: 'جاؤ اور کرنل کو بتاؤ کہ ہوزار فوراً واپس آ جائیں اور پل کو نذر آتش کر دیں۔'''

ژرکوف کے پیچھے پیچھے ایک اور سٹاف افسر آ گیا۔ وہ بھی کرنل کے نام یہی پیغام لایا تھا۔ اس سٹاف افسر کے بعد تنومند پرنس نیس وتسکی اپنا قازق گھوڑا، جسے اس کا بوجھ اٹھانے میں بڑی مشکل پیش آ رہی تھی، سرپٹ دوڑاتا ہوا آ پہنچا۔

''کرنل، یہ کیا؟'' وہ ابھی اپنا گھوڑا بھگائے آ رہا تھا اور دور سے ہی چلانے لگا تھا۔ ''میں نے آپ سے عرض

کیا تھا کہ پل کو آگ لگا دی جائے۔ اب کسی شخص نے سارا معاملہ گڑبڑا دیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہاں جتنے بھی لوگ موجود ہیں، ان سب کے دماغ ماؤف ہو گئے ہیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہو رہا ہے۔"

کرنل نے ارادتاً رجمنٹ کو روک لیا اور پرنس نیس وتسکی کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"آتش گیر مادے کے متعلق تم نے ضرور بات کی تھی،" اس نے اپنے جرمن لہجے میں کہا۔ "لیکن پل کو آگ لگانے کے بارے میں تم نے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"لیکن، مائی ڈیئر فیلو،" پرنس نیس وتسکی نے گھوڑے کی لگام کھینچتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اپنے بالوں پر، جو پسینے سے گیلے ہو رہے تھے، پھیرنے لگا۔ "جب آپ نے آتش گیر مادہ پل پر رکھ دیا تھا، پھر یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ اسے آگ لگا دی جائے۔"

"مسٹر سٹاف آفیسر، میں تمھارا ڈیئر فیلو نہیں ہوں۔ اور تم نے مجھے یہ نہیں کہا تھا کہ میں پل کو آگ لگا دوں! میں اپنے فرائض خوب سمجھتا ہوں اور میرا دستور یہ ہے کہ میں احکام پر حرف بہ حرف[12] عمل کرتا ہوں۔ تم نے کہا تھا کہ پل جلایا جائے گا۔ اب میں تم سے ان تمام اشیاء کا جو تقدس کا درجہ رکھتی ہیں، واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ اس سے یہ کیسے فرض کر لیا گیا کہ مجھے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ یہ کس نے جلانا ہے۔"

"اچھا۔ لیکن ہوتا تو ہمیشہ ایسے ہی ہے،" پرنس نیس وتسکی نے اپنا ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ "تم یہاں کیسے آ گئے؟" اس نے ژرکوف کی طرف مڑ کر پوچھا۔

"میں بھی یہی پیغام لے کر آیا تھا۔ لیکن تمھارا جسم تو گیلا ہو رہا ہے۔ آؤ، ذرا نچوڑ دوں۔"

"مسٹر سٹاف آفیسر، تم کہہ رہے تھے ــ" کرنل نے اپنے لہجے میں مظلومیت بھرتے ہوئے کہا۔

"کرنل،" سٹاف افسر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "آپ ذرا جلدی کریں، ورنہ دشمن اپنی گنجائیں[13] آگے لے آئے گا اور ہم پر گریپ شاٹ کی بارش کر دے گا۔"

کرنل نے خاموشی سے سٹاف افسر، تنومند پرنس نیس وتسکی اور ژرکوف کی جانب دیکھا اور اپنی بھویں سکیڑ لیں۔

"میں لگا دوں گا آگ پل کو،" اس نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ گویا کہ وہ انھیں یہ بتا دینا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ جو ناروا رویہ اختیار کیا گیا ہے، اس کے باوجود وہ صحیح طرزِ عمل کا مظاہرہ کرے گا۔

کرنل نے اپنی لانبی اور گٹھیلی ٹانگوں نے ساتھ گھوڑے کو یوں مہمیز لگایا گویا کہ اس ساری بدمزگی کا ذمے دار وہ تھا۔ وہ وہاں سے چلا اور سکواڈرن نمبر 2 کو، جس میں دینی سوف کی سرکردگی میں رستوف خدمات سرانجام دے رہا تھا، حکم دیا کہ وہ پل کی طرف مراجعت کرے۔

"بالکل وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا،" رستوف نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ میرا امتحان لینا چاہتا ہے۔" اس کا دل اینٹھ گیا اور سارا خون چہرے میں سمٹ آیا۔ "وہ آج دیکھ لے گا کہ میں ڈرپوک نہیں ہوں!" اس نے سوچا۔

سکواڈرن کے جوانوں کے بےفکر چہروں پر پھر وہی سنجیدگی غالب آ گئی جو گولہ باری کے دوران میں ان پر

طاری ہوئی تھی۔ رستوف اپنے دشمن کرنل کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اسے امید تھی کہ اس نے جو قیاس آرائی کی تھی، اس کی وہاں توثیق ہو جائے گی۔ لیکن کرنل، جیسا کہ اس کا دستور تھا، میدان جنگ میں اپنی صورت پر متانت اور خشونت اوڑھ لیتا۔ اب بھی اس کی یہی کیفیت تھی۔ اس نے ایک مرتبہ بھی مڑ کر رستوف کی طرف نہ دیکھا۔

حکم کے الفاظ چاروں طرف سنائی دیے۔

''جلدی! جلدی!'' اسے متعدد آوازیں اپنے قریب سنائی دیں۔

ہوزار گھوڑوں سے نیچے اترنے لگے۔ جلد بازی میں ان کی تلواریں لگاموں میں پھنس گئیں اور ان کے مہمیز جھنجھنانے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ انھوں نے اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنائے۔ رستوف اب کرنل کی جانب نہیں دیکھ رہا تھا، اس کے پاس اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ وہ ہوزاروں کے معیار پر پورا نہیں اتر سکے گا اور اس کا دل ڈوبنے لگا۔ جب اس نے گھوڑا اسائیس کے سپرد کیا، اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ دینی سوف گھوڑے پر سوار اس کے قریب سے گزر گیا۔ وہ پچھلی جانب جھکا ہوا تھا اور با آواز بلند کچھ کہہ رہا تھا۔ رستوف کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا، تاہم ہوزار اس کے چاروں اطراف بھاگے پھر رہے تھے۔ ان کے مہمیز الجھ رہے تھے اور شمشیریں ٹکرا رہی تھیں۔

''سٹریچر!'' کسی نے اس کے عقب میں چلا کر کہا۔

رستوف کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ سٹریچر کیوں منگوائے جا رہے ہیں۔ وہ دوڑتا رہا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ دوسروں سے آگے نکل جائے۔ لیکن جونہی وہ پل کے قریب پہنچا، اس کا پاؤں لیس دار اور پامال کیچڑ پر پڑا۔ اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ وہ نیچے نہ دیکھ سکا۔ وہ پھسل گیا، اس کے ہاتھ نیچے اور وہ خود ان کے اوپر گر پڑا۔ دوسرے اس سے آگے نکل گئے۔

''کیپٹن، دونوں اطراف!'' اسے کرنل کی آواز سنائی دی۔ وہ گھوڑے پر سوار اس سے آگے نکل گیا تھا اور پل کے قریب رک گیا تھا۔ اس کے چہرے پر کامرانی اور مسرت ٹپک رہی تھی۔

رستوف نے برجس پر رگڑ کر اپنے ہاتھ پونچھے، اپنے دشمن پر نگاہ ڈالی اور یہ مفروضہ باندھ کر کہ وہ جتنا آگے جائے گا، اتنا ہی بہتر ہوگا، اس نے بھاگنے کا عزم کیا۔ لیکن بوگدانووچ نے فی الحقیقت اس کی جانب دیکھے یا اسے پہچانے بغیر چلا کر اس سے کہا:

''یہ پل پر کون بھاگا جا رہا ہے؟ کیڈٹ، دائیں طرف ہٹ جاؤ۔ واپس پیچھے آجاؤ!'' اس کی آواز غصے سے لرز رہی تھی۔ پھر وہ دینی سوف کی طرف، جو اپنی ظاہری دلیری کی نمائش کرتا پل کے تختوں پر پہنچ گیا تھا، متوجہ ہوا۔

''کیپٹن، آخر خطرہ مول لینے کی کیا ضرورت ہے؟ بہتر ہے کہ نیچے اتر آؤ،'' کرنل نے کہا۔

''اخ، ہر گولی اپنا نشانہ ڈھونڈ لیتی ہے،'' دینی سوف نے زین پر بیٹھے بیٹھے جواب دیا۔

دریں اثنا پرنس نیس وتسکی، ژرکوف اور سٹاف افسر توپوں کے نشانے کی زد سے باہر اکٹھے کھڑے تھے۔ کبھی وہ پیلی شاکو، گہرے سبز کوٹ، جن پر طلائی جھالریں لگی ہوئی تھیں اور نیلی برجسیں پہنے سپاہیوں کو، جن کا چھوٹا سا گروہ پل کے آس پاس جمگھٹا لگائے کھڑا تھا، دیکھنے لگتے اور کبھی ان کی نظریں سمت مخالف اٹھ جاتیں اور انھیں نیلے اوورکوٹ اور گھوڑوں پر سوار ٹولیاں، جنھیں باآسانی توپ خانہ شناخت کیا جا سکتا تھا اور جو ادھر بڑھتی آ رہی تھیں، نظر آنے لگتیں۔

''یہ پل نظر آتش کر سکیں گے یا نہیں؟ وہاں کون پہلے پہنچ سکے گا؟ یہ گرتے پڑتے وہاں پہنچ جائیں گے اور پل کو آگ لگا دیں گے یا فرانسیسی اتنے قریب آ جائیں گے کہ انھیں باآسانی گریپ شاٹ کا نشانہ بنا لیں اور ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیں گے؟'' یہ تھے وہ سوالات جوان فوجیوں میں سے، جو پل کی بالائی جانب پہاڑی پر کھڑے تھے، کوئی بھی اپنے آپ سے پوچھے بغیر نہیں رہ سکتا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کا دل ڈوبنے لگتا تھا۔ ان سب کی نگاہیں شام کی تیز روشنی میں پل پر، ہوزاروں پر اور نیلے اوورکوٹوں پر، جو سنگینیں اور بندوقیں تھامے سمت مخالف سے آگے بڑھے آ رہے تھے، لگی ہوئی تھیں۔

''اف! ہوزاروں کی شامت آ گئی!'' نیس وتسکی نے کہا۔ ''اب وہ گریپ شاٹ کی زد میں ہیں۔''

''اسے چاہیے تھا کہ اتنے سارے جوان اپنے ساتھ نہ لے جاتا،'' سٹاف افسر نے کہا۔

''بالکل ٹھیک،'' پرنس نیس وتسکی نے کہا۔ ''جرأت مند جوان تو دو ہی کافی تھے۔''

''واہ، یوئر ایکسی لینسی،'' ژرکوف نے ہوزاروں سے نظریں ہٹائے بغیر اور اسی سادہ لوح انداز سے، جس سے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہا ہے یا محض مذاق کر رہا ہے، دخل دیتے ہوئے کہا۔ ''واہ، یوئر ایکسی لینسی، واہ! کیا بات ارشاد فرمائی ہے! اگر صرف دو آدمی بھیج دیے جائیں، پھر ہمیں ولادی میر تمغہ[14] اور فیتہ کون دے گا؟ لیکن اب اگر وہ سارے کے سارے بھی بھن جائیں، سکواڈرن کو انعام و کرام کا مستحق قرار دیا جائے گا اور ممکن ہے کہ خود کرنل کے ہاتھ بھی کوئی فیتہ دیتہ آ جائے۔ ہمارے باگ دانووچ خوب جانتے ہیں کہ اس قسم کے معرکے کس طرح سرانجام دیے جاتے ہیں۔''

''وہ رہا!'' سٹاف افسر نے چلا کر کہا۔ ''انھوں نے گریپ شاٹ داغ دیا ہے!''

اس نے فرانسیسی توپوں کی طرف، جنھیں توپ گاڑیوں سے علیحدہ کیا جا رہا اور پرے ہٹایا جا رہا تھا، اشارہ کیا۔

فرانسیسیوں کی سمت سے، ان ٹولیوں کے، جن کے پاس گجنالیں تھیں، بیچ میں سے دھوئیں کا مرغولہ بلند ہوا۔ پھر تقریباً بیک وقت دوسرا اور تیسرا مرغولہ اوپر اٹھا۔ عین اس وقت جب پہلا آہنی گولہ دغنے کی آواز ان کے کانوں تک پہنچی، چوتھی مرتبہ دھواں بہ جانب آسمان پرواز کرتا دکھائی دیا۔ پھر یکے بعد دیگرے دو آوازیں اور اس کے بعد تیسری سنائی دی۔

''اف! افوہ!'' پرنس نیس وتسکی کراہنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت اذیت میں مبتلا ہے۔ اس نے سٹاف افسر کا بازو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا اور بولا: ''دیکھو، دیکھو، ایک جوان گر پڑا ہے! ایک جوان گر پڑا ہے!''

''دو۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں۔''

''اگر میں زار ہوتا تو کبھی جنگ کے پھڈے میں نہ پڑتا''، پرنس نیس وتسکی نے منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا۔

فرانسیسیوں نے پھرتی سے دوبارہ توپوں میں گولے بھرے۔ نیلے اوورکوٹوں میں ملبوس ان کی پیادہ فوج پل پہ دوڑ لگاتے پل کی جانب بڑھی۔ بے قاعدہ وقفوں کے بعد دھوئیں کے مرغولے پھر بلند ہونے لگے۔ گریپ شاٹ پھٹتے اور کھڑکھڑاتے، دھڑ دھڑاتے پل پر آ گرتے۔ لیکن اس مرتبہ پرنس نیس وتسکی کو نظر نہ آ سکا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ پل پر سے دھوئیں کا دبیز بادل بلند ہو رہا تھا۔ ہوزارا سے آگ لگانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ فرانسیسی توپیں ان پر گولے برسا رہی تھیں لیکن اب کے اس گولہ باری کا مقصد ان کے کام میں رکاوٹ ڈالنا نہیں تھا بلکہ یہ گولہ باری اس لیے ہو رہی تھی کہ کیونکہ شست باندھی جا چکی تھی اور حریف، جسے نشانہ بنایا جا سکتا تھا، سامنے موجود تھا۔

جب تک ہوزار واپس اپنے گھوڑوں تک پہنچتے، فرانسیسیوں کو گریپ شاٹ کے تین رونڈ برسانے کا موقع مل گیا۔ دو مرتبہ ان کا نشانہ بالکل خطا گیا اور گولے بہت اوپر نکل گئے لیکن تیسرا رونڈ ہوزاروں کے ایک گروپ کے عین درمیان میں گرا اور تین جوان نیچے گر پڑے۔

رستوف اپنی ادھیڑ بن میں مصروف تھا اور باگ دانو وچ کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ پل پر رک گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کدھر جائے۔ وہاں کوئی شخص ایسا نہیں تھا جس کی وہ گردن کاٹ سکتا (اس کا خیال تھا کہ جنگ میں یہی کچھ ہوتا ہے)۔ وہ پل کو نذر آتش کرنے میں بھی کوئی مدد نہیں دے سکتا تھا کیونکہ دوسرے سپاہیوں کی طرح وہ پرال کا کوئی مٹھا اپنے ساتھ نہیں لایا تھا۔ وہ وہیں کھڑا ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اچانک اسے دھڑ دھڑاہٹ سنائی دی جیسے کوئی شخص پل پر ہتھوڑی سے اخروٹ توڑ رہا ہو اور ایک ہوزار، جو بالکل اس کے قریب کھڑا تھا، چیختا کراہتا اور جنگلے کے ساتھ ٹکراتا نیچے گر پڑا۔ دوسروں کے ساتھ رستوف بھی ادھر بھاگا اور ایک بار کسی نے چلا کر کہا: ''سٹریچر!'' چار اشخاص نے ہوزار پر ہاتھ رکھے اور اسے اوپر اٹھانے لگے۔

''او۔ و۔ و۔ ہ! یسوع مسیح کا واسطہ، مجھے چھوڑ دو!'' زخمی آدمی چلا رہا تھا۔ تاہم اسے اٹھا لیا گیا اور سٹریچر پر ڈال دیا گیا۔

نکولائی رستوف ایک طرف ہٹ گیا جیسے وہ کچھ تلاش کر رہا ہو۔ اس نے دور فاصلے پر دریائے ڈینیوب کے پانیوں، آسمان اور سورج پر نظریں ٹکا دیں۔ آسمان کتنا خوبصورت، کتنا نیلگوں، کتنا پرسکون، کتنا عمیق نظر آ رہا تھا! روبہ زوال آفتاب کتنا درخشندہ اور عظیم و جلیل تھا! دور دریائے ڈینیوب کی آب و تاب کتنی ملائم تھی! دریا، راہبات کی خانقاہ، پراسرار، اتھاہ وادیوں اور جنگلوں سے، جن کے صنوبر کے درخت چوٹیوں تک برف میں ملفوف تھے، آگے، بہت آگے، نیلگوں کوہساروں کا منظر اور بھی دلکش، اور بھی دلفریب تھا!... ہر طرف امن تھا، سکون تھا... انبساط و شادمانی تھی... ''کاش میں وہاں ہوتا! پھر مجھے کسی چیز کی تمنا نہ ہوتی، خواہش نہ ہوتی، آرزو نہ ہوتی!'' رستوف نے

سوچا۔ ’’صرف مجھ میں، اس دھوپ میں، کتنی زیادہ مسرت ہے لیکن یہاں... آہیں ہیں، مصائب ہیں، اندیشے ہیں، اور یہ غیر یقینی اور جلد بازی ہے... یہاں، وہ پھر چیخ رہے ہیں، چلا رہے ہیں، کہیں پیچھے بھاگ رہے ہیں اور، اور میں بھی ان کے ساتھ بھاگ جاؤں گا جب کہ یہ — موت — یہاں، میرے اوپر، میرے گرد و پیش منڈلا رہی ہے... صرف ایک لمحے کی بات ہے... پھر مجھے یہ سورج، یہ پانی، یہ وادی، کبھی دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔‘‘

عین اسی وقت سورج بادلوں میں روپوش ہو گیا اور رستوف کو مزید سٹریچر نظر آئے۔ اور موت اور سٹریچروں کا خوف، اور سورج اور زندگی سے محبت — سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو گیا۔ اسے تفکرات نے کچھ اس طرح گھیرا کہ اس کا جی متلانے لگا۔

’’یا رب العالمین! تم آسمانوں کی بلندیوں پر جلوہ افروز ہو، مجھے ہر بلا سے بچائیو، میری خطاؤں سے درگزر کیجیو، اپنے حفظ و امان میں رکھیو!‘‘ اس نے اپنے آپ سے سرگوشی کی۔

ہوزار بھاگتے دوڑتے واپس ان لوگوں کے پاس، جنھوں نے ان کے گھوڑے تھام رکھے تھے، پہنچ گئے۔ وہ اب پُرسکون ہو چلے تھے اور ان کی باتیں صاف سنائی دینے لگی تھیں۔ اور سٹریچر نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

’’برادر، پھر تم بارود کی بو سونگھ چکے ہو!‘‘ دینی سوف نے عین اس کے کان کے قریب چلا کر کہا۔

’’قصہ ختم بھی ہو گیا... اور میں ڈرا ک ہوں،‘‘ رستوف نے سوچا۔ اس نے گہری آہ بھری اور اپنے سائیس کی طرف چل دیا۔ اس نے اپنے گھوڑے، رخ، کی، جو ایک ٹانگ پر کھڑا آرام کر رہا تھا، لگام پکڑی اور اس پر سوار ہونے لگا۔

’’کیا وہ گریپ شاٹ تھا؟‘‘ اس نے دینی سوف سے پوچھا۔

’’بالکل، کیسا خوف ناک گریپ شاٹ تھا!‘‘ دینی سوف نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔ ’’تم لوگ واقعی بہادر سپوت ہو! اور سچ پوچھو تو یہ کام ہے بہت گھناؤنا! رہ گیا حملہ — اصل مزہ اسی میں آتا ہے۔ تم ان کے کشتوں کے پشتے لگا سکتے ہو — لیکن یہ کام، توبہ توبہ! بہت گھٹیا، بہت پُرخطر ہے۔ وہ تمھارے اوپر یوں گولے برسا رہے تھے جیسے نشانے بازی کی مشق کر رہے ہوں۔‘‘

اور دینی سوف گھوڑے پر سوار اس گروپ کی طرف، جو رجمنٹل کمانڈر، پرنس نیس وتسکی، ژرکوف اور سٹاف افسر پر مشتمل تھا، اور رستوف سے زیادہ دور نہیں تھا، چل دیا۔

’’معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے بھی نہیں دیکھا...‘‘ رستوف نے سوچا۔

اور واقعتاً کسی نے بھی کچھ نہیں دیکھا تھا کیونکہ ہر شخص اس ہیجانی کیفیت سے، جس کا گولہ باری کے دوران میں کیڈٹ کو پہلی مرتبہ تجربہ ہوا تھا، آگاہ تھا۔

’’آپ کو رپورٹ ارسال کرنے کے لیے زبردست مواد مل گیا ہے!‘‘ ژرکوف نے کہا۔ ’’مجھے مت بھولنا، اور نہیں تو سیکنڈ لیفٹیننٹ ہی بنوا دینا!‘‘

''پرنس کو مطلع کر دینا کہ میں نے پل کو جلا دیا ہے!'' کرنل نے مسرت سے جھومتے ہوئے کہا۔

''اور اگر انھوں نے نقصانات کی تفصیل پوچھ لی، پھر؟''

''وہ قابل ذکر نہیں ہیں،'' کرنل نے تڑاخ سے جواب دیا۔ ''دو ہوزار زخمی ہوئے اور ایک موقع پر ہی ہلاک،'' اس نے اپنی مسرت چھپائے بغیر کہا۔ جب اس نے کڑاکے کے ساتھ یہ خوبصورت ''جملہ موقع پر ہی ہلاک ہوگیا'' ادا کیا۔ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں اور اس سے اپنی مسکراہٹ پر قابو نہ پایا جا سکا۔

9

کوتوزوف کی زیر قیادت پینتیس ہزار افراد پر مشتمل روسی فوج دریائے ڈینیوب کے کنارے کے ساتھ ساتھ پسپا ہو رہی تھی۔ یہ فوج کچھ ایسی مشکلات میں گھر چکی تھی جن کا پہلے سے کوئی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ فرانسیسیوں کی سپاہ، جو ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی اور جس کی قیادت بونا پارٹ کر رہا تھا، اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ مقامی باشندے اس کے ساتھ مخاصمت برتنے لگے تھے۔ اپنے اتحادیوں پر اس کا اعتماد اٹھ چکا تھا؛ خوراک کی رسد روز بروز کم ہوتی جا رہی تھی اور فاقہ کشی کا بھوت سروں پر منڈلا رہا تھا۔ جب غنیم اس کے قریب پہنچتا، یہ رک جاتی۔ اس کا عقبی جیش حریف کے ہراول سے دو دو ہاتھ کرتا اور اسے پیچھے بھگا دیتا۔ لیکن ان جھڑپوں میں زور محض اس بات پر ہوتا کہ اپنے ساز و سامان کو خاص نقصان پہنچوائے بغیر پسپائی کا سفر جاری رکھا جائے۔ اس قسم کی جھڑپیں لم باخ، ام سٹیٹن اور مولک[15] کے مقامات پر ہوئیں۔ لیکن روسیوں نے میدان ہائے کارزار میں جس جرأت اور مستقل مزاجی کا مظاہرہ کیا — اور جس کا اعتراف خود غنیم نے بھی کیا — اس کے باوجود ان لڑائیوں کا صرف یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ پسپائی میں اور بھی عجلت دکھائی جانے لگی۔ وہ آسٹروی سپاہ، جو الم کی جنگ میں گرفتار ہونے سے بچ گئی تھی اور براؤناؤ میں کوتوزوف کی فوج میں شامل ہو گئی تھی، اب روسیوں سے علیحدہ ہوگئی اور کوتوزوف کے پاس صرف اس کی اپنی کمزور اور تھکی ماندہ فوج باقی رہ گئی۔ ان حالات میں ویانا کے دفاع کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ جارحانہ کارروائی کرنے کے لیے آسٹروی ہوف کریگزراٹ (وسیع تر جنگی کونسل) نے نہایت سوچ بچار کے بعد حربیات کی جدید سائنس کے مطابق جو منصوبہ بنایا تھا اور جسے اس نے کوتوزوف کو، اس کے ویانا میں قیام کے دوران میں، پیش کیا تھا، اس پر عمل کرنے کا وقت گزر چکا تھا۔ کوتوزوف اپنی فوج کا وہ حشر، جو میک کی سپاہ کا ہوا تھا، نہیں کرانا چاہتا تھا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی مقصد — اور اس مقصد کا حصول بھی تقریباً ناممکن معلوم ہو رہا تھا — رہ گیا تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس فوج سے، جو روس سے آ رہی تھی، جا ملے۔

28 اکتوبر کو کوتوزوف نے اپنی فوج کے ہمراہ دریائے ڈینیوب عبور کیا اور بائیں کنارے پر ہو لیا۔ اب چونکہ اس کے اور فرانسیسی سپاہ کے بیشتر حصے کے درمیان دریائے ڈینیوب حائل ہو چکا تھا، اس نے پہلی مرتبہ غنیم کے سامنے ڈٹ جانے کا فیصلہ کیا۔ تیس اکتوبر کو اس نے موغ تیغ (Mortier) کی ڈویژن پر، جو بائیں کنارے پر تھی، حملہ

کیا اور اسے شکست کا مزہ چکھایا۔ اس لڑائی کے دوران میں پہلی مرتبہ کچھ مال غنیمت ــ علم، گجنالیس اور دو جرنیل ــ روسیوں کے ہاتھ لگا۔ دو ہفتوں کی پسپائی کے بعد روسی فوج نے پہلی مرتبہ کہیں قیام کیا، دشمن سے دو دو ہاتھ کیے اور اب کے نہ صرف میدان جنگ میں سرخروئی حاصل کی بلکہ اس نے فرانسیسیوں کو پسپا ہونے پر بھی مجبور کر دیا۔ اگرچہ سپاہی تھک کر چور ہو چکے تھے، ان کی وردیاں تار تار ہو رہی تھیں اور پیچھے رہ جانے والوں، بیماروں، زخمیوں اور ہلاک شدگان کی صورت میں اس کی فوج کی تعداد ایک تہائی کم ہو گئی تھی اور اگرچہ کریمس (Krems) کے ہسپتالوں اور بڑے بڑے مکانوں میں، جنھیں شفاخانوں میں تبدیل کر دیا تھا، اتنی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ ان میں تمام بیمار اور زخمی سما سکتے (کوتوزوف نے بعض زخمیوں اور بیماروں کو دریا کے دوسرے کنارے پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ انھیں محض ایک خط، جس میں دشمن سے انسانیت برتنے کی اپیل کی گئی تھی، دے دیا گیا تھا) ــ ان تمام امور کے باوجود کریمس کے مقام پر دشمن سے جو جھڑپ مول لی گئی اور موغ تیغ کے خلاف جو فتح حاصل کی گئی، اس نے سپاہ کے حوصلے اچھے خاصے بلند کر دیے۔ تاہم اس قسم کی خوش کن افواہیں کہ روس سے تازہ دم فوج پہنچا ہی جاتی ہے، آسٹروی فوج نے غنیم کے خلاف کامیابی حاصل کر لی ہے اور بوناپارت کی فوج بدحواسی کے عالم میں پسپا ہو رہی ہے، جو عام گردش کر رہی تھیں، محض دماغی اختراعات تھیں اور حقیقت سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔

لڑائی کے دوران میں پرنس آندرے آسٹروی جرنیل شمٹ (Schmidt) کی، جو میدان جنگ میں مارا گیا تھا، اردل میں رہا تھا۔ وہ گھوڑا، جس پر وہ خود سوار تھا، زخمی ہو گیا تھا اور ایک گولی اس کے اپنے ہاتھ کو چھیلتی گزر گئی تھی۔ یہ کہ کمانڈر انچیف اس پر مہربان تھا، اس کا اظہار اس نے یوں کیا کہ اسے فتح کی نوید پہنچانے آسٹریا کے شاہی دربار روانہ کیا۔ فرانسیسی خطرے کے پیش نظر آسٹروی شاہی دربار اب ویانا نہیں رہا تھا بلکہ برن (Brunn) چلا گیا تھا۔ جس روز معرکہ کارزار بپا ہوا تھا، اسی شام وہ کوتوزوف کے نام دختوروف (Dokhturov) کا پیغام لے کر کریمس پہنچا تھا۔ اگرچہ اس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی لیکن تھکاوٹ اسے نام کو بھی نہیں تھی۔ (بظاہر پرنس آندرے کا وجود لاغر و ناتواں تھا، لیکن وہ توانا سے توانا اشخاص کی نسبت تکان با آسانی برداشت کرنے کی سکت رکھتا تھا۔) اس نے ابھی دم بھی نہ لیا تھا کہ ایلچی کی حیثیت سے برن بھیج دیا گیا۔ جس شخص کو اس قسم کا پیغام پہنچانے کا فریضہ سونپا جاتا، اسے نہ صرف تمغے اور دیگر انعامات و اکرامات کا سزاوار ٹھہرایا جاتا بلکہ اس کی ترقی بھی یقینی ہو جاتی۔

رات اندھیری تھی۔ آسمان پر صرف ستارے جگمگا رہے تھے۔ گزشتہ روز، جو روز جنگ تھا، برف باری ہوئی تھی۔ اس برف میں سڑک تاریک لکیر بن گئی تھی۔ پرنس آندرے ڈاک گاڑی میں سفر کر رہا تھا اور اس کا ذہن مختلف خیالات کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔ کبھی وہ ان تاثرات کا، جو حالیہ معرکے نے اس کے دل و دماغ پر مرتب کیے تھے، جائزہ لینے لگتا اور کبھی وہ جھوم جھوم کر یہ سوچنے لگتا کہ جو فتح کی خوش خبری وہ لے کر جا رہا ہے، آسٹریا کے عمائدین مملکت اسے سن کر کتنے خوش ہوں گے۔ پھر اسے وہ منظر یاد آنے لگتا جب اس نے کمانڈر انچیف اور اپنے احباب کو خدا حافظ کہا تھا۔ اس کی گاڑی خاصی تیز جا رہی تھی اور وہ مسلسل سوچ رہا اور یادیں تازہ کر رہا تھا۔ وہ ایک ایسے شخص

کے، جسے آخر کار وہ مسرت، جس کا اسے عرصہ دراز سے انتظار تھا، مل گئی ہو، احساسات و جذبات سے سرشار ہو رہا تھا۔ جونہی وہ آنکھیں بند کرتا، اس کے کانوں میں گولہ باری کی آوازیں گونجنے لگتیں اور ان آوازوں میں پہیوں کی کھڑ کھڑاہٹ اور فتح مندی کا نشیلا احساس آمیز ہو جاتا۔ پھر اس کے دماغ میں ایک نیا تصور ابھرا کہ روسی سر پر پاؤں رکھے بھاگ رہے ہیں اور وہ خود ہلاک ہو چکا ہے۔ لیکن اس نے بہ عجلت اپنے آپ کو جگایا اور اس پر کچھ اس قسم کی مسرت کا نشہ طاری ہو گیا گویا اس پر ابھی ابھی یہ انکشاف ہوا ہو کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس جن لوگوں نے راہ فرار اختیار کی تھی، وہ روسی نہیں تھے، فرانسیسی تھے۔ اسے ایک بار پھر فتح کی تفصیلات اور میدان جنگ میں اپنی پرسکون دلیری یاد آ گئی۔ وہ مطمئن ہو گیا اور اسے اونگھ آ گئی... ستاروں بھری تاریک رات بیت گئی اور اس کے عقب میں روشن، سہانی صبح طلوع ہوئی۔ گھوڑے سرپٹ بھاگے جا رہے تھے۔ دھوپ میں برف پگھلنے لگی تھی اور سڑک کے دونوں کناروں پر مختلف النوع جنگلات، کھیت اور دیہات مسلسل نظروں کے سامنے ابھرتے رہے۔

جن مقامات پر ڈاک گاڑیاں ٹھہرا کرتی تھیں، ایسے ہی ایک مقام پر اسے زخمی روسیوں کا ایک قافلہ مل گیا۔ سب سے اگلی گاڑی میں باربرداری کا انچارج افسر پاؤں پسارے بیٹھا تھا۔ وہ ایک سپاہی کو مسلسل بے نقط سنائے جا رہا تھا۔ زخمی جرمن چھکڑوں پر سوار تھے۔ ہر چھکڑے میں چھ یا چھ سے بھی زیادہ غلیظ انسان، جن کے مختلف اعضا پٹیوں میں مستور تھے، پڑے تھے اور پتھریلی سڑک پر ہچکولے کھا رہے تھے۔ ان میں سے بعض باتیں کر رہے تھے (اسے روسی الفاظ سنائی دیے)، بعض ڈبل روٹی چبا رہے تھے اور جنھیں گہرے زخم آئے تھے، وہ بیمار بچوں کی نڈھال دلچسپی کے ساتھ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چپ چاپ ایلچی کو، جو ان کے برابر بگٹٹ گاڑی بھگائے جا رہا تھا، دیکھ رہے تھے۔

پرنس آندرے نے گاڑی بان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا اور ایک سپاہی سے پوچھنے لگا کہ وہ کس معرکے میں زخمی ہوئے ہیں۔

''پرسوں، ڈینیوب کے کنارے،'' سپاہی نے جواب دیا۔

پرنس آندرے نے اپنا پرس نکالا اور سپاہی کو تین اشرفیاں دیں۔

''یہ ان سب کے لیے ہیں،'' اس نے ایک افسر کی طرف، جو اس کے قریب آ گیا تھا، مڑتے ہوئے کہا۔ ''جوانو، خداوند تمھیں جلد از جلد صحت یاب فرمائے،'' اس نے سپاہیوں سے کہا۔ ''ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔''

''جناب عالی، کوئی خبر؟'' افسر نے پوچھا۔ اسے توقع تھی کہ وہ پرنس آندرے کو باتوں میں لگا لے گا۔

''اچھی خبر ہے... چلو،'' اس نے اپنے گاڑی بان سے کہا اور گاڑی فراٹے بھرنے لگی۔

جب پرنس آندرے برن پہنچا، اچھا خاصا اندھیرا چھا چکا تھا۔ اس کے چاروں اطراف اونچے اونچے مکانات کھڑے تھے۔ گلیوں اور بازاروں میں جگہ جگہ روشنیاں ایستادہ تھیں۔ گھروں اور دکانوں سے بھی روشنیاں چھن چھن کر باہر آ رہی تھیں۔ پتھریلی سڑکوں پر خوبصورت اور دیدہ زیب گاڑیاں کھڑکھڑاتی آ جا رہی تھیں۔ غرضیکہ وہاں جیتے جاگتے بڑے شہر کی وہ پوری فضا موجود تھی، جو اس فوجی کے لیے، جو کیمپوں میں زندگی گزارنے کے بعد

تازہ تازہ وارد ہوا ہو، بہت خوش کن ہوتی ہے۔ جب وہ محل کے قریب پہنچا، عاجلانہ سفر اور رات بھر کی بے خوابی و بے آرامی کے باوجود اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس میں پہلے سے بھی زیادہ جوش و ولولہ بھر گیا ہو۔ صرف اس کی درخشاں و تاباں آنکھیں قدرے بے کل تھیں اور خیالات تھے کہ غیر معمولی تیز رفتاری سے ریلے کی صورت میں یکے بعد دیگرے چلے آ رہے تھے لیکن ان میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں تھا۔ اس نے ایک بار پھر جنگ کی تفصیلات یاد کیں مگر اب ان میں کوئی انتشار نہیں تھا بلکہ اس کے ذہن میں ان کی ایسی واضح اور بلیغ صورت بن گئی تھی جس میں وہ انھیں امپراطور فرانٹس کے سامنے پیش کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان تمام سوالات کو بھی، جو اس سے باتوں باتوں میں پوچھے جا سکتے تھے، تصور میں لایا اور اس نے ان کے ممکنہ جوابات بھی سوچ لیے۔ اسے توقع تھی کہ اسے فوراً امپراطور کی خدمت میں پیش کر دیا جائے گا لیکن جب وہ محل کے صدر دروازے پر پہنچا، ایک سرکاری افسر بھاگتا بھاگتا اس کے پاس آیا اور جب اسے معلوم ہوا کہ وہ ایلچی ہے، وہ اسے ایک اور دروازے کی جانب لے گیا۔

''یوئر ایکسی لینسی، جب آپ راہداری کے اختتام پر پہنچیں، دائیں طرف گھوم جائیں، وہاں آپ کی ملاقات ڈیوٹی ایڈی کانگ سے ہوگی،'' اس افسر نے کہا۔ ''وہ آپ کو وزیر جنگ کے پاس لے جائے گا۔''

پرنس آندرے کی ملاقات ایڈی کانگ سے ہوگئی۔ اس نے اسے انتظار کرنے کو کہا اور خود وزیر جنگ کے پاس چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد وہ واپس آیا۔ اس نے احتراماً جھک کر پرنس آندرے کو سلام کیا اور اس سے اپنے آگے آگے چلنے کی درخواست کی۔ وہ اسے راہداری میں سے گزارتا ایک پرائیویٹ کمرے میں، جہاں وزیر جنگ کام میں جتا ہوا تھا، لے گیا۔ ایڈی کانگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی انکسار اور شائستگی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس طرح کے رویے سے وہ یہ کوشش کر رہا ہے کہ روسی ایجوٹنٹ کو کسی نوع کی بے تکلفی برتنے کا موقع نہ دیا جائے۔

پرنس آندرے جب وزیر جنگ کے کمرے کے دروازے کے قریب پہنچا، اس کے پر مسرت جذبات پر اچھی خاصی اوس پڑ چکی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے ساتھ ہتک آمیز برتاؤ کیا جا رہا ہے۔ کجا تو اسے خوشخبری کا پیغام لانے پر اتنا فخر تھا لیکن اسے علم بھی نہ ہو سکا کہ کب، لیکن اس کا فخر و مباہات کا احساس نفرت و حقارت کے جذبے میں ڈھل چکا تھا حالانکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی تھی جو اس کے اس تنفر کا سبب بنتی۔ اس کے زرخیز دماغ نے اسے اسی دم ایک ایسا نکتہ سجھا دیا جس کی بنا پر وہ یہ سمجھنے لگا کہ اسے ایڈی کانگ اور وزیر جنگ سے جو نفرت ہونے لگی ہے، اس میں وہ حق بجانب ہے۔ ''ان لوگوں نے بارود کی کبھی بو بھی نہیں سونگھی، شاید اسی لیے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ فتوحات حاصل کرنا بہت آسان ہے،'' اس نے سوچا۔ حقارت سے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ وزیر کے کمرے میں عمداً آہستہ آہستہ داخل ہوا اور جب اس نے وزیر کو خاصی بڑی میز کے سامنے بیٹھے اور دو تین منٹ تک اپنی طرف کوئی توجہ نہ دیتے دیکھا، تو اس کی نفرت اور بھی شدید ہوگئی۔ وزیر اپنا گنجا سر، جس کے کناروں پر کہیں اکا دکا سفید بال تھے، دو موم بتیوں کے مابین جھکائے، چند کاغذات کا مطالعہ کر رہا اور پنسل سے ان پر نشانات لگا رہا تھا۔ دروازہ کھلنے اور قدموں کی آواز سننے کے بعد بھی اس نے اپنی نگاہیں اوپر نہ اٹھائیں اور آخر تک یہی تاثر دیتا رہا کہ وہ بہت

مصروف ہے۔

"یہ اٹھاؤ اور انھیں پہنچادو،" اس نے کاغذات کا پلندہ اپنے ایڈی کانگ کے حوالے کرتے اور اب بھی ایلچی پر کوئی توجہ دیے بغیر کہا۔

پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ وزیر جنگ کو جتنے بھی امور نپٹانے ہیں، ان میں اسے کوتوزوف کی فوج کی کارروائیوں سے یا تو سب سے کم دلچسپی ہے یا پھر وہ روسی ایلچی کو اس قسم کا محض تاثر دینا چاہتا ہے۔ "لیکن مجھے اس کی کوئی پروانہیں،" اس نے سوچا۔ وزیر نے باقی ماندہ کاغذات سمیٹے، ان کے کونے سیدھے کیے اور اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اس کا سر معمولی سر نہیں تھا، یہ امتیازی اور دانش مندانہ سر تھا۔ لیکن جونہی وہ پرنس آندرے کی طرف متوجہ ہوا، اس کے چہرے بشرے سے جو زیرکی اور عزم صمیم جھلک رہا تھا، وہ آن کی آن میں کچھ اس طرح تبدیل ہوا کہ معلوم ہونے لگا کہ وہ یہ تبدیلی شعوری طور پر اور عادتاً لاتا ہے۔ اب اس کے چہرے پر وہ احمقانہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی، جو ان لوگوں کا، جن کے پاس عرضی گزاروں کا تانتا بندھا رہتا ہے، خاصہ ہوتی ہے اور ایسے مواقع پر ان کی یہ مسکراہٹ فطری نہیں بلکہ کھلم کھلا منافقت کی پیداوار ہوتی ہے۔

"جنرل فیلڈ مارشل[16] کوتوزوف کی طرف سے؟" اس نے پوچھا۔ "میرا خیال ہے اچھی خبر ہی ہوگی؟ موغ تیغ کے ساتھ جھڑپ ہوئی؟ فتح؟ ہونا ہی چاہیے تھی، مدتوں سے انتظار تھا!"

اس نے مراسلہ، جو اسی کے نام تھا، لے لیا اور اسے پڑھنے لگا۔ اس کا چہرہ ملول اور افسردہ تھا۔

"اوہ میرے خدایا! میرے خدایا! شمٹ!" اس نے جرمن میں کہا۔ "اتنا بڑا حادثہ! اتنی عظیم آفت!"

اس نے مراسلے پر سرسری نظر ڈالی، اسے میز پر رکھا اور پرنس آندرے کی جانب دیکھنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے۔

"کتنا بڑا صدمہ! تم کہتے ہو کہ معرکہ فیصلہ کن رہا لیکن موغ تیغ تو پکڑا نہیں گیا۔" وہ پھر سوچ بچار میں کھو گیا۔ "اگرچہ شمٹ کی موت اتنا بڑا حادثہ ہے کہ فتح بھی اس کی تلافی نہیں کر سکتی، پھر بھی مجھے خوشی ہے کہ تم اچھی خبر لائے ہو۔ اس میں شک نہیں کہ ہز میجسٹی تم سے ملنا چاہیں گے، لیکن آج نہیں۔ میں تمھارا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اب جاؤ اور آرام کرو۔ کل سلامی کے بعد شاہی دربار پہنچ جانا۔ فکر نہ کرو میں انھیں مطلع کر دوں گا۔"

احمقانہ مسکراہٹ، جو اس کی گفتگو کے دوران میں غائب ہو گئی تھی، عود کر آئی۔

"خدا حافظ، تمھارا بہت بہت شکریہ۔ ہز میجسٹی امپراطور شاید تم سے ملنا پسند فرمائیں،" اس نے دوبارہ کہا اور اپنا سر نیچے جھکا لیا۔

جب پرنس آندرے محل سے رخصت ہوا، اسے محسوس ہوا کہ فتح نے اسے جو ولولہ اور مسرت فراہم کی تھی، وہ اب وزیر جنگ اور اس کے شائستہ ایڈی کانگ کے بے اعتنا رحم و کرم پر ہے۔ آناً فاناً اس کے خیالات کا سارا دھارا تبدیل ہو گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ معرکہ بپا ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں اور اس کی صرف مدھم سی یاد اس کے

ذہن میں باقی رہ گئی ہے۔

10

برن میں پرنس آندرے نے اپنے دوست اور روسی سفارت کار بلیبن (Bilibin) کے ہاں قیام کیا۔

''اخاہ، مائی ڈیئر پرنس، تم سے بڑھ کر بھلا اور کون مہمان ہو سکتا ہے جسے دیکھ کر طبیعت باغ باغ ہو جائے!'' بلیبن نے پرنس آندرے کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ ''فرانٹس، پرنس کا سامان میرے بیڈ روم میں پہنچا دو،'' اس نے ملازم سے، جو بلکونسکی کو اپنے ساتھ لیے آ رہا تھا، کہا۔ ''تو تم فتح کے نقیب ہو؟ بہت خوب! ادھر میں ہوں کہ طبیعت ہی ٹھیک نہیں ہوتی۔ خود دیکھ لو۔''

نہانے دھونے اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد پرنس آندرے سفارت کار کے مرصع اور پر تکلف سٹڈی روم میں داخل ہوا اور کھانا، جو خاص طور پر اسی کے لیے تیار کیا گیا تھا، کھانے لگا۔ بلیبن پاؤں پسار کر آرام سے آتش دان کے قریب بیٹھ گیا۔

مہم کی، جس کے دوران میں پرنس صفائی کی سہولتوں اور زندگی کی اعلیٰ آسائشوں سے محروم رہا تھا، بات چھوڑیں، سفر کے بعد اب جب وہ اس مرصع اور پر تکلف ماحول میں، جس کا وہ بچپن سے عادی چلا آ رہا تھا، داخل ہوا، سکون و راحت کا خوشگوار احساس اس کی رگ رگ میں سما گیا۔ علاوہ ازیں آسٹریا والوں نے اس کا جس طرح استقبال کیا تھا، اس کے بعد اگر وہ روسی میں نہیں (وہ فرانسیسی میں گفتگو کر رہے تھے)، تو کم از کم ایک روسی سے تو باتیں کر رہا تھا اور یہی چیز اس کے دل کا مرجھایا ہوا کنول کھلانے کے لیے کافی تھی (اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اس زمانے میں روسیوں کو عام طور پر آسٹریوں سے جو گھن آتی تھی، بلیبن بھی اس میں شریک ہوگا)۔

بلیبن پینتیس کے لگ بھگ تھا۔ وہ کنوارا تھا اور اسی حلقے سے، جس سے پرنس آندرے کا تعلق تھا، متعلق تھا۔ وہ پیٹرز برگ میں ایک دوسرے کے شناسا تھے لیکن ان کے تعلقات میں گرم جوشی اور بے تکلفی تب آئی جب پرنس آندرے کوتوزوف کے ساتھ ویانا میں قیام پذیر تھا۔ جس طرح پرنس آندرے ایک ایسا نوجوان تھا جس کے متعلق با آسانی یہ پیش گوئی کی جا سکتی تھی کہ وہ سپاہ گری میں بلند مقام حاصل کرے گا، بعینہٖ بلیبن کے متعلق یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ سفارت کاری کے میدان میں اس سے بھی اونچا نام کمائے گا۔ وہ نوجوان تھا لیکن سفارت کاری میں نو آموز نہیں تھا۔ اس نے سولہ سال کی عمر میں یہ ملازمت اختیار کی تھی، پیرس اور کوپن ہیگن میں خدمات سر انجام دے چکا تھا اور اب ویانا میں خاصے اہم عہدہ پر فائز تھا۔ آسٹروی چانسلر (وزیر اعظم) اور ویانا میں ہمارا سفیر، دونوں اسے جانتے تھے اور اس کی قدر کرتے تھے۔ وہ ان لاتعداد سفارت کاروں کی، جن کی استعداد زیادہ تر منفی ہوتی ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ فرانسیسی میں شد بد حاصل کر لینا اور بعض باتوں سے احتراز کرنا ہی سفارت کاری کی معراج ہے، مانند نہیں تھا۔ اس کا شمار ان معدودے چند لوگوں میں ہوتا ہے، جنھیں کام پسند ہوتا ہے اور کام کرنا آتا بھی ہے۔ اور

فطری آلکسی کے باوجود وہ بعض اوقات پوری پوری رات اپنی ڈیسک پر گزار دیتا۔ کام کی نوعیت خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ تمام امور یکساں سلیقے اور نفاست سے سرانجام دیتا۔ اس کی دلچسپی کا محور سوال "کیوں"، نہیں بلکہ "کیسے" ہوتا تھا۔ سفارتی معاملے کی نوعیت کیا ہے، اس کے لیے اس سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ مراسلہ ہو، یادداشت یا رپورٹ، اسے ان سب کو ماہرانہ، حکیمانہ اور خوش اسلوبانہ انداز سے تیار کرنے میں بہت لطف آتا تھا۔ جو کچھ وہ تحریر کرتا تھا، وہ اپنی جگہ قابل قدر ہوتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی خدمات اس لیے بھی بہت گراں قدر تصور کی جاتی تھیں کیونکہ اسے اعلیٰ عہدوں پر فائز حکام کے ساتھ گفتگو کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کے فن میں مہارت تامہ حاصل تھی۔

بلبین جس طرح کام سے لطف اندوز ہوتا تھا، بعینہٖ وہ گفتگو سے بھی حظ اٹھاتا تھا بشرطیکہ یہ شستہ اور بذلہ نجی سے معمور ہو۔ جب وہ اونچے لوگوں کی صحبت میں بیٹھتا، وہ ہمیشہ اسی تاڑ میں رہتا کہ موقع آئے اور وہ کوئی انوکھی اور قابل توجہ بات کہہ سکے۔ وہ گفتگو میں صرف اسی وقت شریک ہوتا جب اس کے لیے ایسا کرنا ممکن ہوتا۔ اس کی گفتگو میں ہمیشہ عمومی دلچسپی کے حامل طبع زاد، نکتہ رس اور نستعلیق جملوں کی خفیف مقدار لازماً شامل ہوتی۔ فصاحت و بلاغت کے شاہکار یہ جملے جنھیں وہ اپنے ذہن کی لیبارٹری میں پہلے ہی کچھ اس طور تیار کر لیتا کہ ان کا ابلاغ باآسانی ہو جاتا۔ مقصد غالباً یہ ہوتا تھا کہ اعلیٰ طبقے کا کند ذہن سے کند ذہن شخص بھی اپنے دماغ پر بار ڈالے بغیر انھیں یاد رکھ سکے اور ایک ڈرائنگ روم سے دوسرے ڈرائنگ روم تک دہراتا پھرے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ بلبین کی بذلہ سنجیاں ویانا کے مختلف ڈرائنگ روموں میں دہرائی جاتی تھیں اور اکثر نام نہاد اہم امور پر اثر انداز ہوتی تھیں۔

اس کے دبلے پتلے، تھکے ماندے، زرد چہرے پر شکنیں پڑی رہتی تھیں اور یہ ہمیشہ اتنی ہی صاف ستھری اور دھلی دھلائی نظر آتی تھیں جتنی کہ کسی شخص کی انگلیاں غسل کے بعد دکھائی دیتی ہیں۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات ہویدا ہوتے تھے، ان شکنوں کی حرکات و سکنات انھیں وجود میں لانے کے لیے اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ ایک موقع آتا جب اس کی بھویں تن جاتیں اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو جاتی۔ دوسرے موقع پر اس کی بھویں نیچے گر پڑتیں اور اس کے رخساروں پر شکن محیط ہو جاتے۔ اس کی اندر کو دھنسی ہوئی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے راست بازی ٹپکتی اور وہ ہر دم مسکراتی نظر آتی تھیں۔

"خیر، اب ہمیں اپنے کارہائے نمایاں سے آگاہ کرو،" اس نے کہا۔

بلکونسکی نے کسی قسم کی مبالغہ آرائی سے کام لیے بغیر معرکے کی تفصیلات بیان کر دیں۔ اس نے اس کے دوران میں اپنا ذکر ایک مرتبہ بھی نہ کیا اور اس کے بعد اس نے بتایا کہ وزیر جنگ کے ہاتھوں اس کی کیا درگت بنی ہے۔

"انھوں نے میرا اور میری خبر کا یوں استقبال کیا جیسے میں کوئی نہایت اوٹ پٹانگ داستان سنا رہا ہوں،" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

بلبین طنزیہ انداز سے مسکرا دیا اور اس کے چہرے کی شکنوں کا تناؤ کم ہو گیا۔

''تاہم، مائی ڈیئر،'' اس نے کچھ فاصلے سے اپنے ناخنوں کا جائزہ لیتے اور بائیں آنکھ کے اوپر جلد کو سکیڑتے ہوئے کہا۔ ''میں اگرچہ اس روسی آرتھوڈوکس فوج کا احترام کرتا ہوں، لیکن اس کے باوجود میں یہ ضرور کہوں گا کہ تمھاری فتح میں فتح کی خوشبو عنقا ہے۔''

وہ اسی انداز سے بولتا چلا گیا۔ اس نے اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لیے فرانسیسی کو ذریعہ بنایا تھا۔ روسی زبان کے الفاظ وہ تبھی استعمال کرتا تھا جب وہ ان پر حقارت آمیز زور دینا چاہتا تھا۔

''سچی بات یہ ہے کہ تم لوگ اپنی ساری سپاہ کے ساتھ بدقسمت موغ تیغ پر، جس کے پاس صرف ایک ڈویژن فوج تھی، چڑھ دوڑے اور اس کے باوجود وہ تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس میں فتح کے شادیانے بجانے کی کون سی بات ہے؟''

''مجھے تم سے اتفاق نہیں،'' پرنس آندرے نے جواب دیا۔ ''اگر سنجیدگی سے دیکھا جائے تو ہم شیخی بگھارے بغیر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُلم کی نسبت یہاں ہم نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔''

''آخر تم لوگوں نے ہمارے لیے ایک، صرف ایک، مارشل کیوں نہیں پکڑا؟''

''اس کی وجہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں نہ وہ ترتیب ہوتی ہے جو پریڈ گراؤنڈ میں ہوتی ہے اور نہ وہاں سب کچھ ہماری توقعات کے مطابق وقوع پذیر ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں، ہمیں امید تھی کہ ہم صبح زیادہ سے زیادہ سات بجے تک ان کے عقب پر حملہ کر سکیں گے لیکن شام کے پانچ بج گئے اور ہم وہاں پہنچ بھی نہ سکے۔''

''اور تم لوگ صبح سات بجے تک کیوں نہ پہنچ سکے؟ تمھیں وہاں صبح سات بجے پہنچنا چاہیے تھا،'' بلبین نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں وہاں صبح سات بجے پہنچنا چاہیے تھا۔''

''اور تم سفارت کاری کے ذریعے بوناپارٹ سے یہ کیوں منوا نہ سکے کہ وہ جنیوا پر چڑھائی نہ کرے کیونکہ یہی اس کے حق میں بہتر تھا؟'' پرنس آندرے نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا۔

''میں جانتا ہوں،'' بلبین نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ سوچ رہے ہو کہ آگ کے قریب صوفے پر بیٹھ کر مارشلوں کو پکڑنا بہت آسان کام ہے۔ تمھاری بات درست ہے لیکن یہ سوال پھر بھی اپنی جگہ قائم ہے کہ تم لوگوں نے اسے پکڑا کیوں نہ؟ اور صرف وزیر جنگ ہی نہیں بلکہ اگر ہز میجسٹی امپراطور بھی تمھاری اس کامرانی پر کوئی زیادہ خوشی کا اظہار نہ کریں، تو تمھیں حیران نہیں ہونا چاہیے۔ بلکہ خود مجھے، روسی سفارت خانے کے بدقسمت سیکرٹری کو بھی، کوئی خاص خوشی نہیں ہوئی۔''

اس نے اپنی نگاہیں سیدھی پرنس آندرے پر گاڑ دیں اور معاً اس کی پیشانی تمام شکنوں سے صاف ہو گئی۔

''دوست، اب 'کیوں' پوچھنے کی میری باری ہے،'' بلکونسکی نے کہا۔ ''مجھے اعتراف ہے کہ میں کچھ نہیں سمجھ سکا۔ ممکن ہے یہاں سفارت کی باریکیاں، جو میری کمزور و ناتواں عقل کی رسائی سے باہر ہیں، مزاحم ہو رہی ہوں۔ لیکن میرے پلے کچھ نہیں پڑا۔ میک پوری سپاہ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ اور آرچ ڈیوک کارل

زندگی کی کوئی علامت ظاہر نہیں کرتے اور ایک سے بڑھ کر ایک غلطی کا ارتکاب کیے جا رہے ہیں۔ صرف ایک کوتوزوف ہے جو فتح سے ہم کنار ہوتا ہے، فرانسیسیوں کے طلسم کو تار تار کر دیتا ہے اور وزیر جنگ اتنی دلچسپی کا بھی اظہار نہیں کرتے کہ تفصیلات ہی دریافت کرلیں۔"

"مائی ڈیئر فیلو، اس کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ واہ واہ زار کی، روس کی، روسی مسلک کی ہوئی ہے۔ بہت خوب! لیکن ہمیں — میرا مطلب آسٹروی دربار ہے — تمھاری فتوحات سے ہمیں کیا غرض؟ ہمیں تو ایسی فتح کی، جو آرچ ڈیوک کارل یا آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ نے — تمھیں معلوم ہے کہ آرچ ڈیوک کوئی ہو، (ان کی نگاہوں میں سبھی اچھے ہیں — پائی ہو، نوید سناؤ، خواہ یہ فتح بوناپارت کے کسی فائر بریگیڈ کو شکست دے کر حاصل کی گئی ہو۔ پھر صحیح معنوں میں خبر ہوگی اور اس کا خیر مقدم توپوں کی سلامی سے ہوگا۔ لیکن تم نے جو حرکت کی ہے (کہ نپولین کے ایک جرنیل کو ہرادیا)، وہ محض ہمیں چڑانے کے لیے کی ہے۔ آرچ ڈیوک کارل ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا ہے۔ آرچ ڈیوک فرڈی نینڈ کی مٹی پلید ہوگئی ہے۔ تم لوگوں نے ویانا کو اپنے حال پر چھوڑ دیا، اس کے دفاع سے ہاتھ اٹھالیا، گویا تم یہ کہہ رہے ہو: 'خدا ہمارے ساتھ ہے اور وہ ہماری مدد کرتا ہے لیکن (تمھارے لیے ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ) خدا تمھاری اور تمھارے پایۂ تخت کی مدد فرمائے!' ہمارا واحد جرنیل، جس کے ہم سب فدائی تھے، شمٹ تھا اور تم نے اسے بھی گولی کے منہ میں دے دیا اور اوپر سے چلے آئے ہیں ہمیں فتح کی مبارک باد دینے! تمھیں ماننا ہوگا کہ جس قسم کی خبر تم لائے ہو، اس سے زیادہ جھنجھلانے والی چیز کا تصور بھی محال ہے۔ اس کے متعلق تو یہی کہا جائے گا کہ جان بوجھ کر زخموں پر نمک پاشی کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں، فرض کرو تمھیں واقعی کوئی زبردست فتح حاصل ہو جاتی ہے یا آرچ ڈیوک کارل ہی کہیں کامیابی سے ہم کنار ہو جاتا ہے، واقعات جس نہج پر جا رہے ہیں، یہ ایک آدھ فتح کیسے ان کا رخ تبدیل کر سکے گی؟ ویانا پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد یہ سب بے وقت کی راگنیاں ہیں۔"

"کس چیز پر — قبضہ ہوگیا؟ ویانا پر قبضہ ہوگیا؟"

"نہ صرف ویانا پر قبضہ ہوگیا ہے بلکہ نپولین شون برن (Schonbrun) پہنچ گیا ہے اور کاؤنٹ، ہمارے ڈیئر کاؤنٹ وربنا (Vrbna) اس سے احکام وصول کرنے جاتے ہیں۔"

سفر کے دوران میں بلکونسکی کو جو تھکاوٹ ہوئی، طرح طرح کے خیالات جس طرح اس کے ذہن پر حملہ کرتے رہے، برن میں اس کا جس طرح استقبال ہوا اور پھر اس نے جو کھانا کھایا، خاص طور پر اس کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ اس قابل نہیں رہا کہ جو کچھ وہ سن رہا ہے، اس کی پوری اہمیت کا ادراک کر سکے۔

"کاؤنٹ لک ٹین فیلس (Lichtenfels) آج صبح یہاں آیا تھا،" بلیبن بولتا چلا گیا۔ "اس نے مجھے ایک مراسلہ دکھایا۔ فرانسیسیوں نے ویانا پر قبضہ کرنے کے بعد جو پریڈ کی اور فتح کا جشن منانے کے لیے پرنس موغا (Murat) کے ایما پر جو شعبدہ کاریاں دکھائیں، ان سب کی تفصیل اس مراسلے میں مندرج تھیں ۔۔۔ اب تم سمجھ گئے ہو

گے کہ تم لوگوں نے جو فتح حاصل کی ہے، وہ کوئی ایسی چیز نہیں جس پر خوشیاں منائی جائیں اور تمھارا بطور نجات دہندہ استقبال کیا جائے..."

"سچ پوچھو تو مجھے اس کی پروا نہیں، بالکل پروا نہیں!" پرنس آندرے نے کہا۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بات آ رہی تھی کہ آسٹروی پایہ تخت کے سقوط جیسے گمبھیر واقعات کے تناظر میں کریمس کی فتح کسی خاص اہمیت کی حامل نہیں تھی۔ "ویانا پر دشمن کا کیسے قبضہ ہوا؟ وہاں پل تھا، پل کے ادھر مورچہ تھا، جس کا بہت شہرہ تھا، پرنس اویرزپرگ (Auersperg) تھا، ان سب کا کیا بنا؟ ہم نے تو سنا تھا کہ پرنس اویرزپرگ دفاع کر رہا ہے،" اس نے کہا۔

"پرنس اویرزپرگ دریا کے اس کنارے، یعنی ہمارے کنارے، مقیم ہے اور ہمارا دفاع کر رہا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں وہ خاصا پھسڈی ثابت ہو رہا ہے، تاہم وہ ہمارا دفاع کر رہا ہے۔ لیکن ویانا مخالف کنارے پر ہے۔ نہیں، پل پر ابھی قبضہ نہیں ہوا اور میرا اندازہ ہے کہ وہ اس پر قبضہ کریں گے بھی نہیں کیونکہ اس کے نیچے سرنگیں بچھا دی گئی ہیں اور اسے اڑا دینے کا حکم جاری ہو چکا ہے۔ بصورت دیگر ہم مدتوں پہلے بوہیمیا[17] کی پہاڑیوں پر پناہ لے چکے ہوتے۔ اور تم اور تمھاری فوج دونوں اطراف کی آتش بازی کے مابین پھنس جاتی اور تمھارا برا حشر ہوتا۔"

"لیکن اب بھی اس کا مطلب یہ نہیں نکلتا کہ مہم کا خاتمہ ہو گیا ہے،" پرنس آندرے نے کہا۔

"ہونہہ، میرا خیال ہے کہ ہو گیا ہے۔ اور یہاں کے بڑے بڑے کوڑھ مغز بھی اسی خیال کے حامی ہیں۔ لیکن ان میں اتنی (اخلاقی) جرأت نہیں کہ وہ (کھلے بندوں) اس کا اظہار کر سکیں۔ ہوگا وہی جس کا اظہار میں نے مہم کے آغاز میں کیا تھا۔ معاملہ تمھاری ڈورنشٹائین (Durenstein) جیسی جھڑپوں سے طے نہیں ہوگا۔ اصولاً معاملات کا تصفیہ بارود کے ذریعے نہیں ہوتا بلکہ انھیں صرف وہی لوگ، جو ان کا سبب بنتے ہیں، سلجھا سکتے ہیں،" بلیبن نے اپنے ہی مقولے کا حوالہ دیتے ہوئے کہا۔ اور جب اس نے ایک آدھ منٹ کا توقف کیا، اس کی پیشانی کی شکنیں درست ہو گئیں۔ "اب مسئلہ صرف یہ ہے کہ امپراطور الیکسا ندر اور شاہ پرشیا کے مابین جو ملاقات[18] طے پائی ہے، وہ کیا رنگ لاتی ہے۔ اگر پرشیا اتحاد میں شامل ہو گیا، آسٹریا بھی اپنے پتے دکھانے پر مجبور ہو جائے گا اور جنگ ہو کر رہے گی۔ اگر یہ اتحاد معرضِ وجود میں نہ آیا، پھر معاملہ صرف اتنا رہ جائے گا کہ کامپوفورمیو دوم[19] کی دفعات کہاں مرتب ہوتی ہیں۔"

"کیسا غیر معمولی نابغۂ روزگار شخص ہے!" پرنس آندرے نے اپنی ننھی منی بند مٹھی اچانک میز پر مارتے ہوئے کہا۔ "واہ کیا قسمت پائی ہے اس آدمی نے!"

"بوناپارٹ؟" بلیبن نے رازدارانہ انداز سے کہا اور اس نے اپنی بھویں یوں سکیڑ لیں جیسے وہ کوئی بڑی ظریفانہ بات کہنا چاہتا ہو۔ "بوناپارٹ؟" اس نے پہلے الف پر بطور خاص زور دیتے ہوئے دوبارہ کہا۔ "میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کہ اب جب کہ وہ شون برن سے آسٹریا والوں کے لیے احکام جاری کر رہا ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم اسے الف سے نجات حاصل کر لینے دیں۔ میں یقیناً اس جدت کو اختیار کروں گا اور اسے محض بوناپارٹ[20] کہوں گا۔"

''نہیں یار، مذاق چھوڑو،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''کیا تم واقعی یہ سمجھتے ہو کہ مہم کا خاتمہ ہو گیا ہے۔''

''میرا تو یہی خیال ہے۔ آسٹریا کو بیوقوف بنایا گیا ہے اور وہ اس کا عادی نہیں ہے۔ وہ یقیناً جوابی وار کرے گا۔ اسے الو بنایا گیا ہے کیونکہ اولاً اس کے صوبوں کو تاخت و تاراج کر دیا گیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مقدس[21] روسی فوج بدترین انداز سے لوٹ مار کر رہی ہے۔، اس کی فوج بربادی کی بھینٹ چڑھا دی گئی ہے اور اس کے پایہ تخت پر قبضہ جما لیا گیا ہے۔ اور یہ سب کچھ اس لیے تاکہ ہز میجسٹی آف سارڈینیا[22] کی آنکھوں کو راحت مل سکے۔ یہی وجہ ہے۔ اور یہ بات ہمارے درمیان ہی رہے۔ کیوں کہ میری چھٹی حس مجھ سے یہ کہہ رہی ہے۔ کہ ہمارے ساتھ فریب کیا جا رہا ہے اور یہ مجھے بتا رہی ہے کہ اندر خانے فرانس کے ساتھ صلح کا ڈول ڈالا جا رہا ہے، گھاتیں کی جا رہی ہیں تاکہ امن کا معاہدہ، خفیہ معاہدہ، طے کیا جا سکے۔''

''ناممکن!'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''یہ تو انتہائی گھٹیا حرکت ہو گی!''

''اس کا جواب تو وقت ہی دے گا،'' بلبین نے جواب دیا۔ ایک بار پھر اس کی پیشانی کی شکنیں درست ہونے لگیں۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ گفتگو ختم ہو چکی ہے۔

پرنس آندرے اس کمرے میں، جو اس کے لیے تیار کیا گیا تھا، چلا گیا۔ پروں کے پلنگ پر صاف ستھری چادریں بچھی تھیں۔ تکیے گرم اور معطر تھے۔ وہ لیٹ گیا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ جس لڑائی کی خبر وہ لایا تھا، وہ اس سے دور، کہیں دور تھی۔ پرشیائی معاہدہ، آسٹریا کی غداری، بونا پارٹ کی نئی فتوحات، اگلے روز کی پریڈ، سلامی اور دربار، امپراطور فرانٹس سے اس کی ملاقات۔ یہ تھیں وہ باتیں جن میں اس کا دماغ الجھا ہوا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن ایکا ایکی گولیوں کے تڑخنے، توپوں کے دہاڑنے اور گاڑیوں کے پہیوں کے کھڑکھڑانے کی آوازیں اس کے کانوں میں گونجنے لگیں۔ ایک بار پھر اسے پہاڑی کے دامن میں بندوقچی بھاگتے نظر آئے۔ فرانسیسی فائرنگ کر رہے تھے اور وہ ایک بار پھر شمٹ کی معیت میں گھوڑے پر جا رہا تھا۔ چاروں اطراف سے گولیاں آ رہی تھیں اور ان کے کانوں کے قریب سنسناتی گزرتی جا رہی تھیں۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور بچپن کے بعد اولیں بار اسے زندگی دس گنا پیاری اور پرلطف محسوس ہونے لگی۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔...

''ہاں، یہ سب کچھ وقوع پذیر ہوا تھا،'' اس نے کہا۔ وہ اپنے آپ بچوں کی طرح مسکرانے لگا اور جوانوں کی مانند گھوڑے بیچ کر سو گیا۔

11

اگلے روز وہ دیر سے جاگا۔ اپنے حالیہ تاثرات کا جائزہ لینے کے دوران میں اس کے ذہن میں جو پہلا خیال آیا، وہ یہ تھا کہ آج اسے امپراطور فرانٹس کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ اس نے وزیر جنگ، شائستہ ایڈی کانگ، بلبین

اور گزشتہ شب کی گفتگو کو یاد کیا۔ دربار میں حاضری دینے کے لیے اس نے اپنی پوری فوجی وردی، جسے اس نے کافی عرصے سے نہیں پہنا تھا، زیب تن کی اور بلبین کے سٹڈی روم میں چلا گیا۔ اس کے ہاتھ پر پٹی بندھی ہوئی تھی لیکن وہ تازہ دم ہو چکا تھا، اس کے ولولے جوان تھے اور وہ خوب نظر آ رہا تھا۔ سٹڈی روم میں اس کی مڈھ بھیڑ سفارتی عملے کے چار ارکان سے ہو گئی۔ وہ پرنس اپولیت کوراگن سے، جو سفارت خانے میں سیکرٹری تھا، پہلے ہی آشنا تھا۔ باقیوں کا تعارف بلبین نے کرا دیا۔

وہ اصحاب، جو بلبین سے ملنے آئے تھے، کھاتے پیتے اور خوش طبع نوجوان تھے۔ ویانا کی طرح انھوں نے یہاں بھی ایک حلقۂ خاص بنا لیا تھا۔ اس حلقے کی قیادت بلبین کے ہاتھوں میں تھی اور انھوں نے اس کا نام Les Notres (''احباب ما'') رکھا ہوا تھا۔ یہ محدود حلقہ تھا اور عام طور پر اس کے ارکان صرف سفارت کار ہی بن سکتے تھے۔ ان لوگوں کو جن چیزوں سے دلچسپی تھی، ان کا بظاہر سیاست یا جنگ سے کوئی واسطہ نہیں تھا۔ ان کی یہ دلچسپیاں اعلیٰ طبقے، بعض خاص الخاص خواتین اور ملازمت کے سرکاری پہلو کے گرد گھومتی تھیں۔ ان اصحاب نے بلا توقف پرنس آندرے کو اپنے قبیلے کا فرد تسلیم کر لیا اور یہ وہ عزت افزائی تھی جو ہر کس و ناکس کے حصے میں نہیں آتی تھی۔ ایک تو شائستگی کا تقاضا تھا، دوسرے گفتگو بہر طور کسی نہ کسی طرح شروع ہونا ہی تھی، چنانچہ انھوں نے ازراہِ اخلاق اس سے فوج اور حالیہ جھڑپ کے بارے میں چند سوالات دریافت کیے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ بے تکی گپیں ہانکنے اور ہنسی مذاق کی باتیں کرنے لگے۔

''لیکن اس سارے قصے کا سب سے مزیدار پہلو یہ ہے،'' ایک نے اس سانحے کا، جو اس کے ساتھی سفارت کار کے ساتھ پیش آیا تھا، ذکر کرتے ہوئے کہا، ''کہ چانسلر نے اسے لگی لپٹی رکھے بغیر بتا دیا ہے کہ لندن[23] میں اس کی تعیناتی ترقی ہے اور اسے اس تعیناتی کو سمجھنا بھی ترقی ہی چاہیے۔ اس پر اس نے جو جو شکلیں بنائیں، کیا تم ان کا تصور کر سکتے ہو؟''

''لیکن، دوستو، اس معاملے کا بدترین پہلو یہ ہے۔ یہاں میں کوراگن کے راز سے پردہ اٹھا رہا ہوں۔ کہ اس بے چارے پر جو افتاد پڑی ہے، اس کا فائدہ سراسر اس بدذات، اس دون واں[24] کو ہوا ہے۔''

پرنس اپولیت مزے سے آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں کرسی کے بازو پر پساری ہوئی تھیں۔ وہ ہنس پڑا: ''چھوڑو یار، جانے دو!''

''ارے، تم دون واں! تم مار آستین!'' ان سب نے با آواز بلند چلا کر کہا۔

''بلکونسکی، تمھیں شاید علم نہیں ہے،'' بلبین نے پرنس آندرے کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔ ''فرانسیسی فوج نے۔ معاف کرنا، میں غلطی سے روسی فوج کہنے والا تھا۔ جو مظالم ڈھائے ہیں، وہ ان تباہ کاریوں کے، جو یہ خواتین کی صفوں پر برپا کرتا رہتا ہے، مقابلے میں بے حیثیت ٹھہرتے ہیں۔''

''عورت تو مرد کی رفیق ہے،'' پرنس اپولیت نے فرانسیسی میں اعلان کیا اور اپنے چشمے میں سے اپنی ٹانگوں

کو، جو اس نے بازو کے اوپر لٹکائی ہوئی تھیں، دیکھنے لگا۔

بلبین اور اس کے احباب نے اپنی نگاہیں سیدھی ایپولیت کے چہرے پر گاڑ دیں اور کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

پرنس آندرے کو یاد آیا کہ یہ تو وہی ایپولیت ہے جس کا — اسے اپنے آپ سے یہ اقرار کرنا پڑا کہ اپنی بیوی کی وجہ سے وہ اس شخص سے حسد کرنے لگا تھا — اس کے اپنے حلقے میں ہر کوئی مذاق اڑایا کرتا تھا۔

''لیکن تمھاری موج تو میں اب کراتا ہوں،'' بلبین نے سرگوشیوں میں بلکونسکی سے کہا۔ ''جب کوراگن سیاست پر بحث کرتا ہے، بہت لطف آتا ہے — دیکھنا، کتنا سنجیدہ ہو جاتا ہے!''

وہ ایپولیت کے قریب بیٹھ گیا اور پیشانی سکیڑ کر اس کے ساتھ سیاست پر باتیں کرنے لگا۔ پرنس آندرے اور دوسرے لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو گئے۔

''برلن کی کابینہ اتحاد کے بارے میں اپنی رائے دینے سے قاصر ہے،'' ایپولیت نے ان پر معنی خیز نظریں ڈالتے ہوئے کہا۔ ''کچھ بتائے بغیر... جیسا کہ ان کے تازہ ترین مراسلے سے... تم سمجھتے ہی ہو،... تم سمجھتے ہی ہو... اور علاوہ ازیں، اگر ہز میجسٹی امپراطور ہمارے معاہدے کے اصول سے انحراف نہیں کرتے... ٹھہرو، میری بات ابھی ختم نہیں ہوئی،'' اس نے پرنس آندرے سے اس کی کلائی پکڑتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ مداخلت عدم مداخلت سے کہیں بہتر ہے اور...'' اس نے توقف کیا۔ ''علاوہ ازیں، اگر انھیں ہمارا اٹھارہ نومبر کا مراسلہ نہیں ملا تو اسے فیصلہ کن امر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تو قصہ یوں ختم ہو گا۔''

اور اس نے بلکونسکی کی کلائی چھوڑ دی۔ یہ اس چیز کی علامت تھی کہ وہ اپنی بات ختم کر چکا ہے۔

''ڈیموستھینیز[25]، میں نے تمھیں اس کنکری سے، جو تم اپنے سنہری دہن میں چھپائے پھرتے ہو، پہچانا ہے،'' بلبین نے جواب دیا۔ اس کی دانست میں اس کا یہ جملہ اتنا بلیغ تھا کہ وہ بالکل مطمئن ہو گیا۔ یہ کہہ وہ بہت مطمئن تھا، اس کا اظہار یوں ہوا کہ اس کے سر پر جو چند ایک بال تھے، وہ حرکت کرنے لگے تھے۔

سب لوگ ہنسنے لگے اور بلند ترین ہنسی ایپولیت کی تھی۔ بظاہر وہ اذیت میں مبتلا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی لیکن وہ اپنی شوریدہ سر ہنسی پر، جس نے اس کے چہرے پر، جو عام طور پر جذبات سے عاری ہوتا تھا، تشنج کی کیفیت پیدا کر دی تھی، قابو نہیں پا سکتا تھا۔

''حضرات، ذرا توجہ فرمائیں،'' بلبین نے کہا۔ ''بلکونسی یہاں برن میں میرا مہمان ہے۔ میں اس کی بہترین خاطر مدارت کرنا چاہتا ہوں اور حتیٰ الامکان اسے زندگی کی تمام نعمتیں فراہم کر دینا چاہتا ہوں۔ اگر ہم ویانا میں ہوتے، تو یہ کام بہت آسان ہوتا۔ لیکن اس موراوی بل[26] میں بے شمار مشکلات حائل ہیں۔ اس لیے میں تم سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس معاملے میں میری مدد کریں۔ برن میں مہمان نوازی کے جتنے لوازم بھی موجود ہیں، وہ ہمیں مل جل کر اسے مہیا کرنا چاہئیں۔ تم اسے تھیٹر اور میں اعلیٰ طبقے میں لے جاؤں گا۔ رہ گئیں خواتین، ان کا ذمہ ایپولیت لے گا۔''

''ہمیں اسے ایمیلی سے ضرور ملانا چاہیے — اس میں اتنی کشش ہے کہ آدمی دیوانہ وار اس کی طرف کھنچا جاتا ہے،'' ایک صاحب نے اپنی انگلیوں کے آخری سرے چومتے ہوئے گوہر افشانی کی۔

''بحیثیت مجموعی ہمیں اس خونخوار فوجی کا دل ایسی چیزوں سے، جن میں انسانی دلچسپی کا پہلو زیادہ ہو، بہلانا چاہیے،'' بلبین نے کہا۔

''حضرات، میرا خیال ہے کہ میں آپ احباب کی مہمان نوازی سے مستفید نہیں ہو سکوں گا۔ میری روانگی کا وقت ہو بھی گیا،'' بلکونسکی نے اپنی گھڑی پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''کہاں؟''

''امپراطور کی خدمت میں۔''

''اوہ! اوہ! اوہ!''

''اچھا خدا حافظ، بلکونسکی۔''

''پرنس! خدا حافظ، ڈنر پر ذرا جلدی آیئے گا۔''

''ہم تمھارا خیال رکھیں گے۔''

''جب تمھاری امپراطور سے ملاقات ہو، تمھیں جو رسد فراہم کی گئی ہے اور راستوں کی جس طرح نشان دہی کی گئی ہے، اس کی تعریف کرنا نہ بھولنا،'' بلبین نے استقبالیہ کمرے تک اس کا ساتھ دیتے ہوئے کہا۔

''میں ان کی تعریف ضرور کرنا چاہتا ہوں لیکن جن باتوں کا مجھے علم ہے، ان کی بنا پر ایسا کرنا ممکن نہیں،'' بلکونسکی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''بہرحال، جہاں تک ممکن ہو، اسے باتوں میں الجھائے رکھنا۔ اسے لوگوں کو شرف باریابی بخشنے کا بہت شوق ہے، لیکن خود باتیں کرنا پسند نہیں — اور وہ باتیں کر سکتا ہی نہیں۔ تمھیں خود معلوم ہو جائے گا۔''

12

شاہی دربار میں امپراطور فرانٹس نے بلکونسکی کے، جو آسٹروی افسروں کے مابین اپنی جائے مقررہ پر کھڑا تھا، چہرے کو محض بغور دیکھا اور اپنی لمبی گردن ہلا دی۔ لیکن دربار کے اختتام پر اسی ایڈی کانگ نے، جس سے اس کی گزشتہ روز رسمی انداز سے ملاقات ہوئی تھی، اسے پیغام دیا کہ امپراطور اسے شرف باریابی بخشنے کے خواہش مند ہیں۔ امپراطور فرانٹس نے کمرے کے بیچ کھڑے کھڑے اس کا استقبال کیا۔ ابھی گفتگو کا آغاز بھی نہ ہونے پایا تھا کہ بلکونسکی کو شدت سے احساس ہوا کہ امپراطور اکھڑا اکھڑا ہے اور سمجھ نہیں پا رہا کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ اس کا چہرہ بھی سرخ ہو رہا تھا۔

''مجھے بتاؤ کہ لڑائی کب شروع ہوئی تھی؟'' اس نے بہ عجلت دریافت کیا۔

پرنس آندرے نے جواب دیا۔ اس کے بعد جو مزید سوالات پوچھے گئے، وہ بھی بالکل سیدھے سادے تھے۔ ''کوتوزوف خیریت سے تھے؟ تمھیں کریمس سے روانہ ہوئے کتنے دن ہو چکے ہیں؟'' علیٰ ہذا القیاس۔ امپراطور یوں لب کشائی کر رہا تھا جیسے اس کا واحد مقصد محض چند گنے گنائے سوالات پوچھنا ہو۔ چونکہ ان سوالات کے جوابات بالکل ظاہر و عیاں تھے، اس لیے اسے ان میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

''لڑائی کتنے بجے شروع ہوئی تھی؟'' امپراطور نے دریافت کیا۔

''یورمیجسٹی، میں تو یہ نہیں بتا سکتا کہ محاذ پر لڑائی کتنے بجے شروع ہوئی تھی لیکن ڈورنشٹائن میں، جہاں کہ میں خود موجود تھا، ہماری سپاہ نے شام چھ بجے اپنے حملے کا آغاز کیا تھا،'' بلکونسکی نے جواب دیا۔ اب اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا تھا اور اسے یہ امید بندھ چلی تھی کہ جو کچھ وہ جانتا تھا، جو کچھ اس نے دیکھا تھا، اور ان سب کے بارے میں اس نے اپنے ذہن میں جو نقشہ ترتیب دیا تھا، اب اسے کماحقہ، بیان کرنے کا اسے موقع میسر آجائے گا۔

لیکن امپراطور مسکرا دیا اور اس نے اس کی بات کاٹ دی، ''کتنے میل؟''

''کہاں سے کہاں تک؟ یورمیجسٹی۔''

''ڈورنشٹائن سے کریمس تک۔''

''ساڑھے تین میل، یورمیجسٹی۔''

''فرانسیسیوں نے بایاں کنارہ خالی کر دیا ہے؟''

''ہمارے مخبروں کے مطابق ان کے آخری آدمی کی کشتی رات پار جا چکی تھی۔''

''کریمس میں تمھارے پاس چارہ اور چبینا کافی ہے؟''

''چارہ اور چبینا اتنا فراہم نہیں کیا گیا کہ...''

امپراطور نے پھر اس کی بات کاٹ دی، ''جنرل شمٹ کتنے بجے ہلاک ہوئے؟''

''میرا خیال ہے کہ سات بجے۔''

''سات بجے؟ بہت افسوسناک! بے حد افسوسناک!''

امپراطور نے شکریہ ادا کیا اور گردن جھکا دی۔ پرنس آندرے پیچھے ہٹ گیا اور پلک جھپکنے میں درباریوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ چاروں اطراف سے اسے دوستانہ نگاہوں اور دوستانہ الفاظ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ اسی ایڈی کانگ نے اسے جھاڑ پلا دی کہ وہ محل میں کیوں نہ ٹھہرا اور اس نے اسے اپنا مکان پیش کر دیا۔ وزیر جنگ بھی اس کے پاس آیا اور اسے ہدیہ تہنیت پیش کیا کہ امپراطور اسے (تمغہ) آرڈر آف ماریا ٹریسا[27] درجہ سوم عطا فرما رہے ہیں۔ امپراطورہ کے چیمبرلین[28] نے اسے مطلع کیا کہ ہر میجسٹی اس سے ملاقات کرنے کی متمنی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس کس کی بات کا جواب دے اور اسے اپنے حواس بحال کرنے میں چند سیکنڈ صرف ہو گئے۔ اتنے میں روسی سفیر وہاں پہنچ گیا۔ اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، اسے دریچے کے پاس لے گیا اور

اس سے باتیں کرنے لگا۔

بلبین کی پیش گوئی کے برعکس وہ جو خبر لایا تھا، اس پر خوشیاں منائی گئیں۔ بارگاہ الٰہی میں شکر ادا کرنے کے لیے خاص مذہبی تقریب کے انعقاد کا حکم جاری کیا گیا۔ کوتوزوف کو (تمغہ) گرینڈ کراس آف ماریا ٹریسا سے نوازا گیا اور ساری فوج کو انعامات و اکرامات کا مستحق ٹھہرایا گیا۔ بلکونسکی کے پاس دعوت ناموں کا ڈھیر لگ گیا اور اس کا سارا دن آسٹریا کی چیدہ چیدہ شخصیات سے ملنے ملانے میں صرف ہو گیا۔ تقریباً پانچ بجے شام، جب وہ لوگوں سے ان کے گھروں پر ملاقاتیں کرنے سے فارغ ہوا، اس نے بلبین کی جائے رہائش کا رخ کیا۔ وہ دل ہی دل میں وہ اس خط کا، جو اس نے اپنے باپ کو تحریر کرنا تھا اور جس میں اس نے لڑائی اور اپنے سفر برن کی تفصیلات بیان کرنا تھیں، نفسِ مضمون سوچ رہا تھا۔ تاہم گھر واپس پہنچنے سے پہلے وہ مہم کے لیے چند کتابیں خریدنے ایک دکان پر رک گیا۔ بلبین کے دروازے پر اسے ایک برتسکا، جو سامان سے نصف بھر چکی تھی، کھڑی نظر آئی۔ بلبین کا ملازم فرانٹس دروازے میں سے ٹرنک نکالنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس سے نکل نہیں رہا تھا۔

''کیا ہوا؟'' بلکونسکی نے دریافت کیا۔

''اوہ، یوئر ایکسی لینسی، آپ؟'' فرانٹس بدقت تمام برتسکا پر ٹرنک چڑھاتے ہوئے بولا۔ ''ہم مزید آگے جا رہے ہیں۔ وہ حرام زادہ ہمارے تعاقب میں یہاں آیا ہی چاہتا ہے۔''

''کیا ہوا؟ کیا کہہ رہے ہو تم؟'' پرنس آندرے نے پوچھا۔

بلبین اسے ملنے باہر آ گیا۔ عام طور پر اس کا چہرہ پرسکون رہتا تھا لیکن اب اس پر اضطراب سایہ فگن تھا۔

''اب تمھیں تسلیم کرنا ہی ہوگا کہ اس ویانا کے پل کا قصہ بھی خوب ہے!'' اس نے کہا۔ ''انھیں ایک گولی بھی نہیں چلانا پڑی اور پل پر بھی قابض ہو گئے۔''

پرنس آندرے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

''جس بات کو شہر کا ہر کوچوان جانتا ہے، وہ تمھیں کیوں معلوم نہ ہو سکی؟ کہاں تھے تم؟''

''میں آرچ ڈچس سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہاں تو میں نے کچھ نہیں سنا۔''

''اور تم نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ ہر جگہ لوگ سامان باندھ رہے ہیں؟''

''نہیں، میں نے کچھ نہیں دیکھا... لیکن یہ کیا ہو رہا ہے؟'' پرنس آندرے نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہو کیا رہا ہے؟ ہو یہ رہا ہے کہ جس پل کا اویرزبرگ دفاع کر رہا تھا، وہ فرانسیسیوں نے عبور کر لیا ہے۔ چونکہ پل کو اڑایا نہیں گیا تھا، چنانچہ موعا برق رفتاری سے ادھر آ رہا ہے اور ایک دو روز میں برن پہنچ جائے گا۔''

''کیا — یہاں؟ اگر پل کے نیچے سرنگیں بچھا دی گئی تھیں، پھر اسے اڑایا کیوں نہ گیا؟''

''یہ سوال تو میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ کسی کو بھی نہیں بلکہ خود بونا پارت کو بھی اس 'کیوں' کا جواب معلوم نہیں۔''

بلکونسکی اپنے کندھے جھٹک کر رہ گیا۔

''اگر انھوں نے پل عبور کرلیا ہے، اسکا مطلب یہ ہوا کہ فوج بیکار ہوگئی۔ اس کا رابطہ منقطع ہوجائے گا۔''

''اصل نکتہ یہ نہیں،'' بلبین نے جواب دیا۔ ''سنو! جیسا کہ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ فرانسیسی ویانا میں داخل ہوگئے تھے۔ بہت خوب! اگلے روز یعنی دیروز، یہ مارشل حضرات موغا، لان (Lannes) اور بلیاخ (Belliard)، تینوں کے تینوں گاسکن ہیں[29]۔۔۔ وہ گھوڑوں پر سوار ہوتے ہیں اور پل پر پہنچ جاتے ہیں۔ 'حضرات' ان میں سے ایک کہتا ہے۔ 'اس پل کے نیچے سرنگیں ہیں اور ان کا توڑ کرنے کے لیے جوابی سرنگیں بچھائی جا چکی ہیں۔ پل کے پار دفاعی مورچہ بھی بہت زبردست ہے۔ ان کے پاس پندرہ ہزار سپاہ ہے۔ اس سپاہ کو حکم دیا جا چکا ہے کہ پل اڑا دیا جائے اور ہمیں دریا عبور کرنے سے روکا جائے۔ لیکن اگر ہم پل پر قبضہ کرلیتے ہیں، ہمارے عالی مقام امپراطور نپولین بہت خوش ہوں گے۔ چنانچہ ہم تینوں چلتے ہیں اور پل پر قبضہ کرلیتے ہیں'۔۔۔ 'بالکل ٹھیک' 'آؤ چلیں،' دوسرے جواب دیتے ہیں۔ یوں وہ چل پڑتے ہیں اور پل پر قبضہ کرلیتے ہیں۔ وہ اسے عبور کرتے ہیں اور جب کہ ان کی ساری فوج ڈینیوب کے اس کنارے پہنچ چکی ہے، انھوں نے اپنا رخ ہماری، تمھاری اور تمھارے رسل و رسائل کے ذرائع کی طرف کرلیا ہے۔''

''مذاق چھوڑو،'' پرنس آندرے نے سنجیدگی سے کہا۔

اس خبر سے اسے دکھ بھی ہوا اور خوشی بھی۔ جونہی اسے احساس ہوا کہ روسی فوج ایک ایسی صورتِ حال میں پھنس گئی ہے جس میں اس کے سرخ رو ہونے کا کوئی امکان نہیں، اپنے آپ ایک خیال اس کے ذہن میں کوندے کی طرح لپکا کہ وہ خود وہ شخص ہے جس کے مقدر میں اس کی رہنمائی کرنا اور اسے اس صورت حال سے باہر نکالنا ہے۔ یہ اس کا تولوں[30] ہوگا جو اسے غیر معروف افسروں کی صف سے اوپر اٹھا دے گا اور شہرت کے زینے پر کھڑا کردے گا۔ بلبین کی باتیں سنتے سنتے اس نے ہوائی قلعے تعمیر کرنا شروع کردیے تھے۔ ''جب میں فوج میں واپس جاؤں گا، میں جنگی کونسل کے سامنے اپنا منصوبہ پیش کروں گا۔ میرا منصوبہ واحد منصوبہ ہوگا جو فوج کو بچا سکے گا اور پھر مجھے ہی اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے کہا جائے گا۔''

''مذاق چھوڑو،'' اس نے کہا۔

''میں مذاق نہیں کر رہا،'' بلبین نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اس سے زیادہ صحیح اور افسوس ناک بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ یہ تینوں حضرات تن تنہا پل پر آتے ہیں اور سفید رومال لہراتے ہیں۔ وہ ڈیوٹی آفیسر کو قائل کرلیتے ہیں کہ یہ صلح کی نشانی ہے، وہ تینوں مارشل ہیں اور پرنس اویرزپرگ سے گفت و شنید کرنے جا رہے ہیں۔ وہ انھیں مورچے کے اندر آنے دیتا ہے۔ وہ گاسکن ہیں اور جیسا کہ گاسکنوں کا وتیرہ ہے، وہ اسے ایک ہزار ایک در فنطنیاں[31] سنا دیتے ہیں۔ وہ اسے بتاتے ہیں کہ جنگ ختم ہو چکی ہے، امپراطور فرانٹس نے بوناپارت کے ساتھ ملاقات کا انتظام کیا ہے اور وہ پرنس اویرزبرگ سے ملاقات کرنے کے متمنی ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ افسر اویرزبرگ کو پیغام بھیجتا

ہے کہ وہ تشریف لائے۔ یہ حضرات افسروں سے گھل مل جاتے ہیں، ان کے ساتھ معانقے کرتے ہیں، لطیفے سناتے ہیں اور ایک گجنال پر بیٹھ جاتے ہیں۔ دریں اثنا ایک فرانسیسی بٹالین چپکے سے پل پر پہنچ جاتی ہے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا۔ فرانسیسی سپاہی آتش گیر مادے کی بوریاں اٹھا کر دریا میں پھینک دیتے ہیں اور مورچے کی جانب پیش قدمی کرنے لگتے ہیں۔ آخر کار لیفٹیننٹ جنرل، ہمارے ڈیئر پرنس اویرزبرگ وان موٹرن، بنفس نفیس تشریف لے آتے ہیں۔ 'ہمارے عزیز ترین دشمن صاحب! غنچۂ سپاہ آسٹریا صاحب! ترکی جنگوں کے ہیرو صاحب! حرب وضرب ختم، اب ہم مصافحہ کر سکتے ہیں۔ امپراطور نپولین پرنس اویرزبرگ سے ملاقات کرنے کے لیے بے قرار ہیں۔' قصہ مختصر، یہ حضرات، جو نپی گاسکن نہیں ہیں، اسے خوبصورت لفظوں اور جملوں کی وہ مار دیتے ہیں کہ اس کے لیے جواب دینا ناممکن ہو جاتا ہے۔ فرانسیسی مارشلوں نے جس برق رفتار بے تکلفی کا مظاہرہ کیا، وہ اس سے اس قدر مسحور ہوا، موغا کے فرغل اور شتر مرغ کے پروں نے اس کی آنکھیں کچھ اس طرح چندھیا دیں کہ اسے جس آگ کا رخ ان کی طرف کرنا چاہیے تھا، وہ اس کی اپنی آنکھوں میں جلنے لگی۔'' بلبین جس جوش وخروش اور ولولے کے ساتھ تقریر کر رہا تھا، اس کے باوجود اس نے وقفہ دینا ضروری خیال کیا تا کہ بلکونسکی کو اتنا موقع مل سکے کہ وہ اس کی خطابت اور بذلہ سنجی کی تحسین کر سکے۔ ''فرانسیسی بٹالین سوختہ پا مورچے کی طرف بڑھتی ہے، گجنالوں کے منہ کیلیں ٹھونک کر بند کر دیتی ہے اور پل پر قبضہ کر لیتی ہے۔ لیکن سب سے پرلطف بات یہ ہے،'' اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اس پر کہانی کا طلسم کچھ اس بری طرح سوار ہوا کہ وہ اپنی پریشانیاں بھی بھول گیا۔ جس سارجنٹ کے سپرد وہ گجنال، جسے اس نے داغ کر یہ اشارہ دینا تھا کہ سرنگوں کو آگ لگا دی اور پل کو تباہ کر دیا جائے، کی گئی تھی، اس سارجنٹ نے جب فرانسیسی سپاہ کو پل کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا، وہ اپنی گجنال داغنے ہی والا تھا کہ لان نے اس کا ہاتھ روک لیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارجنٹ اپنے جرنیل سے زیادہ سمجھ دار تھا۔ وہ اویرزبرگ کے پاس پہنچتا ہے اور اس سے کہتا ہے: 'پرنس، آپ سے فریب کیا گیا ہے۔ فرانسیسی تو یہاں آ بھی گئے ہیں!' موغا تاڑ جاتا ہے کہ اگر سارجنٹ کو مزید بات کرنے کا موقع دیا گیا، بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ چنانچہ وہ سچے گاسکن کی طرح جھوٹ موٹ حیرت کا اظہار کرتا ہے اور مڑ کر اویرزبرگ سے کہتا ہے: 'آسٹریا کے نظم وضبط کے تو کل عالم میں چرچے تھے، کہاں گیا وہ؟ آپ کا ماتحت اور آپ سے یوں بات کرے، حد ہو گئی! ایسی بات صرف نابغے کو ہی سوجھ سکتی ہے! پرنس اویرزبرگ کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کا وقار داؤں پر لگ گیا ہے، چنانچہ وہ سارجنٹ کی گرفتاری کا حکم دے دیتا ہے۔ تمھیں بہرحال یہ تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ ویانا پل کی داستان بے حد لذیذ ہے۔ یہ نہ نری حماقت ہے اور نہ اسے بزدلی کہا جا سکتا ہے۔''

''پھر غالباً یہ غداری ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ وہ اپنے تخیل میں مٹیالے اوورکوٹ، زخم، توپوں کا دھواں، گولہ باری واضح طور پر دیکھ رہا تھا اور پھر جو چیز اس کے لیے سرخاب کا پر بننے والی تھی، اس کی جھلک بھی اس کے ذہن میں گھوم گئی۔

''نہیں، یہ بھی نہیں۔ اس سے تو دربار کو ایک طرح کی فضیلت حاصل ہو جاتی ہے،'' بلیبن بولتا چلا گیا۔'' نہ غداری ہے، نہ بزدلی اور نہ بے حمیتی۔ یہ بالکل وہی ہے جو الم میں ہوا تھا... '' معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی موزوں لفظ یا ترکیب ڈھونڈ رہا تھا۔'' یہ بالکل وہی حرکت ہے جو میک نے کی تھی۔ یوں سمجھو کہ ہمیں میک کر دیا گیا ہے۔'' اس نے اپنی بات ختم کر دی۔ وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے کوئی نیا لفظ تخلیق کر دیا ہو اور اب ہر کہہ ومہہ اس کی جگالی کرتا پھرے گا۔

اس کے ابروؤں کی شکنیں دوبارہ درست ہو گئیں۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ وہ اپنی کارکردگی پر مطمئن ہے۔ اس کے چہرے پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور وہ اپنے ناخنوں کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔

''اب کہاں کے ارادے ہیں؟'' اس نے پرنس آندرے سے، جو اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے کمرے کی طرف جا رہا تھا، دریافت کیا۔

''مجھے جانا ہو گا۔''

''کہاں؟''

''فوج میں۔''

''لیکن تم تو مزید دو دن ٹھہرنا چاہتے تھے۔''

''نہیں، مجھے فوراً روانہ ہونا ہو گا۔''

اور پرنس اپنی روانگی کے بارے میں ہدایات دینے کے بعد اپنے کمرے کی طرف چل پڑا۔

''میرے دوست، تم جانتے ہو،'' بلیبن نے اس کے پیچھے پیچھے آتے ہوئے کہا۔'' میں تمھارے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ تم کیوں جا رہے ہو؟''

اور اس بات کے ثبوت میں کہ جو دلائل وہ دینے والا تھا، ان کی تردید ممکن ہی نہیں، اس کے چہرے کی تمام شکنیں کافور ہو گئیں۔

پرنس آندرے نے اس پر استفہامیہ نگاہ ڈالی اور کوئی جواب نہ دیا۔

''تم کیوں جا رہے ہو؟ مجھے معلوم ہے۔ تمھارا خیال ہے کہ جب فوج خطرے کی زد میں ہو، تو تمھارا یہ فرض بنتا ہے کہ تم پر لگا کر وہاں پہنچ جاؤ۔ مائی ڈیئر، میں خوب سمجھتا ہوں۔ اسی کا نام ہیروازم ہے۔''

''نہیں، بالکل نہیں،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''لیکن تم تو فلسفی ہو، پھر پورے (فلسفی) کیوں نہیں بنتے؟ مسئلے کا دوسرا پہلو بھی دیکھو۔ پھر تمھیں معلوم ہو گا کہ اپنی سوچ کے علی الرغم تمھارا یہ فرض بنتا ہے کہ تم اپنے آپ کا خیال رکھا کرو۔ دیگر تمام باتیں دوسروں پر، جو کسی اور کام کے اہل نہیں، چھوڑ دو۔ تمھیں واپس پہنچنے کا کوئی حکم نہیں دیا گیا اور تمھیں یہاں سے فارغ نہیں کیا گیا، چنانچہ یہیں ٹھہرو اور ہمارے ساتھ چلو۔ سنا ہے کہ ہم اول موٹس (Olmutz) جا رہے ہیں اور اول موٹس بہت دلکش

اور پیارا قصبہ ہے۔ تم بڑے آرام اور سہولت سے میری گاڑی میں وہاں جا سکتے ہو۔"

"بلبین، یہ مسخر گیاں چھوڑ دو،" بلکونسکی نے کہا۔

"میں دوست کی حیثیت سے تمھارے ساتھ بڑے خلوص سے بات کر رہا تھا۔ ذرا سوچو! جب تم یہاں قیام کر سکتے ہو پھر تم کہاں اور کیوں جا رہے ہو؟ تمھارا واسطہ دو میں سے ایک چیز سے ہے۔" ۔ جب اس نے یہ الفاظ کہے، اس کی بائیں کنپٹی کی جلد پر شکنیں پڑ گئیں ۔ "یا تو تمھارے اپنی رجمنٹ میں واپس پہنچنے سے پہلے ہی معاہدۂ امن تکمیل تک پہنچ جائے گا یا پھر کوتوزوف کی تمام فوج کے مقدر میں جو شکست اور رسوائی لکھی جا چکی ہے، تم اس میں برابر کے شریک بن جاؤ گے۔"

یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مخمصہ لا ینحل ہے، بلبین نے اپنی شکنیں درست کر لیں۔

"میں اس بارے میں بحث میں نہیں پڑ سکتا،" پرنس آندرے نے سرد مہری سے کہا۔ لیکن وہ کچھ سوچ رہا تھا اور اس نے کہا: "میں جا رہا ہوں تا کہ فوج کو بچا سکوں۔"

"مائی ڈیئر فیلو۔ تم واقعی ہیرو ہو،" بلبین نے کہا۔

13

بلکونسکی نے وزیر جنگ سے اجازت لی اور اسی رات روانہ ہو گیا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اسے فوج کہاں ملے گی اور پھر اسے یہ اندیشہ بھی لاحق تھا کہ شاہراہ کریمس پر سفر کے دوران میں وہ کہیں فرانسیسیوں کے ہتھے ہی نہ چڑھ جائے۔

برن میں ہر وہ شخص، جس کا تعلق دربار سے تھا، اپنا سامان باندھ اور سفر کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بھاری سامان پہلے ہی اول موٹس روانہ کیا جا چکا تھا۔

ایٹسلٹس ڈورس (Etzelsdors) کے قریب پرنس آندرے اس شاہراہ پر، جس کے ساتھ ساتھ روسی فوج انتہائی بدترتیبی کے عالم میں سروں پر پاؤں رکھے بھاگی جا رہی تھی، پہنچ گیا۔ سڑک سامان کے چھکڑوں سے اتنی پٹی پڑی تھی کہ ان میں سے سواری کی گاڑی کے لیے گزرنا ناممکن تھا۔ پرنس آندرے نے ایک قازق کمانڈر سے گھوڑا اور قازق اردلی لیا اور سامان کے چھکڑوں کو پیچھے چھوڑتا آگے بڑھنے لگا۔ وہ بھوکا تھا، پیاسا تھا اور اس کے جسم کا ایک ایک جوڑ درد کر رہا تھا لیکن اس پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح جلد از جلد کمانڈر انچیف اور سامان کو تلاش کر لے۔ سفر کے دوران میں اسے فوج کی حالت کے بارے میں انتہائی منحوس افواہیں سننے کو ملیں اور جس بدنظمی کے ساتھ سپاہ مارا مار بھاگی جا رہی تھی اس سے ان افواہوں کی تصدیق ہو رہی تھی۔

"جس روسی فوج کو برطانوی سونے کی کشش ادھر کھینچ لائی ہے، ہم اس کا وہی حشر کر دیں گے ۔ وہی حشر، جو اس سپاہ کا، جو الم میں لڑنے آئی تھی، ہوا تھا..." اسے بوناپارٹ کے حکم کے یہ الفاظ، جو اس نے مہم کے آغاز میں اپنی فوج سے خطاب کے دوران میں کہے تھے، یاد آ گئے۔ ان الفاظ نے اسے اپنے ہیرو کی فطانت پر ورطۂ حیرت

میں ڈال دیا۔ ان سے ایک طرف اسے اپنے پندار کے صنم کدے کے ویران ہونے کا احساس ہوا اور دوسری طرف اسے یہ امید بھی ہونے لگی کہ اب وہ نام کما سکے گا۔ ''اگر موت کو گلے لگانے کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار باقی نہیں رہا،'' اس نے سوچا، ''پھر میں موت کو لبیک کہنے کے لیے بھی تیار ہوں اور میں کسی دوسرے کی نسبت بدتر انداز سے نہیں مروں گا۔''

مختلف فوجی دستے، جن کا سلسلہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتا تھا، افراتفری کے عالم میں ایک دوسرے سے الگ تھلگ چلے جا رہے تھے۔ سامان سے لدے پھندے چھکڑے، توپ خانے کی یونٹیں، ان کے بعد پھر چھکڑے اور ممکنہ طور پر ہر قسم کی گاڑیاں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش میں آپس میں گتھم گتھا ہو رہی تھیں۔ کیچڑیلی سڑک پر وہ ایک دوسرے کے لیے رکاوٹ بن رہی تھیں اور بعض اوقات تین تین چار چار ایک دوسرے کے برابر ہو جاتی تھیں۔ آگے پیچھے، دائیں بائیں، چاروں اطراف سے تاحد سماعت پہیوں کی گھڑ گھڑاہٹ، ویگنوں چھکڑوں اور توپ گاڑیوں کی گڑگڑاہٹ، چابکوں کی تڑخ پڑخ، سموں کی دڑ دڑ دڑ، کوچوانوں کی چیخ پکار، اور جوانوں، اردلیوں اور افسروں کی گالی گلوچ کی آوازیں کانوں کے پردے پھاڑے دے رہی تھیں۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی، سڑک کے دونوں کناروں پر گھوڑے گرے پڑے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں سے بعض کو اتنا مارا پیٹا گیا تھا کہ ان کی چمڑی ادھڑ گئی تھی۔ یہاں وہاں شکستہ گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ ان کے قریب اکا دکا جوان بیٹھے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ بعض سپاہی اپنی کمپنیوں سے بچھڑ گئے تھے اور ہجوم در ہجوم قریبی دیہاتوں کا رخ کر رہے تھے یا وہاں لوٹ مار کر رہے تھے۔ جو واپس آ رہے تھے، وہ اپنے ساتھ بھیڑیں، مرغیاں، گھاس، چبینا اور الم غلم اشیا سے بھری بوریاں لا رہے تھے۔ سڑک کی ہر چڑھائی اور اترائی پر ہجوم پہلے سے کہیں زیادہ گھنا ہو جاتا اور شور وغل تھا کہ کہیں تھمنے کا نام نہ لیتا۔ سپاہی ایڑیوں تک کیچڑ میں دھنسے ہوئے تھے اور توپوں اور چھکڑوں کے سہارے آگے بڑھ رہے تھے۔ چھانٹے سرسرا رہے تھے، گھوڑوں کے پاؤں پھسل رہے تھے اور قدموں کے نشانات پلک جھپکنے میں مٹ رہے تھے۔ پھیپھڑے تھے کہ بار بار چلانے سے پھٹے جا رہے تھے۔ وہ افسر، جو پسپائی کی نگرانی پر مامور تھے، گھوڑوں پر گاڑیوں کے آگے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے۔ اس ہاؤ ہش میں ان کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔ ان کے چہروں سے صاف ٹپک رہا تھا کہ وہ اس بدنظمی پر قابو پانے کی امید کھو چکے ہیں۔

بلکونسکی یہ سب کچھ دیکھتا تھا اور نفرت سے منہ دوسری طرف موڑ لیتا تھا۔ ''اور یہ ہماری مذہبی روایات کی حامل پیاری فوج ہے،'' اس نے بلبین کے الفاظ یاد کرتے ہوئے سوچا۔

گھوڑے پر سوار وہ ایک قافلے کے پاس پہنچا۔ وہ کمانڈر انچیف کا اتا پتا معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے بالکل بالمقابل ایک عجیب وغریب گاڑی متحرک تھی۔ اسے صرف ایک گھوڑا کھینچ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ جو الابلا فوجیوں کے ہاتھ آئی، انھوں نے اس سے یہ گاڑی کھڑی کر لی تھی۔ یہ نہ چھکڑا تھی، نہ ٹم ٹم اور نہ کالاش، بلکہ ان کے بین بین کوئی چیز تھی۔ اسے ایک فوجی ہانک رہا تھا۔ اور اس کے عقبی حصے میں ایک عورت، جس نے اپنے جسم

کے گرد شال لپیٹ رکھی تھی، بیٹھی تھی۔ پرنس آندرے گاڑی کے قریب پہنچا۔ وہ ایک جوان سے اپنا سوال پوچھا ہی چاہتا تھا کہ اس کی توجہ اس عورت کی چیخ پکار کی طرف مبذول ہوگئی۔ اصل میں ہوا یہ تھا کہ قافلے کے انچارج افسر نے اس جوان کو، جو اس عورت کی گاڑی ہانک رہا تھا، چابک مارنے کی کوشش کی تھی کیونکہ وہ دوسروں سے آگے نکلنا چاہتا تھا لیکن اس کی زد میں یہ عورت آ گئی۔ یوں وہ محض واویلا ہی نہیں کرنے لگی بلکہ اس نے اپنی چیخوں سے آسمان سر پر اٹھالیا۔ جب اسے پرنس آندرے نظر آیا، وہ گاڑی سے باہر کی جانب جھکی، اپنے دبلے پتلے بازو شال سے باہر نکالے اور انھیں ادھر ادھر گھماتے ہوئے چلا چلا کر کہنے لگی:

''ایجوٹنٹ! مسٹر ایجوٹنٹ... خدا کے لیے... مجھے بچاؤ... ۔ ...کیا بنے گا ہمارا؟... میں شاسروں کی ساتویں رجمنٹ کے ڈاکٹر کی بیوی ہوں... یہ ہمیں گزرنے نہیں دیتے۔ ہم پیچھے رہ گئے ہیں اور اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گئے ہیں...''

میں مار مار کر تمھارا پلپتھن بنادوں گا! پیچھے ہٹو!'' غصے سے آگ بگولا افسر نے فوجی کو جوان سے کہا۔ ''اس بے ہودہ عورت کو لے کر پیچھے ہٹ جاؤ!''

''مسٹر ایجوٹنٹ، مجھے بچاؤ!... کیا بنے گا ہمارا؟'' ڈاکٹر کی بیوی نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کہا۔

''اس گاڑی کو گزر جانے دیں۔ نوازش ہوگی۔ دیکھتے نہیں، اس میں زنانہ سواری ہے؟'' پرنس آندرے نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے افسر کے پاس پہنچ کر کہا۔

افسر نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی اور جواب دیے بغیر فوجی کو جوان کی طرف متوجہ ہوا۔

''میں تمھاری ایسی تیسی کردوں گا... واپس!''

''میں کہتا ہوں انھیں گزر جانے دو!'' پرنس آندرے نے ہونٹ بھینچتے ہوئے دوبارہ کہا۔

''تم کون ہو؟'' افسر نے اچانک یوں غضب ناک ہو کر کہا جیسے وہ نشے سے مخمور ہو۔ ''میں پوچھتا ہوں: کون ہو تم؟ تمھارا خیال ہے کہ یہاں تمھارا حکم چلتا ہے؟ یہاں کمان میرے ہاتھ میں ہے، تمھارے نہیں! چلو، ہٹو پیچھے!'' اس نے دوبارہ کہا۔ ''ورنہ مار مار کر میں تمھارا پلپتھن بنادوں گا۔''

بظاہر اس افسر کو اپنا یہ جملہ بہت پسند تھا۔

''اس نے اس مخنی ایجوٹنٹ کی خوب خبر لی ہے،'' پیچھے سے آواز سنائی دی۔

پرنس آندرے سمجھ گیا کہ اندھے اور نشیلے طیش نے اس افسر کو اس حالت تک پہنچادیا ہے کہ خود اسے معلوم نہیں کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ اس نے عجیب النوع گاڑی میں سوار عورت کی جو حمایت کی ہے، اس سے دوسروں کو اس کا مذاق اڑانے کا موقع مل گیا ہے اور یہ وہ چیز تھی جس سے وہ دنیا کی کسی بھی دوسری چیز کے مقابلے میں زیادہ خائف تھا۔ لیکن وہ اپنی جبلت کے اشارے پر چل رہا تھا۔ اس افسر نے بمشکل اپنا جملہ ختم کیا ہوگا کہ پرنس آندرے، غیظ و غضب نے جس کے چہرے کی شکل بگاڑ دی تھی، گھوڑے پر سوار اس کی طرف

لپکا اور اس نے اپنا چابک اوپر اٹھا لیا۔

''مہر—بانی—سے—ان—ہیں—گزر—جانے دو!''

افسر نے اپنا بازو لہرایا اور تیزی سے اپنا گھوڑا بھگا کر دور لے گیا۔ ''یہ سراسر ان لوگوں کا، ان سٹاف افسروں کا قصور ہے کہ یہاں اتنی بدنظمی ہے،'' اس نے دل کا غبار نکالتے ہوئے کہا۔ ''جو جی میں آئے، کرو۔''

پرنس آندرے نگاہیں اٹھائے بغیر وہاں سے، جہاں ڈاکٹر کی بیوی اسے اپنا نجات دہندہ پکار رہی تھی، بہ عجلت اپنا گھوڑا بھگا لے گیا۔ جب وہ اس گاؤں کی طرف، جہاں اسے بتایا گیا تھا کہ کمانڈر انچیف مل جائے گا، سرپٹ دوڑا جا رہا تھا، اسے اس واقعہ کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل یاد آنے لگی اور اس کا جی متلانے لگا۔

گاؤں پہنچ کر وہ گھوڑے سے اترا اور جو پہلا مکان نظر آیا، اس میں داخل ہو گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ یہاں وہ کچھ کھائے گا، پیے گا، اور کچھ دیر، خواہ ایک منٹ کے لیے ہی، آرام کرے گا۔ اور جن باتوں نے اس کا جی جلایا تھا، اسے شرمندگی میں مبتلا کیا تھا اور جو اس کے ذہن پر سوار ہو گئی تھیں، ان سے چھٹکارا حاصل کرے گا۔

''یہ فوج نہیں—بھیڑ ہے!'' اس نے سوچا۔

وہ مکان کی کھڑکی کی جانب بڑھ رہا تھا کہ کسی جانی پہچانی آواز نے اس کا نام لے کر پکارا۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھائیں۔ پرنس نیس وتسکی کا خوش شکل چہرہ تنگ کھڑکی کے باہر لٹک رہا تھا۔ اس کے مرطوب ہونٹ متحرک تھے۔ وہ کچھ چبا رہا تھا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے پرنس آندرے کو اپنی طرف آنے کو کہا۔

''بلکونسکی! بلکونسکی! تمھیں میری آواز سنائی نہیں دیتی؟ ادھر آ جاؤ۔ جلدی!'' اس نے چلا کر کہا۔

پرنس آندرے مکان کے اندر چلا گیا۔ وہاں پرنس نیس وتسکی اور ایک دوسرا ایجوٹنٹ کچھ کھانے پینے میں مصروف تھے۔ انھوں نے جھٹ پٹ اس سے پوچھا کہ وہ کوئی خبر لایا ہے؟ ان کے جانے پہچانے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ عام طور پر پرنس نیس وتسکی کا چہرہ ہر وقت ہنستا مسکراتا نظر آتا تھا لیکن اس وقت وہ بطور خاص پریشان اور خوف زدہ نظر آ رہا تھا۔

''کمانڈر انچیف کہاں ہیں؟'' بلکونسکی نے پوچھا۔

''وہ یہیں ہیں... اس مکان میں،'' ایجوٹنٹ نے جواب دیا۔

''یہ امن اور اطاعت کی جو باتیں ہو رہی ہیں—درست ہیں؟'' نیس وتسکی نے پوچھا۔

''یہی تو میں تم سے پوچھنا چاہتا تھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں بھاگتا دوڑتا بڑی مشکلوں سے یہاں پہنچا ہوں۔''

''برادر، تمھیں کیا معلوم کہ ہمیں کیا کچھ بھگتنا پڑا! جان عذاب میں آ گئی ہے! میں نے حماقت کی کہ میک کا مذاق اڑایا—جو کچھ ہمارے ساتھ بیت رہی ہے، وہ اس سے بھی بدتر ہے!'' نیس وتسکی نے کہا۔ ''خیر، بیٹھو اور کچھ کھا پی لو۔''

''پرنس، آپ کو اپنا سامان واماں کچھ نہیں ملے گا اور خدا جانے کہ آپ کے اردلی پیوتر کا کیا بنا،'' دوسرے ایجوٹنٹ نے کہا۔

''ہیڈ کوارٹر کہاں ہے؟''

''ہمیں رات زنائم (Znaim) میں گزارنا ہے۔''

''مجھے جو کچھ چاہیے، میں نے دو گھوڑوں پر لادلیا ہے،'' نیس وتسکی نے کہا۔ ''انھوں نے کیا لاجواب پیکنگ کی ہے! میں چاہوں تو اسے اٹھا کر بوہیمیا کی پہاڑیاں عبور کرلوں۔ برادر، بڑا پتلا حال ہے! لیکن تمھیں کیا ہوا ہے؟ تم لازماً بیمار ہوگے، بری طرح کانپ رہے ہو!'' نیس وتسکی نے کہا۔ اس نے پرنس کو یوں جھرجھری لیتے دیکھ لیا تھا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔

''کچھ نہیں،'' پرنس آندرے نے جواب دیا۔

اسے ابھی ابھی ڈاکٹر کی بیوی اور قافلے کے افسر کے ساتھ اپنی حالیہ مڈھ بھیڑ یاد آئی تھی۔

''کمانڈر انچیف یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں،'' نیس وتسکی نے جواب دیا۔

''خیر، میں صرف ایک بات جانتا ہوں — یہ سب کچھ شرم ناک، شرم ناک، انتہائی شرم ناک ہے!'' پرنس آندرے نے کہا اور وہ اس مکان کی طرف، جس میں کمانڈر انچیف مقیم تھا، چل پڑا۔

باہر کوتوزوف کی گاڑی، اس کے سٹاف کے گھوڑے اور قازق، جو آپس میں با آواز بلند باتیں کر رہے تھے، کھڑے تھے۔ پرنس آندرے ان کے قریب سے گزرتا راہداری میں داخل ہو گیا۔ اسے بتایا گیا کہ کوتوزوف اندر ہی ہے اور اس کے ساتھ باگ راتیاں اور وے روٹر (Weyrother) ہیں۔ وے روٹر آسٹروی جرنیل تھا۔ وہ شمٹ کی ہلاکت کے بعد اس کی جگہ تعینات ہوا تھا۔ راہداری میں کوتاہ قامت کزلووسکی آلتی پالتی مارے ایک کلرک کے سامنے بیٹھا تھا۔ کلرک اپنی وردی کے کف دوہرے کیے ایک الٹے ٹب پر کچھ تیز تیز لکھنے میں مصروف تھا۔ کزلووسکی کی شکل سے معلوم ہوتا تھا کہ تھکن سے اس کا برا حال ہے۔ بظاہر وہ ساری رات نہیں سویا تھا۔ اس نے پرنس آندرے کو سرسری نگاہوں سے دیکھا لیکن اتنا بھی نہ کیا کہ ذرا اپنی گردن کو ہی خم دے کر علیک سلیک کر لیتا۔

''دوسری سطر... لکھ لی تم نے؟'' اس نے پوچھا اور کلرک کو لکھانے میں مصروف رہا۔

''کیف گرینیڈیرز کی پہلی رجمنٹ، پادولیا—''

''حضور، میں اتنا تیز نہیں لکھ سکتا،'' کلرک نے کزلووسکی کو غصیلی اور گستاخانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کوتوزوف کی آواز دروازے سے باہر سنائی دے رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوش میں آیا ہوا ہے اور سخت خفا ہے۔ ایک اجنبی آواز نے اسے ٹوکا۔ ان آوازوں کا شور شرابا، کزلووسکی کا اس کی جانب بے توجہی سے دیکھنا، متوحش کلرک کا گستاخانہ رویہ، کزلووسکی اور کلرک کا کمانڈر انچیف کے اتنے نزدیک ٹب کے سامنے فرش پر بیٹھنا،

قازقوں کا گھوڑوں کی لگامیں تھامے دریچے کے عین نیچے فلک شگاف قہقہے لگانا، ان تمام باتوں سے پرنس آندرے کو یہ محسوس ہوا کہ کوئی انتہائی اہم اور قیامت خیز واقعہ ظہور پذیر ہونے والا ہے۔

اس نے کزلووسکی سے کچھ پوچھا اور کہا کہ اسے اس کا فوری جواب چاہیے۔

''پرنس، ایک منٹ،'' کزلووسکی نے کہا،''... باگ راتیاں کے دستوں کی تقسیم و ترتیب۔''

''یہ ہتھیار ڈالنے کا کیا چکر ہے؟''

''ہتھیار ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لڑائی کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔''

جس دروازے سے آوازیں آ رہی تھیں، پرنس آندرے ادھر چل پڑا۔ وہ ابھی دروازہ کھولنے کا ارادہ ہی کر رہا تھا کہ آوازیں بند ہو گئیں، دروازہ کھلا اور کوتوزوف، جس کی ناک طوطے کی ناک سے مشابہ تھی اور جس کے گال پھولے پھولے تھے، نمودار ہوا۔ اگرچہ پرنس آندرے اس کے بالکل سامنے کھڑا تھا، کمانڈر انچیف کی اکلوتی صحیح سلامت آنکھ میں جو تاثر تھا، اس نے اس سے اندازہ لگایا کہ وہ اپنے ہی خیالات و تفکرات میں اتنا مستغرق ہے کہ اسے گردوپیش کچھ سجھائی نہیں دے رہا۔ اس نے سیدھا اپنے ایجوٹنٹ کے چہرے کی جانب دیکھا لیکن اسے کچھ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کون ہے۔

''ہونہہ، ختم کر لیا؟'' اس نے کزلووسکی سے پوچھا۔

''صرف ایک منٹ، یور ایکسی لینسی۔''

سوکھا سڑا، ادھیڑ عمر، میانہ قامت باگراتیاں، جس کے چہرے پر مشرقیوں کے انداز کا عزم جھلک رہا تھا لیکن جو جذبات سے قطعاً عاری تھا، کمانڈر انچیف کے پیچھے پیچھے باہر آ گیا۔

''مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔'' پرنس آندرے نے دوسری مرتبہ اور قدرے باآواز بلند بولتے اور کوتوزوف کے ہاتھ میں لفافہ تھماتے ہوئے کہا۔

''اخاہ، ویانا سے؟ بہت خوب! بعد میں، بعد میں!''

کوتوزوف باگراتیاں کے ساتھ پورچ کی طرف چل پڑا۔

''اچھا، پرنس، خدا حافظ،'' اس نے باگراتیاں سے کہا۔ ''یسوع مسیح تمھارے حامی و ناصر ہوں۔ تمھاری اس عظیم مہم میں میری دعائیں تمھارے ساتھ ہیں۔''

کوتوزوف کا چہرہ اچانک ملائم ہو گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے بائیں ہاتھ سے باگراتیاں کو اپنی جانب کھینچ لیا اور دائیں ہاتھ سے، جس میں اس نے انگوٹھی پہنی ہوئی تھی، اس کے جسم پر ایسے انداز سے صلیب کا نشان بنایا جس سے صاف نظر آتا تھا کہ وہ عادتاً ایسا کرتا ہے۔ اس نے اپنا پھولا پھولا رخسار آگے بڑھا دیا لیکن باگ راتیاں نے اس کی بجائے اس کی گردن پر بوسہ دیا۔

''یسوع مسیح تمھارے حامی و ناصر ہوں!'' کوتوزوف نے دوبارہ کہا اور اپنی گاڑی کی طرف چل پڑا۔

''میرے ساتھ اندر آجاؤ،'' اس نے بلکونسکی سے کہا۔

''یوئر ایکسی لینسی، میں چاہتا ہوں کہ میں یہاں کسی کام آؤں۔ اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں، میں پرنس باگراتیاں کی سپاہ کے ساتھ ٹھہر جاتا ہوں۔''

''اندر آجاؤ،'' کوتوزوف نے کہا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ پرنس آندرے ہچکچا رہا ہے، اس نے مزید کہا، ''خود مجھے اچھے افسروں کی ضرورت ہے، خود مجھے ان کی ضرورت ہے۔''

وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور چند منٹ خاموشی سے سفر کرتے رہے۔

''ابھی ہمیں بہت کچھ کرنا ہے، ابھی بہت کام ہیں،'' اس نے یوں کہا جیسے بلکونسکی کے قلب و دماغ میں جو کچھ گھوم رہا تھا، وہ ایک معمر شخص کی ژرف نگاہی اور فراست سے سب کچھ سمجھتا ہے۔ ''اگر اس کی سپاہ کا دسواں حصہ بھی کل صحیح سلامت واپس آگیا، میں خداوند کے حضور سجدۂ شکر بجالاؤں گا،'' اس نے مزید کہا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔

پرنس آندرے نے کوتوزوف کے چہرے پر، جو اس سے ایک آدھ فٹ دور تھا، سرسری نگاہ ڈالی اور اس نے وہاں غیر ارادی طور پر خالی خانۂ چشم اور اس کی کنپٹی کے نزدیک، جہاں اسمٰعیل کے معرکے میں ایک گولی اس کی کھوپڑی کو چیرتی ہوئی نکل گئی تھی، زخموں کے گہرے اور واضح نشانات دیکھے لیے جنھیں خوب دھو دھا کر صاف کر دیا گیا تھا۔ ''ہاں،'' اس نے سوچا، ''اسے ان اشخاص کے اتلاف کے متعلق یوں پرسکون لہجے سے بات کرنے کا حق حاصل ہے۔''

''اسی لیے میں نے گزارش کی تھی کہ مجھے اس سپاہ میں بھیج دیا جائے،'' اس نے کہا۔

کوتوزوف نے کوئی جواب نہ دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ سب بھول چکا ہے اور اب اپنے خیالات میں مستغرق ہے۔ پانچ منٹ بعد اس نے گاڑی کے لچک دار سپرنگوں پر آرام سے جھولتے ہوئے پرنس آندرے کی جانب مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے قطعاً کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ اس سے امپراطور سے اس کی ملاقات، معرکہ کریمس کے بارے میں درباریوں کے تاثرات اور اپنی جان پہچان کی بعض خواتین کے بارے میں سوالات پوچھنے لگا۔ اس کے لہجے میں مزے کی کاٹ تھی۔

14

یکم نومبر کو کوتوزوف کو اپنے ایک مخبر کے ذریعے یہ اطلاع مل گئی تھی کہ وہ جس فوج کی کمان کر رہا ہے، اس کی حالت خاصی پتلی ہے اور اس سے کسی کارنامے کی توقع باندھنا عبث ہے۔ مخبر نے بتایا تھا کہ فرانسیسیوں نے ویانا کا پل پار کر لیا ہے اور اب ان کا ایک عظیم جیش اس سڑک کی طرف، جس پر روس سے آنے والی سپاہ سفر کر رہی ہے، بڑھ رہا ہے۔ اگر کوتوزوف نے کریمس کے مقام پر قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا، نپولین کا ڈیڑھ لاکھ افراد پر مشتمل جیش اس کا اس فوج کے ساتھ رابطہ مکمل طور پر منقطع کر دے گا، اس کی چالیس ہزار تھکی ماندہ سپاہ گھیرے میں آجائے گی اور اس کا

بھی وہی حال ہوگا جو الم کے مقام پر میک کا ہوا تھا۔ اگر اس نے اس شاہراہ کو، جو اس کا رابطہ روس سے آنے والی فوج کے ساتھ قائم کرتی ہے، ترک کرنے کا فیصلہ کیا، پھر اسے بوہیمیا کی پہاڑیوں کے بیچوں بیچ اجنبی علاقوں میں، جہاں سڑک نام کی کوئی چیز موجود نہیں، سفر کرنا، غنیم کی برتر افواج کے خلاف اپنا دفاع کرنا اور آسٹروی جرنیل بکس ہاؤڈن (Buxhowden) کے زیر کمان فوج کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کی تمام امیدوں سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ اگر کوتوزوف نے اس خیال کے پیش نظر کہ روس سے آنے والی فوج کے ساتھ اس کا ملاپ ہو سکے، کریمس سے اول موٹس جانے والی شاہراہ کے ساتھ ساتھ پسپائی اختیار کی، پھر خدشہ یہ ہے کہ فرانسیسی، جو ویانا میں پل عبور کر چکے ہیں، اس کے ارادے بھانپ کر پہلے ہی اس کا راستہ روک لیں گے اور یوں اسے، جب کہ بھاری سامان اور گاڑیاں اس کے پاؤں کی زنجیر بن چکی ہیں، کوچ کے دوران میں ایک ایسے غنیم کے خلاف، جس کی طاقت اس سے سہ چند زیادہ ہے اور جو اسے دو اطراف سے گھیرے میں لے لے گا، نبرد آزما ہونا پڑے گا۔

کوتوزوف نے آخری راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔

مخبر نے اطلاع دی کہ فرانسیسی ویانا پل عبور کرنے کے بعد مار امار کرتے زنائیم کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں، جو ادھر جدھر کوتوزوف پسپا ہو رہا تھا، چھیاسٹھ میل کے فاصلے پر تھا۔ فوج کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آتی تھی کہ وہ فرانسیسیوں سے پہلے زنائم پہنچ جائے۔ اگر اس نے فرانسیسیوں کو پہلے وہاں پہنچ جانے دیا، پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس کی فوج کو بھی اسی ذلت اور رسوائی سے دوچار ہونا پڑے گا جو الم کے مقام پر آسٹروی فوج کے حصے میں آئی تھی یا پھر اس کا بالکل بولو رام ہو جائے گا۔ لیکن اپنی ساری سپاہ کے ساتھ فرانسیسیوں سے پہلے پہنچنا ناممکن تھا۔ انھوں نے ویانا سے زنائم تک جس سڑک پر سفر کرنا تھا وہ اس سڑک سے، جس پر کوچ کرتے اسے کریمس سے زنائم پہنچنا تھا، طویل بھی کم تھی اور اس کی حالت بھی اس سے بہتر تھی۔

جس رات کوتوزوف کو یہ اطلاع موصول ہوئی، اس نے چار ہزار افراد پر مشتمل باگراتیاں کا ہراول دستہ کریمس زنائم روڈ سے پہاڑیوں کے پار مشرقی جانب ویانا زنائم روڈ کی طرف روانہ کر دیا۔ باگراتیاں نے یہ کوچ راستے میں کہیں آرام کیے بغیر کرنا تھا، اس نے ویانا زنائم روڈ پر اس طرح قیام کرنا تھا کہ اس کا رخ ویانا کی طرف اور پشت زنائم کی طرف ہو، اور اگر وہ وہاں فرانسیسیوں سے پہلے پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تو اسے انھیں حتی الامکان زیادہ سے زیادہ عرصے تک وہاں الجھائے رکھنا تھا۔ جہاں تک کوتوزوف کا تعلق تھا، وہ اپنی بار برداری کی تمام گاڑیوں سمیت سیدھا زنائم جا رہا تھا۔

رات طوفانی، علاقہ پہاڑی، سڑک کا اتا نہ پتا، فوجی بھوکے پیاسے، ان کے جوتے ٹوٹے پھوٹے، ایک تہائی سپاہ بھٹکتی بھٹکاتی پیچھے رہ گئی، پھر بھی باگراتیاں تیس میل کا فاصلہ طے کر کے، فرانسیسیوں سے، جو ویانا سے ہولا برون (Hollabrunn) آ رہے تھے، چند گھنٹے پہلے پہنچ گیا۔ کوتوزوف کو اپنی بار برداری کی گاڑیوں سمیت زنائم پہنچنے کے لیے ابھی چند اور ایام درکار تھے۔ اس کے شاخسانے کے طور پر باگ راتیاں کو اپنی چار ہزار بھوکی پیاسی اور

تھکی ماندہ سپاہ کے ساتھ غنیم کی پوری فوج کو کئی دن ہولا برون رو کے رکھنا اور اس سے مقابلہ کرنا تھا۔ بظاہر یہ کام ناممکن نظر آتا تھا۔ لیکن قدرت کے رنگ نیارے ہیں اور ایک اعجوبے نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔ فرانسیسیوں نے ایک گولی چلائے بغیر ویانا پل کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے جو ناٹک رچایا تھا، اس کی کامیابی نے موغا کو یہ ترغیب دی کہ وہ کوتوزوف کے ساتھ بھی ایسا ہی پاکھنڈ رچائے۔ جب زنائم روڈ پر اس کا آمنا سامنا باگراتیاں کے کمزور دستے سے ہوا، اس نے سمجھا کہ کوتوزوف کی کل فوج یہی ہے۔ اس امید میں کہ وہ اس سپاہ کا بالکل ہی بھرکس نکال دے گا، وہ ان دستوں کا، جو ابھی ویانا سے چلے آ رہے تھے، انتظار کرنے لگا۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے تین یوم کی عارضی جنگ بندی اس شرط پر پیش کی کہ دونوں فوجوں میں سے کوئی بھی اپنی پوزیشن تبدیل نہیں کرے گی بلکہ جو جہاں ہے، وہیں رہے گا۔ موغا نے دعویٰ کیا کہ چونکہ مذاکرات امن پہلے ہی شروع ہو چکے ہیں، اس لیے وہ جس عارضی جنگ بندی کی پیشکش کر رہا ہے، اس کا مقصد غیر ضروری خونریزی سے گریز کرنا ہے۔ آسٹروی جرنیل کاؤنٹ نوسٹیٹز، جو ہراول چوکیوں پر قابض تھا، جھانسے میں آ گیا۔ اس نے عارضی جنگ بندی کے پیغام کو صحیح تسلیم کر لیا اور وہاں سے مراجعت کر گیا۔ یوں باگ راتیاں کا دستہ خطرے کی زد میں آ گیا۔ ایک اور ایلچی روسی صفوں میں پہنچا۔ اس نے وہاں بھی امن مذاکرات کے بارے میں اعلان کیا اور تین یوم کی عارضی جنگ بندی کی پیشکش کی۔ باگراتیاں نے جواب دیا کہ اسے تین روز کی جنگ بندی قبول کرنے یا مسترد کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ اس نے اس تجویز کے بارے میں ایک رپورٹ تیار کی اور اپنے ایجوٹنٹ کے ہاتھ کوتوزوف کو بھیج دی۔

عارضی جنگ بندی کوتوزوف کے پاس وقت حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھی۔ اس سے باگراتیاں کی تھکی ماندہ فوج کو آرام کرنے کا موقع میسر آ جاتا اور باربردار گاڑیوں کو (جن کی حرکات و سکنات فرانسیسیوں سے پوشیدہ رکھی گئی تھی) کو اگر زنائم نہیں، تو زنائم سے ایک منزل ادھر پہنچنے کی مہلت مل جاتی۔ عارضی جنگ بندی کی پیشکش نے فوج کو بچانے کا واحد اور بالکل غیر متوقع موقع فراہم کر دیا تھا۔ جونہی کوتوزوف کو یہ اطلاع موصول ہوئی اس نے بلا تاخیر ایجوٹنٹ جرنل ونٹ ٹسنگے روڈے کو، جو اس کے سٹاف میں شامل تھا، غنیم کے کیمپ میں بھیج دیا۔ ونٹ ٹسنگے روڈے نے نہ صرف جنگ بندی قبول کرنا تھی بلکہ ہتھیار ڈالنے کی شرائط بھی تجویز کرنا تھیں۔ دریں اثنا کوتوزوف نے اپنے تمام ایجوٹنٹ واپس بھیج دیے تاکہ وہ پوری فوج کے سامان سے لدے پھندے چھکڑوں کو انتہائی تیز رفتاری سے کریمس زنائم روڈ پر ہنکوا سکیں۔ باگ راتیاں کی بھوکی پیاسی اور تھکی ماندہ سپاہ، جس نے تمام فوج اور باربرداری کی گاڑیوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا، اپنے سے آٹھ گنا دشمن کے سامنے ہاتھ پاؤں پسار کر بیٹھ گئی۔

کوتوزوف کی دونوں توقعات کہ ہتھیار ڈالنے کی تجاویز، جو اسے کسی چیز کا پابند تو نہیں بناتی تھیں، لیکن اس کے باربرداری کے متعدد یونٹوں کو نکل جانے کا موقع فراہم کرتی تھیں اور یہ کہ موغا کی سنگین غلطی بہت جلد پکڑی جائے گی، صحیح ثابت ہوئیں۔ جونہی بوناپارٹ کو، جو ہولا برون سے سولہ میل دور شون برن میں قیام پذیر تھا، موغا کا مراسلہ اور عارضی جنگ بندی اور ہتھیار ڈالنے کی تجاویز موصول ہوئیں، وہ چال سمجھ گیا اور اس نے موغا کے نام

مندرجہ ذیل خط[32] تحریر کیا:

شون برن، 25 بغنومبغ 1805

بوقت آٹھ بجے صبح

بنام پرنس موغا

مجھے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے الفاظ نہیں ملتے۔ تم میرے صرف ہراول دستے کے کمانڈر ہو اور تمھیں میرے احکام کے بغیر عارضی جنگ بندی کے اہتمام کرنے کا کوئی اختیار حاصل نہیں۔ تم مجھے میری ساری مہم کے فوائد سے محروم کرنے کا موجب بن رہے ہو۔ اس عارضی جنگ بندی کو بلا تاخیر ختم کرو اور غنیم پر چڑھائی کر دو۔ انھیں بتا دو کہ جس جرنیل نے ہتھیار ڈالنے کی شرائط پر دستخط کیے تھے، اسے یہ اختیار کسی نے نہیں دیا تھا۔ یہ اختیار روس کے امپراطور کے علاوہ اور کسی کو حاصل نہیں۔

بہرحال اگر روس کے امپراطور نے اس میثاق کی کسی بھی وقت توثیق کر دی، میں بھی اس کی توثیق کر دوں گا۔ لیکن یہ محض چال ہے۔ آگے بڑھو اور روسی فوج کو تہس نہس کر دو۔ تم ان کے سامان اور توپ خانے پر قبضہ کرنے کی پوزیشن میں ہو۔

روسی امپراطور کا ایڈی کانگ ـــ ہے۔ جب افسروں کے پاس اختیارات نہ ہوں، ان کی حیثیت صفر ہوتی ہے۔ اس شخص کے پاس قطعاً کوئی اختیار نہیں تھا۔ ویانا پل پر آسٹروی فریب کھا گئے اور اب امپراطور کا ایڈی کانگ تمھیں الو بنا رہا ہے۔

نپولین

بوناپارت کا ایجوٹنٹ یہ تہدید آمیز خط لیے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا فوراً موغا کے پاس پہنچ گیا۔ بوناپارت کو اپنے جرنیلوں پر کوئی اعتبار نہیں رہا تھا۔ اس نے اپنے سارے گارڈز اکٹھے کیے اور ان کے ہمراہ میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اسے اندیشہ لاحق ہو گیا تھا کہ اس کا شکار جو پکے پھل کی طرح اس کی جھولی میں گرنے کے لیے تیار تھا، کہیں بچ کر نہ نکل جائے۔ دریں اثنا باگ راتیاں کے دستے کے چار ہزار جوان، تین ایام میں پہلی مرتبہ اپنے کیمپ میں خوشی خوشی آگ جلانے، اسے تاپنے، اپنے آپ کو خشک کرنے اور اپنا دال دلیا تیار کرنے میں مصروف ہو گئے۔ پورے دستے میں ایک شخص کو بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ ان پر کیا آفت ٹوٹنے والی ہے۔

15

پرنس آندرے، جو مسلسل کوتوزوف سے درخواست کرتا رہا تھا، شام کو تین اور چار بجے کے درمیان گرنٹ (Grunt)

پہنچ گیا اور اس نے باگ راتیاں کو اپنی حاضری کی رپورٹ پیش کر دی۔ نپولین کا ایجوٹنٹ ابھی موغا کے پاس نہیں پہنچا تھا، چنانچہ لڑائی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ حالات کا عمومی رخ کیا تھا، اس کے بارے میں راگ باتیاں کے دستے میں کسی کو بھی کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ امن کی باتیں ضرور کرتے تھے لیکن انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ ایسا ممکن ہے۔ وہ مبارزت کی باتیں کرتے تھے لیکن انھیں یقین نہیں آتا تھا کہ لڑائی ان کے سروں پر منڈلا رہی ہے۔

باگ راتیاں کو معلوم تھا کہ بلکونسکی منظور نظر اور معتمد ایجوٹنٹ ہے۔ چنانچہ اس نے اسے اچھی خاصی وقعت دی اور نمایاں عزت واحترام سے اس کا استقبال کیا۔ اس نے اسے بتایا کہ اسی روز یا اس سے اگلے روز لڑائی ہوگی اور اسے یہ پیشکش کی کہ "چاہے تو تم میرے ساتھ رہ سکتے ہو اور جی چاہے تو بے شک عقبی یونٹوں میں چلے جاؤ تا کہ جب پسپائی کا وقت آئے، تو نگرانی کر سکو کہ یہ پسپائی سلیقے اور ترتیب سے ہو۔ یہ کام بھی بہت اہم ہے۔

"تاہم میرا خیال ہے کہ آج شاید لڑائی نہ ہو،" باگ راتیاں نے کچھ اس انداز سے کہا جیسے وہ پرنس آندرے کی ڈھارس بندھانا چاہتا ہو۔

"سٹاف ہیڈکوارٹرز میں جو چھوٹے موٹے بانکے البیلے افسر تعینات ہیں، اگر یہ بھی انھیں میں سے ہے اور اسے تمغہ ومغہ کمانے یہاں بھیجا گیا ہے، پھر اسے عقبی یونٹوں میں چلے جانا چاہیے، وہاں اسے با آسانی اعزاز مل سکے گا۔ لیکن اگر یہ میرے ساتھ ٹھہرنا چاہتا ہے، اس کی مرضی۔ اگر یہ دلیر افسر ہے، پھر کسی نہ کسی کام آ ہی جائے گا،" باگ راتیاں نے سوچا۔

پرنس آندرے نے جواب دیے بغیر صرف اتنا کہا کہ اسے سپاہ کی پوزیشنوں اور تقسیم و ترتیب کا جائزہ لینے کی اجازت دی جائے تا کہ جب اسے حکم دے کر بھیجا جائے تو اسے یہ معلوم ہو کہ اسے کہاں جانا ہے۔ اس روز جو آدمی ڈیوٹی آفیسر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، وہ وجیہ صورت تھا، ہر وقت بنا ٹھنا رہتا تھا اور انگشت شہادت پر ہیرے کی جڑاؤ انگوٹھی پہنتا تھا۔ وہ ہر وقت فرانسیسی میں بات کرنے کے لیے تیار رہتا تھا، لیکن جب فرانسیسی بولتا تھا، تو اس کا ناس مار دیتا تھا۔ پرنس آندرے کی رہنمائی کے لیے اسے بلایا گیا۔

وہ جدھر بھی گئے، ان کا سامنا بارش سے شرابور افسروں سے ہوا۔ ان کے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور وہ یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے انھیں کسی چیز کی تلاش ہو۔ رہ گئے جوان، وہ گاؤں سے دروازے، بنچیں اور باڑیں گھسیٹے لا رہے تھے۔

"ادھر دیکھیں۔ ہم انھیں روک نہیں سکتے،" سٹاف افسر نے جوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "افسروں نے انھیں من مانی کرنے کا موقع دیا ہے۔ اور ذرا ادھر ملاحظہ فرمائیں،" اس نے کینٹین کی طرف، جو ایک خیمے میں قائم کر دی گئی تھی، انگلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ "یہ لوگ یہاں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور یہیں بیٹھے رہتے ہیں۔ آج صبح میں نے ان سب کو یہاں سے چلتا کیا تھا، لیکن دیکھیں، یہاں پھر بھیڑ لگ گئی ہے۔ پرنس، آپ مجھے ذرا اجازت مرحمت فرمائیں، میں ان سب کو بھگا کر ابھی واپس آ جاؤں گا، ذرا دیر نہیں لگاؤں گا۔"

"چلو، میں بھی چلتا ہوں۔ میں کچھ پنیر اور ایک آدھ رول خرید لوں گا،" پرنس آندرے نے کہا۔ اسے ابھی تک کچھ کھانے کا موقع نہیں ملا تھا۔

"پرنس، آپ نے پہلے کیوں نہ فرمایا۔ میں آپ کی خدمت میں کچھ نہ کچھ پیش کر سکتا تھا۔"

وہ گھوڑوں سے اترے اور خیمے کے اندر چلے گئے۔ وہاں متعدد افسر، جن کے چہرے تمتما رہے تھے اور تھکاوٹ سے نڈھال دکھائی دے رہے تھے، میزوں کے سامنے بیٹھے تھے اور خورونوش میں مصروف تھے۔

"حضرات، یہ کیا ہو رہا ہے؟" سٹاف افسر نے ایک ایسے شخص کے، جو اپنی بات متعدد مرتبہ دہرا چکا ہو، تادیبی لہجے میں کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ اگر آپ اسی طرح اپنے فرائض منصبی سے غیر حاضر رہے، اس سے کسی کا بھلا نہیں ہوگا۔ پرنس نے حکم دیا تھا کہ کوئی بھی شخص اپنے تعیناتی کے مقام سے ادھر ادھر نہ جائے۔ اور جناب کیپٹن" وہ توپ خانے کے ایک دبلے پتلے، گندے مندے، کوتاہ قامت افسر کی جانب، جو محض جرابیں پہنے کھڑا تھا (ان کے اندر آنے سے ذرا پہلے اس نے اپنے بوٹ کینٹین کے مالک کے سپرد کر دیے تھے تاکہ وہ انھیں سکھا دے) اور غیر فطری انداز سے مسکرا رہا تھا، متوجہ ہوا۔ "کیپٹن توشن (Tushin)، آپ کو شرم آنا چاہیے!" سٹاف افسر بولتا چلا گیا۔ "خیال تھا کہ توپ خانے کے افسر کی حیثیت سے آپ دوسروں کے سامنے مثال پیش کریں گے اور ایک آپ ہیں کہ بوٹ بھی نہیں پہنے۔ ابھی خطرے کی گھنٹی بجے گی اور بوٹوں کے بغیر آپ خوب تماشا بنیں گے۔" سٹاف افسر مسکرایا۔ "حضرات، مہربانی فرمائیں اور جہاں جہاں آپ کی ڈیوٹی لگی ہے، فوراً وہاں پہنچ جائیں۔ آپ سب، ہاں، سب کے سب،" اس نے رعب جھاڑتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے جب توشن پر نگاہ ڈالی، وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکا۔ توشن خاموشی سے کھسیں نکالتا کبھی ایک پاؤں پر اور کبھی دوسرے پاؤں پر زور دینے لگتا اور اپنی موٹی موٹی، ذہین اور شفیق آنکھوں سے کبھی پرنس آندرے اور کبھی سٹاف افسر کو دیکھنے لگتا۔

"جوان کہتے ہیں کہ اگر آدمی نے بوٹ نہ پہنے ہوں، وہ زیادہ پھرتیلا ہو جاتا ہے،" کیپٹن توشن نے جھینپتے شرماتے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جس ناگوار صورت حال میں پھنس گیا تھا، مسخرے پن کے ذریعے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہے۔

لیکن جونہی الفاظ اس کے منہ سے نکلے، وہ بھانپ گیا کہ نشانہ خطا گیا ہے۔ وہ شرمسار ہو رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

"مہربانی فرمائیں اور اپنی اپنی ڈیوٹی کے مقامات پر تشریف لے جائیں،" سٹاف افسر نے اپنی متانت برقرار رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے ایک بار پھر توپ خانے کے کوتاہ قامت افسر کو جھلملاتی نگاہوں سے دیکھا۔ کوئی ایسی چیز تھی، جو انوکھی تھی، قطعی غیر عسکری تھی اور قدرے مضحک تھی، لیکن وہ جو کچھ بھی تھی، تھی انتہائی دلکش۔

سٹاف افسر اور پرنس آندرے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور آگے چل دیے۔

راستے میں وہ مسلسل مختلف یونٹوں کے جوانوں اور افسروں سے ملتے ملاتے اور انھیں پیچھے چھوڑتے رہے۔ یوں وہ چلتے چلتے گاؤں سے آگے نکل گئے۔ یہاں انھیں اپنی بائیں جانب دمدمے نظر آئے۔ یہ تازہ تازہ سرخ مٹی کھود کر بنائے جا رہے تھے۔ یخ بستہ ہوا کے باوجود جوانوں کی متعدد جماعتیں صرف قمیصیں پہنے سفید چیونٹیوں کی طرح مٹی کی ان تعمیرات پر کام کر رہی تھیں۔ پشت پناہ کے پیچھے ان دیکھے ہاتھ سرخ مٹی کے بیلچوں کے بیلچے پھینک رہے تھے۔ پرنس آندرے اور سٹاف افسر دمدمے کے پاس گئے، اس کا معائنہ کیا اور آگے نکل گئے۔ دمدمے کے بالکل پیچھے انھیں درجنوں جوان بھاگتے نظر آتے، وہ نظروں سے اوجھل ہوتے، تو ان کی جگہ دوسرے آجاتے۔ یوں کام مسلسل جاری تھا۔ فضا میں ناگوار بدبو پھیلی ہوئی تھی، اس سے بچنے کے لیے انھیں اپنی ناکوں پر رومال رکھنے اور گھوڑے تیز دوڑانا پڑے۔

''پرنس، یہ ہیں کیمپ کی زندگی کی دلکشیاں،'' سٹاف افسر نے فرانسیسی میں کہا۔

وہ مخالف پہاڑی کی سمت میں چل پڑے۔ اس کی چوٹی سے فرانسیسیوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ پرنس آندرے رک گیا اور موقع کا معائنہ کرنے لگا۔

دیکھیں، یہاں ہم نے توپ گڑھیاں بنائی ہوئی ہیں،'' سٹاف افسر نے بلند ترین مقام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کی کمان اس عجیب الخلقت شخص کے، جو وہاں بغیر بوٹوں کے بیٹھا تھا، ہاتھ میں ہے۔ وہاں سے آپ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ محترم، آئیں، وہاں چلتے ہیں۔''

''بہت بہت شکریہ، میں اکیلا ہی وہاں چلا جاؤں گا،'' پرنس آندرے نے، جو سٹاف افسر سے پنڈ چھڑانے کی فکر میں تھا، کہا۔ ''اب آپ مزید تکلیف نہ کریں۔''

سٹاف افسر پیچھے ہی ٹھہر رہا اور پرنس آندرے اکیلا آگے چل پڑا۔

وہ جوں جوں آگے بڑھتا اور دشمن کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا، جوان زیادہ سے زیادہ منظم اور ہشاش بشاش نظر آنے لگے۔ اسے سب سے زیادہ بدنظمی اور افسردگی بار برداری کے دستوں میں، جو زنائم کی طرف جا رہے تھے اور جنھیں اس نے صبح دیکھا تھا، نظر آئی تھی حالانکہ وہ فرانسیسیوں سے سات میل دور تھے۔ گرنٹ میں بھی کسی حد تک خوف اور پریشانی کے سائے لہرا رہے تھے۔ لیکن پرنس آندرے جوں جوں فرانسیسیوں کے نزدیک ہوتا گیا، اسے اپنے جوان زیادہ پرحوصلہ اور پراعتماد دکھائی دینے لگے۔ اوورکوٹوں میں ملبوس جوانوں نے صفیں بنائی ہوئی تھیں اور سارجنٹ میجر اور کمپنیوں کے افسران کی گنتی کرنے میں مصروف تھے۔ وہ ہر سیکشن کے آخری آدمی کی پسلیوں میں ٹھوکا لگاتے اور اسے کہتے کہ وہ اپنا حوصلہ پست نہ ہونے دے۔

فوجی جوان سارے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ شہتیر اور سوختنی لکڑی اکٹھا کر رہے تھے، پناہ گاہیں تعمیر کر رہے تھے، ہنس رہے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل کر باتیں کر رہے تھے۔ کیمپ میں جہاں جہاں الاؤ روشن

کیے گئے تھے، ان کے اردگرد جوان اکٹھے ہو گئے تھے۔ کوئی آگ تاپ رہا تھا، کوئی قمیص یا ٹانگوں کے گرد لپیٹنے والی پٹیاں خشک کر رہا تھا، کوئی اوورکوٹ یا بوٹوں کی مرمت کر رہا تھا اور بعض دیگوں اور دیگچوں کے گرد جمگھٹا کیے کھڑے تھے۔ ایک کمپنی میں کھانا تیار ہو چکا تھا اور جوان گرسنہ نگاہوں سے دیگوں کو، جن میں سے بھاپ نکل رہی تھی، دیکھ رہے تھے۔ وہ سب کھانے کے چکھے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ جو کھانا چکھا جانا تھا، اس کا پیالہ بھرا جا چکا تھا اور ایک کوارٹر ماسٹر سارجنٹ اسے ایک افسر کے پاس، جو پناہ گاہ کے سامنے شہتیر پر بیٹھا تھا، لے جا رہا تھا۔

ایک اور کمپنی میں — اور یہ کمپنی بہت خوش نصیب تھی کیونکہ سب کمپنیوں کے پاس ووڈ کا شراب نہیں تھی۔ ایک سارجنٹ میجر کے گرد، جس کا جسم چوڑا چکلا اور جس کے چہرے پر چیچک کے داغوں کی بھرمار تھی، جوانوں کا جم غفیر کھڑا تھا۔ سارجنٹ میجر پیپے کو زور زور سے ہلا رہا اور ان کے پیالے بھرتا جا رہا تھا۔ جوان مؤدب انداز سے انھیں اپنے لبوں تک اٹھاتے، سروں کو پچھلی جانب جھٹکتے، ووڈ کا حلق میں انڈیلتے، ہونٹ چاٹتے، انھیں اپنے کوٹوں کی آستینوں پر پونچھتے، اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ہشاش بشاش واپس چلے جاتے۔ ان کے چہرے اتنے پرسکون اور مطمئن تھے جیسے یہ سب کچھ دشمن کی عین ناک تلے اور ایک ایسی لڑائی سے، جس میں ان میں سے کم از کم نصف کو لاریب وہیں کھیت رہنا تھا، قبل نہیں، بلکہ زمانۂ امن میں ان کی آبائی سرزمین پر ہو رہا ہو۔

شاسر رجمنٹ کے برابر سے گزرنے کے بعد پرنس آندرے کیف گرینیڈیرز کی صفوں میں داخل ہو گیا۔ گرینیڈیرز کی اس رجمنٹ کے لمبے تڑنگے اور تنومند جوان بھی انھی سرگرمیوں میں مشغول تھے۔ ان کے کمانڈر کا ڈیرا قریب ہی تھا اور دوسروں کی نسبت ذرا اونچائی پر واقع تھا۔ یہاں اس کا سامنا گرینیڈیرز کی ایک ایسی پلٹن سے ہوا جس کا ایک جوان باقیوں کے سامنے ننگ دھڑنگ زمین پر پڑا تھا۔ دو جوانوں نے اسے اپنے ہاتھوں میں جکڑ رکھا تھا جب کہ ان کے باقی رفقا چھڑیاں فضا میں لہرا اور باری باری مناسب وقفوں کے بعد اس کی برہنہ پشت پر مار رہے تھے۔ وہ جوان غیر انسانی انداز سے چلا رہا تھا۔ ایک ہٹا کٹا میجر صف کے سامنے چکر لگا رہا تھا اور اس کی چیخ پکار کو نظر انداز کرتے کہہ رہا تھا:

''سپاہی کا چوری کرنا اس کے لیے باعثِ ننگ و عار ہے۔ سپاہی کو دیانت دار، راست باز اور جی دار ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنے کسی ساتھی کی اشیا چراتا ہے، وہ بہت بے حیا اور ذلیل انسان ہے، تخمِ خنزیر ہے، مارو، اور مارو!''

اور چھڑیوں کی سنسناہٹ، قیامت خیز اور غیر فطری چیخوں کا سلسلہ جاری رہا۔

''مارو، اور مارو!'' میجر نے کہا۔

ایک نوجوان افسر، جس کے چہرے پر اذیت اور پریشانی کے آثار تھے، اس مار کٹائی کا منظر برداشت نہ کر سکا۔ وہ وہاں سے پرے ہٹ گیا اور استفہامیہ نگاہوں سے ایجوٹنٹ کو، جو گھوڑے پر سوار ادھر سے گزر رہا تھا، دیکھنے لگا۔

پرنس آندرے سب سے اگلی صف کے قریب پہنچنے کے بعد اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ دائیں اور بائیں دونوں پہلوؤں پر ہماری اور غنیم کی جنگی صفیں ایک دوسرے سے خاصی دور تھیں۔ لیکن جہاں تک قلب کا تعلق ہے، جہاں

سے صبح عارضی جنگ کا معاہدہ کرنے والے سفارت کاروں کا گزر ہوا تھا، وہ ایک دوسرے کے اتنا قریب تھیں کہ جوان ایک دوسرے کے چہرے دیکھ سکتے اور آپس میں گفتگو کر سکتے تھے۔ اگلی صف میں محض فوجی ہی نہیں تھے بلکہ دونوں اطراف متجسس تماشائی بھی، جو ہنستے مسکراتے ان اجنبی، غیر ملکی دشمنوں کو دیکھ رہے تھے، جمع ہو گئے تھے۔

حالانکہ صبح سویرے ہی یہ حکم دیا جا چکا تھا کہ کوئی غیر متعلق شخص اگلی جنگی صفوں کے قریب پھٹکنے نہ پائے، افسران ان مقامی باشندوں کو پیچھے دھکیلنے میں ناکام رہے تھے۔ جو جوان اگلی صف میں تعینات تھے، تماشا گروں کی طرح اپنے تجسس کا اظہار کرنے لگے۔ ان کا دھیان اب فرانسیسیوں کی طرف نہیں تھا بلکہ ان کی توجہ سراسر ان تماشائیوں کی طرف منتقل ہو چکی تھی کیونکہ جن جوانوں نے ان کی جگہ لینا تھی، ان کا انتظار کرتے کرتے وہ خاصی بوریت محسوس کرنے لگے تھے۔ پرنس آندرے نے اپنا گھوڑا روک لیا اور فرانسیسیوں کا جائزہ لینے لگا۔

''ادھر دیکھو! دیکھو!'' ایک جوان نے ایک روسی بندوقچی کی طرف، جو ایک افسر کی معیت میں صف سے آگے نکل گیا تھا اور بڑے جوشیلے اور تیز تیز انداز سے ایک فرانسیسی گرینیڈیر سے باتیں کر رہا تھا، انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''سنو، کیسے بڑھ بڑھ کر بڑیں ہانک رہا ہے! فرانسیسی کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں دے رہا۔ خوب! تمھارا کیا خیال ہے، سداروف؟''

''ٹھہرو۔ غور سے سنو... بہت خوب! بہت اعلیٰ!'' سداروف نے کہا۔ اس کے متعلق عام خیال تھا کہ اسے فرانسیسی میں بات کرنے میں مہارت تامہ حاصل ہے۔

وہ سپاہی، جس کے متعلق یہ دونوں جوان آپس میں چہلیں کر رہے تھے، دلوخوف تھا۔ پرنس آندرے نے اسے پہچان لیا۔ وہ رک گیا تا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اسے سن سکے۔ دلوخوف اور اس کا کیپٹن میسرے سے، جہاں ان کی کمپنی تعینات تھی، آئے تھے۔

''بولتے جاؤ، بولتے جاؤ'' کیپٹن اسے اکسا رہا تھا۔ وہ آگے کی طرف جھکا ہوا تھا تا کہ وہ ایک ایک لفظ سن سکے حالانکہ جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ اس کی سمجھ سے قطعی بالا تھا۔ ''دوبارہ، نوازش۔ وہ کیا کہہ رہا ہے؟''

دلوخوف نے کیپٹن کی بات سنی ان سنی کر دی اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی فرانسیسی گرینیڈیر سے تو تو میں میں شروع ہو گئی تھی۔ توقع کے مطابق ان کا موضوع گفتگو لڑائی تھا۔ فرانسیسی آسٹریوں اور روسیوں کو ایک دوسرے سے خلط ملط کر رہا تھا اور اصرار کر رہا تھا کہ الم کے میدان جنگ میں روسیوں نے شکست کھائی تھی اور وہاں سے دم دبا کر بھاگ گئے تھے۔ اس کے برعکس دلوخوف دعویٰ کر رہا تھا کہ آج تک کوئی مائی کا لال روسیوں کو شکست نہیں دے سکا، بلکہ فرانسیسی روسیوں سے پٹتے رہے ہیں۔

''ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم تمھیں یہاں سے مار بھگائیں اور ہم تمھیں بھگا کر رہیں گے۔''

''ذرا ہوشیار رہنا، کہیں تم اور تمھارے سارے قازق پکڑے نہ جائیں'' فرانسیسی گرینیڈیر نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

فرانسیسی اور تماشائی ہنس پڑے۔

''ہم تمھیں اسی طرح ننگی کا ناچ نچادیں گے جس طرح سواروف نے نچایا تھا۔''

"Ou' est-ce qu'il chante?"* ایک فرانسیسی نے پوچھا۔

''گزرے زمانوں کی داستان سنا رہا ہے،'' دوسرے نے کہا۔ اس کا اندازہ تھا کہ دلوخوف کسی بھولی بسری جنگ کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

''امپراطور نے جس طرح دوسروں کو دن کو تارے دکھائے ہیں، تمھیں بھی دکھا دیں گے۔''

''بوناپارت...'' دلوخوف نے کہنا شروع کیا لیکن فرانسیسی نے اسے ٹوک دیا۔

''بوناپارت نہیں،۔ وہ امپراطور ہیں۔ امپراطور کا مقدس خطاب صرف انھیں زیب دیتا ہے،'' اس نے غضب ناک لہجے سے کہا۔

''جہنم میں گیا تمھارا امپراطور!''

اس کے ساتھ ہی دلوخوف نے اسے روسی زبان میں غلیظ گالی دی، بندوق کندھے پر رکھی اور وہاں سے چل دیا۔

''ایوان لوکچ، آؤ چلیں،'' اس نے کیپٹن سے کہا۔

''یہ ہے فرانسیسی میں گفتگو کرنے کا انداز،'' اگلی صف کے جوانوں نے کہا۔ ''سداروف، اب تمھاری باری ہے۔''

سداروف نے آنکھیں جھپکائیں، اس نے فرانسیسی فوجیوں کی طرف رخ کیا اور جس قدر تیز بول سکتا تھا، اتنی تیزی سے بے معنی آوازیں نکالنے لگا۔

کاری — مالا — تافا — سافی — موتر — کاسکا،'' وہ بک بک کیے جا رہا تھا لیکن ساتھ ساتھ یہ کوشش کر رہا تھا کہ اس کے منہ سے جو الفاظ نکل رہے ہیں، وہ دوسروں کو بامعنی معلوم ہوں۔

''ہو، ہو، ہو! ہا، ہا، ہا!!، وہ، ا، وہ!'' جوانوں نے مسرت سے جھوم جھوم کر اتنے فلک شگاف قہقہے لگانے شروع کر دیے کہ فرانسیسی بھی ان کا ساتھ دیے بغیر نہ رہ سکے۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا تھا کہ سپاہی اپنی بندوقیں اتار پھینکیں گے، گولے بارود کو آگ لگا دیں گے اور امن چین کی بانسری بجاتے جلد از جلد گھروں کو واپس لوٹ جائیں گے۔

لیکن بندوقیں بھری رہیں، مکانوں اور دمدموں کے رُوزن اسی دھمکی آمیز انداز سے کھلے رہے اور توپیں، جو گاڑیوں سے علیحدہ کر لی گئی تھیں، جوں کی توں ایک دوسرے کے بالمقابل کھڑی رہیں۔

16

میمنے سے میسرے تک ساری صف کا چکر لگانے کے بعد پرنس آندرے نے توپ گڑھی کا رخ کیا۔ سٹاف افسر کے بقول

* یہ کیا راگ الاپ رہا ہے؟

یہاں سے سارے میدان جنگ کا منظر نظر آ سکتا تھا۔ وہ گھوڑے سے اترا اور جو چار توپیں گاڑیوں سے علیحدہ کی گئی تھیں، ان میں سے آخری کے قریب کافی دیر تک کھڑا رہا۔ ایک توپ خانے کا سنتری، جو توپوں کے سامنے ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا، افسر کو دیکھ کر مؤدب کھڑا ہونا چاہتا تھا لیکن اشارے کو دیکھ کر نپے تلے قدموں کے ساتھ دوبارہ بے کیف اور بے رنگ چکر کاٹنے لگا۔ توپوں کے عقب میں توپ گاڑیاں تھیں اور ان سے بھی خاصا پیچھے گھوڑوں کو باندھنے کے رسے اور ڈنڈے اور توپ خانے کے سپاہیوں کا پڑاؤ تھا، جہاں جگہ جگہ الاؤ روشن تھے۔ آخری توپ سے ذرا دور بائیں جانب ایک نئی جھونپڑی تھی۔ اسے درختوں کی شاخوں کو آپس میں گوندھ کر بنایا گیا تھا۔ اس جھونپڑی سے افسروں کی زور شور سے باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

یہ بات درست تھی کہ اس توپ گڑھی سے روسی فوجوں کی ساری تقسیم و ترتیب اور غنیم کی فوج کا بیشتر حصہ صاف نظر آ رہا تھا۔ اس کے بالکل بالمقابل پہاڑی کی چوٹی پر شیون گرابرن کا گاؤں دیکھا جا سکتا تھا۔ دائیں بائیں تین مقامات ایسے تھے جہاں فرانسیسی پڑاؤ کے الاؤوں کے دھوؤں کے مابین فرانسیسی سپاہ کے، حالانکہ اس کا بیشتر حصہ لاریب گاؤں کے اندر اور پہاڑی کے پیچھے مقیم تھا، ہجوم پہچاننا ممکن تھا۔ گاؤں کی بائیں جانب دھوئیں میں توپ گڑھی سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر آ رہی تھی لیکن ننگی آنکھ سے اس کا صاف صاف دیکھنا آسان نہ تھا۔ ہمارا میمنہ قدرے سیدھی ڈھلوان پر، جو فرانسیسیوں کے سروں کے عین اوپر اٹھی ہوئی تھی، ادھر ادھر بکھرا ہوا تھا۔ وہاں ہماری پیادہ فوج اور انتہائی آخری سرے پر ڈریگون متعین تھے۔ وہ ندی جو ہمارے اور شیون گرابرن کے درمیان حائل تھی، اس تک پہنچنے کا سیدھا ترین راستہ، جو عمودی ڈھلوان پر سے گزرتا تھا، قلب میں واقع توشن کی توپ گڑھی سے جہاں پرنس آندرے کھڑا پوزیشنوں کا جائزہ لے رہا تھا، شروع ہوتا تھا۔ بائیں طرف ہماری سپاہ جھنڈ کے قریب متعین تھیں۔ وہاں ہماری پیادہ فوج کے جوانوں کے، جو سوختنی لکڑی کاٹ رہے تھے، الاؤوں سے دھواں نکلتا دیکھا جا سکتا تھا۔ فرانسیسی صف بندی ہماری صف بندی کی نسبت کہیں زیادہ لمبی چوڑی تھی اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ دونوں بازوؤں سے با آسانی ہمیں اپنے نرغے میں لے سکتے ہیں۔ ہماری پوزیشن کے عقب میں عمیق گھاٹی تھی۔ اس کے کنارے عمودی اور دشوار گزار تھے۔ چنانچہ اس میں سے توپ خانے اور گھڑسوار دستوں کے لیے پسپائی اختیار کرنا خاصا مشکل ہوگا۔

پرنس آندرے نے اپنی نوٹ بک نکالی، ایک جنگلے پر اپنی کہنی ٹکائی اور فوجوں کی تقسیم و ترتیب کا نقشہ بنانے لگا۔ اس نے دو مقامات نشان زدہ کر دیے۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ان کے بارے میں باگ راتیاں سے بات کرے گا۔ اول: وہ یہ تجویز پیش کرے گا کہ سارا توپ خانہ قلب میں مجتمع کر دیا جائے۔ دوم: گھڑسوار فوج کو پیچھے ہٹا لیا جائے اور گھاٹی کی دوسری جانب تعینات کر دیا جائے۔ کمانڈر انچیف کی مسلسل حاضری بھرتے رہنے، کثیر التعداد افواج کی نقل و حرکت اور عمومی ترتیب و تنظیم کا مطالعہ کرنے اور مختلف جنگوں کے تاریخی واقعات و کوائف کا متواتر جائزہ لینے کے بعد پرنس آندرے کے لیے یہ امر بالکل فطری تھا کہ مستقبل قریب میں عسکری کارروائیاں جو رخ اختیار کریں

گی ،اس کا عمومی نقشہ اپنے ذہن میں مرتب کرے۔ اس کے دماغ میں جن دو اہم امکانات نے سر اٹھایا، وہ یہ تھے:
''اگر غنیم نے میمنے پر حملہ کیا،'' اس نے اپنے آپ سے کہا، ''کیف گرینیڈیرز اور پادولیا شاسروں کو اس وقت تک اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے رہنا پڑے گا جب تک قلب سے محفوظ دستے ان کی مدد کو نہ پہنچ جائیں۔ اس صورت میں ڈریگون ان کے پہلو پر حملہ کر سکتے ہیں اور انھیں پیچھے دھکیل سکتے ہیں۔ اگر انھوں نے ہمارے قلب پر حملہ کیا، تو ہم اپنی مرکزی توپ گڑھی اس پہاڑی پر بنادیں گے اور اس کی آڑ میں اپنا میسرہ پیچھے ہٹالیں گے اور مختلف یونٹوں کو یکے بعد دیگرے گھاٹی میں لے جائیں گے،'' اس نے استدلال کیا۔

جب تک وہ جگنال کے پاس کھڑا رہا، اسے جھونپڑی سے افسروں کی باتیں کرنے کی آوازیں پیہم اور صاف سنائی دیتی رہیں لیکن جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، اس کے ایک لفظ کا مفہوم بھی اس کے پلے نہ پڑا۔ تاہم ایکا ایکی اسے احساس ہوا کہ ان کے لہجوں میں انتہائی سنجیدگی اور گمبھیرتا آگئی ہے، خود بخود اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ بے اختیار ان کی باتیں سننے لگا۔

''نہیں، مائی ڈیئر فیلو،'' ایک آواز، جو سماعت کو بھلی لگی اور جو پرنس آندرے کو کچھ جانی پہچانی محسوس ہوئی، سنائی دی۔ ''میری گزارش یہ ہے کہ اگر یہ جاننا ممکن ہو کہ مابعد موت کیا وقوع پذیر ہوگا، پھر ہم میں سے کسی کو بھی موت سے خوف نہیں آئے گا۔ میرے دوست، میں سچ عرض کر رہا ہوں۔''

ایک دوسری اور نسبتاً کم عمر آواز نے پہلی آواز کو کاٹا: ''خوف آئے یا نہ آئے لیکن اس سے مفر؟ ایں خیال است ومحال است وجنوں۔''

''خوف تو بہر حال آتا ہی ہے، اے عالم فاضل لوگو!'' کڑاکے دار تیسری آواز نے پہلی دونوں آوازوں کو ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''تم توپ خانے والے بڑے سیانے اور ہوشیار آدمی ہو۔ تم جو جی چاہے — شراب، کباب، بسکٹ — اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔''

ظاہر تھا کہ اس کڑاکے دار آواز کا مالک پیادہ فوج کا افسر تھا۔

''ہاں، ڈر تو ہمیشہ آتا ہی ہے،'' پہلے مقرر نے، جس کی آواز شناسا معلوم ہوتی تھی، اپنی بات جاری رکھی۔ ''ڈر ان چیزوں سے آتا ہے، جن کا ہمیں علم نہیں ہوتا۔ آپ خواہ کتنی ہی بار یہ کہتے رہیں کہ قفس عنصری سے رہائی پانے کے بعد روح جانب افلاک محو پرواز ہو جاتی ہے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا... ہم جانتے ہیں کہ فلک ولک کچھ نہیں — اور صرف فضا ہے۔''

کڑاکے دار آواز نے توپ خانے کے افسر کو ٹوکا۔

''چھوڑو یہ قصہ۔ توشن، اپنی نباتاتی برانڈی کے ہی دو گھونٹ پلا دو،'' اس نے کہا۔

''ہا ئیں، یہ تو وہی افسر ہے جو کینٹین میں بوٹوں کے بغیر کھڑا تھا،'' پرنس آندرے نے سوچا۔ وہ اس خوشگوار آواز کو، جو فلسفہ بگھار رہی تھی، پہچان گیا تھا اور بہت خوش ہوا تھا۔

"نباتاتی برانڈی؟ ـــ ارے واہ! کیوں نہیں؟" توشن نے کہا۔ "پھر بھی حیاتِ مستقبل کو اپنے تصور میں لانا ـــ"
"اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ عین اس لمحے فضا میں سنسناہٹ سنائی دی۔ قریب، قریب تر، تیز، تیز تر، بلند، بلند تر، اور گجنال کا گولہ، گویا اس کی سنسناہٹ نے جو کچھ کہنا چاہا تھا، وہ ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا، جھونپڑی کے قریب دھماکے سے پھٹ گیا اور اس نے ایک ایسی قوت کے ساتھ، جو ماورائے انسان تھی، مٹی کی بوچھاڑ اچھال دی۔ تصادم اتنا لرزہ خیز تھا کہ خود دھرتی میا کی چیخیں نکل گئیں۔

عین اسی لحظے کوتاہ قامت توشن، جس کے ذہین اور پرشفقت چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی، منہ کے کونے میں ننھا منا پائپ دبائے سرپٹ بھاگتا دوسروں سے پہلے جھونپڑی سے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے وہ افسر تھا جس کی آواز کڑاکے دار تھی۔ وہ تیز طرار اور بانکا سجیلا جوان تھا۔ وہ سر پر پاؤں رکھے اپنی کمپنی کی طرف بھاگا جا رہا تھا اور بھاگتے بھاگتے اپنے کوٹ کے بٹن بند کرتا جا رہا تھا۔

17

پرنس آندرے گھوڑے پر سوار ہو گیا لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلا نہیں بلکہ وہیں توپ گڑھی کے قریب کھڑا رہا اور گجنال کا، جس سے آہنی گولہ داغا گیا تھا، دھواں دیکھتا رہا۔ اس کے سامنے جو وسیع و عریض منظر پھیلا ہوا تھا، اس نے بہ تعجیل اس پر نظریں دوڑائیں۔ اسے صرف یہی نظر آیا کہ فرانسیسیوں کے جتھے، جو اب تک بے شغلی میں وقت گزار رہے تھے، اب متحرک ہو گئے ہیں اور بائیں جانب واقعتاً توپ گڑھی تھی۔ وہاں ابھی تک فضا پر دھواں محیط تھا۔ دو فرانسیسی، جو گھوڑوں پر سوار تھے، پہاڑی پر سرپٹ دوڑے جا رہے تھے۔ غنیم کا ایک چھوٹا سا پرا، جو صاف دکھائی دے رہا تھا، پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا۔ یہ لوگ غالباً سب سے اگلی صف کے سپاہیوں کو کمک پہنچانے جا رہے تھے۔ ابھی پہلے گولے کا دھواں تحلیل نہیں ہوا تھا کہ ایک اور سرمئی لکیر نمودار ہوئی اور اس کے ساتھ ہی گونج دار آواز سنائی دی۔ معرکہ آرائی کا آغاز ہو چکا تھا! پرنس آندرے نے اپنا گھوڑا موڑا اور پرنس باگ راتیاں کی تلاش میں سرپٹ گرنٹ کی سمت بھاگنے لگا۔ اسے اپنے عقب میں گولہ باری کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گولے دغنے کا شور و غل بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ہماری توپوں نے جوابی کارروائی شروع کر دی تھی۔ ڈھلوان کے نیچے، جہاں سے عارضی جنگ بندی کے ایلچی گزر رہے تھے، دستی بندوقوں کے چلنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

فرانسیسی ایلچی لے ماغوا (Le marrois) گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ابھی ابھی بونا پارٹ کا تہدید آمیز مراسلہ لے کر پہنچا تھا۔ موغا کو اپنی غلطی کا احساس ہو چکا تھا اور وہ اس پر تلملا رہا تھا۔ اپنی اس حماقت کا ازالہ کرنے کے لیے وہ بہت بے چین تھا۔ چنانچہ ایک لمحے کی تاخیر روا رکھے بغیر اس نے روسی سپاہ کے دونوں پہلوؤں کو نرغے میں لینے اور اس کے قلب پر حملہ کرنے کے لیے اپنی فوج کو حرکت دی۔ اسے امید تھی کہ سورج کے غروب ہونے اور امپراطور کے آنے سے پہلے وہ اس حقیر سپاہ کو، جو اس کے سامنے کھڑی تھی، تہس نہس کر دے گا۔

"شروع ہوگئی! یہاں، سامنے!" پرنس آندرے نے سوچا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ لیکن میرا تولوں[33] کہاں —اور کیسے— وقوع پذیر ہوگا؟"

کمپنیوں کے، جو ابھی پندرہ منٹ پہلے دال دلیا کھا رہی اور ووڈکا پی رہی تھیں، بیچوں بیچ گزرتے اسے ہر طرف جوان اسی پھرتی سے صفیں بناتے اور اپنے ہتھیاروں کا بغور جائزہ لیتے نظر آئے۔ اسے ان سب کے چہروں پر وہی اشتیاق، جو وہ اپنے دل میں محسوس کر رہا تھا، تیرتا نظر آیا۔

"شروع ہوگئی! یہاں، سامنے! پرہیبت لیکن طرب ناک!" ہر افسر اور جوان کے چہرے سے یہی مترشح ہو رہا تھا۔

وہ دمدمے، جو تکمیل کے مراحل طے کر رہے تھے، ابھی تک وہ ان تک نہیں پہنچا تھا کہ اسے بے کیف خزاں زدہ شام کی ملگجی روشنی میں چند گھڑ سوار اپنی طرف آتے دکھائی دیے۔ سب سے اگلے سوار نے قازق چغا اور استراخانی[34] ٹوپی پہنی ہوئی تھی۔ وہ پرنس باگ راتیاں تھا۔ پرنس آندرے رک گیا اور اس کا انتظار کرنے لگا۔ پرنس باگ راتیاں نے گھوڑے کو لگام دی اور پرنس آندرے کو پہچانتے ہوئے اپنی گردن کو ذرا سا خم دے کر اس کے سلام کا جواب دیا۔ پرنس آندرے نے جو کچھ دیکھا تھا، وہ اسے بتانے لگا۔ اس دوران میں پرنس باگ راتیاں سامنے دیکھتا رہا۔

یہ احساس کہ "شروع ہوگئی! یہاں، سامنے!" پرنس باگ راتیاں کے درشت گندمی چہرے پر بھی، جہاں نیم بند، نیم غنودہ اور نادرخشاں آنکھیں تھیں، پڑھا جا سکتا تھا۔ پرنس آندرے نے اس جذبات سے عاری چہرے کو پر اضطراب تجسس سے دیکھا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ "یہ شخص اس لمحے اگر واقعی کچھ سوچ رہا یا محسوس کر رہا ہے، کاش میں بتا سکتا، کہ وہ کیا ہے۔ اس جذبات سے عاری چہرے کے پیچھے کچھ ہے بھی یا نہیں؟" وہ اسے دیکھ رہا اور حیران ہو رہا تھا۔ پرنس آندرے نے پرنس باگ راتیاں کو جو کچھ بتایا تھا، اس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اسے اس سے اتفاق ہے، اپنی گردن ہلا دی اور اس نے لفظ "خوب!" یوں کہا جیسے جو کچھ پیش آیا تھا، اور جو کچھ اسے بتایا گیا تھا، وہ اس کی توقعات کے عین مطابق تھا۔ پرنس آندرے، جس کا سرپٹ گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے دم پھول گیا تھا، تیز تیز گفتگو کر رہا تھا۔ پرنس باگراتیاں، جس کا لہجہ مشرقی[35] تھا، ٹھہر ٹھہر کر رک رک کر باتیں کر رہا تھا جیسے وہ یہ بتانا چاہتا ہو کہ آخر اتنی بھی جلدی کیا ہے۔ تاہم وہ اپنا گھوڑا توشن کی توپ گڑھی کی سمت دلکی دوڑانے لگا۔ سٹاف کے ارکان کے ساتھ پرنس آندرے بھی اس کے پیچھے ہولیا۔

پرنس باگ راتیاں کی جماعت ایک سٹاف افسر، اس کے ذاتی ایجوٹنٹ ژرکوف، ایک اردلی افسر، ڈیوٹی افسر، جو بہت خوبصورت لیکن دم کٹے گھوڑے پر سوار تھا، ایک سویلین افسر اور ایک آڈیٹر پر، جو محض تجسس کی خاطر اجازت لے کر محاذ جنگ کی طرف چل پڑا تھا، مشتمل تھی۔ آڈیٹر خاصے تن و توش کا آدمی تھا اور اس کا چہرہ بھی خوب بھرا بھرا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش پر نظریں دوڑاتا اور مسکراتا جا رہا تھا۔ اس کے چہرے بشرے سے معلوم ہوتا تھا کہ جہاں تک عسکری امور کا تعلق ہے، ان کے بارے میں وہ بالکل معصوم ہے لیکن نئے ماحول میں بہت خوش ہے۔

ہوزاروں، قازقوں اور ایجوٹنٹوں کے مابین شتری لبادہ پہنے اور کانوائے افسر کے گھوڑے پر، جس پر زین کسی ہوئی تھی، سوار ہچکولے کھاتے وہ ایک طُرفہ تماشا نظر آرہا تھا۔

"یہ لڑائی کا منظر دیکھنے کے شوقین ہیں" ژرکوف نے آڈیٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بلکونسکی سے کہا۔ "لیکن بے چارے کے پیٹ میں ابھی سے ہول اٹھنا شروع ہو گیا ہے۔"

"چھوڑیں، آپ کافی کچھ کہہ چکے ہیں،" آڈیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ بظاہر اس کی مسکراہٹ معصومانہ تھی لیکن پھر بھی اس میں مکاری جھلکتی تھی۔ وہ یوں ظاہر کر رہا تھا جیسے ژرکوف اس کا مذاق نہیں اڑا رہا بلکہ اس کی خوشامد کر رہا ہے اور اب وہ عمداً اتنا احمق دکھائی دینے کی کوشش کر رہا تھا جتنا وہ حقیقتاً تھا نہیں۔

"Tres drole, mon monsieur prince"* ڈیوٹی افسر نے کہا۔ (اسے یاد آیا کہ فرانسیسی میں لفظ 'پرنس' ادا کرنے کا کوئی انوکھا انداز ہے لیکن خود اس سے صحیح قسم کا انداز برتا نہ جا سکا۔)

"یہ کیا تھا؟" آڈیٹر نے معصومانہ مسکراہٹ سے پوچھا۔

"فرانسیسی بسکٹ،" ژرکوف نے جواب دیا۔

"یہی وہ چیز ہے جس سے وہ آپ کو نشانہ بناتے ہیں؟" آڈیٹر نے پوچھا۔ "کتنی بری بات ہے!"

معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوشی سے پھول کر کپا ہو جائے گا۔ اس کے منہ سے یہ الفاظ بمشکل نکلے ہوں گے کہ ایکا ایکی ایک بار پھر دہشت ناک سنسناتی آواز سنائی دی۔ اچانک کوئی نرم و گداز چیز دھم سے نیچے گری اور سنسناتی آواز بند ہو گئی۔ ایک قازق، جوان کے ذرا دائیں طرف اور آڈیٹر کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، اپنے گھوڑے سمیت زمین بوس ہو گیا۔ ژرکوف اور سٹاف افسر اپنی اپنی زین پر آگے کو جھک گئے اور وہاں سے اپنے گھوڑے ہٹا کر پرے لے گئے۔ آڈیٹر رک گیا۔ وہ قازق کے عین سامنے کھڑا تھا اور بڑے تجسس اور انہماک سے اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ قازق جہانِ فانی سے رخصت ہو چکا تھا لیکن اس کا گھوڑا ابھی تک ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔

پرنس باگ راتیاں نے اپنی آنکھیں سکیڑلیں اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی پارٹی میں جو افراتفری مچی ہوئی تھی، اسے جب اس کا سبب دکھائی دیا، اس نے یوں بے نیازی سے اپنی نگاہیں پھیر لیں جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو کہ "بھلا ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے متعلق پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟" اس نے مشاق سوار کی طرح اپنے گھوڑے کی باگیں کھینچیں اور ذرا آگے جھک کر اپنی شمشیر، جو اس کے چغے میں الجھ گئی تھی، علیحدہ کی۔ یہ قدیم وضع کی شمشیر تھی اور اب عام طور پر استعمال نہیں ہوتی تھی۔ پرنس آندرے کو وہ قصہ، جس کے مطابق سوارف نے اطالیہ میں اپنی شمشیر باگ راتیاں کو دے دی تھی، یاد آگیا۔ یہ یاد اس لمحے خاص طور پر بہت خوشگوار معلوم ہوئی۔ وہ توپ گڑھی میں، جہاں سے پرنس آندرے نے میدان جنگ کا جائزہ لیا تھا، پہنچ گئے تھے۔

"یہ کس کی کمپنی ہے؟" پرنس باگراتیاں نے ایک توپچی سے، جو گولہ بارود کے بکس کے قریب کھڑا تھا۔

---

* موسیو پرنس۔ نری مسخرگی ہے۔

دریافت کیا۔

اس نے پوچھا تو ''کس کی کمپنی ہے؟'' تھا لیکن حقیقتاً اس کا مطلب یہ تھا: ''تمھیں یہاں ڈر نہیں محسوس ہوتا'' اور توپچی اس کا مطلب سمجھ گیا تھا۔

''یوَرایکسی لینسی، کیپٹن توشن کی،'' توپچی نے، جس کے بال سرخ تھے اور جس کے چہرے پر داغ دھبے تھے، خوش دلی سے جواب دیا۔

''ارے، ہاں۔'' باگراتیاں بے توجہی سے بڑبڑایا جیسے وہ کسی سوچ میں کھویا ہوا ہو۔ اور وہ توپ گاڑیوں سے پرے اس گجنال کی جانب، جو سب سے آگے نصب تھی، چل پڑا۔

جونہی وہ اس گجنال کے قریب پہنچا، اسے داغ دیا گیا۔ زبردست دھماکا ہوا جس سے اس کی اور اس کے ساتھیوں کی وقتی طور پر سماعت جاتی رہی۔ دھوئیں میں، جس نے یک بیک گجنال کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، انھیں توپچی نظر آنے لگے تھے۔ توپچیوں نے گجنال کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا اور وہ گھسیٹ گھساٹ کر اسے جلد از جلد اپنی سابقہ پوزیشن پر نصب کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے تھے۔ توپچی نمبر ایک بھاری بھرکم جثے اور چوڑے چکلے سینے کا مالک جوان تھا۔ اس نے صفائی کرنے والی سلاخ پکڑی اور چھلانگ لگا کر پہیے پر چڑھ گیا۔ توپچی نمبر 2 نے کپکپاتے ہاتھوں سے گولہ گجنال کے دہانے میں گھسیڑ دیا۔ افسر توشن، جس کا قد چھوٹا اور شانے مدور تھے، توپ گاڑی کے عقبی حصے سے ٹکراتا آگے کو بھاگا۔ جرنیل کی موجودگی سے بے خبر اس نے اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں پر سایہ کیا اور دور آگے دیکھنے لگا۔

''اسے دو پوائنٹ اوپر اٹھا دو، پھر اس کا نشانہ بالکل ٹھیک بیٹھے گا،'' اس نے اپنی باریک آواز میں دھونس، جو اس کی جسامت سے لگا نہیں کھاتی تھی، پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''نمبر 2!'' اس نے حلق سے سیٹی جیسی آواز نکالتے ہوئے کہا۔ ''میدوی دیف، ان کے بھیجے اڑا دو!''

باگ راتیاں نے اسے پکارا اور وہ جرنیل کی طرف چل پڑا۔ اس نے شرمیلے اور بے ہنگم انداز سے اپنی تین انگلیاں اپنی ٹوپی کی طرف اٹھائی ہوئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ فوجیوں کی طرح سیلوٹ نہیں کر رہا بلکہ پادریوں کی مانند دعا دے رہا ہے۔ اگرچہ توشن کی گجنالیں وادی پر بم باری کے لیے نصب کی گئی تھیں لیکن وہ ان کے ذریعے شیون گرابرن گاؤں پر، جس کے سامنے فرانسیسی فوج کا اجتماع ہو رہا تھا، آتش گیر گولے پھنکوا رہا تھا۔

توشن کو کسی نے یہ حکم نہیں دیا تھا کہ اس نے کہاں اور کس پر گولہ باری کرانا ہے لیکن اپنے سارجنٹ میجر، ذخارچنکو، کے ساتھ صلاح مشورہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ گاؤں کو آگ لگانا بہت مفید رہے گا۔

افسر کی رپورٹ کے جواب میں باگ راتیاں نے ''خوب!'' کہا اور اس کی نگاہوں کے سامنے سارے میدان جنگ کا جو نقشہ ابھر رہا تھا، اس کا یوں جائزہ لینے لگا جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔

فرانسیسی پیش قدمی کرتے دائیں جانب ہمارے قریب ترین آچکے تھے۔ جس پہاڑی پر کیف رجمنٹ تعینات

تھی، اس کے نیچے گھاٹی میں، جس میں ندی بہہ رہی تھی، توپوں کی گڑگڑاہٹ اور گھن گرج سنائی دے رہی تھی۔ دائیں جانب دور، بہت دور، ڈریگونوں سے بھی کہیں آگے، سٹاف افسر نے باگراتیاں کی توجہ فرانسیسی فوج کے پرے کی طرف دلائی۔ جو ہمیں اپنے گھیرے میں لے رہا تھا، بائیں طرف ملحقہ جنگل تا افق پھیلا ہوا تھا۔

پرنس باگراتیاں نے حکم دیا کہ قلب کی دو بٹالینیں میمنے کو کمک پہنچانے کے لیے بھیج دی جائیں۔ سٹاف افسر نے حوصلے سے کام لے کر پرنس سے گزارش کی کہ اگر یہ بٹالینیں یہاں سے ہٹالی گئیں، پھر گنالوں کو آڑ حاصل نہیں رہے گی۔ پرنس باگراتیاں افسر کی جانب مڑا اور اپنی نادرخشاں آنکھوں سے اسے گھورنے لگا۔ پرنس آندرے کو ایسے لگا کہ افسر نے جو کچھ کہا تھا، درست کہا تھا اور اس کی تردید ممکن نہیں تھی۔ لیکن عین اسی لمحے رجمنٹل کمانڈر کا، جو نیچے گھاٹی میں تھا، ایک ایجوٹنٹ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا یہ خبر لایا کہ فرانسیسی بہت بڑی تعداد میں ان کی جانب بڑھ رہے ہیں، رجمنٹ کی صف بندی درہم برہم ہوگئی ہے اور بے ترتیبی کی حالت میں کیف گرینیڈیرز کی طرف پسپا ہو رہی ہے۔ پرنس باگراتیاں نے منظوری اور پسندیدگی کی علامت کے طور پر اپنا سر قدرے نیچے جھکا دیا۔ وہ گھوڑے پر آہستہ آہستہ دائیں سمت چلا گیا اور اس حکم کے ساتھ کہ فرانسیسیوں پر حملہ کر دیا جائے، اس نے ڈریگونوں کی جانب اپنا ایجوٹنٹ بھیج دیا۔ لیکن ایجوٹنٹ آدھ گھنٹے بعد واپس آ گیا اور یہ اطلاع لایا کہ ڈریگونوں کا کمانڈر پہلے ہی پسپائی اختیار کر کے گھاٹی کے پار جا چکا ہے کیونکہ توپوں کا منہ اس کی جانب کھول دیا گیا اور وہ بے کار اپنے آدمیوں سے ہاتھ کھو رہا تھا۔ چنانچہ اس نے اسی میں خیریت جانی کہ وہ بلا توقف جنگل میں چلا جائے۔

"خوب!" باگ راتیاں نے کہا۔

جب وہ گھوڑے پر سوار توپ گڑھی سے رخصت ہو رہا تھا، بائیں جانب کے جنگل سے بھی فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ چونکہ میسرہ اتنا زیادہ دور تھا کہ خود اس کے لیے وہاں جانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ باگ راتیاں نے ژرکوف کو کمانڈنگ جنرل ــــ وہی کمانڈنگ جنرل جس کی رجمنٹ کا کوتوزوف نے براؤناؤ میں معائنہ کیا تھا ــــ کے پاس بھیجا تاکہ اسے وہ یہ پیغام دے سکے کہ وہ حتی الامکان جلد از جلد پسپائی اختیار کر کے گھاٹی کے پار چلا جائے کیونکہ میمنہ غالباً زیادہ دیر تک دشمن کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ لیکن جہاں تک توشن اور اس بٹالین کا، جو اسے آڑ فراہم کر رہی تھی، تعلق تھا، ان سے بالکل صرفِ نظر کر لیا گیا۔ پرنس باگراتیاں کا کمانڈنگ افسروں کے ساتھ جو تبادلۂ خیالات ہوا اور اس نے انھیں جو احکام دیے، پرنس آندرے نے انھیں بغور سنا اور یہ دیکھ کر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حقیقتاً کوئی احکام و حکام دیے ہی نہیں گئے تھے بلکہ پرنس باگراتیاں نے محض یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ جو کچھ ضرورت کے تحت، محض اتفاقاً یا یونٹ کمانڈروں کے ایما پر ہوا، وہ سب کچھ اسی کے حکم پر ہوا یا کم از کم اس کے عزائم کے عین مطابق ہوا۔ پرنس آندرے نے اندازہ لگایا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس میں اتفاق کو بڑا دخل حاصل تھا اور اس میں کمانڈر کی مرضی کسی طور شامل نہیں تھی۔ تاہم پرنس باگ راتیاں نے جس موقع شناسی کا مظاہرہ کیا تھا، اس نے اس کی موجودگی کو بہت اہم بنا دیا تھا۔ کمانڈنگ افسراں، جو منہ لٹکائے اس کی خدمت میں حاضر ہوئے

تھے، دوبارہ پرسکون ہو گئے۔ جوانوں اور افسروں نے نہایت خوش دلی سے اس کا خیر مقدم کیا، اس کی موجودگی میں ان کے حوصلے لوٹ آئے اور وہ اس کے سامنے اپنی جرأت اور دلیری کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب نظر آنے لگے۔

18

باگ راتیاں ہمارے دائیں بازو کے بلند ترین مقام پر پہنچنے کے بعد گھوڑے پر سوار پہاڑی کے نیچے، جہاں سے توپوں کے چلنے کی آوازیں تو سنائی دے رہی تھیں لیکن جہاں دھوئیں کی وجہ سے نظر کچھ نہیں آ رہا تھا، اترنے لگا۔ وہ گھاٹی کے جتنا قریب ہوتے گئے، نظر انھیں اتنا ہی کم آنے لگا لیکن اصل میدان جنگ کے وہ اپنے آپ کو اتنا ہی قریب محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے زخمیوں سے میل ملاقاتیں شروع کر دیں۔ ایک زخمی شخص کے سر سے خون بہہ رہا تھا اور اس کی ٹوپی ندارد۔ دو سپاہی اس کی بغلوں میں اپنے بازو پھنسائے اسے گھسیٹے لیے جا رہے تھے۔ وہ چھینکیں مار رہا تھا اور بار بار خون کی قے کر رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ گولی نے اس کے منہ یا حلق کو نشانہ بنایا تھا۔ ایک اور شخص اپنی دستی بندوق کھو چکا تھا۔ وہ بڑے حوصلے اور ہمت سے اکیلا چلا جا رہا تھا۔ وہ کراہتا اور اپنی زخمی بازو کو، جس سے خون نکل نکل کر اس کے کوٹ پر یوں گر رہا تھا جیسے بوتل کا منہ کھول دیا گیا ہو، فضا میں لہراتا جاتا تھا۔ اس کے چہرے سے درد سے زیادہ خوف کا اظہار ہو رہا تھا۔ وہ صرف چند ثانیے قبل زخمی ہوا تھا۔ سڑک عبور کرنے کے بعد وہ ایک عمودی ڈھلوان سے نیچے اترنے لگے۔ یہاں انھیں متعدد جوان زمین پر لیٹے نظر آئے۔ یہاں انھیں فوجیوں کا ایک ہجوم بھی ملا۔ ان میں سے بعض لوگوں کو خراش تک نہیں آئی تھی۔ یہ جوان پہاڑی پر چڑھ رہے تھے۔ ان کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں اور جنرل کو دیکھنے کے باوجود وہ آپس میں زور شور سے باتیں کر رہے تھے اور اپنا مفہوم واضح کرنے کے لیے پوری قوت سے اپنے بازو لہرا رہے تھے۔ اب دھوئیں کی چادر میں سے سرمئی اوورکوٹوں کی صفیں نظر آنے لگی تھیں اور جب ایک افسر کی نگاہ باگ راتیاں پر پڑی، وہ پسپائی اختیار کرنے والے ہجوم کی طرف لپکا اور چلا چلا کر انھیں واپس آنے کا حکم دینے لگا۔ گھوڑے پر سوار باگ راتیاں اس صف کے قریب پہنچا جہاں کبھی ایک اور کبھی دوسری جگہ سے پے در پے گولوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ شور و غل اتنا زیادہ تھا کہ جوانوں کو واپس بلانے کے لیے جو آوازیں بلند کی جا رہی تھیں، وہ اس میں دب گئی تھیں۔ ساری فضا میں دھوئیں کی بو باس رچی بسی تھی۔ بارود نے جوشیلے جوانوں کے چہروں پر کالک مل دی تھی۔ بعض اپنی گجنالوں کی صفائی کرنے والی سلاخیں چلا رہے تھے، بعض پیالوں میں بارود ڈال رہے تھے یا اپنی تھیلیوں سے کارتوس نکال رہے تھے۔ کچھ لوگ فائرنگ کر رہے تھے، لیکن وہ کس پر فائرنگ کر رہے تھے، دھوئیں کی وجہ سے اس کا کھوج لگانا مشکل تھا اور یہ دھواں اتنا گاڑھا تھا کہ ہوا بھی اسے تحلیل نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک خوشگوار بھنبھناتی اور سنسناتی آواز بھی بار بار سنائی دے رہی تھی۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' پرنس آندرے کو تعجب ہو رہا تھا اور وہ جوانوں کے ہجوم کی طرف بڑھنے لگا۔ ''یہ جنگی

صف نہیں ہو سکتی: یہ سب لوگ ایک دوسرے میں گھسے ہوئے ہیں۔ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ یہ ہلّہ بول رہے ہیں کیونکہ وہ اپنی جگہوں سے ہل جل نہیں رہے۔ ان کی ترتیب بمشکل مربّع[36] بھی نہیں ہے کیونکہ انھیں اس ترتیب سے کھڑا ہی نہیں کیا گیا۔ پھر یہ کیا ہے؟"

رجمنٹ کا کمانڈر دبلا پتلا، نحیف الجثہ معمر شخص تھا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے جھکے ہوئے پپوٹوں نے اس کی بوڑھی آنکھوں کو نصف سے زیادہ ڈھانپ رکھا تھا اور اس کے چہرے کو شفیق بنا دیا تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار باگراتیاں کی جانب آیا اور اس نے اس کا یوں استقبال کیا جیسے کوئی شخص اپنے معزز مہمان کو خوش آمدید کہتا ہے۔ اس نے پرنس باگ راتیاں کو اطلاع دی کہ اس کی رجمنٹ پر فرانسیسی گھڑسواروں نے حملہ کیا تھا اور اگرچہ حملہ پسپا کر دیا گیا ہے لیکن اسے اپنے نصف سے زیادہ جوانوں سے ہاتھ دھونا پڑے ہیں۔ جب اس نے یہ کہا کہ حملہ پسپا کر دیا گیا ہے، اس کی رجمنٹ کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا، اپنی دانست میں وہ اس کے متعلق عسکری اصطلاح استعمال کر رہا تھا لیکن درحقیقت اسے خود بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ جو جوان اس کی تحویل میں دیے گئے تھے، آدھ گھنٹے کے دوران میں ان پر کیا حادثہ گزرا ہے اور وہ یقین کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آیا حملہ پسپا کر دیا گیا ہے یا اس کی اپنی رجمنٹ کے بخیے ادھڑ گئے ہیں۔

وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ معرکے کی ابتدا میں اس کی رجمنٹ پر گجنالوں کے گولے اور دستی بم دھڑا دھڑ گرنے لگے اور اس کے جوانوں کو اپنی زد میں لینے لگے تھے۔ پھر کسی شخص نے چلا کر کہا، "گھڑسوار فوج!" اور ہمارے جوان فائرنگ کرنے لگے۔ لیکن ان کا ہدف اسپ سوار فوج نہیں تھی کیونکہ وہ منظر سے غائب ہو گئی تھی بلکہ ان کا نشانہ فرانسیسی پیادہ فوج تھی جو گھاٹی میں داخل ہو گئی تھی اور ہمارے آدمیوں پر فائرنگ کر رہی تھی۔

پرنس باگ راتیاں نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ جو کچھ ہوا، وہ اس کی خواہش اور توقع کے عین مطابق ہوا۔ اس نے اپنے ایک ایجوٹنٹ کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ چھٹے شاسروں کی دو بٹالینیوں کو، جن کے قریب سے وہ ابھی ابھی گزر کر آئے تھے، یہاں لے آئے۔ اس لمحے پرنس باگراتیاں کے چہرے پر جو تبدیلی رونما ہوئی، اس نے پرنس آندرے کو چونکا دیا۔ وہاں اسے اسی فرحت آگیں عزم صمیم کا ارتکاز نظر آیا جو اس شخص کے چہرے پر، جو کسی ایسے روز، جب بلا کی گرمی پڑ رہی ہو، اس کے پانی میں چھلانگ لگانے سے پہلے اس وقت دکھائی دیتا ہے جب وہ دوڑتا دوڑتا آخری چند قدم اٹھا رہا ہوتا ہے۔ اب اس کی آنکھیں نہ نیم غنودہ تھیں اور نہ نادرخشاں اور نہ وہ جھوٹ موٹ کی سوچ بچار کا ڈراما کر رہا تھا۔ شکرے کی مدور اور سفاک آنکھیں فرط انبساط سے اچھلی جا رہی تھیں اور قدرے حقارت سے سامنے دیکھ رہی تھیں لیکن کسی چیز پر ٹک نہیں رہی تھیں۔ تاہم اس کی حرکات و سکنات اب بھی نپی تلی تھیں اور ان میں کوئی تیزی نہیں آئی تھی۔

رجمنٹل کمانڈر باگ راتیاں کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے التجا کرنے لگا کہ وہ واپس چلا جائے کیونکہ وہاں بہت خطرہ تھا۔ "یور ایکسی لینسی، میں آپ سے مؤدبانہ گزارش کرتا ہوں کہ خدارا آپ واپس تشریف لے جائیں۔"

اس نے اس معاملے میں سٹاف افسر سے بھی، جس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا، استمداد چاہی۔ ''دیکھ رہے ہیں نا آپ!'' اس نے گولیوں کی طرف جو ان کے اردگرد مسلسل بھنبھناتی، سنسناتی، گنگناتی آرہی تھیں، توجہ دلاتے ہوئے کہا۔ اس کا منت سماجت اور گلے شکوے کا انداز بالکل اس بڑھئی کا سا تھا جو کسی سفید پوش سے، جسے اس نے کلہاڑا اٹھاتے دیکھ لیا ہو، کہتا ہے: ''ہم تو اس کے عادی ہیں لیکن آپ کے دست مبارک پر چھالے پڑ جائیں گے۔'' وہ یوں باتیں کر رہا تھا جیسے وہ گولیاں اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گی اور اس کی نیم بند آنکھوں نے اس کے الفاظ کو اور بھی ترغیب آمیز بنا دیا تھا۔ سٹاف افسر نے کرنل کی تائید کی اور پرزور انداز میں واپس چلنے کو کہا لیکن پرنس باگ راتیاں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے محض یہ حکم دینے پر اکتفا کیا کہ فائرنگ بند کر دی جائے اور صف بندی از سرِ نو کی جائے تاکہ ان دو بٹالینیوں کے لیے، جو آرہی تھیں، گنجائش پیدا کی جا سکے۔ جب وہ یہ احکام دے رہا تھا، ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی اور اس نے دھوئیں کی اس چادر کو، جو دائیں سے بائیں پوری گھاٹی پر پھیلی ہوئی تھی، یوں ہٹا دیا جیسے کوئی غیر مرئی ہاتھ کام کر رہا ہو اور بالمقابل پہاڑی، جسے فرانسیسی عبور کر رہے تھے، دکھائی دینے لگی۔ غیر ارادی طور پر تمام لوگوں کی نگاہیں فرانسیسی کالم (پرے) پر، جو ناہموار سطح پر چکر کاٹتا اور ان کی سمت پیش قدمی کرتا آرہا تھا، جم کر رہ گئیں۔ انھیں سپاہیوں کی موٹے جھوٹے پشم کی ٹوپیاں پہلے ہی دکھائی دینے لگی تھیں۔ اب وہ عام سپاہیوں اور افسروں کے مابین امتیاز کر سکتے تھے اور ان کے علم کو اپنے بانس کے ساتھ ٹکراتے دیکھ سکتے تھے۔

''واہ، کیا وقار ہے ان کے کوچ میں!'' باگ راتیاں کے عملے کے کسی رکن نے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

کالم کا ہراول پہلے ہی گھاٹی میں داخل ہو چکا تھا۔ تصادم گھاٹی کے اس جانب ہوگا۔۔۔۔

ہماری رجمنٹ کے، جو ازیں پیشتر ہی ایک معرکہ لڑ چکی تھی، بچے کھچے جوانوں نے جلدی جلدی دوبارہ صف بندی کی اور دائیں طرف ہٹ گئے۔ ان کے پیچھے پیچھے، رجمنٹ سے بچھڑ جانے والوں کو ادھر ادھر منتشر کرتی، چھٹے شاسر کی دو بٹالینیں دل آویز ترتیب بنائے آرہی تھیں۔ ابھی وہ باگ راتیاں کے قریب نہیں پہنچی تھیں لیکن انسانوں کا ہجوم قدم سے قدم ملائے مارچ کرتا آرہا تھا اور پاؤں کی بھاری دھمک سنائی دینے لگی تھی۔ باگراتیاں کے قریب ترین میسرہ تھا۔ اس کا کمپنی کمانڈر خاصی بارعب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کے گول مٹول چہرے پر حماقت ٹپک رہی تھی لیکن وہ بہت مسرور نظر آرہا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جو جھونپڑی سے سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔ فی الحال اس کے ذہن پر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جس طرح بھی ہو وہ اپنے اعلیٰ افسروں کے سامنے دیدہ زیب انداز سے مارچ پاسٹ کرتا گزرے۔

پریڈ کے دوران میں سب سے اگلی صف کے اشخاص کو اپنی ذات پر جو اعتماد ہوتا ہے، اسی اعتماد اور اطمینان کے ساتھ وہ اپنی گٹھیلی ٹانگوں پر آگے کھسکتا، پھسلتا چلا آرہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ چل نہیں رہا بلکہ پیر رہا ہے۔ معمولی سی کوشش کے بغیر وہ بالکل سیدھا تنا ہوا تھا اور جس سہل انداز سے مارچ کر رہا تھا وہ سپاہیوں کے، جو قدم سے قدم ملائے اس کے ساتھ آرہے تھے، بھاری قدموں کی تھاپ سے زبردست تضاد پیش کر رہا تھا۔ وہ اپنی ٹانگ

کے ساتھ دبلی پتلی، مہین اور نازک برہنہ شمشیر چمٹائے ہوئے تھا (یہ شمشیر اتنی چھوٹی اور منحنی تھی کہ کسی طور ہتھیار معلوم نہیں ہوتی تھی)۔ وہ کبھی اپنے اعلیٰ افسروں پر اچٹتی نگاہ ڈالتا اور کبھی پیچھے اپنے جوانوں پر۔ اس کے قوی جثے میں اتنی لچک تھی کہ مڑ کر آگے پیچھے دیکھنے کے باوجود اس کے قدم بالکل صحیح انداز سے زمین پر پڑ رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روح کی ساری قوتیں مجتمع ہو چکی ہیں اور اس بات کا تہیہ کر چکی ہیں کہ وہ اسے اس کے افسروں کے سامنے ممکنہ حد تک بہترین انداز سے گزاریں گی۔ اور خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو رہا ہے۔ ''لیفٹ ... لیفٹ ... لیفٹ ...'' معلوم ہوتا تھا کہ ہر دوسرے قدم پر وہ جی ہی جی میں یہی دہراتا جا رہا ہے۔ سپاہیوں کی متحرک دیوار اس کے ساتھ قدم سے قدم ملائے مارچ کر رہی تھی۔ یہ سپاہی تھیلوں اور ہتھیاروں کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے، ہر چہرے پر اپنے اپنے انداز کی سنجیدگی اور درشتی چھائی ہوئی تھی لیکن وہ سبھی کے سبھی یکساں آہنگ کے ساتھ مارچ کر رہے تھے جیسے یہ سینکڑوں سپاہی اپنے اپنے ذہنوں میں ''لیفٹ ... لیفٹ ... لیفٹ ...'' کی گردان کر رہے ہوں۔ ایک تنومند میجر، جس کی سانس پھول چکی تھی اور جس کا پاؤں اکھڑ گیا تھا، سڑک کے کنارے جھاڑی کے گرد گھوم گیا۔ ایک سپاہی، جو دوسروں سے بچھڑ گیا تھا، اس بات پر ملول تھا کہ وہ دوسروں سے پیچھے کیوں رہ گیا ہے۔ اس نے دوڑ لگا دی تا کہ وہ اپنی کمپنی کے ساتھ جا ملے۔ اس کوشش میں وہ ہانپنے لگا۔ گجنال کا ایک گولہ آیا۔ وہ ہوا کو چیرتا اور باگراتیان اور اس کے ہمراہیوں کے سروں کے اوپر ہی اوپر اڑتا کالم کے بیچ آ گرا جیسے وہ بھی ''لیفٹ ... لیفٹ ... لیفٹ ...'' کے آہنگ سے مسحور ہو گیا ہو اور اس کا ساتھ دینے آ گیا ہو۔

''صفیں ایک دوسرے کے قریب سمٹ جائیں،'' کمپنی کمانڈر کی روح پرور آواز گونجی۔

سپاہی نیم دائرہ بنائے اس جگہ کے، جہاں گولہ گرا تھا، برابر گزرتے رہے۔ ایک معمر نان کمشنڈ افسر، جو مجروحین و ہلاک شدگان کے قریب رک گیا تھا اور یوں پیچھے رہ گیا تھا، لپک جھپک آگے بھاگا آ رہا تھا اور خشم ناک نگاہوں سے مڑ مڑ کر پیچھے دیکھتا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس نے قلانچ بھری اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے لگا۔ نحوست زدہ خاموشی میں ''لیفٹ ... لیفٹ ... لیفٹ ...'' کی آوازیں گونج رہی تھیں اور قدموں کے ایک ساتھ زمین سے ٹکرانے سے یک رنگی موت فضا میں بکھر رہی تھی۔

''شاباش، جوانو!'' باگراتیان نے کہا۔

یوئر—ایک—سی—لینسی—کی خاطر!'' صفوں سے خلط ملط آوازیں آئیں۔

ایک بدمزاج اور اکل کھرے سپاہی نے مارچ کے دوران میں نعرہ لگاتے لگاتے مڑ کر یوں باگراتیان کی طرف دیکھا جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو: ''تمھیں پتا ہی ہے، ہمارے بتانے کی کیا ضرورت ہے؟'' ایک دوسرا منہ پھاڑے چلا رہا تھا۔ اس نے مطلقاً نگاہیں پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ اس کی توجہ بٹ جائے گی۔

رکنے اور تھیلے اتارنے کا حکم دے دیا گیا۔

جو صفیں باگراتیاں سے آگے نکل گئی تھیں، اس نے گھوڑے پر سوار ان کے گرد چکر لگایا اور پھر نیچے اتر آیا۔ اس نے باگیں ایک قازق کے سپرد کر دیں، اپنا چغا اتارا اور وہ بھی اسے تھما دیا۔ پھر اس نے اپنی ٹانگیں سیدھی کیں اور اپنی ٹوپی درست کر کے رکھی۔ فرانسیسی کالم کا ہراول، جس کے افسر آگے آگے آ رہے تھے، پہاڑی کے دامن سے منظر عام پر آ گیا۔

''آگے بڑھو، خدا تمھارا حامی و ناصر ہو!'' باگ راتیاں نے اپنی کراری اور گونج دار آواز میں کہا اور ایک لمحے کے لیے اگلی صف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ پھر وہ اپنے بازوؤں کو آہستہ آہستہ لہراتا، اسپ سواروں کی بے ہنگم چال چلتا غیر ہموار سطح پر یوں قدم آگے بڑھانے لگا کہ اب گرا، اب گرا۔

پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ کوئی نادیدہ طاقت اسے ہنکائے لیے جا رہی ہے اور اسے اپنے رگ و پے میں زبردست خوشی کے دوڑنے کا احساس ہوا۔

فرانسیسی اب قریب پہنچ رہے تھے۔ پرنس آندرے پرنس باگراتیاں کے ساتھ ساتھ جا رہا تھا۔ اسے ان کی کارتوسوں کی پیٹیاں، اور سرخ فیتے بلکہ ان کے چہرے بھی صاف دکھائی دے رہے تھے۔ (اسے ایک معمر فرانسیسی افسر واضح طور پر نظر آیا۔ اس نے ٹانگوں کے گرد ساق پوش لپیٹے ہوئے تھے اور اس کے پاؤں ٹیڑھے میڑھے تھے۔ وہ جھاڑیوں کا سہارا لیتا بدقت پہاڑی سر کر رہا تھا۔) پرنس باگ راتیاں نے مزید کوئی حکم نہ دیا۔ وہ چپ سادھے صفوں کے آگے چلتا رہا۔

دفعتاً فرانسیسیوں کے مابین پہلے ایک، پھر دوسری، اس کے بعد تیسری گولی کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ ان کی شکستہ صفوں سے دھواں بلند ہونے لگا اور توپیں شعلے اگلنے لگیں۔ ہمارے متعدد جوان نیچے گر پڑے۔ ان میں وہ افسر بھی، جس کا چہرہ گول مٹول تھا اور جو اتنی آن بان اور تمکنت سے مارچ کرتا آیا تھا، شامل تھا۔ لیکن جونہی پہلا گولہ چھٹنے کی آواز آئی، باگ راتیاں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور نعرہ لگایا: ''شاباش!''

''شا۔با۔ش، شا۔با۔ش!'' یہ آواز صف بہ صف آخری کنارے تک گونجنے لگی۔ ہمارے جوانوں کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ وہ باگراتیاں سے ہی نہیں، بلکہ ایک دوسرے سے بھی آگے نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کی اپنی صفیں قدرے انتشار کا شکار ہو رہی تھیں لیکن ان کا شوق اور مسرت مہمیز کا کام دے رہی تھی اور وہ بے ترتیب غنیم سے نپٹنے بسرعت پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔[37]

19

چھٹے شاسروں کے حملے نے ہمارے میمنے کی پسپائی کے لیے آڑ مہیا کر دی۔ قلب میں توشن کی بھولی بسری توپ گڑھی شیون گرابن کو آگ لگانے میں کامیاب رہی تھی اور یوں اس نے فرانسیسی پیش قدمی میں رخنہ ڈال دیا تھا۔ فرانسیسی آگ، جسے ہوا پھیلا رہی تھی، بجھانے کے لیے رک گئے اور ہمیں پسپا ہونے کے لیے وقت مل گیا۔ قلب کو گھاٹی کے

دوسری جانب ہٹا لیا گیا۔ اس کام میں تعجیل کی گئی اور کچھ افراتفری بھی دیکھنے میں آئی۔ تاہم مختلف یونٹیں ایک دوسرے میں خلط ملط نہ ہوئیں۔ لیکن میسرے پر، جو پیادہ فوج کی ازوف اور پادولیار جمنٹوں اور پاولوگرات ہوزاروں پر مشتمل تھا، آناً فاناً حملہ ہو گیا۔ لان کی سربراہی میں برتر فرانسیسی سپاہ نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا اور اس میں خلفشار بپا کر دیا۔ باگراتیاں نے ژرکوف کو یہ حکم دے کر کمانڈنگ جرنل کے پاس بھیجا کہ میسرہ بلا تاخیر پیچھے ہٹ جائے۔

ژرکوف نے اپنی ٹوپی سے ہاتھ اٹھائے بغیر چابک دستی کے ساتھ اپنا گھوڑا موڑا اور چلا ہو گیا۔ لیکن وہ باگراتیاں سے چند قدم ہی آگے گیا ہوگا کہ اس کی ہمت جواب دے گئی۔ اس پر اس قدر زبردست خوف غالب آ گیا کہ جہاں خطرہ تھا، وہاں جانے کو اس کا جی نہ مانا۔

جب وہ میسرے میں پہنچ گیا تو بجائے اس کے کہ وہ آگے وہاں جاتا جہاں فائرنگ ہو رہی تھی، وہ ایسی جگہ جرنیل اور اس کے عملے کو تلاش کرنے لگا جہاں ان کے ہونے کا کوئی خاص امکان نہیں تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پیغام پہنچانے میں ناکام رہا۔

سینارٹی کے اعتبار سے میسرے کی کمان کا حق اس کمانڈر کو حاصل تھا جس کی رجمنٹ کا کوتوزوف نے براؤناؤ میں معائنہ کیا تھا اور جس میں دلوخوف عام سپاہی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دے رہا تھا۔ لیکن انتہائی بائیں بازو کی کمان پاولوگرات رجمنٹ کے، جس میں رستوف شامل تھا، کمانڈر کو سونپ دی گئی تھی۔ اس کا نتیجہ غلط فہمی کی صورت میں برآمد ہوا۔ دونوں کمانڈر ایک دوسرے سے نالاں تھے اور ایسے وقت، جب کہ میمنہ پہلے ہی کچھ دیر سے معرکہ آرائی میں الجھا ہوا تھا اور فرانسیسی ہلہ بول چکے تھے، وہ بحث مباحثے میں، جس کا واحد مقصد ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنا تھا، مشغول تھے۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ دونوں رجمنٹیں، ایک پیادہ اور دوسری گھڑسوار، کسی لحاظ سے بھی مبارزت کے لیے، جو سروں پر منڈلا رہی تھی، تیار نہ تھیں۔ عام سپاہی سے لے کر جرنیل تک کسی کو بھی لڑائی چھڑنے کی توقع نہیں تھی اور سبھی دل جمعی سے پرامن سرگرمیوں میں مصروف تھے۔ سوار گھوڑوں کو چبینا کھلا رہے تھے اور پیادہ سپاہی ایندھن اکٹھا کر رہے تھے۔

''یہ ٹھیک ہے کہ رتبے کے اعتبار سے وہ مجھ سے سینئر ہے،'' ہوزاروں کے جرمن کرنل نے تمتماتے اور جرمن لہجے میں اپنے ایجوٹنٹ سے، جو گھوڑے پر سوار اس کے پاس پہنچا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ ''چنانچہ جو اس کا جی چاہے، کرے، میں اپنے ہوزاروں کی قربانی نہیں دے سکتا۔ بگلچی! پسپائی کا بگل بجا دو!''

لیکن معاملات گڑبڑا رہے تھے اور فوری توجہ کے متقاضی تھے۔ میمنے اور قلب میں گجنالوں اور بندوقوں کی ملی جلی آوازیں دہاڑ رہی تھیں۔ لان کے چابک دست نشانچیوں کے کوٹ ازیں پیشتر ہی دکھائی دینے لگے تھے کیونکہ وہ بھی چکی بند عبور کر چکے تھے اور وہ بالکل قریب صف بندی میں مصروف تھے۔

وہ جرنیل، جس کے ہاتھ میں پیادہ فوج کی کمان تھی، لڑکھڑاتے ڈگمگاتے اپنے گھوڑے تک پہنچا، اس پر سوار ہوا، سیدھا تن کر بیٹھا اور پاولوگرات رجمنٹ کے کمانڈر کی طرف چل پڑا۔ دونوں کمانڈروں نے اپنی گردنوں

کو ذرا سا خم دے کر ایک دوسرے کو سلام کیا لیکن اندر سے ان کے دل صاف نہیں تھے، ان میں بغض اور کدورت بھری ہوئی تھی۔

"کرنل، میں ایک بار پھر عرض کیے دیتا ہوں،" جرنیل نے کہا۔ "میں اپنے نصف جوان جنگل میں نہیں چھوڑ سکتا۔ میری آپ سے التجا ہے کہ اس مقام پر آپ قابض ہو جائیں اور حملے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔"

"اور میری آپ سے التجا ہے کہ جس پھڈے سے آپ کا تعلق نہ ہو، اس میں ٹانگ نہ پھنسائیں،" کرنل نے ترش روئی سے جواب دیا۔ "اگر آپ اسپ سوار فوج کے افسر ہوتے۔۔۔"

"کرنل، میں اسپ سوار فوج کا افسر تو نہیں ہوں لیکن میں روسی فوج کا جرنیل ضرور ہوں۔ اور اگر آپ کو اس حقیقت کا علم نہ ہو۔۔۔"

"یور ایکسی لینسی، میں اس سے پوری طرح آگاہ ہوں،" کرنل نے اچانک چلا کر کہا۔ وہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہا تھا اور اپنے گھوڑے کو مہمیز لگایا چاہتا تھا۔ "ذرا نوازش فرمائیں اور میرے ساتھ اگلی صف تک تشریف لے چلیں۔ آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ یہ مقام قابل مدافعت نہیں ہے۔ میں آپ کا جی خوش کرنے کے لیے اپنے جوانوں کو تباہی کے غار میں نہیں دھکیل سکتا۔"

"کرنل، آپ اپنا مقام بھول رہے ہیں۔ میرا اپنا جی خوش کرنے سے کوئی تعلق نہیں۔ میں ایسی بات کہنے کی اجازت نہیں دیتا ہوں۔"

جرنیل نے کرنیل کی درخواست کو اپنی جرأت کے لیے چیلنج تصور کیا۔ اس نے اپنا سینہ پھلایا اور ناک بھوں چڑھاتے اس کے ساتھ گھوڑے پر اگلی صفوں کی طرف چل پڑا جیسے وہاں گولیوں کی بوچھاڑ میں ان کے تمام اختلافات کا فیصلہ ہو جائے گا۔ وہ اگلی صف میں پہنچ گئے۔ متعدد گولیاں سنسناتی ان کے برابر سے گزر گئیں اور وہ منہ باندھے رک گئے۔ اگلی صف سے کوئی نئی چیز دیکھنے کو نہ ملی بلکہ جہاں وہ پہلے کھڑے تھے، وہاں سے بھی یہ صاف نظر آ رہا تھا کہ جھاڑیوں اور گھاٹی نے اسپ سوار فوج کے لیے کسی قسم کی کارروائی کرنا ناممکن بنا دیا ہے اور یہ کہ فرانسیسی ہمارے میسرے کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ جرنیل اور کرنیل نے ایک دوسرے کی جانب معنی خیز اور قہر آلود نگاہوں سے دیکھا جیسے دو مرغے لڑائی کے لیے پر تول رہے ہوں اور وہ دونوں میں سے ہر ایک کی کوشش بے سود ہی تھی، کہ وہ حریف میں بزدلی کی کوئی رمق ڈھونڈ سکے۔ دونوں آزمائش میں پورے اترے۔ چونکہ کہنے سننے کے لیے کچھ رہ نہیں گیا تھا اور چونکہ دونوں میں سے کوئی بھی دوسرے کو یہ دعویٰ جتلانے کا موقع نہیں دینا چاہتا تھا کہ پہلے وہ گولیوں کی مار کے میدان سے پیچھے ہٹا ہے، ممکن ہے کہ وہ غیر معین عرصے تک یونہی کھڑے رہتے اور ایک دوسرے کی جرأت اور حوصلے کا امتحان لیتے رہتے اگر انھیں اپنے پیچھے جنگل میں تڑتڑاہٹ اور گھٹے گھٹے اور خلط ملط شور و غل کی آوازیں سنائی نہ دیتیں۔ وہ سپاہی جو سوختنی لکڑی اکٹھا کرنے میں مصروف تھے، فرانسیسیوں نے ان پر حملہ کر دیا تھا۔ اب ہوزاروں کے لیے پیادہ فوج کے ساتھ پسپائی اختیار کرنا ممکن نہ رہا۔ بائیں جانب فرانسیسی فوج نے

ان کی پسپائی کی تمام راہیں مسدود کر دی تھیں۔ ان حالات میں لڑائی کا میدان ان کے لیے خواہ کتنا ہی غیر موزوں کیوں نہ ہوتا، ان کے لیے یہ ناگزیر ہو گیا تھا کہ وہ غنیم پر حملہ کریں تا کہ اپنے لیے گزرنے کا راستہ بنا سکیں۔

جس سکواڈرن میں رستوف متعین تھا، اسے اتنا بھی موقع نہ ملا کہ وہ ڈھنگ سے گھوڑوں پر سوار ہو جاتے۔ انھیں رکنا اور غنیم کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے اور غنیم کے مابین کوئی چیز حائل نہیں تھی۔ صرف بے یقینی اور خوف کی بھیانک لکیر دونوں کے مابین بالکل اسی طرح کھنچی ہوئی تھی جس طرح زندگی اور موت کے درمیان ایک باریک لکیر ہوتی ہے۔ سبھی اس لکیر سے آگاہ تھے اور یہ سوال، کہ آیا وہ اس لکیر کو پار کریں گے یا نہیں اور اگر کریں گے تو کیسے، ان سب کو پریشانی میں ڈال رہا تھا۔

کرنل گھوڑے پر سوار اگلی صف تک آیا۔ اس نے برافروختگی سے افسروں کے سوالات کے جوابات دیے اور ایک ایسے شخص کی طرح، جس کی جان پر بنی ہوئی ہو اور وہ اپنی مرضی کرنے پر تلا ہوا ہو، اس نے کوئی حکم دے دیا۔ کسی شخص نے بھی واضح انداز سے تو کچھ نہ کہا لیکن سارے سکواڈرن میں حملے کی افواہ پھیل گئی۔ صف بندی کا حکم گونجنے لگا اور میانوں سے شمشیریں کھنچنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ تاہم اپنی جگہ سے ہلا کوئی بھی نہ۔ میسرے کے پیادہ فوجیوں اور ہوزاروں دونوں کو محسوس ہونے لگا کہ کمانڈروں کو خود معلوم نہیں کہ کیا کرنا ہے اور ان کی یہ ہچکچاہٹ جوانوں میں سرایت کرنے لگی۔

''کاش، یہ ذرا جلدی کریں!'' رستوف نے سوچا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ حملے کے ساتھ جو مسرتیں وابستہ ہوتی ہیں جن کے متعلق اس نے اپنے ساتھیوں سے اتنا کچھ سن رکھا تھا، انھیں چکھنے کی گھڑی آ پہنچی ہے۔

''جوانو، آگے بڑھو، خدا تمھارا حامی و ناصر ہو!'' دینی سوف کی کڑاکے دار آواز سنائی دی۔ ''بڑھو، تیزی سے آگے بڑھو!''

اگلی صف کے گھوڑوں کے پٹھے جھولنے لگے۔ رخ (رستوف کا گھوڑا) منہ زور ہو گیا، اس نے اپنی لگام گھسیٹی اور خود ہی چلنے لگا۔

دائیں جانب رستوف کو اپنے ہوزاروں کی سب سے اگلی صفیں نظر آئیں اور ان سے بھی کہیں آگے ایک ملگجی لکیر تھی۔ وہ اسے صحیح طور پر پہچان نہ سکا لیکن اس نے اسے غنیم محمول کیا۔ گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں لیکن یہ کہیں دور سے آ رہی تھیں۔

''تیز ترا!'' حکم کا لفظ سنائی دیا۔ رستوف کو محسوس ہوا کہ رخ کے پہلو نیچے ڈھلک رہے ہیں۔ دراصل گھوڑا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا۔

رستوف نے اپنے گھوڑے کی نقل و حرکت کا پیشگی اندازہ لگا لیا تھا اور وہ مسرت سے جھوم رہا تھا۔ اس نے اپنے سامنے ایک اکلوتا درخت دیکھ لیا تھا۔ ابتداً یہ درخت عین اس جگہ کھڑا تھا جہاں اس کے خیال میں اتنی ڈراؤنی لکیر تھی لیکن اب جب کہ وہ اس لکیر کو عبور کر چکا تھا، اسے نہ صرف یہ کہ کسی ڈراؤنی شے سے واسطہ نہیں تھا بلکہ اس

کے برعکس ہر لمحہ پہلے کی نسبت زیادہ راحت فشاں اور دلچسپ سے دلچسپ تر ہوتا جا رہا تھا۔

"اخاہ، میں ان کے کشتوں کے پشتے لگا دوں گا! مزہ آجائے گا!" رستوف نے سوچا۔ اس نے رخ کو مہمیز لگایا اور گھوڑے کو پوری رفتار سے دوڑا دیا۔ چنانچہ وہ دوسروں سے آگے نکل گئے۔ دشمن اب دکھائی دینے لگا تھا۔ اچانک برچ درخت کے دستہ جاروب کی مانند کوئی خاصی چوڑی چیز سنسناتی سکواڈرن کے بیچ میں سے گزر گئی۔ رستوف نے ضرب لگانے کے لیے اپنی شمشیر بلند کی لیکن عین اس لمحے ایک سپاہی نے، جس کا نام نکولنکو تھا اور جو اس سے آگے آگے گھوڑا سرپٹ بھگائے جا رہا تھا، اپنا رخ بدل دیا اور رستوف کو یوں محسوس ہوا، جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ غیر فطری رفتار سے بھاگا بھی جا رہا تھا لیکن اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں رہا تھا۔ عقب سے ایک اور ہوزار، جس کا نام بندار چوک تھا اور جسے وہ جانتا تھا، اس سے آ ٹکرایا اور اسے خشم ناک نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ بندار چوک کا گھوڑا ابدک گیا اور سرپٹ آگے بھاگنے لگا۔

"یہ کیا؟ میں ہل جل نہیں رہا؟ میں گر پڑا ہوں؟ ہلاک ہو گیا ہوں؟" رستوف نے اپنے آپ سے یہ سوالات پوچھے اور اسی لمحے ان کے جوابات بھی دیے۔ وہ کھیت کے بیچ میں اکیلا تھا۔ اسے اپنے گرد و پیش حرکت پذیر گھوڑے اور سوار تو نظر نہ آئے، البتہ غیر متحرک زمین اور ووڈھ[38] ضرور دکھائی دے رہے تھے۔ اس کے نیچے گرم گرم خون تھا۔

"نہیں، میں زخمی ہو چکا ہوں اور میرا گھوڑا ہلاک۔"

رخ نے اپنی اگلی ٹانگوں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی لیکن اس سے اٹھا نہ گیا اور وہ دوبارہ نیچے گر پڑا۔ اس نے اپنے سوار کی ٹانگ بھی نیچے دبا لی۔ گھوڑے کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ زور لگاتا لیکن اٹھنے میں ناکام رہتا۔ رستوف نے بھی اٹھنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا نیام زین میں پھنس گیا تھا۔ ہمارے آدمی کہاں تھے اور فرانسیسی کہاں تھے، اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس کے آس پاس کوئی ذی روح نہیں تھا۔

اس نے اپنی ٹانگ چھڑائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ "وہ لکیر جس نے دونوں افواج کے مابین اتنی واضح حد فاصل قائم کر دی تھی، کہاں ہے؟ یہ کس فریق کے قبضے میں ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن کوئی جواب نہ دے سکا۔ "کیا میرے ساتھ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہے؟ کیا یہاں یہی کچھ ہوتا ہے؟ اگر ایسا ہے، پھر آدمی کو ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟" اس نے اٹھتے اٹھتے اپنے آپ سے پوچھا۔ اس لمحے اسے یہ محسوس ہوا کہ اس کے بازو کے ساتھ، جو سُن ہو چکا تھا، کوئی فالتو چیز لٹک رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ہاتھ اس کا اپنا ہاتھ نہیں ہے۔ اس نے اس کا بغور معائنہ کیا لیکن وہاں اسے خون کا کوئی نشان نظر نہ آیا۔

"اخاہ، یہاں کچھ لوگ ہیں!" اس نے متعدد اشخاص کو اپنی طرف بھاگتے دیکھ کر سوچا۔ اس کے دل کا کنول کھل گیا۔ "یہ میری مدد کریں گے۔"

جو شخص سب سے آگے آگے بھاگا آ رہا تھا، اس کا رنگ گندمی، چہرہ دھوپ میں جھلسا ہوا، اور ناک خم دار

تھی۔ اس کے سر پر نامانوس شاکو (ٹوپی) تھی اور وہ نیلے کوٹ میں ملبوس تھا۔ اس کے عقب میں دو اور اشخاص اور ان سب کے پیچھے متعدد مزید آدمی بھاگے آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کوئی عجیب بات کہی لیکن روسی میں نہیں۔ عقب میں اسی قسم کی ٹوپیاں پہنے جو لوگ تھے، ان میں ایک روسی ہوزار تھا۔ انھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ رکھا تھا اور اس کے پیچھے کوئی اس کا گھوڑا تھامے ہوئے تھا۔

''یہ ضرور ہمارا ہی کوئی جوان ہوگا۔ اسے انھوں نے قیدی بنالیا ہے۔... ہاں۔ کیا یہ مجھے بھی پکڑ لیں گے؟ یہ کون لوگ ہیں؟'' رستوف سوچ رہا تھا۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ''کیا یہ فرانسیسی ہیں؟'' وہ ٹکٹکی باندھ کر فرانسیسیوں کو، جو قریب آ رہے تھے، دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ ایک ہی ثانیہ قبل وہ انھیں لوگوں تک پہنچنے اور ان کے کشتوں کے پشتے لگانے کے لیے سرپٹ بھاگا جا رہا تھا، اب ان کا قرب اسے اتنا بھیانک معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے لیے اپنی آنکھوں پر یقین کرنا مشکل تھا۔ ''یہ کون ہیں؟ یہ کیوں بھاگے آ رہے ہیں؟ کیا یہ میری طرف آ رہے ہیں؟ واقعی میری طرف آ رہے ہیں؟ اور کیوں؟ مجھے مارنے کے لیے؟ مجھے، جس سے ہر کوئی پیار کرتا ہے؟'' اسے اپنی ماں کی، اپنے خاندان کی، اپنے دوستوں کی، سبھی کی محبت یاد آئی اور دشمن اسے ہلاک کرنے کے ارادے باندھ رہا ہے، ناممکن۔ ''لیکن شاید ـــ وہ مجھے ہلاک کرنا ہی چاہتے ہیں!'' وہ دس سیکنڈ سے زیادہ اپنی جگہ کھڑا رہا۔ گل محمد بنا رہا۔ اسے اپنی صورت حال کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

وہ فرانسیسی، وہی جس کی ناک خم دار تھی، جو سب سے آگے آگے تھا، اب اتنا قریب پہنچ چکا تھا کہ اس کا چہرہ دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔ یہ شخص، جو اپنی سنگین آگے جھکائے اور سانس روکے تیز قدموں اس کی جانب بھاگا آ رہا تھا، اس کے جوشیلے اور اجنبی سراپے نے رستوف کے دل پر دہشت بٹھا دی۔ اس نے اپنا پستول پکڑا لیکن گولی چلانے کے بجائے اسے فرانسیسی کی طرف پھینک دیا اور خود پورا زور لگا کر جھاڑی کی طرف بھاگنے لگا۔ اینس کے پل کی جانب پیش قدمی کے دوران میں اس کے ذہن میں جو شکوک ابھرے تھے اور جس کشمکش سے وہ دوچار ہوا تھا، اب جبکہ وہ بھاگا جا رہا تھا، وہ دونوں مفقود ہو چکے تھے۔ اب اس کے قلب میں جو احساسات سر اٹھا رہے تھے، وہ وہی تھے جو اس خرگوش کے، جو شکاری کتوں سے جان چھڑانے کے لیے ہوا سے باتیں کرتا جاتا ہے، دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے سارے وجود کو اس واحد جذبے نے اپنی گرفت میں جکڑ لیا تھا کہ اس کی پرشباب اور مسرور و مطمئن زندگی کو خطرہ لاحق ہے۔ وہ اندھا دھند باڑوں کو پھلانگتا اس بے سوچی سمجھی برق رفتاری کے ساتھ، جس کا مظاہرہ وہ کھیلوں کے دوران میں کیا کرتا تھا، کھیت پار کرنے لگا۔ کبھی کبھار وہ اپنا زرد، نیک طینت اور نوعمر چہرہ گھما کر پیچھے دیکھتا اور اسے اپنے سارے جسم میں دہشت کی لہر دوڑتی محسوس ہوتی۔ ''نہیں، بہتر ہے کہ میں دیکھوں ہی نہ۔'' اس نے سوچا لیکن جب وہ جھاڑیوں کے قریب پہنچا، اس نے ایک بار پھر سرسری نگاہوں سے پیچھے دیکھا۔ فرانسیسی پیچھے رہ گئے تھے بلکہ وہ جو سب سے آگے تھا، اس کی رفتار بھی دھیمی ہو گئی تھی اور پیچھے مڑ کر اپنے کسی ساتھی سے، جو خاصا دور تھا، چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔ رستوف نے قدم روک

لیے۔ ''کہیں نہ کہیں کوئی غلطی ہوئی ہے،'' وہ سوچنے لگا۔ ''یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ مجھے ہلاک کرنا چاہتے ہوں۔''
دریں اثنا اسے اپنا بایاں بازو اتنا بوجھل محسوس ہونے لگا جیسے اس کے ساتھ سو پاؤنڈ کا وزن لٹکا دیا گیا ہو۔ وہ مزید دوڑ لگانے سے معذور تھا۔ فرانسیسی بھی رک گئے اور انھوں نے شست باندھ لی۔ گولی، پہلے ایک، پھر دوسری، اس کے قریب سے سنسناتی گزر گئی۔ اس نے اپنی بچی کھچی قوت مجتمع کی، اپنا بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ میں پکڑا اور جھاڑیوں کی جانب بھاگنے لگا۔ جھاڑیوں میں روس کے مشاق نشانچی تھے۔

20

وہ پیادہ رجمنٹیں، جن پر بے خبری میں جنگل میں حملہ ہوا تھا، بھاگ پڑیں۔ مختلف کمپنیاں آپس میں خلط ملط ہوگئیں اور یوں انھوں نے بے ترتیب ہجوموں کی صورت میں پسپائی اختیار کرلی۔ ایک سپاہی خوف و ہراس کے عالم میں بے تکا نعرہ ''کٹ گئے!'' جو لڑائی میں اتنا بھیانک محسوس ہوتا ہے، لگانے لگا۔ اور سارا ہجوم دہشت کے احساس کے ساتھ ساتھ اس نعرے کی لپیٹ میں آگیا۔

''گھیرے میں آگئے! کٹ گئے! مارے گئے!'' وہ چلاتے اور بھاگتے جا رہے تھے۔

یونہی جرنیل کو اپنے عقب میں فائرنگ اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دیں، اسے احساس ہوا کہ اس کی رجمنٹ کے ساتھ کوئی ناگفتی واردات ہوگئی ہے۔ وہ سالہا سال سے فوج میں خدمات سرانجام دے رہا تھا، اسے مثالی افسر تصور کیا جاتا تھا اور اسے کبھی ملامت نہیں کی گئی تھی۔ جب اسے یہ خیال آیا کہ شاید اب اسے غفلت یا نااہلی کا مرتکب قرار دے دیا جائے گا، اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اب اسے نہ تو نافرمان گھڑسوار کرنل یاد رہا اور نہ جرنیل کی حیثیت سے اپنے وقار کا دھیان رہا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسے نہ تو خطرے کا کوئی احساس رہا اور نہ یہ یاد رہا کہ اسے اپنی ذات کا کیسے تحفظ کرنا ہے۔ اس نے اپنی کاٹھی کی اگلی موٹھ پکڑی، گھوڑے کو مہمیز لگایا اور گولیوں کی بوچھاڑ میں، جو اس کے چاروں اطراف گر رہی تھیں لیکن خوش قسمتی سے وہ ان کی زد سے بچتا جا رہا تھا، اسے سرپٹ اپنی رجمنٹ کی سمت میں دوڑانے لگا۔ اسے صرف ایک ہی چیز کی تمنا تھی: وہ یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ہو کیا رہا ہے اور اگر اس سے کسی غلطی کا ارتکاب ہوا ہے، وہ اس کی تلافی یا ازالہ کیسے کرسکتا ہے تاکہ بائیس سال کی مثالی ملازمت کے بعد، جس کے دوران میں اسے کبھی ملامت نہیں کی گئی تھی، اب اس پر کوئی حرف نہ آئے۔

فرانسیسیوں کے مابین سرپٹ گھوڑا دوڑاتے دوڑاتے وہ صحیح سلامت جنگل کے پار اس میدان میں پہنچا جہاں ہمارے جوان احکام کی پروا کیے بغیر تتر بتر بھاگے جا رہے تھے اور پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے۔ اخلاقی حیص بیص کی گھڑی، جو جنگوں کے پانسے پلٹ دیتی ہے، آپہنچی تھی۔ کیا سپاہیوں کا یہ بے ہنگم ہجوم اپنے کمانڈر کی آواز پر کان دھرے گا یا وہ محض اس پر اچٹتی نگاہ ڈالے گا اور بھاگتا رہے گا؟ وہ اپنی بلند اور گونج دار آواز سے، جو کبھی ان کے دلوں پر دہشت بٹھا دیتی تھی، چنگھاڑ رہا تھا۔ عالم غیظ و غضب میں اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا، اس کی

شکل بگڑ گئی تھی، اور وہ پہچانا نہیں جا رہا تھا۔ وہ فضا میں اپنی شمشیر لہرا رہا تھا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سپاہی شور و غل مچاتے، فضا میں گولیاں چلاتے اور احکام کی خلاف ورزی کرتے اندھا دھند بھاگے جا رہے تھے۔ وہ اخلاقی تلون، جو جنگوں کے پانسے پلٹ دیتا ہے، بظاہر اپنا وزن خوف و ہراس کے پلڑے میں ڈال رہا تھا۔

ایک تو فضا میں بارود کا دھواں رچا بسا تھا۔ دوسرے جرنیل نے چیخ پکار بھی بہت کی تھی۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر کھانسی کا دورہ پڑ گیا اور وہ مایوسی کے عالم میں پتھر کا بت بن کر کھڑا ہو گیا۔ عین اس وقت جب ہر چیز ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی، نہ جانے فرانسیسی، جنھوں نے حملہ کیا تھا، کیوں اچانک اور بظاہر بلاوجہ پچھلی جانب بھاگ اٹھے اور جنگل کے پار کہیں غائب ہو گئے۔ اب درختوں کے بیچ روس کے مشاق نشانچیوں کی شکلیں نظر آنے لگیں۔ یہ تموخن کی کمپنی تھی اور یہ واحد کمپنی تھی جس نے جنگل میں اپنا نظم و ضبط برقرار رکھا تھا۔ انھوں نے ایک کھائی میں گھات لگائی اور غیر متوقع طور پر فرانسیسیوں پر ہلہ بول دیا۔ حالانکہ تموخن کا اسلحہ صرف ایک شمشیر پر مشتمل تھا، وہ اتنے فلک شگاف نعرے لگاتا اور اتنے مجنونانہ عزم کا مظاہرہ کرتا غنیم کی طرف بھاگا کہ فرانسیسیوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ ملا، انھوں نے اپنے ہتھیار پھینکے اور دوڑ لگا دی۔ دلوخوف نے، جو تموخن کے برابر برابر بھاگا آ رہا تھا، نہایت قریب سے ایک فرانسیسی کو اپنے نشانے کی زد میں لیا اور اسے ہلاک کر دیا۔ پھر وہ پہلا شخص تھا جس نے ایک فرانسیسی کو، جو ہتھیار ڈال رہا تھا، کالر سے پکڑ لیا۔ ہمارے بھگوڑے واپس آ گئے۔ بٹالینیوں کو از سر نو ترتیب دیا گیا اور فرانسیسی، جنھوں نے ہمارے میسرے کو تقریباً دو حصوں میں بانٹ دیا تھا، وقتی طور پر پیچھے دھکیل دیے گئے۔ ہمارے محفوظ دستے وہاں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور بھاگنے والوں نے قدم روک لیے۔

رجمنٹل کمانڈر میجر اکانوموف کے ساتھ پل پر کھڑا تھا اور پسپا ہونے والی کمپنیوں کی واپسی کا معائنہ کر رہا تھا۔ اتنے میں ایک سپاہی آیا۔ اس نے اس کی رکاب تھامی اور قریب قریب اس کے جسم کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس سپاہی نے نفیس کپڑے کا نیلا کوٹ پہنا ہوا تھا لیکن اس کے پاس نہ تھیلا تھا اور نہ شاکو۔ اس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور اس کے کندھے پر فرانسیسی کارتوسوں کی پیٹی لٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں افسروں کی شمشیر تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا۔ اس کی نیلی آنکھیں گستاخانہ انداز سے رجمنٹل کمانڈر کو گھور رہی تھیں اور اس کے ہونٹ متبسم تھے۔ اگرچہ کمانڈر میجر اکانوموف کو احکام دینے میں مصروف تھا، وہ اس سپاہی پر توجہ دیے بغیر نہ رہ سکا۔

"یور ایکسی لینسی، یہ رہیں مال غنیمت کی دو نشانیاں،" دلوخوف نے فرانسیسی شمشیر اور کارتوسوں کی پیٹی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں نے ایک افسر کو قیدی بنا لیا ہے۔ میں نے کمپنی کو روک لیا تھا،" اس نے رک رک کر کہا۔ تھکاوٹ سے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ "ساری کمپنی گواہی دے سکتی ہے۔ یور ایکسی لینسی، میری درخواست ہے کہ آپ یہ سب کچھ یاد رکھیں!"

"بہت اچھا! بہت اچھا!" جرنیل نے جواب دیا اور وہ دوبارہ میجر اکانوموف کی طرف متوجہ ہو گیا۔

لیکن دلوخوف اپنی جگہ کھڑا رہا۔ اس نے رومال کی، جو اس نے اپنے سر کے گرد لپیٹا ہوا تھا، گرہیں کھولیں،

اسے اتارا اور اپنے بالوں میں منجمد خون دکھانے لگا۔
"سنگین کا زخم۔ میں سب سے اگلی صف میں رہا۔ یورُ ایکسی لینسی، یاد رکھیں۔"

توشن کی توپ گڑھی فراموش کی جا چکی تھی اور معرکہ آرائی کے بالکل اختتام پر پرنس باگ راتیاں نے، جسے ابھی تک قلب سے گولہ باری کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، ڈیوٹی افسر اور بعدازاں پرنس آندرے کو یہ حکم دے کر بھیجا کہ گجنالیں حتی الامکان جلد از جلد پیچھے ہٹالی جائیں۔ توشن کی گجنالوں کو آڑ مہیا کرنے کی غرض سے اس کے قریب جو سپاہ متعین کی گئی تھی، معرکے کے عین درمیان میں کسی کے حکم پر واپس آ گئی تھی لیکن گجنالوں نے اپنی فائرنگ جاری رکھی۔ فرانسیسیوں نے ان پر اس لیے قبضہ نہ کیا کیونکہ یہ بات ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتی تھی کہ کوئی شخص، جس کی گجنالوں کو قطعاً کوئی تحفظ حاصل نہ ہو، گولہ باری جاری رکھنے کا حوصلہ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اس بٹالین کی جوشیلی کارروائیوں سے فرانسیسیوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ روسی فوج کا بیشتر حصہ قلب میں مرکوز ہو گا۔ دو مرتبہ انھوں نے اس مقام پر طوفانی حملہ کرنے کی کوشش کی لیکن دونوں ہی مرتبہ پہاڑی پر نصب ان چار گجنالوں نے، جنھیں کوئی آڑ حاصل نہیں تھی، انھیں پیچھے بھگا دیا۔

پرنس باگ راتیاں ابھی زیادہ دور نہیں گیا ہو گا کہ توشن شیون گرابرن کو آگ لگانے میں کامیاب ہو گیا۔

"دیکھو، دیکھو! کیسے چیخ پکار کر رہے ہیں! آگ لگ گئی! گاؤں جل رہا ہے! دھواں دیکھو! بہت خوب! بہت اعلیٰ! وہ دھواں دیکھو، دیکھو تو سہی!" توپ گڑھی کا عملہ جوش و خروش سے نعرے بلند کر رہا تھا۔ ان کے حوصلے بلند ہو چکے تھے۔

احکام کا انتظار کیے بغیر تمام گجنالیں آگ کی جانب، جس نے وسیع و عریض رقبے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، گولے برسائے جا رہی تھیں۔ جب کوئی گولہ داغا جاتا "واہ، واہ! شاباش" کا شور و غل بپا ہو جاتا۔ "بہت اعلیٰ! وہ مارا! دیکھو۔ کیا نشانہ لگا ہے!" معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کو اکسا رہے ہیں اور ایک دوسرے کی پیٹھ ٹھونک رہے ہیں۔ ادھر ہوا نے آگ کو اور بھی بھڑکا دیا تھا اور وہ سرعت سے پھیلتی جا رہی تھی۔ جو فرانسیسی کالم گاؤں سے آگے بڑھ آئے تھے، واپس لوٹ گئے لیکن انھیں یہاں جو زک اٹھانا پڑی تھی، اس کا بدلہ چکانے کے لیے غنیم نے گاؤں کی شرقی سمت میں دس توپیں گاڑ دیں اور توشن کی توپ گڑھی پر فائرنگ شروع کر دی۔

گاؤں کو آگ لگانے اور فرانسیسیوں پر گولے برسانے میں قسمت نے ہمارے جوانوں کو جس کامیابی سے ہمکنار کیا تھا، اس پر بچگانہ انداز سے خوشیاں منانے کے دوران میں انھوں نے غنیم کی ان توپوں کی طرف دھیان ہی نہ دیا۔ ہمارے توپچیوں کو ان کی موجودگی کا علم تب ہوا جب پہلے دو اور ان کے مابعد مزید چار گولے ہماری توپوں کے مابین آ گرے۔ ایک گولے نے دو گھوڑوں کو اگلے جہان پہنچا دیا اور دوسرے نے گولے بارود کے چھکڑے

کے کوچوان کی ٹانگ اڑادی۔ تاہم ہمارے جوانوں کا جو جذبہ ایک مرتبہ بیدار ہو چکا تھا، وہ سرد نہ ہوا، صرف اس کی نوعیت تبدیل ہو گئی۔ جو گھوڑے ہلاک ہو گئے تھے، ان کی جگہ محفوظ توپ گاڑی کے گھوڑے جوت دیے گئے۔ زخمیوں کو وہاں سے ہٹالیا گیا اور دس توپوں کے مقابلے میں چار گجنالیں ڈٹ گئیں۔ توشن کا ایک ساتھی افسر معرکہ آرائی کے آغاز میں ہی جاں بحق ہو گیا تھا اور ایک گھنٹے کے اندر اندر گجنالوں پر تعینات عملے کے چالیس ارکان میں سے سترہ پھٹڑ ہو چکے تھے۔ لیکن ان کے حوصلوں اور ولولوں میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ دو مرتبہ انھیں فرانسیسی اپنے بالکل قریب نیچے دکھائی دیے اور انھوں نے ان پر گریپ شاٹ برسا دیے۔

ناٹا توشن اپنی ناتواں اور بے ڈھنگی حرکات وسکنات کے ساتھ مسلسل اپنے اردلی سے کہے جارہا تھا: "یہ ہوئی نہ بات! اب اس خوشی میں ایک اور پائپ سلگا دو!" پھر اس میں سے چنگاریاں بکھیرتا وہ آگے کی جانب دوڑ پڑتا، اپنے ننھے منے ہاتھوں سے اپنی آنکھوں پر سایہ کرتا اور نیچے فرانسیسیوں کو جھانکنے لگتا۔

"بچو، ان کے پرخچے اڑادو!" وہ بار بار کہے جاتا۔ وہ توپوں کے پہیوں پر ہاتھ ڈالتا اور خود ہی ان کی پوزیشنیں درست کرنے لگتا۔

چاروں اطراف دھوئیں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ توپوں کا پیہم شور وغل کانوں کے پردے پھاڑے دے رہا تھا۔ جب کوئی گجنال گولہ اگلتی اور شور بلند ہوتا، توشن بے اختیار اچھل پڑتا۔ لیکن اسے کسی پل قرار نہیں تھا۔ منہ میں پائپ دبائے وہ بھاگتا دوڑتا کبھی ایک گجنال کے پاس پہنچتا اور کبھی دوسری کے پاس۔ کبھی نشانہ درست کراتا، کبھی گولے گنتا، کبھی مردہ یا زخمی گھوڑا ہٹواتا اور اس کی جگہ نیا گھوڑا جتواتا۔ وہ جہاں بھی جاتا اپنی ناتواں، تیکھی، اونچی اور متذبذب آواز میں احکام دیتا جاتا۔ اس کا چہرہ جوشیلے سے جوشیلا تر ہوتا جارہا تھا۔ صرف اسی وقت جب اس کا کوئی جوان ہلاک یا زخمی ہو کر گرتا، وہ اپنی نگاہیں دوسری طرف پھیر لیتا، اس کی بھویں تن جاتیں اور اپنے آدمیوں پر، جو، جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے، زخمیوں یا مُردوں کو اٹھانے میں متامل ہوتے، برسنے لگتا۔ جہاں تک سپاہیوں کا تعلق ہے، ان میں زیادہ تر افراد خوش شکل اور خوش رو تھے اور جیسا کہ عام طور پر توپ خانے کی کمپنی میں ہوتا ہے، وہ اپنے افسروں سے دو چار انچ لانبے تھے اور ان کے سینے ان کے سینوں سے دگنے فراخ تھے لیکن وہ بھی اپنے کمانڈر کی طرف یوں دیکھتے تھے جیسے مشکل صورت حال میں بچے اپنے بڑوں کی جانب دیکھتے ہیں اور اس کے چہرے پر جو تاثرات ہویدا ہوتے، وہ لاریب ان کے چہروں پر بھی منعکس ہو جاتے۔

ایک تو شور وغل اتنا زیادہ تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دوسرے حالات مکمل انہماک اور جاں فشانی کے متقاضی تھے۔ چنانچہ توشن کو خوف کا معمولی سا ناگوار احساس تک نہ ہوا اور یہ خیال کہ وہ ہلاک یا بری طرح زخمی ہو سکتا ہے، اس کی سوچوں سے کوسوں دور تھا۔ اس کے برعکس اس کی وجد آفریں مسرت میں لحظہ بہ لحظہ ہوتا جارہا تھا۔ اس نے جب پہلی مرتبہ دشمن کو دیکھا اور اس پر اولیں گولہ داغا تھا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس بات کو بیتے بہت عرصہ۔ شاید یہ کل کی بات ہے۔ گزر چکا ہے اور دھرتی کے جس ٹکڑے پر وہ کھڑا ہے، وہ اس کی مدتوں کی جانی پہچانی اور

آبائی سرزمین ہے۔ اگرچہ اسے ایک ایک بات یاد تھی، اس نے معاملے کے ہر پہلو پر خوب سوچ بچار کیا تھا اور اس نے ہر وہ کام، جو اس کی پوزیشن میں بہترین سے بہترین افسر سے متوقع تھا، کیا تھا، پھر بھی اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس شخص کی تھی جس پر بخار کی وجہ سے ہذیانی کیفیت طاری ہو یا جو نشے میں چور ہو۔

اس کی توپیں اتنا شوروغل بپا کر رہی تھیں کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ دشمن کے شیل سنسنا اور پھٹپھٹا رہے تھے۔ گنالوں پر جو جوان متعین تھے، ان کے چہرے تمتما رہے تھے اور ان کے ابدان پسینے میں شرابور تھے۔ سپاہیوں اور گھوڑوں کے اجسام سے خون بہہ رہا تھا۔ دشمن کی سمت دھوئیں کے چھوٹے چھوٹے مرغولے فضا میں بلند ہو رہے تھے۔ (جب بھی کوئی مرغولہ اوپر اٹھتا، اس کے معاً بعد کوئی آہنی گولہ اوپر ہی اوپر آتا اور پھر کبھی دھرتی، کبھی انسان، توپ یا گھوڑے سے ٹکرا جاتا۔) ان تمام مناظر اور اصوات نے اپنی ہی نوعیت کی عجوبہ روزگار دنیا اس کے ذہن میں متشکل کر دی تھی اور وہ اس موقع پر اسے لطف و راحت بہم پہنچا رہی تھی۔ تصورات کی اس دنیا میں اسے دشمن کی توپیں توپیں معلوم نہیں ہو رہی تھیں بلکہ اس کی نگاہوں میں وہ ایسے پائپ تھے جن سے کوئی نادیدہ تمبا کو نوش وقتاً فوقتاً دھوئیں کے بادل اڑا رہا تھا۔

''وہ پھر کش لے رہا ہے،'' توشن منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ اس کے سامنے دھوئیں کا بادل لہراتا، بل کھاتا پہاڑی کے اوپر بلند ہو رہا تھا اور ہوا اسے دھجی کی مانند بائیں جانب اڑائے لیے جا رہی تھی۔ ''تو یہ ہے ان کا آہنی گولہ۔ ہم اسے انھیں کی طرف لوٹا دیں گے۔''

''جناب، کیا فرمایا؟'' ایک توپچی نے پوچھا۔ وہ اس کے قریب کھڑا تھا اور اسے بڑبڑاتے سن چکا تھا۔

''کچھ نہیں...... شیل...'' اس نے جواب دیا۔ ''ماتوینا، اب تمھاری باری ہے!'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

اس نے اپنے تصور میں اس بھاری بھرکم اور قدیم وضع گنال کا، جو سب سے آخر میں نصب تھی، نام ماتوینا رکھ دیا تھا۔ اپنی توپوں کے گرد و پیش جو فرانسیسی بصورتِ ہجوم کھڑے تھے، وہ اسے چیونٹیاں معلوم ہو رہے تھے۔ خوابوں کی اس دنیا میں دوسری گنال کا وجیہہ و شکیل توپچی نمبر 1، جو کثرت سے مے نوشی کرتا تھا، اس کا 'انکل' تھا۔ کسی دوسرے کی نسبت توشن اسے زیادہ دیکھتا تھا اور اس کی ایک ایک حرکت سے اپنا دل پشوری کرتا تھا۔ پہاڑی کے دامن میں دستی بندوقوں کی آوازیں کبھی بلند ہو جاتیں اور کبھی مدھم پڑ جاتیں۔ ان آوازوں کو سن کر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے کوئی شخص سانس لے رہا ہو۔ وہ ان آوازوں کے زیر و بم کو کان لگا کر سنتا۔

''اخاہ، وہ پھر سانس لینے لگی ہے،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

وہ اپنے تصور میں اپنے آپ کو دیو قامت اور انتہائی شہزور انسان، جو دونوں ہاتھوں سے فرانسیسیوں پر آہنی گولے پھینک رہا تھا، سمجھنے لگا۔

''ہونہہ، ماتوینا، جانِ من، مجھے مایوس نہ کرنا!'' اس نے کہا۔ اسے اپنے سر کے اوپر عجیب و غریب اور نامانوس آواز گونجتی سنائی دی اور وہ توپ سے پرے ہٹنے لگا۔

''کیپٹن توشن! کیپٹن!''

توشن کا دل بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔ یہ وہی سٹاف افسر تھا جس نے اسے گرنٹ میں خیمے کی کینٹین سے باہر نکالا تھا۔ وہ اسے با آواز بلند پکار رہا تھا اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''کیا بات ہے؟ تمھارا دماغ تو نہیں چل گیا؟ دو دفعہ تمھیں پیچھے ہٹنے کا حکم دیا گیا اور تم...''

''ان لوگوں نے مجھ پر کیوں چڑھائی کر دی ہے؟'' توشن نے سوچا اور اس نے اپنے افسر اعلیٰ کی جانب خوف زدہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں... میں نے نہیں...'' اس نے دو انگلیوں سے اپنی ٹوپی چھوتے ہوئے کہا۔ ''میں...''

لیکن افسر جو کچھ کہنا چاہتا تھا، وہ اسے ختم نہ کر سکا۔ گجنال کا گولہ آیا اور اس کے سر کے بالکل قریب سے اڑتا گزر گیا۔ اس سے بچنے کے لیے وہ اپنے گھوڑے پر نیچے جھک گیا۔ اس نے توقف کیا۔ وہ کچھ مزید کہنا چاہتا تھا کہ دوسرا گولہ آیا اور اس کی زباں بندی کر گیا۔ اس نے گھوڑا موڑا اور وہاں سے ہوا ہو گیا۔

''پیچھے آجاؤ! سب پیچھے آجاؤ!'' وہ دور سے با آواز بلند پکارنے لگا۔

جوان ہنسنے لگے۔ چند ثانیے بعد ایک ایجوٹنٹ وہی حکم لے کر آ گیا۔

یہ پرنس آندرے تھا۔ جس علاقے میں توشن کی توپیں نصب تھیں، وہاں گھوڑا دوڑاتے پہلی چیز، جس پر اس کی نظر پڑی، ایک ان جتا گھوڑا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ ٹوٹ چکی تھی اور وہ جتے ہوئے گھوڑوں کے قریب دردناک آواز سے بلبلا رہا تھا۔ اس کی ٹانگ سے یوں خون نکل رہا تھا جیسے چشمے سے پانی ابلتا ہے۔ توپ گاڑیوں کے مابین متعدد انسانی لاشیں پڑی تھیں۔ اس کے پہنچتے پہنچتے متعدد گولے اس کے سر کے اوپر سے سنسناتے گزر گئے اور اس کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ لیکن خوف زدگی کے محض تصور ہی نے اسے نیا حوصلہ بخش دیا۔ ''میں خوف سے مغلوب نہیں ہو سکتا۔'' اس نے سوچا اور وہ گجنالوں کے مابین آہستہ آہستہ نیچے اتر آیا۔ اس نے حکم پہنچا دیا لیکن توپ گڑھی سے راہ فرار اختیار نہ کی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے سامنے توپیں اکھڑوائے اور انھیں پیچھے بھجوائے گا۔ لاشیں پھلانگتے اور فرانسیسیوں کی زبردست گولہ باری کا سامنا کرتے وہ اور توشن مل جل کر توپیں ہٹوانے لگے۔

''ایک سٹاف افسر صاحب ابھی یہاں تشریف لائے تھے اور آتے ہی یوں غائب ہو گئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ،'' ایک توپچی نے پرنس آندرے سے کہا۔ ''جناب، وہ آپ سے قطعی مختلف تھے۔''

پرنس آندرے نے توشن سے کوئی کلام نہ کیا۔ وہ اتنے مصروف تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کا بھی موقع نہیں مل رہا۔ جب چار میں سے دو گجنالوں کو، جو صحیح سلامت بچ گئی تھیں، گاڑیوں کے پیچھے باندھ دیا گیا اور پرنس آندرے پہاڑی سے نیچے اترنے لگا (ایک ٹوٹی پھوٹی گجنال اور ایک ہووٹزر پیچھے چھوڑ دی گئی)، وہ توشن کے پاس گیا۔

''اچھا، خدا حافظ، پھر ملاقات ہوگی،'' اس نے توشن کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خدا حافظ، عزیز دوست،'' توشن نے کہا۔ ''محترم، خدا حافظ، میرے عزیز دوست!'' اس نے کہا اور پتا نہیں کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

21

ہوا تھم گئی تھی۔ میدان جنگ پر سیاہ طوفانی بادل چھا چکے تھے اور وہ بھی دور افق پر توپوں کے دھوئیں میں تحلیل ہو رہے تھے۔ اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا اور دو مقامات پر گاؤں کی آگ اور بھی واضح طور پر دکھائی دینے لگی تھی۔ توپوں کی گولہ باری مدھم ہو رہی تھی لیکن عقب میں اور دائیں پہلو کی جانب دستی بندوقوں کی آوازیں قریب سے قریب تر آتی محسوس ہو رہی تھیں اور ان کی تعداد بھی پہلے کی نسبت زیادہ ہو رہی تھی۔ جونہی توشن مسلسل زخمیوں سے بچتا بچاتا اپنی توپوں سمیت گھاٹی میں داخل ہوا اور فائرنگ کی زد سے باہر نکل آیا، اس کی ملاقات متعدد سٹاف افسروں سے ہوئی۔ ان میں ژرکوف بھی شامل تھا۔ اسے دو مرتبہ توشن کی توپ گڑھی کی طرف بھیجا گیا تھا لیکن وہ ایک مرتبہ بھی وہاں پہنچ نہ پایا تھا۔ ان سب نے ایک دوسرے کی بات کاٹتے اسے احکام پہنچانا یا اپنے احکام سنانا شروع کر دیے۔ وہ اسے بتا رہے تھے کہ اس نے کہاں اور کیسے پہنچنا ہے۔ وہ اسے ملامت کر رہے، جھاڑ پلا رہے اور ڈانٹ رہے تھے۔ توشن نے کوئی حکم نہ دیا اور چپ چاپ ــ اسے زبان کھولتے خوف آ رہا تھا کیونکہ ہر لفظ، جو اس کے کان میں پڑ رہا تھا، اسے رونکھا کر رہا تھا ــ توپ خانے کے پھٹیچر گھوڑے پر سوار وہ ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اگرچہ حکم یہی تھا کہ زخمیوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، ان میں سے کئی ایک گھٹنے گھسٹاتے سپاہیوں کے پیچھے آ رہے تھے اور گڑگڑا گڑگڑا کر التجائیں کر رہے تھے کہ انھیں توپ گاڑیوں پر بٹھا لیا جائے۔ پیادہ فوج کا زندہ دل اور ہنس مکھ افسر، جو جنگ چھڑنے سے ذرا پہلے توشن کی جھونپڑی سے بھاگتا باہر آیا تھا، ماتوینا توپ کی گاڑی میں لٹا دیا گیا۔ ایک گولی اس کے پیٹ میں دھنس گئی تھی۔ پہاڑی کے دامن سے ایک زرد رو ہوزار کیڈٹ، جس نے ایک ہاتھ سے دوسرے کو سہارا دے رکھا تھا، توشن کے پاس پہنچا اور اس سے توپ گاڑی پر بیٹھنے کی اجازت طلب کرنے لگا۔

''کیپٹن، خدا کے لیے، میرا بازو زخمی ہو چکا ہے،'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔ ''خدا کے لیے... مجھ سے چلا نہیں جاتا۔ خدا کے لیے!''

صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ کیڈٹ جگہ جگہ لفٹ مانگتا رہا تھا لیکن کہیں بھی اس کی شنوائی نہیں ہوئی تھی۔ وہ متذبذب اور دل دوز لہجے سے درخواست کر رہا تھا۔

''خدا کا واسطہ، ان سے فرمائیں کہ مجھے بٹھا لیں۔''

''بٹھا لو، بھئی، اسے، بٹھا لو اسے،'' توشن نے کہا۔ ''انکل، اس کے نیچے کوٹ رکھ دو،'' اس نے اپنے پسندیدہ سپاہی سے کہا۔ ''لیکن وہ زخمی افسر کہاں ہے؟''

''ہم نے اسے اتار دیا تھا۔ اس کی روح اس کے جسم کا ساتھ چھوڑ گئی تھی،'' کسی نے بتایا۔

''اسے اوپر چڑھنے میں سہارا دو۔ بیٹھ جاؤ، برخودار، بیٹھ جاؤ۔ انتانوف، کوٹ بچھادو۔''

یہ کیڈٹ رستوف تھا۔ اس کا رنگ زرد تھا، اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور بخار سے جسم پھنک رہا تھا۔ وہ ایک بازو سے دوسرے کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ اسے ''ماتوینا'' کے، وہی گجنال جس سے انھوں نے ابھی ابھی مرحوم افسر کی لاش اتاری تھی، اوپر بٹھادیا گیا۔ انھوں نے اس کے نیچے جو کوٹ بچھایا تھا، وہ خون آلود تھا اور اس سے اس کی برجس اور آستین داغ دار ہوگئی تھی۔

''برخوردار، یہ کیا۔ تم زخمی ہو؟'' توشن نے اس گجنال کی طرف، جس پر رستوف بیٹھا تھا، بڑھتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، صرف موچ آئی ہے۔''

''پھر گاڑی پر خون کیوں ہے؟''

''جناب، یہ اس افسر کا ہے۔ وہی یہاں داغ دھبے ڈال گیا ہے،'' ایک توپچی نے جواب دیا۔ وہ اپنے کوٹ کی آستین سے یوں خون پونچھ رہا تھا جیسے اپنی توپ کی اس حالت پر معذرت کر رہا ہو۔

انھوں نے پورا زور لگا دیا اور کچھ مدد پیادہ سپاہیوں سے لی اور یوں وہ جوں توں کر کے توپیں ٹیلے پر پہنچانے میں کامیاب ہوگئے۔ جب وہ گنٹرز ڈورف گاؤں پہنچے، وہ رک گئے۔ اب تاریکی اتنی زیادہ پھیل چکی تھی کہ دس قدم دور جوانوں کی وردی پہچاننا بھی ممکن نہیں رہا تھا۔ فائرنگ مدھم ہونے لگی تھی۔ اچانک قریب ہی دائیں جانب گولیوں کی بوچھاڑ اور چیخ پکار کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ گولی چھوٹتی، شعلہ لپکتا اور آن کی آن اندھیرا اچھٹ جاتا۔ یہ فرانسیسیوں کا آخری حملہ تھا اور جو سپاہی گاؤں کے مکانوں میں گھات لگائے ہوئے تھے، وہ اس کا جواب دے رہے تھے۔ ایک بار پھر گاؤں میں بھگدڑ مچ گئی لیکن توشن کی توپوں کو آگے بڑھنے کے لیے راستہ نہ مل سکا۔ وہ، اس کے توپچی اور ہوزار کیڈٹ، چپ چاپ نگاہوں ہی نگاہوں میں ایک دوسرے سے تبادلۂ خیالات اور اپنے مقدر کا انتظار کرنے لگے۔ جب دونوں جانب گولیاں چلنے کی رفتار تھم گئی، ایک بغلی گلی سے جوان برآمد ہوئے۔ وہ آپس میں زور شور سے باتیں کر رہے تھے۔

''پتیروف، زخمی تو نہیں ہوئے؟'' ایک شخص نے کہا۔

''دوست، ہم نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ اب انھیں ہمارے ساتھ چھیڑ خانی کی جرأت نہیں ہوگی،'' دوسرے نے کہا۔

''ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ سالے اپنے ہی لوگوں کو بھونتے رہے! اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کچھ پینے پلانے کو ہے؟''

فرانسیسیوں کا آخری حملہ بھی ناکام رہا۔ توشن کی توپیں ایک بار پھر آگے چل پڑیں۔ شہد کی مکھیوں کی طرح بھنبھناتے پیادہ سپاہیوں نے ان کے گرد یوں گھیرا ڈال لیا تھا جیسے فریم میں تصویر جڑ دی گئی ہو۔

تاریکی میں یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے کوئی نادیدہ، افسردہ دریا، جس کا رخ ہمیشہ ایک ہی طرف رہتا ہے، بہا جا

رہا ہو۔ کانا پھوسیاں اور زیرلب گفتگوئیں، گھوڑوں کی ٹاپیں اور پہیوں کی چرچراہٹ، سبھی مل جل کر بہتے پانی کی طرح بھنبھنا رہی تھیں۔ اس عام بھنبھناہٹ سے بلند زخمیوں کی کراہیں اور آہیں تھیں اور رات کی تاریکی میں کسی دوسری آواز کی نسبت زیادہ واضح سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اس اندھیرے کو بھی، جو فوج کو اپنے گھیرے میں لے رہا تھا، اپنی لپیٹ میں لیتی محسوس ہو رہی تھیں۔ آہیں اور تاریکی گھل مل کر یکجا ہو گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد متحرک ہجوم میں جوش وخروش کی لہر دوڑ گئی۔ سفید گھوڑے پر کوئی سوار، جس کے پیچھے پیچھے اس کے سٹاف افسر تھے، ان کے برابر سے گزر گیا اور جاتے جاتے کچھ کہہ گیا۔

"اس نے کیا کہا تھا؟ اب ہمیں کہاں جانا ہے؟ کہاں پڑاؤ کرنا ہے؟ اس نے ہمارا شکریہ ادا کیا تھا؟"

چاروں اطراف پر اشتیاق سوالات پوچھے جا رہے تھے اور متحرک ہجوم پورے کا پورے آپس میں پھنس گیا۔ (معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ آگے تھے، رک گئے تھے) اور خبر پھیل گئی کہ رکنے کا حکم جاری ہو گیا ہے۔ کیچڑ یلی سڑک پر جو جہاں تھا، وہیں رک گیا۔

الاؤ روشن ہو گئے اور باتوں کی آوازیں بلند سے بلند تر ہونے لگیں۔ کیپٹن توشن نے اپنی کمپنی کو احکام دینے کے بعد کیڈٹ کے لیے سفری شفاخانے یا ڈاکٹر کی تلاش میں اپنا ایک سپاہی بھگا دیا اور خود الاؤ کے قریب، جو اس کے جوانوں نے سڑک کے کنارے جلایا تھا، بیٹھ گیا۔ رستوف بھی گھسٹتا گھسٹاتا آگ کے قریب پہنچ گیا۔ درد، ٹھنڈک اور سیلن نے اس کا بیڑا کر دیا تھا، اسے سخت بخار تھا اور اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ اس پر غنودگی غالب آتی جا رہی تھی لیکن اس کے بازو میں جو بلا خیز درد ہو رہا تھا، وہ اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔ اس نے ہر انداز سے بیٹھ کر دیکھ لیا لیکن اس کے درد میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ وہ اپنی آنکھیں بند کرتا، کھولتا، بند کرتا، پھر کھول لیتا، کبھی آگ کے سرخ سرخ شعلوں اور کبھی توشن کے، جو اس کے قریب ہی آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، چھریرے اور خمیدہ بدن کو دیکھنے لگتا۔ توشن کی موٹی موٹی شفیق اور ذہین آنکھیں، جن میں ہمدردی اور رحم جھلک رہا تھا، اس پر جمی ہوئی تھیں۔ رستوف سمجھ رہا تھا کہ وہ دل کی گہرائیوں سے اس کی ہر ممکن مدد کرنا چاہتا ہے لیکن کچھ کرنے سے معذور ہے۔

انھیں اپنے چاروں اطراف پیادہ فوجیوں کے قدموں کی چاپ اور ان کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کوئی پیدل گھوم رہا تھا اور کوئی گھوڑے پر سوار تھا۔ سبھی ان کے آس پاس اپنا اپنا ٹھکانا بنانے کی فکر میں تھے۔ آدمیوں کی گفتگو، قدموں کی چاپ، کیچڑ میں گھوڑوں کی رپ رپ اور الاؤوں میں لکڑیوں کی چیخ پکار، دور و نزدیک کی سب آوازیں آپس میں گھل مل کر تھرتھراتی بھنبھناہٹ کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔

افسردہ اور نادیدہ دریا اب اندھیرے میں رواں دواں نہیں رہا تھا، اب اس نے تاریک سمندر کا، جو طوفان کے بعد اچھلتا، بل کھاتا اور پھر مدھم پڑ جاتا ہے، قالب اختیار کر لیا تھا۔ رستوف خالی خولی نظروں سے خلا میں گھور رہا تھا اور اس کے گرد وپیش جو کچھ ہو رہا تھا، کان لگائے اسے سن رہا تھا۔ ایک پیادہ سپاہی الاؤ کے قریب آیا، ایڑیوں کے بل زمین پر بیٹھا، اپنے ہاتھ آگ کی طرف پھیلائے اور منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔

''جناب، کوئی اعتراض تو نہیں؟'' اس نے بے یقینی سے توشن سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''جناب، میں اپنی کمپنی سے بچھڑ گیا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی پتا نہیں کہ میں کہاں ہوں... پھوٹے میرے بھاگ...''

اسی وقت پیادہ فوج کا ایک افسر بھی، جس کے رخسار پر پٹی بندھی ہوئی تھی، آگ کے قریب آ گیا۔ اس نے توشن سے کہا کہ توپیں ذرا پرے ہٹالی جائیں تا کہ چھکڑے گزر سکیں۔ وہ گیا ہی تھا کہ دو سپاہی آگ کی طرف لپکے۔ وہ آپس میں مغلظات کا تبادلہ کر رہے اور مکم مُکا ہو رہے تھے۔ جھگڑا ایک بوٹ کا تھا جسے وہ ایک دوسرے سے چھیننے کی کوشش کر رہے تھے۔

''تمھیں یہ پڑا ملا تھا، ہونہہ! تمھارا مطلب کیا ہے؟ بڑے چالاک بنتے ہو۔ تم یوں آسانی سے نہیں چھوٹ سکو گے،'' ان میں سے ایک کرخت آواز میں چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

پھر ایک دبلا پتلا زرد رو سپاہی آیا۔ اس نے ساق پوش، جو خون آلود تھی، اپنی گردن کے گرد لپیٹ رکھی تھی۔ اس نے ترش روئی سے توپچی کو مخاطب کیا اور اس سے پانی طلب کیا۔

''کیا یہ ضروری ہے کہ آدمی کتے کی موت مرے؟'' اس نے کہا۔

توشن نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ اس شخص کو پانی دیں۔ اس کے بعد ایک خوش طبع شخص آیا اور اس نے پیادہ فوج کے لیے جلتی ہوئی لکڑی کا ٹکڑا مانگا۔

''پیدل لوگوں کا بھی خیال کرو۔ راہ مولا جلتی ہوئی لکڑی کا ٹکڑا دے دو۔ ہم وطنو، اللہ بھلا کرے، مولا بھلا کرے! آگ کا شکریہ! ہم اسے بمعہ سود واپس کر دیں گے،'' اس نے کہا اور جلتی ہوئی لکڑی لے کر اندھیرے کی طرف چلا گیا۔

وہ گیا ہی تھا کہ چار سپاہی اوور کوٹ میں کوئی وزنی شے لپیٹے آگ کے قریب سے گزرے۔ ان میں سے ایک کا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا گیا۔

''بیڑا غرق، کس الو کے پٹھے نے یہ لکڑیاں سڑک پر رکھی ہیں؟'' وہ غرایا۔

''یہ مر چکا ہے۔ اسے اٹھا کر لے جانے کا فائدہ؟'' ان میں سے ایک نے کہا۔

''بکواس بند کرو!''

اور وہ اپنے بوجھ سمیت تاریکی میں غائب ہو گئے۔

''کیا حال ہے؟ ابھی درد ہو رہا ہے؟'' توشن نے رستوف سے زیر لب پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''جناب، آپ کو جرنیل یاد فرما رہے ہیں۔ وہ ادھر جھونپڑے میں ہیں،'' ایک توپچی نے توشن کے قریب پہنچ کر کہا۔

''برخوردار، ابھی آیا۔''

توشن اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اوورکوٹ کے بٹن بند کیے، اسے کھینچ کھانچ کر درست کیا اور چل پڑا۔

توپچیوں نے جہاں الاؤ روشن کیا تھا، وہاں سے کچھ ہی دور پرنس باگ راتیاں کے لیے عارضی چوبی مکان تیار کر لیا تھا۔ وہاں وہ مختلف یونٹوں کے کمانڈروں کے ساتھ، جو اس مکان پر اکٹھے ہو گئے تھے، باتیں کر رہا اور کھانا کھا رہا تھا۔ وہاں وہ پست قد بوڑھا تھا جس کی آنکھیں نیم بند رہتی تھیں، وہ ندیدوں کی طرح دنبے کی ہڈی بھنبھوڑ رہا تھا۔ وہ وہی جرنیل تھا، جس نے بائیس سال بے داغ ملازمت کی تھی۔ اس کا چہرہ کھانا کھانے اور ووڈکا کا جام پینے کے بعد تمتما رہا تھا۔ سٹاف افسر تھا۔ اس کی انگلی پر مہر دار انگوٹھی تھی۔ ژرکوف تھا۔ وہ بہت گھبرایا ہوا تھا وہ کبھی ایک شخص کو اور کبھی دوسرے شخص کو دیکھنے لگتا۔ پھر پرنس آندرے تھا۔ اس کا چہرہ زرد، ہونٹ بھنچے ہوئے اور آنکھیں بے قرار لیکن روشن تھیں۔

جھونپڑے کے ایک کونے میں ایک پھریرا ایستادہ تھا۔ اسے فرانسیسیوں سے چھینا گیا تھا۔ وہ آڈیٹر، جس کے چہرے پر بچوں کی سی معصومیت تھی، یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس کی بناوٹ میں کون سا کپڑا استعمال ہوا ہے، اس پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ وہ الجھن میں گرفتار تھا اور بار بار اپنی گردن جھٹک رہا تھا۔ شاید اسے پھریرے میں واقعی دلچسپی تھی یا شاید اس کے لیے کھانے کی میز کی طرف دیکھنا ممکن نہ تھا کیونکہ وہاں اس کے لیے کوئی نشست فراہم نہیں کی گئی تھی۔ ڈریگونوں نے جس فرانسیسی کرنیل کو قیدی بنایا تھا، وہ ملحقہ جھونپڑے میں تھا۔ ہمارے افسران جوق در جوق اس کا دیدار کرنے جا رہے تھے۔ پرنس باگ راتیاں فرداً فرداً کمانڈروں کا شکریہ ادا کر رہا تھا اور معرکے اور اپنے نقصانات کے بارے میں تفصیلات دریافت کر رہا تھا۔ جس جرنیل کی رجمنٹ کا براؤناؤ کے مقام پر معائنہ ہوا تھا، وہ پرنس کو بتا رہا تھا کہ "جونہی معرکے کا آغاز ہوا، میں جنگل سے باہر نکل آیا۔ جو لوگ ایندھن کے لیے درخت کاٹ رہے تھے، انھیں مجتمع کیا، فرانسیسیوں کو اپنے قریب سے گزرنے دیا، اپنی دو بٹالینوں کے ساتھ ان پر سنگینوں سے حملہ کر دیا اور ان کا کچومر نکال دیا۔

"یور ایکسی لینسی، جب میں نے دیکھا کہ ان کی پہلی بٹالین کی صفوں میں شگاف پڑ گئے ہیں، میں سڑک کے بیچ کھڑا ہو گیا اور سوچنے لگا: 'میں انھیں گزر جانے دوں گا' پھر ان پر پوری بٹالین کے ساتھ گولیوں کا مینہ برسا دوں گا۔۔۔ اور میں نے کیا بھی یہی۔"

جرنیل کی یہ زبردست خواہش تھی کہ وہ بالکل ایسا ہی کرتا اور جب اسے ایسا کرنے میں ناکامی ہوئی، اسے اتنا افسوس ہوا کہ اب اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ بعینہٖ ایسا ہی ہوا تھا اور شاید درحقیقت ایسا ہوا بھی ہو۔ اس بھانبڑ بھوے میں کیا یہ وثوق سے کہا جا سکتا تھا کہ کیا ہوا اور کیا نہیں ہوا؟

"یور ایکسی لینسی، علاوہ ازیں مجھے یہ بات آپ کے علم میں لے آنا چاہیے،" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اسے کوتوزوف کے ساتھ دلوخوف کی گفتگو اور خود اپنے ساتھ اس کی آخری ملاقات یاد آ گئی تھی، "کہ سپاہی دلوخوف نے، جس کی تنزلی کر دی گئی تھی، میری آنکھوں کے سامنے ایک فرانسیسی افسر کو قیدی بنایا تھا اور

اس نے میدان جنگ میں زبردست شجاعت اور جرأت کا مظاہرہ کیا تھا۔"

"یوئر ایکسی لینسی، جب پادلوگرات ہوزاروں نے دھاوا بولا تھا، میں بھی وہیں موجود تھا،" ژرکوف نے مضطرب نگاہوں سے اپنے گردوپیش دیکھتے ہوئے کہا۔ اس نے پورے دن کے دوران میں ایک بھی ہوزار نہیں دیکھا تھا اور محض ایک پیادہ افسر سے ان کے متعلق باتیں سنی تھیں "انھوں نے ان کے دو مربع شکل دستے تہس نہس کر دیے۔"

ژرکوف کی بات سن کر کئی افسر مسکرانے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ حسب معمول دل لگی کر رہا ہے لیکن جب انھیں احساس ہوا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اس سے ہماری فوج کے ماتھے پر جھومر بجتا ہے اور اس کے اس روز کے کارناموں کی تحسین ہوتی ہے، ان کے چہروں پر سنجیدگی طاری ہوگئی حالانکہ ان میں سے کئی ایک اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، سراسر جھوٹ تھا اور حقائق سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ پرنس باگراتیاں بزرگ کرنل کی طرف متوجہ ہوا۔

"حضرات، میں آپ سب کا شکرگزار ہوں۔ ہماری پیادہ سپاہ ہو، اسپ سوار ہوں یا توپ خانہ، الغرض سبھی یونٹوں نے شجاعت اور بہادری کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ قلب کی دو گجنالیں وہیں کیوں چھوڑ دی گئیں؟" اس نے کمرے میں متجسسانہ نگاہیں دوڑاتے ہوئے کہا۔ (پرنس باگ راتیاں نے میسرے کی توپوں کے بارے میں کچھ نہ پوچھا کیونکہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ وہاں کی تمام گجنالیں معرکے کے آغاز میں ہی ہاتھ سے جاتی رہی تھیں۔) "میرا خیال ہے کہ تمھیں ہی میں نے ادھر بھیجا تھا،" اس نے ڈیوٹی افسر سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ایک تو بیکار ہوگئی تھی،" سٹاف افسر نے جواب دیا۔ "لیکن دوسری کا کیا بنا، خود میری سمجھ میں نہیں آرہا۔ میں سارا عرصہ خود وہاں موجود رہا اور ہدایات دیتا رہا۔ میں وہاں سے کچھ ہی دیر پہلے لوٹا تھا... یہ درست ہے کہ وہاں حالات ذرا نازک تھے،" اس نے انکساری سے مزید کہا۔

کسی نے بتایا کہ کیپٹن توشن کا پڑاؤ قریب ہی گاؤں میں ہے اور اسے پہلے ہی بلایا جا چکا ہے۔

"اخاہ، آپ بھی تو وہیں تھے،" پرنس باگ راتیاں نے پرنس آندرے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"میرا خیال ہے کہ ہماری ملاقات ہوتے ہوتے رہ گئی ہوگی۔ ادھر میں وہاں سے چلا ہوں گا اور ادھر آپ وہاں پہنچ گئے ہوں گے،" سٹاف افسر نے پرنس آندرے کی طرف خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے کہا۔

"مجھے آپ کی شکل دیکھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا،" پرنس آندرے نے سردمہری سے جواب دیا۔

سب کی زبانیں گنگ ہوگئیں۔ دروازے پر توشن نمودار ہوا۔ جھونپڑے میں جرنیلوں کا جمگھٹا تھا۔ وہ بچتا بچاتا، ڈرتا سہمتا ان کے عقب سے گزرنے لگا۔ ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی اپنے اعلیٰ افسروں کی موجودگی میں بوکھلا رہا تھا۔ سراسیمگی میں اسے پھریرے کا بانس بھی نظر نہ آیا، اس نے اس سے ٹھوکر کھائی اور بال بال گرتے بچا۔ کئی افسروں کی ہنسی نکل گئی۔

"ایک توپ وہیں کیوں چھوڑ دی گئی؟" پرنس باگراتیاں نے تیوریاں چڑھاتے پوچھا لیکن اس کی خفگی کا سبب

اتنا کیپٹن نہیں تھا جتنا کہ وہ افسران تھے جو ہنس رہے تھے اور جن میں ژرکوف کے ہنسنے کی آواز سب سے اونچی تھی۔

صرف اب جب کہ توشن اپنے ہمہ مقتدر افسروں کے سامنے کھڑا تھا، اسے اپنے جرم کی سنگینی کا احساس ہوا کہ وہ دو توپوں سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے اور خود ابھی تک زندہ ہے۔ اس کے لیے تو یہ ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ وہ اتنی ہیجانی کیفیت میں سے گزر رہا تھا کہ اس نے اس لمحے تک اس معاملے کے بارے میں سوچا تک نہیں تھا۔ افسروں کے قہقہوں نے اسے مزید بوکھلا دیا۔ وہ باگ راتیاں کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے اور اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ ڈرتا جھجکتا صرف اتنا کہہ سکا:

''یوئر ایکسی لینسی... مجھے معلوم نہیں... میرے پاس نفری نہیں تھی، یوئر ایکسی لینسی۔''

''جو دستہ تمھیں آڑ پہنچا رہا تھا، تمھیں چاہیے تھا کہ تم اس سے کچھ جوان لے لیتے۔''

توشن نے یہ نہیں کہا کہ وہاں کوئی ایسا دستہ نہیں تھا جو اسے آڑ فراہم کرتا حالانکہ یہ بات حقیقتاً سولہ آنے درست تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی وجہ سے کوئی دوسرا افسر مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ وہ چپ چاپ باگ راتیاں کے چہرے کی جانب یوں دیکھ رہا تھا جیسے کوئی بوکھلایا طفلِ مکتب اپنے ممتحن کی طرف دیکھتا ہے۔

خاموشی کچھ ثانیے قائم رہی۔ پرنس باگ راتیاں بظاہر سخت رویہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا اور اسے محسوس ہوا کہ اس کے پاس کہنے سننے کو کچھ ہے بھی نہیں۔ دوسروں نے دخل اندازی کا حوصلہ نہ کیا۔ پرنس آندرے نے کنکھیوں سے توشن کی طرف دیکھا۔ بے چینی سے اس کی انگلیاں پھڑک رہی تھیں۔

''یوئر ایکسی لینسی،'' پرنس آندرے کی تیکھی آواز نے مہرِ سکوت توڑ دی۔ ''آپ نے ازراہ کرم مجھے توشن کی توپ گڑھی کی جانب بھیجا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا، مجھے معلوم ہوا کہ توشن کے دو تہائی جوان اور گھوڑے ہلاک ہو چکے ہیں، دو توپیں ناکارہ ہو چکی ہیں اور وہاں کوئی ایسا دستہ نہیں تھا جو آڑ فراہم کر سکتا۔''

بلکونسکی نے گفتگو کے دوران میں جذبات کو اپنے اوپر حاوی نہیں ہونے دیا تھا۔ پرنس باگ راتیاں اور توشن دونوں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہے تھے۔

''اور یوئر ایکسی لینسی، اگر آپ مجھے اپنی رائے ظاہر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں،'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''تو میں یہ عرض کروں گا کہ آج ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی ہے، اس کا سہرا زیادہ تر اس توپ گڑھی کی کارروائی اور کیپٹن توشن اور اس کی کمپنی کی دلیرانہ قوت برداشت کے سر بندھتا ہے،'' پرنس آندرے نے کہا اور جواب کا انتظار کیے بغیر دسترخواں سے اٹھا اور ایک طرف ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

پرنس باگ راتیاں نے توشن کی جانب دیکھا۔ یہ صاف ظاہر تھا کہ پرنس آندرے نے روکھے پھیکے انداز سے ہی سہی لیکن جس بے لاگ طریقے سے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کیا تھا، وہ اس پر شک وشبہے کا اظہار کرنے میں متامل تھا لیکن اسے پوری طرح تسلیم کرنے کو بھی اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے اپنی گردن جھکائی اور توشن سے کہا کہ وہ جا سکتا ہے۔ پرنس آندرے بھی اس کے ساتھ باہر نکل گیا۔

''پیارے دوست، شکریہ، آج آپ نے مجھے مصیبت سے بچالیا،'' توشن نے اس سے کہا۔
پرنس آندرے نے اس کی طرف دیکھا اور کچھ کہے بغیر اپنی راہ چل دیا۔ وہ بے حد مضطرب اور اداس تھا۔ یہ سب کچھ کتنا عجیب تھا! اس کی توقعات سے قطعی مختلف!

''یہ کون ہیں؟ یہ یہاں کیوں ہیں؟ یہ کیا چاہتے ہیں؟ یہ سب کب ختم ہوگا؟'' رستوف کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ اس کے سامنے ہر آن سائے تبدیل ہورہے تھے اور وہ انھیں دیکھنے میں محو تھا۔ اس کے بازو میں جو درد ہورہا تھا، اس کی شدت میں اور بھی اضافہ ہوگیا تھا۔ لحہ بہ لحہ غنودگی اس پر غالب آتی جارہی تھی اور اس کے لیے اس کی مقاومت کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے ارغوانی دائرے رقص کررہے تھے۔ ان آوازوں اور چہروں کے بارے میں اس کے تاثرات اور اس کا اکلاپے کا احساس، یہ تمام چیزیں اس کے تحسّسِ درد میں گھل مل گئی تھیں۔ یہی — زخمی اور غیر زخمی فوجی، دونوں — تو وہ لوگ تھے جو اپنے بوجھ تلے اسے دبا رہے تھے اور اس کا کچومر نکال رہے تھے، اس کی نسوں کو مروڑ رہے تھے اور اس کے موچ زدہ بازو اور کندھے کی کھال جھلسا رہے تھے۔ ان سے پنڈ چھڑانے کے لیے اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔
ایک لمحے کے لیے اسے اونگھ آگئی۔ فراموشی کے اس مختصر وقفے کے دوران میں لاتعداد اشیا اسے خواب میں اپنی جھلک دکھا گئیں: اس کی والدہ اور اس کے بھاری بھرکم سفید ہاتھ، سونیا کے دبلے پتلے اور ننھے منے کندھے، نتاشا کا ہنستا مسکراتا چہرہ اور آنکھیں، دینی سوف کی آواز اور مونچھیں، تلیانن اور تلیانن اور باگ دانووچ کے ساتھ سارا معاملہ۔ وہ سارا معاملہ اس سپاہی کے ساتھ، جس کی آواز اتنی کرخت تھی، یوں خلط ملط ہوگیا تھا کہ انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہ رہا تھا اور یہی وہ معاملہ اور یہی وہ سپاہی تھے، جو اس کے بازو کو اتنی شقاوت اور سفاکی سے کھینچ رہے تھے، دبا رہے تھے، ایک ہی جانب گھسیٹے جارہے تھے کہ درد سے اس کی چیخیں نکلی جارہی تھیں۔ اس نے ان سے اپنا پنڈ چھڑانا چاہا، لیکن انھوں نے اس کے بازو کو ایک لمحے کے لیے بھی بال برابر جنبش نہ کرنے دی۔ کاش وہ اسے نہ کھینچیں، زور نہ لگائیں، پھر یہ ٹھیک ہوجائے گا۔ درد جاتا رہے گا۔
اس نے آنکھیں کھول دیں اور اوپر دیکھنے لگا۔ رات کی سیاہ چھتری چنگاریوں کی لو سے ایک گز سے کم اوپر تنی ہوئی تھی۔ برف کے گالے اس روشنی میں پھڑ پھڑا رہے تھے۔ توشن واپس نہیں آیا تھا، ڈاکٹر پہنچا نہیں تھا۔ وہ اکیلا تھا۔ صرف ایک سپاہی اس کے پاس تھا۔ وہ بے چارہ آگ کی دوسری جانب بیٹھا ہوا تھا اور اپنے ننگ دھڑنگ دبلے پتلے سانولے جسم کو گرما رہا تھا۔
''کسی کو میری پروا نہیں!'' رستوف نے سوچا۔ ''کوئی نہیں جو میری مدد کرے یا مجھ پر ترس کھائے! لیکن ایک وقت وہ تھا جب میں اپنے گھر تھا — توانا وصحت مند، مسرور مطمئن، مجھے چاہا جاتا تھا، مجھ سے محبت کی جاتی

تھی،''اس کی آہ نکل گئی اور وہ بے اختیار کراہنے لگا۔

''درد ہو رہا ہے؟'' سپاہی نے پوچھا۔ وہ اپنی قمیص آگ پر ہلا جلا رہا تھا۔ اس نے جواب کا انتظار تک نہ کیا۔ وہ درندے کی طرح غرایا اور بولا: ''آج زخمیوں کا شمار قطار ہی نہیں رہا— بھیانک، ہول ناک!''

رستوف نے سپاہی کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے برف کے گالوں کو، جو آگ کے اوپر پھڑ پھڑا رہے تھے، دیکھ رہا اور ارضِ روس میں اپنا گھر یاد کر رہا تھا۔ سردیوں میں بھی اس کا مکان گرم اور روشن ہوتا تھا، وہ فر کا نرم نرم کوٹ پہنا کرتا تھا، برف پر چلنے کے لیے تیز رفتار سلیج ہوتی تھی۔ اس کا جسم صحت مند تھا اور سب سے بڑھ کر اس کے گھر والوں کو اس سے پیار تھا اور وہ اس کی فکر کرتے تھے۔ ''پھر میں یہاں کیوں آیا؟'' اسے اچنبھا ہو رہا تھا۔

اگلے روز فرانسیسیوں نے دوبارہ حملہ نہ کیا اور باگ راتیاں کی بچی کھچی سپاہ کوتوزوف کی فوج کے ساتھ پھر جا ملی۔

حصہ سوم

1

پرنس واسیلی ایسا شخص نہیں تھا جو اپنے منصوبے سوچ سمجھ کر بناتا ہے اور اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے دوسروں کو گزند پہنچانے کے فن سے وہ اس سے بھی کم آشنا تھا۔ وہ سیدھا سادا دنیادار شخص تھا۔ وہ جس چیز میں ہاتھ ڈالتا تھا، اس میں کامیابی اس کے پاؤں چومتی تھی اور کامیاب ہونا اس کی عادت بن گیا تھا۔ مختلف تجاویز و تراکیب، جن سے اس کی زندگی کی تمام تر دلچسپیاں عبارت آرا ہوتی تھیں، اس کے ذہن میں تشکیل ضرور پاتی رہتیں لیکن وہ ان کے لیے ان حالات اور اشخاص کا، جن سے اس کا واسطہ پڑتا رہتا تھا، رہینِ منت ہوتا تھا، خود اس نے کبھی ان کا گہرائی اور گیرائی سے معائنہ اور مطالعہ نہیں کیا ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں ایک وقت میں ایک دو نہیں بلکہ درجنوں منصوبے ہوتے تھے۔ ان میں سے بعض تشکیل کے محض ابتدائی مراحل طے کر رہے ہوتے، بعض تکمیل کے قریب ہوتے اور بعض ٹوٹ پھوٹ کے عمل میں سے گزر رہے ہوتے۔ مثلاً اس نے کبھی اپنے آپ سے یہ نہیں کہا: ''فلاں آدمی صاحب رسوخ ہے، مجھے اس کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانا اور اس کا اعتماد حاصل کرنا چاہیے اور اس کے ذریعے خصوصی رعایت حاصل کرنا چاہیے۔'' اور نہ اس نے اپنے آپ سے یہ کہا: ''پیئر مالدار اسامی ہے۔ مجھے اسے بہلا پھسلا کر اپنی بیٹی سے شادی کرنے اور مجھے چالیس ہزار روبل، جن کی مجھے اشد ضرورت ہے، ادھار دینے کے لیے رضامند کر لینا چاہیے۔'' چنانچہ جب بھی کسی بارسوخ ہستی سے اس کا آمنا سامنا ہوتا، اس کے اندر کی آواز اسے فوراً بتا دیتی کہ یہ شخص کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ وہ اس کے ساتھ واقفیت پیدا کرتا اور کسی پیشگی منصوبہ بندی کے بغیر، جونہی موقع ملتا، اس کا اعتماد حاصل کرتا، اس کی چاپلوسی کرتا، اس کی تعریفوں کے پل باندھتا، اس کے ساتھ بے تکلفی پیدا کرتا اور جب دیکھتا کہ لوہا گرم ہو گیا ہے، مطلب کی بات زبان پر لے آتا۔

وہ جب تک ماسکو میں مقیم رہا، پیئر کے ساتھ جڑا رہا۔ اس کے لیے اس نے جنٹلمین آف بیڈ چیمبر[1] کا، جو اس زمانے میں مرتبے کے اعتبار سے کونسلر آف سٹیٹ[2] کے برابر ہوتا تھا، پروانۂ تقرری بھی حاصل کر لیا۔ اور پھر جب اس نے پیٹرزبرگ جانے کا قصد کیا، اس نے نوعمر پیئر سے اصرار کیا کہ ''تمھیں میرے ساتھ چلنا ہوگا اور غریب خانے پر ہی قیام کرنا ہوگا۔'' ظاہر وہ یہی کر رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اس کے بارے میں اس نے پہلے سے کچھ نہیں

سوچا لیکن اس نے پیئر کے ساتھ اپنی بیٹی کا رشتہ طے کرانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ اگر وہ پیشگی منصوبے بنانے کا عادی ہوتا تو اس کا رویہ نہ اتنا فطری ہوتا اور نہ ہر شخص کے ساتھ، سماجی اعتبار سے خواہ وہ اس سے فروتر ہوتا یا برتر، اپنے تعلقات میں اتنے بھولپن اور بے ساختگی کا مظاہرہ کرتا۔ وہ ہمیشہ ان لوگوں کی طرف، جو اس سے زیادہ دھن دولت یا اختیار واقتدار کے مالک ہوتے کھنچا چلا جاتا۔ اس کی خوبی یہ تھی (اور یہ خوبی بہت کم لوگوں میں ہوتی ہے) کہ وہ خوب جانتا تھا کہ اپنی مطلب برآری کے لیے دوسروں کو استعمال کرنے کا صحیح موقع کون سا ہے اور وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتا تھا۔

پیئر، جس کا ابھی حال ہی میں نہ آگا تھا اور نہ پیچھا اور جو ہر قسم کے تفکرات اور پریشانیوں سے آزاد تھا، غیر متوقع طور پر کاؤنٹ بزوخوف اور صاحب حیثیت شخص بن گیا۔ اب وہ اس بری طرح مصروفیتوں میں گھر گیا اور لوگوں کے اتنے زبردست نرغے میں آ گیا کہ اسے صرف رات کو، جب وہ بستر پر دراز ہوتا، تنہائی کا کوئی لمحہ میسر آتا۔ اسے کاغذات پر دستخط کرنا پڑتے، سرکاری دفاتر میں حاضری دینا پڑتی، کیوں؟ یہ عقدہ وہ کبھی حل نہ کر پاتا، اپنے چیف سٹیوارڈ[3] سے سوالات وجوابات کرنا پڑتے، ماسکو کے قرب وجوار میں اپنی جاگیروں پر جانا پڑتا اور بے شمار اشخاص سے ملاقاتیں کرنا پڑتیں۔ یہ وہ لوگ تھے جو پہلے اس کے وجود سے ہی منکر تھے لیکن اگر اب اس نے ان سے ملنے سے انکار کیا ہوتا تو انھیں دکھ پہنچتا اور وہ اس سے ناراض ہو جاتے۔ بھانت بھانت کے لوگ — کاروباری، رشتے دار، واقف کار — سبھی نوعمر رئیس سے محبت کا دم بھرتے، دوستی جتاتے اور اس کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے۔ ان سب کو یہ پختہ یقین تھا اور اس کا اظہار کرنے میں وہ ذرہ برابر ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کرتے کہ وہ اعلیٰ خوبیوں کا مالک انسان ہے۔ اس قسم کے جملے مسلسل اس کے کانوں میں پڑنے لگے: "آپ کی غیر معمولی شفقت کے طفیل،" "آپ کی دریا دلی اور فیاضی کا شکریہ،" "کاؤنٹ، آپ خود اتنے معزز اور ستودہ صفات ہیں،" یا "کاش وہ شخص بھی اتنا ہی ذہین اور سمجھ دار ہوتا جتنا کہ آپ ہیں،" وغیرہ وغیرہ، حتیٰ کہ خود اسے بھی اپنی غیر معمولی شفقت اور استثنائی ذہانت وفطانت کا یقین ہونے لگا۔ اسے یہ باتیں یوں بھی قابل اعتبار معلوم ہوئیں کہ وہ اپنے نہاں خانۂ دل میں اپنے آپ کو ہمیشہ ہی شفیق اور ذہین وفطین انسان سمجھتا رہا تھا۔ وہ لوگ، جو پہلے اس کے خلاف خبثِ باطن اور کینہ رکھتے تھے اور کھلم کھلا اس سے عناد برتتے تھے، اب اس کے ساتھ لطف ومحبت سے پیش آنے لگے۔ آتش مزاج بڑی پرنسس، جس کی کمر لانبی اور جس کے بال گڑیوں کے بالوں کی طرح نرم اور ملائم تھے اور جو ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھی، تجہیز وتکفین کی رسوم کے اختتام پر پیئر کے کمرے میں آئی اور اس نے جھکی جھکی نگاہوں اور شرمسار لہجے میں اسے بتایا: "ماضی میں ہم دونوں کے مابین جن غلط فہمیوں نے جنم لیا تھا، میں سچے دل سے ان کے بارے میں معذرت خواہ ہوں۔ مجھے احساس ہے کہ مجھے آپ سے کچھ مانگنے کا کوئی حق نہیں تاہم میں آپ سے صرف اتنی درخواست کرتی ہوں کہ مجھے جس صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہے، اس کے بعد مجھے اس گھر میں، جو مجھے بے حد عزیز ہے اور جس کی خاطر میں نے اتنی قربانیاں دی ہیں، مزید چند ہفتے قیام کی مہلت عطا کریں۔" اس نے یہ الفاظ کہے اور اس کی

آنکھوں سے بے اختیار ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس مجسمہ نما پرنس میں یہ تبدیلی دیکھ کر پیئر کے دل پر گہرا اثر ہوا، اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اس سے معافی کا طلب گار ہو گیا۔ کس لیے یہ اسے خود بھی معلوم نہ ہوا۔ بعد ازاں بڑی پرنس نے اسی دن پیئر کے لیے دھاری دار سکارف بنانا شروع کر دیا اور اس کے بارے میں اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔

"مائی ڈیئر، یہ کام میری خاطر کر دو۔ آخر بے چاری کو مرحوم کے ہاتھوں بہت کچھ سہنا پڑا تھا،" پرنس واسیلی نے پیئر کو دستاویز تھماتے ہوئے کہا۔ اگر پیئر اس پر دستخط کر دیتا، پرنس کو مالی منفعت حاصل ہو جاتی۔

یوں بھی پرنس واسیلی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ہڈی کا۔ یہ دراصل تیس ہزار روبل کا پرامیسری نوٹ تھا۔ پھینکنا ضروری ہے۔ اگر پرنس واسیلی بے چاری پرنس کو یہ رقم دلوانے کا اہتمام نہ کرتا، تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ چرمی تھیلے کے سلسلے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا، اس کا راز طشت از بام ہو جاتا۔ پیئر نے دستاویز پر دستخط کر دیے اور اس کے بعد پرنس کا رویہ اور بھی شفقت آمیز ہو گیا۔ چھوٹی بہنیں بھی خاص طور پر سب سے چھوٹی، جس کے بالائی ہونٹ پر تل تھا، جو خوب روتھی اور جس کی مسکراہٹیں اور بوکھلاہٹیں، اسے اکثر محجوب کر دیا کرتی تھیں۔ اس سے پیار جتانے لگیں۔

پیئر کے نزدیک یہ بات بالکل فطری تھی کہ ہر شخص اسے اتنا پیار کرے اور اگر کوئی شخص اسے پسند نہ کرتا تو اسے یہ چیز قطعی غیر فطری معلوم ہوتی۔ چنانچہ یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا، وہ ان کے خلوص پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ سے یہ پوچھ سکتا کہ یہ لوگ مخلص ہیں بھی یا نہیں۔ وہ ہر وقت مصروف رہتا تھا اور اس پر مدام ہلکے پھلکے اور خوشگوار نشے کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی اہم تحریک کا مرکز ہے اور اسے مسلسل یہ احساس ستاتا رہتا کہ اس سے کچھ توقعات وابستہ ہیں، اسے ان توقعات کو پورا کرنا ہوگا ورنہ لوگوں کو دکھ اور مایوسی ہوگی اور لیکن یہ کہ اگر اس نے یہ کام کر دیا یا اس کام میں ہاتھ ڈال دیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ وہ وہی کچھ کرتا تھا جس کی اس سے توقع کی جاتی تھی لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا تھا، اس کا کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا، اس کی توقعات وہ مستقبل سے باندھ لیتا تھا۔

ان ابتدائی ایام کے دوران میں پیئر کے معاملات کی باگ ڈور اور خود پیئر کی نکیل کسی دوسرے شخص کی نسبت پرنس واسیلی کے ہاتھ میں زیادہ تھی۔ کاؤنٹ بزوخوف کے انتقال کے بعد اس نے پیئر کو اپنے قبضے سے نکلنے نہ دیا۔ وہ ظاہر یوں کرتا تھا جیسے اسے ایک منٹ کی فرصت نہ ہو، وہ گوناگوں مصروفیات کے بوجھ تلے دب چکا ہو، تھک چکا ہو، زچ ہو چکا ہو اور اس کا کچومر نکل چکا ہو لیکن اس کا دل اتنا نرم و گداز ہے کہ وہ اس بے یار و مددگار نوجوان کو قسمت کے تھپیڑے کھانے اور لچے لفنگے لوگوں کی سازشوں کا شکار بننے کی اجازت نہیں دے گا کیونکہ وہ بہرحال اس کے دوست کا صاحب زادہ اور اس ناتے خزانہ قارون کا مالک تھا۔ کاؤنٹ بزوخوف کی رحلت کے بعد

اس نے جو چند ایام ماسکو میں گزارے، ان کے دوران میں وہ پیئر کو اپنے پاس بلا لیتا یا خود اس کے پاس چلا جاتا اور ہر دم اسے مشوروں سے نوازتا رہتا کہ اسے کیا کرنا یا کیا نہیں کرنا چاہیے۔ وہ جب بھی لب کشائی کرتا، اس کا لہجہ تھکا تھکا ہوتا اور پراعتماد بھی، گویا وہ اسے یہ جتا رہا ہو: ''برخوردار، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ مختلف امور و معاملات نے میرا ناک میں دم کر رکھا ہے اور محض انسانی ہمدردی کا جذبہ مجھے تمھارے معاملات میں دلچسپی لینے کے لیے مجبور کر رہا ہے اور علاوہ ازیں تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ جو مشورے اور تجویزیں میں تمھیں دیتا ہوں، صرف وہی قابل عمل ہوتی ہیں۔''

''خیر، میرے عزیز، آخر کار ہم کل روانہ ہو ہی جائیں گے،'' پرنس واسیلی نے ایک روز کہا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اور پیئر کی کلائی پر یوں اپنی انگلیاں پھیر رہا تھا جیسے یہ معاملہ مدتوں پہلے دونوں کے درمیان طے ہو چکا ہو اور اس کے علاوہ اس کا اور کوئی فیصلہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ ''کل ہماری روانگی ہے۔ میں تمھیں اپنی گاڑی میں نشست دے دوں گا۔ میں بہت خوش ہوں۔ یہاں ہمارے تمام امور طے پا چکے ہیں۔ مجھے بہت عرصہ پہلے یہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے تھا۔ اور مجھے چانسلر[4] کا یہ مراسلہ موصول ہوا ہے۔ میں نے تمھاری طرف سے درخواست دی تھی۔ تمھیں سفارتی سروس میں لے لیا گیا ہے اور تم جنٹلمین آف بیڈ چیمبر بنا دیے گئے ہو۔ اب سفارتی ملازمت کے دروازے تم پر کھل گئے ہیں۔''

تھکے تھکے اور پراعتماد لہجے کے پیچھے جو قوت تھی، اس کے باوجود پیئر، جو کافی عرصے سے کوئی ملازمت اختیار کرنے کے بارے میں سوچتا رہا تھا، احتجاج کیا چاہتا تھا لیکن پرنس واسیلی نے اپنے مدھ بھرے لہجے میں، جو وہ صرف اسی وقت اختیار کرتا تھا جب وہ اپنی بات میں کسی قسم کی مداخلت کے امکان کو ختم کرنا چاہتا تھا اور یہ سمجھتا تھا کہ مخاطب سے اپنی بات منوانے کے لیے اس کے لیے انتہائی اقدامات کرنا لازمی ہے، اسے ٹوک دیا۔

''لیکن مائی ڈیئر، میں نے یہ کام اپنی خاطر، اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے کیا اور میرا شکریہ ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کسی نے آج تک یہ شکایت نہیں کی کہ اس کے ساتھ حد درجہ محبت کی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں تمھارے ہاتھ پاؤں تو بندھ نہیں گئے، تم آزاد ہو اور تمھارا جی چاہے تو کل ہی اس پر ٹھوکر مار سکتے ہو۔ لیکن جب تم پیٹرزبرگ پہنچ جاؤ گے، ہر چیز اپنی آنکھوں سے دیکھ سکو گے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ تم تلخ اور بھیانک یادیں اپنے ذہن کی تختی سے کھرچ ڈالو۔'' پرنس واسیلی نے لمبی سانس لی۔ ''چنانچہ، عزیزم، سب کچھ طے پا گیا۔ رہ گئی تمھاری گاڑی، اس میں میرا ذاتی ملازم سفر کرے گا۔ اور ہاں، یہ تو میں تقریباً بھول ہی گیا تھا،'' اس نے مزید کہا۔ ''تمھارے والد نے میرا کچھ حساب چکانا تھا۔ چنانچہ ریازان کی جاگیر سے مجھے کچھ رقوم موصول ہو گئی ہیں، وہ میں اپنے پاس رکھ لوں گا۔ تمھیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بعد میں حساب برابر کر لیں گے۔''

پرنس واسیلی نے ریازان کی جاگیر سے موصولہ جن رقوم کا ذکر کیا تھا، وہ حقیقتاً ہزاروں روبلوں پر مشتمل تھیں اور یہ آزاد کسانوں[5] سے بطور لگان موصول ہوئی تھیں۔ یہ اس نے اپنے پاس رکھ لیں۔

پیٹرزبرگ میں بھی پیئر کو اسی قسم کی شفقت اور پیار نے اپنے حصار میں لے لیا جس کا سامنا اسے ماسکو میں

کرنا پڑا تھا۔ واسیلی نے اس کے لیے جو عہدہ حاصل کیا تھا، وہ اسے قبول کرنے سے انکار نہیں کر سکتا تھا۔ (اصلاً یہ عہدہ برائے نام تھا کیونکہ پیئر کو کچھ کرنا نہیں پڑتا تھا لیکن اس سے وقار بہت وابستہ تھا۔) پھر یہاں شناسائیوں، دعوتوں اور سماجی ذمے داریوں کا سلسلہ اتنا دراز تھا کہ پیئر ماسکو میں بھی کیا بوکھلایا ہوگا جو یہاں بوکھلایا۔ وہ ہر وقت دوڑ دھوپ میں لگا رہتا اور مستقبل سے سہانی امیدیں، جو کبھی پوری نہ ہوتیں، وابستہ کرتا رہا۔

اس کے کنوارے شناساؤں میں سے بہت سے لوگ اب پیٹرز برگ میں موجود نہیں تھے۔ گارڈز اب جنگی خدمات سرانجام دے رہے تھے۔ دلوخوف کی تنزلی ہوگئی تھی اور اب وہ عام سپاہی تھا۔ اناطول دور کہیں مضافات میں فوجی ملازمت کر رہا تھا اور پرنس آندرے ملک سے باہر تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیئر کو اب اپنی شامیں اس طرح گزارنے کے مواقع دستیاب نہیں تھے جس طرح وہ انھیں ازیں پیشتر گزارنے کا عادی تھا۔ اور نہ اب اسے کسی ایسے دوست کی رفاقت میسر تھی جو عمر میں اس سے بڑا ہوتا، جس کی رائے کا وہ احترام کر سکتا، جس کے ساتھ وہ بے تکلف گفتگو کر سکتا اور یوں اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا۔ اس کا سارا وقت ڈنروں اور بال پارٹیوں میں اور ان سے بڑھ کر پرنس واسیلی کی بھاری بھرکم اہلیہ، بڑی پرنس، اور اس کی حسین و جمیل دختر ہیلین کی صحبتوں میں کٹ رہا تھا۔

پیئر کے بارے میں اونچے طبقے کا رویہ جس طرح تبدیل ہوا تھا، دوسروں کی طرح آنا پاولونا شیرر نے بھی اسے اس کا احساس دلا دیا۔

گئے دنوں میں آنا پاولونا کی موجودگی میں پیئر کو ہمیشہ یہ خیال ستاتا رہا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، نامناسب، بے تکا اور بے محل ہے۔ یہ باتیں جب تک اس کے ذہن میں تشکیل پاتی رہتیں، اسے بے حد معقول اور خردمندانہ معلوم ہوتیں لیکن جونہی وہ اس کے منہ سے نکلتیں، وہ بے معنی اور احمقانہ دکھائی دینے لگتیں۔ اس کے برعکس اپولیت کی انتہائی لایعنی اور بے مغز گفتگو حاضرین پر اس طرح اثر انداز ہوتی کہ انھیں وہ بہت معقول اور سحر انگیز معلوم ہونے لگتی۔ اب پیئر جو کچھ کہتا تھا، اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے جاتے۔ اور ''واہ واہ، سبحان اللہ، واللہ کیا خوبصورت بات کہی ہے'' کے ڈونگرے برسائے جانے لگتے۔ اگر آنا پاولونا خود اس طرح تحسین نہ بھی کرتی، تب بھی اسے صاف نظر آجاتا کہ ایسا کرنے کو اس کا دل مچل رہا ہے لیکن وہ چپ اس لیے رہتی ہے کیونکہ وہ اس کے منکسر مزاجی کے جذبے کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی۔

1806-1805 کی سردیوں کے آغاز میں پیئر کو آنا پولونا کا روایتی گلابی دعوت نامہ موصول ہوا۔ اس کے اواخر میں یہ ایزادی عبارت (پوسٹ سکرپٹ) مندرج تھی:

''چندے آفتاب چندے ماہتاب ہیلین بھی، جسے آدمی بار بار دیکھتا ہے اور پھر بھی اس کی طبیعت سیر نہیں ہوتی، جلوہ افروز ہو رہی ہیں۔''

جب پیئر نے یہ تحریر پڑھی، اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا (حالانکہ دوسرے لوگ پہلے ہی تاڑ چکے تھے) کہ ہیلین اور اس کے مابین کوئی تعلق قائم ہو چکا ہے۔ وہ اس تصور سے یوں بدکا جیسے اس پر کوئی ایسی بھاری ذمے داری ڈالی

جارہی ہو جس سے عہدہ برآ ہونا اس کے بس کی بات نہ ہو۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ تصور اتنا سہانا اور خوش کن تھا کہ اس کا دل باغ باغ ہو گیا۔

آننا پاولوونا کی محفل بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ اس کی سابقہ محفل تھی۔ لیکن اس مرتبہ اس نے اپنے مہمانوں کے سامنے جو نیا نویلا اعجوبہ پیش کیا، وہ موخت ماغ نہیں تھا، بلکہ ایک سفارت کار تھا۔ وہ ابھی ابھی برلن سے آیا تھا اور اپنے ساتھ امپراطور الیکساندر کے دورۂ پوٹسڈم کی تازہ ترین خبر لے کر آیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ ان دو جلیل القدر امپراطوروں نے، جو آپس میں دوست بھی ہیں، نبی نوع انسان کے دشمن کے خلاف انصاف کا علم بلند کرنے کی خاطر کس طرح ناقابل تحلیل معاہدے کی پابندی کرنے کا عہد کیا ہے۔

آننا پاولوونا نے قدرے پرملال انداز سے پیئر کا استقبال کیا۔ حال ہی میں کاؤنٹ بزوخوف کے انتقال سے نوجوان کو جو صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا، یہ لاریب اس کی طرف اشارہ تھا۔ (ہر شخص مسلسل پیئر کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اسے اس کے والد کے انتقال پر گہرا صدمہ پہنچا ہے حالانکہ جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اسے اپنے باپ سے کوئی خاص انس نہیں تھا۔) آننا پاولوونا کا یہ رنج و ملال بالکل اس رنج و ملال سے مشابہ تھا جس کا اظہار وہ انتہائی واجب الاحترام امپراطورہ ماریا فیودرونا کے ذکر پر کیا کرتی تھی۔ پیئر اس چاپلوسی پر پھولا نہ سمایا۔

آننا پاولوونا نے اپنے ڈرائنگ روم میں مختلف گروپ اپنی روایتی چابک دستی اور مہارت سے ترتیب دیے تھے۔ سب سے بڑے گروپ میں پرنس واسیلی اور متعدد جرنیل نمایاں تھے۔ سفارت کار کو اپنے ساتھ بٹھانے کا شرف بھی اسی گروپ کے حصے میں آیا تھا۔ ایک دوسرا گروپ چائے کی میز کے گرد جمع تھا۔ پیئر اول الذکر گروپ کے ساتھ بیٹھنے کو ترجیح دیتا لیکن آننا پاولوونا نے۔ اس پر اسی قسم کی گھبراہٹ اور بدحواسی طاری تھی، جس کا مظاہرہ وہ جرنیل، جس کے پاس میدان جنگ میں ایک ہزار ایک بالکل نئی اور اختراعی تجاویز ہوں لیکن اس کے پاس ان میں سے ایک پر بھی عمل کرنے کا وقت نہ ہو، کرتا ہے۔ جونہی پیئر کو دیکھا، اس نے اپنی انگشت شہادت اس کی آستین پر رکھی اور گویا ہوئی:

"سنو، آج کی شام کے لیے میرے ذہن میں تمھارے لیے خاص منصوبہ ہے۔" اس نے ہیلین کی جانب توجہ کی اور اسے دیکھ کر مسکرائی۔ "ہیلین، جانِ من، میری آنٹی تمھاری پرستش کرتی ہے۔ ان کا دل رکھ لو۔ جاؤ، اور دس منٹ کے لیے اس کے پاس بیٹھ جاؤ۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تم وہاں کسی قسم کی بوریت محسوس کرو۔ ہمارے ڈیئر کاؤنٹ تشریف لے آئے ہیں۔ یہ تمھارا ساتھ دینے میں ذرا ہچکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے۔"

حسین و جمیل ہیلین آنٹی کی طرف چل پڑی لیکن آننا پاولوونا نے پیئر کو روک لیا۔ اس کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ اسے چند آخری لیکن ضروری ہدایات دینا چاہتی ہو۔

"کیا اس کا حسن حسنِ جہاں سوز نہیں ہے؟" اس نے پرشکوہ حسینہ کی جانب، جس کی موجِ خرام گل کترتی جارہی تھی، اشارہ کرتے ہوئے پیئر سے کہا۔ "اس کے اندازِ نقشِ پا تو دیکھو، کیا رعنائی ہے، کیا دل ربائی ہے! اتنی

بالی عمریا اور تس پہ یہ سلیقہ، یہ محل شناسی! اطوار و اسالیب اتنے کامل و بے عیب کہ انگلی اٹھانے کی گنجائش نہیں! یہ سب سچے اور پر خلوص قلب کی علامتیں ہیں۔ اس آدمی کی، جو اس کا دل مٹھی میں کر لے، خوش نصیبی قابلِ رشک ہے! ایک ایسا شخص بھی، جسے دنیاداری سے دور کا بھی واسطہ نہ ہو، اس کے شوہر کی حیثیت سے اعلیٰ طبقے میں ممتاز مقام حاصل کرنے میں ناکام نہیں ہو سکتا۔ تمھارا کیا خیال ہے؟ میں صرف تمھارا عندیہ معلوم کرنے کی خواہش مند تھی،'' آنّا پاولوونا نے کہا اور اس نے پیئر کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

جہاں تک ہیلین کے بے عیب اور کامل اطوار و اسالیب کا تعلق ہے، پیئر پورے خلوص کے ساتھ آنّا پاولوونا سے متفق تھا۔ اگر اس کے ذہن میں ہیلین کا کبھی خیال آیا بھی تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ غیر معمولی حسن و جمال سے بہرہ ور تھی اور اونچے طبقے کی محافل میں پر وقار رویہ اختیار کرنے اور اپنے اوپر پر سکون متانت طاری کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھی۔

معمر آنٹی نے اپنے گوشۂ عزلت میں دونوں نوجوانوں کو خوش آمدید کہا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس کے دل میں ہیلین کی جو قدر و منزلت تھی، اسے اس کا اظہار کرنے کا اتنا شوق نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے اس خوف کی، جو وہ آنّا پاولوونا سے کھاتی تھی، نمائش کرنا ضروری خیال کرتی تھی۔ اس نے اپنی بھانجی کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ یہ دریافت کرنا چاہتی ہو کہ ''میں ان دو نوجوانوں کا کیا کروں؟'' آنّا پاولوونا نے دوبارہ اپنی انگلی پیئر کی آستین پر رکھ دی اور بولی:

''مجھے یقین ہے کہ آئندہ تمھیں کبھی شکایت نہیں ہوگی کہ میرے گھر میں کسی شخص کو بوریت ہوتی ہے۔'' اور اس نے جھلملاتی نگاہ ہیلین پر ڈالی۔

ہیلین کچھ اس ادا سے مسکرائی جیسے وہ یہ کہنا چاہتی ہو کہ ''میں یہ مان ہی نہیں سکتی کہ کبھی ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص میری طرف دیکھے اور میرا جادو اس پر نہ چلے۔'' آنٹی کھنکاری، اپنا آبِ دہن نگلا اور گلا صاف کرتے ہوئے فرانسیسی میں بولی کہ اسے ہیلین سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ پھر وہ پیئر کی جانب متوجہ ہوئی اور کھنکار کر اس نے اس کا بھی اسی طرح خیر مقدم کیا۔ گفتگو رک رک کر ہو رہی تھی اور بالکل بے کیف تھی۔ لیکن اس کے بیچ میں ہیلین نے پیئر کی جانب دیکھا اور اسے بعینہٖ اسی خوبصورت اور دل کش تبسم سے نوازا جس کا مظاہرہ وہ ہر شخص سے کرتی رہتی تھی۔ پیئر اس تبسم کا اتنا عادی ہو چکا تھا اور اس کے لیے یہ ہر قسم کے مفہوم سے اتنا معریٰ تھا کہ اس نے اس کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ اس موقع پر آنٹی نسوار کی ان ڈبیوں کا، جو پیئر کے باپ کاؤنٹ بزوخوف نے جمع کی تھیں، ذکر کر رہی تھی اور اس نے انھیں اپنی نسوار کی ڈبیا دکھائی۔ پرنس ہیلین نے درخواست کی: ''آنٹی، ڈبیا کے ڈھکن پر آپ کے شوہر کی جو تصویر کندہ ہے، آپ ہمیں اس کی زیارت کرائیں۔''

''غالباً یہ تصویر وائیسے (Vinesse) نے منقش کی ہے،'' پیئر نے ایک نامور تصویر چہ ساز کا نام لیتے ہوئے کہا۔ اور وہ ڈبیا اٹھانے کے لیے میز پر جھک گیا لیکن اس عرصے کے دوران میں وہ اس گفتگو کو بھی، جو دوسری میز پر ہو رہی تھی، سننے کی کوشش کرتا رہا۔

وہ نیم ایستادہ ہوگیا۔ اس کا ارادہ میز کا چکر لگا کر آنٹی کے قریب پہنچنے کا تھا لیکن آنٹی نے ڈبیا اٹھائی، ہیلین کی پشت کے پیچھے گھمائی اور پیئر کی طرف بڑھادی۔ ہیلین آگے جھک گئی تا کہ آنٹی کو ڈبیا بڑھانے کے لیے جگہ مل سکے اور مسکرا کر گردوپیش دیکھنے لگی۔ جیسا کہ اس کی عادت تھی وہ شام کی محفلوں میں ہمیشہ اس قسم کا ڈریس پہنا کرتی تھی جس کی، اس زمانے کے فیشن کے مطابق، اگاڑی اور پچھاڑی دونوں خاصی نیچے تک کھلی ہوتی تھیں۔ اس کے جسم کا بالائی حصہ، جو پیئر کو ہمیشہ یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے سنگ مرمر کا بنا ہو، اس کے اتنا قریب تھا کہ اس کی کوتاہ بین نگاہیں اس کی مرمریں گردن اور شانوں کے روح پرور حسن اور دلکشی کو دیکھے بغیر نہ رہ سکیں اور اس کے لب اس کے اتنا نزدیک تھے کہ اگر وہ اپنا سر خفیف سا نیچے جھکاتا وہ انھیں مس کرنے لگتا۔ اس کے جسم کی حرارت اور اس کے پرفیوم کی معطر خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسی جارہی تھی۔ وہ جب سانس لیتی، اس کا کارسیٹ[6] مرتعش ہوجاتا، ہلکی سی آواز پیدا ہوتی اور اسے وہ بھی سنائی دے جاتی۔ مرمریں حسن کی بجائے، جو اس کے ڈریس سے مل کر ایک کُل کی تشکیل کررہا تھا، اب اسے اس کا جسم، جسے محض اس کے ملبوسات نے ڈھانپ رکھا تھا، للچاتا، ورغلاتا نظر آیا۔ اور جب ایک مرتبہ اسے ان نگاہوں سے دیکھ چکا، وہ اسے کسی بھی دوسرے انداز سے دیکھنے کے قابل نہ رہا، بعینہٖ اس طرح جس طرح جب ہماری نگاہوں سے کسی سراب کا پردہ اٹھتا ہے، ہم کبھی دوبارہ اس کی طرف رجوع نہیں کرتے۔

اس نے اپنی گردن پچھلی جانب گھمائی اور اپنی درخشاں سیاہ آنکھوں سے اسے دیکھنے اور مسکرانے لگی۔

''تو تم نے کبھی پہلے یہ اندازہ نہیں لگایا تھا کہ میں کتنی حسین ہوں؟'' وہ کہتی محسوس ہورہی تھی۔ ''تم نے کبھی نہیں دیکھا تھا کہ میں عورت ہوں؟ ہاں میں عورت ہوں اور میں کسی کی بھی ہوسکتی ہوں ۔۔ بلکہ تمھاری بھی،'' اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں۔

اور اس لمحے پیئر کو یہ احساس ہوا کہ ہیلین اس کی بیوی بن سکتی ہے بلکہ اسے بننا ہی ہوگا کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ہو ہی نہیں سکتی۔ اسے اس امر کا اتنا پختہ یقین تھا کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کے ساتھ گرجے میں کھڑا ہے اور ان دونوں کا نکاح پڑھایا جارہا ہے۔ لیکن یہ کیسے ہوگا اور کب ہوگا، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اس کام کا انجام اچھا ہوگا یا برا (حقیقتاً کسی وجہ کی بنا پر وہ نہاں خانۂ دل میں یہ محسوس کررہا تھا کہ اس کا انجام برا ہی ہوگا) لیکن وہ اتنا جانتا تھا کہ یہ کام ہوگا ضرور۔

پیئر نے اپنی نگاہیں جھکالیں، دوبارہ اوپر اٹھائیں اور یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ وہ ایک ایسی حسینہ ہے، جو اس سے بہت دور ہے، اس سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ اس کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ آج تک وہ اسے یہی سمجھتا اور اسے ایسے ہی جانتا رہا تھا۔ لیکن اب؟ اب اس کے لیے ایسا کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی حالت بالکل ایسے شخص کی تھی جو دھند میں دور سٹیپ[7] گھاس کا گچھا دیکھتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ وہ کوئی درخت دیکھ رہا ہے لیکن جس طرح جب وہ ایک مرتبہ اس گچھے کو گھاس کے گچھے کے طور پر پہچان لیتا ہے، اسے کبھی دوبارہ درخت تصور نہیں کرسکتا، بعینہٖ اب وہ بھی اسے دوبارہ کوئی دور دراز کی اجنبی حسینہ تصور کرنے سے قاصر تھا۔ وہ اس کے بے پناہ قریب تھی، اسے اپنی

مٹھی میں لے چکی تھی، اسے اپنے سحر میں گرفتار کر چکی تھی اور اب ان دونوں کے مابین کوئی رکاوٹ باقی نہیں رہ گئی تھی اور اگر کوئی رکاوٹ رہ بھی گئی تھی تو وہ اس کی اپنی قوت ارادی تھی۔

''اچھا، میں تمھیں تمھارے گوشے میں چھوڑے جا رہی ہوں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ تم یہاں بالکل ٹھیک ٹھاک ہو،'' اسے آنا پاولوونا کی آواز کہتی سنائی دی۔

اور پیئر کو فکر لگ گئی اور وہ سوچنے لگا کہ کہیں اس سے کوئی قابل ملامت حرکت تو سرزد نہیں ہو گئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ اپنے گرد و پیش نظریں دوڑانے لگا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے ساتھ جو واردات گزری ہے، جس طرح اسے اس کا علم ہے باقی لوگوں کو بھی اس کے بارے میں آگاہی ہو گئی ہے۔

کچھ دیر بعد جب وہ بڑے حلقے میں شامل ہو گیا، آنا پاولوونا نے اس سے کہا:

''سنا ہے کہ تم پیٹرز برگ میں اپنے مکان کی تزئین و آرائش کرا رہے ہو؟''

اور یہ بات درست تھی۔ میر عمارات نے اسے بتایا تھا کہ ایسا کرنا ضروری ہے اور یہ جانے بغیر کہ ایسا کرنا کیوں ضروری ہے، اس نے پیٹرز برگ میں اپنی وسیع و عریض حویلی کی از سر نو تزئین و آرائش شروع کرا دی تھی۔

''یہ تم بہت اچھا کر رہے ہو۔ تاہم میرا مشورہ یہ ہے کہ اپنی رہائش پرنس واسیلی کے دولت کدے پر ہی رکھنا۔ جس آدمی کو پرنس جیسا دوست مل جائے، وہ کبھی گھاٹے میں نہیں رہتا،'' آنا پاولوونا نے پرنس واسیلی کی جانب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے ان باتوں کا کچھ کچھ علم ہے۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟ تم ابھی بالکل نوعمر ہو۔ تمھیں مشوروں کی ضرورت ہے۔ میں بڑی بوڑھیوں کی طرح باتیں کر رہی ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم ان کا برا نہیں مناؤ گے۔'' جس طرح خواتین اپنی عمر کا تذکرہ کرنے کے بعد کچھ وقفہ دیتی ہیں تا کہ مخاطب کو جواب میں کچھ کہنے کا موقع مل سکے، وہ بھی بولتے بولتے رک گئی۔ ''ہاں اگر تم شادی کر لو، پھر دوسری بات ہے۔''

اس نے دونوں کو ایک ہی نگاہ میں سمو لیا۔ نہ پیئر نے ہیلین کی جانب دیکھا اور نہ ہیلین نے پیئر کی طرف۔ لیکن وہ اب بھی اس کے بے پناہ قریب تھی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے سے کچھ کہا اور شرمانے لگا۔

جب پیئر گھر پہنچا، نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، وہ بار بار یہی سوچتا رہا کہ اس کے ساتھ کیا واردات گزری ہے، کیا وقوعہ پیش آیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں۔ اسے صرف اتنا احساس ہوا تھا کہ وہ عورت، جسے وہ اس وقت بھی جانتا تھا جب وہ ابھی محض بچی تھی، وہ عورت، جس کے حسن کا جب بھی ذکر آتا، وہ بے اعتنائی سے جواب دیتا تھا: ''ہاں، اچھی شکل ہے''، اس کی اپنی بن سکتی ہے۔

''لیکن وہ تو نری احمق ہے۔ میں خود بار بار کہہ چکا ہوں کہ وہ بالکل احمق ہے،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''میرے دل میں وہ جو جذبات انگیخت کرتی ہے، وہ محبت کے جذبات نہیں کہے جا سکتے۔ اس کے برعکس مجھے ان جذبات سے، جو وہ ابھارتی ہے، گھن آتی ہے، میرے نزدیک وہ قابل نفرین ہیں۔ میں نے تو یہاں تک سنا ہے کہ اس کا اپنا بھائی اناطول اس سے محبت کرتا تھا اور وہ اس سے۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ بڑا زبردست سکینڈل ہوا تھا

اور یہی وجہ ہے کہ اسے کہیں باہر بھیج دیا گیا... اور اپولیت اس کا بھائی ہے... پرنس واسیلی اس کا باپ ہے... یہ سب گڑبڑ ہے،'' اس نے سوچا۔ لیکن ابھی وہ غور وفکر میں محو تھا (اور اس کا یہ غور وفکر کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پایا تھا کہ اس نے خود کو مسکراتے پایا) اور اسے یہ احساس ہونے لگا کہ پہلے خیال کے بطن سے ایک نیا سلسلۂ خیالات پر پرزے نکال رہا ہے اور عین اس وقت جب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ یہ عورت بیکار محض ہے، وہ ایک اور خواب بھی دیکھ رہا تھا کہ وہ کس طرح ایک روز اس کی بیوی بن کر آئے گی، کیسے اس پر اپنا تن من نثار کرے گی، عین ممکن ہے کہ وہ مختلف بن جائے اور اس نے اس کے متعلق جو کچھ سوچا اور سنا ہے، وہ جھوٹ کا پشتارہ ثابت ہو جائے۔ اور ایک بار پھر اس نے اس کا اس حیثیت سے تصور نہیں کیا کہ وہ ''پرنس واسیلی کی بیٹی ہے'' بلکہ اس کے خیالوں میں اس کا سراپا، جو صرف سرمئی گاؤن میں مستور تھا، در آیا۔ ''لیکن یہ خیال مجھے پہلے کبھی کیوں نہ سوجھا؟'' اور ایک مرتبہ پھر اس نے اپنے آپ کو بتایا کہ یہ شادی ناممکن ہے، اس میں ضرور کوئی ایسی بات ہے جس سے گھن آتی ہے، جو معلوم ہوتا ہے کہ غیر فطری ہے، موجب رسوائی ہے۔ اس نے اس کی حالیہ باتوں اور نگاہوں کو اور ان لوگوں کی باتوں اور نگاہوں کو، جنھوں نے انھیں اکٹھے دیکھا تھا، یاد کیا۔ آننا پاولوونا نے جو کچھ کہا تھا اور جب وہ اس سے اس کے مکان کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی، تب اس نے اسے جس انداز سے دیکھا تھا، اس نے وہ بھی یاد کیا۔ پرنس واسیلی اور دوسرے لوگوں نے اس قسم کے جو سینکڑوں اشارے کنائے کیے تھے، وہ انھیں بھی اپنے ذہن میں لایا اور یہ سوچ سوچ کر اس کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے کہ کہیں اس نے ازیں پیشتر ہی اپنے آپ کو کوئی ایسا کام کرنے کا، جو بظاہر غلط تھا اور جو اسے نہیں کرنا چاہیے تھا، پابند تو نہیں بنا لیا؟ لیکن جس لمحے اسے اس ایقان کا تجربہ ہو رہا تھا، اس کے نہاں خانۂ دماغ کے کسی دوسرے کونے میں اس کی تصویر اپنے کامل نسائی حسن کے ساتھ نمودار ہونے لگی۔

2

نومبر 1805 کے دوران میں پرنس واسیلی کو مجبوراً چار صوبوں کے انسپیکشن کے دورے پر جانا پڑا۔ اس نے اس دورے کی اجازت دو مقاصد کے پیش نظر حاصل کی تھی۔ ایک تو وہ اپنی جاگیروں کا، جنھیں اس نے کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا تھا، چکر لگانا چاہتا تھا۔ دوسرے وہ اپنے بیٹے اناطول (جس کی رجمنٹ اس کے راستے میں ہی متعین تھی) کو ہمراہ لے کر پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی کے ہاں جانا چاہتا تھا تاکہ اس امیر کبیر بوڑھے شخص کی بیٹی کے ساتھ جیسے تیسے اس کی شادی کا ڈول ڈال سکے۔ لیکن کہیں دور جانے اور ان نئے معاملات میں ہاتھ ڈالنے سے قبل وہ پیئر کا قضیہ طے کر لینا چاہتا تھا۔ یہ درست ہے کہ پیئر نے حال ہی میں صبح سے شام تک پورا پورا دن گھر میں، یعنی پرنس واسیلی کی حویلی میں، جہاں وہ قیام پذیر تھا، گزارنا شروع کر دیا تھا اور (جیسا کہ عاشق کا وتیرہ ہونا چاہیے) ہیلین کی موجودگی میں خاصی جوشیلی، احمقانہ اور عقل وخرد سے کوری حرکات کرتا رہتا تھا، لیکن ابھی تک بیل منڈھے نہیں چڑھی تھی۔ چڑھتی بھی کیسے؟ اس نے شادی کا کوئی عندیہ ہی نہیں دیا تھا۔

''معاملات جا تو ٹھیک نہج پر رہے ہیں لیکن ان کا کوئی فیصلہ بھی تو ہونا چاہیے،'' ایک صبح پرنس واسیلی نے ٹھنڈی اور پر ملال آہ بھرتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس بات کے باوجود کہ پیئر اس کے احسانوں کے بوجھ تلے دبا ہوا ہے (خیر چھوڑو اس قصے کو)، اس معاملے میں مناسب رویہ اختیار نہیں کر رہا۔ ''جوانی... نادانی... خدا اس کا حامی و ناصر ہو،'' وہ سوچ رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنی دریا دلی اور نیک دلی پر خوش ہو رہا تھا۔ ''لیکن یہ معاملہ بہر صورت انجام کو پہنچنا چاہیے۔ پرسوں ایلینا[8] کا نام دن ہے۔ میں چند لوگوں کو دعوت پر بلاؤں گا۔ اگر وہ پھر بھی یہ نہ سمجھا کہ اسے کیا کرنا ہے، پھر اسے انجام تک پہنچانا میرا کام ہوگا۔ ہاں، میرا کام۔ میں اس کا باپ ہوں!''

جس رات آنا پاولونا کے ہاں محفل منعقد ہوئی تھی، پیئر نے اس کا بقایا حصہ پریشانیوں میں گھلنے اور جاگتے رہنے میں گزارا تھا۔ تاہم وہ یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ ہیلین کے ساتھ شادی المیہ ہوگی، لہٰذا اسے اس کی صحبت سے گریز کرنا اور وہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے لیکن چھ ہفتے گزر گئے اور وہ پرنس واسیلی کے ہاں ڈیرا ڈالے رہا۔ یہ سوچ سوچ کر اس کی روح فنا ہوتی رہتی تھی کہ لوگوں کی نگاہوں میں، ہر دن کے گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کا باہمی رشتہ مستحکم سے مستحکم ہوتا جا رہا ہے، یہ کہ اس نے ماضی میں اپنے ذہن میں اس کے بارے میں جو تصورات باندھ رکھے تھے، اب ان کی طرف لوٹنا ناممکن ہے، یہ کہ وہ اس سے علیحدگی کا خیال بھی دل میں نہیں لا سکتا اور یہ کہ اسے اپنا مقدر اس کے مقدر کے ساتھ نتھی کرنا ہی ہوگا حالانکہ اس کی چھٹی حس پکار پکار کر اس سے کہہ رہی تھی کہ یہ نہایت خطرناک حرکت ہوگی۔ لیکن بیچ یہ آن پڑا کہ پرنس واسیلی کی حویلی (جہاں ایام گزشتہ میں شاید ہی کبھی کوئی دعوت منعقد ہوتی تھی) میں آئے روز کوئی نہ کوئی محفل یا تقریب سجنے لگی اور اسے مجبوراً ان دعوتوں میں شامل ہونا پڑتا ورنہ اس پر یہ الزام آتا کہ وہ دوسروں کی خوشیوں میں کھنڈت ڈال رہا ہے اور انھیں خواہ مخواہ پریشان کر رہا ہے۔ یوں تو ایسے مواقع بہت کم آتے جب پرنس واسیلی گھر پر ہوتا لیکن جب بھی ایسا موقع آتا، وہ پیئر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا، اسے اپنی طرف گھسیٹتا اور بے دھیانی میں اپنا صفاچٹ، جھریوں دار رخسار بوسے کے لیے اس کی طرف بڑھا دیتا اور کہتا: ''اچھا، اب کل ملاقات ہوگی۔'' یا ''شام کو کھانے پر گھر پہنچ جانا ورنہ میں تمھاری شکل تک نہیں دیکھوں گا'' یا ''تمھاری خاطر آج میں کہیں نہیں جاؤں گا۔'' اور علیٰ ہٰذالقیاس اور جب بھی وہ (بقول اس کے) پیئر کی خاطر گھر ٹھہرتا، وہ اس سے بمشکل ایک دو الفاظ کا تبادلہ کرتا۔ ادھر پیئر کا یہ حال تھا کہ اسے مایوس کرنا اسے اپنے بس کی بات معلوم نہیں ہوتا تھا۔ وہ ہر روز اپنے آپ سے ایک ہی بات کی تکرار کرتا رہتا تھا۔ ''وقت آ گیا ہے کہ اب میں اسے (ہیلین کو) اچھی طرح جان جاؤں اور یہ سمجھنے کی کوشش کروں کہ وہ حقیقتاً ہے کیا۔ کیا میں پہلے غلطی پر تھا یا اب غلطی کا مرتکب ہو رہا ہوں؟ نہیں، وہ احمق نہیں ہے، وہ سلجھی ہوئی نوجوان خاتون ہے،'' وہ بعض اوقات اپنے آپ سے کہتا۔ ''وہ کبھی غلط قدم نہیں اٹھاتی، کبھی ناعاقبت اندیشانہ بات نہیں کہتی۔ وہ بہت کم بولتی ہے لیکن جو کچھ بھی کہتی ہے اس میں کوئی الجھاؤ یا پیچ نہیں ہوتا، بلکہ ہمیشہ صاف اور کھری بات کرتی ہے۔ پھر وہ احمق تو نہ ہوئی۔ نہیں، وہ سلجھی ہوئی خاتون ہے۔ وہ کبھی بدحواس نہیں ہوئی، کبھی گڑبڑائی نہیں، کبھی الجھن میں گرفتار نہیں ہوئی۔ پھر وہ

بدعورت کیسے ہو سکتی ہے؟''

اکثر ایسا ہوتا کہ وہ اس کی موجودگی میں استدلال کرنے یا با آواز بلند سوچنے لگتا۔ اور وہ ہمیشہ اپنے ردعمل کا اظہار یوں کرتی کہ جواب میں کوئی مختصر لیکن برمحل بات کہہ دیتی۔۔ اس سے وہ یہ ظاہر کر دیتی کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اس میں خود اسے کوئی دلچسپی نہیں۔۔ یا پھر خاموش اسے دیکھتی اور مسکراتی رہتی۔ اس سے پیئر کو یہ محسوس ہوتا کہ کسی دوسری چیز کی نسبت اپنے اس انداز سے اس نے اپنی فوقیت زیادہ واضح طور پر جتادی ہے، چنانچہ اگر وہ اپنے اس تبسم کے مقابلے میں تمام دلائل و براہین کو بیکار اور لایعنی شے سمجھتی ہے، تو ٹھیک ہی سمجھتی ہے۔

وہ جب بھی اس کی طرف متوجہ ہوتی، روشن و تابندہ مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل رہی ہوتی، ایسی مسکراہٹ جیسے وہ اسے اپنا رازداں بنا رہی ہو اور یہ مسکراہٹ صرف اسی کے لیے ہو۔ اس مسکراہٹ میں اس مسکراہٹ کی نسبت جو عام طور پر اس کے چہرے پر سجی رہتی تھی اور جس کا ہدف ہما شما ہوتے تھے، کوئی زیادہ معنی خیز چیز تھی۔ پیئر خوب جانتا تھا کہ ہر شخص اس بات کا منتظر ہے کہ وہ اپنی زبان سے صرف ایک لفظ کہہ دے، ایک خاص حد عبور کر جائے اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ یہ حد عبور کر جائے گا۔ تاہم اس ہولناک قدم کا محض تصور ہی اس پر ایک قسم کا ناقابل فہم لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔ ان چھ ہفتوں کے دوران میں اسے یہ محسوس ہوتا رہا کہ وہ اس مہیب پاتال کی جانب دیوانہ وار کھنچا جا رہا ہے اور روز بروز اس کے قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس عرصے کے دوران میں اس نے اپنے آپ سے کوئی ایک ہزار مرتبہ پوچھا: ''یہ میں کیا کر رہا ہوں؟ مجھے صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ ہے عزم صمیم! کیا یہ عزم صمیم مجھ میں ہے ہی نہیں؟''

اس نے کسی فیصلے پر پہنچنے کی کوشش کی۔ وہ جانتا تھا کہ وہ قوت ارادی سے تہی دامن نہیں اور حقیقت بھی یہی تھی کہ اس میں قوت ارادی موجود تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے، وہ قوت ارادی سے عاری ہو چکا ہے اور اس پر اسے بہت دکھ ہوا۔ پیئر کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا ہے جو اپنے آپ کو صرف تبھی توانا اور قوی محسوس کرتے ہیں جب ان کا ضمیر کا ملاً پاک اور صاف ہو۔ لیکن اس دن سے، جب وہ آنا پاولوونا کے ہاں نسوار کی ڈبیا پر جھکا تھا اور (نفسانی) خواہش نے اس پر تغلب پا لیا تھا، اسے غیر شعوری طور پر یہ احساس ستائے جا رہا تھا کہ اپنی اس نفسانی خواہش کے ذریعے وہ گناہ کا مرتکب ہوا ہے اور اس کے اسی احساس نے اس کی قوت ارادی کو مفلوج کر دیا تھا۔

ہیلین کے نام دن پرنس واسیلی کے ہاں دعوت شبینہ کا اہتمام کیا گیا، جس میں صرف گنے چنے مہمانوں۔۔ اس کی اہلیہ کے بقول صرف قریب ترین اور عزیز ترین رشتہ داروں اور دوستوں۔۔ کو مدعو کیا گیا تھا۔ ان تمام دوستوں اور رشتے داروں کو اشاروں کنایوں میں سمجھا دیا گیا تھا کہ اس شام پرنس کے مقدر کا فیصلہ ہو جائے گا۔ مہمان کھانے کی میز پر بٹھا دیے گئے۔ پرنسس کوراگنا، جو بھاری بھرکم اور بارعب خاتون تھی اور کسی زمانے میں صاحب جمال بھی تھی، کرسی صدارت پر متمکن تھی۔ اس کے دائیں بائیں اس کے انتہائی معزز مہمان۔۔ ایک بزرگ جرنیل، اس

آنکھوں سے بے اختیار ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس مجسمہ نما پرنس میں یہ تبدیلی دیکھ کر پیئر کے دل پر گہرا اثر ہوا، اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑا اور اس سے معافی کا طلب گار ہو گیا۔ کس لیے یہ اسے خود بھی معلوم نہ ہوا۔ بعد ازاں بڑی پرنس نے اسی دن پیئر کے لیے دھاری دار سکارف بننا شروع کر دیا اور اس کے بارے میں اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا۔

''مائی ڈیئر، یہ کام میری خاطر کر دو۔ آخر بے چاری کو مرحوم کے ہاتھوں بہت کچھ سہنا پڑا تھا'' پرنس واسیلی نے پیئر کو دستاویز تھماتے ہوئے کہا۔ اگر پیئر اس پر دستخط کر دیتا، پرنس کو مالی منفعت حاصل ہو جاتی۔

یوں بھی پرنس واسیلی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ اس ہڈی کا — یہ دراصل تیس ہزار روبل کا پرامیسری نوٹ تھا — پھینکنا ضروری ہے۔ اگر پرنس واسیلی بے چاری پرنس کو یہ رقم دلوانے کا اہتمام نہ کرتا، تو اس بات کا اندیشہ تھا کہ چرمی تھیلے کے سلسلے میں اس نے جو کردار ادا کیا تھا، اس کا راز طشت از بام ہو جاتا۔ پیئر نے دستاویز پر دستخط کر دیے اور اس کے بعد پرنس کا رویہ اور بھی شفقت آمیز ہو گیا۔ چھوٹی بہنیں بھی خاص طور پر سب سے چھوٹی، جس کے بالائی ہونٹ پر تل تھا، جو خوب روتھی اور جس کی مسکراہٹیں اور بوکھلاہٹیں، اسے اکثر مجحوب کر دیا کرتی تھیں — اس سے پیار جتانے لگیں۔

پیئر کے نزدیک یہ بات بالکل فطری تھی کہ ہر شخص اسے اتنا پیار کرے اور اگر کوئی شخص اسے پسند نہ کرتا تو اسے یہ چیز قطعی غیر فطری معلوم ہوتی۔ چنانچہ یہ اسی سوچ کا نتیجہ تھا کہ جن لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈالا ہوا تھا، وہ ان کے خلوص پر ایمان لائے بغیر نہ رہ سکا۔ علاوہ ازیں اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ اپنے آپ سے یہ پوچھ سکتا کہ یہ لوگ مخلص ہیں بھی یا نہیں۔ وہ ہر وقت مصروف رہتا تھا اور اس پر مدام ہلکے پھلکے اور خوشگوار نشے کی کیفیت طاری رہتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ کسی اہم تحریک کا مرکز ہے اور اسے مسلسل یہ احساس ستاتا رہتا کہ اس سے کچھ توقعات وابستہ ہیں، اسے ان توقعات کو پورا کرنا ہوگا ورنہ لوگوں کو دکھ اور مایوسی ہوگی اور لیکن یہ کہ اگر اس نے یہ کام کر دیا یا اس کام میں ہاتھ ڈال دیا تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا — چنانچہ وہ وہی کچھ کرتا تھا جس کی اس سے توقع کی جاتی تھی لیکن وہ جو کچھ بھی کرتا تھا، اس کا کوئی خوشگوار نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تھا، اس کی توقعات وہ مستقبل سے باندھ لیتا تھا۔

ان ابتدائی ایام کے دوران میں پیئر کے معاملات کی باگ ڈور اور خود پیئر کی نکیل کسی دوسرے شخص کی نسبت پرنس واسیلی کے ہاتھ میں زیادہ تھی۔ کاؤنٹ بزوخوف کے انتقال کے بعد اس نے پیئر کو اپنے قبضے سے نکلنے نہ دیا۔ وہ ظاہر یوں کرتا تھا جیسے اسے ایک منٹ کی فرصت نہ ہو، وہ گوناگوں مصروفیات کے بوجھ تلے دب چکا ہو، تھک چکا ہو، زچ ہو چکا ہو اور اس کا کچومر نکل چکا ہو لیکن اس کا دل اتنا نرم و گداز ہے کہ وہ اس بے یار و مددگار نوجوان کو قسمت کے تھپیڑے کھانے اور لچے لفنگے لوگوں کی سازشوں کا شکار بننے کی اجازت نہیں دے گا کیونکہ وہ بہرحال اس کے دوست کا صاحب زادہ اور اس ناتے خزانۂ قارون کا مالک تھا۔ کاؤنٹ بزوخوف کی رحلت کے بعد

"بے مروت نہ بنو!" آنناپاولوونا نے میز کے دوسرے سرے سے اس کے سامنے دھمکی آمیز انداز سے انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ "ہمارے نیک دل ویاز متینوف قابل قدر اور نفیس انسان ہیں ..."

تمام مُضار کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کرسی صدارت کے آس پاس، جو معزز مہمان فروکش ہیں، وہ سب کے سب شگفتگی کے عالم میں ہیں اور ان میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ دل لگی کرنے پر تلا ہوا ہے۔ صرف پیئر اور ہیلین میز کے تقریباً آخری سرے پر ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو مہر بلب بیٹھے تھے۔ دبی دبی مسکراہٹ دونوں کے چہروں کو روشن و تاباں بنا رہی تھی۔ اس مسکراہٹ کا سرجی کزمچ سے کوئی تعلق نہ تھا۔ بلکہ یہ اس امر کا عندیہ دے رہی تھی کہ دونوں اتنے شرمیلے ہیں کہ اپنے جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کر سکتے۔ دوسرے خواہ کتنی ہی باتیں کرتے رہیں، ہنستے رہیں، ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹتے اور آپس میں دل لگی کرتے رہیں، اعلیٰ اقسام کی رائن[10] شرابیں پیتے رہیں، بھنے گوشت کی قاشیں صاف کرتے رہیں، رنگ برنگی آئس کریموں سے لطف اندوز ہوتے رہیں، محتاط انداز سے نوجوان جوڑے سے نظریں چراتے رہیں، بظاہر ان پر توجہ نہ دیں اور یوں ظاہر کرتے رہیں جیسے انھوں نے انھیں دیکھا ہی نہیں، بھلے یہ سب کچھ ہو، لیکن کبھی کبھار جو نگاہیں گھوم پھر کر ذرا کی ذرا انھیں دیکھتیں، ان سے کسی نہ کسی طور پر یہ صاف محسوس ہوتا تھا کہ سرجی کزمچ کی کہانی، ہنسی ٹھٹھا اور محفل نا ؤ نوش، یہ سب بہانے ہیں اور دراصل تقریب میں موجود ہر شخص کی توجہ کا مرکز یہ جوڑا — پیئر اور ہیلین — ہے۔

پرنس واسیلی سرجی کزمچ کی سسکیوں کی نقلیں اتارتا رہا لیکن اس کی نظریں بار بار بھٹک کر اپنی بیٹی پر جا پڑتیں اور جب وہ ہنس رہا ہوتا، اس کا چہرہ مہرہ یہ پیغام دے رہا ہوتا: "فکر کی کوئی بات نہیں۔ سارا معاملہ ٹھیک ٹھاک چل رہا ہے۔ آج رات قطعی فیصلہ ہو جائے گا۔" آنناپاولوونا نے ملامت آمیز انداز سے انگلی اس کی طرف لہرائی تھی کہ اس نے "ہمارے نیک دل ویاز متینوف" کا مذاق اڑایا تھا لیکن یہ اوپری بات تھی۔ پرنس واسیلی نے اس کی نگاہوں میں، جو پیئر پر جمی ہوئی تھیں، اپنے مستقبل کے داماد اور اپنی بیٹی کی مسرتوں پر تہنیت کا پیغام پڑھ لیا تھا۔ بڑی پرنس کوراگینا نے ملحقہ کرسی پر نشستہ خاتون کو شراب کا گلاس پیش کرتے ہوئے اندوہ ناک آہ بھری اور تنک مزاجی سے اپنی بیٹی کی جانب دیکھا اور اس کی آہ یہ کہتی محسوس ہو رہی تھی: "مائی ڈیئر، اب میرے اور تمھارے کرنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ بس مے شیریں کی چسکیاں لیتے رہیں۔ اب تو ان نوجوانوں کی باری ہے کہ وہ کھلم کھلا اور اشتعال انگیز انداز سے اپنی مسرتوں کا اظہار کرتے پھریں!..." "اور میں یہ ساری واہیات گفتگو کیوں کر رہا ہوں جیسے مجھے اس میں بہت دلچسپی ہو..." ایک سفارت کار نے پریمیوں کے پر مسرت چہروں پر طائرانہ نظریں ڈالتے ہوئے سوچا۔ "خوشی تو وہ ہے!"

جن چھوٹی چھوٹی بے تکی، بے وقعت اور مصنوعی دلچسپیوں نے محفل کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا، ان کے مابین کشش کے سادے جذبے نے، جو دو خوش شکل اور صحت مند نوجوان ایک دوسرے کے لیے محسوس کر رہے تھے، راہ پالی تھی۔ اور یہ انسانی جذبہ ہر دوسری چیز پر حاوی ہو چکا تھا اور ان کی تمام بناوٹی گپ شپ اور ٹر ٹر کو مات دے چکا تھا۔

چٹکلے اور لطیفے کھوکھلے ہو گئے، خبریں پر لطف نہ رہیں۔ جوش و خروش اور گرما گرمی صرف مانگے تانگے اور دھکے دھکی کی تھی۔ نہ صرف مہمانوں کو بلکہ دسترخوان پر تعینات بیروں کو بھی کچھ یہی محسوس ہو رہا تھا۔ یہ بیرے جب حسین ومہ جبیں ہیلین اور اس کے منور ودرخشاں چہرے کو دیکھتے یا جب ان کی نظریں پیئر کے چوڑے چکلے، سرخ، پرمسرت اور قدرے بے چین خدوخال پر پڑتیں، انھیں اپنے فرائض انجام دینا یاد نہ رہتا۔ کچھ یوں نظر آرہا تھا جیسے شمعوں کی روشنی ان مسرور و مطمئن چہروں پر مرکوز ہو گئی ہے۔

پیئر جانتا تھا کہ ان تمام امور کا مرکزی نقطہ وہ خود ہے۔ اپنے اس مقام پر اسے خوشی بھی ہو رہی تھی اور کچھ کچھ شرمساری بھی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی کیفیت اس شخص کی تھی جو کسی مصروفیت میں مستغرق ہو۔ اسے کوئی چیز نہ صاف سنائی دے رہی تھی، نہ نظر آرہی تھی اور نہ اس کے پلے پڑ رہی تھی۔ صرف کبھی کبھار دنیائے حقیقت سے کچھ غیر مربوط خیالات غیر متوقع طور پر پلک جھپکنے میں اس کے ذہن میں در آتے۔

"تو معاملہ انجام کو پہنچ گیا!" اس نے سوچا۔ "یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اور اتنی عجلت سے! اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ نہ محض اس کی خاطر، نہ محض میری خاطر، بلکہ ہر شخص کی خاطر، یہ لازماً وقوع پذیر ہو ہی جانا چاہیے۔ یہ سب لوگ اس کی امید لگائے بیٹھے ہیں، یہ سب اس کے وقوع پذیر ہونے کے بارے میں اتنے پر اعتماد ہیں کہ میں انھیں مایوس نہیں کر سکتا، نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ ہوگا کیسے؟ مجھے کچھ معلوم نہیں تاہم یہ ہوگا یقیناً!" پیئر نے ان جگمگاتے شانوں کو، جو براہ راست اس کی نگاہوں کی زد میں تھے، دیکھتے ہوئے سوچا۔

پھر اچانک اسے احساسِ خجالت نے آگھیرا۔ اسے یہ سوچ سوچ کر کوفت ہونے لگی کہ وہ سب کی نگاہوں کا مرکز ہے، وہ اسے خوش قسمت انسان تصور کرتے ہیں، حالانکہ اس کی شکل وصورت واجبی سی ہے، وہ اسے پیرس، جو اپنی ہیلن[11] کو بغل میں دبائے بیٹھا ہے، سمجھ رہے ہیں۔ "لیکن غالباً ہمیشہ ایسے ہی ہوتا آیا ہے اور شاید ہونا بھی ایسے ہی چاہیے۔" اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی۔ "لیکن میں نے کیا کیا تھا جو یہ ہو گیا؟ اس کی شروعات کب ہوئی تھی؟ میں نے ماسکو سے یہاں تک کا سفر پرنس واسیلی کی معیت میں کیا تھا۔ اس وقت تک تو ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ اس کے بعد میں نے اس کے گھر میں اپنا ٹھکانا بنا لیا۔ بظاہر کوئی ایسی وجہ نہیں تھی کہ میں اس کے گھر میں نہ ٹھہرتا۔ پھر میں اس (ہیلین) کے ساتھ تاش کی بازیاں لگاتا رہا، اس کا پرس اٹھائے گاڑی میں اس کے ساتھ باہر جاتا رہا۔ اس کی شروعات کب ہوئی؟ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا؟ اور یہاں میں اس کے منگیتر کی حیثیت سے اس کے پہلو میں بیٹھا ہوں اور اس کی قربت، اس کی سانسوں کے زیر و بم، اس کی حرکات و سکنات، اس کے حسن و جمال کو دیکھ رہا، سن رہا اور محسوس کر رہا ہوں۔" پھر ایکا ایکی اسے یوں لگا کہ غیر معمولی حسن و جمال کی مالک ہیلین نہیں بلکہ وہ خود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں اور اس ہمہ گیر تعریف و تحسین نے اسے شاداں و فرحاں کر دیا۔ وہ سیدھا تن کر بیٹھ گیا، اس نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور اپنی خوش قسمتی پر اس کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے۔

اچانک اسے ایک جانی پہچانی آواز، جو دوسری مرتبہ اس سے مخاطب ہوئی تھی، سنائی دی۔ لیکن پیئر اپنی ہی

سوچوں میں اتنا مستغرق تھا کہ اسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ اس سے کیا کہا جا رہا ہے۔

''میں پوچھ رہا ہوں کہ تمھیں بلکونسکی کا آخری خط کب موصول ہوا تھا؟'' پرنس واسیلی نے تیسری مرتبہ اپنا سوال دہرایا۔ ''عزیزم، تم کتنے غائب دماغ ہو!''

پرنس واسیلی مسکرانے لگا اور پیئر نے دیکھا کہ کمرے میں موجود تمام اشخاص کی نگاہیں اس پر اور ہیلین پر جمی ہوئی ہیں اور وہ مسکرا رہے ہیں۔ ''خیر، اس سے کیا فرق پڑتا ہے، کیونکہ تمھیں پہلے ہی سب کچھ معلوم ہے؟'' پیئر نے سوچا۔ ''اور حقیقت ہے بھی یہی۔'' اور وہ اپنے بھلے مانس اور طفلانہ انداز سے مسکرا دیا اور ہیلین بھی متبسم ہوگئی۔

''تمھیں یہ خط کب ملا تھا؟ کیا یہ اول موٹس سے آیا تھا؟'' پرنس واسیلی نے ایک بار پھر پوچھا۔ اس کے پوچھنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ کوئی جھگڑا طے کرانا چاہتا ہو۔

''لوگ اس طرح کی سطحی اور معمولی باتیں کیوں سوچتے ہیں؟ کیوں کرتے ہیں؟'' پیئر نے بے یقینی سے سوچا۔

''جی ہاں، اول موٹس سے،'' پیئر نے آہ بھرتے ہوئے جواب دیا۔

کھانے کے بعد پیئر اور اس کی رفیقہ دوسروں کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ مہمان رخصت ہونے لگے۔ بعضوں نے بوقت روانگی ہیلین کو خدا حافظ بھی نہ کہا۔ دوسرے اس کے پاس آئے ضرور لیکن انھیں یہ فکر دامن گیر تھی کہ وہ کہیں اس کی توجہ سنجیدہ امور سے ہٹانے کے موجب نہ بن رہے ہوں۔ چنانچہ وہ اس کے پاس صرف ایک آدھ منٹ ٹھہرتے، ان سے اجازت چاہتے اور اسے اتنا بھی موقع نہ دیتے کہ وہ انھیں دروازے تک ہی چھوڑ آئے اور خود ہی بہ عجلت اپنے اپنے گھر کی طرف چل پڑتے۔ سفارت کار پر ملال خاموشی سے باہر نکل گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ پیئر کی شادمانی کے مقابلے میں اس کی سفارتی ملازمت بیکار چیز ہے۔ بزرگ جرنیل کی بیوی نے جب اس سے پوچھا کہ ''اب آپ کی ٹانگ کیسی ہے؟'' اس کا پارہ چڑھ گیا اور وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ ''اف، یہ بڑھیا کتنی احمق ہے!'' اس نے سوچا۔ ''ادھر اس ہیلین واسیلونا کو دیکھو، پچاس کی بھی ہو جائے، پھر بھی اس کا حسن ماند نہیں پڑے گا۔''

''میرا خیال ہے کہ مجھے تمھیں ہدیہ تبریک پیش کر ہی دینا چاہیے،'' آنا پاولووانا نے پرنسس کوراگنا کا گرم جوشی سے بوسہ لیتے ہوئے اس کے کان میں کہا۔ ''اگر مجھے یہ کم بخت درد شقیقہ نہ ستاتا تو میں کچھ دیر اور رک جاتی۔''

پرنسس نے کوئی جواب نہ دیا۔ اپنی بیٹی کو یوں خوش دیکھ کر اس کے دل میں ہوک اٹھی تھی اور وہ جل بھن کر کباب ہوگئی تھی۔

جب مہمان رخصت ہو رہے تھے، پیئر کافی دیر تک ہیلین کے ساتھ چھوٹے ڈرائنگ روم میں، جہاں وہ بیٹھے ہوئے تھے، تنہا براجمان رہا۔ گزشتہ چھ ہفتوں کے دوران میں انھیں پہلے بھی اکثر تنہا چھوڑ دیا جاتا رہا تھا لیکن اس نے کبھی اس سے اپنی محبت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ ایسا کرنا اس کا فرض بنتا ہے تاہم اسے یہ فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آ رہی تھی کہ یہ آخری قدم کیسے اٹھایا جائے۔ اسے ندامت ہونے لگی کہ وہ ہیلین سے

کیوں جڑا بیٹھا ہے، اس کے پہلو میں بیٹھنے کا حق اس کا نہیں، کسی اور کا بنتا ہے۔ اس کے اندر کی آواز کہہ رہی تھی: "یہ خوشی تمھارے لیے نہیں۔ اس خوشی کا استحقاق ان لوگوں کو پہنچتا ہے جن کے دلوں میں وہ کچھ نہیں جو تمھارے دل میں ہے۔" لیکن اسے بہر حال کچھ نہ کچھ تو کہنا ہی تھا۔ چنانچہ اس نے گفتگو کا آغاز یوں کیا: "آج کی شام کیسی رہی؟ کچھ لطف آیا؟" اس نے اس کا جواب حسب عادت سادگی سے دیا اور بولی: "میں نے اپنی زندگی میں اور بھی نام دن منائے ہیں لیکن جو مزہ آج آیا، کبھی نہیں آیا۔"

بعض انتہائی قریبی رشتے دار ابھی رخصت نہیں ہوئے تھے۔ وہ بڑے ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ پرنس واسیلی مریل چال چلتا پیئر کے پاس پہنچا۔ پیئر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ خاصی دیر ہو گئی ہے۔ پرنس واسیلی نے درشتی سے گھور کر اسے یوں استفہامیہ انداز سے دیکھا کہ جیسے اس نے جو کچھ ابھی سنا تھا، وہ اتنا عجیب تھا کہ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا۔ لیکن پھر درشتی کا رویہ تبدیل ہو گیا۔ پرنس واسیلی نے پیئر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا، محبت بھرے انداز سے مسکرایا اور اسے اپنے قریب بٹھا لیا۔

"خیر، ایلینا" اس نے دفعتاً اپنی بیٹی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ اس کے استغنائی لہجے میں وہ دائمی ملائمت اور محبت تھی جو ان والدین میں، جو اپنے بچوں کی ان کی شیر خوارگی کے زمانے سے ناز برداری کرتے چلے آئے ہوں، فطرتاً موجود ہوتی ہے لیکن پرنس واسیلی نے یہ لہجہ دوسرے والدین کی محض نقالی کرتے ہوئے اختیار کیا تھا۔

اور وہ دوبارہ پیئر کی جانب متوجہ ہوا۔ "'سرجی کزمچ'... 'مملکت کے گوشے'..." اس نے اپنی واسکٹ کا اوپر کا بٹن کھولتے ہوئے اعادہ کیا۔

پیئر مسکرا دیا لیکن اس کی مسکراہٹ سے یہ بالکل عیاں تھا کہ وہ یہ بات بخوبی سمجھتا ہے کہ پرنس واسیلی کو فی الحال سرجی کزمچ کے قصے میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور پرنس واسیلی کو اندازہ ہو گیا کہ پیئر بات کی تہہ تک پہنچ گیا ہے۔ معاً وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑایا اور وہاں سے چل دیا۔ پیئر کو یوں لگا کہ پرنس واسیلی بھی حواس باختہ ہے۔ پیئر نے جب اس معمر دنیادار شخص کو کچھ یوں بدحواس ہوتے دیکھا، اس کے دل پر چوٹ لگی۔ اس نے ہیلین کی جانب دیکھا۔ اور وہ بھی بدحواس نظر آئی اور اس کی شکل وصورت یہ کہتے دکھائی دی: "ہونہہ! قصور سراسر تمھارا ہے۔"

"اب قدم اٹھانا ناگزیر ہو گیا ہے لیکن اٹھاؤں تو کیسے اٹھاؤں؟ مجھ میں اس کی ہمت ہی نہیں ہے،" پیئر نے سوچا۔ اب وہ دوبارہ غیر متعلق امور کے بارے میں گفتگو کرنے لگا اور پوچھنے لگا: "یہ سرجی کزمچ کا قصہ کیا ہے؟ میں پوری طرح سن نہیں پایا تھا۔" ہیلین نے مسکرا کر جواب دیا: "میرا بھی یہی حال ہے۔ میں بھی نہیں سن سکی تھی۔"

جب پرنس واسیلی دوبارہ ڈرائنگ روم میں آیا، اس کی بیوی ایک معمر خاتون کے ساتھ پیئر کے بارے میں زیر لب گفتگو کر رہی تھی۔

"مائی ڈیئر، رشتہ تو بہت شاندار ہے لیکن جہاں تک پُرمسرت زندگی کا تعلق ہے..."

"رشتے افلاک پر طے ہوتے ہیں،" معمر خاتون نے جواب دیا۔

پرنس واسیلی اپنی دھن میں چلتا دور ایک کونے میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ وہ یوں بن رہا تھا جیسے اسے خواتین کی باتیں سنائی ہی نہ دی ہوں۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اونگھ آ گئی ہے۔ اس کا سر جھولنے ہی لگا تھا کہ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''آلائن، ذرا جا کر تو دیکھو وہ کیا کر رہے ہیں،'' اس نے اپنی بیوی سے فرانسیسی میں کہا۔

پرنس دروازے کے قریب گئی۔ اس کی چال میں وقار لیکن بے اعتنائی تھی۔ اس نے جھانک کر چھوٹے ڈرائنگ روم میں دیکھا۔ پیئر اور ہیلین پہلے کی طرح ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔

''بالکل وہی، جو پہلے کر رہے تھے،'' اس نے اپنے خاوند کو جواب دیا۔

پرنس واسیلی کے ابرو تن گئے۔ اس کا منہ ایک طرف کو جھکا ہوا تھا۔ اس کے رخسار پھڑک رہے تھے اور اس کے چہرے پر وہی بھونڈا اور ناخوشگوار تاثر ابھر آیا تھا جو محض اسی کے ساتھ مخصوص تھا۔ اس نے اپنے آپ کو اچھی طرح ہلایا جلایا اور پرعزم چال چلتا خواتین سے آگے نکل گیا اور چھوٹے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ وہ پرسرت عجلت کے ساتھ پیئر کے پاس پہنچا۔ جب پیئر نے اس کے چہرے پر غیر معمولی مسرت رقصاں دیکھی، اس کا دل بیٹھ گیا اور وہ خوف زدگی کے عالم میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''خدا کا شکر ہے!'' پرنس واسیلی نے کہا۔ ''بیگم نے ابھی ابھی مجھے سب کچھ بتا دیا ہے!'' اس نے اپنا ایک بازو پیئر کی کمر اور دوسرا اپنی بیٹی کی کمر کے گرد حمائل کر دیا۔ ''میرے عزیز بیٹے... ایلینا... میں بہت، بہت خوش ہوں!'' اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ ''مجھے تمھارے والد سے بہت پیار تھا... اور یہ تمھاری بہت اچھی بیوی ثابت ہوگی... خداوند، تم دونوں پر اپنی برکتیں نازل فرمائے!''

وہ پہلے اپنی بیٹی اور پھر پیئر سے بغل گیر ہو گیا اور اس نے بوڑھے آدمی کے ہونٹوں سے پیئر کے گال چوم لیے۔ آنسوؤں سے اس کے رخسار سچ مچ بھیگ گئے۔

''پرنس، ادھر آنا،'' اس نے آواز دی۔

بڑی پرنس اندر آ گئی اور اس کے بھی آنسو بہنے لگے۔ معمر خاتون نے آنکھوں پر رومال رکھ لیا۔ انھوں نے پیئر کی بلائیں لیں اور پیئر نے بار بار ہیلین کے ہاتھوں پر بوسے ثبت کیے۔ چند ثانیے بعد انھیں پھر تنہا چھوڑ دیا گیا۔

''یہ سب کچھ ہونا ہی تھا۔ اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا،'' پیئر نے سوچا۔ ''چنانچہ یہ سوال پوچھنا سعیٔ لاحاصل ہے کہ جو ہوا اچھا ہوا یا برا ہوا؟ اچھی بات یہ ہے کہ معاملہ اب صاف ہو گیا ہے اور جن شکوک و شبہات نے میرا ناک میں دم کر رکھا تھا، وہ اب ختم ہو گئے ہیں۔''

پیئر چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اس نے اپنی منگیتر کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام رکھا تھا اور وہ اس کے حسین وخوش نما سینے کے زیر و بم کا مشاہدہ کر رہا تھا۔

''ہیلین!'' اس نے با آواز بلند کہا اور چپ ہو گیا۔

''ان مواقع پر ہمیشہ کوئی خاص بات کہی جاتی ہے،'' اس نے سوچا لیکن پوری کوشش کے باوجود اسے مطلق یاد نہ آسکا کہ یہ بات ہے کیا۔ اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا اور وہ جھک کر اس کے اور قریب ہوگئی۔ اس کا چہرہ تمتما رہا اور گلاب کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔

''اف، یہ اتار دو... یہ...'' وہ اس کے چشمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولی۔

پیئر نے اپنا چشمہ اتار دیا۔ لوگ جب چشمہ اتارتے ہیں، تو ان کی آنکھیں عجیب عجیب نظر آنے لگتی ہیں۔ پیئر نے جب چشمہ اتارا، اس کی آنکھیں عجیب تو نظر آئیں ہی، علاوہ ازیں ان میں بے کسی اور خوف جھلک رہا تھا اور وہ کچھ پوچھتی دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ نیچے جھک کر اس کا ہاتھ چومنا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے زیادہ تیز نکلی۔ اس نے لیک جھپک طوفانی انداز سے اپنے سر کو جنبش دی، اس کے ہونٹوں کو راستے میں ہی روک لیا اور انھیں اپنے ہونٹوں پر وصول کر لیا۔ اس نے جس بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا، اس سے اس کا چہرہ ناگوار طور پر بدہیئت ہو گیا اور اس تبدیلی پر پیئر کو سخت جھٹکا لگا۔

''اب پچھتائے کیا ہوت، جو ہونا تھا ہو چکا، اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں مجھے اس سے محبت ہے،'' پیئر نے سوچا۔

"Je vous aime!"* اس نے کہا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ ایسے مواقع پر کیا کہا جاتا ہے۔

لیکن یہ الفاظ اتنے ادھورے محسوس ہو رہے تھے کہ اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔

چھ ہفتے بعد اس کی شادی ہو گئی اور وہ پیٹرز برگ میں کاؤنٹ بزدخوف کے محل نما مکان میں، جس کی حال میں از سر نو تزئین و آرائش کی گئی تھی، منتقل ہو گیا۔ لوگ کہتے تھے کہ وہ بڑا بھاگوان ہے کہ حسین و جمیل بیوی اور کروڑوں کا مالک ہے۔

3

دسمبر 1805 کے دوران میں معمر پرنس نکولائی آندریووچ بلکونسکی کو پرنس واسیلی کا خط ملا۔ اس میں اس نے اطلاع دی تھی کہ وہ اپنے بیٹے کی معیت میں اس سے ملاقات کرنے آ رہا ہے۔ ''میرے معزز محسن، میں انسپکشن کے سلسلے میں دورے پر روانہ ہو رہا ہوں۔ ستر بہتر میل کا چکر ضرور پڑے گا لیکن خوشی کا مقام یہ ہے کہ آپ سے ملاقات ہو جائے گی،'' پرنس واسیلی نے لکھا تھا۔ ''میرا بیٹا اناطول، جو واپس فوج میں جا رہا ہے، میرے ساتھ ہوگا۔ اس کے دل میں آپ کی ذات ستودہ صفات کے لیے جو عزت و احترام ہے، اس میں وہ کسی طرح بھی اپنے باپ سے کم نہیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے اس کا ذاتی طور پر اظہار کرنے کے لیے اجازت مرحمت فرمائیں گے۔''

''میرے خیال میں ماری کو مخلوط محفلوں میں لے جانے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ رشتے خود ہی چلے آ رہے

* میں تم سے محبت کرتا ہوں!

ہیں،'' کوچک پرنس نے خبر سن کر نا عاقبت اندیشی سے کہا۔

پرنس نکولائی آندریووچ کی پیشانی پر بل پڑ گئے لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

خط موصول ہونے کے دو ہفتے بعد پرنس واسیلی کے ملازم اپنے آقا کی آمد سے ایک روز پہلے ہی پہنچ گئے۔ اس سے اگلے دن وہ خود بھی اپنے بیٹے کے ہمراہ نمودار ہو گیا۔

پرنس واسیلی کے کردار کے بارے میں سن رسیدہ بلکونسکی کی رائے کبھی اچھی نہیں رہی تھی۔ اور خاص طور پر ماضی قریب میں پاول اور الیکسانڈر کے عہد ہائے حکومت میں پرنس واسیلی کو جو بلند مراتب اور اعزازات حاصل ہوئے تھے، انھوں نے اس کی بدگمانی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ خط میں جو ڈھکے چھپے اشارے تھے اور جن کا کوچک پرنس نے برملا اظہار کر دیا تھا، انھیں پڑھ سن کر اس کے کان کھڑے ہو گئے اور وہ اس کی آمد کا مقصد سمجھ گیا۔ اس کے متعلق اس کی رائے تو پہلے ہی اچھی نہیں تھی، اور اب وہ معاندانہ حقارت میں تبدیل ہو گئی۔ چنانچہ وہ جب بھی اس کا ذکر کرتا، اس کے نتھنے پھڑکنے لگتے اور وہ غیظ و غضب سے غرانے لگتا۔

جس روز پرنس واسیلی کی آمد متوقع تھی، پرنس نکولائی آندریووچ کا مزاج خاص طور پر برہم ہو رہا تھا اور وہ غصے سے پھنکار رہا تھا۔ آیا اس کا مزاج اس لیے برہم تھا کہ پرنس واسیلی آ رہا تھا یا یہ کہ وہ پہلے ہی کسی بات پر جھلایا ہوا تھا اور متوقع آمد نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا، بہر حال حقیقت خواہ کچھ ہی ہو، امر واقعہ یہ ہے کہ وہ آگ بگولا ضرور ہو رہا تھا اور اس صبح تیخون پہلے ہی میر عمارات کو مشورہ دے چکا تھا کہ وہ پرنس کی خدمت میں رپورٹ پیش کرنے کی حماقت نہ کرے۔

''آپ سن رہے ہیں نا کہ وہ کیسے چل رہے ہیں؟'' تیخون نے میر عمارات کی توجہ پرنس کے پاؤں کی چاپ کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ ''کیسے دھپ دھپ ان کی ایڑی سیدھی نیچے آ رہی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کا مطلب کیا ہے...''

تاہم سن رسیدہ پرنس نے اپنی ٹوپی اور کوٹ، جس کا استر سموری اور جس کے کالر کا رنگ سیاہ تھا، پہنا اور حسب معمول نو بجے سیر کے لیے نکل گیا۔ گزشتہ روز برف باری ہوئی تھی اور جس پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ پرنس نکولائی آندریووچ گرین ہاؤسوں[12] کی طرف جاتا تھا، اس کی صفائی ہو چکی تھی۔ برف میں کہیں کہیں جھاڑو کے پھرنے کے نشانات نظر آ رہے تھے اور ایک جگہ، جہاں برف کا کنارہ ڈھلک گیا تھا (ان کناروں نے پگڈنڈی کے دونوں اطراف حد بندی کر رکھی تھی)، بیلچہ پھنسا ہوا تھا اور اسے یوں کا توں وہیں چھوڑ دیا گیا تھا۔ پرنس گرین ہاؤسوں، زرعی نیم غلاموں[13] کے کچے پکے مکانوں اور بیرونی عمارتوں[14] کے بیچوں بیچ چلتا رہا۔ اس کی پیشانی پر شکنیں اور زبان پر تالے پڑے ہوئے تھے۔

''کیا برف گاڑی (سلیج) گزر سکتی ہے؟'' اس نے اپنے سٹیوارڈ سے پوچھا۔ اس کا سٹیوارڈ شکل و صورت کے اعتبار سے اپنے آقا سے مشابہت رکھتا تھا اور چہرے بشرے سے معزز شخص دکھائی دیتا تھا۔ وہ گھر کی طرف واپس

کے دوران میں اس کے ہم رکاب تھا۔

''یوئر ایکسی لینسی، برف خاصی گہری ہے۔ میں سایہ دار سڑک (ایونیو) کی صفائی کرا رہا ہوں۔''

پرنس نے اپنے سر کو جنبش دی اور پورچ کی طرف چل دیا۔

''خداوند کا شکر ہے!'' سٹیوارڈ نے سوچا۔ ''طوفان باد و باراں گزر گیا ہے!''

''یوئر ایکسی لینسی، گاڑی پر گزرنا خاصا دشوار ہوگا...'' سٹیوارڈ نے مزید کہا۔ ''یوئر ایکسی لینسی، سنا ہے کہ کوئی وزیر آپ سے ملاقات کرنے تشریف لا رہے ہیں۔''

پرنس واپس مڑا اور سٹیوارڈ کو آتش بار نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

''کیا؟ وزیر؟ کیسا وزیر؟ تمھیں یہ حکم کس نے دیا تھا؟'' وہ اپنی کرخت اور تیکھی آواز میں دہاڑنے لگا۔ ''تم میری بیٹی، پرنس، کے لیے تو سڑکیں صاف نہیں کراتے لیکن وزیر کے لیے ضرور کراتے ہو! میں کسی وزیر شزیر کو نہیں جانتا!''

''یوئر ایکسی لینسی، میں نے سوچا۔''

''تم نے سوچا!'' پرنس چلایا۔ اس کی گفتگو لحظہ بہ لحظہ تیز تر اور بے ربط ہوتی جا رہی تھی۔ ''تم نے سوچا!... حرام زادو! لچو لفنگو!... سوچنا میں تمھیں سکھاؤں گا!''

اس نے اپنی چھڑی اوپر اٹھائی، اسے گھمایا اور اگر سٹیوارڈ آل پاچ جبلی طور پر لپک کر ایک طرف نہ ہو جاتا، تو اس نے اسے اس پر ضرور برسا دیا ہوتا۔

''تم نے سوچا!... لچو لفنگو!'' پرنس تیزی سے دہاڑا۔

آل پاچ نے ضرب سے بچنے کے لیے جس بے باکی کا مظاہرہ کیا تھا، اس پر وہ سخت شرمندہ تھا۔ وہ پرنس کے قریب آیا اور عاجزی سے اپنا گنجا سر اس کے سامنے جھکا دیا۔ پرنس کو اس کی شاید یہی ادا بھا گئی۔ وہ زبانی کلامی تو ''لچو لفنگو! سڑک پر دوبارہ برف بچھا دو!'' کی گردان کرتا رہا لیکن اس نے اپنی چھڑی دوبارہ اوپر نہ اٹھائی بلکہ تیز تیز قدم اٹھاتا مکان میں داخل ہو گیا۔

پرنس ماریا اور مادموزیل بوغین کو معلوم تھا کہ آج پرنس کا مزاج سخت برہم ہے، پھر بھی انھوں نے ڈنر سے پہلے اس کا انتظار کرنا مناسب سمجھا۔ مادموزیل کے چہرے پر بے نیازی اور شگفتگی، جو یہ کہتی محسوس ہو رہی تھی: ''مجھے کچھ معلوم نہیں، میں بالکل وہی ہوں جو کہ عام طور پر ہوتی ہوں،'' رقص کر رہی تھی۔ پرنس ماریا کا رنگ فق اور اس کے دل پر خوف سوار تھا۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکائی ہوئی تھیں۔ پرنس ماریا کے لیے ایک مصیبت اور تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایسے مواقع پر اسے مادموزیل بوغین کا رویہ اپنانا چاہیے لیکن وہ ایسا کرنے سے معذور تھی۔ ''اگر میں جھوٹ موٹ یہ ظاہر کروں کہ مجھے ان کے مزاج کی برہمی کا علم ہی نہیں، تو وہ یہ سمجھیں گے کہ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں،'' اس نے سوچا۔ ''اور اگر میں کچھ اس طرح کا رویہ اختیار کر لوں کہ خود میرا مزاج درست نہیں تو وہ یہ فرمائیں گے (اور جیسا کہ وہ اکثر فرماتے رہتے ہیں) کہ میں خواہ مخواہ منہ پھلائے پھر رہی ہوں۔''

پرنس نے اپنی بیٹی کے ڈرے سہمے چہرے پر نگاہ ڈالی اور اس کے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے۔

''احمق!'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ ''اور وہ دوسری کہاں ہے؟ یہاں پہلے ہی کھسر پھسر ہو رہی ہے۔'' اس نے قیاس کے گھوڑے دوڑائے اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جب اسے کمرے میں کوچک پرنس نہ دکھائی دی، تو بولا:

''پرنس نہیں آئی؟ کہاں چھپ گئی ہے؟''

''ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے،'' مادموزیل بوغین نے اپنے پورے چہرے پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''وہ آج نہیں آسکیں گی۔ ان کی حالت کے پیش نظر یہ بات بالکل فطری ہے۔''

''اونہہ، ہونہہ!... امھ، ہا!'' پرنس بڑبڑایا اور کرسی پر بیٹھ گیا۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کی پلیٹ صاف نہیں ہے۔ اس نے اس پر ایک دھبے کی طرف اشارہ کیا اور اسے اٹھا کر پرے پھینک دیا۔ تیخون نے اسے راستے میں ہی دبوچ لیا اور بٹلر کے حوالے کر دیا۔

کوچک پرنس کی طبیعت خراب نہیں تھی لیکن اسے پرنس سے اتنا خوف تھا کہ جب اسے معلوم ہوا کہ آج اس کا مزاج بے حد خفا ہے، اس نے کنی کاٹنے کا تہیہ کر لیا۔

''میرے پیٹ میں جو بچہ ہے، مجھے اس کا خوف کھائے جا رہا ہے،'' اس نے مادموزیل بوغین سے کہا۔ ''خدا جانے اس خوف کا کیا نتیجہ نکلے!''

عام طور پر کوچک پرنس پر مسلسل اپنے خسر کا ہوّا سوار رہتا۔ وہ اس سے خوف ہی نہیں، گھن بھی کھاتی تھی لیکن اس پر خوف اس بری طرح سوار تھا کہ اسے خود بھی یہ احساس نہ ہو سکا کہ وہ اسے ناپسند کرتی ہے۔ پرنس اس ناپسندیدگی کا ردعمل ناپسندیدگی سے ظاہر کرتا تھا لیکن اس کی یہ ناپسندیدگی حقارت کے سات پردوں تلے چھپی رہتی تھی۔ جوں جوں پرنس بالڈ ہلز کی زندگی سے مانوس ہوتی گئی، توں توں وہ مادموزیل بوغین کی خاص طور پر گرویدہ ہوتی چلی گئی۔ وہ اپنے دن اس کی صحبت میں گزارتی، راتوں کو اسے اپنے کمرے میں سونے کی دعوت دیتی، اکثر اس کے ساتھ اپنے خسر کی باتیں کرتی اور اسے (خسر کو) اپنی نکتہ چینی کا ہدف بناتی۔

''mon prince*، آج ہمارے ہاں مہمان تشریف لا رہے ہیں،'' مادموزیل نے اپنی گلابی انگلیوں سے اپنا ڈنر نیپکن (napkin) کھولتے ہوئے کہا۔ ''ہز ایکسی لینسی کوراگن اور ان کا صاحب زادہ؟'' اس نے استفہامیہ انداز سے مزید کہا۔

''اخونہہ!... یہ ایکسی لینسی کتے کا پلاّ ہے۔ اس کی اولیں ملازمت اسے میں نے ہی دلائی تھی،'' پرنس نے ناک بھوں چڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اور اس کا بیٹا یہاں کیوں آ رہا ہے، مجھے اس کی کوئی تک نظر نہیں آئی۔ پرنس لساوتا کارلوونا اور پرنس ماریا کو اس کی کوئی سُن گُن ہو تو ہو، مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ اپنے بیٹے کو یہاں کیوں لا رہا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئے۔'' اور اس نے اپنی بیٹی کی طرف، جس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا، دیکھا۔

* مائی پرنس (محترم پرنس)

''تمھاری طبیعت ٹھیک ہے؟ کہیں تم اس 'وزیر' کا، جیسا کہ اس گھن چکر آل پاچ نے آج صبح اسے پکارا تھا، رعب تو طاری نہیں ہو گیا؟''

''نہیں، mon pere* -"

مادموزیل بوغین نے گفتگو کے لیے جس موضوع کا انتخاب کیا تھا، اس میں اگرچہ اسے کامیابی نہیں ہوئی تھی، پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری بلکہ گرین ہاؤسوں اور ایک پھول کی، جو ابھی ابھی کھلا تھا، خوبصورتی کے بارے میں طفلانہ انداز سے باتیں کرتی رہی اور جب پرنس نے اپنا سوپ ختم کیا، وہ خاصا ٹھنڈا پڑ چکا تھا۔

کھانے کے بعد وہ اپنی بہو سے ملنے چلا گیا۔ کوچک پرنس ایک چھوٹی میز کے سامنے بیٹھی تھی اور اپنی خادمہ کے ساتھ گپ شپ کر رہی تھی۔ اپنے خسر کو دیکھ کر اس کا رنگ فق ہو گیا۔

کوچک پرنس خاصی تبدیل ہو چکی تھی۔ اب وہ خوش شکل نہیں بلکہ بدصورت نظر آ رہی تھی۔ اس کے رخسار پچک چکے تھے، ہونٹ اکڑ گئے تھے اور آنکھیں اندر دھنس رہی تھیں۔

''جی ہاں، طبیعت کچھ بوجھل سی ہے...'' اس نے پرنس کے سوال کے جواب میں کہا۔

''کچھ چاہیے تو بتاؤ۔''

"non, merci, mon pere"**

وہ باہر نکل گیا اور سیدھا استقبالیہ میں چلا گیا۔ یہاں آل پاچ سر جھکائے کھڑا تھا۔

''سڑک پر دوبارہ برف دھکیل دی گئی ہے؟''

''جی ہاں، یور ایکسی لینسی۔ خدا کے لیے مجھے معاف فرمادیں۔ یہ میری نری حماقت تھی۔''

پرنس نے غیر فطری انداز سے قہقہہ لگاتے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ ''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' اس نے اپنا ہاتھ آل پاچ کی طرف بڑھا دیا تا کہ وہ اسے چوم سکے۔ اور وہ اپنے سٹڈی روم میں چلا گیا۔

اس شام پرنس واسیلی پہنچ گیا۔ سایہ دار سڑک پر کوچوانوں اور نوکروں چاکروں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ چیختے چلاتے اس کی برف گاڑیاں اس سڑک پر، جس پر جان بوجھ کر برف بچھائی گئی تھی، دھکیلتے مکان کے ایک بازو کی جانب لے گئے۔

پرنس واسیلی اور اناطول کو علیحدہ علیحدہ اپارٹمنٹوں میں پہنچا دیا گیا۔

اناطول نے اپنا اوورکوٹ اتارا، دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے اور بے دھیانی سے مسکراتے اپنی خوبصورت غزالی آنکھیں میز کے، جس کے سامنے وہ بیٹھ چکا تھا، ایک کونے پر جما دیں۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ساری زندگی عیش و تفریح کا، جو کوئی نہ کوئی شخص کسی نہ کسی وجہ کی بنا پر اسے بہم پہنچانے کے لیے مجبور ہے، غیر مختتم سلسلہ ہے۔

* مائی فادر (ابا جان)

** کچھ نہیں، شکریہ، ابا جان۔

چنانچہ وہ ایک اکھڑ بڈھے اور ایک بدصورت دوشیزہ سے، جسے وراثت میں خطاب اور ڈھیروں دولت ملنا تھی، جو ملنے آیا تھا، تو اس ملاقات کو بھی وہ اسی انداز سے دیکھتا تھا۔ ''ممکن ہے کہ یہ سب کچھ بہت اچھا بلکہ شاید دلچسپ بھی ثابت ہو،'' وہ قیاس آرائیاں کر رہا تھا۔ ''اگر اس کے پاس واقعی دولت کے انبار ہیں، پھر اس کے ساتھ شادی کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟ دولت کوئی گھاٹے کا سودا تو ہے نہیں۔''

اس نے نہایت توجہ اور نفاست سے، جو اس کی فطرت ثانیہ بن چکی تھی، شیو بنائی، اپنے بدن پر سینٹ چھڑکا اور اپنے چہرے پر اپنی مخصوص شگفتگی اور زندہ دلی، جو ہر شخص کا دل موہ لیتی تھی، سجائے اپنے باپ کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ دو وردی پوش ملازم پرنس واسیلی کو، جو اپنے گرد و پیش مختلف اشیا کو بہت دلچسپی اور اشتیاق سے دیکھ رہا تھا، لباس پہنا رہے تھے۔ جب اس کا بیٹا کمرے میں داخل ہوا، اس نے بہ طیب خاطر اپنی گردن یوں ہلائی جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو: ''خوب! میری بھی یہی خواہش تھی کہ تم بالکل اسی طرح نظر آؤ۔''

''ابا جان، مذاق چھوڑیں۔ یہ بتائیں، کیا وہ واقعی بہت کریہہ المنظر ہے؟ جی؟'' اناطول نے دریافت کیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سفر کے دوران میں وہ جس موضوع پر ایک سے زیادہ مرتبہ گفتگو کر چکے تھے، وہ اس کا سلسلہ دوبارہ شروع کر رہا ہے۔

''دیکھو، کافی کچھ کہا جا چکا ہے! اب ان فضول قصوں کو چھوڑو! اہم بات یہ ہے — کہ تم بزرگ پرنس کے ساتھ حزم و احتیاط اور احترام کا رویہ اپنانے کی کوشش کرو۔''

''اگر اس نے تھکا فضیحتی کی، میں چلا،'' اناطول نے کہا۔ ''یہ بڈھے میری برداشت سے باہر ہیں۔ ہونہہ؟''

''یاد رکھو کہ تمھارا سب کچھ یہیں داؤ پر لگا ہوا ہے۔''

دریں اثنا نوکرانیوں کے کمرے میں نہ صرف وزیر اور اس کے بیٹے کی آمد کی اطلاع پہنچ چکی تھی بلکہ دونوں کا حلیہ بھی تفصیل سے بیان کیا جا چکا تھا۔

پرنس ماریا اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی تھی اور اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔

''انھوں نے خط کیوں لکھا تھا، لسا نے اس بارے میں مجھے کیوں بتایا تھا؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا!'' اس نے آئینے میں اپنی شکل دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ ''میں ڈرائنگ روم میں کیسے جاؤں گی؟ اگر وہ مجھے پسند آ بھی جائیں، پھر بھی میں ان کے ساتھ فطری رویہ اختیار نہیں کر سکوں گی۔'' اس کا اپنا باپ اسے کن نگاہوں سے دیکھے گا، اس کا محض تصور ہی اس پر ہول طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

کوچک پرنس اور مادموزیل بوغین کو خادمہ ماشا کی وساطت سے وزیر کے بیٹے کے بارے میں ضروری معلومات پہلے ہی حاصل ہو چکی تھیں۔ وہ بہت خوش شکل تھا۔ اس کے رخسار گلابی اور ابرو سیاہ تھے۔ باپ اپنے پاؤں گھسیٹ گھسیٹ کر بہت مشکلوں سے سیڑھیاں چڑھا تھا جب کہ صاحب زادہ مثلِ عقاب پھرتیلا اور سوختہ پا تھا۔ وہ ایک وقت میں تین تین سیڑھیاں پھلانگتا جا رہا تھا۔ اس رپورٹ کے موصول ہونے کے بعد کوچک پرنس اور

مادموزیل بوغین پرنسس ماریا کے، جسے غلام گردش سے ان دونوں کی جوشیلی باتوں کی آواز ازیں پیشتر ہی سنائی دینے لگی تھی، کمرے کی طرف چل پڑیں۔

"ماری، پتا ہے وہ لوگ آگئے ہیں؟" کوچک پرنسس نے بطخ کی بھدی چال چلتے اور دھڑام سے آرام کرسی پر گرتے ہوئے کہا۔

وہ صبح کے وقت عام طور پر جس قسم کا ڈھیلا ڈھالا گاؤن پہنا کرتی تھی، اب وہ اس میں ملبوس نہیں تھی بلکہ اب اس نے اپنا بہترین ڈریس زیب تن کر رکھا تھا۔ اس نے اپنے بال بنانے میں خاصا وقت صرف کیا تھا اور انھیں خوبصورت بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے چہرے پر زندہ دلی اور شگفتگی جھلک رہی تھی۔ تاہم وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے اور پیلے خدوخال کو چھپانے میں ناکام رہی تھی۔ اگرچہ وہ اسی انداز سے بنی ٹھنی تھی جس طرح بن ٹھن کر وہ پیٹرزبرگ کے اعلیٰ طبقوں میں گھوما کرتی تھی لیکن اس کی یہ نےنوازی اس کے کسی کام نہ آئی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ اپنی کشش کھو چکی ہے۔ اس کے برعکس مادام بوغین نے اپنے لباس اور حلیے میں کچھ اس قسم کی تبدیلیاں کی تھیں کہ وہ کھٹکتی نہیں تھیں اور یوں اس کا تر و تازہ اور خوش شکل چہرہ اور بھی پرکشش ہو گیا تھا۔

"جان، تم اپنے کپڑے تبدیل نہیں کرو گی؟" اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ "ڈیئر پرنسس، ابھی نوکر چاکر اطلاع دینے آجائیں گے کہ مہمان ڈرائنگ روم میں تشریف لے آئے ہیں۔ ہمیں چند منٹ بعد ادھر جانا ہوگا اور ادھر تم ہو کہ تم نے اپنا حلیہ درست کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا!"

کوچک پرنسس اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی ملازمہ کو بلانے کے لیے اس نے گھنٹی بجائی اور خود شاداں و فرحاں اپنا دماغ لڑانے لگی کہ پرنسس ماریا کے لیے کون سا لباس مناسب رہے گا اور یہ اسے کس طرح پہنایا جائے گا۔

ایک تو پرنسس ماریا کی خودداری کو اس بات پر ٹھیس پہنچی تھی کہ جو شخص اس کے رشتے کا امیدوار بن کر آیا ہے اس کی آمد پر اس پر بوکھلاہٹ اور گھبراہٹ طاری ہو گئی ہے۔ لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ اس کی دونوں سہیلیاں یہ سمجھتی تھیں کہ اس کا اس کیفیت میں گزرنا لازمی امر ہے۔ اگر وہ انھیں بتاتی کہ اسے اپنے آپ پر اور ان دونوں پر کتنی شرم آرہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کھلم کھلا اپنے اضطراب کا اقرار کر رہی ہے۔ اگر وہ ڈریس کے بارے میں ان کی تجاویز اور مشوروں کو ٹھکراتی ہے تو اس کے معانی یہ ہوں گے کہ وہ اس سے دل لگی کا سلسلہ تادیر جاری رکھیں گی اور اپنی تجاویز پر اصرار کرتی رہیں گی۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا، اس کی خوبصورت آنکھیں دھندلا گئیں، اس کے گالوں پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے اور جب اس نے مادام بوغین اور لسا کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا، اس کے چہرے پر وہی غیر دلکش تاثر ابھر آیا، جسے وہ اکثر اپنے اوپر طاری کر لیا کرتی تھی اور جو اس بات کا مظہر ہوتا تھا کہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ اس کے ساتھ بڑی زیادتی کی جا رہی ہے۔ دونوں خواتین چاہتی تھیں کہ اس کی اس طرح آرائش کر دی جائے کہ وہ خوش شکل نظر آئے اور اس معاملے میں وہ بالکل مخلص تھیں۔ اس کی شکل و صورت اتنی معمولی تھی کہ ان کے وہم و گمان میں بھی کبھی یہ نہیں آیا تھا کہ وہ ان کی رقیب بن سکتی ہے۔ چنانچہ وہ بہ طیب خاطر اسے

ڈریس پہنانے میں مصروف ہوگئیں۔ عام خواتین کی طرح وہ بھی بہت بھولی بھالی تھیں اور اس خیالِ خام میں مبتلا کہ لباس چہرے کو خوش شکل اور پرکشش بنا سکتا ہے۔

"مائی ڈیئر، یہ ڈریس تم پر بالکل نہیں پھبتا،" لسانے پرے ہٹتے اور پرنس ماریا کو ایک پہلو سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "تمھارے پاس عنابی ڈریس ہے۔ وہ منگوالو۔ میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں۔ عین ممکن ہے کہ آج کا دن تمھاری زندگی میں اہم موڑ ثابت ہو... رہا یہ ڈریس، اس کا رنگ بہت ہلکا ہے۔ یہ تم پر بالکل نہیں پھبتا۔ یہ قطعی غیر موزوں ہے!"

قصور دراصل ڈریس کا نہیں تھا۔ سچی بات یہ ہے کہ پرنس ماریا کے نہ تو چہرے میں اور نہ اس کے باقی سراپے میں کسی قسم کی کوئی خوبصورتی تھی۔ لیکن مادموزیل بوغین اور کوچک پرنس کی سمجھ میں یہ نکتہ نہ آسکا وہ اب بھی یہ سمجھتی تھیں کہ اگر اس کے بالوں میں کنگھی کر کے انھیں ذرا اوپر اٹھا دیا جائے، ان میں نیلا ربن لگا دیا جائے، اور اس کے عنابی ڈریس پر، ذرا نچلی جانب، نیلا پٹکا یا اسی قسم کی کوئی دوسری چیز باندھ دی جائے تو سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ یہ حقیقت فراموش کر گئیں کہ ڈرے سہمے چہروں اور شکلوں صورتوں میں کوئی تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ زیب و زینت اور تزئین و آرائش میں خواہ کتنی ہی ترامیم کیوں نہ کر دی جائیں، چہرے میں کوئی انقلاب برپا نہیں کیا جا سکتا، وہ ویسے کا ویسا معمولی اور قابلِ رحم رہے گا۔ وہ جو تبدیلی چاہتیں، پرنس ماریا چپ چاپ مان جاتی۔ دو تین تبدیلیوں کے بعد جب اس کے سر کے بال اوپر اٹھا دیے گئے (اس اسلوب نے نہ صرف اس کی شکل و صورت بالکل تبدیل کر دی بلکہ وہ پہلے سے بھی بدتر ہوگئی)، اسے عنابی ڈریس پہنا دیا گیا اور اس کی کمر کے گرد پٹکا باندھ دیا گیا۔ کوچک پرنس نے اس کے گرد دو چکر لگائے، اس کے ڈریس کی ایک آدھ شکن درست کی، اپنے ننھے منے ہاتھ سے اس کے پٹکے کو ذرا ادھر ادھر کھینچا اور تب سر جھکائے اس نے پہلے ایک اور پھر دوسرے پہلو سے اس کا تنقیدی جائزہ لیا۔

"نہیں، بات نہیں بنی،" اس نے پورے تیقن سے کہا اور عالمِ مایوسی میں اپنے ہاتھ اوپر اٹھا دیے۔ "نہیں، ماری، نہیں۔ یہ ڈریس تمھیں بالکل نہیں جچتا۔ مجھے تو تم اپنے روزمرہ کے سرمئی ڈریس میں زیادہ بھلی معلوم ہوتی ہو۔ کاتیا، میری خاطر ذرا دوڑ کر جانا،" اس نے خادمہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ "جاؤ، پرنس کا سرمئی لباس لے آؤ۔ مادموزیل بوغین، تم دیکھتی جانا کہ میں اس کے ذریعے کیا کیا کمال دکھاتی ہوں،" اس نے فنی چابک دستی کا پیشگی لطف لیتے ہوئے کہا۔

جب کاتیا مطلوبہ ڈریس لے آئی، پرنس ماریا آئینے کے سامنے بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ اس کی نگاہیں اپنے چہرے پر پیوست تھیں اور وہ اپنی اشک آلود آنکھوں اور کپکپاتے لبوں کو دیکھ رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی رو دے گی۔

"ڈیئر پرنس، صبر،" مادموزیل بوغین نے کہا۔ "ذرا ایک کوشش اور کر لینے دیں۔"

کوچک پرنس نے خادمہ سے ڈریس لیا اور پرنس ماریا کے پاس آگئی۔

''اب ہم سادہ لیکن دلکش چیز آزمائیں گے،'' اس نے کہا۔

تین آوازیں۔ کوچک پرنس کی، مادموزیل بوغین کی اور کاتیا کی، جو کسی بات پر خواہ مخواہ ہنسے جا رہی تھی،۔ آپس میں یوں گھل مل کر شگفتہ شور وغل بپا کر رہی تھیں جیسے پرندے خوشی کے عالم میں چہچہاتے ہیں۔

''نہیں، مجھے اکیلا چھوڑ دیں،'' پرنس ماریا نے کہا۔

اس کی آواز میں اتنی گمبھیرتا، اتنا کرب تھا کہ چہچہاہٹ یک دم ختم ہو گئی۔ وہ ان موٹی موٹی، خوبصورت اور متفکر آنکھوں کو، جو آنسوؤں سے لبریز تھیں اور جو ملتجیانہ انداز سے ان کی جانب دیکھ رہی تھیں، تکنے لگیں۔ ان تینوں کو احساس ہو گیا کہ مزید اصرار نہ صرف بیکار ہے بلکہ ظلم کے مترادف ہے۔

''اچھا، اور کچھ نہیں تو کم از کم اپنے بالوں کا سٹائل ہی تبدیل کرا لو،'' کوچک پرنس نے کہا۔ ''میں نے تمھیں بتایا بھی تھا،'' اس نے ملامت انگیز انداز سے مادموزیل بوغین سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''کہ ماریا کا چہرہ ان چہروں میں سے ہے جن پر بالوں کا یہ اسلوب بالکل نہیں پھبتا۔ ذرا بھی نہیں۔ اب ذرا مہربانی کرو اور اسے تبدیل کر دو۔''

''نہیں، نہیں، جاؤ اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، میرے لیے یہ سب کچھ بے معنی ہے،'' روتی چلاتی آواز سنائی دی۔

مادموزیل بوغین اور کوچک پرنس کو اپنے دلوں میں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ اس سوانگ میں پرنس ماریا کی شکل وصورت بالکل معمولی بلکہ معمولی سے بھی کہیں بدتر دکھائی دیتی ہے۔ لیکن اب وقت ہاتھ سے نکل چکا تھا اور کچھ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ انھیں ایسی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی جن سے وہ بخوبی آشنا تھیں۔ یہ نگاہیں انتہائی فکر مند اور اداس تھیں۔ ان نگاہوں سے وہ خوف زدہ نہ ہوئیں (خوف ایک ایسا جذبہ تھا جسے ماریا کبھی کسی کے دل میں پیدا نہ کر سکی)، لیکن وہ اتنا ضرور جانتی تھیں کہ جب وہ ان نگاہوں سے دیکھتی ہے اس کی زبان گنگ اور اس کا رویہ بے لوچ ہو جاتا ہے۔

''تم اسے تبدیل کر لو گی، کر لو گی نا؟'' لسا نے کہا اور جب پرنس ماریا نے کوئی جواب دیا، وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

پرنس ماریا کو تنہا چھوڑ دیا گیا۔ اس نے لسا کی درخواست پر عمل نہ کیا۔ اس نے نہ صرف اپنے بالوں کو جوں کا توں رہنے دیا بلکہ اپنی شکل بھی آئینے میں نہ دیکھی۔ اس نے اپنے بازو بے چارگی کے عالم میں اپنے پہلوؤں پر گرا دیے، آنکھیں جھکا کر نیچے بیٹھ گئی اور سوچنے لگی۔ اس کے خیالوں میں ایک ایسے خاوند کا، جو بے حد زور آور، قوی العزم اور ناقابل تصور حد تک پرکشش تھا، خاکہ ابھرنے لگا۔ وہ اچانک آیا اور اسے اٹھا کر اپنی دنیا میں، جو اس کی اپنی دنیا سے قطعی مختلف اور مسرتوں کا گہوارہ تھی، لے گیا۔ اس کے ذہن میں ایک بچے کی تصویر بھی متشکل ہو گئی۔ یہ بچہ اس کا اپنا بچہ تھا اور اس بچے سے، جسے اس نے ایک روز قبل اپنی نرس کی بیٹی کی بانہوں میں دیکھا تھا،

مشابہ تھا۔ تصویر میں یہ اس کی چھاتیوں کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ خاوند پاس کھڑا تھا اور پیار سے اسے اور بچے کو دیکھ رہا تھا۔ ”لیکن نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بہت بدصورت ہوں،“ اس نے سوچا۔

”چائے پر تشریف لے چلیں۔ محترم پرنس، سیدھے ادھر آ رہے ہیں،“ دروازے کے باہر ایک خادمہ کہہ رہی تھی۔

وہ ہڑبڑا گئی اور دوبارہ اپنے آپ میں آ گئی۔ وہ جو کچھ ابھی ابھی سوچ رہی تھی، اس نے اس کی روح فگار کر دی۔ نیچے جانے سے پہلے وہ گوشۂ عبادت میں گئی اور ہاتھ باندھے نجات دہندہ کے بڑے ایقونے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی نظریں نجات دہندہ کے سانولے چہرے پر، جو ایقونہ لیمپ کی روشنی میں چمک رہا تھا، جمی ہوئی تھیں۔ وہ خاصی دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ شکوک و شبہات اس کی روح میں سر اٹھا رہے تھے اور اسے ایذا پہنچا رہے تھے۔ کیا محبت کی، مرد کے لیے ارضی محبت کی، مسرت اس کے حصے میں آ سکتی ہے؟ پرنس ماریا کے ذہن میں شادی کے بارے میں جو خیالات راہ پا رہے تھے، ان میں وہ ایسی مسرت کا تصور باندھ رہی تھی جو اپنا گھر اور اپنے بچے پا کر حاصل ہوتی ہے لیکن اس کی عظیم ترین اور مخفی ترین آرزو ارضی محبت کا حصول تھی۔ اپنی اس تمنا کو وہ دوسروں سے اور خود اپنے آپ سے جتنا چھپانے کی کوشش کرتی، یہ اتنا ہی اور توانا ہو جاتی۔ ”اف، میرے خدایا!“ اس نے کہا۔ ”یہ جو شیطانی تصورات میرے دل میں سر اٹھا رہے ہیں، میں ان کا قلع قمع کیسے کروں؟ میں ان رذیل اور شرمناک تخیلات سے کیسے دائمی چھٹکارا حاصل کروں تاکہ یکسوئی سے تمھاری رضا پوری کر سکوں؟“ اور اس نے یہ سوال پوچھا ہی تھا کہ جواب خداوندی خود بخود اس کے دل میں در آیا: ”اپنے لیے کسی چیز کی تمنا نہ کر۔ جستجو نہ کر۔ بے قرار یا حاسد نہ بن۔ انسان کا مستقبل اور تیرا اپنا مقدر تجھ سے پوشیدہ ہی رہنا چاہیے۔ لیکن زندگی یوں گزار کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ پیش آئے، تو اس کے لیے تیار رہ۔ اگر خدا کو ازدواجی فرائض کے سلسلے میں تیری آزمائش منظور ہوئی تو تجھے اس کی رضا کی تکمیل کے لیے تیار رہنا چاہیے۔“ اس تسکین آور خیال پر (لیکن اب بھی اسے یہی امید تھی کہ ایک نہ ایک دن اس کا ارضی محبت کا خواب ضرور شرمندۂ تکمیل ہو جائے گا) پرنس ماریا نے آہ بھری، اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور سیڑھیاں اترنے لگی۔ اسے نہ اپنے ڈریس کا خیال تھا اور نہ اپنے بالوں کے سٹائل کا۔ اس نے یہ تک نہ سوچا کہ وہ کمرے میں کیسے داخل ہو گی اور گفتگو کس ڈھب سے کرے گی۔ خدا کی، جس کے حکم کے بغیر سر کا ایک بال بھی نہیں جھڑ سکتا، رضا کے مقابلے میں ان چیزوں کی کیا اہمیت ہو سکتی تھی؟

4

جب پرنس ماریا نیچے آئی، پرنس واسیلی اور اس کا بیٹا، جو اس سے پہلے ہی ڈرائنگ روم میں پہنچ چکے تھے، کوچک پرنس اور مادموزیل بوغین کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ جونہی وہ بوجھل قدم اٹھاتے اور ایڑیوں کے بل چلتے کمرے میں داخل ہوئی، مرد حضرات اور مادموزیل بوغین اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور کوچک پرنس نے اس کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے کہا: "Voila Marie!*" پرنس ماریا نے ان سب کو دیکھا اور تفصیل سے دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ اسے دیکھتے ہی پرنس واسیلی کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہوگئی لیکن اس نے معاً اسے جھٹک دیا اور مسکرانے لگا۔ اس نے دیکھا کہ کوچک پرنس متجسس نگاہوں سے مہمانوں کے چہروں کا جائزہ لے رہی ہے تاکہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ ماری نے ان پر کیا تاثرات ثبت کیے ہیں۔ اس نے مادموزیل بوغین کے ربن اور خوشنما چہرے پر بھی نظر دوڑائی۔ اس نے دیکھا کہ وہ معمول سے کہیں زیادہ شگفتہ ہے اور اس کی نگاہیں اس (اناطول) پر مرکوز ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، وہ اسے (اناطول کو) نہ دیکھ سکی۔ وہ جب کمرے میں داخل ہوئی، اسے کوئی گرانڈیل، خیرہ کن اور خوش شکل چیز اپنی طرف حرکت کرتی نظر آئی۔ سب سے پہلے پرنس واسیلی اس کی جانب بڑھا۔ اس نے اس کی گنجی پیشانی پر، جو اس کے ہاتھ پر جھکی ہوئی تھی، بوسہ دیا اور کہا: ''جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، اس کے برعکس مجھے آپ بہت اچھی طرح یاد ہیں۔'' پھر اناطول اس کے قریب آیا۔ وہ اب بھی اسے نہ دیکھ سکی۔ اسے صرف اتنا محسوس ہوا کہ ایک نرم و نازک ہاتھ نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا ہے اور اوپر اس کے اپنے ہونٹ ایک سفید پیشانی سے، جس پر ہلکے سنہری بال تھے، مس ہوئے ہیں۔ ان بالوں سے پوماد (pomade) کی لپٹیں آرہی تھیں۔ جب اس نے اس پر اچٹتی نظر ڈالی وہ اس کے حسن و جمال سے مسحور ہوگئی۔ اناطول ایک ٹانگ پر وزن ڈالے کھڑا تھا۔ اس کی دوسری ٹانگ آہستہ آہستہ جھول رہی تھی۔ اس نے اپنا سینہ پھلایا ہوا تھا اور اس کی کمر مثلِ کمان تھی۔ اس کے دائیں ہاتھ کا انگوٹھا اس کی وردی کے ایک بٹن سے کھیل رہا تھا اور وہ اپنا سر قدرے ایک طرف جھکائے ہوئے تھا۔ پرنس کو دیکھ کر اس کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ آگئی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے اور وہ اس کے بارے میں بالکل نہیں سوچ رہا۔

اناطول نہ تو حاضر جواب تھا اور نہ اسے بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے کا فن آتا تھا، لیکن اس میں ایک خوبی تھی کہ وہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی پرسکون رہتا اور کبھی خود اعتمادی کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیتا۔ اور یہ وہ خوبی ہے جو اونچے طبقے میں بہت کام آتی ہے۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص سے متعارف ہونے کے دوران میں خود اعتمادی کے فقدان کی وجہ سے خاموشی اختیار کرلے اور اپنی حرکات وسکنات سے یہ ظاہر کردے کہ اسے خود بھی یہ شعور ہے کہ اس کی یہ خاموشی آداب کے منافی ہے، وہ بات کرنا چاہتا ہے لیکن اسے کوئی بات سوجھتی نہیں، تو اس سے کوئی اچھا اثر مترتب نہیں ہوتا۔ لیکن اناطول چپ کا روزہ رکھ سکتا تھا، اس کی ٹانگ جھول سکتی تھی اور وہ مزے مزے سے پرنس کے بالوں کا جائزہ لے سکتا تھا۔ یہ بالکل عیاں تھا کہ وہ اس انداز سے جتنی دیر چاہے، خاموشی اختیار کرسکتا ہے اور قطعاً پریشان نہیں ہوگا۔ وہ یہ کہتا نظر آرہا تھا: ''اگر کسی شخص کو یہ خاموشی نہیں بھاتی، وہ خود بات کرسکتا ہے لیکن جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، مجھے قطعاً پروا نہیں۔'' علاوہ ازیں جہاں تک خواتین سے اس کے رویے کا تعلق تھا، وہ کچھ ایسے پرنخوت انداز سے انھیں یہ احساس دلاتا کہ وہ جانتا ہے کہ وہ ان سے برتر ہے اور کسی دوسری چیز کی نسبت اس کا یہی

* وہ رہی ماری!

طریق ان کے قلوب میں تجسس، ہیبت بلکہ محبت تک کے جذبات ابھار دیتا۔ اس کا یہ رویہ ایسا تھا جو یہ کہتا دکھائی دیتا تھا: ''میں تمھیں جانتا ہوں، بالکل جانتا ہوں لیکن مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں تمھارے بارے میں فکر کرتا پھروں؟ ہاں، اگر میں فکر کروں، تو تمھیں ضرور مسرت ہوگی!'' کسی خاتون سے ملاقات کے متعلق وہ شاید حقیقتاً اس طرح نہیں سوچتا تھا (اس کا امکان کم ہی ہے کیونکہ وہ سوچتا ہی کب تھا)، لیکن اس کی شکل وصورت اور اطوار سے یہی تاثر مترشح ہوتا تھا۔ پرنس ماریا کو اسی طرح محسوس ہوا اور گویا یہ دکھانے کے لیے کہ اسے اپنی طرف راغب کرنے کی اس کے دل میں کوئی تمنا نہیں ہے، وہ اس کے باپ کی طرف متوجہ ہوگئی۔

گفتگو عمومی نوعیت کی اور خاصی پر جوش تھی۔ اس کا سہرا کوچک پرنس کے سر بندھتا تھا۔ وہ اپنا روئیں دار ہونٹ دل کش انداز سے اپنے سفید دانتوں کے اوپر نیچے گھماتے ہوئے خوب چہک رہی تھی۔ وہ پرنس واسیلی کے ساتھ شوخ اور چنچل انداز سے پیش آ رہی تھی۔ یہ انداز زیادہ تر وہ لوگ اپناتے ہیں جو باتونی ہوتے ہیں اور زندگی کے بارے میں جن کا رویہ ہوتا ہے بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔ وہ ایک دوسرے پر پھبتیاں کس سکتے ہیں، ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹ سکتے ہیں اور بھولی بسری دلچسپ یادیں جن سے دوسرے بالکل بے خبر ہوتے ہیں، تازہ کر سکتے ہیں۔ درحقیقت ان کے مابین نہ کوئی بے تکلفی ہوتی ہے اور نہ ان کی کوئی مشترکہ یادیں ہوتی ہیں۔ کوچک پرنس اور پرنس واسیلی کے باہمی تعلقات کی بھی یہی کیفیت تھی۔ تاہم پرنس واسیلی نے جھٹ پٹ اس کا لہجہ اختیار کر لیا اور کوچک پرنس نے اناطول کو بھی، جس سے اس کی کوئی خاص واقفیت نہ تھی، ان دلچسپ اور پر تفنن واقعات کی، جو کبھی منصۂ شہود پر ظاہر نہیں ہوئے تھے، یادیں تازہ کرنے میں اپنے ساتھ ملا لیا۔ مادموزیل بوغین بھی گفتگو میں حصہ لینے لگی۔ اور تو اور پرنس ماریا کو بھی اتنا لطف آنے لگا کہ وہ بھی اس ہنسی مذاق میں شریک ہوگئی۔

''ڈیئر پرنس، کم از کم یہاں ہم آپ کی صحبت سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکتے ہیں،'' کوچک پرنس نے پرنس واسیلی سے فرانسیسی میں کہا۔ (اس کا فرانسیسی میں بات کرنا طے شدہ امر تھا)۔ ''یہ آننا پاولوونا کی محفل نہیں کہ آپ آسانی سے غچہ دے سکیں گے۔ آپ کو •Cette Chere آنیت یاد ہے؟''

''بالکل، لیکن اس کی طرح تم مجھ سے سیاست کی باتیں نہیں کرو گی؟''

''اور وہ ہماری چھوٹی سی چائے کی میز؟''

''ہاں، بالکل۔''

تم کبھی آنیت کے ہاں کیوں نہیں آئے؟'' اس نے اناطول سے پوچھا۔ ''ارے ہاں، مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے،'' اس نے ذرا آنکھ مار کر کہا۔ ''تمھارے بھائی اپولیت نے مجھے تمھارے کارناموں کی دلچسپ کہانیاں سنائی تھیں! واہ واہ!'' اور اس نے اسے خاموش رکھنے کے لیے اپنی انگلی اس کی جانب لہرائی۔ ''پیرس میں تم جو شرارتیں کرتے رہے، ان کے متعلق بھی اس نے مجھے بتایا تھا!''

• This dear (یہ پیاری)

"اپولیت نے تمھیں یہ نہیں بتایا تھا،" پرنس واسیلی نے اپنے بیٹے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اس نے کوچک پرنس کا ہاتھ یوں اپنی گرفت میں تھام رکھا تھا جیسے وہ زقند لگا کر بھاگ جانا چاہتی ہو اور اس نے بڑی مشکل سے اسے روک رکھا ہو۔ "کیا اس نے تمھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس طرح ہماری اس ننھی منی پرکشش پرنس کے غم میں گھلا جا رہا ہے اور انھوں نے اسے کیسے دھتا بتایا؟ اجی پرنس، یہ تو خواتین میں ہیرا ہیں ہیرا،" اس نے پرنس ماریا کی طرف نگاہیں پھیرتے ہوئے کہا۔

جب پیرس کا ذکر آیا، مادموزیل بوغین کو بھی موقع مل گیا اور وہ بھی یادیں تازہ کرنے کی اس عمومی گفتگو میں شریک ہو گئی۔ اس نے کچھ جرأت دکھائی اور اناطول سے پوچھنے لگی: "آپ کو پیرس سے واپس آئے زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا ہوگا؟ کیسا لگا آپ کو یہ شہر؟" اناطول فرانسیسی خاتون کے سوالات کے جوابات دینے پر فوراً آمادہ ہو گیا۔ وہ اسے دیکھتا بھی جاتا تھا، مسکرا بھی رہا تھا اور اس کے آبائی وطن کے بارے میں گفتگو بھی کیے جا رہا تھا۔ جب سے اس نے ننھی منی من موہنی بوغین کو دیکھا تھا، وہ اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ بالڈ ہلز کا ماحول بہرحال اتنا بھی بے لطف اور غیر دلچسپ نہیں جتنا کہ وہ سمجھتا تھا۔ "بری نہیں، بالکل نہیں۔" اس نے گہری نظروں سے اسے تاڑتے ہوئے سوچا۔ "یہ ننھی منی رفیقہ بری نہیں۔ بالکل نہیں۔ مجھے امید ہے کہ جب ہماری شادی ہو جائے گی، وہ اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے گی — یہ ننھی منی چیز خاصی پیاری ہے۔"

معمر پرنس سٹڈی روم میں لباس تبدیل کر رہا تھا۔ اسے کوئی جلدی نہیں تھی۔ اس کی پیشانی شکن آلود تھی اور وہ یہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ ان مہمانوں کی آمد نے اسے برافروختہ کر دیا تھا۔ "پرنس واسیلی اور اس کے بیٹے کا مجھ سے کیا تعلق؟ پرنس واسیلی سطحی شیخی خورا ہے... اور اس کا بیٹا باپ ہی کا نمونہ ہوگا،" وہ آپ ہی آپ بڑبڑا رہا تھا۔ جو چیز اس کی خفگی کا سبب بنی تھی، وہ یہ تھی کہ اس آمد نے اس کے ذہن میں غیر حل شدہ مسئلے کو، جسے وہ نظرانداز کرنے کی مسلسل کوشش کرتا رہتا تھا اور جس کے بارے میں وہ ہر دم اپنے آپ کو فریب دیتا رہتا تھا، تازہ کر دیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ آیا وہ کبھی اپنی بیٹی کو اپنے سے جدا کر پائے گا اور اسے اس کے شوہر کے سپرد کر سکے گا؟ پرنس ہمیشہ اس مسئلے سے کنی کتراتا رہا کیونکہ وہ خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے صحیح انداز سے اس مسئلے پر غور کیا، تو وہ اس کا لازماً منصفانہ جواب دے گا اور انصاف کی نہ صرف اس کے جذبات کے ساتھ کھینچا تانی ہوگی بلکہ اس کے زندہ رہنے کے امکانات بھی اس کی بھینٹ چڑھ جائیں گے۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس کے نزدیک پرنس ماریا کی کوئی وقعت نہیں لیکن وہ پرنس ماریا کے بغیر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ "آخر، اسے بیاہ رچانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" اس نے سوچا۔ "یہی نا کہ شادی کے بعد غالباً جلا کڑھا کرے گی۔ لساہی کو لے لو۔ آندرے سے شادی کی — آج اس سے بہتر شوہر ملنا دشوار ہے — لیکن کیا وہ اپنی قسمت پر قانع ہے؟ اور ماریا سے محبت کی شادی کون کرے گا؟ شکل واجبی، جسم بے ہنگم، بے ڈول۔ جو بھی اس سے شادی کرے گا، اس لیے کرے گا کہ اس کے پاس دھن دولت ہے، اسے اونچے لوگوں سے نسبت ہے۔ پھر ایسی عورتوں کی کوئی کمی ہے کہ

بوڑھی ہوگئیں لیکن ابھی تک ناکتخدا ہیں؟ ان کی حالت اتنی گئی گزری بھی نہیں، خاصی خوش ہیں!'' پرنس نکولائی آندریوچ لباس بھی تبدیل کرتا جا رہا تھا اور کچھ اس انداز سے سوچتا بھی جا رہا تھا۔ تاہم جس سوال کو وہ معرض التوا میں ڈال رہا تھا، وہ فوری جواب کا متقاضی تھا۔ پرنس واسیلی اپنے ہمراہ اپنے بیٹے کو لے کر آیا تھا۔ اس کے عزائم بالکل واضح تھے۔ وہ رشتے کی تجویز پیش کرے گا اور لاریب آج یا کل غیر مبہم جواب چاہے گا۔ اس کا نام اور سوسائٹی میں مقام ٹھیک ٹھیک ہے۔ ''خیر، میں اس رشتے کے خلاف نہیں ہوں،'' پرنس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''بشرطیکہ صاحب زادہ اس (پرنسس ماریا) کے لائق ہو اور یہی ہم معلوم کریں گے۔''

''اور یہی ہم معلوم کریں گے،'' اس نے با آواز بلند دہراتے ہوئے کہا۔ ''یہی ہم معلوم کریں گے!''

''وہ حسب معمول تیز تیز قدم اٹھاتا ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اس نے سرعت سے بیک نظر تمام حاضرین کا جائزہ لیا۔ اسے کوچک پرنسس کی تبدیلیٔ لباس، مادموزیل بوغین کا ربن، پرنسس ماریا کے بالوں کا بدہیئت سٹائل، اناطول اور فرانسیسی عورت کی مسکراہٹیں اور عام گفتگو کے مابین اپنی بیٹی کا اکلاپا خاص طور پر کھٹکا۔ ''ہونقوں کی طرح بنی ٹھنی بیٹھی ہے!'' اس نے اپنی بیٹی کی طرف کینہ توز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''بے حیا، بے شرم! اور ایک وہ ہے کہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا!''

وہ پرنس واسیلی کی طرف گیا۔ ''خوب، کیا حال ہے، کیا حال ہے؟ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔''

''دوستی کے سامنے فاصلوں کی کیا حیثیت ہے!'' پرنس واسیلی نے حسب معمول عاجلانہ، پراعتماد اور بے تکلفانہ لہجے سے کہا۔ ''یہ میرا دوسرا بیٹا ہے۔ میری التجا ہے کہ آپ اس کے سر پر، جیسا کہ ہم کہا کرتے ہیں، شفقت کا ہاتھ رکھیں۔''

پرنس نکولائی آندریوچ نے اناطول کا گہری نظر سے جائزہ لیا۔ ''اچھا جوان ہے، اچھا جوان ہے،'' اس نے کہا۔ ''خیر آؤ اور میرا بوسہ لو،'' اور اس نے اپنا گال آگے بڑھا دیا۔

اناطول نے معمر شخص کا بوسہ لیا اور تجسس اور کامل یکسوئی سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ہر آن یہ توقع کر رہا تھا کہ اس نے اب کوئی انوکھی حرکت کی، اب کی۔ اس کے بارے میں اس کا باپ پہلے ہی اسے بتا چکا تھا۔

پرنس نکولائی آندریوچ صوفے کے کونے پر اپنی معمول کی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے پرنس واسیلی کے لیے آرام کرسی کھینچی، اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور اس سے سیاسی امور اور دیگر خبروں کے متعلق سوالات پوچھنے لگا۔ بظاہر وہ پرنس واسیلی کی باتیں کان لگا کر سن رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں مسلسل پرنسس ماریا پر مرکوز رہیں۔

''گویا انھوں نے ازیں پیشتر ہی پوٹسڈم سے خط کتابت شروع کر دی ہے؟'' اس نے پرنس واسیلی کے آخری الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ پھر وہ اچانک اٹھا اور اپنی بیٹی کی طرف چل پڑا۔ ''تم نے اپنا یہ حلیہ اپنے ان مہمانوں کی خاطر بنایا ہے؟'' اس نے کہا۔ ''خوب، بہت خوب! تم نے بالوں کا یہ سٹائل مہمانوں کی خاطر اختیار کیا ہے، تو میں ان مہمانوں کی موجودگی میں تمھیں حکم دیتا ہوں کہ آئندہ میری اجازت کے بغیر اپنے لباس کے رنگ ڈھنگ میں کوئی

تبدیلی نہ کرنا۔''

''ابا جان، قصور وار میں ہوں،'' کوچک پرنس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''تمھارا جو جی چاہے، کرو، تمھیں کھلی چھٹی ہے،'' پرنس نکولائی آندریوچ نے اپنی بہو کے سامنے کچھ زیادہ ہی جھکتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اسے اپنی شکل بگاڑنے کی کوئی ضرورت نہیں — وہ ویسے ہی خاصی بدصورت ہے۔''

اور وہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا اور اس نے اپنی بیٹی پر، جسے اس نے قریب قریب رلا دیا تھا، مزید کوئی توجہ نہ دی۔

''مجھے آپ سے اتفاق نہیں۔ بالوں کا یہ سٹائل پرنس پر بہت پھبتا ہے،'' پرنس واسیلی نے کہا۔

''ہاں، برخوردار، کیا نام ہے تمھارا؟'' پرنس نکولائی آندریوچ نے اناطول کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''ادھر آؤ۔ مجھ سے باتیں کرو تا کہ ہم ایک دوسرے سے واقفیت پیدا کر سکیں۔''

''اب مزہ آئے گا!'' اناطول نے سن رسیدہ پرنس کے پہلو میں مسکرا کر بیٹھتے ہوئے سوچا۔

''خیر، سنا ہے کہ تم نے بیرون ملک تعلیم پائی ہے۔ میری یا اپنے باپ کی طرح کسی ٹٹ پونجیے پادری سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا۔ ہاں، صاحب زادے، یہ بتاؤ کہ تم ہارس گارڈز میں خدمت سرانجام دے رہے ہو؟'' بوڑھے نے اناطول کا بڑے غور اور باریک بینی سے جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، میرا تبادلہ عام سپاہ میں ہو گیا ہے،'' اناطول نے کہا۔ اس کے لیے اپنی ہنسی پر قابو پانا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔

''اخاہ، تو یہ بات ہے! تو تم اپنے وطن اور اپنے زار کی خدمت کرنا چاہتے ہو۔ ٹھیک ہے نا؟ جنگ کا زمانہ ہے۔ ایسے نفیس نوجوان کو خدمات سرانجام دینا ہی چاہئیں۔ تو تم محاذ پر جا رہے ہو؟''

''نہیں، محترم پرنس، میں نہیں جا رہا، البتہ ہماری رجمنٹ ضرور جا رہی ہے۔ مجھے کہیں اور تعینات کر دیا گیا ہے... پاپا، مجھے کہاں تعینات کیا گیا ہے؟'' اناطول نے ہنستے ہوئے اپنے باپ سے استمداد چاہی۔

''تم واقعی فوج کی آبرو ہو، آبرو۔ مجھے کہاں تعینات کیا گیا ہے، واہ، سبحان اللہ! ہا، ہا!'' پرنس کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔

اناطول نے اور بھی بلند قہقہے لگانے شروع کر دیے۔ اچانک پرنس نکولائی آندریوچ کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔

''تم جا سکتے ہو،'' اس نے اناطول سے کہا۔

اناطول مسکراتا ہوا خواتین کے جھرمٹ میں آ بیٹھا۔

''تو تم نے اسے بیرون ملک تعلیم دلائی ہے۔ ٹھیک ہے پرنس واسیلی؟'' معمر پرنس نے پرنس واسیلی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''مجھ سے جو بن پڑا، میں نے کیا۔ اتنا میں آپ کو یقین دلا سکتا ہوں کہ ہمارے مقابلے میں وہاں تعلیم کا معیار کہیں بلند ہے۔''

''جی ہاں، آج کل ہر چیز مختلف ہے۔ ہر شے میں نیا پن ہے۔ اچھا جوان ہے، اچھا جوان ہے! آئیے، ذرا میرے کمرے تک چلتے ہیں۔''

اس نے پرنس واسیلی کا بازو تھام لیا اور اسے اپنے سٹڈی روم کی طرف لے گیا۔

جونہی انھیں تنہائی میسر آئی، پرنس واسیلی نے اپنی امیدوں اور آرزوؤں سے پردہ ہٹانے میں ڈھیل نہ کی۔

''تمھارا خیال ہے کہ میں نے اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال رکھی ہیں کہ میں اس سے جدا نہیں ہو سکتا؟'' معمر پرنس نے بھڑکتے ہوئے کہا۔ ''وہ چاہے تو بے شک کل چلی جائے۔ میں صرف ایک بات بتانا چاہتا ہوں: میں اپنے مستقبل کے داماد کو بہتر طور پر جاننا چاہتا ہوں۔ تمھیں میرے اصولوں کا پتا ہی ہے — میں کوئی چیز چھپانے کا قائل نہیں، ہر بات اعلانیہ اور برملا ہونا چاہیے! میں کل تمھاری موجودگی میں اس کی رائے دریافت کروں گا۔ اگر وہ راضی ہوئی، پھر آپ کا صاحب زادہ مزید قیام کر سکتا ہے۔ وہ کچھ عرصہ یہاں قیام کرے، پھر میں دیکھوں گا،'' معمر پرنس کے نتھنے پھڑ پھڑانے لگے۔ ''وہ (اس کی بیٹی) شادی کر لے، مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا!'' وہ اسی تیکھے لہجے سے، جس سے اس نے اپنے بیٹے کو خدا حافظ کہا تھا، چلانے لگا۔

''میں آپ کے ساتھ صاف گوئی سے کام لوں گا،'' پرنس واسیلی نے ایک ایسے عیار شخص کے، جسے اس بات کا پختہ یقین ہو کہ اتنے زیرک اور تیز فہم ہم سخن کے ساتھ عیاری برتنا لاحاصل ہے، انداز سے کہا۔ ''اس میں کلام نہیں کہ آپ کو دلوں کے بھید تک رسائی حاصل کرنے میں ملکہ حاصل ہے۔ اناطول کوئی نابغۂ روزگار شخصیت نہیں۔ لیکن وہ دیانتدار، نیک دل نوجوان، فرماں بردار بیٹا اور اچھا قرابت دار ضرور ہے۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، دیکھا جائے گا۔''

جیسا کہ عام طور پر ان عورتوں کے ساتھ، جو کافی عرصے سے مردانہ صحبتوں سے دور الگ تھلگ زندگی بسر کرتی چلی آئی ہوں، ہوتا ہے، اناطول کی آمد پر پرنس نکولائی آندریوچ کے گھرانے کی تینوں خواتین کو بھی یہی محسوس ہوا کہ اب تک انھوں نے جو زیست کی ہے، وہ حقیقی معنوں میں زیست نہیں، بلکہ کچھ اور تھا۔ ان کے سوچنے، محسوس کرنے اور مشاہدہ کرنے کی صلاحیتیں ایکا ایکی دس گنا بڑھ گئیں اور انھیں یوں لگا کہ ان کی زندگیاں، جو اب تک اندھیرے میں بیتی تھیں، ایکا ایکی نئی روشنی سے، جو معانی سے بھرپور تھی، جگمگا اٹھی ہیں۔

پرنسس ماریا کو نہ اپنی شکل وصورت کا دھیان رہا اور نہ اسے اپنے بالوں کا سٹائل یاد رہا۔ اس شخص کا، جو شاید اس کا خاوند بن جائے، خوش شکل اور شگفتہ چہرہ اس کی تمام تر توجہ کا مرکز بن گیا۔ وہ اسے شفیق، باعزم، مردانہ صفات سے بہرہ ور، عالی ظرف اور بلند فطرت انسان نظر آیا۔ اسے پختہ یقین تھا کہ وہ ان خوبیوں سے متصف ہے۔ اس کے تخیل میں مستقبل کی شادی شدہ زندگی کے بارے میں ہزاروں خواب بنتے اور ابھرتے رہے۔ اس نے انھیں اپنے ذہن سے نکالنے اور انھیں دبانے کے لیے بہت ہاتھ پاؤں مارے۔

''پر ان کے ساتھ میرا رویہ سرد مہرانہ اور مغائرانہ نہیں ہے؟'' پرنسس نے سوچا۔ ''میں اپنے آپ کو ضبط کی زنجیروں

میں اس لیے جکڑنے کی کوششیں کر رہی ہوں کیونکہ ازیں پیشتر ہی عالم حیرت میں مجھے اپنی روح کی گہرائیوں میں محسوس ہونے لگا ہے کہ میں ان کے بے حد قریب ہوں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ جو کچھ میں ان کے بارے میں سوچ رہی ہوں، انھیں اس کا کوئی علم نہیں ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ یہی سمجھ بیٹھیں کہ میں انھیں پسند ہی نہیں کرتی۔''

اور پرنسس ماریا نے اپنے مہمان کے ساتھ گرم جوشی کا رویہ اختیار کرنے کی کوشش کی لیکن اس معاملے میں وہ بالکل پھسڈی تھی، اسے پتا ہی نہیں تھا کہ یہ کام کیسے کیا جاتا ہے۔

''بے چاری لڑکی! یہ تو بالکل ہی گئی گزری ہے۔ خوبصورتی تو اس کو چھو کر بھی نہیں گزری،'' اناطول نے سوچا۔

مادموزیل بوغین کے، جو اناطول کی آمد پر آپے سے باہر ہوئی جا رہی تھی، خیالات مختلف نوعیت کے تھے۔ وہ خوبصورت تھی، جوان تھی اور اس بات کے باوجود کہ معاشرے میں اس کا کوئی واضح مقام نہیں تھا، اس کا کوئی سنگی ساتھی تھا نہ کوئی عزیز رشتے دار، وہ اپنے آبائی وطن سے بھی بہت دور تھی، یہ امر یقینی تھا کہ وہ اپنی ساری عمر پرنس نکولائی آندریوچ کی خدمت کرنے، اسے کتب، اخبارات اور رسائل پڑھ کر سنانے اور اس کی بیٹی کی رفیقہ بن کر گزارنے کی روادار نہیں تھی۔ وہ مدت مدید سے کسی ایسے روسی پرنس کا، جو اس بدصورت، بدقطع اور بدلباس پرنس کے مقابلے میں اس کی فوقیت آناً فاناً بھانپ جائے گا، اس کی تحسین کرے گا، آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ پٹ اس کی زلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو جائے گا اور اسے کندھوں پر بٹھا کر اپنے ساتھ لے جائے گا، انتظار کر رہی تھی۔ اور خدا کی قدرت، اس روسی پرنس نے آخر اپنا جلوہ دکھا ہی دیا!

مادموزیل بوغین کو ایک کہانی، جو کسی زمانے میں اسے اس کی خالہ نے سنائی تھی، یاد تھی۔ اس کہانی کا انجام اس نے خود گھڑ لیا تھا۔ وہ اسے بار بار اپنے دل میں دہراتی اور مزے لیتی رہتی تھی۔ یہ کہانی ایک دوشیزہ کے، جسے کسی نے ورغلا لیا تھا، بارے میں تھی۔ اس کی بے چاری ماں (sa pauvre mere) اس کے پاس آئی اور اسے پھٹکار کرنے لگی کہ اس نے نکاح کیے بغیر مرد کی بالادستی کیوں قبول کر لی۔ مادام بوغین نے اپنے تصورات میں یہ کہانی اسے، یعنی جو اسے ورغلاتا ہے، بار بار سنائی تھی اور کہانی سناتے سناتے اکثر اس کی آنکھیں اشک بار ہو جاتی رہی تھیں۔ ''اب وہ، جیتا جاگتا سچ مچ کا روسی پرنس، آ گیا ہے۔ وہ مجھے بھگا لے جائے گا، بے چاری ماں موقع واردات پر آ موجود ہو گی اور وہ مجھ سے شادی کر لے گا۔'' مادموزیل بوغین جب اناطول سے پیرس کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی، مستقبل کی یہ تصویر اس کے ذہن میں ابھر رہی تھی۔ یہ نہیں کہ اس نے شعوری طور پر اس بارے میں سوچا سمجھا اور اس کے مطابق اپنا طریق عمل متعین کیا تھا (اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اس پر غور نہیں کیا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے)۔ یہ سب کچھ تو اس کے باطن میں مدتوں پہلے سے تیار اور موجود تھا اور اب جب کہ اناطول منظر پر آ گیا تھا، یہ سارا تانا بانا اس کی ذات کے گرد مکمل ہو گیا۔ اور وہ ہر ممکن انداز سے اپنے آپ کو اس کے سامنے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنا کر پیش کرنے کی سعی میں جت گئی۔

جس طرح جب تجربے کار جنگی گھوڑے کے کانوں میں بگل کی آواز آتی ہے، اس کی ٹانگیں خود بخود متحرک

ہو جاتی ہیں اور وہ سبک گامی کے لیے بے قرار ہونے لگتا ہے، اناطول کی آمد نے کوچک پرنس پر بھی کچھ ایسا ہی اثر دکھایا۔ وہ یہ بھول گئی کہ اس کی حالت کیا ہے، اور غیر شعوری طور پر عشوہ وغمزہ وادا کے جانے پہچانے گر آزمانے پر تل گئی۔ اگرچہ اس کا اپنا الوسیدھا کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا، پھر بھی اس نے اپنا دامن بچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ اس کی نادانی اور سادہ لوحی اسے یہ پٹی پڑھا رہی تھی کہ جو ہو سو ہو، بس تفریح کا موقع ہاتھ سے نکلنا نہیں چاہیے۔

اگرچہ نسوانی صحبتوں میں عام طور پر اناطول کا رویہ اس مرد کا ہوتا تھا جو اس بات سے تنگ آ چکا ہوتا ہے کہ وہ جہاں بھی جاتا ہے، عورتیں اس کا تعاقب شروع کر دیتی ہیں، تاہم اس کی موجودگی ان تین عورتوں پر جس طرح اثر انداز ہوئی تھی، اس سے اس کی انا کو خاصی تسکین پہنچی۔ علاوہ ازیں وہ مادموزیل بوغین میں، جو خوش شکل بھی تھی اور جذبات کو برانگیختہ بھی کرتی تھی، وہی پر جوش حیوانی کشش محسوس کرنے لگا جو سرعت سے اس پر غالب آ جاتی تھی اور اسے اسفل تریں اور انتہائی ناعاقبت اندیشانہ حرکات پر مجبور کر دیتی تھی۔

چائے کے بعد تمام لوگ سٹنگ روم میں چلے گئے۔ وہاں پرنس ماریا سے کلاوی کارڈ (Clavichord) پر نغمہ سنانے کی فرمائش کی گئی۔ اناطول آیا اور مادموزیل بوغین کے برابر کھڑا ہو گیا۔ وہ اپنی کہنیوں پر جھکا اور اس نے اپنی نگاہیں، جن میں مسرت اور مسکراہٹ چھلک رہی تھی، پرنس ماریا پر گاڑ دیں۔ پرنس کو احساس تھا کہ یہ نظریں اس پر جمی ہوئی ہیں، یہ احساس اس کے لیے مسرور کن بھی تھا اور اذیت ناک بھی۔ وہ ساز پر اپنے پسندیدہ کلاسیکی نغمے (sonata) کی دھن بجا رہی تھی، اس کی دھن نے اسے اس کے اپنے ہی شعری عالم میں پہنچا دیا تھا اور اس نظر نے، جو اسے اپنے بدن پر محسوس ہو رہی تھی، اس شعریت میں مزید چار چاند لگا دیے تھے۔ تاہم اس (اناطول) کی نگاہیں اگرچہ اس (پرنس) پر مرکوز تھیں، لیکن جو کچھ وہ کہہ رہی تھی، اس کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا بلکہ وہ مادموزیل بوغین کے پاؤں سے، جسے وہ کلاوی کارڈ کے نیچے اپنے پاؤں سے چھو رہا تھا، منسلک تھیں۔ مادموزیل بوغین کی نگاہیں بھی پرنس ماریا پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں امید بھی تھی، سرور بھی اور اس کے ساتھ ان میں خوف کے سائے بھی لہرا رہے تھے۔ یہ کیفیت پرنس کے لیے بھی نئی تھی۔

"وہ مجھ سے کتنا پیار کرتی ہے!" پرنس ماریا نے سوچا۔ "اب میں کتنی خوش ہوں! ایسی سہیلی اور ایسے شوہر کی موجودگی میں تو میری خوشیوں کا کوئی ٹھکانا ہی نہیں رہے گا! شوہر — کیا یہ واقعی ممکن ہے؟" وہ سوچتی اور دریائے حیرت میں ڈوبتی رہی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہ تھا کہ وہ نگاہیں اٹھا کر اس کا چہرہ دیکھ سکے۔ تاہم اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ وہ نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں۔

سہ پہر کے بعد جب محفل بکھر گئی اور سب لوگ اپنی اپنی خوابگاہوں کی طرف چلنے لگے، اناطول نے پرنس ماریا کے ہاتھ پر بوسہ ثبت کر دیا۔ یہ تو اس کی سمجھ میں بھی نہ آیا کہ اس میں اتنی جرأت کہاں سے آ گئی لیکن جونہی اس کا خوبصورت چہرہ اس کی کوتاہ بین آنکھوں کے سامنے آیا، اس نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں۔ اس کے بعد وہ مادام بوغین کے پاس گیا اور اس نے اس کا ہاتھ بھی چوم لیا۔ (اس کی یہ حرکت مسلمہ آداب کے خلاف تھی لیکن وہ

ہر کام اتنی سادگی اور خود اعتمادی سے کرتا تھا کہ اس کی یہ حرکت بھی بری نہ لگی!) مادموزیل بوغین شرم سے پانی پانی ہوگئی اور سر بگریباں پرنس ماریا کو دیکھنے لگی۔

''اس تمیز، اس سلیقے پر داد دینے کو جی چاہتا ہے!'' پرنس ماریا نے سوچا۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ آمیلی (مادموزیل بوغین) یہ سمجھتی ہو کہ میں اس سے حسد کرتی ہوں اور اسے مجھ سے جو اتنا بے ریا پیار اور لگاؤ ہے، میں اس کی قدر نہیں کرتی؟''

وہ اس کے پاس پہنچی اور اس نے گرم جوشی سے اس کے رخساروں پر بوسہ دیا۔ اناطول کوچک پرنس کے قریب گیا۔

''نہیں، نہیں! جب تمھارے ابا جان مجھے خط لکھیں گے اور یہ اطلاع دیں گے کہ تم آدمی بن گئے ہو، میں تمھیں اپنے ہاتھ پر بوسہ دینے کی اجازت دے دوں گی۔ اس سے پہلے بالکل نہیں!'' اس نے کہا۔

اور مسکراتے اور اس کی جانب انگلی لہراتے وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

5

وہ اپنے اپنے کمروں میں چلے گئے۔ اناطول تو لیٹتے ہی خواب خرگوش کے مزے لینے لگا لیکن دوسروں کی آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی اور وہ بھی دیر تک کروٹیں بدلتے رہے۔

''کیا یہ اجنبی، خوب رو اور خوب سیرت شخص میرا خاوند بن جائے گا؟ خوب سیرت... اصل بات یہی ہے،'' پرنس ماریا نے سوچا اور ایک خاص قسم کی دہشت، جو اس نے اس سے پہلے تقریباً کبھی محسوس نہیں کی تھی، اس پر غالب آگئی۔ اس میں اتنا بوتا نہ تھا کہ اپنے گردوپیش دیکھ سکے۔ اسے یہ دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کوئی شخص سکرین[15] کے پیچھے تاریک کونے میں دبکا کھڑا ہے۔ اور یہ کوئی شخص وہ ۔ ابلیس ۔ ہے اور یہ وہ آدمی بھی تھا جس کی پیشانی سفید، ابرو سیاہ اور لب سرخ تھے۔

اس نے گھنٹی بجائی۔ خادمہ حاضر ہوگئی۔ اس نے کہا: ''یہیں میرے کمرے میں سو جاؤ۔''

مادموزیل بوغین اس رات خاصی دیر تک پودگھر میں ٹہلتی رہی۔ اسے توقع (جو نقشِ بر آب ثابت ہوئی) تھی کہ آج رات کوئی آئے گا۔ وہ کبھی مسکرانے لگتی اور کبھی اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو جاتے کیونکہ اپنے قعر مذلت میں گرنے پر اسے اپنی، بے چاری ماں، کی خیالی ڈانٹ ڈپٹ یاد آجاتی۔

کوچک پرنس مسلسل اپنی خادمہ سے گلہ شکوہ کرتی رہی کہ آج اس نے بستر ڈھنگ سے نہیں بچھایا۔ اس سے نہ تو سیدھا لیٹا جاتا ہے اور نہ پہلو کے بل۔ اسے قرار آتا ہے نہ سکون۔ اس کا بوجھ اس کے لیے عذاب بنا ہوا تھا۔ اب جب کہ اناطول پہنچ گیا تھا، یہ بوجھ پہلے سے بھی زیادہ مصیبت بن گیا تھا۔ اس (اناطول) کی موجودگی نے اسے واضح طور پر ان دنوں کی، جب وہ اس بوجھ سے آزاد تھی، جب ہر چیز ہلکی پھلکی اور مسرت سے معمور تھی، یاد دلا دی

تھی۔ وہ ڈریسنگ گاؤن اور شبینہ ٹوپی پہنے آرام کرسی پر بیٹھی تھی۔ کاتیا، جس کی آنکھیں نیند سے بوجھل اور بال پریشان تھے، پروں کا بھاری بچھونا الٹا پلٹا رہی اور جھاڑ رہی تھی۔ ساتھ ہی ساتھ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا بھی رہی تھی۔

''میں نے کہا تھا کہ یہ کہیں پچکا ہوا اور کہیں ابھرا ہوا ہے!'' کوچک پرنس نے اپنی بات دہرائی۔ ''اگر مجھے نیند آجائے تو میں بہت خوش ہوں گی۔ یہ میرا قصور نہیں ہے۔'' اور اس کی آواز اس بچے کی، جو معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی رو دے گا، آواز کی طرح لرزنے لگی۔

معمر پرنس بھی جاگ رہا تھا۔ تیخون کو نیم غنودگی کے عالم میں اس کے خشم ناک انداز سے پاؤں پٹخنے اور نتھنے پھڑپھڑانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ معمر پرنس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اپنی بیٹی کے حوالے سے توہین برداشت کرنا پڑ رہی ہے اور یہ توہین اور بھی تکلیف دہ تھی کیونکہ اس کا تعلق اس کی اپنی ذات سے نہیں بلکہ ایک دوسری ہستی سے تھا اور یہ دوسری ہستی اس کی اپنی بیٹی تھی جو اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ اس نے اپنے آپ کو بتایا: ''میں اس سارے معاملے پر غور کروں گا اور پھر فیصلہ کروں گا کہ صحیح راہ عمل کیا ہے۔'' وہ یہ تو نہ کر سکا لیکن غصے سے مزید ضرور جلتا بھنتا رہا۔

''پہلا مرد آیا نہیں — اور وہ سب کچھ بھول بیٹھی۔ اس نے مجھے — اپنے باپ کو — بھی بھلا دیا۔ کدکڑے لگاتی پھر رہی ہے، نئے نئے طریقوں سے کنگھی چوٹی کرتی ہے، چٹیا اچھالتی پھرتی ہے۔ اپنی شکل یوں بناتی ہے کہ پہچانی ہی نہیں جاتی۔ کتنی خوش ہے کہ باپ سے پنڈ چھوٹا! جانتی بھی ہے کہ میں برا مناؤں گا... اخ تھو!... اخ تھو!... اور مجھے معلوم ہی نہ ہو سکا کہ وہ الو کا پٹھا صرف بوغین پر نظریں رکھے ہوئے ہے۔ (مجھے اس بوغین سے پیچھا چھڑانا ہوگا)... اس بے وقوف لڑکی کا پندار کہاں گیا کہ اسے یہ سب کچھ نظر ہی نہیں آ رہا؟ اگر اپنا نہیں، تو کم از کم میرا ہی لحاظ کرتی۔ اسے سمجھانا ہی پڑے گا کہ یہ کوڑھ مغز اسے جوتی کی نوک کے برابر بھی نہیں سمجھتا اور صرف بوغین پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اس میں پندار نام کی کوئی چیز نہیں، میں اسے بتاؤں گا کہ پندار کیا ہوتا ہے...''

معمر پرنس اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ وہ خیال خام میں مبتلا ہے اور فریب کھا رہی ہے، اناطول اس سے نہیں، مادموزیل بوغین سے محبت جتا رہا ہے، تو وہ اس کی انا کو ٹھیس پہنچائے گا اور اس کا اپنا مقصد (اس سے جدا نہ ہونا) پورا ہو جائے گا۔ اس خیال نے اسے یک سُو کر دیا۔ اس نے تیخون کو آواز دی اور خود کپڑے اتارنے لگا۔

''ابلیس ہی انھیں یہاں لایا ہے!'' وہ سوچ رہا تھا جب کہ تیخون اس کی کھنکھرہڈیوں پر، جن پر نام کو بھی گوشت نہیں تھا، البتہ چھاتی سفید بالوں سے ڈھکی ہوئی تھی، شبینہ قمیص پہنا رہا تھا۔ ''میں نے انھیں کب بلایا تھا؟ بن بلائے نازل ہو گئے اور میری زندگی — جو تھوڑی بہت جتنی بھی رہ گئی ہے — درہم برہم کر گئے ہیں۔ خدا بچے ان سے!'' وہ بڑبڑایا جب کہ اس کا سر ابھی تک شبینہ قمیص میں مستور تھا۔

بعض اوقات پرنس کے خیالات جس طرح خود بخود زبان پر آجاتے تھے اور وہ با آواز بلند ان کا اظہار

کرنے لگتا تھا، تیخون اس کا عادی تھا۔ چنانچہ جب اس کا غصیلا اور استفہامیہ چہرہ شبینہ قمیص سے برآمد ہوا، اس نے سکون و تحمل سے اس کا سامنا کیا۔

''سو گئے؟''

تمام اچھے خدمت گاروں کی طرح تیخون بھی جبلی طور پر اپنے آقا کے خیالات کی رو کا اندازہ لگانے میں ماہر ہو چکا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ سوال کا اشارہ پرنس واسیلی اور اس کے بیٹے کی طرف ہے۔

''یور ایکسی لینسی، معزز مہمانوں نے بتیاں بجھا دی ہیں اور وہ بستروں پر لیٹ گئے ہیں۔''

''کوئی وجہ نہیں تھی، بالکل کوئی وجہ نہیں تھی...'' پرنس بسرعت بڑبڑائے جا رہا تھا۔ اس نے پاؤں سلیپروں میں اور بازو ڈریسنگ گاؤن کی آستینوں میں گھسیڑے اور جس صوفے پر وہ سویا کرتا تھا، اس کی طرف چل پڑا۔

اگرچہ اناطول اور مادموزیل بوغین کے مابین کوئی بات نہ ہوئی تھی لیکن جہاں تک ان کے رومان کے پہلے مرحلے کا۔ ''بے چاری ماں'' کی آمد کے منظر تک۔ تعلق ہے، وہ ایک دوسرے کا منشا پوری طرح سمجھ گئے تھے۔ انھیں محسوس ہو چکا تھا کہ انھیں خلوت میں ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا ہے۔ چنانچہ آفتاب ابھی طلوع بھی نہیں ہوا تھا کہ انھوں نے تنہائی میں ملاقات کرنے کا موقع ڈھونڈنا شروع کر دیا۔ جب پرنسس ماریا مقررہ وقت پر اپنے باپ کے کمرے میں چلی گئی، مادموزیل بوغین اور اناطول پودگھر میں اکٹھے ہو گئے۔

پرنسس ماریا جب اپنے باپ کے سٹڈی روم کے دروازے کے قریب پہنچی، اس کا دل معمول سے کہیں زیادہ دھک دھک کر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ ہر شخص کو نہ صرف معلوم ہے کہ آج اس کے مقدر کا فیصلہ ہو جائے گا بلکہ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ وہ خود اس کے بارے میں کیا سوچ رہی ہے۔ اسے یہ بات تیخون کے چہرے پر تحریر نظر آئی اور پرنس واسیلی کے ذاتی خدمت گار کے چہرے پر بھی منعکس ہوتی دکھائی دی۔ اس سے اس کی مڈھ بھیڑ غلام گردش میں ہوئی تھی۔ وہ اپنے آقا کے لیے پانی لیے جا رہا تھا اور جھک کر اسے تسلیمات بجا لایا تھا۔

اس صبح معمر پرنس اپنی بیٹی کے ساتھ نہایت پرشفقت لیکن محتاط انداز سے پیش آیا۔ اس کے چہرے پر جو کشیدگی ہویدا تھی، پرنسس اس سے بخوبی آگاہ تھی۔ یہ وہی کشیدگی تھی جو ہمیشہ اس وقت اس کے چہرے پر ظاہر ہوا کرتی تھی جب وہ حساب کا کوئی سوال سمجھنے میں ناکام رہتی تھی، وہ جھلا جاتا تھا، اس کی پژمردہ مٹھیاں بھنچ جاتی تھیں، اپنی کرسی سے اٹھتا اور دور جا کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد وہ وہی الفاظ بار بار دبی زبان سے دہرانے لگتا تھا۔

وہ اس کے ساتھ شائستہ لیکن رسمی انداز سے گفتگو کر رہا تھا اور بلا تاخیر مطلب کی بات زبان پر لے آیا۔

''مجھے ایک تجویز پیش کی گئی ہے اور اس تجویز کا تعلق تمھاری ذات سے ہے،'' اس نے غیر فطری انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ یہ قیافہ تو تم نے بھی لگا لیا ہو گا کہ پرنس واسیلی اپنے متوسل (کوئی خاص بات ہی تھی کہ پرنس نکولائی آندریوچ نے اناطول کے لیے 'متوسل' کا لفظ استعمال کیا) کے ہمراہ جو یہاں آیا ہے، تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ اسے مجھ میں کوئی کشش نظر آئی تھی۔ گزشتہ رات اس نے مجھے تمھارے متعلق تجویز پیش کی۔ تم

میرے اصولوں کو جانتی ہو۔ میں یہ معاملہ تمھارے سپرد کر رہا ہوں۔"

"mon pere,*، میں کیا سمجھوں کہ آپ کا مطلب کیا ہے،" پرنس نے زیرلب کہا۔ شرم سے پہلے اس کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر اس کا رنگ فق ہو گیا۔

"تم کیا سمجھو کہ میرا مطلب کیا ہے!" اس کے باپ نے لال بھبوکا ہو کر کہا۔ "تم پرنس واسیلی کو بطور بہو قبول ہو اور اس نے اپنے متوسل کی طرف سے تمھیں شادی کا پیغام دیا ہے۔ یہ ہے میرا مطلب۔ کچھ آیا تمھارے خیال شریف میں؟... میں پوچھتا ہوں کہ تم کیا سمجھی ہو!"

"mon pere، مجھے کچھ معلوم نہیں کہ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے،" پرنس نے زیرلب کہا۔

"میری؟ میری؟ میرا اس سے کیا تعلق؟ مجھے اس سے نکال دو! شادی میں نے نہیں کرنا۔ تمھاری کیا رائے ہے؟ اصل بات یہی معلوم ہونا چاہیے۔"

پرنس اتنا سمجھ گئی کہ وہ شادی کے اس پیغام پر خوش نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ جہاں تک اس کی شادی کا تعلق ہے، اس کا فیصلہ یا تو آج ہو جائے گا یا پھر وہ ہمیشہ لکیر پیٹتی رہے گی۔ اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں تاکہ وہ ان نظروں سے بچ سکیں جن کے متعلق اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ یونہی اس پر گڑی رہیں، پھر وہ سوچنے سمجھنے کی تمام صلاحیتوں سے محروم ہو جائے گی اور حکم کی تعمیل بجا لانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکے گی کیونکہ یہ اس کی عادت بن چکی تھی۔

"میری صرف ایک ہی آرزو ہے کہ میں آپ کی خواہشات کے مطابق عمل کروں،" اس نے کہا۔ "لیکن اگر مجھے صرف یہی بتانا ہے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔"

لیکن ابھی وہ اپنی بات ختم نہ کر پائی تھی کہ پرنس نے اسے ٹوک دیا۔ "بہت خوب!" اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔ "وہ تمھیں تمھارے جہیز سمیت تو لے ہی جائے گا لیکن مادموزیل بوغین اسے جھونگے میں مل جائے گی۔ وظیفۂ زوجیت وہ ادا کرے گی اور رہی تم، تم۔"

پرنس ڈھیلا پڑ گیا۔ اس کے الفاظ نے اس کی بیٹی پر جو اثر کیا تھا، وہ اسے نظر آ رہا تھا۔ پرنس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور اس کے آنسو تھے کہ اب چھلکے، کہ اب چھلکے۔

"چھوڑو، جانے دو۔ میں تو صرف مذاق کر رہا تھا، صرف مذاق،" اس نے کہا۔ "پرنس، یہ بات اپنے پلے باندھ لو۔ میں اس اصول پر قائم ہوں کہ ہر نوجوان خاتون کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ اپنے شوہر کا انتخاب وہ خود کرے۔ میری طرف سے تمھیں پوری آزادی حاصل ہے۔ لیکن اتنا یاد رکھو کہ تمھاری زندگی کی خوشیوں کا انحصار تمھارے اپنے فیصلے پر ہے۔ میرے متعلق بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

"لیکن mon pere مجھے معلوم نہیں ہے..."

---

* اباجان

"بحث کی ضرورت نہیں ہے! وہ حکم کا بندہ ہے اور ہر حالت میں حکم کی تعمیل کرے گا۔ اگر اسے حکم ملا کہ وہ تمھارے ساتھ شادی کر لے، اسے کوئی عذر نہیں ہوگا اور اگر اسے کسی اور کے ساتھ رشتۂ مناکحت میں منسلک ہونے کے لیے کہا گیا، وہ پھر بھی سرتابی نہیں کرے گا۔ لیکن تمھارے اوپر ایسی کوئی پابندی نہیں، تم اپنے انتخاب میں آزاد ہو... اپنے کمرے میں چلی جاؤ اس معاملے کے بارے میں سوچ بچار کرو۔ ایک گھنٹے میں واپس آجاؤ اور اس کی موجودگی میں مجھے بتادو: صرف ایک کا،' ہاں یا نہ!' مجھے معلوم ہے کہ تم اس سلسلے میں وظائف پڑھوگی اور دعائیں مانگو گی۔ خیر، اگر تم دعائیں مانگنا چاہو، ضرور مانگو۔ بس اب جاؤ..." پرنس چلی گئی لیکن وہ ابھی تک "ہاں یا نہ، ہاں یا نہ!" چلائے جا رہا تھا۔ اس کے پاؤں ڈگمگا رہے تھے جیسے اس پر سکتہ طاری ہوگیا ہو۔ وہ چلاتا، لڑکھڑاتا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے مقدر کا فیصلہ ہوگیا تھا اور یہ فیصلہ اس کی خوشیوں کے حق میں ہوا تھا۔ لیکن اس کے باپ نے مادموزیل بوغین کے بارے میں جو کچھ کہا تھا۔ بڑی بھیانک تہمت تھا۔ مانا یہ تہمت صحیح نہیں تھی لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ وہ تھی بہت بھیانک اور وہ اس کے متعلق بار بار سوچ رہی تھی کیونکہ وہ اس کے ذہن سے نکلتی ہی نہ تھی۔ سوچتے سوچتے وہ سیدھی پود گھر میں پہنچ گئی۔ اسے نہ کچھ سنائی دے رہا تھا اور نہ دکھائی۔ معاً مادموزیل بوغین کی (وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی) جانی پہچانی آواز نے اس کے تمام حواس بیدار کر دیے۔ اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اسے چند قدم دور اناطول فرانسیسی عورت سے ہم آغوش ہوتا اور اس کے کان میں کچھ کہتا دکھائی دیا۔ جب اناطول کی نظر پرنس ماریا پر پڑی، اس کا خوبصورت چہرہ دہشت زدہ ہوگیا تاہم اس نے مادموزیل بوغین کو، جس نے پرنس ماریا کو نہیں دیکھا تھا، اپنی آغوش سے فوراً علیحدہ نہ کیا۔

"کون ہو تم؟ کیا چاہتی ہو؟ ذرا ٹھہرو!" اناطول کا چہرہ کہتا محسوس ہو رہا تھا۔ پرنس ماریا چپ سادھے انھیں دیکھتی رہی۔ وہ اس کی تفہیم نہ کر سکی۔ بالآخر مادموزیل بوغین کی چیخ نکل گئی اور وہ وہاں سے بھاگ گئی۔ اناطول نے یوں مسکرا کر، جیسے اسے بہت لطف آ رہا ہو، پرنس ماریا کو جھک کر سلام کیا گویا وہ اسے دعوت دے رہا ہو کہ اس انوکھے واقعے پر وہ بھی اس کے ساتھ قہقہے لگائے۔ پھر اس نے اپنے کندھے جھٹکائے اور اس دروازے کی طرف، جو اس کے اپارٹمنٹ میں کھلتا تھا، چل پڑا۔

ایک گھنٹے بعد تیخون آیا اور اس نے پرنس ماریا کو بتایا: "بزرگ پرنس آپ کو یاد فرما رہے ہیں اور پرنس واسیلی سرگیویچ بھی وہیں ہیں۔" جب تیخون کمرے میں داخل ہوا، پرنس ماریا مادموزیل بوغین کو، جو زار و قطار رو رہی تھی، اپنے بازوؤں میں سمیٹے صوفے پر بیٹھی تھی اور ہولے ہولے اس کا سر سہلا رہی تھی۔ پرنس کی خوبصورت آنکھوں کی سابقہ چمک دمک اور متانت دوبارہ لوٹ آئی تھی اور وہ مادموزیل بوغین کے ننھے منے پر جمال چہرے کو بہ نگاہ لطف و شفقت دیکھ رہی تھی۔

"نہیں، پرنس، میں آپ کی عنایات سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہوگئی ہوں،" مادموزیل بوغین نے کہا۔

''کیوں؟ میں تو تمھیں پہلے سے بھی زیادہ پیار کرنے لگی ہوں،'' پرنس ماریا نے جواب دیا۔ ''اور تمھاری خوشیوں کے لیے مجھ سے جو بن پڑا، ضرور کروں گی۔''

''لیکن دل میں تو آپ مجھ سے نفرت ہی کرتی رہیں گی۔ آپ اتنی پاک صاف ہیں کہ آپ سمجھ ہی نہیں سکتیں کہ حیوانی جذبات کس طرح انسان پر غالب آجاتے ہیں۔ کاش "ma pauvre mere*"۔

''میں سب کچھ سمجھتی ہوں،'' پرنس ماریا نے اپنے چہرے پر اداس مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے کہا۔ ''مائی ڈیئر، اپنے آپ کو سنبھالو۔ اب میں ابا جان کے پاس جا رہی ہوں،'' اس نے یہ الفاظ کہے اور باہر نکل گئی۔

پرنس واسیلی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں نسوار کی ڈبیا اور چہرے پر جذباتی تبسم تھا۔ اس کا یہ تبسم بزبانِ حال پکار پکار کر کہہ رہا تھا کہ ''میں اتنا شدید طور پر متاثر ہوا ہوں کہ اپنی حساسیت[16] پر رونے اور ہنسنے کے لیے مجبور ہوں۔'' جب پرنس اندر آئی، اس نے چٹکی بھر نسوار بہ عجلت اپنی ناک میں ڈال لی۔

''اخاہ، مائی ڈیئر، مائی ڈیئر!'' اس نے اٹھتے اور اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔ اس نے لمبی سانس لی اور پھر بولا: ''میرے بیٹے کا مقدر تمھارے ہاتھ میں ہے۔ مائی ڈیئر، میری جان، میری عزیز، نیک دل ماری، اپنے فیصلے سے ہمیں آگاہ کر دو۔ میں نے تمھیں ہمیشہ اپنی بیٹی کی طرح چاہا ہے۔''

وہ پیچھے ہٹ گیا اور سچ مچ کا آنسو اس کی آنکھ سے ٹپک پڑا۔

''اخون! اخون!'' پرنس نکولائی آندریوچ کے نتھنے پھڑ پھڑائے اور وہ گویا ہوا: ''پرنس نے اپنے متوسل۔ اپنے صاحب زادے۔ کی جانب سے تمھیں شادی کی تجویز پیش کی ہے۔ تم پرنس اناطول کوراگن کی بیوی بننا چاہتی ہو یا نہیں؟ جواب دو: ہاں یا نہ!'' اس نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔ ''میری رائے کیا ہے، یہ میں بعد میں بتاؤں گا۔ ہاں، یہ رائے میری اور صرف میری ہوگی،'' اس نے پرنس واسیلی کی ملتجیانہ نگاہوں کے جواب میں مزید کہا۔ ''ہاں یا نہ؟ ہونہہ؟''

''ابا جان، میری تمنا یہ ہے کہ میں کبھی آپ کو چھوڑ کر نہ جاؤں، کبھی آپ سے علیحدہ گھر نہ بساؤں۔ میں شادی نہیں کرنا چاہتی،'' اس نے بہت پر اعتماد لہجے سے کہا۔ اس نے اپنی خوبصورت آنکھیں اپنے باپ کے چہرے سے پرنس واسیلی کے چہرے کی طرف منتقل کر دیں۔

''واہیات! فضول! واہیات، واہیات، واہیات!'' معمر پرنس چلا کر کہہ رہا تھا۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہوگئی اور اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس نے اس کا بوسہ تو نہیں لیا البتہ اس نے اپنی پیشانی نیچے جھکا دی اور اس کی پیشانی کے ساتھ محض چھوا دی۔ پھر اس نے جو ہاتھ تھام رکھا تھا، اسے اتنے زور سے بھینچا کہ پرنس کو جھرجھری آگئی اور اس کی چیخ نکل گئی۔

پرنس واسیلی اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''اگر اجازت ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ وہ لمحہ ہے جو میں تاحیات

---

* میری بے چاری ماں

فراموش نہیں کرسکوں گا، کبھی نہیں بھلاسکوں گا۔ لیکن مائی ڈیئر، کیا تم ہمیں ادنیٰ سی امید بھی نہیں دلاؤ گی کہ ہم کبھی تمھارے دل کو، جو اتنا نیک، اتنا فیاض ہے، جیت پائیں گے؟ صرف 'شاید' ہی کہہ دو... مستقبل کا اور چھور نہیں۔ صرف 'شاید' کہہ دو۔''

''پرنس، میں نے جو کچھ عرض کیا ہے، وہی ہے، جو میرے دل میں ہے۔ آپ نے جو میری قدر افزائی فرمائی ہے، میں اس کے لیے آپ کی ممنون ہوں لیکن میں آپ کے صاحب زادے کی شریک حیات کبھی نہیں بن سکتی۔''

''مائی ڈیئر فیلو، یہ معاملہ ختم ہوگیا، انجام کو پہنچ گیا! تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی، مجھے خوشی ہے کہ تم یہاں آئے۔ پرنس، اپنے کمرے میں واپس چلی جاؤ۔ جاؤ!'' معمر پرنس نے کہا۔ ''تمھیں مل کر بہت خوشی ہوئی'' اس نے دوبارہ کہا اور پرنس واسیلی سے بغل گیر ہوگیا۔

''میری افتادِ طبع مختلف قسم کی ہے،'' پرنس ماریا سوچ رہی تھی۔ ''میری سرشت کا تقاضا ہے کہ میں بہ اندازِ دیگر مسرت کی جستجو کروں... محبت اور ایثار و قربانی کی راہ پر چلوں، پھر میری جھولی خوشیوں سے بھر سکے گی۔ اور میں اس بے چاری آمیلی کو ضرور خوشی کا سامان بہم پہنچاؤں گی خواہ مجھے اس کی کتنی ہی قیمت کیوں نہ چکانا پڑے۔ وہ اسے دیوانہ وار چاہتی ہے اور جو کچھ اس سے سرزد ہوا ہے، اس پر وہ خون روتی ہے۔ ان دونوں کو شادی کے بندھن میں باندھنے کے لیے مجھ سے جو بن پڑا، ضرور کروں گی۔ اگر وہ اتنا دولت مند نہیں ہے، پھر میں اس (بوغین) کو وسائل مہیا کروں گی۔ میں اباجان کے پاؤں پکڑلوں گی، میں آندرے سے تقاضا کروں گی۔ جب وہ اس کی شریک حیات بن جائے گی، میرا دل شاد ہوجائے گا۔ کتنی بدقسمت ہے بیچاری! اجنبی، بے یار و مددگار، تن تنہا! اوہ، میرے خدایا، وہ اس کو کتنا ٹوٹ کر پیار کرتی ہوگی کہ اپنا آپ بھی بھلا بیٹھی! شاید میں نے بھی یہی کیا ہوتا!...'' پرنس ماریا نے سوچا۔

6

رستوفوں کو کافی عرصے تک نکولائی کی کوئی خبر نہ مل سکی تا آنکہ آدھی سردیاں نکل گئیں، پھر کہیں کاؤنٹ کو ایک خط، جسے اس کے لختِ جگر نے اپنے ہاتھ سے لکھا تھا، تھمایا گیا۔ اسے ملتے ہی وہ دوسروں کی نظروں سے بچتا بچاتا اور پنجوں کے بل چلتا اپنے سٹڈی روم میں چلا گیا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اسے خط پڑھنے کی جلدی تھی۔ اس نے دروازہ بند کیا اور خط پڑھنے لگا۔

جب آنّا میخائیلوونا کو خط کے متعلق معلوم ہوا (گھر میں جو کچھ ہوتا تھا، اسے اس کی ایک ایک بات معلوم ہوجاتی تھی)، وہ دبے پاؤں کاؤنٹ کے کمرے میں کھسک گئی۔ اس نے دیکھا کہ کاؤنٹ ہاتھ میں خط پکڑے بیک وقت سسکیاں بھی بھر رہا ہے اور ہنس بھی رہا ہے۔

اگرچہ آنّا میخائیلوونا کے حالات بہتر ہوگئے تھے، مگر وہ ابھی تک رستوفوں کے ہاں ٹکی ہوئی تھی۔

''مائی ڈیئر فرینڈ؟'' اس نے پرملال لہجے سے دریافت کیا۔ وہ موقع محل کے مطابق ہر قسم کی ہمدردی جتانے

کے لیے تیار تھی۔

کاؤنٹ اور بھی زور زور سے سسکیاں لینے لگا۔

''نکولشکا... خط... مجروح... ہوسکتا ہے... مائی ڈیئر... مجروح... میر الخت جگر... کوچک کاؤنٹس... ترقی... افسر بن گیا... خدا کا شکر ہے!... ہم ننھی منی کاؤنٹس کو کیسے بتائیں گے؟''

آننا میخائیلوونا اس کے قریب بیٹھ گئی، اپنے رومال سے اس کے، وہ جو خط پر ٹپکے تھے اور خود اپنے، آنسو پونچھے، خود خط پڑھا، کاؤنٹ کو تسلی دلاسا دیا اور پھر اپنا فیصلہ سنایا کہ وہ ڈنر پر اور ڈنر کے بعد چائے تک کے عرصے کے دوران میں کاؤنٹس کو تیار کرے گی اور اگر خداوند کا فضل شامل حال رہا، وہ چائے کے اختتام پر اسے سب کچھ بتادے گی۔

ڈنر کے دوران میں آننا میخائیلوونا جنگ کے متعلق افواہوں اور نکولشکا کے بارے میں باتیں کرتی رہی۔ اگرچہ اسے پہلے ہی معلوم تھا، پھر بھی اس نے استفسار کیا کہ اس کا آخری خط کب موصول ہوا تھا۔ پھر خود ہی بولی: ''میرا خیال ہے کہ شاید آج ہی اس کا کوئی خط موصول ہو جائے۔'' جب بھی ان اشاروں کنایوں سے کاؤنٹس کو کوئی تشویش ہوتی، وہ گھبرا کر کبھی کاؤنٹ اور کبھی آننا میخائیلوونا کی طرف دیکھنے لگتی۔ موخر الذکر جھٹ پٹ صورت حال سنبھال لیتی اور بڑی مہارت اور چابک دستی سے گفتگو کا رخ روزمرہ کی چھوٹی موٹی باتوں کی طرف موڑ دیتی۔ نتاشا پورے خاندان کی وہ واحد فرد تھی جسے لب ولہجے کے اتار چڑھاؤ، اچٹتی نظروں اور چہروں کے تاثرات کی خفیف ترین باریکیوں کا ادراک کرنے کا خداداد ملکہ حاصل تھا۔ اس کے ڈنر کے آغاز میں ہی کان کھڑے ہوگئے۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ دال میں کہیں کالا کالا ہے، اس کا باپ اور آننا میخائیلوونا کچھ چھپا رہے ہیں اور جو کچھ وہ چھپا رہے ہیں، اس کا تعلق اس کے بھائی سے ہے اور آننا میخائیلوونا جس انداز سے گفتگو کر رہی ہے، اس کا مقصد انھیں کہی ڈھکی چھپی بات سننے کے لیے تیار کرنا ہے۔ اپنی تمام تر بے باکی کے باوجود (نتاشا اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی ماں ہر اس چیز کے بارے میں جس کا تعلق نکولشکا سے بنتا تھا، بے حد حساس ہے) وہ ڈنر کے دوران میں کوئی سوال پوچھنے کا حوصلہ نہ کر سکی۔ لیکن اس کے دل میں جو گھد بد ہو رہی تھی، وہ اسے کسی کل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔ اس سے ٹھیک طرح کھانا بھی نہیں کھایا جا رہا تھا اور گورنس کی ڈانٹ ڈپٹ کے باوجود وہ کرسی پر بار بار پہلو بدل رہی تھی۔ ڈنر کے بعد وہ سر پر پاؤں رکھ کر آننا میخائیلوونا کے پیچھے بھاگی، اس نے اسے سٹنگ روم میں جا پکڑا اور کچ کچ اس کی گردن پر سوار ہوگئی۔

''آنٹی ڈارلنگ، مجھے بتائیں کہ معاملہ کیا ہے؟''

''مائی ڈیئر، کچھ بھی تو نہیں۔''

''نہیں، اچھی آنٹی، پیاری آنٹی، چھوڑوں گی میں بھی نہیں آپ کو۔ میں یقین کے ساتھ کہہ سکتی ہوں کہ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے اور آپ کو یہ بات معلوم ہے۔''

آنا میخائیلوونا نے اپنی گردن کو زور سے جھٹکا۔ ''mon enfant*، تم نری آفت کی پڑیا ہو۔''

''نکولینکا کا خط؟ مجھے پکا یقین ہے کہ بالکل یہی بات ہے!'' نتاشا نے گلا پھاڑ کر کہا۔ اس نے آنا میخائیلوونا کے چہرے پر توثیق پڑھ لی تھی۔

''خدا کے لیے محتاط رہنا۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس سے تمھاری امی کو کتنا صدمہ پہنچے گا۔''

''ضرور، ضرور! صرف مجھے بتادیں!... نہیں بتائیں گی؟ اچھا، پھر میں جاتی ہوں اور ابھی بتاتی ہوں!''

آنا میخائیلوونا نے اس شرط پر کہ وہ کسی سے ذکر نہیں کرے گی، اسے مختصراً خط کے مندرجات بتا دیے۔

''نہیں، بالکل نہیں۔ وعدہ رہا،'' نتاشا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا اور سونیا کی تلاش میں بھاگنے لگی۔

نکولینکا... زخمی... خط!'' اس نے کامرانی کے نشے سے جھومتے ہوئے کہا۔

''نکولاس!'' سونیا صرف یہی کہہ سکی اور آناً فاناً اس کا رنگ فق ہو گیا۔

نتاشا نے جب سونیا پر اپنے بھائی کی جراحت کی خبر کا یوں اثر ہوتے دیکھا، اسے پہلی مرتبہ اس اطلاع کی سنگینی کا احساس ہوا۔

وہ جھٹ پٹ سونیا کی طرف لپکی، اس کے گلے میں اپنے بازو حمائل کیے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''انھیں بڑا معمولی زخم آیا ہے۔ ان کی ترقی ہو گئی ہے اور اب وہ افسر بن گئے ہیں۔ انھوں نے خط اپنے ہاتھ سے لکھا ہے،'' اس نے اشکوں اور آہوں کے مابین کہا۔

''صاف نظر آ گیا ہے کہ تمام عورتیں بس بچوں کی طرح رونا ہی جانتی ہیں،'' پیتیا نے کہا۔ وہ لمبے لمبے اور پرعزم ڈگ بھرتا کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ ''میں بہت خوش، واقعی بہت خوش ہوں کہ میرے بھائی نے اتنی نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ تم لوگوں کو بس دھاڑیں مار مار کر رونا ہی آتا ہے۔ تمھاری سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔''

نتاشا آنسو بہاتے بہاتے مسکرا پڑی۔

''تم نے خط پڑھا نہیں؟'' سونیا نے پوچھا۔

''نہیں، لیکن وہ کہہ رہی تھیں کہ سب معاملہ ختم ختما ہو گیا ہے اور یہ کہ وہ اب افسر بن گئے ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے!'' سونیا نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے کہا۔ ''انھوں نے شاید تمھیں پوری بات نہیں بتائی ہے۔ آؤ، امی کے پاس چلتے ہیں۔''

پیتیا چپ چاپ کمرے کے چکر لگاتا رہا اور پھر بولا: ''اگر میں نکولینکا کی جگہ ہوتا، تو کئی مزید فرانسیسیوں کو جہنم واصل کر دیتا۔ سالے، بڑے بدمعاش ہیں! میں اتنے، اتنے مارتا کہ ڈھیر لگ جاتا،'' پیتیا کہے جا رہا تھا۔

''پیتیا، چپ کرو۔ تم نرے احمق ہو!''

---

* میری بچی

''احمق میں نہیں، احمق وہ ہیں جو خواہ مخواہ آنسو بہانے بیٹھ جاتی ہیں،'' پیتیا نے جواب دیا۔

''تمھیں وہ یاد ہیں؟'' چند لمحوں کی خاموشی کے بعد نتاشا نے اچانک پوچھا۔

سونیا مسکرائی: ''نکولاس یاد ہے؟''

''نہیں، سونیا، میرا مطلب یہ تھا کہ کیا وہ تمھیں اتنی اچھی طرح یاد ہیں کہ تم ان کی ایک ایک بات یاد کر سکو؟'' نتاشا نے پرزور انداز سے اپنا بازو لہراتے ہوئے کہا۔ ظاہر تھا کہ وہ اپنے الفاظ کو نہایت سنجیدہ معانی پہنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''میں بھی نکولینکا کو یاد کر سکتی ہوں،'' اس نے کہا۔ ''لیکن مجھے بورس اس طرح یاد نہیں آتا، میں اسے بالکل یاد نہیں کر سکتی۔''

''کیا؟ تمھیں بورس یاد نہیں ہے؟'' سونیا نے حیران ہو کر پوچھا۔

''یہ بات نہیں کہ وہ مجھے یاد نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کی شکل وصورت کیسی ہے۔ لیکن میں جس طرح نکولینکا کو یاد کر سکتی ہوں، اسے اس طرح یاد نہیں کر سکتی۔ محض آنکھیں بند کرنے کی بات ہے اور وہ مجھے سامنے دکھائی دینے لگتے ہیں۔ لیکن بورس — نہیں۔'' (اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔) ''نہیں — کچھ بھی نہیں۔''

''اف، نتاشا!'' اس نے کچھ یوں وفورِ مسرت سے بے خود ہو کر اور اپنے چہرے پر گمبھیرتا طاری کرتے ہوئے کہا جیسے وہ جو کچھ کہنا چاہتی تھی، وہ اسے اس قابل نہیں سمجھتی کہ وہ اس کی سماعت کر سکے بلکہ وہ کسی دوسرے شخص سے، جس کے ساتھ ٹھٹھا مذاق کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، مخاطب تھی۔ ''جب ایک مرتبہ مجھے تمھارے بھائی کے ساتھ محبت ہو گئی، یہی سمجھا کہ میں بس اسی کی ہو گئی۔ اب خواہ اسے کچھ ہو جائے یا مجھے، میں آخری سانس تک اس سے محبت کرتی رہوں گی۔''

نتاشا اسے متحیر اور متجسس نگاہوں سے دیکھنے لگی لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔ اسے محسوس ہوا کہ سونیا نے جو کچھ کہا ہے، مبنی بر حقیقت ہے۔ ایسی محبت حقیقتاً موجود ہے۔ لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اسے اس قسم کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اسے یقین تھا کہ ایسی محبت کا وجود ممکن ہے لیکن وہ اس کی تفہیم کرنے سے قاصر تھی۔

''انھیں خط لکھیں؟'' اس نے پوچھا۔

سونیا سوچ میں پڑ گئی۔ یہ سوال کہ نکولاس کو خط کیسے لکھا جائے یا یہ کہ اسے خط لکھنا بھی چاہیے یا نہیں، اسے سخت اذیت پہنچا رہا تھا۔ ''اب جب کہ وہ افسر بن چکا ہے اور زخم خوردہ ہیرو ہے، اسے اپنے متعلق یاد دلانا مناسب ہے بھی یا نہیں؟ کہیں وہ یہ تو نہیں سمجھے گا کہ میرے بارے میں اس نے جس ذمے داری کی ہامی بھری تھی میں خط کے بہانے اسے یاد تو نہیں دلا رہی؟''

''مجھے پتا نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اگر اس نے مجھے خط لکھا... میں بھی ضرور لکھوں گی،'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔

''تم انھیں خط لکھتے شرماؤ گی تو نہیں؟''

سونیا مسکرائی۔ ''نہیں۔''

''خیر، مجھے تو بورس کو لکھتے بڑی شرم آئے گی اور میں لکھوں گی بھی نہیں۔''

''اس میں شرم کی کیا بات ہے؟''

''پتا نہیں۔ کچھ اچھا نہیں لگتا... بس شرم آرہی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے کہ اسے کیوں شرم آرہی ہے،'' پیتیا نے کہا۔ نتاشا نے ازیں پیشتر اس سے جو کچھ کہا تھا، اس نے اس کے تن بدن میں آگ لگا دی تھی۔ ''بتاؤں،، کیوں؟ اسے اس موٹے سے، وہی جو عینک پہنتا ہے،'' (پیتیا نے اپنے ہم نام کاؤنٹ بزوخوف کا نقشہ انھی الفاظ میں کھینچا تھا) ''عشق ہو گیا تھا۔ اب یہ اس گویے پر مرتی ہے۔'' (اس کا اشارہ نتاشا کے اطالوی میوزک ٹیچر کی طرف تھا)، ''اس لیے اسے شرم آرہی ہے۔''

''پیتیا، تم نرے کاٹھ کے الو ہے۔''

''مادام، میں تم سے بڑا کاٹھ کا الو نہیں ہوں،'' نو سالہ پیتیا نے ایک بزرگ بریگیڈیر کے انداز سے کہا۔

آنّا میخائیلوونا نے ڈنر پر جو اشارے دیے تھے، انھوں نے کاؤنٹس کو (اچھی بری خبر سننے کے لیے) تیار کر دیا تھا۔ وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور آرام کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس کی نظریں نسوار کی ڈبیا کے ڈھکنے پر اپنے لختِ جگر کے تصویر چے پر مرکوز تھیں اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ آنّا میخائیلوونا، ہاتھ میں خط پکڑے، پنجوں کے بل چلتی، کاؤنٹس کے کمرے کی طرف آئی اور دروازے پر رک گئی۔

''آپ اندر نہ آئیں،'' اس نے معمر کاؤنٹ سے کہا۔ ''بعد میں آجائیں۔'' وہ اندر چلی گئی اور اپنے پیچھے دروازہ بھیڑ دیا۔

کاؤنٹ نے روزنِ قفل پر اپنا کان لگا دیا اور سننے لگا۔ ابتدا میں اسے ادھر ادھر کی باتیں سنائی دیں۔ پھر آنّا میخائیلوونا نے لمبی چوڑی تقریر شروع کر دی۔ اس کے بعد چیخ کی آواز سنائی دی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ تب ایکا ایکی دونوں عورتیں اکٹھی بولنے اور خوشی سے چہچہانے لگیں۔ آخر کار قدموں کی چاپ سنائی دی اور آنّا میخائیلوونا نے دروازہ کھول دیا۔ اس کا چہرہ فخر و مباہات سے دمک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جراح قطع عضو کے کسی مشکل آپریشن سے فارغ ہوا ہے اور اب اپنی مہارت کی داد وصول کرنے کے لیے عامۃ الناس کو اندر آنے کی دعوت دے رہا ہے۔

''سر ہو گیا!'' اس نے فتح مندی کے احساس سے جھومتے ہوئے کاؤنٹ سے کہا اور کاؤنٹس کی طرف، جو ایک ہاتھ میں نسوار کی ڈبیا، جس پر تصویر چہ تھا، اور دوسرے میں خط تھامے ہوئے تھی اور انھیں باری باری اپنے لبوں سے لگا رہی تھی، اشارہ کیا۔

جب اس نے کاؤنٹ کو دیکھا، اس نے اپنے بازو پھیلا دیے اور اس کے گنجے سر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کی چوٹی کے اوپر سے تصویر چے اور خط کو بھی دیکھتی جا رہی تھی اور اس نے انھیں ایک

مرتبہ پھر چومنے کے لیے آہستہ آہستہ بے بال سر ایک طرف دھکیل دیا۔

ویرا، نتاشا، سونیا اور پیتیا بھی کمرے میں آ گئے اور خط دوبارہ پڑھا جانے لگا۔ فوج کی پیش قدمی، ان دو لڑائیوں، جن میں اس نے حصہ لیا تھا اور اپنی ترقی کی اجمالی روداد بیان کرنے کے بعد نکولائی نے اپنے والدین کی دست بوسی کی تھی اور ان سے اپنے حق میں دعا کرنے کی درخواست کی تھی۔ اس نے ویرا، نتاشا، اور پیتیا کے متعلق لکھا کہ وہ ان کے ہاتھوں کو بھی بوسہ دیتا ہے۔ اس نے موسیو شیلنگ، مادام شوس اور اپنی سابقہ آیا کو سلام بھیجا تھا۔ آخر میں اس نے التجا کی تھی: ''میری طرف سے پیاری سونیا کا بوسہ لیں۔ میں اب بھی اس سے پیار کرتا ہوں اور اس کے بارے میں میرے خیالات اب بھی وہی ہیں جو پہلے تھے۔'' جب سونیا نے یہ سب کچھ سنا، وہ شرما گئی اور اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔ وہ ان نگاہوں کی، جو اسے دیکھ رہی تھیں، تاب نہ لا سکی اور بال روم میں بھاگ گئی۔ وہاں وہ اتنا ناچی، گھومی اور کودی کہ اس کی سکرٹ غبارے کی طرح پھول گئی اور وہ خوشی سے تمتماتے اور مسکراتے فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

کاؤنٹس رو رہی تھی۔

''ماما، آپ کیوں رو رہی ہیں؟'' ویرا نے پوچھا۔ ''اس نے جو کچھ لکھا ہے، ہمیں اس پر خوشی ہونا چاہیے نہ کہ رونا۔''

بات بالکل ٹھیک تھی۔ لیکن کاؤنٹ، کاؤنٹس اور نتاشا، سبھی اسے ملامت آمیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''یہ کس پر گئی ہے؟'' کاؤنٹس سوچ رہی تھی۔

نکولنکا کا خط سینکڑوں مرتبہ پڑھا گیا۔ جن لوگوں کو اس قابل سمجھا گیا کہ انھیں یہ خط سنایا جا سکتا ہے، انھیں کاؤنٹس کی خدمت میں حاضر ہونا پڑتا کیونکہ وہ اسے ہاتھ سے چھوڑنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ ٹیوٹر، آیائیں، متکا اور متعدد دوست آتے اور کاؤنٹس خود انھیں خط پڑھ کر سناتی۔ ہر بار اسے نیا لطف آتا اور ہر مرتبہ اس پر اپنے نکولنکا کی نئی خوبیاں آشکار ہونے لگتیں۔ اسے یہ بات کتنی عجیب، غیر معمولی اور فرحت آگیں معلوم ہوتی کہ اس کا بیٹا۔ جس کے ننھے منے اور مہین اعضا آج سے بیس سال قبل اسے اپنے پیٹ میں خفیف گردش کرتے محسوس ہوتے تھے، وہ بیٹا جس کے بارے میں اس کا کاؤنٹ سے، جو خود ضرورت سے زیادہ اس کی ناز برداری کیا کرتا تھا، جھگڑا ہو جایا کرتا تھا، وہ بیٹا جس نے "nanny"* سے پہلے "pear"** کہنا سیکھا تھا۔ آج اس کا وہی بیٹا دیار غیر میں، اجنبی ماحول میں نڈر جنگجو ہے، اکیلا ہے، بے یار و مددگار ہے، لیکن مردوں کے کارنامے سر انجام دے رہا ہے۔ قرن ہا قرن کا یہ عالمگیر تجربہ کہ بچے پالنے سے پالی میں پہنچ جاتے ہیں اور محسوس بھی نہیں ہونے دیتے، کاؤنٹس کے نزدیک کوئی وجود نہیں رکھتا تھا۔ اس کا بیٹا جب ایک منزل سے دوسری منزل میں داخل ہوتا، کاؤنٹس اسے غیر معمولی واقعہ قرار دیتی جیسے اربوں انسانوں نے ازیں قبل بالکل اسی طرح نمود کی منازل طے نہیں کی تھیں۔ جس طرح آج سے بیس سال پہلے اسے یہ بات ناقابل یقین دکھائی دیتی تھی کہ ننھی منی مخلوق جو اس کے قلب کے نیچے کہیں دبکی پڑی تھی، ایک

---

* امی

** ابا

روز چیخم چاخ کرے گی، اس کی چھاتیوں کا دودھ پیے گی یا باتیں کرے گی، بعینہٖ آج اس کے لیے یہ یقین کرنا ناممکن ہو رہا تھا کہ وہی ننھی منی مخلوق قوی تن اور قوی دل افسر بن گئی ہے، فرزندوں اور مردوں کے معیار کو چھونے لگی ہے، اس کے خط سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا۔

"کیا اسلوب بیان ہے! کس خوبصورت انداز سے اس نے ہر چیز کا نقشہ کھینچا ہے!" اس نے خط کی بیانیہ عبارت پڑھتے ہوئے کہا۔ "کتنا بڑا دل پایا ہے اس نے! اپنے بارے میں کچھ بھی نہیں لکھا... ایک لفظ تک تحریر نہیں کیا۔ کوئی دینی سوف ہے، اس کا لمبا چوڑا تذکرہ ہے حالانکہ وہ خود دوسروں کی نسبت غالباً کہیں زیادہ بہادر ہے۔ میں ہمیشہ کہتی تھی، ہمیشہ کہتی تھی، جب وہ اتنا سا تھا، میں ہمیشہ کہتی تھی..."

گھر کے تمام افراد ایک ہفتے سے زیادہ نکولشکا کے نام خطوط لکھنے میں مصروف رہے۔ انھوں نے ابتدائی مسودے تیار کیے، ان پر بار بار نظر ثانی کی اور پھر انھیں خوش خط تحریر کیا۔ نو کمشن یافتہ افسر کی وردیاں بنانے اور اس کی دوسری ضروریات فراہم کرنے کے لے جو روپیہ پیسہ اور دیگر اشیا درکار تھیں، کاؤنٹس کی زیر نگرانی اور کاؤنٹ کی بھاگ دوڑ کے بعد جمع کی گئیں۔ آننا میخائیلوونا عملی عورت تھی۔ وہ فوجی حکام سے اپنے اور اپنے بیٹے کے لیے خاصی مراعات حاصل کرنے میں کامیاب رہی تھی۔ ان مراعات میں اپنے بیٹے کے ساتھ مراسلت کی سہولت بھی شامل تھی۔ اسے گارڈز کے کمانڈر گرینڈ ڈیوک کانستانتن پاولووچ کے نام خطوط ارسال کرنے کے مواقع میسر تھے۔ رستوفوں نے فرض کرلیا کہ خطوط پر اتنا پتا: روسی گارڈز مقیم دساور: ہی کافی ہے۔ اگر گارڈز کے کمانڈر گرینڈ ڈیوک کو خط مل سکتا ہے، پھر کوئی وجہ نہیں کہ یہ پاولوگرات رجمنٹ تک، جو غالباً کہیں اڑوس پڑوس میں ہی مقیم ہوگی، نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ یہ فیصلہ کرلیا گیا کہ خطوط اور رقوم ڈیوک کے ایلچی کی وساطت سے بورس تک پہنچا دی جائیں اور بورس انھیں نکولشکا تک پہنچانے کا بندوبست کردے گا۔ کاؤنٹ نے اپنے بیٹے کے نام جو سامان بھیجا، اس میں کاؤنٹ، کاؤنٹس، پیتیا، ویرا، نتاشا اور سونیا کے خطوط اور اس کی وردی اور دیگر ضروریات کے لیے چھ ہزار روبل کی رقوم شامل تھیں۔

7

کوتوزوف کے جنگجو دستے، جو اول موتس کے قرب و جوار میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے، بارہ نومبر کو روسی اور آسٹروی دونوں امپراطوروں کو سلامی دینے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ گارڈز تازہ تازہ روس سے وارد ہوئے تھے۔ انھوں نے رات اول موتس سے دس میل دور گزاری۔ انھیں سلامی کے لیے صبح دس بجے سیدھا اول موتس کے میدان میں پہنچنا تھا۔

اس روز نکولائی رستوف کو بورس کا رقعہ ملا۔ اس میں اس نے اسے اطلاع دی تھی: "اسماعیلوف[17] رجمنٹ اول موتس سے دس میل ادھر مقیم ہے۔ میں تم سے ملنا چاہتا ہوں کہ کیونکہ میں تمھیں ایک خط اور کچھ رقم پہنچانا چاہتا ہوں" اب جب کہ اپنی مہم کے بعد فوجی دستے اول موتس کے نزدیک قیام پذیر تھے، رستوف کو روپے پیسے کی خاص طور پر

ضرورت محسوس ہورہی تھی کیونکہ ان کے کیمپ میں عارضی دکانوں کی، جو ہر قسم کے مال واسباب سے اٹی پڑی تھیں، بھرمار ہوگئی تھی اور آسٹروی یہودی فروخت کے لیے ایسی ایسی اشیا، جنھیں خرید نے کو ہر شخص کا جی للچاتا تھا، پیش کررہے تھے۔ مہم کے دوران میں پاولوگرات ہوزاروں کو جو تمغے اور ایوارڈ ملے تھے، ان کا جشن منانے کے لیے یکے بعد دیگرے دعوتیں منعقد ہورہی تھیں۔ پھر لوگ تفریح منانے جوق در جوق اول موٹس کے چکر کاٹ رہے تھے۔ وہاں ایک ہنگروی خاتون کیرولین نے ایک ریستوران، جس میں بیروں کی خدمات لڑکیاں سرانجام دیتی تھیں، کھولا تھا۔ رستوف کی کیڈٹ سے لیفٹیننٹ کی جو ترقی ہوئی تھی، اس کا اس نے پچھلے دنوں جشن منایا تھا۔ اس نے دینی سوف کا گھوڑا بدؤ بھی خرید لیا تھا اور یوں وہ ہماشاسب کا مقروض ہوگیا تھا۔ بورس کا رقعہ ملنے کے بعد اس نے گھوڑا پکڑا اور اپنے ایک ساتھی افسر کی معیت میں اول موٹس پہنچ گیا۔ وہاں انھوں نے کھانا کھایا اور ایک بوتل مے انگور پی۔ اس کے بعد وہ اپنے بچپن کے دوست کی تلاش میں اکیلا ہی گارڈز کے کیمپ کی طرف چل پڑے۔

رستوف کو ابھی تک وردی خریدنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس نے کیڈٹوں کا وہی پرانا سرانا کوٹ، جس پر عام سپاہیوں کی صلیب کشیدہ تھی، پہن رکھا تھا۔ اس کی برجس کی حالت خاصی خستہ تھی۔ اس کی چرمی پشت گھس چکی تھی۔ وہ اپنا افسرانہ خنجر اس پھندنے دار ڈوری کے ساتھ، جو شمشیر باندھنے کے کام آتی تھی، باندھے ہوئے تھے۔ وہ جس روسی گھوڑے پر سوار تھا، وہ اس نے مہم کے دوران میں ایک قازق سے خریدا تھا۔ اس نے ہوزاروں کی ٹوپی، جو ٹیڑھی میڑھی ہوچکی تھی، بانکپن سے سر کے ایک جانب ٹکائی ہوئی تھی۔ جب وہ اسماعیلوف رجمنٹ کی طرف جا رہا تھا، اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ بورس اور اس کے ساتھی اس کے حلیے کے ــــ وہ شکل صورت سے بالکل جنگجو ہوزار، جو میدان جنگ میں فائرنگ کا سامنا کرچکا ہو، معلوم ہوتا تھا ــــ بارے میں کیا رائے قائم کریں گے۔

اپنے کوچ کے تمام عرصے کے دوران میں گارڈز اپنی صفائی ستھرائی اور ضبط ونظم کی جس طرح نمائش کرتے چلے آئے تھے، اس سے یہ تاثر ملتا تھا کہ وہ کسی تفریحی دورے پر نکلے ہوئے ہیں۔ انھوں نے سفر چھوٹی چھوٹی منزلیں طے کرتے آرام اور سہولت سے طے کیا تھا۔ ان کے تھیلے سامان کے چھکڑوں پر لدے تھے اور راستے میں انھوں نے جہاں بھی قیام کیا، آسٹروی حکام نے ان کے افسروں کی مرغن کھانوں سے تواضع کی۔ رجمنٹیں بینڈ بجاتے شہر میں داخل ہوتیں اور بینڈ بجاتے رخصت ہوتیں اور گرینڈ ڈیوک کے حکم پر جوانوں نے سارا سفر قدم سے قدم ملا کر طے کیا (اس نکتے پر گارڈز بہت دوں کی لیتے تھے)۔ افسران پیدل تھے اور سب اپنی اپنی جگہیں سنبھالے رہے۔

پورے سفر کے دوران میں بورس برگ کی، جو مہم کے دوران میں کیپٹن بن چکا تھا اور اب کمپنی کمانڈر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، معیت میں رہا اور اسی کے ساتھ قیام کرتا رہا۔ برگ اپنا ہر کام نہایت پھرتی اور مستعدی سے کرتا تھا اور پابندئ وقت کا خاص خیال رکھتا تھا۔ یوں وہ اپنے سینئر افسروں کا اعتماد حاصل کرنے اور اپنے مالی امور نہایت سودمندانہ بنیادوں پر استوار کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ بورس نے اسی عرصے کے دوران میں متعدد ایسے اشخاص کے ساتھ، جو بوقت ضرورت اس کے کام آسکتے تھے، روابط بڑھا لیے تھے اور ایک سفارشی خط کے، جو اس

نے پیئر سے حاصل کیا تھا، حوالے سے اس نے پرنس آندرے بلکونسکی تک رسائی حاصل کر لی۔ اسے امید تھی کہ وہ اس کی وساطت سے کمانڈر انچیف کے سٹاف میں شامل ہو سکے گا۔

برگ اور بورس دونوں نئی، بے داغ اور بے عیب وردیوں میں ملبوس تھے۔ گزشتہ روز کے کوچ کے بعد انھیں جو تھکاوٹ محسوس ہوئی تھی، آرام کے بعد وہ بھی دور ہو گئی تھی اور اب صاف ستھرے مکان میں، جو انھیں الاٹ ہوا تھا، بیٹھے شطرنج کی بازی لگا رہے تھے۔ برگ نے خاصا بڑا اسموکنگ پائپ اپنے گھٹنوں کے بیچ گھسیڑ رکھا تھا۔ بورس اپنی مخصوص درستی اور مہارت کو بروئے کار لا کر اپنی نرم و نازک سفید انگلیوں کے ساتھ مہروں کا اہرام تعمیر کر رہا تھا اور اس انتظار میں کہ اس کا ساتھی کب چال چلتا ہے، اس کے چہرے کی جانب دیکھ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ صرف اپنے کھیل کے بارے میں سوچ رہا ہے کیونکہ یہ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنی توجہ ہمیشہ صرف اس کام پر، جو وہ کر رہا ہوتا، مرکوز رکھتا تھا۔

''اچھا، اب کیسے بچو گے؟'' اس نے پوچھا۔

''کوشش کریں گے،'' برگ نے ایک پیادے کو چھیڑتے اور جھٹ پٹ اپنا ہاتھ پیچھے کھینچتے ہوئے کہا۔ اسی لمحے دروازہ کھلا۔

''اخاہ، یہ رہا وہ!'' رستوف نے نعرہ مارا۔ ''اور برگ بھی! ارے واہ، "petisfan, allay cushay dormir"، اس نے اپنی نرس کا غلط سلط فرانسیسی میں جملہ، جس پر وہ اور بورس خوب ہنسا کرتے تھے، دہراتے ہوئے کہا۔

''واللہ تم تو بالکل بدل گئے ہو!'' بورس نے رستوف کا استقبال کرتے ہوئے کہا لیکن اٹھنے کے دوران میں وہ ان چند مہروں کو، جو ذرا ادھر ادھر ہو گئے تھے، ٹھیک کرنا نہ بھولا۔

وہ اپنے دوست سے معانقہ کرنا چاہتا تھا لیکن نکولائی پیچھے ہٹ گیا۔ شباب کی ایک خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ پٹے پٹائے راستوں پر چلنے سے خائف رہتا ہے، تقلید سے روگردانی کرنا چاہتا ہے، اپنے احساسات کا اظہار نئے اور انوکھے انداز سے کرنے پر مچلتا ہے، بزرگوں نے جو روایتی اسالیب اپنائے ہوتے ہیں، ان سے گریز کرتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک ان کی اساس منافقت پر ہوتی ہے۔ چنانچہ نکولائی بھی اپنے دوست سے ملاقات کے موقع پر کوئی ایسی حرکت، جو کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو، کرنا چاہتا تھا: وہ بورس کے چٹکی لے سکتا تھا، اسے دھکا دے سکتا تھا لیکن روایتی بوسہ بازی کا روادار نہیں ہو سکتا تھا، اس کا کیا تھا یہ تو ہر کوئی کرتا پھرتا تھا۔ اس کے برعکس بورس اس سے پرسکون اور دوستانہ انداز سے بغل گیر ہوا اور اس نے تین مرتبہ اس کے بوسے لیے۔

دونوں کو ملے تقریباً تین ماہ ہو چکے تھے۔ وہ عمر کے اس دور میں سے گزر رہے تھے جب نوجوان عملی زندگی میں پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ ان کی جب ملاقات ہوتی ہے، انھیں ایک دوسرے میں زبردست تبدیلیاں نظر آتی ہیں۔ درحقیقت یہ تبدیلیاں ان حالات و اشخاص کی، جن کے مابین انھوں نے یہ اولیں قدم اٹھایا ہوتا ہے، عکاس ہوتی ہیں۔ چنانچہ اپنی گزشتہ

ملاقات کے بعد وہ خاصے تبدیل ہو چکے تھے اور دونوں اپنی ان تبدیلیوں کی نمائش کرنے کے لیے بہت بیتاب تھے۔

''ارے خدا کی پھٹکار تم لوگوں پر، بڑے بانکے، چھیل چھبیلے بنے پھرتے ہو! اتنے نئے نئے اور دھلے دھلائے، معلوم ہوتا ہے کہ ابھی ابھی ضیافت سے واپس آئے ہو! — نہ کہ ہم برگشتہ نصیبوں کی طرح محاذ جنگ سے!'' رستوف نے عسکری اکڑفوں سے اپنی گرد آلود برجس کی طرف اشارہ کرتے اور خاصے تیکھے لہجے سے بات کرتے ہوئے کہا۔ اس کا یہ انداز گفتگو بورس کے لیے بالکل نیا تھا۔

رستوف کی چیختی چنگھاڑتی آواز سن کر جرمن مالکہ مکان نے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا۔

''اچھی ہے، کیا خیال ہے؟'' رستوف نے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

''تم اتنا چلا کیوں رہے ہو؟ تم ان کی روح فنا کر دو گے،'' بورس نے کہا۔ ''مجھے امید نہیں تھی کہ تم آج آؤ گے،'' اس نے مزید کہا۔ ''میں نے تمھیں کوتوزوف کے ایک ایجوٹنٹ — بلکونسکی، جو اتفاق سے میرا دوست ہے — کے ذریعے رقعہ بھیجا تھا۔ میں نے یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اتنی جلدی تمھیں پہنچا دے گا... خیر تمھارا حال کیا ہے؟ فائرنگ بھی بھگت چکے؟''

جواب دیے بغیر رستوف نے اپنے بازو کی طرف، جس پر پٹی بندھی ہوئی تھی، اشارہ کیا، سینٹ جارج کراس (تمغہ)، جو عسکری انداز سے ایک دھاگے سے اس کی وردی کے ساتھ لٹک رہا تھا، ذرا آگے پیچھے کھینچا اور پھر مسکرا کر برگ پر نگاہ ڈالی۔

''دیکھ لو،'' اس نے کہا۔

''ہاں، بالکل،... ہاں، ہاں!'' برگ نے خندہ لبی سے کہا۔ ''ہمارا کوچ بھی بہت پر شکوہ تھا۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہز امپیریل ہائی نس نے بیشتر سفر ہماری رجمنٹ کے دوش بدوش کیا۔ چنانچہ ہم ہر قسم کی سہولت اور آرام سے بہرہ یاب ہوئے۔ پولینڈ میں ہمارے اعزاز میں جو جو تقریبات، ڈنر اور ناچ کی محافل منعقد ہوئیں، میں ان کی تفصیل بتانے سے قاصر ہوں، بلکہ انھیں صحیح انداز میں بیان کرنا اس ہیچ مدان کے بس کی بات ہی نہیں! زار یوچ[18] ہم تمام افسروں کے ساتھ نہایت شفقت سے پیش آتے رہے۔''

اور دونوں دوست ایک دوسرے کو اپنے اپنے کارناموں کی تفصیل سناتے رہے۔ ایک نے ہوزاروں کی رنگ رلیوں اور محاذ جنگ پر ان کی زندگی کے بارے میں بتایا اور دوسرے نے اعلیٰ ترین شخصیات کی کمان میں خدمات سرانجام دینے کے فوائد اور سہولتیں گنوائیں، وغیرہ وغیرہ۔

''ارے، تم گارڈز!'' رستوف نے کہا۔ ''خیر، چھوڑو، آؤ دخترِ رز سے ذرا شغل ہو جائے۔''

بورس نے برا سا منہ بنایا۔ ''اگر واقعی تمھاری یہی خواہش ہے۔'' وہ اپنے پلنگ کی طرف گیا۔ صاف ستھرے تکیوں کے نیچے سے اپنا پرس نکالا اور انگوری شراب منگوانے کے لیے آدمی بھیج دیا۔ ''اور میرے پاس تمھاری جو رقم اور خط ہے، وہ میں تمھیں دیے دیتا ہوں۔''

رستوف نے روپیہ صوفے پر اچھال دیا، خط پکڑا، اپنی دونوں بانہیں میز پر ٹکائیں اور اسے پڑھنے بیٹھ گیا۔ کئی سطور پڑھنے کے بعد اس نے خونخوار نگاہوں سے برگ کی جانب دیکھا۔ جب دونوں کی نظریں چار ہوئیں، اس نے اپنا چہرہ خط کے پیچھے چھپالیا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تمھیں خاصی بڑی رقم بھیجی ہے،'' برگ نے وزنی پرس کی طرف جس کے بوجھ سے صوفے پر ہلکا سا گڑھا نمودار ہوگیا تھا، دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ایک ہم ہیں کہ تنخواہ سے دال دلیا چلانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ کاؤنٹ، جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، میں تمھیں بتا سکتا ہوں کہ—''

''دیکھو، دوست،'' رستوف نے برگ سے کہا۔ ''جب گھر سے تمھیں کوئی خط موصول ہوگا اور اپنے کسی عزیز سے، جس سے تم بہت کچھ پوچھنا چاہو گے، تمھاری ملاقات ہوگی، اگر میں وہاں موجود ہوا، میں بلا تاخیر وہاں سے کھسک جاؤں گا اور تمھارے پھڈے میں ٹانگ نہیں اڑاؤں گا! اب ذرا مہربانی فرماؤ اور سیدھے سادے یہاں سے تشریف لے جاؤ۔ جاؤ، چلے جاؤ، کہیں بھی چلے جاؤ— خواہ جہنم میں جاؤ لیکن چلے جاؤ!'' اس نے حلق کا پورا زور لگا کر کہا۔ پھر اس نے معاً اس کا کندھا پکڑا، خوش خلقی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے زبانی کلامی جس بدتمیزی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ ''یار، ناراض نہ ہونا،'' اس نے مزید کہا۔ ''تمھارے جیسے پرانے دوست کے ساتھ میں لگی لپٹی رکھے بغیر بات کرتا ہوں۔''

''چھوڑو کاؤنٹ۔ میں تمھاری بات سمجھ گیا ہوں،'' برگ نے اٹھتے اور گھٹی گھٹی آواز حلق سے نکالتے ہوئے کہا۔

''یوں کیوں نہیں کرتے کہ اپنے میزبانوں کے ہاں چلے جاؤ۔ انھوں نے تمھیں دعوت تو دی تھی،'' بورس نے تجویز پیش کی۔

برگ نے اپنا بہترین اور انتہائی صاف ستھرا کوٹ، جس پر کوئی دھبا یا گرد کا معمولی سا ذرہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا، پہنا، آئینے کے سامنے کھڑا ہوا اور کنپٹیوں پر اپنے بال، جو اس نے الیکساندر پاولووچ کے انداز میں ترشوائے اور بنوائے تھے، درست کیے۔ اور جب اسے رستوف کے چہرے مہرے کو دیکھ کر یقین ہوگیا کہ اس کا کوٹ دیکھ لیا گیا ہے، وہ خوش خلقی سے مسکرایا اور باہر نکل گیا۔

''میں بھی نرا درندہ ہوں، واقعی!'' رستوف خط پڑھتے پڑھتے بڑبڑایا۔

''کیوں؟''

''میں بالکل سؤر ہوں۔ پہلے تو گھر والوں کو خط تک نہ لکھا اور جب لکھا، ان کے اوسان خطا کرا دیے،'' اس نے اپنی بات دہرائی اور اس کا چہرہ اور کان سرخ ہو گئے۔ ''خیر، چھوڑو۔ تم نے گاوریلا کو شراب لانے بھیجا تھا۔ بہت خوب، پھر ہو جائے کچھ شغل؟''

گھر والوں نے اسے جو خطوط بھیجے تھے، ان میں ایک سفارشی رقعہ باگ راتیاں کے نام تھا۔ معمر کاؤنٹس نے یہ خط آننا میخائیلوونا کے مشورے پر اپنے ملنے ملانے والوں کی وساطت سے حاصل کیا تھا اور اپنے بیٹے کو بھیج

دیا تھا۔ اس نے اپنے لختِ جگر کو تلقین کی تھی کہ وہ یہ خط مکتوب الیہ کو لازماً پہنچادے اور اس سے فائدہ اٹھائے۔

"بالکل فضول چیز ہے! مجھے اس سے کیا لینا ہے؟" رستوف نے خط میز کے نیچے پھینکتے ہوئے کہا۔

"یہ تم نے پھینک کیوں دیا ہے؟" بورس نے پوچھا۔

"سفارشی قسم کا رقعہ ہے۔ جہنم میں جائے، مجھے اس سے کیا لینا ہے؟"

"جہنم میں کیوں جائے؟" بورس نے خط اٹھاتے اور اس پر درج پتا پڑھتے ہوئے کہا۔ "یہ خط تمھارے بہت کام آسکتا ہے۔"

"مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے اور نہ میں کسی کا ایجوٹنٹ بننا چاہتا ہوں۔"

"کیوں نہیں؟" بورس نے پوچھا۔

"یہ چمچہ گیروں کی نوکری ہے!"

"سمجھ گیا۔ تم ابھی تک خوابوں کی دنیا میں رہتے ہو،" بورس نے اپنی گردن جھٹکاتے ہوئے کہا۔

"اور تم نے ابھی تک موقع شناسی نہیں چھوڑی۔ خیر، چھوڑو ان باتوں کو، ان کی یہاں کوئی تک نہیں ہے... اب بتاؤ، تمھارا حال کیا ہے؟" رستوف نے پوچھا۔

"تمھارے سامنے ہی ہے۔ اب تک تو ہر چیز ٹھیک ٹھاک ہے۔ لیکن میں ایک بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میں محاذ پر نہیں رہنا چاہتا، میرا دل چاہتا ہے کہ میں جھٹ پٹ ایجوٹنٹ بن جاؤں۔"

"کیوں؟"

"وہ اس لیے جب ایک دفعہ آپ نے فوجی پیشہ اختیار کرلیا، پھر آپ کو چاہیے کہ اس میں زیادہ سے زیادہ ترقی کے مواقع تلاش کریں۔"

"ہونہہ، تو یہ وجہ ہے..." رستوف نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔

اس نے نہایت توجہ اور استفہامیہ نگاہوں سے اپنے دوست کے چہرے کی طرف دیکھا۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی سوال کا جواب تلاش کرنے کی ناکام کوشش کررہا ہے۔

سن رسیدہ گاوریلا شراب لے آیا۔

"اب ہم الفانسے کارلووچ[19] کو نہ بلالیں؟" بورس نے پوچھا۔ "پینے پلانے میں وہ تمھارا ساتھ دے سکے گا، میں نہیں۔"

"ہاں، ہاں، بلالو۔ تمھاری اس جرمن[20] کے ساتھ کیسے نبھتی ہے؟" رستوف نے حقارت سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"وہ انتہائی نفیس، کھرا اور شگفتہ مزاج آدمی ہے،" بورس نے جواب دیا۔

رستوف نے ایک بار نہایت توجہ سے بورس کے چہرے کی طرف دیکھا اور آہ بھری۔ برگ واپس آگیا۔ مے نوشی کے دوران میں تینوں افسروں کے مابین گفتگو میں خاصی گرماگرمی آگئی۔ گارڈز کے افسروں نے رستوف

کو اپنے کُوچ کے بارے میں بتایا۔ سفر کے دوران میں ان کی روس، پولینڈ اور ممالک غیر میں جس طرح خاطر تواضع ہوئی تھی، انھوں نے اس کی تفصیلات کھول کر بیان کیں۔ انھوں نے اپنے کمانڈر کے فرمودات اور افعال پر روشنی ڈالی اور اس کی شفقت اور بدمزاجی کے قصے سنائے۔ جن امور سے برگ کا براہ راست تعلق نہ بنتا تھا، وہ حسب معمول ان کے بارے میں چپ سادھے رہا، تاہم جب گرینڈ ڈیوک کی آتش مزاجی کا ذکر آیا، اس نے مزے لے کر بتایا کہ وہ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوا تھا۔ ''گالیشیا[21] میں قیام کے دوران میں ایک مرتبہ گرینڈ ڈیوک رجمنٹوں کا معائنہ فرما رہے تھے کہ انھیں کوئی بے قاعدگی نظر آ گئی۔ اس پر ان کا پارہ چڑھ گیا لیکن جب میرا ان سے سامنا ہوا، میں انھیں ٹھنڈا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔'' برگ شگفتہ مزاجی سے مسکرایا اور بتانے لگا: ''گرینڈ ڈیوک گھوڑے پر سوار میرے قریب پہنچے اور چلا کر بولے، 'آرنوت۔'[22] (یہ زار یوچ کی دل پسند دشنام تھی اور وہ اسے انتہائی غصے کے عالم میں استعمال کیا کرتا تھا۔) ''اور اس نے کمپنی کمانڈر یعنی مجھے بلا بھیجا۔

''کاؤنٹ، کیا تم یقین کرو گے کہ مجھے ذرا بھی خوف محسوس نہ ہوا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ میں راستی پر ہوں۔ کاؤنٹ، تم جانتے ہو کہ رجمنٹ کے احکام اور قواعد مجھے اسی طرح حفظ ہیں جس طرح دعائے ربانی۔ میں سیدھی سادی حقیقت بیان کر رہا ہوں، ڈون کی نہیں لے رہا۔ چنانچہ، کاؤنٹ، یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ میری کمپنی میں کبھی غفلت یا لاپروائی نہیں برتی گئی۔ میرا ضمیر صاف تھا۔ میں نے قدم آگے بڑھایا۔'' (برگ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور عملی طور پر بتانے لگا کہ وہ ڈیوک کے سامنے کس طرح پیش ہوا تھا۔ اس نے اپنی ٹوپی کے چھجے کو جس انداز سے چھوا، اس کے بعد یہ تصور کرنا قطعی ناممکن تھا کہ کوئی اور شخص اس سے بڑھ کر بھی مؤدب اور مطمئن ہو سکتا ہے یا نہیں۔) ''خیر وہ ابل پڑے۔ وہ مجھے برا بھلا کہے جا رہے تھے، لعن طعن کیے جا رہے تھے، جھاڑ پلائے جا رہے تھے۔ کبھی وہ مجھے، آرنوت، کہتے، کبھی 'ملعون' اور کبھی سائبیریا بھیجنے کی دھمکی دیتے۔ میرے لیے یہ اتنا زندگی کا مسئلہ نہیں رہا تھا جتنا کہ موت کا بن چکا تھا،'' برگ نے زیرکی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں جانتا تھا کہ میں راستی پر ہوں چنانچہ میں منہ میں گھنگھنیاں ڈالے کھڑا رہا۔ کاؤنٹ، یہ بہترین ترکیب نہ تھی؟... 'کیا بات ہے، تم گونگے ہو، بہرے ہو؟' انھوں نے چلا کر کہا۔ میں پھر بھی خاموش رہا۔ اگلے روز جو ہدایات موصول ہوئیں، ان میں اس واقعے کا ذکر تک نہیں تھا۔ اگر آدمی اپنے اوسان بحال رکھے، تو اس کا یہ فائدہ ہوتا ہے! واقعی، کاؤنٹ، میں صحیح عرض کر رہا ہوں،'' برگ نے اپنے پائپ کا کش لیتے اور دھوئیں کے مرغولے بناتے ہوئے کہا۔

''ہاں، تمھارا رویہ قابل تعریف تھا!'' رستوف نے کہا۔

لیکن بورس بھانپ گیا کہ رستوف برگ کی بھد اڑانا چاہتا ہے، چنانچہ اس نے نہایت چابک دستی سے موضوع تبدیل کر دیا۔ اس نے رستوف سے کہا: ''یہ بتاؤ کہ تمھیں یہ زخم کہاں اور کیسے آیا؟'' اس پر رستوف خوش ہو گیا اور وہ انھیں تفصیلات بتانے لگا۔ جوں جوں وہ اس بارے میں گفتگو کرتا گیا، توں توں اس کا جوش و خروش بڑھتا گیا۔ اس نے شون گرابرن کی جھڑپ بالکل ان لوگوں کے، جنھوں نے کسی جنگ میں شرکت کی ہوتی ہے، انداز میں

بیان کی۔ یہ لوگ عام طور پر واقعات کو اس طرح بیان نہیں کرتے جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئے ہوتے ہیں بلکہ وہ انھیں اس طرح پیش کرتے ہیں جس طرح انھوں نے دوسرے لوگوں کو ان کا ذکر کرتے سنا ہوتا ہے۔ یوں وہ ان واقعات کو کہیں زیادہ پرشکوہ بنا دیتے ہیں اور وہ وہ نہیں رہتے جو حقیقتاً وقوع پذیر ہوئے ہوتے ہیں۔ رستوف راست باز نوجوان تھا اور وہ کسی صورت میں بھی دیدہ دانستہ جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ اس نے گفتگو کا انداز اس ارادے سے کیا تھا کہ وہ بالکل وہی کچھ، جو درحقیقت پیش آیا تھا، بیان کرے گا۔ لیکن وہ نامحسوس، غیر شعوری اور ناگزیر طور پر دروغ گوئی کا شکار ہو گیا۔ اس کی طرح اس کے سامعین نے گھڑسوار دستے کے حملے کے متعلق بے شمار داستانیں سنی تھیں اور حملہ اصل میں کیا تھا، اس کے بارے میں اپنے ذہن میں ایک واضح تصور باندھ لیا تھا۔ وہ بھی اس وقت اسی قسم کی کہانی سننے کی توقع کر رہے تھے۔ اگر وہ انھیں صحیح صورت حال سے آگاہ کرتا، انھیں یقین ہی نہ آتا اور اس سے بھی بدتر بات یہ ہوتی کہ وہ یہ سمجھنے لگتے کہ خود رستوف غلط بیانی کر رہا ہے کیونکہ رستوف کے ساتھ وہ کچھ پیش نہیں آیا تھا جو عام طور پر ان لوگوں کے ساتھ، جو گھڑسوار دستوں کے حملوں میں حصہ لیتے ہیں، پیش آیا ہوتا ہے۔ وہ انھیں یہ سیدھی سادی بات نہ بتا سکا کہ وہ خاصی تیز رفتاری سے گھوڑوں پر روانہ ہوئے تھے لیکن وہ خود گھوڑے سے گر پڑا تھا، اس کے بازو میں موچ آگئی تھی، ایک فرانسیسی سے بچنے کے لیے وہ سر پر پاؤں رکھ کے بھاگا تھا اور جنگل میں جا چھپا تھا۔ علاوہ ازیں اگر وہ ہر بات بالکل اسی طرح بیان کرتا جس طرح وہ وقوع پذیر ہوئی تھی، اسے اچھے خاصے ضبطِ نفس سے کام لینا پڑتا۔ سچ بولنا بڑا مشکل کام ہے اور نوجوان شاذ و نادر ہی اس کے اہل ہوتے ہیں۔ اس کے سامعین یہ توقع کر رہے تھے کہ وہ انھیں یہ بتائے گا کہ وہ کس طرح جوش میں آ کر اپنے آپ کو فراموش کر بیٹھا، مثلِ طوفان دشمن کی صفوں پر جھپٹا، دائیں بائیں جو بھی اس کی لپیٹ میں آیا، اس نے اسے تہ تیغ کر دیا، کس طرح اس کی شمشیر نے خون کا ذائقہ چکھا اور پھر کس طرح وہ نڈھال ہو کر نیچے گر پڑا، وغیرہ وغیرہ۔ اور اس نے انھیں بتایا بھی یہی کچھ۔

کہانی کے دوران میں جب وہ یہ کہہ رہا تھا کہ "تم لوگ یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ حملے کے دوران میں انسان پر کس طرح کا جنون طاری ہو جاتا ہے،" پرنس آندرے بلکونسکی، جس کا بورس منتظر تھا، کمرے میں داخل ہوا۔ پرنس آندرے کو نوجوانوں کی سرپرستی کر کے لطف آتا تھا اور جب نوجوان اس کے اثر و رسوخ کے پیش نظر اس سے کوئی درخواست کرتے تھے، اس کی انا کو بہت تسکین پہنچتی تھی۔ بورس ایک روز قبل اس پر اچھا تاثر قائم کرنے میں کامیاب رہا تھا۔ چنانچہ اس نوجوان کے ساتھ اس کا رویہ ہمدردانہ ہو گیا تھا اور وہ اس کی درخواست کو قبولیت بخشنے میں خوشی محسوس کر رہا تھا۔ کوتوزوف نے اسے زاریوچ کو چند کاغذات پہنچانے کے لیے بھیجا تھا۔ اس نے سوچا کہ چلتے چلتے کہ وہ اس نوجوان سے بھی ملتا جائے۔ چنانچہ وہ اس امید میں کہ وہ اکیلا ہی ہوگا، اندر آگیا۔ جب اس نے لڑاکا ہوزار کو اپنے کارنامے سناتے دیکھا (پرنس آندرے اس قسم کے اشخاص برداشت نہیں کر سکتا تھا)، وہ بورس کی طرف دوستانہ انداز سے مسکرایا لیکن تھکے تھکے اور نڈھال انداز سے صوفے پر بیٹھنے سے قبل رستوف کو، جسے اس نے سر کی معمولی جنبش سے سلام کیا تھا، دیکھ کر اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ اس کی

طبیعت میں ملال آ گیا کیونکہ وہ ناپسندیدہ لوگوں کی صحبت میں پھنس گیا تھا۔ رستوف سمجھ گیا اور اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ تاہم اس نے کوئی پروانہ کی کیونکہ یہ آدمی اس کے نزدیک پرکاہ کے برابر بھی نہ تھا لیکن جب اس نے نگاہ اٹھا کر بورس کی طرف دیکھا، تو اسے یوں لگا جیسے وہ بھی جنگجو ہوزار کی وجہ سے شرمندہ ہو رہا ہے۔ اس امر کے باوجود کہ پرنس آندرے کا لہجہ ناخوشگوار اور طنزیہ تھا اور اس بات کے باوصف کہ رستوف اپنے نقطۂ نظر کے اعتبار سے ایک جنگجو افسر کی حیثیت سے ان چھوٹے موٹے سٹاف ایجوٹنٹوں کو، جن میں واضح طور پر یہ نووارد بھی شامل تھا، بنظرِ حقارت دیکھتا تھا، وہ (رستوف) جھینپ گیا، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

بورس نے پوچھا: ''سٹاف افسروں کو کوئی خبر ملی ہے؟ اگر آپ نامناسب نہ سمجھیں، تو یہ بھی فرما دیں کہ ہمارا آئندہ لائحہ عمل کیا ہوگا؟''

''ہم غالباً پیش قدمی کریں گے،'' بلکونسکی نے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اجنبیوں کی موجودگی میں وہ مزید کچھ کہنے سے ہچکچا رہا ہے۔

برگ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور بڑی لجاجت سے بولا: ''سنا ہے کہ کمپنی کمانڈروں کا گھوڑا الاؤنس دگنا کیا جا رہا ہے؟'' اس کے جواب میں پرنس نے مسکراتے ہوئے کہا: ''اتنے سنجیدہ سرکاری مسئلے پر میں اپنی رائے ظاہر کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔'' اس جواب پر برگ کو بہت لطف آیا اور وہ ہنس پڑا۔

''جہاں تک تمھارے مسئلے کا تعلق ہے،'' پرنس آندرے نے بورس کی طرف متوجہ ہو کر کہا، ''ہم اس کے بارے میں بعد میں بات کریں گے،'' اس نے اچٹتی سی نظر رستوف پر ڈالی اور مزید کہا: ''معائنے کے بعد میرے پاس آ جانا، مجھ سے جو ہو سکا، ضرور کروں گا۔''

اس نے سرسری نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر رستوف کی طرف متوجہ ہو گیا۔ رستوف کی بچگانہ کوفت، جس پر اس کے لیے قابو پانا مشکل ہو رہا تھا، اب برہمی میں تبدیل ہو گئی۔ پرنس آندرے نے اس پر دھیان دینا اپنی شان کے منافی سمجھا اور بولا:

''میرا خیال ہے کہ تم شون گرابرن کے معرکے کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ تم وہاں تھے؟''

''تھا،'' رستوف نے جھلا کر کہا جیسے وہ ایجوٹنٹ کی توہین کرنا چاہتا ہو۔

بلکونسکی ہوزار کی ذہنی کیفیت سے آگاہ تھا اور اس پر وہ کچھ محظوظ بھی ہوا تھا۔ وہ قدرے حقارت سے مسکرایا۔

''ہاں، اس جھڑپ کے بارے میں طرح طرح کی داستانیں سننے میں آ رہی ہیں،'' اس نے کہا۔

''داستانیں، جی ہاں!'' رستوف نے باآواز بلند چلا کر کہا۔ اس نے پہلے بورس کو اور پھر بلکونسکی کو ایسی نگاہوں سے دیکھا، جو اچانک شعلہ بار ہو گئی تھیں۔ ''جی ہاں، داستانیں بے شمار ہیں۔ لیکن ہماری داستانیں ان بہادروں کی، جو وہاں موجود تھے اور جنھوں نے دشمن کی فائرنگ کا سامنا کیا تھا، داستانیں ہیں! ہماری داستانوں میں کچھ وزن ہے۔ یہ داستانیں ان شستہ و نفیس لوگوں کی، جو سٹاف میں شامل ہیں، ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے

رہتے ہیں اور مفت میں تمغوں سے نوازے جاتے ہیں، داستانوں سے مختلف ہیں!''

''وہ طبقہ، جس کے بارے میں تمھارا خیال ہے، کہ میں بھی اس کا فرد ہوں؟'' پرنس آندرے نے بڑے تحمل سے پوچھا اور وہ یوں مسکرایا جیسے وہ بہت محظوظ ہو رہا ہو۔

اس شخص کے تحمل اور ضبطِ نفس کو دیکھ کر رستوف کے دل میں غصہ بھر گیا، جس میں عجیب وغریب انداز سے اس آدمی کے لیے احترام کا جذبہ شامل ہو گیا تھا۔

''میں آپ کی بات نہیں کر رہا،'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کو جانتا نہیں اور سچی بات یہ ہے کہ مجھے آپ کی پروا بھی نہیں۔ میں عمومی اعتبار سے سٹاف افسروں کی بات کر رہا تھا۔''

''اور میں تمھیں اتنا بتائے دیتا ہوں'' پرنس آندرے نے پرسکون تحکم سے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا، ''کہ تم میری توہین کرنے کے خواہش مند ہو۔ اگر تم میں عزتِ نفس اور خودداری کا فقدان ہے، پھر ایسا کرنا کوئی مشکل کام نہیں لیکن تم نے اس مقصد کے لیے جو مقام اور وقت منتخب کیا ہے، وہ بالکل نامناسب ہے۔ چند دنوں میں ہمیں عظیم اور کہیں سنجیدہ معرکہ آرائی میں شریک ہونا ہے اور اس کے علاوہ اگر بدقسمتی سے تمھیں میرا چہرہ مہرہ اچھا نہیں لگتا تو اس میں دروبتیسکوئے کا، جنھوں نے مجھے بتایا ہے کہ وہ تمھارے بہت پرانے دوست ہیں، قطعاً کوئی قصور نہیں۔ تاہم'' اس نے اٹھتے ہوئے کہا: ''تم میرا نام بھی جانتے ہو اور تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ میں کہاں مل سکتا ہوں۔ لیکن یاد رکھو،'' اس نے مزید کہا: ''میں نہیں سمجھتا کہ میری یا تمھاری کوئی توہین ہوئی ہے اور ایک ایسے شخص کی حیثیت سے جو عمر میں تم سے بڑا ہے، میں تمھیں یہ مشورہ دوں گا کہ اس قصے کو اب جانے دو... دروبتیسکوئے، میں جمعے کو معائنہ کے بعد تمھارا منتظر رہوں گا۔ خدا حافظ۔'' اس نے اپنی بات ختم کی، دونوں کو ذرا جھک کر سلام کیا اور باہر نکل گیا۔

پرنس آندرے جب جا چکا، تب کہیں رستوف کو وہ جواب سوجھا جو اس کے خیال کے مطابق اسے دینا چاہیے تھا۔ چونکہ یہ جواب وقت پر اس کے دماغ میں نہیں آیا تھا، اسے اور بھی غصہ آ گیا اور وہ جل بھن کر کباب ہو گیا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کا گھوڑا بلا تاخیر حاضر کیا جائے۔ اس نے سرد مہری سے بورس سے اجازت لی اور روانہ ہو گیا۔ تمام راستہ اسے یہ سوال پریشان کرتا رہا کہ اس معاملے پر مٹی ڈالی جائے یا کل ہیڈ کوارٹر جا کر اس گھمنڈی ایجوٹنٹ کو ڈوئیل لڑنے پر للکارا جائے۔ ایک موقع پر وہ مخاصمت سے اس مسرت کے، جو اسے اس خر دماغ، کمزور دل اور پست قامت شخص کو اس کے پستول کا سامنا کرتے وقت کپکپاتے دیکھ کر ہوگی، بارے میں سوچنے لگا، لیکن اگلے ہی لمحے جب اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ جن لوگوں کو جانتا ہے ان میں سے کسی کو بھی وہ دوست بنانا اتنا پسند نہیں کرے گا جتنا کہ اس قابلِ نفرت منحنی ایجوٹنٹ کو، اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

8

جس روز رستوف بورس سے مل کر آیا، اس سے اگلے دن تمام روسی اور آسٹروی دستوں کا معائنہ ہوا۔ ان میں وہ

دستے، جو تازہ تازہ روس سے آئے تھے اور وہ جو کوتوزوف کے ساتھ مختلف معرکہ آرائیوں میں شرکت کر چکے تھے، دونوں شامل تھے۔ دونوں امپراطوروں نے اسی ہزار افراد پر مشتمل مشترک سپاہ سے سلامی لی۔ روسی امپراطور کے ساتھ اس کا ولی عہد زار یوچ اور آسٹروی امپراطور کے ساتھ اس کا ولی عہد آرچ ڈیوک تھا۔

دھلی دھلائی اور صاف ستھری وردیوں میں ملبوس سپاہ علی الصبح میدان میں مجتمع ہوگئی تھی اور قلعے کے سامنے صف بندی کر رہی تھی۔ وقفے وقفے سے افسروں کے حکم پر ہزاروں ٹانگیں اور سنگینیں متحرک ہو جاتیں یا رک جاتیں، پرچم لہراتے مڑتیں، وقفوں کے دوران میں صف بندی کرتیں اور دوسری اقسام کی وردیوں میں ملبوس پیادہ فوج کی ایسی ہی صف بندیوں کے گرد چکر کاٹنے لگتیں۔ ان سے کچھ دور اسپ سواروں کے، جن کی زرق برق وردیوں میں کبودی، ارغوانی اور زمردی پٹیاں پیوست تھیں، دستے تھے اور ان کے آگے آگے مشکی، کمیت اور سرمئی گھوڑوں پر عمدہ وردیاں، جوان کے اجسام پر خوب پھب رہی تھیں، پہنے بینڈ باجے والے تھے۔ وقفے وقفے سے گھوڑوں کے سم باقاعدہ تال میل کے ساتھ زمین پر گرتے اور گھڑ سواروں کا ساز و سامان چھنچھنانے لگتا۔ اسپ سواروں اور پیادہ دستوں کے مابین توپ خانے کی لمبی قطار رینگتی جا رہی تھی۔ گجنالوں پر نیا نیا رنگ روغن کیا گیا تھا اور وہ خوب چمک رہی تھیں۔ ان گجنالوں کے فتیلوں سے مخصوص قسم کی بو آ رہی تھی۔ جن گاڑیوں پر وہ لدی ہوئی تھیں، وہ ان کے بوجھ تلے دبی جا رہی تھیں اور ڈھٹائی سے ڈھچک ڈھچک کرتی اپنی مقررہ پوزیشنوں کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

نہ صرف جرنیل، جو اپنے سکارفوں، تمغوں اور اعزازوں سمیت اپنی مکمل وردیوں میں ملبوس تھے، جنھوں نے اپنی دبلی پتلی یا موٹی کمریں حد الامکان حد تک اندر کو بھینچ رکھی تھی اور جن کی گردنیں تنگ کالروں میں پچکی ہوئی تھیں، افسر جو بن ٹھن کر اور خوشبوئیں لگا کر آئے تھے، بلکہ عام سپاہی، جو پوری طرح تیار ہو کر آئے تھے، جن میں سے ہر ایک نے ہاتھ منہ دھویا اور سلیقے سے شیو بنائی تھی، اور اپنے ہتھیاروں اور دوسرے سامان کو صاف کیا اور چمکایا تھا، اور گھوڑے بھی، جن کے اجسام کھریروں سے رگڑ رگڑ کر اتنے صاف کیے گئے تھے کہ وہ ساٹن کی طرح جھلملانے لگے تھے اور جن کی ایالیں شکنیں دور کرنے کے لیے پانی میں بھگوئی گئی تھیں، ــ سبھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے، نہایت اہم، سنجیدہ اور پر وقار ہے، اس لیے اس کے بارے میں کسی قسم کا تساہل یا لاپروائی نہیں برتنا چاہیے۔ ہر جرنیل اور سپاہی کو اپنی بے وقعتی کا احساس تھا اور وہ اس بات سے آگاہ تھا کہ انسانوں کے اس سمندر میں اس کی حیثیت ریت کے ذرے سے زیادہ نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے اپنی قوت کا شعور بھی تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ عظیم کُل کا جزو ہے۔

چہل پہل اور محنت مشقت نور کے تڑکے ہی سے شروع ہوگئی تھی۔ دس بجے تک ہر چیز مقررہ ترتیب کے مطابق آراستہ کی جا چکی تھی اور فوجی دستے وسیع و عریض میدان میں اپنی اپنی صفیں بنا چکے تھے۔ ساری فوج تین طبقوں میں صف آرا کی گئی تھی۔ سب سے آگے گھڑ سوار دستے تھے، ان کے عقب میں توپ خانہ اور سب سے آخر میں پیادہ سپاہ تھی۔ فوج کی مختلف شاخوں ــ کوتوزوف کے لڑاکا دستے (جن کی دائیں جانب سب سے اگلی صف

میں پاولوگرات ہوزار کھڑے تھے)، گارڈز، وہ جنگجو رجمنٹیں جو ابھی ابھی روس سے آئی تھیں اور آسٹروی سپاہ۔کے مابین کشادہ سڑک برابر فاصلہ رکھا گیا تھا لیکن وہ سب کی سب ایک جیسی ترتیب بنائے اپنی اپنی صفوں میں اپنے اپنے کمانڈر کے ساتھ کھڑی تھیں۔

جس طرح ہوا پتوں میں سرسراتی گزر جاتی ہے، اسی طرح ایک سے دوسری اور دوسری سے تیسری صف تک کانا پھوسیوں کے ذریعے یہ اطلاع پہنچنے لگی کہ ''وہ آرہے ہیں! وہ آرہے ہیں!'' خوف وہراس کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور دستے آخری تیاریوں میں مصروف ہو گئے۔ اگرچہ اس روز ہوا بند تھی لیکن عین اسی لمحے ان کے سروں کے اوپر ہلکی ہلکی بادنسیم سر اٹھانے لگی۔ نیزوں پر پھریرے پھڑ پھڑانے لگے اور بلند پرچم اپنے بانسوں کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس ہلکی پھلکی جنبش کے ساتھ فوج فی نفسہٖ امپراطوروں کی آمد پر اپنی خوشی کا اظہار کر رہی ہے۔ واحد آواز ''اٹینشن'' سنائی دی۔ پھر جس طرح بوقتِ طلوعِ آفتاب یکے بعد دیگرے مرغوں کی ککڑوں کوں کی صدائیں کانوں سے ٹکراتی ہیں، بعینہٖ یہ آواز بھی مختلف مقامات پر دہرائی گئی اور اس کے بعد کامل سکوت طاری ہو گیا۔

مرگ آسا خاموشی کے دوران میں صرف گھوڑوں کے سموں کے زمین سے ٹکرانے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ گھوڑے امپراطوروں اور ان کے سٹاف افسروں کے تھے۔ جونہی دونوں امپراطور بازو کی جانب بڑھے، اسپ سوار فوج کی فرسٹ رجمنٹ کے بگلچیوں نے عمومی کوچ کا ترانہ چھیڑ دیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نہ صرف بگلچیوں بلکہ بحیثیت مجموعی ساری فوج نے امپراطوروں کی آمد پر خوشی سے سرشار ہو کر فی البدیہہ یہ آوازیں اٹھانا شروع کر دی ہیں۔ موسیقی کی تانوں میں صرف امپراطور الیکساندر کی پرشباب اور فرحت بخش آواز سنی جاسکتی تھی۔ جونہی اس کے لبوں سے ''خوش آمدید'' کے الفاظ ادا ہوئے، فرسٹ رجمنٹ کے جوان ''ہرّا'' ("hurraah!") کے فلک شگاف نعرے بلند کرنے لگے۔ ان کے نعروں کی آواز اتنی بلند، طویل اور فرحت آثار تھی کہ خود جوانوں پر اس ہجوم کی، جس کا وہ حصہ تھے، تعداد اور قوت کا اتنا رعب پڑا کہ وہ ہیبت زدہ رہ گئے۔

رستوف کو توزوف کی فوج کی، جس کی طرف زار سب سے پہلے آیا، سب سے اگلی صفوں میں کھڑا تھا۔ زار کی آمد پر اس نے وہی کچھ محسوس کیا جو فوج کے باقی تمام افراد محسوس کر رہے تھے۔۔یہ احساس تھا خود فراموشی کا، طاقت کے پرفخر شعور کا اور اس شخص کے ساتھ، جس کے اعزاز میں یہ پروقار تقریب منعقد ہو رہی تھی، پرجوش جاں نثاری کا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس آدمی کے ابرو کے ایک اشارے پر یہ زبردست ہجوم (جس میں وہ بے وقعت ذرہ بھی، جو کہ وہ خود تھا، شامل تھا) آگ میں کود جائے گا، پانی میں چھلانگ لگا دے گا، جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہو جائے گا، موت کو گلے لگا لے گا یا جرأت و دلیری کے عظیم ترین کارنامے سرانجام دینے پر تیار ہو جائے گا۔ اور جب اسے محسوس ہوا کہ یہ اشارہ ان کے سروں پر منڈلا رہا ہے، اسے جھرجھری آ گئی، اس کا جسم تھرتھرانے لگا اور اس کے دل کی حرکت رک گئی۔

عمومی کوچ کی دھنوں کی معیت میں مختلف رجمنٹیں یکے بعد دیگرے امپراطور کو خوش آمدید کہہ رہی تھیں۔ جونہی وہ کسی رجمنٹ کے قریب پہنچتا، چاروں اطراف سے فضا "ہرّا، ہرّا، ہرّا" کے نعروں سے گونج اٹھتی۔ اس کے بعد عوامی کوچ کی دھن بجتی اور ایک بار پھر "ہرّا، ہرّا" کے فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگتے۔ یہ آوازیں لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلندتر ہوتی جا رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے شور وغل سے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ امپراطور کی آمد تک ہر رجمنٹ پتھر کے بت کی طرح ساکت وصامت کھڑی رہتی لیکن جونہی وہ اس کے برابر آتا، اس بت میں جان پڑ جاتی اور وہ جن رجمنٹوں کا معائنہ کر کے آیا ہوتا، ان کی آوازوں کے ساتھ آواز ملا کر نعرہ بلند کرنے لگتا۔ ان آوازوں کے مہیب اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے شور وغل اور پتھروں کی طرح چپ چاپ کھڑے فوجی دستوں کے مابین سینکڑوں سٹاف افسر خراماں خراماں لیکن تال میل کے ساتھ گھوڑوں پر سوار چلے آ رہے تھے اور ان کے آگے آگے دو اشخاص — دونوں امپراطور — تھے اور یہی وہ اشخاص تھے جن پر تمام سپاہ کی بھرپور، غیر منقسم اور پرجوش توجہ مرکوز تھی۔

طرح دار نوجوان امپراطور الیکساندر ہارس گارڈز کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سر پر ترچھی ٹوپی تھی۔ اس کے خدوخال دلکش تھے اور اس کی آواز دھیمی ہونے کے باوجود پاٹ دار تھی۔ وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھا اور سبھی نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔

رستوف بگلچیوں کے آس پاس کھڑا تھا۔ اس کی تیز نگاہوں نے زار کو دور ہی سے پہچان لیا تھا اور وہ اس کی آمد کا منظر بغور دیکھ رہا تھا۔ جب ان کے مابین بیس قدموں کا فاصلہ رہ گیا اور نکولائی اس کے خوبصورت، شگفتہ اور پرشباب چہرے کے ایک ایک خدوخال میں امتیاز کرنے لگا، اس کے باطن میں محبت اور وجد آفریں مسرت کا چشمہ، جس کا اسے پہلے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، رواں ہو گیا۔ اسے زار کی ایک ایک چیز — اس کا ایک ایک خدوخال، ایک ایک اشارہ، ایک ایک جنبش — دلفریب معلوم ہونے لگی۔

زار پاولوگراد رجمنٹ کے سامنے رک گیا۔ اس نے فرانسیسی میں آسٹروی امپراطور سے کچھ کہا اور مسکرانے لگا۔

اس مسکراہٹ کو دیکھ کر رستوف بھی بے اختیار مسکرا دیا اور اسے اپنے دل میں امپراطور کی محبت پہلے سے بھی کہیں زیادہ امنڈتی محسوس ہوئی۔ وہ کسی نہ کسی انداز سے اپنی محبت کا اظہار کرنے کے لیے بے قرار ہو رہا تھا۔ چونکہ اسے معلوم تھا کہ یہ ناممکن ہے، وہ رونکھا ہو گیا۔ زار نے رجمنٹل کمانڈر کو بلایا اور اس سے چند الفاظ کہے۔

"اف، خدایا، اگر زار مجھ سے ہم کلام ہو گئے، پھر کیا ہو گا؟" رستوف نے سوچا۔ "خوشی سے میرا تو دم ہی نکل جائے گا۔"

زار نے افسروں کو بھی مخاطب کیا۔

"جنٹلمین، میں آپ سب کا ممنون ہوں۔" (رستوف کو اس کا ہر لفظ سماوی لفظ معلوم ہوتا تھا۔) "میں آپ

سب کا تہہ دل سے مشکور ہوں۔"

اگر رستوف وہیں اور اسی وقت اپنے زار پر جان قربان کرسکتا، اِسے کتنی راحت ہوتی!

"آپ حضرات نے اپنی ہمت کے بل بوتے پر سینٹ جارج کے عَلَم حاصل کر لیے ہیں اور مجھے معلوم ہے کہ آپ صاحبان ان کے اہل ثابت ہوں گے۔"

"کاش میں ان پر اپنی جان فدا کرسکتا، انھیں اپنی جان کا نذرانہ پیش کرسکتا!"

زار نے کچھ اور بھی کہا لیکن رستوف کو وہ سنائی نہ دیا اور سپاہیوں نے اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر نعرہ بلند کیا: "ہرّا!"

رستوف بھی اپنی زین پر جھک کر پوری قوت سے نعرے لگانے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنی وجد آور مسرت کا پوری طرح اظہار کرسکے، اس کوشش میں خواہ وہ مجروح ہی کیوں نہ ہو جائے۔

زار کئی سیکنڈ ہوزاروں کی طرف رخ کیے کھڑا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ متذبذب ہے۔

"امپراطور کیسے متذبذب ہوسکتے ہیں؟" رستوف سوچ رہا تھا۔ لیکن زار کے باقی تمام افعال کی طرح اسے اس کا یہ تذبذب بھی پرشکوہ اور مسحور کن نظر آرہا تھا۔

تاہم زار کا یہ تذبذب صرف ایک ثانیہ برقرار رہا۔ اس نے اپنے پاؤں سے، جس میں وہ اس زمانے کے فیشن کے مطابق تنگ اور نوکدار جوتے پہنے ہوئے تھا، اپنی مختصر دم والی کمیت گھوڑی کو، جس پر وہ سوار تھا، ایڑ لگائی، سفید دستانوں میں ملفوف ہاتھوں سے لگام تھامی اور وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے ایڈی کانگوں کی فوج کی فوج ڈولتی ڈالتی چلی آرہی تھی۔ وہ دوسری رجمنٹوں کے سامنے رکتا رکتا آگے ہی آگے چلتا گیا جہاں تک ایڈی کانگوں کے بیچ میں، جنھوں نے دونوں امپراطوروں کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا، رستوف کو اس کے ہیٹ کے صرف سفید پر ہی دکھائی دینے لگے۔

ایڈی کانگوں کے اس جلوس میں رستوف کو بلکونسکی کی شکل بھی نظر آئی۔ وہ اپنے گھوڑے پر ڈھیلے ڈھالے انداز سے بیٹھا تھا اور ماحول سے بیگانہ معلوم ہو رہا تھا۔ رستوف کو اس کے ساتھ اپنی دیروزہ جھڑپ یاد آگئی اور وہ سوچنے لگا کہ اسے ڈوئیل لڑنے کے لیے چیلنج دیا جائے یا نہ۔ "بالکل نہیں!" اسے اب خیال آیا۔ "اس موقع پر اس قسم کی باتیں سوچنے کا یا ان کے ذکر کرنے کا فائدہ؟ محبت، وجد آفریں مسرت اور جاں نثاری کے اس عالم میں ہمارے چھوٹے موٹے جھگڑوں اور بے عزتیوں کی اہمیت ہی کیا رہ جاتی ہے؟ اب میں ہر شخص سے پیار کرتا اور اس کی خطائیں معاف کرتا ہوں۔"

جب امپراطور تقریباً تمام رجمنٹوں کا معائنہ کر چکا، رسمی مارچ پاسٹ شروع ہوگیا اور رستوف اپنے بدو گھوڑے پر، جو اس نے دینی سوف سے خریدا تھا، سوار اپنے سکواڈرن کے عقب میں چلنے لگا ۔ بہ الفاظ دیگر، وہ اکیلا جا رہا تھا اور امپراطور کو صاف نظر آسکتا تھا۔

امپراطور کے قریب پہنچنے سے پہلے رستوف نے، جو بہت عمدہ اسپ سوار تھا، اپنے گھوڑے کو دو مرتبہ مہمیز لگایا اور اسے اچھی خاصی تیز رفتار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ گھوڑا بھی جب جوش میں آتا تھا، اسی رفتار سے دوڑنا اس کی عادت بن گیا تھا۔ اس نے جھاگ اڑاتی تھوتھنی جھکائی اور اپنی دم اوپر اٹھالی۔ امپراطور اسی کی طرف دیکھ رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ گھوڑے کو بھی یہ احساس ہے کہ امپراطور کی نگاہیں اس پر پڑ رہی ہیں۔ وہ اپنی ٹانگوں کو خوبصورت اور دلکش انداز سے اچھالتا، جیسے زمین کو چھوئے بغیر فضا میں اڑا جا رہا ہو، بے حد دل آویز چال چلتا امپراطور کے سامنے سے گزر گیا۔

رستوف خود بھی، اپنی ٹانگیں خاصی پچھلی جانب لٹکائے، اپنا پیٹ اندر کو بھینچے اور اپنے آپ کو گھوڑے ہی کا جزو سمجھتے، جیسا کہ دینی سوف نے بعد میں کہا تھا، ''بالکل ابلیس کی طرح،'' امپراطور کے برابر سے گزر گیا۔

''پاولوگراتو۔ شاباش!'' امپراطور نے کہا۔

''میرے خدایا! اگر وہ اسی وقت مجھے آگ میں کود جانے کا حکم دے دیں، مجھے کتنی مسرت ہوگی!'' رستوف نے سوچا۔

جب مارچ پاسٹ ختم ہو گیا، نو آمدہ سپاہ اور کوتوزوف کی زیر کمان فوج کے افسر ٹولیوں میں بٹ گئے اور ان اعزازات کے، جو عطا کیے گئے تھے، آسٹرویوں اور ان کی وردیوں، اگلی صفوں اور بوناپارت کے بارے میں گفتگو کرنے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر پرشیا کی ایسن[23] میں مقیم کور پہنچ گئی اور روسیوں اور آسٹرویوں کے دوش بدوش جنگ میں حصہ لینے پر آمادہ ہو گئی، پھر بوناپارت کا کیا حشر ہوگا۔

لیکن تمام ٹولیوں کی گفتگو کا سب سے بڑا موضوع امپراطور الیکساندر تھا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، اس کا ایک ایک لفظ دہرایا گیا اور اس کے ایک ایک اشارے کا مسرت و شادمانی سے ذکر کیا گیا۔

ان سب کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ زار کے زیر کمان برق رفتاری سے دشمن پر پل پڑیں۔ انھیں یقین تھا کہ امپراطور کی قیادت میں وہ ہر شخص کا، خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو، بھرکس نکال دیں گے۔ مارچ پاسٹ کے بعد رستوف اور باقی افسروں کا بھی یہی خیال تھا۔ اگر انھیں گزشتہ دو لڑائیوں میں کامیابی ہو بھی جاتی، تب بھی انھیں اپنی نصرت کے بارے میں وہ اعتماد نہ ہوتا جو کہ اب تھا۔

9

معائنے کے اگلے روز بورس نے اپنی بہترین وردی پہنی، کامیابی کے لیے اپنے دوست برگ کی دعائیں اور نیک تمنائیں لیں اور بلکونسکی سے ملاقات کرنے اول موٹس روانہ ہو گیا۔ اسے امید تھی کہ وہ اس کے توسط سے امکانی طور پر بہترین اسامی پر فائز ہونے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کی ترجیح کسی اہم شخصیت کا ایجوٹنٹ مقرر ہونا تھا کیونکہ فوج کا یہ عہدہ اسے خاص طور پر بہت پرکشش نظر آتا تھا۔ ''رستوف کا کیا ہے، اس کا باپ اسے یک مشت دس ہزار روبل

بھیج دیتا ہے، اس لیے وہ اس قسم کی گفتگو کرسکتا ہے کہ اسے کسی کی جبیں سائی کرنا یا کسی کا چمچہ بننا منظور نہیں لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے، اپنی ملازمت میں ترقی کرنے کے لیے میرے پاس عقل وذہانت کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اس لیے مجھے جو بھی موقع ملتا ہے، میں اس سے قطع نظر نہیں کرسکتا، میں اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاؤں گا۔"

اس روز اول موٹس میں اسے پرنس آندرے تو نہ ملا، تاہم محض شہر دیکھنے کے بعد، جہاں فوج کے ہر جرنیل کا ہیڈ کوارٹر تھا، مختلف سفارتی عہدیدار تعینات تھے اور دونوں امپراطور اپنے اپنے سٹاف افسروں، درباریوں اور افرادِ خانہ کے ہمراہ مقیم تھے، اس کی اس بلند و برتر دنیا میں داخل ہونے کی خواہش شدید تر ہوگئی۔

اس کی وہاں کوئی جان پہچان نہ تھی۔ اگرچہ اس نے گارڈز کی چھیل چھبیلی وردی زیب تن کی ہوئی تھی، اس کے باوجود اسے یہ مہتمم بالشان شخصیات، جن میں درباری اور فوجی افسر دونوں ہی شامل تھے، جو اپنے سینوں اور وردیوں پر تمغے، کلغیاں اور عہدوں کے نشانات سجائے اپنی ٹھاٹ دار گاڑیاں ادھر ادھر بھگائے پھر رہی تھیں، اپنے آپ سے، جو گارڈز کا محض معمولی افسر تھا، اتنی برتر اور فائق نظر آئیں کہ وہ نہ صرف اس کا وجود تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھیں بلکہ واضح طور پر معلوم ہوتا تھا کہ یہ ان کے بس کی بات ہی نہیں۔ کمانڈر انچیف کوتوزوف کے ہیڈ کوارٹر میں، جہاں اس نے بلکونسکی کے متعلق دریافت کیا تھا، تمام ایجوٹنٹوں نے ہی نہیں بلکہ اردلیوں نے بھی اسے یوں دیکھا تھا جیسے وہ اسے یہ جتانا چاہتے ہوں: "تم جیسے لاتعداد افسر یہاں منڈلاتے رہتے ہیں، جاؤ میاں، اپنا کام کرو، ہم تم لوگوں سے بالکل تنگ آچکے ہیں۔" اس کے باوجود یا شاید اسی بنا پر اس نے اگلے روز یعنی پندرہ نومبر کو دوبارہ اول موٹس کا رخ کیا۔ جس مکان میں کوتوزوف مقیم تھا، وہ وہاں پہنچا اور اس نے بلکونسکی کے متعلق استفسار کیا۔ پرنس آندرے اندر ہی تھا اور بورس کو ایک کشادہ ہال میں، جو غالباً کسی زمانے میں رقص وسرود کے لیے استعمال ہوتا تھا لیکن اب جس میں پانچ پلنگ، مختلف اقسام کا فرنیچر (میز، کرسیاں وغیرہ) اور ایک کلاوی کارڈ پڑا تھا، پہنچا دیا گیا۔ دروازے کے بالکل قریب ایک ایجوٹنٹ ایرانی ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس میز کے سامنے بیٹھا تھا اور کچھ لکھ رہا تھا۔ دوسرا پلنگ پر لیٹا ہوا تھا۔ یہ نیس وتسکی تھا۔ جس کا جسم لحیم شحیم اور چہرے کا رنگ — سرخ تھا۔ اس کے ہاتھ اس کی گردن کے نیچے تھے اور وہ ایک افسر کے ساتھ، جو اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا، ہنسی مذاق کی باتیں کر رہا تھا۔ تیسرا کلاوی کارڈ پر ویانوی والز کی دھنیں بجا رہا تھا۔ چوتھا کلاوی کارڈ پر جھکا ہوا تھا اور ان دھنوں کو گنگنا رہا تھا۔ بلکونسکی کمرے میں نہیں تھا۔ جو صاحبان وہاں موجود تھے، ان میں سے کسی نے بورس کو دیکھ کر اپنی جگہ سے خفیف سی حرکت بھی نہ کی۔ اس شخص نے، جو کچھ لکھ رہا تھا اور جس سے بورس نے استفسار کیا تھا، ترش روئی سے اس کی جانب دیکھا اور کہا: "بلکونسکی ڈیوٹی پر ہیں اور اگر تمھیں ان سے ملنا ہی ہے، بائیں طرف استقبالیے میں چلے جاؤ۔" بورس نے اس کا شکریہ ادا کیا اور استقبالیے میں چلا گیا۔ اس کمرے میں دس بارہ افسر اور جرنیل تھے۔

جب بورس اندر داخل ہوا، پرنس آندرے، جس کی نگاہیں حقارت آمیز انداز سے نیچے کو جھکی ہوئی تھیں (یہ وہ مخصوص نگاہیں تھیں جو شائستہ انداز سے تھکاوٹ کا اظہار کرتی ہیں اور الفاظ کی طرح صاف کہتی دکھائی دیتی ہیں:

"اگر یہ میرا فرض نہ ہوتا، میں ایک ثانیہ بھی تمھارے ساتھ بات چیت کرنا گوارا نہ کرتا")، کسی روسی جرنیل کی گفتگو سن رہا تھا۔ یہ جرنیل معمر تھا۔ اس کے سینے پر بے شمار تمغے سجے ہوئے تھے۔ وہ یوں سیدھا تن کر کھڑا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ تقریباً پنجوں کے بل ایستادہ ہے۔ اس کے سرخ چہرے پر وہ چاپلوسی، جو صرف فوجیوں ہی کے لیے مخصوص ہے، جھلک رہی تھی۔ وہ پرنس آندرے کو کسی معاملے کے بارے میں رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

"بہت اچھا۔ اب ذرا اتنی مہربانی فرمائیں کہ کچھ دیر انتظار کریں،" پرنس آندرے نے جرنیل سے کہا۔ وہ روسی فرانسیسی لہجے میں بول رہا تھا اور وہ یہ مصنوعی لہجہ صرف اسی وقت اختیار کرتا تھا جب اس نے اپنی حقارت کا اظہار کرنا ہوتا تھا۔ اتنے میں اس کی نظر بورس پر پڑی اور اس نے جرنیل کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ (بے چارہ جرنیل اس کے پیچھے بھاگا اور التجائیں کرنے لگا کہ اس کی بات سنی جائے)۔ اس نے گردن کو خم دے کر بورس کا خیر مقدم کیا اور چہرے پر تبسم سجائے اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جس چیز کا بورس کو پہلے ہی خفیف سا شبہ تھا، اب وہ اس پر پوری طرح عیاں ہو گئی کہ فوج میں ماتحتی اور نظم و ضبط ایک تو وہ ہوتا ہے جس کا ذکر عسکری قواعد وضوابط کی کتاب میں کیا جاتا ہے اور جسے وہ اور رجمنٹ کا ہر جوان بخوبی جانتا ہے لیکن اس کے علاوہ ایک مزید اور زیادہ اساسی ماتحتی بھی ہوتی ہے۔ یہ وہ ماتحتی ہے جو اس جرنیل کو، جس کے چہرے کی رنگت سرخ ہے اور جو تن کر سیدھا کھڑا ہے، مجبور کرتی ہے کہ وہ مؤدب ہو کر انتظار کرے کیونکہ کیپٹن بلکونسکی نے اپنا دل بہلانے کے لیے لیفٹیننٹ دروبتیسکوئے سے گپ شپ لگانا زیادہ ضروری سمجھا ہے۔ بورس نے پہلے سے بھی زیادہ عزم کے ساتھ یہ تہیہ کر لیا کہ آئندہ وہ تحریری ضوابط پر اتنا عمل نہیں کرے گا جتنا وہ ان غیر تحریری قواعد پر کاربند ہو گا۔ اسے محسوس ہوا کہ محض اس حقیقت نے کہ اس کی سفارش پرنس آندرے سے ہو چکی ہے، اسے ایک دم جرنیل سے، جو دوسرے حالات میں، محاذ پر، گارڈز کے ادنیٰ لیفٹیننٹ کو توپ دم کرنے کے اختیار سے بہرہ ور تھا، اوپر اٹھا دیا تھا۔ پرنس آندرے اس کے قریب آیا اور اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔

"مجھے افسوس ہے کہ میں کل تمھیں یہاں نہ مل سکا۔ میرا سارا دن جرمنوں سے نپٹتے گزر گیا۔ ہم وے روٹر[24] کے ساتھ افواج کی تقسیم وترتیب دیکھنے چلے گئے تھے۔ اور جب کوئی جرمن یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ وہ ہر چیز بلا کم وکاست بیان کرے گا۔ پھر آخری سرا ہاتھ میں آنا مشکل ہو جاتا ہے!"

بورس یوں مسکرایا جیسے پرنس آندرے جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ سب سمجھ گیا ہو بلکہ وہ جن باتوں کی طرف اشارہ کر رہا تھا، وہ بچے بچے کو بھی معلوم ہیں۔ لیکن درحقیقت وہ وے روٹر کا نام اور افواج کی تقسیم وترتیب جیسی اصطلاح زندگی میں اولیں بار سن رہا تھا۔

"اچھا دوست، تو تم ابھی تک ایجوٹنٹ بننے کے خواہش مند ہو؟ میں تمھارے بارے میں سوچتا رہا ہوں۔"

"جی ہاں، میں سوچ رہا تھا..." بورس نے کسی وجہ سے شرماتے ہوئے کہا،" کہ کمانڈر انچیف کے نام درخواست بھیج دوں۔ پرنس کوراگن نے انھیں میرے بارے میں خط لکھا تھا۔ میں محض اس لیے استفسار کرنا چاہتا تھا کیونکہ

مجھے اندیشہ ہے کہ گارڈز جنگ میں شریک نہیں کیے جائیں گے،'' اس نے یوں کہا جیسے وہ اپنی صفائی بیان کر رہا ہو۔

''خوب! خوب! ہم اس کے متعلق تفصیل سے بات کریں گے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''بس مجھے ذرا اتنی اجازت دو کہ میں ان صاحب کا کام نپٹا دوں، پھر میں تمھاری خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔''

جب پرنس آندرے سرخ چہرے والے جرنیل کی طرف سے رپورٹ پیش کرنے چلا گیا، اس صاحب نے، جو بظاہر غیر تحریری قواعد و ضوابط کے فوائد کے متعلق بورس کے نقطۂ نظر سے متفق نہیں تھا، اس بے ادب لیفٹیننٹ کو، جو ایجوٹنٹ کے ساتھ اس کی گفتگو میں مخل ہوا تھا، شعلہ بار نگاہوں سے یوں لگاتار گھور کر دیکھا کہ بورس کو بے چینی محسوس ہونے لگی۔ وہ وہاں سے پرے چلا گیا اور بے قراری سے پرنس آندرے کی کمانڈر انچیف کے کمرے سے واپسی کا انتظار کرنے لگا۔

''اچھا، دوست، میں تمھیں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں تمھارے متعلق سوچتا رہا ہوں،'' پرنس آندرے نے، جب وہ اس کشادہ کمرے میں، جس میں کلاوی کارڈ پڑا تھا، چلے گئے، کہا۔ ''تمھارا کمانڈر انچیف کے پاس جانا نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوگا۔ وہ تمھارے ساتھ انتہائی شائستگی اور اخلاق سے پیش آئیں گے اور تمھیں اپنے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت دیں گے۔'' (''غیر تحریری قواعد و ضوابط کے مطابق یہ اتنا برا بھی نہیں ہوگا!'' بورس نے سوچا۔) ''لیکن اس سے زیادہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ لیکن میں تمھیں بتاتا ہوں کہ ہم کیا کریں گے۔ میرے ایک بہت اچھے دوست ہیں۔ ان کا نام پرنس دلگوروکوف ہے۔ وہ ایجوٹنٹ جنرل ہیں اور بہت اچھے انسان ہیں۔ تمھیں شاید معلوم نہ ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ کوتوزوف، اس کے سٹاف افسروں اور ہم سب لوگوں کی، جو یہاں موجود ہیں، اس وقت بالکل کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اب ہر بات کا مرکز خود زار ہیں۔ ہم سیدھے دلگوروکوف کے پاس چلتے ہیں۔ مجھے بہرحال ان سے ملنے جانا ہی تھا اور میں تمھارے بارے میں ان سے پہلے ہی بات کر چکا ہوں۔ دیکھتے ہیں کہ وہ تمھیں اپنے سٹاف میں شامل کرتے ہیں یا کوئی اور اچھی اسامی ڈھونڈتے ہیں۔''

پرنس آندرے کو جب کسی نوجوان کی رہنمائی کرنے اور دنیوی کامرانی کے حصول میں اس کی مدد کرنے کا موقع ملتا، وہ بڑے ولولے اور جوش و خروش سے یہ فریضہ سرانجام دیتا۔ اس کا پندار اسے خود اپنے لیے اس قسم کی مدد تلاش کرنے کی کبھی اجازت نہ دیتا لیکن دوسروں کی مدد کرنے کے بہانے اس کا تعلق اس حلقے سے، جو لوگوں پر نوازشات کرتا ہے اور جس میں اسے کشش نظر آتی تھی، استوار ہو جاتا۔ اس نے بہ رضا و رغبت بورس کے کام کا بیڑا اٹھایا اور اس کے ساتھ پرنس دلگوروکوف سے ملنے چلا گیا۔

جب وہ اول موٹس کے اس محل میں پہنچے جہاں دونوں امپراطور اور خدام و حشم قیام پذیر تھے، جھٹ پٹے کا وقت ہو چکا تھا۔

اس روز جنگی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس میں دونوں امپراطوروں اور ہوف کریگزراٹ (وسیع جنگی کونسل) کے ارکان نے شرکت کی تھی۔ اجلاس نے کوتوزوف اور شوارٹسن برگ[25] جیسے جہاندیدہ اور سرد و گرم چشیدہ

جرنیلوں کے مشورے کے علی الرغم بلا تاخیر پیش قدمی کرنے اور بوناپارت سے دو دو ہاتھ کرنے کا فیصلہ صادر کر دیا تھا۔ اجلاس پرنس آندرے اور بورس کے، جو پرنس دلگوروکوف کی تلاش میں ادھر آئے تھے، محل میں پہنچنے سے ذرا پہلے اختتام پذیر ہوا تھا۔ جنگی کونسل کے نوجوان ارکان کے ٹولے کو اس روز جو کامیابی ہوئی تھی، ابھی تک ہر شخص پر اس کا سحر طاری تھا۔ جن اشخاص نے پیش قدمی کو موخر کرنے اور کسی نہ کسی بہانے انتظار کرنے پر زور دیا تھا، ان کی رائے اس طرح بیک زبان دبا دی گئی اور حملے کے فوائد کے حق میں اتنے فیصلہ کن ثبوت پیش کر کے ان کے دلائل مسترد کر دیے گئے کہ کونسل میں جو امور — متوقع لڑائی اور یقینی فتح — زیر بحث آئے، وہ مستقبل سے نہیں، بلکہ ماضی سے متعلق معلوم ہونے لگے۔ (ان دلائل کے مطابق) تمام فوائد ہمارے حق میں جاتے تھے۔ ہماری فوجِ غفیر، جو لاریب نپولین کی فوج سے برتر تھی، ایک مقام پر مجتمع تھی۔ امپراطوروں کی موجودگی نے فوجی دستوں میں نیا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا تھا اور وہ دشمن کے خلاف صف آرا ہونے کے لیے بے تاب تھے۔ وہ مقامات جو جنگی نقطۂ نظر سے اہم تھے اور جہاں معرکہ آرائی کی توقع کی جا سکتی تھی، ان کی ایک ایک تفصیل آسٹری سپاہ کے کمانڈر جنرل وے روٹر کو معلوم تھی۔ (خوش قسمتی کی بات یہ تھی کہ جن میدانوں میں فرانسیسیوں کے ساتھ معرکہ آرائی ہونا تھی، وہاں گزشتہ سال آسٹری فوج نے جنگی مشقیں کی تھیں۔) ملحقہ علاقہ بھی جانا پہچانا تھا اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل نقشے پر دکھا دی گئی تھی۔ اس کے برعکس بوناپارت، جو بظاہر کمزور ہو چکا تھا، کچھ بھی نہیں کر رہا تھا۔

جن لوگوں نے فوری حملے کی پرزور حمایت کی تھی، ان میں دلگوروکوف شامل تھا۔ وہ ابھی ابھی کونسل کے اجلاس سے واپس آیا تھا۔ تھکاوٹ سے اس کا جسم چور چور ہو رہا تھا لیکن اس کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ انھیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، وہ اس کے نشے سے سرشار تھا۔ پرنس آندرے نے اپنے متوسل کا تعارف کرایا۔ پرنس دلگوروکوف نے شائستگی اور تپاک سے بورس سے ہاتھ ملایا لیکن زبان سے کچھ نہ کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس وقت جو چیز اس کے دماغ پر حاوی تھی، وہ اس کا تذکرہ کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ وہ پرنس آندرے کے ساتھ فرانسیسی میں گفتگو کرنے لگا۔

"خیر، مائی ڈیئر فیلو، آج ہم نے زبردست معرکہ سر کیا ہے! اس کے نتیجے کے طور پر جو اصلی جنگ برپا ہو گی، خدا کرے کہ ہمیں اس میں بھی اسی طرح کی کامیابی حاصل ہو۔ تاہم، مائی ڈیئر فیلو،" اس نے اکھڑ اور پرجوش انداز سے کہا، "مجھے اعتراف ہے کہ میں نے آسٹریوں، اور خاص طور پر وے روٹر کے ساتھ انصاف نہیں برتا۔ انھوں نے نقشے اور منصوبے تیار کرنے میں بڑی عرق ریزی سے کام کیا ہے۔ باریک سے باریک تفصیل بڑی صحت اور درستی سے بیان کی ہے۔ علاقے کے بارے میں ان کی معلومات بے پناہ ہیں۔ چنانچہ انھوں نے ہر صورت حال سے نپٹنے کی پیش بندی کر دی ہے۔ یوں، مائی ڈیئر فیلو، حالات جس طرح اب ہمارے لیے سازگار ہیں، یہ سوچا بھی نہیں جا سکتا کہ ان سے کبھی بہتر ہمیں میسر آ سکیں گے۔ آسٹروی صحت و درستی اور روسی جرأت و شجاعت کے امتزاج کے بعد آپ کو اور کیا چاہیے؟"

''تو حملے کا حتمی فیصلہ ہو گیا ہے؟'' بلکونسکی نے پوچھا۔

''اور مائی ڈیئر فیلو، میرے خیال کے مطابق بونا پارٹ کی کیفیت یہ ہو گئی ہے، 'گوئم مشکل وگرنہ گوئم مشکل'، اس کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کا آج ہی امپراطور کے نام خط آیا ہے۔'' دلگوروکوف یوں مسکرایا جیسے وہ بہت کچھ جانتا ہو۔

''واقعی؟ کیا لکھا ہے اس نے؟'' بلکونسکی نے استفسار کیا۔

''لا۔ را۔ لی۔ ری۔ لا، لارالیری لا! غاں۔ غاں! فضول، بکواس! اس کا اصل مقصد مہلت حاصل کرنا ہے۔ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ اب وہ ہماری مٹھی میں آچکا ہے— یہ بالکل یقینی بات ہے! لیکن سب سے مزید اربات یہ ہوئی،'' اس نے اچانک خوش مزاجی سے ہنستے ہوئے کہا: ''کہ ہمیں سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جواب میں اسے خطاب کیسے کریں! قونصل[26] اسے نہیں لکھ سکتے تھے اور یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اسے امپراطور کہنا خارج از سوال تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا کہ 'جنرل بونا پارٹ' مناسب رہے گا۔''

''اسے امپراطور تسلیم نہ کرنے اور جنرل بونا پارٹ پکارنے کے مابین تو بڑا فرق ہے،'' بلکونسکی نے کہا۔

''یہی تو اصل نکتہ ہے،'' دلگوروکوف نے ہنستے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔ 'بلبین کو جانتے ہو؟— اس کے کاٹے کا پانی نہیں مانگتا— اس نے تجویز پیش کی کہ اسے 'غاصب اور دشمن بنی نوع انسان' کا لقب دیا جائے،'' دلگوروکوف نے دل جمعی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''بس اتنا ہی؟'' بلکونسکی نے پوچھا۔

''تاہم یہ بلبین ہی تھا جس نے خطاب کی سنجیدہ صورت ڈھونڈ نکالی۔ وہ انتہائی سمجھ دار اور تیز فہم آدمی ہے۔''

''اور یہ خطاب کیا تھا؟''

''سربراہ حکومت فرانس کے نام: Au Chef du gouvernement Francais''، دلگوروکوف نے گمبھیر خاطر جمعی سے کہا۔ ''اچھا ہے۔ کیا خیال ہے؟''

''اچھا تو ہے لیکن اس کے تن بدن میں آگ لگا دے گا،'' بلکونسکی نے اظہار خیال کیا۔

''ارے ہاں، بالکل لگا دے گا! میرا بھائی اسے جانتا ہے۔ وہ پیرس میں اس— اس موجودہ امپراطور کے ساتھ ایک سے زیادہ مرتبہ کھانا کھا چکا ہے۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ اس نے اس سے زیادہ باریک بیں اور عیار سفارت کار نہیں دیکھا— کیوں نہ ہو، آخر کار، تم جانتے ہو، کہ اس میں فرانسیسی چابک دستی اور اطالوی تھیٹریت[27] دونوں عناصر کا امتزاج ہے۔ تم نے اس کا اور کاؤنٹ مارکوف کا قصہ تو سنا ہوگا۔ کاؤنٹ مارکوف واحد شخص تھا جو اس سے نپٹنے کا گر جانتا تھا۔ تمھیں وہ رومال والا قصہ یاد ہے؟''

اور باتونی دلگوروکوف کبھی بورس کی جانب اور کبھی پرنس آندرے کی جانب دیکھنے لگتا اور قصہ سنانے لگا۔

''ایک مرتبہ'' اس نے کہا، ''بونا پارٹ نے ہمارے سفیر، مارکوف، کا امتحان لینے کے لیے عمداً اپنا رومال اس کے

سامنے گرادیا۔ اسے یقیناً یہ توقع ہوگی کہ مارکوف اسے اٹھائے گا اور اس کے حوالے کردے گا۔ مارکوف نے کیا کیا؟ بجائے اس کے وہ اس کا رومال اٹھاتا، اس نے اپنا رومال اس کے قریب گرادیا، پھر وہ نیچے جھکا، اپنا رومال اٹھایا اور بونا پارٹ کا وہیں پڑا رہنے دیا۔"

"بہت اعلیٰ!" بلکونسکی نے کہا۔ "لیکن پرنس، میں آپ کی خدمت میں اس نوجوان کی طرف سے درخواست گزار بن کر حاضر ہوا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ۔"

لیکن پرنس آندرے کی بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ایک ایڈی کانگ اندر آگیا اور اس نے پیغام دیا کہ پرنس دلگوروکوف کو زار نے یاد کیا ہے۔

"کیا مصیبت ہے!" دلگوروکوف نے بہ عجلت اٹھتے اور پرنس آندرے اور بورس کے ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ "تم جانتے ہو کہ مجھ سے جو کچھ بن پڑا، تمھارے اور اس پرکشش نوجوان کے لیے کرنے میں مجھے بہت راحت ہوگی۔" اگرچہ اس کے چہرے مہرے پر شوخی اور غیر سنجیدگی ہویدا تھی، اس نے ایک بار پھر پورے خلوص کے ساتھ بورس سے ہاتھ ملایا۔ "تم خود سمجھ گئے ہوگے کہ... خیر، پھر کبھی سہی۔"

اعلیٰ حکام کے اتنا قریب ہونے کا، جتنا کہ بورس خود کو اس وقت محسوس کر رہا تھا، محض تصور ہی اس کے لیے بے حد سہانا اور ولولہ انگیز تھا۔ اسے یہ احساس تھا کہ اس کا رابطہ ان سرچشموں سے ہے جو اس ہجوم کی، جس کا وہ اپنی رجمنٹ میں اپنے آپ کو مختصر، حقیر اور غیر اہم جز و سمجھتا تھا، دیوہیکل حرکات وسکنات کو روبہ عمل لاتے ہیں۔

وہ راہداری میں دلگوروکوف کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے کہ ان کا سامنا ایک پست قامت شخص (وہ اسی دروازے میں سے، جس میں سے دلگوروکوف زار سے ملنے اندر گیا تھا، باہر آیا تھا) سے ہوگیا۔ اس کے چہرے بشرے سے ذہانت وفراست ٹپکتی تھی۔ اس کے جبڑے خاصے نمایاں اور ابھرواں تھے لیکن انھوں نے اس کی شکل بگاڑنے کی بجائے اس کے تیوروں کو خاص قسم کی شگفتگی اور تحرک بخش دیا تھا۔ اس کوتاہ قامت شخص نے دوستوں کی طرح گردن کو خم دے کر دلگوروکوف کو سلام کیا لیکن پرنس آندرے کو سرد مہرانہ نظروں سے گھور کر دیکھا اور سیدھا چلتا اس کی طرف آیا۔ اسے امید تھی کہ پرنس آندرے یا تو اسے جھک کر سلام کرے گا یا اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ پرنس آندرے نے دونوں میں سے کچھ بھی نہ کیا۔ اس کے چہرے پر خصومت کے آثار ہویدا ہوگئے۔ وہ ایک طرف ہٹ گیا اور راہداری کی دوسری سمت چلا گیا۔

"یہ کون تھا؟" بورس نے پوچھا۔

"یہ وزیر خارجہ آدم تسارتورسکی ہے۔ اس کا شمار ملک کی مایہ ناز شخصیات میں ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک یہ انتہائی مکروہ آدمی ہے۔ اسی قسم کے اشخاص اقوام کی قسمتوں کے فیصلے کرتے ہیں۔" پرنس آندرے کے منہ سے آہ نکلی، جسے وہ دبا نہ سکا۔ اس کے ساتھ ہی وہ محل سے باہر نکل گئے۔

اگلے روز فوجوں نے میدان جنگ میں اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں اور بورس اوسٹرلٹس کی لڑائی تک بلکونسکی

اور دلگورکوف دونوں میں سے کسی سے بھی ملاقات کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا اور اسے اسماعیلوف رجمنٹ میں مزید کچھ عرصہ کام کرنا پڑا۔

10

سولہ تاریخ کو صبح سویرے دینی سوف کا سکواڈرن، جس میں نکولائی رستوف خدمات سرانجام دے رہا تھا اور جو پرنس باگ راتیاں کے دستے میں شامل تھا، ان لوگوں کے بقول ''کھلی فضا میں رات بسر کرنے'' کے بعد مارچ کرتا ہوا میدان جنگ میں داخل ہوا۔ فوج کے دوسرے کالموں کے پیچھے کوئی پون میل چلنے کے بعد اسے شاہراہ پر رکنے کا حکم ملا۔ رستوف نے قازقوں، ہوزاروں کے پہلے اور دوسرے سکواڈرنوں، پیادہ بٹالینیوں اور توپ خانے کو اپنے برابر سے گزرتے اور آگے جاتے دیکھا۔ ان کے بعد جنرل باگ راتیاں اور جنرل دلگوروکوف اپنے اپنے ایجوٹنٹوں کے ساتھ آئے اور گھوڑوں پر سوار آگے نکل گئے۔ معرکے میں حصہ لینے کی توقع میں اسے جنگ کے جس خوف کا تجربہ ہوا تھا، پہلے کی طرح اس خوف پر قابو پانے کے لیے اسے جس داخلی کشمکش میں سے گزرنا پڑا تھا اور معرکے میں سچے ہوزار کی طرح اس نے نمایاں کارکردگی دکھانے کے جو خواب دیکھے تھے، وہ سب بیکار ثابت ہوئے۔ اس کے سکواڈرن کو محفوظ دستے کے طور پر پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا اور نکولائی رستوف کو وہ دن سخت بوریت اور کوفت کے عالم میں گزارنا پڑا۔

تقریباً نو بجے صبح اسے اپنے آگے فائرنگ اور ''ہرّا'' کی آوازیں سنائی دیں اور اس نے مجروحین (جن کی تعداد اگرچہ زیادہ نہیں تھی) کو واپس لاتے دیکھا۔ آخر میں اسے فرانسیسی اسپ سواروں کا پورا دستہ نظر آیا۔ انھیں قازقوں کی ایک کمپنی اپنی نگرانی میں لا رہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ معرکہ انجام کو پہنچ گیا ہے۔ اگرچہ یہ بظاہر کوئی بڑا معرکہ نہیں تھا تاہم کامیابی پر منتج ہوا تھا۔ جو افسر اور جوان واپس آئے، وہ زبردست فتح کا ڈنکا بجاتے اور فش ہاؤ قصبے پر قبضے اور پورے فرانسیسی دستے کی گرفتاری کے متعلق باتیں کرتے آرہے تھے۔

رات بے پناہ پالا پڑا تھا لیکن دن کو مطلع صاف ہوگیا اور دھوپ نکل آئی۔ روزِ خزاں کی خیرہ کن روشنی نویدِ کامرانی کے عین مطابق تھی۔ اس فتح کا چرچا صرف ان لوگوں کی، جنھوں نے اس معرکے میں حصہ لیا تھا، زبانوں سے ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ رستوف کے قریب سے جو جوان، افسر، جرنیل اور ایجوٹنٹ گزر رہے تھے، ان سب کے خوشی سے تمتماتے چہرے بھی اس کی غمازی کر رہے تھے۔ اور نکولائی جسے، اس خوف کے عالم میں، جو جنگ سے پہلے فوجیوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے، بیکار گزرنا پڑا تھا، اب اور بھی افسردہ ہوگیا کیونکہ اس پرمسرت دن اسے محض مکھیاں مارنے کے لیے پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

''رستوف، آؤ یار، ہم اپنے غم واندوہ کو بوتل میں غرق کر دیں!'' دینی سوف نے سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے کہا۔ اس کے پاس بوتل اور کچھ کھانے کی اشیا تھیں۔

افسروں نے دینی سوف کی بوتل اور کھانے کی اشیا کے گرد دائرہ بنالیا اور کھانے پینے اور باتیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

''ادھر دیکھو، وہ ایک اور پکڑے لا رہے ہیں!'' ایک افسر نے ایک فرانسیسی سوار کی، جسے دو قازق پیدل ہنکائے لا رہے تھے، جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ان میں سے ایک ایک بہت خوبصورت اور گرانڈیل گھوڑے کی، جسے انھوں نے اس قیدی سے چھینا تھا، لگام تھامے ہوئے تھا۔

''یہ گھوڑا ہمیں بیچ دو!'' دینی سوف نے قازق سے چلا کر کہا۔

''جناب عالی، اگر آپ کی یہی خواہش ہے، پھر ٹھیک ہے۔''

افسر اٹھے اور گھوڑے اور قازقوں کے ارد گرد کھڑے ہو گئے۔ نوجوان فرانسیسی اسپ سوار ایل زاس[28] کا باشندہ تھا اور جرمن لہجے میں فرانسیسی بولتا تھا۔ پریشانی اور اضطراب سے اس کا دم پھول رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ تھا۔ جونہی اسے فرانسیسی زبان میں گفتگو سنائی دی وہ جھٹ پٹ افسروں کی طرف لپکا اور کبھی ایک اور کبھی دوسرے کو مخاطب کرنے لگا۔ ''اگر کارپورل بیچ میں نہ آتا،'' اس نے بتایا، ''تو میں کبھی گرفتار نہ ہوتا۔ قصور میرا نہیں بلکہ کارپورل کا تھا۔ میں نے اسے بتایا بھی کہ ادھر روسی ہیں لیکن اس کے باوجود اس نے مجھے گھوڑوں کی جھولیں اٹھانے بھیج دیا۔'' وہ ہر جملے کے بعد اپنے گھوڑے کو تھپکی دیتا اور کہتا: ''انھیں فرمائیں کہ میرے گھوڑے کو کوئی گزند نہ پہنچائیں!'' صاف ظاہر تھا کہ اسے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے۔ ایک موقع پر وہ اپنی گرفتاری کا جواز پیش کرنے لگتا اور دوسرے پر وہ اپنے سپاہیانہ نظم وضبط اور فوجی خدمات کے لیے اپنے جوش وخروش کا یوں ذکر کرنا شروع کر دیتا، جیسے وہ اپنے اعلیٰ افسروں کے سامنے کھڑا ہو۔ وہ ہماری عقبی سپاہ میں فرانسیسی فوج کا بالکل نیا اور مختلف ماحول، جو ہمارے لیے اتنا اجنبی تھا، لایا تھا۔

قازق تین تین روبل کے دو طلائی سکوں کے عوض گھوڑا فروخت کرنے پر آمادہ ہو گئے اور رستوف نے، جو گھر سے رقم موصول ہونے کے بعد تمام افسروں میں امیر ترین شخص بن چکا تھا، اسے خرید لیا۔

جب گھوڑا رستوف کے حوالے کر دیا گیا، فرانسیسی قیدی نے اسے خوش طبعی سے مشورہ دیا: ''میرے گھوڑے کو گزند نہ پہنچنے دینا۔''

رستوف مسکرا دیا۔ اس نے فرانسیسی اسپ سوار کو اطمینان دلایا اور اسے کچھ رقم بھی دی۔

''چلو، چلو!'' قازقوں نے قیدی کے بازو پر ہاتھ رکھا اور اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

''امپراطور! امپراطور!'' اچانک ہوزاروں کے نعرے سنائی دینے لگے۔

ایکا ایکی بڑی گہما گہمی اور ہل چل کا احساس ہونے لگا۔ رستوف نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اسے سڑک پر متعدد گھڑسوار، جنھوں نے اپنی ٹوپیوں میں کلغیاں سجائی ہوئی تھیں، دکھائی دیے۔ پلک جھپکنے میں ہر شخص اپنے اپنے

مقام پر پہنچ گیا اور انتظار کرنے لگا۔

رستوف کو معلوم ہے اور نہ یاد ہے کہ وہ کیسے اپنے گھوڑے تک پہنچا اور کیسے اس پر سوار ہوا۔ چٹکی بجانے میں اس کا یہ تاسف فضا میں تحلیل ہو گیا کہ اسے معرکے میں حصہ لینے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ان لوگوں کے بیچ، جو اسے ایک آنکھ نہ بھاتے تھے، اسے جو اکتاہٹ ہو رہی تھی، اب وہ بھی جاتی رہی اور اسے اپنی ذات بھی فراموش ہو گئی۔ اپنے آپ کو امپراطور کے حضور پا کر اس پر والہانہ خوشی طاری ہو گئی اور یوں اس کا جو دن شغلِ بیکاری میں گزرا تھا، اس کی تلافی ہو گئی۔ وہ عاشق کی طرح پھولے نہ سماتا تھا کہ ہجر کی گھڑیاں ختم ہوئیں اور وقت وصال آ پہنچا لیکن جب وہ وقت آیا، اسے اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ وہ نگاہیں اٹھا کر ہی دیکھ لیتا لیکن نگاہیں اٹھانے کی ضرورت بھی کیا تھی، اس کے بغیر ہی یہ وجد آفریں احساس کہ وہ اسے اپنے قرب سے نواز رہا ہے، اس کے رگ و پے میں سماتا جا رہا تھا۔ اسے اس کا اندازہ نہ صرف قافلے کے سواروں کے گھوڑوں کے سموں کی ٹاپوں سے ہو رہا تھا کہ وہ آ رہا ہے بلکہ اس بات سے بھی کہ جوں جوں وہ قریب آ رہا تھا، اس کے گرد و پیش ہر چیز روشن تر، مسرور تر، معنی خیز تر اور بشاش تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ آفتاب اپنی شاہانہ اور شفیق کرنیں بکھیرتا اس کے قریب سے قریب تر ہوتا گیا اور اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ ان کرنوں کی لپیٹ میں آتا جا رہا ہے۔ اسے اس کی آواز بھی سنائی دی۔ یہ آواز شفقت سے بھرپور، پر سکون اور رعب دار بھی تھی اور اس میں ایک قسم کی معصومیت بھی تھی۔ اچانک مرگ آسا سکوت، جو رستوف کو بالکل موزوں دکھائی دیا، طاری ہو گیا اور اس میں امپراطور کی آواز گونجنے لگی:

"Les hussards de Pavlograd?"* اس نے دریافت کیا۔

"Le reserve, Sire"** آواز سنائی دی — یہ آواز اس مافوق الفطرت آواز کے، جس نے "Les hussards de Pavlograd" کہا تھا، مقابلے میں بالکل بشری معلوم ہوتی تھی۔

زار رستوف کے بالکل بالمقابل آ گیا اور وہیں رک گیا۔ تین روز قبل معائنے کے دوران میں زار کا جو چہرہ دکھائی دیا تھا، اس کے مقابلے میں یہ چہرہ کہیں زیادہ خوبصورت تھا۔ اس سے شگفتگی اور شباب — شباب معصوم کی وہ شعاعیں پھوٹ رہی تھیں کہ جلیل القدر امپراطور کا چہرہ ہونے کے باوجود اس پر چودہ سالہ نوخیز طفل کی شوخی کا گماں ہوتا تھا۔ سکواڈرن کا بے دھیانی سے جائزہ لیتے لیتے امپراطور کی نظریں رستوف کی نظروں سے ٹکرا گئیں اور وہیں ٹھہر گئیں۔ ٹھہرنے کا یہ عمل دو سیکنڈ سے بھی کم عرصے میں مکمل ہو گیا لیکن انھوں نے رستوف کی روح میں ہل چل مچا دی۔ رستوف کی روح میں جو ہل چل بپا تھی، امپراطور اسے سمجھا یا نہیں سمجھا (رستوف کو یہی محسوس ہوا کہ وہ ہر چیز سمجھ گیا ہے) لیکن اس کی نیلی آنکھیں بہرحال دو سیکنڈ رستوف کے چہرے پر مرکوز رہیں۔ ان سے نرم و گداز روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ پھر یک بیک اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں، اچانک اپنے بائیں پاؤں سے اپنے

---

* یہ پاولوگراد ہوزار ہیں؟

** عالی جاہ، محفوظ دستہ

گھوڑے کو ہلکی سی مہمیز لگائی اور اسے سرپٹ دوڑا دیا۔

نوجوان امپراطور کو جب اپنے سامنے فائرنگ کی آواز سنائی دی، اس کے دل میں بنفسِ نفیس میدانِ جنگ میں جانے کی جو آرزو مچل رہی تھی، وہ اس پر قابو نہ پاسکا اور اپنے درباریوں کے احتجاج کے باوجود اس نے تیسرے کالم کو، جس کے وہ عقب میں آرہا تھا، بارہ بجے پیچھے چھوڑا اور ہراول دستوں کی جانب سرپٹ گھوڑا بھگانے لگا۔ تاہم وہ ابھی ہوزاروں تک پہنچ نہ پایا تھا کہ اسے متعدد ایجوٹنٹ مل گئے۔ انھوں نے اسے بتایا کہ معرکہ سر کرلیا گیا ہے۔

اس لڑائی میں اور کچھ تو حاصل نہ ہوا، اتنا ضرور ہوا کہ ایک فرانسیسی سکواڈرن گرفتار کرلیا گیا لیکن اسے دشمن کے خلاف زبردست فتح بنا کر پیش کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زار اور ساری فوج۔ خاص طور پر جب کہ دھواں ابھی تک میدان جنگ پر چھایا ہوا تھا۔ کو یہ یقین ہوگیا کہ فرانسیسی پٹ گئے ہیں اور پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں۔

زار کے گزرنے کے چند منٹ بعد پاولوگرات ڈویژن کو آگے بڑھنے کا حکم ملا۔ رستوف کو زار ایک بار پھر جرمنی کے چھوٹے سے قصبے فش ہاؤ میں نظر آیا۔ قصبے کے تجارتی مرکز میں، جہاں زار کی آمد سے قبل زبردست فائرنگ ہوئی تھی، بے شمار زخمی اور ہلاک شدگان پڑے تھے۔ کسی کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ انھیں وہاں سے ہٹاتا۔ اپنے سٹاف افسروں اور درباریوں کے جیش میں محصور اور اپنی کوتاہ قامت اور کمیت گھوڑی پر، جو اس گھوڑی سے مختلف تھی جس پر اس نے معائنے کے روز سواری کی تھی، سوار زار ایک طرف جھکا، اس نے نہایت نفاست اور سلیقے سے چھوٹی دوربین آنکھوں پر لگائی اور ایک سپاہی کو، جس کا ننگا سر خون میں لتھڑا پڑا تھا، دیکھنے لگا۔ زخمی سپاہی کا جسم اتنا غلیظ، اجڈ اور گھناؤنا تھا کہ رستوف کو زار کو اس کے اتنا قریب دیکھ کر سخت دھچکا محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ زار کے مدور شانے کچھ یوں سکڑ گئے ہیں جیسے کڑاکے کی سردی کی وجہ سے ان پر کپکپی طاری ہوگئی ہو۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا بایاں پاؤں بے اختیار کانپ رہا ہے اور اس کے مہمیز سے بار بار گھوڑی کے پہلو میں ٹھوکے لگ رہے ہیں۔ تاہم گھوڑی اتنے اچھے طریقے سے سدھائی گئی تھی کہ اس پر کچھ اثر نہیں ہورہا تھا، اس نے اپنی جگہ سے مطلق جنبش نہ کی اور لاتعلق وہیں کھڑی رہی۔ ایک ایجوٹنٹ اپنے گھوڑے سے نیچے اترا، اس نے سپاہی کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور اسے سٹریچر پر، جو وہاں لایا گیا تھا، لٹا دیا۔ سپاہی کراہنے لگا۔

"آرام سے، آرام سے، کیا تم ذرا دھیرج سے کام نہیں لے سکتے؟" زار نے کہا۔ بظاہر یہی نظر آرہا تھا کہ سپاہی سے، جو موت کے کنارے پہنچ چکا تھا، زیادہ اسے تکلیف ہورہی ہے اور وہ وہاں سے آگے چل دیا۔

رستوف نے دیکھا کہ زار کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے ہیں اور جب وہ گھوڑی پر سوار وہاں سے رخصت ہو رہا تھا، اس نے اسے تسارتورسکی سے کہتے سنا: "جنگ کتنی بھیانک چیز ہے، کتنی بھیانک!" اور یہی الفاظ اس نے فرانسیسی میں بھی دہرائے۔

ہراول دستے فش ہاؤ سے ذرا ادھر تعینات کیے گئے تھے۔ وہاں سے دشمن کی صفیں صاف دکھائی دیتی تھیں۔ ذرا

گولی چلتی اور غنیم پیچھے ہٹ جاتا۔ دن بھر یہی سلسلہ چلتا رہا۔ ہراول تک زار کا شکریہ پہنچا دیا گیا۔ انعامات و اکرامات کے وعدے کیے گئے اور جوانوں کو ووڈکا کا دگنا راشن دیا گیا۔ کیمپ میں جگہ جگہ الاؤ روشن رہے اور سپاہیوں کے گیت گزشتہ شب کی نسبت زیادہ شادمانی سے گونجتے رہے۔

اس رات دینی سوف نے میجر کی حیثیت سے اپنی ترقی کا جشن منایا۔ رنگ رلیوں کے اختتام پر رستوف نے، جو پہلے ہی خوب ڈٹ کرمے نوشی کر چکا تھا، امپراطور کا جام صحت تجویز کیا۔ ''لیکن یہ جام صحت ہمارے 'ہمہ مقتدر امپراطور' کے لیے، جیسا کہ انھیں سرکاری تقریبات پر کہا جاتا ہے، نہیں ہوگا،'' اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا، ''بلکہ ہم یہ جام صحت اپنے زار کے لیے، جو نیک نفس، مسحور کن اور عظیم انسان ہیں، نوش کریں گے۔ آئیں، ہم ان کا اور اس فتح کا، جو ہمیں فرانسیسیوں پر یقیناً حاصل ہوگی، جام (صحت) پئیں۔''

''اگرچہ ہم ان کے خلاف پہلے ہی برسرپیکار ہو چکے ہیں،'' اس نے کہا، ''اور ہم نے شون گرابرن میں ان کا کوئی لحاظ نہیں کیا تھا۔ اب جب کہ وہ بنفس نفیس ہماری قیادت فرما رہے ہیں، ہم کیا کچھ نہیں کر گزریں گے! ہم ہنستے مسکراتے ان کی خاطر موت کو گلے لگا لیں گے۔ کیوں حضرات، ہم ایسا کر گزریں گے نا؟ شاید میرا بات کرنے کا طریقہ صحیح نہیں ہے۔ میں پی بھی تو بہت چکا ہوں۔ لیکن میں محسوس کچھ اسی طرح کر رہا ہوں اور آپ کے احساسات بھی ایسے ہی ہیں۔ آئیں، الیکساندر اول کا جام صحت نوش کریں! ہرّا!''

''ہرّا!'' افسروں نے جوش و خروش سے نعرہ لگایا۔

تجربے کار اور معمر کرسٹن کا نعرہ بیس سالہ رستوف کے نعرے سے کسی طور کم پرجوش اور کم پرخلوص نہیں تھا۔

جب افسر جام صحت پی چکے اور اپنے اپنے گلاس پاش پاش کر چکے، کرسٹن نے نئے گلاس بھرے، اس نے اپنا گلاس ہاتھ میں پکڑا اور صرف قمیص اور برجس پہنے جوانوں کے الاؤوں کی طرف چل پڑا۔ وہاں اس نے اپنی لمبی سفید مونچھوں اور کھلے سینے کے ساتھ بہ اندازِ شاہانہ اپنا بازو اوپر اٹھا کر لہرایا۔

''جوانو، اپنے 'ہمہ مقتدر امپراطور' کا اور دشمنوں کے خلاف فتح کا جام پیو! ہرّا!'' اس نے تجربے کار ہوزاروں کے بلند آہنگ انداز سے چلا کر کہا۔

اس کے اردگرد ہوزاروں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا اور ان سب نے اس کے بلند بانگ اعلان کے جواب میں زور زور سے نعرے لگائے اور تالیاں بجائیں۔

جب رات بھیگ گئی اور تمام لوگ اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے گئے، دینی سوف نے اپنے چوڑے چکلے ننھی ہاتھ سے اپنے چہیتے رستوف کے کندھے پر تھپکی دی اور کہا:

''جب لڑائی کے دوران میں میرے شیر کو محبت کرنے کے لیے اور کوئی نہ ملا، وہ زار ہی کے عشق میں گرفتار ہو گیا۔''

''دینی سوف، اس کا مذاق نہ اڑاؤ!'' رستوف نے چلا کر کہا۔ ''یہ بہت خوبصورت اور ارفع و اعلیٰ جذبہ ہے،

چنانچہ—"

"مان گئے، دوست، مان گئے۔ میں بھی اس میں برابر کا شریک ہوں اور اسے پسند کرتا ہوں—"

"نہیں، تم نہیں سمجھ سکو گے!"

اور رستوف اٹھا اور الاؤوں کے مابین بے مقصد گھومنے لگا۔ وہ جاگتے یہ خواب بننے لگا کہ مرنے میں کتنا لطف آئے گا۔ اس نے یہ خواب نہیں بنا کہ وہ اپنی جان کیسے بچائے گا (اس میں اس قسم کا خواب بُننے کا یارا نہ تھا)، بلکہ وہ تو محض اپنے امپراطور کی آنکھوں کے سامنے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کرنا چاہتا تھا۔ وہ درحقیقت زار، روسی افواج کے کروفر اور آئندہ فتح کی امید کے عشق میں گرفتار ہو گیا تھا اور اوسٹرلٹس کی جنگ سے قبل کے ان یادگار ایام کے دوران میں صرف اسی اکیلے پر اس قسم کے احساسات حاوی نہیں تھے بلکہ نوے فیصد جوان اپنے زار اور روسی فوج کے کروفر کے سحر میں اپنا آپ بھول چکے تھے، البتہ ان کا جذبہ اتنا شدید نہیں تھا جتنا کہ رستوف کا تھا۔

11

اگلے روز زار فش ہاؤ میں مقیم رہا۔ اس کا طبیب ویلیئے (Villier) متعدد مرتبہ اس کے پاس بلایا گیا۔ ہیڈ کوارٹر اور نزدیکی سپاہ میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ امپراطور کی طبیعت ناساز ہے۔ اس کے حاشیہ نشینوں نے اطلاع دی کہ اس نے نہ کچھ کھایا ہے اور نہ پیا ہے اور اس نے رات بھی بے آرامی میں گزاری ہے۔ اس کی اس ناسازیٔ طبع کا سبب یہ بتایا گیا کہ ہلاک شدگان اور زخمیوں کے منظر نے اس کی حساس روح کو شدید طور پر متاثر کیا ہے۔

سترہ تاریخ کو پو پھٹے ایک فرانسیسی افسر، جو صلح کا علم لہراتے امپراطور سے ملاقات کی درخواست کرتا آیا تھا، بیرونی چوکیوں سے فش ہاؤ پہنچایا گیا۔ اس افسر کا نام ساواغی (Savary) تھا۔ زار کو ابھی ابھی نیند آئی تھی۔ چنانچہ ساواغی کو انتظار کرنا پڑا۔ اسے دوپہر کے وقت امپراطور کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ پرنس دلگوروکوف کی معیت میں فرانسیسیوں کی بیرونی چوکیوں کی جانب روانہ ہو گیا۔

افواہ پھیل گئی کہ ساواغی صلح کا پیغام اور امپراطور الیکساندر اور نپولین کے مابین ملاقات کی تجویز لے کر آیا ہے۔ ساری فوج کو یہ خبر سن کر کہ ذاتی ملاقات کی تجویز مسترد کر دی گئی ہے، بہت خوشی اور فخر محسوس ہوا۔ نپولین کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لیے فش ہاؤ کے فاتح پرنس دلگوروکوف کو ساواغی کے ہمراہ بھیجا گیا تا کہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ عام توقعات کے برعکس مذاکرات کی یہ پیشکش صلح کی سچی خواہش پر مبنی ہے یا نہیں۔

دن ڈھلے دلگوروکوف واپس آ گیا۔ وہ سیدھا زار کے پاس پہنچا اور کافی دیر تک وہیں رہا۔

اٹھارہ اور انیس نومبر کو فوج نے دو یوم کی پیش قدمی کی۔ مختصر جھڑپ کے بعد دشمن کی بیرونی چوکیاں پسپا ہو گئیں۔ انیس تاریخ کی دوپہر کو فوج کے اعلیٰ ترین حلقوں میں بڑا جوش و خروش اور زبردست مصروفیت دیکھنے کو ملی۔ یہ کیفیت بیس تاریخ کی صبح تک جاری رہی اور اسی تاریخ کو اوسٹرلٹس کا یادگار معرکہ برپا ہوا۔

انیس تاریخ کی دوپہر تک مصروفیت اور جوشیلی گفتگو امپراطوروں کے ہیڈ کوارٹر تک محدود رہی۔ وہیں افسران آتے جاتے رہے اور وہیں سے ایجوٹنٹوں کو مختلف سمتوں میں بھیجا جاتا رہا۔ دوپہر کے بعد مصروفیت کا رخ کوتوزوف اور مختلف ڈویژنل کمانڈروں کے ہیڈ کوارٹروں کی طرف ہوگیا۔ شام ہوتے ہوتے ایجوٹنٹوں نے اس کا دائرہ فوج کے گوشے گوشے تک پھیلا دیا۔ انیس تاریخ کی رات اسی ہزار پر مشتمل متحدہ سپاہ کھلے آسمان تلے اپنی عارضی قیام گاہوں سے اٹھی، مختلف آوازوں کی بھنبھناہٹ گونجنے لگی اور چھ میل طویل مجمع حرکت کرنے لگا۔

جو پرزور مصروفیت امپراطوروں کے ہیڈ کوارٹر میں بوقت صبح شروع ہوئی تھی اور جس نے ان تمام حرکات و سکنات کو، جو وسیع و عریض علاقے میں دور دور تک نمایاں ہونے لگی تھیں، مہمیز دی تھی، کسی عظیم الجثہ ٹاور کلاک کی مرکزی چرخی کی پہلی جنبش کی مانند تھی۔ ایک کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری اور یوں ساری چرخیاں متحرک ہو جاتی ہیں اور بتدریج ان کی رفتار تیز اور تیز سے تیز تر ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ بیرم (levers) اور دندانے دار چرخ (cogwheels) اپنے اپنے کام کا آغاز کر دیتے ہیں، گجر (chimes) بجنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، ہندسے نمایاں ہو جاتے ہیں اور اس ابتدائی فعلیت کے شاخسانے کے طور پر سوئیاں معینہ وقت کے حساب سے آگے بڑھنے لگتی ہیں۔

عسکری مشین کی ساخت کلاک کی ساخت کے بالکل مشابہ ہوتی ہے۔ جس طرح کلاک میں جب ایک مرتبہ قوت محرکہ فراہم کر دی جائے، وہ لازماً اور بلا روک ٹوک آخری نتیجے کی طرف بڑھنا شروع ہو جاتی ہے، اس طرح عسکری مشین کے کل پرزوں کو جب ایک مرتبہ متحرک کر دیا جاتا ہے، وہ بلا مدافعت اپنے منطقی انجام کی طرف رواں دواں ہو جاتے ہیں۔ لیکن کلاک کے پرزوں کی طرح عسکری مشین کے تمام پرزے بیک وقت متحرک نہیں ہوتے۔ ابتداً بعض پہیے اور چرخیاں غیر متحرک رہتی ہیں۔ قوت متحرکہ فراہم ہونے پر مختلف چرخیاں اپنے دھروں سے رگڑ کھانے لگتی ہیں، دندانے گرفت مضبوط کرنے لگتے ہیں، اور چرخیاں اپنی تیز حرکت کے دوران میں گھر رگھرر کی آوازیں پیدا کرنا شروع کر دیتی ہیں لیکن قریبی چرخی بالکل ساکن اور غیر متحرک رہتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ سینکڑوں سال تک اس کی یہی کیفیت رہے گی۔ لیکن پھر ایک لمحہ آتا ہے کہ بیرم اسے بھی اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور بیرم کے اس عمل کے ردعمل کے طور پر یہ چرخی چرچراتی ہے، گھومتی ہے اور پھر عام حرکت میں، جس کا نتیجہ اور مقصد اس کی سمجھ سے بالا ہوتا ہے، حصہ لینے لگتی ہے۔

جس طرح کلاک میں بے شمار پہیوں اور چرخیوں کے پیچیدہ عمل کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ وقت کا اظہار کرنے کے لیے سوئیاں آہستہ آہستہ اور معین رفتار کے ساتھ متحرک ہو جاتی ہیں بعینہ اوسٹرلٹس کی جنگ میں — تین امپراطوروں کی نام نہاد جنگ — ایک لاکھ ساٹھ ہزار روسیوں اور فرانسیسیوں کی پیچیدہ مصروفیات — ان کے جذبوں، امنگوں، امیدوں، حسرتوں، اہانتوں، مصیبتوں، تعلیوں، اندیشوں اور گرم جوشیوں — کا نتیجہ بصورت شکست برآمد ہوا۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیں کہ انسانی تاریخ کے ڈائل پر سوئی مدھم رفتار سے جنبش کرنے لگی۔

پرنس آندرے اس روز ڈیوٹی پر تھا اور وہ مسلسل کمانڈر انچیف کی خدمت میں حاضر رہا۔

شام چھ بجے کوتوزوف امپراطور کے ہیڈ کوارٹر گیا۔ وہاں وہ کچھ دیر زار کے ساتھ گفتگو کرتا رہا اور اس کے بعد دربار کے گرینڈ مارشل[29] کاؤنٹ طالسطائی سے ملنے چلا گیا۔

بلکونسکی نے اس وقفے سے فائدہ اٹھایا اور آئندہ کی کارروائی کے بارے میں تفصیلات معلوم کرنے کی غرض سے دلگوروکوف کے پاس چلا گیا۔ پرنس آندرے کو احساس ہوا تھا کہ کوتوزوف کسی چیز کے بارے میں متفکر اور ملول ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ امپراطور کے ہیڈ کوارٹر میں تعینات لوگ اس (کوتوزوف) سے مطمئن نہیں ہیں اور انھوں نے اس کے بارے میں جو تیوَر اختیار کر رکھا ہے، اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ انھیں ان باتوں کا، جن کے بارے میں دوسرے لاعلم ہیں، علم ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ دلگوروکوف سے بات کرنا چاہتا تھا۔

''کیا حال ہے، mon cher*'' دلگوروکوف نے کہا۔ وہ بلبین کے ساتھ بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ''کل جشن بپا ہوگا۔ تمھارے صاحب کے مزاج کیسے ہیں؟ کبیدہ خاطر ہیں؟''

''میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ وہ کبیدہ خاطر ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی بات سنی جائے۔''

''خوب، جنگی کونسل میں ان کی بات سنی گئی تھی اور جب بھی وہ معقول نقطۂ نظر بیان کریں گے، ان کی بات سنی جائے گی۔ لیکن اب جب کہ ہمارے مشترکہ حملے کے امکان نے بوناپارت کے اوسان خطا کر دیے ہیں، تاخیری حربے اختیار کرنے اور ٹال مٹول کی پالیسی پر عمل کرنے کی اجازت۔ نہیں، یہ ناممکن ہے۔''

''لیکن آپ تو بوناپارت سے ملاقات کر چکے ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''اس کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ اس نے آپ پر کیا نقش چھوڑا تھا؟''

''ہاں، میری اس سے ملاقات ہوئی تھی اور مجھے یقین ہو چکا ہے کہ وہ جتنا ہمارے مشترکہ حملے کے امکان سے خائف ہے، اتنا اور کسی چیز سے نہیں،'' دلگوروکوف نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ نپولین سے ملاقات کے بعد اس نے جو نتائج اخذ کیے تھے، وہ اس کے نزدیک بہت وقیع تھے۔ ''اگر وہ لڑائی سے خوف زدہ نہیں ہے، پھر اس نے یہ ملاقات کرنے کی خواہش کا اظہار کیوں کیا؟ مذاکرات کا ڈول کیوں ڈالنا چاہا؟ اور سب سے بڑھ کر اس نے پسپائی کیوں اختیار کی جب کہ پسپائی اس کے طریقۂ جنگ کے بالکل برعکس ہے؟ میری بات مانو، وہ خوف زدہ ہے، عمومی معرکے کے تصور سے اس کی جان نکلی جا رہی ہے۔ اس کے لیے فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی ہے۔ میرے ان الفاظ کو یاد رکھو۔''

''لیکن یہ فرمائیں کہ وہ دیکھنے میں کیسا نظر آتا ہے؟'' پرنس آندرے نے دوبارہ استفسار کیا۔

''یہ آدمی سرمئی اوورکوٹ پہنتا ہے۔ اسے اس بات کا بہت فکر رہتا ہے کہ اسے 'یور میجسٹی' کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے یا نہیں۔ اور جب میں نے اسے اس نوع کا کوئی خطاب مرحمت نہ کیا، اسے سخت تکلیف پہنچی۔ بس وہ اسی

* مائی ڈیر

قسم کا آدمی ہے، اس کے علاوہ کچھ نہیں،'' دلگوروکوف نے بلبین کی طرف مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں بزرگ کوتوزوف کا غیر مشروط احترام کرتا ہوں لیکن اس کے باوجود میں یہ کہوں گا،'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''کہ اب جب کہ وہ بلاشبہ ہماری مٹھی میں ہے اگر ہم انتظار کرتے رہے اور اسے یونہی بچ نکلنے یا اپنے ساتھ دغا کھیلنے کا موقع فراہم کرتے رہے، ہم سے بڑا احمق اور کوئی نہیں ہوگا۔ نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ ہمیں سواروف اور اس کا یہ اصول کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے: 'مخالف فریق کو کبھی یہ موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ آپ پر جنگ میں حملہ آور ہوسکے، اس سے کہیں بہتر یہ بات ہے کہ آپ خود اس پر چڑھائی کر دیں۔' میری بات پلے باندھ لو کہ لیت ولعل سے کام لینے اور معاملات کو معرض تعویق میں ڈالنے والے بزرگوں کے تجربے کے مقابلے میں نوجوانوں کی توانائی کہیں بہتر رہبر ورہنما ہے۔''

''لیکن ہم کس مقام سے اس پر یورش کریں گے؟ میں نے آج بیرونی چوکیوں کا دورہ کیا تھا اور اس بات کا تعین کرنا کہ اس کی افواج کی بڑی تعداد کہاں متعین ہے، ناممکن دکھائی دیا،'' پرنس آندرے نے کہا۔

اس نے خود حملے کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ دلگوروکوف کے سامنے اس کی تفصیل بیان کرنا چاہتا تھا۔

''اس چیز کی کوئی خاص اہمیت نہیں،'' دلگوروکوف بیچ میں بول پڑا۔ وہ عجلت سے اٹھا اور میز پر جو نقشہ پڑا تھا، اسے کھولنے لگا۔ ''ہر ناگہانی صورت حال کا توڑ سوچ لیا گیا ہے۔ اگر اس نے برن کے مقام پر پاؤں جمانے کی کوشش کی...''

پرنس آندرے اس منصوبے کی خامیاں بیان کرنے اور اپنے منصوبے کی وضاحت کرنے لگا۔ اس کا منصوبہ اتنا ہی اچھا ہوسکتا تھا جتنا کہ وے روٹر کا تھا لیکن مصیبت یہ تھی کہ اس کا منصوبہ ابھی تک اس کے اپنے ذہن میں تھا۔ جونہی پرنس آندرے وے روٹر کے منصوبے کی خامیاں اور اپنے منصوبے کی خوبیاں گنوانے لگا، پرنس دلگوروکوف نے اس کی بات سنی ان سنی کرنا شروع کر دیا اور بے دھیانی سے نقشے کی طرف نہیں بلکہ پرنس آندرے کے چہرے کی طرف تکنے لگا۔

''خیر، آج کوتوزوف کے ہاں جنگی کونسل کا اجلاس ہوگا، تم وہاں اپنے خیالات کا اظہار کر لینا،'' دلگوروکوف نے کہا۔

''میرا بھی یہی ارادہ ہے،'' پرنس آندرے نے نقشے سے پرے ہٹتے ہوئے کہا۔

''حضرات، آپ کس بات پر جھنجھلا رہے ہیں؟'' بلبین نے پوچھا۔ وہ اب تک چپ چاپ ان کی گفتگو سنتا، مسکراتا اور جی ہی جی میں محظوظ ہوتا رہا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اسے اب ٹھٹھا اڑانے کی سوجھی ہے۔ ''کل فتح نصیب ہو یا شکست کا سامنا کرنا پڑے، روسی فوج کی سج دھج میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ کوتوزوف کے علاوہ ایک بھی روسی ایسا نہیں جس کے پاس کسی کالم کی کمان ہو۔ ہمارے کمانڈر کون ہیں؟ ہر[30] جنرل ومپ فن، کاؤنٹ لانژغوں،[31] پرنس لک ٹین شٹائن، پرنس ہوہن لوئے اور آخر میں پرش پرش، جس کا نام دوسرے پولستانی ناموں جیسا ہے۔''

''چپ رہ، چغل خور، خدا کے چور،'' دلگوروکوف نے کہا۔ ''تم نے جو کہا، درست نہیں ہے۔ دوروسیوں 'جرنل' میں چاول۔ میلورادووچ اور دختوروف ۔۔ کے پاس کالموں کی کمان ہے اور اگر تیسرے ۔کاؤنٹ آراک چیف۔ کے اعصاب کمزور نہ ہوتے، تو اسے بھی یہ کمان مل جاتی۔''

''میرا خیال ہے کہ میخائیل الاری اوناوچ (کوتوزوف) واپس تشریف لے آئے ہیں،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''حضرات، میں آپ کی خوش بختی اور کامیابی کے لیے دعا گو ہوں،'' اس نے مزید کہا اور وہ دلگوروکوف اور بلبین سے مصافحہ کرنے کے بعد رخصت ہوگیا۔

جب وہ ہیڈ کوارٹر کی طرف واپس جا رہے تھے، پرنس آندرے کوتوزوف سے، جو گاڑی میں اس کے برابر مہر بلب بیٹھا تھا، پوچھے بنا نہ رہ سکا: ''کل کی لڑائی کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

کوتوزوف نے اپنے ایجوٹنٹ پر گمبھیر نگاہ ڈالی، اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر کہا:

''میرا خیال ہے کہ ہم اس معرکے میں پٹ جائیں گے۔ میں نے کاؤنٹ طالسطائی سے یہی بات کہی تھی اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے امپراطور کے گوش گزار کر دیں۔ تمھارے خیال میں اس نے کیا جواب دیا ہوگا؟ 'جرنل، میں چاول اور کٹلٹ کھانے میں مصروف ہوں۔ رہے عسکری امور، تم جانو یا تمھارا کام ...'، مجھے بالکل یہی جواب ملا تھا۔''

12

اسی شام نو بجے کے ذرا بعد وے روٹر اپنا منصوبہ لے کر کوتوزوف کے ہیڈ کوارٹر پہنچا جہاں جنگی کونسل کا اجلاس منعقد ہونا تھا۔ تمام کالموں کے کمانڈروں کو وہیں بلا لیا گیا تھا اور پرنس باگ راتیاں کے علاوہ، جس نے آنے سے انکار کر دیا تھا، باقی تمام حضرات مقررہ وقت پر پہنچ گئے۔

وے روٹر، جو مجوزہ لڑائی کے منصوبوں کا پوری طرح ذمے دار تھا، اپنی پھرتی اور جوش وخروش کے باعث، سوئے سوئے اور اکھڑے اکھڑے کوتوزوف کے مقابلے میں، جو بادل ناخواستہ جنگی کونسل کے چیئرمین اور قائد کا کردار ادا کر رہا تھا، زبردست تضاد پیش کر رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وے روٹر اپنے آپ کو ایک ایسی تحریک کا، جسے اب کسی صورت دبایا نہیں جا سکتا تھا، سربراہ تصور کرتا تھا۔ اس کی کیفیت اس گھوڑے کی تھی جو ایک ایسی گاڑی میں، جس پر وزنی سامان لدا ہو اور جو تیز رفتاری سے پہاڑی سے نیچے اتر رہی ہو، جتا ہو۔ گاڑی کو وہ کھینچ رہا تھا یا گاڑی اسے آگے دھکیل رہی تھی، اس کے متعلق وہ کچھ بتانے سے قاصر تھا۔ تاہم وہ اس کے ساتھ سرپٹ بھاگا ضرور جا رہا تھا اور اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یہ سوچ سکتا کہ اس کی یہ نقل وحرکت اسے کہاں لے جائے گی۔

وے روٹر اس روز دو مرتبہ غنیم کے ہراول دستوں کا جائزہ لینے گیا تھا۔ اس نے اپنے جائزے کی رپورٹ پیش کرنے اور متعلقہ تفصیلات بیان کرنے کے لیے دوبارہ دونوں امپراطوروں سے ملاقات کی تھی۔ اس کے بعد وہ اپنے دفتر

گیا تھا۔ وہاں اس نے فوجوں کی تقسیم اور مختلف مقامات پر ان کی تعیناتی کے بارے میں جرمن زبان میں تفصیلات قلم بند کرائی تھیں۔ اب اس کا جوڑ جوڑ درد کر رہا تھا اور وہ اسی حالت میں کوتوزوف کے ہاں پہنچ گیا تھا۔

لگتا تھا کہ وہ اپنے ہی خیالات میں اتنا غلطاں و پیچاں ہے کہ اسے کمانڈر انچیف کی تعظیم کرنا بھی یاد نہ رہا۔ اس نے اس کو ٹوک دیا اور خود سرعت رفتاری اور غیر واضح انداز سے بولنے لگا۔ اس نے اس شخص کی طرف، جس سے وہ مخاطب تھا، آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور اس سے جو سوالات دریافت کیے گئے، وہ ان کے جوابات دینے میں ناکام رہا۔ اس کے کپڑوں پر کیچڑ کے چھینٹے پڑے ہوئے تھے اور اس کا یہ انداز یہ غمازی کر رہا تھا کہ وہ تھکن سے نڈھال ہے، ذہنی طور پر پریشان ہے اور اس کی حالت قابل رحم ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کا رویہ متکبرانہ اور خود اعتمادی سے بھرپور تھا۔

کوتوزوف اوسٹرلٹس کے نزدیک کسی نواب کے قلعے میں، جو نہ تو اتنا بڑا تھا اور نہ اس سے کسی قسم کی امارت کا اظہار ہوتا تھا، مقیم تھا۔ کشادہ ڈرائنگ روم میں، جسے کمانڈر انچیف کے دفتر میں تبدیل کر دیا گیا تھا، کوتوزوف، وے روٹر اور جنگی کونسل کے ارکان جمع تھے۔ وہ چائے پی رہے تھے اور جنرل باگ راتیاں کا انتظار کر رہے تھے تاکہ کارروائی شروع کی جا سکے۔ آخر کار باگ راتیاں کا اردلی آیا اور اس نے اطلاع دی کہ "پرنس تشریف نہیں لا سکیں گے۔" پرنس آندرے اس بارے میں کمانڈر انچیف کو مطلع کرنے اندر آیا۔ اس سے قبل وہ کمانڈر انچیف سے کونسل کے اجلاس میں شرکت کی اجازت حاصل کر چکا تھا۔ چنانچہ اس اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ کمرے میں ہی موجود رہا۔

"چونکہ باگ راتیاں نہیں آ رہے، ہمیں کارروائی کا آغاز کر دینا چاہیے۔" وے روٹر نے تیزی سے اٹھتے اور اس میز کی طرف، جس پر برن کے قرب و جوار کا خاصا بڑا نقشہ کھلا پڑا تھا، بڑھتے ہوئے کہا۔

کوتوزوف آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کی وردی کے بٹن کھلے تھے، چنانچہ اس کی فربہ گردن کالر سے یوں باہر نکلی ہوئی تھی جیسے وہ بندھن سے چھٹکارا پانے کی فکر میں ہو۔ اس کے بوڑھے، موٹے اور لجلجے ہاتھ متناسب انداز سے کرسی کے بازوؤں پر ٹکے ہوئے تھے۔ وہ تقریباً سویا ہوا تھا، اسے جب وے روٹر کی آواز سنائی دی، اس نے بڑی مشکل سے اپنی واحد آنکھ کھولی۔

"ہاں، ہاں، شروع کر دیں۔ پہلے ہی خاصی دیر ہو چکی ہے۔" اس نے اظہار اتفاق کے طور پر اپنی گردن کو جنبش دی۔ اس کے ساتھ ہی اس کا سر نیچے ڈھلک گیا اور اس کی آنکھ بند ہو گئی۔

اگر اوائل میں کونسل کے ارکان کا یہ خیال تھا کہ کوتوزوف سونے کا صرف مکر کر رہا ہے، اب خواندگی کے دوران میں اس کی ناک سے جو آوازیں نکلنا شروع ہوئیں، وہ اس امر کا کافی ثبوت فراہم کر رہی تھیں کہ فوجوں کی تقسیم و ترتیب یا اس قسم کی کسی دوسری چیز کے بارے میں اپنی حقارت کا اظہار کرنے کی نسبت وہ کہیں زیادہ سنجیدہ معاملے میں مشغول ہے۔ وہ ایک ایسی انسانی ضرورت کی، جس کے آگے بند نہیں باندھا جا سکتا، تشفی میں مصروف

تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ سو رہا تھا، حقیقتاً گہری نیند میں کھو چکا تھا۔

وے روٹر، ایک ایسے شخص کی طرح، جسے ایک منٹ بھی ضائع کرنا گوارا نہیں ہوتا، ذرا آگے بڑھا، اس نے کوتوزوف پر ایک نظر ڈالی اور جب اسے یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ واقعی خواب خرگوش کے مزے لے رہا ہے، اس نے ایک کاغذ اٹھایا اور سپاٹ اور یک رنگی آواز میں آئندہ جنگ میں فوجوں کی جو تقسیم و ترتیب ہونا تھی، بیان کرنے لگا۔ اس نے اپنے منصوبے کا جو عنوان سوچا تھا، وہ بھی پڑھ دیا:

''کوبیل نٹس اور سوکول نٹس[32] کے عقب میں غنیم کی پوزیشنوں پر یورش کرنے والی فوج کی تقسیم و ترتیب۔''

تقسیم و ترتیب خاصی پیچ در پیچ اور گھمبیر تھی۔ اصل مسودہ جرمن زبان میں تھا اور اس میں کہا گیا تھا:

''اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ غنیم کا میمنہ جنگلاتی پہاڑیوں پر مقیم ہے اور اس کا میسرہ ان جوہڑوں سے، جو کہ کوبیل نٹس اور سوکول نٹس کے گرد و پیش میں پائے جاتے ہیں، بہت آگے تک پھیلا ہوا ہے، اور مزید یہ کہ اس کے میسرے کے سامنے ہمارا میمنہ پھیلا ہوا ہے، اس لیے اگر غنیم کے اس موخر الذکر پہلو پر حملہ کیا جائے، تو یہ ہمارے حق میں جائے گا، خاص طور پر اس صورت میں کہ اگر ہم سوکول نٹس اور کوبیل نٹس کے دیہات پر قبضہ جمالیں، پھر ہم غنیم کے پہلو پر بلہ بول سکیں گے، یوں ہم شلاپانٹس اور ٹوراسا جنگل کے مابین میدانی علاقے میں اس کا تعاقب کر سکیں گے اور اس طریقے سے شلاپانٹس اور بیلوونٹس کی تنگناؤں سے، جنھوں نے غنیم پر پردہ تان رکھا ہے، دور رہ سکیں گے... اس مقصد کے پیش نظر یہ ضروری ہے کہ... فرسٹ کالم آگے بڑھتا ہے... سیکنڈ کالم آگے بڑھتا ہے... تیسرا کالم آگے بڑھتا ہے...'' وغیرہ، وغیرہ، وے روٹر نے پڑھ کر سنایا۔

معلوم ہوتا تھا کہ جرنیل ان پیچیدہ ہدایات کو بادلِ ناخواستہ سن رہے ہیں۔ جنرل بکس ہیوڈن، جس کا قد دراز اور بال بھورے تھے، دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں شمع فروزاں کو گھور رہی تھیں اور وہ یوں دکھائی دے رہا تھا کہ وہ نہ صرف کچھ سن ہی نہیں رہا بلکہ وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ کوئی یہ سمجھے کہ وہ سن رہا ہے۔ وے روٹر کے بالکل سامنے جنرل میلورادووچ، جس کا چہرہ سرخ و سپید تھا اور جس کی فراخ اور روشن آنکھیں، جو پوری طرح کھلی ہوئی تھیں، وے روٹر پر مرکوز تھیں، عسکری انداز سے بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ گھٹنوں پر اور کہنیاں پہلوؤں پر تھیں۔ وہ اپنے کندھے اچکائے اور مونچھوں کو بل دے کر اوپر اٹھائے ہوئے تھا۔ اس نے زبان نہ کھولنے کی ضد باندھ رکھی تھی اور وہ ٹکٹکی باندھے وے روٹر کے چہرے کو دیکھ رہا تھا اور اس نے اپنی یہ نظریں صرف اسی وقت وہاں سے ہٹائیں جب آسٹروی چیف آف سٹاف اپنی خواندگی مکمل کر چکا۔ تب اس نے بامعنی انداز سے دوسرے جرنیلوں کی طرف دیکھا، لیکن اس کی ان معنی خیز نظروں سے یہ اندازہ لگانا ناممکن تھا کہ وہ فوجوں کی تقسیم و ترتیب کے منصوبے سے متفق ہے یا غیر متفق، مطمئن ہے یا غیر مطمئن۔ وہ شخص، جو وے روٹر کے قریب ترین بیٹھا ہوا تھا، کاؤنٹ لانژغوں تھا۔ اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی یہ مسکراہٹ اس کے مخصوص جنوبی فرانسیسی چہرے سے ایک لحظے کے لیے بھی غائب نہ ہوئی۔ وہ لگاتار اپنی ہی انگلیوں کو۔ جن کے سروں سے وہ اپنی نسوار کی طلائی

ڈبیا کو، جس پر تصویر چہ نقش تھا، بطور شغل گھما پھرا رہا تھا۔ تکے جا رہا تھا۔ ایک طویل ترین جملے کے عین درمیان میں اس نے ڈبیا کو گھمانا پھرانا بند کیا، گردن اوپر اٹھائی اور مخاصمانہ شائستگی سے، جو اس کے باریک باریک ہونٹوں کے آخری کناروں تک پھیلی ہوئی تھی، وے روٹر کوٹو کا کیونکہ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ لیکن آسٹروی جرنیل نے قطعاً کوئی توقف نہ کیا اور اپنی ہی دھن میں پڑھتا رہا۔ غیظ وغضب سے اس کی جبیں شکن آلود ہوگئی اور اس نے اپنی کلائیاں یوں جھٹکیں جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو: ''تم اپنی رائے بعد میں دے لینا، فی الحال مہربانی فرماؤ، نقشے پر دیکھو اور میری بات سنو۔'' لانژغوں نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور بوکھلاہٹ کے عالم میں میلورادووچ کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے وضاحت طلب کر رہا ہو لیکن جب اس کی نظریں معنی خیز نظروں سے، جن میں کوئی معانی نہیں تھے، چار ہوئیں، اس نے آزردگی سے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں اور دوبارہ نسوار کی ڈبیا آگے پیچھے گھمانے لگا۔

''جغرافیے کا درس۔'' وہ یوں بڑبڑایا جیسے محض اپنے آپ سے بڑبڑا رہا ہو، پھر بھی اس کی آواز اتنی بلند ضرور تھی کہ دوسروں کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔

پرزے بزیوسکی نے مودب لیکن باوقار شائستگی کے ساتھ اپنے اس کان کی، جو وے روٹر کے قریب ترین تھا، لوؤں کو چھوا۔ وہ بالکل اس شخص کی طرح، جو سراپا توجہ بنا ہوا ہو، دکھائی دے رہا تھا۔ پست قامت دختوروف، جو چہرے مہرے سے ثابت قدم، محنتی اور منکسر المزاج دکھائی دیتا تھا، وے روٹر کے بالکل سامنے بیٹھا تھا۔ وہ کھلے ہوئے نقشے کے اوپر جھکا ہوا تھا اور بڑے انہماک اور ایمانداری سے فوجوں کی تقسیم وترتیب اور اجنبی علاقے کا مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے متعدد مرتبہ وے روٹر کو اپنے الفاظ، جو وہ سن نہیں سکا تھا، دہرانے اور دیہاتوں کے مشکل نام دوبارہ پڑھنے کے لیے کہا۔ وے روٹر تعمیل کرتا رہا اور دختوروف انھیں کاغذ پر تحریر کرتا رہا۔

جب خواندگی، جو ایک گھنٹے سے زیادہ عرصے تک جاری رہی تھی، مکمل ہوگئی، لانژغوں نے ایک مرتبہ پھر نسوار کی ڈبیا ادھر ادھر لڑھکانے کا شغل ترک کیا اور وے روٹر یا کسی بھی دوسرے شخص کی جانب خاص طور پر دیکھے بغیر کہا: ''فوجوں کی تقسیم وترتیب کے اس منصوبے پر عمل کرنا کارے دارد ہوگا کیونکہ اس میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہمیں غنیم کی پوری افواج کی پوزیشن کا علم ہے حالانکہ حقیقتاً ہمیں اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں کیونکہ وہ لگاتار حرکت کر رہی ہیں۔'' لانژغوں کے اعتراضات میں بڑا وزن تھا لیکن یہ بالکل عیاں تھا کہ ان اعتراضات کے ذریعے اس کا بڑا مقصد وے روٹر پر۔ جس نے افواج کی تقسیم وترتیب سے متعلق اپنا منصوبہ کچھ اس قسم کی خود اعتمادی سے پیش کیا تھا جیسے وہ مدرسے کے طالب علموں کے گروہ سے مخاطب ہو۔ یہ واضح کرنا تھا کہ اس کا واسطہ احمقوں سے نہیں بلکہ ایسے اشخاص سے پڑا ہے جو عسکری اور جنگی امور کے بارے میں اسے ایک دو باتیں سکھا سکتے ہیں۔

جب وے روٹر کی، جس کے لہجے میں اکتا دینے کی حد تک یکسانیت تھی، آواز آنا بند ہوگئی، کوتوزوف نے یوں آنکھیں کھول دیں جیسے پن چکیا چکی کی گھر گھر کی آواز بند ہونے پر اچانک بیدار ہو جاتا ہے۔ اس نے لانژغوں کے اعتراضات یوں سنے جیسے وہ یہ کہہ رہا ہو: ''تم ابھی تک وہی بے تکی اور واہیات باتیں کیے جا رہے

ہو۔'' اس نے جھٹ پٹ اپنی آنکھیں دوبارہ بند کرلیں اور اپنی گردن کو پہلے سے بھی زیادہ نیچے ڈھلک جانے دیا۔

لانژغوں کی پوری کوشش یہ تھی کہ منصوبے کے خالق کی حیثیت سے وہ وے روٹر کی عسکری انا کو زیادہ سے زیادہ ٹھیس پہنچائے۔ اس نے یہ دلیل پیش کی کہ ''ہوسکتا ہے کہ بوناپارٹ اتنا موقع ہی نہ دے کہ ہم اس پر حملہ کر سکیں، اس کے برعکس وہ خود با آسانی ہم پر حملہ کرسکتا ہے۔ یوں وہ ہماری پوری تقسیم وترتیب کو درہم برہم کرسکتا اور اسے بیکار بنا سکتا ہے۔'' وے روٹر نے کسی بھی اعتراض کو جوتی کی نوک پر نہ لکھا اور جواب میں محض حقارت آمیز انداز سے مسکراتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ مخالفانہ تنقید سے، خواہ وہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، نپٹنے کے لیے پوری طرح تیاری کر کے آیا تھا۔

''اگر اس میں حملہ کرنے کی ہمت ہوتی، وہ آج کر چکا ہوتا،'' اس نے بھنا کر جواب دیا۔

''دوسرے الفاظ میں آپ کا خیال یہ ہے کہ اس میں اتنی سکت نہیں؟'' لانژغوں نے دریافت کیا۔

اس کے پاس زیادہ سے زیادہ چالیس ہزار کی نفری ہے،'' اس نے ایک ایسے طبیب کی طرح کہا جس سے کوئی نرس اس کے طریقۂ علاج کی وضاحت طلب کر رہی ہو۔

''اس صورت میں وہ ہمارے حملے کا انتظار کر کے اپنی تباہی کو دعوت دے رہا ہے۔'' لانژغوں نے اپنے چہرے پر پراسرار اور طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دیا اور ایک بار پھر تائید کے لیے میلورادووچ کی، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، جانب دیکھا۔

لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت میلورادووچ کا دھیان کسی اور طرف ہے۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ جرنیل کس مسئلے پر بحث کر رہے ہیں۔

"ma foi"*، اس نے کہا، ''کل میدان جنگ میں سب کچھ سامنے آجائے گا۔''

وے روٹر پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ سے یہ عندیہ مل رہا تھا کہ جن امور کے بارے میں وہ خود قائل ہو چکا تھا اور دونوں ''ہمہ مقتدر'' امپراطوروں کو قائل کر چکا تھا، انھیں ان روسی جرنیلوں کے سامنے ثابت کرنا اور ان پر ان کے اعتراضات کا جواب دینا اس کے نزدیک بالکل احمقانہ اور عجیب بات ہوگی۔

''غنیم نے اپنے مختلف کیمپوں کے الاؤ بجھادیے ہیں اور وہاں سے مسلسل شور وغل کی صدائیں دے رہی ہیں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ یا تو وہ پسپائی اختیار کر رہے ہیں اور یہ واحد چیز ہے جس سے ہمیں کوئی اندیشہ لاحق ہونا چاہیے، یا پھر وہ اپنی پوزیشنیں تبدیل کر رہے ہیں۔'' وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ ''وہ بے شک ٹوراسا جنگل میں نئی پوزیشنیں قائم کرلیں، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا بلکہ ہم اچھی خاصی کوفت سے بچ جائیں گے۔ ہمارا منصوبہ جزئیات سمیت جوں کا توں رہے گا اور اس میں مو برابر فرق نہیں آئے گا۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' پرنس آندرے نے کہا۔ وہ خاصی دیر تک اپنے شکوک وشبہات کا اظہار کرنے کے

---

* well (خیر)

لیے موقع کی تلاش میں تھا۔

کوتوزوف جاگ گیا۔ اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا اور ادھر ادھر جرنیلوں کو دیکھا۔

''حضرات، فوجوں کی جو تقسیم و ترتیب ہو چکی ہے، اب اس میں کل ـــ بلکہ یوں کہیے کہ آج کیونکہ شب آدھی سے زیادہ بیت چکی ہے ـــ کوئی ترمیم و تنسیخ نہیں ہو سکتی۔'' اس نے کہا۔ ''آپ اس کے بارے میں سن چکے ہیں۔ ہم سب اپنے اپنے فرائض ادا کریں گے اور ماقبل از جنگ اس سے بڑھ کر اور کوئی چیز اہم نہیں...'' اس نے کچھ توقف کیا اور کہا ''کہ رات اچھی طرح سویا جائے۔''

وہ اپنی جگہ سے کچھ اس طرح ہلا کہ جیسے وہ اٹھنا چاہتا ہو۔ جرنیلوں نے ذرا جھک کر سلام کیا اور واپس چلے گئے۔ رات نصف سے زیادہ بھیگ چکی تھی۔ پرنس آندرے باہر نکل آیا۔

❖

جنگی کونسل کے اجلاس نے، جس میں پرنس آندرے کو اپنی توقعات کے برعکس اپنے خیالات ظاہر کرنے کا موقع نہ ملا تھا، اسے قدرے تذبذب اور بے چینی میں مبتلا کر دیا۔ سچا کون تھا ـــ دلگوروکوف اور وے روٹریا کوتوزوف، لانژغوں اور دوسرے جو حملے کے منصوبے سے متفق نہیں تھے؟ وہ اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ''لیکن سوال یہ ہے کہ کیا کوتوزوف کے لیے براہ راست زار کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرنا واقعی ناممکن تھا؟ کیا مختلف انداز سے اس کا اہتمام نہیں کیا جا سکتا تھا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ذاتی اور درباری ضروریات کے پیش نظر ہزاروں انسانوں کی زندگی کو، میری زندگی کو، خود میری زندگی کو'' اس نے سوچا ''معرضِ خطر میں ڈال دیا جائے؟... ہاں، یہ عین ممکن ہے کہ میں کل ہلاک ہو جاؤں۔''

موت کے اس تصور پر اس کے ذہن میں ایکا ایکی انتہائی دور افتادہ اور انتہائی ذاتی نوعیت کی یادیں سر اٹھانے لگیں۔ اسے اپنے باپ اور بیوی سے اپنی آخری ملاقات یاد آئی، اپنی بیوی کے ساتھ محبت کے ابتدائی ایام یاد آئے، اس نے اس کے پاؤں بھاری ہونے کے متعلق سوچا اور اسے اس پر اور اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔ اس کی ذہنی حالت سخت ہیجانی اور بوجھل ہوتی جا رہی تھی اور وہ اسی کیفیت میں اس مکان سے، جس میں اسے اور نیس وتسکی کو ٹھہرایا گیا تھا، باہر نکل گیا اور اس کے سامنے چکر لگانے لگا۔

یہ دھندلی رات تھی اور چاند کی روشنی پر اسرار انداز سے دھند میں سے چھن چھن کر آ رہی تھی۔ ''ہاں، کل، کل،'' اس نے سوچا۔ ''شاید یہ کل میری زیست کا آخری دن ہو۔ پھر نہ یہ یادیں ہوں گی اور نہ میرے لیے ان کے کوئی معانی ہوں گے۔ شاید کل ـــ یقیناً کل ـــ میرا ماتھا ٹھنک رہا ہے کہ کل پہلی مرتبہ، جو کچھ مجھ سے ہو سکا، مجھے کر کے دکھانا ہوگا۔'' اور اس کے ذہن میں لڑائی، شکست، ایک مقام پر گھمسان کے رن اور تمام کمانڈروں کے تذبذب کا خاکہ ابھرنے لگا اور آخر کار وہ مسرت بخش لمحہ، جس کا اس نے اتنا طویل انتظار کیا تھا، جب نپولین کی معرکہ تولوں

میں کامیابی کی طرح اسے بھی فیصلہ کن کامرانی حاصل ہو گی، اس کے ذہن کی گرفت میں آ ہی گیا۔ وہ ثابت قدمی اور کسی قسم کے الجھاؤ کے بغیر کوتوزوف، وے روٹر اور امپراطوروں کے سامنے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ اس کے نظریات کی صحت سبھی کو متاثر کرتی ہے لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ خود ایک رجمنٹ، ایک ڈویژن کی کمان اس شرط کے ساتھ سنبھال لیتا ہے کہ کوئی شخص بھی اس کے احکام میں دخل اندازی نہیں کرے گا۔ وہ اس ڈویژن کو فیصلہ کن مقام پر لے جاتا ہے اور تن تنہا فتح سے ہمکنار ہو جاتا ہے۔ ''اور موت اور مصائب کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' ایک دوسری آواز آئی۔ لیکن پرنس آندرے نے اس آواز کو نظر انداز کر دیا اور اپنی کامیابیوں اور کامرانیوں کے ہوائی قلعے تعمیر کرتا رہا۔ اس سے اگلی لڑائی کی منصوبہ بندی وہ اکیلا ہی کرتا ہے۔ کہنے کو تو وہ کوتوزوف کا صرف ایجوٹنٹ ہے لیکن وہ سب کچھ تن تنہا کرتا ہے۔ کوتوزوف کو الگ کر دیا جاتا ہے اور اس کی جگہ اسے تعینات کر دیا جاتا ہے... ''خیر اور پھر؟'' دوسری آواز پوچھتی ہے۔ ''فرض کرو کہ تم درجن بار زخمی یا ہلاک ہونے سے بچ جاتے ہو، تمھارے ساتھ غداری بھی کوئی شخص نہیں کرتا... تب کیا؟...''[33] ''خیر، تب...'' پرنس آندرے خود ہی جواب دیتا ہے۔ ''میں جاننا نہیں چاہتا۔ تاہم اگر میں نام کمانے کی آرزو کرتا ہوں، عوام میں مقبول ہونا اور ان سے ستائش کرانا چاہتا ہوں، صرف انھی چیزوں کی تمنا کرتا ہوں، ان کے علاوہ کسی اور چیز کی خواہش نہیں کرتا، اور صرف انھیں کی خاطر زندگی بتا رہا ہوں، پھر ان کے لیے مجھے موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ ہاں، صرف انھیں چیزوں کے لیے! میں کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔ لیکن میرے خدایا، اگر مجھے نام و نمود اور انسانوں کی تحسین کے علاوہ کسی اور چیز کی قطعاً کوئی پروا نہیں، پھر میں کیا کر سکتا ہوں؟ موت، زخم، خاندان کا اتلاف — مجھے کسی سے خوف محسوس نہیں ہوتا۔ اگرچہ متعدد ہستیاں میرے لیے بے حد عزیز اور بیش بہا ہیں — اور ان میں سب سے عزیز تریں باپ، بہن اور بیوی ہیں — آپ کو یہ بات خواہ کتنی ہی بھیانک اور غیر فطری کیوں نہ محسوس ہو، میں ان سب کی بلا تاخیر بھینٹ چڑھا سکتا ہوں بشرطیکہ مجھے شان و شکوہ اور ناموری کا ایک لمحہ نصیب ہو جائے، انسانوں پر فتح و ظفر حاصل ہو جائے اور ان انسانوں کی، جنھیں میں نہ جانتا ہوں اور نہ کبھی جان پاؤں گا، محبت مل جائے... ان انسانوں کی، جو یہاں موجود ہیں، محبت سے بہرہ ور ہو جاؤں۔'' اس نے ان آوازوں پر، جو کوتوزوف کے مکان کے احاطے سے آ رہی تھیں، کان لگاتے ہوئے سوچا۔

جوار دلی سامان باندھ رہے تھے، یہ آوازیں انھیں کی تھیں۔ ان میں سے ایک، غالباً کوچوان، کوتوزوف کے ادھیڑ عمر باورچی (اس کا نام تیت تھا اور پرنس آندرے اسے جانتا تھا) سے دل لگی کر رہا تھا۔

''تیت، اوہ، تیت!''

''کیا ہے بے؟'' تیت نے پوچھا۔

''تیت، بھوسا جھاڑ پچھیت!'' دل لگی باز نے کہا۔

''بھاڑ میں جاؤ!'' باورچی کی آواز سنائی دی لیکن اردلیوں اور نوکروں چاکروں کے قہقہوں کے شور و غل

میں دب گئی۔

''بہرحال کچھ بھی ہو، واحد چیز جس سے مجھے پیار ہے اور جس کی میرے دل میں قدر ہے، یہ ہے کہ میں تمام انسانوں پر فتح ونصرت حاصل کروں۔ میں صرف اس پراسرار قوت اور شان وشکوہ کی، جو اس دھند میں میرے اوپر منڈلا رہی ہے، قدر کرتا ہوں۔''

13

اسی رات رستوف باگراتیاں کے دستے کے سامنے ایک پلٹن کے ہمراہ بیرونی چوکیوں کے آس پاس گشتی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے ہوزاروں کو دو دو کی صورت میں بیرونی چوکیوں کے قرب وجوار میں متعین کیا گیا تھا اور وہ خود گھوڑے پر سوار کبھی ادھر اور کبھی ادھر آ جا رہا تھا۔ زبردست غنودگی اسے اپنی گرفت میں لے رہی تھی اور وہ اس پر غالب آنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ اپنے پیچھے وسیع وعریض میدان میں اسے اپنی فوج کے الاؤ، جو مختلف مقامات پر روشن کیے گیے تھے، نظر آرہے تھے۔ دھند میں یہ الاؤ ہلکی ہلکی لو دے رہے تھے۔ اس کے سامنے دھندلی تاریکی تھی۔ پورے غور سے دیکھنے کے باوجود اسے اس دھندلی تاریکی میں کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بعض اوقات ظلمت کا پردہ ذرا کھسک جاتا لیکن اگلے ہی لمحے گھٹاٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ دور فاصلے پر، جہاں خیال تھا کہ غنیم مقیم ہوگا، اسے یوں نظر آتا کہ ننھی منی روشنیاں ٹمٹما رہی ہیں، لیکن پھر یہی ٹمٹماہٹ اسے فریب نظر معلوم ہونے لگتی۔ اس کی آنکھیں بار بار بند ہو رہی تھیں۔ اس کے تصور میں پہلے زار، پھر دینی سوف اور اس کے بعد ماسکو کی تصاویر ابھرنے لگتیں۔ وہ جھٹ پٹ اپنی آنکھیں کھول دیتا اور اسے معاً اپنے سامنے صرف اس گھوڑے کا، جس پر وہ سوار تھا، سر اور کان نظر آتے یا پھر ہوزاروں کی شکلیں دکھائی دیتیں لیکن وہ بھی صرف اس وقت جب وہ ان سے صرف چھ قدم دور رہ جاتا۔ لیکن دور فاصلے پر وہی دھندلی تاریکی چھائی ہوتی تھی۔

''کیوں نہیں؟ ایسا باآسانی ہوسکتا ہے،'' رستوف خیالی گھوڑے دوڑا رہا تھا، ''کہ زار کی مجھ سے اچانک مڈھ بھیڑ ہو جائے اور وہ مجھے حکم دیں، جیسا کہ وہ کسی بھی افسر کو دے سکتے ہیں کہ 'جاؤ اور دیکھو کہ ادھر کیا ہو رہا ہے؟' اس قسم کی متعدد کہانیاں سننے میں آئی ہیں کہ ان کی اتفاقیہ کسی افسر سے ملاقات ہوگئی اور انھوں نے اسے اپنے سٹاف میں شامل کرلیا۔ اگر وہ مجھے اپنے اڑوس پڑوس کسی اسامی پر تعینات کرلیں، کتنا لطف آئے گا! میں ان کی سلامتی کا پورا پورا خیال رکھوں گا، انھیں سب کچھ سچ سچ بتایا کروں گا اور وہ لوگ، جو ان سے غداری کے مرتکب ہوتے ہیں، ان کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑا کروں گا۔'' اور امپراطور سے اپنی محبت اور جاں نثاری کا جو خاکہ اس نے اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا، اس کو رنگین بنانے کے لیے اس نے کسی دشمن یا غدار جرمن کا تصور کیا جسے نہ صرف ہلاک کر کے اسے مسرت ہوگی بلکہ زار کی نگاہوں کے عین سامنے وہ اسے تھپڑ مار کر راحت محسوس کرے گا۔

''میں کہاں ہوں؟ ارے ہاں، گشت پر۔ پاس ورڈ اور واچ ورڈ۔ شافٹ، اول موٹس۔ یہ کتنی مایوس کن

بات ہے کہ کل ہمیں محفوظ دستے کی حیثیت سے رکھا جائے گا...'' اس نے سوچا۔ ''میں درخواست کروں گا کہ مجھے محاذ پر بھیج دیا جائے۔ زار سے ملاقات کرنے کا میرے پاس شاید یہی واحد موقع ہوگا... ہاں، کچھ دیر میں مجھے یہاں سے چھٹی مل جائے گی اور گشت پر میری جگہ اور کوئی آدمی آ جائے گا۔ میں ایک بار پھر یہاں کا گھوڑے پر چکر لگاتا ہوں۔ جب میں واپس آؤں گا، میں سیدھا جرنیل کے پاس جاؤں گا اور ان سے عرض کروں گا۔'' وہ زین پر سیدھا تن کر بیٹھ گیا اور دوبارہ اپنے ہوزاروں کا معائنہ کرنے چل دیا۔ اسے احساس ہوا کہ مطلع پہلے کی نسبت روشن تر ہو رہا ہے۔ بائیں طرف اسے ڈھلان کی جھلک نظر آ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا پہلو روشن ہو گیا ہے۔ اس کے بالمقابل ٹیلا تھا۔ یہ دیوار کی طرح سیدھا تھا اور اس کے اوپر سفید پٹی تھی۔ رستوف کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہے: ''کیا یہ جنگل کے بیچ میں کوئی کھلا علاقہ ہے جسے چاند نے اجاگر کر دیا ہے؟ برف ہے جو ابھی پگھلی نہیں؟ یا سفید مکانات ہیں؟'' اسے یہ بھی خیال آیا کہ اسے اس سفید پٹی پر کوئی چیز حرکت کرتی نظر آئی ہے۔ ''یہ لازماً برف ہوگی... وہ دھبا... دھبا... unetache*... نتاشا، میری ہمشیرہ، اس کی سیاہ آنکھیں... نا۔ تاشا... جب میں اسے بتاؤں گا کہ میری زار سے ملاقات ہوئی تھی، اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی نہیں رہ جائیں گی؟ نتاشا... میری شمشیر پکڑنا...''

''جناب دائیں طرف رہیں، ادھر جھاڑیاں ہیں،'' رستوف کو ایک ہوزار کی آواز سنائی دی۔ وہ نیند کے عالم میں گھوڑے پر سوار اس ہوزار کے قریب سے گزر رہا تھا۔

ناگہاں رستوف نے اپنا سر، جو تقریباً گھوڑے کی ایال پر گر پڑا تھا، اوپر اٹھایا اور اپنا گھوڑا ہوزار کے برابر روک لیا۔ وہ بچگانہ غنودگی سے، جو اس پر غالب آ گئی تھی، پیچھا نہ چھڑا سکا۔ ''لیکن میں سوچ کیا رہا تھا؟ مجھے بھولنا نہیں چاہیے۔ میں زار سے کیسے بات کروں گا؟ نہیں، یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو مسئلہ فردا ہے۔ ارے، ہاں، نتاشا... شمشیر... اڑادو... تہ تیغ کردو... کسے؟ ہوزار، ارے ہاں، مونچھوں والے ہوزار... مونچھوں والا ہوزار خیابان تورسکایا[34] پر جا رہا تھا... میں اس کے متعلق بھی سوچ رہا تھا، عین گریف کے مکان کے سامنے... بوڑھا گریف... اخاہ، اور دینی سوف اچھا انسان ہے۔ لیکن یہ سب بکواس ہے۔ فی الحال اصل بات یہ ہے — کہ زار یہاں ہے! اس نے مجھے کیسے دیکھا تھا، وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اسے ہمت نہ ہوئی... نہیں، یہ میں تھا جس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ لیکن یہ سب بکواس ہے۔ اصل بات یہ ہے... مجھے اہم بات، جو میں سوچ رہا تھا، بھلانا نہیں چاہیے... ہاں، نا۔ تاشا... شمشیر... ہاں، ہاں، ہاں، بالکل یہی بات ہے!'' اور ایک مرتبہ پھر اس کا سر گھوڑے کی ایال پر ڈھلک گیا۔ ایکا ایکی اسے یوں لگا کہ کوئی شخص اس پر گولی چلا رہا ہے۔ ''کیا؟ کیا؟ کیا؟... ان کی گردنیں اڑادو۔ کیا؟'' اس نے جاگتے ہوئے کہا۔

عین اس لمحے جب رستوف نے آنکھیں کھولیں، اسے اپنے سامنے غنیم کی سمت کافی دیر تک انسانوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ ان آوازوں کو سن کر اس کے اور اس کے قریب دوسرے ہوزار کے گھوڑے

---

* a spot (دھبا)۔ فرانسیسی میں U ne (ایک) مونث اشیا کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

نے اپنی کنوتیاں کھڑی کر لیں۔ جس علاقے سے آوازیں آ رہی تھیں، ادھر دفعتاً پہلے آگ کا ایک شعلہ بھڑکا اور بجھ گیا، اس کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا، پھر چوتھا، اور جدھر فرانسیسی تھے، ادھر پہاڑی پر آگیں ہی آگیں روشن ہو گئیں اور چیخنے چلانے کی آوازیں بلند سے بلند تر ہونے لگیں۔ رستوف کو فرانسیسی سنائی دی لیکن وہ الفاظ کی شناخت نہ کر سکا۔ بے شمار آوازوں کا شور وغل اتنا زیادہ تھا کہ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کون کیا کہہ رہا ہے۔ وہ صرف ''آ۔آ۔آ۔آ!'' اور ''را۔را۔را۔را!'' ہی سن سکتا تھا۔

''یہ کیا ہے؟ تمھارا کیا خیال ہے؟'' رستوف نے اپنے قریب ہوزار کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''یہ سب کچھ غنیم کے کیمپ میں ہو رہا ہوگا؟ یقیناً؟''

ہوزار نے کوئی جواب نہ دیا۔

''ہونہہ! تمھیں کچھ سنائی نہیں دے رہا؟'' رستوف نے جواب کے لیے مناسب انتظار کرنے کے بعد کہا۔

''جناب عالی، کچھ کہا نہیں جا سکتا،'' ہوزار نے جھجکتے جھجکتے جواب دیا۔

''سمت کے اعتبار سے تو غنیم ہی ہونا چاہیے،'' رستوف نے اپنی بات دہرائی۔

''ممکن ہے وہی ہو، ممکن ہے کہ کچھ بھی نہ ہو،'' ہوزار نے کہا۔ ''اندھیرا بہت زیادہ ہے... خبردار، ہوشیار!'' اس نے اپنے گھوڑے سے، جس کی بے چینی میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہو رہا تھا، چلا کر کہا۔

رستوف کا اپنا گھوڑا ابھی خاصا بے قرار ہو رہا تھا اور وہ یخ بستہ زمین پر ٹاپیں مار رہا تھا، اس کی کنوتیاں کھڑی ہو گئی تھیں اور وہ ادھر، جدھر آگیں روشن تھیں، دیکھے جا رہا تھا۔ شور وغل بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ اس عمومی غل غپاڑے میں، جو صرف ہزاروں افراد پر مشتمل فوج میں ہی برپا ہو سکتا ہے، جذب ہو رہا تھا۔ آگوں کا یہ سلسلہ طویل سے طویل تر ہوتا چلا گیا۔ یہ لازماً فرانسیسی سپاہ کا پڑاؤ ہوگا۔ رستوف کی آنکھوں سے نیند اب کافور ہو چکی تھی۔ غنیم کے پر جوش قہقہوں اور مسرت وشادمانی سے بھرپور بلند آوازوں نے اس کے جذبات کو متلاطم کر دیا تھا۔

"Vive l' Empereur... l' Empereur!"*، اسے واضح طور پر سنائی دیا۔

''یہ زیادہ دور نہیں ہوں گے، شاید ندی کے اس پار ہی ہوں،'' اس نے ہوزار سے کہا۔

ہوزار نے کوئی جواب نہ دیا، صرف آہ بھری۔ پھر وہ غصے کے عالم میں اپنا گلا کھنکارنے لگا۔

انھیں گشت کی لکیر کے ساتھ ساتھ گھوڑے کے اچھی خاصی رفتار سے بھاگنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ اچانک تاریکی میں سے ہوزاروں کے کسی سارجنٹ کی شکل نمودار ہوئی، وہ آدمی نہیں، عظیم الجثہ ہاتھی نظر آتا تھا۔

''جناب عالی، جرنیل صاحبان!'' گھوڑے پر سوار سارجنٹ نے رستوف کے قریب جا کر کہا۔

رستوف کا دھیان ابھی تک ادھر، جدھر آگیں روشن ہو رہی اور شور وشغب کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، لگا ہوا تھا۔ وہ ادھر دیکھتا سارجنٹ کے ساتھ ان متعدد اشخاص سے، جو بیرونی چوکیوں کے برابر آ رہے تھے، ملنے چل پڑا۔

* امپراطور زندہ باد

ان میں سے ایک سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ پرنس باگ راتیاں اور پرنس دلگوروکوف اپنے ایجوٹنٹوں کی معیت میں غنیم کے کیمپ میں روشنیوں اور غل غپاڑے کے عجیب وغریب منظر کی تفتیش کرنے آئے تھے۔ رستوف گھوڑے پر سوار پرنس باگ راتیاں کے پاس پہنچا اور اس کی خدمت میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس کے بعد وہ ایجوٹنٹوں میں جا شامل ہوا اور جو کچھ جرنیل کہہ رہے تھے، اسے بغور سننے لگا۔

''میری بات کا یقین کریں،'' پرنس دلگوروکوف پرنس باگ راتیاں سے کہہ رہا تھا۔ ''یہ کچھ بھی نہیں، بس چال ہے۔ وہ پسپا ہو چکا ہے اور ہمیں مغالطہ دینے کے لیے اپنے عقبی دستوں کو آگیں جلانے اور ہنگامہ ہاؤ ہو برپا کرنے کا حکم دے گیا ہے۔''

''میں سمجھتا ہوں کہ یہ بات نہیں ہے،'' باگ راتیاں نے کہا۔ ''میں نے انھیں آج شام اسی ٹیلے پر دیکھا تھا۔ اگر انھوں نے پسپائی اختیار کی ہوتی، وہ وہاں سے بھی پیچھے ہٹ چکے ہوتے۔ آفیسر،'' اس نے رستوف کی جانب متوجہ ہو کر کہا، ''ان کی گشتی چوکیاں اور دستے ابھی تک وہیں ہیں؟''

''یوئر ایکسی لینسی، آج شام تک تو وہیں تھے لیکن اس وقت صورت حال کیا ہے، میں اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں چند ہوزار ساتھ لے جاؤں اور معلوم کر آؤں؟'' رستوف نے پوچھا۔

باگراتیاں ہچکچایا اور اس نے جواب دینے سے پیشتر دھند میں رستوف کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

''اچھا... جاؤ اور دیکھ آؤ،'' اس نے مختصر توقف کے بعد جواب دیا۔

''بہت اچھا، جناب عالی۔''

رستوف نے اپنے گھوڑے کو مہمیز لگایا۔ اس نے سارجنٹ فید چنکو اور دو دوسرے ہوزاروں کو بلایا، انھیں اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا، جس طرف سے شور وغل کی آوازیں آ رہی تھیں (اور یہ آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں)، ادھر گھوڑا بھگانے اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ اس پراسرار، پرخطر اور دور دراز سمت تین ہوزاروں کی معیت میں جاتے رستوف کی خوف سے جان بھی نکلی جا رہی تھی اور خوشی سے باچھیں بھی کھلی جا رہی تھیں کیونکہ اس سے پیشتر کوئی بھی ادھر نہیں گیا تھا۔ باگ راتیاں نے پہاڑی کی چوٹی سے چلا کر اسے کہا کہ وہ ندی کے پار نہ جائے لیکن اس نے یوں ظاہر کیا کہ جیسے اسے یہ حکم سنائی ہی نہیں دیا اور کہیں رکے بغیر آگے اور مزید آگے چلتا گیا۔ وہ مسلسل جھاڑیوں کو درخت اور تنگ وتاریک گھاٹیوں کو انسان سمجھتا رہا لیکن ہر بار اسے اپنی غلطی کا احساس ہوتا رہا۔ جب ایک مرتبہ وہ پہاڑی سے نیچے اتر گیا، اسے نہ اپنی اور نہ غنیم کی کوئی آگ دکھائی دی تاہم فرانسیسیوں کا شور وغل پہلے کی نسبت بلند تر اور واضح تر ہوتا چلا گیا۔ وادی میں اسے اپنے سامنے دریا سے ملتی جلتی چیز نظر آئی لیکن جب وہ اس کے قریب پہنچا، معلوم ہوا، یہ دریا نہیں، سڑک ہے۔ یہاں پہنچ کر اس نے گھوڑے کو لگام دی۔ اب اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ سڑک پر چلتا رہے یا اسے پار کر جائے اور سیاہ میدان میں گزرتا پہاڑی پر چڑھ جائے۔ سڑک دھند میں چمک رہی تھی اور اس پر چلنا کم پرخطر تھا کیونکہ اگر کوئی شخص اس پر آ رہا ہوتا، اسے دیکھنا آسان ہوتا۔

''میرے پیچھے پیچھے آؤ!'' اس نے حکم دیا اور گھوڑا دوڑاتے اس مقام کی طرف، جہاں شام کو فرانسیسیوں نے گشتی چوکیاں قائم کی تھیں، پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

''جناب عالی، وہ ادھر ہے!'' ایک ہوزار نے پیچھے سے پکار کر کہا۔

پیشتر اس کے کہ رستوف اس دھندلے سایے کو، جو ایکا ایکی دھند میں سے نمودار ہوا تھا، پہچان سکتا، روشنی چمکی اور بندوق چلنے کی آواز سنائی دی۔ ایک گولی روتی اور سنسناتی فضا میں بلند ہوئی اور پلک جھپکنے میں دائرہ سماعت سے باہر نکل گئی۔ دوسری بندوق کا نشانہ خطا گیا لیکن اس کے پیالے[35] سے روشنی ضرور نمودار ہوئی۔ رستوف نے اپنا گھوڑا موڑا اور سرپٹ پچھلی جانب بھاگنے لگا۔ وقفے وقفے سے مزید چار بار بندوق دغنے کی آواز سنائی دی اور چار مزید گولیاں ایک دوسری سے مختلف انداز سے سنسناتی آگے گزر اور دھند میں غائب ہوگئیں۔ رستوف نے اپنے گھوڑے کی، جسے اسی کی طرح فائرنگ نے نہال کر دیا تھا، لگام کھینچی اور اس کی رفتار ڈھیلی کر دی۔ ''اور چلاؤ، چلاؤ، چلاؤ'' اس کے باطن میں کوئی مسرور و مطمئن آواز کہہ رہی تھی لیکن مزید کوئی گولی نہ آئی۔

جب تک وہ باگ راتیاں کے قریب نہ پہنچ گیا، وہ اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑانے سے احتراز کرتا رہا۔ اور جب وہ جرنیل کے قریب پہنچا، وہ سلیوٹ کے لیے اپنا ہاتھ اٹھا کر ٹوپی تک لے گیا۔

دلگوروکوف ابھی تک اصرار کیے جا رہا تھا کہ فرانسیسی پسپا ہو چکے ہیں اور محض ہمیں دھوکا دینے کے لیے انھوں نے الاؤ روشن کر رکھے ہیں۔

''اس سے کیا ثابت ہوا؟'' جب رستوف واپس آیا وہ کہہ رہا تھا۔ ''وہ پسپا ہو سکتے ہیں اور اپنی گشتی چوکیاں چھوڑ سکتے ہیں۔''

''پرنس، صاف ظاہر ہے کہ وہ ابھی تک نہیں گئے'' باگ راتیاں نے کہا۔ ''کل صبح تک انتظار کریں، کل ہمیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

''یوئر ایکسی لینسی، گشتی چوکیاں ابھی تک پہاڑی پر موجود ہیں، بالکل انھی مقامات پر، جہاں وہ کل شام تھیں،'' رستوف نے رپورٹ دی۔ وہ نیچے جھک گیا لیکن سلیوٹ کے لیے اس کا ہاتھ ابھی تک اوپر اٹھا ہوا تھا۔ اس مہم، خاص طور پر گولیوں کی آوازوں نے، اس کے چہرے پر جو پُرمسرت تبسم بکھیر دیا تھا، وہ اسے چھپانے میں ناکام رہا تھا۔

''خوب! خوب!'' باگ راتیاں نے کہا۔ ''آفیسر، تمھارا شکریہ۔''

''یوئر ایکسی لینسی،'' رستوف نے کہا۔ ''میں کچھ عرض کر سکتا ہوں؟''

''کیا چاہتے ہو؟''

''کل میرا اسکواڈرن محفوظ دستہ قرار دے دیا جائے گا۔ میری درخواست ہے کہ مجھے فرسٹ سکواڈرن میں شامل کر دیا جائے۔''

''کیا نام ہے تمھارا؟''

''کاؤنٹ رستوف۔''

''اخاہ، بہت خوب۔ تم بطور اردلی افسر میرے ساتھ رہ سکتے ہو۔''

''تم الیا آندریچ کے صاحبزادے ہو؟'' دلگورکوف نے پوچھا۔

رستوف نے کوئی جواب نہ دیا۔

''یورُ ایکسی لینسی، میں اسے پکی بات سمجھوں۔''

''میں حکم جاری کردوں گا۔''

''عین ممکن ہے کہ کل مجھے پیغام پہنچانے کے لیے امپراطور کی خدمت میں روانہ کردیا جائے،'' رستوف نے سوچا۔ ''شکر ہے خداوند کا!''

❖

غنیم کے کیمپ میں جو روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں اور وہاں سے جو شور وغل کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، اس کی وجہ یہ تھی کہ جب فوجیوں کو نپولین کا حکم پڑھ کر سنایا جا رہا تھا، وہ بہ نفسِ نفیس گھوڑے پر سوار عارضی قیام گاہوں میں آ گیا تھا۔ جب جوانوں نے اسے دیکھا، انھوں نے پرال کے گچھے توڑ مروڑ کر مشعلیں بنالیں، وہ اس کے آگے پیچھے بھاگنے اور "Vivel,Empereur" کے نعرے بلند کرنے لگے۔ نپولین نے جو حکم جاری کیا تھا، وہ درج ذیل ہے:

جوانو! الم کے مقام پر آسٹروی سپاہ کو جو شکست ہوئی تھی، اس کا انتقام لینے روسی فوج تمھارے خلاف پیش قدمی کرتی آ رہی ہے۔ یہ وہی بٹالینیں ہیں جنھیں تم نے ہولابرون[36] کے مقام پر ہزیمت سے دوچار کیا تھا اور جن کا تم اس وقت سے تعاقب کرتے کرتے یہاں پہنچ گئے ہو۔ جس پوزیشن پر ہم قابض ہیں، وہ بہت مستحکم اور مضبوط ہے۔ اگر انھوں نے دائیں جانب سے مجھے اپنے گھیرے میں لینے کی کوشش کی، ان کا اپنا ایک بازو میری زد میں آ جائے گا۔ جوانو، میں خود تمھاری بٹالینوں کی قیادت کروں گا۔ اگر تم نے اپنی روایتی جرأت اور شجاعت سے غنیم کی صفوں میں افراتفری اور انتشار پیدا کر دیا، میں تمھیں گولہ باری کی زد میں نہیں آنے دوں گا۔ لیکن اگر ایک ثانیے کے لیے بھی ہمیں یہ شبہ ہوا کہ فتح ہمارے ہاتھ سے نکلی جا رہی ہے، تم دیکھو گے کہ تمھارا امپراطور غنیم کی فائرنگ کا سامنا کرنے سب سے آگے نکل آیا ہے۔ چنانچہ فتح کے بارے میں کسی بھی قسم کی بے یقینی کو قطعاً ہوا نہیں ملنا چاہیے اور امروز تو یہ اور بھی ضروری ہے کیونکہ آج فرانس کی پیادہ فوج کا عزّ و وقار، جس سے ہماری قوم کا عزّ و وقار وابستہ ہے، خطرے میں ہے۔

زخمیوں کے ہٹانے کے بہانے صفوں کو قطعاً درہم برہم نہ ہونے دیا جائے۔ آج ہر جوان کے قلب و ذہن میں یہ خیال پوری طرح جاگزیں ہو جانا چاہیے کہ ہمیں انگلستان کے ان بھاڑے کے ٹٹوؤں کو شکست فاش

سے دوچار کرنا ہے کیونکہ ان کے قلوب میں ہماری قوم کے خلاف نفرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اس فتح سے ہماری مہم اپنے اختتام کو پہنچ جائے گی اور ہم واپس اپنے سرمائی صدر مقام چلے جائیں گے۔ وہاں وہ تازہ دم دستے، جنھیں اس وقت فرانس میں بھرتی کیا جا رہا ہے، ہمارے ساتھ شامل ہو جائیں گے۔ پھر میں جو صلح نامہ طے کروں گا، وہ میری قوم کے، تمھارے اور خود میرے شایانِ شان ہوگا۔

14

صبح کے پانچ بج چکے تھے لیکن رات ہنوز خاصی تاریک تھی۔ قلب، محفوظہ اور باگراتیاں کا میمنہ ابھی تک حرکت میں نہیں آیا تھا۔ تاہم میسرے کی پیادہ سپاہ، گھڑسوار فوج اور توپ خانے کے دستے بیدار ہو چکے تھے اور تیاریوں میں جت گئے تھے۔ اس میسرے نے پہاڑیوں سے اتر کر فرانسیسی میمنے پر حملہ کرنا اور منصوبے کے مطابق اسے بوہیمیا[37] کے کوہستانوں میں دھکیلنا تھا۔ پڑاؤ میں جو جگہ جگہ الاؤ روشن کیے گئے تھے، ان میں ہر قسم کی الابلا اور فالتو اشیا پھینک دی گئیں اور یوں جو دھواں اٹھا، وہ آنکھوں میں چبھنے لگا۔ فضا سرد اور تاریک تھی۔ افسران شتابی سے چائے انڈیل اور ناشتہ ٹھونس رہے تھے۔ جوانوں نے الاؤوں کے گرد جمگھٹا کر رکھا تھا۔ وہ رس چبا رہے اور اپنے آپ کو گرم کرنے کے لیے پاؤں سے زمین پر ٹھوکریں مار رہے تھے۔ وہ عارضی جھونپڑیاں، کرسیاں، میزیں، پہیے، تسلے، غرضیکہ ہر وہ چیز، جس کی انھیں ضرورت نہیں رہی تھی یا جسے وہ اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے، آگ میں جھونک رہے تھے۔

آسٹروی فوج کے گائیڈ، جنھوں نے ہراول دستوں کے مابین پیغام رسانی کے فرائض سرانجام دینا تھے، مختلف دستوں کے مابین آجا رہے تھے۔ جونہی کوئی آسٹروی افسر کسی رجمنٹل کمانڈر کے ڈیرے کے قریب دکھائی دیتا، اس رجمنٹ میں ہل چل مچ جاتی۔ جوان الاؤوں سے بھاگتے، اپنے پائپ اپنے بوٹوں میں ٹھونستے، اپنے تھیلے سامان گاڑیوں پر پھینکتے، اپنی بندوقیں سنبھالتے اور صفیں ترتیب دینے لگتے۔ افسران کوٹوں کے بٹن بند کرتے، شمشیریں اور نیام درست کرتے اور چیختے چلاتے صفوں کے مابین چکر کاٹنے لگتے۔ اردلی اور کوچوان گھوڑے جوتتے، گاڑیوں پر سامان رکھتے اور اسے باندھنے لگتے۔ ایجوٹنٹ اور بٹالینوں اور رجمنٹوں کے کمانڈر اپنے گھوڑوں پر سوار ہوتے، سینوں پر صلیب کے نشانات بناتے اور جن لوگوں نے سامان گاڑیوں کے ساتھ رہنا تھا، انھیں آخری ہدایات و احکام دیتے اور ذمہ داریاں تفویض کرنے لگتے اور یوں ہزاروں قدموں کی یک رنگ تھاپ گونجنے لگتی۔ مختلف کالم آگے بڑھنے لگے، لیکن انھیں معلوم نہیں تھا کہ وہ کدھر جا رہے ہیں۔ چونکہ ان کے گردو پیش انسانوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہجوم تھا، دھواں تھا اور دھند تھی جو ہر آن بڑھتی جا رہی تھی، اس لیے انھیں نہ وہ مقامات، جدھر وہ جا رہے تھے اور نہ وہ جہاں سے وہ روانہ ہوئے تھے، نظر آ رہے تھے۔

جس طرح جہاز کے ملاح کا دائرۂ عمل محدود ہوتا ہے، بعینہٖ وہی کیفیت اس سپاہی کی، جو پیش قدمی میں شرکت کرتا ہے، ہوتی ہے۔ اس کی رجمنٹ اسے چاروں اطراف سے گھیر لیتی ہے، اس کے ادھر ادھر ہٹنے یا باہر

نکلنے کی راہیں مسدود کر دیتی ہے اور اسے اپنے ساتھ بہائے لیے جاتی ہے، وہ خواہ کتنا ہی دور نکل جائے، کتنے ہی ان جانے، خطرناک، مستحکم علاقے میں گھس جائے وہ اسی طرح۔ جس طرح ملاح ہمیشہ ایک سے عرشوں، مستولوں، بلیوں اور رسیوں میں محصور رہتا ہے۔ انھیں رفیقوں، جوانوں، سارجنٹ میجر ایوان میتر چ، کمپنی کے کتے ژچکا اور افسروں میں، جن سے اس کا روزانہ واسطہ پڑتا ہے، گھرا رہتا ہے۔ جیسے جہاز کے ملاح کو قطعاً اس امر کی پروا نہیں ہوتی کہ سمندر کے جس حصے میں وہ سفر کر رہا ہے، اس کا عرض بلد یا طول بلد کیا ہے، کوچ کے دوران میں عام فوجی سپاہی کا رویہ بھی کچھ اسی قسم کا ہوتا ہے۔ تاہم ان تمام باتوں کے باوجود روزِ جنگ فوج کی اخلاقی فضا میں ایک نوع کی درشت آواز۔ خدا جانے یہ کہاں سے اور کیسے آتی ہے۔ گونجنے لگتی ہے۔ یہ سب کو سنائی دیتی ہے اور اس امر کا اعلان کر رہی ہوتی ہے کہ کوئی گمبھیر اور فیصلہ کن واقعہ پیش آنے والا ہے۔ یہ ان تمام فوجیوں کے اندر غیر معمولی تجسس ابھار دیتی ہے۔ جنگ کے روز جوانوں کے سینے جوش و خروش سے معمور ہو جاتے ہیں، وہ رجمنٹ کے مفادات سے ماورا ہونے کی سعی کرتے ہیں اور ان کے گرد و پیش جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہوتا ہے، وہ اسے توجہ سے سنتے، غور سے دیکھتے اور اس کے بارے میں ذوق و شوق سے سوالات پوچھتے ہیں۔

دھند کی چادر اتنی دبیز ہو گئی تھی کہ اس امر کے باوجود کہ روشنی پھیلتی جا رہی تھی، انھیں دس قدم سے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جھاڑیاں تناور درخت اور ہموار زمین چٹانوں اور ڈھلوانوں سے بھرپور دکھائی دے رہی تھی۔ کہیں بھی اور کسی سمت سے بھی ان کا اچانک غنیم سے، جو عین ممکن تھا کہ محض دس قدم آگے کہیں روپوش ہو، تصادم ہو سکتا تھا۔ لیکن کالم کافی دیر تک آگے بڑھتے رہے۔ ہر جگہ وہی دھند تھی۔ کہیں اترائی تھی، کہیں چڑھائی تھی، باڑیں تھیں، باغات تھے، وہ کبھی ان کے اندر گزرتے اور کبھی ان کے اوپر چکر لگاتے۔ سارا علاقہ نیا اور انجانا تھا اور غنیم کا دور دور تک پتا نہیں تھا۔ اس کے برعکس جوانوں کے قلوب میں یہ احساس جاگزیں ہو رہا تھا کہ ان کے آگے پیچھے، دائیں بائیں، غرضیکہ ہر طرف روسی کالم ایک ہی سمت میں کوچ کر رہے ہیں۔ یہ معلوم ہونے پر کہ جس انجانے علاقے کی طرف وہ گامزن ہے، بے شمار دیگر جوان بھی اسی طرف جا رہے ہیں، ہر شخص کا حوصلہ بڑھ جاتا۔

''ادھر دیکھو۔ کرسکی[38] بھی ادھر ہی گئے ہیں،'' عام سپاہی آپس میں کہہ رہے تھے۔

''دوستو، کتنی زبردست بات ہے۔ دیکھو، ہم نے کتنی بڑی فوج اکٹھی کر لی ہے۔ گزشتہ رات میں کیمپ کے الاؤ دیکھ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سارا ماسکو امنڈ آیا ہے۔ ان کا سلسلہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتا تھا!''

اگرچہ کوئی بھی کالم کا کمانڈر نہ تو عام سپاہیوں تک پہنچا اور نہ کسی نے ان سے بات کی (جیسا کہ جنگی کونسل کے اجلاس میں دیکھنے میں آیا تھا کہ وہ زیر بحث معاملے کے بارے میں اتنے افسردہ اور غیر مطمئن تھے کہ انھوں نے محض احکام کی تعمیل کرنے پر اکتفا کیا، انھوں نے جوانوں کا حوصلہ بڑھانے کے لیے ذرا بھی تردد نہ کیا)، تاہم جیسا کہ جوانوں کا وتیرہ ہوتا ہے کہ وہ جب بھی معرکے میں شریک ہونے، بالخصوص غنیم پر یورش کرنے کے سلسلے میں، پیش قدمی کرتے ہیں، بڑی خوش طبعی اور بشاشت کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ اب بھی ایک دوسرے سے چہلیں کر رہے

اور اپنی فطری زندہ دلی کا اظہار کر رہے تھے۔ لیکن دبیز دھند میں لگ بھگ ایک گھنٹہ مارچ کرنے کے بعد فوج کا بیشتر حصہ رکنے پر مجبور ہو گیا اور عام جوانوں میں بھی یہ ناخوشگوار احساس پھیلنے لگا کہ صفوں میں افراتفری اور بدنظمی راہ پا رہی ہے۔ اس قسم کا احساس کیسے سرایت کرتا ہے، اس کی تشریح کرنا مشکل ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ غیر معمولی رفتار اور صحت کے ساتھ نفوذ کرتا ہے اور یہ بالکل اسی غیر محسوس اور اٹل انداز سے، جس انداز سے پانی کوہستانی وادی میں رستا ہے، سرایت کرتا ہے۔ اگر روسی فوج تنہا ہوتی اور اس کے ساتھ اس کا کوئی اتحادی نہ ہوتا، عین ممکن ہے کہ بدنظمی اور افراتفری کے اس احساس کے یقین کامل میں ڈھلنے میں کافی وقت صرف ہوتا، لیکن موجودہ حالت میں جرمنوں کو اس بدنظمی کا ذمے دار ٹھہرانا بطور خاص خوشگوار اور فطری معلوم ہوتا تھا اور ہر شخص کو یہ یقین تھا کہ یہ خطرناک ابتری ساسیج خور[39] جرمنوں کی پیدا کردہ ہے۔

''ہم رک کیوں گئے ہیں؟ راستہ بند ہے؟ فرانسیسیوں سے ہمارا تصادم شروع ہو گیا ہے؟''

''نہیں، سنائی تو کچھ نہیں دیتا۔ اگر کچھ سنائی دیتا، پھر یہ ثابت ہو جاتا کہ فرانسیسیوں نے فائرنگ شروع کر دی ہے۔''

''انھیں ہمیں پیش قدمی کرانے کی جلدی تھی، چنانچہ ہم چل پڑے۔ اور اب ہم بیچ میدان میں بے سبب اور بے جواز کھڑے ہیں۔ ان ملعون جرمنوں نے ہر چیز گڑبڑا دی ہے! نرے کاٹھ کے الو ہیں!''

''میں بتاؤں کہ میں کیا کرتا۔ میں انھیں آگے محاذ پر بھیج دیتا، لیکن یقین مانو وہ لازماً ہمارے عقب میں ہاتھ پیر سمیٹے پڑے ہوں گے۔ اور ایک ہم ہیں کہ کچھ کھایا نہ پیا، یہاں بیچ میدان میں پھنسے کھڑے ہیں!''

''میں پوچھتا ہوں کہ ہم آگے بڑھ سکیں گے یا نہیں ہیں؟ سنا ہے کہ گھڑسوار راستہ روکے کھڑے ہیں،'' ایک افسر نے کہا۔

''لعنت ہو ان جرمنوں پر! انھیں اپنے ہی دیس کا کچھ پتا نہیں،'' ایک اور نے کہا۔

''تمھارا ڈویژن کون سا ہے؟'' ایک ایجوٹنٹ نے، جو گھوڑے پر آ رہا تھا، چلا کر پوچھا۔

''اٹھارہواں۔''

''پھر تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ تمھیں تو بہت عرصہ پہلے محاذ پر موجود ہونا چاہیے تھا۔ اب تم غروب آفتاب تک بھی وہاں پہنچ نہیں پاؤ گے۔ کیا احمقانہ احکام ہیں! انھیں خود معلوم نہیں کہ یہ کیا کر رہے ہیں،'' افسر نے کہا اور گھوڑے پر آگے چلتا بنا۔

اس کے بعد ایک جرنیل گھوڑا دوڑاتا آیا۔ وہ روسی نہیں بلکہ کسی غیر ملکی زبان میں چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔

''تاں پھڑاں، تاں پھڑاں! یہ کیا کیا بک بک کر رہا ہے؟ مجال ہے کہ جو ایک لفظ بھی پلے پڑا ہو،'' ایک جوان نے جرنیل کی، جو آگے نکل گیا تھا، نقل اتارتے ہوئے کہا۔ ''جی چاہتا ہے کہ ان سب کی گردنیں اڑا دوں۔ لچے لفنگے کہیں کے!''

''ہمیں وہاں دس بجے سے پہلے پہنچنے کا حکم ملا تھا اور ابھی ہم نے آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا۔ کیسے زبردست احکام ہیں!'' چاروں اطراف اسی قسم کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

اور جوش وخروش کے جس جذبے کے ساتھ سپاہ نے کوچ کیا تھا، اس کی جگہ بے تلے انتظامات اور جرمنوں کے خلاف غم وغصے نے لے لی تھی۔

بدنظمی کا سبب یہ امر بنا کہ جب آسٹروی گھڑسوار دستے بائیں طرف بڑھ رہے تھے، ہائی کمان کو معلوم ہوا کہ ہمارا قلب ہمارے میمنے سے خاصا دور ہٹ گیا ہے اور تمام اسپ سواروں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ دائیں طرف چلیں۔ چونکہ ہزاروں گھڑسوار پیادہ فوج کے سامنے سے گزر رہے تھے، پیادہ فوج کو لازماً رکنا پڑا۔

فوجی دستوں کے آگے ایک آسٹروی گائیڈ اور ایک روسی جرنیل کے مابین جھگڑا اٹھ کھڑا ہوا۔ روسی جرنیل چلا چلا کر مطالبہ کر رہا تھا کہ رسالے کو روکا جائے۔ آسٹروی افسر کا استدلال یہ تھا کہ قصوروار وہ نہیں، ہائی کمان ہے۔ دریں اثنا فوجی پتھر کے بت بنے کھڑے تھے۔ ان کے حوصلے ٹوٹتے جا رہے تھے اور لڑائی میں ان کی دلچسپی مدھم پڑتی جا رہی تھی۔ ایک گھنٹے کی تاخیر کے بعد وہ آخرکار آگے بڑھنے اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ بلندیوں پر دھند چھٹنا شروع ہوگئی تھی لیکن وادی میں، جہاں جوان اتر رہے تھے، اس کی دبیز چادر ویسی کی ویسی تنی ہوئی تھی۔ شروع میں گولیاں بے قاعدہ وقفوں سے چلی تھیں۔ تڑاخ تڑاخ۔ پھر باقاعدگی سے فائرنگ ہونے لگی اور اس میں تیزی بھی آگئی۔ یوں گولڈباخ ندی کے قریب معرکے کا آغاز ہوگیا۔

روسیوں کو یہ توقع نہیں تھی کہ غنیم سے ان کا تصادم ندی کے قریب ہوجائے گا لیکن اب اچانک وہ دھند میں اس سے ٹکرا گئے۔ انھیں اپنے کمانڈنگ افسروں کی طرف سے حوصلہ افزائی کا ایک لفظ تک سنائی نہ دیا۔ عام سپاہیوں میں یہ احساس سرایت کر چکا تھا کہ انھیں محاذ جنگ پر پہنچنے میں تاخیر ہوگئی ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ انھیں دھند میں نہ سامنے کچھ نظر آتا تھا اور نہ دائیں بائیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ فائرنگ تو ضرور کرنے لگے لیکن اس میں نہ تیزی تھی اور نہ جوش وخروش۔ وہ آگے بڑھتے اور پھر رک جاتے۔ انھیں افسروں اور ایجوٹنٹوں کی جانب سے وقت پر ایک بھی حکم نہ ملا۔ خود افسر اور ایجوٹنٹ اجنبی اور نامانوس علاقے میں ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے اور انھیں اپنے اپنے یونٹ تلاش کرنے میں دقت پیش آرہی تھی۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے کالم کے لیے، جو پہاڑی سے نیچے اترے تھے، معرکہ آرائی کا آغاز کچھ ان خطوط پر ہوا۔ چوتھا کالم، جس کے ساتھ کوتوزوف تھا، پراٹ سن پہاڑی پر کھڑا تھا۔

نیچے، جہاں معرکہ آرائی کی ابتدا ہو چکی تھی، ابھی تک دبیز دھند چھائی ہوئی تھی۔ بلندی پر مطلع نکھرنے لگا تھا لیکن سامنے کیا ہو رہا تھا، کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ کیا غنیم کی تمام سپاہ، جیسا کہ ہم نے مفروضہ تراش لیا تھا، چھ میل دور تھی یا وہ دھند کی اس چادر کے کہیں آس پاس تھی، اس بارے میں کسی کو نو بجے تک کوئی علم نہ ہوسکا۔

نو بھی بج گئے۔ نیچے دھند بحر بیکراں کی طرح پھیلی ہوئی تھی لیکن شلاپانٹس کے گاؤں میں، جو بلندی پر واقع

تھا اور جہاں نپولین اپنے مارشلوں میں گھرا کھڑا تھا، اچھی خاصی روشنی ہو چکی تھی۔ نپولین کے اوپر صاف نیلگوں آسمان تھا اور آفتاب کا وسیع وعریض کرہ دھند کے دودھیا سمندر کی سطح پر کسی عظیم الجثہ، کھوکھلے، قرمزی "تیراک پیپے" کی مانند کپکپا رہا تھا۔ تمام فرانسیسی سپاہ، بلکہ خود نپولین اور اس کے عملے کے ارکان تک، سوکول نٹس اور شلاپانٹس کے ندی نالوں اور گھاٹیوں کے، جہاں ہم اپنی پوزیشنیں سنبھالنا اور غنیم کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنا چاہتے تھے، پار نہیں تھے بلکہ وہ انھیں عبور کر کے ادھر آ چکے تھے اور ہماری فوج کے اتنے قریب تھے کہ نپولین دوربین کے بغیر ننگی آنکھ سے ہمارے پیادے اور سوار کے مابین تمیز کر سکتا تھا۔ نپولین اس نیلے کوٹ میں، جو وہ اطالیہ میں اپنی تمام مہموں کے دوران میں پہنا کرتا تھا، ملبوس تھا۔ وہ اپنے کوتاہ قامت سرمئی عربی گھوڑے پر سوار تھا اور اپنے مارشلوں سے ذرا آگے کھڑا تھا۔ وہ چپ چاپ ان پہاڑیوں کو، جو کہر کے سمندر سے برآمد ہو رہی تھیں اور جن کے اوپر دور فاصلے پر روسی افواج حرکت پذیر تھیں، دیکھ رہا اور فائرنگ کی، جو نیچے وادی میں جاری تھی، آوازیں سن رہا تھا۔ اس کے چہرے — جوان دنوں ابھی تک دبلا پتلا تھا — کا ایک پٹھا بھی ہل نہیں رہا تھا۔ اس کی جگمگاتی آنکھیں نہایت انہماک کے ساتھ ایک ہی مقام پر مرکوز تھیں۔ اس کے اندازے صحیح ثابت ہو رہے تھے۔ روسی فوج کا ایک حصہ پہلے ہی وادی میں اتر چکا تھا اور جوہڑوں اور جھیلوں کی جانب گامزن تھا۔ اور دوسرا حصہ پراٹ سن پہاڑی کو، جسے وہ اپنی پوزیشن کے لیے کلیدی مقام تصور کرتا تھا اور جس پر وہ حملہ کرنے کا ارادہ کیے ہوئے تھا، خالی کر رہا تھا۔ اسے دھند میں سے پراٹسن گاؤں کے قریب دو پہاڑیوں کے مابین گہری وادی میں سنگینیں چمکتی نظر آئیں۔ روسی دستے لگاتار ایک ہی سمت میں وادیوں کی جانب بڑھ رہے اور یکے بعد دیگرے دھند میں غائب ہو رہے تھے۔ گزشتہ شام اسے جو اطلاعات موصول ہوئی تھیں، رات کے دوران میں بیرونی چوکیوں کے قرب وجوار میں اسے پہیوں اور قدموں کی جو آوازیں سنائی دی تھیں، روسی دستے جس بے ترتیبی سے حرکت کر رہے تھے اور اس نے خود جو قیاس آرائیاں کی تھیں، ان سب شہادتوں سے اسے واضح طور پر یہ احساس ہوا کہ اتحادی سمجھتے ہیں کہ وہ ان سے آگے کہیں بہت دور ہے۔ اسے یہ اندازہ بھی ہوا کہ پراٹ سن کے اڑوس پڑوس میں جو دستے حرکت کر رہے ہیں، ان پر روسی فوج کا قلب مشتمل ہے اور یہ قلب اتنا کمزور ہو چکا ہے کہ اس پر کامیاب حملہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر بھی اس نے ہنوز معرکہ آرائی کا آغاز نہ کیا۔

وہ یوم اس کے لیے یومِ نصرت تھا — اس روز اس کی تاج پوشی کی سالگرہ تھی۔ وہ تڑکے چند گھنٹے سویا تھا لیکن جب جاگا، وہ اپنے آپ کو تروتازہ اور توانا محسوس کر رہا تھا۔ اس کے حوصلے بلند اور امیدیں جوان تھیں۔ وہ اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور میدان جنگ کی طرف روانہ ہو گیا۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس طور آسودہ وشگفتہ تھی جب آدمی کو ہر چیز ممکن معلوم ہوتی ہے اور وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا ہے، اس میں کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ وہ بالکل بے حس وحرکت بیٹھا تھا۔ اس کی نظریں ان چوٹیوں پر، جو دھند سے اوپر نظر آ رہی تھیں، لگی ہوئی تھیں۔ اس کے سرد چہرے پر اعتماد اور خود اطمینانی سے بھرپور وہ مسرت، جو آپ کو کسی گرفتار محبت اور شاداں وسرور نوخیز لڑکے کے چہرے بشرے پر نظر آتی ہے، جھلک رہی تھی۔ اس کے مارشل اس کے پیچھے رہے۔ ان میں اتنی جرأت نہ تھی کہ

Austerlitz
Road to Olmütz
Brünn
Road to Venice
Schlappanitz
Pratzen
Kobelnitz
Pratzen Heights
Hosjeradek
Augezd
Satschau
Sokolnitz
Goldbach Brook
Roads
0 1 2 3 miles
0 1 2 3 4 5 km

اوسٹرلٹس
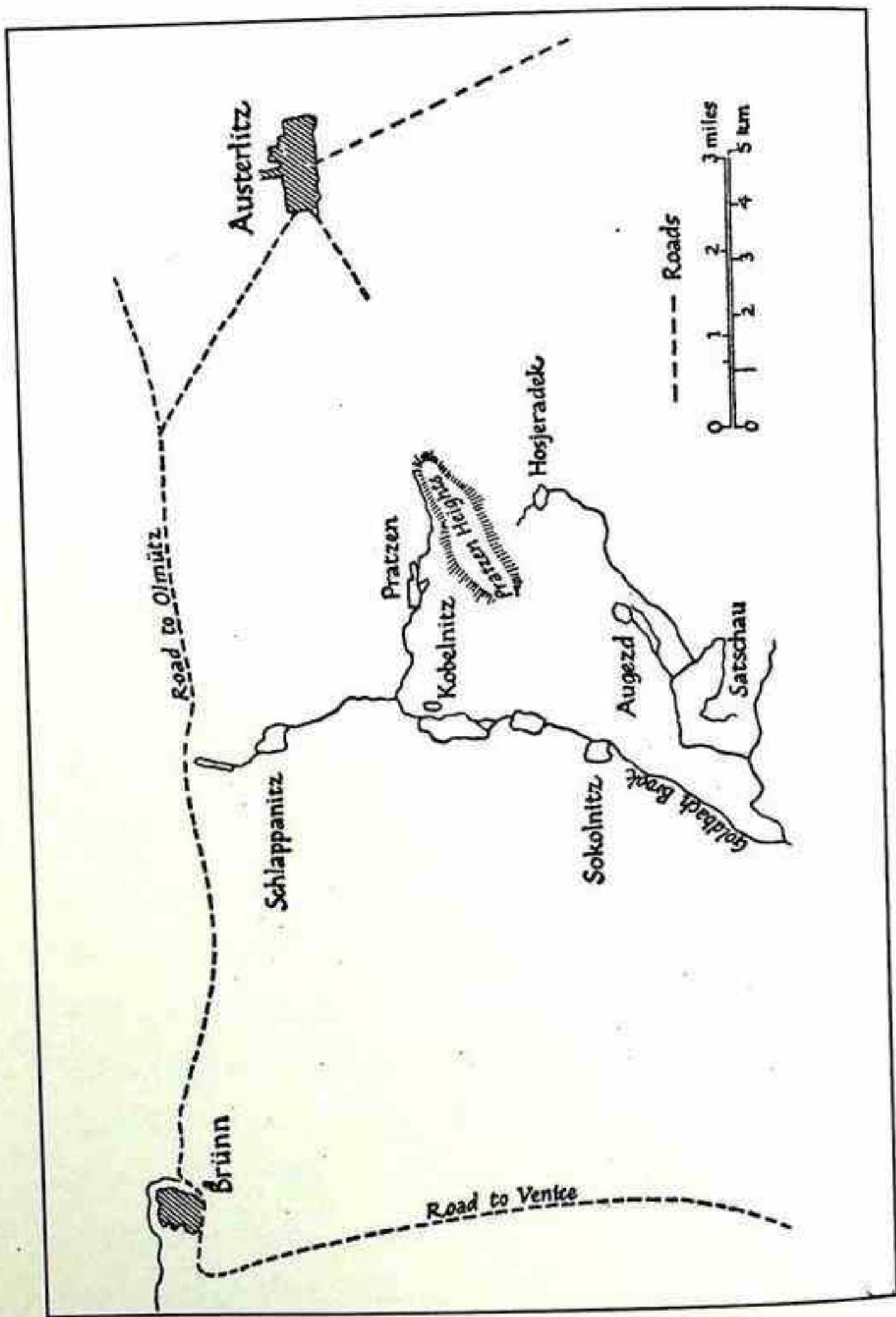
وہ اس کے خیالات میں مخل ہو سکتے۔ وہ کبھی پراٹ سن کی پہاڑیوں اور کبھی سورج کی طرف، جو دھند کے اوپر تیر رہا تھا، دیکھنے لگتا۔

جب سورج دھند سے پوری طرح نکل آیا اور کھیت اور دھند دونوں اس کی خیرہ کن روشنی میں نہا گئے، اس نے۔گویا معرکے کی ابتدا کرنے کے لیے وہ اسی کا منتظر تھا۔ اپنے سڈول اور خوش وضع ہاتھ سے دستانہ اتارا، اس سے مارشلوں کو اشارہ کیا اور جنگ شروع کرنے کا حکم دے دیا۔ مارشل ایجوٹنٹوں کی معیت میں مختلف سمتوں میں گھوڑے سرپٹ دوڑانے لگے اور چند منٹ بعد فرانسیسی فوج کا بڑا حصہ، پراٹ سن کی اس پہاڑی کی جانب، جسے روسی دستے، جو کہ بائیں ہاتھ وادی میں اتر رہے تھے، بتدریج خالی کر رہے تھے، رواں دواں ہو گیا۔

15

آٹھ بجے صبح کوتوزوف میلورادووچ کے چوتھے کالم کی قیادت کرتا ہوا گھوڑے پر سوار پراٹسن کی طرف روانہ ہوا۔ اس کالم نے پرزے بزیوسکی اور لانژ غون کے کالموں کی، جو پہلے ہی پہاڑی سے نیچے اتر چکے تھے، جگہ لینا تھی۔ اس نے سب سے اگلی رجمنٹ کے جوانوں سے علیک سلیک کی اور انھیں آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ اپنے اس عمل سے اس نے یہ ظاہر کر دیا کہ وہ اس کالم کی قیادت خود کرے گا۔ جب وہ پراٹسن گاؤں میں داخل ہوا، وہ رک گیا۔ پرنس آندرے، جو کمانڈر انچیف کے سٹاف کے لاتعداد ارکان میں شامل تھا، اس کے بالکل پیچھے تھا۔ پرنس آندرے کی کیفیت کچھ اس شخص کی تھی جسے مدتوں سے کسی لمحے کا انتظار ہو اور جب وہ لمحہ آ پہنچتا ہے، ایک طرف اس کے دل میں کھلبلی مچنے لگتی ہے اور وہ اعصابی چڑچڑے پن کی گرفت میں آنے لگتا ہے اور دوسری طرف وہ آپے سے باہر نہیں ہوتا بلکہ دھیما اور پرسکون رہتا ہے۔ اسے یہ پختہ یقین تھا کہ آج کے معرکے میں وہ وہی کارنامہ، جو نپولین نے تولوں میں یا آرکول کے پل پر سرانجام دیا تھا، دکھائے گا۔ یہ کیسے ہوگا؟ اس بارے میں وہ کچھ نہیں جانتا تھا لیکن اس بارے میں اس کے قلب و دماغ میں قطعاً کوئی شبہ نہیں تھا کہ ایسا ہوگا اور لازماً ہوگا۔ ہماری افواج کہاں کہاں اور کس کس طرح تعینات تھیں، اس کے متعلق ہماری فوج میں اگر کسی کو علم ہو سکتا تھا، تو اسے بھی تھا۔ اس کا اپنا عسکری اور جنگی منصوبہ، جس پر عمل درآمد کے بارے میں اب سوچنا بھی سعی لاحاصل تھا، فراموش کر دیا گیا تھا۔ اس نے وے روٹر کے منصوبے کو اپنا لیا تھا اور اب وہ یہ سوچ رہا تھا کہ کہاں کہاں ناگہانی صورت حال کے پیدا ہونے کا امکان ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ اپنے ذہن میں وہ نئی تدابیر بھی، جن کے متعلق اسے بسرعت سوچنا اور فیصلہ کرنا ہوگا، تشکیل دے رہا تھا۔

بائیں طرف، نیچے دھند میں دو نادیدہ قوتوں کے مابین گولیوں کے تبادلے کی آوازیں سنی جا سکتی تھیں۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ لڑائی زیادہ تر وہیں مرکوز رہے گی، وہیں مشکلات درپیش ہوں گی "اور وہیں" اس نے سوچا، "مجھے ایک بریگیڈ یا ڈویژن دے کر بھیجا جائے گا اور میں، ہاتھوں میں علَم اٹھائے، آگے بڑھوں گا اور جو بھی میرے سامنے آیا، اسے گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دوں گا۔"

جو بٹالینیں گزر رہی تھیں، ان کے علم دیکھ کر پرنس آندرے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکا۔ انھیں دیکھ کر وہ لگاتار یہی سوچتا رہا: ''عین ممکن ہے کہ یہی علم تھام کر میں فوج کی قیادت کروں۔''

دن چڑھتے چڑھتے پہاڑی سے دھند کلیتاً غائب ہو گئی۔ اس کی باقیات میں صرف سفید پالا رہ گیا تھا اور وہ بھی اب شبنم میں تبدیل ہو رہا تھا۔ لیکن وادیوں میں کہرا ابھی تک دودھیا سمندر کی مانند موجود تھی۔ وادی میں بائیں طرف، جہاں ہمارے فوجی دستے اترے تھے اور جہاں سے گولیوں کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں، کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پہاڑی کے اوپر نکھرا نکھرا نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا اور دائیں طرف آفتاب کا کرۂ عظیم۔ سامنے دور، بہت دور، اس کہربائی سمندر کے آخری کنارے کے پار درختوں سے گھرے ہوئے ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ مفروضے کے مطابق غنیم کو وہیں کہیں ہونا چاہیے تھا اور وہاں اب کوئی چیز دکھائی دے رہی تھی۔ دائیں طرف گارڈز دھند کے علاقے میں داخل ہو رہے تھے۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں اور پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ صاف سنائی دے رہی تھی اور کبھی کبھار ان کی سنگینوں کی چمک بھی نظر آ جاتی۔ بائیں طرف گاؤں کے پار اسپ سواروں کے اسی قسم کے ہجوم آگے بڑھتے اور دھند کے سمندر میں روپوش ہوتے دیکھے جا سکتے تھے۔ سامنے اور عقب میں پیادہ فوج رواں دواں تھی۔ کمانڈر انچیف گاؤں کے سرے پر کھڑا تھا اور فوجی دستوں کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھ رہا تھا۔ اس صبح کوتوزوف تھکا تھکا اور چڑچڑا نظر آ رہا تھا۔ جو پیادہ فوج اس کے پاس سے گزر رہی تھی، وہ کسی حکم کے بغیر رک گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے سامنے کوئی رکاوٹ آ گئی ہے۔

''ہونہہ، انھیں حکم دو کہ بٹالین کالم بنائیں اور گاؤں کا چکر کاٹ کر آگے نکل جائیں!'' اس نے خفگی سے ایک جرنیل سے، جو گھوڑے پر سوار اس کے پاس پہنچا تھا، کہا۔ ''یوئر ایکسی لینسی، مائی ڈیئر سر، آپ کی سمجھ میں یہ بات کیوں نہیں آتی کہ اب جب کہ ہم دشمن کے خلاف نبرد آزما ہونے جا رہے ہیں، گاؤں کی ٹیڑھی میڑھی اور تنگ گلیوں میں صفیں بنا کر گزرنا ناممکن ہے!''

''یوئر ایکسی لینسی، میرا ارادہ تھا کہ گاؤں کی دوسری جانب از سرِ نو صف بندی کی جائے۔''

کوتوزوف تلخی سے مسکرایا۔ ''کیا کہنے ہیں آپ کے! جناب غنیم کی عین ناک تلے صف بندی کریں گے! بہت اعلیٰ!''

''یوئر ایکسی لینسی غنیم ابھی بہت دور ہے۔ فوجوں کی تقسیم و ترتیب کے منصوبے کے مطابق۔۔۔''

''تقسیم و ترتیب!'' کوتوزوف کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''اور تمھیں اس کے متعلق کس نے بتایا تھا؟ تمھیں جو حکم دیا جا رہا ہے، وہی کرو۔ نوازش ہو گی۔''

''جی، جناب عالی۔''

"mon cher"* نیس وتسکی نے پرنس آندرے سے کھسر پھسر کرتے ہوئے کہا۔ ''آج بابے کا مزاج بہت

* مائی ڈیر

برہم ہو رہا ہے۔''

ایک آسٹروی افسر، جس نے سفید وردی زیب تن کی ہوئی تھی اور اپنی ٹوپی میں سبز پھندنے پرو رکھے تھے، سرپٹ گھوڑا دوڑاتے کوتوزوف کے پاس پہنچا اور امپراطور کا حوالہ دے کر دریافت کیا کہ چوتھا کالم لڑائی میں شریک ہو گیا ہے یا نہیں؟

کوتوزوف نے جواب دیے بغیر ہی منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اتفاق سے اس کی نظر پرنس آندرے پر، جو اس کے قریب کھڑا تھا، پڑ گئی۔ اس کے چہرے سے جو عناد اور بغض جھلک رہا تھا، بلکونسکی کو دیکھ کر اس کی شدت میں کچھ کمی آ گئی، گویا وہ اس امر کا اعتراف کر رہا تھا کہ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے، اس کے لیے اس کے ایجوٹنٹ کو کسی صورت میں بھی موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ اس نے آسٹروی ایجوٹنٹ کو ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا، اس سے پہلے ہی وہ بلکونسکی کی طرف متوجہ ہوا اور فرانسیسی میں اسے کہا:

''"mon cher"، ذرا جانا اور دیکھنا کہ تیسرا کالم گاؤں سے نکل گیا ہے یا نہیں۔ انھیں کہو کہ وہ جہاں ہیں، وہیں رک جائیں اور میرے احکام کا انتظار کریں۔''

پرنس آندرے ابھی روانہ ہی ہوا تھا کہ کمانڈر انچیف نے اسے واپس بلا لیا۔

''اور ان سے پوچھو کہ ماہر نشانچی تعینات کر دیے گئے ہیں یا نہیں؟'' اس نے مزید حکم دیا۔ ''وہ کیا کر رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں!'' وہ آپ ہی آپ بڑبڑایا۔ آسٹروی افسر کو اس نے ابھی تک کوئی جواب نہیں دیا تھا۔

پرنس آندرے حکم کی تعمیل کرنے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

جو بٹالینیں آگے جا رہی تھیں، انھیں پیچھے چھوڑتے ہوئے اس نے تیسرے ڈویژن کو روک لیا اور اس بات کی بھی تصدیق کر لی کہ ہمارے کالموں کے آگے فی الواقع کوئی ماہر نشانچی نہیں تھے۔ رجمنٹ کے سربراہ کرنل کو جب ماہر نشانچیوں کی تعیناتی کے بارے میں کمانڈر انچیف کے احکام موصول ہوئے، اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس وقت تک اسے پختہ یقین تھا کہ اس کے آگے دیگر دستے ہیں اور غنیم اس سے چھ میل سے کم دور نہیں ہو سکتا۔ سچی بات یہ ہے کہ اسے ایک بنجر ڈھلوان کے علاوہ (اور وہ بھی دبیز دھند میں مستور تھی) کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس فروگزاشت کی تلافی کرنے کے متعلق کمانڈر انچیف کا حکم پہنچانے کے بعد پرنس آندرے اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا واپس آ گیا۔

کوتوزوف ابھی تک وہیں کھڑا تھا۔ ڈھلتی عمر نے اس کے لحیم شحیم اور فربہ جسم کو کسل مند بنا دیا تھا اور وہ زین پر ڈھلکا ہوا تھا۔ اس کی واحد آنکھ بند تھی اور وہ تھکے ماندے انداز سے جمائیاں لے رہا تھا۔ دستوں نے ابھی تک کوئی حرکت نہیں کی تھی بلکہ وہ ہتھیار زمین پر رکھے احکام کا انتظار کر رہے تھے۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،'' اس نے پرنس آندرے سے کہا اور ایک جرنیل کی طرف، جو ہاتھ میں گھڑی پکڑے کہہ رہا تھا کہ چونکہ بائیں بازو کے تمام دستے اس سے پہلے ہی نیچے اتر چکے ہیں، انھیں بھی روانہ ہو جانا

چاہیے، متوجہ ہو گیا۔

''یور ایکسی لینسی، ابھی بہت وقت ہے،'' کوتوزوف جمائی لیتے ہوئے بڑبڑایا۔ ''بہت وقت ہے،'' اس نے دوبارہ کہا۔

اس وقت کوتوزوف کے عقب میں خاصے فاصلے سے رجمنٹوں کے سلیوٹ کرنے کی آوازیں فضا میں گونجیں اور بہ سرعت ان کے قریب سے قریب تر بلند ہونے لگیں کیونکہ ان کا سلسلہ ان روسی کالموں کے، جو پیش قدمی کر رہے تھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیل چکا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ جس شخص یا اشخاص کا اس انداز سے استقبال ہو رہا تھا، وہ برق رفتاری سے گھوڑے بھگائے آ رہے ہیں۔ جب اس رجمنٹ کے جوان، جن کے سامنے کوتوزوف کھڑا تھا، گلے پھاڑ پھاڑ کر نعرے لگانے لگے، وہ گھوڑے پر سوار چند قدم ایک طرف گیا اور تیوریاں چڑھا کر پیچھے دیکھنے لگا۔ پراٹسن روڈ پر رنگا رنگ وردیوں میں ملبوس گھڑسواروں کا بظاہر پورا اسکواڈرن سرپٹ گھوڑے بھگائے آ رہا تھا۔ ان میں سے دو باقیوں سے آگے تھے اور وہ ایک دوسرے کے برابر اندھا دھند گھوڑے دوڑا رہے تھے۔ ان میں سے ایک کے جسم پر سیاہ وردی تھی اور اس کی ٹوپی میں سفید کلغی لہرا رہی تھی۔ وہ جس گھوڑی پر سوار تھا اس کا رنگ سرخی مائل بھورا اور دم قدرے چھوٹی تھی۔ دوسرے گھڑسوار کی وردی سفید اور گھوڑا مشکی تھا۔ یہ دونوں امپراطور تھے اور ان کے پیچھے پیچھے ان کے حوالی موالی آ رہے تھے۔ کوتوزوف ایک کایاں تھا۔ اس نے محاذ جنگ کے تجربہ کار سپاہی کے پرتصنع انداز سے ''اٹینشن'' کا حکم دیا اور سلیوٹ کرتا امپراطوروں کی طرف بڑھا۔ پلک جھپکنے میں اس کی وضع قطع اور طور طریقے میں تغیر کلی آ گیا۔ اس کا انداز اس ماتحت کا تھا جو چوں چرا کیے بغیر حکم کی تعمیل کرتا ہے۔ وہ پُرنمود احترام کے ساتھ، جسے امپراطور الیکسانڈر نے واضح طور پر پسند نہیں کیا، آگے آیا اور اس نے سلیوٹ کیا۔

امپراطور کے نوجوان اور مسرور و مطمئن چہرے پر تکدر کے جو آثار نمودار ہوئے تھے، وہ روشن و شفاف آسمان پر دھند کے گالوں کی طرح آئے اور اپنی جھلک دکھا کر غائب ہو گئے۔ جب وہ اول موتس کے میدان میں، جہاں بلکونسکی نے اسے پہلی مرتبہ بدلیش میں دیکھا تھا، سلامی لینے آیا تھا، تب بھی اس کا جسم دبلا پتلا ہی دکھائی دیا تھا لیکن اب ناسازئ طبع کے بعد وہ نسبتاً اور بھی لاغر نظر آ رہا تھا۔ تاہم اس کی خوبصورت سرمئی آنکھوں میں شان و شکوہ اور ملائمت کا وہی مسحور کن امتزاج تھا۔ اس کے نرم و نازک اور مہین لب اب بھی اپنے اوپر مختلف اقسام کے مطالب طاری کرنے پر قادر تھے اور اس کے چہرے سے اب بھی اسی معصومیت اور نیک دلی کا اظہار ہو رہا تھا۔

اول موتس کی سلامی کے دوران میں اس کے انداز میں شاہانہ تمکنت اور وقار زیادہ جھلک رہا تھا لیکن یہاں اس کے انگ انگ سے توانائی اور مسرت پھوٹ رہی تھی۔ دو میل سرپٹ گھوڑی دوڑانے کے بعد اس کا چہرہ قدرے تمتمایا ہوا تھا۔ اس نے اپنی گھوڑی کو لگام دی، اطمینان کا سانس لیا اور گردن گھما کر پیچھے اپنے عملے کے ارکان پر، جو اسی کی طرح نوجوان اور جوشیلے تھے، نظر ڈالی۔ تسارتورسکی، نوواسلت سیف، پرنس ولکونسکی، ستروگانوف اور دوسرے

سبھی شگفتہ مزاج نوجوان تھے اور زرق برق ملبوسات پہنے ہوئے تھے۔ جن گھوڑوں پر وہ سوار تھے، وہ خوش شکل، خوب سدھے ہوئے اور تازہ دم تھے لیکن سرپٹ بھاگنے سے ان کے ابدان قدرے گرم ہو گئے تھے۔ وہ آئے اور زار کے پیچھے رک گئے۔ ان کے چہروں پر تبسم تھا اور وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ امپراطور فرانٹس بھی نوجوان تھا۔ اس کا چہرہ کتابی اور رنگ سرخ و سپید تھا۔ وہ اپنے خوبصورت ناآختہ مشکی اسپ پر سیدھا تن کر بیٹھا ہوا تھا اور اپنی سوچوں میں مستغرق بے فکری سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے ایک ایجوٹنٹ کو، جس کے تن پر سفید وردی تھی، بلایا اور اس سے کچھ پوچھا۔ ''وہ غالباً یہ پوچھ رہا ہے کہ وہ کب روانہ ہوئے تھے؟'' پرنس آندرے نے اپنے پرانے شناسا کو دیکھ کر سوچا۔ برن کے مقام پر اس کی اس سے جو ملاقات ہوئی تھی، اسے یاد آ گئی اور اس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے اس مسکراہٹ کو دبانے کی کوشش بھی کی لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ امپراطوروں کا ذاتی سٹاف روس اور آسٹریا کی لڑاکا رجمنٹوں اور گارڈز کے چیدہ نوعمر اردلی افسروں پر مشتمل تھا۔ ان میں شاہی اصطبل کے گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والے سائیس بھی شامل تھے اور وہ زار کے فالتو گھوڑے، جو بہت خوبصورت تھے اور جن کی زینوں پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے، تھامے ہوئے تھے۔

جس طرح دریچہ کھلنے پر کمرے میں، جہاں دم گھٹتا محسوس ہوتا ہے، تازہ ہوا کا جھونکا داخل ہو جاتا ہے، بعینہٖ ان ذہین و فطین نوجوانوں کی آمد پر کوتوزوف کے افسردہ پژمردہ سٹاف کو شباب، توانائی اور اعتمادِ کامرانی کی لپٹیں آتی محسوس ہوئیں۔

''میخائیل الاری اوناوچ، تم شروع کیوں نہیں کرتے؟'' زار نے کھڑے گھاٹ کوتوزوف سے پوچھا۔ اس کے ساتھ اس نے شائستگی سے امپراطور فرانٹس کی جانب دیکھا۔

''یوئر میجسٹی، میں انتظار کر رہا ہوں،'' کوتوزوف نے احتراماً آگے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔

قدرے ناک بھوں چڑھاتے زار نے اپنا کان یوں آگے بڑھایا جیسے اسے سنائی نہ دیا ہو۔

''یوئر میجسٹی، میں انتظار کر رہا ہوں،'' کوتوزوف نے دوبارہ کہا۔ (پرنس آندرے نے دیکھا کہ جب کوتوزوف نے لفظ ''انتظار'' دہرایا، اس کا بالائی ہونٹ غیر فطری انداز سے پھڑپھڑانے لگا تھا۔) ''ابھی تک تمام کالم اکٹھے نہیں کیے جا سکے۔''

زار نے اس کی بات سن تو لی لیکن صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جواب پر ناخوش ہے۔ اس نے اپنے قدرے مدور شانے اچکا دیے اور نوواسلت سیف کی جانب، جو اس کے قریب کھڑا تھا، یوں دیکھا جیسے وہ اس سے کوتوزوف کی شکایت کر رہا ہو۔

''میخائیل الاری اوناوچ، ہم اس وقت زارتسین میڈو[40] میں تو نہیں کہ جب تک تمام رجمنٹیں اکٹھی نہ ہو جائیں، پریڈ شروع نہیں کی جا سکتی،'' زار نے ایک بار پھر امپراطور فرانٹس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ (اس نے جس انداز سے امپراطور فرانٹس کو دیکھا تھا، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ اس سے یہ درخواست کر رہا ہے کہ ''بھلے آدمی،

اگر تم گفتگو میں شریک ہونا نہیں چاہتے، پھر جو میں کہہ رہا ہوں، کم از کم وہ تو سنو۔'')

لیکن امپراطور فرانسس ادھر ادھر دیکھتا رہا اور اس نے مطلق کوئی توجہ نہ دی۔

''عالی جاہ، بالکل یہی وجہ ہے کہ میں شروع نہیں کر رہا،'' کوتوزوف نے گونج دار آواز میں کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس امر کو ناممکن بنانا چاہتا تھا کہ اس کی بات کسی کے کانوں تک پہنچی ہی نہیں۔ اور ایک بار پھر اس کا بالائی ہونٹ پھڑ پھڑانے لگا۔ ''ہم یہاں نہ پریڈ کرنے آئے اور نہ ہم زارتسین میڈو میں ہیں،'' اس نے واضح اور جچے تلے انداز سے کہا۔

جب اس نے یہ الفاظ کہے، زار کے سٹاف میں جتنے لوگ شامل تھے، ان سب نے آپس میں نگاہوں کا، جن سے ملامت اور ناپسندیدگی کا اظہار ہوتا تھا، تبادلہ کیا۔ ''یہ شخص عمر کے اعتبار سے خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، اسے اس قسم کا طرز تخاطب یقیناً اختیار نہیں کرنا چاہیے،'' یہ نگاہیں کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔

امپراطور نے استقلال اور انہماک کے ساتھ کوتوزوف کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا۔ وہ منتظر تھا کہ کوتوزوف مزید کچھ کہے گا لیکن معلوم ہوتا تھا کہ کوتوزوف بھی احترام سے سر جھکائے انتظار کر رہا ہے۔ یہ خاموشی تقریباً ایک منٹ جاری رہی۔

تاہم، اگر یہ ہز میجسٹی کا فرمان ہے...'' کوتوزوف نے اپنا سر اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ یوں بن رہا تھا جیسے وہ کوئی کند ذہن جرنیل ہو، استدلال کرنے کے فن سے نا آشنا ہو اور صرف حکم بجالانا جانتا ہو۔

اس نے اپنے گھوڑے پر ہاتھ پھیرا، کالم کمانڈر میلورادووچ کو بلایا اور اسے آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ سپاہ متحرک ہوگئی۔ نووگورد کی دو بٹالینیں اور آپ شیرون کی ایک رجمنٹ امپراطور کے برابر سے گزریں اور آگے نکل گئیں۔

جب آپ شیرون رجمنٹ کوچ کر رہی تھی، میلورادووچ نے، جس کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ تھا اور جس نے اوورکوٹ تو نہیں پہنا تھا لیکن جس نے اپنی وردی پر اپنے تمام تمغے اور اعزازات سجا رکھے تھے اور جس کی ترچھی ٹوپی پر پروں کا بہت بڑا گچھا ٹنکا ہوا تھا، اپنے گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا، چستی سے سلیوٹ کیا، گھوڑے کو لگام دی اور اسے زار کے سامنے روک لیا۔

''جرنیل، خداوند تمھارا حامی و ناصر ہو،'' زار نے کہا۔

"Ma foi, sire"*، جو کچھ ہمارے بس میں ہوا، ہم یقیناً کریں گے،'' میلورادووچ نے خوش مزاجی سے فرانسیسی میں کہا۔ اس کا فرانسیسی لہجہ واجبی سا تھا۔ اس پر زار کے عملے کے ارکان طنزیہ انداز سے مسکرانے لگے۔ میلورادووچ نے تیزی سے اپنا گھوڑا موڑا اور زار سے کچھ دور اس کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ امپراطور کی موجودگی نے آپ شیرون کے جوانوں میں تازہ ولولہ پیدا کر دیا۔ وہ قدم سے قدم ملاتے امپراطوروں اور ان کے

* یور میجسٹی۔

سٹاف افسروں کے برابر خاصے جوش و خروش اور تیز رفتاری سے گزرنے لگے۔

''جوانو،'' میلورادووچ نے اپنے بلند آہنگ، پراعتماد اور ولولہ انگیز لہجے سے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کہا۔ فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، لڑائی صحیح معنوں میں شروع ہوا چاہتی تھی، پھر اس کے سامنے آپ شیرون رجمنٹ کے شجیع و دلیر جوان تھے جو کسی زمانے میں سواروف کے زیر کمان اس کے ساتھ لڑ چکے تھے اور اب پھرتیلے انداز سے دونوں امپراطوروں کے برابر سے گزر رہے تھے۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ ان سب باتوں نے مل جل کر اسے کچھ اس قسم کی ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا ہے کہ وہ زار کی موجودگی بھی بھول گیا اور چلا کر کہنے لگا: ''یہ پہلا گاؤں نہیں ہے جس پر ہمیں قبضہ کرنا ہے۔''

''ہم سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے،'' جوانوں نے چلا کر جواب دیا۔

اس اچانک نعرے بازی سے زار کی گھوڑی بدک گئی۔ یہ گھوڑی، جس پر سوار ہو کر زار روس میں مختلف دستوں سے سلامی لیا کرتا تھا، اب اسے اوسٹرلٹس کے میدان جنگ میں لے آئی تھی۔ اس نے جس طرح ایمپرس فیلڈ میں اس کے بائیں پاؤں کے لاپروایانہ ٹھوکوں کو صبر و تحمل سے برداشت کیا تھا اور فائرنگ کی آوازیں سن کر اپنی کنوتیاں کھڑی کر لی تھیں، اب بھی وہ اسی طرح اس کے ٹھوکوں کو صبر و تحمل سے برداشت کر رہی تھی اور اس نے فائرنگ کی آوازیں سن کر اپنے کان کھڑے کر لیے تھے۔ لیکن یہ فائرنگ کیوں ہو رہی ہے؟ امپراطور فرانٹس کا ناآختہ گھوڑا کیوں اس کے اتنا قریب کھڑا ہے؟ اسے ان باتوں کی مطلق سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ اسے یہ بھی قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس روز اس کا سوار کیا کہہ رہا، سوچ رہا یا محسوس کر رہا ہے۔

زار مسکراتا ہوا اپنے عملے کے ایک رکن کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے آپ شیرون رجمنٹ کے جری جوانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کچھ کہا۔

16

کوتوزوف اپنے ایجوٹنٹوں کی معیت میں دھیرے دھیرے رائفل بردار سواروں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ کالم کے عقب میں کوئی نصف میل چلنے کے بعد وہ ایک الگ تھلگ عمارت کے۔۔ جو کسی زمانے میں دیہی ہوٹل اور مے خانے کے طور پر استعمال ہوتی ہوگی۔۔ قریب ٹھہر گیا۔ یہاں سے دو سڑکیں دو مختلف سمتوں سے نیچے وادی میں اترتی تھیں اور اس وقت دونوں رواں دواں دستوں سے اٹاٹ بھری پڑی تھیں۔

دھند چھٹنا شروع ہو گئی تھی۔ کوئی ڈیڑھ میل پرے مخالف پہاڑی پر دشمن کے دھندلے دھندلے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔ بائیں طرف نیچے وادی میں فائرنگ کی آوازیں زیادہ واضح سنائی دینے لگی تھیں۔ کوتوزوف رک گیا تھا اور ایک آسٹروی جرنیل کے ساتھ محو گفتگو تھا۔ پرنس آندرے، جو چند قدم دوران کے پیچھے کھڑا تھا اور انھیں بغور دیکھ رہا تھا، ایک ایجوٹنٹ کی طرف متوجہ ہوا اور اس سے دستی دوربین مانگنے لگا۔

''دیکھیں، دیکھیں!'' ایجوٹنٹ نے کہا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی جا رہی تھیں۔ دور فاصلے پر جو فوجی دستے تھے، وہ ان کی طرف نہیں بلکہ پہاڑی سے نیچے کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ''باپ رے باپ، یہ تو فرانسیسی ہیں!''

دونوں جرنیل اور ایجوٹنٹ دستی دوربین کی طرف لپکے اور ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کرنے لگے۔ ایکا ایکی ان کے چہروں کی رنگت تبدیل ہوگئی اور ان پر خوف و دہشت کی پرچھائیں منڈلانے لگیں۔ فرانسیسیوں کے متعلق یہ فرض کر لیا گیا تھا کہ وہ کوئی ڈیڑھ میل دور ہوں گے لیکن پلک جھپکنے میں وہ ہمارے سروں پر آ موجود ہوئے تھے۔

''یہ غنیم ہے؟... نہیں!... ہاں، دیکھیں، وہی ہے... یقیناً وہی ہے... اس کا کیا مطلب ہوا؟'' مختلف آوازیں سنائی دیں۔

اپنے دائیں طرف، اس مقام سے جہاں کوتوزوف کھڑا تھا، پانچ سو قدم سے بھی کم فاصلے پر، پرنس آندرے نے اپنی ننگی آنکھ سے فرانسیسی فوجیوں کا گھنا اور پر ہجوم کالم دیکھا۔ وہ آپ شیرون رجمنٹ سے مقابلہ کرنے آگے آ رہا تھا۔

''وہی ہیں۔ فیصلہ کن گھڑی آ پہنچی ہے۔ یہ میرے کچھ کرنے کا موقع ہے!'' پرنس آندرے نے سوچا۔ اس نے اپنے گھوڑے کو مہمیز لگایا اور کوتوزوف کے قریب پہنچا۔

''یوایکسی لینسی، آپ شیرون رجمنٹ کو روک لینا چاہیے!'' اس نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔

لیکن عین اسی لمحے دھوئیں کے بادل نے ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ فائرنگ کی آوازیں بالکل قریب سے سنائی دینے لگیں اور ایک آواز نے، جو پرنس آندرے سے دو قدم سے زیادہ دور نہیں تھی، معصومانہ لیکن خوف زدہ انداز سے چلا کر کہا: ''دوستو، اپنا کام تمام ہوگیا!'' یہ آواز سن کر، جیسا کہ حکم کی آواز سننے پر ہوتا ہے، ہر شخص نے دوڑ لگا دی۔

افراتفری اور انتشار کے عالم میں لوگوں کے ہجوم ادھر، جہاں پانچ منٹ پیشتر فوجی دستے امپراطوروں کو سلامی دیتے گزرے تھے، بھاگنے لگے اور اس بھگدڑ میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہونے لگا۔ نہ صرف اس بھیڑ کو روکنا مشکل ہوگیا تھا بلکہ بھگدڑ میں اس کا ساتھ نہ دینا بھی ناممکن ہوگیا تھا۔ بلکونسکی کی صرف یہ کوشش تھی کہ وہ کوتوزوف سے بچھڑنے نہ پائے۔ وہ حیران پریشان ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ غصے سے نیس وتسکی کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپے میں نہیں رہا۔ وہ چلا چلا کر کوتوزوف سے کہہ رہا تھا کہ وہ جھٹ پٹ وہاں سے فرار ہو جائے ورنہ اسے قیدی بنا لیا جائے گا۔ کوتوزوف نے جیب سے رومال نکالا اور جواب دیے بغیر جہاں کھڑا تھا وہیں کھڑا رہا۔ اس کے رخسار سے خون بہہ رہا تھا۔ پرنس آندرے دھکم دھکا کرتا اس کے قریب پہنچا۔

''آپ زخمی ہوگئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ اس کا جبڑا کپکپا رہا تھا اور وہ اسے قابو میں رکھنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

''زخم یہاں نہیں ہے،'' اس نے رومال سے اپنا رخسار سہلاتے ہوئے کہا۔ ''بلکہ وہاں ہے،'' اس نے بھاگتے فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''انھیں روکو!'' اس نے چلا کر کہا اور اس کے ساتھ اسے غالباً یہ احساس ہوگیا کہ انھیں روکنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دائیں طرف چل پڑا۔

بھگوڑوں کا تازہ ریلا آیا اور اسے اپنے ساتھ بہاتا پیچھے لے گیا۔

فوجی اتنا زبردست جم غفیر بنائے بھاگ رہے تھے کہ جو شخص ایک بار اس کی لپیٹ میں آ گیا، اس کے لیے اس سے باہر نکلنا ناممکن ہوگیا۔ کوئی شخص گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا: ''چلو، چلو، انتظار کس بات کا؟'' ایک اور شخص اسی جگہ مڑا اور اس نے فضا میں گولی چلا دی۔ تیسرے نے بالکل اسی گھوڑے کو، جس پر کوتوزوف سوار تھا، ضرب لگا دی۔ انسانوں کے اس سیلِ بے پناہ سے کوتوزوف بڑی مشکل سے اپنے آپ کو علیحدہ کرنے میں کامیاب ہوا۔ وہ بائیں طرف مڑا اور اپنے عملے کے ارکان کے ساتھ، جن کی تعداد نصف سے بھی کم رہ گئی تھی، نزدیک ہی اس سمت بڑھا جدھر سے توپوں کے گولے اگلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پرنس آندرے نے، جو کوتوزوف کے قریب رہنے کی کوشش کر رہا تھا، دھکم پیل کرتے ہجوم میں سے راستہ بنایا۔ اسے دھوئیں میں سے پہاڑی پر ایک روسی توپ خانہ نظر آیا۔ اس نے دیکھا کہ توپیں ابھی تک گولہ باری کر رہی ہیں اور فرانسیسی ان کی طرف بھاگے آ رہے ہیں۔ اس سے بھی ذرا اونچائی پر کچھ روسی پیادہ سپاہ کھڑی تھی۔ یہ سپاہ نہ تو توپچیوں کی مدد کرنے کے لیے آگے جا رہی تھی اور نہ بھگوڑوں کے ساتھ پیچھے ہٹ رہی تھی۔ ایک جرنیل، جو گھوڑے پر سوار تھا۔ اس پیادہ بریگیڈ سے الگ ہوا اور کوتوزوف کی طرف چل پڑا۔ کوتوزوف کے ذاتی عملے کے صرف چار ارکان اس کے ساتھ رہ گئے تھے۔ ان سب کے رنگ فق تھے اور وہ آپس میں خاموش نگاہوں کا تبادلہ کر رہے تھے۔

''ان بدبختوں کو روکو!'' کوتوزوف نے بھگوڑے فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہانپتے کانپتے جرنیل سے کہا۔

لیکن عین اس موقع پر، اس نے جو الفاظ استعمال کیے تھے، گویا کہ ان کے انتقام کے طور پر، پرندوں کے غول کی طرح گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور رجمنٹ اور کوتوزوف کے عملے کے سروں کے اوپر سنسناتی گزر گئی۔

فرانسیسی توپ خانے پر حملہ کر رہے تھے۔ انھوں نے کوتوزوف کو دیکھ لیا تھا اور اب وہ اس پر بھی فائرنگ کر رہے تھے۔ گولیوں کی اس بوچھاڑ کے بعد رجمنٹل کمانڈر نے اپنی ٹانگ تھام لی۔ متعدد فوجی نیچے گر چکے تھے اور ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ نے، جو اپنے ہاتھوں میں علم اٹھائے ہوئے تھا، اسے نیچے گر جانے دیا۔ علم لہرایا، نیچے گرا اور جو جوان قریب کھڑے تھے، ان کی بندوقوں میں پھنس گیا۔ فوجیوں نے حکم کے بغیر فائرنگ شروع کر دی۔

''او۔و۔ہ!'' کوتوزوف کی آہ نکل گئی اور وہ مایوسی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ''بلکونسکی،'' اس نے سرگوشی کی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے اور بالکل بے بس ہے۔ اس کے اس علم نے اس کی آواز میں کپکپاہٹ پیدا کر دی تھی۔ ''بلکونسکی،'' اس نے شکست خوردہ بٹالین اور دشمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سرگوشی

کی: ''یہ کیا ہے؟''

اس کی بات ابھی مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ پرنس آندرے نے، جس کا غصے اور خجالت سے گلا رندھ گیا تھا، گھوڑے سے چھلانگ لگا دی اور وہ عَلَم کی طرف بھاگنے لگا۔

''جوانو، آگے بڑھو'' وہ بچوں کی تیکھی آواز سے چلایا۔

''وہ لمحہ آگیا ہے!'' اس نے عَلَم کا بانس تھامتے اور ان گولیوں سے، جن کا بظاہر وہ نشانہ تھا، لطف اندوز ہوتے ہوئے سوچا۔

متعدد جوان ڈھیر ہو گئے۔

''ہرّا!'' پرنس آندرے نے با آواز بلند نعرہ لگایا اور بصد مشکل بھاری علم اٹھائے آگے بھاگ پڑا اسے پورا یقین تھا کہ ساری بٹالین اس کی پیروی کرے گی۔

اور وہ واقعی محض چند ہی قدم آگے دوڑا ہوگا کہ پہلے ایک جوان، پھر دوسرا اور اس کے بعد پوری کی پوری بٹالین ''ہرّا'' کے نعرے بلند کرتی آگے دوڑ پڑی اور اس کے ساتھ جا ملی۔ بٹالین کے ایک سارجنٹ نے زقند لگائی اور علم، جو وزن کی وجہ سے پرنس آندرے کے ہاتھوں میں ڈول رہا تھا، تھام لیا۔ لیکن وہ ترت ہلاک ہو گیا۔ پرنس آندرے نے دوبارہ علم پکڑ لیا اور اسے بانس سے گھسیٹتے بٹالین کے ساتھ دوڑنے لگا۔ اسے اپنے سامنے اپنے چند توپچی نظر آئے۔ ان میں سے کچھ ابھی تک دست بدست لڑ رہے تھے اور باقی گجنالیں چھوڑ چھاڑ اس کی طرف بھاگے آ رہے تھے۔ اس نے فرانسیسی پیادوں کو توپ خانے کے گھوڑوں کی لگامیں پکڑتے اور گجنالوں کا رخ موڑتے دیکھا۔ اب پرنس آندرے اور بٹالین اور گجنالوں کے درمیان صرف بیس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اسے اپنے سر کے اوپر گولیوں کی غیر مختتم سنسناہٹ سنائی دے رہی تھی۔ اس کے دائیں بائیں فوجی مسلسل ڈھے رہے اور کراہ رہے تھے۔ لیکن اس نے ان کی طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ اس کا دھیان صرف سامنے لگا ہوا تھا اور وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہاں — توپ خانے کے گرد و پیش — کیا ہو رہا ہے۔ اسے اب ایک توپچی کی — جس کے سر کے بال سرخ تھے اور جس کی ٹوپی گولی لگنے سے ایک طرف ڈھلک گئی تھی — شکل واضح طور پر نظر آنے لگی تھی۔ وہ توپ صاف کرنے والی سلاخ کا ایک سرا پکڑے اسے اپنی جانب کھینچ رہا تھا جب کہ فرانسیسی اس کے دوسرے سرے پر زور لگا رہا تھا۔ اسے ان دونوں جوانوں کے مضطرب لیکن خشم ناک چہرے بخوبی دکھائی دے رہے تھے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ان دونوں کو خود بھی علم نہیں تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔

''یہ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' پرنس آندرے نے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''یہ سرخ بالوں والا توپچی بھاگ کیوں نہیں جاتا کیونکہ یہ غیر مسلح ہے؟ فرانسیسی اس کے جسم میں سنگین کیوں نہیں بھونک دیتا؟ وہ زیادہ دور بھاگ بھی نہیں سکے گا کیونکہ اس کے زیادہ دور جانے سے پہلے فرانسیسی کو اپنی سنگین یاد آ جائے گی اور وہ اسے اس کے جسم میں اتار دے گا۔''

ایک اور فرانسیسی، جو اپنی بندوق بھر چکا تھا، حقیقتاً ہاتھا پائی کرتے جوڑے کی جانب لپکا۔ سرخ بالوں والا توپچی سلاخ چھین چکا تھا لیکن وہ اس امر سے قطعی بے خبر تھا کہ اس کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ لیکن پرنس آندرے اس کا انجام نہ دیکھ سکا۔ اسے اچانک یوں محسوس ہوا جیسے کسی فوجی نے، جو اس کے کہیں آس پاس کھڑا تھا، اس کے سر پر بھاری لاٹھی دے ماری ہو۔ اسے چوٹ کا احساس تو ہوا لیکن اس سے بھی بدتر بات یہ ہوئی کہ درد نے اس کی توجہ بٹا دی اور وہ جس چیز پر نظریں جمائے ہوئے تھا، اسے دیکھنے سے قاصر رہا۔

''یہ کیا ہے؟ کیا میں گر رہا ہوں؟ میری ٹانگیں جواب دے رہی ہیں،'' اس نے سوچا اور پشت کے بل نیچے گر پڑا۔

''اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اسے امید تھی کہ وہ یہ دیکھ سکے گا کہ توپچی اور فرانسیسی کے مابین کشمکش کا انجام کیا ہوا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ سرخ بالوں والا توپچی ہلاک ہو گیا ہے یا بچ گیا ہے، توپیں غنیم کے قبضے میں چلی گئی ہیں یا بچالی گئی ہیں۔ لیکن اسے کچھ نظر نہ آیا۔ اب اس کے سر کے اوپر آسمان — بلند و بالا آسمان — کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ یہ آسمان صاف نہیں تھا، سرمئی بادل دبے پاؤں، آہستہ آہستہ، اسے اپنی لپیٹ میں لے رہے تھے۔

''یہاں کتنا سکوت، کتنا سکون، کتنی ہیبت ہے! اس سے، جب میں دوڑ رہا تھا، کس قدر مختلف!'' پرنس آندرے نے سوچا۔ ''اس سے قطعی مختلف جب ہم دوڑ رہے، چلا رہے اور لڑ رہے تھے! اس توپچی اور فرانسیسی سے بھی مختلف، جن کے چہرے مضطرب اور خشم ناک تھے اور جو سلاخ ہتھیانے کے لیے آپس میں الجھ رہے تھے۔ یہ بادل بھی جو اس بلند بام، لامتناہی آسمان پر تیر رہے ہیں، کتنے مختلف نظر آ رہے ہیں! میں نے اس آسمان کو پہلے کبھی کیوں نہیں دیکھا؟ میں کتنا خوش ہوں کہ میں نے آخر اسے دریافت کر ہی لیا ہے! اس لامتناہی فلک کے سوا باقی سب کچھ بے جا غرور، تکبر اور فریب ہے، اس کے علاوہ سب کچھ ہیچ ہے، بے حقیقت ہے! لیکن یہ بھی کہاں ہے؟ اس کا بھی کوئی وجود نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ صرف سکوت ہے، سکون ہے۔ خداوند کا شکر ہے...''

17

ہمارا میمنہ، جس کی کمان جنرل باگ راتیاں کے ہاتھ میں تھی، نو بجے تک جنگ میں شریک نہیں ہوا تھا۔ وہ دلگوروکوف کے اس مطالبے کی، کہ کارروائی شروع کر دی جائے، تکمیل بھی نہیں کرنا چاہتا تھا اور ذمے داری سے پہلو تہی اختیار کرنے کا بھی آرزومند تھا۔ چنانچہ اس نے دلگوروکوف کو تجویز پیش کی کہ کسی شخص کو بھیج کر کمانڈر انچیف سے دریافت کر لیا جائے۔ باگ راتیاں جانتا تھا کہ چونکہ میمنے اور میسرے کے مابین سات میل کا فاصلہ حائل ہے، اس لیے اگر پیغام رساں ہلاک نہ بھی ہوا (اور اس کے مارے جانے کا پورا امکان تھا) اور وہ کمانڈر انچیف کو ڈھونڈ نکالنے میں کامیاب ہو بھی گیا (اور یہ امر خاصا دشوار تھا) پھر بھی وہ شام سے پہلے واپس نہیں آ سکے گا۔

باگ راتیاں نے اپنی غزالی اور خوابیدہ آنکھیں، جو ہر قسم کے تاثر سے عاری تھیں، اپنے عملے کی جانب

منعطف کر دیں اور سب سے پہلے اس کی نظر رستوف کے، جس کا دل جوش و خروش سے بلیوں اچھل رہا تھا، طفلانہ چہرے پر پڑیں۔ اس نے اسے بھیج دیا۔

''یورا یکسی لینسی، اگر کمانڈر انچیف سے پہلے مجھے ہز میجسٹی امپراطور مل گئے، پھر؟'' رستوف نے اپنا ہاتھ اپنی ٹوپی کی طرف اٹھاتے ہوئے کہا۔

''تو تم یہ پیغام ہز میجسٹی کو دے دینا،'' دلگوروکوف نے عجلت سے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

گشتی ڈیوٹی سے چھٹی مل جانے کے بعد رستوف کو صبح طلوع ہونے سے قبل چند گھنٹے سونے کا موقع مل گیا تھا۔ اب وہ ہشاش بشاش تھا، اس کے عزائم جوان تھے اور ڈر اسے چھو کر بھی نہیں گیا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات میں لوچ اور پھرتیلا پن تھا اور اسے اپنے مقدر پر کامل اعتماد تھا۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ اس قسم کی تھی جب ہر کام ممکن، خوشگوار اور آسان معلوم ہوتا ہے۔

اس روز اس کی تمام امیدیں بر آ رہی تھیں۔ اس دن گھسان کا رن پڑنا تھا اور اس نے اس میں شرکت کرنا تھی۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ دلیر ترین جرنیل کا اردلی افسر تھا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ اسے کوتوزوف اور یا شاید خود زار تک بھی پیغام پہنچانے کے لیے روانہ کیا جا رہا تھا۔ یہ چمکیلی صبح تھی، اس کے نیچے بہت عمدہ گھوڑا تھا اور اس کا دل مسرت وانبساط سے معمور تھا۔ احکام وصول کرنے کے بعد اس نے گھوڑے کی باگ ڈھیلی چھوڑ دی اور اسے سرپٹ بھگانے لگا۔ ابتدا میں وہ گھوڑا باگ راتیاں کے دستوں کے، جو ابھی تک لڑائی میں شریک نہیں ہوئے تھے اور ساکت وصامت کھڑے تھے، بیچوں بیچ دوڑاتا رہا۔ پھر وہ اس علاقے میں، جس پر یواروف کا رسالہ قابض تھا، داخل ہو گیا۔ یہاں اسے کچھ چہل پہل اور لڑائی کی تیاری کے آثار دکھائی دیے۔ جب وہ یواروف کے رسالے کی حدود سے آگے نکل گیا، اسے بندوقوں اور توپوں کے چلنے کی آوازیں واضح طور پر سنائی دینے لگیں۔ فائرنگ کا شور وغل بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا تھا۔

نسیم سحر میں اسے جو آوازیں سنائی دینا شروع ہو گئی تھیں، وہ پہلے کی طرح بے قاعدہ وقفوں سے اکا دکا بندوق یا کبھی کبھار ایک آدھ توپ کے چلنے کی آواز نہیں تھی، بلکہ اب پراٹسن پہاڑیوں کی ڈھلوانوں سے بندوقوں کی مسلسل فائرنگ کی گونج بلند ہو رہی تھی اور بیچ بیچ میں توپیں اتنے تواتر اور زور شور سے دہاڑنے لگتی تھیں کہ ان میں امتیاز کرنا ناممکن ہو جاتا تھا کیونکہ ان کی آواز عمومی شور وغل میں مدغم ہو جاتی تھی۔

اسے پہاڑی کے پہلو پر بندوقوں کے دھوئیں کے مرغولے ایک دوسرے کا تعاقب کرتے نظر آ رہے تھے جب کہ توپوں کے دھوؤں کے بادل فضا میں تیر رہے تھے اور آپس میں گھل مل رہے تھے۔ سنگینوں کی چمک دمک سے، جو دھوؤں میں نظر آ رہی تھی، وہ پیادہ فوج کے متحرک ہجوموں اور گولے بارود کے سبز ڈبوں سمیت توپ خانے کی چھدری صفوں کے مابین امتیاز کر سکتا تھا۔

یہ دیکھنے کے لیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے، رستوف نے ایک ثانیے کے لیے اپنا گھوڑا ایک ٹیلے پر روک لیا۔

لیکن پوری توجہ اور انہماک سے دیکھنے کے باوجود وہ یہ سمجھنے میں اور معلوم کرنے میں قطعاً ناکام رہا کہ وہاں کیا ظہور پذیر ہو رہا ہے۔ کسی قسم کے آدمی دھوئیں میں ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے، سپاہیوں کی صفیں کبھی آگے ہو جاتیں اور کبھی پیچھے۔ یہ معلوم کرنا کہ وہ کون تھے، کہاں جا رہے تھے اور کیوں جا رہے تھے، ناممکن تھا۔ ان مناظر اور آوازوں نے اس کے دل میں قطعاً کسی قسم کا کوئی وسوسہ یا مایوسی پیدا نہ کی بلکہ اس کی توانائی اور عزم صمیم کو مزید جلا دے دی۔

''چلو، چلو، آگے بڑھو، انھیں سبق سکھا دو!'' اسے جو آوازیں سنائی دے رہی تھیں، ان کے بارے میں یہ اس کا ذہنی ردعمل تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنا گھوڑا سرپٹ بھگانے لگا اور جس علاقے میں پہلے ہی فوج برسر پیکار تھی، وہ اس کے اندر ہی اندر دور تک چلتا گیا۔

''یہاں کے حالات کیسے ہوں گے، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میرا خیال ہے کہ ٹھیک ہی ہوں گے،'' رستوف نے سوچا۔

چند آسٹروی دستوں کے درمیان میں سے گزرتے رستوف نے دیکھا کہ صفوں کا اگلا حصہ، جو کہ گارڈز پر مشتمل تھا، پہلے ہی جنگی کارروائی شروع کر چکا ہے۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہوا! میں اسے قریب سے دیکھ سکوں گا،'' اس نے سوچا۔

وہ اگلی صفوں کے تقریباً برابر برابر جا رہا تھا۔ چند اسپ سوار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے اس کی جانب آئے۔ یہ ہماری اولان رجمنٹ کے جوان تھے اور میدان جنگ سے تتر بتر بھاگے آ رہے تھے۔ رستوف جب ان کے قریب پہنچا، اسے معاً ایک گھڑسوار نظر آیا۔ وہ خون میں تر بتر تھا لیکن اپنا گھوڑا سرپٹ بھگائے جا رہا تھا۔

''یہ میرا مسئلہ نہیں ہے،'' رستوف نے سوچا۔

اس کے بعد وہ ابھی چند سو قدم ہی دور گیا ہوگا کہ اسے اپنے بائیں طرف ایک وسیع و عریض میدان پورے کا پورا اسپ سواروں کے جم غفیر سے اٹا نظر آیا۔ وہ سیاہ گھوڑوں پر سوار تھے اور ان کی سفید شفاف وردیاں آنکھیں خیرہ کر رہی تھیں۔ وہ دلکی چال چلتے اور اس کا راستہ کاٹتے سیدھے اسی کی طرف آ رہے تھے۔ رستوف ان لوگوں کے راستے سے ہٹنے کے لیے اپنا گھوڑا انتہائی تیز رفتاری سے دوڑانے لگا۔ اگر وہ اپنی رفتار پر چلتے رہتے، وہ صاف بچ کر نکل جاتا لیکن وہ اپنی رفتار بڑھانے لگے اور ان میں سے چند ایک نے تو اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیے۔ رستوف کو گھوڑوں کی ٹاپ اور ہتھیاروں کی کھنکھناہٹ قریب سے قریب تر سنائی دینے لگی اور اسے ان کے گھوڑے، ان کی شکلیں بلکہ ان کے چہرے بھی واضح سے واضح تر دکھائی دینے لگے۔ یہ ہمارے ہارس گارڈز تھے۔ وہ فرانسیسی رسالے پر، جو ان کی طرف پیش قدمی کرتا نظر آ رہا تھا، حملہ کرنے جا رہے تھے۔

ہارس گارڈز اپنے گھوڑے خاصا تیز بھگا رہے تھے لیکن انھوں نے ان کی لگامیں پوری طرح ڈھیلی نہیں چھوڑی تھیں۔ رستوف کو اب ان کے چہرے صاف دکھائی دے رہے تھے اور اسے ایک افسر کا، جو اصیل گھوڑے پر

سوار تھا، حکم "ٹوٹ پڑو!" جو اس نے چلا کر دیا تھا، سنائی دے گیا۔ رستوف کو خدشہ لاحق ہو گیا کہ فرانسیسیوں پر حملے کے دوران میں وہ کہیں پاؤں تلے ہی نہ کچلا جائے یا ان کے ساتھ آگے نہ نکل جائے، چنانچہ اس نے اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ان کی صفوں سے باہر نکلنے کی کوشش کی لیکن پورا زور لگانے کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا اور بیچ میں ہی پھنسا رہا۔

ہارس گارڈز کا آخری جوان عظیم الجثہ شخص تھا۔ اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے۔ اس کی نظر جب رستوف پر پڑی، اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں اور اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا کیونکہ وہ اس کے عین سامنے تھا اور اس کے ساتھ اس کا تصادم ناگزیر تھا۔ اگر رستوف کے ذہن میں اپنا چابک گارڈز کے اس جوان کے گھوڑے کے سامنے لہرانے کا خیال نہ آتا تو یہ اسپ سوار یقیناً رستوف اور اس کے عربی گھوڑے (وہ ان ہاتھی کے ڈیل ڈول کے لوگوں اور ان کے گھوڑوں کے مقابلے میں اپنے آپ کو بالکل حقیر محسوس کر رہا تھا) کو زمین پر گرا دیتا۔ سولہ بالشت[41] اونچا بھاری بھرکم سیاہ فام گھوڑا بدک گیا اور اس نے اپنی کنوتیاں پچھلی جانب ڈھلکا لیں لیکن چیچک زدہ سوار نے اپنے بہت بڑے بڑے مہمیزوں سے ٹھوکر ماری اور گھوڑا اپنی دم زور زور سے لہراتا اور اپنی گردن آگے بڑھاتا پہلے سے بھی کہیں زیادہ تیز رفتار سے بھاگنے لگا۔ گارڈز کے سوار رستوف کے برابر سے بمشکل آگے نکلے ہوں گے کہ اس نے انھیں "ہرا" کے نعرے بلند کرتے سنا۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور اسے سب سے اگلی صفیں کسی غیر ملکی گھڑ سواروں کی، جن کے شانوں پر سرخ فیتے آویزاں تھے اور جو لاریب فرانسیسی ہی ہو سکتے تھے، صفوں سے بھڑتے نظر آئیں۔ اس کے علاوہ اسے اور کچھ نظر نہ آیا کیونکہ اس کے معاً بعد کہیں سے توپوں نے دھواں اگلنا شروع کر دیا تھا اور ساری فضا تیرہ و تار ہو گئی تھی۔

جس وقت ہارس گارڈز اس سے آگے نکل گئے اور دھوئیں میں اوجھل ہو گئے، رستوف کے لیے یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو گیا کہ وہ ان کے پیچھے بھاگے یا ادھر جائے جہاں اسے بھیجا گیا تھا۔ ہارس گارڈز کا یہ حملہ اتنا زبردست تھا کہ خود فرانسیسی بھی ہکا بکا رہ گئے۔ رستوف کو بعد ازاں یہ سن کر سخت صدمہ پہنچا کہ ان جسیم اور خوش وضع جوانوں اور طرح دار اور صاحب حیثیت نوجوان افسروں اور کیڈٹوں پر، جو ہزاروں روبل کے گھوڑے دوڑاتے اس کے برابر سے گزرے تھے، مشتمل جیش کے بیشتر افراد اس حملے میں اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ان میں سے صرف اٹھارہ زندہ بچ سکے تھے۔

"مجھے ان سے حسد کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مجھے بھی کوئی نہ کوئی موقع مل ہی جائے گا۔ ممکن ہے کہ اگلے چند لمحوں کے دوران میں میری زار سے ہی ملاقات ہو جائے،" رستوف سرپٹ گھوڑا بھگاتا اور سوچتا جا رہا تھا۔

جب وہ پیادہ گارڈز کے قریب پہنچا، اسے احساس ہوا کہ توپوں کے گولے ان کے سروں اور گرد و پیش کے اوپر ہی اوپر برق رفتاری سے اڑے جا رہے ہیں۔ اسے یہ احساس ان کی سنسناہٹ سن کر اتنا نہیں ہوا جتنا کہ جوانوں کے چہروں پر اضطراب اور افسروں کی غیر فطری عسکری متانت دیکھ کر ہوا۔

وہ پیادہ گارڈز کی رجمنٹ کی ایک صف کے عقب میں سے گزر رہا تھا کہ اسے ایک آواز، جو اسے اس کا نام لے کر پکار رہی تھی، سنائی دی۔

''رستوف!''

''کیا؟'' اس نے جواباً دریافت کیا۔

''کیا سمجھے؟— ہم محاذ پر پہنچ چکے ہیں! ہماری رجمنٹ حملہ کر چکی ہے!'' بورس نے کہا۔ اس کے چہرے پر وہ پرمسرت مسکراہٹ، جوان جوانوں کے، جو زندگی میں اولین مرتبہ فائرنگ کی زد میں آئے ہوتے ہیں، چہروں پر نظر آتی ہے، کھیل رہی تھی۔

رستوف رک گیا۔ ''واقعی!'' اس نے کہا۔ ''خیر، تمھارے اس حملے کا کیا بنا؟''

''ہم نے انھیں پیچھے دھکیل دیا ہے،'' بورس نے کہا۔ جوش و خروش نے اسے پُرگو بنا دیا تھا۔ ''کیا تم تصور کر سکتے ہو...''

اور وہ اسے بتانے لگا کہ گارڈز پوزیشنیں سنبھال چکے تھے کہ انھیں اپنے سامنے فوجی دستے نظر آئے۔ گارڈز نے سمجھا کہ یہ آسٹروی جیش ہے لیکن جب انھیں دستوں نے ان پر توپ کے گولے برسانا شروع کر دیے، انھیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور ان پر یہ بات روشن ہو گئی کہ وہ محاذ جنگ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ یوں انھیں غیر متوقع طور پر معرکہ آرائی میں شریک ہونا پڑا۔

رستوف بورس کی پوری بات سنے بغیر آگے چل پڑا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' بورس نے پوچھا۔

''ہز میجسٹی کے پاس۔ پیغام لے کر۔''

''وہ تو ادھر ہیں،'' بورس نے کہا۔ اس نے سمجھا کہ رستوف نے ''ہز میجسٹی'' نہیں بلکہ ''ہز ہائی نس'' کہا ہے۔

اس نے گرینڈ ڈیوک کی طرف دیکھا، جو ہارس گارڈز کا ہیلمٹ اور چغا پہنے ان سے تقریباً سو قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا اور اپنے کندھے اچکائے اور ماتھے پر بل ڈالے سفید وردی میں ملبوس کسی زرد رو آسٹروی افسر سے چلا چلا کر کچھ کہہ رہا تھا۔

''لیکن وہ تو گرینڈ ڈیوک ہیں اور مجھے کمانڈر انچیف یا زار کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے بھیجا گیا ہے،'' رستوف نے کہا اور اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھوڑے کو مہمیز لگانا چاہا۔

''کاؤنٹ! کاؤنٹ!'' برگ گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا۔ وہ دوسری سمت سے بھاگا چلا آ رہا تھا اور اس کا جوش و خروش بورس سے کم نہیں تھا۔ ''کاؤنٹ، میرا دایاں ہاتھ زخمی ہو گیا ہے،'' اس نے اپنا ہاتھ، جو خون آلود رومال میں لپٹا ہوا تھا، دکھاتے ہوئے کہا۔ ''اور میں محاذ پر ہی موجود رہا۔ کاؤنٹ، مجھے اپنی شمشیر بائیں ہاتھ میں پکڑنا پڑی۔ ہمارے خاندان— وان برگ گھرانے— کے افراد پشتوں سے نائٹ[42] چلے آ رہے ہیں۔''

برگ نے کچھ اور بھی کہا لیکن رستوف اس کی بات سنی ان سنی کر کے وہاں سے گھوڑا بھگا لے گیا۔
گارڈز کو بھگتانے اور ایک خالی علاقے میں سے گزرنے کے بعد رستوف ادھر چل پڑا جہاں محفوظ دستے تعینات تھے۔ اس کا مقصد محاذ جنگ سے دور رہنا تھا۔ وہ ایک مرتبہ پہلے ہی خطا کھا چکا تھا اور گارڈز کے حملے کے دوران میں خواہ مخواہ اگلی صفوں میں پہنچ گیا تھا۔ اب جس جگہ سے توپوں اور بندوقوں کی فائرنگ کی آواز آتی، وہ اس سے دور رہتا اور لمبا چکر کاٹ کر آگے نکل جاتا۔ اچانک اسے اپنے سامنے اپنی فوجوں کے عقب میں، اپنے بالکل قریب، جہاں وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہاں غنیم موجود ہوگا، فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔
''یہ کیا ہو سکتا ہے؟'' رستوف حیرت و استعجاب سے سوچنے لگا۔ ''غنیم ہماری فوج کے عقب میں پہنچ گیا ہے؟ ناممکن۔'' اچانک اسے اپنی ذات اور اس ساری لڑائی کے انجام کے بارے میں زبردست اندیشہ لاحق ہو گیا۔ ''یہ جو کچھ بھی ہو، اب اس کے گرد چکر لگانا عبث ہے۔ مجھے یہیں کہیں کمانڈر انچیف کو ڈھونڈنا ہوگا۔ اگر سب کچھ جاتا رہا، پھر میرا یہ فرض بنتا ہے کہ باقیوں کی طرح میں بھی اپنی جان نثار کر دوں۔''
وہ پراٹسن گاؤں کے علاقے سے، جو مختلف اقسام کی افواج سے پٹا پڑا تھا، جتنا دور نکلتا گیا، بدشگونی کا احساس، جس نے ایکا ایکی اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔
''اس کا کیا مطلب ہے؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ یہ کس پر فائرنگ ہو رہی ہے؟ یہ فائرنگ کون کر رہا ہے؟'' رستوف روسی اور آسٹروی سپاہیوں سے، جو منتشر ہجوموں کی صورت میں اس کے راستے پر بھاگے چلے آ رہے تھے، مسلسل پوچھتا رہا۔
''خدا ہی جانے! انھوں نے سب کو ہلاک کر دیا ہے! ہمارا بیڑا غرق ہو گیا ہے!'' اسے جوانوں نے روسی، جرمن اور چیک زبانوں میں جواب دیا۔ وہ سب بے ترتیب سروں پر پاؤں رکھے بھاگے چلے آ رہے تھے۔ رستوف کی طرح انھیں بھی کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہو کیا رہا ہے۔
سڑک پر زخمیوں کی بھی اچھی خاصی تعداد جا رہی تھی۔ عام شوروغل میں گالیوں، چیخوں اور کراہوں کی آمیزش ہو رہی تھی۔ فائرنگ کی شدت میں تخفیف ہونے لگی۔ کہیں بعد میں رستوف کو معلوم ہوا کہ روسی اور آسٹروی سپاہی ایک دوسرے پر فائرنگ کر رہے تھے۔
''میرے خدایا! اس کا کیا مطلب ہے؟ یہاں کیا ہو رہا ہے؟ کسی بھی لمحے زار یہاں تشریف لا سکتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں!... لیکن نہیں، یہ مٹھی بھر بدمعاشوں کی کارستانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ یہ وہ معاملہ نہیں ہو سکتا۔ بالکل نہیں ہو سکتا،'' اس نے سوچا۔ ''مجھے جلد از جلد ان سے آگے نکل جانا چاہیے، جلد از جلد!''
شکست اور فرار کا تصور ہی رستوف کے لیے سوہانِ روح تھا۔ اگرچہ اسے پراٹسن پہاڑی پر، عین اس مقام پر، جہاں اسے کمانڈر انچیف کو تلاش کرنے کا حکم دیا گیا تھا، فرانسیسی توپیں اور فرانسیسی دستے نظر آ رہے تھے، اسے

یقین نہیں آ رہا تھا، یقین آ ہی نہیں سکتا تھا کہ وہ وہاں ہوں گے۔

18

رستوف کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ کمانڈر انچیف اور زار کو پراٹسن گاؤں کے قرب و جوار میں تلاش کرے۔ وہ تو کجا، کسی کمانڈنگ افسر کا بھی اتا پتا معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ ہر طرف صرف مختلف فوجیوں کے بے ترتیب ہجوم اندھا دھند بھاگے پھر رہے تھے۔ وہ اپنے گھوڑے کو، جو پہلے ہی تھک کر چور ہو چکا تھا، اور تیز بھگانے کی کوشش کر رہا تھا تا کہ وہ جلد از جلد اس بھیڑ سے آگے نکل جائے۔ لیکن وہ جوں جوں آگے بڑھتا گیا، توں توں ہجوم پہلے سے کہیں زیادہ بے ترتیب اور بے حوصلہ نظر آنے لگتے۔ وہ جس شاہراہ پر چل کر آیا تھا، اس پر ہر قسم کی دو پہیہ اور چار پہیہ گاڑیوں کا، جن میں ہر قسم کی رجمنٹوں کے زخمی اور غیر زخمی روسی اور آسٹروی جوان ٹھسا ٹھس بھرے ہوئے تھے، ازدحام تھا۔ فرانسیسی توپ خانہ پراٹسن پہاڑی پر نصب تھا اور ان کے گولوں تلے، جو منحوس آوازیں پیدا کرتے لوگوں کے سروں کے اوپر سے گزر رہے تھے، یہ ہجوم بھنبھنا رہا تھا اور لحظہ بہ لحظہ اس کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

''زار کہاں ہیں؟ کوتوزوف کہاں ہیں؟'' رستوف ہر اس شخص سے، جسے وہ روکنے میں کامیاب ہو جاتا تھا، یہی سوالات پوچھتا جا رہا تھا لیکن کسی سے بھی اسے تسلی بخش جواب نہ مل سکا۔

آخر کار اس نے ایک سپاہی کا کالر پکڑ لیا اور اسے جواب دینے پر مجبور کر دیا۔

''ارے بھائی، وہ تو کبھی کے رفو چکر ہو چکے ہیں!'' سپاہی نے کسی بات پر ہنستے اور اپنے آپ کو چھڑاتے ہوئے کہا۔

رستوف نے اس سپاہی کو، جو بظاہر نشے میں چور معلوم ہوتا تھا، چھوڑا، کسی اہم شخصیت کے اردلی یا سائیس کا گھوڑا پکڑا اور اس سے سوال جواب کرنے لگا۔ اس شخص نے اسے بتایا کہ زار بری طرح زخمی ہو گیا ہے اور کوئی ایک گھنٹہ پہلے اسے انتہائی تیز رفتار گاڑی پر بٹھا کر اسی شاہراہ پر کہیں دور پہنچا دیا گیا ہے۔

''ایسا نہیں ہو سکتا،'' رستوف نے کہا۔ ''یہ کوئی اور شخص ہو گا۔''

'بادشاہو، میں نے اپنی آنکھوں سے انھیں دیکھا تھا،'' اردلی نے اطمینان سے اپنے دانت نکوستے ہوئے کہا۔ ''میں زار کو اتنی مرتبہ پیٹرزبرگ میں دیکھ چکا ہوں کہ میرا خیال ہے کہ میں اب انھیں آسانی سے پہچان سکتا ہوں۔ وہ گاڑی میں بیٹھے تھے، ان کا رنگ بالکل سفید ہو چکا تھا اور وہ چار سیاہ فام گھوڑے بھاگ نہیں رہے تھے بلکہ اڑے جا رہے تھے — واہ واہ! کیا رفتار تھی ان کی! میں زار کے گھوڑے بھی پہچانتا ہوں اور الیا ایوانووچ کو بھی۔ میرے خیال میں الیا زار کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو اپنی گاڑی میں نہیں لے جائے گا۔''

رستوف نے گھوڑا چھوڑ دیا۔ وہ آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ ایک زخمی افسر، جو اس کے قریب سے گزر رہا تھا، اس سے مخاطب ہوا۔

''آپ کسے ملنا چاہتے ہیں؟'' افسر نے پوچھا۔ ''کمانڈر انچیف؟ اجی، وہ تو توپ کے گولے سے ہلاک ہو چکے ہیں ـــ وہ ہماری رجمنٹ میں تھے کہ گولہ آیا اور سیدھا ان کے سینے سے ٹکرا گیا۔''

''ہلاک نہیں، زخمی ہوئے تھے،'' ایک دوسرے افسر نے اس کی تصحیح کی۔

''کون، کوتوزوف؟'' رستوف نے پوچھا۔

''کوتوزوف نہیں۔ لیکن اس کا نام کیا ہے؟ ـــ خیر، کیا فرق پڑتا ہے۔ سب ایک جیسے ہی ہیں... جو لوگ زندہ بچ گئے ہیں، ان کی تعداد زیادہ نہیں۔ تم ادھر چلے جاؤ، اس گاؤں کی طرف۔ تمام کمانڈنگ افسر وہیں ہیں،'' اس افسر نے ہوزجےراڈے گاؤں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور خود آگے چل دیا۔

رستوف آہستہ رو جا رہا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس کے پاس جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔ زار زخمی ہو چکا تھا، لڑائی ہاری جا چکی تھی۔ اب اس بارے میں کسی شک وشبے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ وہ اس سمت، جدھر اسے اشارہ کیا گیا تھا، چل پڑا۔ دور فاصلے پر اسے مینار اور کلیسا دکھائی دینے لگے۔ بھاگ دوڑ کی ضرورت کیا تھی؟ اگر زار اور کوتوزوف زندہ بھی ہوں اور زخمی بھی نہ ہوئے ہوں، اس کے پاس انھیں بتانے کے لیے رہ ہی کیا گیا تھا؟

''جناب، اس سڑک پر جائیں۔ ادھر تو آپ پلک جھپکنے میں ہلاک ہو جائیں گے،'' ایک سپاہی نے گلا پھاڑ کر اسے متنبہ کیا۔ ''ادھر آپ ہلاک ہو جائیں گے!''

''ارے، تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ایک دوسرے نے کہا۔ ''انھوں نے کہاں جانا ہے؟ وہ راستہ چھوٹا ہے۔''

رستوف نے کچھ سوچا اور پھر اس راستے پر، جس کے بارے میں اسے بتایا گیا تھا کہ وہاں موت اس کا انتظار کر رہی ہے، چل پڑا۔

''اب کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر زار زخمی ہو چکے ہیں، مجھے اپنی چمڑی بچانے کی کوشش کرنا چاہیے؟'' اس نے سوچا۔ وہ گھوڑے پر سوار اس مقام کی طرف، جہاں پراٹسن سے فرار کے دوران میں سب سے زیادہ تعداد میں آدمی ہلاک ہوئے تھے، چلنے لگا۔ فرانسیسیوں نے ابھی تک اس علاقے کو اپنے قبضے میں نہیں لیا تھا اور روسی ـــ جنھیں کوئی چوٹ نہیں آئی تھی یا معمولی زخم آئے تھے۔ کبھی کے اسے خالی کر چکے تھے۔ جس طرح اس زرعی کھیت میں، جس پر خوب اچھی طرح قلبہ رانی کی گئی ہو، جا بجا کھاد کے ڈھیر پڑے ہوتے ہیں، یہ میدان بھی پورے کا پورا زخمیوں اور ہلاک شدگان سے پٹا پڑا تھا۔ ہر دو ایکڑ رقبے میں دس دس پندرہ پندرہ اشخاص پڑے تھے۔ زخمی رینگ رینگ کر دو دو تین تین کی ٹولیوں میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ ان کی تکلیف دہ چیخیں اور کراہیں، جو رستوف کو بعض اوقات مصنوعی معلوم ہونے لگتی تھیں، صاف سنائی اور کلیجہ چھلنی کیے دے رہی تھیں۔ مصائب وآلام میں مبتلا ان لوگوں سے نظریں بچانے کے لیے رستوف نے اپنے گھوڑے کی رفتار تیز کر دی۔ اسے خوف محسوس ہو رہا تھا ـــ اسے خوف اپنی زندگی کا نہیں تھا بلکہ اس بات کا تھا کہ اس میں ضروری حوصلے کی کمی ہے اور وہ جانتا تھا کہ وہ ان بدقسمت اشخاص کے منظر

کو دیکھنے کی تاب نہیں لا سکے گا۔

فرانسیسیوں نے اس میدان پر، جو زخمیوں اور ہلاک شدگان سے پٹا پڑا تھا، فائرنگ کا سلسلہ بند کر دیا تھا کیونکہ یہاں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔ لیکن جب انھوں نے ایک ایجوٹنٹ کو اس میں سے گزرتے دیکھا، انھوں نے ایک توپ کا رخ اس کی طرف موڑ دیا اور متعدد گولے داغ دیے۔ ایک طرف یہ منحوس سنسناتی آوازیں تھیں، دوسری طرف میدان میں لاشیں ہی لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ ان دونوں نے اس کے سینے میں مختلف اقسام کے احساسات کو جنم دیا لیکن وہ بالآخر گھل مل کر دہشت اور خود رحمی کے واحد تاثر میں تبدیل ہو گئے۔ اسے اپنی ماں کا آخری خط یاد آیا۔ ''اگر وہ اب کسی طرح مجھے اس میدان میں، جہاں توپ نے مجھے اپنے نشانے کی زد میں لے رکھا ہے،'' اس نے سوچا، ''دیکھ سکے، وہ کیا محسوس کرے گی؟''

ہوزیے راڈے گاؤں میں روسی تھے، اگرچہ وہ بھی ذہنی انتشار کا شکار تھے لیکن میدان جنگ سے پسپائی اختیار کرنے کے دوران میں ان کی صفوں میں وہ بے ترتیبی نہیں تھی جس کا مظاہرہ دوسروں نے کیا تھا۔ وہ فرانسیسی گنالوں کی زد سے باہر آ چکے تھے اور غنیم کی بندوقوں کی آوازیں بہت دور محسوس ہوتی تھیں۔ یہاں ہر شخص کو یہ واضح طور پر نظر آ رہا تھا کہ لڑائی ہاری جا چکی ہے اور وہ کھلے عام اس کا اعلان کرتا پھر رہا تھا۔ جس جس آدمی سے رستوف نے زار یا کوتوزوف کے بارے میں دریافت کیا، ان میں سے کوئی بھی اسے یہ نہ بتا سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ افواہ کہ زار زخمی ہو چکا ہے، درست ہے۔ دوسروں نے کہا کہ ''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' انھوں نے اس جھوٹی رپورٹ کی توضیح یوں کی کہ زار کی گاڑی میدان جنگ سے فراٹے بھرتی فرار ہو گئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زرد رو اور دہشت زدہ گرینڈ مارشل کاؤنٹ طالسطائی بھی تھا، جو زار کے ذاتی عملے کے دیگر ارکان کے ہمراہ گھوڑے پر میدان جنگ میں آیا تھا۔ ایک افسر نے رستوف کو بتایا کہ اس نے بائیں جانب کے گاؤں کے عقب میں ہیڈ کوارٹر کے کسی کارندے کو دیکھا تھا۔ رستوف کو اب یہ امید تو نہیں رہی تھی کہ وہ کسی کو تلاش کر سکے گا، وہ محض اپنے ضمیر کی تسلی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ادھر چل پڑا۔ وہ کوئی دو میل دور گیا ہو گا اور آخری روسی سپاہی سے آگے نکل چکا تھا کہ اسے گھوڑوں پر سوار دو اشخاص نظر آئے۔ وہ ایک کھائی کے، جو کسی گھر سے ملحقہ سبزیوں کے باغ کے ارد گرد بنی ہوئی تھی، سامنے رک گئے تھے۔ ان میں سے ایک کی، جس کی ٹوپی میں سفید کلغی آویزاں تھی، شکل رستوف کو جانی پہچانی معلوم ہوئی۔ دوسرا شاندار کمیت گھوڑے پر سوار تھا (رستوف کو محسوس ہوا کہ اس نے یہ گھوڑا بھی کہیں دیکھا ہے)، جب وہ کھائی کے نزدیک پہنچا، اس نے گھوڑے کو مہمیز لگایا، اس کی لگام ڈھیلی چھوڑی، ہلکے پھلکے انداز سے کھائی کے اوپر جست لگائی اور باغ میں داخل ہو گیا۔ گھوڑے کے پچھلے پاؤں کنارے سے ٹکرائے اور مٹی کا معمولی سا ٹکڑا نیچے گر پڑا۔ وہ پھرتی سے واپس مڑا، اس نے کھائی کے اوپر دوبارہ جست لگائی اور نہایت احترام کے ساتھ اس گھڑ سوار سے، جس کی ٹوپی میں سفید کلغی آویزاں تھی، مخاطب ہوا۔ وہ بظاہر اسے یہ سمجھا رہا تھا کہ اسے بھی ایسا ہی کرنا چاہیے۔ سوار نے، جس کی شکل رستوف کو جانی پہچانی معلوم ہوئی تھی اور جس پر اس نے ساری توجہ مرکوز

کر رکھی تھی، سر کو جھٹکا دیا اور اپنے ہاتھ سے انکار کا اشارہ کر دیا۔ اس اشارے سے رستوف کو یہ معلوم ہوا کہ یہ تو اس کا امپراطور ہے جس کے بارے میں وہ رنج والم کا اظہار کرتا اور جس کی وہ پرستش کرتا رہا ہے۔

''لیکن یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ اجاڑ میدان کے بیچ میں تن تنہا،'' رستوف نے سوچا۔

عین اسی لمحے الیکساندر نے اپنی گردن گھمائی اور رستوف کو وہ محبوب خدوخال، جو اس کے ذہن کی تختی پر واضح انداز سے مرتسم ہو چکے تھے، نظر آ گئے۔ زار کا رنگ فق تھا۔ اس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے اور اس کی آنکھیں خالی خالی تھیں۔ لیکن اس کے چہرے کی دلکشی اور ملائمت اور بھی نمایاں ہو گئی تھی۔ اسے دیکھ کر رستوف پھولا نہ سمایا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کے قریب جا سکتا ہے بلکہ سچ پوچھا جائے تو اسے جانا چاہیے اور وہ اسے وہ پیغام، جس کے متعلق دلگوروکوف نے اسے حکم دیا تھا کہ اسے پہنچایا جائے، پہنچانا چاہیے۔ لیکن جس طرح گرفتار محبت نوجوان مدتوں اس امید پر زندہ رہتا ہے کہ ایک نہ ایک دن اسے اپنی محبوبہ سے تنہائی میں ملاقات کا موقع میسر آ جائے گا لیکن جب یہ موقع آتا ہے، اور اسے اس کی خلوت میسر آتی ہے، اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں، اس کے جسم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور جن جذبات کا اظہار کرنے کے لیے اس نے راتیں خواب دیکھتے گزاری ہوتی ہیں، وہ انھیں بیان کرنے کا حوصلہ نہیں پاتا، بزدلوں کی طرح مدد کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑاتا ہے، کوشش کرتا ہے کہ کسی طرح ملاقات میں تاخیر ہو جائے یا راہ فرار کی کوئی صورت نکل آئے۔ اسی طرح اب جب کہ رستوف کو وہ چیز، جس کے حصول کے لیے اس نے دنیا کی ہر چیز سے زیادہ تمنا کی تھی، مل گئی تھی، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ زار کے قریب کیسے آئے اور اس کے ذہن میں ہزاروں دلائل سر اٹھانے لگے کہ ایسا کرنا بے موقع، بے محل، غیر مناسب اور ناممکن ہے۔

''کیا کروں؟ مجھے تو کچھ یوں محسوس ہوتا ہے کہ اب جب کہ وہ تنہا رہ گئے ہیں اور مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں، مجھے ان سے ملاقات کرنے کا جو موقع میسر آ گیا ہے، اگر میں اس سے فائدہ اٹھاؤں، میرا جی تو باغ باغ ہو جائے گا، لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس افسوس ناک لمحے میں انھیں کسی اجنبی چہرے کو دیکھنا ناگوار لگے یا شاید ذہنی تکلیف پہنچے۔ علاوہ ازیں اب جب کہ ان کو دیکھنے سے میرا دل دھڑکنا بند ہو گیا ہے اور میری زبان خشک ہو گئی ہے، میں انھیں کہہ بھی کیا سکتا ہوں؟''

اس نے اپنے تخیل میں جو لاتعداد تقریریں، جو اس نے زار کے سامنے کرنا تھیں، تیار کی تھیں، اب اسے ان میں سے ایک بھی یاد نہ آ سکی۔ وہ تقاریر زیادہ تر مختلف حالات کے لیے سوچی گئی تھیں اور انھیں فتح و نصرت کے مواقع پر، خاص طور پر اس وقت جب وہ زخموں سے چور بستر مرگ پر پڑا اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہو گا، ادا کیا جانا تھا۔ اپنے شجاعانہ کارناموں کے لیے وہ زار کا شکریہ وصول کر چکا ہو گا اور جس محبت کا اظہار وہ پہلے ہی عملاً کر کے دکھا چکا ہو گا، اب جان کنی کے دوران میں الفاظ کی صورت میں ادا کر رہا ہو گا۔

''اب جب کہ شام کے چار بج چکے ہیں اور جنگ ہاری جا چکی ہے، میں زار سے یہ پوچھنے کی جسارت کیسے

کرسکتا ہوں کہ میمنے کے متعلق ان کے احکام کیا ہیں؟ نہیں، مجھے یقیناً ان کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہیے۔ مجھے ان کے خیالات میں مخل نہیں ہونا چاہیے۔ ان کی غصیلی نگاہ یا اظہار ناپسندیدگی کا سامنا کرنے کی نسبت ہزار بار موت کو گلے لگانا زیادہ بہتر ہے۔'' رستوف نے فیصلہ کیا اور اپنے دل میں مایوسی وملال سمائے وہاں سے چل پڑا لیکن وہ بار بار مڑ کر زار کو، جو ابھی تک حیص بیص کی کیفیت میں وہیں کھڑا تھا، دیکھتا رہا۔

جب رستوف دل ہی دل میں اس قسم کا استدلال کر رہا تھا اور غم واندوہ کی حالت میں وہاں سے روانہ ہو رہا تھا، اتفاق سے کیپٹن وان ٹول کا ادھر سے گزر ہوا اور زار پر نظر پڑتے ہی وہ سیدھا اس کے پاس چلا گیا، اسے اپنی خدمات پیش کیں اور اسے پیدل کھائی عبور کرنے میں مدد دی۔ زار کی طبیعت ناساز ہو رہی تھی اور وہ آرام کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ ایک سیب کے درخت تلے بیٹھ گیا اور وان ٹول اس کے پاس ٹھہرا رہا۔ دور فاصلے پر رستوف کو یہ دیکھ کر رشک بھی آ رہا تھا اور اسے ندامت بھی ہو رہی تھی کہ وان ٹول بڑی گرم جوشی سے زار سے طویل گفتگو کر رہا ہے۔ زار نے اپنی آنکھیں ڈھانپ رکھی تھیں اور وہ وان ٹول کا ہاتھ دبا رہا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہو رہا تھا کہ وہ رو رہا ہے۔

''اور اس کی جگہ میں ہو سکتا تھا!'' رستوف نے سوچا۔ زار کی حالت دیکھ کر اسے اتنا ترس آیا کہ اس کے لیے اپنے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو گیا۔ مایوسی نے اسے پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اسی عالم میں وہ وہاں سے چل پڑا۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

اس کی مایوسی اس احساس سے اور بھی شدید ہو گئی تھی کہ اس کے رنج والم کا سبب اس کی اپنی کم ہمتی تھی۔

وہ چاہتا تو زار کے پاس جا سکتا تھا۔ نہ صرف جا سکتا تھا بلکہ اسے جانا چاہیے تھا۔ اپنی جان نثاری جتانے کا یہ فقید المثال موقع تھا اور اس نے اس سے فائدہ نہیں اٹھایا تھا... ''یہ میں نے کیا کیا؟'' وہ سوچ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھوڑے کا رخ بدل دیا اور اسے سرپٹ بھگاتا اس جگہ پہنچا جہاں اس نے پہلے پہلے زار کو دیکھا تھا۔ لیکن اب کھائی کی دوسری جانب نہ کوئی بندہ تھا نہ بشر۔ صرف چند گاڑیاں اور چھکڑے گزر رہے تھے۔ ایک کوچوان کی زبانی اسے معلوم ہوا کہ کوتوزوف کا عملہ قریب ہی کے گاؤں میں مقیم ہے اور چھکڑے ادھر ہی جا رہے ہیں۔ رستوف ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

اس کے آگے کوتوزوف کا سائیس چند گھوڑے، جن کے اجسام پر جھول پڑے تھے، ہنکائے جا رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک چھکڑا اور چھکڑے کے پیچھے ایک گھریلو ملازم، جس کی ٹانگیں ٹیڑھی، سر پر پھندے دار ٹوپی اور جسم پر بھیڑ کی کھال کا کوٹ تھا، جا رہا تھا۔

''تیت، اوہ، تیت!'' سائیس نے کہا۔

''کیا ہے؟'' بوڑھے نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

''تیت، بھوسا جھاڑ پچھیت!''

''احمق! الو کی دم!'' بوڑھے نے کہا اور غصے سے زمین پر تھوک دیا۔

کچھ دیر خاموشی رہی اور اس کے بعد اس مذاق کو دوبارہ دہرایا گیا۔

اس روز شام کے پانچ بجے تک تمام مقامات پر لڑائی ہاری جا چکی تھی۔ ایک سو سے زائد گنیں فرانسیسیوں کے قبضے میں جا چکی تھیں۔ پرزے بزیوسکی اور اس کی کور ہتھیار ڈال چکی تھی۔ جہاں تک دوسرے کالموں کا تعلق ہے، ان کے نصف کے قریب جوان موت کے گھاٹ اتر چکے تھے اور باقی بے ترتیب ہجوموں کی صورت میں پسپائی اختیار کر رہے تھے۔

لانژغوں اور دختوروف کے بچے کھچے لشکری اوگذ گاؤں کے قریب بندوں[43] اور جوہڑوں کے کناروں پر بدنظمی اور بے ترتیبی سے بھیڑ لگائے جمع تھے۔

شام کے چھ بجے جس واحد فائرنگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، وہ فرانسیسیوں کی اوگذ ڈیم پر گولہ باری تھی۔ فرانسیسیوں نے متعدد توپیں پراٹسن کی پہاڑی پر نصب کر لی تھیں اور وہ وہیں سے ہمارے جوانوں پر، جو پسپا ہو رہے تھے، یہ گولہ باری کر رہے تھے۔

عقب میں دختوروف اور کچھ دوسرے اشخاص نے چند بٹالینیں اکٹھی کر لی تھیں اور وہ مسلسل فرانسیسی رسالے پر، جو ہمارے دستوں کا تعاقب کر رہے تھے، فائرنگ کر رہے تھے۔ شام کا دھندلکا گہرا ہو رہا تھا۔ اوگذ ڈیم خاصا تنگ تھا۔ اس کے قریب جو پن چکی تھی، کئی سالوں سے اس کے مالک کا یہ دستور تھا کہ وہ چھجے دار ٹوپی پہن لیتا، ڈیم پر بیٹھ جاتا اور امن وسکون سے مچھلیاں پکڑتا رہتا۔ اس دوران میں اس کا پوتا آستینیں چڑھائے، پانی کے پیپے میں ہاتھ ڈالے، اچھلتی کودتی مچھلیوں کے ساتھ، جو اس کے ہاتھ سے پھسل پھسل جاتیں، کھیلتا رہتا۔ موراویا کے باشندے نیلے کوٹ اور پشم دار ٹوپیاں پہنے، برسوں سے اسی ڈیم کے ساتھ ساتھ اپنی گاڑیاں، جن پر گندم لدی ہوتی تھی اور جن میں دو دو گھوڑے جتے ہوتے تھے، ہانکتے لاتے رہے اور پن چکی پر گندم پسوانے کے بعد اپنی گاڑیاں، جو آٹا بکھرنے سے سفید نظر آنے لگتیں، اسی ڈیم کے ساتھ ساتھ چلتے واپس لے جاتے رہے تھے۔ ڈیم اب بھی وہی تھا لیکن اب اس پر توپوں اور چھکڑوں کے مابین، گھوڑوں کے قدموں تلے اور گاڑیوں کے پہیوں کے بیچ جوان گٹھڑیاں بنے جا رہے تھے۔ موت کے خوف نے ان کے چہرے بگاڑ دیے تھے، دھکم پیل میں وہ ایک دوسرے کو کچل رہے تھے، دم گھٹنے سے ہلاک ہو رہے تھے، ہلاک شدگان کے اوپر چھلانگیں لگا رہے تھے، ایک دوسرے کی ہلاکت کا باعث بن رہے تھے۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کر رہے تھے تاکہ وہ چند قدم آگے بڑھ سکیں۔ وہ آگے بڑھتے ضرور تھے لیکن خود بھی اسی طرح ہلاک ہو رہے تھے۔

ہر دس سیکنڈ بعد ایک گولہ لہراتا، بل کھاتا، ہوا سے ٹکراتا آتا اور گڑاپ سے اس ہجوم کے مابین گر پڑتا یا کوئی شیل ان کے درمیان پھٹ جاتا۔ کچھ لوگ ہلاک ہو جاتے اور ان کے خون کے چھینٹے ان اشخاص پر، جوان کے

قریب ہوتے، جا پڑتے۔

دلوخوف کا بازو زخمی ہو چکا تھا اور وہ اپنی کمپنی (اسے اب افسر بنا دیا گیا تھا) کے دس بارہ جوانوں کے ساتھ پیدل چل رہا تھا۔ اس کا رجمنٹل کمانڈر، جو گھوڑے پر سوار تھا، ان کے ساتھ تھا۔ پوری رجمنٹ میں صرف یہی اشخاص زندہ بچے تھے۔ دھکم پیل میں ہجوم انھیں اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا۔ جب وہ ڈیم کے قریب پہنچے، وہ چاروں اطراف سے بھیڑ میں پھنس گئے۔ وہ اب نہ آگے جا سکتے تھے اور نہ پیچھے ہٹ سکتے تھے کیونکہ آگے ایک گھوڑا گجنال کے نیچے گر پڑا تھا اور ہجوم اسے گھسیٹنے میں مصروف تھا۔ توپ کا ایک گولہ آیا۔ ایک شخص ان کے عقب میں ہلاک ہو گیا اور ایک ان کے سامنے گر پڑا۔ خون کے چھینٹوں نے دلوخوف کو تر کر دیا۔ ہجوم میں لوگ بری طرح ایک دوسرے میں پھنسے ہوئے تھے، وہ آگے بڑھنے کے لیے زور لگا رہے تھے، چند قدم چلتے بھی لیکن پھر رک جاتے۔

"سو قدم مزید آگے نکل گئے تو میں لازماً بچ جاؤں گا لیکن یہاں دو منٹ اور ٹھہرے رہے، میں یقیناً بے موت مارا جاؤں گا،" ہر شخص اسی انداز سے سوچ رہا تھا۔

دلوخوف نے جو ہجوم کے عین درمیان میں تھا، دھکا مارا اور ڈیم کے کنارے پر پہنچ گیا۔ اس عمل میں اس نے دو جوان نیچے گرا دیے۔ چکی کے تالاب کی سطح برف نے ڈھانپ رکھی تھی اور یہاں پھسلن ہو رہی تھی۔

"ادھر آ جاؤ!" دلوخوف نے برف پر، جو اس کے بوجھ تلے چرچرانے لگی تھی، چھلانگتے ہوئے چلا کر کہا۔ "اس طرف آ جاؤ!" اس نے جوانوں سے، جو توپ اٹھائے آ رہے تھے، چلا کر با آواز بلند کہا۔ "یہاں پاؤں ٹک رہے ہیں!"

برف نے اس کا بوجھ سہار تو لیا لیکن وہ اس کے پاؤں تلے چٹخنے اور آگے پیچھے جھولنے لگی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ گجنال اور چند مزید لوگوں کا بوجھ تو کیا برداشت کرے گی، خود اس کا اپنا وزن بھی نہیں اٹھا سکے گی۔ اسے دیکھ کر جوانوں نے کنارے کی جانب دھکم پیل شروع کر دی لیکن وہ برف پر چڑھنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ گھوڑے پر سوار جرنیل نے اس راستے پر، جو ڈیم کو جاتا تھا، پہنچ کر اپنا ہاتھ اوپر اٹھایا اور دلوخوف سے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ اچانک گجنال کا ایک گولہ ہجوم کے سروں کے اتنے قریب سے اڑتا گزرا کہ ہر شخص نیچے جھک گیا۔ گولے کے لہرانے، بل کھانے اور اس کے کسی نرم شے سے ٹکرانے کی آواز پیدا ہوئی۔ جرنیل اپنے گھوڑے سے نیچے گر پڑا اور اپنے ہی خون میں نہا گیا۔ کسی شخص نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور نہ اسے اٹھانے کے متعلق سوچا۔

"برف پر چڑھ جاؤ! برف پر چڑھ جاؤ! چلو، چلو! مڑو! سنا نہیں تم نے؟ چلو۔" جرنیل کے گولے کی زد میں آنے کے بعد بے شمار آوازیں گلے پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہی تھیں حالانکہ کسی کو بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ چلا چلا کر کیا کہہ رہے اور کیوں کہہ رہے ہیں۔

پیچھے سے ایک توپ گاڑی، جو ابھی ابھی ڈیم تک پہنچی تھی، برف کی طرف موڑ دی گئی۔ ڈیم سے فوجیوں کے ہجوم دوڑ دوڑ کر برف سے ڈھکے ہوئے پن چکی کے تالاب پر چڑھنے لگے۔ ان میں سے ایک کے پاؤں تلے برف چٹخ گئی اور اس کی ٹانگ پھسل کر پانی میں چلی گئی۔ اس نے سیدھا ہونے کی کوشش کی اور کمر تک پانی میں

دھنس گیا۔ اس کے نزدیک جو جوان تھے، وہ ہچکچائے اور توپ گاڑی کے کوچوان نے اپنے گھوڑے روک لیے لیکن اس کے پیچھے آوازیں چلائے جارہی تھیں: "برف پر چڑھو! برف پر چڑھو تم رک کیوں گئے ہو؟ چلو! آگے چلو!" اور ہجوم میں خوف ودہشت کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ توپ گاڑی کے نزدیک جو جوان تھے، وہ اپنے بازو لہرانے اور گھوڑوں پر گھونسے برسانے لگے تاکہ انھیں مڑنے اور چلنے پر مجبور کیا جاسکے۔ گھوڑے کناروں سے ہٹنے لگے۔ برف، جواب تک پیدل آدمیوں کا بوجھ اٹھانے میں کامیاب رہی تھی، نیچے دھنسنے لگی۔ اس کا بہت بڑا ٹکرا، جس پر تقریباً چالیس آدمی موجود تھے، ٹوٹنے لگا۔ کچھ لوگ اگلی طرف گرے اور کچھ پچھلی طرف۔ وہ پانی میں گرتے اور ایک دوسرے کو ڈبوتے جارہے تھے۔

توپوں کے گولے ابھی تک باقاعدہ وقفوں سے سروں کے اوپر سنسناتے گزر رہے تھے۔ ان میں سے چند ایک برف پر گرتے، دھماکے کی آواز پیدا کرتے اور پانی میں ڈوب جاتے۔ تاہم ان کی بیشتر تعداد ان جوانوں کے، جنھوں نے ڈیم، چکی کے تالاب اور ندی کے کناروں پر بھیڑ کررکھی تھی، عین درمیان میں گر رہے تھے۔

19

پراٹسن پہاڑی پر، جہاں وہ اپنے ہاتھوں میں پرچم کا بانس تھامے گرا تھا، پرنس آندرے بلکونسکی پڑا تھا۔ اس کا کثیر مقدار میں خون بہہ رہا تھا اور غیر شعوری طور پر اس کی مدھم، کرب ناک اور طفلانہ کراہیں نکل رہی تھیں۔

شام ڈھلے اس کی کراہیں بند ہوگئیں اور وہ بالکل ساکت ہوگیا۔ اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر بے ہوش رہا ہے۔ اچانک اسے دوبارہ محسوس ہوا کہ وہ زندہ ہے اور اس کے سر میں روح سوز اور دل خراش درد ہورہا ہے۔

"وہ بلند وبالا آسمان، جسے میں نے آج ہی دیکھا تھا اور جس سے میں ازیں پیشتر کبھی آشنا نہیں تھا، کہاں ہے؟" اس کے ذہن میں جس اولیں خیال نے راہ پائی، وہ یہی تھا۔ "اس اذیت سے بھی میں پہلے آشنا نہیں تھا،" اس نے سوچا۔ "نہیں، اس سے پہلے مجھے کچھ نہیں، بالکل کچھ نہیں معلوم تھا۔ لیکن میں ہوں کہاں؟"

وہ غور سے سننے لگا۔ اسے گھوڑوں کی ٹاپیں اور فرانسیسی میں باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ اس کے سر پر ایک بار پھر وہی بلند وبالا آسمان تھا۔ بادل اٹھ رہے تھے اور ان کے بیچ میں اسے نیلگوں ابدیت کی جھلک دکھائی دی۔ اس نے نہ اپنی گردن گھمائی اور نہ ان لوگوں کو دیکھا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں اور ان کی آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس کے قریب پہنچ کر رک گئے ہیں۔

یہ نپولین تھا۔ اس کی معیت میں اس کے دو ایڈی کانگ تھے۔ میدان جنگ کا چکر لگانے کے بعد بوناپارٹ نے آخری حکم یہ دیا تھا کہ وہ توپیں، جو اوگڈ ڈیم پر گولہ باری کررہی ہیں، ان کی تعداد میں اضافہ کردیا جائے۔ اور اب وہ ان زخمیوں اور ہلاک شدگان کا، جو میدان جنگ میں بکھرے پڑے تھے، جائزہ لے رہا تھا۔

"اچھے آدمی ہیں یہ!" نپولین نے ایک روسی سپاہی کی، جس کا کام دستی بم پھینکنا تھا، لاش دیکھ کر کہا۔ (یہ سپاہی

اوندھے منہ پڑا تھا، اس کا چہرہ زمین کے اندر دھنسا ہوا تھا، اس کی گردن سیاہ ہو چکی تھی اور اس کا ایک بازو، جو پہلے ہی اکڑ چکا تھا، باہر کی طرف نکلا ہوا تھا۔)

''عالی جاہ! توپوں کا گولہ بارود ختم ہو چکا ہے،'' ایک ایجوٹنٹ نے اطلاع دی۔ وہ سیدھا اس توپ خانے سے، جو اوگڈ ڈیم پر بم برسا رہا تھا، آرہا تھا۔

''محفوظے سے کچھ منگوا لو،'' نپولین نے کہا۔ وہ چند قدم چلا، پھر رک گیا اور نیچے پرنس آندرے کو، جو پشت کے بل پڑا تھا، دیکھنے لگا۔ پرچم کا بانس، جو پرنس آندرے کے ساتھ گرا تھا، اس کے قریب پڑا تھا۔ (فرانسیسی نشانی کے طور پر پرچم پہلے ہی اتار چکے تھے۔)

''کیا بڑھیا موت ہے!'' نپولین نے بلکونسکی کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے کو احساس ہوا کہ یہ جملہ اس کے بارے میں کہا گیا ہے اور جس شخص نے یہ جملہ کہا ہے، وہ نپولین ہے۔ وہ سن چکا تھا کہ متکلم کو ''عالی جاہ'' کے لقب سے مخاطب کیا گیا ہے لیکن اسے یہ الفاظ بالکل اسی طرح سنائی دیے تھے، جس طرح مکھی کی بھنبھناہٹ سنائی دیتی ہے۔ نہ صرف یہ کہ اسے ان میں کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس نے ان کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی تھی اور انھیں فوراً بھول گیا تھا۔ اس کے سر میں سوزش ہو رہی تھی، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا خون ضائع ہو رہا ہے اور اسے اپنے اوپر، دور، بہت دور، بلند و بالا، ابدی آسمان نظر آیا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ نپولین — اس کا ہیرو — ہے، لیکن اس لمحے اس کی روح اور بلند و بالا، بے پایاں آسمان کے مابین، جس پر بادل تیر رہے تھے، جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا تھا، اس کے مقابلے میں نپولین اسے بالکل چھوٹا اور حقیر نظر آیا۔ اس لمحے اس کے لیے یہ بات قطعی بے معنی تھی کہ اس کے سر پر کون کھڑا ہے اور اس کے بارے میں کیا کہا جا رہا ہے۔ اسے تو صرف اس بات کی خوشی تھی کہ وہاں چند لوگ موجود ہیں، وہ صرف یہ چاہتا تھا کہ وہ اس کی مدد کریں اور اس کی زندگی، جو اب اسے اتنی حسین نظر آ رہی تھی کہ اس کے بارے میں اس کا رویہ یکسر تبدیل ہو گیا تھا، بحال کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں ہلائیں۔ اس نے ہلنے جلنے اور کچھ کہنے کے لیے انتہائی زبردست کوشش کی۔ اس نے ناتوانی سے اپنی ٹانگ کو جنبش دی اور اتنے مدھم اور مریضانہ انداز سے آہ بھری کہ خود اسے اپنے اوپر ترس آ گیا۔

''ارے، یہ تو زندہ ہے!'' نپولین نے کہا۔ ''اس نوجوان کو اٹھاؤ اور مرہم پٹی کی چوکی پر لے چلو!''

نپولین نے یہ کہا اور مارشل لانؔ کی جانب بڑھا۔ مارشل نے ہاتھ میں ٹوپی پکڑ رکھی تھی اور وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ اسے فتح کی مبارک باد دینے آیا تھا۔

پرنس آندرے کو مزید کچھ یاد نہ رہا۔ اسے جس طرح اٹھا کر سٹریچر پر لٹایا گیا، منتقلی کے دوران میں جو ہچکولے آئے اور مرہم پٹی کی چوکی پر اس کے زخموں کو جس طرح کریدا گیا، اس سے اتنا شدید درد ہوا کہ وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا اور اسے ہوش صرف اس وقت آیا جب شام ڈھل چکی تھی اور اسے دوسرے زخمی اور اسیر روسی افسروں کے ساتھ ہسپتال منتقل کیا جا چکا تھا۔ اس منتقلی کے دوران میں اسے محسوس ہوا کہ اس کی کچھ توانائی عود کر آئی

ہے۔اب وہ اپنے گرد و پیش نظریں دوڑانے بلکہ لب کشائی کرنے کے بھی قابل ہو گیا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد جو اولین الفاظ اس کے کانوں میں پڑے، وہ ایک فرانسیسی کانوائے افسر کے تھے۔ وہ تیز تیز باتیں کر رہا اور کہہ رہا تھا:

''ہمیں یہیں رک جانا چاہیے۔ امپراطور سیدھے ادھر تشریف لا رہے ہوں گے اور وہ ان عالی نسب اسیروں کو دیکھ کر خوش ہوں گے۔''

''آج تو اتنی زیادہ تعداد میں قیدی پکڑے گئے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری روسی فوج ہی اسیر ہوگئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ انھیں دیکھ دیکھ کر اکتا چکے ہوں گے،'' دوسرے افسر نے کہا۔

''بہرحال سنا ہے کہ یہ آدمی امپراطور الیکساندر کے تمام گارڈز کا کمانڈر ہے،'' اس نے ایک مجروح روسی افسر کی طرف، جو ہارس گارڈز کی سفید وردی میں ملبوس تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

بلکونسکی نے پرنس ریپ نن (Repnin) کو پہچان لیا۔ اس سے اس کی ملاقات پیٹرز برگ کی محفلوں میں ہوئی تھی۔ اس کے قریب ایک انیس سالہ نوجوان کھڑا تھا۔ وہ بھی ہارس گارڈز کا افسر تھا اور زخمی تھا۔

بونا پارت سرپٹ گھوڑا دوڑاتا آیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے لگام کھینچ لی۔

''یہاں سینئر افسر کون ہے؟'' اس نے اسیروں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

انھوں نے کرنل ریپ نن کا نام لیا۔

''تم امپراطور الیکساندر کے ہارس گارڈز رجمنٹ کے کمانڈر ہو؟'' نپولین نے پوچھا۔

''میں سکواڈرن کمانڈر تھا،'' ریپ نن نے جواب دیا۔

''تمھاری رجمنٹ نے اپنے فرائض احسن طریقے سے نبھائے،'' نپولین نے کہا۔

''ایک عظیم سالار کی تعریف و تحسین سپاہی کا سب سے بڑا انعام ہے،'' ریپ نن نے جواب دیا۔

''میں اسے نہایت مسرت سے تم پر نچھاور کرتا ہوں،'' نپولین نے کہا۔ ''تمھارے قریب یہ نوجوان کون ہے؟'' پرنس ریپ نے اس کا نام لیفٹیننٹ سختےلن بتایا۔

نپولین اسے دیکھ کر مسکرایا اور بولا: ''ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے کہ ہمارے ساتھ بھڑنے آ گیا۔''

''نوعمری شجاعت و جرأت کے راستے میں دیوار نہیں بنتی،'' نوجوان نے زیر لب کہا۔ اس کا گلا رندھ رہا تھا۔

''واہ، واہ! بہت عمدہ جواب ہے،'' نپولین نے کہا۔ ''نوجوان تم بہت ترقی کرو گے۔''

پرنس آندرے جسے، امپراطور کے سامنے اسیروں کی نمائش مکمل کرنے کے لیے آگے لایا گیا تھا، اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں ناکام نہ رہا۔ نپولین اسے پہلے ہی میدان جنگ میں دیکھ چکا تھا اور نظر آ رہا تھا کہ اسے یہ بات یاد ہے۔ اس نے اسی لقب ''نوجوان'' سے، جو بلکونسکی کو پہلی مرتبہ دیکھنے کے بعد اس کے ذہن میں چپک گیا تھا، مخاطب کیا۔

''نوجوان، تم؟'' اس نے کہا۔ ''mon brave*، کیا حال ہے؟''

اگرچہ پانچ منٹ قبل پرنس آندرے ان سپاہیوں سے، جو اسے اٹھا کر لا رہے تھے، چند الفاظ کہنے میں کامیاب رہا تھا، لیکن اب جب کہ اس کی نگاہیں نپولین پر جمی ہوئی تھیں، وہ خاموش رہا... نپولین جن چیزوں میں دلچسپی لے رہا تھا، وہ بلند و بالا، منصف مزاج اور کریم النفس فلک کے مقابلے میں، جسے وہ دیکھ اور سمجھ چکا تھا، اسے اتنی حقیر اور معمولی محسوس ہوئیں اور خود اس کا ہیرو، جو اپنی فتح و کامرانی کے موقع پر اپنی جس ہیچ پوچ خود پسندی اور مسرت کا اظہار کر رہا تھا، اس وقت اتنا گھٹیا دکھائی دیا کہ وہ اسے جواب دینے سے قاصر تھا۔

دراصل بات یہ تھی کہ ضعف و ناتوانی، ضیاع خون، اذیت اور قرب مرگ نے اس کے ذہن میں جن متین اور برتر خیالات کی رو چلا دی تھی، ان کے مقابلے میں اسے ہر چیز بیکار، فضول اور بے حقیقت نظر آ رہی تھی۔ وہ نپولین کی آنکھوں میں دیکھ رہا اور سوچ رہا تھا کہ عظمت کتنی غیر اہم ہے، زندگی، جسے کوئی بھی سمجھ نہیں سکا ہے، کتنی بے حیثیت ہے اور سب سے بڑھ کو موت، جس کی کوئی ذی روح نہ تفہیم کر سکا ہے اور نہ تشریح، کتنی بے وقعت ہے۔

امپراطور جواب کا انتظار کیے بغیر اپنے ایک افسر کی طرف متوجہ ہوا اور بولا:

''ان شرفاء کا پورا خیال رکھیں اور انھیں میرے کیمپ میں پہنچا دیں۔ میرے ڈاکٹر لانے (Larrey) سے کہیں کہ وہ ان کے زخموں کا معائنہ کرے۔ Au revoir**' پرنس ریپ نن۔''

اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور ہوا سے باتیں کرنے لگا۔ مسرت و اطمینان سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

ان سپاہیوں نے، جو پرنس آندرے کو اٹھا کر لائے تھے، وہ طلائی تعویذ، جو پرنسس ماریا نے اپنے بھائی کے گلے میں حمائل کیا تھا، اتار لیا تھا۔ لیکن جب انھوں نے ان اسیروں کے بارے میں امپراطور کو دوستانہ رویہ اپناتے دیکھا، انھوں نے یہ جھٹ پٹ اسے لوٹا دیا۔ پرنس آندرے کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ یہ اس کے گلے میں کیسے لٹکایا گیا یا کس نے لٹکایا ہے، لیکن اس کی نازک طلائی زنجیر پر جو شبیہہ بنی ہوئی تھی، وہ اچانک اس کے سینے پر وردی کے باہر دکھائی دینے لگی۔

''اگر ہر چیز اتنی ہی واضح، غیر مبہم اور سیدھی سادی ہو،'' پرنس آندرے نے اس شبیہہ پر، جو اس کی ہمشیرہ نے اتنے ادب و احترام اور جوش و جذبے سے اس کے گلے میں حمائل کی تھی، نظریں ٹکاتے ہوئے سوچا، ''جتنی پرنسس ماریا کو نظر آتی ہے تو اس سے بہتر بات اور کیا ہوگی، اور کیا ہوگی! اگر آدمی کو یہ معلوم ہو کہ اس زندگی میں مدد کہاں ڈھونڈی جا سکتی ہے اور بعد از مرگ، مرقد سے آگے، کس چیز کی توقع کی جا سکتی ہے، اس سے بہتر بات اور کیا ہوگی، اور کیا ہوگی! اگر میں یہ کہہ سکوں: 'خدایا' مجھ پر کرم فرما! مجھے کتنی خوشی اور سکون محسوس ہو... لیکن میں یہ کہوں کس سے؟ کسی اس طاقت سے۔ جس کی نہ تعریف ممکن ہے اور نہ تفہیم۔ جس سے میں نہ صرف یہ کہ استدعا

---

* میرے بہادر دوست

** (فی الحال) خدا حافظ

نہیں کر سکتا بلکہ جسے میں اپنے الفاظ میں بیان بھی نہیں کر سکتا۔ جو یا تو عظیم تریں ہے یا پھر کچھ بھی نہیں،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یا پھر اس خدا سے جسے ماریا نے اس تعویذ میں سی دیا ہے؟ کچھ بھی تو یقینی نہیں ہے، بالکل یقینی نہیں ہے، سوائے اس بات کے کہ ہر شے لاشے ہے، میری سمجھ میں تو صرف یہی چیز آتی ہے یا پھر کسی ایسی چیز کی، جو نا قابل فہم لیکن اہم تریں ہے، عظمت!''

سٹریچر حرکت کرنے لگے۔ ہر ہچکولے پر اسے دوبارہ نا قابل برداشت درد محسوس ہونے لگتا۔ اس کا بخار بڑھنے لگا اور اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اپنے باپ، بیوی، ہمشیرہ اور اپنے بیٹے کی، جس نے مستقبل قریب میں جنم لینا تھا، تصویریں، لڑائی سے ایک رات قبل اس نے ان کے لیے جو شفقت و محبت محسوس کی تھی، حقیر و کوتاہ قامت نپولین کی شکل و صورت اور سب سے بڑھ کر وہ بلند و بالا فلک۔ ہذیانی کیفیت میں اس کی آنکھوں کے سامنے جو سائے لہرا رہے تھے، یہ اس کے بڑے بڑے عناصر تھے۔

بالڈ ہلز کی پر سکون گھریلو زندگی اور طمانیت بخش مسرت کا خاکہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ وہ اپنی اس مسرت سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ ننھے منے نپولین کا ہیولیٰ نمودار ہونے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا نقطۂ نظر محدود ہے اور وہ سنگدلانہ انداز سے دوسروں کی بپتا پر خوش ہو رہا ہے... اس کے بعد پھر وہی شکوک و شبہات اور وہی اذیتیں اور کرب... صرف فلک امن و سکون کی نوید سنا رہا تھا۔

صبح کے طلوع ہونے پر اس کے تمام خواب بے ہوشی اور نسیان کی تاریکی اور انتشار میں مدغم ہو گئے اور اپنے وجود سے محروم ہو گئے۔ نپولین کے ڈاکٹر لاغے کے خیال کے مطابق یہ کیفیت کچھ اس قسم کی تھی کہ صحت یابی کی نسبت موت کا امکان زیادہ تھا۔

''یہ شخص اعصابی اور صفراوی ہے،'' ڈاکٹر لاغے نے کہا۔ ''یہ صحت یاب نہیں ہو سکے گا۔''

ان دوسرے اشخاص کی طرح، جن کی صحت یابی کی کوئی امید نہیں رہ گئی تھی، پرنس آندرے کو بھی مقامی باشندوں کی محافظت میں دے دیا گیا۔

دوسری کتاب

حصہ اول

1

1806 کے اوائل میں نکولائی رستوف چھٹی پر گھر آیا۔ دینی سوف بھی اپنے گھر وارانیژ[1] جا رہا تھا۔ رستوف نے اسے ماسکو تک اپنے ساتھ سفر کرنے اور وہاں اپنے ہاں قیام کرنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ ماسکو سے دو منزل ادھر دینی سوف کی اپنے ایک دوست سے ملاقات ہوئی اور اس نے اس کے ساتھ مل کر تین بوتل شراب پی۔ اور اس امر کے باوجود کہ گاڑیوں کی مسلسل آمدورفت کی وجہ سے سڑک پر جگہ جگہ گڑھے اور کھڈے بنے ہوئے تھے، وہ سلیج (برف گاڑی) کے نچلے حصے میں رستوف کے برابر گھوڑے بیچ کر سویا رہا۔ جہاں تک رستوف کا تعلق ہے، جوں جوں ماسکو قریب آتا گیا، توں توں اس کی بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہوتا گیا۔

"ابھی کتنا دور ہے؟ کتنا دور ہے؟ اف، یہ ناقابل برداشت گلی کوچے، یہ دکانیں، بیکریوں کے سائن بورڈ، سٹریٹ لیمپ اور سلیجیں! ختم ہونے میں ہی نہیں آتے!" رستوف جھنجھلا رہا تھا۔ وہ شہر کے دروازے پر اپنی اپنی چھٹی کے اجازت نامے پیش کر چکے تھے اور اب ماسکو کے کوچوں اور بازاروں میں سے گزر رہے تھے۔

"دینی سوف ہم پہنچ گئے!... ارے، سو گئے!" اس نے کہا اور اس نے اپنا سارا جسم یوں آگے کو جھکا لیا گویا کہ اس کے ایسا کرنے سے سلیج کی رفتار تیز ہو جائے گی۔

دینی سوف نے کوئی جواب نہ دیا۔

"چوک کے اس کونے میں گاڑی بان ذاخار کا اڈا ہے۔ اور وہ خود ذاخار ہے۔ اس کے پاس ابھی تک وہی گھوڑا ہے! اور وہ رہی ننھی منی دکان جہاں سے ہم جنجر بریڈ[2] خریدا کرتے تھے! ذرا جلدی کرو!"

"کون سا مکان ہے؟" ڈرائیور نے پوچھا۔

وہ نکڑ والا۔ اتنا بڑا۔ نظر نہیں آتا؟ وہ ہمارا مکان ہے!" رستوف نے کہا۔ "بالکل وہی مکان ہے، بالکل وہی! دینی سوف! دینی سوف! سمجھو کہ ہم پہنچ گئے!"

دینی سوف نے اپنا سر اٹھایا اور کھنکار کر گلا صاف کیا لیکن وہ منہ سے کچھ نہ بولا۔

"دمیتری،" رستوف نے اپنے وردی پوش ملازم سے کہا جو ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ "وہ ہمارے گھر کی

روشنیاں ہیں۔ٹھیک ہے؟''

''جی، جناب، اور وہ روشنی آپ کے ابا جان کے سٹڈی روم سے آرہی ہے۔''

''تو گویا وہ ابھی تک سوئے نہیں؟ تمھارا کیا خیال ہے؟ ہاں، ذرا دھیان رکھنا، فوراً میرا نیا کوٹ نکالنا نہ بھولنا،'' رستوف نے اپنی نئی نئی مونچھوں میں انگلی پھیرتے ہوئے مزید کہا۔ ''خیر، چلے چلو!'' اس نے گلا پھاڑ کر ڈرائیور سے کہا۔ ''واسکا، اب جاگ بھی جاؤ،'' اس نے دینی سوف کی جانب، جو ایک بار پھر جھولنے لگا تھا، متوجہ ہو کر کہا۔ ''چلو نا، بھئی جلد کرونا!۔تمھیں ووڈکا کے لیے چاندی کے تین روبل ملیں گے۔لیکن جلدی کرو!'' رستوف نے چلا کر کہا حالانکہ سلیج اس کے گھر سے صرف تین مکان دور تھی۔

اسے یوں لگ رہا تھا جیسے گھوڑے بالکل حرکت نہیں کر رہے۔آخر کار سلیج دائیں طرف مڑی اور پورچ کے سامنے پہنچ کر رک گئی۔رستوف کو اپنے سر کے اوپر جانی پہچانی کنگنی، جس کے پلستر کا ایک کونا ٹوٹ چکا تھا، سیڑھیاں اور پشتی بان پتھر نظر آئے۔اس نے گاڑی رکنے کا انتظار نہ کیا، نیچے جست لگائی اور قلانچیں بھرتا استقبالیہ کمرے کی طرف بھاگ پڑا۔مکان میں نہ تو زندگی کے کوئی آثار دکھائی دیتے تھے اور نہ وہ کسی مہمان کے استقبال کے لیے تیار نظر آتا تھا۔معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس بات کی مطلق پروا نہیں کہ کون آیا ہے۔استقبالیہ کمرے میں کوئی متنفس نہیں تھا۔''اف میرے خدایا! یہاں خیریت ہے؟'' رستوف نے سوچا۔وہ ایک ثانیے کے لیے رک گیا کیونکہ اس کا دل ڈوب رہا تھا۔تاہم وہ پھر دوڑنے لگا اور جانا پہچانا ٹیڑھا میڑھا زینہ چڑھنے لگا۔دروازے کا وہی پرانا ہینڈل تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح اب بھی ڈھیلا ڈھالا تھا۔اگر اس ہینڈل کی مناسب انداز سے صفائی نہ کی جاتی، کاؤنٹس آگ بگولا ہو جایا کرتی تھی۔پیش دالان میں چربی کی صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔

سن رسیدہ میخائیل صندوق پر سویا پڑا تھا۔خدمتگار پراکوفی، جو اتنا تگڑا تھا کہ وہ عقب سے گاڑی اوپر اٹھا سکتا تھا، سن کے جوتوں پر رنگین پھندنے ٹانک رہا تھا۔جب دروازہ کھلا، اس نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا اور معاً اس کے خواب آلودہ اور بے حس چہرے کی کایا کلپ ہو گئی۔اب وہاں پر مسرت استعجاب جھلک رہا تھا۔

''یارحیم! یا کریم! چھوٹے کاؤنٹ!'' اس نے اپنے نوجوان آقا کو پہچان کر باآواز بلند کہا۔ ''آپ؟ چھوٹے صاحب!''

رستوف کو دیکھ کر پراکوفی بالکل بوندلا گیا اور اس کا جسم تھرتھرانے لگا۔اسی ہیجانی کیفیت میں وہ ڈرائنگ روم کی طرف بھاگا۔اس کا ارادہ غالباً اس کی آمد کی اطلاع کرنا تھا۔تاہم اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور وہ واپس آ گیا اور اپنے نوجوان آقا کا شانہ چومنے لگا۔

''سب خیریت سے ہیں؟'' رستوف نے اپنا بازو پیچھے کھینچتے ہوئے پوچھا۔

''بالکل، بالکل! خداوند کا شکر ہے! سب خیر سلا ہے! خداوند کا شکر ہے! وہ ابھی ابھی سپر سے فارغ ہوئے ہیں۔یوئر ایکسی لینسی، مجھے اپنا چہرہ تو دکھائیں!''

''ہر چیز بالکل ٹھیک ٹھاک ہے؟''

''خداوند کا شکر ہے! خداوند کا شکر ہے!''

رستوف دینی سوف کو بالکل فراموش کر چکا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی دوسرا شخص اس کی آمد کا اعلان کرے۔ چنانچہ اس نے اپنا سموری کوٹ اتارا اور پنجوں کے بل تیز تیز قدم اٹھاتا تاریک کشادہ بال روم میں داخل ہوا۔ ہر چیز جوں کی توں تھی۔۔ وہی تاش کی قدیمی میزیں اور وہی فانوس جس پر غلاف لپٹا ہوا تھا۔ لیکن کسی شخص کی نظر پہلے ہی نوجوان آقا پر پڑ چکی تھی اور اس کے ڈرائنگ روم میں پہنچنے سے پیشتر ہی کوئی چیز برق رفتار طوفان کی مانند بغلی دروازے سے لپکی، اور اس سے بغل گیر ہونے اور تڑاق پڑاق اس کے بوسے لینے لگی۔ پھر اسی قسم کی دوسری اور تیسری مخلوق دوسرے دروازوں سے برآمد ہوئی، وہی بغل گیری، وہی چوما چاٹی، وہی شور و شغب اور وہی خوشی کے آنسو۔ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ پاپا کون ہے، نتاشا کون ہے، اور پیتا کون ہے۔ ہر کوئی چلا رہا تھا، بولے جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ اسے چومے جا رہا تھا۔ صرف اس کی اماں وہاں نہیں تھی۔۔ اور وہ یہ بات بھانپ گیا۔

''اور مجھے پتا ہی نہیں تھا۔۔ نکولنکا۔۔ میری جان!''

''وہ آ بھی گیا۔۔ ہمارا بیٹا، ہمارا لخت جگر... ڈارلنگ کو لیا! کتنا بدل گیا ہے!... موم بتیاں کہاں ہیں؟... چائے؟''

''مجھے بھی بوسہ دو!''

''مجھے بھی، ڈارلنگ!''

سونیا، نتاشا، پیتا، آنا میخائیلوونا، ویرا اور معمر کاؤنٹ، سبھی اس سے معانقہ کر رہے تھے، بغل گیر ہو رہے تھے۔ نوکر چاکر، خادمائیں اور مامائیں سب اسی کمرے میں اکٹھا ہو گئے۔ وہ چلا رہے تھے اور آہ اور واہ کر رہے تھے۔

پیتا اس کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ گیا۔

''مجھے بھی!'' وہ چلائے جا رہا تھا۔

نتاشا نے اسے اپنی جانب گھسیٹ لیا اور اس کے چہرے پر بوسوں کی بارش کر دی۔ وہ دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے، ایک ہی جگہ بکری کی طرح اچھل کود رہی تھی لیکن اس کے کوٹ کا دامن نہیں چھوڑ رہی تھی اور عالمِ انبساط میں چیخیں مار رہی تھی۔

چاروں اطراف محبت بھری نگاہیں تھیں۔ آنکھیں خوشی کے آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔ ہونٹ بوس و کنار کے متمنی تھے۔

گلاب کی طرح سرخ سونیا اس کے بازو سے چمٹی ہوئی تھی۔ کامل مسرت نے اس کے چہرے کو فروزاں کر دیا تھا اور وہ والہانہ شوق سے اس کی آنکھوں میں، جنھیں دیکھنے کی وہ دل میں تمنا سجائے بیٹھی تھی، جھانک رہی تھی۔ اب اس کا سن سولہ کا ہو گیا تھا اور اس کا جوبن نکھر چکا تھا۔ اور اس پر مسرت اور وجد آفریں ہیجانی موقع پر اس کے

حسن کو خاص طور پر چار چاند لگ گئے تھے۔ وہ اسے مسلسل ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی اور وہاں سے نگاہیں اٹھانے کے لیے حوصلہ نہیں پا رہی تھی۔ وہ مسکرائے جا رہی تھی اور اپنی سانس روکے ہوئے تھی۔ رستوف نے اسے متشکر نگاہوں سے دیکھا لیکن اس کی نگاہیں ابھی تک کسی ہستی کو ڈھونڈ رہی تھیں، اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ عمر رسیدہ کاؤنٹس ابھی تک نہیں آئی تھی لیکن ایکا ایکی دروازے پر قدموں کی چاپ سنائی دی تاہم یہ قدم اتنے تیز رفتار تھے کہ اسے خیال گزرا کہ یہ اس کی ماں کے نہیں ہو سکتے۔

تاہم یہ وہی تھی۔ وہ نئے گاؤن میں، جو اس نے نہیں دیکھا تھا کیونکہ یہ اس کی عدم موجودگی کے دوران میں بنوایا گیا تھا، ملبوس تھی۔ دوسروں نے اسے چھوڑ دیا اور وہ اس کی طرف لپکا۔ جب وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے، وہ اس کے سینے پر ڈھیر ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں تھا، وہ اپنا چہرہ اوپر اٹھانے سے قاصر تھی کیونکہ وہ اسے اس کے ہوزاروں کے کوٹ کی سرد سنجاف پر رگڑ رہی تھی۔

دینی سوف کمرے میں آچکا تھا۔ کسی کی اس پر نظر نہیں پڑی تھی۔ وہ انھیں دیکھ رہا اور اپنے آنسو پونچھ رہا تھا۔

''واسیلی دینی سوف، آپ کے صاحب زادے کا دوست،'' اس نے کاؤنٹ سے، جو استفہامیہ نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا، اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''خوش آمدید! مجھے معلوم ہے، معلوم ہے کہ آپ کون ہیں،'' کاؤنٹ نے دینی سوف سے معانقہ کرتے اور اس کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ ''نکولشکا نے مجھے آپ کے بارے میں لکھا تھا... نتاشا، ویرا، ادھر آؤ، یہ دینی سوف ہیں!''

مسرت و وجد سے سرشار وہی چہرے دینی سوف کو، جس کے جسم پر بال ہی بال تھے، دیکھنے لگے اور انھوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

''ڈارلنگ دینی سوف!'' نتاشا منمنائی۔ وہ خوشی سے پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ وہ زقندیں بھرتی برق رفتاری سے اس کی طرف آئی، اس کے گلے میں باز وحمائل کیے اور اسے دھڑا دھڑ چومنے لگی۔

نتاشا کی اس عجوبۂ روزگار حرکت نے ہر شخص کو حواس باختہ کر دیا۔ دینی سوف کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا لیکن وہ مسکرا رہا تھا۔ اس نے نتاشا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر بوسہ دیا۔

دینی سوف کو اس کمرے میں، جو ان کے لیے تیار کیا گیا تھا، پہنچا دیا گیا اور تمام رستوف سٹنگ روم میں نکولشکا کے اردگرد جمع ہو گئے۔

معمر کاؤنٹس اس کے برابر بیٹھی تھی۔ وہ اس کا ہاتھ نہیں چھوڑ رہی تھی اور منٹ منٹ بعد اسے چومنے لگتی تھی۔ دوسروں نے اس کے اردگرد جمگھٹا کر رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں پیار تھا، پرستش تھی، وہ جدھر دیکھتا تھا، جو لفظ کہتا تھا، جو اشارہ کرتا تھا، وہ سب کچھ اپنی نگاہوں میں سمو رہے تھے۔ اس کا بھائی اور بہنیں اس کے قریب بیٹھنے کے لیے زور آزمائی کر رہے تھے۔ ان کی تو تکار اس بات پر ہو رہی تھی کہ اس کی چائے کون لائے، رومال کون لائے۔ پائپ کون لائے۔

وہ اس پر جو محبت نچھاور کر رہے تھے، اس نے اس کی باچھیں کھلا دی تھیں۔ لیکن ملاقات کا اولیں لمحہ اتنا کیف آگیں تھا کہ اسے اپنی موجودہ خوشی ادھوری محسوس ہو رہی تھی، وہ ہر آن مزید، ہل من مزید، ہل من مزید کی توقع کیے جا رہا تھا۔

سفر کے بعد مسافر اگلی صبح دس بجے تک سوئے رہے۔

ملحقہ کمرے میں تیغیں، شمشیریں، تھیلے، چرمی کیسے، کھلے ٹرنک اور گندے بوٹ بکھرے پڑے تھے۔ جوتوں کے دو نئے جوڑے، جن پر مہمیز لگے تھے، ابھی ابھی دیوار کے ساتھ رکھ دیے گئے تھے۔ ملازمین چلمچیاں، گرم پانی اور خوب جھاڑے پونچھے ملبوسات لا رہے تھے۔ وہاں مردانہ خوشبویات بھی تھیں اور تمباکو کی بو بھی۔

''ارے گوشکا — میرا پائپ!'' واسکا دینی سوف کی بھاری آواز سنائی دی۔ ''رستوف — اٹھ جاؤ!''

رستوف نے آنکھیں ملتے، جو معلوم ہو رہا تھا کہ آپس میں جڑ گئی ہیں، گرم تکیے سے اپنا سر اوپر اٹھایا۔ اس کے بال پریشان اور ژولیدہ تھے۔

''کیوں؟ دیر ہو گئی؟''

''دیر؟ حضور دس بجا چاہتے ہیں!'' اگلے کمرے سے، جہاں سے کلف لگے پیٹی کوٹوں کی سرسراہٹ اور لڑکیوں کی کھسر پھسر اور ہنسنے ہنسانے کی صدائیں بھی آ رہی تھیں، نتاشا کی آواز سنائی دی۔

دروازہ ذرا برابر کھلا اور کسی نیلی چیز، ربنوں، سیاہ زلفوں اور پر مسرت چہروں کی جھلک دکھائی دی۔ یہ نتاشا، سونیا اور پیتیا تھے۔ وہ یہ معلوم کرنے آئے تھے کہ وہ اٹھ گئے ہیں یا نہیں۔

''نکولینکا، اب اٹھ بھی جاؤ'' دروازے پر ایک مرتبہ پھر نتاشا کی آواز سنائی دی۔

''ابھی، فوراً!''

دریں اثنا پیتیا نے بیرونی کمرے میں شمشیریں ڈھونڈ لی تھیں اور اپنے قبضے میں لے لی تھیں۔ پھر اس نے اس لطف و سرور سے، جو فوجی بھائی کو دیکھ کر لڑکے بالے محسوس کرتے ہیں، بیڈ روم کا دروازہ کھول دیا۔ اسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ نوخیز لڑکیوں کے لیے مردوں کو ایسی حالت میں، جب انھوں نے موزوں کپڑے نہ پہنے ہوں، دیکھنا مناسب نہیں ہے۔

''یہ آپ کی شمشیر ہے؟'' اس نے چلا کر پوچھا۔

لڑکیاں پچھلی طرف کود گئیں۔ دینی سوف نے اپنی بالوں بھری ٹانگیں کمبل میں چھپا لیں اور خوف و ہراس کے عالم میں اپنے دوست سے استمداد کا جویا ہوا۔ جس دروازے سے پیتیا اندر آیا تھا، بند ہو گیا۔ باہر سے کھلکھلا کر ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

''نکولینکا، اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنو اور باہر آ جاؤ'' نتاشا نے اپنے بھائی کو پکارا۔

''یہ شمشیر آپ کی ہے'' پیتیا نے پوچھا، ''یا آپ کی؟'' اس نے غلامانہ احترام کے ساتھ دینی سوف سے، جس کی سیاہ مونچھیں تھیں، مخاطب ہو کر پوچھا۔

رستوف نے ترت پھرت اپنے پاؤں میں کچھ پہنا، اپنا ڈریسنگ گاؤن گھسیٹ کر جسم پر ڈالا اور باہر نکل آیا۔ نتاشا ایک مہمیز والا بوٹ پہن چکی تھی اور دوسرے میں اپنا پاؤں ڈال رہی تھی کہ وہ اندر آ گیا۔ سونیا بیٹھنے سے قبل اپنی سکرٹ کو غبارے کی طرح پھلانے کے لیے لٹو کی مانند گھوم رہی تھی۔ دونوں کے نیلوفری ڈریس نئے اور بالکل ایک جیسے تھے۔ اور دونوں کے چہرے تازہ، گلابی اور شاداں تھے۔ سونیا نے وہاں سے بھاگنے میں ہی خیریت جانی لیکن نتاشا نے اپنے بھائی کا بازو تھاما، اسے سٹنگ روم میں لے گئی اور وہاں دونوں باتیں کرنے لگے۔ وہ ہزاروں معمولی معمولی چیزوں کے متعلق، جو صرف انھیں کی دلچسپی کی تھیں، تابڑتوڑ ایک دوسرے سے سوالات کر رہے تھے اور بمشکل ایک دوسرے کو ان کے جوابات دینے کا موقع دے رہے تھے۔ دونوں میں سے جو بھی جو بات بھی کہتا، نتاشا اس پر ہنس پڑتی، اس لیے نہیں کہ وہ بہت دلچسپ باتیں کر رہے تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اتنی شاداں و فرحاں تھی کہ وہ اپنی مسرت پر قابو نہیں پا رہی تھی اور بات بے بات ہنس رہی تھی۔

"واہ واہ! بہت خوب! بہت اعلیٰ!" وہ ہر بات کے جواب میں کہے جا رہی تھی۔

رستوف کو گھر سے نکلے اٹھارہ مہینے بیت چکے تھے اور اسے محسوس ہوا کہ اس عرصے کے دوران میں اس کا چہرہ خالص بچگانہ مسکراہٹ سے عاری رہا ہے لیکن محبت کی ان حرارت بخش کرنوں کے زیر اثر اس کی یہ مسکراہٹ ایک بار پھر لوٹ آئی۔ اس کی روح جھوم رہی تھی اور اس کا چہرہ کھل اٹھا تھا۔

"نہیں۔ لیکن سنو۔ اب تم بالغ مرد بن گئے ہو۔ ٹھیک ہے نا؟ میں بہت خوش ہوں کہ تم میرے بھائی ہو،" نتاشا نے اپنے بھائی کی مونچھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ "میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم مرد فی الحقیقت ہوتے کیا ہو؟ کیا تم ہمارے جیسے ہو؟"

"نہیں۔ لیکن سونیا کیوں بھاگ گئی؟"

"آخ، یہ بڑی لمبی داستان ہے! تم اسے کیا کہہ کر بلاؤ گے۔ 'تم' یا 'آپ'؟"

"پتا نہیں۔ جیسا موقع ہوا،" رستوف نے کہا۔

"اسے 'آپ' ہی کہو۔ عنایت ہوگی۔ وجہ میں بعد میں بتاؤں گی۔"

"لیکن کیوں؟"

"بہت اچھا، پھر لو، میں ابھی بتائے دیتی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ سونیا میری عزیز ترین سہیلی ہے۔ ایسی سہیلی کہ میں نے اس کی خاطر اپنا بازو جلا لیا۔ لو، دیکھ لو۔"

اس نے اپنے لانبے، مہین اور نرم و نازک بازو سے ململ کی آستین اوپر کھسکا دی اور کہنی سے خاصا اوپر شانے کے نزدیک سرخ نشان دکھایا (یہ نشان اتنی اونچی جگہ تھا کہ بال گاؤن میں بھی مستور رہتا۔)

"یہ میں نے اس لیے کیا کیونکہ میں اسے اپنی محبت کا ثبوت دینا چاہتی تھی۔ میں نے صرف یہ کیا کہ مسطر آگ پر گرم کیا اور اسے یہ یہاں دبا دیا۔"

اس کمرے میں جو کبھی اس کی پڑھائی کا کمرہ ہوتا تھا، اپنے بازوؤں میں کشن تھامے، صوفے پر بیٹھے اور نتاشا کی آنکھوں میں، جن میں دیوانگی کی حد تک جوش و خروش جھلک رہا تھا، رستوف بچپن اور خاندان کی حدود میں داخل ہو گیا۔ اگرچہ یہ دوسروں کے لیے کوئی معانی نہیں رکھتی تھیں تاہم زندگی میں جو چند اشیا اسے عظیم ترین مسرت بہم پہنچاتی تھیں، یہ ان میں شامل تھیں۔ چنانچہ محبت کا ثبوت بہم پہنچانے کے لیے اپنے بازو کو جلا لینے کا فعل اسے مہمل نظر نہ آیا۔ وہ اس کی کُنہ سمجھتا تھا اور اسے کوئی حیرت نہ ہوئی۔

''اور پھر؟ یا بس؟''

''خیر، ہم ایسی سہیلیاں ہیں، اتنی دوست ہیں، کہ بس کچھ نہ پوچھو! رہی وہ مسطر والی بات — وہ بس فضول سی حرکت تھی۔ لیکن ہماری دوستی امر ہے۔ جب وہ کسی سے محبت کرتی ہے، زندگی بھر کے لیے اس کی ہو جاتی ہے۔ مجھے اس کی سمجھ نہیں آتی۔ میں بڑی بُھلکّڑ ہوں، فوراً بھول جاتی ہوں۔''

''خیر، اس کے بعد۔''

''خیر، وہ مجھ سے اسی طرح محبت کرتی ہے... اور تم سے بھی۔''

اچانک نتاشا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔

''خیر، تمھیں یاد ہے کہ تمھارے جانے سے پہلے... خیر، وہ کہتی ہے کہ تمھیں یہ سب کچھ بھول جانا ہوگا... وہ کہتی ہے: 'میں ان سے ہمیشہ پیار کرتی رہوں گی لیکن انھیں آزاد کر دوں گی۔' ہے نا کتنی خوبصورت — اور شاندار بات! ہے نا؟ بے حد شاندار! نہیں؟'' نتاشا نے یہ سب کچھ اتنی متانت اور جذبے سے پوچھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس بارے میں آہوں اور اشکوں سے بات کر چکی ہے۔

رستوف سوچ میں پڑ گیا۔ ''میں کبھی اپنے قول سے نہیں پھرتا،'' اس نے کہا۔ ''علاوہ ازیں سونیا اتنی پُرکشش ہے کہ کوئی احمق ہی اس مسرت کو ٹھکرا سکے گا۔''

''بالکل ٹھیک کہا تم نے!'' نتاشا نے حلق پھاڑ کر کہا۔ ''وہ اور میں اس بارے میں پہلے ہی بات کر چکی ہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ تم یہی کہو گے لیکن اس سے بات نہیں بنے گی۔ کیا تم سمجھتے نہیں کہ اگر تم نے یہ کہا — اگر تم نے اپنے آپ کو اپنے قول کا پابند سمجھ لیا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، کسی خاص مقصد کے پیش نظر کہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اس سے کسی مجبوری کے تحت شادی کر رہے ہو اور یہ بالکل غلط بات ہوگی!''

رستوف سمجھ گیا کہ وہ اس معاملے میں خوب سوچ بچار کر چکی ہیں۔ اگرچہ گزشتہ رات سونیا کے حسن نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی تھی لیکن آج جب اس نے اس کی جھلک دیکھی، وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ حسین نظر آئی۔ وہ سولہ برس کی پُرکشش دوشیزہ تھی اور بظاہر اس کے ساتھ دیوانگی کی حد تک محبت کرتی تھی (اس بارے میں اسے ایک سیکنڈ کے لیے بھی کوئی شبہ نہ ہوا)۔ ''پھر میں اس سے کیوں محبت بلکہ شادی نہ کروں؟'' اس نے سوچا... ''لیکن فی الحال نہیں... ابھی میرے سامنے اور قسم کی خوشیاں اور دلچسپیاں ہیں۔ ہاں،'' اس نے نتیجے پر پہنچتے

ہوے دل میں کہا۔ ''وہ اس مسئلے کے متعلق خوب چھان پھٹک کر چکی ہیں۔ مجھے آزاد ہی رہنا چاہیے۔''

''اچھا، تم ٹھیک ہی کہتی ہو،'' اس نے کہا۔ ''چھوڑو اس قصے کو، اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے۔ میں بے حد خوش ہوں کہ میں تم لوگوں میں دوبارہ پہنچ گیا ہوں۔'' اس نے مزید کہا۔ ''اور ہاں، تمھارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے ـــ تم ابھی تک بورس کے نام کی مالا جپ رہی ہو؟''

''چھوڑو، کیا فضول بات لے بیٹھے ہو!'' نتاشا نے کھلکھلا کر ہنستے ہوے کہا۔ ''میں نے اس کے بارے میں ـــ اور نہ کسی دوسرے کے بارے میں کبھی سوچا تک نہیں۔ مجھے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''واقعی؟ پھر اب تمھیں کن باتوں میں دلچسپی ہے؟''

''مجھے؟'' نتاشا نے دہرایا۔ اور اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ ''تم نے کبھی دُوپوخ کو دیکھا ہے ـــ مشہور و معروف فرانسیسی رقاصہ؟... پھر تم کچھ نہیں سمجھ پاؤ گے۔''

نتاشا نے اپنے بازوؤں کو خم دیا، رقاصاؤں کی مانند اپنی سکرٹ پھیلائی، چند قدم پیچھے بھاگی، مڑی، کلیل بھری، پھرتی سے اپنے ننھے پاؤں کو ایک دوسرے سے منسلک کیا اور پھر چند قدم پنجوں کے بل چلی (وہ یہ سب کچھ بیلے ڈانسر کے انداز میں کر رہی تھی)۔

''دیکھو، میں کیسے کھڑی ہوں؟ دیکھو!'' لیکن وہ اپنے پنجوں پر تا دیر کھڑی نہ رہ سکی۔ ''مجھے اب اس میں دلچسپی ہے! میں کبھی شادی وادی نہیں کروں گی! ـــ میں رقاصہ بننا چاہتی ہوں۔ بس یہ بات کسی کو بتانا نہیں۔''

رستوف اتنے زور زور اور مسرت سے بھرپور قہقہے لگانے لگا کہ جب ان کی آوازیں بیڈ روم میں دینی سوف کے کانوں تک پہنچیں، اسے رشک آنے لگا اور خود نتاشا بھی اس کا ساتھ دیے بنا نہ رہ سکی۔

''کیا خیال ہے، یہ خوبصورت منصوبہ نہیں ہے؟'' وہ بار بار پوچھے جا رہی تھی۔

''اچھا ہے۔ تو تم اب بورس سے شادی نہیں کرو گی؟''

نتاشا کے تلووں تلے آگ لگ گئی۔ ''مجھے کسی سے شادی وادی نہیں کرنا۔ جب وہ آئے گا، میں خود اسے بتا دوں گی!''

''واقعی؟''

''لیکن یہ فضول بات ہے،'' نتاشا بے لگام بولتی چلی گئی۔ ''خیر، یہ بتاؤ، دینی سوف اچھا آدمی ہے؟''

''بہت۔''

''اچھا، پھر خدا حافظ، جاؤ اور کپڑے پہنو۔ کیا وہ بہت خوف ناک ہے؟ ـــ وہ، یعنی دینی سوف؟''

''خوف ناک کیوں؟'' نکولائی نے پوچھا۔ ''نہیں، واسکا بہت نفیس آدمی ہے۔''

''تم اسے واسکا کہتے ہو؟ بڑا مضحکہ خیز نام ہے! واقعی بہت نفیس آدمی ہے؟''

''بے حد نفیس!''

''خیر، جلدی کرو۔ ہم ناشتہ اکٹھے کریں گے۔''

اور نتاشا اٹھی اور بیلے ڈانسر کی طرح اٹھلاتی اور پنجوں کے بل چلتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ لیکن وہ مسکرا رہی تھی اور اس طرح صرف پندرہ سالہ الھڑ دوشیزہ ہی، جو بہت خوش ہو، مسکرا سکتی ہے۔

جب ڈرائنگ روم میں رستوف کا سونیا سے آمنا سامنا ہوا، وہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کس طرح پیش آئے۔ گزشتہ شب ملاقات کے اولین پرمسرت لمحوں میں انھوں نے ایک دوسرے کو چوما تھا لیکن انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ آج اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کی والدہ اور ہمشیرگان سمیت ہر شخص کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں اور وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب ہیں کہ وہ اس کے ساتھ کس قسم کا رویہ اختیار کرتا ہے۔ اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور اسے ''آپ'' اور ''سونیا'' کہہ کر مخاطب کیا لیکن جب ان کی نگاہیں چار ہوئیں، وہ ایک دوسرے کو 'تم' کہہ رہی تھیں اور پرلطف بوسوں کی حکایت سنا رہی تھیں۔ اس کی نظریں معافی کی طلب گار تھیں کیونکہ اس نے نتاشا کے ذریعے اسے اس کا قول یاد دلانے کی جرأت کی تھی اور وہ اس کی محبت کا شکریہ ادا کر رہی تھیں۔ ادھر اس کی نگاہیں اس کا شکریہ ادا کر رہی تھیں کہ اس نے اسے بندھنوں سے آزاد کرنے کی پیشکش کی تھی اور اسے بتا رہی تھیں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کی محبت سے کبھی دستکش نہیں ہو گا کیونکہ اس سے محبت نہ کرنا ناممکن تھا۔

''کتنی عجیب بات ہے،'' ویرا نے عمومی خوشی کا لمحہ منتخب کرتے ہوئے کہا، ''کہ سونیا اور نکولینکا ایک دوسرے کو 'آپ، آپ' کہہ رہے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اجنبیوں کی طرح پیش آ رہے ہیں۔''

ویرا نے درست بات کہی تھی جیسا کہ وہ عام طور پر درست باتیں ہی کہتی تھی لیکن اس کی اکثر باتوں کی طرح اس کی اس بات پر بھی ہر شخص ــ صرف سونیا، نکولائی اور نتاشا ہی نہیں بلکہ معمر کاؤنٹس کو بھی، جسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ اس کا بیٹا سونیا سے جو محبت کرتا ہے، وہ اس کے راستے کی دیوار بن جائے گی اور وہ کسی صاحب حیثیت گھرانے میں شادی نہیں کر سکے گا ــ بے چینی محسوس کرنے لگا اور کاؤنٹس تو بیر بہوٹی کی مانند سرخ ہو گئی۔

رستوف کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ دینی سوف بن ٹھن کر ــ اس کی وردی نئی نکور تھی، بالوں سے پوماد اور جسم سے سینٹ کی لپٹیں آ رہی تھیں ــ ڈرائنگ روم میں آیا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بھی اتنا ہی بانکا سجیلا تھا جتنا کہ میدان جنگ میں ہوتا تھا اور رہ گئے خواتین و حضرات، وہ ان کے ساتھ توقع سے بڑھ کر ملنساری سے پیش آ رہا تھا۔

2

نکولائی رستوف کے فوج سے واپس ماسکو پہنچنے کے بعد اس کے خاندانی حلقے نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا تھا۔ وہ ان کا سپوت، ہیرو اور ڈارلنگ نکولشکا تھا۔ رشتے داروں کی نگاہوں میں وہ پرکشش، خوب رُو، شائستہ اور گھبرو جوان تھا۔ اس کے احباب اسے ہوزاروں کا خوش شکل لیفٹیننٹ اور طرح دار رقاص تصور کرتے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق

ماسکو میں دوشیزاؤں کے رشتے کے لیے اسے بہترین جوڑ شمار کیا جا سکتا تھا۔

رستوف ماسکو کے بچے بچے سے واقف تھے اور اس سال معمر کاؤنٹ کے پاس روپیہ پیسہ بھی وافر تھا کیونکہ اس سال اس کی زمینیں از سر نو پٹے پر چڑھائی گئی تھیں۔ چنانچہ نکولائی کو اپنا ''دلکی گھوڑا''[3]، نئے فیشن کی خوبصورت برجس، جو ابھی ماسکو میں کہیں نظر نہیں آئی تھی اور تازہ ترین ڈیزائن کے انتہائی نوکیلے بوٹ، جن کے ساتھ چاندی کے چھوٹے چھوٹے مہمیز پیوست تھے، مل گئے۔ اور وہ اپنا وقت انتہائی خوشگوار انداز سے گزار رہا تھا۔ اگرچہ اپنے آپ کو زندگی کی پرانی ڈگر کے مطابق ڈھالنے میں اسے کچھ وقت لگا لیکن دوبارہ گھر پہنچ کر اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا اور وہ خوب لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بلوغت کی حدود میں داخل ہو گیا ہے اور لڑکے سے مرد بن گیا ہے۔ انجیل مقدس کے امتحان میں فیل ہونے پر اس کا مایوسی کے اتھاہ سمندر میں ڈوب جانا، سلیج ڈرائیور کو ادائیگی کرنے کے لیے اس کا وقتاً فوقتاً گاوریلا سے ادھار لینا، چوری چھپے سونیا سے بوس و کنار کرنا، اسے یہ تمام باتیں اور حرکتیں اب بچگانہ دکھائی دیتی تھیں اور وہ ان سے بے انتہا دور نکل آیا تھا۔ اب وہ ہوزاروں کی رجمنٹ میں لیفٹیننٹ تھا، فوجی کوٹ، جس میں روپہلی موباف لگی ہوئی تھی، پہنتا تھا، اپنے سینے پر عسکری تمغہ، سینٹ جارج کراس، آویزاں کرتا تھا، ریس سے وابستہ مشہور اور معزز اشخاص کی، جو عمر میں بھی اس سے بڑے تھے، صحبت میں اٹھتا بیٹھتا تھا اور ایک ریس کے لیے خود اپنے ''دلکی'' گھوڑے کی تربیت کر رہا تھا۔ شہر کی ایک خیابان پر ایک خاتون رہائش پذیر تھی، وہ ایک شام اس کے ہاں بھی گزار آیا تھا۔ آرخاروفوں کے ہاں جب محفل رقص (بال) منعقد ہوئی تھی، (پولستانی رقص) مازورکا کا آغاز اسی نے کیا تھا۔ اس نے فیلڈ مارشل کامینسکی کے ساتھ جنگ پر بحث و تمحیص کی تھی۔ وہ اکثر انگلش کلب[4] جایا کرتا اور ایک چالیس سالہ کرنل کے ساتھ، جس سے دینی سوف نے اس کا تعارف کرایا تھا، دوستی کا دم بھرتا تھا۔

ماسکو میں قیام کے دوران میں اس کا امپراطور کے لیے جوش و خروش قدرے ٹھنڈا پڑ گیا تھا کیونکہ وہ اس سے ملاقات نہیں کر سکا تھا۔ تاہم وہ اکثر اس کا اور اس کے ساتھ اپنے لگاؤ کا ذکر کرتا رہتا تھا۔ وہ اشارتاً اور کنایتاً جتاتا رہتا تھا کہ وہ اس ضمن میں انھیں ساری باتیں نہیں بتا سکتا کیونکہ اپنے امپراطور کے بارے میں اس کے جو احساسات ہیں، انھیں سمجھنا ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ اس زمانے میں عام لوگ زار الیکسانڈر پاولووچ (ماسکو کے باشندے اسے ''انسان کے بھیس میں فرشتہ'' قرار دیتے تھے) سے جس طرح ٹوٹ کر پیار کرتے تھے، وہ اس میں بہ دل و جان ان کے ساتھ تھا۔

فوج میں دوبارہ جانے سے قبل ماسکو میں اپنے اس مختصر قیام کے دوران میں رستوف سونیا کے زیادہ قریب نہ آ سکا بلکہ اس کے برعکس وہ اس سے دور ہٹتا گیا۔ وہ بے حد خوش رو، خوش اندام اور پرکشش تھی اور بظاہر اس پر جان چھڑکتی تھی لیکن وہ اوائل شباب کے اس دور میں سے گزر رہا تھا جب انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ اسے بہت کچھ کرنا ہے لیکن اس بہت کچھ کے لیے اسے وقت نہیں ملتا۔ اس عمر میں نوجوان بندھنوں سے بدکتا ہے اور اپنی آزادی کو، جو اسے بہت سی دوسری چیزوں کے لیے درکار ہوتی ہے، بہت بیش قیمت گردانتا ہے۔ اپنے ماسکو میں

قیام کے دوران میں اسے جب بھی سونیا کا دھیان آتا، وہ اپنے آپ سے کہا کرتا: ''خوب اس جیسی اور بہت، جنھیں میں نے ابھی دیکھا بھی نہیں ہے، مل جائیں گی۔ محبت کے لیے ابھی بہت وقت پڑا ہے اور جب جی چاہے گا، یہ کام بھی کر لیں گے، فی الحال میرے پاس فرصت نہیں ہے۔'' علاوہ ازیں اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ نسوانی صحبت اس کی مردانہ وجاہت کے شایان شان نہیں۔ وہ رقص کی محفلوں میں جاتا اور خواتین کی صحبتوں میں اٹھتا بیٹھتا ضرور لیکن بنتا اس طرح تھا جیسے وہ یہ سب کچھ اپنی مرضی کے خلاف کر رہا ہو۔ گھڑ دوڑ میں جانا، انگلش کلب میں اٹھنا بیٹھنا، دینی سوف کے ساتھ بلانوشی کرنا اور ایک خاص مکان کے چکر کاٹنا۔۔۔ یہ سب دوسری نوعیت کے امور تھے اور بانکے چھبیلے ہوزار کے لیے بالکل موزوں۔

اوائل مارچ میں سن رسیدہ کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف انگلش کلب میں پرنس باگ راتیاں کے اعزاز میں ضیافت کا اہتمام کرنے میں بری طرح مصروف تھا۔

ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس وہ بال روم کے چکر لگا رہا تھا اور ڈنر کے لیے ایسپاریگس[5]، تازہ کھیروں[6]، سٹرابیری، بچھڑوں کے گوشت اور مچھلی کے متعلق کلب کے داروغے اور کلب کے مشہور و معروف میر مطبخ، فیکوتست، کو احکام دے رہا تھا۔ کاؤنٹ اسی تاریخ سے، جس روز کلب کا قیام عمل میں آیا تھا، اس کا رکن اور کمیٹی کا ممبر چلا آ رہا تھا۔ باگراتیاں کے اعزاز میں اس ضیافت کا انتظام اس لیے اس کے سپرد کیا گیا تھا کیونکہ ایسے اشخاص، جنھیں اس کی طرح لمبی چوڑی اور پرتکلف دعوتیں کرنے کا تجربہ تھا، بہت کم تھے بلکہ ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اور ایسا شخص تو ڈھونڈے سے بھی نہ ملتا جو ضرورت پڑنے پر اس قسم کی دعوتوں کے کامیاب انعقاد کے لیے اپنا روپیہ صرف کر سکتا یا صرف کرنے کے لیے تیار ہو سکتا۔ داروغہ اور میر مطبخ اس کے احکام بخوشی سن اور بجا لا رہے تھے کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ اس نوعیت کی ضیافت سے، جس کے اہتمام میں اس کے علاوہ اور کوئی شخص شامل نہیں تھا اور جس پر ہزاروں روبل اٹھ جاتے تھے، وہ اچھی خاصی کمائی کر سکتے ہیں۔

''اور تاج خروس[7] تو لازماً ہونا چاہیے۔ تمھیں معلوم ہی ہے کہ پیٹیوں[8] میں بھرنا ہے۔''

''گویا تین اقسام کے ٹھنڈے کھانے ہوے؟'' میر مطبخ نے پوچھا۔

کاؤنٹ اپنا سر کھرکھرانے اور سوچنے لگا۔

''تین تو لازمی ہیں، اس سے کم نہیں ہو سکتے... انڈے کی ساس[9] والا سلاد، ایک تو یہ ہوا...'' اس نے اپنی ایک انگلی مروڑتے ہوے کہا۔

''پھر میرے ذمے بڑی sterlets[10] منگوانا ہیں؟'' داروغے نے دریافت کیا۔

''ہاں بھائی! اگر انھوں نے قیمت نہ بھی گھٹائی، پھر بھی منگوانا تو پڑے گی۔''

''ارررے، میں تو بھول ہی گیا تھا۔ ہمیں دستر خوان پر ایک اور چیز کا اضافہ کرنا ہوگا۔ اف، میرے خدایا!'' وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ''پھول کون لائے گا؟ متنکا، اے متنکا، گھوڑا پکڑ و اور لپک کر جاگیر (یہ جاگیر ماسکو کے

بالکل قریب تھی) پر جاؤ،'' اس نے اپنے سٹیوارڈ سے کہا، جو اس کے پکارنے پر حاضر ہو گیا تھا۔ ''اور باغبان ماکسم سے کہو کہ وہ فوراً کھیت مزدوروں کو کام پر لگا دے اور اسے یہ بھی بتاؤ کہ گرین ہاؤسوں میں جو کچھ بھی ہے، نمدے میں لپیٹ کر یہاں پہنچا دے۔ جمعہ تک میرے پاس یہاں دو گملے موجود ہونا چاہئیں۔''

متعدد مزید احکام سنانے کے بعد وہ آرام کی غرض سے اپنی ''لٹل کاؤنٹس'' کے پاس جانا چاہتا تھا کہ اسے کوئی اہم بات یاد آ گئی، وہ واپس مڑا، اس نے داروغے اور میر مطبخ کو بلایا اور انھیں اضافی ہدایات دینے لگا۔ دروازے پر مردانہ قدموں کی ہلکی پھلکی چاپ اور مہمیزوں کی جھنکار سنائی دی اور نوجوان کاؤنٹ، جس کی چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں تھیں، جس کا ماسکو میں آرام دہ زندگی گزارنے کے بعد رنگ نکھر آیا تھا اور جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوب رو نظر آ رہا تھا، اندر آیا۔

''آہ، میرے پیارے بیٹے، میرا سر گھوم رہا ہے!'' بوڑھے نے اپنے بیٹے کی جانب قدرے ڈھٹائی سے مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم میرا ذرا سا ہاتھ بٹا دو... مجھے ابھی گلوکاروں کا انتظام کرنا ہے۔ آرکسٹرا تو میرا اپنا ہوگا۔ کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ ہم جپسی سنگیت کاروں کو بھی بلا لیں؟ تم فوجی حضرات اس قسم کی چیزیں پسند کرتے ہو۔''

''پاپا، یہ کیا ہو رہا ہے؟ میرا خیال ہے کہ پرنس باگ راتیاں نے شون گرابرن کے معرکے کی تیاریوں کے سلسلے میں اتنی کھکھیڑیں نہیں اٹھائی ہوں گی جتنی آپ یہاں اٹھا رہے ہیں،'' اس کے بیٹے نے مسکراتے ہوئے کہا۔

معمر کاؤنٹ نے جھوٹ موٹ غصے کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''تمھیں باتیں بنانا خوب آتا ہے۔ مزہ تو جب ہے کہ خود کام کر کے دکھاؤ!''

کاؤنٹ میر مطبخ کی طرف، جو بڑی سمجھ بوجھ اور احترام کے ساتھ کبھی بیٹے اور کبھی باپ کو دیکھ رہا تھا، متوجہ ہوا۔

''فیکوتست، یہ آج کل کے نوجوان آخر چاہتے کیا ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''ہم بڈھوں ٹھڈوں کا مذاق اڑانا؟''

''بالکل یور ایکسی لینسی، وہ صرف مزیدار کھانے کھانا جانتے ہیں۔ لیکن ان کھانوں کا اہتمام کیسے کرنا ہے اور انھیں دسترخوان پر کیسے سجانا ہے — ان باتوں سے انھیں کوئی سروکار نہیں۔''

''ٹھیک، بالکل ٹھیک!'' کاؤنٹ نے با آواز بلند کہا اور ناچتے کودتے اور اپنے بیٹے کو دونوں ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے چلا کر کہنے لگا: ''بچو، اب بچ کر کہاں جاؤ گے؟ ٹھنڈے دو گھوڑوں والی سلیج پکڑو، بزوخوف کے ہاں جاؤ اور ان سے بولو کہ کاؤنٹ الیا آندریچ نے سٹرابیری اور تازہ اناناس منگوائے ہیں۔ تمھیں یہ اور کہیں نہیں ملیں گے۔ اگر وہ گھر پر موجود نہ ہوئے، پھر تمھیں اندر جانا ہوگا اور پرنسوں سے ملنا ہوگا۔ جب وہاں سے فارغ ہو جاؤ، پھر راز گولائی — کوچوان اِپاتکا کو پتا معلوم ہے — جاؤ، وہاں الوشکا جپسی کو — وہی، تمھیں یاد ہوگا، جس نے قازقوں کے سفید کوٹ میں کاؤنٹ ارلوف کے ہاں رقص کیا تھا — تلاش کرو اور اسے میرے پاس لے آؤ۔''

''جپسی لڑکیاں بھی لے آؤں؟'' نکولائی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ٹھہر، بے، ذرا!''

اسی لمحے آنا میخائیلوونا دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے چہرے پر تردد اور مصروفیت کی چھاپ لگی ہوئی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے چہرے پر ہمیشہ کی طرح مسکینی ٹپک رہی تھی۔ اگر چہ ایسا دن شاذ ہی کوئی آتا ہوگا جب وہ اس کے سر پر، جب وہ محض ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ہوتا تھا، نازل نہیں ہوتی ہوگی۔ لیکن اس کا اپنا یہ حال تھا کہ ان مواقع پر وہ سداہڑ بڑا جاتا تھا اور اپنے پہناوے کے لیے معافی کا خواستگار ہو جاتا تھا۔

''مائی ڈیئر کاؤنٹ،'' اس نے جھینپتے، شرماتے، لجاتے اور اپنی آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا، ''چھوڑیں، کیوں شرمندہ کرتے ہیں! بزوخوف کے ہاں میں خود جاؤں گی۔ نوجوان بزوخوف ابھی ابھی لوٹے ہیں اور ہمیں جو کچھ درکار ہے، وہ سب ان کے گرین ہاؤسوں سے مل جائے گا۔ مجھے بہرحال ان سے ملنا ہی ہے۔ انھوں نے مجھے بورس کا خط بھیجا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ اب بورس سٹاف کارکن بن گیا ہے!''

کاؤنٹ کی باچھیں کھل گئیں کہ آنا میخائیلوونا نے اس کا ایک کام اپنے ذمے لے لیا ہے اور اس نے حکم دیا کہ اس کے لیے چھوٹی بند گاڑی میں گھوڑا جوت دیا جائے۔

''بزوخوف سے کہنا کہ وہ بھی ضیافت میں آجائے۔ میں اس کا نام فہرست میں درج کرلوں گا۔ اس کی زوجہ محترمہ اس کے ساتھ آئی ہے؟''

آنا میخائیلوونا نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور اس کے چہرے پر گہری اداسی چھا گئی۔

''میرے دوست، افسوس، صد افسوس، وہ انتہائی بدقسمت انسان ہے،'' اس نے کہا۔ ''جو اطلاعات ہمیں موصول ہوئی ہیں، اگر وہ درست ہیں، پھر یہ معاملہ بہت بھیانک صورت اختیار کر گیا ہے۔ اور جب ہم اس کی خوشیوں کا جشن منا رہے تھے، اس قسم کی صورت حال ہمارے خواب وخیال میں بھی نہیں آئی تھی! اور یہ نوجوان بزوخوف، کتنا بلند پایہ اور فرشتہ صفت آدمی ہے، جی ہاں، مجھے دل کی گہرائیوں سے اس پر ترس آرہا ہے۔ میں جیسے تیسے اس کی دل جوئی کی کوشش کروں گی۔''

''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟'' باپ بیٹے دونوں رستوفوں نے پوچھا۔

آنا میخائیلوونا نے گہری آہ بھری۔

''سنا ہے کہ ماریا ایوانوونا کے بیٹے دلوخوف نے اس کی بیوی کی عزت خاک میں ملا دی ہے،'' اس نے پراسرار انداز سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ''پیئر نے اس شخص کو ہاتھوں ہاتھ لیا، پیٹرزبرگ میں اسے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی اور اب... اب جب کہ وہ یہاں آگئی ہے، یہ مُوا فتنہ پرداز اس کے پیچھے پیچھے پہنچ گیا ہے!'' آنا میخائیلوونا نے کہا۔ وہ بظاہر تو پیئر سے ہمدردی جتانا چاہتی تھی لیکن اس کا لہجہ اور اس کا نیم تبسم اس بات کی غمازی کھا رہا تھا کہ وہ غیر ارادی طور پر اس مُوئے فتنہ پرداز کی، جیسا کہ اس نے دلوخوف کو کہا تھا، ناز برداری کر رہی ہے۔ ''سنا ہے کہ اس بلائے ناگہانی نے اس بے چارے کی کمر توڑ دی ہے۔''

''بہرحال، ان سے کہیں کہ وہ کلب ضرور آئیں — یہ معاملہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔ یہ ضیافت بہت پرتکلف

ہوگی!"

اگلے روز تین مارچ کو دوپہر کے ایک بجے کے ذرا بعد انگلش کلب کے اڑھائی سو ارکان اور ان کے پچاس مہمان اپنے مہمان خصوصی اور آسٹروی مہم کے ہیرو پرنس باگ راتیاں کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔

اوسٹرلٹس کے معرکے کی خبر جب ماسکو پہنچی، شہر کے لوگ بالکل بوکھلا گئے۔ اس زمانے میں روسی فتوحات کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ جب ایک شکست کی خبر موصول ہوئی، اسے بعض لوگوں نے صحیح ماننے سے انکار کر دیا جب کہ دوسروں نے اس کی توجیہہ یوں کی کہ لازماً استثنائی نوعیت کے حالات پیش آئے ہوں گے، جبھی یہ غیر معمولی واقعہ رونما ہوا۔ جب دسمبر میں یہ خبر گردش کرنے لگی، انگلش کلب میں، جہاں شہر کی اہم، نامی گرامی اور باخبر ہستیاں جمع ہوتی تھیں، جنگ اور آخری معرکے کے بارے میں ایک لفظ تک نہ کہا گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگوں نے لب کشائی نہ کرنے کی سازش کر رکھی ہے۔ وہ اشخاص — کاؤنٹ رستوپ چن[11]، پرنس یوری ولادی میر ووچ دلگاروکی، والیوییف، کاؤنٹ مارکوف، اور پرنس ویازیمسکی ---- جو گفتگو کا رخ متعین کیا کرتے تھے، کلب سے غیر حاضر ہونے لگے اور اپنے گھروں میں اپنے بے تکلف احباب سے ملنے ملانے لگے۔ چنانچہ ماسکو کے وہ باشندے (جن میں کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف شامل تھا)، جو اپنے خیالات و آرا دوسروں سے مستعار لیا کرتے تھے، کچھ عرصہ جنگ کے بارے میں کوئی واضح رائے قائم نہ کر سکے اور نہ انھیں کوئی ایسا شخص ملا جو ان کی رہنمائی کر سکتا۔ ماسکو کے باسیوں کو محسوس ہو رہا تھا کہ کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے لیکن ان کے لیے یہ جاننا دشوار تھا کہ وہ خبر بد کے متعلق کیا سوچیں۔ چنانچہ انھوں نے عافیت اسی میں جانی کہ خاموشی بہتر ہے۔ تاہم کچھ دنوں کے بعد زعمائے شہر، جو کلب میں دوسروں کی آراء پر اثر انداز ہوتے تھے، بالکل اسی طرح اپنے گھروں سے برآمد ہوئے جس طرح جیوری کے ارکان جیوری روم سے برآمد ہوتے ہیں۔ اب ہر شخص اپنے خیالات کا اظہار واضح اور دوٹوک انداز سے کرنے لگا۔ کبھی کسی نے یہ نہیں سنا تھا کہ روسی شکست کھا گئے ہیں اور اگر انھیں کوئی بتاتا بھی کہ وہ میدان جنگ میں پٹ گئے ہیں، انھیں کبھی یقین نہ آتا کیونکہ ان کے خیال کے مطابق اس قسم کا وقوعہ کبھی پیش آ ہی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ اب جب یہ واقعہ ظہور پذیر ہو گیا، اس کی وجوہات تلاش کی گئیں، پھر ہر بات سورج کی طرح عیاں ہو گئی اور ماسکو کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک لوگ ایک ہی قسم کی باتوں کی جگالی کرنے لگے۔ شکست کی جو وجوہات دریافت کی گئیں، وہ یہ تھیں: آسٹرویوں کی غداری، محکمہ رسد کی خامیاں اور نالائقیاں، پولستانی جرنیل پرزے بزیوسکی اور فرانسیسی جرنیل لانژ غون کی نمک حرامی، کوتوزوف کی نااہلی اور زار کی نوعمری اور ناتجربہ کاری (اور یہ آخری بات سرگوشیوں میں کہی جاتی تھی)، کہ اس نے نکمے اور بے حیثیت لوگوں پر اعتماد کیا۔ لیکن ہر شخص یہ بات دعوے سے کہتا تھا کہ فوج، یعنی روسی فوج، فقیدالمثال ہے کیونکہ وہ جرأت و شجاعت کے معجزانہ کارنامے سرانجام دے چکی ہے۔ عام سپاہی، افسر اور جرنیل ---- بلاتخصیص سبھی ہیرو تھے۔ لیکن ہیروؤں کا بھی ہیرو باگ راتیاں تھا۔ وہ شون گرابرن اور اوسٹرلٹس کے معرکوں میں کارہائے نمایاں سرانجام دے چکا تھا۔ اوسٹرلٹس کے

میدان سے جب فوج پسپا ہوئی تھی، اس کا کالم واحد کالم تھا جس میں کوئی بھگدڑ نہیں مچی، اس نے اپنے سے دس گنا دشمن کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دیا اور جب پسپا ہوا، قاعدے قرینے سے ہوا۔ اور جس چیز نے اسے ماسکو کا عوامی ہیرو منتخب ہونے میں مدد دی، وہ یہ تھی کہ اس کا اس شہر سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا۔ اس کی ذات کے حوالے سے عام روسی سپاہی کے لیے، جس کی نہ کوئی سفارش ہوتی ہے اور نہ جسے سازشوں سے کوئی سروکار ہوتا ہے، عزت واحترام کا اظہار کیا جا سکتا تھا۔ لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بیٹھ چکی تھی کہ عام روسی سپاہی وہی ہے جو اطالیہ کی مہموں میں اور سواروف کی کمان میں زبردست کارنامے سرانجام دے چکا تھا، اس لیے وہ اس کی تحسین کرنے کا جواز تلاش کر لیتے تھے۔ اس کے علاوہ باگ راتیاں کو اس لیے بھی عزت افزائی کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا کیونکہ کوتوزوف کے بارے میں ناپسندیدگی اور ناخوشی کا اظہار کرنے کا یہ ممکنہ طور پر بہترین طریقہ تھا۔

''اگر باگ راتیاں کا کوئی وجود نہ ہوتا، تو اسے لازماً گھڑنا پڑتا۔'' بذلہ سنج شن شن نے والتیئر کی پیروڈی کرتے ہوئے کہا۔

کوتوزوف کے متعلق ایک لفظ بھی نہ کہا گیا۔ جو چند ایک اشخاص اس کا نام زبان پر لاتے بھی تھے، وہ زیرلب اسے بےنقط سناتے تھے، اسے درباری، تھالی کا بینگن اور بوالہوس کہتے تھے۔

''سارے شہر میں پرنس دلگاروکی کا یہ قول گونج رہا تھا: ''جو شخص مٹی سے ٹھیکر بنائے گا، اس کے ہاتھ پاؤں میلے تو ہوں گے ہی۔'' یہ قول ایک طرف ہماری سابقہ فتوحات کی یاد دلاتا تھا، دوسری طرف اب ہمیں جو شکست کا سامنا کرنا پڑا، اس کے لیے مرہم کا کام دیتا تھا۔ پھر رستوپ چن کی یہ بات بھی بچے بچے کی زبان پر تھی: ''فرانسیسی سپاہی کو آمادۂ پیکار کرنے کے لیے غلو سے کام لینا پڑتا ہے۔ جرمنوں کو منطقی دلائل سے قائل کرنا پڑتا ہے کہ آگے بڑھنے کی نسبت راہ فرار اختیار کرنے میں زیادہ خطرات پنہاں ہیں لیکن جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، انھیں روکنا پڑتا ہے اور سمجھانا پڑتا ہے کہ وہ آہستہ روی سے کام لیں!'' اوسٹرلٹس کے میدان میں ہمارے افسروں اور جوانوں نے جس نام نہاد انفرادی شجاعت اور مردانگی کے جوہر دکھائے تھے، ان کے متعلق ہر روز نئی سے نئی کہانیاں تراشی جا رہی تھیں۔ ایک نے پرچم کی حفاظت کی تھی، دوسرے نے نصف درجن فرانسیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، تیسرا تن تنہا پانچ توپوں میں گولے بھرتا رہا۔ وہ لوگ جو برگ کے نام سے بھی واقف نہیں تھے، کہتے تھے کہ جب اس کا دایاں ہاتھ زخمی ہو گیا، اس نے بائیں ہاتھ میں شمشیر پکڑ لی اور غنیم کی صفوں میں گھس گیا۔ بلکونسکی کے متعلق کسی نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ صرف ان لوگوں کو، جو اسے قریب سے جانتے تھے، ملال تھا کہ وہ عالمِ شباب میں جان ہار گیا اور اپنے پیچھے حاملہ بیوی اور سنکی باپ چھوڑ گیا تھا۔

3

تین مارچ کو انگلش کلب کے تمام کمرے گفتگو کی بھنبھناہٹ سے گونج رہے تھے۔ جس طرح موسم بہار میں شہد کی مکھیاں

ہجوم در ہجوم امنڈ آتی ہیں، بعینہٖ کلب کے ارکان اور مہمان ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے، بیٹھے تھے، کھڑے تھے، معانقہ کرتے اور ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے تھے۔ بعض وردیوں اور بعض ڈریس کوٹوں[12] میں ملبوس تھے۔ چند ایک نے اپنے بالوں میں پاؤڈر چھڑکا ہوا تھا اور ان کے ابدان روسی کفتان میں ملفوف تھے۔ ہر دروازے پر نوکر چاکر اور بیرے کھڑے تھے۔ انھوں نے مخصوص وردیاں، اونچی جرابیں اور تسمے دار جوتے پہنے ہوئے تھے اور سروں پر وگیں، جن پر پاؤڈر چھڑکا ہوا تھا، لگائی ہوئی تھیں۔ ان کی پوری کوشش تھی کہ وہ کلب کے ارکان اور ان کے مہمانوں کی ایک ایک حرکت کا پیشگی اندازہ لگالیں تاکہ انھیں موزوں انداز سے اپنی خدمات پیش کر سکیں۔ جو لوگ کلب میں موجود تھے، ان کی اکثریت معزز اور بزرگ اشخاص پر مشتمل تھی۔ ان کے چہرے کشادہ اور پر اعتماد، انگلیاں موٹی اور آوازیں اور اشارے پرعزم تھے۔ اس طبقے کے ارکان اور مہمان اپنی مخصوص دائمی نشستوں پر متمکن تھے اور اپنے مخصوص دائمی حلقوں میں مجالس جمائے ہوئے تھے۔ اقلیت کبھی کبھار یا اتفاقیہ آنے والے مہمانوں پر مشتمل تھی۔ یہ لوگ زیادہ تر نوجوان تھے اور ان میں دینی سوف، رستوف اور دلوخوف (جو حال ہی میں بحال ہو چکا تھا اور ایک بار پھر سیمیونووسکی رجمنٹ میں افسر تھا) وغیرہ شامل تھے۔ ان نوجوانوں، خاص طور پر ان میں سے ان اشخاص کے، جو افسر تھے، چہروں سے صاف عیاں تھا کہ وہ بزرگوں کا احترام ضرور کرتے ہیں لیکن اس انداز سے، جیسے وہ ان پر احسان کر رہے ہوں۔ وہ پرانی نسل کو یہ کہتے محسوس ہوتے تھے: ''ہم آپ لوگوں کے ساتھ عزت و احترام سے ضرور پیش آ رہے ہیں لیکن یہ مت بھولیں کہ مستقبل کے مالک ہم ہیں۔''

نیس وتسکی وہاں کلب کے پرانے رکن کی حیثیت سے آیا تھا۔ پیئر، جس نے بیوی کے حکم پر سر کے بال بڑھا لیے تھے اور چشمہ اتار دیا تھا، کمروں میں بے مقصد گھوم پھر رہا تھا۔ اس کا لباس فیشن ایبل تھا لیکن اس کے چہرے پر اداسی اور حزن و ملال ٹپک رہا تھا۔ دوسرے مقامات کی طرح یہاں بھی اس کی امارت کی بنا پر اس کے تلوے چاٹنے والوں نے اس کا گھراؤ کر رکھا تھا۔ اسے ان خوشامدیوں اور کاسہ لیسوں کو لاابالی انداز سے نظر انداز کرنے اور ان کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کرنے کی عادت پڑ چکی تھی اور یہاں بھی وہ ان کے ساتھ اسی قسم کا سلوک کر رہا تھا۔

عمر کے اعتبار سے اس کا تعلق نوجوان نسل سے بنتا تھا لیکن اس کی دولت، اثر و رسوخ اور تعلقات نے اسے بزرگ اور قابل احترام مہمانوں کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی ایک حلقے میں بیٹھ جاتا اور کبھی دوسرے میں۔ بعض بزرگ ترین اور ممتاز ترین ارکان اپنے اپنے حلقوں کے مرکز بن گئے تھے اور ان مشہور و معروف اصحاب کی گفتگو سننے کے لیے اجنبی بھی احترام و تکریم کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ سب سے بڑے حلقے کاؤنٹ رستوپ چن، والیوییف اور ناری شکن کے ارد گرد بنے ہوئے تھے۔ رستوپ چن بتا رہا تھا کہ راہ فرار اختیار کرنے والے آسٹرویوں نے کس طرح روسیوں کو پاؤں تلے روند ڈالا اور روسیوں نے کس طرح سنگینوں کی نوک پر ان میں سے اپنا راستہ بنایا۔ والیوییف بڑے رازدارانہ انداز سے اپنے حلقے کو مطلع کر رہا تھا کہ یواروف کو پیٹرز برگ سے اس مقصد کے لیے یہاں بھیجا گیا ہے کہ وہ یہ معلوم کرے کہ اوسٹرلٹس کے بارے میں اہالیان ماسکو کیا سوچ رہے ہیں۔ تیسرے

گروپ میں ناری شکن آسٹروی جنگی کونسل کے اس اجلاس کی، جس میں آسٹروی جرنیلوں کی حماقتوں کے جواب میں سواروف نے مرغ کی طرح بانگ دی تھی، روداد بیان کر رہا تھا۔ شن شن نے، جو قریب کھڑا تھا، مذاق اڑانے کی کوشش کی۔ اس نے کہا: ''معلوم ہوتا ہے کہ کوتوزوف سواروف سے اتنی آسان سی بات بھی نہ سیکھ سکا کہ مرغ کی طرح بانگ دینے کا کیا طریقہ ہے۔'' لیکن کلب کے بزرگ ارکان بذلہ سنج کی طرف خشم گیں نگاہوں سے دیکھنے لگے اور یوں انھوں نے اسے باور کرا دیا کہ کوتوزوف کا اس انداز سے ذکر کرنے کا نہ یہ موقع ہے اور نہ مقام۔

کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف، جن کے چہرے پر تعجیل اور ذہنی مصروفیت ٹپک رہی تھی، نرم و ملائم بوٹ پہنے ڈائننگ روم اور ڈرائنگ روم کے مابین گھوم پھر رہا تھا۔ وہ اہم اور غیر اہم میں امتیاز کیے بغیر رواداری سے مہمانوں کا، جن سب کو وہ جانتا تھا، استقبال کر رہا تھا۔ اس دوران میں اس کی نگاہیں وقتاً فوقتاً اپنے خوش اندام اور بانکے سجیلے بیٹے کو ڈھونڈنے لگتیں۔ جب وہ اسے نظر آ جاتا، وہ جی بھر کر اسے دیکھتا اور خوشی کے عالم میں اسے آنکھ مارتا۔ نوجوان رستوف ایک دریچے کے قریب دلوخوف کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ دلوخوف سے حال ہی میں متعارف ہوا تھا اور اس کی بہت قدر کرتا تھا۔ سن رسیدہ کاؤنٹ ان کے پاس آیا اور اس نے دلوخوف کے ساتھ مصافحہ کیا۔

''مجھے امید ہے کہ آپ ہمارے ہاں تشریف لائیں گے اور ہمیں ملاقات کا موقع دیں گے... تو آپ میرے بیٹے کے دوست ہیں... وہاں اکٹھے رہے... اور اکٹھے بہادری کے کارنامے سرانجام دیتے رہے... اخاہ، واسیلی اگناتچ... mon vieux کیا حال چال ہیں؟'' لیکن پیشتر اس کے کہ وہ بزرگ شخص سے، جو ادھر سے گزر رہا تھا، علیک سلیک ختم کرتا، عام ہل چل مچ گئی۔ ایک ملازم بھاگتا بھاگتا اندر آیا اور اس نے ہیبت زدگی کے عالم میں اعلان کیا:

''وہ تشریف لے آئے ہیں!''

گھنٹیاں بجنے لگیں، سٹیوارڈ لپک کر آگے بڑھے اور مہمان، جو مختلف کمروں میں بکھرے ہوئے تھے، بڑے ڈرائنگ روم میں یوں ہجوم کرنے لگے جیسے چھاج میں گندم کے دانے اکٹھے ہو جاتے ہیں اور ان سب کی استقبالیہ کمرے کے دروازے پر بھیڑ لگ گئی۔

باگ راتیاں پیش دالان کے دروازے پر ٹوپی یا شمشیر کے بغیر نمودار ہوا۔ اس نے کلب کے رواج کے مطابق یہ دونوں چیزیں ہال پورٹر کے سپرد کر دی تھیں۔ اپنی استرخانی ٹوپی یا اپنی چابک کے بجائے، جن کے ساتھ ساتھ رستوف نے اسے اوسٹرلٹس کے معرکے سے قبل دیکھا تھا، وہ اب نئی اور نسبتاً تنگ وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے تمام روسی اور غیر ملکی تمغے بشمول سٹار آف سینٹ جارج اس کے بائیں سینے پر آویزاں تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے بالوں اور مونچھوں کی تازہ تازہ تراش خراش کرائی ہے لیکن اس سے اس کی شکل و صورت میں بہتری کے کوئی آثار پیدا نہ ہوئے، بلکہ پہلے سے کچھ بدتر ہی ہو گئی۔ اس کے اطوار سے کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ میلے پر آ نکلا

• بزرگوار

ہو۔ شادمانی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں لیکن اس کی یہ بھولی بھالی مسرت اس کے گٹھیلے اور شہزور جسم پر جچ نہیں رہی تھی بلکہ اس نے اس کی صورت قدرے مضحکہ خیز بنا دی تھی۔ بیکلی شیف اور فیودر پیتر ووچ یواروف، جو اس کے ساتھ آئے تھے، دروازے کے پاس رک گئے تاکہ مہمان خصوصی کی حیثیت سے وہ ان سے پہلے اندر داخل ہو سکے۔ باگراتیاں کو قدرے خفت محسوس ہوئی اور وہ ان کی شائستگی سے فائدہ اٹھانے پر متامل تھا۔ یوں دروازے پر معمولی سی تاخیر ہوگئی تاہم بالآخر وہ پہلے داخل ہونے پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے استقبالیہ کمرے کے چوبی فرش کو انکسار لیکن بھونڈے انداز سے پار کیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں کا کیا کرے۔ اسے گولہ باری کے دوران میں ایک ایسے کھیت میں سے، جس میں تازہ تازہ ہل چلایا گیا ہو، گزرنا ہوتا جیسا کہ اس نے شون گرابرن کے میدان میں کرسک رجمنٹ کی قیادت کرتے ہوئے کیا تھا، تو اسے زیادہ آسانی محسوس ہوتی۔ کلب کمیٹی کے ارکان نے اس کا پہلے دروازے پر استقبال کیا، اس کی شان میں چند کلمات کہے کہ وہ اتنی نامور ہستی سے مل کر کتنا خوش ہوئے ہیں اور انھوں نے اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر، یوں کہیے کہ اسے اپنے قبضے میں لے لیا اور اسے ڈرائنگ روم کی طرف لے چلے۔ کمرے میں داخل ہونا ناممکن تھا کیونکہ ممبروں اور مہمانوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی، وہ ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کر رہے تھے اور اچھل اچھل کر ایک دوسرے کے کندھوں کے اوپر سے اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے یوں تگ ودو کر رہے تھے جیسے وہ انسان نہیں، کوئی نایاب درندہ ہو۔ کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف ہنستے مسکراتے اور بار بار ''مائی ڈیئر، رستہ چھوڑ دو، مائی ڈیئر، رستہ چھوڑ دو،'' کی گردان کرتے کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت زیادہ زورآوری سے کام لیتا ہجوم میں گھستا چلا گیا۔ یوں وہ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں لے گیا اور وہاں انھیں مرکزی صوفے پر بٹھا دیا۔ کلب کی کرتا دھرتا اور ممتاز شخصیتوں نے مہمانوں کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف ایک بار پھر ہجوم میں دھکم پیل کرتا کمرے سے باہر نکل گیا اور ایک منٹ بعد کمیٹی کے ایک رکن کے ساتھ دوبارہ آن موجود ہوا۔ کمیٹی کا یہ رکن چاندی کی خاصی لمبی چوڑی کشتی لے کر آیا تھا۔ اس نے یہ کشتی باگ راتیاں کی خدمت میں پیش کر دی۔ کشتی پر قصیدہ جو ہیرو کی شان میں لکھا اور چھاپا گیا تھا، رکھا ہوا تھا۔ جب باگ راتیاں کی نظر کشتی پر پڑی، اس کے پسینے چھوٹ گئے اور وہ ادھر ادھر جھانکنے لگا جیسے استمداد کا متلاشی ہو۔ لیکن تمام نگاہیں مطالبہ کر رہی تھیں کہ وہ سر تسلیم خم کر دے۔ باگ راتیاں کو محسوس ہوا کہ وہ ان لوگوں کے رحم و کرم پر ہے، چنانچہ اس نے پرعزم انداز سے کشتی کو دونوں ہاتھوں سے اٹھا لیا اور وہ غصیلی اور ملامت آمیز نظروں سے کاؤنٹ کو، جو اسے وہاں لانے کا ذمے دار تھا، گھورنے لگا۔ تاہم کوئی شخص آگے بڑھا، اس نے ازرہ مروت یہ کشتی اس سے پکڑ لی (ورنہ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ اسے غروب آفتاب تک تھامے رہے گا اور کھانا بھی اسے اٹھائے اٹھائے زہر مار کرے گا) اور اس کی توجہ اشعار کی جانب مبذول کرائی۔ ''بہت اچھا، میں انھیں پڑھ لیتا ہوں،'' باگ راتیاں کا چہرہ مہرہ کہتا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی نڈھال نگاہیں کاغذ پر جمائیں اور نہایت سنجیدگی اور انہماک سے پڑھنے لگا۔ تاہم شاعر نے اپنا کلام اٹھا لیا اور بزبان خویش بلند آواز سے پڑھنا شروع کر دیا۔ باگ راتیاں نے گردن جھکا لی اور سننے لگا:

تم الیکساندر کے عہد حکومت کی شان وشکوہ ہو،
تم ہمارے ٹائی ٹس[14] کے تخت کے محافظ ہو!
تم تند خو سپاہی ہو لیکن شفیق و مہربان سردار
میدان جنگ میں تم سیزر لیکن گھر میں رھفی اس۔[15]

متکبر نپولین بھی سمجھ گیا ہے کہ تم کون ہو
اب اس میں اتنی جرأت نہیں کہ وہ تمھارے
لشکر کے ساتھ ٹکر لے،
باگراتیاں، کوئی نہیں جو تمھیں ہرا سکے۔

لیکن قصیدہ ابھی ختم نہیں ہوا تھا کہ کلب کا داروغہ اندر آیا اور اس نے بلند اور پرزور آواز میں اعلان کیا کہ ''کھانا لگا دیا گیا ہے!'' دروازہ کھول دیا گیا اور ڈرائنگ روم میں پولستانی رقص ''پولونیز'' کی دھنوں کی صدا گونجنے لگی۔ ''بہادر روسیو، تمھیں فتح مبارک ہو!'' کاؤنٹ الیا آندریچ نے شاعر کو، جو اپنے اشعار سنائے جا رہا تھا، قہر آلود نگاہوں سے دیکھا اور باگ راتیاں کے سامنے تسلیمات بجا لیا۔ تمام لوگ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ڈنر شعر و شاعری سے کہیں زیادہ اہم ہے، اٹھ کھڑے ہوئے۔ باگ راتیاں ایک بار پھر سب سے آگے آگے اور باقی اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ ڈرائنگ روم میں اسے مہمان خصوصی کی نشست پر بٹھایا گیا۔ اس کے دونوں اطراف دونوں الیکساندر۔ بیکلی شیف اور ناری شکن۔ بیٹھ گئے (یہ امپراطور کے نام کی طرف باریک اشارہ تھا)۔ تین سو اشخاص نے اپنے اپنے مرتبے اور اہمیت کے اعتبار سے ڈائننگ روم میں اپنی اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ جو شخص جتنا زیادہ اہم تھا، وہ اتنا ہی معزز مہمان کے قریب تھا، بالکل اسی طرح جس طرح پانی از خود اپنی سطح دریافت کر لیتا ہے۔

ڈنر کے آغاز سے ذرا پہلے کاؤنٹ الیا آندریچ نے اپنے بیٹے کو پرنس کی خدمت میں پیش کیا۔ باگ راتیاں نے اسے پہچان لیا اور اس سے چند الفاظ کہے۔ اس کی اس روز کی دوسری باتوں کی طرح اس کے یہ الفاظ بھی بے تکے اور بے ربط تھے۔ تاہم جب باگ راتیاں اس کے بیٹے سے گفتگو کر رہا تھا، کاؤنٹ الیا آندریچ بڑے فخر و مسرت سے حاضرین کو دیکھ رہا تھا۔

نکولائی رستوف، ڈینی سوف اور اپنے نئے دوست دلوخوف کے ساتھ میز کے تقریباً درمیان میں بیٹھ گیا۔ پیئر اور نیس وتسکی ان کے بالمقابل بیٹھے تھے۔ کاؤنٹ الیا آندریچ، جو ماسکووی مہمان نوازی کی مجسم مثال تھا، کمیٹی کے دیگر ارکان کے ساتھ باگراتیاں کے سامنے بیٹھ گیا اور اس کی خدمت میں مصروف ہو گیا۔

اس کی کوششیں بیکار نہیں گئی تھیں۔ مرغن اور سادہ، دونوں اقسام کی غذائیں، کھانے والوں کے لیے

پر تکلف طعام کا انتظام کیا گیا تھا۔ تاہم جب تک دعوت اختتام کو نہ پہنچ گئی، وہ بے کلی محسوس کرتا رہا۔ وہ بٹلر کو آنکھ سے اشارے کرتا، نوکروں چاکروں کو سرگوشیوں میں ہدایات دیتا اور ہر متوقع ڈش کا نہایت بے چینی سے انتظار کرتا رہا۔ ہر چیز اعلیٰ پیمانے کی تھی۔ کھانے کے بعد دوسرے دور کے دوران میں، جو کہ عظیم الجثہ سٹرلٹ مچھلی پر مشتمل تھا (اور جسے دیکھ کر کاؤنٹ خود شعوری مسرت سے سرخ ہو گیا)، بیروں نے بوتلوں کے کاگ کھولنا اور شیمپین گلاسوں میں انڈیلنا شروع کر دی۔ مچھلی کے بعد، جس نے کسی حد تک سنسنی پیدا کر دی تھی، کاؤنٹ نے کمیٹی کے دیگر ارکان کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ ''متعدد جام ہائے صحت تجویز کیے جانا ہیں۔ وقت ہے کہ اب یہ کام شروع کر دیا جائے!'' اس نے کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا اور وہ گلاس ہاتھ میں پکڑے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ تمام لوگ خاموش ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ وہ کیا کہتا ہے۔

''میں مقتدر اعلیٰ امپراطور کا جام صحت تجویز کرتا ہوں!'' اس نے گلا پھاڑتے ہوئے کہا اور اس کی شفیق آنکھوں میں مسرت اور جوش و خروش کے آنسو امنڈ آئے۔

موسیقاروں نے آن کی آن میں ''بہادر روسیو، تمھیں فتح مبارک ہو!'' کا ترانہ چھیڑ دیا۔ تمام لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ''ہرّا ہرّا'' کے نعرے بلند کرنے لگے۔ اور باگراتیاں نے بھی بالکل اسی آہنگ سے، جس آہنگ سے اس نے شون گرابرن کے میدان میں نعرہ لگایا تھا، ''ہرّا'' کا نعرہ لگا دیا۔ نوجوان رستوف کی وجد آفریں آواز تین صد آوازوں میں بلند ترین تھی۔ وہ تقریباً رو پڑا۔

''ہمارے مقتدر اعلیٰ امپراطور کا اقبال بلند ہو!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''ہرّا'' اس نے ایک ہی سانس میں گلاس خالی کر دیا اور اسے فرش پر پٹخ دیا۔

متعدد دیگر اشخاص نے اس کی مثال پر عمل کیا اور خاصی دیر تک ہنگامہ ہاؤ ہو بپا رہا۔ اس کے اختتام پر بیروں اور ملازموں نے فرش سے کرچیاں اٹھا لیں۔ ہلا گلا کرنے پر تمام لوگ بے حد خوش تھے اور مسکرا رہے تھے۔ وہ دوبارہ نشستوں پر بیٹھ گئے اور آپس میں باتیں کرنے لگے۔

کاؤنٹ الیا آندریچ ایک بار پھر اٹھا۔ اس کی پلیٹ کے قریب کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا۔ اس نے اس پر نگاہ دوڑائی اور بولا: ''اب میں اپنی آخری مہم کے ہیرو پیوتر ایوانووچ باگراتیاں کا جام صحت تجویز کرتا ہوں۔'' اور ایک بار پھر اس کی نیلی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

اس مرتبہ موسیقاروں نے ترانہ نہ چھیڑا بلکہ ایک غنائیہ، جس کی دھنیں کسی پاول ایوانووچ کوتوزوف[16] نے ترتیب دی تھیں، چھیڑ دیا:

روسی تمام رکاوٹیں تہس نہس کر دیتے ہیں۔
ان کی شجاعت فتح کی ضمانت ہے۔

ہمارے پاس باگ راتیاں ہے
چنانچہ تمام دشمن گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

غنایئے کے اختتام پر مختلف اشخاص کے جام ہائے صحت تجویز کیے گئے۔ ہر جام صحت کے اختتام پر کاؤنٹ الیا آندریچ پر پہلے سے زیادہ رقت طاری ہوجاتی۔ گلاس پاش پاش ہوتے چلے گئے اور چیخ وپکار بلند سے بلندتر۔ بیکلی شیف، ناری شکن، یواروف، دلگوروکوف، اپراکسن، والیوییف، کلب کمیٹی کے ارکان، کلب کے تمام ممبران اور ان کے مہمانوں کے جام ہائے صحت تجویز ہوئے اور آخر کار ضیافت کے منتظم کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف کی باری آئی۔ جب یہ جام صحت تجویز ہوا، کاؤنٹ نے جیب سے رومال نکالا، اپنا چہرہ ڈھانپا اور سیدھے سبھاؤ رونا شروع کر دیا۔

4

پیئر دلوخوف اور نکولائی رستوف کے بالمقابل بیٹھا تھا۔ اس نے ہمیشہ کی طرح ندیدوں کی مانند ڈٹ کر کھانا کھایا اور جام پر جام لنڈھائے۔ تاہم ان لوگوں کو، جو اسے جانتے تھے، اس میں عظیم تغیر نظر آیا۔ وہ ڈنر کے دوران میں ہمہ وقت خاموش رہا۔ کبھی وہ آنکھیں جھپکاتا اور ناک بھوں چڑھاتا ادھر ادھر دیکھنے لگتا اور کبھی ایک ہی جگہ نظریں گاڑ کر اور بالکل بے دھیانی کے عالم میں انگلی سے اپنی ناک کا بانسا مسلنے لگتا۔ اس کے چہرے پر حزن وملال اور مایوسی کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ یوں نظر آرہا تھا کہ اس کے گرد وپیش جو کچھ ہو رہا ہے، وہ اسے نہ دیکھ اور نہ سن رہا ہے بلکہ وہ کسی اذیت ناک اور غیر حل شدہ مسئلے میں مستغرق ہے۔

یہ غیر حل شدہ مسئلہ، جو اس کے لیے اذیت کا باعث بنا ہوا تھا، ان اشاروں کا رہین منت تھا، جو ماسکو میں اس کی پھوپھی زاد بہن بڑی پرنسس نے اس کی بیوی اور دلوخوف کے مابین بے تکلفی کی طرف کیے تھے اور اس میں کچھ ہاتھ اس گمنام خط کا بھی تھا جو اسے اس صبح موصول ہوا تھا اور عام گمنام خطوں کی طرح اس میں اسے گھٹیا اور شوخ انداز سے مطلع کیا گیا تھا کہ "تم آنکھوں پر بیکار چشمہ چڑھائے پھرتے ہو۔ تمھیں کچھ نظر نہیں آتا لیکن ساری دنیا دیکھ رہی ہے کہ تمھاری بیوی دلوخوف کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھا رہی ہے۔" پیئر کو پرنسس کے اشاروں اور خط کے مندرجات پر قطعاً یقین نہیں آیا تھا لیکن اب جب کہ دلوخوف اس کے بالمقابل بیٹھا تھا، اسے اس سے آنکھ ملاتے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ جب بھی اس کی نگاہیں دلوخوف کی خوبصورت اور گستاخ آنکھوں سے ٹکراتیں، اسے یوں لگتا جیسے اس کی روح میں کوئی مہیب اور انسانیت سوز چیز کھب گئی ہو اور وہ ایکا ایکی اپنی نظریں پرے ہٹا لیتا۔

پیئر غیر ارادی طور پر اپنی بیوی کے ماضی اور دلوخوف کے ساتھ اس کے رویے کو یاد کرنے لگا۔ اب اسے محسوس ہوا کہ اگر خط کے مندرجات اس کی اپنی بیوی کے متعلق نہ ہوتے، وہ شاید درست ہی ہوتے یا کم از کم انھیں درست ہونا چاہیے تھا۔ اسے یاد آیا کہ دلوخوف، جو جنگ کے بعد بحال ہو چکا تھا، کس طرح پیٹرزبرگ لوٹا اور اس

کے پاس آیا تھا۔ اوائل عمری میں وہ مل کر جس قسم کی شرارتیں کیا کرتے تھے، انھوں نے ان کے مابین دوستی کے رشتے استوار کر دیے تھے اور اسی دوستی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دلوخوف سیدھا اس کے گھر چلا آیا تھا۔ پیئر نے اسے نہ صرف اپنے ہاں ٹھہرایا بلکہ اسے رقم بھی قرض دی۔ پیئر کو یاد آیا کہ ہیلین نے کس طرح ہنستے مسکراتے اپنے گھر میں دلوخوف کے قیام پر عدم اطمینان کا اظہار کیا تھا، کس سنکی انداز سے دلوخوف نے اس کے سامنے اس کی بیوی کے حسن کی تعریف کی تھی اور ان کے ماسکو چلے آنے تک وہ کس طرح اپنی آمد کے بعد ایک دن کے لیے بھی ان کے گھر سے باہر نہیں رہا تھا۔

''اس میں کوئی کلام نہیں کہ دلوخوف بہت وجیہ اور خوش اندام ہے۔'' پیئر نے سوچا: ''اور میں اسے جانتا ہوں۔ محض اس لیے کہ میں نے اس کی خاطر بھاگ دوڑ کی، اس کی مدد کی اور اسے دوست بنایا، اسے مجھ پر کیچڑ اچھالنے اور میرا مضحکہ اڑانے میں خاص طور پر کشش نظر آئی ہوگی۔ میں جانتا ہوں، سمجھتا ہوں کہ میرے اعتماد کو، اگر واقعی یہ درست ہے، ٹھیس پہنچا کر، اس نے اپنی مسرت میں کتنا چٹخارا محسوس کیا ہوگا۔ ہاں، اگر یہ بات درست ہو، لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔ مجھے اس پر یقین کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں اور میں اس کا یقین نہیں کر سکتا۔''

سفاکی کے لمحات میں دلوخوف کے چہرے پر جس قسم کے تاثرات ہویدا ہوتے تھے، وہ اسے یاد آئے۔ مثلاً جب اس نے پولیس مین کو ریچھ کے ساتھ باندھا اور اسے پانی میں گرایا تھا یا کسی نوع کے اشتعال کے بغیر اس نے ایک شخص کو ڈوئیل لڑنے کے لیے چیلنج دے دیا تھا یا اپنے پستول کی گولی سے سلیج ڈرائیور کے گھوڑے کو ہلاک کر دیا تھا۔ یہ سارے واقعات اس کے ذہن میں ابھر آئے اور اسے یاد آیا کہ دلوخوف کے چہرے پر سفاکانہ تاثرات صرف اسی وقت نظر آتے تھے جب وہ اس کی طرف دیکھ رہا ہوتا۔ ''ہاں، یہ شخص غنڈا ہے،'' پیئر نے سوچا۔ ''کسی شخص کی جان لینا اس کے لیے کوئی معانی نہیں رکھتا۔ وہ غالباً یہ سمجھتا ہے کہ ہر شخص اس سے خوف کھاتا ہے اور یہ تصور اس کے لیے مسرت کا باعث بنتا ہوگا۔ وہ لازماً یہ سوچتا ہوگا کہ میں بھی اس سے خائف ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ میں واقعی اس سے خائف ہوں۔'' اس نے سوچا اور اسے ایک مرتبہ پھر اپنی روح میں کوئی مہیب اور انسانیت سوز چیز کھبتی محسوس ہوئی۔

دلوخوف، دینی سوف اور رستوف پیئر کے بالمقابل بیٹھے تھے اور بے حد شاداں و مسرور نظر آ رہے تھے۔ رستوف اپنے دونوں دوستوں کے ساتھ مزے مزے سے گفتگو کر رہا تھا۔ ان میں سے ایک بانکا سجیلا ہوزار تھا جب کہ دوسرا بدنام ڈوئیل باز اور اوباش شخص تھا۔ دلوخوف کبھی کبھار پیئر پر، جو دنیا و مافیہا سے بے خبر، اپنی سوچوں میں مستغرق اور اپنے بھاری بھرکم ڈیل ڈول کی بنا پر ضیافت میں بہت نمایاں نظر آ رہا تھا، طنزیہ نظر ڈال لیتا۔ رستوف پیئر کو اس لیے مخاصمانہ نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ خود ہوزار تھا اور ہوزار کی نگاہوں میں پیئر محض دولت مند سویلین، حسین و جمیل خاتون کا خاوند اور بڑی بی تھا۔ دوسرے پیئر نے، جو اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا اور بے دھیانی سے ادھر ادھر نگاہیں گھما رہا تھا، رستوف کو پہچانا نہیں تھا اور نہ اس کے سلام کا جواب دیا تھا۔ جب امپراطور کا جام

صحت تجویز ہوا، پیئر جو اپنی ادھیڑ بن میں مصروف تھا، نہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور نہ اس نے اپنا گلاس اوپر اٹھایا۔

''تمھیں کیا ہوا ہے؟'' رستوف نے چلا کر کہا۔ ''تم نے سنا نہیں کہ امپراطور کا جام صحت پیا جا رہا ہے؟''

پیئر نے لمبی سانس لی، فرماں برداری سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اپنا گلاس خالی کیا اور جب سب لوگ بیٹھ گئے، وہ نیک دلی سے رستوف کی طرف متوجہ ہوا اور اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔

''ارے، میں نے تمھیں پہچانا ہی نہیں!''

لیکن رستوف چیخنے چلانے میں اتنا مصروف تھا کہ اسے کچھ سنائی نہ دیا۔

''تم ازسرنو اپنا تعارف کیوں نہیں کرا لیتے؟'' دلوخوف نے رستوف سے کہا۔

''اجی لعنت بھیجو، یہ نرا احمق ہے!'' رستوف نے کہا۔

''خوبصورت عورتوں کے خاوندوں سے ہمیشہ بنا کر رکھنا چاہیے،'' دینی سوف نے لقمہ دیا۔

وہ جو کچھ کہہ رہے تھے، پیئر کو سنائی نہ دیا لیکن وہ اتنا سمجھ گیا کہ وہ اسی کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ اس کا رنگ سرخ ہو گیا اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''آئیں، اب ہم خوبصورت عورتوں کا جام صحت نوش کریں!'' دلوخوف نے کہا۔ اگرچہ اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں، تاہم اس نے اپنے چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔ وہ پیئر کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے اپنا گلاس اوپر اٹھایا۔ 'پتر دشکا، خوبصورت عورتوں اور ان کے عاشقوں کی صحت کے نام پر!'' اس نے مزید کہا۔

پیئر نے نظریں جھکائے اور دلوخوف کی جانب دیکھے یا اس کی بات کا جواب دیے بغیر اپنا گلاس ہونٹوں سے لگا لیا۔ ایک وردی پوش ملازم نے، جو کوتوزوف کا غنائیہ تقسیم کر رہا تھا، ایک نقل پیئر کے سامنے رکھ دی کیونکہ اس کا شمار انتہائی سربرآوردہ مہمانوں میں ہوتا تھا۔ اس نے یہ نقل اٹھائی ہی تھی کہ دلوخوف میز پر آگے جھکا، اس نے جھپٹا مار کر کاغذ اس کے ہاتھ سے چھینا اور اسے پڑھنا شروع کر دیا۔ پیئر نے دلوخوف کی جانب دیکھا اور پھر اپنی نظریں جھکا لیں۔ جس مہیب اور انسانیت سوز چیز کا احساس ڈنر کے سارے عرصے کے دوران میں اسے ڈستا رہا تھا، اس نے دوبارہ اسے اپنی گرفت میں جکڑ لیا۔ اس نے اپنے بے ڈول اور بھاری بھرکم جسم کو میز پر جھکایا اور اسے ذرا آگے بڑھا کر چلایا:

''تمھیں یہ پکڑنے کی جرأت کیسے ہوئی؟''

نیس وتسکی اور اس کے دائیں پڑوسی نے جب یہ چیخ پکار سنی اور انھوں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ اس کا مخاطب کون ہے، ان کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ جھٹ پٹ بزدخوف کی طرف متوجہ ہوئے۔

''نہیں، نہیں، جانے دیں! چھوڑیں! کیا کر رہے ہیں آپ؟'' انھوں نے زیر لب کہا۔ خوف سے ان کی آوازیں لرز رہی تھیں۔

دلوخوف نے اپنی صاف شفاف، سفاک اور ہشاش بشاش آنکھوں سے پیئر کی جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا

کہ اس کی نگاہیں یہ کہہ رہی ہیں: ''مجھے تو یہی بات پسند ہے!''

''جاؤ، میں نہیں دیتا!'' اس نے دوٹوک انداز سے کہا۔

پیئر کا رنگ فق ہو گیا، اس کے ہونٹ کپکپانے لگے اور اس نے دلوخوف کے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کر دیا۔

''تم — تم — بدمعاش!... میں تمھیں چیلنج دیتا ہوں!'' اس نے پرزور انداز سے چلا کر کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے کرسی دھکیل کر ایک طرف کر دی اور دسترخوان سے اٹھ کھڑا ہوا۔

جونہی پیئر کی زبان سے یہ الفاظ نکلے، اسے محسوس ہوا کہ اس کی بیوی کی تقصیر کا مسئلہ، جو گزشتہ چوبیس گھنٹوں سے اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا، قطعی اور ناقابلِ تردید انداز سے صحیح ثابت ہو گیا ہے۔ اسے اس (اپنی بیوی) سے گھن آنے لگی اور اس کے ساتھ اس کا رشتہ دائمی طور پر منقطع ہو گیا۔

دینی سوف کی منت سماجت کے باوجود کہ رستوف کو اس معاملے میں قطعاً مداخلت نہیں کرنا چاہیے، وہ دلوخوف کا سیکنڈ[17] بننے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ چنانچہ اس نے ڈنر کے بعد پیئر کے سیکنڈ نیس وتسکی کے ساتھ ڈوئیل کے انتظامات طے کیے۔ پیئر گھر چلا گیا لیکن رستوف دلوخوف اور دینی سوف کے ساتھ کلب میں ہی ٹھہرا رہا اور گئی رات تک جپسیوں اور دوسرے گلوکاروں کے نغمات سنتا رہا۔

''اچھا، خدا حافظ، کل ساکول نکی جنگل میں ملاقات ہوگی،'' دلوخوف نے کلب سے رخصت ہوتے ہوئے رستوف سے کہا۔

''تم پریشان تو نہیں ہو؟'' رستوف نے پوچھا۔

دلوخوف رک گیا۔ ''دیکھو، ڈوئیل کیسے لڑی جاتی ہے، اس کا سارا راز میں تمھیں دو لفظوں میں بتائے دیتا ہوں۔ اگر ڈوئیل لڑنے سے پہلے آدمی اپنا وصیت نامہ تیار کرنے اور اپنے والدین کے نام محبت بھرے خطوط لکھنے بیٹھ جائے اور دل میں یہ گمان کرنے لگے کہ 'کہیں میں مارا ہی نہ جاؤں' — پھر سمجھ لو کہ اس سے بڑا احمق اور کوئی نہیں اور اس کا بیڑا غرق ہو گیا لیکن اگر وہ اپنے دل میں یہ پختہ یقین پیدا کر لے کہ اس نے اپنے حریف کو حتی الامکان جلد از جلد اور لازماً موت کی نیند سلانا ہے، پھر اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں کاسترو کا ایک ریچھوں کا شکاری تھا۔ وہ مجھ سے کہا کرتا تھا: 'ٹھیک ہے کہ آدمی کو ریچھ سے خوف آتا ہے' لیکن جونہی اس کی نظر اس پر پڑتی ہے، اس کا سارا خوف پادر ہوا ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں صرف یہ اندیشہ جاگزیں ہو جاتا ہے کہ کہیں یہ بچ کر نہ نکل جائے۔' میری کیفیت بھی کچھ اسی قسم کی ہے۔ اچھا، پیارے، کل ملاقات ہوگی۔''

اگلی صبح آٹھ بجے پیئر اور نیس وتسکی ساکول نکی جنگل پہنچے۔ انھوں نے رستوف، دلوخوف اور دینی سوف کو پہلے ہی وہاں موجود پایا۔ پیئر کے چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کسی ایسی ادھیڑ بن میں، جس کا موجودہ معاملے سے کوئی تعلق نہیں، مصروف ہے۔ اس کا وحشت زدہ چہرہ زرد ہو چکا تھا۔ بظاہر وہ ساری رات سو نہیں سکا

تھا۔ وہ کھوئے کھوئے انداز میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور اپنی آنکھیں یوں جھپکا رہا تھا جیسے وہ تیز دھوپ میں چندھیا گئی ہوں۔ اس کے ذہن پر صرف دو خیالات نے قبضہ جما رکھا تھا۔ اول: اپنی بیوی کی تقصیر، رات بھر جاگنے کے بعد اس بارے میں اس کے دماغ میں شک وشبے کی رمق بھی باقی نہیں رہ گئی تھی۔ دوم: دلوخوف کی بے تقصیری۔ اسے بھلا ایک ایسے شخص کے، جس کی اس کی نگاہوں میں کوئی اہمیت نہیں تھی، ناموس کے تحفظ سے کیا سروکار ہو سکتا تھا۔ ''اگر اس کی جگہ میں ہوتا، تو شاید میں بھی یہی کرتا،'' پیئر نے سوچا۔ ''واقعی مجھے یقین ہے کہ میں نے بھی یہی کیا ہوتا۔ پھر یہ ڈوئیل، یہ قتل کیوں؟ یا میں اسے ہلاک کر دوں گا یا وہ میرے بھیجے، کہنی یا گھٹنے میں گولی اتار دے گا۔ کیا میں یہاں سے فرار نہیں ہو سکتا؟ بھاگ نہیں سکتا؟ کہیں غائب نہیں ہو سکتا؟'' کچھ اس قسم کے سوالات اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔ لیکن جب وہ اس نوعیت کے تصورات میں کھویا ہوا تھا، وہ کچھ ایسے عجیب پرسکون اور لاتعلق انداز سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ دیکھنے والے اس کا احترام کرنے پر مجبور تھے۔

''کتنی دیر ہے؟ وہ تیار ہو گئے؟'' اس نے پوچھا۔

جب تیاریاں مکمل ہو گئیں، پستولوں میں گولیاں بھر دی گئیں اور برف میں شمشیریں گاڑ دی گئیں تاکہ ان مقامات کی، جہاں تک وہ بڑھ سکتے تھے، حد بندی ہو جائے، نیس وتسکی پیئر کے پاس آیا۔

''کاؤنٹ، اگر اس انتہائی گمبھیر لمحے میں میں نے آپ کو پوری حقیقت سے خبردار نہ کیا،'' اس نے لڑکھڑاتی آواز میں اس سے کہا، ''تو میں سمجھوں گا کہ میں اپنا فرض نبھانے میں ناکام رہا ہوں اور آپ نے مجھے اپنا سیکنڈ منتخب کر کے مجھ پر جس اعتماد کا اظہار کیا ہے اور میری جو عزت افزائی کی ہے، اس کا اپنے آپ کو اہل نہیں ثابت کر سکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ معاملے کو یہاں تک پہنچانے میں اور اس سلسلے میں خون بہانے کی کافی وجوہات موجود نہیں... غلطی آپ کی تھی۔ آپ اپنے غصے پر قابو نہ پا سکے...''

''ہاں، بالکل انتہائی احمقانہ حرکت تھی...''

''پھر مجھے اجازت دیں کہ میں آپ کی طرف سے تاسف کا اظہار کر دوں اور مجھے امید ہے کہ ہمارے مخالفین آپ کی معذرت قبول کر لیں گے،'' نیس وتسکی نے کہا۔ (اس معاملے میں جو لوگ شریک تھے یا اس سے ملتے جلتے دیگر معاملات میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، ان سب کی طرح اس کا بھی یہ خیال تھا کہ حقیقی ڈوئیل کی نوبت نہیں آئے گی۔) ''کاؤنٹ، آپ جانتے ہیں کہ معاملات کو اس مقام تک، جہاں ان کی تلافی ناممکن ہو جائے، لے جانے کی نسبت یہ بات زیادہ باعث عزت ہے کہ آدمی اپنی غلطی تسلیم کر لے۔ یوں طرفین میں سے کسی کی بھی توہین نہیں ہوتی۔ پھر مجھے اجازت دیں کہ میں...''

''نہیں، اب کہنے سننے کے لیے رہ ہی کیا گیا ہے!'' پیئر نے کہا۔ ''اب کچھ فرق نہیں پڑے گا... سب تیاریاں مکمل ہو گئیں؟ مجھے صرف اتنا بتا دیں کہ مجھے کہاں جانا ہے اور کہاں گولی چلانا ہے؟'' اس نے اپنے چہرے پر غیر فطری انداز سے نرم وگداز مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

اس نے پستول پکڑ لیا اور پوچھنے لگا کہ اس کا گھوڑا کس طرح کام کرتا ہے۔ وہ یہ سوالات اس لیے پوچھ رہا تھا کہ اس نے زندگی بھر پستول کو ہاتھ تک نہیں لگایا تھا۔ اور یہ وہ حقیقت تھی جس کا وہ اعتراف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ''ارے ہاں، بالکل اسی طرح... مجھے معلوم تو تھا لیکن میں بھول گیا تھا۔''

''معذرت کیسی؟ بالکل نہیں، ہرگز نہیں۔'' دلوخوف دینی سوف (جو اپنے طور پر صلح کرانے کی کوشش کر رہا تھا) سے کہہ رہا تھا۔ وہ بھی مقررہ مقام پر پہنچ گیا۔

ڈوئیل کے لیے جو جگہ منتخب کی گئی تھی، اس سڑک سے، جس پر سلیج گاڑیاں کھڑی کی گئی تھیں، اسی قدم دور تھی۔ جنگل کا یہ مقام بالکل چٹیل تھا اور صنوبر کے درختوں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کی سطح برف سے، جو گزشتہ چند دنوں سے پگھلنے لگی تھی، ڈھکی ہوئی تھی۔ دونوں حریف ایک دوسرے سے چالیس قدم دور اس خالی جگہ کے کناروں پر کھڑے ہو گئے۔ دونوں کے سیکنڈوں نے فاصلہ ماپتے وقت اپنے قدموں کے نشانات، اس مقام سے جہاں وہ کھڑے تھے، اس مقام تک، جہاں نیس وتسکی اور دینی سوف کی شمشیریں حد بندی کرنے کے لیے ایک دوسری سے دس قدم دور زمین میں گاڑ دی گئی تھیں، گہری اور گیلی برف پر ثبت کر دیے تھے۔ برف پگھل رہی تھی اور دھند چھائی ہوئی تھی۔ چالیس قدم کے فاصلے پر کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کئی منٹ سے سب تیاریاں مکمل تھیں لیکن وہ ابھی تک ابتدا کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ ہر شخص مہر بلب تھا۔

5

''چلو، پھر شروع کریں!'' دلوخوف نے کہا۔

''یقیناً،'' پیئر نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا۔

فضا پر ایک قسم کی دہشت کا احساس حاوی تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ معاملہ، جو ہنسی دل لگی سے شروع ہوا تھا، اب کسی صورت میں بھی اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکے گا۔ اب اسے اپنے انجام کو پہنچنا تھا، انسانوں کے منشا کو اس میں کوئی دخل نہیں رہا تھا۔ پہلے دینی سوف حد بندی کی طرف بڑھا اور اس نے اعلان کیا:

''چونکہ حریف صلح کرنے سے انکاری ہیں، اس لیے کارروائی کا آغاز ہو جانا چاہیے۔ اپنے اپنے پستول تھام لیں۔ میں گنتی کروں گا۔ جب میں تین تک پہنچوں، آگے بڑھنا شروع کر دیں... لیجیے... ایک!... دو!... تین!'' اس نے قہر آلود انداز سے چلا کر کہا اور ایک طرف ہٹ گیا۔

حریف اس پگڈنڈی پر، جو برف پر چلنے سے بن گئی تھی، چلتے آگے بڑھنے لگے۔ اب وہ ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر آ رہے تھے اور انھیں ایک دوسرے کی شکلیں نظر آنے لگی تھیں۔ جب وہ درمیانی حد بندی کے قریب پہنچ گئے، انھیں یہ حق حاصل ہو گیا کہ وہ جب چاہیں، ایک دوسرے پر گولی چلا دیں۔ دلوخوف اپنا پستول بلند کیے بغیر آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ اس کی جگمگاتی، صاف شفاف، نیلی آنکھیں اپنے حریف کے چہرے پر مرکوز

تھیں۔ حسب معمول اس کے لبوں پر ہلکی مسکراہٹ تیر رہی تھی۔

لفظ ''تین'' پر پیئر پھرتی سے آگے بڑھا، برف پر جو پگڈنڈی بن گئی تھی، عجلت میں وہ اس سے قدرے پرے ہٹ گیا اور اس کے پاؤں گہری برف میں دھنس گئے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں، جو اس کے جسم سے خاصا آگے نکلا ہوا تھا، پستول تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے یہ اندیشہ دامن گیر ہے کہ کہیں وہ اپنی ہی گولی کا نشانہ نہ بن جائے۔ اس کا جی للچا رہا تھا کہ وہ اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے دائیں ہاتھ کو سہارا دے دے۔ چونکہ وہ جانتا تھا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے، اس نے نہایت احتیاط سے اپنا بایاں ہاتھ پیچھے کیے رکھا۔ چھ قدم آگے بڑھنے اور پگڈنڈی سے بھٹک کر برف میں دھنسنے کے بعد پیئر نے اپنے پاؤں پر نظر ڈالی اور پھر عجلت سے دلوخوف کی طرف دیکھا۔ پھر، جیسا کہ اسے سمجھایا گیا تھا، اس نے اپنی انگلی کو خم دیا اور گولی چلا دی۔ اسے یہ قطعاً توقع نہیں تھی کہ گولی چلنے سے اتنی زبردست آواز پیدا ہوگی۔ چنانچہ جب یہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی، وہ گھبرا کر اچھل پڑا، پھر وہ اپنے ردعمل پر مسکرایا اور اپنی جگہ ساکن کھڑا ہو گیا۔ دھند کی وجہ سے دھواں اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ یوں ایک لمحے کے لیے اسے کچھ بھی نظر نہ آیا لیکن وہ جس گولی کا انتظار کر رہا تھا، توقع کے برعکس اسے اس کی آواز سنائی نہ دی۔ صرف دلوخوف کے تیز قدموں کی چاپ اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھی اور اب دھوئیں میں اس کی شکل بھی واضح طور پر دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنا بایاں پہلو مضبوطی سے تھام رکھا تھا اور دوسرے میں پستول، جو نیچے کی جانب لٹک رہا تھا، پکڑ رکھا تھا۔ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ رستوف بھاگم بھاگ اس کے پاس آیا اور اس سے کچھ کہنے لگا:

''نا۔ ہیں...'' دلوخوف بڑبڑایا۔ اس کے دانت بھنچے ہوئے تھے۔ ''نہیں، معاملہ ابھی ختم نہیں ہوا!''

اور وہ بیچارگی سے گھسٹتا گھسٹتا چند قدم آگے بڑھا، شمشیر کے قریب پہنچا اور اس کے پاس برف میں دھنس گیا۔ اس کا بایاں ہاتھ خون سے تر تھا۔ اس نے اسے اپنے کوٹ پر پونچھا اور اس کے ساتھ اپنے آپ کو سہارا دیا۔ اس کا چہرہ زرد، پیشانی شکن آلود اور جسم بید مجنوں کی طرح کانپ رہا تھا۔

''مہربا۔'' دلوخوف نے بولنا چاہا لیکن ابتداً وہ لفظ صحیح طور پر ادا نہ کر سکا۔ ''مہربانی کرو!'' آخر وہ بڑی دقت سے کہہ پایا۔

پیئر کے لیے اپنی سسکیوں اور آہوں پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا اور وہ دلوخوف کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ شمشیروں کے مابین جگہ پار کر جاتا کہ دلوخوف نے چلا کر اس سے کہا:

''اپنی حد بندی کی طرف!''

اور پیئر سمجھ گیا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ چنانچہ وہ اپنی سمت کی شمشیر کے قریب رک گیا۔ اب دونوں کے مابین صرف دس قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ دلوخوف نے اپنا سر نیچے جھکایا اور مر بھکوں کی طرح مٹھی بھر برف دانتوں سے کاٹ لی۔ پھر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا، جسم سیدھا کیا، ٹانگیں سمیٹیں اور بیٹھ گیا۔ وہ کشش ثقل کا مضبوط مرکز

تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ٹھنڈی برف چوس اور نگل رہا تھا۔ اگرچہ اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے لیکن وہ اب بھی متبسم تھے۔ اپنی بچی کھچی قوت کو مجتمع کرنے کے لیے اسے جو زور لگانا پڑا تھا اور اس کی نگاہوں میں جو مخاصمت تھی، ان دونوں نے اس کی آنکھوں کو جگمگا دیا تھا۔ اس نے اپنا پستول اٹھایا اور شست لی۔

''ایک طرف ہٹ جاؤ! اپنے پستول کو بطور آڑ استعمال کرو!'' نیس وتسکی نے چلا کر کہا۔

''اپنے آپ کو بچاؤ!'' دینی سوف بھی چلائے بغیر نہ رہ سکا حالانکہ اس کا تعلق فریق مخالف سے تھا۔

پیئر کے چہرے پر دردمندی اور پچھتاوے کی لطیف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے اپنی ٹانگیں اور بازو پھیلا رکھے تھے اور اس کی چوڑی چکلی چھاتی دلوخوف کے بالکل سامنے تھی۔ یوں وہ اپنے حریف کے سامنے بالکل غیر محفوظ تھا۔ وہ پر ملال نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ دینی سوف، رستوف اور نیس وتسکی نے اپنی اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسی لمحے انھیں گولی چلنے اور دلوخوف کے غضب ناک انداز سے چنگھاڑنے کی آوازیں سنائی دیں۔

''نشانہ خطا گیا!'' دلوخوف نے با آواز بلند کہا اور یوں نیچے گر پڑا جیسے اس کے جسم میں جان باقی نہ رہی ہو۔ وہ اوندھے منہ پڑا تھا۔

پیئر نے اپنا سر پکڑ لیا اور ایک طرف ہٹ گیا۔ وہ گہری برف میں لمبے لمبے ڈگ بھرتا جنگل کی طرف جا رہا تھا اور بے ربط الفاظ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔

''حماقت... حماقت! موت... دروغ گوئیاں۔'' وہ بار بار دہرائے جا رہا تھا اور اس کے ماتھے کی لکیریں گہری ہوتی جا رہی تھیں۔

نیس وتسکی نے اسے روکا اور گھر لے گیا۔

رستوف اور دینی سوف زخمی آدمی کو اپنے ساتھ لے گئے۔

سلیج میں دلوخوف چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ اس سے جو سوالات پوچھے جا رہے تھے، وہ ان کے جواب میں ایک لفظ بھی نہیں کہہ رہا تھا۔ لیکن جب وہ ماسکو میں داخل ہوئے، وہ ایک دم ہوش میں آ گیا، اس نے بہ دقت اپنا سر اوپر اٹھایا اور رستوف کا، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ رستوف کو احساس ہوا کہ دلوخوف کے چہرے کے تاثرات کاملاً تبدیل ہو چکے ہیں اور وہاں ایک قسم کی نرمی اور غایت انبساط جھلک رہا ہے۔

''اچھے ہو؟ اب طبیعت کیسی ہے؟''

''اچھی نہیں! لیکن یہ بات اہم نہیں... میرے دوست،'' دلوخوف نے ہانپتے کانپتے کہا۔ ''ہم کہاں ہیں؟ میں جانتا ہوں... کہ ماسکو میں میری کوئی اہمیت نہیں۔ لیکن میں نے اسے مار ڈالا ہے، مار ڈالا ہے... وہ اس سے جانبر نہیں ہو سکے گی، جانبر نہیں ہو سکے گی...''

''کون؟'' رستوف نے پوچھا۔

''میری ماں، میری ماں۔ میری فرشتہ صفت ماں۔ میری پیاری، فرشتہ صفت ماں۔'' اور دلوخوف نے رستوف کا ہاتھ دبایا اور اس کے آنسو چھلکنے لگے۔

جب وہ قدرے پرسکون ہوگیا، اس نے رستوف کو بتایا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے اور اگر اسے معلوم ہوگیا کہ وہ مر رہا ہے، تو وہ اس صدمے سے جانبر نہیں ہوسکے گی۔ اس نے رستوف سے گڑگڑا کر کہا کہ وہ جائے اور اسے اس صدمے کے لیے تیار کرے۔

رستوف اس کی خواہش کی تکمیل کرنے کے لیے چلا گیا اور اسے یہ معلوم کر کے سخت حیرانی ہوئی کہ دلوخوف، جو اتنی بڑھکیں مارتا ہے اور دوسروں پر دھونس جماتا ہے، ماسکو میں اپنی بوڑھی ماں اور خمیدہ کمر بہن کے ساتھ رہتا ہے۔ شاید ہی کوئی بیٹا اپنی ماں سے اور کوئی بھائی بہن سے اتنا پیار کرتا ہوگا جتنا کہ وہ کرتا تھا۔

6

گزشتہ کچھ عرصے سے پیئر کی اپنی بیوی سے خلوت میں شاید ہی کبھی ملاقات ہوئی ہوگی۔ پیٹرزبرگ اور ماسکو، دونوں مقامات پر، ان کا مکان مسلسل مہمانوں سے آباد رہتا تھا۔ ڈوئیل کی رات وہ اپنی خواب گاہ میں جانے کے بجائے، جیسا کہ وہ اکثر کیا کرتا تھا، اپنے باپ کے کشادہ سٹڈی روم میں ٹھہرا رہا۔ دراصل یہ وہی کمرا تھا جس میں بوڑھے کاؤنٹ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی تھی۔

گزشتہ رات، جب اس کی روح پر اتنا کچھ بیتا تھا، خواہ کتنی ہی اذیت ناک رہی ہو، لیکن اب اسے اس سے بھی شدید تر اذیتوں کا تجربہ ہونے لگا۔ وہ صوفے پر لیٹ گیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا تا کہ اس کے ساتھ جو واردات گزری تھی، اسے بھلا سکے لیکن وہ ایسا نہ کرسکا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی، کوسوں دور رہی۔ جذبات، احساسات، خیالات اور یادداشتوں کا ایسا طوفانی ریلا اس کے ذہن میں در آیا کہ نیند تو نیند، وہ پلک تک نہ جھپکا سکا۔ اسے کسی پہلو قرار نہیں تھا اور وہ بار بار کروٹیں بدل رہا تھا تا آنکہ اس نے پلنگ سے جست لگائی اور تیز تیز ڈگ بھرتا کمرے کے چکر لگانے لگا۔

ایک لمحے کے دوران میں وہ اسے بعینہٖ ویسے ہی دکھائی دی جیسے وہ شادی کے ابتدائی ایام کے دوران میں ہوتی تھی: وہی برہنہ شانے، وہی بوجھل پلکیں اور مخمور و بے خود آنکھیں۔ لیکن ایکا ایکی اسے اس کے ساتھ دلوخوف کا خوبصورت، گستاخ اور سفاکانہ انداز سے تمسخر اڑاتا چہرہ، جیسا کہ اس نے ضیافت میں دیکھا تھا، نظر آیا اور پھر یہی چہرہ، جب وہ چکرایا اور برف پر گرا تھا، پیلا پڑ گیا تھا، کپکپانے لگا تھا اور اذیت میں مبتلا دکھائی دینے لگا تھا۔

''ہوا کیا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''میں نے اس کے یار کو قتل کردیا ہے۔ ہاں، اپنی بیوی کے یار کو قتل کردیا ہے۔ ہاں، یہی ہوا۔ اور کیوں؟ مجھ سے یہ حرکت سرزد کیوں ہوئی؟'' ''اس لیے کہ تم نے اس کے ساتھ شادی کی تھی،'' باطنی آواز نے جواب دیا۔

''لیکن اس میں میرا کیا قصور تھا؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''تمھارا قصور یہ تھا کہ تمھیں اس سے محبت تو تھی نہیں لیکن اس سے بیاہ رچانے چل پڑے۔ تم نے اسے بھی دھوکا دیا اور اپنے آپ کو بھی۔'' اور اسے وہ لمحہ واضح طور پر یاد آ گیا جب پرنس واسیلی کے ہاں سپر کے بعد اس نے وہ الفاظ، جنھیں زبان پر لانے میں اسے سخت دقت ہو رہی تھی، اگل دیے تھے: *Ja vous aime۔ ''یہ سارا بکھیڑا وہیں سے شروع ہوا تھا۔ مجھے اس وقت بھی محسوس ہوا تھا'' اس نے سوچا، ''بالکل محسوس ہوا تھا کہ یہ غلط ہے اور یہ کہ مجھے ایسا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اور انجام کار وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔'' اسے اپنا ہنی مون یاد آیا اور اس یاد پر اس کا چہرہ لال لال ہو گیا۔ پھر وہ واقعہ تو بھلائے نہیں بھلتا تھا۔ اس کی یاد اس کے ذہن میں یوں تازہ تھی جیسے یہ کل کی بات ہو لیکن یہ یاد اتنی کڑوی تھی کہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اس کی ہتک کر دی ہے اور وہ سخت شرمندہ ہو رہا ہے۔ ہوا یہ کہ شادی کے چند دن بعد وہ ایک روز دوپہر سے ذرا قبل ریشمی ڈریسنگ گاؤن پہنے اپنے بیڈروم سے سٹڈی روم میں آیا۔ یہاں اس کی مڈھ بھیڑ اپنے ہیڈ سٹیوارڈ سے ہو گئی۔ اس شخص نے نیازمندانہ انداز سے جھک کر اسے سلام کیا، اس کے چہرے اور ڈریسنگ گاؤن پر نظر ڈالی اور اپنے لبوں پر یوں خفیف سی مسکراہٹ لایا جیسے وہ مؤدبانہ انداز سے اسے جتا رہا ہو: ''آپ کی بہجت و مسرت کے کیا کہنے! میں اس کی اصلیت خوب سمجھتا ہوں۔''

''لیکن کتنی ہی بار میں اس کی ذات پر فخر و ناز محسوس کرتا رہا!'' وہ سوچ رہا تھا۔ ''مجھے فخر تھا کہ اس کا حسن ملکوتی ہے، وہ جب محفلوں اور تقریبوں میں جاتی تھی اور وہاں جس قسم کے سلیقے اور موقع شناسی کا مظاہرہ کرتی تھی، میں اس پر ناز کرتا تھا۔ میرے جس مکان میں وہ سارے پیٹرزبرگ کو مدعو کیا کرتی تھی، وہ میرے لیے باعث صد افتخار تھا۔ پھر مجھے یہ گھمنڈ تھا کہ وہ اتنی حسین ہے لیکن اس تک دوسروں کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ یہ ہیں وہ چیزیں جن پر میں ڈون کی لیتا رہا ہوں! اس وقت میں سوچا کرتا تھا کہ میں اسے سمجھ نہیں سکا ہوں، جب بھی میں نے اس کے کردار اور چال چلن کے بارے میں سوچا، میں نے بارہا اپنے آپ کو یہی بتایا کہ 'قصور تمھارا اپنا ہے، تم اسے سمجھ ہی نہیں سکے ہو، اس کے چہرے مہرے پر جو دائمی سکون اور اطمینان جھلکتا تھا، میں سمجھ نہ سکا کہ ایسا کیوں ہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا وہ کسی بھی قسم کے شوق اور خواہش میں دلچسپی کیوں نہیں لیتی، حالانکہ یہ بالکل واضح تھا کہ اس سارے گورکھ دھندے کی کلید صرف ایک لفظ 'ہوس کاری' ہے: یہ عورت ہوس کار ہے۔ اب جب کہ یہ لفظ میرے منہ سے ادا ہو گیا ہے، سارا معاملہ روز روشن کی طرح عیاں ہو گیا ہے۔''

''اناطول[18] اس سے رقم ادھار لینے آیا کرتا تھا اور اس کے برہنہ شانوں پر بوسے ثبت کیا کرتا تھا۔ وہ اسے روپیہ پیسہ تو نہیں دیتی تھی لیکن چوما چاٹی پر معترض نہیں ہوتی تھی۔ اس کا باپ مذاق مذاق میں اس کا جذبہ، حسد بیدار کرنے کی کوشش کرتا اور وہ پرسکون تبسم کے ساتھ جواب دیتی: 'میں اتنی احمق نہیں کہ حسد کرنے لگوں۔' اور میرے متعلق کہتی: 'ان کا جو جی چاہے، کرتے رہیں۔' ایک مرتبہ میں نے اس سے پوچھا: 'تمھیں کوئی ایسی علامات محسوس

* میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

ہوئی ہیں، جن سے معلوم ہو کہ تم امید سے ہو۔' اس نے حقارت سے قہقہہ لگایا اور کہا: 'میں اتنی بیوقوف نہیں ہوں کہ بچوں کی تمنا کرنے لگوں اور رہا تمھارا بچہ، اس کی نوبت تو میں کبھی بھی نہیں آنے دوں گی۔'''

سوچتے سوچتے اسے یاد آیا کہ اس کی بیوی نہایت گھٹیا، عامیانہ اور ناشائستہ خیالات کا اظہار کرتی ہے۔ انتہائی اونچے اشرافی طبقے میں پرورش پانے کے باوجود بے ہودہ بازاری کلمات فطرتاً اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں۔ ''میں الو کی پٹھی نہیں ہوں... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا، آزما کر دیکھ لو... جاؤ، دفع ہو جاؤ۔'' وہ اس قسم کے کلمات اکثر کہتی۔ جوانوں اور بوڑھوں، مردوں اور عورتوں، وہ جس طرح سبھی کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی، اسے دیکھ کر پیئر کی سمجھ میں نہ آتا کہ آخر اسے اس عورت سے محبت کیوں نہیں ہے۔ ''نہیں، مجھے اس سے کبھی بھی محبت نہیں ہوئی،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''مجھے معلوم ہے کہ یہ عورت ہوس کار ہے،'' اس نے اپنی بات دہرائی۔ ''لیکن مجھ میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ میں اس کا اقرار کر سکتا۔''

''اور اب دلوخوف... وہ ادھر برف پر بیٹھا ہے اور زبردستی مسکرانے کی کوشش کر رہا ہے، اور شاید زندگی کی آخری سانسیں لے رہا ہے... میں نے اپنے کیے پر جو ندامت کا اظہار کیا، اس نے اس کا جواب بڑھک مار کر دیا۔''

پیئر ان لوگوں میں تھا جو ظاہری طور پر اس قسم کے کردار کے، جسے کمزور کہا جاتا ہے، مالک ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے مصائب کا دکھڑا سنانے کے لیے کسی رازدان کو تلاش نہیں کرتے، بلکہ تن تنہا ان سے نپٹنے کی سعی کرتے ہیں۔

''ہر معاملے میں وہی قصوروار ٹھہرتی ہے، صرف اسی کا دامن آلودہ نظر آتا ہے،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''لیکن ایسی باتوں کا فائدہ؟ میں نے کنوئیں میں چھلانگ لگائی ہی کیوں؟ اپنا دامن اس کے پلو سے باندھا ہی کیوں؟ میں نے اس سے یہ کہا ہی کیوں: 'Ja vous aime' حالانکہ یہ جھوٹ تھا بلکہ جھوٹ سے بھی بدتر۔ مجرم میں ہوں اور سب کچھ مجھے ہی جھیلنا ہوگا... یہ سب کچھ کیا؟ اپنے نام پر دھبا، اپنی زندگی کے رنج و محن؟ اونہہ، یہ سب لایعنی باتیں ہیں،'' اس نے سوچا۔ ''میری بدنامی اور بے عزتی — یہ سب باتیں روایتی ہیں، مجھ سے ان کا کیا تعلق؟

''لوئی شانزدھم[19] کا سر اس لیے قلم کر دیا گیا کیونکہ ان کا دعویٰ یہ تھا: 'یہ شخص بے حیا، بے شرم اور خطاکار ہے۔''' (پیئر کے ذہن میں خیال آیا۔) ''اور اپنے نقطۂ نظر سے وہ لوگ ٹھیک تھے۔ اسی طرح اپنے نقطۂ نظر سے وہ لوگ بھی ٹھیک تھے جنھوں نے اسے باقاعدہ ولی (سینٹ) تسلیم کیا اور اس کی خاطر شہادت کا جام نوش کر گئے۔ پھر غوبس پیئے[20] کا سر گلوٹین سے کاٹ دیا گیا کیونکہ وہ ظالم، جابر اور مستبد تھا۔ صحیح کون ہے اور غلط کون ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ لیکن جب تک آپ زندہ ہیں — زندہ رہیں۔ کل آپ مر جائیں گے، جس طرح ایک گھنٹہ پہلے میں مر سکتا تھا۔ جب ابد کے مقابلے میں آپ نے صرف ایک ثانیہ زندگی گزارنا ہے، پھر خواہ مخواہ تردد کرنے اور اپنے آپ کو ایذا پہنچانے کا فائدہ؟''

لیکن عین اس وقت جب وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس قسم کے خیالات نے اسے پرسکون بنا دیا ہے، ایکا ایکی اس کا

وہ ہیولا، جب وہ شد و مد سے اس کے سامنے اپنی منافقانہ محبت کا اقرار کر رہا تھا، اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے جسم کا سارا خون نچڑ کر اس کے قلب میں جمع ہو گیا ہے۔ اسے اٹھ کر کھڑے ہونا، ادھر ادھر چکر لگانا اور جو کچھ اس کے ہاتھ میں آیا، اسے توڑنا اور پرزے پرزے کرنا پڑا۔

''آخر میں نے اس سے یہ کہا ہی کیوں 'ja vous aime'؟'' وہ بار بار اپنے آپ سے یہ سوال کرتا رہا۔ اور جب یہ سوال دسویں مرتبہ دہرا چکا، مولیئر کا ایک جملہ اس کے ذہن میں وارد ہوا: ''آخر کس ولدالزنا نے اس سے یہ کہا تھا کہ وہ اس پنگے میں ہاتھ ڈالے؟'' اور وہ اپنے آپ پر ہنسنے لگا۔

رات کے دوران میں پیئر نے اپنے وردی پوش ملازم کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ پیٹرزبرگ جانے کے لیے رختِ سفر باندھ لے۔ جس مکان میں وہ رہتی تھی، اب اس میں رہنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا اور نہ اس کے ساتھ کسی قسم کی بول چال کی کوئی گنجائش تھی۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اگلے روز ہی روانہ ہو جائے گا اور جانے سے پہلے اس کے نام ایک خط، جس میں وہ اسے مطلع کر دے گا کہ اس نے اس سے مستقل علیحدگی کا فیصلہ کر لیا ہے، چھوڑ جائے گا۔

جب صبح کو پیئر کا وردی پوش ملازم اس کی کافی لے کر سٹڈی روم میں آیا، وہ صوفے پر سویا پڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کھلی کتاب تھی۔ اس نے آنکھیں کھول دیں اور کچھ دیر گھبرائی گھبرائی نظروں سے ادھر ادھر نگاہیں دوڑاتا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے۔

''کاؤنٹس پوچھ رہی ہیں کہ یوئر ایکسی لینسی گھر پر ہی ہیں؟'' ملازم نے کہا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ پیئر یہ فیصلہ کر پاتا کہ اس کا جواب کیا ہو گا، کاؤنٹس بنفس نفیس بڑی دل جمعی اور شاہانہ انداز سے ٹھمکتی کمرے کے اندر داخل ہو گئی۔ وہ سفید ساٹن کے ڈھیلے ڈھالے ڈریسنگ گاؤن میں، جس پر نقرئی بیل بوٹے کشیدہ کیے ہوئے تھے، ملبوس تھی۔ اس نے اپنے بال سیدھے سادے انداز سے سنوارے ہوئے تھے۔ (اس کے انتہائی خوبصورت سر کے ارد گرد دو بھاری بھاری مینڈھیاں سہرے کی طرح لپٹی ہوئی تھیں۔) ظاہری دل جمعی کے باوجود اس کی کشادہ مرمریں پیشانی پر قہر آلود لکیر تھی۔ اس نے کمال سکون اور تحمل کے ساتھ ملازم کی موجودگی میں لب کشائی سے احتراز کیا۔ اسے ڈوئیل کے بارے میں علم تھا اور وہ اسی کے متعلق گفتگو کرنے آئی تھی۔ تاہم جب تک ملازم نے کافی کی ٹرے میز پر نہ رکھ دی اور کمرے سے باہر نہ نکل گیا، وہ انتظار کرتی رہی۔

پیئر نے ڈرتے جھجکتے اسے چشمے کے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔ اس کی حالت اس خرگوش کی تھی جو شکاری کتوں کے گھیرے میں آ چکا ہو اور اپنے دشمنوں کی نگاہوں کے سامنے کان دبائے چپ چاپ پڑا ہو۔ اس نے اپنا مطالعہ جاری رکھنے کی کوشش کی۔ پھر اسے احساس ہوا کہ ایسا کرنا نہ تو ممکن ہے اور نہ قرینِ عقل۔ چنانچہ اس نے ڈرتے جھجکتے دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ وہ بیٹھی نہیں بلکہ حقارت آمیز انداز سے مسکراتی کھڑی رہی۔ وہ محض نوکر کے جانے کی منتظر تھی۔

''یہ کیا ہے؟ میں جاننا چاہتی ہوں کہ حضور کیا حرکات فرما رہے ہیں؟'' اس نے درشتی سے پوچھا۔

''میں؟... میں نے کیا...؟'' پیئر بڑبڑایا۔

''ہیرو بننے کی کوشش کر رہے تھے؟ خیر، مجھے جواب دو کہ یہ ڈوئیل چہ معنی وارد؟ تم ثابت کرنا چاہتے ہو؟ کیا۔ میں تم سے پوچھ رہی ہوں!''

پیئر نے بھاری بھرکم انداز سے صوفے پر کروٹ بدلی اور اپنا منہ کھولا لیکن اس سے کوئی جواب بن نہ پڑا۔

''اگر تم جواب نہیں دو گے، تو میں تمھیں بتائے دیتی ہوں،'' ہیلین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تم جو کچھ سنتے ہو، جھٹ اس پر ایمان لے آتے ہو۔ تمھیں بتایا گیا...'' وہ ہنس پڑی، ''کہ دلوخوف میرا amant* ہے۔'' اس نے یہ بات اپنے بے ہودہ بازاری لہجے سے فرانسیسی میں کہی۔ اس نے لفظ "amant" اسی بے نیازی اور لاپرواہی سے ادا کیا جس طرح کہ وہ کسی بھی دوسرے لفظ کو ادا کرتی تھی۔ ''اور تم نے اس بات کو صحیح مان لیا! تم نے اس سے ثابت کیا کیا ہے؟ ہونہہ، تم نے اس ڈوئیل سے کیا ثابت کیا ہے؟ یہی نا کہ تم الو کے پٹھے ہو، احمق ہو، گاؤدی ہو۔ لیکن تمھاری یہ صفات کوئی ڈھکی چھپی تو ہیں نہیں، ان سے ہرا ایرا غیرا واقف ہے! لیکن تمھاری اس حرکت کا نتیجہ کیا ہوگا؟ یہی نا کہ میں ماسکو والوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاؤں گی، وہ میرا مذاق اڑائیں گے، گھر گھر اس بات کا چرچا ہوگا کہ تم نے اتنی پی، اتنی پی کہ بدمست ہو گئے، اپنے آپے میں نہ رہے اور تمھیں معلوم ہی نہ ہو سکا کہ تم کر کیا رہے ہو، اور پھر یہی نا کہ تم نے ایک ایسے شخص کو للکارا جس سے تم بلاوجہ حسد کرنے لگے تھے۔'' ہیلین کا پارہ چڑھتا گیا اور اس کی آواز بلند سے بلند تر ہونے لگی۔ ''حالانکہ وہ ایک ایسا آدمی ہے جو ہر لحاظ سے تم سے برتر ہے...''

''اونہہ... اونہہ...'' پیئر غرایا۔ اس کی بھویں تن گئیں لیکن اس نے نہ تو اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ اپنی جگہ سے انچ برابر حرکت کی۔

''اور تم نے یہ کیوں یقین کر لیا کہ وہ میرا یار ہے؟ کیوں؟ محض اس لیے کہ مجھے اس کی صحبت پسند ہے؟ اگر تم چست چالاک ہوتے، تمھاری شخصیت پسندیدہ ہوتی، میں تمھاری صحبت کو ترجیح دیتی۔''

''مجھ سے کوئی بات نہ کرو... میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں...'' پیئر نے بھرائی ہوئی آواز سے سرگوشی کی۔

''میں کیوں بات نہ کروں؟ میں جو چاہوں، کہہ سکتی ہوں اور میں تمھیں صاف صاف بتائے دیتی ہوں کہ ایسی بیویاں، جن کے خاوند تم جیسے ہوں اور وہ amants نہ بنائیں، ڈھونڈے سے نہیں ملیں گی، لیکن میں نے ایسا نہیں کیا۔''

پیئر نے کچھ کہنا چاہا اور جب وہ اس کی جانب دیکھ رہا تھا، اس کی آنکھیں کچھ عجیب و غریب قسم کا پیغام دے رہی تھیں لیکن وہ اس پیغام کا مفہوم نہ سمجھ سکی۔ وہ دوبارہ لیٹ گیا۔ وہ اس وقت شدید جسمانی کرب میں مبتلا تھا۔ اسے اپنے سینے میں کھنچاؤ محسوس ہوا اور اس کے لیے سانس لینا ناممکن ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنے اس کرب کو ختم

* یار

کرنے کے لیے اسے کچھ کرنا ہوگا، لیکن جو کچھ وہ کرنا چاہتا تھا وہ بے حد بھیانک اور لرزہ خیز تھا۔

''بہتر ہے کہ ہم ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کرلیں،'' وہ گلوگیر لہجے سے بڑبڑایا۔

''علیحدگی؟ میری بلا سے، ہو جاؤ علیحدہ، مجھے کیا۔ لیکن ایک شرط پر، تمھیں مجھے ڈھیروں جائیداد دینا ہوگی،'' ہیلین نے کہا۔ ''علیحدگی! مجھے ڈرانا چاہتے ہو!''

پیئر نے صوفے سے جست لگائی اور لڑکھڑاتا ڈگمگاتا اس کی طرف بھاگا۔

''میں تمھیں جان سے مار ڈالوں گا!'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا اور ایسی قوت کے ساتھ، جس کا اسے علم ہی نہیں تھا کہ وہ اس کا مالک ہے، اس نے جھپٹ کر ایک میز کی مرمریں تختی اکھاڑی اور اسے فضا میں لہراتا ایک قدم اس کی طرف بڑھا۔

ہیلین کے چہرے پر مردنی چھا گئی، کاٹو تو جسم میں خون نہیں۔ اس کی چیخیں نکل گئیں اور وہ اچھل کر اس سے پرے ہٹ گئی۔ پیئر میں اپنے باپ کی فطرت ظاہر ہونے لگی۔ جنونی غیظ و غضب کا شدید جذبہ اس پر غالب آ گیا۔ اس نے سنگ مرمر کی تختی نیچے پھینک دی اور وہ کرچی کرچی ہوگئی۔ پیئر نے اپنے بازو پھیلائے اور ہیلین کو دبوچنے بے ہنگم انداز سے آگے کی جانب لپکا۔

''یہاں سے نکل جاؤ!'' اس نے ایسی ڈراؤنی آواز سے چلا کر کہا کہ سارے گھر میں اس کی گونج سنائی دی اور ہر شخص پر دہشت طاری ہوگئی۔

اگر ہیلین وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر نہ بھاگ جاتی، خدا ہی جانتا ہے کہ وہ کیا کر بیٹھتا۔

ایک ہفتے کے اندر اندر پیئر نے وسطی اور شمالی روس[21] میں واقع اپنی تمام جاگیروں کے، جو اس کی جائیداد کے نصف سے زائد حصے پر مشتمل تھیں، نظم و نسق کا مختار نامہ اپنی بیوی کے سپرد کر دیا اور خود اکیلا پیٹرز برگ روانہ ہوگیا۔

7

ہالڈ ہلز میں اوسٹرلٹس کی جنگ اور پرنس آندرے کی گم شدگی کی خبر پہنچے دو ماہ بیت چکے تھے۔ سفارت خانے کے ذریعے متعدد خطوط ارسال کیے گئے اور ہر قسم کی تحقیقات کی گئیں۔ لیکن ان تمام کارروائیوں کے باوجود نہ تو اس کی لاش دستیاب ہوئی اور نہ اسیران جنگ کی فہرست میں اس کا نام آیا۔ اس کے عزیز و اقارب کے لیے جو حقیقت سب سے زیادہ سوہان روح تھی، وہ یہ امکان تھا کہ اسے اس علاقے کے باشندوں نے اٹھا لیا ہوگا اور اب وہ اجنبیوں کے مابین تنہا پڑا ہوگا۔ پتا نہیں وہ زندگی کی آخری سانسیں گن رہا ہے یا صحت یاب ہو رہا ہے، تاہم یہ بات یقینی تھی کہ وہ اپنے متعلق کوئی اطلاع دینے سے قاصر ہے۔ اخبارات، جن کی وساطت سے معمر پرنس کو سب سے پہلے اوسٹرلٹس کے مقام پر شکست کا علم ہوا تھا، حسب معمول ادھوری اور گول مول خبریں چھاپ رہے تھے کہ روسی کس طرح زبردست جنگی کارنامے سرانجام دینے کے بعد پسپائی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے تھے اور ان کی یہ

پسپائی بڑے نظم و ضبط سے عمل میں آئی تھی۔ معمر پرنس اس سرکاری اطلاع سے سمجھ گیا کہ ہماری فوج پٹ چکی ہے۔ اوسٹرلٹس کے معرکے کے ایک ہفتہ بعد اسے کوتوزوف کا طویل خط موصول ہوا۔ اس کے بیٹے کے ساتھ جنگ میں جو کچھ بیتا تھا، اس خط میں اس کی تفصیل بیان کی گئی تھی۔

''آپ کا بیٹا'' کوتوزوف نے تحریر کیا تھا، ''ایک رجمنٹ کی قیادت کر رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھوں میں علم تھام رکھا تھا اور وہ میری نگاہوں کے سامنے سورماؤں کی طرح زمین پر گرا تھا۔ اس نے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا، وہ اس کے والد محترم اور مادر وطن کے شایان شان تھی۔ مجھے اور ساری فوج کو اس بات کا ملال ہے کہ ہمیں ابھی تک یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ زندہ ہے یا نہیں۔ میں اپنی بھی اور آپ کی بھی اس امید سے ڈھارس بندھاتا ہوں کہ آپ کا صاحب زادہ زندہ ہے، ورنہ اس کا نام ان افسروں میں، جو میدان جنگ میں پائے گئے اور جن کی فہرست عارضی صلح نامے کے تحت میرے سپرد کی گئی تھی، ضرور شامل ہوتا۔''

معمر پرنس کو یہ خط بوقت شام، جب وہ اپنے سٹڈی روم میں اکیلا تھا، ملا تھا۔ اگلی صبح وہ حسب معمول سیر کے لیے باہر نکلا، تاہم وہ اپنے سٹیوارڈ، باغبان یا میر تعمیرات میں سے کسی سے بھی بات کرنے پر آمادہ نہیں تھا اور اگرچہ اس کے چہرے پر حزن و ملال برس رہا تھا، اس نے کسی سے کچھ بھی نہ کہا۔

اور جب پرنس ماریا مقررہ وقت پر اس کی خدمت میں حاضر ہوئی، وہ خراد پر کام کر رہا تھا اور اس نے حسب معمول آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

''آہا، پرنس ماریا!'' اس نے اچانک چھینی نیچے پھینکتے ہوئے غیر فطری آواز سے کہا۔ (پہیہ اپنے ہی زور پر حرکت کرتا رہا۔ اس کی چرخ چوں کس طرح آہستہ آہستہ اختتام پذیر ہوئی، پرنس ماریا کو مدتوں یاد رہی کیونکہ اس کے بعد جو کچھ ظہور پذیر ہوا، وہ اس کے حافظے میں محفوظ رہ گیا تھا اور یوں ان دونوں چیزوں کے مابین تعلق قائم ہو گیا تھا۔)

جب وہ اس کے قریب پہنچی اور اسے اس کا چہرہ نظر آیا، اس کا دل ڈوب گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اس کے باپ کے چہرے پر نہ اداسی تھی اور نہ وہ مرجھایا ہوا تھا۔ وہاں بس غیظ و غضب جھلک رہا تھا اور جس انداز سے وہ کام کر رہا تھا، وہ غیر فطری تھا۔ اس نے جب اپنے باپ کی یہ کیفیت دیکھی، وہ سمجھ گئی کہ اس پر کوئی زبردست مصیبت نازل ہوا چاہتی ہے۔ یہ مصیبت اسے ریزہ ریزہ کر دے گی اور یہ اس کی زندگی کی بدترین مصیبت ہو گی۔ اس مصیبت کا اسے ابھی تک کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا، اس کا کوئی مداوا نہیں تھا اور یہ اس کی سمجھ سے بالاتر تھی۔۔۔ اور اس مصیبت کا تعلق ایک ایسے شخص کی، جس سے وہ محبت کرتی تھی، موت سے تھا۔

"mon pere!*" آندرے؟'' پرنس نے کہا۔ اگرچہ جسمانی اعتبار سے پرنس بونگی تھی اور رعنائی سے تہی دامن، لیکن اس کی گفتار میں جو غم و اندوہ اور خود فراموشی تھی، اس میں ایک ایسا حسن تھا جو مٹائے مٹ نہیں سکتا تھا۔ اس کا باپ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا، اس نے سسکی لی اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

* مائی فادر۔ ابا جان

''مجھے اطلاع موصول ہوئی ہے۔اس کا نام نہ ہلاک شدگان میں ہے اور نہ اسیروں میں...کوتوزوف نے لکھا ہے،'' اس کی اتنی تیکھی چیخ نکل گئی جیسے وہ اس طرح چلا کر اپنی بیٹی کو وہاں سے بھگانا چاہتا ہو،'' کہ وہ ہلاک ہو چکا ہے!''

پرنس کی نہ تو ہمت نے جواب دیا اور نہ اس کے ہوش وحواس زائل ہوئے۔اس کا رنگ پہلے ہی پیلا پڑ چکا تھا لیکن جب اس نے یہ الفاظ سنے،اس کے چہرے کی کایا پلٹ گئی اور اس کی خوبصورت اور منور آنکھوں سے نور کی شعاعیں پھوٹنے لگیں۔معلوم ہوتا تھا کہ شادمانی،ماورائے فطرت شادمانی،جو اس دنیائے دوں کی مسرتوں اور غموں سے الگ تھلگ کوئی چیز تھی،اس کے عظیم داخلی کرب پر حاوی ہو گئی ہے۔اپنے باپ کا جو خوف اس پر سوار رہتا تھا، وہ اس نے فراموش کر دیا۔وہ اس کے قریب گئی،اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا،اسے اپنے نزدیک کھینچا اور اپنا بازو اس کی دبلی پتلی،سوکھی مرجھائی گردن میں حمائل کر دیا۔

"mon pere"،"اس نے کہا۔'' آپ مجھ سے دور نہ ہٹیں،آئیں،ہم اکٹھے مل کر روتے ہیں۔''

''بدمعاش!لچے لفنگے!'' بوڑھے نے اپنا منہ پھیرتے ہوئے دھاڑتے ہوئے کہا۔''حرامزادے،فوج کا بیڑا غرق کر رہے ہیں!جوانوں کو موت کے گھاٹ اتر وا رہے ہیں!اور کیوں؟جاؤ،جاؤ اور لسا کو بتاؤ۔''

پرنس بے چارگی کے عالم میں بے اختیار اپنے باپ کے قریب ایک بازوؤں والی کرسی پر گر پڑی اور رونے لگی۔اسے اپنا بھائی عین مین اسی طرح نظر آ رہا تھا جس طرح وہ اس وقت دکھائی دے رہا تھا جب وہ اسے اور لسا کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔اس وقت اس کے انداز میں شفقت بھی تھی اور رعونت بھی۔پھر اس کے ذہن میں اس کی جو تصویر ابھری،وہ اس وقت کی تھی جب وہ اس کے گلے میں ایقونہ حمائل کر رہی تھی۔وہ خوش بھی ہو رہا تھا اور اس کے چہرے پر طنز بھی ہویدا تھی۔''کیا اسے اعتقاد کی دولت مل گئی تھی؟کیا اسے اپنی بے اعتقادی پر ندامت ہوئی تھی؟کیا اب وہ وہاں—ابدی امن اور برکتوں کی اقلیم میں—ہے؟'' وہ سوچ رہی تھی۔

"mon pere"،"مجھے بتائیں کہ یہ ہوا کیسے؟'' اس نے اشک بہاتے ہوئے پوچھا۔

''جاؤ،چلی جاؤ یہاں سے!وہ اس لڑائی میں،جس میں روس کے بہترین فرزند،روسی شان وشکوہ کے امین، موت کے منہ میں دھکیل دیے گئے،ہلاک ہوا۔پرنس ماریا،جاؤ،جاؤ اور لسا کو بتاؤ۔میں بعد میں آؤں گا۔''

جب پرنس ماریا اپنے باپ (کے کمرے) سے واپس آئی،کوچک پرنس اپنا کام لیے بیٹھی تھی۔اس نے نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھا۔اس کی آنکھوں میں وہ داخلی اطمینان اور مسرت،جو صرف حاملہ خواتین سے مخصوص ہوتی ہے،جھلک رہی تھی۔صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی نگاہیں پرنس ماریا کو نہیں دیکھ رہی بلکہ وہ اس کی اپنی ذات کے اندر،دور کہیں گہرائیوں میں،کسی مسرور اور پراسرار چیز کو،جو وہاں رونما ہو رہی تھی،دیکھ رہی تھیں۔

''ماری،'' اس نے کشیدہ کاری کے فریم سے پرے ہٹتے اور اپنی کمر پچھلی جانب جھکاتے ہوئے کہا۔''مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ۔''

اس نے پرنس ماریا کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے اپنے پیٹ پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھیں پرامید انداز سے مسکرا رہی تھیں، اس کا روئیں دار ہونٹ اوپر اٹھا اور بچوں کی معصوم مسکراہٹ سے آراستہ اوپر ہی اٹھا رہا۔

پرنس ماریا اس کے سامنے دوزانو ہوگئی اور اس نے اپنی بھاوج کے ڈریس کی تہوں میں اپنا منہ چھپا لیا۔

''وہیں — وہیں — تمھیں کچھ محسوس ہوا؟ مجھے کتنا عجیب محسوس ہوتا ہے! اور ماری، تمھیں معلوم ہے کہ میں اس سے بے پناہ محبت کروں گی،'' لِسا نے کہا اور وہ ایسی نگاہوں سے، جن میں مسرت چھلک رہی تھی، اپنی نند کو دیکھنے لگی۔

پرنس ماریا اپنا سر اوپر نہ اٹھا سکی۔ وہ رو رہی تھی۔

''ماشا، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں... بس کچھ اداسی محسوس ہو رہی ہے... آندرے کے بارے میں اداس تھی،'' اس نے اپنی بھاوج کے گھٹنوں پر اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔

صبح کے دوران میں پرنس ماریا نے متعدد مرتبہ اپنی بھاوج کو (بری خبر سننے کے لیے) تیار کرنے کی سعی کی لیکن ہر بار اس کے آنسو رواں ہوگئے۔ اگرچہ کوچک پرنس عام طور پر اپنے گرد و پیش کی اشیا پر کوئی خاص توجہ نہیں دیتی تھی، ان آنسوؤں سے، جن کی وہ کوئی توجیہہ کرنے سے قاصر تھی، اس کے دل پر خوف بیٹھنے لگا۔ اس نے زبان سے تو کچھ نہ کہا لیکن بے چینی اور اضطراب کے عالم میں وہ یوں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگی جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔ ڈنر سے قبل، معمر پرنس، جس سے وہ سدا خوف کھاتی تھی، اس کے کمرے میں آیا۔ آج وہ خاص طور پر مضطرب اور چڑچڑا نظر آ رہا تھا۔ تاہم وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ کوچک پرنس نے پرنس ماریا پر نگاہ ڈالی اور پھر کچھ دیر بیٹھی سوچتی رہی۔ اس کے چہرے پر داخلی انہماک، جو صرف حاملہ خواتین کا خاصہ ہوتا ہے، دکھائی دے رہا تھا۔ اور پھر وہ اچانک رونے لگی۔

''آندرے کی کوئی خبر آئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں۔ تمھیں معلوم ہے کہ ابھی کوئی زیادہ وقت تو گزرا نہیں، اتنی جلدی خبر کیسے آسکتی ہے؟ تاہم mon pere بہت فکر مند ہیں اور مجھے خوف محسوس ہو رہا ہے۔''

''گویا خبر وبر کچھ نہیں؟''

''کچھ نہیں،'' پرنس ماریا نے کہا۔ اس کی منور آنکھیں پرعزم انداز سے بھاوج کو دیکھ رہی تھیں۔

وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ اپنی بھاوج کو کچھ نہیں بتائے گی اور اس نے اپنے باپ کو بھی منا لیا تھا کہ جب تک زچگی، جو چند دنوں میں متوقع تھی، نہیں ہو جاتی، وہ اس خوف ناک خبر کی اسے ہوا تک نہیں لگنے دے گی۔ پرنس ماریا اور معمر پرنس دونوں نے اپنے اپنے انداز سے اپنے غم کو چھپایا اور برداشت کیا۔ معمر پرنس نے کوئی امید باندھنے سے انکار کر دیا۔ وہ فیصلہ کر چکا تھا کہ پرنس آندرے ہلاک ہو چکا ہے اور اگرچہ اس نے اپنے بیٹے کا اتا پتا معلوم کرنے کی

غرض سے ایک سرکاری ملازم آسٹریا بھجوادیا تھا، اس نے اس کی یادگار تعمیر کرنے کے لیے ماسکو آرڈر دے دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ اپنے بیٹے کی نشانی کے طور پر وہ اس کی یہ یادگار اپنے باغیچے میں بنوائے گا۔ وہ ہر شخص کو بتا چکا تھا کہ اس کا بیٹا ہلاک ہو چکا ہے۔ اس نے اپنا طرزِ حیات کسی قسم کی تبدیلی لائے بغیر برقرار رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ اندر سے ٹوٹ چکا تھا اور اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ اس کا گھومنا پھرنا، کھانا پینا اور سونا، بھی کم ہوتا جا رہا تھا اور وہ روز بروز کمزور سے کمزور تر ہونے لگا۔ پرنس ماریا آس کی ڈوری سے چمٹی رہی۔ وہ اپنے بھائی کے لیے اسی طرح دعائیں کرتی تھی جیسے وہ بقیدِ حیات ہو اور وہ ہر دم اس کی واپسی کی خبر کی منتظر رہتی تھی۔

8

"Ma bonne amie*..." کوچک پرنس نے انیس مارچ کی صبح ناشتے کے بعد کہا۔ اس کا روئیں دار ہونٹ ہمیشہ کی طرح اوپر اٹھا ہوا تھا لیکن جب سے وہ دہشت ناک خبر موصول ہوئی تھی، اس گھر کی ہر مسکراہٹ، ہر لفظ، بلکہ قدموں کی ہر چاپ پر بھی غم واندوہ کی چھاپ لگ چکی تھی۔ اگرچہ کوچک پرنس سب سے نابلد تھی لیکن عمومی کیفیت سے وہ بھی متاثر ہو چکی تھی۔ چنانچہ اب اس کی مسکراہٹ کچھ ایسی تھی کہ آدمی کو خواہ مخواہ عمومی اداسی کی یاد آ جاتی تھی۔ "Ma bonne amie" مجھے اندیشہ ہے کہ آج کا، بقول فُو کا باورچن، "fruschtique"[22] راس نہیں آیا۔"

"مائی ڈارلنگ، کیا بات ہے؟ تمھارا رنگ زرد پڑ چکا ہے۔ تم واقعی بہت زرد رو ہو رہی ہو!" پرنس ماریا نے خوف زدہ ہو کر کہا اور اپنی بھاوج کی طرف بھاگی۔ اس کے پاؤں نرم وگداز لیکن چال بھاری اور بے ڈول تھی۔

"یوئر ایکسی لینسی، ہم ماریا باگدانو ونا کو نہ بلالیں؟" ایک خادمہ نے، جو کمرے میں موجود تھی، پوچھا۔

(ماریا باگدانو ونا دائی تھی، پڑوسی قصبے میں رہتی تھی اور گزشتہ دو ہفتے سے بالڈ ہلز آ جا رہی تھی۔)

"بالکل، بالکل۔" پرنس ماریا نے اپنی رضا مندی کا اظہار کر دیا۔ "شاید یہی بات ہے۔ میں خود جاتی ہوں۔ my ange**، حوصلہ کرو۔"

اس نے لسا کا بوسہ لیا اور کمرے سے باہر نکلنا چاہا۔

"اف نہیں! نہیں!" کوچک پرنس زود رو تو تھی ہی۔ اس پر مستزاد، اس کا چہرہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ اسے جو جسمانی مشقت بھگتنا تھی، وہ اس سے بچوں کی طرح خوف زدہ تھی۔ "نہیں، ماریا، نہیں، مجھے صرف بدہضمی کی شکایت ہے۔ ہاں، ماریا، کہہ دو کہ یہ صرف بدہضمی ہے۔ کہہ دو نا کہ یہ بدہضمی ہے!" اور کوچک پرنس رونے لگی اور بچوں کی طرح وہمی اور قدرے بناوٹی انداز سے اپنے ہاتھ مسلنے لگی۔

پرنس ماریا کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ وہ ماریا باگدانو ونا کو بلانے گئی تھی۔

---

* My dear love (جانِ من)۔

** My angel (میری جان)۔

"Oh mon Dieu! Mon Dieu!"* اسے اپنے پیچھے آوازیں سنائی دیں۔
دائی پہلے ہی ادھر آ رہی تھی۔ وہ اپنے ننھے منے اور گداز سفید ہاتھ یوں پرسکون انداز سے مسل رہی تھی جیسے وہ اپنی اہمیت جتلا رہی ہو۔

''ماریا باگدانوونا! میرا خیال ہے کہ آغاز ہو گیا ہے!'' پرنس ماریا نے کہا۔ خوف و دہشت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی تھیں۔

''اچھا! پرنس، خداوند کا شکر کرنا چاہیے،'' ماریا باگدانوونا نے اپنی چال میں کسی قسم کی تیزی پیدا کیے بغیر کہا۔ ''آپ جیسی نوجوان خواتین کو ایسی باتیں جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''لیکن ماسکو سے جس ڈاکٹر نے آنا تھا، وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا؟'' پرنس ماریا نے پوچھا۔ (لسا اور پرنس آندرے کی خواہشات کے پیشِ نظر انھوں نے کافی دن پہلے ہی ڈاکٹر منگوانے کے لیے ماسکو پیغام بھجوا دیا تھا اور وہ توقع کر رہے تھے کہ وہ اب آیا کہ اب آیا۔)

''پرنس، گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آپ فکر نہ کریں،'' ماریا باگدانوونا نے کہا۔ ''ہم ڈاکٹر کے بغیر ہی اچھا بھلا کام چلا لیں گے۔''

پانچ منٹ بعد پرنس ماریا کو اپنے کمرے میں کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے اس کے دروازے کے سامنے سے کوئی وزنی چیز اٹھا کر لے جائی جا رہی ہو۔ اس نے باہر جھانکا اور دیکھا کہ ملازمین پرنس آندرے کے سٹڈی روم سے بڑا چرمی صوفہ اٹھا کر بیڈ روم میں لے جا رہے ہیں۔ ان کے چہرے بجھے بجھے اور سنجیدہ تھے۔

پرنس ماریا اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ گھر میں جو مختلف اقسام کی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں، وہ انھیں بغور سن رہی تھی۔ وقتاً فوقتاً جب کوئی شخص ادھر سے گزرتا، وہ اپنا دروازہ کھولتی اور دیکھنے لگتی کہ راہداری میں کیا ہو رہا ہے۔ متعدد عورتیں، جو چپ چاپ بیڈ روم کے اندر جا رہی ہوتیں یا وہاں سے باہر نکل رہی ہوتیں، پرنس ماریا پر نظر ڈالتیں اور اپنی راہ لیتیں۔ وہ کوئی سوال پوچھنے کی جسارت نہ کرتی بلکہ دروازہ بند کرتی اور اپنے کمرے میں واپس چلی جاتی۔ کبھی وہ واپس آرام کرسی پر بیٹھ جاتی، کبھی کتابِ مناجات پڑھنے لگتی اور کبھی ایقونوں کی الماری کے سامنے دوزانو ہو جاتی۔ اسے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور دکھ بھی پہنچا کہ دعاؤں کی تلاوت کرنے کے باوجود اس کی گھبراہٹ میں کوئی تخفیف نہیں ہوئی تھی۔ اچانک دروازہ آہستگی سے کھلا اور اس کی بوڑھی نرس پراسکوویا ساواشینا، جو شاذ ہی اس کے کمرے میں آتی تھی کیونکہ معمر پرنس نے اس کی ممانعت کر رکھی تھی، اپنے سر پر رومال لپیٹے دہلیز پر دکھائی دی۔

''ماشینکا، میں یہ کچھ دیر تمھارے ساتھ بیٹھنے آئی ہوں،'' نرس نے کہا۔ ''اور جانِ من، یہ دیکھو، میں وہ شمعیں، جو پرنس کی شادی پر استعمال ہوئی تھیں، لائی ہوں۔ ہم یہ ان کے سینٹ کے ایقونے کے سامنے روشن کریں گے۔''

''اف، نرس، میں بہت خوش ہوں!''

---

* مائی گوڈ (خدایا!)

''مائی ڈارلنگ، خداوند رحیم ہے۔''

نرس نے سنہری شمعیں الیقونوں کے سامنے روشن کر دیں اور اپنی کڑھائی لے کر دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔ پرنسس ماریا نے ایک کتاب اٹھائی اور پڑھنے لگی۔ صرف اسی وقت جب انھیں آوازیں یا قدموں کی چاپ سنائی دیتی، وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھتیں۔ پرنسس کی نگاہیں متردد اور متجسس ہوتیں جب کہ نرس کی پراعتماد۔ اپنے کمرے میں بیٹھے پرنسس ماریا کو جن جذبات کا تجربہ ہو رہا تھا، وہ سارے گھر پر سایہ فگن تھے اور ہر شخص ان کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ لیکن اس قدیم توہم کے پیش نظر کہ جو عورت دردِزہ میں مبتلا ہو، جتنے کم لوگوں کو اس کی اذیت کا علم ہوگا، اسے اتنی ہی کم تکلیف ہوگی، ہر شخص یہ جھوٹ موٹ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے کچھ معلوم نہیں کہ کیا ہو رہا ہے۔ کسی کی زبان پر اس کا ذکر نہ آیا۔ پرنس کے گھر میں ویسے ہی جو ہر دم متانت اور سنجیدگی چھائی رہتی تھی، وہ تو تھی ہی، اس کے علاوہ یہ واضح کیفیت بھی فضا میں محسوس کی جاسکتی تھی کہ سب کو ایک ہی قسم کی تشویش لاحق ہے، سب کے قلوب نرم و گداز ہوگئے ہیں اور سب اس امر سے آگاہ ہیں کہ اس لمحے کوئی عظیم اور ناقابل فہم چیز تکمیل کے مراحل طے کر رہی ہے۔

خادماؤں کے کمرے میں کسی قسم کی ہنسی کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ملازمین کے کمرے میں بھی لوگ منتظر، خاموش اور چوکس بیٹھے تھے۔ نوکروں چاکروں کے مکانوں میں مشعلیں اور موم بتیاں جل رہی تھیں اور ایک شخص بھی سویا نہیں تھا۔ معمر پرنس زور زور سے اپنی ایڑیاں فرش پر پٹختا سٹڈی روم میں ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔ اس نے تیخون کو ماریا بابا گدانو ونا کے پاس بھیجا۔

''اس سے صرف اتنا کہنا: 'مجھے پرنس نے دریافت کرنے بھیجا ہے۔' اور وہ جو بھی جواب دے، واپس آ کر مجھے بتانا۔''

''پرنس کو بتا دو کہ دردِزہ شروع ہو گیا ہے،'' ماریا بابا گدانو ونا نے پیغام بر پر معنی خیز انداز سے نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

تیخون واپس چلا گیا اور اس نے پرنس کو یہ اطلاع پہنچا دی۔

''بہت اچھا،'' پرنس نے کہا اور دروازہ بند کر لیا۔ اس کے بعد تیخون کو سٹڈی روم سے ہلکی سے ہلکی آواز بھی سنائی نہ دی۔

کچھ دیر بعد تیخون دوبارہ سٹڈی روم میں داخل ہوا اور بہانہ یہ بنایا کہ وہ موم بتیاں تراشنا چاہتا ہے۔ اس نے دیکھا کہ پرنس صوفے پر دراز ہے۔ جب اس نے غور سے اس پر نظر دوڑائی، اسے معلوم ہوا کہ پرنس کے چہرے پر زبردست فکر و تشویش کے آثار موجود ہیں۔ اس نے اپنے سر کو جھکا دیا، دبے پاؤں چلتا اس کے قریب پہنچا، اس کے کندھے پر بوسہ دیا اور موم بتیاں بجھائے یا یہ بتائے بغیر کہ وہ کیوں اندر آیا تھا، باہر نکل گیا۔

کارگہِ حیات کی انتہائی گمبھیر چیستاں اپنے جادے پر رواں دواں تھی۔ شام گزر گئی، رات آ گئی۔ ناقابل

ادراک کی موجودگی میں ''اب کیا ہوگا؟'' کے احساس میں کوئی تخفیف ہوئی نہ دلوں کا گداز کسی طور کم ہوا، بلکہ دونوں باتوں میں پہلے کی نسبت کچھ اضافہ ہی ہوا۔ کسی شخص کو بھی نیند نہ آئی۔

یہ مارچ کی ان راتوں میں سے ایک رات تھی جب زمستان اپنی تمام حشر سامانیوں کے ساتھ ایک بار پھر اپنی سیادت بحال کرنے پر تلا نظر آتا تھا۔ وہ اپنے چیختے چلاتے چنگھاڑتے طوفانوں کے آخری تھپیڑوں اور زبردست برف باری کی جلو میں حملہ آور ہو رہا تھا۔ کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے برسرپیکار ہے۔ ماسکو سے جس جرمن ڈاکٹر نے آنا تھا، اس کی آمد ہر آن متوقع تھی۔ جن گھوڑوں کو اس کی گاڑی میں باری باری جتنا تھا، انھیں شاہراہ پر بھیج دیا گیا تھا۔ مختلف چوراہوں میں متعدد گھڑسوار بھی کھڑے کر دیے گئے تھے۔ ان کے پاس لالٹینیں تھیں۔ انھوں نے اندھیرے میں ڈاکٹر کو راستہ دکھانا تھا تاکہ وہ سڑک کے کھڈوں اور برف سے مستور پانی کے گڑھوں سے محفوظ رہ سکے۔

پرنسس ماریا مدتوں پہلے کتاب تیاگ چکی تھی اور اس کی روشن وتاباں آنکھیں نرس کے جھریوں زدہ چہرے پر، جس کی وہ ایک ایک لکیر سے بخوبی آشنا تھی، اس کے سفید بالوں کی لٹ پر، جو اس کے رومال سے نیچے لٹک آئی تھی اور اس کی ڈھیلی ڈھالی جلد پر، جو اس کی ٹھوڑی کے نیچے ڈھلک رہی تھی، جمی ہوئی تھیں۔

نرس ساواشینا، کڑھائی ہاتھ میں پکڑے، زیرلب کہانی سنا رہی تھی کہ مرحومہ پرنسس نے کس طرح کشی نیف کے مقام پر دائی کے بجائے ایک مولداوی[23] عورت کی مدد سے پرنسس ماریا کو جنم دیا تھا۔ وہ یہ کہانی اس سے قبل کوئی سو مرتبہ سنا چکی تھی لیکن اب وہ جو کچھ کہہ رہی تھی، اس کا نہ اسے خود کوئی علم ہو رہا تھا اور نہ اس کی آواز اسے سنائی دے رہی تھی۔

''خداوند رحیم ہے۔ ڈاکٹروں کی ضرورت نہیں ہے،'' اس نے کہا۔

اچانک تیز ہوا کا جھونکا آیا اور دریچے کے واحد چوکھٹے سے ٹکرانے لگا (سردیوں کے اختتام پر، جب کونپلیں دوبارہ چہچہانے لگتی تھیں، پرنس کے حکم پر کھڑکیوں کے دوہرے چوکھٹوں میں سے ایک ایک چوکھٹا اتار لیا جاتا تھا)۔ دریچے کی چٹخنی ڈھیلی ڈھالی تھی، وہ کھل گئی اور بوٹے دار ریشمی پردے پھڑپھڑانے لگے اور موم بتی بجھ گئی۔ پرنسس ماریا پر کپکپی طاری ہوگئی، نرس جو جراب بن رہی تھی، وہ اس نے نیچے رکھ دی، اٹھی، دریچے کی جانب گئی، باہر جھکی اور کھلے پٹ کو پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ سرد ہوا میں اس کے رومال کے کنارے اور اس کے سفید بالوں کی ڈھیلی لٹیں پھڑپھڑانے لگیں۔

''پرنسس، مائی ڈیئر، خیابان پر کسی شخص کی گاڑی آرہی ہے،'' اس نے پٹ پکڑتے اور اسے بند کیے بغیر کہا۔ ''لالٹینیں بھی ہیں۔ ضرور ڈاکٹر ہوں گے۔''

''اف، میرے خدایا! اف، شکر ہے خداوندا!'' پرنس ماریا نے کہا۔ ''مجھے جانا اور ان کا استقبال کرنا چاہیے۔ انھیں روسی نہیں آتی۔''

پرنس ماریا نے کندھوں پر شال لپیٹی اور ڈاکٹر سے ملنے باہر بھاگی۔ جب وہ پیش دالان میں سے گزر رہی تھی، اس نے کھڑکی میں سے باہر جھانکا۔ اسے ایک گاڑی اور لالٹینیں نظر آئیں۔ گاڑی دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ آگے بڑھی اور زینے کے قریب پہنچی۔ زینے کے جنگلے کے کھمبے پر چربی کی موم بتی چپکے چپکے آنسو بہا رہی تھی۔ وردی پوش ملازم فلپ ایک اور موم بتی تھامے سیڑھیوں کے درمیانی مچان پر مبہوت کھڑا تھا۔ اس سے بھی نیچے، جہاں زینہ گھومتا تھا، کسی اور شخص کے، جس نے بھاری بوٹ پہنے ہوئے تھے، قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ ایک آواز، جو پرنس ماریا کو جانی پہچانی محسوس ہوئی، کچھ کہہ رہی تھی۔

''خدا کا شکر ہے!'' آواز نے کہا۔ ''اور ابا جان؟''

''وہ سو گئے ہیں،'' بٹلر دیمیاں نے کہا۔ وہ زینے کے نیچے کھڑا تھا۔

پھر آواز نے کچھ مزید کہا اور دیمیاں نے اس کا جواب دیا۔ اب بھاری بوٹوں کی چاپ زینے کے اس موڑ سے، جو نگاہوں سے اوجھل تھا، سنائی دے رہی تھی۔ یہ شخص، جو کوئی بھی تھا، خاصی تیز رفتار سے اوپر آ رہا تھا۔

''یہ تو آندرے ہیں!'' پرنس ماریا نے سوچا۔ ''نہیں، یہ وہ نہیں ہو سکتے۔ یہ بالکل انہونی بات ہوگی!''

جس لمحے اس کے ذہن میں یہ خیال آیا، پرنس آندرے کا چہرہ اور شکل، زینے کے اس مچان پر جہاں وردی پوش ملازم موم بتی پکڑے کھڑا تھا، نظر آنے لگی۔ پرنس آندرے کے جسم پر سمور کا کوٹ تھا۔ کوٹ کے کالر کو برف نے ڈھانپ رکھا تھا۔ ''ہاں، یہ وہی ہیں لیکن مہین اور زرد رو۔'' عجیب و غریب قسم کی نرمی اور پریشانی نے اس کے چہرے کو بالکل تبدیل کر دیا تھا۔ وہ زینے کے اوپر آیا اور اپنی ہمشیرہ سے لپٹ گیا۔

''تمھیں میرا خط نہیں ملا؟'' اس نے پوچھا اور جواب کا انتظار کیے بغیر، جو واقعتاً اسے ملتا بھی نہ، کیونکہ پرنس میں گفتگو کرنے کی سکت نہیں رہ گئی تھی، وہ نیچے اتر گیا اور ڈاکٹر کے ساتھ، جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا (دونوں کی ملاقات آخری اڈے پر ہوئی تھی)، بہ عجلت دوبارہ اوپر آیا اور ایک بار پھر اپنی بہن سے لپٹ گیا۔

''ڈیئر ماشا! قسمت کے رنگ ڈھنگ بھی کتنے نرالے ہیں!'' اس نے کہا۔

اس نے کوٹ اور بوٹ اتار کر ایک طرف پھینکے اور کوچک پرنس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔

9

کوچک پرنس سر پر سفید ٹوپی پہنے تکیوں کے سہارے لیٹی ہوئی تھی۔ (اس کا دردِ زہ ابھی ابھی ختم ہوا تھا۔) اس کی سیاہ زلفیں لہراتی، بل کھاتی، اس کے رخساروں کے، جن پر سوجن تھی اور جو پسینے سے تر تھے، ارد گرد گھیرا ڈالے ہوئے تھیں۔ اس کا ننھا منا دل آویز گلابی دہن روئیں دار ہونٹ سمیت کھلا تھا اور وہ خوشی کے عالم میں مسکرا رہی تھی۔

پرنس آندرے کمرے میں داخل ہوا اور وہ اس صوفے کی، جس پر وہ دراز تھی، پائینتی کے قریب رک گیا اور اس کے روبرو کھڑا ہو گیا۔ اس کی جگمگاتی آنکھیں، جو طفلانہ اندیشوں اور جوش وخروش سے مملو تھیں، آندرے کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔ ''میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔ پھر مجھے اس اذیت میں سے کیوں گزرنا پڑ رہا ہے؟ میری مدد کرو!'' اس کی نگاہیں کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے اپنا خاوند نظر آ رہا تھا لیکن عین اس وقت اس کے سامنے اس کی موجودگی کیا معنی رکھتی تھی، وہ اس کی تفہیم کرنے سے قاصر تھی۔ پرنس آندرے مڑا، صوفے کی ایک جانب کھڑا ہوا اور اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔

''مائی ڈارلنگ!'' اس نے کہا۔ اس نے اس سے پہلے اس کے لیے یہ لفظ کبھی استعمال نہیں کیا تھا۔ ''خدا رحیم ہے...''

وہ متجسس نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی نظروں میں بچگانہ زجر وتوبیخ تھی۔

''مجھے امید تھی کہ تم میری مدد کرو گے لیکن مجھے یہ مدد نہیں ملی، نہیں ملی۔ تم سے بھی نہیں!'' اس کی نگاہیں کہہ رہی تھیں۔ وہ اس کی آمد پر حیران نہیں ہوئی تھی۔ اسے یہ اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ آ گیا ہے۔ اس کی آمد کا اس کی اذیت اور تسکین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ دردِ زہ پھر شروع ہو گیا اور ماریا بگدانونا نے پرنس آندرے کو مشورہ دیا کہ وہ کمرے سے باہر چلا جائے۔

ڈاکٹر اندر آ گیا۔ پرنس آندرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کی پرنسس ماریا سے دوبارہ مڈھ بھیڑ ہو گئی اور وہ اس کے پاس چلا گیا۔ وہ سرگوشیوں میں باتیں کرنے لگے لیکن بار بار خاموش ہو جاتے۔ وہ انتظار کر رہے تھے اور کان لگائے سن رہے تھے۔

''مائی ڈیئر، جائیں،'' پرنسس نے کہا۔

پرنس آندرے دوبارہ اپنی بیوی کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا اور ملحقہ کمرے میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ بیڈروم سے ایک عورت باہر نکلی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور اس نے جب پرنس آندرے کو دیکھا، تو بالکل گڑبڑا گئی۔ پرنس آندرے نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور کئی منٹ یونہی بیٹھا رہا۔ ملحقہ کمرے سے چیخنے چلانے اور کراہنے کی لاچار اور دل دوز حیوانی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، دروازے کے قریب پہنچا اور اسے کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ کوئی شخص اسے اندر سے بند کیے ہوئے تھا۔

''آپ اندر نہیں آ سکتے! نہیں آ سکتے!'' ادھر سے کوئی دہشت زدہ آواز میں کہہ رہا تھا۔

وہ کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ چیخیں بند ہو گئیں۔ کئی سیکنڈ گزر گئے۔ پھر ایکا ایکی بیڈروم سے دل خراش چیخ بلند ہوئی۔ ''یہ وہ نہیں ہو سکتی، وہ ایسی چیخ نہیں مار سکتی۔'' پرنس آندرے سرپٹ دروازے کی طرف بھاگا۔ چیخ اپنی موت آپ مر گئی اور ایک (نومولود) بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔

''یہ لوگ بچے کو وہاں کیوں لے گئے ہیں؟'' پرنس آندرے کو اس لمحے تعجب ہو رہا تھا۔ ''بچہ؟ کیسا بچہ... یا بچہ

پیدا ہوا ہے؟''

جب اسے اچانک اس رونے کی خوش کن معنویت کی سمجھ آئی، آنسوؤں سے اس کا گلا رندھ گیا۔ اس نے دونوں کہنیاں دریچے کی چوکھٹ پر ٹکائیں اور بچوں کی مانند بلکنے لگا۔

دروازہ کھلا۔ ڈاکٹر کمرے سے باہر آیا۔ اس نے کوٹ اتارا ہوا تھا اور قمیص کی آستینیں اوپر چڑھائی ہوئی تھیں۔ اس کی رنگت اڑی ہوئی تھی اور جبڑا کانپ رہا تھا۔ پرنس آندرے اس کی جانب بڑھا لیکن ڈاکٹر نے اس پر مضطربانہ نگاہ ڈالی اور ایک لفظ کہے بغیر آگے نکل گیا۔ ایک عورت دیوانہ وار بھاگتی باہر آئی اور پرنس آندرے کو دیکھ کر چوکھٹ پر ہی رک گئی۔ وہ ہچکچا رہی تھی۔ پرنس آندرے اپنی بیوی کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ انتقال کر چکی تھی۔ وہ بالکل اسی حالت میں، جس میں اس نے اسے چند منٹ قبل دیکھا تھا، لیٹی ہوئی تھی۔ اور اس امر کے باوجود کہ اس کی آنکھیں ایک مقام پر ٹھہر چکی تھیں اور اس کے رخساروں پر زردی کھنڈ گئی تھی لیکن روئیں دار بالائی ہونٹ سمیت اس کے ننھے سے دل آویز، شرمیلے اور بچگانہ چہرے پر کوئی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔

''میں تم سب سے محبت کرتی ہوں اور میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا اور یہ تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے؟'' دلکش، دل خراش، بے جان چہرہ کہہ رہا تھا۔

کمرے کے ایک کونے میں کوئی ننھی منی اور سرخ سرخ شے ماریا باگدانوونا کے لرزتے کانپتے ہاتھوں میں غرغش اور چیں چیں کی آوازیں بلند کر رہی تھی۔

❖

دو گھنٹے بعد پرنس آندرے دبے پاؤں اپنے باپ کے سٹڈی روم میں داخل ہوا۔ بوڑھے کو ہر بات کا پہلے ہی علم ہو چکا تھا۔ وہ دروازے کے نزدیک کھڑا تھا اور جونہی یہ وا ہوا، اس کے ضعیف اور بے لوچ بازو شکنجے کی طرح اپنے بیٹے کی گردن کے گرد لپٹ گئے اور ایک لفظ کہے بغیر وہ بچوں کی طرح سسکیاں لینے لگا۔

❖

تین روز بعد کوچک پرنس کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ پرنس آندرے آگے بڑھا اور تابوت کے پہلو میں کھڑا ہو گیا تاکہ وہ اسے آخری مرتبہ خدا حافظ کہہ سکے۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن تابوت میں بھی اس کا چہرہ جوں کا توں تھا۔ ''اف! یہ تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے؟'' وہ اب بھی یہی کہتا نظر آ رہا تھا۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ اس کی روح پارہ پارہ ہو گئی ہے اور یہ کہ اس سے ایک ایسا جرم سرزد ہوا ہے جس کی نہ وہ تصحیح کر سکتا ہے اور نہ جسے وہ فراموش کر سکتا ہے۔ وہ رو بھی نہیں سکتا تھا۔ بڑے میاں بھی آئے اور انھوں نے اس کے ننھے منے موی ہاتھ (اس کے

دونوں ہاتھ اس کے سینے پر ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے) پر بوسہ دیا۔ انھیں بھی اس کا چہرہ کہہ رہا تھا: ''اف! یہ تم نے میرے ساتھ کیا کر دیا ہے؟۔۔ اور کیوں؟'' اور اس چہرے کو دیکھ کر بڑے میاں بہت بھنائے اور واپس مڑ گئے۔

❦

مزید پانچ دن گزر گئے۔ پھر چھوٹے پرنس نکولائی آندریوچ کو بپتسمہ دینے کی رسم ادا کی گئی۔ جس کمبل میں وہ لپٹا ہوا تھا، دودھ پلانے والی انا نے اسے اپنی ٹھوڑی سے تھام رکھا تھا جب کہ پادری ہنس کے مرطوب پر سے شیر خوار کی سرخ آلود ہتھیلیوں اور تلووں پر مسح کرتا رہا۔

شیر خوار کا دینی باپ، جو اس کا دادا تھا، اس خوف سے لرزاں وترساں تھا کہ کہیں بچہ اس کے ہاتھوں سے نیچے نہ گر پڑے۔ تاہم وہ اسے ٹین کے اس شکستہ برتن کے، جس میں بپتسمے کا پانی گرایا جانا تھا، پاس لے گیا۔ وہاں اس نے اسے اس کی دینی ماں 'پرنسس ماریا' کے سپرد کر دیا۔ پرنس آندرے ملحقہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کا کلیجا اس فکر سے اس کے منہ سے باہر نکل رہا تھا کہ کہیں وہ اسے برتن میں ہی نہ ڈبو دیں۔ وہ رسم کے جلد از جلد ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب نرس بچے کو اس کے پاس لائی، اس کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ نظریں اوپر اٹھا کر دیکھنے لگا۔ جب نرس نے اسے اس نیک شگون کے متعلق بتایا کہ موم کا وہ ٹکڑا، جس میں شیر خوار کے بال[24] تھے، جب بپتسمے کے پانی کے برتن میں پھینکا گیا، وہ ڈوبا نہیں بلکہ تیرتا رہا، تو اس نے پسندیدگی کے اظہار کے طور پر اپنی گردن ہلا دی۔

10

دلوخوف اور بزدخوف کے مابین ڈوئیل میں رستوف نے جو کردار ادا کیا تھا، معمر کاؤنٹ کی مساعی سے اسے دبا دیا گیا۔ توقع تو اسے یہی تھی کہ اس کی تنزلی کر دی جائے گی اور اسے عام سپاہیوں میں بھیج دیا جائے گا لیکن ہوا یہ کہ اسے ماسکو کے گورنر جنرل کا ایجوٹنٹ مقرر کر دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے خاندان کے باقی افراد کے ساتھ گاؤں نہ جا سکا بلکہ اپنے نئے فرائض نبھانے کے سلسلے میں اسے ساری گرمیوں کے دوران میں ماسکو میں قیام کرنا پڑا۔ دلوخوف صحت یاب ہو گیا۔ بحالیٔ صحت کے زمانے میں رستوف کا اس کے ساتھ گہرا یارانہ ہو گیا۔ ناسازیٔ طبع کے دوران میں وہ اپنی والدہ کے، جو اس سے بے انتہا اور پر جوش محبت کرتی تھی، گھر بستر پر دراز رہا۔ بوڑھی ماریا ایوانوونا رستوف کو بھی پسند کرنے لگی کیونکہ وہ اس کے فدیا کا دوست تھا۔ وہ اکثر اپنے بیٹے کے متعلق اس سے باتیں کیا کرتی تھی۔

''ہاں، کاؤنٹ،'' وہ کہا کرتی، ''یہ دل کا اتنا صاف اور پاک ہے کہ ہمارے زمانے کے بدعنوان معاشرے کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ نیکی کی اب کسی کو پروا نہیں رہی۔ ہر شخص نیکی کو اپنے لیے باعثِ ننگ سمجھتا ہے۔ اب، کاؤنٹ،

مجھے بتاؤ کہ بزوخوف نے جو کچھ کیا، وہ ٹھیک تھا، اس کے شایان شان تھا؟ اور فدیا کی شرافت دیکھو۔ یہ اسے جی جان سے چاہتا تھا اور اب بھی اس کے خلاف ایک لفظ تک اپنی زبان پر نہیں لاتا۔ پیٹرز برگ میں انھوں نے جو شرارتیں کیں اور پولیس مین کے ساتھ جو حرکت کی، اس میں یہ بھی شامل تھے۔ تھے یا نہیں؟ لیکن بزوخوف کا بال بھی بیکا نہ ہوا جب کہ سارا نزلہ فدیا پر گرا۔ اسے کیا کچھ برداشت نہ کرنا پڑا؟ ٹھیک ہے کہ وہ بحال ہو چکا ہے۔ لیکن وہ اسے بحال کرنے سے انکار بھی کیسے کر سکتے تھے؟ میں سمجھتی ہوں کہ ادھر (میدان جنگ میں) مادر وطن کے اس جیسے دلیر اور جانباز سپوتوں کی تعداد کوئی خاص نہ تھی۔ اور اب؟۔ یہ ڈوئیل! کیا یہ لوگ ہر قسم کے جذبے اور عزت و آبرو کے احساس سے عاری ہو چکے ہیں؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اکلوتا بیٹا ہے، اسے ڈوئیل کے لیے للکارنا اور پھر اس طرح اسے سیدھا گولی کا نشانہ بنانا مردانگی ہے؟ یہ تو کوئی نیکی ہمارے کام آ گئی اور خداوند کا شکر ہے کہ اس نے ہم پر رحم فرمایا! پھر یہ سارا اللا گلا کیوں؟ آج کے زمانے میں کون ہے جس کے ڈھکے چھپے معاشقے نہیں چلتے؟ اگر اسے اتنا ہی حسد تھا، میری ناقص رائے کے مطابق، اسے اس کا فوراً اظہار کر دینا چاہیے تھا، پورے بارہ ماہ انتظار نہیں کرتے رہنا چاہیے تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فدیا اس کا مقروض ہے، اس لیے وہ اس کے ساتھ لڑنے سے انکار کر دے گا لیکن اس کے باوجود اس نے اسے للکارنے کی ہمت کی! کتنی گھٹیا، کتنی اوچھی حرکت ہے! میرے عزیز کاؤنٹ، میں جانتی ہوں کہ تم فدیا کو سمجھتے ہو اور یقین مانو، اس لیے میں تمھیں دل کی گہرائیوں سے پیار کرتی ہوں۔ بہت کم لوگ ہوں گے، جو اسے سمجھ سکے ہوں گے۔ وہ تو فرشتہ خصلت اور نہایت بلند پایہ انسان ہے...''

بحالی صحت کے زمانے میں خود دلوخوف رستوف سے جس قسم کی گفتگو کیا کرتا تھا، بہت کم لوگوں کو یہ توقع ہو سکتی تھی کہ وہ اس طرح کی باتیں کر سکتا ہے۔

''میں جانتا ہوں کہ لوگ مجھے بدقماش شخص سمجھتے ہیں،'' وہ کہا کرتا۔ ''وہ جو کچھ کہتے ہیں، شوق سے کہتے رہیں! مجھے جن لوگوں سے محبت ہے، ان کے علاوہ مجھے کسی اور شخص کی رتی برابر پروا نہیں۔ لیکن میں جس شخص سے پیار کرتا ہوں، اس کی خاطر اپنی جان بھی قربان کر سکتا ہوں۔ لیکن جہاں تک دوسروں کا تعلق ہے، اگر وہ میرے راستے کی دیوار بنے، میں ان کا گلا بھی گھونٹ سکتا ہوں۔ میری ایک پیاری، واجب التعظیم اور گرانقدر ماں ہے یا پھر دو تین دوست ہیں، جن میں تم بھی شامل ہو۔ رہے باقی لوگ، میں ان پر صرف اس حد تک توجہ دیتا ہوں کہ وہ میرے لیے کتنے کارآمد یا ضرررساں ہیں، اور ان میں سے بیشتر، خاص طور پر عورتیں، ضرررساں ہی ہیں۔ ہاں، میرے پیارے دوست،'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''میں ایسے مردوں سے، جو محبت کرتے ہیں، شریف النفس اور عالی دماغ ہیں، ملا ہوں لیکن مجھے ابھی تک کوئی ایسی عورت۔ وہ کاؤنٹس ہو یا باورچن۔ جو بکاؤ مال نہ ہو، نہیں ملی۔ مجھے عورت میں جس ملکوتی پاکیزگی اور وفاشعاری کی جستجو ہے، وہ آج تک دستیاب نہیں ہوئی۔ اگر مجھے کہیں ایسی عورت مل گئی، میں اس پر اپنی جان نثار کر دوں گا۔ لیکن وہ۔'' اور اس نے ہاتھ سے کچھ اس قسم کا اشارہ کیا جس سے نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا تھا۔ ''اور میری بات کا یقین کرو، اگر میں ابھی تک زندگی کو نگاہ بہ قدر

دیکھتا ہوں، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ مجھے اب بھی یہ اعتماد ہے کہ مجھے ایک نہ ایک روز ایسی قدوسی ہستی، جو میری تخلیق نو کردے گی، مجھے پاکیزہ بنادے گی اور مجھے آسمان تک اٹھادے گی، ضرور مل جائے گی۔ لیکن تم ان باتوں کو نہیں سمجھ سکو گے۔"

"اجی صاحب، میں بالکل سمجھ گیا ہوں،" رستوف نے، جو بری طرح اپنے نئے دوست کے زیرِ اثر آچکا تھا، کہا۔

خریف کے دنوں میں رستوف واپس ماسکو آ گئے۔ جاڑوں کے آغاز میں دینی سوف بھی لوٹ آیا اور ان کے ہاں ہی قیام پذیر ہو گیا۔ 1806 کے زمستان کے ابتدائی مہینے، جو نکولائی رستوف نے ماسکو میں گزارے، وہ اس کی اور اس کے خاندان کی زندگی کے انتہائی مسرت بخش اور مسرور کن ایام میں سے تھے۔ نکولائی خاصی بڑی تعداد میں نوعمر اور نوخیز لڑکے اپنے والدین کے گھر لاتا رہا۔ ویرا بیس سال کی خوش شکل دوشیزہ تھی۔ سولہ سالہ سونیا اپنی ذات میں نودمیدہ کلی کی تمام دلکش خصوصیات سموئے ہوئے تھی۔ نیم بالک اور نیم دوشیزہ نتاشا ایک لمحے بچگانہ مسخر گیاں کرتی تھی اور اگلے ہی لمحے مسحور کن دوشیزگی کا طلسم بکھیرنے لگتی تھی۔

جن گھروں میں نوخیز اور پُرکشش دوشیزائیں ہوتی ہیں، وہاں کی فضاؤں میں محبت کی خوشبوئیں سونگھی جاسکتی ہیں۔ رستوفوں کے گھر میں بھی اس کی موجودگی کا احساس ہوتا تھا اگرچہ کھلے بندوں اس کا کوئی خاص ذکر نہیں ہوتا تھا۔ ہر وہ نوجوان، جو رستوفوں کے گھر میں قدم رکھتا تھا اور ان زود اثر پذیر ہنستے مسکراتے چہروں (جولاریب اپنی ہی خوشیوں پر مسکراتے تھے) کو دیکھتا اور ان نوعمر دوشیزاؤں کو، جن کی امیدیں جوان تھیں اور جو ہمہ وقت ہر کام میں ہاتھ ڈالنے کے لیے پابہ رکاب رہتی تھیں، جس طرح بے ربط لیکن دوستانہ انداز سے چہچہاتی تھیں اور ساز و آہنگ کے فی البدیہہ جادو جگاتی تھیں، سنتا تھا، اس کا بھی دل مچل مچل جاتا تھا۔ اس ماحول میں جس طرح نوعروسانِ چمنِ رستوف محبت کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر ہونے اور مسرتوں اور شادمانیوں کی توقعات باندھنے کے لیے پیہم کمربستہ رہتے تھے، اسے بھی اسی قسم کے جذبات کا تجربہ ہونے لگتا تھا۔

جن نوجوانوں کو رستوف نے اپنے گھرانے سے متعارف کرایا، ان میں دلوخوف بھی تھا۔ نتاشا کے ماسوا گھر کا ہر فرد اسے بنظرِ تحسین دیکھتا تھا۔ اس کے سلسلے میں وہ اپنے بھائی سے قریب قریب جھگڑ پڑی۔ اس کا اصرار تھا کہ وہ بدذات ہے اور اس نے بزخوف کے ساتھ جو ڈوئیل لڑی تھی، اس میں پیئر کا موقف صحیح اور دلوخوف کا غلط تھا۔ وہ یہ بھی کہتی تھی کہ یہ شخص اسے ایک آنکھ نہیں بھاتا، یہ کج سرشت اور کج فطرت ہے۔

"میرے سمجھنے کے لیے ہے ہی کیا؟" اس نے بالقصد ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گلا پھاڑ کر کہا۔ "وہ فاسق و فاجر اور پتھر دل ہے۔ اور تم جانتے ہو کہ میں تمھارے اس دینی سوف کو پسند کرتی ہوں۔ حالانکہ وہ بھی تماش

بین ہے اور تماش بینوں کی ساری حرکتیں کرتا ہے۔ پھر بھی میں اسے پسند کرتی ہوں۔ آیا خیال شریف میں؟ میں تمام باتیں خوب سمجھتی ہوں۔ صرف اتنی بات ہے کہ مجھے اپنا مافی الضمیر ادا کرنا نہیں آتا... یہ شخص جو کچھ بھی کرتا ہے، پہلے سے اچھی طرح سوچا سمجھا ہوتا ہے اور یہی بات مجھے پسند نہیں ہے۔ جہاں تک دینی سوف۔"

"اخ، دینی سوف کا مسئلہ کچھ اور ہے،" رستوف نے جواب دیا۔ اپنے ان الفاظ سے وہ بین السطور یہ جتانا چاہتا تھا کہ دلوخوف کے مقابلے میں دینی سوف کی حیثیت پرکاہ کے بھی برابر نہیں۔ "تمھیں یہ سمجھنا ہوگا کہ دلوخوف کتنا عظیم انسان ہے۔ اسے تب دیکھو جب وہ اپنی ماں کے پاس ہوتا ہے۔ کیا دل پایا ہے اس شخص نے!"

"خیر، میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتی لیکن اس شخص کی موجودگی میں مجھے بے کلی محسوس ہونے لگتی ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ وہ سونیا سے محبت کرنے لگا ہے؟"

"کیا بک بک کر رہی ہو..."

"مجھے اس بارے میں یقین ہے۔ تم خود دیکھ لوگے۔"

نتاشا کا قیافہ صحیح ثابت ہوا۔ دلوخوف، جو اصولاً خواتین کی صحبت کی پروا نہیں کرتا تھا، اس گھر میں بار بار آنے لگا۔ اور اس سوال کا کہ وہ کس کی خاطر آتا ہے (حالانکہ کوئی بھی اسے زبان پر نہ لاتا تھا)، بہت جلد جواب مل گیا۔ وہ سونیا کو دیکھنے آتا تھا۔ اور اگرچہ سونیا کو کبھی اقرار کا حوصلہ نہ ہوسکا، وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ وہ کیوں آتا ہے اور جب بھی وہ آتا تھا، اس کا چہرہ بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو جاتا تھا۔

دلوخوف اکثر رستوفوں کے ہاں کھانا کھایا کرتا تھا اور شہر کی جس تقریب میں وہ شریک ہوتے تھے، وہ وہاں جانا کبھی نہیں بھولتا تھا۔ ڈانسنگ ماسٹر فوگل "نوجوانوں کے لیے اجتماعی رقصوں" (بال) کا اہتمام کیا کرتا تھا۔ رستوف ان رقصوں میں ہمیشہ موجود ہوتے تھے۔ دلوخوف بھی ان میں جانے لگا۔ وہ سب کی نظروں کے سامنے سونیا کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتا تھا اور اسے کچھ اس انداز سے دیکھتا تھا کہ نہ صرف وہ اس کی نگاہوں کی تاب نہ لاسکتی اور شرم سے سرخ ہو جاتی، بلکہ جب معمر کاؤنٹس اور نتاشا بھی اس کی ان نگاہوں کو دیکھتیں، انھیں بھی شرمندگی کا احساس ہونے لگتا۔

صاف ظاہر تھا کہ یہ مضبوط و توانا اور اجنبی شخص اس سانولی سلونی اور طرح دار دوشیزہ کی، جو کسی اور کی محبت کا دم بھرتی تھی، زلفوں کا بری طرح اسیر ہو چکا تھا۔

رستوف کو دلوخوف اور سونیا کے مابین نئی بات نظر آئی، لیکن یہ نئے تعلقات کیا تھے، اس کے لیے ان کی نوعیت طے کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ "یہ ہمیشہ کسی نہ کسی کی محبت کا دم بھرتی رہتی ہیں،" اس نے نتاشا اور سونیا کے متعلق سوچتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ لیکن دلوخوف اور سونیا کی صحبت میں اسے جو سکون ملا کرتا تھا، اب نہیں ملتا تھا اور وہ پہلے کی نسبت گھر میں کم وقت گزارنے لگا۔

1806 کے پت جھڑ کے مہینوں میں ایک بار پھر ہر شخص کی زبان پر نپولین کے ساتھ جنگ[25] کا ذکر آنے لگا۔ گزشتہ سال کی نسبت اب لوگ جنگ کا تذکرہ زیادہ جوش و خروش سے کرتے تھے۔ فرمان جاری ہوگیا کہ ہر ہزار

اشخاص میں سے نہ صرف دس کو با قاعدہ فوج میں بلکہ مزید نو کو ملیشیا میں بھرتی کیا جائے گا۔ ہر جگہ نپولین کے لئے لیے جا رہے تھے اور ماسکو میں گفتگو کا واحد موضوع جنگ، جو سروں پر منڈلا رہی تھی، بن گئی تھی۔ جہاں تک رستوف گھرانے کا تعلق ہے، اسے ان جنگی تیاریوں میں صرف اتنی دلچسپی تھی کہ کسی طرح نکولشکا ماسکو میں رہ جائے لیکن وہ خود اس کا ذکر سننے کے لیے بھی تیار نہیں تھا۔ وہ صرف یہ انتظار کر رہا تھا کہ دینی سوف کی چھٹی ختم ہو اور وہ اس کے ساتھ کرسمس کے بعد دوبارہ اپنی رجمنٹ میں چلا جائے۔ بجائے اس کے کہ قریبی روانگی اس کے پاؤں کی زنجیر بنتی اور اس کے ولولوں پر اوس ڈالتی، اس نے الٹا مہمیز کا کام دیا اور وہ پہلے سے بڑھ چڑھ کر تفریحات کرنے لگا، وہ گھر کم کم آتا اور ضیافتوں، تقریبوں اور اجتماعی رقص کی محفلوں میں زیادہ جانے لگا۔

11

کرسمس کی تیسری تعطیل کے روز نکولائی نے گھر پر ہی کھانا کھایا حالانکہ گزشتہ کچھ عرصے سے اس نے ایسا شاذ ہی کیا تھا۔ یہ پر تکلف الوداعی ڈنر تھا کیونکہ اس نے اور دینی سوف نے تہوار روزِ دوازدہم[26] کے اگلے روز اپنی اپنی رجمنٹوں میں حاضری دینے کے لیے روانہ ہونا تھا۔ دلوخوف اور دینی سوف سمیت تقریباً بیس اشخاص موجود تھے۔

اگر چہ رستوفوں کے گھر میں محبت کا کھلے بندوں کوئی خاص ذکر نہیں ہوتا تھا لیکن ان تعطیلات کے دوران میں یہ جس طرح فضا میں رچی بسی تھی اور اس نے جس طرح ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، ایسا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ ''شادمانی اور مسرت کے لمحات سمیٹ لو،'' یہ کہہ رہی تھی۔ ''محبت کرو اور محبت کرواؤ! اس عالم ناپائیدار میں بس یہی چیز حقیقی ہے۔ باقی سب حماقت ہے۔ یہی ایک چیز ہے جس میں یہاں ہمیں دلچسپی ہے!''

ان تمام مقامات کا، جہاں اسے جانا چاہیے تھا، جہاں اسے مدعو کیا گیا تھا، چکر لگائے بغیر اور حسبِ معمول گھوڑوں کی دو جوڑیوں کا کچومر نکال دینے کے بعد نکولائی ڈنر سے ذرا قبل لوٹ آیا۔ جونہی وہ اندر داخل ہوا، اسے احساس ہوا کہ گھر کی فضا، جس میں محبت کی خوشبو بکھری رہتی تھی، کشیدگی سے مملو ہو چکی ہے۔ اسے یہ احساس بھی ہوا کہ حاضرین عجیب طرح کی بے کلی اور بے قراری محسوس کر رہے ہیں۔ سونیا، دلوخوف اور معمر کاؤنٹس خاص طور پر مضطرب اور پریشان تھے۔ نتاشا بھی قدرے گھبرا رہی تھی لیکن دوسروں کی نسبت ذرا کم۔ نکولائی سمجھ گیا کہ ڈنر سے قبل سونیا اور دلوخوف کے مابین لازماً کوئی وقوعہ پیش آیا ہوگا۔ یہاں اس کی جبلی موقع شناسی کام آئی اور ڈنر کے دوران میں وہ دونوں کے ساتھ بڑی حلیم الطبعی اور احتیاط سے پیش آتا رہا۔ اسی شام فوگل کے ہاں بال، جس کا وہ چھٹیوں کے دوران میں اپنے شاگردوں کے لیے اہتمام کیا کرتا تھا، منعقد ہونا تھا۔

''نکولینکا، تم فوگل کے ہاں آرہے ہو؟ ضرور آنا،'' نتاشا نے کہا۔ ''انھوں نے خاص طور پر تمھیں بلایا ہے۔ واسیلی دمتریچ (دینی سوف) بھی جائیں گے۔''

''چھوٹی کاؤنٹس کے حکم پر تو میں کنوئیں میں بھی چھلانگ لگانے کو تیار ہوں،'' دینی سوف نے مذاق مذاق

میں نتاشا کے نائٹ[27] کا منصب سنبھال لیا تھا۔ ''میں pas de chale[28] رقص کرنے کے لیے بالکل تیار ہوں۔''

''اگر مجھے وقت ملا،'' نکولائی نے جواب دیا۔ ''آرخاروف دعوت کا اہتمام کر رہے ہیں۔ میں نے حاضر ہونے کی ہامی بھر لی تھی۔ تمھارا کیا ارادہ ہے؟'' اس نے دلوخوف کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

جونہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، اسے اندازہ ہو گیا کہ اسے یہ سوال پوچھنا ہی نہیں چاہیے تھا۔

''شاید...'' دلوخوف نے سونیا کو سرد اور غضب ناک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ پھر خفگی سے اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ نکولائی کو بالکل اسی طرح، جس طرح اس نے ضیافت کے موقع پر پیئر کو کلب میں دیکھا تھا، دیکھنے لگا۔

''کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے،'' نکولائی نے سوچا اور اس کے قیافے کی یوں تصدیق ہو گئی کہ ڈنر کے معاً بعد دلوخوف رخصت ہو گیا۔ اس نے نتاشا کو اپنے پاس بلایا اور اس سے پوچھنے لگا کہ معاملہ کیا ہے۔

''میں تمھیں ہی ڈھونڈ رہی تھی،'' نتاشا نے اس کی طرف دوڑتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تمھیں بتایا بھی تھا لیکن تمھیں یقین ہی نہ آیا،'' اس نے بڑے طمطراق سے کہا۔ ''اس نے سونیا کو شادی کی تجویز پیش کی تھی۔''

اگرچہ حالیہ ایام کے دوران میں نکولائی نے سونیا کو شاذ ہی اپنے خیالات کا مرکز بنایا تھا، لیکن جب اس نے یہ بات سنی، اسے اپنی روح پر آرے چلتے محسوس ہوئے۔ بے جہیز یتیم لڑکی کے لیے دلوخوف مناسب اور بعض لحاظ سے نہایت شاندار بر تھا۔ اگر معمر کاؤنٹس اور اعلیٰ طبقے کے نقطۂ نظر سے دیکھا جاتا تو اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ اسے مسترد کرتی۔ چنانچہ نکولائی کا اولین ردِعمل یہی تھا اور اسے سونیا پر شدید غصہ آیا۔ وہ یہ کہا ہی چاہتا تھا: ''یہ تو بہت اچھی بات تھی۔ اسے بچگانہ وعدے وعید بھلا دینا چاہیے تھے اور اس کی تجویز قبول کر لینا چاہیے تھا۔'' لیکن اسے یہ بات کہنے کا موقع ہی نہ مل سکا کیونکہ نتاشا اپنی ہی ہانکے جا رہی تھی۔

''کیا تم سوچ سکتے ہو۔ کہ اس نے اسے ٹھکرا دیا، ٹکا سا جواب دے دیا!'' نتاشا نے کہا اور مختصر وقفے کے بعد اس نے مزید کہا: ''اس نے اسے بتا دیا ہے کہ وہ کسی اور سے پیار کرتی ہے۔''

''ہاں، میری سونیا یہی کر سکتی تھی اور کچھ نہیں!'' نکولائی نے سوچا۔

''اور اماں نے اس کے بہتیرے ترلے منتیں کیں لیکن وہ انکار ہی کرتی رہی۔ میں جانتی ہوں کہ جب وہ کسی بات کا تہیہ کر لیتی ہے، پھر وہ اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتی۔''

''اماں اسے مناتی رہی کہ وہ انکار نہ کرے؟'' نکولائی نے ملامت آمیز انداز سے کہا۔

''ہاں،'' نتاشا نے کہا۔ ''نکولائی، تم جانتے ہو۔ ناراض نہ ہونا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔ مجھے معلوم ہے، مجھے کیسے معلوم ہوا یہ صرف خداوند کو معلوم ہے، لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔''

''خیر، یہ ایک ایسی بات ہے جس کے متعلق تم کچھ نہیں جان سکتی ہو،'' نکولائی نے کہا۔ ''لیکن میں اس سے

بات کرنا چاہتا ہوں۔ سونیا کتنی اچھی ہے!'' اس نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔

''ہاں، وہ واقعی بہت اچھی ہے۔ میں اسے تمھارے پاس بھیج دیتی ہوں۔''

اور نتاشا نے اپنے بھائی کا بوسہ لیا اور وہاں سے رفو چکر ہوگئی۔

ایک منٹ بعد سونیا آ گئی۔ وہ سہمی سہمی، بدحواس اور خطا کار نظر آ رہی تھی۔ نکولائی اس کے پاس گیا اور اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ جب سے وہ واپس آیا تھا، دونوں کی تنہائی میں یہ پہلی ملاقات تھی اور پہلی بار انھوں نے ایک دوسرے کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کیں۔

''سونی،'' وہ اس سے مخاطب ہوا۔ ابتداً وہ خاصا جھینپ رہا تھا، لیکن جوں جوں اس کی زبان کھلتی گئی، توں توں اس کا حوصلہ بڑھتا چلا گیا۔ ''اگر تمھارا ارادہ ایک ایسے شخص کو، جو نہ صرف نہایت اچھا اور فائدے مند بر ہے۔ بلکہ وہ نہایت قابل تعریف اور عالی منش انسان ہے... اور میرا دوست۔''

سونیا نے اسے ٹوک دیا۔ وہ اسے اندیشہ ناک اور ملتجیانہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ''نکولس، مجھ سے کہیں وہ بات نہ کہہ دینا،'' اس نے کہا۔

''لیکن مجھے کہنا ہی ہوگا۔ ممکن ہے کہ یہ بات کہنے کا میرا حق نہ بنتا ہو لیکن بہتر یہی ہے کہ میں یہ بات کہہ ہی دوں۔ اگر تم اسے میری وجہ سے ٹھکرا رہی ہو، پھر مجھے تم سے سچی بات کہنا ہی ہوگی۔ مجھے یقین ہے کہ کسی دوسرے کی نسبت میں تم سے کہیں زیادہ محبت کرتا ہوں۔''

''میرے لیے اتنا ہی کافی ہے،'' سونیا نے کہا۔

''نہیں، میں کوئی ہزار مرتبہ گرفتارِ محبت ہو چکا ہوں اور آئندہ بھی ہوتا رہوں گا۔ لیکن جو یگانگت، اعتماد اور محبت تمھارے متعلق محسوس کرتا ہوں، کسی اور کے متعلق محسوس نہیں کرتا۔ پھر میں جوان ہوں۔ اماں کو یہ بات پسند نہیں۔ خیر، میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ میں کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم دلوخوف کی پیشکش پر غور کرو،'' اس نے کہا۔ اسے اپنے دوست کا نام زبان پر لاتے بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی۔

''مجھ سے ایسی باتیں مت کہو۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تم سے بھائیوں کی طرح پیار کرتی ہوں اور ہمیشہ کرتی رہوں گی۔ اور مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔''

''تم فرشتہ ہو۔ میں تمھارے لائق نہیں ہوں۔ لیکن مجھے ہمیشہ یہی دھڑکا لگا رہتا ہے کہ میں تمھیں کہیں غلط راستے پر نہ ڈال دوں۔''

اور اس نے دوبارہ سونیا کا ہاتھ چوم لیا۔

12

نوگل جس قسم کے رقصوں کا اہتمام کرتا ہے، ان سے زیادہ پر لطف اور رنگا رنگ تقریب ماسکو میں کسی اور جگہ منعقد

نہیں ہوتی۔ یہ خیال ان ماؤں کا ہوتا جب وہ اپنے نوخیز لڑکے لڑکیوں کو قدم سے قدم ملا کر رقص، جس کا ہنر انھوں نے حال ہی میں سیکھا ہوتا، کرتے دیکھتیں۔ خود ان نوخیز لڑکے لڑکیوں کا بھی رقص کے دوران میں یہی خیال ہوتا۔ ناچتے ناچتے ان کے اجسام تھکاوٹ سے چور ہو جاتے اور یوں لگتا کہ وہ ابھی گرے، ابھی گرے لیکن ان کی طبیعت نہ بھرتی اور وہ رقص کرتے چلے جاتے۔ وہ مرد اور خواتین، جن کا شباب پھٹا پڑتا، جو آتی تو سرپرستی کے جذبے کے تحت تھیں لیکن جب وہ بھی لطف و مسرت سے سرشار ہونے لگتیں، پھر وہ بھی اسی قسم کی آرا کا اظہار کرنے لگتیں۔

اس سال اجتماعی رقص کی ان محافل کی بدولت دو رشتے طے ہو گئے۔ گورچاکوف خاندان کی دو پرنسسوں کو یہیں بر ملے اور بعد میں انھیں سے ان کی شادیاں ہوئیں۔ یوں رقص کی ان محفلوں کو مزید شہرت حاصل ہو گئی۔ اس قسم کی دوسری محافل سے جو چیز ان محافل کو ممتاز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ ایک تو یہاں کوئی میزبان، نہ مرد نہ عورت، نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے نیک طینت فوگل کی موجودگی تھی۔ وہ مہمانوں سے ٹکٹ وصول کرنے کے دوران میں بھنبھیری کی طرح ادھر ادھر بھاگا پھرتا اور اپنے فن کے اصولوں کے مطابق کسی کو جھک کر سلام کرتا اور کسی کے ساتھ رگڑ کھا جاتا۔ ان محافل کی ایک اور خصوصیت یہ تھی کہ یہاں صرف وہی لوگ، جو واقعی رقص کرنا اور اس سے لطف اندوز ہونا چاہتے تھے، آتے تھے۔ ان لوگوں میں تیرہ تیرہ چودہ چودہ سالہ الھڑ دوشیزائیں، جنھوں نے زندگی میں اولیں بار لمبا ڈریس پہنا ہوتا تھا، خاص طور پر شامل ہوتی تھیں۔ ان کی مسکراہٹوں میں سرمستی اور آنکھوں میں جگمگاہٹ ہوتی۔ چند ایک کو چھوڑ کر وہ سبھی حسین و جمیل ہوتیں یا حسین و جمیل نظر آتیں۔ بعض اوقات بہترین شاگرد، جن میں نتاشا، جو غیر معمولی طور پر سجیلی اور طرح دار تھی اور بہترین میں سے بھی بہترین تھی، شامل ہوتی، رقص شال (pas de chale) بھی کرتے لیکن سال کی اس آخری محفل میں صرف فرانسیسی رقص ecossaise[29]، انگریزی رقص anglaise اور پولستانی رقص مازورکا (mazurka) کا، جس کا ابھی ابھی رواج شروع ہوا تھا، مظاہرہ کیا گیا۔ فوگل نے بزخوف کے محل نما مکان میں ایک بال روم مستعار لے لیا تھا اور جیسا کہ ہر شخص نے کہا، رقص کی یہ محفل انتہائی کامیاب رہی۔ وہاں درجنوں خوش شکل دوشیزائیں تھیں اور رستوفوں کی لڑکیاں حسین ترین دوشیزاؤں میں سے تھیں۔ اس روز مسرت و شادمانی ان دونوں کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اسی روز سونیا کو دلوخوف نے شادی کا پیغام دیا تھا۔ وہ اس نے ٹھکرا دیا تھا۔ پھر اس کی نکولائی سے باتیں ہوئی تھیں۔ ان تمام چیزوں نے اس پر سرور و وجد کی وہ کیفیت طاری کر دی کہ وہ اپنے کمرے میں کدکڑے لگاتی پھری اور خادمہ کو اس کی مینڈھیاں بنانے میں سخت دقت پیش آئی۔ اب یہاں رقص کی محفل میں اضطراری مسرت و انبساط نے اس کے چہرے کو درخشاں و تابندہ بنا دیا تھا۔ نتاشا، جس نے زندگی میں اولین بار لمبا ڈریس پہنا تھا اور رقص کی حقیقی اور جیتی جاگتی محفل میں شریک ہوئی تھی، اس سے بھی زیادہ خوش تھی۔ دونوں لڑکیاں سفید ململ کے ڈریسوں میں، جن پر گلابی ربن آویزاں تھے، ملبوس تھیں۔

نتاشا نے جونہی بال روم کے اندر قدم رکھا، وہ محبت میں مخمور ہو گئی۔ وہ کسی فرد واحد پر فدا نہیں ہو رہی تھی بلکہ اسے ہر کس و ناکس پر پیار آ رہا تھا۔ جس شخص پر بھی اس کی نگاہ پڑتی، وقتی طور پر وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو جاتی۔

''اف، یہ سماں، یہ ماحول، کتنا خوبصورت، کتنا دلکش ہے!'' وہ بار بار دوڑتی سونیا کے پاس جاتی اور اس سے کہتی رہی۔

نکولائی اور دینی سوف ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے اور رقص کرنے والوں کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے ان پر بڑی کرم فرمائی کر رہے ہوں۔

''وہ کتنی خوبصورت ہے۔ ایک روز وہ سچ مچ حسن کی دیوی ہوگی!'' دینی سوف نے کہا۔

''کون؟''

''کاؤنٹس نتاشا،'' دینی سوف نے جواب دیا۔ ''کیا رقص کرتی ہے! کیا رعنائی ہے!'' اس نے توقف کے بعد مزید کہا۔

''کس کا ذکر کر رہے ہو؟''

''تمھاری ہمشیرہ کا، اور کس کا؟'' دینی سوف نے جھلا کر کہا۔

''رستوف نے کھیسیں نکال دیں۔

"Mon cher Comte"* کوتاہ قامت فوگل نے رستوف کی طرف آتے ہوئے کہا۔ ''تم میرے بہترین شاگردوں میں ہو، تمھیں ضرور رقص کرنا چاہیے! دیکھو، ایک سے ایک بڑھ کر حسینائیں ہیں!''

اس نے دینی سوف سے بھی یہی درخواست کی۔ وہ بھی اس کا پرانا شاگرد تھا۔

"Non, mon cher,"** دینی سوف نے کہا۔ ''میں دور سے کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے کو ترجیح دوں گا۔ آپ کو یاد نہیں کہ آپ کی تعلیمات کا مجھ پر خاک اثر نہیں ہوا تھا؟''

''ارے نہیں!'' فوگل نے جھٹ پٹ اسے یقین دلایا۔ ''بات صرف اتنی ہے کہ تم توجہ ذرا کم دیتے تھے، ورنہ تم میں ذہانت کی کمی نہیں تھی۔ ارے ہاں، تم واقعی ذہین تھے!''

آرکسٹرا نے مازورکا کی، جس کا نیا نیا رواج ہوا تھا، دھنیں چھیڑ دیں۔ نکولائی فوگل کو جواب نہیں دے سکتا تھا اور اس نے سونیا کو رقص کی دعوت دی۔ دینی سوف بزرگ خواتین کے پاس بیٹھ گیا۔ اپنی شمشیر پر جھکتے اور موسیقی کی دھن پر اپنا پاؤں تھرکاتے وہ انھیں دلچسپ قصے کہانیاں سنانے اور ہنسانے لگا لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس کی نگاہیں رقص کنندگان پر مرکوز تھیں۔ پہلی جوڑی فوگل اور نتاشا کی تھی (نتاشا اس کی بہترین طالبہ اور اس کے لیے سرمایۂ فخر و مباہات تھی)۔ فوگل نے اپنے ننھے منے پاؤں کی، جو ڈھیلے ڈھالے اور نرم جوتوں میں مستور تھے، پھرتیلی اور سبک رفتار سے پہلے نتاشا کے ساتھ، جو شرما بھی رہی تھیں لیکن پورے انہماک سے اپنے قدم اس کے قدموں سے ملا رہی تھی، تتلی کی طرح کمرے کا چکر لگایا۔ دینی سوف نے ایک لحظے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہوں

---

* مائی ڈیر کاؤنٹ

** نہیں، مائی ڈیر۔

سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ وہ اپنی شمشیر سے موسیقی کی لے کا اس طرح ساتھ دے رہا تھا کہ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اگر وہ رقص میں شریک نہیں تھا، تو اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اسے رقص کرنا آتا نہیں تھا، بلکہ اس لیے کہ اسے اس کی پروا نہیں تھی۔ ایک موقع پر، جب رقاص چلت پھرت سے خاص قسم کا خاکہ بنا رہے تھے، اس نے رستوف کو، جو اس کے قریب سے گزر رہا تھا، ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور کہا:

''یہ اصلی رقص نہیں ہے،'' اس نے کہا۔ ''یہ کس قسم کا پولستانی مازورکا ہے؟ لیکن وہ بہت دل آویز انداز سے رقص کر رہی ہے۔''

نکولائی جانتا تھا کہ دینی سوف جس ماہرانہ انداز سے مازورکا رقص کرتا تھا، اس کے لیے اس نے خود پولینڈ میں بڑی شہرت حاصل کرلی تھی۔ چنانچہ وہ بھاگم بھاگ نتاشا کے پاس پہنچا اور بولا:

''جاؤ اور دینی سوف کو اپنا ساتھی چنو۔ وہ صحیح معنوں میں رقاص ہے۔ اس کا رقص دیکھ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جاتی ہیں!''

جب نتاشا کی دوبارہ باری آئی، وہ اٹھی اور اپنے ننھے منے خوبصورت منقش جوتے پہنے شرماتے اور تیز تیز چلتے اکیلی اس کونے کی، جہاں دینی سوف بیٹھا تھا، جانب بڑھی۔ وہ جانتی تھی کہ ہر شخص کی نظریں اس پر لگی ہوئی ہیں اور منتظر ہیں کہ وہ کیا کرتی ہے۔ نکولائی نے دیکھا کہ وہ مسکرا رہے ہیں اور آپس میں تکرار کر رہے ہیں۔ دینی سوف انکار کر رہا تھا حالانکہ خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ وہ ان کی طرف بھاگا۔

''واسیلی دمترچ، مان بھی جائیں!'' نتاشا کہہ رہی تھی، ''مان بھی جائیں نا!''

''نہیں، کاؤنٹس، میری جان بخش دو!'' دینی سوف نے کہا۔

''واسکا، جانے بھی دو!'' نکولائی نے کہا۔

''میں پوری شام آپ کو گانا سناؤں گی،'' نتاشا نے وعدہ کیا۔

''یہ ننھی منی ساحرہ، مجھ سے جو جی چاہے، کرا سکتی ہے!'' دینی سوف نے اپنی شمشیر اتارتے ہوئے کہا۔

وہ کرسیوں کے عقب سے باہر آیا، مضبوطی سے اپنی رفیقہ کا بازو تھاما، سر کو جھکا دیا، ایک قدم آگے بڑھایا اور تال کا انتظار کرنے لگا۔ صرف اسی وقت جب وہ یا تو گھوڑے پر سوار ہوتا یا مازورکا رقص کر رہا ہوتا، لوگوں کا دھیان اس کی کوتاہ قامتی کی طرف نہ جاتا۔ صرف انھیں اوقات کے دوران میں وہ واقعی بانکا سجیلا، جو وہ خود کو سمجھتا تھا، نظر آتا۔ موسیقی کی صحیح تال پر اس نے شوخ اور فاتحانہ انداز سے اپنی رفیقہ کو ترچھی نگاہوں سے دیکھا۔ ایکا ایکی ایک پاؤں سے فرش پر ٹھوکر ماری اور یوں سیدھا بھاگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جو کرسیاں سامنے پڑی تھیں، ان پر اس کی نظر نہیں پڑی۔ پھر مہمیز کھنکھناتے اور اپنے پاؤں الگ الگ فرش پر جماتے وہ آناً فاناً رک گیا اور اپنی ایڑیوں پر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک سیکنڈ یونہی کھڑا رہا۔ پھر اپنے مہمیز کھنکھناتے اس نے دونوں پاؤں سے فرش پر ٹھوکر ماری، سرعت سے گھوما، تب اپنی بائیں ایڑی دائیں ایڑی سے ٹکرائی اور دوبارہ دائرے کی صورت میں گھوم گیا۔ نتاشا بھانپ گئی

کہ اس کے عزائم کیا ہیں۔ اس نے خود کو اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ وہ وہی کچھ کر رہی تھی، جو وہ کرا رہا تھا، لیکن وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ یہ سب کچھ کیسے کر رہی ہے۔ دینی سوف نے پہلے اسے دائیں ہاتھ سے لٹو کی طرح گھمایا اور پھر بائیں سے۔ ایک گھٹنے پر اس کے سامنے جھکا، اسے اپنے گرد ایک چکر دیا اور جست لگا کر یوں اضطراری طور پر آندھی کی طرح آگے بھاگا گویا کہ وہ دم لیے بغیر دوڑتے دوڑتے سارے کمرے پار کر جائے گا۔ پھر وہ ایک دم رکا اور اس نے ایک بار پھر بالکل انوکھے اور غیر متوقع انداز سے مختلف قسم کی چلت پھرت کا مظاہرہ کیا۔ اپنی رفیقہ کو اس کی کرسی کے سامنے مشاقی سے لٹو کی طرح گھمانے کے بعد اس نے اپنی ایڑیاں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور اس کے سامنے دوزانو ہو گیا۔ نتاشا نے اسے جھک کر سلام تک نہ کیا۔ وہ بوکھلائی ہوئی تھی اور یوں مسکرا مسکرا کر اسے گھور رہی تھی جیسے وہ اسے پہچان نہ رہی ہو۔

"یہ کیا تھا؟" اس نے ہانپتے ہوئے پوچھا۔

اگرچہ فوگل کی دانست میں یہ صحیح مازورکا نہیں تھا، پھر بھی دینی سوف کی مہارت نے سب کو مسحور کر دیا تھا۔ دوشیزائیں بار بار اس کے پاس آتیں اور اسے اپنی رفیقہ بنانے کی درخواست کرتیں۔ جہاں تک بزرگوں کا تعلق تھا، وہ پولینڈ اور بیتے ایام یاد کرنے لگے۔ مازورکا کے بعد دینی سوف کا چہرہ تمتمانے لگا اور وہ رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتا نتاشا کے قریب بیٹھ گیا۔ اس نے محفل کے اختتام تک نتاشا کا پیچھا نہ چھوڑا۔

13

بال کے بعد دو دن گزر گئے۔ اس دوران میں دلوخوف رستوف سے ملنے نہ خود اس کے گھر گیا اور جب رستوف اس کے اپنے گھر آیا، نہ وہ وہاں اسے ملا۔ تیسرے روز رستوف کو اس کا رقعہ ملا:

> میرا ابھی تمھارے گھر دوبارہ آنے کا ارادہ نہیں۔ اس کی وجہ سے تم خود بھی واقف ہو۔ میں اپنی رجمنٹ میں واپس جا رہا ہوں۔ آج رات میں اپنے دوستوں کو الوداعی سپر دے رہا ہوں۔۔۔ انگلش ہوٹل آ جانا۔

تھیٹر سے فارغ ہونے کے بعد، جہاں وہ اپنے خاندان اور دینی سوف کے ہمراہ گیا تھا، رستوف دس بجے سیدھا انگلش ہوٹل چلا گیا۔ اسے بلا تاخیر ہوٹل کے بہترین کمرے میں، جو دلوخوف نے شام کے لیے ریزرو کرا لیا تھا، پہنچا دیا گیا۔

تقریباً بیس اشخاص نے میز کے، جس کے سامنے دلوخوف دو موم بتیوں کے مابین بیٹھا ہوا تھا، اردگرد ہجوم کر رکھا تھا۔ میز پر طلائی سکوں اور نوٹوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ (یہاں قمار بازی ہو رہی تھی۔) دلوخوف پتے بانٹ رہا تھا اور جوئے کی رقم کا انچارج تھا۔ جب سے سونیا نے دلوخوف کا رشتہ ٹھکرایا تھا، رستوف کی اس سے ملاقات نہیں ہوئی

تھی اوراب جب کہ دونوں کی مڈھ بھیڑ ہونے والی تھی، اس کے تصور ہی سے اس پر گھبراہٹ طاری ہونے لگی تھی۔

جونہی رستوف کمرے میں داخل ہوا، دلوخوف کی آنکھوں میں چمک آ گئی اوراس نے سرد مہرانہ نگاہوں سے اسے یوں دیکھا جیسے وہ اس کا بہت دیر سے منتظر ہو۔

''ہماری کچھ دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی،'' اس نے کہا۔''تمھاری تشریف آوری کا شکریہ۔میں ذرا یہ پتے بانٹ لوں۔ پھر تمھارا یہ خادم ایلوشا اپنے لاؤلشکر سمیت تمھاری خدمت میں حاضر ہو جائے گا۔''

''میں ایک دو مرتبہ تمھارے گھر گیا تھا،'' رستوف نے کہا اوراس کی رنگت سرخ ہوگئی۔

دلوخوف نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔''جی چاہے تو تم بھی داؤ لگا دو،'' اس نے کہا۔

ایک مرتبہ رستوف کی دلوخوف سے کچھ عجیب قسم کی گفتگو ہوئی تھی، اب اسے وہ یاد آ گئی۔''صرف احمق ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو، وہ جوئے میں جیت جائیں گے،'' دلوخوف نے اس وقت کہا تھا۔

''یا تم میرے ساتھ کھیلنے سے گھبراتے ہو؟'' دلوخوف نے اس سے کچھ اس انداز سے پوچھا جیسے وہ جو کچھ سوچ رہا تھا، اس کا اسے الہام ہو گیا ہو۔ دلوخوف مسکرا رہا تھا۔

اس مسکراہٹ کے عقب میں رستوف کو اس کی وہی ذہنی کیفیت، جو اس نے اس میں کلب کی دعوت میں اور متعدد دیگر مواقع پر دیکھی تھی، نظر آئی۔ ایسے مواقع پر رستوف کو ہمیشہ یہی احساس ہوا تھا کہ دلوخوف روزمرہ کی زندگی کی یکسانیت سے اکتا چکا ہے اوراس سے دامن چھڑانے کے لیے اسے کوئی عجیب وغریب لیکن زیادہ تر سفاکانہ حرکت کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔

رستوف کو بے چینی ہونے لگی۔ وہ دماغ سوزی کرنے لگا کہ اسے کوئی ایسا لطیفہ یا پُرلطف جملہ یاد آ جائے جس سے وہ دلوخوف کے سوال کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکے لیکن وائے حسرت، اس کے ذہن میں کچھ بھی نہ آیا۔ اور یوں بھی اسے جواب دینے کا موقع ہی نہ مل سکا کیونکہ دلوخوف نے، جس کی نگاہیں سیدھی اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں، نہایت آہستہ آہستہ، ایک ایک لفظ چبا کر، تاکہ ہر کوئی اس کی بات سن سکے، اس سے کہا:

''تمھیں یاد ہے کہ ہم دونوں نے تاش کے متعلق باتیں کی تھیں... میں نے کہا تھا: 'صرف احمق ہی یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قسمت کی دیوی مہربان ہو تو وہ جوئے میں جیت جائیں گے۔ تاش میں آدمی کو محتاط ہو کر کھیلنا چاہیے۔' آج میں اس کی آزمائش کرنا چاہتا ہوں۔''

''تم قسمت آزمانا چاہتے ہو یا احتیاط؟'' رستوف نے پوچھا۔

''بہتر ہے کہ تم نہ ہی کھیلو،'' دلوخوف نے تاش کی نئی گڈی، جو اس نے ابھی ابھی کھولی تھی، اچھالتے ہوئے کہا۔''دوستو، رقم لگا دو۔''

دلوخوف نے رقم آگے دھکیل دی اور پتے بانٹنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ رستوف اس کے قریب بیٹھ گیا اور ابتدا کھیلنے سے محترز رہا۔ دلوخوف بار بار اس پر نظریں ڈالتا رہا۔

''خیر ہم کھیلتے کیوں نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

اور عجیب بات یہ ہوئی کہ رستوف کو اضطراری طور پر یہ محسوس ہوا کہ اسے پتا لے لینا چاہیے۔ چنانچہ اس نے پتا پکڑا، اس پر معمولی سی رقم لگائی اور کھیل میں شریک ہو گیا۔

''میرے پاس پیسے نہیں ہیں،'' اس نے کہا۔

''مجھے تم پر اعتبار ہے۔''

رستوف نے پتے پر پانچ روبل لگائے اور ہار گیا۔ اس نے مزید پانچ روبل لگائے اور وہ ان سے بھی ہاتھ دھو بیٹھا۔ دلوخوف مسلسل دس پتوں تک اسے مار دیتا یعنی ہراتا رہا۔

''دوستو!'' دلوخوف نے متعدد بار پتے بانٹنے کے بعد کہا۔ ''مہربانی فرمائیں اور اپنی اپنی رقم اپنے اپنے پتوں پر رکھ دیں، ورنہ مجھ سے حساب میں گڑبڑ ہو جائے گی۔''

ایک کھلاڑی نے کہا: ''مجھے امید ہے کہ تم مجھ پر اعتبار کر لو گے۔''

''ٹھیک ہے تم پر اعتبار کیا جا سکتا ہے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں گڑبڑ نہ ہو جائے۔ اس لیے میں یہ درخواست کروں گا کہ اپنی اپنی رقم اپنے اپنے پتوں پر رکھ دیں،'' دلوخوف نے کہا۔ ''تمھیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم بعد میں حساب کتاب کر لیں گے،'' اس نے رستوف کی طرف متوجہ ہو کر مزید کہا۔

کھیل جاری رہا۔ ایک بیرا مسلسل شیمپین لاتا رہا۔

رستوف ہر پتے پر مار کھاتا رہا اور آٹھ سو روبل کا مقروض ہو گیا۔ ابھی اس نے ایک پتے پر الفاظ ''آٹھ سو روبل'' لکھے ہی تھے کہ اس نے، جب اس کے گلاس میں شیمپین انڈیلی جا رہی تھی، اپنا ارادہ بدل دیا اور داؤں کی مقررہ رقم بیس روبل تحریر کرنا چاہی۔

''چلنے دو،'' دلوخوف نے کہا حالانکہ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ اس نے رستوف کی طرف دیکھا تک نہیں۔ ''جلد ہی تم یہ ساری رقم دوبارہ جیت جاؤ گے۔ میں دوسروں سے ہار رہا ہوں لیکن تم سے جیت رہا ہوں... یا تم مجھ سے خوف زدہ ہو؟'' اس نے پوچھا۔

رستوف نے اس کی بات پر عمل کیا۔ اس نے آٹھ سو روبل کی رقم داؤں پر لگی رہنے دی اور پان کا ستا، جس کا ایک کونا پھٹا ہوا تھا اور جسے اس نے فرش سے اٹھایا تھا، نیچے رکھ دیا۔ بعد میں اسے یہ پتا اچھی طرح یاد رہا۔ اس نے پان کا ستا، جس پر اس نے چاک کے شکستہ ٹکڑے کے ساتھ بالکل واضح انداز سے، "800" کے اعداد لکھے تھے، نیچے رکھتے ہوئے، نیم گرم شیمپین کا گلاس، جو کسی نے اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا، خالی کر دیا تھا۔ وہ دلوخوف کے الفاظ پر مسکرا رہا تھا اور اس نے ڈوبتے دل کے ساتھ دلوخوف کے ہاتھوں کی، جن میں تاش کی گڈی تھمی ہوئی تھی، جانب دیکھا تھا۔ وہ انتظار کر رہا تھا کہ پان کا ستا اب نکلا، کہ اب نکلا۔ رستوف کے پان کے اس ستے کے جیتنے یا ہارنے پر بہت کچھ منحصر تھا۔ گزشتہ اتوار کاؤنٹ الیا آندریچ نے اپنے بیٹے کو دو ہزار روبل دیے تھے اور اگرچہ اس

نے روپے پیسے کے بارے میں کبھی اپنی مشکلات کا ذکر نہیں کیا تھا، اس نے اسے صاف صاف بتادیا تھا کہ مئی سے پہلے وہ اسے مزید کچھ نہیں دے سکے گا۔ چنانچہ اس نے اس سے کہا تھا کہ اب کی بار وہ ذرا کفایت شعاری سے کام لے۔ نکولائی نے اسے بتا دیا تھا کہ یہ رقم اس کی ضروریات کے لیے کافی ہے اور اس نے پکا وعدہ کیا تھا کہ وہ قبل از بہار مزید کچھ نہیں مانگے گا۔ اب اس رقم میں سے صرف بارہ سو روبل باقی رہ گئے تھے۔ چنانچہ پان کے اس پتے کا مطلب یہ تھا کہ وہ نہ صرف سولہ سو روبل ہار رہا تھا بلکہ اسے اپنے وعدے سے بھی مکرنا پڑے گا۔ وہ ڈوبتے دل کے ساتھ دلوخوف کے ہاتھوں کی طرف دیکھنے اور سوچنے لگا۔ ''اگر مجھے وہ پتا مل گیا، میں اپنی ٹوپی اٹھاؤں گا اور گھر چلا جاؤں گا۔ وہاں میں دینی سوف، نتاشا اور سونیا کے ساتھ سپر کھاؤں گا اور یقیناً کبھی دوبارہ تاش کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔'' اسی لمحے اس کی آنکھوں کے سامنے اس کی گھریلو زندگی۔ پیتا کے ساتھ لطیفے بازی، سونیا کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں، نتاشا کے ساتھ دوگانے، اپنے باپ کے ساتھ دو پتی تاش[30] کی بازیاں، بلکہ پوارسکایا سٹریٹ پر واقع اپنے گھر کا آرام وہ بستر بھی۔ اتنے واضح اور دلکش انداز کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے ابھرنے لگی گویا کہ یہ کوئی ایسی نعمت تھی جو وہ مدتوں پہلے کھو چکا تھا اور جس کی اس نے اب تک قدر نہیں کی تھی۔ وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک فضول اتفاق، جس کی وجہ سے اگر سات کا پتا بائیں کی بجائے دائیں جانب گر پڑے، اسے اس مسرت سے، جو اس نے ابھی ابھی دریافت کی تھی، جس کا ابھی ابھی اس پر انکشاف ہوا تھا، محروم کر سکتا ہے اور فلاکت و نکبت کے عمیق پاتال میں، جس سے وہ ابھی تک ناآشنا و نابلد تھا، دھکیل سکتا ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا، پھر بھی وہ دہشت زدہ دل کے ساتھ دلوخوف کے ہاتھوں کی حرکات کا جائزہ لے رہا اور انتظار کر رہا تھا۔ ان بڑی بڑی ہڈیوں والے سرخ ہاتھوں نے، جن کی روئیں دار کلائیاں قمیص کے کفوں (cuffs) کے پیچھے نظر آرہی تھیں، پتوں کی گڈی نیچے رکھ دی اور گلاس اور پائپ، جو اسے تھمائے جا رہے تھے، پکڑ لیے۔

''تو تمھیں میرے ساتھ کھیلتے کوئی خوف نہیں آرہا؟'' دلوخوف نے اپنی بات دہرائی۔ وہ اپنی کرسی کے ساتھ ٹیک لگا کر یوں بیٹھ گیا جیسے وہ کوئی بہت مزیدار کہانی سنانے کا ارادہ کر رہا ہو۔ وہ مسکرانے اور اطمینان سے سوچ سوچ کر بولنے لگا:

''حضرات، مجھے بتایا گیا ہے کہ ماسکو میں یہ افواہ پھیلی ہوئی ہے کہ میں تاش میں ہاتھ کی صفائی دکھاتا ہوں۔ چنانچہ میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ لوگ ہوشیار رہیں۔''

''پتے بانٹو، جلدی کرو!'' رستوف نے کہا۔

''اف، ماسکو کے یہ گپ باز!'' دلوخوف نے کہا اور اس نے مسکراتے ہوئے پتے اٹھا لیے۔

''آ۔ ہا!'' رستوف کی تقریباً چیخ نکل گئی اور اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔

جس ستے کی اسے ضرورت تھی، وہ سب سے اوپر پڑا تھا۔ گڈی کا سب سے پہلا پتا وہی تھا۔ اس میں جتنی رقم ادا کرنے کی سکت تھی، وہ اس سے زیادہ ہار چکا تھا۔

''بہرحال اپنے آپ کو تباہ مت کرو،'' دلوخوف نے رستوف پر طائرانہ نظر ڈالتے ہوئے کہا اور پتے بانٹتا رہا۔

14

ایک گھنٹے اور تیس منٹ بعد اکثر کھلاڑیوں کو اپنے کھیل میں کوئی خاص سنجیدہ دلچسپی نہ رہی۔

کھیل کی ساری دلچسپی رستوف پر مرکوز ہو چکی تھی۔ سولہ سو روبل کے بجائے اب اس کے نام کے سامنے رقوم کا خاصا بڑا کالم بن چکا تھا۔ اس کے اپنے حساب سے ان رقوم کی میزان دس ہزار تھی۔ مبہم سے انداز سے اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ دس نہیں بلکہ پندرہ ہزار ہے۔ حقیقتاً یہ میزان بیس ہزار روبل سے متجاوز ہو چکی تھی۔ دلوخوف اب قصے کہانیاں نہ سنا رہا اور نہ سن رہا تھا۔ رستوف اپنے ہاتھوں سے جو بھی حرکت کرتا، وہ اس پر نگاہ ڈالتا۔ وہ کبھی کبھار ان رقوم پر بھی، جو رستوف کے نام کے سامنے لکھی جا رہی تھیں، نظر ڈال لیتا۔ اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اس وقت تک کھیلتا رہے گا جب تک رقم کی کل میزان پینتالیس ہزار تک نہیں پہنچ جاتی۔ اس نے یہ رقم اس لیے طے کی تھی کیونکہ اس کی اور سونیا کی عمروں کا مجموعہ یہی بنتا تھا۔

رستوف دونوں ہاتھوں میں سر تھامے میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر مختلف رقوم تحریر تھیں، وہ شراب سے داغ دار ہو چکی تھی اور پتوں سے پٹی پڑی تھی۔ ایک دل خراش احساس نے رستوف کا پیچھا نہ چھوڑا: ''بڑی بڑی ہڈیوں والے یہ سرخ ہاتھ، جن کے بال قمیص کے کفوں تلے نظر آ رہے ہیں، جن سے وہ پیار بھی کرتا رہا ہے اور نفرت بھی کھاتا رہا ہے، اسے اپنے شکنجے میں کسے ہوئے ہیں۔

''چھ سو روبل، اِکّا، چوتھائی داؤ، نہلا... اسے دوبارہ جیتنا ناممکن ہے!... گھر میں کتنا سکون اور آرام تھا!... غلام، دگنا یا برابر — ایسا نہیں ہو سکتا! لیکن یہ شخص میرے ساتھ یہ سلوک کیوں کر رہا ہے؟'' رستوف کو تعجب ہو رہا تھا۔

بعض اوقات وہ کسی پتے پر خاصی بڑی رقم لگا دیتا لیکن دلوخوف انکار کر دیتا اور داؤ کی رقم وہ خود متعین کرتا۔ نکولائی سر تسلیم خم کر دیتا۔ ایک لمحے وہ بالکل اسی طرح دعا مانگنے لگتا جس طرح اس نے اس وقت، جب وہ دریائے اینس کے پل پر فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا، مانگی تھی۔ دوسرے لمحے اسے یہ خیال آنے لگتا کہ مڑے تڑے پتوں کی گڈی سے جو اگلا پتا برآمد ہو گا، وہ اس کا بیڑا پار کر دے گا۔ کبھی وہ اپنے کوٹ کی ڈوریاں گننے لگتا، اسی نمبر کا پتا اٹھاتا اور اسی کے مطابق اپنے نقصانات کی تلافی کے لیے داؤں کی رقم لگاتا۔ کبھی وہ دوسرے کھلاڑیوں سے استمداد کی خواہش کرنے لگتا اور کبھی دلوخوف کے سرد مہر چہرے کی جانب دیکھنے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگتا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے۔

''وہ جانتا ہے کہ یہ نقصان میرے لیے کیا معانی رکھتا ہے،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''وہ یقیناً مجھے تباہی کے غار میں دھکیلنا نہیں چاہے گا! آخر یہ میرا دوست تھا! اور میں اس سے محبت کرتا تھا... لیکن یہ اس کا قصور نہیں۔ اگر اس کی قسمت ہی اتنی تیز ہے، پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟ لیکن قصور میرا بھی نہیں ہے،'' اس نے دل ہی دل میں

سوچا۔ ''میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ کیا میں نے کسی شخص کو قتل کیا ہے، کسی کی توہین کا مرتکب ہوا ہوں یا کسی کا برا چاہا ہے؟ ابھی تھوڑی دیر پہلے میں اس میز پر یہ خیال لے کر آیا تھا کہ میں سو روبل جیتوں گا تا کہ اماں کے نام دن پر زیورات کا ڈبا[31] خرید سکوں اور پھر گھر چلا جاؤں گا۔ کتنا خوش تھا میں، نہ فکر نہ غم، تتلی کی طرح آزاد! تب مجھے یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ میں کتنا خوش ہوں۔ وہ کیفیت کب ختم ہوئی اور حالات نے یہ نیا اور بھیانک رخ کب اختیار کیا؟ اس تبدیلی کی علامت کیا تھی؟ میں اس سارے عرصے کے دوران میں اسی میز پر اور اسی جگہ بیٹھا رہا ہوں، پتے اٹھاتا رہا ہوں، انھیں نیچے رکھتا رہا ہوں اور ان بڑی بڑی ہڈیوں والے مشاق ہاتھوں کو دیکھتا رہا ہوں۔ یہ کب ہوا اور کیوں ہوا؟ میں تندرست ہوں، توانا ہوں، جیسا تھا ویسا ہی ہوں اور جہاں تھا، ابھی تک وہیں ہوں۔ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا! یقیناً انجام کار اس کا نتیجہ کچھ برآمد نہیں ہوگا!''

وہ لالوں لال ہو گیا اور پسینے میں نہا گیا حالانکہ کمرا گرم نہیں تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت برسنے لگی تھی اور اس کی حالت قابل رحم ہو چکی تھی۔ یہ کیفیت اس لیے بھی اور بھی نمایاں ہو رہی تھی کیونکہ وہ پرسکون ہونے کی سعی کر رہا تھا لیکن اپنی اس کوشش میں اسے قطعاً کوئی کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔

اس کے نام کے آگے رقم کی میزان تینتالیس ہزار کے منحوس ہندسے تک پہنچ چکی تھی۔ رستوف نے ابھی ابھی پتے کا کونا موڑ کر، جس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے حساب میں تین ہزار روبل کی جو رقم درج کی گئی تھی، وہ اسے دگنا کرنا چاہتا ہے، اگلا داؤ کھیلنے کی تیاری کی تھی لیکن دلوخوف نے پتوں کی گڈی میز پر پٹخ کر ایک طرف دھکیل دی اور بہ عجلت رستوف کے ذمے قرضے کی رقوم کی میزان کرنے لگا۔ جب اس نے کل میزان ہاتھ پر زور دے کر واضح انداز سے لکھی، چاک ٹوٹ گیا۔

''سپر، سپر کا وقت ہو گیا اور جپسی بھی آ گئے ہیں!''

اور واقعی سانولے مردوں اور عورتوں کا جتھا اپنے جپسی لہجے سے بات کرتا باہر کی خنک فضا سے اندر آ رہا تھا۔ نکولائی سمجھ گیا تھا کہ تماشا ختم ہو چکا ہے، پھر بھی اس نے بے رخی سے کہا:

''کیا؟ مزید نہیں کھیلو گے؟ میرے ہاتھ کتنا اچھا پتا آیا تھا!''

وہ یوں بات کر رہا تھا جیسے وہ چیز، جس میں اسے دلچسپی تھی، کھیل کا لطف تھا۔

''معاملہ ختم خسما ہو گیا۔ میرا بیڑا غرق ہو گیا ہے!'' اس نے سوچا۔ ''کاش میرے بھیجے میں سے گولی پار ہو جائے — اب میری قسمت میں یہی کچھ رہ گیا ہے۔'' لیکن اس وقت جب وہ ان خطوط پر سوچ رہا تھا، اس نے بہ طیب خاطر کہا: ''اچھا، بس ایک بازی اور ہو جائے۔''

''بہت اچھا،'' دلوخوف نے جواب دیا۔ وہ رقوم کی میزان کر چکا تھا۔ ''بہت اچھا! چلو، اکیس روبل کی بازی لگا لو،'' اس نے اکیس کے عدد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تینتالیس ہزار کی رقم سے بس یہی رقم زائد تھی۔ اس نے گڈی اٹھائی اور پتے بانٹنے کی تیاری کرنے لگا۔

رستوف نے فرماں برداری سے اپنے پتے کا کونا سیدھا کیا اور اس نے جس چھ ہزار کے لکھنے کا ارادہ کیا تھا، اس کی بجائے اس نے احتیاط سے اکیس کا عدد تحریر کر دیا۔

''میرے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا،'' اس نے کہا۔ ''میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آیا یہ دہلا تم جیت جاؤ گے یا مجھے جیتنے دو گے؟''

دلوخوف نہایت سنجیدگی سے پتے بانٹنے لگا۔ اخ، اس لمحے رستوف کو ان سرخ ہاتھوں سے، جن کی انگلیاں صغیر اور کلائیاں بالوں سے بھرپور تھیں اور جو اسے اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھے، گھن محسوس ہونے لگی... دہلا اس کی جانب آ گرا۔

''کاؤنٹ، تم میرے تینتالیس ہزار روبل کے مقروض ہو،'' دلوخوف نے میز سے اٹھتے اور انگڑائی لیتے ہوئے کہا۔ ''اتنی دیر بیٹھے بیٹھے آدمی لازماً تھک جاتا ہے۔''

''ہاں، میں بھی کچھ تھک گیا ہوں،'' رستوف نے کہا۔

دلوخوف نے اس کی بات کاٹ دی جیسے وہ اسے یاد دلانا چاہتا ہو کہ دل لگی کرنا اس کا کام نہیں ہے۔

''کاؤنٹ، مجھے رقم کب ملے گی؟''

رستوف کا چہرہ سرخ ہو گیا اور وہ دلوخوف کو ملحقہ کمرے میں لے گیا۔

''میں اتنی بڑی رقم فی الفور ادا نہیں کر سکتا۔ کہو تو پرونوٹ[32] لکھ دوں؟'' اس نے پوچھا۔

''خیر، رستوف،'' دلوخوف نے مسرت سے کھلتے اور نکولائی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا: ''تمھیں یہ کہاوت تو معلوم ہوگی: 'جو محبت کی بازی جیتتے ہیں' تاش کی بازی ہار جاتے ہیں۔' مجھے معلوم ہے کہ تمھاری خلیری بہن تم پر جی جان سے فدا ہے۔''

''اف، اس شخص کے جال میں پھنس کر مجھے کتنی کوفت محسوس ہو رہی ہے!'' رستوف نے سوچا۔

وہ جانتا تھا کہ جب وہ اس ضیاع کے بارے میں اپنے ابا اور اماں کو بتائے گا، انھیں کتنا صدمہ پہنچے گا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر اسے کسی طرح اس جھنجھٹ سے نجات مل جائے، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہے گا۔ اور اسے یہ بھی احساس ہوا کہ دلوخوف کو معلوم ہے کہ اگر وہ چاہے، تو اسے اس شرمندگی اور اذیت سے نجات دلا سکتا ہے لیکن اب وہ اس کے ساتھ بلی اور چوہے کا کھیل کھیلنا چاہتا تھا۔

''تمھاری خلیری—'' دلوخوف نے کہنا شروع کیا لیکن نکولائی نے اس کی بات کاٹ دی۔

''میری خالہ زاد کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اس کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں،'' اس نے غیظ وغضب سے دہاڑتے ہوئے کہا۔

''پھر تم ادائیگی کب کرو گے؟'' دلوخوف نے مطالبہ کیا۔

''کل،'' رستوف نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

15

''کل'' کہنا اور باوقار لہجہ اختیار کرنا مشکل کام نہیں تھا لیکن بہنوں، بھائی، ماں اور باپ سے آنکھ ملانا، اعتراف کرنا اور وعدہ کرنے کے بعد ایسی رقم کا مطالبہ کرنا، جس پر اس کا کوئی حق نہیں بنتا تھا، بہت سوہانِ روح تھا۔

جب وہ گھر پہنچا، وہ لوگ ابھی سوئے نہیں تھے۔ نوجوان تھیٹر سے واپس آنے اور سپر کھانے کے بعد کلاوی کارڈ کے گرد جمع تھے۔ جونہی نکولائی نے بال روم میں قدم رکھا، عشق و محبت کی شاعرانہ فضا نے، جو ان سردیوں کے دوران میں اس گھر پر چھائی ہوئی تھی، اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ دلوخوف کے پیغام اور نوگل کے بال کے بعد سونیا اور نتاشا کے گرد یہ فضا اور بھی گمبھیر ہوگئی ہے بالکل ایسے ہی جیسے طوفان سے قبل آسمان تیرہ و تاریک ہو جاتا ہے۔ تھیٹر جانے سے پہلے سونیا اور نتاشا نے ہلکے نیلگوں ڈریس پہنے تھے۔ وہ ان میں بہت بھلی لگ رہی تھیں اور انھیں اس کا احساس بھی تھا۔ وہ مسرور و متبسم کلاوی کارڈ کے پاس کھڑی تھیں۔ ویراشن کے ساتھ ڈرائنگ روم میں شطرنج کھیل رہی تھی۔ معمر کاؤنٹس، جو اپنے بیٹے اور شوہر کی گھر واپسی کا انتظار کر رہی تھی، ایک سن رسیدہ خاتون کے ساتھ، جو ان کے ہاں ہی رہتی تھی، پیشنس[33] کھیلنے میں مصروف تھی۔ دینی سوف جگمگاتی آنکھوں اور ژولیدہ بالوں سمیت کلاوی کارڈ کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس نے ایک ٹانگ پچھلی جانب لٹکائی ہوئی تھی۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی انگلیوں کے ساتھ کلاوی کارڈ کے تار جھنجھناتے اور آنکھیں مٹکاتے اپنی باریک اور کھردری لیکن سر تال کے اعتبار سے بالکل صحیح آواز میں اپنی ایک نظم ''ساحرہ''[34]، جسے اس نے خود ہی تحریر کیا تھا اور خود ہی اس کی موسیقی ترتیب دی تھی، گا رہا تھا:

جادوگرنی، یہ تو بتا یہ کون سا جادو ہے
کہ تو نے مجھے
دوبارہ بربط کے سامنے لا بٹھایا ہے
وہ کون سی آگ ہے جو میرے دل میں بھڑک اٹھی ہے؟
وہ کیسا وجد ہے جو میری انگلیوں کو سنسنا رہا ہے؟

وہ بڑے جوشیلے لہجے سے گا رہا تھا۔ اس کی سیاہ اور شفاف آنکھیں خوف زدہ لیکن مسرور و مطمئن نتاشا پر منعکس ہو رہی تھیں۔

''بہت خوب! بہت اعلیٰ! واہ واہ!'' نتاشا نے با آواز بلند کہا۔ ''ایک بند اور ہو جائے،'' اس نے کہا۔ اسے یہ معلوم ہی نہیں ہو سکا تھا کہ نکولائی آ چکا ہے۔

''کچھ نہیں بدلا ہے، سب کچھ جوں کا توں ہی ہے،'' نکولائی نے ڈرائنگ روم میں، جہاں اسے دیرا، اپنی اماں اور بزرگ خاتون نظر آئیں، جھانکتے ہوئے سوچا۔

''آہا! ہمارا نکولینکا آ گیا ہے!'' نتاشا نے اس کی جانب دوڑتے ہوئے کہا۔

''پاپا گھر پر ہیں؟'' نکولائی نے پوچھا۔

''میں بہت خوش ہوں کہ تم آ گئے ہو'' نتاشا نے اس کے سوال کا جواب دیے بغیر قدرے اونچی آواز سے کہا۔ ''یہاں بہت مزے کی باتیں ہو رہی ہیں! جانتے ہو کہ واسیلی دمیترچ میری خاطر ایک دن مزید رک گئے ہیں؟''

''کوکا، تم آ گئے؟ ڈارلنگ، ادھر آؤ'' معمر کاؤنٹس ڈرائنگ روم سے پکاری۔

نکولائی اپنی ماں کے پاس چلا گیا، اس کے ہاتھ کو بوسہ دیا، ایک لفظ کہے بغیر اس کی میز کے سامنے جا بیٹھا اور اس کے ہاتھوں کو، جو میز پر تاش کے پتے ترتیب دینے میں مصروف تھے، دیکھنے لگا۔ بال روم میں قہقہے اور مسرور آوازیں گونج رہی تھیں۔ وہ لوگ نتاشا کو گانا گانے پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''ٹھیک ٹھیک، ٹھیک ہے!'' دینی سوف نے باآواز بلند کہا۔ ''اب بہانوں سے کام نہیں چلے گا۔ اب بار کارول[35] گانے کی تمھاری باری ہے۔۔۔ میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں!''

کاؤنٹس نے اپنے چپ چاپ بیٹے کی جانب دیکھا۔

''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اخ، کچھ نہیں'' اس نے یوں جواب دیا جیسے ایک ہی سوال کے بار بار پوچھے جانے پر وہ تنگ آ گیا ہو۔ ''پاپا جلدی گھر لوٹ آئیں گے؟''

''امید تو یہی ہے۔''

''ان کے نزدیک سب کچھ جوں کا توں ہے۔ انھیں کیا پتا، اب میرا کیا بنے گا؟'' نکولائی نے سوچا۔ وہ اٹھا اور واپس بال روم میں چلا گیا۔

سونیا کلاوی کارڈ کے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ دینی سوف کے پسندیدہ نغمے ''بار کارول'' کے ابتدائی سُر نکال رہی تھی۔ نتاشا گانا گانے کی تیاری کر رہی تھی اور دینی سوف اسے مسحور نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

نکولائی کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

''یہ اس سے گانا کیوں گوانا چاہتے ہیں؟ وہ کیسے گا سکتی ہے؟ اتنا خوش ہونے کی کوئی بات بھی تو نہیں!'' اس نے سوچا۔

سونیا نے گیت کے افتتاحیے کا پہلا سُر نکالا۔

''اف، میرے خدایا! میں تباہ ہو چکا ہوں، میری عزت مٹی میں مل چکی ہے! اب میرے لیے صرف یہی چیز رہ گئی ہے کہ ایک گولی آئے اور میرے بھیجے کو پاش پاش کر دے۔۔۔ گانے وانے کا مجھ سے کیا کام!'' اس نے سوچا۔ ''میں یہاں سے چلا نہ جاؤں؟ لیکن کہاں؟ مجھے کوئی پروا نہیں۔۔۔ یہ گانے گاتے رہیں!''

وہ کمرے کے اندر چکر لگاتا اور ملول نظروں سے دینی سوف اور لڑکیوں کو دیکھتا رہا لیکن وہ ان سے نظریں چراتا

رہا۔

"نکولینکا، کیا بات ہے؟" سونیا کی نگاہیں، جب وہ انہماک سے اسے دیکھ رہی تھی، اس سے پوچھ رہی تھیں۔ وہ جھٹ پٹ سمجھ گئی تھی کہ اس کے ساتھ ضرور کوئی سانحہ پیش آیا ہے۔ وہ اس سے پرے ہٹ گیا۔ نتاشا نے بھی، کہ بے حد حساس لڑکی تھی، فی الفور اپنے بھائی کی کیفیت بھانپ لی تھی۔ اگرچہ وہ اس کی کیفیت بھانپ چکی تھی، تاہم اس وقت اس پر کچھ اس قسم کا کیف ونشاط طاری تھا کہ اس پر اندوہ وملال، اداسی یا ملامت نفس کی پرچھائیاں بھی نہیں پڑ سکتی تھیں۔ چنانچہ اس نے اپنے آپ کو عمداً (جیسا کہ نوخیز لڑکے لڑکیوں کا اکثر شیوہ ہوتا ہے) دھوکے میں رکھا۔ "نہیں، میں اس وقت اتنی خوش ہوں، اتنی خوش ہوں کہ کسی بھی دوسرے شخص کے ابتلا میں اس کے ساتھ ہمدردی جتا کر اپنا مزہ کر کرا نہیں کرنا چاہتی۔" وہ محسوس کر رہی تھی اور اس نے اپنے آپ سے کہا: "اف، شاید یہ میرا وہم ہو یا میں نے اسے غلط سمجھا ہو جب کہ حقیقتاً وہ اسی طرح مسرور ہو جس طرح کہ میں ہوں۔"

"سونیا، ذرا" وہ کمرے کے عین درمیان میں، جہاں اس کے خیال کے مطابق آواز زیادہ واضح انداز سے سنائی دے سکتی تھی، پہنچ کر بولی۔

بیلے رقاصوں کی طرح اپنی گردن اٹھائے اور بازوؤں کو بے جان انداز سے ڈھیلے چھوڑے نتاشا لچک لچک چلتی کمرے کے درمیان میں پہنچی، مڑی اور ساکت وصامت کھڑی ہو گئی۔

"ہاں، یہ میں ہوں!" وہ دینی سوف کی پر اشتیاق اور پر انہماک نگاہوں کے، جو اس کا تعاقب کر رہی تھیں، جواب میں کہتی محسوس ہو رہی تھی۔

"آخر یہ اتنا خوش کیوں ہے؟" نکولائی نے اپنی ہمشیرہ کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔ "آخر اس کے مزاج پر کوئی بات گراں کیوں نہیں گزرتی؟ اسے کسی بات پر شرم کیوں نہیں آتی؟"

نتاشا نے پہلا سُر اٹھایا، اس کے گلے کی رگیں پھول گئیں، جوبنا امڈنے لگا اور اس کی آنکھوں میں سنجیدگی سما گئی۔ اس لمحے وہ ہر شخص اور ہر شے کو فراموش کر چکی تھی اور اس کے متبسم لبوں سے کچھ اس قسم کی آوازیں نکلنے لگیں جو اتنے ہی وقفوں وقفوں کے بعد اور اتنے ہی دورانیے کے لیے نکال تو ہر کوئی سکتا ہے، جنھیں آپ ہزار مرتبہ سنیں، آپ پر کوئی اثر نہیں ہو گا لیکن ایک ہزار اکیویں مرتبہ وہ آپ کو جھنجھنا دیتی ہیں، آپ کے رگ و پے میں اتر جاتی ہیں اور آپ کو رلا رلا دیتی ہیں۔

ان سردیوں کے دوران میں نتاشا نے پہلی مرتبہ اپنی گلوکاری پر سنجیدگی سے توجہ دی تھی۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ دینی سوف اس کی آواز کی جی کھول کر تعریف کرتا تھا۔ اب وہ بچوں کی طرح نہیں گاتی تھی۔ ازیں پیشتر اس کی آواز میں جس طرح کی گدگداہٹ، ناپختگی اور چلبلاہٹ کا احساس ہوتا تھا اور یہ تاثر ابھرتا تھا کہ وہ خواہ مخواہ زور لگا رہی ہے، وہ اب غائب ہو چکا تھا۔ جن باذوق اور باشوق اشخاص نے اس کا گانا سنا تھا، ان کا خیال تھا کہ وہ ابھی تک اچھا نہیں گاتی۔ "اس کی آواز کی تربیت نہیں ہوئی ہے،" ان سب کی یہ رائے تھی۔ "اس کی آواز خوبصورت

ہے لیکن اس کی تربیت ہونا چاہیے۔'' تاہم اس قسم کی باتیں عام طور پر اس وقت کہی جاتی تھیں جب اس کا گانا ختم ہوئے کچھ ساں بیت چکا ہوتا تھا۔ لیکن جب وہ اس غیر تربیت یافتہ آواز کو، جو سانس کے لیے غلط مقامات پر رکتی اور ایک سُر سے دوسرے سُر تک پہنچنے میں دقت محسوس کر رہی ہوتی، سن رہے ہوتے، وہ بھی دم بخود اس (آواز) سے نہ صرف محظوظ ہو رہے ہوتے بلکہ آرزو کر رہے ہوتے کہ کاش انھیں اسے دوبارہ سننے کا موقع میسر آسکے۔ اس کی آواز میں ناشگفتہ دوشیزہ کی پاکیزگی، اپنی اثر انگیزی کے بارے میں عدم آگہی اور ایسی مخملیں نفاست تھی، جو محض قدرت کی دین تھی، کسی انسان کی سکھائی ہوئی نہیں تھی، اور گلوکاری کے دوران میں وہ صناعی اور پرکاری کے جس فقدان کا مظاہرہ کرتی تھی، یہ نفاست اس کا اتنا ناگزیر جزو تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس آواز میں اگر ذرہ برابر تبدیلی کرنے کی کوشش کی گئی تو اس کا سارا حسن غارت ہو جائے گا۔

''یہ کیا ہے؟'' نکولائی نے حیرت زدگی سے سوچا۔ وہ اتنا مبہوت ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ ''یہ اسے کیا ہو گیا ہے؟ یہ آج کس طرح گا رہی ہے!'' اور ایکا ایکی اس کی کل کائنات سمٹ سمٹا کر اگلے سُر اور اگلے بول کا پیشگی اندازہ لگانے پر مرکوز ہو گئی۔ کائنات کی ہر چیز تین تالوں میں منقسم ہو چکی تھی: Oh, mio... crudele af fetto* ایک، دو، تین... ایک۔ Oh, mio crudele affetto... ایک، دو، تین... ایک۔

''اف ہماری یہ لایعنی دنیا!'' نکولائی نے سوچا۔ ''یہ ساری ابتلائیں، روپیہ پیسہ، دلوخوف، بغض و عداوت، عزت و آبرو— سب کچھ لاشے ہے... لیکن یہ— یہ اصل ہے۔ خیر، نتاشا، خیر، ڈارلنگ، اچھا، میری بہن!... یہ ساتواں سُر کیسے اٹھائے گی؟... ارے، اٹھا گئی! اف میرے خدایا!'' اور اس امر سے آگاہ ہوئے بغیر کہ وہ اس کے سُر کے ساتھ سُر ملا کر گا رہا ہے، وہ اس کے مقابلے میں ذرا دھیمی آواز میں اس کا ساتھ دینے لگا۔ ''اف، میرے خدایا، یہ کتنا خوبصورت ہے! کیا میں نے واقعی یہ سُر اٹھا لیا تھا؟ کتنا جلیل القدر ہے!'' اس نے سوچا۔

اس کی روح کا تار کیسے جھنجھنایا تھا؟ رستوف کی ذات کا وہ حصہ، جو ارفع ترین تھا، کیسے متاثر ہوا تھا! اور اس کی ذات کا یہی حصہ دنیا کی باقی تمام اشیا سے مختلف تھا اور دنیا کی تمام اشیا سے ارفع تر تھا۔ جوئے کے نقصانات، دلوخوف اور وعدے مواعید! سب ہیچ تھے، حقیر تھے! آدمی قتل کر دے، ڈاکہ ڈال دے، پھر بھی خوش رہ سکتا تھا...

16

موسیقی سے جتنا لطف اندوز رستوف اس شام ہوا، اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ لیکن جونہی نتاشا نے بارکارول ختم کیا، حقیقت پھر سامنے آن موجود ہوئی۔ وہ ایک لفظ کہے بغیر کمرے سے باہر نکل گیا اور نچلی منزل پر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ کوئی پندرہ منٹ بعد معمر کاؤنٹ کلب سے واپس آ گیا۔ وہ بہت مسرور اور مطمئن تھا۔ اس کی گاڑی کی آواز سن کر نکولائی اس کے پاس پہنچا۔

---

* My credulous love (میرے بھولے بھالے محبوب)۔ اس زمانے میں اطالوی موسیقی اور اطالوی گیت بہت مقبول تھے۔

''اخاہ، آج تو خوب موج اڑائی ہوگی؟'' الیا آندریچ نے اپنے بیٹے کو دیکھ کر فخر وابتہاج سے مسکراتے ہوئے کہا۔

نکولائی نے ''ہاں'' کہنے کی کوشش کی لیکن اس کی زبان گنگ ہوگئی اور اس کی قریب قریب ہچکی نکل گئی۔

کاؤنٹ اپنا پائپ جلا رہا تھا۔ اسے اپنے بیٹے کی کیفیت نظر نہ آئی۔

''خیر، کہے بغیر چارہ بھی نہیں!'' نکولائی نے پہلی اور آخری مرتبہ سوچا۔ اور اچانک انتہائی لاابالی لہجے سے، جو خود اسے بھی کریہہ محسوس ہوا، وہ اپنے باپ سے یوں مخاطب ہوا جیسے وہ اس سے شہر جانے کے لیے محض گاڑی کی فرمائش کر رہا ہو۔

''پاپا، میں ایک غرض لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔ میں تقریباً بھول ہی چلا تھا... مجھے کچھ رقم چاہیے۔''

''واقعی؟'' اس کے باپ نے، جس کی طبیعت خاص طور پر جولانی پر تھی، کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ تمھارے لیے یہ کافی نہیں ہوگی۔ کتنی رقم چاہیے تمھیں؟ بہت بڑی؟''

''بڑی سے بھی زیادہ،'' نکولائی نے کہا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور وہ نہایت احمقانہ اور لاپروایانہ انداز سے مسکرا رہا تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ مدتوں اپنے آپ کو معاف نہ کر سکا۔ ''میں تاش میں کچھ رقم، میرا مطلب ہے کہ اچھی خاصی رقم، درحقیقت بہت بڑی رقم — تینتالیس ہزار روبل — ہار گیا ہوں۔''

''کیا؟ کسے... تم مذاق کر رہے ہو!'' معمر کاؤنٹ کی، جیسا کہ ایسے مواقع پر بڑے بوڑھوں کے ساتھ ہوتا ہے، چیخ نکل گئی۔ گدی تک اس کا رنگ سرخ ہوگیا اور اس پر ایک قسم کا سکتہ طاری ہوگیا۔

''میں وعدہ کر چکا ہوں کہ میں یہ رقم کل ادا کر دوں گا،'' رستوف نے کہا۔

''اچھا!...'' کاؤنٹ نے بے چارگی سے ہاتھ اوپر اچھالتے اور بے اختیار صوفے پر گرتے ہوئے کہا۔

''اب کچھ نہیں ہوسکتا! ہر شخص کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہتا ہے،'' اس کے بیٹے نے بے ساختگی اور بے باکی سے کہا، حالانکہ وہ دل ہی دل میں اپنے آپ کو کام کا نہ کاج کا لفنگا شخص، جو چاہتا بھی ہے، پھر بھی پوری زندگی اپنے جرم کی تلافی نہیں کر سکتا، گردان رہا تھا۔

وہ اپنے باپ کے ہاتھوں کو چومنا اور اس کے سامنے دوزانو ہو کر اس سے معافی مانگنا چاہتا تھا لیکن اس کے بجائے وہ اسے لاپروایانہ، اور ایک اعتبار سے گستاخانہ بھی، انداز سے اسے بتا رہا تھا کہ ہر شخص کے ساتھ یہی کچھ ہوتا رہتا ہے۔

کاؤنٹ الیا آندریچ نے جب اپنے بیٹے کے منہ سے یہ الفاظ سنے، اس کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ اضطراری طور پر یوں پہلو بدلنے لگا جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔

''ہاں، ہاں،'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑانے لگا، ''اتنی بڑی رقم اکٹھا کرنا خاصا مشکل کام ہوگا... مجھے اندیشہ ہے خاصا مشکل کام ہوگا... ہر شخص کے ساتھ ہوتا رہتا ہے... ہاں، ہر شخص کے ساتھ ہوتا رہتا ہے...'' اور اس نے

اپنے بیٹے کے چہرے پر اچٹتی نگاہ ڈالی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔
نکولائی مخالفت کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھا لیکن اسے یہ توقع نہیں تھی۔
''پاپا! پا۔ پا!'' اس نے ہچکیاں لیتے اپنے باپ کو پکارا، ''مجھے معاف فرمادیں!'' اور اس نے اپنے باپ کا ہاتھ پکڑا، اسے دبایا، ہونٹوں سے لگایا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

جب باپ بیٹے کے مابین یہ مکالمہ ہو رہا تھا، ماں بیٹی بھی گفتگو میں، جو کسی لحاظ سے کم اہم نہ تھی، مصروف تھیں۔ نتاشا جوش وخروش کے عالم میں بھاگتی دوڑتی اپنی ماں کے پاس آئی تھی۔
''اماں!... اماں!... انھوں نے مجھے...''
''انھوں نے کیا...؟''
''انھوں نے مجھے شادی کی تجویز پیش کی ہے! اماں! اماں!'' اس نے با آواز بلند کہا۔
کاؤنٹس کو اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ دینی سوف نے شادی کی تجویز پیش کی تھی اور کسے؟ اس بالشت برابر چھوکری کو، نتاشا کو، جو چند دن پہلے گڑیوں سے کھیلتی پھرتی تھی اور ابھی سکول میں تعلیم پا رہی تھی۔
''نتاشا، یہ کیا بکواس ہے، ایسی باتیں منہ سے نہیں نکالتے!'' اسے اب بھی یہی امید تھی کہ اس کی بیٹی مذاق کر رہی ہے۔
''بکواس، واہ! میں آپ کو حقیقت بتا رہی ہوں،'' نتاشا نے برہمی سے کہا۔ ''میں آپ سے دریافت کرنے آئی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور ایک آپ ہیں کہ اسے بکواس کہہ رہی ہیں!''
کاؤنٹس اپنے کندھے اچکانے لگی۔
''اگر موسیو دینی سوف نے واقعی تمھیں شادی کی تجویز پیش کی ہے تو اس سے کہو کہ وہ نرا احمق ہے اور بس۔''
''نہیں، وہ احمق نہیں ہیں!'' نتاشا نے سنجیدگی اور خفگی سے کہا۔
''اچھا، پھر تم کیا چاہتی ہو؟ معلوم ہوتا ہے کہ تم سب کو آج کل محبت کا بخار ہو گیا ہے۔ خیر، اگر تمھیں اس سے محبت ہو گئی ہے، پھر جاؤ اور اس سے بیاہ رچالو،'' کاؤنٹس نے جھنجھلا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور خداوند تمھارے نصیب بلند کرے!''
''نہیں، اماں، مجھے ان سے محبت وحبت نہیں ہے... میرا خیال ہے کہ مجھے ان سے محبت نہیں۔''
''اچھا، پھر جاؤ اور اسے بتا دو۔''
''اماں، آپ ناراض ہیں؟ ڈارلنگ، آپ ناراض نہ ہوں۔ اس میں بھلا میرا کیا قصور ہے؟ یا ہے؟''
''نہیں۔ لیکن مائی ڈیئر، تم چاہتی کیا ہو؟ تم چاہتی ہو کہ میں جاؤں اور اسے بتا آؤں؟'' کاؤنٹس نے

مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں، یہ کام میں خود کروں گی۔ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ میں کہوں کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے لیے یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے،'' ماں کی مسکراہٹ کے جواب میں اس نے بھی مسکراتے ہوئے کہا۔ ''لیکن کاش آپ نے اپنی آنکھوں سے یہ دیکھا ہوتا کہ انھوں نے یہ تجویز پیش کیسے کی تھی! آپ کو معلوم ہے کہ مجھے یقین ہے کہ انھوں نے جو کچھ کہا ہے، وہ ان کا منشا نہیں تھا۔ بس یونہی ان کے منہ سے نکل گیا۔''

''خیر، بہرحال تمھیں اس سے انکار کر دینا چاہیے۔''

''نہیں، مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے ان پر ترس آ رہا ہے۔ کتنے اچھے ہیں وہ!''

''پھر اس کی پیشکش قبول کر لو۔ اچھا ہے کہ تم شادی کر لو ورنہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا،'' کاؤنٹس نے بگڑتے اور طنز کے نشتر چلاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، اماں، نہیں۔ لیکن مجھے ان پر ترس آ رہا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سے کہوں تو کیا کہوں۔''

''نہیں، تمھیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں خود اس سے بات کروں گی،'' کاؤنٹس نے کہا۔ اسے تلملاہٹ اس بات پر ہو رہی تھی کہ لوگ اس کی ننھی منی نتاشا کے ساتھ یوں پیش آ رہے ہیں جیسے وہ سن بلوغ کو پہنچ چکی ہو۔

''نہیں ــ بالکل نہیں! میں خود انھیں بتاؤں گی۔ آپ دروازے پر آ کر سن لیں۔'' اور نتاشا نے دوڑ لگا دی، ڈرائنگ روم عبور کیا اور بال روم میں، جہاں دینی سوف اپنا چہرہ ہاتھوں میں چھپائے ابھی تک کلاوی کارڈ کے پاس اسی کرسی پر بیٹھا تھا، گھس گئی۔

اس کے قدموں کی ہلکی پھلکی چاپ سن کر اس نے جست لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''نتالی،'' اس نے کہا۔ ''میری قسمت کا فیصلہ سنا دو۔ یہ تمھارے ہاتھ میں ہے!''

''واسیلی دمیترچ، مجھے آپ سے ہمدردی ہے!... نہیں، لیکن آپ اتنے اچھے ہیں... لیکن یہ نہیں ہو سکتا... یہ... لیکن دوست کی حیثیت سے میں ہمیشہ آپ کو چاہتی رہی ہوں گی۔''

دینی سوف اس کے ہاتھ پر جھک گیا۔ نتاشا کو عجیب و غریب اور ناقابل فہم آوازیں سنائی دیں اور اس نے دینی سوف کے کھردرے، گھونگھریالے، سیاہ سر پر بوسہ ثبت کر دیا۔ اسی لمحے انھیں کاؤنٹس کے ڈریس کی سبک رفتار سرسراہٹ سنائی دی اور وہ ان دونوں کے پاس پہنچ گئی۔

''واسیلی دمتیرچ، آپ نے ہماری جو عزت افزائی فرمائی ہے، میں اس کے لیے آپ کی ممنون ہوں۔'' اس نے شرمائے گھبرائے انداز سے کہا لیکن دینی سوف کو اس کے لہجہ میں چبھن محسوس ہوئی۔ ''لیکن میری بیٹی ابھی بالکل ہی نوعمر ہے۔ آپ چونکہ میرے بیٹے کے دوست ہیں، اس لیے میرا خیال ہے کہ آپ کو پہلے مجھ سے بات کرنا چاہیے تھی۔ اگر آپ نے یہ طریقہ اختیار کیا ہوتا تو مجھے آپ کو اس طرح جواب دینے پر مجبور نہ ہونا پڑتا۔''

''کاؤنٹس...'' دینی سوف نے نیچی نگاہوں اور مجرم چہرے سے کہنا شروع کیا۔ اس نے مزید کچھ کہنا چاہا لیکن اس کی زبان لڑکھڑا گئی۔

نتاشا سے اس کی یہ حالت دیکھی نہ گئی۔ اس کے ضبط وسکون کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ زاروقطار رونے لگی۔

''کاؤنٹس... مجھ سے غلطی ہوگئی،'' دینی سوف لڑکھڑاتی زبان سے کہتا چلا گیا،''میں آپ کی صاحب زادی اور آپ کے سارے خاندان کی پرستش کرتا ہوں، اتنی کہ میں ایک بار نہیں بلکہ دوبار آپ سب پر اپنی جان نچھاور کر سکتا ہوں...'' اس نے کاؤنٹس کی طرف دیکھا لیکن جب اس نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر ابھی تک درشتگی موجود ہے، اس نے کہا: ''اچھا، کاؤنٹس، خدا حافظ۔'' اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور نتاشا پر نظر ڈالے بغیر تیز اور پرعزم قدموں کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

❦

اگلے روز رستوف نے دینی سوف کو رخصت کر دیا کیونکہ اب وہ ماسکو میں مزید ایک دن بھی قیام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ماسکو کے تمام دوستوں نے اسے جپسیوں کے ریستوران میں الوداعی دعوت دی۔ اسے کچھ یاد نہیں کہ انھوں نے اسے سلیج میں کیسے سوار کرایا اور اس نے کیسے سفر کی پہلی تین منازل طے کیں۔

دینی سوف کی روانگی کے بعد رستوف مزید دو ہفتے ماسکو میں مقیم رہا۔ اسے رقم کا انتظار تھا اور کاؤنٹ کے لیے اس کا فوری بندوبست کرنا ممکن نہ تھا۔ اس نے گھر سے باہر نکلنا ترک کر دیا اور اپنا بیشتر وقت لڑکیوں کے کمرے میں صرف کرنے لگا۔

سونیا اسے پہلے سے بھی زیادہ پیار کرنے لگی اور بالکل اسی کی ہو کر رہ گئی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے جتانا چاہتی ہے کہ اس نے جوئے میں ہار کر ایسا کارنامہ سرانجام دیا ہے جس سے وہ اس کی نظروں میں اور بھی محبوب ہو گیا ہے لیکن نکولائی اپنے آپ کو اس کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔

اس نے لڑکیوں کے البم اشعار اور موسیقی سے بھر دیے۔ اور جب آخر کار اس نے نومبر کے اواخر میں دلوخوف کو تینتالیس ہزار روبل بھیج دیے اور رسید وصول کر لی، اس نے دوستوں اور واقف کاروں کو خدا حافظ کہے بغیر رختِ سفر سنبھالا اور اپنی رجمنٹ میں، جو پہلے ہی پولینڈ پہنچ چکی تھی، شامل ہونے روانہ ہو گیا۔

حصہ دوم

1

اپنی بیوی سے تُو تُو مَیں مَیں ہو جانے کے بعد پیئر عازمِ پیٹرز برگ ہو گیا۔ ترزھوک کی ڈاک چوکی پر پایا تو گھوڑے دستیاب نہ تھے، یا پھر مہتمم انھیں مہیا کرنے پر آمادہ نہیں تھا۔ چنانچہ پیئر کو مجبوراً وہیں ٹھہرنا پڑا۔ اپنا اوورکوٹ وغیرہ اتارے بغیر وہ صوفے پر دراز ہو گیا، اس کے سامنے جو میز پڑی تھی، اس نے اس پر اپنے پاؤں، جو بھاری بھرکم بوٹوں میں ملفوف تھے، دھرے اور سوچ بچار میں مستغرق ہو گیا۔

''سوٹ کیس اندر لے آؤں؟... بستر بچھادوں؟... چائے چاہیے؟'' وردی پوش ملازم بار بار پوچھے جارہا تھا۔

پیئر کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سن رہا تھا۔ جب سے وہ پچھلی ڈاک چوکی سے روانہ ہوا تھا، وہ گہری سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا اور ابھی تک اسی ایک مسئلے پر غور و فکر کیے جارہا تھا — اور یہ مسئلہ اتنا اہم تھا کہ جو کچھ اس کے گرد و پیش وقوع پذیر ہو رہا تھا، اسے اس پر توجہ دینے کی کوئی فرصت نہیں تھی۔ وہ فی الحال جس ادھیڑبن میں مصروف تھا، اس کے مقابلے میں جہاں تک اس قسم کے امور: آیا وہ پیٹرز برگ جلدی پہنچ جائے گا یا دیر سے؟ آیا اسے ڈاک چوکی پر سونے کی جگہ مل سکے گی یا نہیں؟ وغیرہم، کا تعلق ہے، ان میں دلچسپی لینا تو دور کی بات ہے، وہ تو اس مسئلے کے، کہ آیا اسے یہاں چند گھنٹے گزارنے ہوں گے یا باقی ماندہ ساری زندگی، بارے میں بھی کامل بے نیازی برت رہا تھا۔

اس کا ملازم، ڈاک چوکی کا مہتمم، اس کی بیوی اور ایک کسان عورت، جو ترزھوک کی کڑھائی سلائی کی اشیا فروخت کررہی تھی، سبھی اس کے کمرے میں آتے اور اپنی اپنی خدمات پیش کرتے رہے۔ میز سے پاؤں اتارے بغیر پیئر کنکھیوں سے ان اشخاص پر سرسری نگاہ ڈالتا اور بس۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ لوگ چاہتے کیا ہیں یا جن مسائل میں وہ الجھا ہوا ہے، انھیں حل کیے بغیر یہ زندگی کی گاڑی کیسے کھینچے جارہے ہیں۔ جس روز وہ ڈوئیل کے بعد ساکولنکی جنگل سے واپس آیا تھا، اسی روز وہ انھی مسائل میں مستغرق ہو گیا تھا اور اس نے اپنی پہلی اذیت ناک اور بے خواب شب گزاری تھی۔ اور اب کے سفر کی تنہائی میں وہ خاص قوت سے اس پر حملہ آور ہو گئے تھے۔ اس

بات سے قطع نظر کہ وہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ سوچ رہا ہوتا، اس کا دھیان لامحالہ انھی مسائل کی طرف پلٹ آتا۔ وہ انھیں نہ حل کر سکتا تھا اور نہ ان کے بارے میں غور وفکر کیے بنا رہ سکتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس بڑے پیچ کا، جس نے اس کی زندگی کے مختلف حصوں کو مربوط کر رکھا تھا، دھاگہ اتر گیا ہے۔ اب پیچ نہ اندر جاتا تھا اور نہ باہر نکلتا تھا، بلکہ ایک ہی جگہ رکے بغیر گھومے جا رہا تھا۔

ڈاک چوکی کا مہتمم اندر آیا اور بہت لجاجت سے بولا: ''یوئر ایکسی لینسی، بس دو گھنٹے اور انتظار فرمائیں، اس کے بعد (خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے) میں آپ کی خدمت عالیہ میں گھوڑے ضرور پیش کر دوں گا۔'' یہ شخص صریحاً جھوٹ بول رہا تھا۔ وہ مسافر سے محض مزید پیسے ہتھیانا چاہتا تھا۔

''یہ اچھا ہے یا برا؟'' پیئر نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''میرے لیے اچھا اور اگلے مسافر کے لیے برا۔ اور جہاں تک اس ذات شریف کا تعلق ہے، یہ اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا ہے؟ آخر اس کے بھی تو پیٹ لگا ہے! اس نے مجھے بتایا تھا کہ ایک مرتبہ ایک افسر نے اس کی محض اس لیے پٹائی کر دی تھی کیونکہ اس نے ڈاک کے گھوڑے ایک عام مسافر کو دے دیے تھے، در آں حالانکہ افسر نے اس کی پٹائی صرف اس لیے کی تھی کیونکہ اسے حتی الامکان جلد از جلد روانہ ہونا تھا۔ اور میں نے دلوخوف پر محض اس لیے گولی چلا دی کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ میری عزت پر حملہ ہوا ہے۔ اور لوئی شانز دھم کی گردن اس لیے ناپ دی گئی کیونکہ اسے مجرم ٹھہرایا گیا تھا لیکن جن لوگوں نے اسے ہلاک کرایا تھا، اگلے سال انھیں ــ بالکل انھیں وجوہ کی بنا پر ــ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ برا کیا ہے؟ اچھا کیا ہے؟ آدمی پیار کس سے کرے اور نفرت کس سے کھائے؟ آدمی کس لیے زندہ رہتا ہے اور میں کون ہوں؟ زندگی کیا ہے اور موت کیا ہے؟ یہ سب کچھ کس کے تابع ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

ان میں سے کسی سوال کا بھی کوئی جواب نہیں تھا۔ لے دے کے صرف ایک اور وہ بھی غیر منطقی جواب، جو کسی طرح بھی ان سوالات کا جواب نہیں بنتا تھا، رہ جاتا تھا: ''تم مر جاؤ گے ــــ اور یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ تم مر جاؤ گے اور تمھیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا ــ یا پھر تم سوالات پوچھنا چھوڑ دو گے۔'' لیکن مرنے سے بھی تو خوف آتا ہے۔

ترژھوک کی خوانچہ فروش عورت چیختی چنگھاڑتی آواز سے اپنا مال، خاص طور پر بکرے کے چمڑے کے جوتوں کا، ہنکار لگائے جا رہی تھی۔ ''میرے پاس سینکڑوں روبل ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کا کیا کروں اور ایک یہ ہے کہ بوسیدہ کوٹ پہنے وہاں لرزاں و ترساں کھڑی مجھے گھورے جا رہی ہے،'' پیئر نے سوچا۔ ''اسے روپیہ کیوں چاہیے؟ گویا روپے میں اتنی قوت موجود ہے کہ وہ بال برابر اس کی مسرت اور ذہنی سکون میں اضافہ کر سکتا ہے۔ کیا دنیا میں کوئی ایسی چیز، جو اسے یا مجھے بدی یا موت کے شکنجے میں کسے جانے سے ذرا بھی بچا سکے، موجود ہے؟ موت، جو ہر چیز کو ملیامیٹ کر دیتی ہے، آج آ جائے گی یا کل ــ بہر حال اس کے آنے میں صرف اتنا وقت، جو ابد کے مقابلے میں محض ایک لمحہ ہے، صرف ہوگا۔'' اس نے ایک بار پھر پیچ کو، جس کا دھاگا اتر چکا تھا، مروڑا لیکن

کچھ حاصل نہ ہوا، وہ پیچ اپنی جگہ گھومتا رہا۔

اس کے ملازم نے اسے مادام دَسوزا[1] کا ناول، جو بصورتِ خطوط تحریر کیا گیا تھا اور جس کے نصف اوراق ابھی کاٹے جانے تھے، تھما دیا۔ کسی ایمیلی دَمانسفلد کو نیکی کے راستے پر چلنے میں جن مصائب اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور اسے اس راستے کے جن جن کانٹوں کو چننا پڑا، وہ ان کے بارے میں پڑھنے لگا۔ اسے تعجب اس بات پر ہو رہا تھا کہ جس شخص نے اسے دوشیزگی سے محروم کیا، اس نے اس کے خلاف مزاحمت کیوں کی تھی جب کہ وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی؟ خداوند اس کے دل میں اس قسم کے ناگہانی جذبے کو، جو اس کے مُحِب کے ارادوں کے خلاف جاتا تھا، تحریک نہیں دے سکتا تھا؟ میری بیوی نے — جیسا کہ وہ کبھی تھی — کبھی اس قسم کی مزاحمت نہیں کی اور غالباً وہ ٹھیک تھی۔ کچھ بھی دریافت نہیں ہو سکا،'' پیئر نے اپنے آپ سے کہا۔ ''کچھ بھی متشکل نہیں کیا جا سکا۔ جو کچھ ہم معلوم کر سکتے ہیں، صرف یہ ہے کہ ہمیں کچھ بھی معلوم نہیں۔ اور انسانی عقل کی بس یہی معراج ہے۔''

اسے اپنے اندر اور باہر ہر شے ژولیدہ، بے معنی اور گھناؤنی نظر آ رہی تھی لیکن اپنے تمام حالات و واقعات سے اسے جو کراہت ہو رہی تھی، وہ ناگوارِ طبع ضرور سہی لیکن اسی میں اسے اطمینان کا پہلو بھی نظر آ رہا تھا۔

''یورَ ایکسی لینسی، کیا میں آپ سے یہ درخواست کرنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ اس کمرے میں کچھ جگہ ان صاحب کو بھی دے دیں؟'' ڈاک چوکی کے مہتمم نے ایک اور مسافر کو، جسے گھوڑوں کی قلت کی وجہ سے رکنا پڑا تھا، اندر لاتے ہوئے پوچھا۔

نو وارد ایک سن رسیدہ شخص تھا۔ اس کا جسم گٹھا ہوا، ہڈیاں بڑی بڑی اور چہرہ سانولا اور جھریاں زدہ تھا۔ اس کے ملگجی ابرو غیر واضح سرمئی رنگ کی روشن آنکھوں کے اوپر چھائے ہوئے تھے۔

پیئر نے اپنے پاؤں میز سے اتار لیے۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس بستر کی طرف، جو اس کے لیے بچھایا گیا تھا، چل پڑا اور اس پر لیٹ گیا۔ وہ کبھی کبھار اجنبی کی جانب، جو اس پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا، اچٹتی نظر ڈال لیتا۔ اجنبی کے چہرے مہرے پر گمبھیرتا اور تھکاوٹ ٹپک رہی تھی اور وہ بڑی جانفشانی سے اپنے نوکر کی مدد سے اپنا اوورکوٹ اور دوسرے فالتو کپڑے اتار رہا تھا۔ اس نے بھیڑ کی کھال کا جس کے اوپر سوتی کپڑا منڈھا ہوا تھا، بوسیدہ کوٹ اور موزے، جو اس نے اپنی مہین استخوانی ٹانگوں پر چڑھائے ہوئے تھے، نہ اتارے۔ مسافر صوفے پر بیٹھ گیا، اس نے اپنی کشادہ کنپٹیاں اور اچھی طرح منڈھا ہوا سر اس کی پشت پر ٹکایا اور بزوخوف کو دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر جو درشتی، ذہانت اور فراست ٹپک رہی تھی، پیئر اس سے بہت متاثر ہوا۔ اس کا اس اجنبی کے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا لیکن جب اس نے سڑکوں کی حالت کے بارے میں اس سے سوال پوچھنے کا ارادہ کیا، مسافر اپنی آنکھیں بند کر چکا تھا اور اپنے جھریاں زدہ بوڑھے ہاتھوں کو، جن کی ایک انگلی پر ایک بھاری بھرکم انگوٹھی، جس کے اوپر کھوپڑی کا نشان ثبت تھا، چڑھی ہوئی تھی، ایک دوسرے کے اوپر رکھ چکا تھا۔ اجنبی اپنی جگہ پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا اور ذرا بھی ہل جل نہیں رہا تھا۔ پیئر کا خیال تھا کہ وہ یا تو آرام کر رہا ہے اور یا پھر عمیق اور پرسکوت سوچ

بچار میں مستغرق ہے۔ اس کا نوکر بھی زرد رو، سوکھا سڑا اور جھریاں زدہ بوڑھا پھوس تھا۔ اس کا چہرہ مونچھوں اور داڑھی سے بے نیاز تھا، اس لیے نہیں کہ اس نے انھیں منڈوایا ہوا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ ''جماندرو کھودا'' تھا۔ پھرتیلا بوڑھا نوکر ترت پھرت اپنے آقا کا سفری سامان طباخی کھولنے، چائے بنانے کی اشیا نکالنے اور کھولتے ہوئے پانی کا سماوار اندر لانے میں مصروف تھا۔ جب سب کچھ تیار ہو گیا، اجنبی نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور وہ میز کی جانب لپکا۔ اس نے ایک مگ میں اپنے لیے چائے انڈیلی، دوسرے میں ''کھودے'' کے لیے اور ''کھودے'' کا مگ اس کے حوالے کر دیا۔ پیئر کو بے کلی نے آگھیرا اور اسے اس اجنبی کے ساتھ بات کرنے کی ضرورت کا اور بھی شدت سے احساس ہونے لگا، بلکہ اس کے نزدیک اب کلام کرنا ناگزیر ہو چکا تھا۔

نوکر اپنا خالی مگ واپس لے آیا اور اس نے اسے الٹا کر[2] نیچے رکھ دیا۔ اس نے ایک طرف گڑ کی ڈلی بھی، جو ایک طرف سے دانتوں سے کتری ہوئی تھی، رکھ دی۔ پھر اس نے کہا: ''آپ کو کچھ اور تو نہیں چاہیے؟''

''نہیں، بس میری کتاب مجھے دے دو۔''

نوکر نے اسے اس کی کتاب تھما دی۔ پیئر نے سوچا کہ یہ لازماً کوئی مناجات کی کتاب ہوگی۔ اجنبی اس کے مطالعے میں محو ہو گیا۔ پیئر چپ چاپ اسے دیکھتا اور کچھ سوچتا رہا۔ اچانک اجنبی نے کتاب نیچے رکھ دی۔ جس صفحے کا وہ مطالعہ کر رہا تھا، وہاں اس نے نشانی رکھی اور کتاب بند کر دی۔ ایک مرتبہ اس نے آنکھیں بند کر لیں، صوفے کی پشت پر اپنا سر ٹکایا اور دوبارہ اپنی سابقہ صورت اختیار کر لی۔ پیئر ابھی تک اسے دیکھے جا رہا تھا۔ وہ اپنی نظریں وہاں سے ہٹا نہیں پایا تھا کہ پیر سال شخص نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور اپنی درشت اور کٹھور آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔

پیئر بوکھلا گیا اور ان نظروں سے بچنے کی کوشش کرنے لگا لیکن شعلہ فام آنکھوں نے اسے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔

2

''اگر مجھے غلطی نہیں لگی تو میں یہ کہوں گا کہ مجھے کاؤنٹ بزوخوف سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے،'' اجنبی نے بلند آہنگ اور نپے تلے لہجے سے کہا۔

پیئر خاموش رہا اور جواب طلب نگاہوں سے چشمے میں سے متکلم کو دیکھتا رہا۔

''محترم، میں آپ کا اور آپ کی بپتا کا احوال سن چکا ہوں،'' اجنبی نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے لفظ بپتا پر خصوصی زور دیا ہے گویا کہ وہ یہ کہنا چاہتا ہو کہ ''ہاں، بپتا! ماسکو میں تمھارے ساتھ جو کچھ بیتا، تمھارا جو جی چاہے، اسے نام دے لو لیکن میں اسے بپتا ہی کہوں گا۔'' اور اس نے کہا: ''محترم، مجھے آپ کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔''

پیئر کا چہرہ تمتمانے لگا، اس نے چشم زدن میں اپنے پاؤں نیچے اتارے اور شرماتے گھبراتے اور اپنے چہرے پر زبردستی مسکراہٹ پیدا کرتے وہ سن رسیدہ شخص کی طرف جھکا۔

''محترم، میں یہ باتیں تجسس کی خاطر نہیں بلکہ گمبھیر وجوہ کی بنا پر کہہ رہا ہوں۔''

اس نے توقف کیا۔ اس کی نگاہیں ابھی تک پیئر پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر وہ ہٹا اور صوفے کے ایک طرف بیٹھ گیا جیسے وہ پیئر کو دعوت دے رہا ہو کہ وہ آئے اور اس کے قریب بیٹھ جائے۔ اگرچہ پیئر کو اس معمر شخص کے ساتھ بات کرنے میں تامل تھا، وہ غیر ارادی طور پر اس کی اطاعت بجالایا، اپنی جگہ سے اٹھا، اس کی طرف بڑھا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔

''محترم، آپ اداس ہیں، ناشاد ہیں،'' اجنبی نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ نوجوان ہیں اور میں بوڑھا۔ جہاں تک میرے بس میں ہوا، میں آپ کی مدد کرنا چاہوں گا۔''

''بالکل، بالکل،'' پیئر نے غیر فطری انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ کا بے حد ممنون ہوں... کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟''

اجنبی کا چہرہ مروت سے عاری تھا بلکہ ایک لحاظ سے اس پر درشتی اور سردمہری سایہ فگن تھی لیکن اس کے باوجود پیئر کو اپنے نئے ملاقاتی کے چہرے اور الفاظ، دونوں میں ہی، دلکشی نظر آئی۔

''لیکن اگر کسی وجہ کی بنا پر آپ کو مجھ سے گفتگو کرنے میں ناگواری محسوس ہو،'' معمر شخص نے کہا، ''آپ مجھ سے فرما دیں۔'' اور وہ ایکا ایکی بالکل غیر متوقع نرم و ملائم اور پدرانہ شفقت سے مسکرانے لگا۔

''اجی نہیں، بالکل نہیں، اس کے برعکس آپ کا تعارف حاصل ہونے پر مجھے بے پناہ خوشی ہو رہی ہے،'' پیئر نے کہا اور اس نے ایک بار پھر اجنبی کے ہاتھوں پر نظر دوڑائی اور اس کی انگوٹھی کو، جس پر کھوپڑی کی شبیہ۔ میسن تحریک کی علامت۔ منقش تھی، بغور دیکھنے لگا۔

''اگر آپ اجازت مرحمت فرمائیں،'' اس نے کہا، ''میں یہ پوچھنا چاہوں گا کہ آیا آپ میسن ہیں؟''

''جی ہاں، میرا فری میسنوں کی برادری[3] سے تعلق ہے،'' اجنبی نے پیئر کی آنکھوں کی طرف بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں ان کی اور اپنی طرف سے آپ کی جانب دستِ اخوت بڑھاتا ہوں۔''

''معاف کیجیے،'' پیئر نے کہا۔ ایک طرف وہ اعتماد تھا، جو اس میسن کی شخصیت نے اس کی ذات میں بھر دیا تھا، اور دوسری طرف اس کی میسنوں کے عقائد کا ہر دم مذاق اڑانے کی عادتِ کہنہ تھی۔ اب وہ ان دونوں جذبوں کے مابین جھول رہا تھا۔ ''معاف کیجیے، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں — معاف کیجیے، کائنات کے سارے نظریے کے بارے میں میرے تصورات آپ لوگوں کے تصورات سے اتنے مختلف ہیں کہ ہم ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پائیں گے۔''

''میں آپ کے اندازِ فکر سے آگاہ ہوں،'' فری میسن نے کہا۔ ''آپ کا یہ اندازِ فکر، اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ

آپ کی اپنی کاوشوں کا نتیجہ ہے، دراصل عام انسانوں کی اکثریت کا اندازِ فکر ہے اور یہ تکبر، آلکسی اور لاعلمی کا غیر متغیر ماحصل ہے۔ محترم، معاف کیجیے، اگر میں اس سے آگاہ نہ ہوتا، میں آپ سے کلام نہ کرتا۔ آپ کا اندازِ فکر سراسر مغالطے پر مبنی ہے۔"

"بالکل اسی طرح، جس طرح مجھے گمان ہوتا ہے کہ آپ بھی مغالطے کا شکار ہیں،" پیئر نے دھیمی مسکراہٹ سے کہا۔

"میں یہ دعویٰ کرنے کی تو ہرگز جسارت نہیں کروں گا کہ میں نے صداقت دریافت کر لی ہے،" فری میسن نے کہا۔ اس کا لہجہ اتنا درشت اور ناطق تھا کہ پیئر بتدریج اس سے شدید سے شدید تر متاثر ہو رہا تھا۔ "کوئی شخص فی نفسہٖ صداقت تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ ہمارے جدِّ امجد (حضرت) آدم (علیہ السلام) سے موجودہ زمانے تک لاکھوں نسلوں نے (حسبِ توفیق) ایک ایک اینٹ سجائی تب کہیں جا کر اس معبد کی، جو باری تعالیٰ کے شایانِ شان اس کا گھر کہلانے کا سزاوار ہو سکتا ہے، تعمیر ممکن ہوئی،" فری میسن نے کہا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

"مجھے آپ کو بتا دینا چاہیے کہ میں خدا کو نہیں مانتا... خدا کو نہیں مانتا،" پیئر نے کفِ افسوس ملتے اور ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے کہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ کامل سچائی کا اظہار کیے بغیر کام نہیں چلے گا۔

فری میسن نے پیئر پر نگاہیں گاڑ دیں، اسے بغور دیکھا اور مسکرانے لگا۔ اس کا انداز بالکل اس شخص کا تھا جو کروڑوں میں کھیلتا ہے اور کسی مفلس کو، جس بدنصیب کے پلّے بقول اس کے اپنے، پانچ روبل بھی نہیں کہ ان سے اپنی خوشی کا سامان بہم پہنچا سکے، دیکھ کر مسکراتا ہے۔

"لیکن محترم، آپ کو اس ذاتِ والا صفات کا ادراک نہیں،" فری میسن نے کہا۔ "آپ اس کا ادراک کرنے سے عاجز ہیں۔ آپ کو اس کا ادراک نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ناشاد ہیں۔"

"ہاں، ہاں، میں ناشاد ہوں،" پیئر نے ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں کروں کیا؟"

"محترم، آپ کو اس کا ادراک نہیں، اس کارن آپ اتنے ناشاد اور ناخرسند ہیں۔ لیکن وہ یہاں ہے، وہ مجھ میں ہے، وہ میرے الفاظ میں ہے، وہ تجھ میں ہے، بلکہ وہ تو ان بے ادبی کے الفاظ میں، جو ابھی ابھی آپ کے منہ سے ادا ہوئے ہیں، بھی ہے،" فری میسن نے درشت اور مرتعش لہجے سے کہا۔

اس نے توقف کیا اور اس کے سینے سے اک ہُوک نکلی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کی سعی کر رہا ہے۔

"محترم، اگر وہ نہ ہوتا،" وہ نرمی سے گویا ہوا، "تو میں اور آپ اس کا ذکر نہ کر رہے ہوتے۔ ہم کس کا ذکر کر رہے ہیں؟ آپ نے کس (کے وجود) کا انکار کیا ہے؟" اس نے اچانک سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اس کے لہجے میں پُرمسرت تندی اور تحکم تھا۔ "اگر وہ موجود نہیں، تو پھر اسے کس نے گھڑا؟ ایسے بعید الفہم وجود کی موجودگی کا تصور کہاں سے آیا؟ تو نے اور کُل عالم نے ایسے بعید الفہم وجود کا، ایسا وجود جو قادرِ مطلق ہے، لایزال ہے، جو اپنی

تمام صفات میں لاثانی ہے، مفروضہ کیسے بنایا؟''

وہ رک گیا اور دم بھر کے لیے خاموش ہو گیا۔

پیئر اس مہرِ سکوت کو توڑ نہ سکا اور نہ وہ توڑنا چاہتا تھا۔

''وہ موجود ہے لیکن اب اس کا ادراک کارے دارد ہے،'' فری میسن نے اپنا سلسلۂ کلام پھر سے جوڑتے ہوئے کہا۔ اب کے وہ پیئر کی جانب نہیں بلکہ سیدھا اپنے سامنے دیکھ رہا تھا جب کہ اس کے بوڑھے ہاتھ، جنھیں وہ اپنے داخلی ہیجان کی وجہ سے ساکن رکھنے سے معذور تھا، کتاب کے صفحات الٹنے پلٹنے میں مصروف تھے۔ ''اگر آپ کو کسی انسان کے وجود کے بارے میں شک وشبہ ہوتا، میں اسے آپ کی خدمت میں حاضر کر سکتا تھا، میں اس کا ہاتھ پکڑ سکتا اور اسے آپ کو دکھا سکتا تھا۔ لیکن میں، حقیر پُر تقصیر، فنا پذیر آدم زاد، اس کی قادر المطلقیت، اس کی لاثانیت، اس کے کامل عفو و کرم کو ایک ایسے شخص کو، جو نابینا ہے، جو آنکھیں رکھتا ہے لیکن انھیں وا نہیں کرتا کہ کہیں وہ اسے دیکھ نہ لے، اس کا ادراک نہ کر لے، کہیں اسے اپنی سفلگی اور ہوسنا کی کا علم نہ ہو جائے، کیسے دکھا سکتا ہوں؟'' اس نے ایک بار پھر توقف کیا۔ ''تو کون ہے؟ تو کیا ہے؟ تو سمجھتا ہے کہ تو عاقل و دانا ہے کیونکہ تو وہ بے ادبی کے کلمات کہہ سکتا ہے،'' اس نے گمبھیر اور پُر تحقیر طنز خفی سے کہا، ''جب کہ تو اس ننھے منے بچے سے بھی زیادہ گیا گزرا، احمق اور کودن ہے، جو اس گھڑی کے ساتھ، جس کی ساخت میں بڑی مہارت اور مشاقی سے کام لیا گیا تھا، چھیڑ خانی کرتا ہے اور چونکہ اسے مطلق علم نہیں ہوتا کہ یہ گھڑی کس کام آتی ہے، اس لیے اس میں یہ کہنے کا حوصلہ ہوتا ہے کہ 'میں اس استاد کے، جس نے اس کو بنایا ہے، وجود کو نہیں مانتا۔' اس (خدا) کا ادراک کرنا بہت دشوار ہے۔ ہمارے اولین جدِ امجد (حضرت) آدم اور ہمارے اپنے زمانے کے مابین ہزاروں قرنوں کا فاصلہ حائل ہے۔ اس دوران میں ہم اس علم کے حصول میں ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہے ہیں لیکن ابھی تک ہم اپنے مقصد کے حصول میں ان گنت کوسوں دور ہیں۔ تفہیم کے اس فقدان میں میں ہمیں محض اپنا عجز اور اس کی کبریائی نظر آتی ہے...''

فری میسن کی باتیں سن کر پیئر کی آنکھوں میں چمک آ گئی اور اس کا دل اچھلنے لگا۔ اس نے اپنی نگاہیں اس کی نگاہوں میں ڈال دیں۔ اس نے نہ تو اسے ٹوکا اور نہ کوئی سوال اٹھایا، بلکہ جو کچھ اجنبی اس سے کہہ رہا تھا، وہ دل و جان سے اس پر آمنا و صدقنا کہہ رہا تھا۔ فری میسن کی باتیں جن عقلی دلائل و براہین سے پُر تھیں، آیا وہ ان سے قائل ہوا یا اس کے تھرتھراتے لہجے میں، جو شدتِ جذبات سے بعض اوقات اس کا ساتھ نہیں دے پاتا تھا، جو دبدبہ اور خلوص تھا، آیا بچوں کی طرح وہ اس سے متاثر ہوا، یا اس کی موتی چور آنکھوں نے، جنھیں اس عقیدے نے پختہ کار بنا دیا تھا، کام دکھایا یا پھر اس کے مقصد میں جو پُر سکون محکمی اور ایقان تھا جو اس کے سارے وجود سے پھوٹ رہا تھا (اور جس نے پیئر کو اپنے یاس اور نراس کے مقابلے میں خاص طور پر متاثر کیا تھا)، اس نے اپنا اعجاز دکھایا اور اسے لاجواب کر دیا۔ بہرحال وہ بہ صمیم قلب یقین کرنے کا آرزومند تھا اور اسے یقین آ بھی گیا اور اسے یہ مسرت بخش احساس ہونے لگا کہ اسے تسکین حاصل ہو گئی ہے، اس کی تولیدِ نو ہو گئی ہے اور وہ دوبارہ زندگی کی طرف لوٹ آیا ہے۔

''اس کا ادراک بذریعہ عقل نہیں بلکہ بذریعہ حیات ہوسکتا ہے،'' فری میسن نے کہا۔

''میں سمجھ نہیں پارہا،'' پیئر نے کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ شکوک و شبہات پھر سر اٹھانے لگے ہیں اور اس احساس سے اسے سخت دھچکا لگا۔ یہ سوچ کر اس کی روح فنا ہو رہی تھی کہ کہیں فری میسن کے استدلال میں کوئی جھول یا الجھاؤ نہ ہو۔ اسے اس چیز سے بھی خوف آ رہا تھا کہ کہیں وہ اس (فری میسن) کی بات پر عدم یقین نہ کرنے لگے۔

''میں سمجھ نہیں پارہا،'' اس نے کہا، ''کہ جس چیز کا آپ ذکر کر رہے ہیں، اس کے علم تک عقلِ انسانی کی رسائی کیوں نہیں ہوسکتی؟''

فری میسن کے چہرے پر وہی نرم و گداز اور پدرانہ مسکراہٹ تیرنے لگی۔ ''اعلیٰ ترین دانش اور صداقت خالص ترین مائع یا جوہر کی، جسے ہم نوش کرنے کی خواہش کر سکتے ہیں، مانند ہوتی ہے،'' اس نے کہا۔ ''کیا میں اس خالص مائع یا جوہر کو ناپاک برتن میں ڈال سکتا اور پھر اس کے خالص ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟ میں صرف اپنی داخلی پاکیزگی کے ذریعے اس جوہر کی، جو میں اپنے اندر قبول کرتا ہوں، پاکیزگی کسی حد تک برقرار رکھ سکتا ہوں۔''

''ہاں، ہاں، یہ بات تو ٹھیک ہے،'' پیئر نے مسرور لہجے سے جواب دیا۔

''اعلیٰ ترین دانش کی اساس محض استدلال یا بہ الفاظِ دیگر فزکس، تاریخ، کیمسٹری اور ان جیسے دیگر دنیاوی علوم پر، جن میں عقلی علم منقسم کیا جاتا ہے، نہیں ہوتی۔ اعلیٰ ترین دانش واحد اکائی ہے۔ اس کے علم کا صرف ایک ہی خانہ ہے — اور یہ ہے کُل کا علم، وہ علم جو ساری کائنات اور اس میں انسان کے مقام کی صراحت کرتا ہے۔ اس علم کو اپنے اندر جذب کرنے کے لیے یہ انتہائی ضروری ہے کہ آدمی اپنے باطن کو پاکیزہ بنائے اور اسے حیاتِ نو سے آشنا کرے۔ چنانچہ ادراک سے پہلے یہ لابدی ہے کہ آدمی پہلے اپنے اندر ایقان پیدا کرے اور اپنے آپ کو کامل بنائے۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے خداوند نے ہمارے اندر الوہی نور، جسے ضمیر کہا جاتا ہے، جاگزیں کر دیا ہے۔''

''جی ہاں، جی ہاں،'' پیئر نے موافقت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

''اپنے باطن کے عمیق ترین کونوں کو اپنی روحانی آنکھوں سے دیکھ اور اپنے آپ سے پوچھ: 'میں اپنے آپ سے مطمئن ہوں؟ کسی ہادی اور رہنما کا ہاتھ پکڑے بغیر میں نے محض عقل کے بل بوتے پر کیا پایا ہے؟ میں کیا ہوں؟...' محترم، آپ نوجوان ہیں، مال دار ہیں، اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں... آپ کو جو یہ ساری نعمتیں عطا ہوئی ہیں، آپ نے ان کا کیا بنایا؟ کیا آپ اپنے آپ سے اور اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟''

''نہیں، مجھے تو اپنی زندگی سے گھن آتی ہے،'' پیئر نے چیں بہ جبیں ہو کر کہا۔

''تو اس سے گھن کھاتا ہے، پھر اسے تبدیل کر دے۔ اپنے آپ کو پاکیزہ بنا اور جب تو پاکیزہ ہو جائے گا، پھر تجھے عقل و دانش مل جائے گی... محترم، اپنی زندگی پر نظر دوڑائیں۔ اس کا جائزہ لیں۔ آپ نے اسے کیسے بسر کیا ہے؟ معاشرے سے لیا تو سب کچھ لیکن معاوضے میں دیا کچھ نہیں۔ آپ کو دولت عطا کی گئی۔ آپ نے اسے کیسے استعمال کیا؟ آپ نے اپنے پڑوسی کے لیے کیا کیا ہے؟ آپ کے ہزاروں زرعی غلام ہیں، کیا آپ نے کبھی ان

کے بارے میں سوچا؟ کیا آپ نے کبھی ان کی دامے درمے سخنے مدد کی ہے؟ نہیں۔ محنت مشقت وہ کرتے ہیں، عیش آپ اڑاتے ہیں۔ انڈے سیوے فاختہ اور کوے میوے کھائیں۔ یہی آپ نے کیا ہے۔ کیا آپ نے کوئی ایسا عہدہ، جس میں آپ دوسروں کے کام آسکیں، منتخب کیا؟ نہیں۔ آپ ساری عمر نکھٹو بن کر بس ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہے۔ پھر، محترم، آپ نے شادی کی۔ ایک نوجوان خاتون کو زندگی میں سچائی کا راستہ دکھانے کا فریضہ اپنے سر لیا۔ آپ نے یہ ذمے داری کیسے نبھائی؟ صداقت کا راستہ دریافت کرنے میں اس کا ہاتھ تو کیا بٹانا تھا، الٹا اسے مکروفریب اور ذلت وخواری کی دلدل میں دھکیل دیا۔ ایک شخص نے آپ کی شان میں گستاخی کی اور آپ نے اس پر گولی چلادی۔ پھر آپ کہتے ہیں کہ آپ خدا کو نہیں مانتے اور اپنی زندگی سے گھن کھاتے ہیں۔ میرے محترم، اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟"

ان الفاظ کے ساتھ فری میسن نے ایک مرتبہ پھر اپنا سر صوفے کی پشت پر ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس طویل گفتگو نے اسے ہلکان کر دیا ہے۔ پیئر معمر آدمی کے درشت، جذبات سے عاری اور تقریباً بے جان چہرے کو بغور دیکھنے اور کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر اپنے لبوں کو حرکت دینے لگا۔ وہ کہنا چاہتا تھا: "جی ہاں، آپ نے بجا فرمایا ہے کہ میں رنگ رلیوں کا دلدادہ ہوں اور میں نے نہایت گھٹیا، شرم ناک اور نکمی زندگی بسر کی ہے۔" لیکن اس میں مہر سکوت توڑنے کی ہمت نہیں تھی۔

فری میسن نے بوڑھوں کی طرح اپنا گلا کھنکار کر صاف کیا اور اپنے نوکر کو آواز دی۔

"گھوڑوں کے بارے میں کیا خبر ہے؟" اس نے پیئر کی جانب دیکھے بغیر پوچھا۔

"چند ابھی ابھی آئے ہیں،" نوکر نے جواب دیا۔ "آپ یہاں آرام نہیں فرمائیں گے؟"

"نہیں، انھیں جتوا دو۔"

"کیا یہ مجھے سب کچھ بتائے اور مجھ سے مدد کا وعدہ کیے بغیر چلے جائیں گے اور مجھے یکہ وتنہا چھوڑ جائیں گے؟" پیئر نے سوچا۔ وہ اٹھا، اپنا سر جھکایا اور کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ کبھی کبھار فری میسن پر بھی سرسری نظر ڈال لیتا تھا۔ "بالکل۔ میں نے پہلے یہ کبھی سوچا ہی نہیں تھا لیکن میں نے بڑی ذلالت اور اوباشی کی زندگی گزاری ہے... حالانکہ یہ مجھے پسند نہیں تھی اور نہ میں نے کبھی اس کی آرزو کی تھی۔" پیئر سوچ بچار میں غلطاں تھا۔ "اور یہ شخص صداقت کے علم سے بہرہ ور ہے اور اگر یہ چاہے تو میرے سامنے اسے منکشف کر سکتا ہے۔"

پیئر اس بارے میں فری میسن سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اسے حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

مسافر نے بوڑھے مشاق ہاتھوں سے اپنی اشیا سمیٹیں اور اپنے چرمی کوٹ کے بٹن بند کرنے لگا۔ جب وہ فارغ ہوا، وہ بزوخوف کی جانب متوجہ ہوا اور بے نیازی لیکن شائستگی سے بولا:

"محترم، آپ کہاں جانا چاہتے ہیں؟"

"میں؟... میں پیٹرزبرگ جا رہا ہوں،" پیئر نے بچوں کی طرح ڈھلمل انداز سے جواب دیا۔ "میں آپ کا

بے حد مشکور ہوں۔ آپ نے جو کچھ فرمایا، میں اس سے متفق ہوں۔ لیکن مجھے بالکل ہی برا نہ سمجھیں۔ میں بہ صمیمِ قلب وہ کچھ بننا چاہتا ہوں جو آپ چاہتے ہیں کہ میں بنوں۔ لیکن آج تک مجھے کہیں سے مدد نہیں ملی... اگر چہ ہر بات کے لیے موردِ الزام میں ہی ٹھہرتا ہوں۔ آپ میری دست گیری کریں، میری مدد فرمائیں، میری رہبری کریں اور شاید میں—"

پیئر کے لیے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھنا ناممکن ہو گیا، اس کا گلا رندھ گیا اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

فری میسن کافی دیر خاموش کھڑا رہا۔ بظاہر وہ کچھ سوچ رہا تھا۔

"مدد صرف خدا کرتا ہے،" اس نے کہا۔ "تاہم، محترم، جس قدر امداد ہماری جماعت کے بس میں ہوئی، وہ آپ کو مہیا کر دی جائے گی۔ آپ پیٹرز برگ جا رہے ہیں۔ آپ یہ کاؤنٹ ولارسکی کو پہنچا دیں۔" (اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی اور خاصے بڑے چوہرے کاغذ پر کچھ تحریر کیا۔) "اگر آپ اجازت دیں، میں آپ کو ایک مشورہ دوں گا۔ جب آپ دارالسلطنت پہنچ جائیں، کچھ عرصہ خلوت میں بسر کریں، اپنے نفس کا محاسبہ کریں اور اپنے سابقہ طور طریقوں سے گریز کریں۔ اور محترم، اب میری یہ دعا ہے کہ آپ کا سفر بخیر و عافیت طے ہو" اور اس نے اپنے نوکر کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر مزید کہا: "اور کامیابی آپ کے قدم چومے..."

جیسا کہ پیئر کو ڈاک چوکی کے مہتمم کے رجسٹر سے معلوم ہوا، مسافر کا نام آئی اوسف الیکسی وچ باز دیف تھا۔ ناوی کوف[4] کے زمانے میں بھی باز دیف کا شمار جانے پہچانے فری میسنوں اور مارتی نیتوں[5] میں ہوتا تھا۔

اس کی روانگی کے خاصی دیر بعد بھی پیئر نے نہ تو بستر کا رخ کیا اور نہ گھوڑے جوتنے کا حکم دیا۔ وہ کمرے میں ادھر ادھر چکر لگاتا، اپنے ناپاک ماضی کا جائزہ لیتا اور آغازِ نو کے وجد آور احساس کے ساتھ کیف آگیں، بے داغ اور نکوکار مستقبل کی، جس کا حصول اسے بہت آسان نظر آ رہا تھا، تصویر کشی کرتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ راہِ راست سے اس لیے بھٹک گیا تھا کیونکہ وہ کسی طور یہ فراموش کر بیٹھا تھا کہ صالح اور نکوکار ہونا کتنا احسن ہے۔ اس کی روح میں سابقہ شکوک و شبہات کا شائبہ تک باقی نہ رہا۔ اسے یہ پختہ یقین ہو گیا کہ انسانوں کو اخوت کی کڑی میں پرویا جا سکتا ہے اور وہ مل جل کر صراطِ مستقیم پر چل سکتے ہیں۔ اسے اپنے تصورات میں فری میسن تحریک اسی قسم کی برادری نظر آئی۔

3

پیٹرزبرگ پہنچنے کے بعد پیئر نے نہ تو کسی کو اپنی آمد کی اطلاع دی اور نہ وہ کسی سے ملنے گیا۔ وہ مسلسل کئی روز ٹامس آکیمپس[6] کی کتاب، جو کسی اجنبی شخص نے اسے بھیجی تھی، پڑھتا رہا۔ جوں جوں وہ یہ کتاب پڑھتا گیا، اسے ایک چیز، صرف ایک چیز، کا احساس ہوتا گیا اور وہ چیز یہ تھی کہ اگر وہ یقین کرنے لگے کہ بحیثیت انسان وہ اپنے آپ کو کامل بنا سکتا ہے، پھر اسے وہ سرور حاصل ہوگا، جس سے وہ اب تک آشنا نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے یہ اندازہ بھی ہونے لگا کہ انسانوں کے مابین جس فعال اور برادرانہ محبت کا آئی اوسف الیکسی وچ نے ذکر کیا تھا، اس کا

امکان بھی موجود ہے۔ پیئر کی آمد کے ایک ہفتہ بعد نوجوان پولستانی کاؤنٹ ولارسکی، جس کے ساتھ پیٹرزبرگ کے اعلیٰ طبقوں میں اس کی معمولی سی جان پہچان تھی، ایک شام بالکل اسی طرح رسوم وضوابط کی پابندیاں کرتا، جس طرح دلوخوف کے سیکنڈ نے اس سے ملاقات کے وقت کی تھیں، اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی دروازہ بند کر دیا اور جب اسے اطمینان ہوگیا کہ وہاں کوئی تیسرا شخص موجود نہیں، وہ پیئر سے مخاطب ہوا:

''کاؤنٹ، میں آپ کے لیے ایک پیغام اور ایک تجویز لے کر آیا ہوں،'' اس نے بیٹھے بغیر کہا، ''ایک شخص نے، جسے ہماری جماعت میں اعلیٰ مقام حاصل ہے، آپ کی جانب سے درخواست پیش کی ہے کہ آپ کو معمول کی میعاد سے قبل ہی جماعت کا رکن بنالیا جائے اور انھوں نے تجویز پیش کی ہے کہ آپ کی رکنیت کی سفارش میں کروں۔ اس شخص کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانا میں عین سعادت تصور کرتا ہوں۔ آپ میری سفارش پر فری میسنوں کی برادری میں شامل ہونا چاہتے ہیں؟''

اس شخص کے، جسے پیئر نے تقریباً ہمیشہ اجتماعی رقص کی محفلوں میں ہی دیکھا تھا، جو ہر دم خوشگوار انداز سے مسکراتا رہتا تھا اور جس کے اردگرد خواتین کا، جن کا حسن چاند کو شرماتا اور نگاہوں کو خیرہ کرتا تھا، ہجوم رہتا تھا، سرد مہرانہ اور روکھے سوکھے لہجے نے پیئر کے دل پر گہرا اثر کیا۔

''جی، میری بالکل یہی خواہش ہے،'' پیئر نے کہا۔

ولارسکی نے اپنے سر کو خم دیا۔ ''کاؤنٹ، ایک سوال اور،'' اس نے کہا، ''میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اس کا جواب پورے خلوص سے دیں ــ مستقبل کے فری میسن کی حیثیت سے نہیں بلکہ راست باز شخص کی طرح: کیا آپ اپنے سابقہ عقائد سے دست بردار ہوگئے ہیں ــ کیا آپ کو خدا پر یقین ہے؟''

پیئر نے ایک لحظہ سوچا، ''بالکل ... بالکل۔ میں خدا پر یقین رکھتا ہوں،'' اس نے کہا۔

''اگر یہ صورت ہے ــ'' ولارسکی نے کہنا شروع کیا لیکن پیئر نے اسے ٹوک دیا۔

''جی، مجھے خدا پر پورا یقین ہے،'' اس نے اپنی بات دہرائی۔

''اگر یہ صورت ہے، پھر ہم روانہ ہوسکتے ہیں،'' ولارسکی نے کہا۔ ''میری گاڑی حاضر ہے۔''

پورے رستے ولارسکی مہر بہ لب بیٹھا رہا۔ پیئر نے جب اس سے پوچھنا چاہا کہ ''مجھے کیا کرنا ہوگا اور مجھے سوالات کے جوابات کس طرح دینا چاہئیں،'' ولارسکی نے صرف اتنا کہا: ''مجھ سے بہتر ارکان آپ کا امتحان لیں گے اور آپ کو صرف سچ بولنا ہوگا۔''[7]

وہ ایک وسیع وعریض عمارت کے، جس میں لاج کا صدر مقام تھا، صدر دروازے میں داخل ہوئے۔ تنگ و تاریک زینہ چڑھنے کے بعد وہ روشن استقبالیے میں پہنچے۔ یہاں انھوں نے کسی ملازم کی اعانت کے بغیر اپنے اوورکوٹ اتارے اور وہاں سے ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ دروازے پر ایک شخص، جو عجیب وغریب پوشاک میں ملبوس تھا، نظر آیا۔ ولارسکی دبے پاؤں اس کے پاس گیا اور فرانسیسی میں اس کے کان میں کچھ کہا۔ اس کے بعد وہ

ایک چھوٹی سی وارڈروب کی طرف بڑھا۔ وہاں پیئر کو کچھ اس قسم کے ملبوسات، جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے، دکھائی دیے۔ ولارسکی نے وارڈروب سے ایک رومال نکالا اور اسے پیئر کی آنکھوں پر باندھ دیا۔ اس نے جب اس کی پشت پر گرہ لگائی، پیئر کے بال کچھ اس بری طرح اس میں پھنسے کہ اسے خاصی تکلیف ہونے لگی۔ پھر ولارسکی نے اس کا سر نیچے جھکایا، اس کے رخساروں پر بوسہ دیا، اس کا ہاتھ تھاما اور اسے وہاں سے لے چلا۔ پیئر کے بال جس بری طرح گرہ میں پھنسے ہوئے تھے، اس سے اسے اچھی خاصی اذیت ہو رہی تھی اور وہ ڈھٹائی سے مسکرانے لگا۔ وہ ولارسکی کے پیچھے چلتا رہا۔ اس کی چال میں بے یقینی اور جھینپ تھی۔ اس کے بازو بھاری بھرکم جسم کے اطراف جھول رہے تھے اور اس کے چہرے پر تبسم کی شکنیں تھیں۔

کوئی دس قدم چلنے کے بعد ولارسکی رک گیا۔

''اگر آپ ہماری جماعت میں پختہ ارادے سے شامل ہونے آئے ہیں،'' اس نے کہا، ''پھر خواہ آپ کے ساتھ کچھ ہی کیوں نہ پیش آئے، آپ کو صبر و استقلال سے اسے برداشت کرنا ہوگا۔ (پیئر نے ہاں میں سر ہلا دیا۔) ''جب آپ کو دروازے پر دستک سنائی دے، آپ اپنی آنکھوں سے پٹی اتار دیں گے،'' ولارسکی نے مزید کہا۔ ''میری دعا ہے کہ آپ حوصلے سے کام لیں اور کامیابی آپ کے قدم چومے،'' اس نے کہا، پیئر کا ہاتھ دبایا اور باہر نکل گیا۔

جب پیئر اکیلا رہ گیا، وہ پھر بھی اسی طرح مسکراتا رہا۔ ایک دو مرتبہ اس نے کندھے اچکائے اور اپنا ہاتھ یوں اٹھا کر رومال تک لے گیا جیسے وہ اسے اتارنا چاہتا ہو لیکن اس نے دوبارہ اسے نیچے گرا دیا۔ آنکھوں پر پٹی باندھے اس نے جو پانچ منٹ گزارے، وہ اسے ایک گھنٹے کے مساوی معلوم ہوئے۔ اس کے بازو سُن ہو گئے، اس کی ٹانگیں تقریباً جواب دینے لگیں اور اسے بے پناہ تھکن کا احساس ستانے اور مختلف النوع انتہائی پیچیدہ جذبات کا تجربہ ہونے لگا۔ یہ سوچ کر اس کی جان ضیق میں آنے لگی کہ معلوم نہیں کہ اس پر کیا بیتے اور اس سے بھی زیادہ اندیشہ اسے اس بات کا تھا کہ کہیں اس کا خوف ظاہر نہ ہو جائے۔ اسے یہ کرید لگی ہوئی تھی کہ اب کیا وقوع پذیر ہونے والا ہے اور اس کے سامنے کن اسرار و رموز کے پردے اٹھائے جائیں گے۔ لیکن سب سے بڑھ کر اسے یہ خوشی ہو رہی تھی کہ اب وہ گھڑی آ پہنچی ہے جب وہ حیاتِ نو پا سکے گا اور فعال طریقے سے نیکی اور پارسائی کے، جن کا وہ آئی اوسف الیکسی وچ سے ملاقات کے وقت سے خواب دیکھتا آ رہا تھا، راستے پر گامزن ہو سکے گا۔

دروازہ دھڑ ادھڑ پیٹا جانے لگا۔ پیئر نے پٹی اتار دی اور اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا۔ صرف ایک کونے میں کسی سفید چیز کے اندر ایک چھوٹا مدھم چراغ روشن تھا۔ پیئر نزدیک آیا اور اس نے دیکھا کہ چراغ ایک سیاہ میز پر، جس کے اوپر ایک کھلی کتاب پڑی تھی، دھرا تھا۔ کتاب اناجیل اربعہ پر مشتمل تھی۔ وہ سفید چیز، جس میں چراغ جل رہا تھا انسانی کھوپڑی تھی۔ اس کے تمام سوراخ اور دانت صحیح سالم تھے۔ پیئر نے اناجیل اربعہ کے ابتدائی الفاظ پڑھے: ''ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔'' پیئر نے میز کے گرد چکر لگایا۔ اس کی نظر خاصے بڑے ڈبے پر پڑی۔ ڈبا کھلا تھا اور اس میں کوئی چیز ٹھنسی ہوئی تھی۔ یہ صندوقچہ دراصل تابوت

تھا اور اس میں ہڈیاں رکھی ہوئی تھیں۔ جو کچھ اس نے دیکھا، اس میں اسے ذرا بھی تحیر نہ ہوا۔ اس امید میں کہ وہ ایک بالکل نئی زندگی میں داخل ہوا چاہتا ہے، جو اس کی پرانی زندگی سے قطعی مختلف ہوگی، وہ یہ توقع باندھنے لگا کہ یہاں ہر شے غیر معمولی ہوگی، بلکہ جو کچھ وہ دیکھ رہا تھا، اس سے بھی زیادہ غیر معمولی ہوگی۔ کھوپڑی، تابوت، اناجیل اربعہ — اسے محسوس ہوا کہ اسے ان سب اشیا بلکہ ان سے بھی زیادہ کی توقع ہے۔ اپنے جذبات کو ابھارنے کی کوشش میں اس نے کنکھیوں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ ''خدا، موت، محبت اور انسانی اخوت۔'' وہ بار بار ان الفاظ کا ورد اور ان کے ساتھ کسی قسم کے دھندلے لیکن پرمسرت تصورات بھی وابستہ کرتا رہا۔ دروازہ کھلا اور کوئی شخص اندر آیا۔

دھندلی روشنی میں، جس سے پیئر کی آنکھیں پہلے ہی مانوس ہو چکی تھیں، اسے قدرے کوتاہ قامت شخص نظر آیا۔ بظاہر نووارد روشنی سے تاریکی میں آیا تھا، چنانچہ اس نے کچھ توقف کیا۔ پھر وہ محتاط قدموں سے چلا میز کے قریب پہنچا اور اپنے ننھے منے ہاتھ، جن پر اس نے چرمی دستانے اوڑھے ہوئے تھے، اس پر رکھ دیے۔

اس پست قامت شخص کے جسم پر سفید چرمی ایپرن، جس میں اس کا سینہ اور رانیں ڈھنپی ہوئی تھیں، لٹک رہا تھا۔ اس کی گردن میں ایک طرح کی کنٹھی (نیکلیس) حمائل تھی۔ کنٹھی کے عین اوپر سفید اونچی جھالر تھی۔ اس جھالر میں اس کا کتابی چہرہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے چوکھٹے کے اندر تصویر۔ نیچے جو روشنی تھی، اس میں اس کا چہرہ روشن ہو گیا تھا۔

''آپ یہاں کیوں آئے ہیں؟'' نووارد نے پیئر کی جانب، جس نے ہلکی سی سرسراہٹ پیدا کی تھی، متوجہ ہو کر کہا۔ ''تم، جو نور کی صداقت سے منکر ہو، جس نے نور دیکھا ہی نہیں ہے، یہاں کیوں آئے ہو؟ تم ہم سے کیا لینے آئے ہو: دانائی، نیکی، روشن ضمیری؟''

جس لمحے دروازہ کھلا اور نامعلوم شخص اندر آیا، پیئر کو بعینہٖ اسی قسم کی ہیبت اور تعظیم و تکریم کا، جس کا تجربہ اسے بچپن میں بھری محفل میں پادری کے سامنے اقرارِ مذہب کے وقت ہوا تھا، احساس ہوا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے شخص کے، جو روزمرہ کی زندگی میں اس کے لیے بالکل اجنبی تھا لیکن جو اخوتِ انسانی کے ناتے اس کا بھائی بند ہے، سامنے موجود ہے۔ دم سادھے اور دھک دھک کرتے دل کے ساتھ پیئر اتالیق (فری میسن یہ خطاب اپنے اس رفیق کو، جو تحریک میں شامل ہونے کے متمنی شخص کو باضابطہ شرکت کے لیے تیار کرتا ہے، دیتے ہیں) کی جانب بڑھا۔ قریب پہنچنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ وہ اسے جانتا ہے۔ اس کا نام سمالیانینوف تھا اور یہ سوچ کر کہ نووارد اس کا واقف کار ہے، اسے سخت ذہنی اذیت پہنچی۔ وہ اس امر کو ترجیح دیتا کہ نووارد اس کا محض رفیق اور نیکی کا پرچار ک ہوتا۔ کافی دیر تک پیئر کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا۔ چنانچہ اتالیق کو مجبوراً اپنا سوال دہرانا پڑا۔

''جی ہاں، میں... میں... حیاتِ نو کا متلاشی ہوں،'' پیئر نے بصد مشکل یہ الفاظ کہے۔

''بہت خوب،'' سمالیانینوف نے کہا اور وہ فی الفور آگے بڑھا۔ ''تمھارے ذہن میں ان ذرائع کا، جن کی وساطت سے ہماری مقدس جماعت تمھارے مقصد کے حصول میں تمھیں کوئی امداد بہم پہنچا سکتی ہے، کوئی تصور ہے؟''

اتالیق نے سکون اور عجلت سے پوچھا۔

''مجھے ... امید ہے ... کہ حیاتِ نو ... کے سلسلے میں ... مجھے ... امداد ... دستیاب ہوگی،'' پیئر نے کہا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور اسے بولنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے جذبات میں ہل چل مچی ہوئی تھی، دوسرے اسے روسی زبان میں مجرد افکار کے بارے میں گفتگو کرنے کی عادت نہیں تھی۔

''تمھارے ذہن میں فری میسنری کا تصور کیا ہے؟''

''میں سمجھتا ہوں کہ فری میسنری ان انسانوں کے، جن کے مقاصد نیک ہیں، مابین مواخات اور مساوات قائم کرتی ہے،'' پیئر نے کہا۔ وہ اس بات پر شرمسار ہو رہا تھا کہ اس کے الفاظ موقع کی متانت سے مناسبت نہیں رکھتے۔ ''میں سمجھتا ہوں ...''

''بہت خوب،'' اتالیق نے، جو بظاہر اس جواب سے مطمئن دکھائی دیتا تھا، عجلت سے کہا۔ ''اپنے مقصد کے حصول کے لیے تمھیں جو ذرائع درکار ہیں، کیا تم نے انھیں مذہب میں تلاش کیا؟''

''نہیں۔ میرا خیال تھا کہ یہ اغلاط سے پُر ہے، اس لیے میں نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا،'' پیئر نے یہ الفاظ اتنی دبی زبان سے کہے کہ اتالیق سن نہ سکا۔ چنانچہ اس نے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''میں ناستک تھا،'' پیئر نے جواب دیا۔

''تم سچائی کے متلاشی ہو تاکہ تم اس کے اصولوں پر اپنی زندگی میں عمل کر سکو۔ چنانچہ تم دانائی اور نیکی کی تلاش میں ہو۔ ٹھیک ہے نا؟'' اتالیق نے کچھ دیر کی خاموشی کے بعد کہا۔

''جی ہاں، جی ہاں،'' پیئر نے اس کی تائید کی۔

اتالیق نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔ دستانے پوش ہاتھوں سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور بولنے لگا:

''اب مجھے اپنی جماعت کے مقصدِ عظیم کا تمھارے سامنے انکشاف کر دینا چاہیے،'' اس نے کہا، ''اور اگر یہ مقصد تمھارے اپنے مقصد سے لگا کھاتا ہو، پھر تم ہماری جماعت میں منفعت بخش انداز سے داخل ہو سکتے ہو۔ ہماری جماعت کا اولین اور عظیم مقصد، جس اساس پر یہ مصدقہ طور پر قائم ہے اور جسے دنیا کی کوئی طاقت زیر و زبر نہیں کر سکتی، وہ ایک خاص نوعیت کے وقیع راز کا تحفظ کرنا اور اسے وراثتاً اخلاف تک پہنچانا ہے ... یہ راز ہم تک زمانہ پراچین بلکہ درحقیقت انسانِ اول سے پہنچا ہے اور یہ وہ راز ہے جس پر غالباً بنی نوع انسان کے مقدر کا انحصار ہے۔ لیکن چونکہ اس راز کی نوعیت کچھ ایسی ہے، کہ کوئی بھی شخص، تاوقتیکہ وہ طول طویل اور جاں گسل تزکیہ نفس کے لیے تیار نہ ہو، اس سے آگاہ یا مستفید نہیں ہو سکتا اور نہ ہر کس و ناکس اسے آسانی سے دریافت کرنے کی امید کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارا ایک مقصد دوم ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے ارکان کی کچھ اس طرح تہذیب و تربیت کریں کہ وہ ان ذرائع سے، جو ہمیں روایتاً ان اشخاص سے ملے، جنھوں نے اس راز کے حصول کے لیے سرتوڑ کوششیں کیں، اپنے قلوب کی حتی الامکان زیادہ سے زیادہ تطہیر کر سکیں اور اپنے اذہان کو تمام آلائشوں سے پاک اور انھیں باخبر بنا سکیں، اور یوں ہم انھیں اس

قابل بنادیں کہ وہ اس راز کو حاصل کرسکیں۔

''سوم، ہم اپنے ارکان کا جس طرح تزکیہ کرتے اور انھیں حیاتِ نو سے آشنا کرتے ہیں، اس کے ذریعے ہم ساری نسل انسانی کی اصلاح کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ وہ یوں کہ ہم اپنے ارکان کو پارسائی اور نیکی کے نمونے بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس طرح دنیا میں جو بدی کا چلن ہے، اس کا پوری قوت سے ڈٹ کر مقابلہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جو کچھ میں نے عرض کیا ہے، اس پر غور کرو اور میں دوبارہ تمھارے پاس آؤں گا،'' اس نے یہ کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''دنیا میں جو بدی کا چلن ہے، اس کا مقابلہ کرنے کے لیے...'' پیئر نے دہرایا اور اس سمت میں اسے مستقبل میں جو کام سرانجام دینا تھا، اس کا خاکہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا۔ دو ہفتے قبل وہ خود جس قسم کا انسان تھا، وہ اس قسم کے انسانوں کا تصور اپنے دماغ میں باندھنے لگا اور جی ہی جی میں انھیں کارِ خیر کی تلقین کرنے لگا۔ وہ ایسے اوباش، عیاش اور بدقسمت لوگوں کے، جن کی اس نے زبانی اور عملی امداد کرنا تھی، متعلق سوچنے لگا۔ پھر اس کے ذہن میں ان ظالموں کا، جن کے پنجے سے اس نے مظلوموں کو رہائی دلانا تھی، خیال آنے لگا۔ اتالیق نے جو تین مقاصد گنوائے تھے، ان میں سے یہ آخری، جو بنی نوع انسان کی بھلائی کے متعلق تھا، اسے خاص طور پر پرکشش نظر آیا۔ اگرچہ اس وقیع راز نے، جس کا ذکر اتالیق نے کیا تھا، اس کے جذبہ تجسس کو ابھار دیا تھا، لیکن وہ اسے اتنا اہم نظر نہ آیا۔ لیکن جہاں تک دوسرے مقصد — اصلاحِ قلب اور تزکیۂ نفس — کا تعلق تھا، اس میں اس کی دلچسپی برائے نام تھی کیونکہ اس وقت وہ یہ سوچ سوچ کر نہال ہو رہا تھا کہ وہ سابقہ برائیوں سے پوری طرح صحت یاب ہو چکا ہے اور اب صرف نیک افعال کے لیے کمربستہ ہے۔

آدھ گھنٹہ بعد اتالیق واپس آ گیا تاکہ وہ طالب کو ان حسناتِ ہفت سے، جو ہیکل سلیمانی کے سات قدمچوں سے تطابقت رکھتی تھیں اور جن کی ہر فری میسن کو اپنے اندر نمو کرنا چاہیے تھا، آگاہ کرسکے۔ حسناتِ ہفت یہ تھیں: 1۔ حزم واحتیاط (جماعت کے رازوں کی حفاظت کرنا) 2۔ جماعت کے اعلیٰ طبقوں کی اطاعت 3۔ اخلاقیات 4۔ بنی نوع انسان کی محبت 5۔ شجاعت 6۔ سخاوت 7۔ حُبِ مرگ۔

''جہاں تک ان میں سے ساتویں کا تعلق ہے،'' اتالیق نے کہا، ''موت کے بارے میں بار بار غور وفکر کرو اور اس کے متعلق یوں سوچو کہ یہ تمھاری دشمن نہیں، بلکہ دوست ہے... یہ اس زندگی سے جو رنج ومحن سے معمور ہے، روح کو، جو نیکی کی مشقتیں بھگت بھگت کر نڈھال ہو چکی ہے، رستگاری دلاتی ہے اور اسے جزا اور امن وسکون کے راستے پر ڈال دیتی ہے۔''

''ہاں، ہونا بھی بالکل یہی چاہیے،'' پیئر نے سوچا۔ اتالیق اپنی گفتگو ختم کر چکا اور باہر جا چکا تھا تاکہ وہ تنہائی میں غور وفکر کرسکے۔ ''لیکن میں ابھی تک اتنا کمزور ہوں کہ مجھے اپنی زندگی سے، جس کا مفہوم اب مجھ پر بتدریج منکشف ہو رہا ہے، پیار ہے۔'' لیکن جہاں تک پانچ دوسری حسنات — شجاعت، سخاوت، اخلاقیات، بنی نوع

انسان کی محبت اور سب سے بڑھ کر اطاعت — کا، جنھیں پیئر نے اپنی انگلیوں پر گن کر یاد کیا، تعلق تھا، اسے اپنے قلب و روح میں پہلے ہی جاری وساری محسوس ہوئیں۔ البتہ سب سے آخری — اطاعت — اس کے نزدیک اتنی حسنہ نہیں تھی جتنی کہ مسرت (اسے یہ محسوس کر کے قلبی مسرت ہو رہی تھی کہ اب وہ من مانی نہیں کر پائے گا بلکہ وہ ان لوگوں کے، جو ہر قسم کے شکوک سے پاک صداقت کے امین تھے، سامنے تسلیم خم کر دے گا)۔

رہ گئی حسنہ، ہفتم، وہ اسے بھول چکا تھا اور کوشش کے باوجود یاد نہ کر سکا۔

تیسری مرتبہ اتالیق جلدی واپس آ گیا اور پیئر سے دریافت کرنے لگا: ''کیا تم اب بھی اپنے عزم میں پختہ ہو اور وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جس کا تم سے مطالبہ کیا جائے گا؟''

''میں سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں،'' پیئر نے کہا۔

''میں تمھیں مزید مطلع کر دوں،'' اتالیق نے کہا، ''کہ ہماری جماعت محض الفاظ ہی کے ذریعے اپنے نظریات کی تدریس نہیں کرتی بلکہ دوسرے ذرائع بھی استعمال کرتی ہے۔ محض لفظی تدریس کی نسبت یہ ذرائع حکمت اور نیکی کے مخلص طالب پر غالباً زیادہ پرزور طریق سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اگر تمھارا قلب مصفا و مخلص ہے، تو اس کمرے اور اس کمرے میں موجود تمام اشیا نے، جو تمھیں نظر آ رہی ہیں، تم پر پہلے ہی اتنا کچھ واضح کر دیا ہو گا جس کا ابلاغ الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں، اور عین ممکن ہے کہ جماعت میں باضابطہ شرکت کی کارروائی کے دوران میں تمھیں ان سے ملتے جلتے آگہی کے طریقوں سے واسطہ پڑے۔ ہماری جماعت قدیم ترین معاشروں کے، جنھوں نے اپنی تعلیمات تصویری تحریروں کے ذریعے اجاگر کیں، نقشِ قدم پر چلتی ہے۔ تصویری تحریر،'' اتالیق نے بیان کیا، ''ایک ایسی چیز کا، جس کی حواس کے ذریعے پہچان ممکن نہیں لیکن جو ایسی خوبیوں سے جو علامت سے ملتی جلتی ہوتی ہیں بہرہ ور ہوتی ہے، نشان ہوتی ہے۔''

تصویری تحریر کیا ہوتی ہے، پیئر اس سے بخوبی آگاہ تھا، تاہم اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود کوئی بات کہہ سکے۔ وہ چپ چاپ اتالیق کی گفتگو سنتا رہا۔ اتالیق جو کچھ کہہ رہا تھا، اس سے پیئر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی آزمائش کی گھڑی آ پہنچی ہے۔

''اگر تم تہیہ کر چکے ہو، پھر مجھے جماعت میں تمھاری باضابطہ شرکت کی کارروائی کا آغاز کر دینا چاہیے،'' اتالیق نے پیئر کے قریب آ کر کہا۔ ''سخاوت کی نشانی کے طور پر تم اپنی تمام قیمتی اشیا میرے سپرد کر دو، یہ میرا مطالبہ ہے۔''

''لیکن یہاں تو میرے پاس کچھ بھی نہیں۔'' اس نے یہ فرض کر لیا تھا کہ اس کے پاس جو دھن دولت تھی، اسے اس سے دست بردار ہونے کے لیے کہا جا رہا ہے۔

''تمھارے پاس جو کچھ بھی ہے: گھڑی، رقم، انگوٹھیاں...''

پیئر نے بہ عجلت اپنا بٹوا اور جیبی گھڑی نکالی لیکن اس کی فربہ انگلی پر جو منگنی کی انگوٹھی تھی، اسے اتارنے کی کوشش میں اسے خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔ جب یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا، میسن نے کہا:

''اطاعت کی نشانی کے طور پر میں تم سے یہ کہوں گا کہ اپنے کپڑے اتار دو۔''

پیئر نے اتالیق کی ہدایت کے مطابق اپنا کوٹ، واسکٹ اور بایاں بوٹ اتار دیا۔ اتالیق نے اس کے سینے کے بائیں جانب سے اس کی قمیص سرکائی، نیچے جھکا اور اس کی پتلون کی بائیں ٹانگ گھٹنے سے اوپر تک کھینچ لی۔ پیئر جلدی جلدی اپنا دایاں بوٹ بھی اتارنے لگا اور وہ اپنی پتلون کی دوسری ٹانگ بھی خود ہی اوپر اٹھانے کا ارادہ کر رہا تھا تا کہ اجنبی کو کسی قسم کا تردد نہ کرنا پڑے لیکن میسن نے اسے بتا دیا کہ اس کی ضرورت نہیں ہے اور اس نے بائیں پاؤں میں پہننے کے لیے ایک سلیپر اسے تھما دیا۔ اپنی خواہش کے علی الرغم پیئر کے چہرے پر کچھ اس قسم کے آثار ہویدا ہو گئے جیسے وہ اندر ہی اندر شرمسار ہو رہا ہو، دبدھا میں پڑا ہوا اور اپنی ذات کا خود ہی تمسخر اڑا رہا ہو۔ اس کے لبوں پر بچوں کی معصوم مسکراہٹ تھی اور وہ اپنے برادر اتالیق کے سامنے یوں کھڑا تھا کہ اس کے بازو اس کے پہلوؤں کے ساتھ لٹک رہے تھے، اس کے پاؤں ایک دوسرے سے خاصے الگ تھلگ فرش پر گڑے تھے اور وہ اس کے مزید احکام کا انتظار کر رہا تھا۔

''اور آخر الامر، میں یہ کہوں گا کہ اگر تم واقعی مخلص ہو، پھر اس کی نشانی کے طور پر مجھے یہ بتاؤ کہ تمھارا جی سب سے زیادہ کس چیز پر للچاتا ہے؟'' میسن نے کہا۔

''میرا جی سب سے زیادہ کس چیز پر للچاتا ہے؟ ایسی تو بے شمار چیزیں ہیں!'' پیئر نے کہا۔

''صرف اس چیز کا نام لو جو باقی تمام اشیا کے مقابلے میں تمھیں کہیں زیادہ راہ راست سے بھٹکنے پر مجبور کرتی ہے،'' میسن نے کہا۔

پیئر نے توقف کیا۔ وہ جواب تلاش کر رہا تھا۔

''مے انگور؟ بسیار خوری؟ تن آسانی؟ آلکسی؟ تنک مزاجی؟ غصیلا پن؟ عورت؟'' وہ ایک ایک کر کے اپنی کمزوریوں کا شمار کرنے اور انھیں ذہن میں تولنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان میں سے کس کو اولیت دے۔

''عورت،'' اس نے زیر لب کہا۔ اس کی آواز بمشکل سنائی دے رہی تھی۔

اس جواب کے خاصی دیر بعد تک میسن نے نہ تو کوئی حرکت کی اور نہ وہ منہ سے کچھ گویا ہوا۔ آخر کار وہ پیئر کی جانب بڑھا، میز پر جو رومال پڑا تھا، اس نے اسے اٹھایا اور دوبارہ اس کی آنکھوں پر باندھ دیا۔

''میں آخری بار تم سے کہتا ہوں: اپنا پوری طرح محاسبہ کرو، اپنے حواس کو لگام دو، اپنی فرحت اپنی نفسانی خواہشات میں نہیں بلکہ اپنے قلب میں تلاش کرو... ہماری فرحت کا منبع ہمارے خارج میں نہیں، بلکہ ہمارے باطن میں ہے...''

پیئر فرحت کا یہ تازگی بخش منبع مدتوں پہلے ہی اپنے اندر محسوس کر چکا تھا اور اب اس کا سُرور پوری طرح اس کے حواس پر چھانے لگا۔

4

اس کے کچھ ہی دیر بعد تاریک کمرے میں اتالیق نہیں بلکہ اس کا سفارش کنندہ ولارسکی داخل ہوا۔ پیئر نے اسے اس کی آواز سے پہچانا تھا اور وہ اسے لینے آیا تھا۔ ولارسکی نے اس سے اس کے عزم کی پختگی کے بارے میں از سرِ نو پوچھ گچھ کی۔ جواب میں پیئر نے کہا:

''جی ہاں، جی ہاں، میں رضامند ہوں۔''

اور وہ آگے بڑھا۔ اس کے چہرے پر بچوں کی سی معصوم اور روشن و تابندہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس کے ایک پاؤں میں بوٹ اور دوسرے میں سلیپر تھا اور یوں اس کی چال میں ایک قسم کی ناہمواری اور جھجک آ گئی تھی۔ ادھر ولارسکی نے اس کے بھرے بھرے اور عریاں سینے پر برہنہ شمشیر ٹکائی ہوئی تھی۔ اسے کمرے سے باہر لایا گیا اور کبھی دائیں اور کبھی بائیں جانب مختلف غلام گردشوں میں گھمانے پھرانے کے بعد بالآخر لاج کے دروازوں پر پہنچا دیا گیا۔ ولارسکی کھنکھنارا۔ اس کے جواب میں میسنوں کے موگرے ٹکرائے گئے اور ان کے سامنے دروازے کھول دیے گئے۔ ایک کھنک دار آواز نے (پیئر کی آنکھوں پر ابھی تک پٹی بندھی ہوئی تھی) اس سے پوچھا: ''تم کون ہو؟ کہاں اور کب پیدا ہوئے؟'' وغیرہ وغیرہ۔ وہاں سے وہ اسے کسی اور طرف لے چلے۔ اس کی آنکھوں سے ابھی تک پٹی نہیں اتاری گئی تھی اور جب وہ چل رہا تھا، وہ اس کی ''یاترا'' کے دوران میں پیش آنے والی مشقتوں، مقدس دوستی، کائنات کے ازلی معمار، اور اس حوصلے کا جس کے ساتھ اس نے اپنی تمام مشقتوں اور خطروں کو برداشت کرنا تھا، بیان تمثیلی حکایتوں کے ذریعے کرتے رہے۔ اس ''یاترا'' کے دوران میں پیئر کو احساس ہوا کہ کبھی اسے ''طالب''، کبھی ''بلاکش'' اور کبھی ''امیدوار'' کہا گیا اور ہر خطاب پر موگروں اور شمشیروں کے ساتھ مختلف اقسام کی اصوات پیدا کی جاتی رہیں۔ جب اسے کسی شے کی جانب لے جایا جا رہا تھا، اسے معلوم تھا کہ اس کے رہبروں پر ہچکچاہٹ اور بوکھلاہٹ کی کیفیت طاری ہے۔ اس کے اردگرد جن لوگوں کا ہجوم تھا، وہ اسے ایک دوسرے کے ساتھ سرگوشیوں میں تکرار کرتے سنائی دیے اور ان میں سے ایک شخص اصرار کر رہا تھا کہ اسے ایک خاص قالین پر سے گزارا جائے۔ اس کے بعد انھوں نے اس کا دایاں ہاتھ پکڑا، اسے کسی چیز پر رکھا اور اس کے ساتھ ہی اسے حکم دیا کہ وہ اپنے دوسرے ہاتھ سے اپنے بائیں سینے پر پرکار رکھے اور جو شخص جماعت کے قوانین کے ساتھ وفاداری کے الفاظ کہہ رہا ہے، اس کی معیت میں انھیں دہراتا جائے۔ اس کے بعد موی شمعیں بجھا دی گئیں اور سپرٹ کا دیا روشن کر دیا گیا۔ پیئر نے اسے اس کی بو سے پہچانا۔ اسے بتایا گیا کہ اب وہ جو روشنی دیکھے گا، وہ کم تر ہو گی۔ اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی اور جلتی سپرٹ کی روشنی میں پیئر کو اپنے سامنے متعدد اشخاص یوں کھڑے نظر آئے جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ اتالیق کی طرح ان اشخاص کے اجسام پر ایپرن اور ہاتھوں میں تلواریں تھیں۔ ان تلواروں کا رخ اس کے سینے کی جانب تھا۔ ان لوگوں کے بیچ ایک شخص، جس کی سفید قمیص لہو سے داغ دار تھی، کھڑا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر

پیئر نے اپنا سینہ تلواروں کی جانب بڑھایا اور خود آگے چل پڑا۔ اس سے اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ چاہیں تو اس کی چھاتی چھلنی کر دیں۔ لیکن تلواریں واپس کھینچ لی گئیں اور پلک جھپکنے میں اس کی آنکھوں کی پٹی دوبارہ باندھ دی گئی۔

''اب تم کم تر روشنی دیکھ چکے ہو،'' ایک آواز نے کہا۔

تب مومی شمعیں دوبارہ روشن کر دی گئیں اور اسے بتایا گیا کہ اب وہ پوری روشنی دیکھ سکے گا۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے پٹی اتار دی گئی اور ایک درجن سے زیادہ آوازوں نے بیک وقت کہا: "Sic transit gloria mundi"*

پیئر بتدریج دوبارہ اپنے آپ میں آنے لگا۔ اس نے کمرے میں چاروں اطراف نگاہیں دوڑائیں اور اس میں موجود لوگوں کو دیکھا۔ ایک طویل کشادہ میز کے، جس پر سیاہ میز پوش بچھا تھا، اردگرد تقریباً بارہ اشخاص بیٹھے تھے۔ وہ وہی ملبوسات، جو وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا، پہنے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض کے ساتھ اس کی پیٹرزبرگ کے اعلیٰ طبقوں کی محفلوں میں ملاقات ہو چکی تھی۔ کرسی صدارت پر ایک نوجوان شخص متمکن تھا۔ اس کے گلے میں عجیب وغریب قسم کی انجیل حمائل تھی۔ پیئر اسے نہیں جانتا تھا۔ اس کی دائیں جانب اطالوی صدر راہب، جس سے دو سال قبل پیئر کی آنا پاولوونا کے ہاں ملاقات ہوئی تھی، بیٹھا تھا۔ دوسرے لوگوں میں ایک اہم شخصیت تھی اور ایک سوستانی ٹیوٹر بھی، جو کوراگنوں کے ہاں ہوتا تھا، موجود تھا۔ سبھی خاموش تھے اور ان کے چہروں پر سنجیدگی اور متانت جھلک رہی تھی۔ وہ نہایت توجہ اور انہماک کے ساتھ صدر کی، جس کے ہاتھ میں موگرا تھا، گفتگو سن رہے تھے۔ دیوار کے طاق میں ستارہ نما شمع نصب تھی۔ میز کے ایک جانب ایک چھوٹا غالیچہ، جس میں رنگارنگ تصاویر بافتہ تھیں، اور دوسری جانب مائدۂ مقدسہ، جس پر اناجیل اربعہ اور ایک کھوپڑی رکھی ہوئی تھی، پڑی تھی۔ میز کے اردگرد بالکل اسی قسم کے، جیسے کہ کلیساؤں میں استعمال ہوتے ہیں، سات بھاری بھرکم شمع دان ایستادہ تھے۔ دو برادران پیئر کو مائدۂ مقدسہ کے قریب لے گئے۔ انھوں نے اس کے پاؤں زاویہ قائمہ پر ٹکائے، اور اسے یہ بتاتے ہوئے کہ اسے ہیکل کے صدر دروازوں کے سامنے سجدہ ریز ہو جانا چاہیے، اسے نیچے لیٹنے کا حکم دیا۔

''اسے سب سے پہلے کرنی** ملنا چاہیے،'' ایک برادر نے سرگوشیوں میں کہا۔

''جناب، ذرا خاموش رہیں،'' دوسرے نے کہا۔

پیئر بوکھلا گیا۔ اس نے حکم کی تعمیل کیے بغیر اپنی چندھی آنکھوں سے چاروں اطراف دیکھا اور ایکا ایکی اس کے دل میں شکوک وشبہات نے گھر کر لیا۔ ''میں کہاں ہوں؟ میں کیا کر رہا ہوں؟ کیا یہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں؟ جب مجھے یہ باتیں یاد آیا کریں گی، مجھے شرمندگی تو محسوس نہیں ہوا کرے گی؟'' لیکن یہ شکوک وشبہات صرف

---

* دنیوی جاہ وحشمت یونہی انجام پذیر ہوتی ہے۔

** معماروں کا اوزار، جس سے گارا بچھاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فری میسنوں کا ایک فرض ہیکل سلیمانی کی تعمیر نو ہے اور یہ اوزار اس کی علامت ہے۔

گھڑی کے گھڑی رہے۔ اپنے گرد و پیش سنجیدہ شکلیں دیکھتے اور جن مراحل میں سے وہ اب تک گزرا تھا، انھیں یاد کرتے اسے احساس ہوا کہ اب وہ یہ کام ادھورا چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔ وہ اپنی ہچکچاہٹ پر ٹپٹا گیا اور اپنی لگن کے سابقہ جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش میں ہیکل کے صدر دروازوں کے سامنے سجدہ ریز ہو گیا اور واقعی عبودیت کے یہ جذبات دوبارہ اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پرزور بن کر امڈ آئے۔ وہ کچھ دیر یونہی سجدہ ریز رہا، پھر اسے اٹھنے کا حکم دیا گیا اور اسی قسم کا سفید چرمی ایپرن، جیسا کہ دوسروں نے پہنا ہوا تھا، اسے اوڑھا دیا گیا۔ ایک کرنی اور دستانوں کے تین جوڑے اسے تھما دیے گئے اور گرینڈ ماسٹر اس سے مخاطب ہوا۔ ''اس ایپرن کی سپیدی کبھی داغ دار نہ ہونے دینا،'' اس نے کہا، ''یہ سپیدی قوت اور پاکیزگی کی علامت ہے۔'' پھر اس نے پراسرار کرنی کی وضاحت کرتے ہوئے کہا: ''تمھیں اس کی مدد سے دل کی سیاہی کھرچنا ہوگی اور ضبط و تحمل سے کام لے کر برادر انسانوں کے قلوب کی سلوٹیں دور کرنا ہوں گی۔ جہاں تک دستانوں کی پہلی جوڑی کا تعلق ہے، یہ مردانہ دستانے ہیں، تمھیں ان کی اہمیت کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جائے گا لیکن تمھیں انھیں اپنے کلیجے سے لگا کر رکھنا ہوگا۔ دوسری جوڑی بھی مردانہ ہے۔ انھیں تم لاج کی مجالس میں پہنا کرو گے۔'' دستانوں کی تیسری جوڑی زنانہ تھی۔ ان کے متعلق اس نے کہا:

''برادر عزیز، یہ زنانہ دستانے بھی تمھارے ہی لیے ہیں۔ انھیں اس خاتون کی، جس کی تم باقی خواتین سے زیادہ عزت کرو گے، خدمت میں پیش کرنا۔ اس تحفے کے ذریعے تم اسے، جسے تم میسنری کے کاموں میں اپنی رفیق بنانے کے مستحق سمجھو گے، یہ پیمان دے سکو گے کہ اس کے بارے میں تمھارا دل صاف ہے اور اس میں کوئی کھوٹ نہیں۔'' اس نے کچھ دیر توقف کیا اور پھر بولا: ''برادر، اس بات کا خیال رکھنا کہ یہ دستانے کبھی ناپاک ہاتھوں کی زینت نہ بننے پائیں۔''

پیئر کو محسوس ہوا کہ گرینڈ ماسٹر جب یہ آخری کلمات کہہ رہا تھا، وہ کچھ گھبرا اور شرما رہا تھا۔ خود پیئر پر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ گھبراہٹ اور شرم ساری طاری ہو گئی۔ وہ بچوں کی طرح شرما رہا تھا اور اس کی آنکھیں قریب قریب ڈبڈبانے لگیں۔ وہ بے قراری سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا اور محفل پر بے ڈھب سی خاموشی چھا گئی۔

بالآخر ایک برادر نے مہر سکوت توڑی۔ وہ پیئر کو غالیچے کے قریب لے گیا۔ وہاں ایک مسودہ، جس کے اندر مختلف اقسام کی اشیا — سورج، چاند، ہتھوڑی، *ساقول، کرنی، ایک بے ڈھنگے انداز سے تراشیدہ پتھر اور ایک مکعبی پتھر، ستون، اور تین دریچوں وغیرہ — کی تصاویر منقوش تھیں، پڑا تھا۔ وہ مسودے میں سے ان تمام اشیا کی تشریح و تعبیر کی خواندگی کرنے لگا۔ اس کے بعد پیئر کے لیے جگہ متعین کر دی گئی۔ اسے لاج کی نشانیاں دکھائی گئیں، اسے پاس ورڈ (شناخت کا خفیہ لفظ) بتایا گیا اور آخر کار اسے بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی۔ گرینڈ ماسٹر نے قوانین و ضوابط پڑھنا شروع کر دیے۔ یہ بہت طویل تھے۔ پیئر پر شادمانی، گھبراہٹ اور شرم ساری کے ملے جلے جذبات طاری تھے۔ اس لیے جو کچھ پڑھا جا رہا تھا، وہ اس کیفیت میں نہیں تھا کہ اسے پوری طرح سمجھ سکے، وہ قوانین کے صرف آخری الفاظ پر

* معماروں کا آلہ، جس سے دیوار کی سیدھ معلوم کی جاتی ہے: پنسال، لٹکن، ساہل۔

صحیح معنوں میں توجہ دے سکا اور یہ اس کے حافظے پر نقش ہو گئے۔

''ہمارے ہیکلوں کا یہ دستور ہے،'' گرینڈ ماسٹر نے پڑھا،'' کہ ہم یہاں صرف نیکی اور بدی کے مابین امتیاز برتتے ہیں، اس کے علاوہ ہم اور کسی قسم کے امتیاز کے قائل نہیں۔ اس قسم کے تمام امتیازات، جو مساوات کی حدود پھلانگ جائیں، برتنے سے احتراز کرو۔ جو برادر، خواہ وہ کوئی ہو، مصیبت میں گرفتار ہو، اس کی مدد کے لیے لپکو، جو راہ راست سے بھٹک جائے، اسے سمجھاؤ، جو قعر مذلت میں گر پڑے، اس کا ہاتھ تھام لو، کسی برادر کے لیے دل میں کینہ، بغض یا عداوت نہ پالو۔ شفقت اور شائستگی کو اپنا شعار بناؤ۔ سب دلوں میں نیکی کی جوت جلاؤ۔ پڑوسیوں کو اپنی خوشیوں میں شریک کرو اور خدا کرے کہ اس نعمت کی پاکیزگی کبھی حسد کے گدلے پانی سے داغ دار نہ ہو۔

''اپنے دشمن کو معاف کر دو۔ اس کے ساتھ بھلائی کرو، اس کے علاوہ اس سے اور کوئی انتقام نہ لو۔ اعلیٰ ترین قانون کی اس طریقے سے تعمیل کر کے تم اس قدیم عز و وقار کا، جس سے تم محروم ہو چکے ہو، کھوج لگا سکو گے۔''

گرینڈ ماسٹر نے اپنا بیان ختم کیا۔ وہ اٹھا، پیئر سے بغل گیر ہوا اور اس نے اس کا منہ چوم لیا۔

پیئر نے اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ اس کی آنکھوں میں مسرت و شادمانی کے آنسو تیر رہے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کے واقف کار، جنھوں نے اس کے ارد گرد جمگھٹا کر رکھا تھا، اسے جو تہنیتیں اور مبارک بادیاں پیش کر رہے تھے، وہ ان کا کیسے جواب دے۔ وہ انھیں واقف کار تسلیم نہیں کر رہا تھا! اس کے نزدیک وہ سب اس کے برادر تھے اور وہ ان کی معیت میں کام کرنے کے لیے بہت بے قرار تھا۔

گرینڈ ماسٹر نے اپنا موگرا میز پر مارا اور سب لوگ اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ان میں سے ایک اٹھا اور عجز و انکسار کی ضرورت کے بارے میں اپدیش پڑھنے لگا۔

گرینڈ ماسٹر نے تجویز پیش کی کہ اب آخری فریضہ ادا ہو جانا چاہیے اور اہم شخصیت، جس کے پاس ''دان بٹورو'' کا عہدہ تھا، باری باری سب برادران کے پاس گیا۔ پیئر کے پاس جو کچھ تھا، اس کا جی چاہتا تھا، وہ سب چندے میں دے دے لیکن اسے اندیشہ تھا کہ کہیں اسے متکبر نہ سمجھ لیا جائے، چنانچہ اس نے بھی اتنی ہی رقم، جتنی کہ دوسروں نے لکھی تھی، لکھ دی۔

اجلاس ختم ہو گیا اور جب پیئر گھر پہنچا، اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک ایسے سفر سے، جس کا دورانیہ درجنوں برسوں پر محیط تھا، واپس آیا ہے، اس کی بالکل کایا کلپ ہو چکی ہے اور وہ اپنی سابقہ عادات و اطوار کو کہیں پیچھے چھوڑ آیا ہے۔

5

لاج میں داخلہ حاصل کرنے کے اگلے روز پیئر گھر بیٹھا کتاب پڑھ رہا تھا اور وہ مربعے (Square) کی، جس کا ایک کنارا خدا، دوسرا عالم اخلاق، تیسرا عالم خاکی اور چوتھا ان سب کے مجموعے کی علامت تھا، اہمیت سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ کتاب نیچے رکھ دیتا اور اپنے تخیل میں زندگی کا نیا منصوبہ ترتیب دینے لگتا۔ گزشتہ شام لاج

میں اسے بتایا گیا تھا کہ اس کی ڈوئیل کی افواہ زار تک پہنچ چکی ہے اور اس کے لیے مناسب یہی رہے گا کہ وہ کچھ مدت کے لیے پیٹرز برگ سے کہیں باہر چلا جائے۔ پیئر نے تجویز پیش کی کہ وہ جنوب میں واقع اپنی جاگیر پر چلا جائے گا اور وہاں اپنی زرعی غلاموں کی بہبود کے لیے کام کرے گا۔ وہ اپنی نئی زندگی کو کچھ اسی نہج پر استوار کرنے کے منصوبے باندھ رہا اور جی ہی جی میں بہت خوش ہو رہا تھا کہ غیر متوقع طور پر پرنس واسیلی کمرے میں داخل ہوا۔

''مائی ڈیئر فیلو، یہ تم ماسکو میں کیا گل کھلا کر آئے ہو؟ 'mon cher'* یہ تم نے ایلینا سے جھگڑا کیوں کیا ہے؟ تم ضرور کسی غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہو،'' پرنس واسیلی نے کمرے میں داخل ہونے پر کہا۔ ''مجھے اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے اور میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ ہیلین تمھارے حضور بالکل اسی طرح معصوم اور منزہ عن الخطا ہے، جس طرح یہودیوں کے سامنے حضرت عیسیٰ تھے۔''

پیئر نے جواب میں کچھ کہنا چاہا لیکن پرنس واسیلی بھانپ گیا کہ وہ کیا کہنا چاہتا ہے اور اس نے اسے بیچ ہی میں ٹوک دیا۔

''تم دوست کی طرح سیدھے میرے پاس کیوں نہ آئے؟ مجھے اس بارے میں سب کچھ معلوم ہے، میں سب کچھ سمجھتا ہوں،'' اس نے کہا۔ ''تمھارا رویہ بالکل اس شخص کے، جسے اپنی عزت کا پاس ہو، شایانِ شان تھا۔ غالباً تم نے ذرا عجلت پسندی کا مظاہرہ کیا لیکن ہم اس سلسلے میں مغز کھپائی نہیں کریں گے۔ تاہم تمھیں ایک بات پر توجہ دینا ہوگی اور وہ بات یہ ہے کہ ذرا سوچو کہ تم (اپنے اس رویے سے) میری اور اس کی معاشرے بلکہ دربار کی نگاہوں میں کیا گت بنا رہے ہو،'' اس نے اپنی آواز مدھم کرتے ہوئے مزید کہا۔ ''وہ ماسکو میں دن گزار رہی ہے اور تم یہاں پڑے ہو۔ عزیزم، اب جانے دو، کافی ہو گئی ہے،'' اس نے پیئر کو بازو سے گھسیٹ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''(تم دونوں کے مابین جو کچھ ہوا ہے) وہ سراسر غلط فہمی کی پیداوار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم خود بھی محسوس کرتے ہو گے۔ آؤ، ہم ابھی مل جل کر اسے خط تحریر کیے دیتے ہیں، وہ یہاں آجائے گی۔ ہر بات آئینے کی طرح صاف روشن ہو جائے گی اور سب یاوہ گویوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ورنہ میرے عزیز، میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔''

پرنس واسیلی نے پیئر کو معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

''مجھے مصدقہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ مادر امپراطورہ اس سارے معاملے میں گہری دلچسپی لے رہی ہیں۔ تم جانتے ہو کہ وہ ہیلین پر بہت مہربان ہیں۔''

پیئر نے متعدد بار کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن ایک طرف تو پرنس واسیلی اسے کوئی موقع نہیں دے رہا تھا اور دوسرے خود پیئر کو بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ وہ کوئی ایسا لہجہ، جس سے فیصلہ کن انکار اور اختلاف مترشح ہوتا ہو، اختیار کرے حالانکہ وہ یہ پختہ تہیہ کر چکا تھا کہ وہ اپنے سسر کو اسی انداز سے جواب دے گا۔ مزید برآں فری میسن تحریک کا یہ فرمان

* مائی ڈیئر۔

کہ ''شفقت اور شائستگی کو اپنا شعار بناؤ'' اس کے کانوں میں گونج رہا تھا۔ اس کی بھویں تن گئیں اور گال تمتمانے لگے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور دوبارہ نیچے بیٹھ گیا۔ وہ وہ کام، جو اسے زندگی کا دشوار ترین کام۔ کسی شخص کے، خواہ وہ کوئی ہی کیوں نہ ہو، منہ پر کچھ کہنا، اسے کوئی ایسی بات سنانا جس کا اسے سان گمان بھی نہ ہو۔ معلوم ہوتا تھا، کرنے کی سعی کر رہا تھا۔ پرنس واسیلی کا بات کرنے اور حکم چلانے کا جو پُر اعتماد اور لاپروایانہ انداز تھا، وہ اس کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ اسے یہ احساس ستانے لگا کہ اب بھی اس میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ اس کی مزاحمت کر سکے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ اب کہے گا اسی پر اس کے سارے مستقبل کا دارومدار ہوگا: اس سے یہ طے پا جائے گا کہ آیا وہ اپنی گزشتہ روش پر گامزن رہے گا یا نیا راستہ، جس کی میسوں نے اس کے سامنے دلکش اور دل آویز تصویر کشی کی تھی اور جس کے متعلق اسے پکا یقین تھا کہ وہ اس پر چل کر حیات نو پا لے گا، تراشے گا۔

''عزیزم، چلو، جانے دو،'' پرنس واسیلی نے دل لگی کے انداز سے کہا۔ ''صرف 'ہاں' کہہ دو۔ اسے میں خود خط لکھ دوں گا۔ پھر ہم موٹا تازہ بچھڑا ذبح کریں گے۔''

لیکن پیشتر اس کے کہ پرنس واسیلی اپنی مسخرگی کو انجام تک پہنچاتا، پیئر نے اس کی جانب دیکھے بغیر اور اپنے چہرے پر شدید خفگی کے آثار پیدا کرتے، جنھوں نے اس کے باپ کی یاد تازہ کر دی، ایسی آواز سے جو سرگوشی سے ملتی جلتی تھی، ہکلا کر کہا:

''پرنس، میں نے آپ کو یہاں نہیں بلایا تھا۔ آپ تشریف لے جائیں، برائے مہربانی تشریف لے جائیں!'' اور اس نے اپنی نشست سے جست لگائی اور لپک کر دروازہ کھول دیا۔ ''تشریف لے جائیں!'' اس نے دہرایا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس پر خود اسے بھی اچنبھا ہو رہا تھا لیکن پرنس واسیلی کے چہرے پر جو بوکھلاہٹ اور دہشت نظر آ رہی تھی، وہ اس پر محظوظ بھی ہو رہا تھا۔

''کیا بات ہے؟ تم بیمار تو نہیں؟''

''تشریف لے جائیں،'' تہدید آمیز آواز پھر دہاڑی۔

اور پرنس واسیلی کو جاتے ہی بنی۔ اسے اس سلوک کی کوئی توجیہہ نہ ملی۔

اس کے ایک ہفتہ بعد پیئر نے اپنے نئے دوستوں، میسوں، کو خیراتی مقاصد کے لیے خاصی بڑی رقم تھمائی، ان سے اجازت چاہی اور اپنی جاگیر کی سمت عازمِ سفر ہو گیا۔ اس کے تازہ برادران نے اسے کیف اور اوڈیسا کے میسوں کے نام خطوط دیے اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ اسے خطوط لکھتے اور زندگی کی نئی سرگرمیوں کے بارے میں اس کی رہنمائی کرتے رہیں گے۔

6

پیئر اور دولوخوف کے مابین جو ڈوئیل ہوئی تھی، اس پر پردہ ڈال دیا گیا اور اگرچہ اس عہد میں ڈوئیل بازی کے بارے میں

زار کا رویہ خاصا سخت تھا، ڈوئیل کے اصل حریفوں اور ان کے معاونین کو کوئی گزند نہ پہنچا۔ تاہم ڈوئیل کی 'داستان'، جس کی تصدیق پیئر اور اس کی بیوی کے مابین انقطاعِ تعلقات سے ہوگئی تھی، اعلیٰ طبقے کی محافل کا موضوعِ گفتگو بنی رہی۔ جب پیئر کی حیثیت ولد الحرام پسر کی تھی، اس کے بارے میں اونچے خاندانوں کے لوگوں کا رویہ سرپرستانہ اور مربیانہ تھا۔ جب پوری سلطنت روس میں وہ شادی کے لیے بہترین بر متصور ہوتا تھا، ہر کوئی اس کی تعریفوں کے پل باندھتا اور اس کی خایہ بوسی کرتا تھا۔ لیکن جب اس کی شادی ہوگئی اور ان دوشیزاؤں، جو شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھیں، اور ان کی ماؤں کے لیے امید کی کوئی کرن باقی نہ رہ گئی، اعلیٰ طبقے کے لوگوں کی نظروں میں بھی اس کی کوئی وقعت نہ رہ گئی— یہ اس لیے بھی ہوا کیونکہ لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنے کا نہ اسے ہنر آتا تھا اور نہ اسے اس قسم کا کوئی شوق تھا۔ چنانچہ اب جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس کا الزام اسی کے سر منڈھا جانے لگا۔ اس کے متعلق کہا جانے لگا کہ وہ جنون کی حد تک حاسد ہے اور اپنے باپ کی طرح خون آشام غیظ و غضب کے تابع ہے۔ اور جب پیئر کی روانگی کے بعد ہیلین واپس پیٹرز برگ آئی، اس کے تمام دوستوں اور میل ملاقاتیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا، بلکہ تقدیر نے اس کے ساتھ جو ہاتھ کیا تھا، اس کی بنا پر اسے سر آنکھوں پر بٹھایا گیا۔ اگر کبھی گفتگو کے دوران میں ہیلین کے شوہر کا ذکر آجاتا، اس کی مخصوص سوجھ بوجھ اور معاملہ فہمی اس کے آڑے آتی اور وہ آناً فاناً اپنے چہرے پر پروقار متانت طاری کر لیتی حالانکہ اسے قطعاً یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ اس کے اس رویے سے دوسرے متاثر ہوتے بھی ہیں یا نہیں۔ تاہم اس کی اس متانت سے یہ ضرور مترشح ہوتا کہ اس نے اپنی ابتلا کو بہ صبر و سکون برداشت کرنے کا تہیہ کر لیا ہے اور اس کی زبان پر شکائتیں یا حکائتیں، کچھ بھی نہیں آئے گا۔ رہا اس کا شوہر، وہ ایک ایسی مصیبت تھا جو خداوند نے اس پر نازل کی تھی اور وہ اسے برداشت کرنے پر مجبور تھی۔ جہاں تک پرنس واسیلی کا تعلق ہے، وہ اپنی رائے کا اظہار کھلے بندوں لگی لپٹی رکھے بغیر کرتا تھا۔ جب کبھی پیئر کا ذکر آتا، وہ اپنے کندھے جھٹکاتا اور اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کر کے کہتا:

''پاگل ہے— میں ہمیشہ یہی کہتا رہا ہوں۔''

''میں نے تو شروع میں ہی کہہ دیا تھا،'' آننا پاولوونا نے پیئر کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے تو اسی وقت ہی جب کسی شخص کو اس کا اندازہ بھی نہیں ہوا تھا، کہہ دیا تھا'' (وہ ہر دم یہ اصرار کرتی تھی کہ اولیت کا سہرا ہمیشہ اسی کے سر بندھتا ہے) ''کہ اس عہد کے فاسقانہ تصورات نے اس باؤلے نوجوان کا بھٹا بٹھا دیا ہے۔ جب یہ نوجوان نیا نیا پردیس سے واپس آیا تھا اور آپ کو یاد ہوگا کہ میری محفل میں اس نے اپنے آپ کو ایک قسم کا ماغا بنا[8(الف)] کر پیش کرنے کی کوشش کی تھی اور سب لوگ اس کے قصیدے پڑھ رہے تھے، میں نے اسی وقت ہی یہ کہہ دیا تھا۔ اور جو انجام ہوا، وہ آپ کے سامنے ہی ہے۔ میں اس وقت بھی اس شادی کے خلاف تھی اور جو کچھ وقوع پذیر ہوا ہے، میں نے اس کی پیشین گوئی بھی کر دی تھی۔''

آننا پاولوونا جس شام فارغ ہوتی، وہ حسب معمول اس روز محفل منعقد کرتی— اس قسم کی محافل سجانے کا ملکہ صرف اسے ہی حاصل تھا— اور خود اس کے اپنے الفاظ میں ان محافل میں "la creme de la veritable

le fine fleur de l`essence intellectuelle de la societe de bonne societe, "Petersbourg" شریک ہوتی تھی۔ اس کے استقبالیوں میں جو لوگ آتے تھے، وہ ان کے مابین اس طرح کھرے کھوٹے کی تمیز تو روا رکھتی ہی تھی لیکن اس سے بڑھ کر وہ ایک کام اور کرتی تھی: وہ اپنی ہر دعوت میں اپنے مہمانوں کو کسی نئی اور دلچسپ شخصیت سے لازماً متعارف کراتی تھی اور یوں پیٹرزبرگ کے اصیل درباری طبقے کا جو درست اور صحیح سیاسی پیمانہ یہاں پڑھنے کو ملتا تھا، کسی اور جگہ دستیاب نہیں ہوسکتا تھا۔

نپولین نے جینا اور اورسٹٹ کے مقامات پر پرشیا کی افواج کو جو عبرت ناک شکست دی تھی اور پرشیا کے بیشتر قلعے جس طرح اس کے قبضے میں چلے گئے تھے، اس کی دل خراش تفصیلات 1806 کے اختتام تک روس میں موصول ہوچکی تھیں۔ دریں اثنا ہماری افواج پرشیا میں داخل ہوچکی تھیں اور نپولین کے خلاف ہماری دوسری مہم کا آغاز ہوچکا تھا۔ اسی زمانے میں آنا پاولونا نے اپنی ایک محفل کا اہتمام کیا۔ یہ محفل La creme de la veritable bonne societe یعنی پرکشش لیکن بدقسمت ہیلین، جس کا شوہر اس سے کنارہ کشی کرچکا تھا، موخت ماغ، خوش باش اپولیت، جو حال ہی میں ویانا سے واپس آیا تھا، دو سفارت کاروں، معمر آنٹی، ایک نوجوان، جسے اس ڈرائنگ روم میں محض ''گوناگوں خوبیوں کا مالک شخص'' (Un hommee de beaucoup de merite) کی حیثیت سے متعارف کرایا گیا، ایک خاتون، جو پچھلے دنوں لیڈی ان ویٹنگ مقرر ہوئی تھی، اس کی والدہ اور متعدد نسبتاً کم اہم شخصیات پر مشتمل تھی۔

آنا پاولونا اس موقع پر جس نئی نویلی ہستی کو پیش کررہی تھی، وہ بورس دروبتیسکوئے[8(ب)] تھا۔ وہ انھی دنوں پرشیا کی افواج کا خاص پیغام لے کر آیا تھا اور ایک نہایت ہی اہم شخصیت کا ایڈی کانگ تھا۔

اس مخصوص شام حاضرین کو جو مخصوص سیاسی پیمانہ نظر آیا، وہ یہ تھا: ''یورپ کے بااختیار حکمران مجھے اور عمومی طور پر ہمیں جھنجھلاہٹ میں مبتلا کرنے اور ذہنی اذیت پہنچانے کی خاطر بوناپارٹ کی خواہ کتنی ہی حوصلہ افزائی کیوں نہ کریں، بوناپارٹ کے بارے میں ہماری رائے میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ اس موضوع کے متعلق ہمارے جو خیالات ہیں، ہم انھیں چھپائیں گے نہیں، بلکہ ان کا کھلم کھلا اظہار کرتے رہیں گے۔ جہاں تک پرشیا کے بادشاہ اور دوسرے لوگوں کا تعلق ہے، ہم صرف اتنا ہی کہہ سکتے ہیں: 'خدا تمھارا اس سے بھی زیادہ خانہ خراب کرے۔ تم نے جو بویا، اب وہ کاٹو۔' بس ہم یہی کہہ سکتے ہیں۔'' اس شام آنا پاولونا کی محفل کا سیاسی پیمانہ یہی کچھ ہی ظاہر کررہا تھا۔

جب بورس، جسے اس شام کا بہترین لقمہ بنا کر پیش کیا جانا تھا، ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، تقریباً تمام مدعوئین آچکے تھے اور گفتگو، جس کے تار آنا پاولونا ہلا رہی تھی، آسٹریا کے ساتھ ہمارے سفارتی تعلقات اور اس کے ساتھ معاہدے کی توقع کے بارے میں ہو رہی تھی۔

بورس ایڈی کانگ کی خوش وضع اور خوش قطع وردی میں ملبوس تھا۔ اس کا چہرہ سرخ وسپید اور تروتازہ تھا اور اس

• پیٹرزبرگ کے صحیح معنوں میں اعلیٰ طبقے کے بہترین اشخاص اور دانش ور طبقے کے چنیدہ اصحاب

کی شکل وصورت پر مردانگی کی چھاپ تھی۔ وہ فطری خود اعتمادی سے قدم اٹھاتا اندر آیا اور اسے حسب دستور معمر آنٹی کی خدمت میں پیش کیا گیا تاکہ وہ اسے سلام عرض کر سکے۔ اس کے بعد اسے عمومی حلقے میں واپس لایا گیا۔

آنا پاؤلوونا نے اپنا سوکھا سڑا اور جھریوں زدہ ہاتھ اسے تھما دیا تاکہ وہ اس پر بوسہ ثبت کر سکے۔ پھر وہ مختلف ہستیوں سے، جن سے وہ واقف نہیں تھا، اس کا تعارف کرانے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اس کے کان میں ہر شخص کا عہدہ اور اس کے اوصاف بتاتی گئی۔

"پرنس اپولیت کوراگن — سحر انگیز شخصیت کا مالک نوجوان، موسیو کراؤگ — عظیم دانشور اور کوپن ہیگن (ڈنمارک) کے ناظم الامور، موسیو شیتوف، گوناگوں خوبیوں کے مالک۔"

کچھ بھاگ دوڑ آنا میخائیلوونا نے کی تھی اور کچھ بورس کی اپنی محتاط پسند طبیعت کے میلانات اور خصوصیات نے رنگ دکھایا تھا۔ ان سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ملازمت میں نہایت منفعت بخش مقام پر پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ وہ ایک ممتاز اور عالی مرتبت شخص کا ایڈی کانگ مقرر ہو چکا تھا، اسے نہایت اہم مشن پر پرشیا بھیجا گیا تھا اور وہاں سے وہ ابھی ابھی ایلچی کی حیثیت سے واپس آیا تھا۔ ملازمت کے غیر تحریری قواعد وضوابط، جنھوں نے اول موٹس کے مقام پر اس کی نس نس میں خوشی کی لہر دوڑا دی تھی، وہ پوری طرح جذب کر چکا تھا۔ ان قواعد کی رو سے لیفٹیننٹ کو جرنیل کے مقابلے میں کہیں اونچا مقام حاصل ہو سکتا تھا۔ ملازمت میں کامیابی کے لیے جن اوصاف کی ضرورت پیش آ سکتی تھی، وہ محنت، جدوجہد، شجاعت یا ثابت قدمی نہیں بلکہ محض آپ کی یہ صلاحیت تھی کہ آپ ان لوگوں کے، جو انعام وکرام عطا کرنے اور ترقی و درجات بلند کرنے کی حیثیت میں تھے، نباہ کر سکتے ہیں یا نہیں — اسے جس تیز رفتاری سے پے درپے ترقیاں ملیں اور دوسروں کو ان امور کے سمجھنے میں جو ناکامی ہوئی، اس پر وہ خود اکثر متحیر ہوا کرتا تھا۔ اس دریافت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے طرز حیات، اپنے پرانے دوستوں اور واقف کاروں سے تعلقات اور اپنے مستقبل کے بارے میں اس کے منصوبوں کی نوعیت یکسر تبدیل ہو گئی۔ وہ سیم وزر میں نہیں کھیلتا تھا اور نہ روپیہ اس کے ہاتھ کی میل تھا لیکن وہ دوسروں سے بہتر لباس پہننے کے لیے اپنی آخری کوڑی بھی خرچ کر دیتا۔ وہ پیٹ پر پتھر باندھ لیتا اور زمانے کی بے شمار تفریحات سے منہ موڑ لیتا لیکن وہ یہ کبھی گوارا نہ کرتا کہ وہ پیٹرز برگ کے گلی کوچوں میں کسی خستہ گاڑی یا پھٹی پرانی وردی میں نظر آئے۔ وہ صرف ایسے لوگوں سے، جو مرتبے میں اس سے بلند تر تھے اور یوں اس کے کام آ سکتے تھے، تعلقات استوار کرنے کی کوشش کرتا۔ وہ پیٹرز برگ پر جان چھڑکتا اور ماسکو سے گھن کھاتا تھا۔ رستوفوں کے گھرانے اور نتاشا کے ساتھ اپنی بچگانہ محبت سے اس کا دل بھر چکا تھا اور ان کی یاد اس کے لیے سوہان روح تھی۔ وہ جس روز فوج میں شمولیت اختیار کرنے کی غرض سے ماسکو سے روانہ ہوا تھا، اس کے بعد وہ ان کے ہاں ایک بار بھی نہیں گیا تھا۔ آنا پاؤلوونا کی محفل میں باریابی کو وہ اپنی ترقی کے لیے اہم قدم تصور کرتا تھا۔ وہ جونہی وہاں پہنچا، وہ فی الفور تاڑ گیا کہ اس سے کس کردار کی توقع کی جا رہی ہے۔ چنانچہ اس نے مکمل طور پر اپنے آپ کو اپنی میزبان کی تحویل میں دے دیا تاکہ وہ اپنے مہمانوں کی دلچسپی کی خاطر اسے جس قسم کے مصرف میں لانا

چاہے، لاسکے۔ لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، وہ ایک ایک چہرے کا بغور مشاہدہ کرنے اور اس بات کا جائزہ لینے لگا کہ جو اشخاص وہاں موجود ہیں، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے فوائد اور امکانات کیا ہیں۔ اسے جس نشست کی طرف اشارہ کیا گیا، وہ حسین و جمیل ہیلین کے قریب تھی، وہ اس پر بیٹھ گیا اور عمومی گفتگو بغور سننے لگا۔

''مجوزہ معاہدہ[9] جن اساسات پر طے ہونا پایا ہے، ویانا انھیں اتنا ناقابلِ حصول سمجھتا ہے کہ پے در پے زبردست اور شاندار فتوحات بھی حاصل ہو جائیں، پھر بھی انھیں امکانات کے دائرے میں نہیں لایا جا سکے گا اور اسے یہ بھی شبہہ ہے کہ انھیں پانے کے لیے ہمارے پاس کوئی وسائل موجود نہیں۔ 'یہ ویانا وزارت کے اصل الفاظ ہیں،'' ڈنمارک کے ناظم الامور نے کہا۔

''ان کا یہ شک و شبہ ہمیں یہ تاثر دیتا ہے کہ ہم بہت مضبوط ہیں لیکن حقیقتاً شاید ایسا نہیں،'' عظیم دانشور[10] نے گھٹنے پن سے مسکرا کر کہا۔

''ہمیں ویانا وزارت اور امپراطور آسٹریا کے مابین حدِ فاصل کھینچنا ہوگا،'' موخت ماغ نے کہا۔ ''امپراطور آسٹریا کے دماغ میں ایسی بات کبھی نہیں آسکتی۔ صرف وزارت ہی نے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔''

"Ah, mon cher vicomte"* آنا پاولوونا نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔[11] "l'Urope" (پتا نہیں اس نے Europe کی بجائے Urope کیوں کہا۔ شاید اس کا یہ خیال ہو کہ یہ فرانسیسی کا نسبتاً شستہ تلفظ ہے اور وہ فرانسیسی شخص سے گفتگو کے دوران میں اسے استعمال کر سکتی ہے۔)

"L`Urope ne sera jamais notre alliee sincere"**

اس نے یہ کہا اور گفتگو کا رخ شاہ پرشیا کی جرأت اور استقامت کی طرف پھیر دیا۔ اس کا مقصد بورس کو شریک گفتگو کرنا تھا۔

بورس نہایت توجہ سے ہر شخص کی گفتگو سنتا اور اپنی باری کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس دوران میں وہ کبھی کبھی حسین و جمیل ہیلین پر، جو اس کے قریب بیٹھی تھی، نگاہ ڈالتا رہا۔ خود ہیلین نے خوب رُو نوجوان ایڈی کانگ کی نگاہوں کا جواب متعدد مرتبہ مسکرا کر دیا۔

آنا پاولوونا نے پرشیا کی پوزیشن کا ذکر کرتے ہوئے بالکل فطری انداز سے بورس سے درخواست کی کہ اس نے اپنے سفر گلوگاؤ[12] کے دوران میں جو کچھ دیکھا اور پرشیا کی افواج کو جس حال میں پایا، اس کے بارے میں انھیں بتائے۔ بورس نے آمادگی کا اظہار کر دیا تاہم کسی قسم کے غیر ضروری اشتیاق یا جلد بازی کا مظاہرہ بھی نہ کیا۔ اس نے ٹکسالی اور شستہ فرانسیسی میں انھیں افواج اور دربار کے متعلق بے شمار دلچسپ باتیں سنائیں۔ تاہم وہ جو حقائق

---

* مائی ڈیر کاؤنٹ۔

** یورپ ہمارا کبھی بھی مخلص اتحادی نہیں ہو سکتا۔

بیان کر رہا تھا، ان کے بارے میں اپنی کسی رائے کا اظہار کرنے سے اس نے کمال دانش مندی سے احتراز کیا۔ کچھ دیر تو حاضرین اس کی باتیں بہت شوق سے سنتے رہے اور آنا پاولوونا کو یہ گمان ہونے لگا کہ اس نے اپنے مہمانوں کے سامنے جو انوکھی اور نئی نویلی چیز پیش کی ہے، وہ اسے بنظرِ تحسین دیکھ رہے ہیں۔ تاہم بورس جو کچھ کہہ رہا تھا، اس پر سب سے زیادہ توجہ ہیلین دے رہی تھی۔ اس نے اس سفر کے بارے میں متعدد سوالات دریافت کیے اور معلوم ہو رہا تھا کہ اسے پرشیا کی افواج کی حالت کے بارے میں گہری دلچسپی ہے۔ جونہی وہ اپنا بیان ختم کر چکا، وہ حسب عادت مسکراتے اس کی جانب متوجہ ہوئی۔

''غریب خانے تشریف لائیں اور مجھ سے ملیں۔ تاکید ہے،'' اس نے یہ الفاظ کچھ اس لہجے سے کہے کہ بعض واقعات کی بنا پر، جن کا اسے (بورس کو) کوئی علم نہیں ہو سکتا تھا، یہ بالکل لازمی ہو گیا تھا کہ وہ آئے اور اس سے ملاقات کرے۔ ''بروز منگل۔ آٹھ اور نو بجے کے درمیان۔ مجھے بہت خوشی ہو گی۔''

بورس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کا حکم سر آنکھوں پر بجا لائے گا اور وہ اس کے ساتھ باتوں میں مشغول ہوا چاہتا تھا کہ آنا پاولوونا نے اسے اپنے پاس بلا لیا اور بہانہ یہ بنایا کہ آنٹی اس کی داستان سننا چاہتی ہے۔

''تم اس کے شوہر کو تو جانتے ہی ہو،'' آنا پاولوونا نے آنکھیں بند کرتے اور غمزدہ انداز سے ہیلین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اتنی چھیل چھبیلی اور طرح دار خاتون اور قسمت کی اتنی ہیٹی! اتنی مہربانی کرنا کہ اس کے سامنے اس کے شوہر کا ذکر نہ کرنا، بلکہ اس کا نام بھی نہ لینا، اس سے اسے سخت اذیت ہوتی ہے!''

7

جب بورس اور آنا پاولوونا محفل میں واپس آئے، پرنس اپولیت گفتگو کی عنان اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا۔ وہ بازوؤں والی کرسی پر بیٹھا تھا اور آگے کی طرف جھکا کہہ رہا تھا:

"Le Roi de Prusse!"* اس نے یہ الفاظ کہے اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ہر شخص اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"Le Roi de Prusse?" اس نے سوالیہ لہجے سے دوبارہ کہا، ایک بار پھر ہنسا اور اس کے بعد خاموشی اور سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ کر اپنی کرسی پر ٹک گیا۔

آنا پاولوونا نے ایک آدھ منٹ انتظار کیا کہ وہ شاید کچھ اور کہنا چاہے لیکن جب اسے اندازہ ہو گیا کہ وہ مزید کچھ نہ کہنے کا تہیہ کیے ہوئے ہے، وہ بتانے لگی کہ پوٹسڈم کے مقام پر بے دین بوناپارٹ نے کس طرح فریڈرک اعظم[13] کی تلوار اڑائی تھی۔

''فریڈرک اعظم کی یہ وہی تلوار ہے جس میں...'' اس نے کہنا شروع کیا لیکن اپولیت نے اسے ٹوک دیا۔

"Le Roi de Prusse..." اس نے کہا اور جب ہر شخص کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو گئی، اس نے

* لفظی ترجمہ: شاہِ پرشیا۔ لیکن فرانسیسی محاورے میں اس کا مطلب ''نکمی اور بے کار شے'' ہے۔ (ماڈ)

معذرت چاہی اور دوبارہ چپ سادھ لی۔

آنا پاولونا کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ اپولیت کے دوست موخت ماغ نے بڑے رعب اور تحکم سے اسے مخاطب کیا اور پوچھا:

''تمھارے اس Roi de Prusse کو کیا ہوا؟''

اپولیت یوں ہنسا جیسے وہ اپنی ہنسی پر خود ہی شرمندہ ہو۔

''اجی، کچھ نہیں، کچھ نہیں، کچھ نہیں۔ میرا مطلب صرف یہ تھا...'' (وہ ساری شام ایک جگت، جو اس نے ویانا میں سنی تھی اور جس میں فرانسیسی محاورہ Roi de Prusse استعمال ہوا تھا، سنانے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔) ''میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ Le Roi de Prusse کی خاطر جنگ کرنا بیکار ہے۔''

بورس محتاط انداز سے مسکرایا۔ اس کی یہ مسکراہٹ طنزیہ بھی ہو سکتی تھی لیکن اس سے یہ مفہوم بھی اخذ کیا جا سکتا تھا کہ وہ پسندیدگی کا اظہار کر رہا ہے۔ یہ تو ہر شخص کے اپنے ذوق کی بات تھی کہ اس نے اس جگت کو کس انداز سے لیا ہے۔ ہر شخص ہنسنے لگا۔

''تمھاری یہ جگت کوئی اچھا تاثر نہیں چھوڑتی — اس میں بذلہ سنجی تو ہے لیکن یہ ہے بے جا اور نامناسب،'' آنا پاولونا نے اپنی جھریوں زدہ انگلی اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''ہم یہ جنگ Le Roi de Prusse کے لیے نہیں بلکہ صحیح اصولوں کے لیے لڑ رہے ہیں۔ اف، یہ پاجی پرنس اپولیت!'' اس نے کہا۔

گفتگو زیادہ تر سیاسی خبروں کے متعلق ہوتی رہی اور اس میں کسی قسم کا جھول نہ آیا۔ محفل کے اختتام پر جب وہ انعامات، جو زار نے مرحمت کیے تھے، زیرِ بحث آئے، اس میں اور بھی جوش و خروش آ گیا۔

''آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ برس این — این — کو نسوار کی ڈبیا، جس پر تصویر نقش تھی، ملی تھی،'' عظیم دانشور نے کہا۔ ''چنانچہ ایس — ایس — کو وہی انعام کیوں نہ ملے؟''

''معافی چاہتا ہوں۔ جس نسوار کی ڈبیا پر امپراطور کی تصویر نقش ہو، وہ انعام تو کہلا سکتی ہے لیکن اسے امتیاز نہیں قرار دیا جا سکتا،'' ایک سفارت کار نے کہا۔ ''ہاں، آپ اسے عطیہ کہہ سکتے ہیں۔''

''نظائر موجود ہیں — مثلاً شوارٹسن بیرگ۔''

''یہ ناممکن ہے،'' ایک اور شخص نے اعتراض اٹھایا۔

''شرط لگاتے ہو؟ تمغے کا ربن — وہ مختلف قسم کا مسئلہ ہے۔''

جب ہر شخص روانگی کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا، ہیلین، جس نے ساری شام شاذ ہی زبان کھولی تھی، ایک بار پھر بورس کی جانب متوجہ ہوئی اور بڑے ناز و انداز اور معنی خیز انداز سے گویا ہوئی: ''منگل کا دن نہ بھولیں۔ میرا اصرار ہے۔''

''میرے لیے یہ بے حد اہم ہے،'' اس نے مسکراتے اور مڑ کر آنا پاولونا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

آنا پاولوونا نے، جس طرح وہ اپنی عالی مرتبت شاہی مربیہ کا ذکر آنے پر مسکرایا کرتی تھی، اداس انداز سے مسکراتے ہیلین کی خواہش پر صاد کر دیا۔

بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ بورس نے پرشیائی فوج کے متعلق کوئی ایسی بات کہہ دی ہے کہ ہیلین کو اچانک احساس ہو گیا ہے کہ اس کے لیے اس کے ساتھ ملاقات کرنا انتہائی ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے رویے سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ یہ وعدہ کرتی ہے کہ جب وہ بروز منگل اس سے ملنے آئے گا، وہ اسے بتائے گی کہ اس کے نزدیک یہ ملاقات کیوں ضروری ہے۔

تاہم منگل کی شام ہیلین کے آراستہ و پیراستہ ڈرائنگ روم میں بورس کو اس قسم کی کوئی وضاحت نہ مل سکی کہ آخر اس کا آنا اتنا ضروری کیوں تھا۔ وہاں اور مہمان بھی موجود تھے۔ کاؤنٹس نے اس سے کوئی خاص بات نہ کی اور صرف اس وقت، جب روانگی سے پیشتر وہ اس کے ہاتھ پر بوسہ دے رہا تھا، اس نے غیر متوقع طور پر (اس کا چہرہ ہر قسم کی مسکراہٹ سے عاری تھا اور اس کے سلسلے میں یہ بات بہت عجیب تھی) سرگوشیوں میں اس سے کہا:

''کل شام کھانے پر آنا... بھولنا نہیں... ضرور آنا!''

پیٹرزبرگ میں اپنے عارضی قیام کے دوران میں بورس بے تکلفانہ کاؤنٹس بزوخووا کے گھر آتا جاتا رہا۔

8

جنگ زور شور سے جاری تھی اور روز بروز روسی سرحد کے قریب سے قریب تر آ رہی تھی۔ ہر جگہ بوناپارٹ پر پھٹکار پڑ رہی تھی اور اسے ''دشمنِ بنی نوعِ انسان'' قرار دیا جا رہا تھا۔ دیہاتوں میں باقاعدہ اور محفوظ افواج دونوں کے لیے رنگروٹ بھرتی کیے جا رہے تھے۔ ادھر محاذِ جنگ سے متضاد اور حسبِ معمول جھوٹی خبریں موصول ہو رہی تھیں، چنانچہ مختلف حلقوں میں ان کے مختلف مفاہیم اخذ کیے جا رہے تھے۔

1805 سے معمر پرنس بلکونسکی، پرنس آندرے اور پرنسس ماریا کی زندگیاں خاصی حد تک تبدیل ہو چکی تھیں۔

1806 میں پورے روس میں ملیشیا کے جو آٹھ کمانڈر انچیف مقرر کیے گئے، معمر پرنس ان میں شامل تھا۔ ضعفِ پیری کے باوجود، جو اس زمانے میں، جب اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا ہلاک ہو چکا ہے، خاص طور پر نمایاں ہو گیا تھا، اسے یہ قطعاً خیال نہ آیا کہ اسے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ایک ایسا فرض، جو امپراطور نے بذاتِ خود اسے تفویض کیا تھا، نبھانے سے انکار کر دے، اور عمل و مصروفیت کے اس تازہ موقع نے اس کے اندر نئی توانائی اور قوت بھر دی۔ جو تین صوبجات اس کی تحویل میں دیے گئے تھے، وہ مسلسل ان میں سفر کرتا رہا۔ جہاں تک فرائض کی ادائیگی کا تعلق ہے، وہ انھیں پوری تندہی سے ادا کرنے کا قائل اور اس معاملے میں سرِ مُو رعایت برتنے کا روادار نہیں تھا۔ وہ اپنے ماتحتوں کے ساتھ نہایت سختی سے، جس کے ڈانڈے سنگ دلی کو چھونے لگتے تھے، پیش آتا تھا اور چھوٹی سے چھوٹی جزئیات کا بذاتِ خود جائزہ لیتا تھا۔

پرنس ماریا نے اپنے باپ سے ریاضی کا درس لینا چھوڑ دیا تھا اور صرف ان ایام کے دوران میں جب وہ گھر پر ہوتا تھا، وہ ہر صبح (دودھ پلانے والی) لنا اور ننھے پرنس نکولائی (اس کا دادا اسے اسی نام سے پکارتا تھا) کی معیت میں اس کے سٹڈی روم میں جاتی تھی۔ شیر خوار اپنی انا اور نرس ساویشنا کے ساتھ مرحومہ پرنس کے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ پرنس ماریا اپنا بیشتر وقت نرسری میں گزارتی تھی اور پوری کوشش کرتی تھی کہ اس کا بھتیجا حتی الوسع اپنی ماں کی کمی محسوس نہ کرے۔ بظاہر یہ نظر آتا تھا کہ مادموزیل بوغین بھی بچے پر جان چھڑکتی ہے اور پرنس ماریا اکثر اوقات اتنا ایثار کرتی تھی کہ وہ اپنے بجائے اپنی سہیلی کو یہ موقع دیتی تھی کہ وہ ننھے ange• (اپنے بھتیجے کو وہ ننھا منا فرشتہ کہا کرتی تھی) کے ساتھ لاڈ پیار کرے، گھٹنوں پر اچھالے اور اسے جھولا جھلائے۔

بالڈ ہلز کے گرجے کے مائدۂ مقدسہ کے قریب کو چک پرنس کی ابدی آرام گاہ کے اوپر چیپل[14] تعمیر کر دیا گیا تھا۔ اس چیپل میں سنگ مرمر کی یادگاری مورتی، جو اطالیہ سے منگوائی گئی تھی، نصب کر دی گئی تھی۔ اس مورتی میں ایک فرشتہ، جو اپنے بازو پھیلائے جانبِ آسمان پرواز کے لیے تیار تھا اور جس کا بالائی لب یوں اوپر کی طرف اٹھا ہوا تھا جیسے وہ ابھی ابھی مسکرا دے گا، دکھایا گیا تھا۔ ایک روز جب پرنس آندرے اور پرنس ماریا چیپل سے باہر آ رہے تھے، انھوں نے ایک دوسرے کے سامنے اعتراف کیا۔ ”عجیب بات ہے کہ فرشتے کو دیکھ کر کوچک پرنس یاد آ جاتی ہے۔“ لیکن اس سے بھی عجیب تر بات یہ تھی۔ اگرچہ اس بارے میں پرنس آندرے نے اپنی ہمشیرہ سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ کہ مجسمہ ساز نے اتفاق سے فرشتے کے چہرے پر جو تاثر نمایاں کیا تھا، اس میں اسی نرم سرزنش کا، جو پرنس آندرے نے اپنی مرحومہ بیوی کے چہرے پر پڑھی تھی، ”آہ! تم نے میرے ساتھ یہ کیوں کیا ہے؟“ احساس پایا جاتا تھا۔

جب پرنس آندرے واپس آیا، اس کے چند ہی روز بعد معمر پرنس نے اپنی جائیداد کا کچھ حصہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس حصے میں باگوچارانو کی وسیع و عریض جاگیر بھی، جو بالڈ ہلز سے تقریباً پچیس میل دور تھی، شامل تھی۔ پرنس آندرے نے اس سے یوں فائدہ اٹھایا کہ اس نے وہاں عمارتیں تعمیر کرانا اور اپنا بیشتر وقت ادھر صرف کرنا شروع کر دیا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کی بالڈ ہلز کے ساتھ بڑی تکلیف دہ یادیں وابستہ تھیں (اور وہ ان سے فرار حاصل کرنا چاہتا تھا)۔ دوسرے اسے اپنے باپ کی طبیعت کے ساتھ نباہ کرنے میں بہت دشواری پیش آتی تھی اور پھر اسے خلوت کی ضرورت شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔

اوسٹرلٹس کے معرکے کے بعد پرنس آندرے نے پختہ عزم کر لیا تھا کہ اب وہ دوبارہ فوجی خدمات سرانجام نہیں دے گا اور جب جنگ دوبارہ چھڑ گئی اور ہر شخص کو فوج میں لازمی خدمات سرانجام دینا پڑیں، اس نے فعال ملازمت سے بچنے کی غرض سے اپنے والد کی ماتحتی میں رنگروٹ بھرتی کرنے کا کام سنبھال لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ 1805 کی مہم کے بعد معمر پرنس اور ان کے صاحب زادے نے اپنے اپنے کرداروں کا باہمی تبادلہ کر لیا ہے۔

• فرشتہ

باپ کو فعال ہونے کا جو موقع ملا، اس نے اس کے اندر ولولہ تازہ پیدا کر دیا اور اسے یہ توقع بندھنے لگی کہ نئی مہم سے بہترین نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کے برعکس پرنس آندرے جنگ میں کوئی حصہ نہیں لے رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں اپنی بے عملی پر کڑھ رہا تھا اور معاملے کا صرف تاریک پہلو دیکھ رہا تھا۔

چھبیس فروری 1807 کو معمر پرنس جب حسب معمول دورے پر روانہ ہوا، پرنس آندرے اس کی عدم موجودگی میں ہمیشہ کی طرح بالڈ ہلز میں مقیم تھا۔ ننھے نکولائی کی طبیعت گزشتہ تین چار روز سے ناساز تھی۔ جو کوچوان معمر پرنس کو شہر چھوڑنے گیا تھا، واپس آ چکا تھا۔ وہ اپنے ساتھ پرنس آندرے کے لیے دستاویزات اور خطوط لایا تھا۔

وردی پوش ملازم کو جب نوجوان پرنس سٹڈی روم میں نظر نہ آیا، وہ خطوط لے کر پرنس ماریا کے اپارٹمنٹ میں چلا گیا لیکن وہ وہاں بھی نہ تھا۔ ملازم کو بتایا گیا کہ پرنس سٹڈی روم میں چلا گیا ہے۔

''یوئر ایکسی لینسی، اجازت ہو تو کچھ عرض کروں۔ پتروشکا چند کاغذات لایا ہے،'' ایک کھلائی نے پرنس آندرے سے کہا۔ پرنس بچے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس کے ابروؤں پر بل پڑے ہوئے تھے اور وہ کانپتے ہاتھوں دوا کی بوتل سے چند قطرے ساغر میں، جو آدھا پانی سے بھرا ہوا تھا، انڈیل رہا تھا۔

''کیا ہے؟'' اس نے غصے سے پھنکارتے ہوئے پوچھا اور اس کے کانپتے ہاتھوں سے اتفاقاً ضرورت سے کچھ زیادہ قطرے گلاس میں گر گئے۔

اس نے آمیزہ فرش پر اچھال دیا اور مزید پانی لانے کا حکم دیا۔ خادمہ پانی لے آئی۔

بچے کے پالنے اور ننھی منی کرسی کے علاوہ، جس پر پرنس آندرے بیٹھا تھا، کمرے میں دو بازوؤں والی کرسیاں، ایک بڑی میز اور ایک بچوں کی میز پڑی تھی۔ پردے گرائے جا چکے تھے۔ میز پر واحد موم بتی جل رہی تھی۔ اس کے سامنے مجلد کتاب دھری تھی تاکہ اس کی روشنی پالنے میں نہ جائے۔

''مائی ڈیئر،'' پرنس ماریا نے، جو پالنے کے قریب کھڑی تھی، وہاں سے ہٹتے اور اپنے بھائی کی جانب بڑھتے ہوئے کہا۔ ''بہتر یہی ہے کہ قدرے انتظار کریں... بعد ازاں...''

''ذرا ٹھہرو... تمھیں معلوم ہی نہیں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔ تم ہمیشہ معاملات معرض التوا میں ڈالتی رہتی ہو۔ اب دیکھ لیا نا کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟'' پرنس آندرے نے قدرے جھنجھلاتے لیکن دھیما لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی ہمشیرہ کے جذبات کو ٹھیس پہنچانا چاہتا ہے۔

''مائی ڈیئر، میں سچ عرض کر رہی ہوں۔ وہ سو چکا ہے اور اب اسے جگانا مناسب نہیں ہوگا،'' پرنس ماریا نے منت سماجت کے انداز سے کہا۔

پرنس آندرے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پنجوں کے بل چلتا پالنے کے قریب آیا۔ ساغر اس کے ہاتھ میں تھا۔

''کیا تم واقعی یہ سمجھتی ہو کہ ہمیں اسے جگانا نہیں چاہیے؟'' اس نے جھجکتے، ہچکچاتے پوچھا۔

''جیسے آپ کا من چاہے... لیکن سچ پوچھیں... میرا یہی خیال ہے... ویسے آپ خود فیصلہ کر لیں،'' پرنس ماریا نے

کہا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اپنی رائے کے منوائے جانے پر وہ سخت خوف زدہ ہو گئی تھی اور اس کے پسینے چھوٹنے لگے تھے۔

اس نے اپنے بھائی کی توجہ خادمہ کی، جو زیرلب اسے پکار رہی تھی، طرف دلائی۔

بچہ بخار سے پھنک رہا تھا۔ دونوں اس کی خبر گیری میں مصروف تھے۔ یہ دوسری رات تھی اور وہ پلک تک نہیں جھپکا سکے تھے۔ انھیں اپنے گھریلو ڈاکٹر پر اعتماد نہیں رہا تھا۔ انھوں نے شہر سے ڈاکٹر کو بلا بھیجا تھا اور اب اس کا انتظار کر رہے تھے۔ دریں اثنا وہ ان چند دنوں کے دوران میں یکے بعد دیگرے متعدد دوائیں اور ٹوٹکے استعمال کر چکے تھے۔ نیند کے فقدان اور خوف دہراس نے ان کے اعصاب شل کر دیے تھے۔ وہ اپنے تفکرات اور پریشانیوں کا نشانہ ایک دوسرے کو بنا رہے تھے، ایک دوسرے میں خامیاں ڈھونڈ رہے تھے اور آپس میں تو تکار کر رہے تھے۔

''پتروشکا آپ کے والد محترم کے کچھ کاغذات لایا ہے،'' خادمہ نے ہولے سے کہا۔

پرنس آندرے باہر چلا گیا۔

''اب کیا ہے؟'' وہ غصے میں بڑبڑایا۔ اس کے باپ نے اسے جو زبانی ہدایات بھیجی تھیں، وہ اس نے سنیں، اپنے باپ کا خط اور دوسرے مراسلے وصول کیے اور واپس نرسری میں آ گیا۔

''ہونہہ؟'' اس نے پوچھا۔

''ویسے ہی ہے۔ خدا کے لیے ذرا انتظار کریں! کارل ایوانچ ہمیشہ یہی کہتے رہتے ہیں کہ کسی دوسری چیز کی نسبت نیند کہیں بہتر ہے،'' پرنسس ماریا نے آہ بھرتے ہوئے زیرلب کہا۔

پرنس آندرے بچے کی طرف گیا اور اس نے بچے کا جسم چھو کر دیکھا۔

''تم اور تمھارا کارل ایوانچ!''

اس نے دوا کا گلاس اٹھایا اور دوبارہ پالنے کی طرف چل دیا۔

''آندرے، اسے مت چھیڑو،'' پرنسس ماریا نے کہا۔

اس نے اسے گھور کر دیکھا اور غرایا۔ اس کے چہرے پر عناد لیکن آنکھوں میں کرب جھلک رہا تھا۔ گلاس ہاتھوں میں تھامے وہ بچے کے اوپر جھکا۔

''لیکن میں یہ چاہتا ہوں،'' اس نے کہا۔ ''آؤ، میں تمھارے سامنے ہاتھ جوڑتا ہوں — یہ اسے پلا دو۔''

پرنسس ماریا نے کندھے اچکائے۔ تاہم اس نے فرماں برداری سے گلاس پکڑ لیا، نرس کو بلایا اور بچے کو دوا پلانے لگی۔ بچے نے چیخ ماری اور خرخراہٹ کے ساتھ سانس لینے لگا۔ پرنس آندرے سے یہ منظر دیکھا نہ گیا اور اسے جھرجھری آ گئی۔ اس نے اپنا سر پکڑا اور باہر نکل گیا۔ وہ ملحقہ کمرے میں چلا گیا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔

خطوط ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھے۔ اس نے مشینی انداز سے انھیں کھولا۔ معمر پرنس نے کہیں کہیں اختصارات استعمال کیے تھے۔ اس کا خط نیلے کاغذ پر تھا اور خاصے موٹے اور لمبوترے حروف میں تحریر کیا گیا تھا۔ خط کی عبارت مندرجہ ذیل تھی:

ابھی ابھی خصوصی ایلچی کی وساطت سے نہایت خوش کن خبر — بشرطیکہ یہ دروغ گوئی پر مبنی نہ ہو — موصول ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ آئی لاؤ[15] کی جنگ میں بے نگ سین کو بوناپارت کے خلاف کامل فتح حاصل ہوئی ہے۔ پیٹرز برگ میں خوشی کے شادیانے بجائے جا رہے ہیں۔ لاتعداد انعامات اور تمغہ جات فوج کو ارسال کر دیے گئے ہیں۔ اگرچہ وہ جرمن نژاد ہے — میں اسے مبارک باد پیش کرتا ہوں! سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ شخص — کوئی خاندریکوف ہے — جو کارچیوو میں کمانڈر کے فرائض سرانجام دے رہا ہے، کیا کرنا چاہتا ہے۔ ابھی تک نہ تو مزید جوان پہنچے ہیں اور نہ سامانِ رسد۔ چٹکی بجاتے اس کے پاس پہنچو اور اسے بتادو کہ اگر یہ سب کچھ ہفتے کے اندر اندر نہ پہنچا، میں اس کا سر اتروا دوں گا۔ پروئے سِش۔ آئی لاؤ کے معرکے کے بارے میں پتنکا کا خط بھی موصول ہوا ہے۔ وہ خود اس معرکے میں شریک تھا۔ چنانچہ خبر درست ہے۔ اگر غیر متعلقہ اشخاص دخل اندازی سے گریز کریں، جرمن بھی بوناپارت کی ٹھکائی کر سکتا ہے۔ سنا ہے کہ وہ بڑی افراتفری کے عالم میں پسپا ہو رہا ہے۔ بلاتاخیر کارچیوو پہنچو اور کام کرواؤ!

پرنس آندرے نے لمبی سانس لی اور دوسرا لفافہ کھولا۔ دو صفحے کا یہ مراسلہ بلیبین کا تھا اور بہت باریک حروف میں لکھا ہوا تھا۔ اس نے پڑھے بغیر اس کی تہہ لگائی اور دوبارہ اپنے باپ کا خط، جس کے آخری الفاظ ''بلاتاخیر کارچیوو پہنچو اور کام کراؤ!'' تھے، پڑھنے لگا۔

''نہیں، آپ میری خطا معاف فرمائیں۔ جب تک بچے کی حالت بہتر نہیں ہو جاتی، میں کہیں نہیں جاؤں گا،'' اس نے اٹھ کر دروازے کی طرف جاتے اور نرسری میں جھانکتے ہوئے سوچا۔

پرنس ابھی تک پالنے کے قریب کھڑی تھی اور دھیرے دھیرے بچے کو جھلا رہی تھی۔

''اور یہ انھوں نے دوسری بدمزہ خبر کیا لکھی ہے؟'' پرنس آندرے اپنے باپ کا خط یاد کر کے سوچنے لگا۔ ''ارے ہاں، ہمیں بوناپارت کے خلاف فتح حاصل ہوئی ہے۔ کم بخت فتح بھی تبھی حاصل ہونا تھی جب میں فوج کے ساتھ نہیں تھا! ہاں، جی ہاں، وہ ہمیشہ میری ٹانگ گھسیٹتے رہتے ہیں... اچھا، خیر، انھیں مزے لینے دو!''

اور وہ بلیبین کا خط، جو فرانسیسی میں تحریر کیا گیا تھا، پڑھنے لگا۔ وہ پڑھتا رہا، پڑھتا رہا اور نصف تک پہنچ گیا لیکن اس کے پلے خاک نہ پڑا۔ وہ محض اس لیے پڑھے جا رہا تھا کیونکہ وہ ان خیالات سے، جو اتنے طویل عرصے سے اور اتنے تکلیف دہ انداز سے اس کی سوچوں پر غالب آ چکے تھے کہ اسے کسی اور چیز کا دھیان ہی نہیں رہا تھا، وقتی طور پر ہی سہی، فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔

9

بلیبین ان دنوں سفارتی حیثیت سے فوج کے ہیڈ کوارٹرز میں تعینات تھا اور اگرچہ اس نے اپنا یہ خط فرانسیسی زبان

میں تحریر کیا تھا، فرانسیسی پھکڑ بازی سے کام لیا تھا اور اسلوب نگارش بھی فرانسیسیوں ہی کا اپنایا تھا، لیکن اس نے ساری مہم کے بیان میں جس بے دھڑک انداز سے اپنے آپ کو ملامت کا نشانہ بنایا تھا اور اپنا تمسخر آپ اڑایا تھا، وہ خالصتاً روسی تھا۔ بلیبن نے لکھا تھا کہ سفارتی احتیاط پسندی کے تقاضے اس کے لیے سوہان روح ہیں اور یہ کہ پرنس آندرے اس کا ایسا مکتوب الیہ ہے، جس کے سامنے وہ اپنے اس تمام غم و غصے کا، جو فوج میں جو کچھ ہو رہا ہے، اسے دیکھ دیکھ کر اس کے نہاں خانۂ قلب میں مجتمع ہو رہا ہے، (بلا خوف و خطر) اظہار کر سکتا ہے۔ اس خط پر پروئے سش آئی لاؤ کے معرکے سے چند ایام قبل کی تاریخ مندرج تھی۔ ''جس روز ہمیں اوسٹرلٹس کے معرکے میں شاندار کامیابی نصیب ہوئی،'' بلیبن نے لکھا تھا:

وہ دن اور آج کا دن، مائی ڈیئر پرنس، تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں نے ہیڈ کوارٹرز سے باہر قدم نہیں رکھا۔ مجھے صریحاً جنگ کا چسکا پڑ چکا ہے اور مجھے خوشی ہے کہ مجھے یہ چسکا پڑ گیا ہے۔ گزشتہ تین ہفتوں کے دوران میں جو کچھ میں نے دیکھا اور سنا ہے، آنکھوں اور کانوں کو اس پر اعتبار نہیں آ رہا۔

میں یہ سارا قصہ بالکل شروع سے (ab ovo) بیان کرتا ہوں۔ جیسا کہ تمھیں معلوم ہے کہ ''دشمن بنی نوع انسان'' اہالیان پرشیا کو اپنے حملوں کا نشانہ بنا رہا ہے۔ پرشیا والے ہمارے وفادار اتحادی ہیں۔ انھوں نے تین برسوں کے دوران میں صرف تین مرتبہ ہمارے ساتھ بے وفائی کی ہے۔ ہم ان کے نصب العین کو اپنا نصب العین بنا لیتے ہیں لیکن ہوتا یہ ہے کہ ''دشمن بنی نوع انسان'' ہماری مسجع و مرصع تقریروں پر ذرا بھی کان نہیں دھرتا۔ وہ اپنے بد اطوار، بد تہذیب اور بد خصال انداز سے پرشیا کے باشندوں پر پل پڑتا ہے اور انھیں اتنا موقع بھی نہیں دیتا کہ جو پریڈ وہ شروع کر چکے ہیں، اسے ہی ختم کر لیں۔ چٹکی بجاتے وہ ان کی دھنائی کر دیتا ہے اور پوٹسڈم کے شاہی محل میں قدم رنجہ ہو جاتا ہے۔

''میری سب سے بڑی تمنا یہ ہے،'' پرشیا کے بادشاہ سلامت بونا پارٹ کو تحریر فرماتے ہیں ''کہ میں اپنے محل میں یور میجسٹی کا ایسے انداز سے استقبال کروں اور خدمت بجا لاؤں جو یور میجسٹی کے مزاج اقدس کے عین مطابق ہو۔ اس مقصد کے حصول کے لیے میں بہ عجلت وہ تمام اقدامات، جن کی حالات نے مجھے اجازت دی ہے، کر چکا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ میں اپنے اس مقصد میں کامیاب رہا ہوں!''

پرشیا کے جرنیل اس بات پر بہت فخر کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ فرانسیسیوں کے ساتھ بڑی شائستگی سے پیش آتے ہیں اور اولین مطالبے پر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ گلوگاؤ میں متعین دس ہزار سپاہ کا کمانڈر پرشیا کے بادشاہ سے دریافت کرتا ہے: ''اگر مجھے ہتھیار ڈالنے کے لیے کہا گیا، پھر مجھے یہ کرنا ہوگا...'' اور یہ بات سو فیصد درست ہے۔

قصہ مختصر، ہمیں توقع تھی کہ اگر ہم نے محض جنگجویانہ رویہ اپنایا، (حریف پر) ہیبت طاری ہو جائے گی۔

لیکن ہوا کیا ہے؟ ہم فی نفسہ پوری طرح جنگ کی لپیٹ میں آ چکے ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ جنگ کے شعلے ہماری سرحدوں تک پہنچ چکے ہیں۔ اب ہم اس جنگ میں پرشیا کے بادشاہ کے حلیف بن گئے ہیں اور اس کی خاطر اس میں کود پڑے ہیں۔ ہر شے تیار ہے۔ صرف ایک چھوٹی سی چیز۔ کمانڈر انچیف۔ کی کمی ہے۔ چونکہ اب یہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ اوسٹرلٹس کے معرکے میں ہمیں جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، اگر ہمارا کمانڈر انچیف اتنا نو عمر نہ ہوتا، وہ فیصلہ کن ثابت ہو سکتی تھی، چنانچہ اسی اسی سالہ پیرانِ فرتوت کو ترازو کے پلڑوں پر پرکھا گیا ہے۔ مقابلہ پرازورفسکی اور کامینسکی کے مابین تھا۔ قرعہ فال مؤخر الذکر کے نام نکلا اور اسے منتخب کر لیا گیا۔ جرنیل صاحب سواروف کے انداز میں بند گاڑی میں تشریف لاتے ہیں اور ''واہ واہ، سبحان اللہ، مرحبا اور زندہ باد'' کے نعروں سے ان کا پرجوش استقبال کیا جاتا ہے۔

چوتھی تاریخ کو پیٹرز برگ سے پہلا ہرکارہ یہاں پہنچتا ہے۔ ڈاک کے تھیلے فیلڈ مارشل کے حضور ان کے کمرے میں پہنچا دیے جاتے ہیں کیونکہ وہ ہر کام بنفسِ نفیس سرانجام دینا پسند فرماتے ہیں۔ خطوط کی چھانٹی میں ہاتھ بٹانے اور وہ جو ہمارے نام آئے ہوتے ہیں، انھیں لے جانے کے لیے مجھے طلب کیا جاتا ہے۔ حضور کمانڈر انچیف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں اور انتظار فرما رہے ہیں کہ ہم انھیں وہ خطوط، جو ان کے نام آئے ہیں، کب انھیں پیش کرتے ہیں۔ ہم ڈھونڈتے ہیں، ڈھونڈتے ہیں۔ لیکن ان کے نام کا ایک خط بھی برآمد نہیں ہوتا۔ فیلڈ مارشل میں صبر کا مزید یارا نہیں رہتا، وہ آگے بڑھتے ہیں اور خود چھانٹی کے کام میں جت جاتے ہیں۔ امپراطور نے کاؤنٹ، پرنس واؤ اور دیگر اشخاص کے کے نام جو مکتوبات ارسال فرمائے ہیں، وہ تو مل جاتے ہیں لیکن ان کا اپنا خانہ خالی رہتا ہے۔ چنانچہ وہ حسبِ معمول جلال میں آ جاتے ہیں، ان کے منہ سے جھاگ اڑنے لگتا ہے اور وہ ہر ایک کو بے نقط سنانے لگتے ہیں۔ امپراطور نے دوسروں کے نام جو خطوط تحریر کیے ہوتے ہیں، وہ انھیں کھولنا اور پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ''ہونہہ! تو یہ ہے ان کا میرے ساتھ سلوک! مجھ پر اعتبار ہی نہیں رہا! آہا! حکم دیا جاتا ہے کہ مجھ پر نگاہ رکھی جائے! بہت خوب۔ دفع ہو جاؤ، تم سب یہاں سے!'' اور وہ خود جنرل بے نگ سین کے نام اپنا مشہور و معروف ''حکمِ امروز'' لکھانے بیٹھ جاتے ہیں۔

''میں زخمی ہوں اور گھوڑے پر سوار نہیں ہو سکتا، چنانچہ میں فوج کی کمان سنبھالنے سے معذور ہوں۔ تم اپنے شکست خوردہ دستوں کو پلتسک[16] لے آئے ہو۔ یہاں وہ غنیم کی زد میں ہیں۔ ان کے پاس نہ ایندھن ہے اور نہ چارہ۔ چنانچہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہوگا۔ جیسا کہ کل تم نے خود کاؤنٹ بکس ہیوڈن کو اطلاع دی تھی کہ تمھیں ہماری اپنی سرحدوں تک پسپائی اختیار کرنے کے متعلق سوچنا ہوگا: چنانچہ آج ہی سے یہ کام شروع کر دو۔''

اور امپراطور کے نام وہ تحریر کرتے ہیں: ''میں نے تمام جنگوں میں گھوڑے پر سوار ہو کر حصہ لیا ہے۔

گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھے بیٹھے میری پشت پر لاگا لگ گیا ہے۔ یوں مجھے بار بار مرہم پٹی کرانا پڑتی ہے۔ ان حالات میں میرے لیے گھوڑے کی سواری کرنا اور اس فوج کی، جو دور دراز مختلف علاقوں میں بکھری پڑی ہے، کمان کرنا ممکن نہیں رہا۔ چنانچہ میں نے متذکرہ کمان اپنے بعد سینئر ترین جرنیل کاؤنٹ بکس ہیوڈن کے سپرد کر دی ہے۔ میں نے اپنا سارا عملہ اور اپنے عہدے کے دیگر متعلقات انھیں بھیج دیے ہیں اور انھیں مشورہ دیا ہے کہ اگر انھیں روٹی کی کمی کا مسئلہ درپیش ہو، وہ پسپائی اختیار کر کے پرشیا کے اندرونی علاقوں میں جا سکتے ہیں۔ یہ مشورہ اس لیے ضروری ہو گیا کیونکہ ڈویژن کمانڈروں ۔۔ اوسٹرمان اور سیدمورتسکی ۔۔ کی اطلاعات کے مطابق ڈبل روٹی مقامی کسان چٹ کر گئے ہیں اور بعض رجمنٹوں کے پاس صرف اتنی روٹی رہ گئی ہے کہ صرف ایک دن کی ضرورت پوری ہو سکتی ہے اور بعض کے پاس تو اتنی بھی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں جب تک صحت یاب نہیں ہو جاتا، میں آسترولینکا[17] کے ہسپتال میں مقیم رہوں گا۔ میں اپنی یہ رپورٹ بصد عجز و انکسار خدمت عالیہ میں پیش کر رہا ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میں یہ مزید عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ اگر ہماری سپاہ یونہی کھلی فضا میں اپنے موجودہ پڑاؤوں میں پڑی رہی، پھر موسم بہار تک کوئی شخص بھی صحت مند نہیں رہے گا۔

مجھ جیسے ضعیف و ناتواں اور عمر رسیدہ شخص کے کندھوں پر جو عظیم اور رفیع الشان فریضہ ڈالا گیا تھا، میں اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں ناکام رہا ہوں اور یوں میں ہر شخص کی نگاہوں میں ذلیل و خوار ہو گیا ہوں۔ اس لیے میں آپ سے یہ مؤدبانہ گزارش کروں گا کہ مجھے اپنی حیاتِ مستعار کے بچے کھچے ایام دیہاتی فضا میں گزارنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے۔ میں آپ کی عنایت خسروانہ کا یہیں ہسپتال میں انتظار کروں گا اور یہ کہ مجھے فوج کے سپہ سالار کی بجائے محرر کا کردار ادا کرنے پر مجبور نہیں ہونا پڑے گا۔ میری موتوفی سے رتی برابر فرق نہیں پڑے گا۔ یوں سمجھیں کہ کوئی نابینا شخص فوج سے رخصت ہو گیا ہے۔ روس میں مجھ جیسے ہزاروں لوگ موجود ہیں۔

فیلڈ مارشل صاحب کو گلہ امپراطور کی ذاتِ بابرکات سے ہے اور نزلہ برعضوِ ضعیف می ریزد، سزا ہم سب کو دیتے ہیں۔ اسی کا نام منطق ہے!

یوں ایکٹ اول اختتام پذیر ہوتا ہے۔ اس کے بعد کے مناظر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ دلچسپ اور مضحکہ خیز ہیں۔ فیلڈ مارشل صاحب کی روانگی کے بعد یوں معلوم ہوتا ہے کہ دشمن ہمارے سر پر آ پہنچا ہے اور ہمارا اس کے ساتھ ٹکراؤ لازماً ہو کر رہے گا۔ سینارٹی کے اعتبار سے بکس ہیوڈن کمانڈر انچیف بن جاتا ہے لیکن جنرل بے نگ سین کو اس سے اتفاق نہیں ہے، خاص طور پر اس لیے کیونکہ غنیم کی زد میں صرف وہ

• لاگا (saddle-sore): لاگا پنجابی زبان کا لفظ ہے۔ مجھے اردو میں اس کا متبادل نہیں مل سکا۔ گھوڑے کی ننگی پشت پر سفر کرنے سے کھال پر رگڑ آ جاتی ہے اور وہ سرخ ہو جاتی ہے۔ تکلیف کا احساس بھی ہوتا ہے۔ (مترجم)

اور اس کے دستے ہیں۔ چنانچہ وہ اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہتا ہے اور جرمنوں کے بقول وہ جنگ جو اس کے "سر پر آ پہنچی ہے"، وہ اسے لڑنا چاہتا ہے۔ وہ لڑتا ہے۔ یہ پلتسک کی لڑائی ہے۔ اسے فتحِ عظیم گردانا جاتا ہے لیکن میری رائے میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جیسا کہ تم جانتے ہو، کہ یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ لڑائی جیتی گئی ہے یا اس میں ہار ہوئی ہے، ہم غیر فوجیوں نے بڑا ناگوار قسم کا معیار مقرر کر رکھا ہے۔ معرکے کے بعد جو فریق پسپائی اختیار کرتا ہے، ہماری نظروں میں وہ شکست خوردہ ہوتا ہے۔ اس اصول کی روشنی میں ہم نے پلتسک کی لڑائی ہار دی تھی۔ قصہ مختصر، لڑائی کے بعد ہم پسپائی اختیار کرتے ہیں لیکن پیٹرز برگ جو ہرکارہ بھیجتے ہیں، وہ فتح کی نوید لے کر جاتا ہے۔ چنانچہ جنرل بے نگ سین فوج کی کمان بکس ہیوڈن کے سپرد نہیں کرتے بلکہ اس امید میں اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں کہ انھوں نے جو (نام نہاد) فتح حاصل کی ہے، اس کے صلے میں انھیں کمانڈر انچیف کے عہدے پر سرفراز کر دیا جائے گا۔ اس وقفے کے دوران میں ہم انتہائی دلچسپ اور انوکھی چالیں چلتے ہیں۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ ہم دشمن پر حملہ کرنے یا اس سے پہلو بچانے کی تدابیر اختیار کرتے لیکن ہم اپنے اصل مقصد سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں اور سارا زور اس بات پر لگا دیتے ہیں کہ ہم جنرل بکس ہیوڈن کو، جسے سینارٹی کے اعتبار سے ہمارا کمانڈر انچیف ہونا چاہیے تھا، کیسے غچہ دے سکتے ہیں۔ ہم اپنے مقصد کے حصول کے لیے اتنا زور لگاتے ہیں کہ ہم ایک ایسے دریا کو، جسے پل کے بغیر عبور نہیں کیا جا سکتا، عبور کر لیتے ہیں، پلوں کو نذرِ آتش کر دیتے ہیں تاکہ دشمن ادھر نہ آ سکے اور یہ دشمن فی الحال بوناپارٹ نہیں بلکہ بکس ہیوڈن ہے۔ جنرل بکس ہیوڈن ہمارا تعاقب کرتا ہے — اور ہم رسی تڑا کر بھاگ اٹھتے ہیں۔ جونہی وہ دریا عبور کر کے ہمارے کنارے پہنچتا ہے، ہم دوبارہ دریا عبور کرتے ہیں اور ایک بار پھر دوسرے کنارے پر پہنچ جاتے ہیں۔ بالآخر ہمارا دشمن بکس ہیوڈن ہمارے سر پر پہنچ جاتا ہے اور ہم پر حملہ کر دیتا ہے۔ دونوں جرنیلوں کا پارہ چڑھ جاتا ہے۔ ایک موقع پر ہیوڈن تو ڈوئیل کا چیلنج بھی دے دیتا ہے اور دوسرے موقع پر بے نگ سین کو مرگی کا دورہ پڑ جاتا ہے۔ لیکن اس نازک موقع پر وہ ہرکارہ، جو پلتسک کی فتح کی خبر لے کر پیٹرز برگ گیا تھا، بطور کمانڈر انچیف ہماری تقرری کا فرمان لے کر پہنچ جاتا ہے اور یوں ہمارا دشمن نمبر ایک بکس ہیوڈن ڈھیر ہو جاتا ہے اور اب ہم اپنی توجہ اپنے دشمن نمبر 2 — بوناپارٹ — پر مبذول کر سکتے ہیں لیکن خدا کی مار، اس موقع پر ایک نیا گل کھل جاتا ہے اور ہمارا دشمن نمبر 3 ہمارے بالمقابل تن کر کھڑا ہو جاتا ہے — ہماری لکیر کی فقیر سپاہ روٹی، گوشت، بسکٹوں، چارے اور پتا نہیں کن کن الم غلم اشیا کا مطالبہ شروع کر دیتی ہے! ذخائر ختم ہو چکے ہیں اور شاہراہیں ناقابلِ عبور بن گئی ہیں۔ لکیر کی فقیر سپاہ لوٹ مار کرنے لگتی ہے اور وہ بھی ایسے انداز سے جس کا ہماری گزشتہ مہم سے تم کوئی اندازہ نہیں لگا سکتے۔ آدھی رجمنٹیں جتھوں میں بٹ جاتی ہیں اور وہ دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجا دیتی ہیں۔ جو چیز بھی ان کے سامنے آتی ہے، اسے یا تو نذرِ آتش کر دیتی ہیں یا تلوار

کے گھاٹ اتار دیتی ہیں۔ مقامی باشندے بالکل تباہ و برباد ہو چکے ہیں۔ ہسپتال مریضوں اور زخمیوں سے اٹے پڑے ہیں اور قحط سالی کا دور دورہ ہے۔ قازق دو مرتبہ ہیڈ کوارٹرز پر بھی حملہ کر چکے ہیں اور کمانڈر انچیف کو انھیں بھگانے کے لیے بٹالین بلانا پڑی۔ ایک حملے کے دوران میں وہ میرا خالی ٹرنک اور ڈریسنگ گاؤن بھی لے اڑے۔ امپراطور سوچ رہے ہیں کہ تمام ڈویژن کمانڈروں کو ان قازقوں کو گولیوں سے بھوننے کی اجازت دے دی جائے لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ اس قسم کے حکم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نصف فوج بقیہ نصف فوج ہلاک کرنے پر مجبور ہو جائے گی۔

شروع میں تو پرنس آندرے صرف نظریں ہی دوڑاتا رہا لیکن اپنی ذہنی کیفیت کے باوجود وہ کچھ ہی دیر بعد (اگرچہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اسے بلیبن کی باتوں کا کس حد تک اعتبار کرنا چاہیے) وہ جو کچھ پڑھ رہا تھا، اس میں اس کی دلچسپی بہ لحظہ بڑھتی گئی۔ جب وہ یہاں تک پڑھ چکا، اس نے خط مسل ڈالا اور اسے پرے پھینک دیا۔ اسے کوفت اس سے، جو وہ پڑھ رہا تھا نہیں ہو رہی تھی بلکہ اس بات سے کہ وہاں کی زندگی، جس سے اس کا ناتا ٹوٹ چکا تھا، اب بھی اسے مضطرب کر سکتی تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں میچ لیں اور اپنے ہاتھوں سے یوں اپنی پیشانی ملنے لگا گویا جو کچھ اس نے پڑھا تھا، اس کی یادیں اپنے ذہن سے کھرچ دینا چاہتا ہو۔ پھر اس کی تمام تر توجہ ان آوازوں پر، جو نرسری سے آ رہی تھیں، مبذول ہو گئی۔ اچانک اسے محسوس ہوا کہ اسے دروازے میں سے کوئی عجیب و غریب آواز سنائی دی ہے۔ خوف و ہراس نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ اسے اندیشہ لاحق ہونے لگا کہ جب وہ خط پڑھنے میں محو تھا، اس دوران میں بچے کو کچھ ہو نہ گیا ہو۔ وہ اٹھا، دبے پاؤں چلتا نرسری کے دروازے تک پہنچا اور اسے وا کر دیا۔

جونہی وہ اندر داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ نرس، جس کی خوف سے گھگھی بندھی ہوئی تھی، اس سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہے اور یہ کہ پرنس ماریا پالنے کے قریب نہیں ہے۔

''مائی ڈیئر!'' اسے یہ الفاظ یوں سنائی دیے جیسے اس کی ہمشیرہ اس کے عقب میں کھڑی ہو اور مایوسی کے عالم میں اس سے سرگوشیاں کر رہی ہو۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ وہ بے خواب راتوں اور مطوّل تفکرات کے بعد غیر منطقی خوف و دہشت کی گرفت میں آ چکا تھا۔ ایکا ایکی کوندے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن میں لپکا کہ بچہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ جو کچھ اسے دکھائی اور سنائی دیا، وہ اس کے وسوسوں کی توثیق کرتا نظر آتا تھا۔

''قصہ تمام ہوا،'' اس نے سوچا اور اس کی پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔ وہ اپنے آپ میں نہیں تھا اور جوں توں کر کے پالنے کے قریب پہنچا۔ اسے یقین تھا کہ پالنا خالی ہوگا اور یہ کہ نرس مرحوم بچے کو چھپانے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے پردے ایک طرف ہٹائے۔ کافی دیر تک اس کی نگاہیں، جو کسی ایک جگہ ٹھہر نہیں رہی تھیں اور جن میں اندیشے جھلک رہے تھے، کچھ نہ دیکھ سکیں۔ آخر کار وہ اسے نظر آ ہی گیا۔ بچہ، جس کے گال تمتما رہے تھے، ہمک ہمک

کر اپنی جگہ سے ہٹ چکا تھا اور اب وہ پالنے کے آر پار لیٹا ہوا تھا۔ اس کا سر تکیے سے ڈھلک چکا تھا، اور اس کے لبوں سے کچھ اس قسم کی آواز آ رہی تھی جیسے وہ کچھ چوس رہا ہو اور وہ ہموار انداز سے سانس لے رہا تھا۔

پرنس آندرے نے جب بچے کو اس کیفیت میں دیکھا، وہ دیوانہ وار مسرت سے جھوم گیا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا جیسے بچہ اس سے چھن چکا تھا اور اب وہ دوبارہ اس کی تحویل میں آ گیا ہو۔ وہ اس کے اوپر جھک گیا اور بالکل اسی طرح جس طرح اس کی ہمشیرہ نے اسے سمجھایا تھا، اس نے اپنے ہونٹ اس کے جسم کے ساتھ لگا دیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنے لگا کہ آیا اس کا جسم ابھی تک پہلے کی طرح گرم ہے۔ بچے کی نرم و ملائم پیشانی تر تھی۔ پرنس آندرے نے اپنا ہاتھ اس کے ننھے منے سر پر رکھ دیا۔ بچے کو اتنا زبردست پسینہ آیا تھا کہ اس کے بال بھی بھیگ چکے تھے۔ نہ صرف یہ کہ بچے کا انتقال نہیں ہوا تھا، بلکہ اس کے برعکس ہر علامت سے یہ واضح ہو رہا تھا کہ نازک مرحلہ گزر چکا ہے اور اب وہ روبہ صحت ہے۔ پرنس آندرے کے دل میں یہ شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ اس کمزور و ناتواں مخلوق کو جھپٹ کر اٹھا لے اور اسے اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لے لیکن اس میں اس کا حوصلہ نہیں تھا۔ وہ اس کے سر بالیں کھڑا رہا اور اس کے سر، ننھے منے بازوؤں اور ٹانگوں کو، جو کمبل کے نیچے نظر آ رہی تھیں، بغور دیکھتا رہا۔ اسے اپنے قریب سرسراہٹ سنائی دی اور پالنے کے چھتر کے نیچے سایہ لہرایا۔ اس نے قطعاً ادھر ادھر نگاہ نہ کی بلکہ وہ ابھی تک بچے کا چہرہ دیکھنے میں محو تھا اور اس کی سانس کے باقاعدہ زیر و بم پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ تاریک سایہ پرنس ماریا کا تھا، وہ بے آہٹ چلتی پالنے تک آئی تھی۔ اس نے پردے اٹھائے اور اپنے پیچھے گرا دیے۔ پرنس آندرے گرد و پیش نظریں دوڑائے بغیر اسے پہچان گیا اور اس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔ وہ اسے دبانے لگی۔

"اسے پسینہ آ رہا ہے،" پرنس آندرے نے کہا۔

"میں یہی آپ کو بتانے آئی تھی۔"

بچے نے نیند میں خفیف سی حرکت کی، وہ مسکرایا اور اس کی پیشانی تکیے سے رگڑ کھا گئی۔

پرنس آندرے نے اپنی ہمشیرہ کی جانب دیکھا۔ چھتر کے مدھم سائے میں پرنس کی روشن و تاباں آنکھیں معمول سے کہیں زیادہ چمک رہی تھیں کیونکہ وہ خوشی کے آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ وہ اپنے بھائی پر جھکی اور اس نے اس کی پیشانی پر بوسہ ثبت کر دیا۔ اس عمل کے دوران میں پالنے کا پردہ ذرا سا کھسکا۔ دونوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو محتاط رہنے کا اشارہ کیا اور وہ چھتر کے مدھم سائے تلے پتھر کے بت بن کر کھڑے ہو گئے جیسے وہ اس گوشۂ تنہائی کو، جہاں وہ تینوں باقی دنیا سے الگ تھلگ اور اکیلے تھے، چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہوں۔ پرنس آندرے نے پہل کی اور وہاں سے ہٹنے لگا۔ اس کے بال پردے سے ٹکرا رہے اور بے ترتیب ہو رہے تھے۔

"ہاں، میرے پاس بس یہی ایک چیز باقی رہ گئی ہے،" اس نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے سوچا۔

10

میسنوں کی برادری میں اپنی شمولیت کے چند روز بعد ہی پیئر نے صوبہ کیف کا، جہاں اس کے زرعی غلاموں کی سب سے زیادہ تعداد آباد تھی، رخ کیا۔ اس نے اپنی جاگیروں میں کیا کرنا تھا، اس سلسلے میں اس کے پاس مکمل ہدایات تھیں۔ یہ اس نے کاغذ پر تحریر کر لی تھیں۔

کیف پہنچنے کے بعد پیئر نے اپنے تمام سٹیوارڈوں (منتظمین) کو اپنے دفتر بلایا اور ان کے سامنے اپنے عزائم وخواہشات کی وضاحت کی۔ اس نے انھیں بتایا کہ غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے بلا تاخیر اقدامات کیے جائیں گے اور جب تک یہ منصوبہ پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ جاتا، ان سے ضرورت سے زیادہ محنت ومشقت نہیں لی جائے گی۔ جن عورتوں کے بچے ہیں، انھیں کام پر نہیں بھیجا جائے گا۔ کسانوں کو امداد بہم پہنچائی جائے گی۔ جسمانی سزاؤں سے گریز کیا جائے گا اور صرف زبانی سرزنش کی جائے گی۔ ساری جاگیروں میں شفا خانے، مدارس اور محتاج گاہیں تعمیر کی جائیں گی۔ بعض منتظمین (ان میں نیم خواندہ نگران شامل تھے) نے یہ سمجھا کہ نوجوان کاؤنٹ نے اپنی گفتگو میں ان کی بدانتظامیوں اور بدعنوانیوں پر اظہار ناپسندیدگی کیا ہے اور وہ اس کی باتیں سن کر رنجیدہ ہوئے۔ بعض ابتدا میں تو کچھ پریشان ہوئے لیکن انھوں نے اپنی گھبراہٹ پر جلد قابو پالیا۔ پیئر تقریر کے دوران میں جس طرح لکنت کھا رہا تھا اور جو نئے نئے الفاظ، جو انھوں نے ازیں قبل کبھی نہیں سنے تھے، استعمال کر رہا تھا، وہ ان سے خاصے محظوظ ہو رہے تھے۔ بعض ایسے بھی تھے جنھیں محض اس چیز سے لطف آ رہا تھا کہ ان کا آقا کس قسم کی باتیں کر رہا ہے۔ تاہم چوتھا گروہ، جو نسبتاً ذہین منتظمین پر مشتمل تھا اور جن میں چیف سٹیوارڈ (منتظم اعلیٰ) بھی شامل تھا، اس گفتگو سے یہ اندازہ لگانے لگا کہ اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے انھیں اپنے آقا سے کس طرح نپٹنا ہوگا۔

چیف سٹیوارڈ نے پیئر کے منصوبوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا، تاہم اس نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ اختراعات اپنی جگہ بجا ہیں لیکن انھیں تمام معاملات کا ٹھوک بجا کر جائزہ لینا ہوگا کیونکہ حالات خاصے دگرگوں ہو رہے ہیں۔

پیئر کو کاؤنٹ بزوخوف کی بے پناہ دولت وراثت میں ملی تھی اور اس کی سالانہ آمدنی بھی، جس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ وہ پانچ لاکھ روبل تک پہنچ جاتی تھی، کچھ کم نہ تھی، اس کے باوجود اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ جب سے اسے یہ سب کچھ ملا ہے، وہ اتنا امیر نہیں رہا جتنا کہ وہ اپنے آپ کو اس وقت محسوس کرتا تھا جب اسے اپنے باپ سے صرف دس ہزار روبل سالانہ الاؤنس حاصل ہوتا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنے بجٹ کا جو مبہم سا خاکہ تھا، وہ کچھ اس قسم کا تھا:

مختلف جاگیروں کے لیے زرعی بنک سے جو قرضے لیے گئے تھے، اسی ہزار روبل سالانہ ان کی ادائیگی پر اٹھ جاتے تھے۔ ماسکو کے مضافات میں جاگیر اور مکانات تھے اور شہر میں حویلی تھی۔ ان کے انتظام وانصرام اور تینوں پرنسوں کے الاؤنس پر تیس ہزار روبل صرف ہو جاتے تھے۔ پندرہ ہزار روبل پنشنوں کی ادائیگی میں نکل جاتے

تھے اور اتنی ہی رقم خیراتی اداروں میں بانٹ دی جاتی تھی۔ ڈیڑھ لاکھ روبل کاؤنٹس کا ذاتی خرچہ تھا۔ دوسرے قرضوں پر جو سود دینا پڑتا تھا، وہ ستر ہزار روبل تھا۔ دو سال قبل اس نے گرجے کی تعمیر کا بیڑا اٹھایا تھا، اس مد میں اسے دس ہزار روبل سالانہ خرچ کرنا پڑ رہے تھے۔ لے دے کر جو ایک لاکھ روبل باقی بچتے تھے، اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیسے خرچ ہو رہے ہیں اور اسے تقریباً ہر سال قرضہ لینا پڑتا تھا۔ مزید برآں اس کا چیف سٹیوارڈ اسے اس قسم کی اطلاعات بہم پہنچاتا رہتا تھا کہ فلاں فلاں جگہ آگ لگ گئی ہے، فصلیں خراب ہوئی ہیں اور فیکٹریوں اور ورکشاپوں کی تعمیر نو ہونا چاہیے۔ چنانچہ پیئر کو جس اولین کام سے نپٹنا پڑ رہا تھا وہ عملی کاروبار تھا اور یہی وہ کام تھا جس کے کرنے کی نہ تو اس میں صلاحیت تھی اور نہ اس کا طبعی میلان اس طرف تھا۔

پیئر ہر روز اپنے چیف سٹیوارڈ کے ساتھ مختلف امور کا جائزہ لیتا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ معاملات ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھ رہے۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس کے ان مشوروں کا حقیقی معاملات سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایک طرف اس کا چیف سٹیوارڈ تھا۔ وہ معاملات کو مسلسل بدترین صورت میں پیش کر رہا تھا اور پیہم اصرار کر رہا تھا کہ تمام قرضوں کو ادا کرنا اور زرعی غلاموں کی مدد سے نئے منصوبوں کا، جس سے پیئر متفق نہیں ہو رہا تھا، آغاز کرنا ضروری ہے۔ دوسری طرف پیئر مطالبہ کر رہا تھا کہ غلاموں کو آزاد کرنے کے سلسلے میں اقدامات کیے جائیں۔ چیف سٹیوارڈ اس کا توڑ یوں کرتا تھا کہ وہ زرعی بنک کے قرضوں کی فوری ادائیگی کی ضرورت ثابت کرنے لگتا اور نتیجتاً غلاموں کی بسرعت آزادی کو ناممکن بنا دیتا۔

سٹیوارڈ نے یہ تو نہ کہا کہ یہ بالکل ہی ناممکن ہے تاہم اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر کاست روما[18] صوبے کے جنگلات، زیریں دریا کے کنارے واقع اراضی اور کریمیا کی جاگیر فروخت کر دی جائے، پھر اسے ممکن بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن جنگلات اور اراضی کی فروخت اتنا آسان کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں بڑی پیچیدگیاں اور الجھنیں حائل ہیں۔ مختلف عدالتوں اور محکموں نے جو امتناعی احکام جاری کر رکھے ہیں، انھیں منسوخ کرانا پڑے گا، جگہ جگہ درخواستیں دینا پڑیں گی، اجازت نامے حاصل کرنا ہوں گے، وغیرہ وغیرہ۔ تب کہیں ان کی فروخت کا مرحلہ آئے گا۔ یہ اس قسم کی بھول بھلیاں تھیں کہ پیئر بالکل چکرا گیا اور وہ صرف اتنا کہہ سکا: "ہاں، ہاں، یہی کرو۔"

پیئر میں اس عملی مستقل مزاجی کا، جو اسے اپنا کاروبار خود سنبھالنے کے قابل بنا سکتی تھی، فقدان تھا۔ چنانچہ اسے کاروبار سے گھن آتی تھی لیکن سٹیوارڈ کے سامنے وہ یوں بننے کی کوشش کر رہا تھا جیسے وہ سب کچھ سمجھتا ہو اور اس پر پوری توجہ دے رہا ہو۔ جہاں تک سٹیوارڈ کا تعلق ہے، وہ پیئر کے سامنے کچھ اس قسم کی اداکاری کر رہا تھا کہ وہ جو آپس میں صلاح مشورے کر رہے ہیں، وہ اس کے خیال کے مطابق اس کے آقا کے لیے تو سودمند ہیں لیکن خود اس کے لیے خاصے تکلیف دہ اور بے آرامی کا باعث ہیں۔

کیف خاصا بڑا شہر تھا۔ وہاں اس کی ملاقات کچھ اپنی جان پہچان کے لوگوں سے ہو گئی۔ دوسروں نے اس دولت مند نو وارد سے، جو صوبے کا سب سے بڑا جاگیردار تھا، متعارف ہونے اور اسے پرجوش انداز سے

خوش آمدید کہنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔ وہ اخلاقی کمزوری، جس سے جان چھڑانا اس کے لیے قریب قریب ناممکن تھا۔ اور جس کا فری میسنوں کی جماعت میں شمولیت کے دوران میں اس نے اعتراف بھی کیا تھا۔ اس کی تسکین کے لیے یہاں اتنی ترغیبات تھیں کہ وہ ان کی تابِ مقاومت نہ لا سکا۔ ایک بار پھر پیٹرزبرگ کی طرح یہاں بھی اس کے پورے پورے ایام، ہفتے اور مہینے پارٹیوں، عشائیوں، سہ پہر کے کھانوں اور اجتماعی رقص کی محفلوں کی نذر ہونے لگے۔ ان پیہم مصروفیات کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ یہاں بھی اسے سوچ بچار کا ایک لمحہ تک میسر نہ آیا۔ اس نے جو نیا طرزِ حیات اختیار کرنے کی امیدیں باندھی تھیں، وہ نقشِ برآب ثابت ہوئیں اور وہ ایک بار پھر پرانی ڈگر پر چل رہا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ ماحول تبدیل ہو گیا تھا۔

جہاں تک فری میسنوں کے تین اصولوں کا تعلق تھا، پیئر کو یہ اقرار کرتے بنی کہ وہ اس اصول کی، جو ہر میسن کو یہ تلقین کرتا تھا کہ اسے دوسروں کے سامنے راست بازی کا نمونہ بن کر پیش ہونا چاہیے، پاسداری نہیں کر رہا۔ وہ یہ بھی مان رہا تھا کہ وہ حسناتِ ہفت میں سے دو — اخلاقیات اور حبِّ مرگ — میں بالکل کورا ہے۔ تاہم وہ یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لیا کرتا تھا کہ وہ ایک اور اصول — بنی آدم کی اصلاح و بہبود — پر تو عمل پیرا تھا۔ پھر اس میں چند اور خوبیاں بھی تھیں۔ وہ پڑوسیوں سے محبت کرتا تھا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ فیاض تھا۔

1807 کے موسم بہار میں پیئر نے پیٹرزبرگ واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ واپسی کے سفر کے دوران میں وہ اپنی تمام جاگیروں کا معائنہ کرے گا اور اپنی آنکھوں سے دیکھے گا کہ اس کے احکام کی کس حد تک تعمیل ہوئی ہے۔ وہ یہ بھی معلوم کرے گا کہ زرعی غلام، جنھیں خداوند نے اس کی تحویل میں دیا تھا اور جنھیں منفعت پہنچانے کی وہ پوری کوشش کر رہا تھا، اب کن حالوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔

چیف سٹیوارڈ نے، جس کی نگاہوں میں کاؤنٹ کے منصوبے قریب قریب جنونی تھے، ان میں نہ اس کی، نہ مالک کی اور نہ کسانوں کی بھلائی تھی، زرعی غلاموں کو چند رعایات دے دی تھیں۔ وہ ان کی آزادی کو تو ناممکن العمل بنا کر پیش کرتا رہا، تاہم اس نے تمام جاگیروں میں مدارس، شفاخانے اور محتاج گاہیں قائم کرنے کی غرض سے بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرنے کے احکام دے دیے۔ ہر جگہ آقا کے استقبال کی تیاریاں کی گئیں۔ تاہم اس سلسلے میں پُر نمود جشن اور رقص و سرود کی محفلیں برپا کرنے سے گریز کیا گیا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پیئر انھیں پسند نہیں کرے گا۔ ان کی بجائے شکرانے کی مجالس منعقد کی گئیں۔ ان میں لوگوں کو ایقونات کی زیارت کرائی جاتی اور ان کی تواضع روٹی اور نمک سے کی جاتی۔ جہاں تک وہ اپنے آقا کے کردار کو سمجھ سکا تھا، اس کا خیال تھا کہ وہ ان طور طریقوں سے اسے متاثر بھی کر سکے گا اور اسے جُل بھی دے سکے گا۔

دکھنی بہار، ساختہ ویانا گاڑی میں آرام دہ اور تیز رفتار سفر اور سُونی شاہراہ، ان تمام چیزوں نے پیئر کا دل خوش کر دیا۔ جن جاگیروں کا اس نے پہلے کبھی دورہ نہیں کیا تھا، ان میں سے ہر ایک پہلی سے بڑھ کر خوبصورت اور دل آویز دکھائی دے رہی تھی۔ وہ جہاں بھی گیا، کسان بظاہر خوشحال نظر آئے اور انھیں جن عنایات سے بہرہ ور کیا

گیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے ان کے قلوب پر گہرا اثر کیا ہے اور وہ بے حد ممنون و مشکور ہیں۔ ہر جگہ اس کا والہانہ استقبال کیا گیا۔ اس سے پیئر کو شرمندگی کا احساس ضرور ہوتا تھا تاہم اپنی اس قدر افزائی پر وہ خوشی سے پھولا نہیں سماتا تھا۔ ایک مقام پر کسانوں نے اسے روٹی، نمک اور سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کا ایقونہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی انھوں نے گزارش کی: ''آپ نے جو کچھ ہمارے لیے کیا ہے، اس کے عوض اپنے تشکر اور محبت کی نشانی کے طور پر ہمیں اپنے خرچ پر آپ اپنے مربی سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے اعزاز میں کلیسا سے ملحق نئی خانقاہِ موقوفہ[19] تعمیر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں۔'' ایک اور مقام پر اس کی خدمت میں چند خواتین پیش ہوئیں۔ وہ بازوؤں میں دودھ پیتے بچے اٹھائے ہوئے تھیں۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرنے آئی تھیں کہ اس نے انھیں محنت شاقہ سے نجات دلائی ہے۔ تیسری جاگیر پر اس کی ملاقات ایک پادری سے ہوئی۔ اس نے صلیب اٹھا رکھی تھی اور اس کے اردگرد بچوں کا ہجوم تھا۔ وہ اسے یہ بتانے آیا تھا: ''صاحب، آپ کی دریادلی کے طفیل میں ان بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا رہا اور انھیں دین کی تعلیم دے رہا ہوں۔'' اس نے اپنی تمام جاگیروں میں اپنی آنکھوں سے اینٹوں کی عمارتیں دیکھیں۔ یہ عمارتیں یا تو تعمیر ہو چکی تھیں یا تعمیر کے مراحل طے کر رہی تھیں۔ ان سب کا نقشہ یکساں تھا۔ ان میں عنقریب مدارس، شفاخانے اور محتاج گاہیں قائم کی جانا تھیں۔ اس نے ہر جگہ منتظمین کے حساب کتاب کا جائزہ لیا۔ جائزے کے دوران میں اس امر کا عندیہ ملتا تھا کہ جبری مشقت میں تخفیف کر دی گئی ہے۔ ہر مقام پر نیلے کوٹوں میں ملبوس کسانوں کے نمائندے اس کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور تہہ دل سے اس کا شکریہ ادا کرتے تھے۔

جس بات کا پیئر کو علم نہیں تھا، وہ یہ تھی کہ جس گاؤں میں اسے روٹی اور نمک پیش کیا گیا تھا اور جس کے باشندوں نے اس سے سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے اعزاز میں خانقاہ موقوفہ تعمیر کرنے کی اجازت مانگی تھی، وہ میلہ گاؤں (مارکیٹ ویلج) تھا۔ یہاں ہر سال سینٹ پیئر کے یوم پر میلہ منعقد ہوتا تھا اور جو کسان وفد بنا کر اس کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، وہ کھاتے پیتے لوگ تھے اور مدتوں پہلے خانقاہِ موقوفہ کی تعمیر شروع کر چکے تھے جب کہ گاؤں کے نوے فیصدی کسان انتہائی مفلوک الحالی اور مفلسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ جب سے اس نے یہ حکم دیا تھا کہ دودھ پلانے والی ماؤں کو اس کی زمینوں پر کام کرنے کے لیے نہ بھیجا جائے، انھیں اپنے قطعاتِ اراضی پر پہلے سے بھی کہیں زیادہ جان توڑ محنت مشقت کرنا پڑتی تھی۔ وہ اس امر سے آگاہ نہیں تھا کہ جو پادری صلیب لٹکائے اس سے ملاقات کرنے آیا تھا، وہ کسانوں سے طرح طرح کے چندے وصول کرتا تھا اور یوں اس نے ان کا جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہ جن شاگردوں کو اپنے ہمراہ لے کر گیا تھا، انھیں آنسوؤں اور سسکیوں سے اس کے سپرد کیا گیا تھا اور پھر انھیں واگزار کرانے کے لیے ان کے والدین کو اسے بھاری رقوم ادا کرنا پڑی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ منصوبے کے مطابق اینٹوں کی جو عمارتیں اٹھائی جا رہی تھیں، ان کی تعمیر میں زرعی کسانوں کا خون پسینہ شامل تھا، ان کی جبری مشقت میں محض کاغذی تخفیف ہوئی تھی جب کہ اصلاً وہ پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اسے پتا نہیں تھا کہ جب منتظمین نے حساب کے رجسٹروں میں اسے یہ دکھایا کہ زرعی غلاموں

کو جو لگان ادا کرنا پڑتا ہے، اس میں ایک تہائی کمی کر دی گئی ہے، اس وقت ان کی کھیتوں پر لازمی مشقت ڈیڑھ گنا ہو چکی تھی۔ چنانچہ اپنی جاگیروں کے اس دورے کے بعد پیئر کا دل وفور مسرت سے بلیوں اچھلنے لگا اور پیٹرزبرگ سے روانہ ہونے سے قبل اس پر انسانوں کے ساتھ فیاضانہ رویہ اختیار کرنے کی جو کیفیت طاری ہوئی تھی، وہ لوٹ آئی اور اس نے "اصول ساز برادر" (وہ گرینڈ ماسٹر کو اسی نام سے پکارتا تھا) کو نہایت ولولہ انگیز خطوط تحریر کیے۔

"اتنی زیادہ بھلائی کرنے پر کتنی کم محنت کرنا پڑی ہے اور اس میں کھکھیڑیں بھی کتنی کم اٹھانا پڑی ہیں!" پیئر نے سوچا۔ "اس قسم کے کام کرنے کے لیے ہم کتنے کم ہاتھ پاؤں ہلاتے ہیں!"

اس کے سامنے تشکر و احسان مندی کے جن جذبات کا اظہار کیا گیا، اس پر اسے خوشی تو ہوئی لیکن درپردہ اسے شرمندگی ہو رہی تھی کہ وہ ان کا وصول کنندہ ہے۔ اس تشکر سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ان سادہ دل اور نیک لوگوں کے لیے مزید کتنا کچھ کر سکتا ہے۔

چیف سٹیوارڈ بالکل احمق لیکن اس کے ساتھ ہی بڑا اکائیاں شخص تھا۔ وہ ذہین و فطین لیکن سادہ لوح کاؤنٹ کو ٹھیک ٹھیک سمجھ گیا تھا اور اس کے ساتھ یوں کھیل رہا تھا جیسے بچہ کھلونے سے کھیلتا ہے۔ اس نے جب پیئر پر ان استقبالیوں کا، جنھیں پہلے سے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت منظم کیا گیا تھا، یہ اثر دیکھا، وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ زرعی غلاموں کو آزاد کرنا ناممکن ہی نہیں بلکہ لاحاصل بھی ہے کیونکہ وہ اپنے حال میں مست ہیں، پہلے سے بھی زیادہ قوی دلائل، جنھیں صحیح تسلیم کیے بغیر بن نہ پڑے، پیش کرنے لگا۔

اپنے نہاں خانۂ دل میں پیئر چیف سٹیوارڈ سے متفق تھا کہ ان سے زیادہ خوش و خرم لوگوں کا تصور محال ہے اور اگر انھیں آزاد کر دیا گیا، پھر خدا جانے ان کا کیا بنے گا۔ تاہم وہ جس چیز کو درست سمجھتا تھا، بادلِ ناخواستہ ہی سہی، اس پر اصرار ضرور کرتا تھا۔ چیف سٹیوارڈ نے وعدہ کیا کہ جس قدر ممکن ہوا، وہ کاؤنٹ کی خواہشات پورا کرنے کی کوشش کرے گا۔ وہ تاڑ گیا تھا کہ کاؤنٹ کے لیے یہ کبھی ممکن نہیں ہوگا کہ وہ یہ معلوم کر سکے کہ اراضی اور جنگلات کی فروخت اور بنک کے قرضے سے مرتہن جائیداد چھڑانے کے ضمن میں ہر اقدام کیا گیا ہے یا نہیں بلکہ غالباً وہ اس سلسلے میں کوئی پوچھ گچھ بھی نہیں کرے گا۔ اور اس چیز کا تو اسے کبھی علم نہیں ہو پائے گا کہ نو تعمیر عمارتیں خالی پڑی ہیں اور دوسرے لوگوں کے زرعی غلاموں کی طرح ان کے زرعی غلام بھی روپے پیسے اور محنت و مشقت کی صورت میں وہی کچھ ادا کرتے رہیں گے — بہ الفاظ دیگر جو کچھ ان سے ہتھیایا جا سکتا تھا، ہتھیایا جا رہا تھا۔

11

پیئر اپنے دکھنی دورے سے بالکل شاد و مطمئن تھا۔ واپسی میں اس نے اپنے دوست بلکونسکی کے، جس سے اس کی ملاقات دو سال سے نہیں ہوئی تھی، ہاں جانے کے ارادے کو، جو مدتوں سے اس کے دل میں پل رہا تھا، عملی جامہ پہنانے کا فیصلہ کر لیا۔

آخری ڈاک چوکی پر اسے معلوم ہوا کہ پرنس آندرے بالڈ ہلز میں نہیں بلکہ اس جاگیر پر، جو اسے حال ہی میں ملی تھی، قیام پذیر ہے۔ چنانچہ وہ اسے ملنے ادھر چل پڑا۔

باگوچورانو جس خطے میں واقع تھا، وہ چپٹا اور غیر دلکش تھا۔ یہ زرعی کھیتوں اور فر[20] اور برچ[21] کے جنگلات میں گھرا ہوا تھا۔ کہیں کہیں یہ درخت کاٹ دیے گئے تھے۔ پرنس آندرے کا فارم ہاؤس گاؤں کے، جو بڑی سڑک کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا، سرے پر بنا ہوا تھا۔ فارم ہاؤس کے اردگرد جھاڑیوں اور درختوں کا نسبتاً نیا ذخیرہ تھا۔ جھاڑیوں کے مابین کہیں کہیں صنوبر کے قدآور درخت کھڑے تھے۔ مکان کے سامنے پانی کا حوض تھا۔ اسے حال ہی میں زمین کھود کر بنایا گیا تھا۔ پانی اس کے کناروں سے اچھل رہا تھا لیکن ابھی تک ان پر گھاس نہیں اگی تھی۔

فارم ہاؤس غلے کے گوداموں، اصطبلوں، مویشیوں کے باڑوں، اجتماعی غسل خانوں، مین گیٹ کے قریب چوکیداروں اور دوسرے ملازموں کے کوارٹروں اور اینٹ سے بنے وسیع وعریض مکان پر مشتمل تھا۔ اس کے نزدیک پختہ فرش، جس پر فصلیں کوٹ کر غلہ بھوسے سے الگ کیا جاتا تھا، بنا ہوا تھا۔ مکان کے سامنے کا حصہ نیم دائرے کی شکل کا تھا اور ابھی زیر تعمیر تھا۔ مکان کے گرداگرد حال ہی میں باغیچہ بچھایا گیا تھا۔ باڑیں اور دروازے ٹھوس، مضبوط اور نئے تھے۔ چھپر کے نیچے دو واٹر پمپ اور ایک پانی کا ڈرم، جس پر سبز روغن پھرا ہوا تھا، پڑا تھا۔ سڑکیں سیدھی اور پل، جن کے دونوں اطراف جنگلے تھے، مضبوط تھے۔ ہر چیز پر اعلیٰ کارکردگی اور دیکھ بھال کی مہر لگی تھی۔ پیئر کو راستے میں چند گھریلو ملازمین ملے۔ ان سے دریافت کرنے پر اسے معلوم ہوا کہ پرنس آندرے حوض کے کنارے نوتعمیر مکان میں رہتا ہے۔ بوڑھے خدمت گار انتن نے، جس نے پرنس آندرے کے لڑکپن میں اس کی خدمت کی تھی، پیئر کو گاڑی سے نیچے اترنے میں مدد دی اور بتایا کہ پرنس گھر پر ہی ہے۔ وہ اسے صاف ستھرے چھوٹے استقبالیہ کمرے میں لے گیا۔

پیئر کی اپنے دوست سے آخری ملاقات پیٹرزبرگ کے پرشکوہ اور درخشاں ماحول میں ہوئی تھی۔ اس نے جب اس کا یہ چھوٹا لیکن انتہائی صاف ستھرا مکان دیکھا، وہ بہت متاثر ہوا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ننھے منے ڈرائنگ روم میں، جس کی چھت اور دیواریں ابھی تک پلستر سے محروم تھیں اور جس کی فضا میں ابھی تک صنوبر کی لکڑی کی بوباس رچی بسی تھی، داخل ہوا۔ وہ شاید مزید آگے جاتا لیکن انتن پنجوں کے بل چلتا لپک کر آگے آیا اور اس نے ایک دروازے پر دستک دی۔

''ہونہہ، کیا بات ہے؟'' کرخت اور کریہہ آواز آئی۔

''مہمان۔''

''اسے کہو کہ ذرا انتظار کرے،'' اور کرسی پیچھے دھکیلے جانے کی آواز سنائی دی۔

پیئر برق رفتاری سے چلتا دروازے کی طرف بڑھا اور اس نے ایکا ایکی اپنے آپ کو پرنس آندرے کے،

• جو جنگل خود اگایا جائے، بگمہ جنگلات اسے ذخیرہ کہتا ہے۔

جونا ک بھوں چڑھاتا اور پہلے کی نسبت معمر نظر آ رہا تھا، بالمقابل کھڑے پایا۔ پیئر اس سے لپٹ گیا، اس نے اپنا چشمہ اتارا، اپنے دوست کے گالوں پر بوسہ ثبت کیا اور نہایت انہماک سے اسے دیکھنے لگا۔

''مجھے قطعاً توقع نہیں تھی کہ تم یہاں آؤ گے۔ ویسے مجھے خوشی ہوئی ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔

پیئر نے کچھ نہ کہا۔ اپنے دوست کی شکل وشباہت میں اسے اتنی تبدیلی نظر آئی کہ حیرت سے اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اس کے لیے وہاں سے نگاہیں ہٹانا ناممکن ہو گیا۔ اس کے الفاظ میں گرم جوشی اور اس کے چہرے پر مسکراہٹ ضرور تھی لیکن اس کی آنکھیں افسردہ اور بے روح تھیں حالانکہ اس نے اپنے طور پر ان میں مسرت وشادمانی کی جوت جگانے کی پوری کوشش کی تھی۔ بات صرف اتنی نہیں تھی کہ اس کا دوست پہلے کی نسبت زیادہ لاغر، زیادہ زرد رو اور زیادہ بالغ نظر ہو گیا تھا، بلکہ جس چیز سے پیئر کو سخت دھچکا لگا اور وہ اپنے آپ کو اس کی موجودگی میں بیگانہ محسوس کرنے لگا تا آنکہ وہ اس کا عادی ہو گیا، وہ یہ تھی کہ اس کی آنکھوں سے کچھ قسم کا تاثر جھلکتا تھا اور اس کی پیشانی پر کچھ اس طرح کی لکیریں نمودار ہو گئی تھیں کہ یوں محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ خاصے عرصے سے کسی ایک ہی سوچ میں مستغرق ہے۔

جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ دو دوست جب طویل جدائی کے بعد آپس میں ملتے ہیں، انھیں گفتگو کو کسی خاص موضوع پر مرکوز کرنے میں خاصا وقت درکار ہوتا ہے۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ انھوں نے ایک دوسرے سے سوالات پوچھے اور ایسی باتوں کے متعلق، جن کے بارے میں انھیں معلوم تھا کہ انھیں ذرا تفصیل سے گفتگو کرنا چاہیے، مختصر جوابات دیے۔ بالآخر گفتگو بتدریج بعض ایسے موضوعات پر، جن کا انھوں نے پہلے محض سرسری ذکر کیا تھا، ٹھہر گئی اور وہ دونوں بیتے واقعات، مستقبل کے عزائم، پیئر کے سفر اور اس کی حالیہ سرگرمیوں، جنگ اور اس قسم کی دوسری چیزوں کے متعلق کھل کر باتیں کرنے لگے۔ پیئر کو پرنس آندرے کی آنکھوں میں جس استغراق اور یاس کی پرچھائیاں نظر آئی تھیں، اب اس کی مسکراہٹ میں، جو وہ اپنے چہرے پر بکھیرے اس کی باتیں سننے میں محو تھا، اور بھی نمایاں دکھائی دینے لگیں۔ جب پیئر پرمسرت جوش وخروش کے ساتھ ماضی یا مستقبل کا ذکر کر رہا ہوتا، ان میں اس وقت خاص طور پر مزید اضافہ ہو جاتا۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ پیئر جو کچھ کہہ رہا ہے، پرنس آندرے اس میں دلچسپی لینا تو چاہتا ہے لیکن ایسا کرنے سے قاصر ہے۔ ادھر پیئر کو یہ احساس ستانے لگا کہ پرنس آندرے کی موجودگی میں اپنے اشتیاقات، خوابوں اور مسرت کی امیدوں کے بارے میں بات کرنا کچھ جچتا نہیں۔ فری میسنوں سے اس نے جو خیالات اخذ کیے تھے اور جنھیں اس کے حالیہ دورے نے حیات نو بخش دی تھی اور انھیں مضبوط وتوانا بنا دیا تھا، اب ان کے متعلق گفتگو کرتے اسے شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ اس نے اپنے آپ کو روکا کیونکہ اسے یہ خوف آنے لگا تھا کہ کہیں وہ بالکل ہی سادہ لوح نظر نہ آئے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی یہ خواہش، جس کی مزاحمت کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی، سر اٹھا رہی تھی کہ وہ اپنے دوست کو جلد از جلد یہ بتا دے کہ جس پیئر کو پرنس آندرے پیٹرز برگ میں جانتا تھا، اب وہ اس سے بالکل مختلف اور بہتر انسان ہے۔

''میں تمھیں بتا نہیں سکتا کہ اس وقت سے مجھے کن کن حالات میں سے گزرنا پڑا ہے۔''

''ہاں، ہم ان ایام کے بعد بہت زیادہ بدل گئے ہیں،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''خیر، تم اپنی سناؤ،'' پیئر نے کہا۔ ''تمھارے کیا عزائم ہیں؟''

''عزائم؟'' پرنس آندرے نے طنزیہ انداز سے دہراتے ہوئے کہا۔ ''میرے عزائم؟'' اس نے ایک بار پھر کہا گویا اس لفظ نے اسے دریائے حیرت میں غوطہ زن کر دیا ہو۔ ''تم دیکھ رہے ہو کہ میں عمارتیں تعمیر کرا رہا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں آئندہ سال یہاں مکمل طور پر منتقل ہو جاؤں...''

پیئر چپ ہو گیا اور متجسس نگاہوں سے پرنس آندرے کا چہرہ، جو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ کہن سال ہو گیا تھا، دیکھنے لگا۔

''نہیں، میرا مطلب یہ معلوم کرنا تھا...'' پیئر نے کہنا شروع کیا لیکن پرنس آندرے نے اسے ٹوک دیا۔

''لیکن میرے متعلق باتیں کرنے کا فائدہ؟ تم مجھے بتاؤ.. تم مجھے بتاؤ کہ تمھارا سفر کیسا رہا، تم اپنی جاگیروں پر کیا کرتے رہے ہو؟''

پیئر اسے بتانے لگا کہ اس نے اپنی جاگیروں پر کیا کچھ کیا ہے، تاہم وہاں حالات کار کو بہتر بنانے کے سلسلے میں جو کچھ کیا گیا تھا، وہ اس میں اپنے کردار پر حتی الوسع پردہ ڈالنے کی کوشش کرتا رہا۔ کئی مواقع ایسے آئے جب پرنس آندرے نے کچھ یوں دخل اندازی کی جیسے اسے معلوم ہو کہ پیئر کیا کہنا چاہتا ہے۔ گویا پیئر نے جو کچھ کیا تھا، وہ کوئی پرانی اور جانی پہچانی کہانی تھی اور جو کچھ وہ سن رہا تھا، نہ صرف یہ کہ اسے اس میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس کا انداز اس قسم کا تھا کہ پیئر جو کچھ اسے بتا رہا ہے، اس پر وہ محجوب ہو رہا ہے۔

اپنے دوست کی صحبت میں پیئر نہ صرف بے چینی محسوس کر رہا تھا بلکہ اس پر افسردگی بھی طاری ہونے لگی۔ بالآخر وہ چپ ہو گیا۔

''مائی ڈیئر فیلو، میں تمھیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ'' پرنس آندرے نے کہا، اپنے مہمان کی آمد پر وہ خود بھی کچھ گھٹا گھٹا محسوس کر رہا تھا اور اس پر بھی افسردگی طاری ہونے لگی تھی، ''یہاں میرا قیام بالکل عارضی ہے— یہاں میں صرف مختلف امور کا جائزہ لینے آیا تھا۔ میں آج ہی واپس اپنی بہن کے پاس جا رہا ہوں۔ میں تمھیں اس سے ملواؤں گا۔ تاہم تم اسے جانتے تو ہو ہی،'' اس نے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ ایک ایسے مہمان سے، جس کے ساتھ اب اس کی کوئی قدر مشترک باقی نہیں رہ گئی تھی، کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ''ہم ڈنر کے بعد چل پڑیں گے۔ خیر، اب تم یہ بتاؤ کہ میرے اس غریب خانے کو دیکھنا پسند کرو گے؟''

وہ باہر نکل گئے اور ڈنر تک ادھر ادھر گھومتے پھرتے رہے اور ایسے اشخاص کی طرح، جن کی آپس میں کوئی بے تکلفی نہ ہو، سیاسی خبروں اور باہمی واقف کاروں کے متعلق باتیں کرتے رہے۔ جہاں تک پرنس آندرے کا تعلق تھا، اس نے گفتگو میں صحیح طور پر دلچسپی تبھی لی اور اس میں جوش و خروش کا مظاہرہ کیا جب وہ اپنے نئے فارم ہاؤس یا اس سے

متعلقہ تعمیرات کے متعلق باتیں کررہا تھا۔ لیکن اس دوران میں بھی جب وہ معماروں کے مچان پر کھڑے تھے، وہ تعمیراتی منصوبے کا ذکر کرتے کرتے اچانک خاموش ہو گیا۔

''خیر، یہ کوئی دلچسپ موضوع نہیں ہے۔ چلو، چل کر کھانا کھاتے ہیں۔ اس کے بعد ہماری روانگی ہوگی۔''

کھانے کے دوران میں پیئر کی شادی کا موضوع زیر بحث آ گیا۔

''جب مجھے اس کی خبر ملی، مجھے سخت تعجب ہوا'' پرنس آندرے نے کہا۔

پیئر کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ جب بھی یہ موضوع چھڑتا تھا، اس کی کیفیت یہی ہو جاتی تھی۔ اس نے فی الفور کہا:

''یہ سب کچھ کیسے ہوا، کسی وقت میں تمھیں اس کے متعلق بتاؤں گا۔ لیکن تم جانتے ہو کہ اب یہ معاملہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے۔''

''ہمیشہ کے لیے؟'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''کوئی چیز ہمیشہ نہیں رہتی۔''

''تمھیں یہ تو معلوم ہوگا کہ یہ ختم کیسے ہوئی؟ نہیں؟ تم نے ڈوئیل کے متعلق کچھ سنا؟''

''ہاں، تو تمھیں اس مصیبت میں سے بھی گزرنا پڑا!''

''میں خداوند کا شکر کرتا ہوں کہ وہ شخص میرے ہاتھوں ہلاک نہیں ہوا۔''

''کیوں؟'' پرنس آندرے نے پوچھا۔ ''خبیث کتے کو ہلاک کرنا تو بڑا نیکی کا کام ہے۔ واقعی۔''

''نہیں، کسی انسان کو ہلاک کرنا اچھا کام نہیں، غلط ہے...''

''غلط کیوں؟'' پرنس آندرے نے اصرار کیا۔ ''غلط کیا ہے، صحیح کیا ہے، اس کا فیصلہ کرنا انسان کے بس کی بات نہیں۔ انسان ہمیشہ غلطیوں کا ارتکاب کرتے رہے ہیں اور ہمیشہ کرتے رہیں گے اور اس بات کا اطلاق کسی اور چیز پر اتنا نہیں ہوتا جتنا کہ اس پر جس کو وہ صحیح یا غلط تصور کرتے ہیں۔''

''ہر وہ چیز جو دوسروں کے لیے ضرر رساں ہو، غلط ہے،'' پیئر نے کہا۔ اسے یہ دیکھ کر مسرت ہو رہی تھی، کہ جب سے وہ آیا تھا، پرنس آندرے پہلی مرتبہ ذرا جوش میں آیا تھا اور صحیح معنوں میں گفتگو میں شرکت کرنے لگا تھا۔ اب اسے یہ آس بندھنے لگی کہ وہ چیز، جس نے اس کی یہ حالت بنا رکھی تھی، اس کا وہ ضرور ذکر کرے گا۔

''اور تمھیں یہ کس نے بتایا ہے کہ دوسروں کے لیے کیا ضرر رساں ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ضرر رساں؟ ضرر رساں؟'' پیئر نے دہرایا۔ ''ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے لیے کیا ضرر رساں ہے۔''

''ہاں، اتنا ہم سب کو معلوم ہے لیکن جس چیز کو میں اپنے لیے ضرر رساں سمجھتا ہوں، وہ وہ ضرر نہیں ہے جس کا نشانہ میں دوسروں کو بنا سکتا ہوں،'' پرنس آندرے نے کہا۔ اس کے جوش و خروش میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور صاف دکھائی دینے لگا تھا کہ اپنے نئے نقطۂ نظر کو پیئر کے سامنے بیان کرنے کے لیے اس کا اشتیاق دو چند ہو رہا ہے۔ اب وہ فرانسیسی میں بولنے لگا۔ ''میرے نزدیک زندگی کی صرف دو آفات ہیں اور وہ ہیں: پشیمانی اور علالت۔ واحد بھلائی ان دونوں کی عدم موجودگی ہے۔ اپنے لیے زندہ رہو اور ان دونوں آفات سے بچو۔ میرا سارا فلسفہ اب صرف

یہی ہے۔"

"حبِّ ہمسایہ اور ایثارِ ذات کے بارے میں کیا خیال ہے؟" پیئر نے کہنا شروع کیا۔ "نہیں، میں تمھاری بات سے اتفاق نہیں کرسکتا۔ محض اس لیے زندہ رہنا کہ انسان افعال شنیع سے پہلو بچاتا رہے تاکہ اسے بعد میں کسی قسم کی پشیمانی سے دوچار نہ ہونا پڑے، میرے خیال میں کافی نہیں ہے۔ میں اسی قسم کی زندگی بسر کرتا رہا، میں محض اپنے لیے جیتا رہا اور اس رویے نے میری زندگی میں زہر گھول دیا۔ اب جب کہ میں دوسروں کے لیے زیست کررہا ہوں یا کم از کم کرنے کی کدوکاوش کررہا ہوں،" (عجز و فروتنی نے پیئر کو اپنی تصحیح کرنے پر مجبور کردیا) "تو مجھے احساس ہوا کہ زندگی اپنے دامن میں انسان کے لیے کتنی مسرتیں سموئے ہوئے ہے۔ نہیں، میں تم سے اتفاق نہیں کرسکتا اور جو کچھ تم کہہ رہے ہو، حقیقتاً تمھیں خود بھی اس پر یقین نہیں ہے۔"

پرنس آندرے خاموش رہا۔ اس کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ کھیل رہی تھی اور اس کی نگاہیں پیئر پر گڑی ہوئی تھیں۔

"جب تمھاری ملاقات میری ہمشیرہ ماریا سے ہوگی، تمھاری اس سے خوب نبھے گی،" اس نے کہا۔ "شاید اپنے بارے میں تم ٹھیک کہتے ہو،" مختصر وقفے کے بعد وہ پھر کہنے لگا: "لیکن ہر شخص اپنے انداز سے زندگی بسر کرتا ہے۔ تم اپنی ذات کے لیے زندگی بسر کرتے رہے اور تم کہتے ہو کہ اس طریقے سے تم نے اپنی زندگی میں زہر گھول لیا، اور تمھیں مسرت تب ملی جب تم دوسروں کی خاطر زندگی کرنے لگے۔ لیکن میرا تجربہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ میں نے عزو وقار اور شان و شکوہ کے لیے زندگی بسا ری اور بہرحال یہ عزو وقار اور شان و شکوہ ہیں کیا؟ یہی نا کہ ہم دوسروں سے پیار کرتے ہیں، ان کی خاطر کچھ کرنے کی آرزو دل میں پالتے ہیں، ان کی پسندیدگی کی تمنا کرتے ہیں۔ چنانچہ میں نے ان کے لیے اپنی زندگی بتائی اور تقریباً ساری نہیں بلکہ کاملاً ساری حیات تباہ کرلی۔ اور جب سے میں نے صرف اپنی خاطر زندگی گزارنا شروع کیا ہے، مجھے سکون ملا ہے۔"

"لیکن جب تم یہ کہتے ہو کہ تم صرف اپنی خاطر زندگی کررہے ہو، اس سے تمھاری کیا مراد ہے؟" پیئر نے ہیجانی عالم میں دریافت کیا۔ "اپنے بیٹے، اپنے والد اور اپنی ہمشیرہ کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟"

"وہ کوئی غیر تھوڑے ہیں — وہ میری اپنی ذات کا جزو ہیں،" پرنس آندرے نے کہا۔ "لیکن جہاں تک دوسروں — مثلاً اپنے ہمسایوں، 'le prochain'* جیسا کہ پرنس ماریا اور تم انھیں کہتے ہو — کا تعلق ہے، وہ غلطی اور بدی کا سرچشمہ ہیں۔ ہمسایوں سے میری مراد تمھارے کیف کے کسانوں، جن کے ساتھ تم بھلائی کرنا چاہتے ہو، جیسے لوگ ہیں۔"

اس کے ساتھ ہی اس نے پیئر کو کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ اس کا تمسخر اڑا رہا ہو، اسے للکار رہا ہو۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے مشتعل کرنا چاہتا ہے۔

* پڑوسی۔

''تم سنجیدہ نہیں ہو،'' پیئر نے کہا۔ اس کا لہجہ بہ لحظہ جلالی ہوتا جارہا تھا۔ ''اگر میں کسی کے ساتھ بھلائی کرنا چاہوں، اس میں غلطی یا برائی کیا ہے؟۔ میں مانتا ہوں کہ میں نے جو کچھ کیا، وہ بہت کم ہے اور پھر میں نے اسے احسن انداز سے بھی نہیں کیا۔ پھر بھی میں نیکی کرنا چاہتا تھا اور اس میں کچھ نہ کچھ کامیاب بھی رہا ہوں۔ یہ بدقسمت لوگ، ہمارے زرعی غلام۔ وہ ہمارے جیسے ہی انسان ہیں۔ بے معنی دعاؤں اور رسوم کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتے۔ انھیں نہ خدا کا علم ہے اور نہ سچائی کا، بس پیدا ہوتے، بڑھتے اور بالآخر مرجاتے ہیں۔ اب جب کہ انھیں یہ سکھانے کا بندوبست کردیا گیا ہے کہ اگر وہ حیاتِ اخروی، جزا اور سزا پر ایمان لے آئیں، تو ان کا یہاں بھی بھلا ہوگا اور آخرت میں بھی، تو اس میں حرج ہی کیا ہے؟ جب لوگ امراض کی وجہ سے موت کے منہ میں جارہے تھے اور کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں تھا حالانکہ انھیں باآسانی مادی امداد فراہم کی جاسکتی تھی، ایسے میں اگر میں نے ان کے لیے کوئی ہسپتال بنوادیا، ڈاکٹر فراہم کردیا اور بوڑھوں اور ضعیفوں کے لیے کوئی محتاج گاہ تعمیر کرادی ہے، تو اس میں غلطی یا برائی کیا ہے؟ اگر کسی کسان یا شیر خوار بچے کی ماں کو، دن ہو یا رات، ایک لمحہ آرام سے بیٹھنا نصیب نہ ہوتا ہو اور میں اسے یہ آرام اور فرصت مہیا کردوں، تو کیا یہ کارِ خیر۔ جو ہر ایک کو نظر آسکتا ہے اور جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ نہیں ہوگا؟'' پیئر نے کہا۔ اگرچہ اس کی زبان بیچ بیچ میں لکنت کھا جاتی تھی، تاہم وہ خاصی روانی اور تیزی سے گفتگو کر رہا تھا۔ ''یہی کچھ تو میں نے کیا ہے، اگرچہ بدسلیقگی سے کیا ہے اور ضرورت سے بہت کم کیا ہے، تاہم میں نے آغاز تو کردیا ہے۔ اور تم مجھ سے یہ نہیں منوا سکتے کہ یہ اچھا کام نہیں تھا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ تم مجھے کسی طور قائل نہیں کر سکتے کہ تم خود اسے اچھا کام نہیں سمجھتے ہو۔ اور بڑی بات یہ ہے،'' اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ''کہ مجھے معلوم ہے، یقینی طور پر معلوم ہے کہ اس قسم کی نیکی کر کے جو خوشی ملتی ہے، وہی زندگی کی واحد سچی خوشی ہے۔''

''افوہ، اگر تم مسئلے کو اس رنگ میں پیش کروگے، تو یہ بالکل مختلف معاملہ بن جاتا ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور باغ لگاتا ہوں۔ اور تم شفاخانے بناتے ہو۔ دونوں مصروفیات وقت گزاری کا ذریعہ بن سکتی ہیں۔ لیکن صحیح کیا ہے، نیک کیا ہے، اس کا فیصلہ اس پر، جو سب کچھ جانتا ہے، چھوڑ دینا چاہیے، حکم لگانا ہمارا کام نہیں ہے۔ خیر، اگر تم مناظرہ ہی کرنا چاہتے ہو،'' اس نے مزید کہا، ''پھر بندہ حاضر ہے۔''

وہ دسترخوان سے اٹھے اور اندر آنے کی راہداری میں، جو برآمدے کا کام دیتی تھی، بیٹھ گئے۔

''آؤ، اس مسئلے کے متعلق بحث کرلیں،'' پرنس آندرے نے کہا، ''تم مدارس'' اس نے ایک انگلی کو خم دیتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ''اور درس و تدریس وغیرہ کی بات کرتے ہو۔ بہ الفاظ دیگر تم اسے'' (اس نے ایک کسان کی طرف، جو اپنی ٹوپی اتارے ان کے قریب سے گزر رہا تھا، اشارہ کیا) ''اس کی حیوانی سطح سے اوپر اٹھانا چاہتے ہو اور اسے اخلاقی ضروریات سے بہرہ ور کرنا چاہتے ہو۔ میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ حیوانی مسرت واحد مسرت ہے جس کا حصول ممکن ہے اور تم اسے اس سے بھی محروم کرنے کے خواہش مند ہو۔ مجھے اس پر رشک آتا ہے لیکن تم پر اسے وہ کچھ، جو کہ میں ہوں، اسے میری ذہانت، میرے احساسات اور میرے ذرائع فراہم کیے بغیر، بنانے کی

دھن سوار ہے۔ ایک اور بات — تم اس کی محنت و مشقت کا بار ہلکا کرنا چاہتے ہو لیکن میرے خیال کے مطابق جس طرح دانشورانہ سرگرمیاں میری اور تمھاری زندگی کا لازمی جزو ہیں کہ ان کے بغیر ہمیں زندگی محال نظر آتی ہے، اسی طرح اس کے لیے جسمانی مشقت انتہائی ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر اس کی زندگی اس کے لیے وبالِ جان بن جائے گی۔ ہم غور وفکر کیے بنا رہ ہی نہیں سکتے۔ میں رات دو بجے کے بعد بستر پر لیٹتا ہوں۔ میرے ذہن پر خیالات یلغار کر دیتے ہیں۔ نیند مجھ سے کوسوں دور رہتی ہے اور میں صبح صادق تک کروٹیں بدلتا رہتا ہوں کیونکہ میں سوچ بچار کرتا رہتا ہوں۔ جس طرح ہل چلانا اور فصلیں کاٹنا اس کی زندگی ہے، وہ اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتا (اگر وہ یہ کام نہیں کرے گا، پھر وہ کسی شراب خانے میں گھس جائے گا یا بستر سے لگ جائے گا)، بعینہٖ سوچ بچار میری زندگی ہے اور میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جس طرح میرے لیے اس کی جسمانی مشقت برداشت کرنا ممکن نہیں، اگر مجھے اس کی طرح محنت مشقت کرنا پڑے، تو شاید ہفتے دس دن کے اندر اندر میں اگلے جہان چل بسوں گا، بعینہٖ اگر وہ میری طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے، وہ پھول کر کپا ہو جائے گا اور زندہ نہیں بچ سکے گا۔ اور تیسری بات، کیا کہا تھا تم نے؟'' پرنس آندرے نے اپنی تیسری انگلی مروڑتے ہوئے کہا۔ ''ارے ہاں، شفاخانے، ادویات۔ ہمارے کسان پر اچانک بیماری حملہ کر دیتی ہے اور اس کی موت اس کے سر پر منڈلانے لگتی ہے۔ تم اس کی فصد کھلوا دیتے ہو اور وہ بچ جاتا ہے لیکن زندگی بھر کے لیے معذور ہو جاتا ہے۔ وہ گھسٹ گھسٹا کر دس سال مزید گزار لیتا ہے لیکن دوسروں پر بوجھ بن جاتا ہے۔ اگر اسے موت آ جاتی، اسے کتنی آسانی اور سہولت رہتی! اس کی جگہ لینے والوں کی کوئی کمی نہیں۔ آئے روز لاتعداد پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ اگر تمھیں اس لیے غصہ آتا ہے کہ تم ایک محنت کش — میں اسے یہی سمجھتا ہوں — سے محروم ہو گئے ہو، تو اور بات ہوتی لیکن تم تو اس لیے اس کی صحت کی بحالی کرانا چاہتے ہو کیونکہ تم اس سے محبت کرتے ہو اور یہ وہ چیز ہے جس کا وہ طلب گار نہیں۔ علاوہ ازیں یہ بھی تمھاری بھول ہے کہ ادویات انسان کو تندرست کر دیتی ہیں۔ بھلا دوا نے کبھی کسی انسان کو تندرست کیا ہے! ہاں، اس نے ہلاک ضرور کیا ہے!'' اس نے زہر خند انداز سے بھویں سکیڑتے اور پیئر سے منہ موڑتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے اپنے خیالات اتنے غیر مبہم اور صحیح انداز سے پیش کیے کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے اپنے موضوع پر ایک سے زیادہ مرتبہ سوچ بچار کیا ہے۔ اس کی گفتگو میں وہی روانی اور تیزی تھی، جو اس شخص کی، جسے مدتوں کسی سے ہم کلام ہونے کا موقع نہ ملا ہو، زبان میں ہوتی ہو۔ اس کے خیالات جتنے زیادہ مایوس کن تھے، وہ خود اتنا ہی زیادہ جوشیلا نظر آ رہا تھا۔

''اف، تمھاری باتیں کتنی ڈراؤنی ہیں!'' پیئر نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا کہ اس قسم کے خیالات کے ساتھ تم زندگی کیسے گزار سکتے ہو؟ اس قسم کے لمحات میں سے مجھے بھی گزرنا پڑا ہے — زیادہ دنوں کی بات نہیں، ماسکو میں اپنے قیام اور پھر سفر کے دوران میں میری یہی کیفیت تھی — لیکن میں اتنی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتا ہوں کہ مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں فی الحقیقت زندگی نہیں کر رہا۔ مجھے ہر چیز سے... بالخصوص اپنے آپ سے،

شدید نفرت ہونے لگتی ہے۔ پھر مجھ سے نہ کھانا کھایا جاتا ہے اور نہ نہایا دھویا... اپنے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟...''

''نہاتے دھوتے نہیں ہو— کیوں؟ اس سے جسم پلید ہو جاتا ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''اس کے برعکس انسان کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ اپنی زندگی کو خوشگوار سے خوشگوار تر بنائے۔ میں زندہ ہوں اور اس میں میرا کوئی قصور نہیں۔ تاہم میرا یہ فرض بنتا ہے کہ دوسروں کے معاملات میں خلل انداز ہوئے بغیر اپنی زندگی بہترین انداز سے گزارنے کی کوشش کروں۔''

''لیکن تمھارا مقصد حیات کیا ہے؟ اگر خیالات کا عالم یہ ہو، پھر آدمی ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہے اور تنکا تک نہ توڑے، کبھی کسی کام کا آغاز نہ کرے...''

''اس صورت میں بھی زندگی آدمی کو آرام چین سے نہیں بیٹھنے دے گی۔ اگر مجھے کچھ نہ کرنا پڑے، مجھے بڑی فرحت ہوگی۔ اس کے برعکس یہاں کے مقامی شرفا نے میری یوں عزت افزائی کی کہ انھوں نے مجھے اپنا مارشل[22] منتخب کر لیا۔ بڑی مشکل سے میں نے اپنی جان چھڑائی۔ وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس عہدے کے لیے جو لازمی خصوصیات— اگر آدمی مارشل بننا چاہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خوش خصال ہو، سطحی ہو اور معمولی باتوں کو بہت اہمیت دیتا ہو— درکار ہیں، مجھ میں ان کا فقدان ہے۔ پھر یہ مکان ہے۔ اس کی تعمیر بہت ضروری تھی تاکہ کوئی ایسی جگہ ہو جسے میں اپنا گھر کہہ سکوں اور جہاں میں رہ سکوں۔ اور اب ملیشیا کی ذمے داریاں ہیں۔''

''تم فوج میں خدمات کیوں سرانجام نہیں دے رہے؟''

''اوسترلٹس کے بعد؟'' پرنس آندرے نے افسردگی سے کہا۔ ''نہیں، شکریہ۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اب میں کبھی دوبارہ روسی افواج میں فعال خدمات سرانجام نہیں دوں گا۔ نہیں، بالکل نہیں۔ بے شک بوناپارت یہاں سمولنسک[23] پہنچ جائے اور بالڈ ہلز خطرے کی زد میں آ جائے۔ پھر بھی میں روسی افواج میں خدمات سرانجام نہیں دوں گا۔ خیر، جیسا کہ میں تمھیں بتا رہا تھا،'' اس نے اپنے آپ کو دوبارہ پرسکون بناتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ''یہاں ملیشیا کی ذمے داریاں ہیں۔ والد ضلع سوم کے کمانڈر انچیف ہیں اور میرے پاس فعال ملازمت سے بچنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ میں ان کی ماتحتی میں کام کروں۔''

''بہر حال تم ملازمت تو کر ہی رہے ہو۔''

''ہاں،'' اس نے جواب دیا اور خاموش ہو گیا۔

''لیکن کیوں؟''

''میں اس 'کیوں' کا جواب دیتا ہوں۔ والد محترم اپنے زمانے کی نادر روزگار ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ روز بروز بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ اگرچہ صحیح معنوں میں انھیں ظالم تو نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن انھوں نے عجب سیمابی طبیعت پائی ہے، وہ ایک گھڑی نچلا نہیں بیٹھ سکتے، کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہیں گے۔ وہ غیر محدود اختیارات

کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ ان کا مزاج بالکل جلالی ہو گیا ہے اور اب امپراطور نے انھیں ملیشیا کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے مزید اختیارات تفویض کر دیے ہیں۔ اگر دو ہفتے قبل مجھے صرف دو گھنٹے کی تاخیر ہو جاتی، وہ یخانوفو[24] کے رجسٹر کلرک کو پھانسی چڑھا چکے ہوتے،" پرنس آندرے نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "چنانچہ میں یہ خدمات سرانجام دے رہا ہوں کیونکہ میں واحد شخص ہوں جو میرے والد پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔ اور کبھی کبھار میں انھیں ایسا فعل، جو بعد میں ان کے لیے شدید اذیت کا سبب بن سکتا ہے، سرانجام دینے سے باز رکھ سکتا ہوں۔"

"یہ ہوئی نہ بات!"

"ہاں، لیکن یہ وہ بات نہیں جو تم سمجھتے ہو،" پرنس آندرے نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "وہ رجسٹر کلرک واقعی بڑا بدمعاش تھا۔ وہ رنگروٹوں کے بوٹ اور دوسری اشیا بیچ کھاتا تھا، مجھے اس سے ہمدردی تھی اور نہ ہے۔ مجھے اپنے والد — جس کا ایک بار پھر مطلب 'میری اپنی ذات' ہے — پر ترس آ گیا تھا۔"

پرنس آندرے کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ جب وہ پیئر کے سامنے یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا، کہ اس نے جو کچھ کیا، اس میں حبِ ہمسایہ کا کوئی دخل نہیں تھا، اس کی آنکھوں میں عاجلانہ چمک آ گئی۔

"دیکھو، تم اپنے غلاموں کو آزاد کرنا چاہتے ہو،" وہ بولے چلا گیا، "یہ بہت اچھی بات ہے لیکن تمھارے لیے نہیں — مجھے یقین ہے کہ تم نے نہ تو کبھی کسی کو کوڑوں سے پٹوایا ہے اور نہ کسی کو سائبیریا بھجوایا ہے — اور تمھارے غلاموں کے لیے تو اس میں بھلائی کا بالکل ہی کوئی پہلو نہیں ہے۔ اگر انھیں مارا پیٹا جائے، کوڑے لگائے جائیں یا انھیں سائبیریا بھیج دیا جائے، میرا خیال ہے کہ انھیں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اس قسم کی وحشیانہ زندگی وہ سائبیریا میں بھی بسر کر سکتے ہیں، جسم پر کوڑوں سے جو زخم آتے ہیں، وہ مندمل ہو جاتے ہیں اور وہ پہلے کی طرح خوش و خرم رہنا شروع کر دیتے ہیں۔ اس سے اگر کسی کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو زرعی غلاموں کے ان مالکوں کو جن کا اخلاقی طور پر دیوالہ پٹ چکا ہے، جنھیں اپنے کیے پر پشیمانی تو ہوتی ہے لیکن وہ اپنی اس پشیمانی کا گلا گھونٹ دیتے ہیں اور چونکہ انھیں جائز ناجائز سزائیں دینے کا اختیار حاصل ہے، وہ سنگ دلی کو اپنا شعار بنا لیتے ہیں۔ یہ ہیں وہ لوگ جن پر مجھے ترس آتا ہے اور ان لوگوں کی (بھلائی کی) خاطر میں یہ چاہوں گا کہ غلاموں کو آزاد کر دیا جائے۔ ممکن ہے کہ تمھیں موقع نہ ملا ہو لیکن میں متعدد ایسے اشخاص کو، جو فطرتاً نیک اور بھلے تھے، جانتا ہوں۔ ان لوگوں نے غیر محدود اختیارات کی روایات میں تربیت پائی اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان کے مزاج میں درشتی اور تندی آتی گئی اور ان کا رویہ ظالمانہ اور سنگ دلانہ ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنی ان کمزوریوں سے آگاہ بھی ہیں لیکن وہ اپنے اوپر قابو پانے میں ناکام رہتے ہیں اور یوں ان کی زندگی تلخ سے تلخ تر ہوتی چلی جاتی ہے۔"

پرنس آندرے اتنے جوش و جذبے سے تقریر کر رہا تھا کہ پیئر یہ سوچے بنا نہ رہ سکا کہ اس کے ذہن میں اس قسم کے خیالات اپنے والد کا رویہ دیکھ کر آئے ہوں گے۔ اس نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

"تو تم نے دیکھ لیا کہ مجھے کس پر ترس آتا ہے اور کس چیز کا افسوس ہو رہا ہے۔ یہ چیزیں سر اور پشتیں نہیں ہیں

کہ آپ انھیں جتنی بار ماریں پیٹیں، جو چاہیں، سزائیں دیں، جس طرح چاہیں ان کے بال مونڈیں[25]، سر سر ہی اور پشتیں پشتیں ہی رہیں گی۔ اصل اشیا انسانی توقیر، ذہنی سکون اور پاکیزگی ہیں۔"
"نہیں، نہیں، ہزار مرتبہ نہیں، میں کبھی تم سے متفق نہیں ہوں گا،" پیئر نے کہا۔

12

شام کو پرنس آندرے اور پیئر کالاش میں سوار ہوئے اور بالڈ ہلز کی طرف چل پڑے۔ پرنس آندرے کبھی کبھار پیئر کی جانب دیکھتا اور کچھ اس قسم کا فقرہ، جس سے معلوم ہوتا کہ اس کا مزاج شگفتہ ہو رہا ہے، کہہ کر مہر خاموشی توڑ دیتا۔
کھیتوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، وہ اسے ان اقدامات کے، جن کی مدد سے وہ اپنی زراعت کو بہتر بنا رہا تھا، بارے میں بتانے لگا۔
پیئر نے روکھی خاموشی اختیار کیے رکھی یا پھر وہ ایک لفظی جواب دے دیتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی سوچوں میں مصروف ہے۔ اس کا خیال تھا کہ پرنس آندرے غلطی پر ہے اور راہ راست سے بھٹک گیا ہے۔ ایسے میں اس کا، یعنی پیئر کا، یہ فرض بنتا ہے کہ وہ آگے بڑھے، اس کی مدد کرے، اسے صحیح راستہ دکھائے اور اسے اخلاقی اور روحانی اعتبار سے اوپر اٹھائے۔ لیکن جونہی سوچ بچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے کیا کہنا چاہیے اور کیسے کہنا چاہیے، وہ پیشگی بھانپ گیا کہ پرنس آندرے محض ایک لفظ یا دلیلِ واحد سے اس کے تمام پند و نصائح کے تار و پود بکھیر دے گا۔ چنانچہ جو چیز اسے عزیز از جان تھی اس کے نزدیک تقدس کا درجہ رکھتی تھی، وہ اس کے متعلق بات کرنے کا یارانہ پاتا تھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ کہیں پرنس آندرے اسے ٹھٹھے مخول میں نہ اڑا دے۔
"آخر قصہ کیا ہے کہ تم اس طرح سوچنے لگے ہو؟" پیئر اچانک بولنے لگا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ کوئی سانڈ ہو اور حملہ کیا چاہتا ہو۔ "آخر تم اس انداز سے کیوں سوچتے ہو؟ تمھیں یوں نہیں سوچنا چاہیے۔"
"اس انداز سے کیا سوچ رہا ہوں؟" پرنس آندرے نے متعجب ہو کر پوچھا۔
"زندگی کے بارے میں، انسان کے مقدر کے بارے میں۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں بھی کچھ اسی انداز سے سوچا کرتا تھا اور تمھیں معلوم ہے کہ مجھے کس چیز نے بچایا؟ فری میسنری نے۔ نہیں، مسکراؤ مت۔ میں سمجھتا تھا کہ فری میسنری کوئی مذہبی یا رسوماتی فرقہ ہے جب کہ حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ یہ بنی نوع انسان کے ارفع ترین اور ابدی پہلوؤں کا فقید المثال اظہار ہے۔"
اور فری میسنری کو جس طرح وہ خود سمجھ پایا تھا، پرنس آندرے کے سامنے وہ اس کی وضاحت کرنے لگا۔
اس نے بتایا کہ فری میسنری کی تعلیمات وہی ہیں جو عیسائیت کی ہیں۔ عیسائیت کی طرح فری میسنری بھی اخوت، مساوات اور محبت کی تعلیم دیتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسے ان بیڑیوں سے، جو مملکت اور کلیسا نے عیسائیت

کے پاؤں میں ڈال رکھی ہیں، نجات دلا دی گئی ہے۔

''صرف ہماری تقدس مآب برادری کو زندگی کے صحیح مفہوم کا شعور ہے۔ باقی سب کچھ محض خواب وخیال ہے،'' پیئر نے کہا۔ ''میرے دوست، بس یوں سمجھو کہ اس برادری سے جو کچھ باہر ہے، وہ دروغ اور فریب سے پُر ہے۔ اور مجھے تم سے اتفاق ہے کہ ذہین اور نیک انسان کے لیے اس کے علاوہ اور کوئی چارہ ہی نہیں رہ جاتا کہ وہ تمھاری طرح یوں زندگی کی سعی کرے کہ اس سے دوسروں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ لیکن (میں چاہتا ہوں کہ) تم ہمارے بنیادی عقائد کو اپنالو، ہماری برادری میں شامل ہو جاؤ، قلب وروح کی گہرائیوں سے ہمارا ساتھ دو، ہمیں موقع دو کہ ہم تمھاری رہبری کرسکیں اور جس طرح میرے ساتھ ہوا، تم بھی پلک جھپکنے میں یہ محسوس کرنے لگو گے کہ تم اس بے کراں، غیر مرئی زنجیر کے، جس کا ابتدائی سرا افلاک میں مستور ہے، جزو ہو۔''

پرنس آندرے سیدھا اپنے سامنے دیکھ رہا اور مہر بلب اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ متعدد بار ایسا ہوا کہ گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ میں کوئی لفظ اس کے پلّے نہ پڑا اور اس نے پیئر سے اسے دہرانے کے لیے کہا۔ پرنس آندرے نے جس طرح خاموشی اختیار کر رکھی تھی اور اس کی آنکھوں میں جو مخصوص روشنی جھلملا رہی تھی، اس سے پیئر نے اندازہ لگایا کہ اس کی گفتگو اکارت نہیں گئی ہے، پرنس آندرے نہ تو اسے ٹوکے گا اور نہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، اس کا مذاق اڑائے گا۔

وہ ایک دریا کے قریب پہنچے۔ اس کا پانی کناروں سے اچھل رہا تھا اور اسے انھوں نے کشتی سے پار کرنا تھا۔ دونوں نوجوان کشتی پر سوار ہو گئے اور جب ان کی گاڑی اور گھوڑے اس پر لادے جا رہے تھے، پرنس آندرے اس کے جنگلے پر جھک گیا اور خاموشی سے سیلابی پانی کو، جو دھوپ میں چمک رہا تھا، بغور دیکھنے لگا۔

''خیر، اس بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟'' پیئر نے دریافت کیا۔ ''تم بولتے کیوں نہیں؟''

''میرا کیا خیال ہے؟ میں نے تمھاری گفتگو سنی ہے۔ یہ ٹھیک ٹھاک تھی،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''تم کہتے ہو ہماری برادری میں شامل ہو جاؤ اور ہم تمھیں مقصدِ حیات، مقدرِ انسان اور ان قوانین کے، جو کائنات کا نظام چلا رہے ہیں، بارے میں بتائیں گے۔ لیکن ہم کون ہے؟ — انسان۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے کہ تم سب کچھ جانتے ہو؟ جو کچھ تمھیں نظر آ رہا ہے، صرف مجھے ہی کیوں نظر نہیں آ رہا؟ تم سمجھتے ہو کہ اس دھرتی پر صداقت اور نیکوکاری کا چلن ہوگا لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔''

پیئر نے اس کی بات کاٹ دی۔ ''کیا تمھیں حیاتِ اخروی پر یقین ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''حیاتِ اخروی؟'' پرنس آندرے نے دہرایا لیکن پیئر نے اسے جواب دینے کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ سمجھا کہ پرنس آندرے نے اس کے الفاظ جوں کے توں دہرا کر اس کے وجود سے انکار کیا ہے۔ اسے اس پر یوں بھی جھٹ پٹ یقین آ گیا کیونکہ وہ پرنس آندرے کے سابقہ ملحدانہ عقائد سے بخوبی آگاہ تھا۔

''تم کہتے ہو کہ تمھیں اس دھرتی پر صداقت اور نیکوکاری کے چلن کا امکان نظر نہیں آتا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ اگر ہم یہ تصور کرلیں کہ یہاں کی زندگی ہر چیز کا اختتام ہے، پھر امکان نظر آ بھی نہیں سکتا۔ دھرتی، پر — یہاں اس

دھرتی پر،'' (پیئر نے کھیتوں کی طرف اشارہ کیا) ''کوئی صداقت نہیں ہے — صرف بدی اور فریب کا راج ہے۔ لیکن کائنات میں، کُلّی کائنات میں، صداقت کی قلمرو موجود ہے اور ہم، جو کہ اس دھرتی کے بالک ہیں، ابدی معانی میں کائنات کے بالک ہیں۔ کیا میں اپنی روح میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں اس وسیع وعریض، ہم آہنگ اور مربوط کائنات کا جزو ہوں؟ کیا میں یہ محسوس نہیں کرتا کہ میں لاتحصیٰ ولاتعدٰ مخلوقات کے جن میں الوہیت — تم چاہو تو اسے اعلیٰ ترین طاقت بھی کہہ سکتے ہو — کا ظہور ہوتا ہے، اس ہم آہنگ اور مربوط ہجوم میں، ادنیٰ ترین سے اعلیٰ ترین مخلوقات کے مابین کڑی، واسطہ یا پیڑی ہوں؟ اگر میں اس سیڑھی کو، جو پودے سے انسان تک پہنچتی ہے، دیکھ سکتا ہوں، واضح طور پر دیکھ سکتا ہوں، پھر میں یہ کیوں فرض کرلوں کہ یہ سیڑھی، جس کا نقطۂ آغاز میرے، بہت نیچے کہیں ہے اور میری نگاہوں سے اوجھل ہے، مجھ پر ہی آکر ختم ہوجاتی ہے اور وہ آگے، بہت ہی آگے، ان مخلوقات تک، جو مجھ سے کہیں بلند تر ہیں، نہیں جاتی؟ میں نہ صرف یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں ناپید نہیں ہوسکتا کیونکہ اس دنیا میں کچھ بھی ناپید نہیں ہوتا، بلکہ مجھے یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ میں ہمیشہ موجود رہوں گا، ہمیشہ موجود رہا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میرے علاوہ مجھ سے بالا ارواح موجود ہیں اور اس دھرتی پر صداقت کا وجود بھی ہے۔''

''ہاں، یہ ہرڈر[26] کا نظریہ ہے،'' پرنس آندرے نے اظہار خیال کیا۔ ''لیکن، مائی ڈیئر فیلو، اس قسم کی باتیں مجھے قائل نہیں کرسکیں گی۔ مجھے جو چیزیں قائل کرتی ہیں، وہ زندگی اور موت ہیں۔ آپ قائل اس وقت ہوتے ہیں جب آپ اس شخص کو دیکھتے ہیں جو آپ کو بہت عزیز ہوتا ہے، جس کا وجود آپ کے وجود سے منسلک ہوتا ہے، جس کے ساتھ آپ زیادتی کر بیٹھے ہیں لیکن آپ کو توقع ہے کہ آپ اس زیادتی کی تلافی کرسکیں گے۔'' (پرنس آندرے کی آواز کپکپانے لگی اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیرلیا۔) ''لیکن اچانک یہ شخص صاحب فراش ہوجاتا ہے، شدید کرب میں مبتلا ہوجاتا ہے، اس پر نزع کا عالم طاری ہوجاتا ہے اور اس کا وجود معدوم ہوجاتا ہے... کیوں؟ اس کا کوئی جواب ہونا چاہیے! اور مجھے یقین ہے کہ جواب ہے... یہ ہے وہ چیز جو قائل کرتی ہے اور یہی ہے وہ چیز، جس نے مجھے قائل کیا ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''بالکل، بالکل، بجا کہا،'' پیئر نے کہا۔ ''کیا میں یہی کچھ نہیں کہہ رہا؟''

''نہیں۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں، وہ صرف یہ ہے کہ آپ محض دلائل کے بل بوتے پر کسی شخص کو حیات اخروی کی ضرورت کے بارے میں قائل نہیں کرسکتے بلکہ جو چیز اسے قائل کرتی ہے وہ یہ ہے: جب آپ کسی شخص کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے زندگی کے سفر پر گامزن ہوں، پھر ایکا ایکی وہ شخص ناپید ہوجاتا ہے، وہاں، جہاں عدم ہے، چلا جاتا ہے اور آپ کو خود اس اتھاہ گہرائی کا سامنا اکیلے کرنا پڑتا ہے، آپ اس میں اکیلے جھانکتے رہ جاتے ہیں... اور میں نے اس میں جھانک کر دیکھا ہے...''

''اچھا، پھر بات بن گئی نا! تم جانتے ہو کہ ایک جہان اُدھر ہے اور اس جہان میں کوئی ہے۔ یہ جہان (بہ الفاظ دیگر) حیاتِ اخروی ہے اور کوئی کا دوسرا نام خداوند ہے۔''

پرنس آندرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ گاڑی اور گھوڑے مدتوں پہلے کشتی سے اتارے جا چکے تھے اور گاڑی میں گھوڑے جوتے جا چکے تھے۔ سورج خاصا نیچے جا چکا تھا اور کشتی کے قریب جوہڑوں کی سطح پر شام کا پالا ستاروں کی طرح جھلملانے لگا تھا لیکن پیئر اور پرنس آندرے ابھی تک کشتی پر کھڑے تھے اور باتوں میں محو تھے، اس پر ملازموں، کوچوانوں اور کشتی رانوں کو سخت اچنبھا ہو رہا تھا۔

''اگر کوئی خدا اور اخروی حیات ہے، پھر صداقت اور نیکوکاری کا وجود بھی لازماً ہے۔ اور انسان کی اعلیٰ ترین مسرت کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ ان کے حصول کے لیے جدوجہد کرے۔ ہمیں لازماً زندگی کرتے رہنا چاہیے، لازماً محبت کا اظہار کرتے رہنا چاہیے اور لازماً اس بات پر یقین رکھنا چاہیے کہ ہم نہ صرف آج زمین کے اس ٹکڑے پر زندگی کر رہے ہیں بلکہ ہم وہاں، کُل میں، زندگی کر چکے ہیں اور ابدی طور پر وہاں زندگی کرتے رہیں گے،'' پیئر نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے کشتی کے جنگلے پر کہنیاں ٹکائے کھڑا رہا اور پیئر کی گفتگو توجہ سے سنتا رہا۔ دریں اثنا اس کی نظریں آفتاب کے سرخ عکس پر، جو نیلگوں پانی میں دکھائی دے رہا تھا، مرکوز رہیں۔ پیئر خاموش ہو گیا۔ سب کچھ ساکت وصامت تھا۔ کشتی بہت دیر پہلے کنارے لگ چکی تھی اور جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، وہ پانی کی ان لہروں کی، جو ہولے ہولے کشتی کے زیریں حصے سے ٹکرا رہی تھیں، پیدا کردہ تھی۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ پانی جس انداز سے ہولے ہولے کشتی سے ٹکرا کر آواز پیدا کر رہا ہے وہ ایسے ہے جیسے پیئر کسی نظم کا ٹیپ کا مصرعہ ''یہ صداقت ہے، اسے مان لو،'' دہرا رہا ہو۔

''ہاں، اگر ایسا ہوتا!'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''خیر، چھوڑو، گاڑی میں بیٹھتے ہیں،'' اس نے مزید کہا۔ وہ کشتی سے نیچے اتر آیا اور آسمان کی جانب، جس کی طرف پیئر نے اشارہ کیا تھا، دیکھنے لگا۔ اوسٹرلٹس کے معرکے کے بعد اسے پہلی مرتبہ وہ بلند و بالا افلاک، جو اس نے میدان جنگ میں لیٹے لیٹے دیکھے تھے، نظر آئے اور کوئی چیز، جو مدتوں سے اس کے وجود کے اندر موجود تھی لیکن خوابیدہ تھی، کوئی چیز، جو اس کے اندر بہترین تھی، اچانک اس کی روح میں نوخیز کلی کی طرح خنداں و متبسم بیدار ہو گئی۔ جونہی وہ زندگی کے عام حالات میں واپس آیا، یہ غائب ہو گئی تاہم اسے یہ معلوم ہو گیا کہ اس احساس کو، جو اس کے وجود میں موجود تھا، کیسے نمو دی جا سکتی ہے۔ پیئر کی آمد سے پرنس آندرے کی زندگی کے نئے دور کا آغاز ہوا۔ اگرچہ خارجی طور پر وہ اسی ڈگر پر چل رہا تھا لیکن داخلی طور پر اس کے لیے نئی زندگی کی ابتدا ہو گئی۔

13

جب پرنس آندرے اور پیئر کی گاڑی بالڈ ہلز کے سامنے کے پھاٹک پر پہنچی، اندھیرا گہرا ہونے لگا تھا۔ جب وہ مکان میں داخل ہونے لگے، پرنس آندرے مسکرایا اور اس نے پیئر کی توجہ اس شور و غل کی جانب دلائی جو عقبی پورچ میں بپا

تھا۔ ان کی گاڑی دیکھ کر ایک کمر خمیدہ پست قامت بڑھیا، جس کی پشت پر جھولی لٹک رہی تھی اور ایک کوتاہ قامت نوجوان، جس کے گیسو دراز اور جس کے جسم پر سیاہ لباس تھا، واپس پھاٹک کی طرف بھاگے آرہے تھے۔ ان کے پیچھے پیچھے دو عورتیں دوڑی آرہی تھیں۔ جب ان چاروں کی نظریں گاڑی پر پڑیں، ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں اور وہ بگٹٹ عقبی پورچ کی سیڑھیاں پھلانگنے لگے۔

''ان کا تعلق ان لوگوں سے ہے، جنھیں میری ہمشیرہ 'اللہ لوگ'[27] کہتی ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''انھوں نے غلطی سے ہمیں ابا جان تصور کر لیا۔ یہ واحد معاملہ ہے جس میں وہ ان کی نافرمانی کرتی ہے۔ ان کا حکم ہے کہ ان زائرین کو یہاں سے بھگا دیا جائے لیکن وہ انھیں 'جی آئیاں نوں' کہتی ہے۔''

''لیکن یہ 'اللہ لوگ' ہیں کیا؟'' پیئر نے پوچھا۔

پرنس آندرے کو جواب دینے کا موقع نہ ملا۔ ان کا استقبال کرنے نوکر چاکر باہر آچکے تھے۔ اس نے ان سے دریافت کیا کہ بڑے میاں کہاں ہیں اور آیا ان کی آمد جلد متوقع ہے؟ ''بڑے پرنس ابھی تک شہر میں مقیم ہیں لیکن وہ کسی وقت بھی واپس تشریف لا سکتے ہیں،'' اسے بتایا گیا۔

پرنس آندرے پیئر کو اپنے باپ کے مکان کے اس حصے میں، جہاں وہ خود رہا کرتا تھا، لے گیا۔ اس کے کمرے اس کے لیے ہمیشہ صاف ستھرے اور تیار رکھے جاتے تھے۔ اس نے پیئر کو یہیں چھوڑا اور خود نرسری میں چلا گیا۔

''آؤ، ہمشیرہ کے پاس چلتے ہیں،'' اس نے واپس آکر پیئر سے کہا۔ ''میری ابھی اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔ وہ کہیں چھپی ہوئی ہے اور اپنے 'اللہ لوگوں' کو لیے بیٹھی ہے۔ ہمیں دیکھ کر وہ خفت محسوس کرے گی، لیکن یہ اس کا اپنا کیا دھرا ہے، اس کے ساتھ یہی ہونا چاہیے۔ تاہم تمھیں اس کے 'اللہ لوگوں' سے ملنے کا موقع مل جائے گا۔ میں اتنا بتا سکتا ہوں کہ یہ عجیب و غریب نظارہ ہے۔''

''لیکن یہ 'اللہ لوگ' ہیں کیا؟''

''تم خود دیکھ لوگے۔''

پرنس ماریا انھیں دیکھ کر واقعی گھبرا گئی اور اس کے چہرے پر سرخ دھبے نمودار ہو گئے۔ اس کے آرام دہ کمرے میں، جہاں الیقونات کے سامنے شمعیں جل رہی تھیں، ایک نوجوان چھوکرا، جس کی ناک لمبی اور گیسو دراز تھے، راہبوں کا چغہ پہنے سماوار کے پیچھے صوفے پر اس کے قریب بیٹھا تھا۔ ان کے نزدیک آرام کرسی پر ایک بڑھیا بیٹھی تھی۔ اس کے جسم پر گوشت نام کو نہ تھا، اس کی جلد چرمرا چکی تھی اور اس کے بچگانہ چہرے پر مسکینی ٹپک رہی تھی۔

''آندرے، آپ نے مجھے بتایا کیوں نہ؟'' پرنس ماریا نے ہلکی سی سرزنش کرتے ہوئے کہا اور وہ اپنے زائرین کے سامنے یوں کھڑی ہو گئی جیسے مرغی اپنے چوزوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے۔

''آپ سے مل کر خوشی ہوئی، بہت مسرت ہوئی،'' اس نے پیئر سے، جو اس کی دست بوسی کر رہا تھا، فرانسیسی میں کہا۔ وہ بچپن ہی سے اسے جانتی آئی تھی۔ چونکہ وہ آندرے کا دوست تھا، اس کی شادی الم ناک ثابت ہوئی تھی

اور سب سے بڑھ کر اس کے چہرے پر شفقت اور سادگی جھلک رہی تھی، وہ اس کے ساتھ ہمدردانہ انداز سے پیش آ رہی تھی۔ وہ اپنی چمکیلی اور حسین و جمیل آنکھوں سے یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ اس سے کہہ رہی ہو: "میں آپ کو بہت پسند کرتی ہوں، پر اتنی مہربانی فرمائیں کہ میرے اس چھوٹے سے ریوڑ کا مذاق نہ اڑائیں۔"

ابتدائی علیک سلیک کے تبادلے کے بعد وہ بیٹھ گئے۔

"ارے، ایوانشکا بھی یہیں ہے،" پرنس آندرے نے نوجوان زائر کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

"آندرے!" پرنس ماریا نے کہا۔ اس کے لہجے میں لجاجت تھی۔

"تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ یہ لڑکی ہے،" پرنس آندرے نے فرانسیسی میں پیئر سے کہا۔

"آندرے، خدا کے لیے!" پرنس ماریا نے دوبارہ واویلا کیا۔

صاف عیاں تھا کہ زائرین کے بارے میں پرنس آندرے کا رویہ طنزیہ تھا اور پرنس ماریا ان کا تحفظ کرنے کے لیے سعی لاحاصل کرتی رہتی تھی۔ اس سلسلے میں دونوں کی چخ چخ ان کی عادتِ راسخہ بن چکی تھی۔

"لیکن میری پیاری بنو،" پرنس آندرے نے کہا۔ وہ ابھی فرانسیسی میں باتیں کر رہا تھا۔ "تمھیں تو میرا مشکور ہونا چاہیے کہ میں اس نوجوان سے تمھاری پکی دوستی کے بارے میں پیئر کے سامنے پہلے ہی وضاحت کر چکا ہوں۔"

"واقعی؟" پیئر نے گھڑی کی گھڑی اپنے چشمے میں سے ایوانشکا کے چہرے پر متجسس اور سنجیدہ نگاہیں ڈالتے ہوئے کہا۔ (پرنس ماریا اس کے اس رویے پر خاص طور پر مشکور تھی۔) ادھر ایوانشکا کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ ان کی گفتگو کا موضوع ہے اور وہ ان سب کو عیارانہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

اپنے ریوڑ کے بارے میں پرنس ماریا کا اضطراب بالکل غیر ضروری تھا۔ وہ رتی برابر بھی محجوب نہیں تھے۔ بڑھیا نے اپنی نگاہیں ضرور نیچے جھکائی ہوئی تھیں لیکن وہ مسلسل نوواردوں کو دزدیدہ نظروں سے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اپنی پیالی الٹا چکی اور اسے گڑ کی ڈلی کے، جسے دانتوں سے تھوڑا سا کاٹا جا چکا تھا، قریب پرچ پر رکھ چکی تھی۔ وہ چپ چاپ بیٹھی تھی تاہم اسے امید تھی کہ اسے چائے کی ایک اور پیالی سے نوازا جائے گا۔ ایوانشکا پرچ میں سے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا اور اپنی مکار، نسوانی آنکھوں سے ان نوجوانوں کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ کہاں گئی تھیں؟ کیف؟" پرنس آندرے نے بڑھیا سے پوچھا۔

"جی ہاں، آقا،" باتونی بڑھیا نے جواب دیا۔ "کرسمس کے دوران میں مجھے اس قابل سمجھا گیا کہ میں اولیا کے مزاراتِ مقدس پر عشائے ربانی کی پاکیزہ اور سماوی رسوم میں شرکت کروں۔ پر آقا، اب میں کولیازن سے، جہاں برکتِ عظیم کا انکشاف ہوا ہے، آئی ہوں۔"

"ایوانشکا بھی آپ کے ساتھ تھا؟"

"محسن، میں جدھر بھی جاتا ہوں، عام طور پر اکیلا ہی جاتا ہوں،" ایوانشکا نے کہا۔ وہ اپنے لہجے میں گہرائی پیدا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ "اتفاقاً یخنانوفو میں میری ملاقات پیلا جی اُشکا سے ہوگئی۔"

پیلاجی اشکا نے اپنے رفیق کی بات کاٹ دی۔ بظاہر وہ یہ بتانے کے لیے بہت بے قرار تھی کہ خود اس نے کیا دیکھا تھا۔

"آقا، کولیازن میں برکتِ عظیم کا انکشاف ہوا ہے۔"

"کیا؟ کوئی نئے تبرکات ملے ہیں؟"

"آندرے، چھوڑو، جانے دو۔ کافی ہو گئی ہے،" پرنس ماریا نے کہا۔ "پیلاجی اشکا، انھیں کچھ نہ بتانا۔"

"جانی، کیوں نہ بتاؤں؟ کوئی وجہ؟ میں انھیں پسند کرتی ہوں۔ یہ بہت مہربان ہیں۔ یہ خداوند کے چیدہ بندوں میں شامل ہیں۔ میرے محسن ہیں ـــ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے مجھے دس روبل دیے تھے۔ جب میں کیف میں تھی، اس پاگل کریوشا ـــ وہ خداوند کا اپنا بندہ ہے، گرمیاں ہوں یا سردیاں، ننگے پاؤں گھومتا پھرتا ہے ـــ نے مجھ سے کہا تھا: 'تو صحیح جگہ کیوں نہیں جاتی؟ تو کولیازن جا،' اس نے مجھ سے کہا۔ 'وہاں مقدس مادرِ خداوند کا معجز نما القونہ دریافت ہوا ہے۔' جونہی میں نے یہ الفاظ سنے، میں نے اپنے اللہ لوگ ساتھیوں سے اجازت لی اور ادھر چل پڑی..."

سب چپ سادھے بیٹھے تھے۔ صرف زائرہ جچے تلے لہجے کے ساتھ بولے جا رہی تھی۔ وہ جب سانس لیتی تھی، اس کی آواز صاف سنائی دیتی تھی۔

"چنانچہ، آقا، میں وہاں پہنچ گئی۔ وہاں لوگوں نے مجھے بتایا۔ 'یہاں برکتِ عظیم کا انکشاف ہوا ہے۔ مادرِ خداوند مقدس کنواری کے رخساروں سے پاکیزہ تیل قطرہ قطرہ بہہ رہا ہے'۔"

"اچھا، اچھا، اس کے متعلق مجھے بعد میں بتا دینا،" پرنس ماریا نے کہا۔ اس کے گال تمتما رہے تھے۔

"میں کچھ پوچھ سکتا ہوں؟" پیئر نے کہا۔ "تم نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا؟" اس نے دریافت کیا۔

"بالکل، آقا۔ انھوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔ ان کا چہرہ اتنا روشن، اتنا چمکیلا تھا کہ بس یوں معلوم ہوتا تھا کہ سماوی نور کی بارش ہو رہی ہے اور مادرِ مقدس کے رخساروں پر ایک کے بعد دوسرا قطرہ ـــ"

"یہ نری شعبدہ بازی ہے،" پیئر نے زائرہ کی باتیں سننے کے بعد سادگی سے کہا۔

"آقا، یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟" پیلاجی اشکا نے کہا۔ اس بے ادبی پر اس کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ مدد کے لیے پرنس ماریا کا منہ تکنے لگی۔

"وہ اسی طرح لوگوں کو الو بناتے ہیں،" پیئر نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا۔

"اف، خداوند یسوع مسیح!" زائرہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے چلائی۔ "آقا، ایسی باتیں منہ سے نہ نکالیں۔ ایک جرنیل یہ باتیں نہیں مانا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: 'یہ راہبوں کے ڈھکوسلے ہیں۔' جونہی یہ الفاظ ان کے منہ سے نکلے، ان کی بینائی جاتی رہی۔ انھوں نے خواب دیکھا۔ ان کے خواب میں کیف کے زمین دوز قبرستان کی مادرِ مقدس ان کے پاس آئیں اور فرمانے لگیں: 'مجھ پر ایمان لے آؤ۔ میں تمھیں دوبارہ سالم بنا دوں

گی۔' چنانچہ وہ مسلسل فریاد کرنے لگے: 'مجھے ان کے پاس لے چلو' مجھے ان کے پاس لے چلو۔' جو کچھ میں آپ لوگوں کو بتا رہی ہوں، وہ صحیفۂ خداوندی کی آیات کی طرح سچ ہے۔ یہ سب کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ نپٹ اندھے تھے۔ چنانچہ وہ سیدھا اسے کنواری ماں کے حضور لے گئے۔ جونہی وہ وہاں پہنچے، وہ گھٹنوں کے بل جھک گئے اور فریاد کرنے لگے: 'مجھے سالم کردیں۔ جو کچھ مجھے زار نے عطا کیا ہے، وہ آپ کے چرنوں میں بھینٹ کردوں گا۔' اور آقا، میں نے ان گنہگار آنکھوں سے دیکھا کہ ایک ستارہ لپکا اور مادر مقدس کے جسم میں داخل ہوگیا اور جرنیل کو دوبارہ آنکھوں کی روشنی مل گئی!... ایسی باتیں منہ سے نکالنا گناہ ہے۔ تم خداوند کے عذاب سے بچ نہیں سکو گے،" اس نے پیئر کو جھاڑ پلاتے ہوئے کہا۔

"اور یہ ستارہ ایقونے میں کیسے داخل ہوا؟" پیئر نے کہا۔

"اور مادر مقدس کی جرنیل کے عہدے پر ترقی ہوگئی؟" پرنس آندرے نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

ایکا ایکی پیلاجی اشکا کا رنگ فق ہوگیا۔ کاٹو تو بدن میں خون نہیں اور اس نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔

"آقا، آقا، کیوں کفر بولتے ہیں؟ یہ گناہ ہے! اور آپ کا ایک بیٹا ہے!" وہ چلا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر پیلاہٹ نابود ہوچکی تھی اور اب وہ غصے سے لال بھبوکا ہو رہی تھی۔ "آقا، آپ نے جو کچھ کہا ہے، خداوند آپ کو معاف فرمائے۔" اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ "خداوند، انھیں معاف کردو، جانی، ان کی بات کا مطلب کیا ہے؟" اس نے پرنس ماریا سے مخاطب ہو کر کہا۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی، اس کی آنکھیں اشک آلود ہو رہی تھیں اور وہ اپنی جھولی درست کر رہی تھی۔ نظر آ رہا تھا کہ خوف سے اس کی جان نکلی جا رہی ہے اور اسے شرمندگی ہو رہی ہے کہ اس نے ایک ایسے گھر سے، جہاں اس قسم کی باتیں کہی جاتی ہیں، خیرات وصول کی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ افسوس بھی ہو رہا تھا کہ آئندہ اسے اس گھر کے عطیات سے دست کش ہونا پڑے گا۔

"آپ نے یہ کیوں کیا؟" پرنس ماریا نے کہا۔ "آپ میرے کمرے میں آئے ہی کیوں؟"

"پیلاجی اشکا، جانے بھی دیں۔ میں تو محض مذاق کر رہا تھا،" پیئر نے کہا۔ "پرنس، میں حلفاً کہتا ہوں کہ میرا ہرگز یہ ارادہ نہیں تھا کہ میں انھیں ناراض کروں،" اس نے فرانسیسی میں پرنس ماریا سے کہا۔ "آپ اس بارے میں قطعاً دل میلا نہ کریں، میں تو محض مذاق کر رہا تھا،" اس نے شرماتے مسکراتے اور اپنی زیادتی کی تلافی کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

پیلاجی اشکا رک تو گئی لیکن اس کا دل اب بھی وسوسوں سے معمور تھا۔ تاہم پیئر کے چہرے سے اس قدر پر خلوص ندامت کا اظہار ہو رہا تھا اور پرنس آندرے، جو کبھی پیئر اور کبھی پیلاجی اشکا کو دیکھنے لگتا تھا، اتنا سنجیدہ، متین اور شفیق نظر آ رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اس کا غصہ فرو ہوگیا اور وہ بالکل مطمئن ہوگئی۔

14

زائرہ کا غصہ کافور ہوگیا اور کچھ دوسروں نے اسے پھونک دی۔ چنانچہ وہ دوبارہ فرفر بولنے لگی اور انھیں نہایت تفصیل سے فادر آمفی لوچس کے متعلق بتانے لگی۔ اس کے بقول فادر آمفی لوچس اتنے متقی اور پرہیزگار تھے کہ ان کے دست مبارک سے خوشبو کی لپٹیں نکلتی تھیں۔ ''میں جب پچھلی مرتبہ زیارت کے لیے کیف گئی تھی، میری جان پہچان کے چند راہبوں نے زیرزمین قبرستان کی چابیاں میرے سپرد کردیں،'' وہ کہہ رہی تھی۔ ''میں اپنے ساتھ کچھ خشک روٹی لے گئی تھی اور وہاں میں نے اولیاء کرام کی صحبت میں دو دن اور دو راتیں گزاریں۔

''میں ایک سینٹ کے مزار کے سرہانے چند دعائیں پڑھتی، انجیل مقدس کی چند آیات کی تلاوت کرتی اور دوسرے مقبرے پر پہنچ جاتی۔ کچھ دیر کے لیے سوتی، اٹھتی اور مقدس تبرکات کو بوسہ دیتی۔ جانی، وہاں کی فضا اتنی پرسکون، اتنی بابرکت ہے کہ خداوند کی اس دنیا میں دوبارہ واپس آنے کو جی نہیں چاہتا۔''

پیئر متانت اور توجہ سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ پرنس آندرے کمرے سے باہر نکل گیا۔ پرنس ماریا نے ''اللہ لوگوں'' کو وہیں چھوڑا کہ وہ اپنی چائے ختم کرلیں اور پیئر کو ساتھ لے کر ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

''آپ نے بہت شفقت فرمائی،'' وہ اس سے بولی۔

''افوہ، میں قطعاً ان کے جذبات کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میں ان لوگوں کو خوب سمجھتا ہوں اور ان کی بہت قدر کرتا ہوں۔''

پرنس ماریا، جس کے چہرے پر نرم و گداز مسکراہٹ کھیل رہی تھی، اسے خاموشی سے دیکھتی رہی۔

''آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کو بہت عرصے سے جانتی ہوں اور آپ سے بھائی کی طرح پیار کرتی ہوں،'' اس نے کہا۔ ''آندرے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟'' اس نے یہ سوال اتنی عجلت سے پوچھا کہ پیئر کو اتنا موقع ہی نہ مل سکا کہ وہ اس محبت کا، جو اس نے اس سے جتائی تھی، خاطر خواہ جواب دے سکتا۔ ''مجھے ان کے بارے میں شدید پریشانی ہے۔ سردیوں میں ان کی صحت بہتر تھی لیکن گزشتہ بہار کے دنوں میں ان کا زخم دوبارہ کھل گیا اور ڈاکٹر نے انھیں بتایا کہ انھیں یہاں سے چلے جانا اور اپنا موزوں علاج کرانا چاہیے۔ اور روحانی طور پر بھی میں ان کے بارے میں خوف زدہ ہوں۔ ان کی طبیعت ایسی ہے کہ ہم عورتوں کی طرح آنسو بہا کر اپنے دل کا غبار ہلکا نہیں کرسکتے، بس اندر ہی اندر گھلتے رہتے ہیں۔ آج وہ خوب چہک رہے اور خوش خوش نظر آرہے ہیں لیکن یہ آپ کی تشریف آوری کا اثر ہے۔ اکثر و بیشتر ان کا یہ انداز نہیں ہوتا۔ کاش آپ انھیں بیرون ملک جانے پر آمادہ کرسکیں! انھیں متحرک ہونے کی ضرورت ہے۔ یہ پرسکون، دھیما اور لگا بندھا طرز حیات ان کی جان لے بیٹھے گا۔ دوسروں کو یہ نظر نہیں آتا لیکن میری آنکھیں سب کچھ دیکھ رہی ہیں۔''

دس بجے کے قریب معمر پرنس کی گاڑی کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دی۔ نوکر چاکر پھاٹک کی جانب بھاگے۔
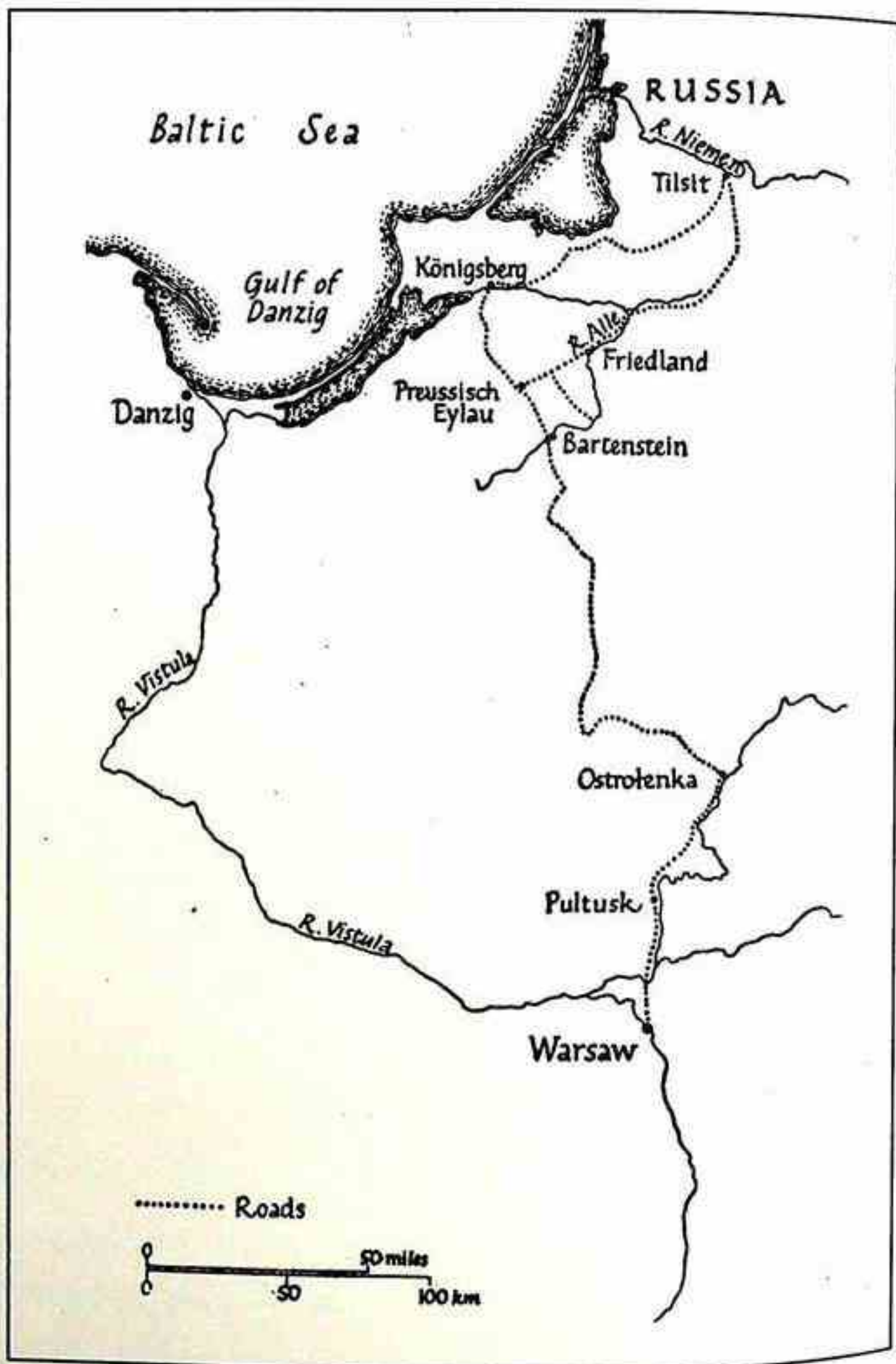
پیئر اور آندرے بھی زینے کی طرف چل پڑے۔
''یہ کون ہیں؟'' معمر پرنس نے گاڑی سے اترتے اترتے پوچھا۔ اس کی نگاہیں پیئر پر پڑ چکی تھیں۔
''ارے تم؟ تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی! مجھے بوسہ دو!'' اس نے نوجوان اجنبی کو پہچانتے ہوئے کہا۔
معمر پرنس ہشاش بشاش تھا۔ وہ پیئر کے ساتھ گرم جوشی سے پیش آیا۔
جب سپر سے قبل پرنس آندرے اپنے باپ کے سٹڈی روم میں داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ وہ اپنے مہمان کے ساتھ گرما گرم بحث کر رہا ہے۔ پیئر کا ادّعا تھا کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب جنگیں نہیں ہوا کریں گی۔ معمر پرنس اس کے ساتھ نوک جھونک تو کر رہا تھا لیکن اس کا پارہ گرم نہیں ہو رہا تھا۔
''مردوں کی رگوں سے خون نچوڑ ڈالو اور ان میں پانی انڈیل دو، پھر جنگیں دنگیں نہیں ہوں گی۔ نری نحیف دزار بڑھیاؤں کی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہو،'' اس نے کہا۔ تاہم اس نے پیار سے پیئر کے شانے پر تھپکی دی اور اس میز کی طرف، جہاں پرنس آندرے کھڑا تھا، چل دیا۔ نظر بظاہر پرنس آندرے کو اس تکرار میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور نہ وہ اس میں شریک ہونے کا آرزومند معلوم ہوتا تھا۔ وہ ان کاغذات کا، جو اس کا باپ شہر سے لایا تھا، مطالعہ کرنے میں محو تھا۔ معمر پرنس اس کے قریب آیا اور اس سے سرکاری امور کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔
''مارشل کوئی کاؤنٹ رستوف ہے۔ اس کے ذمے جو سپاہ تھی، اس نے اس میں سے ابھی آدھی بھی نہیں بھیجی۔ وہ شہر آیا تھا اور اس نے مجھے ڈنر پر بلایا تھا۔ اور میں نے اس کی خوب خبر لی!... اور ہاں، ذرا اس پر نظر ڈالو... خیر، صاحب زادے...'' اس نے پیئر کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا۔ 'تمھارا دوست اچھا آدمی ہے' مجھے پسند ہے! مجھے خوب بھڑکاتا ہے! بعض لوگ بہت دانائی کی باتیں کرتے ہیں لیکن آپ ان میں کوئی دلچسپی نہیں لیتے۔ ادھر یہ شخص ہے۔ نادانی کی باتیں کرتا ہے لیکن مجھ جیسے بوڑھے آدمی کو بھڑکا دیتا ہے۔ خیر، اب جاؤ، جاؤ اور اپنا کام کرو،'' اس نے کہا۔ ''شاید میں بھی آجاؤں اور سپر پر کچھ دیر تمھارے ساتھ بیٹھ جاؤں۔ ہم دوبارہ ایک دوسرے کے ساتھ چخ چخ کریں گے۔ میری بے وقوف بیٹی پرنس ماریا کے ساتھ دوستی گانٹھ لو،'' اس نے دروازے میں سے چلاتے ہوئے پیئر سے کہا۔
اب یہاں بالڈ ہلز میں اپنی آمد کے بعد پیئر کو پرنس آندرے کے ساتھ اپنی دوستی کی استواری اور دلکشی کی قدر معلوم ہوئی۔ اس دلکشی کا اظہار اتنا ان تعلقات سے، جو اس کے خود پرنس آندرے کے ساتھ تھے، نہیں ہوتا تھا، جتنا ان تعلقات سے جو اس کے خاندان اور گھرانے سے استوار ہو چکے تھے۔ اگرچہ وہ سخت گیر معمر پرنس اور سلیم الطبع اور حد سے شرمیلی پرنس سے کوئی خاص واقف نہیں تھا لیکن ان دونوں کی موجودگی میں اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کا پرانا دوست ہو۔ نہ صرف پرنس ماریا، جو اپنے زائرین کے ساتھ اس کے مشفقانہ سلوک کو دیکھ کر اس کی مداح بن گئی تھی، اور اپنی انتہائی روشن و تاباں آنکھوں سے اسے دیکھتی رہتی تھی بلکہ یک سالہ ننھا پرنس نکولائی بھی، کہ اس کا دادا اسے اسی نام سے پکارتا تھا، اسے دیکھ کر کھل اٹھتا اور بخوشی اس کی بانہوں میں چلا جاتا۔ جب پیئر معمر پرنس کے

ساتھ گفتگو کررہا ہوتا، میخائیل ایوانچ اور مادموزیل بوغین کے دل باغ باغ ہو جاتے۔ وہ ان دونوں کو دیکھتے اور مسکرانے لگتے۔

یہ بالکل واضح تھا کہ معمر پرنس محض پیئر کی خاطر سپر میں شریک ہوتا رہا۔ پیئر نے جو دو دن بالڈہلز میں گزارے، ان کے دوران میں صاحبِ خانہ اس کے ساتھ انتہائی پرتپاک انداز سے پیش آتا رہا۔ اس نے اسے دوبارہ آنے اور اپنے ہاں قیام کرنے کی دعوت بھی دی۔

جب پیئر رخصت ہوگیا اور جیسا کہ کسی نئے دوست کی روانگی پر ہمیشہ ہوتا ہے، تمام افراد خانہ اکٹھے ہوئے اور اس کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ ہر شخص اس کی تعریف میں رطب اللسان تھا اور ایسا شاذونادر ہی ہوتا تھا۔

15

رستوف جب چھٹی گزار کر واپس آیا، اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا اور اسے اس کا بھرپور اندازہ بھی ہوا کہ جن رشتوں نے اسے دینی سوف اور رجمنٹ کے باقی تمام افراد کے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا، وہ کتنے مضبوط اور پائیدار ہیں۔

جوں جوں وہ رجمنٹ کے پڑاؤ کے قریب پہنچتا گیا، اسے اپنے رگ وپے میں وہی سنسنی، جو اس نے تب، جب وہ ماسکو میں اپنے گھر کے قریب پہنچ رہا تھا، محسوس کی تھی، دوڑتی نظر آئی۔ اور جب اس کی نگاہ اپنی رجمنٹ کے پہلے ہوزار پر، جس کی وردی کے بٹن کھلے تھے، پڑی، جب اس نے دیمینتیاف کو، جس کے بال سرخ تھے، پہچانا، جب اس نے کمیت گھوڑوں کے کھونٹوں کے رسے دیکھے، جب اس نے لاوروشکا کو اپنے آقا کو خوشی سے چلاتے بتاتے سنا: "کاؤنٹ آگئے!" جب دینی سوف، جو اپنے بستر پر محوخواب تھا، اپنے الجھے بالوں اور پریشان لباس میں اپنے کچے پکے مکان سے بھاگتا باہر آیا اور اس سے بغل گیر ہو گیا، اور جب افسران اس کا استقبال کرنے اس کے اردگرد اکٹھے ہوگئے، اس کے احساسات بالکل وہی تھے جن کا تجربہ اسے تب ہوا تھا جب وہ اپنی اماں، بہنوں اور باپ کے ساتھ ہم آغوش ہو رہا تھا اور خوشی کے آنسوؤں سے اس کا گلا اتنا رندھ گیا تھا کہ اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکل سکا تھا۔ اس کے نزدیک رجمنٹ بھی گھر کی مانند تھی اور یہ گھر غیر متبدل طور پر اتنا ہی پیارا اور انمول تھا جتنا کہ اس کا آبائی گھر تھا۔

جب وہ ڈیوٹی پر حاضر ہونے کی رپورٹ کرنل کی خدمت میں پیش کر چکا، اپنے سابقہ سکواڈرن میں دوبارہ اپنی تقرری کرا چکا، اس روز یونٹ کے سکیورٹی آفیسر کی حیثیت سے اپنے فرائض سرانجام دے چکا، گھوڑے کے لیے چارے اور چبینے کا انتظام کر چکا، رجمنٹ کی چھوٹی چھوٹی دلچسپیوں اور تفریحات میں حصہ لے چکا، اور یہ محسوس کر چکا کہ مادر پدر آزادی کے لمحات ہوا ہو چکے اور اب اسے تنگ اور بے لوچ نظم میں کام کرنا ہوگا، اسے بالکل اسی قسم کے سکون اور اخلاقی تائید کا تجربہ ہوا، بالکل وہی طمانیت محسوس ہوئی اور اس نے اپنے آپ کو عین اسی طرح اپنے مخصوص گوشے میں پایا، جیسے وہ اپنے ہی گھر میں ہو۔ یہاں دنیائے بسیط کے، جہاں اسے اپنے صحیح مقام کا

یقین نہیں تھا اور جہاں فیصلے کرتے وقت وہ غلطیوں کا ارتکاب کر بیٹھتا تھا، ہنگامے اور افراتفری نہیں تھی۔ یہاں کوئی سونا نہیں تھی کہ اسے یہ سوچنا پڑتا کہ اس کی اس کے ساتھ مفاہمت پر مبنی دوستی ہونا چاہیے یا نہیں۔ یہاں اس نوعیت کے شش وپنج میں بھی پڑنے کا کوئی امکان نہیں تھا کہ اسے فلاں جگہ جانا چاہیے یا فلاں جگہ۔ یہاں اسے دن کے وہ چوبیس گھنٹے، جنھیں اتنے مختلف النوع انداز سے گزارا جا سکتا تھا، میسر نہیں تھے۔ یہاں احباب کا، جن میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جو اسے دوسروں سے زیادہ عزیز ہوتا، غیر مختتم سلسلہ نہیں تھا۔ روپے پیسے کے معاملے میں اس کے اپنے باپ کے ساتھ جو مبہم اور غیر واضح تعلقات تھے، یہاں وہ بھی عنقا تھے اور دلوخوف کے ہاتھوں اسے جس ہولناک نقصان سے دوچار ہونا پڑا تھا، یہاں کوئی ایسی چیز جو اسے اس کی یاد دلاتی، نہیں تھی! یہاں رجمنٹ میں ہر چیز کھری، صاف اور سیدھی سادی تھی۔ عالمِ کُل دو غیر مساوی اجزا میں منقسم تھا۔ ایک جزو پاولوگرات رجمنٹ پر اور دوسرا باقی دنیا پر مشتمل تھا اور یہ باقی دنیا اس کا دردِ سر نہیں تھی۔ رجمنٹ میں ہر شے معین تھی: لیفٹیننٹ کون ہے اور کیپٹن کون ہے، کون شخص اچھا ہے اور کون نہیں ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا جگری یار کون ہے۔ کینٹین کا مالک اشیا ادھار دیتا تھا۔ تنخواہ چار ماہ بعد ملتی تھی۔ یہاں نہ کچھ سوچنے کی ضرورت تھی اور نہ کوئی فیصلہ کرنے کی۔ یہاں صرف ایک ہی احتیاط کافی تھی کہ آپ کوئی ایسا کام، جو پاولوگرات رجمنٹ میں ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہو، نہ کریں اور جب کوئی حکم، جو بالکل صاف، بیّن اور غیر مبہم ہو، ملے، اس کی تعمیل کریں ــــ پھر راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔

جب رستوف رجمنٹ کی زندگی کے ان آئینے کی طرح صاف حالات میں واپس آ گیا، اسے اسی قسم کی راحت اور مسرت کا، جو تھکے ماندے شخص کو بستر استراحت پر محسوس ہوتی ہے، احساس ہوا۔ اس مہم کے دوران میں رستوف کے لیے رجمنٹ کی زندگی اور بھی تسکین بخش تھی کیونکہ دلوخوف کے ساتھ قمار بازی میں وہ جو بھاری رقم ہارا تھا (اس کے گھر والوں نے اسے تسلی دلاسا دینے کی پوری کوشش کی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اپنے آپ کو معاف کرنے کے لیے تیار نہیں تھا)، اس کی تلافی کے طور پر اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ پہلے کی طرح نہیں بلکہ حقیقتاً بہت اچھے انداز سے اپنے فرائض بجا لائے گا اور اپنے آپ کو اول درجے کا ساتھی اور افسر ثابت کر دکھائے گا ــــ بہ الفاظ دیگر وہ اپنے آپ کو نہایت اعلیٰ انسان کے روپ میں پیش کرے گا۔ باہر کی دنیا میں اسے یہ کام بہت دشوار معلوم ہوتا تھا لیکن یہاں رجمنٹ میں قابل الحصول نظر آتا تھا۔

وہ یہ عزم کر چکا تھا کہ اس نے قمار بازی میں جو رقم ہاری تھی، پانچ سال کے اندر اندر وہ اپنے والدین کو لوٹا دے گا۔ پہلے وہ اسے دس ہزار روبل سالانہ بھیجا کرتے تھے۔ اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ صرف دو ہزار روبل اپنے پاس رکھا کرے گا اور باقی رقم قرضے کی ادائیگی کے لیے اپنے ماں باپ کو واپس بھیج دیا کرے گا۔

❦

متعدد پسپائیوں، پیش قدمیوں اور پلتسک اور پروئے سش آئی لاؤ کی لڑائیوں کے بعد ہماری فوج بارٹن شٹائین کے نواح

میں مجتمع ہو چکی تھی۔ یہاں وہ زار کی آمد اور نئی مہم کے آغاز کا انتظار کر رہی تھی۔

پاولوگرات رجمنٹ کا تعلق فوج کے اس حصے سے تھا جو 1805 کی مہم میں شریک ہوا تھا۔ اس کے تمام جوان اور افسر روس میں بھرتی کیے گئے تھے۔ چونکہ یہ قدرے تاخیر سے پہنچی تھی، اس لیے مہم کی ابتدائی جھڑپوں میں حصہ نہیں لے سکی تھی۔ پاولوگرات رجمنٹ نہ پلتسک میں موجود تھی اور نہ پروئے سِش آئی لاؤ میں۔ جب مہم کے دوسرے دور کے دوران میں یہ میدانِ جنگ میں بڑی فوج کے ساتھ ملی، اسے پلاتوف[28] کے ڈویژن کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔

پلاتوف کا ڈویژن بڑی فوج سے الگ آزادانہ حیثیت سے کارروائیاں کر رہا تھا۔ پاولوگرات رجمنٹ کی یونٹیں متعدد مواقع پر دشمن کے خلاف جھڑپوں میں شریک ہو چکی تھیں، متعدد اشخاص کو جنگی قیدی بنا چکی تھیں اور ایک مرتبہ تو انھوں نے مارشل ویدی نو[29] کی گاڑیوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔

اپریل میں پاولوگرات ہوزار ایک جرمن گاؤں کے، جس کی اینٹ سے اینٹ بج چکی تھی اور اب خالی ڈھنڈار تھا، نزدیک تعینات کر دیے گئے۔ یہاں وہ کئی ہفتے مقیم رہے اور اس دوران میں انھوں نے قطعاً کوئی حرکت نہ کی۔

برف پگھلنا شروع ہو گئی تھی۔ موسم یخ بستہ تھا اور ہر طرف کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ دریا کی سطح پر برف ٹوٹنے لگی اور سڑکوں پر سفر کرنا ناممکن ہو گیا۔ کئی دنوں تک نہ انسانوں کو رسد فراہم کی گئی اور نہ گھوڑوں کے لیے چارہ اور چبینا مہیا کیا گیا۔[30] چونکہ گاڑیوں کی آمد و رفت ناممکن ہو گئی تھی، فوجی جوان خالی اور ویران گاؤں میں پھیل گئے تاکہ آلو تلاش کیے جا سکیں لیکن اب یہ بھی جنسِ نایاب بن چکے تھے۔

ہر چیز کھائی جا چکی تھی اور تمام ساکنانِ دہ فرار ہو چکے تھے۔ اگر کوئی بھولے بھٹکے اشخاص رہ بھی گئے تھے، ان کی حالت بھکاریوں سے بدتر ہو چکی تھی۔ کسی کے پاس کوئی چیز ایسی نہیں تھی جسے قبضے میں لیا جا سکتا۔ عام طور پر فوجی جوان رحم نام کی کسی چیز سے آشنا نہیں ہوتے لیکن اب وہ بھی کوئی فائدہ اٹھانے کی بجائے انھیں اپنا بچا کھچا راشن دینے لگے۔

جنگی کارروائیوں کے دوران میں پاولوگرات رجمنٹ کے صرف دو جوان زخمی ہوئے تھے لیکن فاقہ کشی اور بیماریوں نے ان کی تعداد میں نصف کے قریب تخفیف کر دی تھی۔ ہسپتالوں میں موت اتنی یقینی تھی کہ وہ جوان، جو بخار میں مبتلا ہوتے تھے یا ناقص غذا کی وجہ سے جن کے معدے پھول جاتے تھے، ڈیوٹی پر رہنے کو ترجیح دیتے تھے۔ ان میں اتنی سکت بھی نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے پاؤں ہی گھسیٹ سکیں۔ یوں وہ محاذ جنگ پر تو پہنچ جاتے لیکن ہسپتال میں داخل ہونا گوارا نہ کرتے۔ بہار کی آمد پر جوانوں نے ایک نیا پودا دریافت کیا۔ یہ تازہ تازہ زمین سے باہر نکلا تھا اور دیکھنے میں ایسپاریگس معلوم ہوتا تھا۔ پتا نہیں کیوں لیکن وہ اسے 'ماشکا کی بیخ شیریں' کہنے لگے۔ وہ 'ماشکا کی بیخ شیریں' (اس کا ذائقہ بہت ترش تھا) کی تلاش میں کھیتوں اور چراگاہوں میں مارے مارے پھرتے، اپنی تلواروں سے اسے کھودتے اور اس حکم کے باوجود کہ اس مضرِ صحت پودے کو ہاتھ نہ لگایا جائے، وہ اسے کھاتے رہتے۔ اس موسم

بہار میں فوجیوں میں نئی بیماری پھوٹ پڑی۔ ان کے بازو، ٹانگیں اور چہرے متورّم ہونے لگے۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ یہ عارضہ اس جڑ کے کھانے سے لاحق ہوتا ہے۔ تاہم لاکھ ممانعت کے باوجود دینی سوف کے سکواڈرن کے جوان زیادہ تر ''ماشکا کی بیخ شیریں'' سے پیٹ کی آگ ٹھنڈی کرتے رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کھانے پینے کا سامان تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ گزشتہ دو ہفتوں سے صرف پاؤ بھر بسکٹ فی کس تقسیم ہو رہے تھے اور یہ بھی عدم دستیاب ہوا چاہتے تھے۔ رہ گئے آلو، ان کی آخری قسط برف کی طرح جم چکی تھی اور ان میں شگوفے پھوٹنے لگے تھے۔

گزشتہ دو ہفتوں سے گھوڑوں کا گزارہ بھی اس پرال پر، جو پھونس کی چھتوں سے نکالی جا رہی تھی، ہو رہا تھا۔ ان کے اجسام انتہائی لاغر اور نحیف ہو چکے تھے، تاہم ان پر زمستانی بال بدستور اگ رہے تھے۔

اس وحشت ناک کمیابی کے باوجود جوانوں اور افسروں کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ان کے چہرے زرد اور متورم اور وردیاں تار تار سہی لیکن ہوز ار حاضری کے لیے پہلے کی طرح صفیں ترتیب دیتے، نظم وضبط کی پابندی کرتے، گھوڑوں کو خرخرا کرتے، ہتھیاروں کو چمکاتے، چارے کی بجائے چھتیں ادھیڑ کر پرال لاتے، کھانا کھانے کے لیے دیگوں کے گرد جمع ہوتے، وہاں سے بھوکے واپس آتے، واہیات کھانوں اور اپنی گرسنگی کا مذاق اڑاتے۔ ہمیشہ کی طرح فالتو اوقات میں بیکار اشیا سے بڑے بڑے الاؤ روشن کرتے، ان کے سامنے اپنے کپڑے اتارتے اور اپنے ابدان کو حرارت پہنچاتے۔ تمبا کو نوشی کرتے، ادھر ادھر سے گلے سڑے آلو، جن پر شگوفے پھوٹ رہے ہوتے، لاتے اور انھیں آگ میں بھونتے اور پوٹمکن اور سواروف کی مہمات کی داستانیں یا شعبدہ باز آلوشا یا پادری کے خدمت گار مکولکا کے قصے سناتے۔

ایک ایک مکان میں حسب معمول دو دو تین تین افسران قیام پذیر تھے۔ ان مکانوں کی چھتیں ناپید اور عمومی حالت بہت خستہ تھی۔ عام فوجی جوانوں کو آلو، بھوسا اور دیگر ضروریاتِ زندگی بہم پہنچانے کے لیے سینئر افسران کے جو کچھ بس میں ہوتا، کیا جاتا۔ جونیئر افسران ہمیشہ کی طرح اپنا وقت تاش یا دوسری کھیلیں کھیلنے (خوراک میسر ہو یا نہ ہو، لیکن روپے پیسے کی کوئی کمی نہیں تھی) میں صرف کر رہے تھے۔ مہم کیا رخ اختیار کر رہی تھی، اس کے بارے میں عام طور پر کم ہی گفتگو ہوتی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے متعلق یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا اور دوسری بات یہ مبہم سا احساس تھا کہ عمومی طور پر جنگ ان کے حق میں نہیں جا رہی۔

پہلے کی طرح رستوف اب بھی دینی سوف کے ساتھ مقیم تھا۔ جب سے وہ لمبی چھٹی منا کر واپس آئے تھے، ان کے مابین دوستی کے رشتے اور بھی مستحکم ہو گئے تھے۔ دینی سوف رستوفوں کے خاندان کا کبھی ذکر نہیں کرتا تھا لیکن کمانڈر رستوف کے ساتھ جس قسم کی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتا تھا، اس سے اسے یہ محسوس ہوتا تھا کہ سینئر افسر کو نتاشا کی محبت میں جس ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس نے ان کے باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس میں قطعاً کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں کہ دینی سوف رستوف کا بہت خیال رکھتا تھا اور اس کی حتی الوسع یہی کوشش ہوتی تھی کہ اسے خطرات میں کم سے کم دھکیلا جائے اور جب ایک جھڑپ کے بعد وہ واپس آیا،

اس نے اس کا استقبال بے ریا مسرت سے کیا۔

ایک بار جب رستوف کو ایک اجڑے پجڑے اور مسمار شدہ گاؤں میں رسد تلاش کرنے کی غرض سے روانہ کیا گیا، اس کی ملاقات ایک پولستانی بزرگ اور اس کی دختر سے ہوئی جس نے ایک شیر خوار بچہ اپنی بانہوں میں تھام رکھا تھا۔ فاقہ کشی اور نیم ستر پوشی نے ان کا کچومر نکال دیا تھا اور ان میں اتنا کس بل نہ تھا کہ وہ پا پیادہ کہیں جا سکتے اور نہ ان میں اتنا دم تھا کہ کوئی کرائے کی گاڑی حاصل کر سکتے۔ رستوف واپسی پر انھیں اپنے ساتھ لے گیا اور مکان کے جس حصے میں وہ خود مقیم تھا، انھیں وہیں ٹھہرا دیا۔ جب تک مرد پیر صحت یاب نہ ہو گیا، وہ کئی ہفتے وہیں ٹھہرے رہے۔ رستوف کے ایک رفیق کار نے عورتوں کا ذکر کرتے ہوئے اس پر پھبتی کسی کہ ''تم ہم سب کے گرد ہو۔ اب تمھارا بھلا اسی میں ہے کہ جس پولستانی محترمہ کو تم نے مصیبت سے بچایا ہے، اس کا تعارف ہم سب سے کرا دو۔'' رستوف نے اس مذاق کو اپنی توہین تصور کیا اور اس کا پارہ ساتویں آسمان پر پہنچ گیا۔ دینی سوف نے بڑی مشکل سے بیچ بچاؤ کرایا اور یوں ان دونوں کے مابین ڈوئیل ہوتے ہوتے رہ گئی۔ جب وہ افسر وہاں سے چلا گیا، دینی سوف، جسے پولستانی دوشیزہ کے ساتھ رستوف کے تعلقات کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا، اسے اس کی گرمئ مزاج کے متعلق لیکچر پلانے لگا۔ اس پر رستوف نے کہا:

''میں کیا کرتا؟ — وہ میرے نزدیک بہن کے برابر ہے۔ میں تمھیں بتا نہیں سکتا کہ مجھے کس قدر غصہ آیا تھا... کیونکہ... خیر، کیونکہ...''

دینی سوف نے رستوف کے کندھے پر تھپکی دی اور جیسا کہ جذباتی کھلبلی کے عالم میں اس کا دستور تھا، وہ اس کی طرف دیکھے بغیر کمرے میں چہل قدمی کرنے لگا۔

''یہ تم رستوفوں کی نسل کتنی باؤلی ہے!'' وہ بڑبڑایا اور رستوف نے دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے ہیں۔

16

اپریل کے دوران میں زار کی آمد نے فوجیوں کو نیا حوصلہ بخشا۔ زار نے بارٹن شٹائین کے مقام پر فوجی دستوں کا معائنہ کیا۔ رستوف کو وہاں جانے کا کوئی موقع نہ مل سکا کیونکہ پاولوگرات رجمنٹ بارٹن شٹائین سے کہیں دور بیرونی چوکی پر تعینات تھی۔

پاولوگرات رجمنٹ کا پڑاؤ کھلی فضا میں تھا اور وہاں کسی قسم کی سہولت دستیاب نہیں تھی۔ دینی سوف اور رستوف کچے جھونپڑے میں ڈیرا ڈالے پڑے تھے۔ یہ جھونپڑا فوجی جوانوں نے ان کے لیے تعمیر کیا تھا اور اس پر انھوں نے گھاس پھوس اور درختوں کی شاخوں کی چھت بنا دی تھی۔ جھونپڑا تیار کرنے کے لیے جو طریقہ استعمال کیا گیا تھا، اس کا ان دنوں عام رواج تھا۔ ہوتا یہ تھا کہ آٹھ فٹ لمبی، ساڑھے تین فٹ چوڑی اور ساڑھے چار فٹ گہری خندق

کھودی جاتی۔ خندق کے ایک کنارے کو کاٹ کر زینہ بنایا جاتا اور جھونپڑے کے اندر آمدورفت اسی کے ذریعے ہوتی۔ یہ خندق کمرے کا کام دیتی اور جو لوگ خوش نصیب ہوتے جیسا کہ سکواڈرن کمانڈر تھا، ان کی خندق میں زینے کے بالمقابل دوسرے کنارے پر چار پایوں پر چوبی تختہ نصب کر دیا جاتا اور اس تختے سے میز کا کام لیا جاتا۔ خندق کے دونوں کناروں پر تقریباً اڑھائی اڑھائی فٹ چوڑی زمین سے مٹی کھود کر باہر پھینک دی جاتی۔ اس طرح جو جگہ بنتی، وہ سونے اور بیٹھنے کے لیے استعمال ہوتی۔ چھت اس طرح تعمیر کی جاتی کہ اگر کوئی شخص خندق کے درمیان میں کھڑا ہونا چاہتا، اسے کوئی دقت پیش نہ آتی بلکہ اگر کوئی شخص بستر پر بیٹھنا چاہتا تو وہ بھی بیٹھ سکتا تھا، اسے صرف میز کی طرف قدرے جھکنا پڑتا تھا۔ دینی سوف بڑے مزے سے رہ رہا تھا کیونکہ وہ اپنے سکواڈرن کے جوانوں میں بہت مقبول تھا۔ خندق کے اندر داخل ہونے کا جو راستہ تھا، وہاں اس نے تختہ لگوالیا تھا۔ اس تختے میں شکستہ لیکن مرمت شدہ شیشہ نصب تھا اور یوں یہ کھڑکی کا کام دینے لگا۔ جب موسم بہت سرد ہو جاتا، جوانوں کے الاؤوں سے ٹیڑھی میڑھی آہنی چادر پر دہکتے انگارے لائے جاتے اور زینے پر۔۔ جسے دینی سوف ''استقبالیہ'' کہتا تھا۔ رکھ دیے جاتے۔ اس سے خندق اتنی گرم ہو جاتی کہ افسران جن کی اچھی خاصی تعداد ہر وقت دینی سوف اور رستوف کے پاس رہتی تھی، اپنے کوٹ اتار دیتے اور محض قمیصوں میں خاصا آرام محسوس کرتے۔

اپریل کے مہینے میں رستوف ڈیوٹی افسر کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ بے خواب شب گزارنے کے بعد وہ ایک صبح سات اور آٹھ بجے کے درمیان واپس آیا۔ اس نے انگارے لانے کا حکم دیا، بارش سے شرابور اپنے زیر جامے تبدیل کیے، مناجات کی تلاوت کی، کچھ چائے پی اور اپنے جسم کو حرارت پہنچائی۔ پھر اس نے اپنے کونے میں اور میز پر مختلف اشیا ترتیب اور سلیقے سے رکھیں۔ کھلی فضا میں گھومنے پھرنے کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ خالی قمیص پہنے اور دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے پشت کے بل لیٹا ہوا تھا۔ اس کا مزاج بہت خوشگوار تھا اور وہ اپنی ترقی کے، جس کی اسے غالباً ایک دو روز میں ملنے کی امید تھی (یہ ترقی اسے اس لیے ملنا تھی کیونکہ پچھلی بار غنیم کی افواج کے بارے میں ٹوہ لگانے کے سلسلے میں اس نے زبردست خدمات سرانجام دی تھیں)، بارے میں سوچ رہا تھا۔ وہ دینی سوف کا، جو کہیں باہر گیا ہوا تھا، انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔

اچانک اسے جھونپڑے کے عقب میں دینی سوف کی آواز سنائی دی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ غیظ و غضب سے دہاڑ رہا ہے۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ کس پر اپنا غصہ جھاڑ رہا ہے، رستوف اٹھا اور کھڑکی کی طرف چل پڑا۔ وہاں اسے کوارٹر ماسٹر توپ چینکو نظر آیا۔

''میں نے تمھیں حکم دیا تھا کہ انھیں وہ جڑ۔ کیا کہتے ہو اسے، ہاں ماشا کا مال۔ مت کھانے دو!'' دینی سوف گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہا تھا، ''اور میں نے اپنی آنکھوں سے لازارچک کو اسے کھیتوں سے لاتے دیکھا ہے۔''

''جناب عالی، میں انھیں بار بار آپ کا حکم پہنچا چکا ہوں لیکن کوئی میری سنے بھی تو،'' کوارٹر ماسٹر نے جواب دیا۔

رستوف دوبارہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا اور مزے مزے سے سوچنے لگا: ''میں اپنی ڈیوٹی دے چکا ہوں،

اب وہ جانے اور اس کا کام۔ چلاّتا ہے تو چلاّتا رہے، میں تو اب آرام کروں گا— واہ، واہ کیا لطف آرہا ہے!'' دیوار میں سے اسے دینی سوف کے چرب زبان اور بدمعاش اردلی لاوروشکا کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ لدی پھندی گاڑیوں، بسکٹوں اور بیلوں کے متعلق کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے یہ تمام چیزیں اس وقت دیکھی تھیں جب وہ رسد ڈھونڈنے گیا تھا۔

دینی سوف کی آواز پہلے سے کہیں زیادہ دور سے سنائی دے رہی تھی۔ وہ باآواز بلند چلا رہا تھا:

''کاٹھیاں، کس لو!— دوسری پلٹن!''

''یہ کہاں جارہے ہیں؟'' رستوف سوچ رہا تھا۔

کوئی پانچ منٹ بعد دینی سوف جھونپڑے میں آیا، کیچڑ آلود بوٹوں سمیت بستر میں گھسا، خشم گین انداز سے پائپ جلایا، اپنی اشیا ادھر ادھر بکھیریں، چابک اور شمشیر اٹھائی اور دوبارہ باہر نکل گیا۔ جب رستوف نے پوچھا: ''کہاں جارہے ہو؟'' اس نے مبہم اور غصیلا جواب دیا: ''مجھے کچھ کام ہے۔''

''خداوند اور عظیم زار میرا انصاف فرمائیں!'' دینی سوف نے باہر جاتے جاتے کہا۔

باہر متعدد گھوڑے چھپ چھپ کیچڑ میں سے گزر رہے تھے۔ ان کے سموں کی دھپ دھپ رستوف کو سنائی دے رہی تھی۔ اس نے اتنا بھی معلوم کرنے کا تردد نہ کیا کہ دینی سوف کہاں گیا ہے۔ اپنے کونے میں اس کا جسم نیم گرم ہوگیا تھا اور اس کی آنکھ لگ گئی۔ وہ شام ڈھلے تک باہر نہ نکلا۔ دینی سوف ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ مطلع نکھر چکا تھا۔ اگلے جھونپڑے کے قریب دو افسر اور ایک کیڈٹ سوائی[31] کا کھیل رہے تھے۔ جب چھلّے نرم کیچڑ میں دھنس جاتے، وہ ہنس پڑتے۔ رستوف ان میں جا شامل ہوا۔ ابھی کھیل جاری تھا کہ افسروں کو متعدد چھکڑے ادھر آتے دکھائی دیے۔ تقریباً پندرہ ہوزار مریل گھوڑوں پر سوار ان کے پیچھے پیچھے آرہے تھے۔ چھکڑے، جو ہوزاروں کی نگرانی میں آرہے تھے، پڑاؤ کے قریب پہنچ گئے۔ ہوزاروں کا جمِ غفیر ان کے گرد اکٹھا ہوگیا۔

''یہ بھی خوب رہی۔ دینی سوف ناحق پریشان ہوتا رہا اور رسد یہاں پہنچ بھی گئی،'' رستوف نے کہا۔ ''اور آئی بھی عین موقع پر! جوان کتنے خوش ہوں گے!'' افسروں نے لقمہ دیا۔

ہوزاروں سے چند قدم پیچھے گھوڑے پر سوار دینی سوف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ پیادہ فوج کے دو افسر تھے۔ وہ ان کے ساتھ کسی چیز کے بارے میں بحث کر رہا تھا۔ رستوف ان کا استقبال کرنے آگے بڑھا۔

''کیپٹن، میں آپ کو خبردار کیے دیتا ہوں،'' ایک نحیف و نزار کوتاہ قامت شخص، جو بظاہر بہت برہم تھا، کہہ رہا تھا۔

''میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ میں انھیں واپس نہیں کروں گا،'' دینی سوف نے جواب دیا۔

''کیپٹن، آپ کو اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ یہ بغاوت ہے— آپ نے اپنی ہی فوج کی گاڑیوں پر قبضہ کرلیا ہے! ہمارے جوانوں کے منہ میں دو دنوں سے کھیل بھی نہیں گئی۔''

''اور میرے جوان دو ہفتوں سے فاقے کر رہے ہیں۔''

''یہ نری قزاقی ہے! جناب، آپ کو اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا!'' پیادہ فوج کے افسر نے اپنی آواز بلند کرتے ہوے کہا۔

''تم نے کیوں میرا ناک میں دم کر رکھا ہے؟'' دینی سوف نے چلا کر کہا۔ اس کا پارہ اک دم گرم ہو گیا تھا۔ ''جواب دہ مجھے ہونا پڑے گا، تمھیں نہیں۔ بہتر ہے کہ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمھاری ٹھکائی ہو جائے۔ چلو، بھاگو یہاں سے!'' اس نے دہاڑتے ہوے افسروں سے کہا۔

''بہت اچھا پھر!'' کوتاہ قامت افسر نے بڑبڑاتے ہوے کہا۔ وہ ذرا بھی خوف زدہ نہیں ہوا تھا اور نہ اس نے اپنی جگہ سے کوئی جنبش کی۔ ''اگر آپ اس قزاقی پر تل ہی چکے ہیں، پھر میں...''

''جہنم میں جاؤ! جان کی سلامتی چاہتے ہو، یہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جاؤ!'' دینی سوف نے اپنا گھوڑا موڑا اور افسر کی طرف لپکا۔

''بہت اچھا! بہت اچھا!'' افسر تہدید آمیز انداز سے بڑبڑایا۔ وہ واپس مڑا اور گھوڑا بھگانے لگا۔ وہ زین پر بیٹھا اچھل رہا تھا۔

''کتے کا پلا باڑ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے! کتے کا پلا باڑ پر پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے!'' دینی سوف اس کی طرف منہ کر کے چلائے جا رہا تھا۔ اسپ سوار فوج کا افسر پیادہ فوج کے گھوڑے پر سوار افسر کی اس سے زیادہ توہین نہیں کر سکتا تھا۔ پھر وہ گھوڑے پر بیٹھا بیٹھا رستوف کی طرف آیا۔ ہنستے ہنستے اس کے پیٹ میں بل پڑ گئے۔

''پیادہ فوج سے لایا ہوں۔ چھین کر لایا ہوں!'' اس نے کہا۔ ''میں اپنے جوانوں کو بھوکے مرتے نہیں دیکھ سکتا۔ بالکل نہیں۔''

یہ چھکڑے، جو اب ہوزاروں کے قبضے میں تھے، پیادہ رجمنٹ کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔ لیکن جب دینی سوف کو لاوروشکا کی زبانی معلوم ہوا کہ ان چھکڑوں کے ہمراہ فوجی گارڈ نہیں ہے، اس نے اور اس کے ہوزاروں نے ان پر بزورِ شمشیر قبضہ کر لیا۔ جوانوں کو اجازت دے دی گئی کہ وہ جتنے رس چاہیں، لے لیں۔ یہی نہیں بلکہ انھیں دوسرے سکواڈرنوں میں بھی تقسیم کر دیا گیا۔

اگلے روز رجمنٹل کمانڈر نے دینی سوف کو بلایا۔ اس نے اپنی انگلیاں اپنی نگاہوں کے سامنے پھیلائیں اور اس سے کہنے لگا:

''اس معاملے میں میرا رویہ یہ ہو گا کہ مجھے اس کے متعلق کچھ علم نہیں اور میں کوئی کارروائی بھی نہیں کروں گا۔ لیکن تمھیں میں یہ مشورہ دوں گا کہ اپنا گھوڑا پکڑو اور جھٹ پٹ ہیڈ کوارٹرز پہنچ جاؤ۔ وہاں شعبۂ رسد کے حکام سے ملو اور ان معاملات کو سلجھا لو۔ اگر ہو سکے تو مختلف اشیاء کی وصولی کی رسید بھی دے دو۔ اگر ایسا نہ ہو سکا اور اشیائے خوردنی پیادہ فوج کے کھاتے میں مندراج رہیں، پھر معاملہ گڑبڑا جائے گا۔''

کرنل سے ملنے کے بعد دینی سوف سیدھا ہیڈ کوارٹرز پہنچا۔ وہ اس کے مشورے پر پورے خلوص سے عمل کرنے کا خواہاں تھا۔ شام کو جب وہ واپس آیا، اس کی جو حالت ہو رہی تھی، رستوف نے اس میں اسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے بات نہیں ہو رہی تھی اور اس کا دم پھول رہا تھا۔ جب رستوف نے استفسار کیا کہ گڑبڑ کیا ہے، وہ نحیف و ناتواں اور بیٹھی ہوئی آواز میں صرف بے ربط دھمکیاں اور گالیاں ہی اگل سکا۔

دینی سوف کی حالت دیکھ کر رستوف کو کھٹکا لاحق ہو گیا۔ اس نے اسے اپنا لباس تبدیل کرنے اور پانی پینے کا مشورہ دیا۔ اور خود اس نے ڈاکٹر کو بلا بھیجا۔

"مجھ پر قزاقی کا مقدمہ چلے گا۔ اف!۔ مجھے۔ اور پانی۔ دو... چلانے دو انھیں مقدمہ۔ مجھے کوئی پروا نہیں۔ میں بدمعاشوں کی پٹائی کرتا رہوں گا۔ اور میں زار کے بھی گوش گزار کر دوں گا... کچھ برف۔ ہے؟ مجھے دینا..." وہ کہتا رہا۔

رجمنٹل کمانڈر نے کہا کہ دینی سوف کی فصد کھولنا ضروری ہو گیا ہے۔ جب اس کے بالوں بھرے بازو سے سوپ کے پیالے کے برابر سیاہ خون نکالا جا چکا، تب کہیں وہ اس قابل ہوا کہ اس کے ساتھ جو کچھ پیش آیا تھا، اس کی تفصیل بیان کر سکے۔

"میں وہاں پہنچا" دینی سوف بتانے لگا۔ "میں نے ان سے دریافت کیا: 'آپ کے صاحب کہاں ہیں؟' انھوں نے اس کے مکان کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے کہا: 'مہربانی کریں اور ذرا انتظار فرمائیں'۔ 'میں نے بیس میل گھوڑے پر سفر کیا ہے۔ مجھے اور بھی فرائض سرانجام دینا ہیں۔ میرے پاس فالتو وقت نہیں ہے، میری آمد کی اطلاع کر دو!'، بہت خوب، قزاق اعلیٰ باہر آ گیا۔ اس کے سر میں بھی مجھے لیکچر پلانے کا سودا سما گیا۔ 'یہ قزاقی ہے!' اس نے کہا۔ 'آپ اس شخص کو' میں نے اسے بتایا، 'جو اپنے جوانوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خوردنی اشیا پر قبضہ کرتا ہے، قزاق نہیں کہہ سکتے۔ قزاق وہ شخص ہوتا ہے جو اپنی جیبیں بھرنے کے لیے دوسروں کا مال لوٹتا ہے'، 'بہت خوب' رسد کمشنر کے دفتر میں جاؤ اور رسید لکھ دو' اس نے کہا۔ لیکن اس معاملے کے بارے میں ہیڈ کوارٹرز کو رپورٹ بھیج دی جائے گی۔ میں رسد کمشنر کے دفتر پہنچا اور اندر چلا گیا۔ وہاں، تمھارے خیال میں۔ میز پر کون بیٹھا تھا؟۔ نہیں، دماغ پر زور دو... کون ہمیں بھوکوں مار رہا ہے؟" دینی سوف نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے تختے پر اس بازو کے ساتھ، جس کی ابھی ابھی فصد کھولی گئی تھی، اتنے زور سے مکا مارا کہ گلاس اچھلنے لگے اور تختہ گرتے گرتے بچا۔ تلیانن![32] ۔ 'تو یہ تم ہو جو ہمیں فاقہ کشی پر مجبور کر رہا ہے؟ کیا کہتے ہو؟' اور میں نے اسے اس کا مزہ چکھا دیا۔ اسے جھانپڑ رسید کیا۔ وہ سیدھا اس کی تھوتھنی پر لگا۔ 'ارے، بدذات کے تخم، تم... تم!' میں نے اس کی پٹائی شروع کر دی۔ سچ بڑا مزہ آیا" اس نے کینہ توز مسرت سے اپنی سیاہ مونچھوں تلے اپنے سفید دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے کہا۔ "اگر وہ مجھے گھسیٹ کر پرے نہ لے جاتے، میں اس کی جان لے کر ہی ٹلتا۔"

"لیکن تم چلا کیوں رہے ہو؟" رستوف نے کہا۔ "چپ ہو جاؤ۔ تمھارے بازو سے پھر خون رسنے لگا ہے۔"

ٹھہرو۔ پٹی دوبارہ باندھنا پڑے گی۔"

دینی سوف کی پٹی دوبارہ باندھ دی گئی اور اسے بستر پر لٹا دیا گیا۔ جب وہ اگلے روز بیدار ہوا، وہ پرسکون ہو چکا تھا اور اس کی طبیعت باغ و بہار ہو رہی تھی۔

لیکن دوپہر کے وقت رجمنٹ کا ایجوٹنٹ ان کے زیرزمین جھونپڑے میں آیا۔ اس کے چہرے پر متانت اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ اس نے بصد افسوس میجر دینی سوف کو رجمنٹل کمانڈر کا مراسلہ دکھایا جس میں اس سے گزشتہ روز کے واقعات کی وضاحت طلب کی گئی تھی۔ ایجوٹنٹ نے انھیں بتایا: "معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر چکا ہے۔ فوجی عدالت کی تقرری ہو چکی ہے۔ ان دنوں لوٹ مار اور حکم عدولی کے واقعات کے متعلق جو سختی روا رکھی جا رہی ہے، اس کے پیشِ نظر اگر آپ کی محض تنزلی ہو گئی اور آپ کو عام سپاہی بنا دیا گیا، آپ اپنے آپ کو بہت خوش نصیب تصور کریں۔"

شکایت کنندگان کا موقف یہ تھا کہ چھکڑوں پر قبضہ کرنے کے بعد میجر دینی سوف بحالتِ نشہ چیف کوارٹر ماسٹر کے دفتر پہنچا، بلا اشتعال اسے 'چور' کہا اور اسے دھمکیاں دینے لگا کہ وہ اس کی پٹائی کر دے گا۔ جب اسے باہر نکالنے کی کوشش کی گئی، وہ زبردستی اندر گھس گیا، دو ملازموں کو بری طرح مارا پیٹا اور ان میں سے ایک کے بازو کا جوڑ الگ کر دیا۔

رستوف کے مزید سوالات کے جواب میں دینی سوف نے قہقہہ لگایا اور کہا: "مجھے کچھ کچھ یاد پڑتا ہے کہ کسی دوسرے شخص نے اس پھڈے میں ٹانگ اڑا دی تھی۔ لیکن یہ سب واہیات ہے، پریشانی کی قطعاً کوئی بات نہیں۔ رہا کورٹ مارشل، اس سے تو میں خواب میں بھی نہیں ڈرتا۔ اگر ان حرام زادوں نے مجھ سے الجھنے کی کوشش کی، میں انھیں وہ سبق سکھاؤں گا کہ وہ مدتیں بھلا نہ سکیں گے۔"

دینی سوف اس سارے مسئلے کا تحقیر سے ذکر کرتا رہا، تاہم رستوف، جو اس کی رگ رگ سے واقف تھا، بھانپ گیا کہ وہ اندر سے کورٹ مارشل سے خائف ہے (تاہم اس نے اپنے اس احساس کو دوسروں سے چھپانے کی پوری کوشش کی)۔ اس کے لیے یہ مسئلہ پریشانی کا باعث بن گیا کیونکہ یہ امر قطعی یقینی تھا کہ اس کے نتائج تباہ کن ہوں گے۔ سرکاری کاغذات روزانہ موصول ہونے لگے۔ کبھی مختلف اقسام کے فارم، جنھیں پر کرنا ہوتا تھا، آ جاتے اور کبھی عدالتی سمن پہنچ جاتے۔ اور یکم مئی کو دینی سوف کو حکم ملا کہ وہ سکواڈرن کی کمان اگلے سینئر افسر کے حوالے کر دے اور خود ڈویژنل سٹاف کے سامنے حاضر ہو جائے تاکہ اس ہنگامے کی، جو اس نے دفتر رسد میں بپا کیا تھا، تحقیقات کی جا سکیں۔

جس روز اسے یہ حکم ملا، اس سے ایک دن پہلے پلاتوف نے دو قازق رجمنٹوں اور ہوزاروں کے دو سکواڈرنوں کے ساتھ دشمن کے زیر قبضہ علاقے کی ریکی کی تھی۔ اپنی عادت کے مطابق دینی سوف گھوڑے پر سوار سب سے آگے تھا اور اپنی جرأت و دلیری کی نمائش کر رہا تھا۔ اتنے میں کسی ماہر فرانسیسی نشانچی کی گولی آئی اور اس کی ران کو چھوتی نکل

گئی۔ اگر کوئی اور وقت ہوتا، دینی سوف اتنے معمولی زخم کی پروا بھی نہ کرتا اور نہ اپنی رجمنٹ چھوڑ کر کہیں جاتا۔ تاہم اب اس نے اس موقع کو غنیمت تصور کیا، اسے سٹاف کے سامنے پیش نہ ہونے کا بہانہ مل گیا اور وہ ہسپتال میں داخل ہو گیا۔

17

فریڈلانٹ کا معرکہ، جس میں پاولوگرات رجمنٹ شریک نہیں ہوئی تھی، جون میں بپا ہوا تھا۔ لڑائی کے بعد عارضی صلح کا اعلان ہوا۔ رستوف کو اپنے دوست کی عدم موجودگی کھل رہی تھی۔ جب سے وہ گیا تھا، اسے اس کے بارے میں کوئی اطلاع موصول نہیں ہوئی تھی۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ معلوم نہیں کہ اس کے زخم کی کیا حالت ہو اور اس کے معاملات کس نہج پر جا رہے ہوں۔ چنانچہ اس نے اس عارضی صلح نامے سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور دینی سوف سے ہسپتال میں ملنے کی غرض سے چھٹی لے لی۔

ہسپتال پرشیا کے ایک چھوٹے سے قصبے میں واقع تھا اور دو مرتبہ روسی اور فرانسیسی افواج اس کی اینٹ سے اینٹ بجا چکی تھیں۔ چونکہ یہ گرمیوں کا موسم تھا جب کھیتوں اور چراگاہوں میں ہر چیز اپنے جوبن پر ہوتی ہے، یہ ننھا منا قصبہ، جس کے مکانوں کی چھتیں اور باڑیں مسمار ہو چکی تھیں، جس کے گلی کوچے غلاظت سے اٹے ہوئے تھے، جس کے باسیوں کی حالت پتلی تھی اور جس میں بیمار اور مدہوش فوجی آوارہ گردی کرتے پھرتے تھے، خاص طور پر بڑا اداس اور ویران منظر پیش کر رہا تھا۔

ہسپتال خشتی عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے دریچوں کے چوکھٹے اور شیشے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے۔ اس کے چاروں اطراف صحن تھا۔ اس صحن کے اردگرد بچی کھچی باڑ کی نشانیاں کھڑی تھیں۔ متعدد فوجی، جن کے چہرے زرد اور پھولے ہوئے تھے، پٹیاں باندھے صحن میں چہل قدمی کر رہے تھے یا بیٹھے دھوپ کے مزے لے رہے تھے۔

جونہی رستوف دروازے کے اندر داخل ہوا، گلے سڑے اجسام کی سڑاند اور ہسپتال کی معمول کی بدبوؤں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ سیڑھیوں پر اس کی ملاقات ایک روسی ڈاکٹر سے ہوئی جو سگار نوشی میں مصروف تھا۔ ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے اس کا روسی مددگار تھا۔

''میں بیک وقت ہر جگہ نہیں جا سکتا،'' ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ''آج شام ماکار الیکسی وچ کے ہاں آ جانا، میں وہیں ہوں گا۔''

طبی مددگار نے مزید ایک سوال دریافت کیا۔

''جو مناسب سمجھتے ہو، کرو! کیا فرق پڑتا ہے؟''

ڈاکٹر کی نظر سیڑھیاں چڑھتے رستوف پر پڑی۔

''محترم، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔ ''تم گولیوں سے اس لیے بچے ہو کہ یہاں ٹائفس بخار[33] اپنے گلے لگا لو۔ محترم، میں سچ عرض کر رہا ہوں، یہ ہسپتال نہیں، وباؤں کا گھر ہے۔''

''کیا مطلب؟'' رستوف نے پوچھا۔

''ٹائفس، محترم۔ اس چار دیواری میں داخل ہونا موت کو دعوت دینے کے برابر ہے۔ صرف ہم دونوں، میں اور ماکیف'' (اس نے اپنے مددگار کی طرف اشارہ کیا) ''ابھی تک صحیح سلامت ہیں۔ ہمارے نصف درجن رفقا خدا کو پیارے ہو چکے ہیں... جونہی کوئی نیا آدمی آتا ہے—ایک ہفتے کے اندر اندر چلتا بنتا ہے،'' ڈاکٹر نے بدیہی اطمینان سے کہا۔ ''پرشیا کے ڈاکٹروں کو یہاں آنے کا حکم دیا گیا تھا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے یہ اتحادی یہاں کی ملازمت کو جوتی کی نوک پر بھی نہیں مارتے۔''

رستوف نے کہا: ''میں یہاں ہوزاروں کے میجر دینی سوف سے ملنے آیا ہوں۔ انھیں یہاں زخمی حالت میں لایا گیا تھا۔''

''محترم سرکار، مجھے کچھ علم نہیں— میں آپ کو کچھ بتانے سے قاصر ہوں۔ ذرا سوچیں: تین ہسپتالوں کا انتظام وانصرام میرے ذمے ہے— چار سو مریضوں کی نگہداشت کرنا ہوتی ہے۔ وہ تو بھلا ہو پرشیا کی چند مخیّر خواتین کا کہ وہ ہر مہینے ہمیں دو پاؤنڈ کافی اور کچھ مرہم پٹیوں کا کپڑا بھیج دیتی ہیں ورنہ ہمارا تو خدا ہی حافظ تھا،'' اس نے قہقہہ لگایا۔ ''چار سو جناب، اور ہر روز نئے مریضوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ چار سو ہی ہیں؟'' اس نے اپنے مددگار کی جانب مڑتے ہوئے دیکھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ تھکاوٹ اور بے آرامی نے مددگار کا پلیتھن نکال دیا ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بہت جھنجھلایا ہوا ہے اور چاہتا ہے کہ باتونی ڈاکٹر سے جلد از جلد پیچھا چھوٹ جائے۔

''میجر دینی سوف،'' رستوف نے پھر کہا۔ ''وہ مولیٹین میں زخمی ہوا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی ہے۔ کیونکہ ماکیف؟'' ڈاکٹر نے بے نیازی سے پوچھا۔

تاہم مددگار نے ڈاکٹر کی تائید نہ کی۔

''بلند قامت؟ سرخ بال؟'' ڈاکٹر نے پوچھا۔

رستوف نے دینی سوف کا حلیہ بیان کیا۔

''ہاں اس قسم کا آدمی تھا تو سہی،'' ڈاکٹر نے یوں کہا جیسے خوشی سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی ہوں۔ ''وہ یقیناً راہیٔ ملکِ عدم ہو چکا ہوگا۔ بہرحال میں دریافت کرتا ہوں— ہمارے پاس فہرستیں تھیں۔ ماکیف، تمھارے پاس تو نہیں۔''

''فہرستیں الیکسی وچ کے پاس ہیں،'' مددگار نے کہا۔ ''لیکن اگر آپ افسروں کے وارڈ میں تشریف لے جائیں، آپ کو خود ہی سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔''

''محترم، آپ نہ ہی جائیں تو بہتر ہوگا،'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''ورنہ شاید آپ کو بھی یہیں قیام کرنا پڑے!''

تاہم رستوف نے گردن کو خم دے کر اجازت چاہی اور مددگار سے راستہ دریافت کیا۔

''اچھا، بعد میں مجھے الزام نہ دینا!'' ڈاکٹر نے زینے پر اس کے پیچھے باآواز بلند کہا۔

رستوف اور مددگار ایک راہداری میں مڑ گئے۔ اس تاریک غلام گردش میں تعفن کی وہ بھرمار تھی کہ رستوف نے ہاتھ ناک پر رکھ لیا اور مجبوراً یہیں رک گیا تا کہ آگے جانے کے لیے اپنا جی کڑا کر سکے۔ دائیں ہاتھ ایک دروازہ کھلا اور ایک زرد رو مریل شخص ننگے پاؤں اور صرف جانگیا پہنے بیساکھیوں کے سہارے پھدکتا باہر آیا۔ اس نے دروازے کی چوکھٹ کا سہارا لیا اور انھیں چمکتی دمکتی اور پُر رشک آنکھوں سے بغور دیکھنے لگا۔ رستوف نے کمرے کے اندر جھانکا۔ اسے زخمی اور بیمار فرش پر لیٹے نظر آئے۔ چند ایک کے نیچے گھاس پھوس اور بعضوں کے نیچے اوورکوٹ بچھے ہوے تھے۔

یہ کون ہیں؟'' رستوف نے پوچھا۔

''فوجی ہیں،'' مددگار نے جواب دیا۔ ''ہم بھلا کیا کر سکتے ہیں؟'' اس نے معذرت طلب انداز سے کہا۔

''میں اندر جا کر دیکھ سکتا ہوں؟''

''وہاں دیکھنے کو ہے ہی کیا؟'' مددگار نے جواب دیا۔

لیکن محض اس بنا پر کہ طبی مددگار واضح طور پر اسے اندر جانے کی اجازت دینے پر متامل تھا، رستوف عام سپاہیوں کے وارڈ میں چلا گیا۔ جس تعفن کا وہ راہداری میں بتدریج عادی ہو رہا تھا، یہاں اس کے بھبکوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ یہاں کی بدبو قدرے مختلف تھی، نتھنوں میں زیادہ تیزی سے گھسی جا رہی تھی اور محسوس ہو رہا تھا کہ سارے ہسپتال میں جو تعفن پھیلا ہوا ہے، اس کا منبع یہی کمرا ہے۔

طویل و عریض کمرے میں، جسے دھوپ نے، جو بڑے بڑے دریچوں میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی، منور کر رکھا تھا، زخمی اور بیمار دیوار کی جانب منہ کیے دو قطاروں میں لیٹے ہوے تھے۔ قطاروں کے درمیان میں گزرنے کا راستہ تھا۔ ان میں سے اکثر کو سر پیر کا کوئی ہوش نہیں تھا، کون کمرے میں آتا ہے اور کون باہر جاتا ہے، اس کا انھیں مطلق علم نہیں تھا۔ دوسروں میں قدرے ہلچل پیدا ہوئی۔ بعض نے اپنے سر اٹھائے اور بعض نے اپنے مہین زرد چہرے گھمائے۔ وہ بھی نہایت انہماک سے رستوف کی جانب دیکھ رہے تھے۔ ان کے انداز سے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ مدد کی توقع کر رہے ہیں، لعنت ملامت کر رہے ہیں یا دوسروں کی صحت مندی کے بارے میں حسد میں مبتلا ہیں۔

رستوف چلتا چلتا کمرے کے درمیان میں پہنچا، اس نے دو کھلے دروازوں میں سے ملحقہ کمروں میں جھانک کر دیکھا اور وہاں بھی اسے وہی مناظر نظر آئے۔ وہ بالکل ساکت و صامت کھڑا تھا اور اپنے چاروں اطراف دیکھ رہا تھا۔ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ اسے کبھی اس قسم کے مناظر دیکھنا پڑیں گے۔ اس کے بالکل قریب راستے کے عین بیچ میں ایک بیمار شخص پڑا تھا۔ جس انداز سے اس نے اپنے بال ترشوائے ہوے تھے، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ شاید کوئی قازق ہے۔

یہ شخص اپنی پشت کے بل لیٹا ہوا تھا۔اس کے بھاری بھرکم بازو اور ٹانگیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔اس کے چہرے کا رنگ گہرا ارغوانی تھا۔اس کی آنکھیں یوں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں کہ ان کی صرف سفیدی نظر آ رہی تھی اور اس کے برہنہ بازوؤں اور ٹانگوں کی، جو ابھی تک سرخ تھیں، رگیں رسیوں کی مانند ابھری ہوئی تھیں۔وہ اپنا سر فرش کے ساتھ ٹکرا رہا تھا اور رندھی ہوئی آواز میں صرف ایک ہی لفظ ''پانی، پانی، پانی!'' کی تکرار کیے جا رہا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا، رستوف بڑے غور سے سننے کے بعد ہی سمجھ سکا۔رستوف نے اپنے گرد و پیش نگاہیں دوڑائیں۔ اسے کسی ایسے شخص کی تلاش تھی جو اس بیمار آدمی کو اپنی جگہ لٹا سکتا اور اسے پانی پلا سکتا۔

''یہاں مریضوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟'' اس نے مددگار سے پوچھا۔

عین اسی وقت آرمی سروس کور کا ایک اردلی اگلے کمرے سے اندر آیا، وہ پھرتی سے رستوف کے پاس پہنچا اور اٹینشن کھڑا ہو گیا۔

''یور ایکسی لینسی، خداوند آپ کی عمر دراز کرے!'' اس فوجی جوان نے چلا کر کہا۔جس وقت وہ رستوف سے بات کر رہا تھا، وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھے جا رہا تھا اور صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اسے ہسپتال کا کوئی افسر سمجھ رہا ہے۔

''دیکھو جوان، اس شخص کو اپنی جگہ لٹا دو اور اسے پانی پلا دو،'' رستوف نے قازق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے کہا۔

''بہت اچھا، یور ایکسی لینسی!'' فوجی جوان نے جواب دیا۔اس نے اور بھی سیدھا ہونے کی کوشش کی اور اس کوشش کے دوران میں اس کی آنکھیں بالکل ہی باہر نکل آئیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی نہ ہلا۔

''نہیں، میں یہاں کچھ نہیں کر سکتا،'' رستوف نے سوچا اور اس کی نگاہیں جھک گئیں۔

وہ باہر نکلا ہی چاہتا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ دائیں جانب کوئی شخص اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا ہے۔وہ اس کی جانب مڑا اور اس نے دیکھا کہ کمرے کے تقریباً کونے میں ایک ضعیف العمر فوجی، جس کے زرد چہرے پر خشونت برس رہی تھی، داڑھی کھچڑی ہو چکی تھی اور جسے خط بنائے مدتیں بیت چکی تھیں، اوور کوٹ پر بیٹھا ہے، اور اسے مسلسل گھور گھور کر دیکھے جا رہا ہے۔اس کا پڑوسی اس سے کانا پھوسی کر رہا تھا اور رستوف کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ رستوف کو احساس ہوا کہ پیر مرد اس سے کچھ پوچھنا چاہتا ہے۔وہ اس کے قریب چلا گیا۔اس نے دیکھا کہ اس کی صرف ایک ٹانگ ہے اور اس نے یہ ٹانگ آلتی پالتی کے انداز میں رکھی ہوئی ہے۔اس کی دوسری ٹانگ گھٹنے سے کٹی ہوئی تھی۔دوسری طرف اس کا ہمسایہ سر نہوڑائے اس سے کچھ فاصلے پر بے حس و حرکت پڑا تھا۔وہ نوجوان فوجی سپاہی تھا۔اس کی ناک چپٹی تھی۔اس کے زرد موی چہرے پر ابھی تک چھائیاں موجود تھیں اور اس کی آنکھیں پپوٹوں کے نیچے اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔رستوف نے اس نوجوان سپاہی کو دیکھا اور اسے ٹھنڈا پسینہ آ گیا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص...'' اس نے مددگار کی طرف متوجہ ہو کر کہنا شروع کیا۔

''محترم ہم اس کی منت سماجت کر چکے ہیں، اس سے حجت کر چکے ہیں...'' بوڑھے سپاہی نے کہا۔اس کے ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ''آخر ہم انسان ہیں، کتے تو نہیں...''

''میں ابھی کسی کو بھیجتا ہوں۔اسے اٹھا لیا جائے گا۔فی الفور اٹھا لیا جائے گا'' مددگار نے کہا۔''محترم، آئیں، تشریف لے چلیں۔''

''ہاں، ہاں، آؤ چلیں!'' رستوف نے جھٹ کہا۔اس کی نگاہیں جھک گئیں اور وہ آپ میں سمٹنے کی سعی کرنے لگا۔اس کی پوری کوشش یہی تھی کہ راستے کے دونوں اطراف جو ملامت آمیز اور حاسد نگاہیں اس پر گڑی ہوئی ہیں، وہ کسی طور ان سے بچ جائے اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

18

راہداری میں سے گزرتے مددگار نے رستوف کو افسروں کے وارڈ میں پہنچا دیا۔یہ وارڈ تین کمروں پر، جن کے دروازے ایک دوسرے کے اندر کھلتے تھے، مشتمل تھا۔ان کمروں کے اندر پلنگ بچھے ہوئے تھے۔زخمی یا بیمار افسران ان کے اوپر لیٹے یا بیٹھے ہوئے تھے۔بعض ہسپتال کے ڈریسنگ گاؤن پہنے کمرے میں ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔افسروں کے وارڈ میں جس اولین شخص سے رستوف کی مڈھ بھیڑ ہوئی، وہ ایک دبلا پتلا کوتاہ قامت شخص تھا۔اس کا صرف ایک ہی بازو تھا۔وہ شبینہ ٹوپی اوڑھے، ڈریسنگ گاؤن پہنے اور چھوٹا سا پائپ دانتوں تلے دبائے پہلے کمرے میں چہل قدمی کر رہا تھا۔رستوف نے اس پر نظر ڈالی اور یہ یاد کرنے کی کوشش کی کہ وہ ازیں پیشتر اس سے کہاں ملا تھا۔

''تقدیر نے ایک بار پھر ہمیں یک جا کر دیا ہے!'' کوتاہ قامت شخص نے کہا۔''توشن، توشن—کچھ یاد آیا؟ میں نے تمہیں شون گرابرن میں لفٹ دی تھی۔یہ تو تمہیں نظر آ ہی گیا ہے کہ ان لوگوں نے میرے جسم کا ایک عضو کاٹ کر پھینک دیا ہے...'' وہ اپنے ڈریسنگ گاؤن کی خالی آستین کی طرف اشارہ کرتے اور مسکراتے بولتا چلا گیا۔

''واسیلی دمیترچ دینی سوف کی تلاش میں ہو؟ ٹھیک؟ وہ میرا روم میٹ ہے،'' اس نے، جب اسے معلوم ہوا کہ رستوف کس سے ملنا چاہتا ہے، کہا۔''ادھر، اس طرف۔'' اور توشن اسے اگلے کمرے میں، جہاں جاندار قہقہوں کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں، لے گیا۔

''قہقہے تو رہے ایک طرف، یہ لوگ یہاں زندہ کیسے ہیں؟'' رستوف نے سوچا۔اس نے فوجی جوانوں کے کمرے میں جو لاش دیکھی تھی، اس کی بو اب تک اس کے نتھنوں میں گھسی ہوئی تھی، اور کمرے سے باہر نکلنے کے دوران میں جن حاسد نگاہوں نے اس کا تعاقب کیا تھا، وہ اب تک اسے دکھائی دے رہی تھیں۔وہ اس نوجوان فوجی کا، جس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھی، چہرہ بھی فراموش نہیں کر سکا تھا۔

اگرچہ تقریباً دو پہر ہو چکی تھی، دینی سوف کمبل میں سر چھپائے ابھی تک سو رہا تھا۔

''ارے، رستوف! کیسے ہو! کیا حال چال ہیں؟'' اس کی پکار سنائی دی۔اگرچہ اس کی آواز میں اب بھی وہی

گھن گرج تھی، جس کا مظاہرہ وہ رجمنٹ میں کیا کرتا تھا، لیکن رستوف کو یہ دیکھ کر بہت ملال ہوا کہ اس کی روایتی زندہ دلی اور لاف زنی کی تہہ میں ایک نیا، بدخواہانہ اور مخفی جذبہ، جس کا اظہار اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی آواز کے اتار چڑھاؤ سے ہو رہا تھا، کارفرما ہے۔

اس کا زخم اگرچہ معمولی تھا لیکن ابھی مندمل نہیں ہوا تھا حالانکہ اسے یہ گھاؤ آج سے چھ ہفتے قبل آیا تھا۔ ہسپتال میں مقیم باقی لوگوں کی طرح اس کے چہرے پر بھی زردی مائل سوجن نمایاں تھی لیکن رستوف کو جو چیز کھٹکی، وہ یہ پیلی سوجن نہیں تھی بلکہ اس کا یہ احساس تھا کہ دینی سوف اسے دیکھ کر خوش نہیں ہوا اور یہ کہ اس کے چہرے پر جو تبسم تھا، وہ زبردستی کا تھا۔ اس نے نہ تو رجمنٹ کے بارے میں کوئی سوال کیا اور نہ یہ پوچھا کہ حالات کا عمومی رخ کیا ہے اور جب رستوف ان امور کا ذکر کر رہا تھا، اس نے کوئی توجہ نہ دی۔

رستوف کو اندازہ ہوا کہ دینی سوف کو یہ بات پسند نہیں آ رہی کہ اسے رجمنٹ کے بارے میں کوئی چیز یاد دلائی جائے یا ہسپتال سے باہر پابندیوں سے آزاد جو زندگی گزاری جا رہی تھی، اس کے سامنے عمومی طور پر اس کا کوئی ذکر کیا جائے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس سابقہ زندگی کو فراموش کرنے کی سعی کر رہا ہے اور اب جس واحد معاملے میں اسے دلچسپی رہ گئی تھی، وہ دفتر رسد کے افسروں کے ساتھ اس کا معاملہ تھا۔ جب رستوف نے اس سے پوچھا کہ اب معاملات کس نہج پر جا رہے ہیں، اس نے جھٹ پٹ اپنے تکیے کے نیچے سے ایک کاغذ نکالا، جو کمیشن نے اسے ارسال کیا تھا، اس نے اس کے جواب میں جو ابتدائی مسودہ تیار کیا تھا، وہ بھی اسے دکھایا۔ جب وہ اپنے اس مسودے کی خواندگی کر رہا تھا، وہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا اور لحظہ بہ لحظہ اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس نے جس جلے کٹے اور طنزیہ انداز سے اپنے حریفوں کے لتے لیے تھے، اس نے اس کی طرف رستوف کی توجہ خاص طور پر دلائی۔ جب دینی سوف نے یہ خط پڑھنا شروع کیا، اس کے ہسپتال کے ساتھی جو رستوف کو بیرونی دنیا سے تازہ وارد سمجھ کر اس کے گرد اکٹھے ہو گئے تھے، ایک ایک کر کے چھٹنے لگے۔ ان کے چہروں سے رستوف نے اندازہ لگایا کہ وہ اس کہانی کو ایک سے زیادہ مرتبہ سن چکے ہیں اور اب اس سے قطعی عاجز آ چکے ہیں۔ صرف اگلا پڑوسی مریض، جو ہٹا کٹا اولان تھا، اپنے بستر پر بیٹھا رہا۔ وہ پائپ کے کش لے رہا تھا اور اس کے چہرے پر اداسی اور خفگی جھلک رہی تھی۔ یا پھر کوتاہ قامت توشن، جس کا صرف ایک ہی بازو تھا، یہ کتھا سنتا رہا اور وہ بھی ناپسندیدگی سے گردن ہلاتا رہا۔ ابھی خط کی خواندگی جاری تھی کہ بیچ میں اولان نے دینی سوف کو ٹوک دیا۔

"لیکن میرا خیال یہ ہے،" اس نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، "کہ انھیں زار کو معافی کی درخواست بھیجنا چاہیے۔ سنا ہے کہ ان دنوں ڈھیروں انعامات و اکرامات منقسم ہونا ہیں۔ ان حالات میں انھیں معافی ملنے کا قوی امکان ہے۔"

"میں اور زار کو عرضی دوں!" دینی سوف کچھ اس قسم کے لہجے سے پکارا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس میں اپنی سابقہ قوت اور شعلہ افشانی بھرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اس کی آواز کچھ اس طرح سنائی دی جیسے اس کی ہمت جواب دے چکی ہو اور اب وہ نامردوں کی طرح محض اپنی تنگ مزاجی کا اظہار کر رہا ہو۔ "کس لیے؟ اگر میں کوئی لٹیرا ہوتا ضرور

رحم کی درخواست پیش کرتا، لیکن میرا کورٹ مارشل محض اس لیے ہو رہا ہے کیونکہ میں لٹیروں سے حساب کتاب کرنا چاہتا تھا۔ یہ چلا لیں مجھ پر مقدمہ، میں کسی سے ڈرتا ورتا نہیں۔ میں نے باعزت طریقے سے زار اور اپنے وطن کی خدمت کی ہے اور میں کوئی چور نہیں ہوں! وہ مجھے ذلیل کرنا اور عام سپاہی بنانا چاہتے ہیں اور — اور کان کھول کر سن لو۔ میں انھیں لگی لپٹی رکھے بغیر لکھ رہا ہوں۔ میں نے انھیں لکھا ہے: 'اگر میں نے خزانے پر ڈاکا مارا ہوتا...''

''آپ نے جو کچھ لکھا ہے، بالکل صحیح لکھا ہے، کون کافر اس کے متعلق شبہ کر سکتا ہے،'' توشن نے کہا۔ ''لیکن، واسیلی دمیترچ، مسئلہ یہ نہیں۔'' اور وہ بھی رستوف کی طرف متوجہ ہوا۔ ''آدمی کو صبر شکر کرنا پڑتا ہے اور واسیلی دمیترچ یہی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ آڈیٹر نے خود آپ کو بتایا تھا کہ معاملہ دگرگوں ہے۔''

''دگرگوں ہے، پھر اسے دگرگوں ہی رہنے دیں!'' دینی سوف پھٹ پڑا۔

''آڈیٹر نے آپ کو عرض داشت لکھ کر دی تھی،'' توشن نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''آپ کو اس پر دستخط کر دینا چاہئیں اور اس بھلے مانس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ لاریب ان کے (رستوف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) سٹاف افسروں کے ساتھ روابط ہیں۔ آپ کو اس سے بہتر موقع میسر نہیں آئے گا۔''

''میں نے بتایا نہیں کہ میں کسی کے پاؤں نہیں پکڑوں گا؟'' دینی سوف نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا اور دوبارہ اپنا جواب پڑھنے لگا۔

رستوف کو جبلی طور پر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ توشن اور دوسرے افسروں نے دینی سوف کو جو طرزِ عمل اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا، وہ انتہائی دانش مندانہ تھا اور اگر وہ اس کے کسی کام آ سکتا تو اسے قلبی مسرت ہوتی، لیکن اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اسے سمجھا بجھا سکتا اور اس قسم کی راہ عمل اپنانے کی ترغیب دے سکتا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس کے دوست کا عزم کڑی کمان کی طرح بے لوچ ہے اور وہ دیانت داری کے معاملے میں بے حد جوشیلا ہے۔

جب دینی سوف اپنا کٹیلا اور زہریلا جواب، جس پر اس کا ایک گھنٹہ صرف ہوا، پڑھ چکا، رستوف نے اپنی زبان بند رکھی۔ اس نے بقایا دن نہایت افسردگی کے عالم میں دینی سوف کے ساتھی مریضوں کی، جو ایک بار پھر اس کے گرد جمع ہو گئے تھے، صحبت میں گزارا۔ وہ ان کی کہانیاں سنتا اور جو کچھ اسے معلوم تھا، انھیں بتاتا رہا۔ دینی سوف ساری شام منہ پھلائے بیٹھا رہا اور اس نے زبان سے ایک لفظ تک نہ کہا۔

آخر کار جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے اور رستوف نے روانگی کا ارادہ کیا، اس نے دینی سوف سے پوچھا: ''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیں۔''

''ہاں، ایک منٹ انتظار کرو،'' دینی سوف نے کہا۔ اس نے دوسرے افسروں پر اچٹتی نظر ڈالی، اپنے تکیے کے نیچے سے کاغذات کا پلندا نکالا، کھڑکی کے، جہاں قلم دان دھرا تھا، قریب پہنچا اور لکھنے بیٹھ گیا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ پتھر کی دیوار سے سر ٹکرانے کا کوئی فائدہ نہیں،'' اس نے واپس آتے اور رستوف کو ضخیم لفافہ تھماتے ہوئے کہا۔

یہ وہ عرض داشت تھی جو آڈیٹر نے زار کے نام تحریر کی تھی۔ اس میں دینی سوف نے شعبۂ رسد کے افسروں کے جرائم اور بدعنوانیوں کی کوئی نشان دہی نہیں کی تھی بلکہ اس نے سیدھے سادے الفاظ میں معافی کی درخواست کی تھی۔

''یہ پہنچادو... معلوم ہوتا ہے...''

وہ اپنا جملہ مکمل نہ کر سکا۔ بس تکلیف دہ غیر فطری مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لے آیا۔

19

رجمنٹ میں واپس آنے اور دینی سوف کے معاملات کے بارے میں کمانڈر کو مطلع کرنے کے بعد رستوف نے گھوڑا پکڑا اور زار کے نام درخواست لے کر ٹلزٹ[34] روانہ ہو گیا۔

فرانسیسی اور روسی امپراطوروں کے مابین تیرہ جون کو ٹلزٹ میں ملاقات ہو چکی تھی۔ بورس بتیسکوئے جن اہم شخصیات کی اردل میں تھا، ان سے اس نے درخواست کی تھی کہ اس موقع پر جن سٹاف افسروں کو ڈیوٹی پر متعین کیا جانا ہے، ان میں اسے بھی شامل کر لیا جائے۔

''میں اس عظیم آدمی کا دیدار کرنا چاہوں گا،'' اس نے فرانسیسی میں نپولین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ باقی لوگوں کی طرح وہ بھی اسے بوناپارت ہی کہتا تھا۔

''تم بوناپارت کی بات کر رہے ہو؟'' جرنیل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

بورس نے مستفسرانہ انداز سے جرنیل کی طرف دیکھا اور آناً فاناً اس کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ سوال کے بہانے اس کی معلومات کا امتحان لیا جا رہا ہے۔

''mon prince، میں امپراطور نپولین کا ذکر کر رہا ہوں،'' اس نے جواب دیا۔

جرنیل نے اس کے کندھے پر تھپکی دی اور مسکرا دیا۔

''تم بہت ترقی کرو گے،'' اس نے کہا اور اسے اپنے ساتھ ٹلزٹ لے گیا۔

جس روز دریائے نیمین کے کنارے دونوں امپراطوروں کے مابین ملاقات ہوئی، اس موقع پر جو گنے چنے لوگ وہاں موجود تھے، بورس ان میں شامل تھا۔ اس نے وہ بجرے دیکھے جن پر شاہی مونوگرام کندہ تھا، اس نے دریا کے مخالف کنارے پر نپولین کو فرنچ گارڈز کے قریب سے گزرتے دیکھا، اس نے امپراطور الیکساندر کا، جب وہ دریائے نیمن کے کنارے ہوٹل میں بیٹھا تھا اور خاموشی سے نپولین کی آمد کا انتظار کر رہا تھا، فکر میں غلطاں و پیچاں چہرہ دیکھا۔ اس نے دونوں امپراطوروں کو بجرے میں سوار ہوتے دیکھا۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ نپولین، جو بجرے کے پاس پہلے پہنچا تھا، کس تیزی سے الیکساندر کا استقبال کرنے آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دیا اور پھر کس طرح

* مائی پرنس۔ محترم پرنس

دونوں امپراطور پیولین کے اندر چلے گئے۔

جب سے بورس کو اعلیٰ ترین حلقوں میں رسائی حاصل ہوئی تھی، اس نے یہ وتیرہ بنالیا تھا کہ اس کے گرد وپیش جو کچھ ظہور پذیر ہو رہا ہوتا، وہ اس کا بغور مشاہدہ کرتا اور اسے قلم بند کر لیتا۔ ٹلزٹ میں ملاقات کے دنوں میں وہ یہ ٹوہ لگاتا پھرا کہ نپولین کے ہمراہ جو اشخاص آئے ہیں، ان کے نام کیا ہیں اور انھوں نے کس قسم کی وردیاں پہنی ہوئی ہیں۔ صاحبانِ مرتبہ وحیثیت جو کچھ کہتے، وہ اسے نہایت توجہ سے سنتا رہا۔ جونہی دونوں امپراطور پیولین میں داخل ہوئے، اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی اور جب الیکساندر واپس آیا، وہ اسے دوبارہ دیکھنا نہ بھولا۔ یہ ملاقات ایک گھنٹہ اور ترپن منٹ جاری رہی تھی۔ اس نے اسی شام دوسرے حقائق کے علاوہ، جو اس کے خیال کے مطابق تاریخی اہمیت کے حامل تھے، اس ملاقات کا دورانیہ بھی اپنی ڈائری میں درج کر لیا۔ چونکہ دونوں امپراطوروں کے مابین اس ملاقات کے موقع پر زار کے سٹاف میں جو لوگ شامل تھے، ان کی تعداد بہت قلیل تھی، اس لیے ایک ایسے آدمی کے لیے، جو ملازمت میں ترقی کو ہر چیز پر ترجیح دیتا تھا، ان میں شامل ہونا نہایت اہم تھا اور چونکہ بورس وہاں جانے میں کامیاب رہا تھا، اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اس کی پوزیشن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ و مستحکم ہوگئی ہے۔ وہ نہ صرف معروف ہوگیا تھا بلکہ لوگ اس کی موجودگی کے عادی ہوگئے تھے اور انھوں نے اس کی حیثیت تسلیم کر لی تھی۔ دو مرتبہ وہ پیغام لے کر خود زار کی خدمت میں حاضر ہو چکا تھا۔ چنانچہ والئ سلطنت اس کے چہرے سے آشنا ہو چکا تھا اور وہ لوگ، جو ہر وقت دربار میں موجود رہتے تھے، اگر ابتدا میں اسے نو وارد سمجھ کر اس سے بے التفاتی سے پیش آئے تھے، اب اگر وہ موجود نہ ہوتا، بہت متعجب ہوتے۔

بورس ایک اور ایجوٹنٹ کاؤنٹ ژی لنسکی کے ساتھ مقیم تھا۔ ژی لنسکی پولستانی تھا۔ اس نے پیرس میں تعلیم پائی تھی۔ وہ صاحب حیثیت آدمی تھا اور فرانسیسیوں پر جان چھڑکتا تھا۔ ان کا جتنی مدت ٹلزٹ میں قیام رہا، تقریباً ہر روز فرانسیسی گارڈز اور فرانسیسی جنرل سٹاف کے افسر اس کے اور بورس کے ساتھ لنچ یا ڈنر کھانے آتے رہے۔

چوبیس جون کی شام کاؤنٹ ژی لنسکی اپنی جان پہچان کے فرانسیسی افسروں کی بیر پر خاطر تواضع کر رہا تھا۔ نپولین کا ایک ایڈی کانگ مہمان خصوصی تھا۔ دیگر مہمانوں میں نپولین کا ایک خاص نوعمر خدمت گار[35] جس کا تعلق فرانسیسی روسا کے ایک قدیم خاندان سے تھا، اور فرانسیسی گارڈز کے متعدد افسر شامل تھے۔ اسی روز رستوف تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، عام شہری لباس میں تاکہ وہ پہچانا نہ جاسکے، ٹلزٹ پہنچا اور سیدھا بورس اور ژی لنسکی کے مسکن پر وارد ہوگیا۔

نپولین اور فرانسیسیوں — جن کی حیثیت ایکا ایکی دشمن سے دوست میں تبدیل ہوگئی تھی — کے بارے میں ہیڈ کوارٹرز اور خود بورس کے باطن میں جذبات کی جو کایا پلٹ ہوئی تھی، باقی ساری فوج اس کے متعلق قطعی لاعلم تھی۔ رستوف بھی اسی فوج سے آیا تھا، اس لیے اسے بھی اس تبدیلی جذبات کا کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ فوج میں ابھی تک بوناپارٹ اور فرانسیسیوں کے خلاف مخاصمت، حقارت اور خوف کے ملے جلے جذبات کا سکہ رواں تھا۔ کچھ زیادہ

دنوں کی بات نہیں، پلاتوف کے ایک قازق افسر کے ساتھ گفتگو کے دوران میں رستوف نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ اگر نپولین قیدی بنالیا گیا، اس کے ساتھ امپراطور کی نہیں بلکہ مجرم کی حیثیت سے برتاؤ کیا جائے گا۔ اور ابھی حال ہی میں رستوف کی راستے میں ایک زخمی فرانسیسی کرنل کے ساتھ اچانک مڈھ بھیڑ ہوگئی تھی اور اس نے نہایت تندی سے یہ دعویٰ کیا تھا کہ قانونی امپراطور اور مجرم بوناپارٹ کے مابین کوئی صلح نہیں ہوسکتی۔ چنانچہ جب رستوف نے بورس کی رہائش گاہ پر فرانسیسی افسروں (اور وہ بھی ایسی وردیوں میں، جنھیں وہ میدان جنگ میں مختلف نظروں سے دیکھنے کا عادی ہو چکا تھا) کو دیکھا، وہ ہکا بکا رہ گیا۔ جونہی اس کی نگاہ ایک فرانسیسی افسر پر پڑی جس نے اپنی گردن دروازے کے باہر نکالی ہوئی تھی، اس پر وہی جنگ جویانہ اور مخاصمانہ جذبہ، جو دشمن کو دیکھنے کے بعد اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا کرتا تھا، طاری ہوگیا۔ وہ دہلیز پر رک گیا اور روسی زبان میں دریافت کرنے لگا: ''دروبتیسکوئے یہیں رہتے ہیں؟'' بورس کو جب استقبالیہ سے نامانوس آواز آتی سنائی دی، وہ اسے ملنے باہر آگیا۔ جب اس نے رستوف کو پہچان لیا، گھڑی کی گھڑی اس کے چہرے پر تکدر اور جھنجلاہٹ کے آثار نمایاں ہوگئے۔

''ارے تم! تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی، بہت خوشی ہوئی،'' تاہم اس نے آگے بڑھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

مگر رستوف اس کا اولین ردعمل دیکھ چکا تھا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ میں غلط وقت پر آگیا ہوں۔ اگر مجھے کام نہ ہوتا، میں ہرگز نہ آتا،'' اس نے سرد مہری سے کہا۔

''نہیں، مجھے تو حیرت اس بات پر ہوئی تھی کہ تمھیں اپنی رجمنٹ سے غیر حاضر ہونے کا موقع کیسے مل گیا؟ میں ابھی حاضر ہوتا ہوں،'' اس نے فرانسیسی میں کسی شخص سے کہا جس نے اسے آواز دی تھی۔

''نظر آتا ہے کہ میں غلط وقت پر آگیا ہوں،'' رستوف نے اپنی بات دہرائی۔

بورس کے چہرے پر تکدر کے جو آثار نمایاں ہوئے تھے، وہ آناً فاناً ناپید ہوگئے۔ بظاہر وہ سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اسے کیا کرنا ہوگا۔ اس نے رستوف کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے اور نہایت دل جمعی کے ساتھ اسے اگلے کمرے میں لے گیا۔ اس کی آنکھیں جو اطمینان سے مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھیں، سات پردوں میں مستور تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھوں پر یہ پردہ اعلیٰ معاشرتی زندگی کے نیلے چشمے نے ڈالا تھا، کم از کم رستوف کو یہی محسوس ہوا۔

''چھوڑو یار! یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تم غلط وقت پر آؤ!'' اس نے کہا اور اسے اس کمرے میں لے گیا، جہاں سپر کے لیے دسترخوان سجا تھا۔ اس نے اپنے مہمانوں سے اس کا تعارف کرایا اور انھیں بتایا کہ وہ عام شہری نہیں ہے، بلکہ ہوزاروں کا افسر اور پرانا دوست ہے۔

''کاؤنٹ ژی لنسکی، "Le Comte N.N*، Le Capitaine S.S**" اس نے اپنے مہمانوں کے نام

---

* کاؤنٹ این این

** کیپٹن ایس ایس

گنواتے ہوئے کہا۔

رستوف نے چیں بہ جبیں ہو کر فرانسیسیوں پر سرسری نگاہ ڈالی، اینٹھ کر گردن کو خم دیا اور منہ سے کچھ نہ کہا۔

صاف معلوم ہو رہا تھا کہ ژی لنسکی کو اس غیر معروف روسی کو اپنے حلقے میں دیکھ کر قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی اور اس نے رستوف کو کوئی گھاس نہ ڈالی۔ ادھر یہ دکھائی دے رہا تھا کہ نو وارد کی آمد پر محفل پر جو کھنچاؤ کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، بورس اس سے قطعی لاعلم ہے۔ اس نے وہی خوشگوار اور پرسکون لہجہ اپنائے اور آنکھوں پر وہی نقاب اوڑھے، جس کے ساتھ اس نے رستوف کا خیر مقدم کیا تھا، محفل کو گرمانے کی کوشش کی۔ ایک مہمان اپنی مخصوص فرانسیسی شائستگی کے ساتھ رستوف سے، جو ہٹ دھرمی سے منہ میں گھنگھیاں ڈالے بیٹھا تھا، مخاطب ہوا اور گویا ہوا:

''آپ شاید امپراطور سے ملنے ٹلزٹ آئے ہیں؟''

''نہیں، میں ایک کام کے سلسلے میں آیا ہوں۔''

رستوف کا مزاج تبھی برہم ہو گیا تھا جب اس نے بورس کے چہرے پر تکدر کے آثار دیکھے تھے اور جیسا کہ ہر شخص کے، جس کا مزاج برہم ہو، ساتھ ہوتا ہے، اسے بھی یہی محسوس ہو رہا تھا کہ ہر شخص اسے مخاصمانہ نگاہوں سے دیکھ رہا ہے اور اسے ناخوانده مہمان تصور کر رہا ہے۔ اور درحقیقت وہ صحیح ٹھکانے پر تھا بھی نہیں۔ وہ واحد شخص تھا جو گفتگو میں، جو دوبارہ عام موضوعات پر ہونے لگی تھی، شریک نہیں تھا۔ دوسرے لوگ اسے جن نظروں سے دیکھ رہے تھے، وہ یہ کہتی محسوس ہو رہی تھیں۔ ''یہ شخص ابھی تک یہاں کیوں بیٹھا ہے؟ جاتا کیوں نہیں؟'' وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور بورس کے قریب چلا گیا۔

''معلوم ہوتا ہے کہ میں یہاں رنگ میں بھنگ ڈال رہا ہوں،'' اس نے دھیمی آواز میں کہا۔ ''آؤ، میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، اس کے بعد میں یہاں سے چلتا بنوں گا۔''

''ارے نہیں، بالکل نہیں،'' بورس نے کہا۔ ''اگر تم تھک چکے ہو، میرے کمرے میں چلے چلو، وہاں لیٹ جاؤ اور آرام کرو۔''

''خیر، بات یہ ہے کہ...''

وہ اس کمرے میں، جہاں بورس سوتا تھا، چلے گئے۔ رستوف نے بیٹھنا گوارا نہ کیا اور کھڑے کھڑے بات شروع کر دی۔ اس کے لہجے میں جھلاہٹ کا عنصر شامل تھا (گویا اس معاملے میں بورس کسی نہ کسی طرح قصوروار تھا)۔ وہ جھٹ پٹ دینی سوف کا معاملہ بیان کرنے اور اس سے پوچھنے لگا: ''کیا تم دینی سوف کا معافی نامہ اپنے جرنیل کی وساطت سے زار کے سامنے پیش کر سکتے ہو اور پیش کرو گے؟'' جب وہ دونوں اکیلے ملے، رستوف کو پہلی مرتبہ واضح طور پر احساس ہوا کہ بورس کی موجودگی میں اسے بے چینی ہو رہی ہے اور وہ اس سے آنکھ نہیں ملا سکتا۔ بورس نے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ کے گرد لپیٹ رکھی تھی اور وہ اپنے دائیں ہاتھ کی دبلی پتلی انگلیوں سے اپنا بایاں ہاتھ سہلا رہا تھا۔ وہ رستوف کی باتیں یوں سن رہا تھا جیسے کوئی جرنیل اپنے ماتحت کی رپورٹ سنتا ہے۔ کبھی وہ

ادھر دیکھنے لگتا اور کبھی ادھر، اور کبھی اپنی نقاب پوش آنکھوں سے رستوف کی آنکھوں میں جھانکنے لگتا۔ وہ جب بھی یہ حرکت کرتا، رستوف کو بے کلی ہونے لگتی اور اس کی نظریں جھک جاتیں۔

"میں اس قسم کے معاملات کے بارے میں سن چکا ہوں اور مجھے معلوم ہے کہ امپراطور ان امور کے متعلق نہایت سخت رویہ اپناتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس مسئلے کو براہ راست ان کی بارگاہ میں پیش نہ کیا جائے بلکہ کور کمانڈر کی وساطت سے رجوع کیا جائے... لیکن اگر عمومی اعتبار سے بات کی جائے، مجھے یقین ہے کہ۔"

"اگر تم کچھ نہیں کرنا چاہتے، صاف صاف کہہ دو!" رستوف نے بورس کی طرف دیکھے بغیر تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

بورس مسکرانے لگا۔ "اس کے برعکس مجھ سے جو کچھ بن پڑا، میں کروں گا۔ میرا صرف یہ خیال تھا۔" اس لمحے ژی لنسکی کی آواز سنائی دی۔ وہ بورس کو بلا رہا تھا۔

"اچھا، جاؤ، چلے جاؤ..." رستوف نے کہا۔ اس نے سپر میں شریک ہونے سے انکار کر دیا۔ وہ اس کے چھوٹے کمرے میں ہی مقیم رہا۔ وہ کافی دیر تک اس میں چکر کاٹتا رہا اور ملحقہ کمرے سے ہلکی پھلکی گپ شپ کی بھنبھناہٹ سنتا رہا۔

20

رستوف جس روز ٹلزٹ پہنچا، دینی سوف کی طرف سے معافی نامہ پیش کرنے کے لیے اس سے زیادہ نامساعد دن شاید ہی کوئی اور ہو سکتا تھا۔ اس کے خود حاضر جرنیل کی خدمت میں پیش ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہ وردی میں ملبوس نہیں تھا اور ٹلزٹ بھی اپنے کمان افسر کی اجازت کے بغیر آیا تھا۔ رہا بورس، وہ اگر چاہتا بھی، تب بھی وہ یہ کام نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگلے روز یعنی ستائیس جون کو صلح نامے کے ابتدائی مسودے پر دستخط ہونا تھے۔ دونوں امپراطوروں نے آپس میں اعزازات کا تبادلہ کرنا، الیکساندر کو لیجن آف آنر[36] اور نپولین کو آرڈر آف سینٹ آندرے[37] ملنا تھا۔ اسی روز فرانسیسی گارڈز کی ایک بٹالین نے پرزے برزیوسکی بٹالین کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کیا۔ دونوں امپراطوروں نے اس ضیافت میں شریک ہونا تھا۔

رستوف کو بورس کی صحبت اتنی کھل رہی تھی کہ جب مؤخر الذکر نے سپر کے بعد اندر جھانک کر دیکھا، وہ یوں بن گیا جیسے وہ گہری نیند سو رہا ہو۔ اگلے روز وہ صبح سویرے ہی باہر نکل گیا تاکہ دوبارہ ملاقات کی نوبت ہی نہ آ سکے۔ وہ اپنا فراک کوٹ اور گول ہیٹ پہنے قصبے میں گھومتا پھرتا، فرانسیسیوں اور ان کی وردیوں کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا اور جن سڑکوں اور مکانوں میں روسی اور فرانسیسی امپراطور مقیم تھے، ان کا جائزہ لیتا رہا۔ ضیافت کے انتظامات کے ضمن میں وسطی چوک میں جو میزیں بچھائی اور سجائی گئی تھیں اور جو دوسری تیاریاں ہو رہی تھیں، اس

نے وہ بھی دیکھیں۔ مختلف گلی کوچے ایک سرے سے دوسرے سرے تک، فرانسیسی اور روسی جھنڈوں سے، جن پر دونوں امپراطوروں کی رعایت سے ن اور الف کے حروف منقش تھے، بڑی سج دھج سے مزین کیے گئے تھے۔ مکانوں کے دریچوں میں بھی بڑے بڑے علم لہرا رہے تھے۔ یہ سب بھی اس کے ملاحظے میں آئے۔

''بورس میری مدد کرنا نہیں چاہتا، نہ کرے، میں بھی اسے جوتی کی نوک پر نہیں دھرتا۔ یہ بات طے ہے کہ اب میں اس سے قطعاً کوئی گزارش نہیں کروں گا،'' نکولائی نے سوچا۔ ''اب ہمارے مابین کوئی قدرِ مشترک باقی نہیں رہی، تاہم دینی سوف کی خاطر جو کچھ مجھ سے بن پڑے گا، میں وہ کیے بنا یہاں سے نہیں ٹلوں گا۔ خاص طور پر جب تک میں زار تک اس کی درخواست نہیں پہنچا لیتا، میں بالکل نہیں ہلوں گا۔ زار؟— لیکن وہ تو یہاں ہیں!'' اور وہ چلتا چلاتا غیر شعوری طور پر واپس اس مکان کے، جس میں زار کا قیام تھا، سامنے جا پہنچا۔

دروازے کے روبرو گھوڑے کھڑے تھے۔ ان پر زینیں کسی جا چکی تھیں۔ خدام و حشم اکٹھے ہو رہے تھے۔ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ زار کی آمد کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔

''کسی بھی لمحے میری ان سے ملاقات ہو سکتی ہے،'' رستوف نے سوچا۔ ''کاش میں خود یہ درخواست ان کے حضور پیش کر سکتا اور انھیں تمام حالات سے آگاہ کر سکتا۔ کیا مجھے محض اس بنا پر تو گرفتار نہیں کر لیا جائے گا کہ میں عام شہری لباس میں ملبوس ہوں؟ نہیں، اتنا بھی اندھیر نہیں! وہ یقیناً سمجھ جائیں گے کہ انصاف کا پلڑا کس کے حق میں جھکتا ہے۔ وہ ہر بات سمجھتے ہیں۔ ان سے بڑھ کر منصف مزاج اور دریا دل اور کون ہے؟ اور اگر انھوں نے مجھے حراست میں لے بھی لیا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں، کون سی قیامت ٹوٹ پڑے گی؟'' اس نے ایک افسر کو، جو اس مکان میں، جس میں زار مقیم تھا، داخل ہو رہا تھا، دیکھ کر سوچا۔ ''آخر لوگ اندر جا ہی رہے ہیں۔ میری سوچ بالکل واہیات ہے! میں اندر جاؤں گا اور خود زار کی خدمت میں درخواست پیش کروں گا۔ لعنت ہو اس درو بتسکوئے پر جس کی وجہ سے میں یہ قدم اٹھانے پر مجبور ہوا ہوں۔'' اور اچانک ایسے عزمِ صمیم کے ساتھ، جس کا اسے کبھی شائبہ بھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اس کے اندر موجود ہے، اس نے جیب میں درخواست کو ٹٹولا اور سیدھا اس مکان میں، جس میں زار مقیم تھا، گھس گیا۔

''نہیں، اس مرتبہ میں موقع ہاتھ سے جانے نہیں دوں گا جیسا کہ اوسٹرلٹس میں میرے ساتھ ہوا تھا،'' اس نے سوچا۔ اسے یہ توقع تھی کہ کسی بھی لمحے اس کی والئ مملکت سے ملاقات ہو سکتی ہے اور جونہی اسے یہ بات سوجھی، اسے اپنا سارا خون بجانب قلب دوڑتا محسوس ہوا۔ ''میں ان کے پاؤں پڑ جاؤں گا اور ان کی منت سماجت کروں گا۔ وہ مجھے اٹھا کر کھڑا کر دیں گے، میری عرض داشت سنیں گے بلکہ میرا شکریہ بھی ادا کریں گے۔' جب مجھ سے بھلائی کا کوئی کام سرزد ہو، مجھے خوشی ہوتی ہے لیکن مجھے عظیم ترین راحت تب حاصل ہوتی ہے جب میں کسی ناانصافی کا ازالہ کر سکوں،'' اس نے خیالوں ہی خیالوں میں زار کو کہتے سنا۔ مکان کے اندر باہر آنے جانے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ جو بھی گزرتا، اسے تجسس کی نگاہوں سے دیکھتا۔ وہ ان سب کے قریب سے گزرتا پورچ میں پہنچ گیا۔

پورچ سے خاصا کشادہ زینہ سیدھا اوپر جاتا تھا۔ اسے دائیں طرف بند دروازہ نظر آیا۔ زیریں زینہ ایک اور پورچ تھا۔ یہ نچلی منزل کے کمروں میں کھلتا تھا۔

''آپ کن سے ملنا چاہتے ہیں؟'' کسی نے دریافت کیا۔

''میں ہز میجسٹی کی خدمت میں درخواست پیش کرنا چاہتا ہوں،'' نکولائی نے کہا۔ اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی۔

''درخواست؟ ادھر تشریف لائیں۔ ڈیوٹی افسر ادھر بیٹھتے ہیں،'' اس نے زیریں دروازے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''بس اسے قبول نہیں کیا جائے گا۔''

اس لاابالی آواز کو سن کر رستوف سٹی بھول گیا اور وہ سوچنے لگا: ''میں یہاں کیا کر رہا ہوں؟'' کسی بھی لمحے اپنے آپ کو والئی سلطنت کے روبرو پانے کا تصور اتنا دلکش اور نتیجتاً اتنا لرزہ خیز تھا کہ اس کے چھکے چھوٹ گئے اور اس کا جی چاہا کہ وہ فوراً وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ جائے لیکن اس ملازم نے، جس سے اس کی ملاقات ہوئی تھی، ڈیوٹی افسر کے کمرے کا دروازہ کھول دیا اور رستوف اندر چلا گیا۔

کمرے میں ایک کوتاہ قامت، ہٹا کٹا، تقریباً تیس سالہ شخص سفید برجس، اونچے جوتے اور نفیس پاپلین کی قمیص (معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ ابھی ابھی زیب تن کر کے فارغ ہوا ہے) پہنے کھڑا تھا جب کہ اس کا اردلی اس کی برجس کے عقبی جانب نئے اور دیدہ زیب گیلسوں[38] کے، جن پر ریشمی دھاگوں سے کشیدہ کاری کی گئی تھی، بٹن لگا رہا تھا۔ پتا نہیں کیوں، بہرحال رستوف کی توجہ ان گیلسوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ ہٹا کٹا شخص ملحقہ کمرے میں موجود کسی آدمی سے باتیں کر رہا تھا۔

''سبحان تیری قدرت، کیا قیامت خیز دوشیزہ ہے! نازک بدن، کھلتا رنگ، اوائلِ شباب،'' وہ فرانسیسی میں کہہ رہا تھا لیکن رستوف کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور اس کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔

''کیا چاہتے ہو؟ کوئی درخواست ہے؟''

''کیا بات ہے؟'' ملحقہ کمرے سے دوسرے شخص نے پوچھا۔

''ایک اور عرضی گزار،'' گیلسوں والے آدمی نے جواب دیا۔

''اسے کہو کہ بعد میں کسی اور وقت آئے۔ وہ تشریف لایا ہی چاہتے ہوں گے۔ ہمیں چلنا چاہیے۔''

''کسی اور وقت، کسی اور وقت۔ کل آجانا۔ اب بہت دیر ہو چکی ہے۔''

رستوف واپس جانے کے لیے مڑا لیکن گیلسوں والے شخص نے اسے روک دیا۔

''کس کی درخواست لائے ہو؟ تمھارا کیا نام ہے۔؟''

''میں میجر دینی سوف کے پاس سے آیا ہوں،'' رستوف نے جواب دیا۔

''تم کون ہو؟۔ افسر؟''

''لیفٹیننٹ کاؤنٹ رستوف۔''

''کیا دیدہ دلیری ہے! مجاز افسروں کی وساطت سے بھیجو۔ اب چلو۔ بھاگو یہاں سے...'' اور خود وہ وردی، جو اس کے اردلی نے اسے تھمائی تھی، پہننے لگا۔

رستوف واپس ہال میں چلا گیا۔ وہاں متعدد افسر اور جرنیل اکٹھے ہو چکے تھے۔ وہ بھی مکمل وردیوں میں ملبوس تھے اور اسے ان کے قریب سے گزرنا تھا۔

وہ اپنی بے باکی کو کوس رہا تھا اور اس تصور سے اس کا خون خشک ہوا جا رہا تھا کہ کسی بھی آن اس کا زار سے آمنا سامنا ہو جائے گا، اسے سب کے سامنے ذلیل ہونا پڑے گا اور امیر اطور کی موجودگی میں اس کی گرفتاری عمل میں لائی جائے گی۔ جو کچھ اس نے کیا تھا، خود اس کی اپنی نظروں میں وہ نامعقول اور ناشائستہ ٹھہرا تھا اور وہ کفِ افسوس مل رہا تھا کہ اس نے یہ حرکت کی ہی کیوں۔ اس ادھیڑ بن میں مصروف رستوف نے اپنی نظریں جھکا لیں اور وہ زرق برق وردیوں میں ملبوس خدام وحشم کے بیچوں بیچ کمرے سے باہر نکلنے کی تگ و دو کرنے لگا کہ ایک جانی پہچانی آواز نے اسے پکارا اور ایک ہاتھ نے اسے روک لیا۔

''محترم، آپ یہاں کیا کر رہے ہیں اور وہ بھی فراک کوٹ پہنے؟'' ایک بھاری آواز نے دریافت کیا۔

یہ آواز اسپ سوار فوج کے ایک جرنیل کی تھی۔ وہ ایک حالیہ جھڑپ کے دوران میں زار کا منظورِ نظر بن گیا تھا اور جس ڈویژن میں رستوف خدمات سرانجام دے رہا تھا، پہلے اس کی کمان اسی کے پاس تھی۔

رستوف پر دہشت طاری ہو گئی اور وہ اپنے رویے کا جواز پیش کرنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن جب اس نے جرنیل کے چہرے کی جانب دیکھا، اسے وہاں شفقت اور خوش طبعی نظر آئی۔ وہ اسے ایک طرف لے گیا اور اس نے پریشان و درماندہ لہجے میں اس کے سامنے سارا قصہ بیان کر دیا اور لجاجت سے درخواست کرنے لگا: ''آپ دینی سوف کو جانتے ہیں، خدا کے لیے کچھ کریں۔'' جرنیل نے رستوف کی پوری بات سنی اور گمبھیر انداز سے اپنے سر کو جنبش دی۔

''بہت برا ہوا۔ اس دلیر آدمی کے بارے میں یہ سب کچھ سن کر مجھے بے حد افسوس ہوا ہے،'' اس نے کہا۔

''مجھے اس کی درخواست دے دو۔''

رستوف دینی سوف کے معاملے کی بمشکل وضاحت کر اور اس کی درخواست تھما سکا تھا کہ زینے پر تیز تیز قدموں کی چاپ اور مہمیزوں کی کھنکھناہٹ سنائی دینے لگی۔ جرنیل نے اسے وہیں چھوڑا اور خود پورچ میں چلا گیا۔ زار کے خدام وحشم لپک جھپک سیڑھیوں سے اترے اور اپنے اپنے گھوڑوں کی طرف چل دیے۔ وہی سائیس، جس کا نام ہینے تھا اور جو اوسٹرلٹس میں موجود تھا، زار کا گھوڑا لے کر آگے بڑھا اور سیڑھیوں سے قدموں کی ہلکی ہلکی چرچراہٹ، جسے رستوف فی الفور پہچان گیا، سنائی دی۔ رستوف نے اس اندیشے کو توپسِ پشت ڈالا کہ وہ کہیں پہچانا نہ جائے اور بعض دیگر متجسس تماش بینوں کے ساتھ زینے کی طرف لپکا اور اس نے دو سال کے وقفے کے بعد اپنی آنکھیں ان خدوخال کی، جن کی وہ پرستش کرتا تھا، زیارت سے سینکیں۔ وہی چہرہ، وہی آنکھیں، وہی چال، وہی

شاہانہ وقار اور نرم خوئی کا امتزاج۔۔۔ اور رستوف کے دل میں زار کے لیے جو گرم جوشی اور محبت موجود تھی، اپنی پوری سابقہ قوت کے ساتھ دوبارہ موج زن ہونے لگی۔

پرزے بزیوسکی رجمنٹ کی وردی میں — نرم و گداز چرمی کپڑے کی برجس اور اونچے بوٹ — ملبوس اور سینے پر ستارے کی شکل کا تمغہ (رستوف اسے پہچاننے سے قاصر رہا، یہ لیجن آف آنر تھا) سجائے، والئی مملکت اپنا ہیٹ بغل میں دبائے اور دستانہ پہنتے پہنتے نیچے اترا۔ وہ رک گیا اور ایسی نظروں سے، جو چاروں اطراف روشنی بکھیر رہی تھیں، اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا۔ اس نے ایک دو جرنیلوں سے مختصر بات کی۔ اتنے میں اس کی نظر رستوف کے سابق کمانڈر پر پڑی، وہ اسے پہچان گیا اور اس نے ہاتھ کے اشارے سے اسے اپنی جانب بلایا۔

خدام و حشم پیچھے ہٹ گئے اور رستوف نے دیکھا کہ جرنیل کافی دیر تک والئی مملکت سے کچھ کہتا رہا۔

جواب میں زار نے اس سے مختصراً کوئی بات کہی اور اپنے گھوڑے کی طرف چل پڑا۔ ایک بار پھر خدام و حشم اور تماش بین، جن میں رستوف بھی شامل تھا، امپر اطور کی سمت بڑھنے لگے۔ امپر اطور اپنے گھوڑے کے قریب رک گیا، اس نے اپنا ہاتھ زین پر رکھا، اسپ سوار فوج کے جرنیل کی طرف رخ کیا اور خاصی بلند آواز میں، جو صاف ظاہر تھا کہ وہ سب کو سنانا چاہتا تھا، کہا:

"جنرل، میں یہ نہیں کر سکتا، بالکل نہیں کر سکتا کیونکہ قانون مجھ سے زیادہ طاقت ور ہے۔" اور اس نے اپنا پاؤں رکاب میں ڈال دیا۔

21

جس عوامی چوک کی طرف گھوڑے پر سوار زار جا رہا تھا، وہاں دائیں طرف پرزے بزیوسکی رجمنٹ کی ایک بٹالین صفیں بنائے کھڑی تھی اور ان کے سامنے بائیں جانب فرانسیسی گارڈز کی بٹالین تعینات تھی۔ فرانسیسیوں نے حسب معمول ریچھ کی کھال کی ٹوپیاں اوڑھ رکھی تھیں۔

گھوڑے پر سوار زار جب بٹالینیوں کے، جنھوں نے اسے سلامی دی، ایک پہلو کی جانب بڑھا، اسپ سواروں کا دوسرا گروہ سرپٹ گھوڑے دوڑاتا مخالف پہلو کی سمت آیا۔ رستوف نے اندازہ لگایا کہ ان سواروں کی قیادت نپولین کر رہا ہے، نپولین کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ چھوٹا ہیٹ اور نیلی وردی، جس کے بٹن کھلے تھے اور جس کے نیچے سفید صدری تھی، پہنے ہوئے تھے اور اس کے کندھے پر آرڈر آف سینٹ آندرے کی پٹی چسپاں تھی۔ وہ اپنا خاکستری گھوڑا، جو خالصتاً عربی النسل اور نہایت شاندار تھا، سرپٹ دوڑاتا آیا تھا۔ گھوڑے کا جھول قرمزی رنگ کا تھا اور اس پر سنہری تاروں سے بیل بوٹے بنائے گئے تھے۔ جب وہ الیکسانڈر کے قریب پہنچا، اس نے اپنا ہیٹ اوپر اٹھایا۔ اس کے اس فعل کے دوران میں رستوف، جو اسے گھڑ سوار فوج کے افسر کی آنکھ سے دیکھ رہا تھا، یہ مشاہدہ کیے بنا نہ رہ سکا کہ نپولین کا گھوڑے پر بیٹھنے کا انداز نہ تو دل آویز تھا اور نہ اس سے کسی قسم کی خود اعتمادی

کا اظہار ہوتا تھا۔ دونوں بٹالینوں نے ''ہرا'' اور "Vive l' Empereur"* کے نعرے بلند کیے۔ نپولین نے الیکساندر سے کچھ کہا۔ امپراطور گھوڑوں سے نیچے اترے اور انھوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے۔ نپولین کے چہرے پر ناگوار قسم کی مصنوعی مسکراہٹ تھی۔ الیکساندر نے دلفریب انداز سے اس سے کچھ کہا۔

اس امر کے باوجود کہ فرانسیسیوں کے گھوڑے دولتیاں جھاڑ رہے تھے جس سے ہجوم کو آگے بڑھنے کا موقع نہیں مل رہا تھا، رستوف دونوں امپراطوروں کی ایک ایک حرکت کا بغور مشاہدہ کرتا رہا اور اس نے ایک لحظے کے لیے بھی اپنی نظریں ان سے نہ اٹھائیں۔ اسے یہ دیکھ کر اچنبھا ہوا کہ بونا پارت کے ساتھ الیکساندر کا سلوک کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ اس کا ہم پلّہ ہو اور جہاں تک اول الذکر کا تعلق تھا، زار کی موجودگی میں اس پر کوئی گھبراہٹ طاری نہیں ہوئی تھی بلکہ وہ یوں ہمہ تن پرسکون تھا جیسے شہنشاہوں کے ساتھ اس کا یہ قرب اس کے لیے بالکل فطری اور روزمرہ کا واقعہ ہو۔

الیکساندر اور نپولین اپنے خدام وحشم کے لشکرِ جرار کی معیت میں پرزے بزیوسکی بٹالین کے میمنے کے قریب پہنچے۔ یوں وہ سیدھے اس ہجوم کی، جو وہاں کھڑا تھا، طرف آ گئے تھے۔ وہ غیر متوقع طور پر ہجوم کے اتنا نزدیک پہنچ گئے کہ رستوف کو، جو پہلی قطار میں کھڑا تھا، یہ فکر دامن گیر ہو گئی کہ کہیں وہ پہچان ہی نہ لیا جائے۔

''عالی جاہ، میری درخواست ہے کہ مجھے یہ اجازت مرحمت فرمائی جائے کہ میں آپ کے دلیر ترین سپاہی کو لیجن آف آنر پیش کر سکوں،'' ایک شخص نے کرخت لیکن بالکل صحیح مخرج سے فرانسیسی میں کہا۔ وہ ایک ایک حرف اور لفظ بالکل درست اور واضح انداز سے ادا کر رہا تھا۔

یہ الفاظ جس شخص نے کہے تھے، وہ کوتاہ قامت نپولین تھا۔ وہ بالکل سیدھا الیکساندر کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ جو کچھ الیکساندر سے کہا گیا، وہ اس نے نہایت توجہ سے سنا۔ اس نے اپنی گردن کو خم دیا اور خوشگوار انداز سے مسکرا دیا۔

''گزشتہ جنگ میں جس شخص نے سب سے بڑھ کر شجاعت اور دلیری کا مظاہرہ کیا تھا، یہ تمغہ اسی کے لیے ہے،'' نپولین نے مزید کہا۔ وہ ایک ایک لفظ پر اتنے سکون اور خود اعتمادی سے زور دے رہا تھا کہ رستوف کو تاؤ آ گیا۔ اپنی اس تقریر کے دوران میں نپولین ان روسی صفوں کا، جو اس کے سامنے مؤدب کھڑی تھیں، مشاہدہ کرتا جا رہا تھا۔ سب روسی سپاہی ہتھیار اٹھائے سلامی تو اسے دے رہے تھے لیکن ان کی نگاہیں اپنے امپراطور پر مرکوز تھیں۔

''یور میجسٹی، اجازت ہو تو میں اپنے کرنل سے مشورہ کر لوں؟'' الیکساندر نے کہا اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا بٹالین کے کمانڈر پرنس کزلووسکی کی طرف بڑھا۔

دریں اثنا بونا پارت نے اپنے ننھے منے سفید ہاتھ سے دستانہ اتارا، اس کے چیتھڑے کیے اور انھیں پرے پھینک دیا۔ اس کے عقب میں جو ایڈی کانگ کھڑا تھا، وہ تیزی سے آگے لپکا اور اس نے انھیں اٹھا لیا۔

* امپراطور زندہ باد

''یہ کسے دلایا جائے؟'' امپر اطور الیکساندر نے روسی میں کزلووسکی سے مدھم آواز میں پوچھا۔
''یور میجسٹی جسے حکم فرمائیں۔''
زار کی خفگی سے بھویں تن گئیں اور اس نے پیچھے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا: ''ہمیں اسے کچھ نہ کچھ جواب تو دینا ہی ہوگا۔''

کزلووسکی نے پختہ ارادے کے انداز سے اپنے سپاہیوں کا جائزہ لیا۔ اس کی نگاہوں نے جن لوگوں کا احاطہ کیا، ان میں رستوف بھی شامل تھا۔

''کوئی امکان ہے کہ یہ مجھے ہی مل جائے؟'' رستوف نے سوچا۔

''لازاریف!'' ترش رو کرنل کی آواز گونجی۔

لازاریف، جو پہلی صف کا پہلا آدمی تھا، پھرتی سے آگے بڑھا۔

''کہاں جا رہے ہو؟ وہیں کھڑے رہو،'' متعدد آوازوں نے دھیمے لہجوں سے لازاریف کو، جس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کہاں جانا ہے، خبردار کیا۔

لازاریف کے قدم جہاں تھے، وہیں رک گئے اور وہ ترچھی لیکن خوف زدہ نظروں سے اپنے کرنل کو دیکھنے لگا۔ جیسا کہ عام طور پر ان سپاہیوں کے، جنھیں صفوں سے باہر بلا لیا جائے ساتھ ہوتا ہے، اس کے چہرے پر بھی تشنج کے آثار نمایاں ہو گئے۔

نپولین نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی اور اپنا ننھا منا ہاتھ پیچھے بڑھا دیا جیسے وہ کوئی چیز وصول کرنا چاہتا ہو۔ اس کے خدام وحشم فی الفور تاڑ گئے کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ انھوں نے تھوڑی بہت ادھر ادھر بھاگ دوڑ کی، آپس میں کانا پھوسی کی اور کوئی چیز ہاتھوں ہاتھ ایک سے دوسرے شخص تک پہنچانے لگے۔ ایک اور ملازم خاص (page)— وہی جسے گزشتہ شب رستوف نے بورس کے ہاں دیکھا تھا— نے آگے، جست لگائی، وہ نہایت ادب سے آگے بڑھتے ہوئے ہاتھ پر جھکا اور اس نے اسے ایک لمحہ بھی انتظار میں رکھے بغیر اس پر ایک سرخ تمغہ، جو سرخ پٹی پر پیوست تھا، رکھ دیا۔ نپولین نے اتنا بھی نہ کیا کہ ایک نگاہ اسے دیکھ ہی لیتا، اس نے بس دو انگلیاں دبائیں اور تمغہ ان کے بیچ میں آ گیا۔ وہ لازاریف کے، جو مسلسل ایسی آنکھوں سے، جو معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ابھی اچھل کر اس کے بھیجے سے باہر گر پڑیں گی، اپنے امپر اطور کو ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا، قریب پہنچا۔ نپولین نے گردن گھما کر یوں پچھلی جانب الیکساندر پر نظر ڈالی جیسے وہ اسے جتا رہا ہو کہ جو کچھ وہ اب کر رہا تھا، محض اپنے اتحادی کی خاطر کر رہا ہے۔ جو ننھا منا سفید ہاتھ تمغہ تھامے ہوئے تھا، لازاریف کے بٹن کو چھونے لگا۔ نپولین کا اندازہ کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ جانتا ہو کہ اس کے بکمال مہربانی سپاہی کے سینے کو چھونے کی دیر ہے، اس جوان کو احساس ہو جائے گا کہ اسے انعام مل گیا ہے، اب وہ باقی تمام دنیا سے ممتاز ہو گیا ہے اور یوں تا حیات خوش وخرم رہ سکے گا۔ نپولین نے محض اتنا کیا کہ صلیبی نشان صرف لازاریف کے سینے پر رکھ دیا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ نیچے گرا دیا اور یوں الیکساندر

کی جانب مڑا جیسے اسے اس بات کا یقین ہو کہ اس نے صلیبی نشان جہاں رکھا تھا، وہ وہیں رہے گا۔ صلیبی نشان واقعی وہیں پیوست رہا کیونکہ خدمت کے لیے ہمہ وقت تیار دونوں روسی اور فرانسیسی ہاتھ پلک جھپکنے میں آگے بڑھے، انھوں نے نشان پکڑا اور وردی پر ٹانک دیا۔ لازاریف بڑی پریشانی کے عالم میں سفید ہاتھوں والے کوتاہ قامت شخص کو، جو اس کے ساتھ کچھ کر رہا تھا، دیکھتا رہا۔ تاہم وہ سیدھا اکڑ کر کھڑا رہا اور ہتھیار اٹھا کر سلامی دیتے ہوئے اس نے دوبارہ الیکساندر کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا جیسے وہ اس سے پوچھ رہا ہو: ''میں یہیں کھڑا رہوں، ادھر ادھر ہٹ جاؤں یا کچھ اور کروں؟'' تاہم جب اسے کوئی اِذن نہ ملا، وہ مزید کچھ دیر اپنی جگہ بت کی طرح ساکت ایستادہ رہا۔

امپراطور دوبارہ اپنے گھوڑوں پر سوار ہوئے اور وہاں سے چل دیے۔ پرزے بزیوسکی بٹالین کے جوان منتشر ہو گئے اور فرنچ گارڈز کے ساتھ ان میزوں کے، جو ان کے لیے ترتیب دی گئی تھیں، سامنے بیٹھ گئے۔

لازاریف مہمان خصوصی کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فرانسیسی اور روسی افسروں نے اس کے ساتھ معانقہ کیا، اسے مبارک باد دی اور اس سے ہاتھ ملائے۔ افسر اور غیر فوجی شہری گروہ در گروہ محض اس کا دیدار کرنے اس کے پاس آنے لگے۔ فرانسیسی اور روسی آوازوں کے شور وغل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ دو افسر، جن کے چہرے تمتما رہے تھے اور جو بے حد مسرور اور خوش باش نظر آ رہے تھے، رستوف کے قریب سے گزرے۔

''بچو، اس ضیافت کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ اتنے سارے چاندی کے ظروف!'' ایک نے کہا۔ ''لازاریف کو دیکھا؟''

''ہاں، میں نے دیکھا ہے۔''

''سنا ہے کہ کل پرزے بزیوسکی رجمنٹ اس کے اعزاز میں ڈنر کا اہتمام کرے گی؟''

''یہ لازاریف بھی کیا قسمت کا دھنی ہے! تاحیات بارہ سو فرانک پنشن!''

''دوستو، اس ٹوپی کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' پرزے بزیوسکی کے ایک جوان نے ایک پشم دار ٹوپی سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

''بہت اعلیٰ— تمھیں بالکل پوری آئی ہے!''

''آپ لوگوں نے پاس ورڈ (لفظ شناخت) سنا ہے؟'' دوسرے نے پوچھا۔ ''پرسوں یہ 'Napoleon, France, bravoure'* تھا، اور آج 'Aleksandr, Russie, grandeur'** ہے۔ ایک روز اس کا فیصلہ ہمارے امپراطور کرتے ہیں اور اگلے روز نپولین۔ کل ہمارے امپراطور تمغہ سینٹ جارج فرانسیسی گارڈز کے بہادر ترین جوان کو پیش کریں گے۔ اس کے علاوہ ان کے پاس اور کوئی چارہ ہے بھی نہیں۔ خیر سگالی کا جواب دینا ہی ہوگا۔''

* نپولین، فرانس، شجاعت

** الیکساندر، روس، شان و شکوہ۔

بورس اور اس کا دوست ژی لنسکی بھی ضیافت کا جائزہ لینے آئے تھے۔ واپسی پر بورس نے دیکھا رستوف مکان کے کونے میں کھڑا ہے۔

''رستوف کیسے ہو؟ ہمیں ایک دوسرے کی کمی بہت محسوس ہوتی ہے،'' اس نے کہا۔ وہ یہ پوچھے بنا نہ رہ سکا کہ اسے کیا ہوا ہے کیونکہ رستوف کے چہرے پر عجیب وغریب قسم کی پژمردگی اور پریشانی جھلک رہی تھی۔

''کچھ نہیں، کچھ نہیں،'' رستوف نے جواب دیا۔

''واپسی پر رکو گے؟''

''ہاں، ذرا بعد میں۔''

رستوف کافی دیر تک کونے میں کھڑا دور سے رونق میلہ دیکھتا رہا۔ اس کے دماغ میں اذیت ناک انتشار برپا تھا۔ وہ اسے سلجھانے اور کوئی نتیجہ اخذ کرنے سے قاصر تھا۔ اس کی روح میں ہولناک شکوک وشبہات سر اٹھا رہے تھے۔ اسے دینی سوف، اس کا توکل اور اس کی قلبِ ماہیت یاد آئی۔ اس کے ذہن میں ہسپتال، بریدہ بازوؤں اور ٹانگوں، وہاں کی غلاظت اور امراض کی تصاویر دوڑنے لگیں۔ اسے سڑے بسے گوشت کی سڑاند اتنے واضح انداز سے یاد آئی کہ اس نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر یہ یقین کرنے کی کوشش کی کہ یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے۔ پھر اس نے بوناپارت کے، جو اپنے آپ سے کاملاً مطمئن تھا، جس کا ننھا منا سفید ہاتھ تھا، جو اب امپراطور تھا، جسے الیکسانڈر پسند کرتا اور جس کا وہ احترام کرتا تھا، متعلق سوچا۔ پھر وہ سب بازو اور ٹانگیں کیوں کٹی تھیں؟ ان لوگوں نے اپنے آپ کو ہلاکت میں کیوں ڈالا تھا؟ پھر اسے یہ خیال آیا کہ لازاریف کو انعام سے نوازا گیا ہے جبکہ دینی سوف کو سزا مل رہی ہے اور اس کی تقصیر معاف نہیں ہوئی۔ اس نے اپنے آپ کو ان عجیب وغریب سوچوں میں یوں مستغرق پایا کہ اس کا روم روم کانپ اٹھا۔

بھوک اور پریزے بزیوسکی رجمنٹ کے ڈنر کی اشتہا آور خوشبو نے اسے ان خیالات سے چونکا دیا۔ اسے روانگی سے پیشتر کچھ نہ کچھ زہر مار کرنا تھا۔ وہ ایک ہوٹل میں، جس پر اس کی صبح نظر پڑی تھی، چلا گیا۔ وہاں خلقِ خدا کا، جن میں بعض افسر بھی، جو اسی کی طرح شہری لباس پہن کر آئے تھے، شامل تھے، وہ ہجوم تھا کہ اسے ڈنر کے حصول میں خاصی دقت اٹھانا پڑی۔ اس کی اپنی ڈویژن کے دو افسر اس کے پاس آ بیٹھے۔ فریڈلانٹ کے بعد جو امن کا سمجھوتہ طے پایا تھا، فطرتاً گفتگو اسی کے متعلق ہونے لگی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہم کچھ دیر اور نپولین کے خلاف ڈٹے رہتے اس کا خاتمہ یقینی تھا کیونکہ اس کی افواج کے پاس نہ سامانِ رسد تھا اور نہ گولہ بارود۔ نکولائی مہر بلب کھاتا پیتا (زیادہ تر موخر الذکر) رہا۔ وہ اکیلا ہی انگوری شراب کی دو بوتلیں چڑھا گیا۔ اس کے ذہن میں جس کشمکش نے گھر کر لیا تھا، اس کا اسے ابھی تک کوئی حل نہیں سوجھا تھا۔ چنانچہ وہ بدستور اسے اذیت پہنچاتی رہی۔ اسے اپنے خیالات کا اظہار کرتے خوف آ رہا تھا لیکن ان سے پیچھا چھڑانا بھی اس کے لیے ناممکن تھا۔ جب ایک افسر نے یہ کہا کہ فرانسیسیوں کو دیکھ کر بڑی ذلت کا احساس ہوتا ہے، رستوف کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا، وہ اچانک

اتنے بے جواز زور شور سے چلانے لگا کہ اس کے ساتھی افسر بھی بھونچکا رہ گئے۔

''آپ یہ کیسے محاکمہ کر سکتے ہیں کہ بہترین طریق کار کیا ہوتا؟'' وہ گلا پھاڑ کر چلایا۔ اس کا سارا خون نچڑ کر اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا۔ ''آپ زار کے افعال کے بارے میں کیسے فیصلہ صادر کر سکتے ہیں؟ ہمیں یہ حق کس نے دیا ہے کہ ہم ان کے بارے میں رائے زنی کریں؟ ہم زار کے مقاصد یا افعال نہیں سمجھ سکتے!''

''لیکن میں نے تو زار کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا!'' ایک افسر نے اپنا جواز پیش کرتے ہوئے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر رستوف اس قدر آگ بگولا کیوں ہو رہا ہے۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی توجیہہ آئی اور وہ یہ کہ وہ نشے سے مغلوب ہو گیا ہے۔

لیکن رستوف نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

''ہم سفارت کار نہیں ہیں، صرف سپاہی ہیں اور کچھ نہیں،'' وہ بولتا چلا گیا۔ ''اگر ہمیں موت کو گلے لگانے کا حکم دیا جائے، ہم موت کو گلے لگا لیں گے۔ اگر ہمیں سزا کے عمل میں سے گزارا جاتا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم سے غلطی سرزد ہوئی ہے۔ محاکمہ کرنا ہمارا کام نہیں ہے۔ اگر ہز میجسٹی امپراطور بونا پارٹ کو امپراطور تسلیم کرنا اور ان کے ساتھ اتحاد کرنا مناسب سمجھتے ہیں، وہ ضرور راستی پر ہوں گے۔ ایک مرتبہ ہم نے فیصلہ سنانے اور ہر چیز کے متعلق بحث کرنے کا عمل شروع کر دیا، پھر کچھ بھی مقدس نہیں رہے گا۔ اس طریقے سے ہم کل کلاں یہ بھی کہنا شروع کر دیں گے کہ خدا وا کچھ نہیں۔ کچھ نہیں!'' نکولائی نے زور سے میز پر مکا مارتے ہوئے گلا پھاڑ کر کہا۔ اس کے ساتھیوں کو تو یہی محسوس ہوا کہ وہ غیر متعلق باتیں کر رہا ہے لیکن اس کے اپنے ذہن میں خیالات کی جو رو چل رہی تھی، یہ سب کچھ اس کے عین مطابق تھا۔

''ہمارا کام یہ ہے کہ ہم اپنا فرض ادا کریں، تلوار چلائیں اور کچھ نہ سوچیں! بس یہی ہے حاصلِ کلام!'' اس نے اپنی بات کا اختتام کرتے ہوئے کہا۔

''اور خوب ڈٹ کر پئیں!'' ایک افسر نے جو جھگڑا مول نہیں لینا چاہتا تھا، کہا۔

''بالکل، اور خوب ڈٹ کر پئیں!'' نکولائی نے فی الفور اس کی بات پر صاد کیا۔ ''ارے، ادھر آؤ! ایک بوتل اور لاؤ!'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

حصہ سوم

1

1808 کے دوران میں امپراطور الیکساندر امپراطور نپولین سے ایک اور ملاقات کرنے کی غرض سے ارفورٹ[1] گیا اور فتح ونصرت کے اس موقع کی عظمت وجلالت کے بارے میں پیٹرزبرگ کے اعلیٰ ترین حلقوں میں خوب باتیں ہوئیں۔

1809 کے دوران میں روئے زمین کے دو ثالثوں کے مابین، جیسا کہ نپولین اور الیکساندر کے بارے میں عام مشہور تھا، مودّت اور اخوت کا یہ عالم تھا کہ جب نپولین نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کیا، ایک روسی کور ہمارے سابق غنیم نپولین کی حمایت اور ہمارے سابق اتحادی امپراطور آسٹریا کے خلاف رزم آرا ہونے سرحد پار چلی گئی اور شاہی حلقوں میں نپولین اور الیکساندر کی ایک ہمشیرہ کے مابین مناکحت کی باتیں ہونے لگیں۔ تاہم اس زمانے میں روسی معاشرے کی توجہ خارجہ پالیسی کے تقاضوں کے علاوہ ان داخلی تبدیلیوں کی، جو حکومت کے تمام محکموں میں لائی جا رہی تھیں، منعطف ہو چکی تھی اور ان تبدیلیوں میں خاص دلچسپی لی جا رہی تھی۔

دریں اثنا زندگی — روزمرہ کی حقیقی اور جیتی جاگتی زندگی، جس میں تندرستی، علالت، محنت مشقت اور آرام کے متعلق بچی تشویش، خیالات وافکار، سائنس، شعروشاعری اور موسیقی کے شعبوں میں دانش ورانہ سرگرمیاں، محبت، دوستی، نفرت، تندوتیز جذبات، سبھی کچھ شامل ہیں — اپنے معمول کے ڈگر پر رواں دواں رہی۔ اس زندگی کا امکانی اصلاحات سے کوئی تعلق واسطہ نہیں تھا، یہ ان سے بالکل الگ تھلگ تھی۔

❖

پرنس آندرے دو سال سے گاؤں میں مقیم تھا اور اس دوران میں وہ ایک مرتبہ بھی دیہاتی علاقے سے کہیں باہر نہیں گیا تھا۔ وہ تمام منصوبے، جنھیں پیئر نے اپنی جاگیروں میں آزمانے کی سعی کی تھی اور منہ کی کھائی تھی — وہ ناکام اس لیے رہا کیونکہ وہ کسی بھی منصوبے پر جم کر کام نہیں کرتا تھا۔ وہ ایک منصوبہ شروع کرتا لیکن کچھ عرصے کے بعد اسے چھوڑ دیتا اور دوسرا شروع کر دیتا — لیکن انھیں منصوبوں کو پرنس آندرے نے کسی قسم کے دھوم دھڑکے اور مری کوشش کے بغیر پایہ تکمیل تک پہنچا دیا اور انھیں ثمرآور بنا دیا۔ پیئر میں عملاً مستقل مزاجی نام کو بھی نہیں تھی لیکن پرنس آندرے

اس سے بدرجۂ اُتم بہرہ ور تھا۔ وہ نہ تو چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں بے جا پریشانی کا اظہار کرتا تھا اور نہ ضرورت سے بڑھ کر سعی کرتا تھا۔ وہ جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا، اسے تحرک دیتا اور اسے صحیح راستے پر ڈال دیتا۔

اس کی ایک جاگیر پر تین سو زرعی غلاموں کا درجہ تبدیل کر کے انھیں خود مختار زرعی کارکن بنا دیا گیا (روس میں یہ اقدام اپنی نوعیت کی اولین مثالوں میں شامل تھا)۔ باقی جاگیروں پر جبری مشقت کی جگہ چھکارا لگان[2] کا نظام رائج کیا گیا۔ باگوچارافو میں اس نے کسان عورتوں کو وضعِ حمل کے دوران میں مدد دینے کے لیے اپنے خرچ پر تربیت یافتہ دائی کا انتظام کیا۔ کسانوں کے بچوں کو تعلیم دینے اور گھریلو ملازمین کو پڑھنا لکھنا سکھانے کے لیے باتنخواہ پادری ملازم رکھا گیا۔

پرنس آندرے اپنا نصف وقت اپنے باپ اور بیٹے کے ساتھ، جو ابھی تک نرسوں کی نگہداشت میں تھا۔ بالڈ ہلز میں اور بقیہ نصف ''گوشۂ باگوچارافو'' میں، کہ اس کا باپ اپنی اس جاگیر کو اسی نام سے پکارتا تھا، صرف کرتا تھا۔ دنیوی امور کے بارے میں اس نے پیئر کے سامنے جس بے نیازی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے باوجود وہ واقعات و حادثات سے، جو ظہور پذیر ہوتے رہتے تھے، نہایت تندہی سے اپنے آپ کو باخبر رکھتا، بے شمار کُتب کا مطالعہ کرتا اور یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوتا کہ پیٹرز برگ سے، جو فی نفسہٖ وہ محور تھا کہ خود زندگی اس کے گرد گردش کرتی تھی، اسے یا اس کے باپ سے ملنے جو مہمان آتے، ان کا ان واقعات کے بارے میں علم، جو اندرون یا بیرون ملک وقوع پذیر ہو رہے تھے، اس کے اپنے علم سے کہیں کم تر ہوتا حالانکہ وہ دیہاتی علاقے سے کبھی باہر نہیں گیا تھا۔

پرنس آندرے اپنی جاگیر کے معاملات پر توجہ تو دیتا ہی تھا، طرح طرح کی کتابیں بھی اس کے زیر مطالعہ رہتی تھیں لیکن ان کے علاوہ وہ اس زمانے میں ہماری دو گزشتہ ناکام مہموں کا تنقیدی جائزہ لینے اور ہماری فوج کے قوانین وضوابط کے متعلق منصوبہ مرتب کرنے میں بھی مصروف رہا۔

1809 کے موسم بہار میں پرنس آندرے ریازان[3] میں واقع جاگیروں کا معائنہ کرنے چلا گیا۔ یہ جاگیریں اس کے نوعمر بیٹے کو وراثت میں ملی تھیں اور وہ ان کا متولی تھا۔

موسم بہار کی دھوپ نے اس کے جسم کو گرما دیا تھا۔ وہ اپنی کلاش میں بیٹھا نو دمیدہ گھاس، برچ کے درختوں کے نوخیز پتوں اور سفید بہاریہ بادلوں کے اولین ٹکڑوں کو، جو صاف نیلگوں آکاش پر تیرتے پھر رہے تھے، دیکھتا جا رہا تھا۔ وہ کسی چیز کے بارے میں بھی سوچ نہیں رہا تھا بلکہ بےفکر اور خوش باش انداز سے اپنے گرد و پیش کی اشیا پر نظریں دوڑا رہا تھا۔

جس مقام پر اس نے گزشتہ سال پیئر کے ساتھ مکالمہ کیا تھا، وہیں سے انھوں نے کشتی کے ذریعے دریا عبور کیا۔ وہ کیچڑ میں لت پت دیہات میں سے گزرے، اس کے راستے میں زمستانی رائی کے کھیت بھی آئے اور گھاس کے چٹیل میدان بھی۔ پل کے نزدیک دامنِ کوہ میں ابھی تک ہلکی پھلکی برف کا، جو ریلے کی صورت میں آئی تھی، ڈھیر پڑا تھا۔ پہاڑی کے اوپر جس کچی سڑک کے ساتھ ساتھ بارش نے آبی گزرگاہیں بنا دی تھیں، انھوں نے اسے بھی طے کیا۔

سڑک کے دونوں اطراف کھیتوں میں فصلیں کٹ چکی تھیں، وہاں اب صرف ٹھنٹھ کھڑے تھے۔ جھاڑیوں کا ذخیرہ آیا جس میں کہیں کہیں سبزہ اپنی بہار دکھا رہا تھا۔ اس کے بعد برچ کے درختوں کا جنگل تھا اور یہ سڑک کے دونوں کناروں کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا تھا۔ جنگل میں تقریباً حبس تھا۔ ہوا بند تھی اور ایک پتا بھی ہلتا دکھائی نہیں دیتا تھا۔ برچ کے درختوں پر لیس دار پتوں کی بہار تھی لیکن یہ پتے بالکل ساکن تھے۔ بنفشی رنگ کے پھول اور سبز گھاس کی اولیں پتیاں سال گزشتہ کے پتوں میں سے اپنے سر باہر نکال رہی تھیں۔ برچوں کے مابین یہاں کہیں فر کے پست قد اور کھردرے سدابہار درخت کھڑے تھے اور یوں وہ ناگوار انداز سے جاڑے کے دنوں کی یادیں تازہ کر رہے تھے۔ جونہی گھوڑے جنگل میں داخل ہونے لگے، ان کے نتھنے پھڑ پھڑانے اور ان کے اجسام پر پسینے کے قطرے چمکنے لگے۔

فٹ مین پیوتر نے کوچوان سے کچھ کہا۔ کوچوان نے اس سے اتفاق کیا۔ بظاہر پیوتر اس سے مطمئن نہ ہوا۔ باکس[4] پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنی گردن اپنے آقا کی جانب گھمائی۔

''یورایکسی لینسی، موسم کتنا معتدل ہے!'' اس نے مؤدبانہ مسکراہٹ سے کہا۔

''کیا؟''

''معتدل، یورایکسی لینسی۔''

''پتا نہیں کیا کہہ رہا ہے؟'' پرنس آندرے نے متعجب ہو کر سوچا۔ ''اوہ، میرا خیال ہے کہ وہ موسم بہار کی بات کر رہا ہے،'' اس نے دونوں اطراف نظریں دوڑاتے ہوئے دل میں کہا۔ ''اور واقعی ہر چیز پہلے ہی سرسبز ہو چکی ہے.... بالکل پیش از وقت! برچ، خودرو چیری، آلڈر،[5] سبھی نے پر پرزے نکالنا شروع کر دیے ہیں... لیکن اوک کا ابھی تک کوئی نشان نظر نہیں آ رہا۔ ارے نہیں، ایک ہے۔ ادھر ایک اوک ہے۔''

سڑک کے کنارے ایک اوک کھڑا تھا۔ برچ کے درختوں سے، جن پر جنگل مشتمل تھا، اس کی عمر غالباً دس گنا تھی اور کسی بھی برچ سے یہ دگنا اونچا اور دس گنا موٹا تھا۔ یہ دیو قامت درخت تھا۔ اس کے تنے کا گھیر آدمی کے دونوں بازوؤں کی لمبائی سے دوچند تھا۔ بظاہر اس کے بعض ٹہن مدتوں پہلے ٹوٹ کر گر چکے تھے اور یوں ان مقامات پر چھال جھڑنے سے جو گھاؤ ابھرے تھے، وہ اب مندمل ہو چکے تھے۔ اپنے بھاری بھرکم، عظیم الجثہ اور بے ہنگم اعضا، جو مڑے تڑے اور گھسے پٹے بازوؤں اور انگلیوں کے مشابہ تھے، غیر متناسب انداز سے چاروں اطراف پھیلائے، یہ کسی ازمنہ قدیم عفریت کی مانند قہر آلود چہرے پر زہر خند سجائے ہنستے مسکراتے برچ کے درختوں کے بیچوں بیچ کھڑا تھا۔ یہ اوک واحد درخت تھا جس نے موسم کے طلسم سے مرعوب ہونے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے بہار اور دھوپ دونوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیا تھا۔

''بہار، محبت، مسرت!'' یہ اوک کہتا دکھائی دے رہا تھا۔ ''کیا ہیں یہ؟ بے معنی اور احمقانہ دھوکوں کی ٹٹیاں۔ تمھارا ان سے جی نہیں بھرا؟ ان دھوکوں کا بار بار اعادہ کیا جاتا ہے لیکن ان میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی، یہ ہمیشہ وہی رہتے ہیں جو تھے، وہی دھوکوں کی ٹٹیاں! نہ کوئی بہار ہے، نہ دھوپ ہے، نہ مسرت۔ ان فر کے درختوں کو دیکھو،

بے روح، بے جان، جیسے کسی نے ان کا ٹینٹوا دبا رکھا ہو، ہمیشہ ایک سے نظر آتے ہیں۔ اور ایک مجھے دیکھو، شکستہ اور کھال ادھڑے شاخچوں سے، جو من مانے انداز سے دائیں بائیں، آگے پیچھے ہر جگہ میرے جسم پر اگتے رہتے ہیں، اٹا پڑا ہوں جیسے وہ اگے ہوئے ہیں، ویسے میں کھڑا ہوں اور مجھے تمھاری امیدوں اور سرابوں میں کوئی اعتقاد نہیں ہے۔"

جنگل میں سے گزرتے گزرتے پرنس آندرے نے متعدد مرتبہ مڑ کر اس اوک کو دیکھا جیسے وہ اس سے کسی چیز کی توقع کر رہا ہو۔ اوک کے نیچے بھی گھاس اور پھول اگے ہوئے تھے لیکن یہ ان کے درمیان ہمیشہ کی طرح ویسے کا ویسے کھڑا تھا: غیر متحرک، درشت رو، بدقطع اور گمبھیر۔

"ہاں، یہ اوک ٹھیک کہتا ہے، ہزار بار ٹھیک کہتا ہے،" پرنس آندرے نے سوچا۔ "نوجوان بھلے اس سراب کے دوبارہ جال میں پھنس جائیں لیکن ہم جانتے ہیں کہ زندگی کیا ہے۔ ہماری زندگی میں اب کچھ نہیں رہ گیا!"

اوک کے اس درخت کے تعلق سے پرنس آندرے کی روح نئے خیالات کے پورے سلسلے کی۔ جو اصلاً قنوطیت کی پیداوار تھے لیکن حسرت ناک انداز سے تسلی بخش تھے۔ آماجگاہ بن گئی۔ اس کی زندگی جیسی کیسی تھی، اس سفر کے دوران میں اس کا اس نے از سر نو جائزہ لیا اور اسی پرانے نتیجے پر پہنچا، جو یاس کن ہونے کے باوجود سکون بخش تھا، کہ اس کا کام یہ نہیں کہ وہ کسی چیز کو نئے سرے سے شروع کرے بلکہ وہ جیسے تیسے اپنی زندگی گزار دے، کسی کو گزند نہ پہنچائے، کسی شے سے خوف نہ کھائے اور کسی چیز کی آرزو نہ کرے۔

2

ریازان جاگیر کے متولی کی حیثیت سے پرنس آندرے پر جو ذمے داریاں عاید ہوتی تھیں، ان کے سلسلے میں وہ شرفا کے مقامی ضلعی مارشل سے ملنے پر مجبور ہو گیا۔ کاؤنٹ ایلیا آندریچ رستوف مارشل تھا اور مئی کے وسط میں پرنس آندرے اس سے ملنے چل پڑا۔

گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ درخت پہلے ہی پتوں سے ڈھک چکے تھے۔ گرد اور گرمی اتنی زیادہ تھی کہ سفر کے دوران میں اگر کہیں پانی نظر آ جاتا، آدمی کا نہانے کو جی مچلنے لگتا۔

پرنس آندرے اپنی گاڑی میں دو رویہ درختوں کے بیچ اس شاہراہ پر، جو اترادنایا میں رستوف کے گھر کی طرف جاتی تھی، سفر کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پژمردگی چھائی ہوئی تھی اور وہ جس کام کے سلسلے میں مارشل سے مشورہ کرنے جا رہا تھا، اس کے متعلق سوچوں میں مستغرق تھا۔ دائیں جانب چند درختوں کے عقب سے اسے چنچل اور زندہ دل دوشیزاؤں کی آوازیں سنائی دیں اور یکایک اسے، اس راستے پر، جس پر اس کی گاڑی جا رہی تھی، چند نوخیز لڑکیوں کا گروہ کدکڑے لگاتا اور اسے عبور کرتا نظر آیا۔ جو لڑکی سب سے آگے اور سیدھی اسی کی طرف بھاگی آ رہی تھی، وہ نازک بدن، حقیقتاً نمایاں انداز سے نازک بدن، اور سیاہ چشم تھی۔ اس کے بال کالی گھٹا تھے۔ اس کا ڈریس زرد پرنٹ کا تھا اور اس کے سر کے اردگرد سفید جیبی رومال کچھ اس طرح لپٹا ہوا تھا کہ اس کی ڈھیلی ڈھالی

زلفیں باہر نکلی پڑتی تھیں۔ وہ چلا چلا کر کچھ کہہ رہی تھی لیکن جب اسے احساس ہوا کہ وہ کوئی اجنبی ہے، وہ اس پر نظر ڈالے بغیر ہنستی مسکراتی واپس بھاگ گئی۔

پتا نہیں کیا وجہ ہوئی لیکن پرنس آندرے کو دل میں زبردست ٹیس محسوس ہوئی۔ دن اتنا سہانا، سورج اتنا روشن اور اس کے گردوپیش ہر چیز پر اتنا نکھار تھا، پھر بھی وہ نازک بدن حسینہ نہ اس کے وجود سے باخبر تھی اور نہ اس کے وجود کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش مند تھی اور اپنی ذاتی — اور لاریب عقل وخرد سے عاری — بے فکر اور مسرور زندگی سے مطمئن اور اسی میں خوش وخرم تھی۔ ''آخر یہ اتنی شاداں وفرحاں کیوں ہے؟ یہ کیا سوچ رہی ہے؟ یہ جو کچھ بھی سوچ رہی ہے، اس کا تعلق نہ عسکری قواعد وضوابط سے ہو سکتا ہے اور نہ ریازان کے زرعی غلاموں کے لیے چھکارا لگان کے انتظامات سے۔ یہ کیا سوچ رہی ہے؟ آخر یہ اتنی خرسند کیوں ہے؟'' پرنس آندرے نے اپنے آپ سے پوچھا۔

1809 میں کاؤنٹ ایلیا آندریچ سابقہ برسوں کے دستور کے مطابق اترادنایا میں مقیم تھا اور حسبِ عادت تقریباً پورے کے پورے صوبے کی شکار، ڈراموں، عشائیوں اور محافلِ موسیقی سے خاطر تواضع کر رہا تھا۔ جس طرح ہر مہمان کو دیکھ کر اس کی باچھیں کھل جاتی تھیں، پرنس آندرے کی آمد پر بھی اس نے قلبی مسرت کا اظہار کیا اور اس سے رات ٹھہرنے پر اصرار کیا۔

دن تھا کہ اکتاہٹ سے بھرپور تھا لیکن اس کے دوران میں بلکونسکی کے بزرگ میزبان، اس کی اہلیہ اور ان کے نہایت نامور مہمانوں (کاؤنٹ کے گھر میں بہت بھیڑ بھڑکا تھا کیونکہ عنقریب ایک نام دن کی تقریب منعقد ہونا تھی) نے اس کی متعدد مرتبہ خاطر مدارات کی اور ان مواقع کے دوران میں پرنس آندرے کو معلوم ہوا کہ اس کی نگاہیں بار بار نتاشا کی، جو محفل کے نوعمر ارکان کے مابین قہقہے لگا رہی اور حظ اٹھا رہی تھی، جانب اٹھ رہی ہیں۔ جب بھی ایسا ہوتا، وہ اپنے آپ سے پوچھتا: ''یہ کیا سوچ رہی ہے؟ یہ اتنی مسرور کیوں ہے؟''

اس شب نئے ماحول میں جب وہ تنہا رہ گیا، وہ کافی دیر تک اپنی پلک تک نہ جھپکا سکا۔ وہ کچھ دیر مطالعہ کرتا رہا، پھر اس نے شمع بجھا دی لیکن فوراً ہی اسے دوبارہ روشن کر دیا۔ کمرے کے اندر گرمی تھی کیونکہ اندرونی کواڑ بند تھے۔ اسے رہ رہ کر اس احمق بڈھے (اس کے خیال میں رستوف یہی کچھ تھا) پر غصہ آ رہا تھا کہ اس نے اسے رات بھر قیام کرنے پر آمادہ کر لیا تھا اور بہانہ یہ بنایا تھا کہ شہر سے ابھی ضروری کاغذات نہیں آئے۔ اسے اپنے آپ پر بھی طیش آ رہا تھا کہ آخر وہ ٹھہرا ہی کیوں؟

پرنس آندرے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دریچے کی جانب چل پڑا۔ جونہی اس نے کواڑ کھولے، چاندنی، جیسے وہ کافی دیر سے اسی کا انتظار کر رہی تھی، جھپ سے اندر داخل ہو گئی اور سارا کمرہ منور ہو گیا۔ رات خنک، روشن اور ساکن تھی۔ باہر دریچے کے بالکل قریب، ایسے درختوں کی، جن کی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں تا کہ وہ چھتنار اور تناور بن سکیں، قطار تھی۔ ان درختوں کا ایک رخ تاریک اور دوسرا مانندِ نقرہ روشن تھا۔ درختوں کے نیچے کسی قسم کا سرسبز و

شاداب جھاڑ جھنکار اگا ہوا تھا۔ کہیں کہیں ان جھاڑیوں کی شاخیں اور پتے چاندنی میں نہائے ہوئے تھے اور چاندی کی طرح چمک رہے تھے۔ تاریک درختوں سے دور، خاصی دور، ایک چھت تھی۔ اس پر شبنم کے قطرے اپنی آب و تاب دکھا رہے تھے۔ دائیں طرف پتوں میں لپٹا ایک تناور درخت کھڑا تھا۔ اس کا تنا اور شاخیں براق سفید تھیں۔ اس کے اوپر تقریباً مکمل چاند چمک رہا تھا۔ بہار یہ آسمان پیلا تھا اور اس پر ستارے خال خال دکھائی دے رہے تھے۔ پرنس آندرے نے اپنی کہنی دریچے کی چوکھٹ پر ٹکادی اور اس کی نگاہیں اس چرخ پر ٹھہر گئیں۔

اس کا کمرہ دوسری منزل پر تھا۔ اس سے اوپر کی منزل پر جو کمرے تھے، ان میں چند ایسے لوگ تھے، جنھیں ابھی تک نیند نہیں آئی تھی۔ اسے اپنے اوپر نسوانی آوازیں سنائی دیں۔

''صرف ایک اور،'' اس کے سر کے اوپر ایک دوشیزہ نے کہا۔ پرنس آندرے نے یہ آواز فوراً پہچان لی۔

''تم سوؤ گی کب؟'' دوسری آواز نے جواب دیا۔

''میں سوؤں گی نہیں — مجھے نیند آ ہی نہیں رہی... پھر میں کیا کروں؟ آؤ نا، یہ آخری بار ہوگا...''

دونوں لڑکیوں نے کوئی بول گنگنایا۔ غالباً یہ کسی گیت کا اختتامیہ تھا۔

''اف، کتنا خوبصورت تھا! آؤ، شب بخیر کہیں اور سو جائیں۔''

''تم سو جاؤ، میں نہیں سو سکتی،'' پہلی آواز نے کھڑکی کے اور قریب آ کر کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ کھڑکی کے باہر سر جھکائے ہوئے ہے کیونکہ اب وہ نہ صرف اس کے ڈریس کی سرسراہٹ بلکہ اس کی سانس کا زیر و بم بھی سن سکتا تھا۔ چاروں اطراف سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہر شے پتھر کی طرح ساکت اور خاموش تھی — بالکل چاند، اس کی روشنی اور سایوں کی مانند۔ پرنس آندرے میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ اپنی جگہ سے حرکت کر سکے کیونکہ اسے یہ اندیشہ تھا کہ کہیں اس کی غیر ارادی موجودگی کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔

''سونیا! سونیا!'' پہلی آواز دوبارہ سنائی دی، ''تمھیں نیند کیسے آ گئی ہے؟ دیکھو، فضا کتنی حسین ہے! کتنی دل آویز ہے! سونیا، جاگو تو سہی!'' اس نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔ ''اتنی حسین رات پہلے کبھی نہیں، کبھی نہیں آئی!''

سونیا نے بادلِ ناخواستہ کوئی جواب دیا۔

''آؤ نا، آؤ نا، دیکھو نا! چاند کتنا خوبصورت ہے! حسنِ کامل کا مرقع ہے!... آ بھی جا، میری دلدار، آ بھی جا! ادھر، دیکھا؟ جی چاہتا ہے کہ آلتی پالتی مارے یہیں بیٹھی رہوں... کچھ اس طرح... گھٹنوں کو بازوؤں کے شکنجوں میں کس لوں... پوری طرح کس لوں... یوں... اور فضا میں پرواز کرنے لگوں[6]! ایسے —''

''سنبھل کر، ورنہ نیچے گر پڑو گی!''

کھینچا تانی اور دھینگا مشتی کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر سونیا کی آواز ابھری۔ وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر رہی تھی۔

''بنو، ایک بج چکا ہے!''

''تم ہر وقت رنگ میں بھنگ ڈالتی رہتی ہو! سارا مزا اکارت کر دیتی ہو! اچھا، جاؤ — اور جا کر سو جاؤ!''

ایک بار پھر سکوت طاری ہو گیا لیکن پرنس آندرے کو معلوم تھا کہ وہ ابھی تک وہیں بیٹھی ہے۔ کبھی کبھار ہلکی سرسراہٹ یا آہ بھرنے کی آواز سنائی دے جاتی۔

''خداوند! خداوند! یہ سب کچھ کیا ہے؟'' وہ اچانک پھٹ پڑی۔ ''اگر سونا اتنا ہی لازمی ہے، چلو، پھر میں سو جاتی ہوں!'' اور اس نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔

''میرا کوئی وجود ہے یا نہیں، اس کی بلا جانے!'' پرنس آندرے نے اس کی آواز پر کان لگائے سوچا۔ معلوم نہیں کیا وجہ تھی لیکن اسے امید تھی اور ساتھ ہی دھڑکا بھی کہ وہ شاید اس کے بارے میں کچھ کہے گی۔ ''لو، وہ پھر آ گئی ہے! شاید جان بوجھ کر آئی ہے!'' اس نے سوچا۔

اور ایکا ایکی اس کی روح پر بھرپور جوانی کے تصورات اور امیدوں نے غیر متوقع انداز سے کچھ اس قسم کی یلغار کر دی جو اس کی زیست کی ساری روش کے بالکل برعکس تھی۔ اسے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنی حالت اپنے آپ سے بیان کرنے سے عاجز ہے۔ اسی ادھیڑ بن میں اسے یک دم نیند نے گھیر لیا۔

3

اگلے روز کاؤنٹ کے ماسوا کسی اور شخص سے ملے اور خواتین کا انتظار کیے بغیر پرنس آندرے نے اپنے گھر کی راہ لی۔

جون کا پہلے ہی آغاز ہو چکا تھا۔ واپسی سفر کے دوران میں اس کا دوبارہ برچ کے جنگل میں سے، جہاں اوک کے گانٹھ دار کہنہ درخت نے اس کے ذہن پر اتنے عجیب و غریب اور یادگار قسم کے تاثرات مرتسم کیے تھے، گزر ہوا۔ جنگل میں کالاش کی گھنٹی کی آواز پچھلے مہینے کی نسبت اور بھی مدھم سنائی دینے لگی تھی کیونکہ اب بوٹا بوٹا پتوں سے ڈھک چکا، گھنا ہو چکا اور سایہ دار بن چکا تھا۔ اور فر کے نوخیز درخت، جو جنگل میں یہاں وہاں نگینوں کی طرح جڑے ہوئے تھے، اب عام حسن میں بگاڑ پیدا کرنے کا سبب نہیں بن رہے تھے بلکہ گرد و پیش کی فضا سے متاثر ہو کر نئی اور نرم و نازک کونپلیں نکال رہے تھے۔ ان کونپلوں نے دل کش اور پرلطف انداز سے انھیں سرسبز بنا دیا تھا۔

سارا دن گرم رہا۔ کہیں طوفان کے آثار نمودار ہو رہے تھے لیکن صرف ہلکا پھلکا برشگالی بادل آیا تھا اور اس نے سڑک اور رسیلے پتوں سے گرد دھو دی تھی۔ چونکہ جنگل کا بایاں پہلو سائے میں تھا، اس لیے وہاں تاریکی تھی۔ دایاں پہلو مرطوب اور دھوپ میں نہایا ہوا تھا اور خوب جگمگا رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی اور درختوں میں سرسراہٹ پیدا کرتی جا رہی تھی۔ ہر پودے پر جوبن چھایا ہوا تھا اور اس پر پتے اور شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ بلبلیں چہچہا اور گنگنا رہی تھیں۔ ان کی آوازیں کبھی دور سے اور کبھی نزدیک سے سنائی دینے لگتی تھیں۔

''ہاں، یہاں اس جنگل میں کہیں اوک کا درخت تھا جس سے میں پوری طرح متفق تھا،'' پرنس آندرے نے سوچا۔ ''لیکن وہ ہے کہاں؟'' اس نے سڑک کے بائیں جانب دیکھتے اور عین اسی اوک کی، جس کی اسے تلاش تھی، تحسین کرتے ہوئے اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

پرانے اوک کی اب بالکل کایا پلٹ چکی تھی۔ وہ گھرے سبز اور رسیلے پتوں کا لبادہ اوڑھے مست و بے خود کھڑا تھا اور شام کے آفتاب کی کرنوں میں ہولے ہولے جھول رہا تھا۔ گٹھیلی انگلیاں، زخموں کے نشانات، پرانا کرب اور بدگمانیاں، سبھی کچھ غائب ہو چکا تھا۔ صد سالہ قدیم کھردری چھال کے ان حصوں پر بھی، جہاں شاخوں اور ٹہنیوں کا نام و نشان تک نہیں تھا، تازہ پتے پھوٹ آئے تھے۔ یہ پتے اتنی برق رفتاری سے نمودار ہوئے تھے کہ آدمی کو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ اسی کہنہ اور سال خوردہ مخلوق کے جسم سے نکلے ہیں۔

''ہاں، یہ وہی اوک ہے،'' پرنس آندرے نے سوچا اور پلک جھپکنے میں بے جواز مسرت اور زیستِ نو کے جذبے نے اسے پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ یکا یکی اس کی زندگی کے بہترین لمحات اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے۔ اوسٹرلٹس اپنے بلند و بالا افلاک سمیت، عالم نزع کے دوران میں اس کی بیوی کے چہرے پر ملامت کا اظہار، پیئر درکشتی، حسنِ شب سے مسحور و مخمور الھڑ دوشیزہ اور نِی نسفہ رات اور ماہتاب — یہ تمام چیزیں اور مناظر یک بارگی اس کے دماغ میں در آئے۔

''نہیں اکتیس سال کی عمر میں زندگی اختتام کو نہیں پہنچ جاتی!'' پرنس آندرے نے اضطراری، قطعی اور اٹل فیصلہ کیا۔ ''میرے لیے محض اتنا ہی کافی نہیں کہ اسے جو میرے اندر ہے، صرف میں ہی جانوں، ہر شخص کو — پیئر کو، اس نوخیز دوشیزہ کو جو جانبِ آسمان پرواز کرنا چاہتی تھی۔ معلوم ہونا چاہیے کہ میں کیا ہوں تا کہ میں اپنی زندگی محض اپنی ذات کی خاطر ہی نہ بتاؤں جب کہ دوسرے، جیسا کہ وہ لڑکی ہے، اس سے اتنا الگ تھلگ رہیں، مجھے اپنی زندگی کچھ اس طور بتانا چاہیے کہ وہ ان سب میں منعکس ہوتا کہ وہ میرے ساتھ میری زندگی میں حصے دار بن سکیں!''

گھر پہنچنے کے بعد پرنس آندرے نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ خزاں کے دوران میں پیٹرزبرگ جائے گا اور اپنے اس فیصلے کے جواز میں اس نے ہر قسم کے عذر تراش لیے۔ اس کے ذہن میں معقول اور منطقی وجوہات کا پورا سلسلہ کلبلانے لگا کہ اس کا پیٹرزبرگ جانا بلکہ فوج میں بھی دوبارہ شامل ہونا کیوں ضروری ہے۔ جس طرح ایک ماہ قبل وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ دیہات سے کہیں اور جائے گا، اسی طرح اب یہ بات اس کے فہم و ادراک میں نہیں آ رہی تھی کہ زندگی میں سرگرم انداز سے شرکت اختیار کرنے کی ضرورت کے بارے میں اس کے ذہن میں شکوک کیوں پیدا ہو گئے تھے۔ اب اسے یہ واضح انداز سے احساس ہونے لگا کہ اب تک اسے جو تجربات حاصل ہوئے ہیں، اگر اس نے انھیں کسی کام میں استعمال نہ کیا اور زندگی میں فعال انداز سے شرکت نہ کی، تو یہ سب رائیگاں جائیں گے۔ اسے یہ تک یاد نہ آیا کہ ماضی میں اسی قسم کے بودے دلائل نے اسے یہ سجھایا تھا کہ زندگی نے اسے جو کچھ سکھایا ہے، اگر اس کے بعد بھی اس نے یہ یقین کر لیا کہ وہ کسی کے کام آ سکتا ہے اور محبت یا مسرت کا حصول ممکن ہے، پھر

اس کی اپنی نگاہوں میں اس کا وقار جاتا رہے گا۔ اب عقل و دانش اس کے علی الرغم رستہ دکھا رہی تھی۔ اپنے ریازان کے اس سفر کے بعد پرنس آندرے کے لیے دیہاتی ماحول اور فضا میں کوئی دلکشی باقی نہ رہی اور وہ اس سے اکتانے لگا۔ اپنے سابقہ مشاغل میں اس کی دلچسپی جاتی رہی اور جب وہ اپنے سٹڈی روم میں تنہا ہوتا، وہ اٹھتا اور آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر کافی دیر تک اپنا ہی چہرہ دیکھنے میں محو رہتا۔ پھر وہ اپنی مرحومہ بیوی لسا کی، جس نے اپنی زلفیں یونانی انداز سے بن لگا کر نائی ہوئی تھیں، تصویر کے سامنے جا کھڑا ہوتا۔ اسے محسوس ہوتا کہ وہ اپنے سنہری فریم میں سے اسے بہ نگاہِ لطف و الفت دیکھ رہی ہے۔ اب وہ اس کے سامنے ان مہیب الفاظ کا اعادہ نہیں کرتی تھی بلکہ فطری، پرمسرت اور رازدارانہ انداز سے اس کا جائزہ لے رہی ہوتی تھی۔ اور پرنس آندرے اپنی پشت پر اپنے ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے خاصی دیر تک کمرے کے اندر چکر لگاتا رہتا۔ کبھی اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور کبھی اس کے لبوں پر تبسم آ جاتا اور اس دوران میں وہ ان خیالات کے، جو منطق سے خالی تھے، جن کا اظہار ممکن نہ تھا اور جنھیں کسی جرم کی طرح پردۂ اخفا میں رکھنا لازمی تھا، بارے میں سوچتا رہتا۔ ان خیالات کا تعلق پیئر سے تھا، شہرت سے تھا، دریچے کی دوشیزہ سے تھا، اوک کے بوڑھے درخت سے تھا، عورت کے حسن اور عشق سے تھا۔ انھوں نے اس کی ساری زندگی ہی پلٹ دی تھی۔ ان مواقع پر اگر کوئی شخص کمرے میں آ جاتا، اس کے ساتھ اس کا رویہ خاص طور پر روکھا، درشت اور سب سے بڑھ کر ناگوار انداز سے منطقی ہوتا۔

"Mon Cher"*، ایسے ہی کسی موقع پر پرنس ماریا کی، جو بھولے بھٹکے ادھر آ نکلتی، آواز سنائی دیتی: ''ننھا نکولائی آج باہر نہیں نکل سکتا، سخت سردی ہے۔''

''ٹھیک ہے، اگر سردی نہ ہوتی،'' وہ خشک لہجے سے جواب دیتا، ''وہ خالی قمیص میں بھی باہر جا سکتا تھا۔ چونکہ سردی بڑھ گئی ہے، اس لیے اسے گرم کپڑے، جو خاص اسی مقصد کے لیے بنوائے گئے ہیں، پہنا دو۔ اگر موسم یخ ہو، تو یہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے، نہ کہ جس بچے کو تازہ ہوا کی ضرورت ہو، اسے چار دیواری کے اندر مقید کر دیا جائے۔'' وہ ایسی شستہ منطق سے کہتا کہ اس میں مین میکھ نکالنا ناممکن ہوتا۔ اس کے اس رویے سے یہ محسوس ہوتا کہ وہ ان ناتمام مخفی اور غیر منطقی قوتوں کی پاداش میں، اس کے اندر مصروف کار تھیں، دوسروں کو سزا دینے پر تلا ہوا ہے۔

4

پرنس آندرے اگست 1809 کے مہینے پیٹرز برگ پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جواں سال سپے رانسکی[7] کی شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا اور اس کی تجویز کردہ اصلاحات کو بڑے زور شور سے عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا۔ اسی اگست کے دوران میں زار اپنی گاڑی سے گر پڑا اور اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ وہ تین ہفتے ہسپتال میں صاحبِ فراش رہا۔ اس علالت کے دوران میں وہ سپے رانسکی سے تو روزانہ ملاقات کرتا رہا لیکن کسی دوسرے شخص کو اس نے اپنے قریب بھی

* مائی ڈیر

نہ پھٹکنے دیا۔ ان دنوں نہ صرف دو بدنامِ زمانہ فرامین — درباری مدارج کا خاتمہ اور شعبہ محصولات کے اسیسروں[8] اور سٹیٹ کونسلروں کے عہدوں کے متمنی اشخاص کے لیے امتحانات کا اجراء۔ تشکیل و تدوین کے مراحل میں سے گزر رہے تھے بلکہ مکمل آئینِ مملکت، جس کے تحت کونسل آف سٹیٹ[9] سے لے کر ضلعی ٹریبونلوں تک اس زمانے کے قانونی، انتظامی اور مالیاتی ڈھانچے کو یکسر تبدیل کیا جانا تھا، زیرِ بحث تھا۔ اب وہ مبہم لبرل خواب، جو الیکسانڈر نے اپنی تخت نشینی کے وقت دیکھے تھے اور جنھیں اس نے اپنے مشیروں زار تورسکی، نادوسلت سیف، کوچوبی اور ستراگانوف کی — یہ وہ لوگ تھے جنھیں خود زار نے* Comite de salut public کا نام دیا تھا۔ مدد سے عملی جامہ پہنانے کی سعی کی تھی، حقیقت کا روپ دھار رہے تھے۔ اب سول محکموں میں ان کی جگہ پہ رانسکی اور محکمہ دفاع میں آراک چیف[10] کی تعیناتی ہو چکی تھی۔

اپنی آمد کے چند روز بعد ہی پرنس آندرے جنٹلمین ان ویٹنگ کی حیثیت سے دربار میں حاضر ہو گیا۔ اگرچہ امپراطور قبل ازیں دو مرتبہ اسے مل چکا تھا، اس نے اس سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ پرنس آندرے کو ہمیشہ، بلکہ اس سے پہلے بھی، یہی محسوس ہوتا رہا تھا کہ اس کے دل میں زار کے لیے کوئی نرم گوشہ نہیں ہے۔ خود زار کے نزدیک اس کا چہرہ اور ساری شخصیت ناپسندیدہ تھی۔ امپراطور نے اسے جس سرد مہرانہ انداز سے دیکھا اور اسے دیکھ کر جس طرح ناک بھوں چڑھائی، اس سے اسے اپنے مفروضے کی مزید تصدیق مل گئی۔ درباریوں نے پرنس آندرے کو بتایا: ''زار نے آپ سے جو بے رخی برتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ نے 1805 کے بعد ان کی کوئی خدمات سرانجام نہیں دیں، لہٰذا وہ آپ سے خفا ہیں۔''

''مجھے اپنے طور پر معلوم ہے کہ انسان کو اپنی پسند اور ناپسند پر اختیار نہیں ہوتا،'' پرنس آندرے نے سوچا۔ ''چنانچہ اگر میں نے فوجی قواعد و ضوابط میں ترمیمات کے متعلق ذاتی طور پر زار کو تجاویز پیش کیں، اس کا کوئی حاصل نہیں ہوگا، تاہم میرا منصوبہ خود ہی اپنے آپ کو منوائے گا۔''

اس نے اپنے محضرنامے کے متعلق ایک ضعیف العمر فیلڈ مارشل کو، جو اس کے باپ کا دوست تھا، پیغام بھیجا۔ فیلڈ مارشل نے اسے ملاقات کا وقت دے دیا۔ جب وہ اس کے ہاں پہنچا، اس نے شفقت سے اس کا استقبال کیا اور اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس معاملے کو امپراطور کے سامنے پیش کر دے گا۔ چند روز بعد پرنس آندرے کو مطلع کیا گیا کہ وہ وزیرِ جنگ آراک چیف کی خدمت میں حاضر ہو جائے۔

مقررہ دن پرنس آندرے صبح نو بجے آراک چیف کے استقبالیہ کمرے میں پہنچ گیا۔

وہ ذاتی طور پر کاؤنٹ آراک چیف سے واقف نہیں تھا اور نہ کبھی اس کی اس سے ملاقات ہوئی تھی۔ تاہم اس

---

* کمیٹی برائے بہبودیٔ عوام

نے اس کے متعلق جو کچھ سنا تھا، اس سے اس کے دل میں اس کے متعلق کوئی احترام کے جذبات پیدا نہ ہوئے۔

"وہ وزیر جنگ ہے اور زار اس پر اعتماد کرتا ہے۔ اس کے ذاتی اوصاف سے مجھے یا کسی کو کوئی سروکار نہیں ہونا چاہیے۔ اسے میرے منصوبے کے مسودے کا جائزہ لینے کا کام سونپا گیا ہے۔ چنانچہ صرف وہی اسے پروان چڑھا سکتا ہے،" پرنس آندرے نے سوچا۔ وہ کاؤنٹ آراک چیف کے استقبالیہ کمرے میں بیٹھا تھا۔ اس کے اردگرد اہم، غیر اہم اور بعض دیگر اشخاص بھی موجود تھے۔

اپنی ملازمت کے زمانے میں — زیادہ تر ایجوٹنٹ کی حیثیت سے — پرنس آندرے نے متعدد اعلیٰ شخصیات کے استقبالیہ کمرے دیکھے تھے اور ان کمروں کی مختلف اقسام وہ باآسانی پہچان لیا کرتا تھا۔ کاؤنٹ آراک چیف کا کمرا خصوصی وصف کا حامل تھا۔ جو غیر اہم اشخاص ملاقات کے لیے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے، ان کے چہروں بشروں سے گھبراہٹ اور اپنی تذلیل کا احساس ٹپک رہا تھا۔ جہاں تک اونچے مراتب کے حامل لوگوں کا تعلق تھا، ان کے خدوخال یہ غمازی کر رہے تھے کہ یہ وہ جگہ نہیں، جہاں انھیں آنا چاہیے تھا اور یوں وہ ایک طرح کے اضطراب میں پھنسے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنے اضطراب پر کچھ اس قسم کا پردہ ڈال رکھا تھا جیسے انھیں کسی چیز سے کوئی تعلق ہی نہ ہو اور جیسے وہ خود اپنے آپ کی، اپنے مراتب کی اور اس شخص کی، جس سے ملاقات کے لیے وہ انتظار کی زحمت گوارا کر رہے تھے، ہنسی اڑا رہے ہوں۔ ان میں سے بعض، اپنے خیالات میں مستغرق، کمرے میں ادھر ادھر چکر لگا رہے تھے اور بعض آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اور قہقہے لگا رہے تھے۔ پھر پرنس آندرے کے کانوں میں ایک شخص کا عرف "سیلا آندریچ"[11] پڑا اور اسے یہ الفاظ سنائی دیے: "بڑے میاں آج ہماری خوب خبر لیں گے!" ان کا اشارہ کاؤنٹ آراک چیف کی طرف تھا۔ کمرے میں ایک جرنیل (وہ بڑا اہم شخص تھا) بھی تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اس سے جس طرح انتظار کرایا جا رہا تھا، وہ اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا ہے۔ وہ بار بار اپنی ٹانگیں ایک دوسرے کے اوپر رکھ رہا اور پھر انھیں علیحدہ علیحدہ کر رہا تھا، اور آپ ہی آپ تحقیر آمیز انداز سے مسکرا رہا تھا۔

لیکن جونہی دروازہ کھلتا، سبھی کے چہروں پر ایک ہی قسم کا تاثر — خوف و اندیشہ — نمایاں ہو جاتا۔ پرنس آندرے نے دوسری مرتبہ ڈیوٹی ایجنٹ سے کہا کہ وہ اس کا نام اندر پہنچا دے۔ جواب میں اسے طنزیہ نگاہوں سے دیکھا گیا اور اسے بتایا گیا: "مناسب وقت پر آپ کی باری آئے گی۔" جب ایجوٹنٹ متعدد اشخاص کو وزیر کے کمرے کے اندر اور وہاں سے باہر لا چکا، ایک ایسے افسر کو، جس کے چہرے کو دیکھ کر پرنس آندرے کو احساس ہوا کہ یہ شخص نہایت گھٹیا بھی ہے اور دہشت زدہ بھی، مہیب دروازے میں سے اندر پہنچایا گیا۔ اس افسر کی ملاقات خاصی دیر تک جاری رہی۔ اچانک دروازے کی دوسری جانب سے درشت اور چیختی چنگھاڑتی آواز سنائی دی اور وہ افسر باہر آ گیا۔ اس کا چہرہ زرد اور ہونٹ لرزاں تھے۔ وہ اپنا سر پکڑے تیز تیز قدم اٹھاتا استقبالیہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے بعد معاً پرنس آندرے کو دروازے تک پہنچا دیا گیا اور ایجوٹنٹ نے اس سے کہا: "دائیں طرف، دریچے کے قریب۔"

پرنس آندرے سادہ لیکن صاف ستھرے سٹڈی روم میں داخل ہو گیا۔ اسے میز کے سامنے ایک چالیس سالہ شخص، جس کی کمر چوڑی، سر لمبوترا، بال خشخشی، چہرہ جھریاں زدہ، ناک خمیدہ، آنکھیں بجھی بجھی اور سرخی مائل، جن کے اوپر شکن آلود پیشانی تھی، بیٹھا نظر آیا۔ آراک چیف نے دیکھے بغیر اپنا رخ اس کی طرف کیا اور پوچھا:

''تمھاری درخواست کس چیز کے بارے میں ہے؟''

''یوئر ایکسی لینسی ... میں کوئی درخواست لے کر نہیں آیا ہوں،'' پرنس آندرے نے دھیرے سے جواب دیا۔

آراک چیف کی نظریں اس پر ٹھہر گئیں۔

''بیٹھو... پرنس بلکونسکی؟'' آراک چیف نے کہا۔

''مجھے کوئی درخواست پیش نہیں کرنا ہے۔ میں نے ہز میجسٹی امپراطور کی خدمت میں ایک منصوبے کا مسودہ پیش کیا تھا، انھوں نے بکمال لطف وکرم اسے آپ کے سپرد کر دیا۔''

'مائی ڈیئر سر، اگر اجازت ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ میں آپ کا محضر نامہ پڑھ چکا ہوں،'' آراک چیف نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی گفتگو کے محض چند ابتدائی کلمات خاص نوع کی شائستگی سے کہے لیکن پھر اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اس کے لہجے میں بتدریج چڑچڑاپن اور حقارت آ گئی: ''تم نئے عسکری قواعد وضوابط تجویز کر رہے ہو؟ ہمارے پاس پہلے ہی قواعد وضوابط کی بھرمار ہے۔ کوئی بھی ان پرانے قواعد وضوابط پر عمل نہیں کرتا۔ آج کل ہر کس وناکس نئے سے نئے قوانین مرتب کرنے میں مشغول ہے۔ لکھنا آسان ہے، عمل کرنا دشوار ہے۔''

''میں ہز میجسٹی امپراطور کی خواہش کے مطابق یوئر ایکسی لینسی سے یہ دریافت کرنے حاضر ہوا تھا کہ میں نے جو محضر نامہ پیش کیا تھا، اس کے متعلق آپ کیا کرنا چاہتے ہیں؟'' پرنس آندرے نے شائستگی سے کہا۔

''میں نے تمھارے محضر نامے پر اپنا تبصرہ لکھ دیا ہے اور اسے کمیٹی کے پاس بھیج دیا ہے۔ مجھے یہ پسند نہیں آیا،'' آراک چیف نے کہا۔ وہ اٹھا، میز پر سے کاغذ اٹھایا اور اسے پرنس آندرے کو تھماتے ہوئے بولا: ''یہ لو!''

اس کاغذ پر گھسیٹ گھساٹ کر مندرجہ ذیل عبارت، جو ہجوں اور رموزِ اوقاف، دونوں اقسام کی اغلاط سے پر تھی، لکھی ہوئی تھی:

''ناقص، فرانسیسی عسکری ضوابط کی بھونڈی نقل! ہمارے اپنے جنگی ضوابط سے خواہ مخواہ انحراف کیا گیا ہے۔''

''یہ محضر نامہ کس کمیٹی کو ارسال کیا گیا ہے؟'' پرنس آندرے نے دریافت کیا۔

''کمیٹی برائے عسکری ضوابط۔ اور ہاں، میں نے یہ سفارش بھی کر دی ہے کہ حضور کو اس کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا جائے۔ تاہم اس کام کی تنخواہ نہیں ملے گی۔''

''میں تنخواہ کے پیچھے نہیں بھاگ رہا۔''

''بلا تنخواہ رکن،'' آراک چیف نے اپنی بات دہرائی۔ ''اچھا، خدا حافظ۔ اے! اگلے شخص کو بھیج دو! ان کے علاوہ اور کون ہے؟'' اس نے پرنس آندرے کو برائے نام سلام کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

5

جب پرنس آندرے کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے اپنی تقرری کے رسمی اعلان کا انتظار کر رہا تھا، اس نے سوچا کیوں نہ پرانے شناساؤں، خاص طور پر ان لوگوں سے، جن کے متعلق اسے معلوم تھا کہ وہ صاحبانِ اختیار ہیں اور اسے ان کی مدد کی ضرورت پیش آسکتی ہے، ملاقاتیں کی جائیں۔ اب کے پیٹرز برگ میں اسے بعینہٖ اسی نوع کے احساسات کا تجربہ ہوا، جن میں سے وہ تب گزرا تھا جب جنگ شروع ہوا چاہتی تھی۔ ایک بے چین تجسس اسے کسی کل آرام نہیں لینے دیتا تھا اور وہ دیوانہ وار ان حلقوں کی، جہاں مستقبل کے بارے میں نقشے، جن پر لاکھوں انسانوں کی زندگیوں کا دارومدار تھا، ترتیب دیے جا رہے تھے، جانب کھنچا چلا جاتا تھا۔ بڑے بوڑھوں کی جھلاہٹ اور تنک مزاجی، نوآموزوں کا تجسس اور آزمودہ کاروں کی چُپ، ہر ایرے غیرے کی بھاگ دوڑ اور مصروفیت کا ڈراما، کمیٹیوں اور کمشنوں کی بھرمار — وہ آئے روز نئی نئی کمیٹیوں اور نئے نئے کمشنوں کے قیام کے اعلانات سنتا رہتا تھا — ان سب چیزوں سے اسے اب 1809 میں یہ احساس ہو رہا تھا کہ پیٹرز برگ میں کوئی زبردست غیر فوجی معرکہ ہوا چاہتا ہے۔ جو لوگ اس معرکے کی تیاریوں میں جتے ہوئے تھے ان کا کمانڈر انچیف ایک پُراسرار شخص تھا۔ اسے وہ خود تو نہیں جانتا تھا لیکن اس کے بارے میں عام خیال یہی تھا کہ وہ نابغۂ روزگار ہستی ہے۔ اس شخص کا نام سپے رانسکی تھا۔ اصلاحات کی جو تحریک، جس کے بارے میں پرنس آندرے کو محض مبہم سا علم تھا، چل رہی تھی، اسے اس میں اور اس کی روحِ رواں شخصیت، سپے رانسکی، میں اتنی دلچسپی ہونے لگی کہ اس کے ذہن میں عسکری قواعد وضوابط کا مسئلہ بہت جلد ثانوی حیثیت اختیار کر گیا۔

پرنس آندرے کو معلوم ہوا کہ وہ خود جس پوزیشن میں ہے، وہ بہت سودمند ہے اور وہ اپنے زمانے کے پیٹرز برگ کے اعلیٰ ترین اور انتہائی مختلف النوع حلقوں میں انتہائی آسانی اور سہولت سے رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ وہ اصحاب، جو اصلاحات کے شیدائی تھے، اس کا گرم جوشی سے خیر مقدم کرتے اور اس کی تائید وحمایت حاصل کرنے کی مساعی کرتے۔ اس کی ایک وجہ تو اس کی یہ شہرت تھی کہ وہ بہت ہوشیار، سمجھ دار اور خوب پڑھا لکھا آدمی ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس نے اپنے زرعی غلاموں کو جس طرح آزاد کیا تھا، اس نے اسے لبرل کی حیثیت سے مشہور کر دیا تھا۔ بزرگ اور مخالفینِ اصلاحات اس لیے اس کی طرف لپکتے تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ انھیں اصلاحات سے جو کد ہے، اس میں وہ ان کا ساتھ دے گا کیونکہ آخر وہ اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ خواتین، جو محافل کی جان ہوتی تھیں، اس لیے اسے ہاتھوں ہاتھ لیتی تھیں کیونکہ وہ صاحبِ حیثیت تھا، نامور تھا اور رشتہ جوڑنے کے لیے موزوں بر تھا اور تقریباً نووارد۔ اس کی مفروضہ ہلاکت اور اس کی اہلیہ کے الم ناک انتقال نے اس کی ذات کے گرد رومانوی ہالہ تان دیا تھا۔ مزید برآں ان تمام لوگوں کی، جو پہلے ہی سے اسے جانتے تھے، عمومی رائے یہ تھی کہ وہ ان گزشتہ پانچ برسوں کے دوران میں خاصا بدل چکا ہے اور پہلے کی نسبت کہیں بہتر انسان بن گیا ہے۔ اس کے اطوار میں ملائمت اور اس کی

عقل میں پختگی آ گئی ہے۔ تصنع اور بناوٹ، نخوت اور خود پسندی، تحقیر آمیز طنز، سبھی عنقا ہو گئے ہیں اور اس میں وہ متانت بھی آ گئی ہے جو عمر اور تجربے سے نصیب ہوتی ہے۔ لوگ اس کا ذکر کرتے تھے، اس میں دلچسپی لیتے تھے اور اس سے ملاقات کرنے کا اشتیاق ظاہر کرتے تھے۔

جس روز پرنس آندرے کی ملاقات کاؤنٹ آراک چیف سے ہوئی، اس سے اگلی شام اس نے کاؤنٹ کوچوبی[12] کے ہاں گزاری۔ اس نے کاؤنٹ کو "سیلا آندریچ" کے ساتھ اپنی ملاقات کا احوال سنایا۔ (کاؤنٹ کوچوبی کبھی آراک چیف کا نام نہیں لیتا تھا، وہ اس کا ذکر اسی قسم کے خندۂ استہزا کے ساتھ، جس کا مظاہرہ پرنس آندرے نے وزیر جنگ کے استقبالیہ کمرے میں دیکھا تھا، اس کے عرف سے کرتا تھا۔)

"Mon cher"* کوچوبی نے کہا۔ "اس معاملے میں بھی تم میخائیل میخائیلووچ (سپے رانسکی) کے تعاون کے بغیر کچھ نہیں کر سکتے۔ اصلی حاکم وہی ہے۔ میں اس سے بات کروں گا۔ اس نے آج شام آنے کا وعدہ کیا تھا..."

"لیکن سپے رانسکی کا عسکری قواعد و ضوابط سے کیا تعلق ہے؟" پرنس آندرے نے پوچھا۔

کوچوبی کے لبوں پر تبسم آ گیا اور اس نے اپنے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے اسے بلکونسکی کی سادہ لوحی پر سخت حیرت ہوئی ہو۔

"چند دن ہوئے میں اور وہ تمھارے اور تمھارے ان زرعی غلاموں کے بارے میں، جنھیں تم نے آزادی دی ہے، باتیں کر رہے تھے۔" کوچوبی نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"پرنس، تو یہ آپ ہیں جنھوں نے اپنے زرعی غلاموں کو آزاد کیا ہے؟" امپراطورہ کیتھرین[13] کے وقتوں کے ایک بزرگ نے بلکونسکی کو حقارت سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہ چھوٹی سی جاگیر تھی اور اس سے یافت بھی کوئی خاص نہیں ہوتی تھی،" پرنس آندرے نے جواب دیا۔ اس نے جو کچھ کیا تھا، وہ اس کی اہمیت زیادہ سے زیادہ گھٹا کر پیش کرنے کی کوشش کر رہا تھا تاکہ پیرِ فرتوت خواہ مخواہ ناراض نہ ہو جائے۔

"مجھے ڈر ہے کہ کہیں تاخیر نہ ہو جائے..." پیر فرتوت نے کوچوبی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی،" اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر انھیں آزادی دے دی گئی، پھر زمینیں کون کاشت کرے گا؟ قوانین مرتب کرنا آسان کام ہے لیکن حکومت کرنا دشوار۔ اسی طرح، کاؤنٹ، میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہوں گا کہ اگر ہر شخص کو امتحان پاس کرنا پڑا، پھر محکموں کے سربراہ کون لوگ مقرر ہوں گے؟"

"میرا خیال ہے کہ وہی لوگ، جو امتحانات میں کامیاب ہوں گے،" کوچوبی نے اپنی ایک ٹانگ دوسری ٹانگ پر رکھتے اور اپنے چاروں اطراف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

"میرے محکمے میں ایک شخص پریانچنیکوف ہے۔ وہ اتنا اچھا اور انمول کارکن ہے کہ اس جیسا ڈھونڈے سے

* مائی ڈیر

نہیں ملے گا۔ لیکن اس کی عمر ساٹھ سال ہو چکی ہے۔۔ اسے بھی امتحان کی چکی میں سے گزرنا پڑے گا؟''
''ہاں، اس قسم کے معاملات میں ضرور دشواری پیش آئے گی کیونکہ تعلیم اتنی عام نہیں ہوئی...''
کاؤنٹ کوچوبی نے اپنی بات ختم نہ کی۔ وہ اٹھا، پرنس آندرے کا بازو پکڑا اور ایک چہل سالہ شخص کا، جو کمرے میں داخل ہو رہا تھا، استقبال کرنے چل پڑا۔ نو وارد کا قد لانبا، سر کے بال تقریباً ندارد، (لیکن جو تھے، ان کی رنگت سنہری تھی)، پیشانی فراخ اور اونچی، چہرہ کتابی تھا، جس پر عجیب وغریب اور انوکھی نوعیت کی رنگت چھائی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر نیلے رنگ کا فراک کوٹ تھا، گلے میں صلیب لٹک رہی تھی اور بائیں سینے پر ستارہ نما تمغا آویزاں تھا۔ یہ پے رانسکی تھا۔ پرنس آندرے اسے ایک نظر میں ہی پہچان گیا۔ آدمی کی زندگی میں جب عظیم لمحات آتے ہیں، اس کے جسم میں تھرتھری سی دوڑ جاتی ہے۔ پرنس آندرے کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اس تھرتھری کا سبب جذبۂ احترام تھا، حسد تھا یا پیش بینی؟ اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ پے رانسکی کا سارا ڈیل ڈول کچھ عجیب وغریب قسم کا تھا اور یوں اسے پہچاننا آسان تھا۔ جس طبقے میں پرنس آندرے کے شب و روز بسر ہو رہے تھے، اس میں اسے اس نوع کی طمانیت اور خود اعتمادی سے، جیسی کہ اس شخص کی بے ہنگم اور دھیمی نقل وحرکت میں نظر آ رہی تھی، کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا۔ اس کی نیم بند اور قدرے مرطوب آنکھوں سے عزم ٹپکتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ حلیم تھیں، اس نے اس طرح کی آنکھیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اسے کبھی اس قسم کا پر استقلال تبسم، جو بے شک بے معنی تھا، نظر نہیں آیا تھا اور نہ اس نے کبھی اتنی نرم، ملائم، شیریں اور نستعلیق آواز سنی تھی۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر جس چیز نے اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی، وہ اس کے ہاتھوں اور خاص طور پر ہاتھوں کی۔۔ جو قدرے چوڑے چکلے، غیر معمولی طور پر لچکیلے، نرم اور سفید تھے۔ کومل سپیدی تھی۔ اس قسم کی سپیدی پرنس آندرے نے صرف ان فوجیوں کے، جو کافی کافی عرصہ ہسپتالوں میں صاحب فراش رہے تھے، چہروں پر دیکھی تھی۔ یہ تھا پے رانسکی، وزیر داخلہ، زار کا رازدان اور مخبر، ارفورٹ میں، جہاں اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ نپولین سے ملاقات اور گفتگو کی تھی، اس کا رفیق۔
عام طور پر جب لوگ کسی خاصی بڑی محفل میں داخل ہوتے ہیں، ان کی نگاہیں غیر ارادی طور پر ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے چہرے کی طرف منتقل ہونے لگتی ہیں۔ پے رانسکی نے اس قسم کی کوئی حرکت نہ کی اور نہ اسے اپنی زبان کھولنے کی کوئی جلدی تھی۔ وہ باتیں دھیمے سروں میں کرتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ اس کی گفتگو توجہ سے سنی جائے گی اور اپنی گفتگو کے دوران میں وہ صرف اس شخص کی طرف دیکھتا تھا، جس سے وہ مخاطب ہوتا تھا۔
پرنس آندرے پے رانسکی کے ایک ایک لفظ کو توجہ سے سنتا اور اس کے ایک ایک اشارے کو بغور دیکھتا رہا۔ جیسا کہ عام طور پر ان لوگوں کا، جو اپنے ساتھی انسانوں کا سخت محاکمہ کرتے ہیں، دستور ہوتا ہے، پرنس آندرے کی جب بھی کسی شخص سے۔۔ خاص طور پر پے رانسکی جیسے شخص سے، جسے وہ اس کی شہرت کی بنا پر جانتا تھا۔۔ ملاقات ہوتی، وہ ہمیشہ یہ توقع کرتا کہ یہ شخص انسانی خوبیوں کا کامل مرقع ہوگا۔
پے رانسکی نے کوچوبی سے اپنے تاخیر سے آنے پر معذرت کی کیونکہ اسے محل میں روک لیا گیا تھا۔ اس نے

یہ نہیں کہا کہ اسے روکنے والا شخص زار تھا۔ انکسار کا یہ پر تصنع اظہار پرنس آندرے کی نظروں سے بچ نہ سکا۔ جب کوچوبی نے پرنس آندرے کا تعارف کرایا، سپے رانسکی نے آہستہ آہستہ اپنی نگاہیں بلکونسکی کی جانب منتقل کیں اور چپ چاپ اسے دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر وہی مسکراہٹ تھی جس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی تھی۔

"مجھے آپ سے تعارف حاصل کر کے بہت خوشی ہوئی ہے۔ دوسروں کی طرح میں بھی آپ کے بارے میں کافی سن چکا ہوں،" اس نے کہا۔

آراک چیف نے ملاقات کے دوران میں بلکونسکی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، کوچوبی نے اس کا مختصر احوال سنایا۔ سپے رانسکی کی مسکراہٹ اور پھیل گئی۔

"کمیٹی برائے عسکری قواعد وضوابط کا چیئرمین میرا عزیز دوست موسیو ماگ نتسکی ہے،" اس نے ایک ایک لفظ کے ایک ایک جزو کو واضح انداز سے ادا کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ چاہیں تو، میں اس سے آپ کی ملاقات کرا سکتا ہوں۔" (جملے کے اختتام پر اس نے کچھ توقف کیا۔) "مجھے یقین ہے کہ وہ آپ کو ایک ایسا شخص نظر آئے گا جو ہر معقول بات میں دلچسپی لیتا ہے اور اسے پروان چڑھانے کے لیے تیار رہتا ہے۔"

چشمِ زدن میں لوگوں نے سپے رانسکی کے اردگرد حلقہ بنا لیا اور وہ بزرگ شخص جس نے اپنے ماتحت پریانچنیکوف کے متعلق باتیں کی تھیں، ان لوگوں میں، جنھوں نے اس کے سامنے کوئی نہ کوئی سوال اٹھایا، شامل تھا۔

پرنس آندرے نے گفتگو میں کوئی حصہ نہ لیا۔ وہ محض سپے رانسکی کو دیکھتا رہا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ ابھی کل کی بات ہے کہ یہ شخص دینیات کا معمولی طالب علم تھا اور آج روس کی تقدیر اس کے ہاتھوں — لجلجے سفید ہاتھوں — میں ہے۔ سپے رانسکی نے جس غیر معمولی تحقیر آمیز طمانیت کے ساتھ پیر فرتوت کے سوال کا جواب دیا، اس پر پرنس آندرے کے کان کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود ہمالیائی بلندیوں پر جاگزیں ہے اور یہ اس کی کمال مہربانی ہے کہ وہ اس پیر فرتوت جیسے عام لوگوں سے محوِ کلام ہے۔ جب پیر فرتوت نے ضرورت سے زیادہ بلند لہجے سے بولنا شروع کر دیا، سپے رانسکی کا چہرہ متبسم ہو گیا اور وہ کہنے لگا: "امپراطور جس چیز کو منظور کرنا مناسب خیال کرتے ہیں، میری کیا مجال کہ اس کے ناقص یا سودمند ہونے کے بارے میں حکم لگاؤں۔"

سپے رانسکی کچھ دیر اس عمومی حلقے میں گفتگو کرتا رہا، پھر وہ اٹھا، سیدھا پرنس آندرے کے پاس پہنچا اور اسے اپنے ساتھ کمرے کے دوسرے سرے پر لے گیا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ بلکونسکی سے میل جول بڑھانا زیادہ ضروری خیال کرتا ہے۔

"پرنس، اس قابل احترام بزرگ نے مجھے جس قسم کی پرجوش گفتگو میں گھسیٹ لیا، اس کے دوران میں مجھے آپ کے ساتھ ہم کلام ہونے کا کوئی موقع دستیاب نہ ہو سکا،" اس نے ہلکی سی پر تحقیر مسکراہٹ سے کہا۔ اس کا یہ رویہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ وہ ابھی ابھی محو کلام تھا، اس کا خیال تھا کہ اس کی طرح پرنس آندرے بھی انھیں حقیر کیڑے مکوڑے تصور کرتا ہے۔ اس کے اس رویے سے پرنس آندرے نہال ہو گیا اور اس کے جذبہ خود پسندی

کو بڑی تقویت ملی۔ ''میں آپ کو بہت عرصے سے جانتا ہوں — مجھے آپ کی ذات میں جو دلچسپی پیدا ہوئی، اس کی پہلی وجہ تو آپ کا وہ اقدام ہے جو آپ نے اپنے زرعی غلاموں کے بارے میں کیا ہے۔ یہ اپنی نوعیت کی اولین مثال ہے اور ضرورت اس بات کی ہے کہ دوسرے بھی اس کی تقلید کریں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آپ کا شمار ان درباری مصاحبین میں ہوتا ہے، جنھوں نے نئے فرمان پر، جس کے تحت درباریوں کی از سر نو درجہ بندی کی گئی ہے، جس کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کی گئی ہیں اور جسے خواہ مخواہ اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا ہے، کوئی ناک بھوں نہیں چڑھائی۔''

''جی نہیں، میرے والد قطعاً نہیں چاہتے،'' پرنس آندرے نے کہا، ''کہ مجھے جو استحقاق حاصل ہے، میں اس سے جائز یا ناجائز کوئی فائدہ اٹھاؤں۔ میں نے اپنی ملازمت کا آغاز سب سے نچلے درجے سے کیا تھا۔''

''آپ کے والد ماجد کا تعلق پرانی نسل کے لوگوں سے ہے لیکن یہ روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ وہ ہمارے ان معاصرین سے، جو اس اقدام میں کیڑے نکال رہے ہیں، کہیں بلند تر ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ مخالفین کو اس فرمان سے کیا کد ہے، حالانکہ اس کا مقصد محض فطری انصاف کے تقاضے پورے کرنا اور اس کا بول بالا کرنا ہے۔''

''تاہم میرا خیال یہ ہے کہ جو نکتہ چینی ہو رہی ہے، اس کی کچھ وجوہات ہیں،'' پرنس آندرے نے سپے رانسکی کے طلسم کی مزاحمت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ سپے رانسکی کی سحر انگیز شخصیت اس پر بھی اثر انداز ہونے لگی ہے۔

اس کی ہر بات میں ہاں سے ہاں ملانا اسے پسند نہیں تھا اور اس نے اس کی تردید کرنا ضروری خیال کیا۔ عام طور پر وہ بلا جھجک اور با آسانی گفتگو کر سکتا تھا لیکن سپے رانسکی کے ساتھ مذاکرہ کرتے اسے اپنا مافی الضمیر ادا کرنے میں دقت پیش آ رہی تھی۔ اس نامور آدمی کی شخصیت کا مطالعہ کرنے میں وہ کچھ ضرورت سے زیادہ ہی محو ہو گیا تھا۔

''ان وجوہ کے پس پردہ شاید ذاتی امنگیں کارفرما ہوں؟'' سپے رانسکی نے دھیمے انداز سے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''اور کسی حد تک مملکت کے مفادات بھی،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' سپے رانسکی نے اپنی نگاہیں جھکائے نرمی سے پوچھا۔

''میں مونتیس کیو[14] کا مداح ہوں۔ اس کا یہ تصور کہ 'le princi pe des monarchies est l'honneur'* میرے نزدیک ناقابل تردید ہے۔ شرفا کے بعض حقوق اور استحقاقات اس جذبے کو برقرار رکھنے کا ایک ذریعہ ہیں۔''

سپے رانسکی کے سپید چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی لیکن اس تبدیلی سے اس کے خدوخال قدرے خوبصورت نظر آنے لگے۔ بظاہر یہی دکھائی دے رہا تھا کہ وہ پرنس آندرے کے خیالات میں بہت دلچسپی لے رہا ہے۔

''اگر آپ مسئلے کو اس نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں...'' اس نے فرانسیسی میں کہنا شروع کیا۔ نظر بظاہر اسے اپنے

---

* بادشاہت کا اصول یہ ہے کہ دوسروں کا احترام کیا جائے۔

الفاظ کی ادائیگی میں مشکل پیش آ رہی تھی۔ وہ جب روسی میں گفتگو کر رہا تھا، تب بھی اس کی رفتار دھیمی تھی لیکن اب تو یہ اور بھی دھیمی ہو گئی تاہم اس کی کامل طمانیت اپنی جگہ موجود تھی، اس میں سرِ مو فرق نہیں آیا تھا۔

وہ کہہ رہا تھا: ''اس احترام (l'honneur) کو، جو ایسے استحقاقات کا، جو سرکاری ملازمت کے دوران میں عمدہ کارکردگی کی راہ میں مزاحم ہوں، مرہونِ منت ہو، برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ احترام یا تو منفی تصور ہے کہ اس کا جوئندہ قابلِ ملامت حرکات سے اجتناب کرے گا یا پھر یہ تقلید کا منبع بن سکتا ہے کہ ایسے کام کیے جائیں کہ آپ بھی دوسروں کی نگاہوں میں سرخ رو بن سکیں اور انعام و اکرام حاصل کر سکیں۔'' اس کے دلائل سیدھے سادے، مجمل اور غیر مبہم تھے۔

''وہ ادارہ، جو اس قسم کے احترام کو، جو تقلید کا منبع ہو، برقرار رکھتا ہے، وہ عظیم امپراطور نپولین کے legion d' honneur* کے مشابہ ہے۔ پھر یہ ملازمت کے لیے ضرر رساں نہیں رہتا بلکہ اس کی کامیابی میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اس صورت میں یہ طبقاتی یا درباری استحقاق نہیں رہتا۔''

''جو کچھ آپ فرما رہے ہیں، بجا ہے، میں اس بارے میں آپ سے تکرار نہیں کر سکتا۔ تاہم اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ درباری استحقاقات کے ذریعے بھی یہی مقصد حاصل ہوتا ہے،'' پرنس آندرے نے جواب دیا۔ ''ہر درباری اپنے آپ کو اس بات کا پابند گردانتا ہے کہ اس نے اپنا منصب شایانِ شان طریقے سے سنبھالے رکھنا ہے۔''

''پرنس، اس کے باوجود آپ اپنے استحقاقات سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کرتے،'' سپے رانسکی نے کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ یہ اس بات کی علامت تھی کہ وہ ایک ایسی بحث کو، جو اس کے مخاطب کے لیے پریشان کن تھی، خوشگوار انداز سے ختم کرنے کا متمنی ہے۔ ''اگر آپ بروز بدھ میرے غریب خانے پر تشریف لانے کی زحمت گوارا کر سکیں،'' اس نے مزید کہا، ''میں آپ کو شاید کوئی ایسی بات، جو آپ کے لیے دلچسپی کا باعث ہو، بتا سکوں گا کیونکہ اس وقت تک ماگ نتسکی سے میری ملاقات ہو چکی ہوگی۔ مزید برآں، مجھے آپ کے ساتھ تفصیلی تبادلہ خیالات کا موقع بھی میسر آ سکے گا۔''

اس نے اپنی آنکھیں بند کیں، گردن کو خم دیا اور اس کوشش میں کہ کسی کو اس کی روانگی کی کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، وہ خدا حافظ کہے بغیر چپکے سے باہر نکل گیا۔

6

پیٹرز برگ میں اپنے قیام کے ابتدائی ہفتوں میں پرنس آندرے کو معلوم ہوا کہ دیہی فضا میں گوشہ نشینی کی زندگی گزارنے کے دوران میں اس نے سوچنے سمجھنے کی جو عادت اختیار کی تھی، وہ ان ادنیٰ مصروفیات کے باعث، جن میں وہ یہاں شہر میں الجھا رہتا تھا، ختم ہوتی جا رہی ہے۔

* خطاب و انعام یافتگان کا گروہ

شام کو جب وہ گھر لوٹتا، وہ اپنی ڈائری میں ان چار پانچ ملاقاتوں کے، جو اس نے مقررہ اوقات پر مختلف اشخاص سے کرنا ہوتیں اور جن سے وہ کسی صورت میں بھی پہلو نہیں بچا سکتا تھا، اوقات درج کر لیتا۔ اس کی زندگی کچھ اس ڈگر پر چل رہی تھی کہ اس کی اصل قوت کا بیشتر حصہ اسی ادھیڑ بن میں صرف ہو جاتا کہ وہ اپنے دن کی کس طرح تقسیم و ترتیب کرے کہ وہ ہر جگہ وقتِ معینہ پر پہنچ جائے۔ وہ کوئی کام نہیں کرتا تھا بلکہ سوچتا بھی نہیں تھا اور نہ اسے سوچنے کا موقع میسر آتا تھا۔ وہ صرف ان امور کے بارے میں، جن کے متعلق اسے گاؤں میں سوچنے سمجھنے کا خاصا وقت ملا تھا، باتیں کرتا تھا اور وہ یہ باتیں بہت اچھے انداز سے کرتا تھا۔

بعض اوقات اسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک ہی بات ایک ہی روز مختلف حلقوں میں کہہ چکا ہے۔ اس پر اسے بہت کوفت ہوتی۔ لیکن وہ مسلسل کئی کئی ایام ہمہ وقت اتنا مصروف رہتا کہ اسے یہ سوچنے کی فرصت ہی نہ ملتی کہ وہ کچھ نہیں کر رہا۔

جس طرح کوچوبی کے ہاں پہلی ملاقات میں سپے رانسکی نے بلکونسکی کو بے طرح متاثر کیا تھا، اب جب دونوں کی بدھ کو اس کے مکان پر بالمشافہ ملاقات ہوئی اور ان کے درمیان بہت طویل اور راز دارانہ گفتگو ہوئی، اس نے اس کو اور بھی زیادہ متاثر کیا۔

پرنس آندرے جن لوگوں کو حقیر اور بے وقعت تصور کرتا تھا، ان کا شمار ممکن نہیں۔ اس کی یہ شدید آرزو تھی کہ اسے کوئی ایسا آدمی مل جائے، جو کاملیت کا جیتا جاگتا نمونہ ہو۔ وہ خود بھی کامل بننے کی تگ و دو کر رہا تھا۔ چنانچہ جب سپے رانسکی سے اس کی ملاقات ہوئی، تو اس کے لیے یہ یقین کرنا آسان ہو گیا کہ اسے کامل منطقی اور پارسا انسان مل گیا ہے۔ اگر سپے رانسکی کا تعلق بھی سماج کے اسی طبقے سے ہوتا، جس کی وہ خود پیداوار تھا، اگر اس نے بھی وہی تربیت پائی ہوتی اور اسے بھی وہی اخلاقی روایات ورثے میں ملی ہوتیں، تو بلکونسکی بہت جلد اس کے کردار کے کمزور، بودے اور غیر اولوالعزم پہلو تلاش کر لیتا۔ لیکن ہوا یوں کہ سپے رانسکی کی عجیب و غریب اور منطقی ذہنی ساخت نے اس کے دل میں اس کے لیے احترام کا جذبہ اور بھی کوٹ کوٹ کر بھر دیا کیونکہ وہ اس کی پوری تفہیم کرنے سے قاصر تھا۔ علاوہ ازیں سپے رانسکی محض اس بنا پر کہ وہ پرنس آندرے کی خوبیوں کا واقعی معترف تھا اور ان کی تحسین کرتا رہتا تھا یا پھر وہ اسے اپنا حمایتی بنانا بہت ضروری سمجھتا تھا، بہر حال وجہ خواہ کچھ ہی ہو وہ اس کے سامنے کچھ اس قسم کا رویہ اختیار کر لیتا جس سے احساس ہوتا کہ اس سے بڑھ کر اور کوئی معقول انسان ہے ہی نہیں۔ ایسے میں نہ اس پر جذبات غالب آتے اور نہ وہ طیش میں آتا۔ وہ اس کی چاپلوسی کرنے کے لیے خوشامد کی وہ لطیف قسم استعمال کرتا جس کا نخوت اور خود پسندی سے چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے اور اس ان کہے مفروضے پر مشتمل ہوتی ہے کہ آپ کے علاوہ آپ کا ساتھی ہی وہ واحد انسان ہے جو باقی دنیا کی حماقتیں اور آپ کے خیالات کی گہرائی، گیرائی اور حکمت سمجھ سکتا ہے۔

بدھ کی شام دونوں کے مابین جو طویل مکالمہ ہوا، اس کے دوران میں سپے رانسکی نے ایک سے زیادہ مرتبہ

یہ کہا: ''ہم ہر اس چیز کی، جو رسم کہنہ کے معیار سے اونچی ہوتی ہے، قدر کرتے ہیں...'' یا پھر زیر تبسم: ''ہم اس خیال کے حامی ہیں کہ بھیڑیوں کو شکم سیر ہونے کا موقع دیا جائے اور بھیڑوں کی رکھوالی کی جائے...'' یا ''وہ یہ نہیں سمجھ سکتے...'' وہ یہ سب کچھ اس انداز سے کہتا کہ جس سے یہ مترشح ہوتا کہ وہ کہنا یہ چاہتا ہے کہ ''ہم — میں اور آپ — خوب سمجھتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور ہم کون ہیں۔''

پہلی ملاقات کے دوران میں پرنس آندرے کے ذہن پر سپے رانسکی کے بارے میں جو تاثرات مرتسم ہوئے تھے، اس اولین گفتگو نے ان پر مہر ثبت کردی۔ وہ اسے ایک ایسا انسان نظر آیا جس کی دانشِ بے پایاں میں کوئی کلام نہیں تھا، وہ معاملہ فہم تھا، مدبر تھا، سنجیدہ و متین تھا۔ اس نے اپنے زورِ بازو اور استقلال سے قوت و اقتدار کی مسند حاصل کی تھی اور اب اپنے اس اختیار و قوت کو محض روس کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کر رہا تھا۔ پرنس آندرے کی نگاہوں میں سپے رانسکی عین مین وہی انسان تھا جو وہ خود بننا چاہتا تھا۔ یعنی وہ ایک ایسا شخص تھا جو زندگی کے تمام حقائق و مظاہر کی عقلی توجیہہ کرتا تھا، صرف اسی بات کو، جو منطق کے اصولوں پر پورا اترتی تھی، صحیح تسلیم کرتا تھا اور ہر چیز پر منطق کے معیاروں کا اطلاق کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور تھا۔ ہر وہ چیز، جس کی سپے رانسکی تشریح و تعبیر کرتا، اتنی سادہ اور عام فہم نظر آنے لگتی کہ پرنس آندرے بے اختیار ہر نکتے پر آمنا وصدقنا پکار اٹھتا۔ اگر وہ اس سے تکرار کرتا یا اس کی کسی بات پر کوئی اعتراض اٹھاتا، اس کا مقصد یہ جتانا ہوتا کہ اسے اپنی آزادروی عزیز ہے اور وہ اسے برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ وہ ہرگز ہرگز یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ جو کچھ سپے رانسکی کہہ رہا ہے، اس کے ایک ایک حرف سے اتفاق ہے۔ تاہم ہر بات صحیح تھی، ہر چیز وہی تھی جیسے کہ وہ ہونا چاہیے تھی۔ صرف ایک بات پرنس آندرے کو مضطرب کر رہی تھی اور وہ سپے رانسکی کی سرد مہر اور آئینہ نما آنکھیں تھیں۔ جس طرح آئینہ اس چیز کو تو، جو اس کے سامنے آتی ہیں، منعکس کر دیتا ہے لیکن یہ نہیں بتاتا کہ خود اس کے اپنے پیچھے کیا ہے۔ یعنہٖ سپے رانسکی کی آنکھیں دیکھ کر یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا تھا کہ ان کے پس پردہ کیا چیز ہے۔ ان سے صرف یہ عندیہ ملتا تھا کہ پرنس آندرے کو اس کی روح تک رسائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پھر سپے رانسکی کے نرم و نازک اور سپید ہاتھ بھی اس کے لیے پریشانی کا سبب بنے ہوئے تھے۔ بلکونسکی انھیں یوں اضطراری طور پر دیکھ رہا تھا جیسے عام طور پر ان ہاتھوں کو، جو طاقت و اختیار کے مالک ہوں، دیکھا جاتا ہے۔ پرنس آندرے کو سپے رانسکی کی آئینہ نما آنکھوں اور نرم و نازک ہاتھوں پر خواہ مخواہ طیش آ رہا تھا۔ ادھر سپے رانسکی کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کو ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بہ نگاہ تحقیر دیکھتا ہے اور اپنے مقابلے میں انھیں پرکاہ کے برابر بھی نہیں سمجھتا۔ اس کا یہ انداز بھی پرنس آندرے کو نہ بھایا۔ پھر سپے رانسکی اپنے خیالات و آراء کی تائید میں جس طرح گوناگوں دلائل و براہین پیش کر رہا تھا، وہ بھی اس کی طبیعت پر گراں گزرا۔ پرنس آندرے نے دیکھا کہ انسانی عقل اور ذہن جو چال ترکیب یا ہتھکنڈا سوجھا سکتا ہے، سپے رانسکی ان سب کو بروئے کار لا رہا ہے لیکن وہ تمثیلی استدلال کو ہاتھ تک نہیں لگاتا۔ اور جب وہ ایک استدلال سے دوسرے استدلال کی طرف جست لگاتا، یوں محسوس ہوتا کہ یہ اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ایک موقع پر وہ عملی آدمی

کا موقف اختیار کر لیتا اور خیالی منصوبے گھڑنے والوں (visionaries) کے لئے لے رہا ہوتا۔ اگلے لمحے اس کا انداز طنزیہ ہو جاتا اور وہ اپنے مخالفوں پر طنز و تشنیع کے تیر چلا رہا ہوتا۔ پھر وہ پکا منطقی طریق اختیار کر لیتا یا ایکا ایکی مابعد الطبعیات کی قلمرو میں داخل ہو جاتا (اس آخری وسیلے کا وہ خاص طور پر شیدائی معلوم ہوتا تھا)۔ وہ مسئلے کی نوعیت تبدیل کر دیتا اور اسے مابعد الطبعیاتی بلندیوں تک پہنچا دیتا، زمان و مکان اور تصور کی تعریف بتانے لگتا اور جب اس انداز سے ابطال کر لیتا، وہ ایک بار پھر اصل بحث کی سطح پر نیچے اتر آتا۔

پرنس آندرے کو پے رانسکی کی ذہنیت میں جو سب سے بڑی خصوصیت نظر آئی، وہ اس کا عقل کی قوت اور اختیار پر مطلق اور غیر متزلزل یقین تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ ایک بات جسے پرنس آندرے فطرتاً نہایت آسانی سے سمجھ سکتا تھا، وہ اسے کبھی نہیں سمجھ سکے گا کہ آدمی لاکھ زور مارے، وہ جو کچھ سوچتا ہے، اس سب کو بہر حال الفاظ میں بیان کرنے پر قادر نہیں۔ پھر اس کے ذہن میں کبھی اس قسم کا شک وشبہ پیدا نہیں ہوا تھا کہ جو کچھ وہ سوچ رہا ہے یا جس چیز کو وہ صحیح مان رہا ہے، عین ممکن ہے کہ وہ نری خرافات ہو۔ اور پے رانسکی کے ذہن کی یہی وہ انوکھی خصوصیت تھی، جس نے پرنس آندرے کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

اپنے تعلقات کے ابتدائی ایام میں پرنس آندرے اس کا دیوانگی کی حد تک مداح تھا۔ اس کی یہ فریفتگی اس کی اس فریفتگی سے، جو وہ کسی زمانے میں بونا پارت کے لیے محسوس کرتا تھا، کسی طور کم نہ تھی۔ اس حقیقت نے کہ پے رانسکی پادری کا بیٹا تھا اور اس خدشے نے کہ عقل سے کورے لوگ اسے راندۂ درگاہ طبقے کا فرد سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ کچھ اس قسم کی حقارت سے، جو بازاری اور اوچھے لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے (اور حقیقتاً متعدد اشخاص اس کے ساتھ کچھ اس طرح کا برتاؤ کرتے تھے) پیش آنے لگیں، پرنس آندرے کو اس بات پر مائل کیا کہ اس کے دل میں اس کے لیے احترام کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا، اسے وہ سینے سے لگا کر رکھے اور غیر شعوری طور پر اس کی آبیاری کرتا رہے۔

اس اولین شام کو، جو بلکونسکی نے اس کی معیت میں گزاری، پے رانسکی نے قانونی ضوابط میں اصلاحات و ترامیم تجویز کرنے والے کمشن کا ذکر کرنے کے بعد بڑے تمسخرانہ انداز سے کہا: ''یہ کمشن گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے قائم ہے۔ اس پر لاکھوں روبل صرف ہو چکے ہیں لیکن اس نے ابھی تک دھیلے کا کام نہیں کیا ہے۔ البتہ روزن کامپف نے مشابہ دفعات پر چٹیں ضرور چسپاں کر دی ہیں۔''

''اور مملکت نے جو لکھوکھہا روبل صرف کیے ہیں، اس کا اسے بس یہی معاوضہ ملا ہے،'' اس نے کہا۔ ''ہم سینیٹ کو نئے قانونی اختیارات تفویض کرنا چاہتے ہیں لیکن اس مقصد کے لیے ہمارے پاس کوئی قانون نہیں۔ چنانچہ، پرنس، اگر آپ جیسے اصحاب اس موقع پر آگے نہیں آئیں گے، تو یہ بہت بڑا گناہ ہوگا۔''

''اس قسم کے کام کے لیے ضروری ہے کہ آدمی نے قانون کی تعلیم حاصل کی ہو اور میں نے یہ تعلیم نہیں پائی،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''لیکن اور بھی تو کسی نے نہیں پائی۔ پھر آپ کا کیا خیال ہے؟ اس گھمن گھیری سے نکلنے کا کوئی تو راستہ ہونا

چاہیے۔"

❦

ایک ہفتے کے اندر اندر پرنس آندرے کمیٹی برائے عسکری ضوابط کا رکن مقرر ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اسے قانونی ضوابط میں اصلاحات وترمیمات تجویز کرنے والے کمشن کی ایک ذیلی کمیٹی کا چیئرمین۔۔اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا بھی ہو سکے گا۔بنا دیا گیا۔اس نے سپے رانسکی کی درخواست پر ضابطۂ دیوانی کا حصہ اول، جو تشکیل نو کے مراحل میں سے گزر رہا تھا، اپنے ذمے لے لیا اور ان ضوابط کی مدد سے، جو نپولین اور جسٹینین[15] نے ترتیب دیے تھے، شخصی قوانین کے سیکشن کی از سر نو تدوین کرنے لگا۔

7

اس سے تقریباً دو سال قبل، 1808 میں جب پیئر اپنی جاگیروں کے دورے سے واپس لوٹا، اس نے اپنی کسی منصوبہ بندی کے بغیر اپنے آپ کو پیٹرز برگ کے فری میسنوں کی صف اول میں پایا۔لاج میں جو دعوتیں اور تعزیتی اجلاس منعقد ہوتے، وہ ان کا انتظام وانصرام کرتا، نئے ارکان بھرتی کرتا، مختلف لاجوں کو اتحاد کی کڑی میں پرونے اور ان کے لیے مصدقہ چارٹر حاصل کرنے کے کام میں زور شور سے حصہ لیتا۔میسنی معبدوں کی تعمیر کے لیے روپیہ پیسہ فراہم کرتا اور خیراتی مقاصد کے لیے حاصل کردہ رقوم میں، جن کے بارے میں ارکان کی اکثریت بڑی خست دکھاتی اور بالکل بے قاعدگی سے چندہ دیتی تھی، اضافہ کرنے کے لیے جو بن پڑے کرتا۔جماعت نے پیٹرز برگ میں جو محتاج گھر قائم کیا تھا، وہ تقریباً تن تنہا اس کے اخراجات برداشت کرتا تھا۔

دریں اثنا اس کی زندگی اسی سابقہ ڈگر پر چلتی رہی۔اس کی فریفتگیوں، عیاشیوں اور خرمستیوں میں کوئی کمی نہ آئی۔اسے ڈٹ کر کھانا اور پینا پسند تھا۔کنواروں کے حلقوں میں، جن میں وہ گھومتا پھرتا تھا، جو تفریحات مقبول تھیں، اگرچہ وہ انھیں غیر اخلاقی اور معیوب تصور کرتا تھا، تاہم وہ ان میں شریک ہوئے بنا رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ اپنی مصروفیات کے اس طوفان بدتمیزی کے مابین پیئر کو محسوس ہونے لگا کہ وہ جتنی زیادہ استقامت سے فری میسنری کی سرزمین پر، جس پر اس نے کھڑے ہونے کا فیصلہ کیا تھا، پاؤں ٹکانے کی کوشش کرتا ہے، وہ اتنی ہی زیادہ اس کے پیروں تلے کھسک رہی ہے۔اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ زمین جتنی زیادہ اس کے پیروں کے نیچے دھنستی جا رہی ہے وہ خود اتنا ہی زیادہ اس میں پھنستا جا رہا ہے اور باہر نکلنے کا راستہ مسدود ہوتا جا رہا ہے۔جب وہ نیا نیا برادری میں شامل ہوا تھا، اسے جس نوعیت کے احساسات کا تجربہ ہوا تھا، وہ اس شخص کے، جس نے بڑے پراعتماد انداز سے دلدل کی ہموار سطح پر پاؤں دھرا ہو، مشابہ تھے۔جب اس نے ایک پاؤں رکھ دیا، وہ نیچے دھنسنے لگا۔اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ نیچے زمین پختہ ہے، اس نے اپنا دوسرا پاؤں بھی دھر دیا اور مزید

نیچے دھنس گیا۔ جب وہ دلدل میں پوری طرح پھنس گیا، وہ اس میں گھٹنوں گھٹنوں چلنے پر مجبور ہو گیا۔

آئی اوسپ الیکسی وچ پیٹرز برگ سے غیر حاضر تھا۔ (اس نے حال ہی میں پیٹرز برگ کی لاجوں کے امور سے اپنے آپ کو علیحدہ کر لیا تھا اور اب کبھی ماسکو سے باہر نہیں جاتا تھا۔) لاجوں کے سبھی ارکان ان اشخاص پر مشتمل تھے، جن سے پیئر کا روزمرہ زندگی میں واسطہ پڑتا رہتا تھا۔ اس کے لیے انھیں محض فری میسن گردانتا اور انھیں پرنس ب یا ایوان واسیلی وچ د نہ سمجھنا دشوار تھا۔ وہ ان لوگوں کی رگ رگ سے واقف تھا اور انھیں معاشرے کے کمزور اور نکھٹو افراد تصور کرتا تھا۔ میسنوں کی حیثیت سے وہ جو ایپرن پہنتے اور اپنے سینوں پر جو امتیازی نشانات چسپاں کرتے تھے، وہ خوب جانتا تھا کہ عام زندگی میں وہ ان کے نیچے کس قسم کی وردیاں پہننے، عہدوں کے نشانات لگانے اور تمغے سجانے کی حسرتیں دلوں میں پالے ہوئے ہیں۔ خیراتی مقاصد کے لیے چندے اکٹھے کرنے اور بیس سے تیس روبل تک رقوم کا، جن کا بیشتر حصہ محض مواعید پر مشتمل ہوتا تھا (حالانکہ ان میں سے نصف ارکان اتنے ہی مرفہ الحال تھے جتنا کہ وہ خود تھا)، شمار کرنے کے بعد وہ میسنوں کے اس حلف کے، جس کے تحت ہر رکن نے یہ عہد کیا ہوتا تھا کہ وہ اپنا سارا سرمایہ اپنے پڑوسیوں کے لیے وقف کر دے گا، متعلق سوچنے لگتا اور اس کے دل میں شکوک سر اٹھانے لگتے۔ اس کی کوشش یہی ہوتی کہ وہ اس بارے میں زیادہ نہ سوچے۔

وہ جن برادران کو جانتا تھا، اس نے انھیں چار زمروں میں تقسیم کر دیا۔ اس نے پہلے زمرے میں ان لوگوں کو رکھا جو نہ تو لاجوں کے اور نہ عام انسانوں کے امور میں کوئی فعال حصہ لیتے تھے۔ ان کی مصروفیات کا دائرہ جماعت کے محض علوم خفی تک محدود تھا۔ بہ الفاظ دیگر وہ صرف اس قسم کے مسائل، جن کا تعلق خدا کی سہ چند صفات یا اساسی عناصر ثلاثہ — گندھک، پارہ اور نمک[16] — یا مربع کے مفہوم یا ہیکل سلیمانی کی مختلف اشکال کے مطالب سے تھا، الجھے رہتے تھے۔ پیئر اپنے برادر میسنوں کے اس طبقے کا، جو زیادہ تر بشمول خود آئی اوسپ الیکسی وچ اور دوسرے قدیم ارکان پر مشتمل تھا، احترام کرتا تھا لیکن وہ ان کی دلچسپیوں میں شریک نہیں ہوتا تھا۔ اس کے لیے فری میسنری کے باطنی پہلو میں کوئی کشش نہیں تھی۔

دوسرے زمرے میں وہ اپنا اور اپنے جیسے دیگر ارکان کا، جو جستجو اور تذبذب کے بیچ لٹکے ہوئے تھے، شمار کرتا تھا۔ انھیں ابھی تک فری میسنری میں سیدھا اور قابل فہم راستہ سجھائی نہیں دیا تھا لیکن انھیں توقع تھی کہ وہ عنقریب اس کا سراغ لگا لیں گے۔

تیسرے زمرے میں اس نے ان برادران کو، جنھیں فری میسنری میں خارجی مظاہر اور رسوم کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آتا تھا (اور اکثریت انھی لوگوں کی تھی)، شامل کیا۔ انھیں بس ان رسوم کی کڑی ظاہری ادائیگی عزیز تھی، اس کی روح یا معانی سے کوئی سروکار نہ تھا۔ ولارسکی بلکہ سپریم لاج کا گرینڈ ماسٹر بھی انھیں میں شامل تھا۔

آخری اور چوتھے زمرے میں بھی اس نے برادران کی خاصی بڑی تعداد شمار کی۔ ان میں خاص طور پر وہ لوگ شامل تھے، جو حالیہ ایام میں جماعت کے ارکان بنے تھے۔ جہاں تک پیئر مشاہدہ کر سکا تھا، یہ وہ اشخاص تھے جنھیں

نہ تو کسی چیز پر اعتقاد تھا اور نہ وہ کچھ کرنے کے آرزومند تھے۔ یہ فری میسنوں میں محض اس لیے شامل ہوئے تھے تاکہ انھیں لاج کے ان کھاتے پیتے نوجوان ارکان کے، جو اپنے مراتب یا تعلقات کی بنا پر اثرورسوخ کے مالک تھے، ساتھ گھل مل جانے کے مواقع میسر آسکیں۔

جو کچھ پیئر کر رہا تھا، وہ اس سے غیر مطمئن ہونے لگا۔ بعض اوقات اسے محسوس ہونے لگتا کہ فری میسنری، بہرحال اس نے جو کچھ یہاں دیکھا تھا اس کے مطابق، محض ظواہر ہی پر مبنی ہے۔ یہ تو اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ خود فری میسنری کو شکوک کی نگاہوں سے دیکھے گا تاہم اسے اتنا شبہ ضرور تھا کہ روسی فری میسنری غلط پٹڑی پر چڑھ گئی ہے اور اپنے اصل اصولوں سے انحراف کر چکی ہے۔ چنانچہ وہ سال کے اختتام پر ممالک غیر کے سفر پر روانہ ہو گیا تاکہ وہ جماعت کے اعلیٰ اسرار تک رسائی حاصل کر سکے۔

❖

1809 کے تابستان میں پیئر پیٹرز برگ لوٹ آیا۔ ہمارے اور غیر ملکی فری میسنوں کے مابین جو خط کتابت ہوئی، اس سے اندازہ ہوا کہ بزوخوف متعدد ایسے اشخاص کا، جو نہایت اعلیٰ درجات پر فائز تھے، اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب رہا ہے، اسے بہت سے اسرار و رموز سے آگاہ کر دیا گیا ہے، اعلیٰ درجے میں داخل کر لیا گیا ہے اور وہ اپنے ساتھ بہت کچھ، جو روس میں فری میسنری کے مقاصد کو آگے بڑھانے میں کافی ممد ثابت ہوگا، لا رہا ہے۔ پیٹرز برگ کے میسن اس سے ملنے آئے، انھوں نے اس کے دل میں گھر کرنے کی کوشش کی اور ان سب کا یہ خیال تھا کہ وہ ان کے سامنے کسی چیز کا انکشاف کرنے کے لیے پر تول رہا ہے۔

دوسرے درجے کی لاج کے باضابطہ اجلاس کا اہتمام کیا گیا۔ پیئر نے وعدہ کیا کہ جماعت کے اعلیٰ ترین قائدین نے اسے جو پیغام تفویض کیا ہے، وہ اس کی تفصیلات اجلاس میں پیش کرے گا۔ اجلاس میں سبھی ارکان شامل ہوئے۔ معمول کی رسوم کے بعد پیئر اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے اپنا خطاب شروع کر دیا۔

''عزیز برادران،'' اس نے اپنی تقریر کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ وہ شرما رہا تھا اور اس کی زبان لکنت کھا رہی تھی۔ اس نے تقریر کا مسودہ ہاتھ میں تھام رکھا تھا۔ ''محض اتنا ہی کافی نہیں کہ ہم اپنی مخفی رسوم لاج کی خلوتوں میں ادا کرتے رہیں۔ بلکہ ہمیں عملاً... عملاً کچھ کرنا چاہیے۔ ہمیں لوریاں سنا کر سلا دیا گیا ہے جب کہ ہمیں عملاً کچھ کرنا چاہیے!'' پیئر نے مسودے کے اوراق کھولے اور انھیں پڑھنے لگا: ''خالص سچائی کی تبلیغ اور نیکی کے فروغ کے لیے ہمیں انسانوں کو تعصبات سے چھٹکارا دلانا چاہیے، زمانے کے رجحانات سے ہم آہنگ اصولوں کی ترویج کرنا چاہیے، نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے انتظامات کرنا چاہئیں، انتہائی روشن خیال انسانوں کے ساتھ ناقابل تحلیل اور پائیدار رشتے استوار کرنا چاہئیں، بڑی دلیری لیکن زیرکی کے ساتھ توہمات، زندقہ والحاد اور حماقتوں کے خلاف صف آرا ہونا چاہیے اور وہ لوگ، جو ہمارے ہم خیال ہوں، ان کے ساتھ مل کر ایک ایسی جماعت، جسے مقصد واحد

نے ایک لڑی میں پرو دیا ہو اور جو اختیارات اور قوت سے بہرہ ور ہو، تشکیل دینا چاہیے۔

''اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں یہ کوشش کرنا ہوگی کہ بدی کے مقابلے میں نیکی کو تفوق حاصل ہو اور ہمیں اس امر کے لیے پورا زور لگانا ہوگا کہ دیانت دار آدمی کو ابدی اجر اسی دنیا میں مل سکے۔ لیکن ہماری ان کوششوں کی راہ میں موجودہ سیاسی ادارے سنگ ہائے گراں بنے ہوئے ہیں۔ پھر ان حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ انقلابات کا خیر مقدم کریں، ہر چیز کو تہس نہس کر دیں، طاقت کا مقابلہ طاقت سے کریں؟ نہیں، بالکل نہیں۔ اس قسم کے اقدامات سے ہمیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ ہر پرتشدد اصلاح زجر و توبیخ کی سزاوار ہے کیونکہ جب تک انسان جو ہیں، وہی رہتے ہیں، یہ طریق کار کسی انداز سے بھی بدی کا علاج نہیں بن سکتا۔ اس کی ضرورت اس لیے بھی نہیں ہے کہ کیونکہ حکمت تشدد کی محتاج نہیں ہے۔

''ہماری جماعت کے پورے منصوبے کی اساس یہ ہونا چاہیے کہ ہمیں باکردار اور صالح اشخاص پیدا کرنا ہیں۔ ان تمام اشخاص کے اذہان میں یہ عقیدہ، جو انھیں ایک دوسرے کے ساتھ ایک لڑی میں منسلک کر دے گا، راسخ کرنا ہوگا کہ انھیں ہر جگہ اور ہر ذریعے سے بدی اور حماقت کو بیخ و بن سے اکھاڑنا ہے، لیاقت اور نیکی کی ترویج کرنا ہے، مستحق انسانوں کو خاک سے اٹھانا اور انھیں اپنی برادری میں شامل کرنا ہے۔ جب یہ کام ہو جائے گا، تبھی ہماری جماعت کو اتنی قوت حاصل ہو سکے گی کہ ہم غیر محسوس طریقے سے بدی اور بدنظمی کے پرچارکوں کے ہاتھ باندھ سکیں گے اور ان پر یوں قبضہ پا لیں گے کہ انھیں اس کا پتا بھی نہیں چل سکے گا۔ قصہ مختصر، جس چیز کی ضرورت ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ایسی حکومت، جو عالمی اختیارات کی حامل ہو، تشکیل دی جائے۔ اس حکومت کا سکہ تو کُل عالم پر چلے گا لیکن وہ مقامی شہری معاملات میں دخیل نہیں ہوگی۔ اس کے تحت تمام مقامی حکومتیں اپنے روایتی انداز سے کام کرتی رہیں گی۔ تاہم انھیں اس امر کی قطعاً کوئی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ ہماری جماعت کے عظیم مقصد — بدی پر نیکی کا غلبہ — کی راہ میں روڑے اٹکا سکیں۔ خود عیسائیت کا بھی یہی مقصد ہے۔ اس نے لوگوں کو دانائی اور نیکی کی تعلیم دی اور انھیں یہ سکھایا کہ ان کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ بہترین اور عقلمند انسانوں کے نقشِ قدم پر چلیں اور ان کے اصولوں اور مثالوں پر عمل کریں۔

''ان زمانوں میں، جب ہر چیز ظلمت میں مستور تھی، محض پند و نصائح کافی ہوتے تھے کیونکہ سچائی کی ندرت اسے انوکھی قوت عطا کر دیتی تھی، لیکن موجودہ زمانے میں ہم کہیں زیادہ طاقت ور ذرائع کا سہارا لینے پر مجبور ہیں۔ آج کے انسان کے اعصاب پر اس کے حواس سوار ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے نیکی میں ٹھوس کشش نظر آئے۔ جسمانی جذبات و خواہشات کا گلا نہیں گھونٹا جا سکتا۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ ہم ان کا رخ نیک مقاصد کی طرف موڑ دیں۔ چنانچہ ضرورت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہر شخص کو یہ موقع ملنا چاہیے کہ وہ نیکی کی حدود کے اندر اپنے نفسانی جذبات و خواہشات کی تسکین کر سکے۔ اور ہماری جماعت کو اس مقصد کے حصول کے لیے ذرائع فراہم کرنا چاہئیں۔

''جونہی ہمیں ہر خطے میں قابل قدر اشخاص، جن میں ہر ایک اپنی باری پر دو دوسروں کی تربیت کرے گا اور سبھی باہم یک دیگر ہو کر اپنے فرائض سرانجام دیں گے، ایک خاص تعداد میں میسر آ گئے، ہماری جماعت کے لیے جو بنی نوع انسان کی بھلائی کی خاطر پہلے ہی خفیہ خفیہ اتنا کچھ پایہ تکمیل تک پہنچا چکی ہے، ہر کام ممکن ہو جائے گا۔''

اس تقریر کا نہ صرف یہ کہ حاضرین پر زبردست اثر ہوا، بلکہ اس نے لاج میں ایک قسم کا ہنگامہ بھی بپا کر دیا۔ برادران کی اکثریت کو اس میں جرمنی کے فرقہ عقلیہ و جمہوریہ[17] کے خطرناک نظریات نظر آئے۔ چنانچہ ان کا ردعمل اتنا سرد مہرانہ تھا کہ پیئر حیران و پریشان ہو گیا۔ گرینڈ ماسٹر نے اعتراضات کی بوچھاڑ کر دی اور پیئر اور بھی جوش و خروش سے اپنے نظریات کی وضاحت کرنے لگا۔ اتنا ہنگامہ خیز اجلاس طویل مدت کے بعد ہوا تھا۔ لاج دو فریقوں میں تقسیم ہو گیا۔ ایک فریق اس پر عقلیہ و جمہوریہ فرقے کا حامی ہونے کا الزام لگا رہا تھا اور دوسرا اس کی حمایت کر رہا تھا۔ پیئر کو پہلی مرتبہ اس اجلاس میں یہ شدید احساس ہوا کہ انسانوں کے اذہان کچھ اتنی اقسام میں بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا شمار ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کسی بھی دو اشخاص کو حقیقت ایک جیسی نظر نہیں آتی۔ ان ارکان نے بھی، جو بظاہر اس کے طرف دار نظر آتے تھے، اس کی باتوں کا مفہوم اپنے اپنے انداز سے لیا۔ ان کی اگر مگر کچھ اس نوعیت کی تھی کہ پیئر کے لیے ان سے متفق ہونا ممکن نہیں تھا کیونکہ اس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک اس طرح پہنچائے جس طرح کہ وہ خود انھیں سمجھتا تھا۔

پیئر نے جس زبردست جوش و خروش سے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا، اس پر گرینڈ ماسٹر نے اجلاس کے اختتام پر اسے سرزنش کی۔ اس نے طنز اور بغض کے تیر چلاتے ہوئے کہا: ''اس نزاعی بحث میں جس جذبے نے پیئر کی رہنمائی کی ہے، وہ محض یہ نہیں کہ اسے نیکی سے بڑا پیار ہے بلکہ یہ ہے کہ اسے فساد کرانے کا بہت شوق ہے۔'' پیئر نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے مختصراً صرف یہ دریافت کیا: ''آپ حضرات کو میری تجویز منظور ہے؟'' اسے بتایا گیا کہ ''نہیں۔'' وہ معمول کی رسمی کارروائی کا انتظار کیے بغیر لاج سے باہر نکل آیا اور اپنے گھر چلا گیا۔

8

پیئر پر پھر وہی افسردگی، جس سے وہ اتنا خائف تھا، طاری ہو گئی۔ لاج میں تقریر کرنے کے بعد وہ تین دن[18] اپنے گھر صوفے پر لیٹا رہا۔ اس عرصے کے دوران میں اس نے نہ کسی شخص سے ملاقات کی اور نہ وہ کہیں باہر گیا۔

یہی وہ ایام تھے جب اسے اپنی بیوی کا خط ملا۔ اس نے بڑی لجاجت سے اس سے یہ التجا کی تھی: ''آپ مجھے ملنے تشریف لائیں۔ میں اپنے کیے پر بہت پشیمان ہوں اور میری آرزو صرف یہ ہے کہ میں اپنی بقیہ زندگی آپ کے چرنوں میں گزار دوں۔'' خط کے اواخر میں اس نے یہ اطلاع دی تھی کہ وہ ایک دو روز میں دساور سے واپس پیٹرزبرگ پہنچ رہی ہے۔

اس خط کے پیچھے پیچھے ایک ایسا فری میسن، جس کا پیئر کے دل میں قطعاً کوئی احترام نہیں تھا، آدھمکا اور

اس کی تنہائی میں مخل ہوا۔ اس نے اپنی گفتگو کی تان اس کے ازدواجی معاملات پر توڑی۔ اس نے اسے برادرانہ مشورہ دیتے ہوئے اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ وہ نادم و پشیمان شخص کو معاف نہ کر کے فری میسنری کے اولین اصولوں کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو رہا ہے۔

اسی دوران میں اس کی خوش دامن، پرنس واسیلی کی اہلیہ، نے اسے ایک ملتجیانہ خط تحریر کیا۔ اس میں اس نے التماس کی تھی: ''خواہ چند منٹ کے لیے سہی، آپ مجھے ملنے ضرور بالضرور تشریف لائیں۔ مجھے آپ کے ساتھ نہایت اہم معاملے کے بارے میں بات کرنا ہے۔'' پیئر تاڑ گیا کہ اس کے خلاف سازش ہو رہی ہے، ان لوگوں کا ارادہ اس کی بیوی کے ساتھ اس کی صلح کرانا ہے اور جس قسم کی ذہنی کیفیت میں وہ اس وقت گزر رہا تھا، اس میں یہ بات خود اس کے اپنے لیے ناگوار نہیں تھی۔ اس کے لیے اب سب برابر تھا۔ زندگی میں کسی چیز کی کوئی خاص اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ جس قسم کی افسردگی نے اس پر غلبہ پا لیا تھا، اس کے زیر اثر اس کے نزدیک نہ اپنی آزادی کی کوئی قدر و قیمت باقی رہ گئی تھی اور نہ اپنی بیوی کو سزا دینے کی ضد۔

''کوئی بھی سچا نہیں، کسی کو بھی مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔ چنانچہ اس پر کوئی الزام نہیں دھرا جا سکتا،'' اس نے سوچا۔

اگر وہ اپنی بیوی کے ساتھ فوری صلح پر آمادہ نہ ہوا، تو اس کی وجہ محض یہ تھی کہ افسردگی کی جو کیفیت اس پر طاری ہو چکی تھی، اس کے دوران میں اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ اس میں کسی کام کا بیڑا اٹھانے کا یارا نہیں۔ اگر ان ایام میں اس کی بیوی اس کے پاس آ جاتی، وہ اسے گھر سے باہر نہ نکالتا۔ وہ جس ادھیڑ بن میں مصروف تھا، اس کے مقابلے میں کیا یہ بات توجہ کے قابل رہ جاتی ہے کہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ رہتا ہے یا نہیں؟

اپنی بیوی یا خوش دامن کے خطوط کا جواب دیے بغیر وہ ایک روز، جب رات ڈھل چکی تھی، چپ چاپ ماسکو روانہ ہو گیا۔ اس کا مقصد آئی اوسپ الیکسی وچ سے ملاقات کرنا تھا۔ اس نے اپنے روزنامچے میں جو کچھ تحریر کیا، درج ذیل ہے:

ماسکو: 17 نومبر:

میں ابھی ابھی اپنے محسن سے مل کر آ رہا ہوں۔ میں نے جو کچھ وہاں محسوس کیا، اسے فی الفور سپرد قلم کر رہا ہوں۔ آئی اوسپ الیکسی وچ غربت و افلاس کی چکی میں پس رہا ہے اور گزشتہ تین برسوں سے مثانے کے کسی موذی مرض میں مبتلا ہے۔ کسی شخص نے بھی نہ تو کبھی اسے کراہتے اور نہ حرف شکایت زبان پر لاتے دیکھا ہے۔ صبح سویرے سے رات گئے تک وہ مطالعے میں مستغرق رہتا ہے۔ اس دوران میں وہ سادہ غذا کھانے اور حوائج ضروریہ سے فارغ ہونے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا۔ اس نے بکمال شفقت میرا خیر مقدم کیا اور جس بستر پر دراز تھا، اس پر مجھے بٹھایا۔ میں نے اس کے سامنے مشرق اور یروشلم کے سرداروں کی علامات بنائیں اور

اس نے اسی انداز سے مجھے جواب دیا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار تبسم تھا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں پرشیا اور سکاٹ لینڈ کی لاجوں سے کیا سیکھ کر آیا ہوں۔ اپنی بساط کے مطابق مجھ سے جو کچھ بن پڑا، میں نے اسے بتایا اور اس کے سامنے ان اصولوں کا بھی، جو میں نے پیٹرز برگ کی لاج کے سامنے پیش کیے تھے، اعادہ کیا۔ میری تجاویز کے بارے میں وہاں جو مخالفانہ ردعمل ہوا تھا اور برادران کے ساتھ میری جو جھڑپ ہوئی تھی، میں نے اس کے متعلق بھی اسے آگاہ کیا۔ آئی اوسپ کچھ دیر خاموش رہا اور سوچ بچار کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ان امور کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر بیان کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ معاً میرا تمام ماضی نکھر کر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا اور مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اب آئندہ مجھے کیا لائحہ عمل اپنانا ہو گا۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے مجھ سے دریافت کیا کہ آیا مجھے جماعت کے سہ گونہ مقاصد یاد ہیں: 1۔ سِرّ و رمز کا مطالعہ اور تحفظ 2۔ اس کی پذیرائی کے لیے اپنے نفس کی اصلاح اور تزکیہ۔ 3۔ اس تزکیے کی خاطر جدوجہد کے ذریعے بنی آدم کی تہذیب و درستگی۔ پھر اس نے مجھ سے پوچھا کہ ان تینوں مقاصد میں سے اولین اور اہم ترین کون سا ہے؟ لاریب اپنے نفس کی اصلاح اور تزکیہ۔ یہی وہ مقصد ہے جس کی خاطر ہم ہر قسم کے حالات سے، خواہ وہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، بے نیاز ہو کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی صرف یہی وہ مقصد ہے جو یہ تقاضا کرتا ہے کہ ہم اس کے حصول کے لیے پوری تندہی سے کوشش کریں لیکن ہوتا کیا ہے۔ یہی کہ ہمارا تکبر ہمیں صحیح راستے سے بھٹکا دیتا ہے، ہم اس مقصد کو فراموش کر دیتے ہیں اور یا تو سِرّ و رمز کی، جس کی، اپنی آلائشوں کے سبب، ہم پذیرائی کرنے کے اہل نہیں ہوتے، کھوج میں مصروف ہو جاتے ہیں یا پھر بنی آدم کی تہذیب و درستگی کا فریضہ اپنے ذمے لے لیتے ہیں اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم عملاً بدترین فسق و فجور اور خباثت کی مثالیں پیش کر رہے ہیں۔ عقلیت و جمہوریت صحیح معنوں میں خالص نظریہ نہیں کیونکہ اس کا رجحان دنیوی معاملات کی طرف ہے اور اس کے غبارے میں تکبر کی ہوا بھری ہوئی ہے۔ میں نے جس قسم کی تقریر کی تھی اور جس طرح کی سرگرمیوں میں ملوث رہا ہوں، آئی اوسپ الیکسی وچ نے اسی بنیاد پر اس کی مذمت کی۔ میں نے جب اپنے نہاں خانۂ دل میں جھانک کر دیکھا، اپنے آپ کو اس سے متفق پایا۔ میرے خانگی امور کا ذکر کرتے ہوئے اس نے مجھ سے کہا: ”جیسا کہ میں تمھیں بتا چکا ہوں کہ میسن کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ اپنی ذات کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرے لیکن ہم اکثر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ہماری زندگی میں جو مشکلات وارد ہوتی ہیں، اگر ہم ان سب کا قلع قمع کر دیں، ہم بہت جلد اور باآسانی اپنا مقصد حاصل کر لیں گے۔ اس کے برعکس، میرے محترم، اگر ہم دنیوی تفکرات کے بھنور میں گھرے رہیں، ہم اپنے تینوں بڑے مقاصد حاصل کر سکتے ہیں: 1۔ شعورِ ذات: آدمی اپنا دوسروں سے مقابلہ کرنے کے بعد ہی اپنی ذات سے آگہی حاصل کر سکتا ہے۔ 2۔ تکمیلِ ذات: اس کا حصول صرف کشمکش اور جدوجہد سے ہی ممکن ہے۔ 3۔ حسنۂ عظیم۔ حُبِّ موت۔ زندگی کے محض نشیب و فراز

سے ہی ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ زندگی ہیچ ہے، موت سے ہمارا لگاؤ فطری اور خلقی ہے اور موت کے بعد ہم پھر سے جنم لیں گے اور نئی زندگی بسر کریں گے۔'' یہ الفاظ اس لیے بھی غیر معمولی تھے کیونکہ اپنی تمام جسمانی تکالیف اور عوارض کے باوجود آئی اوسپ الیکسی وچ کبھی بھی زندگی سے بیزار نہیں ہوا حالانکہ وہ موت سے پیار کرتا ہے اور جس کے لیے۔ اپنی تمام تر روحانی بالیدگی اور پاکیزگی کے باوجود۔ وہ اپنے آپ کو کافی حد تک تیار نہیں پاتا۔ اس کے بعد میرے محسن نے تخلیق کے مربع عظیم کی پوری اہمیت اجاگر کی اور مجھے بتایا کہ تین اور سات کے اعداد ہر چیز کی اساس ہیں۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں پیٹرزبرگ کے برادران سے قطع علائق نہ کروں۔ ''لاج کے درجہ دوم کے جو فرائض تم پر عائد ہوتے ہیں،'' اس نے کہا، ''انھیں نبھاتے چلے جاؤ اور اس کے ساتھ ساتھ یہ کوشش کرتے رہو کہ برادران تکبر کی راہ اختیار نہ کرنے پائیں بلکہ انھیں تکمیلِ ذات اور شعورِ ذات کا صحیح راستہ دکھاتے رہو۔ علاوہ ازیں جہاں تک تمھاری اپنی ذات کا تعلق ہے، میرا مشورہ یہ ہے کہ تمھیں سب سے بڑھ کر اپنی ذات کی نگرانی کرنا چاہیے۔'' اس نے مجھے ایک نوٹ بک دی۔ میں اسی پر یہ سب کچھ تحریر کر رہا ہوں اور آئندہ بھی اپنے تمام اعمال و افعال کا اندراج اس میں کرتا رہوں گا۔

پیٹرزبرگ: 23 نومبر:

میں ایک بار پھر اپنی اہلیہ کے ساتھ رہ رہا ہوں۔ میری خوش دامن بہ چشمِ نم میرے پاس آئی اور کہنے لگی کہ ہیلین واپس آ گئی ہے۔ اس نے مجھ سے التجا کی کہ ''کم از کم اس کی بات تو سن لو۔ وہ بے قصور ہے اور اس بات پر بہت دکھی ہے کہ میں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔'' اس نے اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کہا۔ میں جانتا تھا کہ اگر ایک مرتبہ میں نے اس سے ملاقات کرنے پر آمادگی کا اظہار کر دیا، پھر میرے پاس اس کی خواہشات پر عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہیں رہ جائے گا۔ میں جس مخمصے میں پھنس چکا تھا، کچھ میں نہیں آتا تھا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کس کو آواز دوں، کس سے مشورہ کروں اور کس سے استمداد طلب کروں۔ اگر میرا محسن یہاں ہوتا، وہ مجھے بتاتا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میں کمرے میں بند ہو کر بیٹھ گیا، آئی اوسپ کے تمام خطوط کا از سرِ نو مطالعہ کیا، اس کے ساتھ میرے جتنے مکالمے ہوئے تھے، ان سب کو یاد کیا اور یہ سب کچھ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ مجھے مستدعی کو ٹھکرانا نہیں چاہیے اور مجھے ہر شخص کی۔۔ خاص طور پر ایک ایسی ہستی کی، جس کی میرے ساتھ اتنی قرابت تھی۔۔ دست گیری کرنا چاہیے اور اپنی صلیب آپ اٹھانا چاہیے۔ لیکن اگر میں اسے محض اس بنا پر معاف کر رہا ہوں کہ میں راستی کے راستے پر چلنا چاہتا ہوں، پھر اس کے ساتھ میرا اسمبندھ محض روحانی ہونا چاہیے۔ یہی میرا فیصلہ تھا اور یہی کچھ میں نے آئی اوسپ الیکسی وچ کو تحریر کیا۔ میں نے اپنی بیوی سے کہا: ''میں تم سے التماس کرتا ہوں کہ ماضی کو بھول جاؤ۔ اگر میں نے تمھارے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے، تو مجھے معاف کر دو۔ جہاں تک میرا

تعلق ہے، کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کے لیے میں تمھیں معاف کروں۔'' جب میں یہ سب کچھ اس سے کہہ چکا، مجھے بہت خوشی ہوئی۔ خدا کرے کہ اسے یہ کبھی معلوم نہ ہو کہ اس کی دوبارہ شکل دیکھنا میرے لیے کتنا اذیت ناک تھا! میں اس وسیع وعریض محل کی بالائی منزل پر متمکن ہو گیا ہوں اور احیائے نو کے خوشگوار تجربے سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔

9

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، اس زمانے میں بھی معاشرے کا اعلیٰ ترین طبقہ، جو دربار اور اجتماعی رقص کی تقریبات میں آپس میں میل ملاقات کرتا رہتا تھا مختلف حلقوں میں منقسم تھا اور ہر حلقے کا اپنا مخصوص لہجہ تھا۔ ان میں سب سے بڑا۔ جس کے کاؤنٹ رومانت سیف[19] اور مارکوئیس ڈکولین کوٹ[20] روحِ رواں تھے۔ متصف بہ فرانسیسی حلقہ تھا۔ یہ حلقہ نپولین کے ساتھ اتحاد کا حامی تھا۔ جونہی ہیلین نے پیٹرز برگ میں اپنے خاوند کے محل میں دوبارہ پاؤں جما لیے، اسے اس حلقے میں نمایاں مقام حاصل ہو گیا۔ وہ لوگ جو سیاسی اعتبار سے اس حلقے کے نقطۂ نظر کے حامی تھے اور اپنی دانش وفراست اور تہذیب وشائستگی کے سبب نمایاں حیثیت کے حامل تھے، جوق در جوق اور بکثرت اس کے ڈرائنگ روم میں آنے جانے لگے۔ فرانسیسی سفارت خانے کے ارکان بھی ان میں شامل تھے۔

جن ایام میں ارفورٹ[21] کے مقام پر دونوں امپراطوروں کی مشہور ملاقات ہوئی تھی، ہیلین وہیں موجود تھی۔ وہیں اس نے اس زمانے کی اہم ترین یورپی شخصیات سے، جو نپولین کی حامی تھیں، یہ روابط استوار کیے تھے۔ ارفورٹ میں اسے ایک زبردست کامیابی نصیب ہوئی تھی۔ ایک دفعہ تھیٹر میں خود نپولین کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے دریافت کیا کہ یہ خاتون کون ہے اور وہ اس کے حسن وجمال کے قصیدے پڑھنے لگا۔ حسین وجمیل اور متعلیق و شائستہ خاتون کی حیثیت سے وہ جس طرح محافل پر چھا جاتی رہی، پیئر کو اس پر مطلق تعجب نہ ہوا، کیونکہ جوں جوں وقت آگے بڑھ رہا تھا توں توں اس کے حسن میں نکھار آتا جا رہا تھا۔ لیکن جس چیز نے اسے واقعی حیرت میں مبتلا کیا، وہ یہ تھی کہ ان گزشتہ دو برسوں کے دوران میں اس کی شریک حیات یہ شہرت کمانے میں کامیاب وکامران رہی تھی: ''یہ پرکشش خاتون جتنی خوبصورت ہے، اتنی ہی بذلہ سنج بھی ہے۔'' نامور پرنس ڈلینے[22] اسے آٹھ آٹھ صفحات کے خطوط لکھا کرتا تھا۔ بلیبن نے اپنے جو ظریفانہ جملے سینت سینت کر رکھے ہوئے تھے، اب وہ انھیں پہلی مرتبہ کاؤنٹس بزوخوا کی موجودگی میں استعمال کر رہا تھا۔ جس شخص کو کاؤنٹس بزوخوا کی محفل میں اذنِ باریابی مل جاتا، اس کی دانش وفراست پر مہر ثبت ہو جاتی۔ نوجوان اشخاص ہیلین کی محافل میں شریک ہونے سے قبل کتب کا دقیق مطالعہ کرتے تاکہ وہ اس کے ڈرائنگ روم میں کچھ کہہ سکیں۔ سفارت خانوں کے سیکرٹری، بلکہ خود سفیران کرام بھی، اسے سفارتی رازوں میں اپنا محرم بناتے تھے۔ یوں ایک اعتبار سے ہیلین اچھی خاصی قوت بن گئی تھی۔

پیئر کبھی کبھار اس کی محفلوں اور عشائیوں میں، جہاں سیاست، شاعری اور فلسفے پر بحث وتمحیص ہوتی تھی، شرکت

کیا کرتا تھا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ نہایت احمق عورت ہے، وہ جب اس کی گفتگو سنتا، اسے عجیب وغریب احساسات کا تجربہ ہونے لگتا۔ ایک طرف اسے حیرت واستعجاب گھیر لیتا، دوسری طرف وہ پریشانی میں مبتلا ہو جاتا۔ اس کی حالت اس شعبدہ باز کی ہو جاتی جسے ہر لمحہ یہ اندیشہ دامن گیر رہتا ہے کہ کسی آن بھی اس کا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے۔ لیکن اس قسم کی محافل آراستہ کرنے کے لیے آیا اسی نوع کی حماقت کی ضرورت تھی، یا ان لوگوں کو، جو فریب کھاتے تھے، اس فریب کاری میں فی نفسہٖ مزہ آتا تھا، بہر حال یہ وہ راز تھا جو کبھی طشت از بام نہیں ہوا اور ہیلین واسیلیو نا بزوخوا نے ''دلکش اور بذلہ سنج خاتون'' کی حیثیت سے جو شہرت حاصل کی تھی، وہ اتنی مستحکم ہوگئی کہ اگر وہ نڈر اور بے خوف ہو کر انتہائی پیش پا افتادہ، گھسی پٹی اور احمقانہ بات بھی کہہ دیتی، تب بھی حاضرین اس کے ایک ایک لفظ پر وجد میں آنے لگتے، اس پر داد وتحسین کے ڈونگرے برسانا شروع کر دیتے اور اس کی گفتگو میں ایسے ایسے دقیق اور دور رس مفاہیم، جو خود کبھی اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے تھے، تلاش کرنے لگتے۔

پیئر عین مین اسی طرح کا شوہر تھا جس کی اس ''شمعِ محفل'' کو ضرورت تھی۔ وہ غیر حاضر دماغ، خبطی اور ''بڑے نواب صاحب'' قسم کا خاوند تھا جو کسی کے رنگ میں بھنگ نہیں ڈالتا تھا۔ ڈرائنگ روم کی لطیف ومفرّح فضا کو مکدر کرنا تو دور کی بات ہے، وہ الٹا اپنی موجودگی سے ایسا تضاد پیش کر دیتا کہ اس کی شریک حیات کی شائستگی اور موقع شناسی کی آب وتاب میں اور بھی اضافہ ہو جاتا۔ گزشتہ دو برسوں کے دوران میں پیئر مسلسل جس نوعیت کی مجرد دلچسپیوں میں مستغرق رہا تھا اور باقی تمام اشیا کو وہ جس بچی حقارت سے دیکھتا رہا تھا، اس نے اسے اپنی بیوی کے حلقے میں، جو اس کے لیے قطعاً کسی قسم کی دلچسپی کا باعث نہیں تھا، بے نیازی اور لاتعلقی کا وہ رویہ اپنانے اور سب لوگوں کے ساتھ یکساں مروّت برتنے کا کچھ ایسا اسلوب اختیار کرنے میں مدد دی جس کا مصنوعی طریقوں سے حصول ممکن نہیں اور یوں وہ دوسروں کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ احترام کے ساتھ پیش آئیں۔ وہ اپنی اہلیہ کے ڈرائنگ روم میں یوں داخل ہوتا جیسے وہ ڈرائنگ روم نہ ہو، کوئی تھیئٹر ہو۔ وہ ہر ایک سے تعارف حاصل کرتا تھا، ہر ایک کے ساتھ یکساں کشادہ پیشانی سے پیش آتا تھا، تاہم وہ ہر ایک سے یکساں بے نیازی برتتا تھا۔ کبھی کبھی وہ ایسی گفتگو میں، جس میں اسے دلچسپی ہوتی، شریک بھی ہو جاتا اور اس بات سے قطع نظر کہ سفارت خانے کا کوئی ''بڑا صاحب'' آیا ہے یا نہیں، وہ چبا چبا کر اپنی رائے کا، جو کسی لحاظ سے بھی ہمیشہ مروجہ خیالات سے لگا نہیں کھاتی تھی، اظہار کر دیتا لیکن اونچا طبقہ ''پیٹرزبرگ کی ممتاز ترین خاتون'' کے خبطی شوہر سے اتنا مانوس ہو چکا تھا کہ کوئی شخص بھی اس کی عجیب وغریب اور انوکھی حرکات پر سنجیدگی سے توجہ نہیں دیتا تھا۔

ہیلین کی ارفورٹ سے واپسی کے بعد اس کے ڈرائنگ روم میں جو بے شمار نوجوان روزانہ آتے تھے، ان میں بورس دروبیتسکوئے، جو اب تک اپنی ملازمت میں زبردست کامیابیاں حاصل کر چکا تھا، بزوخوف گھرانے کا بے تکلف ترین دوست تھا۔ ہیلین اسے mon page (مائی پیج) کہہ کر پکارتی تھی اور اس کے ساتھ یوں برتاؤ کرتی تھی جیسے وہ کوئی بچہ ہو۔ وہ اس پر جس قسم کی مسکراہٹ نچھاور کرتی تھی، وہ بالکل ویسی ہی ہوتی تھی جس سے وہ دوسروں

کو نوازتی تھی لیکن بعض اوقات پیئر جب یہ (مسکراہٹ) دیکھتا، اس کی طبیعت مُنغّض ہو جاتی۔ بورس پیئر کے ساتھ خاص طور پر متین اور پُروقار تعظیم وتکریم سے پیش آتا تھا۔ تعظیم وتکریم کا یہ رنگ بھی پیئر کے لیے پریشانی کا سبب بن جاتا تھا۔ تین سال قبل اس کی شریک حیات نے اسے جو کچوکے لگائے تھے، اس نے ان کی کسک اتنی شدت سے محسوس کی تھی، کہ اب بھی اس کی یہ ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ اس کی کسی طرح بھی تذلیل نہ ہونے پائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے اس نے یہ طریقہ اختیار کیا: اول: حقوقِ زناشوئی سے دست برداری اختیار کر لی۔ دوم: اپنے دل میں کسی قسم کا شک پیدا نہ ہونے دیا۔

''اب جب کہ وہ علم وادب کا ادِّعا کرنے لگی ہے، وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی تمام سابقہ شیفتگیوں سے دست بردار ہو گئی ہے۔'' اس نے اپنے آپ کو سمجھایا۔ ''ڈھونڈے سے ایک بھی ایسی مثال نہیں ملے گی کہ وہ عورت جسے علم وادب میں درک کا دعویٰ ہو، وہ دل کے معاملات سے بھی متاثر ہوتی ہو۔'' اس نے یہ قول کہیں پڑھا یا سنا تھا اور وہ اس کی صداقت پر آنکھیں بند کر کے ایمان لائے ہوئے تھا اگرچہ اس نے زبان سے اس کا کبھی اظہار نہیں کیا تھا۔ لیکن یہ بات کتنی عجیب تھی کہ اپنی بیوی کے ڈرائنگ روم میں بورس کی موجودگی (اور وہ تقریباً ہمہ وقت وہاں موجود ہوتا تھا) پیئر پر جسمانی طور پر اثر انداز ہوتی تھی۔ اس کے اعضاء میں کھنچاؤ پیدا ہونے لگتا، وہ بے طرح جھینپنے لگتا اور اسے یوں محسوس ہونے لگتا جیسے اس سے اس کی حرکات وسکنات کی آزادی چھن گئی ہو۔

''اتنی نفرت، اتنی کراہت، عجیب بات ہے!'' پیئر نے سوچا، ''حالانکہ ایک وقت وہ بھی تھا جب یہ شخص مجھے حقیقتاً اچھا لگتا تھا۔''

دنیا کی نگاہوں میں پیئر بہت بڑا نواب، ایک نامی گرامی خاتون کا قدرے کور چشم اور مضحکہ خیز شوہر اور چالاک خبطی شخص تھا جو کرتا ورتا کچھ نہیں تھا لیکن کسی کو اس کے ہاتھ کوئی گزند نہیں پہنچتا تھا۔ وہ بہت نفیس اور خوش خلق انسان تھا۔ لیکن اس تمام عرصے کے دوران میں پیئر کی روح نشوونما کے پیچیدہ اور مشقت طلب عمل میں سے گزر رہی تھی۔ اس کے سامنے بے شمار چیزیں منکشف ہو رہی تھیں اور وہ ان گنت روحانی شکوک اور مسرتوں سے آشنا ہو رہا تھا۔

10

وہ مسلسل روزنامچہ تحریر کرتا رہا۔ وہ جو کچھ سپردِ قلم کر رہا تھا، اس کے چند اقتباسات درج ذیل ہیں:

24 نومبر:
صبح آٹھ بجے بیدار ہوا۔ انجیل مقدس کا مطالعہ کیا اور پھر دفتر چلا گیا (اپنے محسن کے مشورے پر پیئر نے ملازمت اختیار کر لی تھی اور اب وہ ایک سرکاری کمیٹی کا ممبر تھا)، گھر واپس آیا اور اکیلے کھانا کھایا (کاؤنٹس کے لاتعداد مہمان، جن کی مجھے قطعاً کوئی پروا نہیں، آئے ہوئے ہیں)۔ خورونوش دونوں میں اعتدال برتا۔

کھانے سے فراغت پانے کے بعد برادران کے لیے چند عبارات کی نقول تیار کیں۔ سہ پہر ڈرائنگ روم میں چلا گیا اور ب کے بارے میں مضحک قصہ سنایا۔ صرف اس وقت جب تمام اشخاص کھلکھلا کر ہنسنے لگے، مجھے احساس ہوا کہ مجھے یہ واقعہ نہیں سنانا چاہیے تھا۔

میں مسرور و مطمئن ذہن کے ساتھ بستر پر دراز ہونے جا رہا ہوں۔ بزرگ و برتر خداوند، مجھے صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرما۔ 1۔ مجھے سکون و اطمینان بخش تا کہ میں غصے پر قابو پا سکوں۔ 2۔ اتنا ضبطِ نفس دے اور میرے قلب میں وہ کراہت بھر دے کہ میں شہوانی خواہشات کو زیر کر سکوں۔ 3۔ مجھے اتنی ہمت دے کہ (الف) مملکت کی خدمت (ب) خانگی امور (ج) دوستوں سے تعلقات اور (د) اپنے معاملات کے انتظام و انصرام کے سلسلے میں میرے جو فرائض بنتے ہیں، ان سے جی چرائے بغیر دنیاداری سے گریز کر سکوں۔

27 نومبر:

دیر سے جاگا۔ کسل مندی کا اتنا غلبہ تھا کہ آنکھیں کھلنے کے بعد بھی خاصا وقت بستر پر لیٹا رہا۔ خداوند، میری دست گیری فرما اور مجھے اتنی شکتی عطا کر کہ میں تیرے متعین کردہ راستے پر چل سکوں۔ انجیل مقدس کا مطالعہ کیا لیکن دل پر وہ اثر، جو ہونا چاہیے تھا، نہ ہوا۔ برادر اروسوف آیا اور ہم دونوں دنیائے دوں کی لغویات کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ اس نے مجھے زار کے نئے منصوبوں سے آگاہ کیا۔ میں ان کو اپنی نکتہ چینی کا نشانہ بنانا چاہتا تھا کہ مجھے اپنے اصول اور اپنے محسن کے الفاظ یاد آ گئے — کہ سچے فری میسن کو، جب مملکت کو اس کی خدمات کی ضرورت پیش آئے، بڑھ چڑھ کر کام کرنا چاہیے اور جب اس کی خدمات طلب نہ کی جائیں، اسے حالات کا مشاہدہ کرتے رہنا چاہیے لیکن اپنی زبان بند رکھنا چاہیے۔ میری زبان ہی میری دشمن ہے۔ برادران گاف، واؤ اور الف مجھ سے ملنے آئے۔ ہم نے ایک نئے برادر کو جماعت میں شامل کرنے کے بارے میں ابتدائی گفتگو کی۔ انھوں نے معلّم کے فرائض مجھے سپرد کر دیے۔ مجھے محسوس ہوا کہ میں کمزور اور بودا آدمی ہوں اور جو ذمے داری مجھے تفویض کی گئی ہے، اسے نبھانے کا اہل نہیں۔ پھر ہماری گفتگو ہیکل کے سات ستونوں اور قدمچوں کی تشریح و تعبیر کے بارے میں ہونے لگی۔ کیا ان سات ستونوں اور قدمچوں کا مطلب سات علوم، سات نیکیاں، سات بدیاں اور روح مقدس کے سات عطیات ہیں؟ برادر الف نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیے۔ شام کو نئے رکن کے داخلے کی رسوم سرانجام پائیں۔ لاج کی جواز سرِ نو تزئین و آرائش کی گئی ہے، اس نے کارروائی کو چار چاند لگانے میں اہم کردار ادا کیا۔ نیا رکن بورس دروبتیسکوئے بنا تھا۔ اس کا نام میں نے تجویز کیا تھا اور معلّم کے فرائض بھی میں نے ہی سرانجام دیے۔ میں جتنا عرصہ اندھیرے کمرے میں تنہا اس کے ساتھ رہا، عجیب و غریب احساس مجھے پریشان کرتا رہا۔ مجھے احساس ہوا کہ میرے دل میں اس کے خلاف نفرت کا جذبہ پل رہا ہے۔ میں نے اس جذبے کو زیر کرنے کی کوشش کی

لیکن بے سود۔ بالکل یہی وجہ تھی کہ میں پورے خلوص کے ساتھ اسے بدی سے بچانے اور اسے صحیح راستے پر ڈالنے کا آرزومند تھا لیکن میرے اپنے قلب و دماغ میں جو خیالاتِ بد سر اٹھا رہے تھے، میں ان سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ مجھے کچھ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے لاج میں داخل ہونے کا مقصد صرف ارکان کے ساتھ گہرے تعلقات استوار کرنا اور ان کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس نے بار بار مجھ سے دریافت کیا تھا کہ آیا ن اور س لاج کے ارکان ہیں؟ (یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا میں جواب نہیں دے سکتا تھا۔)، دوسرے جہاں تک میرا مشاہدہ کام کرتا ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ ہماری جماعت کا احترام کر سکے۔ وہ جس طرح اپنی ادھیڑ بن میں مصروف رہتا ہے اور جس طرح آدمی کے محض ظواہر میں دلچسپی لیتا ہے اور ان سے جس طرح مطمئن ہو جاتا ہے، اس سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ اسے روحانی بالیدگی کی کوئی خواہش نہیں۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی وجہ سے مجھے اس کے بارے میں شک ہونے لگتا تھا تاہم ان کے ماسوا میرے پاس شُبے کی کوئی بنیاد موجود نہیں تھی۔ لیکن وہ مجھے ریاکار نظر آیا۔ میں جتنا عرصہ تاریک کمرے میں تنہا اس کے پاس کھڑا رہا، ہر دم مجھے یہی محسوس ہوتا رہا کہ جو شمشیر میں نے تھام رکھی ہے، وہ اس کے سینے میں اتار دوں۔ میں نہ تو اپنا مدعا آسانی سے بیان کر سکا اور نہ گرینڈ ماسٹر اور برادران کے سامنے لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے شکوک کا اظہار کر سکا۔ میری دعا ہے کہ عظیم معمار فطرت مجھے اتنی توفیق دے کہ میں کذب و افترا کی بھول بھلیوں میں صحیح راستہ تلاش کر سکوں۔

روزنامچے کے اگلے تین صفحات خالی چھوڑ دیے گئے تھے۔ ان کے بعد مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی:

برادر واؤ کے ساتھ طویل اور سبق آموز گفتگو ہوئی۔ اس نے مجھے مشورہ دیا کہ میں برادر الف کا ساتھ نہ چھوڑوں۔ اگرچہ میں اس قابل تو نہیں، پھر بھی میرے سامنے بہت کچھ منکشف کیا گیا۔ اس عالم کے خالق کا نام آدونائی[23] اور سب کے مالک کا نام الوہیم[24] ہے۔ تیسرا نام زبان ادا کرنے سے قاصر ہے، تاہم اس کا مطلب ہمہ ہے۔ برادر واؤ کے ساتھ باتیں کر کے میری ہمت بڑھتی ہے، روح میں تازگی کا احساس ہونے لگتا ہے اور نیکی کے راستے پر چلنے کے لیے حمایت حاصل ہوتی ہے۔ مادی علوم کی ناقص اور تشنہ تعلیمات اور ہمارے مقدس اور ہمہ گیر نظریے کے مابین جو فرق ہے، وہ مجھ پر روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتا ہے۔ انسانی علوم ہر چیز کی چیر پھاڑ کر دیتے ہیں تا کہ اس کی تفہیم ہو سکے، ہر شے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں تا کہ اسے جانچا اور پرکھا جا سکے۔ ہماری جماعت کی مقدس تعلیم میں سب کچھ واحد ہے، سب کچھ اس زندگی میں ہی اور کلی طور پر جانا جاتا ہے۔ تثلیث — مادے کے تین عناصر — گندھک، پارا اور نمک ہیں۔ گندھک میں تیل اور آگ کی خصوصیات ہیں۔ جب اس میں نمک کی آمیزش ہوتی ہے، اس کی

آتشیں خصوصیت اس میں وہ تڑپ، جس کے ذریعے یہ پارے کو اپنی طرف راغب کر لیتی ہے، پیدا کر دیتی ہے۔ جب پارا غائب ہو جاتا ہے، یہ اسے دبوچ لیتی اور اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ اور یوں جب دونوں کا آپس میں میل ہوتا ہے، تب دوسرے عناصر وجود میں آتے ہیں۔

3 دسمبر:

دیر سے جاگا۔ انجیل مقدس کا مطالعہ کیا لیکن دل پر کوئی اثر نہ ہوا۔ اس کے بعد اٹھا اور بڑے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں کچھ دیر چکر کاٹتا رہا۔ فکر و استغراق میں محو ہونے کی سعی کی لیکن اس کے بجائے میرے تخیل میں ایک ایسا واقعہ، جو چار سال قبل پیش آیا تھا، گھومنے لگا۔ ہوا یوں کہ ہماری ڈوئیل کے بعد ایک روز ماسکو میں میری دلوخوف سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ اس نے کہا: ''مجھے امید ہے کہ اپنی بیوی کی عدم موجودگی کے باوجود تم کامل ذہنی سکون و اطمینان سے رہ رہے ہو گے۔'' اس وقت میں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ لیکن اب مجھے اس ملاقات کی ایک ایک تفصیل یاد آ گئی اور میں نے اس سے یوں انتقام لیا کہ دل ہی دل میں اسے خوب ملاحیاں سنائیں اور بڑھے چبھتے جواب دیے۔ تاہم میں نے اپنے آپ کو سنبھالا اور صرف اسی وقت ان خیالات کو اپنے ذہن سے نکالنے میں کامیاب ہوا جب مجھے یہ اندازہ ہوا کہ میں غصے سے پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ اس کے باوجود میں پوری طرح پشیمان نہ ہوا۔ بعد ازاں بورس دروبتیسکوئے آ گیا اور اپنے مختلف کارنامے بیان کرنے لگا۔ اس کی آمد مجھے ابتدا میں ہی بہت بری لگی تھی اور میں نے چند تردیدی کلمات کہہ دیے۔ اس نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ میں آگ بگولا ہو گیا، اسے سخت سست کہا اور بہت سی ایسی باتیں کہہ دیں، جو ناگوار ہی نہیں ناشائستہ بھی تھیں۔ وہ چپ ہو گیا اور میں بھی صرف تب جب معاملہ ہاتھ سے نکل چکا تھا اپنے آپ پر قابو پا سکا۔ خداوند! میں اس شخص کے ساتھ ہرگز ہرگز نباہ نہیں کر سکتا! یہ میری انانیت ہے جو مجھ سے اس قسم کی حرکات سرزد کراتی ہے اور میرے ذہن میں اس طرح کے خیالات ڈالتی ہے۔ میں اپنے آپ کو اس سے بہتر گرداننے لگتا ہوں لیکن ہوتا یہ ہے کہ میں اس سے کہیں فروتر بن جاتا ہوں کیونکہ وہ ناشائستگیوں سے درگزر کرتا ہے جب کہ اس کے برعکس میں اپنے دل میں اس کے خلاف نفرت کے جذبات پالتا رہتا ہوں۔ خداوند! مجھے اتنی توفیق دے کہ میں اس کی موجودگی میں اپنی خباثت دیکھ سکوں اور اس کے ساتھ ایسا برتاؤ کر سکوں جس سے اسے بھی کچھ تمتع حاصل ہو سکے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد میں نے قیلولے کا قصد کیا اور عین اس وقت جب میری آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، مجھے واضح طور پر اپنے بائیں کان میں آواز سنائی دی: ''یہ دن تیرا ہے۔''

میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اندھیرے میں چل رہا ہوں اور اچانک کتوں نے میرے گرد گھیرا ڈال لیا لیکن میں نڈر ہو کر چلتا رہا۔ ناگاہ ایک قدرے پست قامت کتے نے میری بائیں ٹانگ اپنے دانتوں میں

دبوچ لی۔ وہ اسے چھوڑ نہیں رہا تھا۔ میں نے کتے پر جھپٹا ڈالا اور اس کا گلا گھونٹنے لگا۔ ابھی میں نے بمشکل اس سے پنڈ چھڑایا تھا کہ ایک دوسرا کتا، جو پہلے سے بڑا تھا، مجھے کاٹنے لگا۔ میں نے اسے اوپر اٹھانا چاہا، لیکن میں جتنا اسے اوپر اٹھاتا تھا، یہ اتنا ہی وزن دار ہوتا جاتا تھا۔ اچانک برادر الف ادھر آ گیا۔ اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور ایک عمارت کی طرف لے چلا۔ اس عمارت میں داخل ہونے کے لیے ہمیں ایک تنگ شہتیر پر سے گزرنا تھا۔ میں لپک کر شہتیر پر چڑھ گیا لیکن میرے بوجھ تلے یہ خم کھا گیا اور میرے نیچے سے کھسک گیا۔ میں چوبی جنگلے پر، جس تک میرا ہاتھ بہت مشکلوں سے پہنچ سکا، چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بڑا زور لگانے کے بعد میں گھسٹتا گھسٹتا اس کے اوپر پہنچا لیکن ہوا یہ کہ میری ٹانگیں اس کے ایک جانب اور بقیہ جسم دوسری طرف جھولنے لگا۔ میں نے مڑ کر پچھلی جانب دیکھا۔ مجھے برادر الف چوبی جنگلے پر کھڑا نظر آیا۔ وہ ہاتھ سے ایک کشادہ سڑک، جس کے دونوں اطراف درخت تھے، اور ایک گلستان کی جانب اشارہ کر رہا تھا۔ اس گلستان کے بیچ ایک وسیع وعریض اور دیدہ زیب عمارت کھڑی تھی۔ میری آنکھ کھل گئی۔ اے خداوند! اے عظیم معمار فطرت! میری دستگیری فرما کہ میں ان کتوں — خواہشاتِ ہوا و ہوس — سے پیچھا چھڑا سکوں اور میری مدد فرما کہ میں نیکی کے اس ہیکل میں، جس کی بشارت مجھے خواب میں ملی تھی، داخل ہو سکوں۔

7 دسمبر:

میں نے خواب میں دیکھا کہ آئی اوسپ الیکسی وچ میرے گھر میں بیٹھا ہوا ہے۔ میں خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا۔ میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں اس کی خوب خاطر مدارات کروں لیکن مجھے محسوس ہوا کہ میں تو پیہم دوسروں کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف ہوں۔ ایکا ایکی یہ خیال کوندے کی طرح میرے ذہن میں لپکا کہ اسے یہ بات پسند نہیں آئے گی۔ میں اس کے قریب جانا اور اس کے ساتھ معانقہ کرنا چاہتا تھا لیکن جونہی میں اس کے قریب پہنچا، میں نے دیکھا کہ اس کا چہرہ منقلب ہو چکا ہے۔ یہ چہرہ تروتازہ اور نوجوان تھا۔ وہ مجھے ہماری جماعت کی تعلیمات کے بارے میں کچھ بتا رہا تھا لیکن اس کی آواز اتنی دھیمی تھی کہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پھر یوں لگا کہ ہم سب کمرے سے باہر نکل گئے ہیں اور کوئی انہونی بات وقوع پذیر ہو گئی ہے۔ ہم سب فرش پر بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ وہ مجھے کچھ بتا رہا تھا۔ میں اسے یہ جتانے کی فکر میں تھا کہ میں اس کی باتوں سے کتنا متاثر ہوا ہوں لیکن میرا حال یہ تھا کہ میں اس کی گفتگو پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا۔ میں اپنے تصورات میں اپنے اندر کے آدمی کی حالت کا نقشہ باندھنے اور یہ سوچنے لگا کہ خداوند کا فضل میرے شامل حال ہے اور وہ میرے گناہوں کی آلائشیں صاف کر دے گا۔ میری آنکھیں اشک آلود ہو گئیں اور مجھے خوشی اس بات پر ہوئی کہ اس نے یہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اس نے مجھ پر طائرانہ نگاہ، جس میں جھلاہٹ تھی، ڈالی اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ مجھ سے جو گفتگو کر رہا تھا، اس نے اس کا سلسلہ

منقطع کر دیا۔ میں گھبرا گیا اور اس سے پوچھنے لگا: ''آپ جو کچھ فرما رہے تھے، اس کا میری ذات سے تو کوئی تعلق نہیں تھا؟'' اس نے کوئی جواب نہ دیا تاہم اس نے مجھے بہ نگاہ کرم دیکھا۔ پھر ایکا ایکی جانے کیا ہوا، ہم نے اپنے آپ کو میرے بیڈروم میں، جہاں ڈبل بیڈ ہے، موجود پایا۔ وہ اس کے ایک کنارے پر لیٹ گیا۔ مجھے اس خواہش نے آتشِ زیرِ پا کر رکھا تھا کہ میں اس کے ساتھ لاڈ پیار کروں اور اس کے جسم کو سہلاؤں۔ چنانچہ میں بھی لیٹ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: ''صاف صاف بتاؤ کہ وہ کون سی شے ہے جو سب سے بڑھ کر تمھیں گناہ پر مائل کرتی ہے؟ تم نے معلوم کر لیا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ تمھیں اب تک علم ہو چکا ہو گا۔'' اس کے سوال پر میں بہت محجوب ہوا تاہم میں نے اسے بتایا کہ ''کاہلی میرا سب سے بڑا عیب ہے۔ اس سے پیچھا چھڑانا میرے لیے مشکل ہے۔'' اس نے اپنے سر کو یوں جنبش دی جیسے اسے میری بات کا یقین نہ آیا ہو۔ میں اور بھی محجوب ہوا اور میں نے اسے بتایا: ''آپ کے مشورے کے مطابق میں اپنی شریکِ حیات کے ساتھ رہ ضرور رہا ہوں لیکن خاوند کی حیثیت سے زناشوئی کے حقوق ادا نہیں کر رہا۔'' اس پر اس نے جواب دیا: ''کسی بھی بیوی کو اپنے شوہر کی ہم آغوشی سے محروم نہیں رکھا جانا چاہیے۔'' اور اس نے اپنی باتوں سے مجھے یہ تاثر دیا کہ ایسا کرنا میرا فرض ہے۔ لیکن میں نے جواب دیا کہ ''اس سے تو مجھے سخت شرمندگی ہوگی۔'' اور ایکا ایکی سب کچھ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میری آنکھ کھل گئی اور میرے ذہن میں انجیل مقدس کی یہ آیت گھوم رہی تھی: ''اور زندگی انسانوں کی روشنی تھی۔ روشنی ظلمت میں چمک رہی تھی اور ظلمت اس کی تفہیم نہیں کر پا رہی تھی۔''

آئی اوسپ کا چہرہ نوخیز، شاداب اور تاب دار دکھائی دے رہا تھا۔ آج ہی مجھے اپنے محسن کا خط ملا ہے۔ اس میں اس نے میرے ازدواجی فرائض یاد دلائے ہیں۔

9 دسمبر:

میں نے خواب دیکھا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں ماسکو میں اپنے مکان کے کشادہ نشستی کمرے میں بیٹھا ہوں۔ اتنے میں آئی اوسپ الیکسی وچ ڈرائنگ روم میں سے گزرتا اندر داخل ہوا۔ مجھے فوراً معلوم ہو گیا کہ اس میں نشاۃ الثانیہ کا عمل پہلے ہی پایۂ تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔ میں اس کا استقبال کرنے تیزی سے آگے بڑھا، اس سے بغل گیر ہوا اور تابڑ توڑ اس کے ہاتھوں پر بوسے ثبت کرنے لگا۔ اس نے کہا: ''تم نے دیکھ لیا کہ اب میرا چہرہ مختلف ہے؟'' میں ابھی تک اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹے ہوئے تھا۔ میں نے اس پر نظر ڈالی اور دیکھا کہ اس کا چہرہ جوان ہو چکا ہے لیکن اس کا سر بالوں سے محروم تھا اور اس کے خد و خال خاصے تبدیل ہو چکے تھے۔ اور میں نے کہا: ''اگر ہماری ملاقات

اتفاقیہ بھی ہوتی، تب بھی میں آپ کو پہچان جاتا'' اور اس کے ساتھ ہی میں نے سوچا: ''کیا میں سچ کہہ رہا ہوں؟'' اور اچانک میں نے دیکھا کہ وہ یوں لیٹا ہوا ہے جیسے وہ کوئی لاش ہو۔ پھر وہ بتدریج اپنے آپ میں آ گیا اور میرے ساتھ کشادہ سٹڈی روم میں چلا گیا۔ اس کے ہاتھ میں ڈرائنگ کے کاغذات پر مشتمل خاصی ضخیم کاپی تھی۔ میں نے کہا: ''یہ تصاویر میں نے بنائی ہیں۔'' اور اس نے جواب میں گردن کو خم دیا۔ میں نے کاپی کھولی۔ تمام صفحات پر خوبصورت اور دل آویز تصاویر نقش تھیں۔ اپنے خواب میں مجھے یہ معلوم تھا کہ ان تصاویر میں روح کی اپنے محبوب کے ساتھ عشقیہ مہم جوئیوں کے خاکے پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے صفحات پر مجھے ایک دوشیزہ کی، جس کا جسم شفاف تھا، جو شفاف لباس میں ملبوس تھا اور جو بادلوں کی جانب محو پرواز تھی، خوبصورت تصویر نظر آئی۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ دوشیزہ اس کے علاوہ جس کی عکاسی نغمہ سلیمانی[25] میں کی گئی ہے، اور کوئی نہیں۔ خواب میں ان تصاویر کو دیکھتے ہوئے مجھے محسوس ہوا کہ میں فعلِ بد کا مرتکب ہو رہا ہوں لیکن میں اپنی نگاہیں ان سے ہٹا نہ سکا۔ خداوند! میری مدد فرما! اے خداوند، اگر تیرا مجھ سے منہ موڑنا تیرا اپنا فعل ہے، پھر تیری رضا پوری ہو! لیکن اگر اس کا سبب خود میری ذات ہے، پھر مجھے سکھا کہ میں کیا کروں! اگر تو نے کاملاً مجھ سے منہ موڑ لیا، پھر میری نفس پرستی مجھے کہیں کا نہ چھوڑے گی!

11

رستوفوں نے جو گزشتہ دو سال دیہہ میں گزارے تھے، ان کے دوران میں ان کے مالی امور میں بہتری کے کوئی آثار نمودار نہیں ہوئے تھے۔

اگرچہ نکولائی رستوف سختی سے اپنے ارادے پر ڈٹا ہوا تھا، ابھی تک ایک غیر معروف رجمنٹ میں خدمات سرانجام دے رہا تھا اور نسبتاً کم خرچ کر رہا تھا، لیکن اترادنایا میں زندگی کے رنگ ڈھنگ — اور خاص طور پر متنکا کا انتظام و انصرام — کچھ اس قسم کے تھے کہ قرضہ ناگزیر طور پر بڑھتا جا رہا تھا۔ معمر کاؤنٹ کو اس مشکل کا صرف ایک ہی حل نظر آیا کہ کسی سرکاری ملازمت کے لیے درخواست بھیج دی جائے۔ چنانچہ وہ اس کی تلاش میں پیٹرز برگ آ گیا اور اس کے بقول اس کا یہاں آنے کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ بچیوں کو جی بھر کر لطف اندوز ہونے کا آخری موقع فراہم کیا جا سکے۔

انھیں پیٹرز برگ آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ برگ نے ویرا کو شادی کی تجویز پیش کر دی۔ اس کی اس تجویز کو قبول کر لیا گیا۔

اس امر کے باوجود کہ ماسکو میں رستوفوں کا تعلق معاشرے کے اعلیٰ ترین طبقے سے تھا (خود انھوں نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا)، پیٹرز برگ میں ان کے واقف کاروں کا حلقہ قدرے ملا جلا اور غیر واضح تھا۔ پیٹرز برگ میں وہ قصباتی تھے اور وہی لوگ، جنھیں انھوں نے یہ پوچھے بغیر کہ ان کا تعلق کس زمرے سے ہے، دعوتیں

کھلائی تھیں، یہاں انھیں بنظرِ حقارت دیکھتے تھے۔

ماسکو کی طرح پیٹرزبرگ میں بھی رستوفوں کی مہمان نوازی میں کوئی فرق نہیں آیا تھا اور بھانت بھانت کے لوگ ۔ اترادنایا میں ان کے دیہاتی ہمسائے، مفلوک الحال بزرگ تعلقہ دار بمعہ دختران، درباری مصاحبہ پیرانسکایا، پیئر بزوخوف اور ان کے ضلعی پوسٹ ماسٹر کا بیٹا، جو پیٹرزبرگ کے کسی دفتر میں ملازم تھا۔ ان کے ہاں ماحضر تناول کرنے آتے تھے۔ مردوں میں جن لوگوں کا بہت جلد پیٹرزبرگ میں رستوفوں کے گھر اکثر آنا جانا ہو گیا، ان میں بورس، پیئر، جس سے معمر کاؤنٹ کی ملاقات سرراہے ہوئی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ اپنے ہاں گھسیٹ لے گیا تھا، اور برگ شامل تھے۔ برگ سارا سارا دن رستوفوں کے ہاں گزارتا تھا اور وہ سب سے بڑی بیٹی، کاؤنٹس ویرا پر اس نوجوان کی طرح، جو شادی کا پیغام دینے کا ارادہ کیے ہوئے ہو، ہمہ تن توجہ دیتا تھا۔

اوسٹرلٹس کے میدان جنگ میں اپنا دایاں ہاتھ زخمی کرانے کے بعد برگ نے اس کی جس طرح نمائش کی تھی اور بیکار بائیں ہاتھ میں شمشیر تھامنے کا جو ڈرامہ رچایا تھا، وہ یونہی نہیں تھا۔ وہ اس واقعے کو اتنے تسلسل اور اتنے مظلومانہ انداز سے سناتا رہتا تھا کہ ہر شخص کو یقین آجاتا کہ اس کا یہ کارنامہ نہایت احسن اور تقاضائے وقت کے عین مطابق تھا۔ اور برگ کو اس کارنامے کے طفیل دو تمغے ملے تھے۔

فن لینڈ کے خلاف جنگ میں بھی اس نے نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس نے گرینیڈ کا ایک ٹکڑا، جس نے کمانڈر انچیف کے قریب کھڑے ایک ایجوٹنٹ کو ہلاک کر دیا تھا، اٹھایا اور وہ اسے اپنے کمانڈر کے پاس لے گیا۔ اوسٹرلٹس کے وقوعے کی طرح وہ اس واقعے کا بھی اتنی تفصیل اور اتنے ان تھک طریقے سے ذکر کرتا تھا کہ ہر شخص کو یقین ہو گیا کہ ایسا کرنا ضروری تھا۔ اور فن لینڈ کی جنگ نے اسے مزید دو تمغات عطا کیے۔ 1809 میں وہ گارڈز میں کپتان تھا، اپنے سینے پر تمغے سجایا کرتا تھا اور پیٹرزبرگ میں بعض خاص اور منفعت آور مناصب پر فائز تھا۔

اگرچہ بعض متشککین ایسے بھی تھے کہ جب ان کے سامنے برگ کے اوصاف بیان کیے جاتے، وہ زیرلب مسکرا دیتے، تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ضابطے کا پابند، جفاکش اور دلیر افسر تھا۔ اپنے افسران بالا سے اس کی خوب نبھتی تھی۔ وہ محتاط، سچا اور کھرا نوجوان تھا۔ اس کا مستقبل بہت درخشاں تھا اور یہ بات قطعی یقینی تھی کہ وہ معاشرے میں بہت اہم مقام حاصل کرے گا۔

چار سال قبل ماسکو کے ایک تھیئٹر ہال میں اس کی ملاقات اپنے ایک جرمن رفیق کار کے ساتھ ہوئی تھی۔ تب اس نے ویرا رستووا کی طرف اس کی توجہ دلاتے ہوئے جرمن میں کہا تھا: ''یہ لڑکی میری شریکِ حیات بنے گی۔'' اور اسی لمحے اس نے یہ ٹھان لیا تھا کہ وہ اس دوشیزہ کو اپنے حبالۂ عقد میں لا کر ہی دم لے گا۔ اب پیٹرزبرگ میں اپنی اور رستوفوں کی پوزیشن کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ شادی کی تجویز پیش کرنے کا وقت آپہنچا ہے۔

برگ کی تجویز کچھ اس قسم کے حیص بیص سے، جو کسی طرح بھی اس کی انا کی تسکین کا باعث نہیں بن سکتی تھی، قبول کی گئی۔ ابتدا تو یہ بات ہی بہت عجیب نظر آئی کہ لیوونیا[26] کے کسی غیر معروف جنٹلمین[27] کا صاحب زادہ رستوفوں

کی کسی صاحب زادی سے شادی کی خواہش کا اظہار کرے۔ تاہم اس کے کردار کا سب سے بڑا وصف — انانیت — اتنی سادہ لوحی اور نیک طینتی پر مبنی تھا کہ رستوف غیر شعوری طور پر یہ سمجھنے لگے کہ یہ اچھی ہی چیز ہوگی کیونکہ خود اسے یہ پختہ یقین تھا کہ یہ واقعی نہایت عمدہ چیز ہے۔ مزید برآں رستوفوں کے معاملات اتنے دگرگوں ہو چکے تھے کہ رشتے کے خواستگاروں کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ویرا چوبیس برس کی ہو چکی تھی، اسے تقریباً ہر جگہ گھمایا پھرایا گیا تھا اور اس حقیقت کے باوصف کہ وہ ناقابل تردید حد تک خوبصورت اور سمجھ دار تھی، کسی نے بھی اب تک اس سے شادی کی خواہش کا اظہار نہیں کیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اپنی رضامندی دے دی۔

''دیکھو نا،'' برگ نے اپنے رفیق کار سے کہا۔ وہ اسے محض اس لیے اپنا دوست کہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ ہر شخص کے دوست ہوتے ہیں۔ ''دیکھو نا، میں نے ہر شے کا نہایت احتیاط سے جائزہ لیا ہے۔ اگر میں نے اس شادی کے بارے میں غور و فکر نہ کیا ہوتا یا یہ کسی اعتبار سے بھی مجھے غیر موزوں دکھائی دیتی، تو میں اس کا نام بھی نہ لیتا۔ لیکن اب حالات یہ ہیں کہ میرے پاپا اور ماما کے نان نفقے کا معقول بندوبست ہو گیا ہے — مجھے بالٹک کے صوبوں میں بعض اراضی جات پر لگان[28] وصول کرنے کا جو اختیار ملا ہے، وہ میں نے انھیں منتقل کر دیا ہے — اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے، کچھ مجھے تنخواہ ملتی ہے، تھوڑی بہت جائیداد وہ بھی جہیز میں لائے گی۔ اللّوں تللّوں کا میں عادی نہیں۔ چنانچہ پیٹرز برگ میں احسن طریقے سے زندگی بسر کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ میں روپے کی خاطر شادی نہیں کر رہا۔ میرے نزدیک اس قسم کی حرکت گھٹیا اور عزتِ نفس کے منافی ہے — تاہم میں سمجھتا ہوں کہ بیوی کو اپنا اور خاوند کو اپنا حصہ تو لانا ہی چاہیے۔ ملازمت میں میرا مقام ہے۔ اس کے خاندانی تعلقات ہیں اور وہ چھوٹی موٹی جائیداد کی مالکہ بھی ہے اور فی زمانہ یہ چیزیں بہت اہم ہیں۔ ٹھیک ہے نا؟ لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ حسین اور قابلِ قدر دوشیزہ ہے اور مجھ پر جان چھڑکتی ہے...''

برگ شرما گیا اور مسکرانے لگا۔

''اور میں بھی اس سے پیار کرتا ہوں کیونکہ وہ سمجھ دار ہے اور... نیک سرشت ہے۔ جہاں تک اس کی دوسری ہمشیرہ کا تعلق ہے، اگرچہ دونوں ایک ہی خاندان کی افراد ہیں، وہ بالکل مختلف ہے — اس کا رویہ خوشگوار نہیں اور نہ وہ اتنی ذہین ہے، وہ اتنی... تمھیں معلوم ہے؟... خوش اطوار نہیں ہے۔ لیکن میری منگیتر — خیر تم ہمارے ساتھ —'' وہ ''کھانا کھانے'' کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے بروقت اپنا ارادہ بدل دیا اور کہا: ''تم ہمارے ساتھ چائے پینے تو آؤ گے ہی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے اپنی زبان کو ذرا ٹیڑھا کیا، اور منہ سے دھوئیں کا مرغولہ باہر نکال دیا۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ جس قسم کی مسرت کے وہ خواب دیکھتا رہا تھا، وہ اسے مل گئی ہے۔

برگ کے پیغام پر اگرچہ ویرا کے والدین کا اولین ردعمل شکوک و شبہات کا تھا، تاہم ایسے مواقع پر جو خوشیاں منائی جاتی ہیں اور جو جشن منعقد ہوتے ہیں، بعد ازاں وہ سب کچھ یہاں بھی ہوا۔ لیکن خوشیاں منانے کا عمل سطحی تھا، اس میں خلوص اور سچا جذبہ مفقود تھا۔ عزیز و اقارب کے رویوں سے صاف جھلک رہا تھا کہ وہ گھٹے گھٹے سے

ہیں اور جھینپ رہے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ضمیر انھیں کچوکے لگا رہے ہیں کہ انھوں نے ویرا سے کافی محبت نہیں کی اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے پابہ رکاب ہیں۔ سب سے زیادہ جس شخص کی جان ضیق میں آئی ہوئی تھی، وہ معمر کاؤنٹ تھا۔ وہ غالباً یہ بتانے سے قاصر تھا کہ اس کی پریشانی کی وجہ کیا ہے تاہم اس کے تفکرات کا بنیادی سبب اس کی مالی مشکلات تھیں۔ اسے قطعاً یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کے پاس کیا کچھ ہے، وہ کتنے کا مقروض ہے اور یا وہ ویرا کو جہیز میں کیا دے سکتا ہے۔ جب اس کے ہاں بیٹیاں تولد ہوئی تھیں، اس نے ہر ایک کو شادی پر دینے کے لیے ایک ایک جاگیر، جس پر تین تین سو زرعی غلام کام کرتے تھے، علیحدہ کر دی تھی۔ لیکن ان میں سے ایک جاگیر پہلے ہی فروخت ہو چکی تھی، دوسری رہن پڑی تھی اور اس پر سود کے بقایا جات اتنے بڑھ چکے تھے کہ اسے بھی کسی نہ کسی دن فروخت ہونا تھا۔ چنانچہ ویرا کو یہ جاگیر دینا بھی ممکن نہیں تھا۔ ادھر گھر میں روپیہ بھی نہیں تھا۔

برگ کی سگائی قرار پائے ایک مہینہ گزر چکا تھا اور اب شادی کی تقریب کے انعقاد میں صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا۔ لیکن کاؤنٹ یہ ابھی تک طے نہیں کر سکا تھا کہ اس نے جہیز میں کیا کچھ دینا ہے اور نہ اس موضوع کے بارے میں اس نے اپنی شریک حیات سے کوئی بات کی تھی۔ ایک موقع پر تو اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ ریازان کی جاگیر ویرا کو دے دی جائے۔ پھر اس کے دل میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ ایک جنگل فروخت کر دیا جائے یا پرونوٹ کے ذریعے روپیہ حاصل کر لیا جائے۔

شادی سے چند روز قبل برگ ایک دن صبح سویرے کاؤنٹ کے سٹڈی روم میں داخل ہوا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور اس نے نہایت احترام سے اپنے ہونے والے سسر سے دریافت کیا کہ ویرا کا جہیز کیا ہوگا۔ کاؤنٹ کئی دنوں سے اس بات کا منتظر تھا کہ اس سے کب اس قسم کا سوال پوچھا جائے گا۔ تاہم برگ کے سوال نے اسے اتنا بوکھلا دیا کہ اس کے ذہن میں جو اولین بات آئی، وہ اس نے بے سوچے سمجھے کہہ دی۔

''تم نے جس سیدھے سادے انداز سے بات کہی ہے، کسی ہیر پھیر سے کام نہیں لیا، مجھے بہت پسند آیا۔ فکر نہ کرو، تم بالکل مطمئن ہو جاؤ گے ...''

اس نے برگ کے کندھے پر تھپکی دی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے توقع تھی کہ یوں بات ختم ہو جائے گی۔ لیکن برگ بھی ایک ہی کایاں شخص تھا، آسانی سے ہاتھ نہیں آ سکتا تھا۔ یوں اس کے چہرے پر بھولی بھالی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی تاہم عملاً اس نے یہ کیا کہ بلا جھجک کہنے لگا: ''اگر مجھے یقینی طور پر یہ معلوم نہ ہوا کہ ویرا کو جہیز میں کیا ملے گا اور اس جہیز کا کم از کم کچھ حصہ مجھے پیشگی نہ دیا گیا، تو مجھے مجبوراً شادی سے دست کش ہونا پڑے گا۔

''کیونکہ، کاؤنٹ، ذرا سوچیں۔ اگر مجھے واضح طور پر یہ معلوم نہ ہوا کہ اپنی شریک حیات کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مجھے کن ذرائع پر انحصار کرنا ہوگا اور میں نے شادی رچا لی، تو میرا یہ رویہ بہت قابل نفرین ہوگا۔''

کاؤنٹ نے جو دریا دلی کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا اور مزید چخ چخ سے بھی جان چھڑانا چاہتا تھا، یہ کہہ کر کہ وہ اسی ہزار روبل کا پرونوٹ دے دے گا، گفتگو ختم کر دی۔ برگ شیریں انداز سے مسکرایا، اس نے معمر کاؤنٹ

کے شانے پر بوسہ دیا اور بولا: ''میں آپ کا بے حد مشکور ہوں، تاہم جب تک مجھے تیس ہزار روبل نقد نہیں مل جاتے، میں نئی زندگی کا آغاز نہیں کر سکتا۔

''یا پھر، کاؤنٹ،'' اس نے مزید کہا، ''آپ مجھے بیس ہزار روبل نقد عطا کر دیں اور ساٹھ ہزار کا پرونوٹ لکھ دیں۔''

''ہاں، ہاں، بالکل، بالکل،'' کاؤنٹ نے عجلت سے کہا۔ ''مائی ڈیئر بوائے، میں تمھیں بیس ہزار نقد بھی دوں گا اور اسی ہزار کا پرونوٹ بھی۔ ہاں، میں اتنا کچھ کر ہی دوں گا — اچھا، اب میرا بوسہ لو!''

12

نتاشا کا سن سولہ ہو چکا تھا اور یہ 1809 کی بات ہے۔ یہی وہ سال تھا جو اس نے چار برس قبل بورس کے ساتھ چوما چاٹی کے بعد انگلیوں پر شمار کیا تھا۔ اس کے بعد ان دونوں کی کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اگر سونیا یا اپنی والدہ کے ساتھ گفتگو کے دوران میں بورس کا کبھی ذکر آتا بھی، تو وہ اس سارے معاملے کو چٹکیوں میں اڑا دیتی اور کہتی: ''مٹی ڈالو۔ یہ بچگانہ اور احمقانہ حرکتیں تھیں۔ اب ان کا ذکر کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں۔ مدتیں ہوئیں میں انھیں فراموش کر چکی ہوں۔'' لیکن اس کے قلب کی گہرائیوں میں یہ سوال اٹھتا رہتا اور اسے اذیت دیتا رہتا تھا: ''میں نے اس کے ساتھ جو سگائی کی تھی، وہ محض مذاق تھا یا سنجیدہ عہد، جس کی پابندی لازمی ہے؟''

جب سے 1805 میں بورس نے فوج میں شمولیت اختیار کرنے کی غرض سے ماسکو کو خیرباد کہا تھا، وہ ایک مرتبہ بھی رستوفوں سے ملنے نہیں آیا تھا۔ وہ متعدد بار ماسکو کے چکر کاٹ چکا تھا اور اترادنایا کے قریب سے بھی گزرا تھا لیکن اس نے ان کے ہاں جانے کا تکلف کبھی گوارا نہ کیا۔

کبھی کبھی نتاشا کو یہ بات کھٹکتی اور وہ سوچنے لگتی کہ وہ اس سے شادی کا روادار ہی نہیں۔ اس کی اس قیاس آرائی کی تصدیق اس کے اپنے بزرگوں کے لہجے سے بھی ہو جاتی۔ جب بھی اس کا ذکر آتا، اس کے بڑے یوں بات کرتے جیسے وہ یہ سمجھتے ہوں کہ ان کے ساتھ بڑی زیادتی ہوئی ہے۔

''آج کل پرانے دوستوں کو فراموش کر دینا رواج بن گیا ہے،'' بورس کا ذکر آنے پر کاؤنٹس جھٹ کہتی۔

گزشتہ کچھ عرصے سے آننا میخائیلوونا کا آنا جانا بھی خاصا کم ہو گیا تھا۔ ان کے بارے میں اس کے رویے میں نمایاں آن بان آ گئی تھی۔ وہ اپنے لختِ جگر کے اوصافِ حمیدہ اور جس شاندار ملازمت کو اس نے اختیار کیا تھا، اس کا ذکر کرنے سے کبھی نہ چوکتی۔ وفورِ مسرت سے اس کا گلا رندھ جاتا اور وہ اس عنایتِ بے پایاں کے لیے خداوند کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتی۔ جب رستوف پیٹرزبرگ پہنچے، بورس انھیں ملنے آیا۔

جب وہ گاڑی میں ان کے مسکن کی طرف جا رہا تھا، وہ جذبات سے بالکل ہی تہی دامن نہیں تھا۔ اس کے دل میں نتاشا کی جو یادیں سمائی ہوئی تھیں، وہ اس کا زبردست شعری سرمایہ تھیں۔ تاہم جب اس نے ان کے ہاں جانے کا ارادہ کیا اس نے دل میں یہ ٹھان لیا تھا: ''میں نتاشا اور اس کے والدین کو یہ واضح اشارہ دے دوں گا کہ میرے اور

نتاشا کے مابین جو یگانہ تعلقات استوار ہوئے تھے، ان کا نبھانا ہم دونوں میں سے کسی کے لیے بھی لازمی نہیں رہا۔"
کاؤنٹس بزوخوا سے بے تکلفانہ دوستی کی وجہ سے اسے اعلیٰ طبقوں میں اہم مقام حاصل ہو چکا تھا۔ سرکاری ملازمت میں بھی اس کی پوزیشن بہت زبردست اور خیرہ کن تھی کیونکہ اسے ایک سرکردہ شخصیت کا، جو اس کی سرپرستی کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتی تھی، کلّی اعتماد حاصل تھا۔ اب وہ پیٹرزبرگ کی متموّل ترین وراثت کی مالک دوشیزہ سے بیاہ رچانے کے منصوبے باندھ رہا تھا اور قرائن سے یہی نظر آتا تھا کہ اپنے اس منصوبے کو پروان چڑھانے کے لیے اسے کسی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔ جب بورس رستوفوں کے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، نتاشا اپنے کمرے میں تھی۔ جب اسے اس کی آمد کی اطلاع ملی، وہ تقریباً بگٹٹ بھاگتی ڈرائنگ روم میں آدھمکی۔ اس کا چہرہ گلنار ہو رہا تھا اور اس پر جس نوع کا تبسم تھا، وہ اس امر کی علامت تھا کہ وہ مہمان کو دوست سے بڑھ کر کچھ اور سمجھتی ہے۔

بورس کے ذہن میں نتاشا کا جو نقشہ تھا وہ ایک کم سن بچی کا تھا جو چھوٹا ڈریس پہنا کرتی تھی، جس کی زلفوں کے نیچے چمکتی دمکتی سیاہ آنکھیں تھیں اور جو ترنگ میں آکر بچوں کی طرح قہقہے لگایا کرتی تھی۔ لیکن اب جو نتاشا اس کے سامنے کھڑی تھی، وہ بالکل ہی مختلف تھی۔ وہ ٹپٹا گیا اور اس کے چہرے پر جو حیرت و استعجاب اور تحسین و آفریں امڈی، وہ دیدنی تھی۔ اس کے چہرے پر ان تاثرات کو دیکھ کر نتاشا کھل اٹھی۔

"خیر، تم نے اپنی کھیل کی ننھی منی شرارتی ساتھی کو پہچانا؟" کاؤنٹس نے دریافت کیا۔

بورس نے نتاشا کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور بولا: "تم میں جو تبدیلیاں آئی ہیں، انھیں دیکھ کر میں ورطۂ حیرت میں گم ہو گیا ہوں۔

"واہ واہ، کیا رنگ روپ نکلا ہے! کتنی حسین ہو گئی ہو!"

"میرا بھی کچھ یہی اندازہ ہے!" نتاشا کی چمکتی دمکتی اور مسکراتی آنکھیں جواب میں کہہ رہی تھیں۔ "پاپا، پہلے کی نسبت کچھ معمر نہیں دکھائی دیتے؟" وہ بولی۔

نتاشا بیٹھ گئی۔ بورس اس کی ماں کے ساتھ جو گفتگو کر رہا تھا، اس نے اس میں کوئی دخل نہ دیا۔ وہ اس شخص کا، جو بچپن میں اس کے رشتے کا امیدوار تھا، بس خاموشی اور باریک بینی سے جائزہ لیتی رہی۔ وہ خود بھی اس دلبرانہ اور پیار بھری جانچ پرکھ کا بوجھ محسوس کر رہا تھا اور کبھی کبھی آنکھ چرا کر اس پر طائرانہ نگاہ ڈال لیتا تھا۔

بورس کی وردی، اس کے مہمیز، اس کی ٹائی، اس کا بال سنوارنے کا انداز — ایک ایک چیز میں تازہ ترین فیشن کی لہک مہک تھی اور نک سک سے بالکل درست تھی۔ نتاشا نے یہ سب کچھ فوراً بھانپ لیا۔ وہ کاؤنٹس کے قریب بازوؤں والی کرسی پر ذرا تر چھا بیٹھا تھا۔ وہ اپنے دائیں ہاتھ سے اپنے بائیں ہاتھ کے انتہائی صاف ستھرے اور بے عیب دستانے کو، جو چمڑی کی طرح وہاں چپکا ہوا تھا، درست کر رہا تھا اور انوکھے شائستہ انداز سے ہونٹوں کو بھینچ بھینچ کر پیٹرزبرگ کے اعلیٰ ترین طبقوں کی رنگ رلیوں کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ماسکو کے احباب اور ایام کی، جو اس نے وہاں گزارے تھے، ہلکے طنزیہ طریق سے یادیں تازہ کرنے لگتا۔ نتاشا کو محسوس ہوا

کہ اعلیٰ ترین اشرافیہ طبقے کے ذکر کے دوران میں اس نے جب ایک سفیر کے اجتماعی رقص کی محفل کی، جس میں وہ شریک ہوا تھا اور ان دعوت ناموں کی، جو اسے ن ن اور س س نے ارسال کیے تھے، اشارہ کیا تھا، اس نے ایسا محض بر سبیلِ تذکرہ نہیں کیا تھا۔

اس تمام عرصے کے دوران میں نتاشا مہر بلب بیٹھی اسے کن انکھیوں سے دیکھتی رہی۔ اس کی تاک جھانک بورس کی بے چینی اور بوکھلاہٹ میں اضافہ کرتی رہی۔ وہ بار بار مڑ کر اسے دیکھتا اور اپنی بات ادھوری چھوڑ تا رہا۔ وہ دس منٹ بھی نہیں بیٹھا ہوگا کہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جانے کی اجازت طلب کرنے لگا۔ اس پر وہی متجسس، للکارنے والی اور قدرے تمسخر انگیز نگاہیں جمی ہوئی تھیں۔

اس پہلے پھیرے کے بعد بورس نے اپنے آپ سے کہا: ''ہمیشہ کی طرح اب بھی نتاشا مجھے کشش کرتی ہے لیکن مجھے اس جذبے کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کر دینا چاہیے کیونکہ اس لڑکی — یہ جہیز تو لائے گی نہیں — سے شادی کرنے کا مطلب اپنے کیریر پر لات مارنے کے مترادف ہوگا لیکن اس کے ساتھ نکاح کیے بغیر سابقہ تعلقات کی تجدید کرنا کمینی حرکت ہوگی۔'' اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ نتاشا سے دور دور رہنے کی کوشش کرے گا لیکن اس عزم کے باوجود وہ چند روز بعد پھر آ موجود ہوا۔ اب وہ مسلسل رستوفوں کے ہاں آنے اور پورا پورا دن وہاں گزارنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نتاشا کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لے! اسے صاف صاف بتا دے کہ انھیں ماضی کو فراموش کرنا ہوگا اور ہر چیز کے باوجود... وہ اسے اپنی شریک حیات نہیں بنا سکتا، وہ (بورس) بالکل قلاش اور تہی دست ہے اور یہی امران کی شادی کے راستے میں دیوار بن کر کھڑا ہو جائے گا۔ وہ اس قسم کے ارادے باندھتا تو تھا لیکن انھیں عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہتا۔ عین وقت پر اس کی ہمت جواب دے جاتی اور وہ اس موضوع کے بارے میں کوئی بات نہ کر سکتا۔ وہ روز بروز دلدل میں مزید اور مزید دھنستا رہا۔ ادھر معمر کاؤنٹس اور سونیا کو محسوس ہو رہا تھا کہ نتاشا پہلے کی طرح اس کی محبت میں گرفتار ہے۔ وہ جن نغموں کو پسند کرتا تھا، نتاشا اس کی موجودگی میں وہی گاتی تھی، اسے اپنا البم دکھاتی تھی، اسے اس پر کچھ نہ کچھ لکھنے کے لیے اکساتی تھی اور اسے کبھی بھولے سے بھی ماضی کا تذکرہ نہیں کرنے دیتی تھی، اسے ہمیشہ یہی محسوس کراتی رہتی کہ حال کتنا سہانا اور پر لطف ہے اور یوں ہر روز وہ حیران و ششدر واپس لوٹ جاتا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، نہ تو اسے کہہ پاتا اور نہ اس کی سمجھ میں کچھ آتا کہ وہ یہاں کیا کر رہا ہے، کیوں بار بار آ رہا ہے اور یہ سلسلہ کیسے ختم ہو گا۔ اس نے ہیلین کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا، اسے روزانہ اس کے ملامت انگیز خطوط ملتے تھے لیکن پھر بھی رستوفوں کے ہاں اس کا آنا جانا لگا رہا اور وہ پورا پورا دن وہاں صرف کرتا رہا۔

13

ایک رات کا ذکر ہے، معمر کاؤنٹس شبینہ ٹوپی اوڑھے اور ڈریسنگ جیکٹ پہنے قالین پر جھکتے اور فرش پر سجدے کرتے

عبادت میں مصروف تھی۔ اس نے اپنی مصنوعی کاکلیں اتار دی تھیں اور اس کے اپنے بالوں کا ہلکا پھلکا گچھا اس کی سفید ململیں ٹوپی کے نیچے جھانک رہا تھا۔ عبادت کے دوران میں وہ کبھی آہیں بھرنے اور کبھی کراہنے لگتی۔ اتنے میں دروازہ چرچرایا اور نتاشا بھاگتی دوڑتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ نتاشا بھی ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھی۔ اس کے پاؤں میں سلیپر تھے اور اس کے بالوں میں گھونگر پٹیاں[29] اٹکی ہوئی تھیں۔ کاؤنٹس نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا اور اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ اپنی آخری دعا ختم کرنے کے قریب تھی: "اگر یہ پلنگ میرا جنازہ بن گیا..." عبادت نے اس پر جو روحانی کیفیت طاری کر دی تھی، نتاشا کی آمد سے وہ زائل ہو گئی۔ نتاشا کے گال تمتما رہے تھے اور وہ بڑے ارمانوں سے آئی تھی۔ لیکن جب اس نے اپنی ماں کو مصروفِ عبادت پایا، ایکا ایکی اس کے قدم رک گئے۔ اس نے قدرے جھک کر اسے سلام کیا اور غیر شعوری طور پر اپنی زبان باہر نکالی جیسے وہ اپنے آپ کو سرزنش کر رہی ہو۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کی عبادت ابھی جاری ہے، وہ پنجوں کے بل چلتی پلنگ کی طرف لپکی، اپنے ننھے منے پاؤں کو ایک دوسرے سے ٹکرایا اور سلیپر اتار پھینکے۔ پھر جست لگا کر پلنگ پر، جس کے متعلق کاؤنٹس کو اندیشہ تھا کہ وہ کہیں اس کا جنازہ نہ بن جائے، چڑھ گئی۔ یہ خاصا اونچا پلنگ تھا۔ اس میں پر بھرے ہوئے تھے اور اس پر اوپر نیچے پانچ تکیے، جن میں سے ہر ایک اپنے سے نچلے کی نسبت چھوٹا تھا، دھرے تھے۔ جب نتاشا جست لگا کر پلنگ پر چڑھی، وہ پروں میں دھنسنے لگی اور دیوار کی جانب لڑھک گئی۔ پھر وہ لحاف کے نیچے گھس گئی اور اسے اپنے جسم کے اردگرد اوڑھنے لپیٹنے لگی۔ اس نے اپنے گھٹنے اپنی ٹھوڑی سے لگائے، پھر اس نے زور سے لات ماری اور مدھم آواز میں، جو بمشکل سنائی دے رہی تھی، کھلکھلانا شروع کر دیا۔ کبھی وہ اپنا سر لحاف میں چھپا لیتی اور کبھی اسے باہر نکال کر ماں کی طرف جھانکنے لگتی۔

کاؤنٹس نے اپنی عبادت ختم کی اور اپنے پلنگ کی جانب چل پڑی۔ اس کے چہرے پر درشتی جھلک رہی تھی لیکن جب اس نے دیکھا کہ نتاشا نے اپنا سر لحاف میں چھپا رکھا ہے، اس کے چہرے پر حسبِ معمول نرم و گداز اور شفقت آمیز تبسم جھلملانے لگا۔

"چھی، چھی، چھی! یہ کیا حرکت ہے!" اس نے کہا۔

"ماما، آپ کے ساتھ کچھ گفتگو ہو سکتی ہے؟... کہیے نا کہ ہاں!" نتاشا نے کہا۔ "بس ایک بوسہ آپ کے حلق پر، اس کے بعد ایک اور۔ اتنا ہی کافی ہوگا،" اس نے یہ کہا، پھر اپنے بازو اپنی ماں کی گردن میں حمائل کیے اور تابڑ توڑ دو مرتبہ اس کا گلا چوم لیا۔

بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ نہایت بھونڈا برتاؤ کر رہی ہے لیکن نتاشا اتنی حساس اور مشاق تھی کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ خواہ کیسے ہی ہم آغوش ہوتی، وہ ہمیشہ اس بات کا انتظام کر لیتی کہ اس کی ماں کو کسی قسم کی تکلیف یا پریشانی نہ اٹھانا پڑے اور نہ اس کا مزاج برہم ہونے پائے۔

"اچھا، آج کیا بات ہے؟" اس کی ماں نے تکیے درست کرتے پوچھا اور اس کے جواب کا انتظار کرنے

لگی۔ نتاشا، جو پہلے ہی دو مرتبہ لڑھکنیاں کھا چکی تھی، اب سنبھل کر لحاف کے نیچے اپنی والدہ کے قریب لیٹ گئی۔ اس نے اپنے ہاتھ باہر نکالے اور چہرے پر سنجیدگی طاری کر لی۔

رات کو کاؤنٹ کی کلب سے واپسی سے قبل نتاشا اس قسم کے جو چکر اپنی ماں کے کمرے کے لگاتی تھی، ان سے ماں بیٹی دونوں کو بے حد مسرت ہوتی تھی۔

''اچھا، آج کیا بات ہے؟... میں خود بھی تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔''

نتاشا نے اپنا ہاتھ اپنی ماں کے منہ پر رکھ دیا۔ ''بورس کے بارے میں۔ مجھے معلوم ہے،'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں بھی یہی بات کرنے آئی ہوں۔ آپ کچھ نہ کہیں۔ مجھے معلوم ہے، ضرور کہیں!'' اس نے اپنا ہاتھ پرے ہٹا لیا۔ ''ماما، بولو نا! وہ بہت نفیس آدمی ہے، ہے نا؟''

''نتاشا اب تم سولہ سال کی ہو گئی ہو۔ جب میں تمھاری عمر کی تھی، میں شادی شدہ زندگی بسر کر رہی تھی۔ تم کہتی ہو کہ بورس نفیس اور شستہ آدمی ہے اور میں اسے بیٹے کی طرح چاہتی ہوں۔ پھر تم اور کیا مانگتی ہو؟... تم کیا سوچ رہی ہو؟ تم نے اس کا دماغ گھما دیا ہے، مجھے صاف نظر آ رہا ہے۔''

یہ کہتے کہتے کاؤنٹس نے گردن گھما کر اپنی بیٹی کی جانب دیکھا۔ نتاشا ٹکٹکی باندھے مہاگنی کے ابوالہول، جو پلنگ کی پائنتی اور سرہانے کے تختوں کے کناروں پر منقش تھے، دیکھ رہی تھی۔ چنانچہ کاؤنٹس اپنی بیٹی کا چہرہ صرف جزوی طور پر دیکھ سکی۔ اس کے خدوخال پر جو سنجیدگی اور عزم جھلک رہا تھا، اسے دیکھ کر وہ بہت متعجب ہوئی۔

نتاشا سن رہی اور سوچ رہی تھی۔

''اچھا، تو پھر کیا؟'' اس نے پوچھا۔

''تم نے اس کا دماغ بالکل ہی گھما دیا ہے۔ آخر کیوں؟ تم اس سے کیا چاہتی ہو؟ تم جانتی ہو کہ تم اس سے شادی نہیں کر سکتیں۔''

''کیوں نہیں؟'' نتاشا نے اپنی جگہ سے ہلے جلے بغیر پوچھا۔

''کیونکہ وہ نوعمر ہے، قلاش ہے۔ ہمارا قرابت دار ہے... اور کیونکہ تم اس سے حقیقتاً محبت نہیں کرتی ہو۔''

''آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''مجھے معلوم ہے۔ ننھی، یہ ٹھیک نہیں ہے۔''

''لیکن اگر میں چاہوں تو...'' نتاشا نے کہا۔

''فضول باتیں مت کرو،'' کاؤنٹس نے کہا۔

''لیکن اگر میں چاہوں تو...''

''نتاشا، میں سنجیدگی سے...''

نتاشا نے اسے بات ختم کرنے کا موقع نہ دیا۔ اس نے کاؤنٹس کا لمبا تڑنگا ہاتھ اپنی جانب کھینچا، پہلے اس کی

الٹی جانب اور پھر ہتھیلی پر بوسہ ثبت کیا۔ تب اسے دوبارہ الٹایا، پہلے ایک جوڑ کو، پھر پور کو، پھر دوسرے جوڑ کو چوما اور ساتھ ساتھ زیرِ لب کہتی جارہی تھی: ''جنوری، فروری، مارچ، اپریل، مئی...''[30]

''ماما، کچھ تو کہیں۔ آپ کچھ کہتی کیوں نہیں؟ کچھ تو کہیں!'' اس نے اپنی ماں کی طرف، جو پیار سے اسے ٹکٹکی باندھے دیکھے جارہی تھی اور اپنی سوچوں میں گم صم بظاہر یہ بھول چکی تھی کہ وہ کیا کہنا چاہتی تھی، دیکھتے ہوئے کہا۔

''ننھی، یوں بات نہیں بنے گی۔ ہر شخص تو اس رفاقت کو، جس کا آغاز تب ہوا تھا جب تم دونوں ابھی بچے تھے، نہیں سمجھ سکتا۔ اور جو دوسرے نوجوان اس گھر میں آتے ہیں، جب وہ تمھیں اس کے ساتھ اس طرح کی بے تکلفی برتتے دیکھیں گے، ان کی نگاہوں میں تمھاری قدر و قیمت جاتی رہے گی... لیکن اس سے بھی جو بات زیادہ اہم ہے، وہ یہ ہے کہ تم اسے خواہ مخواہ اذیت پہنچا رہی ہو۔ اسے شاید کسی صاحبِ حیثیت دوشیزہ کا موزوں رشتہ مل چکا ہوتا، لیکن اس کے بجائے اس پر جنون غالب آتا جارہا ہے۔''

''جنون غالب آتا جارہا ہے؟'' نتاشا نے دہرایا۔

''میں تمھیں ایک واقعہ سناتی ہوں۔ یہ میرے ساتھ پیش آیا تھا۔ میرا ایک چچیرا بھائی تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ کرِل ماتوِچ۔ لیکن وہ تو اتنے بوڑھے ہیں۔ نہیں؟''

''لیکن وہ سدا کا بوڑھا تو نہیں۔ لیکن سنو، نتاشا، پتا ہے میں کیا کرنا چاہتی ہوں؟ میں بورس سے دُوبدُو بات کروں گی۔ اسے بار بار یہاں نہیں آنا چاہیے۔''

''اگر وہ آنا چاہتا ہے تو پھر کیوں نہ آئے؟''

''کیونکہ میں جانتی ہوں کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔''

''آپ کو کیسے پتا چلا؟ نہیں، ماما، آپ اس سے مت کچھ کہیں۔ اس سے بات کرنے کا خطرہ مول نہ لیں۔ بالکل واہیات حرکت ہوگی!'' نتاشا نے ایک ایسے شخص کے، جو یہ سمجھتا ہے کہ اسے اس کی ملکیت سے محروم کیا جارہا ہے، لہجے سے کہا۔ ''بہت اچھا، میں اس سے شادی نہیں کروں گی۔ لیکن اگر اسے یہاں آنے سے لطف ملتا ہے، پھر اسے آنے دیں۔ اور مجھے تو لطف آتا ہے۔'' نتاشا نے مسکرا کر اپنی ماں پر طائرانہ نگاہ ڈالی۔ ''ہم شادی نہیں کریں گے... لیکن اتنا کرم تو کریں... ہم جیسے چل رہے ہیں، ہمیں ویسے چلتے رہنے دیں۔''

''میری لاڈلی، تمھارا مطلب کیا ہے؟''

''ہم جیسے چل رہے ہیں۔ اگر مجھے اس سے واقعی شادی نہیں کرنا چاہیے... پھر ہم جیسے چل رہے ہیں، ویسے چلتے جائیں گے۔''

''تم جیسے چل رہے ہو،'' کاؤنٹس نے دہراتے ہوئے کہا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی وہ غیر متوقع طور پر خوشگوار اور بزرگانہ انداز سے ہنسنے لگی۔

''مت ہنسیں — رک جائیں!'' نتاشا نے چلاتے ہوئے کہا۔ ''آپ نے تو سارا بیڈ لرزا دیا ہے۔ آپ تو بالکل

مجھ جیسی ہیں: ہنسوڑ، دل لگی باز!...رک جائیں!...'' اس نے کاؤنٹس کے دونوں ہاتھ پکڑ لیے، چھنگلی کا ایک جوڑ چھوا اور اس کے ساتھ بولی: ''جون۔'' پھر وہ دوسرا ہاتھ چومنے لگی، ''جولائی، اگست۔ ماما کیا وہ واقعی محبت میں مجنوں ہو رہا ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا آپ سے کبھی کسی نے اس قدر ٹوٹ کر محبت کی تھی؟ اور وہ تو بہت نفیس، بلکہ نفیس ترین آدمی ہے، صرف میرے ذوق پر پورا نہیں اترتا...اس کی دنیا بہت محدود ہے، ڈرائنگ روم کے کلاک کی طرح... آپ سمجھتی ہیں نا؟ محدود، آپ جانتی ہیں، سرمئی — ہلکا سرمئی،...''

''یہ کیا احمقوں کی سی باتیں کر رہی ہو!'' کاؤنٹس نے کہا۔

''آپ کی سمجھ میں نہیں آیا؟'' نتاشا بولتی چلی گئی۔ ''نکولائی سمجھ جائے گا۔ بزوخوف کو لیں، وہ نیلگوں ہے... گہرا نیلگوں اور قرمزی اور بالکل مربع۔''

''تم اس سے بھی محبت کی پینگیں بڑھا رہی ہو!'' کاؤنٹس نے ہنستے ہوئے کہا۔

''نہیں۔ وہ فری میسن ہے۔ میں معلوم کر چکی ہوں۔ وہ بے انتہا نفیس ہے۔ گہرا نیلگوں اور سرخ۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟''

''ننھی کاؤنٹس!'' دروازے کے باہر کاؤنٹ کی آواز سنائی دی۔

نتاشا نے پلنگ سے نیچے چھلانگ لگا دی، جھپٹ کر سلیپر اٹھائے اور ننگے پاؤں کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

اسے کافی دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ یہی سوچتی رہی کہ جو کچھ وہ سمجھتی ہے اور جو کچھ اس کے باطن میں ہے، اسے کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔

''سونیا؟'' اس نے اس بلونگڑی کے، جو اپنی بھاری بھرکم چوٹی سمیت سمٹی سمٹائی سوئی پڑی تھی، متعلق سوچا۔ ''نہیں، بھلا اسے کیسے علم ہو سکتا ہے؟ یہ معصوم اور نیک فطرت ہے۔ اسے نکولائی سے محبت ہو گئی ہے اور اسے بس صرف اسی کی فکر ہے۔ ماما بھی نہیں سمجھتیں۔ حیرت کی بات ہے کہ میں کتنی تیز طرار ہوں اور کتنی...اف، یہ کتنی پرکشش ہے!'' اور وہ اپنا یونہی صیغۂ غائب میں ذکر کرتی رہی اور تصور ہی تصور میں سوچتی رہی کہ اس کے متعلق یہ باتیں کرنے والا شخص کوئی ذہین وفطین، انتہائی ذہین وفطین اور بہترین مرد ہے۔ ''اس (نتاشا) کے پاس سب کچھ ہے'' یہ مرد کہتا چلا گیا۔ ''سب کچھ ہے، یہ ہے۔ اس (نتاشا) کے پاس سب کچھ ہے،'' یہ مرد کہتا چلا گیا۔ ''سب کچھ ہے' یہ ہمہ صفت موصوف ہے۔ غیر معمولی طور پر ذہین ہے، پرکشش ہے...خوبصورت، انتہائی خوبصورت ہے، خوش وضع وخوش اندام ہے — غضب کی تیراک اور گھڑ سوار ہے۔ اور اس کی آواز؟ کیا کہنے اس آواز کے، حیرت انگیز حد تک سریلی اور دلکش ہے!''

وہ کاروبینی[31] کے اوپیرا میں سے اپنی دل پسند دھن گنگنانے لگی اور جست لگا کر بستر میں گھس گئی۔ وہ اس خیال پر کہ وہ چٹکی بجاتے نیند کی وادیوں میں کھو جائے گی، خوشی سے کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس نے دنیاشا کو آواز دی کہ وہ شمع بجھا دے اور خادمہ ابھی کمرے سے باہر نہیں نکل پائی تھی کہ وہ خوابوں کی دوسری لیکن مسرتوں سے معمور

دنیا میں، جہاں ہر چیز حقیقی زندگی کی طرح ہلکی پھلکی اور حسین وجمیل تھی بلکہ حقیقی دنیا سے بھی کہیں بڑھ کر تھی کیونکہ یہ مختلف تھی، پہنچ گئی۔

اگلے روز کاؤنٹس نے بورس کو بلایا، اس سے گفتگو کی اور اسی دن سے اس نے رستوفوں کے ہاں آنا جانا ترک کر دیا۔

14

1810 کے نوروز سے ایک دن قبل 31 دسمبر کو امپراطورہ کیتھرین کے ایک کہن سال مصاحب نے اجتماعی رقص کی محفل اور نیم شب ضیافت کا اہتمام کیا۔ سفارتی نمائندوں اور وزرا نے اس تقریب میں شریک ہونا تھا۔

انگلش گھاٹ پر اس مصاحب کا مشہور و معروف محل ان گنت روشنیوں سے بقعۂ نور بنا ہوا تھا۔ صدر دروازے پر جو روشنیوں میں نہایا ہوا تھا اور جہاں سرخ بانات بچھی ہوئی تھیں، پولیس تعینات تھی۔ وہاں نہ صرف پیادہ اور سوار سپاہی بلکہ پولیس کا سربراہ بنفس نفیس اور درجنوں دیگر افسر بھی ایستادہ تھے۔ گاڑیوں کا تانتا بندھا تھا۔ پہلی نکلتی تھیں کہ ان کی جگہ نئی آ جاتیں۔ ان کے کوچوانوں نے پردار ہیٹ اور ان کی جلو میں آنے والے ملازمین نے سرخ وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ ان گاڑیوں میں وردیوں میں ملبوس، سینوں پر تمغے اور ریشمی فیتے سجائے مرد، اور ساٹن اور سمور کے ملبوسات میں مستور خواتین برآمد ہوتیں، حزم و احتیاط سے پائیدانوں پر، جو ان کی خاطر کھنکھناہٹ سے نیچے کیے جاتے، پاؤں ٹکاتیں اور پھر تیز تیز لیکن دبے قدموں صدر دروازے کے آر پار بچھائی سرخ بانات پر چلتے گزر جاتیں۔

جونہی کوئی نئی گاڑی آتی، تقریباً ہر بار ہجوم میں کھسر پھسر ہونے لگتی اور ٹوپیاں لہرائے جانے لگتیں۔

"امپراطور؟... ارے نہیں، وزیر... پرنس... سفیر۔ تمھیں کلغیاں نظر نہیں آتیں؟..." ہجوم کی آوازیں سنائی دیتیں۔

ہجوم میں ایک شخص ایسا بھی تھا جس کا لباس دوسروں سے بہتر تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اسے ہر شخص کے بارے میں علم ہے کہ کون کیا ہے۔ وہ اس زمانے کی انتہائی نامور اور اہم شخصیتوں کے نام لے کر ان کی آمد سے دوسروں کو مطلع کر رہا تھا۔

ایک تہائی مہمان پہلے ہی پہنچ چکے تھے لیکن رستوف، جنھیں بھی وہاں موجود ہونا چاہیے تھا، ابھی تک تیاریوں میں پھنسے ہوئے تھے۔

اس اجتماعی رقص کی تقریب میں شرکت کرنے کے سلسلے میں رستوف گھرانے میں خوب بحثیں ہوئی تھیں اور انھوں نے تیاریاں کرنے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ انھیں بار بار یہ اندیشے لاحق ہوئے کہ انھیں شاید دعوت نامہ ہی نہ ملے، شاید ملبوسات وقت پر تیار نہ ہو سکیں، شاید بہ اعتبار نفاست ہر چیز نک سک سے پوری طرح

درست نہ ہو۔

رستوفوں نے کاؤنٹس کی دیرینہ سہیلی اور قرابت دار، لاغر اندام اور زرد رو ماریا اگناتیونا پیرانسکایا کی، جو مادر امپرطورہ کی مصاحبہ تھی اور اپنے دیہاتی رشتے داروں کو پیٹرز برگ کے اعلیٰ ترین طبقوں میں متعارف کراتی تھی، معیت میں جانا تھا۔

انھیں دس بجے محلہ تاوری چسکی گارڈنز میں اس کے گھر پہنچنا تھا، لیکن دس بجنے میں پانچ منٹ رہ گئے اور لڑکیوں نے ابھی تک اپنے ملبوسات نہیں پہنے تھے۔

نتاشا نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی مہتمم بالشان اور پرشکوہ بال میں شریک ہونا تھا۔ وہ اس روز صبح سویرے آٹھ بجے ہی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا سارا دن بھاگتے دوڑتے اور تھرتھلی مچاتے گزرا تھا۔ وہ جس لمحے بیدار ہوئی، اس وقت سے اس کا سارا زور اس بات پر صرف ہو رہا تھا کہ وہ سب — وہ خود، اماں اور سونیا — حتیٰ الامکان اپنے بہترین ملبوسات پہنیں۔ سونیا اور کاؤنٹس آنکھیں بند کر کے اس کی ہدایات پر عمل کرنے لگیں۔ کاؤنٹس نے ارغوانی رنگ کا مخملیں گاؤن پہننا تھا اور دونوں لڑکیوں نے گلابی ریشمی بے بازو کرتیوں کے اوپر سفید مہین جالی دار ریشمی ڈریس زیب تن کرنا اور اپنے ڈریسوں کے بالائی حصے پر گلاب کے پھول ٹکانا تھے۔ انھوں نے اپنے بالوں کی آرائش یونانی انداز (a la greque) سے کرنا تھی۔

آرائشِ جمال کے لوازمات پہلے ہی پورے کیے جا چکے تھے۔ ہاتھ، پاؤں، گردنیں اور کان اچھی طرح دھوئے اور صاف کیے جا چکے تھے اور جیسا کہ اجتماعی رقص کا تقاضا ہے، ان پر پرفیوم چھڑکی اور پاؤڈر لگایا جا چکا تھا۔ جالی دار ریشمی لیس کی لمبی جرابیں اور سفید ساٹن کے سلیپر، جن کے اوپر پھندنے لگے تھے، پہنے جا چکے تھے۔ زلفوں کی آرائش بھی تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ سونیا اور کاؤنٹس دونوں لباس پہن چکی تھیں، لیکن نتاشا، جو ہر ایک کا ہاتھ بٹانے کے لیے تتلی کی مانند ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی، پیچھے رہ گئی تھی۔ وہ ابھی تک آئینے کے سامنے بیٹھی تھی، بناؤ سنگار کے دوران میں جو ڈریسنگ گاؤن اوڑھا جاتا تھا، وہ ابھی تک اس کے مہین شانوں پر لٹک رہا تھا۔ سونیا، جو پوری طرح ملبوس ہو چکی تھی، کمرے کے عین درمیان میں کھڑی تھی اور آخری پھندنا لگا رہی تھی۔ اس نے پن کا سرا اتنے زور سے دبایا کہ وہ چرچراتا فیتے میں گھس گیا لیکن جاتے جاتے اس کی نرم و نازک انگلی زخمی کر گیا۔

''سونیا، ایسے نہیں، ایسے نہیں!'' نتاشا نے گردن گھمانے اور دونوں ہاتھوں سے اپنے بالوں کو سنبھالتے ہوئے چلا کر کہا۔ اس کے یہ بال ابھی تک خادمہ کے، جو اس کا بناؤ سنگار کر رہی تھی، ہاتھوں میں تھے۔ نتاشا اتنی تیزی سے گھومی تھی کہ اسے انھیں چھوڑنے کا موقع ہی نہ ملا۔

''تمھارا یہ پھندنا درست نہیں لگا ہے۔ ادھر آؤ۔''

سونیا نیچے بیٹھ گئی اور نتاشا نے پھندنا ذرا مختلف انداز سے چسپاں کر دیا۔

''مس، اس طرح تو میں اپنا کام نہیں نپٹا سکوں گی،'' خادمہ نے، جو ابھی تک اس کے بال سنبھالے ہوئے

تھی، کہا۔

''اللہ کی بندی، پھر ذرا صبر کر! ہاں سونیا، اب ٹھیک ہے۔''

''آپ لوگ تیار ہو گئیں یا نہیں؟'' کاؤنٹس کی آواز سنائی دی۔ ''دس بجنے کو ہیں۔''

''ابھی آئیں، ابھی آئیں! ماما، آپ تیار ہو گئیں؟''

''مجھے بس اپنے سر کے پٹکے کی پنیں لگانا ہیں۔''

''آپ کچھ نہ کریں، مجھے آلینے دیں!'' نتاشا نے چلا کر کہا۔ ''آپ سے ٹھیک طرح نہیں لگیں گی۔''

''لیکن دس تو بج بھی گئے!''

انھوں نے اجتماعی رقص کی تقریب میں ساڑھے دس بجے پہنچنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن نتاشا نے ابھی اپنا ڈریس پہننا تھا اور انھیں تاوری چسکی گارڈنز بھی جانا تھا۔

جب نتاشا کی کنگھی چوٹی ختم ہو گئی، وہ اپنا چھوٹا پیٹی کوٹ، جس کے نیچے اس کے رقص کے سلیپر اپنی جھلک دکھا رہے تھے، اور اپنی والدہ کا بناؤ سنگار کا ڈریسنگ گاؤن اوڑھے، بھاگم بھاگم سونیا کے پاس پہنچی، اس کا بنظر غور جائزہ لیا اور پھر امی کی طرف بھاگ پڑی۔ اس نے کاؤنٹس کے سر کو کبھی ادھر اور کبھی ادھر گھمایا، اس کے پٹکے پر پنیں لگائیں، جلدی جلدی اس کے سفید بالوں پر بوسہ دیا اور بھاگتی دوڑتی دوبارہ خادماؤں کے، جو اس کے ڈریس کے بخیے لگا رہی تھیں، پاس آگئی۔

نتاشا کے ڈریس نے تاخیر کرا دی۔ ڈریس ذرا لمبا تھا۔ دو خادمائیں اس کی جھالر دوہری کیے ٹانکے لگا رہی تھیں، تیسری منہ میں پنیں دبائے سونیا سے کاؤنٹس کی جانب بھاگی جا رہی تھی اور چوتھی اپنے ہاتھوں میں مہین جالی دار ریشمی ڈریس اوپر اٹھائے کھڑی تھی۔

''ماورُوشا، ڈارلنگ، ذرا جلدی ہاتھ چلاؤ۔''

''مس، انگشتانہ پکڑانا، ادھر پڑا ہے...''

''کبھی تیار ہو گی بھی یا نہیں؟'' کاؤنٹ نے دروازے کی جانب آتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ لو، پرفیوم لگا لو۔ مادام پیرانسکایا انتظار کرتے کرتے تنگ آگئی ہوں گی۔''

''مس، یہ لیں، تیار ہو گیا،'' خادمہ نے دو انگلیوں سے ڈریس، جسے ذرا چھوٹا کر دیا گیا تھا، اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی جھاڑ وھاڑ کر رہی تھی اور پھونکیں مار مار کر اس پر سے کوئی چیز ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اپنی اس حرکت سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ جو کچھ وہ اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے ہے، وہ اس کی پاکیزگی اور لطافت سے پوری طرح آگاہ ہے۔

نتاشا ڈریس پہننے لگی۔

''ایک منٹ، ایک منٹ — پاپا، اندر نہ آئیں!'' اس نے اپنے باپ سے کہا جو دروازہ کھول رہا تھا۔ اس کا

سر ڈریس کے بادل میں مستور تھا۔

سونیا نے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ تاہم ایک منٹ بعد انھوں نے کاؤنٹ کو اندر بلا لیا۔ وہ نیلا ڈریس کوٹ، لمبی جرابیں اور بکسوئے دار جوتے پہنے اور پرفیوم اور پوماد لگائے ہوئے تھا۔

''پاپا، آپ تو بہت شاندار لگ رہے ہیں!۔۔۔ایک دم شاندار اور خوبصورت!'' نتاشا نے کہا۔ وہ کمرے کے بیچ میں کھڑی تھی اور اپنے مہین ڈریس کی شکنیں درست کر رہی تھی۔

''مس، ذرا اجازت دیں۔'' ایک خادمہ نے کہا۔ وہ گھٹنوں پر جھکی اس کا ڈریس سیدھا کر رہی تھی۔ اس کے منہ میں پنیں تھیں۔ وہ انھیں زبان سے ایک جانب سے دوسری جانب پھرا رہی تھی۔

''تم جو جی چاہے، کہو،'' سونیا نے نتاشا کے ڈریس کا ناقدانہ جائزہ لیتے ہوئے منہ لٹکا کر کہا۔ ''تم جو جی چاہے، کہو، لیکن یہ ہے اب بھی لمبا!''

نتاشا لپک کر دیواری آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی تاکہ وہ اپنا جائزہ خود لے سکے۔ ڈریس کچھ زیادہ ہی لمبا تھا۔

''نہیں، مادام، یہ لمبا ومبا نہیں ہے، بالکل نہیں،'' مادروشا نے کہا۔ وہ اپنی نوجوان مالکہ کے پیچھے گھٹنوں کے بل رینگتی آ رہی تھی۔

''اگر یہ لمبا ہے، اسے ہم اور چھوٹا کر دیتی ہیں، بس ایک منٹ لگے گا،'' دھن کی پکی دُنیاشا نے رومال سے، جو اس نے بصورت صلیب اپنے سینے پر ٹانکا ہوا تھا، سوئی نکالتے ہوئے کہا۔ وہ دوبارہ گھٹنوں کے بل جھک گئی اور اس نے اپنا کام شروع کر دیا۔

اسی لمحے کاؤنٹس اپنے مخملیں گاؤن اور سر کا پٹکا پہنے شرماتے لجاتے دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی۔

''اوہو...میری پری پیکر!'' کاؤنٹ نے اپنے حلق کا پورا زور لگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ تم دونوں سے زیادہ خوبصورت نظر آ رہی ہے!''

وہ اسے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیتا لیکن وہ پیچھے ہٹ گئی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں اس کے لباس میں سلوٹیں نہ پڑ جائیں۔

''ماما، آپ کا پٹکا ایک طرف کھسک گیا ہے،'' نتاشا نے کہا۔ ''آئیں، میں اسے دوبارہ ٹھیک کیے دیتی ہوں۔'' وہ ہرنی کی طرح یوں آگے کو بھاگی کہ خادمائیں، جو اس کا ڈریس سنبھالے ہوئے تھیں، اس کا ساتھ نہ دے سکیں اور اس کے ڈریس سے ایک دھجی پھٹ کر علیحدہ ہو گئی۔

''خداوندا رحم! یہ کیا ہوا؟ پر یہ میرا قصور تو نہیں...''

''فکر نہ کریں۔ میں ابھی رفو کیے دیتی ہوں۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا،'' دُنیاشا نے کہا۔

''میری بنو! میری ننھی شہزادی!'' بوڑھی نرس نے دروازے کی جانب آتے ہوئے کہا۔ ''اور سونیوشکا بھی!

پرستان کی پریاں ہیں، پریاں!''

آخر سوا دس بجے وہ گاڑی میں بیٹھ گئے اور چل پڑے لیکن ابھی انھیں تاوری چسکی گارڈنز جانا تھا۔

پیرانسکایا تیار ہو چکی تھی اور ان کا انتظار کر رہی تھی۔ پیرانہ سالی اور سپاٹ نقوش کے باوجود رستوفوں کی طرح اس نے بھی بناؤ سنگار میں کوئی کسر باقی نہ چھوڑی تھی، تاہم اس نے کوئی شور شرابا نہیں کیا تھا کیونکہ اس کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔ اس کا بھدا اور غیر دلکش بدن انھی کی طرح نہلا دھلا کر صاف کیا گیا تھا اور اس پر بھی ویسے ہی پرفیوم اور پاؤڈر لگایا گیا تھا۔ اس کے کانوں کی لویں بھی بالکل انھیں کی طرح احتیاط سے دھو دھو کر صاف کی گئی تھیں اور جب وہ زرد گاؤن پہنے اور سینے پر اپنا اعزاز، جس پر مادرہ امپراطورہ کا مونوگرام منقش تھا، سجائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، اس کی ادھیڑ عمر خادمہ نے بھی رستوفوں کے ملازمین کی طرح ''واہ، واہ، اور سبحان اللہ'' کے ڈونگرے برسائے تھے۔

اس نے رستوفوں کے اور انھوں نے اس کے ملبوسات کی تعریف کی اور وہ گیارہ بجے اپنے بالوں اور گاؤنوں کو سنبھالتے گاڑیوں میں بیٹھ گئے اور اپنی منزل کی طرف چل پڑے۔

15

صبح سویرے سے نتاشا کو ایک لمحہ بھی ایسا، جسے وہ اپنا کہہ سکتی، میسر نہیں آیا تھا اور نہ اسے یہ سوچنے کا، کہ اسے کن حالات میں سے گزرنا پڑے گا، کوئی موقع میسر آیا تھا۔

وہ ٹھنڈی مرطوب ہوا اور جھولتی، ڈگمگاتی گاڑی کی نیم تاریکی میں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی اور اسے پہلی مرتبہ یہ موقع ملا تھا کہ وہ اپنے ذہن میں ان تمام اشیا اور امور — موسیقی، پھول، رقص گری، زار، پیٹرز برگ کے تمام بانکے سجیلے نوجوانوں کا — جن سے اس کا اجتماعی رقص اور جگمگاتی روشنیوں سے منور ہال کمروں میں واسطہ پڑنا تھا، واضح نقشہ بنا سکے۔ امکانات اتنے رفیع الشان اور سہانے تھے کہ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کچھ سچ ہو سکتا ہے کیونکہ اس وقت وہ جس گاڑی میں بیٹھی تھی، اس کے باہر اتنی ٹھنڈک اور اس کے اندر اتنی تاریکی اور تنگی تھی کہ دونوں کی ایک دوسرے سے کوئی مناسبت نظر نہیں آتی تھی۔ اسے کن چیزوں سے نپٹنا تھا، اس کا اندازہ اسے تبھی ہوا جب وہ صدر دروازے سے سرخ بانات پر چلتی پیش دالان میں پہنچی، اپنا چغا اتارا اور سونیا کی معیت میں اپنی امی کے آگے آگے پھولوں کے بیچوں بیچ چلتی زینہ، جو روشنیوں میں نہایا ہوا تھا، چڑھنے لگی۔ صرف اب اسے یاد آیا کہ اسے اجتماعی رقص پر کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور اس نے وہ پرشکوہ انداز، جو اس کے خیال کے مطابق ایسے موقع پر نوجوان لڑکیوں کے لیے ضروری ہوتا ہے، اپنانے کی کوشش کی۔ لیکن اسے اس کی خوش قسمتی ہی کہیں کہ اس کی آنکھیں اتنی چندھیا گئیں کہ اسے کوئی چیز صاف دکھائی نہیں دے رہی تھی، اس کی نبض کی رفتار فی منٹ سو تک پہنچ چکی تھی اور اس کا خون اس کے دل میں نہایت تیزی سے گردش کرنے لگا تھا۔ ان حالات میں اس کے لیے اس قسم کا پوز بنانا، جو

اسے دوسروں کی نگاہوں میں نکو بنا دیتا، ناممکن ہوگیا۔ وہ اپنے قدم آگے بڑھائے جارہی تھی۔ اس کے دل میں جو بل چل برپا تھی، اس سے اس کے ہوش وحواس تقریباً معطل ہوتے جارہے تھے اور وہ اپنی اس بل چل کو چھپانے کی پوری سعی کررہی تھی۔ اس کی یہی وہ ادا تھی جو اس پر صحیح معنوں میں پھبتی تھی۔ ان کے آگے پیچھے دیگر مہمانوں نے بھی لمبے گاؤن پہنے ہوئے تھے اور وہ زیرلب باتیں کرتے جارہے تھے۔ زینے کے ساتھ ساتھ دیواروں پر جو آئینے نصب تھے، ان میں سفید، ہلکے نیلگوں اور گلابی گاؤن پہنے اور اپنے برہنہ بازوؤں اور سینوں پر ہیرے جواہرات سجائے خواتین کے عکس دکھائی دے رہے تھے۔

نتاشا نے آئینوں میں جھانک کر دیکھا اور اسے اپنے اور دوسروں کے عکس میں کوئی فرق نظر نہ آیا۔ سبھی جھلملاتے، چمچماتے جلوس میں گھل مل کر ایک ہوگئے تھے۔ انسانی آوازوں، قدموں کی چاپوں اور علیک سلیک کے مسلسل شوروغل نے نتاشا کے کان بہرے کردیے۔ روشنیوں کی جگمگاہٹ اور چمک دمک نے اس کی آنکھیں چندھیادیں۔ میزبان اور اس کی اہلیہ نے، جنھیں دروازے پر کھڑے کھڑے آدھ گھنٹے سے اوپر گزر چکا تھا اور جو ہر نئے مہمان کی آمد پر ایک ہی جملہ "Charme de vous voir"* دہرائے جارہے تھے، رستوفوں اور پیرانسکایا کا بھی اسی طرح استقبال کیا۔

دونوں لڑکیاں، جو سفید ڈریس پہنے اور اپنے سیاہ بالوں میں گلاب کا ایک ایک پھول ٹکائے ہوئے تھیں، بالکل یکساں انداز سے جھک کر آداب بجالائیں لیکن میزبان کی اہلیہ کی نگاہیں غیرارادی طور پر نتاشا کے اکہرے جسم پر زیادہ دیر تک ٹکی رہیں۔ اس نے اس کا جس مسکراہٹ سے خیرمقدم کیا، وہ اس مسکراہٹ سے، جس سے وہ دوسرے مہمانوں کا استقبال کررہی تھی، کچھ زیادہ بامعنی تھی، اسے دیکھ کر اسے شاید اپنے لڑکپن کا وہ سنہری زمانہ، جب وہ بھی اپنے اولیں بال میں شریک ہوئی ہوگی، یاد آگیا ہو لیکن وہ زمانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھوں سے نکل چکا تھا اور اس کے دوبارہ گرفت میں آنے کا امکان قطعی ختم ہوچکا تھا۔ میزبان نے بھی اپنی نگاہوں سے نتاشا کا تعاقب کیا اور اس نے کاؤنٹ سے دریافت کیا: ''آپ کی صاحب زادی کون ہے؟''

"Charmante!"* اس نے اپنی انگلیوں کی پھنگیں چومتے ہوئے کہا۔

زار کے انتظار میں مہمان بال روم میں دروازے کے قریب ہجوم کیے کھڑے تھے۔ کاؤنٹس نے اس گروہ کی پہلی قطار میں پوزیشن سنبھال لی۔ نتاشا کو سنائی بھی دے رہا تھا اور محسوس بھی ہو رہا تھا کہ متعدد اشخاص اس کے بارے میں چہ میگوئیاں کررہے ہیں اور اسے دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ اسے احساس ہوا کہ جن لوگوں کی نظریں اس پر پڑی ہیں، اس نے ان پر اچھا تاثر چھوڑا ہے۔ اس مشاہدے سے اس کے جذبات میں قدرے ٹھہراؤ آگیا۔

''ان میں سے بعض تو ہمارے ہی جیسے ہیں اور بعض بالکل ہی گئے گزرے ہیں،'' اس نے سوچا۔

- آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔
- سحرانگیز پرکشش

ہال میں جو ممتاز شخصیات آئی تھیں، پیرانسکایا ہاتھ کے اشارے سے کاؤنٹس کو ان کے بارے میں بتا رہی تھی۔
''وہ ولندیزی سفیر ہے۔ نظر آیا؟ وہ جس کے بال سفید ہیں،'' اس نے ایک بزرگ شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس شخص کے سر پر چاندی کے بالوں کا زبردست جمگھٹا تھا۔ اس کے گرد و پیش خواتین نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ وہ انھیں کچھ بتا رہا تھا اور وہ خوب قہقہے لگا رہی تھیں۔

''اور یہ رہی پیٹرز برگ کی ملکہ، کاؤنٹس بزوخووا،'' اس نے ہیلین کی طرف، جو ابھی ابھی اندر آئی تھی، انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ ''کتنی خوبصورت ہے! یہ صحیح معنوں میں ماریا آنتونونونا[32] سے ٹکر لے سکتی ہے۔ اور دیکھو، بوڑھے اور جوان، ہر عمر کے مرد کس طرح اس کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں۔ وہ حسین بھی ہے اور تیز طرار بھی۔ کہتے ہیں کہ پرنس۔۔اس کے عشق میں پاگل ہوا جا رہا ہے۔ اور ان دونوں کو دیکھو، اگرچہ حسن نام کی کوئی چیز انھیں چھو کر بھی نہیں گزری، پھر بھی ان کی مانگ بے حد زیادہ ہے۔''

اس نے ایک خاتون کی طرف، جو اپنی بالکل معمولی شکل و صورت والی بیٹی کے ہمراہ کمرے میں سے گزر رہی تھی، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ لونڈیا لاکھوں کروڑوں کی وارث ہے،'' پیرانسکایا نے کہا۔ ''اور یہ رہے اس کے چاہنے والے۔
''وہ کاؤنٹس بزوخووا کا بھائی اناطول کوراگن ہے،'' اس نے ہارس گارڈز کے ایک خوب رو افسر کی طرف، جو سیدھا تن کر ان کے قریب سے گزر رہا تھا اور خواتین کے سروں کے اوپر ہی اوپر کوئی چیز دیکھ رہا تھا، انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ ''وجیہہ و شکیل۔ ہے نا؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ اس لاکھوں کروڑوں کی وارث سے شادی کرے گا۔ اور تمھارا کزن دروبیتسکوئے بھی اس کے تلوے چاٹ رہا ہے۔ سنا ہے کہ لاکھوں کروڑوں ... ارے ہاں، وہ فرانسیسی سفیر ہے،'' اس نے کولین کورخ کے متعلق کاؤنٹس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''دیکھو تو سہی۔۔بالکل بادشاہ سلامت نظر آتا ہے! بہرحال یہ فرانسیسی ہوتے ہی بڑے من موہنے اور فسوں ساز۔ سوسائٹی میں ان سے بڑھ کر خوبصورت اور دل کش شکلیں کہیں نہیں ملیں گی۔ اور ہاں، یہ رہی وہ! ہماری ماریا آنتونونونا، اس جیسی ڈھونڈے سے بھی کہیں نہیں ملے گی! دیکھو تو، اس نے کتنا سادہ لباس پہنا ہوا ہے! لیکن کتنا خوبصورت اور دل آویز ہے! وہ ہٹا کٹا شخص، جس نے عینک لگائی ہوئی ہے، بہت بڑا افری میسن ہے،'' اس نے پیئر بزوخوف کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کو اگر اس کی بیوی کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے، بالکل مسخرہ نظر آئے گا۔''

پیئر ہجوم میں راستہ بناتے آگے جا رہا تھا۔ اس کا بھاری بھرکم جسم جھول رہا تھا اور وہ دائیں بائیں یوں لاتعلقی اور خوش طینتی سے گردن گھما کر سلام کرتا جا رہا تھا جیسے وہ کسی میلے میں پھر رہا ہو۔ وہ جس انداز سے دھکم پیل کرتا ہوا آگے جا رہا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اسے کسی شخص کی تلاش ہے۔

نتاشا پیئر (اور بقول پیرانسکایا ''مسخرہ'') کا جانا پہچانا چہرہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئی۔ وہ جان گئی کہ وہ جن لوگوں کو ڈھونڈ رہا ہے، وہ اس کے گھر والے اور خاص طور پر وہ خود ہے۔ پیئر نے اس سے وعدہ کیا تھا کہ وہ آئے گا اور اس

کے لیے رقص کے ساتھی تلاش کرے گا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ پیئر ان تک پہنچ پاتا وہ ایک وجیہہ وشکیل سانولے نوجوان کے، جس کا قد درمیانہ اور جو سفید وردی میں ملبوس تھا، قریب رک گیا۔ یہ نوجوان ایک بلند قامت شخص کے ساتھ، جس کے سینے پر تمغے اور فیتے آویزاں تھے، محو گفتگو تھا۔ نتاشا نے جھٹ پٹ اس سفید وردی میں ملبوس میانہ قامت اور خوب رو نوجوان کو پہچان لیا۔ وہ اسے پہلے کی نسبت کہیں کم عمر، زیادہ خوش وخرم اور خوش شکل نظر آیا۔

''یہاں ایک اور آدمی، جسے ہم جانتے ہیں، ـــ بلکونسکی ـــ بھی ہے۔ ماما، دیکھا آپ نے؟'' نتاشا نے پرنس آندرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو یاد ہوگا کہ یہ ایک رات ہمارے گھر اترادنایا ٹھہرا تھا؟''

''ارے، تم اسے جانتی ہو؟'' پیرانسکایا نے دریافت کیا۔ ''مجھ سے یہ شخص برداشت نہیں ہوتا۔ آج کل ہر کوئی اس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ اس شخص کا دماغ... اللہ توبہ... بالکل آسمان تک پہنچا ہوا ہے۔ ہو بہو اپنے باپ کی نقل ہے۔ آج کل سپے رانسکی سے اس کی گاڑھی چھنتی ہے۔ دونوں کسی منصوبے پر کام کر رہے ہیں۔ دیکھو، یہ خواتین کو جوتی کی نوک پر نہیں رکھتا۔ وہ خاتون اس سے بات کرنے کی متمنی ہے اور یہ ہے کہ اس کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا ہے،'' اس نے اس کی جانب انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ ''یہ جس قسم کا سلوک ان خواتین کے ساتھ کر رہا ہے، میرے ساتھ کرے تو میں اسے وہ سناؤں کہ اسے چھٹی کا دودھ یاد آجائے!''

16

اچانک ہجوم میں ہل چل مچ گئی۔ لوگ کھسر پھسر کرنے لگے۔ وہ آگے بڑھے اور پھر پیچھے ہٹ گئے۔ یوں وہ دو قطاروں میں بٹ گئے۔ ان قطاروں کے بیچ جو راستہ بنا، اس پر آرکسٹرا کی، جو اس کی آمد پر بجنے لگا تھا، دھنوں کا ساتھ دیتے زار گزرنے لگا۔ اس کے پیچھے پیچھے میزبان اور اس کی اہلیہ آرہے تھے۔ زار یوں تیز تیز قدم اٹھاتے اور دائیں بائیں سر جھکاتے جارہا تھا جیسے وہ ان ابتدائی رسمی کارروائیوں سے جلد از جلد جان چھڑانے کی فکر میں ہو۔ آرکسٹرا پولستانی رقص کی، جس کا اس زمانے میں بہت رواج ہو چلا تھا، دھنیں بکھیر رہا تھا۔ مقبولیت کا سبب وہ بول تھے جو ان میں سموئے گئے تھے۔ نغمے کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی تھی: ''الیکساندر، ایلزاویتا، تم نے ہمارے دل موہ لیے ہیں۔'' زار چلتے چلتے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا۔ ہجوم دروازوں پر پل پڑا۔ دھکم پیل ہو رہی تھی۔ کسی نے اگلی جانب دھکا کھایا اور کسی نے پچھلی جانب۔ سب کے چہرے منقلب ہو چکے تھے۔ تاہم ڈرائنگ روم کے دروازوں پر بھیڑ چھٹ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں زار اپنے میزبان کی اہلیہ کے ساتھ مصروف گفتگو ہے۔ ایک نوجوان نے، جو چہرے مہرے سے بدحواس نظر آرہا تھا، خواتین پر یلغار کر دی اور ان سے التجائیں کرنے لگا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔ متعدد عورتیں، جن کی صورتیں یہ غمازی کر رہی تھیں کہ وہ شائستگی کے تمام آداب بالائے طاق رکھ چکی ہیں، آگے دھکم پیل کرنے لگیں اور انھیں اتنا خیال بھی نہ رہا کہ اس طرح ان کے قیمتی ملبوسات کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ جہاں تک

مردوں کا تعلق ہے، وہ اپنی ساتھی خواتین منتخب کرنے اور پولستانی رقص کے لیے اپنی اپنی جگہیں سنبھالنے لگے۔

ہر شخص پیچھے ہٹ گیا، جگہ خالی ہو گئی اور متبسم زار، اپنے میزبان کی اہلیہ کے ہاتھوں میں ہاتھ دیے ڈرائنگ روم سے برآمد ہوا لیکن اس کی چال موسیقی کی لے کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا میزبان زار کی چہیتی ماریا آنتو ونا نارش کینا کی معیت میں آ رہا تھا۔ ان کے عقب میں سفیر، وزیر اور مختلف جرنیل تھے۔ پیرانسکایا باری باری سب کے نام گنوا رہی تھی۔ نصف سے زیادہ خواتین کو ساتھی مل چکے تھے اور وہ رقص کے لیے اپنی جگہیں سنبھال چکی تھیں یا سنبھالنے میں مصروف تھیں۔

نتاشا کو محسوس ہوا کہ وہ، اس کی ماں اور سونیا اس اقلیت کے ساتھ، جو دیوار کے قریب ہجوم کیے تھی، کھڑی کی کھڑی رہ جائیں گی کیونکہ کسی نے بھی انھیں رقص کی دعوت نہیں دی تھی۔ وہ اپنے دبلے پتلے بازو اپنے پہلوؤں کے ساتھ لٹکائے وہاں کھڑی تھی۔ اس کا سینہ، جس کا ابھار ابھی ٹھیک طرح واضح نہیں ہوا تھا، باقاعدہ رفتار سے اوپر نیچے اٹھ رہا تھا۔ وہ دم سادھے اپنی جگمگاتی خوف زدہ نگاہوں سے ٹکر ٹکر ناک کی سیدھ دیکھ رہی تھی۔ قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ بے پناہ مسرت یا بے پناہ گلفت دونوں کے لیے تیار ہے۔ اسے نہ زار میں کوئی دلچسپی تھی اور نہ ان شخصیات میں، جن کی طرف پیرانسکایا اشارے کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا: ''کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی مجھے بلانے نہ آئے؟ پہلے رقص میں جو خواتین شریک ہوں گی، کیا میں ان میں شامل نہیں ہوں گی؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان مردوں میں کوئی بھی مجھے التفات کے قابل نہ سمجھے؟ مجھے تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ میں انھیں نظر ہی نہیں آ رہی اور اگر کسی کو نظر آ بھی رہی ہوں، کچھ یوں معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ کہہ رہے ہوں، 'نہیں، یہ وہ نہیں جس کی مجھے تلاش ہے، پھر اس کی طرف دیکھنا لاحاصل ہے۔' نہیں ایسا نہیں ہو سکتا؛'' اس نے سوچا۔ ''انھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں رقص کے لیے کتنی بے تاب ہوں، میں کتنا شاندار رقص کرتی ہوں اور میرے ساتھ رقص کرنے میں انھیں کتنا لطف آئے گا۔''

پولستانی نغمے کی دھنیں، جنھیں چھڑے کچھ وقت گزر چکا تھا، اب نتاشا کے کانوں میں کسی مغموم یاد کی طرح افسردہ آوازیں بن کر گونجنے لگیں۔ اس کا رونے کو جی چاہتا تھا۔ پیرانسکایا انھیں چھوڑ کر جا چکی تھی۔ کاؤنٹ بال روم کے دوسرے کنارے پر تھا اور وہ، کاؤنٹس اور سونیا اجنبیوں کے اس ہجوم میں اسی طرح یکہ و تنہا تھیں جس طرح آدمی جنگل کے عین قلب میں ہوتا ہے۔ ان میں نہ کوئی دلچسپی لے رہا تھا اور نہ وہ کسی کے مطلب کی تھیں۔ پرنس آندرے ایک خاتون کی معیت میں آیا اور ان کے عین قریب سے گزر گیا۔ صاف ظاہر تھا کہ اس نے انھیں پہچانا ہی نہیں تھا۔ خوب رو اناطول مسکرا مسکرا کر اپنی ساتھی سے باتیں کر رہا تھا اور اس نے نتاشا کے چہرے کی جانب یوں دیکھا، جیسے وہ کوئی دیوار کو دیکھتا ہے۔ بورس دو مرتبہ ان کے قریب سے گزرا تھا اور ہر مرتبہ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تھا۔ برگ اور اس کی جیون ساتھی رقص نہیں کر رہے تھے۔ وہ ان کے پاس آ گئے۔

یہاں بال روم میں خاندانی بے تکلفی نتاشا کے لیے سوہان روح تھی۔ گویا اس خاندان کو اجتماعی رقص کی

تقریب کے ماسوا باتیں کرنے کے لیے اور کوئی موقع اور مقام میسر نہیں آ سکتا تھا! اس نے ویرا کی طرف، جو انھیں اپنے سبز ڈریس کے بارے میں کچھ بتا رہی تھی، نہ آنکھ اٹھا کر دیکھا اور نہ اس کی کوئی بات سنی۔

آخر کار زار اپنی آخری ہم رقص کے قریب رک گیا (وہ تین خواتین کے ساتھ رقص کر چکا تھا) اور موسیقی تھم گئی۔ ایک ایڈی کانگ، جو ضرورت سے زیادہ مستعدی کا مظاہرہ کر رہا تھا، لپکتا جھپکتا رستوفوں کے پاس پہنچا اور ان سے کہنے لگا کہ وہ مزید پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جائیں حالانکہ وہ پہلے ہی دیوار سے لگ کر کھڑے تھے اور ادھر گیلری سے والز کی بالکل صحیح، پر شکوہ اور دلکش دھنوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ زار نے مسکرا کر بال روم میں نگاہ دوڑائی۔ ایک منٹ گزر گیا۔ ابھی تک کسی نے بھی رقص کا آغاز نہیں کیا تھا۔ ایک ایڈی کانگ، جو میر تشریفات[33] تھا، کاؤنٹس بزوخوا کے پاس پہنچا اور اس سے اپنے ساتھ رقص کی فرمائش کی۔ وہ مسکرائی، اس نے اپنا بازو بلند کیا اور اس کی طرف دیکھے بغیر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ ایڈی کانگ نے، جو اپنے فن کا استاد تھا، اپنی ہم رقص کی کمر پر ہاتھ ڈالا، مضبوطی سے اسے اپنی گرفت میں لیا اور پر اعتماد لیکن دھیمے انداز سے تھرکنے لگا۔ اس کی حرکات میں ملائمت تھی۔ اس نے یوں ہی دائرے کے گرد پہلا چکر لگایا۔ جب وہ کمرے کے کونے میں پہنچا، اس نے ہیلین کا بایاں ہاتھ پکڑا اور اسے گھمایا۔ موسیقی کی لے کے علاوہ، جو ہر دم تیز ہوتی جا رہی تھی، کمرے میں جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، وہ اس کے تیز اور پھرتیلے پاؤں پر مہمیزوں کی ہم آہنگ جھنکار تھی اور ہر تیسری تال پر اس کی ہم رقص کی مخملیں سکرٹ فضا میں یوں اچھلتی جیسے دریا میں پانی کی موج اٹھ رہی ہو جب کہ وہ خود گولے کی طرح گھوم رہی ہوتی۔ نتاشا کی نگاہیں ان پر جمی ہوئی تھیں اور وہ آبدیدہ ہو رہی تھی کیونکہ والز کے پہلے دور میں جو خاتون رقص کر رہی تھی وہ، وہ خود نہیں تھی۔

پرنس آندرے، جس نے گھڑ سوار فوج کے کرنل کی سفید وردی، لمبی ریشمی جرابیں اور رقص کے جوتے پہن رکھے تھے، رستوفوں سے کچھ ہی دور کھڑا تھا۔ وہ جوش و خروش سے لبریز اور بے حد خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔ اگلے روز کونسل آف سٹیٹ کا جو ابتدائی اجلاس منعقد ہونا تھا، بیرن فرہوف اس سے اس کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ پرنس آندرے کو ایک تو سپے رانسکی کا قرب حاصل تھا، دوسرے وہ قانون ساز کمشن کے کام میں بھی ہاتھ بٹاتا تھا، اس لیے وہ اس حیثیت میں تھا کہ وہ اس اجلاس کے متعلق، جس کے بارے میں متضاد افواہیں پھیل رہی تھیں، مصدقہ معلومات فراہم کر سکے۔ تاہم اس کے کان فرہوف کی باتوں پر نہیں تھے بلکہ اس کی نگاہیں کبھی زار پر اور کبھی ان مردوں پر، جو رقص کرنے کے لیے پر تول رہے تھے لیکن ابھی تک اس میں شریک ہونے کی ہمت نہیں کر سکے تھے، مرکوز تھیں۔

جب پرنس آندرے ان مرد حضرات کو، جو امیر اطور کی موجودگی میں محجوب ہو رہے تھے اور ان خواتین کو، جو رقص کی دعوت حاصل کرنے کے لیے مری جا رہی تھیں، دیکھ رہا تھا، پیئر اس کے پاس آیا اور اس نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

''تم ہمیشہ رقص کرتے رہتے ہو۔ میں بھی ایک دوشیزہ کا مربی ہوں۔ وہ رستوفوں کی چھوٹی صاحب زادی

ہے۔اسے ضرور دعوت دو۔''

''کہاں ہے وہ؟'' بلکونسکی نے پوچھا۔ ''معافی چاہتا ہوں،'' اس نے بیرن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ہم یہ گفتگو کسی اور موقع کے لیے اٹھائے رکھتے ہیں—بال پر تو رقص ہی کرنا چاہیے۔''

پیئر نے جدھر اشارہ کیا تھا، اس نے ادھر قدم بڑھایا اور معاً اس کی نظر نتاشا کے اداس اور پژمردہ چہرے پر پڑی۔ وہ اسے پہچان گیا اور تاڑ گیا کہ یہ اس کا افتتاحی بال ہے۔ اس نے اس کے احساسات وجذبات کے متعلق قیافہ لگالیا اور اسے وہ گفتگو، جو اس نے نادانستہ دریچے کے اوپر سنی تھی، یاد آ گئی۔ وہ اپنے چہرے پر پرمسرت مسکراہٹ سجائے کاؤنٹس رستووا کی طرف چل دیا۔

''اگر آپ برا نہ منائیں، تو میں اپنی بیٹی کا تعارف آپ سے کرادوں؟'' کاؤنٹس نے کہا۔ اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو رہا تھا۔

''کاؤنٹس، اگر آپ کو یاد ہو تو میں یہ عرض کروں گا کہ مجھے ان سے پہلے ہی تعارف حاصل ہے،'' پرنس آندرے نے ذرا جھک کر اور شائستہ انداز سے سلام کرتے ہوئے کہا۔ پیر انسکایا نے اس کی بے سلیقگی اور ناتراشیدگی کا جو نقشہ کھینچا تھا، اس نے اپنے قول و فعل سے اسے جھٹلا دیا۔

پھر وہ نتاشا کی طرف مڑا اور ابھی اسے، ہم رقص بننے کی دعوت مکمل بھی نہیں کر پایا تھا کہ اپنا بازو اس کی کمر کے گرد حائل کر دیا۔ اس نے تجویز پیش کی انھیں والز کا چکر لگانا چاہیے۔ نتاشا کے چہرے پر کچھ اس قسم کی لرزیدگی طاری تھی کہ یوں لگ رہا تھا کہ اس نے یا تو مسرت کی انتہائی بلندیوں کو چھو لیا ہے یا پھر وہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر چکی ہے۔ آناً فاناً اس کا چہرہ کھل اٹھا اور وہاں پرمسرت، پرتشکر اور بچوں کی معصوم مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

''میں تو روزِ ازل سے تمھارا انتظار کر رہی ہوں!'' جب خوف زدہ مسرور ننھی منی لڑکی نے اپنا ہاتھ اٹھا کر پرنس آندرے کے شانے پر رکھا، وہ کہتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے پر وہ تبسم تھا جس نے آنسوؤں کے مابین، جو اس کی آنکھوں سے چھلکا ہی چاہتے تھے، اس کے خدوخال کو جلا بخش دی تھی۔ رقص کے دائرے میں شامل ہونے والا یہ دوسرا جوڑا تھا۔ پرنس آندرے کا شمار اپنے زمانے کے بہترین رقاصوں میں ہوتا تھا اور نتاشا نہایت نفاست سے رقص کرتی تھی۔ اس کے ننھے منے پاؤں، جو ساٹن کے بنے رقص کے سلیپروں میں مستور تھے، اس نزاکت اور برق رفتاری سے حرکت کر رہے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان میں پر لگ گئے ہیں جب کہ مسرت وشادمانی نے اس کے چہرے پر رونق پیدا کر دی تھی اور وجد طاری کر دیا تھا۔ اس کی دبلی پتلی گردن اور برہنہ بازو اتنے خوبصورت نہیں تھے اور ہیلین کے مقابلے میں اس کے شانے مہین اور اس کے سینے کا ابھار غیر واضح تھا۔ لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ہیلین کے بدن پر، اس پالش کی، جو ان ہزاروں آنکھوں نے جو اس کے جسم کو کھنگالتی رہی تھیں، وہاں چھوڑا تھا، تہیں چڑھ چکی ہیں۔ اس کے برعکس نتاشا نوخیز دوشیزہ تھی۔ یوں نظر آتا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ کھلے گلے کا لباس (decolletee) پہنا ہے اور اگر اسے یہ یقین نہ دلایا جاتا کہ اس نے جو کچھ زیب تن کیا ہے، وہ بالکل

مناسب ہے، وہ شرم سے پانی پانی ہو جاتی۔

پرنس آندرے رقص کر رہا تھا کیونکہ رقص کرنے میں اسے لطف آتا تھا۔ اس کے رقص کرنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے ہر شخص سیاسی اور دانش ورانہ گفتگو میں گھسیٹنے کی فکر میں تھا اور اسے اس سے فرار حاصل کرنے کے لیے بہانہ درکار تھا۔ پھر ایک بات اور بھی تھی۔ زار کی موجودگی نے ماحول میں جو گھٹن پیدا کر دی تھی اور ہر شخص کو ضبط و تحمل برتنے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اس قسم کے دل آزار بندھنوں کو توڑ دینا چاہتا تھا۔ اس نے نتاشا کو اس لیے ہم رقص کے طور پر منتخب کیا تھا کیونکہ اس کی توجہ پیئر نے اس کی طرف دلائی تھی اور پھر وہ پہلی خوش اندام دوشیزہ تھی جس پر اس کی نظر پڑی تھی۔ تاہم اس نے جونہی اپنے بازو اس کی دبلی پتلی، لچک دار اور لرزاں کمر کے گرد حمائل کیے، اس کے دل کو اپنے اتنا قریب دھڑکتے اور اسے اپنے چہرے کے اتنا نزدیک مسکراتے دیکھا، تو اس کی دل کشی اور رعنائی بنت العنب کی طرح اس کے دماغ کو چڑھ گئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ از سر نو جوان ہو گیا ہے اور اس کے جذبات کو نئی جلا مل گئی ہے۔ اس نے گہری سانس لی، اسے اپنے سے الگ کیا اور محو رقص دوسرے جوڑوں کو دیکھنے لگا۔

17

پرنس آندرے کے بعد بورس نتاشا کو رقص کی دعوت دینے آیا۔ پھر وہ ایڈی کانگ، جس نے بال کا آغاز کیا تھا اور متعدد دوسرے نوجوان آئے۔ خوشی سے نتاشا کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ اپنے فالتو ہم رقصوں کو سونیا کے حوالے کر دیتی اور خود بقیہ سارا وقت رقص میں مصروف رہی۔ باقی لوگوں کو جن چیزوں میں دلچسپی تھی، اس نے نہ تو نگاہ اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور نہ ان پر کوئی توجہ دی۔ وہ نہ صرف یہ دیکھنے میں ناکام رہی کہ زار خاصا طویل عرصہ فرانسیسی سفیر سے باتیں کرتا رہا تھا، اور جب وہ ایک خاص خاتون سے محو کلام تھا اس کا رویہ بالخصوص مشفقانہ اور گرم گسترانہ تھا، یا فلاں فلاں صاحب اور فلاں فلاں پرنس نے یہ کیا یا وہ کہا تھا، یا ہیلین نے بھرا میلہ لوٹ لیا تھا اور فلاں فلاں حضرات نے اس پر خاص طور پر التفات کی بارش کی تھی، بلکہ اس نے تو زار کو نگاہ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا اور اسے اس کی روانگی کا علم بھی محض اس لیے ہوا تھا کیونکہ اس کے رخصت ہو جانے کے بعد رقص میں ایکا ایکی جان پڑ گئی تھی اور اس میں بڑی تیزی آ گئی تھی۔

سپر سے قبل فرانسیسی رقص کوتیلیاں (Cotillions) کے، جو خود بھی اور جس کی دھنیں بھی انتہائی شوخ اور چنچل ہوتی ہیں، دوران میں پرنس آندرے نے ایک بار پھر نتاشا کو اپنی ساتھی بنایا۔ اترادنایا کے خیاباں میں ان کی جو اولین مڈھ بھیڑ ہوئی تھی، اس نے اسے وہ یاد دلائی اور اس نے اسے یہ بھی بتایا: "اس چاندرات تمھیں نیند نہیں آ رہی تھی اور میں نے بلا قصد تمھاری باتیں سن لی تھیں۔" یادوں کے اس اعادے سے نتاشا کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا اور اس نے ان کے بارے میں معذرت خواہانہ رویہ اپنانے کی کوشش کی جیسے پرنس آندرے نے اتفاقاً جو کچھ سنا تھا، اس کا اس پر محجوب ہونا ضروری تھا۔

ان تمام مردوں کی طرح، جن کا اوڑھنا بچھونا ہی معاشرے کا بلند ترین طبقہ رہا ہو، پرنس آندرے بھی ہر اس شخص سے، جس پر اس طبقے کی روایتی چھاپ نہیں لگی ہوتی تھی، ہل کر بہت خوش ہوتا تھا۔ نتاشا جس طرح اپنی حیرت اور مسرت کا اظہار کر رہی تھی، بلکہ فرانسیسی میں گفتگو کے دوران میں بھی وہ جس قسم کی غلطیوں کا ارتکاب کر رہی تھی، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ بھی ایسی ہی دوشیزہ ہے۔ اس کے ساتھ پرنس آندرے کا رویہ خاص طور پر بے حد محتاط اور مشفقانہ تھا۔ جب وہ اس کے قریب بیٹھا انتہائی سہل اور بالکل ہی غیر اہم امور کے بارے میں باتیں کر رہا تھا، اس پر اس کی آنکھیں جس طرح چمکنے لگتی تھیں اور وہ جس طرح تبسم کرتی تھی، وہ اس کے من کو بہت بھایا کیونکہ اس کی ان اداؤں کا ان باتوں سے، جو وہ کر رہا تھا، کوئی تعلق نہیں تھا، بلکہ وہ اس طرح اپنے داخلی سرور کا اظہار کر رہی تھی۔ جب اس نے نتاشا کو رقص کی دعوت دی، وہ جس طرح مسکراتی اٹھی اور کمرے میں تتلی کی طرح گھومی، اس کی اس حجابانہ رعنائی نے اس کا دل خاص طور پر موہ لیا۔ کوتیلیاں ناچ کے دوران میں، جب رقص کا ایک ٹکڑا* (figure) مکمل ہوا، وہ اپنی نشست کی طرف واپس آ رہی تھی کہ ایک اور شخص نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ تھک چکی تھی اور اس کی سانس پھول رہی تھی۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ وہ معذرت کر لے گی لیکن اس نے جھٹ پٹ اپنا ہاتھ اپنے نئے ہم رقص کے کندھے پر رکھ دیا اور متبسم نگاہوں سے پرنس آندرے کو دیکھتی دوبارہ چل پڑی۔

"میں تھک چکی ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ کچھ دیر آپ کے پاس بیٹھوں اور ستاؤں،" اس کی مسکراہٹ کہہ رہی تھی۔ "لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ کس طرح بار بار مجھ سے تقاضا کر رہے ہیں۔ ان دعوتوں سے مجھے بھی خوشی ہوتی ہے۔ میں بہت مسرور ہوں اور ہر شخص مجھے پیارا لگتا ہے۔ آپ اور میں یہ سب کچھ خوب سمجھتے ہیں۔"

جب نتاشا کا ہم رقص رخصت ہوا، وہ بھاگتی دوڑتی کمرے کے پار دوسری طرف گئی تا کہ رقص کے اگلے ٹکڑے کے لیے دو خواتین کا انتخاب کر سکے۔

"اگر وہ پہلے اپنی کزن اور پھر کسی دوسری خاتون کی طرف گئی، اس کا مجھ سے بیاہ ہو جائے گا۔" پرنس آندرے نے اس پر نگاہیں جمائے اپنے آپ کو۔ اور اس پر اسے خاصا تعجب بھی ہوا۔ سوچتے پایا۔ وہ واقعی پہلے اپنی کزن ہی کی طرف گئی۔

"بعض اوقات آدمی کے ذہن میں کیسی کیسی لغو باتیں در آتی ہیں!" پرنس آندرے نے سوچا۔ "لیکن ایک بات قطعی یقینی ہے۔ یہ لڑکی اتنی پیاری ہے، عام ڈگر سے اتنی ہٹ کر ہے کہ اسے بال روموں میں گھومتے پھرتے ایک مہینہ بھی نہ گزرنے پائے گا کہ کسی نہ کسی کے ساتھ اس کی شادی ہو جائے گی... یہاں اس قسم کی دوشیزاؤں کا قحط ہے۔" وہ اس طرح کی ادھیڑ بن میں مصروف تھا جب کہ نتاشا اس کے قریب بیٹھی تھی اور اپنے سینے پر گلاب کے پھول کو، جو نیچے گرا چاہتا تھا، دوبارہ درست کر رہی تھی۔

کوتیلیاں کے اختتام پر، معمر کاؤنٹ، نیلا کوٹ پہنے، رقص کناں نوجوانوں کے پاس آیا۔ اس نے پرنس آندرے

* ناچ کی چلت پھرت جو خاص شکل یا صورت اختیار کر لیتی ہے۔

کو اپنے گھر آنے اور ان سے ملنے ملانے کی دعوت دی۔ اس نے اپنی بیٹی سے پوچھا: ''کچھ لطف آیا؟'' نتاشا نے فوراً کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس نے یوں مسکرا کر اس کی جانب دیکھا جیسے وہ اسے ملامت کر رہی ہو اور کہہ رہی ہو: ''آپ نے یہ سوال پوچھا ہی کیوں؟''

''مجھے زندگی بھر اتنا لطف کبھی نہیں آیا!'' اس نے جواب دیا اور پرنس آندرے نے دیکھا کہ اس کے مہین بازو کیسے بعجلت اوپر اٹھے جیسے وہ اپنے باپ سے بغل گیر ہونا چاہتی ہو لیکن پلک جھپکنے میں وہ دوبارہ نیچے گر پڑے۔

نتاشا کو اتنی فرحت و مسرت کبھی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ وہ سرورِ مطلق کی اس بلند منزل پر، جہاں انسان کاملاً نیک اور شفیق ہو جاتا ہے اور اسے یہ یقین نہیں آتا کہ کہیں بدی، رنج و محن یا ناخوشی کا امکان ہو سکتا ہے، پہنچ چکی تھی۔

❖

پیئر کی شریک حیات کو درباری حلقوں میں جو مقام حاصل تھا، اس پر زندگی میں پہلی مرتبہ اسے تذلیل محسوس ہوئی۔ اس کا منہ لٹک گیا اور وہ اپنے ہی خیالات میں مستغرق ہو گیا۔ اس کی پیشانی پر گہری لکیر نمودار ہو گئی۔ وہ ایک دریچے کے قریب کھڑا خالی خالی آنکھوں سے فضا میں گھور رہا تھا لیکن اس کی نظریں کسی خاص شخص یا چیز کو نہیں دیکھ رہی تھیں۔

سپر کے لیے جاتے وقت نتاشا اس کے قریب سے گزری۔ اسے اس کی مایوسی، ناشاد اور دل گرفتہ صورت دیکھ کر بہت حیرت ہوئی۔ اس کے دل میں یہ خواہش امنڈ آئی کہ وہ کسی طور اس کی مدد کر سکے اور جن مسرتوں سے اس کا دل اچھل رہا ہے، وہ انھیں اس کی جھولی میں ڈال سکے۔

''کاؤنٹ، یہاں کتنا مزہ آ رہا ہے!'' اس نے کہا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟''

صریحاً نظر آ رہا تھا کہ پیئر سے جو کچھ کہا گیا تھا، وہ اس کے قطعاً پلے نہیں پڑا ہے۔ وہ بس بے دھیانی سے مسکرا دیا۔

''ہاں، میں بہت خوش ہوں،'' اس نے جواب دیا۔

''کوئی شخص کسی چیز سے غیر مطمئن کیسے ہو سکتا ہے؟'' نتاشا نے سوچا۔ ''خاص طور پر ایسا نفیس شخص، جیسا کہ بزوخوف ہے۔'' جو لوگ بال میں موجود تھے، نتاشا کی نگاہوں میں وہ سب کے سب بھلے، مشفق اور شاندار اشخاص تھے، سب ایک دوسرے کے شیدائی تھے اور ایک دوسرے کو ناراض کرنے کی صلاحیت سے عاری۔ چنانچہ ان سب کو خوش و شادمان ہونا چاہیے تھا۔

18

اگلے روز پرنس آندرے بال کے متعلق اپنی یادیں تازہ کرتا رہا لیکن اس کا ذہن زیادہ دیر تک ان میں مصروف نہ رہ سکا۔ ''ہاں، یہ کمال کا بال تھا۔ اور پھر... ارے ہاں، وہ ننھی منی رستووا بہت پرکشش ہے۔ اس کی شکل و صورت اور اطوار

میں کچھ ایسی تازگی اور نیا پن ہے، جو عام طور پر پیٹرزبرگ میں نہیں پایا جاتا اور یہی چیز اسے دوسروں سے ممیز کرتی ہے۔" گزشتہ رات کے بارے میں اس نے بس اتنا ہی سوچا اور صبح کی چائے پینے کے بعد اپنے کام میں جت گیا۔

لیکن یہ تھکاوٹ کا اثر تھا یا نیند کا فقدان؟ بہر حال اس کا کام میں جی نہ لگا اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ وہ اپنے ہی کام میں نقائص تلاش کرتا رہا — اور اس کے معاملے میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی — اور جب کسی ملاقاتی کے قدموں کی آہٹ اس کے کانوں سے ٹکرائی، اس کا جی خوش ہو گیا۔

نو وارد کا نام بتسکی تھا۔ وہ مختلف کمیٹیوں کا رکن تھا، پیٹرزبرگ کے ہر طبقے میں اس کا آنا جانا تھا، بے پر کی اڑانے میں اس کا کوئی ثانی نہیں تھا اور وہ یہ کام بڑی تندہی اور مستقل مزاجی سے کرتا تھا۔ وہ سپیرانسکی اور نئے تصورات کا بہ دل و جان مداح تھا۔ وہ ان لوگوں میں شامل تھا جو اپنے خیالات و افکار کا انتخاب بھی نئے ملبوسات کی طرح نت نئے فیشن کے مطابق کرتے ہیں اور محض اسی بنا پر تازہ ترین رجحانات کے پرجوش حمایتی نظر آتے ہیں۔ اپنا ہیٹ اتارتے ہی وہ پرنس آندرے کے کمرے میں جا دھمکا اور اس نے وہاں پہنچتے ہی آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ اپنی باتوں کا آغاز کر دیا۔ اسے ابھی ابھی کونسل آف سٹیٹ کے صبح کے اجلاس کی، جس کا افتتاح زار نے کیا تھا، تفصیلات معلوم ہوئی تھیں، اور اب وہ انھیں نہایت جوش و خروش سے بیان کر رہا تھا۔ امپراطور کی تقریر غیر معمولی تھی۔ یہ بالکل اسی قسم کی تقریر تھی جیسی صرف آئینی فرماں رواہی کرتے ہیں۔

"امپراطور نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ کونسل اور سینیٹ مملکت کے ایسے ادارے ہیں جن کے اپنے واضح سیاسی حقوق ہیں۔ انھوں نے فرمایا کہ حکومت کا انحصار من مانے اور مستبدانہ اختیارات پر نہیں بلکہ مستحکم اصولوں پر ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ مالیاتی نظام کی لازماً تنظیم نو ہونا چاہیے اور میزانیے کی تفصیلات عوام کے سامنے پیش کی جانا چاہئیں۔" بتسکی نے بعض الفاظ پر زور دیتے اور اپنی آنکھیں معنی خیز انداز سے جھپکاتے ہوئے کہا: "واقعہ یہ ہے کہ آج جو کچھ پیش آیا ہے، اس سے ہماری تاریخ کے نئے اور عظیم ترین دور کا آغاز ہو گیا ہے،" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے سٹیٹ کونسل کے افتتاحی اجلاس کی تفصیلات توجہ سے سنتا رہا۔ یہ وہ واقعہ تھا جس کا وہ نہایت بے چینی سے انتظار کرتا رہا تھا اور جس کو وہ اتنی زیادہ اہمیت دیتا رہا تھا۔ لیکن اسے تعجب اس بات پر تھا کہ اب جب کہ اس نے مسلمہ حقیقت کا روپ دھار لیا تھا، وہ نہ صرف اس سے قطعاً متاثر نہ ہوا بلکہ اسے وہ ہیچ پوچ چیز سے بھی کم تر محسوس ہوا۔ وہ بتسکی کے پرجوش بیان کو چہرے پر پرسکون طنز سجائے سنتا رہا۔ اس کے ذہن میں نہایت سیدھا سادا خیال ابھرا: "امپراطور نے کونسل کے اجلاس میں جن باتوں کا بہ مسرت اعلان کیا ہے، ان سے مجھے یا بتسکی کا کیا واسطہ؟ ہمارے لیے ان کی کیا اہمیت ہے؟ کیا ان سے میری خوشی میں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے یا میں بہتر انسان بن سکتا ہوں؟"

جن اصلاحات کو عملی جامہ پہنایا جا رہا تھا، ان میں پرنس آندرے جو دلچسپی لیا کرتا تھا، اس سیدھے سادے خیال

سے وہ پادر ہوا ہوگئی۔ اس روز اس نے سپے رانسکی کے ہاں کھانا کھانا تھا۔ جیسا کہ اس کے میزبان نے اسے مدعو کرتے وقت اسے مطلع کیا تھا، کھانے پر ''محض چند گنے چنے احباب'' نے آنا تھا۔ اس شخص کے، جس کا وہ اتنا زبردست مداح تھا، بے تکلف گھریلو حلقے میں ڈنر کا تصور پرنس آندرے کو بہت دلچسپ معلوم ہوا تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ اس نے ابھی تک سپے رانسکی کو اس کے خانگی ماحول میں نہیں دیکھا تھا لیکن اب اسے وہاں جانے کی کوئی خواہش باقی نہیں رہ گئی تھی۔

تاہم وہ وقت مقررہ پر تاوری چسکی گارڈنز میں واقع سپے رانسکی کے عام سے گھر پہنچ گیا۔ اس چھوٹے سے مکان کا نمایاں ترین وصف یہ تھا کہ یہ اتنا صاف ستھرا تھا کہ ڈھونڈے سے بھی اس میں کوئی نقص نظر نہیں آسکتا تھا (اسے دیکھ کر خانقاہ کی یاد تازہ ہوجاتی تھی)۔ ڈائننگ روم میں، جس کا فرش چوبی تختوں کا تھا، پرنس آندرے کو، جو قدرے تاخیر سے آیا تھا، سپے رانسکی کے حلقے کے یارانِ بے تکلف نظر آئے۔ یہ لوگ پہلے ہی پانچ بجے پہنچ چکے تھے۔ سپے رانسکی کی نوعمر دختر (جس کا چہرہ اپنے باپ کے چہرے کی طرح کتابی تھا) اور اس کی گورنس کے علاوہ اور کوئی خاتون موجود نہیں تھی۔ دوسرے مہمان گرویس[34]، ماگ نتسکی[35] اور ستالی پن[36] تھے۔ پرنس آندرے کو پیش دالان میں ہی پرشور آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کسی شخص کی تراشیدہ اور کھنکھناتی ہنسی کی۔ بالکل اسی نوع کی ہنسی، جو ڈرامے کی سٹیج پر سنائی دیتی ہے۔ گونج بھی اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ کوئی شخص۔ وہ آواز سے سپے رانسکی معلوم ہوتا تھا، بڑے واضح انداز سے 'ہاہاہا' کی آوازیں نکال رہا تھا۔ پرنس آندرے نے اس سے پہلے سپے رانسکی کو کبھی ہنستے نہیں سنا تھا۔ ایک عظیم سیاسی مدبر کی اس تیکھی اور کھنکھناتی ہنسی نے اس پر عجیب تاثر قائم کیا۔

وہ ڈائننگ روم میں چلا گیا۔ وہ دریچوں کے مابین ایک چھوٹی میز پر مصالحے دار گوشت اور سبزیوں پر مشتمل مختلف اقسام کے کھانے (hors d`oeuvres)، جو اصل طعام سے پہلے کھائے جاتے ہیں، پڑے تھے اور سب حاضرین ان کے اردگرد جمع تھے۔ سپے رانسکی نے خاکستری فراک کوٹ، جس پر ستارہ آویزاں تھا، اور بظاہر وہی سفید واسکٹ اور وہی سفید چرمی گلوبند، جو اس نے کونسل آف سٹیٹ کے شہرہ آفاق اجلاس میں پہنے تھے، زیب تن کر رکھے تھے۔ وہ اپنے مہمانوں میں گھرا کھڑا تھا اور اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹتی محسوس ہو رہی تھی۔ ماگ نتسکی اپنے میزبان سے مخاطب ہوکر کوئی قصہ بیان کر رہا تھا۔ ماگ نتسکی نے جو کچھ کہنا تھا، سپے رانسکی نے اس پر پیشگی ہی ہنسنا شروع کردیا تھا۔ جونہی پرنس آندرے کمرے میں داخل ہوا، ماگ نتسکی کے الفاظ دوبارہ قہقہوں میں دب گئے۔ ستالی پن نے ڈبل روٹی اور پنیر کا لقمہ چباتے چباتے نیچی آواز سے قہقہہ لگایا، گرویس نے منمنانے پر اکتفا کیا اور سپے رانسکی اپنی تیکھی اور تراشیدہ ہنسی ہنس رہا تھا۔

اس نے ہنستے ہنستے اپنا نرم و ملائم اور سفید ہاتھ پرنس آندرے کی طرف بڑھا دیا۔

''پرنس، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی،'' اس نے کہا۔ ''ایک منٹ...'' وہ ماگ نتسکی کی طرف مڑا اور اس کے قصے میں مداخلت کرتے ہوئے اپنی ہی کہتا چلا گیا۔ ''ہم نے یہ طے کرلیا ہے کہ یہ ڈنر محض تفریح طبع کے لیے

ہوگا، یہاں سرکاری امور کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا جائے گا۔" وہ دوبارہ قصہ گو کی طرف متوجہ ہوا اور ایک بار پھر ہنسنے لگا۔

پرنس آندرے نے مسرور و خوش طبع پیے رانسکی کو حیرت کی نگاہوں سے دیکھا۔ اس کے بارے میں اس کی ساری خوش فہمیاں کافور ہوگئیں اور اس کا منہ لٹک گیا۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا کہ یہ پیے رانسکی نہیں بلکہ کوئی اور شخص ہے۔ وہ پیے رانسکی سے پہلے بے حد متاثر ہوا تھا کیونکہ اسے اس کی ذات میں بعض پراسرار اور دل کش پہلو نظر آئے تھے لیکن اب بھانڈا پھوٹ چکا تھا اور سب کچھ اپنی دل کشی کھو چکا تھا۔

ڈنر پر گفتگو میں ایک ثانیے کا بھی وقفہ نہ آیا اور یہ کسی لطیفوں کی کتاب کے مندرجات پر مشتمل معلوم ہوتی تھی۔ ماگ نتسکی نے ابھی بمشکل اپنا قصہ ختم کیا ہوگا کہ کسی دوسرے نے اس سے بھی لذیذ تر حکایت سنانے کی ہامی بھر لی۔ اکثر و بیشتر قصے اگر سرکاری ملازمت کے بارے میں نہیں تھے، تو کم از کم ان افراد کے، جن کا تعلق سرکار سے بنتا تھا، متعلق ضرور تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس حلقے میں ان اشخاص کی بے وقعتی کو اتنے فیصلہ کن انداز سے تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ان کے متعلق جو واحد ممکنہ رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے، وہ یہی ہو سکتا ہے کہ ان کا خوش مزاجانہ انداز سے مضحکہ اڑایا جائے۔

پیے رانسکی نے بتایا کہ اس روز جب کونسل کے اجلاس میں ایک بہرے مدبر سیاستدان سے اس کی رائے دریافت کی گئی، اس نے جواب میں کہا: "ہاں، میرا بھی یہی خیال ہے۔" ایک واقعہ، جس کا تعلق مردم شماری سے تھا، گرویس نے اس کا تفصیل سے ذکر کیا۔ اس واقعے کا خاص پہلو یہ تھا کہ اس سے ہر متعلقہ شخص کی ضعیف العقلی عیاں ہوتی تھی۔ ستالی پن نے ہکلاتے ہکلاتے اس کی بات کاٹ دی اور اتنے جوش و خروش سے سابقہ نظام کی خرابیاں گنوانے لگا کہ گفتگو کے سنجیدہ رخ اختیار کرنے کا اندیشہ لاحق ہوگیا۔ ماگ نتسکی نے اس کے جوشیلے پن کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ گرویس نے لطیفہ گوئی کے ذریعے ان دونوں کو خاموش کر دیا اور یوں گفتگو دوبارہ ہرزہ سرائی کی طرف لوٹ آئی۔

بظاہر تو یہی نظر آتا تھا کہ محنت مشقت کے بعد پیے رانسکی کو استراحت کرنا اور اپنے دوستوں کے حلقے میں دل بہلانا بہت مرغوب ہے۔ اس کے دوست اس کی خواہشات سمجھ چکے تھے۔ چنانچہ وہ خود بھی لطف اندوز ہو رہے تھے اور اسے بھی محظوظ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن پرنس آندرے کو ان کی یہ شگفتہ مزاجی بھرتی کی اور بے کیف دکھائی دی۔ پیے رانسکی کا بلند آہنگ لہجہ اس کی طبیعت پر بار بن رہا تھا اور اسے اس کے مسلسل قہقہوں کی کھنکھناہٹ، جو اس کے کانوں پر گراں گزر رہی تھی، مصنوعی معلوم ہوئی۔ پرنس آندرے نے ہنسنے اور قہقہے لگانے سے گریز کیا اور نتیجتاً اسے محسوس ہونے لگا کہ کہیں اس پر رنگ میں بھنگ ڈالنے کا الزام نہ دھر دیا جائے۔ لیکن کسی شخص کو بھی یہ خیال نہ آیا کہ وہ محفل کے عمومی مزاجی سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ قرائن بتا رہے تھے کہ وہ جی بھر کر لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

اس نے گفتگو میں شریک ہونے کے لیے بہتیرے ہاتھ پاؤں مارے لیکن اس کی ہر بات یوں اڑا دی جاتی

جیسے پانی کارک کو اٹھا کر پرے پھینک دیتا ہے۔ چنانچہ وہ ان کے ساتھ پھکڑ پن اور لطیفہ گوئی کے کھیل میں شریک ہونے سے قاصر رہا۔

جو کچھ وہ کہہ رہے تھے، وہ غلط یا بے موقع نہیں تھا۔ ان کی باتوں میں ظرافت تھی اور عین ممکن ہے کہ وہ پر لطف بھی بن جاتیں لیکن ان میں اس چیز کا، جسے نشاط و انبساط کی چاشنی کہا جا سکتا ہے، فقدان تھا۔ یہ ایک ایسی شے تھی جس کے بارے میں انھیں معلوم ہی نہیں تھا کہ یہ بھی وجود رکھ سکتی ہے۔

ڈنر کے اختتام پر پیے رانسکی کی دختر اور اس کی گورنس دستر خوان سے اٹھ کر کھڑی ہوئیں۔ پیے رانسکی نے اپنی ننھی منی بیٹی کے رخساروں پر بوسے دیے اور اپنے سفید ہاتھوں سے اس کے بال سہلائے۔ اس کا یہ انداز بھی پرنس آندرے کو غیر فطری محسوس ہوا۔

مرد حضرات دستر خوان پر ڈٹے رہے۔ وہ انگریزوں کی طرح پورٹ[37] سے شغل کرنا چاہتے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں جب ہسپانیہ میں نپولین کے اقدامات[38] کا ذکر چھڑا اور انھوں نے بیک زبان ان کی تائید کی، پرنس آندرے نے ان کی آراء کے برعکس خیالات کا اظہار کیا۔ پیے رانسکی کے لبوں پر تبسم آ گیا۔ روز روشن کی طرح عیاں تھا کہ وہ یہ قطعاً نہیں چاہتا تھا کہ گفتگو میں کوئی تلخی آنے پائے۔ چنانچہ وہ ایک ایسی حکایت، جس کا موضوع زیر بحث سے قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا، بیان کرنے لگا۔ چند لمحوں کے لیے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔

پیے رانسکی چند لمحے دستر خوان پر بیٹھا رہا، پھر اس نے انگوری شراب کی بوتل کا کاگ بند کیا اور یہ کہتے ہوئے کہ ''آج کل اچھی شراب حاصل کرنا جوئے شیر ڈھونڈنے کے برابر ہے،'' اسے ملازم کے ہاتھ میں تھما دیا اور اس کے ساتھ ہی وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

دوسروں نے اس کی پیروی کی اور وہ بھی اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ ابھی تک اونچے لہجوں میں باتیں کر رہے تھے۔ باتیں کرتے کرتے وہ ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ دو لفافے، جو ہرکارہ لے کر آیا تھا، پیے رانسکی کے حوالے کر دیے گئے۔ وہ انھیں اپنے سٹڈی روم میں لے گیا۔ جونہی وہ کمرے سے باہر نکلا، قہقہے چہچہے ختم ہو گئے اور مہمان آپس میں دھیمے لہجوں میں سنجیدہ گفتگو کرنے لگے۔

''اچھا، اب کچھ شعر خوانی ہو جائے!'' پیے رانسکی نے سٹڈی روم سے واپس آ کر کہا۔ ''شعر گوئی اور شعر خوانی میں اس شخص کا جواب نہیں،'' اس نے پرنس آندرے سے کہا۔

ماگ نتسکی نے جھٹ پٹ پوز بنا لیا اور فرانسیسی زبان میں مزاحیہ اشعار، جو اس نے پیٹرز برگ کی چند نامی گرامی ہستیوں کے بارے میں لکھے تھے، پڑھنے لگا۔ اس پر بار بار داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے۔ جب شعر خوانی اختتام پذیر ہوئی، پرنس آندرے پیے رانسکی کے پاس گیا اور اس سے اجازت کا طلب گار ہوا۔

''اتنی جلدی کہاں جانا ہے؟'' پیے رانسکی نے دریافت کیا۔

''میں نے ایک محفل شام میں شرکت کی حامی بھر لی تھی...''

پرنس آندرے نے گزشتہ چار ماہ کے دوران میں پیٹرزبرگ میں جو جو کچھ کیا تھا، گھر پہنچنے کے بعد اس نے اس کا نئے انداز سے جائزہ لیا۔ اس نے عسکری قواعد وضوابط میں اصلاح وترمیم کی غرض سے جو منصوبہ وضع کیا تھا، اس کے سلسلے میں جو بھاگ دوڑ کی تھی اور جن جن لوگوں سے ملنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے تھے، اس نے ان سب کے بارے میں سوچا۔ اگرچہ اس کا یہ منصوبہ غور وفکر کے لیے منظور ہو چکا تھا لیکن عملاً اسے ایک دوسرے منصوبے کی خاطر، جو انتہائی بے مغز تھا، اٹھا کر طاق نسیان پر رکھ دیا گیا تھا کیونکہ وہ منصوبہ پہلے ہی تیار کیا جا چکا تھا اور زار کی خدمت میں پیش کیا جا چکا تھا۔ اس نے اس کمیٹی کے، جس کا برگ رکن تھا، اجلاسوں کے بارے میں سوچا۔ اسے یاد آیا کہ قواعد کی ظاہری شکل وصورت اور طریق کار کے ایک ایک نکتے کے بارے میں دیانت دارانہ اور طویل مباحث ہوئے تھے لیکن جہاں تک معاملے کی روح کا تعلق ہے، اس سے بڑی جانفشانی اور عجلت سے پہلو بچا لیا گیا۔ اس نے ضابطۂ قانون کے بارے میں جو کام کیا تھا، اسے وہ بھی یاد آیا۔ اس نے رومی اور فرانسیسی ضوابط کا روسی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے بڑی کھکھیڑیں اٹھائیں لیکن سب رائیگاں گئیں اور اسے خود ہی شرم محسوس ہونے لگی۔ پھر باگوچارافو، دیہات میں اپنے مشاغل اور ریازان کے سفر کے واضح خاکے اس کے ذہن میں آنے لگے۔ اس نے اپنے کسانوں اور دیہی مکھیادرون کے بارے میں سوچا اور جب اس نے شخصی حقوق سے متعلق دفعات کا، جن کی اس نے مختلف سیکشنوں میں درجہ بندی کی تھی، اطلاق ذہناً ان پر کیا، تو اسے سخت اچنبھا ہوا کہ اس نے اس قسم کے لایعنی کام پر اتنا وقت کیسے صرف کر دیا۔

19

اگلے روز پرنس آندرے نے ملاقات کی غرض سے ان متعدد اشخاص کے، جن سے وہ پہلے ملنے نہیں گیا تھا، دروازوں پر دستک دی۔ ان لوگوں میں رستوف بھی، جن کے ساتھ اس نے بال پر تعلقات کی تجدید کی تھی، شامل تھے۔ شائستگی کے تقاضوں کے علاوہ، جنھوں نے اس ملاقات کو ناگزیر بنا دیا تھا، اس کے دل میں یہ شدید خواہش موجزن تھی کہ وہ اس چنچل، شگفتہ مزاج اور اپنی مثال آپ دوشیزہ سے، جو اس کے ذہن پر اتنے خوشگوار تاثرات چھوڑ گئی تھی، اس کے اپنے گھر میں مل سکے۔

جن لوگوں نے سب سے پہلے اس کا خیر مقدم کیا، ان میں نتاشا شامل تھی۔ وہ روزمرہ کا گہرے نیلے رنگ کا ڈریس پہنے ہوئے تھی۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوا کہ وہ اس لباس میں بال گاؤن سے بھی زیادہ حسین نظر آ رہی ہے۔ اس نے اور اس کے گھر والوں نے اس کا سادہ لیکن پرتپاک استقبال کیا، بالکل اسی طرح جس طرح ایک دیرینہ دوست کا کیا جاتا ہے۔ پورے کا پورا خاندان، جس کا اس نے پہلے اتنا سخت محاکمہ کیا تھا، اب اسے شستہ، سلیم الطبع اور سیدھے سادے اشخاص پر مشتمل نظر آیا۔ کاؤنٹ کی مہمان نوازی اور خوش نہادی، جو پیٹرزبرگ میں خاص طور پر وضع داری کا پہلو سموئے نظر آ رہی تھی، کچھ اس نوعیت کی تھی کہ جب پرنس آندرے سے ڈنر تک ٹھہرنے کی

درخواست کی گئی، وہ انکار نہ کر سکا۔ ''ہاں، یہ نفیس اور شستہ لوگ ہیں،'' اس نے سوچا۔ ''لیکن انھیں قطعاً معلوم نہیں کہ نتاشا کی شکل میں وہ کتنے بڑے خزانے کے مالک ہیں۔ تاہم یہ لوگ نیک فطرت، رحم دل اور رقیق القلب ہیں اور وہ اس دوشیزہ کے لیے جو حسن و رعنائی اور دلکشی کا مرقع ہے اور جس کے انگ انگ سے زندگی پھوٹی پڑ رہی ہے، امکانی حد تک بہترین پس منظر متشکل کرتے ہیں!''

نتاشا میں پرنس آندرے کو ایک غیر معمولی دنیا کا، جو نامعلوم مسرتوں سے پٹی پڑی تھی اور جو اس کے لیے قطعی اجنبی تھی، شعور ہوا۔ ایسی عجیب و غریب دنیا جس نے اسے اترادنایا کے خیابان میں اور اس چاند شب کے دریچے میں بھی، تر ساتر سا دیا تھا۔ اب یہ دنیا نہ تو اس کی انا کو ٹھیس پہنچا رہی تھی اور نہ اس کے لیے اجنبی رہی تھی۔ اب جب کہ وہ خود اس میں بار پا چکا تھا، اسے اس میں نئی نئی دلچسپیاں اور راحتیں حاصل ہو رہی تھیں۔

ڈنر کے بعد پرنس آندرے کی درخواست پر نتاشا کلاوی کارڈ کے سامنے بیٹھ گئی اور نغمہ سرائی کرنے لگی۔ پرنس آندرے دریچے کے قریب کھڑا خواتین سے باتیں کر رہا اور اس کا گانا سن رہا تھا۔ اچانک وہ بولتے بولتے فقرے کے عین بیچ میں خاموش ہو گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے آنسو اب نکلے کہ اب نکلے اور اس کا گلا رندھنے لگا۔ یہ ایک ایسی کیفیت تھی جس کے بارے میں اسے کبھی یقین ہی نہیں آسکتا تھا کہ یہ اس کے ساتھ بھی پیش آسکتی ہے۔ جب نتاشا گا رہی تھی، اس کی نگاہیں اس پر مرکوز رہیں اور اسے یوں لگا کہ اس کی روح میں کوئی نئی اور مسرور کن چیز انگڑائیاں لے رہی ہے۔ وہ خوش بھی تھا اور اس کے ساتھ غم گین بھی۔ قطعاً کوئی ایسی بات نہیں ہوئی تھی کہ اسے رونا آتا، اس کے باوجود وہ اشک بہانے کے لیے تیار تھا۔ کس لیے؟ اپنی سابقہ محبت کے لیے؟ کوچک پرنس کے لیے؟ اپنی گم شدہ خود فریبیوں کے لیے؟... اپنی مستقبل کی امیدوں کے لیے؟... ہاں اور نہیں۔ سب سے بڑی بات، جس نے اسے آنسو بہانے کے قریب پہنچا دیا تھا، وہ اس بھیانک تضاد کا فوری اور شدید احساس تھا۔ یہ تضاد کیا تھا؟ ایک طرف کوئی لامحدود طور پر عظیم اور غیر تعریف پذیر چیز تھی جو اس کے باطن میں موجود تھی اور دوسری طرف گوشت پوست کا محدود وجود تھا جس سے نہ صرف وہ خود بلکہ وہ (نتاشا) بھی عبارت تھی۔ جب وہ گانا گا رہی تھی، یہ تضاد اس کی روح کو کچوکے لگا رہا اور اسے مسرت و بہجت بہم پہنچا رہا تھا۔

جونہی نتاشا کا گانا ختم ہوا، وہ فی الفور اس کے پاس پہنچی اور اس سے پوچھنے لگی: ''آپ کو میری آواز کیسی لگی؟'' پوچھنے کو تو اس نے یہ سوال پوچھ لیا لیکن اس کے ساتھ ہی وہ محجوب بھی ہو گئی۔ اسے احساس ہوا کہ یہ ایک ایسی بات تھی جو اسے پوچھنا نہیں چاہیے تھی۔ وہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا: ''جس طرح مجھے تمھاری ہر بات پسند ہے، اسی طرح مجھے تمھارا گانا بھی پسند ہے۔''

جب پرنس آندرے رستوفوں سے رخصت ہوا، رات خاصی گزر چکی تھی۔ عادت کے موافق وہ بستر میں گھس گیا لیکن بہت جلد اسے احساس ہو گیا کہ نیند اس سے کوسوں دور ہے۔ اس نے شمع روشن کی اور اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ پھر وہ دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ اپنی اس بے خوابی سے وہ مطلق پریشان نہ ہوا۔ اس کی روح نئے اور پرمسرت احساسات

سے اس قدر سرشار تھی کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کسی ایسے کمرے سے، جہاں حبس کی وجہ سے دم گھٹتا تھا، کھلی فضا میں آ گیا ہے۔ اسے یہ بالکل خیال نہ آیا کہ وہ نتاشا کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ وہ اس کے متعلق سوچ نہیں رہا تھا بلکہ ذہن میں اس کا خاکہ بنا رہا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے اپنی ساری زندگی روشنی میں نظر آنے لگی۔ ''میں اس تنگ اور محدود ماحول میں کیوں جدوجہد کر رہا ہوں، خون پسینہ ایک کر رہا ہوں جب کہ زندگی، ساری زندگی اور اس کی تمام مسرتیں اور رعنائیاں اپنے دامن پھیلائے میرے سامنے کھڑی ہیں؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ اور وہ طویل عرصے کے بعد پہلی مرتبہ مستقبل کے بارے میں خوشگوار منصوبے بنانے لگا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کی تعلیم و تدریس پر یوں ذاتی طور پر توجہ دے گا کہ وہ اس کے لیے اتالیق کا بندوبست کرے گا اور اسے اس کی تحویل میں دے دے گا۔ وہ ملازمت سے ریٹائر ہو جائے گا اور غیر ممالک کی سیر پر روانہ ہو جائے گا، وہ انگلستان، سوئٹزرلینڈ اور اطالیہ گھومے پھرے گا۔ ''جب تک میرے اندر طاقت اور توانائی کا احساس موجود ہے، مجھے اپنی آزادی سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہیے،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''پیئر نے جب یہ کہا تھا کہ اگر آدمی خوش رہنا چاہتا ہے، اسے یہ یقین کر لینا چاہیے کہ خوشی کا امکان موجود ہے، تو ٹھیک ہی کہا تھا اور میرا ابھی اس پر پختہ یقین ہو گیا ہے۔ گڑے مردوں کو گڑے ہی رہنے دینا چاہیے۔ جب تک سانس کی ڈوری باقی ہے، آدمی کو زندہ رہنا چاہیے اور خوش رہنا چاہیے!'' اس نے سوچا۔

20

ایک صبح کرنل ادلف برگ، جسے پیئر جانتا تھا، جس طرح وہ ماسکو اور پیٹرزبرگ کے ہر شخص کو جانتا تھا، نئی نکور وردی پہنے، بالوں میں پومید لگائے اور امپراطور الیکساندر پاولووچ کے انداز میں زلفوں سے کنپٹیاں ڈھانپے، اسے ملنے آیا۔

''کاؤنٹ، میں ابھی ابھی کاؤنٹس، آپ کی شریک حیات، سے مل کر آ رہا ہوں۔ بدقسمتی سے انھوں نے میری درخواست کو شرف قبولیت نہیں سمجھا۔ مجھے امید ہے کہ یہاں قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگی،'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کرنل، آپ کا کیا حکم ہے؟ میں آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔''

''کاؤنٹ، میں اپنے نئے اپارٹمنٹ میں ٹھیک ٹھاک طرح ٹک گیا ہوں،'' برگ نے اعلان کیا۔ اس کے انداز سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس بات کا پختہ یقین ہے کہ اس کی یہ اطلاع پیئر کا جی خوش کرنے میں ہرگز ناکام نہیں رہے گی۔ ''چنانچہ مجھے یہ امید ہو گئی ہے کہ اب میں اپنے اور اپنی شریک حیات کے احباب کے لیے ایک چھوٹی سی محفل کا انعقاد کر سکوں گا۔'' (اب وہ اور بھی خوش خلقی سے مسکرانے لگا۔) ''میں آپ سے اور کاؤنٹس سے محض یہ درخواست کرنے آیا تھا کہ آپ اور وہ مجھ پر کرم فرمائی کریں اور میرے ہاں چائے کی پیالی نوش کرنے... پر تناول فرمانے... تشریف لائیں۔''

صرف کاؤنٹس ہیلینا واسیلیو نا، جو برگ جیسے لوگوں کو اپنے سے کم تر سمجھتی تھی، اتنا ظلم کر سکتی تھی کہ وہ اس قسم کی دعوت کو پائے استحقار سے ٹھکرا دے۔ برگ کو اپنے نئے اپارٹمنٹ میں چند گنے چنے اشخاص پر مشتمل محفل سجانے کی ضرورت کیوں پیش آئی، اس سے اسے کیا خوشی حاصل ہوگی اور وہ اچھی محفل کی خاطر کیوں اچھی خاصی رقم خرچ کرنے کے لیے تیار ہوا حالانکہ تاش بازی اور اس قسم کے دوسرے گھٹیا مشاغل پر روپیہ لٹانا اس کی فطرت کے خلاف تھا، اس نے یہ سب کچھ پیئر کو اتنی صراحت اور تفصیل سے بتایا کہ وہ انکار نہ کر سکا اور اس نے آنے کا وعدہ کر لیا۔

''کاؤنٹ، اگر آپ اسے گستاخی محمول نہ کریں تو میں یہ عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ برائے مہربانی اپنی تشریف آوری میں زیادہ تاخیر نہ کریں۔ میرے خیال میں سات پچاس کا وقت موزوں رہے گا۔ ہم ایک ربر کا اہتمام کریں گے۔ ہمارے جرنیل تشریف لا رہے ہیں۔ وہ مجھ پر بہت مہربان ہیں۔ کاؤنٹ، چھوٹے موٹے پر کا انتظام بھی ہوگا۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔''

پیئر کی کچھ یہ عادت سی بن گئی تھی کہ وہ اس قسم کی محافل میں عام طور پر تاخیر سے پہنچا کرتا تھا لیکن اس شام وہ معمول کے برعکس سات پچاس کے بجائے پونے آٹھ بجے ہی برگ کے گھر پہنچ گیا۔

برگ اور اس کی اہلیہ اپنی محفل کے لیے ہر چیز کا بندوبست کر چکے تھے اور اب وہ اپنے مہمانوں کا خیر مقدم کرنے کے لیے بالکل تیار تھے۔ وہ اپنے نئے، روشن اور صاف ستھرے سٹڈی روم میں، جس میں نیا فرنیچر سجایا گیا تھا اور جس کی نیم مجسموں اور تصویروں سے آرائش کی گئی تھی، بیٹھے تھے۔ برگ نے نئی وردی، جو بٹن بند کرنے سے تنگ تنگ سی لگتی تھی، پہن رکھی تھی۔ وہ اپنی بیوی کے قریب بیٹھا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ آدمی ان لوگوں کے، جو مراتب کے اعتبار سے اس سے اونچے ہوں، راہ و رسم بڑھا سکتا ہے اور اسے بڑھانا بھی چاہیے، کیونکہ صرف اسی طرح وہ صحیح معنوں میں دوستوں اور واقف کاروں سے فیض یاب ہو سکتا ہے۔

''اس طرح آپ کو کوئی نہ کوئی بات معلوم ہو سکتی ہے، آپ کسی چیز کے لیے درخواست کر سکتے ہیں۔ یہ تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ جب سے مجھے اولین ترقی ملی ہے، میرے حالات نے کیا کیا پلٹا کھایا ہے۔'' (برگ اپنی زندگی کا حساب سالوں سے نہیں بلکہ ترقیوں سے کرتا تھا۔) ''میرے سابق ساتھی ابھی تک کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے جب کہ میں صرف اس بات کا منتظر ہوں کہ کب کوئی رجمنٹل کمانڈر کا عہدہ خالی ہوتا ہے، پھر مجھے اس پر تعینات کر دیا جائے گا اور مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ میں آپ کا شوہر ہوں۔'' (وہ اٹھا، اس نے ویرا کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور وہ چلتے چلتے ذرا رکا تا کہ قالین کے کنارے کو، جو ذرا مڑ گیا تھا، سیدھا کر سکے۔) ''اور میں نے یہ سب کچھ کیسے حاصل کیا؟ زیادہ تر اس لیے کہ میں نے یہ ڈھنگ سیکھ لیا ہے کہ کن لوگوں سے تعلقات بڑھانا چاہئیں اور ہاں یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ آدمی کو باضمیر اور بااصول ہونا چاہیے۔''

برگ اس احساس پر مسکرا دیا کہ اسے ایک کمزور عورت پر تفوق حاصل ہے۔ وہ رک گیا اور سوچنے لگا۔ ''میری اس پیاری شریک حیات کا تعلق بہر حال ہے تو صنف نازک ہی سے۔ یہ ان چیزوں کو جو مردکی وجاہت

اور آن بان متشکل کرتی ہے، انھیں کبھی سمجھ نہیں پائے گی۔''

ویرا ابھی مسکرا رہی تھی۔ اسے بھی یہ احساس تھا کہ اسے اپنے خوش خصال اور قابل قدر شوہر پر تفوق حاصل ہے کیونکہ اس کے خیال کے مطابق زندگی کے متعلق تمام مردوں کی طرح اس کے شوہر کا انداز فکر بھی غلط فہمی پر مبنی تھا۔ اپنی بیوی کو دیکھنے اور پرکھنے کے بعد برگ نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ تمام خواتین کمزور اور احمق ہوتی ہیں۔ ادھر ویرا کا واسطہ صرف اپنے شوہر سے پڑا اور اس نے صرف اسی کو دیکھا اور بھالا اور اسے دیکھ کر جو کچھ اس کے مشاہدے میں آیا، اس سے اس نے یہ عمومی نتیجہ نکالا کہ تمام مرد یہ سمجھتے ہیں کہ ان کے علاوہ باقی تمام مخلوق سوجھ بوجھ سے عاری ہے حالانکہ ان کا اپنا یہ حال ہے کہ وہ خود خود غرض، انا پسند اور ہر قسم کی معاملہ فہمی سے تہی دامن ہوتے ہیں۔

برگ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے نہایت حزم و احتیاط سے اپنی بیوی کو اپنی آغوش میں لے لیا تا کہ وہ کہیں بے دھیانی میں اس کی بے آستین نیم قبا، جس پر اس نے اچھی خاصی رقم خرچ کی تھی، چر مر نہ کر دے اور بھرپور انداز سے اس کے لبوں پر بوسہ ثبت کر دیا۔

''ہمیں صرف ایک بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ ابھی بچے پیدا نہ ہونے دیں،'' اس نے تلازمِ خیالات کی، جس سے وہ خود بھی آگاہ نہ تھا، رو میں بہتے ہوئے کہا۔

''نہیں،'' ویرا نے جواب دیا۔ ''میں خود یہ نہیں چاہتی۔ ہمیں ابھی سوسائٹی میں گھومنا پھرنا ہے۔''

''پرنس یوسوپووا نے بالکل اس سے ملتی جلتی پوشاک پہن رکھی تھی،'' برگ نے مطمئن و مسرور انداز سے مسکراتے ہوئے ویرا کی بے آستین نیم قبا کی طرف اشارہ کیا۔

عین اسی لمحے ملازم نے کاؤنٹ بزوخوف کی آمد کی اطلاع دی۔ میاں بیوی نے آسودہ مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا۔ دونوں میں سے ہر ایک اس مہمان کی آمد کو اپنے کھاتے میں ڈال رہا تھا۔

''دیکھا، آدمی کو دوست بنانے کا ڈھنگ آتا ہو، تو اس کا یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے!'' برگ نے سوچا۔ ''آدمی کو صحیح رویہ اختیار کرنے کا سلیقہ آتا ہو، تو اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے!''

''میری گزارش یہ ہے'' ویرا نے کہا، ''کہ جب میں مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہوں گی، آپ اس میں کوئی دخل نہیں دیں گے کیونکہ میں سمجھتی ہوں کہ کس شخص کو کس چیز میں دلچسپی ہے اور کس شخص سے کیا کہنا ہے۔''

برگ دوبارہ مسکرا پڑا۔ ''لیکن اس سے مفر بھی تو کوئی نہیں۔ مرد بعض اوقات مردانہ گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں،'' اس نے کہا۔

پیئر کو ڈرائنگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اشیا کچھ اس طرح رکھی گئی تھیں کہ ان کے حسنِ تناسب، صفائی ستھرائی اور ترتیب میں رخنہ ڈالے بغیر وہاں بیٹھنا ناممکن تھا، چنانچہ یہ بات بالکل قابل فہم تھی اور اس پر کسی قسم کی حیرت نہیں ہونا چاہیے کہ برگ عالی ظرف کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے معزز مہمان کی خاطر کسی بازوؤں والی کرسی یا صوفے کے حسن ترتیب کی قربانی دینے کی پیشکش کرتا، لیکن پھر اسے محسوس ہوا کہ وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا۔ اس سے اسے ذہنی

اذیت تو ضرور ہوئی، تاہم مہمان کو کہاں بیٹھنا چاہیے، اس کا فیصلہ اس نے اسی پر چھوڑ دیا۔ پیئر نے ایک کرسی گھسیٹ لی اور یوں اس نے حسن ترتیب میں بگاڑ پیدا کر دیا۔ ادھر برگ اور ویرا نے جو محفل رچائی تھی، اس کا افتتاح انھوں نے اس طرح کیا کہ اپنے مہمان کی خاطر تواضع کرنے کی کوشش میں فوراً ایک دوسرے کی بات کاٹنے لگے۔

ویرا اپنے ذہن میں طے کر چکی تھی کہ پیئر کو فرانسیسی سفارت خانے کے بارے میں گفتگو کر کے محظوظ کیا جانا چاہیے۔ چنانچہ اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ پٹ یہی موضوع چھیڑ دیا۔ برگ اپنے دل میں ٹھان چکا تھا کہ موقع مردانہ گفتگو کا تقاضا کرتا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنی بیوی کی بات کاٹ دی اور جنگ آسٹریا کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرنے لگا۔ اس نے گفتگو عمومی انداز سے شروع کی تھی لیکن اس نے غیر شعوری طور پر اس کا رخ پلٹ دیا اور اس میں اپنی ذات کو گھسیٹ لیا۔ آسٹروی مہم میں شرکت کرنے کے لیے اسے جو تجاویز پیش کی گئی تھیں، اس نے ان کا ذکر کیا اور پھر اس نے ان وجوہ پر، جن کی بنا پر اس نے یہ تجاویز مسترد کر دی تھیں، روشنی ڈالی۔ اگرچہ گفتگو انتہائی بے ربط اور بے جوڑ تھی اور ویرا اس بات پر طیش کھا رہی تھی کہ مردانہ پہلو خواہ مخواہ کیوں بیچ میں گھسیٹ لیا گیا ہے، میاں بیوی دونوں کو اس امر کے باوجود کہ گو ابھی تک صرف ایک ہی مہمان آیا تھا، بہت اطمینان محسوس ہو رہا تھا کہ ان کی محفل کا آغاز بہت احسن طریقے سے ہوا ہے اور وہ سمجھ رہے تھے کہ جس طرح پھلی میں مٹر کے دو دانے بالکل ایک جیسے ہوتے ہیں، ان کی محفل بھی اسی قسم کی دوسری محافل جیسی ہے۔ آخر یہاں کس چیز کی کمی تھی؟ وہی چائے، وہی گفتگو اور وہی روشن شمعیں، سبھی کچھ تو موجود تھا۔

کچھ زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ برگ کا سابق رفیق کار بورس آ گیا۔ وہ برگ اور ویرا کے ساتھ جس انداز سے پیش آ رہا تھا، اس سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آپ کو ان سے قدرے برتر محسوس کر رہا ہے اور اس نے یہاں آ کر ان پر بڑا احسان کیا ہے۔ بورس کے بعد کرنل اور اس کی اہلیہ، پھر بنفس نفیس جرنیل اور اس کے بعد رستوف پہنچ گئے۔ اب اس بارے میں شک وشبے کی کوئی گنجائش نہیں رہ گئی تھی کہ یہ محفل دوسری محافل کا رنگ پکڑ گئی تھی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں جس قسم کی ہل چل مچی ہوئی تھی، جس طرح جھک جھک کر ایک دوسرے کو سلام اور آداب کہا جا رہا تھا، جس طرح سکرٹوں میں سرسراہٹ ہو رہی تھی اور بے ربط گفتگو جاری تھی، اس پر ویرا اور برگ اتنے مطمئن تھے کہ ان کے لیے اپنی مسکراہٹوں کو دبانا مشکل ہو گیا۔ (ان کے خیال کے مطابق) سب کچھ عین مین ویسے ہی ہو رہا تھا جیسا کہ باقی جگہوں پر ہوتا ہے۔ جرنیل پر یہ بات خاص طور پر صادق آتی تھی۔ اس نے اپارٹمنٹ کی دل کھول کر تعریف کی، برگ کے کندھے پر تھپکی دی اور پدرانہ اختیار استعمال کرتے ہوئے تاش کے کھیل بوسٹن[39] کے لیے میز لگانے پر اصرار کیا۔ جرنیل کاؤنٹ ایلیا آندریچ کے قریب بیٹھ گیا کیونکہ مرتبے کے اعتبار سے خود اس کے بعد اسی کا نمبر آتا تھا۔ بزرگوں نے بزرگوں کے پاس اور نوجوانوں نے نوجوانوں کے پاس نشستیں سنبھال لیں۔ چائے کی میز، جس پر بالکل اسی قسم کے کیک، جو پانن گھرانے نے اپنی ضیافت کے لیے منگوائے تھے، چاندی کی ٹرے میں پڑے تھے، میزبان کی اہلیہ نے اپنی تحویل میں لے لی۔ درحقیقت ہر چیز بالکل

ویسی ہی تھی جیسی کہ دوسری جگہوں پر ہوتی ہے۔

21

پیئر انتہائی معزز مہمانوں میں شامل تھا، اس لیے بوسٹن کے کھیل کے دوران میں اسے مجبوراً کاؤنٹ ایلیا آندریچ، جرنیل اور کرنیل کے ساتھ بیٹھنا پڑا۔ جس میز پر یہ کھیل ہو رہا تھا، اس کے بالکل سامنے نتاشا بیٹھی تھی۔ اجتماعی رقص کی شب سے اس میں جو حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی، اس نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ وہ شاذونادر ہی کوئی بات منہ سے نکال رہی تھی۔ بال پر اس کا حسن جس طرح نکھرا تھا، اس کے مقابلے میں اب نہ صرف اس کی خوبصورتی ماند پڑ چکی تھی بلکہ اگر اس کے چہرے پر اپنے گردوپیش کی ہر چیز کے بارے میں خفیف بے نیازی نہ جھلک رہی ہوتی تو یہ بالکل ہی سپاٹ نظر آتا۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' پیئر نے اس پر اچھلتی نگاہ ڈالتے ہوئے سوچا۔

وہ اپنی ہمشیرہ کے پاس چائے کی میز کے سامنے بیٹھی اور بے دلی سے بورس کی، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، کسی بات کا، اس کی طرف دیکھے بغیر ہی، جواب دے رہی تھی۔ پیئر نے تاش کی پوری بازی، جس کے دوران میں اس نے پانچ ٹرک بھی کھیلے جس پر اس کے ساتھی کو بہت اطمینان ہوا، کھیل لی۔ اتنے میں اس کے کانوں میں کچھ اس قسم کی آوازیں ٹکرائیں جیسے کسی شخص کو خیر مقدمی کلمات کہے جا رہے ہوں اور اس کے ساتھ ہی اسے کسی شخص کے اندر آنے کی آہٹ سنائی دی۔ پیئر اپنے پتے اٹھا رہا تھا کہ ایک بار پھر اس کی نگاہیں نتاشا پر پڑ گئیں۔

''اسے کیا ہوا ہے؟'' اس نے اور بھی حیرت زدہ ہو کر سوچا۔

اس کے سامنے پرنس آندرے کھڑا تھا۔ اس کی نگاہوں میں محتاط ملائمت تھی اور وہ اس سے کچھ کہہ رہا تھا۔ وہ اپنا سر اٹھائے اس کی جانب دیکھ رہی اور شرما رہی تھی۔ نظر آتا تھا کہ وہ اپنی تیز سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کر رہی ہے۔ کسی اندرونی آتش کی چمک، جو پہلے بجھ چکی تھی، اب پھر سے اس کے چہرے پر ہویدا ہونے لگی تھی۔ اس کی تو کایا ہی پلٹ گئی۔ اب اس کا چہرہ سپاٹ نہیں رہا تھا بلکہ ایک بار پھر وہاں وہی حسن و جمال تھا جو اس نے اجتماعی رقص کی رات دیکھا تھا۔

پرنس آندرے پیئر کے پاس آیا اور پیئر کو اپنے دوست کے چہرے پر نئی تازگی اور شباب جھلکتا نظر آیا۔

کھیل کے دوران میں پیئر نے متعدد بار اپنی جگہ تبدیل کی۔ کبھی وہ نتاشا کی جانب پشت کر لیتا اور کبھی اس کے روبرو ہو جاتا۔ اس نے چھ ربر کھیلے اور ان کے دوران میں وہ مسلسل اسے اور اپنے دوست کو دیکھتا رہا۔

''ان دونوں کے مابین کوئی انتہائی اہم اور سنجیدہ چیز وقوع پذیر ہو رہی ہے،'' پیئر نے سوچا۔ اور اس کے مسرت اور تلخی کے ملے جلے جذبات نے اس کے قلب میں وہ ہل چل پیدا کر دی کہ کھیل پر اس کی توجہ مرکوز نہ رہ سکی۔

جب چھ ربر مکمل ہو گئے، جرنیل یہ کہتے ہوئے کہ اس طرح کھیلنا لاحاصل ہے، اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور پیئر کی

جان چھوٹ گئی۔ نتاشا ایک طرف ہٹ گئی تھی اور سونیا اور بورس کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ویرا شوخ اور نٹ کھٹ انداز سے مسکرا رہی تھی اور پرنس آندرے سے کچھ کہہ رہی تھی۔ پیئر اپنے دوست کے پاس پہنچا اور پوچھنے لگا: ''کوئی راز دارانہ گفتگو ہو رہی ہے؟'' وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

پرنس آندرے نتاشا کے ساتھ جس التفات سے پیش آیا تھا، وہ ویرا کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس قسم کی محفل، اصلی محفل، کا تقاضا یہ ہے کہ نرم وملائم جذبات کی طرف محتاط انداز سے اشارہ کیا جائے اور ایک موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے، جب پرنس آندرے تن تنہا تھا، اس نے جذبات کے بارے میں عمومی گفتگو شروع کر دی اور بیچ بیچ میں اپنی ہمشیرہ کا ذکر بھی کرنے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس طرح کے دانش ور مہمان کے ساتھ، جیسا کہ پرنس آندرے اس کی دانست میں تھا، نپٹنے کے لیے اسے فنِ سفارت کی مہارت کو بروئے کار لانا ہوگا۔

جب پیئر ان کی محفل میں جا شامل ہوا، اس نے دیکھا کہ ویرا جس روانی سے گفتگو کر رہی ہے، اس پر وہ خود ہی نازاں ہو رہی ہے، جب کہ پرنس آندرے شرما اور گھبرا رہا ہے۔۔۔ اور یہ ایک ایسی کیفیت تھی جو شاذ ہی کبھی اس کے ساتھ پیش آئی ہوگی۔

''آپ کی کیا رائے ہے؟'' ویرا نے گھنے انداز سے مسکرا کر پوچھا۔ ''پرنس، آپ اتنے دقیقہ شناس ہیں کہ پلک جھپکنے میں کسی شخص کے اندر جھانک کر دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کا انسان ہے۔ نتالیا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟۔۔۔ کیا وہ اپنی وابستگیوں کے بارے میں استقامت کا مظاہرہ کر سکتی ہے؟ کیا وہ دوسری خواتین'' ۔۔۔ ویرا کی مراد اپنی ذات تھی ۔۔۔ ''کی طرح ہمیشہ ایک ہی مرد سے پیار کر سکتی ہے اور دائمی طور پر اس سے وفاداری نبھا سکتی ہے؟ میرے خیال میں سچی محبت اسی چیز کا نام ہے۔ پرنس، آپ کی کیا رائے ہے؟''

''میں آپ کی ہمشیرہ کو کچھ زیادہ نہیں جانتا،'' پرنس آندرے نے بناوٹی تبسم سے، جس کی اوٹ میں وہ اپنی گھبراہٹ اور احساس شرمندگی کو چھپانے کی کوشش کر رہا تھا، کہا۔ ''اس لیے میں اس نازک مسئلے کے بارے میں کوئی قطعی رائے دینے سے قاصر ہوں۔ اور پھر میں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ'' اس نے پیئر کی جانب، جو ان کے نزدیک پہنچ چکا تھا، دیکھتے ہوئے کہا، ''عورت میں جتنی کم دلکشی ہوتی ہے، اس کے ثابت قدم رہنے کا اتنا ہی زیادہ امکان ہوتا ہے۔''

''جی ہاں، پرنس، آپ نے بجا فرمایا۔ ہمارے زمانے میں،'' ویرا نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ (وہ ''ہمارے زمانے'' کا ذکر بعینہٖ اسی انداز سے کر رہی تھی جس طرح محدود ذہانت کے حامل اشخاص عام طور پر کرتے ہیں۔ وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ ''ہمارے زمانے'' کی خصوصیات دریافت کر چکے اور اس کا محاکمہ کر چکے ہیں، اور انھیں یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ انسانی فطرت تبدیل ہوتی رہتی ہے۔) ''ہمارے زمانے میں لڑکی کو اتنی آزادی مل چکی ہے کہ مرد اس کا دل لبھانے اور اسے رجھانے پر چانے کی جو کوشش

کرتا ہے، اس سے وہ اتنا مسرور ہو جاتی ہے کہ اکثر اوقات اس کے سچے جذبات کا گلا گھٹ جاتا ہے اور یہاں یہ اعتراف کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نتالیا اس سلسلے میں کچھ زیادہ ہی اثر پذیر ہے۔''

نتاشا کے موضوع کی اس تکرار نے پرنس آندرے کو برافروختہ کر دیا اور اس کی بھویں تن گئیں۔ وہ اٹھنے ہی والا تھا کہ ویرا نے اور بھی گھٹتے انداز سے مسکراتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''میں نہیں سمجھتی کہ کسی دوشیزہ کا دل جیتنے کی اتنی کوششیں کی گئیں ہوں گی جتنی کہ اس کی،'' اس نے کہا۔ ''لیکن پچھلے دنوں تک کوئی بھی اسے صحیح معنوں میں متاثر نہیں کر سکا تھا اور نہ اس نے سنجیدگی سے کسی کے بارے میں سوچا تھا۔ اور کاؤنٹ،'' اس نے پیئر سے مخاطب ہو کر کہا: ''آپ تو جانتے ہیں کہ ہمارا پیارا کزن بورس، اور یہ بات میں محض آپ سے کہہ رہی ہوں، محبت (la tendresse) کی مملکت میں بہت دور تک سفر کر چکا تھا...'' (وہ محبت کے اس نقشے کی طرف، جو اس زمانے میں بہت رواج پا چکا تھا، اشارہ کر رہی تھی۔)

پرنس آندرے کی تیوریاں چڑھ گئیں لیکن اس نے لب کشائی سے احتراز کیا۔

''آپ اور بورس دوست ہیں۔ میں نے درست کہا؟'' ویرا نے پوچھا۔

''ہاں، میں اسے جانتا ہوں...''

''میرا خیال ہے کہ اس نے نتاشا سے اپنی بچگانہ محبت کے متعلق آپ کو کچھ نہ کچھ بتایا ہوگا؟''

''ان میں بچگانہ محبت تھی؟'' پرنس آندرے نے یک دم پوچھا۔ غیر متوقع طور پر شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

''ہاں، آپ کو معلوم ہے کہ کزنوں کے مابین بے تکلفی ہوتی ہے اور یہ بے تکلفی اکثر اوقات محبت پر منتج ہوتی ہے۔ *Le Cousinage est un dangereus voisinage۔ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''ارے ہاں، بے شک، بے شک،'' پرنس آندرے نے کہا۔ پھر وہ دفعتاً اور غیر فطری بشاشت سے پیئر سے دل لگی کرنے اور اسے متنبہ کرنے لگا کہ ماسکو میں اس کی جو پچاس پچاس سالہ کزن ہیں، اسے ان کے ساتھ اپنے تعلقات کے بارے میں حد درجہ محتاط رہنا چاہیے اور اس قسم کی پر تفنن باتیں کرتے کرتے وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے پیئر کو بازو سے پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔

''ہونہہ! کیا بات ہے؟'' پیئر نے پوچھا۔ اپنے دوست کی خلاف عادت شگفتہ مزاجی نے اسے حیران و سرگرداں کر دیا تھا۔ اس نے اٹھتے اٹھتے جس انداز سے نتاشا کو دیکھا تھا، وہ اسے دیکھ چکا تھا اور وہ بھی اس کے لیے اچنبھے کا باعث بنا تھا۔

''مجھے... مجھے تمھارے ساتھ بات کرنا ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''تمھیں خواتین کے دستانوں کی اس جوڑی کے بارے میں تو پتا ہی ہے۔'' (اس کا اشارہ میسوں کے ان کے دستانوں کی طرف تھا جو اس شخص کو جو فری

* قریبی قرابت داروں کا اختلاط خطرناک نتائج کو جنم دیتا ہے۔

میسنری تحریک کا نیا نیارکن بنا ہو، دیے جاتے ہیں۔ اس نے یہ دستانے اس خاتون کو، جس سے اسے محبت ہو، دینا ہوتے ہیں۔) ''میں... خیر، چھوڑو، میں بعد میں تم سے بات کروں گا...'' وہ اتنا ہی کہہ سکا۔ وہ نتاشا کی طرف چل دیا اور اس کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی آنکھوں میں عجیب و غریب قسم کی جگمگاہٹ اور اس کی حرکات و سکنات میں بے قراری تھی۔

پیئر نے دیکھا کہ پرنس آندرے نے نتاشا سے کچھ پوچھا اور جب وہ جواب دے رہی تھی، شرم و حجاب سے اس کے گال سرخ ہو رہے تھے۔

اتنے میں برگ پیئر کے پاس آیا اور اس سے اصرار کرنے لگا کہ جرنیل اور کرنیل کے مابین ہسپانیہ کی صورت حال کے بارے میں جو بحث چھڑی ہوئی ہے، اس میں وہ بھی شرکت کرے۔

برگ مطمئن اور ہشاش بشاش تھا۔ اس کا چہرہ مستقلاً مسکرا رہا تھا۔ اس کی پارٹی بہت کامیاب رہی تھی اور سولہ آنے ان محافل کی مماثل تھی جن میں اسے کبھی شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔ ان محافل میں جو کچھ۔۔ خواتین کی نستعلیق گفتگو، تاش کا کھیل، کھیل کے بارے میں جرنیل کا با آواز بلند تبصرہ، سماوار، اور چائے کے کیک بسکٹ۔ ہوتا ہے، یہاں بھی ہو بہو وہی کچھ موجود تھا۔ صرف ایک چیز کی، جو اس نے ہمیشہ دوسری محافل میں دیکھی تھی اور جس کی وہ نقل کرنا چاہتا تھا، کمی رہ گئی تھی۔ کسی اہم دانش ورانہ مسئلے کے متعلق مردوں میں نہ تو تند و تیز گفتگو ہوئی اور نہ وہ آپس میں الجھے۔ اب جرنیل نے اس قسم کی بحث چھیڑ دی تھی اور برگ پیئر کو اس میں گھسیٹ رہا تھا۔

22

اگلے روز پرنس آندرے کاؤنٹ کی دعوت پر رستوفوں کے ہاں گیا اور اس نے بقیہ دن وہیں گزارا۔

تمام افراد خانہ کو یہ اندازہ ہو گیا کہ اس نے کس کی خاطر ان کے گھر آنے کی زحمت گوارا کی ہے۔ پرنس آندرے نے بھی کسی قسم کی رازداری برتنے کی کوشش نہ کی اور وہ ہمہ وقت نتاشا کے ساتھ نتھی رہنے کے جتن کرتا رہا۔ نہ صرف نتاشا اپنے نہاں خانۂ دل میں ڈری سہمی ہوئی تھی اور ساتھ ساتھ مسرت و انبساط کے فلک ہفتم پر بھی پہنچی ہوئی تھی بلکہ گھر کے دیگر افراد پر کچھ اس نوع کی ہیبت طاری تھی جیسے وہ کسی عظیم اور گمبھیر واقعے کے ظہور پذیر ہونے کے منتظر ہوں۔ جب بھی پرنس آندرے نتاشا کے ساتھ کوئی بات کرتا، کاؤنٹس اداس اور انتہائی سنجیدہ نگاہوں سے اس کا تعاقب کرنے لگتی اور جونہی وہ مڑ کر خود اس کی جانب دیکھتا، وہ ڈرے ڈرے انداز سے مصنوعی اور بے ربط گفتگو شروع کر دیتی۔ سونیا نتاشا کے پاس سے اٹھ کر جانے سے بھی خائف تھی لیکن وہاں بیٹھے رہنے پر بھی اس کے دل پر ہول طاری ہو رہا تھا کہ کہیں وہ دونوں کے مابین سدِ راہ تو نہیں بن رہی۔ خود نتاشا کی یہ حالت تھی کہ اگر وہ ایک آدھ لمحے کے لیے بھی اس کے ساتھ تنہا رہ جاتی، اس اندیشے سے کہ اب کچھ ہوا، اب کچھ ہوا، اس کی رنگت پیلی پڑ جاتی۔ پرنس آندرے کی بے حوصلگی اور جھجک نے اسے ششدر کر دیا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ پرنس آندرے

اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن اپنا مافی الضمیر ادا کرنے کا حوصلہ نہیں پا رہا۔

شام کو جب پرنس آندرے چلا گیا، کاؤنٹس نتاشا کے پاس گئی اور اس کے کان میں کہنے لگی:

''ہونہہ؟''

''ماما، خدا کے لیے مجھ سے فی الحال کچھ نہ پوچھیں۔ اس بارے میں بات کرنا ناممکن ہے!'' نتاشا نے کہا۔

تاہم اس رات وہ خاصی دیر تک اپنی ماں کے بستر میں لیٹی رہی۔ وہ ٹکٹکی باندھے سیدھ میں دیکھ رہی تھی، کبھی وہ خوشی سے جھوم اٹھتی اور کبھی اندیشوں اور وسوسوں میں گھر جاتی۔ اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ کس طرح اس کی تعریفوں کے پل باندھتا رہا تھا، اس نے کیسے اسے بتایا کہ وہ دساور جا رہا ہے، کیسے اس سے پوچھا کہ وہ گرمیاں کہاں گزاریں گے اور پھر کس طرح بورس کے بارے میں کرید کی۔

''لیکن ایسی... ایسی چیز اس سے پہلے میرے ساتھ کبھی پیش نہیں آئی تھی!'' اس نے کہا۔ ''بات صرف یہ ہے کہ ان کی موجودگی میں مجھ پر خوف طاری ہو جاتا ہے۔ جب بھی میں ان کے پاس ہوتی ہوں، میں خوف میں مبتلا ہو جاتی ہوں۔ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حقیقی چیز ہے؟ یہی مطلب ہے؟ ماما، آپ سو رہی ہیں؟''

''نہیں، ڈارلنگ، میں خود خوف زدہ ہوں،'' اس کی ماں نے کہا۔ ''اب تم جاؤ۔''

''لیکن مجھے نیند نہیں آئے گی۔ اگر میں سو گئی، تو یہ بڑی احمقانہ حرکت ہوگی! اف، ماما، ڈیئر ماما، اس سے پہلے کبھی مجھ پر اس قسم کی واردات نہیں گزری تھی!'' وہ پکاری۔ باطن میں اسے جس احساس کا وقوف تھا، اس نے اسے ورطۂ حیرت میں گم کر دیا تھا اور اس پر ہیبت طاری کر دی تھی۔ ''اور ہم نے کبھی خواب میں بھی یہ نہیں سوچا ہوگا...''

نتاشا کو احساس ہوا کہ اس نے جب پہلی مرتبہ پرنس آندرے کو اترادنایا میں دیکھا تھا، وہ اسی وقت اس کی محبت میں گرفتار ہو گئی تھی۔ جس شخص کو اس نے تب اپنا جیون ساتھی منتخب کیا تھا (اسے پختہ یقین تھا کہ اس نے ایسا ہی کیا تھا)، اب یوں لگ رہا تھا کہ بالکل اسی آدمی سے دوبارہ مل کر، بالخصوص ان حالات میں جب کہ وہ بظاہر اس سے بے اعتنا نظر نہیں آتا تھا، اسے جو انوکھی اور غیر متوقع خوشی حاصل ہوئی تھی، اس سے اس کے دل میں خوف بیٹھ گیا ہے۔

''یہ کہ وہ بالکل انھی ایام میں پیٹرز برگ آئے جب کہ ہم یہاں موجود تھے! پھر بال میں ہماری ملاقات ہوئی! اسی کا نام مقدر ہے! صریحاً یہ مقدر ہی تو ہے کہ سب کچھ اس انجام کو پہنچا۔ جب میں نے انھیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا، تبھی میں نے کوئی خاص بات محسوس کی تھی۔''

''اس نے تم سے کیا کہا تھا؟ اور یہ کیا اشعار ہیں؟ مجھے پڑھ کر سناؤ،'' اس کی ماں نے ان چند اشعار کی طرف، جو پرنس آندرے نے نتاشا کی البم میں تحریر کیے تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس طریقے سے وہ اس کی دل جوئی کرنا چاہتی تھی۔

''ماما، وہ رنڈوا ہے، اس میں شرم کی تو کوئی بات نہیں؟''

''نتاشا، چپ کرو۔ خداوند سے خیر مانگو۔ رشتے افلاک پر طے ہوتے ہیں۔''

''ماما ڈارلنگ، میں آپ کو کتنا چاہتی ہوں! میں کتنا خوش ہوں!'' نتاشا نے با آواز بلند کہا۔ وہ اپنی ماں سے لپٹ گئی اور مسرت و ہیجان کے عالم میں اس کی آنکھوں کے پیمانے چھلکنے لگے۔

ادھر عین اسی وقت پرنس آندرے پیئر کے پاس بیٹھا تھا اور اسے اپنی داستان محبت سنا رہا تھا۔ وہ اپنے اس عزم صمیم کا اظہار کر رہا تھا کہ وہ اسے اپنی دلہن بنا کر ہی دم لے گا۔

❦

اسی شام کاؤنٹس ہیلینا واسیلیونا بزوخوا نے استقبالیے کا اہتمام کیا۔ دعوت میں فرانسیسی سفیر، ایک عجیب الطرفین غیر ملکی شہزادہ، جو گزشتہ کچھ عرصے سے باقاعدگی سے کاؤنٹس کے گھر کا طواف کر رہا تھا، اور ذہین و فطین خواتین و حضرات کی اچھی خاصی تعداد شریک تھی۔ پیئر نیچے اتر آیا تھا اور مختلف کمروں میں گھوم پھر رہا تھا۔ وہ کھویا کھویا سا تھا، اپنے خیالات میں مستغرق تھا اور اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ اس کی یہ کیفیت دیکھ کر سب مہمان بہت متعجب ہوئے۔

جس رات بال منعقد ہوا تھا، تبھی سے اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اس پر اعصابی اضمحلال کا دورہ پڑنے والا ہے اور وہ اس سے نبرد آزما ہونے کی سر توڑ کوشش کر رہا تھا۔ جب سے اس کی اہلیہ نے شاہی شہزادے کے ساتھ راہ و رسم بڑھائی تھی، اسے غیر متوقع طور پر مصاحب (جنٹلمین۔ان۔ویٹنگ) مقرر کر دیا گیا تھا۔ اب اسے درباری طبقے کے مابین کچھ یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس کا دم گھٹ رہا ہو۔ اس پر شرمندگی کا احساس اس قدر غالب تھا کہ اپنی دانست میں وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا تھا۔ ماضی میں وہ یہ سمجھتا رہا تھا کہ ہر وہ چیز، جس کا تعلق حضرت انسان سے ہے، ہیچ ہے، بے بنیاد ہے، اب ایک بار پھر اسی طرح کے بھیانک خیالات بالتواتر اس کے ذہن پر یورش کرنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے نتاشا، جسے وہ اپنی متوسل سمجھتا تھا، اور اپنے دوست پرنس آندرے کے مابین جس قسم کے جذبے کا مشاہدہ کیا تھا، اس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ وہ جب اپنے دوست کی اور خود اپنی صورت حال کا موازنہ کرتا، اس کی افسردگی فزوں تر ہو جاتی۔ وہ برابر اس کوشش میں لگا رہتا تھا کہ وہ اپنی بیوی اور نتاشا و پرنس آندرے کے بارے میں کچھ نہ سوچے۔ ابدیت کے مقابلے میں اسے ہر چیز دوبارہ بے وقعت نظر آنے لگی اور ایک بار پھر اس کے ذہن میں یہ سوال گردش کرنے لگا: ''یہ سب کس لیے ہے؟'' میسن کی حیثیت سے وہ جس نوعیت کے کاموں میں مشغول تھا، انھیں سرانجام دینے کے لیے اب وہ اپنی جان پر جبر کرنے لگا اور دن رات محنت کرنے لگا۔ اسے امید تھی کہ اس طرح وہ اس بدروح سے، جو ہر وقت خطرہ بن کر اس کے سر پر منڈلاتی رہتی تھی، پیچھا چھڑا سکے گا۔

بوقت نیم شب وہ کاؤنٹس کے اپارٹمنٹ سے بالائی منزل پر اپنے کمرے میں، جس کی چھت نیچی تھی اور جو دھوئیں سے بھرا ہوا تھا، پہنچ گیا۔ اس نے بوسیدہ ڈریسنگ گاؤن پہنا اور میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ سکاٹش فری میسوں کے اولین مسودوں کی نقول تیار کر رہا تھا کہ کوئی شخص اندر آ گیا۔ یہ پرنس آندرے تھا۔

''ارے تم!'' پیئر نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا ہے اور نا مطمئن و نا آسودہ ہے۔ ''دیکھ رہے ہو میں اپنے کام میں مصروف ہوں،'' اس نے اپنے مسودے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اس کا انداز ان ناشاد و نامراد اشخاص کا تھا جو اپنے کام کو زندگی کی تلخیوں اور دشواریوں سے نجات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

پرنس آندرے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر وہ چمک دمک اور فرحت و راحت تھی جیسے اسے نئی زندگی مل گئی ہو۔ اس کے دوست کی شکل و صورت سے جو حزن و ملال ٹپک رہا تھا، اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اس کے سامنے مسرت کی انا کے ساتھ، کھلا جا رہا تھا۔

''دیکھو یار!'' اس نے کہا، ''میں کل تمھارے ساتھ بات کرنا چاہتا تھا اور اب میں تمھیں اسی کے متعلق بتانے آیا ہوں۔ اس سے قبل مجھے اس قسم کا کبھی کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ دوست، مجھے محبت ہو گئی ہے!''

اچانک پیئر نے زور سے آہ بھری اور وہ دھڑام سے پرنس آندرے کے قریب صوفے پر پاؤں پسار کر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے کہ نتاشا رستووا سے،'' اس نے کہا۔

''بالکل، بالکل ــ اور کس سے؟ مجھے کبھی یقین نہ آتا کہ ایسا ممکن ہے لیکن جذبہ مجھ سے قوی تر ہے۔ کل میں انگاروں پر لوٹ رہا تھا، میں کرب و اذیت میں مبتلا تھا لیکن میں اس کرب و اذیت کا بھی دنیا کی کسی چیز سے تبادلہ نہیں کروں گا۔ اس سے پہلے میں جیا ہی نہیں، زندگی تو مجھے اب ملی ہے لیکن اس کے بغیر میں زندہ نہیں رہ سکوں گا... لیکن کیا وہ مجھ سے محبت کر سکے گی؟ ہم دونوں کی عمروں میں بہت فرق ہے ــ تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟''

''میں؟ ... میں؟ میں کیا کہوں؟'' پیئر نے کہا۔ وہ دفعتاً اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔ ''میں نے ہمیشہ یہی سمجھا ہے ... وہ لڑکی ایسا گنج بے بہا ہے، ایسا ... وہ نایاب لڑکی ہے ... میرے عزیز دوست، میں تم سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں، قیل و قال نہ کرو، اگر مگر کے چکر میں نہ پڑو، شک و شبے کے جال میں نہ پھنسو، شادی کر لو، شادی کر لو ... اور میں یہ بات دھڑلے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم سے زیادہ مسرور و مطمئن شخص دنیا کے تختے پر نہیں ملے گا۔''

''لیکن اس کی مرضی؟ ...''

''وہ تم سے محبت کرتی ہے۔''

''فضول باتیں مت کرو...'' پرنس آندرے نے مسکراتے اور پیئر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

''وہ تم سے محبت کرتی ہے، مجھے معلوم ہے!'' پیئر نے پرزور انداز سے کہا۔

''نہیں، سنو،'' پرنس آندرے نے اس کا بازو تھامتے اور اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں معلوم ہے کہ میں

کس کیفیت میں سے گزر رہا ہوں؟ مجھے اس کے بارے میں کسی نہ کسی سے لازماً بات کرنا ہوگی۔"

"اچھا، پھر شروع ہو جاؤ۔ کرو بات۔ میں بہت خوش ہوں،" پیئر نے کہا اور واقعی اس کا چہرہ منقلب ہو چکا تھا۔ اس کی پیشانی پر جو سلوٹیں تھیں، وہ کافور ہو چکی تھیں۔ وہ خوش تھا اور ہمہ تن گوش۔

پرنس آندرے مکمل طور پر مختلف اور نیا شخص نظر آرہا تھا اور حقیقتاً وہ تھا بھی۔ وہ جو ہر وقت بیزار رہتا تھا، زندگی کے متعلق حقارت کا اظہار کرتا تھا، کہتا تھا کہ مجھے اس نے مایوس کیا ہے۔ پھر اس کی یہ بیزاری کہاں گئی؟ اس کی حقارت کا کیا بنا؟ اور اس کی مایوسی کہاں غائب ہو گئی؟ پیئر واحد شخص تھا جس سے وہ کھل کر بات کر سکتا تھا اور جو کچھ اس کے دل میں تھا، وہ اس نے اس کے سامنے بلاکم وکاست بیان کر دیا۔ اس نے بلا تامل اور پراعتماد انداز سے اپنے ان منصوبوں پر، جن کا تعلق دور مستقبل سے تھا، روشنی ڈالی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنی خوشیوں کو اپنے باپ کی تلون مزاجی کی بھینٹ نہیں چڑھا سکتا۔ وہ یا تو اسے مجبور کر دے گا کہ وہ اس شادی کے بارے میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دے اور اس کی دلہن سے التفات برتے، اور یا وہ اس کی رضامندی کا خیال ہی چھوڑ دے گا۔ اس کے بعد اس نے ان جذبات کے بارے میں، جو اسے اپنی گرفت میں لے چکے تھے، اپنی حیرت کا اظہار کیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس کے یہ جذبات نرالے اور ناقابلِ فہم ہیں اور از خود اس کے دل میں در آئے ہیں، اس میں اس کی اپنی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا۔

"اگر کوئی دوسرا شخص مجھے یہ بتاتا کہ میں اس طرح ٹوٹ کر محبت کر سکتا ہوں، مجھے کبھی یقین نہ آتا،" اس نے کہا۔ "میں نے اس قسم کا جذبہ اس سے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا۔ میرے لیے اب کل عالم دو نصف نصف اجزا میں تقسیم ہو چکا ہے۔ ایک نصف وہ ہے، جہاں وہ ہے۔ وہیں ساری امیدیں، مسرتیں اور روشنیاں ہیں اور دوسرا نصف وہ ہے، جہاں وہ نہیں ہے۔ وہاں مکمل تاریکی ہے، اداسی ہے، ناامیدی ہے..."

"تاریکی، اداسی، ناامیدی،" پیئر نے دہرایا۔ "ہاں، ہاں، میں سمجھ گیا ہوں۔"

"میں روشنی سے محبت کیے بنا رہ ہی نہیں سکتا۔ یہ میرا قصور نہیں۔ اور میں بے حد مسرور ہوں! کیا تم میری بات سمجھتے ہو؟ مجھے معلوم ہے کہ تم میری خاطر خوش ہو۔"

"ہاں، ہاں،" پیئر نے اس سے اتفاق کا اظہار کیا۔ وہ اداس اور ہمدردانہ نگاہوں سے اپنے دوست کو دیکھ رہا تھا۔

پرنس آندرے کا مقدر اسے جتنا زیادہ روشن دکھائی دیا، اپنی قسمت اسے اتنی ہی زیادہ تاریک نظر آئی۔

23

اپنا بیاہ رچانے کے لیے پرنس آندرے کو اپنے باپ کی اجازت درکار تھی اور اس مقصد کے حصول کے لیے وہ اگلے ہی روز گاؤں روانہ ہو گیا۔

باپ نے بیٹے کی خبر بظاہر صبر و تحمل سے سنی لیکن اندر ہی اندر وہ غصے سے کھول رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب جب کہ وہ خود چراغ سحری تھا اور اپنی زندگی کے آخری ایام بتا رہا تھا، کسی شخص کو اپنی زندگی کا ڈھانچہ تبدیل کرنے اور اس میں کسی نئی چیز کو متعارف کرانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ''اگر یہ لوگ مجھے اپنی زندگی اس ڈھب سے، جس ڈھب سے میں اسے گزارنا چاہتا ہوں، گزارنے دیں،'' بڑے میاں نے اپنے آپ سے کہا، ''پھر میرے بعد ان کے جو جی میں آئے، کرتے رہیں۔'' تاہم اپنے بیٹے کے ساتھ اس نے اسی حکمت عملی سے، جو وہ نہایت اہم مواقع پر استعمال میں لاتا تھا، کام لیا۔ اس نے پرسکون لہجہ اختیار کیا اور سارے مسئلے کو زیر بحث لے آیا۔

اول: حسب نسب، روپے پیسے، حفظ مراتب، کسی اعتبار سے بھی یہ رشتہ ان کے شایان شان نہیں ہے۔ دوم: پرنس آندرے شباب کی دہلیز پر دستک نہیں دے رہا اور اس کی صحت بھی چنداں قابل رشک نہیں (بڑے میاں نے اس نکتے پر خاص طور پر زور دیا)، جب کہ وہ بالکل نوخیز ہے۔ سوم: وہ ایک بیٹے کا باپ ہے اور اسے محض بچی کی تحویل میں دینا ظلم ہوگا۔ ''چوتھی اور آخری بات یہ ہے،'' باپ نے بیٹے کو طنزیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا: ''میری التجا ہے کہ تم اپنی اس شادی کو ایک سال کے لیے مؤخر کردو۔ دساور جاؤ، اپنا علاج کراؤ اور جیسا کہ تمھاری خواہش ہے، اپنے صاحب زادے کے لیے کوئی جرمن ٹیوٹر تلاش کرو اور اس کے بعد بھی اگر تمھارا عشق، نفسانی جذبہ، ہٹ دھرمی — جو چاہے، اسے نام دے لو — اتنا ہی توانا رہے، پھر بے شک شادی کرلو۔ اور اس موضوع پر یہ میرا حرف آخر ہے، کسی بھول میں نہ رہنا، حرف آخر ہے!...'' پرنس نے اپنی بات کا اختتام کچھ اس لہجے سے کیا جس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔

پرنس آندرے پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ بڑے میاں کو امید ہے کہ نہ اس کے اپنے اور نہ اس کی متوقع دلہن کے جذبات ایک سال کی آزمائش پر پورا اتریں گے یا پھر اس عرصے کے دوران میں معمر پرنس راہئ ملک عدم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے اپنے باپ کی خواہشات کا احترام کرنے اور اپنی شادی ایک سال کے لیے مؤخر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

رستوفوں کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کے تین ہفتے بعد پرنس آندرے پیٹرزبرگ واپس آگیا۔

❖

جس روز نتاشا کی اپنی والدہ سے گفتگو ہوئی تھی، اس سے اگلے دن وہ ہمہ وقت بلکونسکی کی آمد کی منتظر رہی لیکن وہ نہ آیا۔ اس سے اگلا اور اس سے بھی اگلا دن اسی کیفیت میں گزرا۔ پیئر نے بھی اپنی شکل نہ دکھائی۔ نتاشا کو یہ معلوم نہیں تھا کہ پرنس آندرے اپنے باپ سے ملنے چلا گیا ہے، اس لیے اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس غیر حاضری سے کیا مفہوم اخذ کرے۔

یوں تین ہفتے بیت گئے۔ نتاشا کو کہیں بھی آنے جانے کی خواہش نہیں رہی تھی۔ وہ بھوت کی مانند بلا مقصد

ایک کمرے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے کے چکر کاٹتی رہی۔ اس کا چہرہ لٹک گیا اور دل بجھ گیا تھا۔ وہ راتوں کو چھپ چھپ کر روتی اور ماں کے کمرے میں جانے سے گریز کرتی رہی۔ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا اور شرمندگی کا احساس اس کے چہرے پر برستا رہتا تھا۔ اسے یوں نظر آ رہا تھا کہ اس کی امیدوں کے غنچے، جو بن کھلے مرجھا گئے تھے، ہر کسی کی نگاہوں میں ہیں اور وہ دل ہی دل میں اس کا ٹھٹھا اڑا رہے ہیں اور اس کی حالت زار پر ترس کھا رہے ہیں۔ اس کے دل پر تو چرکے لگ ہی رہے تھے لیکن اس کی انا کو جو ٹھیس پہنچی تھی، اس نے اس کے آلام میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا۔

ایک روز وہ اپنی ماں کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ وہ کچھ کہنا ہی چاہتی تھی کہ بے اختیار اس کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس کے آنسو اس بچے کے تھے جس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ آخر اسے کس بات کی سزا مل رہی ہے۔

کاؤنٹس نے اسے دم دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ابتداً میں تو نتاشا اپنی ماں کی تسلیاں سنتی رہی۔ پھر وہ اچانک پھٹ پڑی اور اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''چپ کرو، ماما! میں اس بارے میں سوچ بھی نہیں رہی اور نہ سوچنا چاہتی ہوں۔ وہ بس آئے اور پھر چلے گئے.... چلے گئے...''

اس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی اور اس کی آنکھیں دوبارہ اشک آلود ہو گئیں۔ تاہم وہ سنبھل گئی اور بولی:''

''میں بالکل شادی نہیں کرانا چاہتی۔ مجھے ان سے خوف آتا ہے۔ اور بہر حال، میں اب سنبھل چکی ہوں۔''

اس گفتگو کے اگلے روز نتاشا نے اپنا پرانا ڈریس، جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ اس میں یہ عجیب خصوصیت ہے کہ جب وہ صبح کے دوران میں اسے پہنتی ہے، اس کی طبیعت ہشاش بشاش ہو جاتی ہے، پہن لیا۔ اور اس روز بھی جب وہ اس میں ملبوس ہوئی، اس نے پرانے طور طریق، جو اس نے بال کے انعقاد کے فوراً بعد ترک کر دیے تھے، دوبارہ اختیار کر لیے۔ صبح کی چائے پینے کے بعد وہ بال روم میں، جو اسے خاص طور پر پسند تھا کیونکہ اس میں آواز خوب گونجتی تھی، چلی گئی اور گلوکاری کی مشق کرنے لگی۔ وہ کمرے کے وسط میں کھڑی ہو گئی اور ایک بول، جو اسے خاص طور پر پسند تھا، بار بار گنگنانے لگی۔ اس کے گلے سے سُروں کی جو آواز نکل رہی تھی، اسے سن کر وہ جی ہی جی میں محظوظ ہو رہی تھی جیسے یہ کوئی غیر متوقع چیز ہو۔ خالی کمرے میں اس کی آواز گونجتی اور پھر دم توڑ دیتی۔ ایکا ایکی اس کے دل سے غم واندوہ کے بادل چھٹ جاتے اور وہ اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتی۔ ''اس بارے میں تردد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ حالات جیسے بھی ہیں، ٹھیک ہیں،'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور کمرے میں گھومنے پھرنے لگی۔ وہ چوبی فرش پر، جس پر پاؤں دھرنے سے صدائے بازگشت پیدا ہو رہی تھی، فطری انداز سے چل پھر نہیں رہی تھی بلکہ وہ سنبھل سنبھل کر پہلے اپنی ایڑی اور پھر انگلیاں نیچے رکھتی (وہ اپنے پسندیدہ جوتے پہنے ہوئے تھی)۔ جتنی خوشی اسے اپنی گنگناہٹ سن کر ہوئی تھی، اتنی ہی اسے اپنی ایڑی کی غنائی دھمک اور انگلیوں کی چرچراہٹ سے مل رہی تھی۔ آئینے کے سامنے گزرتے گزرتے اس نے اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ ''وہ، میں ہوں!'' اس کا چہرہ

کہتا نظر آ رہا تھا، ''اور بہت خوب صورت بھی! مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے!''

ایک فٹ مین اندر آنا چاہتا تھا۔ اسے کمرے میں سے کوئی چیز اٹھانا تھی لیکن اس نے اسے اندر آنے سے منع کر دیا اور دروازہ بھیڑ دیا۔ وہ دوبارہ چہل قدمی کرنے لگی۔ اس روز اس پر اپنے آپ کو پسند کرنے اور اپنی ذات پر شاداں و فرحاں ہونے کی پسندیدہ کیفیت ایک بار پھر طاری ہوگئی۔ ''یہ نتاشا کتنی پرکشش مخلوق ہے!'' وہ اپنے آپ سے یوں باتیں کر رہی تھی جیسے کوئی تیسرا شخص، از روئے جنس، مرد، اس سے مخاطب ہو۔ ''خوش رو، خوش اندام، خوش شباب، خوش آواز... کسی کو شکایت کا موقع نہیں دیتی بشرطیکہ اس کے اپنے سکون میں خلل اندازی نہ کی جائے...'' لیکن دوسرے اس کے سکون میں مخل ہونے سے کتنا ہی گریز کیوں نہ کرتے، اس کا سکون اب بحال نہیں ہو سکتا تھا اور وہ یہ چیز پلک جھپکنے میں سمجھ گئی۔

پیش دالان میں بڑے کمرے کا دروازہ کھلا اور کسی نے دریافت کیا: ''آپ لوگ گھر پر ہی ہیں؟'' پھر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ نتاشا نے آئینے کے روبرو اپنے سراپے پر نظر ڈالی لیکن وہ اپنے آپ کو نہیں دیکھ رہی تھی، اس کے کان ان آوازوں پر، جو بڑے کمرے سے آ رہی تھیں، لگے ہوئے تھے۔ جب اس نے اپنے آپ کو دیکھا، اسے معلوم ہوا کہ اس کا رنگ فق ہو چکا ہے۔ نووارد وہ تھا۔ اسے اس بارے میں پختہ یقین تھا حالانکہ بند دروازے میں سے جو آواز آ رہی تھی، وہ اسے بمشکل سن پا رہی تھی۔

نتاشا کا چہرہ زرد اور حال ناگفتہ بہ تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں بھاگ گئی۔

''ماما، بلکونسکی آ گئے ہیں!'' اس نے کہا۔ ''ماں، یہ تو بڑی بری بات ہوئی۔ مجھ میں برداشت کی سکت نہیں رہی... میں نہیں چاہتی... کہ مجھے اذیت پہنچے! کیا کروں؟''

پیشتر اس کے کہ کاؤنٹس کچھ جواب دے پاتی، پرنس آندرے کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور تشویش ٹپک رہی تھی۔ جونہی اس کی نظر نتاشا پر پڑی، اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ اس نے کاؤنٹس اور نتاشا کی دست بوسی کی اور صوفے کے قریب بیٹھ گیا۔

''آپ سے ملاقات کی سعادت حاصل ہوئے عرصہ...'' کاؤنٹس نے کہنا شروع کیا لیکن پرنس آندرے نے اس کی بات بیچ میں کاٹ دی اور اس کے بین السطور جو سوال پوشیدہ تھا، اس کا جواب دینے لگا۔ یہ اظہر من الشمس تھا کہ اسے کچھ کہنا تھا اور وہ اسے جلد از جلد کہہ دینا چاہتا تھا۔

''میں اس عرصے میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا کیونکہ میں والد سے ملنے گاؤں چلا گیا تھا۔ مجھے ان کے ساتھ چند انتہائی اہم امور پر تبادلۂ خیالات کرنا تھا۔ میں بس کل رات ہی واپس آیا ہوں،'' اس نے نتاشا کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کاؤنٹس، میں آپ سے کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں،'' اس نے ایک لمحے کے توقف کے بعد مزید کہا۔

کاؤنٹس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں اور ٹھنڈی سانس بھری۔ ''ارشاد، میں حاضر ہوں،'' اس نے زیر لب کہا۔

نتاشا جانتی تھی کہ اسے اٹھ جانا چاہیے لیکن وہ اٹھ نہ سکی۔ اس کے حلق کی رگیں تن گئیں۔ وہ آداب بھول گئی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ ٹکر ٹکر پرنس آندرے کو دیکھنے لگی۔

''ابھی؟ اسی وقت؟... نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!'' وہ سوچ رہی تھی۔

پرنس آندرے نے دوبارہ اس پر چھچھلتی نگاہ ڈالی اور اس نظر سے اسے یقین آ گیا کہ وہ غلطی پر نہیں تھی۔ ہاں، ابھی، اسی لمحے، اس کے مقدر کا فیصلہ ہو جائے گا۔

''نتاشا، تم چلو۔ میں تمھیں بلا لوں گی،'' کاؤنٹس نے سرگوشیوں میں کہا۔

نتاشا نے ڈری سہمی، منت سماجت سے بھرپور نگاہوں سے پرنس آندرے اور اپنی ماں کو دیکھا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔

''کاؤنٹس، میں آپ کی دخترِ نیک اختر سے رشتے کی درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں،'' پرنس آندرے نے کہا۔

کاؤنٹس کا چہرہ لالوں لال ہو گیا لیکن اس نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

''آپ کی پیشکش...'' اس نے متانت سے کہنا شروع کیا۔

وہ خاموش بیٹھا رہا اور اس کی نگاہوں میں جھانکتا رہا۔

''آپ کی پیشکش...'' وہ پھر رک گئی۔ وہ ذہنی انتشار کا شکار تھی اور اپنے خیالات مجتمع نہیں کر پا رہی تھی۔

''ہمیں پسند ہے اور میں... آپ کی پیشکش قبول کرتی ہوں۔ میں خوش ہوں... اور میرے شوہر... مجھے امید ہے... لیکن آخری فیصلہ وہ خود کرے گی...''

''جونہی مجھے آپ کی رضامندی حاصل ہو گئی، میں اس سے بات کروں گا... آپ رضامند ہیں؟'' پرنس آندرے نے پوچھا۔

''ہاں،'' کاؤنٹس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے جواب دیا۔ پھر جب وہ اس کے ہاتھوں پر بوسہ دینے کے لیے نیچے جھکا، اس نے پیار اور بیگانگی کے ملے جلے جذبات سے اپنے لب اس کی پیشانی پر چسپاں کر دیے۔

وہ اسے بیٹے کی طرح پیار کرنا چاہتی تھی لیکن اسے محسوس ہوا کہ یہ کوئی اجنبی شخص ہے جسے دیکھ کر اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا ہے۔

''مجھے یقین ہے کہ میرے شوہر رضامند ہو جائیں گے،'' کاؤنٹس نے کہا۔ ''لیکن آپ کے والد گرامی...''

''والد کو میں پہلے ہی اپنے منصوبوں کے متعلق مطلع کر چکا ہوں لیکن انھوں نے واضح قدغن لگا دی ہے کہ شادی ایک سال سے قبل نہیں ہو گی۔ میں اس سلسلے میں آپ سے گفتگو کرنا چاہتا تھا،'' پرنس آندرے نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے کہ نتاشا ابھی کم سن ہے لیکن... اتنا طویل عرصہ!''

''اس کا کوئی علاج نہیں،'' پرنس آندرے نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

''میں اسے آپ کے پاس بھیجتی ہوں،'' کاؤنٹس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

''خداوند ہم پر رحم فرمائے،'' وہ بار بار زیر لب کہتی اپنی بیٹی کو تلاش کرنے چل پڑی۔

سونیا نے بتایا کہ نتاشا اپنی خواب گاہ میں ہے۔ وہ اپنے بستر پر بیٹھی تھی، اس کا رنگ فق اور آنکھیں خشک تھیں۔ وہ کسی دینی بزرگ کے ایقونے پر نظریں جمائے، اپنے سینے پر تیز تیز صلیب کی علامات بنا رہی اور منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ جب اس کی نظر اپنی ماں پر پڑی، اس نے جست لگائی اور اس کی طرف بھاگی۔

''ہونہہ، ماما؟... ہونہہ؟''

''جاؤ، اس کے پاس چلی جاؤ۔ اس نے تمھارا رشتہ مانگا ہے،'' کاؤنٹس نے کہا۔ نتاشا کو لگا کہ اس کے لہجے میں سرد مہری ہے۔ ''جاؤ... جاؤ'' ماں ملامت آمیز انداز سے بڑبڑائی۔ وہ زور زور سے ٹھنڈی سانسیں بھر رہی تھی اور اتنے میں اس کی بیٹی وہاں سے رفو چکر ہو چکی تھی۔

نتاشا کبھی یہ نہ بتا سکی کہ وہ ڈرائنگ روم میں کیسے پہنچی تھی۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس کی نظر اس پر پڑی، وہ جھجک گئی۔ ''کیا یہ اجنبی میرے لیے سب کچھ بن گیا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور فوراً ہی جواب دیا: ''ہاں، اب صرف یہی میرے لیے دنیا کی عزیز ترین متاع ہیں۔''

پرنس آندرے نگاہیں جھکائے اس کی طرف بڑھنے لگا۔

''میں نے جس لمحے تمھیں دیکھا تھا، اسی وقت سے تم سے محبت کرنے لگا تھا۔ کیا میری امید بر آسکتی ہے؟''

اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور جب اس نے اس کے سنجیدہ اور جذباتیت سے معمور چہرے کو دیکھا جو یہ کہتا دکھائی دے رہا تھا: ''بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے؟ جو بات آپ کو معلوم ہو ہی جانا ہے، اس کے متعلق شک کرنے کی کیا تک ہے؟ آدمی جو کچھ محسوس کرتا ہے، جب اسے الفاظ میں ادا کرنا ناممکن ہو جائے، پھر بات کیوں کی جائے؟'' تو وہ بہت متاثر ہوا۔

وہ اس کے قریب پہنچی اور رک گئی۔ اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے چومنے لگا۔

''تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟''

''جی ہاں، جی ہاں!'' نتاشا یوں بڑبڑائی جیسے اس پر جھلاہٹ سوار ہو۔ پھر اس نے گہری سانس لی، مزید گہری سانس کھینچی۔ یوں اس کی سانسیں دھونکنی کی طرح چلنے لگیں اور وہ سسکیاں بھرنے لگی۔

''کیا ہوا؟ کیا بات ہے؟''

''اف، میں کتنی خوش ہوں!'' اس نے اشکوں کے بیچ مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جھک کر اس کے اور قریب ہو گئی، ایک لمحے کے لیے جھجکی گویا اپنے آپ سے پوچھ رہی ہو کہ ''مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' اور پھر اس نے اس کا بوسہ لے لیا۔

پرنس آندرے نے اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگا، لیکن اسے

اس کے ساتھ پہلے جو محبت تھی، اب اس کی رمق بھی اس کے دل میں موجود نہ تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے اندر کسی تبدیلی نے جنم لے لیا ہے۔ آرزو کی سابقہ شعری اور پراسرار دلکشی مفقود ہو چکی تھی۔ اب اسے اس کے بجائے اس کی نسوانی اور بچگانہ کمزوری پر ترس آنے اور اس کے اندھے پیار اور راست گوئی سے خوف محسوس ہونے لگا۔ اسے اس فرض کے احساس نے گھیر لیا تھا کہ وہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اس کے ساتھ بندھ گیا ہے۔ فرض کے اس احساس سے اس کا گلا بھی گھٹ رہا تھا اور اسے اس سے لطف بھی آرہا تھا۔ موجودہ جذبہ اگرچہ سابقہ تجربے کی طرح درخشاں اور شعریت سے بھرپور نہیں تھا تاہم یہ کہیں زیادہ سنجیدہ اور توانا تھا۔

''آپ کی امی جان نے آپ کو بتا دیا ہے کہ ابھی ایک سال انتظار کرنا ہوگا؟'' پرنس آندرے نے پوچھا۔ وہ ابھی تک اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے کھڑا تھا۔

''کیا یہ واقعی میں ہوں، کل کی چھوکری جیسا کہ ہر کوئی مجھے سمجھتا اور کہتا ہے؟'' نتاشا سوچ رہی تھی۔ ''کیا یہ ممکن ہے کہ اسی لمحے مجھے اس اجنبی، پیارے اور تیز طرار شخص کی، جس کا میرا پاپا بھی احترام کرتا اور اسے بہ نگاہ تحسین دیکھتا ہے، شریک حیات اور ہمسر بنا ہے؟ کیا یہ سچ ہو سکتا ہے؟ کیا یہ سچ ہو سکتا ہے کہ اب زندگی سے اٹکھیلیاں کرنے کے دن گئے، کہ اب میں بالغ ہو گئی ہوں، کہ اب ایک ایک لفظ اور ایک ایک فعل کی ذمے داری میرے کندھوں پر آن پڑی ہے؟... لیکن انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا تھا؟''

''نہیں،'' اس نے جواب دیا، تاہم وہ اس کا سوال سمجھ نہیں پائی تھی۔

''میں معذرت خواہ ہوں،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''لیکن تم اتنی نوعمر ہو اور میں زندگی میں پہلے ہی اتنا کچھ دیکھ چکا اور بھگت چکا ہوں کہ مجھے تمھارے متعلق اندیشے لاحق ہونے لگتے ہیں۔ تم ابھی اپنا برا بھلا نہیں سمجھتی ہو!''

نتاشا پوری توجہ اور انہماک سے سنتی رہی۔ اس نے بڑی کوشش کی کہ اس کے الفاظ کا مفہوم اس کے پلے پڑ جائے لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔

''اپنی خوشی مؤخر کرنے سے یہ سال مجھ پر گراں ضرور گزرے گا،'' پرنس آندرے نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ''لیکن اس سے تمھیں اتنا موقع ضرور مل جائے گا کہ تم اپنے بارے میں پریقین بن سکو۔ میری تم سے التجا ہے کہ سال کے اختتام تک میری جھولی خوشیوں سے بھر دو، تاہم تمھیں کھلی چھوٹ ہے۔ ہماری یہ سگائی راز رہے گی اور اگر تمھیں یہ احساس ہو کہ تمھیں مجھ سے محبت نہیں یا پھر تمھیں مجھ سے محبت ہو جائے...'' اس نے غیر فطری انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟'' نتاشا نے اس کی بات میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ آپ جس روز اترادنایا تشریف لائے تھے، میں اسی وقت آپ سے پیار کرنے لگی تھی۔'' اس نے اس یقین کے ساتھ کہ وہ جو کچھ کہہ رہی ہے، سچ کہہ رہی ہے، کہا۔

''ایک سال میں تم اپنے آپ کو اچھی طرح جاننے سمجھنے لگو گی۔''

''پورا سال!'' نتاشا نے با آواز بلند کہا۔ حیرت سے اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔ اسے صرف اب احساس ہوا کہ شادی ایک برس کے لیے معرضِ تعویق میں ڈالنا ہوگی۔ ''لیکن ایک سال کیوں؟ ایک سال کیوں؟...''

پرنس آندرے اسے تاخیر کی وجوہات بتانے لگا۔ نتاشا نے اس کی بات سنی ان سنی کر دی۔

''اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

پرنس آندرے نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس کے چہرے بشرے سے عیاں ہو رہا تھا کہ اس فیصلے میں تبدیلی ناممکن ہے۔

''اف، یہ تو بڑی بھیانک بات ہوئی! اف، بھیانک، قطعی بھیانک!'' نتاشا اچانک پھٹ پڑی اور وہ ایک بار پھر سسکیاں بھرنے لگی۔ ''اگر مجھے ایک سال انتظار کرنا پڑا، پھر میرا خدا حافظ، میں جان بر نہیں ہو سکوں گی! اف، یہ ناممکن ہے! بھیانک ہے!''

اس نے پرنس آندرے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ ترس اور تشویش سے مملو تھا۔

''نہیں، نہیں، میں سب کچھ بھگت لوں گی،'' اس نے اچانک اپنے آنسو روکتے ہوئے کہا۔ ''میں کتنی خوش ہوں!''

اس کے والدین کمرے میں آ گئے۔ انھوں نے منگیتروں کو دعائیں دیں۔

اس دن سے پرنس آندرے رستوفوں کے ہاں نتاشا کے منگیتر کی حیثیت سے آنے جانے لگا۔

24

سگائی کی کوئی رسم ادا نہ کی گئی اور نہ اس کے بارے میں کوئی اعلان کیا گیا۔ پرنس آندرے کا یہی اصرار تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ چونکہ تاخیر کی ذمے داری اس پر عائد ہوتی ہے، لہٰذا اس کا سارا بار بھی اسے خود اٹھانا چاہیے، وہ زندگی بھر کے لیے اپنے آپ کو اپنے عہد کا پابند تصور کرتا ہے لیکن وہ نتاشا کو جکڑ بندیوں میں نہیں کسنا چاہتا اور وہ اس کے لیے عمل کی راہیں کلیتاً کھلی رکھنا چاہتا ہے۔ اگر چھ ماہ بعد وہ یہ محسوس کرے کہ اسے اس سے محبت نہیں، تو اسے اسے ٹھکرانے کا مکمل حق حاصل ہے۔ یہ درست کہ نہ نتاشا اور نہ اس کے والدین اس قسم کی کوئی بات سننے کے روادار تھے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔

اگرچہ پرنس آندرے بلا ناغہ رستوفوں کے ہاں آتا رہتا تھا لیکن وہ نتاشا کے ساتھ منگیتروں کی طرح پیش نہیں آتا تھا۔ وہ جب بھی اس کے ساتھ بات کرتا، کبھی بے تکلفانہ تُو استعمال نہیں کرتا تھا بلکہ ہمیشہ تم کہہ کر اس سے بات کرتا تھا اور صرف اس کے ہاتھ پر بوسہ دیتا تھا۔ منگنی کے دن ہی سے ان کے مابین بالکل مختلف، سیدھے سادے اور دوستانہ مراسم قائم ہو گئے تھے اور یہ کچھ اس نوعیت کے تھے گویا کہ اس سے پہلے وہ ایک دوسرے کو جانتے تک نہیں تھے۔ جب ان کا آپس میں کوئی سمبندھ نہیں تھا، تب ان کی ایک دوسرے کے بارے میں کیا رائے تھی، دونوں کو اس کا یاد کرنا بہت مرغوب تھا۔ اب انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بالکل مختلف قسم کی ہستیاں ہیں۔

تب وہ ایک دوسرے کے ساتھ تصنع اور بناوٹ برتتے تھے اور اب ان کا رویہ فطری اور مخلصانہ تھا۔ ابتدا میں گھر والوں کو پرنس آندرے کے ساتھ مکالمہ کرنے اور اس سے راہ ورسم بڑھانے میں قدرے الجھن ہوتی تھی، وہ بالکل کسی دوسری دنیا کی مخلوق دکھائی دیتا تھا اور نتاشا کو انھیں اس کا خوگر بنانے کے لیے خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔ وہ بڑے فخر سے انھیں یقین دلاتی رہتی تھی کہ وہ دیکھنے میں مختلف نظر آتا ہے، ورنہ حقیقتاً وہ باقی لوگوں جیسا ہی ہے، وہ نہ تو خود اس سے خوف زدہ ہے اور نہ دوسروں کو اس سے خوف زدہ ہونے کی ضرورت ہے۔ چند دنوں کے بعد وہ اس سے مانوس ہوگئے اور اب وہ اس کی موجودگی میں گھٹے گھٹے محسوس نہیں کرتے تھے۔ اب وہ بلا جھجک اپنے روزمرہ کے معمولات پر عمل کرنے لگے اور وہ بھی ان میں شرکت کرنے لگا۔ اسے یہ فن خوب آتا تھا کہ کاؤنٹ سے اس کی جاگیروں کے انتظام وانصرام، کاؤنٹس اور نتاشا سے تازہ ترین فیشنوں، اور سونیا سے البموں اور کشیدہ کاری کے بارے میں کس قسم کی گفتگو کی جانا چاہیے۔ یہ سب کچھ کیسے وقوع پذیر ہوا اور خود واقعے کے ظہور سے قبل جو علامات نمودار ہو رہی تھیں، ان کے بارے میں رستوف بعض اوقات آپس کی گفتگو میں اور بعض اوقات پرنس آندرے کی موجودگی میں بھی اپنے استعجاب وتحیر کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ پرنس آندرے کی اترادنایا آمد، ان کی پیٹرزبرگ نقل مکانی، نتاشا اور پرنس آندرے کے مابین مشابہت، جو معمر نرس نے اس کی اولین آمد پر ہی بھانپ لی تھی، 1805 میں نکولائی اور آندرے کی اتفاقیہ مڈھ بھیڑ اور اس نوع کے لاتعداد دیگر واقعات، جو آنے والے وقوعہ کی نشان دہی کرتے تھے، خاندان کی باہمی گفتگو کے موضوعات بنتے رہتے تھے۔

دو منگیتروں کی موجودگی میں گھر کی فضا جس قسم کی شعری اکتاہٹ اور سکوت سے بوجھل ہونے لگتی ہے، وہ یہاں بھی پوری طرح سایہ فگن تھی۔ بار ہا ایسا ہوا کہ وہ سبھی ایک کمرے میں بیٹھے ہوتے لیکن کسی کے منہ سے ایک لفظ بھی نہ نکلتا۔ بعض اوقات دوسرے لوگ اٹھ جاتے اور منگیتر تنہا رہ جاتے لیکن مہرِ سکوت پھر بھی نہ ٹوٹتی۔ وہ اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں شاذ ہی کوئی بات کرتے۔ پرنس آندرے کو اس سلسلے میں ضمیر کی کسک محسوس ہونے لگتی تھی۔ نتاشا اس جذبے میں اسی طرح اس کی ساجھی تھی جس طرح وہ اس کے تمام جذبوں میں، جنھیں وہ علی التواتر اپنی خداداد صلاحیتوں سے بھانپتی رہتی تھی، شریک رہتی تھی۔ ایک مرتبہ وہ اس سے اس کے بیٹے کے بارے میں سوالات پوچھنے لگی۔ پرنس آندرے کا چہرہ سرخ ہوگیا ــ وہ اب اکثر شرمانے لگا تھا اور نتاشا کو اس کا یہ انداز خاص طور پر پسند تھا ــ اور بولا: "میرا بیٹا ہمارے ساتھ نہیں رہا کرے گا۔"

"آخر کیوں؟" نتاشا نے دل گیر ہو کر پوچھا۔

"میں اسے اس کے دادا جان سے علیحدہ نہیں کرسکتا۔ اور اس کے علاوہ ــ"

"میں اس سے کتنی محبت کرتی!" نتاشا نے کہا۔ اس نے جھٹ پٹ قیافہ لگا لیا تھا کہ پرنس آندرے کے ذہن میں کیا بات ہے۔ "خیر میں جانتی ہوں کہ آپ کسی کو یہ موقع فراہم نہیں کرنا چاہتے کہ وہ ہم پر انگلی اٹھا سکے۔"

کبھی کبھار معمر کاؤنٹ پرنس آندرے کے پاس آجاتا، اسے بوسہ دیتا اور اس سے پیتا کی تعلیم یا ملازمت

میں نکولائی کے مقام کے بارے میں مشورہ کرتا۔ معمر کاؤنٹس جب ان دو چاہنے والوں کو دیکھتی، اس کی آہ نکل جاتی۔ سونیا کو سدا یہ اندیشہ دامن گیر رہتا کہ کہیں وہ ان کی تنہائی میں مخل تو نہیں ہو رہی، چنانچہ وہ مسلسل اس وقت بھی، جب انھیں خلوت کی قطعاً کوئی خواہش نہ ہوتی، ان کے پاس سے اٹھ جانے کے عذر تلاش کرتی رہتی۔ جب پرنس آندرے بات کر رہا ہوتا (اسے قصے کہانیاں سنانے کا فن خوب آتا تھا)، نتاشا بڑے فخر سے سنتی اور جب وہ خود بات کرتی، اسے یہ دیکھ کر کہ وہ اپنی منہمک اور متجسس نگاہیں اس پر گاڑے ہوئے ہے، خوشی بھی ہوتی اور خوف بھی لاحق ہونے لگتا۔ ''انھیں مجھ میں کیا چیز پانے کی امید ہے؟'' وہ سراسیمگی کے عالم میں اپنے آپ سے پوچھتی۔ ''وہ اپنی ان نظروں سے کیا تلاش کر رہے ہیں؟ فرض کرو کہ وہ مجھ میں جو کچھ ڈھونڈ رہے ہیں، وہ مجھ میں نہیں ہے، پھر؟'' بعض اوقات اس کی طبیعت جنونی اور رنگیلی ہو جاتی (یہ اس کے مزاج کا خاصہ تھا)، ایسے میں اسے پرنس آندرے کو دیکھنے اور اسے ہنستے ہوئے سننے میں خاصا لطف آتا تھا۔ وہ شاذ ہی ہنستا تھا لیکن جب ہنستا تھا، وہ اپنی خوش طبعی کے سامنے سرتاپا مغلوب ہو جاتا تھا اور اس قسم کی ہنسی کے بعد وہ اپنے آپ کو اس کے قریب تر محسوس کرتی تھی۔ اگر ان کی متوقع علیحدگی کا سنگین خطرہ، جو ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا، نتاشا کے دل میں جاگزیں نہ ہوتا، اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہتا۔

پیٹرزبرگ سے اپنی روانگی سے ایک روز قبل پرنس آندرے پیئر کو، جو بال کے انعقاد کے بعد ایک مرتبہ بھی رستوفوں کے ہاں نہیں آیا تھا، اپنے ہمراہ لایا۔ پیئر اکھڑا اکھڑا اور شرمندہ شرمندہ سا نظر آ رہا تھا اور وہ زیادہ تر کاؤنٹس کے ساتھ گفتگو کرتا رہا۔ نتاشا سونیا کے ساتھ شطرنج کی چھوٹی میز کے سامنے بیٹھی تھی اور وہیں سے پرنس آندرے کو بلا رہی تھی۔ وہ ان کے پاس چلا گیا۔

''تم بزدخوف کو خاصے عرصے سے جانتی ہو، ٹھیک ہے نا؟'' پرنس آندرے نے نتاشا سے پوچھا۔ ''تمھیں وہ پسند ہے؟''

''ہاں، وہ بہت بھلا آدمی ہے، لیکن ہے مضحکہ خیز!''

اور جیسا کہ دوسرے لوگ ہمیشہ کرتے تھے، پیئر کا ذکر آنے پر وہ بھی اس کی غیر حاضر دماغی کے بارے میں قصص و لطائف، جن میں سے اکثر و بیشتر ایجادِ بندہ تھے، سنانے لگی۔

''تمھیں معلوم ہے کہ میں نے اسے اپنے راز میں شریک کر لیا ہے!'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ اس کا دل خالص سونے کا ہے۔ نتالی، میری تم سے یہ درخواست ہے،'' پرنس آندرے نے اچانک سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں یہاں سے جا رہا ہوں۔ خدا معلوم اس عرصے کے دوران میں پردۂ غیب سے کیا کچھ ظہور میں آ جائے۔ ممکن ہے کہ تمھارا ارادہ بدل جائے ـــ ارے ہاں، مجھے معلوم ہے کہ مجھے اس طرح کی بات نہیں کہنا چاہیے۔ میری تم سے صرف ایک ہی درخواست ہے ـــ میری عدم موجودگی میں تمھارے ساتھ خواہ کچھ ہی کیوں نہ پیش آ جائے ـــ''

''مجھے کیا پیش آ سکتا ہے؟''

"کسی قسم کی کوئی بھی مشکل پیش آئے..." پرنس آندرے نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، "مادموزیل سونی، خواہ یہ کیسی ہی کیوں نہ ہو، مشورے اور مدد کے لیے کسی بھی شخص کے در پر دستک نہ دینا، سیدھی اس کے پاس چلے جانا۔ اس جیسا غیر حاضر دماغ اور مضحک آدمی روئے زمین پر ڈھونڈے سے نہیں ملے گا لیکن اس کا دل خالص سونے کا ہے۔"

مفارقت کا جو اثر نتاشا نے قبول کیا، اس کا اندازہ نہ اس کے والدین، نہ سونیا اور نہ پرنس کر سکا۔ وہ تمتماتے گالوں اور آشفتہ حالوں سارا دن گھر میں بے مقصد گھومتی پھرتی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور وہ انتہائی معمولی چیزوں میں مصروفیت کے بہانے ڈھونڈ رہی تھی جیسے اسے یہ قطعاً احساس ہی نہ ہو کہ اسے کس صورت حال سے واسطہ پڑنا ہے۔ جب وہ آخری مرتبہ اس کا ہاتھ چومنے لگا، وہ اس وقت بھی نہ روئی۔ "مت جائیں!" وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی لیکن اس کا لہجہ کچھ اس قسم کا تھا کہ وہ سوچنے لگا کہ اسے واقعی نہیں ٹھہرنا چاہیے اور یہ بات اسے مدتوں یاد رہی۔ جب وہ چلا گیا، وہ پھر بھی نہ روئی بلکہ کئی دن گم صم اپنے کمرے میں بیٹھی رہی۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں لیکن اسے کسی چیز میں دلچسپی نہیں رہی تھی اور وہ وقتاً فوقتاً صرف یہی سوال دہراتی رہتی تھی: "اف، وہ کیوں چلے گئے؟"

لیکن اس کی روانگی کے دو ہفتے بعد اس کے اعزہ و اقارب یہ دیکھ کر ششدر رہ گئے کہ اس نے اپنے روحانی اور ذہنی انتشار پر قابو پا لیا ہے اور وہ دوبارہ وہی بن گئی ہے، جو وہ پہلے تھی۔ تاہم اتنا فرق ضرور نمودار ہوا تھا کہ جس طرح طویل عارضے کے بعد بچے کا چہرہ منقلب ہو جاتا ہے، اس کے اخلاقی خدوخال بھی وہ نہیں رہے تھے جو پہلے تھے۔

25

اپنے بیٹے کی دساور روانگی کے بعد گزشتہ برس کے دوران میں پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی کی صحت اور مزاج دونوں ہی خاصے ابتر ہو چکے تھے۔ اس کا غصہ پہلے سے کہیں زیادہ ناک پر دھرا رہنے لگا اور اسے بات بے بات جو بڑھی ہوتی، اس کے وار کی زد میں عام طور پر پرنس ماریا آتی۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر دم اس ٹوہ میں لگا رہتا ہے کہ اس کی بیٹی کی فطرت میں وہ کون کون سی خامیاں ہیں جنھیں وہ با آسانی اپنے حملوں کا نشانہ بنا سکتا ہے اور یوں وہ اسے شدید ترین ذہنی اذیت پہنچانے کے لیے انتہائی سنگ دلانہ رویہ اختیار کرنے سے گریز نہیں کرتا تھا۔ پرنس ماریا کو صرف دو چیزوں — اپنے برادرزادے نکولشکا اور مذہب — میں دیوانگی کی حد تک دلچسپی تھی۔ نتیجتاً اسے صرف انھیں دو اشیا سے راحت نصیب ہوتی تھی اور یہی دو چیزیں پرنس کے دھاووں اور پھبتیوں کے پسندیدہ موضوعات بنتی تھیں۔ گفتگو کا موضوع خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوتا، وہ گھما پھرا کر بات کی تان بڑی بوڑھیوں کے توہم پرستیوں میں مبتلا ہونے یا بچوں کی ناز برداریاں اٹھانے اور بے جا لاڈ پیار کر کے ان کی عادات بگاڑنے پر توڑتا۔ "تم اسے (نکولشکا کو) بھی اپنی طرح کی بڑھیا کھوسٹ، جو کام کی نہ کاج کی، دشمن اناج کی، بنانا چاہتی ہو اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔ پرنس آندرے کو بیٹا چاہیے، بڈھی کھوسٹ زنانی نہیں،" وہ کہتا رہتا۔ یا پھر مادموزیل بوغین کی

طرف متوجہ ہوتا اور پرنسس ماریا کی موجودگی میں اس سے پوچھتا: ''تمھارا ہمارے گاؤں کے پادریوں اور ایقونوں کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' اور ان کے متعلق لطیفے سنانے لگتا۔

وہ پیہم پرنسس ماریا کے جذبات کند چھری سے ذبح کرتا رہتا لیکن اسے اپنے باپ کو معاف کرنے میں دشواری پیش نہ آتی۔ کیا وہ کسی چیز کے بارے میں بھی، جس کا اس کی اپنی ذات سے تعلق تھا، اپنے باپ کو موردِ الزام ٹھہرا سکتی ہے اور کیا وہ، جس کے متعلق اسے علم ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود وہ اس سے پیار کرتا ہے، اس کے ساتھ ناانصافی برت سکتا ہے؟ پھر انصاف ہے کیا؟ پرنسس نے اس متکبر لفظ ''انصاف'' کے بارے میں مطلق کبھی بھی نہیں سوچا تھا۔ بنی آدم نے جتنے بھی پیچیدہ قوانین مرتب کیے ہیں، ان سب کا لب لباب محبت اور ایثار کے اس واحد غیر پیچیدہ اور سیدھے سادے قانون میں موجود ہے جو اس (مسیح) نے، جس نے تمام انسانوں سے اپنی محبت کی خاطر مصائب کو خندہ پیشانی سے جھیلا تھا حالانکہ وہ خود خداوند تھا، وضع کیا تھا۔ ''مجھے دوسرے لوگوں کی انصاف پسندی یا غیر منصف مزاجی سے کیا واسطہ؟ میرا کام جھیلنا اور محبت کرنا ہے۔'' اور یہ کام وہ کیے جا رہی تھی۔

جاڑوں کے دوران میں پرنس آندرے بالڈ ہلز آیا تھا۔ جتنا وہ اب سلیم الطبع، مسرور اور شفیق تھا، پرنسس ماریا نے اس سے قبل اسے اتنا خاصی مدت سے نہیں دیکھا تھا۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی خاص واردات گزری ہے لیکن اس نے اپنی محبت کے بارے میں اس سے ایک لفظ تک نہ کہا۔ روانگی سے پیشتر اس کی اپنے باپ کے ساتھ کسی موضوع پر طویل گفتگو ہوئی تھی اور پرنسس ماریا نے بھانپ لیا تھا کہ رخصت کے وقت دونوں ایک دوسرے سے ناخوش ہیں۔

پرنس آندرے کی روانگی کے چند روز بعد پرنسس ماریا نے اپنی سہیلی جولی کاراگینا کے نام پیٹرزبرگ خط ارسال کیا۔ جولی کے متعلق اس نے خواب میں دیکھا تھا۔ جیسا کہ لڑکیاں عام طور پر دیکھا ہی کرتی ہیں — کہ اس کی اس کے اپنے بھائی سے شادی ہو رہی ہے لیکن اس وقت وہ اپنے بھائی کی، جو ترکی میں[40] ہلاک ہو گیا تھا، موت کا سوگ منا رہی تھی۔

میری عزیز اور پیاری سہیلی، معلوم ہوتا ہے کہ دکھ ہم سب کا مشترکہ مقدر ہے۔

تمھارا یہ نقصان اتنا گمبھیر اور اندوہ ناک ہے کہ میں اپنے آپ سے اس کی توجیہہ صرف بدیں الفاظ کر سکتی ہوں کہ یہ خداوند کی، جو تمھارے ساتھ اپنی محبت کی خاطر تمھیں اور تمھاری قابل توقیر والدہ کو آزمائش کی بھٹی میں سے گزارنا چاہتا ہے، رحمت کی خاص نشانی ہے۔ اوہ، مائی ڈیئر، مذہب اور صرف مذہب ہی — میں یہ نہیں کہتی کہ یہ ہمیں تسکین بہم پہنچاتا ہے — ہمیں مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے سے بچا سکتا ہے۔ صرف مذہب ہی ہمیں وہ کچھ، جس کی ہم اس کی مدد کے بغیر تفہیم نہیں کر سکتے، سمجھا سکتا ہے: آخر نیک طینت اور بھلے مانس انسان، جو زندگی میں مسرت پا سکتے ہیں، جنھوں نے نہ صرف کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا

ہوتا بلکہ واقعتاً دوسروں کی خوشی کے لیے جن کا وجود لابدی ہے، کیوں، کس لیے، دربار خداوندی میں بلالیے جاتے ہیں جب کہ بدباطن، بدکار اور بے مصرف اشخاص کو یا ان لوگوں کو، جو دھرتی پر خود اپنے اور دوسروں کے لیے بوجھ ہیں، زندہ رہنے دیا جاتا ہے؟ پہلی موت نے، جسے میں نے دیکھا اور جسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکوں گی — میری پیاری بھاوج کی موت — مجھ پر اسی قسم کا تاثر چھوڑا۔ جس طرح تم مشیت سے یہ سوال کرتی ہو کہ آخر تمھارے ہی قابلِ تعریف اور لائق فائق بھائی کی موت کیوں ضروری تھی، اسی طرح میں بھی یہ پوچھتی پھرتی تھی کہ فرشتہ خصلت لسا کا، جس نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی، جس کے دل میں کبھی کسی کے بارے میں کوئی ایسا خیال، جس کا مقصد دوسروں کو دکھ دینا ہو، نہیں آیا تھا، مرنا کیوں ناگزیر تھا؟ اور مائی ڈیئر، تمھارا کیا خیال ہے؟ اس سانحہ پر پانچ برس کا عرصہ محیط ہو چکا ہے اور اب تو میں بھی، جس کی عقل ناقص ہے، واضح طور پر یہ سمجھنے لگی ہوں کہ اس کا رحلت کرنا کیوں ضروری تھا، کسی لحاظ سے اس کی موت خالقِ کائنات کی، جس کا ہر فعل، جو اگرچہ زیادہ تر ہماری فہم وفراست سے بعید ہے، اس کے محض اپنی مخلوق کے لیے لامحدود فضل وکرم کا اظہار ہے، بے پایاں رحمت کا مظہر تھی۔ میں اکثر سوچتی ہوں کہ وہ فرشتوں کی مانند اتنی معصوم تھی کہ ماں ہونے کے ناتے اس پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، وہ ان سب کو پورا کرنے کی سکت سے شاید بہرہ ور نہیں تھی۔ نوجوان بیوی کی حیثیت سے اس کا کردار شفاف اور بے داغ تھا، لیکن عین ممکن ہے کہ بطور ماں وہ ایسی نہ ہوتی۔ اب صورت حال جیسی بھی ہے، یہ ہے کہ وہ خود تو چلی گئی لیکن اپنے پیچھے نہ صرف ہمارے لیے اپنی پاکیزہ ترین یادیں اور تاسّفات چھوڑ گئی ہے بلکہ اس بات کا بھی پورا امکان ہے کہ اسے عالم بالا میں وہ مقام، جس کے متعلق میں کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ یہ مجھے حاصل ہو سکے گا، مل جائے گا۔ لیکن صرف اسی کا ذکر کیوں کیا جائے؟ اس کی ہول ناک اور قبل از وقت موت نے، اس صدمے کے باوجود جو ہمیں اٹھانا پڑا، مجھ پر اور میرے بھائی پر انتہائی بابرکت اور فیض رساں اثر چھوڑا ہے۔ جب ہمیں یہ دکھ جھیلنا پڑا، تب میں یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس قسم کے خیالات میرے ذہن میں رسائی حاصل کر سکتے ہیں، اگر آتے بھی تو میں انھیں گھناؤنی چیز سمجھ کر جھٹک دیتی۔ لیکن اب ان کے بارے میں میرا ذہن بالکل صاف ہے اور وہ ہر قسم کے شکوک وشبہات سے ماورا ہے۔ ڈیئر فرینڈ، میں تمھیں یہ سب کچھ اس لیے لکھ رہی ہوں تاکہ میں تمھیں اس الہامی سچائی کا، جو میرے لیے اصولِ حیات بن چکی ہے، یقین دلا سکوں: اس کی رضا کے بغیر ہمارے سروں کا ایک بال بھی نہیں گر سکتا۔ اور اس کی رضا کا ایک رہنما اصول اس کی ہمارے ساتھ بے پایاں محبت ہے، چنانچہ جو کچھ ہمیں پیش آتا ہے، اس میں ہماری ہی بھلائی مضمر ہوتی ہے۔

تم پوچھتی ہو کہ آیا ہم اگلے جاڑے ماسکو میں گزاریں گے؟ تم سے ملاقات کی شدید آرزو کے باوجود مجھے نہ تو اس کی توقع ہے اور نہ خواہش۔ اور تم یہ سن کر ششدر رہ جاؤ گی کہ اس کا سبب بوناپارٹ ہے۔

کیوں؟ اس کا جواب میں دیتی ہوں۔ میرے پاپا کی صحت روز بروز خاصی گرتی جارہی ہے۔ ان سے اب اپنی بات کی تردید برداشت نہیں ہوتی اور وہ بہت جلد جلال میں آجاتے ہیں۔ جیسا کہ تم جانتی ہو کہ بنیادی طور پر ان کی خشم آلودگی کا رخ سیاسی امور کی طرف ہوتا ہے۔ ان کے لیے یہ بات قطعاً ناقابل برداشت ہے کہ بوناپارٹ یورپ کے تمام حکمرانوں، بالخصوص کیتھرین اعظم کے نبیرے کے ساتھ برابر کی سطح پر مذاکرات کرتا پھرے! جیسا کہ تمھیں معلوم ہے کہ مجھے سیاست و ریاست میں بالکل کوئی دلچسپی نہیں لیکن پاپا جو کچھ فرماتے رہتے ہیں اور مائیخل ایوانووچ کے ساتھ جس طرح کی گفتگو کرتے رہتے ہیں، اس سے مجھے اندازہ ہوتا رہتا ہے کہ دنیا کے حالات کس نہج پر جارہے ہیں اور بوناپارٹ کو جن اعزازات سے سرفراز کیا گیا ہے، ان کے متعلق تو مجھے خاص طور پر آگاہی حاصل ہو چکی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ بالڈ ہلز روئے زمین کا واحد گوشہ ہے جہاں اسے فرانس کا امپراطور تو کجا، عظیم آدمی بھی تسلیم نہیں کیا جاتا۔ والد ماجد یہ سننا بھی گوارا نہیں کرتے کہ کوئی اسے امپراطور فرانس کے لقب سے پکارے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں ماسکو جانے میں جو تامل ہے، اس کے پس پردہ زیادہ تر ان کے سیاسی خیالات کارفرما ہیں۔ انھیں یہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں وہ وہاں کسی سے لڑائی جھگڑا نہ کر بیٹھیں کیونکہ ان کی یہ عادت ہے کہ اس امر سے قطع نظر کہ ان کے سامنے کون بیٹھا ہے، وہ اپنی رائے کا اظہار کیے بنا نہیں رہتے۔ طبی علاج کے ذریعے انھیں جو بھی افاقہ ہوگا، وہ لازماً بوناپارٹ کے متعلق تو تو میں میں کی وجہ سے اکارت ہو جائے گا۔ بہر حال یہ معاملہ عنقریب سلجھا لیا جائے گا۔

ہماری خانگی زندگی اسی ڈگر پر، جس کے ہم خوگر ہیں، رواں دواں ہے۔ فرق صرف یہ آیا ہے کہ میرا بھائی یہاں موجود نہیں۔ جیسا کہ میں پہلے ہی تحریر کر چکی ہوں، حال ہی میں ان میں انقلابی تبدیلیاں آئی ہیں۔ صرف گزشتہ سال کے دوران میں وہ صدمے سے سنبھل سکے ہیں۔ وہ ایک بار پھر ویسے ہی بن گئے ہیں جیسا کہ میں انھیں بچپن میں دیکھا کرتی تھی: مشفق، مہربان، اور قلب سونے کا، جو مجھے کسی اور میں نظر نہیں آیا۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ انھیں یہ اندازہ ہو گیا ہے کہ ان کے لیے زندگی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ اگرچہ ذہنی طور پر وہ خاصے تبدیل ہو چکے ہیں، تاہم ان کی جسمانی صحت خاصی ڈانواں ڈول ہو گئی ہے۔ وہ پہلے کی نسبت لاغر بھی ہیں اور ان کے اعصاب بھی وہ نہیں رہے، جو کبھی ہوا کرتے تھے۔ مجھے ہر دم ان کے متعلق دھڑکا لگا رہتا ہے تاہم مجھے خوشی اس بات کی ہے کہ ڈاکٹروں نے مدتوں پہلے انھیں ممالک غیر میں گھومنے پھرنے کا جو مشورہ دیا تھا، وہ اس پر عمل کرتے ہوئے عازم سفر ہو چکے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اس دورے سے ان کی صحت بحال ہو جائے گی۔ تم نے لکھا ہے کہ پیٹرزبرگ میں ان کا شمار انتہائی مستعد، مہذب اور ذہین نوجوانوں میں ہوتا ہے۔ بہن کو بھائی پر جو فخر ہوتا ہے، اسے بھول جاؤ لیکن مجھے ان کی ان خوبیوں کے بارے میں کبھی کوئی شبہ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنے کسانوں سے لے کر مقامی شرفا تک کے لیے بھلائی کے جو کام کیے ہیں، وہ حدو حساب سے باہر ہیں۔ ان کا جو استحقاق بنتا ہے، پیٹرزبرگ میں انھیں اس سے زیادہ کچھ نہیں ملا۔

پیٹرز برگ سے ماسکو جو افواہیں پہنچتی رہتی ہیں، وہ مجھے ہمیشہ اچنبھے میں ڈالتی رہی ہیں۔ خاص طور پر اس قسم کی بے بنیاد افواہیں کہ میرے بھائی کی کم سن رستووا سے منگنی قرار پائی ہے اور جس کے متعلق تم نے مجھے لکھا ہے، میرے چھکے چھڑا دیتی ہیں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ آندرے کبھی دوبارہ شادی کریں گے اور اس کے ساتھ تو وہ ہرگز ہرگز بیاہ نہیں کریں گے۔ میں بتاتی ہوں کہ کیوں: اول، اگرچہ وہ اپنی مرحومہ شریک حیات کے بارے میں شاذ ہی کوئی کلمہ زبان پر لاتے ہیں تاہم مجھے معلوم ہے کہ انھیں اس کی موت کا اتنا شدید صدمہ ہے کہ وہ کبھی کسی دوسری کو اس کی جگہ لانے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے اور نہ وہ ہمارے فرشتہ صفت ننھے منے پرنس کے سر پر سوتیلی ماں سوار کرانے کا تصور کر سکتے ہیں۔ دوم، جو کچھ میرے علم میں ہے، اس سے قطعاً یہ عندیہ نہیں ملتا کہ یہ صاحب زادی اس قسم کی دوشیزہ ہے کہ میرے بھائی کا دل موہ سکے۔ میں نہیں سمجھتی کہ پرنس آندرے اسے اپنی دلہن کے طور پر منتخب کریں گے اور سچی بات یہ ہے کہ میں خود بھی یہ نہیں چاہتی۔

لیکن ایں، یہ کیا؟ یہ خط تو شیطان کی آنت کی طرح لمبا ہوتا جا رہا ہے۔ اب تو دوسرا ورق بھی ختم ہونے کو آ رہا ہے۔ مائی ڈیئر فرینڈ، خدا حافظ۔ میری دعا ہے کہ وہ تمھیں ہمیشہ اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ میری عزیز رفیقہ مادموزیل بوغین تمھیں محبت بھرا سلام بھیجتی ہے۔

ماری

26

گرمیوں کے وسط میں پرنسس ماریا کو پرنس آندرے کا خلاف توقع خط ملا۔ اس میں عجیب و غریب اور تحیر انگیز خبر تھی۔ اس نے اسے نتاشا رستووا کے ساتھ اپنی منگنی کی اطلاع دی تھی۔ اسے اپنی منگیتر کے ساتھ جو وجد آفریں محبت تھی، سارا خط اس کی خوشبو سے مہک رہا تھا یا پھر اس میں اس نرم، ملائم اور رازدارانہ پیار کا، جو اسے اپنی ہمشیرہ سے تھا، ذکر تھا۔ اس نے تحریر کیا کہ جس طرح کی محبت میں وہ اب گرفتار ہوا ہے، اس کا ذائقہ اس نے قبل ازیں کبھی نہیں چکھا تھا اور یہ کہ زندگی کیا ہے، اس کی تفہیم اور اندازہ صرف اب اسے ہوا ہے۔ اس نے گڑگڑا کر اپنی بہن سے اپنی اس خطا کی معافی مانگی تھی کہ جب وہ پچھلی مرتبہ بالڈ ہلز آیا تھا، وہ اسے اپنے منصوبوں کے بارے میں آگاہ نہیں کر سکا تھا حالانکہ اس نے اپنے والد سے اس سلسلے میں بات کی تھی۔ اس نے اسے اس لیے کچھ بتانے سے گریز کیا تھا کیونکہ اسے اندیشہ تھا کہ وہ اپنے والد سے یہ اصرار کرنا شروع کر دے گی کہ وہ اجازت دے دیں۔ وہ اپنا مقصد تو حاصل نہ کر سکتی لیکن اس کی ناراضگی خواہ مخواہ مول لے لیتی۔ یوں نزلہ بر عضو ضعیف می ریزد، اس کی شامت آ جاتی۔

''علاوہ ازیں'' اس نے لکھا:

اس وقت یہ معاملہ اتنے واضح انداز سے طے نہیں ہوا تھا جتنے کہ اب ہوا ہے۔ تب والد ماجد نے اصرار کیا

تھا کہ یہ مسئلہ ایک سال کے لیے اٹھا رکھا جائے۔ اب اس کی نصف مدت یعنی چھ ماہ گزر چکے ہیں اور میرا عزم پہلے سے بھی پختہ تر ہو گیا ہے۔ اگر ڈاکٹر مجھے یہاں معدنی پانیوں کے چشموں کے پاس ٹھہرنے کے لیے اتنے پرزور انداز سے آمادہ نہ کرتے، میں واپس روس پہنچ چکا ہوتا۔ لیکن ان حالات کے پیش نظر مجھے اپنی واپسی مزید تین ماہ کے لیے ملتوی کرنا پڑے گی۔ تم مجھے جانتی ہو اور والد کے ساتھ میرے، جس قسم کے تعلقات ہیں، وہ بھی تم سے ڈھکے چھپے نہیں۔ مجھے ان سے کچھ نہیں چاہیے، میں اپنے افعال و اعمال میں ہمیشہ آزاد رہا ہوں اور ہمیشہ آزاد رہنا چاہتا ہوں۔ تاہم میں ان کے منشا کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہتا اور یوں ان کی ناراضگی مول لینا نہیں چاہتا کیونکہ اس طرح میری آدھی خوشیاں ملیامیٹ ہو جائیں گی۔ اب میں اسی مسئلے کے متعلق انھیں خط لکھ رہا ہوں۔ میری تم سے التجا ہے کہ کوئی اچھا سا موقع دیکھ کر یہ خط انھیں پہنچا دو۔ وہ جس قسم کے ردعمل کا اظہار کریں، اس کے بارے میں مجھے مطلع کر دینا اور یہ بھی لکھنا کہ آیا اس مدت میں تین ماہ کی تخفیف کرنے کے لیے ان کی رضامندی کی امید کی جا سکتی ہے؟

پرنسس ماریا کافی دیر حیص بیص میں مبتلا رہی، وہ مختلف شکوک و شبہات کے نرغے میں آئی رہی اور وہ دعاؤں پر دعائیں مانگتی رہی تا آنکہ اس نے خط اپنے باپ کے حوالے کر دیا۔ اگلے روز معمر پرنس نے اسے بلایا اور اس سے بڑے سکون سے کہا:

''اپنے بھائی کو لکھ دو کہ وہ میری موت کا انتظار کرے... اب اس میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔۔ میں بہت جلد اسے تمام بندھنوں سے آزاد کر دوں گا۔''

پرنس نے اعتراض اٹھانا چاہا لیکن اس کے باپ نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی اور وہ بولے جا رہا تھا:

''بیاہ رچاؤ، خوشیاں مناؤ، پُتر، بیاہ رچاؤ! کیا شاندار رشتہ ڈھونڈا ہے! چالاک لوگ، ہونہہ؟ امیر کبیر، ہونہہ؟ نکولشکا کو کیسی اعلیٰ سوتیلی ماں ملے گی!... اسے لکھ دو اور بتا دو کہ اس کا جی چاہے تو وہ کل ہی دو بول پڑھوا سکتا ہے! نکولشکا کو سوتیلی ماں مل جائے گی اور میں ننھی منی بوغین سے بیاہ رچا لوں گا!... ہا، ہا، ہا! اس کی بھی تو ایک عدد سوتیلی ماں ہونا چاہیے۔ صرف ایک بات اور ہے۔۔ میں اپنے گھر میں مزید عورتوں کو نہیں گھسنے دوں گا۔ وہ شادی کر لے اور جہاں اس کا جی چاہے، رہے۔ شاید تم بھی یہاں سے جانا اور اس کے ساتھ رہنا پسند کرو گی؟'' اس نے پرنسس ماریا کی طرف رخ کر کے مزید کہا۔ ''تمھیں کھلی چھٹی ہے، جب جی چاہے، چلی جانا! خس کم جہاں پاک! خس کم جہاں پاک!... خس کم جہاں پاک!''

غیظ و غضب کے اس طوفانی مظاہرے کے بعد پرنس نے دوبارہ اس موضوع کا اشارتاً ذکر بھی نہ کیا لیکن اپنے بیٹے کی ڈوں ہمتی اور کم حوصلگی پر وہ جس طرح اندر ہی اندر کھول رہا تھا، اس کا اظہار وہ اس سلوک سے، جو وہ

اپنی بیٹی سے روا رکھتا تھا، کرتا تھا۔ اس کا مذاق اڑانے کے لیے وہ ازیں پیشتر جو حیلے تراشا کرتا تھا، ان میں اب دو نئی چیزوں کا— سوتیلی ماؤں کی طرف اشاروں اور مادموزیل بوغین کے ساتھ کچھ اس نوع کی خوش خلقی کا برتاؤ جیسے وہ اس کے ساتھ عشق کی پینگیں بڑھا رہا ہو— اضافہ ہو گیا تھا۔

''میں اس سے شادی کیوں نہ کروں؟'' وہ اپنی بیٹی سے کہا کرتا۔ ''وہ بڑے ٹھسے کی بیگم بنے گی!''

اور پرنسس ماریا یہ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئی کہ اس کا باپ حقیقتاً فرانسیسی خاتون کا روز بروز دل دادہ سے دل دادہ تر ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے اپنے بھائی کے نام خط لکھا اور اس میں اسے بتایا کہ اس کے عریضے کا اس کے باپ پر کیا اثر ہوا ہے۔ تاہم اس نے اسے تسلی دی کہ وہ اپنے باپ کو منا لے گی اور اسے اس کی خواہش پورا کرنے کے لیے آمادہ کر لے گی۔

پرنسس ماریا کو جن اشیا میں مسرت اور تسکین حاصل تھی، وہ نکولنشکا اور اس کی تعلیم، آندرے اور مذہب تھا۔ ان کے علاوہ، جیسا کہ ہر شخص کی ذاتی امنگیں اور امیدیں ہوتی ہیں، اس نے بھی اپنے نہاں خانۂ دل کی عمیق گہرائیوں میں پوشیدہ آرزو یا خواب، جو اسے زندگی میں سب سے بڑا دلاسا فراہم کرتا تھا، پال رکھا تھا۔ یہ تسکین بخش آرزو اور خواب اسے اپنے ''اللہ لوگ'' ساتھیوں کی وساطت سے ملا تھا۔ یہ ''اللہ لوگ'' ان زائرین اور پراگندہ خیال راہگیروں پر، جو اس کے باپ کے علم کے بغیر اس کے پاس آتے جاتے رہتے تھے، مشتمل تھے۔ جوں جوں اس کی عمر بڑھتی جا رہی تھی، توں توں زندگی کے بارے میں اس کے تجربے اور مشاہدے میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اسی حساب سے ان انسانوں کی، جو اس دھرتی پر لطف و مسرت کے متلاشی رہتے ہیں، کوتاہ بینی کے متعلق اس کی حیرت فزوں تر ہوتی جا رہی تھی۔ یہ انسان، بے چارے، قسمت کے مارے، کولھو کے بیل کی طرح دن رات کام میں جتے رہتے ہیں، مصائب جھیلتے ہیں، ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے درپۓ آزار رہتے ہیں۔ کس لیے؟ کہ ناممکن الحصول، موہوم اور گناہ آلود مسرت تک ان کی رسائی ہو جائے لیکن مسرت ہے کہ ہاتھ آتی ہے پر نہیں آتی۔

''پرنس آندرے اپنی بیوی سے محبت کرتے تھے۔ وہ خدا کو پیاری ہو گئی لیکن بات بنی نہیں،'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اب وہ اپنی خوشیاں ایک اور عورت کے ساتھ وابستہ کرنا چاہتے ہیں۔ پاپا اس پر معترض ہیں کیونکہ وہ آندرے کے رشتے کے لیے کہیں زیادہ مال دار، ذی حیثیت اور ذی رتبہ اسامی کے خواہش مند ہیں۔ ادھر یہ لوگ خون پسینہ ایک کر رہے ہیں، مصائب کی چکی میں پس رہے ہیں، ایک دوسرے کے گلے کاٹ رہے ہیں، اپنی روحوں، غیر فانی روحوں، کو پلید کر رہے ہیں تاکہ کسی بھی نعمت کا، جس کی عمر خواہ ایک لمحہ ہو، حصول ان کے لیے ممکن ہو سکے۔ نہ صرف ہم سب خود جانتے ہیں بلکہ فرزند خداوند، یسوع مسیح، اس دھرتی پر تشریف لائے اور انھوں نے ہمیں بتایا کہ یہ حیات چند روزہ ہے، یہ دور آزمائش ہے، پھر بھی اس کے ساتھ چمٹے رہتے ہیں اور سمجھنے لگتے ہیں کہ ہم یہیں مسرت ڈھونڈ لیں گے۔ کسی کو یہ شعور ہی نہیں کہ ایسا کیسے ممکن ہے،'' وہ سوچ جا رہی تھی۔ ''اگر کسی کو یہ

شعور ہے تو ان راندۂ درگاہ 'اللہ لوگوں' کو، جو اپنی گدڑیاں کندھوں پر ڈالے عقبی زینہ چڑھ کر میرے پاس آتے ہیں لیکن انھیں ہر وقت یہ خوف دامن گیر رہتا ہے کہ کہیں پرنس کی نظر ان پر نہ پڑ جائے — انھیں ذرا اس بات کا نہیں ہوتا کہ پرنس انھیں پٹوا دے گا بلکہ انھیں اندیشہ یہ ہوتا ہے کہ کہیں وہ پرنس سے گناہ کا ارتکاب نہ کرا دیں۔ گھر بار اور گرہستی سے کنارہ کشی اختیار کرنا، تمام مادی خواہشات سے منہ موڑ لینا اور دنیوی اشیاء سے کوئی علائق نہ رکھنا، سن کے بوسیدہ چیتھڑوں میں اور فرضی ناموں کے ساتھ در بدر کی خاک چھاننا، کسی کو ضرر نہ پہنچانا بلکہ سب کے لیے دستِ دعا اٹھانا — ان کے لیے بھی جو انھیں دھتکارتے ہیں اور ان کے لیے بھی جو انھیں پناہ مہیا کرتے ہیں، اس نوع کی راست بازی اور زندگی سے بلند تر کوئی راست بازی اور کوئی زندگی نہیں ہو سکتی۔"

ان لوگوں میں ایک زائرہ فیدوسیوشکا تھی۔ وہ خاموش طبع، چیچک رو، کوتاہ قامت پچاس سالہ عورت تھی۔ وہ گزشتہ تیس برس سے بیڑیاں پہنے ننگے پاؤں جہاں تہاں گھوم رہی تھی۔ پرنس ماریا اس کی خاص طور پر گرویدہ تھی۔ ایک روز وہ تاریک کمرے میں اکٹھی بیٹھی تھیں۔ وہاں ایک مدھم لیمپ کے، جو کسی ایقونے کے سامنے روشن تھا، ماسوا اور کوئی روشنی نہیں تھی۔ فیدوسیوشکا اپنی زندگی کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔ دفعتاً پرنس ماریا کے ذہن میں یہ خیال کوندے کی طرح لپکا کہ صرف اس عورت کو صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ یہ خیال اس بری طرح اس کے ذہن پر حاوی ہوا کہ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ خود بھی زائرہ بن جائے گی۔ جب فیدوسیوشکا سو گئی، پرنس ماریا خاصی دیر تک اسی بارے میں سوچتی رہی اور بالآخر وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ بظاہر یہ بات خواہ کتنی ہی عجیب نظر آئے، اسے زیارتوں پر بہر صورت نکل جانا چاہیے۔ فادر آکنفی کے علاوہ اس نے اپنے اس ارادے کی بھنک کسی اور کے کانوں میں نہ پڑنے دی۔ فادر آکنفی راہب تھا اور وہ اپنی لغزشوں اور گناہوں کے اعترافات اسی کے سامنے کیا کرتی تھی۔ اس نے اس کے اس منصوبے کی منظوری دے دی۔ پرنس ماریا نے ظاہر تو یہ کیا کہ وہ زائرہ عورتوں کو تحائف دینا چاہتی ہے لیکن ان کے پردے میں اس نے خود اپنے لیے زائرہ کا پورا سامان — موٹے جھوٹے کپڑے کی قمیص، زیزفون درخت کی چھال کے جوتے، کھردرے کپڑے کا کوٹ اور سیاہ رومال — تیار کرا لیا۔ وہ اکثر اس الماری کے، جس میں یہ قیمتی اشیا دھری تھیں، سامنے جا کھڑی ہوتی اور سوچنے لگتی: "کیا اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی گھڑی آ گئی ہے؟"

بعض اوقات، جب وہ ان زائرین کے قصے کہانیاں سن رہی ہوتی، وہ ان کی سیدھی سادی باتوں سے، جو ان کے لیے تو عین فطری ہوتیں لیکن وہ اسے معنویت سے بھرپور نظر آتیں، اتنا متاثر ہوتی اور اس کی طبیعت میں اتنا جوش و خروش بھر جاتا کہ وہ بیٹھے بٹھائے یہ فیصلہ کر لیتی کہ اسے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر گھر سے بھاگ جانا چاہیے۔ وہ تصور ہی تصور میں موٹے جھوٹے کپڑوں میں ملبوس ہو جاتی، اپنا ڈنڈا اور گدڑی ہاتھوں میں تھام لیتی اور کسی گرد آلود سڑک پر سفر کر رہی ہوتی۔ فیدوسیوشکا اس کے ہمراہ ہوتی۔ وہ اسے ایک درگاہ سے دوسری درگاہ تک لے جا رہی ہوتی، وہ حسد و رشک، دنیاوی خواہشات اور محبتوں سے ماورا ہو چکی ہوتی اور آخر کار اس منزل مقصود کو

پالیتی جہاں نہ غم واندوہ ہے اور نہ سسکیاں اور آہیں۔ بس دائمی مسرت اور برکت کا دوردورہ ہے۔

''میں کسی جگہ رک جایا کروں گی اور وہاں عبادت کیا کروں گی لیکن پیشتر اس کے کہ میں وہاں کے ماحول سے عادی ہوجاؤں اور اس کی محبت میری رگ وپے میں سمانے لگے، میں وہاں سے آگے چل دیا کروں گی۔ آگے ہی آگے، اور آگے، جہاں تک میری ٹانگیں جواب دے جائیں، میں وہیں کہیں لیٹ جاؤں گی اور اپنی جان جان آفرین کے سپرد کردوں گی۔ آخرکار میں کسی پرسکون مامن میں پہنچ جاؤں گی، وہاں نہ غم واندوہ ہوگا اور نہ آہیں اور سسکیاں...'' پرنس ماریا سوچتی۔

لیکن جب اس کی نظر اپنے باپ پر اور اس سے بھی بڑھ کر کوکا (نکولشکا) پر پڑتی، اس کی ہمت جواب دے جاتی، اس کے عزائم متزلزل ہونے لگتے، وہ چھپ چھپ کر روتی اور محسوس کرتی کہ وہ گنہگار ہے کیونکہ وہ خداوند سے زیادہ اپنے باپ اور بھتیجے سے پیار کرتی ہے۔

حصہ چہارم

1

انجیل کی ایک حکایت میں بیان ہوا ہے کہ ہبوطِ آدم سے قبل انسان کو جو سرورِ کامل حاصل تھا، اس کا سبب مشقت کا فقدان — عدم مصروفیت یا فراغت — تھا۔ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہنا اب بھی حضرت انسان کو پستی میں گرنے کے باوجود بہت مرغوب ہے۔ بنی نوع انسان ابھی تک قہرِ خداوندی کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، نہ صرف اس لیے کہ ہمیں اپنی روزی خون پسینہ ایک کر کے کمانا پڑتی ہے بلکہ ہماری اخلاقی فطرت کچھ اس قسم کی بن گئی ہے کہ نہ ہم سے بیکار بیٹھا جاتا ہے اور نہ ہم امن چین سے رہ سکتے ہیں۔ مخفی آواز ہمیں بتاتی رہتی ہے کہ بیکار بیٹھے رہنا گناہ ہے۔ اگر انسان کوئی ایسا طرزِ حیات دریافت کر لیتا کہ وہ کرتا بھی کچھ نہ اور محسوس بھی یہ کرتا کہ اس کا وجود بیکار محض نہیں بلکہ وہ دوسروں کے کام آ رہا ہے اور اپنا فرض سرانجام دے رہا ہے، وہ عہدِ عتیق کے سرورِ کامل کا کوئی عنصر ڈھونڈ چکا ہوتا۔ اس نوعیت کی واجب التعمیل اور خالی از ملامت عدم مصروفیت سے ایک پورا طبقہ — فوج — لطف اندوز ہوتا ہے۔ عسکری ملازمت کی سب سے بڑی کشش یہی واجب التعمیل اور خالی از ملامت عدم مصروفیت ہے۔

1807 کے بعد جب نکولائی رستوف ہنوز پاولوگرات رجمنٹ میں خدمات سرانجام دے رہا تھا اور جب سے اس سکواڈرن کی کمان، جو پہلے دینی سوف کے پاس تھی، اسے منتقل ہوئی تھی، اسے اسی قسم کے بابرکت سرور کی کیفیت کا پوری طرح تجربہ ہو رہا تھا۔

اپنی فوجی ملازمت کے دوران میں رستوف میں ایک طرح کی ناتراشیدگی اور اکھڑپن آ گیا تھا لیکن فطرتاً وہ خوش خصال شخص تھا اور خوش خصال ہی رہا۔ اس میں یوں جو تبدیلیاں آئی تھیں، اگرچہ اس کے ماسکو کے شناسا حلقوں میں انھیں رذیل ٹھہرایا جاتا اور ان پر ناک بھوں چڑھائی جاتی، لیکن اپنے رفقائے کار، ماتحتوں اور اعلیٰ افسروں میں اسے بنظرِ پسندیدگی دیکھا جاتا اور اس کا احترام کیا جاتا تھا اور وہ اپنی زندگی سے خاصا مطمئن تھا۔ 1809 کے دوران میں اسے کچھ عرصے سے گھر سے جو خطوط ملنا شروع ہوئے تھے، ان میں اس کی ماں اکثر شکایت کرتی رہتی تھی کہ ان کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور وہ ہر دم اسے نصیحت کرتی رہتی تھی کہ اسے اب گھر واپس آ جانا چاہیے اور اپنے ماں باپ کے قلوب کو ٹھنڈک پہنچانا اور انھیں راحت فراہم کرنا چاہیے۔

نکولائی جس ماحول میں رہ رہا تھا، اس نے اسے زندگی کے جھمیلوں اور الجھنوں سے پناہ گاہ مہیا کر رکھی تھی اور یوں اس کے ایام سکون واطمینان سے گزر رہے تھے۔ تاہم جب وہ یہ خطوط پڑھتا، اس پر ہول طاری ہو جاتا اور اس کے دل کو ٹیس پہنچتی کیونکہ اسے یہ محسوس ہونے لگتا کہ وہ اسے یہاں سے نکال لے جانا چاہتے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اسے جلد یا بدیر زندگی کے بھنور میں کودنا ہوگا اور اس کی پیچ در پیچ گتھیوں اور معاملات۔ سٹیوارڈ کے حسابات، دنیوی تنازعات اور سازشیں، معاشرہ اور معاشرتی بندھن، سونیا کی محبت اور اس کے ساتھ اس کے قول وقرار۔ کے ساتھ نپٹنا اور انھیں سلجھانا ہوگا۔ یہ سب کچھ انتہائی مشکل اور پیچیدگیوں سے معمور تھا، اور وہ جواب میں اپنی ماں کو فرانسیسی میں سرد مہر اور رسمی خطوط، جن کا آغاز "Ma Chere maman"* سے اور انجام "Votre obeissant fils"** پر ہوتا تھا، لکھتا رہتا۔ وہ ان خطوط میں کبھی یہ نہ بتاتا کہ اس کی واپسی کب ہوگی۔ 1810 میں اسے اپنے والدین کے جو خطوط ملے، ان میں انھوں نے اسے بلکونسکی کے ساتھ نتاشا کی نسبت کی اطلاع دی تھی اور یہ بھی بتایا تھا کہ شادی ایک سال کے لیے معرض التوا میں ڈالنا پڑی ہے تاکہ معمر پرنس کی رضامندی حاصل کی جاسکے۔ ان خطوط کو پڑھ کر نکولائی رنجیدہ و مغموم ہو گیا اور وہ سخت خفت محسوس کرنے لگا۔ اول: اسے اس بات کا افسوس تھا کہ نتاشا، جسے وہ گھر کے کسی دوسرے فرد کی نسبت کہیں زیادہ پیار کرتا تھا، گھر والوں سے بچھڑ جائے گی۔ دوم، ہوزار ہونے کے ناتے اسے اس بات کا افسوس تھا کہ وہ موقع پر موجود نہیں تھا ورنہ وہ اس ذات شریف بلکونسکی کو بتادیتا کہ اس کے ساتھ قرابت قائم ہونا کسی لحاظ سے بھی ان کے لیے کوئی خاص عزت افزائی نہیں ہے اور اگر اسے نتاشا سے قرار واقعی محبت ہے، تو پھر وہ اپنے مخبوط الحواس بڈھے باپ کی رضامندی کو باآسانی طاق پر رکھ سکتا ہے۔ کچھ دیر وہ اس ادھیڑ بن میں مصروف رہا کہ آیا اسے چھٹی کی درخواست دے دینا چاہیے تاکہ وہ شادی سے پہلے ایک مرتبہ نتاشا سے مل سکے لیکن اتنے میں فوجی مشقیں شروع ہو گئیں، سونیا کا تصور اور گھر کی مشکلات بھی اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں اور نکولائی نے ایک مرتبہ پھر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا۔ لیکن اسی سال کے موسم بہار میں اسے اپنی والدہ کا خط، جو اس کے والد کے علم کے بغیر لکھا گیا تھا، ملا۔ یہ خط پڑھنے کے بعد وہ قائل ہو گیا کہ اسے واپس جانا چاہیے۔ اس کی والدہ نے لکھا تھا کہ اگر وہ واپس نہ آیا اور اس نے معاملات اپنے ہاتھ میں نہ لیے، ان کی ساری جائیداد نیلام ہو جائے گی اور وہ سب قلاش ہو جائیں گے۔ کاؤنٹ اتنا کمزور و بے بس ہے، متکا پر اس طرح آنکھیں بند کر کے اعتبار کرتا ہے اور اتنا بھلا مانس ہے کہ ہر کوئی اپنا الو سیدھا کر لیتا ہے۔ اور حالات ہیں کہ بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔ "اگر تم مجھے اور سارے خاندان کو مفلوک الحال نہیں دیکھنا چاہتے، پھر میری یہی درخواست ہے کہ خدا کے لیے فی الفور واپس آجاؤ،" کاؤنٹس نے تحریر کیا۔

نکولائی نے اس خط کا اثر قبول کیا۔ وہ اوسط درجے کی ذہانت کے مالک شخص کی عام سوجھ بوجھ سے بہرہ ور تھا

---

* میری پیاری امی

** آپ کا فرماں بردار بیٹا

اور اس سوجھ بوجھ نے اسے راہ عمل سجھا دی۔

اب اس کے لیے درست راستہ یہی تھا کہ اگر ملازمت سے ریٹائرمنٹ نہ بھی لی جائے، اسے رخصت پر گھر ضرور جانا چاہیے۔ اس کا جانا کیوں ضروری تھا، یہ تو وہ شاید نہ بتا سکتا، تاہم قیلولے کے بعد اس نے حکم دیا کہ اس کے گھوڑے مریخ (Mars) پر زین کس دی جائے۔ اس کا یہ سرمئی گھوڑا آختہ نہیں تھا اور انتہا درجے کا خبیث اور بدخصال تھا۔ خاصے عرصے سے اس پر سواری نہیں کی گئی تھی۔ جب وہ اس کی لگام تھامے واپس آیا، اس نے لاوروشکا (دینی سوف کا ملازم جو اس کے ساتھ رہ گیا تھا) اور اپنے دوستوں کو، جو اس شام اتفاقاً اسے ملنے چلے آئے تھے، بتایا کہ وہ چھٹی کی درخواست دے رہا اور گھر جا رہا ہے۔ اگرچہ اس کے لیے یہ سوچنا بڑا محال اور عجیب تھا کہ وہ کمانڈر انچیف کے دفتر سے اس قسم کی کوئی اطلاع — حالانکہ اس میں اسے انتہائی دلچسپی تھی — کہ آیا اسے ترقی دے کر کیپٹن بنا دیا گیا ہے یا نہیں یا گزشتہ مشقوں کے دوران میں اس نے جو کارکردگی دکھائی تھی، اس کی بنا پر اسے آرڈر آف سینٹ این عطا ہو گا یا نہیں، وصول کیے بغیر جا رہا ہے، اگرچہ اسے یہ سوچتے بھی بہت عجیب معلوم ہو رہا تھا کہ وہ پولستانی کاؤنٹ گالوخوو سکی کے ہاتھ اپنے تین کمیت گھوڑے، جن کے سلسلے میں کاؤنٹ اس سے سودے بازی کی کوشش کر رہا تھا جب کہ رستوف اس سے شرط بد چکا تھا کہ وہ ان کے دو ہزار روبل لے کر ہی رہے گا، بیچے بغیر ہی جا رہا ہے، اگرچہ اس کے لیے یہ امر بھی ناقابل تصور تھا کہ وہ خود تو جا رہا ہو اور ادھر ہوزار پولستانی رقاصہ مادموزیل پنا پرزادزیسکا کے اعزاز میں بال کا، جس میں وہ شریک نہیں ہو سکے گا، اہتمام کر رہے ہوں (وہ یہ تقریب اولان گھڑسواروں کو، جنھوں نے اپنی پولستانی رقاصہ مادموزیل پنا برزوزوسکا کے اعزاز میں بال منعقد کیا تھا، چڑانے کے لیے برپا کر رہے تھے) — تاہم وہ خوب جانتا تھا کہ اسے اس چمکیلے اور خوشگوار عالم کو خیرباد کہنا اور ایک ایسی دنیا میں، جہاں ہر چیز اوندھی اور بے سروپا تھی، جانا ہی ہوگا۔ ایک ہفتے بعد اس کی چھٹی کی منظوری آ گئی۔ باس کے رفقائے کار — نہ صرف اس کی اپنی رجمنٹ بلکہ سارے بریگیڈ کے ہوزاروں — نے اس کے اعزاز میں ڈنر کا، جس کا چندہ فی کس پندرہ روبل تھا، اہتمام کیا۔ شرکا کو محظوظ کرنے کے لیے دو فوجی بینڈ اور دو موسیقاروں کے طائفے بلائے گئے۔ رستوف نے میجر بازوف کے ساتھ Trepak رقص کیا۔ نشے میں مخمور افسر اسے فضا میں اچھالتے، اس سے بغل گیر ہوتے اور اسے نیچے پٹخ دیتے۔ سکواڈرن کے سپاہیوں نے بھی اسے ایک بار اپنے کندھوں پر اٹھایا اور ''ہرّا'' کے نعرے بلند کیے۔ پھر انھوں نے اسے سلیج (برف گاڑی) میں لٹایا اور اپنی حفاظت میں اسے پہلی ڈاک چوکی پہنچا دیا۔

کریمنچگ[1] سے کیف[2] تک، اپنے سفر کے پہلے نصف کے دوران میں، جیسا کہ عام طور پر مسافروں کا وتیرہ ہوتا ہے، رستوف بھی ان چیزوں کے، جنھیں وہ سکواڈرن کے ساتھ پیچھے چھوڑ آیا تھا، متعلق سوچتا رہا۔ جب اس کا آدھا پینڈا کٹ گیا، وہ اپنے تینوں کمیت گھوڑوں، اپنے کوارٹر ماسٹر اور مادموزیل پرزادزیسکا کو فراموش کرنے لگا اور یہ سوچ سوچ کر اس کا کلیجا منہ کو آنے لگا کہ پتا نہیں کہ اترادنایا میں حالات کیسے ہوں گے اور وہاں اسے کس چیز

کا سامنا کرنا پڑے گا۔ جوں جوں وہ گھر کے نزدیک سے نزدیک تر ہوتا گیا، توں توں اس کے خیالات میں شدت۔ کہیں زیادہ شدت ۔ آتی گئی (جیسے اخلاقی جذبہ کلیہ مربع معکوس[3] کا پابند ہو)۔ اترادنایا سے پہلے اس نے آخری ڈاک چوکی پر کوچوان کو تین روبل بخشش میں دیے اور گھر پہنچنے پر بچوں کی طرح بھاگتا دوڑتا سیڑھیاں پھلانگنے لگا۔ اس کوشش میں اس کی سانس پھول گئی۔

گھر پہنچنے کے بعد جب نکولائی کا جوش وخروش قدرے دھیما ہوا (ویسے اسے ایک طرح کی مایوسی ہوئی تھی، ہر چیز یوں کی توں تھی، کچھ بھی تو نہ بدلا تھا، پھر اس نے جلد بازی کیوں کی؟)، ایک مرتبہ پھر زندگی جانے پہچانے خانگی ڈھرے پر رواں دواں ہوگئی۔ اس کی اماں اور ابا بالکل ویسے کے ویسے تھے، صرف پہلے کی نسبت کبرسن ضرور گئے تھے۔ ان میں جو نئی چیز دیکھنے میں آئی، وہ ان کے مابین خاص قسم کی کشیدگی تھی۔ گاہے گاہے ان میں اختلاف بھی، جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آیا تھا، رونما ہوجاتا اور جیسا کہ نکولائی کو بہت جلد معلوم ہوگیا، اس کا سبب ان کے وہ حالات تھے جو روز بروز دگرگوں ہوتے جارہے تھے۔ سونیا اب تقریباً بیس برس کی ہوچکی تھی۔ اب اس کے حسن میں مزید نکھار آنے کے امکانات معدوم ہوچکے تھے۔ اس کے سراپے میں اس نوعیت کے قطعاً کوئی آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے، پھر بھی وہ جیسی بھی تھی خاصی قبول صورت تھی۔ جونہی رستوف واپس آیا، وہ مسرت اور محبت کی کرنیں بکھیرنے لگی تھی اور اس لڑکی کی پر استقلال اور وفا شعار محبت نے اس کا دل باغ باغ کردیا۔ سب سے زیادہ اسے پیتا اور نتاشا نے متعجب کیا۔ پیتا تیرہ سالہ جسیم اور خوش شکل لڑکا تھا۔ وہ تیز فہم اور منسوڑ تھا اور اس کی آواز میں مردانہ پن آنے لگا تھا۔ جہاں تک نتاشا کا تعلق ہے، نکولائی کے لیے اپنے استعجاب پر قابو پانا محال تھا، وہ جب بھی اسے دیکھتا، اس کی ہنسی چھوٹ جاتی۔

''تم بالکل بدل گئی ہو،'' اس نے اسے چھیڑا۔

''کیسے؟۔ پہلے سے بدصورت ہوگئی ہوں؟''

''نہیں، یہاں معاملہ الٹ گیا ہے۔ کتنا وقار آگیا ہے! پرنس بن رہی ہو؟'' اس نے سرگوشی کی۔

''بالکل، بالکل، بالکل!'' نتاشا نے باآواز بلند کہا۔ اس کی باچھیں کھلی جارہی تھیں۔

اس نے اسے پرنس آندرے کے ساتھ اپنے معاشقے اور اس کی اترادنایا آمد کے بارے میں سب کچھ بتایا اور اسے اس کا تازہ ترین خط بھی دکھایا۔

''خیر، تم خوش ہو؟'' نتاشا نے پوچھا۔ ''میں اب بالکل مسرور و مطمئن ہوں۔''

''بہت خوش،'' نکولائی نے کہا۔ ''وہ بہت جاہ وجلال والا آدمی ہے۔ کیا تمھیں اس سے بہت محبت ہے؟''

''میں کیسے بیان کروں؟'' نتاشا نے جواب دیا۔ ''مجھے بورس سے محبت ہوئی، اپنے استاد سے ہوئی، دینی سوف سے ہوئی لیکن یہ بالکل مختلف قسم کی ہے۔ مجھے یقیناً قرار محسوس ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ اس سے بہتر شخص کرہ ارض پر موجود نہیں، اور اب مجھے کتنا سکون، کتنی دل جمعی ہے! اس طرح کی کیفیت پہلے کبھی محسوس نہیں ہوئی تھی...''

شادی کے ایک سال تک ملتوی کیے جانے پر نکولائی نے عدم اطمینان کا اظہار کیا لیکن نتاشا نے اس کی بات کا بہت برا منایا اور وہ اسے مارنے دوڑی۔ اس کا استدلال یہ تھا کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں تھی، یہ کہ باپ کی مرضی کے بغیر کسی خاندان کا رکن بننا غلط تھا اور یہ کہ وہ خود بھی یہی چاہتی تھی۔

''تم بالکل سمجھتے نہیں، بالکل سمجھتے نہیں،'' وہ بار بار کہے جا رہی تھی۔

نکولائی نے ہار مان لی اور اس نے مزید کچھ نہ کہا۔

اس کا بھائی جب بھی اسے دیکھتا، اکثر دبدھے میں پڑ جاتا۔ اس امر کا قطعاً کوئی عندیہ نہیں ملتا تھا کہ یہ لڑکی کسی کے عشق میں گرفتار ہے اور اپنے منگیتر کی جدائی کا دکھ جھیل رہی ہے۔ وہ ہمیشہ کی طرح معتدل مزاج اور مسرور و مطمئن تھی۔ اس کے اس رویے نے نکولائی کو متحیر کر دیا تھا اور وہ بلکونسکی کے معاشقے کے بارے میں بھی شکوک و شبہات میں مبتلا ہو گیا۔ اسے یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ اس کی ہمشیرہ کی تقدیر مہر بند ہو چکی ہے، خاص طور پر اس لیے بھی نہیں کیونکہ اس نے اسے پرنس آندرے کی معیت میں نہیں دیکھا تھا۔ اس مجوزہ شادی کے بارے میں ہمیشہ یہی خیال اس کے ذہن میں گردش کرتا رہا کہ کہیں نہ کہیں کچھ نہ کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔

''تاخیر کیوں؟ منگنی کی رسم کیوں نہ ادا کی گئی؟'' وہ سوچتا۔

ایک مرتبہ جب وہ اپنی ہمشیرہ کے متعلق اپنی ماں سے گفتگو کر رہا تھا تو اسے یہ معلوم کر کے حیرت بھی ہوئی اور اطمینان بھی کہ اس شادی کے بارے میں اس کے نہاں خانۂ دل میں بھی شکوک پرورش پا رہے ہیں۔

''یہ دیکھو،'' اس نے اپنے بیٹے کو پرنس آندرے کا خط دکھاتے ہوئے کہا۔ اس کے لہجے میں تلخی تھی۔ اس نے اس تلخی کا کھلے بندوں اظہار تو نہیں کیا تھا لیکن یہ محسوس کی جا سکتی تھی۔ اپنی بیٹیوں کی آئندہ کی شادی شدہ زندگی کی مسرتوں کے سلسلے میں ماؤں میں اسی طرح کی تلخی ہوتی ہے۔ ''اس نے لکھا ہے کہ وہ دسمبر سے پہلے نہیں آسکتا۔ اسے کس چیز نے روک رکھا ہے؟ ناسازیٔ طبع؟ بے شک یہی بات ہو گی۔ اس کی صحت خاصی خراب ہے۔ نتاشا کو نہ بتانا۔ وہ جو اتنا چہچہاتی پھر رہی ہے، اس پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ اپنے لڑکپن کے آخری ایام میں سے گزر رہی ہے لیکن مجھے معلوم ہے کہ جب اسے اس کا کوئی خط ملتا ہے، تو اس کا کیا حال ہوتا ہے۔ تاہم، انشاء اللہ، اب بھی ساری نزدیں صحیح پڑ سکتی ہیں۔'' اس نے کہا اور حسب معمول اپنی بات کا اختتام بدیں الفاظ کیا: ''وہ قابلِ ستائش آدمی ہے۔''

2

گھر واپسی کے بعد نکولائی شروع شروع میں اپنے ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہا، بلکہ اس پر اداسی اور اکتاہٹ کا غلبہ بھی رہا۔ اسے پریشانی اس بات کی تھی کہ جن فضول کاروباری امور کو نپٹانے کے لیے اس کی ماں نے اسے طلب کیا تھا، ان سے عہدہ برآ ہونے کی ساعت سر پر منڈلا رہی تھی۔ اس بوجھ سے جلد از جلد نجات پانے کی غرض

سے اپنی آمد کے تیسرے دن وہ غصے سے پھنکارتا، ناک بھوں چڑھاتا اور نتاشا کے اس سوال کو کہ وہ کہاں جا رہا ہے، نظر انداز کرتا، تیز تیز چلتا متنکا کے مسکن کی طرف بڑھتا تاکہ وہ اس سے ایک ایک چیز کا حساب طلب کر سکے۔ ایک ایک چیز کے حساب کا مطلب کیا تھا، اس کے بارے میں نکولائی دہشت اور بوکھلاہٹ کے شکار متنکا سے بھی کم آگاہ تھا۔ گفتگو اور حساب کتاب کی جانچ پڑتال زیادہ دیر نہ جاری رہی۔ گاؤں کا مکھیا، کسانوں کا ایک نمائندہ اور دیہی کلرک، جو راہداری میں ملاقات کا انتظار کر رہے تھے، ہیبت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے نوجوان کاؤنٹ کی گونجتی، دہاڑتی اور مسلسل بلند ہوتی آواز سن رہے تھے۔ اور اس کے ساتھ گالیوں کا طوفان برپا ہو گیا، الفاظ تھے کہ ایک دوسرے کے اوپر ڈھے پڑ رہے تھے۔

''ڈاکو، لٹیرے! ناشکرے، بے حیا، بے شرم!... میں کتے کی تکا بوٹی کر دوں گا... اب تمھارا واسطہ پاپا سے نہیں ہے... تم ہمارا سب کچھ ہڑپ کر گئے ہو... لفنگے...''

اس کے بعد انھوں نے جب نوجوان کاؤنٹ کو، آتش غضب سے جس کا چہرہ لال بھبوکا اور آنکھیں خون آلود ہو رہی تھیں، متنکا کو گدی سے پکڑ کر گھسیٹتے اور الفاظ کے مابین مناسب مناسب وقفوں سے بڑی پھرتی اور مشاقی سے اس کی پیٹھ پر پاؤں سے ٹھوکریں اور گھٹنوں سے ٹھوکے لگاتے دیکھا، ان کی ہیبت اور مسرت میں کوئی تخفیف نہ ہوئی۔ نوجوان کاؤنٹ چلا چلا کر کہہ رہا تھا:

''دفع ہو جاؤ! بدمعاش، مجھے دوبارہ کبھی اپنی شکل نہ دکھانا!''

متنکا سیڑھیوں کے چھ قدمچے سر کے بل لڑھکتا نیچے آیا اور سر پر پاؤں رکھ کر درختوں کے ذخیرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ (اترادنایا میں ذخیرہ مجرموں اور خطا کاروں کی جانی پہچانی پناہ گاہ تھی۔ خود متنکا جب نشے سے چور شہر سے واپس آتا، وہیں چھپا کرتا تھا اور اترادنایا کے بے شمار باسی، جو متنکا کی نظروں سے بچنے کے لیے بے قرار ہوتے تھے، اس ذخیرے کی حفاظتی صلاحیتوں سے بخوبی آگاہ تھے۔)

متنکا کی بیوی اور سالی، جن کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، اپنے کمرے سے باہر جھانک رہی تھیں۔ ان کے کمرے میں چمکتا دمکتا سماوار ابل رہا تھا اور ایک طرف سٹیوارڈ کا اونچا پلنگ، جس پر بوسیدہ لحاف رکھا ہوا تھا، پڑا تھا۔

نوجوان کاؤنٹ نے ان عورتوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ زور زور سے سانس لیتا اور آہنی عزم کے ساتھ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان کے برابر سے گزر گیا اور اپنے مکان میں چلا گیا۔

سٹیوارڈ کے مسکن میں جو کچھ ہوا تھا، پلک جھپکنے میں اس کی اطلاع نوکرانیوں کی وساطت سے کاؤنٹس کو مل چکی تھی۔ اسے اس سوچ سے تسلی ہو رہی تھی کہ اب ان کے معاملات لازماً سدھر جائیں گے لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ اس سارے واقعے کا اس کے بیٹے پر کیا اثر ہوگا۔ وہ متعدد مرتبہ پنجوں کے بل چلتی اس کے دروازے تک گئی اور اس نے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی۔ اس کا بیٹا پائپ پر پائپ سلگائے جا رہا تھا۔

اگلے روز معمر کاؤنٹ اپنے بیٹے کو ایک طرف لے گیا اور ڈری سہمی مسکراہٹ کے ساتھ بولا:
''عزیزم، تم جانتے ہو کہ تم خواہ مخواہ مشتعل ہو گئے! متنکا نے خود اس بارے میں مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''
''مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ اس جنونی دنیا کی کوئی بات میرے پلے نہیں پڑے گی،'' نکولائی نے سوچا۔
''تمھیں غصہ اس لیے آیا کہ اس نے سات سو روبل کا اندراج نہیں کیا تھا لیکن تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ وہاں 'بقایا اگلے صفحے پر' تحریر تھا اور تم نے اگلا صفحہ دیکھا ہی نہیں۔''

''پاپا، وہ پکا بدمعاش اور چور ہے اور مجھے یہ معلوم ہے۔ مجھے جو کچھ کرنا تھا، میں کر چکا ہوں۔ لیکن اگر آپ کی یہی خواہش ہے، میں اس سے مزید کچھ نہیں کہوں گا۔''

''نہیں، میرے بیٹے،'' کاؤنٹ جھینپ رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس نے اپنی زوجہ کی جائیداد کی مناسب دیکھ بھال نہیں کی ہے اور یوں وہ اپنے بچوں کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہوا ہے۔ لیکن اس کی کوتاہی کا مداوا کیا تھا، اس کے متعلق وہ کچھ نہیں جانتا تھا۔ ''نہیں، میری تم سے یہی التجا ہے کہ معاملات کو سنبھالو۔ میں ضعیف العمر ہو چکا ہوں، میں —''

''نہیں، پاپا، اگر میری وجہ سے آپ کو کوئی تکلیف پہنچی ہے، میں معافی کا خواست گار ہوں۔ رہا حساب کتاب، اس کے متعلق میرا علم آپ کے علم سے بھی کم ہے۔''

''لعنت ہو ان سب پر۔ کسانوں پر، روپے پیسے کے معاملوں پر اور 'بقایا اگلے صفحے پر' پر!'' اس نے سوچا۔ ''تاش کا سکور میں خوب اچھی طرح سمجھ لیا کرتا تھا لیکن یہ 'بقایا اگلے صفحے پر' کا معاملہ میری سمجھ سے بالا ہے!'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور وہ وقت اور یہ وقت، اس نے خانگی امور کے پھڈے میں دوبارہ کبھی ٹانگ نہ اڑائی۔

لیکن ایک روز کاؤنٹس نے اپنے بیٹے کو پھر کمرے میں بلایا اور اسے بتانے لگی۔ ''میرے پاس آنّا میخائیلوونا کا پرونوٹ ہے۔ تمھارے خیال میں ہمیں اس کا کیا کرنا چاہیے۔''

''بس یہ،'' نکولائی نے جواب دیا۔ ''آپ فرماتی ہیں کہ فیصلہ میرے اختیار میں ہے۔ پھر سنیں۔ مجھے یہ آنّا میخائیلوونا قطعاً پسند نہیں ہے اور نہ میں بورس کو پسند کرتا ہوں۔ تاہم ہمارے ان کے ساتھ تعلقات تھے اور وہ مفلوک الحال تھے۔ پھر میرا خیال یہ ہے!'' اور اس نے پرونوٹ پرزے پرزے کر دیا۔ اس کے اس طرز عمل نے معمر کاؤنٹس کو خوشی کے آنسو چھلکانے پر مجبور کر دیا۔

اس کے بعد نوعمر کاؤنٹ کسی قسم کے بھی کاروباری معاملات میں کبھی دخیل نہ ہوا بلکہ وہ پورے جوش و خروش اور تن من سے نئے مشغلے — شکار — میں، جو کاؤنٹ کی جاگیر پر بڑے پیمانے پر کھیلا جاتا تھا، مصروف ہو گیا۔

3

جاڑوں کی آمد آمد تھی اور صبح کے پالوں نے دھرتی کو، جو خزانی بارشوں میں خوب بھیگ چکی تھی، یخ بستہ کر دیا۔ قبل ازیں

گھاس گچھوں کی شکل میں اگ چکی تھی اور سرمائی شتری رائی[4]، جسے مویشیوں نے اپنے کھروں اور سموں تلے روندیا تھا، بہاریہ فصل کے زردی مائل ٹھنٹھوں اور بک ویٹ کے ناڑوں[5] کے مقابلے میں خوب سرسبز وشاداب نظر آرہی تھی۔ پہاڑی ٹیلے اور درختوں کے جھنڈ، جو اگست کے اواخر تک سیاہ کھیتوں اور ٹھنٹھوں کے مابین سرسبز وشاداب جزیرے تھے، اب سبز سرمائی رائی کے مابین سنہری اور ارغوانی جزیرے بن چکے تھے۔ خرگوش پہلے ہی اپنے نصف تابستانی لبادے جھاڑ چکے تھے۔ لومڑوں کے بچے ادھر ادھر منتشر ہونا شروع ہو گئے تھے اور بھیڑیوں کے پلے پل کر کتوں سے زیادہ جسیم ہو چکے تھے۔ اس جوشیلے شکاری رستوف کے سگِ تازی نہ صرف شکاری فارم میں آچکے تھے بلکہ وہ اس قدر مشتعل ہو رہے تھے کہ کتوں کے رکھوالوں کی مشترکہ کونسل میں انھیں تین دن آرام دینے اور سولہ ستمبر کو مہم پر روانہ ہونے کا فیصلہ کرلیا گیا۔ اس مہم کا آغاز اوک کے درختوں کے جھنڈ سے، جو ابھی تک غیر پامال تھا اور جہاں نوعمر بھیڑیوں کا جھول رہتا تھا، ہونا تھا۔

یہ صورت حال چودہ ستمبر کی تھی۔

اس تاریخ کو سگ تازی سارا دن گھروں میں بند رکھے گئے۔ اس روز خوب پالا پڑا تھا اور جسم کے آرپار ہو جانے والی یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔ تاہم سرِشام آسمان پر بادل چھا گئے اور برف پگھلنے لگی۔ پندرہ کو صبح سویرے جب ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس نوجوان رستوف نے کھڑکی میں سے باہر جھانک کر دیکھا، اسے خیال گزرا کہ شکار کے لیے اس سے بہتر اور کوئی سحر نہیں ہو سکتی۔[6] معلوم ہوتا تھا کہ آسمان پگھل رہا ہے اور ہوا کے ہلکے سے ہلکے جھونکے کے بغیر زمیں بوس ہو رہا ہے، فضا میں جو واحد چیز حرکت پذیر تھی وہ دھندیا کہر کے خوردبینی قطرات کا بطرف زمین بہاؤ تھا۔ باغ میں ننگی بُوچی شاخوں پر موتیوں کی طرح شفاف قطرے لٹک رہے تھے اور رس رس کر نیچے ان پتوں پر، جو تازہ تازہ درختوں سے جھڑے تھے، گر رہے تھے۔ سبزیوں کے باغیچے کی مرطوب اور سیاہ زمین گل لالہ کے قلب کی طرح جگمگا رہی تھی اور چند ہی قدم آگے دھند کی گیلی اور تاریک چادر میں تحلیل ہو رہی تھی۔ نکولائی باہر آیا اور گیلے اور کیچڑ آلود پورچ میں چلا گیا۔ وہاں گلے سڑے پتوں اور ایک کتیا کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ سیاہ چتیوں، فراخ پشت اور بڑی بڑی آنکھوں والی کتیا مِلکا اپنے مالک کو دیکھ کر اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اس نے اپنی عقبی ٹانگیں پھیلائیں اور خرگوش کی طرح نیچے لیٹ گئی۔ پھر اس نے ایکا ایکی جست لگائی اور عین اس کی ناک اور مونچھیں چاٹنے لگی۔ ایک بارزوئی کتے[7] نے جب باغیچے کی پگڈنڈی سے اپنے آقا کو دیکھا، اس نے اپنی کمر کو کمان کی طرح خمیدہ کیا، سر کے بل لپکتا پورچ کی طرف آیا اور اپنی دم اٹھا کر نکولائی کی ٹانگوں پر اپنی تھوتھنی رگڑنے لگا۔

اسی لمحے ہانکے کی مخصوص آواز "o-hoy" فضا میں گونجی۔ شکاری کتوں کے رکھوالوں کی یہ وہ ہانک پکار ہے جس میں انتہائی نیچا سر انتہائی اونچے سر کے ساتھ یک جان ہو جاتا ہے اور مکان کے کونے سے کتوں کا رکھوالا دانیلو اور اس کا نائب نمودار ہوئے۔ دانیلو کے چہرے پر جھریاں تھیں اور اس کے سفید بال یوکرینی انداز سے پیشانی کے آرپار سیدھے کٹے ہوئے تھے۔ اس کے ہاتھ میں خاصا لمبا خمیدہ چابک تھا۔ اس کے چہرے بشرے کو دیکھ کر یہ

تاثر ملتا تھا کہ یہ شخص اپنی مرضی کا مالک ہے اور دنیا کی ہر چیز کو بہ نظر حقارت دیکھتا ہے۔ اس قسم کی باتیں صرف شکاری کتوں کے رکھوالوں میں نظر آتی ہیں۔ اس نے اپنی سرکیشیائی[8] ٹوپی اتار کر اپنے آقا کو سلام کیا اور اسے حقارت آمیز نظروں سے دیکھنے لگا۔ آقا کے نزدیک اس حقارت میں گستاخی کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ نکولائی جانتا تھا کہ دیکھنے میں دانیلو کا رویہ بے شک حقارت آمیز اور برتر معلوم ہوتا ہے، پھر بھی وہ اس کا وفا شعار ملازم اور اس کے کتوں کا رکھوالا ہے۔

''دانیلو!'' نکولائی نے ذرا ڈھیٹ بن کر کہا۔ وہ اس امر سے بخوبی آگاہ تھا کہ شکار کے اعتبار سے انتہائی سازگار موسم، شکاری کتوں اور رکھوالوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شکار کا وہ زبردست جذبہ پیدا ہو گیا ہے، جس کی مزاحمت نہیں کی جا سکتی اور جس کی موجودگی میں آدمی بعینہٖ اسی طرح اپنے تمام سابقہ ارادے طاق نسیاں پر رکھنے کے لیے مجبور ہو جاتا ہے، جس طرح عاشق اپنی محبوبہ کی موجودگی میں باقی سب کچھ فراموش کر دیتا ہے۔

''سرکار، کیا حکم ہے؟'' ایک دھیمی آواز نے پوچھا۔ اس آواز میں آرچ ڈیکن[9] کی گہرائی تھی لیکن یہ ہانکے لگا لگا کر بیٹھ چکی تھی۔ دو شعلہ فگن آنکھیں استفہامیہ انداز سے اپنے آقا کو، جس نے چپ سادھ رکھی تھی، دیکھ رہی تھیں۔ ''یقیناً تم مزاحمت نہیں کر پاؤ گے؟'' وہ آنکھیں یہ کہتی دکھائی دے رہی تھیں۔

''سازگار دن ہے، شکار کے لیے، سرپٹ دوڑنے دوڑانے کے لیے، کیا خیال ہے؟'' نکولائی نے ملکا کو کانوں کی پچھلی جانب کھجاتے ہوئے کہا۔

دانیلو نے آنکھیں جھپکائیں اور خاموش کھڑا رہا۔

''میں نے سن گن لینے کے لیے پوچھٹے یوارکا کو بھیج دیا تھا،'' اس نے کچھ توقف کے بعد کہا۔ ''وہ کہتا ہے کہ وہ انھیں اترادنایا کے بن میں لے گئی ہے۔ وہ وہاں چیخ چلا رہے تھے۔'' (اس کا مطلب یہ تھا کہ بھیڑنی، جس کے متعلق ان دونوں کو علم تھا، اپنے بچوں کو اترادنایا کے جنگل میں لے گئی ہے۔ یہ نجی شکارگاہ تھی اور گھر سے ڈیڑھ میل دور تھی۔)

''ہمیں جانا نہیں چاہیے؟'' نکولائی نے کہا۔ ''یوارکا کے ساتھ میرے پاس آ جانا۔''

''بہت اچھا، حضور۔''

''پھر انھیں دانہ دنکا دینا بند کر دو۔''

''جی، سرکار۔''

پانچ منٹ بعد دانیلو اور یوارکا نکولائی کے کشادہ سٹڈی روم میں کھڑے تھے۔ اگرچہ دانیلو بلند قامت شخص نہیں تھا لیکن کمرے میں اسے دیکھ کر یہی احساس ہوتا تھا جیسے گھریلو ماحول اور فرنیچر کے درمیان فرش پر کوئی گھوڑا یا ریچھ کھڑا ہو۔ دانیلو خود بھی یہی محسوس کر رہا تھا اور وہ حسب معمول دروازے کے ذرا اندر کھڑا تھا۔ وہ نرم ملائم لہجے سے گفتگو کرنے کی سعی کر رہا تھا اور اپنی جگہ سے بالکل ہل جل نہیں رہا تھا۔ اسے اندیشہ تھا کہ اپنے آقا کے کمرے

میں اس سے کہیں کوئی چیز ٹوٹ نہ جائے۔ اسے جو کہنا تھا، وہ اسے حتی الامکان جلد از جلد کہہ رہا تھا تا کہ وہ ایک مرتبہ پھر چھت سے دور آسمان تلے کھلی فضا میں جا سکے۔

چھان بین کرنے اور دانیلو سے تقریباً جبراً یہ منوا لینے کے بعد، کہ شکاری کتے بالکل چاق چوبند ہیں (خود دانیلو بھی جانے کے لیے بے قرار تھا)، نکولائی نے گھوڑوں پر زینیں کسنے کا حکم دے دیا۔ لیکن عین اس وقت جب دانیلو جانے ہی والا تھا، نتاشا لپک جھپک کمرے میں داخل ہوئی۔ وہ بوڑھی نرس کا بڑا دوشالہ اوڑھے ہوئے تھی کیونکہ ابھی تک اس نے نہ بال بنائے تھے اور نہ ڈھنگ سے کپڑے پہنے تھے۔

''تم جا رہے ہو؟'' نتاشا نے پوچھا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم رکو گے نہیں! سونیا کہتی تھی کہ تم نہیں جاؤ گے لیکن میں جانتی تھی کہ جب دن اس قسم کا ہو، تم جائے بنا رہ نہیں سکو گے۔''

''ہاں، ہم جا رہے ہیں،'' نکولائی نے بادل ناخواستہ جواب دیا کیونکہ وہ اس روز سنجیدگی سے شکار کھیلنا چاہتا تھا اور نتاشا اور پیتیا کو اپنے ساتھ نہیں لے جانا چاہتا تھا۔ ''ہم جا رہے ہیں۔ آج صرف بھیڑیوں کا شکار ہوگا، تمھیں کوئی لطف نہیں آئے گا۔''

''تمھیں معلوم ہے کہ یہ میری سب سے بڑی تفریح ہے،'' نتاشا نے کہا۔ ''بڑا کمینہ ہے۔ اکیلا ہی جا رہا ہے۔ گھوڑے تیار کرنے کا حکم بھی دے دیا اور ہمیں کانوں کان خبر تک نہ ہونے دی۔''

''کوئی رکاوٹ روسیوں کے راہ کا روڑا نہیں بن سکتی! چلو، ہم بھی چلتے ہیں!'' پیتیا نے با آواز بلند کہا۔

''لیکن تم نہیں جا سکتیں۔ ماما نے کہا تھا کہ تمھیں بالکل نہیں جانا چاہیے،'' نکولائی نے نتاشا کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

''کیوں نہیں؟ میں جاؤں گی اور ضرور جاؤں گی!'' نتاشا نے مٹھیاں بھینچ کر کہا۔ ''دانیلو، ہمارے گھوڑوں پر بھی زینیں ڈلوا دو اور میخائیلو سے کہو کہ وہ میرے شکاری کتے لے آئے،'' اس نے رکھوالے سے کہا۔

دانیلو کو تو کمرے میں ہی کھڑا ہونا گراں اور نازیبا معلوم ہو رہا تھا چہ جائیکہ نوجوان دوشیزہ سے بھی واسطہ پڑ جائے اور یہ بات اس کے لیے بالکل ہی ناقابل برداشت ہو گئی۔ اس نے اپنی آنکھیں جھکا لیں اور وہاں سے بہ عجلت کھسکنے میں ہی عافیت جانی گویا یہ اس کا معاملہ نہیں تھا۔ تاہم جاتے جاتے اس نے اتنی احتیاط ضرور برتی کہ اس کے کسی قول و فعل سے اتفاقیہ بھی نوجوان خاتون کے جذبات کو کوئی ٹھیس نہ پہنچے۔

4

معمر کاؤنٹ شکار کا کھٹ راگ ہمیشہ ہی وسیع و عریض پیمانے پر پالتا رہا تھا لیکن حال ہی میں اس نے یہ سب کچھ اپنے بیٹے کی تحویل میں دے دیا تھا۔ تاہم اس روز، بتاریخ پندرہ ستمبر، اس کی طبیعت بہت شگفتہ تھی اور اس نے دوسروں کے ہمراہ چلنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔

ایک گھنٹے کے اندر شکار کے تمام شوقین پورچ میں آموجود ہوئے۔ نکولائی درشت اور سنجیدہ انداز سے، جس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ اب اس کے پاس فضولیات پر ضائع کرنے کے لیے کوئی وقت نہیں ہے، نتاشا اور پیتا کے، جو اسے کچھ بتانے کی کوشش کر رہے تھے، قریب سے گزر گیا۔ اس نے شکار کے لوازمات کی ایک ایک چیز کا خود جائزہ لیا، شکار کو راستے میں روکنے کی غرض سے رکھوالوں کو شکاری کتوں کی ایک ٹولی کے ساتھ آگے بھیجا، وہ اپنے کمیت گھوڑے ''دون'' پر سوار ہوا اور سیٹیاں بجا بجا کر اپنے کتوں کو بلاتا اور ان کی زنجیریں تھامتا، پڑ[10] سے کھیت کی، جہاں سے اترادنایا شکارگاہ کو راستہ جاتا تھا، جانب چل پڑا۔ معمر کاؤنٹ کا گھوڑا آختہ، اس کا رنگ سرخی مائل بادامی اور اس کا نام دی فلائی آنکا تھا۔ اس گھوڑے کو سائیس نے تھام لیا جب کہ خود کاؤنٹ ہلکی پھلکی ٹم ٹم میں جنگل کے اس حصے کی، جسے درخت کاٹ کر صاف کر دیا گیا تھا اور جو اسی کے لیے مخصوص تھا، چل دیا۔

چون شکاری کتے چھ رکھوالوں اور نائب رکھوالوں کی نگرانی میں جا رہے تھے۔ خاندان کے ارکان اور ان کے اپنے اپنے کتوں کے علاوہ چالیس سے زیادہ بارزوئی کتے اور ان کے نگران بھی ساتھ تھے۔ چنانچہ مل ملا کر کل قافلہ ایک سو تیس کتوں اور بیس گھڑسواروں پر مشتمل تھا۔

ہر کتا اپنے آقا کو اور جس نام سے اسے پکارا جاتا تھا، ان کو خوب پہچانتا تھا۔ شکاری قافلے کے ہر شخص کو بخوبی معلوم تھا کہ اس کا کام اور مقام کیا ہے اور کہاں اس نے کیا کرنا ہے۔ جونہی انھوں نے باڑ عبور کی، وہ سب خاموشی اور درست انداز سے اس کھیت اور سڑک پر، جو ترادنایا شکارگاہ کی طرف جاتی تھی، پھیل گئے۔ کسی نے نہ تو کوئی بات کی اور نہ کسی طرح کا شور وغوغا بپا کیا۔

گھوڑے کھیت پر یوں قدم دھرتے تھے جیسے وہ کسی دبیز قالین پر چل رہے ہوں۔ کبھی کبھار سڑک پار کرتے وقت ان کے پاؤں پانی کے چھوٹے موٹے گڑھوں پر پڑ جاتے اور یوں وہ چھینٹے اڑانے لگتے۔ دھند میں لپٹا آکاش اب بھی دھیرے دھیرے اور غیر محسوس انداز سے دھرتی کی جانب اترتا محسوس ہو رہا تھا۔ ہوا بند اور فضا نیم گرم تھی۔ کہیں کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، ماسوا اس کے کہ کبھی کبھار کوئی رکھوالا سیٹی بجا دیتا، کوئی گھوڑا ہنہنانے لگتا، کوئی چابک شوں شاں کر دیتا یا کوئی کتا، جو اپنے ساتھیوں سے بچھڑ چکا ہوتا، رونے کی صدا بلند کر دیتا۔

جب وہ تقریباً پون میل کا فاصلہ طے کر چکے، پانچ مزید گھڑسوار اپنے کتوں کے ہمراہ دھند سے نمودار ہوئے۔ وہ رستوفوں کی طرف آ رہے تھے۔ سب سے اگلے گھوڑے پر ایک خوش اندام بوڑھا شخص سوار تھا۔ اس کا چہرہ سرخ وسپید اور مونچھیں گھنی، بڑی اور سفید تھیں۔

''چچا جان، آداب عرض!'' نکولائی نے بوڑھے کے قریب آنے پر کہا۔

''سہانا کھیت اور صاف راستہ!... مجھے یقین تھا'' بوڑھے شخص نے، جسے ''چچا جان'' کے لقب سے مخاطب کیا گیا تھا، کہا۔ (وہ رستوفوں کا دور پار کا رشتہ دار تھا اور ان کے پڑوس میں اس کی تھوڑی بہت جائیداد تھی۔) ''مجھے معلوم تھا کہ تم اپنی خواہش پر قابو نہیں پا سکو گے۔ چلو اچھا ہوا کہ تم لوگ آ گئے! سہانا کھیت اور صاف راستہ!'' (یہ

اس کا پسندیدہ تکیہ کلام تھا۔)''فی الفور شکارگاہ پہنچ جاؤ کیونکہ میرے ملازم گرچک نے مجھے بتایا ہے کہ الاگن اپنے کتوں کے ہمراہ کارنکی پہنچ چکے ہیں — سہانا کھیت اور صاف راستہ — وہ تمھاری آنکھوں کے عین سامنے بھیڑیوں کا جھول اڑا لے جائیں گے۔''

''میں ادھر ہی جا رہا ہوں۔ کیوں نہ ہم سب ایک ہی جتھا بنالیں؟'' نکولائی نے پوچھا۔

کتوں کو ایک ہی ٹولی میں اکٹھا کر دیا گیا اور ''چچا'' اور نکولائی برابر برابر چلنے لگے۔ نتاشا، جو دو شالوں میں لپٹی ہوئی تھی لیکن اس کا پراشتیاق چہرہ اور چمکتی دمکتی آنکھیں ان میں پوشیدہ نہیں تھیں، پیتیا، نائب رکھوالے میخائیلو اور گھڑسواری کے استاد کی، جسے اس کی خبرگیری کے لیے مامور کیا گیا تھا، معیت میں سرپٹ گھوڑا دوڑاتی ان کے ساتھ آملی۔ پیتیا کسی بات پر قہقہے لگا رہا تھا اور اپنے گھوڑے کو چابک سے پیٹ رہا اور اس کی باگیں کھینچ رہا تھا۔ نتاشا اپنے مشکی اسپ تازی پر بڑے ٹھسے اور اعتماد سے بیٹھی تھی۔ لگام پر اس کی گرفت خاصی مضبوط تھی اور وہ حسب ضرورت بڑے آرام اور سہولت سے اسے کھینچ لیتی یا ڈھیلی چھوڑ دیتی۔

''چچا'' نے پیتیا اور نتاشا کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ وہ شکار جیسے سنجیدہ معاملے میں کسی قسم کی اینڈی بینڈی اور بےہودگی کا پیوند لگانا پسند نہیں کرتا تھا۔

''چچا جان، آداب عرض! ہم بھی آرہے ہیں'' پیتیا نے نعرۂ مستانہ بلند کیا۔

''آداب عرض، آداب عرض! بچو، خیال رکھنا، کہیں کتوں پر گھوڑے نہ چڑھا دینا'' اس نے درشتی سے جواب دیا۔

''نکولینکا، سبحان اللہ، یہ ترونیلا کیا چھب دار کتا ہے! وہ مجھے پہچانتا تھا!'' نتاشا نے اپنے پسندیدہ کتے کے متعلق کہا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ترونیلا کتا نہیں، شکاری کتیا ہے'' نکولائی نے سوچا اور اس نے اپنی ہمشیرہ کو گھور کر دیکھا۔ وہ اسے یہ محسوس کرانے کی کوشش کر رہا تھا کہ دونوں کے مابین جو فاصلہ ہونا چاہیے، اسے اس کا اندازہ ہو جانا چاہیے۔

نتاشا اس کا مدعا سمجھ گئی۔

''چچا جان آپ کے دل میں مطلق یہ خیال نہیں آنا چاہیے کہ ہم آپ کی راہ میں رکاوٹ بنیں گے'' وہ بولی۔

''ہم اپنی جگہ ڈٹے رہیں گے اور ایک انچ بھی ادھر ادھر نہیں ہٹیں گے۔''

''چھوٹی کاؤنٹس، یہ تو بہت اچھی بات ہوگی!'' ''چچا'' نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''صرف اتنا خیال رکھنا کہ کہیں اپنے گھوڑے سے نہ گر جانا'' اس نے مزید گرہ لگائی۔ ''ورنہ — سہانا کھیت، صاف راستہ — تم کچھ بھی نہیں پکڑ سکو گی۔''

کوئی دو سو گز آگے اترا دنایا شکارگاہ صاف نظر آنے لگی اور نائب رکھوالے اپنے گھوڑے ادھر بڑھانے لگے۔

رستوف نے جب بالآخر ''چچا'' کے ساتھ یہ طے کرلیا کہ انھوں نے اپنے شکاری کتے کہاں سے چھوڑنے ہیں اور نتاشا کو یہ سمجھا چکا کہ اس نے کہاں کھڑے رہنا ہے — یہ وہ مقام تھا، جہاں اس بات کا قطعی کوئی امکان نہیں تھا کہ وہاں بھاگتی دوڑتی کوئی چیز پہنچ جائے گی — وہ پہاڑی نالے سے گھیرا ڈالنے آگے چلا گیا۔

''بھتیجے، تم خاصے بڑے شکار پر ہاتھ ڈال رہے ہو،'' ''چچا'' نے کہا۔ ''اس بات کا خیال رکھنا کہ کہیں وہ تمھاری آنکھوں میں دھول جھونک کر نکل نہ جائے۔''

''اس کا انحصار حالات پر ہے،'' رستوف نے جواب دیا۔ ''کارائی، ادھر۔'' اس نے اپنے ایک کتے کا نام لے کر اسے یوں پکارا جیسے وہ ''چچا'' کو جتانا چاہتا ہو کہ وہ بالکل سنجیدہ ہے۔

کارائی جھبرا، بدصورت، بوڑھا اور پرانا شکاری کتا تھا۔ اس کی وجۂ شہرت یہ تھی کہ اس نے تن تنہا ایک جسیم اور خوب پلے ہوئے بھیڑیے کی ہڈی پسلی ایک کردی تھی۔

بیٹے کو شکار کا جو جنون تھا، معمر کاؤنٹ اس سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ بالتعجیل آگے بڑھا تاکہ وہ کہیں پیچھے نہ رہ جائے۔ رکھوالوں نے بمشکل اپنی اپنی جگہیں سنبھالی تھیں کہ الیا آندریچ سرسبز کھیت میں اپنے آبنوسی گھوڑے دوڑاتا اس مقام پر، جو پگڈنڈی پر اس کے لیے مخصوص تھا، پہنچ گیا۔ وہ ہشاش بشاش تھا، اس کا چہرہ تمتمارہا اور اس کے گال پھڑک رہے تھے۔ اس نے اپنے سموری کوٹ کی شکنیں درست کیں، شکاری سامان سے اپنے آپ کو لیس کیا اور اپنے نفیس، خوش اندام، تندرست وتوانا اور مسکین طبع گھوڑے وی فلائی آنکا کی، جس کے بال اس کے اپنے بالوں کی طرح سفید ہو رہے تھے، پشت پر سوار ہو گیا۔ گھوڑے اور ٹم ٹم واپس بھیج دی گئی۔ اگرچہ کاؤنٹ الیا آندریچ کو شکار کا خاص شوق نہیں تھا لیکن وہ شکاریات کے اصولوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار درختوں کے جھنڈ کی طرف چل دیا۔ اسے اسی کے کنارے ٹھہرنا تھا۔ چنانچہ اس نے وہاں پہنچ کر گھوڑے کی لگام کھینچ لی، آرام سے زین پر بیٹھ گیا اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اب وہ بالکل تیار ہے، متبسم ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

اس کے قریب اس کا وردی پوش ملازم سیمی آن چیک مار تھا۔ چیک مار جہاندیدہ اور تجربے کار گھڑسوار تھا لیکن اس وقت وہ کاٹھی پر جسم اکڑائے بیٹھا تھا۔ اس نے تین خونخوار بھیڑیا نما شکاری کتوں کی زنجیریں تھام رکھی تھیں حالانکہ وہ بھی اپنے مالک اور اس کے گھوڑے کی طرح فربہ ہو چکے تھے۔ دو سیانے اور ادھیڑ عمر کتے، رسیوں سے آزاد، زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ جنگل کے کنارے کے ساتھ ساتھ کوئی سو قدم آگے کاؤنٹ کا دوسرا سائیس متکا کھڑا تھا۔ وہ بے دھڑک خطروں میں کود جانے والا جیوٹ گھڑسوار اور بہت جوشیلا شکاری تھا۔

کاؤنٹ نے شکار پر روانہ ہونے سے قبل قدیم اور مقدس روایت پر عمل کرتے ہوئے برانڈی کا ایک نقرئی جام، جس میں شکر، گرم مصالحے اور انڈے کی زردی کی آمیزش تھی، نوش کیا، چند بسکٹ کھائے اور ان سب کے اوپر اپنے پسندیدہ مشروب باردو[11] کی نصف بوتل حلق میں انڈیل لی تھی۔ شراب اور سفر نے اس کے گال قدرے تمتما دیے تھے۔ اس کی آنکھیں، جن میں پانی آیا چاہتا تھا، خاص طور پر روشن وتاباں تھیں۔ وہ فرکوٹ میں لپٹا زین پر

بیٹھا تھا اور بالکل اس ننھے منے بچے کی، جسے گھوڑے پر سوار کرا کر سیر و تفریح کے لیے کھلی فضا میں لے آئے ہوں، مانند نظر آ رہا تھا۔

اپنے فرائض کی ادائیگی کے بعد چیک مارنے، جس کا جسم اکہرا اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں، ایک نظر اپنے آقا پر ڈالی۔ وہ اس کے ساتھ گزشتہ تیس سالوں سے وابستہ تھا اور دونوں کے باہمی تعلقات نہایت خوش گوار تھے۔ خدمتگار نے جب اپنے آقا کو ہشاش بشاش پایا، اسے پر لطف گپ شپ کی امید بندھ گئی۔ ایک تیسرا شخص (جسے بظاہر تربیت دی گئی تھی) کان کھڑے کیے گھوڑے پر سوار جنگل سے باہر نکلا اور کاؤنٹ کے عقب میں رک گیا۔ یہ ذات شریف کہن سال تھا، اس کی ڈاڑھی سفید تھی، اس کے جسم پر زنانہ چغہ اور سر پر بھی جھبے دار ٹوپی تھی۔ یہ مسخرہ[12] تھا اور اسے ناستاسیا ایوانوونا کے نام سے جانا جاتا تھا۔

''ناستاسیا ایوانوونا،'' کاؤنٹ نے اسے آنکھ مارتے ہوئے سرگوشی کی۔ ''اگر تم نے درندے کو ڈرا دیا، پھر دیکھنا، دانیلو کے ہاتھوں تمھیں کیا بے بھاؤ کی پڑتی ہیں۔''

''میں اتنا بھی نادان نہیں!'' ناستاسیا ایوانوونا نے جواب دیا۔

''شی شی!'' کاؤنٹ پھنکارا اور سیمی آن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ تمھیں نتالیا الیچنا کہیں نظر آئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''کہاں ہے وہ؟''

''پیوترا لیچ کے ساتھ۔ زھاروف چراگاہ کے عقب میں،'' متبسم چیک مارنے جواب دیا۔ ''بے شک ان کا تعلق صنف نازک سے ہے لیکن شکار کی بہت دلدادہ ہیں۔''

''سیمی اون، جس انداز سے وہ سواری کرتی ہے، تمھیں تعجب تو ہوتا ہوگا؟'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''بالکل مرد معلوم ہوتی ہے!''

''کون حیران نہیں ہوگا؟ اتنی دلیر، اتنی ہوشیار!''

''اور نکولاشا، وہ کہاں ہے؟ لیادوف ٹیلے کے پاس؟'' کاؤنٹ نے اب بھی سرگوشیوں میں پوچھا۔

''بالکل درست، سرکار۔ انھیں معلوم ہے کہ انھیں کہاں کھڑا ہونا ہے۔ وہ شکار کی باریکیاں اتنی اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ بعض اوقات میں اور دانیلو ششدر رہ جاتے ہیں،'' چیک مارنے کہا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ آقا کو کیسے خوش کیا جاتا ہے۔

''سواری بھی خوب کرتا ہے۔ ٹھیک ہے؟ گھوڑے پر جچتا بھی خوب ہے۔ ٹھیک ہے؟''

''بالکل مورت معلوم ہوتے ہیں۔ واہ واہ، سبحان اللہ! ابھی پچھلے دنوں انھوں نے زاوارزنسکی چراگاہ کی اونچی اونچی گھاس میں لومڑ کا زبردست تعاقب کیا تھا! وہ بالکل طوفان کی مانند گھوڑا سرپٹ دوڑاتے آئے۔ گھوڑا ہزار روبل کا اور سوار؟ بالکل انمول! چراغ لے کر بھی ڈھونڈیں، ان جیسا اور کوئی نہیں ملے گا!''

''ان جیسا اور کوئی نہیں ملے گا...'' کاؤنٹ نے دہرایا۔ اسے بظاہر بڑی مایوسی ہوئی تھی کہ چیک مار کی

تعریفیں اتنی جلدی ختم ہوگئیں۔ ''اور کہیں نہیں ملے گا،'' اس نے پھر کہا اور نسوار کی ڈبیا تک پہنچنے کے لیے اپنا کوٹ الٹ پلٹ کرنے لگا۔

''چند روز ہوئے جب وہ اپنی خوبصورت وردی پہنے گرجے سے باہر آئے اور میخائیل سدورچ...'' چیک مار کہتے کہتے رک گیا۔ گمبھیر سناٹے میں اس نے واضح طور پر دو تین شکاری کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سن لی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ شکار کا آغاز ہوگیا ہے۔ اس نے اپنا سر جھکایا، کان لگا کر غور سے سنا اور انگلی لہرا کر اپنے آقا کو متنبہ کیا۔ ''وہ بھیڑنی کے بچوں کا تعاقب کر رہے ہیں،'' اس نے زیرلب کہا۔ ''وہ سیدھے لیادوف ٹیلے کی طرف جا رہے ہیں۔''

کاؤنٹ نے اپنی پناہ گاہ سے دور جھانک کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی مسکراہٹ تھی اور اس کے ہاتھ میں جو ڈبیا تھی، وہ اس میں سے چٹکی بھر نسوار نکالنا بھول گیا تھا۔ کتوں کے بھونکنے کی آواز کے بعد دانیلو کے ہارن پر بھیڑیے کا شکار کرنے کی ہلکی للکار سنائی دی۔ (کتوں کا) غول پہلے تین شکاری کتوں کے ساتھ آملا۔ وہ پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر وہ مخصوص چیخ، جو اس امر کی علامت ہوتی ہے کہ وہ کسی بھیڑیے کو دوڑا رہے ہیں، بلند کر رہے تھے۔ نائب رکھوالے اب شکاری کتوں کو محض شششکار نہیں رہے تھے بلکہ ہوچھ، ہوچھ کی آوازیں نکالتے انھیں شکار جھپٹنے کے لیے لشکار رہے تھے، اور دانیلو کی آواز، جو کبھی مدھم انداز سے اس کے حلق سے برآمد ہوتی اور کبھی اتنی بلند ہوجاتی کہ کانوں کے پردے پھاڑنے لگتی، باقی تمام آوازوں سے اونچی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی یہ آواز تمام جنگل اور اس کے اردگرد کے سارے علاقے پر محیط ہو چکی ہے اور اس کی بازگشت دور کھلی فضاؤں میں بھی سنائی دے رہی تھی۔

چند سیکنڈ چپ چاپ سننے کے بعد کاؤنٹ اور اس کے سائیس کو یقین ہوگیا کہ شکاری کتے دو ٹولیوں میں تقسیم ہوگئے ہیں۔ بڑی ٹولی بڑے زور شور سے کہیں دور بھاگی جا رہی تھی، جب کہ دوسری جنگل کے کنارے کے ساتھ ساتھ بھاگتی کاؤنٹ سے آگے نکل گئی اور یہی وہ ٹولی تھی جسے دانیلو لش لش کرتا سنائی دے رہا تھا۔ دونوں ٹولیوں کی آوازیں آپس میں گڈمڈ ہوگئیں اور ایک بار پھر علیحدہ علیحدہ ہوگئیں لیکن دونوں ہی دور سے دور تر ہوتی جا رہی تھیں۔

چیک مار نے ٹھنڈی آہ بھری اور نیچے جھک کر زنجیر، جس میں ایک نوعمر شکاری کتے نے اپنی ٹانگ پھنسالی تھی، سیدھی کرنے لگا۔ کاؤنٹ کی بھی سسکی نکل گئی اور جب اس کی نظر اپنے ہاتھ میں ڈبیا پر پڑی، اس نے اسے کھولا اور چٹکی برابر نسوار نکال لی۔

''واپس!'' چیک مار نے ایک شکاری کتے سے، جو بے پاؤں جنگل سے باہر نکل رہا تھا، چلا کر کہا۔

کاؤنٹ گھبرا کر اچھل پڑا اور نسوار کی ڈبیا اس کے ہاتھ سے نیچے گر پڑی۔ ناستاسیا ایوانوونا اسے اٹھانے گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ کاؤنٹ اور چیک مار کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ پھر، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، پلک

جھپکنے میں شکار کی آواز قریب آنے لگی اور یوں معلوم ہونے لگا کہ کتوں کی چیخ پکار اور دانیلو کی لش لش ان کے عین سامنے آ گئی ہے۔

کاؤنٹ نے اپنے ارد گرد نظریں دوڑائیں اور اسے دائیں ہاتھ متنکا دکھائی دیا، جو اسے یوں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی آنکھیں اس کے بھیجے سے باہر نکل آئیں گی۔ اس نے اپنی ٹوپی اٹھا کر سامنے اور دوسری جانب اشارہ کیا۔

''خبردار، ہوشیار!'' اس نے کچھ اس قسم کی آواز سے کہا کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے یہ الفاظ خاصی دیر سے اس کی زبان پر اٹکے ہوئے تھے اور باہر نکلنے کے لیے محض اشارے کے منتظر تھے۔ اس نے بارزوئی کتوں کو آگے نکل جانے دیا اور خود بگٹٹ گھوڑا دوڑاتے کاؤنٹ کی طرف بڑھنے لگا۔

کاؤنٹ اور چیک مار سرپٹ گھوڑے دوڑاتے جھاڑیوں سے باہر نکل آئے۔ انھیں بائیں ہاتھ آرام آرام سے ڈگ بھرتی اور چھلانگیں لگاتی بھیڑنی، بالکل ادھر، جہاں وہ کھڑے تھے، آتے نظر آئی۔ خونخوار کتے واویلا بپا کر رہے تھے۔ انھوں نے زنجیریں چھڑا لیں اور برق رفتاری سے بھیڑنی کا تعاقب کرنے لگے۔ گھوڑے پیچھے رہ گئے۔

بھیڑنی بھاگتے بھاگتے رک گئی۔ اس نے اس آدمی کی طرح، جو خناق میں مبتلا ہو، بے ہنگم انداز سے اپنی بھاری بھرکم اور کشادہ پیشانی کا رخ کتوں کی طرف کیا اور ابھی تک اپنی وہی نرم اور جھومتی چال چلتے دو جستیں بھریں، چابک کی طرح فضا میں لہرائی اور سڑاکے کی آواز پیدا کرتی جنگل میں غائب ہو گئی۔ اسی لمحے نالہ وشیون سے ملتی جلتی آواز نکالتے مخالف جھنڈ سے پہلے ایک، پھر دوسرا، پھر تیسرا اور اس کے بعد شکاری کتوں کا پورے کا پورا غول برآمد ہوا اور کھلے کھیت کو عبور کرتا برق رفتاری سے عین اس مقام کی، جہاں بھیڑنی غائب ہوئی تھی، جانب بڑھا۔ کتوں کے گزرنے سے بادامی سرخی مائل جھاڑیوں میں فاصلہ بن رہا تھا اور اس میں سے دانیلو کا گھوڑا، جس کا پسینے نے حلیہ بگاڑ دیا تھا، نظر آنے لگا۔ گھوڑے کی پشت پر دانیلو گردن آگے جھکائے بیٹھا تھا۔ اس کی ٹوپی ندارد اور بال پریشان تھے۔ اس کے یہ سفید بال اس کے تمتماتے اور پسینہ بہاتے چہرے پر لٹک رہے تھے۔

''ہوچھ، ہوچھ!...'' وہ چلا رہا تھا۔

جب اس کی نظر کاؤنٹ پر پڑی، اس کی آنکھوں سے شعلے نکلنے لگے۔

''آپ —!'' وہ اپنا چابک کاؤنٹ کے سامنے لہراتا دہاڑا۔ ''آپ نے بھیڑنی کو کھسک جانے دیا!... ہونہہ، آئے بڑے شکاری!''

اور گویا کہ اسے متوحش اور شرمسار کاؤنٹ پر مزید الفاظ ضائع کرنے سے چڑ ہو، اس نے اپنے پسینے سے شرابور کمیت آختہ گھوڑے کے، جس کی سانس پھول رہی تھی، چابک رسید کیے اور یوں اس نے اپنے سارے غصے کی، جو کاؤنٹ نے اسے دلایا تھا، بھڑاس اس پر نکالی اور کتوں کے پیچھے ہوا ہو گیا۔

کاؤنٹ کی حالت سکول کے اس طالب علم کی تھی، جس کی زبردست گوشمالی ہوئی ہو۔ اس نے مسکراتے

ہوئے اپنے گرد وپیش یوں نظر دوڑائی جیسے وہ اپنے اس حال زار میں چیک مار سے ہمدردی کی بھیک مانگ رہا ہو۔ لیکن چیک مار وہاں کہاں تھا، وہ تو اپنا گھوڑا سرپٹ بھگا لے گیا تھا تاکہ وہ بھیڑنی کو جنگل میں پناہ لینے سے روک سکے۔ دونوں اطراف کھیت بھی آرہے تھے لیکن بھیڑنی جنگل میں داخل ہو چکی تھی اور ایک بھی شکاری اس کے راستے کی دیوار نہیں بن سکا تھا۔

5

دریں اثنا نکولائی رستوف بھیڑنی کے انتظار میں اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ جس طریقے سے شکار آیا اور واپس چلا گیا، جس انداز سے کتے، جن کی آوازیں اس کی جانی پہچانی تھیں، واویلا کر رہے تھے اور جس ڈھنگ سے چابکوں کی اصوات، کبھی نزدیک اور کبھی دور بلند ہو رہی تھیں، ان سے ہی اس نے اندازہ لگایا کہ جنگل میں کیا ہو رہا ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جنگل میں نوعمر اور کہن سال بھیڑیے موجود ہیں، وہ جانتا تھا کہ کتے دو گروہوں میں تقسیم ہو چکے ہیں، کہیں شکار کے پیچھے بھاگ رہے ہیں اور کہیں نہ کہیں گڑبڑ ضرور ہو گئی ہے۔ اسے ہر آن یہی امید تھی کہ بھیڑنی ابھی ادھر، جدھر وہ کھڑا تھا، ضرور آئے گی۔ اس نے مختلف انواع کی ایک ہزار ایک قیاس آرائیاں کیں کہ درندہ کیسے اور کدھر سے بھاگتا آئے گا اور وہ کس طرح اسے اپنے حملے کی زد میں لے گا۔ کبھی اس کے دل میں امید کی کرن جگمگانے لگتی اور کبھی مایوسی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ وہ بار بار خداوند سے دعائیں مانگ رہا تھا کہ بھیڑنی ادھر، جدھر وہ کھڑا تھا، آنکلے۔ وہ گڑگڑا، گڑگڑا کر اور شرمساری کے اسی احساس کے ساتھ، جس کے ساتھ لوگ شدید جذباتی کیفیت میں، جس کے پس پردہ معمولی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں، اپنے رب کے حضور حاضر ہوتے ہیں، دعاؤں پر دعائیں مانگے جا رہا تھا۔ ''اگر میرا یہ کام ہو جائے'' وہ خداوند سے کہہ رہا تھا، ''تیرے گھر میں کیا کمی آجائے گی؟ میں جانتا ہوں کہ تو عظیم ہے اور اس طرح کی دعائیں مانگنا گناہ ہے لیکن برائے کرم بھیڑنی کو میری طرف بھیج دے اور میرے کتے کارائی کو اس پر جھپٹنے اور 'چچا' کے سامنے، جو وہاں کھڑا سب کچھ دیکھ رہا ہے، اس کو ختم کرنے کا موقع عطا کر دے۔'' اس نصف گھنٹے کے دوران میں اس نے ایک ہزار ایک مرتبہ پرعزم، بوجھل اور متفکر نظروں سے جنگل کے کنارے جھاڑیوں کے جھنڈ کی طرف دیکھا جہاں پہاڑی نالوں کے کنارے، جسے پانی نے کاٹ دیا تھا، دو سرد و گرم چشیدہ، سوکھے سڑے اوک کے درختوں کے نیچے سفیدے کے چھوٹے چھوٹے درخت کھڑے تھے اور جہاں ایک جھاڑی کے عقب میں ''چچا'' کی ٹوپی کی ہلکی سی جھلک نظر آرہی تھی۔

''نہیں، میری ایسی قسمت کہاں!'' رستوف نے سوچا۔ ''اس کی خاطر سب کچھ قربان کیا جا سکتا ہے! لیکن وہ آئے گی نہیں۔ تاش کا کھیل ہو، جنگ کا میدان ہو یا کچھ اور۔۔۔ بدقسمتی میرا پیچھا نہیں چھوڑتی!'' آسٹرلٹس اور دلوخوف کی یادیں غیر مبہم انداز سے بسرعت یکے بعد دیگرے اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ ''کاش زندگی میں تومند بھیڑنی کو ہلاک کرنے کا ایک موقع تو میسر آجائے!۔۔۔ پھر مجھے کسی اور چیز کی تمنا نہیں رہے گی!'' اس نے آنکھوں اور

کانوں پر زور ڈالتے، دائیں بائیں جھانکتے اور کتوں کی آوازوں میں معمولی ترین فرق کی نشان دہی کرنے کی خاطر غور سے سنتے سوچا۔

اس نے ایک بار پھر اپنی دائیں جانب دیکھا اور اسے کھلے کھیت میں کوئی چیز اپنی طرف بھاگتی نظر آئی۔

''نہیں، ایسا نہیں ہوسکتا!'' رستوف نے سوچا اور اس شخص کی طرح، جو اس شے کے، جس کی آرزو مدتوں سے اس کے دل میں پلتی رہی ہو، حصول پر گہری سانس لیتا ہے، اس نے بھی اطمینان کی سانس لی۔ اس کی عظیم ترین مسرت کا لمحہ آ پہنچا تھا — اور وہ بھی اتنے سادے انداز سے، شور شرابے، دھوم دھڑکے اور شان و شوکت کے بغیر کہ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا اور ایک سیکنڈ کے لیے وہ شک و شبہے میں مبتلا رہا۔ بھیڑنی آگے بھاگی اور پوری قوت سے ایک تنگ پہاڑی نالے کو، جو اس کے راستے پر پڑتا تھا، جست لگا کر پھاند گئی، یہ بوڑھی اور سال خوردہ تھی۔ اس کی پشت خاکستری اور پیٹ بھرا بھرا اور سرخی مائل تھا۔ وہ بھاگ ضرور رہی تھی لیکن جلد بازی نہیں کر رہی تھی۔ بظاہر اسے یقین تھا کہ کوئی اسے دیکھ نہیں پائے گا۔ رستوف کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔ اس نے کتوں کی جانب دیکھا۔ وہ کھڑے تھے یا لیٹے ہوئے تھے، انھوں نے بھیڑنی کو نہیں دیکھا تھا اور وہ اس کے وجود سے قطعاً بے خبر تھے۔ بوڑھا کارائی سر نیہوڑائے اپنے جسم پر پسّو ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے پیلے ہونٹ برہنہ تھے اور اپنی پشت پر جھپٹے مار رہا تھا۔

''ہوچھ، ہوچھ!'' رستوف ہونٹ لٹکا کر کھسر پھسر کے انداز میں پکارا۔

کتے جست لگا کر ایستادہ ہوگئے، انھوں نے زنجیروں کی آہنی کڑیوں کو جھٹکایا اور ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ کارائی نے اپنی پچھلی ٹانگ کھرچنا ترک کر دیا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے کان چوکنے تھے اور وہ اپنی دم، جس کے ژولیدہ بال نیچے لٹک رہے تھے، آہستہ آہستہ ہلا رہا تھا۔

''ان کی زنجیریں کھول دوں یا نہیں؟'' نکولائی نے تب، جب بھیڑنی درختوں کے جھنڈ سے نکل کر اس کی طرف آ رہی تھی، اپنے آپ سے پوچھا۔ اچانک درندے کی ساری شکل و صورت متغیر ہوگئی۔ اس کا جسم تھرتھرایا۔ اس نے وہ کچھ — انسانی نگاہیں، جو اس پر مرکوز تھیں — جو اس نے غالباً پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنے سر کو قدرے رستوف کی جانب گھمایا اور رک گئی، وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے آگے جانا یا پیچھے لوٹ جانا چاہیے۔ ''اونہہ، کچھ پروا نہیں — آگے۔'' وہ اپنے آپ سے کہتی محسوس ہو رہی تھی اور عقب میں دیکھے بغیر اطمینان و سکون سے لانبی لیکن فیصلہ کن زقندیں بھرتی آگے بڑھتی رہی۔

''ہوچھ، ہوچھ!'' نکولائی نے کچھ ایسی آواز سے، جو اس کی اپنی نہیں تھی، چیخ ماری اور اس کا گھوڑا از خود اسے خوف ناک رفتار سے لے اڑا اور ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔ بھیڑنی سے دور ہٹنے کے لیے اس نے چھوٹے موٹے نالوں کی بھی پروا نہ کی اور چھلانگیں لگا کر انھیں پار کرتا رہا۔ کتوں کی رفتار ان سے بھی زیادہ تیز تھی اور وہ ان سے آگے نکل گئے۔

نکولائی کو نہ تو اپنی چیخ سنائی دی اور نہ اسے یہ اندازہ ہوا کہ وہ سرپٹ بھاگا جارہا ہے۔ اسے نہ کتے نظر آئے اور نہ وہ زمین، جس پر اس کا گھوڑا ابگنٹ رواں دواں تھا۔ اس کی نگاہیں محض بھیڑنی پر، جو درختوں کے بیچوں بیچ قلانچیں بھرتی اور ہر آن اپنی رفتار تیز کرتی اسی سمت میں بھاگی آرہی تھی، جمی ہوئی تھیں، اس کے علاوہ اسے اور کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ جو چیز سب سے پہلے درندے کی جانب بڑھتی نظر آئی، وہ سیاہ چتیوں اور کشادہ پشت والی (کتیا) ملکا تھی۔ قریب، قریب تر اور قریب تر... اب وہ اس کے برابر پہنچتی جارہی تھی۔ لیکن بھیڑنی نے اچانک اپنا رخ تبدیل کرلیا اور کتیا پر دزدیدہ نگاہ ڈالی۔ ملکا بجائے اس کے جیسا کہ اس کی ہمیشہ عادت رہی تھی، آگے بڑھنے کی سرتوڑ کوشش کرتی، اس نے اچانک اپنی دم اٹھائی اور اپنی اگلی ٹانگیں اکڑا لیں۔

''ہوچھ ہوچھ ہوچھ!'' نکولائی چلایا۔

سرخ سگ تازی، لیوبم، ملکا کی پشت پھلانگتا ہوا آگے لپکا، وحشیانہ انداز سے بھیڑنی پر کودا، اسے پچھلی ٹانگ سے پکڑا لیکن آناً فاناً اس پر ایسا خوف و دہشت طاری ہوا کہ چھلانگ لگا کر ایک طرف ہٹ گیا۔ بھیڑنی دبک گئی، اس نے دانت پیسے، وہ دوبارہ اٹھی اور زقندیں لگاتی آگے بھاگنے لگی۔ کتوں کے پورے غول نے اس کا تعاقب کیا۔ وہ اس سے صرف دو قدم پیچھے تھے لیکن وہ اس تک پہنچنے میں ناکام رہے۔

''یہ تو بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے گی! نہیں، یہ ناممکن ہے!'' رستوف نے سوچا اور وہ اپنی پھٹی پھٹی آواز میں پھر چلانے لگا: ''کارائی! ہوچھ...'' وہ للکارا اور اپنے اردگرد بوڑھے کتے کو، جو اس کی واحد امید رہ گیا تھا، تلاش کرنے لگا۔

کارائی بھیڑنی پر نظریں جمائے اور اپنی زوال پذیر قوت کا آخری قطرہ نچوڑنے کی کوشش کرتے بے ہنگم انداز سے درندے کے ایک جانب دوڑنے لگا تاکہ وہ اس کا راستہ روک سکے لیکن بھیڑنی تھی کہ برق رفتار سے چھلانگیں لگاتی بھاگی جارہی تھی جب کہ کتے کی رفتار لحظہ بہ لحظہ کم ہوتی جارہی تھی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ کارائی کے اندازے غلط ثابت ہوئے ہیں۔ سامنے قلیل فاصلے پر نکولائی کو جنگل دکھائی دے رہا تھا اور اگر بھیڑنی وہاں تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی، پھر وہ یقیناً اس میں غائب ہوجائے گی۔ اس کے سامنے ایک رکھوالا اور کتے نمودار ہوئے۔ وہ بھیڑنی کی سمت میں سرپٹ بھاگے آرہے تھے۔ ابھی امید کی رمق باقی تھی۔ ایک نوجوان لمبا تڑنگا اور زرد شکاری کتا، جسے نکولائی پہچان نہ سکا اور جو کسی دوسرے شخص کی زنجیر میں بندھا ہوا تھا، اندھادھند بھیڑنی سے جا ٹکرایا اور اس نے اسے قریب قریب نیچے گرادیا۔ بھیڑنی نے توقع سے بڑھ کر پھرتی دکھائی، اپنا توازن درست کیا اور دانت کٹکٹاتی زرد سگ تازی پر پل پڑی۔ کتے کے منہ سے دل دوز چیخ نکلی اور وہ سر کے بل زمین پر گر پڑا۔ اس کے ایک پہلو پر گہرا زخم آیا اور وہاں سے خون کا فوارہ بہہ نکلا۔

''کارائی، بڑے میاں...'' نکولائی نے نالہ و شیون بپا کرتے ہوئے کہا۔

بھیڑنی کے فرار میں جو یہ رکاوٹ آئی، یہ اسی کا کرشمہ تھا کہ ژولیدہ دم والے ادھیڑ عمر کتے اور بھیڑنی کے

مابین اب صرف پانچ قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ بھیڑنی نے کارائی کو کچھ اس انداز سے آنکھ ماری جیسے وہ درپیش خطرے سے بے خبر ہو، اس نے اپنی دم مزید اپنی ٹانگوں میں گھسیڑی اور اپنی رفتار بڑھادی۔ لیکن عین اسی لمحے نکولائی نے دیکھا کہ کارائی پر کوئی نیا جذبہ غالب آگیا ہے۔ چٹکی بجاتے کتے نے بھیڑنی کو دبوچ لیا اور وہ دونوں سر کے بل پہاڑی نالے میں، جو اچانک ان کے آگے آگیا تھا، جا گرے۔

جس وقت نکولائی نے نالے میں بھیڑنی کو کتوں کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے دیکھا، وہ اس کی زندگی کا مسرور ترین لمحہ تھا۔ اس کا خاکستری جسم اور اس کی باہر کو نکلی ہوئی عقبی ٹانگیں ان کے نیچے تھیں۔ اس کا دم پھول چکا تھا، چہرے پر دہشت سوار تھی اور اس کے کان پیچھے کو جھکے ہوئے تھے۔ (کارائی نے اس کا نرخرا دبا رکھا تھا۔) اس نے اپنا ہاتھ زین کے ہرنے پر رکھا۔ اب وہ گھوڑے سے اترنے اور بھیڑنی کے جسم میں خنجر بھونکنے کے لیے تیار تھا لیکن ایکا ایکی درندے نے کتوں کے ہجوم میں سے اپنا سر اٹھایا اور اگلے لمحے اس کی اگلی ٹانگیں نالے کے کنارے پر پہنچ گئیں، اس کے دانت کڑکڑائے (وہ کارائی سے اپنا حلقوم چھڑا چکا تھا)، اس نے اپنی پچھلی ٹانگوں پر وزن ڈالا، پورا زور لگایا اور نالے سے باہر کود گیا۔ یوں کتوں سے اپنا پنڈ چھڑا کر بھیڑنی دم دبائے تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ کارائی، جس کے رونگٹے کھڑے تھے، بظاہر یا تو خراشیں یا زخم کھا چکا تھا اور وہ بڑی اذیت کے ساتھ رینگ رینگ کر نالے سے باہر آرہا تھا۔

''اف، میرے خدایا! کیوں!...'' نکولائی مایوسی کے عالم میں چیخ و پکار کرنے لگا۔

دوسری طرف سے ''چچا'' کے کتوں کے رکھوالے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے بھیڑنی کے راستے کی دیوار بن گئے اور ان کے سگان تازی نے ایک مرتبہ پھر اسے روک لیا۔ یوں وہ دوبارہ نرغے میں آگئی۔

نکولائی، اس کا سائیس، ''چچا'' اور اس کے کتوں کے رکھوالے دوبارہ درندے کے گرد گھیرا تنگ کرنے لگے۔ وہ ''ہوچھ، ہوچھ'' کے ہنکارے لگا رہے اور شور و غل بپا کر رہے تھے۔ جونہی وہ دبک کر بیٹھتا، وہ اترنے کے لیے تیار ہو جاتے لیکن جونہی وہ سب کچھ جھاڑ جھوڑ دوبارہ اٹھتا اور جنگل کی طرف، جہاں اسے پناہ مل سکتی تھی، آگے بڑھتا، وہ بھی آگے چل پڑتے۔

اس یورش کے بالکل آغاز میں دانیلو رکھوالوں کی ''ہوچھ، ہوچھ'' کی آوازیں سن کر گھوڑا بھگاتا جنگل کے کنارے پہنچ چکا تھا۔ اس نے کارائی کو بھیڑنی کے ساتھ گتھم گتھا ہوتے دیکھ لیا تھا۔ اس نے اپنا گھوڑا روک لیا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ معاملہ ختم ختما ہو چکا ہے۔ لیکن جب اس نے دیکھا کہ رکھوالے گھوڑوں سے نہیں اترے بلکہ بھیڑنی اپنے آپ کو چھڑانے اور راہ فرار اختیار کرنے میں کامیاب رہی ہے، اس نے اپنا گھوڑا بگٹٹ دوڑا دیا لیکن اس کا رخ درندے کی طرف نہیں تھا بلکہ، جیسا کہ کارائی نے کیا تھا، سیدھا پناہ گاہ کی طرف تھا تا کہ وہ بھیڑنی کو راستے میں روک سکے۔ نتیجتاً وہ اس کے قریب عین اس وقت پہنچا جب ''چچا'' کے کتے اسے دوسری مرتبہ روک چکے تھے۔

دانیلو اپنا گھوڑا خاموشی سے سرپٹ دوڑاتا آیا۔ اس نے بائیں ہاتھ میں خنجر تان رکھا تھا اور وہ اپنے کمیت گھوڑے کے، جس کی سانس پھول چکی تھی، دونوں پہلوؤں پر چابک مار رہا تھا۔

نکولائی کو دانیلو آتا نہ دکھائی دیا اور نہ سنائی تا آنکہ اس کا اپنا گھوڑا ہانپتا کانپتا اس کے برابر سے آگے نہ گزر گیا اور کسی شخص کے نیچے گرنے کی آواز اس کے کانوں تک نہ آئی۔ اب اس نے دیکھا کہ دانیلو کتوں کے مابین بھیڑنی کی پشت پر گرا پڑا ہے اور اسے کانوں سے پکڑنے کی کوشش کر رہا ہے۔ رکھوالوں، کتوں اور خود بھیڑنی پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو چکی تھی کہ اب قصہ تمام ہو چکا ہے۔ درندے نے، جس کے دہشت کی وجہ سے کان پیچھے کو کھنچے ہوئے تھے، اٹھنے کی سعی کی لیکن کتے اس کے ساتھ چپکے رہے۔ دانیلو اٹھا، پھسلا، کچھ یوں لگا جیسے وہ تکان اتارنے کے لیے نیچے بیٹھنا چاہتا ہے، بھیڑنی پر گرا، اپنا پورا وزن اس پر ڈالا اور اسے کانوں سے پکڑ لیا۔ نکولائی اپنا خنجر درندے کے پیٹ میں اتارنا چاہتا تھا کہ دانیلو نے سرگوشی کی: ''صاحب، جانے دیں، ہم اس کی کھال اتاریں گے۔'' پھر اس نے اپنی پوزیشن تبدیل کی اور اپنا پاؤں بھیڑنی کی گردن پر رکھ دیا۔ انھوں نے اس کے جبڑوں کے مابین چھڑی گھسیڑ دی اور اس کے ساتھ اس طرح زنجیر باندھ دی جیسے وہ اس کے منہ میں لگام ڈال رہے ہوں۔ پھر انھوں نے اس کی ٹانگیں باندھ لیں اور دانیلو نے اسے دائیں بائیں ایک دو لڑھکنیاں دیں۔

اگرچہ تھکاوٹ سے ان کے اجسام چور ہو چکے تھے، پھر بھی وہ ہشاش بشاش تھے۔ انھوں نے ادھیڑ عمر زندہ بھیڑنی کو ایک گھوڑے کی، جو ڈر کے مارے بدک رہا اور نتھنے پھڑکا رہا تھا، پشت پر ڈال دیا اور چیختے چلاتے کتوں کی معیت میں ادھر، جہاں ان سب نے اکٹھا ہونا تھا، چل پڑے۔ شکاری کتے بھیڑنی کے دو اور بارزوئی کتے تین بچے ہلاک کر چکے تھے۔ رکھوالے اپنے اپنے مال غنیمت اور قصوں سمیت ایک جگہ مجتمع ہو گئے۔ سبھی عظیم الجثہ بھیڑنی کو، جو اپنی کشادہ پیشانی والے سر سمیت گھوڑے پر جھول رہی تھی، دیکھنے چلے آ رہے تھے۔ بھیڑنی کے دونوں جبڑوں کے مابین چھڑی، جسے اس نے کترنے کی کوشش کی تھی، پھنسی ہوئی تھی اور وہ اپنی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے کتوں اور انسانوں کے ہجوم، جو اس کے اردگرد حصار بنائے کھڑے تھے، دیکھ رہی تھی۔ جب وہ اسے چھوتے، وہ اپنی بندھی ہوئی ٹانگوں کو جھٹکا دیتی اور ان سب کو وحشت سے دیکھنے لگتی، وہ محض دیکھتی تھی اور کرتی کچھ نہیں تھی۔

کاؤنٹ الیا آندریچ بھی گھوڑا دوڑاتا آیا اور اس نے بھیڑنی کو چھو کر دیکھا۔

''اف، کتنی بڑی ہے!'' اس نے کہا۔ ''بہت بڑی! کیا خیال ہے؟'' اس نے دانیلو سے، جو قریب کھڑا تھا، کہا۔

''بالکل، یوئر ایکسی لینسی،'' دانیلو نے بالتعجیل ٹوپی اتارتے ہوئے جواب دیا۔

کاؤنٹ کو بھیڑنی، جسے اس نے کھسک جانے دیا، اور دانیلو کا غیظ و غضب یاد آ گیا۔

''خیر، برخوردار، تم ہو بڑے غصیلے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے،'' کاؤنٹ نے کہا۔

دانیلو چپ رہا۔ وہ اسے شرمیلی، خوشگوار اور بچوں کی معصوم مسکراہٹ سے دیکھتا رہا۔

6

معمر کاؤنٹ گھر چلا گیا۔ نتاشا اور پیتیا نے وعدہ کیا کہ وہ بس اس کے پیچھے آ رہے ہیں۔ لیکن چونکہ ابھی سویرا تھا،

شکاری مزید آگے چلے گئے۔ دوپہر کے وقت انھوں نے شکاری کتے ایک تنگ گھاٹی میں، جس میں ندی بہتی تھی اور گھنی جھاڑیاں کھڑی تھیں، ڈال دیے۔ نکولائی اوپر بلندی پر کھیت میں، جس کی فصل کٹ چکی تھی اور اب وہاں صرف ناڑے باقی رہ گئے تھے، کھڑا تھا۔ وہاں سے اسے اپنی ساری پارٹی نظر آرہی تھی۔

نکولائی کے سامنے گھاٹی کی دوسری جانب سرمائی رائی کے کھیت تھے اور اس کے اپنے کتوں کے رکھوالے نیچے گھاٹی میں سرخی مائل بادامی جھاڑیوں کے عقب میں اکیلے کھڑے تھے۔ ابھی وہ بمشکل شکاری کتوں کو گھیر گھار کر لائے تھے کہ نکولائی کے کانوں سے ایک کتے، والتوروں کی، جسے وہ جانتا تھا، آواز ٹکرائی۔ وہ وقفے وقفے سے بھونک رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے شکار کی بو پالی ہے۔ دوسرے کتے بھی اس کا ساتھ دینے لگے۔ کبھی وہ بھونکنے لگتے اور کبھی خاموش ہو جاتے۔ چند ثانیے کے بعد اس گھاٹی سے شور وغل سنائی دیا کہ انھیں لومڑ کا سراغ مل گیا ہے۔ سارا غول ندی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔ ان کا رخ رائی کے کھیت کی طرف تھا اور وہ نکولائی سے دور ہٹتے جا رہے تھے۔

اسے ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ گھوڑے دوڑتے اور سرخ ٹوپیوں کے مابین چابک لہراتے نظر آنے لگے۔ سگانِ تازی بھی دکھائی دینے لگے۔ اسے ہر آن یہ توقع تھی کہ گھاٹی کی دوسری جانب رائی کے کھیت میں لومڑ اب منظر عام پر آیا، اب آیا۔

جو رکھوالا وادی میں کھڑا تھا، وہ بھی چل پڑا۔ اس نے اپنے کتوں کی زنجیریں ڈھیلی کر دی تھیں۔ اتنے میں نکولائی کو لومڑ دکھائی دینے لگا۔ یہ عجیب الخلقت جانور تھا۔ اس کی ٹانگیں چھوٹی چھوٹی، رنگت سرخ اور دم پر گھنے بال تھے۔ وہ کھیت کے بیچوں بیچ بھاگا جا رہا تھا۔ کتے کچھ یوں اس کا تعاقب کر رہے تھے کہ اس کی خیر معلوم نہیں ہوتی تھی۔ اب وہ اس کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ لومڑ بھی ایک ہی کایاں تھا۔ وہ بڑی صفائی اور پھرتی سے نیم دائرہ بناتا اور انھیں جُل دے جاتا۔ اس کی دم اس کے پیچھے گھسٹتی آرہی تھی۔ اچانک ایک نامعلوم سفید کتا تیر کی طرح آگے بڑھا، ایک کالا کتا اس کے پیچھے ہو لیا اور پھر وہ سب آپس میں گڈمڈ ہو گئے۔ یوں انھوں نے ستارے کی شکل بنالی۔ ان کے اجسام بمشکل کوئی حرکت کر رہے تھے۔ ان کے سر مرکز کی طرف تھے اور ان کی دمیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں۔ دو رکھوالے گھوڑے دوڑاتے کتوں تک پہنچے۔ ان میں سے ایک کے سر پر سرخ ٹوپی تھی۔ دوسرا کوئی اجنبی تھا۔ وہ سبز کوٹ میں ملبوس تھا۔

"اس کا مطلب کیا ہے؟" نکولائی متعجب تھا۔ "یہ دوسرا رکھوالا کہاں سے آٹپکا؟ 'چچا' کا آدمی تو یہ ہے نہیں۔"

رکھوالوں نے لومڑ کو ٹھکانے لگا دیا اور پھر اسے کاٹھی سے باندھے بغیر وہ کافی دیر تک وہیں کھڑے رہے۔ ان کے اکہری لگام والے گھوڑے، جن کی اونچی اونچی کاٹھیاں دور سے نظر آرہی تھیں، ان کے قریب ایستادہ تھے اور کتے زمین پر لیٹے ہوئے تھے۔ رکھوالے اپنے بازو فضا میں لہرا رہے تھے اور وہ لومڑ کے ساتھ کچھ کر رہے تھے۔ اسی مکان سے ہارن کی آواز سنائی دی — یہ وہ سگنل تھا جو کسی جھگڑے کے موقع پر دیا جاتا تھا۔

"وہ الاگن کے کتوں کا رکھوالا ہے اور ہمارے ایوان کے ساتھ الجھ رہا ہے،" نکولائی کے سائیس نے کہا۔

نکولائی نے سائیس کو حکم دیا کہ وہ جائے اور اس کی ہمشیرہ اور پیتیا کو اس کے پاس بلا لائے۔ پھر وہ دھیمے دھیمے چلتا اس جگہ، جہاں نائب رکھوالے کتے اکٹھے کر رہے تھے، پہنچا۔ متعدد رکھوالے گھوڑوں پر ادھر، جہاں جھگڑا ہو رہا تھا، چل پڑے۔

نکولائی گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ نتاشا اور پیتیا بھی گھوڑوں پر وہیں پہنچ گئے تھے۔ وہ سب شکاری کتوں کے قریب کھڑے تھے اور اس چیز کے منتظر تھے کہ دیکھیں جھگڑے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ جو رکھوالا جھگڑا کر رہا تھا، وہ جھاڑیوں سے برآمد ہوا۔ وہ گھوڑے پر سوار اپنے نوجوان آقا کے پاس پہنچا۔ اس نے لومڑ کاٹھی کے ساتھ باندھ رکھا تھا۔ ابھی وہ کچھ دور تھا کہ اس نے اپنی ٹوپی اتار لی اور قریب پہنچ کر احترام سے بات کرنے کی کوشش کرنے لگا، لیکن اس کا رنگ فق اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ غصے سے اس کے چہرے کی شکل مسخ ہو چکی تھی۔ چوٹ سے اس کی آنکھ نیلی ہو رہی تھی لیکن اسے غالباً اس کا علم بھی نہیں تھا۔

"وہاں کیا ہوا تھا؟" نکولائی نے دریافت کیا۔

"وہ ہمارے کتوں کی آنکھوں کے عین سامنے ہمارا شکار اڑانے کی فکر میں تھا۔ اس لومڑ کو میری کتیا — وہی جو چوہیا رنگت ہے — نے دبوچا تھا... کہتا ہے عدالت میں نالش کردوں گا، ہونہہ! اس نے مجھ سے لومڑ چھیننا چاہا اور میں نے اسے لومڑ ہی دے مارا۔ میں یہ لومڑ لے آیا ہوں، یہ میری کاٹھی کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ اس کا مزہ چکھنا چاہو گے؟" رکھوالے نے اپنے شکاری چاقو کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی تک یہی تصور کر رہا تھا کہ وہ اپنے دشمن سے ہم کلام ہے۔

نکولائی نے اس شخص پر الفاظ ضائع کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے اپنی ہمشیرہ اور پیتیا سے کہا: "تم یہیں انتظار کرو۔" وہ خود گھوڑے پر سوار ہوا اور ادھر، جدھر الاگن کے رکھوالے اکٹھے ہو رہے تھے، چل دیا۔

فاتح رکھوالا گھوڑے پر سوار اپنے ساتھیوں سے جا ملا۔ وہاں وہ ہمدرد اور متجسس ہجوم کی توجہ کا مرکز بن گیا اور اپنے کارنامے کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔

اصل صورت حال یہ تھی کہ الاگن، جس کے ساتھ رستوفوں کا کچھ جھگڑا تھا اور مقدمے بازی بھی چل رہی تھی، ان علاقوں میں، جو رواجاً رستوفوں کی ملکیت میں تھے، شکار کھیلتا رہتا تھا اور اب معلوم ہوتا تھا کہ اس نے عمداً اپنے آدمی، اس علاقے میں، جہاں رستوف شکار کھیل رہے تھے، بھیج دیے تھے اور جس لومڑ کو ان کے کتوں نے دبوچا تھا، اس نے اپنے آدمیوں کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ اسے ہتھیا لیں۔

نکولائی کی الاگن سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی لیکن چونکہ وہ خیالات اور جذبات کے اعتبار سے اعتدال آشنا شخص نہیں تھا، اس لیے اس تک اس کے متکبرانہ اور استبدادی رویے اور زبان درازی کے متعلق جو افواہیں پہنچیں، اس نے انھیں صحیح مان لیا تھا، انھی کی بنیاد پر وہ اس سے دلی نفرت کرنے اور اسے اپنا بدترین دشمن تصور

کرنے لگا تھا۔ چنانچہ اس کا جوش اور غصہ دیدنی تھا۔ وہ غیظ و غضب سے پھنکار رہا تھا اور اس نے اپنا چابک اپنی مٹھی میں بھینچ رکھا تھا۔ وہ اپنے بیری سے نپٹنے کے لیے فیصلہ کن اقدام کرنے اور مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔

ابھی اس نے جنگل کا ایک ہی موڑ کاٹا تھا کہ اس نے ایک ہٹے کٹے شخص کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ نووارد نے اودبلاؤ کی سموری ٹوپی اوڑھ رکھی تھی اور وہ دیدہ زیب مشکی گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کی معیت میں دو سائیس تھے۔ دشمن کی بجائے نکولائی کو الاگن شائستہ اور مہذب جنٹل مین نظر آیا۔ اس کی شکل وصورت سے رعب ٹپک رہا تھا اور وہ نوعمر کاؤنٹ کی طرف دوستی اور اخوت کا ہاتھ بڑھانے کے لیے خاص طور پر بے قرار نظر آ رہا تھا۔ جونہی وہ رستوف کے قریب پہنچا، اس نے اسے اپنی سموری ٹوپی اٹھا کر سلام کیا اور کہا کہ جو کچھ ہوا ہے، اسے اس پر دلی افسوس ہوا ہے، وہ اس شخص کو، جس نے لومڑ کو، جسے دوسروں کے کتوں نے رگیدا تھا، ہتھیانے کی کوشش کی تھی، سخت سزا دے گا۔ اس نے اس امید کا اظہار کیا کہ اب ان کی ایک دوسرے کے ساتھ بہتر جان پہچان ہو جائے گی اور اس نے اسے اپنا جنگل کھنگالنے کی دعوت دی۔

اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس کے بھائی سے کوئی مہیب حرکت نہ سرزد ہو جائے، پریشان و مضطرب نتاشا بھی اس کے پیچھے چل پڑی۔ دونوں کے مابین محض چند قدموں کا فاصلہ تھا۔ جب اس نے حریفوں کو دوستانہ انداز سے علیک سلیک کرتے دیکھا، وہ خود بھی ان کے قریب پہنچ گئی۔ الاگن نے اپنی ٹوپی اور بھی اونچی کر کے نتاشا کو سلام کیا۔ وہ خوشگوار انداز سے مسکرایا اور بولا کہ نوجوان کاؤنٹس، اپنی خوبصورتی اور شوق شکار کی، جس کے متعلق وہ بہت کچھ سن چکا تھا، بنا پر حسن اور شکار کی کنواری دیوی ڈیانا سے مشابہت رکھتی ہے۔

اپنے رکھوالے کے جرم کی تلافی کے طور پر الاگن نے رستوف سے پر اصرار انداز سے کہا کہ وہ اس کے ٹیلے پر، جو وہاں سے پون میل دور تھا، چلا چلے۔ عام طور پر وہ یہ ٹیلا، جس پر اس کے قول کے مطابق خرگوشوں کی بہتات تھی، اپنے لیے مخصوص رکھتا تھا۔ نکولائی نے ہامی بھر لی اور شکاریوں کا ٹولا، جو پہلے سے دوچند ہو گیا تھا، آگے چل پڑا۔

الاگن کے ٹیلے کا راستہ کھیتوں کے بیچوں بیچ جاتا تھا۔ رکھوالے قطار میں چل رہے تھے اور ان کے آقا ایک دوسرے کے ساتھ گھوڑے بڑھائے جا رہے تھے۔ ''چچا'' رستوف اور الاگن ایک دوسرے کے شکاری کتوں کو دزدیدہ نگاہوں سے دیکھتے رہے۔ ان کی کوشش یہ تھی کہ ان کے ہمراہی ان کی یہ حرکات نہ دیکھ سکیں تاہم وہ بڑی بے قراری سے اپنے کتوں کے ممکن رقیب ڈھونڈ رہے تھے۔

رستوف الاگن کی ایک دبلی پتلی، کوتاہ قامت، ابلق اصیل کتیا سے خاص طور پر متاثر ہوا۔ اس کتیا کے عضلات فولادی، تھوتھنی مہین اور آنکھیں سیاہ اور غزالی تھیں۔ اس نے سنا تھا کہ الاگن کے پاس چند بڑے جی دار تازی کتے ہیں اس خوبصورت کتیا میں اسے اپنے ملکا کی رقیب نظر آئی۔

سال گزشتہ کی فصل کے بارے میں بے کیف گفتگو کے، جس کا آغاز الاگن نے کیا تھا، دوران میں نکولائی نے ابلق کتیا کی طرف اشارہ کیا۔

''آپ کی کتیا بہت خوبصورت ہے،'' اس نے لاابالی انداز سے کہا۔ ''بہت تیز طرار ہے؟''

''وہ والی؟ ہاں، اچھی کتیا ہے۔ جس چیز کے پیچھے پڑتی ہے، اسے حاصل کر کے ہی دم لیتی ہے،'' الاگن نے بڑے لاپروایانہ انداز سے اپنی چتکبری کتیا ''یرزا'' کا، جس کی خاطر اس نے گزشتہ سال اپنے گھریلو غلاموں کے تین کنبے اپنے ہمسائے کو دے دیے تھے، ذکر کرتے ہوئے کہا۔ ''چنانچہ، کاؤنٹ، آپ کے علاقے میں فصلیں اتنی اچھی نہیں ہوئیں کہ ان پر فخر کا اظہار کیا جا سکے!'' اس نے جس گفتگو کا آغاز کیا تھا، اس کا سلسلہ دوبارہ بحال کرتے ہوئے کہا۔ تاہم شائستگی کا تقاضا یہ تھا کہ کاؤنٹ نے اس کی کتیا کی جو تعریف کی تھی، اس کے جواب میں وہ بھی کوئی توصیفی کلمہ کہے۔ چنانچہ الاگن نے اس کے کتوں کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیا اور اس نے ملکا کو، جس کی کشادہ پشت اس کی نگاہوں میں جچ گئی تھی، منتخب کر لیا۔ ''آپ کی یہ چتکبری کتیا بہت بڑھیا ہے۔۔۔ اس کا جسم موزوں اور سڈول ہے،'' اس نے کہا۔

''جی ہاں، اچھی ہے، دوڑ لیتی ہے،'' نکولائی نے جواب دیا۔ ''کاش کوئی موٹا تازہ خرگوش یہاں کھیت میں نظر آجاتا، پھر میں تمھیں بتاتا کہ وہ کیا کر سکتی ہے!'' اس نے سوچا۔ اور اس نے اپنے سائیس کی طرف متوجہ ہو کر کہا: ''جو کوئی خرگوش کی نشان دہی کرے گا، میں اسے ایک روبل دوں گا۔''

''سمجھ میں نہیں آتا،'' الاگن نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ''کہ بعض شکاریوں کو دوسروں کے شکار یا کتوں کے بارے میں حسد کیوں ہو جاتا ہے۔ اور کاؤنٹ، جہاں تک میرا تعلق ہے، میں یہ عرض کروں گا کہ اگر مجھے گھڑسواری کے لیے ایسے ساتھیوں کی، جیسے آج ملے ہیں، صحبت میسر آ جائے، تو میں بہت لطف اندوز ہوتا ہوں... بھلا، اس سے بڑھ کر اور کوئی اچھی بات کیا ہو سکتی ہے؟'' (اس نے دوبارہ ٹوپی اٹھا کر نتاشا کو سلام کیا۔)
''لیکن جہاں تک کھالیں گننے اور انھیں اپنے ساتھ لے جانے کا تعلق ہے، مجھے اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔''

''جی، بالکل نہیں!''

''اور مجھے اس بات پر بھی جھنجھلاہٹ نہیں ہوتی کہ فلاں شخص کے کتے نے شکار کیوں دبوچ لیا اور میرے کتے نے کیوں نہیں پکڑا۔۔۔ مجھے تو بس تعاقب میں مزہ آتا ہے۔ کاؤنٹ، آپ کو مجھ سے اتفاق ہے نا؟ اس کے علاوہ میرا خیال ہے۔''

ایک نائب رکھوالے کی للکار ''اوہو'' کی آواز سنائی دی۔ وہ ناڑوں کے مابین چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا تھا۔ اس نے اپنا چابک اوپر اٹھا رکھا تھا اور وہ اپنی للکار دہرا رہا تھا۔ (اس کی اس للکار اور اوپر اٹھے ہوئے چابک کا مطلب یہ تھا کہ اس نے کسی خرگوش کو کہیں بیٹھے دیکھ لیا ہے۔)

''معلوم ہوتا ہے کہ اسے خرگوش کا سراغ مل گیا،'' الاگن نے لاپروائی سے کہا۔ ''کاؤنٹ، آئیں، اس کا پیچھا کرتے ہیں۔''

''جی ہاں، ہمیں ضرور چلنا چاہیے... اکٹھے تعاقب کریں؟'' نکولائی نے یرزا اور ''رچجا'' کے سرخ کتے رگائی

کو نہایت انہاک سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ یہ دونوں کتیا اور کتا وہ رقیب تھے۔ جن کے خلاف اسے اپنے کتوں کو ابھی تک آزمانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ''اگر انھوں نے ابتدا ہی میں میری ملکا کو پچھاڑ دیا، پھر کیا ہوگا؟'' اس نے ''چچا'' اور الاگن کے ساتھ خرگوش کے پیچھے جاتے ہوئے سوچا۔

''موٹا تازہ ہے؟'' الاگن نے رکھوالے کے، جس نے خرگوش کو دیکھا تھا، قریب پہنچ کر پوچھا۔ اس نے جوشیلے انداز سے اپنے چاروں اطراف نظریں دوڑائیں اور سیٹی بجا کر ریزا کو خبردار کیا۔ ''اور آپ میخائیل نکانورچ؟'' اس نے ''چچا'' سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

مؤخرالذکر اپنا گھوڑا بھگائے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے۔

''میں کیوں بیچ میں ٹانگ اڑاؤں؟ اف، تمھارے یہ کتے۔ تم نے ایک ایک کے عوض پورا پورا گاؤں دیا ہے۔ ہزاروں روبل کے ہیں۔ تم ایک دوسرے کے خلاف زور لگاؤ، میرا کیا ہے، میں صرف تماشا دیکھوں گا... ایں، رگائی، ایں!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''رگائی یشکا!'' اس نے مزید کہا اور یوں اس نے اپنے سرخ کتے کے لیے اپنی محبت کا اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، ان کا غیر ارادی طور پر اظہار کر دیا۔

یہ دونوں بزرگ اور اس کا اپنا بھائی، اپنے جس جوش و جذبے کو چھپانے کی کوشش کر رہے تھے، نتاشا کو وہ نظر بھی آ رہا تھا اور وہ اسے محسوس بھی کر رہی تھی۔ وہ خود بھی اسی رو میں بہہ چلی تھی۔

رکھوالا اپنا چابک اوپر اٹھائے ٹیلے پر کھڑا تھا اور شرفا خراماں خراماں اس کے پاس پہنچے۔ کتوں کا وہ غول، جو افق کی پٹی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا، خرگوش سے پرے ہٹ گیا۔ شرفا تو نہیں البتہ رکھوالے بھی ایک طرف ہو گئے۔ ہر کام سج سج اور سوچ سمجھ کر کیا جا رہا تھا۔

''یہ کدھر اشارے کر رہا ہے؟'' نکولائی نے اس رکھوالے کی طرف، جس نے خرگوش کا سراغ لگایا تھا، گھوڑے پر کوئی سو قدم بڑھانے کے بعد پوچھا۔

لیکن پیشتر اس کے کہ رکھوالا کوئی جواب دیتا، خرگوش کے لیے اس پالے کو، جو اگلی صبح پڑنا تھا، بھانپتے ہوئے ساکن بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا اور وہ چھلانگیں لگاتا بھاگنے لگا۔ شکاری کتے، جو زنجیروں میں بندھے ہوئے تھے، پورا زور لگاتے خرگوش کا تعاقب کرنے اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگے۔ چاروں اطراف سے بارزوئی کتے، جو زنجیروں میں بندھے ہوئے نہیں تھے، شکاری کتوں اور خرگوش کے پیچھے بھاگ اٹھے اور پلک جھپکنے میں ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ تمام نائب رکھوالے، جو اب تک کسی قسم کی عجلت یا تیزی کا مظاہرہ کیے بغیر آہستہ آہستہ آگے جا رہے تھے، اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑانے لگے۔ وہ شکاری کتوں کو ''رکو، رکو!'' کی صداؤں سے اور بارزوئی کتوں کو ''اوہو'' کی آوازوں سے اکٹھا کر رہے اور انھیں خرگوش پر چڑھا رہے تھے۔ سنجیدہ و متین الاگن، نکولائی، نتاشا، اور ''چچا'' کے ساتھ برق رفتاری سے ادھر ادھر بھاگا پھر رہا تھا۔ انھیں اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں اور کیسے جا رہے ہیں۔ انھیں کتوں اور خرگوش کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اور ان پر صرف ایک ہی چیز کا خوف سوار

تھا کہ کہیں ایک لحظہ کے لیے بھی شکاران کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائے۔ جس خرگوش کو انھوں نے بھگایا تھا، خاصا تنومند اور تیز رفتار نکلا۔ جب وہ چھلانگ لگا کر اٹھا تھا، اس نے بھاگنے کی جلدی نہیں کی تھی، بلکہ اس نے اپنے کان کھڑے کیے، شور وغل کی آوازیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں، جو چاروں اطراف سے آرہی تھیں، غور سے سنیں اور درجن بھر قندیں بھریں، لیکن اتنی تیزی سے نہیں بلکہ اس نے بارزوئی کتوں کو اپنے قریب آجانے دیا۔ آخر کار جب اسے اپنے خطرے کا صحیح اندازہ ہو گیا اور اس نے جس سمت بھاگنا تھا، وہ بھی منتخب کر لی، تب اس نے اپنے کان پچھلی جانب جھکائے اور سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ وہ ناڑوں کے مابین لیٹا رہا تھا لیکن اس کے سامنے خریف کی فصل کھڑی تھی اور وہاں زمین دلدلی تھی۔ جس رکھوالے نے اس کا سراغ لگایا تھا، اس کے دو تازی کتے چونکہ قریب ترین تھے، اس لیے سب سے پہلے انھیں نے اسے دیکھا اور اس کا پیچھا کیا تھا۔ لیکن وہ ابھی زیادہ دور نہیں گئے تھے کہ الاگن کی ابلق کتیا یرزا آئی اور ان سے آگے نکل گئی۔ اب اس کے اور خرگوش کے مابین صرف ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا۔ اس نے خرگوش کی دم کا نشانہ لیا، برق آسا رفتار سے اس پر چھلانگ لگائی اور لوٹنیاں کھانے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے خرگوش کو اپنے قابو میں کر لیا ہے، تاہم خرگوش بھی کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا، اس نے اپنی پشت کو کمان کی طرح خم دیا اور پہلے سے بھی تیز رفتار سے دوڑنے لگا۔ یرزا کے عقب سے سیاہ دھبوں اور کشادہ پشت والی ملکا نمودار ہوئی اور نہایت سرعت کے ساتھ اپنے اور خرگوش کے مابین فاصلہ کم کرنے لگی۔

''میلوشکا، شاباش، شاباش!'' نکولائی کی فاتحانہ للکار بلند ہوئی۔

بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ ملکا خرگوش کو اپنے جھپٹے میں لے لے گی لیکن اس کی قوت رفتار نے اسے ضرورت سے زیادہ آگے دھکیل دیا اور وہ خرگوش سے، جو اپنی جگہ رک گیا تھا، آگے نکل گئی۔ بانکی سجیلی یرزا پھر آگے بڑھی اور خرگوش کی دم پر یوں منڈلاتی دکھائی دی جیسے وہ فاصلے کا تعین کر رہی ہو تاکہ وہ اس مرتبہ نہ صرف اپنی سابقہ غلطی دہرانے سے محترز رہ سکے بلکہ اسے پچھلی ٹانگ سے پکڑ سکے۔

''یرزنکا، میری گڑیا!'' الاگن کچھ ایسے لہجے سے، جو اس کا اپنا معلوم نہیں ہوتا تھا، گڑگڑایا۔

یرزا نے اس کی منت سماجت کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ عین اس لمحے جب معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے شکار کو دبوچ لے گی، خرگوش نے جھوک کھائی اور سرسبز کھیت اور ناڑوں کے مابین مینڈھ پر فراٹے بھرنے لگا۔ ایک بار پھر یرزا اور ملکا، جو چھکڑے کے بیلوں کی طرح پہلو بہ پہلو بھاگی جا رہی تھیں، اپنے اور خرگوش کے مابین مسافت کم کرنے لگیں لیکن خرگوش کے لیے مینڈھ پر دوڑنا نسبتاً آسان تھا اور کتیوں کے لیے اسے تیزی سے پکڑنا نسبتاً دشوار۔

''رگائی، رگائی یوشکا! ہموار کھیت، صاف راستہ!'' عین اس وقت تیسری آواز کا غلغلہ بلند ہوا اور چچا کے سرخ شکاری کتے رگائی نے اپنی ٹانگیں پھیلائیں، اپنی کمر کو کمان کی طرح نیم خمیدہ کیا اور اپنے سے آگے دونوں کتیوں کو جا لیا، پھر وہ ان سے آگے نکل گیا اور جب وہ خرگوش کے قریب پہنچ گیا، اس نے ہر چہ بادا باد اپنی رفتار میں خوف ناک حد تک اضافہ کر دیا، خرگوش کو ٹکر ماری اور اسے مینڈھ سے نیچے رائی کے کھیت میں گرا دیا۔ اس نے بھیانک رفتار

سے کیچڑ آلود کھیت میں چھلانگ لگائی اور کندھوں تک زمین میں دھنس گیا۔ اب جو کچھ نظر آ رہا تھا، وہ صرف یہ تھا کہ کتا خرگوش کے ساتھ بار بار لڑھکنیاں کھا رہا ہے اور اس کی پشت پر کیچڑ چپک گئی ہے۔

کتوں نے اس کے گرد ستارہ نما حصار بنالیا۔ ایک ثانیے بعد تمام لوگ کتوں کے جھرمٹ کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ صرف ''چچا''، جس کی خوشی سے باچھیں کھلی جا رہی تھیں، گھوڑے سے نیچے اترا، اس نے زور سے خرگوش کو جھنجھوڑا تا کہ اس کا خون نچڑ جائے، اس کا ایک پنجہ کاٹا اور بے قرار ہو کر چاروں اطراف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں اور پاؤں پر رعشہ طاری تھا اور اس کے لیے انھیں سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کس سے مخاطب ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔

''یہ ہوئی نہ بات... کتا تو یہ ہے... سب کو مات دے گیا، خواہ اس کی قیمت ایک روبل تھی یا ایک ہزار! ہموار کھیت، صاف راستہ!'' وہ بولے جا رہا تھا۔ اس کا دم پھول چکا تھا اور وہ اپنے چاروں اطراف یوں خشم ناک نگاہوں سے دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی کو مطعون کر رہا ہو، جیسے وہ سب اس کے حریف ہوں، اس کی توہین کے مرتکب ہوے ہوں اور ان کے ساتھ اگلا پچھلا حساب چکانے کا اسے اب موقع ملا ہو۔ ''تمھارے ہزار ہزار روبل کے کتوں کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے۔ سہانا کھیت — رگائی، یہ دیکھو تمھارے لیے پنجہ!'' اس نے کیچڑ سے لتھڑا ہوا پنجہ، جو اس نے ابھی ابھی کاٹا تھا، پھینکتے ہوے کہا۔ ''تم اس کے مستحق ہو، تم نے اسے زورِ بازو سے کمایا ہے، سہانا کھیت، ہموار راستہ!''

''اس بے چاری نے اپنی جان ہلکان کر دی... تین مرتبہ اکیلی اس پر حملہ آور ہوئی اور یوں اس کا کچومر نکال دیا،'' نکولائی کہہ رہا تھا۔ اس امر سے قطع نظر کہ کوئی اس کی بات سن بھی رہا ہے یا نہیں، وہ اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا، وہ خود بھی تو کسی کی نہیں سن رہا تھا۔

''اس قسم کی بے تکی باتیں کرنے کا فائدہ؟'' الاگن کے سائیس نے کہا۔

''میری کتیا اس سے آگے نکل گئی لیکن وہ اسے اس طرح دھکا دے گئی کہ کوئی پلا بھی با آسانی اسے دبوچ سکتا تھا؛'' الاگن کہہ رہا تھا۔ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے اور جوش و خروش کا مظاہرہ کرتے اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا۔

عین اسی لمحے نتاشا نے سانس روک کر اپنی خوشی کا اظہار وجد آفریں کوک سے کیا۔ کوک اتنی باریک اور تیکھی تھی کہ سبھی کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں۔ اس کے ذریعے اس نے وہ سب کچھ کہہ دیا جو باقی بیک وقت بول کر ادا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ اتنی نامانوس تھی کہ اس شوریدہ چیخ پر خود اسے بھی شرمندگی کا احساس ہوا ہوگا اور اگر کوئی اور سماں ہوتا، دوسرے بھی بھونچکا رہ جاتے۔ ''چچا'' نے بہ نفسِ نفیس خرگوش کی کھال ادھیڑی، اسے بڑی مشاقی اور پھرتی سے اپنے گھوڑے کی پشت پر پھینکا گویا کہ اپنی اس ادا سے وہ باقیوں کی سرزنش کرنا چاہتا ہو اور کسی سے کلام کرنے کا روادار نہ ہو۔ وہ اپنے کمیت گھوڑے پر سوار ہوا، اسے ایڑ لگائی اور وہاں سے چل پڑا۔ دوسروں نے اس کی پیروی کی۔ ان کے منہ لٹکے ہوے اور دل بجھے ہوے تھے۔ صرف خاصا وقت گزر جانے کے بعد ہی وہ بے نیازی کا سابق ملمع ایک بار پھر چڑھانے میں کامیاب ہوے۔ وہ کافی دیر تک سرخ شکاری کتے کو، جو کیچڑ میں

لتھڑا اور اپنی زنجیر کھنکھناتا چہرے پر سکون واطمینان سجائے خراماں خراماں ''چچا'' کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا، گھور گھور کر دیکھتے رہے۔

نکولائی کو کچھ یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس سے یہ کہہ رہا ہو: ''میں باقی کتوں سے کوئی خاص مختلف نہیں۔ فرق صرف تب پڑتا ہے جب معاملہ خرگوش کے تعاقب کا ہو۔ جب ایسی صورت درپیش ہو۔ پھر ہوشیار رہیں!''

کچھ دیر بعد ''چچا'' گھوڑا دوڑاتے نکولائی کے پاس آیا اور اس نے اس سے مخاطب ہو کر کچھ کہا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں کیونکہ جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا، اس کے باوجود ''چچا'' عرش سے فرش پر آ گیا تھا اور اس سے باتیں کر رہا تھا۔

7

شام ڈھلے جب الاگن نے ان سے رخصت لی، نکولائی نے یہ دیکھ کر کہ وہ ابھی تک گھر سے خاصا دور ہیں، ''چچا'' کی دعوت، کہ شکار پارٹی اس کے ننھے منے گاؤں میخائیلووکا میں شب بسری کرے، منظور کر لی۔

''اور اگر تم میرے غریب خانے پر قیام کرو۔ سہانا کھیت، ہموار راستہ۔ چشمِ ماروشن، دلِ ماشاد،'' اس نے کہا۔ ''تم دیکھ رہے ہو کہ موسم مرطوب ہے، تم آرام کر سکتے ہو۔ رہی چھوٹی کاؤنٹس، اسے ٹم ٹم میں واپس پہنچایا جا سکتا ہے۔''

پیشکش منظور کر لی گئی اور ٹم ٹم لانے ایک رکھوالا اترادنایا روانہ کر دیا گیا جب کہ نکولائی، نتاشا اور پیتا گھوڑوں پر ''چچا'' کے گھر کی طرف چل دیے۔

کوئی آدھی درجن چھوٹے بڑے مرد گھریلو غلام اپنے آقا کا استقبال کرنے، بیرونی پورچ کی طرف بھاگتے آئے۔ ہر عمر اور قد کی تقریباً ایک کوڑی باندیوں نے عقبی دروازے سے سر باہر نکالے اور شکاریوں کو، جو واپس آ رہے تھے، دیکھنے لگیں۔ نتاشا۔ عورت ذات، گھڑ سوار خانم۔ کی آمد نے ان کے تجسس کو اس انتہا تک بیدار کر دیا کہ ان میں سے کئی اس کے بالکل قریب پہنچ گئیں، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کے چہرے کو دیکھنے اور اس کی موجودگی میں شرمائے لجائے بغیر اس کے متعلق ایسی باتیں بنانے لگیں جیسے وہ کوئی انسان نہ ہو جو وہ سب کچھ جو اس کے متعلق کہا جا رہا تھا، سن سکتا اور سمجھ سکتا ہو بلکہ وہ کوئی اعجوبہ ہو جس کی کھلے عام نمائش کی جا رہی تھی۔

''اری آرنکا، وہ دیکھو، وہ ایک جانب ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ہے! اس کی سکرٹ جھول رہی ہے... اور وہ چھوٹا ہارن بھی نظر آ رہا ہے!''

''ہائے اللہ! اور چاقو بھی!''

''بالکل تاتارن ہے!''

''آپ سر کے بل گرنے سے کیسے بچ گئیں؟'' ان میں سے دلیر ترین ملازمہ نے براہ راست نتاشا سے پوچھ لیا۔

''چچا'' اپنے تنگ چوبی مکان کی دہلیز پر گھوڑے سے نیچے اتر آیا۔ مکان کے چاروں اطراف باغیچہ تھا اور وہ ضرورت سے زیادہ ہی روئیدگی میں گھرا ہوا تھا۔ جب ''چچا'' کی نظر اپنے ملازمین پر پڑی، اس نے تحکمانہ انداز سے باآواز بلند حکم دیا کہ فالتو لوگ فوراً وہاں سے چلے جائیں اور جو باقی رہ گئے، انھیں بتایا کہ وہ مہمانوں اور نو وارد رکھوالوں کے آرام اور خاطر تواضع کے لیے خاطر خواہ انتظامات کریں۔

تمام باندیاں اور غلام تتر بتر ہو گئے۔ ''چچا'' نے اپنے ہاتھوں سے نتاشا کو گھوڑے سے نیچے اتارا، اس کا ہاتھ تھاما اور اس کے ساتھ پورچ کی بوسیدہ سیڑھیاں چڑھنے لگا۔

اندرون خانہ صفائی ستھرائی کا خاص خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ چوبی شہتیروں پر پلستر نہیں تھا۔ آثار بتا رہے تھے کہ مکینوں کا منشا اسے بے عیب طریقے سے صاف ستھرا رکھنا نہیں ہے، تاہم ایسی بھی کوئی بات نہیں تھی جس سے معلوم ہوتا کہ اسے بالکل ہی اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ غلام گردش میں تازہ سیبوں کی خوشبو رچی بسی تھی اور اس کی دیواروں پر بھیڑیوں اور لومڑیوں کی کھالیں لٹک رہی تھیں۔

''چچا'' غلام گردش میں سے اپنے مہمانوں کو چھوٹے ہال کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک میز، جسے تہہ کیا جا سکتا تھا، اور سرخ رنگ کی کرسیاں دھری تھیں۔ وہاں سے وہ ڈرائنگ روم میں، جس میں ایک صوفہ اور برج کی گول میز پڑی تھی، داخل ہوئے۔ اس سے آگے سٹڈی روم تھا۔ اس میں ایک شکستہ صوفہ، بوسیدہ قالین، جنرل سواروف، میزبان کے والد والدہ اور خود اس کی اپنی فوجی وردی میں تصاویر تھیں۔ کمرے میں تمباکو اور کتوں کی بو، جو نتھنوں میں گھسی جا رہی تھی، پھیلی ہوئی تھی۔

مہمانوں کو بٹھانے اور انھیں آرام کا مشورہ دینے کے بعد ''چچا'' سٹڈی روم سے باہر نکل گیا۔ رگائی، جس کی پشت ابھی تک کیچڑ میں لتھڑی ہوئی تھی، آیا اور صوفے پر لیٹ گیا۔ پیتا اپنی کہنی پر جھکا اور آناً فاناً سو گیا۔ نتاشا اور نکولائی آپس میں باتیں کیے بغیر بیٹھے رہے۔ ان کے چہرے تمتما رہے تھے۔ وہ ہشاش بشاش تھے لیکن ان کے پیٹوں میں چوہے دوڑ رہے تھے۔ انھوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا (اب جب کہ شکار کا دھندا ختم ہو چکا تھا اور وہ گھر کے اندر بیٹھے ہوئے تھے، نکولائی کو اپنی ہمشیرہ کے سامنے اپنے مردانہ تفوق کا اظہار کرنا غیر ضروری معلوم ہوا۔)، نتاشا نے اپنے بھائی کو آنکھ ماری اور دونوں میں سے کوئی بھی زیادہ دیر تک اپنی ہنسی پر قابو نہ رکھ سکا۔ ابھی وہ جواز بھی تلاش نہ کر پائے تھے کہ کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔

چند ثانیے بعد ''چچا'' واپس آ گیا۔ اس نے قازق کوٹ، نیلی پتلون اور اونچے بوٹ پہن لیے تھے۔ نتاشا کو محسوس ہوا کہ یہ پہناوا — جب ''چچا'' اسے پہن کر اترادنایا آیا تھا، اسے دیکھ کر نتاشا کو حیرت بھی ہوئی تھی اور اس میں اسے دل لگی کا سامان بھی نظر آیا تھا — بالکل بے عیب ہے اور کسی اعتبار سے بھی سوالوٹیل[13] یا فراک کوٹ سے کم تر نہیں ہے۔ ''چچا'' بھی ترنگ میں تھے۔ بہن بھائی کی ہنسی پر ناک بھوں چڑھانا تو دور کی بات تھی (وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عین ممکن ہے کہ وہ اس کے رہن سہن کا ہی مذاق اڑا رہے ہوں)، وہ خود بھی ان کے بے ساختہ قہقہوں

میں شریک ہو گیا۔

''خیر، یہ نوجوان کاؤنٹس — سہانا کھیت، ہموار راستہ — اس جیسی خاتون سے کبھی واسطہ نہیں پڑا تھا!'' اس نے ایک پائپ، جس کی نال لمبی تھی، نکولائی کو تھماتے اور دوسرے میں مشاق انداز سے تین انگلیوں سے تمبا کو بھرتے ہوئے کہا۔ (اس نے اپنا پائپ چھوٹا کرالیا تھا۔) ''یہ سارا دن زین پر بیٹھی رہی — یوں بیٹھے بیٹھے تو مرد بھی تنگ آجاتا — لیکن یوں نظر آرہا ہے جیسے اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی۔''

''چچا'' کی دوبارہ آمد کے کچھ ہی دیر بعد دروازہ کھلا — آہٹ سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کسی ننگے پاؤں ملازم دوشیزہ نے کھولا ہوگا — اور ایک بھاری بھرکم، گل عذار اور خوش رو عورت، جو چالیس کے پیٹے میں ہوگی اور جس کی ٹھوڑی دوہری اور ہونٹ کالماً سرخ تھے، اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں خاصی بڑی اور لدی پھندی ٹرے تھی۔ اس نے مہمانوں پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں اور ایک ایک حرکت سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ انھیں پروقار اور پرتپاک انداز سے خوش آمدید کہہ رہی ہے۔ وہ خوش ترکیبی سے مسکرائی اور اس نے انھیں جھک کر سلام کیا۔ اپنے غیر معمولی جثے کے باوجود، جو اسے اپنا سر پیچھے جھکانے پر مجبور کر رہا تھا جب کہ اس کا سینہ اور پیٹ آگے کو نکلا ہوا تھا، یہ عورت (وہ چچا کی منتظمہ خانہ تھی) غیر معمولی پھرتی سے قدم آگے بڑھا رہی تھی۔ وہ میز کے قریب پہنچی، ٹرے نیچے رکھی اور اس کے نرم و گداز سفید ہاتھ بوتلوں، مچھلیوں، گوشت، ترکاریوں اور زیتون کے انواع و اقسام کے طعام اور دیگر لذیذ اشیا نہایت مشاقی اور مہارت سے ترتیب دینے لگے۔ جب وہ اپنا کام ختم کر چکی، وہ واپس دروازے کے پاس چلی گئی اور چہرے پر تبسم سجائے وہاں کھڑی ہو گئی۔ ''یہ میں ہوں — میں! اب تم سمجھ گئے ہو کہ 'چچا' کیا چیز ہے؟'' رستوف کو اس کا انداز کہتا محسوس ہو رہا تھا۔ اسے سمجھے بنا بھلا کوئی بات بنتی تھی؟ ''چچا'' جس کی پیشانی پر شکنیں اور ہونٹوں پر سلوٹیں تھیں، انیسیا فیودرَوْنا کی اندر آمد پر جس خوش باش اور مطمئن انداز سے مسکرانے لگا، اس کا مفہوم نہ صرف نکولائی بلکہ نتاشا کی سمجھ میں بھی آ گیا۔ ٹرے پر مختلف اقسام کی تیز اور خوشبودار شرابیں، نباتاتی برانڈی، کھنبیاں، لسی میں بنے ہوئے رائی کیک، چھتے میں رکھا ہوا شہد، جھاگ دار اور بے جھاگ دونوں انواع کی مے، جو شہد سے کشید کی گئی تھی، کچے اور بھنے ہوئے گری دار میوے، سیب، شہد اور گری دار میووں سے بنی ہوئی مٹھایاں اور پیسٹریاں تھیں۔ بعد میں انیسیا فیودرونا تازہ بھنے ہوئے مرغ اور گوشت کے تِقلے، جام اور مربے لائی۔

یہ تمام اشیا اس نے اپنے ہاتھوں سے بنائی تھیں۔ اس نے خود ہی ان کے اجزا منتخب کیے اور خود ہی انھیں تیار کیا تھا۔ انھیں دیکھ کر انیسیا فیودرونا کی شکل نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتی تھی: وہی رسیلاپن، وہی صفائی ستھرائی، وہی دودھیا ملگجاپن، وہی فرحت بخش تبسم، کہ بس آدمی انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔

''چھوٹی لیڈی، کاؤنٹس، ذرا یہ آزما کر دیکھیں،'' وہ بار بار کہتی اور نتاشا کو کبھی ایک اور کبھی دوسری چیز پیش کر دیتی۔

نتاشا نے ہر چیز سے اپنے کام و دہن کی تواضع کی۔ وہ سوچ رہی تھی: ''میں نے زندگی میں لسی کے ایسے

مزے دار کیک، ایسے لذیذ جام اور مربے، ایسا خوش ذائقہ شہد اور گری دار میووں کی مٹھائیاں یا اس طرح کے بھنے ہوئے مرغ نہ کہیں دیکھے اور نہ چکھے تھے۔ واہ واہ، سبحان اللہ!"

انیسیا فیودرونا واپس چلی گئی۔

سہ پہر کے بعد چیری کی برانڈی کا دور چلا اور رستوف اور "چچا" ماضی اور مستقبل کے شکاروں، رگائی اور الاگن کے کتوں کے متعلق باتیں کرنے لگے۔ نتاشا تن کر صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور وہ ان کی گفتگو انہماک سے سن رہی تھی۔ اس نے متعدد بار پیتا کو جگانے اور اسے کچھ کھلانے پلانے کی کوشش کی لیکن وہ کچھ ایسے گھوڑے بیچ کر سویا تھا کہ آنکھ کھولے بغیر بے ربط انداز سے کچھ بڑبڑا کر رہ جاتا۔ اس بیگانے ماحول میں نتاشا اتنی شاداں و فرحاں تھی کہ اسے جس واحد چیز کا خوف تھا، وہ یہ تھی کہ کہیں ٹم ٹم جلدی نہ آ جائے۔ باتوں کے دوران میں ایسے وقفے بھی آتے جب ناگہانی طور پر گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو جاتا اور محفل پر خاموشی چھا جاتی۔ جب آدمی پہلی مرتبہ اپنے گھر پر اپنے دوستوں کی خاطر تواضع کرتا ہے، تو خاموشی کے ایسے وقفے آ ہی جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک وقفے کے بعد "چچا" نے بر سبیل تذکرہ وہ بات، جو مہمانوں کے اذہان میں بھی گردش کر رہی تھی، چھیڑ دی۔

"چنانچہ یہ تو تم نے دیکھ ہی لیا،" اس نے کہا، "کہ میں اپنی زندگی کے آخری ایام کیسے گزار رہا ہوں... موت اٹل ہے، اسے ایک نہ ایک دن آنا ہی ہے — سہانا کھیت، ہموار راستہ — اور کچھ باقی نہیں بچے گا۔ پھر گناہوں کا ارتکاب کیوں کیا جائے؟"

"چچا" کے خدوخال سے نہ صرف اس کے جذبات وعزائم کا اظہار ہو رہا تھا بلکہ وہ خوبصورت بھی نظر آ رہا تھا۔ رستوف کو یاد آیا کہ اس کا باپ اور تمام پڑوسی "چچا" کا ذکر ہمیشہ اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔ سارے علاقے میں اس کی شہرت یہ تھی کہ وہ بھلے اعجوبہ شخص سہی لیکن وہ تھا انتہائی شریف النفس اور بے غرض انسان۔ ریاکاری اسے چھو کر نہیں گئی تھی۔ خاندانی تنازعات میں اسے ثالثی کا فریضہ سونپا جاتا، وصیت ناموں کی تعمیل کے لیے اسے منتخب کیا جاتا اور لوگ اپنے رازوں کا امین اسے بناتے۔ اسے جج بھی چنا گیا، بار بار سرکاری مناصب پیش کیے گئے لیکن وہ اپنی ضد پر اڑا رہا اور اس نے کبھی کوئی عہدہ قبول نہ کیا۔ وہ خریف اور ربیع کے ایام اپنے کمیت آختہ گھوڑے کی کمر پر اپنے کھیتوں میں گزارتا، سردیوں میں گھر کے اندر بیٹھا رہتا اور گرمیوں میں اپنے باغیچے میں، جہاں سبزے اور روئیدگی کی بہتات تھی، چہل قدمی کرتا رہتا۔

"چچا، آپ نے ملازمت کیوں نہ اختیار کی؟"

"میں نے ملازمت کی تھی لیکن چھوڑ دی تھی، میں اس کے لیے موزوں نہیں تھا۔ مجھے اس کا سر پیر کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یہ تم جیسے لوگوں کے لیے ہے — جس کا کام، اسی کو ساجھے۔ میرا اس میں ذہن کام نہیں کرتا۔ رہا شکار — یہ بالکل مختلف قسم کا شغل ہے — سہانا کھیت، ہموار راستہ — وہ دروازہ کھول دو!" اس نے چلا کر کہا۔ "تم نے اسے بند کیوں کر دیا ہے؟"

غلام گردش کے، جسے ''چچا'' گلام غروش کہتا تھا، اختتام پر ایک دروازہ تھا۔ یہ شکاریوں کے کمرے میں کھلتا تھا۔ اصلاً یہ کمرا ان ملازموں کے، جو شکار میں ساتھ جاتے تھے، لیے تھا۔ وہاں تیز تیز ننگے پاؤں کی آہٹ سنائی دی اور کسی نادیدہ ہاتھ نے رکھوالوں کے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ غلام گردش سے روسی رباب (balalaika) کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے کوئی ایسا شخص، جو لاریب اپنے فن کا استاد تھا، بجا رہا تھا۔ نتاشا کچھ دیر سے موسیقی کی دھنیں سن رہی تھی۔ اب وہ غلام گردش میں چلی گئی تا کہ وہ انھیں بہتر طور سے سن سکے۔

''وہ میرا کوچوان متکا ہے... میں نے اسے بہت عمدہ رباب خرید دیا تھا۔ مجھے یہ پسند ہے،'' ''چچا'' نے کہا۔

متکا کا یہ دستور تھا کہ جب ''چچا'' شکار سے واپس لوٹتا، وہ شکاریوں کے کمرے میں رباب بجاتا۔ ''چچا'' یہ موسیقی سنتا اور اس پر سر دھنتا۔

''کتنا اچھا بجا رہا ہے! واقعی بہت اچھا ہے،'' نکولائی نے کہا۔ اس کے لہجے میں خاص نوع کی غیر شعوری نخوت تھی جیسے اسے یہ تسلیم کرتے عار آ رہا ہو کہ اسے موسیقی میں بہت لطف آ رہا ہے۔

''بہت اچھا؟'' اپنے بھائی کے لہجے کے جواب میں نتاشا نے سرزنش کرتے ہوئے کہا۔ ''اچھا، یہاں صحیح لفظ نہیں ہے — یہ سرتاپا مسحور کن ہے!''

جس طرح ''چچا'' کی کھنبیاں، شہد اور شرابیں نتاشا کو دنیا میں لذیذ ترین معلوم ہوئی تھیں، اسی طرح اس وقت یہ موسیقی بھی اسے غنائی لطف کی معراج معلوم ہوئی۔

''مکرر، مکرر،'' جونہی موسیقی ختم ہوئی، نتاشا نے، جو دروازے کے قریب کھڑی تھی، کہا۔

متکا نے سُر ٹھیک کیے اور وہ دوبارہ ''محبوبۂ من'' کی تانیں الاپنے لگا۔ وہ تار کبھی دباتا، کبھی کھینچتا اور کبھی ان پر پھرتی سے انگلی چلاتا اور یوں وہ اپنی تان میں کھنک اور تنوع پیدا کر رہا تھا۔ ''چچا'' اپنا سر ایک طرف جھکائے اسے بغور سن رہا تھا اور اس کے ہونٹوں پر ہلکی پھلکی مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ''محبوبۂ من'' کی لے کوئی سو مرتبہ دہرائی گئی۔ رباب کے سُر ایک سے زیادہ بار درست کیے گئے اور اس کے بعد وہی تانیں دوبارہ الاپی گئیں لیکن سامعین کی طبیعتیں سیر نہ ہوئیں اور انھیں بار بار سننے کی خواہش ان کے قلوب میں امنڈتی رہی۔ انیسیا فیودرونا اندر آئی اور اپنا کیم شیحم جسم دروازے کے بازو پر لٹکا کر کھڑی ہو گئی۔

''چھوٹی کاؤنٹس، اسے ذرا اب سنیں،'' اس نے ایسی مسکراہٹ سے، جو غیر معمولی طور پر ''چچا'' سے مشابہ تھی، کہا۔ ''ہمارا متکا حقیقتاً ساز بجا سکتا ہے۔''

''وہ یہ سُر تی ٹھیک سے نہیں بجا رہا،'' ''چچا'' نے ایکا ایکی پوری قوت سے بازو لہرا کر کہا۔ ''یہاں سُر لہر دار ہونا چاہیے — سہانا کھیت، ہموار راستہ — لہر دار!''

''آپ کو ساز بجانا آتا ہے؟'' نتاشا نے دریافت کیا۔

''چچا'' بس مسکرا دیا لیکن اس نے جواب کوئی نہ دیا۔

''انیسی اشکا، ذرا دیکھو کہ میرے گٹار کے تار درست ہیں یا نہیں۔ مدتیں ہوگئیں، میں نے انھیں چھوا تک نہیں — سہانا کھیت، ہموار راستہ — میں یہ کام چھوڑ چکا ہوں۔''

انیسیا فیودرونا اپنے آقا کے حکم کی تعمیل میں بلا تامل چل پڑی اور گٹار اٹھا لائی۔

''چچا'' نے کسی جانب دیکھے بغیر پتلی پتلی پھونکوں سے گٹار کی گرد جھاڑی، ساؤنڈنگ بورڈ[14] پر اپنی استخوانی انگلیاں کھٹکھٹائیں، سر ٹھیک کیے اور اپنی بازوؤں والی کرسی پر آرام سے ٹک گیا۔ اس نے قدرے تھیٹرانہ انداز سے اپنا بایاں بازو کمان کی طرح ٹیڑھا کیا، فنگر بورڈ[15] سے ذرا اوپر گٹار کو پکڑا، انیسیا فیودرونا کو آنکھ ماری اور اس کے ساتھ ہی واحد سر، پاکیزہ اور پرشوکت، اٹھایا، پھر وہ دھیرے دھیرے ''محبوبۂ من'' کی نہیں بلکہ مشہور زمانہ گیت ''گلی میں دوشیزہ چلی آئی'' کی تانیں الاپنے لگا۔ اس کا انداز پرسکون، شائستہ اور پراعتماد تھا۔ نکولائی اور نتاشا کے قلوب میں نغمے کی نپی تلی شگفتگی سے — وہی شگفتگی جو انیسیا فیودرونا کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی — جوش و مسرت کی لہریں موجزن ہونے لگیں۔ انیسیا فیودرونا کا چہرہ لالوں لال ہو رہا تھا، اس نے اسے رومال میں چھپایا اور ہنستے مسکراتے کمرے سے باہر نکل گئی۔ ''چچا'' اپنے بے عیب، مشقت طلب اور پرزور انداز سے ساز پر گیت الاپتا رہا۔ دریں اثنا اس کی نگاہیں ٹکٹکی باندھے مسلسل اس جگہ کو، جہاں انیسیا فیودرونا کھڑی تھی، دیکھتی رہیں۔ اس کی ہیئت منقلب ہو چکی تھی اور یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے القا ہو رہا ہو۔ اس کی سفید مونچھوں تلے ہلکی پھلکی مسکراہٹ اس کے دہن کے ایک جانب نمایاں ہونے لگی اور جوں جوں گیت آگے بڑھتا گیا، تانیں تیز سے تیز تر ہوتی چلی گئیں اور اس کی مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ اور جہاں کہیں پرشکوہ توڑ آتا، تار جھنجھنا اٹھتے۔

''خوبصورت، روح پرور، چچا! مکرر! مکرر!'' جونہی گیت ختم ہوا، نتاشا نے چلا کر کہا۔ پھر وہ قلانچیں بھرتی آگے آئی، چچا کو اپنی بانہوں میں بھینچا اور اس کے گال چوم لیے۔ ''نکولینکا، نکولینکا،'' اس نے اپنے بھائی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اپنی حیرت کا اظہار کرنے کے لیے اسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے۔

چچا کی کارکردگی پر نکولائی بھی خوشی سے دیوانہ ہوا جا رہا تھا اور گیت کی دھن ایک بار پھر بجائی گئی۔ انیسیا فیودرونا کا مسکراتا چہرہ دروازے میں نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے چہرے تھے...

چشمے سے پانی نکالتے وہ چلایا
جانِ من، ذرا ٹھہر جا، یہ میری التجا ہے

''چچا'' نے یہ ٹکڑا ایک بار پھر دہرایا، پرشکوہ انداز سے سر اٹھایا، کندھے جھٹکائے اور گیت ختم کر دیا۔

''انکل ڈارلنگ، ابھی بجائیں، اور بجائیں،'' نتاشا نے ملتجیانہ انداز سے واویلا کیا جیسے اس کی زندگی کا دارومدار اسی پر ہو۔

''چچا'' اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت اس کی ذات میں دو اشخاص سما چکے ہیں۔ ایک سنجیدہ اور

گمبھیر انداز سے دوسرے کی طرف، جو رنگین مزاج اور خوش طبع تھا، مسکرا رہا تھا، جب کہ رنگین مزاج اور خوش طبع شخص نے وہ معصومانہ اور رسمی انداز، جو رقص کی تمہید ہوتا ہے۔ اپنالیا۔

''اری ننھی منی بھتیجی!'' اس نے اپنا ہاتھ، جس سے اس نے ابھی ابھی سر نکالے تھے، نتاشا کی طرف لہراتے ہوے باآواز بلند کہا۔

نتاشا نے اپنی شال اتار پھینکی، لپک جھپک آگے آئی اور چچا کے سامنے کھڑی ہوگئی۔ اس نے دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے، اپنے شانوں کو جنبش دی اور رقص کا پوز بنالیا۔

اس نوخیز کاؤنٹس نے، جس کی تعلیم و تربیت ایک فرانسیسی گورنس کے، جو انقلابِ فرانس کے بعد ترکِ وطن کر کے روس آبسی تھی، ہاتھوں ہوئی تھی، کب، کہاں اور کیسے اس روسی فضا سے، جس میں وہ سانس لیتی تھی، اس رقص کی روح اپنی ذات میں سمولی تھی؟ اس نے وہ انداز، جو خیال کیا جاسکتا ہے کہ فرانسیسی رقص pas de chale (شال ڈانس) نے کبھی کا نیست و نابود کر دیا ہوگا، کہاں سے اپنالیا؟ لیکن اس کی چال ڈھال اور حرکات میں اصلاً روسی روح سمٹی ہوئی تھی۔ یہ چیزیں نہ سکھائی جاسکتی ہیں اور نہ ان کی نقل اتاری جاسکتی ہے۔ لیکن ''چچا'' اس سے جو توقع کر سکتا تھا، یہ اس کے عین مطابق تھیں۔ جس آن اس نے رقص کا پوز بنایا اور وہ اپنی تفاخرانہ، فاتحانہ اور دانستگانہ ہنسی ہنسی، تو ابتدا میں نکولائی اور دوسروں پر جو یہ خوف سوار ہوا کہ شاید وہ رقص کا صحیح پوز اختیار نہ کر سکے، از خود زائل ہوگیا اور وہ بلا توقف اس کی تعریفوں کے پل باندھنے لگے۔

اس کی کارکردگی اتنی بے عیب، اتنی کاملاً بے عیب تھی، کہ انیسیا فیودرونا کی، جس نے جھٹ پٹ اپنا رومال، جس کی اسے رقص میں ضرورت تھی، اس کے حوالے کر دیا تھا، آنکھیں نم ناک ہوگئیں حالانکہ وہ تب بغلیں بجارہی تھی جب وہ اس چھریری، بانکی سجیلی اور طرح دار کاؤنٹس کو دیکھ رہی تھی، جو وہ سب کچھ جو انیسیا، انیسیا کے ماں باپ اور خالہ اور ہر روسی مرد و زن کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا: سمجھنے میں کامیاب رہی تھی حالانکہ اس کی پرورش ریشم و کمخواب میں ہوئی تھی اور اس کا تعلق جس دنیا سے تھا، وہ اس کی دنیا سے قطعی مختلف تھی۔

''خوب، بہت خوب! ننھی کاؤنٹس — سہانا کھیت، ہموار راستہ!'' ''چچا'' چلا چلا کر کہہ رہا تھا اور خوشی کے عالم میں قہقہے لگا رہا تھا۔ ''بہت اعلیٰ، بھتیجی! اب ہمارے کرنے کا ایک ہی کام ہے کہ تمھارے لیے کوئی خوبصورت نوجوان بر ڈھونڈیں —''

''ایک تو پہلے ہی ڈھونڈا جاچکا ہے،'' نکولائی نے مسکراتے ہوے کہا۔

''اچھا!'' ''چچا'' نے متحیر ہو کر کہا اور وہ استفہامیہ انداز سے نتاشا کو دیکھنے لگا۔ نتاشا نے خوشی سے سرشار ہو کر اور لبوں پر تبسم پھیلا کر تائید کر دی۔

''اور وہ اتنے اچھے ہیں!'' وہ بول پڑی۔

جونہی اس کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، اس کے دماغ میں خیالات و جذبات کا نیا سلسلہ چل نکلا۔ ''جب نکولائی

یہ کہہ کر کہ "وہ تو پہلے ہی ڈھونڈا جا چکا ہے" مسکرایا تھا، اس کی مسکراہٹ کا کیا مفہوم تھا؟ کیا وہ خوش ہے یا رنجیدہ ہے؟ نظر آتا ہے کہ اس کے خیال میں بلکونسکی اس قسم کے رونق میلے کی غایت نہیں سمجھ سکیں گے اور نہ اسے پسند کریں گے۔ لیکن وہ سب کچھ سمجھ جائیں گے۔ "پر وہ اس وقت ہیں کہاں؟" وہ متعجب تھی اور اس کا چہرہ یک دم سنجیدہ ہو گیا۔ تاہم یہ کیفیت صرف ایک سیکنڈ رہی۔ "اس بارے میں مت سوچ، ایسا خیال بھی دل میں نہ لاؤ" اس نے اپنے آپ کو بتایا اور وہ خندہ دہن، خندہ جبیں "چچا" کے قریب بیٹھ گئی اور اس سے التجا کرنے لگی کہ وہ مزید کچھ دیر ساز بجائے۔

چچا نے ساز پر ایک اور گیت کی دھن اور والز رقص کی گت بجائی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اپنا گلا صاف کیا اور اپنا پسندیدہ شکاری گیت گانے لگا۔

جب شام ڈھلے

زمستاں کی اولیں اور دلکش برف باری ہوئی۔۔۔

"چچا" کے گانے کا انداز بالکل دیہاتی کسانوں کا تھا۔ کتنے سادہ دل ہیں یہ لوگ! انھیں پورا یقین ہوتا ہے کہ گیت کے پورے معانی الفاظ میں مضمر ہوتے ہیں، یہ کہ دھن بے ساختہ آتی ہے اور شعر کو، جس کے بغیر یہ کچھ بھی نہیں رہتی، محض اجاگر کرنے اور اس کا وزن متعین کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے۔ چنانچہ اس دھن میں، جس میں آورد کا شائبہ تک نہیں تھا، وہی غیر معمولی دلکشی تھی جو پرندے کے گیت میں ہوتی ہے۔ چچا کی گلوکاری نے نتاشا پر وجد کی کیفیت طاری کر دی۔ اس نے جی میں ٹھان لیا کہ وہ بربط کے اسباق نہیں لے گی اور اپنی ساری توجہ صرف گٹار پر لگا دے گی۔ اس نے چچا سے گٹار مانگی اور آناً فاناً گیت کے سر اٹھا لیے۔

نتاشا اور پیتیا کو واپس لے جانے کے لیے تقریباً دس بجے چھوٹی ویگن[16] اور دروشکی[17] پہنچ گئیں۔ ان کی حفاظت کے لیے تین ملازم بھی ہمراہ تھے۔ ایک ملازم نے بتایا: "کاؤنٹ اور کاؤنٹس کو قطعاً معلوم نہیں کہ آپ لوگ کہاں ہیں۔ وہ آپ کے بارے میں بہت فکر مند ہیں۔"

پیتیا کو لاش کی طرح اٹھا کر لایا گیا اور اسے چھوٹی ویگن میں لٹا دیا گیا۔ نکولائی اور نتاشا دروشکی میں بیٹھ گئے۔ "چچا" نے نتاشا کو دوشالہ اوڑھا دیا اور اسے نئی طرح کی شفقت اور ملائمت سے خدا حافظ کہا۔ وہ پل تک پیدل ان کے ساتھ آیا۔ پل پر سے گاڑیاں نہیں گزر سکتی تھیں، چنانچہ انھیں اپنی گاڑیاں ندی میں ڈالنا پڑیں اور یوں اسے عبور کیا۔ "چچا" نے اپنے چند نوکر چاکر، جن کے پاس لالٹینیں تھیں، ساتھ کر دیے، وہ گاڑیوں کے آگے آگے چلنے لگے۔

"پیاری ننھی بھتیجی، خدا حافظ!" تاریکی میں اس کی آواز سنائی دی لیکن یہ وہ آواز نہیں تھی جس سے نتاشا پہلے شناسا تھی، بلکہ یہ وہ آواز تھی جس نے "جب شام ڈھلے" گایا تھا۔

گاؤں میں، جس کے بیچوں بیچ وہ گزرے، سرخ روشنیاں چمک رہی اور دھوئیں کی خوشگوار مہک پھیلی ہوئی تھی۔

"یہ چچا کتنے پیارے ہیں!" بڑی سڑک پر پہنچنے کے بعد نتاشا نے کہا۔

''ہاں،'' نکولائی نے جواب دیا۔ ''تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی؟''

''نہیں، میں بالکل، بالکل ٹھیک ہوں۔ میں بے حد خوش ہوں!'' نتاشا نے کہا۔ اس کے دل میں جو جذبات موج زن تھے، انھوں نے اسے صریحاً الجھن میں ڈال دیا تھا۔

وہ کافی دیر خاموش رہے۔

رات اندھیری اور مرطوب تھی۔ انھیں گھوڑے نظر نہیں آ رہے تھے، صرف نادیدہ کیچڑ میں ان کے چھپکے اڑانے کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

اس معصوم صفت اور اثر پذیر روح میں، جو زندگی کے گوناگوں اور متنوع تاثرات کو قبول کر رہی اور انھیں اپنے اندر جذب کر رہی تھی، کیا کیا خیالات اور احساسات سر اٹھا رہے تھے؟ وہ سب اس کے دل و دماغ میں کس طرح سما گئے؟ لیکن وہ مسرت سے بے حال ہو رہی تھی۔ جب وہ گھر کے نزدیک پہنچنے لگے، وہ اچانک ''جب شام ڈھلے'' کی دھن گنگنانے لگی۔ وہ سارا راستہ اسے یاد کرنے کی سعی کرتی رہی تھی اور آخر کار اسے اپنی گرفت میں لینے میں کامیاب ہو گئی۔

''یاد آ گئی؟'' نکولائی نے پوچھا۔

''نکولینکا، تم ابھی ابھی کیا سوچ رہے تھے؟''

انھیں ایک دوسرے سے یہ سوال پوچھنے کا بہت شوق تھا۔

''میں؟'' نکولائی نے تراخ سے جواب دیا۔ وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''خیر، تمھیں معلوم ہونا ہی چاہیے۔ پہلی بات، جو میں سوچ رہا تھا، یہ ہے کہ رگائی، وہی سرخ کتا 'چچا' سے مشابہ ہے اور یہ کہ اگر وہ انسان ہوتا، وہ اگر شکار کے لیے نہیں تو کم از کم ہم آہنگی کے لیے 'چچا' کو ضرور ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا۔ 'چچا' واقعی مونس و دم ساز آدمی ہے! تمھارا کیا خیال ہے؟... خیر، چھوڑو، تم کیا سوچ رہی تھیں؟''

''میں؟ ایک منٹ ٹھہرو... بس ایک منٹ۔ پہلے تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہاں ہماری گاڑیاں چل رہی ہیں اور ہم سمجھتے ہیں کہ ہم گھر جا رہے ہیں لیکن صرف خداوند جانتا ہے کہ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ہم کہاں جا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہم ایکا ایکی کسی ایسے مقام پر، جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہو کہ یہ اترادنایا تو نہیں، پہنچ جائیں اور ہم یہ سوچنے لگیں کہ عین ممکن ہے کہ یہی پرستان ہو۔ اور پھر میں نے سوچا... نہیں، بس یہی کچھ تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ تم غالباً اس کے بارے میں سوچ رہی تھیں،'' نکولائی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نتاشا اس کی آواز سن کر بتا سکتی تھی کہ وہ مسکرا رہا ہے۔

''نہیں۔'' نتاشا نے کہا حالانکہ وہ واقعتاً اس وقت پرنس آندرے کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں یہ خیال بھی آیا تھا کہ ''چچا'' کے بارے میں اس کا رویہ کیا ہوتا۔ ''پھر سارا راستہ میں اپنے آپ سے یہ کہتی رہی کہ انیسیا نے اپنے فرائض کتنی خوبصورتی سے نبھائے اور کس خوبصورتی...''

اور نکولائی کو اس کی بے ساختہ، گونج دار اور مسرت سے بھرپور ہنسی کی آواز سنائی دی۔

''اور تم جانتے ہو،'' وہ اچانک گویا ہوئی۔ ''مجھے یقین ہے کہ مجھے اس وقت جو راحت اور سکون میسر ہے، دوبارہ کبھی نہیں مل سکے گا۔''

''واہیات ــ لغو باتیں مت کرو!'' نکولائی نے کہا اور وہ سوچنے لگا: ''میری یہ نتاشا کتنی پیاری ہے! اس جیسا دوست نہ مجھے ملا ہے اور نہ ملے گا۔ آخر اسے بیاہ رچانے کی ضرورت کیوں پیش آ گئی ہے؟ میں اس کی معیت میں اس طرح کا سفر ہمیشہ کر سکتا ہوں!''

''میرا یہ نکولائی کتنا پیارا ہے!'' نتاشا سوچ رہی تھی۔

''ارے، ڈرائنگ روم میں ابھی تک بتیاں جل رہی ہیں،'' اس نے گھر کے دریچوں کی طرف، جو رات کی مرطوب اور مخملیں تاریکی میں جھلملا رہے تھے اور ان کے لیے چشم براہ تھے، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

8

کاؤنٹ الیا آندریچ شرفا کے مارشل کے منصب سے مستعفی ہو گیا تھا کیونکہ اس کی وجہ سے اسے ضرورت سے زیادہ اخراجات اٹھانا پڑتے تھے تاہم اس کے مالی امور میں پھر بھی اصلاح کے کوئی آثار نمودار نہ ہوئے۔ نکولائی اور نتاشا نے اکثر اپنے والدین کو پریشانی کے عالم میں اور چھپ چھپ کر آپس میں صلاح مشورے کرتے دیکھا اور انھیں ماسکو میں رستوفوں کے عالی شان اور بیش قیمت آبائی مکان اور ماسکو کے مضافات میں اپنی جاگیر فروخت کرنے کے متعلق باتیں کرتے سنا۔ اب جب کہ کاؤنٹ 'مارشل آف دی نوبیلیٹی' نہیں رہا تھا، ان کے لیے وسیع پیمانے پر پرتکلف دعوتیں منعقد کرنے کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی، چنانچہ سابقہ برسوں کے مقابلے میں اترادنایا میں ان کے ایام نسبتاً سکون اور خاموشی سے گزر رہے تھے، تاہم ان کے وسیع وعریض مکان اور اس سے ملحق عمارتوں میں اب بھی لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا اور ہر روز دسترخوان پر بیس سے زیادہ حالی موالی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ ان میں سے بیشتر ان کے اپنے احباب تھے، وہ ان کے گھر میں آباد ہو چکے تھے اور تقریباً خاندان کے ارکان بن چکے تھے۔ چند ایک اصحاب ایسے بھی تھے جن کے لیے کاؤنٹ کے گھر میں بسیرا کرنا بظاہر امر مجبوری بن چکا تھا۔ ان میں موسیقار ڈِملر[19] اور اس کی اہلیہ، استادِ رقص فوگل اور اس کا خاندان، ایک غیر شادی شدہ بزرگ خاتون بیالووا، جس نے یہیں اپنا گھر بنا لیا تھا اور بہت سے دوسرے لوگ شامل تھے۔ ان دوسرے لوگوں میں پیتیا کے ٹیوٹر، لڑکیوں کی سابقہ گورنس اور مختلف دیگر اشخاص شمار کیے جا سکتے تھے۔ یہ سبھی اپنے گھروں میں رہنے کے بجائے کاؤنٹ کے مکان کو اپنا ڈیرا بنانے کو ترجیح دیتے تھے یا اس میں انھیں زیادہ منفعت نظر آتی تھی۔ اگرچہ باہر سے مہمان اب پہلے کی نسبت کم آتے تھے لیکن ان کے اپنے رہن سہن میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی کیونکہ کاؤنٹ اور کاؤنٹس کسی دوسرے اسلوب سے زندگی بسر کرنے کے متعلق سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ شکاریات کا لاؤ لشکر جوں کا توں تھا۔ بلکہ نکولائی نے اس میں

مزید اضافہ کر دیا تھا۔ کہ اصطبلوں میں پچاس گھوڑے اور پندرہ سائیس تھے۔ نام دن کے مواقع پر حسب سابق قیمتی تحائف دینے اور اس کے ساتھ ساتھ پر شکوہ ضیافتیں، جن میں سارے ضلع کے لوگوں کو مدعو کیا جاتا، منعقد کرنے کا سلسلہ جاری تھا۔ کاؤنٹ اب بھی تاش کے کھیل وسٹ (Whist) اور بوسٹن کھیلتا۔ کھیل کے دوران میں وہ پتے کچھ اس انداز سے پکڑتا کہ ہر شخص انھیں دیکھ سکتا اور یوں اس کے پڑوسی روزانہ اس کے سینکڑوں روبلوں پر ہاتھ صاف کر جاتے۔ ان ہمسایوں کے نزدیک کاؤنٹ کے ساتھ بازی لگانا آمدنی کا منفعت بخش ذریعہ بن گیا تھا۔

کاؤنٹ نے اپنے معاملات کے بارے میں جو طرز عمل اپنا رکھا تھا، وہ ایسے ہی تھا جیسے وہ کسی عظیم الجثہ جال کے اندر چل پھر رہا ہو۔ اس کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ کہیں اسے یہ یقین نہ آجائے کہ وہ پھندے میں گرفتار ہو چکا ہے، لیکن ہر قدم جو وہ اٹھاتا تھا، وہ اسے اس میں مزید الجھا دیتا تھا اور اسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ اب اس میں نہ اتنی سکت باقی رہی ہے کہ جس پھندے نے اسے پھانس لیا ہے، وہ اسے توڑ سکے اور نہ اتنا صبر وضبط کہ وہ اس کی گرہیں کھول سکے۔ کاؤنٹس کا پیار بھرا دل اسے بتا رہا تھا کہ اس کے بچے تباہی کے غار میں دھکیلے جا رہے ہیں لیکن اسے محسوس ہوتا تھا کہ اس میں کاؤنٹ کا کوئی دوش نہیں کیونکہ وہ جو کچھ تھا، اس کے علاوہ وہ اور کچھ بن ہی نہیں سکتا تھا، اور یہ کہ خود اسے اپنی اور اپنے بچوں کی بربادی کا پورا پورا شعور تھا اور یہ شعور اسے کسی پل چین نہیں لینے دیتا تھا (حالانکہ وہ اپنی اس بے چینی کو پردۂ اخفا میں رکھنے کی پوری کوشش کرتا تھا۔) کاؤنٹس اس صورت حال کا مداوا ڈھونڈنے کے لیے مغز ماری کرتی رہتی تھی لیکن اس کا نسوانی نقطۂ نظر اسے اس مسئلے کا صرف ایک ہی حل بتاتا تھا۔ کہ نکولائی کسی متمول اور صاحب جائیداد دوشیزہ کے ساتھ شادی کرلے۔ وہ محسوس کرتی تھی کہ یہ ان کی امید کی آخری کرن ہے اور اگر نکولائی نے اس رشتے کو بھی، جو اس نے اس کے لیے تلاش کیا تھا، قبول کرنے سے انکار کر دیا، پھر ان کے سارے سہانے خواب چکنا چور ہو جائیں گے اور وہ اپنی شان وشوکت کبھی بحال نہیں کرسکیں گے۔ یہ رشتہ جُولی کاراگنا کا تھا۔ وہ معزز اور راست باز والدین کی بیٹی تھی۔ رستوف اسے بچپن سے جانتے تھے اور اب جب کہ اس کا آخری بھائی موت سے ہم کنار ہو چکا تھا، وہ وسیع وعریض جائیداد کی واحد وارث تھی۔

کاؤنٹس نے براہ راست جولی کی والدہ کو ماسکو خط تحریر کیا تھا۔ اس میں اس نے آپس کے بچوں کے مابین رشتے کی تجویز پیش کی تھی اور اسے خاطر خواہ جواب موصول ہوا تھا۔ جولی کی والدہ نے اپنے جواب میں لکھا تھا: ''جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے، مجھے اس رشتے میں کوئی عذر نہیں، تاہم ہر بات کا دارومدار میری بیٹی کے میلانات وخواہشات پر ہوگا۔'' اس نے نکولائی کو ماسکو آنے کی دعوت دی۔

کاؤنٹس نم ناک آنکھوں سے متعدد مواقع پر اپنے بیٹے کو جتا چکی تھی کہ اب جب کہ اس کی دونوں بیٹیوں کی تقدیر طے ہو چکی ہے، اس کی واحد خواہش صرف یہ رہ گئی ہے کہ اس کا بیٹا دلہن لے آئے۔ وہ کہتی کہ اگر یہ معاملہ پایۂ تکمیل تک پہنچ گیا، پھر وہ سکون واطمینان سے اپنی لحد میں جا سوئے گی۔ پھر وہ اسے بتاتی کہ اس کے ذہن میں ایک خوش شکل اور خوش اطوار دوشیزہ ہے اور اس سے پوچھتی کہ شادی کے بارے میں اس کے اپنے نظریات کیا ہیں۔

بعض دوسرے مواقع پر وہ اس کے سامنے جولی کی تعریفوں کے پل باندھ دیتی اور نکولائی کو مشورہ دیتی کہ وہ سیر و تفریح کے لیے ماسکو چلا جائے اور وہاں کی زندگی سے لطف اٹھائے۔ نکولائی بھانپ گیا کہ اس کی والدہ کی باتوں کا رخ کس طرف ہے اور اس قسم کے ایک مکالمے کے دوران میں اس نے اصرار کیا کہ وہ کھل کر بات کرے۔ اس پر اس نے اسے صاف الفاظ میں بتادیا: ''ہمارے معاملات میں اتنا بگاڑ آچکا ہے کہ انھیں درست کرنے کا صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا ہے کہ تم جولی سے شادی کرلو۔''

''لیکن ماما، فرض کریں، مجھے ایک ایسی لڑکی سے، جو بالکل تہی دست ہے، پیار ہے، کیا آپ پھر بھی مجھ سے یہ توقع کریں گی کہ میں دولت کی خاطر اپنے جذبات کا گلا گھونٹ دوں اور اپنی عزت داؤں پر لگادوں؟'' اس نے اپنی والدہ سے پوچھا۔ اس کے سوال میں کتنی سفاکی تھی، اس کا اسے اندازہ ہی نہیں تھا۔ وہ تو محض یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ وہ دیانت دار اور بااصول شخص ہے۔

''نہیں، تم میری بات ٹھیک طرح نہیں سمجھ پائے،'' اس کی ماں نے کہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنے موقف کو صحیح کیسے ثابت کرے۔ ''نکولینکا، تم نے مجھے غلط سمجھا ہے۔ میں تو صرف تمھاری خوشی چاہتی ہوں'' اس نے مزید کہا۔ وہ محسوس کررہی تھی کہ وہ راست گوئی سے کام نہیں لے رہی اور پراگندہ ذہن ہورہی ہے۔ وہ رونے لگی۔

''ماما، ڈیئر ماما، آپ روتی کیوں ہیں؟ آپ صرف اتنا فرمادیں کہ آپ چاہتی کیا ہیں اور آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے ذہنی سکون کی خاطر سر دھڑ کی بازی لگادوں گا،'' نکولائی نے کہا۔ ''میں آپ کی خاطر اپنا سب کچھ، حتیٰ کہ اپنے جذبات بھی قربان کردوں گا۔''

لیکن کاؤنٹس اس طرح دست سوال دراز نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے بیٹے سے کسی قربانی کا تقاضا کرنے کی خواہش مند نہیں تھی، اس کی قربانی سے پہلے وہ اس کی خاطر اپنی ذات کی قربانی دے سکتی تھی۔

''نہیں، تم میری بات سمجھے ہی نہیں۔ اچھا، چھوڑو اس قصے کو،'' اس نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''شاید میں واقعی کسی نادار لڑکی سے محبت کرتا ہوں،'' نکولائی نے اپنے آپ سے کہا۔ ''کیا مجھے روپے کی خاطر واقعی اپنے جذبات کا گلا گھونٹنا ہوگا؟ اپنی عزت کو داؤں پر لگانا ہوگا؟ سمجھ میں نہیں آتا کہ ماما نے اس طرح کی تجویز میرے سامنے رکھی ہی کیوں؟ چونکہ سونیا مفلس ہے، مجھے اس سے محبت نہیں کرنا چاہیے، اس کی وفاشعار اور سچی محبت سے آنکھیں چرالینا چاہیے؟ اور سچی بات یہ ہے کہ جولی جیسی کسی گڑیا کی نسبت میں اس کے ساتھ کہیں زیادہ خوش رہوں گا۔ میں اپنے جذبات پر حکم نہیں چلاسکتا،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''اگر مجھے سونیا سے پیار ہے، پھر میرے نزدیک یہ جذبہ کسی دوسری چیز کی نسبت کہیں زیادہ قوی اور ارفع و اعلیٰ ہے۔''

نہ نکولائی ماسکو گیا اور نہ کاؤنٹس نے شادی کے متعلق اس سے دوبارہ بات کی، لیکن وہ یہ دیکھ کر کہ اس کے بیٹے اور بے جہیز سونیا کے مابین محبت کی پینگیں روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہیں، جی ہی جی میں کڑھتی رہی، تلملاتی

رہی اور غصے سے بل کھاتی رہی۔ اور اگرچہ وہ اپنے آپ کو کوستی رہتی تھی کہ وہ اس قسم کی حرکت کیوں کرتی ہے، پھر بھی اس سے رہا نہ جاتا، وہ سونیا کو دیکھ کر بڑبڑانے لگتی، اس میں مین میکھ نکالتی رہتی اور جب اس سے بات کرتی، بڑی اکڑفوں سے اسے "مائی ڈیئر" کہہ کر مخاطب کرتی اور بے تکلفانہ "تم" کی جگہ رسمی "آپ" کہتی۔ مشفق و مہربان کاؤنٹس کو جس چیز سے سخت کوفت ہوتی، وہ یہ تھی کہ اس کی یہ مفلس و قلاش سیاہ چشم بھانجی بالکل اللہ میاں کی گائے ہے، اتنی منکسر المزاج، اتنی نیک طینت، اپنے محسنوں کی اتنی جی جان سے احسان مند اور نکولائی کے ساتھ اتنی وفا شعار، پرثبات اور بے غرض محبت میں گرفتار، کہ اس میں عیوب تلاش کرنے کی کوئی وجہ جواز نہیں تھی۔

نکولائی نے اپنی بقیہ چھٹی اپنے والدین کے ہاں ہی گزاری۔ روم سے پرنس آندرے کا خط موصول ہوا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ اگر گرم آب و ہوا میں اس کا زخم غیر متوقع طور پر دوبارہ نہ کھل جاتا، وہ کبھی کا عازم روس ہو چکا ہوتا لیکن موجودہ صورت حال میں وہ اپنی وطن روانگی سال نو کے آغاز تک معرض التوا میں ڈالنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ نتاشا کی اپنے منگیتر کے ساتھ محبت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا، اسے ابھی تک محبت میں وہی سکون مل رہا تھا اور وہ زندگی کی مسرتوں میں اب بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی، تاہم مفارقت کے چوتھے مہینے کے اختتام پر اس پر افسردگی کے دورے پڑنا شروع ہو گئے۔ ان کا توڑ کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اسے اپنے آپ پر ترس آنے اور اس بات کا افسوس رہنے لگا کہ اس عرصے کے دوران میں اس کی جسمانی اور ذہنی صلاحیتیں خواہ مخواہ ضائع ہوتی رہی ہیں اور وہ کسی کے کام بھی نہیں آسکی ہے جب کہ اس کی سوچ یہ تھی کہ اس میں محبت کرنے اور کرانے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔

رستوفوں کے گھر میں زندگی کی لہر بہر اور چہک مہک عنقا تھی۔

9

کرسمس آگئی۔ گرجے میں رسمی عبادت کی گئی، ہمسایوں اور خانگی غلاموں کو سنجیدہ اور دُو بھر انداز سے مبارک بادیاں دی گئیں اور تمام افراد خانہ نے نئے ملبوسات زیب تن کیے۔ یہ سب کچھ تو تھا لیکن ان کے علاوہ اور کوئی بات ایسی نہ ہوئی جس سے یہ عندیہ ملتا کہ ان چھٹیوں کو شایان شان طریق سے منانے کا کوئی خاص اہتمام کیا گیا ہے، درآں حالیکہ موسم بے عیب انداز سے ٹھہرا ہوا تھا۔ درجہ حرارت بے شک نقطہ انجماد سے تیرہ درجے فارن ہائیٹ[19] نیچے تھا لیکن دن کو آنکھیں چکا چوندھ کر دینے والی دھوپ پڑتی تھی اور رات کو آسمان ستاروں سے جگمگا اٹھتا تھا۔ اس قسم کے موسم کا تقاضا تھا کہ کرسمس ذرا دھوم دھڑکے سے منائی جاتی۔

ہفتہ کرسمس کے تیسرے روز ڈنر کے بعد افراد خانہ مختلف کمروں میں منتشر ہو گئے۔ دن کا یہ وقت انتہائی بیزار کن تھا۔ نکولائی، جس نے چاشت پڑوسیوں کے ہاں حاضری دیتے گزاری تھی، سٹنگ روم میں محو خواب تھا۔ معمر کاؤنٹ

روسی میں "تم" اور "تو" ہوگا۔

اپنے سٹڈی روم میں استراحت کر رہا تھا۔ سونیا ڈرائنگ روم میں گول میز کے سامنے بیٹھی تھی اور کشیدہ کاری کا کوئی نمونہ اتار رہی تھی۔ کاؤنٹس اکیلی ہی تاش کے کھیل ''پیشنس'' میں مصروف تھی۔ مسخرہ ناستاسیا ایوانوونا، جس کے چہرے پر افسردگی ٹپک رہی تھی، دو بڑی بوڑھیوں کے ساتھ کھڑکی کے قریب بیٹھا تھا۔ نتاشا کمرے میں آئی، سیدھی سونیا کے پاس گئی، جو کچھ وہ کر رہی تھی، اس پر ایک نظر ڈالی، پھر کمرے کی دوسری جانب اپنی ماں کے پاس پہنچی اور چپ سادھے کھڑی ہو گئی۔

''یہ تم دھوبی کے کتے کی طرح کیا آوارہ گردی کر رہی ہو؟'' اس کی ماں نے پوچھا۔ ''کیا چاہیے؟''

''مجھے وہ چاہئیں... ابھی اور اسی وقت! مجھے وہ چاہئیں!'' اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں لیکن اس کے چہرے پر تبسم نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

کاؤنٹس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور متلاشی نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

''مجھے مت دیکھیں، ماما، مجھے مت دیکھیں، نہیں تو میں رونے بیٹھ جاؤں گی۔''

''بیٹھو— یہاں آؤ اور میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

''ماما، مجھے وہ چاہئیں۔ آخر مجھے یونہی ضائع ہونے کے لیے کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟''

اس کی آواز ٹوٹ گئی اور اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ہو گیا۔ انھیں چھپانے کے لیے اس نے فی الفور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔ وہ سٹنگ روم میں پہنچی، کچھ دیر اپنے خیالوں میں گم صم وہیں کھڑی رہی اور پھر باندیوں کے کمرے کی طرف چل دی۔ وہاں ایک ادھیڑ عمر خادمہ ایک نوجوان لڑکی کو، جو اس کے سامنے کھڑی تھی، ڈانٹ ڈپٹ کر رہی تھی۔ لڑکی ابھی ابھی غلاموں کے سرد کمرے سے بھاگ کر آئی تھی اور ہانپ رہی تھی۔

''کافی ہو چکی، اب کھیلنا ویلنا بند! ہر کام کا وقت ہوتا ہے۔''

''کوندراتیونا، اسے جانے دو،'' نتاشا نے کہا۔ ''ماوروشا، جاؤ۔''

ماوروشا کی گلوخلاصی کرانے کے بعد نتاشا ہال روم میں سے گزرتی پیش دالان میں چلی گئی۔ وہاں ایک معمر وردی پوش ملازم اور اس کے دو نوجوان چھچے تاش کھیل رہے تھے۔ اس کی آمد پر انھوں نے پتے ایک طرف پھینک دیے اور کھڑے ہو گئے۔

''ان سے کیا کراؤں؟'' نتاشا نے تعجب سے سوچا۔

''نکیتا، ذرا جانا... (اسے کہاں بھیجوں؟)۔ ہاں، ذرا باڑے تک جاؤ اور میرے لیے ایک مرغا لے آؤ۔ اور ہاں، مِشا، تم جئی کے چند دانے اٹھا لاؤ۔''

''مٹھی بھر جئی؟'' مشا پہلے ہی کمر باندھے کھڑا تھا اور خوش بھی۔

''جاؤ، بھاگ کر جاؤ،'' معمر آدمی نے زور دے کر اس سے کہا۔

''اور فیودر، تم ذرا چاک لے آؤ۔''

واپسی پر جب وہ اشیائے خورونوش کے کمرے کے قریب سے گزری، اس نے حکم دیا کہ ساوار چولھے پر چڑھا دیا جائے حالانکہ ابھی چائے کا وقت نہیں ہوا تھا۔ فوکا بٹلر گھر کا انتہائی بدمزاج شخص تھا اور نتاشا کو ہمیشہ یہ بات آزمانے میں بہت لطف آتا تھا کہ ''دیکھوں تو سہی کہ اس پر میرا کتنا اختیار چلتا ہے؟'' اسے اس کے حکم پر یقین نہ آیا اور وہ یہ دریافت کرنے چلا گیا کہ آیا ساوار کی واقعی ضرورت ہے۔

''اف، یہ چھوٹی بی بی بھی خوب ہیں!'' فوکا نے نتاشا پر جھوٹ موٹ کا غصہ جھاڑتے ہوئے کہا۔

گھر کا کوئی فرد بھی نوکروں اور نوکرانیوں کو نہ اتنا بھگاتا دوڑاتا تھا اور نہ انھیں اتنا ستاتا تھا جتنا کہ نتاشا کرتی تھی۔ جونہی ان میں سے کسی پر اس کی نظر پڑتی، اس سے کچھ نہ کچھ کرانے کو اس کا جی مچلنے لگتا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ پرکھنا چاہتی ہے کہ کوئی اس کے حکم پر ناک بھوں چڑھاتا ہے اور اس پر غصہ کھاتا ہے یا نہیں۔ لیکن کسی کے احکام کی اتنی خوش دلی سے تعمیل نہیں ہوتی تھی جتنی کہ اس کے۔

''کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟'' وہ غلام گردش میں دھیرے دھیرے چلتی سوچ رہی تھی۔

''ناستاسیا ایوانوونا، میرے بچے کس قسم کے ہوں گے؟'' اس نے مسخرے سے، جو زنانہ کوٹ پہنے اس کی جانب آ رہا تھا، پوچھا۔

''پسّو، کابلی مکھیاں، ٹڈے،'' مسخرے نے جواب دیا۔

''ہائے اللہ، ہائے اللہ! ہمیشہ یہی جواب ملتا ہے۔ اف! کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟''

اور وہ دھپ دھپ پاؤں اٹھاتی، گرتی بھاگتی، زینہ چڑھنے لگتی۔ اس کا ارادہ فوگل اور اس کی بیوی سے، جو سب سے آخری منزل پر رہتے تھے، ملنے کا تھا۔ دو گورنسیں فوگلوں کے ساتھ میز کے، جس پر کشمش، اخروٹ اور بادام کی پلیٹیں دھری تھیں، سامنے بیٹھی تھیں اور اس بات پر بحث کر رہی تھیں کہ ماسکو سستا ہے یا اودیسہ[21]۔ نتاشا بیٹھ گئی، سنجیدہ اور پرفکر انداز سے ان کی گفتگو سنتی رہی اور دوبارہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جزیرہ مڈغاسکر[22]،'' اس نے کہا۔ ''مڈ۔ غا۔ س۔ کر،'' اس نے ایک ایک جوڑ واضح اور غیر مبہم انداز سے ادا کرتے ہوئے کہا۔ اور جب مادام شوس نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے، وہ اس کی بات کا جواب دیے بغیر کمرے سے باہر نکل گئی۔

اس کا بھائی پیتیا بھی بالائی منزل پر تھا۔ وہ اپنے ٹیوٹر کے ساتھ پھلجھڑیاں، جو رات کو چھوڑی جانا تھیں، تیار کر رہا تھا۔

''پیتیا! پیتیا!'' اس نے اسے آواز دی۔ ''مجھے نیچے لے چلو!''

پیتیا بھاگتا بھاگتا آیا اور اس کے سامنے پشت جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جست لگا کر اس پر سوار ہو گئی اور اپنے بازو اس کی گردن میں حمائل کر دیے۔ وہ اسے اٹھائے ادھر ادھر کدکڑے لگاتا پھرا۔

''بس اتنا کافی ہے.... جزیرہ مڈغاسکر...'' اس نے کہا، اس کی پشت سے چھلانگ لگائی اور پھر وہ نیچے سیڑھیاں اترنے لگی۔

کچھ ایسے تھا جیسے وہ اپنی شاہی مملکت کا معائنہ کر چکی ہو، اپنے اختیارات کی آزمائش کر چکی ہو اور اپنے آپ کو یقین دلا چکی ہو کہ اگرچہ ہر کوئی اس کا مطیع و فرمانبردار ہے، بہرحال یہ سب کچھ بے کیف و بے لطف تھا۔ نتاشا بال روم میں چلی گئی۔ اس نے اپنا گٹار اٹھایا، اس کے ساتھ کتابوں کی ایک الماری کے پیچھے تاریک کونے میں جا بیٹھی اور اس کے تاروں پر انگلیاں پھیرنے لگی۔ اس نے اس اوپیرا کی، جو اس نے پیٹرز برگ میں پرنس آندرے کی معیت میں دیکھا تھا، موسیقی کی ایک دھن یاد کی اور اسے دھیمے دھیمے دہرانے لگی۔ اس کے گٹار سے جو آوازیں برآمد ہو رہی تھیں، دوسرے سامعین کو بے شک ان میں کوئی معانی نظر نہ آتے، لیکن خود اس کے اپنے ذہن میں یادوں کا پورا سلسلہ تازہ ہو رہا تھا۔ وہ کتابوں کی الماری کی اوٹ میں بیٹھی تھی، اس کی نگاہیں روشنی کی ایک لکیر پر، جو اشیائے خورونوش کے کمرے سے برآمد ہو رہی تھی، مرکوز تھیں، وہ خود ہی بجا رہی، خود ہی سن رہی اور یادیں تازہ کر رہی تھی۔ اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ رہ رہ کر اس کا دھیان ماضی کی طرف جا رہا تھا۔

سونیا اشیائے خورونوش کے کمرے کے قریب سے گزری۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ نتاشا کی نظر اس پر اور دروازے کی درز پر پڑی اور اسے یوں محسوس ہوا کہ اسے یاد آ گیا ہے کہ اس نے اس سے پہلے بھی اس دروازے کی درز میں سے روشنی کی کرن کو چھن چھن کر باہر آتے اور سونیا کو ہاتھ میں گلاس پکڑے ادھر سے گزرتے دیکھا تھا۔

''ہاں، بالکل اسی طرح ہوا تھا،'' نتاشا نے سوچا۔

''سونیا، یہ کیا ہے؟'' اس نے ایک تار جھنجھناتے پوچھا۔

''اوہ، تم وہاں ہو!'' سونیا نے گھبرا کر کہا اور اس کی بات سننے اس کے پاس چلی آئی۔ ''پتا نہیں... طوفان؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے مسکراتے کہا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں وہ غلط بات نہ کہہ بیٹھی ہو۔

''وہ مارا! یہ اس وقت بھی اسی طرح گھبرائی تھی اور اسی طرح ڈرتے ڈرتے مسکراتے آئی تھی،'' نتاشا کے ذہن میں خیال آیا۔ ''بعینہٖ اس سے بھی مجھے یہی محسوس ہوا تھا کہ اس میں کسی چیز کی کمی ہے۔''

''نہیں، یہ 'دلو'[23] کے کورس کا ٹکڑا ہے۔ سنو!'' اور نتاشا کورس کی دھن گنگنانے لگی تاکہ سونیا اسے سمجھ سکے۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''اس گلاس کا پانی تبدیل کرنے۔ میرا ڈیزائن ختم ہوا چاہتا ہے۔''

''تم کرنے کے لیے ہمیشہ کچھ نہ کچھ ڈھونڈ ہی لیتی ہو، مجھے کچھ نہیں ملتا،'' نتاشا نے کہا۔ ''اور ہاں، نکولینکا کہاں ہے؟''

''میرا خیال ہے، سو رہے ہیں۔''

''سونیا، جاؤ اور اسے جگا دو،'' نتاشا نے کہا۔ ''اسے کہو کہ میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں آئے اور گانا گائے۔''

وہ کچھ دیر مزید یونہی بیٹھی رہی۔ وہ یہ سوچ کر کہ یہ واقعہ پہلے بھی پیش آیا تھا، پھر اس کا مطلب کیا ہوا، حیران وسرگرداں ہوتی رہی۔ تاہم اس مسئلے کو حل کیے بغیر اور اپنی ناکامی پر کسی قسم کے تردد کا ذرا بھی اظہار کیے بنا وہ اپنے تصورات میں ان وقتوں کو جب وہ اس کے ساتھ ہوتا تھا اور اسے پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوتا تھا، یاد کرنے لگی۔

''کاش وہ جلدی آ جائیں! میرے دل میں ہول اٹھ رہا ہے کہ یہ کبھی نہیں ہوگا! اور بدترین بات یہ ہے کہ میری عمر ڈھل رہی ہے، اصل مصیبت یہی ہے! وہ دن دور نہیں جب میں وہ نہیں ہوں گی جو اب ہوں۔ پر شاید وہ آج آ جائیں گے۔ شاید وہ ابھی پہنچ جائیں گے! شاید وہ آ چکے ہیں اور ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔ شاید وہ کل آئے تھے اور میں ہی بھول گئی ہوں۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی، گٹار نیچے رکھا اور ڈرائنگ روم کی طرف چل پڑی۔ سارا خانگی حلقہ۔ ٹیوٹر، گورنسیں اور مہمان۔ میز کی چائے کے اردگرد بیٹھا تھا۔ ان کے پیچھے نوکر چاکر کھڑے تھے۔ لیکن پرنس آندرے وہاں نہیں تھا اور زندگی حسب معمول رواں دواں تھی۔

''اخاہ، وہ آ گئی ہے!'' کاؤنٹ الیا آندریچ نے نتاشا کو آتے دیکھ کر کہا۔ ''آؤ اور میرے پاس بیٹھ جاؤ۔''

لیکن نتاشا اپنی ماں کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ ادھر ادھر یوں نگاہیں گھما پھرا رہی تھی جیسے اسے کسی چیز کی تلاش ہو۔

''ماما،'' وہ بڑبڑائی، ''انھیں مجھے دے دو، انھیں مجھے دے دو، ماما، فوراً، ابھی!'' اور ایک بار پھر اسے اپنی سسکیوں پر قابو پانے میں مشکل پیش آئی۔

وہ میز پر بیٹھ گئی اور اپنے بزرگوں اور نکولائی کے، جو میز پر پہنچ چکا تھا، مابین مکالمہ سننے لگی۔

''اف، میرے خدایا، میرے خدایا! وہی چہرے، وہی باتیں۔ پاپا بالکل ویسے ہی ہاتھ میں کپ پکڑے ہوئے ہیں اور بالکل ویسے ہی اس پر پھونکیں مار رہے ہیں!'' نتاشا نے سوچا۔ وہ یہ محسوس کر کے دہشت زدہ ہو گئی کہ اسے اپنے سارے کنبے سے کراہت، جس میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا، ہونے لگی ہے کیونکہ ان کے رویے اور اطوار ہمیشہ یکساں رہتے ہیں۔

چائے کے بعد نکولائی، سونیا اور نتاشا سٹنگ روم میں چلے گئے اور اپنے پسندیدہ کونے میں، جہاں ہمیشہ بے تکلف گفتگو ہوتی تھی، بیٹھ گئے۔

10

''کیا تمھارے ساتھ کبھی ایسا ہوا ہے،'' نتاشا نے اپنے بھائی سے، جب وہ سٹنگ روم میں بیٹھ گئے، پوچھا، ''کیا تمھیں کبھی محسوس ہوا ہے کہ کبھی کچھ وقوع پذیر نہیں ہوگا۔ کچھ نہیں اور یہ کہ ہر اچھی شے ماضی کا حصہ بن چکی ہے؟ اور کیا کبھی تمھیں یہ احساس ہوا ہے کہ تم اتنا بور نہیں ہو رہے جتنا اداسی نے تم پر غلبہ پا لیا ہے؟''

''ہاں، میرا خیال ہے کہ ایسا ہوتا ہے!'' اس نے جواب دیا۔ ''کبھی کبھی میرے ساتھ ایسا ہوا ہے۔ بظاہر ہر شے اچھی بھلی ہے، ہر شخص مسرور و مطمئن ہے لیکن اچانک مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں ان سب سے تنگ آ گیا ہوں اور یہ کہ ہم سب فنا ہو جائیں گے۔ ایک روز جب رجمنٹ کے لوگ کوئی جشن منا رہے تھے اور میں اس میں شریک نہیں ہو سکا تھا، موسیقی کی دھنیں بج رہی تھیں... ایکا ایکی مجھ پر اتنی افسردگی طاری ہو گئی...''

''ارے ہاں، میں اس کیفیت سے آگاہ ہوں۔ آگاہ ہوں، آگاہ ہوں،'' نتاشا بیچ میں بول پڑی۔ ''جب میں ابھی ننھی منی بچی تھی، تب بھی میرے ساتھ ایسا ہو جایا کرتا تھا۔ تمھیں وہ دن یاد ہیں جب مجھے آلوچوں کی وجہ سے سزا ملی تھی؟ تم سب لوگ ناچ کود رہے تھے اور میں کلاس روم میں بیٹھی سسکیاں بھر رہی تھی۔ میں اتنا روئی، اتنا روئی کہ زندگی بھر بھلا نہیں پاؤں گی۔ مجھے ہر شخص پر — اپنے آپ پر اور دنیا کے ہر شخص پر — ترس آنے لگا، رحم آنے لگا۔ اور دکھ کی بات یہ ہے کہ میں نے کیا بھی کچھ نہیں تھا،'' نتاشا نے کہا۔ ''تمھیں یاد ہے؟''

''مجھے یاد ہے،'' نکولائی نے کہا۔ ''مجھے یاد آیا کہ میں بعد ازاں تمھارے پاس آیا تھا۔ میں تمھیں تسلی دینا چاہتا تھا لیکن تمھیں معلوم ہے کہ میں بہت شرمندہ تھا۔ ہم سب نے خوب ہلا گلا کیا تھا۔ میرے پاس ننھی سی چوبی گڑیا تھی اور یہ میں تمھیں دینا چاہتا تھا۔''

''اور تمھیں یاد ہے،'' نتاشا نے اداس مسکراہٹ سے کہا، ''کہ بہت مدت پہلے جب ہم ابھی بالکل بچے تھے، انکل نے ہمیں سٹڈی روم میں بلایا تھا؟ — یہ پرانے گھر کی بات ہے — وہاں اندھیرا تھا۔ ہم اندر چلے گئے اچانک وہاں ہمیں اپنے سامنے ایک شخص کھڑا نظر آیا...''

''حبشی!'' نکولائی نے بغلیں بجاتے ہوئے اس کا فقرہ مکمل کر دیا۔ ''مجھے بالکل یاد ہے! مجھے آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہاں واقعی کوئی حبشی تھا یا یہ محض ہمارا واہمہ تھا اور یا یہ بات ہمارے ذہنوں میں ڈال دی گئی تھی۔''

''یاد ہے کہ اس کے بال ملگجے اور چٹے سفید تھے اور وہ کھڑا ہمیں گھور گھور کر دیکھ رہا تھا؟...''

''سونیا، تمھیں یاد ہے؟'' نکولائی نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے اس بارے میں کچھ کچھ یاد ہے،'' سونیا نے شرماتے لجاتے کہا۔

''تمھیں معلوم ہے کہ میں پاپا اور ماما سے اس حبشی کے بارے میں پوچھتی رہی ہوں،'' نتاشا نے کہا۔ ''وہ کہتے ہیں کہ حبشی وبشی کوئی نہیں تھا۔ پر دیکھا کہ تمھیں وہ یاد ہے!''

''بالکل، مجھے یاد ہے۔ مجھے اس کے دانت اتنی اچھی طرح یاد ہیں جیسے میں نے انھیں ابھی ابھی دیکھا ہو۔''

''یہ کتنی عجیب بات ہے! — یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کوئی خواب ہو اور یہی بات مجھے پسند ہے۔''

''اور تمھیں یاد ہے کہ ہم بال روم میں انڈے لڑھکا رہے تھے کہ اچانک دو بڈھی کھوسٹ عورتیں کہیں سے نمودار ہوئیں اور وہ قالین کے اردگرد لٹو کی مانند گھومنے لگیں؟ حقیقت میں ایسے ہوا تھا یا نہیں؟ تمھیں یاد ہے کہ ہمیں کتنا مزہ آیا تھا؟''

''اور ہاں، تمھیں یاد ہے کہ پاپا نے، جو نیلے اوور کوٹ میں ملبوس تھے، کس طرح پورچ میں بندوق داغ دی تھی؟''

یوں وہ مسرت وشادمانی سے مسکراتے اپنی یادداشتوں کو کریدتے رہے لیکن یہ کبرسنی کی دل گیر اور افسردہ کن یادداشتیں نہیں تھیں بلکہ یہ اٹھتی جوانی کے شاعرانہ قصے تھے، ان کے بعید تریں ماضی کے وہ تاثرات، جن میں خواب اور حقائق آپس میں گتھم گتھا ہو جاتے ہیں — وہ پرسکون انداز سے لطف اندوز ہورہے تھے اور قہقہے پر قہقہے لگا رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح یہاں بھی سونیا دوسرے دونوں کے مقابلے میں پھسڈی رہ گئی حالانکہ ان سب کی یادداشتیں مشترک تھیں۔ جو کچھ انھیں یاد آرہا تھا، وہ اسے زیادہ تر بھول چکی تھی اور جو کچھ اسے یاد آیا بھی، وہ اس کے اندر اس قسم کے شاعرانہ جذبات، جن کا انھیں تجربہ ہورہا تھا، ابھار نہ سکا۔ وہ محض ان کی مسرت سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور جھوٹ موٹ اسے اپنے اوپر طاری کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ ان کی گفتگو میں پوری طرح صرف تب شریک ہو سکی جب انھوں نے اپنے گھر میں اس کی آمد کے بارے میں باتیں شروع کر دیں۔ سونیا نے انھیں بتایا کہ وہ نکولائی سے کس طرح خوف زدہ ہوئی تھی کیونکہ جو کوٹ وہ پہنے ہوئے تھا، اس میں موٹی موٹی ڈوریاں پروئی ہوئی تھیں اور نرس نے اسے بتایا تھا کہ اسے بھی رسیوں کے ساتھ سی دیا جائے گا۔

''اور مجھے یاد ہے کہ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ تم گوبھی کے پودے کے نیچے پیدا ہوئی تھیں،'' نتاشا نے کہا۔ ''اور مجھے یاد ہے کہ مجھ میں ان کی اس بات پر یقین نہ کرنے کی جرأت نہیں تھی حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ یہ درست نہیں ہے اور اس نے مجھے خاصا بے چین کیا تھا۔''

جب وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے، سٹنگ روم کے عقبی دروازے سے ایک نوکرانی نے جھانک کر اندر دیکھا۔

''بی بی، مرغا آگیا ہے،'' اس نے کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا۔

''پولیا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی۔ ان سے کہو کہ وہ اسے واپس لے جائیں،'' نتاشا نے کہا۔

ان کی گفتگو کے دوران میں ڈملر اندر آگیا تھا۔ وہ بربط کے، جو کونے میں کھڑا تھا، قریب چلا گیا۔ اس نے اس کا غلاف اتارا اور بربط جھنجھنا اٹھا۔

''ایڈورڈ کارلچ، میرا وہ پسندیدہ نغمہ، جس کی موسیقی فیلڈ[24] نے ترتیب دی تھی، بجائیں۔ میں آپ کی بے حد ممنون ہوں گی،'' ڈرائنگ روم سے کاؤنٹس کی آواز سنائی دی۔

ڈملر نے تار چھیڑا اور نتاشا، نکولائی اور سونیا کی طرف متوجہ ہو کر بولا:

''آپ نوجوان لوگ قطعاً کوئی شوروغل نہیں کررہے!''

''ہاں، ہم ذرا فلسفیانہ گفتگو کر رہے ہیں،'' نتاشا نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر کہا اور دوبارہ باتوں میں جت گئی۔ وہ خوابوں کے متعلق بحث کر رہے تھے۔

ڈملر ساز بجانے لگا۔ نتاشا دبے پاؤں پنجوں کے بل میز کے قریب پہنچی، اس نے موم بتی اٹھائی، اسے باہر لے گئی اور خاموشی سے دوبارہ اپنی جگہ آبیٹھی۔ کمرے میں، خاص طور پر اس جگہ جہاں وہ صوفے پر بیٹھے تھے، اندھیرا تھا لیکن چودھویں کے چاند کی روپہلی روشنی بلند وبالا دریچوں میں سے چھن چھن کر اندر آ رہی تھی اور فرش کو منور کر رہی تھی۔

''تمھیں معلوم ہے،'' نتاشا نے نکولائی اور سونیا کے قریب کھسکتے ہوئے سرگوشی کی، جب کہ ڈملر، جو نغمہ ختم کر چکا تھا، ابھی تک دھیرے دھیرے تاروں پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ بظاہر وہ طے نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے اب بس کر دینا چاہیے یا کوئی اور نغمہ شروع کر دینا چاہیے۔ ''تمھیں معلوم ہے کہ میرے خیال کے مطابق جب کوئی شخص پرانی یادیں کریدتا چلا جاتا ہے، تو آخر میں ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب اسے وہ باتیں بھی، جو اس وقت وقوع پذیر ہوئی تھیں جب وہ ابھی اس دنیا میں آیا بھی نہیں تھا، یاد آنے لگتی ہیں۔''

''یہ تناسخِ ارواح کا مسئلہ ہے،'' سونیا نے، جو اچھی طالبہ تھی اور جو پڑھتی تھی ہمیشہ یاد رکھتی تھی، کہا۔ ''مصریوں کا عقیدہ تھا کہ کسی زمانے میں ہماری روحیں جانوروں کے اجسام میں متمکن تھیں اور دوبارہ وہیں لوٹ جائیں گی۔''

''نہیں، میں نہیں مانتی کہ ہم کبھی جانوروں کے اندر رہتے تھے،'' نتاشا نے کہا۔ وہ ابھی تک سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھی حالانکہ موسیقی کبھی کی بند ہو چکی تھی۔ ''لیکن میں اتنا یقیناً جانتی ہوں کہ کبھی ہم کسی دوسری دنیا میں فرشتگان ضرور تھے۔ اور اب ہم یہاں ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ہمیں سب کچھ یاد ہے...''

''میں بھی شریک ہو جاؤں؟'' ڈملر نے پوچھا۔ وہ خاموشی سے آیا اور ان کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

''اگر ہم فرشتے ہوتے، پھر اتنی پستی میں کیوں گرتے؟'' نکولائی نے کہا۔ ''نہیں، میں یہ نہیں مان سکتا!''

''پستی میں نہیں۔ تمھیں کس نے بتایا کہ ہم پستی میں ہیں؟... میں پہلے کیا تھی، مجھے اس کا علم کیسے ہوا؟'' نتاشا نے بڑے تیقن سے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''تم جانتے ہو کہ روح غیر فانی ہے... چنانچہ اگر مجھے ابد تک رہنا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ ماضی میں میری کوئی زندگی رہی ہوگی، میں ازل سے موجود رہی ہوں گی۔''

''ہاں، لیکن ہمارے لیے ازل سے ابد کا تصور ذہن میں لانا مشکل ہے،'' ڈملر نے کہا۔ وہ کچھ یوں مسکراتا نوجوانوں کی گفتگو میں شریک ہو گیا تھا جیسے ان پر کسی حد تک احسان کر رہا ہو لیکن اس کا لہجہ انھیں کی طرح دھیما اور سنجیدہ تھا۔

''ازل سے ابد کا تصور ذہن میں لانا کیوں مشکل ہے؟'' نتاشا نے کہا۔ ''آج کے بعد کل آئے گا اور کل کے بعد پرسوں۔ یونہی یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا اور اسی طرح آج سے قبل کل تھا اور کل سے قبل پرسوں...''

''نتاشا، اب تمھاری باری ہے۔ مجھے کوئی گیت سناؤ،'' انھیں کاؤنٹس کی آواز سنائی دی۔ ''یہ تم لوگ اس طرح کیوں بیٹھے ہو؟ کوئی سازش ہو رہی ہے؟''

''ماما، میرا بالکل جی نہیں چاہتا!'' نتاشا نے کہا، تاہم وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

''ان میں سے کوئی بھی، یہاں تک کہ ادھیڑ عمر ڈملر بھی، گفتگو کو ختم کرنا اور سٹنگ روم کے اس کونے سے اٹھنا نہیں چاہتا تھا، لیکن نتاشا اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور نکولائی کلاوی کارڈ کے سامنے جا بیٹھا۔ نتاشا حسبِ معمول بال روم کے عین درمیان میں چلی گئی اور اس نے وہ جگہ، جہاں سے آواز بہترین انداز سے سنوائی جا سکتی تھی، منتخب کرلی۔ اب وہ اپنی والدہ کا پسندیدہ گیت گانے لگی۔

اس نے کہا تھا کہ اس کا گانا گانے کو جی نہیں چاہتا، لیکن جس انداز سے وہ اس شام گائی، اس طرح اسے گائے مدتیں بیت چکی تھیں اور مدتیں بیت جانا تھیں کہ اس نے پھر اس طرح گانا تھا۔ کاؤنٹ الیا آندریچ کو سٹڈی روم میں، جہاں وہ متنکا کے ساتھ باتیں کر رہا تھا، اس کی آواز سنائی دی۔ سکول کے کسی طالب علم کی طرح جسے اپنا آموختہ یاد کرنے کی جلدی ہوتی ہے کہ اس نے کھیلنے جانا ہوتا ہے، کاؤنٹ بھی ان احکام میں، جو وہ اپنے سٹیوارڈ کو دے رہا تھا، گڑبڑا گیا اور آخر کار بالکل خاموش ہوگیا۔ متنکا، جو اس کے روبرو کھڑا تھا، وہ بھی غور سے سننے اور مسکرانے لگا۔ نکولائی اپنی نظریں اپنی بہن کے چہرے سے نہ ہٹا سکا۔ وہ اس کی گائیکی کے دوران میں دم سادھ لیتا اور تب سانس لیتا جب وہ رکتی۔ سونیا سماعت کے دوران میں سوچ رہی تھی کہ اس کے اور اس کی سہیلی کے مابین کتنا عظیم فرق ہے اور یہ کہ اس کے لیے اپنی کزن کی طرح مسحور کن بننا کتنا ناممکن ہے۔ معمر کاؤنٹس کے چہرے پر سرور آگیں لیکن اداس مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ کبھی کبھار وہ اپنا سر ہلا دیتی۔ اسے نتاشا کی اور اپنی، دونوں کی جوانی یاد آرہی تھی اور یہ کہ پرنس آندرے کے ساتھ متوقع شادی میں کوئی نہ کوئی ایسی بات ضرور تھی جو ہولناک اور غیر فطری تھی۔

ڈملر، جو کاؤنٹس کے قریب جا بیٹھا تھا، آنکھیں موندے سن رہا تھا۔

''آہ، کاؤنٹس،'' اس نے آخر کار کہا، ''اس کا یہ ہنر یورپی ہے۔ اسے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے—کیا ملائمت، کیا مٹھاس، کیا توانائی ہے...''

''اف، میں اس کے بارے میں کتنی خوف زدہ ہوں، کتنی خوف زدہ ہوں!'' کاؤنٹس نے کہا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں تھا کہ وہ کس کے ساتھ باتیں کر رہی ہے۔

اس کی مادرانہ جبلت اسے بتا رہی تھی کہ نتاشا میں کوئی چیز ضرورت سے کہیں زیادہ ہے اور محض اس کی وجہ سے وہ خوش و خرم نہیں رہ سکے گی۔

پیشتر اس کے کہ نتاشا گانا ختم کرتی، چودہ سالہ پیتیا، جس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی، بھاگتا دوڑتا کمرے میں داخل ہوا اور اس نے بتایا کہ سوانگی[25] آگئے ہیں۔

نتاشا نے اپنا گانا بیچ میں ختم کر دیا۔

"Idiot"[26] اس نے چلا کر اپنے بھائی سے کہا۔ پھر وہ ایک کرسی کی طرف لپکی اور اس پر گر پڑی۔ وہ اتنا زار و قطار رو رہی تھی کہ اسے اپنی سسکیوں پر قابو پانے میں خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔

"ماما، کوئی بات نہیں، بالکل کوئی بات نہیں، بس پیتا نے مجھے ڈرا دیا تھا۔" وہ بولی۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے آنسو تھے کہ تھمنے کا نام ہی نہ لیتے تھے اور سسکیوں سے اس کا گلا رندھ گیا تھا۔

سوانگی (اصل میں یہ خانگی ملازمین تھے، انھوں نے ریچھوں، ترکوں، کلالوں اور نفاست پسند خواتین کے سوانگ بھر رکھے تھے۔ ان کی شکلیں مضحک بھی تھیں اور مرعوب کن بھی۔ وہ ابتداً جھینپتے جھانپتے پیش دالان میں سمٹ سمٹا کر کھڑے ہو گئے اگرچہ ان کے انگ انگ سے شگفتگی ٹپک رہی تھی، لیکن جس انداز سے وہ اندر آئے اور کھڑے ہوئے اس سے احساس ہوتا تھا کہ باہر بہت سردی ہے)۔ پھر وہ ایک دوسرے کے پیچھے چھپتے چھپاتے دھکم پیل کرتے بال روم میں آموجود ہوئے۔ وہاں شروع شروع میں وہ ذرا لیے دیے رہے، تاہم ان کی خوش طبعی اور زندہ دلی میں بتدریج اضافہ ہونے لگا اور وہ گانے بجانے، ناچنے کودنے اور کرسمس سے متعلق کھیلیں کھیلنے لگے۔ کاؤنٹس انھیں پہچاننے اور ان کی وضع قطع پر ہنسنے کے بعد واپس ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔ کاؤنٹ بال روم میں ہی بیٹھ گیا۔ اس کے چہرے پر چمکتی دمکتی مسکراہٹ تھی اور وہ سوانگیوں کی تعریفیں کر رہا تھا۔ نوجوان رفو چکر ہو چکے تھے۔

کوئی نصف گھنٹہ بعد بال روم میں سوانگیوں کے مابین ایک ضعیفہ نظر آئی۔ اس کی سکرٹ کے اندر لچک دار تار کا چکر لگا ہوا تھا تاکہ وہ اٹھی اور پھیلی رہے ــ یہ نکولائی تھا۔ پیتا ترک دوشیزہ، ڈملز مسخرے، نتاشا ہوزار اور سونیا، جس نے اپنی بھویں اور مونچھیں سوختہ کارک سے بنائی تھیں، سرکیشیائی باشندے کے بھیس میں تھی۔

جب وہ اشخاص، جو اس سوانگ سازی میں شریک نہیں ہوئے تھے، نوجوانوں کو دیکھ کر اپنی جھوٹ موٹ کی حیرت کا اظہار کر چکے اور انھیں بتا چکے کہ اگرچہ انھوں نے انھیں خوب بے وقوف بنایا ہے، تاہم وہ انھیں ان بہروپوں میں دیکھ کر بہت خوش ہوئے ہیں، نوجوانوں نے فیصلہ کیا کہ ان کے پہناوے اتنے عمدہ ہیں کہ انھیں ان کی کسی اور جگہ نمائش کرنا چاہیے۔

چونکہ سڑکوں کی حالت بہت اچھی تھی، نکولائی نے جو اپنی ٹرویکا[27] میں گھومنا پھرنا چاہتا تھا، تجویز پیش کی کہ انھیں اپنے ساتھ دس بارہ غلام، جنھوں نے سوانگ بھرا ہوا تھا، ساتھ لے لینا اور "چچا" کے ہاں چلنا چاہیے۔

"نہیں، بڑے میاں کو پریشان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں!" کاؤنٹس نے کہا۔ "اگر جانا ہی ہے، پھر میلیوکوفوں کے ہاں چلے جاؤ۔"

مادام میلیوکووا بیوہ تھی۔ وہ ہر عمر کے بچوں، ان کے ٹیوٹروں اور گورنسوں کے ساتھ رستوفوں سے تقریباً تین میل دور رہتی تھی۔

"ہاں، ma chere' یہ بہت اچھی تجویز ہے،" معمر کاؤنٹ نے پھرتی سے گرہ لگائی۔ "میں چٹکی بجاتے کپڑے تبدیل کرلوں گا اور ان کے ساتھ جاؤں گا۔ اگر مجھے دیکھ کر پاشیت کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی نہ رہ گئیں، تو میرا ذمہ!"

لیکن کاؤنٹس اس کے جانے پر رضامند نہ ہوئی کیونکہ گزشتہ کئی دن سے اس کی ٹانگ ٹھیک نہیں تھی۔ چنانچہ یہ فیصلہ کیا گیا کہ کاؤنٹ تو ان کے ساتھ نہیں جائے گا، لڑکیاں البتہ جا سکتی ہیں بشرطیکہ لوئیسا ایوانوونا (مادام شوس)

ان کا ساتھ دینے کی ہامی بھر لے۔ سونیا، جو عام طور پر شرمائی گھبرائی رہتی تھی اور کم ہی بات کرتی تھی، مادام شوس سے اصرار کرنے میں سب سے پیش پیش تھی۔

سب سے بہترین پہناوا سونیا کا تھا۔ اس کی بھویں اور مونچھیں غیر معمولی طور پر اس پر پھب رہی تھیں۔ ہر شخص اسے بتا رہا تھا کہ وہ بہت خوبصورت دکھائی دے رہی ہے اور وہ خود بھی خلاف معمول بہت چاق چوبند اور تیز طرار نظر آ رہی تھی۔ کوئی باطنی آواز اسے سمجھا رہی تھی کہ اس کا معاملہ "اب یا پھر کبھی نہیں" کا ہے، آج اس کی تقدیر کا فیصلہ ہو کر رہے گا اور اپنے مردانہ بھیس میں وہ بالکل مختلف دکھائی دے رہی تھی۔ لوئیسا ایوانوونا نے ساتھ جانے پر آمادگی کا اظہار کر دیا۔ آدھ گھنٹے بعد چار ٹرویکائیں، جن کی گھنٹیاں کھنکھنا رہی تھیں اور جن کے چوبی تختے،[28] جن پر برف گاڑی پھسلتی ہے، چرچرا رہے اور زناٹے کی آوازیں پیدا کر رہے تھے، پورچ میں آ کھڑی ہوئیں۔

کرسمس کی چھٹیوں کی چہلوں، ہنسی مذاق اور دل لگیوں کی ابتدا نتاشا سے ہوئی، بتدریج ایک سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا ان کی لپیٹ میں آنے لگا، ہر لمحے ان کی بے لگامی اور شوریدہ سری میں اضافہ ہوتا رہا۔ جب وہ یخ بستہ ہوا میں آئے اور برف گاڑیوں میں سوار ہوئے، ان کا شور وغل نقطۂ عروج پر پہنچ گیا۔ وہ زور زور سے باتیں کر رہے تھے، ایک دوسرے کو پکار رہے تھے، قہقہے لگا رہے تھے اور اپنے غل غپاڑے سے آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔

دو ٹرویکائیں وہ برف گاڑیاں تھیں جو گھریلو کاموں کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ تیسری کاؤنٹ کی تھی۔ اس کا درمیان کا گھوڑا گاڑیوں کی دوڑوں میں حصہ لیا کرتا تھا اور آرلوفوں کے گھوڑی پال فارم سے خریدا گیا تھا۔ چوتھی گاڑی نکولائی کی اپنی تھی۔ اس کا درمیانہ گھوڑا نسبتاً کوتاہ قامت تھا اور اس کے جسم پر موٹے موٹے بال تھے۔ نکولائی نے ضعیفہ کی سکرٹ پر اپنا ہوزاروں کا اوور کوٹ پہن لیا تھا۔ وہ ہاتھوں میں لگامیں تھامے گاڑی کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔

روشنی اتنی زیادہ تھی کہ اسے گھوڑوں کے، جو پورچ کی چھت کے سائے میں غل غپاڑا مچاتے اشخاص کو دیکھ کر بدک رہے تھے، دھاتی ساز و سامان اور ان کی آنکھوں میں منعکس ہوتی نظر آ رہی تھی۔

نتاشا، سونیا، مادام شوس اور دو نوکرانیاں نکولائی کی برف گاڑی میں سوار ہو گئیں۔ ڈملر، اس کی اہلیہ اور پیتیا کاؤنٹ کی گاڑی میں بیٹھ گئے۔ باقی سوانگیوں نے دوسری دو گاڑیوں میں نشستیں سنبھال لیں۔

"ذاخار، آگے آگے تم چلو،" نکولائی نے اپنے باپ کے کوچوان کو چلا کر حکم دیا تاکہ سڑک پر پہنچنے کے بعد اسے اپنی گاڑی دوڑانے اور اس کی گاڑی سے آگے نکل جانے کا موقع مل سکے۔

کاؤنٹ کی سہ اسپی گاڑی، جس میں ڈملر اور اس کی پارٹی کے دیگر افراد سوار تھے، چل پڑی۔ اس کے چوبی تختے یوں چرچرا رہے تھے جیسے وہ بھی جم کر برف بن گئے ہوں۔ اس کی گھنٹی، جس کی آواز بھاری تھی، کھنکھنا رہی تھی۔ اس کا راس گھوڑا زور لگا کر بم کے قریب ہو گیا، اس کے پاؤں برف میں، جو چینی کی طرح سخت اور منور تھی، دھنسے جا رہے تھے اور وہ اسے ٹھوکریں مار مار کر اڑا رہا تھا۔

نکولائی پہلی سہ اسپی گاڑی کے پیچھے چل پڑا۔ دوسری دونوں، جن کے چوبی تختے کتوں کی طرح چیخم پکار کررہے تھے، اس کا تعاقب کرنے لگیں۔ شروع شروع میں سڑک تنگ تھی اوران کی رفتار بھی معتدل تھی۔ جب وہ باغ کے برابر سے گزرر ہے تھے، ننگے بچّے درختوں کے سائے سڑک پر پڑنے لگے اور یوں وہ مہتاب کی تیز روشنی کو دھندلانے لگے، لیکن جونہی انھوں نے باڑ عبور کی، انھیں اپنے سامنے ساکن برفیلا میدان، جو روشن دتاباں چاندنی میں ہیروں کی مانند جگمگار ہا اور نیلگوں آب وتاب دکھار ہا تھا، دور دور تک پھیلا نظر آیا۔

دھم، دھم۔ پہلی گاڑی برف کے اندر گڑھے میں دھنس گئی۔ دوسری اور تیسری نے بھی اسی طرح ہچکولے کھائے۔ اس کے بعد وہ یکے بعد دیگرے بھونڈے انداز سے گمبھیر خاموشی کوتوڑتی سڑک پر پھیلنے لگیں۔

''خرگوش کے پاؤں کے نشانات... بے شمار نشانات!'' یخ بستہ ہوا میں نتاشا کی آواز گونجی۔

''نکولس، رات کتنی روشن ہے!'' سونیا کی آواز آئی۔

نکولائی نے اچٹتی سی نظر سونیا پر ڈالی اور وہ نیچے جھک گیا تا کہ اس کے چہرے کو قریب سے دیکھ سکے۔ یہ بالکل نیا اور دل پذیر چہرہ تھا۔ اس پر سیاہ بھویں اور مونچھیں تھیں۔ سونیا نے جو سیاہ سموری کوٹ پہن رکھا تھا، یہ اس میں سے اس کی طرف جھانک رہا تھا۔ روپہلی روشنی میں یہ اتنا قریب، پھر بھی اتنا دور تھا۔

''یہ سونیا ہوا کرتی تھی،'' نکولائی نے سوچا۔ اس نے اسے اور قریب سے دیکھا اور مسکرا دیا۔

''نکولس، کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں،'' اس نے جواب دیا اور گھوڑوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔

جب وہ بڑی سڑک پر، جسے برف گاڑیوں نے رگڑ رگڑ کر چمکا دیا تھا اور جسے گھوڑوں کے کھردرے نعلوں نے، جن کے روپہلی روشنی میں جگہ جگہ نشانات نظر آرہے تھے، جگہ جگہ سے کاٹ دیا تھا، پہنچے، گھوڑے باگیں تڑانے اور اپنی مرضی سے اپنی رفتار تیز کرنے لگے۔ دائیں طرف کے گھوڑے نے اپنی گردن کو کمان کی طرح خم دیا اور پویہ چلنے لگا۔ یوں اس کی راسوں پر زور پڑنے لگا اور وہ قریب قریب ٹوٹنے لگیں۔ درمیان کا گھوڑا دائیں بائیں جھول رہا تھا۔ اس نے اپنے کان یوں کھڑے کر لیے تھے جیسے وہ یہ پوچھ رہا ہوں: ''کیا ہم ہوا سے باتیں کرنے لگیں یا ابھی بہت وقت ہے؟'' سب سے اگلی گاڑی، جسے ذاخار ہانک رہا تھا، پہلے ہی کافی آگے نکل چکی تھی اور اب اس کے اور باقی گاڑیوں کے مابین فاصلہ مزید بڑھتا جا رہا تھا، اس کی گھنٹی کی آواز دور سے دور تر ہوتی جارہی تھی اور سفید برف کے بالمقابل اس کے سیاہ گھوڑے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ ذاخار کے ساتھ جو سوانگیے بیٹھے تھے ان کے چیخنے چلانے اور ہنسنے ہنسانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''میرے جانیو!'' نکولائی نے لگام ایک طرف کھینچتے اور اپنا چابک ہوا میں لہراتے ہوئے اپنے گھوڑوں سے چلا کر کہا۔

جس شدت سے ہوا ان کے چہروں سے ٹکرا رہی تھی اور اپنی رفتار میں اضافہ کرنے کی غرض سے گھوڑے

جس انداز سے اپنی باگوں پر زور دے رہے تھے، ان دونوں چیزوں سے انھیں یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ برف گاڑی کتنی سرعت سے بھاگی جا رہی ہے۔ نکولائی نے مڑ کر پیچھے نگاہ ڈالی۔ عقبی گاڑیاں چیخ پکار کرتی، چرچراتی اور چابک، جو درمیانے گھوڑوں کو اپنی رفتار بڑھانے پر مجبور کر رہے تھے، ہوا میں لہراتی، سرپٹ اس کے پیچھے بھاگی آ رہی تھیں۔ اس کا اپنا درمیانہ گھوڑا مسلسل آگے پاؤں بڑھا رہا تھا اور اس بات کا قطعاً کوئی عندیہ نہیں دے رہا تھا کہ وہ اپنی رفتار کم کرنا چاہتا ہے بلکہ یوں نظر آ رہا تھا کہ اگر ضرورت پیش آئی تو وہ اپنی رفتار مزید تیز کر دے گا۔

نکولائی پہلی گاڑی کے قریب ہونے لگا۔ وہ ایک ڈھلوان سے نیچے اترے اور خاصی کشادہ لیکن پامال سڑک پر، جو دریا کے قریب چراگاہ کے بیچوں بیچ گزرتی تھی، چڑھ گئے۔

''ہم کہاں جا رہے ہیں؟'' نکولائی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ''یہ کہیں کوسائی چراگاہ تو نہیں؟ پر نہیں — یہ جگہ تو میں نے پہلے کبھی دیکھی ہی نہیں۔ یہ کوسائی چراگاہ نہیں اور نہ یہ دیامکن پہاڑی ہے — خدا معلوم یہ کون سی جگہ ہے! یہ کوئی نیا اور سحر زدہ مقام ہے۔ خیر، کوئی بات نہیں...'' اور وہ با آواز بلند اپنے گھوڑوں کو ہنکارنے اور اپنی اور پہلی گاڑی کے مابین فاصلہ کم کرنے لگا۔

ذاخار نے اپنے گھوڑے روک لیے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے لگا۔ پالے سے اس کا چہرہ بھوؤں تک سفید ہو چکا تھا۔ نکولائی نے اپنے گھوڑوں کی باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ ذاخار نے بازو آگے بڑھائے اور اس نے بھی اپنے گھوڑوں کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ وہ انھیں اکسانے اور اپنی رفتار بڑھانے کے لیے چٹاخ چٹاخ کی آوازیں نکال رہا تھا۔

''آقا، ذرا سنبھل کر!'' اس نے چلا کر نکولائی سے کہا۔

نکولائی نے اپنے گھوڑے پوری رفتار سے سرپٹ دوڑا دیے اور ذاخار سے آگے نکل گیا۔ گھوڑوں کی ٹھوکروں سے باریک اور خشک برف اڑتی اور سواریوں کے چہروں پر جا پڑتی۔ ان کے قریب گھنٹیاں جھنجھنا رہی تھیں اور جس سمت سے اپنی گاڑی کے برابر سے وہ گزر رہے تھے، اس کا سایہ اور گھوڑوں کی صبا رفتار ٹانگیں انھیں گڈمڈاتے انداز سے نظر آ رہی تھیں۔ مختلف اطراف سے گاڑیوں کے تختوں کے برف سے ٹکرانے اور جھنجھنانے اور لڑکیوں کی چیخ پکار کی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔

نکولائی نے ایک بار پھر اپنے گھوڑوں کی رفتار دھیمی کی اور اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ چاروں اطراف طلسم زدہ میدان، جو مہتابی روشنی میں نہایا ہوا تھا اور جس پر ستارے بکھرے ہوئے تھے، پھیلا ہوا تھا۔

''ذاخار مجھے آوازیں دے رہا ہے کہ مجھے بائیں طرف مڑنا ہے لیکن بائیں طرف کیوں؟'' نکولائی کو تعجب ہو رہا تھا۔ ''کیا ہم واقعی میلیوکوفوں کی طرف جا رہے ہیں؟ — کیا یہ واقعی میلیوکووکا ہے؟ خدا جانے ہم کہاں جا رہے ہیں — اور خدا جانے ہمارے ساتھ کیا واردات بیت رہی ہے لیکن یہ جو کچھ بھی ہے، ہے بہت عجیب اور شاندار۔'' اور وہ اپنی برف گاڑی میں چاروں اطراف نظریں دوڑانے لگا۔

''دیکھو — اس کی مونچھیں اور بھوئیں بالکل سفید ہیں،'' نرالی، حسین اور نامانوس صورتوں میں سے، جو اس

کے قریب بیٹھی تھیں، ایک نے — وہی جس کے نفیس ابرو اور مونچھیں تھیں — کہا۔

''میرا خیال ہے کہ وہ نتاشا تھی،'' نکولائی نے سوچا۔ ''اور وہ مادام شوس ہے، پر شاید نہیں... اور وہ جو مونچھوں والی سرکیشیائی ہے، میں اسے پہچان نہیں سکا لیکن میں اس سے محبت کرتا ہوں۔''

''تمھیں سردی تو نہیں لگ رہی؟''

انھوں نے کوئی جواب نہ دیا لیکن وہ ہنسنے لگیں۔ پچھلی گاڑی سے ڈملر نے چلا کر کچھ کہا۔ اس نے جو کچھ کہا تھا، غالباً کوئی دلچسپ بات تھی لیکن اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔

''ہاں، ہاں،'' متعدد ہنستی کھلکھلاتی آوازوں نے جواب دیا۔

لیکن اب وہ کسی سحرزدہ جنگل میں داخل ہو چکے تھے۔ وہاں تاریک سائے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے، کبھی ادھر نظر آتے اور کبھی ادھر۔ ہیروں کی خیرہ کن جگمگاہٹ تھی، سنگ مرمر کی سیڑھیاں تھیں، پرستان کی عمارتوں پر روپہلی چھتیں تھیں اور کسی قسم کے درندوں کی تیکھی آوازیں۔

''اگر یہ واقعتاً ملیوکوفوں کا مسکن ہے، پھر تو یہ اور بھی عجیب و غریب بات ہے۔ خدا جانے ہم کہاں پھرتے پھراتے رہے اور آخر یہاں ملیوکووکا پہنچ گئے،'' نکولائی نے سوچا۔

یہ واقعی ملیوکووکا تھا۔ نوکر نوکرانیاں موم بتیاں اٹھائے پورچ کی طرف بھاگے آ رہے تھے، ان کے چہرے خوشی سے تمتما رہے تھے۔

''کون ہے؟'' صدر دروازے میں سے کسی نے پوچھا۔

''کاؤنٹ کے ہاں سے سوانگیے آئے ہیں۔ میں ان کے گھوڑے دیکھ کر بوجھ سکتا ہوں،'' متعدد آوازوں نے جواباً کہا۔

11

پیلا گیا دانیلوونا ملیوکووا چوڑی چکلی اور مستعد و پرجوش عورت تھی۔ وہ چشمہ لگائے اور ڈھیلا ڈھالا ڈریس پہنے ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔ اس کے اردگرد اس کی بیٹیوں نے ہجوم کر رکھا تھا اور وہ انھیں خوش کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ پگھلی ہوئی موم کے قطرات پانی میں انڈیلنے اور موی اشیا کے عکس دیکھنے میں محو تھیں کہ انھیں ہال میں مہمانوں کے قدموں کی آہٹ اور ان کی باتوں کی آوازیں سنائی دیں۔

ہوزاروں، طرح دار خواتین، جادوگرنیوں، مسخروں اور ریچھوں نے کھنکار کر اپنے گلے صاف کیے، اپنے چہروں سے یخ بستہ شبنم جھاڑی اور بال روم میں، جہاں بھاگم بھاگ موم بتیاں روشن کر دی گئی تھیں، داخل ہو گئے۔ مسخروں — ڈملر اور خاتون — نکولائی — نے رقص شروع کر دیا۔ سوانگی، جو چیختے چلاتے بچوں کے مابین گھرے ہوئے تھے، اپنے چہروں پر نقابیں اوڑھے اور اپنی آوازیں چھپائے اپنی میزبان کے سامنے جھک کر آداب بجا لائے

اور کمرے میں بکھر گئے۔

''ارے، انھیں پہچاننا ناممکن ہورہا ہے! اخاہ، نتاشا! یہ کس سے مشابہ ہے؟ اسے دیکھ کر مجھے واقعی کوئی یاد آ گیا ہے! اور ایڈورڈ کارچ (ڈملر) اپنے بھیس میں کتنے اچھے لگ رہے ہیں! مجھ سے تو وہ پہچانے ہی نہ گئے۔ ارے واہ، کیا دلفریب رقص ہے ان کا! اف، میرے خدایا! اس سرکیشیائی کو دیکھو! سونیوشکا پر اس کا بھیس کیسا پھبا ہے! اور یہ کون ہے؟ خیر، تم لوگوں نے ہمارے دل خوش کردیے ہیں۔ نکیتا، وانیا، یہ میزیں یہاں سے اٹھالو۔ اور ایک ہم ہیں کہ یہاں چپ گھڑپ بیٹھے تھے۔

''ہاہاہا، وہ ہوزار، ادھر، وہ ہوزار! بالکل چھوکرا معلوم ہوتا ہے۔ اور ٹانگیں... مجھ سے وہ دیکھا ہی نہیں جاتا!'' مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

نتاشا، جو کہ میلیوکووا کے بچوں میں بہت مقبول تھی، ان کے ساتھ عقبی کمروں میں غائب ہوگئی۔ وہاں سوختہ کارک، طرح طرح کے ڈریسنگ گاؤن اور مردانہ ملبوسات منگوائے گئے اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی کم سن، معصوم اور بھولی بھالی لڑکیوں نے بازو پھیلا پھیلا کر انھیں وردی پوش ملازمین سے وصول کرلیا۔ دس منٹ بعد میلیوکووا کی بیٹیاں سوانگیوں میں جاشامل ہوئیں۔

پیلاگیا دانیلوونا اپنے مہمانوں کے لیے جگہ خالی کرانے اور شرفا اور ملازمین دونوں کی خاطر تواضع کا سامان فراہم کرنے کے بعد سوانگیوں کے مابین گھومنے پھرنے لگی۔ وہ ابھی تک چشمہ لگائے ہوئے تھی اور دبی دبی مسکراہٹ سے بغور ان کے چہرے دیکھ رہی تھی لیکن کسی کو بھی پہچان نہیں پارہی تھی۔ وہ نہ صرف رستوفوں اور ڈملر کی شناخت میں ناکام رہی، بلکہ وہ اپنی بیٹیوں کو بھی نہ پہچان سکی اور نہ اسے اپنے مرحوم خاوند کے ڈریسنگ گاؤنوں اور وردیوں کا، جو وہ پہنے ہوئے تھیں، کچھ پتا چل سکا۔

''اور یہ کون ہوسکتا ہے؟'' اس نے گورنس سے مخاطب ہوکر اور اپنی ہی بیٹی کے، جس نے قازانی تاتار کا بھیس بنا رکھا تھا، چہرے پر نگاہیں گاڑ کر کہا: ''یہ لازماً کوئی رستوف ہوگا! ہونہہ، مسٹر ہوزار، تمھارا کس رجمنٹ سے تعلق ہے؟'' اس نے نتاشا سے پوچھا۔ ''ارے بھئی، اس ترک کو تر کی مٹھائی کھلاؤنا۔'' اس نے اپنے بٹلر کو، جو مشروبات و ماکولات لیے لیے پھر رہا تھا، حکم دیا۔ ''ان کی شرع میں یہ چیز یقیناً حرام نہیں ہے۔''

بعض اوقات جب پیلاگیا دانیلوونا رقاصوں کو، جو یکبارگی یہ تہیہ کرچکے تھے کہ وہ اپنے فینسی ڈریسوں میں کسی شخص کو بھی اپنی حقیقت کے بارے میں علم نہیں ہونے دیں گے اور تمام شرم وحجاب کو بالائے طاق رکھ چکے تھے، عجیب وغریب اور مضحکہ خیز اچھل کود کرتے دیکھتی، وہ اپنا چہرہ رومال میں چھپا لیتی اور اس کا سارا فربہ جسم، سر سے پاؤں تک، ایسی ہنسی سے، جو بزرگانہ اور ہر قسم کے کینے اور بغض سے پاک تھی اور جس پر قابو پانا اس کے لیے ناممکن تھا، کانپنے لگتا۔

''میری ننھی ساشا! میری ننھی ساشا! میری ننھی ساشا کو دیکھو!'' اس نے بآواز بلند کہا۔

جب روس کے دیہاتی اور لوک رقص ختم ہو گئے، پیلا گیا دانیلوونا نے تمام شرفا اور ملازمین کو خاصے بڑے دائرے کی شکل میں کھڑا کر دیا۔ ایک انگوٹھی، ایک رسی اور ایک چاندی کا روبل منگوایا گیا اور وہ سب مل جل کر مختلف اقسام کے کھیل کھیلنے لگے۔

کوئی ایک گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور اچھل کود کے بعد ملبوسات تڑ مڑ گئے اور وہ بے ترتیب ہونے لگے۔ پسینے سے شرابور، تمتماتے اور ہنستے مسکراتے چہروں پر، بھویں اور مونچھیں، جو سوختہ کارکوں سے بنائی گئی تھیں، دھبوں کی صورت اختیار کر گئیں۔ پیلا گیا دانیلوونا بہروپیوں کو پہچاننے لگی۔ انھوں نے جس مہارت اور چابک دستی سے بھیس بدلے تھے، ان کی تعریف میں اس نے کسی بخل سے کام نہ لیا۔ وہ انھیں بتا رہی تھی کہ وہ ان سب پر، خاص طور پر نوجوان لڑکیوں پر، خوب جچ رہے ہیں۔ اس نے ان سب کا جی کھول کر شکریہ ادا کیا کہ انھوں نے اتنے اچھے طریقے سے اس کے لیے تفریح کا سامان بہم پہنچایا تھا۔ مہمانوں کو ڈرائنگ روم میں سپر کھانے کی دعوت دی گئی اور غلاموں کو بال روم میں کھلایا پلایا گیا۔

''اگر کسی شخص کو اس کی قسمت کا حال سُونے غسل خانے میں بتایا جائے۔ اس سے زیادہ ڈراؤنی بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی،'' ایک بوڑھی خادمہ نے، جو میلیوکوفوں کے ہاں رہتی تھی، سپر کے دوران میں کہا۔

''کیوں؟'' میلیوکوفوں کی سب سے بڑی بیٹی نے دریافت کیا۔

''افوہ، آپ نہیں جائیں گی ـــ اس کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے۔''

''میں جاؤں گی،'' سونیا نے کہا۔

''آپ بتائیں کہ اس لڑکی کے ساتھ کیا ہوا تھا،'' میلیوکوفوں کی دوسری بیٹی نے کہا۔

''خیر، وہ قصہ کچھ یوں تھا،'' بوڑھی خادمہ نے کہا۔ ''نوجوان لڑکی باہر گئی، ایک مرغا لائی، اس نے دو آدمیوں کے لیے دسترخوان بچھایا۔ سب کچھ اسی طرح، جیسا کہ ہونا چاہیے تھا، ہوا۔ اور پھر وہ بیٹھ گئی۔ وہ کچھ دیر یونہی بیٹھی رہی، اچانک اس کے کانوں کو یوں محسوس ہوا کہ کوئی آ رہا ہے۔ گھنٹیاں کھنکھناتی برف گاڑی اس کے دروازے پر آ رکی... اسے اس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی... وہ اندر آ گیا... اس کا پیکر انسانی تھا، بالکل افسر معلوم ہوتا تھا، وہ آیا اور اس کے ساتھ میز کے سامنے بیٹھ گیا!''

''اخ، اخ!'' نتاشا دہشت سے آنکھیں گھماتے چلائی۔

''اور اس نے کیا کیا ـــ کیا وہ منہ سے کچھ بولا؟''

''ہاں، بالکل کسی مرد کی طرح۔ سب کچھ بعینہٖ ایسے ہی، جیسے کہ ہونا چاہیے تھا، ہوا۔ وہ بار بار اس کا دل جیتنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ مرغ کی بانگ تک اسے باتوں میں لگائے رکھتی، لیکن اس کی ہمت جواب دے گئی، بس وہ حوصلہ ہار بیٹھی اور اس نے اپنا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ لیکن پھر... وہ اٹھا اور اس نے اسے دبوچ لیا! خوش قسمتی یہ ہوئی کہ عین اسی لمحے خادمائیں بھاگتی دوڑتی اندر آ گئیں...''

''چھوڑو، جانے دو، کیوں انھیں ڈرا رہی ہو؟'' پیلا گیا دانیلوونا نے کہا۔

''پر ماما، آپ خود بھی تو اسی طرح اپنی قسمت کا حال معلوم کرنے کی کوشش کیا کرتی تھیں،'' اس کی بیٹی نے کہا۔

''اور آدمی اناج گودام میں اپنی قسمت کا حال کیسے معلوم کرتا ہے؟'' سونیا نے پوچھا۔

''اچھا، فرض کرو کہ تم ابھی ابھی اناج گودام میں چلی گئی ہو اور غور سے سن رہی ہو۔ سارا دارومدار اس بات پر ہے کہ تمھیں سنائی کیا دیتا ہے۔ اگر دروازے پر دستک ہو جائے یا کھٹ کھٹ کی آواز آ جائے — تو یہ برا شگون ہو گا۔ ہاں، اگر دانوں کو بھوسے سے الگ کرنے کی آواز کانوں میں آئے — تو یہ نیک شگون ہو گا۔ یا بعض اوقات یوں ہوتا ہے —''

''ماما، آپ بتائیں کہ اناج گودام میں آپ کے ساتھ کیا ہوا تھا؟''

پیلا گیا دانیلوونا مسکرائی۔ ''اوہو، میں بھول گئی ہوں،'' اس نے کہا۔ ''اور مجھے یقین ہے کہ تم میں سے کوئی بھی وہاں نہیں جائے گا۔''

''پیلا گیا دانیلوونا، میں جاؤں گی، آپ بس مجھے اجازت دے دیں! میں جاؤں گی!'' سونیا نے کہا۔

''بہت اچھا۔ اگر تمھیں ڈر نہیں آتا تو ضرور جاؤ۔''

''لوئیسا ایوانوونا، مجھے اجازت ہے؟'' سونیا نے پوچھا۔

خواہ وہ رسی پر انگوٹھی ٹکانے کے کھیل میں مصروف تھے، خواہ روبل گیم میں یا باتوں میں، جیسے کہ وہ اب تھے، نکولائی سونیا کے پلو سے بندھا اور اسے بالکل نئی نظروں سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ اسے محسوس ہوا کہ سوختہ کارک کی مونچھوں کے طفیل آج وہ پہلی مرتبہ اسے اس کی اس حیثیت سے، جس کی وہ درحقیقت مالک تھی، پوری طرح شناخت کر سکا ہے۔ اور سچی بات یہ ہے کہ وہ جتنی مسرور، حسین اور طناز اب دکھائی دے رہی تھی، اتنی کبھی معلوم نہیں ہوئی تھی۔

''تو یہ ہے وہ جو وہ فی الحقیقت ہے! میں بھی کیسی کیسی حماقتیں کرتا رہا ہوں!'' اس نے سوچا۔ وہ اس کی جگمگاتی آنکھیں اور اس کے چہرے پر پرمسرت اور وجد آفریں تبسم جو اس کی مونچھوں تلے اس کے رخسار پر چاہ زنخداں بنا رہا تھا، دیکھ رہا تھا — یہ مسکراہٹ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

''میں کسی چیز سے نہیں ڈرتی،'' ''میں ابھی جا سکتی ہوں؟'' اس نے اٹھتے اٹھتے پوچھا۔ انھوں نے اسے بتایا کہ اناج گودام کہاں ہے، سونیا نے کہا۔ اسے وہاں کیسے خاموش کھڑے ہونا اور کان لگا کر سننا ہے۔ انھوں نے سمور کا لبادہ اس کے حوالے کر دیا۔ اس نے وہ اپنے سر اور کندھوں پر ڈال لیا اور اچٹتی نگاہوں سے نکولائی کی طرف دیکھا۔

''یہ لڑکی کتنی من بھاونی ہے!'' اس نے سوچا۔ ''اور اس سارے عرصے کے دوران میں میں کن خیالوں کے تانوں بانوں میں مصروف رہا ہوں؟''

سونیا اناج گودام جانے کے لیے غلام گردش کی طرف چل دی۔ نکولائی یہ بتا کر کہ اسے بہت گرمی محسوس ہو

رہی ہے، بہ عجلت سامنے کے پورچ کی طرف روانہ ہوگیا۔ لوگوں کے ہجوم کی وجہ سے مکان میں واقعی دم گھٹنے لگا تھا۔

باہر ابھی تک وہی ٹھنڈک تھی اور وہی چاند تھا لیکن چاندنی پہلے سے زیادہ چھٹک رہی تھی۔ روشنی اتنی تیز تھی اور اتنے کثیر التعداد ستاروں کی وجہ سے برف اتنی جگمگا رہی تھی کہ نگاہ اوپر نہیں اٹھتی تھی اور آسمان پر جو حقیقی ستارے جھلملا رہے تھے، آدمی انھیں دیکھ نہیں پا رہا تھا۔ آسمان تاریک اور بے کیف تھا جب کہ دھرتی نور کی کرنوں سے جگمگ جگمگ کر رہی تھی۔

''میں بے وقوف ہوں، احمق ہوں! آخر میں اتنا عرصہ کس چیز کا انتظار کرتا رہا ہوں؟'' نکولائی نے سوچا۔ اور پورچ سے بھاگتے دوڑتے اس نے مکان کے کونے سے موڑ کاٹا اور اس راستے پر ہولیا جو عقبی پورچ کی طرف جاتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سونیا یہی راستہ اختیار کرے گی۔ اناج گودام کے راستے کے درمیان میں سوختنی لکڑی کے برف پوش ڈھیر، جن کا سایہ یہاں وہاں پھیلا ہوا تھا، پڑے تھے۔ ان کے پار راستے کے ایک جانب بے برگ و بار لیموں کے درختوں کے سایوں کا جال بنا ہوا تھا۔ چوبی دیواریں اور اناج گودام کی برف پوش چھت سیمیں روشنی میں یوں جگمگا رہی تھی جیسے انھیں قیمتی پتھروں سے تراش کر بنایا گیا ہو۔ باغ میں کہر سے ایک درخت چٹخا اور دوبارہ چاروں اطراف سناٹا چھا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے پھیپھڑے اندر ہوا نہیں، بلکہ ابدی شباب اور سرورِ حیات پرور قوت کھینچ رہے ہیں۔

عقبی پورچ سے کسی کے زینے سے نیچے اترنے کی آواز سنائی دی۔ زینے کے آخری قدمچے سے، جس پر برف کا ڈھیر لگا ہوا تھا، چرچراہٹ کی گونج بلند ہوئی اور اس کے بعد ایک بوڑھی خادمہ کی آواز کانوں سے ٹکرائی۔

''مس، بالکل سیدھے آگے، راستے کے ساتھ ساتھ، بس پیچھے مڑ کر نہ دیکھیں!'' وہ کہہ رہی تھی۔

''میں ڈرتی ورتی نہیں،'' سونیا کی آواز سنائی دی اور راستے کے ساتھ ساتھ نکولائی کی جانب سونیا کے ننھے منے پاؤوں کی، جس پر اس نے پتلے پتلے سلیپر پہنے ہوئے تھے، چرمراتی، چیں چیں کرتی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

لبادے میں لپٹی لپٹائی سونیا نمودار ہوئی۔ جب وہ اسے دیکھ پائی، وہ اس سے صرف دو قدم دور تھی اور وہ بھی اب جس نکولائی کو دیکھ رہی تھی، وہ نکولائی وہ نہیں تھا جس سے وہ اب تک آشنا تھی اور جس سے وہ کچھ کچھ خوف زدہ رہی تھی۔ وہ نسوانی پارچات میں ملبوس تھا، اس کے بال ژولیدہ اور پریشان تھے اور اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کی پرمسرت مسکراہٹ تھی جو سونیا کے لیے بالکل نئی تھی۔ وہ اس کی طرف دوڑی۔

''کاملاً مختلف اور پھر بھی بالکل ویسی کی ویسی،'' نکولائی نے اس کے چہرے کی، جو چاندنی میں چمک دمک رہا تھا، طرف دیکھ کر سوچا۔ اس نے اپنے بازو اس کے پوستینی لبادے کے، جس سے وہ اپنا سر ڈھانپے ہوئے تھی، اندر گھسیڑ دیے اور اس سے ہم آغوش ہوگیا۔ اس نے اسے اپنی جانب بھینچا اور اس کے لبوں پر، جن پر مونچھیں پیوست تھیں اور جن سے سوختہ کارک کی بو آ رہی تھی، بوسہ ثبت کر دیا۔ سونیا نے اس کے ہونٹوں کا بھرپور بوسہ لیا اور اپنے ننھے منے ہاتھوں کو چھڑا کر اس کے رخساروں کو اپنی گرفت میں لے لیا۔

''سونیا''... ''نکولس!'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکے۔

وہ بھاگتے دوڑتے اناج گودام پہنچے اور پھر واپس چل دیے۔ وہ مکان میں دوبارہ انھیں راستوں سے، جن سے باہر آئے تھے، داخل ہوئے۔ نکولائی فرنٹ پورچ سے اور سونیا عقبی پورچ سے اندر آئی۔

12

''جب وہ پیلا گیا دانیلوونا کے گھر سے روانہ ہوئے، نتاشا نے، جس کی نظریں سب کچھ بھانپ لیتی تھیں اور جو ہر بات سے آگاہ رہتی تھی، کچھ یوں انتظام کیا کہ وہ خود اور لوئیسا ایوانوونا ڈملر کے ساتھ برف گاڑی میں بیٹھ گئیں جب کہ سونیا نکولائی اور خادماؤں کے ہمراہ چل پڑی۔

واپسی کے سفر کے دوران میں نکولائی نے گاڑی دوڑانے کے بجائے میانہ روی اختیار کی اور وہ پراسرار مہتابی روشنی میں، جو ہر چیز میں تغیر کلی برپا کر رہی تھی، مسلسل کن انکھیوں سے سونیا کو دیکھتا رہا۔ وہ اس چہرے میں ابروؤں اور مونچھوں کے نیچے اپنی سابقہ اور موجودہ دونوں طرح کی سونیا کو، جس سے اس نے کبھی جدا نہ ہونے کا تہیہ کر لیا تھا، تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اسے دیکھتے دیکھتے، پرانی اور نئی دونوں طرح کی سونیا کو پہچانتے اور سوختہ کارک کی بو کو، جس میں اس کے بوسے کا تجسس شامل تھا، یاد کرتے کرتے اس نے یخ بستہ ہوا میں گہری سانس لی اور اس نے دھرتی، جوان کے نیچے کھسکتی جا رہی تھی اور آکاش کی، جوان کے سروں کے اوپر جگمگا رہا تھا، طرف دیکھتے ہوئے محسوس کیا کہ وہ ایک بار پھر طلسم زدہ مملکت میں داخل ہو گیا۔

''سونیا، تیری طبیعت ٹھیک ہے؟'' وہ اس سے گاہے بگاہے پوچھ لیتا۔

''ہاں،'' وہ جواب دیتی۔ ''اور تیرا کیا حال ہے؟''

گھر کا نصف راستہ طے کرنے کے بعد نکولائی نے باگیں کوچوان کے سپرد کر دیں اور خود پیچھے نتاشا کی برف گاڑی کی طرف بھاگ پڑا۔ وہ کچھ دیر گاڑی کے بازو پر کھڑا رہا۔

''نتاشا،'' وہ فرانسیسی میں سرگوشی کرنے لگا۔ ''میں سونیا کے بارے میں قطعی فیصلے تک پہنچ گیا ہوں۔''

''اسے بتا دیا ہے؟'' نتاشا نے پوچھا۔ اچانک خوشی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''اف، ان ابروؤں اور ان مونچھوں کے ساتھ تم کتنی عجیب نظر آ رہی ہو۔ نتاشا، تم خوش ہو؟''

''میں؟ اتنی خوش ہوں کہ تمھیں بتا نہیں سکتی! مجھے تو تم پر طیش آنا شروع ہو گیا تھا۔ میں نے تم سے کچھ کہا تو نہیں تھا لیکن اس کے ساتھ تمھارا رویہ ٹھیک نہیں رہا تھا۔ نکولس، اس نے کیا دل پایا ہے! میں بے حد خوش ہوں! کبھی کبھی میرا رویہ نہایت بھیانک ہو جاتا ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب وہ خوشی سے محروم تھی، مجھے اپنی خوشی پر بڑی شرم آنے لگتی تھی،'' نتاشا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں کتنی خوش ہوں! اب بھاگو اور واپس اس کے پاس چلے جاؤ۔''

''نہیں، ایک منٹ ٹھہرو۔ تم کتنی مضحک نظر آرہی ہو!'' نکولائی نے کہا۔ وہ ابھی تک ٹکٹکی باندھے اس کا چہرہ دیکھے جارہا تھا۔ اسے اپنی ہمشیرہ میں بھی کوئی ایسی چیز، جو بالکل نئی تھی، غیر معمولی تھی اور من لبھانے کی حد تک پرلطف تھی اور جو اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی، نظر آرہی تھی۔ ''نتاشا، یہ بالکل طلسمی ہے، ٹھیک ہے؟''

''ہاں''، اس نے جواب دیا۔ ''تم نے قابل تعریف کام کیا ہے!''

''جن نگاہوں سے اب میں اسے دیکھ رہا ہوں، اگر پہلے دیکھ لیتا''، نکولائی نے سوچا، ''تو میں مدتوں پہلے اسے بتا چکا ہوتا کہ ہمیں کیا کرنا ہے اور جو کچھ وہ کہتی، میں اسے کر چکا ہوتا۔ یوں سب معاملہ ٹھیک ڈھنگ سے طے ہو چکا ہوتا۔''

''تو تم خوش ہو اور جو کچھ میں نے کیا ہے، ٹھیک کیا ہے؟''

''اوہ، بالکل ٹھیک! کوئی زیادہ دن نہیں ہوئے کہ اس بارے میں ماما سے میری تکرار بھی ہو گئی تھی۔ ماما کہہ رہی تھیں کہ وہ تمھارے لیے مچھلی پھانسنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ انھیں یہ بات زیب نہیں دیتی تھی۔ میں نے ماما کے سامنے قریب قریب ہنگامہ بپا کر دیا۔ میں کبھی کسی کو یہ اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ سونیا کے بارے میں کوئی بے ہودہ بات کہے یا سوچے کیونکہ وہ مجسم اچھائی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔''

''پھر یہ بالکل ٹھیک ہے؟'' نکولائی نے پوچھا اور اس نے یہ جانچنے کے لیے کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، درست کہہ رہی ہے، ایک بار پھر اس کے چہرے پر متجسسانہ نگاہ ڈالی، تب گاڑی سے نیچے چھلانگ لگائی اور اپنی گاڑی کی طرف بھاگ اٹھا۔ اس کے قدموں تلے برف چرمرا رہی تھی۔

وہی شاداں و فرحاں اور متبسم سرکیشیائی، جس کی مونچھیں اور تاب دار آنکھیں تھیں، وہاں بیٹھا تھا۔ سیاہ کلاہ کے نیچے سے اس کی نگاہیں اسے تکے جا رہی تھیں۔ وہ سرکیشیائی سونیا تھی اور لاریب اس مسرور و خوش مزاج اور الفت کرنے والی دوشیزہ نے مستقبل میں اس کی دلہن بننا تھا۔

جب وہ گھر پہنچ گئے اور اپنی ماں کو بتا چکے کہ میلیوکوفوں کے ہاں انھوں نے اپنا وقت کیسے گزارا تھا، لڑکیاں اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جب وہ اپنے کپڑے تبدیل کر چکیں۔۔۔ تاہم انھوں نے سوختہ کارک کی مونچھیں صاف نہ کیں۔۔۔ وہ اپنی فرخندگی کے متعلق کافی دیر بیٹھی باتیں کرتی رہیں۔ جب ان کی شادیاں ہو جائیں گی، وہ کس قسم کی زندگی گزاریں گی، کس طرح ان کے شوہر ان کے دوست ہوں گے اور وہ کتنی خوش و شادماں ہوں گی، یہ اور اس قسم کے موضوعات ان کی گفتگو کا محور بنے رہے۔ نتاشا کی میز پر دو آئینے، جنھیں قسمت کا حال معلوم کرنے کے لیے دنیاشا نے سرِ شام وہاں ترتیب دیا تھا، ایستادہ تھے۔

''لیکن یہ سب کچھ کب ہو گا؟ مجھے اندیشہ ہے کہ کبھی نہیں... یہ بات کچھ زیادہ ہی خوش آئند ہے!'' نتاشا نے اٹھتے اور آئینوں کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

''نتاشا، بیٹھ جاؤ، شاید، تمھیں نظر آجائیں''، سونیا نے کہا۔

نتاشا نے موم بتیاں روشن کر دیں اور بیٹھ گئی۔

''مجھے تو کوئی مونچھوں والا نظر آ رہا ہے،'' نتاشا نے (آئینے میں) اپنے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''مس، آپ کو یوں مذاق نہیں اڑانا چاہیے،'' دنیاشا نے کہا۔

نتاشا نے سونیا اور خادمہ کی مدد سے آئینے ایک دوسرے کے بالمقابل صحیح طور پر نصب کر دیے۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری ہو گئی اور وہ بالکل خاموش ہو گئی۔ آئینے میں یکے بعد دیگرے موم بتیوں کے عکس نظر آنے لگے۔ وہ کافی دیر تک انھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتی رہی اور (ان کہانیوں کے مطابق جو اس نے سن رکھی تھیں) اس امر کی توقع کرنے لگی کہ کوئی دم میں اسے دور ترین دھندلے اور غیر واضح چوک میں کوئی تابوت یا وہ، یعنی پرنس آندرے، نظر آ جائے گا۔ اگرچہ وہ معمولی سے معمولی دھبے کو بھی انسانی ہیولیٰ یا تابوت سمجھنے کے لیے تیار تھی، اسے کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھیں جھپکائیں اور پھر آئینوں سے پرے ہٹ گئی۔

''آخر یہ دوسرے لوگوں کو چیزیں کیوں نظر آ جاتی ہیں اور مجھے کیوں نہیں آتیں؟'' اس نے کہا۔ ''سونیا، اب تم آؤ اور یہاں بیٹھ جاؤ۔ آج رات تمھیں لازماً بیٹھنا ہوگا۔ میری خاطر بیٹھ جاؤ... آج رات خوف مجھ پر آسیب بن کر سوار ہو گیا ہے...''

سونیا آئینوں کے سامنے بیٹھ گئی۔ اس نے اپنا آسن درست کیا اور ان میں جھانکنے لگی۔

''سونیا الیکساندرونا کو ضرور بالضرور کچھ نہ کچھ نظر آ جائے گا۔'' دنیاشا نے سرگوشی کی، ''لیکن آپ ہمیشہ مذاق اڑاتی رہتی ہیں۔''

سونیا نے یہ بات سن لی اور اس نے نتاشا کو بھی کھسر پھسر کرتے سنا:

''مجھے معلوم ہے کہ اسے کچھ نہ کچھ لازماً نظر آ جائے گا۔ اس نے گزشتہ برس بھی کچھ دیکھا تھا۔''

دو تین منٹ وہ سب خاموش رہیں۔

''وہ یقیناً کچھ نہ کچھ دیکھ لے گی!'' نتاشا نے زیرِ لب کہا۔ لیکن یہ الفاظ بمشکل اس کے منہ سے نکلے تھے کہ اچانک سونیا نے وہ آئینہ، جو وہ تھامے ہوئے تھی، ایک طرف دھکیل دیا اور اپنے ہاتھ سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں۔

''اف، نتاشا!'' وہ چلائی۔

''تم نے کچھ دیکھا؟ کچھ دیکھا؟ کیا تھا یہ؟'' نتاشا نے چیختے ہوئے پوچھا۔

سونیا نے کچھ نہیں دیکھا تھا۔ وہ صرف اپنی آنکھیں جھپکانا اور اٹھنا چاہتی تھی کہ اس نے نتاشا کو یہ کہتے سنا: ''وہ یقیناً کچھ نہ کچھ دیکھ لے گی!'' وہ دنیاشا یا نتاشا کو مایوس نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن وہاں بیٹھنا بھی بارِ خاطر تھا۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ جب اس نے اپنی آنکھیں ڈھانپی تھیں، اس کے منہ سے کیوں اور کیسے چیخ نکل گئی تھی۔

''تم نے انھیں دیکھا؟'' نتاشا نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔ ٹھہرو... میں... میں نے انھیں دیکھا،'' سونیا نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے پایا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم

نہیں ہوسکتا تھا کہ انھیں سے نتاشا کی مراد نکولائی تھا یا پرنس آندرے۔

''میں کیوں نہ یہ کہہ دوں کہ میں نے کچھ دیکھا ہے؟ آخر دوسرے لوگوں کو چیزیں نظر آتی ہی ہیں۔ علاوہ ازیں کون کہہ سکتا ہے کہ میں نے کچھ دیکھا ہے یا نہیں؟'' اچانک سونیا کے ذہن میں یہ خیال کوندے کی طرح لپکا۔

''ہاں، میں نے انھیں دیکھا،'' اس نے کہا۔

''لیکن کیسے — کھڑے تھے یا لیٹے ہوئے؟''

''خیر، میں نے دیکھا... پہلے پہل تو کچھ دکھائی نہ دیا، پھر میں نے انھیں لیٹے دیکھا۔''

''آندرے لیٹے ہوئے تھے، وہ بیمار ہیں؟'' نتاشا نے کہا۔ اس کی خوف زدہ نگاہیں اپنی سہیلی پر مرکوز تھیں۔

''نہیں، اس کے برعکس، اس کے برعکس — وہ ہشاش بشاش نظر آرہے تھے اور انھوں نے مڑ کر میری طرف دیکھا...'' اور جب وہ یہ الفاظ کہہ رہی تھی، اسے محسوس ہونے لگا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہی ہے، اسے وہ فی الواقع دیکھ چکی ہے۔

''اس کے بعد میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ یہ کیا ہے... کوئی نیلی اور سرخ چیز...''

''سونیا! وہ کب واپس آئیں گے؟ میں انھیں کب دیکھ سکوں گی؟ اف، خدایا! مجھے ان کے اور اپنے بارے میں کتنی تشویش ہے — میں ہر چیز کے بارے میں ڈر رہی ہوں...'' نتاشا بولتی چلی گئی۔ سونیا نے اسے بار بار تسلی دینے کی کوشش کی لیکن اس نے اس کی کسی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اپنے بستر میں گھس گئی اور اپنی موم بتی کے بجھنے کے بعد بھی کافی دیر تک آنکھیں کھولے بے حس و حرکت لیٹی رہی اور یخ بستہ دریچوں میں سے جو ناخوشگوار مہتابی روشنی چھن چھن کر اندر آرہی تھی، اسے گھور گھور کر دیکھتی رہی۔

13

کرسمس کی چھٹیوں کے اختتام کے چند دن بعد ہی نکولائی نے اپنی ماں کو سونیا سے اپنی محبت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ وہ اس کے ساتھ شادی کرنے کا پختہ ارادہ کر چکا ہے۔ ان دونوں کے مابین جو پخت و پز ہو رہی تھی، کاؤنٹس کافی عرصے سے اس سے آگاہ تھی اور اس اعلان کی توقع کر رہی تھی۔ وہ چپ چاپ سب کچھ سنتی رہی۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو بتایا کہ وہ جس سے اس کا جی چاہے، شادی رچالے لیکن اس طرح کی شادی میں نہ اس کی اپنی اور نہ اس کے باپ کی دعائیں ان کے شامل حال ہوں گی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ نکولائی کو احساس ہوا کہ اس کی ماں اس سے ناخوش ہے اور یہ کہ اس کے ساتھ اپنی تمام تر محبت کے باوجود کبھی اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کرے گی۔ کاؤنٹس نے اپنے بیٹے کی طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا تک گوارا نہ کیا اور سرد مہری سے اپنے خاوند کو بلا بھیجا۔ جب وہ آ گیا، اس نے نکولائی کی موجودگی میں سخت روکھے لہجے سے اسے مختصراً صورت حال سے آگاہ کیا، تاہم وہ اپنی شدت جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور جھلاہٹ میں زار و قطار روتی کمرے سے باہر نکل گئی۔ سن رسیدہ کاؤنٹ نے

نیم دلی سے نکولائی کو ڈانٹ ڈپٹ پلائی اور اس سے التجا کرنے لگا کہ وہ اپنے عزائم کو طاق نسیان پر رکھ دے۔ نکولائی نے جواب دیا کہ وہ اپنے قول وقرار سے نہیں پھر سکتا۔ اس کے باپ نے آہ بھری۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کھسیانا ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس نے اپنا مکالمہ ادھورا چھوڑا اور کاؤنٹس کے پاس چلا گیا۔

کاؤنٹ کی جب بھی اپنے بیٹے سے مڈھ بھیڑ ہوتی، اسے جرم کا احساس گھیر لیتا کہ اس نے خاندانی جائیداد اللوں تللوں میں اڑا دی ہے اور یوں وہ اس کے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہوا ہے۔ چنانچہ اگر اس نے کسی صاحب جائیداد دوشیزہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور بے جہیز سونیا کو اپنی شریک حیات منتخب کیا ہے، تو وہ اس سے برافروختہ نہیں ہو سکتا۔ صرف اس موقع پر اسے اس بات کا شدت سے احساس ہوا کہ اگر اس کے حالات اتنے دگرگوں نہ ہوتے تو نکولائی کے لیے سونیا سے بہتر شریک حیات کی آرزو نہیں کی جا سکتی تھی، اور یہ کہ اس کے کنبے کے مالی امور نے جو ابتر صورت اختیار کی ہے، اس کے لیے اس کے اپنے علاوہ، اگرچہ متنکا اور اس کی ناقابل اصلاح عاداتِ بد کا اس میں برابر کا حصہ ہے، کسی اور کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

ماں اور باپ نے اس معاملے کے بارے میں دوبارہ اپنے بیٹے سے کوئی بات نہ کی، لیکن چند دنوں کے بعد کاؤنٹس نے سونیا کو بلایا اور اپنی بھانجی کو زجر و توبیخ کرنے لگی کہ وہ اس کے بیٹے کو اپنے جال میں پھانس رہی ہے اور اس پر الزام لگایا کہ وہ سخت ناشکری ہے۔ اس کا انداز گفتگو اتنا سفاکانہ اور بہیمانہ تھا کہ وہ دونوں ہی ششدر رہ گئیں۔ سونیا نگاہیں جھکائے چپ چاپ کاؤنٹس کی تلخ و ترش باتیں سنتی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے کس چیز کا تقاضا کیا جا رہا ہے۔ وہ اپنے محسنوں کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار تھی۔ ایثار و قربانی اس کا محبوب ترین آدرش تھا لیکن اس معاملے میں وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھی کہ اسے کیا قربانی دینا ہوگی اور کس کے لیے دینا ہوگی۔ وہ کاؤنٹس اور سارے کے سارے رستوف خاندان سے محبت کیے بنا نہیں رہ سکتی تھی لیکن وہ نکولائی سے پیار کیے بنا بھی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس (نکولائی) کی تمام خوشیوں کا دار و مدار اسی محبت پر ہے۔ وہ اداس و مغموم خاموش کھڑی رہی اور جواب میں کچھ نہ بولی۔

نکولائی کو احساس ہونے لگا کہ وہ اس صورت حال کو مزید برداشت نہیں کر سکتا اور وہ اسے سلجھانے اپنی ماں کے پاس چلا گیا۔ اس نے پہلے تو اس کی منت سماجت کی کہ وہ اسے اور سونیا کو معاف کر دے اور ان کی شادی پر رضامندی کا اظہار کر دے۔ پھر وہ دھمکیوں پر اتر آیا اور بولا کہ اگر وہ سونیا کو یونہی ذہنی اذیت دیتی رہی، وہ جھٹ پٹ چپکے چپکے اس سے شادی کر لے گا اور کسی کو کانوں کان اس کی خبر نہ ہونے دے گا۔

کاؤنٹس نے کچھ ایسی سرد مزاجی سے، جو اس کے بیٹے نے اس سے پہلے کبھی اس میں نہیں دیکھی تھی، جواب دیا کہ وہ بالغ ہو چکا ہے، پرنس آندرے اپنے باپ کی رضا کے بغیر شادی کر رہا ہے، وہ بھی کر لے، اسے کھلی چھٹی ہے۔ تاہم جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے، وہ اس intrigante* کو کبھی اپنی بیٹی تسلیم نہیں کرے گی۔

* سازشی (عورت یا لڑکی)۔

intrigante کا لفظ سن کر نکولائی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔اس کی آواز بلند ہوگئی اور اس نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ اسے یوں اپنے جذبات کا سودا کرنے پر مجبور کرے گی اور اگر حالات یہی رہے، پھر اسے جو آخری بات کہنا ہے، وہ... لیکن پیشتر اس کے کہ اس کے منہ سے انمٹ اور فیصلہ کن الفاظ، جن کا، اس کے چہرے کے تاثرات بھانپتے ہوئے اس کی ماں خوف ودہشت کے عالم میں انتظار کر رہی تھی، اور جو غالباً ان دونوں کے اذہان پر اذیت ناک یادیں مرتسم کر دیتے، ادا ہوتے، نتاشا، جو دروازے کے قریب کھڑی سب کچھ سن رہی تھی، بھاگتی اندر آئی۔اس کا رنگ فق اور چہرہ گمبھیر تھا۔

''نکولینکا، تمھیں پتا نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو! چپ ہو جاؤ، چپ ہو جاؤ، میں کہتی ہوں، چپ ہو جاؤ!'' اس کی آواز دبانے کی کوشش میں وہ تقریباً چیخ رہی تھی۔

''ماما ڈارلنگ، اس کا یہ مطلب بالکل نہیں تھا۔میری پیاری، بے چاری ماما!'' اس نے اپنی ماں سے کہا جو اس بات سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی کہ وہ ناچاقی کی حدود تک پہنچ چکے ہیں اور جو خوف ودہشت کے عالم میں ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہی تھی لیکن اس کی اپنی ہٹ دھرمی اور جھگڑے کی شدت اسے ہتھیار ڈالنے نہیں دیتی تھی اور نہ دے سکتی تھی۔

''نکولینکا، میں تمھیں بعد میں سمجھا دوں گی۔بس اب تم جاؤ! ماما ڈارلنگ، سنیں...'' نتاشا نے کہا۔

اس کے الفاظ بے ربط تھے لیکن وہ اپنا مقصد پورا کر گئے۔

کاؤنٹس نے زور سے سسکی بھری اور اپنا چہرہ اپنی بیٹی کے سینے میں چھپا لیا۔دریں اثنا نکولائی اٹھا اور سر پکڑے کمرے سے باہر نکل گیا۔

نتاشا صلح کرانے میں جت گئی اور وہ اس حد تک کامیاب رہی کہ نکولائی کو اس کی ماں کی طرف سے یقین دلا دیا گیا کہ سونیا کے ساتھ بدسلوکی نہیں کی جائے گی اور جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اس نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ اپنے ماں باپ کو بتائے بغیر کوئی قدم نہیں اٹھائے گا۔

نکولائی نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ جونہی وہ اپنی فوجی ملازمت سے متعلق معاملات نپٹا سکا، وہ اپنے عہدے سے مستعفی ہو جائے گا، واپس آئے گا اور سونیا کے ساتھ شادی کر لے گا۔اس کے چہرے پر ہر وقت سنجیدگی اور حزن وملال برسنے لگا، والدین سے اس کی راہیں مختلف ہو گئی تھیں لیکن اپنے خیال کے مطابق وہ سرتاپا شدت سے محبت میں گرفتار ہو چکا تھا۔جنوری کے آغاز میں وہ اپنی رجمنٹ میں دوبارہ شامل ہونے کی غرض سے گھر سے روانہ ہو گیا۔

نکولائی کی روانگی کے بعد رستوفوں کے گھر کا ماحول پہلے سے بھی زیادہ افسردہ ہو گیا۔ذہنی پریشانیوں نے کاؤنٹس کو بستر علالت پر لٹا دیا۔

نکولائی کی فرقت نے سونیا کو رنجیدہ کر دیا، لیکن اس سے بھی زیادہ دکھ اسے کاؤنٹس کے معاندانہ رویے سے، جو وہ اختیار کیے بنا رہ نہیں سکتی تھی، ہوتا تھا۔معاملات کی، جو کسی فیصلہ کن اقدام کے متقاضی تھے، زبوں حالی نے

کاؤنٹ کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پریشان کر دیا تھا۔ شہری مکان اور ماسکو کے مضافات میں واقع جاگیر فروخت کیے بنا چارہ نہیں رہا تھا۔ اس کے لیے ماسکو جانا ضروری تھا لیکن کاؤنٹس کی ناسازیٔ طبع انھیں آئے دن اپنی روانگی ملتوی کرنے پر مجبور کر دیتی تھی۔

نتاشا نے اپنے منگیتر سے فراق کا ابتدائی عرصہ کسی قسم کا خاص تردد کیے بغیر، بلکہ ہنسی خوشی گزار دیا تھا، لیکن اب اس کی بے چینی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگا تھا۔ یہ خیال کہ اس کی زندگی کا بہترین دور، جو اس سے محبت کرنے میں گزارا جا سکتا تھا، بیکار جا رہا ہے اور کسی کو اس سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا، اس کے لیے متواتر سوہان روح بنتا جا رہا تھا۔ اس کے خطوط زیادہ تر اسے غصہ دلانے کا موجب بنتے تھے۔ یہ سوچ سوچ کر اسے بہت دکھ ہوتا تھا کہ وہ محض اس کو اپنے خیالوں میں بسائے زندگی گزار رہی ہے جب کہ وہ خود حقیقی زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہے کہ نت نئے نئے مقامات کی سیر کرتا ہے اور نت نئے نئے لوگوں سے، جو اسے دلچسپ معلوم ہوتے، ملاقاتیں کرتا پھرتا ہے۔ اس کے خطوط جتنے زیادہ پر لطف ہوتے، اسے وہ اتنا ہی زیادہ مشتعل کرتے۔ جو خطوط وہ اسے لکھتی، بجائے اس کے کہ وہ اس کی تسکین کا باعث بنتے، انھیں لکھنا اسے ناگوار اور مصنوعی فریضہ معلوم ہونے لگا۔ وہ صحیح معنوں میں لکھ نہیں سکتی تھی کیونکہ یہ بات اس کے ذہن میں آتی ہی نہیں تھی کہ وہ بات جسے وہ اپنے لہجے کے اتار چڑھاؤ، مسکراہٹ یا نظروں سے ادا کرنے کی عادی تھی، اس کا ہزارواں حصہ بھی پر خلوص انداز سے خط میں بیان کرنا ممکن ہے۔ وہ اسے خشک، روایتی، یک لہجی اور غیر متنوع خطوط، جنھیں وہ خود ذرا سی بھی اہمیت نہیں دیتی تھی اور جن کے ابتدائی مسودوں میں کاؤنٹس اس کی املا کی غلطیاں درست کرتی تھی، تحریر کرتی رہی۔

کاؤنٹس کو ابھی کوئی افاقہ نہیں ہوا تھا لیکن ماسکو کا سفر مزید ملتوی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نتاشا کا عروسی جوڑا تیار کرانا اور مکان فروخت کرنا تھا۔ مزید برآں ماسکو میں پرنس آندرے کی آمد متوقع تھی کیونکہ اس کا باپ سردیاں وہیں گزارا کرتا تھا اور نتاشا کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ وہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکا ہے۔

کاؤنٹس دیہاتی جاگیر پر ہی مقیم رہی اور جنوری کے اختتام پر کاؤنٹ نتاشا اور سونیا کی معیت میں عازمِ ماسکو ہو گیا۔

حصہ پنجم

1

نتاشا کی پرنس آندرے کے ساتھ نسبت طے پا جانے کے بعد پیئر کو بظاہر کسی وجہ کے بغیر اچانک محسوس ہونے لگا کہ پہلے کی طرح زندگی گزارنا ناممکن ہے۔ اس کے محسن نے اس کے سامنے جن حقائق کی نقاب کشائی کی تھی، اگرچہ اسے ان کی صحت کے بارے میں پختہ یقین تھا اور تکمیل ذات کے روحانی کام میں، جس کے لیے اس نے اپنا تن من دھن وقف کر رکھا تھا، وہ جس طرح جوش و خروش کا اظہار کرتا تھا، اگرچہ اس کے ابتدائی دور میں وہ بے حد مسرور و شادماں تھا، لیکن نتاشا اور پرنس آندرے کی منگنی اور آئی اوسف الیکسی وچ کے انتقال کے بعد، جس کی اطلاع اسے تقریباً اسی زمانے میں ملی تھی، اس قسم کی زندگی اس کے لیے ساری دل کشی کھو بیٹھی۔ صرف زندگی کا خول— اس کا گھر، درخشندہ شریک حیات، جو اب ایک انتہائی اہم شخصیت کی منظور نظر بن چکی تھی، سارے پیٹرز برگ سے شناسائی، اپنی اکتا دینے والی رسوم و قواعد کے ساتھ اس کی درباری ملازمت— باقی رہ گیا تھا۔ اور ایکا ایکی پیئر کو غیر متوقع طور پر اس زندگی سے گھن آنے لگی۔ اس نے روزنامچہ لکھنا بند کر دیا، برادران کی صحبت سے کنی کترانے لگا، وہ ایک بار پھر کلب جانے اور جی بھر کر شراب نوشی کرنے لگا۔ اس نے کنواروں کے حلقوں کے ساتھ اپنے تعلقات کی از سر نو تجدید کی اور اس طرح کی زندگی بسر کرنا شروع کر دیا کہ کاؤنٹس ہیلینا واسیلیونا کے لیے اسے آڑے ہاتھوں لینا ناگزیر ہو گیا۔ پیئر کو محسوس ہوا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے، چنانچہ اس بات سے بچنے کی غرض سے کہ کہیں اس کی اہلیہ کو محض اس کی وجہ سے کسی ناگوار صورت حال کا سامنا نہ کرنا پڑے، وہ ماسکو روانہ ہو گیا۔

جونہی اس نے ماسکو میں اپنے وسیع و عریض محل نما مکان میں، جس میں خدام کی فوج ظفر موج تعینات تھی اور جس میں ابھی تک پرنسیس، جو مرجھا چکی تھیں اور مزید مرجھاتی جا رہی تھیں، مقیم تھیں، قدم رکھا، جونہی اپنی گاڑی میں سوار شہر کے بیچوں بیچ گزرتے اسے آیبریائی چیپل[1]، جس کے طلائی ڈبوں میں رکھے ایقونوں کے سامنے لاتعداد باریک مخروطی موم بتیاں جل رہی تھیں دکھائی دیا، جونہی اس نے کریملن سکوائر، جس کی برف ابھی گاڑیوں کے تلے روندی نہیں گئی تھی، برف گاڑیوں کے کوچوانوں اور سیوسیف وراژوک (محلہ غربا) کے تنگ و تاریک مکانوں کو دیکھا، جونہی اس کی ماسکو کے قدیم باسیوں پر، جو پرسکون انداز سے اپنی زندگیوں کے ایام پورے کر

رہے تھے، جنھیں کسی چیز کی تمنا نہیں تھی، کہیں جانے کی جلدی نہیں تھی، پڑیں، جونہی ماسکو کی سن رسیدہ خواتین اور نوجوان دوشیزائیں، ماسکو کا انگلش کلب اور اجتماعی رقص گاہیں اس کی نگاہوں میں آئیں، اسے محسوس ہوا کہ وہ اپنے گھر۔ پرسکون جنت۔۔۔ میں پہنچ گیا ہے۔ ماسکو میں اسے اسی راحت و آرام اور حرارت کا احساس ہوتا جو آدمی کو پرانے اور بوسیدہ ڈریسنگ گاؤن میں ملتی ہے۔

بڑی بوڑھیوں سے لے کر بچوں تک ماسکو کی سوسائٹی نے پیئر کا استقبال ایک ایسے مہمان کی، جس کا مدتوں سے انتظار ہو، جس کی جگہ ہمیشہ تیار ہو اور اس کی آمد منتظر، حیثیت سے کیا۔ اہالیان ماسکو کی نظروں میں وہ eccentric* ضرور تھا لیکن ایسا eccentric، جو انتہائی شستہ، شفیق، ذہین، ملنسار اور فیاض تھا اور وہ اسے شرفا کے پرانے دبستان کا غیر حاضر دماغ اور غمگسار روسی گردانتے تھے۔ اس کا بٹوا ہمیشہ خالی رہتا تھا کیونکہ یہ ہر کس و ناکس کے لیے ہر دم کھلا رہتا تھا۔

امدادی شو، معمولی تصویریں اور مجسمے، جپسیوں کے موسیقی کے جشن، درس گاہیں، چندے کے ڈنر، رفاہی انجمنیں، ناؤ و نوش کی محفلیں، فری میسن، گرجے، کتابیں۔۔۔ جس نام سے اور جس غرض سے بھی سوالی آیا، کبھی اس کے در سے خالی نہ گیا۔ اور اگر دو دوست، جنھوں نے اس سے بڑی بڑی رقوم قرض لے رکھی تھیں اور اب اسے اپنی پناہ میں لے چکے تھے، بیچ میں نہ پڑتے، وہ اپنا سب کچھ بانٹ چکا ہوتا۔ (انگلش) کلب میں کوئی دعوت یا محفل اس کے بغیر منعقد نہیں ہوتی تھی۔ مارگو کی دو بوتلیں چڑھانے کے بعد جونہی وہ صوفے پر اپنی معمول کی نشست پر نڈھال ہو کر گر پڑتا، احباب اس کے ارد گرد حلقہ بنا لیتے، پھر باتوں، بحثوں، لطیفوں اور ایک دوسرے کی ٹانگ گھسیٹنے کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا۔ جب کبھی معاملہ تو تکار تک پہنچتا، اس کی پر از شفقت مسکراہٹ اور برمحل فقرے بازی مخالفین کے مابین دوبارہ صلح کرانے کا موجب بنتی۔ اس کی عدم موجودگی میں میسوں کی دعوتیں پھیکی اور بے کیف ہوتیں۔ جب کبھی وہ کنواروں کے سپر کے اختتام پر اٹھ کھڑا ہوتا، لیکن اپنی دل کش اور مشفقانہ مسکراہٹ سے رنگ رلیاں منانے والوں کی التجاؤں اور منت سماجتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا اور گاڑی میں سوار ان کے ساتھ کہیں چل پڑتا، اس کے نوجوان ساتھی خوشی اور مسرت سے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے لگتے۔ اگر اجتماعی رقص کے دوران میں کسی کو ساتھی کی ضرورت پیش آتی، وہ اپنی خدمات پیش کر دیتا اور ناچ میں شریک ہو جاتا۔ لڑکیاں اور نوجوان شادی شدہ خواتین اسے بنظر پسندیدگی دیکھتی تھیں کیونکہ وہ کسی کے ساتھ بھی معاشقہ لڑانے کی کوشش نہیں کرتا تھا بلکہ اس کا سب کے ساتھ، خاص طور پر سپر کے بعد، سلوک یکساں طور پر ملتفتانہ ہوتا تھا۔ "Il est charmant, il n'a pas de sexe"** وہ اس کے متعلق کہا کرتے۔

---

* وہ شخص جو عادات، اطوار، خیالات یا اپنے ملبوسات کی بنا پر دوسروں سے الگ تھلگ اور یوں عجیب و غریب اور نرالا دکھائی دے۔ بعض لوگ ایسے شخص کو خبطی بھی تصور کرتے ہیں۔

** وہ پرکشش ہے۔ اس کی کوئی جنس نہیں۔

پیئر ان ریٹائرڈ درباری مصاحبوں میں، جو سینکڑوں کی تعداد میں ماسکو میں خوش وخرم اپنی زندگیوں کے ایام بتا رہے تھے، شامل تھا۔

سات سال قبل، جب وہ اولین بار پردیس سے دیس لوٹا تھا، اگر کوئی اس سے یہ کہتا کہ اسے کسی چیز کی جستجو کرنے یا منصوبہ بندی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اس کا راستہ مدتوں پہلے متشکل ہو چکا ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے متعین کیا جا چکا ہے، وہ خواہ کتنا ہی تڑپے، بل کھائے، وہ رہے گا وہی جو اس کے مقام کے دوسرے اشخاص کا مقدر ہے، تو اسے کتنا دھچکا پہنچتا! اسے اس پر یقین ہی نہ آتا۔ کیا کسی زمانے میں اس کی یہ زبردست آرزو نہیں تھی کہ روس کو جمہوری ملک بنایا جائے؟ کیا اس کے بعد وہ نپولین، پھر فلسفی، پھر فن حرب وضرب کا ماہر اور پھر خود نپولین کا فاتح نہیں بننا چاہتا تھا؟ کیا اس نے بدخصال وبداعمال بنی نوع انسان کی نشاۃ الثانیہ کے خواب نہیں بنے تھے اور اپنی ذات کو اکملیت کے بلند ترین درجے تک پہنچانا نہیں چاہا تھا؟ کیا اس نے مدارس اور شفاخانے قائم نہیں کیے تھے اور زرعی غلاموں کو آزاد نہیں کیا تھا؟

لیکن ان تمام باتوں کے بجائے وہ اب کیا تھا؟ بے وفا بیوی کا دولت مند شوہر اور ریٹائرڈ مصاحب شاہ، جس کا شوق کھانا پینا اور ڈنر کے بعد واسکٹ کے بٹن کھول کر حکومت کو ملاحیاں سنانا تھا۔ وہ انگلش کلب کا رکن تھا اور ماسکو کے سارے اونچے طبقے کی آنکھوں کا تارا۔ کافی عرصے تک اس سے یہ بات ہضم نہ ہو سکی کہ وہ اب اسی طرح کا ریٹائرڈ مصاحب شاہ ہے جسے وہ قبل ازیں سات سال تک بھرپور حقارت کی نظر سے دیکھتا رہا تھا۔

بعض اوقات وہ اس تصور سے اپنا دل بہلا لیتا تھا کہ جس نوعیت کی زندگی وہ بسر کر رہا ہے، وہ محض عارضی ہے لیکن بہت جلد اسے ایک خیال سے سخت دھچکا پہنچا ــ اس کی طرح کتنے ہی آدمیوں نے، جب ابھی ان کے پیٹ میں آنت، منہ میں دانت اور سر پر ڈھیروں بال تھے، یہ سمجھ کر اس قسم کی زندگی کی شروعات کی اور اس کلب کی رکنیت اختیار کی کہ اس کی نوعیت محض عارضی ہے، لیکن جب وہ یہاں سے نکلے، ان کے دانت، آنت اور بال سب صاف ہو چکے تھے!

جب وہ تعلّی اور فخر ومباہات کے لمحات میں اپنے مقام کا جائزہ لے رہا ہوتا، اسے کچھ یوں دکھائی دیتا کہ وہ ان ریٹائرڈ مصاحبین شاہ سے، جن سے اسے دور سابق میں گھن آتی تھی، بالکل مختلف اور متمائز ہے ــ وہ سطحی، کم ظرف اور گاؤدی ہیں اور اپنے مقام ومرتبے پر مطمئن ہیں، ''جب کہ میں ابھی تک نامطمئن ہوں، میں اب بھی بنی نوع انسان کی بھلائی کے لیے کچھ کرنے کا شدت سے آرزومند ہوں۔'' ایسے مواقع پر وہ اپنے آپ سے کہا کرتا۔ ''لیکن شاید میرے ان تمام رفقا نے میری ہی طرح جدوجہد کی تھی، زندگی میں نئی اور اچھوتی راہیں تراشنے کی کوشش کی تھی اور شاید میری ہی طرح حالات، معاشرے اور نسب ــ وہ فطری قوت جس کے آگے انسان بے بس ہے ــ نے انھیں بھی اسی مقام پر، جس پر میں اپنے آپ کو پا رہا ہوں، لا کھڑا کیا،'' وہ عاجزی کے لمحات میں اپنے آپ سے کہتا۔ اور ماسکو میں چندے قیام کے بعد اسے اب اپنے ہم تقدیر ساتھیوں سے نفرت نہ رہی بلکہ وہ ان کا گرویدہ

ہونے، ان کا احترام کرنے اور ان پر رحم کھانے لگا۔

پیئر پر اب مایوسی، مالیخولیا اور زندگی سے بیزاری کے لمحات کبھی وارد نہیں ہوتے تھے، لیکن وہ عارضہ، جو دورِ سابق میں شدید دوروں کی شکل میں اپنا اظہار کرتا تھا، اب باطن کی جانب دھکیل دیا گیا اور ایک لحظے کے لیے بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ ''کس لیے؟ کیا فائدہ؟ دنیا میں کیا ہو رہا ہے؟'' وہ دن کے دوران میں بار بار اپنے آپ سے پوچھتا اور مخمصے میں گرفتار ہو جاتا، اور یوں غیر ارادی طور پر مظاہرِ حیات کے مفاہیم کی از سرِ نو جستجو کرنے لگتا۔ پھر چونکہ تجربے سے اسے معلوم تھا کہ ان سوالات کے کوئی جوابات نہیں ہیں، وہ بالتعجیل انھیں اپنے دماغ سے نکال باہر کرنے کی سعی کرنے لگتا۔ وہ کوئی کتاب اٹھا لیتا یا بلا تاخیر کلب یا اپالون نکولائی وچ کے ریستوران کا رخ کرتا تاکہ شہر کی تازہ ترین گپ شپ کے بارے میں تبادلۂ خیالات کر سکے۔

''ہیلینا واسیلیونا کو اپنے جسم کے علاوہ کبھی کسی دوسری چیز کے متعلق فکر لاحق نہیں ہوئی۔ اس کا شمار روئے زمین کی احمق ترین عورتوں میں کیا جا سکتا ہے،'' پیئر سوچتا۔ ''لیکن اسے ذہانت اور نستعلیقیت کی معراج تصور کیا جاتا ہے اور لوگ ہیں کہ اس کے آگے بچھے جاتے ہیں اور اس کی تعریفوں کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ نپولین جب تک عظمت کے سنگھاسن پر براجمان رہا، ہر کوئی اسے بنظرِ حقارت دیکھتا رہا لیکن اب جب کہ وہ قابلِ رحم مسخرہ بن چکا ہے، امپراطور فرانٹس اپنی دخترِ نیک اختر کو اس کے غیر شرعی حبالۂ عقد[3] میں دینا چاہتا ہے۔ ہسپانوی چودہ جون[4] کو اپنے کیتھولک پادریوں کی وساطت سے خداوند کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اس نے انھیں فرانسیسیوں پر فتح دلائی تھی اور فرانسیسی بھی اپنے کیتھولک پادریوں کی وساطت سے اس کا شکر بجا لاتے ہیں کہ اس نے اسی روز انھیں ہسپانیوں کے خلاف کامیاب کرایا تھا۔ میرے میسن برادران اپنے خون میں انگلی ڈبو کر حلف اٹھاتے ہیں کہ وہ اپنے پڑوسی کے لیے تن من دھن قربان کر دیں گے لیکن غربا و مساکین کے لیے چندہ جمع کرنے کی نوبت آئے، تو ایک روبل تک نہیں دیتے۔ آستریا لاج 'متلاشیانِ من و سلویٰ'[5] کے خلاف سازشیں کرتی ہے اور یہ سب اصلی سکاٹش غالیچے[6]، یا منشور کے، جس کا مطلب خود اس شخص کی، جس نے اسے تحریر کیا تھا، سمجھ میں بھی نہیں آیا تھا اور جس کی نہ کسی کو ضرورت ہے، متعلق خوب غل غپاڑا مچاتے ہیں۔ ہم سب مسیحی قانون ــ اگر کوئی شخص تمھارے ساتھ زیادتی کرے، تو عفو اور درگزر سے کام لو اور اپنے پڑوسی سے پیار کرو ــ کا محض زبانی کلامی کلمہ پڑھتے ہیں۔ یہ وہ قانون ہے، جس کے احترام میں ہم نے ماسکو میں لاتعداد گرجے تعمیر کر دیے ہیں لیکن کل ایک مرتد کو کوڑے[7] مار مار کر ہلاک کر دیا گیا اور عفو و محبت کے اسی قانون پر عمل درآمد کرنے والے ایک پادری نے کارروائی سے پہلے جلاد کو صلیب تھمائی تاکہ وہ اسے چوم سکے۔'' پیئر کافی دیر تک اسی طرح سوچ بچار کرتا رہا اور یہ کاملاً عالم گیر منافقت، جس کا ہر کوئی کلمہ پڑھتا ہے، باوجود اس امر کے کہ پیئر کو آئے روز اس سے واسطہ پڑتا تھا اور وہ اس کا عادی ہو چکا تھا، کبھی کبھی اسے حیرت و استعجاب میں ڈالنے میں ناکام نہ رہی جیسے یہ کوئی نئی چیز ہو۔ ''بد دیانتی اور پریشان خیالی میری سمجھ میں آتی ہے لیکن جو کچھ میں دیکھتا ہوں، انھیں کیسے بتاؤں؟ میں نے کوشش کی اور مجھے ہمیشہ یہی احساس ہوا کہ جس

طرح میں جانتا ہوں، قلوب کی گہرائیوں میں وہ بھی اسی طرح جانتے ہیں لیکن وہ جان بوجھ کر اپنی آنکھیں بند کیے ہوئے ہیں اور پوری کوشش کرتے ہیں کہ وہ اسے دیکھ نہ پائیں۔ میرا خیال ہے کہ بات کچھ ایسی ہی ہے۔ لیکن میں۔ میرا کیا بنے گا؟'' پیئر نے سوچا۔

متعدد انسانوں، بالخصوص روسیوں میں ایک صلاحیت عام ہوتی ہے کہ وہ نیکی اور صداقت کے امکانات تو بھانپ لیتے ہیں اور ان پر یقین بھی کرنے لگتے ہیں لیکن زندگی میں جو بدی اور عدم صداقت پائی جاتی ہے، وہ ان پر اتنے واضح انداز سے آشکار ہوتی ہے کہ وہ سنجیدگی سے کچھ بھی کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ بدقسمتی سے پیئر کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ اس کی نگاہوں میں زندگی کا ہر دائرہ کار بدی اور ریاکاری سے منسلک تھا۔ وہ جو کچھ بھی بننے کی کوشش کرتا، جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتا، وہ ہمیشہ بدی اور فریب کے ہاتھوں مار کھا جاتا اور اسے محسوس ہوتا کہ یہ دونوں چیزیں اس کے راستے میں دیوار بن کر حائل ہوگئی ہیں۔ لیکن اس نے زندہ رہنا تھا، کوئی مصروفیت ڈھونڈنا تھی۔ ان لاینحل مسائل کے بوجھ تلے دبے رہنا بے حد خوف ناک صورت تھی۔ چنانچہ انھیں فراموش کرنے کے لیے جو اولین چیز، جو اس کی توجہ دوسری طرف موڑ سکتی تھی، اس کے سامنے آتی، وہ بے اختیار اس کی طرف لپکتا اور اسی کا ہو کر رہ جاتا۔ وہ ہر قسم کی مجلسوں میں بکثرت آتا جاتا، خوب ڈٹ کرے نوشی کرتا، تصویریں خریدتا، عمارتیں تعمیر کراتا اور سب سے بڑھ کر — مطالعہ کرتا۔

وہ پڑھتا اور خوب پڑھتا، جو چیز بھی اس کے ہاتھ آتی، وہ اسے پڑھ کر ہی دم لیتا۔ چنانچہ جب وہ رات کو گھر واپس آتا، ابھی نوکر چاکر اس کے کپڑے تبدیل کرا رہے ہوتے کہ وہ کتاب اٹھا لیتا، پڑھتے پڑھتے سو جاتا، سو کر اٹھتا تو ڈرائنگ روموں یا کلب میں گپ شپ لگانے چلا جاتا، وہاں سے اٹھتا تو مے خانوں اور بالا خانوں کا رخ کرتا، ان کے بعد پھر گپ شپ، مطالعے اور مے نوشی کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مے نوشی اس کے لیے روز بروز جسمانی ہی نہیں، اخلاقی ضرورت بھی بنتی گئی۔ اگرچہ ڈاکٹروں نے اسے متنبہ کر دیا تھا کہ اس کی فربہی کے پیش نظر مے نوشی اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے، وہ بمقدار کثیر پیتا چلا گیا۔ اسے آسودگی کا احساس صرف اسی وقت ہوتا جب مشینی انداز سے اپنے فراخ حلق میں انگوری شراب کے متعدد جام انڈیلنے کے بعد اسے اپنے جسم میں خوشگوار حرارت محسوس ہوتی۔ اس وقت وہ ساتھی انسانوں کے ساتھ تلطف سے پیش آتا اور گہرائی میں جائے بغیر ہر آدرش کو سطحی طور پر قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتا۔ صرف ایک دو بوتلیں خالی کرنے کے بعد اسے یہ دھندلا دھندلا احساس ہونے لگتا کہ زندگی کی انتہائی ژولیدہ گتھی، جو ماضی میں اس کے اتنے چھکے چھڑاتی رہی تھی، بہرحال اتنی مہیب نہیں جتنی کہ وہ سمجھتا رہا ہے۔ اس گتھی کے کسی نہ کسی پہلو کا اسے ہمیشہ احساس رہتا تھا، جیسا کہ ڈنر یا سپر کے بعد جب وہ گپ شپ کر رہا، گفتگو سن رہا یا کتاب پڑھ رہا ہوتا، اسے یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے دماغ میں گھنٹیاں سی بج رہی ہیں۔ لیکن صرف اسی وقت، جب وہ انگوری شراب کے نشے سے پوری طرح دھت ہو چکا ہوتا، وہ اپنے آپ سے یہ کہہ سکتا تھا: ''کوئی بات نہیں، میں اسے سلجھا لوں گا — میرے پاس اس کا بنا بنایا حل موجود ہے، لیکن فی الحال

میرے پاس کوئی وقت نہیں — میں اس کے متعلق بعد میں سوچوں گا۔" لیکن یہ بعد کبھی نہ آتا۔

صبح دم جب اس کا پیٹ خالی ہوتا، دیرینہ سوالات ہمیشہ کی طرح لا ینحل نظر آتے اور پیئر بہ عجلت کوئی کتاب اٹھا لیتا اور اگر کوئی ملاقاتی آ جاتا، اس کی باچھیں کھل جاتیں۔

بعض اوقات اسے یاد آتا کہ اس نے کسی سے سنا ہے کہ جب پناہ گاہوں میں فوجیوں پر دشمن کی گولہ باری ہو رہی ہو اور ان کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہو، تو وہ اپنے آپ کو کسی نہ کسی کام میں مصروف رکھنے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں تا کہ خطرے کو نسبتاً زیادہ آسانی سے برداشت کیا جا سکے۔ اور پیئر کو یہ محسوس ہونے لگتا کہ سب انسان ان فوجیوں ہی کی مانند ہیں کہ زندگی سے پناہ ڈھونڈنے کی فکر میں لگے رہتے ہیں، بعض اسے جاہ طلبی میں، بعض تاش کے کھیل میں، بعض عورتوں، شراب، لعبتوں، گھوڑوں یا کھیلوں میں اور بعض سیاست رانی یا امور مملکت میں تلاش کرتے ہیں۔ "نہ کچھ بے وقعت ہے اور نہ کچھ باوقعت — انجام کار یہ سب کچھ یکساں ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ آدمی اس سے حتی المقدور بچنے کی پوری کوشش کرے،" پیئر سوچتا۔ "یہ سب کچھ دہشت ناک ہے، کاش آدمی نے اسے نہ دیکھا ہوتا۔"

2

جاڑوں کے آغاز کے ساتھ ہی پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی اور اس کی بیٹی ماسکو منتقل ہو گئے۔ بالخصوص ایک ایسے دور میں جب امپراطور الیکسانڈر کی حکومت کے لیے عوام کی گرم جوشی مدھم پڑنے لگی تھی اور ماسکو میں قوم پرستانہ اور فرانس مخالف رجحانات کو فروغ حاصل ہو رہا تھا، پرنس نکولائی آندریوچ کے ماضی، دانش و فراست اور اپج کی شہرت نے اسے بیک وقت اہالیان ماسکو کی آنکھوں کا تارا بھی بنا دیا اور شہر میں حکومت کے جو مخالفین تھے، ان کا مرکز بھی۔

اس برس کے دوران میں پیرانہ سالی نے پرنس کو کچھ زیادہ ہی ضعیف بنا دیا تھا۔ ضعف کبر سنی نے بلا مغالطہ اپنا رنگ کچھ یوں دکھایا تھا کہ بیٹھے بٹھائے اس پر اچانک غنودگی طاری ہو جاتی، حالیہ واقعات اس کے ذہن سے نکل جاتے جب کہ بھولے بسرے ماضی کی داستانیں اسے اچھی طرح یاد ہوتیں، اور پھر جس بچگانہ انداز سے اس نے ماسکو کے حکومت مخالف طبقے کی سربراہی قبول کی تھی، وہ بھی اسی علامت کی طرف اشارہ کرتا تھا۔ ان سب باتوں کے باوجود مرد کبر سن جب شام کو، اپنا پرانی وضع کا کوٹ اور پاؤڈر چھڑکی وگ پہنے ڈرائنگ روم میں شام کی چائے پینے آتا اور اگر کسی ہما شما کے اشتعال دلانے پر بیتے دنوں کے بارے میں مختصر لیکن جامع آرا کا اظہار کرتا یا اس سے بھی بڑھ کر موجودہ زمانے پر پتی تلی اور بے رحمانہ تنقید کرتا، وہ بلا امتیاز اپنے تمام ملاقاتیوں کو اتنا متاثر کرتا کہ وہ کبھی اس کا مؤدبانہ انداز سے احترام کرنے پر مجبور ہو جاتے۔ یہ دقیانوسی مکان، جس کی کھڑکیوں اور دروازوں کے مابین دیواروں پر بڑے بڑے آرائشی آئینے لگے ہوئے تھے، جہاں قبل از انقلاب (فرانس) کے زمانے کا فرنیچر تھا، جہاں سر پر پاؤڈر چھڑکے وردی پوش ملازمین تھے اور جس میں یہ سخت مزاج اور زیرک مرد پیر

سال — جو خود ماضی کی نشانی تھا — اپنی منکسر المزاج دختر اور خوش شکل فرانسیسی خاتون کے ساتھ، جو دونوں اس کی تعظیم میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتی تھیں، رہتا تھا، ان کے سامنے مرعوب کن اور خوشگوار منظر پیش کرتا تھا۔ لیکن ان ملاقاتیوں نے کبھی اس بات پر دھیان نہیں دیا تھا کہ انھوں نے اپنے میزبانوں کی معیت میں جو دو گھنٹے گزارے ہیں، ان کے علاوہ دن رات کے بائیس گھنٹے اور بھی ہوتے ہیں اور ان کے دوران میں اس گھر کی نجی اور مانوس زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں رہتی ہے۔

حالیہ ایام میں پرنس ماریا کے لیے یہ زندگی خاصی دکھی اور اذیت ناک بن چکی تھی۔ جس چیز — زائرین کے ساتھ گفتگو اور خلوت نشینی، جو بالڈ ہلز میں اسے تازہ دم کر دیتی تھی — سے اسے زندگی کی عظیم ترین مسرت حاصل ہوتی تھی، ماسکو میں وہ اس سے محروم ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ شہری زندگی میں جو فوائد اور تفریحات میسر آتی ہیں، وہ بھی اس کے حصے میں نہیں آئی تھیں۔ اس کا لوگوں کے گھروں اور محفلوں میں آنا جانا نہیں تھا۔ سبھی جانتے تھے کہ جب تک اس کا باپ خود اس کے ساتھ نہ جائے، وہ اسے کہیں جانے نہیں دے گا اور چونکہ اس کی صحت، جو روز بروز گرتی جا رہی تھی، اسے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی، چنانچہ احباب اس کی بیٹی کو دعوتوں اور شبینہ محفلوں میں مدعو نہیں کرتے تھے۔ وہ یہ امید کہ اس کی کہیں شادی ہو سکے گی، کھو چکی تھی۔ وہ نوجوان، جو کبھی کبھار اس کے گھر آ جاتے اور جو امکانی طور پر اس کے رشتے کے امیدوار ہو سکتے تھے، معمر پرنس ان کا جس سرد مہری اور خصومت سے استقبال کرتا اور پھر ان کی چھٹی کرتا تھا، وہ اس کی نظروں کے سامنے تھا۔ پرنس ماریا کا کوئی ساتھی تھا نہ سنگی۔ جب سے وہ ماسکو آئی تھی، وہ اپنی ان دو سہیلیوں سے، جو اس کے قریب ترین تھیں، مایوس ہو چکی تھی۔ مادموزیل بوئیین، جس کے سامنے وہ اپنا حال دل کبھی صحیح معنوں میں کھول کر بیان نہیں کر سکی تھی، اب اسے زہر لگنے لگی تھی اور مختلف وجوہات کی بنا پر وہ اس سے کنی کاٹنے لگی تھی۔ جولی، جس کے ساتھ وہ گزشتہ پانچ سال سے خط کتابت کرتی رہی تھی، ماسکو میں ہی تھی، لیکن جب ان دونوں کی ملاقات ہوئی، وہ اسے بالکل اجنبی دکھائی دی۔ اپنے بھائیوں کے انتقال کی وجہ سے جولی کا شمار ماسکو کی امیر ترین وارثوں میں ہونے لگا تھا اور وہ عیش و طرب کی محافل میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگی تھی۔ وہ ہر وقت نوجوانوں کے، جن کے متعلق اسے یقین تھا کہ انھوں نے اس کی قدر و قیمت کی تحسین کرنا ایکا ایکی سیکھا ہے، نرغے میں گھری رہتی۔ دولت مند، اونچے اور فیشن ایبل طبقے کی اس خاتون کی طرح، جس کا شباب ڈھلتا جا رہا ہو، جولی زندگی کے اس مرحلے پر پہنچ چکی تھی جب عورت کو یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ اس کے لیے شوہر تلاش کرنے کا آخری موقع آن پہنچا ہے اور یہ کہ اس کے مقدر کا فیصلہ اب ہو ہی جانا چاہیے ورنہ وہ ہمیشہ کفِ افسوس ملتی رہے گی۔

ہر جمعرات پرنس ماریا چہرے پر اداس مسکراہٹ سجائے سوچا کرتی کہ اب کوئی شخص ایسا نہیں رہا جسے وہ خط لکھ سکے کیونکہ جولی — جس کی موجودگی سے اسے کوئی راحت نہیں ہوتی تھی — یہیں موجود تھی اور ہر ہفتے ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ اس بوڑھے تارک وطن کی طرح، جس نے اس خاتون کے ساتھ، جس کے ہاں وہ برسوں اپنی شامیں گزارتا رہا تھا، شادی کرنے کی دعوت محض اس لیے ٹھکرا دی تھی کہ اگر اس نے اس کے ساتھ بیاہ رچا لیا، پھر شام گزارنے

کے لیے اس کے پاس کوئی جگہ نہیں رہ جائے گی، پرنس ماریا کو بھی اس بات کا افسوس تھا کہ جولی چونکہ یہاں موجود ہے، اس لیے اس نے اسے مکتوب الیہ سے محروم کر دیا ہے۔ ادھر ماسکو میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے وہ اپنا حال دل سنا سکتی یا جسے وہ اپنے غموں اور دکھوں کا رازداں بنا سکتی اور دریں اثنا اسے نت نئے آلام و مصائب گھیرتے رہے۔

پرنس آندرے کی واپسی اور شادی کا وقت قریب آ رہا تھا لیکن اس نے اس کے ذمے جو فرض لگایا تھا کہ وہ اس کے باپ کو اس واقعے کے لیے تیار کرے، مرحلۂ تکمیل سے اتنا دور تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ سارا معاملہ گڑبڑا جائے گا۔ نوجوان کاؤنٹس رستووا کا ذکر آیا نہیں کہ معمر پرنس (جو بہر حال ویسے ہی بدمزاج تھا) کا پارہ آسمان پر چڑھا نہیں۔

ایک اور مصیبت، جو حال ہی میں پرنس ماریا کے ذہن پر اچھا خاصا بوجھ بن گئی تھی، وہ ان اسباق کی، جو وہ اپنے بھتیجے کو دیا کرتی تھی، پیدا کردہ تھی۔ اسے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوتا کہ وہ نکولشکا کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کرنے لگی تھی، اس میں اس کے باپ کی بدمزاجی کی علامات نمودار ہونا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ اپنے آپ کو خواہ کتنا ہی کیوں نہ سمجھاتی کہ جب وہ بچے کو پڑھانے بیٹھتی ہے، اسے غصے کو اپنے قریب بھی نہیں پھٹکنے دینا چاہیے لیکن تقریباً ہر بار یہی ہوتا کہ جب بھی فرانسیسی حروف تہجی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے وہ اپنے ہاتھ میں چھڑی پکڑ کر درس کا آغاز کرتی، اسے کام نپٹانے کی اتنی جلدی ہوتی اور اپنا علم بچے۔۔۔ جسے پہلے ہی یہ خوف اپنے شکنجے میں جکڑنے لگتا کہ آنٹی کسی بھی لمحے اس سے ناراض ہو سکتی ہے۔۔۔ کے ذہن میں انڈیلنے کے لیے اتنا آسان بنانے کی فکر ہوتی، کہ اگر وہ ذرا بھی بے توجہی کا مظاہرہ کرتا، وہ سر سے پاؤں تک کانپنے لگتی اور ہڑبڑا جاتی، اس کی کیفیت ہیجانی ہو جاتی، اس کی آواز بلند ہو جاتی اور بعض اوقات وہ اس کا بازو پکڑ کر جھنجھوڑ دیتی اور اسے کونے میں کھڑا کر دیتی۔ اسے کونے میں کھڑا کر چکنے کے بعد وہ اپنی سفاک اور نابکار فطرت پر رونے بیٹھ جاتی اور نکولشکا اس کی مثال پر عمل کرتے ہوئے زار و قطار رونے لگتا، بغیر اجازت کونے سے نکلتا، اس کے پاس پہنچتا اور اس کے چہرے سے اس کے لیے ہاتھ اٹھا کر اسے تسلی دینے کی کوشش کرتا۔

لیکن پرنس ماریا کو جس سب سے بڑی بپتا کا سامنا کرنا پڑتا، وہ اس کے باپ کی تنک مزاجی تھی۔ وہ اس کا مستقل نشانہ بنی رہتی۔ حال ہی میں یہ شقاوت کی سرحدوں کو چھونے لگی تھی۔ اگر اسے ساری ساری رات رکوع و سجود کی حالت میں گزارنے پر مجبور کیا جاتا یا اسے لکڑیاں کاٹ کر لانے یا پانی ڈھونے کا حکم دیا جاتا، تو یہ بات کبھی اس کے نہاں خانۂ دماغ میں نہ آتی کہ اس کی قسمت ہی خراب ہے، لیکن یہ محب و مشفق ڈکٹیٹر۔۔۔ چونکہ وہ اس سے محبت کرتا تھا، اس لیے وہ اور بھی سفاک ہو گیا تھا اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو بھی اور اسے بھی اذیت میں مبتلا رکھتا تھا۔۔۔ نہ صرف دیدہ و دانستہ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے اور اس کو ذلیل و خوار کرنے کا اہتمام کرتا رہتا تھا بلکہ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اسے یہ کیسے جتانا ہے کہ ہر معاملے میں قصوروار وہی ٹھہرتی ہے۔ حال ہی میں اس نے ایک نیا گل کھلانا شروع کر دیا تھا اور یہ بات کسی دوسری چیز کی نسبت زیادہ سوہان روح بن گئی تھی۔ یہ نیا گل جو وہ کھلا رہا تھا، یہ تھا کہ اس کے اور مادموزیل بوغین کے مابین بے تکلفی میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسے یہ مسخرگی تب سوجھی جب

اسے اپنے بیٹے کے عزائم کے بارے میں خبر ملی۔ بظاہر اس کی سوچ یہ تھی کہ اگر آندرے شادی کراتا ہے، پھر اس کے مادموزیل بوغین کے ساتھ نکاح کرنے میں کیا مضائقہ ہے؟ گزشتہ کچھ عرصے سے اس کا مسلسل یہ وتیرہ بن گیا تھا کہ مادموزیل کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آتا جیسے وہ اس سے جی جان سے پیار کرتا ہو(پرنس ماریا کا خیال تھا کہ وہ یہ سب کچھ محض اس کی تذلیل کرنے کے لیے کرتا ہے)۔ درحقیقت فرانسیسی خاتون سے پیار و محبت جتا کر وہ اپنی بیٹی سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کر رہا تھا۔

ایک روز ماسکو میں معمر پرنس نے پرنس ماریا کی موجودگی میں (وہ یہ سمجھتی تھی کہ اس کے باپ نے جب وہ وہاں بیٹھی تھی، عمداً یہ حرکت کی ہے) مادموزیل بوغین کے ہاتھ پر بوسہ دیا، اسے اپنی جانب کھینچا، اپنی آغوش میں بھینچا اور پیار سے اس کا جسم سہلانے لگا۔ پرنس شرم سے بیر بہوٹی بن گئی اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ چند منٹ بعد مادموزیل بوغین پرنس ماریا کے کمرے میں آئی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اپنی شیریں آواز میں چہچہا چہچہا کر باتیں کر رہی تھی۔ پرنس ماریا نے پھرتی سے اپنے آنسو پونچھے، بڑے عزم و حوصلے کے ساتھ مادموزیل بوغین کے پاس پہنچی اور بظاہر اس بات سے بے خبر کہ وہ کیا کر رہی ہے، بڑی تندی اور تیز مزاجی سے بھرائی ہوئی آواز میں فرانسیسی عورت پر پھٹ پڑی:

''کسی شخص کی کمزوری سے یوں فائدہ اٹھانا قابل نفرین، شرم ناک، وحشیانہ—'' اس میں اپنی بات ختم کرنے کا یارا نہیں تھا۔ ''نکل جاؤ میرے کمرے سے!'' اس نے چلا کر کہا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اگلے روز پرنس نے اپنی بیٹی سے ایک لفظ تک نہ کہا تاہم ڈنر پر اس نے دیکھا کہ وہ حکم دے رہا ہے کہ سب سے پہلے مادموزیل بوغین کو کھانا پیش کیا جائے۔ کھانے کے اختتام پر جب بٹلر کافی لایا اور اس نے عادتاً اسے سب سے پہلے پرنس ماریا کے سامنے رکھا، معمر پرنس آگ بگولا ہو گیا، اس نے اپنی چھڑی بٹلر فلپ کو دے ماری اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، جھٹ حکم صادر کر دیا کہ اسے فوج میں بھرتی کرا دیا جائے۔

''یہ حکم مانتا ہی نہیں— میں نے دو دفعہ دہرایا— یہ پھر بھی نہیں مانا! یہ اس گھر کی خاتون اول ہے، یہ میری بہترین دوست ہے!'' پرنس نے چلا کر کہا۔ ''اور اگر تم نے'' اس نے آپے سے باہر ہو کر پہلی مرتبہ پرنس ماریا سے مخاطب ہو کر کہا، ''اگر تم نے اس کی موجودگی میں دوبارہ اپنا مقام بھلانے کی کوشش کی تو مجھے تمھیں یہ بتانا پڑے گا کہ اس گھر کا مالک کون ہے۔ دفع ہو جاؤ! میری آنکھوں سے دور ہو جاؤ! اس سے معافی مانگو!''

پرنس ماریا نے مادموزیل بوغین سے معذرت کی اور اپنے باپ سے بھی درخواست کی کہ وہ اسے اور بٹلر فلپ، جس نے اس سے گڑگڑا کر التجا کی تھی کہ اس کی شفاعت کر دے، دونوں کو معاف کر دے۔

ایسے مواقع پر ایک ایسا جذبہ، جو قربانی کے فخر سے مماثل ہوتا، اس کی روح کو گرما دیتا اور یک بیک وہ باپ، جسے وہ دل ہی دل میں کوس رہی ہوتی تھی، اس کی موجودگی میں اپنا چشمہ ڈھونڈنے لگتا۔ وہ اس کے قریب ہی پڑا ہوتا لیکن وہ اسے دیکھ نہ رہا ہوتا، بلکہ بے ڈھنگے انداز سے اسے ٹٹول رہا ہوتا، یا وہ کوئی ایسی بات، جو ابھی ابھی وقوع

پذیر ہوئی ہوتی، بھول جاتا، یا اپنی ٹانگوں پر، جو جواب دیتی جا رہی تھیں لڑکھڑاتا چل پڑتا اور مڑ کر پیچھے دیکھتا جاتا کہ کہیں کسی نے اس کی کمزوری بھانپ تو نہیں لی اور سب سے بدتر بات یہ ہوتی کہ اگر ڈنر پر اسے انگیخت کرنے کے لیے کوئی مہمان نہ ہوتا، وہ یک دم اونگھنے لگتا، اس کا نیپکن نیچے گر پڑتا اور اس کا کانپتا لرزتا ہاتھ پلیٹ میں جا پڑتا۔ ''وہ بوڑھے اور ضعیف ہیں اور میں ان کا محاکمہ کرنے چلی ہوں!'' وہ سوچتی اور اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگتی۔

3

1811 میں ماسکو میں ایک فرانسیسی طبیب ڈاکٹر میتی ویئے، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے قبولیت عامہ حاصل کر لی تھی، رہتا تھا۔ وہ بے حد لمبا تڑنگا، خوش شکل اور کچھ اس طور نستعلیق وشائستہ تھا، جو صرف کوئی فرانسیسی ہی ہو سکتا ہے۔ ہر شخص کی اس کے متعلق ایک ہی رائے تھی کہ وہ غیر معمولی طور پر ہوشیار اور باکمال طبیب ہے۔ بہترین گھروں میں اسے محض معالج کے طور پر ہی نہیں بلکہ برابر کے آدمی کی حیثیت سے ''جی آیاں نوں'' کہا جاتا تھا۔

پرنس نکولائی آندریوچ نے ہمیشہ طب کا مذاق اڑایا تھا، تاہم حال ہی میں مادموزیل بوغین کے مشورے پر اس نے اس ڈاکٹر کو اپنے گھر آنے اور اپنا معائنہ کرنے کی اجازت مرحمت کر دی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس کا خوگر ہو گیا۔ میتی ویئے ہفتے میں کوئی دو مرتبہ پرنس کو دیکھنے آیا کرتا تھا۔

جس روز سینٹ نکولائی کی یاد تازہ کی جاتی تھی، وہی دن پرنس آندرے کا نام دن تھا۔ اس روز سارا ماسکو اس کے دروازے پر پہنچ گیا لیکن اس نے حکم دے دیا تھا کہ کسی کو گھر کے اندر گھسنے نہ دیا جائے۔ صرف چند گنے چنے مہمانوں کو، جن کی فہرست اس نے پرنس ماریا کے سپرد کر دی تھی، کھانے پر مدعو کیا جانا تھا۔

میتی ویئے، جو ذرا دن چڑھے ہدیۂ تبریک پیش کرنے چلا آیا تھا، ڈاکٹر کی حیثیت سے اپنا یہ حق سمجھتا تھا کہ ضرورت پڑے تو وہ، جیسا کہ اس نے پرنس ماریا کو بتایا، حکم کی خلاف ورزی کر کے (forcer la consigne) بھی اندر آ سکتا ہے۔ چنانچہ وہ آیا اور پرنس کو دیکھنے اندر چلا گیا۔ ہوا یہ کہ اپنے نام دن کی صبح پرنس پر بدمزاجی کا شدید ترین دورہ پڑ گیا۔ اس نے چاشت کا سارا وقت گھر میں بے مقصد گھومنے پھرنے میں گزارا تھا، وہ ان تھک انداز سے ہر شخص میں خامیاں تلاش کر رہا تھا اور یوں بن رہا تھا کہ جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے، وہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا اور نہ کوئی دوسرا اس کی بات صحیح طور پر سمجھ رہا ہے۔ اس کے مزاج کی اس چڑچڑی کیفیت سے، جس میں وہ بظاہر پرسکون اور اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا معلوم ہوتا تھا، لیکن جس کا عام طور پر انجام یہ ہوتا تھا کہ وہ غیظ وغضب سے بارود کے دھماکے کی طرح پھٹ جایا کرتا تھا، پرنس ماریا بخوبی آگاہ تھی اور وہ ساری صبح کچھ یوں پریشان رہی تھی جیسے اسے کسی ایسی بندوق کا، جس میں گولیاں بھری جا چکی ہوں اور جس کا گھوڑا چڑھایا جا چکا ہو، سامنا ہو، اب وہ محض دھماکے کی، جسے ٹالا نہیں جا سکتا تھا، منتظر تھی۔

ڈاکٹر کی آمد تک خیریت رہی تھی اور کوئی خاص سانحہ پیش نہیں آیا تھا۔ میتی ویئے کا استقبال کرنے کے بعد

پرنس ماریا کتاب لے کر ڈرائنگ روم میں دروازے کے قریب بیٹھ گئی۔ سٹڈی روم میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہاں سے وہ با آسانی سن سکتی تھی۔

شروع شروع میں اسے صرف میتی ویئے کی آواز سنائی دی، پھر اپنے باپ کی آواز اس کے کانوں میں پڑی اور اس کے بعد دونوں کے بیک وقت بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ طوفانی انداز سے دروازہ کھلا اور دہلیز پر اپنے ژولیدہ بالوں سمیت میتی ویئے کی، جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں، وجیہہ شکل نمودار ہوئی۔ اس کے پیچھے پیچھے پرنس تھا۔ وہ شبینہ ٹوپی اور ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا، غیظ و غضب سے اس کے چہرے کی صورت مسخ ہو گئی تھی اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں باہر ابل آئی تھیں۔

''تم سمجھے یا نہیں؟'' پرنس نے چلا کر کہا۔ ''لیکن میں سمجھ گیا ہوں! فرانسیسی جاسوس! بوناپارٹ کا پٹھو۔ جاسوس! میرے گھر سے نکل جاؤ۔ میں کہتا ہوں، نکل جاؤ!'' اور اس نے دھماکے سے زور دروازہ بند کر دیا۔

میتی ویئے نے کندھے اچکائے اور مادموزیل بوغین کے، جو شور وغل کی آواز سن کر ملحقہ کمرے سے بھاگتی آئی تھی، پاس چلا گیا۔

''پرنس کی طبیعت اچھی نہیں ہے۔ ان کا مزاج صفراوی ہے، بہت جلد خون کھولنے لگتا ہے۔ فکر نہ کرو، میں کل پھر آ جاؤں گا،'' میتی ویئے نے کہا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور بھاگم بھاگ باہر نکل گیا۔

سٹڈی روم کے دروازے میں سے سلیپر پہنے پاؤں کی چاپ سنائی دے رہی تھی اور کوئی شخص چلا چلا کر کہہ رہا تھا: ''جاسوس، غدار۔ ہر طرف غدار ہی غدار! مجھے اپنے ہی گھر میں لمحہ بھر سکون نہیں ملتا!''

میتی ویئے کی روانگی کے بعد معمر پرنس نے اپنی بیٹی کو بلا بھیجا اور اس کے سارے قہر کا وبال اسے جھیلنا پڑا۔

''یہ سارا قصور تمھارا ہے کہ ایک جاسوس میرے سر پر آ سوار ہوا۔ میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا کہ فہرست بنا لو اور جس آدمی کا نام فہرست میں شامل نہ ہو، اسے مت اندر آنے دو؟ پھر تم نے اس بدمعاش کو کیوں اندر آنے دیا؟ یہ سب تمھاری وجہ سے ہوا۔ تم مجھے ایک گھڑی آرام سے رہنے نہیں دیتیں، تم تو مجھے سکون کی موت بھی نہیں مرنے دو گی!'' اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔

''نہیں، مادام، ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہونا ہی پڑے گا، لازماً الگ ہونا پڑے گا۔ یہ میں بھی جانتا ہوں اور تم بھی جانتی ہو۔ میں مزید برداشت نہیں کر سکتا،'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ پھر اسے شاید یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ وہ کہیں تسکین و تشفی کے کوئی اسباب ہی نہ ڈھونڈ لے، وہ واپس آیا اور یوں ٹھہر ٹھہر کر بولنے لگا جیسے وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہو کہ وہ یہ باتیں غصے کے عالم میں نہیں، بلکہ ٹھنڈے مزاج سے کہہ رہا ہے: ''یہ مت سوچو کہ میں غصے سے پاگل ہو گیا ہوں۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک اور پر سکون ہوں۔ میں نے جو کچھ کہا ہے، خوب سوچ سمجھ کر کہا ہے اور میری ان باتوں پر عمل ہو کر رہے گا۔ ہمیں لازماً ایک دوسرے سے علیحدہ ہونا پڑے گا، چنانچہ اپنے لیے کوئی ٹھور ٹھکانا ڈھونڈ لو!''

لیکن پھر وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکا اور ایسی مسموم تلخی سے، جس کا اظہار صرف اسی شخص سے، جو صحیح معنوں میں محبت کرتا ہو، ممکن ہوتا ہے، پھٹ پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شدید ذہنی اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ اس کی جانب مکے لہرانے اور حلق پھاڑ پھاڑ کر کہنے لگا:

''کاش کوئی الو کا پٹھا تم سے شادی کر چکا ہوتا!'' پھر اس نے دھماکے سے دروازہ بند کیا، مادموزیل بوغین کو بلایا اور ٹھنڈا ہو کر اپنے سٹڈی روم میں بیٹھ گیا۔

دو بجے اس کے چھ منتخب مہمان ڈنر پر اکٹھے ہوئے۔ یہ مہمان۔ مشہور و معروف کاؤنٹ رستوپ چن، پرنس لپوخن اور اس کا برادرزادہ، جنرل چاتروف، جو فوج میں معمر پرنس کا سابق رفیق تھا اور نئی نسل میں پیئر اور بورس دروبتیسکوئے۔ ڈرائنگ روم میں اپنے میزبان کا انتظار کر رہے تھے۔

بورس کی، جو چند روز پیشتر چھٹی پر ماسکو آیا تھا، یہ خواہش تھی کہ اسے پرنس نکولائی آندریوچ کی خدمت میں حاضر ہونے کا کوئی موقع مل جائے۔ نہ صرف یہ کہ اس کی دلی آرزو پوری ہوئی تھی بلکہ وہ اس حد تک اس کے دل میں گھر کرنے میں کامیاب رہا تھا کہ پرنس، جس نے جو یہ اصول بنا رکھا تھا کہ وہ کسی کنوارے کو اپنے گھر میں پاؤں نہیں رکھنے دے گا، اس کے معاملے میں استثنا برتنے پر مجبور ہو گیا۔

پرنس کا مکان ان مکانوں میں شامل نہیں تھا جن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں شہر کے متمول، اونچے اور فیشن پرست طبقے کے لوگ دعوتوں، محفلوں اور دوسری تفریحات کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا چھوٹا سا حلقہ، جس کا اگرچہ شہر میں کوئی خاص ذکر نہیں ہوتا تھا، ایسا تھا کہ کسی بھی دوسری جگہ کی نسبت اس میں باریابی پانا کہیں زیادہ فخر و مباہات کی بات سمجھا جاتا تھا۔ بورس نے اس کا اندازہ گزشتہ ہفتے کر لیا تھا جب اس کی موجودگی میں کمانڈر انچیف نے کاؤنٹ رستوپ چن کو سینٹ نکولائی کے یوم کی تقریبات کے سلسلے میں دعوت دی اور رستوپ چن نے جواب میں کہا:

''اس روز میں ہمیشہ پرنس نکولائی آندریوچ کے تبرکات کو سلام کرنے جاتا ہوں۔''

''ارے ہاں، بالکل بالکل...'' کمانڈر انچیف نے کہا۔ ''ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

مختصر گروپ، جو بلند و بالا اور قدیم الوضع ڈرائنگ روم میں ڈنر سے پہلے اکٹھا ہوا تھا، عدالت انصاف کے سنجیدہ حاضرین سے مشابہ تھا۔ سب لوگ یا تو خاموش تھے، یا اگر لب کشائی کرتے بھی تھے تو اتنا آہستہ بولتے تھے کہ ان کی آواز بمشکل سنائی دیتی تھی۔ پرنس نکولائی آندریوچ اندر آیا۔ اس نے سنجیدگی کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس نے کچھ نہ کہنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ پرنسس ماریا معمول سے کہیں زیادہ مسکین اور ڈری سہمی نظر آ رہی تھی۔ مہمان اس سے ہم کلام ہونے میں متامل تھے کیونکہ انھیں یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی ذہنی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ وہ ان سے بات کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہے۔ کاؤنٹ رستوپ چن واحد شخص تھا جو گفتگو کا سرا تھامے ہوئے تھا، کبھی وہ شہر کی تازہ ترین خبریں سنانے لگتا اور کبھی کوئی حالیہ سیاسی گپ شپ۔

کبھی کبھار لپوخن اور بوڑھا جرنیل بھی کوئی لقمہ دے دیتے۔ پرنس نکولائی اندریوچ کچھ اس انداز سے، جس

طرح عدالت انصاف کا صدر کوئی ایسی رپورٹ، جو اسے پیش کی جارہی ہو، سنتا ہے، سن رہا تھا۔ وہ رپورٹ سنتا رہتا ہے، بس کہیں بیچ بیچ میں غرفش کر دیتا ہے یا روکھے پھیکے لہجے سے کوئی لفظ کہہ دیتا ہے۔ اس کا یہ رویہ، اس امر کی علامت ہوتا ہے کہ وہ رپورٹ کو نظر انداز نہیں کر رہا، بلکہ اس پر پوری توجہ دے رہا ہے۔ معمر پرنس کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ جہاں تک گفتگو کا تعلق ہے، وہ جس لہجے میں ہو رہی تھی، اس سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ دنیائے سیاست میں جو کچھ ہو رہا ہے، کوئی بھی اسے پسندیدگی کی نگاہوں سے نہیں دیکھتا۔ جو واقعات بیان کیے جارہے ہیں، وہ اس رائے کی تصدیق کرتے تھے کہ حالات بد سے بدتر ہوتے جارہے ہیں، لیکن بیان خواہ کسی واقعے کا ہوتا یا اظہار کسی بھی رائے کا، قابل غور بات یہ تھی کہ ایک خاص مقام پر پہنچ کر متکلم یا تو خود ہی خاموشی اختیار کر لیتا یا پھر اسے ٹوک دیا جاتا کیونکہ اس سے آگے اس بات کا احتمال ہو جاتا تھا کہ کہیں اس کی نکتہ چینی کی زد میں خود امپراطور کی ذات والا صفات نہ آجائے۔

ڈنر پر گفتگو تازہ ترین سیاسی خبر کے۔ ڈیوک آف اولڈن برگ[8(الف)] کے محروسہ علاقے پر نپولین کے قبضے اور اس کے بارے میں روسی مراسلہ کے، جس میں نپولین کے اقدام کی مخالفت کی گئی تھی اور جو یورپ کے تمام شاہی درباروں کو ارسال کیا گیا تھا۔ متعلق ہونے لگی۔

''بوناپارٹ یورپ کے ساتھ جو سلوک روا رکھتا ہے، وہ بالکل وہی ہے جو بحری قزاق مقبوضہ جہاز کے بارے میں اختیار کرتا ہے،'' کاؤنٹ نے اپنا ایک فقرہ، جو وہ بار بار استعمال کر چکا تھا، دہراتے ہوئے کہا۔ ''آدمی کو تعجب ان والیان تخت و تاج، جو عرصے سے مصائب کی چکی میں پس رہے ہیں یا اپنی آنکھیں بند کیے بیٹھے ہیں، ہوتا ہے۔ اب پوپ کی باری آگئی ہے، نپولین رومن کیتھولک مسلک[8(ب)] کے سربراہ کو معزول کرنے میں ضمیر کی ذرا سی بھی کسک محسوس نہیں کرتا اور سبھی منہ میں گھنگھنیاں ڈالے ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے بیٹھے ہیں۔ صرف ہمارے امپراطور نے ڈیوک آف اولڈن برگ کے علاقے پر قبضے کے خلاف احتجاج کیا ہے اور وہ بھی...'' کاؤنٹ رستوپ چن نے توقف کیا۔ اسے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ وہ اس حد کو، جس سے آگے نکتہ چینی ناممکن الامر تھی، چھونے لگا ہے۔

''ڈچی آف اولڈن برگ کے عوض دوسرے علاقوں کی پیشکش کی گئی ہے،'' پرنس نکولائی آندریوچ نے کہا۔ ''وہ ڈیوکوں کی اکھاڑ پچھاڑ ایسے ہی کرتا رہتا ہے جیسے میں اپنے زرعی غلاموں کو بالڈ ہلز سے اپنی باگوچارافو یا ریازان کی جاگیروں میں بھیجتا رہتا ہوں۔''

''ڈیوک آف اولڈن برگ، اپنے مصائب کو جس صبر و تحمل سے جھیل رہے ہیں اور انھوں نے انھیں جس طرح مشیت ایزدی سمجھ کر قبول کیا ہے، وہ قابل تعریف ہے،'' بورس نے نہایت ادب و احترام سے لقمہ دیا۔

اس نے یہ بات کیوں کہی، اس کی وجہ یہ تھی کہ پیٹرز برگ سے اپنے سفر کے دوران میں اسے ڈیوک کی خدمت میں حاضر ہونے کا اعزاز ملا تھا۔ پرنس نکولائی آندریوچ نے آنکھ اٹھا کر نوجوان کو کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ جواب میں کچھ کہنا چاہتا ہو، تاہم اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ بظاہر اس کا خیال تھا کہ وہ اتنا نو عمر ہے کہ اس کی توجہ کا مستحق نہیں۔

''اولڈن برگ کے معاملے میں ہم نے جو احتجاج کیا ہے، مجھے وہ پڑھنے کا موقع ملا ہے۔ اس کو جس برے طریقے سے تحریر کیا گیا ہے، اسے دیکھ کر میں ہکا بکا رہ گیا،'' کاؤنٹ رستوپ چن نے ایک ایسے شخص کے، جو کسی ایسی بات کا، جس سے وہ پوری طرح آگاہ ہو، محاکمہ کر رہا ہو، لاپروایانہ انداز سے کہا۔

پیئر نے رستوپ چن کو معصومانہ حیرت سے دیکھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ اگر مراسلے میں بلیغ زبان استعمال نہیں ہوئی تھی، تو اس پر اسے پریشان ہونے کی کیا ضرورت تھی۔

''کاؤنٹ، اگر مراسلے کا متن زوردار ہو، پھر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ اس میں کس قسم کی زبان استعمال کی گئی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مائی ڈیئر فیلو، اگر آپ کے پاس پانچ لاکھ افراد پر مشتمل سپاہ ہو، پھر بلیغ اسلوب بنانا آسان ہو جاتا ہے،'' کاؤنٹ رستوپ چن نے کھٹ فرانسیسی میں جواب دیا۔

مراسلے کے اسلوب نگارش پر کاؤنٹ رستوپ چن نے عدم اطمینان کا جو اظہار کیا تھا، وہ پیئر کی سمجھ میں آ گیا۔

''ہمارا تو یہی خیال تھا کہ وہاں قلم کاروں کی کوئی کمی نہیں،'' معمر پرنس نے کہا۔ ''پیٹرز برگ میں انھیں لکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں اور وہ صرف مراسلے ہی نہیں لکھتے — قوانین بھی تحریر کرتے رہتے ہیں۔ میرا آندرے وہیں ہے۔ اس نے روس کے لیے قوانین کی پوری کتاب لکھ دی ہے۔ آج کل ہر کس و ناکس لکھ رہا ہے!'' اس نے غیر فطری انداز سے ہنستے ہوئے کہا۔

گفتگو میں عارضی توقف آ گیا۔ معمر جرنیل نے دوسروں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرانے کے لیے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

''پیٹرز برگ میں مارچ پاسٹ کے موقع پر جو تازہ ترین واقعہ پیش آیا ہے، آپ میں سے کسی نے اس کے بارے میں کچھ سنا ہے؟ اس واقعے کا تعلق نئے فرانسیسی سفیر کے وتیرے سے ہے۔''

''کیا؟ میں نے کچھ سنا تو تھا۔ میرا خیال ہے کہ اس نے امپراطور کی موجودگی میں کوئی کڈھب بات کہہ دی تھی۔''

''امپراطور نے اس کی توجہ گرینیڈ ڈویژن اور مارچ پاسٹ کی جانب دلائی تھی،'' جرنیل نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''معلوم ہوتا ہے کہ سفیر موصوف نے اس پر مطلق توجہ نہ دی اور بڑی بدتمیزی سے بولا: 'فرانس میں ہم اس قسم کی معمولی چیزوں پر وقت ضائع نہیں کرتے!' امپراطور نے اس کا جواب دینا اپنی شان سے بعید تصور کیا۔ کہتے ہیں اگلے مارچ پاسٹ پر انھوں (امپراطور) نے اسے بالکل نظر انداز کر دیا۔''

تمام لوگ خاموش بیٹھے رہے۔ کسی ایسے معاملے کے، جس کا براہ راست تعلق امپراطور کی ذات سے ہو، بارے میں رائے زنی کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

''گستاخ لفنگے!'' پرنس نے کہا۔ ''آپ صاحبان میتی ویئے کو جانتے ہیں؟ آج میں نے اسے اپنے گھر سے نکال دیا۔ وہ یہاں آ دھمکا تھا۔ انھوں نے اسے مجھ سے ملنے اندر آنے دیا حالانکہ میں نے ان سے عرض بھی کیا تھا

کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے،'' وہ بولتا چلا گیا اور غصیلی نظروں سے اپنی بیٹی کو دیکھتا رہا۔

فرانسیسی ڈاکٹر کے ساتھ اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے الف سے ی تک دہرانے اور انھیں یہ بتانے لگا کہ وہ میتی ویئے کو کیوں جاسوس سمجھتا ہے، اگر چہ وجوہات ناکافی اور مبہم تھیں، کسی نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔

روسٹ کے بعد شیمپین پیش کی گئی۔ معمر پرنس کو تہنیت پیش کرنے کے لیے مہمان اپنی نشستوں سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پرنس ماریا بھی اس کے پاس چلی گئی۔

اس نے سرد مہر اور غضب ناک نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا جھریاں زدہ اور صفاچٹ گال آگے بڑھا دیا تا کہ وہ اس پر بوسہ دے سکے۔ اس کے انگ انگ سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ ان دونوں کے مابین صبح جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے بھولا نہیں تھا اور نہ اس کے فیصلے میں کوئی تبدیلی آئی تھی، یہ تو صرف مہمانوں کی موجودگی تھی جو اس کے اسے یہ سب کچھ بتانے میں رکاوٹ ڈال رہی تھی۔

جب وہ کافی نوش کرنے کے لیے ڈرائنگ روم میں چلے گئے، بڑھے ٹھڈے ایک دوسرے کے پاس بیٹھ گئے۔

پرنس نکولائی آندریوچ کے جوش و خروش میں اضافہ ہونے لگا اور وہ متوقع جنگ کے بارے میں اپنے خیالات بیان کرنے لگا۔ اس نے کہا جب تک ہم جرمنوں کے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہیں گے اور یورپی معاملات کے، جن میں ہمیں عہد نامہ ٹلزٹ نے گھسیٹ لیا ہے، پھٹے میں ٹانگ اڑاتے رہیں گے، بوناپارت کے ساتھ ہماری جنگیں تباہ کن ثابت ہوتی رہیں گی۔

''ہمیں نہ تو آسٹریا کی خاطر جنگ کرنا چاہیے اور نہ اس کے خلاف،'' اس نے کہا۔ ''ہمارے تمام سیاسی مفادات، مشرق میں ہیں اور جہاں تک بوناپارت کا تعلق ہے، واحد کام جو ہمارے کرنے کا ہے، یہ ہے کہ ہم سرحدوں پر مسلح افواج تعینات کر دیں اور مضبوط پالیسی اختیار کریں، پھر جس طرح 1807 میں اس نے روسی سرحد عبور کی تھی، وہ دوبارہ اس قسم کی حرکت کرنے کی جرأت نہیں کرے گا۔''

''لیکن پرنس، ہم فرانسیسیوں کے خلاف ممکنہ طور پر کیسے جنگ کر سکتے ہیں؟'' کاؤنٹ رستوپ چن نے کہا۔ ''کیا ہم اپنے اساتذہ کے، جو ہمارے نزدیک دیوتاؤں کی مانند ہیں، خلاف ہتھیار اٹھا سکتے ہیں؟ اپنے نوجوانوں کو دیکھیں، اپنی خواتین پر نظر ڈالیں! ان سب کے نزدیک فرانسیسی ہمارے دیوتا ہیں اور پیرس جنت الفردوس!''

اس کی آواز بلند ہو گئی۔ بظاہر اس کی خواہش یہی معلوم ہوتی تھی کہ ہر شخص تک اس کی آواز پہنچے۔

''ہمارے فیشن فرانسیسی ہیں، ہمارے خیالات فرانسیسی ہیں، ہمارے جذبات و احساسات فرانسیسی ہیں! آپ نے میتی ویئے کو چلتا کیا کیونکہ وہ فرانسیسی ہے اور لفنگا ہے لیکن ہماری خواتین گھٹنوں کے بل چل کر اس کے پاس جانا عار نہیں سمجھتیں۔ کل رات میں ایک دعوت میں شریک ہوا۔ وہاں پانچ خواتین میں سے تین رومن کیتھولک تھیں۔ انھیں پوپ نے خصوصی اجازت مرحمت فرمائی ہے کہ وہ اتوار (روزِ سبت) کو سلائی کڑھائی کر سکتی ہیں۔ وہاں وہ تقریباً عریاں بیٹھی تھیں اور اگر آپ برا نہ منائیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ وہ خواتین معلوم ہی نہیں ہوتی

تھیں بلکہ عوامی حماموں کے سائن بورڈ نظر آتی تھیں۔ جب ان نوجوانوں پر نظر پڑتی ہے، میرا جی چاہتا ہے کہ عجائب گھر سے پیٹر اعظم کا عصا اٹھالاؤں اور قابلِ قدر قدیم روسی انداز سے چندایک پسلیاں توڑ دوں۔ یوں ان چھوکروں چھوکریوں کے دماغوں سے خرافات نکل جائیں گی۔''

کسی نے کچھ نہ کہا۔ معمر پرنس نے رستوپ چن کی جانب دیکھا اور پسندیدگی سے اپنی گردن ہلادی۔

''اچھا، یوئر ایکسی لینسی، خدا حافظ۔ اپنی صحت کا خیال رکھیں،'' رستوپ چن نے اپنی مخصوص پھرتی کے ساتھ اٹھتے اور پرنس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''مائی ڈیئر فیلو، خدا حافظ... اس کے الفاظ کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ میں اس کی باتوں سے کبھی سیر نہیں ہوتا،'' معمر پرنس نے رستوپ چن کا ہاتھ تھامتے اور بوسے کے لیے اپنا گال اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

رستوپ چن کی مثال پر عمل کرتے ہوئے دوسرے بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔

4

پرنسس ماریا ڈرائنگ روم میں بیٹھی اور بڑے بوڑھوں کی جلی کٹی باتیں سنتی رہی، لیکن اس کی سمجھ میں خاک نہ آیا۔ وہ صرف اسی ادھیڑ بن میں مصروف رہی کہ اس کے باپ نے اس کے بارے میں جو مخاصمانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے، وہ مہمانوں کے مشاہدے میں آیا ہے یا نہیں۔ بورس دروبتیسکوئے، جو اس روز تیسری مرتبہ ان کے گھر آیا تھا، ڈنر کے سارے عرصے کے دوران میں اس پر جس نمایاں انداز سے توجہ دیتا رہا اور اسے جس التفات کی نظروں سے دیکھتا رہا تھا، پرنسس ماریا کا دھیان اس طرف بھی نہ گیا۔

اس نے کھوئی کھوئی لیکن دریافت طلب نگاہوں سے پیئر کی، جو ہاتھوں میں ہیٹ پکڑے اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے اس کے پاس آنے والا آخری مہمان تھا، جانب دیکھا۔ معمر پرنس اندر جا چکا تھا اور اب وہ ڈرائنگ روم میں اکیلے رہ گئے تھے۔

''کیا میں کچھ دیر مزید ٹھہر سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا اور اس کا بھاری بھرکم جسم دھم سے بازوؤں والی کرسی پر، جو پرنسس ماریا کی نشست کے قریب پڑی تھی، گر پڑا۔

''ارے، بالکل، بالکل،'' اس نے جواب دیا۔ ''آپ نے کچھ نہیں دیکھا؟'' اس کی نگاہیں پوچھ رہی تھیں۔

ڈنر کے بعد پیئر کا مزاج بہت خوشگوار تھا۔ وہ بالکل سامنے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے پر نرم وگداز مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

''پرنسس، کیا آپ اس نوجوان کو کافی عرصے سے جانتی ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''کون نوجوان؟''

''دروبتیسکوئے۔''

''نہیں، زیادہ عرصے سے تو نہیں...''

''کیا آپ اسے پسند کرتی ہیں؟''

''ہاں، وہ پسند خاطر نوجوان ہے... آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' پرنسس ماریا نے کہا۔ اس کا ذہن ابھی تک اس گفتگو پر، جو صبح اس کی اپنے باپ سے ہوئی تھی، مرکوز تھا۔

''کیونکہ میرا مشاہدہ یہ ہے کہ جب کوئی نوجوان پیٹرزبرگ سے چھٹی پر ماسکو آتا ہے، تو عام طور پر اس کی نیت کسی ایسی دوشیزہ سے، جو خاصی بڑی جائیداد کی وارث ہو، شادی کرنا ہوتی ہے۔''

''آپ کو اس کے بارے میں مشاہدہ ہوا ہے؟''

''ہاں،'' پیئر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اور یہ نوجوان کچھ ایسا اہتمام کرتا ہے کہ جونہی اسے کسی ایسی دوشیزہ کی، جو بھاری جائیداد کی وارث ہو، سن گن ملتی ہے، یہ جھٹ وہاں پہنچ جاتا ہے۔ میں اسے بالکل اسی طرح پڑھ سکتا ہوں جس طرح آدمی کتاب پڑھتا ہے۔ فی الحال وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ وہ کس کے ــ آپ کے یا جولی کاراگنا کے ــ گرد دام ہم رنگ زمیں بچھائے۔ وہ آج کل اسے خاص توجہ دے رہا ہے۔''

''کیا وہ ان کے ہاں آتا جاتا ہے؟''

''ہاں، اکثر۔ نوجوان لڑکیوں کو رجھانے کے لیے جو نئے نئے اسالیب اختیار کیے جا رہے ہیں، آپ کو ان کے بارے میں کچھ علم ہے؟'' پیئر نے یوں مسکراتے ہوئے پوچھا جیسے وہ بہت محظوظ ہو رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس پر ہلکے پھلکے انداز سے اسی قسم کی دل لگی کرنے، جس کے ذریعے وہ اپنے روزنامچے میں اکثر اپنی سرزنش آپ کرتا رہتا تھا، دھن سوار ہے۔

''نہیں،'' پرنسس ماریا نے جواب دیا۔

''آج کل ماسکو کی لڑکیوں کو خوش کرنے کے لیے اپنے اوپر افسردگی طاری کرنا پڑتی ہے۔ وہ جب بھی مادموزیل کاراگنا سے ملتا ہے، وہ اپنی شکل افسردہ بنالیتا ہے،'' پیئر نے کہا۔

''واقعی؟'' پرنسس ماریا نے پیئر کے شفقت سے معمور چہرے کو دیکھتے اور اپنے رنج والم کے متعلق تا حال سوچتے ہوئے کہا۔ ''اگر میں کسی شخص کو اپنا راز دان بنانے کے سلسلے میں فیصلہ کر سکوں، مجھے ذہنی طور پر سکون مل جائے گا،'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اور پیئر بالکل اسی قسم کے آدمی ہیں جنھیں میں وہ سب کچھ، جو میں محسوس کر رہی ہوں، بتانا چاہوں گی۔ وہ بہت شفیق اور کشادہ دل ہیں۔ میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ وہ مجھے مشورہ دے سکیں گے۔''

''آپ اس سے شادی کرنا چاہیں گی؟''

''اف، میرے خدایا! کاؤنٹ، بعض اوقات ایسے لمحے آجاتے ہیں جب میں ہرایرے غیرے کے ساتھ شادی کرنے کے لیے تیار ہو جاتی ہوں!'' پرنسس ماریا نے اچانک با آواز بلند کہا۔ اپنے اس لب ولہجہ پر وہ خود بھی حیران رہ گئی اور اس کی آواز بھرا گئی۔ ''آہ، یہ بات کتنی اذیت ناک ہے کہ آپ ایک شخص کے ساتھ، جو آپ کے اتنا قریب

ہے، محبت کرتے ہیں اور آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ..." وہ لرزتی ہوئی آواز میں بولتی چلی گئی، "آپ اس شخص کو دکھ پہنچانے کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے اور پھر آپ کو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے، آپ اس میں کوئی تبدیلی نہیں لا سکتے تو آپ کی اس اذیت میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں صرف ایک ہی راہ عمل باقی رہ جاتی ہے — کہ آپ کہیں چلے جائیں، لیکن میں جا بھی کہاں سکتی ہوں؟"

"پرنس، کیا ہوا؟ گڑبڑ کیا ہے؟"

لیکن پرنس کسی قسم کی مزید وضاحت کیے بغیر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔

"پتا نہیں آج مجھے کیا ہو گیا ہے؟ آپ کوئی فکر نہ کریں — بھول جائیں کہ میں نے کیا کہا ہے؟"

پیئر کی شگفتگی کا ملا ہوا ہو گئی۔ وہ مضطرب تھا اور پرنس پر سوالات کی بوچھاڑ کر رہا تھا، اس سے التجائیں کر رہا تھا کہ وہ منہ سے کچھ بولے، اپنے غموں میں اسے راز داں بنالے، لیکن ان سب کے جواب میں وہ اس سے صرف یہی استدعا کر رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہہ چکی ہے، وہ اسے بھول جائے اور بار بار تکرار کر رہی تھی کہ جو کچھ اس نے کہا ہے، وہ خود اسے بھی یاد نہیں رہا، اسے کوئی دکھ نہیں، کوئی ملال نہیں ہے۔ ہاں، اسے جو دکھ ہے، وہ اس کے متعلق پہلے ہی جانتا ہے — اسے دکھ صرف یہ ہے کہ پرنس آندرے کی متوقع شادی باپ بیٹے کے مابین خلیج حائل کر دے گی۔

"آپ کے پاس رستوفوں کی کوئی خبر ہے؟" اس نے موضوع تبدیل کرنے کی خاطر پوچھا۔ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہ چند دنوں میں یہاں پہنچنے والے ہیں اور میرا خیال ہے کہ آندرے بھی عنقریب یہاں آجائیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ (رستوف) یہاں آکر مل جائیں۔"

"اس بارے میں اب ان کا رویہ کیسا ہے؟" پیئر نے پوچھا۔ ان سے پیئر کی مراد معمر پرنس تھا۔

پرنس ماریا نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"لیکن کیا بھی کیا جا سکتا ہے؟ چند مہینوں میں سال پورا ہو جائے گا۔ معاملہ ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ کاش میں اپنے بھائی کو ابتدائی لمحات کی ٹکر سے بچا سکتی! کاش رستوف ہی ذرا جلدی آجائیں! مجھے امید ہے کہ میں اس (نتاشا) کے ساتھ دوستی کر سکوں گی... آپ تو انھیں کافی عرصے سے جانتے ہیں،" پرنس ماریا نے کہا۔ "مجھے لگی لپٹی رکھے بغیر اس کے متعلق سب کچھ بتا دیں، اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر صحیح صحیح بتائیں کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے اور آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے۔ مجھے سچ، پورا سچ، چاہیے کیونکہ آپ جانتے ہیں کہ آندرے یہ سب کچھ اپنے باپ کی مرضی کے خلاف کر کے بہت بڑا خطرہ مول لے رہے ہیں اور میں یہ جاننا چاہوں گی..."

کوئی مبہم جبلت پیئر کو بتا رہی تھی کہ وضاحتیں اور مکمل سچائی معلوم کرنے کے لیے یہ بہ تکرار التجائیں اس امر کی غمازی کر رہی ہیں کہ ہونے والی بھابی کے بارے میں اس کے نہاں خانۂ دل میں کہیں بغض پوشیدہ ہے اور کوئی خواہش تقاضا کر رہی ہے کہ وہ پرنس آندرے کے انتخاب پر اظہار ناپسندیدگی کر دے لیکن جواب میں اس نے جو کچھ کہا، وہ وہ نہیں تھا جو وہ سوچ رہا تھا بلکہ وہ تھا جو وہ محسوس کر رہا تھا۔

"سمجھ میں نہیں آتا کہ تمھارے اس سوال کا جواب کیسے دوں،" اس نے لالوں لال ہوکر کہا لیکن وہ لالوں لال کیوں ہورہا تھا، اس کا علم اسے خود بھی نہیں تھا۔ "سچی بات یہ ہے کہ مجھے بالکل معلوم نہیں کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے۔ میں ہرگز ہرگز اس کی ذات کا تجزیہ نہیں کرسکتا۔ وہ پرکشش ہے اور آدمی کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے، لیکن اسے پرکشش کون سی چیز بناتی ہے، مجھے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اس کے بارے میں بس یہی کچھ کہا جاسکتا ہے۔"

پرنس ماریا نے ٹھنڈی سانس بھری اور اس کے چہرے پر جو تاثر ابھرا، وہ یہ کہہ رہا تھا: "ہاں، مجھے یہی توقع تھی، یہی اندیشہ تھا۔"

"وہ چالاک ہے؟" اس نے پوچھا۔

پیئر نے کچھ دیر سوچا۔ "میرا خیال ہے، نہیں،" اس نے کہا۔ "اور تاہم— ہاں۔ وہ سمجھتی ہے کہ چالاک بننے کا کوئی خاص فائدہ نہیں... وہ بس پرکشش ہے اور آدمی کو اپنا گرویدہ بنالیتی ہے، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔"

پرنس ماریا نے ایک بار پھر اپنا سر ناپسندیدگی سے ہلایا۔

"آہ، میری کتنی خواہش ہے کہ میں اس سے محبت کرسکوں! اگر مجھ سے پہلے آپ کی اس سے ملاقات ہو جائے، میری طرف سے یہ بات اسے بتادیں۔"

"سنا ہے کہ وہ چند دنوں میں یہاں پہنچنے والے ہیں،" پیئر نے کہا۔

پرنس ماریا نے اسے اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ اس کا ارادہ ہے کہ جونہی رستوف پہنچے، وہ اپنی ہونے والی بھابی سے ملے گی اور معمر پرنس کو بھی اس سے متعارف کرانے کی کوشش کرے گی۔

5

بورس پیٹرز برگ میں کسی رئیس زادی کو شیشے میں اتارنے میں ناکام رہا تھا اور اب وہ یہی مقصد لے کر ماسکو آیا تھا۔ یہاں اس کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ وہ دو متمول ترین دوشیزگان — جولی اور پرنس ماریا — میں سے کسے منتخب کرے۔ اگرچہ اسے پرنس ماریا اپنی واجبی شکل وصورت کے باوجود جولی سے زیادہ پرکشش معلوم ہوتی تھی، تاہم اس سے محبت جتانا اسے ٹیڑھا کام محسوس ہوتا تھا، کیوں؟ اس کا جواب اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ معمر پرنس کے نام دن پر جب ان کی آخری ملاقات ہوئی تھی، اس نے جتنی مرتبہ بھی جذبات میں ڈوب کر اس سے بات کرنے کی کوشش کی، اسے جواب میں غیر متعلقہ باتیں ہی سننے کو ملیں۔ صاف ظاہر تھا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ اسے مطلق سن نہیں رہی تھی۔ اس کے برعکس اس نے جولی کو جب بھی بنظر التفات دیکھا یا اس سے بات کی، وہ کچھ ایسے انداز سے اپنے شوق کا دامن پھیلا دیتی جو محض اسی سے مخصوص تھا۔

جولی کی عمر ستائیس برس ہوچکی تھی۔ اپنے بھائیوں کی اموات کے بعد وہ بے حد امیر کبیر ہوگئی تھی۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ اب اس کے خدوخال میں دلکشی باقی نہیں رہی تھی لیکن وہ اپنے آپ کو بالکل اسی طرح روشن

جمال سمجھتی تھی جس طرح وہ اوائل شباب کے زمانے میں تھی بلکہ اس کی اپنی دانست میں اس کی دل کشی میں پہلے کی نسبت کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ اس کی اس فریب خیالی پر اس حقیقت نے بھی کہ وہ وسیع وعریض جائیداد کی مالک بن چکی تھی، مہر تصدیق ثبت کر دی تھی۔ پھر ستم یہ ہوا کہ جوں جوں اس کی عمر ڈھلتی جا رہی تھی، وہ مردوں کے لیے کم خطرناک ہوتی جا رہی تھی اور وہ کہیں کھلے ڈھلے انداز سے اس سے راہ ورسم بڑھا سکتے تھے، بلا جھجک اس کی محفلوں اور طعام کی دعوتوں میں شریک ہو سکتے تھے اور جو زندہ دل اور بذلہ سنج اشخاص بکثرت اس کے گھر کو رونق بخشنے لگے تھے، کسی قسم کی احسان مندی کے بغیر اس کے ہاں آ جا سکتے تھے۔ اس نے اس کثیر آمد ورفت کو اپنی مقبولیت محمول کیا حالانکہ بات کچھ اور تھی۔ وہ مرد، جو دس سال قبل ایک ایسے گھر میں، جہاں سترہ سالہ دوشیزہ رہتی تھی، اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں وہ اس کی شہرت کو داغ دار نہ بنا دیں یا کہیں وہ خود ہی اس کے دام الفت میں گرفتار نہ ہو جائیں، قدم رکھنے سے پہلے دو مرتبہ سوچا کرتے تھے، اب بے دھڑک اس کے ہاں آنے جانے لگے اور اس کے ساتھ کچھ اس طرح پیش آنے لگے جیسے وہ کوئی ایسی دوشیزہ نہیں جو شادی کی عمر میں داخل ہو چکی ہے، بلکہ وہ ایک ایسی شناسا مخلوق ہے جس کی سرے سے کوئی جنس ہی نہ ہو۔

ان جاڑوں میں کاراگنوں کا مسکن ماسکو کا خوشگوار ترین اور انتہائی مہمان نواز گھر تھا۔ وہاں سرشام رسمی محفلیں تو سجا ہی کرتی تھیں اور طعام کی دعوتیں بھی منعقد ہوتی رہتی تھیں۔ ان کے علاوہ ہر روز خاصا بڑا ہجوم، جو زیادہ تر مردوں پر مشتمل ہوتا تھا، وہاں جمع ہو جاتا، آدھی رات کو یہ لوگ سپر کھاتے اور صبح کے تین بجے تک وہیں جمے رہتے۔ پھر کہیں بال ہو، نغمہ وسرود کی ایستادہ محفل[9] ہو یا ڈرامہ ہو، جولی ضرور وہاں پہنچ جاتی تھی۔ اس کے ملبوسات ہمیشہ تازہ ترین فیشن کے مطابق ہوتے۔ لیکن ان چیزوں کے باوجود کچھ یوں نظر آتا جیسے جولی کا ہر شے سے اعتبار اٹھ چکا ہو اور وہ ہر شخص کو یہی بتاتی کہ وہ دوستی، محبت اور زندگی کی مسرتوں پر یقین نہیں رکھتی اور اسے صرف حیات اخروی میں ہی تسکین پانے کی توقع ہے۔ وہ ایک ایسی دوشیزہ کا روپ دھار لیتی جسے بے پناہ مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا ہو، جس کا محبوب اس سے چھن گیا ہو یا جس کے محبوب نے اسے سنگ دلانہ انداز سے دھوکا دیا ہو۔ اگرچہ اس کے ساتھ اس قسم کی کوئی واردات نہیں ہوئی تھی، عام طور پر سمجھا یہی جانے لگا کہ اس کے ساتھ اس نوع کی بات ہوئی ضرور ہے اور خود اسے بھی یقین ہونے لگا کہ اسے زندگی میں بڑے گھاؤ برداشت کرنا پڑے ہیں۔ اس افسردگی نے نہ تو اسے ہی جی بھر کر لطف اندوز ہونے سے روکا اور نہ یہ ان نوجوانوں کے، جو بکثرت اس کے گھر کے پھیرے لگاتے رہتے تھے، اپنا وقت خوشگوار انداز سے گزارنے میں رکاوٹ بنی۔ ہر مہمان اپنی میزبان کی افسردہ مزاجی کو خراج تحسین پیش کرتا اور پھر اونچے اور فیشن ایبل طبقے کے بارے میں گپ شپ، رقص، دانش ورانہ کھیلوں یا فی البدیہہ اشعار گوئی کے مقابلوں[10] سے، جس کا کاراگنوں کے ہاں بڑا رواج تھا، جی بہلانے لگتا۔ صرف چند نوجوان، جن میں بورس شامل تھا، ایسے تھے جو جولی کی افسردگی کے سمندر میں گہری ڈبکی لگاتے تھے اور وہ ان کے ساتھ دنیائے دوں کی ہیچ مائیگیوں کے بارے میں طویل اور راز دارانہ گفتگوئیں کرتی، جی بھر کر اپنے دل کی بھڑاس نکالتی اور انھیں

اپنے البم، جوافسردہ تصویروں، کہاوتوں اور اشعار سے بھرے ہوتے، دکھاتی۔

جولی بورس پر بالخصوص نظر کرم کرتی تھی۔ اسے اوائل حیات میں ہی جن مایوسیوں کا سامنا کرنا پڑا، وہ ان کے بارے میں اس سے اظہار ہمدردی کرتی اور ایک ایسی خاتون کی طرح، جسے خود بھی بے شمار مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہو، جو کچھ اس سے بن پڑتا، دوست بن کر اس کی ڈھارس بندھاتی اور اسے اپنے البم دکھاتی۔ بورس نے البم میں دو درختوں کی تصویر بنائی اور ان کے نیچے لکھا۔

ناتراشیدہ درختو، تمھاری سیاہی مائل شاخیں
مجھ پر اداسی اور افسردگی کے تاریک سائے ڈال رہی ہیں

ایک دوسرے صفحے پر اس نے تربت بنائی اور لکھا:

*La mort est secourable et la mort est tranquille.
Ah! contre les douleurs il n'y a pas d' autre asile.

جولی نے کہا: ''بہت خوبصورت شعر ہے۔''

''افسردگی کی مسکراہٹ میں کوئی ایسی چیز ہے کہ انسان پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔'' اس نے ایک عبارت ''یہ تاریکی میں روشنی کی کرن ہے، ملال اور مایوسی کے مابین باریک اور نازک حد فاصل ہے اور تسکین کے امکان کا انکشاف کرتی ہے۔'' لفظ بہ لفظ دہراتے ہوئے بورس سے کہا۔

اس پر بورس نے یہ سطور تحریر کر دیں:

**Aliment de poison d'une ame trop sensible,
Toi, sans qui le bonheur me serait impossible,
Tendre melancolie, ah, viens me consoler,
Viens calmer les tourments de ma sombre retrate
Et mele une douceur secrete
A ces pleurs, que je sens couler.

---

* موت ہماری مددگار ہے اور یہ ہمیں سکون بخشتی ہے۔
اس کے بعد ہمارے تمام دکھ درد ختم ہو جاتے ہیں۔

** بے حد حساس روح کے لیے مسموم غذا
تیرے بغیر مسرت کا تصور محال ہے
نرم و لطیف افسردگی، تسکین شیریں
آؤ، اور جو دکھ میں عزلت میں جھیل رہا ہوں، ان سے مجھے چھٹکارا دلا دو۔
اپنا مخفی اور تسکین بخش مرہم
میرے اشکوں میں، جو سدا رواں رہتے ہیں، گھول دو

جولی اپنے انتہائی غم آشام رومانی نغمے بورس کو مطرب پر سناتی اور بورس اسے نظم Poor Liza (''بیچاری لزا'') با آواز بلند پڑھ کر سناتا۔ نظم کی خواندگی کے دوران میں اس کا گلا بار بار شدتِ جذبات سے رندھ جاتا اور خواندگی میں توقف آ جاتا۔ بڑی بڑی محافل میں وہ یوں ایک دوسرے کی طرف دیکھتے جیسے وہ روکھے پھیکے اور غیر دلچسپ لوگوں کے مابین یک جان و دو قالب ہوں۔

آنّا میخائیلوونا کاراگنوں کے گھر کا بار بار طواف کرتی رہتی تھی اور اس کی ماں کے ساتھ تاش کی بازی کے دوران میں کھلم کھلا جولی کے جہیز کے ــ اسے پینزا[11] میں دو جاگیریں اور نیژہنی اور نووگورد[12] میں جنگلات ملنا تھے ــ بارے میں معلومات دریافت کرتی رہتی تھی۔ جس شائستہ افسردگی نے اس کے بیٹے کو صاحب ثروت جولی کے ساتھ منسلک کر دیا تھا، اس پر اس کے دل میں نرم و نازک جذبات کروٹیں لینے لگتے اور وہ مشیت ایزدی کے حضور سرِ تسلیم خم کر دیتی۔

"Toujours charmante et melancholique, cette chere julie",*

وہ بیٹی سے کہا کرتی، اور اس کی ماں کو بتاتی: ''بورس کہتا ہے کہ اس کی روح کو تمھارے گھر میں سکون ملتا ہے۔ اس نے بہت دکھ جھیلے ہیں اور وہ بہت حساس ہے۔'' اور پھر ایک روز اس نے اپنے بیٹے سے کہا: ''اخ، مائی ڈیئر، میں بیان نہیں کر سکتی کہ میں حال ہی میں جولی کی کتنی گرویدہ ہو گئی ہوں! لیکن کون ہے، جو اس سے محبت کیے بنا رہ سکتا ہے؟ وہ ملکوتی روح ہے! آہ، بورس، بورس!'' اس نے ایک لحظہ توقف کیا۔ ''اور مجھے اس کی ماں پر کتنا ترس آتا ہے!'' اس نے دوبارہ اپنا سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ''پینزا ــ ان کی وہاں دو وسیع و عریض جاگیریں ہیں ــ جو حسابات اور خطوط موصول ہوئے ہیں، وہ اس نے آج مجھے دکھائے۔ اور وہ بے چاری، قسمت کی ماری، کوئی بھی تو نہیں جو اس کا ہاتھ بٹا سکے اور لوگ ہیں کہ اسے دونوں ہاتھ سے لوٹ رہے ہیں!''

بورس اپنی ماں کی باتیں توجہ سے سن رہا تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا لیکن اس کی یہ مسکراہٹ اتنی مہین تھی کہ بمشکل نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی بھولی بھالی ڈپلومیسی پر اندر ہی اندر محظوظ ہو رہا تھا لیکن، بہرحال وہ کچھ کہہ رہی تھی، اس کے کان اسی پر لگے ہوئے تھے اور وہ وقتاً فوقتاً پینزا اور نیژہنی نووگورد جاگیروں کے بارے میں محتاط انداز سے سوال پوچھ لیتا تھا۔

جولی کافی دنوں سے اس بات کی منتظر تھی کہ اس کا افسردہ پرستار کب اسے شادی کی پیش کش کرتا ہے اور وہ اسے شرف قبولیت بخشنے کے لیے بالکل تیار تھی، تاہم بورس کو ابھی تک جو چیز روکے ہوئے تھی، وہ یہ تھی کہ وہ باطنی طور پر اس سے مغائرت محسوس کرتا تھا، وہ جو اس شدید خواہش میں مبتلا تھی کہ اس کی جلد از جلد شادی ہو جائے، وہ اس کی بے لگام خواہش اور اس کے مصنوعی طور طریقوں سے گھن کھاتا تھا اور پھر اس پر یہ دہشت بھی سوار ہو گئی تھی کہ یوں وہ سچی محبت کے امکانات سے کنارہ کش ہو جائے گا۔ اس کی چھٹی تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ وہ ہر دن اور سارا سارا دن کاراگنوں کے ہاں گزارتا، ہر شب اس معاملے پر غور و فکر کرتا اور اپنے آپ سے یہ کہتا رہتا تھا کہ وہ اگلے روز شادی

* ''مائی ڈیئر جولی، تم اب بھی ہمیشہ کی طرح پرکشش اور اداس ہو۔''

کی تجویز پیش کردے گا، لیکن جولی کی موجودگی میں جب وہ اس کے سرخ چہرے اور ٹھوڑی (جن پر تقریباً ہمیشہ پاؤڈر کی تہہ جمی رہتی)، اور اس کی مرطوب آنکھوں کو دیکھتا اور اس کے چہرے کے تاثرات کو پڑھتا جن سے یہ عندیہ ملتا کہ وہ تو ازل سے پابہ رکاب ہے اور اس بات کی منتظر ہے کہ اسے پیغام ملے۔ پیغام ملتے ہی اس کی افسردگی چشم زدن میں کافور ہو جائے گی اور وہ بڑے طمطراق سے اس وجد کی، جو شادی کی بابرکت تقریب منعقد ہونے پر طاری ہوتا ہے، کیفیت میں ڈوب جائے گی۔ بورس فیصلہ کن الفاظ ادا کرنے کا اپنے آپ میں حوصلہ نہ پاتا حالانکہ اپنے تخیل میں وہ کبھی کا پینزا اور نیز ہنی نووگورد جاگیروں کا مالک بن چکا تھا بلکہ یہ بھی فیصلہ کر چکا تھا کہ ان کی آمدنی کن کن مدات پر خرچ کی جائے گی۔

بورس کا تذبذب جولی کی نظروں میں تھا اور بعض اوقات یہ بات اس کے دماغ میں آتی کہ وہ اسے برگشت کرتی ہے، لیکن اس کی نسوانی خود فریبی فوراً اسے دلاسا دیتی اور وہ اپنے آپ سے کہتی کہ وہ بے چارہ اس قدر محبت کا مارا ہے کہ حال دل بھی بیان نہیں کر سکتا، خواہ مخواہ جھینپ جاتا ہے۔ تاہم اب اس کی افسردگی زود رنجی میں تبدیل ہونے لگی تھی اور بورس کی روانگی سے صرف چند ایام قبل اس نے واضح طرز عمل اختیار کرنے کا منصوبہ سوچ لیا۔ عین اس وقت جب بورس کی تعطیل اختتام پذیر ہو رہی تھی، اناطول کوراگن ماسکو میں آوارد ہوا اور یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ آتے ہی کاراگنوں کے ڈرائنگ روم کے پھیرے لگانے لگا، اس پر جولی نے افسردگی کو خدا حافظ کہا، چہلوں سے یارانہ لگایا اور دیوانہ وار کوراگن پر نثار ہونے لگی۔

"Mon Cher" آنا میخائیلونا نے اپنے بیٹے سے کہا۔ ''مجھے معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ پرنس واسیلی نے اپنے صاحب زادے کو ماسکو بھیجا ہی اس مقصد کے لیے ہے کہ وہ جولی سے بیاہ کر لے۔ میں جولی کی اتنی گرویدہ ہوں کہ (اگر یہ شادی ہوگئی) مجھے اس پر بڑا ترس آئے گا۔ مائی ڈیئر، تمھارا اس بارے میں کیا خیال ہے؟''

اس خیال نے کہ کہیں اسے بے وقوف نہ بنا دیا جائے، اس نے مہینہ بھر جولی کی جو مشقت طلب اور افسردگی سے بھرپور خدمت کی تھی، وہ رائیگاں نہ چلی جائے اور ان جاگیروں کی تمام آمدنی، جسے وہ ذہنی طور پر مختلف مدات کے اخراجات کے لیے تقسیم کر چکا تھا، کسی دوسرے شخص کے ہاتھوں میں۔ بالخصوص اس گاؤدی اناطول کے ہاتھوں میں۔ نہ چلی جائے، بورس کے تن بدن میں آگ لگا دی اور اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ آج وہ کاراگنوں کے ہاں جائے گا اور شادی کا پیغام دے کر ہی دم لے گا۔ جب وہ وہاں پہنچا، جولی نے چہکتے ہوئے بڑی بے نیازی سے اس کا استقبال کیا اور بر سبیل تذکرہ اسے بتایا کہ وہ گزشتہ رات جس بال میں شریک ہوئی تھی، اس سے خوب محظوظ ہوئی تھی۔ پھر وہ اس سے پوچھنے لگی کہ وہ کب واپس جا رہا ہے۔ اگرچہ بورس یہ عزم صمیم لے کر آیا تھا کہ وہ اپنی محبت کا ذکر کرے گا اور وہ پیار بھرا لہجہ اختیار کرنا پختہ ارادہ بھی کر چکا تھا، وہ (جولی کی باتیں سن کر جھنجھلا گیا اور) عورتوں کی تلون مزاجی کا تذکرہ کرنے لگا کہ ان کی ذہنی کیفیت کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا، گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ۔ ابھی افسردہ ہیں، ابھی مسرت کے شادیانے بجانے لگی ہیں۔ ان کی مزاج کی کیفیت کا دارومدار سراسر اس چیز پر ہے کہ

ان کے ساتھ محبت کون جتا رہا ہے۔ جولی نے اس کی باتوں کا برا منایا اور بولی: ''تم بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ عورت کی ضرورت تنوع ہے، یکسانیت سے تو ہر کوئی اکتا جاتا ہے۔''

''پھر میں تمھیں مشورہ دوں گا . . .'' بورس ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتا تھا۔ وہ کوئی جگر فگار جملہ کسنا چاہتا تھا، لیکن عین اس لمحے یہ اذیت ناک خیال اس کے دماغ میں کوندے کی طرح لپکا کہ کہیں اسے اپنا مقصد حاصل کیے بغیر ماسکو سے لوٹنا نہ پڑے اور اگر ایسا ہوا، پھر اس کی تمام کاوشیں اکارت جائیں گی (اور یہ ایک ایسی چیز تھی جو اس نے کبھی گوارا نہ کی تھی)۔ وہ جملے کے درمیان میں ہی رک گیا، اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں تا کہ جولی کے چہرے پر تکدر اور بے یقینی کے جو اثرات پیدا ہو رہے تھے، ان سے چشم پوشی کر سکے اور بولا:

''لیکن میں یہاں تم سے جھگڑا کرنے تو نہیں آیا تھا۔ اس کے برعکس . . .''

اس نے دزدیدہ نگاہوں سے جولی کی جانب دیکھا تا کہ وہ اپنا اطمینان کر سکے کہ وہ بات کو آگے بڑھا سکتا ہے یا نہیں۔ اس (جولی) کی ساری خفگی آناً فاناً پادر ہوا ہو چکی تھی اور اس کی متفکر، ملتجیانہ نگاہیں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور حریصانہ انداز سے انتظار کر رہی تھیں کہ وہ کب اپنا جملہ مکمل کرتا ہے۔

''میں ہمیشہ اس بات کا اہتمام کر سکتا ہوں کہ مجھے اس کی صحبت میں کم سے کم وقت گزارنا پڑے،'' بورس نے سوچا۔ ''اور اب جب کہ یہ قضیہ شروع ہو ہی گیا ہے، اسے اس کے انجام تک پہنچا دینا چاہیے!'' اس کے رخسار تمتمانے لگے اور ان کی رنگت سرخ ہو گئی۔ اس نے اپنی نظریں اس کی جانب اٹھائیں اور بولا:

''تمھیں اپنے بارے میں میرے جذبات کا علم ہے!''

مزید کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں تھی۔ جولی کا چہرہ کامرانی اور آسودہ خاطری سے جگمگانے لگا، تاہم اس نے بورس کو وہ سب کچھ کہنے پر مجبور کر دیا جو ایسے مواقع پر عموماً کہا جاتا ہے کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اور اس نے کبھی کسی عورت سے اتنی محبت نہیں کی جتنی کہ وہ اس سے کرتا ہے۔ وہ خوب جانتی تھی کہ وہ پینزا کی جاگیروں اور نیز ہنی نوو گورود کے جنگلات کے عوض وہ اس کا مطالبہ کر سکتی ہے اور اس نے جو کچھ طلب کیا، وہ اسے مل گیا۔

منگنی طے پا جانے کے بعد انھیں ان درختوں کی طرف، جن سے اداسی اور غم گینی ٹپکتی رہتی تھی، مزید اشارے کرنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب وہ پیٹرز برگ میں ٹھاٹ دار ڈیرا بنانے کے منصوبے سوچنے، لوگوں سے ان کے گھروں پر جا کر ملنے ملانے اور شادی کی تقریبات منعقد کرنے کی تیاریاں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

6

جنوری کے اختتام پر کاؤنٹ الیا آندریچ نتاشا اور سونیا کی معیت میں ماسکو پہنچا۔ کاؤنٹس کی طبیعت ابھی تک ناساز تھی اور وہ سفر کا جوکھم اٹھانے کے قابل نہیں تھی تاہم اس کے روبصحت ہونے کا انتظار عبث تھا۔ پرنس آندرے کسی روز بھی پہنچ سکتا تھا، عروسی جوڑے کا آرڈر دینا تھا اور ماسکو کے قرب و جوار میں جو جاگیر تھی، اسے فروخت کرنا تھا۔

علاوہ ازیں ماسکو میں معمر پرنس بلکونسکی کی موجودگی سے فائدہ اٹھا کر اس کی ہونے والی بہو کو اس کی خدمت میں پیش کرنا تھا۔ رستوفوں کا ماسکو میں جو مکان تھا، ان ساری سردیوں کے دوران میں اسے گرم نہیں کیا گیا تھا اور چونکہ وہ مختصر مدت کے لیے آئے تھے، پھر کاؤنٹس بھی ان کی ہم رکاب نہیں تھی، اس لیے کاؤنٹ نے ماریا دمتریونا آخروسیمووا کے، جو مدتوں سے ان کی مہمان نوازی کرنے پر اصرار کر رہی تھی، ہاں قیام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک روز جب شام خاصی بیت چکی تھی، رستوفوں کی چار گاڑیاں اولڈ کونی یوشیمایا سٹریٹ میں اس کے صحن کے سامنے آرکیں۔ ماریا دمتریونا تن تنہا رہتی تھی۔ وہ اپنی بیٹی کی پہلے ہی شادی کر چکی تھی اور اس کے تمام بیٹے سرکاری ملازمت کر رہے تھے۔

ہمیشہ کی طرح وہ اب بھی سیدھا تن کر چلتی تھی، ہمیشہ کی طرح ہر شخص کے سامنے اپنی رائے کا اظہار لگی لپٹی رکھے بغیر، منہ پھٹ طریق اور بلند آواز سے کرتی تھی۔ اس کے اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے اور لوگوں سے ملنے ملانے کا جو انداز تھا، وہ اس امر کا غماز تھا کہ وہ دوسروں کی سرزنش کر رہی ہے کہ ان میں کمزوریاں ہیں اور وہ نفسانی جذبے یا ترغیب وتحریص کا شکار ہو جاتے ہیں کیونکہ اس کی لغت میں ان چیزوں کا کوئی وجود نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ صبح سویرے اٹھتی، ڈھیلا ڈھالا اون دار فرغل پہنتی اور اپنے خانگی امور کے انتظامات کی نگرانی میں جت جاتی۔ اس کے بعد وہ گاڑی پکڑتی اور باہر چلی جاتی۔ کسی سینٹ کا دن ہوتا تو گرجے کا رخ کرتی اور جب دعا ختم ہوتی تو جیلوں اور قید خانوں میں، جن کے معاملات کے بارے میں وہ کبھی کسی کو کچھ نہیں بتاتی تھی، پہنچ جاتی۔[13] عام دنوں میں وہ لباس تبدیل کرنے کے بعد مختلف طبقوں کے درخواست گزاروں سے، جو روزانہ اس کی امداد حاصل کرنے آتے تھے، ملاقاتیں کرتی۔ پھر وہ ڈنر کھاتی۔ ڈنر مختلف الانواع اور اشتہا آور کھانوں کی خاصی تعداد پر مشتمل ہوتا اور دسترخوان پر ہر روز تین چار مہمان ضرور موجود ہوتے۔ ڈنر کے بعد وہ بوسٹن کھیلتی۔ رات کو وہ خود تو کشیدہ کاری سنبھال لیتی اور کوئی دوسرا شخص اسے اخبارات یا نئی کتابیں پڑھ کر سناتا۔ وہ کسی دوسرے شخص سے ملاقات کرنے کی غرض سے اپنے معمول سے شاذونادر ہی ہٹ کر اس کے گھر جاتی اور جب کسی کے ہاں جاتی بھی، تو وہ ماسکو کی اہم ترین شخصیات میں سے کوئی ہوتا۔

جب رستوف پہنچے، اس نے ابھی سونے کا قصد نہیں کیا تھا۔ مسافروں اور ان کے ملازموں کو سردی سے اندر لانے کے لیے جب پیش دالان کا دروازہ کھلا، وہ اپنی چرخیوں پر چرچرایا۔ ناک کے بانسے پر چشمہ دھرے، جس نے اسے اپنا سر پچھلی جانب جھکانے پر مجبور کر دیا تھا، ماریا دمتریونا پیش دالان کے دروازے کے بیچ جا کھڑی ہوئی اور درشتی اور ترش مزاجی سے نوواردوں کا جائزہ لینے لگی۔ اگر وہ عین اسی وقت مہمانوں کو ٹھہرانے اور ان کے سامان کو سنبھالنے کے سلسلے میں اپنے نوکروں چاکروں کو پر از احتیاط ہدایات نہ دے رہی ہوتی، دیکھنے والا یہی سمجھتا کہ وہ ان سے سخت ناراض ہے اور انھیں گھر سے باہر پھنکوانے کی تیاریاں کر رہی ہے۔

"کاؤنٹ کا سامان؟ اسے یہاں لے آؤ" اس نے کسی سے بھی علیک سلیک کیے بغیر چمڑے کے سوٹ کیسوں

کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔ ''چھوکریاں؟ انھیں ادھر لے جاؤ؟ بائیں طرف۔ ہونہہ، یہ تم گھن گھیریاں کیوں ڈال رہی ہو؟'' اس نے ایک خادمہ سے چلا کر کہا۔ ''جاؤ، سماوار تیار کرو! اس چھوکری کا جسم بھر گیا ہے اور یہ پہلے سے زیادہ خوش اندام ہوگئی ہے،'' اس نے نتاشا (جس کے رخسار برفیلی ہوا میں تمتمانے لگے تھے) کو اس کی کلاہ سے پکڑ کے اپنی طرف گھسیٹتے ہوئے اس کے متعلق رائے زنی کرتے ہوئے کہا۔ ''ارے غضب، تمھارا جسم تو بہت ٹھنڈا ہے۔ ہونہہ، یہ اپنے فالتو کپڑے جلدی جلدی اتار دو،'' اس نے کاؤنٹ سے، جو اس کے ہاتھ پر بوسہ دینا چاہتا تھا، چلا کر کہا۔ ''تمھاری تو قلفی جم گئی ہوگی۔ چائے کے ساتھ کچھ رم[14] لے آؤ!... سونیوشکا، bon jour*'' - اس نے سونیا سے کہا۔ اپنی اس فرانسیسی علیک سلیک سے وہ یہ ظاہر کر رہی تھی کہ اگرچہ سونیا کے ساتھ اس کا رویہ مشفقانہ ہے لیکن وہ اپنے آپ کو اس سے قدرے برتر بھی تصور کرتی ہے۔

جب وہ سفر کے بعد شالیں، کمبل وغیرہ اتار کر اور اپنے کپڑے جھاڑ پونچھ کر چائے پینے اندر آئے، ماریا دمتریونا نے باری باری ان سب کے گال چومے۔

''مجھے قلبی مسرت ہو رہی ہے کہ تم لوگ یہاں آئے اور میرے ہاں قیام پذیر ہوئے۔ اب مناسب وقت آگیا ہے،'' اس نے نتاشا کی طرف معنی خیز انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''بڈھا یہیں ہے اور اس کا صاحب زادہ کسی روز بھی پہنچ سکتا ہے۔ تمھیں یقیناً اس سے متعارف ہونا پڑے گا۔ خیر چھوڑو، اس بارے میں ہم بعد میں بات کریں گے،'' اس نے سونیا کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ وہ اس کی موجودگی میں اس موضوع کو زیر بحث لانا نہیں چاہتی۔

''اب بتاؤ،'' وہ کاؤنٹ کی طرف متوجہ ہوئی، ''کل کے بارے میں تمھارے کیا منصوبے ہیں؟ تم کسے کسے بلاؤ گے؟ شن شن؟'' اس نے اپنی ایک انگلی ٹیڑھی کی۔ ''آنا میخائیلوونا، وہ جو تُسوے بہاتی ہے؟ چلو، دو ہوئے۔ اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی ہے۔ یہ صاحب زادہ بیاہ رچا رہا ہے! پھر بزدخوف، کیا خیال ہے؟ وہ اور اس کی بیوی دونوں یہاں ہیں۔ وہ اس سے پنڈ چھڑا کر بھاگا تھا لیکن وہ ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو کر اس کے پیچھے آ دھمکی۔ وہ بدھ کے روز میرے ہاں کھانا کھانے آیا تھا۔ جہاں تک ان کا تعلق ہے۔'' اس نے لڑکیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں کل انھیں پہلے مادر خداوند کی آئیبر یائی خانقاہ لے جاؤں گی اور وہاں سے ہم عروسی ملبوسات کا آرڈر دینے، مہالفنگی[15] (مادام شامے) کے ہاں چلے جائیں گے۔ میرا خیال ہے کہ تم سب کچھ نیا بنوانا چاہو گی۔ میری طرف دیکھ کر اندازے مت لگاؤ۔ آج کل آستینیں اسی قسم کی ہیں! چند دنوں کی بات ہے کہ نوعمر پرنس آئی رینا واسیلیونا مجھے ملنے آئی تھی۔ وہ کچھ یوں ڈری سہمی نظر آتی تھی جیسے اس نے بازوؤں میں بندوق کی دونالیاں پہن رکھی ہوں۔ تم جانتے ہو کہ کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کوئی نہ کوئی نیا فیشن معرض وجود میں نہ آتا ہو۔ اور تم اپنے بارے میں کیا کہتے ہو۔ تم یہاں کیا لینے آئے ہو؟'' اس نے کاؤنٹ کو ڈانٹتے ہوئے پوچھا۔

---

* گڈ ڈے (دن بخیر)۔

''معلوم ہوتا ہے کہ سب مسائل یک دم اٹھ کھڑے ہوے ہیں،'' کاؤنٹ نے جواب دیا۔''اس لڑکی کے کپڑے لتے خریدنا ہیں۔ ادھر ماسکو کی جاگیر اور مکان کا ایک خریدار نمودار ہوگیا ہے۔ اگر آپ اتنی مہربانی فرمائیں اور ان لڑکیوں کو سنبھال لیں، میں وقت طے کرلوں گا اور ایک دن کے لیے جاگیر پر چلا جاؤں گا۔''

''خوب، بہت خوب۔ یہ میرے پاس رہیں گی اور انھیں کوئی گزند نہیں پہنچے گا۔ جہاں ان کا جانا ضروری ہوا، میں انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ کچھ ڈانٹ ڈپٹ کروں گی، کچھ چونچلے برداشت کروں گی،'' ماریا دمتریونا نے اپنی دینی بیٹی اور چہیتی دوشیزہ کے رخسار اپنے لانبے ہاتھ سے چھوتے ہوے کہا۔

اگلی صبح ماریا دمتریونا نوجوان خواتین کو پہلے آئیبریائی خانقاہ اور پھر مادام شامے کے ہاں لے گئی۔ مادام شامے اس سے اتنا خائف رہتی تھی کہ وہ اس سے جلد از جلد خلاصی پانے کے لیے اپنے ملبوسات ہمیشہ اونے پونے داموں فروخت کردیتی تھی۔ ماریا دمتریونا نے تقریباً سبھی عروسی ملبوسات کا آرڈر دے دیا۔ جب وہ گھر پہنچے، اس نے نتاشا کے علاوہ تمام لوگوں کو کمرے سے باہر نکال دیا۔ پھر اس نے اپنی چہیتی دوشیزہ کو بلایا اور اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

''خیر، اب ہماری گفتگو ہوسکتی ہے۔ میں تمھیں تمھاری سگائی پر مبارک باد دیتی ہوں۔ تم نے اچھا آدمی پھانسا ہے! میں تمھاری خاطر خوش ہوں۔ میں اسے تب سے جانتی ہوں جب وہ اتنا سا تھا'' (اس نے فرش سے دو فٹ کی اونچائی پر اپنا ہاتھ روک لیا)۔ نتاشا کا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔ ''میں اسے اور اس کے سارے خاندان کو پسند کرتی ہوں۔ اب سنو، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ پرنس نکولائی اس شادی کے سخت خلاف ہے۔ مانا کہ پرنس آندرے اب بچہ نہیں رہا اور وہ اس کے بغیر بھی اپنا کام چلاسکتا ہے، لیکن باپ کی مرضی کے خلاف کسی خاندان میں داخل ہونا اچھی بات نہیں ہے۔ حالات ایسے ہونا چاہئیں کہ گھر امن چین اور محبت کا گہوارہ بن جائے۔ تم ہوشیار لڑکی ہو اور تم حالات سنبھالنے کا گر جانتی ہو۔ صرف اپنی عقل استعمال کرو اور اخلاص و محبت کا رویہ اپناؤ۔ پھر سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔''

نتاشا خاموش رہی۔ اس لیے نہیں، جیسا کہ ماریا دمتریونا نے فرض کرلیا تھا کہ وہ شرما رہی تھی، بلکہ اس لیے کہ اسے پرنس آندرے کے ساتھ جو محبت تھی، اس میں وہ کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتی تھی۔ اسے اپنی یہ محبت تمام انسانی معاملات سے اتنی جداگانہ معلوم ہوتی تھی کہ اس کی دانست میں یہ ہر شخص کے فہم و ادراک سے ماورا تھی۔ وہ صرف پرنس آندرے سے محبت کرتی تھی اور صرف اسی کا خیال اس کے قلب و دماغ میں جاگزیں تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا تھا، وہ ایک دو دن میں آجائے گا اور وہ اسے بھگا لے جائے گا۔ وہ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتی تھی۔

''تمھیں معلوم ہے کہ میں اسے ایک عرصے سے جانتی ہوں اور میں اس کی ہمشیرہ، تمھاری ہونے والی نند، ماشا، کی بہت گرویدہ ہوں۔ کہتے ہیں کہ نندیں بڑی فسادی ہوتی ہیں لیکن ماشا تو مکھی بھی نہیں مار سکتی۔ اس نے مجھ سے درخواست کی ہے کہ میں تم دونوں کی ملاقات کرادوں۔ کل تم اپنے باپ کے ساتھ اسے ملنے جاؤ گی۔ اس کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔ تم اس سے چھوٹی ہو اور جب وہ نوجوان، تمھارا منگیتر، آئے گا، اسے معلوم ہوجائے

گا کہ تم اس کی ہمشیرہ اور باپ کو پہلے سے جانتی ہو اور وہ تمھیں پسند کرتے ہیں۔ میں نے ٹھیک کہا نا؟ یہ بہترین بات نہیں ہوگی؟''

''جی ہاں، میرا بھی کچھ یہی خیال ہے،'' نتاشا نے بادلِ ناخواستہ جواب دیا۔

7

اگلے روز ماریا دمتریونا کے مشورے پر کاؤنٹ رستوف نتاشا کے ہمراہ پرنس نکولائی آندریوچ سے ملنے چل دیا۔ روانگی کے وقت کاؤنٹ کی حالت دیدنی تھی۔ وہ قطعاً خوش نہیں تھا اور اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ فوجی بھرتی کے دوران میں اس کی معمر پرنس کے ساتھ جو ملاقات ہوئی تھی، وہ اسے فراموش نہیں کر سکا تھا۔ اس نے معمر پرنس کو ڈنر کی دعوت دینا چاہا تھا لیکن اس کے جواب میں اسے سخت سست سننا پڑا کہ اسے فوج میں جتنے آدمی بھرتی کرانے کے لیے کہا گیا تھا، اس نے ان کی تعداد کیوں پوری نہیں کی تھی۔

اس کے برعکس نتاشا، جس نے اپنا بہترین ڈریس زیب تن کیا تھا، بے حد ہشاش بشاش تھی۔ ''وہ بھلا مجھے کیوں پسند نہیں کریں گے؟ ضرور کریں گے،'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''ہمیشہ ہر شخص نے مجھے پسند کیا ہے۔ میں ان کی ہر خواہش پر عمل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ وہ ان کے والد ہیں اور وہ ان کی ہمشیرہ، اس لیے میں ان سے محبت کرنے کے لیے آمادہ ہوں۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ مجھے پسند نہ کریں...''

وہ وزدویزھنکا سٹریٹ میں اداس اور تاریک مکان پر پہنچے اور پیش دالان میں داخل ہو گئے۔

''اچھا، خداوند ہم پر رحم فرمائے!'' کاؤنٹ نے نیم دل لگی اور نیم سنجیدگی سے کہا۔

''جب وہ پیش دالان کے اندر گئے، نتاشا نے دیکھا کہ اس کا باپ خاصا بدحواس ہے اور وہ ڈرتے ڈرتے، جھجکتے جھجکتے پوچھتا پھر رہا ہے کہ آیا پرنس اور پرنس گھر پر موجود ہیں۔

جب وہ اپنا نام بتا چکے، نوکروں چاکروں میں کچھ افراتفری دیکھنے میں آئی۔ ایک وردی پوش ملازم ان کی آمد کی اطلاع دینے اندر بھاگا۔ جب وہ بڑے ہال میں پہنچا، دوسرے وردی پوش ملازم نے اسے روک لیا۔ دونوں کھڑے ہو گئے اور آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ پھر ایک خادمہ گرتی پڑتی ہال میں آئی اور پرنس کا نام لے کر جلدی جلدی کچھ کہنے لگی۔ آخر کار ایک ادھیڑ عمر وردی پوش ملازم، جس کے چہرے پر خشونت ٹپک رہی تھی، آیا اور اس نے رستوفوں کو بتایا کہ پرنس ان سے ملاقات نہیں کریں گے، البتہ پرنس ان سے مل کر خوش ہوگی۔ جو ہستی سب سے پہلے ان سے ملنے آئی، وہ مادموزیل بوغین تھی۔ اس نے باپ بیٹی کے استقبال میں نمایاں انداز سے شائستگی کا مظاہرہ کیا اور وہ انھیں پرنس کے کمرے میں لے گئی۔ پرنس مضطرب و متفکر تھی اور اس کے چہرے پر سرخ دھبے نمایاں ہو گئے تھے۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتی بہ عجلت آگے بڑھی۔ وہ پوری کوشش کر رہی تھی کہ اس کا رویہ پرتپاک اور پراطمینان نظر آئے لیکن اپنی اس سعی میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑ رہا تھا۔ وہ پہلی نظر میں ہی نتاشا کو

ناپسند کرنے لگی۔ اس کا خیال تھا کہ اس نے حد درجہ فیشن ایبل لباس پہن رکھا ہے، پندار کا صنم کدہ بسائے ہوئے ہے اور بے ہودہ طور پر ہشاش بشاش ہے۔ پرنس ماریا کو اس امر کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اپنی بھابی کو ایک نظر دیکھنے سے پہلے ہی اس کے دل میں اس کے خلاف تعصب بیٹھ چکا تھا کیونکہ وہ غیر شعوری طور پر اس کی خوبصورتی، جوانی اور ہشاشت بشاشت سے حسد کرنے لگی تھی۔ پھر اسے اس بات کی جلن بھی تھی کہ اس کا بھائی اس سے محبت کرتا تھا۔ منافرت کے اس نا قابل مفتوح جذبے کے علاوہ پرنس کو اس چیز سے بھی گھبراہٹ ہو رہی تھی کہ عین اس وقت، جب رستوفوں کی آمد کی اطلاع پہنچائی جا رہی تھی، معمر پرنس نے با آواز بلند چلا کر کہا تھا: ''وہ لوگ جائیں بھاڑ میں، میں ان سے نہیں ملوں گا۔ پرنس ماریا کا جو جی چاہے، کرے لیکن میرے پاس انھیں ہرگز ہرگز نہ لایا جائے۔'' وہ ان سے ملنے کا فیصلہ کر چکی تھی لیکن اسے اس چیز کا بھی اندیشہ تھا کہ کہیں پرنس پر کوئی بھوت سوار نہ ہو جائے اور وہ کوئی ایسی ویسی حرکت نہ کر بیٹھے کیونکہ رستوفوں کی آمد نے اس کے اوسان خطا کر دیے تھے۔

''مائی ڈیئر پرنس، دیکھیں، میں نے اپنی ننھی منی بلبل آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہے،'' کاؤنٹ نے گردن جھکاتے اور پاؤں سے فرش کھرچتے ہوئے کہا۔ وہ وحشت کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس پر یہ خوف سوار تھا کہ کہیں معمر پرنس ادھر نہ آ نکلے۔ ''میں بہت خوش ہوں کہ آپ لوگوں کو ایک دوسرے سے متعارف ہونے کا موقع میسر آ گیا ہے۔ مجھے افسوس ہے، بے حد افسوس ہے کہ پرنس کی طبیعت ابھی تک ناساز ہے۔'' اس قسم کی چند مزید پیش پا افتادہ باتیں کرنے کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''پرنس، اگر آپ مجھے اجازت دیں، تو میں پندرہ منٹ کے لیے نتاشا کو آپ کے پاس چھوڑے دیتا ہوں۔ اتنے میں میں ذرا آنا سیمونووا سے مل آتا ہوں۔ وہ یہاں سے چند قدم کے فاصلے پر سوباچی سکوائر[16] میں رہتی ہیں۔ پھر میں اسے لینے واپس آ جاؤں گا۔''

الیا آندریچ نے یہ سفارتی چال اس لیے چلی تھی کیونکہ وہ (جیسا کہ اس نے بعد میں اپنی بیٹی کو بتایا) مستقبل کی خواہران نسبتی کو آپس میں کھل کر بات چیت کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ معمر پرنس سے، جس سے اس کی جان جاتی تھی، ملاقات کے امکان سے جان چھڑانا چاہتا تھا۔ اس بات کا ذکر اس نے اپنی بیٹی سے تو نہ کیا لیکن نتاشا اپنے باپ کی بے چینی اور خدشات کو بھانپ گئی اور اس پر اسے سخت شرمندگی ہوئی۔ گھبرا وہ رہا تھا، شرمسار وہ ہو رہی تھی۔ اسے جو شرمساری محسوس ہوئی تھی، اس پر اسے اپنے آپ پر سخت غصہ آیا اور اس غصے میں ہر آن اضافہ ہونے لگا۔ اس نے بے باک اور سرکش نگاہوں سے پرنس کو دیکھا۔ اس کی یہ نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ وہ کسی شخص سے خوف زدہ نہیں۔ جب پرنس نے کاؤنٹ کو یقین دلا دیا کہ وہ اس کی غیر موجودگی کا برا نہیں منائے گی، بلکہ وہ تو یہ چاہے گی کہ وہ آنا سیمونووا کے ہاں زیادہ دیر ٹھہرے، وہ رخصت ہو گیا۔

پرنس ماریا نتاشا کے ساتھ خلوت میں باتیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کی پریشان اور مضطرب نظریں بار بار مادموزیل بوغین کی جانب اٹھیں لیکن وہ اللہ کی بندی ٹس سے مس نہ ہوئی اور اپنی جگہ بت بنی بیٹھی رہی، اور مسلسل ماسکو کی تفریحات اور تھیٹروں کے بارے میں گفتگو کرتی رہی۔ نتاشا نے پیش دالان میں جو تذبذب کی کیفیت

دیکھی تھی، اسے اس پر، اپنے باپ کی گھبراہٹ پر اور پرنس کے، جو قرائن سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا استقبال کر کے اس پر احسان کر رہی ہے، غیر فطری رویے پر، بڑی اہانت محسوس ہونے لگی تھی اور نتیجتاً اسے ہر بات بری لگنے لگی تھی۔ اسے پرنس ماریا پسند نہیں آئی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ بدصورت، ملمع کار اور کٹھور ہے۔ وہ آناً فاناً اپنے آپ میں سکڑ گئی، اور اس نے غیر ارادی طور پر لاپروایانہ انداز اختیار کر لیا۔ اس کے اس رویے نے پرنس کو اور بھی برگشتہ کر دیا۔ پانچ منٹ کی پر آورد اور مصنوعی گفتگو کے بعد انھیں کسی شخص کے، جس نے پاؤوں میں سلیپر پہنے ہوئے تھے اور جو بہ سرعت انھیں کی طرف آ رہا تھا، قدموں کی چاپ سنائی دی۔ پرنس ماریا کے چہرے پر ہول طاری ہو گیا۔ دروازہ کھلا اور پرنس اندر داخل ہو گیا۔ اس کے سر پر شبینہ ٹوپی اور جسم پر ڈریسنگ گاؤن تھا۔

''اخاہ، میڈم'' اس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ ''میڈم، کاؤنٹس... اگر میں غلطی نہیں کر رہا، کاؤنٹس رستووا... معافی چاہتا ہوں، خدارا مجھے معاف کر دیں... میڈم، مجھے معلوم نہیں تھا۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے بالکل علم نہیں تھا کہ آپ اپنی تشریف آوری سے ہماری عزت افزائی فرما رہی ہیں۔ میں تو محض اپنی بیٹی کو دیکھنے آیا تھا، اسی لیے میں نے اس قسم کے کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ آپ مجھے معاف فرما دیں... خدا گواہ ہے کہ مجھے مطلق علم نہیں تھا'' اس نے اپنی بات دہرائی اور لفظ ''خدا'' پر اتنے غیر فطری اور ناخوشگوار انداز سے زور دیا کہ پرنس ماریا نظریں جھکائے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ اپنے باپ یا نتاشا کی طرف دیکھ سکے۔

نتاشا بھی اٹھ کر کھڑی ہو چکی اور جھک کر آداب عرض کر چکی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ صرف مادموزیل بوغین خندہ پیشانی سے مسکرا رہی تھی۔

''میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر التجا کرتا ہوں کہ آپ مجھے معاف فرما دیں، میری آپ سے گزارش ہے کہ آپ مجھے معاف فرما دیں۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے کوئی علم نہیں تھا'' بوڑھا بڑبڑایا اور نتاشا کو سر سے پاؤں تک دیکھنے کے بعد باہر نکل گیا۔

اس بھوت کی روانگی کے بعد سب سے پہلے مادموزیل بوغین آپے میں آئی اور وہ پرنس کی ناسازیٔ طبع کے بارے میں باتیں کرنے لگی۔ نتاشا اور پرنس ماریا مہر بلب ایک دوسرے کو دیکھتی رہیں۔ وہ جتنا زیادہ عرصہ اپنے منہوں میں گھنگھنیاں ڈالے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتی تھیں، اسے کہے بغیر، بیٹھی ایک دوسری کو تکتی رہیں، ان کا باہمی تنافر اتنا ہی زیادہ مصدقہ ہوتا چلا گیا۔

جب کاؤنٹ واپس آیا، نتاشا نے بڑے ناشائستہ انداز سے اطمینان کی سانس لی اور وہاں سے بھاگنے میں ذرہ برابر تاخیر نہ کی۔ اس لمحے اسے پرنس سے، جو اسے بوڑھی دوشیزہ نظر آتی تھی، جو اسے ان پریشان کن حالات میں دھکیل سکتی تھی اور جو پرنس آندرے کا ایک مرتبہ بھی نام لیے بغیر آدھ گھنٹہ گزار سکتی تھی، قریب قریب نفرت ہو گئی۔ ''میں اس فرانسیسی زنانی کی موجودگی میں ان (پرنس آندرے) کے بارے میں گفتگو کی ابتدا نہیں کر سکتی تھی'' نتاشا نے سوچا۔ دریں اثنا یہی خیال پرنس ماریا کو اذیت پہنچا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اسے نتاشا سے کیا کہنا چاہیے

تھا لیکن اسے یہ سب کچھ کہنے میں ناکامی ہوئی تھی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ مادموزیل بوغین کی موجودگی اس کے لیے رکاوٹ بن گئی تھی۔ دوسرے۔ اگر چہ اسے معلوم نہیں تھا کہ کیوں۔ شادی کے بارے میں اسے گفتگو کرنا دشوار معلوم ہوا۔ کاؤنٹ کمرے سے تقریباً نکل ہی چکا تھا کہ پرنس ماریا لپک جھپک نتاشا کے پاس آئی، اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور گہری سانس لے کر بولی:

''ٹھہریں، مجھے۔''

نتاشا نے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ اس کا منہ چڑا رہی ہو۔ اس نے ایسا کیوں کیا، اس کی وجہ وہ خود بھی نہیں بتا سکتی تھی۔

''ڈیئر نتالی، میں تمھیں بتانا چاہتی ہوں کہ مجھے خوشی ہے کہ میرے بھائی کو دل کی مراد مل گئی ہے...''

''پرنس، میرا خیال ہے کہ یہ اس قسم کی باتیں کرنے کا وقت نہیں ہے،'' نتاشا نے ظاہراً سرد مزاجی اور آن بان سے کہا لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے آنسو اب نکلے، کہ اب نکلے اور اس کا گلا رندھنے لگا۔

''یہ میں نے کیا کہہ دیا؟ یہ میں نے کیا کر دیا؟'' جونہی وہ کمرے سے باہر نکلی، اس نے سوچا۔

❖

اس روز انھیں ڈنر پر نتاشا کا خاصی دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کسی بچی کی طرح رو رہی تھی۔ وہ بار بار سسکیاں لیتی اور اپنی ناک چھنکتی جاتی۔ سونیا اس کے قریب کھڑی تھی اور اس کے بالوں کو چوم رہی تھی۔

''نتاشا، تم رو کیوں رہی ہو؟'' وہ پوچھ رہی تھی۔ ''تم ان لوگوں کا برا کیوں مناتی ہو؟ نتاشا، بات آئی گئی ہو جائے گی۔''

''کاش تمھیں معلوم ہوتا کہ یہ کتنا ہتک آمیز تھا... جیسے میں...''

''نتاشا، اس کا مت ذکر کرو۔ یہ تمھارا قصور نہیں تھا۔ پھر تم کیوں برا مناتی ہو؟ اچھا، میرا بوسہ لو،'' سونیا نے کہا۔

نتاشا نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اپنی سہیلی کے لبوں کو چومتے ہوئے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اس کے چہرے کے ساتھ چمٹا دیا۔

''میں تمھیں بتا نہیں سکتی، مجھے معلوم نہیں۔ قصور وار کوئی نہیں،'' نتاشا نے کہا۔ ''غلطی میری ہے۔ لیکن یہ ہے بہت تکلیف دہ۔ وہ آتے کیوں نہیں؟''

وہ سرخ آنکھوں کے ساتھ ڈنر پر آئی۔ ماریا دمتریونا نے، جسے معلوم تھا کہ پرنس نے رستوفوں کا کیسا خیر مقدم کیا ہے، یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس نے نتاشا کا کلفت زدہ چہرہ دیکھا ہی نہیں اور وہ دستر خوان پر با آواز بلند اور رکے بغیر کاؤنٹ اور دوسرے مہمانوں کے ساتھ لطیفہ گوئی کرتی رہی۔

8

اس شام رستوف اوپیرا گئے۔ اس کے لیے ماریا دمتریونا نے باکس ریزرو کرالیا تھا۔

نتاشا جانا نہیں چاہتی تھی لیکن وہ ماریا دمتریونا کی، جب کہ یہ سارا انتظام خاص طور پر اسی کے لیے کیا گیا تھا، شفقت ٹھکرا بھی نہیں سکتی تھی۔ اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور بڑے ہال میں اپنے باپ کا انتظار کرتے کرتے اس نے قدِ آدم آئینے کے سامنے اپنے سراپے کا جائزہ لیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ کتنی خوبصورت ہے، وہ پہلے سے بھی زیادہ اداس ہوگئی لیکن اس کی اس اداسی میں مٹھاس اور ملائمت تھی۔

''اف، خداوند، کاش کہ وہ یہاں ہوتے! اگر وہ یہاں ہوتے، میں نے تب جس قسم کے احمقانہ شرمیلے پن کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اب نہ کیا ہوتا، بلکہ میرا رویہ مختلف ہوتا۔ میں اپنے بازو ان کے گلے میں حمائل کردیتی، ان سے چمٹ جاتی اور انھیں مجبور کردیتی کہ وہ مجھے ان متجسس اور مستفسرانہ نگاہوں سے، جن سے وہ مجھے اکثر دیکھا کرتے تھے، دیکھیں اور پھر میں انھیں اسی طرح ہنسا دیتی جس طرح کہ وہ اس وقت ہنسا کرتے تھے۔ اور ان کی آنکھیں— اس وقت بھی مجھے ان کی آنکھیں بالکل صاف صاف نظر آرہی ہیں!'' نتاشا نے سوچا۔ ''مجھے ان کے باپ اور بہن سے کیا لینا؟ میں صرف ان سے، ان سے، اس چہرے سے، ان آنکھوں سے اور ان کی مسکراہٹ سے— مردانہ تاہم بچوں کی طرح معصومانہ— پیار کرتی ہوں... نہیں، بہتر یہی ہے کہ ان کے متعلق سوچا ہی نہ جائے، بالکل سوچا ہی نہ جائے، بلکہ فی الحال میں انھیں بھول جاؤں، بالکل بھول جاؤں۔ انتظار کی یہ کیفیت مجھ سے برداشت نہیں ہوسکتی۔ میں ابھی، ایک منٹ میں، رو پڑوں گی!'' اور وہ آئینے سے پرے ہٹ گئی۔ وہ پوری کوشش کررہی تھی کہ وہ رونے نہ بیٹھ جائے۔ ''اور سونیا نکولائی سے اتنے سکون اور استقلال کے ساتھ کیسے محبت کرلیتی ہے اور صبر و تحمل سے اتنا طویل انتظار کس طرح برداشت کرلیتی ہے؟'' اور وہ سونیا کو، جو اوپیرا کے لیے اپنا لباس تبدیل کر کے ہاتھ میں پنکھیا پکڑے اندر آئی تھی، دیکھ کر ورطۂ حیرت میں گم ہوگئی۔ ''نہیں، وہ مجھ سے بالکل مختلف ہے۔ میں یہ نہیں کرسکتی۔''

اس وقت نتاشا اپنا دل ملائمت اور جذبے سے اس قدر معمور محسوس کررہی تھی کہ اس کے لیے محض اتنا کافی نہیں تھا کہ وہ محبت کرتی ہے اور جانتی ہے کہ اس کے ساتھ محبت کی جارہی ہے۔ اب تو وہ یہ چاہتی تھی کہ چشم زدن میں اپنے محبوب سے بغل گیر ہوجائے، اس سے راز و نیاز کی باتیں، جن سے اس کا اپنا دل لبریز تھا، کرے، کچھ اپنی کہے اور کچھ اس کی سنے۔ جب وہ گاڑی میں اپنے باپ کے برابر بیٹھی جارہی تھی اور غم گینی کے عالم میں، سڑک کی روشنیاں، جو برفیلے دریچوں پر جھلملا رہی تھیں، دیکھ رہی تھی، وہ اور بھی اداس اور اپنے آپ کو پہلے سے بھی کہیں زیادہ گرفتارِ محبت محسوس کرنے لگی۔ اسے اتنا بھی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں اور کس کے ساتھ جارہی ہے۔ رستوفوں کی گاڑی ان گاڑیوں کی، جو تھیئٹر کے احاطے کے اندر جارہی تھیں، صف میں شامل ہوگئی۔ اس کے پہیے آہستہ آہستہ

برف سے رگڑیں کھا رہے اور چرمرا رہے تھے۔ نتاشا اور سونیا نے اپنے ڈریس سنبھالے اور جھٹ پٹ نیچے کود گئیں۔ کاؤنٹ وردی پوش ملازموں کی مدد سے نیچے اترا اور وہ تینوں پروگرام بیچنے والوں اور ان خواتین و حضرات کے، جو تھیئٹر میں داخل ہو رہے تھے، درمیان میں سے راستہ بناتے اور غلام گردش میں سے گزرتے، باکسوں کی پہلی قطار میں پہنچ گئے۔

بند دروازوں میں سے موسیقی کی دھنیں ازیں پیشتر ہی سنائی دینے لگی تھیں۔

''نتاشا، تمھارے بال...!'' سونیا نے سرگوشی کی۔

تھیئٹر کا ایک خدمت گار تیزی سے آگے آیا اور ان کے باکس کا دروازہ کھولنے تعظیم سے خواتین کے برابر سے گزر گیا۔ موسیقی کی آواز اور بلند ہوگئی اور انھیں دروازے میں سے روشنیوں میں نہائے اور تدریجاً بلند ہوتے باکسوں کی، جن میں برہنہ بازوؤں اور شانوں والی خواتین رونق افروز تھیں، قطاریں نظر آئیں۔ نیچے سٹال تھے۔ وہاں خوب شور وغل ہو رہا تھا اور ملازمین کی بھڑکیلی وردیاں چمک رہی تھیں۔ ایک خاتون نے، جو اگلے باکس میں داخل ہو رہی تھی، ذرا کی ذرا حاسدانہ نگاہوں سے نتاشا کو دیکھا۔ پردہ ابھی اٹھا نہیں تھا اور آرکسٹرا اوپیرا کی افتتاحی دھن بجا رہا تھا۔ نتاشا اپنے گاؤن کی شکنیں درست کرتی سونیا کے ساتھ آگے بڑھی اور اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کی نگاہیں اپنے بالمقابل چمکتے دمکتے باکسوں پر مرکوز تھیں۔ وہ تجسس جس کا اسے مدتوں سے تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جب آپ کے عریاں بازوؤں اور گردن پر سینکڑوں نگاہیں لگی ہوئی ہوں۔ اچانک اس کے رگ و پے میں سما گیا۔ وہ خوش بھی تھی اور بے چین و مضطرب بھی۔ اس احساس کے ساتھ یادوں، امنگوں اور جذبوں کا جو جم غفیر وابستہ تھا، وہ یک بارگی اس کے ذہن میں در آیا۔

دو غیر معمولی طور پر خوبصورت دوشیزاؤں، سونیا اور نتاشا نے، جو کاؤنٹ رستوف کے ساتھ آئی تھیں اور جنھیں کچھ مدت سے ماسکو میں دیکھا نہیں گیا تھا، تمام حاضرین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ مزید برآں ہر شخص کو یہ دھندلا دھندلا سا احساس تھا کہ نتاشا کی پرنس آندرے سے نسبت طے پا چکی ہے۔ انھیں یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت سے رستوف گاؤں میں قیام پذیر ہیں اور وہ اس لڑکی کو، جس کے مقدر میں روس کا ایک بہترین رشتہ لکھا تھا، تجسس کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

جیسا کہ ہر شخص نے اسے بتایا تھا، دیہاتی فضا میں نتاشا کا رنگ روپ نکھر آیا تھا اور اس شام اس پر جو ہیجانی کیفیت طاری تھی، اس کے طفیل وہ خاص طور پر حسن و جمال کا مرقع دکھائی دے رہی تھی۔ اس کی شگفتہ مزاجی اور حسن نے اپنے گردوپیش کی ہر چیز کے بارے میں اس کی بے نیازی سے مجتمع ہو کر ہر شخص پر زبردست تاثر قائم کر دیا تھا۔ اس کی غزالی آنکھیں، جو کسی شخص کی متلاشی نہیں تھیں، ہجوم کے اوپر تیرتی پھر رہی تھیں۔ اس کے مہین بازو، جو کہنیوں سے اوپر تک برہنہ تھے، باکس کے مخملیں کنارے پر پڑے تھے جب کہ وہ بالکل غیر شعوری طور پر موسیقی کی دھن کے ساتھ ساتھ اپنی مٹھی کبھی کھولتی اور کبھی بند کرتی جا رہی تھی۔ یوں اس کے ہاتھوں میں پروگرام کا کتابچہ چرمر ہوتا جا رہا تھا۔

''وہ دیکھو، اُدھر آلینینا ہے،'' سونیا نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کی ماں بھی ساتھ ہے۔''

''غضب خدا کا، میخائل کریلیچ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ موٹا ہوگیا ہے!'' کاؤنٹ نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اپنی آننا میخائیلوونا کو دیکھو! یہ اس نے سر پر کیا اوڑھ رکھا ہے!''

''وہ رہے کاراگنز — بورس جولی کے ساتھ ہے۔ یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ ان کی نسبت طے پا چکی ہے۔

''دروبیتسکوئے نے پیغام دے دیا ہے! یقین مانیں یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا ہے،'' شن شن نے رستوفوں کے باکس میں آتے ہوئے کہا۔

اپنے باپ کی نگاہوں کا تعاقب کرتے ہوئے نتاشا نے جولی کو اپنی ماں کے برابر بیٹھے دیکھا۔ اس کے چہرے پر طمانیت جھلک رہی تھی اور اس کی موٹی سرخ گردن (نتاشا کو معلوم تھا کہ اس پر پاؤڈر کی تہہ جمی ہوگی) میں موتیوں کی مالا لٹک رہی تھی۔ ان کے عقب میں بورس کا خوبصورت سر نظر آرہا تھا۔ اس نے اپنے بال بہت دلکش انداز سے سنوارے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ آگے کو جھکا ہوا تھا اور اس کا کان جولی کے منہ کے قریب تھا۔ اس نے کن انکھیوں سے رستوفوں کی جانب دیکھا اور تبسم روا اپنی منگیتر سے کچھ کہا۔

''وہ ہمارے، میرے اور ان کے بارے میں، باتیں کر رہے ہیں!'' نتاشا نے سوچا۔ ''وہ مجھ سے حسد کرتی ہے اور وہ غالباً اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ انھیں تردد کرنے کی ضرورت نہیں! کاش انھیں معلوم ہوتا کہ اب میرے نزدیک ان کی کوئی اہمیت نہیں رہی، ان میں سے کسی کی بھی نہیں۔''

ان کے پیچھے آننا میخائیلوونا بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر سبز پہناوا تھا۔ بیک وقت اس کی باچھیں بھی کھلی جا رہی تھیں اور وہ پارسایانہ انداز سے راضی بہ رضا بھی نظر آرہی تھی۔ باکس اس فضا سے، جو منگیتروں سے مخصوص ہوتی ہے، جس سے نتاشا خوب آگاہ تھی اور جسے وہ اتنا پسند کرتی تھی، رچا بسا تھا۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اچانک وہ تذلیل، جس کا اسے صبح کے چکر کے دوران میں سامنا کرنا پڑا تھا، اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔

''اسے کیا حق ہے کہ وہ مجھے اپنے خاندان میں شامل نہ ہونے دے؟ اف! بہتر ہے کہ اس بارے میں سوچا ہی نہ جائے۔ اس وقت تک نہ، جب تک وہ واپس نہ آجائیں،'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور وہ ان لوگوں کے، جو نیچے سٹال میں بیٹھے تھے، چہروں کا جائزہ لینے لگی۔ ان میں کچھ چہرے شناسا تھے اور کچھ اجنبی۔

پہلی قطار کے عین درمیان میں آرکسٹرا کے جنگلے سے پشت ٹکائے ایرانی لباس میں ملبوس دلوخوف کھڑا تھا۔ اس نے اپنے گھونگریالے بالوں کو کچھ یوں سنوارا تھا کہ وہ بہت اونچے اور گھنے[17] نظر آرہے تھے۔ وہ حاضرین کے عین سامنے کھڑا تھا اور اس بات سے بخوبی آگاہ تھا کہ وہ سارے تھیئٹر کا مرکزِ نگاہ ہے، لیکن وہ کھڑا یوں تھا جیسے وہ تھیئٹر میں نہیں، اپنے کسی کمرے میں موجود ہو۔ ماسکو کے بانکے سجیلے نوجوانوں کا گروہ، جس کا وہ بظاہر لیڈر تھا، اس کے گرد ہجوم کیے ہوئے تھا۔

کاؤنٹ الیا آندریچ نے ہنستے ہوئے سونیا کو، جس کے رخسار لال ہو رہے تھے، ٹھوکا دیا اور اس کی توجہ اس

کے سابقہ پرستار کی طرف دلائی۔

''تم نے اسے پہچانا؟'' اس نے پوچھا۔ ''یہ اچانک کہاں سے آٹپکا ہے۔ میرا تو خیال تھا کہ یہ کہیں روپوش ہوگیا ہے۔''

''ہاں، روپوش تو ہوگیا تھا،'' شن شن نے جواب دیا۔ ''یہ کاکیشیا چلا گیا تھا لیکن وہاں سے فرار ہوگیا۔ سنا ہے کہ یہ ایران میں، جہاں اس نے شاہ کے بھائی کو قتل کر دیا تھا، کسی حکمران بادشاہ کے وزیر کی حیثیت سے کام کرتا رہا ہے۔ اب ماسکو کی تمام خواتین اس پر جانیں چھڑ کنے لگی ہیں۔ 'دلوخوف ایرانی' — ان الفاظ نے یہ کرشمہ کر دکھایا ہے۔ وہ اس کا نام لے کر قسمیں کھاتی ہیں۔ محفلیں منعقد کرنے والی خواتین اسے یوں پیش کرتی ہیں جیسے وہ دلوخوف نہ ہو، سٹرلیٹ مچھلی کی بہترین ڈش ہو،'' شن شن نے کہا۔ ''دلوخوف اور اناطول کوراگن نے تمام خواتین کے سر گھما دیے ہیں۔''

ملحقہ باکس میں ایک دراز قد حسین و جمیل خاتون اپنا بھاری بھرکم ریشمی گاؤن لہراتی، سرسراتی داخل ہوئی۔ اس کے بال بہت بڑی مینڈھی کی صورت میں گندھے ہوئے تھے۔ اس کے کھلے گلے کے ڈریس میں اس کی گردن اور سفید گداز بازوؤں کی سرعام نمائش ہو رہی تھی۔ اس کے گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی دوہری مالا تھی۔ اس نے اپنی نشست سنبھالنے میں خاصا وقت صرف کیا۔

نتاشا اس گردن، ان بازوؤں، موتیوں اور کنگھی چوٹی کی خوبصورتی کو بغور دیکھے اور اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عین اس وقت جب وہ دوسری مرتبہ اس کا جائزہ لینے اس کی طرف متوجہ ہوئی، اس خاتون نے مڑ کر دیکھا اور جب اس کی نگاہیں کاؤنٹ کی نگاہوں سے ٹکرائیں، اس نے گردن کو جنبش دی اور مسکرانے لگی۔ یہ پیئر کی اہلیہ کاؤنٹس بزوخوا تھی۔ کاؤنٹ الیا آندریچ، جو اونچے طبقے کے ہر فرد کو جانتا تھا، آگے جھکا اور اس سے مخاطب ہوا۔

''کاؤنٹس، آپ یہاں کب سے ہیں؟'' اس نے دریافت کیا۔ ''میں حاضر ہوں گا، دست بوسی کے لیے حاضر ہوں گا۔ میں یہاں کام کے سلسلے میں آیا ہوں اور اپنی بچیاں ساتھ لایا ہوں۔ سنا ہے کہ سیمیونووا کی اداکاری بے نظیر ہے،'' کاؤنٹ اپنی ہانکتا چلا گیا۔ ''کاؤنٹ پیوتر کرلووچ نے کبھی ہمیں فراموش نہیں کیا تھا۔ کیا وہ یہیں ہیں؟''

''جی ہاں، ان کا ارادہ یہاں آنے کا تھا،'' ہیلین نے نتاشا کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

کاؤنٹ رستوف دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔

''خوبصورت، وجیہہ۔ ہے نا؟'' کاؤنٹ نے نتاشا کے کان میں کہا۔

''بہت متاثر کن!'' نتاشا نے اتفاق کیا۔ ''مرد اس کی محبت میں آسانی سے گرفتار ہو جاتا ہوگا۔''

عین اسی لمحے افتتاحی نغمے کے آخری سر سنائی دیے اور کنڈکٹر نے اپنی چھڑی کھٹکھٹائی۔ بعض تماشائی، جو تاخیر سے آئے تھے، نیچے سٹال میں اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے اور پردہ اٹھ گیا۔

جونہی پردہ اٹھا، سٹال اور باکسوں پر گہرا سکوت طاری ہوگیا اور تمام مردوں، بوڑھے تھے یا نوجوان، جو وردیوں اور ڈریس کوٹوں میں ملبوس تھے، اور خواتین نے، جو اپنے اجسام کے برہنہ حصوں پر قیمتی جواہرات پہنے ہوئے تھیں، پرجوش توقعات کے ساتھ اپنی توجہ سٹیج کی طرف مبذول کردی۔

نتاشا کی نگاہیں بھی سٹیج پر مرکوز ہوگئیں۔

9

درمیان میں سٹیج ہموار تختوں پر مشتمل تھا۔ پہلوؤں پر گتے کی دفتیاں، جن پر درختوں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں، پڑی تھیں۔ عقب میں دفتیوں کے اوپر کینوس کھنچا ہوا تھا۔ سٹیج کے درمیان میں سرخ چولیوں[18] اور سفید پیٹی کوٹوں میں ملبوس چند دوشیزائیں بیٹھی تھیں۔ ایک انتہائی فربہ اندام لڑکی، جس نے سفید ریشمی ڈریس پہن رکھا تھا، دوسروں سے الگ تھلگ کوتاہ قامت بنچ پر متمکن تھی۔ اس بنچ کے عقب میں سبز گتے کی تختی گوند سے جوڑ دی گئی تھی۔ وہ سب نغمہ سرائی کررہی تھیں۔ جب ان کا گیت اختتام پذیر ہوا، وہ لڑکی جو سفید ڈریس میں ملبوس تھی، پرامپٹر[19] کے باکس کی طرف آئی اور ایک شخص، جس کی ٹانگیں سفید، چست ریشمی پتلون میں ملفوف تھیں، جس کے سر پر کلغی اور ہاتھ میں خنجر تھا، گانا گانے اور فضا میں ہاتھ لہرانے لگا۔

پہلے تو تنگ پتلون والا شخص اکیلا گاتا رہا، پھر وہ گانے لگی، پھر وہ دونوں رک گئے اور اس شخص نے سفید ڈریس والی دوشیزہ کا ہاتھ اپنی انگلی سے چھوا۔ وہ بظاہر اس تال کا، جس پر اس نے اس کے ساتھ مل کر گانا گانا تھا، انتظار کر رہا تھا۔ جب ان کا دوگانا ختم ہوگیا، سارے تھیٹر میں داد و تحسین کے وہ ڈونگرے بلند ہوئے اور اتنا شور وغل بپا ہوا کہ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی، جب کہ سٹیج پر وہ شخص اور لڑکی، جو عاشق و معشوق کے کردار ادا کررہے تھے، مسکراتے اور اپنے ہاتھ آگے پھیلا پھیلا کر اور اپنے سر جھکا جھکا کر سلام کرتے رہے۔

دیہاتی فضا میں زندگی گزارنے کے بعد اور اپنی موجودہ سنجیدہ کیفیت میں نتاشا کو یہ سب کچھ حیرت انگیز اور طرفہ تماشا نظر آیا۔ وہ اوپیرا پر پوری توجہ مرکوز نہ کرسکی، بلکہ وہ نغمہ بھی صحیح طور پر نہ سن سکی۔ اسے صرف باتصویر دفتیاں، یا عجیب وغریب ملبوسات پہنے مرد اور لڑکیاں، جو اس چکا چوند روشنی میں اتنے عجیب انداز سے حرکتیں یا باتیں کر رہے اور گانے گارہے تھے، نظر آرہے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ان سب کا مدعا کیا پیش کرنا تھا لیکن یہ سب کچھ اتنا ڈھٹائی سے باطل، بناوٹی اور غیر فطری تھا کہ کبھی اسے اداکاروں پر شرم آنے لگتی اور کبھی وہ ان کی حرکتوں سے محظوظ ہونے لگتی۔ اس نے اپنے گرد و پیش ناظرین کے چہروں پر نظر ڈالی۔ وہ دیکھنا چاہتی تھی کہ آیا وہ بھی اسی طرح بوکھلا رہے ہیں یا نہیں اور جس مضحکہ خیزی کو وہ محسوس کررہی ہے، انھیں بھی اس کا احساس ہے یا نہیں۔ لیکن نظر بظاہر یہی دکھائی دیا کہ جو کچھ سٹیج پر ہورہا تھا، وہ اس میں پوری طرح محو تھے اور ایک ایسی سرخوشی کا اظہار کررہے تھے، جو نتاشا کو سراسر جھوٹی اور مصنوعی معلوم ہورہی تھی۔ "میرا خیال ہے کہ یہاں جو کچھ ہورہا ہے، اتفاقاً نہیں ہورہا، منتظمین

شاید چاہتے ہی یہ تھے کہ ایسا ہو،'' اس نے سوچا۔ وہ کبھی نیچے سٹال میں پوماد لگائے سروں کی قطاروں کو اور کبھی کھلے گلے کے گاؤن پہنے باکسوں میں بیٹھی خواتین اور بالخصوص ہیلین کو دیکھنے لگتی۔ یہ ہیلین صریحی طور پر بے لباس دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر آسودہ اور پر اطمینان مسکراہٹ تھی۔ اس کی نگاہیں سٹیج پر مرکوز تھیں اور وہ اس خیرہ کن روشنی سے، جس میں سٹیج نہایا ہوا تھا اور پر کیف اندرونی فضا سے، جسے ہجوم کی موجودگی نے قدرے گرم کر دیا تھا، لطف اندوز ہو رہی تھی۔ نتاشا بتدریج کیف و مستی کی ایک ایسی کیفیت کی، جس کا اسے مدتوں تجربہ نہیں ہوا تھا، لپیٹ میں آتی چلی گئی۔ اسے یہ مطلق احساس نہ رہا کہ وہ کون ہے، کہاں ہے اور جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے، وہ کیا ہے۔ جب وہ اپنے اردگرد ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی، غیر متوقع طور پر اور بے ربط انداز سے انتہائی عجیب و غریب تصورات برق رفتاری سے اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے۔ ایک لمحے تو اسے خیال آیا کہ وہ سٹیج کے سامنے کی روشنیوں (فٹ لائٹس) کے اوپر سے چھلانگ لگا دے اور اوپیرا کا نغمہ، جو اداکارہ تن تنہا گا رہی تھی، خود گانے لگے۔ پھر ایکا ایکی اس کے من میں یہ ترنگ آئی کہ اس کے قرب میں جو سن رسیدہ شخص بیٹھا ہے، اسے پنکھیا کی نوک سے ٹھوکا دے دے یا ذرا جھک کر ہیلین کے گدگدی کر دے۔

ایک موقع پر جب واحد اداکار نے اپنا نغمہ شروع کرنا تھا، سٹیج پر مکمل سکوت طاری تھا، ایک دروازہ، جو رستوفوں کے قریب ترین تھا اور جو نیچے سٹال میں کھلتا تھا، چرچرایا اور ایک نو وارد کے، جو تاخیر سے آیا تھا، مردانہ قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ''کوراگن آیا ہے!'' شن شن نے سرگوشی کی۔ کاؤنٹس بزخووا نے اپنی گردن گھمائی اور نو وارد کو دیکھ کر مسکرانے لگی۔ نتاشا نے کاؤنٹس کی نگاہوں کا تعاقب کیا اور اسے ایک غیر معمولی طور پر وجیہہ و شکیل ایجوٹنٹ نظر آیا۔ وہ انھیں کے باکس کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی چال ڈھال اور طور طریق میں بلا کی خود اعتمادی لیکن شائستگی تھی۔ یہ اناطول کوراگن تھا۔ اسے اس نے مدتوں پہلے پیٹرزبرگ کے ایک بال میں دیکھا تھا اور اسے قابل توجہ سمجھا تھا۔ اب وہ ایجوٹنٹ کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے کندھے پر ایک پھول اور ایک فیتے کی گرہ تھی۔ اس کی چال میں محتاط اکڑ پن تھا۔ اگر وہ اتنا خوب رو نہ ہوتا اور اگر اس کے خدوخال سے اتنی نیک دلانہ آسودگی اور عالی حوصلگی نہ ٹپک رہی ہوتی، تو اس کی یہ چال مضحکہ خیز معلوم ہوتی۔ اگرچہ اوپیرا جاری تھا، وہ نشستوں کے درمیانی راستے پر، جس پر قالین بچھا ہوا تھا، شہزادوں کی طرح چہل قدمی کرتا چلا آ رہا تھا، اس کی شمشیر اور مہمیز قدرے کھنکنا رہے تھے اور اس کا خوش وضع سر، جس پر خوشبو لگی ہوئی تھی، سیدھا تنا ہوا تھا۔ نتاشا پر اچٹتی نظر ڈالنے کے بعد وہ اپنی ہمشیرہ کے پاس پہنچا، اپنا ہاتھ، جس پر دستانہ پوری طرح فٹ تھا، اس کے باکس کے کنارے پر رکھا، اسے گردن ہلا کر سلام کیا، آگے جھک کر اور نتاشا کی جانب اشارہ کر کے کوئی سوال پوچھا۔

"Mais charmante!"* اس نے کہا۔ وہ لاریب نتاشا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ نتاشا کو اس کے الفاظ اتنے واضح طور پر تو سنائی نہ دیے، تاہم اس نے اس کے لبوں کی حرکت سے اندازہ لگا لیا۔

* بلاشبہ پرکشش یا من موہنی

اس کے بعد وہ نیچے سٹال میں چلا گیا اور وہاں پہلی قطار میں دلوخوف کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے اس شخص کو، جس کے ساتھ دوسروں کا رویہ چاپلوسانہ تھا، لاابالی اور دوستانہ انداز سے اپنی کہنی سے ٹھوکا دیا، شگفتہ روئی سے اسے آنکھ ماری اور مسکرایا۔ اس کے بعد اس نے اپنا پاؤں آرکسٹرا کے پردے پر ٹکا دیا۔

''بہن بھائی میں کتنی مشابہت ہے!'' کاؤنٹ نے رائے زنی کی۔ ''اور دونوں کتنے وجیہہ و شکیل ہیں!''

شن شن زیرلب کاؤنٹ کو کوراگن کے ماسکو میں کسی خفیہ معاشقے کے متعلق بتانے لگا۔ چونکہ اس نے نتاشا کو ''من موہنی'' کہا تھا، اس نے، جو کچھ کہا جا رہا تھا، کان لگا کر سننے کی کوشش کی۔

پہلا ایکٹ ختم ہو گیا۔ سٹال میں تمام لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا، یوں ایک قسم کی کھلبلی مچ گئی۔

بورس رستوفوں کے باکس میں آیا، سنے ان سنے انداز سے ان کی مبارک باد قبول کی، اپنے ابرو اوپر اٹھائے، غیر حاضر دماغی سے مسکرایا، انھیں اپنی منگیتر کی طرف سے شادی میں شرکت کی دعوت دی اور واپس چل دیا۔ نتاشا ہشاش بشاش انداز سے اترا اترا کر اس سے باتیں کرتی رہی اور بار بار مسکراتی رہی۔ اس نے اسے شادی کی، جو عنقریب ہونا تھی، مبارک باد پیش کی — حالانکہ یہ وہی بورس تھا جس کی محبت میں وہ خود کبھی گرفتار رہی تھی۔ اپنی کیف و مستی کی موجودہ کیفیت میں اسے ہر چیز سہل اور فطری معلوم ہو رہی تھی۔

نیم عریاں ہیلین، جو اس کے قرب میں بیٹھی تھی، ہر کس و ناکس کو یکساں تبسم سے نواز رہی تھی اور بالکل اسی قسم کی مسکراہٹ نتاشا نے بورس پر نچھاور کی۔

انتہائی روشن طبع اور نامی گرامی اشخاص نے ہیلین کے باکس پر یلغار کر دی تھی۔ نہ صرف اندر تل دھرنے کی گنجائش نہیں رہی تھی بلکہ سٹال کی جانب باہر بھی لوگ اسے گھیرے کھڑے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ دوسروں کو یہ جتانے کے لیے کہ ان کی اس کے ساتھ راہ و رسم ہے، ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگائے ہوئے ہیں۔

وقفے کے دوران میں کوراگن سارا عرصہ دلوخوف کے ساتھ سٹیج کی اگلی روشنیوں کے سامنے کھڑا اور ٹکٹکی باندھ کر رستوفوں کے باکس کی طرف دیکھتا رہا۔ نتاشا جانتی تھی کہ وہ اسی کے متعلق باتیں کر رہا ہے اور اس نے اس کی باچھیں کھلا دیں۔ وہ اپنی جگہ سے کچھ ہلی تاکہ وہ اس کا چہرہ اس زاویے سے، جو اس کے خیال میں بہترین تھا، دیکھ سکے۔

دوسرے ایکٹ کے آغاز سے قبل پیئر سٹال میں نمودار ہوا۔ جب سے رستوف ماسکو وارد ہوئے تھے، اس سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر حزن و ملال برس رہا تھا اور جب نتاشا نے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا، اس کے مقابلے میں اس کے تن و توش میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ کسی شخص پر بھی توجہ دیے بغیر وہ اگلی نشستوں کی جانب بڑھا۔ اناطول اس کے پاس آیا اور اس نے رستوفوں کی طرف آنکھ اٹھا کر اور ہاتھ کا اشارہ کر

کے اس سے کچھ کہا۔ جب پیئر کی نظر نتاشا پر پڑی، وہ کھل اٹھا اوران کے باکس کی طرف تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ یہاں پہنچ کر وہ اپنی کہنیوں پر جھک کر کھڑا ہو گیا اور کافی دیر تک اس سے مسکرا مسکرا کر باتیں کرتا رہا۔ پیئر کے ساتھ گفتگو کے دوران میں نتاشا کو کاؤنٹس بزوخوا کے باکس میں کسی مرد کی آواز سنائی دی اور کسی چیز نے اس کے کان میں پھونک ماری کہ یہ لازماً کوراگن ہوگا۔ وہ مڑی اوران کی نگاہیں ٹکرا گئیں۔ اناطول نے تقریباً مسکراتے ہوئے کچھ ایسی متوالی اور پیار بھری نگاہوں سے سیدھا اس کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا کہ نتاشا کو اس کے اتنے قریب ہونا، اس کا اس کی طرف اس انداز سے دیکھنا اوراس بات کا یقین ہونا کہ وہ اس کی تحسین کر رہا ہے، اوران سب باتوں کے باوجود اس سے کوئی شناسائی نہ ہونا، عجیب لگا۔

دوسرے ایکٹ کے دوران میں سٹیج پر جو دفتیاں رکھی گئیں، وہ قبرستان کا منظر پیش کر رہی تھیں۔ عقب میں جو پردہ لٹک رہا تھا، اس میں سوراخ تھا۔ یہ سوراخ کچھ اس انداز سے بنایا گیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ چاند چمک رہا ہے۔ سٹیج کے سامنے کی روشنیاں ڈھانپ دی گئیں۔ ہارنوں[20] اور کنٹرابیسوں[21] کے دھیمے سر سنائی دینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں اطراف سے سیاہ لبادوں میں ملبوس متعدد اشخاص کوئی ہتھیار، جو بظاہر خنجر معلوم ہوتے تھے، فضا میں لہراتے سٹیج پر نمودار ہوئے۔ پھر چند اور اشخاص بھاگتے آئے اوراس دوشیزہ کو، جو پہلے سفید اوراب ہلکے نیلے لباس میں ملبوس تھی، گھسیٹنے لگے۔ وہ جھٹ پٹ اسے گھسیٹ کر نہیں لے گئے، بلکہ پہلے وہ خاصی دیر تک اس کے ساتھ گانا گاتے رہے اور پھر اسے گھسیٹتے گھسیٹتے سٹیج سے باہر نکل گئے۔ سٹیج کے عقب میں کوئی دھاتی چیز تین بار کھٹکھٹائی گئی، ہر شخص دوزانو ہو گیا اور مناجات کا ورد کرنے لگا۔ ناظرین کے پرزور نعرہ ہائے تحسین سے ان تمام افعال میں بار بار خلل پڑا۔

اس ایکٹ کے دوران میں جب بھی نتاشا کی نظر سٹال کی طرف اٹھی، اسے اپنا بازو کرسی کے عقب پر لٹکائے اناطول کوراگن ٹکٹکی باندھ کر مسلسل اپنی طرف دیکھتا دکھائی دیا۔ وہ یہ دیکھ کر باغ باغ ہو گئی کہ وہ اسے اپنا اتنا فریفتہ بنا چکی ہے اوراسے یہ خیال چھو کر بھی نہ گزرا کہ اس میں کوئی خرابی کا پہلو بھی پوشیدہ ہو سکتا ہے۔

جب دوسرا ایکٹ ختم ہوا، کاؤنٹس بزوخوا اٹھی، رستوفوں کے باکس کی طرف مڑی (عملی طور پر اس کا سارے کا سارا سینہ عریاں تھا)، اپنی چھنگلی کے اشارے سے کاؤنٹ کو اپنی طرف بلایا اوران لوگوں کی طرف، جو اس کے باکس میں داخل ہو گئے تھے، مطلق دھیان دیے بغیر دلکش مسکراہٹ کے ساتھ اس سے باتیں کرنے لگی۔

''اپنی خوبصورت بیٹیوں کے ساتھ میرا تعارف کرائیں نا؟'' اس نے کہا۔ ''سارا شہران کے گن گا رہا ہے اور ایک میں ہوں کہ انھیں جانتی تک نہیں۔''

نتاشا اٹھی اور دوزانو ہو کر پرشکوہ کاؤنٹس کو آداب بجا لائی۔ وہ اس حسینہ کی، جس کا حسن جہاں سوز تھا، تعریف سے اتنا خوش ہوئی کہ اس کے گال تمتمانے لگے۔

''اب تو میں ماسکوی بننے کا تہیہ کر چکی ہوں۔ آپ کو شرم نہیں آتی کہ آپ نے ایسے جواہر پارے گاؤں میں

دفنار کھے ہیں؟''

کاؤنٹس بزدخووا نے مسحور کن خاتون کی جو شہرت کمائی تھی، وہ اس کی کاملاً مستحق تھی۔ وہ ایسی باتیں بھی۔۔ خاص طور پر اگر ان کا تعلق خوشامد سے ہوتا۔۔ جو کبھی اس نے سوچی بھی نہیں ہوتی تھیں، بے عیب سادگی اور بے ساختگی سے کہہ دیتی تھی۔

''مائی ڈیئر کاؤنٹ، اب آپ اپنے ان جگر گوشوں کو میری تحویل میں دے دیں۔ میں کوئی زیادہ دن یہاں قیام نہیں کروں گی۔۔ اور خود آپ کا بھی تو یہی پروگرام ہے۔۔ پھر بھی میں انھیں محظوظ کرنے کی کوشش کروں گی۔ جب میں پیٹرز برگ میں تھی، میں نے تمھارے بارے میں بہت کچھ سنا تھا اور میں تمھارے ساتھ واقفیت کرنا چاہتی تھی،'' اس نے اپنی خوبصورت اور غیر متبدل مسکراہٹ سے نتاشا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اپنے مصاحب خاص دروبتیسکوئے[22] تمھیں معلوم ہے کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔۔ اور اپنے شوہر کے دوست، بلکونسکی، پرنس آندرے بلکونسکی۔۔ سے بھی، تمھارے بارے میں بہت کچھ سنا ہے۔'' وہ چبا چبا کر اور خاص زور دے کر بات کر رہی تھی۔ اپنے اس لہجے سے وہ یہ جتانا چاہتی تھی کہ اسے پرنس آندرے کے نتاشا کے ساتھ رشتے کا علم ہے۔

پھر اس نے کہا کہ ایک لڑکی اوپیرا کے بقیہ دورانیے کے لیے اس کے باکس میں آجائے تا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بہتر انداز سے واقفیت پیدا کر سکیں۔ چنانچہ نتاشا اٹھی اور اس کے باکس میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔

تیسرے ایکٹ میں محل کا منظر پیش کیا گیا۔ بے شمار شمعیں روشن تھیں اور دیواروں پر باریش نائٹوں کی تصاویر لٹک رہی تھیں۔ سٹیج کے درمیان میں ایک مرد اور ایک خاتون کھڑی تھی۔ بظاہر وہ بادشاہ اور ملکہ تھے۔ بادشاہ اپنے دائیں ہاتھ سے اشارے کر رہا تھا اور بہت مضطرب نظر آ رہا تھا۔ اس نے بھونڈے انداز سے کوئی گانا گایا اور عنابی تخت پر بیٹھ گیا۔ وہ دوشیزہ، جو پہلے سفید اور پھر ہلکے نیلے رنگ کے ڈریس میں سٹیج پر آئی تھی، اب ایک قسم کے صرف ڈھیلے ڈھالے بلاؤز میں ملبوس تھی اور بال لٹکائے تخت کے قریب کھڑی تھی۔ وہ حزنیہ انداز سے نغمہ سرائی کر رہی تھی اور ملکہ سے خطاب کر رہی تھی۔ بادشاہ نے تحکمانہ انداز سے اپنے بازو کو جنبش دی اور سٹیج کے دونوں بازوؤں سے چند مرد اور خواتین، جن کی ٹانگیں برہنہ تھیں، برآمد ہوئیں۔ ان مردوں اور عورتوں نے اکٹھے مل کر رقص کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد تیکھی اور پر مسرت لے میں وائلنوں کی دھنیں سنوائی گئیں۔ اور ایک لڑکی، جس کی برہنہ ٹانگیں فربہ اور بازو پتلے تھے، دوسروں سے علیحدہ ہوئی، سٹیج کے بازو میں گئی، وہاں اس نے اپنی چولی درست کی، سٹیج کے وسط میں آئی اور فضا میں چھلانگیں لگانے اور تیزی سے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں سے ٹکرانے لگی۔ سٹال میں موجود تمام اشخاص تالیاں پیٹنے اور داد و تحسین کے ڈونگرے برسانے لگے۔ پھر ایک شخص سٹیج کے ایک کونے میں گیا۔ آرکسٹرا میں مجیرے[23] اور ہارن جھنجھنانے لگے اور یہ شخص، جس کی ٹانگیں ننگی تھیں، کدکڑے لگانے لگا۔ وہ اتنی تیزی سے بلندی پر اچھلتا تھا کہ اس کی ٹانگوں کی بس جھلک نظر آتی تھی۔ (اس شخص کا نام دُوپوخ تھا اور محض اس اچھل کود کے عوض ساٹھ ہزار روبل سالانہ پاتا تھا۔) سٹالوں، باکسوں اور گیلری میں موجود تمام خواتین و حضرات پرزور

انداز سے نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے اور پوری قوت سے تالیاں بجانے لگے۔ یہ شخص رکا، مسکرانے اور جھک جھک کر چاروں اطراف سلام کرنے لگا۔ اس کے بعد دوسرے مرد اور خواتین اپنی ننگی ٹانگوں کے ساتھ ناچنے لگیں۔ ان کے بعد بادشاہ اور ملکہ میں سے کسی نے گا کر کچھ کہا اور وہ سب کے سب نغمہ سرا ہو گئے۔ لیکن ایکا ایکی ایک طوفان برپا ہو گیا اور آرکسٹرا پر بارہ نیم سرتیوں پر مشتمل سرگم[24] اور نغمۂ ہفتم[25] کے دھیمے سر سنائی دینے لگے۔ اور وہ اپنے ایک اور ساتھی کو دوبارہ گھسیٹتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئے اور پردہ گر پڑا۔ اس بار شور وغل سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ نعرہ ہائے تحسین بلند ہو رہے تھے اور تالیاں پٹ رہی تھیں۔ ہر چہرے پر مسرت و انبساط ٹپک رہی تھی اور حاضرین چلا چلا کر پکار رہے تھے:

''ڈوپوخ / دوپوخ / دوپوخ!''

نتاشا کو اب یہ سب کچھ اجنبی نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بہجت و شادمانی سے مسکراتے پر اطمینان انداز سے گردوپیش نظریں دوڑائیں۔

''دوپوخ نے سماں نہیں باندھ دیا؟ کتنا لطف آیا!'' ہیلین نے اس کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

''جی، بالکل،'' نتاشا نے جواب دیا۔

10

وقفے کے دوران میں ہیلین کے باکس میں سرد ہوا کا جھونکا محسوس کیا گیا۔ دروازہ کھلا اور اناطول اندر داخل ہوا۔ اس نے کمر جھکا رکھی تھی اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ کسی کے ساتھ ٹکرا نہ جائے۔

''اجازت ہو تو میں اپنے بھائی سے تعارف کرا دوں؟'' ہیلین نے اپنی مضطرب نگاہیں نتاشا سے اناطول کی جانب منتقل کرتے ہوئے کہا۔

نتاشا نے اپنا خوبصورت ننھا منا سر وجیہہ و شکیل ایجوٹنٹ کی جانب گھمایا اور اپنے عریاں بازو کے اوپر سے اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اناطول، جو قریب سے بھی اتنا ہی خوش شکل تھا جتنا کہ وہ دور سے نظر آیا تھا، اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور اسے بتانے لگا کہ وہ مدتوں سے اس کا دیدار حاصل کرنے کا متمنی تھا بلکہ سچ پوچھیں تو جب اس اولین مرتبہ اسے ناری شکن کے بال میں دیکھا تھا، اسے اتنی مسرت ہوئی تھی کہ وہ اسے کبھی فراموش نہ کر سکا اور اسی دن سے اس کے دل میں اس سے ملاقات کرنے کی تمنا مچل رہی ہے۔ کوراگن مردوں کی نسبت عورتوں کی صحبت میں کہیں زیادہ سمجھدار اور بے بناوٹ تھا۔ وہ لگی لپٹی رکھے بغیر اور فطری انداز سے گفتگو کرتا تھا اور نتاشا کو یہ دیکھ کر عجیب و غریب اور خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس شخص میں، جس کے متعلق اس نے اتنا کچھ سنا تھا، قطعاً کوئی ایسی بات، جسے مہیب یا ڈراؤنی کہا جا سکے نہیں ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کی مسکراہٹ جتنی بے تصنع، نیک نہاد اور خوشگوار نظر آتی تھی، اس سے بڑھ کر ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

اناطول نے فنکاروں کی کارکردگی کے بارے میں اس کی رائے دریافت کی اور اسے بتایا کہ کس طرح سیمیونووا اپنے سابقہ مظاہرے کے دوران میں سٹیج سے نیچے گرگئی تھی۔

''اور کاؤنٹس، تمھیں معلوم ہے،'' اس نے اس سے یوں مخاطب ہو کر پوچھا جیسے وہ اس کی کوئی دیرینہ دوست ہو، ''کہ ہم ایک کاسٹیوم ٹورنامنٹ[26] کا اہتمام کر رہے ہیں؟ تمھیں اس میں لازماً شریک ہونا چاہیے۔ بڑا مزہ آئے گا۔ ہم سب آرخاروفوں کے ہاں اکٹھے ہو رہے ہیں۔ ضرور آؤ، تاکید ہے۔ آؤ گی نا؟''

جب وہ یہ باتیں کہہ رہا تھا، اس نے ایک ثانیے کے لیے بھی اپنی متبسم نگاہیں اس کے چہرے، اس کی گردن اور اس کے عریاں بازوؤں سے نہ ہٹائیں۔ نتاشا کو اس بارے میں مطلق شبہ نہیں تھا کہ وہ اس سے مسحور ہو چکا ہے، اس سے اسے خوشی تو ہوئی لیکن کوئی بات ایسی ضرور تھی جس نے اس کی موجودگی کو اس کے لیے پریشان کن بنا دیا تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ کڈھب صورت حال میں پھنس گئی ہے اور اس احساس نے اسے بے چین اور بے سکون بنا دیا۔ جب وہ اس کی جانب نہیں دیکھ رہی ہوتی تھی، اسے یہ احساس ستانے لگتا کہ وہ اس کے شانوں کا عمیق نظروں سے جائزہ لے رہا ہے اور جبلی طور پر اپنی نگاہیں اس کی نگاہوں میں گاڑ دیتی تاکہ وہ اس کی توجہ اپنے چہرے کی طرف منعطف کرا سکے۔ جب وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی، اس پر خوف سوار ہو جاتا اور اسے یہ اندازہ ہونے لگتا کہ اس نے شعوری طور پر اپنے اور دوسرے مردوں کے مابین ادب و شائستگی کی جو دیوار کھڑی کر رکھی تھی، وہ ان دونوں کے مابین عدم موجود ہے۔ یہ بات اس کے فہم و ادراک میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ پانچ منٹ کے اندر اندر اس شخص کے بے پناہ طور پر اتنا قریب کیوں محسوس کر رہی ہے۔ جب وہ اپنی نظریں دوسری طرف پھیرتی، اسے یہ اندیشہ لاحق ہو جاتا کہ وہ عقب سے اسے عریاں بازو سے پکڑ لے گا اور اس کی گردن پر بوسہ ثبت کر دے گا۔ وہ بالکل عام قسم کی باتیں کرتے رہے لیکن اسے لگ رہا تھا کہ اسے کبھی کسی مرد کے ساتھ اتنی بے تکلفی کا احساس نہیں ہوا تھا جتنا کہ اس کے ساتھ ہو رہا ہے۔ نتاشا اچٹتی نگاہوں سے ہیلین اور اپنے باپ کو دیکھتی رہی جیسے وہ پوچھ رہی ہو کہ یہ سب کیا ہے اور اس کا مطلب کیا ہے۔ لیکن ہیلین کسی جرنیل کے ساتھ باتوں میں محو تھی اور اس نے اس کی نظروں کا کوئی جواب نہ دیا۔ رہا اس کا باپ، اس کی نگاہوں میں ہمیشہ کی طرح صرف ایک ہی پیغام تھا، اور کچھ نہیں: ''محظوظ ہو رہی ہو؟ بہت خوب، مزے کرو۔ میں خوش ہوں!''

وقتاً فوقتاً دونوں کے مابین خاموشی کے کڈھب لمحات آ جاتے۔ ایسے ہی ایک لمحے کے دوران میں جب اناطول کی موٹی موٹی آنکھیں، جن میں سکون اور ٹھہراؤ تھا، ٹکٹکی باندھے مسلسل اسے دیکھے جا رہی تھیں، نتاشا نے مہرِ سکوت توڑنے کی غرض سے اس سے پوچھا: ''آپ کا ماسکو کے بارے میں کیا خیال ہے؟ پسند آیا؟'' پوچھنے کو تو اس نے یہ سوال پوچھ لیا لیکن شرم و حیا سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔ اسے ہر دم یہ خیال ستاتا رہا کہ اس شخص سے محوِ کلام ہو کر وہ کسی نازیبا حرکت کا ارتکاب کر رہی ہے۔ اناطول یوں مسکرایا جیسے وہ اس کی ہمت افزائی کرنا چاہتا ہو۔

''شروع شروع میں تو مجھے اس شہر میں کوئی جاذبیت نظر نہ آئی۔ آخر وہ کون سی چیز ہے جو کسی شہر کی دل کشی کا

سبب بنتی ہے؟ پری چہرہ اور پری جمال خواتین۔ ٹھیک کہا نا میں نے؟ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب مجھے یہ شہر بہت پسند ہے،'' اس نے معنی خیز نظروں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کاؤنٹس، تم کاسٹیوم ٹورنامنٹ میں آؤگی نا؟ ضرور آنا!'' اور نتاشا کے ہاتھوں میں جو گلدستہ تھا، کوراگن نے اپنا ہاتھ اس پر رکھا، اپنی آواز دھیمی کی اور فرانسیسی میں بولا: ''وہاں تم ملکۂ حسن ہوگی، ضرور آنا، ڈیئر کاؤنٹس، اور یہ پھول مجھے بطور ضمانت دے دو۔''

وہ کیا کہہ رہا تھا، نتاشا کچھ نہیں سمجھ رہی تھی اور نہ وہ خود سمجھ رہا تھا۔ تاہم وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ اس کے ناقابل تفہیم الفاظ میں کوئی ناشائستہ غرض وغایت پوشیدہ ہے۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اسے کیا کہنا چاہیے اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو۔ لیکن جونہی اس نے اپنا رخ دوسری طرف کیا، اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ وہ تو اس کے پیچھے ہے اور اس کے اتنا قریب ہے۔

''اب وہ کیا محسوس کر رہا ہے؟ بدحواس ہے؟ ناراض ہے؟ کیا مجھے اصلاح احوال کرنے چاہیے؟'' وہ اپنے آپ سے پوچھ رہی تھی۔ وہ اپنے گرد وپیش نظریں دوڑائے بنا نہ رہ سکی۔ اس نے سیدھا اس کی نگاہوں میں جھانک کر دیکھا اور وہ اس کی قربت، اس کی خوداعتمادی اور اس کے تبسم کی پرشفقت ملائمت کے سامنے ڈھیر ہوگئی اور اس کے تبسم کے جواب میں متبسم ہوگئی۔ اسے یہ سوچ کر دوبارہ تشویش لاحق ہوئی کہ دونوں کے مابین کوئی دیوار نہیں رہی۔

پردہ اٹھا اور اناطول باکس سے باہر نکل گیا۔ وہ مسرور ومطمئن تھا۔ نتاشا دوسرے باکس میں اپنے باپ کے پاس چلی گئی۔ وہ اس عالم کے، جس میں وہ اپنے آپ کو پا رہی تھی، مکمل طور پر طلسم میں گرفتار ہو چکی تھی۔ اب جو کچھ اس کے سامنے وقوع پذیر ہو رہا تھا، بالکل فطری نظر آ رہا تھا۔ اس کے برعکس اپنے منگیتر، پرنس ماریا یا دیہی زندگی کے بارے میں اس کے ذہن میں جو سابقہ خیالات تھے، وہ ایک مرتبہ بھی اس کے دماغ میں نہ آئے جیسے ان سب کا تعلق کسی ماضی بعید سے ہو۔

چوتھے ایکٹ میں ایک قسم کا ابلیس سٹیج پر نمودار ہوا۔ وہ گاتا جاتا اور بازو اور ہاتھ لہراتا جاتا تھا تاآنکہ ایکاایکی اس کے پاؤں تلے کے تختے کھینچ لیے گئے اور وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ نتاشا نے چوتھے ایکٹ میں بس یہی کچھ دیکھا۔ وہ پریشان ومضطرب تھی اور اس کے اس اضطراب کا باعث کوراگن تھا جسے وہ بغور دیکھے بنا نہ رہ سکی۔ جب وہ تھیئٹر سے روانہ ہو رہے تھے اناطول ان کے پاس آیا، اس نے ان کی گاڑی منگوائی اور اس میں انھیں سوار ہونے میں مدد دی۔ جب وہ نتاشا کو گاڑی میں بٹھا رہا تھا، اس نے اس کا بازو دبایا۔ نتاشا کے جذبات میں ہل چل مچ گئی، اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور اس کے رگ وپے میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے مڑ کر پیچھے نگاہ ڈالی، وہ چمکتی دمکتی آنکھوں اور متبسم ملائمت سے اسے دیکھ رہا تھا۔

❦

نتاشا کے ساتھ کیا واردات ہوئی تھی، اس کا صحیح اندازہ اسے گھر پہنچ کر ہی ہو سکا۔ اور جب اچانک پرنس آندرے کا

خیال اس کے ذہن میں آیا، وہ دہشت زدہ ہوگئی۔ چائے پر، جو وہ تھیئٹر سے واپسی کے بعد پینے بیٹھے تھے، اس کے حلق سے با آواز بلند کراہ نکل گئی، اس کا چہرہ قرمزی ہوگیا اور وہ کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

"اف، خداوند، میں لٹ گئی، برباد ہوگئی!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "میں نے اس معاملے کو یہاں تک جانے ہی کیوں دیا؟" اسے حیرت ہو رہی تھی۔

وہ کافی دیر تک اپنا دہکتا سلگتا چہرہ اپنے ہاتھوں میں چھپائے بیٹھی اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتی رہی کہ اس پر کیا واقعہ گزرا ہے، لیکن وہ نہ تو یہ سمجھ سکی کہ اس کے ساتھ ہوا کیا ہے اور نہ اسے یہ معلوم ہوسکا کہ وہ محسوس کیا کر رہی ہے۔ ہر چیز دھندلی دھندلی، گنجلک اور ہیبت ناک دکھائی دے رہی تھی۔ اس وسیع وعریض اور درخشاں آڈیٹوریم میں، جہاں نوخیز لڑکیاں، ادھیڑ عمر مرد اور طرح دار اور مطمئن انداز سے مسکراتی نیم عریاں ہیلین، جوشِ انبساط میں داد وتحسین کے نعرے لگا رہے تھے۔۔ اس ہیلین کے زیرِ سایہ یہ سب کچھ سیدھا سادا اور فطری معلوم ہو رہا تھا، لیکن اب جب کہ وہ تنہا تھی، یہ سب کچھ نا قابلِ تفہیم ہوگیا تھا۔ "یہ کیا ہے؟ مجھ پر اس کا ہول کیوں طاری ہوا تھا؟ ضمیر کے ان کچوکوں کا، جو میں اب محسوس کر رہی ہوں، مفہوم کیا ہے؟" اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

نتاشا جو کچھ محسوس کر رہی تھی، وہ اس کا ذکر بستر میں صرف معمر کاؤنٹس سے کرسکتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ سونیا، جس کا نقطۂ نظر پاکیزہ اور بے لوچ ہے، اس اعتراف کو یا تو بالکل سمجھ نہیں پائے گی یا اس پر ہیبت زدہ رہ جائے گی۔ چنانچہ جو چیز نتاشا کو اذیت پہنچا رہی تھی، وہ خود ہی اس کا حل ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کیا میں اتنی پلید ہوگئی ہوں کہ پرنس آندرے کی محبت کی مستحق نہیں رہی؟" اس نے اپنے آپ سے سوال کیا اور پراعتماد استہزا سے جواب دیا: "میں بھی کیا احمق ہوں کہ اس قسم کے سوالات اٹھا رہی ہوں! میرے ساتھ حقیقتاً ہوا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں! میں نے کیا کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں! میں نے ہرگز ہرگز اسے کوئی تحریک نہیں دی۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چلے گا اور میں اسے دوبارہ کبھی نہیں ملوں گی،" اس نے اپنے آپ سے کہا۔ "چونکہ یہ بات بالکل عیاں ہے کہ کچھ بھی نہیں ہوا، پھر پچھتاوا کس بات کا؟ اور پرنس آندرے اب بھی مجھ سے محبت کر سکتے ہیں۔

"لیکن یہ 'اب بھی' کیوں؟ اف، میرے خداوند، وہ یہاں کیوں نہیں ہیں؟"

کچھ دیر کے لیے تو اسے سکون محسوس ہوا، لیکن کسی جبلت نے اسے دوبارہ جتایا کہ اگرچہ یہ سب کچھ درست ہے اور اگرچہ کچھ بھی نہیں ہوا ہے، لیکن پرنس آندرے کے لیے اس کی محبت میں ازیں پیشتر جو پاکیزگی تھی، وہ اب غارت ہوگئی ہے۔ کوراگن کے ساتھ اس کی جو گفتگو ہوئی تھی، اس نے اسے اپنے تخیل میں ایک مرتبہ پھر دہرایا اور اس دوران میں اس بے باک اور وجیہہ شخص کا چہرہ، اس کے ہاتھوں اور بازوؤں کی حرکات اور اشارے اور اس کی ملائم مسکراہٹ، جو اس کا بازو دباتے وقت اس کے ہونٹوں پر نمودار ہوئی تھی، اس کی نگاہوں کے سامنے گھومتی رہی۔

11

اناطول کوراگن ماسکو میں اس لیے مقیم تھا کیونکہ اس کے باپ نے اسے پیٹرزبرگ سے، جہاں وہ سالانہ بیس ہزار روبل سے زیادہ خرچ کر رہا تھا، باہر بھیج دیا تھا۔ مزید برآں وہ اس سے کہیں زیادہ رقم کا مقروض تھا اور اس کے قرض خواہوں نے اس کے باپ کا ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

پرنس واسیلی نے اپنے بیٹے کو متنبہ کر دیا تھا کہ وہ اس کے نصف قرضے ادا کرے گا، لیکن اس شرط پر کہ وہ کمانڈر انچیف کے ایجوٹنٹ۔۔ اس کے لیے یہ عہدہ اس کے باپ نے حاصل کیا تھا۔ کی حیثیت سے ماسکو چلا جائے اور قطعی طور پر یہ عہد کرے کہ وہاں وہ کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ لے گا۔ اس نے اسے پرنسس ماریا اور جولی کاراگنا کے نام بجھائے۔

اناطول نے ہامی بھر لی اور ماسکو چلا آیا۔ یہاں اس نے پیئر کے مکان میں ڈیرا جما لیا۔ شروع شروع میں پیئر اسے اپنے گھر میں رکھنے میں متامل تھا، تاہم کچھ دنوں کے بعد وہ اس کا عادی ہو گیا اور وقتاً فوقتاً اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے بھی جانے لگا۔ وہ قرض کے پردے میں اسے رقوم بھی دینے لگا۔

جب شن شن نے یہ کہا تھا کہ اناطول نے ماسکو کی تمام خواتین کے سر گھما دیے ہیں، تو ٹھیک ہی کہا تھا۔ بنیادی طور پر اس کا طریق کار یہ تھا کہ وہ ان کے ساتھ تغافل شعاری کا رویہ اختیار کرتا اور بظاہر جپسی لڑکیوں اور فرانسیسی اداکاراؤں کو ترجیح دیتا تھا۔ ان فرانسیسی اداکاراؤں میں نمایاں ترین نام یوغیی کا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے ساتھ اس کے تعلقات بے تکلفانہ تھے۔ دلوخوف یا ماسکو کے عیاش ٹولے کے کسی بھی مرد کے ہاں ناؤ نوش کی جو محفلیں منعقد ہوتی تھیں، وہ ان میں شرکت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ وہ ساری ساری رات مے نوشی کرتا اور اس معاملے میں بڑے بڑے حریفوں کو چت کر دیتا۔ شہر کے انتہائی اونچے طبقے کے کسی بھی گھر میں محفل یا بال منعقد ہوتا، وہاں وہ لازماً پہنچ جاتا۔ ماسکو کی خواتین کے ساتھ اس کے چھپے ڈھکے معاشقوں کی افواہیں پھیل رہی تھیں اور وہ اجتماعی رقصوں میں ان کے ساتھ وقتی محبت کی پینگیں بڑھاتا نظر آتا تھا۔ لیکن وہ نوجوان دوشیزاؤں، خاص طور پر مالدار دوشیزاؤں سے۔۔ جن میں سے اکثر کی شکل وصورت بس واجبی سی تھی۔۔ دور دور رہتا تھا۔ اس کی ایک وجہ تھی۔ دو برس قبل۔۔ اس حقیقت سے اس کے صرف قریب ترین دوست ہی آگاہ تھے۔ اناطول نے شادی کر لی تھی۔ اس زمانے میں اس کی رجمنٹ پولینڈ میں مقیم تھی اور ایک پولستانی زمیندار نے، جو تھوڑی سی زمین کا مالک تھا، اسے اپنی بیٹی کے ساتھ عقد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کو چھوڑنے میں لمحہ بھر کی تاخیر نہ کی اور خاصی معقول رقم کے، جس کا اس نے اپنے خسر کو بھیجنے کا اقرار کیا تھا، معاوضے میں گلوخلاصی کرا لی اور اب وہ کنوارے کی حیثیت سے دندناتا پھر رہا تھا۔

اناطول اپنے مقام، اپنے آپ اور باقی دنیا سے ہمیشہ مطمئن رہتا تھا۔ اسے جبلتاً اور کاملاً یقین تھا کہ جس

طرح کی زندگی وہ بسر کر رہا ہے، اس سے مختلف انداز اختیار کرنا اس کے بس کی بات نہیں اور یہ کہ اس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی گھٹیا حرکت نہیں کی ہے، لیکن اس میں اتنی صلاحیت نہیں تھی کہ وہ یہ سوچ سکتا کہ اس کے اعمال وافعال سے دوسرے کیسے متاثر ہوتے ہیں یا یہ کہ اس کے اس یا اس فعل کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ اس کا ایقان تھا کہ جس طرح بطخ پانی میں رہنے کے لیے تخلیق ہوئی ہے، اسی طرح خدا نے اسے تیس ہزار سالانہ اڑانے اور معاشرے میں ہمیشہ نمایاں مقام پر فائز رہنے کے لیے بنایا ہے۔ اسے اس بات کا اتنا پختہ یقین تھا کہ جب دوسروں کی نگاہیں اس پر پڑتی تھی، تو وہ بھی اس کے قائل ہو جاتے تھے اور وہ اسے نہ معاشرے میں اعلیٰ مقام عطا کرنے اور نہ اسے روپیہ، جو وہ دائیں بائیں ہر طرف سے ادھار لیتا رہتا تھا اور بظاہر کبھی یہ نہیں سوچتا تھا کہ یہ اس نے واپس بھی کرنا ہے، فراہم کرنے سے انکار کرتے تھے۔

وہ جواری نہیں تھا ــ کم از کم اس نے جیتنے کے بارے میں کبھی نہیں سوچا تھا اور اگر وہ ہار جاتا، تو قطعی دل میلا نہیں کرتا تھا۔ وہ نخوت پسند بھی نہیں تھا۔ اسے اس امر کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی کہ لوگ اس کے بارے میں کیا سوچتے ہیں اور اس پر یہ تہمت تو بالکل نہیں لگائی جا سکتی تھی کہ وہ جاہ پسند ہے۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ محض اس لیے اپنے باپ کو ناراض کیا تھا کہ ملازمت کے دوران میں اسے ترقی کے جو مواقع ملے تھے، وہ اس نے گنوا دیے تھے، اور اسے ہر قسم کے امتیازات سے چڑ تھی۔ وہ سُوم نہیں تھا اور جس نے اس سے جو بھی مانگا، وہ اس نے دینے سے کبھی انکار نہ کیا۔ اگر اسے کسی چیز کا لپکا تھا، وہ عیش وعشرت اور خواتین تھیں۔ اس کا یہ قول تھا کہ ان چسکوں میں کوئی رذالت نہیں۔ چونکہ وہ یہ سوچنے سمجھنے کی، کہ اس کی اپنی نفس پروری کے دوسروں کو کیا نتائج بھگتنا پڑیں گے، اہلیت سے بے بہرہ تھا، وہ بڑے خلوص سے اپنے بارے میں یہ رائے رکھتا تھا کہ اس کے کردار پر کوئی انگلی نہیں اٹھائی جا سکتی، غلط کاروں اور لچوں لفنگوں سے سچی نفرت کرتا تھا اور صاف ستھرے ضمیر کے مالک کی حیثیت سے اپنی گردن بلند رکھتا تھا۔

ہوس کاروں، مرد مگدلینوں،[27] کو زنانہ مگدلینوں کی طرح اپنی معصومیت کا باطنی یقین ہوتا ہے اور انھیں کی طرح انھیں بھی بخشش کی امید ہوتی ہے: ''وہ تو اس لیے بخشش کی مستحق ٹھہری کیونکہ اس نے محبت بہت کی تھی اور یہ اس لیے بخش دیا جائے گا کیونکہ اس نے جی بھر کر مزے اڑائے ہیں۔''

دلوخوف، جو اپنی جلاوطنی اور ایرانی مہم جوئیوں کے بعد اسی سال دوبارہ ماسکو وارد ہوا تھا، ایک بار پھر قمار بازی کی لت میں گرفتار ہو چکا تھا۔ وہ خوب مے نوشی کرتا اور جی بھر کر رنگ رلیاں مناتا۔ اس نے پیٹرزبرگ کے اپنے پرانے یار کوراگن کے ساتھ دوستی کی تجدید کر لی تھی اور اپنی مطلب برآری کے لیے اسے استعمال کر رہا تھا۔

اناطول دلوخوف سے اس کی ذہانت، فطانت اور جسارت کی بنا پر سچے دل سے پیار کرتا تھا۔ دلوخوف کو اناطول کوراگن کے نام، سماجی حیثیت اور تعلقات کی ضرورت تھی تا کہ وہ ان کی آڑ میں کھاتے پیتے نوجوانوں کو بہلا پھسلا کر اپنے قمار بازی کے حلقے میں شامل کر سکے۔ وہ اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا اور اس کے

پیسے پر داد عیش دیتا تھا لیکن اسے شبہ بھی نہیں ہونے دیتا تھا۔ اناطول سے مفادات حاصل کرنے کے علاوہ دوسرے آدمی کے عزم و ارادے پر تغلب پانے کا عمل دلوخوف کے لیے فی نفسہٖ باعث مسرت تھا، یہ اس کی عادت اور ضرورت تھا۔

نتاشا نے کوراگن کے دل و دماغ پر گہرے نقوش چھوڑے تھے اور اس نے اوپیرا کے بعد پر کے دوران میں دلوخوف سے ایک باذوق قدردان کی طرح اس کے بازوؤں، شانوں، پاؤوں اور بالوں کی پرکشش خوبیاں بیان کیں اور اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اس کے ساتھ عاشقانہ تعلقات استوار کرے گا۔ اس کے اس جذباتی ابال اور دکھاوے کی محبت کا ممکنہ انجام کیا ہوتا، اس کے متعلق سوچنا اس کے اسی طرح بس کی بات نہیں تھا، جس طرح اس نے اس امر پر کبھی غور نہیں کیا تھا کہ جو حرکات وہ کر رہا ہے اور جو افعال اس سے سرزد ہو رہے ہیں، ان کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا۔

''میرے دوست، وہ واقعی بہت خوبصورت ہے لیکن وہ ہمارے لیے نہیں ہے،'' دلوخوف نے اس سے کہا۔

''میں اسے اپنی ہمشیرہ کی وساطت سے ڈنر پر بلواؤں گا،'' اناطول نے کہا۔ ''کیا خیال ہے؟''

''تمھارا بھلا اسی میں ہے کہ جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی، انتظار کرو...''

''تمھیں معلوم ہے کہ میں ننھی منی لڑکیوں کا جاں سپار ہوں،'' اناطول نے اپنے خیالات کی رو میں بہتے ہوئے کہا۔ ''وہ اپنے ہوش و حواس کھونے میں دیر نہیں لگاتیں۔''

''ایک 'ننھی منی' لڑکی تمھیں پہلے ہی پھانس چکی ہے،'' دلوخوف نے، جسے اس کی شادی کے بارے میں علم تھا، کہا۔ ''احتیاط سے کام لو!''

''ہونہہ، آدمی کا دوسری مرتبہ ڈسا جانا دشوار ہے،'' اناطول نے خوش مزاجی سے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

12

اوپیرا سے اگلے روز رستوف گھر پر ہی ٹھہرے رہے اور کوئی شخص انھیں ملنے بھی نہ آیا۔ ماریا دمتریونا کی کاؤنٹ کے ساتھ کسی ایسے معاملے پر، جس کے بارے میں انھوں نے نتاشا کو اندھیرے میں رکھا، گفتگو ہوئی۔ نتاشا نے قیاس آرائی کی وہ معمر پرنس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں اور کوئی منصوبہ بنا رہے ہیں۔ اس پر اسے پریشانی بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اسے توقع تھی کہ پرنس آندرے کسی بھی گھڑی پہنچ سکتا ہے اور اس روز اس نے دو مرتبہ ایک ملازم یہ دریافت کرنے کہ وہ آ گیا ہے یا نہیں، وزدویزھنکا سٹریٹ بھیجا۔ وہ نہیں آیا تھا۔ ماسکو کے قیام کے ابتدائی ایام میں اسے اتنی مشکل صورت حال کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا جتنا کہ اب کرنا پڑ رہا تھا۔ ایک طرف تو اس کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹا جا رہا تھا اور وہ اس کی فرقت میں گھلی جا رہی تھی اور دوسری طرف پرنسس ماریا اور معمر پرنس کے ساتھ جو ملاقات ہوئی تھی، اس کی تلخ یادیں اس کے ذہن پر آسیب بن کر سوار ہو گئی تھیں اور اس پر طرہ یہ کہ اسے ایک قسم کی

تشویش اور خوف نے گھیر لیا تھا۔ اس کا سبب اسے خود بھی معلوم نہیں تھا، لیکن اس کے ذہن میں مسلسل یہ خیال وارد ہوتا رہتا تھا کہ وہ کبھی نہیں آئے گا یا پھر اس کی آمد سے قبل خود اس کے ساتھ کوئی واردات ہو جائے گی۔ پہلے وہ یک سوئی سے گھنٹوں اس کے بارے میں خوابوں کے تانے بانے بنتی رہتی تھی لیکن اب وہ اس صلاحیت سے عاری ہو چکی تھی۔ جونہی اس کا تصور اس کے ذہن میں آتا، معمر پرنس، پرنسس ماریا، تھیٹر اور کوراگن کی یادیں اس کے خیالات میں در آتیں۔ ایک بار پھر اس نے اپنے آپ سے سوال کیا: ''کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہے؟ میں نے پرنس آندرے کے ساتھ جو پیمان وفا باندھا تھا، میں اسے توڑ تو نہیں چکی ہوں؟'' اور اسے ایک بار پھر معلوم ہوا کہ جس شخص نے اس کے قلب میں اتنے نا قابل تفہیم و ردہشت ناک جذبات موجزن کر دیے تھے، وہ اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارے اور اس کے چہرے کے ایک ایک تاثر کا جزئیات سے جائزہ لے رہی ہے۔ جو لوگ نتاشا کے ارد گرد تھے، انھیں وہ معمول سے زیادہ شگفتہ مزاج اور خوش طبع نظر آ رہی تھی، لیکن حقیقت اس کے برعکس تھی۔ وہ پہلے کی نسبت ذہنی طور پر کم آسودہ اور مسرور تھی۔

اتوار کی صبح ماریا دمتریونا نے اپنے مہمانوں کو اپنے حلقے کے گرجے — چرچ آف ازمپشن[28] — میں نماز عشائے ربانی میں شرکت کی دعوت دی۔

''مجھے یہ فیشن ایبل گرجے پسند نہیں ہیں،'' اس نے کہا۔ وہ بظاہر اپنی آزادی رائے پر بہت نازاں معلوم ہوتی تھی۔ ''خدا ہر جگہ ایک ہے۔ ہمارے پادری صاحب بہت نفیس آدمی ہیں۔ وہ مذہبی رسوم پورے وقار اور رکھ رکھاؤ سے سرانجام دیتے ہیں۔ اور یہی حال ان کے نائب کا ہے۔ گانے والوں کے طائفے بنا کر حمدیں اور مناجاتیں گانے میں کیا تقدس ہے؟ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔ یہ بس جذبات کی تسکین کا ذریعہ ہیں، اور کچھ نہیں!''

ماریا دمتریونا کو اتوار کے ایام پسند تھے اور وہ انھیں منانا خوب جانتی تھی۔ بروز ہفتہ اس کا سارا گھر رگڑ رگڑ کر صاف کیا جاتا اور چمکایا جاتا۔ اتوار کو نہ وہ خود کوئی کام کرتی اور نہ اس کے نوکر چاکر کسی کام کو ہاتھ لگاتے۔ ڈنر پر معمول سے زیادہ کھانے ہوتے۔ ملازمین کی خاطر تواضع ووڈکا اور بھنے گوشت سے کی جاتی تھی لیکن سارے گھر میں کسی شخص کے چہرے پر تعطیل کا احساس اتنے واضح اور بین انداز سے ہویدا نہ ہوتا جتنا کہ ماریا دمتریونا کے چوڑے چکلے اور سخت گیر چہرے پر نظر آتا تھا۔ اس روز وہاں غیر متبدل مسرت آمیز متانت جھلکتی رہتی۔

عشائے ربانی کی تقریب کے بعد جب وہ طعام گاہ میں، جہاں میزوں اور کرسیوں سے غلاف ہٹا لیے گئے تھے، کافی ختم کر چکے، ایک ملازم نے اسے اطلاع دی کہ گاڑی تیار ہے اور ماریا دمتریونا پُرخشونت انداز سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی بہترین شال، جس میں وہ دوسرے لوگوں سے ملنے جایا کرتی تھی، اوڑھ رکھی تھی۔ اس نے اعلان کیا کہ وہ پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی سے ملاقات کرنے اور نتاشا کے بارے میں اس سے گفتگو کرنے جا رہی ہے۔

جب وہ جا چکی، مادام شامے کی ایک ڈریس میکر پہنچ گئی۔ نتاشا کو اپنی توجہ دوسرے امور کی طرف منعطف کرنے کا بہانہ مل گیا اور اس کی باچھیں کھل گئیں۔ وہ ڈرائنگ روم سے ملحق کمرے میں بند ہوگئی اور نئے ملبوسات

آزمانے لگی۔ اس نے ابھی چولی، جس میں کچے دھاگے تو لگا دیے گئے تھے لیکن ابھی وہ آستینوں سے محروم تھی، پہنی تھی اور وہ آئینے کے سامنے اپنی گردن گھما پھرا کر یہ جائزہ لے رہی تھی کہ یہ اس کے جسم پر پھب رہی ہے یا نہیں، کہ اس نے اپنے باپ اور ایک خاتون کو ڈرائنگ روم میں جوشیلے انداز سے باتیں کرتے سنا اور اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔ نتاشا کو اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ اپنی کرتی ہی اتار سکتی کہ دروازہ کھلا اور کاؤنٹس بزوخووا اندر داخل ہو گئی۔ اس کے جسم پر گہرے بنفشی رنگ کا مخملیس گاؤن، جس کے کالر معمول سے اونچے تھے، اور چہرے پر دوستانہ تبسم تھا۔

اخاہ، "madelicieuse!" اس نے شرماتی لجاتی نتاشا سے باآواز بلند کہا۔ "Charmantel" پھر وہ کاؤنٹ کی، جو اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلا آیا تھا، طرف متوجہ ہوئی اور بولی: "نہیں، مائی ڈیئر کاؤنٹ، یہ سخت زیادتی ہے! یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ رہیں بھی ماسکو میں اور کہیں آئیں جائیں بھی نہ؟ نہیں، میں آپ کو ہرگز ہرگز نہیں بخشوں گی! آج شام مادموزیل یوغیی میرے غریب خانے پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ صرف چند گنے چنے لوگ آئیں گے اور اگر آپ اپنی صاحب زادیوں کو۔۔ جو اپنے حسن سے مادموزیل یوغیی کو بھی شرماتی ہیں۔۔ اپنے ساتھ لے کر نہ آئے، تو میری آپ سے کٹی ہو جائے گی۔ میرے شوہر یہاں نہیں ہیں، وہ تور[29] گئے ہوئے ہیں، ورنہ میں انھیں بھیج دیتی اور وہ آپ لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتے۔ آپ کو آنا ہوگا، لازماً آنا ہوگا۔ وقت آٹھ اور نو کے درمیان۔"

اس نے ڈریس میکر کی طرف اپنی گردن کو جنبش دی۔ وہ اسے جانتی تھی اور دوزانو ہو کر آداب بجالائی۔ ہیلین آئینے کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی اور دل کش انداز سے اپنے مخملیس گاؤن کی تہیں سنوارنے لگی۔ وہ خوش گوار اور ہلکے پھلکے انداز سے چہچہاتی اور نتاشا کے حسن و جمال کی تعریفوں کے پل باندھتی رہی۔ جب وہ نئے ملبوسات کا جائزہ لے اور ان کی تحسین کر چکی، اس نے اپنے ڈریس کا، جو کہ باریک جالی سے بنا تھا اور ابھی ابھی اسے پیرس سے موصول ہوا تھا، ذکر چھیڑ دیا۔ نتاشا کو مشورہ دیا کہ وہ بھی ایک ایسا ہی ڈریس بنوائے۔

"لیکن، میری جادوگرنی، تم پر تو ہر چیز پھبتی ہے،" اس نے کہا۔

نتاشا کے چہرے پر پرمسرت تبسم مسلسل نظر آتا رہا۔ وہ کچھ یوں خوش ہو رہی تھی جیسے وہ اس مسحور کن کاؤنٹس کی، جو ماضی میں اتنی پرشکوہ اور ناقابل رسائی معلوم ہوتی تھی اور اب وہ اتنی گرم گستری کا مظاہرہ کر رہی تھی، تعریف و تحسین تلے پروان چڑھ رہی ہو۔ نتاشا کے حوصلے بلند ہو گئے اور وہ اس عورت سے، جو اتنی حسین و جمیل اور کریم النفس تھی، قریب قریب محبت کرنے لگی۔ اور جہاں تک ہیلین کا تعلق ہے، اس نے نتاشا کی تعریفوں کے جو پل باندھے تھے، ان میں اس نے کسی ریاکاری سے کام نہیں لیا تھا۔ اس نے پورے خلوص سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ نتاشا خوب مزے اڑائے اور لمبی تان کر سوئے۔ اناطول نے اس سے گڑگڑا کر درخواست کی تھی کہ وہ ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لائے اور اسی مقصد کے پیش نظر وہ رستوفوں سے ملنے چلی آئی تھی۔ وہ نتاشا اور اپنے بھائی کو

* میری ساحرہ، میری جادوگرنی

** دل نواز، فسوں ساز۔

ایک دوسرے کے قریب لانے کے تصور سے خوب محظوظ ہو رہی تھی۔

اگرچہ پیٹرز برگ میں ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب اسے نتاشا پر سخت غصہ آیا تھا کہ وہ بورس کو اس سے دور کیے جا رہی ہے، لیکن اب اس کے دل میں کوئی ملال نہیں تھا اور اپنے انداز سے اس کا بھلا چاہنے لگی تھی۔ جب وہ رستوفوں سے رخصت چاہ رہی تھی، وہ اپنی متوسل کو ایک طرف لے گئی۔

''میرے بھائی نے کل میرے ہاں کھانا کھایا۔ ہنستے ہنستے ہمارا برا حال ہو گیا۔ میری جادوگرنی، اس سے کچھ کھایا نہیں جا رہا تھا، بس تمھارا نام لے کر آہیں بھرے جا رہا تھا۔ مائی ڈیئر، اس پر تمھارے عشق کا جنون سوار ہو گیا ہے، پاگل ہوا جا رہا ہے۔''

''دیکھو تو، ma delicieuse، کیسے شرما رہی ہے، لجا رہی ہے!'' ہیلین بولتی چلی گئی۔ ''تمھیں لازماً آنا ہے۔ ma delicieuse، ٹھیک ہے کہ تم کسی سے پیار کرتی ہو لیکن اس کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہے کہ تم کسی راہبہ کی طرح بند ہو کر بیٹھ رہو۔ اگر تمھاری نسبت طے پا چکی ہے، تو بھی مجھے یقین ہے کہ تمھارا منگیتر یہ قطعاً نہیں چاہے گا کہ تم اس کی عدم موجودگی میں بوریت سے گھٹ گھٹ کر مر جاؤ، بلکہ وہ یہی چاہے گا کہ تم سوسائٹی میں گھومو پھرو۔''

''اسے معلوم ہے کہ میری منگنی ہو چکی ہے،'' نتاشا نے سوچا۔ ''اور وہ اور اس کا خاوند۔ نیک دل پیئر۔ اس بارے میں باتیں کرتے رہے اور خوب ہنستے رہے ہوں گے۔ چنانچہ وہاں جانے میں کوئی ہرج نہیں۔'' اور ایک بار پھر وہ بات، جو اسے اتنی گھناؤنی اور دہشت ناک نظر آتی تھی، ہیلین کے زیر اثر بالکل سادہ اور فطری معلوم ہونے لگی۔ ''اور وہ اتنی grande damê* ہیں، ان کی شخصیت میں اتنی دل کشی ہے اور قرائن سے نظر آتا ہے کہ وہ مجھے پسند کرتی ہیں۔ پھر میں لطف کیوں نہ اٹھاؤں؟'' نتاشا نے ہیلین کو حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے سوچا۔

ماریا دمتریونا بوقت ڈنر واپس پہنچ گئی۔ اس کے منہ پر قفل لگا ہوا تھا اور اس کے چہرے پر سنجیدگی طاری تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ پرنس سے پٹ کر آئی ہے۔ وہ ملاقات کے بعد ابھی تک اپنے حواس مجتمع نہیں کر سکی تھی اور اس معاملے کے بارے میں دل جمعی سے بات کرنے کے قابل نہیں تھی۔ کاؤنٹ کے سوالات کے جواب میں وہ صرف اتنا کہہ سکی: ''سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، میں اس بارے میں کل تم سے بات کروں گی۔'' اس نے جب کاؤنٹس بزوخوا کی آمد اور شام کی دعوت کے بارے میں سنا، تو گویا ہوئی:

''میں کاؤنٹس بزوخوا سے میل جول بڑھانا پسند نہیں کرتی اور میں تمھیں بھی یہی مشورہ دوں گی۔ تاہم اگر تم وعدہ کر چکے ہو، پھر بے شک چلے جاؤ۔ تمھاری ذرا تفریح ہو جائے گی،'' اس نے نتاشا سے مخاطب ہو کر کہا۔

13

کاؤنٹ الیا آندریچ اپنی بیٹیاں کاؤنٹس بزوخوا کے ہاں لے گیا۔ وہاں لوگوں کی اچھی خاصی تعداد موجود تھی اور وہ

* گریٹ لیڈی۔ عظیم خاتون

تقریباً سارے کے سارے نتاشا کے لیے اجنبی تھے۔ کاؤنٹ رستوف کی طبیعت یہ دیکھ کر سخت مکدر ہوئی کہ محفل سراسر ایسے مردوں اور عورتوں پر، جو اپنی آزادروی کے لیے بدنام تھے، مشتمل ہے۔ مادموزیل یوغیی، نوجوان مردوں کے حلقے میں گھری، ڈرائنگ روم کے ایک کونے میں کھڑی تھی۔ وہاں متعدد فرانسیسی موجود تھے۔ ان میں ڈاکٹر میتی وبے بھی شامل تھا اور جب سے کاؤنٹس بزوخوا نے ماسکو میں ڈیرا ڈالا تھا، وہ باقاعدگی سے اس کے ہاں آنے لگا تھا۔ کاؤنٹ الیا آندریچ نے دل میں ٹھان لیا کہ وہ نہ تو تاش کھیلے گا اور نہ اپنی بیٹیوں کو نظروں سے اوجھل ہونے دے گا، بلکہ جونہی مادموزیل یوغیی کے فن کا مظاہرہ ختم ہوا، وہ اٹھ کر چلا جائے گا۔

اناطول دروازے پر کھڑا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ رستوفوں کی آمد کا انتظار کر رہا ہے۔ کاؤنٹ سے علیک سلیک کرنے کے بعد وہ نتاشا کے ساتھ نتھی ہو گیا اور اس کے پیچھے پیچھے ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ جونہی نتاشا کی نظر اس پر پڑی، اسے انھیں جذبات نے، جن کا تجربہ اسے اوپیرا کے دوران میں ہوا تھا، اپنی گرفت میں لے لیا۔ ایک طرف تو اس کی ستائش سے اس کی انا کی تسکین ہو رہی تھی اور دوسری طرف اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ ان کے مابین اخلاقی دیوار موجود نہیں رہی ہے۔

ہیلین اس پر واری صدقے ہونے اور اس کے حسن اور لباس کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کرنے لگی۔ ان کی آمد کے ذرا دیر بعد مادموزیل یوغیی اپنا کاسٹیوم تبدیل کرنے کمرے سے باہر چلی گئی۔ دریں اثنا ڈرائنگ روم میں کرسیاں ترتیب دے دی گئیں اور لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے لگے۔ اناطول نتاشا کے لیے ایک کرسی اٹھا لایا۔ وہ خود اس کے برابر بیٹھنا چاہتا تھا، لیکن کاؤنٹ نے، جس نے اپنی نظریں اپنی بیٹی سے ہٹائی نہیں تھیں، خود اس کے پاس نشست سنبھال لی۔ اناطول نتاشا کے پیچھے بیٹھ گیا۔

مادموزیل یوغیی، جس کے عریاں، فربہ اور گداز بازوؤں پر چھوٹے چھوٹے گڑھے بن اور مٹ رہے تھے۔ ایک کندھے پر شال لپیٹے، کرسیوں کے درمیان جگہ پر، جو خالی چھوڑ دی گئی تھی، چلتی اندر آئی اور غیر فطری انداز سے کھڑی ہو گئی۔ واہ واہ کی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔

مادموزیل یوغیی نے افسردہ اور گمبھیر انداز سے ناظرین کا جائزہ لیا اور فرانسیسی زبان میں یک کرداری ڈرامے کی، جس کا موضوع ایک ماں کے اپنے بیٹے کے بارے میں سفلی جذبات تھے، عبارت بولنے لگی۔ کہیں اس کی آواز بلند ہو جاتی اور کہیں اتنی دھیمی کہ سرگوشیوں میں تبدیل ہو جاتی۔ وقتاً فوقتاً وہ توقف کرتی، اپنی آنکھیں گھماتی اور ایک بار پھر اپنی بھاری اور کھردری آواز میں بولنے لگتی۔

"Adorable! Divin! Delicieux!"* چاروں اطراف سے آوازیں سنائی دیں۔

نتاشا کی نگاہیں فربہ اندام اداکارہ پر گڑی رہیں، لیکن اس کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے نہ نظر آیا اور نہ سمجھ۔ اگر اسے کسی چیز کا شعور تھا، تو وہ یہ تھا کہ ایک بار پھر اسے اٹھا کر اس عجیب و غریب اور لایعنی دنیا میں، جہاں سے وہ

* واہ واہ! سبحان اللہ! بہت خوب!

لوٹ کر کبھی واپس نہیں جا سکتی، پہنچا دیا گیا ہے۔ یہ دنیا اس کی اپنی پرانی دنیا سے دور، بہت دور تھی اور اس میں یہ جاننا ناممکن تھا کہ اچھا کیا ہے یا برا کیا ہے، معقول کیا ہے یا غیر معقول کیا ہے۔ اس کے پیچھے اناطول بیٹھا تھا۔ وہ اس کے قرب سے آگاہ تھی اور یہ سوچ سوچ کر کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے، اس پر ہول طاری ہو رہا تھا۔

پہلے یک کرداری ڈرامے کے اختتام پر ناظرین اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے مادموزیل یوغیی کے گرد گھیرا ڈال لیا اور اس کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے لگے۔

''وہ کتنی حسین ہے!'' نتاشا نے اپنے باپ سے کہا جو دوسروں کے ساتھ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اداکارہ تک پہنچنے کے لیے ہجوم میں سے راستہ بنا رہا تھا۔

''جب میں تمھیں دیکھتا ہوں تو مجھے تمھاری اس رائے سے اتفاق نہیں رہتا!'' اناطول نے نتاشا کے پیچھے پیچھے آ کر اور ایک ایسے لمحے کا، جب اس کی بات صرف وہی سن سکتی تھی، انتخاب کر کے کہا۔ ''تم میں بلا کی کشش ہے... جب سے میں نے تمھیں دیکھا ہے، تبھی سے میں تمھارے۔''

''نتاشا، آگے آ جاؤ، آگے آ جاؤ!'' کاؤنٹ نے مڑ کر اپنی بیٹی سے کہا۔ ''وہ کتنی خوش شکل ہے!''

نتاشا کچھ کہے بغیر اپنے باپ کے پاس چلی گئی اور اسے مبہوت، سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگی۔

اپنے فن کا متعدد بار مظاہرہ کرنے کے بعد مادموزیل یوغیی رخصت ہو گئی اور کاؤنٹس نے مہمانوں کو بال روم میں آنے کی دعوت دی۔

کاؤنٹ گھر جانا چاہتا تھا لیکن ہیلین اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی اور بولی کہ وہ رنگ میں بھنگ نہ ڈالے اور اسے جو بے ساختہ اجتماعی رقص منعقد کرنے کا خیال آیا ہے، اسے ہونے دے۔ چنانچہ رستوف رک گئے۔ اناطول نے نتاشا سے والز کی فرمائش کی۔ رقص کے دوران میں وہ اس کی کمر اور ہاتھ دباتا رہا، اسے بتاتا رہا کہ اس کا حسن خیرہ کن ہے اور یہ کہ وہ اس کی زلف گرہ گیر کا اسیر ہو چکا ہے۔ ecossaise[30] کے دوران میں بھی وہ دونوں ہم رقص تھے۔ اس کے دوران میں جب بھی انھیں تنہائی میسر آتی، اناطول منہ سے تو کچھ نہ کہتا، بس اسے تکتا رہتا۔ نتاشا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ والز کے دوران میں وہ جو کچھ اس سے کہتا رہا تھا، کہیں وہ خواب کی باتیں تو نہیں تھیں۔ جب رقص کا پہلا دور ختم ہوا، اناطول نے دوبارہ اس کا ہاتھ دبایا۔ نتاشا نے خوف زدہ نگاہیں اوپر اٹھا کر اسے دیکھا لیکن اس کی پیار بھری نظروں اور مسکراہٹ میں اتنی پر اعتماد ملائمت تھی کہ جو کچھ وہ اس سے کہنا چاہتی تھی، اسے وہ کہنا ناممکن معلوم ہونے لگا۔ اس نے اپنی نگاہیں جھکا لیں۔

''مجھ سے ایسی باتیں نہ کریں۔ میری منگنی ہو چکی ہے اور میں کسی اور سے پیار کرتی ہوں،'' وہ برق رفتاری سے بولتی چلی گئی۔

پھر اس نے نظر اٹھا کر اس کی جانب دیکھا، لیکن جو کچھ اس نے کہا تھا، اناطول نے نہ تو اس کا برا منایا تھا اور نہ اس کے چہرے سے کسی قسم کی پریشانی کا اظہار ہو رہا تھا۔

''مجھے یہ باتیں مت بتاؤ۔ میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اس نے کہا۔ ''میں تو تمھیں یہ بتا رہا ہوں کہ میں تمھارے عشق میں پاگل ہو رہا ہوں۔ کیا یہ میرا قصور ہے کہ تم اتنی پر کشش ہو؟... اب (رقص میں) رہنمائی کرنے کی ہماری باری ہے۔''

نتاشا کے دل و دماغ میں ہل چل بپا تھی اور اس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ اس نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر متوحش نظروں سے چاروں اطراف دیکھا۔ وہ معمول سے زیادہ مسرور دکھائی دے رہی تھی۔ اس شام جو کچھ ہوا، بعد میں کوشش کرنے کے باوجود اسے کچھ خاص یاد نہ آیا۔ انھوں نے ecossaise اور grossvater[31] رقص کیے۔ اس کے باپ نے اسے گھر چلنے کو کہا لیکن وہ التجائیں کرنے لگی کہ ابھی وہ کچھ دیر اور ٹھہریں۔ وہ جہاں کہیں بھی ہوتی، جس کسی سے بھی بات کر رہی ہوتی، اسے یہی محسوس ہوتا کہ اس کی نگاہیں اسی پر مرکوز ہیں۔ بعد میں اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے باپ سے کہا تھا کہ وہ ڈرائنگ روم میں جانے کی اجازت دے کیونکہ اس نے اپنا لباس ٹھیک کرنا تھا، یہ کہ ہیلین اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی اور ہنستے مسکراتے اس سے اپنے بھائی کی بے پناہ محبت کی باتیں کرتی رہی تھی اور یہ کہ چھوٹے نشستی کمرے میں اس کی اناطول سے ملاقات ہوئی تھی۔ ہیلین خود تو کہیں چھپت ہوگئی اور انھیں تنہا چھوڑ گئی تھی۔ اناطول نے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا اور اس سے کہا تھا:

''میں تمھیں ملنے تو نہیں آ سکتا لیکن کیا ممکن ہے کہ میری دوبارہ تم سے کبھی ملاقات نہ ہو؟ میں تمھاری محبت میں ہوش و حواس کھو بیٹھا ہوں۔ کیا میں کبھی بھی...'' اور اس کا راستہ روک کر وہ اپنا چہرہ اس کے چہرے کے قریب لے گیا۔

اس کی موٹی موٹی، روشن روشن، مردانہ آنکھیں اس کی اپنی آنکھوں کے اتنا قریب تھیں کہ اسے ان کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

''نتالی؟'' اس نے استفہامیہ انداز سے سرگوشی کی اور وہ محسوس کرنے لگی کہ اس کے ہاتھ اتنے زور سے دبائے جا رہے ہیں کہ ان میں درد ہونے لگا ہے۔ ''نتالی؟''

''میں کچھ نہیں سمجھ رہی۔ مجھے کچھ نہیں کہنا،'' اس کی آنکھوں نے جواب دیا۔

آتشیں ہونٹ اس کے ہونٹوں سے پیوست ہو گئے اور تقریباً عین اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ اس کی رہائی ہو گئی ہے کیونکہ کمرے میں ہیلین کے قدموں کی چاپ اور اس کے گاؤن کی سرسراہٹ سنائی دینے لگی تھی۔ نتاشا نے اپنے گرد و پیش نظر ڈالی۔ وہ بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو رہی تھی اور اس کا جسم کپکپا رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ استفہامیہ نظروں سے اناطول کو دیکھا اور دروازے کی طرف چل پڑی۔

''ایک لفظ، صرف ایک، خدا کے لیے!'' اناطول نے چلا کر کہا۔

وہ رک گئی۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتی تھی، اس سے معلوم کرنا چاہتی تھی کہ یہ کیا واقعہ پیش آیا ہے اور اس کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''نتالی، ایک لفظ، صرف ایک لفظ!'' وہ اپنی بات دہراتے ہوئے بولا جیسے اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو کہ اسے کیا کہنا چاہیے۔ وہ یہی گردان کرتا رہا تا آنکہ ہیلین ان کے پاس پہنچ گئی۔

نتاشا ہیلین کے ساتھ واپس ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ رستوف سپر کا انتظار کیے بغیر واپس آ گئے۔

جب وہ گھر پہنچے، نتاشا ساری رات جاگتی اور کروٹیں بدلتی رہی۔ اسے یہ نا قابل حل مسئلہ کہ وہ اناطول سے پیار کرتی ہے یا پرنس آندرے سے، اذیت پہنچاتا رہا۔ اسے پرنس آندرے سے پیار تھا۔ اسے واضح طور پر یاد تھا کہ وہ اس سے قلب کی گہرائیوں سے پیار کرتی تھی لیکن وہ اناطول سے بھی پیار کرتی تھی اور اس سلسلے میں بھی شک وشبے کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں تھی۔ ''ورنہ یہ سب کچھ کیسے ہو جاتا؟'' اس نے سوچا۔ ''اگر میں اس کے بعد بھی بوقت رخصتی، جب ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا جا رہا تھا، اس کی مسکراہٹ کا جواب مسکراہٹ سے دے سکتی تھی، اگر میں حالات کو یہاں تک پہنچنے کی اجازت دے سکتی تھی، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ابتدا میں ہی اس سے محبت ہو گئی تھی۔ چنانچہ وہ لازماً خوش خصال، شریف النفس، عالی منش اور بامروت ہوگا اور میرے لیے اس سے محبت کیے بنا کوئی چارہ ہی نہ رہا۔ اگر مجھے دونوں سے پیار ہے، پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن وہ ان خوف ناک سوالوں کے جواب تلاش کرنے سے قاصر تھی۔

14

دن چڑھ گیا اور اپنے ساتھ روزمرہ کے تفکرات اور بکھیڑے لایا۔ سب کی آنکھ کھل گئی۔ ہر کوئی ادھر ادھر بھاگنے دوڑنے اور باتیں کرنے لگا۔ ڈریس میکر دوبارہ آ گئی۔ ماریا دمتریونا نمودار ہوئی اور ان سب کی ناشتے پر طلبی ہوئی۔ نتاشا آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر بے چینی سے ہر کسی کو دیکھتی رہی جیسے وہ یہ چاہتی ہو کہ ہر وہ نگاہ، جو اس کی طرف اٹھے، اسے راستے میں ہی روک لے اور اس کی کوشش یہ تھی کہ وہ معمول کے مطابق ہی نظر آئے۔

ناشتے کے بعد، جو اس کا بہترین وقت ہوتا تھا، ماریا دمتریونا اپنی کرسی پر ٹک کر بیٹھ گئی اور اس نے نتاشا اور کاؤنٹ کو اپنے پاس بلایا۔

''ہاں، تو میرے دوستو، میں نے سارے مسئلے پر خوب سوچ بچار کیا ہے اور تمھارے لیے میرا مشورہ یہ ہے،'' اس نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ ''جیسا کہ تمھیں معلوم ہے، میں کل پرنس نکولائی سے ملنے گئی تھی۔ خیر، میری ان سے گفتگو ہوئی... پتا نہیں ان کے جی میں کیا آیا کہ وہ مجھ پر گرجنے برسنے لگے، لیکن میں ان لوگوں میں سے نہیں جو چیخنے چلانے سے دب جاتے ہیں۔ جو کچھ میں نے کہنا تھا، کہہ دیا۔''

''لیکن انھوں نے کیا کہا؟'' کاؤنٹ نے کہا۔

''وہ؟ وہ سترے بہترے ہو گئے ہیں... اس بارے میں کچھ سنتے ہی نہیں۔ لیکن باتیں بنانے کا حاصل؟ ہم اس بے چاری لڑکی کو پہلے ہی کافی پریشان کر چکے ہیں،'' ماریا دمتریونا نے کہا۔ ''تمھارے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ

اپنا کام نپٹاؤ اور واپس اترادنایا چلے جاؤ... اور وہیں انتظار کرو۔''

''اوہ، نہیں!'' نتاشا چلائی۔

''ہاں، واپس چلے جاؤ'' ماریادمتریونا نے کہا۔ ''اور وہیں انتظار کرو۔ اگر تمھارا منگیتر اب یہاں آ گیا۔ لازماً جھگڑا ہوگا۔ لیکن اگر وہ اکیلا ہوا، تو وہ خود ہی بڈھے سے معاملہ نپٹا لے گا اور پھر تمھارے پاس چلا آئے گا۔''

کاؤنٹ رستوف کو مشورہ معقول نظر آیا اور وہ اس سے متفق ہو گیا۔ ''اگر بڑے میاں ٹھنڈے پڑ گئے، پھر ان سے بعدازاں ماسکو یا بالڈ ہلز، کہیں بھی ملاقات ہو سکتی ہے اور اگر وہ اپنی 'میں نہ مانوں' پر قائم رہے، تب شادی ان کی خواہشات کے برعکس اترادنایا میں ہی ہو سکے گی۔''

''آپ بالکل صحیح فرماتی ہیں،'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں انھیں خواہ مخواہ ملنے چل دیا اور اپنے ساتھ اسے بھی گھسیٹ لے گیا۔''

''نہیں، افسوس کس بات کا؟ جب تم یہاں تھے، پھر تمھیں علیک سلیک کے لیے جانا ہی چاہیے تھا۔ اگر انھیں یہ بات پسند نہیں آئی، تو یہ ان کا اپنا معاملہ ہے،'' ماریادمتریونا نے اپنے پرس میں کچھ تلاش کرتے ہوئے کہا۔ ''علاوہ ازیں، عروسی ملبوسات تیار ہو گئے ہیں، چنانچہ تمھارے یہاں ٹھہرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہ گئی۔ اگر کوئی چیز ابھی تیار نہیں ہو سکی، تو وہ میں تمھیں بھیج دوں گی۔ اگرچہ تمھارے جانے پر مجھے قلق ہوگا، لیکن تمھارے لیے یہی بہتر رہے گا۔''

وہ اپنے پرس میں جو چیز ڈھونڈ رہی تھی، وہ اسے مل گئی اور یہ اس نے نتاشا کو تھما دی۔ یہ پرنس ماریا کا خط تھا۔

''یہ اس نے تمھیں لکھا ہے۔ دیکھو، بے چاری کتنا پریشان ہے! اسے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ کہیں تم یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ وہ تمھیں پسند نہیں کرتی۔''

''لیکن وہ مجھے پسند نہیں کرتی!'' نتاشا نے کہا۔

''فضول باتیں مت کرو!'' ماریادمتریونا دہاڑی۔

''کوئی بھی مجھے قائل نہیں کر سکتا۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ مجھے پسند نہیں کرتی،'' نتاشا نے خط پکڑتے ہوئے بڑی دلیری سے ترکی بہ ترکی جواب دیا، اور اس کے چہرے پر کچھ ایسا سرد مہرانہ اور غصیلا عزم نمودار ہوا کہ ماریادمتریونا نے بڑے انہماک سے اس کی طرف دیکھا اور اس کے ابروؤں پر بل پڑ گئے۔

''جمعہ جمعہ آٹھ دن کی چھوکری، میری بات کو اس طرح مت جھٹلاؤ!'' اس نے کہا۔ ''میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سچ کہہ رہی ہوں، تمھیں اس خط کا جواب دینا ہوگا۔''

نتاشا چپ رہی اور پرنس ماریا کا خط پڑھنے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

پرنس ماریا نے لکھا تھا کہ ان دونوں کے مابین جو غلط فہمی پیدا ہو گئی ہے، اس کا اسے بہت دکھ ہے۔ ''میرے باپ کے جذبات خواہ کیسے ہی کیوں نہ ہوں، جہاں تک میرا تعلق ہے، میری اس بات کا یقین کرو،'' اس

نے نتاشا سے پرزور التجا کی تھی، ''کہ جس لڑکی کو میرے بھائی نے، جن کی خوشی کی خاطر میں بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوں، اپنی شریک حیات منتخب کیا ہے، میں اس سے پیار کیے بنا نہیں رہ سکتی۔

''تاہم یہ مت سوچو کہ میرے باپ کو تم سے کوئی عناد ہے،'' اس نے مزید لکھا تھا۔ ''وہ بیمار، ضعیف، بوڑھے آدمی ہیں اور ہمیں عفو سے کام لینا چاہیے۔ تاہم وہ دل کے کھرے، نیک نفس اور عالی ظرف انسان ہیں، اور جو عورت ان کے بیٹے کا دامن خوشیوں سے بھر دے گی، انھیں اس سے پیار ہو جائے گا۔''

خط پڑھنے کے بعد نتاشا اس کا جواب لکھنے بیٹھ گئی۔

"Chere princesse"* اس نے بہ عجلت اور مشینی انداز سے لکھا اور پھر رک گئی۔

گزشتہ رات جو کچھ ہوا تھا، اس کے بعد اس کے پاس لکھنے کو رہ ہی کیا گیا تھا؟ ''ہاں، ہاں! یہ سب کچھ ہوا اور اب ہر چیز مختلف ہوگئی۔'' وہ خط، جو اس نے لکھنا شروع کیا تھا، سامنے رکھے اس نے سوچا۔ ''کیا مجھے ان (پرنس آندرے) سے قطع تعلق کرنا ہوگا؟ واقعی مجھے؟ یہ تو بڑی خوف ناک صورت ہوگی!...''

اور اس قسم کے ڈراؤنے خیالات سے فرار حاصل کرنے کی غرض سے وہ سونیا کے پاس چلی گئی اور اس کے ساتھ کشیدہ کاری کے نمونوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔

ڈنر کے بعد نتاشا اپنے کمرے میں چلی گئی اور ایک بار پھر پرنس ماریا کا خط پڑھنے بیٹھ گئی۔ ''کیا واقعی یہ سب کچھ ختم ہو گیا ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''کیا یہ سب کچھ اتنی جلدی ہو سکتا ہے اور جو کچھ اس سے پہلے تھا، اسے نیست و نابود کر سکتا ہے؟'' اسے پرنس آندرے کے ساتھ جو محبت تھی، اس نے اسے اپنی تمام تر سابقہ قوت کے ساتھ دوبارہ یاد کیا اور اس کے ساتھ ہی اسے یہ احساس بھی ہوا کہ وہ اناطول سے محبت کرتی ہے۔ اس نے بین انداز سے پرنس آندرے کی بیوی کی حیثیت سے اپنے ذہن میں اپنی تصویر بنائی، اس کے ساتھ مسرت کے وہ مناظر، جن کے خواب اس نے اکثر اپنے تخیل میں دیکھے تھے، یاد کیے اور اسی وقت وہ گزشتہ شام اناطول کے ساتھ جذبات کی حرارت سے دہکتی تمتماتی ملاقات کی ایک ایک تفصیل کا جائزہ لینے لگی۔

''آخر میں دونوں کے ساتھ بیک وقت محبت کیوں نہیں کر سکتی؟'' ضغطے میں گرفتار وہ بار بار اپنے سے پوچھ رہی تھی۔ ''صرف تبھی مجھے کامل مسرت مل سکتی ہے۔ لیکن اب مجھے انتخاب کرنا ہے اور اگر میں ان دونوں میں سے کسی ایک سے بھی دست بردار ہوئی، میں خوش نہیں رہ سکوں گی... ایک بات یقینی ہے،'' اس نے سوچا، ''کہ جو کچھ ہوا، اس کے بارے میں پرنس آندرے کو بتانا مشکل ہوگا یا اسے ان سے چھپانا بھی اتنا ہی ناممکن ہوگا۔ لیکن جہاں تک دوسرے کا تعلق ہے، کچھ بھی نہیں بگڑا... پرنس آندرے سے مجھے جو اتنے طویل عرصے سے محبت ہے اور اس محبت سے مجھے جو مسرت ملتی ہے، کیا مجھے اس سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑے گا؟''

''مس صاحبہ،'' ایک خادمہ نے پراسرار انداز سے اندر داخل ہوتے ہوئے زیر لب کہا۔ ''ایک آدمی نے

---

* ڈیر پرنسس

مجھ سے کہا تھا کہ یہ میں آپ تک پہنچا دوں''۔ اور اس نے ایک خط نتاشا کو تھما دیا۔ ''صرف خدا کے لیے''۔ لڑکی بولے جا رہی تھی جب کہ نتاشا سوچے سمجھے بغیر مشینی انداز سے خط کھول رہی تھی۔ خط کھلا اور نتاشا اناطول کا محبت نامہ پڑھنے لگی۔ اس کے پلے کچھ نہ پڑا۔ وہ صرف اتنا جان سکی کہ یہ اس کا خط ہے، اس شخص کا، جس سے وہ محبت کرتی ہے، خط ہے۔ ہاں، وہ اس سے محبت کرتی ہے، ورنہ جو کچھ ہوا، وہ کیسے ہو سکتا تھا؟ اس کا محبت نامہ اس کے ہاتھوں میں کیسے پہنچ سکتا تھا؟

نتاشا لرزتے کانپتے ہاتھوں میں اناطول کا شدت جذبات سے معمور محبت نامہ، جو اسے دلوخوف نے لکھ کر دیا تھا، پکڑے رہی اور جوں جوں وہ اسے پڑھتی گئی، اسے محسوس ہونے لگا کہ اس میں جو کچھ ہے، ''میں نے یہ جانا، گویا یہ بھی میرے دل میں ہے۔''

''کل شام سے میرے مقدر پر مہر ثبت ہو چکی ہے: یا تو مجھے تمھاری محبت حاصل رہے یا پھر مجھے موت آ جائے۔ اس کے علاوہ میرے لیے تیسری صورت کوئی نہیں،'' خط کی ابتدا ان الفاظ سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے تحریر کیا تھا: ''مجھے معلوم ہے کہ تمھارے والدین تمھارا عقد مجھ سے کرنے پر کبھی رضامند نہیں ہوں گے۔ اس کی وجوہ خفیہ ہیں اور ان کا انکشاف میں صرف تمھارے سامنے کروں گا۔ لیکن اگر تم مجھ سے محبت کرتی ہو، پھر صرف 'ہاں' کہہ دو اور دنیا کی کوئی طاقت ہماری خوشی کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔ محبت فاتح عالم ہے، اس کے سامنے سب مخالفتیں خس و خاشاک کی طرح بہہ جائیں گی۔ میں تمھیں اٹھا لے جاؤں گا اور دنیا کے آخری کناروں تک لے جاؤں گا۔''

''ہاں، میں اس سے محبت کرتی ہوں،'' نتاشا نے بیسویں مرتبہ خط پڑھتے ہوئے اور اس کے ایک ایک لفظ میں کوئی خاص عمیق معانی تلاش کرتے ہوئے سوچا۔

اس شام ماریا دمتریونا آرخاروفوں کے ہاں جا رہی تھی۔ وہ لڑکیوں کو بھی اپنے ساتھ لے جانا چاہتی تھی۔ نتاشا نے سر درد کا بہانہ کر دیا اور گھر پر ہی رہی۔

15

سونیا شام کو ذرا تاخیر سے گھر آئی اور سیدھی نتاشا کے کمرے میں چلی گئی۔ اسے یہ دیکھ کر اچنبھا ہوا کہ وہ ابھی تک اپنا پورا لباس پہنے ہوئے ہے اور صوفے پر سوئی پڑی ہے۔ اس کے قریب میز پر اناطول کا کھلا خط پڑا تھا۔ سونیا نے اسے اٹھایا اور پڑھنے لگی۔

جب وہ یہ خط پڑھ رہی تھی، اس نے نظر اٹھا کر محو خواب نتاشا کی طرف دیکھا اور جو کچھ وہ پڑھ رہی تھی، اس کی کلید اس کے چہرے پر ڈھونڈنا چاہی لیکن وہاں سے اسے کچھ نہ ملا۔ اس کے چہرے پر طمانیت، ملائمت اور مسرت ٹپک رہی تھی۔ خوف و اضطراب سے سونیا کا رنگ فق ہو گیا اور اس کا جسم لرزنے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنے سینے

پرنکالیے کہ کہیں اس کا گلانہ گھٹ جائے۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

''یہ کیسے ہوا کہ مجھے کچھ نظر نہ آیا؟ نوبت یہاں تک پہنچی کیسے؟ کیا پرنس آندرے سے اس کی محبت ختم ہوگئی ہے؟ اس نے کوراگن کو یہاں تک پہنچنے کا موقع ہی کیوں دیا؟ یہ بات طے ہے کہ وہ عورتوں کا شکاری ہے، لچا اور لفنگا ہے۔ نکولس، جان سے عزیز اور شریف النفس نکولس، جب اسے یہ معلوم ہوگا، اس کا ردعمل کیا ہوگا؟ تو کل، گزشتہ رات اور آج، اس کے چہرے پر جو ہیجانی، پرعزم اور غیر فطری تاثر نظر آتا تھا، تو اس کا مفہوم یہ تھا،'' سونیا نے سوچا۔ ''یہ اور اس سے محبت کرے، نہیں، یہ ناممکن ہے! ہوسکتا ہے کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہو کہ خط کس کا ہے اور اس نے خط کھول لیا ہو۔ غالب گمان یہ ہے کہ اسے یہ خط پڑھ کر توہین محسوس ہوئی ہو۔ یہ اس قسم کی حرکت نہیں کرسکتی!''

سونیا نے اپنے آنسو پونچھ ڈالے اور نتاشا کے قریب جا کر ایک بار پھر اس کے چہرے کا بغور جائزہ لینے لگی۔

''نتاشا'' اس نے زیر لب اور اتنی دھیمی آواز سے، جو بمشکل سنائی دے سکتی تھی، کہا۔

نتاشا کی آنکھ کھل گئی اور اسے سونیا دکھائی دی۔

''ارے، تم واپس آگئی ہو؟''

اور جیسا کہ آنکھ کھلنے پر اکثر ہوتا ہے، وہ بے ساختہ اپنی دوست سے لپٹ گئی۔ اس کے انگ انگ میں پیار امنڈ رہا تھا، لیکن جب اس نے دیکھا کہ سونیا بوکھلا رہی ہے، اس کے چہرے پر پریشانی، اضطراب اور شک وشبہے کے سائے لہرانے لگے۔

''سونیا، تم نے وہ خط پڑھ لیا؟''

''ہاں،'' سونیا نے نرمی سے جواب دیا۔

نتاشا فورِ مسرت سے کھل اٹھی۔ ''یہ سلسلہ اس طرح آگے نہیں چل سکتا،'' اس نے کہا۔ ''میں تم سے مزید نہیں چھپا سکتی۔ تم نے دیکھ لیا ہے کہ ہم ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں!... سونیا ڈارلنگ! انھوں نے لکھا ہے۔ سونیا...''

سونیا دیدے پھاڑے گھور گھور کر نتاشا کو دیکھ رہی تھی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔

''اور بلکونسکی؟'' اس نے پوچھا۔

''اوہ، سونیا، کاش تمھیں معلوم ہوتا کہ میں کتنی خوش ہوں!'' نتاشا نے بآواز بلند کہا۔ ''تمھیں معلوم ہی نہیں کہ محبت ہوتی کیا ہے۔''

''لیکن نتاشا، تمھارا مطلب ہے کہ دوسری ختم ہوگئی ہے؟''

نتاشا نے اپنی بڑی بڑی متحیر آنکھوں سے سونیا کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کا سوال اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

''پھر تم پرنس آندرے سے قطع تعلق کرلوگی؟''

''اف، تم سمجھتی ہی نہیں! فضول باتیں مت کرو۔ بس سنو!'' نتاشا نے گھڑی کی گھڑی ناراض ہو کر کہا۔

''نہیں، مجھے یقین نہیں آتا،'' سونیا نے زور دے کر کہا۔ ''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ تم پورا

سال ایک شخص سے محبت کرتی رہیں اور پھر آناً فاناً... ہونہہ، تمھاری تو اس سے صرف تین ملاقاتیں ہوئی ہیں! نتاشا، مجھے تم پر یقین نہیں آرہا، تم ضرور مذاق کر رہی ہو۔ تم تین دن ہی میں سب کچھ بھول گئیں اور نوبت بہ ایں جا۔"

"تین دن؟" نتاشا نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے تو معلوم ہوتا ہے کہ میں ان سے سو سال سے محبت کرتی چلی آرہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے کہ میں نے اس سے پہلے محبت کبھی کی ہی نہیں تھی۔ سونیا، یہ باتیں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ سونیا، ذرا ٹھہرو، یہاں بیٹھ جاؤ۔" اور نتاشا نے اپنے بازو اس کی کمر میں ڈال دیے اور اسے چومنے لگی۔ "میں نے سنا تو تھا کہ ایسی چیزیں ہوتی ہیں اور تم نے بھی یقیناً سنا ہوگا، لیکن صرف اب مجھے اس قسم کی محبت ہوئی ہے۔ ایسی محبت کا پہلے مجھے کبھی احساس بھی نہیں ہوا تھا۔ جونہی میری نگاہیں ان پر پڑیں، مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے آقا ہیں اور میں ان کی باندی، اور یہ کہ میں ان سے محبت کیے بنا نہیں رہ سکتی۔ ہاں، ان کی باندی! وہ جو حکم بھی دیں گے، میں بسر و چشم اسے بجالاؤں گی۔ تم یہ باتیں نہیں سمجھتیں۔ میں کیا کروں؟ سونیا، میں کیا کروں؟" نتاشا نے با آواز بلند کہا۔ اس کے انگ انگ سے خوشی پھوٹ پڑ رہی تھی، پھر بھی اس کے چہرے پر خوف کے آثار ہویدا تھے۔

"لیکن سوچو کہ تم کر کیا رہی ہو؟" سونیا نے کہا۔ "میں اس معاملے کو یوں نہیں چھوڑ سکتی۔ یہ در پردہ خط کتابت... تم نے اسے اتنی ڈھیل دی ہی کیوں کہ نوبت یہاں تک آ پہنچی؟" وہ بولتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں دہشت بھی تھی اور حقارت بھی، اور اسے چھپانا اس کے بس میں نہ رہا۔

"میں بتا چکی ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں ہے،" نتاشا نے کہا۔ "تم سمجھتی کیوں نہیں؟ میں ان سے پیار کرتی ہوں!"

"پھر میں یہ سلسلہ نہیں چلنے دوں گی ــــ میں سب کو بتا دوں گی!" سونیا پھٹ پڑی اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

"کیا مطلب؟ خدا کے لیے... اگر تم نے کسی کو بتایا تو میں تمھیں اپنا دشمن سمجھوں گی!" نتاشا نے اعلان کیا۔ "تم مجھے دکھ دینا چاہتی ہو، تم مجھ سے کٹی کرنا چاہتی ہو ــــ"

جب سونیا نے نتاشا کی گھبراہٹ اور خوف دیکھا، اسے اپنی دوست پر ترس بھی آیا اور اس سے شرم بھی۔ اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

"لیکن یہ تم دونوں کا چکر کیا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "اس نے تم سے کہا کیا ہے؟ وہ یہاں گھر کیوں نہیں آتا؟"

نتاشا نے اس کے سوالوں کا کوئی جواب نہ دیا۔

"خدا کے لیے، سونیا، کسی کو مت کچھ بتانا۔ مجھے انگاروں پر نہ لٹاؤ،" نتاشا نے منت سماجت کرتے ہوئے کہا۔ "یاد رکھو کہ ان معاملوں میں کوئی ٹانگ نہ اڑائے، کوئی دخل نہ دے۔ میں نے تمھیں اپنا رازدان بنایا ہے ــــ"

"لیکن یہ رازداری کیوں؟ وہ گھر کیوں نہیں آتا؟" سونیا نے پھر رٹ لگائی۔ "وہ کھلے عام تمھارا رشتہ کیوں

نہیں مانگتا؟ تم جانتی ہو کہ پرنس آندرے نے تمھیں مکمل آزادی دے دی تھی... اگر واقعی اس قسم کی کوئی بات ہے... لیکن مجھے اس کا یقین نہیں آتا۔ نتاشا، تم نے سوچا ہے کہ یہ خفیہ وجوہات کیا ہو سکتی ہیں؟''

نتاشا ہکا بکا رہ گئی اور سونیا کا منہ تکنے لگی۔ بظاہر یہ سوال اسے پہلے نہیں سوجھا تھا اور اسے کچھ علم نہیں تھا کہ وہ اس کا کیا جواب دے۔

''مجھے نہیں معلوم کہ ان کے پاس کیا وجوہات ہیں، لیکن کوئی نہ کوئی وجوہات ہوں گی ہی!''

سونیا نے لمبی سانس لی اور بے اعتباری سے اپنا سر ہلانے لگی۔

''اگر وجوہات تھیں—'' اس نے کہنا شروع کیا۔

لیکن نتاشا اس کے شکوک بھانپ گئی اور اس نے دہشت زدگی کے عالم میں قطع کلامی کی۔

''سونیا، ان پر شک نہیں کیا جا سکتا! نہیں، بالکل نہیں! تم سمجھتی کیوں نہیں؟'' وہ پھٹ پڑی۔

''کیا وہ تمھارے ساتھ محبت کرتا ہے؟''

''کیا وہ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟'' نتاشا نے اپنی دوست میں تفہیم کے فقدان پر ترس کھا کر مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم ان کا خط پڑھ چکی ہو۔ پڑھا ہے یا نہیں؟ اور تم ان سے مل چکی ہو!''

''لیکن اگر اس کی نیت صاف نہ ہوئی؟''

''ان کی؟— نیت صاف نہ ہوئی؟ کاش کہ تمھیں معلوم ہوتا!'' نتاشا نے کہا۔

''اگر اس کی نیت صاف ہے، پھر وہ اپنے ارادوں کا صاف صاف اظہار کرے، ورنہ تم سے ملنا ترک کر دے۔ اگر تم اسے یہ نہیں بتاؤ گی، تو میں بتا دوں گی۔ میں اسے خط لکھ دوں گی۔ میں پاپا کو بتا دوں گی!'' سونیا نے پکے ارادے سے کہا۔

''لیکن میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی!'' نتاشا چلائی۔

''نتاشا، تم میری سمجھ سے بالا ہو۔ تم کیا کہہ رہی ہو؟ اپنے باپ کا سوچو، نکولس کا خیال کرو۔''

''مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، مجھے ان کے علاوہ کسی سے پیار نہیں۔ تمھیں یہ کہنے کا حوصلہ کیسے ہوا کہ ان کی نیت صاف نہیں ہے؟ تمھیں پتا نہیں کہ میں ان سے محبت کرتی ہوں؟'' نتاشا چیخنے چلانے لگی۔ ''جاؤ، سونیا، جاؤ۔ میں تم سے جھگڑنا نہیں چاہتی۔ جاؤ، خدا کے لیے جاؤ۔ تمھیں پتا ہے کہ میں کس عذاب میں سے گزر رہی ہوں،'' نتاشا نے ایک ایسے لہجے میں، جس کی کاٹ میں اس نے اپنی مایوسی اور جھلاہٹ کو دبانے کی کوشش کی تھی، غصے سے چلا کر کہا۔

سونیا روتی چیختی کمرے سے باہر بھاگ گئی۔

نتاشا نے میز کا رخ کیا اور ایک لمحہ سوچے بغیر پرنس ماریا کے خط کا جواب، جو صبح اس کے لیے لکھنا محال ہو گیا تھا، تحریر کر دیا۔ اس نے اپنے خط میں مختصراً پرنس ماریا کو مطلع کیا کہ ان کے مابین تمام غلط فہمیاں دور ہو

گئی ہیں، یہ کہ پرنس آندرے نے غیر ممالک کا سفر اختیار کرنے سے قبل اسے مکمل آزادی دے کر جس عالی ظرفی کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے، یہ کہ وہ ہر چیز بھول جائے اور اگر وہ اس کے ساتھ کوئی زیادتی کر بیٹھی ہے تو وہ اسے معاف کر دے لیکن وہ اس کے بھائی کی شریک حیات بننے سے معذور ہے۔ اس وقت نتاشا کو یہ سب کچھ نہایت سہل، سادہ اور واضح معلوم ہوا۔

رستوفوں نے بروز جمعہ گاؤں واپس چلے جانا تھا، لیکن بدھ کو کاؤنٹ متوقع خریدار کے ساتھ ماسکو کے اڑوس پڑوس میں اپنی جاگیر پر چلا گیا۔

جس روز کاؤنٹ باہر گیا، اسی روز سونیا اور نتاشا کو کاراگنوں کے ہاں عظیم الشان ڈنر پارٹی میں شمولیت کی دعوت ملی اور ماریا دمتریونا انھیں وہاں لے گئی۔ اس پارٹی پر نتاشا کی ایک بار پھر اناطول سے ملاقات ہوئی اور سونیا نے دیکھا کہ وہ اس سے کچھ کہہ رہی ہے اور کوشش کر رہی ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہی ہے، کسی کے کانوں میں اس کی بھنک نہ پڑے اور یہ کہ ڈنر کے پورے عرصے کے دوران میں وہ پہلے سے کہیں زیادہ ہیجانی کیفیت میں مبتلا رہی ہے۔ جب وہ گھر پہنچے، نتاشا نے خود ہی وہ بات، جس کا سونیا کو انتظار تھا، چھیڑ دی۔

''دیکھو سونیا، تم ان کے بارے میں ہر قسم کی واہیات باتیں کہتی رہتی ہو،'' نتاشا نے ایسے مسکین لہجے سے، جو بچے اس وقت اختیار کرتے ہیں، جب وہ اپنی تعریف کرانا چاہتے ہوں، کہنا شروع کیا۔ ''انھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔''

''اچھا، کیا کہا اس نے؟ کیا کہا؟ نتاشا، میں بہت خوش ہوں کہ تم مجھ سے ناراض نہیں ہو۔ مجھے سب کچھ بتاؤ۔ ایک ایک بات، کچھ نہ چھپاؤ۔ اس نے کیا کہا تھا؟''

نتاشا سوچ بچار کرنے لگی۔

''اوہ، سونیا، کاش تم بھی انھیں اسی طرح جانتی ہوتیں، جس طرح کہ میں جانتی ہوں! انھوں نے کہا... انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے بلکونسکی کے ساتھ کیا عہد و پیمان کیا تھا۔ جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں جب چاہوں، اسے جواب دے سکتی ہوں، ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔''

سونیا نے دکھ کی گہری سانس لی۔ ''لیکن تم نے بلکونسکی کو جواب تو نہیں دیا، یا دے دیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''شاید میں دے چکی ہوں! ممکن ہے کہ میرے اور بلکونسکی کے مابین اب کوئی تعلق واسطہ نہ رہا ہو۔ لیکن تم میرے بارے میں اتنی اتنی بری بری باتیں کیوں سوچتی ہو؟''

''میں کچھ نہیں سوچتی۔ میں بس یہ سمجھنے سے قاصر ہوں...''

''سونیا، بس کچھ دیر انتظار کرو اور تم سب کچھ سمجھ جاؤ گی۔ تمھیں معلوم ہو جائے گا کہ وہ کس کینڈے کے

انسان ہیں۔ میرے یا ان کے متعلق بری بری باتیں مت سوچو۔"

"میں کسی کا برا نہیں سوچتی۔ میں ہر شخص سے پیار کرتی ہوں اور مجھے ہر شخص سے ہمدردی ہے۔ لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

نتاشا نے اسے پیار اور محبت سے جیتنا چاہا لیکن وہ کسی طرح بھی اس کے قابو میں نہ آئی۔ نتاشا کا چہرہ جتنا نرم اور ملائم ہوتا گیا، سونیا کا اتنا ہی سنجیدہ اور درشت ہونے لگا۔

"نتاشا، تم نے مجھ سے کہا تھا کہ میں اس بارے میں تم سے کوئی بات نہ کروں اور میں نے کی بھی نہیں۔ لیکن اب جب کہ تم نے خود ہی یہ مسئلہ چھیڑ دیا ہے، میں یہ کہوں گی کہ مجھے اس پر اعتبار نہیں۔ یہ رازداری کیوں؟"

"تم پھر شروع ہو گئی ہو!" نتاشا نے اسے ٹوکا۔

"نتاشا، میں تمھارے بارے میں فکرمند ہوں!"

"فکرمندی کس بات کی؟"

"مجھے اندیشہ ہے کہ تم کہیں برباد نہ ہو جاؤ" سونیا نے جی کڑا کر کے کہا اور جو کچھ اس نے کہا تھا، اس پر وہ خود بھی ہیبت زدہ رہ گئی۔

نتاشا کے چہرے پر پھر خفگی کے آثار نمودار ہو گئے۔

"پھر میں اس بربادی کو گلے لگا لوں گی، بالکل لگا لوں گی اور یہ بربادی جتنی جلدی ہو، اتنا ہی بہتر ہوگا! تمھیں اس پھڈے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں ہے۔ برباد تم نہیں، میں ہوں گی! مجھے تنہا چھوڑ دو، مجھے تنہا چھوڑ دو! مجھے تم سے نفرت ہے!"

"نتاشا!" سونیا کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

"مجھے تم سے نفرت ہے، نفرت ہے! تم میری سدا کی دشمن ہو!" اور نتاشا کمرے سے بھاگ گئی۔

نتاشا نے دوبارہ سونیا سے کلام نہ کیا اور وہ اس کے سائے سے بھی بچتی رہی۔ وہ سارے گھر میں بے مقصد ادھر ادھر گھومتی پھرتی رہی۔ اس کے چہرے پر وہی پر از اضطراب تحیر اور احساسِ تقصیر ہویدا تھا۔ کبھی وہ ایک کام میں ہاتھ ڈالتی اور کبھی دوسرے میں، پھر پلک جھپکنے میں اسے چھوڑ چھاڑ کچھ اور شروع کر دیتی۔

سونیا کے لیے یہ کام دشوار ضرور تھا، تاہم وہ مستعدی سے اپنی سہیلی کی نگرانی کرتی رہی اور اس نے ایک لمحے کے لیے بھی اسے اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔

کاؤنٹ کی واپسی سے ایک روز قبل سونیا نے دیکھا کہ نتاشا نے ساری چاشت ڈرائنگ روم کے دریچے کے قریب بیٹھے بیٹھے گزار دی ہے، گویا اسے کسی کا انتظار ہو، اور یہ کہ اس نے ایک افسر کو، جو گاڑی میں سوار ادھر سے گزرا تھا اور جسے اس نے اناطول محمول کیا، کوئی اشارہ کیا تھا۔

سونیا اپنی دوست کی اور بھی چوکسی سے نگرانی کرنے لگی اور اس کے ملاحظے میں آیا کہ اس روز ڈنر کے

دوران میں اور ساری شام نتاشا کی ذہنی کیفیت عجیب و غریب اور غیر فطری رہی ہے۔ اس سے پوچھا کچھ جاتا اور جواب کچھ ملتا، وہ فقرہ شروع کرتی اور اسے ادھورا چھوڑ دیتی، اور بات بے بات ہنسے جا رہی تھی۔

چائے کے بعد سونیا نے ایک نوکرانی کو نتاشا کے دروازے پر کھڑے دیکھا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ اس کے گزرنے کا انتظار کر رہی تھی۔ سونیا نے اس سے کوئی تعرض نہ کیا، اسے اندر جانے دیا اور خود کنسوئیاں لینے دروازے کے ساتھ چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ اسے معلوم ہوا کہ ایک اور خط پہنچایا گیا ہے۔

اچانک سونیا کے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ وہ سمجھ گئی کہ نتاشا اس شام کسی خوف ناک منصوبے پر عمل پیرا ہونا چاہتی ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ نتاشا نے اسے دھتکار دیا اور اندر نہ آنے دیا۔

''وہ اس کے ساتھ فرار ہونا چاہتی ہے!'' سونیا نے سوچا۔ ''اس سے کوئی چیز بعید نہیں۔ خاص طور پر آج اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے، وہ قابل رحم بھی تھے اور عزم کے آئینہ دار بھی۔ اور جب اس نے پاپا کو خدا حافظ کہا تھا، اس کے آنسو نکل آئے تھے،'' سونیا کو یاد آیا۔ ''ہاں، بالکل یہی بات ہے، وہ اس کے ساتھ اُڑنچھو ہو جانا چاہتی ہے۔ لیکن مجھے کیا کرنا چاہیے؟'' وہ سوچ میں پڑ گئی۔ اسے ساری علامات، جو واضح طور پر یہ نشان دہی کر رہی تھیں کہ نتاشا کسی ہیبت ناک منصوبے پر عمل کرنا چاہتی ہے، یاد آنے لگیں۔ ''کاؤنٹ یہاں نہیں ہیں۔ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ کوراگن کو خط لکھ کر پوچھوں کہ یہ سب کیا ہے؟ لیکن اس سے میرے خط کا جواب لکھوائے گا کون؟ پیئر کو لکھوں جیسا کہ پرنس آندرے نے کہا تھا کہ مصیبت کے وقت ان سے رجوع کروں؟... لیکن وہ شاید بلکونسکی کو ٹھکرا چکی ہے۔ اس نے کل پرنسس ماریا کو خط بھیجا تھا۔ اور انکل یہاں نہیں ہیں!''

اور ماریا دمتریونا کو، جو نتاشا پر اندھا اعتماد کرتی تھی، وہ کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی، اس کے نزدیک یہ اقدام بہت خوف ناک تھا۔

''لیکن کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا،'' سونیا نے اندھیری غلام گردش میں کھڑے کھڑے سوچا۔ ''اب مجھے یہ ثابت کرنا ہوگا کہ اس خاندان نے مجھ پر جو عنایات کی ہیں، میں انھیں بھولی نہیں ہوں اور یہ کہ میں نکولس سے پیار کرتی ہوں۔ دوبارہ اس قسم کا موقع کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ ہاں، اگر مجھے بغیر سوئے یہاں مسلسل تین راتیں بھی کھڑے ہونا پڑا، میں اس غلام گردش سے نہیں ہلوں گی اور اسے زبردستی روک لوں گی۔ میں خاندان کے ماتھے پر کبھی کلنک کا ٹیکا نہیں لگنے دوں گی!'' اس نے سوچا۔

16

اناطول حال ہی میں دلوخوف کے ہاں منتقل ہو گیا تھا۔ نتاشا کو اغوا کرنے کا منصوبہ دلوخوف نے چند روز قبل وضع کیا تھا اور اسی نے اس پر عمل کرنے کے انتظامات مکمل کیے تھے۔ اس پر اس روز عمل ہونا تھا، جس روز سونیا نے نتاشا کے دروازے پر سن گن لینے کے بعد اسے بچانے کا تہیہ کیا تھا۔ نتاشا نے وعدہ کیا تھا کہ وہ دس بجے شب عقبی دروازے

پر کوراگن کے پاس پہنچ جائے گی، کوراگن نے اسے سہ اسپی گاڑی میں، جس میں اس نے انتظار کرنا تھا، سوار کرانا اور اسے چالیس میل دور کامینکا گاؤں لے جانا تھا۔ وہاں ان کا نکاح پڑھانے کے لیے ایک معزول پادری نے منتظر ہونا تھا۔ کامینکا میں انھوں نے چند گھوڑوں کا بندوبست بھی کر لیا تھا۔ انھیں ادلتے بدلتے انھوں نے دور، بہت دور وارسا روڈ تک پہنچنا تھا۔ وارسا روڈ پر کام آسان تھا۔ وہاں مختلف مقامات پر ڈاک چوکیاں تھیں۔ ان چوکیوں پر گھوڑے تبدیل کرتے انھیں کسی غیر ملک میں چلے جانا تھا۔

اناطول کے پاس ایک پاسپورٹ، ڈاک گھوڑوں کی فراہمی کا اجازت نامہ اور بیس ہزار روبل تھے۔ دس ہزار روبل اس نے اپنی بہن سے ادھار لیے تھے اور دس ہزار دلوخوف کی مدد سے اکٹھے کیے تھے۔

نقلی شادی کے دو گواہ دلوخوف کے سامنے کے کمرے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ ان میں سے ایک کا نام خوستی کوف تھا۔ وہ ریٹائرڈ ادنیٰ افسر تھا اور دلوخوف اسے اپنے قمار بازی کے دھندے میں استعمال کرتا تھا۔ دوسرا ماکارن تھا۔ کسی زمانے میں وہ ہوزار دستے میں خدمات سرانجام دیتا تھا۔ وہ نیک طینت اور بودا انسان تھا۔ وہ کوراگن پر جان چھڑکتا تھا۔

دلوخوف اپنے کشادہ سٹڈی روم میں، جس کی دیواروں پر چھت سے فرش تک ایرانی غالیچے، ریچھوں کی کھالیں اور مختلف قسم کے ہتھیار لٹک رہے تھے، سفری چغہ اور بوٹ پہنے میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ میز کی درازیں کھلی تھیں۔ اس پر گنتارا[32] اور نوٹوں کی گدیاں پڑی تھیں۔

اُناطول، جس کی وردی کے بٹن کھلے تھے، اس کمرے، جہاں گواہان بیٹھے تھے، سٹڈی روم اور عقبی کمرے کے، جس میں اس کا فرانسیسی اردلی اور دوسرے ملازمین اس کا بچا کھچا سامان سمیٹ رہے تھے، مابین چکر کاٹ رہا تھا۔ دلوخوف رقوم گن رہا اور کاغذ پر ان کا اندراج کر رہا تھا۔

''ہونہہ،'' اس نے کہا۔ ''خوستی کوف کو لازماً دو ہزار روبل دینا ہوں گے۔''

''پھر دے دو،'' اناطول نے جواب دیا۔

''ماکارکا'' (وہ ماکارن کو اسی نام سے پکارتے تھے) ''خواہ اسے دھیلا بھی نہ دو، تمھاری خاطر آگ میں کودنے اور کنوئیں میں چھلانگ لگانے سے گریز نہیں کرے گا۔ چنانچہ ہمارے تمام حسابات طے پا گئے ہیں،'' دلوخوف نے اسے کھاتا دکھاتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے؟''

''ہاں، ٹھیک ہے۔'' صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے دلوخوف کی بات سنی ان سنی کر دی ہے۔ وہ سیدھا سامنے دیکھ رہا تھا اور مستقلاً مسکرائے جا رہا تھا۔

دلوخوف نے دھماکے سے دراز کا ڈھکنا بند کر دیا اور طنزیہ انداز سے مسکراتا کوراگن کی طرف متوجہ ہوا۔

''دیکھو، اب بھی وقت ہے۔ تمھارے حق میں بہتر یہی ہے کہ اس سارے دھندے سے ہاتھ اٹھا لو!'' دلوخوف نے کہا۔

''احمق!'' اناطول نے پٹ جواب دیا۔ ''بکواس مت کرو! کاش تمھیں معلوم ہوتا۔ صرف میں جانتا ہوں یا شیطان کہ میرے لیے یہ معاملہ کتنا اہم ہے!''

''نہیں۔ واقعی، چھوڑو، جانے دو!'' دلوخوف نے کہا۔ ''میں سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں۔ یہ تم نے جو سازش تیار کی ہے، مذاق کی بات نہیں ہے۔''

''تم کہنا کیا چاہتے ہو؟۔ مجھے اشتعال دلانا؟ جہنم میں جاؤ!'' اناطول نے منہ بنا کر کہا۔ ''سچ پوچھو تو مجھ میں تمھارے یہ بھونڈے مذاق برداشت کرنے کا یارا نہیں،'' اس نے مزید کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

دلوخوف نے پر از نخوت اور حقارت آمیز انداز سے مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

''ذرا ٹھہرو،'' اس نے آواز دی۔ ''میں مذاق نہیں کر رہا، بالکل سنجیدگی سے بات کر رہا ہوں، ادھر آؤ۔ اب آ بھی جاؤ۔''

اناطول واپس آ گیا اور دلوخوف کا منہ تکنے لگا۔ وہ اس پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن بظاہر اپنے ارادے کے علی الرغم اس کے سامنے ہار مان رہا تھا۔

''اب میری بات ذرا غور سے سنو۔ یہ میں آخری مرتبہ تم سے کہہ رہا ہوں۔ آخر مجھے مذاق کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا میں نے کبھی تمھیں زک پہنچانے کی کوشش کی ہے؟ تمھارے لیے یہ سارے انتظامات کس نے کیے ہیں؟ پادری کس نے ڈھونڈا؟ پاسپورٹ کس نے بنوایا؟ رقم کس نے اکٹھی کی؟ یہ سب کچھ میں نے کیا!''

''اس تکلیف کے لیے میں تمھارا شکر گزار ہوں۔ تمھارا خیال ہے کہ میں ناشکرا ہوں؟'' اناطول نے گہری سانس لی اور دلوخوف سے لپٹ گیا۔

''میں نے تمھاری مدد تو کر دی ہے، پھر بھی میں تمھیں سچائی سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ جس راستے پر تم چل پڑے ہو، بڑا خطرناک ہے، اور اگر تم غور کرو تو حماقت سے بھی بھرپور۔ تم اسے اٹھا لے جاتے ہو۔ بہت خوب، سبحان اللہ۔ لیکن تمھارے خیال میں وہ معاملے کو یہیں ختم کر دیں گے؟ یہ راز کھل جائے گا کہ تم پہلے ہی شادی شدہ ہو۔ وہ تمھیں مجرمانہ کارروائی کے الزام میں گرفتار کرا دیں گے...''

''بکواس، نری بکواس!'' اناطول کے منہ سے نکلا اور اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ ''میں نے ہر چیز کھول کر تمھیں بتائی نہیں؟ ہونہہ؟''

کودن اور کوتاہ اندیش اشخاص کی یہ عجیب افتاد ہوتی ہے کہ اپنے استدلال کے ذریعے وہ جس نتیجے پر پہنچتے ہیں، اس کی بار بار وضاحت کرنے کا انھیں بہت شوق ہوتا ہے۔ اناطول بھی اس سے مستثنیٰ نہیں تھا۔ وہ جن دلائل کو سو مرتبہ دہرا چکا تھا، ایک بار پھر ان کا اعادہ کرنے لگا۔

''میں پہلے ہی تمھارے سامنے وضاحت کر چکا ہوں کہ میری نظروں میں معاملہ کچھ یوں ہے: اگر یہ شادی غیر قانونی ٹھہرائی گئی،'' اس نے اپنی ایک انگلی ٹیڑھی کرتے ہوئے کہا، ''اس کا مطلب کیا ہوگا کہ مجھے کسی بات کے

لیے جواب وہ نہیں ہونا پڑے گا۔ لیکن اگر یہ شادی قانونی متصور ہوئی، پھر اللہ اللہ خیر سلا۔ غیر ملک میں کسی کو اس معاملے کی کانوں کان خبر نہیں ہوگی ــ ٹھیک ہے یا نہیں؟ پھر مجھ سے بحث مت کرو! مت کرو!''

''میں پھر سنجیدگی سے مشورہ دے رہا ہوں: بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ نہ ڈالو، خواہ مخواہ مصیبت مول لے لو گے!''

''جہنم میں جاؤ!'' اناطول نے کہا۔ اس نے اپنا سر دونوں ہاتھوں میں پکڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا لیکن ترت واپس آ گیا اور کرسی پر پاؤں ٹکا کر دلوخوف کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''بڑی بھیانک صورت ہے! ہونہہ؟ دیکھو، کیسے دھک دھک کر رہا ہے!'' اس نے دلوخوف کا ہاتھ پکڑا اور اپنے دل پر رکھ دیا۔ ''ارخ، مائی ڈیئر فیلو، وہ ننھا منا پاؤں! وہ نظر! دیوی ہے وہ، دیوی! ہونہہ؟''

دلوخوف سرد مہری سے مسکرایا۔ اس کی خوبصورت اور گستاخ آنکھوں میں چمک آ گئی۔ اس نے اناطول کی جانب یوں دیکھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی اس کا جی نہیں بھرا، وہ اپنی تفریح کے لیے اسے مزید تختۂ مشق بنانا چاہتا ہے۔

''اچھا، جب روپیہ ختم ہو جائے گا، پھر؟''

''پھر؟ ہونہہ؟'' اناطول نے دہرایا۔ مستقبل کے خیال نے اسے واقعی اچنبھے میں ڈال دیا تھا۔ ''پھر؟ مجھے کیا معلوم... لیکن فضول باتیں کرنے کا فائدہ؟'' اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''وقت ہو گیا!''

اناطول عقبی کمرے میں چلا گیا۔

''تیاری مکمل نہیں ہوئی؟ جلدی کرو۔ کیوں وقت ضائع کر رہے ہو؟'' وہ نوکروں پر برس پڑا۔

دلوخوف نے رقم ایک طرف رکھی، ایک وردی پوش خدمت گار کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ کچھ کھانے پینے کا سامان لے آئے تاکہ وہ سفر سے پہلے پیٹ پوجا کر سکیں۔ وہ خود اس کمرے کی، جس میں خوستی کوف اور ماکارن بیٹھے تھے، طرف چل دیا۔

اناطول سٹڈی روم میں صوفے پر لیٹ گیا۔ وہ کہنی پر جھکا اور خواب گین کیفیت میں مسکراتا زیرِ لب اپنے آپ سے کچھ کہہ رہا تھا۔

''ادھر آ جاؤ اور کچھ کھا لو۔ ایک گھونٹ ہی لگا لو'' دلوخوف نے ملحقہ کمرے سے چلا کر کہا۔

''مجھے کچھ نہیں چاہیے،'' اناطول نے کہا۔ وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔

''آ جاؤ۔ بالا گا پہنچ گیا ہے۔''

اناطول اٹھا اور ڈائننگ روم میں چلا گیا۔ بالا گا سہ اسپی گاڑیوں کا زبردست اور مشہور کوچوان تھا۔ وہ دلوخوف اور اناطول کو گزشتہ چھ برسوں سے جانتا تھا اور ان کے خوب کام آتا رہتا تھا۔ جب اناطول کی رجمنٹ تور میں مقیم تھی، وہ متعدد بار شام کو اناطول کے ساتھ تور سے روانہ ہوا، علی الصبح اسے ماسکو لایا اور اگلی رات دوبارہ اسے واپس پہنچا دیا۔ اس نے ایک سے زیادہ مرتبہ دلوخوف کو اس کے متعاقبین سے بچنے میں مدد دی تھی۔ اس نے متعدد مرتبہ

انھیں جپسیوں اور اس کے اپنے بقول ''ننھی منی بیبیوں'' کی معیت میں اپنی گاڑی میں شہر کے مختلف علاقوں میں گھمایا پھرایا تھا۔ ان کی ملازمت کے دوران میں اس نے ماسکو کے گلی کوچوں میں متعدد بار اپنی گاڑی پاپیادہ لوگوں پر چڑھائی تھی اور دوسروں کی گاڑیاں الٹائی تھیں۔ اس کی ان حرکتوں کے نتائج وعواقب سے اس کے ''جنٹل مینوں'' نے، جیسا کہ وہ انھیں کہا کرتا تھا، ہمیشہ اسے بچایا تھا۔ اس نے ان کی ملازمت کے دوران میں متعدد گھوڑوں کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ انھوں نے متعدد مرتبہ اس کی پٹائی کی تھی اور متعدد بار اسے شیمپین اور مدیرا،[33] جس پر اس کی جان جاتی تھی، پلا کر نشے میں چور کیا تھا۔ خود اسے ان دونوں کے بارے میں ایک ایک دو دو باتیں ایسی معلوم تھیں جن کی پاداش میں ایک عام آدمی کو کبھی کا سائبیریا بھیجا جا چکا ہوتا۔ وہ اکثر اسے اپنی خرمستیوں میں شریک کر لیتے، جی بھر کر اسے شراب پلاتے اور جپسیوں کے ہاں اس سے رقص کراتے، اور ان کے ہزاروں روبل اسی کے ذریعے آر پار ہو جاتے۔ ان کی ملازمت کے دوران میں وہ سال میں کوئی بیس مرتبہ ان کی خاطر اپنا سر اوکھلی میں دیتا اور اپنی جان ہتھیلی پر لیے لیے پھرتا رہتا۔ جتنی رقم وہ اسے ادا کرتے تھے، اس سے کہیں زیادہ قیمت کے گھوڑے وہ ان کی خاطر تھکا تھکا کر مار دیتا۔ لیکن وہ انھیں پسند کرتا تھا، اسے کوچوانی سے عشق تھا اور بارہ میل فی گھنٹہ کی مجنونانہ رفتار سے گاڑی چلانے کا شوق رکھتا تھا۔ دوسرے کوچوانوں کی چیخیں بلا دینے یا پیادہ لوگوں پر گاڑی چڑھا دینے اور ماسکو کے گلی کوچوں میں سرپٹ گھوڑے دوڑانے میں اسے لطف آتا تھا۔ ادھر نشے میں ڈوبے ہوئے اور ہوش وحواس سے عاری تماش بین جب ''تیز، اور تیز'' کے نعرے بلند کرتے، اسے بڑا مزہ آتا، حالانکہ رفتار میں مزید اضافہ ناممکن ہوتا تھا۔ اسے کسی کسان کی، جو مُردہ زیادہ اور زندہ کم نظر آتا تھا اور جو پہلے ہی بھاگم بھاگ اس کے راستے سے ہٹنے کی کوشش کر رہا ہوتا، گردن پر چابک سے تکلیف دہ ضرب لگانا اچھا لگتا تھا۔ وہ انھیں ''اصلی اور کھرے جنٹل مین'' سمجھا کرتا تھا۔

اناطول اور دلوخوف بھی بالاگا کو اس کی ماہرانہ کوچوانی کی وجہ سے پسند کرتے تھے اور پھر وہ اس وجہ سے بھی ان کی نگاہوں میں سمایا ہوا تھا کیونکہ جو چیزیں انھیں مرغوب تھیں، وہ انھیں پسند کرتا تھا۔ دوسروں کے ساتھ بالاگا مول تول کرتا تھا، دو گھنٹوں کی کوچوانی کے عوض پچیس روبل وصول کرتا تھا، خود کم جاتا تھا اور اپنے کسی ''پٹھے'' کو زیادہ بھیجتا تھا۔ لیکن اپنے ''جنٹل مینوں'' کی کوچوانی وہ ہمیشہ خود کرتا تھا اور کبھی اپنی خدمات کا معاوضہ طلب نہیں کرتا تھا۔ سال میں صرف دو تین مرتبہ جب اسے ان کے اردلیوں کی زبانی معلوم ہوتا کہ ان کی جیبوں میں رقمیں ہیں، وہ صبح سویرے آموجود ہوتا، اس وقت وہ پوری طرح ہوش حواس میں ہوتا، وہ انھیں خاصا جھک کر سلام کرتا اور عرض کرتا کہ اس کی مدد کی جائے۔ ''جنٹل مین'' ہمیشہ اسے بٹھا لیتے۔

''فیودر ایوانچ، جناب عالی،'' یا ''یوئر ایکسی لینسی، میری دستگیری فرمائیں،'' وہ التجا کرتا۔ ''میرے پاس گھوڑے نہیں رہے، میری دستگیری فرمائیں۔ جو کچھ ہو سکے، مجھے عطا فرمائیں تاکہ میں میلے جا سکوں۔''

اور اناطول اور دلوخوف، جب ان کے پاس رقم ہوتی، اسے ہزار دو ہزار روبل دے دیتے۔

بالاگا اصلاً کسان تھا۔ وہ ستائیس سے ذرا اوپر تھا۔ اس کا قد ناٹا، جسم گٹھا ہوا، ناک چھوٹی اور قدرے ابھری ہوئی، بال بھورے، چہرہ سرخ، گردن موٹی اور نمایاں طور پر لال تھی۔ اس کی مہین آنکھیں ہر دم چمکتی رہتی تھیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی تھی۔ وہ بھیڑ کی پوستین کے چغے کے اوپر نفیس نیلا کوٹ، جس کا استر ریشمی کپڑے کا تھا، پہنے ہوئے تھا۔

کمرے میں داخل ہونے کے بعد وہ پہلے کونے میں گیا۔ وہاں اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ پھر وہ دلوخوف کے حضور حاضر ہوا اور اس نے اپنا میلا کچیلا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''فیودر ایوانچ!'' اس نے دو زانو ہو کر کہا۔

''سلام، دوست، سلام! لیجیے صاحب، وہ آ گیا ہے!''

''یور ایکسی لینسی، آداب،'' اس نے اناطول کی، جو ابھی ابھی کمرے میں آیا تھا، طرف اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''بالاگا، میں کہتا ہوں،'' اناطول نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمھیں مجھ سے ذرا سی محبت ہے، پھر اس کے اظہار کا وقت آ گیا ہے... کیسے گھوڑے لائے ہو؟ ہونہہ؟''

''جیسا کہ آپ کے ایلچی نے کہا تھا، آپ کے پسندیدہ گھوڑے لایا ہوں،'' بالاگا نے کہا۔

''بالاگا، غور سے سنو۔ تمھارے تینوں گھوڑے جان سے جاتے ہیں، تو جائیں، لیکن مجھے وہاں تین گھنٹوں میں پہنچا دو۔ سنا؟''

''اگر ہم نے انھیں بھگا بھگا کر مار دیا، پھر وہاں کیسے پہنچیں گے؟'' بالاگا نے آنکھ مار کر پوچھا۔

''یہ مذاق وذاق رہنے دو، ورنہ وہ جھانپڑ دوں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا!'' اناطول نے قہر آلود نظروں سے اسے گھورتے ہوئے چلا کر کہا۔

''مذاق کون کر رہا ہے؟'' کوچوان ہنسا۔ ''گویا میں اپنے جنٹل مین کو کوئی چیز دینے سے بخل کروں گا۔ اپنی تو جان بھی حاضر ہے! ہم اتنا تیز، اتنا تیز جائیں گے کہ کوئی کاہے کو اتنا دوڑا ہو گا۔''

''واہ!'' اناطول کے منہ سے نکلا۔ ''خیر بیٹھو۔''

''ہاں، بیٹھ جاؤ،'' دلوخوف نے کہا۔

''فیودر ایوانچ، میں کھڑا ہی اچھا ہوں۔''

''واہیات! بیٹھ جاؤ۔ کچھ پی لو،'' اناطول نے کہا اور اس کے لیے مدیرا شراب کا بڑا گلاس لبالب بھر دیا۔ مے انگور دیکھ کر کوچوان کی آنکھیں چمچمانے لگیں۔ تقاضائے آداب کے پیش نظر پہلے تو اس نے ذرا نہ نہ کی، پھر گلاس اٹھایا اور غٹا غٹ چڑھا گیا، ٹوپی سے ریشمی رومال نکالا اور اس سے اپنا منہ پونچھ لیا۔

''یور ایکسی لینسی، ہماری روانگی کب ہے؟''

''ہونہہ...'' اناطول نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''ہمیں ابھی روانہ ہونا ہے۔ دیکھو، بالاگا، تمھیں ہمیں وقت پر وہاں پہنچانا ہوگا۔ ہونہہ؟''

''یہ تقدیر کا کھیل ہے۔ اگر شروع میں ہی قسمت نے ہماری یاوری کی اور ہماری روانگی میں تاخیر نہ ہوئی، پھر کوئی وجہ نہیں کہ ہم وہاں وقت پر نہ پہنچ سکیں،'' بالاگا نے جواب میں کہا۔ ''کیا میں نے آپ کو تور سات گھنٹے میں نہیں پہنچایا تھا؟ یورایکسی لینسی، آپ کو یقیناً یاد ہوگا؟''

''تمھیں معلوم ہے کہ ایک مرتبہ کرسمس کے موقع پر ہم تور سے روانہ ہوئے،'' اناطول نے یادوں پر مسکراتے اور ماکارن کی، جس کی پرشوق اور پرلگن نگاہیں اسی پر جمی ہوئی تھیں، طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''اور ماکارکا، کیا تم یقین کرو گے کہ ہماری رفتار اتنی تیز تھی کہ ہماری اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی نیچے رہ گئی؟ راستے میں برف گاڑیوں کا، جو لدی ہوئی تھیں، قافلہ آ گیا اور ہم ان میں سے دو کے اوپر سے کود گئے۔ سنا؟''

''وہ اصیل گھوڑے تھے!'' بالاگا نے داستان کا سرا اٹھایا۔ ''اس وقت'' اس نے دلوخوف کی طرف مخاطب ہو کر اپنی بات آگے بڑھائی، ''میں نے دو نوخیز گھوڑے دائیں بائیں جوتے اور مشکی گھوڑا بیچ میں ڈالا۔ فیودر ایوانچ، یقین مانیں، یہ جانور چالیس میل تک ہوا سے باتیں کرتے رہے۔ انھیں سنبھالنا محال ہو رہا تھا۔ پالے میں میرے ہاتھ سُن ہو گئے، چنانچہ میں نے باگیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ 'یورایکسی لینسی، ذرا سنبھل کر بیٹھیں،' میں نے کہا۔ اور میرا یہ حال کہ میں لڑھکتا لڑھکتا گاڑی کے عقب میں پہنچ گیا اور وہیں پڑا رہا۔ انھیں تیز چلنے کے لیے اکسانے کی ضرورت ہی نہیں تھی — اور جب تک وہ ٹھکانے پر نہ پہنچ گئے، انھیں روکا ہی نہ جا سکا۔ ان ابلیس کے بچوں نے ہمیں تین گھنٹوں میں وہاں پہنچا دیا! صرف دائیں ہاتھ کا خدا کو پیارا ہو گیا۔''

17

اناطول کمرے سے باہر نکل گیا اور چند منٹ بعد واپس آ گیا۔ اس نے سمور کا کوٹ پہن لیا تھا۔ اس کی کمر کے گرد نقرئی پیٹی بندھی ہوئی تھی۔ اس نے سیاہ رنگ کی ٹوپی ترچھے انداز سے اپنے سر پر ٹکا رکھی تھی اور یہ اس کے وجیہہ چہرے پر خوب پھب رہی تھی۔ اس نے آئینے کے روبرو اپنے سراپے پر نظر ڈالی اور پھر جس انداز سے آئینے کے سامنے کھڑا تھا، اسی انداز سے وہ دلوخوف کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے انگوری شراب کا گلاس اٹھایا۔

''اچھا، فدیا، خدا حافظ اور میری خاطر تم نے جو جو تکلیف اٹھائی، اس کے لیے شکریہ... خدا حافظ!'' اناطول نے کہا۔ ''اور ہاں، دوستو، ساتھیو، اب...'' اس نے ایک لحظہ سوچا۔ ''میرے عہد شباب کے دوستو، ساتھیو... خدا حافظ'' اس نے ماکارن اور دوسروں کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

اگرچہ وہ بھی اس کے ہمراہ جا رہے تھے، وہ اپنے ساتھیوں سے جس انداز سے خطاب کر رہا تھا، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اس گفتگو کو کسی نہ کسی طور سنجیدہ اور متاثر کن بنانے کے درپے ہے۔ وہ اپنا سینہ پھلائے اور

ایک ٹانگ کو قدرے آگے پیچھے جھلاتے سوچے سمجھے اور بلند آہنگ لہجے سے بولے جا رہا تھا۔

"سب گلاس تھام لو۔ بالاگا تم بھی۔ ہاں تو میرے عہد شباب کے دوستو اور ساتھیو، ہم سب نے مل جل کر خوب رنگ رلیاں منائیں، مل جل کر صحیح معنوں میں زندگی گزاری، مزے کیے، لطف اٹھایا۔ ہونہہ؟ پھر اب ہماری دوبارہ ملاقات کب ہوگی؟ میں وطن سے باہر جا رہا ہوں... ہم سب مل کر دھوم مچاتے اور عیش کرتے رہے ہیں اور اب جوانو، خدا حافظ، اور یہ رہا تمھارا جام صحت! ہرّا!" اس نے چلا کر کہا، اپنا گلاس خالی کیا اور اسے فرش پر دے مارا۔

"اور یہ رہا آپ کا جام صحت!" بالاگا نے کہا۔ اس نے بھی اپنا گلاس خالی کر دیا اور رومال سے منہ صاف کرنے لگا۔

ماکارن اناطول سے بغل گیر ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

آہ، پرنس، آپ سے جدا ہوتے میرا کلیجا پھٹ رہا ہے،" اس نے کہا۔

آؤ چلیں، چلیں!" اناطول چلایا۔

بالاگا چل پڑا۔

"نہیں، ٹھہرو!" اناطول نے کہا۔ "دروازہ بند کر دو۔ ہمیں رسم پوری کرنا چاہیے۔ آؤ، ذرا بیٹھ جائیں،[34] پھر چلیں گے، صحیح طریقہ یہی ہے۔"

انھوں نے دروازہ بند کر دیا اور سب بیٹھ گئے۔

"جوانو، اب چلو، ذرا تیز قدم بڑھاؤ!" اناطول نے اٹھتے ہوئے کہا۔

اس کے اردلی جوزف نے اسے چرمی کیسہ اور شمشیر تھما دی اور وہ سب پیش دالان میں چلے گئے۔

"اور سمور کا کوٹ کہاں ہے؟" دلوخوف نے پوچھا۔ "اے، اگناشکا، دوڑ کر جاؤ اور ماتر دیانا ماتریونا سے سیاہ کوٹ کے بارے میں دریافت کرو۔ عورتیں جب اپنے آشناؤں کے ساتھ بھاگتی ہیں، تب کیا ہوتا ہے، میں نے اس کے متعلق کچھ سن رکھا ہے،" دلوخوف نے آنکھ مار کر کہا۔ "جب وہ بھاگم بھاگ باہر آئے گی، اس میں زندگی کی رمق کم اور اس کے چہرے پر مردنی زیادہ ہوگی۔ گھر میں اس نے جو کچھ پہن رکھا ہوگا، جلد بازی میں بس اسی میں چل پڑے گی۔ ذرا سی بھی تاخیر ہوئی، بس ٹپ ٹپ آنسو بہنا شروع ہو جائیں گے اور 'ڈیئر ماما اور پاپا' کی گردان شروع ہو جائے گی۔ اور پیشتر اس کے کہ آپ کو اندازہ ہو کہ کیا ہوا، اس کی قلفی جم چکی ہوگی اور وہ واپس جانا چاہے گی۔ بس فوراً اسے چغا اڑھا دو اور گاڑی میں بٹھا دو۔"

ایک خدمت گار زنانہ کوٹ لے آیا۔ اس کے اندر لومڑی کے سمور کا استر تھا۔

"احمق، گاؤدی! میں نے تمھیں سیاہ چغا لانے کو کہا تھا! اے، ماتریانا، کالے والا!" اس نے اتنے زور سے چلا کر کہا اس کی آواز کی گونج تمام کمروں میں سنائی دی۔

ایک خوبصورت، دبلی پتلی، نازک اندام جپسی دوشیزہ، جس کے بال بلیو بلیک اور گھونگریالے، آنکھیں روشن

اور سیاہ، اور چہرہ پیلا تھا، اپنے بازو پر سیاہ چغا ڈالے بھاگتی آئی۔

''یہ رہا، لے لیں، میں برا نہیں مناتی،'' اس نے کہا۔ بظاہر اپنے آقا کے سامنے خوف سے اس کی جان بھی نکلی جا رہی تھی اور چغے کا ہاتھ سے جاتے رہنا بھی اسے پسند نہیں آ رہا تھا۔

دلوخوف نے جواب دیے بغیر چغا پکڑ لیا اور آگے بڑھ کر اسے ماترویانا کے جسم کے گرد لپیٹ دیا۔

''اس طرح،'' دلوخوف نے کہا۔ ''اور اس طرح۔'' اس نے کوٹ کا کالر کچھ اس طرح اس کے سر کے گرد لپیٹ دیا کہ چہرے کے لیے باریک سی جھری باقی رہ گئی۔ ''اور پھر اس طرح، دیکھ رہے ہو؟'' اور اس نے اناطول کا سر آگے دھکیل دیا تا کہ وہ کالر کی جھری، جس میں ماترویانا کی چمکتی دمکتی مسکراہٹ دکھائی دے رہی تھی، دیکھ سکے۔

''اچھا، ماترویانا، خدا حافظ،'' اناطول نے اس کے گال پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔ ''آہ، یہاں میرے عیش ونشاط کے دن پورے ہوئے! استیوشکا[35] کو میرا سلام کہنا۔ خدا حافظ، ماترویانا! خدا حافظ! میرے لیے دعا کرنا!''

''پرنس، خداوند آپ کا دامن خوشیوں سے بھر دیں!'' ماترویانا نے خپسی لہجے سے کہا۔

پورچ میں دو سہ اسپی گاڑیاں کھڑی تھیں اور دو ہٹے کٹے نوجوان کوچوان گھوڑوں کی باگیں تھامے ہوئے تھے۔ بالاگا اگلی برف گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی کہنی اوپر اٹھائی اور راسیں درست کرنے لگا۔ اناطول اور دلوخوف اس کی گاڑی میں سوار ہو گئے۔ ماکارن، خوستی کوف اور خدمت گار دوسری گاڑی میں بیٹھ گئے۔

''سب تیار ہو گئے؟'' بالاگا نے پوچھا۔ ''چلو!'' اس نے باگیں اپنے ہاتھ کے اردگرد لپیٹتے ہوئے چلا کر کہا اور سہ اسپی گاڑی نکتسکی خیابان پر فرائے بھرنے لگی۔

''ہاہاہ!... ارے، دھیان سے!... تاہ تاہ!'' بالاگا اور نوجوان کوچوان کی، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، بس یہی چیخ پکار سنائی دے رہی تھی۔

آرباط سکوائر میں سہ اسپی گاڑی کسی دوسری گاڑی سے ٹکرا گئی، کوئی چیز تڑخی، چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں اور سہ اسپی گاڑی آرباط سٹریٹ پر سرپٹ بھاگتی رہی۔ جب وہ پدنو ونسکی خیابان پوری کی پوری طے کر چکے، بالاگا پیچھے مڑا اور پرانی کونی یوشینایا سٹریٹ کے چوک پر رک گیا۔

گھوڑوں کو تھامنے نوجوان کوچوان نیچے کود آیا اور اناطول اور دلوخوف فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ جب وہ گیٹ کے پاس پہنچے، دلوخوف نے سیٹی بجائی۔ سیٹی کے جواب میں سیٹی آئی اور ایک نوکرانی بھاگتی باہر آئی۔

''یہاں صحن میں تشریف لے آئیں، نہیں تو کوئی آپ کو دیکھ لے گا، وہ ابھی آئیں کہ آئیں،'' اس نے کہا۔

دلوخوف گیٹ پر ٹھہرا رہا۔ اناطول نوکرانی کے پیچھے پیچھے صحن میں چلا آیا، موڑ مڑا اور دوڑتا بھاگتا پورچ میں پہنچ گیا۔

اس کے سامنے ماریا دمتریونا کا دیوقامت وردی پوش ملازم گاوریلو کھڑا تھا۔

''جناب، ادھر سے، مالکن کے پاس،'' ملازم نے اس کی واپسی کا راستہ روکتے گلے سے آواز نکال کر کہا۔

''کون سی مالکن؟ کون ہو تم؟'' اناطول نے زیرلب پوچھا۔ اس کی سانس پھول رہی تھی۔

''تشریف لائیں، جناب۔ مجھے حکم ملا ہے کہ آپ کو اندر پہنچا دوں۔''

''کوراگن، واپس آجاؤ!'' دلوخوف چلایا۔ ''تمھارے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ واپس آجاؤ!''

دلوخوف، جو گیٹ کے پاس کھڑا تھا، اب وہیں ہاؤس پورٹر کے، جو تالا لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اناطول بچ کر جانے نہ پائے، ساتھ گتھم گتھا ہو رہا تھا۔ دلوخوف نے عالم بے چارگی میں آخری مرتبہ زور لگایا اور اس نے پورٹر کو ایک طرف دھکیل دیا۔ اس نے اناطول کا، جو سر پر پاؤں رکھے بھاگا آرہا تھا، بازو پکڑا، اسے دروازے سے باہر گھسیٹا اور اس کے ساتھ سہ اسپی گاڑی کی طرف دوڑنے لگا۔

18

ماریا دمتریونا نے سونیا کو غلام گردش میں روتے دیکھ لیا اور اس سے سب کچھ اگلوا لیا تھا۔ نتاشا کے نام جو خط لکھا گیا تھا، وہ اس نے راستے ہی میں دبوچ لیا، اس نے اسے پڑھا اور وہ اسے پکڑے نتاشا کے کمرے میں گھس گئی۔

''بے شرم، بے حیا چھوکری!'' وہ گرجی۔ ''میں ایک لفظ بھی نہیں سنوں گی!''

اس نے نتاشا کو، جو حیران و ششدر نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی لیکن جس کی آنکھیں بالکل خشک تھیں، پیچھے دھکیلا، اسے کمرے میں بند کیا اور باہر سے تالا لگا دیا۔ اس نے پورٹر کو حکم دیا کہ جو لوگ شام کو آئیں، انھیں اندر تو آنے دینا لیکن انھیں باہر نہ نکلنے دینا۔ پھر اس نے وردی پوش ملازم کو حکم دیا۔ ''انھیں میرے پاس لے آنا۔'' اس کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں جا بیٹھی اور اغوا کاروں کا انتظار کرنے لگی۔

جب گاوریلو نے اسے اطلاع پہنچائی کہ وہ اشخاص آئے ضرور تھے لیکن فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں، وہ تیوریاں چڑھاتے کرسی سے اٹھی، اپنے ہاتھ ایک دوسرے میں پھنسائے، انھیں اپنی کمر پر ٹکایا اور خاصی دیر تک کمرے میں چکر لگاتی رہی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ آدھی رات کے لگ بھگ وہ جیب میں چابی ٹٹولتے نتاشا کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ سونیا غلام گردش میں بیٹھی سسکیاں لے رہی تھی۔

''ماریا دمتریونا، خدا کا واسطہ، مجھے اس کے پاس جانے دیں!'' اس نے ملتجیانہ لہجے سے کہا۔

لیکن ماریا دمتریونا نے تالا کھولا اور اسے جواب دیے بغیر اندر چلی گئی۔

''کریہہ! قبیح! مذموم!... میرے گھر میں... بے حیا چھنال! مجھے تو بس اس کے باپ پر ترس آرہا ہے،'' ماریا دمتریونا نے اپنے غیظ و غضب پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ ''کام مشکل ضرور ہے، تاہم میں کوشش کروں گی کہ وہ اپنی زبانیں بند رکھیں اور کاؤنٹ کو کچھ پتا نہیں چلنے دوں گی۔''

وہ ثابت قدم چلتی کمرے میں داخل ہو گئی اور اسے نتاشا منہ سر ہاتھوں میں چھپائے صوفے پر لیٹی نظر آئی۔ وہ اپنی جگہ سے قطعاً نہیں ہلی تھی، بلکہ وہ بالکل اسی حالت میں لیٹی پڑی تھی جس حالت میں ماریا دمتریونا اسے چھوڑ

کر گئی تھی۔

''بہت خوب! بہت اعلیٰ! کیا کہنے!'' ماریا دمتریونا بولی۔ ''کیا سمجھا ہے تم نے میرے گھر کو کہ آنکھ بچا کر یاروں سے ملاقاتیں کرتی پھر رہی ہو! کوئی مکر نہیں چلے گا اب۔ جب میں بات کروں، تو تمھارا فرض ہے کہ اسے غور سے سنو!'' اور ماریا دمتریونا نے نتاشا کو ذرا بازو سے جھنجھوڑا۔ ''جب میں کچھ کہوں، تو تمھارا فرض ہے کہ اسے توجہ سے سنو! تم نے عام گری پڑی قطامہ کی طرح اپنے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا لگا لیا ہے۔ اگر مجھے تمھارے باپ کا خیال نہ ہوتا، پتا نہیں میں تمھارے ساتھ کیا سلوک کرتی! تا ہم میں یہ ٹھان چکی ہوں کہ اسے اس معاملے کی ہوا بھی نہیں لگنے دوں گی۔''

نتاشا جوں کی توں پڑی رہی، تا ہم اس کا سارا جسم بے آواز اور لرزہ فگن سسکیوں سے کھنچا جا رہا تھا اور اسے اپنا دم گھٹتا محسوس ہو رہا تھا۔ ماریا دمتریونا نے نظر اٹھا کر سونیا کی طرف دیکھا اور نتاشا کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔

''اس کی قسمت اچھی تھی کہ میرے ہاتھوں سے بچ گیا۔ خیر، چھوڑوں گی میں بھی نہیں اسے، ڈھونڈ نکالوں گی!'' اس نے اپنے سخت گیر لہجے سے کہا۔ ''میں جو کچھ کہہ رہی ہوں، سن رہی ہو یا نہیں؟''

اس نے اپنا لمبا چوڑا ہاتھ نتاشا کی ٹھوڑی کے نیچے رکھا اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔ لیکن جب ماریا دمتریونا اور سونیا کی نظریں نتاشا کے چہرے پر پڑیں، انھیں سخت جھٹکا لگا، اس کی آنکھیں خشک اور درخشاں تھیں، اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے اور گال اندر دھنسے ہوئے تھے۔

''مجھے چھوڑ دیں... مجھے کیا... میں مر... مر جاؤں گی!'' وہ بڑبڑائی۔ اس نے جھٹکا مارا، ماریا دمتریونا کی گرفت سے اپنے آپ کو چھڑایا اور دوبارہ پہلے کی طرح لیٹ گئی۔

''نتالیا!'' ماریا دمتریونا نے کہا۔ ''میں صرف تمھارا بھلا چاہتی ہوں اور کچھ نہیں۔ بے شک یونہی لیٹی رہو، بالکل نہ ہلو جلو، میں تمھیں چھوؤں گی بھی نہیں۔ لیکن ایک بات کان کھول کر سن لو۔ یہ میں نہیں کہتی کہ تم سے کتنا بڑا قصور سرزد ہوا ہے، یہ تم خود اچھی طرح جانتی ہو۔ لیکن کل جب تمھارا باپ واپس آئے گا، میں اسے کیا بتاؤں گی؟ بولو، جواب دو۔''

نتاشا کا جسم دوبارہ سسکیوں سے کانپنے لگا۔

''اگر اسے — اسے، تمھارے بھائی یا تمھارے منگیتر کو معلوم ہو گیا، پھر کیا ہو گا؟''

''میرا کوئی منگیتر نہیں، میں اسے جواب دے چکی ہوں!'' نتاشا نے چیخ کر کہا۔

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،'' ماریا دمتریونا نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''اگر انھیں معلوم ہو گیا، تمھارا خیال ہے وہ چپ سادھ لیں گے؟ فرض کرو تمھارا باپ — میں اسے جانتی ہوں — فرض کرو، وہ اسے ڈوئیل کے لیے للکارتا ہے — کیا یہ اچھی بات ہو گی؟ ہونہہ؟''

''اف، مجھے اکیلی چھوڑ دیں! آخر آپ لوگوں کو رنگ میں بھنگ ڈالنے کی ضرورت کیا تھی؟'' نتاشا چت سر

پر اٹھائے ہوئے تھی۔ وہ اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گئی اور قہر آلود نگاہوں سے ماریا دمتریونا کو گھور گھور کر دیکھنے لگی۔

''لیکن تم چاہتی کیا تھیں؟'' ماریا نے کرخت لہجے سے پوچھا۔ ایک بار پھر اس کا مزاج برہم ہونے لگا تھا۔ ''تمھیں کسی نے تالے کے اندر بند کر کے تو نہیں رکھا تھا؟ یا کہو کہ رکھا تھا؟ اسے گھر آنے سے کس نے روکا تھا؟ وہ تمھیں بھگا کر کیوں لے جانا چاہتا تھا؟ تم کوئی جپسیوں کی بیٹی ہو؟.. اگر وہ کامیاب ہو جاتا، تمھارے خیال میں وہ اسے تلاش نہ کر سکتے؟ تمھارا باپ، تمھارا بھائی یا تمھارا منگیتر؟ وہ لچا ہے، لفنگا ہے، کام کا نہ کاج کا، یہ ہے اس کی اصل حقیقت!''

''وہ تم سب سے بہتر ہے!'' نتاشا نے بیٹھتے ہوئے گلا پھاڑ کر کہا۔ ''کاش آپ نے اس پھڈے میں ٹانگ نہ اڑائی ہوتی — اف، میرے خداوند! یہ کیا ہے، یہ کیا ہے! سونیا، تم نے کیوں — میری نظروں سے دور ہو جاؤ!''

اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے اور سسکیاں بھرنے لگی۔ اس کی آہ و زاری میں مایوسی کی وہ شدت تھی جس کا اظہار ان لوگوں کے، جو یہ محسوس کرتے ہیں کہ اپنے مصائب کے ذمے دار وہ خود ہیں، واویلے میں ہوتا ہے۔ ماریا دمتریونا پھر کچھ کہنا چاہتی تھی کہ نتاشا پھٹ پڑی۔

''چلے جاؤ، چلے جاؤ! تم سب مجھ سے نفرت کرتے ہو، مجھے ذلیل سمجھتے ہو!'' اس نے چلا کر کہا اور دوبارہ صوفے پر گر پڑی۔

ماریا دمتریونا اسے مزید کچھ دیر فہمائش کرتی اور سمجھاتی رہی کہ اس کی اس حرکت کا علم اس کے باپ کو قطعاً نہیں ہونا چاہیے۔ وہ اسے یقین دلاتی رہی کہ اگر نتاشا نے خود اسے بھلانے کی سعی کی اور کسی کو یہ معلوم نہ ہونے دیا کہ کیا ہوا ہے، تو وہ کسی کو اس کی کانوں کان خبر نہ ہونے دے گی۔ نتاشا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی سسکیاں بند ہو چکی تھیں، لیکن سردی سے اس کا بدن کانپنے لگا تھا۔ ماریا دمتریونا نے اس کے سر کے نیچے تکیہ رکھ دیا اور اس کا جسم دو لحافوں میں ڈھانک دیا۔ وہ اس کے لیے لیموں کا رس لینے چل دی۔ لیکن ان تمام باتوں کا نتاشا پر کوئی اثر نہ ہوا۔ واں خامشی تھی سب کے جواب میں۔

''خیر، اسے سونے دو۔'' ماریا دمتریونا نے کمرے سے باہر جاتے ہوئے کہا۔ اس کا خیال تھا کہ نتاشا سو رہی ہے۔ لیکن نیند نتاشا کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ دیدے پھاڑے، نگاہیں سیدھے سامنے گاڑے دیکھے جا رہی تھی۔ اس نے ساری رات نہ آنکھ جھپکائی، نہ کوئی اشک بہایا اور نہ اس نے سونیا سے، جو بار بار اٹھتی اور اس کے پلنگ کے قریب آ کر کھڑی ہو جاتی تھی، کوئی کلام کیا۔

اگلے روز کاؤنٹ رستوف ماسکو کے قریب و جوار میں واقع اپنی جاگیر سے حسب وعدہ عین لنچ کے قریب پہنچ گیا۔ خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ ٹک رہے تھے۔ خریدار سے اس کی بات پکی ہو گئی تھی اور اب کوئی ایسا کام نہیں تھا جو اسے کاؤنٹس سے، جو اسے بہت یاد آ رہی تھی، دور ماسکو میں روکے رکھتا۔ ماریا دمتریونا اسے ملی اور اس نے اسے بتایا کہ گزشتہ روز سے نتاشا کی طبیعت سخت ناساز ہے، اس نے ڈاکٹر کو بلایا تھا لیکن اب اس کی حالت

پہلے کی نسبت کافی بہتر ہے۔ نتاشا اس صبح اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے اور ان پر پپڑیاں جم چکی تھیں۔ اس کی آنکھیں خشک تھیں اور وہ خلا میں گھور رہی تھیں۔ وہ دریچے کے قریب بیٹھی تھی اور حیران و مضطرب ان لوگوں کو، جو گلی میں سے گزر رہے تھے، دیکھ رہی تھی۔ اگر کوئی شخص اس کے کمرے میں داخل ہوتا، وہ بہ عجلت مڑ کر اس پر سرسری نظر ڈالتی۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کے بارے میں کسی خبر کی منتظر ہے۔ اسے توقع تھی کہ وہ یا تو خود آئے گا یا پھر اسے خط لکھے گا۔

جب کاؤنٹ اس سے ملنے اس کے کمرے میں آیا، مردانہ قدموں کی آہٹ سن کر وہ متردد و مشوش یہ دیکھنے کے لیے مڑی کہ کون آیا ہے، اور اس کے چہرے پر وہی سرد مہرانہ اور منتقمانہ تاثر عود کر آیا۔ وہ اس سے علیک سلیک کرنے بھی نہ اٹھی۔

"میری جان، کیا بات ہے؟ نصیب دشمناں طبیعت ناساز ہوگئی ہے،" کاؤنٹ نے پوچھا۔

نتاشا کچھ دیر خاموش رہی۔

"ہاں، ناساز،" اس نے جواب دیا۔

کاؤنٹ کے متفکر سوالات کے، کہ وہ اتنی پژمردہ خاطر کیوں ہے اور کیا کوئی ایسا واقعہ، جس کا تعلق اس کے منگیتر سے ہو، تو پیش نہیں آ گیا۔ جواب میں اس نے یقین دلایا کہ نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اور اس سے التجا کرنے لگی کہ وہ قطعاً پریشان نہ ہو۔ ماریا دمتریونا نے بھی نتاشا کی یقین دہانیوں کی تائید کی کہ کچھ نہیں ہوا ہے۔ لیکن اپنی بیٹی کی رونی صورت، دکھاوے کی بیماری، اور ماریا دمتریونا اور سونیا کے سراسیمہ چہروں سے کاؤنٹ کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی کہ اس کی عدم موجودگی میں کچھ ہوا ضرور ہے، تاہم وہ یہ سوچنا بھی نہیں چاہتا تھا کہ اس کی عزیز از جان بیٹی کے ساتھ کوئی شرم ناک واردات بھی ہو سکتی ہے کیونکہ اس کے لیے یہ صدمہ اٹھانا محال ہو جاتا اور اسے اپنا مسرت بخش سکون و اطمینان اتنا عزیز تھا کہ وہ اسے قطعاً کھونا نہیں چاہتا تھا۔ چنانچہ اس نے کسی قسم کی چھان بین کرنے سے احتراز کیا اور اپنے آپ کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ کوئی خاص خلاف معمول بات نہیں ہوئی ہے۔ اب اسے صرف یہ ملال تھا کہ اس کی ناسازیِ طبع کی وجہ سے اسے اپنی روانگی چند دنوں کے لیے ملتوی کرنا پڑے گی۔

19

پیئر کی بیوی نے جس روز ماسکو میں قدم رکھا تھا، اس نے اسی دن یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ کہیں چلا جائے گا تاکہ وہ اس کی صحبت سے بچا رہے۔ رستوفوں کو ماسکو آئے زیادہ دن نہیں گزرے تھے، لیکن نتاشا نے اسے کچھ اس طور متاثر کیا تھا کہ اسے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے میں تعجیل کرنا پڑی۔ وہ آئی اوسف ایلکسی وچ کی بیوہ سے، جس نے اسے اپنے مرحوم شوہر کے کاغذات دینے کا وعدہ کیا تھا، ملنے تو رچلا گیا۔

جب پیئر ماسکو پہنچا، اسے ماریا دمتریونا کا خط ملا۔ ماریا دمتریونا نے اسے اپنے ہاں آنے اور اس کے ساتھ ایک نہایت اہم معاملے کے، جس کا تعلق آندرے بلکونسکی اور اس کی منگیتر سے تھا، بارے میں گفتگو کرنے کے لیے بلایا تھا۔ پیئر نتاشا سے کئی کتراتا پھر رہا تھا کیونکہ اسے یہ نظر آ رہا تھا کہ اس کے متعلق اس کے جذبات وہ نہیں جو شادی شدہ شخص کے اپنے دوست کی منگیتر کے بارے میں ہونا چاہئیں، بلکہ وہ حدود سے بہت آگے نکل چکے ہیں۔ لیکن مقدر تھا کہ وہ انھیں مسلسل ایک دوسرے کی جلو میں لانے کے انتظامات کرتا رہتا تھا۔

''کیا واقعہ پیش آسکتا ہے؟ اور وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟'' ماریا دمتریونا کے جانے سے پیشتر پیئر نے لباس تبدیل کرتے ہوئے غور کیا۔ ''کاش پرنس آندرے جلد آجائے اور اس سے شادی کر لے!'' اس نے اس کے گھر کی طرف جاتے ہوئے سوچا۔

تورسکوئے خیابان پر اسے کوئی جانی پہچانی آواز سنائی دی۔

''پیئر! کب آئے؟'' کسی نے چلا کر پوچھا۔

پیئر نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کے قریب سے ایک برف گاڑی، جس میں دو تیز رفتار خاکستری گھوڑے، جن کے سموں سے برف ٹھوکر کھا کر اڑتی اور گاڑی کے کیچڑ روک تختوں سے ٹکراتی جا رہی تھی، جتے ہوئے تھے، زناٹے سے گزر گئی۔ گاڑی میں اناطول اور اس کا مستقل رفیق ماکارن سوار تھے۔ اناطول بانکے فوجی افسر کے مستند انداز سے تن کر سیدھا بیٹھا ہوا تھا، اس کے چہرے کا نچلا حصہ سنجابی کالر کی اوٹ میں تھا اور اس کی گردن قدرے جھکی ہوئی تھی۔ اس کی شکل وصورت سے تازگی اور سرخی جھلک رہی تھی۔ اس کا سفید ہیٹ، جس میں کلغی بجی ہوئی تھی، بانکے انداز سے ترچھا تھا اور اس کے نیچے اس کے گھونگریالے اور پامید سے چپڑے بال، جن پر کہیں کہیں باریک برف نظر آ رہی تھی، دکھائی دے رہے تھے۔

''یہ شخص آٹھوں گانٹھ کمیت ہے،'' پیئر نے اپنے آپ سے کہا۔ ''اس کا دھیان ہمیشہ وقتی تفریح پر مرکوز رہتا ہے، آگے پیچھے کچھ نہیں سوچتا، اسے کسی چیز کی فکر نہیں، تردد نہیں، پریشانی اسے کبھی چھو کر نہیں گزری، چنانچہ اسے آپ ہمیشہ من موجی، مسرور اور مطمئن پائیں گے۔ مجھ سے جو چاہو لے لو، بس مجھے اس جیسا بنا دو!'' اس نے رشک سے سوچا۔

ماریا دمتریونا کے پیش دالان میں، جس وردی پوش ملازم نے اسے اپنا سموری کوٹ اتارنے میں مدد دی، اسے بتایا: ''مالکہ کہتی ہیں کہ آپ بیڈ روم میں تشریف لے آئیں۔''

جب پیئر نے بال روم کا دروازہ کھولا، اس کی نظر نتاشا پر پڑی۔ وہ کھڑکی کے قریب بیٹھی تھی اور زرد رو، کمزور اور جلی بھنی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا، تیوری چڑھائی اور سرد مہرانہ آن بان کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئی۔

''کیا ہوا؟'' پیئر نے ماریا دمتریونا کے کمرے میں داخل ہو کر پوچھا۔

''کیسی کیسی زبردست حرکتیں ہو رہی ہیں، واہ واہ، سبحان اللہ!'' ماریا دمتریونا نے جواب دیا۔ ''میں نے اس دھرتی پر اٹھاون سال بتائے ہیں۔۔۔ لیکن اس سے بڑھ کر شرمناک حرکت دیکھی نہ سنی!''

اور جب اس کے اصرار پر پیئر اپنی عزت کی قسم کھا کر یہ وعدہ کر چکا کہ جو کچھ وہ اسے بتائے گی، وہ اس کے ایک لفظ کی بھی بھنک کسی کے کانوں میں نہیں پڑنے دے گا، ماریا دمتریونا نے اسے مطلع کیا کہ نتاشا نے اپنے والدین کو بتائے بغیر پرنس آندرے سے اپنی منگنی توڑ دی ہے اور یہ کہ اس کی اس حرکت کا موجب اناطول ہے، جس کی صحبت میں پیئر کی بیوی نے نتاشا کو دھکیلا تھا اور جس کے ساتھ اس نے اپنے باپ کی عدم موجودگی میں فرار ہونے کی کوشش کی تھی۔ وہ آپس میں خفیہ شادی کرنا چاہتے تھے۔

ماریا دمتریونا جو کچھ اسے بتا رہی تھی، پیئر کندھے ذرا آگے جھکائے اور منہ کھولے سنتا رہا۔ اس کے لیے اپنے کانوں پر اعتبار کرنا محال ہو رہا تھا۔ اسے یہ بات ناقابل تفہیم اور ناقابل تصور معلوم ہو رہی تھی کہ پرنس آندرے کی منگیتر نتاشا رستووا۔۔۔ جو سب کی آنکھوں کا تارا تھی اور جو اب تک بے حد پرکشش نظر آتی رہی تھی۔۔۔ اس احمق اناطول کی، جس کے متعلق پیئر کو معلوم تھا کہ وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے، خاطر بلکونسکی کو چھوڑ دے گی بلکہ وہ اس کے ساتھ اتنی شدید محبت کرنے لگے گی کہ اس کے ساتھ فرار ہونے کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔

وہ نتاشا کو اس وقت سے جانتا تھا جب وہ ابھی بچی تھی۔ ایک طرف اس نے اس کے دل و دماغ پر کچھ اس قسم کا سحر انگیز تاثر قائم کیا تھا کہ اللہ اللہ۔ دوسری طرف اس کی رذالت، حماقت اور بربریت کا یہ نیا نقشہ سامنے آیا تھا۔ دونوں باتوں میں اتنا تضاد تھا کہ اسے ان میں توافق پیدا کرنا ناممکن نظر آ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں اپنی بیوی کا خیال آیا۔ ''یہ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں،'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور سوچنے لگا کہ وہ واحد شخص نہیں ہے جسے بدنصیبی نے ایک بدکار عورت کے پلو سے باندھ دیا ہے۔ لیکن اس پر بھی اسے پرنس آندرے اور اس کی زخمی انا پر اتنا ترس آیا کہ اس کا رونے کو جی چاہا۔ اپنے دوست کی حالت زار پر اسے اس کے ساتھ جتنی زیادہ ہمدردی ہو رہی تھی، نتاشا کے، جو ابھی ابھی ہال روم میں اتنی سرد مہرانہ آن بان چہرے پر سجائے اس کے قریب سے گزری تھی، خلاف اس کے دل میں اتنی ہی زیادہ نفرت بلکہ حقارت پیدا ہو رہی تھی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ نتاشا کی روح یاس، خجالت اور خفت کے طوفان میں گھر چکی ہے اور اگر اس کے چہرے پر پرسکون وجاہت اور بے مہری کے آثار ہویدا ہو گئے تھے، تو یہ اس کا قصور نہیں تھا۔

''شادی کرنا چاہتے تھے؟'' پیئر نے ماریا دمتریونا کے آخری الفاظ پر چونک کر کہا۔ ''وہ اس سے شادی کیسے رچا سکتا تھا؟۔۔۔ وہ تو پہلے ہی شادی شدہ ہے!''

''نگوڑی صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے!'' ماریا دمتریونا چلائی۔ ''کیا بڑھیا آدمی ہے! اول درجے کا لفنگا! اور وہ یہاں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہے۔۔۔ دو دن سے اس کی نظریں دروازے پر جمی ہوئی ہیں کہ وہ اب آیا، کہ اب آیا۔ ہمیں اسے بتانا ہوگا، کم از کم یہ انتظار کی کیفیت تو ختم ہو!''

جب ماریا دمتریونا اناطول کے نکاح کی تفصیلات سن چکی، جی بھر کر اسے کوس اور اپنے دل کی بھڑاس نکال چکی، اس نے پیئر کو بتایا کہ اس نے اسے کیوں بلایا ہے۔ اگرچہ اس کا ارادہ یہی ہے کہ کاؤنٹ یا بلکونسکی کو، جو کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتا ہے، اس معاملے کی ہوا بھی نہ لگنے پائے، پھر بھی اسے یہ اندیشہ لاحق ہو رہا ہے کہ کسی نہ کسی ذریعے یہ خبر ان کے کانوں تک پہنچ سکتی ہے اور وہ اناطول کو ڈوئیل کے لیے للکار سکتے ہیں۔ چنانچہ اس نے پیئر سے پرزور التجا کی کہ وہ اس کا نام لے کر اپنے سالے کو سمجھائے کہ وہ فی الفور ماسکو سے کہیں اور چلا جائے اور نتاشا کو کبھی اتنا موقع نہ دے کہ وہ دوبارہ اس کی شکل دیکھ سکے۔ معمر کاؤنٹ، نکولائی اور پرنس آندرے کے سروں پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا، پیئر کو صرف اب اس کا ادراک ہوا۔ چنانچہ اس نے یہ وعدہ کر لیا کہ وہ جو کچھ کہتی ہے، وہ اس کے مطابق عمل کرے گا۔ جو کچھ وہ چاہتی تھی، اس نے اسے مختصراً لیکن غیر مبہم انداز سے بیان کیا اور پھر اسے ڈرائنگ روم میں جانے کی اجازت دے دی۔

''یاد رکھو، کاؤنٹ کو اس بارے میں مطلق کچھ پتا نہیں۔ چنانچہ اس کے ساتھ کچھ اس طور پیش آؤ جیسے تمھیں خود بھی کچھ معلوم نہیں ہے،'' اس نے کہا۔ ''اب میں جاتی ہوں اور اسے بتاتی ہوں کہ اس کا انتظار عبث ہے! ہاں، اگر جی چاہے تو ڈنر تک ٹھہر جانا!''

پیئر معمر کاؤنٹ سے ملا۔ وہ بوکھلایا اور گھبرایا دکھائی دے رہا تھا۔ اس صبح نتاشا نے اسے بتا دیا تھا کہ وہ بلکونسکی کے ساتھ اپنی نسبت ختم کر چکی ہے۔

''مصیبت، مصیبت، مائی ڈیئر فیلو!'' اس نے پیئر سے کہا۔ ''ان لڑکیوں کی ماں یہاں نہیں ہے اور میں کس عذاب میں پھنس گیا ہوں! مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں آیا ہی کیوں؟ میں تم سے کچھ نہیں چھپاؤں گا۔ سنا تم نے کہ اس نے کسی سے مشورہ کیے بغیر اپنی منگنی توڑ دی ہے؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ رشتہ مجھے کوئی خاص پسند نہیں تھا۔ مانا، وہ بہت نفیس آدمی ہے، لیکن جب اس کا باپ مخالفت پر ادھار کھائے بیٹھا ہو، وہ خوش نہیں رہ سکتے تھے اور نتاشا کے لیے رشتوں کی کمی نہیں ہے۔ پھر بھی، یہ معاملہ اتنی دیر سے چل رہا تھا، اور اس نے نہ ماں سے پوچھا اور نہ باپ سے، اور اتنا بڑا قدم اٹھا لیا! اور اب اس کی طبیعت ناساز ہے... خدا جانے، یہ گورکھ دھندا کیا ہے۔ کاؤنٹ، میں تو صرف ایک بات جانتا ہوں کہ لڑکیوں کا اپنی ماں سے دور رہنا اچھی بات نہیں ہے...''

پیئر سمجھ گیا کہ کاؤنٹ بے حد پریشان ہے۔ اس نے گفتگو کا رخ کسی اور موضوع کی جانب موڑنے کی کوشش کی، لیکن کاؤنٹ بار بار اپنے مصائب کا تذکرہ کرتا رہا۔

سونیا کمرے میں آئی۔ اس کی صورت پر خوف برس رہا تھا۔

''نتاشا کی طبیعت خراب ہوگئی ہے۔ وہ اپنے کمرے میں ہے اور آپ سے ملنا چاہتی ہے۔ ماریا دمتریونا اس کے پاس ہیں اور وہ بھی چاہتی ہیں کہ آپ تشریف لے آئیں۔''

''ارے ہاں،'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''تم تو بلکونسکی کے دوست ہو۔ وہ شاید تمھاری وساطت سے اسے کوئی

پیغام بھیجنا چاہتی ہے۔ اف خداوند، خداوند! چند ہی روز پہلے ہم لوگ کتنے خوش تھے!''

اور کاؤنٹ نے اپنی کنپٹی پر سے اپنے چند بچے کھچے بال پکڑے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

ماریادمتریونا نے نتاشا کو بتا دیا تھا کہ اناطول شادی شدہ ہے، لیکن نتاشا نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ پیئر خود اس کی تصدیق کرے۔ سونیا نے غلام گردش میں پیئر کی نتاشا کے کمرے کی طرف رہنمائی کرتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

زرد رو نتاشا جسم اکڑائے ماریادمتریونا کے پاس بیٹھی تھی۔ جونہی پیئر اندر داخل ہوا، اس کی چمکتی دمکتی اور بخار سے پھنکتی آنکھیں استفہامیہ انداز سے اس پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ نہ مسکرائی اور نہ اس نے گردن ہلائی، بس ٹک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھیں صرف ایک سوال پوچھ رہی تھیں: ''تم اناطول کے دوست ہو یا باقیوں کی طرح اس کی جان کے دشمن؟'' بظاہر اس کے لیے خود پیئر کا کوئی وجود نہیں تھا۔

''یہ اس بارے میں سب کچھ جانتے ہیں،'' ماریادمتریونا نے پیئر کی طرف اشارہ کرتے اور نتاشا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''یہ خود ہی سب کچھ تمھیں بتائیں گے کہ میں نے جھوٹ کہا تھا یا سچ؟''

نتاشا نے ایک سے دوسرے کی جانب یوں دیکھا جیسے زخمی صیدان کتوں اور شکاریوں کی، جو اس کے قریب سے قریب تر آتے جا رہے ہوں، طرف دیکھتا ہے۔

''نتالیا الیئچنا،'' پیئر نے اپنی بات کا آغاز کیا۔ جو کچھ اس نے کہنا تھا، اس سے اسے اتنی گھن آرہی تھی اور نتاشا پر اتنا ترس محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی نگاہیں خود بخود جھک گئیں۔ ''یہ بات سچ ہے یا نہیں، تمھارے لیے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ—''

''پھر یہ صحیح نہیں ہے کہ وہ شادی شدہ ہیں؟''

''ہاں، صحیح ہے۔''

''انھیں شادی کیے لمبا عرصہ ہو گیا؟'' اس نے پوچھا۔ ''اپنی عزت کی قسم کھا کر بتائیں۔''

پیئر نے اپنی عزت کی قسم کھائی۔

''کیا وہ یہیں ہیں؟'' اس نے عجلت سے پوچھا۔

''ہاں، میں نے اسے ابھی دیکھا تھا۔''

بظاہر اس میں اب مزید بولنے کی ہمت نہیں رہی تھی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے کچھ اس قسم کا نشان بنایا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اسے تنہا چھوڑ دیں۔

20

پیئر ڈنر کے لیے نہ رکا بلکہ نتاشا کے کمرے سے باہر نکلتے ہی رخصت ہو گیا۔ وہ اپنی گاڑی میں بیٹھا اور اناطول کی،

جس کا ذہن میں خیال آتے ہی اس کا خون کھولنے لگتا اور اس کا دل اتنے زور زور سے دھڑکنے لگتا کہ اسے سانس لینے میں دشواری ہونے لگتی، تلاش میں سارے شہر کا چکر لگانے لگا۔ وہ نہ برفانی پہاڑوں پر، نہ جپسیوں کے ڈیرے میں اور نہ کومانیو کے رستوراں میں ملا۔ پیئر کلب پہنچا۔ وہاں سب کچھ معمول کے مطابق ہو رہا تھا۔ جوارکان کھانا کھانے اکٹھے ہوئے تھے، ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے اور وہ شہر کی خبروں کے بارے میں اس سے باتیں کرنے لگے۔ ایک وردی پوش ملازم نے، جو اس کے دوستوں کو جانتا اور اس کی عادتوں سے آگاہ تھا، سلام کرنے کے بعد اسے بتایا کہ چھوٹے ڈائننگ روم میں اس کے لیے جگہ موجود ہے، پرنس میخائیل ذخارچ لائبریری میں ہے لیکن پاول تموفیچ ابھی نہیں آیا ہے۔ پیئر کے ایک واقف کار نے موسم کے بارے میں اپنی گفتگو بیچ میں چھوڑی اور اس سے کہا: ''سنا ہے کہ کوراگن نے ننھی رستووا کو اغوا کر لیا ہے۔ سارے شہر میں اس خبر کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ویسے یہ سچ ہے؟'' پیئر ہنس پڑا اور اس نے جواب دیا: ''یہ نری بکواس ہے۔ میں ابھی ابھی رستوفوں کے ہاں سے آ رہا ہوں۔'' وہ ہر شخص سے اناطول کے بارے میں پوچھنے لگا۔ ایک شخص نے اسے بتایا کہ وہ ابھی نہیں آیا ہے اور دوسرے نے اسے اطلاع دی کہ وہ ڈنر یہیں کھائے گا۔ لوگوں کے اس پرسکون اور بے نیاز ہجوم کو، جسے اس امر کا قطعاً کوئی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے دل و دماغ پر کیا بیت رہی ہے، دیکھ کر پیئر کو عجیب قسم کا احساس ہونے لگا۔ وہ بال روم میں چکر لگاتا رہا اور جب تک ہر شخص آ نہ گیا، انتظار کرتا رہا، اور چونکہ اناطول نہیں آیا تھا، اس لیے وہ ڈنر کھانے کے لیے نہ ٹھہرا بلکہ گھر چلا گیا۔

اناطول نے، جس کی تلاش میں پیئر مارا مارا پھر رہا تھا، اس روز دلوخوف کے ساتھ کھانا کھایا اور اس سے صلاح مشورہ کرتا رہا کہ وہ اس معاملے کو، جو ناٹائیں فش ہو گیا تھا، کس طرح اپنے حق میں سلجھائے۔ وہ سمجھتا تھا کہ نتاشا سے ملنا ضروری ہے۔ شام کو وہ اپنی بہن کے ہاں چلا گیا تاکہ اس کے ساتھ مل کر نتاشا سے ملاقات کی کوئی سبیل نکالی جائے۔ جب سارے ماسکو کی خاک چھاننے کے بعد پیئر واپس گھر پہنچا، اس کے ذاتی خدمت گار نے اسے بتایا کہ پرنس اناطول کاؤنٹس کے پاس بیٹھا ہے۔ کاؤنٹس کا ڈرائنگ روم مہمانوں سے پٹا پڑا تھا۔

اپنی بیوی سے، جس سے وہ ماسکو واپس آنے کے بعد نہیں ملا تھا۔ اس وقت وہ اسے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ گھناؤنی نظر آئی۔ علیک سلیک کیے بغیر وہ ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہاں اسے اناطول کی شکل دکھائی دی اور وہ سیدھا اس کے پاس پہنچ گیا۔

''اخاہ، پیئر،'' کاؤنٹس نے اپنے شوہر کے پاس جا کر کہا۔ ''آپ کو معلوم ہی نہیں کہ ہمارا اناطول کس تکلیف دہ صورت حال سے دوچار ہے۔''

وہ بات کرتے کرتے چپ ہو گئی۔ اسے اپنے خاوند کے آگے جھکے ہوئے سر، شعلہ بار نگاہوں اور پرعزم چال میں اس غیظ و غضب اور تشدد کی بھیانک علامتیں، جن سے وہ بخوبی آگاہ تھی اور جن کا دلوخوف کے ساتھ اس کی ڈوئیل کے بعد اسے فی نفسہٖ تجربہ ہو چکا تھا، نظر آ گئی تھیں۔

''تم جہاں بھی جاؤ گی، بدی اور فسق و فجور تمھاری جلو میں ہوں گے،'' پیئر نے اپنی بیوی سے کہا۔ ''اناطول،

آؤ، مجھے تمھارے ساتھ ضروری بات کرنا ہے،'' اس نے فرانسیسی میں مزید کہا۔
اناطول نے ایک نظر اپنی ہمشیرہ پر ڈالی، مؤدبانہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور پیئر کے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو گیا۔
پیئر نے اسے بازو سے پکڑا، اپنی طرف کھینچا اور کمرے سے باہر لے جانے لگا۔
''میرے ڈرائنگ روم میں تمھاری یہ جرأت...'' ہیلین نے زیرلب کہا، لیکن وہ اس کی بات سنی ان سنی کر کے کمرے سے باہر نکل گیا۔
اناطول حسب معمول اکڑ اکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے چلنے لگا لیکن اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔
سٹڈی روم میں داخل ہونے اور دروازہ بند کرنے کے بعد پیئر اناطول کی طرف دیکھے بغیر اس سے مخاطب ہوا:
''تم نے کاؤنٹس رستووا سے شادی کا وعدہ کیا تھا؟ تم اسے بھگا لے جانا چاہتے تھے؟ ٹھیک ہے؟''
"Mon cher"* اناطول نے جواب دیا۔ (ان کی ساری گفتگو فرانسیسی میں ہو رہی تھی)۔ ''میں سمجھتا ہوں کہ اس لہجے سے مجھ سے جو سوالات پوچھے جا رہے ہیں، مجھ پر ان کے جوابات دینے کی ذمے داری عاید نہیں ہوتی۔''
پیئر کا چہرہ، جو پہلے زرد تھا، اب غیظ و غضب سے مسخ ہو گیا۔ اس نے اپنے لحیم و شحیم ہاتھوں سے اس کی وردی کا کالر پکڑا اور اسے اتنے زور سے جھٹکے دیے کہ اس کی سٹی گم ہو گئی اور وہ خوف سے خاصا لرزہ براندام ہو گیا۔
''جب میں کہتا ہوں کہ مجھے تم سے ضروری بات کرنا ہے۔'' پیئر نے دہراتے ہوئے کہا۔
''چھوڑو، یار، بالکل احمقانہ حرکتیں کر رہے ہو۔ ہائیں!'' اناطول نے اپنے کالر کے ایک بٹن کو، جو ڈھیلا ہو گیا تھا، انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔
''تم لفنگے، پاجی، بدقماش ہو۔ جی چاہتا ہے کہ مار مار کر تمھارا بھیجا نکال دوں، اس سے میرے کلیجے میں ٹھنڈک پڑ جائے گی، پر پتا نہیں کہ میرے ہاتھ کو کیا چیز روکے ہوئے ہے۔'' اس کا انداز بالکل مصنوعی تھا کیونکہ وہ فرانسیسی بول رہا تھا۔ اس نے اچھے خاصے بھاری پیپر ویٹ پر ہاتھ ڈالا اور دھمکی آمیز طریقے سے اسے اوپر اٹھایا، تاہم اس نے فوراً ہی اسے نیچے رکھ دیا۔
''تم نے اس سے شادی کا وعدہ کیا تھا؟''
''میں — میں — میں نے اس بارے میں سوچا نہیں تھا... درحقیقت میں نے کوئی وعدہ نہیں کیا تھا کیونکہ...''
''تمھارے پاس اس کے کوئی خطوط ہیں؟ کوئی خطوط؟'' پیئر نے اناطول کی جانب بڑھتے ہوئے مطالبہ کیا۔
اناطول نے اسے سرسری نگاہوں سے دیکھا، پلک جھپکنے میں اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اپنی پاکٹ بک باہر نکالی۔
اناطول نے ایک خط اسے تھما دیا۔ پیئر نے خط پکڑا اور ایک میز کو، جو اس کے راستے میں رکاوٹ بنی ہوئی تھی، ایک جانب دھکیلتے ہوئے صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔

---

* مائی ڈیر

''ڈرومت، میں تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچاؤں گا،'' اناطول اپنی حرکات وسکنات سے جس خوف کا اظہار کر رہا تھا، پیئر نے اس کے جواب میں کہا۔ ''نمبر ایک۔ خطوط'' اس نے یوں کہا جیسے آموختہ دہرا رہا ہو۔ ''نمبر 2۔'' ایک لحظے کے توقف کے بعد وہ پھر بولا، اٹھ کر کھڑا ہوا اور کمرے میں گھومنے لگا۔ ''کل تم ماسکو سے رخصت ہو جاؤ گے۔''

''لیکن میں کیسے۔''

''نمبر 3،'' پیئر اس کی بات سنے بغیر اپنی ہی کہتا چلا گیا۔ ''تمھارے اور کاؤنٹس رستووا کے مابین جو کچھ بھی ہوا ہے، تم اس کے بارے میں کسی سے ایک لفظ بھی نہیں کہو گے۔ مجھے معلوم ہے کہ میں تمھیں ایسا کرنے سے روک نہیں سکتا، لیکن اگر تمھارے اندر ضمیر کی ذرا سی بھی رمق ہے...''

پیئر خاموشی سے کمرے میں ٹہلتا رہا۔ اناطول میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ وہ ناک بھوں چڑھا رہا اور اپنے ہونٹ کاٹ رہا تھا۔

''تمھیں لازماً معلوم ہونا چاہیے کہ تمھارے عیش وعشرت کے علاوہ ایک چیز اور بھی ہے، اسے دوسروں کی خوشی، دوسروں کا ذہنی سکون کہتے ہیں اور تم محض اپنے تلذذ کی خاطر ایک پوری زندگی کو تباہی کے غار میں دھکیل رہے ہو! میری بیوی جیسی عورتوں کے ساتھ عیش کرتے ہو۔ اس قسم کی عورتوں کی صحبت میں تم اپنے حقوق سے متجاوز نہیں ہوتے کیونکہ انھیں معلوم ہوتا ہے کہ تم ان سے کیا چاہتے ہو۔ جس قسم کے فسق وفجور کے تم عادی ہو، انھیں بھی اس کا تجربہ ہوتا ہے، اس لیے تم ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن کسی معصوم لڑکی کے ساتھ شادی کا وعدہ کرنا، اسے فریب دینا، اسے اغوا کرنا۔ تم سمجھتے نہیں کہ یہ اتنی ہی گھٹیا حرکت ہے جتنا کہ کسی مردِ ضعیف یا بچے پر ہاتھ اٹھانا؟''

پیئر نے توقف کیا اور وہ اناطول کو قہر آلود نگاہوں سے نہیں بلکہ استفہامیہ انداز سے دیکھنے لگا۔

''مجھے ان باتوں کا کچھ علم نہیں، اخ؟'' اناطول نے کہا۔ اب جب کہ پیئر نے اپنے غیظ وغضب کو تسخیر کر لیا تھا، اس کا حوصلہ بڑھنے لگا تھا۔ ''میں اس بارے میں نہ کچھ جانتا ہوں اور نہ جاننا چاہتا ہوں،'' اس نے پیئر کی جانب دیکھے بغیر اور اپنے نچلے جبڑے کو قدرے ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تم نے میرے بارے میں ایسے ایسے الفاظ۔ 'گھٹیا'، 'وغیرہ' وغیرہ۔ استعمال کیے ہیں، جو میں باعزت شخص ہونے کے ناتے کسی اور کو اپنے بارے میں کہنے کی اجازت نہیں دیتا۔''

پیئر سکتے کے عالم میں اس کا منہ تکنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ شخص کہنا کیا چاہتا ہے۔

''اگرچہ یہ ہماری آپس کی گفتگو تھی،'' اناطول نے اپنی بات جاری رکھی، ''پھر بھی میں...''

''کیا تم تلافی کرنا چاہتے ہو؟'' پیئر نے طنزیہ انداز سے پوچھا۔

''جو کچھ تم نے کہا ہے، کم ازکم اتنا تو کر سکتے ہو کہ اسے واپس لے لو۔ ہونہہ؟ اگر تم چاہتے ہو کہ میں تمھاری خواہش پر عمل کروں، ہونہہ؟''

''ہاں، ہاں، میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں، واپس لیتا ہوں۔ اور میں تم سے معافی بھی مانگتا ہوں،'' پیئر نے غیر ارادی طور پر ڈھیلے بٹن کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور اگر تمھیں سفر کے لیے رقم درکار ہو...''

اناطول مسکرا دیا۔ یہ وہی گھٹیا اور لجاجت آمیز مسکراہٹ تھی جس کا پیئر اپنی بیوی میں خوب مشاہدہ کر چکا تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اسے ابکائی آ جائے گی۔

''اف، رذیل، سفاک، چینگی پوٹے!'' وہ پکارا۔

اگلے روز اناطول پیٹرز برگ روانہ ہو گیا۔

21

پیئر نے ماریا دمتریونا کے گھر کا رخ کیا تا کہ وہ اسے بتا سکے کہ اس کی جو یہ خواہش تھی کہ کوراگن کو ماسکو سے نکال دیا جائے، پوری ہو گئی ہے۔ سارے گھر میں کھلبلی اور افراتفری مچی ہوئی تھی۔ نتاشا کی طبیعت سخت خراب ہو گئی تھی۔ دراصل، جیسا کہ ماریا دمتریونا نے رازداری سے پیئر کو بتایا، نتاشا نے اس رات، جب اسے معلوم ہوا کہ اناطول شادی شدہ ہے، چوری چھپے کہیں سے سنکھیا حاصل کیا اور کھا لیا۔ ابھی اس نے اس کی خفیف سی مقدار حلق میں ڈالی تھی کہ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور اس پر اتنا خوف طاری ہوا کہ اس نے سونیا کو جگا دیا اور اسے بتا دیا کہ اس نے کیا کر دیا ہے۔ وقت پر مناسب تریاق فراہم ہو گئے اور اسے کھلا دیے گئے۔ اب اس کی حالت خطرے سے باہر ہے لیکن وہ اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ ابھی اس کا گاؤں لے جانا خارج از امکان ہے، چنانچہ کاؤنٹس کو بلا بھیجا گیا ہے۔ پیئر آشفتہ حال کاؤنٹ اور سونیا سے، جس کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو گئی تھیں، ملا، لیکن اسے نتاشا سے ملاقات کی اجازت نہ دی گئی۔

اس روز اس نے کلب میں ڈنر کھایا۔ وہاں چاروں اطراف سے اس کے کانوں میں یہ افواہ، کہ کاؤنٹس رستووا کو اغوا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، پڑ رہی تھی۔ اس نے جانفشانی سے ان افواہوں کی تردید کی اور ہر شخص کو یہ یقین دلایا کہ بات صرف اتنی ہے کہ اس کے برادر نسبتی نے اس کا رشتہ مانگا تھا لیکن اس کی درخواست کو شرف قبولیت نہ حاصل ہو سکا۔ اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہوا۔ پیئر کا یہ خیال تھا کہ اس سارے معاملے کو پردۂ اخفا میں رکھنا اور نتاشا کی نیک نامی بحال کرنا اس کا فرض ہے۔

اس کی یہ سوچ سوچ کر خوف سے جان نکلی جا رہی تھی کہ پرنس آندرے اب پہنچا کہ اب پہنچا۔ وہ اس کے متعلق خبر حاصل کرنے ہر روز معمر پرنس کے گھر کے پھیرے لگانے لگا۔

شہر میں جو افواہیں گردش کر رہی تھیں، وہ مادموزیل بوغین کی وساطت سے پرنس نکولائی آندریوچ تک پہنچ چکی تھیں۔ اس نے وہ خط بھی، جس میں نتاشا نے اپنی منگنی کی تنسیخ کے بارے میں پرنس ماریا کو اطلاع دی تھی، پڑھا تھا۔ وہ معمول سے زیادہ ہشاش بشاش نظر آ رہا تھا اور بڑی بے قراری سے اپنے بیٹے کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔

اناطول کی روانگی کے چند روز بعد پیئر کو پرنس آندرے کا خط ملا۔ اس میں اس نے اپنی آمد کی اطلاع دی تھی اور اس سے کہا تھا کہ وہ کسی روز اس سے ملنے اس کے گھر آئے۔

جونہی پرنس آندرے ماسکو پہنچا، اس کے باپ نے اسے وہ خط، جو نتاشا نے پرنس ماریا کے نام تحریر کیا تھا اور جس میں اس نے اپنی سگائی ختم کرنے کے متعلق اطلاع دی تھی، تھما دیا۔ (مادموزیل بوغین نے یہ خط پرنس ماریا کے کمرے سے چرایا اور معمر پرنس کے حوالے کیا تھا۔) اس نے اپنے باپ سے نتاشا کے اُدھل جانے کی کہانی بھی سنی۔ اس کے باپ نے یہ کہانی خوب مرچ مصالحہ لگا کر اور بڑھا چڑھا کر پیش کی۔

پرنس آندرے کی آمد شام کو ہوئی تھی اور اگلی صبح پیئر اسے ملنے آ گیا۔ پیئر کو توقع تھی کہ پرنس آندرے کی بھی وہی حالت ہوگی جو نتاشا کی تھی۔ لیکن جب وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا اور اسے سٹڈی روم سے پیٹرز برگ کی کسی سازش کے متعلق اس کے جوش و خروش اور بلند لہجے سے باتیں کرنے کی آواز آتی سنائی دی، اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کبھی کبھی معمر پرنس اور کوئی دوسرا شخص اسے ٹوک دیتا اور خود بولنے لگتا۔ پرنس ماریا پیئر سے ملنے آئی۔ جس کمرے میں اس کا بھائی تھا، اس کی نگاہیں اس طرف پلٹ گئیں۔ اس نے ٹھنڈی سانس بھری۔ بظاہر وہ یہ عندیہ دینا چاہتی تھی کہ اس کے بھائی کو جس الم ناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا ہے، وہ اس میں اس کی برابر کی شریک ہے لیکن جب پیئر نے اس کے چہرے پر نگاہ ڈالی، اسے صاف نظر آ گیا کہ جو کچھ ہوا اور نتاشا کی بے وفائی پر اس کے بھائی نے جس ردعمل کا اظہار کیا ہے، ان دونوں باتوں پر وہ جی ہی جی میں بہت خوش ہے۔

''وہ کہتے ہیں کہ انھیں یہی توقع تھی،'' وہ بولی۔ ''میں جانتی ہوں کہ ان کا پندار انھیں اپنے جذبات کے اظہار کی اجازت نہیں دے گا، پھر بھی انھوں نے اس صدمے پر میری توقع سے کہیں بڑھ کر صبر و تحمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ بظاہر یہی ہونا تھا...''

''کیا ان دونوں کے تعلقات واقعی بالکل ختم ہو گئے ہیں؟'' پیئر نے پوچھا۔

پرنس ماریا کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا اور وہ ٹک ٹک اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی شخص اس قسم کا سوال کیسے پوچھ سکتا ہے۔ پیئر سٹڈی روم میں چلا گیا۔ پرنس آندرے عام شہری لباس میں ملبوس تھا۔ اس میں خاصی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں اور بظاہر اس کی صحت بحال ہو گئی تھی۔ تاہم اس کے ابروؤں کے مابین نئی اور نمایاں لکیر ابھر آئی تھی۔ وہ اپنے باپ اور پرنس مشٹرسکی کی جانب رخ کیے کھڑا تھا، اور جوش و خروش سے استدلال کر رہا اور زور شور سے ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کر رہا تھا۔

گفتگو سپے رانسکی[36] کے، جس کی اچانک جلاوطنی اور مبینہ غداری کی خبر ابھی ماسکو پہنچی تھی، بارے میں ہو رہی تھی۔

''وہی لوگ، جو ایک ماہ قبل اس کے تلوے چاٹ رہے تھے اور اسے آسمان پر چڑھا رہے تھے، آج اس کی مذمت کرنے اور اس پر الزامات کی بوچھاڑ کرنے میں پیش پیش ہیں،'' پرنس آندرے کہہ رہا تھا۔ ''اور اس معاملے میں وہ لوگ بھی، جو اس کے مقاصد کو سمجھنے میں ناکام رہے، کسی سے پیچھے نہیں ہیں۔ جب کسی شخص کے سر سے عزت کا تاج اتر جاتا ہے، اس پر الزام تراشی کرنا، اسے سولی پر لٹکانا اور دوسروں کی غلطیاں اس کے کھاتے میں ڈالنا نہایت

آسان کام ہے۔ لیکن میری رائے یہ ہے کہ اس عہد میں اگر کسی نے کوئی اچھا کارنامہ سرانجام دیا ہے، تو اسی نے، صرف اسی نے، سرانجام دیا ہے۔"

اس کی نظر پیئر پر پڑی اور وہ خاموش ہو گیا۔ گھڑی کی گھڑی اس کا چہرہ کپکپایا لیکن دیکھتے ہی دیکھتے وہاں معاندانہ تاثر نمودار ہو گیا۔

"آنے والی نسلیں اس سے انصاف کریں گی،" اس نے اپنی بات ختم کی اور معاً پیئر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

"ہونہہ، کیا حال ہیں تمھارے؟ ابھی تک چربی کی تہیں چڑھائے جا رہے ہو؟" اس کا لہجہ جوشیلا تھا لیکن اس کی پیشانی پر جو لکیر نئی نئی نمودار ہوئی تھی، وہ اور گہری ہو گئی۔ "ہاں، میں ٹھیک ہوں،" اس نے پیئر کے سوال کے جواب میں کہا اور مسکرانے لگا۔

پیئر پر یہ بالکل واضح تھا کہ اس کی مسکراہٹ کا مفہوم یہ ہے: "ہاں، میں ٹھیک ہوں، لیکن اب میری صحت کسی کے کام نہیں آئے گی۔"

پولستانی سرحدوں سے اسے جن خستہ سڑکوں پر سفر کرنا پڑا تھا، سوئٹزرلینڈ میں وہ جن لوگوں سے، جو پیئر کو جانتے تھے، ملا تھا اور وہ اپنے بیٹے کے لیے جو نیا ٹوٹیر موسیو دیسال لایا تھا، اس نے ان سب کے بارے میں پیئر کو مختصراً بتایا اور وہ دوبارہ جوش و خروش سے سپے رانسکی کے متعلق گفتگو میں، جو ابھی تک دونوں بزرگوں کے مابین ہو رہی تھی، شریک ہو گیا۔

"اگر کہیں غداری ہوتی یا نپولین کے ساتھ خفیہ ساز باز کا کوئی ثبوت ہوتا، تو وہ اسے لازماً منظر عام پر لے آتے،" اس نے بڑی گرم جوشی اور تیزی سے بولتے ہوئے کہا۔ "مجھے ذاتی طور پر سپے رانسکی نہ تو پسند ہے اور نہ میں نے اسے کبھی پسند کیا ہے، لیکن انصاف مجھے پسند ہے۔"

پیئر کو اپنے دوست کے رویے میں اسی ضرورت کا، جس سے وہ خود بخوبی آگاہ تھا، احساس ہوا۔ اس ضرورت کے تحت آدمی کسی ایسے معاملے کے، جس کا اس کی ذات سے براہ راست کوئی تعلق نہیں ہوتا، بارے میں اس لیے کاملاً جوش و خروش کا مظاہرہ کرنے اور منطق چھانٹنے لگتا ہے کیونکہ وہ ان ذاتی خیالات کا، جو اس کے لیے بے حد اذیت ناک ہوتے ہیں، گلا گھونٹ دینا چاہتا ہے۔

جب پرنس مشچرسکی رخصت ہو گیا، پرنس آندرے نے پیئر کا بازو تھاما اور اسے اس کمرے میں، جو اس کے لیے تیار کیا گیا تھا، چلنے کو کہا۔ وہاں بستر لگا ہوا تھا اور ادھر ادھر متعدد سوٹ کیس اور ٹرنک، جو کھلے ہوئے تھے، پڑے تھے۔ پرنس آندرے ایک سوٹ کیس کے پاس گیا، اس نے ایک ڈبا اٹھایا اور اس میں سے ایک پیکٹ، جو کاغذ میں لپٹا ہوا تھا، نکالا۔ یہ سب کچھ بہ تعجیل اور خاموشی سے ہوا۔ وہ دوبارہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اپنا گلا کھنکارنے لگا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں اور اس کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔

"میں معافی چاہتا ہوں کہ تمھیں زحمت دے رہا ہوں..."

پیئر کو اندازہ ہو گیا کہ پرنس آندرے نتاشا کے متعلق بات کرنا چاہتا ہے اور اس کے چوڑے چکلے چہرے پر ہمدردی اور ترحم کے آثار نمایاں ہو گئے۔ اس کے چہرے پر ان تاثرات کو دیکھ کر پرنس آندرے جھلا گیا اور وہ پرعزم، کھنکھناتے اور ناخوشگوار لہجے سے بولتا چلا گیا۔

''مجھے کاؤنٹس رستووا کا انکار موصول ہوا ہے اور میں نے کچھ اس قسم کی خبریں بھی سنی ہیں کہ تمھارے برادر نسبتی نے اس سے شادی وغیرہ کرنے کی خواہش کی ہے۔ کیا یہ ٹھیک ہے؟''

''صحیح بھی ہے اور نہیں بھی،'' پیئر نے اپنی بات شروع کی لیکن پرنس آندرے نے اسے ٹوک دیا۔

''یہ رہے اس کے خطوط اور تصویر۔'' اس نے میز سے پیکٹ اٹھایا اور پیئر کو پکڑا دیا۔

''یہ کاؤنٹس کو دے دینا... اگر تمھاری اس سے ملاقات ہو۔''

''وہ سخت بیمار ہے،'' پیئر نے کہا۔

''پھر وہ ابھی تک یہیں ہے؟'' پرنس آندرے نے دریافت کیا۔ ''اور پرنس کوراگن؟'' اس نے بلا تاخیر پوچھا۔

''وہ چند روز قبل یہاں سے چلا گیا تھا اور وہ موت کے دروازے پر دستک دے رہی ہے...''

''مجھے اس کی علالت کے متعلق سن کر بہت افسوس ہوا ہے،'' پرنس آندرے نے اپنے باپ کی طرح ناخوشگوار، سرد مہرانہ اور معاندانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''چنانچہ موسیو کوراگن نے کاؤنٹس رستووا کو حبالۂ عقد میں لینے کا شرف نہیں بخشا؟'' اس نے بار بار نتھنے پھلا کر جملہ کسا۔

''وہ اس سے شادی نہیں کر سکتا تھا، وہ پہلے ہی شادی شدہ ہے،'' پیئر نے کہا۔

پرنس آندرے ایک بار پھر بالکل اپنے باپ کی طرح ناگوار انداز سے ہنس پڑا۔

''اگر اجازت ہو تو کیا میں یہ پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں کہ آپ کے سالے شریف کہاں ہیں؟'' اس نے کہا۔

''وہ چلا گیا ہے، شاید پیٹرز۔۔ لیکن حقیقتاً مجھے معلوم نہیں،'' پیئر نے کہا۔

''خیر، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا،'' پرنس آندرے نے کہا۔ ''کاؤنٹس رستووا کو بتا دیں کہ اس پر نہ پہلے کوئی پابندی تھی اور نہ اب ہے، اور میں ہر دم اس کی خوشی کے لیے دعا گو ہوں۔''

پیئر نے پیکٹ اٹھا لیا۔ پرنس آندرے نگاہیں گاڑے اسے دیکھتا رہا۔ وہ شاید یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اسے مزید کچھ تو نہیں کہنا یا پھر وہ اس بات کا منتظر تھا کہ شاید پیئر کچھ کہے۔

''سنو... پیٹرزبرگ میں ہم دونوں کے مابین جو مکالمہ ہوا تھا، تمھیں وہ یاد ہے؟'' پیئر نے پوچھا۔ ''اس کا موضوع۔''

''مجھے یاد ہے،'' پرنس آندرے نے فی الفور جواب دیا۔ ''میں نے کہا تھا کہ جو عورت راہِ راست سے بھٹک

جائے، ہمیں اسے معاف کر دینا چاہیے۔ لیکن میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ میں اسے معاف کر سکتا ہوں، میں نہیں کر سکتا۔''

''لیکن کیا اس کا اس سے موازنہ ہو سکتا ہے...؟'' پیئر نے کہا۔
پرنس آندرے نے اس کی بات کاٹ دی اور درشت لہجے سے چلا کر بولا:
''ہاں، دوبارہ اس سے شادی کی استدعا کروں، عالی ظرفی کا مظاہرہ کروں، وغیرہ وغیرہ؟... بات تو بہت بلند پایہ ہے لیکن میں ان صاحب کے نقش قدم پر چلنے سے معذور ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ ہماری دوستی برقرار رہے، پھر اس... اس سارے معاملے کا کبھی ذکر نہ کرنا۔ اچھا، خدا حافظ۔ اسے پیکٹ پہنچا دو گے؟''
پیئر اس سے رخصت ہوا اور معمر پرنس اور پرنسس ماریا کے پاس چلا گیا۔
بڑے میاں معمول سے کہیں زیادہ شگفتہ نظر آ رہے تھے۔ پرنسس ماریا بالکل ویسی کی ویسی تھی جیسی وہ ہمیشہ ہوتی تھی۔ بظاہر اسے اپنے بھائی سے ہمدردی تھی لیکن پیئر بھانپ گیا کہ اس ہمدردی کے نیچے خوشی پنہاں تھی کہ منگنی ٹوٹ گئی ہے۔ انھیں بغور دیکھنے کے بعد پیئر کو اندازہ ہو گیا کہ ان کے قلوب میں رستوفوں کے خلاف کتنی حقارت اور عناد بھرا پڑا ہے، اور یہ کہ ان کی موجودگی میں اس لڑکی کا، جو دنیا کے کسی دوسرے شخص کی خاطر پرنس آندرے کو ٹھکرا سکتی تھی، نام لینا بھی ناممکن ہے۔

ڈنر کے دوران میں گفتگو کا رخ جنگ کی، جس کے آثار روز بروز واضح ہوتے جا رہے تھے، طرف منتقل ہو گیا۔ پرنس آندرے کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور وہ مسلسل بولے جا رہا تھا، کبھی وہ اپنے باپ سے اور کبھی سوس ٹیوٹر دیسال سے بحث کرنے لگتا۔ وہ غیر فطری بشاشت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ اس کی وجہ پیئر کو اچھی طرح معلوم تھی۔

22

اسی شام پیئر اس ذمے داری کی، جو اس کے کندھوں پر ڈالی گئی تھی، تکمیل کے لیے رستوفوں کے ہاں چلا گیا۔ نتاشا بستر پر دراز تھی اور کاؤنٹ کلب گیا ہوا تھا۔ پیئر نے خطوط سونیا کے سپرد کر دیے اور خود ماریا دمتریونا کے، جسے یہ جاننے میں دلچسپی تھی کہ پرنس آندرے نے خبر پر کیا ردعمل ظاہر کیا ہے، پاس چلا گیا۔ دس منٹ بعد سونیا ماریا دمتریونا کے کمرے میں آئی۔

''نتاشا پیوتر کرلووچ سے ملنے پر مصر ہے،'' اس نے کہا۔
''ہم انھیں وہاں کیسے لے جا سکتے ہیں؟ تمھارے کمرے کی جھاڑ پونچھ تو ہوئی نہیں۔''
''نہیں، وہ لباس تبدیل کر چکی ہے اور نیچے ڈرائنگ روم میں آ گئی ہے،'' سونیا نے کہا۔
ماریا دمتریونا اپنے کندھے اچکا کر رہ گئی۔
''کاش کہ اس کی ماں آ جاتی! اس لڑکی نے تو مجھے اتنا پریشان کیا ہے کہ میرا اچومر نکل گیا ہے! ہاں، ذرا سمجھ

ے کام لینا اور اسے سب کچھ نہ بتا دینا،'' اس نے پیئر سے کہا۔ ''اس کی حالت اتنی قابل رحم ہے کہ مجھ میں اتنا جگرا نہیں رہا کہ اسے ڈانٹ ڈپٹ کر سکوں!''

نتاشا ڈرائنگ روم کے درمیان میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور پرعزم تھا (لیکن اس پر خجالت کے آثار قطعاً نہیں تھے، حالانکہ پیئر کو امید تھی کہ وہ محجوب ہو رہی ہو گی)۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا، وہ کچھ ہڑبڑائی اور ہچکچائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہی کہ آیا اسے آگے بڑھ کر پیئر کا استقبال کرنا چاہیے یا وہیں کھڑے کھڑے اس کا انتظار کرنا چاہیے۔

پیئر تیزی سے آگے بڑھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ حسب معمول اپنا ہاتھ آگے بڑھائے گی لیکن وہ اس کی طرف آتے آتے رک گئی۔ اس کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور اس کے بازو بالکل اسی بے جان انداز سے اس کے پہلوؤں پر لٹک رہے تھے جس طرح وہ اس وقت لٹکا کرتے تھے جب وہ نغمہ سرائی کرنے کے لیے بال روم کے درمیان میں کھڑی ہوا کرتی تھی، لیکن اب اس کے چہرے پر بالکل ہی مختلف قسم کا تاثر نمایاں ہو رہا تھا۔

''پیوتر کرلووچ،'' وہ تیز تیز بولنے لگی، ''پرنس بلکونسکی آپ کے دوست تھے — دوست ہیں،'' اس نے اپنی اصلاح کی۔ (وہ سمجھ رہی تھی کہ ہر چیز ماضی سے متعلق ہو چکی ہے، چنانچہ اب ہر چیز کی شکل صورت لازماً مختلف ہو گئی ہو گی)۔ ''ایک مرتبہ انھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ سے رجوع کروں۔''

پیئر کی نظر جب اس پر پڑی، اس نے ناک کے راستے زور کی سانس کھینچی اور اسے بولنے میں دشواری محسوس ہونے لگی۔ اب تک وہ دل ہی دل میں اسے برا بھلا کہتا رہا اور اس سے نفرت کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا، لیکن اب اسے اتنا ترس آنے لگا کہ لعنت ملامت کی مزید گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی۔

''وہ اب یہاں تشریف لا چکے ہیں... ان سے عرض کریں کہ وہ مجھے معاف فرما دیں۔''

وہ رک گئی اور اس کی سانس اب اور بھی تیز تیز چلنے لگی، لیکن اس کی آنکھ سے آنسو ایک بھی نہ ٹپکا۔

''ہاں... میں اسے بتا دوں گا،'' پیئر زیر لب بڑبڑایا۔ ''لیکن...''

اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔

نظر آ رہا تھا کہ نتاشا کو یہ سوچ ہلکان کر رہی تھی کہ معلوم نہیں پیئر کیا سمجھ رہا ہو گا۔

''میں جانتی ہوں کہ اب ہمارے مابین تمام رشتے ناتے منقطع ہو چکے ہیں،'' اس نے عجلت سے کہا۔ ''نہیں، اب انھیں دوبارہ بحال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں نے ان کے ساتھ جو زیادتی کی ہے، اس کی وجہ سے میں سخت اذیت میں مبتلا ہوں۔ ان سے صرف اتنا عرض کر دیں کہ میں ان سے معافی کی التجا کرتی ہوں، معافی کی بھیک مانگتی ہوں... مجھے سب کچھ معاف فرما دیں...''

اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا اور وہ کرسی پر بیٹھ گئی۔

دیا کا ایسا جذبہ، جس سے ازیں پیشتر پیئر قطعاً ناآشنا تھا، اس کے رگ وپے میں دوڑنے لگا۔

''میں اسے سب کچھ بتادوں گا، ایک بار پھر ایک ایک بات اس تک پہنچادوں گا،'' پیئر نے کہا۔ ''لیکن... میں ایک بات جاننا چاہوں گا۔''

''کیا جاننا چاہتے ہیں؟''

''میں یہ جاننا چاہوں گا: کیا تمھیں اس سے محبت ہوگئی تھی؟...'' پیئر کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اناطول کا نام کیسے لے اور اس کے تصور سے ہی اس کا چہرہ لال سرخ ہوگیا۔ ''کیا تمھیں اس بدذات سے محبت ہوگئی تھی؟''

''انھیں بدذات نہ کہیں،'' نتاشا نے کہا۔ ''لیکن مجھے پتا نہیں — قطعاً کچھ پتا نہیں۔''

وہ رونے لگی۔ پیئر کے دل میں پہلے سے بھی کہیں زیادہ ترحم، شفقت اور محبت کے جذبات امنڈنے لگے۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی عینک کے نیچے آنسو قطرہ قطرہ بہہ رہے ہیں اور وہ جی ہی جی میں دعائیں مانگنے لگا کہ نتاشا کی نظر ان پر نہ پڑے۔

''مائی ڈیئر، اب ہم اس بارے میں مزید کوئی بات نہیں کریں گے۔'' اور اچانک نتاشا کو اس کی پرخلوص، دھیمی اور نرم و ملائم آواز سن کر بہت عجیب لگا۔ ''مائی ڈیئر، اب ہم اس بارے میں بات نہیں کریں گے — میں اسے خود ہی سب کچھ بتادوں گا۔ لیکن میری ایک التجا ہے — مجھے اپنا دوست سمجھو۔ اگر تمھیں مدد درکار ہو، مشورے کی ضرورت ہو یا محض کسی کے سامنے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا ہو — ابھی نہیں، بلکہ اس وقت جب تمھارا دماغ صحیح طور پر سوچنے سمجھنے لگے — مجھے بلا لینا۔'' اس نے اس کا ہاتھ تھاما اور اسے چوم لیا۔ ''مجھے بے حد خوشی ہوگی اگر میں تمھارے کسی...''

پیئر ژولیدگی کا شکار ہوگیا۔

''مجھ سے اس طرح کی باتیں نہ کریں، میں ان کی مستحق نہیں ہوں!'' نتاشا چیخ پڑی اور وہ کمرے سے نکل چکی ہوتی لیکن پیئر نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

وہ جانتا تھا کہ ابھی اس نے مزید کچھ کہنا ہے لیکن جب وہ گویا ہوا، اپنے الفاظ پر خود ہی ہکابکا رہ گیا۔

''شی، شی! ابھی تو تمھاری ساری زندگی تمھارے سامنے ہے،'' اس نے کہا۔

''میرے سامنے؟ نہیں۔ میرے لیے سب کچھ ختم ہو چکا ہے،'' اس نے خفت اور خواری محسوس کرتے ہوئے کہا۔

''سب کچھ ختم ہوگیا؟'' پیئر نے دہرایا۔ ''اگر میں میں نہ ہوتا بلکہ میں روئے زمین کا وجیہہ ترین، عقل مند ترین اور ہر لحاظ سے بہترین مرد ہوتا، اور شادی کے بندھنوں سے آزاد ہوتا، میں اسی وقت، فی الفور، تمھارے سامنے دوزانو ہوگیا ہوتا اور گڑگڑا کر تم سے محبت کی بھیک مانگ رہا ہوتا، تم سے شادی کی التجا کر رہا ہوتا۔''

کئی دنوں کے بعد پہلی مرتبہ نتاشا کی آنکھوں سے تشکر اور نرم و ملائم جذبات کے آنسو ٹپک پڑے۔ اس نے پیئر کو ایک نظر دیکھا اور باہر نکل گئی۔

جب وہ جا چکی، پیئر بھی پیش دالان کی طرف بھاگ اٹھا۔ وہ ان آنسوؤں کو، جو مسرت اور ملائمت کے مظہر

تھے، روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے اپنا سموری کوٹ کندھوں پر ڈالا، اسے یہ خیال ہی نہ رہا کہ اسے بازو آستینوں میں ڈال لینا چاہئیں، اور وہ اپنی برف گاڑی میں جا بیٹھا۔

''یوئر ایکسی لینسی، کدھر چلیں؟'' کوچوان نے دریافت کیا۔

''کدھر؟'' پیئر نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''میں کہاں جا سکتا ہوں؟ کلب تو یقیناً نہیں جا سکوں گا اور نہ لوگوں سے ملنے ان کے گھر۔'' محبت اور شفقت کے جن جذبات کا اسے تجربہ ہوا تھا، نتاشا نے اپنے اشکوں کے بیچ میں سے اسے جن ملائم اور متشکر نگاہوں سے آخری مرتبہ دیکھا تھا، ان چیزوں کے مقابلے میں اسے تمام انسان قابل رحم اور بدنصیب دکھائی دے رہے تھے۔

''گھر!'' پیئر نے کہا اور اس بات کے باوجود کہ درجہ حرارت نقطہ انجماد سے دس درجے نیچے گر چکا تھا، اس نے اپنے چوڑے چکلے سینے پر ریچھ کی پوستین کے کوٹ کے بٹن کھول دیے اور مسرت کے احساس سے سرشار تازہ ہوا پھیپھڑوں میں کھینچنے لگا۔

مطلع صاف تھا اور پالا پڑ رہا تھا۔ گندی غلیظ سڑکوں، جن پر روشنی ناکافی تھی، اور سیاہ چھتوں کے اوپر تاریک اور ستاروں بھرا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ پیئر نے جب ٹکٹکی باندھ کر آسمان کی طرف دیکھا، صرف تبھی اسے یہ احساس ہوا کہ اب جن بلندیوں تک اس کی روح پہنچ چکی ہے، ان کے مقابلے میں تمام ارضی اشیا کتنی حقیر، کتنی گھٹیا ہیں۔ جب وہ آرباط سکوائر میں داخل ہوا، اس کی نگاہوں کے سامنے ستاروں سے معمور فلک کی لامحدود وسعتیں سما گئیں۔ اس آکاش کے تقریباً مرکز میں پری چیتنسکی خیابان کے اوپر 1812 کا جسیم تاباں و درخشاں دُم دار ستارہ جگمگا رہا تھا۔ یہ چاروں اطراف سے دوسرے ستاروں میں، جو آسمان پر چمک رہے تھے، محصور تھا، لیکن یہ باقی ستاروں سے اس لحاظ سے مختلف تھا کہ یہ ان کی نسبت زمین سے کہیں زیادہ قریب تھا، اس کی روشنی سفید براق تھی اور اس کی بے حد طویل دم اوپر کو اٹھی ہوئی تھی۔ لوگ کہتے تھے کہ یہ دُم دار ستارہ اپنی جلو میں ہر قسم کے مصائب و آفات لے کر آیا ہے اور قرب قیامت کا پیش خیمہ ہے۔ لیکن اس درخشاں و تاباں دُم دار ستارے نے، جس کی لمبی اور خیرہ کن دم تھی، پیئر کے دل میں کسی نوع کے خوف کا جذبہ نہ ابھارا، اس کے برعکس وہ مسرت و شادمانی سے سرشار اور اشکوں سے بھرپور آنکھوں سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اسے یہ سیارہ لامحدود خلا میں ناقابل تصور تیز رفتاری سے اپنے محور کے گرد سفر کرنے کے بعد سیاہ آسمان میں اپنی منتخب جگہ اسی طرح گڑا نظر آ رہا تھا جیسے کوئی تیر، جو زمین میں کھبا کھڑا ہو، دکھائی دیتا ہے۔ وہ بڑی جاں فشانی سے اپنی دم سیدھی اوپر اٹھائے ہوئے تھا اور لاتعداد دیگر چمکتے ستاروں کے مابین جگمگا رہا اور اپنی سفید براق روشنی کی نمائش کر رہا تھا۔ پیئر کو یوں لگا کہ یہ سیارہ اس کی اپنی روح سے، جو نرم و گداز ہو چکی تھی اور بلندیوں کی جانب اٹھ چکی تھی، پوری طرح ہم آہنگ ہے۔

تیسری کتاب

حصہ اول

1

1811 کے اواخر میں مغربی یورپ کے ممالک اپنی افواج کو سرتاپا مسلح اور انھیں مختلف مقامات پر جمع کرنے میں مصروف ہو گئے۔ 1812 میں لکھوکھا افراد پر مشتمل یہ افواج ــــ ان لوگوں میں وہ لوگ بھی، جن کے ذمے فوج کی نقل و حمل کے انتظامات کرنا اور انھیں سامان خورونوش فراہم کرنا تھا، شامل تھے ــــ مشرق کا رخ کرنے اور روس کی سرحدوں کی جانب بڑھنے لگیں۔ روسی بھی غافل نہیں تھے، انھوں نے بھی اسی سال کے دوران میں اپنی فوجیں وہاں پہنچانا شروع کر دیں۔ بارہ جون کو مغربی یورپ کی افواج روسی سرحد پار کر گئیں اور طبلِ جنگ بج گیا۔ بہ الفاظ دیگر ایک ایسا واقعہ، جو عقلِ انسانی اور فطرتِ انسانی سے قطعاً میل نہیں کھاتا تھا، ظہور پذیر ہو گیا۔ لاکھوں انسانوں نے ایک دوسرے کے خلاف جن جرائم ــــ دسیسہ کاریوں، فریب دہیوں، بے وفائیوں، دغابازیوں، قزاقیوں، جعل سازیوں، نقلی سکے اور نوٹ بنانے کی وارداتوں، غارت گریوں، آتش زنیوں اور قتلوں ــــ کا ارتکاب کیا، وہ بہ اعتبار تعداد اتنے زیادہ تھے کہ روئے زمین کی تمام عدالت ہائے انصاف میں اب تک جتنے مقدمات کا اندراج ہوا ہے، گنتی کے لحاظ سے وہ بھی ان کے مقابلے میں ہیچ ہیں۔ لیکن جو لوگ ان جرائم کے مرتکب ہوئے، وہ انھیں جرائم سمجھتے ہی نہیں تھے۔

یہ غیر معمولی واقعہ کیوں پیش آیا؟ اس کے پسِ پردہ کیا اسباب کارفرما تھے؟ مورخین بڑے بھولے بادشاہ ہیں کہ ہمیں پورے تیقن سے یہ بتاتے ہیں کہ یہ واقعہ اس لیے رونما ہوا کیونکہ ڈیوک آف اولڈن برگ کے ساتھ زیادتیاں کی گئی تھیں، براعظمی نظام[2] پر عمل نہ کیا گیا، نپولین کی خواہشات بے لگام ہو گئی تھیں، الیکساندر کے رویے میں لچک نہیں رہی تھی، سفارت کاروں سے حماقتیں سرزد ہوتی رہی تھیں، وغیرہ وغیرہ۔

اگر بات صرف اتنی تھی، پھر میٹرنش[3]، رومانتسیف[4] یا تالیغاں[5] کو یہ چاہیے تھا کہ وہ ان وقفوں کے، جو دربار کے انعقاد اور شام کی ضیافتوں کے مابین آتے تھے، دوران میں تھوڑی سی تکلیف کر لیا کرتے اور جچے تلے مراسلے تحریر کر دیا کرتے، یا پھر نپولین یہ کرتا کہ قلم اٹھاتا اور الیکساندر کے نام لکھتا:

"Monsieurmon frere"، میں ڈیوک آف اولڈن برگ کی بحالی کی منظوری دیتا ہوں..." بات رفت

• موسیو، برادر عزیز

گزشت ہو جاتی اور نوبت جنگ تک نہ پہنچتی۔

اگر اس زمانے کے لوگ اس انداز سے سوچتے تھے، بات ہماری سمجھ میں آتی ہے۔ نپولین سمجھتا تھا کہ جنگ کا باعث انگلستان کی ریشہ دوانیاں بنی ہیں (جیسا کہ اس نے سینٹ ہیلینا کے جزیرے میں، جہاں اسے مقید کیا گیا تھا، کہا بھی تھا)، برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کا خیال تھا کہ نپولین کی بے لگام خواہشات جنگ کا سبب بنیں، ڈیوک آف اولڈن برگ کا خیال تھا کہ جنگ اس لیے چھڑی کیونکہ اس کے ساتھ زیادتی روا رکھی گئی تھی، تاجروں کی سوچ یہ تھی کہ جنگ کی نوبت اس لیے آئی کیونکہ براعظمی نظام یورپ کو تباہ و برباد کر رہا تھا، جرنیلوں اور آزمودہ کار بوڑھے فوجیوں کی رائے یہ تھی کہ جنگ اس لیے برپا ہوئی کیونکہ ان کے لیے روزگار فراہم کیا جانا تھا، وہ لوگ، جو بادشاہت کے موروثی وارثوں، بالخصوص فرانس پر بوربوں خاندان[6] کی حکومت کے حامی تھے، وہ ان ''اعلیٰ اصولوں'' کی ترویجِ نو کی ضرورت کو اس کا باعث قرار دیتے تھے اور اس عہد کے سفارت کاروں کا خیال یہ تھا کہ جنگ اس لیے ہوئی کیونکہ 1809 میں روس اور آسٹریا کے مابین جو معاہدہ[7] طے پایا تھا، اسے نپولین سے ٹھیک طرح پوشیدہ نہ رکھا جا سکا اور یہ کہ میمورنڈم نمبر 178 کی عبارت ڈھنگ سے تحریر نہیں کی جا سکی تھی۔ یہ اور ان کی طرح کی لاتعداد اور بے شمار وجوہات[8] — تعداد کا انحصار نقطہ ہائے نظر کی فراوانی پر ہے — اس دور کے لوگوں کے اذہان میں آتی تھیں۔ ان کا اس انداز سے سوچنا بالکل فطری بات تھا اور ہماری سمجھ میں بھی یہ چیز آتی ہے کہ وہ اس طرح کیوں سوچتے تھے۔ لیکن جہاں تک ہم لوگوں، ان کے 'اخلاف' کا تعلق ہے، ہم ایک ایسی حقیقت کا، جو اپنے انت کو پہنچ چکی ہے، اس کی تمام تر وسعتوں سمیت، جائزہ لے رہے ہیں اور اس کے واضح اور بھیانک مفہوم کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمیں یہ وجوہ ناکافی نظر آتی ہیں۔ ہمیں یہ بات قابلِ فہم معلوم نہیں ہوتی کہ لکھوکھا عیسائیوں نے اس لیے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیا یا ایذائیں پہنچائیں کیونکہ نپولین کی خواہشات بے لگام تھیں، الیگزانڈر کا رویہ بے لوچ تھا، انگلستان کی پالیسی عیاری پر مبنی تھی یا ڈیوک آف اولڈن برگ کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی۔ ان حالات اور عام کشت و خون و تشدد کی اصل حقیقت کے مابین جو رشتہ ہونا چاہیے، ہمیں اس کا کوئی سرا ہاتھ نہیں آتا۔ اگر ڈیوک کے ساتھ زیادتی ہوئی تھی، یورپ کے دوسرے کنارے کے ہزاروں لوگوں کو کیا مجبوری تھی کہ انھوں نے سمولنسک اور ماسکو کو تاخت و تاراج کر دیا اور وہاں کے باشندوں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے، اور ان کے ہاتھوں خود بھی ہزاروں کی تعداد میں مارے گئے۔

ہم لوگ، ان کے وہ اخلاف، جو مورخ ہونے کا دعویٰ نہیں رکھتے اور جو تحقیق کی رو میں بہہ کر عاجلانہ یا احمقانہ نتائج اخذ نہیں کرتے، اس واقعے کا عام سوجھ بوجھ سے، جو کسی الجھن کا شکار نہیں ہوئی ہوتی، جائزہ لے سکتے ہیں اور یوں ان اسباب کو، جن کی تعداد حدوحساب سے باہر ہے، دریافت کر سکتے ہیں۔ ہم ان اسباب کی تلاش میں جتنا زیادہ گہرائی میں جائیں گے، اتنی ہی زیادہ تعداد میں ہم انھیں ڈھونڈ نکالیں گے، اور ہر سبب علیحدہ علیحدہ یا اسباب کا پورا اسلسلہ ہمیں جس طرح بالکل صحیح نظر آتا ہے، اسی طرح اگر اسے واقعے کی وسعتوں کے تناظر میں رکھ

کر دیکھا جائے، تو اپنی بے بضاعتی کی بنا پر اتنا ہی باطل دکھائی دینے لگتا ہے اور (اگر اسے مماثل اسباب سے نتھی نہ کیا جائے) اپنی ناطاقتی کے کارن کسی واقعے کو ظہور میں لانے سے اتنا ہی قاصر نظر آنے لگتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس یا اُس فرانسیسی کارپورل کا دوسری میقات کے لیے خدمات سرانجام دینے کے لیے رضامندی یا نارضامندی کا اظہار اس واقعے کے منظرِ عام پر آنے کے لیے اتنا ہی اہم تھا جتنا کہ نپولین کا دریائے وستولا سے فوجوں کو واپس بلانے اور اولڈن برگ کی ڈچی بحال کرنے سے انکار تھا کیونکہ اگر ایک 'دو' تین یا ہزار کارپورل اور عام سپاہی فوجی خدمات سرانجام دینے سے انکار کر دیتے، نپولین کی فوج میں اتنی تخفیف ہو جاتی کہ جنگ کے شعلوں کے بھڑکنے کا امکان ہی ختم ہو جاتا۔

اگر نپولین اس مطالبے پر' کہ وہ اپنی فوجیں دریائے وستولا کے پار لے جائے' ناراضگی کا اظہار نہ کرتا اور اس نے اپنی افواج کو پیش قدمی کا حکم نہ دیا ہوتا، جنگ نہ ہوتی۔ لیکن اگر اس کے تمام سارجنٹوں نے دوسری میقات کے لیے عسکری خدمات سرانجام دینے سے انکار کیا ہوتا، جنگ نہیں ہو سکتی تھی۔ جنگ پھر بھی نہ ہوتی' اگر انگریز ریشہ دوانیاں نہ کرتے، ڈیوک آف اولڈن برگ کا کوئی وجود نہ ہوتا، الیکساندر کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اس کی توہین ہوئی ہے، روس میں غیر جمہوری استبدادی حکومت نہ ہوتی، انقلاب فرانس برپا نہ ہوتا اور اپنی جلو میں آمریت اور امپائر نہ لایا ہوتا یا وہ تمام امور، جو انقلاب فرانس کا موجب بنے، نہ ہوتے، وغیرہ وغیرہ۔ اگر ان میں سے ایک سبب بھی عدم موجود ہوتا، کچھ بھی نہ ہوتا۔ چنانچہ وہ سب کے سب — اسباب کا جم غفیر — ایک ہی وقت میں ظہور پذیر ہوئے اور جو کچھ ہوا، اس کا باعث بنے۔ چنانچہ کسی ایک امر کو جنگ کا واحد سبب قرار نہیں دیا جا سکتا بلکہ یہ اس لیے برپا ہوئی کیونکہ اسے برپا ہونا ہی تھا۔ لاکھوں انسانوں نے اپنے انسانی جذبات اور عقل و فہم کو بالائے طاق رکھ کر بالکل اسی طرح اپنے برادر انسانوں کا قتل عام کرنے مغرب سے مشرق آنا ہی تھا جس طرح چند صدیاں پیشتر اپنے برادر انسانوں کو نوکِ شمشیر پر پرونے کے لیے تاتاریوں کے جتھوں نے مشرق سے مغرب کی طرف کوچ کیا تھا۔

جس طرح عام فوجی جوان کو، جسے قرعہ اندازی یا جبری بھرتی کے ذریعے جنگ میں دھکیل دیا گیا تھا، اپنے اعمال پر کوئی اختیار نہ تھا، بعینہٖ نپولین اور الیکساندر کے، بظاہر جن کے فرمان پر جنگ کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار تھا، اعمال میں بھی ان کی مرضی کو کوئی دخل نہیں تھا۔ حالات اس سے مختلف ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ نپولین اور الیکساندر (بظاہر واقعے کے ظہور پذیر ہونے کا انحصار انھیں دونوں پر تھا) کے منشا کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے بے شمار دوسرے حالات کا اسی وقت رونما ہونا ضروری تھا۔ ان میں سے اگر ایک بھی کتم وجود میں نہ آتا، یہ واقعہ منصۂ شہود پر نمودار نہ ہوتا۔ یہ ضروری تھا کہ لکھوکھا انسان — فوجی جوان، جو توپیں چلاتے تھے اور رسد و عسکری ساز و سامان ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے — جن کے ہاتھوں میں اصلی طاقت تھی، ان کمزور و ناتواں افراد کے منشا کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے رضامند ہو جاتے اور لامحدود، گوناگوں اور پیچیدہ وجوہات کی بنا پر اس کام کے لیے راغب کر لیے جاتے۔

تاریخ کے غیر عقلی واقعات (یعنی وہ واقعات جن کی عقلی طور پر توجیہہ کرنا ہمیں ممکن معلوم نہیں ہوتا) کی تشریح وتوضیح کرنے کے لیے ہمیں چار وناچار جبریت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ ہم ان واقعات کی عقلی توضیح کرنے کی جتنی زیادہ کوشش کرتے ہیں، یہ ہمیں اتنے ہی زیادہ غیر عقلی اور ناقابلِ فہم معلوم ہونے لگتے ہیں۔

ہر شخص اپنی ذات کی خاطر زندگی بسر کرتا ہے، وہ اپنی آزادی کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے اور اسے اپنے سارے وجود میں یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ فلاں وقت فلاں کام کر سکتا ہے یا نہیں، لیکن جونہی وہ کسی کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیتا ہے، اس پر اس کا اختیار ختم ہو جاتا ہے، وہ اس پر خطِ تنسیخ نہیں پھیر سکتا، بلکہ اس کا یہ کام تاریخ کا جزو بن جاتا ہے اور تاریخ میں اس کی حیثیت آزاد نہیں، بلکہ پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے۔

ہر شخص کی زندگی کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو اس کی نجی یا خلوتی زندگی۔ اس زندگی کے مشاغل دوسروں کی شراکت سے جتنے زیادہ بے نیاز ہوں گے، یہ اتنی ہی زیادہ آزاد ہوگی۔ دوسرے اس کی مشترکہ یا جلوتی زندگی۔ اس زندگی میں وہ انسانی گروہ میں ایک اکائی بن کر جیتا ہے اور جو قوانین اس کے لیے وضع کیے جا چکے ہوں، ان سے وہ سرِ مُو روگردانی نہیں کر سکتا۔

شعوری طور پر انسان اپنی ذات کی خاطر زندگی بسر کرتا ہے، لیکن غیر شعوری طور پر وہ بنی آدم کے تاریخی اور معاشرتی مقاصد کی تکمیل کے لیے آلۂ کار کے طور پر کام کرتا ہے۔ جو فعل پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے، ناقابلِ تنسیخ ہو جاتا ہے اور وہ فعل جو عین اس وقت، جب لکھو کھا دیگر انسانوں کے (اسی قسم کے) افعال برپا ہوتے ہیں، منصۂ شہود پر آتا ہے، تاریخی اہمیت اختیار کر جاتا ہے۔ سماجی پیمانے میں ایک انسان جتنی زیادہ بلندی پر پہنچ جاتا ہے، انسانوں کے ساتھ اس کے تعلقات جتنے زیادہ وسیع ہو جاتے ہیں اسے ان پر جتنا زیادہ اختیار حاصل ہو جاتا ہے، ہر فعل جو وہ سرانجام دیتا ہے، اس کا پہلے سے طے شدہ ہونا اور ناگزیر طور پر وجود میں آنا اتنا ہی زیادہ اظہر من الشمس ہو جاتا ہے۔

"بادشاہوں کے قلوب خدا کی مٹھی میں ہیں۔"

بادشاہ تاریخ کا غلام ہوتا ہے۔

تاریخ، یعنی بنی آدم کی غیر شعوری، عالم گیر اجتماعی زندگی، بادشاہوں کی زندگی کے ایک ایک پل کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتی ہے۔

❦

اگر چہ کسی بھی دوسرے وقت کے مقابلے میں 1812 کے ان ایام میں نپولین کو کہیں زیادہ یہ یقین ہو چکا تھا کہ اپنے مختلف ممالک کے باشندوں کے خون بہائے جانے یا نہ بہائے جانے کا انحصار — جیسا کہ الیکسانڈر نے اس کے نام اپنے آخری مکتوب میں تحریر کیا تھا — اس کی اپنی مرضی پر ہے، وہ قدرت کے اٹل قوانین کے اتنا تابع کبھی نہیں رہا تھا جتنا کہ وہ تب تھا۔ یہ قوانین اسے مجبور کر رہے تھے (جب کہ وہ خود یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی

مرضی سے کر رہا ہے) کہ وہ دنیا کے لیے، تاریخ کے لیے، عمومی طور پر وہی کچھ کرے جس کا بروئے کار لایا جانا پہلے سے معین کیا جا چکا تھا۔

اپنے برادر انسانوں کا قتل کرنے مغرب کے لوگ مشرق کی جانب بڑھنے لگے۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ مختلف واقعات اتفاق سے بیک وقت ظہور پذیر ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اس اصول کے مطابق ہزاروں ہی چھوٹی بڑی وجوہات — براعظمی نظام کی عدم پابندی پر لعنت ملامت، ڈیوک آف اولڈن برگ کے ساتھ زیادتیاں، پرشیا کے اندر فوجوں کی نقل و حرکت (نپولین کے خیال کے مطابق یہ کام بزورِ شمشیر امن حاصل کرنے کے لیے کیا جا رہا تھا)، فرانسیسی امپراطور کی جنگ سے محبت اور اس کی معرکہ آرائی کرنے کی عادت، جو اتفاق سے اس کی قوم کے رجحانات سے مطابقت رکھتی تھی، پرشکوہ تیاریاں کرتے رہنے کا شدید جذبہ، ان تیاریوں پر اٹھنے والے اخراجات اور ان کی تلافی کے لیے فوائد حاصل کرنے کی ضرورت، ڈریسڈن[9] میں اسے جن اعزازات والقابات سے نوازا گیا، ان کے نشہ آور اثرات، سفارتی مذاکرات، جو معاصرین کی رائے کے مطابق حصولِ امن کی پرخلوص خواہش کے تحت منعقد کیے گئے تھے لیکن جنھوں نے دونوں فریقوں کی خودداری کو صرف ٹھیس پہنچائی، اور اس قسم کے بے شمار دیگر واقعات — منظر عام پر آنے، ایک دوسرے پر منطبق ہونے اور ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہونے لگیں۔ یہ تمام کی تمام اس واقعے کے، جس کا پیش آنا مقدر ہو چکا تھا، ساتھ ہم آہنگ ہونے اور عین اسی زمانے میں، جب یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا چاہتا تھا، نمودار ہونے لگیں۔

جب سیب پک جاتا اور نیچے گر پڑتا ہے — یہ نیچے کیوں گرتا ہے؟ کیا اس کی وجہ کشش ثقل کی قوت ہے؟ یا اس کا سبب یہ ہے کہ یہ جس تنے پر لگا ہوا ہے، وہ مرجھا جاتا ہے، یا یہ دھوپ سے سوکھ جاتا ہے، یا اس کا وزن حد سے بڑھ جاتا ہے، یا ہوا اسے زور زور سے ہلانے لگتی ہے، یا وہ لڑکا جو اس کے نیچے کھڑا ہے، اسے کھانا چاہتا ہے؟

ان میں سے کوئی بھی اصل وجہ نہیں ہے۔ یہ سب مل جل کر ان حالات کا ارتکاز، جس کے تحت نامیاتی فطرت کا ہر حیاتی عمل اپنی تکمیل کرتا ہے، وجود میں لاتے ہیں۔ اور وہ ماہر نباتات، جو یہ معلوم کرتا ہے کہ سیب اس لیے گرا ہے کیونکہ خلیہ دار بافتیں گل سڑ گئی ہیں، وغیرہ وغیرہ، اتنا ہی صحیح یا غلط ہے جتنا کہ وہ لڑکا، جو درخت کے نیچے کھڑا ہے اور کہتا ہے کہ سیب اس لیے گرا کیونکہ وہ اسے کھانا چاہتا تھا اور اس نے اس کے نیچے گرنے کی دعا مانگی تھی۔ اسی طریقے سے وہ مورخ، جو یہ کہتا ہے کہ نپولین ماسکو اس لیے گیا کیونکہ وہ وہاں جانا چاہتا تھا اور تباہ و برباد اس لیے ہوا کیونکہ الیکساندر اس کی تباہی و بربادی چاہتا تھا، اتنا ہی صحیح یا غلط ہے جتنا کہ وہ شخص، جو یہ کہتا ہے کہ ہزاروں ٹن وزنی پہاڑی، جس کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور جو ڈانواں ڈول ہو رہی تھی محض اس لیے گری کہ اس پر ہتھوڑے سے جو آخری ضرب لگائی گئی، وہ کارگر ثابت ہوئی۔ تاریخی اہمیت کے واقعات میں نام نہاد مردانِ عظیم محض چٹیں (لیبل) ہوتے ہیں۔ ان کا کام واقعے کو محض نام دینا ہوتا ہے اور چٹ کی طرح فی نفسہٖ ان کا واقعے سے تعلق صرف سطحی ہوتا ہے۔

ان کا ہر فعل، جو انھیں اپنی آزاد قوتِ ارادی کا فعل معلوم ہوتا ہے، تاریخی مفہوم میں بالکل آزاد نہیں ہوتا بلکہ

وہ تاریخ کے پورے دھارے کے ساتھ منسلک ہوتا ہے اور ازل سے اس کا وجود میں آنا طے پا چکا ہوتا ہے۔

2

نپولین 29 مئی کو ڈریسڈن سے روانہ ہوا۔ یہاں اس نے تین ہفتے درباریوں کے، جن میں پرنس، ڈیوک، بادشاہ بلکہ ایک امپراطور بھی شامل تھا، مابین گزارے تھے۔ اپنی روانگی سے قبل اس نے امپراطور اور ان بادشاہوں اور پرنسوں کو، جو اس کی دانست میں اس کی عنایاتِ خسروانہ کے مستحق تھے، دل کھول کر اپنی نوازشات سے نوازا، تاہم جن بادشاہوں اور پرنسوں سے وہ پوری طرح مطمئن نہیں تھا، اس نے ان کے کان اینٹھنے سے دریغ نہ کیا۔ اس نے آسٹریا کی امپراطورہ کو اپنے ہیرے جواہرات — یعنی وہ، جو اس نے دوسرے بادشاہوں سے حاصل کیے تھے — پیش کیے۔ وہ بڑے پیار اور شفقت سے امپراطورہ ماری لوئیسے سے — جو اس حقیقت کے باوجود کہ اس کی ایک بیوی پیرس میں موجود تھی، اپنے آپ کو اس کی شریکِ حیات سمجھتی تھی — بغل گیر ہوا اور اسے روتے کلبلاتے (اس کے مورخین ہمیں بتاتے ہیں کہ امپراطورہ کے لیے اس کی یہ جدائی برداشت کرنا محال ہو رہا تھا) چھوڑ کر عازمِ سفر ہو گیا۔

اگرچہ سفارت کاروں کو امن کے امکان پر پختہ یقین تھا اور وہ اس مقصد کے حصول کے لیے بڑے جوش و خروش سے بھاگ دوڑ کر رہے تھے، اور اگرچہ امپراطور نپولین نے بذاتِ خود الیکساندر کے نام خط، جس میں اس نے اسے "Monsieurmon frere" کے لقب سے خطاب کیا تھا، تحریر کیا تھا اور اس میں اسے یقین دلایا تھا کہ وہ جنگ نہیں چاہتا اور ہمیشہ اس سے محبت کرتا اور اس کے ساتھ احترام سے پیش آتا رہے گا، — اس کے باوجود اس نے رختِ سفر باندھا اور اپنی فوج کے ساتھ جا ملنے کے لیے کوچ کر گیا۔ وہ ہر پڑاؤ پر تازہ احکام صادر کرتا رہا کہ اس کی فوجوں کو مغرب سے مشرق پہنچانے کے کام کی رفتار تیز سے تیز تر کر دی جائے۔ وہ اس سڑک پر، جو پوزین،[10] تورن،[11] ڈانسگ[12] اور کونگش برگ[13] جاتی تھی، اپنے عالی مرتبت خدمت گاروں، ایڈی کانگوں اور ایک حفاظتی دستے کی جلو میں ایک بند بگھی میں، جسے چھ گھوڑے کھینچ رہے تھے، سفر کرتا رہا۔ ان تمام قصبوں اور شہروں کے ہزاروں لوگوں نے ڈرتے کانپتے اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

فوج مغرب سے مشرق کی جانب رواں دواں تھی اور وہ خود بھی اسی جانب جا رہا تھا۔ وہ مختلف چوکیوں پر اپنی بگھی کے چھیوں کے چھ گھوڑے تبدیل کرتا رہا۔ دس جون کو وہ فوج سے آملا۔ اس کے قیام کے لیے ولکووسکی جنگل میں ایک پولستانی کاؤنٹ کی جاگیر پر بندوبست کیا گیا تھا۔ اس نے رات وہیں بسر کی۔

اگلے روز نپولین فوج سے آگے نکل گیا اور دریائے نیمین[14(الف)] کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے دریا عبور کرنے کے لیے کوئی مناسب جگہ منتخب کرنے سے پہلے اپنی وردی اتار دی اور پولستانی وردی پہن لی۔

جب اس نے دوسرے کنارے پر قازقوں کو تعینات دیکھا اور اس کی نظر گھاس کے وسیع و عریض میدانوں پر

• برادرِ من

بڑی جن کے درمیان میں ماسکو کا مقدس شہر — "*Moscoulaville sainte' — واقع ہے اور جو اسی قسم کی مملکت کا، جس قسم کی مملکت توران تھی اور جس پر سکندر اعظم نے چڑھائی کی تھی دار السلطنت تھا، نپولین نے غیر متوقع طور پر اور فنِ حرب وضرب کی حکمت عملیوں اور سفارتی تقاضوں کے علی الرغم پیش قدمی کرنے کا حکم دے دیا اور اگلے روز اس کی افواج دریائے نیمین عبور کرنے لگیں۔

بارہ جون کی صبح کو وہ تڑکے تڑکے اپنے خیمے سے، جو اس روز دریائے نیمین کے بائیں کنارے سیدھی ڈھلوان پر نصب تھا، باہر آیا اور دوربین سے اپنی افواج کو ولکووسکی جنگل سے نکلتے اور تین پلوں پر سے، جو عارضی طور پر بنائے گئے تھے، دریا عبور کرتے دیکھنے لگا۔ فوجیوں کو امپراطور کی موجودگی کا علم تھا۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ ایک نظر اسے دیکھ سکیں۔ انھوں نے جب پہاڑی پر اپنے خیمے کے سامنے اپنے ایڈی کانگوں اور سٹاف کے دیگر ارکان سے الگ تھلگ اوورکوٹ اور ہیٹ پہنے ایک شخص کو کھڑے دیکھا، انھوں نے اپنی ٹوپیاں فضا میں اچھال دیں اور "امپراطور زندہ باد" ("!Vivel, Empereur") کے نعرے بلند کرنے لگے۔ وہ صفیں باندھے موج کی طرح مسلسل یکے بعد دیگرے جنگل سے، جس نے انھیں چھپا رکھا تھا، باہر آتے گئے۔ ان کی صفوں میں صرف اسی وقت شگاف نمودار ہوتے جب وہ دریا عبور کرنے کے لیے تینوں پلوں کے قریب پہنچتے۔

"اب کامیابی ہمارے قدم چومے گی! جب وہ خود کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں، پھر کچھ نہ کچھ ہو کر ہی رہتا ہے... خدا کی قسم!... وہ رہے وہ!... !Vivel, Empereur، تو یہ ہیں ایشیا کے گھاس کے میدان! بہرحال بڑا غلیظ ملک ہے۔ خدا حافظ، خدا تمھارا بھلا کرے!... میں تمھارے لیے ماسکو کا بہترین محل محفوظ رکھوں گا! خدا حافظ! خدا تمھارا بھلا کرے!... تم نے امپراطور کو دیکھا؟ !Vivel, Empereur اگر انھوں نے مجھے ہندوستان کا گورنر مقرر کر دیا، پھر پیغاغ، میں تمھیں وزیرِ کشمیر بنا دوں گا[14(ب)] — یہ میرا تمھارے ساتھ وعدہ ہے۔ زندہ باد امپراطور! ہرّا، ہرّا، ہرّا... (ان بدمعاش قازقوں کو دیکھو، کیسے دوڑے چلے جا رہے ہیں!! !Vivel, Empereur وہ رہے، ادھر! نظر آئے؟ میں نے واضح طور پر دو مرتبہ انھیں دیکھا ہے، بالکل ایسے جیسے میں تمھیں دیکھ رہا ہوں **de petit Corporel... میں نے انھیں ہمارے ایک پرانے ساتھی کو صلیب پیش کرتے دیکھا ہے... زندہ باد امپراطور!" کردار اور سماجی حیثیت کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف بوڑھے اور جوان سبھی فوجیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ جس مہم کا مدتوں سے انتظار ہو رہا تھا، اس کے آغاز پر تمام چہروں پر یکساں مسرت کا اظہار ہو رہا تھا، اور وہ شخص، جو سرمئی کوٹ پہنے پہاڑی پر کھڑا تھا، اس کے متعلق گرم جوشی اور الفت دکھائی جا رہی تھی۔

تیرہ جون کو ایک قدرے کوتاہ قامت اصیل عربی گھوڑا نپولین کے پاس لایا گیا۔ وہ اس پر سوار ہوا اور اسے بگٹٹ دوڑاتا دریائے نیمین پر ایک تعمیر شدہ پل کی جانب چل پڑا۔ اس سارے عرصے کے دوران میں کانوں کے

---

* ماسکو، ولیوں کا شہر

** ننھا کارپورل۔ پست قامتی کی وجہ سے یہ نپولین کا عرف بن گیا تھا۔

پردے پھاڑ دینے والے وجد آفریں نعرے لگتے رہے۔ بظاہر وہ انھیں اس لیے برداشت کر رہا تھا کیونکہ اس کے جوان جس طرح گلے پھاڑ پھاڑ کر اس سے اپنی محبت کا اظہار کر رہے تھے، انھیں اس سے روکنا ناممکن تھا۔ تاہم یہ شور وغل، جو اس کا، وہ جدھر بھی جاتا، پیچھا کر رہا تھا، اسے تھکانے اور اس کی توجہ عسکری مسائل سے ہٹانے لگا تھا۔ وہ ان مسائل میں تبھی سے، جب وہ نیا نیا فوج میں بھرتی ہوا تھا، گھرا اور ان پر سوچ بچار کرتا چلا آ رہا تھا۔ وہ جھولتے جھالتے کشتیوں کے پل کے پار پہنچا، تیزی سے بائیں جانب مڑا اور اپنا گھوڑا اکا ونو گاؤں کی سمت میں سرپٹ دوڑانے لگا۔ اس کے آگے آگے ہارس گارڈز کے پرجوش اور برق رفتار جوان تھے۔ ان کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا اور وہ اس کے آگے آگے سربکف بھاگے جا رہے تھے اور فوجوں کے عین درمیان میں سے اس کے لیے راستہ بنا رہے تھے۔ جب وہ بہت چوڑے پاٹ کے دریا ولایا کے قریب پہنچا، اس نے پولستانی نیزہ بردار سواروں (uhlans) کی رجمنٹ کے پاس، جو دریا کے کنارے پر متعین تھی، اپنے گھوڑے کی لگامیں کھینچ لیں۔

''امپراطور زندہ باد!'' پولستانیوں کے نعرے کی گھن گرج کسی سے کم نہ تھی۔ ان کی صفیں الٹ گئیں اور وہ اس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ایک دوسرے سے دھکم پیل کرنے لگے۔

نپولین نے دریا کا جائزہ لیا، گھوڑے سے نیچے اترا اور ایک شہتیر پر، جو دریا کے کنارے پڑا تھا، بیٹھ گیا۔ اس کے خاموش اشارے پر اسے ایک دوربین تھما دی گئی۔ اس نے اسے وفورِ مسرت سے سرشار خدمت گار کی، جو بھاگتا دوڑتا اس کے پاس پہنچا تھا، پشت پر ٹکا دیا۔ اس نے دریا کے دوسرے کنارے کو اچھی طرح دیکھا بھالا اور پھر ایک نقشے کے، جسے چند شہتیروں پر پھیلا دیا گیا تھا، مطالعے میں محو ہو گیا۔ اس نے سر اٹھائے بغیر کچھ کہا اور اس کے دو ایڈی کانگ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے پولستانی نیزہ بردار سواروں کی طرف چل دیے۔

حکم یہ تھا کہ وہ دریا میں پایاب گزرگاہ تلاش کریں اور دریا پار کر جائیں۔ پولستانی سواروں کے کرنل نے جو، وجیہہ و شکیل معمر شخص تھا، جس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور جس کی کیفیت ہیجانی ہو رہی تھی، ایڈی کانگ سے دریافت کیا کہ آیا اسے پایاب گزرگاہ تلاش کرنے کے بجائے اپنے جوانوں کے ساتھ تیر کر دریا پار کرنے کی اجازت مل سکتی ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے یہ خوف کھائے جا رہا ہے کہ کہیں اسے انکار ہی نہ ہو جائے۔ چنانچہ اس نے ایک ایسے لڑکے کی طرح، جو گھوڑے پر سوار ہونے کی اجازت مانگ رہا ہو، گڑگڑا کر درخواست کی کہ اسے امپراطور کی نگاہوں کے سامنے تیر کر دریا عبور کرنے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ ایڈی کانگ نے جواب دیا: ''غالب امکان یہی ہے کہ امپراطور اس قسم کے بے پناہ جوش و خروش پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں فرمائیں گے۔''

جونہی ایڈی کانگ کے منہ سے یہ الفاظ نکلے، موچھیل بوڑھے افسر نے چمکتی آنکھوں اور تمتماتے چہرے کے ساتھ اپنا نیزہ فضا میں لہرایا، ''زندہ باد'' کا نعرہ لگایا، اپنے جوانوں کو اپنے پیچھے آنے کا حکم دیا، اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور بگٹٹ دریا کی جانب بھاگنے لگا۔ اس نے بے دردی سے اپنے گھوڑے کو، جو اس کے نیچے اڑیل ہو چلا تھا، ٹھوکا دیا اور دریا میں کود پڑا۔ وہ سیدھا اس طرف جا رہا تھا جہاں پانی کی گہرائی سب سے زیادہ تھی اور جہاں انتہائی

تیز موجیں محوِ گردش تھیں۔ سینکڑوں نیزہ بردار سوار اس کے پیچھے سرپٹ گھوڑے دوڑانے لگے۔ تیز موجوں کے بیچ میں پانی ٹھنڈا تھا اور وہاں جانا پرخطر تھا۔ سوار گھوڑوں سے نیچے گرنے اور ایک دوسرے کے ہاتھ تھامنے لگے۔ چند گھوڑے اور چند انسان بھی ڈوب گئے۔ باقی دریا کے دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ کوئی تیر رہا تھا، کوئی کاٹھی کے ساتھ چمٹا ہوا تھا اور کسی نے گھوڑے کی ایال پکڑ رکھی تھی۔ اس حقیقت کے باوجود کہ دریا کا پایاب پاٹ صرف چوتھائی میل دور تھا، انھیں اس بات پر فخر تھا کہ وہ اس شخص کی، جو شہتیر پر بیٹھا تھا اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہا، نگاہوں کے سامنے تیر کر دریا عبور کر رہے اور ڈوب رہے ہیں۔ جب ایڈی کانگ واپس آیا، اس نے مناسب موقع منتخب کر کے امپر اطور کی توجہ پولستانیوں کے اس کی ذات کے ساتھ لگاؤ کی طرف مبذول کرائی۔ سرمئی کوٹ میں ملبوس پست قامت شخص اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس نے بیخ تیئے[15] کو بلایا اور اس کے ساتھ دریا کے کنارے چہل قدمی کرنے لگا۔ وہ اسے احکامات سنانے لگا اور کبھی کبھار ڈوبتے سواروں پر ناپسندیدگی کی نگاہ ڈال لیتا کیونکہ وہ اس کی توجہ میں مخل ہو رہے تھے۔

یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس کا اسے پہلی بار تجربہ ہوا ہو۔ وہ جانتا تھا کہ افریقہ سے لے کر مسکووی[16] کے گھاس کے میدانوں تک دنیا کے کسی بھی حصے میں اس کی موجودگی انسانوں کے سر گھمانے اور انھیں ایثار و قربانی کے لایعنی کارنامے سرانجام دینے پر ابھارنے کے لیے کافی ہے۔ اسے اس سلسلے میں کسی ثبوت کی ضرورت نہیں تھی۔ اس نے اپنا گھوڑا منگوایا اور اپنے پڑاؤ کی جانب چل پڑا۔

امدادی کشتیاں بھیجے جانے کے باوجود چالیس سوار لہروں کی بھینٹ چڑھ گئے۔ اکثریت کسی نہ کسی طرح اس کنارے، جہاں سے وہ چلے تھے، واپس پہنچ گئی۔ کرنل اور اس کے متعدد جوان دریا پار کر گئے لیکن وہ بڑی مشکلوں سے باہر نکل سکے۔ اگرچہ ان کے ملبوسات پانی میں تربتر ہو چکے تھے اور ان کے اجسام کے ساتھ چپکے ہوئے تھے، وہ جونہی پانی سے باہر آئے، انھوں نے گلوں کی پوری قوت سے ''زندہ باد'' کا نعرہ لگایا اور وفورِ مسرت سے اس مقام کی، جہاں نپولین موجود تھا، طرف دیکھنے لگے۔ اگرچہ نپولین جا چکا تھا، پھر بھی ان کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔

شام کو دو احکام جاری ہوئے۔ ایک حکم کے مطابق ان جعلی نوٹوں کو، جو روس میں پھیلانے کے لیے تیار کیے گئے تھے، جلد از جلد پہنچایا جانا تھا۔ دوسرے حکم کے تحت ایک سیکسن[17] باشندے کی سزائے موت پر عمل کیا جانا تھا۔ اس شخص کو اس لیے سزائے موت دی گئی تھی کیونکہ اس کے قبضے سے ایک خط، جس میں فرانسیسی افواج کی تقسیم و ترتیب کے متعلق معلومات مندرج تھیں، برآمد ہوا تھا۔ ان دونوں احکام کے درمیان میں نپولین نے ایک تیسرا حکم دیا کہ جو پولستانی کرنل غیر ضروری طور پر دریا میں کود گیا تھا، اسے لیجن ڈانر[18] میں جس کا نپولین خود سربراہ تھا، شامل کر لیا جائے۔

Quos vult perdere — dementat*

---

* پورا جملہ یہ ہے Quos (Juppiter) vult perdere demental (prius) جسے خدا نے تباہ کرنا ہوتا ہے، وہ اس کی موت مار دیتا ہے۔

3

دریں اثنا روس کا امپراطور فوجوں کے معائنے اور جنگی مشقوں کے انعقاد کے سلسلے میں ایک ماہ سے کچھ اوپر ولنا[19] میں مقیم تھا۔ جس جنگ کی توقع ہر شخص کر رہا تھا اور جس کی تیاریوں کی خاطر امپراطور پیٹرز برگ سے آیا تھا، اس کا سامنا کرنے کے لیے ابھی کچھ بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا تھا۔ جنگ کس طریقے سے لڑی جائے گی، اس کا ابھی تک کوئی عمومی خاکہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ مختلف خاکے تجویز کیے گئے لیکن عمل کس پر ہوگا، زار کو ہیڈ کوارٹر پہنچے ایک ماہ سے اوپر ہو چکا تھا، لیکن کوئی فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔ تینوں افواج کے اپنے اپنے کمانڈر انچیف[20] تھے، لیکن تمام سپاہ کا سپریم کمانڈر کون ہوگا، اس کی تقرری ابھی ہونا تھی اور امپراطور نے اس ذمے داری کو خود سنبھالنا مناسب خیال نہ کیا۔

ولنا میں امپراطور کا قیام جوں جوں طویل ہوتا جا رہا تھا، جنگی تیاریوں کے لیے ہر شخص کے۔۔ انتظار کرتے کرتے سب لوگ تنگ آ چکے تھے۔۔ جوش و خروش اور ولولے میں توں توں کمی آتی جا رہی تھی۔ جن لوگوں نے امپراطور کو اپنے نرغے میں لے رکھا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کوششوں کا محور محض یہ ہے کہ اس کے لیے عیش و عشرت کا زیادہ سے زیادہ سامان فراہم کیا جائے اور ایسے حالات پیدا کیے جائیں کہ وہ جنگ، جس کا خطرہ سروں پر منڈلا رہا تھا، اس کے ذہن سے نکل جائے۔

جون میں جب لاتعداد اجتماعی رقص کی محفلیں اور ضیافتیں، جن کا اہتمام پولستانی عمائدین، درباریوں اور خود زار نے کیا تھا، منعقد ہو چکیں، ایک پولستانی جرنیل کو، جو زار کے عملے میں شامل تھا، خیال آیا کہ امپراطور کے ایڈی کانگوں کو زار کے اعزاز میں ضیافت اور محفل رقص رچانا چاہیے۔ اس کی تجویز کو اس کے تمام رفقا نے سراہا اور زار نے بھی اسے شرفِ قبولیت بخش دیا۔ ایڈی کانگوں نے چندہ کر کے رقم اکٹھا کر لی۔ جس خاتون کے متعلق خیال تھا کہ وہ امپراطور کی منظورِ نظر ہے، اسے میزبانی کے فرائض ادا کرنے کے لیے منتخب کر لیا گیا۔ کاؤنٹ بے نگ سین نے، جو ولنا صوبے کا جاگیر دار تھا، دعوت کے انعقاد کے لیے اپنا قصر پیش کر دیا اور بے نگ سین کے دیہی مسکن زاک ریتو میں ضیافت، محفل رقص، کشتیوں کی دوڑ اور آتش بازی کے لیے جون کی تیرہ تاریخ مقرر ہو گئی۔

عین اس روز، جب نپولین نے اپنی افواج کو دریائے نیمین عبور کرنے کا حکم دیا اور اس کے ہراول دستے نے قازقوں کو پیچھے دھکیل کر روسی سرحد عبور کی، الیکساندر اپنی شام اجتماعی رقص کی محفل میں، جس کا اہتمام اس کے ایڈی کانگوں نے بے نگ سین کے دیہی قصر میں کیا تھا، گزار رہا تھا۔

یہ بڑی زرق برق، پرشکوہ اور خیرہ کن ضیافت تھی۔ صاحبان ذوق سلیم و تمیز اور قدردان حضرات نے ڈنکے کی چوٹ کہا کہ پری تمثال، روشن جمال اور خوش اندام خواتین اتنی بڑی تعداد میں شاید ہی کبھی ایک مقام پر جمع ہوئی ہوں گی۔ کاؤنٹس بزوخوا جو دوسری روسی خواتین کے ساتھ امپراطور کے تعاقب میں پیٹرز برگ سے ولنا آئی تھی، دعوت میں موجود تھی۔ اس کا نام نہاد جسیم روسی حسن پولستانی خواتین کی، جو اس کے مقابلے میں کہیں نازک اور لاغر اندام

تھیں، آب وتاب کو گہنا رہا تھا۔ زار اس کی طرف ملتفت ہوا اور اس نے اسے اپنے ساتھ رقص کرنے کا اعزاز بخشا۔

بورس دروبتیسکوئے بھی، جو اپنی دلہن کو ماسکو چھوڑ آیا تھا اور خود اپنے بقول فی الحال en garcon• تھا، وہاں موجود تھا۔ اگرچہ وہ امپراطور کا ایڈی کانگ نہیں تھا، اس نے اخراجات کے ضمن میں خاصی بڑی رقم دی تھی۔ بورس اب مالدار آدمی تھا اور خاصے بلند مقام پر فائز ہو چکا تھا۔ اب وہ دوسروں کی سرپرستی کا جویا نہیں تھا بلکہ اپنی نسل کے انتہائی ممتاز اور نمائندہ اشخاص کے ہم پلہ تھا۔

رات بھیگ چکی تھی لیکن رقص جاری تھا۔ ہیلین کو اپنی پسند کا کوئی ساتھی میسر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بورس کو پیشکش کی کہ وہ اس کے ساتھ مازورکا رقص کرنے کے لیے تیار ہے۔ ان کا جوڑا تیسرا تھا۔ ہیلین کے برہنہ شانوں کی آب وتاب نگاہوں کو خیرہ کر رہی تھی اور وہ سیاہ باریک جالی کے گاؤن سے، جس پر تلے سے کشیدہ کاری کی ہوئی تھی، باہر جھانک رہے تھے۔ بورس نے انھیں سرد مہرانہ بے نیازی سے دیکھا اور اس کے ساتھ پرانے واقف کاروں کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ اس کے ساتھ ہی، اگرچہ خود اسے اس کا شعور نہیں تھا اور نہ دوسروں نے اس پر کوئی دھیان دیا تھا، اس نے ایک لحظے کے لیے بھی اپنی نگاہیں زار سے، جو اسی کمرے میں موجود تھا، نہ ہٹائیں۔ امپراطور رقص نہیں کر رہا تھا۔ وہ دروازے میں کھڑا تھا اور شفقت آمیز لہجے سے، جسے صرف وہی اپنانا جانتا تھا، کبھی ایک اور کبھی دوسرے جوڑے کو روک لیتا تھا۔

جب مازورکا رقص کا آغاز ہوا، بورس نے دیکھا کہ ایجوٹنٹ جنرل بالاشیف، جو ان لوگوں میں شامل تھا جنھیں صحیح معنوں میں زار کا قرب حاصل تھا، اس کے پاس گیا اور درباری آداب کو پس پشت ڈال کر اس کے قریب جا کھڑا ہوا حالانکہ وہ اس وقت ایک پولستانی خاتون سے مصروف کلام تھا۔ زار نے اس خاتون سے ایک دو جملے کہے اور دریافت طلب نگاہوں سے بالاشیف کی طرف دیکھا۔ بظاہر وہ سمجھ گیا تھا کہ بالاشیف نے یہ حرکت یونہی نہیں کی بلکہ اس کے پیچھے اہم وجوہ ہوں گی۔ اس نے خاتون کی جانب گردن کو ذرا سا خم دیا اور اپنے ایجوٹنٹ جنرل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بالاشیف نے بمشکل اپنی زبان کھولی ہو گی کہ زار کے چہرے پر تحیر کے آثار نمودار ہو گئے۔ اس نے بالاشیف کا بازو پکڑا اور اس کے ساتھ کمرا عبور کرنے لگا۔ وہ غیر ارادی طور پر تین گز چوڑا راستہ بناتا جا رہا تھا کیونکہ دونوں اطراف کے لوگ پیچھے ہٹتے جا رہے تھے۔ جب زار بالاشیف کے ساتھ باہر نکل رہا تھا، بورس نے دیکھا کہ آراک چیف[21] کے چہرے پر اضطراب کا سایہ نمودار ہو گیا ہے۔ آراک چیف نے ترچھی نگاہوں سے امپراطور کی طرف دیکھا، اپنی سرخ ناک سے ذرا سُوں سُوں کی اور ہجوم میں سے نکل کر آگے بڑھا جیسے اسے امید ہو کہ امپراطور اس سے مخاطب ہو گا۔ (بورس پر بالکل واضح ہو گیا کہ آراک چیف بالاشیف سے حسد کرتا ہے اور اس بات پر جل بھن رہا ہے کہ وہ خبر، جو بظاہر بہت اہم تھی، اس کی وساطت سے نہیں، بلکہ کسی دوسرے ذریعے سے امپراطور تک پہنچی ہے۔)

لیکن زار اور بالاشیف آراک چیف کی طرف توجہ دیے بغیر باہر نکل گئے۔ مرتا کیا نہ کرتا، آراک چیف اپنی

• کنوارا

شمشیر سنبھالتا اور ہر کس و نا کس کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اس کے اور ان دونوں کے مابین بیس قدم کا فاصلہ تھا۔

دریں اثنا بورس نے مازورکا رقص تو جاری رکھا لیکن اس کا دماغ اس ادھیڑ بن میں مصروف تھا کہ بالاشیف کیا خبر لایا ہے اور وہ سب سے پہلے کس طرح اس کی ٹوہ لگا سکتا ہے۔

رقص کے اس جزو کے دوران میں، جب اسے دو خواتین کا انتخاب کرنا تھا، بورس نے ہیلین کے کان میں کہا کہ وہ کاؤنٹس پاتوکاکو، جس کے متعلق اسے یقین تھا کہ وہ باہر برآمدے میں چلی گئی ہے، اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے۔ وہ چوبی تختوں کے فرش پر دبے پاؤں چلتا اس دروازے میں سے، جو باغیچے میں کھلتا تھا، باہر کھسک گیا۔ وہاں جب اس نے دیکھا کہ امپراطور اور بالاشیف واپس برآمدے کی طرف آ رہے ہیں، وہ وہیں کھڑا ہو گیا۔ وہ دروازے کی جانب آ رہے تھے۔ بورس نے پھرتی دکھائی اور یوں ظاہر کیا جیسے اسے راستے سے ہٹنے کا موقع نہ ملا ہو، وہ چوکھٹ کے ساتھ چمٹ گیا اور اس نے نہایت عزت و احترام سے اپنی گردن جھکا دی۔

امپراطور، ایک ایسے شخص کی طرح، جس کی کسی نے توہین کر دی ہو، مضطرب لہجے سے کہہ رہا تھا:

''اعلانِ جنگ کیے بغیر روس میں داخل ہونا! جب تک دشمن کا ایک بھی مسلح سپاہی میرے ملک میں موجود ہے، میں صلح نہیں کروں گا!''

بورس کو کچھ یوں لگا کہ زار کو یہ الفاظ ادا کرتے وقت خوشی محسوس ہو رہی ہے۔ اس نے جس انداز سے یہ الفاظ کہے تھے، اس پر وہ مطمئن تھا لیکن اسے خفگی اس چیز پر تھی کہ بورس نے نادانستہ اس کی بات سن لی تھی۔

''خبردار، یہ بات کسی کے کانوں تک نہ پہنچنے پائے!'' زار نے چیں بہ جبیں ہو کر مزید کہا۔

بورس سمجھ گیا کہ یہ جملہ اس کے لیے ہے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اپنے سر کو ذرا سا جھکا دیا۔ زار دوبارہ بال روم میں چلا گیا اور بورس کوئی آدھ گھنٹہ وہیں ٹھہرا رہا۔

چنانچہ بورس وہ پہلا شخص تھا جسے یہ معلوم ہوا کہ فرانسیسی افواج دریائے نیمین عبور کر چکی ہیں۔۔۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ اسے بعض اہم شخصیات کو یہ جتانے کا موقع مل گیا کہ وہ باتیں، جنھیں دوسروں سے چھپا کر رکھا جاتا ہے، اسے عام طور پر معلوم ہو جاتی ہیں اور یوں وہ ان کی نگاہوں میں اپنی قدر و قیمت مزید بڑھانے میں کامیاب ہو گیا۔

❦

ایکا ایکی یہ جو خبر آئی کہ فرانسیسی دریائے نیمین عبور کر چکے ہیں، اس نے سب کو ششدر کر دیا۔ ان کے یوں ششدر ہونے کی خاص وجہ یہ تھی کہ پورا مہینہ اس قسم کی خبر کا انتظار ہوتا رہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا، لیکن جب یہ موصول ہوئی تو اس وقت جب اجتماعی رقص کی تقریب اپنے زوروں پر تھی! خبر کی وصولی کے چند ثانیوں کے اندر اندر امپراطور کو طیش اور خفگی کے زیرِ اثر ایک ایسا جملہ سوجھ گیا جس پر وہ بہت خوش ہوا، جو اس کے جذبات کا پوری طرح احاطہ کرتا تھا اور جو

اس وقت سے زبانِ زدِ خاص و عام ہو گیا تھا۔ جب وہ رات کے دو بجے تقریب سے واپس لوٹا، اس نے اپنے سیکرٹری شش کوف کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ وہ افواج کے نام فرمان اور فیلڈ مارشل سالتی کوف[22] کے نام ہدایت شاہی تحریر کرے۔ اس نے اصرار کیا کہ ہدایت شاہی میں مندرجہ ذیل الفاظ لازماً درج کیے جائیں:

جب تک روس کی سرزمین پر ایک بھی فرانسیسی مسلح فوجی موجود ہے، میں ہرگز ہرگز صلح کا ڈول نہیں ڈالوں گا۔

اگلے روز نپولین کے نام مندرجہ ذیل مراسلہ تحریر کیا گیا:

محترم برادر من:*

کل مجھے معلوم ہوا کہ عالی جاہ کے ساتھ اپنے وعدوں کی میں نے جو سختی سے پابندی کی ہے، اس کے باوجود آپ کی افواج نے روسی سرحد پار کر لی ہے۔ مجھے اس وقت پیٹرزبرگ سے مراسلہ موصول ہوا ہے۔ اس میں کاؤنٹ لوغستوں[23] نے مجھے یہ اطلاع دی کہ عالی جاہ اسی وقت سے، جب پرنس کوراکن[24] نے اپنے پاسپورٹوں کے لیے درخواست کی تھی، اپنے آپ کو میرے خلاف حالت جنگ میں تصور کرتے ہیں۔ ڈیوک آف باسانو[25] نے جن وجوہات کو یہ پاسپورٹ اس کی تحویل میں دینے سے انکار کے لیے بنیاد بنایا تھا، ان کے پیش نظر میں یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ یہ واقعہ جارحانہ کارروائی کا بہانہ بن جائے گا۔ درحقیقت میرے سفیر کو، جیسا کہ اس نے خود کہا ہے، اس قسم کی درخواست کرنے کا کبھی اختیار نہیں دیا گیا تھا۔ جونہی مجھے اطلاع موصول ہوئی، میں نے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار یوں کیا کہ اسے حکم دیا کہ وہ اپنی تعیناتی کا مقام چھوڑ کر نہ آئے۔ اگر عالی جاہ اس قسم کی غلط فہمی** کی بنا پر دونوں اقوام کے افراد کا خون بہانے پر مائل نہ ہوں اور روسی سرزمین سے اپنی افواج واپس بلانے پر رضامند ہوں، تو جو کچھ ہو چکا ہے، میں اسے نظرانداز کر دوں گا اور ہمارے مابین میثاق طے پا سکے گا۔ اگر معاملہ اس کے برعکس ہوا، پھر میں اس حملے کا، جس کا میں کسی صورت میں بھی ذمے دار نہیں ہوں، خاطر خواہ جواب دینے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ بنی نوع انسان کو ایک جنگ کی تباہ کاریوں سے بچانا ابھی تک عالی جاہ کے اختیار میں ہے۔

میں ہوں، وغیرہ وغیرہ

(دستخط) الیکساندر

4

چودہ جون کی صبح دو بجے زار نے بالاشیف کو بلانے اور اس کے سامنے نپولین کے نام اپنا یہ خط پڑھنے کے بعد اسے حکم دیا کہ وہ ذاتی طور پر اسے فرانسیسی امپراطور کو پہنچا آئے۔ جب وہ بالاشیف کو رخصت ہونے کی اجازت دے

---

* Monsieurmon frere

** malentendu

رہا تھا، اس نے ایک بار پھر اپنے اس عزم کا اعادہ کیا کہ جب تک ایک بھی مسلح دشمن روس کی سرزمین پر موجود ہے، وہ ہرگز ہرگز صلح کا ڈول نہیں ڈالے گا۔ اس نے اسے تاکید کی کہ اس نے نپولین کے سامنے اس کے یہ الفاظ لازماً دہرانا ہیں۔ الیکساندر نے نپولین کے نام اپنے خط میں ان الفاظ کا اندراج نہیں کیا تھا کیونکہ جیسا کہ اس کی طبیعت کا خاصہ تھا، وہ ہر معاملے میں خاصی احتیاط کا مظاہرہ کرتا تھا۔ یہاں بھی اسے یہی احساس ہوا کہ ایک ایسے موقع پر، جب صلح جوئی کی آخری کوشش کی جارہی ہے، اس قسم کے الفاظ کا استعمال غیر دانش مندانہ ہوگا، تاہم اس نے بالاشیف کو یہ ہدایت دینے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھی کہ وہ نپولین تک اس کا یہ پیغام زبانی ضرور بالضرور پہنچادے۔

بالاشیف ایک بگلچی اور دو قازقوں کی معیت میں چودہ جون کو صبح کاذب سے بھی خاصا پہلے روانہ ہوا اور پو پھٹنے پر رائی کونتی پہنچ گیا۔ یہ گاؤں دریائے نیمین کے ادھر روسی سرحدوں کے اندر واقع تھا اور یہاں فرانسیسی اپنی بیرونی چوکیاں قائم کرچکے تھے۔

ایک نان کمشنڈ فرانسیسی ہوزار نے، جو قرمزی وردی اور روئیں دار ٹوپی میں ملبوس تھا، سفیر سے، جو قریب آتا جارہا تھا، چلاکر رکنے کو کہا۔ فوراً رکنے کے بجائے بالاشیف پیدل آدمی کی رفتار سے سڑک پر چلتا رہا۔

نان کمشنڈ افسر نے تیوریاں چڑھاتے اور منہ ہی منہ میں گالیوں کی گردان کرتے اپنا گھوڑا بالاشیف کے گھوڑے کے آگے کردیا اور یوں اس کے راستے میں رکاوٹ بن گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ شمشیر پر ڈالا اور بدتمیزی سے چلاتے روسی جرنیل سے پوچھنے لگا کہ آیا وہ بہرا ہے کہ اس سے جو کچھ کہا گیا ہے، وہ اس نے سنا نہیں۔ بالاشیف نے اپنا نام بتایا۔ نان کمشنڈ افسر نے اپنے ایک جوان کو اپنے افسرِ اعلیٰ کی خدمت میں بھیج دیا۔ اس نے بالاشیف کی طرف مزید کوئی توجہ نہ دی اور رجمنٹ کے معاملات کے بارے میں اپنے ساتھی افسروں سے باتیں کرنے لگا۔

بالاشیف کو ان لوگوں کا، جو مملکت میں اعلیٰ ترین اختیارات اور اقتدار کے مالک ہوتے ہیں، تقرب حاصل تھا۔ ابھی صرف تین گھنٹے قبل وہ زار سے گفتگو کررہا تھا۔ ملازمت میں اپنے عہدے کی بنا پر اس کی جو توقیر و تکریم کی جاتی تھی، وہ اس کا عادی ہوچکا تھا۔ اسے جب اپنے ہی وطن کی سرزمین پر بہیمانہ قوت کے مخاصمانہ، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر گستاخانہ اظہار سے واسطہ پڑا، تو اسے سخت دھچکا لگا۔ اسے یہ تجربہ بالکل عجیب و غریب اور انوکھا محسوس ہوا۔

بادلوں کی اوٹ سے آفتاب نے ابھی ابھی اپنا جلوہ دکھانا شروع کیا تھا۔ ہوا تازہ اور شبنم آلود تھی۔ سڑک پر گاؤں سے مویشیوں کا ریوڑ ہانکا جارہا تھا۔ کھیتوں پر یکے بعد دیگرے گنگناتے لارک• یوں بلندی کی طرف اٹھ رہے تھے جیسے پانی کی سطح پر بلبلے نمودار ہوتے ہیں۔

بالاشیف اپنے گردوپیش کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ گاؤں سے کسی افسر کی آمد کا منتظر تھا۔ کبھی کبھار روسی بگلچی اور قازق سوار، اور فرانسیسی ہوزار ایک دوسرے کی جانب دیکھ لیتے لیکن منہ سے کچھ نہ کہتے۔

فرانسیسی ہوزاروں کا کرنل اپنے دو جوانوں کی معیت میں خوبصورت اور چاق چوبند گھوڑے پر سوار چلا آرہا

• ایک خوش آواز پرندہ

تھا۔ افسر، جوان اور ان کے گھوڑے بھی چھیل چھبیلے اور مطمئن و مسرور نظر آ رہے تھے۔
یہ جنگ کا وہ ابتدائی مرحلہ تھا جب فوجی جوان تقریباً اسی طرح صاف ستھرے اور بنے سنورے نظر آتے ہیں جس طرح کہ وہ زمانہ امن کی مشقوں کے دوران میں دکھائی دیتے ہیں۔ جیسا کہ معرکے کے آغاز میں ہمیشہ ہوتا ہے ان کے ملبوسات سے ایک قسم کی عسکری دھونس ٹپکنے لگتی ہے اور ان کی روح مہم جوئی کے جذبے سے سرشار ہونے لگتی ہے۔

فرانسیسی کرنل کو جمائی آگئی اور وہ اسے بڑی مشکل سے روک سکا۔ تاہم اس کے اطوار شائستہ تھے اور بظاہر اسے بالاشیف کی اہمیت کا اعتراف تھا۔ وہ اسے اپنی بیرونی چوکیوں کے پیچھے لے گیا اور اسے بتانے لگا کہ امپراطور کی خدمت میں باریابی کے لیے اس کی خواہش غالباً فوراً پوری ہو جائے گی کیونکہ شاہی پڑاؤ زیادہ دور نہیں ہے۔

وہ رائی کونتی گاؤں میں سے گزرتے فرانسیسی ہوزاروں کے گھوڑوں، جو بندھے ہوئے تھے، سنتریوں اور جوانوں سے، جو اپنے کرنل کو سلام کرتے اور روسی وردی کو متجسس نگاہوں سے دیکھتے جاتے تھے، آگے نکل گئے۔ جب وہ گاؤں کے دوسرے سرے پر پہنچے، کرنل نے بالاشیف کو بتایا کہ ڈویژنل کمانڈر کا، جو اس کا استقبال کرے گا اور اسے منزل مقصود تک پہنچائے گا، پڑاؤ صرف سو میل آگے ہے۔

اب آفتاب پوری طرح طلوع ہو چکا تھا اور سبز و شاداب گھاس پر پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔

ابھی انھوں نے شراب خانے سے آگے بمشکل پہاڑی پر چڑھائی شروع کی ہوگی کہ انھیں اپنے سامنے گھڑسواروں کا ایک دستہ، جو پہاڑی سے نیچے اتر رہا تھا، آتا دکھائی دیا۔ اس دستے کی قیادت ایک بلند قامت شخص کر رہا تھا۔ اس شخص نے تیز سرخ رنگ کا چغا اور کلغی دار ٹوپی پہن رکھی تھی۔ اس کے سیاہ گھونگھریالے بال اس کے شانوں پر لٹک رہے تھے۔ وہ مشکی گھوڑے پر، جس کا ساز و سامان دھوپ میں جگمگا رہا تھا، سوار تھا اور اس کی لانبی ٹانگیں فرانسیسی انداز سے آگے کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔ یہ ذی وقار شخص اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑائے بالاشیف کی طرف آ رہا تھا۔ اس کی ٹوپی کا پھندنا لہلہا رہا تھا اور جون کی تیز دھوپ میں اس کے ہیرے جواہرات اور سنہری پٹیاں جگمگ جگمگ کر رہی تھیں۔

یہ سوار، جس نے نیکلیس، بازوبند، کلغیاں اور طلائی پٹیاں پہن رکھی تھیں اور جو تھیٹرانہ انداز سے اپنے چہرے بشرے پر سنجیدگی طاری کیے بگٹٹ بالاشیف کی طرف بھاگا آ رہا تھا، ابھی اس سے دس گز دور ہوگا کہ فرانسیسی کرنل یولنے (Julner) نے مؤدبانہ انداز سے سرگوشی کی: "شاہ نیپلز!" یہ درحقیقت موغا[26] تھا جسے اب "شاہ نیپلز" کہا جاتا تھا۔ اگرچہ یہ بات بالکل ناقابل فہم تھی کہ آخر وہ "شاہ نیپلز" کیوں تھا، پھر بھی اسے اسی نام سے پکارا جاتا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ خود اسے بھی یقین ہو گیا تھا کہ وہ "شاہ نیپلز" ہی ہے اور یوں اس کے رویے میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ متانت اور وقار آ گیا تھا۔ اس کا اس بات پر کہ وہ حقیقتاً "شاہ نیپلز" ہی ہے، ایقان اتنا پختہ ہو چکا تھا کہ جب نیپلز سے اپنی روانگی سے ایک روز قبل وہ اپنی بیوی کے ساتھ اس شہر کے گلی کوچوں میں سرگشت کر رہا تھا کہ چند

اطالوی باشندوں نے اسے دیکھ کر* "!Vivail re" کا نعرہ لگا دیا، وہ حسرت آلود تبسم سے اپنی شریک حیات کی طرف متوجہ ہوا اور بولا: ''بے چارے، قسمت کے مارے، انھیں پتا ہی نہیں کہ میں کل انھیں داغ مفارقت دے رہا ہوں!''

اگرچہ اسے اس بارے میں قطعاً کوئی شبہہ نہیں تھا کہ وہ ''شاہ نیپلز'' ہے اور اس کی شہر سے روانگی پر (اس کے خیال کے مطابق) اس کی رعایا نے جس غم واندوہ کا اظہار کیا تھا، اس پر اس نے دل ہی دل میں اس سے ہمدردی جتائی تھی، تاہم جب اسے دوبارہ فوجی خدمات سرانجام دینے کے لیے واپس بلا لیا گیا اور خاص طور پر جب ڈان سگ کے مقام پر اس کی نپولین سے آخری ملاقات ہوئی، جس میں اس کے جلیل القدر برادر نسبتی نے اس سے یہ کہا: ''میں نے تمھیں بادشاہ اس لیے بنایا تھا کہ تم میرے طریقے سے حکومت کرو گے، نہ کہ اپنے طریقے سے!'' اس کی باچھیں کھل گئی تھیں اور اس نے خوشی خوشی اپنے فرائض سنبھال لیے تھے۔ اس گھوڑے کی مانند جسے خوب اچھی طرح پالا پوسا گیا ہو لیکن جسے ضرورت سے زیادہ فربہ نہ کیا گیا ہو، جو ہر وقت جتا ہوا محسوس کرتا ہو اور گاڑی کے بموں کے مابین فراٹے بھرتا ہو، وہ بھی اتنے قیمتی اور بھڑکیلے ملبوسات کہ ان پر نظر نہ ٹھہر سکے، زیب تن کر کے بڑے اطمینان ومسرت سے پولینڈ کی سڑکوں پر یوں بگٹٹ بھاگا پھرتا تھا کہ خود اسے بھی معلوم نہیں ہوتا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں جا رہا ہے۔

روسی جرنیل کو دیکھ کر اس نے دراز گھونگریالے گیسوؤں سمیت اپنے سر کو پیچھے کی جانب جھٹکا دیا اور شاہانہ اور پروقار انداز سے فرانسیسی کرنل پر مستفسرانہ نگاہ ڈالی۔ کرنل نے بڑے ادب کے ساتھ ہز میجسٹی کو بالاشیف کے، جس کا وہ نام بھی صحیح انداز سے نہ لے سکا، مشن کے بارے میں بتایا۔

''دبال۔ اچیف!'' بادشاہ نے (اس مشکل پر، جو کرنل کو پیش آئی تھی، اپنی خود اعتمادی سے غالب آتے ہوئے) کہا۔ ''جنرل، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی!'' اس نے شاہانہ کرم فرمائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے مزید کہا۔

جونہی، بادشاہ، نے با آواز بلند اور تیز تیز بولنا شروع کیا، اس کا سارا شاہی طنطنہ دھرے کا دھرا رہ گیا اور وہ غیر شعوری طور پر اپنے فطری لہجے میں، جس میں نیک دلانہ بے تکلفی جھلک رہی تھی، باتیں کرنے لگا۔ اس نے بالاشیف کے گھوڑے کے شانے پر ہاتھ رکھا اور کہا:

''خیر، جنرل، معلوم ہوتا ہے کہ ہم جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔'' گویا اسے ایک ایسی صورت حال پر، جس کے متعلق وہ خود کوئی رائے دینے سے قاصر تھا، ملال ہو رہا ہو۔

''جناب عالی!'' بالاشیف نے جواب دیا۔ ''میرے آقا، امپراطور، جنگ کے خواہاں نہیں اور جب کہ یور میجسٹی خود دیکھ سکتے ہیں... '' وہ ''یور میجسٹی'' کی تکرار کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دے رہا تھا لیکن اس کے لہجے میں بناوٹ تھی لیکن جب کسی خطاب کو بار بار دہرایا جائے اور کسی ایسے شخص کو، جس کے لیے یہ خطاب ابھی نئی اور انوکھی چیز ہو، مخاطب کیا جائے، اس قسم کی بناوٹ ناگزیر ہو جاتی ہے۔

---

* ''بادشاہ سلامت زندہ باد''۔

جب موغا ''موسیو دَبال آچیف'' کی باتیں سن رہا تھا، اس کا چہرہ احمقانہ اطمینان سے دمک رہا تھا۔ لیکن بادشاہت کی اپنی ذمے داری ہوتی ہیں، اس نے بادشاہ اور اتحادی کی حیثیت سے اپنا فرض منصبی گردانا کہ وہ اہم امور کے بارے میں الیکساندر کے سفیر سے گفت وشنید کرے۔ وہ گھوڑے سے اترا، اس نے بالاشیف کو بازو سے پکڑا اور اسے اپنے ماتحت عملے سے، جو احتراماً اس کے انتظار میں اپنی جگہ کھڑا رہا، دور لے گیا۔ وہاں وہ اس کی معیت میں آگے پیچھے چکر کاٹنے لگا۔ وہ پوری کوشش کر رہا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، اہم نظر آئے۔ اس نے اسے یہ امرِ واقعہ بتایا کہ نپولین سے یہ جو مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنی فوجیں پرشیا سے واپس بلالے، اس پر وہ سخت ناراض ہے، خاص طور پر اس لیے کہ اس سے یہ مطالبہ اب برسرعام کیا جا رہا ہے اور یوں فرانس کے وقار کو ٹھیس پہنچائی جا رہی ہے۔

بالاشیف نے جواب دیا کہ یہ مطالبہ کسی طرح بھی توہین آمیز نہیں کیونکہ... لیکن موغا نے اسے ٹوک دیا۔

''تو تمھارے خیال میں امپراطور الیکساندر جارح نہیں؟'' اس نے احمقانہ لیکن نیک دلانہ تبسم سے پوچھا۔

بالاشیف نے اسے بتایا کہ اس کے خیال میں جنگ بھڑکانے کی ذمے داری نپولین پر عاید ہوتی ہے اور اس نے اس سلسلے میں اپنے دلائل بھی دیے۔

''اخاہ، مائی ڈیئر جنرل!'' موغا نے ایک بار پھر اسے ٹوکا۔ ''میں خلوص دل سے یہ چاہتا ہوں کہ امپراطور ان کرام یہ معاملہ آپس میں طے کرلیں اور یہ جنگ، جس کے شروع ہونے میں میری خواہشات کا قطعاً کوئی دخل نہیں، حتی الامکان جلد از جلد ختم ہوجائے!'' اس نے ایک ایسے ملازم کے، جو اپنے آقاؤں کے جھگڑوں کے باوجود دوسرے شخص کے ملازم سے دوستانہ تعلقات برقرار رکھنے کے لیے بے چین ہو، لہجے سے کہا۔

پھر اس نے گفتگو کا رخ گرینڈ ڈیوک کی طرف موڑ دیا اور وہ اس کی صحت کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔ اس نے نیپلز میں اس کی صحبت میں جو پُرمسرت اور خوشگوار ایام گزارے تھے، وہ ان کی یاد تازہ کرنے لگا۔ اچانک اسے اپنے شاہی دبدبے اور وقار کا خیال آگیا۔ وہ متانت سے سیدھا تن کر کھڑا ہوگیا، اس نے وہ پوز، جو اس نے اپنی تاج پوشی کے موقع پر اختیار کیا تھا، بنالیا اور اپنا دایاں ہاتھ لہرا کر بولا:

''جنرل، میں تمھیں زیادہ دیر نہیں روکوں گا۔ خدا کرے کہ تم اپنے مشن میں کامیاب و کامران ہو!'' اور وہ اپنے کامدار سرخ چغے اور کلغی کو کھڑکھڑاتا اور اپنے جواہرات کی چمکیلی جھلک دکھاتا اپنے ماتحت عملے سے، جو اس کا مؤدبانہ انتظار کر رہا تھا، جاملا۔

بالاشیف آگے چل پڑا۔ موغا کے الفاظ سے اس نے یہ فرض کرلیا تھا کہ اسے بہت جلد نپولین کے سامنے پیش کردیا جائے گا، لیکن بجائے اس کے کہ اس کی بلا تاخیر نپولین سے ملاقات ہوتی، جس طرح اسے بیرونی چوکیوں میں روکا گیا تھا، اسی طرح اگلے گاؤں میں مارشل داووٗ[27] کی پیادہ کور کے سنتریوں نے روک لیا اور اسے مارشل داووٗ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کور کمانڈر کے ایک ایجوٹنٹ کو بلا بھیجا گیا۔

5

امپراطور نپولین کی نگاہوں میں داوؤ کی وہی حیثیت تھی جو الیکساندر کے نزدیک آراک چیف کی تھی۔ اگرچہ وہ آراک چیف کی طرح بزدل تو نہیں تھا، لیکن سخت گیر اور سفاک اسی کی مانند تھا، اور اپنے حکمران سے اپنی اطاعت شعاری جتانے کا اس کی طرح اسے بھی صرف ایک ہی طریقہ آتا تھا کہ وہ دوسروں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرے۔

مملکتوں کے نظام کو بروئے کار لانے کے لیے اس قسم کے لوگوں کا وجود اتنا ہی ضروری ہے جتنا کہ فطرت کے نظام مشیت کے لیے بھیڑیوں کا۔ ان کی موجودگی اور سربراہ مملکت سے ان کا قرب کتنا ہی انمل اور بے تکا کیوں نہ نظر آئے، ایسے لوگ ہمیشہ موجود رہتے ہیں، ہمیشہ منظر عام پر نمودار ہوتے رہتے ہیں اور کبھی پسپا نہیں ہوتے۔ صرف یہی امر کہ ان کا وجود ناگزیر ضرورت بن گیا ہے، اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ آراک چیف جیسا سنگدل شخص، جو اپنے ہاتھوں سے لمبے تڑنگے فوجی جوانوں کی مونچھیں اکھاڑ سکتا تھا، لیکن جس کے کمزور اعصاب اسے خطرے کا سامنا کرنے کے نااہل بنا دیتے تھے، اور جو نہ تعلیم یافتہ تھا اور نہ درباری آداب سے واقف، کس طرح الیکساندر، جو بذات خود شریف الطبع، نیک فطرت اور زیردستوں کا زبردست حامی تھا، جیسے حکمران کے دور میں اتنا اثر و رسوخ برقرار رکھ سکتا تھا۔

بالاشیف نے دیکھا کہ مارشل داوؤ کسی کسان کے جھونپڑے میں لکڑی کے مدوّر پیپے پر بیٹھا ہے اور کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ (وہ حسابات کی جانچ پڑتال کر رہا تھا۔) ایک ایجوٹنٹ اس کے قریب کھڑا تھا۔ گاؤں میں اس کے لیے بہتر رہائش تلاش کی جا سکتی تھی لیکن مارشل داوؤ ان لوگوں میں شامل تھا، جو ارادتاً اپنی زندگی حتی الوسع کٹھن بنا لیتے ہیں تاکہ وہ اپنے اکل کھرے پن کا جواز پیش کر سکیں۔ اور محض اسی وجہ سے وہ ہر وقت اتنی محنت مشقت کرتے اور یہی تاثر دیتے رہتے ہیں کہ وہ اپنا کام جلد از جلد نپٹانا چاہتے ہیں۔ ''تم دیکھتے نہیں کہ میں گندے مندے جھونپڑے میں پیپے پر بیٹھا کام کر رہا ہوں، ان حالات میں مجھے زندگی کے روشن پہلو کیسے سوجھ سکتے ہیں؟'' اس کے چہرے کے تاثرات کہتے دکھائی دے رہے تھے۔ اگر ان لوگوں کی مڈھ بھیڑ کسی ایسے شخص سے، جو زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہو، ہو جائے، تو انھیں اطمینان قلب صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی افسردہ اور غیر مختتم مشغولیت کی نمائش کرتے رہیں اور ان کی ضرورت بس یہی ہوتی ہے۔ جب بالاشیف کو اندر لایا گیا، داوؤ نے بھی اسی انداز سے تسکین حاصل کرنا چاہی۔ جونہی روسی جرنیل نے اندر پاؤں دھرا، وہ اور بھی اپنے کام میں منہمک ہو گیا۔ اس نے اپنے چشمے کے اوپر سے بالاشیف کے چہرے پر، جسے صبح کے حسن اور موغا کے ساتھ گفتگو نے گرما دیا تھا، نظر ضرور ڈالی لیکن وہ نہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور نہ اپنی جگہ سے سرکا، اس نے بس ناگوار انداز سے تیوریاں چڑھالیں اور تحقیر آمیز انداز سے طرح طرح کی شکلیں بنانے لگا۔

داوؤ نے جب دیکھا کہ اس طریقے سے بالاشیف کا جو استقبال ہوا ہے، اس کا اس نے برا منایا ہے، اس نے

اپنا سر اوپر اٹھایا اور سرد مہری سے اس سے پوچھا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔

بالاشیف نے یہ سوچتے ہوئے کہ اس کا اس انداز سے استقبال محض اس لیے ہوا کیونکہ داووُ کو یہ معلوم نہیں کہ وہ امپراطور الیکساندر کا ایجوٹنٹ جنرل ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نپولین کی خدمت میں بطور سفارت کار حاضر ہوا ہے، اس نے بہ عجلت اسے اپنے عہدے اور مشن سے آگاہ کیا۔ داووُ نے جب یہ سنا، بالاشیف کی توقع کے برعکس اس کی بدمزاجی اور بدتمیزی میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔

''کہاں ہے تمھارا مراسلہ؟'' اس نے پوچھا۔ ''لاؤ، یہ مجھے دے دو، میں اسے امپراطور کی خدمت میں بھجوا دوں گا۔''

بالاشیف نے جواب دیا: ''مجھے حکم ہے کہ میں اسے خود امپراطور تک پہنچاؤں۔''

''تمھارے امپراطور کے احکام کی تعمیل تمھاری فوج میں ہوتی ہوگی،'' داووُ نے کہا، ''لیکن یہاں تمھیں وہی کرنا پڑے گا جو تمھیں کہا جاتا ہے۔''

داووُ نے اپنے ایجوٹنٹ کو حکم دیا کہ وہ ڈیوٹی افسر کو بلا لائے۔ اس کا انداز کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ روسی جرنیل کو مزید باور کرانا چاہتا ہو کہ وہ بہیمانہ قوت کے رحم و کرم پر ہے۔

بالاشیف نے وہ پیکٹ، جس میں زار کا خط تھا، نکالا اور اسے میز پر رکھ دیا۔ (دروازے کا ایک تختہ، جس کے قلابے ابھی ساتھ لٹک رہے تھے، دو پیپوں کے اوپر رکھ دیا گیا تھا اور میز کا کام دے رہا تھا۔) داووُ نے پیکٹ اٹھا لیا اور اس پر تحریر پڑھنے لگا۔

''آپ میری عزت کریں یا نہ کریں، آپ کو پوری آزادی ہے، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ میں امپراطور کا ایجوٹنٹ جرنل ہوں...''

داووُ نے خاموشی سے بالاشیف پر اچٹتی نظر ڈالی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ روسی ایلچی کے چہرے پر جو تکدر اور پریشانی کے آثار ہویدا ہو گئے تھے، وہ ان سے خوب لطف اندوز ہو رہا ہے۔

''تمھارے ساتھ تمھارے مرتبے کے مطابق سلوک کیا جائے گا،'' داووُ نے کہا، پیکٹ اپنی جیب میں ڈالا اور چھپر سے باہر نکل گیا۔

ایک منٹ بعد مارشل کا ایجوٹنٹ ڈ کاسٹ (De Castes) آیا اور وہ اسے اس مکان میں، جو اس کے لیے مخصوص کیا گیا تھا، لے گیا۔

بالاشیف نے اس روز مارشل کے ساتھ اسی سائبان تلے اور دو پیپوں کے اوپر رکھے ہوئے تختے پر کھانا کھایا۔

اگلے روز داووُ صبح سویرے گھوڑے پر سوار ہوا لیکن روانگی سے پیشتر اس نے بالاشیف کو بلا بھیجا اور واجب التعمیل انداز سے اسے بتایا کہ وہ جہاں ہے، وہیں ٹھہرا رہے، ہاں اگر سامان ڈھونے والے قافلے کو کوچ کا حکم ملے، وہ بھی اس کے ساتھ چل پڑے اور موسیو ڈ کاسٹ کے علاوہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ ہم کلام ہونے کی کوشش

نہ کرے۔

چار روز گزر گئے۔ اس عرصے کے دوران میں کوئی بھی شخص اس کے قریب نہ پھٹکا اور وہ بوریت کا شکار ہوتا رہا۔ وہ رہ رہ کر اپنی بے بسی اور بے وقعتی پر کڑھتا رہا۔ موجودہ صورت حال میں اسے اس کی شدت خاص طور پر اس لیے بھی محسوس ہوئی، کیونکہ وہ حال ہی میں جس حلقے سے آیا تھا، وہاں وہ یہاں کے مقابلے میں اختیار اور دبدبے کا مالک تھا — اور اسے ان ایام کے دوران میں مارشل کے ساز و سامان اور فرانسیسی فوج کے ساتھ، جواب سارے ضلع پر قابض ہو چکی تھی، بار بار کوچ کرنا پڑا۔ آخر کار اسے ولنا — جواب فرانسیسیوں کے قبضے میں تھا — پہنچا دیا گیا۔ وہ شہر میں دوبارہ اسی دروازے سے، جس میں سے گزر کر دو چار روز قبل روانہ ہوا تھا، داخل ہوا۔

اگلے روز امپراطور کا ایک مصاحب، کاؤنٹ دَتوغنیے (Turenne)، بالاشیف کو یہ اطلاع دینے آیا کہ امپراطور نپولین اسے شرف ملاقات بخشنا چاہتے ہیں۔

چار دن قبل اس مکان کے سامنے، جس میں بالاشیف کو پہنچایا گیا تھا، پری ابرازینسکی رجمنٹ کے سنتری پہرے پر تعینات تھے، اب وہاں دو لمبے تڑنگے فرانسیسی سپاہی ایستادہ تھے۔ ان کے سروں پر روئیں دار ٹوپیاں اور اجسام پر نیلی وردیاں، جن کے سامنے کے بٹن کھلے ہوئے تھے، تھیں، جب کہ ہوزاروں اور پولستانی نیزہ بردار سواروں کا ایک حفاظتی دستہ، اور ایڈی کانگوں، ذاتی خادموں اور جرنیلوں پر، جو زرق برق وردیوں میں ملبوس تھے، مشتمل ایک جتھا، جو نپولین کے باہر آنے کا منتظر تھا، اس کے سواری کے گھوڑے اور اس کے مملوک رستن[28] کے گرد گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔ نپولین نے بالاشیف کو اسی مکان میں، جہاں سے الیکساندر نے اسے اپنے مشن کے لیے بھیجا تھا، ملاقات کے لیے بلایا۔

6

اگرچہ بالاشیف شاہی شان و شوکت کا عادی تھا، لیکن جو کرّ و فر اور ٹھاٹ باٹ اسے نپولین کے دربار میں نظر آئے، انھیں دیکھ کر اس کی سٹی گم ہو گئی۔

کاؤنٹ دتوغنیے اسے بڑے استقبالیہ کمرے میں لے گیا۔ وہاں جرنیلوں، مصاحبوں اور پولستانی عمائدین — ان میں اکثر کو بالاشیف روسی امپراطور کے دربار میں دیکھ چکا تھا — کا جم غفیر نپولین کا انتظار کر رہا تھا۔ دُوغوک (Duroc) نے اسے بتایا کہ نپولین گھڑ سواری پر جانے سے قبل روسی جرنیل سے ملاقات کرے گا۔

چند منٹ بعد ڈیوٹی پر موجود مصاحب استقبالیہ کمرے میں آیا۔ اس نے شائستگی سے اپنی گردن کو خم دیا اور بالاشیف سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔

بالاشیف چھوٹے استقبالیہ کمرے میں داخل ہوا۔ اس کا ایک دروازہ اس سٹڈی روم میں، جہاں سے وہ روسی امپراطور سے رخصت ہوا تھا، کھلتا تھا۔ وہ ایک دو منٹ کھڑا انتظار کرتا رہا۔ دروازے کی دوسری جانب کسی کے

تیز تیز چلنے کی آواز سنائی دی۔ مصاحب نے بہ عجلت دروازے کے دونوں پٹ کھول دیے اور خود مؤدب کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ پھر سٹڈی روم میں کسی اور شخص ـــ یہ نپولین تھا ـــ کے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ اس چال میں عزم اور استقلال تھا۔ نپولین ابھی ابھی گھڑ سواری کا لباس پہننے سے فارغ ہوا تھا۔ وہ نیلی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے سینے کے بٹن کھلے ہونے کی وجہ سے وردی کے نیچے سفید واسکٹ، جو اتنی لمبی تھی کہ اس کی ساری گول توند اس میں چھپ گئی تھی، نظر آنے لگی تھی۔ اس کی برجس ہرنی کی کھال کی تھی اور وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگوں کی فربہ رانوں سے چپکی ہوئی تھی۔ اس کے ہسّی بوٹ[29] پنڈلیوں تک پہنچتے تھے۔ بظاہر اس کے چھوٹے چھوٹے بالوں پر ابھی ابھی کنگھی پھیری گئی تھی لیکن لٹوں کا ایک گچھا اب بھی اس کی کشادہ پیشانی کے درمیانی حصے پر جھول رہا تھا۔ اس کی فربہ سفید گردن اس کی وردی کے سیاہ کالر کے اوپر سیدھی کھڑی تھی اور اس کے جسم سے یوڈی کلون کی مہلک آ رہی تھی۔ اس کے بھرے بھرے چہرے پر، جس پر اب بھی قدرے شباب جھلک رہا تھا، نمایاں ٹھوڑی سمیت، جو تاثر جھلک رہا تھا، وہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ وہ بکمال تلطّف و مہربانی، جو شاہی شان و شکوہ کے عین مطابق تھا، خوش آمدید کہہ رہا ہے۔

وہ تیز تیز قدم اٹھاتے، ہر قدم پر پاؤں کو ذرا سا جھٹکا دیتے اور اپنا سر قدرے پچھلی جانب ڈھلکاتے اندر داخل ہوا۔ اس نے اپنے چوڑے چکلے اور دبیز شانے، چھاتی اور توند غیر شعوری طور پر آگے کو جھکائے ہوئے تھے۔ وہ کوتاہ قامت، فربہ اندام اور گول مٹول ضرور تھا لیکن اس کے پورے سراپے پر وہ رعب اور شاہانہ وقار جھلک رہا تھا جو ایسے اشخاص میں، جو چالیس کے پیٹے میں ہوتے ہیں اور آسودگی کی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں، عام نظر آتا ہے۔ یہ بھی عیاں تھا کہ وہ اس روز خاص طور پر ہشاش بشاش تھا۔

بالاشیف مؤدبانہ انداز سے دوزانو ہو گیا۔ اس کے جواب میں اس نے اپنی گردن کو خم دیا، ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر اس کے پاس گیا اور ایک ایسے شخص کی طرح، جو اپنے وقت کا ایک ایک لمحہ بہت قیمتی سمجھتا ہے لیکن جو کچھ اس نے کہنا ہوتا ہے، اسے تیار کرنا اپنی شان کے خلاف تصور کرتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، ٹھیک کہہ رہا ہے اور اچھے انداز سے کہہ رہا ہے، باتیں کرنے لگا۔[30]

''جنرل، bon jour*'' اس نے کہا۔ ''آپ امپراطور الیکساندر کا جو خط لائے ہیں، وہ مجھے مل گیا ہے اور آپ سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔''

اس نے اپنی غلافی آنکھوں سے بالاشیف کے چہرے کا سرسری جائزہ لیا اور فی الفور اس سے آگے دیکھنے لگا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے جرنیل کی شخصیت میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے دلچسپی صرف اس بات سے تھی جو اس کے اپنے دماغ میں گردش کر رہی تھی۔ اس کی ذات سے باہر جو چیزیں تھیں، وہ اس کے لیے کسی اہمیت کی حامل نہیں تھیں کیونکہ وہ یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اس کا انحصار صرف اس کے منشا پر ہے۔

---

* گڈ ڈے۔ آداب

''مجھے جنگ کی نہ خواہش ہے اور نہ میں نے کبھی اس کی خواہش کی تھی،'' اس نے کہا۔ ''لیکن یہ مجھ پر ٹھونسی گئی ہے۔اب'' (اس نے لفظ پر زور دیا) ''بھی میں ہر وہ وضاحت، جو آپ پیش کرنا چاہیں، سننے کے لیے تیار ہوں۔''

اور وہ غیر مبہم اور بلیغ انداز سے ان وجوہات کو، جو اس کی روسی حکومت سے ناخوشی کا باعث بنی تھیں، بیان کرنے لگا۔ فرانسیسی امپراطور کے معتدل، پرسکون اور دوستانہ لہجے سے اندازہ لگاتے ہوئے بالاشیف کو پکا یقین ہو گیا کہ وہ امن کے لیے بے قرار ہے اور مذاکرات کا ڈول ڈالنا چاہتا ہے۔

''عالی جاہ، امپراطور، میرے آقا...'' جب نپولین اپنی بات ختم کر چکا اور روسی سفیر کی طرف مستفسرانہ انداز سے دیکھنے لگا، بالاشیف نے کہنا شروع کیا۔ تاہم امپراطور نے جس انداز سے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ رکھی تھیں، اس سے وہ گڑبڑا گیا اور بہت دن پہلے اس نے جس تقریر کا نقشہ اپنے ذہن میں جمایا تھا، وہ اس کے دماغ سے نکل گئی ''تم بوکھلائے ہوئے ہو—اپنے آپ کو سنبھالو۔'' نپولین کی ٹکٹکی کہتی دکھائی دے رہی تھی جب کہ وہ ایک ایسی مسکراہٹ، جو بمشکل نظر آ رہی تھی، اپنے چہرے پر سجائے بالاشیف کی شمشیر اور وردی کو دیکھ رہا تھا۔

بالاشیف نے اپنی بوکھلاہٹ پر قابو پا لیا اور بولنے لگا۔ اس نے بتایا کہ کوراکن نے اپنے پاسپورٹوں کا جو مطالبہ کیا تھا، امپراطور الیکساندر کی نظروں میں وہ جنگ کا مناسب سبب نہیں بن سکتا، یہ کہ کوراکن نے یہ قدم اپنی مرضی سے اٹھایا تھا اور اس بارے میں امپراطور نے اسے کوئی اختیار نہیں دیا تھا، یہ کہ امپراطور الیکساندر جنگ نہیں چاہتا اور اس کے انگلستان کے ساتھ کوئی روابط نہیں ہیں۔

''ابھی—تو نہیں ہیں!'' نپولین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ پھر اسے غالباً یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں اس کے دلی جذبات آشکار نہ ہو جائیں، اس نے تیوری چڑھائی اور گردن کو ذرا سی جنبش دی جو اس بات کی علامت تھی کہ بالاشیف اپنی بات جاری رکھ سکتا ہے۔

بالاشیف جب وہ سب کچھ، جو اسے کہنے کی ہدایت کی گئی تھی، کہہ چکا، اس نے مزید یہ کہا کہ امپراطور الیکساندر امن کے خواہش مند ضرور ہیں لیکن وہ کسی قیمت پر مذاکرات کے لیے تیار نہیں ہوں گے جب تک ان کی ایک شرط پوری نہ کر دی جائے اور وہ شرط یہ ہے...'' یہاں بالاشیف ڈگمگا گیا۔ اسے وہ الفاظ، جو امپراطور نے (نپولین کے نام) اپنے خط میں تحریر نہیں کیے تھے لیکن سالتی کوف کے نام اپنے فرمان میں بالاصرار درج کرائے تھے، یاد آ گئے۔ اس نے بالاشیف کو حکم دیا تھا کہ وہ الفاظ کو زبانی اس تک پہنچا دے۔ الفاظ: ''جب تک ایک بھی مسلح دشمن روس کی سرزمین پر موجود ہے...'' بلاشبہ بالاشیف کے ذہن میں گردش کر رہے تھے، لیکن کسی گنجلک جذبے نے اس کی زبان پر آئی ہوئی بات کاٹ دی۔ چاہنے کے باوجود وہ ان الفاظ کو ادا نہ کر سکا اس نے تامل کیا اور پھر بولا: ''اور وہ شرط یہ ہے کہ فرانسیسی فوج دریائے نیمین کے پار چلی جائے۔''

بالاشیف نے یہ آخری الفاظ جھینپتے جھینپتے کہے تھے اور نپولین سے اس کی یہ جھینپ پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس کا چہرہ پھڑکنے اور اس کی بائیں ٹانگ کی پنڈلی باقاعدہ آہنگ کے ساتھ لرزنے لگی۔ جہاں وہ کھڑا تھا، وہاں سے ایک

قدم اٹھائے بغیر وہ پہلے سے بلند تر اور تیز تر لہجے سے بولنے لگا۔ اس کے بعد اس نے جو تقریر کی، اس کے دوران میں بالاشیف، جس نے ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی نظریں جھکائیں، یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکا کہ نپولین کی بائیں پنڈلی لرز رہی ہے اور جوں جوں اس کی آواز بلند تر ہوتی جا رہی ہے، توں توں اس لرزش میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

''میں امپراطور الیکسانڈر سے کم امن کا متمنی نہیں،'' اس نے کہنا شروع کیا۔ ''اس مقصد کے حصول کے لیے وہ کون سا دقیقہ ہے جو میں نے گزشتہ اٹھارہ مہینوں کے دوران میں فروگزاشت کیا ہے؟ میں اٹھارہ ماہ سے وضاحت کا انتظار کر رہا ہوں۔ لیکن مذاکرات کا آغاز کرنے کے لیے مجھ سے کس چیز کا تقاضا کیا جا رہا ہے؟'' اس نے بھویں سکیڑتے اور ننھے منے فربہ ہاتھ سے استفسارانہ اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''عالی جاہ، یہی کہ آپ اپنی افواج دریائے نیمین کے پار لے جائیں،'' بالاشیف نے کہا۔

''نیمین کے پار؟'' نپولین نے دہراتے ہوئے کہا۔ ''تو تم چاہتے ہو کہ میں نیمین کے پار چلا جاؤں— صرف نیمین کے پار؟'' نپولین نے سیدھے بالاشیف کی طرف دیکھتے ہوئے ایک بار پھر دہرایا۔

بالاشیف نے مؤدبانہ انداز سے سر جھکا دیا۔

چار ماہ قبل اس سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ وہ اپنی فوجیں پومیرانیا[31] سے نکال لے اور اب اس سے صرف یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ نیمین کے پار چلا جائے۔ نپولین بہ عجلت پیچھے ہٹا اور کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔

''تم کہتے ہو کہ مذاکرات شروع ہونے سے پہلے میں اپنی فوجیں نیمین کے پار لے جاؤں لیکن دو ماہ پیشتر مجھ سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ میں اودر[32] اور وستولا[33] کے پار چلا جاؤں اور پھر بھی تم مذاکرات کے لیے رضامند ہو!''

وہ چپ چاپ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کمرے کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچ گیا اور دوبارہ بالاشیف کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ بالاشیف نے دیکھا کہ اس کی بائیں پنڈلی پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پھڑک رہی ہے اور اس کے چہرے پر جو درشتی جھلک رہی تھی، اس سے یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پتھر کا بنا ہوا ہو۔ اس کی یہ جو بائیں پنڈلی لرز رہی تھی، خود اسے اس کا شعور تھا۔ ''میری بائیں ٹانگ کا لرزنا میرے نزدیک بہت بڑی علامت ہے،'' اس نے ایک مرتبہ کہا تھا۔

''اودر اور وستولا کے پار پسپائی اختیار کرنے کے مطالبات کسی پرنس آف باڈن[34] سے تو کیے جا سکتے ہیں، مجھ سے نہیں!'' نپولین نے تقریباً یوں چیخ کر کہا کہ خود اسے بھی حیرانی ہوئی۔ ''اگر تم پیٹرزبرگ اور ماسکو طشتری میں رکھ کر مجھے پیش کر دو میں اس قسم کی شرائط تسلیم نہیں کروں گا۔ تم کہتے ہو کہ یہ جنگ میں نے شروع کی ہے؟ لیکن ہم میں سے سب سے پہلے کون فوج کے ساتھ آ کر ملا؟ امپراطور الیکسانڈر، نہ کہ میں! جب میں کروڑوں کا خرچہ کر چکا ہوں، جب تم انگلستان کے ساتھ اتحاد کر چکے ہو، جب تمھاری پوزیشن کمزور ہے، تم مجھے مذاکرات کی پیشکش کرنے لگے— تم مجھے مذاکرات کی پیشکش کرنے لگے! لیکن تمھارا انگلستان کے ساتھ اتحاد کرنے کا مقصد کیا ہے؟ اس نے تمھیں دیا کیا ہے؟'' وہ پیہم بولتا چلا گیا۔ امن میں کیا فوائد مضمر تھے، صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ نہ تو اس بارے میں

تفصیل سے کوئی بات کرنا چاہتا تھا اور نہ اس کے امکانات اس کی گفتگو کا حصہ تھے، بلکہ وہ اپنے پرزور اور جلالی بیان سے صرف یہ ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا کہ اس کا موقف سو فیصد درست ہے، وہ بہت طاقتور ہے، یہ کہ الیکساندر غلطیوں کا ارتکاب کر رہا ہے اور منافقت برت رہا ہے۔

اس نے اس گفتگو کا آغاز اس واضح ارادے سے کیا تھا کہ وہ یہ جتائے گا کہ اس کی پوزیشن بہت مضبوط اور فائق ہے لیکن اس کے باوجود وہ یہ عندیہ دے گا کہ وہ مذاکرات کے لیے آمادہ ہے۔ لیکن جب اس نے بولنا شروع کیا، جوں جوں اس کی گفتگو آگے بڑھتی گئی، اس کے مفہوم پر اس کا کنٹرول کم سے کم تر ہوتا چلا گیا۔ لاریب اب اس کی باتوں کا سارا مقصد صرف اپنی ذات کو آسمان پر چڑھانا اور الیکساندر کی تذلیل کرنا رہ گیا تھا۔ حالانکہ یہ وہ چیزیں تھیں جن کا ملاقات کے آغاز میں وہ ہرگز تاثر دینا نہیں چاہتا تھا۔

''میں نے سنا ہے کہ تم نے ترکوں سے بھی صلح[35] کر لی ہے۔''

بالاشیف نے اثبات میں سر جھکا دیا۔

''صلح نامہ طے پا چکا ہے...'' اس نے کہنا شروع کیا۔

لیکن نپولین نے اسے بولنے کا موقع نہ دیا۔ وہ بظاہر تمام گفتگو خود کرنا چاہتا تھا اور وہ اسی طلاقت لسانی اور بے قید جھلاہٹ کے ساتھ، جو ان لوگوں کا، جن کا ظفر مندی کی وجہ سے دماغ ٹھکانے پر نہیں رہتا، وتیرہ بن جاتا ہے، بولتا چلا گیا۔

''ہاں میں جانتا ہوں کہ تم نے مولداویا[36] اور ولاکیا[37] حاصل کیے بغیر ترکوں سے صلح کر لی ہے۔ جس طرح میں نے تمھارے امپراطور کو فن لینڈ[38] دیا تھا، اسی طرح میں یہ صوبجات بھی ان کی تحویل میں دے سکتا تھا۔ ہاں، بالکل،'' اس نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''میں نے امپراطور الیکساندر سے مولداویا اور ولاکیا کا وعدہ کیا تھا اور میں وہ انھیں دے بھی دیتا، لیکن اب انھیں ان خوبصورت صوبجات سے محروم رہنا پڑے گا۔ وہ انھیں اپنی مملکت میں شامل کر سکتے تھے اور ایک ہی عہد حکومت میں روس کی سرحدوں کی خلیج بوتھنیا[39] سے دریائے ڈینیوب کے منابع تک توسیع کر سکتے تھے۔ کیتھرین اعظم بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتی تھی،'' نپولین نے کہا۔ وہ کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا اور اس کی ہیجانی کیفیت میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ بالاشیف کے سامنے بالکل وہی الفاظ، جو اس نے ٹلزٹ میں خود الیکساندر سے کہے تھے، دہرا رہا تھا۔ ''یہ سب کچھ انھیں میری دوستی کے طفیل حاصل ہو جاتا۔ اخ، کیا مہتمم بالشان عہد حکومت ہوتا، کیا مہتمم بالشان عہد حکومت ہوتا!'' اس نے یہ الفاظ بار بار دہرائے، پھر وہ رکا، جیب سے نسوار کی سنہری ڈبیا نکالی، اسے اپنی ناک کے نیچے لے گیا، حریصانہ اسے سونگھا اور زور سے چھینک ماری۔ ''امپراطور الیکساندر کا عہد حکومت کتنا مہتمم بالشان ہوتا!''

اس نے بالاشیف کی طرف یوں دیکھا جیسے اسے اس پر بڑا ترس آ رہا ہو اور جب مؤخرالذکر نے کچھ جواب دینے کی کوشش کی، اس نے آناً فاناً دوبارہ اسے ٹوک دیا۔

''آخر انھیں کس چیز کی خواہش یا جستجو ہے جو انھیں میری دوستی کے طفیل نہیں مل سکتی تھی؟'' نپولین نے یوں کندھے اچکاتے ہوئے مطالبہ کیا جیسے یہ چیستان ان کی سمجھ سے بالا ہو۔ ''لیکن نہیں، انھوں نے میرے دشمنوں کو اپنے ارد گرد اکٹھا کرنے کو ترجیح دی اور کن لوگوں کو؟ شٹائینوں[40] کو، آرم فیلٹوں[41] کو، بے نگ سینوں[42] کو، ونٹ ٹسنگے روڈیوں[43] کو اشٹائین — وہ غدار، جسے اپنے ملک سے جلاوطن کیا گیا، آرم فیلٹ — عیاش اور سازشی، ونٹ ٹسنگے روڈے — غدار فرانسیسی شہری، بے نگ سین — باقیوں سے ذرا بہتر فوجی لیکن بہر حال نا اہل، جس سے 1807 میں کچھ نہ ہو سکا اور جسے دیکھ کر امپر اطور الیکساندر کے ذہن میں مہیب یادیں تازہ ہونا چاہئیں۔ ... چلیں، اگر یہ اشخاص لائق فائق ہوتے، مجھے کوئی اعتراض نہ ہوتا، کیونکہ پھر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا،'' نپولین نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اس کے ذہن میں خیالات و دلائل کی، جو اس کی نظروں میں اس کا حق یا قوت (اس کے نزدیک یہ دونوں ایک ہی چیز کے دو رخ تھے) ثابت کر رہے تھے، اتنی تیزی سے یلغار ہو رہی تھی کہ اس کے الفاظ ان (خیالات و دلائل) کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے۔ ''لیکن وہ تو یہ بھی نہیں ہیں۔ وہ نہ جنگ میں کام آ سکتے ہیں اور نہ زمانہ امن کے دوران میں کوئی مدد کر سکتے ہیں! سنا ہے کہ اس ٹولے میں بار کلے قابل ترین شخص ہے — لیکن اس کی ابتدائی چالوں کو دیکھ کر مجھے اس سے اتفاق نہیں ہونا چاہیے ... اور یہ کر کیا رہے ہیں؟ یہ سب درباری کیا کر رہے ہیں؟ پفوہل[44] منصوبے بناتا ہے، آرم فیلٹ رد و قدح کرتا ہے، بے نگ سین غور کرتا ہے، اور بار کلے، جسے عمل کرنے کے لیے کہا جاتا ہے، فیصلہ نہیں کر پاتا اور وقت گزر جاتا ہے۔ صرف باگ راتیان صحیح معنوں میں فوجی آدمی ہے۔ وہ احمق ضرور ہے، لیکن اس کے پاس تجربہ، تیز نگاہ اور عزمِ صمیم ہے ... اور شائستگی سے عاری اس ہجوم میں آپ کے نوجوان امپر اطور کیا کردار ادا کر رہے ہیں؟ یہ لوگ ان کی پوزیشن کو مشتبہ بنا رہے ہیں اور جو کچھ ہوتا ہے، اس کی ذمے داری ان پر ڈال دیتے ہیں۔ جب تک کوئی حکمران خود جرنیل نہ ہو، اس کا فوج میں کیا کام؟'' نپولین نے کہا۔ صاف عیاں تھا کہ ان آخری الفاظ کے ذریعے اس کا ارادہ براہ راست روسی امپر اطور کو للکارنا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ الیکساندر فوجی کمانڈر کہلانے کا شدید آرزو مند ہے۔

''مہم شروع ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا ہے اور تم لوگ ولنا کا بھی دفاع نہیں کر سکے۔ تمھاری فوج دو حصوں میں تقسیم کی جا چکی ہے اور تمھیں پولینڈ کے صوبوں سے باہر دھکیلا جا چکا ہے۔ تمھاری فوج میں بے اطمینانی پھیل رہی ہے —''

''اس کے برعکس، عالی جاہ،'' بالاشیف نے کہا۔ اس سے جو کچھ کہا گیا تھا، اس کے لیے اسے یاد کرنا مشکل اور اس لفظی آتش بازی کو سمجھنا دشوار ہو رہا تھا، ''ہماری افواج کے جوش و خروش میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے —''

''مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے،'' نپولین نے اسے ٹوک دیا۔ ''مجھے یہ سب کچھ معلوم ہے۔ جس طرح مجھے یہ صحیح صحیح معلوم ہے کہ میری فوج میں کتنی بٹالینیں ہیں، اسی طرح میں تمھاری فوج کی بٹالینوں سے بھی بلا کم و کاست آگاہ ہوں۔ تمھارے پاس دو لاکھ سے زیادہ جوان نہیں اور میرے پاس ان سے تگنے ہیں۔ یہ میں تمھیں اپنی عزت کی

قسم کھا کر بتا رہا ہوں۔" وہ یہ بھول گیا تھا کہ اس کی عزت کی قسم کی کوئی وقعت نہیں رہ گئی تھی۔ "میں عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ دریائے وستولا کے اس پار میرے پاس پانچ لاکھ تیس ہزار جوان ہیں۔ ترک تمھارے کسی کام نہیں آئیں گے۔ وہ بالکل ناکارہ لوگ ہیں اور تمھارے ساتھ صلح کر کے انھوں نے یہ ثابت کر دکھایا ہے۔ رہے سویڈی — ان کا مقدر یہی ہے کہ ان پر پاگل بادشاہ حکومت کرتے رہیں ان کا بادشاہ مخبوط الحواس تھا۔ انھوں نے اسے تخت سے اٹھایا اور دوسرے کو بٹھا دیا۔ لیکن یہ دوسرا — برناڈوٹ[45] — دیکھتے ہی دیکھتے اپنے ہوش و حواس گنوا بیٹھا کیونکہ کوئی سویڈی، جب تک وہ پاگل نہ ہو، روس کے ساتھ اتحاد نہیں کر سکتا۔"

نپولین حقارت و معاندت سے مسکرایا اور دوبارہ نسوار کی ڈبیا اپنی ناک تلے لے گیا۔

بالاشیف نپولین کی ہر بات کا ترکی بہ ترکی جواب دے سکتا تھا اور وہ بار بار بات کرنے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ اس نے بار بار اپنے ہاتھ اور بازو یوں ہلائے جیسے وہ یہ اشارہ دینا چاہتا ہو کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن نپولین اسے کوئی موقع ہی نہیں دے رہا تھا اور ہر مرتبہ اسے ٹوک دیتا تھا۔ مثلاً جب اس نے یہ دعویٰ کیا کہ سویڈیوں کا کیا ہے، وہ تو پاگل ہیں، بالاشیف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر روس سویڈن کا ساتھ دے، تو وہ عملاً جزیرہ بن جاتا ہے، لیکن نپولین آپے سے باہر ہو گیا اور غضب ناک انداز سے چیخنے چلانے لگا، یوں بالاشیف کی آواز دب گئی۔

نپولین پر کچھ اس قسم کی جھلاہٹ سوار تھی جس میں ایک آدمی کو اپنے آپ کے سامنے یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ صحیح ہے، باتوں کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہ بس بولتا ہی بولتا چلا جاتا ہے۔ بالاشیف کو بے چینی ہونے لگی۔ سفیر کی حیثیت سے اسے اپنا وقار برقرار رکھنے کی فکر تھی اور وہ جواب دینے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا، لیکن انسان کی حیثیت سے وہ اس بلا سبب غیظ و غضب کے، جس کی لپیٹ میں نپولین آ چکا تھا، سامنے سکڑ گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نپولین اب خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہے، اس کی کوئی اہمیت نہیں اور نپولین خود بھی، جب وہ اپنے آپے میں آئے گا، اپنے الفاظ پر شرمندگی محسوس کرے گا۔ بالاشیف نظریں جھکائے کھڑا، نپولین کی فربہ ٹانگوں کو، جو تیزی سے آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں، دیکھتا اور اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کرتا رہا۔

"لیکن تمھارے ان اتحادیوں کی مجھے کیا پرواہ ہے؟" نپولین نے کہا۔ "میرے بھی اتحادی ہیں — پولستانی۔ ان کی تعداد اسی ہزار ہے اور وہ شیروں کی طرح لڑتے ہیں۔ چند دنوں میں ان کی تعداد دو لاکھ ہو جائے گی۔"

نپولین جانتا تھا کہ وہ صریحاً کذب بیانی سے کام لے رہا ہے۔ ادھر بالاشیف اس کے سامنے اسی طرح کھڑا تھا، گم صم، راضی برضا۔ غالباً ان دونوں باتوں نے نپولین کو اور بھی جھلا دیا۔ چنانچہ وہ تیزی سے پیچھے مڑا، اپنا چہرہ بالاشیف کے چہرے کے قریب لایا اور اپنے ننھے منے سفید ہاتھوں کو پوری قوت اور تیزی سے فضا میں لہراتا تقریباً چلا کر بولا:

"اور میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ اگر تم نے پرشیا کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی، تو میں یورپ کے نقشے سے اس کا نام و نشان مٹا دوں گا!" اس نے اعلان کیا۔ غیظ و غضب سے اس کا چہرہ زرد اور مسخ ہو گیا، اور اس

نے بڑے زور سے اپنا ایک ننھا منا ہاتھ دوسرے پر مارا۔ ہاں، میں تمھیں دوینا[46] ونیپر[47] کے پار دھکیل دوں گا، اور میں وہ سرحدیں، جن کو یورپ نے تمھیں پامال کرنے کی اجازت دے کر پہلے جرم کیا اور پھر چشم پوشی برتی، دوبارہ بحال کردوں گا۔[48] ہاں، تمھارے ساتھ اب یہی کچھ ہوگا، مجھے بیگانہ بنا کر تم یہی کچھ کاٹو گے!'' اس نے کہا اور وہ چپ چاپ کمرے کے چکر کاٹنے لگا۔ اس کے فربہ کندھے پھڑک رہے تھے۔

اس نے اپنی نسوار کی ڈبیا واسکٹ کی جیب میں ڈالی، پھر نکالی، متعدد بار اسے اپنی ناک کے نیچے رکھا اور بالاشیف کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے کچھ دیر توقف کیا، تمسخرانہ انداز سے سیدھا بالاشیف کی آنکھوں میں جھانکا اور دھیمے انداز سے کہا:

''اور اس کے باوجود تمھارے آقا کا دور حکومت کتنا پر شکوہ ہو سکتا تھا!''

بالاشیف کو محسوس ہوا کہ اب جواب دینا بالکل لازمی ہوگیا ہے اور اس نے کہا کہ روسیوں کا اس بارے میں نقطہ نظر اتنا قنوطی نہیں ہے۔ نپولین چپ سادھے رہا۔ وہ اب بھی اسے بنظرِ تحقیر دیکھ رہا تھا اور بظاہر اس کی بات سن نہیں رہا تھا۔ بالاشیف نے کہا کہ روسیوں کو توقع ہے کہ جنگ سے بہترین نتائج حاصل ہوں گے۔ نپولین ازرہ کرم فرمائی مسکرایا گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہو ''مجھے معلوم ہے کہ اس قسم کی بات کرنا تمھارا فرض بنتا ہے لیکن خود تمھیں اس بات کا کوئی یقین نہیں۔ میں نے تمھیں قائل کر دیا ہے۔''

جب بالاشیف اپنی بات ختم کر چکا، نپولین نے ایک بار پھر اپنی نسوار کی ڈبیا نکالی، اسے سونگھا اور سگنل کے طور پر اپنا پاؤں زور سے دو مرتبہ فرش پر مارا۔ دروازہ کھلا اور ایک مصاحب نے مؤدبانہ انداز سے جھک کر امپراطور کو اس کا ہیٹ اور دستانے پیش کیے۔ دوسرا مصاحب جیبی رومال لایا۔ ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے بغیر نپولین بالاشیف کی جانب متوجہ ہوا۔

''امپراطور الیکساندر کو یقین دلا دو،'' اس نے اپنا ہیٹ پکڑتے ہوئے کہا، ''کہ ہمیشہ کی طرح میں اب بھی ان کا خادم ہوں۔ میں انھیں اچھی طرح جانتا ہوں اور وہ جن بلند و بالا اوصاف کے مالک ہیں، ان کے پیش نظر میں ان کا بہ دل و جان احترام کرتا ہوں۔ جنرل، اب میں تمھیں مزید نہیں روکوں گا، تمھیں امپراطور کے نام میرا خط مل جائے گا۔''

اور نپولین تیز تیز قدم اٹھاتا دروازے کی جانب چل دیا۔ استقبالیہ کمرے میں جتنے بھی لوگ موجود تھے، جھٹ پٹ آگے بھاگے اور زینہ اترنے لگے۔

7

نپولین نے جو کچھ اس سے کہا تھا، جس طرح غیظ و غضب سے لال پیلا ہوا تھا اور اس نے جس خشک لہجے سے اس سے یہ آخری الفاظ کہے تھے: ''جنرل، اب میں تمھیں مزید نہیں روکوں گا، تمھیں میرا خط مل جائے گا۔'' اس سے بالاشیف

کو یہ یقین ہو گیا کہ نپولین اس سے دوبارہ ملاقات کرنا نہیں چاہے گا۔ واقعتاً وہ ایک ایسے سفیر کے، جس کے ساتھ وہ اتنی بے ہودگی سے پیش آیا تھا اور جس کے سامنے اس نے اتنی ناشائستہ تندی و تیزی کا مظاہرہ کیا تھا، قریب بھی نہیں پھٹکے گا۔ لیکن جب دوغوک کی وساطت سے اسے امپراطور کے ساتھ کھانا کھانے کی دعوت ملی، اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔

ڈنر میں بیسی ایغ، کولین کورخ[49] اور بیخ تیئے[50] موجود تھے۔

نپولین بالاشیف سے بہت کشادہ دلی اور خندہ پیشانی سے ملا۔ اس صبح اس پر غصے کا جو دورہ پڑا تھا، اس کے رویے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس کے بارے میں نہ تو اس کے جذبات میں کوئی تناؤ ہے اور نہ اسے اس کا ضمیر کوئی لعنت ملامت کر رہا ہے، بلکہ اس کے برعکس اس کی پوری کوشش یہ تھی کہ بالاشیف کسی قسم کی گھبراہٹ یا بے چینی محسوس نہ کرے۔ صاف دکھائی دے رہا تھا کہ اسے مدتوں سے یقین ہو چکا ہے کہ اس سے کسی نوع کی غلطی کا ارتکاب ہو ہی نہیں سکتا اور اس کے خیال کے مطابق وہ جو کچھ بھی کرتا ہے، وہ بالکل صحیح ہوتا ہے۔ وہ ایسا کیوں سمجھتا تھا، اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس کے افعال صحیح یا غلط کے پیمانے پر پورے اترتے تھے بلکہ وہ اس کے لیے صحیح ہوتے تھے کیونکہ یہ اس سے سرزد ہوئے ہوتے تھے۔

ولنا میں، جہاں کے باشندوں نے اس کا والہانہ انداز سے استقبال کیا تھا اور جوش و خروش سے اس کے گھوڑے کے پیچھے بھاگے تھے، سواری کرنے کے بعد اس کا مزاج بہت خوشگوار تھا۔ وہ جن سڑکوں اور گلیوں میں سے گزرا، وہاں ہر دریچے میں غالیچے، جھنڈے اور پردے، جن پر اس کے مونوگرام نقش تھے، لٹک رہے تھے اور پولستانی خواتین نے رومال ہلا ہلا کر اسے اہلاً و سہلاً کہا تھا۔

ڈنر پر بالاشیف کو اپنے برابر بٹھانے کے بعد نپولین نہ صرف اس کے ساتھ ملنساری سے پیش آیا، بلکہ وہ اس کے ساتھ کچھ اس قسم کا برتاؤ کرنے لگا جیسے وہ اسی کا درباری ہو، اور ان لوگوں میں، جنھیں اس کے منصوبوں سے ہمدردی تھی اور جنھیں لازماً اس کی کامرانیوں پر خوشیاں منانا چاہیے تھا، شامل ہو۔ گفتگو کے دوران میں اس نے ماسکو کا ذکر چھیڑ دیا اور بالاشیف سے روسی دارالسلطنت کے بارے میں سوالات پوچھنے لگا۔ تاہم اس کا انداز اس مسافر کا نہیں تھا جو کسی نئے شہر کے، جس کی وہ سیر کرنا چاہتا ہے، متعلق دریافت کرتا ہے، بلکہ وہ یوں استفسار کر رہا تھا جیسے اسے یقین ہو کہ اس کے تجسس کو دیکھ کر بالاشیف، جو روسی شہری تھا، پھولے نہ سمائے گا۔

''ماسکو کی آبادی کتنی ہے؟ مکانات کتنے ہیں؟ کیا یہ صحیح ہے کہ ماسکو کو 'Moscou la sainte'* کہا جاتا ہے؟ ماسکو میں گرجے کتنے ہیں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔

اور جب اسے بتایا گیا کہ ماسکو میں گرجوں کی تعداد دو سو سے اوپر ہے، اس نے کہا:

''اتنے گرجوں کا فائدہ؟''

---

* مقدس ماسکو

”روسی بہت دین دار ہیں،“ بالاشیف نے جواب دیا۔

”تاہم خانقاہوں اور گرجوں کی کثیر تعداد ہمیشہ کسی قوم کی پسماندگی کی علامت ہوتی ہے،“ نپولین نے رائے زنی کی اور اپنے اس جملے پر داد وصول کرنے کے لیے اچٹتی نگاہوں سے کولین کورخ کی طرف دیکھا۔

بالاشیف نے فرانسیسی امپراطور سے مؤدبانہ اختلاف کرنے کا حوصلہ دکھایا۔

”ہر ملک کے اپنے رسوم و رواج ہوتے ہیں،“ اس نے کہا۔

”لیکن یورپ کے کسی بھی دوسرے ملک میں اس قسم کی کوئی نظیر نہیں ملتی،“ نپولین نے کہا۔

”یور میجسٹی، جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں،“ بالاشیف نے کہا۔”روس کے علاوہ ہسپانیہ ہے۔ وہاں بھی بے شمار گرجے اور خانقاہیں ہیں۔“

بالاشیف کے اس ترکی بہ ترکی جواب پر، جس میں ہسپانیہ میں فرانسیسیوں کی حالیہ ہزیموں[51] کے بارے میں ڈھکا چھپا اشارہ کیا گیا تھا، بعدازاں الیکساندر کے دربار میں، جب اسے وہاں دہرایا گیا، داد و تحسین کے ڈونگرے برسائے گئے، لیکن نپولین کے دسترخوان پر اسے کوئی خاص پسند نہ کیا گیا اور کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔

مارشلوں کے چہروں پر جو بے نیازی اور الجھاؤ جھلک رہا تھا، اس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس دبدھے میں پڑے ہوئے ہیں کہ بالاشیف کے لہجے کا مفہوم کیا ہے۔”اگر اس میں کوئی نکتہ ہے، تو ہم اسے سمجھنے سے قاصر ہیں“ یا ”اس فقرے میں قطعاً کسی قسم کی بذلہ سنجی نہیں ہے،“ ان کے تاثرات کہتے نظر آرہے تھے۔ اس کے ترکی بہ ترکی جواب کی اتنی کم تفہیم ہوئی کہ نپولین نے اس پر مطلق توجہ نہ دی اور بڑی سادگی سے پوچھنے لگا کہ وہاں (ولنا) سے ماسکو کا سیدھا راستہ کن کن شہروں میں سے گزرتا ہے۔ بالاشیف نے، جو ڈنر کے سارے عرصے کے دوران میں بڑا چوکس رہا تھا، جواب دیا کہ جس طرح ”تمام شاہراہیں روم پہنچتی ہیں، اسی طرح یہاں تمام شاہراہیں ماسکو پہنچتی ہیں۔ پھر یہاں متعدد شاہراہیں ہیں اور ان میں وہ شاہراہ، جو براستہ پولٹاوا[52(الف)] جاتی ہے اور جسے چارلس دوازدہم[52(ب)] نے منتخب کیا تھا، بھی شامل ہے۔“ بالاشیف کا یہ جواب اتنا برمحل تھا کہ غیر ارادی طور پر اس کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا، لیکن اس کا جملہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا کہ کولین کورخ پیٹرز برگ تا ماسکو شاہراہ کی خستہ حالی کا ذکر کرنے اور پیٹرز برگ میں اپنے قیام کی یادیں تازہ کرنے لگا۔

ڈنر کے بعد وہ کافی پینے نپولین کے سٹڈی روم میں چلے گئے۔ چار روز پیشتر یہ امپراطور الیکساندر کا سٹڈی روم تھا۔ نپولین بیٹھ گیا اور کافی کی پیالیوں سے، جو سیورے[53] میں بنائی گئی تھیں، کھیلنے لگا۔ اس نے بالاشیف کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا اور اپنے قریب کی کرسی پر بٹھا لیا۔

یہ بات کسی سے ڈھکی چھپی نہیں کہ کھانا کھانے کے بعد آدمی پر کچھ اس قسم کی کیفیت، جو کسی سوچے سمجھے سبب کی نسبت کہیں زیادہ اسے اپنے آپ سے مطمئن و مسرور بنا دیتی ہے، طاری ہو جاتی ہے۔ اس کیفیت میں وہ ہر شخص کو اپنا دوست سمجھنے لگتا ہے۔ نپولین بھی اسی کیفیت میں گرفتار تھا۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ ایسے اشخاص کے، جو اس کی پرستش

کرتے ہیں، حلقے میں ہے اور اپنی اس بعد از طعام کی کیفیت میں وہ یہ باور کرنے لگا کہ بالاشیف بھی اس کا دوست اور مداح ہے۔ وہ خوشگوار لیکن قدرے طنزیہ انداز سے مسکراتا ہوا اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ یہی کمرا پہلے امپراطور الیکساندر کے زیرِ استعمال تھا۔ کتنی عجیب بات ہے! کیوں جنرل؟'' اس نے کہا۔ اسے اس بارے میں ذرہ برابر شبہہ نہیں تھا کہ اس کا یہ جملہ کسی روسی کو قطعاً پسند نہیں آ سکتا کیونکہ اس سے اس کی، یعنی نپولین کی، الیکساندر پر برتری ثابت ہوتی تھی۔

بالاشیف کوئی جواب نہ دے سکا اور اس نے خاموشی سے اپنا سر جھکا لیا۔

''ہاں، اسی کمرے میں چار روز قبل ونٹ ٹسنگے روڈے اور شتائین مشاورتی اجلاس منعقد کر رہے تھے،'' نپولین نے اپنی اسی خود اعتماد، طنزیہ مسکراہٹ سے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی، وہ یہ ہے کہ امپراطور الیکساندر نے میرے تمام ذاتی دشمن اپنے اردگرد مجتمع کر لیے ہیں۔ یہ.... میں بالکل.... سمجھ نہیں پایا۔ کیا انھیں کبھی یہ خیال نہیں آیا کہ یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں؟'' اس نے بالاشیف کی طرف متوجہ ہو کر پوچھا اور بظاہر اس سوال نے اسے دوبارہ اسی پٹڑی پر، جس پر وہ صبح رواں دواں تھا، ڈال دیا اور اس کا غصہ جو ابھی فرو نہیں ہوا تھا پھر تازہ ہو گیا۔

''اور انھیں بتا دو کہ میں بھی یہی کچھ کروں گا!'' نپولین نے اپنی پیالی ایک طرف دھکیلتے اور اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں ان کے تمام عزیزوں اور قرابت داروں — ورٹم برگوں[54]، باڈنوں، وائمروں[55] — کو جرمنی سے نکال باہر کروں گا۔ ہاں، چن چن کر سب کو نکال باہر کروں گا۔ انھیں چاہیے کہ وہ ان کے لیے روس میں عافیت گاہیں تعمیر کرا لیں۔''

بالاشیف نے جس انداز سے اپنا سر جھکایا، وہ اس بات کی علامت تھا کہ وہ رخصت ہونا چاہے گا اور جو کچھ اس سے کہا جا رہا ہے، وہ اسے اس لیے سن رہا ہے کیونکہ وہ اسے سننے پر مجبور ہے۔ اس کے چہرے پر جو تاثرات تھے، نپولین نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ وہ بالاشیف سے کچھ اس طرح پیش آ رہا تھا جیسے وہ اس کے حریف کا سفیر نہ ہو، بلکہ بہ دل و جان اس کا شیدائی ہو اور بلاشبہہ اپنے سابقہ آقا کی تذلیل پر خوش ہو رہا ہو گا۔

''اور امپراطور الیکساندر نے فوجوں کی کمان اپنے ہاتھوں میں کیوں لے لی ہے؟ اس کا فائدہ؟ جنگ میرا پیشہ ہے۔ ان کا کام فرمان روائی کرنا ہے، فوجوں کی کمان سنبھالنا نہیں۔ انھوں نے یہ ذمے داری اپنے سر کیوں لے لی ہے؟''

اور اس نے دوبارہ نسوار کی ڈبیا نکالی، خاموشی سے کمرے کے متعدد چکر کاٹے، پھر وہ اچانک اور غیر متوقع طور پر بالاشیف کے پاس پہنچا، صرف ہونٹوں سے قدرے مسکراتے ہوئے اس نے چالیس سالہ جرنیل کے چہرے تک اپنا ہاتھ اٹھایا اور ہلکے سے جھٹکے سے اس کا کان مروڑ دیا۔ اس نے یہ حرکت اتنے اعتماد، اتنی عجلت اور اتنی بے تکلفی سے کی گویا کہ وہ کوئی نہایت اہم کام سرانجام دے رہا ہو، بلکہ ایسا کام جس میں گویا خود بالاشیف کو بھی بڑا مزہ آیا ہو گا۔ فرانسیسی دربار میں امپراطور سے اپنے کان اینٹھوانا عظیم ترین عزت اور شاہی لطف و کرم کی علامت سمجھا جاتا

تھا۔

"Ehbien، امپراطور الیکساندر کے درباردار اور مداح، تم کچھ کہتے کیوں نہیں؟" اس نے یوں پوچھا جیسے اس کی موجودگی میں اس، "نپولین" کے علاوہ کسی اور کا درباری اور مداح ہونا بڑی مضحکہ خیز بات ہو۔ "انھیں میرے گھوڑے دے دو۔ انھیں بہت لمبا سفر کرنا ہے..."

بالاشیف کے ذریعے جو خط ارسال کیا گیا، الیکساندر کے نام وہ اس کا آخری مراسلہ تھا۔ اس ملاقات کی ایک ایک تفصیل روس کے امپراطور کو پہنچادی گئی اور جنگ کا آغاز ہوگیا۔

8

ماسکو میں پیئر سے ملاقات کے بعد پرنس آندرے پیٹرزبرگ روانہ ہوگیا۔ گھر والوں کو تو اس نے یہی بتایا تھا کہ اسے کچھ کام ہے لیکن حقیقتاً اسے اناطول کوراگن کی، جس سے ملنا اسے بہت ضروری محسوس ہو رہا تھا، تلاش تھی۔ جونہی وہ پیٹرزبرگ پہنچا، اس نے کوراگن کا پتہ کرایا لیکن وہ اب وہاں نہیں تھا۔ پیئر اپنے برادرِ نسبتی کو بتاچکا تھا کہ پرنس آندرے اس کے تعاقب میں ہے، چنانچہ اناطول کوراگن نے پیٹرزبرگ پہنچتے ہی وزیرِ جنگ سے ملاقات کی اور فوج میں شامل ہونے کے لیے مولداویا چلا گیا۔

پیٹرزبرگ میں اپنے اس قیام کے دوران میں پرنس آندرے نے اپنے سابق کمانڈر کوتوزف سے، جس کے دل میں پرنس آندرے کے لیے ہمیشہ نرم گوشہ موجود رہا تھا، ملاقات کی۔ بوڑھے جرنیل نے اسے تجویز پیش کی کہ وہ اس کے ساتھ مولداویا، جہاں کی فوج[56] کا وہ کمانڈر انچیف مقرر ہوچکا تھا، چلا چلے۔ چنانچہ پرنس آندرے نے ہیڈکوارٹر سٹاف میں اپنی تعیناتی کے احکام حاصل کیے اور ترکی روانہ ہوگیا۔

پرنس آندرے نے کوراگن کو خط لکھنا اور اسے ڈوئیل کے لیے للکارنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے سوچا کہ اگر اسے کوئی نیا بہانہ ہاتھ نہ آیا اور اس نے یونہی کوراگن کو للکار دیا، اس سے نوجوان کاؤنٹس کی شہرت پر حرف آجائے گا۔ چنانچہ اس نے یہ ارادہ کرلیا کہ وہ خود کوراگن سے ملاقات کرے گا اور اس کے ساتھ ڈوئیل لڑنے کا کوئی جواز ڈھونڈلے گا لیکن کوراگن ترکی میں بھی اس کے ہتھے نہ چڑھا، وہ پرنس آندرے کی آمد کے چند ہی روز بعد روس روانہ ہوگیا تھا۔

نئے ملک اور نئے ماحول میں پرنس آندرے کو زندگی کا بوجھ اٹھانا آسان محسوس ہوا۔ اپنی منگیتر کی بے وفائی — اس کے اس پر جو اثرات ہوئے تھے، وہ انھیں جتنا زیادہ چھپانے کی کوشش کرتا تھا، وہ اس کے لیے اتنے ہی زیادہ اذیت ناک ثابت ہو رہے تھے — کے بعد وہ ماحول، جس میں وہ شاداں و مطمئن رہتا تھا، اب اسے کاٹ کھانے لگا، اور وہ آزادروی اور خودمختاری، جسے کسی زمانے میں وہ حرزِ جاں بنا کر رکھتا تھا، اب اسے وبالِ جان محسوس ہونے

• خوب

گی۔ وہ خیالات، جو اوسٹرلٹس کے میدان جنگ میں لیٹے آسمان کی جانب ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے کے دوران میں اس کے ذہن میں وارد ہوئے تھے اور جنھیں بعد ازاں پیئر کے ساتھ اپنے مکالموں کے دوران میں شرح وبسط سے بیان کرنا اسے بہت مرغوب تھا— وہ خیالات، جنھوں نے باگوچارافوا اور بعد ازاں سوئٹزرلینڈ اور روم میں اس کی تنہائیوں کو پُر کیا تھا— اب نہ صرف اس کے دماغ میں آتے ہی نہیں تھے، بلکہ انھیں اور ان درخشاں اور بے کنار آفاق کو، جنھیں انھوں نے آشکار کیا تھا، یاد کرنے میں اسے خوف محسوس ہونے لگتا تھا۔ اب اس کی فکروں کا محور صرف وہ امور تھے جنھیں فوری طور پر نپٹایا جانا ضروری تھا اور جن کا اس کے پرانے آدرشوں سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا۔ موخرالذکر جتنا زیادہ اس کی رسائی سے دور ہو رہے تھے، ان نئی دلچسپیوں میں اس کا شوق اتنا ہی زیادہ بڑھتا جا رہا تھا۔ یہ ایسے ہی تھا جیسے چرخ نیلی فام کی وہ بلند و بالا غیر محدود چھتری، جو کبھی اس کے سر پر سایہ فگن تھی، اچانک پست ٹھوس گنبد نما چھت میں تبدیل ہوگئی ہو اور اس پر وزنی بوجھ بن گئی ہو۔ اس گنبد نما چھت کے نیچے ہر شکل واضح ضرور تھی لیکن پُراسراریت اور ابدیت سے تہی داماں ہو چکی تھی۔

اس کے ذہن میں جتنے بھی مشاغل آئے، ان سب میں فوجی ملازمت ایک ایسا پیشہ تھا جو ہر قسم کی گنجلکوں سے پاک اور سب سے زیادہ جانا پہچانا تھا۔ اس نے کوتوزوف کے سٹاف میں ڈیوٹی جرنیل کی ذمے داریاں قبول کر لیں اور اپنے فرائض اتنی تن دہی اور استقلال سے سرانجام دینے لگا کہ خود کوتوزوف اس کی مستعدی اور راست بازی پر ششدر رہ گیا۔ جب ترکی میں کوراگن پرنس آندرے کے ہاتھ نہ آیا، تو اس نے اس کے تعاقب میں واپس روس جانا لاحاصل گردانا، تاہم وہ دل میں خوب سمجھتا تھا کہ خواہ کتنا طویل عرصہ بیت جائے، ایک نہ ایک دن اس کا اس سے آمنا سامنا لازماً ہو گا— اس حقارت کے باوجود، جو وہ اس کے لیے محسوس کر رہا تھا اور ان تمام دلائل کے باوصف، جن سے وہ اپنے آپ کو یہ یقین دلاتا رہتا تھا کہ وہ "اس قابل نہیں کہ میں اپنے آپ کو اتنا نیچا گرا لوں کہ اس کے ساتھ ہاتھا پائی کرنے لگوں"— وہ خوب جانتا تھا کہ جب کبھی ان کی ملاقات ہوئی، وہ اسے بالکل اسی طرح، جس طرح کہ وہ شخص جس کی بھوک سے جان نکلی جا رہی ہو، کھانے پر ٹوٹے بنا نہیں رہ سکتا، اسے للکارے بنا نہیں رہ سکے گا۔ اور اس کا یہ شعور کہ ابھی تک تذلیل کا انتقام نہیں لیا گیا، اور اس کے دل میں عداوت کی جو آگ بھڑک رہی ہے، ابھی تک بجھائی نہیں جا سکی، اس کے ذہن پر بوجھ بنا ہوا تھا اور اس مصنوعی اطمینان وسکون میں، جو اس نے ترکی میں پیہم جفاکشانہ، قدرے نخوت پسندانہ اور جاہ طلبانہ مصروفیت کے ذریعے حاصل کیا تھا، زہر گھول رہا تھا۔

1812 میں جب نپولین کے ساتھ جنگ کی خبر بخارسٹ— جہاں کوتوزوف دو ماہ سے مقیم تھا اور اپنے روز و شب ایک ولاکیائی عورت کی صحبت میں گزار رہا تھا— پہنچی، پرنس آندرے نے درخواست کی کہ اس کا تبادلہ مغربی فوج میں کر دیا جائے۔ کوتوزوف نے، جس کا پہلے ہی اس کی جان توڑ سرگرمیوں سے ناک میں دم آ چکا تھا کیونکہ اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ یہ اس کی اپنی آرام طلبی پر مستقل طمانچہ ہیں، اسے جھٹ پٹ اجازت دے دی اور اسے اہم مشن پر بارکلے ڈ تولی کے پاس روانہ کر دیا۔

براہ راست مغربی فوج میں شامل ہونے سے قبل جو اس وقت، مئی میں، دریسا[57] میں خیمہ زن تھی، پرنس آندرے نے بالڈ ہلز کا، جو اس کے راستے میں آتا تھا کیونکہ یہ سمولنسک شاہراہ سے صرف دو میل ہٹ کر واقع تھا، چکر لگایا۔ گزشتہ تین برسوں کے دوران میں اس کی زندگی میں اتنی زیادہ تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں، اس نے اتنا کچھ سوچا، محسوس کیا اور دیکھا تھا (کیونکہ وہ مشرق اور مغرب دونوں میں سفر کر چکا تھا) کہ جب وہ بالڈ ہلز پہنچا، تو اسے یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور عجیب بھی محسوس ہوا کہ وہاں زندگی کے اطوار میں مو برابر فرق نہیں آیا تھا۔ اس کی گاڑی سنگی پھاٹک کے اندر داخل ہوئی اور اس خیابان پر، جو مکان کو جاتی تھی، چلنے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کسی طلسم زدہ قلعے میں، جہاں ہر چیز گہری نیند میں کھوئی ہوئی ہے، پہنچ گیا ہے۔ مکان پر وہی سنجیدہ اور متین ماحول، وہی بے داغ صفائی ستھرائی اور وہی سکوت حاوی تھا۔ اندرون مکان وہی فرنیچر اور دیواریں، وہی آوازیں اور وہی خوشبوئیں اور بوئیں، اور وہی ڈرپوک چہرے، جو پہلے کی نسبت ذرا کہولت زدہ ہو گئے تھے، نظر آ رہے تھے۔ پرنسس ماریا وہی ڈری سہمی، کم رو دوشیزہ تھی۔ اس کے شباب کا اولین دور ختم ہو چکا تھا اور وہ اپنی زندگی کے بہترین سال اندیشوں، وسوسوں اور اخلاقی کرب میں ضائع کر چکی تھی۔ مادموزیل بوغین بھی ویسی کی ویسی تھی۔ جوان، اپنے آپ سے مطمئن، عشوہ گر۔۔۔ وہ زندگی کے ایک ایک لمحے سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور مستقبل کے بارے میں سہانی امیدیں پال رہی تھی۔ فرق صرف یہ آیا تھا کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کہیں زیادہ پر اعتماد ہو چکی تھی (پرنس آندرے نے سوچا)۔ ٹیوٹر دیسال، جسے وہ سوئٹزرلینڈ سے لایا تھا، روسی طرز کا کوٹ پہنے ہوئے تھا اور ٹوٹی پھوٹی روسی میں نوکروں چاکروں سے باتیں کر رہا تھا لیکن وہ اب بھی وہی مہذب، باضمیر، ایماندار اور کتاب پسند اتالیق تھا لیکن فراخ ذہن سے محروم تھا۔ معمر پرنس میں جو واحد جسمانی تبدیلی نظر آ رہی تھی وہ اس کے ذہن میں ایک طرف اچھا خاصا رخنہ تھا جو ایک دانت کے نکلوائے جانے کے بعد وہاں بن گیا تھا۔ جہاں تک اس کے مزاج کا تعلق تھا، وہ جوں کا توں تھا، بلکہ اس کی خشونت میں کچھ اضافہ ہو گیا تھا اور دنیا میں جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے، ان کے بارے میں اس کا رویہ مزید تشکیک پسندانہ ہو گیا تھا۔ صرف نکولشکا میں تبدیلیاں رونما ہوئی تھیں، وہ بڑا ہو گیا تھا، اس کے گال پہلے کی نسبت زیادہ گلابی، اور اس کے بال سیاہ اور گھونگریالے تھے۔ اور جب وہ ہنستا اور خوش ہوتا تھا، وہ غیر شعوری طور پر اپنی ماں، کوچک پرنسس، کی طرح اپنا بالائی ہونٹ اوپر اٹھا لیتا تھا۔ اس سحر زدہ اور خفتہ قلعے میں وہ واحد ذی روح تھا جس نے عدم تغیر کے اصول پر عمل نہیں کیا تھا۔ تاہم اگرچہ ہر چیز خارجی طور پر جوں کی توں تھی، لیکن اب ان تمام لوگوں کے باہمی باطنی تعلقات وہ نہیں تھے جن کا مشاہدہ پرنس آندرے کو اپنی سابقہ آمد پر ہوا تھا، اب ان میں تبدیلیاں در آئی تھیں۔ افراد خانہ دو اجنبی اور متخاصم گروہوں میں منقسم ہو چکے تھے۔ وہ آپس میں اس لیے ملتے تھے کیونکہ وہ وہاں تھا، اس کی خاطر انھوں نے اپنی زندگی کے معمول کے ڈھانچے کو تبدیل کر لیا تھا۔ ایک گروہ معمر پرنس، مادموزیل بوغین اور میر تعمیرات پر مشتمل تھا، جب کہ دوسرے گروہ میں پرنسس ماریا، دیسال، نکولشکا اور تمام ادھیڑ عمر کھلائیاں اور انائیں شامل تھیں۔

بالڈ ہلز میں اس کے قیام کے دوران میں سارا خاندان یک جا کھانا کھاتا تھا، لیکن وہ سبھی کے سبھی عدم اطمینان کا

شکار رہتے تھے۔ پرنس آندرے کو محسوس ہوتا تھا کہ وہ ایک ایسا مہمان ہے جس کی خاطر استشنا برتا جا رہا ہے اور یہ کہ اس کی موجودگی ان سب کے اعصاب پر بوجھ بنی ہوئی ہے۔ اسے اس کا جبلی طور پر شعور ہو گیا۔ چنانچہ وہ پہلے روز ڈنر کے دوران میں گم صم بیٹھا رہا۔ اس کا یہ غیر فطری رویہ معمر پرنس کی نظروں سے اوجھل نہ رہ سکا، وہ بھی منہ جھاڑ سر پہاڑ بیٹھا رہا اور جونہی کھانا ختم ہوا، سیدھا اپنے اپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ شام کو جب پرنس آندرے اس کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے نوجوان کامینسکی کی مہم کے بارے میں باتیں کر کے اس کی دلچسپی ابھارنے کی کوشش کی، معمر پرنس نے اچانک پرنسس ماریا کا ذکر چھیڑ دیا۔ اسے اس پر اعتراض تھا کہ وہ ضعیف الاعتقاد اور توہم پرست ہے، اور مادموزیل بوغین سے خار کھاتی ہے حالانکہ مادموزیل واحد ہستی ہے جو اس (معمر پرنس) پر جان چھڑکتی ہے۔

معمر پرنس نے دعویٰ کیا کہ اگر اس کی طبیعت خراب رہتی ہے، تو اس کی ذمے داری سراسر پرنسس ماریا پر عاید ہوتی ہے، وہ عمداً اسے ستاتی، زچ کرتی اور اشتعال دلاتی رہتی ہے اور یہ کہ وہ اپنے بے جا لاڈ پیار اور احمقانہ باتوں سے ننھے پرنس نکولائی کا بیڑا غرق کر رہی ہے۔ معمر پرنس خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کو کرب میں سے گزار رہا ہے اور اس نے اس کی زندگی جہنم بنا رکھی ہے، لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اسے ایذا پہنچائے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ کہ وہ اسی کی مستحق ہے۔ ''پرنس آندرے سب کچھ دیکھتا ہے لیکن وہ اپنی بہن کے بارے میں مجھ سے کچھ کہتا کیوں نہیں؟'' معمر پرنس کو اچنبھا ہو رہا تھا۔ ''کیا وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں فاسق ہوں، بدکار ہوں یا فاتر العقل بڈھا ہوں جس نے بلا وجہ اپنی بیٹی سے تعلقات کشیدہ کر لیے ہیں اور فرانسیسی عورت سے اپنا ناطہ جوڑ لیا ہے۔ وہ کچھ نہیں سمجھتا، مجھے اسے سمجھانا اور سب کچھ بتانا ہوگا۔ اسے میری بات سننا ہوگی۔'' معمر پرنس نے سوچا اور وہ اسے بالتفصیل بتانے لگا کہ وہ اپنی بیٹی کا احمقانہ رویہ کیوں برداشت نہیں کر سکتا۔

''سچی بات یہ ہے،'' پرنس آندرے نے نظر اٹھا کر اپنے باپ کی طرف دیکھے بغیر کہا (اپنی زندگی میں وہ اولیں مرتبہ اپنے باپ پر نکتہ چینی کر رہا تھا)، ''کہ میں اس بارے میں بات نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن چونکہ آپ کا اصرار ہے، میں صاف گوئی سے کام لوں گا اور لگی لپٹی رکھے بغیر اپنی رائے کا اظہار کروں گا۔ اگر آپ کے اور ماری کے مابین کوئی غلط فہمی یا نزاع ہے، میں اس کے لیے کسی طرح بھی اسے موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ وہ آپ سے کتنی محبت کرتی ہے اور آپ کا کتنا احترام کرتی ہے۔ چونکہ آپ نے مجھ سے پوچھا ہے،'' پرنس آندرے نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ جیسا کہ پچھلے کچھ عرصے سے اس کے ساتھ ہو رہا تھا، اس کا پارہ بتدریج چڑھتا جا رہا تھا، ''میں صرف اتنا عرض کر سکتا ہوں کہ اگر کوئی غلط فہمیاں پیدا ہوئی ہیں تو وہ اس فضول عورت کے، جو کسی طرح بھی میری ہمشیرہ کی ہم نشیں بننے کی اہل نہیں، سبب ہوئی ہیں۔

ایک لمحہ تو پرنس ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم بنا رہا، پھر وہ زبردستی مسکرایا۔ جب وہ یوں مسکرایا، اس کے منہ میں جو تازہ تازہ شگاف رونما ہوا تھا، وہ منکشف ہو گیا۔ پرنس آندرے ابھی اس کا عادی نہیں ہوا تھا۔

''میرے عزیز بیٹے، کون ہم نشیں؟ تو تم دونوں اس سلسلے میں پہلے ہی گفتگو کر چکے ہو۔ ٹھیک ہے؟''

''ابا جان، میں قطعاً کوئی محاکمہ نہیں کرنا چاہتا تھا،'' پرنس آندرے نے درشت اور تلخ لہجے میں جواب دیا، ''لیکن آپ نے اصرار کیا۔ میں کہہ چکا ہوں اور ہمیشہ کہتا رہوں گا کہ ماری بالکل بے قصور ہے۔ قصوروار وہ لوگ ہیں۔ قصوروار وہ فرانسیسی عورت ہے۔''

''اخ، اس نے فیصلہ سنا دیا ہے۔۔۔ اس نے فیصلہ سنا دیا ہے!'' معمر پرنس نے زیر لب کہا، اور جیسا کہ پرنس آندرے کو محسوس ہوا، وہ یہ بات کہتے ہوئے قدرے جھینپ رہا اور شرم سار ہو رہا تھا۔ لیکن اگلے ہی لمحے وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا اور چلانے لگا: ''نکل جاؤ۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ! آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا!''

❦

پرنس آندرے اسی روز روانہ ہو جانا چاہتا تھا لیکن پرنسس ماریا نے اسے مزید ایک دن قیام کرنے کے لیے منا لیا۔ اس روز وہ اپنے باپ کے سامنے نہ گیا۔ معمر پرنس اپنے کمرے میں مقید رہا اور اس نے مادموزیل بوغین اور تیخون کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو اندر نہ آنے دیا۔ وہ بار بار پوچھ رہا تھا کہ اس کا بیٹا چلا گیا ہے یا نہیں۔

اگلے روز روانگی سے قبل پرنس آندرے اپنے بیٹے کے اپارٹمنٹ میں گیا۔ قوی الجسم ننھا لڑکا، جس کے بال اپنی ماں کی طرح گھونگریالے تھے، اس کی گود میں بیٹھ گیا۔ پرنس آندرے اسے نیلگوں پرندے کی کہانی سنانے لگا لیکن اسے انجام تک پہنچانے سے پہلے ہی اپنے خیالات میں کھو گیا۔ وہ اپنے خوبصورت بیٹے کے، جسے اس نے اپنی گود میں بٹھا رکھا تھا، متعلق سوچ نہیں رہا تھا، بلکہ اس کی سوچوں کا محور خود اس کی اپنی ذات تھی۔ اس نے جستجو ضرور کی لیکن اسے اپنے نہاں خانہ دل میں ندامت کا کوئی سراغ نہ ملا کہ اس نے اپنے باپ کی ناراضگی مول لے لی ہے اور نہ اسے اس بات پر کوئی افسوس تھا کہ وہ زندگی میں پہلی مرتبہ ان حالات میں اپنے گھر سے رخصت ہو رہا ہے کہ اس کی اپنے باپ سے ان بن ہو گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی پریشانی یہ تھی کہ اس کے دل میں اپنے بیٹے کے لیے جو پیار اور شفقت تھی، اب ڈھونڈے سے اس کا نشان تک نہیں مل رہا تھا حالانکہ جب اس نے اسے اپنی گود میں بٹھایا اور چمکارا پچکارا تھا، اسے امید تھی کہ اس کے سابقہ پیار اور محبت کا سیل پھر رواں ہو جائے گا۔

''اچھا، آگے چلیں!'' اس کے بیٹے نے کہا۔

پرنس آندرے نے جواب دیے بغیر اسے گود سے اتارا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

جونہی پرنس آندرے نے اپنی روزمرہ کی مصروفیات معرض التوا میں ڈالیں اور خاص طور پر اس وقت، جب وہ پرانے ماحول میں، جس میں اس نے ہشاش بشاش ایام گزارے تھے، واپس آیا، زندگی کا کرب اپنی تمام تر سابق شدت کے ساتھ دوبارہ اس پر حملہ آور ہو گیا۔ وہ ان یادوں سے پیچھا چھڑانے اور بلا تاخیر کوئی مصروفیت ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگا۔

''آندرے، آپ واقعی جا رہے ہیں؟''

"خدا کا شکر ہے کہ میں جاسکتا ہوں!" اس نے کہا۔ "مجھے بے حد افسوس ہے کہ تم کہیں نہیں جاسکتی ہو۔"

"آپ ایسا کیوں کہتے ہیں؟" پرنس ماریا نے پوچھا۔ "آپ اس قسم کی باتیں کیوں کرتے ہیں جب کہ آپ اس ہول ناک جنگ میں جارہے ہیں اور وہ اتنے ضعیف ہو چکے ہیں؟ مادموزیل بوغین کہتی ہیں کہ وہ بار بار آپ کے متعلق پوچھ رہے ہیں..."

جونہی وہ اس موضوع کے متعلق بات کرنے لگی، اس کے ہونٹ کانپنے اور اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ پرنس آندرے نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔

"اف، میرے خداوند، میرے خداوند! کون اور کیا۔ کیسی کیسی بے وقعت اشیا اور کیسے کیسے بے حیثیت لوگ آدمی کے مصائب کا سبب بن جاتے ہیں!" اس نے کہا۔ اس کے لہجے میں کچھ اس قسم کی مخاصمت تھی کہ پرنس ماریا لرزہ براندام ہوگئی۔

اسے اندازہ ہوا کہ جب اس نے "بے حیثیت" لوگوں کا ذکر کیا تھا، اس کا اشارہ محض مادموزیل بوغین کی، جو اس (ماریا) کے لیے مصیبت کا باعث بنی تھی، طرف ہی نہیں تھا بلکہ اس شخص کی، جس نے اس کی اپنی زندگی میں زہر گھول دیا تھا اور اس سے اس کی تمام خوشیاں چھین لی تھیں، طرف بھی تھا۔

"آندرے، میں آپ سے ایک چیز کی بھیک مانگتی ہوں، التجا کرتی ہوں،" اس نے اس کی کہنی کو چھوتے اور اسے ایسی آنکھوں سے، جو اس کے آنسوؤں میں چمک رہی تھیں، دیکھتے ہوئے کہا۔ "میں آپ کا دکھ سمجھتی ہوں۔" (اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکالیں۔) "یہ مت سمجھیں کہ غم انسان دیتے ہیں۔ انسان اس (خدا) کے آلۂ کار ہیں۔" اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں، پرنس آندرے کے سر سے ذرا اوپر۔ یہ پر اعتماد اور خوگر نظریں تھیں جن سے انسان کسی ایسی جگہ کو، جہاں جانی پہچانی تصویر لٹک رہی ہوتی ہے، دیکھتا ہے۔ "غم وہ دیتا ہے نہ کہ انسان۔ انسان اس کے آلۂ کار ہیں۔ اس لیے انھیں الزام نہیں دیا جاسکتا۔ اگر آپ کو محسوس ہوتا ہو کہ کسی نے آپ کے ساتھ زیادتی کی ہے، اسے بھول جائیں اور معاف کر دیں۔ ہمیں یہ حق حاصل نہیں ہے کہ ہم سزائیں دیتے پھریں۔ پھر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ معاف کرنے میں کیا راحت ہے۔"

"ماری، اگر میں عورت ہوتا، میں یہی کرتا۔ یہ نسائی وصف ہے۔ لیکن مرد کو بھولنا چاہیے نہ معاف کرنا، اور وہ بھول سکتا ہے نہ معاف کر سکتا ہے۔" اور اگرچہ اس لمحے تک اسے کوراگن کا کوئی خیال نہیں آیا تھا، اس کا تمام غصہ، جسے فرو کرنے کا اسے موقع میسر نہیں آیا تھا، اچانک اس کے دل میں جاگ اٹھا۔

"اگر پرنس ماریا کو یہ امید ہے کہ وہ مجھے درگزر سے کام لینے پر آمادہ کر لے گی،" اس نے سوچا، "تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے اسے بہت عرصہ پہلے سزا دے دینا چاہیے تھی۔" چنانچہ اس کی بات کا مزید کوئی جواب دیے بغیر وہ اس خوش کن انتقامی لمحے کے، جب اس کی ملاقات کوراگن سے ہوگی، متعلق سوچنے لگا۔ اسے معلوم تھا کہ کوراگن اب فوج میں ملازمت کر رہا ہے۔

پرنس ماریا نے اپنے بھائی سے التجا کی کہ وہ ایک دن مزید ٹھہر جائے۔اس کی دلیل یہ تھی کہ اگر وہ اپنے باپ سے صلح کیے بغیر چلا گیا، وہ جانتی ہے کہ اسے کتنا دکھ ہوگا، لیکن پرنس آندرے نے جواب دیا کہ کوئی زیادہ عرصہ گزرنے سے پہلے ہی وہ غالباً فوج سے واپس آجائے گا اور اپنے باپ کو وہ خط تو یقیناً لکھے گا ہی، لیکن اس کا قیام جتنا طویل ہوتا چلا گیا، ان کے اختلافات کی تلخی اتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی۔

"خداحافظ، آندرے! اتنا یاد رکھیں کہ مصائب خداوند کے فرستادہ ہوتے ہیں، ان کے لیے بندوں کو قصوروار نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔" یہ آخری الفاظ تھے جو اس نے اپنی بہن سے رخصت ہوتے وقت سنے۔

"مقدر میں یہ لکھا تھا!" بالڈ ہلز کے خیابان پر سے گزرتے وقت پرنس آندرے نے سوچا۔ "بے چاری، شامت کی ماری، بے گناہ ہے، بے قصور ہے، پھر بھی بڑے میاں کے، جو زندہ تو ہیں لیکن ہوش وحواس سے بیگانہ ہو چکے ہیں، ہاتھوں سزا بھگتنے کے لیے پیچھے رہ گئی ہے۔ بڑے میاں جانتے ہیں کہ قصوروار وہ خود ہیں لیکن وہ بدل نہیں سکتے۔ میرا بیٹا بڑا ہو رہا ہے اور زندگی سے لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اور یہ زندگی؟ باقی لوگوں کی طرح وہ اسے فریب دے گا یا خود اس سے فریب کھا جائے گا۔ اور میں فوج میں جا رہا ہوں۔ کیوں؟ مجھے خود معلوم نہیں۔ اور میں اس آدمی سے، جس کے لیے میرے دل میں نفرت ہی نفرت ہے، ملنا چاہتا ہوں تاکہ میں اسے یہ موقع دے سکوں کہ وہ مجھے ہلاک کر سکے اور مجھے تمسخر کا نشانہ بنا سکے۔"

زندگی کے یہ حالات پہلے بھی ایسے ہی تھے، تاہم تب یہ حالات ایک ہی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھے، متحد و مربوط، اب یہ زنجیر ٹوٹ چکی تھی اور کڑیاں بکھر گئی تھیں۔ اس کا دماغ بے ترتیب انداز سے ایک شے سے دوسری شے کی طرف زقندیں لگا رہا تھا، سب کچھ ہوش وخرد اور مفہوم سے عاری تھا۔

9

پرنس آندرے جون کے اواخر میں فوج کے ہیڈ کوارٹرز میں پہنچا۔ سپاہ اول، جس کے ساتھ امپراطور ہم رکاب تھا، دریسا کے قلعہ بند کیمپ پر قابض تھی۔ سپاہ دوم[58] پسپا ہو رہی تھی اور کوشش کر رہی تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح سپاہ اول کے ساتھ آملے۔ شنید یہ تھی کہ فرانسیسیوں کے خاصے بڑے لشکر نے ان دونوں فوجوں کے مابین رابطہ منقطع کر دیا ہے۔ روسی افواج میں عسکری حالات جس نہج پر جا رہے تھے، ان سے کوئی بھی مطمئن نہیں تھا لیکن کسی کے کبھی یہ خواب و خیال میں بھی نہیں آیا تھا کہ روسی صوبجات کو حملے کا خطرہ لاحق ہو جائیگا اور نہ کبھی کسی کے یہ وہم وگمان میں آیا تھا کہ جنگ مغربی محاذ، بالفاظ دیگر، پولستانی صوبوں[59] تک محدود نہیں رہے گی۔

پرنس آندرے کو بارکلے دتولی، جس کے سپرد اس کی خدمات کی گئی تھیں، دریائے دریسا کے کنارے پر ملا۔ چونکہ کیمپ کے قرب وجوار میں ایک بھی قصبہ یا بڑا گاؤں نہیں تھا، چنانچہ فوج کے ساتھ جرنیلوں اور درباریوں کا جو لاؤ لشکر تھا، اس نے چھ میل کے دائرے کے اندر دریا کی دونوں اطراف جتنے بھی چھوٹے چھوٹے دیہات تھے، ان

سب کے بہترین مکانوں پر قبضہ کرلیا تھا۔ بار کلے زار سے کوئی تین میل دور قیام پذیر تھا۔ اس نے بلکونسکی کا خشک اور سرد مہرانہ انداز سے خیر مقدم کیا، اور اپنے جرمن لہجے میں اسے مطلع کیا کہ وہ اس کی اصل تعیناتی کا مسئلہ فرماں روائے مملکت کے سامنے پیش کردے گا، تاہم اس نے اسے پیشکش کی کہ وہ فی الحال اس کے سٹاف پر کام کرے۔

اناطول کوراگن، جس کے بارے میں پرنس آندرے کو امید تھی کہ فوج میں مل جائے گا، وہاں نہیں تھا۔ وہ پیٹرز برگ میں تھا۔ یہ خبرسن کر بلکونسکی کو خوشی ہوئی۔ اس کی دلچسپیوں کا محور اس عظیم جنگ کی کارروائیاں تھیں جن کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا اور جن کے بیچ میں وہ خود کو پا رہا تھا۔ اسے مسرت اس بات کی تھی کہ کوراگن کے متعلق سوچ سوچ کر اسے جو جھلاہٹ ہورہی تھی، اس سے وقتی طور پر اس کا پنڈ چھوٹ جائے گا۔ چونکہ اسے فوری طور پر کوئی فرائض سرانجام نہیں دینا تھے، اس نے اپنے پہلے چار دن گھوڑے پر سارے قلعہ بند کیمپ کا چکر لگانے میں صرف کیے۔ اپنے تجربے اور ان گفتگوؤں کی، جو اس نے ماہرین سے کیں، مدد سے اس نے اس کے متعلق واضح رائے قائم کرنے کی کوشش کی، لیکن یہ سوال کہ آیا اس کیمپ کا کوئی فائدہ بھی ہے، اس کے لیے لاینحل ہی رہا۔ اپنے عسکری تجربے کی بنا پر وہ پہلے ہی اس نتیجے پر پہنچ چکا تھا کہ جنگ میں ایسے منصوبے بھی، جن پر خوب غور و فکر کیا جا چکا ہوتا ہے (جیسا کہ اوسٹرلٹس کے میدان میں ہوا تھا)، دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اور ہر چیز کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ آپ غنیم کی غیر متوقع کارروائیوں — جن کی پیش بینی کرنا ممکن نہیں ہوتا — کا کس طرح سامنا کرتے ہیں، اور یہ کہ یہ سارا عمل کس طرح اور کس کے ہاتھوں سرانجام پاتا ہے۔ اپنے ذہن میں اس آخری نقطے کو سلجھانے کے لیے پرنس آندرے نے اپنے مقام اور واقف کاروں سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور یوں اس نے فوجی کمان اور ان لوگوں اور فریقوں کے، جن پر یہ مشتمل تھی، کردار کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ حالات کا نقشہ کیا تھا، اس کے متعلق اس نے اپنے ذہن میں مندرجہ ذیل نتیجہ مستنبط کیا۔

جب زار ابھی تک ولنا میں قیام پذیر تھا، پورے لشکر کو تین افواج میں تقسیم کردیا گیا تھا۔ فوج اول بارکلے ذتولی، فوج دوم باگ راتیاں اور فوج سوم ترماسوف کی کمان میں تھی۔ فرماں روائے مملکت فوج اول کے ساتھ تھا لیکن اس مرتبہ کمانڈر انچیف نہیں تھا۔ اس ضمن میں جو فرمان جاری ہوا تھا، اس میں یہ تو کہا گیا تھا کہ امپراطور فوج کے ہم رکاب ہوں گے، لیکن یہ نہیں کہ وہ اس کی کمان کریں گے۔ علاوہ ازیں اس کے ساتھ کمانڈر انچیف کا سٹاف نہیں تھا، صرف امپیریل ہیڈکوارٹرز سٹاف تھا۔ جو لوگ اس کے ساتھ آئے تھے، ان میں امپیریل سٹاف کا کوارٹر ماسٹر جنرل پرنس ولکونسکی، متعدد دیگر جرنیل، امپیریل ایڈی کانگ، سفارتی افسران اور اچھی خاصی تعداد میں غیر ملکی شامل تھے، لیکن یہ فوجی سٹاف نہیں تھا۔ چند اور لوگ — آراک چیف (سابق وزیر جنگ)، کاؤنٹ بے نگ سین (عہدے کے اعتبار سے سینئر ترین جرنیل)، گرینڈ ڈیوک کونستانتن پاؤلووچ (زار یوچ)[60]، کاؤنٹ رومانتسیف (چانسلر/ وزیراعظم) شتائین (پرشیا کا سابق وزیر)، آرام فیلٹ (سویڈی جرنیل)، پفوہل (جنگی منصوبے کا اصل خالق وہی تھا)، جنرل ایجوٹنٹ پاؤلوچی (سارڈینیا کا تارک وطن)[61]، وول ٹسوگن[62] اور متعدد دیگر حضرات — بھی اس کی

اردل میں تھے۔ اگر چہ یہ واضح نہیں تھا کہ یہ اشخاص کس حیثیت سے آئے ہیں اور نہ فوج میں ان کے ذمے کوئی سرکاری فرائض تھے، تاہم ان کے مقام و مرتبہ نے انھیں اثر و رسوخ سے بہرہ ور کر رکھا تھا۔ یہ لوگ فوجی حکام کو مشورے دیتے رہتے تھے، لیکن کور کمانڈروں کو اکثر اوقات اور کمانڈر انچیفوں کو بھی بعض اوقات یہ معلوم نہیں ہو پاتا تھا کہ بے نگ سین، گرینڈ ڈیوک، آراک چیف یا پرنس ولکونسکی انھیں کس حیثیت سے مشورہ دے رہا یا ان سے استفسار کر رہا ہے اور نہ وہ یہ بتا سکتے تھے کہ کوئی خاص حکم، جو انھیں مشورے کے قالب میں وصول ہوا تھا، زار کا حکم ہے یا اس شخص کا، جس نے یہ اس تک پہنچایا تھا، اور آیا اسے عملی جامہ پہنانا ہے یا نہیں۔ یہ صورت حال کا محض خارجی پہلو تھا، لیکن ایک درباری (اور جہاں فرماں روائے مملکت موجود ہو، وہاں بھی درباری ہوتے ہیں) کے نقطۂ نظر سے امپر اطور اور اس کے حاشیہ نشینوں کی موجودگی کا مفہوم کسی سے ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی موجودگی سے واضح کر دیا تھا کہ اگر چہ زار نے کمانڈر انچیف کا عہدہ نہیں سنبھالا ہے، لیکن افواج کا کنٹرول اسی کے ہاتھوں میں ہے اور وہ اشخاص، جنھوں نے اسے اپنے نرغے میں لے رکھا ہے، اس کے نائبین ہیں۔ آراک چیف نظم و نسق کا وفادار نگران اور فرماں روا کا باڈی گارڈ تھا۔ بے نگ سین صوبہ ولنا کا جاگیر دار تھا۔ بظاہر وہ اپنے علاقے کی جانب سے میزبانی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا لیکن وہ حقیقتاً بہت اچھا جرنیل تھا، مشیر کی حیثیت سے کار آمد تھا اور ضرورت پڑے تو، بار کلے کی جگہ سنبھالنے کے لیے تیار تھا۔ گرینڈ ڈیوک اس لیے وہاں موجود تھا کیونکہ وہاں موجود ہونا اسے راس آ رہا تھا۔ پرشیا کا سابق وزیر شٹائین اس لیے وہاں حاضر تھا کیونکہ اس کے مشورے سود مند ہوتے تھے اور امپر اطور الیکساندر اس کی ذاتی خوبیوں کا زبردست مداح تھا۔ آرم فیلٹ نپولین کا جانی دشمن تھا اور ایک ایسا جرنیل تھا جسے اپنی صلاحیتوں پر زبردست اعتماد تھا — اور یہ خصوصیت زار پر کبھی اثر انداز ہوئے بنا نہیں رہتی تھی۔ پاؤلوچی کی موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ کیونکہ اس کا بات کرنے کا انداز جرأت مندانہ اور فیصلہ کن ہوتا تھا۔ ایجوٹنٹ جنرلوں کی آمد اس لیے ہوئی تھی کیونکہ وہ ہمیشہ وہیں ہوتے ہیں جہاں امپر اطور ہوتا ہے اور آخر میں پفوہل کا نام آتا ہے اور وہ ان سب سے بالا تھا۔ وہ اس لیے وہاں آیا تھا کیونکہ نپولین کے خلاف جنگ کا منصوبہ اسی نے تیار کیا تھا۔ وہ اپنے منصوبے کی مؤثریت کے بارے میں زار کو شیشے میں اتار چکا تھا اور اب تمام کارروائیوں کے بارے میں ہدایات جاری کر رہا تھا۔ وول ٹسوگن پفوہل کا ساتھ دے رہا تھا۔ اس نے پفوہل کے خیالات کو خود پفوہل سے زیادہ قابل فہم صورت میں پیش کیا تھا۔ خود پفوہل سے یہ کام نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ کابینہ کا بے لچک نظریہ ساز رکن تھا اور اس حد تک خود اعتماد کہ کسی دوسرے کو خاطر میں لانا اپنی شان کے منافی سمجھتا تھا۔

ان روسیوں اور غیر ملکیوں (ان غیر ملکیوں کو باقیوں پر تفوق حاصل تھا کیونکہ یہ آئے روز نئی سے نئی چونکا دینے والی تجاویز پیش کرتے رہتے تھے اور اس ضمن میں ایسی بے باکی کا مظاہرہ کرتے تھے جو ان لوگوں کا خاصہ ہوتی ہے جو ایسی مصروفیات کو، جو ان کے دائرہ کار سے باہر ہوتی ہیں، گلے لگا لیتے ہیں۔) کے علاوہ وہاں لاتعداد ایسے اشخاص موجود تھے جن کی حیثیت محض ثانوی تھی لیکن وہ اس لیے فوج کے ہم رکاب تھے کیونکہ ان

کے بڑے وہاں تشریف فرما تھے۔

اس وسیع وعریض، بے چین ومضطرب، ہم چو ما دیگرے نیست اور روشن تاب دنیا میں متضاد و متصادم خیالات اور آوازوں کے مابین پرنس آندرے نے فریقین اور رجحانات کی مندرجہ ذیل ضمنی درجہ بندیاں، جو ایک دوسرے سے واضح طور پر مختلف تھیں، نوٹ کیں:

فریق اول پفوبل اور اس کے پیروکاروں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ عسکری نظریہ ساز تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ جنگ ایک سائنس ہے اور اس سائنس کے غیر متغیر قوانین ہیں ۔۔ غنیم کے میمنے یا میسرے کو کیسے گھیرے میں لینا ہے تا کہ عسکری توازن آپ کے حق میں ہو جائے، فوج کی تقسیم و ترتیب میں ترچھے رخ سے کیسے تغیر و تبدل کیا جائے، ان سے اور اس قسم کی دیگر چیزوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے با قاعدہ اور واضح قوانین ہیں۔ پفوبل اور اس کے حواریوں کا مطالبہ یہ تھا کہ فوج کو اندرون ملک پیچھے ہٹالیا جائے اور یہ واپسی بالکل ان شین قاف سے درست اصولوں کے مطابق، جن کی جنگ کے نام نہاد نظریے میں حد بندی کی گئی ہے، ہونا چاہیے۔ انھیں اس نظریے سے ہر انحراف میں بربریت، جہالت یا کوئی مکروہ مقصد نظر آتا تھا۔ اس فریق میں جرمن پرنس، وول ٹسوگن، ونٹ ٹسنگے روڈے اور دوسرے لوگ، زیادہ تر جرمن، شامل تھے۔

فریق دوم فریق اول کے بالکل معکوس تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے، ایک انتہا کے مقابلے میں دوسری انتہا کے نمائندے تھے۔ اس فریق کے ارکان ان لوگوں پر مشتمل تھے جن کا مطالبہ یہ تھا کہ ولنا سے پولینڈ میں پیش قدمی کی جائے اور جتنے منصوبے پہلے ہی بنائے جا چکے ہیں، ان سب کو طاق نسیاں پر رکھ دیا جائے۔ یہ فریق محض جرأت مندانہ کارروائی ہی کے حق میں نہیں تھا بلکہ اس کے ارکان قوم پرستی کی بھی نمائندگی کرتے تھے اور اس چیز نے انھیں اس نزاع میں اور بھی یک رخا بنا دیا تھا۔ یہ فریق روسیوں کا تھا۔ باگ راتیاں، یرمالوف (جس نے حال ہی میں اپنے آپ کو منوانا شروع کیا تھا) اور بعض دوسرے اشخاص اس میں شامل تھے۔ یہی وہ زمانہ تھا جب یرمالوف کا مشہور زمانہ لطیفہ۔۔ اس نے زار سے درخواست کی تھی کہ اسے ترقی دے کر ''جرمن'' بنا دیا جائے ۔۔ زبان زد خاص و عام ہونے لگا تھا۔ اس فریق کے لوگ ہمہ وقت سواروف کے حوالے دیتے رہتے تھے اور یہ اصرار کرتے تھے کہ قیافے لگانے اور نقشوں پر پنیں لگانے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصل چیز یہ ہے کہ غنیم کے خلاف جنگ کی جائے، اس کا بھرکس نکالا جائے، اسے روس سے دور رکھا جائے اور فوج کو اس قسم کا کوئی موقع فراہم نہیں کرنا چاہیے کہ وہ حوصلہ ہار بیٹھے۔

فریق سوم ۔۔ جس پر زار سب سے زیادہ اعتماد کرنے پر مائل تھا ۔۔ درباریوں پر مشتمل تھا۔ یہ فریق ہمیشہ دوسرے دو فریقوں کے مابین مصالحت کرانے کی مساعی کرتا رہتا تھا۔ اس فریق کے ارکان، جن میں زیادہ تر غیر فوجی، بشمول آراک چیف، تھے۔ ان لوگوں کی طرح، جن کی اپنی کوئی جچی تلی رائے نہیں ہوتی لیکن ظاہر یہ کرنا چاہتے ہیں کہ نہیں، ان کی رائے ہے، وہ سوچتے اور بات کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ جنگ، خاص طور پر جب کہ سامنا بونا پارت (انھوں نے اب اسے پھر بونا پارت کہنا شروع کر دیا تھا) جیسے نابغۂ روزگار سے ہو، لاریب ایسے منصوبوں کا، جن

بہ گہرا سوچ بچار کیا گیا ہو اور زبردست سائنسی علم کا، تقاضا کرتی ہے، اور اس معاملے میں پفوہل کا جواب نہیں کیونکہ وہ غیر معمولی طور پر ذہین و فطین ہے۔ اس کے ساتھ اس بات کا بھی اقرار کرنا پڑے گا کہ نظریہ سازوں کی سوچ اکثر و بیشتر یک رخی ہوتی ہے، اس لیے ان پر اندھا دھند اعتماد نہیں کیا جا سکتا، بلکہ پفوہل کے مخالفین جو کچھ کہتے ہیں، اس پر اور ان لوگوں کے جنھیں رزم آرائی کا عملی تجربہ حاصل ہے، نقطۂ نظر پر بھی دھیان دیا جانا چاہیے، اور یوں دونوں کے بیچ بیچ کوئی راہِ عمل اختیار کی جانا چاہیے۔ اس فریق کے ارکان کا اصرار تھا کہ پفوہل کے منصوبے کے مطابق دریسا کا (قلعہ بند) کیمپ برقرار رکھا جانا چاہیے، لیکن جہاں تک دوسری دونوں افواج کا تعلق تھا، وہ ان کی تقسیم و ترتیب میں تبدیلیاں لانے کی حمایت کرتے تھے۔ اگرچہ اس قسم کے طریقۂ عمل کو اپنانے سے نہ تو فریق اول اور نہ فریق دوم کا مقصد پورا ہوتا تھا لیکن مصالحتی فریق سوم کے نزدیک یہی بہترین راہ عمل تھی۔

فریق چہارم کا نمایاں ترین نمائندہ گرینڈ ڈیوک اور ولی عہد تھا۔ اوسٹرلٹس میں اس کا زعم باطل جس طرح پاش پاش ہوا تھا، وہ اسے فراموش نہیں کر سکا تھا۔ وہاں اس نے سر پر خود سجائے اور جسم پر گھڑ سواروں کی وردی پہنے گارڈز کی قیادت کی تھی۔ اسے توقع تھی کہ اپنی دلیری اور شجاعت کے بل بوتے پر وہ فرانسیسیوں کے پاؤں اکھاڑ دے گا اور ان میں بھگدڑ مچا دے گا، لیکن اس کی کوئی امید بر نہ آئی اور ساری سوچیں دھری کی دھری رہ گئیں۔ ہوا یہ کہ وہ بالکل اگلی صف میں پہنچ گیا اور عام بھگدڑ میں بڑی مشکل سے اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو سکا۔ اس فریق کے ارکان کی بیک وقت خوبی اور خامی یہ تھی کہ یہ لوگ صاف باطن تھے، اور جس بات کو صحیح سمجھتے تھے، اس کا برملا اظہار کر دیتے تھے۔ وہ نپولین سے خوف کھاتے تھے، اس کی قوت اور اپنی کمزوری کا اعتراف کرتے تھے، اور لگی لپٹی رکھے بغیر اپنے ان خیالات کو نوک زبان پر لے آتے تھے۔ "جو کچھ ہو رہا ہے، اس سب کا نتیجہ صعوبت، فضیحت اور شکست کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا۔" وہ کہتے تھے "ہم ولنا کو اس کے حال پر چھوڑ چکے ہیں، وی تبسک خالی کر چکے ہیں اور اسی طرح ہم دریسا سے بھی نکل جائیں گے۔ پیشتر اس کے کہ ہمیں پیٹرزبرگ سے بھی بھگا دیا جائے، معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس سے پہلے ہی، جس قدر جلد ممکن ہو، صلح کر لیں۔"

فوج کے اعلیٰ حلقوں میں اس نقطۂ نظر کو زبردست حمایت حاصل تھی۔ پیٹرزبرگ (کے حکام) اور چانسلر رومانتسیف بھی اس کی تائید کرتے تھے۔ رومانتسیف بعض دیگر مملکتی وجوہات کی بنا پر صلح کے حق میں تھا۔

فریق پنجم جن لوگوں پر مشتمل تھا وہ بارکلے ڈتولی کی حمایت کرتے تھے۔ یہ لوگ اس لیے اس کی حمایت نہیں کرتے تھے کہ وہ انسان تھا، بلکہ اس لیے کیونکہ وہ وزیر جنگ اور کمانڈر انچیف تھا۔ "وہ اور جو کچھ بھی ہوں،" وہ اپنی بات کا آغاز ہمیشہ اسی جملے سے کرتے تھے، "وہ دیانت دار اور عمل پسند آدمی ہیں اور ان سے بہتر کوئی دوسرا شخص ہمارے پاس نہیں ہے۔ انھیں حقیقی اختیارات تفویض کریں کیونکہ منقسم کمان کے تحت جنگ کامیابی سے نہیں لڑی جا سکتی، اور جیسا کہ انھوں نے فن لینڈ میں کیا تھا، وہ آپ کو دکھا دیں گے کہ وہ کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ اگر ہماری فوج ٹھیک طرح منظم اور مضبوط ہے، اور ایک بھی شکست کھائے بغیر دریسا تک پسپا ہو گئی ہے، اس کا سہرا سراسر انھیں

کے سر بندھتا ہے اور ہم سب کو ان کا مشکور ہونا چاہیے۔ اگر اس موقع پر بار کلے کی جگہ بے نگ سین کی تعیناتی عمل میں لائی گئی، تو سب کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا کیونکہ بے نگ سین بہت عرصہ قبل 1807 میں اپنی نااہلی ثابت کر چکا ہے۔''

فریق ششم — بے نگ سینی — اس کے برعکس یہ دلیل دیتا تھا کہ ''بہر حال ایسا کوئی شخص، جو بے نگ سین سے زیادہ قابل اور زیادہ تجربے کار ہو، موجود نہیں ہے'' اور یہ کہ '' آپ لوگ خواہ کتنی ہی مین میکھ نکالیں، کتنی ہی سخن طرازی کریں، انجام کار آپ کو بے نگ سین کی طرف ہی رجوع کرنا پڑے گا۔'' ان کا استدلال یہ تھا کہ دریا تک پسپائی اختیار کرنا شرم ناک شکست ہے اور حماقتوں اور فاش غلطیوں کا غیر مختتم سلسلہ۔ غلطیاں جتنی زیادہ ہوں گی، اتنا ہی بہتر ہوگا۔ اس سے اور کچھ نہیں، تو انھیں کم از کم اتنا سبق ضرور مل جائے گا کہ حالات جوں کے توں جاری نہیں رکھے جاسکتے۔ ہمیں تمھارے بار کلے جیسا نہیں، بلکہ بے نگ سین جیسا آدمی چاہیے۔ اس نے 1807 میں بتا دیا تھا کہ وہ کس مٹی سے بنا ہے اور یہی وہ شخص ہے جس کی صلاحیتوں کا خود نپولین بھی اعتراف کرنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ ہمیں ایک ایسا آدمی درکار ہے جس کی سیادت سب برضا و رغبت تسلیم کرلیں اور بے نگ سین اس کینڈے کا واحد آدمی ہے۔''

فریق ہفتم جن لوگوں پر مشتمل تھا، اس قسم کے لوگ درباروں، خاص طور پر نوجوان فرماں رواؤں کے درباروں، میں ازل سے موجود رہے ہیں، اور الیکسانڈر کے حاشیہ نشینوں میں یہ افراد خاص طور پر بہت کثیر تعداد میں شامل تھے۔ ان میں جرنیل بھی تھے اور امپیریل ایڈی کانگ بھی۔ یہ لوگ اپنے فرماں روا پر دیوانہ وار فدا تھے۔ وہ اس کی عزت محض امپراطور کی حیثیت ہی سے نہیں، بلکہ بطور انسان بھی کرتے تھے۔ انھوں نے، جیسا کہ 1805 میں رستوف نے کیا تھا، اسے پورے خلوص اور بے غرضی سے دیوتا کے سنگھاسن پر بٹھا رکھا تھا۔ ان کی نظروں میں وہ محض اوصاف حمیدہ سے ہی مالا مال نہیں تھا بلکہ تمام انسانی صلاحیتوں سے بھی بہرہ ور تھا۔ اگر چہ زار کی یہ ادا ان کے دلوں کو بھا گئی تھی کہ اس نے فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کر دیا تھا لیکن وہ اس ضرورت سے زیادہ انکسار پر تاسف کا اظہار بھی کرتے تھے۔ وہ پرزور طریقے سے اصرار کرتے تھے کہ ان کے محبوب فرماں روا کو اس خواہ مخواہ کی جھجک کو ترک کر دینا، علانیہ اپنے آپ کو فوج کا سربراہ قرار دے دینا، کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اپنا عملہ مقرر کرنا، جب اور جہاں ضرورت پڑے، نظریہ سازوں اور عملی افراد کا مشورہ لینا اور اپنی افواج کی بنفس نفیس قیادت کرنا چاہیے۔ اس طریقے سے اور صرف اسی طریقے سے وہ ان کے جوش و خروش کو بلندیوں تک پہنچا سکے گا۔

فریق ہشتم سب سے بڑا تھا۔ باقی تمام فریقوں کے ایک شخص کے مقابلے میں اس میں ننانوے افراد شامل تھے۔ یہ ان لوگوں پر مشتمل تھا جو نہ امن چاہتے تھے اور نہ جنگ۔ وہ نہ کسی جارحانہ کارروائی کے حق میں تھے اور نہ دریسا یا کسی بھی دوسرے مقام پر دفاعی کیمپ کے۔ انھیں نہ بار کلے سے کوئی سروکار تھا اور نہ زار سے، نہ پفوہل سے اور نہ بے نگ سین سے۔ انھیں کسی چیز سے غرض تھی تو بس اپنے حلوے مانڈے سے۔ وہ زیادہ سے زیادہ فوائد

سمیٹنا اور تفریح کرنا چاہتے تھے۔ زار کے ہیڈ کوارٹرز کے متلاطم پانیوں میں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی جن متضاد لہروں کے بھنور بن رہے تھے، ان میں کئی طریقوں سے، جن کا کسی دوسرے زمانے میں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا، کامیابی کے جھنڈے گاڑے جاسکتے تھے۔ ایک شخص، جس کی واحد دلچسپی کسی منفعت بخش عہدے سے چمٹے رہنے تک ہوتی، ایک دن وہ پفوئل کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوتا اور اس سے اگلے روز اس کے مخالف کا دم بھر رہا ہوتا، اور محض ذمے داری سے بچنے یا زار کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تیسرے دن یہ اعلان کر رہا ہوتا کہ اس معاملے میں اس کی اپنی کوئی رائے نہیں ہے۔ ایک دوسرا شخص جو کوئی لمبا ہاتھ مارنے یا زار کی نظروں میں آنے کے چکر میں ہوتا، امپراطور کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے گلا پھاڑ پھاڑ کر کسی ایسی بات کی حمایت کرنے لگتا جس کا اشارتاً ذکر خود فرماں روا نے ایک روز پہلے کیا ہوتا تھا۔ وہ کونسل میں دوسروں سے الجھتا، پورے زور سے چیختا چلاتا، سینے پر دوہتڑ مارتا اور جو لوگ اس سے متفق نہ ہوتے، انھیں ڈوئیل کے لیے للکارتا اور یوں ثابت کر دیتا کہ وہ مشترکہ بھلائی کے لیے اپنی جان بھی قربان کر دے گا۔ ایک تیسرا، کونسل کے دو اجلاسوں کے مابین، اپنے حریفوں کی عدم موجودگی میں اپنی وفادارانہ خدمات کے عوض کسی خاص بخشش کا طلب گار ہوتا۔ وہ اس بات سے بخوبی آگاہ ہوتا تھا کہ ایسے موقع پر انکار کم ہوگا، شرفِ قبولیت زیادہ ہوگا۔ چوتھا ہمیشہ اس قسم کی تدابیر کرتا رہتا کہ جب بھی زار کی نظر اس پر پڑے، وہ کام کے بوجھ تلے لدا دکھائی دے۔ پانچواں، جس کے دل میں مدتوں سے زار کے ساتھ کھانا کھانے کی خواہش انگڑائیاں لے رہی ہوتی، اپنی اس آرزو کی تکمیل کے لیے کسی ایسی تجویز کی، جو حال ہی منظر عام پر آئی ہوتی، صحت یا عدم صحت کے بارے میں بڑے زور شور سے دلائل کے انبار لگانا شروع کر دیتا اور اس سلسلے میں بڑے قوی اور قابل قبول ثبوت فراہم کرتا۔

اس فریق کی تمام کوششوں کا محور روبلوں، اعزازات اور ترقیوں کا حصول تھا اور اپنی اس جستجو میں ان کی نظریں ہمیشہ شاہی عنایات کے بادنما پر مرکوز رہتی تھیں۔ جونہی وہ اس کا رخ ایک طرف دیکھتے، فوج کے یہ طفیلی زنگس ادھر پرواز کرنے لگتے اور زار کے لیے اس کا رخ کسی اور طرف گھمانا تقریباً ناممکن بنا دیتے۔ ایک طرف صورت حال کی بے یقینی تھی، کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ کب کیا ہو جائے، اور پر سروں پر خطرے کی تلوار لٹک رہی تھی جس نے ہر شخص کو بے چینی میں مبتلا کر رکھا تھا، دوسری طرف سازشوں، خود غرضانہ خواہشات، متصادم نظریات وجذبات اور مختلف قومیتوں کا بھنور تھا، ان سب کے بیچ میں انسانوں کے اس آٹھویں اور سب سے بڑے فریق نے، جو ذاتی مفادات کی دوڑ میں مصروف و مستغرق تھا، مشترکہ کام میں اچھا خاصا انتشار اور ابہام پیدا کر دیا تھا۔ جو مسئلہ بھی اٹھتا، ان زنگسوں کا ہجوم کا ہجوم اپنی بھنبھناہٹ ختم کرنے سے پہلے ان لوگوں کی، جو دیانت داری سے اس کے متعلق بحث مباحثہ کر رہے ہوتے، آوازوں کا گلا گھونٹ دیتا اور ہر چیز خلط ملط کر دیتا۔

بالکل انھیں ایام میں، جب پرنس آندرے فوج کے ساتھ آ کر ملا، ان سب میں سے ایک اور یعنی فریق نہم کی تشکیل عمل میں لائی جا رہی تھی اور اب اس کی آواز بھی سنائی دی جانے لگی تھی۔ یہ فریق بزرگوں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ

سمجھ دار، معاملہ فہم اور باصلاحیت تھے۔ انھیں سرکاری امور کا تجربہ تھا۔ وہ متضاد و متصادم نظریات میں سے کسی کی بھی حمایت نہیں کرتے تھے۔ سٹاف ہیڈ کوارٹرز میں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اس کا بے تعصبی اور غیر جانبداری سے جائزہ لے سکتے تھے اور اس پراگندہ خیالی، غیر یقینیت، ژولیدگی اور ضعف سے بچنے کے ذرائع سوچ سکتے تھے۔

اس فریق کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ اور وہ کہتے بھی یہی تھے کہ یہ ساری خرابی اس لیے پیدا ہوئی ہے کیونکہ زار اپنے فوجی درباریوں کی معیت میں یہاں مقیم ہے۔ درباریوں کے آپس کے تعلقات کبھی ایک جیسے نہیں رہتے، ان میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں، ان کی نوعیت غیر واضح اور اتفاقات کی مرہون منت ہوتی ہے۔ دربار میں عموماً اس سے کوئی خلل نہیں پڑتا لیکن فوج کے لیے یہ چیز سم قتل کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان کی سوچ اور قول کے مطابق فرماں روائے مملکت کو حکمرانی تو کرنا چاہیے لیکن فوج کی کمان اپنے ہاتھ میں نہیں لینا چاہیے۔ زار کی محض موجودگی نے پچاس ہزار فوجیوں کو مفلوج کر دیا ہے کیونکہ وہ اس کی ذاتی حفاظت کے لیے درکار ہیں۔ بدترین کمانڈر انچیف اگر اپنے فیصلوں میں آزاد ہے، بہترین سے بہترین کمانڈر انچیف سے، جس کے کام میں فرماں روا کی موجودگی اور منصب رکاوٹ بن جاتے ہیں، بہتر ہے۔

ان دنوں، جب پرنس آندرے کو ابھی تک کوئی ذمے داری نہیں سونپی گئی تھی، سیکرٹری آف سٹیٹ (وزیر خارجہ) اور اپنے گروپ کے ایک اعلیٰ نمائندے شش کوف نے زار کے نام ایک خط تحریر کیا۔ بالاشیف اور آراک چیف نے اس پر دستخط کرنے کی ہامی بھری۔ فرماں روائے مملکت نے حالات کی عمومی نہج کے بارے میں بحث مباحثہ کرنے کی اجازت دے رکھی تھی، شش کوف نے اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس خط میں مؤدبانہ تجویز پیش کی کہ زار کو فوج سے رخصت ہو جانا چاہیے۔ اس نے عذر یہ پیش کیا کہ لوگوں میں جنگ کا جوش و جذبہ ابھارنے کے لیے اس کا دارالحکومت میں موجود ہونا ضروری ہے۔

فرماں روائے مملکت نے اس شعلے کو جو ہوا دی اور اپنی رعایا سے مادر وطن کا دفاع کرنے کی جو اپیل کی، وہ بالآخر روس کی کامیابی کا سبب بنی۔ اگرچہ زار کی ماسکو میں ذاتی موجودگی لوگوں میں جوش و خروش پیدا کرنے کا سبب بنی، تاہم اسے وہاں جانے کی ترغیب اس لیے دی گئی تھی تاکہ وہ فوج سے کنارہ کشی اختیار کر سکے۔ خود زار نے بھی اس ترغیب پر کوئی اعتراض نہ کیا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس سے فوج سے دور جانے کا تقاضا کیوں کیا جا رہا ہے۔

10

یہ خط ابھی امپراطور کی خدمت میں پیش نہیں کیا گیا تھا کہ ایک روز ڈنر کے دوران میں بارکلے نے بلکونسکی کو مطلع کیا کہ ترکی کے متعلق استفسارات کرنے کے لیے فرماں روا اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہے اور پرنس آندرے کو اسی شام چھ بجے بے نگ سین کی قیام گاہ پر پہنچنا ہے۔

اسی شام زار کے عملے کو اطلاع ملی کہ نپولین نے اپنی فوجوں کو ازسرنو آگے پیچھے کیا ہے اور اس کی سپاہ کی یہ

نقل وحرکت روسی فوج کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتی ہے — تاہم بعد ازاں یہ اطلاع غلط ثابت ہوئی۔ اسی صبح کرنل میشو (Michaud) زار کے ساتھ دریسا کی قلعہ بندیوں کے معائنے پر گیا تھا اور اس نے امپراطور کو بتایا تھا کہ یہ قلعہ بند کیمپ، جسے پفوہل کی ہدایات پر تعمیر کرایا گیا تھا اور جسے اس وقت تک عسکری سائنس کا chef d,oeuvré خیال کیا جارہا تھا، نری حماقت ہے اور روسی افواج کی تباہی و بربادی کا سامان ہے۔

جس پرنس آندرے بے نگ سین کے ہیڈ کوارٹرز — یہ دریا کے کنارے مقامی تعلقہ دار کا اوسط درجے کا مکان تھا۔ پہنچا، وہاں بے نگ سین تھا نہ زار۔ زار کے ایڈی کانگ چرنی شیف نے اس کا استقبال کیا اور اسے بتایا کہ زار مارکوئیس پاؤلوچی اور جنرل بے نگ سین کی معیت میں دوسری مرتبہ دریسا کیمپ کی قلعہ بندیوں کے معائنے پر نکلا ہوا ہے کیونکہ ان کی افادیت کے بارے میں شکوک وشبہات ابھرنا شروع ہو گئے ہیں۔

چرنی شیف بیرونی کمرے کے دریچے کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کوئی فرانسیسی ناول تھا، اور یہ کمرا غالباً بال روم تھا۔ وہاں ابھی تک ارگن باجہ، جس پر غالیچوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا، پڑا تھا۔ ایک کونے میں بے نگ سین کے ایجوٹنٹ کا پلنگ، جسے تہہ کیا جا سکتا تھا، رکھا ہوا تھا۔ یہ ایجوٹنٹ بھی وہیں تھا اور لیٹے ہوئے بستر پر بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ بظاہر اسے رنگ رلیوں یا کام کی زیادتی نے تھکا کر چور کر دیا تھا۔ اس کمرے سے دو دروازے نکلتے تھے۔ ایک تو سیدھا اس کمرے میں، جو کبھی ڈرائنگ روم تھا، اور دوسرا دائیں جانب سٹڈی روم میں کھلتا تھا۔ پہلے دروازے میں سے بعض آدمیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ گفتگو جرمن زبان میں ہو رہی تھی لیکن کبھی کبھار فرانسیسی بھی کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ زار کی خواہش کے مطابق سابق ڈرائنگ روم میں فوجی کونسل تو نہیں (امپراطور معاملات گول مول رکھنے کو ترجیح دیتا تھا)، البتہ چند ایسے اشخاص موجود تھے جن کی رائے وہ ان مشکلات کے، جو عنقریب پیش آنا تھیں، بارے میں سننے کا خواہش مند تھا۔ یہ جنگی کونسل نہیں تھی لیکن بہر حال تھی ایک قسم کی کونسل ہی۔ اسے خود زار کے لیے بعض مسائل کی تشریح و توضیح کرنا تھی۔ اس نیم کونسل میں سویڈی جرنل آرم فیلٹ، ایجوٹنٹ جنرل وول ٹسوگن، ونٹ ٹسنگے روڈے (جسے نپولین نے فرانسیسی رعایا کا بدعہد و غدار قرار دیا تھا) میشو، کاؤنٹ شٹائین (جو قطعاً فوجی نہیں تھا)، ٹول[63] اور پفوہل کو، جس کے متعلق پرنس آندرے نے سنا تھا کہ وہ اس سارے معاملے میں اصل کرتا دھرتا ہے، بلایا گیا تھا۔ پرنس آندرے کو اسے (پفوہل کو) اچھی طرح دیکھنے کا موقع مل گیا کیونکہ وہ اس کی اپنی آمد کے چند منٹ بعد ہی آ گیا تھا اور ڈرائنگ روم میں جانے سے پہلے اس نے چرنی شیف سے مختصر بات کی تھی۔

پفوہل نے روسی جرنیل کی بد وضع وردی پہنی ہوئی تھی اور فینسی ڈریس کی طرح یہ اس کے جسم پر قطعاً سج نہیں رہی تھی۔ پہلی نظر میں وہ پرنس آندرے کو جانا پہچانا معلوم ہوا حالانکہ اس نے از یں پیشتر اسے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس میں بعض ایسی باتوں کی، جو اس نے وے روٹر، میک، شمٹ اور بعض دوسرے نظریہ ساز جرمن جرنیلوں میں، جن سے اس کی 1805 میں مڈھ بھیڑ ہوئی تھی، دیکھی تھیں، جھلک دکھائی دی، لیکن وہ ان میں سے کسی کی بھی نسبت

master piece (شہکار)

زیادہ مثالی جرمن تھا۔ پرنس آندرے نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی ایسا جرمن نظریہ ساز، جس کی ذات میں دوسرے تمام جرمنوں کی خصوصیات یوں مجتمع ہوگئی ہوں، نہیں دیکھا تھا۔

پفوہل پست قامت اور بے حد لاغر تھا، تاہم اس کی ہڈی چوڑی تھی۔ ساخت کے اعتبار سے اس کا جسم بھدا اور تگڑا تھا۔ اس کے کولھے چوڑے چکلے اور کندھوں کی ہڈیاں ابھرواں تھیں۔ اس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں تھیں اور اس کی آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی تھیں۔ بظاہر اس کے بالوں میں جلد بازی سے کنگھی کی گئی تھی اور انھیں کنپٹیوں کے قریب آگے کی جانب ہموار بنانے کی کوشش کی گئی تھی لیکن وہ عجیب بے ہنگم انداز سے چھوٹے چھوٹے گچھوں کی صورت میں اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے گرد و پیش یوں مضطرب اور غصیلی نگاہوں سے دیکھتا اندر آیا جیسے وہ اس کشادہ کمرے کی، جس میں سے اسے گزرنا تھا، ہر چیز سے مرعوب ہو۔ اس نے اپنی شمشیر بڑے بے ڈھب انداز سے تھامتے ہوئے چرنی شیف سے جرمن زبان میں خطاب کیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ امپراطور کہاں ہے۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کمرے میں سے جلد از جلد گزرنا، تسلیمات اور علیک سلیک سے نپٹنا اور نقشے کے سامنے بیٹھ کر اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہتا ہے کیونکہ اسی میں اسے صحیح معنوں میں سکون ملتا تھا۔ اس نے چرنی شیف کے سلام کے جواب میں بے اعتنائی سے سر کو جنبش دی اور یہ سن کر کہ زار ان قلعہ بندیوں کا، جو اس کے نظریات کے مطابق تعمیر کی گئی تھیں، معائنہ کرنے گیا ہوا ہے، طنزیہ انداز سے مسکرا دیا۔ اس نے اپنی گہری آواز میں بڑبڑاتے ہوئے اپنے آپ سے کچھ کہا۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، ان جرمنوں کے، جو اپنی آراء کو ہمیشہ صحیح اور دوسروں کو غلط قرار دیتے ہیں، مخصوص منہ پھٹ انداز سے کہہ رہا تھا اور کچھ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کہہ رہا ہو: ''احمق، گاؤدی!'' ''لعنت ہو اس سارے معاملے پر!'' یا ''سارا معاملہ گڑبڑا جائے گا!'' جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، پرنس آندرے کو سنائی نہیں دیا اور وہ اس کی بھی پروا نہ کرتا، لیکن چرنی شیف نے اس کا تعارف پفوہل سے کرا دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ پرنس آندرے ابھی ابھی ترکی سے، جہاں جنگ اتنی کامیابی سے اختتام پذیر ہوئی ہے، آیا ہے۔ پفوہل نے اس پر کچھ یوں اچٹتی نظر ڈالی جیسے وہ اسے نہیں، بلکہ اس کے آر پار دیکھ رہا ہو اور ہنستے ہوئے بولا: ''یہ جنگ عسکری تدابیر کا زبردست نمونہ بنی ہوگی!'' اور ہنستے ہنستے اس کمرے میں، جہاں سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں، چلا گیا۔

یہ بات روز روشن کی طرح عیاں تھی کہ پفوہل، غصہ جس کی ہمیشہ ناک پر دھرا رہتا تھا اور جو ہر دم جلی کٹی سنانے کی طرف مائل رہتا تھا، اس روز خاص طور پر جلال میں آیا ہوا تھا کیونکہ چند لوگوں نے اس کی عدم موجودگی میں اس کے کیمپ کا معائنہ کرنے اور اس میں مین میکھ نکالنے کی جسارت کی تھی۔ پرنس آندرے کو آسٹرلٹس میں جو تجربات ہوئے تھے، ان کی بدولت اسے اس مختصر ملاقات کے بعد اس شخص کے کردار کے متعلق واضح تصور قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ پفوہل کا شمار ان لوگوں میں کیا جا سکتا تھا جو حد سے زیادہ اور غیر متزلزل طور پر خود اعتماد ہوتے ہیں — اس حد تک خود اعتماد کہ وہ اپنی گردن کٹا دیں گے لیکن اپنی رائے سے پیچھے ہٹنا گوارا نہیں کریں گے۔ یہ وصف صرف جرمنوں میں پایا جاتا ہے کیونکہ جرمن اپنی خود اعتمادی کی اساس مجرد تصور پر — سائنس

یعنی مطلق صداقت کے مفروضہ علم پر — رکھتے ہیں۔ فرانسیسی کی خود اعتمادی کا سرچشمہ اس کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ ذہنی اور جسمانی اعتبار سے اس میں اتنی دلکشی ہے کہ مرد اور خواتین دونوں دیوانہ وار اس کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں۔ انگریز کی خود اعتمادی اس کے اس ایقان سے پھوٹتی ہے کہ وہ دنیا کی بہترین منظم مملکت کا شہری ہے، اور اس کے ساتھ وہ اسے بھی حقیقت تصور کرتا ہے کہ انگریز ہونے کے ناطے اسے ہمیشہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسے کیا کرنا ہوگا اور انگریز ہونے کے ناطے وہ جو کچھ کرے گا، لاریب درست ہوگا۔ اطالوی اس لیے خود اعتماد ہوتا ہے کیونکہ آؤ دیکھا نہ تاؤ، فوراً مشتعل ہو جاتا ہے اور آسانی سے اپنے آپ کو اور دوسروں کو بھول جاتا ہے۔ روسی محض اس لیے خود اعتماد ہوتا ہے کیونکہ وہ نہ کچھ جانتا ہے اور نہ جاننا چاہتا ہے کیونکہ وہ یہ مانتا ہی نہیں کہ کسی چیز کو مکمل طور پر جاننا ممکن ہے۔ تاہم جرمن کی بداعتمادی بدترین چیز ہے۔ وہ کسی بھی دوسری قوم کے فرد کی نسبت زیادہ بے لچک اور نامطبوع ہوتا ہے کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ اسے صداقت یعنی سائنس — جو محض اس کی اپنی اختراع ہوتی ہے لیکن جو اس کے نزدیک مطلق صداقت ہے — کا علم ہے۔

پفوہل صریحاً ایسا ہی آدمی تھا۔ اس کے پاس اپنی سائنس — ترچھی نقل وحرکت کا نظریہ، جس کا اس نے فریڈرک اعظم کی جنگوں سے استنباط کیا تھا — تھی اور وہ ہر بات، جو اسے نسبتاً حالیہ جنگوں کی تاریخ میں نظر آئی، اسے وہ بے ہودہ، لچر اور خلاف فطرت معلوم ہوئی۔ اس کے نزدیک یہ حربی معرکے بھونڈے اور بے ڈھنگے تھے۔ ان میں طرفین نے ایسی ایسی فاش غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا کہ ان مجادلوں کو جنگ کا نام دینا لفظ ''جنگ'' کی توہین تھا۔ وہ نظریے کی کسوٹی پر پورے نہیں اترتے تھے، اس لیے سائنس کی دلچسپی کا ان میں کوئی سامان نہیں تھا۔

جو لوگ 1806 میں اس مہم کی، جو جینا[64] اور اورشٹٹ[65] میں انجام پذیر ہوئی تھی، منصوبے بندی کے ذمے دار تھے، پفوہل ان میں شامل تھا۔ لیکن اس جنگ کا جو نتیجہ برآمد ہوا، اس سے اسے اس امر کی بال برابر شہادت نہ ملی کہ اس کا نظریہ خطا پذیر ہو سکتا ہے، اس کے برعکس اس کی سوچ یہ تھی کہ اس ساری تباہی و بربادی کی واحد وجہ یہ تھی کہ اس کے نظریے سے انحراف کیا گیا تھا، اور وہ اپنے مخصوص مسرور و مطمئن انداز سے کہا کرتا تھا: ''میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ سارا معاملہ گڑبڑا جائے گا۔'' وہ ان نظریہ سازوں میں سے تھا جنھیں اپنے نظریے سے اتنا لگاؤ ہوتا ہے کہ نظریے کا مقصد — اس کا عملی اطلاق — ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اس کے نظریے سے دیوانگی کی حد تک لگاؤ نے اسے تمام عملی پہلوؤں سے متنفر کر دیا اور وہ ان کا ذکر تک سننا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ ناکامیوں پر اس کی مسرت دیدنی ہوتی تھی کیونکہ ناکامیاں جو عمل میں نظریے سے انحراف کا نتیجہ ہوں، اسے صرف اپنے نظریے کی صحت کا ثبوت فراہم کرتی تھیں۔

اس نے پرنس آندرے اور چرنی شیف سے موجودہ جنگ کے بارے میں ایک ایسے شخص کے، جسے پہلے ہی یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی کل سیدھی نہیں بیٹھے گی اور جسے قطعاً اس بات کا ملال نہیں ہوتا کہ ایسا ہوا ہے، انداز سے چند الفاظ کہے۔ اس کے بالوں کے وہ گچھے، جو کنگھی کی زد میں نہیں آئے تھے اور جو پیچھے کو کھڑے تھے، اور اس کے کنپٹیوں کے قریب

کے وہ بال، جنھیں اس نے بہ عجلت کنگھی پھیر کر ٹھیک ٹھاک کر لیا تھا، یہ سب کچھ بزبان حال پکار پکار کر خوش اسلوبی سے بیان کر رہے تھے۔

وہ اگلے کمرے میں چلا گیا اور اگلے ہی لمحے اس کی پرزور، جھگڑالو گفتگو سنائی دینے لگی۔

11

پرنس آندرے ابھی اپنی نگاہوں سے پفوہل کا تعاقب کر رہا تھا کہ کاؤنٹ بے نگ سین لپک جھپک کمرے میں داخل ہوا، اس نے رکے بغیر سلام کے انداز میں اپنی گردن کو ذرا سا خم دیا اور سٹڈی روم کی طرف جاتے کمرے میں سے گزرتے گزرتے اپنے ایجوٹنٹ کو ہدایات دیں۔ امپراطور اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا اور بے نگ سین اس لیے بھاگم بھاگ پہلے پہنچ گیا تھا کیونکہ وہ بعض تیاریاں کرنا چاہتا اور اس کے استقبال کے لیے خود وہاں موجود ہونا چاہتا تھا۔

چرنی شیف اور پرنس آندرے پورچ میں چلے گئے۔ وہاں امپراطور، جو تھکاوٹ سے نڈھال معلوم ہوتا تھا، گھوڑے سے نیچے اتر رہا تھا۔ مارکوئیس پاؤلوچی اس سے باتیں کر رہا تھا اور فرمانروائے مملکت اپنا سر بائیں طرف جھکائے اس کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خفگی کے آثار تھے، لیکن پاؤلوچی جوش و خروش سے اپنی کہتا چلا گیا۔ امپراطور آگے بڑھا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس گفتگو کو ختم کرنا چاہتا ہے، مگر اطالوی، جس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور جس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی، آداب کو پس پشت ڈالے اس کے پیچھے پیچھے چلتا اور اپنی باتیں گوش گزار کرتا رہا۔

"جہاں تک اس شخص کا، جس نے اس کیمپ، اس دریا کیمپ کو قائم کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا، تعلق ہے..." وہ فرانسیسی میں کہہ رہا تھا جب کہ امپراطور زینہ چڑھ رہا اور پرنس آندرے کو دیکھ کر اس کے ناشناسا چہرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ "عالی جاہ، جہاں تک اس شخص کا..." پاؤلوچی بے جگری سے بولے جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے لیے ضبط کرنا ناممکن ہے۔ "جہاں تک اس شخص کا جس نے دریا کیمپ قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا، تعلق ہے۔ مجھے اس کے علاوہ اور کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی کہ اسے یا تو پاگل خانے میں بھیج دیا جائے یا پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا جائے۔"

اطالوی کی بات کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر اور ایسے جیسے اس نے کچھ سنا ہی نہ ہو، امپراطور بلکونسکی کو پہچانتے ہوئے بہ کمال لطف و عنایت اس کی جانب متوجہ ہو گیا۔

"تمھیں دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ باقی لوگ جہاں بیٹھے ہیں، تم بھی وہیں چلو اور میرا انتظار کرو۔"

امپراطور سٹڈی روم میں چلا گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے پرنس پیوتر میخائیلووچ ولکونسکی اور بیرن شٹائین تھے۔ ان کے اندر داخل ہونے کے بعد دروازہ بند ہو گیا۔ پرنس آندرے زار کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پاؤلوچی

1812 کی مہم
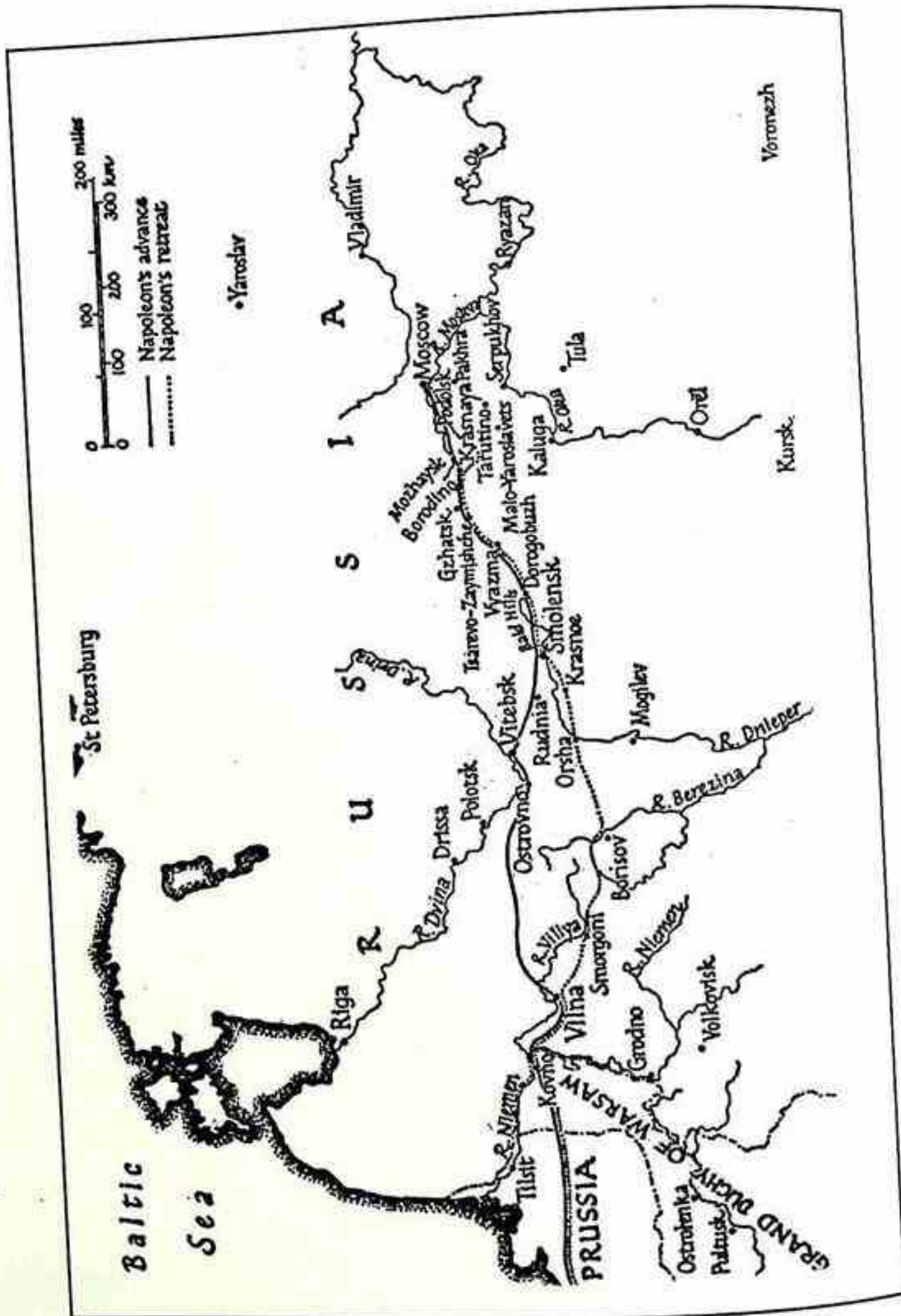
کے، جس سے اس کی ترکی میں ملاقات ہوئی تھی، ساتھ چل پڑا اور ڈرائنگ روم میں، جہاں کونسل کے ارکان اکٹھے ہو چکے تھے، پہنچ گیا۔

پرنس پیوتر میخائیلووچ ولکونسکی جس قسم کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، ان سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ امپراطور کے عملے کا سربراہ ہے۔ وہ سٹڈی روم سے ڈرائنگ روم میں آیا۔ اس کے پاس چند نقشے تھے۔ اس نے انھیں میز پر پھیلایا اور ان نکات کا، جن کے بارے میں وہ معزز حاضر اصحاب کی رائے دریافت کرنا چاہتا تھا، اعلان کیا۔ ہوا یہ تھا کہ دورانِ شب یہ خبر (بعد میں غلط ثابت ہوئی) کہ فرانسیسیوں نے دریسا کیمپ کو نرغے میں لینے کے لیے نقل و حرکت کی تھی، ملی تھی۔

سب سے پہلے جنرل آرم فیلٹ نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے اس مشکل کا سامنا کرنے کے لیے غیر متوقع طور پر تجویز پیش کی کہ ماسکو اور پیٹرز برگ کو جانے والی شاہراہوں سے پرے ہٹ کر بالکل نئی پوزیشن سنبھالی جائے، وہیں سب فوجیں اکٹھی ہو جائیں اور مل کر دشمن کا انتظار کریں۔ یہ تجویز کیوں پیش کی گئی، کسی کو اس کی تک سمجھ نہ آئی۔ یہ الگ بات ہے کہ اس نے یہ تجویز محض اس لیے پیش کی ہوتا کہ دوسروں کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی بھی کوئی رائے ہے۔ بظاہر یہی دکھائی دیتا تھا کہ آرم فیلٹ یہ منصوبہ بہت عرصہ قبل مرتب کر چکا تھا اور اس نے اب اسے اس مقصد کے پیشِ نظر آگے نہیں بڑھایا تھا کہ اس سے موجودہ مسئلے کا کوئی حل نکلتا تھا— اس سلسلے میں یہ قطعاً سودمند نہیں تھا— بلکہ اس نے اسے اس لیے پیش کیا تھا کیونکہ وہ اسے پیش کرنے کا موقع گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ان لاکھوں مفروضوں میں سے ایک مفروضہ تھا جن میں سے ہر ایک بظاہر دل کو اتنا ہی لبھاتا ہے جتنا کہ دوسرا اور اگر آدمی کو یہ معلوم نہ ہو کہ جنگ کیا شکل اختیار کرے گی، انھیں با آسانی مرتب کیا جا سکتا ہے۔ بعض حاضرین نے اس کے دلائل کی مخالفت کی اور بعض نے حمایت۔ سب سے زیادہ نوجوان جنرل ٹول نے سویڈی جرنیل کے نظریات کی بھد اڑائی۔ اس کا انداز بالکل جلالی تھا۔ تو تکار کے دوران میں اس نے جیب سے نوٹ بک، جس کے صفحے کے صفحے تحریروں سے پٹے پڑے تھے، نکالی اور اسے پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ اپنی اس ضخیم یادداشت کی خواندگی کے دوران میں اس نے ایک نیا منصوبہ، جو آرم فیلٹ یا پفوہل کے منصوبوں سے قطعی مختلف تھا، پیش کر دیا۔ پاؤلوچی نے ٹول کے منصوبے پر اعتراضات اٹھاتے ہوئے پیش قدمی اور حملہ کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس کا دعویٰ تھا کہ جس بے یقینی اور پھندے (وہ دریسا کیمپ کو پھندا کہتا تھا) میں وہ اب گرفتار ہیں، اس سے نکلنے کا یہی واحد راستہ ہے۔ اس تمام مباحثے کے دوران میں پفوہل اور اس کا ترجمان وول ٹسوگن (وہ درباری معاملات میں بھی پفوہل کا رابطہ تھا) منہ باندھے بیٹھے رہے۔ پفوہل حقارت سے محض نتھنے پھلاتا رہا اور اس نے یہ ظاہر کرنے کے لیے، کہ جس قسم کی خرافات وہ سن رہا ہے، اس کا جواب دینا اس کی شان سے فروتر ہے، اپنی پشت دوسری طرف گھما لی۔ اور جب پرنس ولکونسکی نے، جو اس مباحثے میں صدرِ مجلس کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، اس سے اس کی رائے طلب کی، اس نے محض یہ کہنے پر اکتفا کیا:

''مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟ جنرل آرم فیلٹ نے زبردست پوزیشن بچھائی ہے، بس دشمن کو ہمارے عقب میں بلا روک ٹوک آنے کی کھلی چھٹی مل جائے گی۔ یا پھر ان اطالوی بزرگوار کی۔ حملے کی تجویز کیوں نہیں قبول کر لیتے؟۔ اتنی عمدہ تجویز کسی کو کاہے کو سوجھی ہو گی! یا پھر پسپائی؟ یہ بھی بہت اعلیٰ خیال ہے! مجھ سے کیا پوچھتے ہیں؟'' اس نے پھر دہرایا۔ ''مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ سب مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔''

لیکن جب ولکونسکی نے تیوری چڑھا کر یہ کہا کہ وہ اس کی رائے امپراطور کے نام پر دریافت کر رہا ہے، تو پفوہل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے اچانک جوش آ گیا اور وہ کہنے لگا:

''آپ لوگوں نے سب کچھ تہس نہس کر دیا ہے۔ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا ہے۔ ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ وہ مجھ سے بہتر جانتا ہے۔ اب آپ لوگ میرے پاس چلے آئے ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ حالات کیسے ٹھیک کیے جا سکتے ہیں۔ ٹھیک کیا کرنا ہے؟ سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے۔ میں نے جو اصول وضع کیے ہیں، ان پر حرف بہ حرف عمل ہونا چاہیے۔'' اس نے اپنی استخوانی انگلیوں سے میز کو پیٹتے ہوئے کہا ''مشکل کیا ہے؟ واہیات! یہ تو بچوں کا کھیل ہے!''

وہ میز کے قریب گیا، اس نے اپنی انگلی نقشے پر رکھی اور بڑی سرعت سے عملی مظاہرہ کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے لگا کہ دریسا کیمپ کے جو فوائد ہیں، کوئی اتفاقی واقعہ ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ ہر چیز کی پیش بندی کر لی گئی ہے اور اگر غنیم نے اسے گھیرے میں لینے کی کوشش کی، وہ لازماً ملیامیٹ ہو جائے گا۔

پاؤلوچی، جسے جرمن نہیں آتی تھی، فرانسیسی میں اس سے استفسارات کرنے لگا۔ وول ٹسوگن اپنے چیف کی، جو خراب فرانسیسی بولتا تھا، مدد کرنے آگے بڑھا اور جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس کا ترجمہ کرنے لگا۔ لیکن اس کے لیے پفوہل کا ساتھ دینا مشکل ہو رہا تھا کیونکہ پفوہل کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور وہ یہ ثابت کر رہا تھا کہ اس کے منصوبے میں نہ صرف ان باتوں کا، جو ماضی میں پیش آ چکی ہیں، خیال رکھا گیا ہے بلکہ ان باتوں کو بھی، جو مستقبل میں پیش آ سکتی ہیں، سمو لیا گیا ہے، اور اب اگر کوئی مشکلات پیش آ رہی ہیں تو غلطی صرف یہ ہوئی ہے کہ اس کے منصوبے کو ایمانداری سے نہیں اپنایا گیا اور اسے من وعن عملی جامہ نہیں پہنایا گیا۔ وہ دلائل لڑھکاتا جا رہا تھا اور ساتھ ساتھ طنزیہ ہنسی ہنستا جا رہا تھا، اور آخر کار ایک ایسے ریاضی دان کی طرح جو کسی مسئلے کو، جس کا حل پہلے ہی طے پا چکا ہو، حل کرنے کے لیے مختلف طریقوں کی مثالیں دینا بند کر دیتا ہے، اسی طرح اس نے بڑی حقارت سے اپنا عملی مظاہرہ بند کر دیا۔ اس کی جگہ اب وول ٹسوگن نے لے لی اور وہ اس کے نظریات کی فرانسیسی میں تشریح کرنے لگا۔ کبھی کبھی وہ مڑ کر پفوہل کی طرف دیکھتا اور اس سے پوچھتا: ''یور ایکسی لینسی، میں نے ٹھیک کہا نا!'' لیکن پفوہل ایک ایسے شخص کی طرح، جو مجادلے کی گرما گرمی میں اپنے ہی لوگوں کو نشانے کی زد میں لے لیتا ہے، غیظ وغضب سے وول ٹسوگن پر برس پڑا اور چلا کر کہنے لگا:

''ہونہہ، اب تشریح کے لیے رہ کیا گیا ہے؟ سب کچھ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے!''

پاؤلوچی اور میشو نے بیک وقت فرانسیسی میں وول ٹسوگن کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کر دیا۔ آرم فیلٹ

جرمن زبان میں پفوہل سے مخاطب ہوا۔ ٹول نے پرنس ولکونسکی کے سامنے روسی زبان میں وضاحتی بیان دیا۔
پرنس آندرے نے دیکھنے اور سننے پر اکتفا کیا، اس نے زبان سے کچھ نہ کہا۔

ان تمام اشخاص میں پرنس آندرے کو سب سے زیادہ ہمدردی تندخو، باعزم اور نامعقولیت کی حد تک خوداعتماد پفوہل سے تھی۔ جتنے لوگ وہاں موجود تھے، ان سب میں وہ واحد شخص تھا جو یقیناً طور پر اپنے لیے کچھ نہیں چاہتا تھا، اسے کسی کے خلاف کوئی ذاتی عناد نہیں تھا اور اسے صرف ایک ہی آرزو تھی کہ اس کا منصوبہ، جس کی اساس ایک ایسے نظریے پر تھی جسے اس نے برسوں کی ریاضت کے بعد اپنایا تھا، اختیار کرلیا جائے۔ اس کا رویہ نامعقول تھا اور اس کی طنز ناخوشگوار، لیکن اسے ایک تصور سے جو غیر محدود لگاؤ تھا، وہ آدمی کو غیر ارادی طور پر اس کا احترام کرنے پر مجبور کرتا تھا۔ مزید برآں اس نشست میں ہر شخص نے جو کچھ کہا، اس میں ایک خصوصیت مشترک تھی (اور یہ چیز 1805 کی جنگی کونسل میں مفقود تھی)۔ وہ مشترک خصوصیت یہ تھی کہ ان سب پر نپولین کی غیر معمولی ذہانت وفطانت کی ہیبت طاری تھی۔ اگرچہ ان تمام اشخاص کی سرتوڑ کوشش یہ تھی کہ اس ہیبت کو سات پردوں میں چھپا کر رکھا جائے لیکن ان کی ایک ایک دلیل پکار پکار کر یہ کہہ رہی تھی کہ نپولین ان کے ذہنوں پر کابوس بن کر سوار ہو چکا ہے۔ صرف پفوہل وہ واحد شخص تھا جو اس سے مستثنیٰ تھا۔ جہاں تک باقیوں کا تعلق ہے، سبھی نے یہ مفروضہ قائم کرلیا تھا کہ نپولین کے لیے ہر چیز ممکن ہے، انھیں ہر نکڑ سے اس کا سایہ لہراتا نظر آتا تھا اور ایک دوسرے کی تجاویز کی دھجیاں اڑانے کے لیے وہ اسے ہوا بنا کر پیش کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ صرف پفوہل واحد شخص ہے جو نپولین کو اسی طرح وحشی اور اجڈ سمجھتا ہے، جس طرح وہ ہر اس شخص کو، جو اس کے نظریے کی مخالفت کرتا تھا، سمجھتا تھا۔ لیکن احترام کے علاوہ پفوہل نے پرنس آندرے کے دل میں اپنے لیے رحم کا جذبہ بھی ابھارا۔ جس لہجے سے درباری اس سے مخاطب ہوتے تھے اور جس انداز سے پاؤلوچی نے امپراطور سے اس کے بارے میں بات کرنے کی جسارت کی تھی، لیکن ان سب سے بڑھ کر پفوہل کی اپنی گفتار میں جو مرنے مارنے کا انداز جھلک رہا تھا، اس سے یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ دوسروں کو علم ہے اور پفوہل کو محسوس ہو رہا ہے کہ اس کا زوال چند دنوں کی بات ہے۔ اپنی تمام تر خوداعتمادی اور جھگڑالو جرمن طنز وتعریض کے باوجود اس شخص کی، جس کے کنپٹیوں کے بالوں کو اچھی طرح کنگھی کر کے ہموار کر دیا گیا تھا لیکن جس کے پچھلے بال سیدھے کھڑے تھے، حالت قابل رحم تھی۔ اگرچہ اس نے اپنی اس حالت کو چڑچڑے پن اور حقارت کا اظہار کر کے چھپانے کی کوشش کی تھی، صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ مایوسیوں میں گھر چکا ہے اور وہ سمجھنے لگا ہے کہ اپنے نظریے کی وسیع پیمانے پر آزمائش کرنے اور کل عالم کے سامنے اس کی صحت ثابت کرنے کا بچا کھچا موقع اس کے ہاتھ سے نکلتا جا رہا ہے۔

بحث وتمحیص خاصی دیر تک جاری رہی اور جوں جوں یہ طول پکڑتی گئی، توں توں تکرار میں شدت اور گرمی آتی گئی۔ انجام کار وہ ایک دوسرے پر چیخنے چلانے اور آپس میں الجھنے لگے، اور جو کچھ کہا گیا تھا، اس کی مدد سے کسی عمومی نتیجے پر پہنچنا اتنا ہی کم ممکن نظر آنے لگا۔ پرنس آندرے کو اس ہفت زباں گفتگو، مفروضوں، پیش فرضیوں، منصوبوں،

تردیدوں اور غل غپاڑے کو سننے کے بعد اچنبھا ہی ہوسکتا تھا۔ اپنی عسکری مصروفیات کے دوران میں ایک خیال جو بہت پہلے اور بار بار اس کے ذہن میں آیا تھا، یہ تھا کہ علم حرب وضرب (سائنس آف وار) نام کی نہ کوئی چیز ہے اور نہ ہوسکتی ہے، نتیجتاً عسکری جینئس نام کی مخلوق یا چیز بھی ممکن نہیں، اب یہ بات اسے بدیہی حقیقت دکھائی دی۔ جہاں فعال طاقتوں کے حالات وواقعات معلوم نہ ہوں، خاص طور پر جب ان کی قوت کے بارے میں یقین سے کچھ نہ کہا جاسکتا ہو، وہاں سائنس یا نظریہ کیسے ممکن ہے؟ کسی شخص کو پیشگی کبھی یہ معلوم نہیں ہوسکا ہے کہ کسی دن کے اختتام پر، ہماری یا غنیم کی سپاہ کی پوزیشن کیا ہوگی اور نہ کوئی آدمی اس یا اُس دستے کی امکانی قوت کی کبھی پیمائش کر سکا ہے۔ بعض اوقات ـــ جب کوئی بزدل چلا چلا کر نہیں کہہ رہا ہوتا: ''ہمارا رابطہ منقطع ہوگیا ہے!'' اور بھاگنا شروع نہیں کر دیتا، بلکہ کوئی جری اور پر جوش شخص نعرۂ تحسین ومسرت بلند کرتا ہے: ''واہ واہ! شاباش!'' ـــ تو پانچ ہزار کا دستہ، جیسا کہ شون گرابرن میں ہوا تھا، تیس ہزار کے برابر ہوجاتا ہے جب کہ دوسرے اوقات میں پچاس ہزار کا دستہ، جیسا کہ اوسٹرلٹس میں ہوا، آٹھ ہزار کے آگے دم دبا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ''ایک ایسے معاملے میں (جیسا کہ تمام عملی معاملات میں ہوتا ہے)، جس میں ہر چیز مبہم اور غیر واضح ہو اور جس میں ہر چیز کا انحصار حالات کی ان گنت انواع پر ہو، جن کی اہمیت خاص موقع پر ہی آشکار ہو اور کوئی بھی یہ نہ بتا سکتا ہو کہ وہ موقع کب آئے گا، سائنس کیا ہو گی؟ آرم فیلٹ کہتا ہے کہ ہماری افواج کا آپس میں رابطہ منقطع ہو چکا ہے جب کہ پاؤلوچی یہ سمجھتا ہے کہ ہم نے فرانسیسی سپاہ کو دونوں اطراف سے اپنے حملے کی زد میں لے لیا ہے۔ میشو کے خیال میں دریسا کیمپ کو جس چیز نے بے مصرف اور ناکارہ بنا دیا ہے، وہ یہ ہے کہ اس کے عقب میں دریا ہے جب کہ پفوہل کا دعوٰی ہے کہ یہی چیز قوت فراہم کرتی ہے۔ ٹول ایک منصوبہ پیش کرتا ہے اور آرم فیلٹ دوسرا۔ سبھی میں خوبیاں ہیں اور سبھی میں خرابیاں۔ کسی منصوبے کی سودمندی تبھی ثابت ہوسکتی ہے جب اسے آزمائش کی بھٹی میں سے گزارا جائے۔ پھر ان تمام لوگوں نے 'عسکری نابغے' کی رٹ کیوں لگا رکھی ہے؟ کیا ہم کسی شخص کو اس لیے نابغہ کہہ سکتے ہیں کیونکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ فوج کے لیے بسکٹ اور روٹی فراہم کرنے کا آرڈر کب دیا جانا چاہیے؟ کب اپنی افواج کو دائیں طرف اور کب بائیں طرف حرکت دینا چاہیے؟ اسے نابغہ محض اس ٹھاٹ باٹ اور قوت کی بنا پر، جس سے فوجی بہرہ ور کر دیے جاتے ہیں، کہا جاتا ہے اور چونکہ چمچوں اور جی حضوریوں کے ٹولے طاقت کی خایہ بوسی کرنے کے لیے ہر دم تیار رہتے ہیں، وہ اس کے ساتھ جینئس کے اوصاف، جن سے وہ تہی داماں ہوتا ہے، منسوب کر دیتے ہیں۔ بہترین جرنیل، جنھیں میں جانتا ہوں، درحقیقت وہ اشخاص تھے جو یا تو احمق تھے یا غیر حاضر دماغ، بہترین باگ راتیاں تھا ـــ خود نپولین نے اس کا اعتراف کیا تھا۔ یا پھر خود نپولین! میں نے اوسٹرلٹس کے میدان میں اس کے چہرے پر خود اطمینانی اور محدود نظری کی جو جھلکیاں دیکھی تھیں، وہ مجھے اب تک یاد ہیں۔ ایک اچھے کمانڈر کو نہ صرف یہ کہ کسی خاص اوصاف کی ضرورت نہیں رہتی، بلکہ اس کے برعکس اگر وہ انسانوں میں بلند ترین اور نفیس ترین صفات ـــ محبت، شعری احساسات، ملائمت اور فلسفیانہ ومستفسرانہ تشکیک پسندی ـــ سے بالکل ہی کورا ہو، تو اور بھی بہتر ہوگا۔

اس کی سوچ محدود ہونا چاہیے اور اسے اس امر کا یقین محکم ہونا چاہیے کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے، زبردست اہمیت کا حامل ہے (ورنہ وہ مناسب مستقل مزاجی سے کام نہیں کر سکے گا)، تبھی وہ نڈر قائد بن سکے گا۔ خدا نہ کرے کہ اس کے دل میں رحم کی کوئی رمق بھی ہو، اس کے قلب میں محبت یا ترس کے جذبات امنڈ آئیں اور وہ یہ سوچنے لگے کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے۔ ان کے 'نابغہ' ہونے کا نظریہ جو زمانہ قدیم میں ہی گھڑ لیا گیا تھا، اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے۔ وہ 'نابغے' اس لیے ہیں کیونکہ وہ قوت کے مالک ہیں۔ فوجی کارروائی کا انحصار ان پر نہیں ہوتا بلکہ اس عام سپاہی پر ہوتا ہے جو چلا چلا کر کہتا ہے 'ہم مارے گئے؟' یا اس پر جو 'واہ واہ! شاباش!' کے نعرے بلند کرتا ہے۔ اور صرف عام سپاہی کی حیثیت سے آدمی اس یقین کے ساتھ، کہ وہ کارآمد ہے، خدمات سرانجام دے سکتا ہے۔''

پرنس آندرے کے گرد و پیش جو مباحثہ ہو رہا تھا، اس کے دوران میں پرنس آندرے کچھ انھیں خطوط پر سوچ رہا تھا اور وہ صرف تب بیدار ہوا جب پاؤلوکچی نے اسے آواز دی اور ہر شخص باہر جا رہا تھا۔

اگلے روز معائنے کے دوران میں امپراطور نے پرنس آندرے سے دریافت کیا کہ وہ کہاں خدمات سرانجام دینا چاہتا ہے اور جب پرنس آندرے نے فرماں روائے مملکت کے خدام وحشم میں شامل کیے جانے کی درخواست کرنے کے بجائے فوج کے ساتھ فرائض ادا کرنے کی اجازت مانگی، تو وہ درباری حلقوں میں اپنا مقام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھا۔

12

جنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی کہ رستوف کو اپنے والدین کا محبت نامہ موصول ہوا۔ اس میں انھوں نے اسے مختصراً نتاشا کی علالت اور پرنس آندرے سے اس کی سگائی کے انقطاع (ان کے خیال میں یہ اس لیے ہوا کیونکہ نتاشا نے اسے مسترد کر دیا تھا) کے بارے میں اطلاع دی تھی اور ایک بار پھر اس سے پرزور التجا کی تھی کہ وہ فوج سے ریٹائر ہو جائے اور واپس گھر آ جائے۔ اس خط کے موصول ہونے کے بعد رستوف نے نہ صرف یہ کہ فوج سے ریٹائرمنٹ لینے کی کوئی تگ و دو نہ کی بلکہ اس نے چھٹی کی درخواست بھی نہ دی۔ تاہم اس نے اپنے والدین کے خط کے جواب میں نتاشا کی علالت اور اس کی اپنے منگیتر کے ساتھ ناچاقی کے بارے میں اظہار افسوس کیا اور انھیں اطمینان دلایا کہ وہ اس کی خواہشات کی تعمیل کرنے کی پوری کوشش کرے گا۔ سونیا کے نام اس نے علیحدہ خط تحریر کیا۔

''میرے دل کی ملکہ،'' اس نے لکھا ''مسئلہ محض ناک کا ہے، ورنہ مجھے کوئی چیز وطن واپس آنے سے نہ روک سکتی، لیکن اب جب کہ جنگ شروع ہوا چاہتی ہے، اگر میں نے مادر وطن کی محبت اور اپنے فرض پر اپنی ذاتی خوشی کو ترجیح دی، میں نہ صرف اپنے رفقا، بلکہ خود اپنی نظروں میں ذلیل و خوار ہو جاؤں گا، لیکن یقین مانو کہ یہ ہماری آخری مفارقت ہوگی۔ جونہی جنگ اختتام پذیر ہوئی اور میں زندہ سلامت بچ گیا، اور مجھے تمھارا پیار حاصل رہا، میں سب کچھ چھوڑ چھاڑ دوں گا، پر لگا کر تمھارے پاس پہنچوں گا اور تمھیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے سینۂ سوزاں سے چمٹا لوں گا۔''

درحقیقت جو چیز رستوف کے، جیسا کہ اس نے وعدہ کیا تھا، گھر لوٹنے اور سونیا کے ساتھ شادی کرنے کی راہ میں مزاحم ہوئی، وہ معرکہ آرائی کا آغاز ہی تھا، ورنہ اترادنایا کی خزاں، جس کے دوران میں شکار کھیلا جاتا ہے، وہاں کا موسم، جس میں کرسمس کا پرمسرت تہوار منایا جاتا ہے، اور سونیا کی محبت، سبھی اسے اشارے کر رہے اور اپنی طرف بلا رہے تھے۔ اسے توقع تھی کہ ان چیزوں کی موجودگی میں اس کے سامنے پرسکون دیہی مسرتوں اور دل جمعیوں کا، جن سے وہ اب تک ناآشنا رہا تھا، نیا باب کھل جائے گا۔ ''پرکشش اہلیہ، بچے، شکاری کتوں کا لشکر، تین تین تیز رفتار روسی کتوں کی ایک درجن ٹولیاں، دیکھ بھال کے لیے جاگیر، خاطر تواضع کے لیے پڑوسی اور شاید مقامی شرفا کے ووٹوں سے الیکشن میں کامیابی!'' رستوف خیالات کے گھوڑے دوڑا رہا تھا، لیکن ادھر معرکہ آرائی کی ابتدا ہو چکی تھی اور اسے اپنی رجمنٹ کے ساتھ رہنا تھا۔ اور چونکہ ایسا ہونا ہی تھا، نکولائی رستوف، جیسا کہ اس کی عادت تھی، رجمنٹ میں جس قسم کی زندگی گزار رہا تھا، اس سے وہ مطمئن تھا اور اس زندگی کو خوشگوار بنانے میں کامیاب رہا تھا۔

جب وہ چھٹی گزار کر واپس آیا اور اس کی آمد پر اس کے ساتھی اپنی مسرت کا اظہار کر چکے، اسے رجمنٹ کے لیے گھوڑے اکٹھے کرنے کے کام پر روانہ کر دیا گیا اور وہ یوکرین سے چند نہایت عمدہ گھوڑے لے آیا۔ اس کام کی کامیابی پر وہ خود بھی بہت مسرور تھا اور رجمنٹ کے اعلیٰ افسروں نے بھی اس کی دل کھول کی تعریف کی۔ اس کی عدم موجودگی کے دوران میں اس کی ترقی کر دی گئی تھی اور اسے لیفٹیننٹ سے کپتان بنا دیا گیا تھا اور جب رجمنٹ کو، جس کی نفری میں پہلے کی نسبت خاصا اضافہ ہو چکا تھا، جنگ کی تیاریاں کرنے کا حکم ملا، اسے دوبارہ اپنے پرانے سکواڈرن میں بھیج دیا گیا۔

معرکہ آرائی شروع ہو گئی۔ رجمنٹ کو دگنی تنخواہ پر پولینڈ روانہ کر دیا گیا۔ نئے افسر، نئے جوان اور نئے گھوڑے اس میں شامل ہوتے گئے، اور سب سے بڑھ کر، جیسا کہ آغاز جنگ پر ہوتا ہے، ہر شخص میں نیا جوش و خروش اور ولولہ پیدا ہو گیا۔ رستوف، جو رجمنٹ میں اپنے منفعت بخش مقام سے پوری طرح آگاہ تھا، بہ دل و جان فوجی ملازمت کی دلکشیوں اور مسرتوں میں کھو گیا۔ ویسے اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ جلد یا بدیر اسے ان سے دست کش ہونا پڑے گا۔

مختلف پیچیدہ سیاسی، مملکتی اور عسکری وجوہ کی بنا پر فوج ولنا سے پیچھے ہٹ آئی تھی۔ پسپائی کے ضمن میں جو قدم بھی اٹھایا جاتا، اس پر ہیڈ کوارٹرز میں مفادات، دلائل اور ہیجانی جذبات کے پیچ در پیچ ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ تاہم جہاں تک پاولوگرات ہوزاروں کا تعلق ہے، موسم گرما کے بہترین ایام کے دوران میں، جب کہ رسد فراواں مقدار میں میسر تھی، پسپائی کا یہ سارا عمل ہر قسم کی پیچیدگیوں سے معرا اور دل پذیر تھا۔ ہیڈ کوارٹرز میں بھلے مردنی، افسردگی، بے چینی اور سازش کی فضا چھائی ہوئی ہو، لیکن جہاں تک عام فوجیوں کا تعلق تھا، کسی نے بھی یہ سوال نہ اٹھایا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور کیوں جا رہے ہیں۔ اگر انھیں پسپائی اختیار کرنے پر کوئی قلق ہو رہا تھا، تو وہ صرف اس بات کا تھا کہ انھیں وہ قیام گاہیں، جن کے وہ عادی ہو چکے تھے، چھوڑنا پڑ رہی تھیں یا کسی پولستانی مہ جبیں سے جدائی اختیار کرنا پڑ رہی تھی۔ اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال آیا بھی کہ آثار اچھے نہیں دکھائی دیتے، تو وہ جیسا کہ

اچھے سپاہی کا شیوہ ہوتا ہے، ہشاش بشاش رہنے اور واقعات کے عمومی رجحان کے بجائے اس کام پر، جو وقتی طور پر اس کے سپرد کیا جاتا، توجہ دینے کی کوشش کرتا۔ ابتدا میں انھوں نے ولنا کے قریب پڑاؤ ڈالا۔ وہ بہت خوش تھے۔ ان کا کام پولستانی زمینداروں کے ساتھ راہ و رسم بڑھانا، معائنے کی تیاریاں کرنا اور وزرا اور دوسرے اعلیٰ فوجی حکام کے سامنے پریڈ کرنا ہوتا تھا۔ پھر حکم موصول ہوا کہ سویسیانی[66] تک پسپا ہو جائیں اور جو رسد ساتھ نہ لے جائی جا سکے، اسے ضائع کر دیا جائے۔ ہوزاروں کو سویسیانی محض ''مدہوشی کا پڑاؤ'' کے طور پر یاد رہا۔ ساری فوج نے وہاں اپنے قیام کے دوران میں اسے یہی نام دیا تھا۔ یہ جگہ انھیں اس لیے بھی یاد رہی کیونکہ یہاں فوجیوں کے خلاف شکایات کا طومار بندھ گیا تھا۔ ہوا یوں کہ یہاں فوجیوں کو رسد کا سامان اکٹھا کرنے کا حکم ملا تھا۔ انھوں نے اس حکم کا پورا پورا فائدہ اٹھایا اور سامان رسد کے علاوہ پولستانی شرفا کے گھوڑے، گاڑیاں، غالیچے، الغرض جو چیز بھی ہاتھ لگی، سامان رسد کے نام پر ہتھیا لی۔ رستوف کو یہ ننھا منا قصبہ اس لیے یاد رہا کیونکہ وہ جس روز یہاں پہنچا تھا، اس نے اسی روز اپنا کوارٹر ماسٹر سارجنٹ تبدیل کر لیا تھا اور وہ اپنے سکواڈرن کے جوانوں پر، جو اس کے علم کے بغیر پرانی بیئر کے پانچ بیرل لے اڑے تھے اور مے نوشی کے بعد اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھے تھے، قابو پانے میں ناکام رہا تھا۔ وہ سویسیانی سے بھی پیچھے، مزید پیچھے ہٹتے گئے جہاں تک وہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دریسا پہنچ گئے۔ پھر انھوں نے دریسا سے بھی پسپائی اختیار کی اور وہ خود روس کی سرحدوں کے قریب پہنچ گئے۔

تیرہ[67] جون کو پاولوگراد رجمنٹ نے پہلی سنجیدہ جھڑپ میں حصہ لیا۔

اس جھڑپ سے ایک روز قبل بارہ جون کو بارش اور اولوں کا زبردست طوفان آیا۔ عمومی طور پر 1812 کا سال اپنے طوفانوں کی وجہ سے امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔

پاولوگراد رجمنٹ کے دونوں سکواڈرن رائی کے، جس کی بالیاں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں، لیکن جسے مویشیوں اور گھوڑوں نے بری طرح روند ڈالا تھا، کھیت میں پڑاؤ ڈالے پڑے تھے۔ چھاجوں مینہ برس رہا تھا اور رستوف الی ین نامی نوجوان افسر کے، جو اس کی کفالت میں تھا، ساتھ جھونپڑا نما پناہ گاہ میں، جسے لشٹم پشٹم بہ عجلت کھڑا کر دیا گیا تھا، بیٹھا تھا۔ ان کی رجمنٹ کا ایک افسر، جس کی لمبی لمبی مونچھیں اس کے رخساروں سے نیچے ڈھلک رہی تھیں، سٹاف ہیڈکوارٹرز سے واپسی پر بارش میں پھنس گیا اور ان کے جھونپڑے میں آ گیا۔

''کاؤنٹ میں سیدھا سٹاف سے آ رہا ہوں۔ تم نے رایف سکی کے کارنامے کے بارے میں کچھ سنا؟''

اور افسران کے سامنے سالتانوف[68] کی لڑائی کے بارے میں تفصیلات، جو اس نے سٹاف میں سنی تھیں، بیان کرنے لگا۔

رستوف سر نہوڑائے، کندھے اچکائے اور جسم آگے جھکائے، کہ پانی قطرہ قطرہ اس کی گردن پر بہہ رہا تھا، اپنا پائپ پی رہا اور بے توجہی سے سن رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار نوجوان الی ین پر، جو اس کے قریب بیٹھا تھا، اچٹتی نظر ڈال لیتا۔ یہ افسر محض سولہ سال کا چھوکرا تھا اور حال ہی میں رجمنٹ میں شامل ہوا تھا۔ اس کا نکولائی سے وہی تعلق

تھا جو سات برس قبل نکولائی کا دینی سوف سے تھا۔ الی ین ہر بات میں رستوف کی نقالی کرتا تھا اور وہ اس کی بالکل اسی طرح پرستش کرتا تھا جس طرح کہ کوئی دوشیزہ کرتی۔

مونچھیل افسر نے، جس کا نام زدرژنسکی تھا، طمطراق سے اعلان کیا کہ سالتانوف بندروسی تھرموپلی[69] ہے اور اس بند پر جنرل رائیف سکی نے جو کارنامہ سرانجام دیا ہے، وہ متقدمین کے شایان شاں ہوتا۔ اس نے بتایا کہ کس طرح جنرل رائیف سکی گولیوں کی زبردست بوچھاڑ میں اپنے دو بیٹوں کو بند تک لے گیا اور کس طرح اس نے ان کے ساتھ اپنے پہلو سے غنیم پر حملہ کیا۔ رستوف نے کہانی سنی ضرور لیکن اس نے نہ صرف کہ زدرژنسکی کا حوصلہ بڑھانے کے لیے منہ سے کچھ نہ کہا بلکہ اس کے برعکس اس کی شکل اس آدمی کی سی دکھائی دے رہی تھی جسے جو کچھ بتایا جا رہا ہو، اس پر اگرچہ اسے خفت محسوس ہو رہی ہوتی ہے لیکن وہ اسے جھٹلانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتا۔ اوسٹرلٹس اور 1807 کی مہموں کے بعد اسے اپنے تجربے سے معلوم تھا کہ جب فوجی عسکری کارناموں کی تفصیل بیان کرتے ہیں، ہمیشہ دروغ بیانی کرتے ہیں جیسا کہ خود اس نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے یہ جاننے سمجھنے کا بھی کافی تجربہ ہو چکا تھا کہ جنگ میں جو کچھ ہوتا ہے، اس کے بارے میں ہم جو تخیل باندھتے ہیں اور اسے جس طرح بیان کرتے ہیں، وہ اس سے، جو پیش آیا ہوتا ہے، بالکل مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ اسے زدرژنسکی کی کہانی پسند نہ آئی اور نہ اسے یہ آدمی، جس نے اپنی مونچھیں اتنی بڑھا رکھی تھیں کہ اس کے رخساروں سے نیچے ڈھلک رہی تھیں اور جس کی یہ بدعادت تھی کہ وہ اپنے مخاطب کے چہرے کے عین اوپر جھک جاتا تھا، اچھا لگا۔ رستوف کے اسے پسند نہ کرنے کی ایک وجہ اور بھی تھی اور وہ یہ تھی کہ اس نے تنگ جھونپڑے میں ضرورت سے زیادہ جگہ گھیر رکھی تھی اور یوں وہ دوسروں کے لیے زحمت کا سبب بن گیا تھا۔ رستوف اسے خاموشی سے تکتا رہا۔ ''پہلی بات تو یہ ہے کہ وہاں بند پر، جو حملے کی زد میں تھا، اتنی بھگدڑ مچی ہو گی، اتنی افراتفری برپا ہو رہی ہو گی کہ اگر رائیف سکی نے اپنے بیٹوں کے ساتھ حملہ کیا بھی ہو گا، اس کا، سوائے ان دس بارہ آدمیوں کے، جو اس کے قریب ترین ہوں گے، کسی دوسرے پر کوئی خاص اثر نہ ہوا ہو گا،'' رستوف نے سوچا۔ ''رہے دوسرے، وہ یہ دیکھ ہی نہیں سکتے تھے کہ رائیف سکی کیسے اور کس کے ساتھ بند پر آیا ہے، اور وہ، جنھوں نے اسے دیکھا ہو گا، اسے دیکھ کر ان کے دلوں میں بھی کوئی ولولہ پیدا نہیں ہوا ہو گا، انھیں تو اپنی جانوں کے لالے پڑے ہوئے ہوں گے، ایسے میں ان کے لیے رائیف سکی کے نرم و ملائم پدرانہ جذبات کیا معانی رکھتے ہوں گے؟ مزید براں، مادر وطن کے مقدر کا انحصار، جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ تھرموپلی کے سلسلے میں ہوا تھا، اس بات پر نہیں تھا کہ سالتانوف بند پر قبضہ ہوتا ہے یا نہیں۔ پھر اس قربانی کا فائدہ؟ پھر اپنے ہی بچوں کو لڑائی میں جھونکنے کی کیا ضرورت تھی؟ میں پیتا کو، بلکہ الی ین کو بھی، جو سوائے اس کے کہ اچھا لڑکا ہے، میرا کچھ نہیں لگتا، کبھی اپنے ساتھ نہ لے جاتا، میں انھیں خطرے سے دور رکھنے کی کوشش کرتا۔'' نکولائی زدرژنسکی کی گفتگو سنتا اور ان خطوط پر سوچتا جاتا تھا، لیکن اس نے اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے سے گریز کیا۔ یہ چیز بھی اس نے تجربے سے سیکھی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ یہ داستان ہماری سپاہ کی شان و شوکت کو چار چاند لگاتی ہے چنانچہ آدمی کو جھوٹ موٹ ہی

سہی لیکن ظاہر یہی کرنا پڑتا تھا کہ وہ اسے صحیح تسلیم کرتا ہے اور اس نے اسی کے مطابق عمل کیا۔

''مجھ سے اب مزید برداشت نہیں ہوتا،'' الی ین نے کہا۔ ''وہ بھانپ چکا تھا کہ رستوف کو زدرژنسکی کی گفتگو میں کوئی دلچسپی نہیں لی ہے۔ ''جرابیں، قمیص، ہر چیز — تر بتر بھیگنے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی! کہیں اور پناہ ڈھونڈتا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ بارش کا زور ٹوٹ گیا ہے۔''

الی ین باہر نکل گیا اور زدرژنسکی نے گھوڑے پر اپنی راہ لی۔

پانچ منٹ بعد الی ین کیچڑ میں چھینٹے اڑاتا واپس آ گیا۔

''ہرّا، رستوف! جلدی کریں! جلدی کریں! مجھے مل گیا ہے! یہاں سے کوئی دو سو گز دور سے خانہ ہے۔ ہمارے کئی ساتھی پہلے ہی وہاں موجود ہیں۔ ہم کم از کم اپنے کپڑے تو خشک کر سکیں گے اور ماریا ہیندری خوونا وہیں ہے۔''

ماریا ہیندری خوونا رجمنٹ کے ڈاکٹر کی شریک حیات تھی۔ وہ نازک اندام، قبول صورت، نوجوان جرمن خاتون تھی۔ ڈاکٹر نے پولینڈ میں اس کے ساتھ شادی کی تھی۔ ڈاکٹر کے پاس یا تو اتنے ذرائع نہیں تھے کہ وہ اپنی اہلیہ کے لیے کوئی گھر خرید سکتا یا پھر اس کے لیے شادی کے ابتدائی زمانے میں اپنی بیوی سے جدائی کا تصور سوہان روح تھا، وجہ بہرحال کچھ ہی کیوں نہ ہو، وہ رجمنٹ کے ساتھ جہاں بھی جاتا، اپنی دلہن کو اپنے ساتھ لے جاتا اور ہوزاروں میں اس کا حاسدانہ رویہ مذاق کا مستقل موضوع بن گیا تھا۔

رستوف نے اپنا اوورکوٹ اپنے کندھوں پر ڈالا اور چلا کر لاوروشکا کو حکم دیا کہ وہ ان کی اشیا اٹھا کر ان کے پیچھے پیچھے آ جائے۔ وہ خود الی ین کے ساتھ چل پڑا۔ راہ گزر پر کبھی وہ کیچڑ میں پھسل جاتا اور کبھی اس میں چھپکے اڑانے لگتا لیکن رستے سے ادھر ادھر نہ ہٹتا۔ بارش تھمتی جا رہی تھی لیکن اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی کہیں دور بجلی چمک جاتی اور ذرا کی ذرا تاریکی چھٹ جاتی۔

''رستوف، آپ کہاں ہیں؟''

''یہاں، ادھر۔ بجلی کی کیا چمک ہے!'' وہ ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

13

اجڑے بگڑے سے خانے میں، جس کے سامنے ڈاکٹر کی بند گاڑی کھڑی تھی، کوئی نصف درجے افسر پہلے ہی موجود تھے، نرم و گداز جسم اور خوبصورت بالوں والی پست قامت جرمن خاتون، ماریا ہیندری خوونا، ڈریسنگ جیکٹ اور شبینہ ٹوپی پہنے، باہری دروازے کے قریب کھلے ڈھلے بنچ پر بیٹھی تھی۔ اس کا خاوند اس کے قریب محو استراحت تھا۔ جب رستوف اور الی ین اندر داخل ہوئے، حاضرین نے خوشی سے چلاتے اور ہنستے انھیں ''جی آیاں نوں'' کہا۔

''اخ، معلوم ہوتا ہے کہ خوب مزے ہو رہے ہیں!'' رستوف نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اور یہ تم منہ پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو؟''

''اچھے نمونے ہیں! ان کے جسموں سے پانی یوں گر رہا ہے جیسے ندی بہہ رہی ہو! خبردار، کہیں ہمارے ڈرائنگ روم کو نہ بھگو دینا!''

رستوف اور الی ین لپک جھپک ایک کونے کی طرف بڑھے۔ وہاں وہ گیلے کپڑے اتار کر خشک لباس پہن بھی سکتے تھے اور ماریا ہیندری خوونا کو شرم سار ہونے سے بھی بچا سکتے تھے۔ وہ چوبی تختوں کے پیچھے بالکل ہی تنگ سٹور روم میں گھسنا چاہتے تھے لیکن وہاں اکلوتی موم بتی کی روشنی میں خالی صندوق پر بیٹھے تین افسر تاش کھیلنے میں مصروف تھے۔ جگہ اتنی تنگ تھی کہ تل دھرنے کی گنجائش نہیں تھی۔ انھوں نے پورا زور لگایا مگر وہ افسرٹس سے مس نہ ہوئے اور انھوں نے اپنی جگہ چھوڑنے سے صاف انکار کر دیا۔ ماریا ہیندری خوونا نے اتنی نوازش کی کہ اپنا پیٹی کوٹ انھیں دے دیا تا کہ وہ اسے بطور پردہ استعمال کر سکیں اور اس پردے کے عقب میں رستوف اور الی ین نے لاورشکا کی مدد سے، جوان کی وردیاں اور دوسرا سامان لایا تھا، خشک ملبوسات پہن لیے۔

انھوں نے ٹوٹے پھوٹے خشتی سٹو میں آگ جلائی۔ ایک چوبی تختہ ان کے ہاتھ آ گیا۔ انھوں نے اسے دو کاٹھیوں کے آر پار رکھا اور اسے جھول سے ڈھانک دیا۔ انھیں کہیں سے چھوٹا سماوار اور بوتلوں کا ڈبا، جس میں رم کی آدھی بوتل تھی، مل گیا۔ انھوں نے ماریا ہیندری خوونا سے تمام انتظامات اپنے ہاتھ میں لینے کی درخواست کی اور خود اس کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ ایک شخص نے اسے اجلا رومال پیش کیا تا کہ وہ اس سے اپنے خوبصورت ہاتھ پونچھ سکے، دوسرے نے اس کے قدموں تلے اپنا اوورکوٹ بچھا دیا تا کہ اس کے ننھے منے پاؤں گیلے نہ ہو جائیں، تیسرے نے اپنا لبادہ کھڑکی پر ڈال دیا تا کہ اسے ہوا کے جھونکوں سے آڑ میسر آ سکے اور چوتھا اس کے خاوند کے چہرے سے مکھیاں اڑانے لگا کہیں وہ جاگ نہ جائے۔

''انھیں رہنے دیں!'' ماریا ہیندری خوونا نے جھینپتے شرماتے اور خوشی سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یوں بھی یہ ساری رات جاگتے رہے ہیں، گھوڑے بیچ کر سوئے ہیں، بالکل نہیں ہلیں گے۔''

''واہ نہیں، ماریا ہیندری خوونا،'' ایک افسر نے جواب دیا۔ ''ہمیں ڈاکٹر صاحب کا خیال رکھنا ہی ہوگا۔ کون جانے کیا ہو جائے ــ اگر کسی روز میرا بازو یا ٹانگ کاٹنے کی نوبت آ گئی، مجھے امید ہے کہ یہ مجھ پر ترس کھائیں گے۔''

وہاں صرف تین گلاس تھے اور پانی اتنا گدلا تھا کہ یہ معلوم کرنا کہ چائے پتلی یا ٹھیک ہے، ناممکن تھا۔ ادھر سماوار میں صرف چھ آدمیوں کے لیے پانی کی گنجائش تھی لیکن ان سب باتوں کے باوصف چائے نوشی کا لطف دوبالا ہو گیا تھا کہ سب لوگ سینیارٹی کے اعتبار سے باری باری ماریا ہیندری خوونا کے نرم و گداز ننھے منے ہاتھوں سے، جن پر چھوٹے چھوٹے اور تقریباً صاف ناخن تھے، گلاس پکڑتے تھے۔ اس شام یوں معلوم ہونے لگا تھا کہ سب افسر سچے دل سے اس سے پیار کرنے لگے ہیں، بلکہ ان لوگوں نے بھی، جو چوبی پارٹیشن کے پیچھے تاش کھیلنے میں مصروف تھے، اپنا کھیل ترک کیا اور تعجیل سے سماوار کے پاس آ گئے۔ افسروں پر ماریا ہیندری خوونا کا دل جیتنے کا بھوت سوار تھا، انھوں نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ ماریا ہیندری خوونا نے بھی جب دیکھا کہ اتنے تیز طرار

اور شائستہ نوجوانوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے، خوشی سے اس کے گال تمتمانے لگے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی اس مسرت کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی اور اس کے ساتھ ہی، جب بھی اس کے قریب اس کا شوہر نیند میں کروٹ بدلتا، خوف سے اس کی جان ہوا ہو جاتی۔

وہاں صرف ایک ہی چمچہ تھا اور اگرچہ چینی کسی بھی دوسری چیز کی نسبت زیادہ مقدار میں موجود تھی، لیکن افسر اسے اپنے گلاسوں میں ہلانے میں اتنا وقت لیتے تھے کہ آخر یہ فیصلہ کیا گیا کہ ماریا ہیندری خونا خود ان کے گلاسوں میں چینی ہلائے۔ رستوف نے اپنا چائے کا گلاس پکڑا اور اس میں کچھ رم انڈیل دی۔ پھر اس نے ماریا ہیندری خونا سے التجا کی کہ وہ اسے ہلا دے۔

''چینی کے بغیر ہی پییں گے؟'' اس نے پوچھا۔ اس سارے عرصے کے دوران میں وہ یوں مسکراتی رہی گویا کہ ہر بات جو وہ خود یا دوسرے کہہ رہے تھے، ممکنہ حد تک پر لطف اور ذو معنی ہو۔

''مجھے چینی کی قطعاً کوئی پروا نہیں ــ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ آپ اپنے ننھے منے ہاتھوں سے میری چائے ہلا دیں۔''

ماریا ہیندری خونا نے ہامی بھر لی اور چمچہ، جو کوئی اور شخص لے اڑا تھا، ڈھونڈنے لگی۔

''ماریا ہیندری خونا، اپنی اس ننھی منی انگلی سے ہی ہلا دیں،'' رستوف نے کہا۔ ''سچ، بڑا مزہ آئے گا۔''

''لیکن یہ تو بہت گرم ہے!'' اس نے کہا اور مسرت سے اس کا چہرہ گلنار ہو گیا۔

الی ین نے رم کے چند قطرے پانی کے ڈول میں گرائے، اسے وہ ماریا ہیندری خونا کے پاس لایا اور اس سے التجا کرنے لگا کہ وہ اسے اپنی انگلی سے ہلا دے۔

''یہ میری پیالی ہے،'' اس نے کہا۔ ''صرف اپنی انگلی اس میں ڈبو دیں اور میں اسے غٹا غٹ پی جاؤں گا، قطرہ بھی نہیں بچے گا۔''

جب وہ سماوار ختم کر چکے، رستوف نے تاش کی گڈی پکڑی اور ماریا ہیندری خونا کو 'بادشاہوں' کی بازی لگانے کی پیشکش کی۔ انھوں نے یہ طے کرنے کے لیے کہ ماریا ہیندری خونا کا جوڑی دار کون ہوگا، قرعہ اندازی کی۔ رستوف نے کھیل کے جو قوانین تجویز کیے، ان کے مطابق اس شخص کو، جو 'بادشاہ' بن جاتا، ماریا ہیندری خونا کا ہاتھ چومنے کا حق حاصل ہو جاتا اور جو 'غلام' رہ جاتا، اسے ڈاکٹر کے بیدار ہونے پر اس کے لیے سماوار تیار کرنا پڑتا۔

''لیکن فرض کریں کہ ماریا ہیندری خونا، بادشاہ، بن جاتی ہے، پھر؟''

''وہ تو پہلے ہی ہماری ملکہ ہے اور اس کا ایک ایک لفظ ہمارے لیے قانون کا درجہ رکھتا ہے!''

''کھیل بمشکل شروع ہوا ہوگا کہ دفعتاً ڈاکٹر کا سر، جس کے بال پریشان تھے، اچانک اپنی بیوی کے عقب سے نمودار ہوا۔ وہ کچھ دیر سے جاگ رہا تھا اور جو کچھ کہا جا رہا تھا، سب سن رہا تھا، اور جو کچھ ہو رہا تھا، بظاہر اسے اس میں نہ تو مزاح کا کوئی پہلو نظر آیا اور نہ اس میں اسے کوئی دلچسپی اور لطف معلوم ہوا۔ اس کے چہرے پر خفگی اور افسردگی

کے آثار تھے۔ اس نے افسروں سے علیک سلیک کرنا گوارا نہ کیا بلکہ اپنے جسم کو کھرچتے ہوئے بولا کہ وہ ایک طرف ہٹ جائیں کیونکہ انھوں نے اس کا راستہ روک رکھا ہے۔ جونہی وہ باہر نکلا، تمام افسر کھلکھلا کر ہنسنے لگے جب کہ ماریا ہیندری خوونا کا چہرہ شرم سے سرخ سے سرخ تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے اور اس سے وہ افسروں کی نگاہوں میں اور بھی دلکش معلوم ہونے لگی۔ جب ڈاکٹر صحن سے واپس اندر آیا اس نے اپنی بیوی (جواب خوشی سے مسکرا نہیں رہی تھی بلکہ خوف زدہ ہو کر اپنے خاوند کو دیکھ رہی اور اپنی سزا کا انتظار کر رہی تھی) کو بتایا کہ بارش تھم گئی ہے، انھیں اب چلنا اور رات اپنی بند گاڑی میں بسر کرنا چاہیے ورنہ سب کچھ چوری ہو جائے گا۔

''میں اپنا اردلی —بلکہ دو اردلی— بھیج دیتا ہوں!'' رستوف نے کہا۔ ''کیا عمدہ تجویز ہے، کیوں ڈاکٹر صاحب؟''

''میں خود پہرہ دینے کے لیے تیار ہوں!'' الی ین نے کہا۔

''نہیں، حضرات، بالکل نہیں۔ آپ لوگ جی بھر کر سو چکے ہیں لیکن میں دو راتیں نہیں سو سکا،'' ڈاکٹر نے کہا۔ وہ منہ پھلا کر اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا اور بازی کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔

افسروں نے جب اسے افسردہ و دل گیر بیوی کی طرف منہ لٹکائے دیکھا، وہ اور بھی ترنگ میں آ گئے اور ان کے لیے اپنی ہنسی دبانا ناممکن ہو گیا۔ لیکن وہ ہنس کیوں رہے تھے، ان میں سے چند ایک اگلے ہی لمحے اس کا قابل قبول جواز گھڑنے کی کوشش کرنے لگے۔ جب ڈاکٹر اپنی بیوی کے ساتھ رخصت ہو گیا اور وہ دونوں اپنی بند گاڑی میں لیٹ گئے، افسران مے خانے ہی میں دراز ہو گئے۔ انھوں نے اپنے گیلے اوور کوٹ اپنے اوپر ڈال لیے لیکن نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی اور وہ خاصی دیر تک سو نہ سکے۔ وہ آپس میں باتیں کرنے لگے۔ کبھی وہ ڈاکٹر کے اضطراب اور اس کی بیوی کی مسرت کا ذکر کرتے اور کبھی ان میں سے کوئی بھاگ کر پورچ میں جاتا اور واپس آ کر بتاتا کہ بند گاڑی میں کیا ہو رہا ہے۔ رستوف نے متعدد مرتبہ اپنا چہرہ ڈھانپا اور سونے کی کوشش کی کہ کوئی نہ کوئی افسر ایسی بات کہہ دیتا کہ اس کی آنکھ کھل جاتی، باتوں کا سلسلہ دوبارہ شروع ہو جاتا اور وہ ایک بار پھر احمقانہ، بچگانہ اور پرشور انداز سے قہقہے لگانے لگتے۔

14

تین بج چکے تھے لیکن ابھی تک کوئی بھی نہیں سویا تھا۔ اتنے میں کوارٹر ماسٹر حکم لے کر آ گیا کہ انھیں استرووِنا کے چھوٹے قصبے میں پہنچنا ہے۔

افسران ابھی تک باتیں کیے جا رہے اور قہقہے لگائے جا رہے تھے اور ساتھ ساتھ روانگی کی تیاریاں بھی کرتے جا رہے تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر سماوار میں گدلا پانی ابالا لیکن رستوف چائے کا انتظار کیے بغیر اپنے سکواڈرن کے ساتھ روانہ ہو گیا۔ اندھیرا چھٹ چکا تھا، بارش تھم چکی تھی اور آسمان پر بادل تتر بتر ہونے لگے تھے۔ موسم سرد اور مرطوب تھا۔ جب رستوف اور الی ین صبح کے دھندلکے میں مے خانے سے باہر نکلے، دونوں نے ڈاکٹر کی گیلی اور

بارش میں چمکتی پوشش کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر کے پاؤں ایپرن سے باہر نکلے ہوئے تھے۔ گاڑی کے اندر تکیے کے اوپر انھیں اس کی بیوی کی شبینہ ٹوپی کی جھلک دکھائی دی اور نیند میں اس کی سانسوں کے چلنے کی آواز سنائی دی۔

''وہ واقعی بہت نفیس عورت ہے،'' رستوف نے الی ین سے، جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، کہا۔

''پرکشش خاتون!'' الی ین نے سولہ سالہ لڑکے کی پوری سنجیدگی سے کہا۔

آدھ گھنٹہ بعد سکواڈرن سڑک پر صف بندی کر چکا تھا۔ حکم ''سوار ہو جاؤ!'' سنائی دیا، جوانوں نے سینوں پر صلیب کے نشانات بنائے اور گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔ رستوف نے جو سب سے آگے آگے جا رہا تھا، حکم دیا ''آگے بڑھو!'' اور ہوزاروں نے اپنے اپنے گھوڑوں کو ایڑ لگائی اور چل پڑے۔ ان کی تلواریں کھنکھنا رہی تھیں اور وہ مدھم سروں میں باتیں کر رہے تھے۔ ان کے گھوڑے کیچڑ میں چھینٹے اڑا رہے تھے۔ سڑک خاصی کھلی تھی اور اس کے دونوں کناروں پر برچ کے درخت لہلہا رہے تھے۔ چار چار سوار ایک دوسرے کے برابر برابر جا رہے تھے۔ ان کے آگے آگے توپ خانہ اور پیادہ فوج کے دستے تھے۔ وہ ان سے پہلے روانہ ہوئے تھے۔

شکستہ سرمئی بادل، جو مشرق میں طلوع آفتاب کی وجہ سے سرخ ہونے لگے تھے، ہوا کے آگے آگے بھاگے جا رہے تھے۔ روشنی میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ لہراتی بل کھاتی گھاس، جو ہمیشہ دیہی سڑکوں کے کناروں پر اگی رہتی ہے، دکھائی دینے لگی تھی۔ رات کی بارش کی وجہ سے وہ ابھی تک گیلی تھی۔ برچ کے درختوں کی نچلی جانب جھکی ہوئی شاخیں بھی ابھی تک بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ ہوا میں جھول رہی تھیں اور سڑک پر پانی کے درخشندہ قطرے گرا رہی تھیں۔ ہر گزرتے منٹ کے ساتھ جوانوں کے چہرے واضح سے واضح تر ہوتے چلے گئے۔ رستوف، الی ین کی، جو کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا، معیت میں برچ کے درختوں کی دونوں قطاروں کے بیچوں بیچ سڑک پر جا رہا تھا۔

رستوف جب جنگی خدمات سرانجام دے رہا ہوتا، وہ اتنی عیاشی ضرور کر لیتا کہ وہ رجمنٹ کے گھوڑے کی بجائے قازق گھوڑے پر سوار ہو جاتا۔ وہ شکاری تھا اور گھوڑوں کو خوب پہچانتا تھا۔ اس نے حال ہی میں ایک بہت عمدہ، جی دار گھوڑا دریائے ڈان کے گھاس کے میدانوں سے خریدا تھا۔ اس گھوڑے کا جسم مشکی لیکن اس کی دم اور ایال سفید تھیں۔ وہ اس پر سوار ہو کر ہر کسی کو پچھاڑ سکتا تھا۔ وہ جب بھی اس پر سواری کرتا، اسے بہت لطف آتا۔ وہ گھوڑے پر بیٹھا تھا اور گھوڑے کے بارے میں، صبح کے بارے میں، ڈاکٹر کی بیوی کے بارے میں سوچتا جا رہا تھا، لیکن اس کے سر پر جو خطرہ منڈلا رہا تھا، اس کی طرف اس کا دھیان ایک مرتبہ بھی نہ گیا۔

ابتدائی ایام میں اسے جب کبھی محاذ جنگ پر جانا ہوتا، اس کے پسینے چھوٹ جاتے تھے لیکن اب اسے خوف کا ذرہ برابر احساس نہیں تھا۔ وہ اس لیے نڈر نہیں تھا کہ کیونکہ اسے گولہ باری میں جانے کی عادت ہو چکی تھی (انسان خطرات کا کبھی عادی نہیں ہو سکتا)، بلکہ اس لیے کیوں کہ وہ سیکھ چکا تھا کہ خطرے کے سامنے اپنے خیالات کو کس طرح قابو میں رکھا جا سکتا ہے۔ اس نے اپنی تربیت کچھ اس طرح کر لی تھی کہ جب بھی اسے محاذ کی جانب جانا ہوتا، وہ ہر چیز کے متعلق سوچتا، لیکن وہ چیز۔ خطرہ، جس کا اسے سامنا کرنا ہوتا تھا۔ بظاہر اسے جس میں سب سے زیادہ

دلچسپی لینا چاہیے ہوتی، وہ اس کے بارے میں کچھ نہ سوچتا۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی دور میں وہ خواہ کتنی ہی کوشش کرتا، اپنے آپ کو بزدلی کے کتنے ہی تلخ طعنے دیتا، وہ یہ کیفیت کبھی اپنے اوپر طاری نہ کر سکتا۔ وقت کے ساتھ ساتھ یہ خود بخود پیدا ہوگئی تھی۔ اب وہ الی ین کی معیت میں برچ کے درختوں کے نیچے نیچے جا رہا تھا۔ کبھی کوئی شاخ اس کے ہاتھ میں آجاتی اور وہ اس کا ایک آدھ پتا توڑ لیتا، کبھی وہ اپنے پاؤں سے گھوڑے کے پہلو کو چھوتا یا اپنی گردن گھمائے بغیر اپنا پائپ، جو وہ ختم کر چکا ہوتا، اپنے عقب میں ہوزار کے سپرد کر دیتا، اور وہ یہ سب کچھ اتنے پرسکون اور لاپروایانہ انداز سے کر رہا تھا جیسے وہ محض تفریحاً گھڑسواری کر رہا ہو۔ جب کبھی اس کی نظر الی ین کے، جو گھبرا بھی رہا تھا اور بڑھ بڑھ کر باتیں بھی بنا رہا تھا، ہیجانی چہرے پر پڑتی، وہ تجربے سے خوف اور موت کی اس تکلیف دہ توقع کو، جس میں نوخیز لیفٹیننٹ مبتلا تھا، بھانپ جاتا اور سمجھ جاتا کہ صرف وقت ہی اس کی مدد کر سکے گا۔

جونہی بادلوں کے عقب میں آسمان کے صاف شفاف حصے پر سورج طلوع ہوا، ہوائیں بند ہوگئی جیسے اس میں طوفان کے بعد اس تابستانی صبح کے حسن میں رخنہ انداز ہونے کا یارانہ رہا ہو۔ درختوں سے پانی کے قطرے اب بھی گر رہے تھے لیکن اب یہ عموداً نیچے آرہے تھے اور ہر چیز ساکن تھی۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ افق پر نمودار ہوا اور بادل کے ایک لمبے اور پتلے ٹکڑے کے، جو اس کے اوپر لٹک رہا تھا، پیچھے غائب ہوگیا۔ چند منٹ بعد یہ پھر اپنا جلوہ دکھانے لگا لیکن اب اس کی آب و تاب پہلے سے کہیں بڑھ کر تھی اور جب یہ بلند ہوا، اس نے بادل کا اوپری کنارا کاٹ دیا۔ ہر چیز دغدغانے اور چمچمانے لگی، اور اس روشنی کے ساتھ ہی، جیسے اس کے جواب میں، آگے توپوں کی گھن گرج سنائی دینے لگی۔

پیشتر اس کے کہ رستوف کو کچھ سوچنے اور گولہ باری کے مقام کا، کہ وہ کتنی دور رہے، اندازہ لگانے کا موقع ملتا، کاؤنٹ اوسترمان طالسطائی[70] کا ایجوٹنٹ وٹبسک[71] سے سرپٹ گھوڑا دوڑاتا یہ حکم لایا کہ سڑک کے ساتھ ساتھ درمیانی رفتار سے آگے بڑھا جائے۔

سکواڈرن نے پیادہ دستوں اور توپ خانے کو، جنھوں نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی، جالیا اور پھر ان سے آگے نکل گیا۔ وہ پہاڑی سے نیچے اترا، ویران اور اجڑے گاؤں میں سے گزرتا اور ایک اور پہاڑی پر چڑھ گیا۔ گھوڑوں کو جھاگ دار پسینہ آنے لگا تھا اور سواروں کے چہرے تمتما رہے تھے۔

''ہالٹ! صفیں درست کر لو!'' گھڑسوار رجمنٹ کے کمانڈر کا حکم گونجا۔

''بائیں مڑو اور آگے بڑھو!'' آگے سے حکم سنائی دیا۔

اور ہوزار ہماری پوزیشن کی بائیں جانب چل دیے اور نیزہ بردار پولستانی سواروں کے، جو اگلی صفوں میں تھے، پیچھے رک گئے۔ دائیں طرف ہمارے پیادہ دستے گنجان کالم بنائے کھڑے تھے۔ یہ محفوظ دستے تھے۔ مزید اوپر، پہاڑی پر، بالکل افق کے ساتھ، بلور کی طرح شفاف فضا میں اپنی توپیں دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ صبح کی ترچھی کرنوں میں جگمگا رہی تھیں۔ سامنے، گھاٹی کے پار، غنیم کے کالم اور توپیں نظر آرہی تھیں۔ گھاٹی میں، جہاں ہماری ہراول

یونٹیں پہلے ہی غنیم سے برسرپیکار تھیں، گولیوں کے بہ سرعت تبادلے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

ان آوازوں پر، جو اس نے مدت سے نہیں سنی تھیں، رستوف بالکل اسی طرح نشاط وانبساط سے جھوم اٹھا جیسے آدمی انتہائی تیز موسیقی کی دھنیں سن کر جھوم جاتا ہے۔ دھڑ ڑ، دھڑ ڑ، دھڑ ڑ، گولیوں کی آوازیں گونج رہی تھیں، کبھی بیک وقت اور کبھی بہ سرعت یکے بعد دیگرے۔ ایک بار پھر چہار سو خاموشی چھا گئی اور ایک بار پھر کچھ اس قسم کی آواز سنائی دی جیسے کوئی شخص چھچھوندروں پر چل رہا ہو۔

ہوزار تقریباً ایک گھنٹہ اسی جگہ انتظار کرتے رہے۔ توپیں داغی جانے لگیں۔ کاؤنٹ اوسترمان طالسطائی گھوڑے پر سوار اپنے عملے کے ساتھ سکواڈرن کے عقب میں آیا، رکا، اس نے رجمنٹ کے کمانڈر سے چند الفاظ کہے اور توپوں کی جانب پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

اوسترمان طالسطائی کی روانگی کے بعد نیزہ بردار سواروں کے دستے میں حکم گونجنے لگا:

"حملے کے لیے صفیں درست کر لی جائیں۔"

پیادہ دستے، جو آگے تھے، پلاٹونوں میں تقسیم ہو گئے تاکہ گھڑ سواروں کو آگے بڑھنے کے لیے رستہ مل سکے۔ نیزہ بردار پولستانی سوار آگے بڑھنے لگے۔ ان کے نیزوں پر علم پھڑ پھڑا رہے تھے۔ وہ دلکی چلتے پہاڑی سے نیچے اتر رہے تھے، اور فرانسیسی سواروں کی، جواب نیچے بائیں جانب نظر آنے لگے تھے، سمت پیش قدمی کر رہے تھے۔

جونہی نیزہ بردار سوار پہاڑی سے نیچے اترے، ہوزاروں کو پہاڑی کے اوپر چڑھنے کا حکم ملا تاکہ توپ خانے کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ جونہی وہ اس جگہ، جو نیزہ بردار سواروں نے خالی کی تھی، پہنچے، سنسناتی، دھاں دھاں کرتی گولیوں کی بوچھاڑ شروع ہو گئی مگر وہ نشانے سے دور گر رہی تھیں۔

ان آوازوں نے، جو اس نے کافی عرصے سے نہیں سنی تھیں، رستوف پر فائرنگ کی سابقہ آوازوں سے بھی کہیں زیادہ پرلطف اور فرحت بخش اثر چھوڑا۔ وہ زین پر سیدھا تن کر بیٹھ گیا، اور پہاڑی سے میدان جنگ کا، جو اس کے سامنے کھلا پڑا تھا، جائزہ لینے اور جی جان سے نیزہ بردار سواروں کی حرکات کا مشاہدہ کرنے لگا۔ وہ نیچے فرانسیسی سواروں کے بالکل قریب پہنچ کر ان پر جھپٹے۔ دھوئیں میں افراتفری کے آثار دکھائی دیے۔ پانچ منٹ بعد نیزہ بردار سوار واپس بھاگے آ رہے تھے، لیکن ان کا رخ اس مقام کی، جہاں سے وہ گئے تھے، طرف نہیں تھا بلکہ وہ نسبتاً زیادہ بائیں جانب جا رہے تھے۔ نارنجی وردیوں میں ملبوس نیزہ بردار پولستانی سواروں کے بیچ میں اور ان کے عقب میں فرانسیسی سواروں کے، جو نیلی وردیوں میں ملبوس اور خاکستری گھوڑوں پر سوار تھے، جھمگٹ نظر آ رہے تھے۔

15

رستوف کی نظر شکاری کی نظر کی طرح تیز تھی۔ جن معدودے چند لوگوں نے فرانسیسی سواروں کو ہمارے نیزہ بردار سواروں کا تعاقب کرتے دیکھا، وہ ان میں شامل تھا۔ نیزہ بردار سواروں کے بے ترتیب ہجوم، جن کا فرانسیسی سوار

پیچھا کر رہے تھے، قریب سے قریب تر آتے جا رہے تھے۔ اگرچہ پہاڑی کی تلیٹی میں ان کی شکلیں بہت چھوٹی چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں، وہ جس طرح ایک دوسرے کو دھکیل رہے، ایک دوسرے سے آگے نکلنے کی کوشش کر رہے اور اپنی بندوقیں یا نیزے فضا میں لہرا رہے تھے، وہ سب کچھ اسے صاف نظر آ رہا تھا۔

رستوف کی نظروں کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے نگاہیں گاڑے یوں دیکھ رہا تھا جیسے کسی شکار کو دیکھ رہا ہو۔ اسے جبلی طور پر محسوس ہوا کہ اگر اس کے ہوزاروں نے اب فرانسیسیوں پر دھاوا بول دیا، تو مؤخر الذکر اس کی تاب نہیں لا سکیں گے، مگر یہ کام فی الفور، اسی وقت، کرنا ہوگا ورنہ بہت تاخیر ہو جائے گی۔ اس نے اپنے گرد و پیش نظریں دوڑائیں۔ اس کے قریب ایک کیپٹن، جس کی نگاہیں بھی نیچے سواروں پر جمی ہوئی تھیں، کھڑا تھا۔

آندرے سیواستیانچ،" رستوف نے کہا۔ "آپ جانتے ہیں کہ ہم انھیں گھیرے میں لے سکتے ہیں..."

"اس سے ہمارا مقصد حاصل ہو جائے گا،" کیپٹن نے جواب دیا۔ "درحقیقت ــ"

اس کی بات ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر رستوف نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور سکواڈرن کے آگے سرپٹ بھاگنے لگا۔ پیشتر اس کے کہ اسے حکم دینے کا موقع ملتا، اس کا سارا اسکواڈرن، جس کے اس معاملے میں جذبات اس سے مماثل تھے، اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ رستوف کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس نے یہ کیسے اور کیوں کیا۔ جیسا کہ وہ شکار کے دوران میں کرتا تھا، یہاں بھی اس نے سوچے سمجھے بغیر یا غور و فکر کیے بغیر عمل کیا۔ اس نے دیکھا کہ فرانسیسی سوار قریب ہیں، وہ سرپٹ بھاگے آ رہے ہیں اور ان کی صفیں درست نہیں ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ان پر حملہ کر دیا جائے تو وہ اس کی مقاومت نہیں کر سکیں گے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ واحد موقع ہے جب وہ کچھ کر سکتا ہے، لیکن اگر اس نے اسے گنوا دیا، پھر یہ کبھی ہاتھ نہیں آئے گا۔ اس کے قریب جو سنسناتی اور دھاں دھاں کرتی گولیاں گزری تھیں، انھوں نے اسے آمادۂ عمل کیا تھا اور اس کا گھوڑا وہاں سے ہٹنے کے لیے اتنا بے قرار تھا کہ وہ اس کی مزاحمت نہ کر سکا۔ اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی، چلا کر حکم دیا اور عین اس وقت اپنے سکواڈرن کے، جو اس کے پیچھے تعینات تھا، گھوڑوں کی ٹاپیں سن کر وہ خاصی رفتار سے پہاڑی سے نیچے اترنے اور فرانسیسی سواروں کی جانب بڑھنے لگا۔ وہ پہاڑی سے بمشکل نیچے اترے ہوں گے کہ ان کی رفتار خود بخود تیز سے تیز تر ہونے لگی، اور جوں جوں وہ ہمارے نیزہ بردار سواروں اور فرانسیسی سواروں کے، جو ان کا تعاقب کر رہے تھے، قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے، توں توں اس رفتار میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اب فرانسیسی سوار ان کے بالکل نزدیک تھے۔ ان میں سے جو لوگ سب سے آگے تھے، انھوں نے جب ہوزاروں کو اپنی طرف آتے دیکھا، وہ پیچھے مڑنے لگے اور جو ان کے پیچھے تھے، وہ اپنی اپنی جگہ رک گئے۔ بالکل اسی احساس کے ساتھ، جس کے ساتھ اس نے اپنا گھوڑا اس راستے پر، جس پر بھیڑیا گزر رہی تھی، سرپٹ دوڑایا تھا، رستوف نے اپنے ڈان گھوڑے کی لگامیں ڈھیلی چھوڑ دیں اور وہ فرانسیسی سواروں کی شکستہ صفوں کو روکنے کے لیے صبا رفتاری سے آگے بڑھا۔ ایک نیزہ بردار سوار رک گیا، دوسرا، جو پیدل تھا، تیزی سے زمین پر گر پڑا کہ کہیں وہ گھوڑے کے پاؤں تلے کچلا نہ جائے۔ ایک بے سوار گھوڑا

ہوزاروں کے ہاتھ آ گیا اور وہ اسے اپنے ساتھ ہانکنے لگے۔ تقریباً سبھی فرانسیسی سوار سرپٹ پیچھے بھاگ گئے۔
رستوف نے ایک خاکستری گھوڑے کو نظر میں لیا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ راستے میں ایک جھاڑی آ گئی اور اس کا دلیر گھوڑا جست لگا کر اسے صاف عبور کر گیا۔ ابھی وہ اپنی کاٹھی پر دوبارہ ٹھیک طرح بیٹھا بھی نہیں تھا کہ اس نے دیکھا کہ جس دشمن کو اس نے اپنے نشانے کے لیے منتخب کیا تھا، وہ اس سے صرف چند سیکنڈ کے فاصلے پر آ گئے ہے۔ یہ فرانسیسی، جو وردی سے افسر معلوم ہوتا تھا، اپنے گھوڑے پر دبکا بیٹھا تھا اور اپنے نیزے کی انی سے اسے تیزی اختیار کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔ پلک جھپکنے میں رستوف کے گھوڑے نے اپنا سینہ فرانسیسی افسر کے گھوڑے کی پچھاڑی سے ٹکرا دیا اور اسی لمحے رستوف نے، یہ جانے بغیر کہ کیوں، اپنا نیزہ اپنے حریف پر دے مارا۔
جونہی رستوف سے یہ فعل سرزد ہوا، اس کا سارا جوش و خروش تحلیل ہو گیا۔ افسر نیچے گر پڑا۔ اس کی وجہ سے یہ نہیں تھی کہ اسے نیزے سے کوئی گہرا گھاؤ آیا تھا۔ اس نے تو اس کے بازو کو کہنی سے ذرا اوپر معمولی سا زخمی کیا تھا۔ اس کے گرنے کا سبب یہ تھا کہ ایک تو اس کے گھوڑے کو ٹکر لگی تھی اور دوسرے وہ ڈر گیا تھا۔ رستوف نے اپنا گھوڑا روک لیا اور اس کی نگاہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ اس نے کس قسم کے آدمی کو چت کیا ہے، اپنے دشمن کو ڈھونڈنے لگیں۔ فرانسیسی افسر یوں اچھل کود رہا تھا کہ اس کا ایک پاؤں زمین پر تھا اور دوسرا رکاب میں پھنسا ہوا تھا۔ اس نے رستوف کی جانب دیکھا اور خوف سے اس کی آنکھیں سکڑ گئیں۔ وہ کچھ یوں دبکا ہوا تھا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کسی بھی آن اسے ایک اور ضرب لگائی جا سکتی ہے۔ اس کا کیچڑ سے اٹا ہوا زرد چہرہ — یہ خوبصورت اور بالکل نوخیز لڑکے کا چہرہ تھا، آنکھیں ہلکی نیلی اور ٹھوڑی میں گڑھا تھا۔ قطعی معاندانہ نہیں تھا اور نہ یہ جنگ کے لیے موزوں تھا، بلکہ یہ تو انتہائی بھولا بھالا اور جانی پہچانی قسم کا چہرہ تھا۔ پیشتر اس کے کہ رستوف یہ فیصلہ کر پاتا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جانا چاہیے، وہ افسر چلا کر بولا: ''میں ہتھیار ڈالتا ہوں!'' اس نے رکاب سے اپنا پاؤں چھڑانے کے لیے دیوانہ وار زور لگایا لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔ دریں اثنا اس کی سہمی سہمی نیلی آنکھیں رستوف کے چہرے پر گڑی رہیں۔ چند ہوزار گھوڑے دوڑاتے آئے، انھوں نے اس کا پاؤں آزاد کرایا اور اسے کاٹھی پر بیٹھنے میں مدد دی۔ چاروں اطراف رستوف کے ہوزار فرانسیسی سواروں سے نپٹنے میں مصروف تھے۔ ایک فرانسیسی سوار زخمی ہو گیا اور اگرچہ اس کے چہرے سے خون بہہ رہا تھا، وہ اپنا گھوڑا چھوڑنے پر آمادہ نہیں تھا۔ ایک دوسرا ایک ہوزار کے گھوڑے کی دمچی پر چڑھ گیا اور اس نے اپنے بازو سوار کے گرد حمائل کر دیے۔ ادھر فرانسیسی سوار بھاگ رہے تھے اور ادھر سامنے فرانسیسی پیادے دھڑا دھڑ گولیاں چلا رہے تھے۔ ہوزار تین قیدیوں سمیت بہ عجلت پچھلی جانب بھاگ پڑے۔ دوسروں کے ساتھ رستوف بھی جا رہا تھا۔ اسے یہ احساس کھائے جا رہا تھا کہ اس کے دل پر کوئی بوجھ ہے، کوئی مبہم اور پراگندہ چیز، جس کی وہ توجیہہ کرنے سے قاصر تھا، اس وقت اس پر غالب آ گئی تھی جب اس نے قیدی کو پکڑا اور اسے ضرب رسید کی تھی۔
کاؤنٹ اوسترمان۔ طالسطائی ہوزاروں سے، جو واپس لوٹ رہے تھے، ملا۔ اس نے رستوف کو بلایا، اس کا

شکریہ ادا کیا اور اسے بتایا کہ وہ اس کے دلیرانہ کارنامے کے بارے میں فرماں روائے مملکت کو رپورٹ ارسال کرے گا اور سفارش کرے گا کہ اسے تمغہ سینٹ جارج کراس عطا کیا جائے۔ جب رستوف کو کاؤنٹ اوسترمان طالسطائی کا پیغام ملا تھا، اسے یاد آیا کہ اس نے حکم کے بغیر حملہ کیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے کمانڈنگ افسر نے اسے ڈانٹ ڈپٹ پلانے کے لیے بلایا ہے کیونکہ اس نے ڈسپلن کی خلاف ورزی کی تھی۔ چنانچہ اوسترمان طالسطائی کے تعریفی الفاظ اور اس کا انعام کا وعدہ اسے اور بھی خوشگوار محسوس ہونے چاہئیں تھے لیکن اخلاقی متلی کا مبہم اور ناخوشگوار احساس اب تک اسے ستا رہا تھا۔ "آخر مجھے پریشانی کس بات کی ہے؟" اس نے جنرل سے ملاقات کے بعد واپسی پر اپنے آپ سے پوچھا۔ "الی ین؟ نہیں۔ وہ صحیح سلامت ہے۔ کیا مجھ سے کوئی موجب خجالت حرکت سرزد ہوئی ہے؟ نہیں، ایسا بھی نہیں ہے۔" پشیمانی سے ملتی جلتی کوئی اور چیز اسے غصہ دلا رہی تھی۔ "ارے ہاں، وہ فرانسیسی افسر، وہی، جس کا چاہ ذقن ہے۔ اور مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں نے بازو اٹھایا تھا، میں نے کچھ تذبذب دکھایا تھا۔"

رستوف کی نظر قیدیوں پر، جنھیں کہیں لے جایا جا رہا تھا، پڑی۔ وہ گھوڑا بھگاتا اس فرانسیسی افسر کی، جس کی ٹھوڑی پر گڑھا تھا، جھلک دیکھنے ان کے پیچھے بھاگا۔ وہ اپنی عجیب وغریب وردی میں ہوزاروں کے لدو گھوڑے پر بیٹھا تھا اور بے قراری سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ نیزے نے اس کے دائیں بازو پر جس طرح خراش ڈالی تھی، اسے زخم بمشکل ہی کہا جا سکتا تھا۔ اس نے رستوف کو بناوٹی مسکراہٹ سے دیکھا اور علیک سلیک کے لیے اپنا بازو لہرایا۔ رستوف کو ابھی تک بے چینی محسوس ہو رہی تھی جیسے کوئی چیز اس کے ضمیر پر بوجھ بنی ہوئی ہو۔

اس روز بھی اور اس سے اگلے روز بھی اس کے دوستوں اور ساتھیوں کے مشاہدے میں یہی آیا کہ رستوف صحیح معنوں میں افسردہ یا چڑچڑا تو نہیں لیکن وہ کھل کر باتیں بھی نہیں کر رہا، اپنے ہی خیالوں میں کھویا ہوا ہے اور مسلسل کچھ سوچے جا رہا ہے۔ اس نے مے نوشی میں بھی کوئی خاص دلچسپی نہ لی، بس تنہا رہنے کی کوشش کرتا رہا اور اپنی ادھیڑ بن میں مصروف رہا۔

رستوف اپنے اس درخشندہ کارنامے کے، جس نے اسے سینٹ جارج کراس ہی نہیں دلایا تھا حالانکہ اسے اس پر، اچنبھا بھی ہوا تھا، بلکہ شجاعت کی شہرت بھی عطا کی تھی، متعلق سوچتا رہا۔ اس میں کوئی ایسی بات تھی جسے وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ "تو وہ ہم سے بھی زیادہ خائف ہیں!" اس نے سوچا۔ "پھر ہیروازم کا مفہوم کیا ہے؟ کیا میں نے یہ واقعی اپنے وطن کے لیے کیا تھا؟ وہ جس کی آنکھیں نیلی اور جس کی ٹھوڑی پر گڑھا تھا، اس کا کیا قصور تھا؟ وہ کتنا سہا ہوا تھا؟ اس کا خیال تھا کہ میں اسے موت کے گھاٹ اتار دوں گا۔ آخر میں اسے کیوں ہلاک کرتا؟ میرا تو ہاتھ کانپنے لگا تھا۔ اور یہ مجھے سینٹ جارج کراس دے رہے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ بالکل سمجھ میں نہیں آتا۔"

لیکن جب نکولائی ان سوالات پر مغز کھپائی کر رہا تھا اور جو چیز اسے پریشان کر رہی تھی، اس کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہیں آ رہا تھا، ملازمت میں قسمت کا چکر، جیسا کہ اکثر ہوتا ہے، اس کے حق میں گھوم رہا تھا۔ اوسترودونا کے واقعے کے بعد اس کی قدر شناسی ہوئی، اسے ہوزاروں کی ایک بٹالین کا کمانڈر بنا دیا گیا اور جہاں کسی دلیر افسر کی

ضرورت محسوس ہوتی تھی، قرعۂ فال اسی کے نام نکلتا تھا۔

16

جونہی کاؤنٹس کو نتاشا کی علالت کی اطلاع ملی، حالانکہ وہ خود ابھی تک پوری طرح صحت یاب نہیں ہوئی تھی، اور اس کے جسم میں طاقت نہیں آئی تھی، وہ پیتیا اور باقی افراد خانہ کے ساتھ عازم ماسکو ہوگئی۔ رستوفوں کا سارا خاندان ماریا دمتریونا کے گھر سے اپنے گھر منتقل ہوگیا اور وہ شہر میں قیام پذیر ہوگئے۔

نتاشا کی علالت اتنی سنگین تھی کہ اسے اس کی اور اس کے والدین کی خوش نصیبی سمجھنا چاہیے کہ وہ تمام باتیں۔۔ اس کا رویہ اور اس کا اپنی نسبت کو منسوخ کرنا۔۔ جو اس کا موجب بنی تھیں، پس منظر میں تحلیل ہوگئیں۔ ان کے لیے یہ سوچنا ممکن نہیں رہا تھا کہ جو کچھ ہوا تھا، اس کے لیے وہ کتنی قصوروار تھی جب کہ اس کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ نہ کھا سکتی تھی اور نہ سو سکتی تھی۔ بظاہر وہ روز بروز نحیف سے نحیف تر ہوتی جارہی تھی، کھانستی رہتی تھی اور ڈاکٹروں نے اشاروں کنایوں سے انھیں سمجھا دیا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے۔ اب انھیں صرف ایک ہی فکر ستائے جا رہی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح صحت یاب کیا جائے۔ اس کے علاوہ انھیں اور کوئی بات سوجھتی ہی نہیں تھی۔ ڈاکٹروں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ کبھی وہ اکیلے اکیلے آتے اور کبھی ایک دوسرے کے ساتھ۔ وہ آپس میں مشورے کرتے، جرمن، فرانسیسی اور لاطینی زبانوں میں طویل گفتگوئیں کرتے اور ایک دوسرے کو تنقید کا نشانہ بناتے۔ وہ انتہائی مختلف اقسام کے نسخے، جن کا اطلاق ان تمام امراض پر جن سے وہ آگاہ تھے، ہوسکتا تھا، تجویز کرتے۔ لیکن ان میں سے کسی کے بھی ذہن میں یہ سیدھا سادا خیال نہ آیا کہ نتاشا جس مرض میں مبتلا تھی، ممکن ہے کہ انھیں اس کا علم ہی نہ ہو کیونکہ کوئی بھی ذی روح جس مرض میں مبتلا ہوتا ہے، اسے مکمل طور پر کبھی نہیں جانا جاسکتا کیونکہ ہر ذی روح کے اپنے انفرادی خصائص ہوتے ہیں اور اس کا مرض خواہ کیسا ہی ہو، ہمیشہ اسی کے لیے مخصوص ہوتا ہے، نیا، پیچیدہ مرض، جس سے طب آگاہ نہیں ہوتی۔۔ مرض محض پھیپھڑوں، جگر، جلد، قلب، اعصاب، علیٰ ہذاالقیاس، کا، جیسا کہ طبی کتابوں میں مندرج ہوتا ہے، نہیں ہوتا، بلکہ ان اعضا کی بے قاعدگیاں یک جائی کی جو لاتعداد صورتیں اختیار کرتی ہیں، ان میں سے ایک صورت ہوتا ہے۔ ڈاکٹروں کے اذہان میں یہ سیدھا سادا خیال کبھی بار نہیں پا سکتا تھا (بالکل اسی طرح، جس طرح کسی جادوگر کے دماغ میں کبھی یہ خیال نہیں سما سکتا کہ اس کا جادو نا کام رہا ہے) کیونکہ طب کی پریکٹس ان کی زندگی بھر کا مشغلہ تھا، انھیں اس کا معاوضہ ملتا تھا اور انھوں نے اپنی زندگی کے بہترین سال اس میں کھپائے تھے۔ لیکن یہ خیال ان کے اذہان میں کیوں بار نہیں پا سکتا تھا، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ لاریب وہ بہت کام کے لوگ ہیں اور ان کا وجود بہت راحت ساں ہے۔ اور حقیقتاً وہ رستوف خاندان کے لیے بہت سودمند بنے ہوئے تھے۔ وہ محض اس لیے سودمند ثابت نہیں ہو رہے تھے کہ وہ مریضہ کو ایسی ایسی اشیا، جو زیادہ تر ضرر رساں ہوتی تھیں (ان سے جو ضرر پہنچتا تھا، اس کا اندازہ لگانا اتنا آسان نہیں تھا کیونکہ ان کی مقدار بہت خفیف

ہوتی تھی)، کھلا پلا دیتے تھے بلکہ ان کا وجود اس لیے فائدے مند، ضروری اور ناگزیر تھا کیونکہ وہ مریض دوشیزہ اور اس کے لواحقین کی، جو اس سے محبت کرتے تھے، اخلاقی ضرورت پوری کررہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا میں نیم حکیم، سیانی عورتیں، ہومیو پیتھ اور ایلو پیتھ ہمیشہ موجود رہے ہیں اور موجود رہیں گے۔ انسان پر جب بھی افتاد پڑتی ہے، وہ ہمیشہ تسکین کی ضرورت محسوس کرتا ہے، ہمدردی ڈھونڈتا ہے، عمل چاہتا ہے اور یہ ڈاکٹر یہی ابدی انسانی ضرورت پوری کررہے تھے۔ وہ اس ابدی انسانی ضرورت کی، جو انتہائی ابتدائی صورت میں بچوں میں نظر آتی ہے، تسکین فراہم کررہے تھے۔ بچوں کو اگر معمولی سی بھی چوٹ آجائے، تو وہ چاہتے ہیں کہ کوئی ان پر دست شفقت پھیرے، انھیں سہلائے اور ان کی اذیت کو کم کرے۔ چنانچہ جب بچہ زخمی ہوتا ہے، وہ فوراً ماں یا آیا کی طرف بھاگتا ہے کہ وہ اسے اپنے بازوؤں میں اٹھالے اور زخمی جگہ کو چومے یا سہلائے۔ وہ یہ مان ہی نہیں سکتا کہ ان اشخاص کے، جو اس سے کہیں زیادہ عقلمند اور قوی ہیں، پاس اس کی تکلیف کا کوئی علاج نہیں ہے۔ اسے محض اس امید سے کہ اس کی تسکین کا سامان فراہم کردیا جائے گا اور اس کی ماں کے چہرے پر، جب وہ اس کی چوٹ سہلا رہی ہوتی ہے، ہمدردی کا جو تاثر ہوتا ہے، اس سے اس کی تشفی ہوجاتی ہے۔ نتاشا کے لیے ڈاکٹر اس لیے مفید تھے کیونکہ وہ اس کے ''مقامِ تکلیف'' کو چومتے تھے، سہلاتے تھے اور اسے یقین دلاتے تھے کہ اس کی ساری تکلیف رفع ہوجائے گی بشرطیکہ کوچوان لپک کر آرباط سکوائر میں کیمسٹ کے ہاں سے ایک روبل ستر کوپک کی خوبصورت ڈبیوں میں بند چند سفوف اور گولیاں لے آئے اور وہ ان سفوفوں کو کم نہ زیادہ بس ہر دو گھنٹے بعد ابلے ہوئے پانی میں حل کرکے پی جائے۔

اگر سونیا، کاؤنٹ اور کاؤنٹس کے پاس کرنے کو کچھ نہ ہوتا، اگر انھیں ڈاکٹروں کے تجویز کردہ نسخوں کے مطابق نتاشا کو گھڑی کے حساب سے گولیاں نہ کھلانا ہوتیں، اسے دوائیں نہ پلانا ہوتیں، چکن کٹ لٹ (Cutlet) اور اس قسم کی دیگر اشیا تیار نہ کرنا ہوتیں، پھر ان کا کیا بنتا؟ ان کے پاس نتاشا کو، جو روز بروز کمزور اور ناتواں ہوتی جارہی تھی، دیکھنے کے علاوہ اور کوئی کام نہ ہوتا، تو وہ بڑی مصیبت میں پھنس جاتے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کام انھیں مصروف رکھتے اور ان کی تسکین کا سامان فراہم کرتے۔ ڈاکٹروں کے احکام جتنے زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور جتنی زیادہ احتیاط کا تقاضا کرنے لگے، خاندان کے ارکان کی اتنی ہی تشفی ہوتی رہی۔

اگر کاؤنٹ کو یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کی چہیتی بیٹی کی بیماری پر اس کے ہزاروں روبل اٹھ رہے ہیں اور اگر اس کی صحت بحال کرانے کے لیے اسے مزید ہزاروں روبل خرچ کرنا پڑے، تو وہ دریغ نہیں کرے گا، تو وہ اسے (بیماری) کو کیسے جھیل سکتا تھا؟ اور یا اگر اسے یہ معلوم نہ ہوتا کہ اتنا کچھ خرچ کرنے کے بعد بھی وہ ٹھیک نہ ہوئی اور اسے اس کے ساتھ مشورے کے لیے ممالک غیر کا سفر اختیار کرنا پڑا اور اس سفر پر مزید ہزاروں روبل کا خرچہ برداشت کرنا پڑا، تو بھی وہ ناک بھوں نہیں چڑھائے گا، یا وہ لوگوں کو بالتفصیل یہ بتا سکتا کہ کس طرح میتی ویئے اور فیلر جیسے لوگ علامات مرض پہنچانے میں ناکام رہے ہیں لیکن فریس انھیں سمجھ گیا ہے اور مدروف اس سے بھی زیادہ کامیاب رہا ہے، اس کے روز و شب کیسے گزر سکتے تھے؟ اور اگر کاؤنٹس کو کبھی کبھار مریضہ کو ڈانٹ پلانے کا موقع نہ

مانا کہ اس نے ڈاکٹر کی ہدایت پر لفظاً اور معناً عمل نہیں کیا، پھر وہ کیا کرتی؟

"اگر تم نے ڈاکٹر کی ہدایات پر عمل نہ کیا اور مقررہ اوقات پر ادویات کھائیں نہ پئیں، پھر تم کبھی ٹھیک نہیں ہو سکو گی!" وہ کہتی اور یوں اسے جھلاہٹ کے پردے میں اپنا دکھ چھپانے کا موقع مل جاتا۔ "تم جانتی ہو کہ تم ان چیزوں کے بارے میں غیر سنجیدہ رویہ نہیں اختیار کر سکتیں، ورنہ تمھیں نمونیا بھی ہو سکتا ہے۔" وہ کہتی رہتی اور اس لفظ کو، جو دوسروں کے لیے اور اس کے اپنے لیے بھی غیر فہم تھا، ادا کر کے بہت خوش ہوتی۔

اور سونیا کا کیا بنتا اگر اسے یہ مسرت بخش آگہی نہ ہوتی کہ اسے پہلی تین راتیں علی التواتر اتنا موقع بھی نہ مل سکا کہ وہ اپنا لباس ہی تبدیل کر لیتی کیونکہ اسے ڈاکٹر کے احکام کی فوری تعمیل کے لیے ہر دم تیار رہنا ہوتا تھا اور یہ کہ وہ اب بھی رات رات بھر جاگتی رہتی ہے کہ کہیں اس سے نتاشا کو عین وقت پر وہ گولیاں، جو مرصع ڈبے میں رکھی تھیں، اور اتنی ضرر رساں نہ تھیں، دینے میں چوک نہ ہو جائے؟

اور خود نتاشا بھی، اگرچہ وہ کہتی یہی تھی کہ اسے کوئی دوا فیض نہیں پہنچا سکے گی اور یہ سب بکواس ہے، یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتی تھی کہ اس کے لیے اتنی قربانیاں دی جا رہی ہیں۔ اس کے لیے یہ امر بھی باعث مسرت تھا کہ اسے مقررہ اوقات پر ادویات کھانا پینا ہیں، یہی نہیں بلکہ یہ بات بھی خوشگوار تھی کہ ہدایات کے بارے میں لاپروائی برت کر وہ یہ جتا سکتی ہے کہ وہ طبی علاج کو نہیں مانتی اور اپنی زندگی کو کوئی اہمیت نہیں دیتی۔

ڈاکٹر ہر روز آتا، اس کی نبض دیکھتا، اس کی زبان کا معائنہ کرتا اور اس کے افسردہ چہرے کو نظر انداز کر کے اس سے ہنسی مذاق کرتا۔ لیکن اس کے بعد جب وہ ملحقہ کمرے میں چلا جاتا اور کاؤنٹس لپک جھپک اس کے پیچھے پیچھے آ جاتی، وہ اپنے چہرے پر سنجیدگی اور متانت طاری کر لیتا، فکر مند انداز سے اپنے سر کو جنبش دیتا اور کہتا: "اگرچہ مریضہ کی حالت خاصی نازک ہے، تاہم مجھے امید ہے کہ اب کے میں نے جو دوا تجویز کی ہے، وہ اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔ اب ہمیں انتظار کرنا اور دیکھنا ہوگا۔ دراصل مریضہ کی بیماری نفسیاتی زیادہ ہے اور..." اور کاؤنٹس ایک طلائی سکہ اس کے ہاتھ میں کھسکا دیتی لیکن اس کی کوشش یہی ہوتی کہ اس کے اس فعل کا احساس نہ ڈاکٹر کو ہونے پائے اور نہ خود اسے۔ اس کے بعد وہ ہلکے پھلکے دل کے ساتھ مریضہ کے کمرے میں واپس لوٹ جاتی۔

نتاشا کے مرض کی علامات یہ تھیں: اس کی بھوک ختم ہو گئی تھی، اسے راتوں کو نیند نہیں آتی تھی، وہ ہر وقت کھانستی رہتی تھی اور اس پر افسردگی طاری رہتی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ طبی علاج کے بغیر اس کا بچنا مشکل ہے۔ چنانچہ انھوں نے اسے شہر کی فضا میں، جہاں آدمی کا ویسے ہی دم گھٹنے لگتا ہے، روکے رکھا۔ یوں رستوف 1812 کی گرمیاں گاؤں نہ گئے۔

نتاشا نے بے حساب گولیاں کھائیں۔ شیشیوں اور ڈبیوں میں سے، جنھیں مادام شوس کو جمع کرنے کا جنون تھا، مسلسل سفوف کھائے اور ادویات کے قطرات حلق میں انڈیلے۔ اسے دیہات کی تازہ فضا میں، جس کی وہ عادی تھی، سانس لینے سے بھی محروم رکھا گیا۔ لیکن ان تمام امور کے باوجود شباب غالب آیا۔ نتاشا کا غم روز مرہ کے

واقعات اور تاثرات میں ڈوب گیا اور اس کے دل پر مزید بوجھ نہ بنا۔ اس کی تکلیف آہستہ آہستہ ماضی میں تحلیل ہونے لگی اور جسمانی طور پر اس کی صحت بحال ہوتی چلی گئی۔

17

نتاشا پہلے کی نسبت پرسکون ضرور تھی لیکن اس کی طبیعت کی مردنی دور نہیں ہو سکی تھی۔ وہ نہ صرف مسرت و بہجت کے خارجی مظاہر — اجتماعی رقص، سیر سپاٹا، محافل موسیقی، تھیٹر — سے اجتناب برتتی تھی بلکہ جب کبھی وہ ہنستی بھی تھی، اس میں آنسوؤں کی آمیزش ضرور ہوتی تھی۔ وہ نغمہ سرائی نہیں کر سکتی تھی۔ جب کبھی اس نے ہنسنا یا تنہائی میں گانا گانا چاہا، اشکوں سے اس کا گلا رندھ جاتا۔ یہ آنسو ندامت کے تھے، معصومیت کے ان ایام کی، جنھیں واپس نہیں لایا جاسکتا تھا، یادوں پر تاسف کے تھے۔ وہ جھلاتی اور کڑھتی کہ اس نے اپنے شباب کی زندگی، جس میں مسرتوں کے رنگ بھرے جاسکتے تھے، لاابالی انداز سے پامال کر دی تھی اور اس کی آنکھیں اشک آلود ہو جاتیں۔ خندہ زنی اور نغمہ آرائی اسے خاص طور پر چبھتے۔ وہ جب کبھی ہنستی یا گانا گانے کی ہمت کرتی، اسے یوں محسوس ہوتا کہ وہ اپنی ان حرکات سے اپنے غم کو نجس کر رہی ہے۔ جہاں تک غمزہ و عشوہ گری کا تعلق ہے، اس معاملے میں ضبط کرنے کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی — اس طرح کا کوئی خیال کہ کوئی اس کی تعریف کرے، بھولے بھٹکے بھی اس کے ذہن میں نہیں آتا تھا۔ اس زمانے میں وہ کہتی بھی یہی تھی اور محسوس بھی یہی کرتی تھی کہ مسخرے نستاسیا ایوانوونا کی طرح مردوں کی اس کے نزدیک بھی کوئی اہمیت نہیں۔ کوئی داخلی چوکیدار پہرے پر تعینات تھا اور اسے ہر نوع کی مسرت سے لطف اندوز ہونے سے روک رہا تھا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اپنے تفکرات سے آزاد لڑکپن میں، جو امیدوں سے اتنا بھرپور تھا، اسے جن چیزوں میں دلچسپی تھی، اب اس کے لیے عنقا ہو گئی تھیں۔ وہ یادیں، جو بار بار اس کے ذہن میں آتیں اور اس کے لیے سخت اذیت کا باعث بنتیں، خزاں کے ان مہینوں کی تھیں، جب وہ اترادنایا میں نکولائی کے ساتھ شکار پر گئی تھی، "چچا" سے ملی تھی اور کرسمس کی چھٹیاں اس کے ساتھ گزاری تھیں۔ اس زمانے کا اگر ایک دن بھی اسے لوٹا دیا جاتا، تو وہ کیا کچھ دینے کو تیار نہ ہو جاتی! لیکن اب یہ زمانہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بیت چکا تھا۔ آئندہ کے مصائب کے بارے میں اس کا جو ماتھا ٹھنکا تھا، ان کے متعلق اسے کوئی دھوکا نہیں ہوا تھا، اسے محسوس ہو گیا تھا کہ آزادی کی کیفیت اور ہر مسرت سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت کبھی واپس نہیں آئے گی۔ لیکن انسان، انسان ہے، اسے کسی ڈھب زندہ تو رہنا ہے۔

اسے یہ سوچ کر تسلی ہوتی تھی کہ اس کی حالت، جیسا کہ اسے ایک مرتبہ خیال آیا تھا، بہتر نہیں ہوئی ہے، بلکہ دنیا کے کسی بھی انسان سے بدتر، کہیں بدتر ہے۔ لیکن اتنا کافی نہیں تھا۔ اسے معلوم تھا اور وہ اپنے آپ سے پوچھتی رہتی تھی: "اس کے بعد کیا ہوگا؟" لیکن اب رکھا ہی کیا تھا — زندگی مسرتوں سے خالی تھی اور زندگی گزرتی جارہی تھی۔ نتاشا کی صریحاً سوچ یہ تھی کہ وہ کسی پر بوجھ نہ بنے، کسی کے راستے میں دیوار نہ بنے، لیکن وہ اپنے لیے کچھ نہیں

چاہتی تھی۔ وہ گھر کے کسی فرد سے گھلتی ملتی نہیں تھی۔ اس کا بھائی، پیتیا، واحد شخص تھا جس کی موجودگی میں اسے اطمینان محسوس ہوتا تھا۔ وہ کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت اس کی صحبت کو ترجیح دیتی اور جب اس کے ساتھ تنہا ہوتی، کبھی کبھار ہنس بھی پڑتی، وہ گھر سے شاذ ہی باہر جاتی تھی اور جو لوگ اس سے ملنے آتے تھے، ان میں پیئر واحد شخص تھا جس کو دیکھ کر اسے واقعی خوشی ہوتی تھی۔

نتاشا کے ساتھ اپنے برتاؤ میں جس نوعیت کی ملائمت، احتیاط اور اس کے ساتھ ہی سنجیدگی کاؤنٹ بزوخوف روا رکھتا تھا، کسی اور کے لیے اس سے زیادہ کا مظاہرہ کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ غیر شعوری طور پر اس شفقت آمیز ملائمت کے سحر میں آتی گئی۔ نتیجتاً اسے اس کی صحبت میں بڑی راحت ملنے لگی۔ لیکن وہ اس بات کے لیے اس کی احسان مند بھی نہیں تھی — وہ یہ محسوس کرتی تھی کہ پیئر کو دوسروں کے ساتھ نیک سلوک کرنے میں کوئی کوشش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کا یہ رویہ اتنا فطری ہوتا تھا کہ اس کے حسنِ خلق میں کوئی خاص خوبی نظر نہیں آتی تھی۔ بعض اوقات نتاشا کو، جب وہ اس کے پاس ہوتا، اس کے رویے میں خاص قسم کا حجاب اور کڈھب پن دکھائی دیتا، خاص طور پر جب وہ اسے خوش کرنے کے لیے کچھ کرنا چاہ رہا ہوتا یا وہ یہ اندیشہ محسوس کرنے لگتا کہ اس کے منہ سے کوئی ایسی بات، جو ان چیزوں کی یادیں تازہ کردے، جو اس کے لیے تکلیف دہ تھیں، نہ نکل جائے۔ وہ یہ سب کچھ دیکھتی تھی اور اسے اس کی عمومی رحم دلی اور شرمیلے پن پر محمول کرتی تھی۔ ان چیزوں کے بارے میں اس نے یہ مفروضہ گھڑ لیا تھا کہ باقی لوگوں کے ساتھ بھی اس کا رویہ ایسا ہی ہوگا۔ اپنے اس غیر ارادی اعلان — کہ اگر وہ آزاد ہوتا، تو وہ گھٹنوں کے بل جھک کر اس سے شادی اور محبت کی بھیک مانگتا — کے بعد، جس کا اظہار اس نے ایک ایسے موقع پر کیا تھا، جب وہ بے حد ہیجانی کیفیت میں مبتلا تھی، پیئر نے کبھی دوبارہ اپنے جذبات کا اظہار نتاشا کے سامنے نہیں کیا تھا اور وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ اس کے یہ الفاظ، جنھوں نے اس وقت اسے اتنی تسکین فراہم کی تھی، اسی طرح ادا کیے گئے تھے جیسے آدمی روتے بچے کو تشفی دینے کے لیے ہر قسم کی بے شمار لایعنی اور فضول باتیں کہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ پیئر شادی شدہ آدمی تھا، بلکہ یہ تھی کہ نتاشا کو اپنے اور کوراگن کے مابین جو اخلاقی رکاوٹ عدم موجود معلوم ہوئی تھی، اپنے اور پیئر کے مابین پوری مضبوطی اور قوت سے کھڑی نظر آرہی تھی۔ چنانچہ یہ بات کبھی بھولے سے بھی اس کے ذہن میں نہ آئی کہ ان کے مابین جو تعلقات ہیں، وہ، جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے، کبھی محبت میں تبدیل ہوسکیں گے اور جہاں تک پیئر کا تعلق تھا، تو اسے اس کا اس کے ساتھ محبت کرنے کا سوال ہی خارج از بحث نظر آتا، اور نہ اسے اپنے دونوں کے بیچ اس طرح کی ملائم، خود شعوری، رومانوی دوستی، جو کسی مرد اور عورت کے مابین استوار ہوسکتی ہے اور جس کی متعدد مثالیں اس کے علم میں تھی، ممکن دکھائی دیتی تھی۔

سینٹ پیٹر[72] کے ایام صیام[73] کے اختتام کے قریب رستوفوں کی ایک دیہاتی پڑوسن اگرافینا ایوانوونا بیالووا بزرگانِ دین کے مقبروں کی زیارت اور سلام کے لیے ماسکو آئی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ نتاشا روزے رکھے اور اس کے ساتھ عشائے ربانی میں شرکت کی تیاری کرے۔ نتاشا نے زور شور سے اس تجویز کی پذیرائی کی۔ اگرچہ

ڈاکٹروں نے اس کے صبح سویرے باہر نکلنے پر پابندی لگا رکھی تھی، اس نے روزے رکھنے اور عشائے ربانی میں شرکت کے لیے تیار ہونے پر اصرار کیا۔ یہ عشائے ربانی اس قسم کی نہیں تھی جس کا رستوفوں کے گھرانے میں رواج تھا کہ وہ اپنے ہی گھر پر تین مذہبی تقریبات منعقد کر لیتے تھے، بلکہ اس میں اس طرح شریک ہونا تھا جس طرح اگر افینا ایوانوونا شریک ہوتی تھی۔ انھیں پورے ہفتے ہر روز گرجے جانا اور تسبیحِ صبح، عبادتِ شام اور عشائے ربانی سبھی میں حاضری دینا اور ان میں سے کسی ایک میں بھی ناغہ نہیں کرنا تھا۔

کاؤنٹس کو نتاشا کا جوش اور ولولہ بہت پسند آیا۔ طبی علاج کے غیر مؤثر ہونے کے بعد وہ یہ امید کرنے لگی تھی کہ جو کام دواؤں سے نہ ہو سکا، وہ دعائیں کر دکھائیں گی۔ اگرچہ اس کا دل اندیشوں اور وسوسوں سے معمور رہتا تھا لیکن اس نے ڈاکٹروں کے سامنے کبھی ان کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اب اس نے نتاشا کی خواہشات سے اتفاق کیا اور اسے بیالووا کے سپرد کر دیا۔

[74]

جب اگرافینا ایوانوونا صبح تین بجے اسے جگانے آتی، عام طور پر وہ یہی دیکھتی کہ نتاشا پہلے ہی بیدار ہو چکی ہے۔ نتاشا کو یہ اندیشہ دامن گیر رہتا کہ کہیں وہ سوتی ہی نہ رہ جائے اور تسبیح صبح کا ناغہ ہو جائے۔ وہ جلدی جلدی ہاتھ منہ دھوتی اور بڑے انکسار و عاجزی کے ساتھ اپنا سادہ ترین ڈریس اور بے آستین کی قبا پہنتی اور یخ بستہ ہوا میں لرزتی کانپتی ویران گلیوں میں، جو صبح صادق کے پیلے اجالے میں روشن روشن ہوتیں، چلنے لگتی۔ اگرافینا ایوانوونا کے مشورے پر نتاشا اپنے کلیسائی حلقے کے گرجے کی عبادت میں شریک ہونے کے بجائے ایک ایسے گرجے میں، جس کا پادری دین دار بیالووا کے بقول سادہ اور پروقار زندگی بسر کرتا تھا، چلی جاتی۔ گرجے میں عبادت گزاروں کی تعداد کوئی زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ نتاشا مریم مقدس، کے ایقونے کے سامنے، جہاں مناجات خوانوں کے روبرو گزر کر پردے کے پیچھے جانا ہوتا تھا، بیالووا کے قریب ہمیشہ اپنی مقررہ جگہ پر کھڑی ہوتی۔ اور جب وہ مادرِ مقدس کے سانولے چہرے کو، جو اس کے قریب موی شمعوں کی روشنی اور دریچے میں سے چھن چھن کر آنے والے صبح کے اجالے میں جگمگا اٹھتا تھا، بغور دیکھ رہی اور عبادت کے الفاظ کو، جنھیں وہ سمجھنے کی کوشش کرتی، سن رہی ہوتی، تو ایک ایسی چیز کے سامنے جو رفیع المرتبت اور ناقابل فہم تھی، اس پر عاجزی و انکساری کا نیا جذبہ غالب آ جاتا۔ جب عبادت کے الفاظ کا مفہوم اس کی سمجھ میں آ جاتا، اس کے ذاتی جذبات کی تمام رنگتیں اس کی دعاؤں میں گھل مل جاتیں۔ جب معانی اس کے پلے نہ پڑتے تو اسے یہ سوچ کر اور بھی لطف محسوس ہوتا کہ سب سمجھنے کی آرزو محض تکبر ہے، یہ کہ ہر چیز کی تفہیم ناممکن ہے، یہ کہ اس کا کام محض یقین کرنا اور اپنے آپ کو خداوند کی، جو اس قسم کے لمحات میں اسے اپنی روح کی رہنمائی کرتا لگتا، تحویل میں دینا ہے۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کے نشانات بناتی، تقریباً فرش تک دوزانو ہو جاتی اور جب اسے تفہیم نہ ہوتی، وہ اپنی رذالت پر خوف زدہ ہو جاتی اور خداوند سے صرف یہ التجا کرتی کہ وہ اس کا ہر گناہ، ہر گناہ معاف کر دے اور اس پر رحم فرمائے۔ جن مناجات کے دوران میں اس پر مکمل خشوع و خضوع کی کیفیت طاری ہو جاتی، وہ توبہ کے بارے میں ہوتیں۔ صبح سویرے گھر واپسی کے وقت جب لوگ

ابھی سو رہے ہوتے، اسے سوائے راج مزدوروں کے جو اپنے کام پر جا رہے ہوتے یا جاروب کشوں کے، جو سڑکوں پر جھاڑو پھیر رہے ہوتے، کسی ذی روح کی شکل نہ دکھائی دیتی، اسے ایک ایسے جذبے کا، جس سے وہ پہلے آشنا نہیں تھی، تجربہ ہوتا اور اسے محسوس ہوتا کہ اس بات کا امکان موجود ہے کہ انسان اپنی بداعمالیوں کی اصلاح کر لے اور از سر نو پاکیزہ اور پر مسرت زندگی کے قابل ہو جائے۔

اس پورے ہفتے کے دوران میں، جو اس نے اس طرح گزارا، یہ جذبہ روز بروز قوی سے قوی تر ہوتا گیا۔ عشائے ربانی میں، جسے بیالووا ''حصولِ قربِ خداوندی کی تقریب'' کہتی تھی، شرکت سے نتاشا کو جو مسرت حاصل ہو رہی تھی، وہ اتنی زیادہ تھی کہ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس بابرکت اتوار تک زندہ نہیں رہ سکے گی۔

لیکن وہ پر مسرت دن آ ہی گیا اور اس یادگار اتوار کو جب نتاشا، ململ کا سفید لباس پہنے، عشائے ربانی کی مقدس تقریب میں شرکت کے بعد گھر پہنچی، کئی مہینوں میں پہلی مرتبہ اسے محسوس ہوا کہ اس کی روح کو قرار آ گیا ہے اور جو زندگی ابھی اس نے گزارنا تھی، اس کا تصور اب اس کے لیے سوہانِ روح نہیں رہا تھا۔

جب اس روز ڈاکٹر اسے دیکھنے آیا، اس نے حکم دیا کہ اس نے دو ہفتے قبل جو سفوف تجویز کیے تھے، وہ انھیں کھاتی رہے۔

''اسے انھیں لازماً صبح و شام کھاتے رہنا چاہیے،'' اس نے کہا۔ اپنی کامیابی پر اسے جو اطمینان ہوا، وہ بے ریا بھی تھا اور اس کے چھپائے چھپتا بھی نہیں تھا۔ ''صرف اتنی احتیاط کریں کہ مقدار میں کوئی کمی بیشی نہ آنے دیں۔ کاؤنٹس، اب آپ خاطر جمع رکھیں۔'' اس نے بڑی چابک دستی سے طلائی سکہ اپنی مٹھی میں تھامتے ہوئے کہا۔ ''وہ عنقریب گانے گانا اور کدکڑے لگانا شروع کر دے گی۔ اس آخری دوا نے معجزہ کر دکھایا ہے۔ اب اس کی حالت بہت بہتر ہے۔''

کاؤنٹس نے، جب وہ خوش خوش ڈرائنگ روم سے واپس آ رہی تھی، اپنے ناخنوں کا بغور جائزہ لیا اور نیک شگون کے لیے کچھ تھوک اگل دیا۔

18

جون کے اوائل میں جنگ کے بارے میں پریشان کن سے پریشان کن خبریں ماسکو میں پھیلنا شروع ہو گئی تھیں۔ یہ کہا جانے لگا کہ امپراطور عوام سے اپیل کرنے والے ہیں اور بنفس نفیس فوج سے ماسکو تشریف لا رہے ہیں۔ چونکہ گیارہ جولائی تک نہ کوئی اعلان اور نہ کوئی اپیل موصول ہوئی، فرماں روائے مملکت اور روس کی پوزیشن کے متعلق انتہائی مبالغہ آمیز افواہیں گردش کرنے لگیں۔ کہنے والے کہتے تھے کہ امپراطور اس لیے فوج سے رخصت ہو رہے ہیں کیونکہ وہ خطرے کی زد میں آ چکی ہے، یہ کہ سمولنسک نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، یہ کہ نپولین کے پاس دس لاکھ سپاہ ہے اور یہ کہ کوئی معجزہ ہی روس کو بچا سکتا ہے۔

گیارہ جولائی بروز ہفتہ اعلان موصول ہو گیا لیکن ابھی تک اس کی نقول طبع نہیں ہوئی تھیں۔ پیئر نے، جو اتفاق سے رستوفوں کے ہاں موجود تھا، وعدہ کیا کہ وہ اعلان اور اپیل کی نقول رستوپ چن سے حاصل کرے گا، اگلے روز، اتوار، کوڈنر پر آئے گا اور انھیں اپنے ساتھ لیتا آئے گا۔

اس اتوار رستوف حسب معمول رازومووسکیوں کے نجی گرجے میں دعائے عشائے ربانی میں شرکت کے لیے گئے۔ یہ جولائی کا گرم دن تھا۔ دس بجے بھی، جب رستوف گرجے کے سامنے اپنی گاڑی سے نیچے اترے، گھس، خوانچہ فروشوں کی چیخ و پکار، ہجوم کے ہلکے پھلکے اور رنگا رنگ گرمائی ملبوسات، خیابان کے دونوں اطراف درختوں کے گرد آلود پتوں، پریڈ کے لیے گزرتی ہوئی بٹالین کی عسکری موسیقی اور سفید براق پتلونوں، پانی سے تراشیدہ پتھروں پر پہیوں کی کھڑ کھڑاہٹ اور چکا چوندھ دھوپ، سبھی میں وہ تابستانی آلکسی اور حال کے ساتھ وہ اطمینان اور بے اطمینانی، جسے کسی گرم اور چمکیلے دن آدمی خاص شدت سے محسوس کرتا ہے، کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ماسکو کے سبھی اکابرین، رستوفوں کے سبھی واقف کاران، رازومووسکیوں کے گرجے میں موجود تھے۔ (اس سال بے شمار متمول گھرانے، جو عام طور پر اپنی گرمیاں اپنی دیہاتی جاگیروں پر گزارتے تھے، یوں شہر میں قیام پذیر رہے جیسے انھیں زبردست واقعات کے ظہور پذیر ہونے کی توقع ہو۔)

جب نتاشا اپنی ماں کے پہلو بہ پہلو اپنے وردی پوش ملازم کے، جو ہجوم میں ان کے لیے راستہ بنا رہا تھا، پیچھے پیچھے جا رہی تھی، اس نے اپنے بارے میں ایک نوجوان کو خاصے بلند لہجے میں سرگوشی کرتے ہوئے سنا:

''وہ رستووا ہے، وہی جو...''

''کتنی لاغر ہو گئی ہے! لیکن اس کی دلکشی میں کوئی کمی نہیں آئی!''

اسے کوراگن اور بلکونسکی کے نام سنائی دیے یا اسے خیال گزرا کہ اسے سنائی دیے ہیں۔ لیکن ایسا تو ہمیشہ ہی ہوتا رہتا تھا۔ جب بھی کوئی شخص اس کی طرف دیکھتا، اسے مدام یہی محسوس ہوتا کہ ''جو کچھ مجھ پر بیتا ہے، یہ لازماً اسی کے بارے میں سوچ رہا ہوگا۔'' نتاشا جب بھی اپنے آپ کو ہجوم میں پاتی، اس کا دل ڈوبنے لگتا اور وہ اذیت میں مبتلا ہو جاتی۔ اب بھی اس پر، جب وہ بنفشی ریشمی ڈریس، جسے سیاہ سنجاف سے سنوارا گیا تھا، پہنے ہوئی تھی، اس پر یہی کیفیت طاری تھی۔ جیسا کہ خواتین کا شعار ہوتا ہے، وہ سکون اور وقار کی تصویر بنے گزر رہی تھی۔ اس کی روح میں جو ندامت اور کرب تھا، اس نے اس سکون اور وقار کو اور بھی عظمت بخش دی تھی۔ وہ یقیناً جانتی تھی کہ وہ دلکش ہے لیکن اسے اپنی اس آگہی سے وہ خوشی نہیں ہوتی تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی، اس کے برعکس حال میں، خاص طور پر شہر کے روشن اور گرم تابستانی دن، جیسا کہ آج کا تھا، کسی دوسری چیز کی نسبت یہ اس کے لیے زیادہ اذیت ناک بن گئی تھی۔ ''ایک اور ہفتہ گزر گیا، ایک اور اتوار آ گیا'' اس نے یہ یاد کرتے ہوئے کہ وہ گزشتہ اتوار بھی یہاں آئی تھی، سوچا۔ ''اور زندگی، جو کوئی زندگی نہیں ہے، ہمیشہ کی طرح کی زندگی ہے اور حالات بھی، جن میں زندگی گزارنا اتنا آسان معلوم ہوتا تھا، وہی ہیں۔ میں خوبصورت ہوں، نوجوان ہوں اور میں جانتی ہوں کہ میں اب نیک اطوار ہوں۔ قبل ازیں

میں بد اطوار ہوا کرتی تھی لیکن اب میں جانتی ہوں کہ میں نیک اطوار ہوں،'' اس نے سوچا۔ ''پھر بھی میری زندگی کے بہترین سال کھسکتے جا رہے ہیں اور کسی کو ان سے کچھ حاصل نہیں ہو رہا۔'' وہ اپنی ماں کے پہلو میں کھڑی تھی اور اپنے ملنے جلنے والوں سے، جو اس کے قریب کھڑے تھے، سر کے اشارے سے علیک سلیک کا تبادلہ کر رہی تھی۔ وہ عادتاً خواتین کے ملبوسات کا تنقیدی نگاہوں سے جائزہ لینے لگی اور اس نے ایک خاتون کے، جو اس کے قریب ایستادہ تھی، ڈریس میں اور جس بے ڈھنگ اور گنجلک انداز سے وہ اپنے سینے پر صلیب کے نشانات بنا رہی تھی، اس میں عیوب ڈھونڈ نکالے۔ پھر اسے یہ سوچ کر بڑی کوفت ہوئی کہ جس طرح وہ دوسروں کا محاکمہ کر رہی ہے، اسی طرح خود اس کا اپنا محاکمہ ہو رہا ہوگا اور جب اچانک عبادت کے الفاظ اس کے کانوں سے ٹکرائے، وہ اپنی کمینگی پر دہشت زدہ رہ گئی۔ اس پر دہشت اس لیے سوار ہوئی تھی کیونکہ وہ اس پاکیزگی سے، جو حال ہی میں اس کے دل میں سمائی تھی، محروم ہو گئی تھی۔

ایک مسکین طبع، معزز، سن رسیدہ شخص عبادت میں رہنمائی کا فریضہ سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے انداز میں وہ پرسکوت متانت اور سنجیدگی تھی جو مقتدیوں کی روحوں کو بالیدگی عطا کرتی اور ان پر تسکین بخش اثرات چھوڑ جاتی ہے۔ مائدہ مقدسہ کے پاک دروازے بند تھے۔ پردہ آہستہ آہستہ بلند ہوا اور اس کے عقب میں کسی ملائم اور پراسرار آواز نے چند الفاظ کہے۔ نتاشا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ کیوں؟ اس کی وجہ وہ شاید خود بھی نہ بیان کر سکتی لیکن ان کا اثر یہ ہوا کہ اس کا سینہ دھک دھک کرنے لگا اور مسرت آگیں اضطراب اسے اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

''مجھے سکھائیں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے، اپنی زندگی کیسے بسر کرنا چاہیے اور کیسے ہمیشہ صحیح کام کرنا چاہیے!'' وہ دعا مانگ رہی تھی۔

چھوٹا پادری ڈائس پر آیا۔ اس نے اپنا انگوٹھا آگے بڑھا کر پکڑ رکھا تھا۔ اس نے اپنی عبا میں سے اپنے لمبے بال باہر نکالے اور وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے بلند اور گمبھیر لہجے سے مناجات کے الفاظ پڑھنے لگا۔

''آئیں، ہم امن وسکون سے خداوند سے دعا کریں۔''

''آئیں، ہم امن وسکون سے، کسی طبقاتی امتیاز کے بغیر، کسی عناد کے بغیر، اخوت کے رشتے میں بندھ کر۔ آئیں، ہم دعا کریں!'' نتاشا نے سوچا۔

''امن کے لیے، جو اوپر سے نازل ہوتا ہے، اپنی روحوں کی بخشش کے لیے!''

''عالم ملائک کے لیے اور ان تمام غیر جسمانی ہستیوں کی روحوں کے لیے، جو ہمارے اوپر، عالم بالا میں قیام پذیر ہیں،'' نتاشا نے دعا کی۔

جب وہ فوج کے لیے دعا مانگ رہے تھے، نتاشا اپنے بھائی اور دینی سوف کے متعلق سوچ رہی تھی۔ جب وہ ان لوگوں کے لیے، جو بحر و بر کا سفر اختیار کرتے ہیں، دعا مانگ رہے تھے، اسے پرنس آندرے یاد آ گیا۔ اس

نے اس کے لیے دعائے خیر کی اور خداوند سے التجا کی کہ وہ اس کے ساتھ جن زیادتیوں کی مرتکب ہوئی ہے، وہ اسے ان کی معافی دے دے۔ جب انھوں نے ان تمام لوگوں کے لیے، جو ہمارے ساتھ محبت کرتے ہیں، دعا کی، اس نے اپنے ہی خاندان کے افراد، اپنی اماں، اپنے ابا اور سونیا کے لیے دعا مانگی اور اسے اولین بار یہ احساس ہوا کہ وہ ان کے ساتھ کتنی زیادتی کرتی رہی ہے اور خود ان سے کتنی شدید محبت کرتی ہے۔ جب انھوں نے ان لوگوں کے لیے جو ہمارے ساتھ نفرت کرتے ہیں، دعا کی، اس نے اپنے دشمنوں اور ان اشخاص کا، جو اس سے نفرت کرتے تھے، نقشہ ذہن میں قائم کرنے کی کوشش کی تاکہ وہ ان کے لیے دعا کر سکے۔ اپنے دشمنوں میں اس نے اپنے باپ کے قرض خواہوں اور ان اشخاص کو، جن سے وہ لین دین کرتا تھا، شمار کیا۔ اسے جب بھی اپنے دشمنوں اور ان لوگوں کا، جو اس سے نفرت کرتے تھے، خیال آتا، اسے ہمیشہ اناطول، جس نے اسے اتنا ضرر پہنچایا تھا، یاد آ جاتا اور اگرچہ وہ اس سے نفرت نہیں کرتی تھی، وہ اسے دشمن سمجھ کر بڑی خوشی سے اس کے لیے دعا کرتی تھی۔ صرف دعا کے موقع پر وہ پرنس آندرے یا اناطول کے بارے میں واضح اور پرسکون انداز سے سوچ سکتی تھی۔ اس وقت اسے یہ احساس ہوتا تھا کہ اس پر خداوند کی جو ہیبت طاری ہوتی ہے اور وہ اس کا جو ادب کرتی ہے، اس کے مقابلے میں ان دونوں کے متعلق اس کے جذبات قطعی بے وقعت ہیں۔ جب انھوں نے شاہی خاندان اور مجلس کلیسا[75] کے لیے دعا مانگی، اس نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور وہ خاص طور پر اور بھی نیچے جھک گئی۔ وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی کہ خواہ وہ کچھ بھی نہ سمجھی ہو، وہ تشکیک میں گرفتار نہیں ہو سکتی، اور وہ بہر حال برسر اقتدار مجلس کلیسا سے محبت کرتی تھی اور اس کے لیے دعا کرتی رہتی تھی۔

جب مناجات اختتام پذیر ہوئی، چھوٹے پادری[76] نے اپنے منصبی رومال[77] سے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور اعلان کیا:

"آئیں، ہم اپنے آپ کو اور اپنی ساری زندگیوں کو یسوع مسیح کے لیے وقف کر دیں۔"

"اپنے آپ کو خداوند کا مطیع و منقاد بنا دیں!" نتاشا نے اپنے دل میں دہرایا۔ "اف، خداوند، میں اپنے آپ کو تیری مرضی کا مطیع بناتی ہوں!" اس نے سوچا۔ "میں کچھ نہیں چاہتی، کسی چیز کی آرزو نہیں کرتی، مجھے بس اتنا سکھا دو کہ میں اپنے ارادے کو کیسے عملی جامہ پہناؤں! مجھے اپنا بنا لو، مجھے اپنی تحویل میں لے لو!" وہ دعا مانگ رہی تھی اور اس کا قلب آرزوئے بے قرار سے لبریز تھا۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان نہیں بنا رہی تھی بلکہ اپنے مہین بازوؤں کو اپنے پہلوؤں پر لٹکائے کھڑی تھی جیسے اسے توقع ہو کہ کسی بھی لمحے کوئی نادیدہ قوت اسے اپنی سپردگی میں لے لے گی اور اسے خود اپنے آپ سے، اپنے تاسفات اور خواہشات، اپنی پشیمانیوں، اپنی امیدوں اور گناہوں سے چھٹکارا دلا دے گی۔

عبادت کے دوران میں کاؤنٹس نے متعدد مرتبہ اپنی بیٹی کے منہمک و مستغرق چہرے اور چمچماتی آنکھوں پر اچٹتی نظر ڈالی اور خداوند سے دعا کی کہ وہ اس کی مدد کرے۔

غیر متوقع طور پر عبادت کے عین درمیان میں اور عام قاعدے سے ہٹ کر چھوٹے پادری نے ادنیٰ فٹ سٹول، جس پر وہ اتوارِ تثلیث[78] کو عبادت کے دوران میں دوزانو ہوتا تھا، باہر نکالا اور ان مقدس دروازوں کے، جو زیارت گاہ میں کھلتے تھے، سامنے رکھ دیا۔ پادری اپنی ارغوانی مخملی ٹوپی پہنے باہر آیا، اس نے اپنے بال درست کیے اور بدقت گھٹنوں پر جھک گیا۔ عبادت گزاروں کا پورے کا پورا مجمع، حیرت و تحیر کی تصویر بنا، اس کے ساتھ دوزانو ہو گیا۔ پھر وہ دعا، جو ابھی ابھی مجلس کلیسا سے موصول ہوئی تھی اور جو غنیم کے حملے سے روس کی رستگاری کے بارے میں تھی، شروع ہو گئی۔

''خداوندِ جبروت و عظمت، خداوندِ نجاتِ ما،'' پادری نے اپنے اس واضح، نرم اور بے زور لہجے سے، جو سلافی پادریوں کا خاصہ ہے اور جو روسی قلوب کو اس طرح گرماتا ہے کہ وہ اس سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتے، دعا کا آغاز کیا۔

خداوند جبروت و عظمت، خداوند نجات ما، آج اپنے عاجز و مسکین بندوں کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے بہرہ ور فرما، اپنا فضل و کرم نازل کر اور ہماری التجائیں سماعت فرما۔ ہمیں اپنی پناہ میں لے لے اور ہمارے اوپر رحم فرما۔ یہ دشمن، جو تمھاری اس دھرتی کو تہس نہس کر رہا ہے، جو کل عالم کو ملیامیٹ کر دینا چاہتا ہے، ہمارے خلاف اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ یہ نافرمان لوگ تیری مملکت کو تہ و بالا کرنے، مقدس یروشلم کو زیر و زبر کرنے، تیرے معبدوں کو پلید کرنے، تیرے کلیساؤں کی اینٹ سے اینٹ بجانے اور ہماری زیارت گاہوں کی بے حرمتی کرنے کے لیے اکٹھے ہو گئے ہیں۔ خداوند، بدکردار کب تک غالب آتے رہیں گے؟ یہ منحرف کب تک ناجائز ہتھکنڈوں سے ہتھیائے ہوئے اختیار استعمال کرتا رہے گا؟

ربِّ ذوالجلال، جب ہم دعا کریں، ہماری دعائیں سن۔ ہمارے انتہائی قابل احترام اور کریم النفس فرماں روا، امپراطور الیکساندر پاولووچ کو قوت و طاقت عطا فرما، ان کی راست بازی اور فروتنی سے صرف نظر نہ کر، انھیں ان کی پارسائی کا اجر دے اور انھیں، اپنے چنیدہ اسرائیل کو، ہمیں محفوظ کر لینے دے! ان کی مشاورتوں، ان کے عزم و استقلال اور ان کے افعال و اعمال کو بابرکت بنا، اپنے قادرِ مطلق ہاتھوں سے ان کی سلطنت کو محفوظ و مستحکم بنا اور انھیں دشمن کے خلاف اسی طرح کامیاب و کامران فرما جس طرح تو نے عمالیق[79] کے خلاف موسیٰ کو، مدیانیوں[80] کے خلاف جدعون[81] کو اور جولیت[82] کے خلاف داؤد کو کامیاب و کامران کیا تھا۔ ان کی افواج کو، جنھوں نے تیرے نام پر ہتھیار اٹھائے ہیں، محفوظ و مامون رکھ، ان کے ہاتھوں میں اعلیٰ ترین اقسام کے اسلحہ جات تھما اور انھیں معرکہ آرائی کے لیے کمربستہ کر۔ اپنی شمشیر اور سپر اٹھا اور ہماری مدد کے لیے آ جا۔ وہ لوگ، جو ہمارے خلاف بداندیشانہ منصوبے بناتے ہیں، انھیں قعرِ مذلت میں گرا اور انھیں زمین بوس کر، اور اپنے باایمان جنگجوؤں کے سامنے ان کا وہی حال کر جو ہوا کے سامنے دھول کا ہوتا ہے۔ اپنے قوی ملائکہ کو حکم دے کہ وہ ان کی گوشمالی کریں اور انھیں شکست کا مزہ چکھائیں۔ خداوند، وہ

ایسے جال میں، جس کا خود انھیں علم نہ ہو، پھنس جائیں اور جو گڑھے انھوں نے خفیہ خفیہ تیار کیے ہیں، ان میں وہ خود ہی گر جائیں۔ انھیں اپنے غلاموں کے قدموں پر گرا دے اور ہمارے فوجیوں کو یہ توفیق دے کہ وہ انھیں زیر کرلیں! خداوند، تمھارے لیے چھوٹوں اور بڑوں، دونوں کو بچانا کوئی مشکل کام نہیں۔ تو خداوند ہے اور بندے کا تیرے خلاف بس نہیں چل سکتا۔

ہمارے آباؤ اجداد کے خداوند! اپنے بے پایاں رحم و کرم کو، جو تو ازل سے نازل کرتا چلا آیا ہے، یاد کر! ہم سے منہ نہ موڑ اور نہ ہماری خطاؤں پر اپنا جلال دکھا، بلکہ اپنے رحم کی عظمت اور اپنے کرم کی لامتناہیت کے ذریعے ہماری بداعمالیوں اور سیہ کاریوں سے صرف نظر فرما۔ ہمارے قلوب کو مصفا کر، ہمارے اندر ایک نیا جذبہ بھر، اپنی ذات پر ہم سب کا ایمان پختہ کر، ہماری امید کو توانا بنا، ہمارے قلوب میں ایک دوسرے کے لیے محبت پیدا کر اور وہ ورثہ، جو تو نے ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو عطا فرمایا تھا، اس کے دیانت دارانہ دفاع کے لیے ہمیں جذبے کی یگانگت سے ہتھیار بند کر اور بدکاروں کے ڈنڈے کو ان لوگوں کے، جنھیں تو نے پاکیزہ کردیا ہے، مقدر پر حاوی نہ ہونے دے۔

ربّ ذوالجلال، خداوند کریم، تجھ پر ہم ایمان رکھتے ہیں اور تجھ پر ہم اعتماد کرتے ہیں، ہم تجھ سے رحم و کرم کی جو امید کرتے ہیں، تو اسے خائب و خاسر نہ کر، اور ہمیں اپنی برکتوں کی کوئی نشانی عطا کرتا کہ وہ، جو ہم سے اور ہمارے مقدس آرتھوڈوکس مذہب سے خار کھاتے ہیں، اسے دیکھ سکیں اور دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہوں اور تباہ و برباد ہوں، اور تمام اقوامِ عالم جان سکیں کہ تو خداوند ہے اور ہم تیرے بندے۔ اے خداوند، آج کے روز ہم پر اپنا رحم و کرم فرما اور ہمیں اپنی مکتی سے بہرہ ور کر۔ اپنے بندوں کے قلوب کو اپنے فضل و کرم کے کرشمے سے شاداں ہونے کا موقع بہم پہنچا۔ ہمارے دشمنوں کا قلع قمع فرما اور انھیں بہ عجلت ان لوگوں کے، جو تجھ پر ایمان رکھتے ہیں، قدموں تلے روندوا دے! جو لوگ تجھ پر ایمان رکھتے ہیں تو ہی ان کا ملجا، تو ہی ان کا ماویٰ، تو ہی ان کا حامی و ناصر ہے اور تیرے ہی ذریعے وہ فتح و نصرت سے ہم کنار ہوتے ہیں۔ ساری کبریائی تجھی کو، باپ، بیٹے، روح القدس کو، زیب دیتی ہے، ایسا ہمیشہ سے ہے، آج بھی ہے اور ابد تک رہے گا۔ آمین۔

نتاشا جس کیفیت میں سے گزر رہی تھی، اس میں اس کا متاثر ہونا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اس دعا نے اس پر شدید اثر کیا۔ امالیق کے اوپر موسیٰ، مدیانیوں کے اوپر جدعون اور جولیت کے اوپر داؤد کی فتح اور یروشلم کی تباہی و بربادی کے بارے میں اس نے ایک ایک لفظ غور سے سنا۔ اس نے پوری رقیق القلبی اور شوق و شغف سے، جس سے وہ سرتاپا لبریز تھی، خداوند سے دعا مانگی، لیکن دعا میں وہ کیا مانگ رہی تھی، اسے وہ پوری طرح سمجھ نہ پائی، وہ بہ صمیم قلب دعا مانگ رہی کہ خداوند اس کے دل میں راستی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھر دے، ایمان و اعتماد سے اس کا دل

مضبوط بنادے اور اس میں محبت کی جوت جگا دے۔ لیکن وہ یہ دعا نہ مانگ سکی کہ اس کے دشمن پاؤں تلے کچلے جائیں جب کہ چند ہی منٹ پہلے وہ یہ خواہش کر رہی تھی کہ ان کی تعداد بڑھ جائے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ لوگوں سے محبت کر سکے اور ان کے لیے دعا مانگ سکے۔ تاہم وہ اس دعا کی، جو دوزانو ہوکر کی جا رہی تھی، موزونیت اور معقولیت پر کسی قسم کا شک وشبہہ بھی نہ کر سکی۔ انسانوں کو اپنے گناہوں کی پاداش میں (خاص طور پر جب اسے اپنے گناہ یاد آئے) جو سزا بھگتنا پڑتی ہے، اس کے تصور نے اس کے دل میں پاکیزہ اور تھرتھرا دینے والی ہیبت طاری کر دی اور اس نے خداوند سے دعا مانگی کہ وہ سب کو، اور خود اسے بھی، معاف کر دے اور سب کو سکون اور مسرت عطا کر دے۔ اور اسے یوں لگا جیسے خداوند نے اس کی دعا سن لی ہو۔

19

جس روز پیئر نے رستوفوں کے ہاں سے رخصت ہونے کے بعد، جب کہ نتاشا کی شکر گزار نگاہوں کا تصور ابھی تک اس کے ذہن میں تازہ تھا، راستے میں دم دار ستارہ، جو فلک میں آویزاں نظر آ رہا تھا، دیکھا تھا اور اسے محسوس ہوا تھا کہ اس کے لیے کسی نئی چیز کا آغاز ہو رہا ہے ــ وہ دن اور آج کا دن، یہ گمبھیر مسئلہ کہ تمام دنیوی اشیا ہیچ اور لغو ہیں، جو ہر وقت اس کے ذہن پر سوار رہتا تھا، اب اسے ذہنی اذیت نہیں پہنچاتا تھا۔ اس ہیبت ناک سوال ''کیوں؟ کس لیے؟'' جو اس روز تک اس کو اپنی ہر مصروفیت کے دوران میں ضخطے میں ڈالے رکھتا تھا، کی جگہ کسی دوسرے سوال یا پہلے سوال کے جواب نے نہیں، بلکہ نتاشا کی شبیہ نے لے لی تھی۔ انسانی خباثتوں اور حماقتوں کے بارے میں خواہ وہ خود کچھ پڑھتا یا دوسروں سے ان کے متعلق سنتا۔ اب اسے ان سے اس طرح وحشت نہیں ہوتی تھی جیسے پہلے ہوتی تھی اور نہ وہ اپنے آپ سے یہ سوال کرتا کہ اگر یہ سب کچھ چندروزہ اور غیر یقینی ہے، پھر انسان اتنی بھاگ دوڑ کیوں کرتے ہیں، بلکہ اب وہ اسے اپنی اس صورت میں، جس میں اس نے اسے آخری مرتبہ دیکھا تھا، دکھائی دینے لگتی اور اس کے تمام شکوک ہوا ہو جاتے ــ اس لیے نہیں کہ اسے جن سوالات کا سامنا تھا، اس کی صورت ان کے جوابات مہیا کر دیتی تھی بلکہ اس لیے کیونکہ اس کی شبیہ اسے ایکاایکی روحانی مشغولیت کی دوسری اور روشن تر مملکت میں پہنچا دیتی۔ اس مملکت میں نیکی تھی نہ بدی ــ یہ حسن اور محبت کی مملکت تھی اور اس قابل تھی کہ آدمی اس کی خاطر زندہ رہے۔ جس قسم کی بھی دنیوی کمینگی اس کے علم میں آتی، وہ اپنے آپ سے کہتا:

''وہ کل مجھے دیکھ کر مسکرائی تھی، اس نے مجھ سے دوبارہ آنے کو کہا تھا، اور میں اس سے محبت کرتا ہوں، اور کسی کو اس کا علم نہیں ہو پائے گا۔ ایسے میں فرض کیا کہ فلاں فلاں نے مملکت اور زار کو لوٹ لیا ہے جب کہ مملکت اور زار اسے اعزازات سے نواز رہے ہیں، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

پیئر اب بھی محفلوں میں گھومتا پھرتا تھا، پہلے کی طرح ڈٹ کر پیتا تھا اور پہلے ہی کی طرح ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا یا لہو ولعب میں مشغول ہو جاتا تھا۔ کیونکہ جو عرصہ وہ رستوفوں کے ہاں گزارتا تھا، اس کے علاوہ بھی اس

کے پاس وقت بچ رہتا اور اس نے اسے کسی نہ کسی طور گزارنا ہوتا تھا۔ ماسکو میں اس نے جو عادتیں اختیار کر لی تھیں اور جن لوگوں کے ساتھ اس نے تعلقات استوار کر لیے تھے، وہ ان کی مزاحمت نہ کر سکتا اور بے دریغ اس قسم کی زندگی کی طرف کھنچا چلا جاتا تھا۔ لیکن حال ہی میں میدان جنگ سے جو خبریں موصول ہونا شروع ہوئی تھیں، چونکہ وہ حوصلہ افزا نہیں ہوتی تھیں اور چونکہ نتاشا کی صحت میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور اسے دیکھ کر اس کے دل میں ترحم کے وہ جذبات پیدا نہیں ہوتے تھے کہ اس کا جی چاہنے لگتا کہ وہ اسے اپنی پناہ میں لے لے، ایک نوع کی بے چینی، جس کی وہ توضیح نہیں کر سکتا تھا اور جس کی شدت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس کے دل و دماغ کو اپنی گرفت میں لینے لگی۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اپنے آپ کو جس صورت حال میں پا رہا ہے، وہ زیادہ دیر باقی نہیں رہے گی، یہ کہ کوئی عظیم آفت، جو لازماً اس کی ساری زندگی کا رخ تبدیل کر دے گی، سر پر منڈلا رہی ہے اور وہ بے صبری سے ہر جگہ اس مصیبت کی، جو کسی وقت بھی نازل ہو سکتی تھی، علامات تلاش کرنے لگتا۔ ایک میسن بردار نے نپولین کے بارے میں مندرجہ پیشین گوئی کا، جو یوحنا عارف کے مکاشفہ سے اخذ کی گئی تھی، انکشاف کیا۔

مکاشفہ کے باب نمبر 13 آیت نمبر 18 میں کہا گیا ہے:

''حکمت کا یہ موقع ہے۔ جو سمجھ رکھتا ہے اور وہ اس حیوان کا عدد گن لے کیونکہ وہ آدمی کا عدد ہے اور اس کا عدد چھ سو چھیاسٹھ ہے۔o''

اور اسی باب کی پانچویں آیت:

''اور بڑے بول بولنے اور کفر بکنے کے لیے اسے ایک منہ دیا گیا اور اسے بیالیس مہینے تک کام کرنے کا اختیار دیا گیا۔o''

اگر فرانسیسی حروف تہجی کو ضبط تحریر میں لایا جائے اور ان کی وہی عددی قیمت مقرر کی جائے جو عبرانی حروف تہجی (جن میں پہلے نو حروف اکائیاں اور باقی دہائیاں ہیں) کی ہے، پھر صورت حال مندرجہ ذیل ہوگی:

a	b	c	d	e	f	g	h	i
1	2	3	4	5	6	7	8	9
k	l	m	n	o	p	q	r	s
10	20	30	40	50	60	70	80	90
t	u	v	w	x	y	z		
100	110	120	130	140	150	160		

اس نظم کے تحت اگر* Empereur Napoleon ,l کے الفاظ کو اعداد میں منقلب کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان کا مجموعہ 666 بنتا ہے۔ اصولاً l کے بعد e آنا چاہیے لیکن قواعد کے تحت اسے حذف کر دیا جاتا ہے تاہم 666

* امپراطور نپولین

کے مجموعے میں اس e کے اعداد 5 شامل ہیں۔ چنانچہ نپولین وہ حیوان ٹھہرا جس کا ذکر ''مکاشفہ'' میں ہوا ہے۔
مزید برآں اگر اس نظم کا اطلاق الفاظ quarante-deux (بیالیس) پر کیا جائے یعنی وہ اصطلاح جو اس جانور کے لیے، جس نے ''بڑے بول بولے اور کفر بکا،'' استعمال کی گئی ہے، وہی عدد یعنی 666 حاصل ہوگا۔ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ نپولین کی قوت (اور اختیارات) کے لیے جو حدود مقرر کی گئی تھی، اس کا اختتام 1812 میں، جب فرانسیسی امپراطور بیالیس سال کا تھا، ہونا تھا۔

اس پیشین گوئی نے پیئر کے ذہن پر گہرا اثر مرتب کیا اور وہ اکثر اپنے آپ سے پوچھتا رہتا کہ وہ کون سی چیز ہے جو جانور یعنی نپولین کو ختم کر کے رکھ دے گی اور جس سوال میں وہ اتنا منہمک ہو گیا تھا، اس کا جواب ڈھونڈنے کے لیے وہ حروف کو اعداد کا قالب پہنانے اور ان کا مجموعہ بنانے کے لیے وہ اسی نظم کا سہارا لیتا۔ اس نے الفاظ I,Empereur Alexandre La nation russe* لکھے اور ان کے اعداد کو جمع کیا لیکن حاصل جمع 666 سے یا تو بہت زیادہ ہو گیا یا بہت نیچے رہ گیا۔

ایک مرتبہ جب وہ جمع تفریق کے اس چکر میں مصروف تھا، اس نے اپنا نام فرانسیسی میں Comte— Pierre Besouhoff** لکھا، لیکن اعداد کا مجموعہ ٹھیک نہ بیٹھا۔ اس نے املا میں تبدیلی کر دی، s کی جگہ z لکھا، اور de اور حرف تعریف le کے اضافے کیے لیکن مطلوبہ نتیجہ پھر بھی برآمد نہ ہوا۔ پھر اسے خیال آیا کہ جس جواب کا وہ متلاشی ہے، اگر وہ اس کے نام میں موجود ہے، پھر اس میں یقیناً اس کی قومیت بھی شامل ہوگی، چنانچہ اس نے الفاظ Le russe Besuhof*** آزمائے۔ اس نے اعداد کو جمع کیا اور اسے 671 کا عدد مل گیا۔ مطلوبہ عدد سے اس میں صرف پانچ کی بیشی تھی اور یہ حرف e سے مطابقت رکھتا تھا۔ e وہی حرف تھا جو empereur کے حرف تعریف le اس سے خارج کر دیا جاتا ہے۔ یوں حرف e نکال کر (حالانکہ طریق کار کے مطابق ایسا کرنا درست نہیں تھا) پیئر کو وہ جواب، جس کی اسے تلاش تھی، مل گیا۔ I,russe Besuhof کے اعداد بالکل 666[83] بنتے تھے۔ اس انکشاف نے اس پر ہیجانی کیفیت طاری کر دی۔ وہ عظیم واقعہ، جس کی ''مکاشفہ'' میں پیشین گوئی کی گئی تھی، وہ خود اس سے کیسے اور کس ذریعے سے منسلک تھا، وہ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا تھا، لیکن یہ کہ اس کا اس سے تعلق بنتا ہے، اس بارے میں اس کے دل میں مطلق کوئی شبہ نہیں تھا۔ نتاشا سے اس کی محبت، دشمن مسیح دجال، نپولین کی چڑھائی، دم دار ستارہ، 666، I,Empereur Napoleon اور I,russe Besuhof — ان تمام چیزوں نے رسیدگی کی منزل تک پہنچنا اور اپنا ظہور کرنا تھا، ماسکو کے جن سحر زدہ اور گھٹیا حلقوں میں جانے کی اسے عادت پڑ گئی تھی اور جن کا وہ اپنے آپ کو اسیر سمجھتا تھا، انھوں نے اسے ان کے چنگل سے چھڑانا اور اسے کسی عظیم کارنامے اور

---

* الیکسانڈر امپراطور، روسی قوم
** کاؤنٹ پیئر بزوخوف
*** روسی بزوخوف

عظیم مسرت کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔

❦

جس اتوار خصوصی دعا کی گئی، اس سے ایک روز قبل پیئر نے رستوفوں سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے لیے رستوپ چن سے، جسے وہ اچھی طرح جانتا تھا، قوم کے نام اپیل کی نقل اور فوج سے وصول شدہ تازہ ترین خبریں لے کر آئے گا۔ صبح کو جب وہ رستوپ چن کے ہاں گیا، اس کی ملاقات ایک ایلچی سے، جو ابھی ابھی فوج سے آیا تھا، ہوگئی۔ یہ ایلچی ماسکو کے اجتماعی رقصوں میں باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوا کرتا تھا اور پیئر کا شناسا تھا۔

''خدا کے لیے یہ بوجھ اٹھانے میں میری کچھ مدد کرو!'' ایلچی نے کہا۔ ''والدین کے نام خطوط کی پوری بوری لایا ہوں۔''

خطوط میں نکولائی رستوپ کا اپنے باپ کے نام مکتوب تھا۔ پیئر نے یہ اٹھا لیا۔ اہالیان ماسکو کے نام امپراطور نے جو اپیل جاری کی تھی، رستوپ چن نے بھی اس کی ایک نقل، جو ابھی ابھی طبع ہوئی تھی، تازہ ترین عسکری احکام اور اپنے تازہ ترین خبرنامے کا ایک پرچہ پیئر کو دے دیا۔ پیئر نے عسکری احکام واعلانات پر سرسری نظر ڈالی۔ ایک اعلان نامے میں، ان لوگوں کے، جو زخمی یا ہلاک ہو چکے تھے یا جنھیں اعزازات سے نوازا گیا تھا، نام مندرج تھے ان میں ایک نام نکولائی رستوف کا تھا۔ اسے استروونا کے معرکے میں جرأت کا مظاہرہ کرنے پر سینٹ جارج کراس (درجہ چہارم) کا تمغہ دیا گیا تھا۔ اس اعلان نامے میں یہ بھی درج تھا کہ پرنس آندرے بلکونسکی شاسروں کی ایک رجمنٹ کا کمانڈر مقرر ہوا ہے۔ اگر چہ پیئر رستوفوں کو بلکونسکی کی یاد نہیں دلانا چاہتا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ جب انھیں یہ خبر ملے گی کہ ان کے بیٹے کو اعزاز عطا ہوا ہے، تو وہ بہت خوش ہوں گے۔ وہ خوشی کی یہ خبر پہنچانے کی خواہش پر قابو نہ پا سکا۔ چنانچہ اس نے زار کی اپیل، خبرنامہ اور دیگر اعلانات اپنے پاس رکھ لیے کہ وہ انھیں، جب وہ ان کے ہاں ڈنر کھانے جائے گا، اپنے ساتھ لے جائے گا، تاہم اس نے نکولائی کا خط اور مطبوعہ اعلان نامہ پہلے ہی بھجوا دیا۔

کاؤنٹ رستوپ چن کے ساتھ اس کی گفتگو، مؤخر الذکر کا تعجیلی اور کھویا کھویا انداز، قاصد سے، جس نے اسے باتوں باتوں میں فوج کے تباہ کن حالات کے متعلق اشارتاً بتایا تھا، اس کی ملاقات، ماسکو میں جاسوسوں کا کھوج لگائے جانے کے بارے میں افواہیں، شہر میں دستی اشتہار کی تقسیم، جس میں یہ کہا گیا تھا کہ نپولین نے قسم کھائی ہے کہ وہ موسم خزاں تک دونوں دار السلطنتوں میں داخل ہو جائے گا، اور اگلے روز زار کی متوقع آمد کے بارے میں باتیں — ان تمام چیزوں نے مل جل کر پیئر کے دل میں نئی شدت کے ساتھ اضطراب اور امید و بیم کی وہ کیفیت، جس کے متعلق وہ دم دار ستارے کے ظہور اور خاص طور پر آغاز جنگ کے وقت سے آگاہ تھا، ابھار دی۔

فوج میں شامل ہونے کا خیال مدتوں پہلے اس کے دماغ میں آیا تھا اور اگر دو باتیں اس کے راستے میں رکاوٹ نہ بنتیں، تو وہ یہ کام کبھی کا کر چکا ہوتا۔ ان میں سے ایک رکاوٹ تو اس کی فری میسنوں کی سوسائٹی کی رکنیت تھی۔ وہ حلف

اٹھا کر اس سوسائٹی کا حلقہ بگوش ہو چکا تھا اور سوسائٹی ابدی امن اور انسداد جنگ کی تعلیم دیتی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس نے جب ماسکو کے لاتعداد باشندوں کو وردیاں پہنے حب الوطنی کے گیت گاتے دیکھا، اسے پتا نہیں کیوں لیکن بہرحال خود یہ قدم اٹھاتے شرم محسوس ہوئی۔ لیکن وہ اس ارادے کو کیوں عملی جامہ پہنا نہ سکا، اس کی بڑی وجہ اس کا یہ دھندلا دھندلا تصور کہ وہ l,russe Besuhof ہے، تھا۔ اس l,russe Besuhof کی انوکھی اہمیت اس بات میں مضمر تھی کہ اس کا عدد 666 بھی وہی تھا جو کہ حیوان کا تھا۔ وہ مبہم انداز سے یہ سمجھتا تھا کہ ازل سے اس کے مقدر میں یہ لکھ دیا گیا ہے کہ اسے حیوان کی، جسے "بڑے بول بولنے اور کفر بکنے" کی عادت ہے، قوت کو حدود کے اندر لانے کے عظیم معرکے میں کچھ نہ کچھ کردار ادا کرنا ہے۔ چنانچہ اس کی سوچ یہ تھی کہ اسے ازخود کوئی قدم اٹھانے سے گریز کرنا چاہیے اور جس چیز کا وقوع پذیر ہونا ازل سے مقدر ہو چکا ہے، اس کا انتظار کرنا چاہیے۔

20

جیسا کہ عام طور پر ہر اتوار کو ہوتا تھا، چند بے تکلف احباب رستوفوں کے ہاں کھانے پر آرہے تھے۔ پیئر تنہائی میں ان کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ وہ باقی مہمانوں سے پہلے پہنچ گیا۔

اس سال اس کے تن و توش میں اتنا اضافہ ہو گیا تھا کہ اگر وہ اتنا دراز قامت نہ ہوتا اور اس کے اعضا اتنے توانا و قوی نہ ہوتے، تو اس کی شکل وصورت بالکل مضحکہ خیز نظر آنے لگتی۔ تاہم اس کی کاٹھی اتنی مضبوط تھی کہ اپنے بھاری بھرکم جثے سمیت وہ با آسانی یہاں وہاں بلکہ ہر جگہ آ جا سکتا تھا۔

وہ زور زور سے سانس لیتا اور منہ ہی منہ میں، کچھ بڑبڑاتا، سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس کے کوچوان نے اس سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ اسے انتظار کرنا ہے یا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ کاؤنٹ جب بھی رستوفوں کے ہاں آتا ہے، آدھی رات سے پہلے جانے کا نام نہیں لیتا۔ رستوفوں کا وردی پوش خدمت گار بھاگا بھاگا آیا تا کہ وہ کوٹ اتارنے میں اس کی مدد کر سکے اور اس کی چھڑی اور ہیٹ سنبھال سکے۔ کلب کی رکنیت کی وجہ سے پیئر کی یہ عادت بن گئی تھی کہ وہ اپنی چھڑی اور ہیٹ پیش دالان میں چھوڑ جاتا تھا۔

گھر کے جس اولین فرد سے اس کی ملاقات ہوئی، وہ نتاشا تھی۔ اسے دیکھنے سے پہلے ہی اپنا اوورکوٹ اتارنے کے دوران میں وہ اس کی آواز سن چکا تھا۔ وہ بال روم میں ریاض کر رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ جب سے وہ علیل ہوئی تھی، اس نے گانا نہیں گایا تھا۔ چنانچہ اس کی آواز سن کر اسے حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اس نے آہستگی سے دروازہ کھولا اور اسے اسی ارغوانی لباس میں، جو وہ پہن کر گرجے گئی تھی، دیکھا۔ وہ گا رہی اور کمرے میں چکر لگا رہی تھی، جب اس نے دروازہ کھولا، اس کی پشت اس کی جانب تھی لیکن جب وہ اچانک مڑی اور اس کی نظر اس کے حیرت زدہ چہرے پر پڑی، وہ شرم سے لال ہو گئی اور تیزی سے اس کی طرف لپکی۔

''میں دوبارہ گانا گانے کی کوشش کرنا چاہتی ہوں،'' اس نے کہا۔ ''اس سے کم از کم اتنا تو ہوتا ہے کہ مصروفیت مل جاتی ہے،'' اس نے یوں کہا جیسے وہ عذر تراش رہی ہو۔

''یہ تو بہت اچھی بات ہے!''

''میں بہت خوش ہوں کہ آپ تشریف لے آئے ہیں! میں آج بے حد خوش ہوں!'' اس نے پرانے انداز سے، جو پیئر نے بہت عرصے سے اس میں نہیں دیکھا تھا، چہکتے ہوئے کہا۔ ''آپ جانتے ہیں کہ نکولس کو سینٹ جارج کراس ملا ہے۔ مجھے اس پر کتنا فخر ہے!''

''ہاں، وہ اعلان نامہ میں نے ہی آپ لوگوں کو بھیجا تھا۔ لیکن میں تمھارے گانے میں مخل نہیں ہونا چاہتا،'' اس نے مزید کہا اور وہ ڈرائنگ روم کی طرف قدم بڑھانے ہی والا تھا کہ نتاشا نے اسے روک لیا۔

''کاؤنٹ، کیا میں گانا گا کر کوئی غلطی کر رہی ہوں؟'' اس نے شرماتے لجاتے پوچھا، لیکن اس کی نگاہیں ابھی تک مستفسرانہ انداز سے پیئر کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

''نہیں... اس میں غلطی کی کیا بات ہے؟ اس کے برعکس... تم مجھ سے کیوں پوچھ رہی ہو؟''

''مجھے خود معلوم نہیں،'' نتاشا نے عجلت سے جواب دیا۔ ''لیکن میں کوئی ایسا کام، جو آپ کو پسند نہ آئے، نہیں کرنا چاہوں گی۔ میں ہر بات میں آپ پر اعتبار کرتی ہوں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ آپ میرے لیے کتنے اہم ہیں اور آپ نے میرے لیے کیا کچھ کیا ہے!...'' وہ تیز تیز بول رہی تھی اور اس نے یہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے الفاظ پر پیئر کا چہرہ کتنا سرخ ہو رہا ہے۔ ''میں نے اس اعلان نامے میں یہ بھی دیکھا کہ وہ، بلکونسکی'' (اس نے یہ نام بہت تیزی سے لیکن زیرلب لیا)، ''روس آ چکے ہیں اور دوبارہ فوج میں شامل ہو گئے ہیں۔ آپ کے خیال میں'' اس کے بولنے کی رفتار بہت تیز تھی جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کہیں اس کی ہمت جواب نہ دے جائے، ''کیا وہ مجھے معاف کر دیں گے؟ کیا انھیں میرے بارے میں ہمیشہ تلخی محسوس نہیں ہوتی رہے گی؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ آپ کا کیا خیال ہے؟''

''میرا خیال ہے...'' پیئر نے کہا۔ ''وہ کیا معاف کرے گا، اس کے پاس معاف کرنے کے لیے کچھ ہے ہی نہیں... اگر میں اس کی جگہ ہوتا...''

تلازم خیالات نے آناً فاناً پیئر کو دوبارہ ماضی کے ان لمحات میں پہنچا دیا جب اسے (نتاشا کو) تسلی دینے کی کوشش میں اس کے منہ سے یہ نکل گیا تھا کہ اگر وہ وہ نہ ہوتا جو وہ تھا، بلکہ وہ دنیا کا بہترین انسان ہوتا اور شادی کے بندھنوں سے آزاد، وہ دوزانوں ہو کر اس سے شادی کی درخواست کر رہا ہوتا، اور اسے رحم، ملائمت اور محبت کے انھیں جذبات نے اپنی گرفت میں لے لیا اور اس کے لبوں پر وہی الفاظ مچلنے لگے لیکن نتاشا نے اسے انھیں ادا کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

''لیکن آپ — آپ —'' اس نے فرطِ انبساط سے سرشار ہو کر لفظ ''آپ'' ادا کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ دوسرا معاملہ ہے۔ مجھے کبھی کسی ایسے شخص سے، جو آپ سے زیادہ بامروت، مہربان، کریم النفس، عالی ظرف اور بہتر انسان ہو،

واسطہ نہیں پڑا۔ کوئی شخص ایسا ہو ہی نہیں سکتا! اگر اس وقت، بلکہ اب بھی، آپ نہ ہوتے، خدا معلوم میرا کیا حشر ہوتا کیونکہ...''

اچانک اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے موسیقی کا کتابچہ اٹھایا، اسے اپنی نگاہوں کے سامنے کیا، اور گانا گانے اور کمرے میں چکر کاٹنے لگی۔

عین اسی لمحے پیتیا ڈرائنگ روم سے بھاگتا باہر نکلا۔ اب وہ پندرہ سال کا وجیہہ و شکیل نوجوان تھا۔ اس کی رنگت شہابی اور اس کے ہونٹ نتاشا کے ہونٹوں کی طرح بالکل سرخ تھے۔ وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا لیکن حال ہی میں اس نے اور اس کے دوست ابولینسکی نے خفیہ خفیہ یہ طے کر لیا تھا کہ وہ ہوزاروں میں بھرتی ہو جائیں گے۔

پیتیا بھاگم بھاگ آیا تھا کیونکہ وہ اس معاملے کے بارے میں اپنے ہم نام کے ساتھ گفتگو کرنا چاہتا تھا۔ اس نے پیئر سے دریافت کیا کہ آیا اسے ہوزاروں میں شامل ہونے کی اجازت مل جائے گی۔

پیئر کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ پیتیا جو کچھ کہہ رہا تھا، اس نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔

پیتیا نے اس کا دھیان اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے اس کا بازو کھینچ لیا۔

''پیوتر کرلووچ، میرے منصوبے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ خدا کے لیے کچھ تو بتائیں۔ آپ میری واحد امید ہیں!'' پیتیا نے کہا۔

''ارے ہاں، تمھارا منصوبہ۔ تم ہوزاروں میں بھرتی ہونا چاہتے ہو؟ میں اس کی بابت بات کروں گا، آج ہی بات کروں گا۔''

''خیر، mon cher*، آپ کو اعلان نامہ مل گیا؟'' بوڑھے کاؤنٹ نے پوچھا۔ ''میری ننھی کاؤنٹس رازدمووسکیوں کے نجی گرجے میں عشائے ربانی میں شریک ہونے گئی تھی۔ وہاں اس نے نئی دعا سنی تھی۔ کہتی ہے، بہت اچھی ہے۔''

''ہاں، میرے پاس ہے،'' پیئر نے کہا۔ ''زار کل یہاں تشریف لائیں گے۔ اشراف کا غیر معمولی اجلاس منعقد ہو رہا ہے اور شنید ہے کہ ہر ہزار میں سے دس افراد فوج میں بھرتی کراتا ہوں گے۔ ارے ہاں، میں آپ کو مبارک باد پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔''

''بالکل، بالکل۔ خداوند کا شکر ہے۔ خیر، فوج کی کیا خبر ہے؟''

''ہم پھر پیچھے ہٹ آئے ہیں۔ سنا ہے کہ ہم پہلے ہی سمولنسک پہنچ چکے ہیں۔''

''رحم، خداوند، رحم!'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''اعلان نامہ کہاں ہے؟''

''امپراطور کی اپیل؟ ہاں، میرے پاس ہے!''

---

* مائی ڈیئر

پیئر کاغذات کے لیے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا لیکن وہ اسے نہ مل سکے۔ اتنے میں کاؤنٹس اندر آ گئی۔ پیئر نے جیبیں تھپکتے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور پھر بے قراری سے نگاہیں ادھر ادھر دوڑانے لگا۔ بظاہر اسے نتاشا کا، جو گانا تو ختم کر چکی تھی لیکن ابھی تک ڈرائنگ روم میں نہیں آئی تھی، انتظار تھا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے انھیں کہاں رکھ دیا ہے،'' اس نے کہا۔

''تمھارا حال وہی رہا۔ ہمیشہ اپنی چیزیں بھولتے رہتے ہو،'' کاؤنٹس نے کہا۔

نتاشا اندر آ گئی۔ اس کے چہرے پر درشتی نہیں بلکہ ملائمت تھی لیکن اس پر گھبراہٹ بھی ہویدا تھی۔ وہ کرسی پر بیٹھ گئی اور ٹکٹکی باندھ کر چپ چاپ پیئر کو دیکھنے لگی۔ جونہی وہ اندر آئی، پیئر کا چہرہ، جس پر پہلے افسردگی تھی، اچانک کھل اٹھا اور کاغذات تلاش کرتے کرتے اس نے متعدد بار اسے اچٹتی نظروں سے دیکھا۔

''کہیں نہیں مل رہے۔ مجھے گھر جانا ہوگا۔ وہیں رہ گئے ہوں گے۔ میں یقیناً...''

لیکن تم ڈنر کے لیے وقت پر نہیں پہنچ سکو گے۔''

''اف، میرا کوچوان بھی جا چکا ہے۔''

لیکن سونیا کو، جو پیش دالان میں کاغذات تلاش کرنے چلی گئی تھی، وہ پیئر کے ہیٹ میں مل گئے۔ وہاں وہ خود ہی انھیں نہایت احتیاط سے استر کے نیچے گھسیڑ آیا تھا۔

پیئر انھیں پڑھ کر سنانا چاہتا تھا۔

''نہیں، ڈنر کے بعد،'' معمر کاؤنٹ نے کہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے امید تھی کہ ان کے پڑھنے میں بہت لطف آئے گا۔

ڈنر کے دوران میں انھوں نے شمپین کی شکل میں سینٹ جارج[84] کے نئے محافظ[85] کا جام صحت پیا اور شن شن نے انھیں معمر جارجیائی پرنس کی علالت اور ماسکو سے میتی ویئے کی گم شدگی کی خبریں سنائیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ کس طرح کوئی جرمن باشندہ رستوپ چن کے سامنے پیش کیا گیا۔ اس پر الزام لگایا گیا تھا کہ وہ Cham — pignon[86] فرانسیسی جاسوس — ہے (رستوپ چن نے یہ کہانی اسی طرح سنائی تھی) اور یہ کہ رستوپ چن نے اسے کس طرح جانے دیا۔ اس نے عوام کو یقین دلا دیا تھا کہ وہ Cham pignon بالکل نہیں ہے بلکہ بوڑھا جرمن نوڈ[87]ستول ہے۔

''یہ خواہ مخواہ لوگوں کو گرفتار کرتے رہتے ہیں،'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''میں کاؤنٹس سے کہتا رہتا ہوں کہ وہ اتنی زیادہ فرانسیسی نہ بولا کریں۔ اس کے لیے وقت سازگار نہیں رہا۔''

''اور آپ لوگوں نے سنا ہے کہ پرنس گالت سن نے ٹیوٹر رکھ لیا ہے؟'' شن شن نے پوچھا۔ ''وہ اسے روسی سکھایا کرے گا۔ گلی کوچوں میں فرانسیسی بولنا[88] خطرناک ہوتا جا رہا ہے۔''

''کاؤنٹ پیوتر کرلووچ، تمھارا اپنے بارے میں کیا خیال ہے؟ اگر عام بھرتی کا حکم صادر ہو گیا، تمھیں بھی

گھوڑے پر سوار ہونا پڑے گا،'' معمر کاؤنٹ نے پیئر سے مخاطب ہو کر کہا۔

پیئر ڈنر کے دوران میں سارا عرصہ خاموش رہا تھا۔ وہ اپنی سوچ بچار میں مصروف تھا۔ اس نے کاؤنٹ کی طرف یوں دیکھا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ اس نے کیا کہا ہے۔

''ہاں، ہاں، جنگ...'' وہ بولنے لگا۔ ''نہیں! میں بھی کیسا اچھا سپاہی ثابت ہوں گا! لیکن یہ سب کچھ اتنا عجیب، اتنا غیر معمولی ہے! لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا، مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ مجھ میں کسی صورت عسکری ذوق پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن موجودہ زمانے میں کوئی بھی اپنے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔''

ڈنر کے بعد کاؤنٹ ٹانگیں پسار کر آرام کرسی پر بیٹھ گیا اور چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے سونیا (جس کی شہرت یہ تھی کہ وہ بہت اچھی خواندگی کرتی ہے) سے بولا کہ وہ انھیں اپیل پڑھ کر سنائے۔

ہمارے نمبر ایک صدر مقام، ماسکو کے نام

''دشمن لشکر جرار کے ساتھ روسی سرحدیں عبور کر چکا ہے۔ وہ ہمارے محبوب وطن کی حرمت خاک میں ملانا چاہتا ہے۔''

سونیا نہایت مستعدی سے اپنے بلند آہنگ لہجے میں اپیل پڑھ کر سنا رہی تھی۔ کاؤنٹ آنکھیں بند کیے سن رہا تھا۔ بعض عبارتوں پر وہ ناگہاں آہیں بھرنے لگتا۔ نتاشا سیدھی تن کر بیٹھی تھی۔ وہ متجسس نگاہوں سے کبھی اپنے باپ کو اور کبھی پیتا کو دیکھنے لگی۔

پیئر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کی نگاہیں اس پر لگی ہوئی ہیں اور وہ کوشش کر رہا تھا کہ وہ ادھر ادھر نہ دیکھے۔ اپیل کے ہر سنجیدہ اور گمبھیر جملے پر کاؤنٹس غصے اور ناپسندیدگی سے اپنا سر ہلانے لگتی۔ ان تمام الفاظ میں اسے صرف ایک ہی چیز نظر آ رہی تھی اور وہ چیز یہ تھی کہ جن خطرات میں اس کا بیٹا گھرا ہوا ہے وہ جلدی ناپید نہیں ہوں گے۔ شن شن کے لبوں پر، جنھیں اس نے بھینچ رکھا تھا، طنزیہ مسکراہٹ تیر رہی تھی۔ صاف عیاں تھا کہ جو بات بھی پہلے اس کے ہتھے چڑھی، وہ اس کا مذاق اڑائے بنا نہیں رہے گا۔ سونیا کی خواندگی، کاؤنٹ کا کوئی تبصرہ، بلکہ اپیل خود بھی، ان سے بڑھ کر اور بہتر عذر کیا ہو سکتا تھا۔

روس کو جو خطرات درپیش تھے، اور امپراطور نے اہالیان ماسکو، بالخصوص اس کے نامور اشراف سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، ان کی خواندگی کے بعد سونیا نے، جس کی آواز میں کپکپاہٹ تھی، جو زیادہ تر اس توجہ کی، جس سے وہ اسے سن رہے تھے، بنا پر تھی، آخری الفاظ پڑھے:

ہم اپنی افواج کی، جو پہلے ہی دشمن کے راستے میں سد سکندری بن چکی ہیں، اور وہ جہاں بھی جائے اس کو ملیامیٹ کرنے کے لیے جو نئی افواج تشکیل دی گئی ہیں، ان کی قیادت کرنے اور اپنی رعایا سے مشورہ کرنے

اس دارالحکومت اور اپنی مملکت کے دوسرے علاقوں کا دورہ کرنے میں ذرا بھی تاخیر روا نہیں رکھیں گے۔
دشمن جو تباہی ہمارے سروں پر نازل کرنے کی سوچ رہا ہے، خدا کرے کہ وہ خود اس کا شکار ہو جائے اور خدا
کرے کہ یورپ غلامی کے بندھنوں سے آزاد ہو جائے اور روس کے نام کو چار چاند لگا دے۔

''یہ ہوئی نا بات!'' کاؤنٹ نے اپنی بھیگی آنکھیں کھولتے اور بار بار چھینکیں مارتے ہوئے، جیسے اس کی ناک کے نیچے کا فوری سرکے کی شیشی رکھ دی گئی ہو، با آواز بلند کہا۔ ''ہمارے فرماں روائے مملکت اپنی زبان مبارک سے صرف ایک لفظ کہہ دیں اور ہم تن من دھن سب کچھ قربان کر دیں گے، قطعاً دریغ نہیں کریں گے۔''

پیشتر اس کے کہ شن شن وہ پھبتی، جس کے ذریعے وہ کاؤنٹ کی حب الوطنی کی بھد اڑانا چاہتا تھا، کس سکتا، نتاشا نے اپنی نشست سے جست لگائی اور اپنے باپ کی طرف بھاگی۔

''ہمارے پاپا کتنے اچھے ہیں!'' وہ اس کا بوسہ لیتے ہوئے با آواز بلند بولی اور اس نے ایک بار پھر غیر شعوری غمزے سے، جو اس کی طبیعت کی شگفتگی کی بحالی کے ساتھ اس میں عود کر آیا تھا، پیئر پر نگاہ غلط انداز ڈالی۔

''واہ واہ، بڑی محبِ وطن ہو!'' شن شن نے کہا۔

''اس میں حب الوطنی کی کوئی بات نہیں۔ یہ تو محض...'' نتاشا برافروختہ ہو کر بولی۔ ''آپ کو ہر بات میں مذاق کا پہلو نظر آتا ہے لیکن یہ کسی عنوان دل لگی کی بات نہیں ہے۔''

''دل لگی کی بات؟ قطعاً نہیں!'' کاؤنٹ نے کہا۔ ''وہ اپنے دہن مبارک سے ایک لفظ ارشاد فرمائیں اور ہم سب چل پڑیں گے...''

''لیکن آپ نے غور نہیں کیا کہ اس میں 'مشورے' کی بات کی گئی ہے؟'' پیئر نے کہا۔

''خیر، جس کا ہے کے لیے بھی ہو۔''

اس لمحے پیتیا، جس پر کوئی توجہ نہیں دے رہا تھا، اپنے باپ کے پاس گیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور وہ ایک ایسی آواز میں، جو کبھی پھٹنے لگتی اور کبھی اس میں باری باری غراہٹ یا تیکھا پن آ جاتا، بات کرنے لگا۔

''پاپا، میں آپ کو بھی — اور ماما کو بھی — صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں، آپ کا جو جی چاہے کرتے رہیں، لیکن میں آپ کو صاف صاف بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں فوج میں شامل ہونے کا خواہش مند ہوں اور آپ مجھے اس کی اجازت دے دیں کیونکہ میں یہ نہیں... بس مجھے یہی کہنا تھا...''

کاؤنٹس نے عالم بے چارگی میں اپنی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھا دیں، اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور خشم ناک ہو کر اپنے خاوند کی طرف متوجہ ہوئی۔

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، دیکھ لیں، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے!'' اس نے کہا۔

لیکن کاؤنٹ اپنے جوش و خروش پر پہلے ہی قابو پا چکا تھا۔

''چھوڑو بھئی!'' اس نے کہا۔ ''بڑے عمدہ فوجی ثابت ہو گے، ہونہہ! نہیں، فضول بات مت کرو۔ ابھی تو تمھیں اپنی تعلیم مکمل کرنا ہے۔''

''پاپا، یہ فضول بات نہیں ہے۔ فدیا ابولینسکی مجھ سے چھوٹا ہے اور وہ جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اب میں پڑھائی وڑھائی نہیں کر سکتا کیونکہ...'' پیتا رک گیا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا یہاں تک کہ اس پر پسینہ چھوٹ آیا۔ تاہم وہ دل کڑا کر کے بولتا چلا گیا، ''کیونکہ اس وقت مادر وطن خطرات میں گھر چکی ہے۔''

''اتنا کافی ہے، اتنا کافی ہے — ایسی فضول باتیں نہیں کرتے۔''

''لیکن آپ نے خود فرمایا تھا کہ آپ سب کچھ قربان کر دیں گے۔''

''پیتا! خاموش ہو جاؤ، میں بتائے دیتا ہوں!'' کاؤنٹ نے چلا کر کہا اور مڑ کر اپنی بیوی کی طرف دیکھا جس کا رنگ فق ہو چکا تھا اور جو ٹکٹکی باندھے اپنے بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔

''لیکن میں آپ سے عرض کر رہا ہوں — اور پیوتر کرلووچ بھی آپ کو کچھ بتائیں گے —''

''اور میں کہتا ہوں کہ یہ نری فضول حرکت ہے۔ ابھی اس کے ہونٹوں پر دودھ بھی خشک نہیں ہوا اور یہ فوج میں جانا چاہتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ان باتوں کو چھوڑو۔'' کاؤنٹ نے کاغذات، جنھیں وہ غالباً قیلولے سے قبل ایک بار پھر اپنے سٹڈی روم میں پڑھنا چاہتا تھا، سمیٹے اور کمرے سے باہر نکلنے لگا۔

''پیوتر کرلووچ، آؤ چلیں، ذرا پائپ کا کش لگاتے ہیں۔''

پیئر بوکھلا گیا اور حیص بیص کرنے لگا۔ نتاشا کی غیر معمولی طور پر تاباں اور شگفتہ آنکھیں بار بار اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ ان میں گرم جوشی سے بڑھ کر کچھ اور تھا اور اسی نے اس کی یہ حالت بنا دی تھی۔

''نہیں، میرا خیال ہے کہ مجھے گھر چلنا چاہیے...''

''گھر؟ کیوں؟ تم تو شام ہمارے ساتھ گزارنا چاہتے تھے،'' کاؤنٹ نے خوش مزاجی سے کہا۔ ''ویسے بھی تم آج کل کبھی کبھار ہی آتے ہو اور میری یہ بیٹی'' اس نے نتاشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''صرف تبھی چہکتی ہے جب تم یہاں ہوتے ہو...''

''لیکن میں بھول گیا تھا... مجھے واقعی گھر جانا ہے... کچھ کام ہے۔'' پیئر نے شتابی سے کہا۔

''اچھا، پھر خدا حافظ،'' کاؤنٹ نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''آپ کیوں جا رہے ہیں؟ آپ اتنا پریشان کیوں ہیں؟ کیوں؟'' نتاشا نے پوچھا اور یوں اس کی آنکھوں میں جھانکنے لگی جیسے وہ اسے للکار رہی ہو کہ ہے ہمت۔

وہ کہنا چاہتا تھا ''کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں،'' لیکن اس نے یہ کہا نہیں۔ اس کا چہرہ لالوں لال ہونے لگا یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور اس نے اپنی نگاہیں نیچے جھکا لیں۔

''کیونکہ میرے لیے بہتر یہی ہے کہ میں یہاں اتنا نہ آیا کروں... کیونکہ... نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ مجھے

کچھ کام ہے...''

دونوں نے بے چارگی اور بوکھلاہٹ سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن وہ مسکرا نہ سکا۔ اس کی مسکراہٹ دکھ کا اظہار کر رہی تھی۔ اس نے اس کا ہاتھ چوما اور ایک لفظ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

پیئر نے تہیہ کر لیا تھا کہ اب وہ رستوفوں کے ہاں نہیں جایا کرے گا۔

21

دوٹوک جواب ملنے کے بعد پیتیا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے اندر سے چٹخنی لگائی اور جی بھر کر رویا۔ جب وہ مہر بلب، آشفتہ حال اور چہرے پر آنسوؤں کے نشانات سجائے چائے پر آیا، ہر شخص جھوٹ موٹ یہی ظاہر کرنے لگا کہ اس نے کچھ نہیں دیکھا ہے۔

اگلے روز امپراطور کی آمد ہوئی۔ رستوفوں کے متعدد ملازموں نے باہر جانے اور زار کو دیکھنے کی اجازت مانگی۔ اس روز پیتیا نے اپنا لباس پہننے، بال سنوارنے اور کالر ٹھیک کرنے میں خاصا وقت صرف کیا تا کہ وہ چہرے مہرے سے بالغ شخص نظر آئے۔ اس نے آئینے کے روبرو ابروؤں پر بل ڈالے، ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کیے، کندھے اچکائے اور آخر کار کسی سے ایک لفظ کہے بغیر اس نے اپنی ٹوپی پہنی اور عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کی کوشش تھی کہ کوئی اسے دیکھنے نہ پائے۔

پیتیا نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ سیدھا وہاں، جہاں زار مقیم تھا، جائے گا اور کسی مصاحب خاص (پیتیا نے اپنے ذہن میں امپراطور کی جو تصویر بنائی تھی، اس میں وہ ہر وقت مصاحبان خاص میں گھرا نظر آتا تھا) سے صاف صاف عرض کرے گا کہ کاؤنٹ رستوف اپنی نوعمری کے باوجود اپنے وطن کی خدمت کرنا چاہتا ہے، یہ کہ نوعمری وفاداری میں رکاوٹ نہیں بن سکتی اور یہ کہ وہ بالکل کمربستہ ہے... لباس تبدیل کرنے کے دوران میں اس نے خاصی تعداد میں نفیس جملے، جو وہ مصاحب خاص سے کہنا چاہتا تھا، سوچ لیے تھے۔

امپراطور تک رسائی حاصل کرنے کے لیے پیتیا محض اسی حقیقت پر کہ وہ اتنا نوعمر ہے، انحصار کر رہا تھا (اس کا تو یہ بھی خیال تھا کہ اس کی نوعمری دیکھ کر ہر شخص کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ جائے گا)، تاہم اس نے جس اسلوب سے اپنے بال بنائے اور کالر سنوارے تھے، اور جس پر وقار اور محتاط انداز سے اس کا چلنے کا ارادہ تھا، اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتا تھا کہ وہ بالغ شخص ہے۔ لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھتا گیا اور جوں جوں لوگوں کے ازدحام سے، جس میں کریملن[89] کے آس پاس ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اس کی توجہ منتشر ہوتی چلی گئی، توں توں اس کے لیے یہ یاد رکھنا کہ اسے بالغ آدمی کی سنجیدگی اور وجاہت برقرار رکھنا ہے، مشکل سے مشکل تر ہوتا چلا گیا۔ جب وہ کریملن کے نزدیک پہنچا، اسے دھکوں سے بچنے کے لیے خاصا چوکس ہونا پڑا، اور اس نے پرعزم اور تہدیدی انداز سے اپنی کہنیاں آگے بڑھا دیں۔ لیکن تثلیث دروازے پر اس کے عزم صمیم کے باوجود، لوگوں نے، جو لاریب اس کے محب الوطنانہ

جذبات سے، جو اسے کشاں کشاں کریملن تک لائے تھے، نا آشنا تھے، اسے دیوار کے ساتھ اتنا دبا دیا کہ اسے مجبوراً انھیں راستہ دینا اور خود رکنا پڑا جب کہ گاڑیاں محرابی دروازے کے نیچے بلا روک گزرتی رہیں۔ اس کے نزدیک ایک کسان عورت، ایک وردی پوش گھریلو ملازم، ایک فوجی، جسے فوج سے فارغ کر دیا گیا تھا اور دو تاجر کھڑے تھے۔ دروازے کے قریب کچھ دیر کھڑا رہنے کے بعد تمام گاڑیوں کے گزرنے کا انتظار کیے بغیر پیتیا نے دھکم پیل کر کے دوسروں سے آگے نکلنے کی کوشش کی اور اس نے عزم صمیم کے ساتھ کہنیاں چلانا شروع کر دیں لیکن کسان عورت نے، جو اس کے نزدیک کھڑی تھی اور جسے اس نے اپنی اولین کوشش کا نشانہ بنایا تھا، غصے سے چلا کر بولی:

''نوجوان صاحبزادے، ذرا دیکھو، یہ تم دھکے کیوں دے رہے ہو؟ تمھیں نظر نہیں آتا کہ ہم سب یہاں چپ چاپ کھڑے ہیں؟ پھر تم دھکم پیل کیوں کرنا چاہتے ہو؟''

''دھکوں کا کیا ہے، وہ تو ہر کوئی دے سکتا ہے،'' وردی پوش گھریلو ملازم نے کہا۔ وہ بھی اپنی کہنیاں چلانے لگا اور اس نے پیتیا کو دروازے کے ایک ایسے کونے میں، جہاں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے تھے، دھکیل دیا۔

پیتیا نے ہاتھوں سے اپنا چہرہ، جس پر پسینہ پھوٹ رہا تھا، پونچھا اور اپنا گیلا کالر، جسے اس نے بالغ نظر آنے کے لیے گھر پر اتنی احتیاط سے ٹھیک کیا تھا، اوپر اٹھا دیا۔

اسے محسوس ہوا کہ اس کی وضع قطع اس قابل نہیں رہی کہ اسے دوسروں کے سامنے پیش کیا جا سکے اور اسے اندیشہ لاحق ہو گیا کہ اگر وہ اس حلیے میں مصاحب خاص کے سامنے گیا، اسے امپراطور کی خدمت میں پیش ہونے کا موقع نہیں دیا جائے گا، لیکن لوگوں کی بھیڑ میں یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ اپنی جھاڑ پونچھ کر سکتا یا کسی دوسری جگہ چلا جاتا۔ ایک جرنیل، جو گاڑی میں جا رہا تھا، رستوفوں کا واقف تھا۔ پیتیا کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ اس سے مدد کی درخواست کی جائے لیکن اسے محسوس ہوا کہ ایسا کرنا شیوۂ مردانگی نہیں ہوگا۔ جب تمام گاڑیاں گزر گئیں، ہجوم کا ریلا مثلِ موجِ سیلاب بہتا اور پیتیا کو اپنے ساتھ بہاتا چوک میں، جو پہلے ہی خلقِ خدا سے پر تھا، پہنچ گیا۔ خلقت کے ٹھٹ صرف چوک میں ہی نہیں تھے، بلکہ ڈھلانیں، چھتیں اور ہر وہ جگہ، جو انھیں میسر آئی، ان سے پٹی پڑی تھی۔ جونہی پیتیا چوک میں پہنچا، اسے گھنٹیوں کے بجنے اور ہجوم کے، جن سے سارا چوک اٹا ہوا تھا، بھنبھنانے کی آوازیں صاف سنائی دینے لگیں۔

کچھ دیر کے لیے چوک میں لوگوں کا ہجوم اتنا گنجان نہیں تھا، لیکن ایکا ایکی تمام سر برہنہ ہو گئے اور لوگوں کا ایک اور ریلا بہنے لگا۔ پیتیا کچھ اس طرح پچک گیا کہ اس کے لیے سانس لینا دشوار ہو گیا۔ وہاں مسلسل ''ہرّا، ہرّا، ہرّا'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔ وہ پنجوں کے بل کھڑا ہوا، اس نے دھکم پیل کی، چٹکیاں کاٹیں، لیکن اسے اپنے گرد و پیش کے سوا کچھ نظر نہ آیا۔

ہر چہرے پر ہیجان اور جوش و خروش کی یکساں کیفیت نمایاں تھی۔ پیتیا کے قریب کسی تاجر کی بیوی کھڑی تھی۔ وہ سسکیاں بھر رہی تھی اور اس کے رخساروں پر آنسو بہہ رہے تھے۔

''باپ! فرشتہ! ہمارا آقا!'' وہ بار بار یہی رٹ لگائے جا رہی تھی اور اپنی انگلیوں سے آنسو پونچھتی جاتی تھی۔
''ہرا!'' چاروں اطراف سے یہ نعرہ سنائی دے رہا تھا۔
ایک لمحے کے لیے ہجوم ساکت وصامت کھڑا رہا۔ پھر بھیڑ کا ریلا ایک بار اور آگے بہنے لگا۔
پیتا اب آپے میں نہیں رہا تھا۔ وہ سختی سے دانت کچکچاتا اور تندی سے آنکھیں مٹکاتا اور آگے دھکم پیل کرنے لگا۔ وہ یوں دائیں بائیں کہنیاں چلا اور ''ہرا'' کا نعرہ بلند کر رہا تھا جیسے مرنے مارنے پر تل چکا ہو لیکن اس کے چاروں اطراف جو لوگ تھے، ان کے چہروں پر بھی خشونت برس رہی تھی، وہ بھی دھکم پیل کر رہے اور ''ہرا'' کا فلک شگاف نعرہ بلند کر رہے تھے۔

''تو معاملے کی نوعیت یہ ہے!'' پیتا نے سوچا۔ ''میں زار کے سامنے خود کبھی درخواست پیش نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی بے باکی کا مظاہرہ ہوتا!'' تاہم وہ آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔ اسے یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ کہیں وہ پیچھے نہ رہ جائے۔ اسے اپنے سامنے لوگوں کی پیٹھوں کے بیچ میں کھلی جگہ دکھائی دی۔ وہاں سرخ باغات کی پٹی بچھی ہوئی تھی۔ تاہم عین اسی وقت ہجوم ڈگمگانے اور پیچھے ہٹنے لگا (ہوا یہ کہ پولیس نے ان لوگوں کو جو جلوس۔ زار محل سے کلیسائے مریم[90] جا رہا تھا۔ کے بہت قریب پہنچ گئے تھے، پیچھے دھکیل دیا تھا۔)، اور پیتا کی پسلیوں پر غیر متوقع طور پر اتنے زور کا گھونسا پڑا اور وہ اس برح طرح کچلا گیا کہ اچانک اس کی نگاہوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ غش کھا گیا۔ جب اسے دوبارہ ہوش آیا، ایک شخص نے، جو شکل وصورت سے کوئی پادری وغیرہ معلوم ہوتا تھا، جس کی لانبی سفید زلفیں اس کی پشت پر لٹک رہی تھیں، اور جس نے پادریوں کا بوسیدہ سیاہ جُبّہ پہنا ہوا تھا، اسے ایک بازو سے تھام رکھا تھا جب کہ وہ دوسرے ہاتھ سے ہجوم کے دباؤ کا توڑ کر رہا تھا۔
''تم نے اس نوجوان کو کچل دیا ہے!'' پادری کہہ رہا تھا۔ ''دھیان سے... آرام سے... تم لوگ اسے کچلے دے رہے ہو!''

زار کلیسائے مریم میں داخل ہو چکا تھا۔ ہجوم ایک بار پھر پھیل چکا تھا اور پادری پیتا کو، جس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا اور سانس اکھڑ رہی تھی، توپ زار[91] کی طرف لے چلا۔ بے شمار آدمیوں کو پیتا پر ترس آ گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے اردگرد لوگوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ جو اشخاص اس کے قریب کھڑے تھے، وہ اس کی خبر گیری کرنے لگے، انھوں نے اس کے کوٹ کے بٹن کھول دیے اور اسے توپ کے بلند چبوترے پر بٹھا دیا۔ دریں اثنا وہ دوسروں کو، جنھوں نے غالباً اسے کچلا تھا، ملاحیاں سناتے رہے۔
''کوئی آدمی بھی اس طرح پاؤں تلے کچلا جا سکتا اور ہلاک ہو سکتا ہے! اس کے بعد؟ لوگوں کی ہلاکت! دیکھو تو، بیچارے کا رنگ بالکل سپید پڑ گیا ہے!'' لوگ کہتے سنائی دے رہے تھے۔
پیتا کی حالت بہت جلد سنبھل گئی، اس کے رخساروں کی سرخی عود کر آئی، درد تھم گیا اور اس عارضی تکلیف سے اسے فائدہ یہ ہوا کہ اسے توپ پر جگہ مل گئی اور وہ یہاں سے امپراطور کو دیکھنے کی امید کر سکتا تھا۔ زار سے درخواست

کرنے کا خیال پیتا کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اگر وہ اپنی آنکھوں سے زار کی زیارت کرنے میں کامیاب ہوگیا، اس کے سارے ارمان پورے ہو جائیں گے۔

کلیسائے مریمؑ میں اجتماعی مشترکہ عبادت کی تقریب ــــ یہ مشترکہ تقریب اس لیے تھی کہ اس میں ایک طرف تو زار کی آمد پر عبادت کرنا اور دوسری طرف ترکوں کے ساتھ معاہدۂ امن طے پا جانے پر شکر خداوندی ادا کرنا مقصود تھا۔ کے دوران میں ہجوم ادھر ادھر چوک میں بکھر گیا اور خوانچہ فروش نظر آنے لگے۔ وہ کواس[92]، کیک، بسکٹ، جن میں ادرک کی آمیزش تھی اور مٹھائیاں، جن میں خشخاش کے دانے ملائے گئے تھے (اور جن کا پیتا خاص طور پر شوقین تھا) فروخت کر رہے تھے۔ اب روزانہ کی عام گفتگو دوبارہ سنائی دینے لگی تھی۔ ایک بیوپاری کی بیوی اپنی دریدہ شال دکھا رہی تھی اور بتا رہی تھی کہ اس نے یہ کتنے میں خریدی تھی۔ دوسری کہہ رہی تھی کہ آج کل ریشمی اشیا کے نرخ بہت چڑھ گئے ہیں۔ وہ پادری، جس نے پیتا کو بچایا تھا، ایک سرکاری کارندے سے ان خادمین دین کے، جو اس روز مذہبی فرائض کی ادائیگی میں بشپ کا ہاتھ بٹانے پر مامور تھے، بارے میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ لفظ ''کانووکیشن'' بار بار استعمال کر رہا تھا۔ یہ لفظ پیتا کی سمجھ میں نہ آیا۔ دو نوجوان مزدور چند نوخیز خادماؤں کے ساتھ، جو اخروٹ توڑنے میں مصروف تھیں، ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ پیتا کو ان تمام گفتگوؤں، بالخصوص لڑکیوں کے ساتھ چھیڑ چھاڑ میں، جو کسی دوسرے وقت اس کا دل لبھا لیتیں، کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ توپ پر اپنی بلند اور محفوظ نشست پر بیٹھا تھا، اور جب بھی اسے امپراطور اور اس کے ساتھ اپنی محبت کا خیال آتا، وہ پہلے کی طرح بے کل ہو جاتا۔ لوگوں کے پاؤں تلے کچلے جانے کے دوران میں اسے جس درد اور خوف کا تجربہ ہوا تھا، اس میں نشاط و انبساط کا جذبہ بھی شامل ہوگیا تھا، اور ان سب چیزوں نے مل ملا کر اس کے دل میں موقع کی سنجیدگی کا جو احساس ابھارا تھا، اس کی شدت میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔

اچانک دریا کے پشتے پر توپ کے داغے جانے کی آواز سنائی دی (توپ ترکوں کے ساتھ معاہدہ امن پر دستخط ہو جانے کی خوشی میں داغی جا رہی تھی) اور بھیڑ یہ منظر دیکھنے کے لیے پشتے پر پل پڑی۔ پیتا بھی بھاگ اٹھتا، لیکن جس پادری نے اسے اپنے سایۂ عاطفت میں لے لیا تھا، اس نے اسے اپنی جگہ سے ہلنے نہ دیا۔ گولے چلتے رہے جب کہ افسر، جرنیل اور مصاحبانِ خاص بھاگم بھاگ کلیسا سے باہر آتے رہے۔ ان کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ آ رہے تھے لیکن انھیں کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ ایک بار پھر ٹوپیاں فضا میں بلند کی گئیں اور وہ لوگ، جو توپوں کی جانب بھاگے تھے، واپس آنے لگے۔ آخر کار وردیاں پہنے اور اپنے سینوں پر تمغے سجائے چار اشخاص گرجے سے برآمد ہوئے۔ ''ہرّا، ہرّا!'' ایک بار پھر ہجوم نعرے بلند کرنے لگا۔

''ان میں سے وہ کون ہے؟ وہ کون ہے؟'' پیتا نے روہانسی آواز سے پوچھا، لیکن کسی نے اسے جواب نہ دیا۔ ہر شخص پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

پیتا نے ان چار میں سے ایک پر اپنی نگاہیں گاڑ دیں مگر چونکہ اس کی آنکھیں مسرت کے آنسوؤں سے لبریز

Convocation = پادریوں کا خصوصی اجتماع۔

تھیں، اسے وہ واضح طور پر دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ تاہم اس نے اپنا سارا شوق و ولولہ اسی پر مرکوز کر دیا۔ اگرچہ اتفاق سے وہ امپراطور نہیں تھا۔ اور دیوانہ وار ''ہرّا'' کا نعرہ بلند کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جی میں ٹھان لیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، وہ لازماً کل فوج میں بھرتی ہو جائے گا۔

ہجوم نے امپراطور کا تعاقب کیا، محل تک اس کے پیچھے پیچھے گیا اور پھر منتشر ہونے لگا۔ پہلے ہی دن خاصا گزر چکا تھا۔ پیتیا کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا اور وہ پسینے میں شرابور ہو رہا تھا، تاہم وہ گھر نہ گیا بلکہ ہجوم کے ساتھ، جو اگرچہ چھٹ رہا تھا، پھر بھی خاصا بڑا تھا، محل کے سامنے کھڑا رہا جب کہ امپراطور ڈنر کھا رہا تھا۔ وہ محل کے دریچوں کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، اسے انتظار تھا لیکن کس کا، یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ اسے ان معزز اشخاص پر، جنھیں وہ امپراطور کے ساتھ ڈنر کھانے کے لیے دروازے کے اندر جاتے دیکھ رہا تھا، اور ان درباری وردی پوش ملازمین پر، جو دسترخوان پر خدمات سرانجام دے رہے تھے اور جن کی جھلک اسے دریچوں میں سے دکھائی دے رہی تھی، یکساں رشک آ رہا تھا۔

جب امپراطور ڈنر کھا رہا تھا، والیو یف نے دریچے میں سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

''یور میجسٹی، لوگ اب بھی آپ کا دوبارہ دیدار کرنے کی امید لگائے ہوئے ہیں۔''

ڈنر تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ امپراطور بسکٹ چباتا اپنی نشست سے اٹھا اور باہر بالکنی میں چلا گیا۔ ہجوم، جس کے بیچ میں پیتیا بھی تھا، بالکنی کی طرف بھاگا۔

''فرشتہ! باپ! ہرّا! آقا!'' ہجوم پورے زور شور سے نعرے لگا رہا تھا اور ایک بار پھر خواتین اور بعض رقیق القلب مرد، بشمول پیتیا، خوشی کے آنسو بہانے لگے۔

زار کے ہاتھ میں جو بسکٹ تھا، اس کا خاصا بڑا ٹکڑا ٹوٹا اور بالکنی کے جنگلے پر گرتا نیچے زمین پر آ رہا۔ ایک کوچوان، جس نے پوستین کا کوٹ پہنا ہوا تھا، بسکٹ کے ٹکڑے پر جھپٹا، اور اس نے اسے دبوچ لیا۔ ہجوم میں بے شمار لوگ کوچوان کی طرف بھاگے۔ جب زار نے یہ منظر دیکھا، اس نے بسکٹوں سے بھری ہوئی پلیٹ[93] منگوائی اور انھیں بالکنی سے نیچے پھینکنے لگا۔ پیتیا، جس کی آنکھیں اب سرخ ہو رہی تھیں اور جسے کچلے جانے کے خوف نے اور بھی ہیجان زدہ کر دیا تھا، بسکٹوں پر ٹوٹ پڑا۔ وہ یہ تو نہیں جانتا تھا کہ کیوں لیکن اسے زار کے ہاتھ سے بسکٹ لینا تھا اور اسے محسوس ہوا کہ وہ یہ کوشش ترک نہیں کر سکتا۔ اس نے آگے زقند لگائی اور ایک بوڑھی عورت کو، جو ایک بسکٹ پکڑنا چاہتی تھی، متزلزل کر دیا۔ بڑھیا نے، حالانکہ وہ زمین پر گری پڑی تھی، یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ وہ پٹ چکی ہے۔ اس نے چند بسکٹ جھپٹنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ ان تک نہ پہنچ سکا۔ پیتیا نے اس کے ہاتھ پر گھٹنا مارا اور اسے پرے دھکیل دیا، خود ایک بسکٹ پکڑا اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس سے تاخیر نہ ہو جائے، ایسی آواز میں، جو اب بیٹھ چکی تھی، اکیلے ہی ''ہرّا'' کا نعرہ لگا دیا۔

امپراطور اندر چلا گیا اور اس کے بعد ہجوم کا خاصا بڑا حصہ تتر بتر ہونے لگا۔

"دیکھا، میں نے کہا نہیں تھا کہ کچھ دیر اور انتظار کرنا چاہیے — اور میں نے ٹھیک ہی کہا تھا،" چاروں اطراف یہی پرمسرت تبصرہ سنائی دے رہا تھا۔

حالانکہ پیتیا خوش تھا لیکن یہ سوچ کر کہ اب اسے واپس گھر جانا ہوگا، اس کا منہ لٹک گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس روز کا مزہ ختم ہوگیا ہے۔ وہ کریملن سے سیدھا گھر نہ گیا بلکہ اپنے دوست ابولینسکی سے، جس کی عمر پندرہ سال تھی اور جو خود بھی فوج میں شامل ہو رہا تھا، ملنے اس کے مکان پر چلا گیا۔

جب پیتیا گھر پہنچا، اس نے بڑے باعزم اور فیصلہ کن انداز سے اعلان کر دیا کہ اگر انھوں نے اجازت نہ دی، تو وہ گھر سے بھاگ جائے گا۔ اگرچہ کاؤنٹ الیا آندریچ نے پوری طرح اپنی رضامندی کا اظہار نہیں کیا تھا، پھر بھی وہ اگلے روز یہ دریافت کرنے چل دیا کہ پیتیا کو کسی ایسے مقام پر جہاں کم سے کم خطرہ درپیش ہو، تعینات کرانے کا بندوبست کس طرح ہوسکتا ہے۔

22

دوروز بعد پندرہ جولائی کی صبح لاتعداد گاڑیاں سلابودا محل[94] کے سامنے کھڑی تھیں۔

وسیع وعریض ہال کمرے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ پہلے میں وردیوں میں ملبوس شرفا تھے۔ دوسرے میں نیلے خفتان پہنے اور سینوں پر تمغے سجائے باریش تجار تھے۔ جس کمرے میں شرفا جمع تھے، وہاں سے بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور لوگ ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ انتہائی ممتاز اکابرین امپراطور کی تصویر کے نیچے، بہت بڑی میز کے سامنے اونچی پشتوں والی کرسیوں پر براجمان تھے، تاہم حاضرین کی بیشتر تعداد کمرے میں سرگشت کر رہی تھی۔

یہ تمام اشراف، جن سے پیئر کی روزانہ کلب میں یا ان کے گھروں میں ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں، وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان میں سے بعض کی وردیاں امپراطورہ کیتھرین کے زمانے کی، بعض کی امپراطور پاول کے دقتوں کی اور بعض کی امپراطور الیکساندر کے نئے عہد کی تھیں۔ ان میں بعض ایسے بھی تھے جنھوں نے شرفا کی عام وردیاں پہننے پر اکتفا کرلیا تھا۔ ان کے ملبوسات کی اس عمومی خصوصیت نے ان متنوع اور جانی پہچانی ہستیوں کی، جن میں بوڑھے اور جوان دونوں شامل تھے، ہیئت کچھ ایسی بنا دی تھی جو دیکھنے میں عجیب اور انوکھی معلوم ہوتی تھی۔ چندھی آنکھوں، بے دانت دہانوں، گنجے سروں، پیلے اور پھولے ہوئے یا سوکھے سڑے اور جھریوں زدہ چہروں والے بوڑھے خاص طور پر دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے تھے۔ وہ زیادہ تر اپنی نشستوں پر گم صم بیٹھے تھے اور ان میں سے اگر کوئی کمرے میں گھومتا پھرتا اور باتیں کرتا بھی، تو وہ اپنے آپ کو کسی نوجوان کے ساتھ نتھی کر لیتا۔ ہجوم میں شامل لوگوں کے، جنھیں پیتیا نے کریملن چوک میں دیکھا تھا، چہروں کی طرف ان اشخاص کے چہروں پر بھی نمایاں طور پر متضاد تاثرات ہویدا تھے۔ ایک طرف تو ان کے چہروں پر کسی گمبھیر واقعے کے ظہور پذیر ہونے کی

توقع جھلک رہی تھی اور دوسری طرف انھیں بوسٹن کے کھیل، باورچی پتروشکا، زینیدا دمتریونا کی صحت وغیرہ کے روزمرہ کے امور میں جو دلچسپی تھی، اس کا عندیہ مل رہا تھا۔

پیئر بھی وہیں تھا۔ وہ صبح سے شرفا کی وردی میں، جس کے بٹن بند تھے، ملبوس تھا۔ اب اسے اس میں خاصی بے آرامی محسوس ہو رہی تھی کیونکہ یہ تنگ تھی اور اس میں اس کا جسم جکڑا ہوا تھا۔ یہ غیر معمولی مجلس، جس میں نہ صرف شرفا بلکہ تاجر بھی شامل تھے، ایک قسم کی مجلس عوام[95] (Les Etates-generaux) تھی اور اس نے اس کے ذہن میں خیالات کے پورے سلسلے کا، جسے وہ مدتیں ہوئیں بھول چکا تھا لیکن جو اس کی روح پر پوری طرح نقش تھا، احیا ہو گیا اور یہ خیالات ''عمرانی معاہدے''[96] اور فرانسیسی انقلاب کے بارے میں تھے۔ امپراطور کے فرمان کے ان الفاظ — فرماں روائے مملکت اپنی رعایا سے مشورے کی غرض سے دارالسلطنت آرہے ہیں — نے اس کی توجہ خاص طور پر اپنی طرف مبذول کرائی تھی اور اس کے ان خیالات کی توثیق بھی کر دی تھی۔ اور یہ فرض کر کے کہ اس سمت، جس کا اسے مدتوں سے انتظار تھا، کوئی اہم پیش رفت ہونے والی ہے، وہ ادھر ادھر چکر لگاتا، دوسروں کو دیکھتا اور ان کی باتیں بغور سنتا رہا لیکن جن خیالات میں وہ مستغرق تھا، اس کی ذرا سی بھی صدائے بازگشت اسے کہیں سنائی نہ دی۔

امپراطور کا فرمان پڑھ کر سنایا گیا۔ اسے سن کر حاضرین میں بڑا جوش و خروش پیدا ہوا اور وہ اس پر بحث و تمحیص کرنے کے لیے مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ گفتگو کے روایتی موضوعات پر باتیں کرنے کے علاوہ پیئر نے لوگوں کو اس قسم کی بحثیں کرتے بھی سنا کہ امپراطور کی آمد پر اشراف کے نمائندوں نے، جو مارشل کہلاتے تھے، کہاں کھڑے ہونا ہے، اس کے اعزاز میں اجتماعی رقص کب منعقد کیا جانا چاہیے، آیا انھیں اپنی جماعت کی تشکیل ضلع یا پورے صوبے کی بنیاد پر کرنا چاہیے... علیٰ ہذا القیاس۔ لیکن جونہی جنگ اور شرفا کو طلب کرنے کا مقصد زیر بحث آیا، گفتگو میں ہچکچاہٹ اور بے یقینی پیدا ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب ہر شخص بولنے پر سننے کو ترجیح دے رہا ہے۔

ایک خوب رو اور تندرست و توانا ادھیڑ عمر شخص، جس نے ریٹائرڈ بحری افسر کی وردی پہنی ہوئی تھی، ایک کمرے میں باتیں کر رہا تھا اور اس کے ارد گرد لوگوں کا حلقہ بن گیا تھا۔ پیئر اس حلقے میں چلا گیا اور کان لگا کر سننے لگا۔ کاؤنٹ الیارستوف امپراطورکیتھرین کے عہد کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کے چہرے پر خوشگوار مسکراہٹ تھی۔ وہ ہجوم میں شامل تمام لوگوں سے واقف تھا اور ان کے مابین ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ پھرتے پھراتے وہ بھی اس حلقے کے قریب پہنچ گیا اور سننے کے لیے رک گیا۔ ہمیشہ کی طرح اب بھی وہ مشفقانہ انداز سے متبسم تھا اور جو کچھ متکلم کہہ رہا تھا، اس پر سر ہلا کر صاد کر رہا تھا۔ ریٹائرڈ بحری افسر بڑی بے باکی کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا۔ (اس کا اندازہ سامعین کے چہروں کے تاثرات اور اس حقیقت سے لگایا جا سکتا تھا کہ ان لوگوں کی، جن کے بارے میں پیئر کو معلوم تھا کہ ان کا شمار مسکین تریں اور بزدل تریں انسانوں میں ہوتا ہے، بیشتر تعداد ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے یا تو وہاں سے پرے کھسک گئی یا پھر وہ اس سے اختلاف رائے کرنے لگی۔) پیئر دھکم پیل کرتا حلقے کے عین درمیان میں پہنچ گیا۔ اس نے متکلم کی باتیں غور سے سنیں اور اسے یقین ہو گیا کہ یہ شخص واقعی لبرل ہے لیکن اس کے خیالات

اس کے اپنے خیالات سے قطعی مختلف تھے۔ بحری افسر روسی اشراف کے مخصوص حلاوت آمیز، سریلے اور بلند آہنگ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ وہ ''ر'' غتر بود کر دیتا اور اپنے حروف صحیح کو عام طور پر بیچ بیچ میں کھا جاتا تھا۔ اس کے لہجے سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ عیش و عشرت کا دلدادہ اور حکم چلانے کا عادی ہے۔

''اگر سمولنسک کے باشندوں نے امپراطور کے لیے فوج میں بھرتی دینے کی پیشکش کی ہے، تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ کیا ہمارے لیے قانون سمولنسک وضع کرے گا؟ اگر صوبہ ماسکو کے امرا و شرفا مناسب سمجھیں، تو وہ امپراطور کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار دوسرے طریقوں سے کر سکتے ہیں؟ سن سات میں ہم نے جو ملیشیا بھرتی کرائی تھی، کیا ہم اسے بھول گئے ہیں؟ اس کا نتیجہ کیا نکلا تھا؟ یہی نا کہ پادریوں کے بیٹوں اور چوروں اچکوں نے خوب ہاتھ رنگے...''

کاؤنٹ رستوف خوش اخلاقی سے مسکرایا اور اس نے پسندیدگی سے اپنا سر ہلا دیا۔

''اور ہم نے جو ملیشیا بھرتی کرائی تھی، کیا وہ امپراطور کے کسی کام آئی؟ ذرا بھی نہیں! البتہ اس سے ہماری کھیتی باڑی ضرور تباہ ہوئی۔ بہتر ہے کہ ایک بار پھر جبری لام بندی کر لی جائے... بصورت دیگر جب ہمارے آدمی واپس ہمارے پاس آئیں گے، وہ نہ صحیح معنوں میں فوجی ہوں گے اور نہ کسان۔ بس ان کی عادتیں بگڑ چکی ہوں گی، وہ عیاشی اور شراب خوری کے عادی ہو چکے ہوں گے اور بالکل نکمے بن چکے ہوں گے۔ شرفا کسی چیز سے دریغ نہیں کریں گے۔ ہم میں جو بھی مرد کا بچہ ہے، جائے گا اور اپنے ساتھ رنگروٹ لے کر آئے گا۔ امپراطور اپنی زبان مبارک سے ایک لفظ ارشاد فرما دیں اور ہم سب ان پر اپنی جانیں نثار کر دیں گے'' خطیب نے اپنے لہجے میں جوش پیدا کرتے ہوئے کہا۔

الیا آندریچ اس کی باتیں سن کر اتنا خوش ہوا کہ اس کی رال بہنے لگی اور اس نے پیئر کو ٹھوکا دیا، لیکن پیئر خود تقریر کرنا چاہتا تھا۔ وہ آگے بڑھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے جذبات مشتعل ہو چکے ہیں مگر کیوں؟ اس کے بارے میں وہ یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا اور نہ اسے معلوم تھا کہ وہ کہے گا کیا۔ اس نے بمشکل اپنا منہ کھولا ہو گا کہ ایک پوپلے منہ والے بوڑھے سینیٹر نے، جس کے چہرے پر زیرکی اور خفگی ٹپک رہی تھی اور جو پہلے مقرر کے قریب کھڑا تھا، اسے ٹوک دیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ مباحثوں کو پٹری پر ڈالنے اور استدلالی انداز کو ہاتھ سے نہ جانے دینے کا عادی ہے۔ اس نے مدھم لیکن صاف لہجے میں بولنا شروع کیا:

''میرا خیال ہے کہ ہمیں یہاں یہ بحث کرنے کے لیے نہیں بلایا گیا'' اس نے پوپلے منہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا، ''کہ موجودہ حالات میں ملک کے لیے کیا موزوں رہے گا۔ جبری بھرتی یا ملیشیا۔ ہمیں یہاں اس اپیل کا، جس سے ہمارے امپراطور نے ہمیں نواز کر ہماری عزت افزائی کی ہے، جواب دینے کے لیے اکٹھا کیا گیا ہے۔ لیکن بہترین طریق کار کیا رہے گا۔ جبری بھرتی یا ملیشیا۔ اس کا فیصلہ ہمیں حاکم اعلیٰ پر چھوڑ دینا چاہیے۔''

• ملیشیا: (نام نہاد) رضاکار فوج۔ حقیقتاً جاگیردار اپنے زرعی غلام جبراً بھرتی کراتے تھے۔

پیئر کو اپنے جوش وخروش کے اظہار کے لیے اچانک رستہ مل گیا۔ اسے سینیٹر پر، جو شرفا کی بحث وتمحیص میں اپنا محدود، روایتی نقطہ نظر گھسیٹر رہا تھا، طیش آ گیا۔ پیئر آگے بڑھا اور اس نے اس کی بات ٹوک دی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنے والا ہے، تاہم اس نے اپنی گفتگو کی ابتدا بڑے ولولے سے کی۔ وہ کتابی روسی بول رہا تھا لیکن وقتاً فوقتاً فرانسیسی کا سہارا لے لیتا تھا۔

''یور ایکسی لینسی، معافی چاہتا ہوں۔'' (پیئر سینیٹر سے اچھی طرح واقف تھا لیکن اس موقع پر اس نے اسے رسمی انداز سے مخاطب کرنا مناسب سمجھا۔) ''اگرچہ میں ان صاحب سے، جنھوں نے ابھی ابھی اپنے خیالات کا اظہار ہے، اتفاق نہیں کر سکتا...'' (وہ قدرے ہچکچایا، وہ اسے mon tres honorable preopinant* کہنا چاہتا تھا) ''اگرچہ میں ان صاحب سے ... جن سے مجھے تعارف کا شرف حاصل نہیں، اتفاق نہیں کر سکتا، میرا اندازہ ہے کہ شرفا کو یہاں محض اس لیے نہیں بلایا گیا کہ وہ ہمدردی جتائیں یا محض اپنے جوش وخروش کا اظہار کریں بلکہ ہمیں ان وسائل وذرائع کے، جن سے ہم اپنی مادر وطن کا دفاع کر سکتے ہیں، بارے میں بھی غور وفکر کرنا ہوگا۔ میں سمجھتا ہوں'' اس نے اپنے موضوع کے سلسلے میں اور بھی گرم جوشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی، ''کہ امپراطور کو جب یہ معلوم ہوگا کہ ہم انھیں کوئی مش۔ مش۔ مشورہ دینے کی بجائے محض یہ بتانے پر اکتفا کر رہے ہیں کہ ہم اپنے ساتھ ساتھ اپنے زرعی غلاموں کو، جن کے ہم مالک ہیں، Chair a Cannon — توپوں کا ایندھن — بنانے پر راضی ہیں، تو وہ کوئی خاص خوش نہیں ہوں گے۔''

گفتگو سننے کے لیے جو لوگ حلقہ بنائے کھڑے تھے، ان کی اچھی خاصی تعداد نے، جب سینیٹر کے چہرے پر تمسخر انگیز مسکراہٹ دیکھی اور پیئر کو بے لگام بولتے سنا، وہاں سے کھسکنے میں ہی عافیت سمجھی، کاؤنٹ رستوف واحد شخص تھا جس نے پیئر کی باتوں پر تحسین کی۔ ویسے بھی اس کی یہ عادت تھی کہ جو شخص جو بھی کہتا تھا، وہ جھٹ اس کے ساتھ متفق ہو جاتا تھا۔ اسی لیے اس نے ازیں قبل بحری افسر اور سینیٹر کی باتوں پر بھی پسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

''ان سوالات پر بحث کرنے سے قبل'' پیئر نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا، ''ہمیں امپراطور سے، نہایت ادب واحترام کے ساتھ ہز میجسٹی سے یہ دریافت کرنا چاہیے کہ وہ ازرہ کرم ہمیں یہ بتائیں کہ ہماری افواج کی تعداد کتنی ہے، ان کی اس وقت پوزیشن کیا ہے اور اس کے بعد—''

لیکن پیئر کے منہ سے یہ الفاظ بمشکل نکلے ہی ہوں گے کہ اس پر سہ طرفی تنقید ہونے لگی۔ متشدد ترین دھاوا اس کے پرانے شناسا اور بوسٹن کھیل میں اس کے حلیف ستیپن ستیپانووچ اپراکسن نے، جو اس کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا، بولا۔ ستیپن ستیپانووچ وردی میں تھا اور یہ وردی کا اعجاز تھا یا اس کا سبب کچھ اور تھا، پیئر کو اپنے سامنے ایک بالکل مختلف شخص نظر آیا۔ پیرانہ سالی کے غیظ وغضب سے اس کا چہرہ لال انگارا ہو گیا اور وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر پیئر سے کہنے لگا: ''میں تمھیں بتائے دیتا ہوں کہ نمبر ۱ ہمیں امپراطور سے اس قسم کے سوالات پوچھنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

* میرے انتہائی معزز مخالف۔

نمبر 2 اگر روسی شرفا کو اس قسم کا کوئی حق حاصل ہے بھی، تو بھی یہ امپراطور کی مرضی ہے کہ وہ اس کا جواب دیں یا نہ دیں۔ فوج کی نقل و حرکت کا انحصار دشمن کی نقل و حرکت پر ہوتا ہے۔ تعداد کا اس سے کوئی تعلق نہیں، وہ بڑھتی یا گھٹتی رہتی ہے۔''

اتنے میں ایک اور آواز مخل ہوگئی۔ یہ آواز ایک خاندانی خطاب یافتہ شخص کی تھی۔ اس کا قد درمیانہ اور اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ پیئر اسے بھلے دنوں میں جپسیوں کے میلوں ٹھیلوں میں دیکھا کرتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ تاش کا بڑا زٹیل کھلاڑی ہے۔ وردی نے اس کی کایا بھی پلٹ دی تھی۔ وہ پیئر کی جانب بڑھا اور بولا:

''بالکل بجا کہا۔ یہ وقت غور و فکر کا نہیں بلکہ عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ جنگ روس میں آ پہنچی ہے۔ دشمن روس کو تہس نہس کرنے، ہمارے آباؤ اجداد کی قبروں کی بے حرمتی کرنے اور ہمارے بیوی بچوں کو اٹھا لے جانے کے لیے پیش قدمی کر رہا ہے،'' اس نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا۔ ''ہم اٹھیں گے، ہم سب چلیں گے اور اپنے باپ زار کی پیروی کریں گے!'' اس نے اپنی خون بار آنکھوں کو گھماتے ہوئے چلا کر کہا۔

ہجوم میں سے چند آوازیں، جو اپنی پسندیدگی کا اظہار کر رہی تھیں، سنائی دیں۔

''ہم روسی ہیں اور اپنی مادر وطن کے دفاع کے لیے اپنا خون بہانے سے دریغ نہیں کریں گے! اگر ہم مادر وطن کے سپوت ہیں، تو ہمیں لایعنی خواب دیکھنے کی عادت ترک کرنا ہوگی۔ ہم یورپ کو دکھا دیں گے کہ روس کس طرح روس کا دفاع کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے!'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

پیئر نے جواب دینے کی کوشش کی لیکن وہ ایک لفظ بھی دوسروں کے کانوں تک نہ پہنچا سکا۔ اسے احساس تھا کہ اس کے الفاظ کا مطلب کیا ہے، اسے پہنچانا تو دور کی بات ہے، مخالفین کی پر جوش چیخ و پکار میں اس کی آواز بھی سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

کاؤنٹ رستوف اس مختصر ہجوم کے عقب میں کھڑا تھا اور پسندیدگی سے اپنا سر ہلا رہا تھا۔ جملے کے اختتام پر متعدد حاضرین تیزی سے مقرر کی جانب بڑھے اور چلانے لگے:

''ہیر، ہیر!''*

پیئر کہنا یہ چاہتا تھا کہ وہ کسی اعتبار سے بھی اپنی دولت، اپنی زرعی غلاموں اور خود اپنی ذات کی قربانی دینے کا مخالف نہیں ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ آدمی کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حالات کس نہج پر جا رہے ہیں تا کہ ان میں اصلاح کی صورت نکالی جا سکے لیکن وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

بیک وقت بولنے اور چلانے کی اتنی زیادہ آوازیں سنائی دے رہی تھیں کہ الیا آندریچ کو ان سب کے ساتھ اپنے اتفاق کے اظہار کا موقع نہ مل سکا۔ ہجوم میں اضافہ ہونے لگا، وہ ٹوٹا اور پھر بنا، اور چلاتے، باتیں کرتے بڑے ہال میں بڑی میز کے پاس پہنچ گیا۔

---

* hear، hear مرحبا، واہ واہ!

پیئر کو نہ صرف بات کرنے سے روکا گیا، بلکہ بڑی بدتمیزی سے ٹوکا گیا، دھکے دیے گئے اور لوگوں نے اس کی طرف یوں پیٹھیں پھیر لیں جیسے وہ مشترکہ دشمن ہو۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں اس کی گفتگو کا رنگ ڈھنگ پسند نہیں آیا تھا۔ وہ اسے اسی وقت بھول گئے تھے جب بعدازاں دوسرے لوگوں نے اپنی تقریریں شروع کر دی تھیں۔ اس کا سبب صرف یہ تھا کہ ہجوم کو گرمانے کے لیے کوئی ایسی ٹھوس چیز، جس سے وہ اپنی محبت کا اظہار کر سکتا، درکار تھی۔ ایسی ہی کوئی چیز، جو ان کی نفرت کا نشانہ بن سکتی، چاہیے تھی۔ پیئر موخرالذکر بن گیا۔

ہیجان زدہ بحری افسر اور نواب کے بعد متعدد مزید مقرروں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے بعض نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے اور بعض نے اپنے نقطۂ نظر کے اظہار میں بڑی اپج کا مظاہرہ کیا، تاہم ان سب کا لب ولہجہ یکساں تھا۔ جریدہ ''پیامبر روس'' کے ایڈیٹر گلنکا نے، جسے پہچان لیا گیا تھا (ہجوم میں ''مصنف! مصنف!'' کے نعرے بلند ہوئے تھے) کہا: ''جہنم کا توڑ جہنم ہی ہونا چاہیے۔ میں نے ایک بچے کو بجلی کی چمک اور بادل کی کڑک پر مسکراتے دیکھا ہے لیکن ہمارا رویہ اس بچے کو رویے سے مختلف ہوگا۔''

''ہیر، ہیر! بادل کی کڑک پر مسکرانا!'' ہجوم کی عقبی قطاروں سے پسندیدگی کی گونج سنائی دی۔

ہجوم دھکم پیل کرتا بڑی میز کی، جس پر ستر ستر بہتر بہتر سال کے گنجے سروں اور سفید بالوں والے بزرگ زعما وردیاں پہنے اور تمغے سجائے بیٹھے تھے، جانب بڑھنے لگے۔ ان بزرگ زعما میں سے تقریباً سبھی سے پیئر ان کے نجی مسخروں کی معیت میں ان کے گھروں میں یا کلبوں میں بوسٹن کھیلتے مل چکا تھا۔ ہجوم مسلسل بھنبھنائے جا رہا تھا اور میز کے قریب پہنچنے پر بھی اس کی بھنبھناہٹ میں کوئی کمی نہ آئی۔ وہ لوگ، جو زور شور سے باتیں کر رہے تھے، انھیں ہجوم نے، جس میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا، اونچی پشتوں والی کرسیوں کی طرف دھکیل دیا تھا لیکن ان کی باتیں پھر بھی بند نہ ہوئیں۔ وہ یکے بعد دیگرے بولے جا رہے تھے بلکہ بعض اوقات تو دو دو اشخاص بیک وقت لب کشائی کرنے لگتے۔ وہ لوگ، جو مزید پیچھے کھڑے تھے، جب یہ دیکھتے کہ بولنے والے سے کوئی بات چھوٹ گئی ہے، وہ اسے لقمہ دینے میں عجلت کرتے۔ اس ہنگامے اور بھیڑ بھڑکے میں دوسروں کی کوشش یہ تھی کہ انھیں کوئی بات سوجھ جائے اور وہ جھٹ پٹ اسے کہہ سکیں۔ بزرگ زعما، جنھیں پیئر جانتا تھا، اپنی نشستوں پر بیٹھے کبھی ایک شخص اور کبھی دوسرے کو تکنے لگتے لیکن ان کے چہروں سے کسی ردعمل کا عندیہ نہیں مل رہا تھا، سوائے اس کے کہ انھیں کمرے میں گرمی محسوس ہو رہی تھی۔ ہجوم پر جو یہ عمومی کیفیت طاری تھی کہ وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار رہے۔ جس کا اظہار وہ اپنے الفاظ کے رنگ ڈھنگ سے کم، لیکن لہجے اور نظروں سے زیادہ کر رہا تھا۔ پیئر بھی اس کی لپیٹ میں آ گیا اور اس کی حالت ہیجانی ہو گئی۔ وہ اپنے خیالات سے تو دست بردار نہ ہوا مگر کسی نہ کسی طرح اسے محسوس ہوا کہ وہ غلطی پر ہے اور وہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بے قرار تھا۔

''میں نے صرف یہ کہا تھا کہ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ ضرورت کس چیز کی ہے، پھر ہم جو قربانیاں دیں گے، ان سے بہتر مقاصد حاصل ہو سکیں گے،'' اس نے حلق کا پورا زور لگا کر کہا۔ اس کی کوشش تھی کہ اس کی آواز

دوسروں کی آواز پر چھا جائے تا کہ وہ حاضرین کے کانوں تک پہنچ سکے۔

اس کے قریب ایک معمر شخص نے اپنے گردوپیش نگاہ دوڑائی لیکن اس کی توجہ معاً اس چیخ پکار کی، جو میز کی دوسری سمت سے سنائی دینے لگی تھی، طرف منعطف ہوگئی۔

''بالکل، ماسکو کو دشمن کے حوالے کر دیا جائے گا! وہ ہمارا کفارہ ادا کرے گا!'' کوئی چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔

''یہ انسانیت کا دشمن ہے!'' دوسرا دہاڑا۔

''مجھے بولنے تو دیں—''

''حضرات، آپ میرا کچومر نکال رہے ہیں!''

23

اسی لمحے اپنی لمبی ٹھوڑی اور چوکس آنکھوں سمیت رستوپ چن بڑے بڑے ڈگ بھرتا کمرے میں داخل ہوا۔ وہ جرنیل کی وردی میں ملبوس تھا اور اس کے شانے پر پٹکا لٹک رہا تھا۔ اس کے سامنے جو ہجوم تھا، ادھر ادھر بکھر گیا۔

''ہمارے امپراطور ایک آدھ منٹ میں تشریف لے آئیں گے،'' رستوپ چن نے اعلان کیا۔ ''میں ابھی ابھی ان کی بارگاہ سے آرہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ اس وقت ہماری جو پوزیشن ہے، اس کے پیش نظر بحث وتمحیص کی کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ امپراطور نے ہمارا اور تاجروں کا اجلاس بلانا مناسب سمجھا ہے۔ وہ اپنی تھیلیوں کے منہ کھول دیں گے اور دل کھول کر لاکھوں روبل دیں گے۔'' (اس نے تاجروں کے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا)، ''جب کہ ہمارا یہ فرض بنتا ہے کہ نفری فراہم کریں اور کسی چیز سے دریغ نہ کریں... یہ کم سے کم ہے جو ہم کر سکتے ہیں۔''

صلاح مشورے شروع ہوگئے لیکن یہ صرف ان بزرگ زعما تک، جو میز کے اردگرد بیٹھے تھے، محدود تھے۔ مشورے ضرورت سے زیادہ دھیمی آوازوں میں ہو رہے تھے اور بوڑھی آوازیں یکے بعد دیگرے ایک دوسرے ''مجھے آپ سے اتفاق ہے۔'' یا تنوع کی خاطر ''میرا بھی یہی خیال ہے،'' کہہ رہی تھیں۔ قبل ازیں جو شور وشغب بپا تھا، اس کے مقابلے میں یہ آوازیں اندوہ گیں معلوم ہو رہی تھیں۔

ماسکو کے اعیان و عمائدین نے یہ قرارداد منظور کی: ''سمولنسک کے شرفا کی طرح ہم بھی اپنے ہزار زرعی غلاموں سے دس، جو ہر اعتبار سے اسلحہ اور دوسرے ساز و سامان سے لیس ہوں گے، فوج میں بھرتی کرا دیں گے۔'' اور سیکرٹری کو حکم ملا کہ وہ اس قرارداد کو قلم بند کر لے۔ عمائدین نے اطمینان کی سانس لی اور جب وہ اپنی نشستوں سے اٹھے، کرسیوں کے چرچرانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے اپنے اپنے دوستوں کے بازو تھامے اور ان سے گپ شپ کرتے کمرے میں ادھر ادھر چہل قدمی کرنے لگے۔

''امپراطور! امپراطور!'' اچانک تمام کمروں سے گونج سنائی دینے لگی اور سارے کا سارا ہجوم دروازے کی طرف لپک پڑا۔

امپراطور شرفا کی دو دیواروں کے مابین خاصی عریض گلی میں سے گزرتا ہال کمرے میں داخل ہوا۔ ہر چہرے پر تجسس تھا لیکن یہ تجسس ان لوگوں کا تھا جن کا رویہ بے حد مؤدبانہ تھا اور جو رعبِ شہنشاہیت سے سرنگوں تھے۔ پیئر ذرا فاصلے پر کھڑا تھا اور امپراطور جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اسے پوری طرح سن نہیں پا رہا تھا، تاہم جو کچھ وہ سن سکا، اس سے وہ یہی سمجھا کہ امپراطور ان خطرات کا جو امپراطوریہ کو لاحق تھے اور ان امیدوں کا، جو اس نے ماسکو کے شرفا سے وابستہ کر رکھی تھیں، ذکر کر رہا ہے۔ امپراطور کی گفتگو کے جواب میں ایک شخص نے اسے اس قرارداد کے، جو حاضرین نے منظور کی تھی، متعلق بتایا۔

''حضرات!'' زار نے کپکپاتی آواز سے کہا۔

ہجوم میں ہل چل مچ گئی اور جب دوبارہ خاموشی چھائی، پیئر کو زار کی بیّن طور پر خوشگوار بشری آواز سنائی دی۔ وہ بڑے جوش وجذبے سے کہہ رہا تھا:

''مجھے روسی شرفا کے خلوص اور وفاشعاری پر کبھی شبہہ نہیں ہوا۔ لیکن آج یہ میری توقعات سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میں مادرِ وطن کے نام پر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ حضرات، آئیں، اب ہم عمل کر کے دکھائیں!۔۔ وقت انمول ترین شے ہے۔۔۔''

امپراطور خاموش ہو گیا، ہجوم دھکم پیل کرتا اس کے اردگرد اکٹھا ہونے لگا اور چاروں اطراف وجد آفریں نعرہ ہائے تحسین گونجنے لگے۔

''بجا فرمایا، انمول ترین۔۔۔ بالکل شاہانہ انداز سے ارشاد فرمایا،'' کاؤنٹ رستوف نے سسکی بھرتے ہوئے کہا۔ وہ پیچھے کھڑا تھا۔ اسے سنائی تو کوئی خاص نہیں دیا تھا لیکن وہ اپنے انداز سے سب کچھ سمجھ گیا تھا۔

شرفا کے کمرے سے امپراطور تجار کے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں وہ تقریباً دس منٹ رہا۔ جن لوگوں نے اسے وہاں سے بچشم نم آتے دیکھا، ان میں پیئر بھی شامل تھا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، زار نے تجار کو بمشکل خطاب کرنا شروع کیا تھا، کہ اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے اور اس نے لرزتی آواز سے اپنی تقریر ختم کی۔ جب پیئر کی نظر اس پر پڑی، وہ دو اشخاص کی معیت میں باہر آ رہا تھا۔ ان میں سے ایک بھاری بھرکم شراب کا ٹھیکے دار تھا اور پیئر کا واقف کار تھا۔ دوسرا امیر تھا۔ وہ زرد رو اور دبلا پتلا تھا۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دبلے پتلے شخص کی آنکھیں اشکوں سے لبریز تھیں لیکن لحیم شحیم ٹھیکے دار بچوں کی طرح بلک رہا تھا اور کہہ رہا تھا:

''یوئر میجسٹی، جان بھی حاضر ہے اور مال بھی!''

اس وقت پیئر کے دل میں صرف ایک ہی خواہش امنڈ رہی تھی۔ وہ یہ دکھانا چاہتا تھا کہ وہ کسی چیز سے دریغ نہیں کرے گا اور اپنا سب کچھ نچھاور کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس کی تقریر میں جو آئینی آہنگ تھا، وہ اس کے ضمیر پر بوجھ بن گیا تھا اور وہ اس کی تلافی کرنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھا۔ جب اس نے یہ سنا کہ کاؤنٹ مامانوف

• امپراطوریہ=Empire، وہ سلطنت جس کی حدود میں ایک سے زیادہ ملک ہوں۔

ایک رجمنٹ فراہم کر رہا ہے، اس نے جھٹ پٹ کاؤنٹ رستوپ چن کو مطلع کیا کہ وہ ایک ہزار جوان فراہم کرے گا اور ان کے تمام اخراجات برداشت کرے گا۔

جب معمر رستوف نے یہ تفصیل اپنی بیوی کو سنائی، وہ اپنے آنسوؤں کو روک نہ سکا۔ اس نے وہیں اور اسی وقت بیتا کی درخواست قبول کر لی اور بذات خود اس کا نام درج کرانے چلا گیا۔

اگلے روز امپراطور ماسکو سے روانہ ہو گیا۔ تمام شرفا نے اپنی وردیاں اتاریں اور مطمئن ہو کر دوبارہ اپنے گھروں اور کلبوں میں بیٹھ گئے۔ انھوں نے کہنے کو تو اپنے سٹیوارڈوں کو حکم دے دیا کہ ان کے ذمے جتنے جتنے رنگروٹ بھرتی کرانے کی پابندی لگائی گئی ہے، وہ انھیں بہم پہنچا دیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ کف افسوس بھی مل رہے تھے کہ وہ کیا کر بیٹھے ہیں۔

حصہ دوم

1

نپولین روس کے خلاف اس لیے رزم آرا ہوا کیونکہ وہ ڈریسڈن جانے کی خواہش پر قابو نہیں پا سکا تھا، وہاں اسے جو خراج تحسین پیش کیا گیا، وہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنے دماغ کو چوتھے آسمان پر پہنچنے سے روک نہیں سکا تھا، پولستانی وردی زیب تن کرنے سے احتراز نہیں کر سکا تھا، جون کی خوبصورت صبح کے ولولہ انگیز اثرات کے سامنے سر تسلیم خم کیے بنا رہ نہیں سکا تھا اور کوراکن اور بعدازاں بالاشیف کی موجودگی میں اپنا غصہ پی نہیں سکا تھا۔

الیکساندر نے گفت و شنید کے تمام دروازے بند کر دیے تھے کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ اس کی ذاتی طور پر توہین ہوئی ہے۔ بارکلے ڈتولی فوج کی کمان بہترین انداز سے کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا کیونکہ وہ اپنا فرض نبھانا اور عظیم جرنیل کی شہرت کمانا چاہتا تھا۔ رستوف نے فرانسیسیوں پر اس لیے ہلّہ بول دیا تھا کیونکہ چراگاہ کے آر پار سرپٹ گھوڑا دوڑانے کی جو ترغیب اس کے دل میں پرورش پا رہی تھی، وہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا۔ اور اسی انداز سے تمام لاتعداد افراد نے، جو جنگ میں شریک تھے، اپنے ذاتی خصائص، عادات، حالات اور مقاصد کے تحت عمل کیا۔ وہ جو کچھ کرتے تھے، اس کے پیچھے ان کے اندیشے، نخوتیں، لطف اندوزیاں یا خفگیاں کارفرما تھیں، اور جب وہ استدلال کرتے تھے، وہ یہ فرض کر لیتے تھے کہ انھیں معلوم ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اپنی مرضی سے کر رہے ہیں درآں حالیکہ وہ سب کے سب غیر ارادی طور پر تاریخ کے آلاتِ کار تھے۔ وہ ایک ایسا فریضہ سرانجام دے رہے تھے جو خود ان کی نگاہوں سے تو اوجھل تھا لیکن وہ ہمارے لیے قابل فہم ہے۔ باعمل اشخاص کا یہی مقدر ہوتا ہے، وہ اسے ٹال نہیں سکتے۔ سماجی درجہ بندی میں ان کا مقام جتنا بلند ہوتا ہے، اپنے افعال میں وہ اتنے ہی کم آزاد ہوتے ہیں۔

جن لوگوں نے 1812 کے واقعات میں حصہ لیا تھا، انھیں منظرِ عام سے اوجھل ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں۔ ان کے ذاتی مفادات اور دلچسپیاں قصہ پارینہ بن چکی ہیں اور ان کا نام و نشان تک بھی باقی نہیں رہا۔ تاریخی نتائج کے ماسوا اب اس زمانے کا کچھ بھی موجود نہیں رہا۔

لیکن آئیں، ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ یورپ کے لوگوں کو نپولین کی قیادت میں روس کے قلب تک آنا اور وہاں

فنا ہونا ہی تھا، پھر ان لوگوں کے ـــ خاص طور ان لوگوں کے جو جنگ میں شریک ہوے ـــ باہمی طور پر متناقض، خارج از عقل، ظالمانہ افعال ہمارے لیے قابلِ فہم بن جاتے ہیں۔

مشیّتِ ایزدی نے ان تمام لوگوں کو، جو اپنے اپنے ذاتی مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں و سرگرداں تھے، عظیم الشان نتیجے کی، جس کا ان میں سے کسی کو (نہ نپولین کو، نہ الیکساندر کو اور ان لوگوں کو تو، جو واقعتاً جنگ میں شریک ہوے، بالکل ہی نہیں) خفیف سا علم بھی نہیں تھا، تکمیل کے لیے ایک جگہ اکٹھے ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔

اب ہمیں یہ بات، کہ 1812 میں فرانسیسی فوج کیوں تباہی سے دوچار ہوئی، واضح طور پر معلوم ہے۔ کوئی شخص بھی یہ بات جھٹلا نہیں سکتا کہ اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ نپولین کی فوج نے موسم (گرما) کے اواخر میں روسی مملکت کے قلب میں پیش قدمی تو کر لی لیکن موسم سرما سے نپٹنے کے لیے کسی قسم کی کوئی تیاری نہ کی۔ دوسری وجہ یہ ہوئی کہ روسی شہروں کے نذرِ آتش کیے جانے پر روسی عوام کے دلوں میں دشمن کے خلاف جو نفرت پیدا ہوئی، اس سے جنگ نے بالکل مختلف شکل اختیار کر لی۔ لیکن اس وقت کوئی شخص بھی پیش از حالات یہ بھانپ نہ سکا (جواب روزِ روشن کی طرح عیاں نظر آتا ہے) کہ آٹھ لاکھ افراد پر مشتمل سپاہ ـــ روئے زمین کی بہترین فوج جس کی قیادت بہترین جرنیل کر رہا تھا ـــ کو جنگ میں ناپختہ فوج، جس کی نفری اس سے نصف تھی اور جس کی قیادت ناتجربہ کار جرنیل کر رہے تھے (جیسا کہ روسی فوج فی الحقیقت تھی)، صرف اسی صورت میں شکست دے سکتی تھی کہ حالات و واقعات بالکل یہی رخ اختیار کرتے۔ نہ صرف یہ کہ کوئی شخص اس کا اندازہ نہ کر سکا بلکہ جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، وہ مسلسل اس واحد چیز کی، جو انھیں بچا سکتی تھی، راہ میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کی کوششیں کرتے رہے۔ جہاں تک فرانسیسیوں کا تعلق ہے، نپولین کے تجربے اور اس کی نام نہاد غیر معمولی عسکری فطانت کے باوجود انھوں نے گرمیوں کے اختتام پر ماسکو پہنچنے کے لیے پورا زور لگا دیا۔ بہ الفاظِ دیگر وہ بالکل وہی کام، جس نے انھیں لازماً تباہی کے کنارے پہنچانا تھا، کرنے کی تگ و دو کرتے رہے۔

1812 کے واقعات کے متعلق فرانسیسی مورخین نے جو تصانیف تحریر کی ہیں، ان میں انھیں اس قسم کے دعاوی کرنے کا بڑا شوق ہے کہ اپنی جنگی حد بندی میں توسیع کرنے میں جو خطرات پنہاں تھے، نپولین ان سے آگاہ تھا، یہ کہ اس نے (سمولنسک پہنچنے سے پہلے روسیوں کے ساتھ) جنگ کرنے کی کوشش کی اور یہ کہ اس کے مارشلوں نے اسے سمولنسک میں رکنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ مصنفین اس قسم کے اور ان سے ملتے جلتے دلائل یہ ثابت کرنے کے لیے دیتے ہیں کہ مہم میں جو خطرات پوشیدہ تھے، اس زمانے میں بھی لوگ ان سے آگاہ تھے۔ اس معاملے میں روسی مصنفین فرانسیسی مصنفین سے بھی دو چار ہاتھ آگے نکل گئے ہیں۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ روسیوں نے مہم کے بالکل آغاز میں یہ منصوبہ بنا لیا تھا کہ وہ تورانیوں[1] کے انداز میں نپولین کو سبز باغ دکھا کر روس کے قلب میں لے آئیں گے۔ بعض لکھاری اس منصوبے کا سہرا پفوہل، بعض کسی فرانسیسی، بعض ٹول اور بعض خود امپراطور الیکساندر کے سر باندھتے ہیں۔ اس ضمن میں وہ مختلف تزکوں، آپ بیتیوں، منصوبوں اور خطوط کے، جن میں واقعی اس قسم کے طریق کار کے

متعلق اشارے موجود ہیں، حوالے دیتے ہیں۔ لیکن امر حقیقت یہ ہے کہ فرانسیسیوں اور روسیوں دونوں کی پیش اندیشی کے متعلق جو معلومات پیش کی جاتی ہیں، وہ محض اس لیے کی جاتی ہیں کیونکہ واقعے نے انھیں صحیح ثابت کر دیا ہے۔ اگر واقعہ پیش نہ آتا، تو ان باتوں کو اسی طرح طاق نسیاں پر رکھ دیا جاتا جس طرح ان سے مختلف و متضاد ان ہزاروں اشاروں، کنایوں اور قیافوں کو، جن کا اس زمانے میں بڑا چرچا تھا، محض اس لیے فراموش کر دیا گیا ہے کیونکہ واقعے نے انھیں غلط قرار دے دیا ہے۔ کوئی واقعی کس کروٹ بیٹھے گا، اس کے متعلق قیاس آرائیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ نتیجہ خواہ کچھ ہی نکلے، چند لوگ آپ کو ہمیشہ ایسے مل جائیں گے جو یہ دعویٰ کرنے سے قطعاً نہیں ہچکچائیں گے: ''میں نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ یہی ہوگا۔'' وہ یہ قطعاً بھول جاتے ہیں کہ انھوں نے جو بے شمار مفروضے تراشے تھے، ان میں سے بیشتر (اصل واقعے کے) بالکل برعکس تھے۔

اس قسم کے قیاسات، کہ جنگی حد بندی کو توسیع دینے میں جو خطرات مضمر تھے، نپولین ان سے آگاہ تھا، یا یہ کہ روسیوں نے دشمن کو سبز باغ دکھا کر ملک کے قلب میں لے آنے کا ارادہ کر لیا تھا، لاریب اسی زمرے میں آتے ہیں؛ اور مورخین محض کھینچ تان کر کے ہی (اور وہ بھی خاصی زیادہ) اس قسم کے تصورات کو نپولین اور اس کے مارشلوں سے یا اس نوعیت کے منصوبوں کو روسی جرنیلوں سے منسوب کر سکتے ہیں۔ تمام حقائق ایسے مفروضوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ مہم کی ساری مدت کے دوران میں نہ صرف یہ کہ روسیوں نے قطعاً کبھی اس رغبت کا اظہار نہیں کیا تھا کہ وہ فرانسیسیوں کو بہلا پھسلا کر ملک کے قلب میں لے آئیں، بلکہ اس کے علی الرغم انھوں نے جونہی سرحد عبور کی، انھوں نے انھیں روکنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ اور جہاں تک نپولین کا تعلق ہے، اپنی جنگی حد بندی کی توسیع سے خطرہ محسوس کرنا تو بہت دور کی بات ہے، وہ تو ہر قدم، جو وہ آگے بڑھاتا تھا، اسے اپنی کامیابی تصور کرتا اور اس پر خوشیاں مناتا تھا۔ اپنی سابقہ مہموں کے دوران میں وہ جس طرح بڑھ چڑھ کر اور ذوق وشوق سے غنیم پر حملہ آور ہوتا تھا، یہاں اس کا طرز عمل اس کے بالکل برعکس تھا، روسیوں کے ساتھ پنجہ لڑانے میں وہ تاخیری حربے استعمال کر رہا تھا۔

مہم کے بالکل آغاز میں ہماری افواج منقسم تھیں (اور مختلف مقامات پر مقیم تھیں) اور ہمارا واحد ہدف انھیں یکجا کرنا تھا۔ اگر ہمارا مقصد پیچھے ہٹنا اور دشمن کو ملک کے قلب میں گھسیٹنا ہوتا، پھر فوج کو یکجا کرنے سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہوتا۔ ہمارا امپراطور فوج کے ساتھ اس لیے نہیں گیا تھا کہ وہ انھیں پسپائی کی ترغیب دینا چاہتا تھا بلکہ اپنی موجودگی سے وہ ان میں یہ روح پھونکنا چاہتا تھا کہ وہ روس کی ایک ایک انچ زمین کا تحفظ کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دیں۔ دریسا کی طول طویل قلعہ بندیاں پفوہل کے منصوبے کے تحت تعمیر کی گئی تھیں اور وہاں سے مزید پیچھے ہٹنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کمانڈر انچیف جو ذرا سی بھی پسپائی اختیار کرتے تھے، اس پر امپراطور انھیں زجر و توبیخ کرتا تھا۔ ماسکو کو نذر آتش کرنا تو دور کی بات ہے، امپراطور تو کبھی خواب میں بھی یہ سوچ نہیں سکتا تھا کہ وہ دشمن کو سمولنسک تک ہی ملک کے اندر گھسنے دے گا۔ اور جب ہماری افواج بالآخر یک جا ہو گئیں تو وہ یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا کہ سمولنسک کی دیواروں تلے کوئی خونی معرکہ لڑے بغیر ہی شہر کو دشمن کے قبضے میں جانے اور اسے نذر آتش

کیے جانے دیا گیا ہے۔

یہ تو امپراطور کا رویہ تھا۔ جہاں تک روسی کمانڈروں اور عوام کا تعلق ہے، ان کا تو یہ تصور کر کے ہی کہ ہماری افواج ملک کے اندر اتنی دور تک پسپا ہوتی جا رہی ہیں، خون کھولنے لگتا تھا۔

نپولین ہماری افواج کو منقسم کرنے کے بعد اندرون ملک دور تک پیش قدمی کر گیا۔ دو بدو جنگ کے متعدد مواقع آئے لیکن وہ ان سب سے کنی کترا گیا۔ اگست کے دوران میں وہ سمولنسک پہنچ گیا۔ اب وہ صرف یہ سوچ رہا تھا کہ مزید آگے کیسے بڑھا جا سکتا ہے حالانکہ، جیسا کہ اب ہمیں معلوم ہے، یہ پیش قدمی اس کے لیے واضح طور پر تباہ کن تھی۔

حقائق چیخ چیخ کر بتا رہے ہیں کہ نپولین کو ماسکو کی جانب اپنی پیش قدمی میں پیشگی کسی قسم کے خطرات نظر نہیں آئے تھے اور یہ کہ الیکسانڈر اور روسی جرنیلوں کے اذہان میں قطعاً کبھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ انھیں نپولین کو بہلا پھسلا کر آگے لے آنا چاہیے بلکہ اس کے برعکس وہ بہر صورت اس کی پیش قدمی روکنا چاہتے تھے۔ نپولین کو روس میں جو گھسیٹا گیا وہ کسی سوچے سمجھے منصوبے کی بدولت نہیں ہوا (کوئی بھی شخص یہ یقین ہی نہیں کرتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے) بلکہ وہ ان لوگوں کی، جو جنگ میں شریک ہوئے، سازشوں، آرزوؤں اور امنگوں کے پیچیدہ تعامل کا نتیجہ تھا۔ خود ان لوگوں کو بالکل یہ ادراک نہیں تھا کہ کیا وقوع پذیر ہونے والا ہے یا روس کو بچانے کا واحد ذریعہ کیا ہو سکتا ہے۔ جو کچھ بھی ظہور پذیر ہوا، اتفاقاً ہوا۔ ہماری افواج مہم کے بالکل آغاز میں ہی منقسم ہو گئی تھیں۔ ہم نے انھیں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ بظاہر مقصد یہی تھا کہ ہم جنگ کریں گے اور حملہ روکنے کی سعی کریں گے۔ ہمارا ارادہ تھا کہ یک جائی کا یہ عمل جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچ جائے اور اس اثنا میں اپنے سے کہیں زیادہ طاقتور دشمن کے ساتھ ٹکر لینے کی نوبت نہ آئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہم زاویہ حادہ بناتے مجبوراً پیچھے ہٹتے گئے اور یوں فرانسیسیوں کو سمولنسک تک کھینچ لائے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم زاویہ حادہ بناتے اس لیے پیچھے ہٹ رہے تھے کیونکہ فرانسیسی ہماری دونوں افواج کے بیچ میں سے پیش قدمی کر رہے تھے۔ زاویہ اس لیے مزید حادہ ہوتا چلا گیا اور ہم اس لیے مزید پسپائی اختیار کرتے چلے گئے کیونکہ بارکلے دَ تولی جرمن تھا اور غیر مقبول تھا اور باگ راتیاں (جسے اس کے زیر کمان آنا تھا) اس سے نفرت کرتا تھا۔ باگ راتیاں فوج دوم کا سپہ سالار تھا، (حالانکہ ہیڈ کوارٹرز میں تمام لوگ چاہتے تھے کہ فوجوں کی یکجائی کا عمل جلد از جلد پایہ تکمیل تک پہنچ جائے) اس نے اپنی فوج کو دَ تولی کی فوج میں مدغم کرنے اور اس کے زیر کمان آنے میں حتی المقدور زیادہ سے زیادہ تاخیر کی۔ اس کا عذر یہ تھا کہ اگر وہ اپنی فوج کو لے کر چل پڑا، تو سفر کے دوران میں وہ خطرات کی زد میں آ جائے گی اور اس کے لیے بہترین طریق کار یہی ہو گا کہ وہ مزید بائیں اور جنوب کی طرف ہٹ جائے، دشمن کے پہلو اور عقب کو مسلسل حملوں سے زچ کرے، اور یوکرین سے اپنی فوج کی کمک کے لیے مزید رنگروٹ حاصل کرے۔ قرائن سے یہی نظر آتا ہے کہ اس نے یہ منصوبہ اس لیے بنایا تھا کیونکہ اسے جرمن بارکلے کے، جس سے ہر کوئی نفرت کرتا تھا، اور جو مزید برآں ملازمت میں اس سے جونیئر

تھا، ماتحت کام کرنا گوارا نہ تھا۔

امپراطور فوج کے ساتھ اس لیے گیا تھا کیونکہ وہ اس کا حوصلہ بڑھانا چاہتا تھا لیکن ہوا یہ کہ اس کی موجودگی، کیا اقدامات کیے جانا چاہئیں، ان کے بارے میں اس کی لاعلمی، مشیروں کی کثرت اور منصوبوں کی بھرمار نے فوج اول کی قوت سلب کر لی اور وہ پیچھے ہٹ گئی۔

ارادہ تو دریسا کا ڈٹ کر دفاع کرنے کا تھا لیکن پاؤلوچی نے، جو خود کمانڈر انچیف بننے کا آرزومند تھا، اپنا سارا زور الیکساندر کو متاثر کرنے کے لیے لگا دیا اور پخوہل کا سارا منصوبہ ترک کر دیا گیا اور کمان بارکلے کے سپرد کر دی گئی، لیکن بارکلے پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کے اختیارات محدود کر دیے گئے۔

افواج منقسم تھیں، کمان میں وحدت نہیں تھی اور بارکلے غیر مقبول تھا۔ اس انتشار، عدم وحدت اور جرمن کمانڈر انچیف کی غیر مقبولیت کا نتیجہ ایک طرف تو عدم فیصلے اور جنگ (اگر فوجیں یک جا ہوتیں اور بارکلے کی جگہ کوئی دوسرا شخص کمانڈر انچیف ہوتا، تو یہ لازماً ہو کر رہتی) سے گریز کی صورت میں برآمد ہوا اور دوسری طرف کیفیت یہ ہوئی کہ جرمنوں سے نفرت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا اور حب الوطنی کا جوش و خروش بڑھنے لگا۔

آخر کار امپراطور اس عذر کے ساتھ — یہ نہایت موزوں عذر تھا اور امکانی طور پر واحد عذر تھا جو اس کی روانگی کا جواز فراہم کر سکتا تھا — فوج سے رخصت ہو گیا کہ اس کے لیے دارالحکومت جانا اور وہاں کے باشندوں میں قومی جنگ کے لیے جوش و جذبہ ابھارنا ضروری ہو گیا ہے۔ یوں فرماں روائے مملکت نے ماسکو کا جو دورہ کیا، اس سے روسی افواج کی قوت میں تین گنا اضافہ ہو گیا۔

وہ فوج سے اس لیے رخصت ہوا تھا تا کہ کمانڈر انچیف کے غیر منقسم اختیارات میں کوئی رکاوٹ نہ پڑے۔ اسے امید تھی کہ (اس کی عدم موجودگی میں) زیادہ فیصلہ کن اقدامات کیے جائیں گے، لیکن عسکری کمان پہلے سے بھی زیادہ پراگندہ خیال اور غیر موثر ہو گئی۔ بے نگ سین، زاریوچ (ولی عہد) اور ایجوٹنٹ جنرلوں کا جم غفیر اس لیے فوج کے ساتھ وابستہ رہا تا کہ کمانڈر انچیف پر نظر رکھی جا سکے اور اسے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھنے نہ دیا جائے بلکہ اسے کچھ نہ کچھ کرنے پر اکسایا جاتا رہے۔ "امپراطور کی ان تمام آنکھوں" کی زیر نگرانی بارکلے اپنے آپ کو پہلے سے زیادہ کم آزاد محسوس کرنے لگا۔ یوں وہ مزید محتاط ہو گیا اور جنگ سے اجتناب کرنے لگا۔

بارکلے مستقل مزاجی سے محتاط رویہ اختیار کیے رہا۔ زاریوچ اشاروں کنایوں سے غداری کے الزامات لگاتا اور عمومی رزم آرائی کا مطالبہ کرتا رہا۔ لیوبامرسکی، برونتسکی، ولوچکی اور ان کے ہم خیال دوسرے لوگوں نے وہ واویلا کیا کہ بارکلے نے امپراطور کو غذات پہنچانے کے بہانے ان پولستانی ایجوٹنٹوں کو پیٹرزبرگ بھیج دیا اور خود بے نگ سین اور زاریوچ کے ساتھ علانیہ چپقلش میں مصروف ہو گیا۔

باگراتیاں کی خواہشات کے علی الرغم افواج بالآخر سمولنسک میں یک جا ہو گئیں۔

باگ راتیاں نے بگھی پکڑی اور اس مکان پر، جس میں بارکلے مقیم تھا، پہنچ گیا۔ بارکلے نے اپنا سرکاری پٹکا

پہنا اور اپنے سینئر افسر کا استقبال کرنے اور اسے رپورٹ پیش کرنے کے لیے باہر نکل آیا۔ عالی ظرفی کے اس مقابلے میں باگ راتیاں پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا چنانچہ ملازمت میں سینیارٹی کے باوجود اس نے اپنے آپ کو بار کلے کی کمان میں دے دیا۔ کہنے کو تو اس نے اس کی ماتحتی قبول کر لی لیکن عملاً وہ پہلے کی نسبت کہیں کم اس سے اتفاق کرنے لگا۔

امپراطور کے خصوصی احکام پر باگ راتیاں اپنی رپورٹیں براہ راست اسے ارسال کرنے لگا اور اس نے آراک چیف کو تحریر کیا:

فرماں روائے مملکت کا منشا میرے لیے بمنزلۂ حکم ہے لیکن میں منسٹر (مراد بار کلے) کے ساتھ کام نہیں کر سکتا۔ للہ، مجھے کہیں اور بھجوا دیں، خواہ رجمنٹ کی کمان پر ہی لگا دیں کیونکہ یہاں رہنا میری برداشت سے باہر ہے۔ تمام کا تمام ہیڈ کوارٹر جرمنوں سے اتنا پٹا پڑا ہے کہ کسی روسی کے لیے سانس لینا محال ہے اور کسی معاملے کا سرا ہاتھ نہیں آتا۔ میرا خیال تھا کہ میں فرماں روائے مملکت اور مادر وطن کی خدمت کرتا رہوں لیکن عقدہ یہ کھلا کہ میں بار کلے کی خدمت پر مامور ہوں۔ مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس کا یارا نہیں۔

برونتسکیوں اور ونٹ ٹسنگے روڈوں اور ان کی قبیل کے دوسرے لوگوں کے جم غفیر نے کمانڈر انچیفوں کے مابین تعلقات میں مزید بس گھول دیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یک جہتی پہلے سے بھی کم ہو گئی۔ سمولنسک سے ادھر ہی فرانسیسیوں پر حملہ کرنے کی تیاریاں کی گئیں۔ پوزیشن کا جائزہ لینے کے لیے ایک جرنیل بھیجا گیا۔ اس جرنیل کو بار کلے سے نفرت تھی۔ وہ اپنے ایک دوست سے، جو کور کمانڈر تھا، ملنے چلا گیا۔ اس کے ساتھ ایک دن گزارنے کے بعد وہ واپس بار کلے کے پاس پہنچ گیا اور مجوزہ میدان کو، جسے اس نے دیکھا تک نہیں تھا، ہر لحاظ سے ناموزوں قرار دینے لگا۔

جب مستقبل کے میدان جنگ کے بارے میں مناقشے اور سازشیں جاری تھیں اور جب ہم فرانسیسیوں کو تلاش کر رہے تھے — ان کے ساتھ ہمارا رابطہ منقطع ہو چکا تھا — بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا، ناگاہ فرانسیسیوں کی نے وی روفسکی کی ڈویژن سے مڈھ بھیڑ ہو گئی اور وہ سمولنسک کی دیواروں تک پہنچ گئے۔

اپنی رسد اور مواصلات کے راستوں کا دفاع کرنے کے لیے ہمیں ناگہانی جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ جنگ ہوئی اور طرفین کے ہزاروں آدمی کھیت رہے۔

فرماں روائے مملکت اور ساری قوم کی خواہشات کے برعکس سمولنسک خالی کر دیا گیا لیکن شہر کو اس کے باسیوں نے، جنھیں ان کے اپنے گورنر نے گمراہ کیا تھا، اپنے ہاتھوں نذر آتش کر دیا، اور یہ خانماں برباد باشندے، دوسرے روسیوں کے سامنے مثال پیش کرتے ماسکو کی طرف راہ فرار اختیار کرنے لگے۔ انھیں صرف اپنے نقصانات کا غم تھا اور وہ جہاں سے بھی گزرتے، دشمن کے خلاف نفرت کی چنگاریوں کو ہوا دیتے جاتے۔ نپولین مزید آگے آ گیا، ہم پیچھے ہٹ گئے اور یوں ہم نے وہ چیز، جو نپولین کی شکست کا سبب بنی، حاصل کر لی۔

2

اپنے بیٹے کی روانگی کے اگلے روز پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی نے پرنس ماریا کو بلا بھیجا۔

''ہونہہ؟ اب تم مطمئن ہو؟'' اس نے اس سے کہا۔ ''تم نے میرے بیٹے سے میری دانتا کلکل کرادی؟ تم مطمئن ہو؟ تم بس یہی چاہتی تھیں! تم مطمئن ہو؟... میرے لیے یہ بہت تکلیف دہ، بے حد تکلیف دہ ہے۔ میں بوڑھا اور ضعیف ہوں اور تم یہی چاہتی تھیں۔ خیر، اب تم قہقہے لگاؤ، بغلیں بجاؤ!''

اس کے بعد پرنس ماریا کی اپنے باپ سے پورا ہفتہ ملاقات نہ ہوئی۔ وہ صاحب فراش تھا اور اپنے سٹڈی روم سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

پرنس ماریا کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اپنی علالت کے دوران میں معمر پرنس نے خود اسے ہی نہیں بلکہ مادموزیل بوغین کو بھی اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ تیخون تن تنہا اس کی تیمارداری کر رہا تھا۔

ہفتے کے اختتام پر پرنس نے اپنی شکل دکھائی اور وہ ایک بار پھر اپنی سابقہ روش پر چل پڑا۔ وہ پوری تن دہی سے باغات کی تزئین وآرائش اور مکان کے قریب زرعی عمارتوں کی تعمیر میں جت گیا۔ اس نے مادموزیل بوغین سے تمام علائق منقطع کر دیے۔ اب وہ اپنی بیٹی کے ساتھ جو سرد مہرانہ لہجہ اور برتاؤ اختیار کیے ہوئے تھا، اس سے وہ یہ تاثر دیتا نظر آتا تھا: ''دیکھا تم نے؟ تم نے میرے خلاف سازش کی، اس فرانسیسی عورت کے ساتھ میرے تعلقات کے بارے میں پرنس آندرے سے جھوٹ بولا اور میری اس سے چخ چخ کرادی، لیکن تم دیکھ رہی ہو کہ مجھے نہ تمھاری ضرورت ہے اور نہ اس فرانسیسی عورت کی!''

پرنس ماریا اپنا نصف دن نکولوشکا کی معیت میں گزارتی تھی۔ وہ اس کے اسباق کی نگرانی کرتی، اسے روسی اور موسیقی کی خود تعلیم دیتی اور دیسال کے ساتھ باتیں کرتی۔ وہ اپنا بقایا وقت اپنے اپارٹمنٹ میں اپنی کتابوں، اپنی بوڑھی آیا یا ''اللہ لوگوں'' کے ساتھ، جو اس سے کبھی کبھار ملنے ملانے عقبی دروازے سے اندر آتے تھے، بتاتی۔

جنگ کے متعلق اس کی سوچ بالکل وہی تھی جو ہمیشہ سے خواتین کی چلی آرہی ہے۔ اسے اپنے بھائی کے، جو اس میں شریک تھا، بارے میں خوف دامن گیر رہتا تھا۔ وہ سفاکی اور درندگی، جو مردوں کو ایک دوسرے کا قتل عام کرنے پر اکساتی رہتی ہے، اسے سدا دہشت زدہ اور مبہوت کرتی رہتی۔ لیکن جنگ کی معنویت کیا تھی، اس بارے میں اس کا ذہن کوری سلیٹ کی طرح معریٰ تھا۔ اسے یہ بھی گزشتہ جنگوں کی طرح کی کوئی جنگ معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ دیسال، جس کے ساتھ وہ ہر روز تبادلۂ خیالات کرتی رہتی تھی، جنگ کی صورت حال میں بڑے جوش وخروش سے دلچسپی لیتا تھا اور اس کے سامنے اس کے متعلق وضاحت سے اپنے خیالات بیان کرنے کی کوشش کرتا تھا، اگرچہ جو ''اللہ لوگ'' اس سے ملنے آتے تھے، خوف ودہشت کے عالم میں اپنے انداز سے ان افواہوں کے بارے میں، جو ''دشمن مسیح'' کے متعلق پھیل رہی تھیں، بتاتے رہتے تھے اور اگرچہ جولی (جواب پرنس دروبتیسکایا تھی)، جس نے

خط کتابت کا سلسلہ دوبارہ شروع کر دیا تھا، ماسکو سے اسے حب الوطنی سے بھرپور خطوط۔ جو عجیب و غریب فرانسیسی زدہ روسی میں تحریر ہوتے تھے۔ بھیجتی رہتی تھی، وہ (پرنس ماریا) جنگ کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہی۔

میری عزیز سہیلی، میں تمھیں روسی میں خط تحریر کر رہی ہوں (جولی نے لکھا تھا) کیونکہ مجھے ہر اس چیز سے، جس کا تعلق فرانس سے ہے، بلکہ فرانسیسی زبان سے بھی، نفرت ہے۔ اگر کوئی شخص میری موجودگی میں فرانسیسی میں گفتگو کرتا ہے، تو مجھ سے قطعاً برداشت نہیں ہوتا...

یہاں ماسکو میں ہمارے محبوب امپراطور کے بارے میں اتنا جوش و خروش پایا جاتا ہے کہ سب لوگ خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے ہیں۔ میرے شوہر نامدار اس وقت قسمت کے پھیر میں ہیں۔ وہ یہودیوں کے زٹیل شراب خانوں میں دھکے کھا رہے ہے اور بھوک و مصائب برداشت کر رہے ہیں، تاہم جو اطلاعات مجھے موصول ہو رہی ہیں، وہ مجھے مزید آمادۂ عمل کر رہی ہیں۔ رائیف سکی نے جو دلیرانہ کارنامہ سرانجام دیا ہے، تم نے لاریب اس کے بارے میں سن لیا ہوگا۔ وہ اپنے بیٹوں سے بغل گیر ہوا اور بولا: ''ہم مر جائیں گے لیکن پیٹھ نہیں دکھائیں گے!'' اور سچی بات یہ ہے کہ ہم نے پیٹھ نہیں دکھائی۔

ہم یہاں مقدور بھر بہترین انداز سے وقت گزارنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن یہ جنگ کا زمانہ ہے! پرنس آلین اور سوفی سارا سارا دن میرے ساتھ گزارتی ہیں اور ہم زندہ شوہروں کی دل گرفتہ بیوائیں (مرہم) پٹیوں کا کپڑا بنتی اور خوبصورت باتیں کرتی ہیں۔ مائی ڈیئر، صرف تمھاری عدم موجودگی کی کھلتی ہے...

اور وغیرہ وغیرہ

پرنس ماریا جنگ کی معنویت کیوں نہ سمجھ سکی، اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ معمر پرنس کبھی اس کا ذکر نہیں کرتا تھا۔ وہ تو یہ بھی تسلیم نہیں کرتا تھا کہ اس (جنگ) کا کوئی وجود ہے اور جب کبھی دیسال ڈنر پر اس کے متعلق کوئی بات کرتا تھا، وہ اس کا مذاق اڑاتا تھا۔ پرنس کا لہجہ اتنا پرسکون اور پراعتماد ہوتا تھا کہ ماریا آنکھیں بند کر کے اس پر یقین کر لیتی۔

جولائی کے سارے مہینے کے دوران میں معمر پرنس معمول سے کہیں زیادہ مصروف اور فعال رہا بلکہ وہ شگفتگی اور زندہ دلی کا مظاہرہ بھی کرتا رہا۔ اس نے نیا باغیچہ لگوایا اور خانگی غلاموں کے لیے نئی عمارت کی تعمیر بھی شروع کرا دی۔ پرنس ماریا کو جو واحد چیز اس کے متعلق مشوش کرتی تھی، یہ تھی کہ وہ سوتا بہت کم تھا۔ اس نے سٹڈی روم میں سونے کی عادت ترک کر دی تھی اور ہر شب مختلف کمرے میں گزارنے لگا تھا۔ ایک روز وہ حکم دیتا کہ اس کا بستر گیلری میں لگا دیا جائے، اگلے روز وہ ڈرائنگ روم میں صوفے یا والتیر کرسی پر دراز ہو جاتا۔ وہاں وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر اونگھتا رہتا جب کہ مادموزیل بوغین کی جگہ ایک چھوکرا پتروشکا اسے اونچی آواز میں کوئی کتاب یا رسالہ پڑھ کر سناتا رہتا۔ پھر کسی رات وہ ڈائننگ روم میں ہی ڈیرا ڈال لیتا۔

یکم اگست کو پرنس آندرے کا دوسرا خط موصول ہوا۔ اپنے پہلے خط میں، جو پرنس آندرے کی روانگی کے فوراً بعد موصول ہوا تھا، اس نے نہایت عاجزی اور فروتنی سے اپنے باپ سے درخواست کی تھی کہ اس نے اس کے سامنے جو گستاخانہ کلمات استعمال کیے تھے، ان کی اسے معافی دے دی جائے اور اس نے گڑگڑا کر التجا کی تھی کہ وہ اسے حسب سابق نگاہ التفات سے نوازتا رہے۔ معمر پرنس نے اس خط کا جواب بہت محبت اور شفقت سے دیا تھا اور تب سے اب تک اس نے فرانسیسی عورت کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ پرنس آندرے نے اپنا دوسرا خط وتیبسک پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اس شہر کے کہیں قرب وجوار سے تحریر کیا تھا۔ اس میں اس نے ساری مہم کا مختصر حال بیان کیا تھا۔ مزید صراحت کے لیے اس نے علاقے کا نقشہ بھی کر دیا تھا اور مستقبل میں جنگ نے کیا رخ اختیار کرنا تھا، اس کے بارے میں اس نے اپنے خیالات کا اظہار بھی کیا تھا۔ چونکہ بالڈ ہلز میدان جنگ کے بالکل قریب اور دشمن کی پیش قدمی کے عین راستے میں آتا تھا، اس لیے یہاں ٹھہرنے میں جو خطرات لاحق تھے، پرنس آندرے نے اپنے باپ کی توجہ ان کی طرف دلائی تھی اور اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ ماسکو نقل مکانی کر جائے۔

اس روز ڈنر پر دیسال نے جب یہ کہا: ''سننے میں آیا ہے کہ فرانسیسی کبھی کے وتیبسک میں داخل ہو چکے ہیں۔'' معمر پرنس کو یاد آیا کہ اسے اپنے بیٹے کا خط موصول ہوا ہے۔

''آج پرنس آندرے کا خط آیا تھا،'' اس نے پرنس ماریا سے کہا۔ ''تم نے پڑھا؟''

"non, mon pere"* پرنس ماریا نے ڈرتے جھجکتے جواب دیا۔

اس کے خط پڑھنے کا کوئی امکان نہیں تھا کیونکہ اس نے اس کی وصولی کے بارے میں سنا تک نہیں تھا۔

''اس نے اس جنگ کے بارے میں لکھا ہے،'' پرنس نے تمسخر انگیز انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ جب بھی وہ اس جنگ کے متعلق کوئی بات کرتا تھا، وہ اسی انداز سے مسکرانے لگتا تھا۔

''خاصا دلچسپ خط ہوگا،'' دیسال نے کہا۔ ''پرنس آندرے اس پوزیشن میں ہیں کہ صحیح حال معلوم کر سکیں۔''

''اخ، بہت دلچسپ!'' مادموزیل بوغین نے اظہار خیال کیا۔

''جاؤ اور لے آؤ،'' معمر پرنس نے مادموزیل بوغین سے کہا۔ ''تمھیں معلوم ہی ہے — یہ چھوٹی میز پر پیپر ویٹ کے نیچے پڑا ہے۔''

مادموزیل بوغین نے پھرتی سے زقند لگائی۔

''نہیں، تم مت جاؤ،'' وہ تیوریاں چڑھا کر چلایا۔ ''میخائیل ایوانچ، تم جاؤ۔''

میخائیل ایوانچ اٹھا اور سٹڈی روم کی طرف چل دیا۔ لیکن وہ کمرے سے نکلا ہی تھا کہ معمر پرنس نے، جو پریشانی کے عالم میں ادھر ادھر دیکھ رہا تھا، اپنا نیپکن نیچے پھینکا اور خود چل پڑا۔

''ان سے کبھی کوئی کام نہیں ہوتا... ہمیشہ کہیں نہ کہیں گڑبڑ کر دیتے ہیں۔''

---

* نہیں، ابا جان

اس کی عدم موجودگی میں پرنس ماریا، دیسال، مادموزیل بوغین، یہاں تک کہ ننھا نکولشکا بھی چپ چاپ ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ معمر پرنس تیز تیز قدم اٹھاتا میخائیل ایوانچ کی معیت میں واپس آیا۔ وہ خط اور نقشہ دونوں لے آیا تھا۔ اس نے انھیں اپنے قریب رکھ لیا اور ڈنر کے دوران میں کسی کو ان پر نظر نہ ڈالنے دی۔

جب وہ ڈرائنگ روم میں منتقل ہو گئے، اس نے پرنس ماریا کو خط تھما دیا۔ اس نے نئی عمارت کا نقشہ اپنے سامنے پھیلایا اور اس پر نگاہیں گاڑتے ہوئے اپنی بیٹی کو حکم دیا کہ وہ با آواز بلند خط پڑھ کر سنائے۔

خط پڑھنے کے بعد پرنس ماریا مستفسرانہ انداز سے اپنے باپ کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ نقشے کا مطالعہ کر رہا تھا اور بظاہر اپنے خیالات میں مستغرق تھا۔

''پرنس، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟'' دیسال نے ہمت کر کے پوچھ لیا۔

''میری؟... میری؟...'' پرنس نے نقشے سے نگاہیں اٹھائے بغیر کہا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس کی مرضی کے خلاف جگا دیا گیا ہے۔

''عین ممکن ہے کہ محاذ جنگ اتنا قریب پہنچ جائے کہ...''

''ہا۔ ہا! محاذ جنگ!'' پرنس نے کہا۔ ''میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور اب بھی یہی کہتا ہوں کہ جنگ کا محاذ پولینڈ بنے گا اور دشمن کبھی دریائے نیمین عبور نہیں کر سکے گا۔''

دیسال نے اچنبھے سے پرنس کی جانب دیکھا۔ وہ نیمین کا راگ الاپ رہا تھا جب کہ غنیم کبھی کا دنیپر کے کنارے پہنچ چکا تھا، لیکن پرنس ماریا نے دریائے نیمین کی جغرافیائی پوزیشن بھول کر اپنے باپ کے فرمودات پر کوئی اعتراض نہ اٹھایا۔

''جب برف پگھلے گی، وہ پولستانی دلدلوں میں غرقاب ہو جائیں گے۔ صرف انھیں یہ نظر نہیں آئیں گی،'' معمر پرنس نے اپنی بات بڑھاتے ہوئے کہا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ 1807 کی مہم کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ اسے وہ بالکل حال کی بات معلوم ہوتی تھی۔ ''بے نگ سین کو بہت پہلے پرشیا میں داخل ہو جانا چاہیے تھا۔ پھر حالات قطعی مختلف صورت اختیار کر لیتے...''

''لیکن پرنس،'' دیسال نے ڈرتے جھجکتے کہا، ''خط میں تو وتیبسک کا ذکر ہے...''

''ہونہہ، خط؟ ارے ہاں...'' پرنس نے جھلا کر کہا۔ ''ہاں... ہاں...'' اس کے چہرے پر اچانک آزردگی چھا گئی اور اس کا مزاج برہم ہو گیا۔ اس نے چندے توقف کیا۔ ''اس نے لکھا ہے کہ فرانسیسیوں کو شکست ہو گئی ہے... بھلا کیا نام ہے دریا کا جہاں انھیں شکست ہوئی ہے؟''

دیسال نے نظریں جھکا لیں۔

''پرنس نے اس بارے میں کچھ نہیں لکھا،'' اس نے نرمی سے کہا۔

''اس نے نہیں لکھا؟ پھر یقیناً یہ بات میں نے نہیں گھڑی۔''

خاصی دیر خاموشی چھائی رہی۔

''اچھا... اچھا... میخائیل ایوانچ!'' اس نے اچانک سر اٹھاتے اور عمارت کے نقشے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مجھے یہ بتاؤ کہ تم یہ تبدیلی کس طرح عمل میں لاؤ گے؟...''

میخائیل ایوانچ ادھر، جہاں نقشہ پڑا تھا، چل پڑا۔ پرنس نئی عمارت کے بارے میں اس سے باتیں کرتا رہا، پھر اس نے پرنس ماریا اور دیسال پر خفگی کی نظر ڈالی اور اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

پرنس ماریا نے دیکھا کہ دیسال کی حیران پریشان اور سراسیمہ نگاہیں اس کے باپ پر گڑی ہوئی ہیں۔ اس نے یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ بالکل خاموش ہے اور اس چیز نے تو اس کی سٹی ہی گم کر دی کہ اس کا باپ اپنے بیٹے کا خط بھول گیا ہے اور اسے ڈرائنگ روم کی میز پر چھوڑ گیا ہے۔ وہ نہ صرف اس کے متعلق بات کرنے اور دیسال سے یہ پوچھنے سے ہی کہ وہ اتنا حیران پریشان اور خاموش کیوں ہے، خوف کھا رہی تھی، بلکہ وہ تو ان کے بارے میں سوچتے بھی لرزہ براندام ہو رہی تھی۔

شام کو پرنس نے میخائیل ایوانچ کو فراموش شدہ خط لانے کے لیے پرنس ماریا کے پاس بھیجا۔ پرنس ماریا نے یہ اس کے حوالے کر دیا اور اگرچہ اسے یہ بات قطعاً پسند نہیں تھی۔ پھر بھی اس نے حوصلہ کر کے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس کا باپ کیا کر رہا ہے۔

''حسب معمول مصروف'' اس نے مؤدبانہ طنزیہ مسکراہٹ سے جواب دیا۔ اس پر پرنس ماریا کا رنگ فق ہو گیا۔ ''وہ نئی عمارت کے بارے میں بہت فکر مند رہتے ہیں۔ وہ کچھ پڑھتے بھی رہے ہیں لیکن اب ــ میخائیل ایوانچ نے اپنی آواز دھیمی کر لی۔'' وہ اس وقت میز کے سامنے بیٹھے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ اپنا وصیت نامہ تیار کرنے میں مصروف ہیں۔ (حالیہ ایام کے دوران میں پرنس کا دل پسند مشغلہ یہ تھا کہ وہ کچھ دستاویزات تیار کرتا رہتا۔ انھیں وہ اپنا ''وصیت نامہ'' کہتا تھا اور انھیں وہ اپنی موت پر چھوڑنا چاہتا تھا۔)

''اور کیا آل پاچ کو سمولنسک بھیجا جا رہا ہے؟'' پرنس ماریا نے دریافت کیا۔

''ارے ہاں، یقیناً۔ وہ کچھ دیر سے روانگی کا منتظر ہے۔''

3

جب میخائیل ایوانچ خط لے کر واپس سٹڈی روم میں آیا، معمر پرنس آنکھوں پر چشمہ اور چشمے پر شیڈ[3] لگائے میز کے، جس کی درازیں کھلی تھیں، سامنے بیٹھا تھا۔ میز پر شمع، جسے شیڈ نے ڈھانپ رکھا تھا، پڑی تھی۔ پرنس نے اپنا ہاتھ، جس میں وہ کوئی کاغذ تھامے ہوئے تھا، آگے بڑھا رکھا تھا اور وہ قدرے ڈرامائی انداز سے اپنے مسودے کا، جسے وہ ''مشاہدات'' کہتا تھا، مطالعہ کر رہا تھا۔ اس کے انتقال کے بعد اس کا یہ مسودہ زار کی خدمت میں ارسال کیا جاتا تھا۔

جب میخائیل ایوانچ اندر داخل ہوا، پرنس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ یہ آنسو ان وقتوں کی، جب

یہ کاغذ، جن کا وہ مطالعہ کر رہا تھا، تحریر کیے گئے تھے، یاد نے چھلکائے تھے۔ اس نے میخائیل ایوانچ سے خط پکڑا، جیب میں ڈالا اور اپنے کاغذات تہہ کرتے ہوئے آل پاچ کو، جو کمرے کے باہر انتظار کر رہا تھا، اندر بلایا۔

پرنس سمولنسک میں جو جو کام کرانا چاہتا تھا، اس نے ان کی فہرست بنائی تھی اور وہ آل پاچ کو، جو دروازے کے قریب کھڑا تھا، ہدایات دینے کے دوران میں چکر لگاتا رہا۔

"نمبر 1، لکھنے کا کاغذ۔ سن رہے ہو؟ آٹھ دستے، اس نمونے کا، سنہری حاشیے والا... یہ اس نمونے کے عین مطابق ہو۔ وارنش، مہریں لگانے کی لاکھ۔ میخائیل ایوانچ کی فہرست کے مطابق۔"

وہ کچھ دیر آگے پیچھے چکر لگاتا رہا اور پھر اس نے اپنی فہرست پر سرسری نظر ڈالی۔

"نمبر 2، وثیقے کے متعلق خط اپنے ہاتھوں گورنر کو پہنچانا۔"

اس کے بعد نئی عمارت کے دروازوں کے لیے چٹخنیاں خریدنا تھیں۔ یہ خاص انداز کی تھیں اور ان کا ڈیزائن پرنس نے خود بنایا تھا۔ پھر ایک بکس کا، جس کے گرد آہنی پٹیاں چڑھی تھیں، آرڈر دیا جانا تھا۔ اس بکس میں اس نے اپنا "وصیت نامہ" رکھنا تھا۔

آل پاچ کو ہدایات دینے میں دو گھنٹے سے زیادہ صرف ہوئے۔ پھر بھی پرنس نے اس کی جان نہ چھوڑی۔ وہ نیچے بیٹھ گیا، کچھ دیر سوچتا رہا، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اسے اونگھ آ گئی۔ آل پاچ تھوڑا تھوڑا کھسکنے لگا۔

"اچھا، اب تم جاؤ، جاؤ! اگر مجھے کسی اور شے کی ضرورت ہوئی، میں تمھارے پیچھے آدمی بھیج دوں گا۔"

آل پاچ باہر نکل گیا۔ پرنس دوبارہ میز کی طرف آیا، اس نے درازوں کے اندر جھانک کر دیکھا، انگلیوں سے کاغذات کو چھوا، درازیں بند کیں اور گورنر کے نام خط لکھنے بیٹھ گیا۔

جب اس نے خط بند کیا، شام خاصی ڈھل چکی تھی۔ وہ تھک چکا تھا اور سونا چاہتا تھا، لیکن وہ جانتا تھا کہ وہ سو نہیں سکے گا۔ وہ جب بھی بستر پر دراز ہوتا تھا، انتہائی افسردہ خیالات اس کے ذہن میں گھومنے لگتے تھے۔ اس نے تیخون کو بلایا اور اس کے ساتھ مختلف کمروں میں گھومنے لگا تاکہ وہ اسے بتا سکے کہ اس نے اس رات اس کا بستر کہاں لگانا ہے۔ وہ ادھر ادھر پھرتا اور ایک ایک کونا کھنگالتا رہا۔

اسے کوئی جگہ تسلی بخش نظر نہ آئی۔ سب سے بدترین وہ کاؤچ تھا جو سٹڈی روم میں پڑا تھا اور جس پر لیٹنا اس کا معمول تھا۔ یہ کاؤچ اب اس کے لیے ڈراؤنی شے بن چکا تھا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کیونکہ جب وہ اس پر لیٹتا تھا، اس کے ذہن میں بڑے موذی اور اذیت ناک خیالات گھومنے لگتے تھے۔ کوئی جگہ بھی صحیح نہیں تھی لیکن سٹنگ روم میں پیانو کا عقبی گوشہ باقی سب سے بہتر تھا۔ وہ ابھی تک وہاں نہیں سویا تھا۔

تیخون ایک وردی پوش ملازم کی مدد سے پلنگ اندر لے آیا اور اسے وہاں رکھنے لگا۔

"اس طرح نہیں، اس طرح نہیں!" پرنس نے چلا کر کہا۔ پھر اس نے اپنے ہاتھوں پلنگ کونے سے چند انچ آگے دھکیل دیا اور اس کے بعد دوبارہ اسے اس کے قریب لے گیا۔

''خیر، آخر کار میں نے یہ کام مکمل کر ہی لیا! اب میں آرام کر سکتا ہوں،'' پرنس نے سوچا اور اس کی اجازت سے تیخون اس کے کپڑے تبدیل کرنے لگا۔

کوٹ پتلون اتارنے کے لیے پرنس کو جو ضروری تگ ودو کرنا پڑی، وہ اس پر بہت تنگ ہوا اور اس کی بھویں تن گئیں۔ بہرحال اس نے جیسے تیسے کپڑے اتارے، دھم سے پلنگ پر گر پڑا اور اپنی سوکھی سڑی زرد ٹانگوں کو بہ نظر حقارت گھور گھور کر کچھ اس طرح دیکھنے لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے خیالات میں کھو گیا ہے۔ درحقیقت وہ سوچ نہیں رہا تھا بلکہ وہ محض اس لمحے کو، جب اسے زور لگا کر ان ٹانگوں کو اوپر اٹھانا اور بستر پر چڑھنا تھا، ٹال رہا تھا۔

''توبہ توبہ! کیا مصیبت ہے! کاش اس روز روز کی مشقت سے میری جان چھوٹ جائے! کاش تو میری خلاصی کرا دے!'' اس نے سوچا۔ اس نے اپنے دانت بھینچے، بیس ہزارویں مرتبہ زور لگایا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ لیکن جونہی اس نے پاؤں پسارے، اسے محسوس ہوا جیسے پلنگ اس کے نیچے آگے پیچھے جھول رہا ہو، زور زور سے سانس لے رہا اور ہچکولے کھا رہا ہو۔ ہر روز اس کے ساتھ یہی واردات ہوتی تھی۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں کہ پھر کھل گئیں۔

''کہیں سکون نہیں، لعنت ہو ان پر!'' وہ غیظ وغضب سے بڑبڑایا۔ اسے غصہ کس پر آ رہا تھا، یہ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا۔ ''ارے ہاں، کوئی اور اہم چیز بھی تھی — اتنی اہم کہ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ بستر میں اس کے بارے میں سوچوں گا۔ ڈرائنگ روم میں کوئی چیز تھی۔ پرنسس ماریا کوئی فضول بات کہہ رہی تھی ... اس احمق دیسال نے کچھ کہا تھا ... میری جیب میں کچھ تھا ... کچھ یاد نہیں آ رہا۔''

''تیخون، ہم نے ڈنر پر کیا باتیں کی تھیں؟''

''پرنس آندرے کے بارے میں ...''

''بکواس بند کرو!'' پرنس نے زور سے میز پر چپت جمائی۔ ''ہاں۔ مجھے معلوم ہے، پرنس آندرے کا خط! یہ پرنسس ماریا نے پڑھ کر سنایا تھا۔ دیسال نے وتیبسک کے بارے میں کچھ کہا تھا۔ اب میں اسے پڑھوں گا۔''

اس نے تیخون کو حکم دیا کہ وہ اس کی جیب سے خط نکال لائے اور چھوٹی میز پر، جس پر اس کا لیمونیڈ اور مخروطی موم بتی پڑی تھی، پلنگ کے قریب کر دے۔ اس نے عینک پہنی اور خط پڑھنے لگا۔ جب وہ رات کے سکوت میں سبز شیڈ کے نیچے مدھم روشنی میں خط پڑھ رہا تھا، اسے پہلی مرتبہ وقتی طور پر اس کا مفہوم سمجھ میں آیا۔

''فرانسیسی وتیبسک میں! اگر انھوں نے مزید چار روز اپنی پیش قدمی جاری رکھی، وہ سمولنسک میں داخل ہو سکیں گے — غالباً وہ پہلے ہی وہاں پہنچ چکے ہیں! اتشکا!'' تیخون ہڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ''نہیں، چھوڑو، جانے دو!'' اس نے چلا کر کہا۔

اس نے خط شمع دان کے نیچے رکھ دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی آنکھوں کے سامنے ڈینیوب کا نقشہ گھومنے لگا — درخشاں وتاباں دوپہر، سرکنڈے، روسی پڑاؤ اور وہ خود نوجوان جرنیل، اس کا سرخ وسپید، جھریوں سے پاک صاف چہرہ، صحت مند اور پھرتیلا جسم، خوش مزاج وخوش طبع، وہ پوتیمکن[4] کے بھڑکیلے اور رنگین خیمے میں داخل

ہو رہا تھا۔ ''چہیتے'' سے حسد کے آتشیں جذبے نے جس طرح اس وقت اس کے رگ و پے میں ہیجان پیدا کر دیا تھا، اب دوبارہ اس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی۔ پوتیمکن کے ساتھ پہلی ملاقات کے دوران میں جو گفتگو ہوئی تھی، اب اسے اس کا ایک ایک لفظ یاد آ گیا۔ پھر اسے ایک کوتاہ قامت، لحیم شحیم عورت، جس کا چہرہ لجلجا اور زرد تھا، نظر آئی۔ یہ مادر امپراطورہ تھی۔ مادر امپراطورہ نے از رہ عنایت اسے جب پہلی مرتبہ شرف باریابی بخشا تھا، اس وقت وہ جس انداز سے مسکرائی تھی اور اس نے گفتگو کے دوران میں جو الفاظ استعمال کیے تھے، وہ اسے من وعن یاد آ گئے۔ پھر اسے وہی چہرہ تابوت گاڑی میں دکھائی دیا اور اس کے بعد اسے زبوف[5] کے ساتھ وہ ہلکی سی جھڑپ، جو اس کا ہاتھ چومنے پر تابوت گاڑی کے قریب دونوں میں ہوئی تھی، یاد آ گئی۔

''کاش وہ زمانہ جلد از جلد، پر لگا کر، دوبارہ واپس آ جائے اور اس زمانہ حال سے چھٹکارا مل جائے۔ کاش یہ مجھے امن چین سے رہنے دیں!''

4

پرنس نکولائی بلکونسکی کی جاگیر ''بالڈ ہلز'' سمولنسک سے چالیس میل دور مشرق میں واقع تھی۔ ماسکو جانے والی جرنیلی سڑک جاگیر سے دو میل ہٹ کر گزرتی تھی۔

اسی شام جب پرنس آل پاچ کو ہدایات دے رہا تھا، دیسال نے پرنس ماریا سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس نے اسے بتایا: ''چونکہ نصیب دشمناں پرنس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور وہ اپنی حفاظت کے لیے کوئی اقدام نہیں کر رہے۔ حالانکہ پرنس آندرے کے خط سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ بالڈ ہلز میں ٹھہرنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ آپ آل پاچ کی وساطت سے صوبائی گورنر کے نام سمولنسک خط بھیج دیں اور ان سے دریافت کریں کہ حالات کس ڈھب پر جا رہے ہیں اور یہ بھی پوچھ لیں کہ بالڈ ہلز کس حد تک خطرے کی زد میں ہے۔'' دیسال نے گورنر کے نام خط لکھ دیا اور اسے پرنس ماریا کے حوالے کر دیا۔ اس نے اس پر دستخط کر دیے اور آل پاچ کو تھماتے اسے ہدایت کی کہ وہ یہ خط خود گورنر تک پہنچائے اور اگر کوئی خطرہ نظر آئے، جلد از جلد واپس چلا آئے۔

اپنے تمام احکام وصول کرنے کے بعد آل پاچ نے سنجابی ٹوپی۔ یہ اسے پرنس نے تحفتاً دی تھی۔ پہنی اور پرنس کی طرح ہاتھ میں چھڑی پکڑے باہر نکل گیا۔ اس نے چرمی چھت والی گاڑی میں، جسے تین چتکبرے گھوڑے، جو خوب پلے ہوئے تھے، کھینچتے تھے، سوار ہونا تھا۔ اس کے اہل خانہ اسے رخصت کرنے ساتھ ہو لیے۔

بڑی گھنٹی کے اوپر کپڑا منڈھ دیا گیا تھا تاکہ وہ زیادہ شور نہ کرے۔ گھوڑوں کے گلوں میں جو گھنٹیاں تھیں، ان میں کاغذات ٹھونس دیے گئے تھے۔ پرنس بالڈ ہلز میں کسی شخص کو ایسی گاڑی، جس میں کھنکھناتی گھنٹیاں نصب ہوں، چلانے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ لیکن آل پاچ جب کہیں لمبے سفر پر روانہ ہوتا تھا، اسے یہ کھنکھناتی گھنٹیاں لگانا بہت پسند تھا۔ اس کے حواری۔ ہیڈ کلرک، حساب دار، باورچن اور برتن مانجھنے والی خادمہ، دو بوڑھی عورتیں،

ایک وردی پوش ملازم لڑکا، جو قازقوں کا لباس پہنے ہوئے تھا، کوچوان اور مختلف گھریلو خدمات سرانجام دینے والے نوکر چاکر—اسے خدا حافظ کہنے آئے۔

اس کی بیٹی نے چھینٹ کے کپڑے میں ملفوف گدیاں اس کی نشست اور پشت پر رکھ دیں۔ اس کی بڑی سالی نے ایک چھوٹی سی پوٹلی گاڑی میں دھکیل دی اور ایک کوچوان نے اسے گاڑی میں سوار ہونے میں مدد دی۔

''یہ زنانیاں بھی مت مار دیتی ہیں! ذرا ذرا سی بات پر پریشان ہو جاتی ہیں! زنانیاں، زنانیاں!'' آل پاچ نے گاڑی میں سوار ہوتے ہوئے عین مین پرنس کی طرح پھونکیں مارتے اور تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔

کسی کام کو نپٹانے کے سلسلے میں ہیڈ کلرک کو الوداعی ہدایات دینے کے بعد آل پاچ نے، جو اب پرنس کی نقالی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کر رہا تھا، اپنے گنجے سر سے ٹوپی اتاری اور اپنے سینے پر تین مرتبہ صلیب کا نشان بنایا۔

''یا کوف آل پاچ، اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی... فوراً واپس چلے آنا۔ مسیح کا واسطہ ہے۔ ہمارا کچھ خیال کرنا!'' اس کی بیوی نے جنگ اور دشمن کے بارے میں افواہوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ زنانیاں اور ان کی خواہ مخواہ کی پریشانیاں!'' آل پاچ نے اپنے آپ سے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ اس کی گاڑی چل پڑی۔ وہ اپنے گردوپیش نظریں دوڑانے لگا۔ کھیتوں میں رائی زرد ہونے لگی تھی۔ جئی کے پودے بہت گھنے تھے اور ابھی تک ان کا رنگ سبز تھا۔ دوسرے کھیت ابھی تک بالکل سیاہ تھے۔ ان میں کسانوں نے ابھی ابھی دوسری مرتبہ ہل چلانا شروع کیا تھا۔

آل پاچ کا سفر جاری تھا۔ وہ دل ہی دل میں اناج کی فصلوں کی، جو اس سال خاص طور پر بہت عمدہ تھیں، تحسین کر رہا تھا۔ وہ رائی کے کھیتوں کا بغور جائزہ لیتا جا رہا تھا (ان کی کہیں کہیں کٹائی شروع ہو گئی تھی) اور سچے کسان کی طرح بوائی اور کٹائی کا حساب کرتا جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے آپ سے یہ بھی پوچھتا جا رہا تھا کہ کہیں وہ پرنس کی کوئی ہدایت بھول تو نہیں گیا۔

اپنے گھوڑوں کو دانہ اور چارہ کھلانے کے لیے وہ راستے میں دو مرتبہ رکا اور بتاریخ چار اگست شام کے وقت شہر پہنچ گیا۔

راستے میں آل پاچ فوجیوں اور سامان کے چھکڑوں کو دیکھتا اور ان سے آگے گزرتا رہا۔ جب وہ سمولنسک پہنچا، اسے دور سے فائرنگ کی آوازیں سنائی دینے لگیں لیکن وہ ان سے کوئی خاص متاثر نہ ہوا۔ تاہم جب وہ شہر کے نزدیک پہنچا، جس چیز نے اس کی توجہ معاً اپنی طرف مبذول کرا لی وہ جئی کا شاندار کھیت تھا۔ اس میں پڑاؤ قائم ہو چکا تھا اور اسے چند فوجی جوان کاٹ رہے تھے۔ ظاہر تھا کہ وہ چارہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ انھیں دیکھ کر آل پاچ متاثر ضرور ہوا لیکن اپنے معاملات کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ یہ سب کچھ بھول گیا۔

آل پاچ کی زندگی کی تمام دلچسپیاں پرنس کی مرضی میں محصور ہو کر رہ گئی تھیں اور اس نے کبھی اس حد کو عبور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جس چیز کا پرنس کے احکام کی تعمیل کرنے سے کوئی تعلق نہیں تھا، اسے اس میں کوئی

دلچسپی نہیں تھی، بلکہ حقیقتاً اس کے نزدیک اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

4 اگست کی شام سمولنسک پہنچنے کے بعد آل پاچ نے دریائے دنیپر کے پار مضافاتی بستی گاچن میں فیراپونتوف کے ہوٹل میں ڈیرا ڈال دیا۔ گزشتہ تیس برسوں کے دوران میں اس کا یہ وتیرہ بن گیا تھا کہ وہ یہیں قیام کرتا تھا۔ بارہ سال قبل فیراپونتوف نے آل پاچ کے توسط سے پرنس سے (درختوں کا) ذخیرہ خریدا تھا اور تجارت کرنے لگا تھا۔ اب اس کا اپنا مکان تھا، اپنا ہوٹل تھا اور اسی علاقے میں غلے کی دکان تھی۔ فیراپونتوف چالیس کے پیٹے میں تھا۔ اس کا جسم ہٹا کٹا، رنگ سانولا، چہرہ سرخ و سپید اور ہونٹ موٹے تھے۔ ناک کے نام پر چوڑا سا گومڑ تھا۔ اس قسم کے گومڑ اس کی سیاہ اور نچلی جانب جھکی ہوئی بھوؤں کے اوپر تھے۔ اس کی توند خاصی بڑی تھی۔

وہ چھینٹ کی قمیص پر واسکٹ پہنے اپنی دکان کے سامنے، جو گلی میں کھلتی تھی، کھڑا تھا۔ اس نے آل پاچ کو دیکھ لیا اور اس کی جانب چل پڑا۔

"خوش آمدید، یاکوف آل پاچ، خوش آمدید۔ لوگ شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں اور تم آ رہے ہو،" اس نے کہا۔

"شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں؟۔ کیوں؟" آل پاچ نے پوچھا۔

"یہی تو میں پوچھتا ہوں۔ لوگوں کی تو مت ماری گئی ہے! ان پر فرانسیسیوں کا ہوا بیٹھ گیا ہے۔"

"بے بنیاد افواہیں ہیں! بے بنیاد افواہیں!" آل پاچ نے کہا۔

"یاکوف آل پاچ، میرا بھی بالکل یہی خیال ہے۔ میں کہتا ہوں: حکم جاری ہو چکا ہے کہ انھیں اندر نہ گھسنے دیا جائے، پھر فکر کی کیا بات ہے؟ سب ٹھیک ہو جائے گا اور کسان ہیں کہ چھکڑے گھوڑے کا کرایہ تین روبل طلب کر رہے ہیں — اتنا زیادہ! ان کے دیدوں کا پانی ڈھل گیا ہے!"

یاکوف آل پاچ بظاہر سن رہا تھا لیکن اس کا دھیان کہیں اور تھا۔ اس نے سماوار اور گھوڑوں کے لیے خشک گھاس طلب کی۔ جب وہ چائے پی چکا، بستر پر لیٹ گیا۔

ساری رات فوجی ہوٹل کے برابر سے گزرتے رہے۔ اگلے روز آل پاچ نے کوٹ زیب تن کیا (اسے وہ شہر میں پہننے کے لیے سنبھال کر رکھتا تھا۔) اور اس کے ذمے جو کام لگائے گئے تھے، وہ انھیں پورا کرنے چل پڑا۔ اس روز دھوپ چمک رہی تھی اور اچھی خاصی گرمی ہو گئی تھی۔ "فصل کاٹنے کے لیے بہت اچھا دن ہے،" آل پاچ نے سوچا۔

تڑکے تڑکے شہر کے باہر فائرنگ شروع ہو گئی تھی اور اس کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ آٹھ بجے دستی بندوقوں کی چٹاخ پٹاخ میں توپوں کی گھن گرج بھی شامل ہو گئی۔ سڑکوں اور گلیوں میں لوگوں کا وہ ازدحام تھا کہ سروں پر تھالی پھیرے اور نیچے نہ گرے۔ ہجوم میں کثیر تعداد فوجیوں کی تھی۔ جس کا جدھر سینگ سمایا، ادھر بھاگ رہا تھا تاہم سڑکوں اور بازاروں میں کرائے کے تانگے ریڑھے ابھی تک رواں دواں تھے۔ دکاندار اپنی دکانوں کے سامنے کھڑے تھے اور کلیساؤں میں حسب معمول صبح کی مناجات جاری تھیں۔ آل پاچ نے دکانوں اور سرکاری دفتروں کے پھیرے لگائے۔ وہ ڈاک خانے بھی گیا اور گورنر کی رہائش گاہ پر بھی۔ وہ جہاں بھی گیا، لوگ فوج اور غنیم کے بارے میں، جو

ازیں پیشتر شہر پر حملہ آور ہو چکا تھا، باتیں کر رہے تھے۔ کبھی ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ اب کیا کرنا چاہیے، کبھی ایک دوسرے کو دم دلاسا دے رہے اور امیدیں بندھا رہے تھے۔

گورنر ہاؤس کے سامنے آل پاچ کو لوگوں کا جم غفیر نظر آیا۔ ان میں قازق اور گورنر کی سفری گاڑی شامل تھے۔ سیڑھیوں پر اس کی مڈھ بھیڑ دو جاگیرداروں سے ہوگئی۔ ان میں سے ایک اس کا شناسا تھا۔ یہ شخص کبھی ضلعی پولیس کا کپتان تھا۔ وہ زور شور سے تقریر کر رہا تھا۔

''آپ جانتے ہیں کہ یہ مذاق کی بات نہیں۔ اگر آپ تن تنہا ہوں تو کوئی بات نہیں۔ کہاوت ہے: 'اکیلا آدمی مارا جائے، وہ اکیلا ہی رہتا ہے۔' لیکن تیرہ افراد کا گھرانہ اور ساتھ اتنا کاٹھ کباڑ... حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ ہم سب کا کباڑا ہو جائے گا۔ اگر ہمارا یہی حشر ہونا ہے، پھر ان افسروں کا فائدہ؟ انھیں پھانسی پر لٹکا دینا چاہیے۔ لٹیرے، ڈاکو!...''

''صبر، بھائی، صبر! اب خاموش ہو جاؤ!'' دوسرے نے کہا۔

''وہ سنتا ہے تو سنتا رہے، میں اسے جوتی کی نوک پر نہیں مارتا! ہم کتے تھوڑے ہی ہیں!'' سابق پولیس کپتان نے کہا۔ اس نے اپنے گرد و پیش دیکھا اور اس کی نظر آل پاچ پر پڑ گئی۔

''ارے، یاکوف آل پاچ، تم یہاں کیسے آ گئے؟''

''میں ہز ایکسی لینسی کے حکم پر گورنر سے ملنے آیا ہوں،'' آل پاچ نے بڑے فخر سے اپنی گردن اکڑاتے اور بند کوٹ کی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈالتے ہوئے کہا۔ وہ جب بھی پرنس کا نام لیتا تھا، یہی انداز اختیار کر لیتا تھا۔ ''ہز ایکسی لینسی نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں یہ معلوم کروں کہ حالات کس نہج پر جا رہے ہیں،'' اس نے مزید کہا۔

''اچھا، تو پھر سن لو،'' جاگیردار نے چلا کر کہا۔ ''انھوں نے ہم سب کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا ہے۔ ڈاکو، لٹیرے!...'' اس نے اپنی بات دہراتے ہوئے کہا اور سیڑھیوں سے نیچے اتر آیا۔

آل پاچ نے گردن کو جھٹکا دیا اور زینہ چڑھنے لگا۔ انتظار گاہ تاجروں، عورتوں اور سرکاری کارندوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ سب کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور وہ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ گورنر کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ سب حاضرین اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور آگے سرکنے لگے۔ ایک کلرک بھاگم بھاگ باہر آیا۔ اس نے کسی تاجر سے کچھ کہا، ایک ہٹے کٹے سرکاری ملازم کو، جس کے گلے میں صلیب لٹک رہی تھی، ہاتھ سے اشارہ کیا اور دوبارہ غائب ہوگیا۔ صاف ظاہر تھا کہ حاضرین جس طرح مستفسرانہ نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے اور تابڑ توڑ اس سے جو سوالات پوچھ رہے تھے، وہ ان سے بچنا چاہتا تھا۔ آل پاچ آگے بڑھا اور جب اگلی مرتبہ کلرک باہر آیا، اس نے ایک ہاتھ کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالا اور اسے دو خطوط تھماتے ہوئے اس سے مخاطب ہوا۔

''جنرل انچیف پرنس بلکونسکی کی طرف سے ہز آنر بیرن آیچ کے لیے۔'' اس نے اتنے گمبھیر اور بارعب انداز سے کہا کہ کلرک کو اس کی جانب متوجہ ہوتے ہی بن پڑی اور اس نے خطوط پکڑ لیے۔

چند منٹ بعد گورنر نے آل پاچ کو طلب کیا اور عجلت سے کہنے لگا۔

"پرنس اور پرنسس کو بتادو کہ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا، میں نے حکام بالا کی ہدایات پر عمل کیا تھا۔ ادھر..." اس نے آل پاچ کو کاغذات تھماتے ہوئے کہا۔ "پھر بھی، چونکہ پرنس کی طبیعت ناساز ہے، میرا انھیں یہی مشورہ ہے کہ وہ ماسکو تشریف لے جائیں۔ میں خود بھی وہیں جارہا ہوں۔ انھیں بتانا..."

لیکن گورنر اپنی بات ختم نہ کرسکا۔ دھول سے لت پت اور پسینے میں شرابور ایک افسر بھاگم بھاگ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے فرانسیسی میں اس سے کچھ کہا۔ گورنر حواس باختہ ہوگیا۔

"اب جاؤ" اس نے سر کو جنبش دے کر آل پاچ سے کہا اور افسر سے سوال جواب کرنے لگا۔

جب آل پاچ گورنر کے کمرے سے باہر آیا، بے قرار، خوف زدہ، مستفسرانہ نگاہوں نے اس کا استقبال کیا۔ وہ مارا مار ہوٹل کی جانب چل پڑا اور نہ چاہتے ہوئے فائرنگ کی آوازیں سنتا رہا۔

گورنر نے اسے جو کاغذات دیے تھے، ان پر مندرجہ ذیل عبارت تحریر تھی:

> میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ سمولنسک شہر کو ابھی رتی برابر خطرہ نہیں اور اس بات کا بھی امکان نہیں کہ اسے کوئی خطرہ لاحق ہوگا۔ ایک طرف سے میں اور دوسری طرف سے پرنس باگ راتیاں اپنی اپنی افواج لے کر آگے بڑھ رہے ہیں تا کہ سمولنسک سے پرے ہی ہم ایک دوسرے سے مل سکیں۔ یکجائی کا یہ عمل اس مہینے کی بائیس تاریخ تک مکمل ہوجائے گا۔ دونوں فوجیں اپنے مشترکہ وسائل سے صوبے کے باشندوں کا، جن کی خبر گیری کی ذمے داری آپ کے کندھوں پر ڈالی گئی تھی، تحفظ کریں گی۔ ہماری یہ کوششیں اس وقت تک جاری رہیں گی جب تک ہم اپنے دشمنوں کو اپنے وطن عزیز کی مقدس سرزمین سے باہر نہیں نکال دیتے یا بصورت دیگر ہماری دلیر اور شجاع افواج کا آخری سپاہی اپنی جان نثار نہیں کردیتا۔ اس سے آپ یہ اندازہ لگاسکیں گے کہ آپ کو یہ پورا حق حاصل ہے کہ آپ سمولنسک کے باشندوں کو یہ یقین دلاسکیں کہ جب ان کی حفاظت کا بیڑا ان دو نڈر اور جری فوجوں نے سنبھال لیا ہے، انھیں کامل اطمینان ہونا چاہیے کہ فتح ان کی ہوگی۔ (فرمان امروز از بارکلے دَتولی برائے بیرن آیچ، سول گورنر سمولنسک، 1812)

لوگ بے مقصد شہر میں ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ انھیں کسی پہلو قرار نہیں تھا۔ خانگی برتنوں، کرسیوں اور الماریوں سے بھرے چھکڑے مسلسل گھروں سے نکل رہے تھے اور شہر کے گلی کوچوں میں رواں دواں تھے۔ فیراپونتوف کے مکان سے اگلے مکان کے دروازے پر لدی پھندی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ عورتیں سَبّ وشتم کررہی تھیں اور آسمان سر پر اٹھائے ہوئے تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ آپس میں گلے مل رہی اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ رہی تھیں۔ ایک پست قامت گھریلو کتا گاڑیوں میں جتے گھوڑوں کے سامنے کلیلیں بھرتا پھر رہا اور بھونک رہا تھا۔

جب آل پاچ ہوٹل کے صحن میں داخل ہوا، وہ معمول سے تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ وہ اس سائبان میں، جہاں اس کی گاڑی اور گھوڑے کھڑے تھے، پہنچا۔ کوچوان سویا پڑا تھا۔ اس نے اسے جگایا، اسے گھوڑے جوتنے کا حکم دیا اور ہوٹل کے اندر چلا گیا۔ ہوٹل والے کے نجی کمرے سے کسی بچے کے رونے کی آوازیں، کسی عورت کی دل خراش چیخیں اور فیرا پونتوف کی کھردری اور غصیلی چیخم دھاڑ سنائی دے رہی تھی۔ جب آل پاچ ہوٹل میں داخل ہوا، باورچن خوف زدہ مرغی کی طرح غلام گردش میں ادھر ادھر بھاگی پھر رہی تھی۔

''وہ مالکن کی جان لے رہا ہے — مار مار کر اس کا بھرکس نکال دیا ہے، ٹھڈے مار کر کبھی ادھر پھینک دیتا ہے اور کبھی ادھر — اتنی پٹائی! آخر کوئی حد ہوتی ہے!''

''کیوں؟ کس لیے؟'' آل پاچ نے پوچھا۔

''وہ بار بار یہاں سے جانے کی التجائیں کر رہی تھی۔ آخر عورت ذات ہے! مجھے یہاں سے لے چلو، وہ کہہ رہی تھی۔ مجھے اور میرے بچوں کو یہاں مرنے نہ دو۔ سب دنیا جا رہی ہے۔' وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ 'پھر ہم کیوں نہیں جاتے؟' اس پر وہ اسے اس قدر پیٹنے اور گالیاں دینے لگا!''

یہ الفاظ سن کر آل پاچ نے یوں سر ہلایا جیسے پسندیدگی کا اظہار کر رہا ہو اور ایک لفظ مزید سنے بغیر سیدھا اس کمرے میں چلا گیا جو ہوٹل والے کے کمرے کے بالمقابل تھا اور جس میں اس نے اپنا سودا سلف رکھا ہوا تھا۔

''وحشی، خونی!'' ایک دبلی پتلی زرد رو عورت نے چلا کر کہا اور اسی لمحے وہ اپنے بازوؤں میں شیر خوار بچہ اٹھائے بھاگتی دروازے سے باہر آئی۔ اس کے سر کا رومال تار تار ہو رہا تھا۔

وہ سیڑھیاں اتر کر نیچے صحن میں چلی گئی۔ فیرا پونتوف اس کے پیچھے پیچھے باہر آیا لیکن آل پاچ کو دیکھ کر اس نے اپنی واسکٹ ٹھیک ٹھاک کی، بال درست کیے، جمائی لی اور آل پاچ کے پیچھے پیچھے سامنے کے کمرے میں چلا گیا۔

''جا رہے ہو؟ ابھی سے؟'' اس نے پوچھا۔

ہوٹل والے کے سوال کا جواب دیے یا اس کی طرف دیکھے بغیر آل پاچ اپنے پارسل چھانٹتا رہا اور اس سے پوچھنے لگا کہ اس کے ذمے کتنی رقم بنتی ہے۔

''حساب کر لیں گے!'' ''تم گورنر کے ہاں گئے تھے؟ کیا فیصلہ ہوا ہے؟''

آل پاچ نے جواب دیا کہ گورنر نے اسے کوئی واضح بات نہیں بتائی۔

''جس قسم کا ہمارا کاروبار ہے، اس میں ہم کیسے سامان باندھ سکتے اور کیسے کہیں جا سکتے ہیں،'' فیرا پونتوف نے کہا۔ صرف دار و گو بژ[7] ہی جانا ہو، تو فی چھکڑا سات روبل ادا کرنا پڑیں گے اور میں کہتا ہوں کہ اتنا کرایہ مانگنا کسی عیسائی کو زیب نہیں دیتا۔ ادھر سیلیوانوف کی چاندی ہو گئی ہے — اس نے جمعرات کو فوج کے ہاتھ نو روبل فی بوری آٹا بیچا۔ کیا خیال ہے، کچھ چائے وائے ہو جائے؟'' اس نے مزید کہا۔

جب گھوڑے جوتے جا رہے تھے، آل پاچ اور فیرا پونتوف غلے اور دوسری فصلوں کی قیمتوں کے متعلق

باتیں کرتے رہے۔ ان کا خیال تھا کہ فصلیں کاٹنے کے لیے موسم سازگار ہے۔

''خیر، معلوم ہوتا ہے کہ حالات کچھ سنبھل گئے ہیں،'' فیراپونتوف نے چائے کی تیسری پیالی ختم کرتے اور اٹھتے ہوئے اظہار خیال کیا۔ ''میدان لازماً ہمارے جوانوں کے ہاتھ رہا ہوگا۔ وہ کہتے تھے کہ وہ انھیں شہر کے اندر گھسنے نہیں دیں گے۔ میرا خیال ہے کہ پلہ ہمارا بھاری ہے۔ سنا ہے کہ ماتوائی ایوانچ پلاتوف نے ان کی گاڑیاں دریائی بندرگاہ میں دھکیل دی تھیں اور اس طرح ایک ہی دن میں ان کے اٹھارہ ہزار آدمی ڈبو دیے۔''

آل پاچ نے سودا سلف اکٹھا کیا، اسے کوچوان کے، جو اندر آ گیا تھا، سپرد کیا اور ہوٹل والے کے ساتھ اپنا حساب چکانے لگا۔ پہیوں کی چرچراہٹ، گھوڑوں کی گردنوں میں پڑی گھنٹیوں کی جھنجھناہٹ اور ان کے سموں کی دھمدھماہٹ کانوں سے ٹکرانے لگی اور ایک دو پہیوں والی ہلکی پھلکی گاڑی، جو چاروں اطراف سے بند تھی، دروازے سے باہر نکل گئی۔

دن کبھی کا ڈھل چکا تھا۔ سائے سڑک کے درمیان تک آ چکے تھے جب کہ بقیہ حصے میں تیز دھوپ چمک رہی تھی۔ آل پاچ نے کھڑکی میں سے جھانک کر باہر دیکھا اور دروازے کی طرف چل پڑا۔ اچانک کہیں دور سے سنسناہٹ سنائی دی۔ اس کے بعد ایک اور آواز کانوں سے ٹکرائی۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی چیز دھم سے گر پڑی ہے۔ پھر توپوں کی گھن گرج کانوں کے پردے پھاڑنے لگی۔ مختلف آوازیں آپس میں مل کر شور وغل بپا کرنے لگیں اور کھڑکیوں کے پٹ کھڑکھڑانے لگے۔

آل پاچ باہر سڑک پر چلا گیا۔ دو آدمی پل کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔ مختلف اطراف سے سیٹیوں کے بجنے، توپوں کے گرجنے اور گولوں کے، جو شہر پر گر رہے تھے، پھٹنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ لیکن شہر کے باشندے ان اصوات کو بمشکل سن پا رہے تھے اور وہ ان پر کوئی خاص توجہ بھی نہیں دے رہے تھے۔ ان کے مقابلے میں وہ توپوں کی، جو شہر سے باہر دہاڑ رہی تھیں، آوازوں پر زیادہ دھیان دے رہے تھے۔ ایک سو تیس توپیں گولہ باری کر رہی تھیں۔ اس کا حکم نپولین نے چار بجے کے ذرا بعد دیا تھا۔

شروع شروع میں تو لوگ سمجھ ہی نہ پائے کہ گولہ باری کیوں ہو رہی ہے۔ دستی بموں اور توپوں کے گولوں کے گرنے سے جو آواز پیدا ہوتی، وہ محض ان کے تجسس کو ہوا دیتی۔ فیراپونتوف کی بیوی، جو اس وقت تک سائبان تلے کھڑی مسلسل چیخ پکار بپا کیے ہوئے تھی، خاموش ہوگئی اور بچہ بازوؤں میں اٹھائے باہر صدر دروازے کی جانب چل دی۔ وہاں وہ کچھ دیر شور وغل سنتی اور صم بکم ٹکٹکی باندھے لوگوں کو دیکھتی رہی۔

باورچن اور ایک دکاندار صدر دروازے کے پاس آ گئے۔ ان کے سروں کے اوپر ہی اوپر جو شیا اڑی جا رہی تھیں، وہ بڑی دلچسپی سے ان کی ایک جھلک دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ متعدد اشخاص نکڑ پر آ کر کھڑے ہو گئے اور زور شور سے باتیں کرنے لگے۔

''کیا قوت ہے!'' ایک شخص نے تبصرہ کیا۔ ''چھتوں کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور انھیں ٹکڑے ٹکڑے کردیا!''

''سُوَروں کی طرح زمین ادھیڑ ڈالی!'' دوسرے نے لقمہ دیا۔

''واہ واہ، کیا بات ہے! آدمی کو خواہ مخواہ جوش آنے لگتا ہے!'' ایک اور نے کہا۔

''شکر کرو کہ تم چھلانگ لگا کر ایک طرف ہٹ گئے، ورنہ ڈھونڈے سے تمھارا نشان تک نہ ملتا!''

انھیں ہجوم نے چپ کرا دیا اور بتایا کہ کس طرح توپ کا گولہ ایک مکان پر، جو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا، گرا تھا۔ دریں اثنا چند اور متحرک اشیا۔ کبھی تیزی سے بھاگتا اور بھیانک سنسناہٹ پیدا کرتا توپ کا گولہ اور کبھی دستی بم وقت بے وقت سیٹی کی خوشگوار آواز نکالتا۔ متواتر لوگوں کے سروں کے اوپر سے گزرتی رہیں لیکن ان میں سے ایک بھی ان کے قریب نہ گری۔ سبھی ان کے سروں کے اوپر ہی اوپر اڑتی آگے نکل گئیں۔

آل پاچ اپنی گاڑی میں سوار ہو گیا۔ ہوٹل والا صدر دروازے پر کھڑا تھا۔

''یہ تم منہ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھنا بند کرو گی یا نہیں؟'' اس نے چلا کر باورچن سے کہا۔ وہ اپنا سرخ پیٹی کوٹ پہنے، آستینیں چڑھائے اور اپنی برہنہ کہنیوں کو گھماتے نکڑ میں جا کھڑی ہوئی تھی تا کہ وہ ان باتوں کو، جو وہاں ہو رہی تھیں، سن سکے۔

''آپ لوگوں کے لیے یہ بالکل انوکھی چیز ہے!'' وہ کہہ رہی تھی لیکن جب اس نے اپنے آقا کی آواز سنی، وہ پیچھے ہٹ گئی اور اس نے اپنی سکرٹ، جو اس نے اوپر ٹانک رکھی تھی، نیچے گرا دی۔

ایک بار پھر، لیکن اب کی مرتبہ بہت قریب، سیٹی کی سی آواز سنائی دی اور کسی ننھے منے پرندے کی طرح کوئی چیز نیچے جھپٹی۔ گلی کے درمیان میں آتشیں چمک دکھائی دی، دھماکہ ہوا اور گلی دھوئیں سے بھر گئی۔

''بدذات، الو کی دم! یہ تم نے کیا کیا؟'' ہوٹل والا باورچن کی جانب بھاگتا چلایا۔

عین اسی لمحے چاروں اطراف سے عورتوں کے رونے پیٹنے کی جگر خراش آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ایک دہشت زدہ بچہ چیخنے چلانے لگا۔ لوگوں کے چہرے فق ہو گئے اور وہ چپ چاپ باورچن کے ارد گرد اکٹھا ہونے لگے۔ اس چیخ چہاڑے میں سب سے بلند باورچن کی آہیں اور کراہیں تھیں۔

''ہائے... ہائے، اوہ! بھلے لوگو! خدا کے نیک بندو! مہربان دوستو، مجھے مرنے سے بچا لو! خدا کے نیک بندو!...''

پانچ منٹ بعد گلی میں کوئی متنفس باقی نہ رہا۔ دستی بم کے ٹکڑے نے باورچن کی ٹانگ توڑ دی تھی اور وہ اسے اٹھا کر باورچی خانے میں لے گئے۔ آل پاچ، اس کا کوچوان، فیراپونتوف کی اہلیہ، بچے اور خانگی نوکر چاکر سبھی تہ خانے میں بیٹھے اور کان لگائے سن رہے تھے۔ توپوں کی گھن گرج، گولوں کی سنسناہٹ، اور باورچن کی دل شگاف آہیں، جو شور وغل سے زیادہ بلند تھیں، ایک لمحے کے لیے بھی بند نہ ہوئیں۔ ہوٹل والے کی بیوی اپنے بچے کو کبھی جھلانے اور کبھی چپ کرانے لگتی، اور جب کوئی شخص تہ خانے میں داخل ہوتا، اس سے درد انگیز سرگوشی میں پوچھنے لگتی کہ اس کے خاوند پر، جو سڑک پر ہی ٹھہر گیا تھا، کیا بیتی ہے۔ ایک دکاندار نے اسے بتایا کہ وہ سمولنسک کے اس

ایقونے کو، جو معجزے دکھاتا ہے، لانے ہجوم کے ساتھ کلیسا چلا گیا ہے۔

جھٹ پٹے کے قریب گولہ باری تھمنے لگی۔ آل پاچ تہہ خانے سے باہر نکلا اور دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ شام کا آسمان، جو اتنا صاف ہوتا تھا، دھوئیں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا اور اس دھوئیں میں درانتی نما چاند آسمان میں بہت بلندیوں پر عجیب وغریب انداز سے ضوافشاں تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ توپوں کی گھن گرج کے بعد شہر پر سکوت چھا گیا ہے۔ اس سکوت کی مہر صرف تب ٹوٹتی جب کسی کے قدموں کی چاپ، آہوں اور کراہوں کی آواز، دور کے شوروغل کی بھنبھناہٹ یا آگ میں، جو چاروں اطراف پھیل رہی تھی، لکڑیوں کے چٹخنے کی صدا سنائی دیتی۔ باورچن کا کراہنا اب تھم گیا تھا۔ دو اطراف دھوئیں کے بادل آگے سے اٹھ رہے اور فضا میں تحلیل ہو رہے تھے۔ قسم قسم کی وردیوں میں ملبوس فوجی جوان ادھر ادھر چل پھر یا بھاگ رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کدھر جائیں اور کدھر نہ جائیں۔ ان کی حالت بالکل ان چیونٹیوں کی، جن کا ڈمکورا* تہس نہس ہو چکا ہو، مانند تھیں۔ ان میں سے متعدد بھاگتے دوڑتے، آل پاچ کی نظروں کے سامنے فیراپونتوف کے صحن میں آ دھمکے۔ آل پاچ صدر دروازے کی طرف چلا گیا۔ ایک رجمنٹ نے، جس کے جوان جلد بازی میں ایک دوسرے سے دھکم پیل ہو رہے تھے، سڑک روک رکھی تھی۔

''شہر مغلوب ہو گیا ہے۔ یہاں سے نکل جاؤ، نکل جاؤ!'' ایک افسر نے، جس نے اسے دیکھ لیا تھا، اس سے کہا۔ پھر وہ جوانوں کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''تمھیں وہ سبق سکھاؤں گا کہ چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا! لوگوں کے صحنوں میں بھاگے جا رہے ہیں، ہونہہ!''

آل پاچ واپس ہوٹل میں آ گیا۔ اس نے کوچوان کو بلایا اور اسے روانگی کا حکم سنا دیا۔ فیراپونتوف کا پورا گھرانہ ان کے پیچھے پیچھے صحن میں چلا آیا۔ جب انھوں نے دھواں، بلکہ آگ کے شعلے بھی، جو جھٹ پٹے میں نظر آنے لگے تھے، اوپر اٹھتے دیکھے، عورتیں، جو اس وقت تک دم سادھے خاموش رہی تھیں، اپنے واویلے سے آسمان سر پر اٹھانے لگیں۔ اسی قسم کی آوازیں سڑک کے دوسرے حصوں سے بھی آنے لگی گویا وہ ان کا جواب دے رہی ہوں۔ سائبان کے اندر آل پاچ اور کوچوان اپنے گھوڑوں کی باگیں اور راسیں، جو آپس میں الجھ گئی تھیں، کانپتے ہاتھوں سے درست کرنے لگے۔

جب آل پاچ اپنی گاڑی میں صدر دروازے سے باہر نکلا، اسے فیراپونتوف کی کھلی دکان میں لگ بھگ ایک درجن فوجی جوان نظر آئے۔ وہ اونچی اونچی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے اور گندم کے آٹے اور سورج مکھی کے بیجوں سے اپنے تھیلے اور بغچے بھرتے جا رہے تھے۔ اتنے میں فیراپونتوف واپس آ گیا اور سیدھا دکان میں چلا گیا۔ فوجی جوانوں کو دیکھ کر وہ چیخنے چلانے والا تھا کہ وہ اچانک رک گیا، اس نے اپنا سر پکڑا اور روکھی ہنسی ہنسنے لگا۔

''بچو، سب کچھ لے جاؤ، ان شیطان کے تخموں کے لیے کچھ نہ چھوڑنا!'' وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر کہہ رہا تھا۔ اس نے جھپٹ کر خود کچھ بوریاں گھسیٹیں اور انھیں باہر سڑک پر پھینک دیا۔

---

* ڈمکورا (ant-hill): چیونٹیوں کے گھروں کے اوپر مٹی کا مخروطی شکل کا ڈھیر۔ (مولوی عبدالحق)

چند جوان ڈر گئے اور باہر بھاگ گئے، تاہم باقی اپنے تھیلے بھرتے رہے۔ آل پاچ کو دیکھ کر فیراپونتوف اس کی جانب متوجہ ہوا۔

''روس تباہ ہو گیا ہے!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''آل پاچ، ہمارا بیڑا غرق ہو گیا ہے! میں اپنے ہاتھوں اس عمارت کو آگ لگا دوں گا۔ ہم اجڑ گئے، تباہ ہو گئے ہیں...'' اور فیراپونتوف باہر صحن میں بھاگ گیا۔

فوجی جوانوں کا ریلا تھا کہ رکنے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ انھوں نے پوری سڑک روک لی تھی۔ چنانچہ آل پاچ باہر نہ نکل سکا اور اسے انتظار کرنا پڑا۔ فیراپونتوف کی بیوی اور بچے بھی ایک چھکڑے میں بیٹھے تھے اور سوچ رہے تھے کہ باہر نکلنا کب ممکن ہو گا۔

رات آ گئی تھی اور آسمان پر ستارے نمودار ہونے لگے تھے۔ فلک پر دھوئیں کی جو چادر لپٹی ہوئی تھی، کبھی کبھار اس میں نیا چاند چمکنے لگتا تھا۔ دریائے دنیپر کی جانب جو ڈھلوان جاتی ہے، اس پر آل پاچ کی گاڑی اور ہوٹل والے کی بیوی کے چھکڑے کو، جو فوجی جوانوں کی قطاروں اور دوسری گاڑیوں کے بیچوں بیچ محو حرکت تھے، رکنا پڑتا۔ چوک سے کچھ دور، جہاں ٹریفک بالکل جام ہو گیا تھا، ایک بغلی گلی میں ایک مکان اور چند دکانیں جل رہی تھیں۔ آگ اب بجھنے کے قریب تھی۔ ایک موقع پر شعلے بالکل ناپید ہو گئے اور سیاہ دھوئیں کے مرغولے سر اٹھانے لگے لیکن شعلے دوبارہ بھڑک اٹھے اور انھوں نے ان لوگوں کے، جو چوک میں ہجوم کیے ہوئے تھے، چہرے عجیب و غریب واضح انداز سے روشن کر دیے۔ آگ کے سامنے سیاہ شکلیں تیزی سے آگے پیچھے حرکت کر رہی تھیں اور شعلوں کی پیہم چیخ چیخ سے مادر اباتوں اور چیخوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ آل پاچ نے جب دیکھا کہ اس کی ٹم ٹم کو آگے چلنے میں ابھی کچھ وقت لگے گا، وہ نیچے اتر آیا اور آگ کا منظر دیکھنے واپس بغلی گلی میں چلا گیا۔ جو عمارتیں جل رہی تھیں، ان کے پڑوس میں فوجی جوان مسلسل آگے پیچھے بھاگے پھر رہے تھے۔ اس نے دیکھا کہ دو فوجی اور ایک دوسرا شخص، جس نے موٹا اور کھردرا اونی کوٹ پہن رکھا تھا، جلتے ہوئے شہتیر گھسیٹ کر گلی کے پار دوسرے صحن میں لے جا رہے ہیں جب کہ دوسرے خشک گھاس کے گٹھے اٹھائے چل رہے ہیں۔

آل پاچ ان لوگوں کی، جو خاصے اونچے مودی خانے کے سامنے ایستادہ تھے، بے پناہ بھیڑ میں گھس گیا۔ گودام دھڑادھڑ جل رہا تھا۔ تمام دیواریں شعلوں کی لپیٹ میں آ چکی تھیں۔ عقبی دیوار زمین بوس ہو چکی تھی۔ شہتیروں کی چھت نیچے گر رہی تھی اور کڑیوں کو آگ لگ چکی تھی۔ نظر آ رہا تھا کہ ہجوم اس لمحے کا، جب چھت نیچے گر پڑے گی، انتظار کر رہا ہے۔ آل پاچ کی نظریں بھی وہیں جمی ہوئی تھیں۔

''آل پاچ!'' اچانک ایک جانی پہچانی آواز نے بوڑھے کو پکارا۔

''یور ایکسی لینسی، مائی ڈیئر سر، آپ!'' آل پاچ نے فوراً اپنے نوجوان آقا کی آواز پہچانتے ہوئے جواب دیا۔

پرنس آندرے اوورکوٹ پہنے سیاہ گھوڑے پر سوار تھا اور ہجوم کے عقب سے ٹکٹکی باندھے آل پاچ کو دیکھ رہا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''یوئر... یوئر ایکسی لینسی،'' آل پاچ نے ہکلاتے ہوئے کہا اور سسکیاں بھرنے لگا۔ ''یوئر... یوئر... واقعی قصہ ختم ہو گیا ہے؟... آپ کے والد محترم...''

''تم یہاں کیا کر رہے ہو؟'' پرنس آندرے نے دوبارہ پوچھا۔

اسی لمحے شعلے دوبارہ بھڑک اٹھے اور آل پاچ کو تیز روشنی میں اپنے نوجوان آقا کا زرد اور نڈھال چہرہ نظر آیا۔ اس نے اسے بتایا کہ اسے شہر بھیجا گیا تھا لیکن اب اسے وہاں سے نکلنے میں دقت پیش آ رہی ہے۔

''یوئر ایکسی لینسی، واقعی ہمارے لیے سب کچھ ختم ہو گیا ہے؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

پرنس آندرے نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے جیب سے نوٹ بک نکالی، ورق پھاڑا، اپنا گھٹنا اوپر اٹھایا اور پنسل سے لکھنے لگا۔ اس نے اپنی ہمشیرہ کو لکھا:

''سمولنسک مغلوب ہو گیا ہے۔ ایک ہفتے کے اندر اندر بالڈ ہلز پر دشمن کا قبضہ ہو جائے گا۔ فوراً ماسکو چلے جاؤ۔ جونہی روانگی ہو، مجھے اطلاع بھیج دینا۔ خصوصی پیغام رساں اسوایاژ[8] روانہ کر دینا۔''

جب وہ یہ رقعہ لکھ اور اسے آل پاچ کے حوالے کر چکا، اس نے اسے بتایا کہ پرنس، پرنسس، اس کے بیٹے اور اس کے ٹیوٹر کی روانگی کے کیا انتظامات کرنا ہیں اور خود اسے کیسے اور کہاں فوراً اطلاع پہنچانا ہے۔ پیشتر اس کے کہ اسے اپنی بات ختم کرنے کا موقع ملتا، ایک سٹاف افسر، ایک ایجوٹنٹ کی معیت میں سرپٹ گھوڑا دوڑاتا اس کے پاس پہنچا۔

''تم کرنل ہو؟'' سٹاف افسر نے جرمن لہجے اور ایک ایسی آواز میں، جسے پرنس آندرے پہچانتا تھا، چلا کر کہا: ''تمھاری موجودگی میں مکانوں کو آگ لگائی جا رہی ہے اور تم آرام سے کھڑے ہو! کیا مطلب ہے تمھارا؟ تمھاری جواب طلبی ہو گی!'' برگ نے، جو اب سپاہ اول کے پیادہ دستوں کے میسرے کے کمانڈر کے چیف آف سٹاف کا نائب تھا، چلا کر کہا۔ (برگ کا خیال تھا کہ جس عہدے پر وہ اب فائز ہے، وہ خاصا اونچا اور انتہائی قابل اطمینان ہے۔)

پرنس آندرے نے اس پر سرسری نگاہ ڈالی اور اسے جواب دیے بغیر آل پاچ کو ہدایات دیتا رہا۔

''انھیں بتانا کہ میں دس تاریخ تک جواب کا انتظار کروں گا اور اگر اس تاریخ تک مجھے اطلاع نہ ملی کہ وہ سب لوگ جا چکے ہیں، تو مجھے مجبوراً سب کچھ چھوڑنا اور خود بالڈ ہلز آنا پڑے گا۔''

''پرنس، میں نے جو کچھ کہا، اس کی واحد وجہ یہ تھی،'' برگ نے پرنس آندرے کو پہچانتے ہوئے کہا، ''کہ مجھے احکام کی تعمیل کرنا ہوتی ہے... اور جہاں تک احکام کی تعمیل کا تعلق ہے، میں کسی قسم کی کوتاہی قطعاً روا نہیں رکھتا... میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں،'' اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

جو عمارت جل رہی تھی، اس میں دھماکہ ہوا۔ ایک لحظے کے لیے آگ ماند پڑ گئی اور چھت کے زیریں حصے سے سیاہ دھوئیں کے مرغولے اوپر اٹھنے لگے۔ ایک اور زبردست دھماکہ ہوا کیونکہ کوئی خاصی بھاری بھرکم چیز نیچے گر

پڑی تھی۔

''اوای ی ی!'' مودی خانے کی چھت گرنے سے جو زبردست دھما کہ ہوا تھا، اس کے جواب میں ہجوم نے چیخ بلند کی۔ چھت گرنے سے اناج آگ کی لپیٹ میں آ گیا اور چاروں اطراف ایسی خوشبو، جو کیک پکانے کے دوران میں محسوس کی جاتی ہے، پھیل گئی۔ شعلے ایک بار پھر بھڑکنے لگے اور ان کے ارد گرد جو لوگ کھڑے تھے، ان کے پر جوش، پر مسرت اور آشفتہ چہرے روشن ہو گئے۔

موٹے کھردرے اونی کوٹ میں ملبوس شخص نے اپنے بازو لہرائے اور چلانے لگا:

''واہ واہ! مرحبا! دوستو، مزہ آ گیا! اب صحیح معنوں میں بھڑکی ہے!''

''وہ خود مالک ہے،'' متعدد آوازیں کہہ رہی تھیں۔

''چنانچہ جو کچھ میں نے تمھیں بتایا ہے، وہ ان تک پہنچا دینا،'' پرنس آندرے نے آل پاچ سے کہا اور برگ سے، جو گم صم اس کے قریب کھڑا تھا، ایک لفظ کہے بغیر اس نے گھوڑے کو مہمیز لگایا اور بغلی گلی پار کرنے لگا۔

5

سمولنسک سے افواج پسپا ہوتی رہیں۔ دشمن ان کا تعاقب کر رہا تھا۔ دس اگست کو وہ رجمنٹ، جس کی کمان پرنس آندرے کے ہاتھ میں تھی، جرنیلی سڑک پر گزرتے گزرتے اس خیابان سے، جو بالڈ ہلز کو جاتی تھی، آگے نکل گئی۔ تین ہفتوں سے اوپر گزر گئے لیکن پانی کی ایک بوند تک نہیں برسی تھی اور گرمی کا یہ عالم کہ ہر متنفس الامان الامان پکار اٹھا۔ ہر روز آسمان پر روئی کی طرح سفید بادلوں کے گالے تیرتے دکھائی دیتے، وہ کبھی کبھار سورج کو اپنی اوٹ میں لے لیتے لیکن دن ڈھلے مطلع دوبارہ صاف ہو جاتا اور آفتاب سرخی مائل بادامی دھند میں غروب ہو جاتا۔ صرف رات کو خوب اوس پڑتی اور یوں دھرتی کو نئی تازگی مل جاتی۔ کھیتوں میں گندم کی جو بچی کھچی فصل کھڑی تھی۔ وہ دھوپ میں چرمرا گئی تھی اور اس کی بالیاں نیچے گر پڑی تھیں۔ دلدلیں خشک ہو گئیں۔ بھوک نے مویشیوں کا برا حال کر دیا اور وہ ہر وقت بھیں بھیں کرتے رہتے، کیونکہ تمازت نے چراگاہوں کا ستیاناس کر دیا تھا اور ان کے چرنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ صرف رات کو اور جنگلوں میں (اور ان میں بھی صرف اس وقت تک جب تک شبنم خشک نہیں ہوتی تھی) خنکی ہوتی تھی، لیکن سڑکوں اور جرنیلی شاہراہ پر، جس پر فوجی جوان سفر کر رہے تھے، رات کو بھی ٹھنڈ نہیں پڑتی تھی۔ یہی نہیں ان کا جو حصہ جنگل میں سے گزرتا تھا، وہ بھی گرم رہتا تھا۔ راستوں پر چھ چھ انچ گہری ڈھول تھی اور اس پر اوس کا قطعاً کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ جونہی اجالا ہوتا، فوجی جوان اپنی راہ چل پڑتے۔ توپ خانے اور بار برداری کے چھکڑوں کے پہیے آدھوں آدھ گرد میں دھنسے ہوتے اور وہ کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر آگے بڑھتے رہتے۔ پیادہ فوج کے جوان نرم، گرم دھول میں، جو کبھی رات کو بھی خنک نہ ہوتی، ٹخنوں ٹخنوں دھنسنے لگتے، ان کے حلق خشک ہونا شروع ہو جاتے اور انھیں اپنا دم گھٹتا محسوس ہونے لگتا۔ یہ ریتلی دھول، جسے گاڑیوں کے پہیوں اور جانوروں اور انسانوں

کے پاؤں نے رگڑ رگڑ کر میدہ کر دیا تھا، بادلوں کی شکل میں فوجیوں کے سروں کے اوپر اڑنے لگتی اور انسانوں اور جانوروں کی، جب وہ سڑکوں پر رواں دواں ہوتے، آنکھوں، کانوں، بالوں، نتھنوں اور سب سے زیادہ تکلیف دہ انداز سے ان کے گلوں اور سینوں میں گھسنے لگتی۔ جوں جوں سورج بلند ہوتا جاتا، توں توں گرد کا بادل اوپر اٹھتا جاتا اور انسان ان باریک اور گرم ذرات کی چادر میں ننگی آنکھ سے آفتاب کا، جو بے ابر آسمان پر بھاری بھرکم انتہائی سرخ گولے کی مانند نظر آتا، مشاہدہ کر سکتا تھا۔ ہوا بند، فضا ساکن اور غیر متحرک۔ ایسے میں سانس لینا بھی دشوار ہو جاتا۔ انسان اپنے مونہوں اور ناکوں پر رومال لپیٹ لیتے لیکن ان کا سفر جاری رہتا۔ جب وہ کسی گاؤں میں داخل ہوتے، کنوؤں پر بھیڑ لگ جاتی، پانی پر جھگڑے ہوتے اور وہ گاد تک پی جاتے۔

پرنس آندرے رجمنٹ کا کمانڈر تھا۔ اسے اس کی تنظیم، جوانوں کی فلاح و بہبود اور احکام وصول کرنے اور ان پر عمل کرانے کی ضرورت کا شدت سے احساس رہتا تھا۔ سمولنسک کی آتش زدگی اور وہاں سے شہریوں کا انخلاء اس کی زندگی کا عصر آفریں واقعہ بن گیا۔ دشمن کے خلاف شدید برہمی کے نئے جذبے نے اسے اس کا ذاتی غم بھلا دیا۔ اسے اپنی رجمنٹ کے امور سے دلی لگاؤ ہو گیا تھا اور وہ اپنے جوانوں اور افسروں کا بڑا خیال رکھنے لگا تھا۔ رجمنٹ میں وہ اسے "ہمارا پرنس" کہتے تھے، اس پر فخر اور اس سے محبت کرتے تھے، لیکن وہ اپنی رجمنٹ کے صرف ان لوگوں سے، جو اس کے لیے بالکل نئے تھے، جو مختلف دنیا سے تعلق رکھتے تھے اور جنھیں اس کے ماضی کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ تموخن اور اس جیسے۔۔۔ شرافت اور شفقت کا برتاؤ کرتا تھا۔ جونہی اس کی مڈھ بھیڑ کسی پرانے شناسا یا سٹاف افسر سے ہوتی، اسے آناً فاناً طیش آ جاتا اور اس کا انداز منتقمانہ، تمسخرانہ اور پر از حقارت ہو جاتا۔ وہ ہر اس چیز سے، جو اسے ماضی کی یاد دلاتی تھی، خار کھاتا تھا۔ چنانچہ جہاں تک اس سابقہ دنیا سے اس کے تعلقات کا ذکر ہے، وہ محض اپنا فرض نبھانے تک محدود رہتا تھا اور کوشش کرتا تھا کہ کسی کے ساتھ ناانصافی نہ ہونے پائے۔

سچی بات یہ ہے کہ پرنس آندرے قنوطی ہو گیا تھا اور اب وہ ہر چیز کا صرف افسردہ اور تاریک پہلو دیکھنے کا عادی ہوتا جا رہا تھا۔ خصوصاً جب چھ اگست کو سمولنسک سے دستبرداری اختیار کی گئی (اس کا خیال تھا کہ شہر کا دفاع کیا جا سکتا تھا اور کیا جانا چاہیے تھا) اور جب اس کے باپ کو، جیسا کہ اس نے فرض کر لیا تھا، اپنے محبوب بالڈ ہلز، جسے اس نے تعمیر اور آباد کیا تھا اور جسے اب تاخت و تاراج ہونا تھا، چھوڑ کر ماسکو فرار ہونا پڑا، اس کی قنوطیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا۔ تاہم پرنس آندرے کے پاس اپنے مرتبے کے طفیل سوچنے اور توجہ دینے کے لیے عمومی نوعیت کے مسائل سے بالکل جدا ایک اور چیز تھی اور یہ چیز اس کی رجمنٹ تھی۔ دس اگست کو وہ کالم، جس کا اس کی رجمنٹ جز تھی، بالڈ ہلز کے برابر پہنچ گیا۔ دو روز قبل اسے اطلاع ملی تھی کہ اس کا باپ، بیٹا اور ہمشیرہ ماسکو روانہ ہو چکے ہیں۔ اگرچہ پرنس آندرے کو بالڈ ہلز میں کوئی کام نہیں تھا لیکن اپنے ذاتی مصائب و آلام کو مزید سنگین بنانے کی جو مخصوص خواہش اس کے دل میں مچلتی رہتی تھی، اس کے زیر اثر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ وہاں ضرور جائے گا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کے گھوڑے پر زین ڈال دی جائے۔ اس کی رجمنٹ آگے چلتی رہی اور وہ اپنے باپ کی جاگیر کی، جہاں وہ پیدا ہوا

تھا اور جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا تھا، طرف چل پڑا۔ جوہڑ کے نزدیک، جہاں ماضی قریب میں درجنوں دیہاتی عورتیں موگریوں سے کپڑوں کے تھان پیٹ پیٹ کر دھوتے یا انھیں نچوڑتے آپس میں گپ شپ کر رہی ہوتی تھیں، گزرتے اسے فرد واحد بھی نظر نہ آیا۔ دھوبی پٹڑا ٹوٹ چکا تھا اور جوہڑ کے درمیان میں تیر رہا تھا، اس کا نصب حصہ پانی میں ڈوب چکا تھا۔ وہ گیٹ کیپر کی کوٹھری کے قریب پہنچا۔ سنگی پھاٹک اور کوٹھری، جس کا دروازہ کھلا تھا، دونوں بے آباد تھے۔ باغات کی روشوں پر گھاس اگنے لگی تھی اور انگلش پارک میں گھوڑے اور بچھیرے آوارہ پھر رہے تھے۔ گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے وہ گرین ہاؤس پہنچا۔ دیواروں کے شیشے جگہ جگہ سے ٹوٹ چکے تھے۔ بعض گملوں کے پودے اوندھے پڑے تھے اور باقی سوکھ چکے تھے۔ اس نے مالی کو، جس کا نام تارس تھا، آواز دی، لیکن اسے کوئی جواب نہ ملا۔ گرین ہاؤس کا چکر کاٹ کر وہ باغ میں داخل ہوا۔ اس کی منقش چوبی دیوار شکستہ ہو چکی تھی اور آلوچوں کی ٹہنیاں پھلوں سمیت توڑی جا چکی تھیں۔ ایک بوڑھا کسان، جسے پرنس آندرے بچپن سے جانتا تھا، باغ کی سبز نشست پر بیٹھا تھا اور کسی درخت کی چھال سے جوتا بنا رہا تھا۔

وہ بہرا تھا اور اسے پرنس آندرے کی آمد کی کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ وہ معمر پرنس کے پسندیدہ بنچ پر بیٹھا تھا اور اس کے قریب مگنولیا (Magnolia) کی مرجھائی ہوئی شاخوں سے چھال کے لچھے لٹک رہے تھے۔

پرنس آندرے مکان کی جانب چل پڑا۔ پرانے باغ میں لیموں کے متعدد درخت کٹے پڑے تھے اور مکان کے قریب گلاب کی جھاڑیوں میں ایک چتکبری گھوڑی اور اس کا بچھیرا آوارہ پھر رہے تھے۔ دریچوں کے پٹ بند تھے۔ نچلی منزل کی صرف ایک کھڑکی کھلی تھی۔ ایک نوعمر غلام لڑکا پرنس آندرے کو دیکھ کر مکان کے اندر بھاگ گیا۔

آل پاچ اپنے گھر والوں کو وہاں سے رخصت کر چکا تھا اور اب وہ اکیلا بالڈ ہلز میں تھا۔ وہ اندر بیٹھا "سیرالاولیا"* پڑھ رہا تھا۔ جب اس نے سنا کہ پرنس آندرے آیا ہے، اس نے ناک پر چشمہ چڑھایا اور وہ کوٹ کے بٹن بند کرتے باہر آیا۔ وہ پرنس آندرے کی طرف لپکا اور ایک لفظ کہے بغیر رونے اور اپنے نوجوان آقا کا گھٹنا چومنے لگا۔

پھر وہ اپنی کمزوری پر تلملاتا ایک طرف ہٹ گیا اور اسے صورت حال بتانے لگا۔ تمام قیمتی اور قابل قدر اشیا باگوچارافو پہنچا دی گئی ہیں۔ آٹھ سو بشل[9] غلہ بھی چھکڑوں میں وہاں بھیج دیا گیا ہے۔ مویشیوں کے چارے اور غلے کی بہاریہ فصل، جو آل پاچ کے مطابق اس سال بے حد شاندار تھی، فوجیوں کے قبضے میں چلی گئی تھی اور انھوں نے اسے پکنے سے پہلے ہی کاٹ دیا تھا۔ کسانوں کا برا حال ہے۔ کچھ باگوچارافو چلے گئے ہیں۔ صرف چند ایک ابھی تک وہیں مقیم ہیں۔

اس کی بات کے مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر پرنس آندرے نے پوچھا کہ اس کا باپ اور ہمشیرہ کب روانہ ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ ماسکو کب گئے تھے۔

---

* سیرالاولیا="Lives of the Saints"

آل پاچ نے فرض کر لیا کہ سوال کا اشارہ ان کی باگوچارا فورواگی کی طرف ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ سات کو روانہ ہوئے تھے اور وہ ایک بار پھر جاگیر کے معاملات بالتفصیل بیان کرنے اور ہدایت مانگنے لگا۔

''جی جانے دوں اور افسروں سے رسید حاصل کر لوں؟'' اس نے پوچھا۔ ''اب بھی ہمارے پاس تقریباً چھ سو کوارٹر[10] بچے پڑے ہیں۔''

''میں اس سے کیا کہوں؟'' پرنس آندرے شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی نگاہیں بوڑھے آدمی کے گنجے سر پر، جو دھوپ میں چمک رہا تھا، جمی ہوئی تھیں۔ آل پاچ کے چہرے پر جو تاثرات تھے، ان سے اسے یہ اندازہ ہوا کہ بڑے میاں خود بھی سمجھتے ہیں کہ ان کا سوال بے محل ہے اور انھوں نے یہ محض اپنے دکھ کی شدت کم کرنے کے لیے پوچھا ہے۔

''ہاں، جانے دو،'' اس نے جواب دیا۔

''یور ایکسی لینسی، آپ کو باغ میں شاید کچھ گڑبڑ نظر آئی ہو،'' آل پاچ نے کہا۔ ''حالات ہی ایسے تھے کہ اسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ یہاں تین رجمنٹیں آچکی اور رات قیام کر چکی ہیں — زیادہ تر ڈریگون[11] تھے۔ میں نے شکایت درج کرانے کے لیے ان کے کمانڈنگ افسر کا نام اور عہدہ لکھ لیا تھا۔''

''خیر، اب تمھارا کیا ارادہ ہے؟ اگر دشمن نے اس جگہ پر قبضہ کر لیا، پھر بھی تم یہیں رہو گے؟'' پرنس آندرے نے اس سے پوچھا۔

آل پاچ نے اپنا رخ پرنس آندرے کی طرف کیا، اس کے چہرے پر نظر ڈالی اور پھر اچانک اس نے اپنا بازو بلند کیا اور سنجیدگی سے اوپر کی جانب اشارہ کرنے لگا۔

''وہ میرا رکھوالا ہے۔ وہی ہوگا جو وہ چاہے گا،'' اس نے باآواز بلند کہا۔

کسانوں اور خانگی غلاموں کا ایک گروہ چراگاہ میں سے گزرتا ادھر آنکلا۔ وہ جب پرنس آندرے کے قریب آئے، انھوں نے (احتراماً) اپنی ٹوپیاں اتار دیں۔

''اچھا، خدا حافظ!'' پرنس آندرے نے آل پاچ کے اوپر جھکتے ہوئے کہا۔ ''تم بھی یہاں سے چلے جاؤ، جو کچھ لے جا سکتے ہو، لے جاؤ اور کسانوں کو بتا دو کہ وہ ریازان کی یا ماسکو کے قریب کی جاگیر پر چلے جائیں۔''

آل پاچ پرنس آندرے کی ٹانگ سے چمٹ گیا اور اس کی سسکیاں نکلنے لگیں۔ پرنس آندرے نے نہایت نرمی سے اپنی ٹانگ چھڑائی، گھوڑے کو مہمیز لگایا اور اسے سرپٹ دوڑانے لگا۔

وہ ایک بار پھر بوڑھے آدمی کے قریب سے گزرا۔ بوڑھے کا چہرہ ہر قسم کے جذبات سے عاری تھا اور اس کی حالت اس مکھی کی تھی جو کسی عزیز کے، جس کا انتقال ہو چکا ہو، چہرے پر بیٹھی ہو۔ وہ ابھی تک وہیں بیٹھا تھا اور جس قالب پر اپنے چھال کے جوتے کی بنائی کر رہا تھا، اس پر کھٹ کھٹ کیے جا رہا تھا۔ دو ننھی منی بچیاں گرین ہاؤس سے بھاگی آرہی تھیں۔ ان کی سکرٹیں آلوچوں سے، جو انھوں نے وہاں سے توڑے تھے، بھری ہوئی تھیں۔ وہ بھاگتی

دوڑتی تقریباً پرنس آندرے سے ٹکرا گئیں۔ دونوں میں سے بڑی نے جب چھوٹے آقا کو دیکھا، اس کا رنگ فق ہوگیا۔ اس نے چھوٹی کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ برچ کے درخت کے پیچھے چھپ گئی۔ انھوں نے اتنا بھی نہ کیا کہ ان کے جو آلوچے گر گئے تھے، انھیں اٹھانے رک جاتیں۔

پرنس آندرے سٹپٹا گیا۔ وہ برق رفتاری سے دوسری طرف گھوم گیا۔ وہ بچیوں پر قطعاً یہ ظاہر نہیں ہونے دینا چاہتا تھا کہ انھیں دیکھ لیا گیا ہے۔ اسے ننھی منی ذری سہمی پیاری پیاری لڑکی پر ترس آگیا۔ وہ اسے دیکھنے سے گھبرا رہا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس خواہش پر قابو نہیں پا سکتا۔ یوں جب اسے دوسری انسانی دلچسپیوں کے، جن کا اس کی اپنی دلچسپیوں سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور جن کے جائز ہونے میں کوئی کلام نہیں تھا، وجود سے آگاہی ہوئی، سکون واطمینان کا ایک نیا جذبہ اسے سرشار کر گیا۔ صریحاً ان ننھی منی بچیوں کو ایک چیز کی شدید آرزو تھی— وہ ان سبز آلوچوں کو لے جانا اور انھیں کھانا چاہتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ان کی یہ خواہش بھی تھی کہ کوئی انھیں دیکھ اور پکڑ نہ لے— اور ان کی طرح پرنس آندرے بھی اس بات کا متمنی تھا کہ وہ بھی اپنی مہم میں سرخرو ہو۔ وہ ایک بار پھر ان کی طرف دیکھے بغیر نہ رہ سکا۔ ادھر وہ تھیں کہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اب خطرہ ٹل گیا ہے، اپنی سکرٹیں اوپر اٹھائے، اپنی مہین تیکھی آوازوں میں ایک دوسرے سے کچھ کہتے اور کدکڑے لگاتے اپنی پناہ گاہ سے باہر نکل آئیں اور ان کے پتلے پتلے برہنہ اور دھوپ میں جھلسے پاؤں جتنا تیز دوڑ سکتے تھے، وہ شاداں و فرحاں چراگاہ کی گھاس پر بھاگنے لگیں۔

گرد آلود جرنیلی سڑک سے، جس پر فوجی جوان سفر کر رہے تھے، ہٹ کر سواری کرنے سے پرنس آندرے قدرے تازہ دم ہوگیا لیکن ہالڈ ہلز سے کچھ ہی دور وہ دوبارہ جرنیلی سڑک پر پہنچ گیا۔ اس کی رجمنٹ نے ڈیم (بند) کے قریب عارضی پڑاؤ ڈال لیا تھا۔ وہ وہاں اس سے آملا۔ دوپہر کا ایک بج چکا تھا۔ گرد و غبار میں سورج سرخ گولے کی مانند نظر آرہا تھا۔ وہ سیاہ کوٹ میں ملبوس تھا اور آفتاب کی تمازت اس کے جسم کو ناقابل برداشت انداز سے جلا اور بھون رہی تھی۔ فوجی آرام کر رہے تھے اور گرد و غبار کا بادل ہمیشہ کی طرح ان کے سروں کے اوپر بے حس و حرکت معلق تھا۔ ہوا بند تھی۔ پتا تک نہیں ہل رہا تھا۔ جب پرنس آندرے بند کے برابر گزر رہا تھا، جھیل کی تازہ، سوندھی خوشبو اس کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ پانی میں، خواہ یہ کتنا ہی گدلا ہو، گھس جائے۔ اس نے پانی کے ذخیرے پر نظر ڈالی۔ وہاں سے چیخنے چلانے اور ہنسنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ ننھی منی جھیل کی سطح، جس پر سبز کیچڑ کی تہہ جمی ہوئی تھی، واضح طور پر ایک فٹ بلند ہو چکی تھی اور اس کا پانی بند کے اوپر بہہ رہا تھا کیونکہ یہ برہنہ گورے انسانی اجسام سے، جن کے ہاتھ، چہرے اور گردنیں اینٹوں کی طرح سرخ تھے، اور جو پانی کو ادھر ادھر اچھال رہے تھے، بھری پڑی تھی۔ یہ تمام چیختے چلاتے، ہنستے کھانستے انسانی اجسام اس گدلے جوہڑ میں اس کارپ (مچھلی) کی طرح، جسے کسی تنگ آبی برتن میں بند کر دیا گیا ہو، ادھر ادھر ٹکراتے اور ٹھوکریں کھاتے پھر رہے تھے۔ دھپ دھپ کرتے اور کیچڑ کے چھینٹے اڑاتے اس ہجوم میں قہقہے اور چہچہے گونج رہے تھے اور یہی چیز ان کی حالت

حیرت انگیز بنا رہی تھی۔

تیسری کمپنی کے ایک نوجوان سپاہی نے، جس کے بال سرخ تھے اور جس نے اپنی پنڈلی کے گرد سرخ پٹی باندھ رکھی تھی (پرنس آندرے اسے جانتا تھا)، اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا، دوڑ کی اچھی ابتدا کرنے کے لیے وہ پیچھے ہٹا اور اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ ایک نان کمشنڈ افسر، جس کا بدن دھوپ میں جھلسا ہوا تھا اور جس کے بال اور کپڑے، ہمیشہ بے ترتیب نظر آتے تھے، پانی میں، جو اس کی کمر تک پہنچتا تھا، کھڑا ہو گیا اور اپنے ہاتھوں سے، جو سیاہ ہو رہے تھے، اپنے سر پر پانی ڈالنے لگا۔ وہ مطمئن تھا۔ اس کا کسرتی جسم جھول رہا اور خوشی سے اس کے نتھنے پھول رہے تھے۔ انسانوں کے ایک دوسرے کو دھپ دھپ تھپکیاں لگانے، چیخنے اور ہانپنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

کنارے پر، بند پر اور جوہڑ کے اندر، ہر جگہ گورے، صحت مند، گٹھے ہوئے انسانی اجسام تھے۔ کمشنڈ افسر تموخن، جس کی ننھی سی سرخ ناک تھی، بند پر کھڑا اپنے جسم پر تولیہ رگڑ رہا تھا۔ وہ پرنس کو دیکھ کر محجوب سا ہو گیا تاہم اس نے اس سے بات کرنے کا تہیہ کر لیا۔

''یور ایکسی لینسی، خاصا مزہ آ رہا ہے!'' اس نے کہا۔ ''آپ نہانا پسند فرمائیں گے؟''

''بہت گدلا ہے!'' پرنس نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

''ہم پلک جھپکنے میں اسے خالی کر دیں گے،'' تموخن نے کہا اور کپڑے پہنے بغیر جوانوں کو پانی سے باہر نکالنے بھاگا۔

''پرنس نہانا چاہتے ہیں۔''

''کون پرنس؟ ہمارے؟'' مختلف آوازیں سنائی دیں اور جوانوں نے اس کے لیے جوہڑ خالی کرنے میں اتنی تیزی دکھائی کہ پرنس آندرے کو انھیں منع کرنے میں بڑی مشکل پیش آئی۔

اس نے سوچا کہ اس کے لیے بہتر یہی رہے گا کہ وہ سائبان کے نیچے اپنے بدن پر پانی انڈیل لے۔

''گوشت، اجسام، توپوں کا ایندھن!'' اس نے اپنے برہنہ جسم کو دیکھتے سوچا اور اسے جھرجھری آ گئی۔ اس پر کپکپاہٹ سردی سے نہیں بلکہ تفاخر کے اس احساس سے، جو گدلے پانی میں چھینٹے اڑاتے ننگے اجسام کو دیکھ کر اس کے دل میں پیدا ہوا تھا اور جو خود اس کی اپنی سمجھ سے ماورا تھا، طاری ہوئی تھی۔

❧

سات اگست کی شام کو پرنس باگ راتیاں نے سمولنسک شاہراہ پر واقع گاؤں میخائیلووکا میں اپنے پڑاؤ سے مندرجہ ذیل خط تحریر کیا:

ڈیئر کاؤنٹ الیکسی آندریوچ (وہ خط آراک چیف کے نام لکھ رہا تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ اسے امپراطور بھی

پڑھے گا، چنانچہ اس نے ایک ایک لفظ خوب جانچا پرکھا اور پھر تحریر کیا۔)

میرا خیال ہے کہ منسٹر — (جیسا کہ وہ بار کلے دَتولی کو کہا کرتا تھا) — آپ کو مطلع کر چکا ہے کہ سمولنسک دشمن کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ تکلیف دہ ہے، افسوس ناک ہے اور ساری فوج کو مایوسی ہوئی ہے کہ اس انتہائی اہم مقام سے یوں من مانے طریقے سے دستبرداری اختیار کر لی گئی ہے۔ میں نے زبانی بھی اور بعد میں تحریری طور پر بھی، پرزور التجائیں کیں لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ میں اپنی عزت کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ نپولین زندگی بھر اس قسم کے مخمصے میں گرفتار نہیں ہوا ہوگا۔ وہ اپنی نصف فوج بھی کٹوا دیتا، تب بھی سمولنسک پر قبضہ نہ کر سکتا۔ ہماری افواج جس طرح لڑی ہیں اور لڑ رہی ہیں، پہلے کبھی نہیں لڑی ہوں گی۔ میرے پاس پندرہ ہزار کی نفری تھی اور میں نے 35 گھنٹے تک دشمن کو اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا اور اسے مار بھگایا۔ لیکن خود وہ چودہ گھنٹے کے لیے بھی ڈٹے رہنے کے لیے تیار نہ ہوا۔ یہ ہماری سپاہ کی تذلیل ہے اور اس کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکا۔ اور جہاں تک اس کا تعلق ہے، میرا خیال ہے کہ اسے اب زندہ نہیں رہنا چاہیے (اس کے لیے یہ شرم سے ڈوب مرنے کا مقام ہے)۔ اگر وہ اطلاع بھیجے کہ ہمیں بھاری جانی نقصان اٹھانا پڑا تو یہ بات درست نہیں ہوگی۔ شاید چار ہزار کے لگ بھگ (جوان کام آئے)، ان سے زیادہ بالکل نہیں، بلکہ اتنے بھی نہیں۔ لیکن اگر تعداد دس ہزار بھی ہوتی، پھر کیا، یہ جنگ ہے۔ اس کے برعکس دشمن کی جو نفری کھیت رہی، اسے شمار نہیں کیا جا سکتا...

اگر ہم مزید دو دن بھی ڈٹے رہتے، اسے کتنا نقصان اٹھانا پڑتا؟ بہر حال فرانسیسیوں کو اپنی مرضی سے پیچھے ہٹنا پڑتا کیونکہ ان کے پاس اپنے جوانوں اور گھوڑوں کے لیے پانی کی بوند تک نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ پسپائی اختیار نہیں کرے گا لیکن اس نے اچانک مجھے پیغام بھیجا کہ وہ اسی رات پیچھے ہٹ رہا ہے۔ اس طریقے سے جنگ لڑنا ناممکن ہے، اس طرح تو ہم بہت جلد دشمن کو ماسکو پہنچ جانے دیں گے...

افواہ گردش کر رہی ہے کہ آپ صلح کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ خدا نہ کرے کہ آپ کو صلح کے بارے میں سوچنا پڑے۔ اتنی قربانیاں دینے اور اس قسم کی مجنونانہ پسپائیاں اختیار کرنے کے بعد صلح کا ڈول ڈالنا! اس طرح تو آپ سارے روس کو اپنا مخالف بنا لیں گے اور ہم سب کو روسی وردی پہنتے عار آئے گی۔ اگر نوبت یہاں تک پہنچ ہی گئی ہے، پھر بھی جب تک روس میں دم خم ہے اور جب تک ایسے افراد، جو کھڑا ہونے کی سکت رکھتے ہیں، موجود ہیں، ہمیں لڑتے رہنا چاہیے...

کمان ایک آدمی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے، دو کے نہیں۔ آپ کا منسٹر وزارت کا کام تو چلا سکتا ہے لیکن جرنیل کی حیثیت سے وہ بد ہی نہیں، بدتریں ہے، اس کے باوجود ساری مادر وطن کا مقدر اس کے ہاتھوں میں دے دیا گیا ہے!... میں نے اپنی تحریر میں جس بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے لیے معذرت خواہ

ہوں، لیکن غصے اور جھلاہٹ سے میرا دماغ ماؤف ہو چلا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ جو شخص صلح نامہ طے کرنے اور فوج کی کمان منسٹر کے سپرد کرنے کا مشورہ دیتا ہے، اسے فرماں روائے مملکت سے کوئی لگاؤ نہیں اور وہ ہم سب کی تباہی و بربادی کے درپے ہے۔ چنانچہ میں صاف گوئی سے کام لے رہا ہوں اور آپ سے تحریراً گزارش کرتا ہوں کہ ملیشیا کو محاذ پر پہنچنے کا حکم دے دیا جائے کیونکہ منسٹر ہمارے ان مہمانوں کو انتہائی ماہرانہ انداز سے ماسکو لے جا رہا ہے۔ ساری فوج شاہی ایڈی کانگ وول ٹسوگن کو زبردست شک وشبے کی نظر سے دیکھتی ہے۔ اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ہم سے زیادہ نپولین کا وفادار ہے اور وہی منسٹر کو الٹے سیدھے مشورے دیتا رہتا ہے۔ میں اس کے ساتھ محض شائستگی اور خوش خلقی سے ہی پیش نہیں آتا بلکہ ادنیٰ سپاہی کی طرح اس کی اطاعت بھی کرتا ہوں حالانکہ میں اس سے سینئر ہوں۔ بات تکلیف دہ ضرور ہے لیکن مجھے چونکہ اپنے امپراطور اور محسن سے محبت ہے، میں نے سرِ تسلیم خم کر دیا ہے۔ مجھے دکھ صرف اس بات کا ہے کہ ہمارے فرماں روا نے ہماری دلیر اور شجاع سپاہ اس قسم کے شخص کی تحویل میں دے دی ہے۔ غور فرمائیں کہ پسپائی کے دوران میں ہمیں محض تھکاوٹ کی بنا پر پندرہ ہزار سے اوپر جوانوں سے محروم ہونا اور انھیں ہسپتالوں میں چھوڑنا پڑا ہے۔ اگر ہم نے (غنیم پر) حملہ کیا ہوتا تو یہ صورت پیش نہ آتی۔ خدارا مجھے بتائیں اس بزدلی کے بارے میں روس — ہمارا پیارا روس — کیا کہے گا۔ ہم اپنے خوبصورت اور بہادر وطن کو اس قسم کے رذیلوں کے حوالے کیوں کر رہے ہیں اور رعیت کے ہر فرد کے دل میں نفرت اور شرم کے جذبات کیوں ابھار رہے ہیں؟ آخر ڈر کس بات کا؟ ہم کس سے خوف زدہ ہیں؟ اگر منسٹر ارادے کا کچا، بے حوصلہ، بے مغز اور تاخیر پسند ہے اور بدترین خصائص کا مالک ہے، تو اس میں میرا کیا قصور؟ ساری فوج اس سے نالاں ہے اور اس پر ہر نوع کے تبرّے بھیجتی رہتی ہے۔

6

مظاہرِ حیات کو جن لاتعداد خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ان کو مجتمع کر کے دو زمرے بنائے جا سکتے ہیں: ایک وہ جس میں مواد کو تغلب حاصل ہو جاتا ہے، دوسرا وہ جس میں ہیئت کو بالادستی مل جاتی ہے۔ پیٹرز برگ کی زندگی — جو دیہاتی، قصباتی، صوبجاتی بلکہ ماسکو کی زندگی سے بھی جداگانہ چیز ہے — اور خاص طور پر اس کے سیلونوں کے رنگ ڈھنگ اور چلن مؤخر الذکر زمرے میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔ یہ وہ زندگی ہے جس میں کبھی کوئی تغیر رونما نہیں ہوتا۔

1805 سے صورت حال کی نوعیت یہ تھی کہ نپولین سے کبھی ہماری صلح ہو جاتی اور کبھی ناچاقی۔ ہم آئین بناتے اور توڑتے رہے لیکن آنا پاولوونا اور ہیلین کے سیلون جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ ایک کا عرصۂ حیات سات سال پر جب کہ دوسرے کا پانچ سال پر محیط تھا۔ آنا پاولوونا کے سیلون میں جن لوگوں کا اجتماع ہوتا تھا، بونا پارت کی

* نپولین اور اس کی سپاہ

کامیابیاں انھیں ہمیشہ الجھن میں ڈالے رکھتیں، انھیں ان میں اوران ناز برداریوں میں، جو یورپ کے حکمران اس سے روار کھتے تھے، کینہ توز سازش کی بو آتی رہتی تھی جس کا واحد مقصد درباری حلقوں کے لیے، جن کی آنناپاولوونا نمائندگی کرتی تھی، ناگوار اور پریشان کن صورت حال پیدا کرنا ہوتا تھا۔ ہیلین کے گھر میں، جسے رومانتسیف بنفس نفیس اپنے قدوم میمنت لزوم سے نوازتا رہتا تھا کیونکہ وہ اسے غیر معمولی طور پر ذہین عورت تصور کرتا تھا، جو اصحاب اکٹھے ہوتے تھے، وہ 1812 میں بھی ''عظیم قوم'' اور ''عظیم آدمی'' کے بارے میں اس والہانہ انبساط سے باتیں کرتے تھے، جس طرح وہ 1808 میں کیا کرتے تھے اور فرانس کے ساتھ ہمارے جو روابط منقطع ہوئے تھے، اس پر وہ افسوس کا اظہار کرتے رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ انجام کار دونوں اقوام میں صلح ہو جائے گی

حال ہی میں، جب سے زار نے فوج سے مراجعت اختیار کی تھی، ان حریف سیلونوں میں ایک قسم کی کھلبلی مچنے لگی تھی۔ اس کا نتیجہ باہمی مخاصمت کے اظہار کی صورت میں نمودار ہوا تھا تاہم دونوں حلقوں کی عصبیت میں کسی نوع کی تبدیلی رونما نہیں ہوئی تھی۔ آنناپاولوونا کے حلقے میں صرف وہی فرانسیسی، جو فرانس میں بادشاہت کا موروثی نظام بحال کرنے کے حق میں بے لچک رویے کے حامل تھے، بار پاسکتے تھے اور وہاں حب الوطنی کا مظاہرہ کچھ اس قسم کی آرا سے کیا جاتا تھا کہ کسی کو فرانسیسی تھیٹر میں نہیں جانا چاہیے اور یہ کہ فرانسیسی طائفے کی دیکھ بھال پر حکومت کو جو اخراجات برداشت کرنا پڑتے ہیں، وہ ان اخراجات کے، جو فوج کی پوری کور پر اٹھتے ہیں، برابر ہیں۔ جنگ کے متعلق خبریں بڑے ذوق وشوق سے اکٹھا کی جاتی اور پوری توجہ سے سنا جاتی تھی۔ اپنی فوج کے بارے میں صرف وہی خبریں، جن میں ان کی تعریف وتحسین کا پہلو نکلتا تھا، پھیلائی جاتی تھیں۔

ہیلین اور رومانتسیف کے فرانس نواز حلقے میں دشمن کی بربریت اور جنگی مظالم کے متعلق خبروں کی تردید کی جاتی تھی اور صلح جوئی کے بارے میں نپولین کی مساعی پر بحثیں کی جاتی تھیں۔ وہاں ان لوگوں کے، جو اس نوعیت کے مشورے دیتے تھے کہ مادر امپراطورہ کی سرپرستی میں چلنے والی زنانہ تعلیمی درسگاہیں اور دربار جلد از جلد قازان منتقل کرنے کے انتظامات کیے جانا چاہئیں، لتے لیے جاتے تھے۔ ہیلین کے حلقے میں جنگ کو عام طور پر فوجی قوت کے رسمی اظہار کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا اور یہ خیال ظاہر کیا جاتا تھا کہ جنگ کا یہ سلسلہ بہت جلد صلح پر منتج ہو جائے گا۔ وہاں اس نقطۂ نظر کو کہ معاملے کا فیصلہ گولہ بارود نہیں بلکہ وہ لوگ، جن کے ذہن رسا کی یہ پیداوار تھی، کریں گے، بڑی قبولیت حاصل تھی۔ (اس نقطۂ نظر کا داعی بلیبن تھا۔ وہ اب پیٹرز برگ آچکا تھا اور ہیلین کے سیلون میں، جہاں ہر زیرک اور طباع نوجوان جانا اپنے شایان شان تصور کرتا تھا، باقاعدگی سے آتا جاتا تھا۔) اہالیان ماسکو کی پر جوش حب الوطنی کی، جس کی خبر زار کی واپسی کے ساتھ پیٹرز برگ پہنچ چکی تھی، ہیلین کے سیلون میں طنزیہ اور انتہائی ظریفانہ انداز سے بھد اڑائی جاتی تھی۔ ویسے اس ضمن میں خاصا محتاط انداز اختیار کیا جاتا تھا۔

اس کے برعکس آنناپاولوونا کے حلقے کے لوگ اہالیان ماسکو کے جوش وخروش پر والہانہ مسرت کا اظہار کرتے تھے اور وہ اس کا ذکر یوں کرتے تھے جیسے پلوٹارک[13] قدما کے کارناموں کا کرتا ہے۔ پرنس واسیلی، جو ابھی تک اپنے

سابقہ عہدوں پر قابض تھا، ان دونوں کے مابین درمیانی کڑی تھا۔ وہ "ma bonne amie"* آنّا پاولوونا کے ہاں بھی جاتا اور اپنی بیٹی کے "Salon diplomatique"** میں بھی۔ دونوں جگہوں پر جانے کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ پراگندہ خیالی کا شکار ہو جاتا۔ اسے جو باتیں آنّا پاولوونا کے ہاں کہنا چاہیے تھیں، وہ انھیں ہیلین کے ہاں کہہ دیتا اور جو باتیں اسے ہیلین کے ہاں کرنا چاہیے تھیں، وہ انھیں آنّا پاولوونا کے ہاں اگل دیتا۔

زار کی آمد کے کچھ ہی عرصہ بعد پرنس واسیلی نے آنّا پاولوونا کے ہاں گفتگو کے دوران میں بارکلے ڈتولی کو زبردست تنقید کا نشانہ بنایا۔ تاہم کمانڈر انچیف کسے مقرر کیا جانا چاہیے، اس بارے میں وہ کوئی واضح رائے قائم نہ کر سکا۔ ایک مہمان نے، جسے عام طور پر "Un homme de beaucoup de merite"***[14] کہا جاتا، بتایا کہ اس کی اس روز کس طرح کوتوزوف سے، جو پیٹرزبرگ ملیشیا کا نیا سربراہ منتخب ہوا تھا اور جسے اس نے اس روز وزارت خزانہ میں رنگروٹوں کی بھرتی کے سلسلے میں (ٹریبونل کے) اجلاس کی صدارت کرتے دیکھا تھا، ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے محتاط انداز سے رائے دی کہ کوتوزوف ایک ایسا شخص ہے جو تمام شرائط پر پورا اترتا ہے۔

آنّا پاولوونا نے اداس مسکراہٹ سے تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کوتوزوف نے زار کو آزردہ کرنے کے علاوہ اور کچھ نہیں کیا۔

''امرا کی اسمبلی میں میں یہی بات متعدد مرتبہ ان کے گوش گزار کر چکا ہوں،'' پرنس واسیلی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا، ''لیکن کیا کیا جائے، کوئی سنتا ہی نہیں۔ میں نے ان سے کہا تھا کہ اگر انھوں نے اسے ملیشیا کا سربراہ منتخب کیا، امپراطور خوش نہیں ہوں گے، لیکن انھوں نے سنی ان سنی ایک کر دی۔ اصل میں ان سب پر حزب اختلاف کا کردار ادا کرنے کا خبط سوار ہے،'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ یہ سب کچھ کس کے لیے کر رہے ہیں؟ محض اس لیے کیونکہ وہ اہالیان ماسکو کے احمقانہ جوش و خروش کی نقالی کرنا چاہتے ہیں،'' پرنس واسیلی نے کہا۔ وہ ایک لحظے کے لیے یہ بھول گیا تھا کہ صرف ہیلین کے حلقے میں اس جوش و خروش کا خاکہ اڑایا جا سکتا ہے لیکن آنّا پاولوونا کے حلقے میں یہ ایک ایسی چیز تھی جسے بنظر تحسین دیکھا جانا چاہیے۔ لیکن وہ فوراً سنبھل گیا۔ ''کیا کوتوزوف کو، جو روس کا معمر ترین جرنیل ہے، یہ بات جچتی ہے کہ وہ اس ٹریبونل کی صدارت کرتا پھرے؟ اسے اس قسم کی مشقت سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھوں نے ایک ایسے شخص کو، جو گھوڑے پر بیٹھ نہیں سکتا، کونسل کے اجلاس میں سو جاتا ہے، اخلاقی اعتبار سے جس کا کردار شرم ناک ہے، کمانڈر انچیف کیسے بنا دیا؟ بخارسٹ میں اس نے کیا نیک نامی کمائی؟ میں جرنیل کی حیثیت سے اس کے اوصاف کا ذکر نہیں کر رہا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم اس جیسے زمانے میں کسی نحیف و نزار، اندھے — ہاں، بالکل اندھے — بڈھے پھوس کا تقرر عمل میں لا سکتے ہیں؟ اندھے جرنیل کی تقرری، کیا لاجواب انتخاب ہے! اسے تو کچھ بھی نظر نہیں آتا! اس سے شاید آنکھ مچولی

---

* "my good friend" ۔ ''میری عزیز دوست''

** ڈپلومیٹک (سفارتی) سیلون۔

*** متعدد خوبیوں کا مالک آدمی۔

کھلاتا ہے؟ اسے قطعاً کچھ نظر نہیں آتا!''

کسی نے اس کی باتوں کی تردید نہ کی۔

24 جون کو یہ نقطہ نظر بالکل صحیح تھا لیکن 29 جون کو کوتوزوف کو پرنس کا خطاب مرحمت ہوا۔[15] یہ عنایتِ بے غایت اس خواہش کی آئینہ دار معلوم ہوتی تھی کہ شاید اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کی سبیل کی گئی ہے۔ اس صورت میں پرنس واسیلی کی رائے پھر بھی صحیح قرار پاتی تاہم وہ اس کا اظہار کرنے کی طرف اتنا مائل نہیں تھا۔ تاہم آٹھ اگست کو ایک کمیٹی کا، جو فیلڈ مارشل (پرنس) سالتی کوف، آراک چیف،[16] ویاز میتینوف، لپُوخِن اور کوچوبی پر مشتمل تھی، جنگی کارروائیوں کا جائزہ لینے کے لیے اجلاس منعقد ہوا۔ کمیٹی اس نتیجے پر پہنچی کہ ہماری ناکامیوں کا سبب منقسم کمان ہے اور اگرچہ کمیٹی کے ارکان کو بخوبی علم تھا کہ والئی سلطنت کوتوزوف کو ناپسند کرتا ہے، انھوں نے مختصر سوچ بچار کے بعد اتفاق رائے سے یہ مشورہ دینے کا فیصلہ کیا کہ اسے کمانڈر انچیف مقرر کر دیا جائے۔ اسی روز کوتوزوف کو کمانڈر انچیف کے عہدے پر تعینات کر دیا گیا اور اسے فوجوں اور ان کے زیر قبضہ علاقوں پر مکمل اختیارات تفویض کر دیے گئے۔

نو اگست کو آنا پاولوونا کے ہاں ایک بار پھر پرنس واسیلی کی ''متعدد خوبیوں کے مالک'' شخص سے ملاقات ہوئی۔ (اس شخص کو توقع تھی کہ مادرِ امپراطورہ کی زیر نگرانی جو تعلیمی ادارے کام کر رہے تھے، اسے ان میں سے کسی کا ٹرسٹی مقرر کر دیا جائے گا، چنانچہ وہ آنا پاولوونا کے اشاروں پر چلنے کے لیے تیار تھا۔) پرنس واسیلی فاتح کی طرح کمرے میں داخل ہوا۔ اس کی یوں باچھیں کھلی جا رہی تھیں جیسے اس کے دل کی مراد پوری ہو گئی ہو۔

''خوب! آپ لوگوں نے زبردست خبر سن لی؟ پرنس کوتوزوف کمانڈر انچیف مقرر ہو گئے ہیں! تمام اختلافات بالائے طاق رکھ دیے گئے ہیں۔ میں بہت خوش ہوں، بس کچھ نہ پوچھیں کہ کتنا خوش!'' پرنس واسیلی نے کہا۔ ''آخر کار ہمیں مردِ بچہ دستیاب ہو ہی گیا!'' اس نے تمام (حاضرین) محفل کو درشت اور معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

اپنے من پسند عہدے کو حاصل کرنے کی خواہش کے باوجود ''متعدد خوبیوں کا مالک'' شخص پرنس واسیلی کو اس کی سابق رائے یاد دلانے سے گریز نہ کر سکا۔ (آنا پاولوونا کے ڈرائنگ روم میں اس قسم کا اندازِ گفتگو پرنس واسیلی اور خود آنا پاولوونا کی، جس نے اس خبر کا خیر مقدم اتنے ہی جوش و خروش سے کیا تھا، دانست میں آداب کے منافی تھا لیکن اس سے رہا نہ گیا۔)

''لیکن، پرنس، وہ تو نابینا ہیں!'' اس نے پرنس واسیلی کو اس کے اپنے الفاظ یاد دلاتے ہوئے کہا۔

''فضول، واہیات! انھیں اچھا بھلا دکھائی دیتا ہے،'' پرنس واسیلی نے کھنکھارتے کھنکتی آواز میں تیز تیز بولتے ہوئے کہا۔ اپنی اس کھنک اور کھنکار کے ذریعے وہ تمام مشکلات سے پیچھا چھڑا لیتا تھا۔ ''انھیں اچھا بھلا دکھائی دیتا ہے،'' اس نے اپنی بات دہرائی۔ ''اور جس بات پر مجھے خاص طور پر خوشی ہوئی ہے، وہ یہ ہے کہ امپراطور نے انھیں تمام افواج اور علاقوں پر پورے اختیارات سونپ دیے ہیں۔ یہ اختیارات کسی کمانڈر انچیف کو اس سے

قبل نہیں ملے تھے۔ وہ دوسرا autocrat[17] ہے،'' اس نے فاتحانہ انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''خدا کرے، خدا کرے!'' آنا پاولوونا نے گرہ لگائی۔

''متعدد خوبیوں کا مالک'' شخص، جو درباری حلقوں میں ابھی مبتدی تھا، آنا پاولوونا کی سابقہ رائے کو صحیح ثابت کر کے اس کی خایہ بوسی کرنا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ گویا ہوا:

''سنا ہے کہ امپراطور کوتوزوف کو یہ اختیارات دینے میں متامل تھے۔ شنید ہے کہ جب انھوں نے کوتوزوف سے یہ فرمایا کہ 'تمھارا فرماں روا اور تمھاری مادر وطن تمھیں یہ اعزاز دے رہے ہیں، وہ اس نوخیز دوشیزہ کی طرح، جسے جوکونڈے[18] پڑھ کر سنائی جا رہی ہو، شرمانے لگے۔''

''شاید وہ دل سے یہ نہ چاہتے ہوں،'' آنا پاولوونا نے اظہار خیال کیا۔

''ارے نہیں، بالکل نہیں،'' پرنس واسیلی نے لال پیلے ہو کر احتجاج کیا۔ اس کے لیے اب کسی دوسرے شخص کو کوتوزوف پر ترجیح دینا ممکن نہیں رہا تھا۔ اس کی رائے میں کوتوزوف نہ صرف بذات خود قابل تحسین تھا بلکہ ہر شخص اس کی پرستش کرتا تھا۔ ''نہیں، یہ ناممکن ہے،'' اس نے کہا۔ ''امپراطور نے ان کی ہمیشہ بڑی قدر کی ہے۔''

''خدا کرے کہ کوتوزوف صحیح معنوں میں اختیارات سنبھال لیں اور کسی کو اپنے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑانے دیں—"des batons dans les roues*"۔'' آنا پاولوونا نے کہا۔

پرنس واسیلی فوراً سمجھ گیا کہ ''کسی'' سے کون مراد ہے اور اس نے زیر لب کہا:

''مجھے معلوم ہے اور یہ بات بالکل صحیح ہے کہ کوتوزوف نے واضح طور پر یہ شرط لگائی تھی کہ زاریوچ فوج میں نہیں رہیں گے۔ تمھیں معلوم ہے کہ انھوں نے امپراطور سے کیا کہا تھا؟''

اور پرنس نے وہ الفاظ، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ کوتوزوف نے زار سے کہے تھے، دہرائے۔

'''اگر ان سے غلطی کا ارتکاب ہوا، میں انھیں سزا نہیں دے سکتا اور اگر انھوں نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، میں انھیں جزا نہیں دے سکتا۔' دیکھا، کتنا ژرف نگاہ شخص ہے! میں انھیں مدتوں سے جانتا ہوں۔''

''یہ بھی سنا گیا ہے،'' ''متعدد خوبیوں والے شخص'' نے، جو درباریوں کی موقع شناسی سے محروم تھا، کہا، ''کہ ہز ایکسی لینسی نے واضح انداز سے یہ شرط بھی لگائی تھی کہ خود امپراطور بھی فوج میں شامل نہیں ہوں گے۔''

اس کے ان الفاظ پر پرنس واسیلی اور آنا پاولوونا دونوں نے بیک وقت اس سے نگاہیں پھیر لیں، حزن وملال سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا اور اس کی سادہ لوحی پر ان کی آہ نکل گئی۔

7

جب پیٹرزبرگ میں یہ واقعات رونما ہو رہے تھے، فرانسیسی سمولنسک میں سے گزرنے کے بعد ماسکو کے قریب

* کسی کے کاموں میں روڑا اٹکانا to put a spoke in someone's (wheel)

سے قریب تر پہنچتے جا رہے تھے۔ نپولین کا سوانح نگار، تیئر، اس کے دیگر سوانح نگاروں کی طرح، اپنے ہیرو کو حق بجانب قرار دینے کی کوشش کرتا ہے اور کہتا ہے: ''نپولین کی اپنی مرضی کے برعکس حالات اسے ماسکو کے در و دیوار کی جانب دھکیل کر لے گئے۔'' اپنے اس دعوئ میں وہ اتنا ہی صحیح ہے جتنے کہ اس کی قبیل کے دوسرے مورخین جو تاریخی واقعات کی توجیہہ فرد واحد کے منشا میں تلاش کرتے ہیں۔ وہ اتنا ہی صحیح ہے جتنے کہ اس کے ہم پیشہ روسی بھائی بند جو یہ دعوئ کرتے نہیں تھکتے کہ روسی جرنیلوں کا حسن تدبیر اسے ماسکو کھینچ لایا تھا۔ یہاں *''قانونِ استقدام''، کے، جو ماضی کو اس طور پیش کرتا ہے کہ وہ ان واقعات کی، جو بعد میں پیش آتے ہیں، محض تیاری معلوم ہوتا ہے، علاوہ **''قانونِ مکافیت'' بھی دخیل ہو جاتا ہے اور یوں سارا معاملہ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ شطرنج کے اچھے کھلاڑی کو کسی بازی میں پٹنے کے بعد یہ واثق یقین ہو جاتا ہے کہ اس کی ناکامی کا سبب یہ ہے کہ وہ کوئی غلط چال چل بیٹھا ہے اور وہ اپنی اس غلطی کو، جو کھیل کے ابتدائی مراحل میں اس سے سرزد ہوئی تھی، ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ کھیل کے ہر مرحلے میں ایسی ہی فاش غلطیوں کا ارتکاب ہوتا رہا ہے اور یہ کہ کوئی چال بھی بے عیب نہیں قرار دی جا سکتی۔ جس غلطی پر وہ اپنی توجہ مرکوز کرتا ہے، اس لیے اس کی نظر میں آ جاتی ہے کیونکہ اس کے حریف نے اس سے بھرپور فائدہ اٹھایا ہوتا ہے۔ جنگ کا کھیل اس سے کہیں زیادہ پیچیدہ ہوتا ہے۔ اسے وقت کی بعض مخصوص حدود کے اندر کھیلنا پڑتا ہے۔ یہاں مسئلہ فرد واحد کے منشا کا نہیں کہ (شطرنج کے کھلاڑی کی طرح) اس کا جس طرح جی چاہے، بے جان اشیا کو ادھر ادھر کرتا رہے، یہاں اس کا سامنا مختلف انسانوں کے منشاؤں سے ہوتا ہے۔ یہ منشا ایک دوسرے سے متصادم ہوتے ہیں تب کہیں کوئی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔

سمولنسک کے بعد نپولین نے دارو گوبژ سے آگے ویازما اور پھر تساریوو زائمش چے کے مقامات پر جنگ بپا کرنے کی کوشش کی لیکن ہوا یہ کہ لاتعداد مرتبہ مختلف حالات نے مل جل کر کچھ ایسی صورت اختیار کی کہ روسی ماسکو سے ستر میل ادھر بارودینو پہنچنے سے قبل مقابلے کے لیے تیار نہ ہو سکے۔ نپولین نے ویازما سے براہ راست ماسکو پر چڑھائی کا حکم دے دیا۔

> Moscou, to capitale de ce grand empire, la ville sacree des peuples d,Alexandre, Moscou avec ses innombrables eglises en forme de pagodes Chinoises!***

نپولین کے (ذہن میں رچے بسے) اس ماسکو نے اس کے تخیل کو دم نہ لینے دیا۔ ویازما سے تساریوو زائمش چے تک سفر کے دوران میں وہ تیلیا سرنگ گھوڑے پر، جو مزے مزے دلکی چلتا تھا، سوار رہا۔ اس کے ہمراہ شاہی دستے کے جوان، اس کا باڈی گارڈ، اس کے خدمت گار اور اڈی کانگ تھے۔ اس کا چیف آف سٹاف، بیغ تیئے، ایک

---

* قانونِ استقدام (the law of retrospective ness)

** مکافیت: (reciprocity)

*** اس عظیم الشان سلطنت کا صدر مقام ماسکو، الیکساندر کی اقوام کا شہر مقدس، چینی پگوڈوں سے مشابہ لاتعداد کلیساؤں کا شہر، ماسکو۔

روسی قیدی کو، جسے گھڑسوار فوج نے پکڑا تھا، تفتیش کی بھٹی میں گزارنے کے لیے پیچھے رہ گیا تھا۔ اپنے ترجمان لاؤنجی دَآئیدے وِل کی، جو اس کے پیچھے پیچھے آرہا تھا، معیت میں سرپٹ گھوڑا دوڑاتے وہ نپولین کے ساتھ آملا اور اس نے مسکراتے ہوئے اپنا گھوڑا روک لیا۔

''ہونہہ؟'' نپولین نے پوچھا۔

''پلاتوف[19] کا قازق ـــ کہتا ہے کہ پلاتوف کی کور بڑی فوج میں شامل ہو رہی ہے اور یہ کہ کوتوزوف کو کمانڈر انچیف مقرر کر دیا گیا ہے۔ بڑا تیز طرار اور باتونی شخص ہے۔''

نپولین مسکرا پڑا۔ اس نے حکم دیا کہ قازق کو گھوڑا دیا جائے اور اسے اس کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ وہ خود اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ متعدد ایجوٹنٹ گھوڑے دوڑاتے واپس چلے گئے اور ایک گھنٹے بعد زرعی غلام لاوروشکا کو، جسے دینی سوف نے رستوف کی تحویل میں دے دیا تھا، گھوڑے پر بٹھا کر نپولین کے حضور پیش کر دیا گیا۔ اس کے نیچے فرانسیسی رسالے کی زین تھی۔ اس نے اردلی کا کوٹ پہن رکھا تھا اور چہرے مہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ آدمی عیار ہے، من موجی ہے اور پیے ہوئے ہے۔ نپولین نے اسے اپنے برابر برابر چلنے کا حکم دیا اور اس پر جرح کرنے لگا:

''تم قازق ہو؟''

''جی، حضور، قازق۔''

''قازق کو'' یہ واقعہ قلم بند کرتے ہوئے تیئر لکھتا ہے، ''یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ وہ کس شخص کی معیت میں ہے کیونکہ نپولین کے سیدھے سادے لباس میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جس سے کسی یورپی کے ذہن میں یہ شائبہ بھی ہوتا کہ وہ کسی امپراطور کی خدمت میں حاضر ہے، چنانچہ وہ جنگی واقعات کے بارے میں کھل کر اور انتہائی بے تکلفی سے باتیں کرتا رہا۔''

قصہ دراصل یہ تھا کہ ایک روز پہلے لاوروشکا نے اتنی پی اتنی پی کہ وہ اپنے آپے میں نہ رہا اور اس نے اپنے آقا کے لیے ڈنر بھی تیار نہ کیا۔ اس پر اس کی زبردست ٹھکائی ہوئی اور اسے مرغیوں کی تلاش میں گاؤں بھیج دیا گیا۔ وہاں وہ لوٹ مار میں جت گیا تا آنکہ وہ فرانسیسیوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انھوں نے اسے گرفتار کر لیا اور قیدی بنا لیا۔ لاوروشکا ان کندۂ ناتراش، ڈھیٹ اور بدلحاظ کاسہ لیسوں میں شامل تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی پی چکے ہوتے ہیں اور اب ہر کام میں، جو وہ کرتے ہیں، عیاری اور مکروفریب استعمال کرنا لازمی تصور کرتے ہیں، اپنے آقاؤں کی ہر خدمت بجالانے کے لیے کمربستہ رہتے ہیں اور ان کے سفلی جذبات، خاص طور پر وہ جو نخوت پسندی اور کم ظرفی کی پیداوار ہوتے ہیں، معلوم کرنے کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔

جب لاوروشکا نے اپنے آپ کو نپولین کی، جس کی شناخت متعین کرنے میں اسے ذرا بھی دقت پیش نہ آئی، صحبت میں پایا، اسے ذرا بھی حجاب نہ آیا بلکہ وہ محض اپنے نئے آقا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کرنے لگا۔

وہ خوب جانتا تھا کہ یہ نپولین ہے لیکن جس طرح رستوف یا سارجنٹ میجر کی اپنے ڈنڈوں سمیت موجودگی اس پر کوئی لرزہ طاری نہیں کر سکتی تھی، نپولین کی موجودگی بھی اسے خائف نہ کر سکی کیونکہ اس کے پاس تھا ہی کیا جس سے سارجنٹ میجر یا نپولین اسے محروم کر سکتا۔

چنانچہ اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی رہی اور وہ تمام گپ شپ، جو اس نے اردلیوں سے سنی تھی، دہراتا رہا۔ ان میں سے بیشتر باتیں صحیح تھیں لیکن جب نپولین نے اس سے پوچھا کہ کیا روسیوں کے خیال میں وہ نپولین کو شکست دے سکیں گے یا نہیں، لاوروشکا نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور سوچنے لگا۔

جیسا کہ اس قسم کے آدمیوں کو ہر چیز میں عیاری نظر آتی ہے، اسے بھی اس سوال میں ایک طرح کی ڈھکی چھپی عیاری دکھائی دی۔ چنانچہ اس کی بھویں تن گئیں اور اس نے کوئی فوری جواب دینے سے اجتناب کیا۔

''بات یہ ہے،'' اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا، ''اگر لڑائی ابھی اور اسی وقت چھڑ جائے، میدان آپ کے ہاتھ رہے گا لیکن اگر تین دن کی تاخیر ہوگئی، پھر معاملہ طول پکڑ جائے گا۔''

للوغیی دَ آئیدے وِل نے مسکراتے ہوئے نپولین کے سامنے اس کی تعبیر یوں کی: ''اگر لڑائی اگلے تین روز کے اندر اندر ہوگئی، جیت فرانسیسیوں کی ہوگی لیکن اگر یہ بعد میں چھڑی، پھر خدا جانے کہ نتیجہ کیا نکلے۔''

اگرچہ بظاہر نپولین کا موڈ خوشگوار تھا، لیکن وہ مسکرایا نہیں اور اس نے فقرہ دوبارہ سنوایا۔

لاوروشکا اس کی یہ کیفیت بھانپ گیا اور اس نے اسے مزید خوش کرنے کے لیے (وہ جھوٹ موٹ یہی ظاہر کر رہا تھا کہ اسے معلوم ہی نہیں کہ وہ کون ہے) بات بڑھاتے ہوئے کہا:

''ہمیں معلوم ہے کہ آپ کے پاس بوناپارت ہیں اور یہ کہ انھوں نے روئے زمین کے ہر شخص کو شکست دی ہے لیکن ہم ذرا مختلف قسم کے لوگ ہیں...'' اسے یہ قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس نے حب الوطنی کے بارے میں یہ شیخی کیسے اور کیوں بگھاردی تھی۔

ترجمان نے اس جملے کا ترجمہ اختتامی الفاظ کے بغیر کیا اور بوناپارت مسکرانے لگا۔

''نوجوان قازق اپنے عظیم اور جلیل القدر شریکِ گفتگو کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کا سبب بنا،'' تیئر لکھتا ہے۔

چند قدم خاموشی سے چلنے کے بعد نپولین برتیئے کی جانب متوجہ ہوا اور بولا: ''میں یہ دیکھنا چاہوں گا کہ (دریائے) ڈان[20] کے اس طفل کو جب یہ معلوم ہوگا کہ جس شخص سے وہ مخاطب ہے، وہ بذات خود امپراطور ہے، وہی امپراطور، جس نے اپنا غیر فانی اور فاتح نام اہرامِ مصر پر کندہ کر دیا ہے، تو اس پر کیا اثر ہوتا ہے۔''

لاوروشکا کو اس حقیقت سے آگاہ کر دیا گیا۔

لاوروشکا کو احساس ہوا کہ اسے یہ اس لیے بتایا گیا ہے تاکہ اس کے پاؤں تلے کی مٹی نکالی جا سکے اور نپولین یہ توقع کر رہا ہے کہ وہ اتنا بھونچکا ہو جائے کہ اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ جائے۔ لاوروشکا بھی ایک کایاں تھا۔ اپنے نئے آقاؤں کی خواہش پوری کرنے کے لیے وہ جھٹ پٹ اداکاری کرنے لگا اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے (رعبِ شاہی

ے) سے اس کی واقعی سٹی گم ہوگئی ہو، ہوش وحواس جاتے رہے ہوں، اور اس نے اپنا منہ یوں بنالیا جیسے اس پر دہشت برسنے لگی ہو۔ اس کی یہ کیفیت تب ہوتی تھی جب اسے کوڑوں سے پٹائی کے لیے باہر لے جایا جاتا تھا۔ ''جونہی نپولین کے ترجمان نے اپنا فقرہ مکمل کیا'' تیئر لکھتا ہے: ''قازق کا منہ حیرت سے کھلے کا کھلا رہ گیا۔ اس نے اپنی زبان سے مزید ایک لفظ بھی نہ کہا بلکہ گھوڑے پر سوار چپ چاپ آگے چلتا رہا۔ اس کی نگاہیں مسلسل اس فاتح پر، جس کی شہرت مشرق میں گھاس کے میدانوں (steppes) کے پار اس کے کانوں تک پہنچ چکی تھی، جمی رہیں۔ اس کی چرب زبانی پلک جھپکنے میں پادر ہوا ہوگئی اور اس کے معصوم اور گم صم چہرے پر ہیبت طاری ہوگئی۔ نپولین نے اسے خاطر خواہ انعام دیا اور اسے اس طرح رہا کرنے کا حکم دے دیا جس طرح کسی پرندے کو اس کے آبائی وطن میں کھلا چھوڑ دیا جائے۔''

نپولین آگے چلتا رہا۔ وہ ماسکو کے بارے میں، جو اس کے تخیل میں سمایا ہوا تھا، خواب دیکھتا جا رہا تھا۔ جب کہ وہ ''پرندہ، جسے اس کے آبائی وطن میں کھلا چھوڑ دیا'' گیا تھا، راستے میں وہ کہانی، جو اس نے اپنے ساتھیوں کو سنانا تھی، گھڑتا گھڑاتا واپس ہماری بیرونی چوکیوں میں پہنچ گیا۔ جو کچھ حقیقتاً ظہور پذیر ہوا تھا، اس کا اسے بتانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ یہ بتانے کے قابل نہیں۔ اس نے قازق تلاش کیے، ان سے اپنی رجمنٹ کے، جو اب پلاتوف کے لشکر میں شامل تھی، بارے میں دریافت کیا اور شام ہوتے ہوتے اپنے آقا نکولائی رستوف کا، جو اب یانکادو میں مقیم تھا، اتا پتا معلوم کرلیا۔ رستوف الی ین کی معیت میں ملحقہ دیہات کا چکر لگانے کے لیے گھوڑے پر سوار ہو رہا تھا۔ اس نے لاوروشکا کو دوسرے گھوڑے پر بٹھایا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

8

جیسا کہ پرنس آندرے نے فرض کرلیا تھا، پرنس ماریا ماسکو نہیں گئی تھی اور نہ خطرے کی زد سے باہر تھی۔

معلوم ہوتا تھا کہ آل پاچ کی سمولنسک سے واپسی کے بعد معمر پرنس اچانک خواب سے بیدار ہوگیا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ گاؤں کے وہ جوان، جو ملیشیا میں شامل ہیں، فوجی خدمات سرانجام دینے کے لیے طلب کرلیے جائیں اور انھیں مسلح کر دیا جائے۔ اس نے کمانڈر انچیف کے نام خط لکھا کہ اس کا ارادہ بالڈ ہلز میں ہی ٹھہرے رہنے اور آخر دم تک اپنے دفاع کرنے کا ہے۔ تاہم اس نے یہ بات کمانڈر انچیف کی صوابدید پر چھوڑ دی کہ وہ چاہے تو بالڈ ہلز کا، جہاں روس کا ایک معمر ترین جرنیل گرفتار ہونے یا موت کو گلے لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے، دفاع کرنے کے لیے کوئی اقدام کرے، چاہے نہ کرے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے گھر والوں کے سامنے اعلان کر دیا کہ وہ کہیں نہیں جائے گا بلکہ بالڈ ہلز میں ہی قیام کرے گا۔

اگرچہ وہ خود تو نہیں جانا چاہتا تھا، تاہم اس نے دیسال اور چھوٹے پرنس کی معیت میں پرنس ماریا کو باگوچارافو اور وہاں سے انھیں ماسکو پہنچانے کے انتظامات مکمل کرلیے۔ کہاں تو پرنس ماریا کا باپ اتنا سرد مہر اور بے حس تھا

اور کہاں اب (اس کی خاطر) اسے اتنی مصروفیت کہ نہ دن کو چین اور نہ رات کو آرام، اس پر بس ہر وقت کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن سوار رہتی تھی۔ اس کی ان سرگرمیوں نے پرنس ماریا کے حواس باختہ کر دیے۔ وہ اسے یوں تنہا چھوڑ دینے کا حوصلہ نہ کر سکی اور اس نے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کی جرأت کی۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا اور اس کے باپ کا غصہ اس پر قہر بن کر نازل ہونے لگا۔ پرنس نے ہر اس ناانصافی اور زیادتی کا، جو اس نے کبھی اپنی بیٹی سے روا رکھی تھی، اعادہ کیا اور اسے موردالزام ٹھہرانے کے لیے اسے بتانے لگا کہ اس نے اسے ہلکان کر دیا ہے، اس کی اپنے بیٹے سے چخ چخ کرا دی ہے، اس کے بارے میں وہ اپنے دل میں بدترین قسم کے شکوک و شبہات پالے ہوئے ہے اور اس نے اس کی زندگی میں بس گھولنا اپنا مقصد حیات بنا لیا ہے۔ پھر اس نے یہ کہہ کر اسے اپنے سٹڈی روم سے باہر نکال دیا: ''اگر تم بالڈ ہلز سے نہیں جاتیں، نہ جاؤ، میری بلا سے، لیکن مجھے کبھی یہ مت جتانا کہ تم ابھی زندہ ہو اور نہ کبھی مجھے اپنی شکل دکھانا، ورنہ مجھ سے کوئی برا نہیں ہوگا۔'' پرنس ماریا کی جان مٹھی میں آ چکی تھی۔ اسے اندیشہ تھا کہ وہ اسے زبردستی بالڈ ہلز سے باہر نکال دے گا لیکن جب اس نے اسے محض یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ وہ اسے اپنی شکل نہ دکھائے، اس کی کچھ ڈھارس بندھی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے نہاں خانہ دل میں خوش ہے کہ وہ جانے کے بجائے گھر پر ہی ٹھہری رہی ہے۔

جس روز نکولشکا کی روانگی عمل میں آئی، اسی دن بعد میں معمر پرنس نے وردی پہنی اور کمانڈر انچیف سے ملنے کی تیاری کرنے لگا۔ اس کی گاڑی دروازے پر کھڑی تھی۔ پرنس ماریا نے اسے وردی زیب تن کیے اور سینے پر اپنے تمام تمغے اور اعزازات سجائے مسلح کسانوں اور گھریلو غلاموں کا معائنہ کرنے کے لیے باغ کی روش کی طرف جاتے دیکھا۔ وہ دریچے کے قریب بیٹھی اس کی آواز، جو باغیچے سے اس تک پہنچ رہی تھی، سن رہی تھی، اچانک متعدد اشخاص خیابان پر بھاگتے نظر آئے۔ ان کے چہروں پر خوف و ہراس ہویدا تھا۔

پرنس ماریا پورچ کی طرف بھاگی۔ وہاں سے وہ اس روش پر، جس کے دونوں کناروں پر پھول لہلہا رہے تھے، ہوتی خیابان پر پہنچ گئی۔ وہاں اس کی مڈھ بھیڑ ملیشیا کے جوانوں اور نوکروں چاکروں کے ہجوم سے ہوئی۔ وہ اسی کی طرف آ رہے تھے۔ وہ اپنے درمیان میں وردی پہنے اور تمغے سجائے بڑے میاں کو کچھ اٹھائے اور کچھ گھسیٹے آ رہے تھے۔ وہ ان کی طرف بھاگی۔ سورج کی جھلملاتی کرنوں کی روشنی لیموں کے درختوں کے سایوں کے بیچوں بیچ جس طرح دائرے بنا رہی تھی، ان میں وہ پوری طرح ان تبدیلیوں کا، جو اس کے خدوخال پر نمودار ہو چکی تھیں، ادراک نہ کر سکی۔ وہ صرف یہی دیکھ سکی کہ اس کے چہرے پر پہلے جو درشتی اور عزم صمیم جھلکتا رہتا تھا، وہ اب ناپید ہو چکا تھا اور اس کی جگہ فروتنی اور کم حوصلگی نمایاں ہونے لگی تھی۔ جب اس کی نظر اپنی بیٹی پر پڑی، اس نے بے بسی سے اپنے ہونٹوں کو حرکت دینے کی کوشش کی اور اس کے لبوں سے گلوگرفتہ آواز نکلی۔ یہ سمجھنا ناممکن تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے۔ لوگوں نے اسے اٹھایا اور اٹھا کر سٹڈی روم میں لے گئے۔ انھوں نے اسے اسی کاؤچ پر، جس پر لیٹنے سے وہ حالیہ دنوں میں خوف کھانے لگا تھا، لٹا دیا۔

ڈاکٹر نے، جسے اسی رات بلایا گیا تھا، اس کی فصد کھولی اور بتایا کہ پرنس پر فالج کا حملہ ہوا ہے اور اس کا دایاں پہلو مفلوج ہو گیا ہے۔

بالڈ ہلز میں قیام خطرناک سے خطرناک تر ہوتا جا رہا تھا اور وہ اگلے روز پرنس کو باگوچارافو لے گئے۔ ڈاکٹر ان کے ساتھ تھا۔

جب وہ باگوچارافو پہنچے، دیسال اور چھوٹا پرنس ماسکو روانہ ہو چکے تھے۔

مفلوج پرنس تین ہفتے[21] باگوچارافو اس نئے مکان میں، جسے پرنس آندرے نے تعمیر کرایا تھا، صاحب فراش رہا۔ اس کی حالت نہ بہتر ہو رہی تھی اور نہ بدتر۔ وہ ہوش وحواس سے عاری تھا اور مڑی تڑی لاش کی طرح پڑا تھا۔ وہ متواتر بڑبڑاتا رہتا، اس کے ہونٹ اور پپوٹے پھڑکتے رہتے لیکن یہ بتانا ناممکن تھا کہ اس کے گرد وپیش جو کچھ رونما ہو رہا تھا، وہ اس سے آگاہ ہے یا نہیں۔ ایک بات یقینی تھی۔ وہ اذیت میں مبتلا تھا اور کچھ کہنا چاہتا تھا، لیکن کیا، اس کا اندازہ لگانا کسی شخص کے بس کی بات نہیں تھی۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کسی علیل اور نیم ہذیانی شخص کے من کی موج ہو یا یہ بھی عین ممکن ہے کہ اس کا تعلق کسی سرکاری مسئلے یا خانگی امور سے ہو۔

ڈاکٹر کا خیال تھا کہ اس کی یہ بے چینی بے معنی ہے اور محض جسمانی اسباب کی پیدا کردہ ہے، تاہم پرنس ماریا کو یقین تھا کہ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا ہے اور یہ حقیقت کہ اس کی موجودگی میں اس کی حالت مزید دگرگوں ہو جاتی، اس کے شبہات کی تائید کرتی نظر آتی تھی۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ جسمانی اور ذہنی دونوں اقسام کی اذیت میں مبتلا ہے۔ بحالی صحت کی کوئی امید باقی نہیں رہی تھی۔ اسے وہاں سے کہیں اور لے جانا ناممکن تھا۔ "اگر ان کا راستے میں ہی انتقال ہو گیا، پھر کیا ہو گا؟ اگر قصہ ختم ہی ہو چکا ہے تو پھر کیا یہ بہتر نہیں ہو گا کہ آخری گھڑی آ ہی جائے؟" پرنس ماریا بعض اوقات سوچتی۔ وہ تقریباً سوئے بغیر دن رات کی اس خبر گیری کرتی اور اگرچہ کہنے کو یہ بات بہت ڈراؤنی ہے لیکن حقیقت یہی ہے کہ جب وہ اسے بغور دیکھتی تھی، اس خیال سے نہیں دیکھتی تھی کہ اسے اس کی حالت میں اصلاح کے کوئی آثار نظر آ جائیں گے بلکہ وہ اس قسم کی علامات، جن سے یہ عندیہ مل جاتا کہ اس کا انجام کب ہو رہا ہے، ڈھونڈنے میں مصروف ہو جاتی۔

اگرچہ اپنے باطن میں اس احساس کو تسلیم کرنا اسے عجیب لگتا تھا لیکن یہ موجود تھا، لیکن پرنس ماریا کو اس سے بھی زیادہ وحشت جس چیز سے ہو رہی تھی وہ یہ تھی کہ جب سے اس کا باپ بستر سے لگا تھا (شاید اس سے بھی پہلے جب اس نے کسی چیز کے ظہور پذیر ہونے کی توقع میں اس کے ساتھ مقیم رہنے کا تہیہ کیا تھا)، وہ تمام ذاتی امیدیں اور آرزوئیں، جنہیں فراموش کر دیا گیا تھا یا جو اس کے نہاں خانہ دل کے کسی گوشے میں خوابیدہ تھیں، انگڑائیاں لینے لگی تھیں۔ وہ خیالات — اپنے باپ کے مسلسل خوف سے آزاد زندگی، پر محبت اور پرمسرت شادی شدہ زندگی کے امکانات —، جو برسوں سے اس کے دماغ میں نہیں آئے تھے، شیطانی ترغیبات کی طرح پیہم اس کے تخیل پر یلغار کرنے

لگے۔ اب جب کہ یہ معاملہ اختتام پذیر ہوا چاہتا تھا، اس قسم کے سوالات کہ وہ اپنی زندگی کس انداز سے ترتیب دے گی، وہ ان سے بچنے کی خواہ کتنی ہی سر توڑ کوشش کیوں نہ کرتی، ہر دم اس کے ذہن پر سوار رہنے لگے۔ یہ شیطانی ترغیبات تھیں اور پرنس ماریا کو اس کا علم تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس (شیطان) کے خلاف واحد (کارگر) ہتھیار عبادت ہے اور وہ عبادت کرنے کی کوشش کرتی۔ وہ عبادت کا انداز اختیار کرتی، ایقونوں کے سامنے بیٹھ جاتی اور انھیں ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگتی۔ وہ دعا کے الفاظ دہراتی لیکن اس سے دعا مانگی نہ جاتی۔ اسے محسوس ہونے لگتا کہ ایک مختلف قسم کی دنیا اس پر قابض ہوگئی ہے — ارضی، پر مشقت، آزادانہ عمل کی دنیا، جو اس روحانی دنیا سے، جس میں وہ اب تک محدود رہی تھی اور جس میں اسے عظیم ترین تسکین دعا اور عبادت سے ملتی تھی، بالکل جداگانہ ہے۔ اب اس سے نہ دعا مانگی جاتی اور نہ رویا جاتا تھا، اور دنیوی تفکرات اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو چکے تھے۔

باگوچارافو میں مزید قیام خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ تمام اطراف سے فرانسیسیوں کی آمد کی خبریں مل رہی تھیں اور باگوچارافو سے دس بارہ میل دور ایک گاؤں میں فرانسیسی قزاقوں نے ایک گھرانے کو تاخت و تاراج کر دیا تھا۔

ڈاکٹر کا اصرار تھا کہ پرنس کو یہاں سے منتقل کرنا ضروری ہے۔ امراء کے صوبائی مارشل نے پرنس ماریا کے پاس اہلکار بھیجا تاکہ وہ اسے حتی الامکان جلد از جلد رخصت ہونے کے لیے آمادہ کر سکے۔ ضلعی پولیس کا سربراہ خود باگوچارافو آیا اور اس نے بھی اسی بات پر زور دیا۔ اس نے بتایا کہ فرانسیسی صرف پندرہ میل دور ہیں، اور ان کے اعلانات دیہاتوں میں پہنچائے جا رہے ہیں۔ ان حالات میں اگر پرنس نے اپنے باپ کے ساتھ پندرہ تاریخ سے پہلے پہلے وہاں سے کوچ نہ کیا، نتائج کا ذمے دار وہ نہیں ہوگا۔

پرنس نے پندرہ کو روانگی کا فیصلہ کیا۔ چودہ تاریخ کو اس نے سارا دن تیاریاں کرنے اور ضروری ہدایات، جن کے لیے اب ہر کوئی اس کے پاس آتا تھا، دینے میں گزارا۔ معمول کے مطابق اس نے چودہ کی رات اس کمرے میں، جو پرنس کے کمرے سے ملحق تھا، گزاری۔ اس کی متعدد مرتبہ آنکھ کھلی، اس کے کراہنے اور بڑبڑانے کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکراتیں۔ اسے اس کے پلنگ کی چرچراہٹ اور ڈاکٹر اور تیخون کے قدموں کی چاپ، جو ان کے اس کا پہلو بدلوانے کے دوران میں پیدا ہوتی، سنائی دیتی۔ وہ بار بار دروازے کے پاس جاتی، کان لگا کر سنتی اور اسے محسوس ہوتا کہ وہ جس طرح بڑبڑا رہا ہے، اس کی آواز معمول سے کہیں زیادہ ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ وہ اس کا پہلو بار بار بدلوا رہے ہیں۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وہ گھڑی گھڑی اٹھتی اور سن گن لینے کے لیے دروازے کے قریب پہنچ جاتی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے دل میں خیال آیا کہ وہ اندر چلی جائے لیکن حوصلہ نہ کر سکی۔ اگرچہ وہ بول نہیں سکتا تھا لیکن وہ دیکھتی بھی تھی اور اسے یہ معلوم بھی تھا کہ وہ یہ بات سخت ناپسند کرتا ہے کہ کوئی شخص اپنے چہرے کے تاثرات سے یہ ظاہر کرے کہ اسے اس کے بارے میں تشویش ہے۔ وہ یہ بات بھانپ چکی تھی کہ جونہی اس کی مشوش نگاہیں غیر ارادی طور پر بھی اس کے چہرے کی طرف اٹھتی ہیں، وہ خفا ہو جاتا ہے اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اگر وہ رات کو کسی ایسے وقت، جو معمول سے ہٹ کر ہوا، اس کے کمرے

میں گئی، وہ برافروختہ ہو جائے گا۔

لیکن اس کی حالت پر اب اسے جو ترس آ رہا تھا، اس سے پہلے کبھی نہیں آیا تھا اور نہ اسے اس احساس سے کہ وہ اس کے سایۂ عاطفت سے محروم ہو جائے گی، کبھی اتنا دکھ پہنچا تھا جتنا کہ اب پہنچ رہا تھا۔ اس نے اس کے ساتھ جو زندگی گزاری تھی، اس کا ایک ایک لمحہ اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا، اور اسے اس کا ایک ایک لفظ اپنے لیے محبت سے بھرپور دکھائی دینے لگا۔ وقتاً فوقتاً ان یادوں میں رخنہ آ جاتا، اسے شیطان ورغلانے لگتا اور اسے اس قسم کے خیالات ستانے لگتے کہ اس کی موت کے بعد کیا ہوگا اور اسے آزادی کی جو نئی زندگی ملے گی، وہ اسے کیسے ترتیب دے گی۔ لیکن اسے ان خیالات سے گھن آنے لگتی اور وہ انھیں اپنے دماغ سے باہر نکال پھینکتی۔ پو پھٹنے کے قریب وہ نسبتاً پرسکون ہو گیا اور وہ سو گئی۔

وہ دیر سے جاگی۔ آنکھ کھلنے پر جس طرح دماغ اکثر تازہ دم ہو جاتا ہے اور ہر چیز واضح انداز سے سمجھنے لگتا ہے، اسے بھی بین اور غیر مبہم طور پر معلوم ہو گیا کہ اپنے باپ کی علالت کے دوران میں اسے کس چیز کی سب سے زیادہ فکر تھی۔ اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، جو کچھ دروازے کے پیچھے ہو رہا تھا، اس کی بھنک لی اور جب اس نے اسے کراہتے سنا، اس کی آہ نکل گئی اور وہ اپنے آپ سے کہنے لگی کہ ''حالات جوں کے توں ہیں، ان میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔''

''لیکن ہونا کیا چاہیے تھا؟ میں چاہتی کیا ہوں؟ میں چاہتی ہوں کہ وہ مر جائیں!'' اس نے چیختے ہوئے کہا اور اسے اپنے آپ سے نفرت ہونے لگی۔

اس نے ہاتھ منہ دھویا، کپڑے تبدیل کیے، مناجات کی تلاوت کی اور پورچ میں چلی گئی۔ دروازے پر چھکڑے کھڑے تھے۔ ان پر سامان لادا جا چکا تھا لیکن ابھی ان میں گھوڑے نہیں جوتے گئے تھے۔

یہ مٹیالی اور نیم گرم صبح تھی۔ پرنسس ماریا پورچ میں گھسی رہی۔ اپنی روحانی فضیحت پر وہ ابھی تک لرزہ براندام تھی اور اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہونے سے پہلے اپنے خیالات مجتمع کرنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔

ڈاکٹر سیڑھیاں اترتا نیچے آیا اور سیدھا اس کے پاس چلا آیا۔

''آج ان کی حالت قدرے بہتر ہے،'' اس نے کہا۔ ''میں آپ کو ڈھونڈتا پھر رہا ہوں۔ وہ جو کچھ فرما رہے ہیں، اس کا کچھ کچھ مفہوم سمجھنے میں آنے لگا ہے۔ ان کا ذہن صاف ہو چکا ہے اور وہ آپ کو بلا رہے ہیں۔''

یہ خبر سن کر پرنسس ماریا کا دل اتنے زور سے دھڑکا کہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی کہ کہیں وہ نیچے نہ گر پڑے۔ اب جب کہ اس کی روح ان خوف ناک اور فاسد خیالات سے اٹاٹ بھری ہوئی تھی، اسے دیکھنا، اس سے باتیں کرنا، اس کی نگاہوں کو اپنے جسم پر محسوس کرنا۔ یہ سب کچھ اس کے لیے اذیت ناک مسرت اور دہشت بن گیا تھا۔

''آئیں، تشریف لے چلیں،'' ڈاکٹر نے کہا۔

پرنسس ماریا اپنے باپ کے کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے پلنگ کی طرف قدم بڑھانے لگی۔ وہ پشت کے

بل لیٹا ہوا تھا۔ تکیوں کے سہارے اس کا دھڑ قدرے اوپر اٹھا دیا گیا تھا۔ اس کے مہین استخوانی ہاتھ گانٹھ دار ارغوانی رگوں سمیت، لحاف پر پڑے تھے۔ اس کی بائیں آنکھ ٹکٹکی باندھے سیدھا سامنے دیکھ رہی تھی۔ اس کی دائیں آنکھ قدرے ترچھی تھی اور اس کے ہونٹ اور ابرو بالکل ساکت تھے۔ وہ اتنا لاغر، اتنا کوتاہ اور اتنا قابل رحم نظر آ رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا چہرہ چرمرا چکا ہے یا پگھل گیا ہے، یوں اس کے خدوخال سکڑ گئے تھے۔ پرنسس ماریا آگے آئی اور اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔ اس کے بائیں ہاتھ نے اس کے ہاتھ کو کچھ اس طرح دبایا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے اس کے ہاتھ کو جھٹکا دیا اور غصے سے اس کے ابرو اور ہونٹ پھڑکنے لگے۔

وہ غم زدہ ہو گئی اور اس کی جانب دیکھنے لگی۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ اس سے چاہتا کیا ہے۔ جب وہ اپنی پوزیشن میں قدرے تبدیلی لائی تاکہ اس کی بائیں آنکھ اسے دیکھ سکے، وہ پہلے کی نسبت پرسکون ہو گیا اور کئی سیکنڈ اپنی نگاہ اس پر گاڑے رہا۔ پھر اس کے لب اور زبان حرکت کرنے لگے، اصوات برآمد ہونے لگیں اور وہ بولنے لگا۔ وہ گھبرائے گھبرائے اور ملتجیانہ انداز سے اسے دیکھ رہا تھا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ اس چیز سے خوف زدہ تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ نہیں پائے گی۔

پرنسس ماریا نے اپنی تمام صلاحیتوں پر دباؤ ڈالا اور اسے بغور دیکھنے لگی۔ اپنی زبان کو حرکت دینے کے لیے وہ جس قسم کی مضحک کوششیں کر رہا تھا، انھوں نے اسے اپنی نگاہیں جھکانے پر مجبور کر دیا۔ وہ رونا چاہتی تھی اور وہ بڑی مشکلوں سے اپنی چیخوں پر قابو پا سکی۔ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے بار بار دہرا رہا تھا۔ اگرچہ اس کے الفاظ کا مفہوم اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا لیکن وہ اپنے طور پر یہ قیافہ لگانے کی بھرپور کوشش کر رہی تھی کہ وہ کہہ کیا رہا ہے۔ اس کے منہ سے جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکل رہے تھے، اس نے انھیں سوالیہ انداز سے دہرایا۔

''رو... رو... مصی... مصی...'' وہ بار بار کہہ رہا تھا۔

سمجھنا ناممکن تھا۔ ڈاکٹر کو زعم تھا کہ وہ مطلب سمجھ گیا ہے اور اس نے پرنس سے کہا: ''میرا خیال ہے کہ وہ آپ سے کہہ رہے ہیں: 'تم ڈرتی ہو؟''' لیکن جب اس نے یہ الفاظ دہرائے، پرنس نے منفی انداز سے اپنے سر کو جنبش دی اور ایک بار پھر اپنی آوازوں کا اعادہ کرنے لگا۔

''روح... روح مصیبت میں ہے،'' پرنسس ماریا نے کہا۔

وہ تائید میں پوپلے منہ سے بڑبڑایا، اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور اس سے اپنے سینے کے مختلف حصے دبانے لگا جیسے وہ اس کے لیے صحیح جگہ تلاش کر رہا ہو۔

''ہمیشہ... ہمیشہ... تمھارے بارے... میں سوچ... سوچتا رہا ہوں۔'' اب جب کہ اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہے ہیں، اس کی زبان پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح انداز سے چل پڑی تھی۔

پرنسس ماریا اپنی سسکیوں اور آنسوؤں کو روکنے کے لیے اپنا سر اس کے ہاتھ پر مسلنے لگی۔

وہ اپنا ہاتھ اس کے بالوں پر پھیرنے لگا۔

''میں ساری رات... تمھیں... آوازیں دیتا رہا،'' اس نے بدقت کہا۔

''کاش مجھے معلوم ہوتا،'' اس نے آنسوؤں اور سسکیوں کے مابین کہا۔ ''میں آتے ڈرتی تھی۔''

وہ اس کا ہاتھ دبانے لگا۔

''تم سوئیں نہیں؟''

''نہیں، مجھے نیند نہیں آرہی تھی،'' پرنسس ماریا نے منفی انداز سے اپنے سر کو جنبش دے کر کہا۔

غیر شعوری طور پر اپنے باپ کی نقالی کرتے وہ اسی کے انداز سے اپنا مفہوم ادا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔ وہ زیادہ تر اشاروں کنایوں سے کام لے رہی تھی جیسے اسے بھی اپنی زبان سنبھالنے میں دقت پیش آرہی ہو۔

''جانِ من...'' یا یہ ''عزیز از جان من'' تھا؟... پرنسس ماریا سمجھ نہ سکی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ تاہم اس کی نگاہوں میں جو شفقت جھلک رہی تھی، اس سے اسے اس بارے میں قطعاً کوئی شبہ نہ رہا کہ اس نے کوئی ملائم، محبت بھرا لفظ، جو اس سے پہلے اس نے کبھی اس کے لیے استعمال نہیں کیا تھا، کہا ہے۔ ''تم آئیں کیوں نہ؟''

''اور میں... میں ان کی موت کی تمنا کر رہی تھی!'' پرنسس ماریا نے سوچا۔

وہ کچھ دیر خاموش رہا۔

''شکریہ... پیاری بیٹی... مجھے سب کچھ... سب کچھ... معاف کردو... شکریہ... معاف کردو،'' اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

''آندریوشکا کو بلاؤ،'' اس نے اچانک کہا اور اس کے چہرے پر بے یقینی کی ڈری سہمی، بچگانہ کیفیت طاری ہوگئی۔

اس کی یہ کیفیت کچھ اس قسم کی تھی جیسے اسے معلوم ہو کہ اس کی یہ درخواست قدرے غیر معقول ہے یا پھر پرنسس ماریا کو یہی محسوس ہوا۔

''مجھے ان کا خط موصول ہوا تھا،'' وہ جواب میں بولی۔

وہ جھجکتے جھجکتے حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔

''وہ کہاں ہے؟''

''mon pere* وہ فوج کے ساتھ سمولنسک میں ہے۔''

وہ کافی دیر خاموش رہا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ پھر ایسے جیسے اس کے تمام شکوک کا ازالہ ہو گیا ہو اور جیسے وہ اس امر کا ادعا کر رہا ہو کہ وہ سب کچھ سمجھ گیا ہے اور اسے ہر چیز یاد آگئی ہے، اس نے مثبت انداز سے اپنا سر ہلایا اور دوبارہ اپنی آنکھیں کھول دیں۔

''ہاں،'' اس نے ملائم اور واضح انداز سے کہا۔ ''روس ختم ہو گیا ہے۔ انھوں نے اس کا بیڑا غرق کر دیا ہے!''

* اباجان

وہ ایک بار پھر سسکیاں لینے لگا اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

پرنسس ماریا کے لیے اب مزید ضبط کرنا ناممکن ہو گیا اور وہ اس کے چہرے پر نظریں جمائے کھل کر رونے لگی۔

اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی سسکیاں تھم گئی تھیں۔ اس نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا۔ تیخون سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتا ہے اور اس نے اس کے آنسو پونچھ ڈالے۔

اس نے دوبارہ اپنی آنکھیں کھولیں اور کچھ کہا لیکن کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس نے کیا کہا ہے تا آنکہ تیخون نے اندازہ لگالیا کہ اس نے کیا کہا ہے اور اس نے اسے دہرادیا۔ پرنسس ماریا اس کے الفاظ کے مفہوم کا سلسلہ ان اشیا سے، جن کے متعلق وہ ابھی ابھی باتیں کررہا تھا، جوڑنے کی کوشش کررہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ وہ لازماً روس، پرنس آندرے، خود اس (پرنسس ماریا) کے، اپنے پوتے اور اپنی موت کے متعلق اشارہ کررہا ہوگا، چنانچہ وہ یہ نہ بھانپ سکی کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔

''اپنا سفید ڈریس پہن لو،'' اس نے کہا تھا۔

اور جب پرنسس ماریا کی سمجھ میں آیا کہ اس نے کیا کہا ہے، وہ پہلے سے زیادہ بلند آواز میں رونے لگی۔ ڈاکٹر نے اسے بازو سے پکڑا اور باہر برآمدے میں لے گیا۔ وہ اس پر زور دے رہا تھا کہ وہ صبر و تحمل سے کام لے اور سفر کے لیے تیاریاں جاری رکھے۔

جب وہ کمرے سے باہر چلی گئی، پرنس دوبارہ اپنے بیٹے، جنگ اور امپراطور کے متعلق باتیں کرنے لگا۔ وہ غیظ و غضب سے اپنے ابرو جھٹکا رہا اور اپنی گلوگرفتہ آواز بلند کررہا تھا۔ پھر دوسرا اور آخری حملہ ہوا۔

پرنسس ماریا ابھی تک برآمدے میں تھی۔ آسمان نکھر چکا تھا، دھوپ چمک رہی تھی اور موسم گرم تھا۔ وہ نہ کچھ سمجھ پارہی تھی، نہ اس سے کچھ سوچا جاتا تھا اور نہ اسے کچھ محسوس ہوتا تھا۔ اس پر صرف ایک ہی جذبہ شدت سے غالب تھا اور وہ تھا اپنے باپ سے محبت کا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اب تک وہ اس جذبے سے نا آشنا رہی تھی۔ وہ روتی کلبلاتی دوڑ کر باغ میں چلی گئی اور ان روشوں پر، جن کے کنارے کنارے پرنس آندرے نے لیموں کے پودے لگوائے تھے، چلتی تالاب کی طرف بڑھنے لگی۔

''ہاں... میں... میں... میں نے ان کی موت کی تمنا کی تھی! ہاں... میں چاہتی تھی کہ یہ جلد از جلد آجائے... تاکہ مجھے سکون مل جائے۔ لیکن میرا کیا بنے گا؟ اگر وہ منہ موڑ گئے، پھر یہ سکون میرے کس کام آئے گا؟'' پرنسس ماریا بڑبڑارہی تھی۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی باغ میں گھوم پھر رہی تھی۔ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی چھاتی، جو اس کے تشنج آلود آہیں بھرنے سے اوپر نیچے اٹھ رہی تھی، دبا رہی تھی۔

جب وہ باغ کا چکر مکمل کرچکی، وہ دوبارہ مکان کے قریب پہنچ گئی۔ اسے مادموزیل بوغین (جو باگوچارافو میں ہی مقیم رہی تھی اور وہاں سے جانے سے انکار کرچکی تھی) نظر آئی۔ وہ کسی اجنبی کے ساتھ اس کی طرف آرہی تھی۔ نو وارد شرفا کا ضلعی مارشل تھا۔ وہ بذات خود پرنسس ماریا کو سمجھانے آیا تھا کہ اس کا فوری طور پر روانہ ہونا ضروری

ہے۔ پرنس ماریا اس کی باتیں سنتی رہی لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وہ اسے گھر کے اندر لے گئی، اس نے اسے لنچ پیش کیا اور اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ پھر اس نے معذرت چاہی اور معمر پرنس کے کمرے کے دروازے کی طرف چل پڑی۔ ڈاکٹر آشفتہ حال اس کی جانب آیا اور اسے بتانے لگا کہ وہ اندر نہیں جا سکتی۔

"پرنس، جائیں! یہاں سے چلی جائیں!—"

وہ واپس باغ میں چلی گئی اور ڈھلوان کے دامن میں تالاب کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئی۔ وہاں اسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ ہوا کہ وہاں وہ کتنی دیر ٹھہری رہی۔ کوئی شخص روش پر بھاگا آ رہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ سن کر اس کے حواس بیدار ہو گئے۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اسے اپنی ملازمہ دنیاشا، جو بظاہر اسے تلاش کرتی پھر رہی تھی، نظر آئی۔ اس نے جب اپنی مالکہ کو دیکھا، اس کے قدم رک گئے۔

"پرنس، پرنس... پرنس..." دنیاشا نے پھٹی پھٹی آواز میں کہا۔

"آئی، ابھی آئی!" پرنس نے چلا کر بہت تیزی سے کہا۔ اس نے دنیاشا کو اپنی بات ختم کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔ اس کی کوشش تھی کہ خادمہ پر اس کی نظر نہ پڑے اور وہ مکان کی جانب دوڑنے لگی۔

"پرنس، یہ خداوند کا منشا ہے۔ آپ کو بری سے بری خبر سننے کے لیے تیار رہنا چاہیے،" مارشل نے مکان کے دروازے پر اس کا سامنا کرتے ہوئے کہا۔

"مجھے تنہا چھوڑ دیں! یہ جھوٹ ہے!" پرنس نے جھلا کر کہا۔

ڈاکٹر نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا اور خود اپنے باپ کے کمرے کی جانب بھاگنے لگی۔ "یہ سب اتنے خوف زدہ کیوں نظر آ رہے ہیں اور مجھے روک کیوں رہے ہیں؟ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے اور یہ یہاں کیا کر رہے ہیں؟" اس نے دروازہ کھولا اور اس کمرے میں، جہاں قبل ازیں تاریکی تھی، دن کی تیز روشنی نے اس کے حواس باختہ کر دیے۔ اس کی ادھیڑ عمر نرس اور بعض دیگر خواتین کمرے میں تھیں۔ اسے رستہ دینے کے لیے وہ سب پلنگ سے پرے ہٹ گئیں۔ پرنس پہلے کی طرح پلنگ پر لیٹا ہوا تھا لیکن اس کے پرسکون چہرے کی درشتی نے پرنس ماریا کے پاؤں دہلیز پر ہی روک دیے۔

"نہیں، ان کا انتقال نہیں ہوا— ایسا ہو ہی نہیں سکتا!" پرنس ماریا نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ پلنگ کے قریب پہنچی اور جس خوف و دہشت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، اس کے خلاف جدوجہد کرتے اس نے اپنے ہونٹ اس کے رخساروں پر ثبت کر دیے لیکن پلک جھپکنے میں وہ بدک کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے سامنے پلنگ پر جو کچھ پڑا تھا، وہ اتنا دہشت ناک اور مہیب تھا کہ اس کے سامنے محبت اور شفقت کے جذبات، جو وہ اس کے لیے اپنے دل میں محسوس کر رہی تھی، آناً فاناً کافور ہو گئے۔ "نہیں، اب وہ نہیں رہے! وہ اب نہیں رہے بلکہ اس جگہ، جہاں وہ دراز تھے، کوئی اجنبی، دہشت ناک، لرزہ انگیز، ڈراؤنی، مہیب، پراسرار چیز پڑی ہے!" پرنس ماریا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا اور ڈاکٹر کے، جس نے اسے سہارا دے کر کھڑے رکھا تھا، بازوؤں

میں گر پڑی۔

تیخون اور ڈاکٹر کی نظروں کے سامنے عورتوں نے اسے، جو کبھی پرنس تھا، غسل دیا۔ انھوں نے اس کے سر کے گرد رومال باندھ دیا تا کہ منہ کھلا رہنے کی وجہ سے اس کا جبڑا اکڑ نہ جائے اور ایک دوسرے رومال سے اس کی دونوں ٹانگیں آپس میں باندھ دیں۔ اس کے بعد انھوں نے اسے اس کی وردی پہنائی، اس کے تمغے اور اعزازات اس کے سینے پر چسپاں کیے اور اس کے مختصر جسم کو، جو چر مراچکا تھا، میز پر لٹا دیا۔ صرف خدا جانتا ہے کہ یہ سب کچھ کس نے اور کس وقت کیا، لیکن یہ سب کچھ ایسے ہوا جیسے اپنے آپ ہو گیا ہو۔ سرِ شام اس کے تابوت کے ارد گرد موم بتیاں جلنے لگیں، اس کی میت پر ماتمی چادر ڈال دی گئی اور فرش پر جونی پر[22] (Juni per) کا تیل چھڑک دیا گیا۔ اس کے جھریاں زدہ سر کے نیچے طغریٰ، جس پر مناجات چھپی ہوئی تھیں، ٹانک دیا گیا اور کمرے کے کونے میں بیٹھا نائب پادری مناجات کی تلاوت کرنے لگا۔

جس طرح مردہ گھوڑے کے گرد دوسرے گھوڑے بدکنے لگتے ہیں، زور زور سے نتھنے پھلاتے ہیں اور ایک دوسرے سے دھکم پیل کرتے ہیں، بعینہٖ مکان کے مکین اور باہر کے لوگ ــ مارشل، گاؤں کا سرپنچ اور کسان عورتیں ــ سبھی اپنی نگاہیں، جن میں خوف تیر رہا تھا، گاڑے، سینوں پر صلیب کے نشان بناتے نیچے جھکتے اور مرحوم پرنس کے ٹھنڈے اور اکڑے ہوئے ہاتھ کو بوسہ دینے لگتے۔

9

جب تک پرنس آندرے نے باگوچارافو میں رہائش اختیار نہیں کی، اس جاگیر پر غیر حاضر زمینداروں کا قبضہ رہا تھا۔ چنانچہ باگوچارافو کے کسان بالڈ ہلز کے کسانوں کے مقابلے میں مختلف کردار کے مالک تھے۔ وہ گفتگو، لباس، مزاج، ہر اعتبار سے ان سے جدا تھے۔ وہ سٹیپ (گھاس کے میدانوں کے) کسان تھے۔ جب وہ فصلوں کی کٹائی میں مدد دینے یا تالاب اور خندقیں کھودنے بالڈ ہلز آتے، معمر پرنس ان کی قوت برداشت کی تعریف ضرور کرتا لیکن وہ ان کے ازمنہ قدیم کے طور طریقے ناپسند کرتا تھا۔

باگوچارافو میں اپنے گزشتہ قیام کے دوران میں پرنس آندرے نے جو اختراعات ــ شفاخانوں اور درسگاہوں کی تعمیر اور اپنی آزادی حاصل کرنے کے خواہش مند کسانوں کے لگان میں تخفیف ــ کی تھیں، وہ نہ صرف ان کے اطوار میں ملائمت پیدا کرنے میں ناکام رہیں بلکہ اس کے برعکس ان کے رنگ ڈھنگ کی وہ خصوصیات، جنھیں معمر پرنس بھونڈا اور قدیم قرار دیتا تھا، اور شدید ہو گئیں۔

ان میں مبہم اور گول مول افواہیں ہمیشہ گردش کرتی رہتی تھیں۔ ایک وقت آیا جب انھیں یقین ہو گیا کہ ان

سب کو قازق کی حیثیت سے (فوج یا ملیشیا میں) بھرتی کر لیا جائے گا۔ پھر دوسرا وقت آیا اور وہ سمجھنے لگے کہ انھیں نیا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔ پھر زار کے کسی فرضی اعلان کی باتیں ہونے لگیں۔ اس کے بعد زار پاول پیتروِچ[23] کے 1897 کے حلف کا ذکر ہونے لگا۔ (یہ کہا جانے لگا کہ اس حلف میں زار نے انھیں آزادی دے دی تھی لیکن جاگیرداروں نے انھیں اس سے محروم رکھا ہے۔) پھر انھیں توقع بندھنے لگی کہ پیوتر فیدوروِچ[24] سات سال کے اندر دوبارہ تخت نشین ہو جائے گا، ان سب کو آزادی مل جائے گی اور ہر چیز اتنی آسان ہو جائے گی کہ کسی قانون کی ضرورت باقی نہیں رہ جائے گی۔ جس طرح دجال، دنیا کے خاتمے اور آزادیٔ مطلق کے متعلق مبہم اور غیر واضح تصورات ان کے دماغوں میں رچے بسے تھے، ایسے ہی جنگ، بوناپارت اور اس کے حملے کے بارے میں کچی پکی افواہیں ان کے ذہنوں میں بار پانے لگیں۔

باگوچارافو کے نواح میں بڑے بڑے دیہات کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ ان کی ملکیت یا حکومت کے پاس تھی یا ان مالکوں کے، جن کے کسان اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے لگان ادا کرتے تھے اور جہاں ان کا جی چاہتا، وہاں کام کر سکتے تھے۔ قرب و جوار میں بہت کم رہائشی مالکان زمین تھے۔ نتیجتاً گھریلو یا خواندہ غلاموں کی تعداد بھی آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ اس زمانے میں روسیوں کی زندگی میں جو پراسرار زیر سطح لہریں[25] رواں دواں تھیں، کسی بھی دوسرے علاقے کی نسبت یہاں کے کسانوں کی زندگیاں ان سے کہیں زیادہ پرزور اور واضح انداز سے متاثر تھیں۔ اس کی وجوہ کیا تھیں یا ان کی اہمیت کیا تھی، یہ عقدہ معاصرین سے حل نہ ہو سکا اور وہ اکثر اوقات چکرا کر رہ جاتے۔ اس قسم کا ایک محیر العقول واقعہ کوئی بیس سال قبل رونما ہوا تھا جب کسانوں کے اذہان میں بعض نامعلوم "نیم گرم دریاؤں" کی طرف ترک وطن کرنے کا سودا سما گیا۔ ہزاروں کسان، جن میں باگوچارافو کے کسان بھی شامل تھے، اچانک اپنے مویشی فروخت کرنے اور اپنے خاندانوں سمیت جنوب مشرقی سمت کوچ کرنے لگے۔ ان پرندوں کی طرح، جو پرواز کر کے سمندر پار کہیں جا رہے ہوتے ہیں، یہ لوگ بھی اپنے بیوی بچوں سمیت جوق در جوق مشرق میں ان علاقوں کی جانب، جہاں ان میں سے قبل ازیں کوئی بھی نہیں گیا تھا، عازم سفر ہونے لگے۔ وہ کارواں بناتے، ایک ایک کر کے اپنی آزادی خریدتے اور پیدل یا چھکڑوں پر "نیم گرم دریاؤں" کی جانب چل پڑتے۔ بعض ویسے ہی بھاگ نکلتے۔ کئیوں کو سزائیں دی گئیں اور سائبیریا بھیج دیا گیا۔ بہت سے بھوک پیاس یا سردی سے راستے میں مر گئے۔ متعدد اپنی مرضی سے واپس آ گئے اور یہ تحریک جس طرح کسی ظاہری وجہ[26] کے بغیر شروع ہوئی تھی، اسی طرح دم توڑ گئی۔ لیکن یہ زیریں سطح رویں اب بھی چل رہی اور لوگوں کو متاثر کر رہی تھیں اور اپنے اظہار کے لیے کسی نئے محرک کی منتظر تھیں۔ یہ جب منظر عام پر آتیں، تو بالکل فطری، سادہ اور پرتشدد معلوم ہوتیں لیکن یہ کہ ایسا ہوگا، کسی کو بھی اس کی توقع نہ ہوتی اور نہ اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں آتی۔ اب 1812 میں ہر اس شخص پر، جو ان کسانوں کے قریب رہتا تھا، یہ بات بالکل عیاں تھی کہ یہ زیر سطح لہریں غیر معمولی قوت سے رواں دواں ہیں اور کسی نہ کسی قسم کا جوالا مکھی پھٹ پڑنے کو بے تاب ہے۔

آل پاچ، جو معمر پرنس کے انتقال سے صرف چند دن قبل باگوچارافو پہنچا تھا، بھانپ گیا کہ کسانوں میں ہلچل پائی جاتی ہے۔ وہ سمجھ گیا کہ بالڈ ہلز میں جو کچھ ہو رہا ہے، یہاں اس کے بالکل برعکس ہو رہا ہے۔ بالڈ ہلز کا حال یہ تھا کہ وہاں چالیس میل سے بھی زیادہ دائرے کے اندر جتنے کسان تھے، وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر فرار ہو رہے تھے اور جن دیہاتوں کو وہ خالی کرتے تھے، قازق انھیں تاخت وتاراج کر دیتے تھے۔ اس کے برعکس باگوچارافو اور اس کے گردونواح گھاس کے میدانوں کے کسانوں کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ ان کے فرانسیسیوں کے ساتھ روابط ہیں، وہ ان سے دو یا چار ورقی کتابچے وصول کر رہے اور ہاتھوں ہاتھ ایک سے دوسرے شخص تک پہنچا رہے ہیں، اور یہ کہ ان کا اپنے گھروں کو چھوڑنے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اسے گھریلو غلاموں کی، جو اس کے وفادار تھے، وساطت سے معلوم ہوا کہ ایک کسان، جس کا نام کارپ ہے، جسے دیہی کمیون[27] میں زبردست اثر ورسوخ حاصل ہے اور جو حالیہ دنوں میں سرکاری گاڑی ہانکنے کا کام سرانجام دیتا رہا ہے، یہ خبر لے کر واپس آیا ہے کہ قازق دیہات کی اینٹ سے اینٹ بجا رہے ہیں لیکن فرانسیسی ان سے کوئی تعرض نہیں کرتے۔ آل پاچ کو یہ بھی معلوم تھا کہ گزشتہ روز ایک اور کسان وسلوخادو گاؤں سے، جس پر فرانسیسیوں کا قبضہ تھا، کسی فرانسیسی جرنیل کے فرمان کی نقل بھی لے آیا ہے۔ اس فرمان میں یہ کہا گیا تھا کہ مقامی باشندوں کو، بشرطیکہ وہ جہاں ہیں، وہیں مقیم رہیں، کوئی گزند نہیں پہنچایا جائے گا اور ان سے جو چیز بھی لی جائے گی، اس کی انھیں قیمت ادا کی جائے گی۔ ثبوت کے طور پر وہ کسان وسلوخادو سے نوٹوں کی شکل میں سو روبل لایا تھا۔ (اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ نوٹ جعلی ہیں۔) یہ رقم اسے خشک گھاس کے عوض پیشگی ادا کی گئی تھی۔

اور آخر میں، اور یہ اہم ترین بات تھی، آل پاچ کو معلوم ہوا کہ جس روز اس نے باگوچارافو سے پرنس ماریا کا سامان منتقل کرنے دیہی سرپنچ کو چھکڑے اکٹھے کرنے کا حکم دیا تھا، اسی روز گاؤں میں (کسانوں کا) اجلاس منعقد ہوا تھا اور اس میں انھوں نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ وہاں سے کہیں نہیں جائیں گے بلکہ انتظار کریں گے۔ لیکن وقت اتنا کم تھا کہ اسے مزید ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ پندرہ اگست کو، جس روز معمر پرنس کا انتقال ہوا، مارشل نے اصرار کیا تھا کہ پرنس کو بلا تاخیر روانہ ہو جانا چاہیے کیونکہ وہاں ٹھہرنا خطرناک سے خطرناک تر ہوتا جا رہا تھا۔ وہ اسے بتا چکا تھا کہ سولہ تاریخ کے بعد جو کچھ وقوع پذیر ہوا، وہ اس کے لیے جواب دہ نہیں ہوگا۔ وہ اسی شام واپس چلا گیا تھا لیکن چلتے چلتے وعدہ کر گیا تھا کہ وہ اگلے روز تجہیز وتکفین کی رسوم میں شریک ہونے واپس آئے گا۔ لیکن وہ واپس نہ آسکا کیونکہ اسے اطلاع ملی تھی کہ فرانسیسی غیر متوقع طور پر آگے بڑھ آئے ہیں اور اسے بڑی مشکل سے صرف اتنا وقت مل سکا کہ وہ اپنی جاگیر سے اپنا خاندان اور قیمتی اشیا کہیں اور منتقل کر سکے۔

کوئی تیس سال سے باگوچارافو کا نظم ونسق دیہاتی سرپنچ ڈرون کے ہاتھوں میں چلا آرہا تھا۔ معمر پرنس اسے ہمیشہ درونشکا کہتا تھا۔ وہ ان کسانوں — جسمانی اور ذہنی اعتبار سے چاق چوبند — میں شامل تھا جو بلوغت کی عمر کو پہنچتے ہی لمبی لمبی داڑھیاں رکھ لیتے ہیں اور جن میں ساٹھ ستر کے پیٹے میں داخل ہونے سے پہلے کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ نہ ان کا کوئی بال سفید ہوتا ہے اور نہ ان کا کوئی دانت گرتا ہے۔ وہ ساٹھ کے تو ہو جاتے ہیں لیکن ان کے

اجسام اسی طرح توانا اور سیدھے ہوتے ہیں جیسے وہ تیس سال کی عمر میں تھے۔

''نیم گرم دریاؤں'' کی طرف کوچ کے، جس میں دوسروں کے ساتھ وہ بھی شریک تھا، کچھ ہی عرصہ بعد درون کو باگوچارافو کا سرپنچ اور اوورسیر مقرر کر دیا گیا اور وہ تئیس سال سے ان عہدوں کے فرائض اتنی خوبی سے سرانجام دے رہا تھا کہ کسی کو مین مکھ نکالنے کا موقع نہ دیا۔ کسان اپنے مالک سے اتنے خائف نہیں تھے جتنے کہ اس سے۔ معمر اور نوجوان، دونوں پرنس، اور سٹیوارڈ اس کی عزت کرتے اور ازرہ مذاق اسے ''منسٹر'' کہا کرتے تھے۔ اپنی ساری ملازمت کے دوران میں درون نہ تو کبھی نشے سے مدہوش ہوا اور نہ کبھی بیمار پڑا۔ انتہائی جان لیوا مشقت کرنے یا بے خواب راتیں گزارنے کے بعد بھی اس میں تھکن کے کبھی معمولی آثار بھی دکھائی نہیں دیے تھے اور اگرچہ اسے پڑھنا آتا تھا نہ لکھنا، وہ حساب کتاب کے معاملے میں اتنا تیز تھا کہ پائی پائی کا خیال رکھتا اور ایک پیسہ بھی ادھر ادھر نہیں ہونے دیتا تھا۔ وہ پرنس کا لاتعداد چھکڑے آٹا فروخت کرتا لیکن مجال ہے کہ ایک آدھ سیر کا بھی ہیر پھیر ہو جانا اور وہ باگوچارافو کے کھیتوں کے ایک ایک ایکڑ سے گندم کا ایک ایک گٹھا وصول کیے بغیر دم نہ لیتا۔

بالڈ ہلز کی لٹی پٹی جاگیر سے اپنی آمد کے بعد آل پاچ نے اسی درون کو پرنس کی تجہیز و تکفین کے روز بلایا۔ اس نے اسے بتایا کہ پرنس کی بگھیوں اور دوسری گاڑیوں کے لیے ایک درجن گھوڑے اور باگوچارافو سے اس کا سامان منتقل کرنے کے لیے اٹھارہ چھکڑے تیار کیے جائیں۔ اگرچہ کسان اپنی آزادی حاصل کرنے کے لیے لگان ادا کرتے تھے، آل پاچ کے کبھی ذہن و گمان میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی کہ اس کے اس حکم کی تعمیل میں کوئی دقت پیش آئے گی کیونکہ باگوچارافو میں جو گھرانے لگان ادا کرتے تھے ان کی تعداد اڑھائی سو تھی اور کسان خوشحال تھے۔ لیکن حکم سن کر درون نے نظریں جھکا لیں اور خاموش رہا۔ آل پاچ نے بعض کسانوں کا، جنھیں وہ جانتا تھا، نام لیا اور اس سے کہا کہ ان سے چھکڑے لے لیے جائیں۔

درون نے جواب دیا کہ ان لوگوں کے گھوڑے کرائے پر گئے ہوئے ہیں۔ آل پاچ نے دوسروں کے نام لیے لیکن درون کے بقول ان کے گھوڑے بھی دستیاب نہیں تھے۔ بعض گھوڑے سرکاری گاڑیوں میں جتے ہوئے تھے، بعض بالکل کمزور تھے اور بعض چارہ نہ ملنے کے سبب مر کھپ گئے تھے۔ بگھیوں وغیرہ کے لیے بھی کافی گھوڑے میسر آنے کی کوئی امید نہیں تھی۔

آل پاچ نے گھور کر درون کی جانب دیکھا اور اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جس طرح درون مثالی دیہی سرپنچ تھا، اسی طرح آل پاچ مثالی سٹیوارڈ تھا۔ وہ گزشتہ بیس سالوں سے پرنس کی جاگیروں کا یونہی منتظم نہیں چلا آ رہا تھا۔ جن لوگوں سے اسے نپٹنا پڑتا تھا، اسے ان کی جبلتوں اور ضرورتوں کو بھانپنے کا غیر معمولی ملکہ حاصل تھا اور اسی بنا پر وہ اتنا اعلیٰ پائے کا سٹیوارڈ تھا۔ اس کے لیے یہ اندازہ لگانے کے لیے درون پر ایک نظر ہی ڈالنا کافی تھا کہ جس قسم کے جوابات وہ دے رہا ہے، وہ اس کے ذاتی خیالات کا اظہار نہیں بلکہ باگوچارافو کمیون کی عمومی ذہنی کیفیت کی، جس کی رو میں سرپنچ بہہ گیا تھا، عکاسی کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی معلوم تھا کہ

درون، جو اچھی خاصی رقم پس انداز کر چکا تھا اور جسے کیمون میں بنظر حقارت دیکھا جاتا تھا، دو فریقوں ــ ایک طرف مالک اور دوسری طرف کسان ــ کے مابین ڈگمگا رہا ہوگا۔ اس کا یہ تذبذب اسے اس کی آنکھوں میں نظر آ گیا۔ چنانچہ اس نے تیوریاں چڑھائیں اور درون کے قریب ہوگیا۔

''درونشکا' سنو!'' اس نے کہا۔ ''مجھ سے فضول باتیں مت کرو۔ ہز ایکسی لینسی پرنس آندرے نکولائی وچ نے بنفس نفیس مجھے حکم دیا تھا کہ تمام لوگوں کو یہاں سے نکال لیا جائے اور انھیں دشمن کے رحم و کرم پر نہ چھوڑا جائے اور زار کا بھی یہی حکم ہے۔ جو شخص یہاں مقیم رہے گا، زار سے غداری کا مرتکب متصور ہوگا۔ سنا تم نے؟''

''سن رہا ہوں،'' درون نے اپنی نگاہیں اٹھائے بغیر کہا۔

آل پاچ اس جواب سے مطمئن نہ ہوا۔

''ہاں، درون، مصیبت کھڑی ہو جائے گی،'' اس نے اپنا سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''حکم دینا آپ کا کام ہے!'' درون نے افسردگی سے کہا۔

''درون، چھوڑو، جانے دو!'' آل پاچ نے کوٹ کی اندرونی جیب سے ہاتھ نکالتے اور درون کے پاؤں تلے فرش کی طرف سنجیدگی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں تمھارے آر پار دیکھ سکتا ہوں ــ یہی نہیں بلکہ تمھارے قدموں کے تین گز نیچے زمین میں بھی دیکھ سکتا ہوں،'' اس نے درون کے پاؤں تلے فرش کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

درون گھبرا گیا۔ اس نے دزدیدہ نگاہوں سے آل پاچ کی جانب دیکھا اور ایک بار پھر اپنی نظریں جھکا لیں۔

''یہ بکواس ختم کرو اور لوگوں سے کہو کہ وہ اپنا بوریا بستر سمیٹیں اور ماسکو چلے جائیں۔ انھیں بتاؤ کہ وہ پرنس کے سامان کے لیے کل چھکڑے تیار رکھیں اور ہاں، ان کے جلسوں سے دور رہو، سنا تم نے؟''

درون اچانک دوزانو ہوگیا۔

''یا کوف آل پاچ، مجھے فارغ خطی دے دو! مسیح کا واسطہ، مجھ سے چابیاں لے لو اور مجھے فارغ خطی دے دو!''

''بند کرو یہ!'' آل پاچ نے درشتی سے کہا۔ ''میں تمھارے قدموں کے تین گز نیچے زمین میں دیکھ سکتا ہوں!'' اس نے ایک بار پھر کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے شہد کی مکھیاں پالنے اور جئی کی صحیح وقت پر کاشت کرنے میں جو مہارت حاصل ہے، اور اس پر مستزاد یہ کہ اسے بیس سال سے معمر پرنس کو مطمئن کرنے میں جو کامیابی ملتی رہی ہے، اس نے مدتوں سے اسے جادوگر کی حیثیت سے مشہور کر رکھا ہے اور یہ کہ کسی شخص کے پاؤں کے تین گز نیچے زمین میں دیکھنا جادوگروں کا ہی وصف گردانا جاتا ہے۔

درون سیدھا کھڑا ہوگیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ آل پاچ نے اسے ٹوک دیا۔

''یہ تم لوگوں کے بھیجوں میں کیا سما گیا ہے؟ ہونہہ... تم سوچ کیا رہے ہو؟ ہونہہ؟''

''میں لوگوں کو کیا سمجھاؤں؟'' درون نے کہا۔ ''ان سب میں ہیجان پھیلا ہوا ہے۔ میں انھیں بتا چکا ہوں...''

''''تم انھیں بتا چکے ہو!'' آل پاچ نے دہرایا۔ ''کیا ان سب کو نشہ چڑھ گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''یاکوف آل پاچ، ان سب میں ہیجان پھیلا ہوا ہے۔ انھیں نیا مشغلہ ہاتھ آ گیا ہے۔''

''پھر میری بات دھیان سے سنو۔ میں پولیس کپتان کے پاس جا رہا ہوں۔ تم انھیں یہ بتا دینا اور ان سے کہنا کہ وہ احمقانہ حرکتیں چھوڑ دیں اور چھکڑے تیار رکھیں۔''

''بہت اچھا،'' درون نے جواب دیا۔

آل پاچ نے مزید اصرار نہ کیا۔ اسے کسانوں سے نپٹتے اتنی مدت ہو چکی تھی کہ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ گیا تھا کہ ان سے حکم منوانے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انھیں مطلق شبہہ نہ ہونے دیا جائے کہ وہ حکم عدولی کر سکتے ہیں۔ اس نے درون سے جو اطاعت شعارانہ ''بہت اچھا'' اگلوالیا تھا، وہ اسی پر مطمئن ہو گیا حالانکہ وہ جانتا تھا کہ فوجی حکام کی مداخلت کے بغیر چھکڑے نہیں آئیں گے۔

چنانچہ یہی ہوا۔ شام ڈھل گئی، رات سر پر آ گئی لیکن چھکڑوں کا نام و نشان تک نہیں تھا۔ گاؤں میں شراب خانے کے باہر ایک اور جلسہ ہوا۔ اس میں یہ طے پایا کہ گھوڑے جنگل میں ہانک دیے جائیں اور چھکڑے فراہم نہیں کیے جائیں گے۔ آل پاچ نے پرنسس سے ایک لفظ کہے بغیر چھکڑوں سے اپنا وہ سامان، جو بالڈ ہلز سے اس کے ساتھ آیا تھا، اتروالیا۔ اس نے ان کے گھوڑے پرنسس کی گاڑیوں میں جتوا دیے اور خود حکام سے ملنے چلا گیا۔

10

اپنے باپ کے کفن دفن کے بعد پرنسس ماریا اپنے کمرے میں بند ہو گئی اور اس نے کسی شخص سے بھی ملنے سے انکار کر دیا۔ دروازے پر ایک خادمہ یہ بتانے آئی کہ آل پاچ روانگی کے متعلق ہدایات مانگ رہا ہے۔ (یہ اس کی درون سے گفتگو سے قبل کی بات ہے۔) پرنسس ماریا جس صوفے پر لیٹی ہوئی تھی، وہ اٹھ کر اس پر بیٹھ گئی اور بند دروازے میں سے جواب دینے لگی: ''میرا یہاں سے کہیں جانے کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں۔ میں ہاتھ جوڑ کر کہتی ہوں کہ میرے سکون میں خلل نہ ڈالیں۔''

وہ جس کمرے میں لیٹی ہوئی تھی، اس کی کھڑکیاں مغرب کی جانب کھلتی تھیں۔ وہ صوفے پر دراز تھی اور اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ وہ چرمی کشن کے بٹنوں پر انگلیاں پھیر رہی تھی۔ اسے کشن کے علاوہ اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا جب کہ اس کے پراگندہ خیالات صرف ایک موضوع پر — موت اٹل ہے اور وہ خود روحانی ضلالت میں گرفتار ہے — مرکوز تھے۔ جہاں تک اس کی روحانی ضلالت کا تعلق ہے، اسے اس کے بارے میں خفیف سا بھی علم نہیں تھا تاآنکہ اپنے باپ کی علالت کے دوران میں یہ خود ہی اس پر آشکار ہو گئی۔ اس کا روم روم دعا مانگنے کے لیے تڑپ رہا تھا لیکن جس ذہنی کیفیت میں وہ اپنے آپ کو پا رہی تھی، اس میں اسے اتنا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ خدا سے مخاطب ہو سکے۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح لیٹی رہی۔

سورج مکان کی دوسری جانب پہنچ چکا تھا اور اس کی ترچھی کرنیں کھلے دریچے میں سے اندر آ رہی تھیں۔ وہ

کمرے اور مراکشی چمڑے[28] کے کشن کے اس حصے کو، جسے پرنس ماریا گھور گھور کر دیکھ رہی تھی، منور کر رہی تھیں۔ اس کے خیالات کی رو اچانک تھم گئی اور وہ غیر شعوری طور پر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے بال درست کیے، صوفے سے نیچے اتری اور چلتے چلتے کھڑکی کے پاس پہنچ گئی۔ مطلع صاف تھا لیکن ہوا چل رہی تھی۔ وہ جبلی طور پر ہوا اپنے پھیپھڑوں میں کھینچنے لگی۔

''ہاں، اب تم جی بھر کر شام سے لطف اندوز ہو سکتی ہو! وہ جا چکے ہیں، اب ڈر کس چیز کا؟ کون ہے جو تمھیں ٹوک سکے؟'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ بے اختیار کرسی میں دھنس گئی لیکن اس نے اپنا سر کھڑکی کی دہلیز پر پڑا رہنے دیا۔

کسی نے باغ میں سے بڑے نرم اور ملائم لہجے سے اس کا نام پکارا اور اس کے سر پر بوسہ دیا۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھا کر دیکھا۔ وہ مادموزیل بوغین تھی۔ وہ سیاہ ڈریس اور سکارف میں ملبوس تھی۔ وہ دبے پاؤں پرنس ماریا کے قریب آئی، اسے چوما، آہ بھری اور جھٹ پٹ پھوٹ پھوٹ کر آنسو بہانے لگی۔ پرنس ماریا نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔ دونوں کے مابین رنجشیں تھیں اور پرنس ماریا فرانسیسی خاتون سے حسد کرتی رہی تھی۔ اب یہ ساری باتیں اس کے ذہن میں گردش کرنے لگیں، لیکن اسے یہ بھی یاد آیا کہ بعد ازاں مادموزیل بوغین کے بارے میں اس کے رویے میں تبدیلی آ گئی تھی اور وہ یہ ظاہر کرنے لگا تھا کہ اسے اس کا وجود ایک آنکھ نہیں بھاتا۔ یوں اس نے یہ دکھا دیا تھا کہ پرنس ماریا اسے دل ہی دل میں جس طرح کوستی رہی تھی، اس میں حق بجانب نہیں تھی اور وہ محض ناانصافی برتتی رہی تھی۔ ''اس کے علاوہ کیا یہ میرا، میرا کام ہے کہ میں، جو اس کی موت کی تمنا کرتی رہی، دوسروں کا مواخذہ کروں؟'' اس نے سوچا۔

پرنس ماریا نے واضح انداز سے مادموزیل بوغین کی پوزیشن کا تصور اپنے ذہن میں قائم کیا۔ دونوں کے مابین خلیج حائل ہو چکی تھی لیکن وہ اپنی ضروریات کے لیے اس کی محتاج تھی اور اس کے مکان میں رہ رہی تھی۔ اسے اس پر ترس آنے لگا۔ اس نے ملائم مستفسرانہ انداز سے اس کی جانب دیکھا اور اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ مادموزیل بوغین ایک بار پھر رونے اور اس کا ہاتھ چومنے لگی۔ پرنس ماریا پر غم کا جو پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا، وہ اس کے متعلق باتیں کرنے اور اپنے آپ کو اس میں برابر کا شریک جتانے لگی۔ ''مجھے ذاتی طور پر جو صدمہ پہنچا ہے وہ تو اپنی جگہ ہے ہی،'' اس نے کہا، ''لیکن میرے لیے تسلی کا پہلو یہ ہے کہ آپ نے مجھے اپنا غم بٹانے کی اجازت دے دی ہے۔ ہمیں جو یہ عظیم صدمہ برداشت کرنا پڑا ہے، اس کے پیش نظر ہمیں اپنی تمام سابقہ غلط فہمیاں فراموش کر دینا چاہئیں۔ میں محسوس کرتی ہوں کہ ہر شخص کے بارے میں میرا ضمیر پاک وصاف ہے۔ وہ عالم بالا میں پہنچ چکے ہیں لیکن انھیں معلوم ہے کہ مجھے (اس خاندان سے) کتنی محبت ہے اور میں اس کی کتنی شکر گزار ہوں۔'' پرنس ماریا کے کان اس کی باتوں پر ضرور تھے لیکن وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔ ہاں، کبھی کبھار وہ آنکھ اٹھا کر اس کی جانب دیکھ لیتی اور اس کی باتوں کی آواز سننے لگتی۔

"ڈیئر پرنس، مجھے معلوم ہے کہ آپ کی پوزیشن دگنا تشویش ناک ہے،" مادموزیل بوغین نے توقف کے بعد کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ آپ اپنے بارے میں نہ سوچ سکتی تھیں اور نہ سوچ سکتی ہیں، لیکن مجھے آپ سے جو محبت ہے، اس کے پیش نظر میں سوچنے پر مجبور ہوں۔ آل پاچ آپ سے ملنے آیا تھا؟ اس نے یہاں سے روانہ ہونے کے بارے میں کوئی بات کی تھی؟" اس نے پوچھا۔

پرنس ماریا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ کس نے جانا ہے اور کہاں جانا ہے۔ "کیا کسی چیز کے بارے میں اب سوچنا یا منصوبے بنانا ممکن ہے؟" اس نے سوچا اور کوئی جواب نہ دیا۔

Chere Marie* آپ جانتی ہیں' مادموزیل بوغین نے کہا، "کہ ہم خطرے میں ہیں۔ ہم فرانسیسیوں کے نرغے میں آچکے ہیں۔ اب یہاں سے جانا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ اگر ہم چل پڑے، ہمیں یقیناً قیدی بنالیا جائے گا اور خدا جانتا ہے..."

پرنس ماریا اپنی مصاحبہ کی طرف دیکھنے لگی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

"کاش کسی کو معلوم ہوتا کہ اب میرے لیے ہر چیز کتنی بے معنی ہوگئی ہے،" اس نے کہا۔ "البتہ ایک بات یقینی ہے کہ میں کسی صورت میں بھی ان سے دور نہیں جانا چاہوں گی... آل پاچ نے جانے کے متعلق کچھ کہا ضرور تھا... آپ ان سے بات کرلیں۔ میں کچھ نہیں کرسکتی اور نہ کچھ کرنا چاہتی ہوں..."

"میں اس سے بات کرچکی ہوں۔ اسے امید ہے کہ ہم کل یہاں سے روانہ ہوسکیں گے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہمارے لیے بہتر یہی ہے کہ ہم یہیں رہیں،" مادموزیل بوغین نے کہا۔ "کیونکہ Chere Marie، آپ مجھ سے اتفاق کریں گی کہ اگر ہم راستے میں فوجیوں یا فسادی کسانوں کے ہتھے چڑھ گئے، پھر بڑا برا حال ہوگا۔"

مادموزیل بوغین نے اپنے (قدیم الوضع) ہینڈ بیگ سے اعلان نامے کی نقل نکالی (یہ عام روسی کاغذ پر طبع نہیں ہوئی تھی)۔ یہ اعلان نامہ فرانسیسی جرنیل غامو نے جاری کیا تھا اور اس میں لوگوں سے کہا گیا تھا کہ وہ اپنے گھر بار چھوڑ کر نہ جائیں، فرانسیسی ان کا تحفظ کریں گے۔ اس نے نقل پرنس کو تھما دی۔

"میرا خیال ہے کہ اس جرنیل سے اپیل کرنا زیادہ بہتر رہے گا،" اس نے مزید کہا۔ "اور مجھے یقین ہے کہ آپ کا شایان شاں انداز سے احترام کیا جائے گا۔"

پرنس ماریا نے کاغذ کا مطالعہ کیا اور گھٹی گھٹی آہوں سے اس کا چہرہ کپکپانے لگا۔

"آپ کو یہ کہاں سے ملا ہے؟" اس نے پوچھا۔

"انھیں غالباً میرے نام سے اندازہ ہوگیا ہوگا کہ میں فرانسیسی ہوں،" مادموزیل بوغین نے کہا اور اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

پرنس ماریا کا رنگ پیلا ہوگیا۔ اعلان نامہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ وہ دریچے کے قریب اپنی

* ڈیر ماری

نشست سے اٹھی اور پرنس آندرے کے سابق سٹڈی روم میں چلی گئی۔

''دنیاشا،'' اس نے کہا۔ ''آل پاچ، درونشکا یا کسی دوسرے شخص کو میرے پاس بھیج دو! اور ہاں، مادام بوغین کو بتادو کہ میں خلوت چاہتی ہوں،'' اس نے اپنی مصاحبہ کی آواز سن کر مزید کہا۔ ''ہمیں فوراً روانہ ہو جانا چاہیے! فی الفور، ابھی!'' اس پر فرانسیسیوں کے ہتھے چڑھ جانے کے خیال سے ہی ہول طاری ہو گیا تھا۔

''اگر پرنس آندرے کو معلوم ہو گیا کہ میں فرانسیسیوں کے قبضے میں ہوں، وہ کیا سوچیں گے! یہی نا کہ پرنس نکولائی کی بیٹی جنرل غاموسے تحفظ کی طلب گار ہوئی اور اس کی نوازش سے فیض یاب ہوئی! ہے ناڈوب مرنے کا مقام!'' اس تصور نے ہی اس پر دہشت طاری کر دی، اس کا بدن کپکپانے لگا اور (شرم) سے اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ اب اسے جو غصہ آیا اور جس آن بان کا احساس ہوا، اس کا تجربہ اسے ازیں پیشتر کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس کی موجودہ حالت اس کے لیے جس طرح تکلیف اور اس سے بھی زیادہ ذلت کا باعث بن گئی تھی، اس کا اسے شدت سے احساس ہو گیا۔ ''وہ، یعنی فرانسیسی، اس گھر میں ڈیرے ڈال دیں گے، Monsieur le general* غاموپرنس آندرے کے سٹڈی روم پر قابض ہو جائے گا اور اس کے کاغذات وخطوط کی چھان پھٹک اور مطالعے سے اپنا دل بہلائے گا۔ مادموزیل بوغین باگوچارافو کی میزبان بن جائے گی اور مجھے ازرہ عنایت کوئی چھوٹا موٹا کمرہ دے دیا جائے گا۔ سپاہی میرے باپ کے تمغے اور اعزازات چرانے کے لیے اس کی تازہ قبر کی بے حرمتی کریں گے۔ وہ مجھے روسیوں پر اپنی فتوحات کے قصے سنائیں گے اور میرے غم واندوہ میں مجھ سے جھوٹ موٹ کی ہمدردی جتائیں گے...'' پرنس ماریا نے سوچا۔ وہ اپنے فطری انداز سے نہیں سوچ رہی تھی بلکہ اس موقع پر جس طرح اس کا باپ اور بھائی سوچتے، وہ اسی طرح سوچنا اپنا فرض سمجھ رہی تھی۔ جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق تھا، اسے اس امر کی مطلق پروا نہیں تھی کہ وہ کہاں قیام کرتی ہے یا اس پر کیا واردات گزرتی ہے، لیکن اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے مرحوم باپ اور پرنس آندرے کی نمائندگی کر رہی ہے۔ وہ غیر شعوری طور پر ان کے خیالات سوچ رہی اور ان کے احساسات وجذبات محسوس کر رہی تھی۔ وہ کیا کہتے، وہ کیا کرتے، اب اس کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ وہی کچھ کرے۔ وہ پرنس آندرے کے سٹڈی روم میں چلی گئی اور اس کے خیالات کی روشنی میں اپنی پوزیشن کا جائزہ لینے کی کوشش کرنے لگی۔

اسے محسوس ہوا تھا کہ باپ کی موت کے ساتھ زندگی کی مقتضیات بھی دم توڑ گئی ہیں لیکن وہ نئی اور ایسی قوت سے، جس سے وہ اب تک ناآشنا رہی تھی، سر اٹھانے اور اسے اپنی گرفت میں لینے لگیں۔

اس کا چہرہ تمتما رہا تھا اور اس کے دل ودماغ میں ہل چل مچی ہوئی تھی، اور اسی کیفیت میں وہ کمرے میں گھومتی رہی۔ وہ کبھی میخائیل ایوانچ، کبھی تیخون اور کبھی درون کو فی الفور پہنچنے کا پیغام بھیجتی۔ دنیاشا، ادھیڑ عمر نرس اور دیگر خادماؤں میں سے کوئی بھی اسے یہ نہ بتا سکی کہ مادموزیل بوغین کا بیان کہاں تک صحیح ہے۔ آل پاچ گھر پر

* موسیو جنرل

نہیں تھا، وہ پولیس کے حکام سے ملنے گیا ہوا تھا۔ ماہر تعمیرات میخائیل ایوانچ بھی، جس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، پرنس ماریا کو کچھ بتانے میں ناکام رہا۔ گزشتہ پندرہ برسوں کے دوران میں اس کی یہ عادت بن گئی تھی کہ معمر پرنس جو کچھ کہتا، وہ اس پر مسکرا کر ''ہونہہ، ہاں'' کرتا رہتا اور اپنے منہ سے کوئی ایسی بات، جسے پورا کرنا اس کا فرض بن جاتا، نہ نکالتا۔ اس نے اب پرنس کے سوالات کے جوابات بھی ''ہونہہ، ہاں'' میں ہی دیے اور کوئی بھی ایسی بات جس کی ذمے داری اس پر ڈالی جا سکتی، نہ کہی۔ چنانچہ اس کے منہ سے کوئی واضح بات اگلوانا ناممکن ہو گیا۔ دیرینہ وردی پوش ملازم تیخون، جس کا پژمردہ اور اندر کو دھنسا ہوا چہرہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ اس کے غم واندوہ کا کوئی مداوا نہیں ڈھونڈا جا سکتا، پرنس ماریا کے تمام سوالات کا صرف ایک ہی جواب دے رہا تھا: ''جی، پرنس۔'' اور وہ جب بھی نظر اٹھا کر اس کی طرف دیکھتا، بے اختیار سسکیاں بھرنے لگتا۔

آخرش دیہی سرپنچ درون اندر آیا۔ اس نے جھک کر پرنس کو سلام کیا اور دروازے کے قریب کھڑا ہو گیا۔

پرنس ماریا نے کمرے کا چکر کاٹا اور اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

''درونشکا'' اس نے کہا۔ وہ اسے انتہائی وفادار دوست سمجھ رہی تھی۔ اس کے خیال میں یہ وہی درونشکا تھا جو ہر سال ویازما کے میلے سے خاص قسم کی خنجر بریڈ لایا کرتا اور مسکرا کر اسے پیش کیا کرتا تھا۔ ''درونشکا، جب سے مجھے ناقابل برداشت صدمے...'' اس نے کہنا شروع کیا لیکن وہ بیچ میں ہی رک گئی، اس کے لیے اس سے آگے کچھ کہنا ناممکن ہو گیا۔

''ہم سب خداوند کے دستِ قدرت میں ہیں،'' وہ آہ بھر کر بولا۔

وہ ایک لمحہ خاموش رہے۔

''درونشکا، آل پاچ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کوئی نہیں جس سے میں کوئی مشورہ لے سکوں۔ جیسا کہ میں نے سنا ہے، کیا یہ درست ہے کہ میں یہاں سے جا بھی نہیں سکتی؟''

''یوئر ایکسی لینسی، آپ کیوں نہیں جا سکتیں۔ آپ جا سکتی ہیں،'' درون نے کہا۔

''مجھے بتایا گیا ہے کہ دشمن کی وجہ سے اس میں خطرہ ہے۔ ڈیئر فرینڈ، میں بے بس ہوں۔ مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کوئی میرا ساتھی نہیں، غم خوار نہیں۔ میں آج رات یا کل صبح سویرے یہاں سے لازماً روانہ ہو جانا چاہتی ہوں۔''

درون نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پرنس ماریا کو کنکھیوں سے دیکھ رہا تھا۔

''گھوڑے دستیاب نہیں ہیں،'' اس نے کہا۔ ''میں نے یاکوف آل پاچ کو بتا دیا تھا۔''

''کیوں؟'' پرنس نے پوچھا۔

''یہ عذابِ الٰہی ہے،'' درون نے کہا۔ ''ہمارے پاس جو گھوڑے تھے، انھیں یا فوج لے گئی ہے یا وہ مر کھپ گئے ہیں... اس سال حالات ہی کچھ ایسے ہیں۔ گھوڑوں کو کہاں سے کھلائیں؟... ہمیں یہ فکر لگی ہوئی ہے کہ کہیں ہم خود بھوکوں نہ مر جائیں۔ حالت یہ ہے کہ بعض لوگوں کو تین تین دن تک لقمہ توڑنے کو نہیں ملتا۔ ہمارے پاس تنکا بھی

نہیں ہے۔ہم تباہ ہوگئے ہیں، برباد ہوگئے ہیں۔''

وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، پرنس ماریا اسے توجہ سے سن رہی تھی۔

''کسان تباہ ہوگئے؟ ان کے پاس روٹی نہیں؟'' اس نے پوچھا۔

''وہ فاقوں مرر ہے ہیں،'' درون نے کہا۔''گھوڑوں اور چھکڑوں کا ذکر کرنا بیکار ہے۔''

''لیکن درونشکا، تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ کیا ان کی مدد کرنے کی کوئی صورت نہیں؟ مجھ سے جو بن پڑا، میں ضرور کروں گی...''

پرنس ماریا کو یہ بات بہت عجیب نظر آئی کہ اب جب کہ اس کا دل غم والم سے لبریز تھا، لوگوں کے امیر اور غریب طبقے ہوسکتے ہیں اور یہ کہ امیر لوگ غریبوں کی مدد کرنے سے کنی کترا سکتے ہیں۔اسے دھندلا دھندلا سا علم تھا کہ ایک چیز جسے ''جاگیردار کا اناج'' کہا جاتا ہے، موجود ہوتی ہے اور یہ کہ اسے بعض اوقات کسانوں میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔وہ یہ بھی جانتی تھی کہ ضرورت کے وقت نہ اس کا باپ اور نہ اس کا بھائی کسانوں کی مدد کرنے سے گریز کرتا۔اسے ڈر صرف ایک بات کا تھا کہ وہ اناج کی تقسیم کے سلسلے میں جو ہدایات دینے کا ارادہ کررہی تھی، انھیں الفاظ کا جامہ پہنانے میں کہیں اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہوجائے۔وہ اس بات پر خوش تھی کہ اس کے پاس کچھ کرنے کا عذر ہے۔وہ یہ کام ضمیر کی خلش محسوس کیے بغیر کرسکتی تھی اور اس کے کرنے میں اپنا غم بھلا سکتی تھی۔وہ درون سے کسانوں کی ضروریات کے بارے میں سوالات کرنے لگی۔اس نے اس سے یہ بھی دریافت کیا کہ آیا باگوچارافو میں اناج کا کوئی محفوظ ذخیرہ موجود ہے۔

''میرا خیال ہے کہ ہمارے پاس میرے بھائی کا اناج موجود ہے؟'' پرنس ماریا نے پوچھا۔

''آقا کے اناج کو کسی نے ہاتھ بھی نہیں لگایا،'' درون نے فخریہ کہا۔''پرنس نے اس کی فروخت کے بارے میں کوئی حکم نہیں دیا تھا۔''

''یہ کسانوں میں تقسیم کردو۔جسے جتنے کی ضرورت ہو، اسے اتنا دے دو۔میں اپنے بھائی کے نام پر تمھیں اس کا اختیار دیتی ہوں،'' پرنس ماریا نے کہا۔

درون نے جواب میں صرف گہری سانس لی۔

''ان میں یہ اناج تقسیم کردو بشرطیکہ یہ کافی ہو۔سب بانٹ دو۔میں اپنے بھائی کے نام پر یہ حکم دے رہی ہوں۔انھیں بتادو کہ جو کچھ ہمارا ہے، ان کا ہے۔ہم انھیں کچھ بھی دینے سے دریغ نہیں کریں گے۔جاؤ، انھیں بتادو۔''

جب وہ بول رہی تھی، درون ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہا تھا۔

''میم، خدا کا واسطہ میری چھٹی کردیں! مجھ سے چابیاں لے لیں!'' اس نے کہا۔''میں نے تئیس سال خدمت کی ہے اور کبھی غلطی نہیں کی۔خدا کا واسطہ، میری چھٹی کردیں!''

پرنس ماریا بالکل سمجھ نہ سکی کہ وہ اس سے کیا چاہتا ہے یا وہ کیوں اس سے کہہ رہا ہے کہ اس کی چھٹی کردی جائے۔ اس نے جواب دیا: ''میں نے تمھاری خدمت کو کبھی شک کی نظروں سے نہیں دیکھا۔ میں تمھارے اور کسانوں کے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔''

11

ایک گھنٹہ بعد دنیاشا پرنس کو بتانے آئی کہ درون واپس آگیا ہے اور پرنس کے حکم پر تمام کسان مودی خانے کے قریب جمع ہوگئے ہیں، وہ اپنی مالکہ سے بات کرنا چاہتے ہیں۔

''لیکن میں نے تو انھیں نہیں بلایا تھا،'' پرنس ماریا نے کہا۔ ''میں نے درونشکا سے صرف یہ کہا تھا کہ انھیں اناج لے لینے دو۔''

''پرنس، خدا کے لیے انھیں یہاں سے چلتا کریں اور ہرگز ہرگز ان کے قریب نہ جائیں۔ یہ محض چال ہے،'' دنیاشا نے کہا۔ ''جونہی یاکوف آل پاچ آئیں گے، ہم روانہ ہوجائیں گے لیکن خدا کے لیے۔''

''چال؟— تم کہنا کیا چاہتی ہو؟'' پرنس ماریا نے اچنبھے سے پوچھا۔

''مجھے اس کا پورا یقین ہے— خدا کے لیے میری بات سنیں! آپ نرس سے پوچھ سکتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے حکم پر باگوچارافو چھوڑ کر نہیں جائیں گے۔''

''تم غلطی کر رہی ہو۔ میں نے انھیں کبھی یہ حکم نہیں دیا تھا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں،'' پرنس نے کہا۔ ''درونشکا کو بلاؤ۔''

درون اندر آگیا اور دنیاشا نے جو کچھ کہا تھا، اس نے اس کی تصدیق کردی۔ ''کسان آپ کے حکم پر آئے ہیں!'' اس نے کہا۔

''لیکن میں نے تو انھیں کبھی نہیں بلایا تھا،'' پرنس نے زور دے کر کہا۔ ''تم سے ان تک میرا پیغام پہنچانے میں غلطی سرزد ہوگئی ہوگی۔ میں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ ان میں غلہ تقسیم کردو۔''

درون نے جواب میں لمبی سانس لی۔

''اگر آپ انھیں حکم دیں گی تو وہ چلے جائیں گے۔''

''نہیں، نہیں، میں ان کے پاس خود جاؤں گی،'' پرنس ماریا نے کہا۔

دنیاشا اور ادھیڑ عمر نرس نے ہر چند اسے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کے باوجود وہ پورچ میں چلی گئی۔

درون، دنیاشا، ادھیڑ عمر نرس اور میخائیل ایوانچ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

''میں بہت خوش ہوں کہ آپ لوگ آگئے ہیں،'' وہ بولنے لگی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں اور اسے محسوس ہورہا تھا کہ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے۔ ''درونشکا نے مجھے بتایا ہے کہ جنگ نے آپ لوگوں کو تباہ کردیا

ہے۔ یہ ہم سب کی مشترکہ پیتا ہے اور میں آپ کی مدد کرنے میں کسی قسم کے بخل سے کام نہیں لوں گی۔ میں خود یہاں سے جا رہی ہوں کیونکہ یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں... دشمن قریب ہے... کیونکہ... دوستو، میں سب کچھ آپ کو دے رہی ہوں اور میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ سب کچھ، ہمارا سارا اناج، لے لیں تاکہ آپ لوگوں کو کوئی تنگی نہ ہو۔ لیکن اگر کسی نے آپ کو یہ بتایا ہے کہ میں آپ لوگوں کو غلہ اس لیے دے رہی ہوں تاکہ آپ لوگوں کو یہیں ٹھہرا سکوں — تو یہ بات درست نہیں ہے۔ اس کے برعکس میری آپ سے درخواست ہے کہ آپ اپنا اپنا سامان اٹھائیں اور میرے ساتھ ماسکو کی جاگیر پر چلے چلیں۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ وہاں میں اس بات کا خیال رکھوں گی کہ آپ کو کسی چیز کی قلت محسوس نہ ہو۔ آپ لوگوں کو گھر بھی دیے جائیں گے اور خوراک بھی مہیا کی جائے گی۔"

پرنسس نے توقف کیا۔ ہجوم میں صرف آہیں سنائی دیں۔

"میں یہ سب کچھ اپنی مرضی سے نہیں کر رہی،" اس نے اپنی تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "بلکہ میں یہ سب کچھ اپنے مرحوم باپ کے، جو آپ لوگوں کے اچھے آقا تھے، نام پر اور اپنے بھائی اور اس کے بیٹے کے لیے کر رہی ہوں۔"

وہ پھر رک گئی۔ کسی نے مہر سکوت نہ توڑی۔

"یہ ہم سب کی مشترکہ پیتا ہے اور ہم سب اس میں برابر کے شریک ہیں۔ جو کچھ میرا ہے، وہ سب آپ کا ہے،" اس نے اپنے سامنے چہروں کا بغور جائزہ لیتے ہوئے اپنی بات ختم کر دی۔

تمام نگاہیں ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھیں۔ سب چہروں پر ایک ہی قسم کا تاثر، جس کا مفہوم وہ سمجھنے سے قاصر تھی، جھلک رہا تھا: یہ تجسس تھا، وفاداری تھی، تشکر تھا، خوف تھا یا بدگمانی؟ بہر حال جو کچھ بھی تھا، تمام چہروں کا تاثر بالکل یکساں تھا۔

"آپ کی اس کرم فرمائی کا شکریہ لیکن ہم اپنے آقا کا اناج نہیں لے سکتے،" ہجوم کے عقب سے ایک آواز سنائی دی۔

"لیکن کیوں؟" پرنسس نے پوچھا۔

کسی نے جواب نہ دیا اور پرنسس ماریا نے ہجوم میں شامل لوگوں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے ایک بات محسوس کی کہ جونہی کوئی آنکھ اس کی آنکھ سے ٹکراتی، فوراً نیچے جھک جاتی۔

"آپ لوگ کیوں نہیں لینا چاہتے؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔

خاموشی اس کی طبیعت پر بار بننے لگی۔ وہ کوشش کرنے لگی کہ کسی شخص کی نگاہوں سے تو وہ اپنی نگاہیں ملا سکے۔

"آپ بولتے کیوں نہیں؟" اس نے ایک بوڑھے شخص سے، جو لاٹھی سے ٹیک لگائے اس کے عین سامنے کھڑا تھا، مخاطب ہو کر کہا۔ "اگر آپ سمجھتے ہیں کہ کچھ اور بھی درکار ہے، مجھے بتائیں! میں سب کچھ کروں گی،" اس

نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

لیکن اس شخص نے اپنا سر جھکا لیا جیسے اسے اس کی بات سن کر غصہ آ گیا ہو اور وہ بڑبڑانے لگا:

''ہم آپ کی بات کیوں مانیں؟ ہمیں آپ کا اناج نہیں چاہیے!''

''ہم سب کچھ کیوں چھوڑ دیں؟ ہمیں آپ سے اتفاق نہیں!... ہمیں اتفاق نہیں... ہم نہیں مان سکتے ہمیں آپ سے ہمدردی ضرور ہے لیکن ہم راضی نہیں ہیں... خود ہی چلی جاؤ، خود ہی اپنا بندوبست کر لو'' ہجوم کے مختلف حصوں سے آوازیں آ رہی تھیں۔

ایک بار پھر ہجوم میں شامل تمام اشخاص کے چہروں پر یکساں نوعیت کا تاثر نمایاں ہو گیا لیکن اب کے یہ تاثر تجسس یا تشکر کا ہرگز نہیں تھا بلکہ وہ غضب آلود عزم صمیم کا مظہر تھا۔

''لیکن آپ لوگ شاید میری بات سمجھ نہیں سکے،'' پرنس ماریا نے اداس مسکراہٹ سے کہا۔ ''آپ لوگ کیوں جانا نہیں چاہتے؟ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ میں آپ کو نئے گھر دوں گی، آپ کو خوراک مہیا کروں گی اور آپ کی دوسری ضروریات پوری کروں گی، جب کہ دشمن یہاں آپ کا سب کچھ تاخت و تاراج کر دے گا...''

مگر اس کی آواز ہجوم کے شور و غل میں ڈوب گئی۔

''ہم جانے کے لیے تیار نہیں ہیں!... وہ بے شک ہمیں تاخت و تاراج کر دے، کوئی پروا نہیں!... ہم آپ کا غلہ نہیں لیں گے... ہم کبھی نہیں مانیں گے!...''

پرنس ماریا نے ایک بار پھر ہجوم میں کسی شخص کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا چاہیں لیکن کسی نے بھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا۔ وہ بظاہر اس کی نگاہوں سے بچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اسے یہ سب کچھ بہت عجیب لگا اور اسے بے کلی ہونے لگی۔

''ارے نہیں، وہ اس قسم کی باتوں سے ہمارے گلوں میں طوق نہیں ڈال سکتی... اس کے پیچھے پیچھے جائیں اور اس کے غلام بن جائیں!... اپنے مکان مسمار کر دیں اور گلوں میں پٹے ڈال لیں! چہ خوب!... کہتی ہے: 'میں تمھیں اناج دوں گی!'۔'' ہجوم میں سے بھانت بھانت کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پرنس ماریا نے اپنا سر جھکا لیا اور وہاں سے واپس مکان کی طرف چل پڑی۔ اس نے ایک بار پھر درون کو حکم دیا کہ وہ ان کی اگلی صبح روانگی کے لیے گھوڑے تیار کرے اور وہ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ وہاں وہ تنہا اپنے خیالات میں مصروف رہی۔

12

پرنس ماریا اس رات خاصی دیر تک اپنے کمرے کی کھلی کھڑکی کے قریب بیٹھی رہی۔ گاؤں سے دیہاتیوں کی آوازیں آ رہی اور اس کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ لیکن اب وہ ان کے متعلق نہیں سوچ رہی تھی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ

وہ ان کے بارے میں خواہ کتنا ہی غور وفکر کیوں نہ کرے، وہ انھیں سمجھ نہیں سکے گی۔ وہ صرف ایک ہی چیز کے متعلق سوچ رہی تھی اور یہ اس کا غم واندوہ تھا۔ فوری تفکرات کے سبب جو وقفہ آیا تھا، اس کے بعد یوں معلوم ہونے لگا جیسے یہ پہلے ہی قصۂ پارینہ بن چکا ہو لیکن اب وہ اس سلسلے میں اپنی یادیں تازہ کر سکتی تھی، آنسو بہا سکتی تھی اور دعائیں مانگ سکتی تھیں۔

غروب آفتاب کے ساتھ ہوا تھم گئی۔ رات ساکت اور خنک تھی۔ نیم شب کے قریب آوازیں آہستہ آہستہ خاموش ہو گئیں، مرغ نے بانگ دی، لیموں کے درختوں کے عقب سے ماہ کامل جلوہ افروز ہوا اور تازہ، سفید، شبنم آلود دھند کی چادر پھیلنے لگی۔ مکان اور گاؤں پر خاموشی کا راج مسلط ہو گیا۔

یکے بعد دیگرے حالیہ ماضی کی تصاویر— اس کے باپ کی علالت اور آخری لمحات — اس کے ذہن میں وارد ہونے لگیں۔ وہ تادیر ان شبیہوں کے بارے میں اداس مسرت سے سوچتی رہی۔ اس نے صرف آخری، یعنی اپنے باپ کے انتقال کی — شبیہہ کو خوف ودہشت سے اپنے ذہن سے جھٹک دیا۔ اس کے متعلق اسے محسوس ہو رہا تھا کہ رات کے اس ساکت اور پراسرار لمحے میں وہ اپنے تخیل میں بھی اس کے بارے میں کچھ سوچنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔ یہ تصاویر اس کے ذہن میں اتنے واضح، غیر مبہم اور مفصل انداز سے آ رہی تھیں کہ اسے یہ خیال گزرنے لگا کہ ان کا تعلق حقیقی حال سے ہے مگر کبھی وہ اسے ماضی اور کبھی مستقبل سے متعلق چیزیں دکھائی دینے لگتیں۔

اسے وہ لمحہ، جب اس پر پہلی مرتبہ فالج کا حملہ ہوا تھا، واضح طور پر یاد آ رہا تھا۔ اسے بغلوں کے نیچے سہارا دے کر باغ میں سے گھسیٹ گھساٹ کر اندر لایا گیا تھا۔ اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی اور وہ بے بسی کے عالم میں منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ اس کی سفید بھویں پھڑک رہی تھیں اور وہ سہمگیں اور پریشان نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

''جو کچھ انھوں نے اپنے انتقال کے دن مجھے بتایا، وہ اس روز بھی مجھے وہی کچھ بتانا چاہتے تھے،'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''تب انھوں نے جو کچھ فرمایا، وہ ہمہ وقت ان کے ذہن میں موجود رہا۔''

اور پھر اسے بالڈ ہلز میں فالج کے حملے سے قبل کی رات، جب اسے بدشگونی کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اس کی مرضی کے برعکس گھر میں مقیم رہی تھی، پوری تفصیل سے یاد آ گئی۔ اسے نیند نہیں آ رہی تھی اور وہ دبے پاؤں نیچے گلاس ہاؤس میں، جہاں اس رات اس کا بستر لگایا گیا تھا، چلی گئی تھی۔ وہ دروازے کے ساتھ کان لگا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ وہ تھکی تھکی، مضمحل آواز میں تیخون سے کچھ کہہ رہا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ باتیں کرنا چاہتا ہے۔ ''اور انھوں نے مجھے کیوں نہ بلایا؟ تیخون کی بجائے مجھے وہاں کیوں نہ بٹھایا؟'' پرنسس ماریا کو اس وقت بھی تعجب ہوا تھا اور اب بھی ہو رہا تھا۔ ''ان کے دل میں کیا کچھ تھا، اب وہ کسی کو نہیں بتائیں گے۔ اب وہ وقت نہ ان کے لیے اور نہ میرے لیے دوبارہ کبھی آئے گا۔ یہی وہ وقت تھا جب وہ مجھے وہ سب کچھ، جس کے بتانے کی ان کے دل میں حسرت تھی، بتا سکتے تھے۔ تب تیخون کی بجائے شاید میں ان کی باتیں سن سکتی اور ان کا مدعا سمجھ سکتی۔ میں اس رات اندر کیوں نہ گئی؟'' اس نے سوچا۔ ''انھوں نے جو کچھ اپنے انتقال کے روز مجھ سے کہا، شاید وہ اس روز کہہ دیتے۔ تیخون کے ساتھ

باتیں کرتے کرتے انھوں نے دو مرتبہ میرے متعلق دریافت کیا تھا۔ وہ مجھے دیکھنا چاہتے تھے اور میں دروازے کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ وہ غمگین تھے اور ان کے لیے تیخون کے ساتھ باتیں کرنا آسان نہیں تھا کیونکہ وہ ان کا مفہوم سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ وہ کس طرح اچانک اس سے لِسا کے متعلق یوں باتیں کرنے لگے جیسے وہ ابھی زندہ ہو۔ وہ بھول چکے تھے کہ وہ خداوند کو پیاری ہو چکی ہے۔ اور جب تیخون نے انھیں یاد دلایا کہ وہ اس دنیا میں نہیں رہی، انھوں نے چلا کر کہا وگاوُدی/، ان کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی۔ جب میں دروازے کے ساتھ آڑ لگائے کھڑی تھی، میں نے انھیں کراہتے، بستر پر لیٹتے اور اونچی آواز سے 'میرے خدایا!' کہتے سنا تھا۔ پھر میں اندر کیوں نہ گئی؟ وہ میرا کیا بگاڑ سکتے تھے؟ میرا کیا بگڑ جاتا؟ شاید انھیں راحت پہنچ جاتی اور شاید مجھے وہ ان الفاظ سے مخاطب کرتے۔'' اور پرنسس ماریا نے پیار کے وہ الفاظ، جو وہ اپنی موت کے روز اپنی زبان پر لایا تھا، بآواز بلند دہرائے: ''عزیز۔ از جان من!'' اور بلک بلک کر رونے لگی۔ آنسوؤں کی اس جھڑی نے اس کے دل کا غبار دھو دیا۔ اب وہ اس کا چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتی تھی اور یہ چہرہ وہ چہرہ نہیں تھا جسے وہ اس وقت سے دیکھتی چلی آئی تھی جب چیزیں اس کے حافظے میں محفوظ ہونا شروع ہوئی تھیں اور جسے اس نے ہمیشہ فاصلے سے دیکھا تھا۔ لیکن جو چہرہ وہ اب دیکھ رہی تھی، وہ نحیف و نزار، ڈرا سہما چہرہ تھا اور اسے اس نے اس کی زندگی کے آخری روز، جب وہ نیچے جھک گئی تھی تا کہ جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اسے غور سے سن سکے، دیکھا تھا۔ وہ زندگی میں پہلی بار اس کے اتنا قریب آئی تھی کہ اسے اس کے چہرے کی باریک سے باریک لکیر اور مہین سے مہین جھری نظر آ گئی تھی۔

''عزیز۔ از جانِ من!'' اس نے ایک بار پھر یہ الفاظ دہرائے۔

''جب انھوں نے یہ الفاظ کہے تھے، وہ کیا سوچ رہے تھے؟ وہ اب کیا سوچ رہے ہیں؟'' یہ سوال اچانک اس کے ذہن میں ابھرا اور جواب میں اسے اس کی شکل اپنے سامنے دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر وہی تاثر، جو انتقال کے روز اس کے رومال سے بندھے ہوئے چہرے پر ہویدا تھا، جھلک رہا تھا۔ اور اس نے اس روز جب اسے چھو کر دیکھا تھا اور اسے یقین ہو گیا تھا کہ یہ وہ نہیں بلکہ، کوئی اور ہی گھناؤنی اور پراسرار چیز ہے، تو جس خوف و دہشت نے اس روز اس پر غلبہ پایا تھا، اس نے اب دوبارہ اسے اپنے شکنجے میں کس لیا۔

اس نے کچھ اور سوچنے کی کوشش کی، دعا مانگنا چاہی لیکن وہ دونوں میں سے کچھ بھی نہ کر سکی۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ ٹکٹکی باندھ کر چاندنی اور سائے دیکھنے لگی۔ اسے ہر لحہ یہ گمان ہو رہا تھا کہ اب بھی اس کا مردہ چہرہ دکھائی دیا، اب بھی دکھائی دیا، اور اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ مکان کے اندر اور باہر جس سکوت کا راج ہے، اس نے اس پر طلسم طاری کر دیا ہے۔

''دنیاشا!'' اس نے زیر لب کہا۔ ''دنیاشا!'' اس نے وحشت زدگی سے چلا کر کہا، اپنے آپ کو اس طلسم سے آزاد کرایا اور سر پر پاؤں رکھ کر نوکرانیوں کے کمرے کی طرف بھاگنے لگی۔ رستے میں وہ ادھیڑ عمر نرس اور خادماؤں سے، جو بھاگم بھاگ اسی کی طرف آ رہی تھیں، ٹکرا گئی۔

13

سترہ اگست کو رستوف اور الی ین صرف لاوروشکا، جو ابھی ابھی اپنی اسیری سے واپس آیا تھا، اور ایک ہوزار کی، جو اردلی کے فرائض سرانجام دے رہا تھا، معیت میں باگوچارافو سے لگ بھگ دس میل پرے یان کاوو میں اپنی جائے رہائش سے روانہ ہوئے۔ الی ین نے نیا گھوڑا خریدا تھا، وہ اس کی آزمائش کرنا چاہتے تھے اور معلوم کرنا چاہتے تھے کہ دیہاتوں میں خشک گھاس میسر آسکتی ہے یا نہیں۔

گزشتہ تین دنوں سے باگوچارافو کی کیفیت یہ تھی کہ دونوں متخاصم افواج کے پڑاؤ وہاں سے برابر برابر فاصلے پر قائم تھے۔ چنانچہ روس کی عقبی سپاہ اور فرانسیسیوں کی ہراول فوج، دونوں کے لیے وہاں پہنچنا خاصا آسان تھا۔ رستوف حاضر دماغ سکواڈرن کمانڈر تھا، اس لیے وہاں جو رسد دستیاب ہوسکتی تھی، وہ فرانسیسیوں کی آمد سے پہلے ہی اس پر قابض ہو جانا چاہتا تھا۔

رستوف اور الی ین دونوں بے حد ہشاش بشاش تھے۔ انھیں معلوم تھا کہ باگوچارافو کسی پرنس کی جاگیر میں شامل ہے، وہاں جاگیردار کا مکان[29] اور زرعی رقبہ ہے اور انھیں امید تھی کہ وہاں انھیں گھریلو غلاموں کی فوج ظفر موج اور چند ایک حسین وجمیل خادمائیں بھی مل جائیں گی۔ ادھر کے سفر کے دوران میں وہ لاوروشکا سے نپولین کے متعلق سوالات پوچھتے، اس کے قصوں پر دل کھول کر قہقہے لگاتے اور الی ین کے نئے گھوڑے کو آزمانے کے لیے ایک دوسرے سے دوڑ لگاتے آرہے تھے۔

رستوف کو یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ جس گاؤں جارہے ہیں، وہ اسی بلکونسکی کی، جو کبھی اس کی ہمشیرہ کا منگیتر تھا، ملکیت ہے۔

باگوچارافو پہنچنے سے قبل رستوف اور الی ین نے آخری دوڑ کے لیے اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھلی چھوڑ دیں۔ رستوف الی ین سے آگے نکل گیا اور سرپٹ گھوڑا بھگاتا سب سے پہلے گاؤں میں داخل ہوا۔

''آپ جیتے،'' الی ین نے کہا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔

''ہاں، ہمیشہ میں ہی جیتتا ہوں، یہاں بھی اور چراگاہ میں بھی،'' رستوف نے اپنے ڈان گھوڑے کو، جس کے منہ سے جھاگ نکل رہا تھا، تھپتھپاتے کہا۔

''یور ایکسی لینسی، میں نے اپنے فرنچی پر میدان مار لیا تھا،'' عقب سے لاوروشکا نے اپنے نکھد ٹٹو کی طرف، جو چھکڑوں میں جوتنے کے کام آتا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ تو میں آپ کی لاج رکھنا چاہتا تھا، اس لیے پیچھے رہ گیا۔''

وہ آہستہ رو مودی خانے کی طرف، جہاں کسانوں کا خاصا بڑا ہجوم کھڑا تھا، آنے لگے۔

بعض لوگوں نے اپنے سروں سے ٹوپیاں اتار دیں اور دوسرے ٹوپیاں اتارے بغیر انھیں گھور گھور کر دیکھنے لگے۔

دو سو کھے سڑے بوڑھے کسان، جن کے چہروں پر جھریاں اور کھردری داڑھیاں تھیں، لڑکھڑاتے شراب خانے سے باہر نکلے۔ وہ مسکراتے اور بے سرے انداز سے گانا گاتے افسروں کی طرف بڑھے۔

''خوب لوگ ہیں!'' رستوف نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ، یہاں کہیں خشک گھاس ہے؟''

''اور ان کی شکلیں دیکھیں، بالکل ایک جیسے ہیں...'' الی ین نے کہا۔

''خوشی سے م ت۔ مت۔ مت۔ والے لو۔ لو۔ گ...'' ایک کسان جوشِ مسرت سے مسکرانے اور لہک لہک کر گانے لگا۔

ہجوم میں سے صرف ایک شخص نکلا اور رستوف کے قریب آیا۔

''آپ کا تعلق کس فریق سے ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہم فرانسیسی ہیں،'' الی ین نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''اور یہ خود نپولین ہے،'' اس نے لاوروشکا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ پھر آپ روسی ہیں؟'' کسان نے دریافت کیا۔

''کیا آپ کے ساتھ خاصا بڑا لشکر ہے؟'' ایک ٹھگنے شخص نے ان کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''بہت بڑا،'' رستوف نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ سب لوگ یہاں کیوں اکٹھے ہوئے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔ ''کوئی میلا ٹھیلا ہے؟''

''گاؤں کے مشترکہ مسائل کے بارے میں بزرگوں کا اجلاس ہو رہا ہے۔''

عین اسی وقت اس سڑک پر، جو بڑے مکان کی طرف جاتی تھی، سفید ہیٹ پہنے ایک مرد اور دو عورتیں نمودار ہوئیں۔ وہ ان افسروں کی طرف آ رہے تھے۔

''گلابی کپڑوں والی میری ہے، اسے تو ہاتھ بھی نہ لگائیں!'' الی ین نے دنیاشا کو، جو پختہ عزم کے ساتھ ان کی طرف بھاگی آ رہی تھی، دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ لونڈیا ہمارے شایانِ شاں ہے!'' لاوروشکا نے آنکھ مار کر الی ین سے کہا۔

''میری حسینہ، کیا چاہیے؟'' الی ین نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''پرنسس نے مجھے یہ دریافت کرنے کے لیے بھیجا ہے کہ آپ کا تعلق کس رجمنٹ سے ہے اور آپ کا اسم شریف کیا ہے؟''

''یہ سکواڈرن کمانڈر رستوف ہیں اور میں آپ کا ادنیٰ خادم ہوں۔''

''م مت۔ مت۔ مت والے...'' نشے سے چور کسان گانے لگا۔ وہ الی ین کو لڑکی سے باتیں کرتے دیکھ کر خوشی سے مسکرا رہا تھا۔

دنیاشا کے پیچھے پیچھے آل پاچ رستوف کی طرف آ رہا تھا۔ وہ ابھی دور ہی تھا کہ اس نے اپنے سر سے ہیٹ

اتار دیا۔

''حضور، جان کی اماں پاؤں، تو کچھ عرض کروں؟'' اس نے مؤدبانہ کہا لیکن رستوف کی نوعمری دیکھ کر اس کے لہجے میں قدرے حقارت آ گئی اور اس نے اپنا ہاتھ کوٹ کے اندر اپنے سینے کی طرف دھکیل دیا۔ ''میری مالکہ، جنرل انچیف پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی کی، جو ماہ رواں کی پندرہ تاریخ کو مالک حقیقی سے جا ملے، دختر نیک اختر، جوان لوگوں کے گنوار اور اجڈ رویے کی وجہ سے'' اس نے کسانوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''مصائب میں گھر چکی ہیں، آپ کو اپنے دولت کدے پر قدم رنجہ فرمانے کی دعوت دیتی ہیں... حضور، اگر آپ ذرا آگے تشریف لے آئیں،'' آل پاچ نے اداس مسکراہٹ سے کہا، ''کیونکہ ان... کی موجودگی میں کچھ کہنا نامناسب ہوگا...'' اس نے ان دو کسانوں کی طرف، جو بڑی مکھیوں کی طرح ان کے اردگرد منڈلا رہے تھے، انگلی لہراتے ہوئے کہا۔

''اے!... آل پاچ... یا کوف آل پاچ... اہم، ہم ہیں یا نہیں؟... مسیح کا واسطہ، ہمیں معاف کردو!... بہت اہم، ہونہہ؟'' دونوں کسانوں نے کھیسیں نکالتے ہوئے کہا۔

رستوف نے نشے میں چور کسانوں کی طرف دیکھا اور مسکرا دیا۔

''یا شاید، حضور، یہ آپ کو محظوظ کر رہے ہیں؟'' آل پاچ نے اپنے خالی ہاتھ سے بوڑھوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے متانت سے کہا۔

''نہیں، یہاں محظوظ کرنے والی کوئی شے نہیں ہے،'' رستوف نے کہا اور اس نے اپنا گھوڑا آگے کر لیا۔ ''کیا بات ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''حضور، جان کی اماں پاؤں تو عرض کروں کہ یہ اجڈ اور ناکندہ تراش لوگ نہیں چاہتے کہ مالکہ جاگیر چھوڑ کر جائیں اور وہ دھمکیاں دے رہے ہیں کہ وہ گھوڑے نہیں جوتیں گے۔ صبح سے ہر چیز بندھی پڑی ہے لیکن ہر ایکسی لینسی یہاں سے روانہ نہیں ہو سکتیں۔''

''ناممکن!'' رستوف نے تعجب سے کہا۔

''حضور، میں نہایت ادب سے اصل حقیقت آپ کے گوش گزار کر رہا ہوں،'' آل پاچ نے کہا۔

رستوف نیچے اترا، اس نے اپنا گھوڑا اردلی کے حوالے کیا اور خود آل پاچ کے ساتھ مکان کی طرف چل پڑا۔ راستے میں وہ صورت حال کے بارے میں اس سے مزید سوالات پوچھتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پرنس نے گزشتہ روز کسانوں کو اناج کی جو پیشکش کی تھی اور جلسے میں اس کی درون اور کسانوں کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی، اس سے معاملات اتنے دگرگوں ہو گئے کہ درون نے آخر کار چابیاں لوٹا دیں اور کسانوں میں جا شامل ہوا۔ جب آل پاچ نے اسے بلایا، اس نے آنے سے انکار کر دیا، اور جب اس صبح پرنس نے حکم دیا کہ اس کے سفر کے لیے گھوڑے جوت دیے جائیں، کسان بہت بڑی تعداد میں مودی خانے کے قریب جمع ہو گئے اور انھوں نے پیغام بھیجا کہ وہ پرنس کو گاؤں سے نکلنے نہیں دیں گے، یہ کہ حکم موصول ہو چکا ہے کہ لوگ اپنے گھربار چھوڑ کر نہ جائیں اور یہ کہ وہ

اپنے گھوڑے کھول دیں گے۔ آل پاچ انھیں سمجھانے گیا تو اسے بتایا گیا (زیادہ تر گفتگو کارپ نے کی تھی، دورون ہجوم کے عقب میں کھڑا رہا) کہ پرنس کو جانے کی اجازت نہیں دی جائے گی کیونکہ یہ احکام کی خلاف ورزی ہوگی، لیکن اگر وہ یہیں ٹھہری رہی، وہ حسب سابق اس کی خدمات کرتے اور اس کے احکام کی تعمیل کرتے رہیں گے۔

عین اس وقت جب رستوف اور الی ین سڑک پر سرپٹ گھوڑے دوڑاتے آرہے تھے، پرنس ماریا نے آل پاچ، ادھیڑ نرس اور خادماؤں کی منت سماجت کے باوجود گھوڑے جوتنے کا حکم دے دیا اور روانگی کے لیے تیار ہوگئی۔ اتنے میں کوچوانوں نے سواروں کو گھوڑے بھگاتے اور ادھر آتے دیکھا۔ وہ سمجھے کہ فرانسیسی آگئے ہیں اور وہ فرار ہو گئے۔ ادھر گھر کی عورتوں نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔

''ہمارے مشفق! ہمارے مہربان! حضور والا! ہمارے محافظ! آپ کو خداوند نے ادھر بھیجا ہے!'' رستوف کو، جب وہ پیش دالان میں سے گزر رہا تھا، مختلف آوازیں سنائی دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے دیکھ کر عورتیں بہت متاثر ہوئی ہیں۔

جب رستوف کو اندر پہنچایا گیا، پرنس ماریا بے چارگی اور آشفتہ حالی کی تصویر بنی ہال میں بیٹھی تھی۔ اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، کیوں آیا ہے یا یہ کہ خود اس کا اپنا کیا بنے گا۔ جب اس نے اس کا روسی چہرہ دیکھا، اس کی چال ڈھال، لب و لہجے اور اولیں الفاظ سے، جو اس کے منہ سے نکلے تھے، پہچانا کہ وہ اس کے اپنے طبقے کا آدمی ہے، اس نے اپنی گہری اور درخشاں آنکھیں اس پر مرکوز کر دیں اور جذبے کی شدت سے لڑکھڑاتی کانپتی آواز میں اس سے گفتگو کرنے لگی۔

آناً فاناً رستوف کو محسوس ہوا کہ اس ملاقات میں کچھ رومانیت کی چاشنی شامل ہے۔ ''بے یار و مددگار دوشیزہ، دکھوں کی ماری اور تنہا، اجڈ، ناکندہ تراش اور باغی کسانوں کے رحم و کرم پر! کیسا عجیب مقدر مجھے یہاں کھینچ لایا ہے!'' وہ اس کی طرف، جب وہ ہراساں و ترساں اپنی داستان سنا رہی تھی، دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ ''اس کے خد و خال اور چہرے مہرے میں کتنی لطافت اور نجابت ہے!''

اور جب وہ اسے یہ بتانے لگی کہ یہ سب کچھ اس کے باپ کی تجہیز و تکفین کے اگلے روز ہی وقوع پذیر ہوگیا، اس کا گلا رندھ گیا۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا اور پھر اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں رستوف یہ نہ سمجھ لے کہ وہ یہ سب کچھ اس کا جذبہ ترحم ابھارنے کے لیے کر رہی ہے، اس نے مستفسرانہ اور خوف زدہ نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ رستوف کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پرنس ماریا نے انھیں دیکھ لیا اور اپنی درخشاں آنکھوں سے، جو اتنی خوبصورت تھیں کہ دیکھنے والا یہ قطعی بھول جاتا تھا کہ اس کی شکل و صورت بالکل معمولی ہے، متشکرانہ اسے دیکھنے لگی۔

''پرنس، میں آپ کو بتا نہیں سکتا کہ میں کتنا خوش ہوں کہ میں اتفاق سے ادھر آنکلا۔ اب مجھے یہ موقع مل گیا ہے کہ میں آپ کی کچھ خدمت کر سکوں،'' رستوف نے کہا۔ ''آپ جب چاہیں، یہاں سے تشریف لے جا سکتی ہیں

اور میں آپ سے حلفاً وعدہ کرتا ہوں کہ اگر آپ مجھے اپنا محافظ بنا کر اپنے ساتھ چلنے کی اجازت مرحمت فرمائیں، پھر کسی مائی کے لال میں اتنی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ آپ کے لیے ذرا سی بھی تکلیف کا باعث بن سکے۔'' پھر اس نے اسے یوں جھک کر مؤدبانہ سلام کیا جیسے وہ شاہی خاندان کی کوئی خاتون ہو اور دروازے کی طرف چل پڑا۔

رستوف کے مؤدبانہ لہجے سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ اگرچہ وہ اس کے ساتھ متعارف ہونا اپنی خوش نصیبی تصور کرے گا لیکن اس کی بدنصیبی سے فائدہ اٹھا کر اپنے آپ کو اس کے سر منڈھنا پسند نہیں کرے گا۔

پرنسس ماریا معاملے کی اس نزاکت کو سمجھ گئی اور دل ہی دل میں اس کی تحسین کرنے لگی۔

''میں آپ کی بہت ہی بہت ممنون ہوں،'' اس نے فرانسیسی میں کہا۔ ''تاہم مجھے امید ہے کہ یہ سب کچھ کسی غلط فہمی کی بنا پر ہوا اور کسی کو موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔'' وہ رونے لگی۔ ''میں معافی چاہتی ہوں،'' اس نے کہا۔

رستوف کی بھویں تن گئیں۔ اس نے ایک بار پھر جھک کر سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

14

''واہ، وہ خوبصورت ہے؟ دوست، میری گلابی دوشیزہ سحر انگیز ہے! اس کا نام دونیاشا ہے...''

لیکن جب الی ین نے رستوف کے چہرے پر اچٹتی نظر ڈالی، وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے بھانپ لیا کہ اس کا افسرِ اعلیٰ اور ہیرو بالکل مختلف ذہنی کیفیت میں واپس آیا ہے۔

رستوف نے الی ین کو خشم گین نگاہوں سے گھورا اور جواب دیے بغیر لمبے لمبے ڈگ بھرتا گاؤں کی طرف چل پڑا۔

''میں ان بدمعاشوں کو ایسا سبق دوں گا، ان کی ایسی تیسی کر دوں گا!'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔

آل پاچ دوڑا تو نہیں، البتہ تیز تیز قدم اٹھاتا رستوف کے پیچھے ہو لیا۔ وہ بڑی مشکل اس تک پہنچ پایا۔

''حضور، آپ نے کیا فیصلہ فرمایا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

رستوف رک گیا، اس نے اپنی مٹھیاں بھینچیں اور غیظ و غضب سے کھولتا اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''فیصلہ؟ کیسا فیصلہ؟ بڈھے مفت خورے!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''تم کیا کھچڑی پکاتے رہے ہو؟ ہونہہ؟ کسان باغی ہو رہے ہیں اور تمھیں اتنی سمجھ نہیں کہ انھیں قابو کیسے کیا جا سکتا ہے۔ تم خود غدار ہو! میں تمھیں خوب جانتا ہوں — میں تم سب کی ہڈی پسلی ایک کر دوں گا!''

پھر گویا اسے یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ وہ اپنے غصے کا ذخیرہ بیکار ضائع کر رہا ہے، اس نے آل پاچ کو چھوڑا اور تیزی سے آگے نکل گیا۔ آل پاچ نے اپنی ذات پر پردہ ڈالا اور رستوف کے پیچھے چھوٹ لگا دی۔ دریں اثنا وہ سارا وقت اپنا نقطۂ نظر بیان کرتا رہا۔ اس نے کہا کہ کسان اتنے سرکش اور متمرّد ہو چکے ہیں کہ مسلح فوج کی مدد کے بغیر ان کی مخالفت کرنا عقل مندی نہیں ہوگا۔ ''کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ چند فوجی دستے بلا لیے جائیں؟'' اس نے کہا۔

''میں ان کے لیے مسلح فوج لاؤں گا... ان کی مخالفت، کروں گا''، نکولائی بے معنی انداز سے بڑبڑاتا رہا۔ غیر عقلی حیوانی غصہ اس پر غالب آ چکا تھا۔ اس غصے اور اس غصے کے اخراج کی ضرورت سے اس کا دم گھٹنے لگا تھا۔

یہ سوچے سمجھے بغیر کہ اس کا اقدام کیا ہوگا، وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا اندھا دھند ہجوم کی جانب بڑھا۔ وہ جوں جوں ہجوم کے قریب بڑھتا گیا، توں توں آل پاچ کو یہ احساس ہوتا گیا کہ رستوف کے اس عقل سے عاری طرزِ عمل سے اچھے نتائج برآمد نہیں ہوں گے۔ کسانوں نے جب رستوف کو بچے تلے اور تیز رفتار قدم اٹھاتے اور اپنے چہرے پر عزم واستقلال اور غیظ وغضب لاتے دیکھا، وہ بھی اسی طرح متاثر ہوئے۔

گھوڑوں پر سوار ہوزاروں کے گاؤں میں داخل ہونے اور رستوف کے پرنس سے ملاقات کرنے کے لیے جانے کے بعد ہجوم کسی قدر ہچکچاہٹ اور اختلاف رائے کا شکار ہو گیا تھا۔ بعض کسانوں کا کہنا تھا کہ چونکہ یہ لوگ روسی ہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات کا برا منائیں کہ مالکہ کو یہاں (خواہ مخواہ) روک لیا گیا ہے۔ درون اسی رائے کا حامی تھا لیکن جونہی اس نے اپنے نقطۂ نظر کا اظہار کیا، کارپ اور چند دوسرے اشخاص اس کے پیچھے پڑ گئے۔

''تمھیں گاؤں کا مال کھاتے اور اپنی توند بڑھاتے کتنا عرصہ ہو گیا ہے؟'' کارپ نے چلا کر کہا۔ ''تمھیں کیا فرق پڑتا ہے! تم نے مرتبان کے مرتبان مال ومنال سے بھر کر زمین میں دبا رکھے ہیں، تم انھیں نکالو گے اور چل پڑو گے... ہمارے گھر اجڑتے ہیں تو اجڑ جائیں، تمھیں کیا پروا؟''

''ہمیں حکم ملا ہے کہ ہم یہاں امن چین برقرار رکھیں، کوئی شخص اپنا گھر بار چھوڑ کر نہ جائے اور اناج کا ایک دانہ بھی باہر نکلنے نہ پائے — اور ایک وہ ہے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے، سب کچھ اٹھائے لیے جا رہا ہے!'' دوسرے نے باآواز بلند کہا۔

''فوج میں (جبری) بھرتی کے لیے تمھارے بیٹے کی باری تھی لیکن تم نے ایسا چکر چلایا کہ تمھارا موٹو نکھٹو صاف بچ گیا!'' ایک ٹھگنے بوڑھے نے اچانک درون پر جھپٹتے ہوئے کہا۔ ''چنانچہ وہ میرے وانکا کو لے گئے تا کہ اس کی داڑھی مونچھ مونڈ کر اسے فوجی بنا سکیں! لیکن موت سے کون بچا ہے؟ ہم سب کو ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے!''

''یقیناً ہم سب کو مرنا ہے!''

''میں کمیون کے خلاف نہیں ہوں،'' درون نے کہا۔

''تم کیوں ہو گے! — تم نے توند جو بھر لی ہے!''

دو لاغر اندام کسانوں کو اپنی کہنے کا موقع مل گیا۔

جونہی رستوف الی ین، لاوروشکا اور آل پاچ کی معیت میں ہجوم کے قریب پہنچا، کارپ اپنے انگوٹھے اپنی پیٹی میں گھسوڑے اور چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیلائے آگے آیا۔ اس کے برعکس درون عقب کی جانب کھسک گیا اور ہجوم میں شامل لوگ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے۔

''ایں! تمھارا سرپنچ کون ہے؟'' رستوف نے ہجوم کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے چلا کر پوچھا۔

''سرپنچ؟'' آپ نے اس سے کیا لینا ہے؟'' کارپ نے پوچھا۔

لیکن ابھی الفاظ اس کے منہ سے نکلے بھی نہیں تھے کہ اس کی ٹوپی اڑ کر دور جا گری اور زبردست گھونسے نے اس کا سر ایک طرف نیہوڑا دیا۔

''ٹوپیاں اتاردو، غدارو!'' رستوف دہاڑا۔ ''سرپنچ کہاں ہے؟'' وہ غضب ناک ہو کر چلایا۔

''سرپنچ... وہ سرپنچ کا پوچھ رہے ہیں!... درون ذا خارج، وہ تمھارا پوچھ رہے ہیں!'' عاجلانہ، تابعانہ جوابات سنائی دیے اور لوگ دھڑا دھڑ اپنی ٹوپیاں اتارنے لگے۔

''بغاوت وغاوت کوئی نہیں کر رہا، ہم احکام کی تعمیل کر رہے ہیں،'' کارپ نے پرزور انداز سے کہا اور دیکھتے ہی دیکھتے ہجوم کے عقب سے متعدد آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''ہمارے بڑوں نے فیصلہ کیا تھا—آپ میں حکم دینے والے بہت ہیں...''

''بحث کرتے ہو، کرو گے؟ بغاوت... لٹیرو، بدمعاشو... غدارو!'' رستوف ایک ایسی آواز میں، جو اس کی اپنی نہیں تھی، بلا سوچے سمجھے اور نتائج وعواقب کی پروا کیے بغیر دہاڑے جا رہا تھا۔ اس نے کارپ کا کالر پکڑا۔ ''اسے باندھ دو، باندھ دو!'' اس نے چلا کر کہا حالانکہ وہاں لاوروشکا اور آل پاچ کے علاوہ ایسا کوئی اور شخص، جو اسے باندھ سکتا، موجود نہیں تھا۔

تاہم لاوروشکا کارپ کی جانب بھاگا اور اس نے پیچھے سے اس کے بازو پکڑ لیے۔

''حضور، پہاڑی کے نیچے ہمارے جوان کھڑے ہیں، انھیں بلالاؤں؟'' اس نے با آواز بلند کہا۔

آل پاچ کسانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے نام لے کر دو اشخاص کو بلایا اور انھیں حکم دیا کہ وہ کارپ کو باندھ دیں۔ کسان مؤدبانہ آگے بڑھے اور اپنی پیٹیاں کھولنے لگے۔

''سرپنچ کہاں؟'' رستوف نے اصرار کیا۔

درون آگے آیا۔ اس کا رنگ فق اور چہرہ افسردہ تھا۔

''تم سرپنچ ہو؟ لاوروشکا، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو،'' رستوف نے یوں چلا کر کہا جیسے اس کے حکم کی خلاف ورزی ممکن ہی نہ ہو۔

اور حقیقتاً دو مزید کسانوں نے درون کو پکڑ لیا اور اس کے ہاتھ پاؤں باندھنے لگے۔ درون نے، جیسے وہ ان کی مدد کرنا چاہتا ہو، خود ہی اپنی پیٹی اتاری اور انھیں پکڑا دی۔

''اب تم سب لوگ کان کھول کر سن لو!'' رستوف نے کسانوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''ابھی، اسی وقت اپنے گھروں کو لوٹ جاؤ اور تمھاری باتوں کا ایک لفظ بھی میرے کانوں تک پہنچنے نہ پائے!''

''کیوں؟ ہم نے کیا بگاڑا ہے؟— بس ذرا سی حماقت ہوگئی... ذرا بے وقوفی کر بیٹھے، بس... میں نے کہا نہیں تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔'' بیک وقت مختلف آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگ ایک دوسرے کو الزام دے رہے

تھے اور آپس میں گتھم گتھا کر رہے تھے۔

"ہونہہ، میں نے کیا کہا تھا؟" آل پاچ نے دوبارہ اپنا رنگ جماتے ہوئے کہا۔ "بچو، تم غلطی کر رہے ہو!"

"یا کوف آل پاچ، ہم سے بس بے وقوفی ہو گئی،" لوگوں نے جواب دیا اور ہجوم چھٹنے اور مختلف گلیوں میں منتشر ہونے لگا۔

دونوں اشخاص کو بندھے ہوئے بازوؤں سمیت باگوچارافو ہاؤس کے احاطے میں لایا گیا۔ نشے سے بدمست دونوں کسان ان کے پیچھے ہو لیے۔

"خوب، اپنا مکھڑا تو دیکھو!" ان میں سے ایک نے کارپ سے کہا۔

"تمھارا کیا خیال تھا کہ تم شرفا سے یوں پیش آسکتے ہو؟ تم نے سوچا کیا تھا؟"

"الو کی دم!" ایک نے کہا۔ "اصلی الو کی دم!" دوسرے نے دعویٰ کیا۔

دو گھنٹے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ باگوچارافو کے احاطے میں چھکڑے پہنچ گئے۔ کسان بڑی پھرتی سے بلکونسکیوں کا سامان اٹھانے اور اسے چھکڑوں پر لادنے لگے۔ اور درون، جسے پرنس ماریا کی خواہش پر کاٹھ کباڑ کے کمرے سے، جہاں اسے مقفل کر دیا گیا تھا، رہا کر دیا گیا تھا، انھیں ہدایات دے رہا تھا۔

"اسے یونہی بے احتیاطی سے نہ رکھ دینا،" ایک کسان نے، جس کا چہرہ گول مٹول اور متبسم تھا، خانگی ملازمہ کے ہاتھوں سے چھوٹا صندوقچہ پکڑتے ہوئے کہا۔ "یقین مانو، اس پر بڑا پیسہ خرچ ہوا تھا! اگر تم نے اسے یونہی اٹھا کر پھینک دیا یا رسیوں کے نیچے دھکیل دیا، اس پر خراشیں پڑ جائیں گی! کام کا یہ انداز مجھے پسند نہیں ہے۔ ہر کام احتیاط اور ٹھیک طریقے سے ہونا چاہیے۔ دیکھو، یہ پکڑو۔ اسے ٹاٹ کے نیچے رکھ دو اور اوپر خشک گھاس ڈال دو۔ بالکل، یہی صحیح طریقہ ہے! بہت اعلیٰ!"

"ارے یہ کتابیں، یہ کتابیں!" ایک اور کسان نے، جو پرنس آندرے کے بک کیس اٹھائے لا رہا تھا، کہا۔ "خیال رہے، کہیں ٹھوکر کھا کر گر نہ پڑنا— بیٹو، بہت بھاری ہیں— کتابوں کا بڑا وزنی ذخیرہ ہے!"

"ہاں، وہ اپنی لکھائی میں لگے رہتے تھے، ادھر ادھر وقت ضائع نہیں کرتے تھے!" ایک بلند قامت کسان نے، جس کا چہرہ بیضوی تھا، سنجیدگی سے لغت کی بھاری بھرکم کتابوں کی طرف، جو سب سے اوپر پڑی تھیں، آنکھ مار کر کہا۔

رستوف پرنس کو قطعاً یہ تاثر نہیں دینا چاہتا تھا کہ 'مان نہ مان میں تیرا مہمان' ہوں۔ چنانچہ وہ واپس مکان میں نہ گیا بلکہ گاؤں میں ہی ٹھہرا رہا اور اس کی روانگی کا انتظار کرتا رہا۔ جب گاڑیاں اور چھکڑے روانہ ہوئے، حفاظت کے خیال سے وہ بھی ان کے ساتھ ہو لیا۔ باگوچارافو سے سات آٹھ میل دور، وہ اس شاہراہ پر، جو ہماری سپاہ کے

قبضے میں تھی، پہنچ گئے۔ یانکاووگاؤں کے ہوٹل میں اس نے مؤدبانہ اس سے اجازت چاہی اور پہلی بار اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

''اس کی بھلا کیا ضرورت ہے!'' اپنی نجات (جیسا کہ پرنس ماریا نے اپنے متعلق کہا تھا) کے لیے اس نے شکریے کے جو الفاظ استعمال کیے تھے، ان کے جواب میں اس نے جھینپتے اور شرماتے ہوئے کہا۔ ''ہر پولیس افسر اتنا کچھ تو کرتا ہی۔ اگر ہمارے پاس لڑائی میں حصہ لینے کے لیے صرف کسان ہوتے، ہم نے دشمن کو اتنی دور تک اندر نہ آنے دیا ہوتا،'' اس نے کہا۔ وہ ایک طرح سے جھجکتا، شرماتا موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ آپ سے متعارف ہونے کا موقع مل گیا۔ اچھا، پرنس، خدا حافظ، میری نیک تمنائیں آپ کے ساتھ ہیں اور دعا کرتا ہوں کہ آپ کا یہ سفر اطمینان سے کٹ جائے۔ مجھے امید ہے کہ ہماری آئندہ ملاقات ان سے بہتر حالات میں ہوگی۔ اگر آپ مجھے شرم سار نہیں کرنا چاہتیں، تو میں یہ عرض کروں گا کہ آپ میرا شکریہ ادا نہ کریں!''

اگرچہ پرنس نے الفاظ میں اس کا دوبارہ شکریہ ادا نہ کیا، تاہم اس کا چہرہ، جو محبت اور تشکر کے جذبات سے تاباں تھا، پکار پکار کر اس کا شکریہ ادا کر رہا تھا۔ وہ یہ مان ہی نہیں سکتی تھی کہ اس کے پاس اس کا شکریہ ادا کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اس کے برعکس اسے یقین تھا کہ اگر وہ نہ آتا تو وہ لازماً باغی کسانوں اور فرانسیسیوں کے ہاتھوں ماری جاتی۔ اسے بچانے کے لیے وہ صریحی اور ہول ناک خطرے میں کود گیا تھا۔ اس سے بھی یقینی بات یہ امر واقعہ تھا کہ وہ بلند کردار، نیک سیرت اور شریف النفس انسان تھا اور جس خطرے میں وہ گھری ہوئی تھی اور جو غم اسے لاحق تھا، وہ اسے سمجھنے کے قابل تھا۔ اس کی پرشفقت اور بادیانت آنکھیں، جو اس وقت، جب وہ اپنے صدمے کا ذکر کرتے کرتے خود رو پڑی تھی، آنسوؤں سے لبریز ہوگئی تھیں، اس کے تخیل میں سما چکی تھیں۔

جب پرنس ماریا اسے خدا حافظ کہہ چکی اور اکیلی رہ گئی، اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ پھر یہ عجیب وغریب سوال ''کیا مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے؟'' اس کے ذہن میں، اگرچہ پہلی بار نہیں، گردش کرنے لگا۔

اگرچہ ماسکو کے بقیہ سفر کے دوران میں پرنس ماریا کی ذہنی کیفیت خوشگوار نہیں تھی، تاہم دنیاشانے، جو اس کی گاڑی میں سوار تھی، ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی مالکہ کو کھڑکی میں سے باہر جھانکتے اور اسے کسی بات پر حسرت ناک اور پرمسرت انداز سے مسکراتے دیکھا۔

''بالفرض مجھے واقعی اس سے محبت ہوگئی ہو؟'' پرنس ماریا (بار بار) سوچتی تھی۔

اگرچہ اسے اپنے آپ سے یہ اقرار کرتے شرم آرہی تھی کہ وہ ایک ایسے شخص کی، جو غالباً کبھی اس کے بارے میں فکر مند نہیں ہوگا، محبت ہوگئی ہے، وہ اس تصور سے اپنے دل کو تسلی دے لیتی کہ کسی کو کبھی اس کے متعلق مطلق کوئی علم نہیں ہوسکے گا اور اگر وہ اس کا کسی سے ذکر کیے بغیر زندگی بھر ایک ایسے شخص سے، جس سے اس نے اپنی حیات میں پہلی اور آخری محبت کی تھی، محبت کرتی رہی، تو اسے کسی قسم کا الزام نہیں دیا جاسکے گا۔

جس انداز سے اس (رستوف) نے اسے دیکھا تھا، اس سے جو ہمدردی جتائی تھی، اس سے جو باتیں کی

تھیں، بعض اوقات جب وہ یہ سب کچھ یاد کرتی، خوشی اسے ناممکن نظر نہ آتی۔ یہی وہ لمحات تھے جب دنیاشا اسے گاڑی کی کھڑکی میں سے باہر جھانکتے اور مسکراتے دیکھتی تھی۔

''اور سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ باگوچارافو آیا— اور وہ بھی اس موقع پر!'' پرنس ماریا سوچ رہی تھی۔ ''عین اس وقت جب اس کی ہمشیرہ آندرے سے شادی کرنے سے انکار کر چکی ہے!''[30]

اور ان تمام چیزوں میں پرنس ماریا کو مشیت ایزدی کارفرما نظر آئی۔

رستوف پر پرنس ماریا نے جو نقش چھوڑا تھا، وہ خوشگوار تھا۔ اس کے متعلق سوچنے سے اس کی روح خوشی سے سرشار ہو جاتی۔ اور جب اس کے ساتھیوں نے اس کی باگوچارافو مہم کے بارے میں سن کر اس کی ٹانگ گھسیٹنا چاہی کہ وہ گیا تو تھا گھاس لینے لیکن لے آیا روس کی متمول ترین وارثہ (جائداد)، تو وہ غصے سے لال پیلا ہو گیا۔ اسے غصہ محض اس لیے آیا تھا کیونکہ شریف النفس پرنس سے، جس میں اسے دلکشی نظر آئی تھی اور جو بے پناہ دولت کی مالک تھی، شادی کرنے کا خیال اس کی مرضی کے خلاف ایک سے زیادہ مرتبہ اس کے اپنے دل میں بھی آ چکا تھا۔ جہاں تک نکولائی کی اپنی ذات کا تعلق تھا، وہ اس سے بہتر بیوی کی خواہش نہیں کر سکتا تھا۔ اگر اس سے اس کی شادی ہو جاتی ہے تو کاؤنٹس، اس کی ماں، کی خوشی کا ٹھکانا نہیں رہے گا اور اس کے باپ کی بگڑی قسمت سنور جائے گی اور بلکہ— اسے محسوس ہو رہا تھا— خود پرنس ماریا کی خوشی کی ضمانت فراہم ہو جائے گی۔

لیکن سونیا کا کیا بنے گا؟ اور اس کا وہ وعدہ جو اس نے کیا تھا، کہاں جائے گا؟ اور یہی وجہ ہے کہ جب وہ پرنس ماریا کے سلسلے میں اس کی ٹانگ گھسیٹ رہے تھے، اسے اتنا شدید غصہ آ گیا تھا۔

15

فوجوں کی کمان سنبھالنے کے بعد کوتوزوف کو پرنس آندرے یاد آیا اور اس نے اسے پیغام بھیجا کہ وہ ہیڈ کوارٹرز رپورٹ کرے۔

پرنس آندرے عین اس روز اور اس وقت تساریوو۔ زائمش پہنچا جب کوتوزوف پہلی مرتبہ فوجوں کا معائنہ کر رہا اور ان سے سلامی لے رہا تھا۔ وہ گاؤں میں پادری کے مکان کے سامنے رک گیا۔ اسی مکان کے سامنے کوتوزوف کی گاڑی کھڑی تھی۔ پرنس آندرے دروازے کے قریب ایک بنچ پر بیٹھ گیا اور ہز سیرین ہائی نس[31] کا، جیسا کہ اب ہر شخص کوتوزوف کا نام ان احترامی الفاظ سے لیتا تھا، انتظار کرنے لگا۔ گاؤں کے پار کھیت سے رجمنٹل موسیقی کی تانوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بیچ بیچ میں بہت بڑا ہجوم ''ہرا'' کے نعرے بلند کرنے لگتا۔ پرنس آندرے سے کوئی دس قدم کے فاصلے پر گیٹ کے قریب دو اردلی، ایک پیغام رساں اور ایک چیف سٹیوارڈ کھڑے تھے اور اپنے آقا کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر سہانے موسم سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ہوزاروں کا ایک سانولا کوتاہ قامت لیفٹیننٹ کرنل، جس کی ہیبت ناک مونچھیں رخساروں تک پھیلی ہوئی تھیں، گھوڑے پر گیٹ تک آیا۔ اس نے

سرسری نگاہوں سے پرنس آندرے کو دیکھا اور اس سے پوچھنے لگا کہ آیا ہز سیرین ہائی نس یہیں قیام پذیر ہیں اور آیا وہ عنقریب تشریف لے آئیں گے۔

پرنس آندرے نے جواب دیا کہ وہ ہز سیرین ہائی نس کے سٹاف میں شامل نہیں ہے اور یہ کہ وہ خود بھی ابھی ابھی آیا ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل ایک تیز طرار اردلی کی طرف متوجہ ہوا۔ اردلی نے اس مخصوص تحقیر آمیز انداز سے، جو کسی افسر سے مخاطب ہوتے وقت کمانڈر انچیف کے اردلیوں کا شعار بن جاتا ہے، جواب دیا:

"کیا فرمایا؟ ہز سیرین ہائی نس؟ میرا خیال ہے کہ انھیں اب یہاں تشریف لانے میں کوئی زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ آپ کو کیا چاہیے؟"

اردلی کے اس انداز گفتگو کے جواب میں لیفٹیننٹ کرنل نے اپنی مونچھوں کے نیچے کھیسیں نکالیں، گھوڑے سے اترا، اسے ایک مراسلہ رساں کے حوالے کیا اور گردن کو ذرا خم دیتا بلکونسکی کی طرف آیا۔ بلکونسکی نے اسے بنچ پر جگہ دے دی اور وہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"آپ بھی کمانڈر انچیف کا انتظار فرما رہے ہیں؟" اس نے گفتگو کی ابتدا کی۔ "سنا ہے کہ وہ ہر شخص کو شرف ملاقات بخش دیتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے... ان ساسیج خوروں کا طریقہ بالکل مختلف تھا! یرمالوف نے جب یہ کہا تھا کہ اسے ترقی دے کر جرمن بنا دیا جائے، تو کوئی غلط نہیں کہا تھا۔ اب شاید روسیوں کو بھی بات کرنے کا موقع مل جائے گا۔ خدا ہی جانتا ہے کہ ان کے عزائم کیا تھے! بس پسپائی اور مزید پسپائی، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ آپ بھی مہم میں شامل تھے؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں، مجھے یہ شرف حاصل ہے،" پرنس آندرے نے کہا، "کہ میں نہ صرف پسپائی میں شامل تھا، بلکہ جاگیریں اور آبائی گھر تو ایک طرف رہے، — میں نے اپنا وہ سب کچھ گنوا دیا جو مجھے بے حد عزیز تھا، میرے والد محترم، وہ صدمے کی تاب نہ لا کر خداوند کو پیارے ہو گئے۔ میرا تعلق صوبہ سمولنسک سے ہے۔"

"اخاہ آپ پرنس بلکونسکی ہیں؟ آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔ میں لیفٹیننٹ کرنل دینی سوف ہوں۔ لوگ مجھے زیادہ تر واسکا کے نام سے جانتے ہیں،" دینی سوف نے پرنس آندرے سے ہاتھ ملاتے اور اس کے چہرے کو خاص طور پر دلچسپی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ہاں، میں نے اس بارے میں سنا تھا،" اس نے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اور کچھ توقف کے بعد اس نے مزید کہا۔ "یہ تورانی طریقہ جنگ یقیناً بہت اچھا ہے — ماسوا ان لوگوں کے جنھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور جانوں کی قربانیاں دینا پڑتی ہیں... تو آپ پرنس آندرے بلکونسکی ہیں!" اس نے اپنے سر کو جنبش دی۔ "پرنس، آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی،" اس نے ایک بار پھر اداس مسکراہٹ سے اپنی بات دہرائی اور پرنس آندرے سے دوبارہ ہاتھ ملایا۔

دینی سوف نتاشا کا اولین امیدوار تھا اور نتاشا نے اس کے بارے میں پرنس آندرے کو جو قصے سنائے تھے، ان کی بنا پر وہ اسے جاننے لگا تھا۔ ان یادوں نے، جو بیک وقت شیریں اور روح فرسا تھیں، اس کے دل میں ازسرنو

تحسسات جگا دیے، جن کے متعلق اس نے کچھ عرصے سے سوچا تک نہیں تھا لیکن جواب بھی اس کے نہاں خانہ قلب میں موجود تھے۔ حالیہ ایام کے دوران میں اسے اتنے زیادہ انوکھے اور سنگین تجربات ـــ سمولنسک سے پسپائی، اس کا بالڈ ہلز کا دورہ، باپ کے انتقال کی خبر ـــ میں سے گزرنا پڑا تھا اور اسے اتنے نوع بہ نوع جذبات سے واسطہ پڑا تھا کہ کافی عرصے تک یہ یادیں اس کے ذہن میں بار نہ پاسکی تھیں اور اب جب وہ آئیں بھی، تو ان کا اثر اتنا زوردار نہ ہوا (جتنا کسی اور وقت ہوتا)۔

اور جہاں تک دینی سوف کا تعلق ہے، بلکونسکی کے نام سے اس کے ذہن میں جو یادیں ابھریں، ان کا تعلق کہیں دور رومانی ماضی سے تھا، جب ایک شام سپر اور نتاشا کی نغمہ سرائی کے بعد اس نے یہ سوچے سمجھے بغیر کہ وہ کیا کہہ رہا ہے، پندرہ سال کی ننھی منی دوشیزہ کو شادی کی تجویز پیش کر دی تھی۔ اسے جب یہ زمانہ اور نتاشا سے اپنی محبت یاد آئی، تو وہ مسکرا دیا لیکن وہ آناً فاناً اس چیز کی طرف، جس میں اب اسے اتنی انتہائی شدید دلچسپی تھی کہ اب وہ اس کے علاوہ کسی اور بات کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا، لوٹ آیا۔ یہ جنگی منصوبہ تھا اور اسے اس نے پسپائی کے دوران میں بیرونی چوکیوں پر خدمات سرانجام دیتے وضع کیا تھا۔ اس نے اسے بارکلے دَتولی کو پیش کیا تھا اور اب اس کا ارادہ اسے کوتوزوف کے سامنے رکھنے کا تھا۔ منصوبے کی اساس اس حقیقت پر رکھی گئی تھی کہ فرانسیسیوں نے ضرورت سے زیادہ لمبا محاذ بنا لیا تھا اور اس کا خیال تھا کہ بجائے اس کے کہ ان کی پیش قدمی روکنے کے لیے ان پر سامنے سے حملہ کیا جائے، ان کے مزید آگے بڑھنے پر ان کے مواصلاتی رابطوں کو نشانہ بنایا جانا چاہیے۔ وہ پرنس آندرے کے سامنے اپنے منصوبے کی وضاحت کرنے لگا۔

''وہ اپنے تمام کے تمام مواصلاتی رابطوں کا دفاع نہیں کر سکتے، یہ ناممکن ہے! میں ان میں شگاف ڈالنے کی کوشش کروں گا۔ آپ مجھے پانچ سو جوان دے دیں اور میں ان کے (مواصلاتی) رابطے منقطع کر دوں گا۔ ایسا یقیناً ہو سکتا ہے! ہمارے پاس صرف ایک ہی طریق کار ہے ـــ اور وہ ہے گوریلا جنگ!''

دینی سوف بلکونسکی کے سامنے اپنے منصوبے کی وضاحت کرتے کرتے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور ہاتھوں سے اشارہ کر کے سمجھانے لگا۔ اس وضاحت کے دوران میں انھیں فوجی جوانوں کے نعرہ ہائے تحسین کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ یہ آوازیں پریڈ گراؤنڈ سے آ رہی تھیں۔ چونکہ یہ عسکری نغموں اور موسیقی کی اصوات میں خلط ملط ہو رہی تھیں، اس لیے وہ غیر مربوط ہو رہی تھیں اور کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ اب آوازوں کا شور و غل اور گھوڑوں کے ٹاپوں کی تڑاق پڑاق گاؤں میں سنائی دینے لگی تھی۔

''وہ تشریف لا رہے ہیں، وہ تشریف لا رہے ہیں!'' ایک قازق نے جو گیٹ کے قریب کھڑا تھا، چلا کر کہا۔

بلکونسکی اور دینی سوف گیٹ کی طرف چل دیے۔ وہاں جوانوں کا ایک گروہ (گارڈ آف آنر) اکٹھا ہو گیا تھا۔ انھیں کوتوزوف، جو قدرے کوتاہ قامت کمیٹ گھوڑے پر سوار تھا، آتا دکھائی دیا۔ جرنیلوں کا خاصا بڑا ٹولا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ بارکلے کا گھوڑا تو تقریباً اس کے برابر برابر تھا۔ افسروں کا ایک ہجوم تھا۔ کوئی اس کے عقب میں تھا اور کوئی

برابر اور وہ سب ''ہرّا! ہرّا'' چلا رہے تھے۔

اس کے ایجوٹنٹ سرپٹ گھوڑے دوڑاتے اس سے پہلے احاطے میں داخل ہو گئے۔ کوتوزوف کا دامنِ صبر ہاتھ سے چھوٹ گیا اور اس نے اپنے گھوڑے کو، جو اس کے بوجھ تلے خراماں خراماں چل رہا تھا، آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ کوتوزوف مسلسل اپنے سر کو جنبش دے رہا اور اپنا ہاتھ اپنی ہارس گارڈ کی سفید ٹوپی تک، جس کے اردگرد سرخ پٹی تو تھی لیکن چھجا نہیں تھا، لے جا رہا تھا۔ گیٹ کے قریب جو گارڈ آف آنر کا دستہ کھڑا تھا، اس کے سارے جوان تنومند تھے اور ان کا تعلق گرینیڈیر گارڈز سے تھا۔ ان میں سے اکثر نے اپنے سینوں پر تمغے اور دوسرے اعزازات سجا رکھے تھے۔ جب کوتوزوف ان کے قریب پہنچا، وہ اسے سلامی دینے لگے۔ اس نے ان پر کمانڈر کی عزم واستقامت سے بھرپور نگاہ ڈالی اور انھیں ایک آدھ منٹ خاموشی سے دیکھتا رہا۔ پھر وہ اپنے اردگرد جرنیلوں اور افسروں کے جمِ غفیر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اچانک اس کے چہرے پر کایاں پن جھلکنے لگا اور وہ اپنے کندھے یوں اچکانے لگا جیسے کسی الجھن میں پڑ گیا ہو۔

''دیکھیں، ہمارے پاس ایک سے ایک نفیس جوان موجود ہے، پھر بھی ہم پسپائی پر پسپائی اختیار کرتے رہے!'' اس نے کہا۔ ''اچھا، جرنیل، خدا حافظ!'' اس نے مزید کہا اور پرنس آندرے اور دینی سوف کے برابر گزرتا احاطے کے اندر چلا گیا۔

''ہرّا، ہرّا!'' اس کے پیچھے آوازیں گونج رہی تھیں۔

جب سے پرنس آندرے کی کوتوزوف سے آخری ملاقات ہوئی تھی، اس کا جسم کہیں زیادہ فربہ، بلکہ پھول کر کپا اور پلپلا ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے جانے پہچانے زخم کے نشان، سفید کرۂ چشم اور تھکے تھکے چہرے مہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس نے فوجی اوورکوٹ اور ہارس گارڈز کی سفید ٹوپی پہنی ہوئی تھی اور اس کے کندھے پر تپلی پیٹی سے تازیانہ لٹک رہا تھا۔ تنومند کوتاہ قامت گھوڑے پر اس کا بھاری بھرکم بے ڈول جسم آگے پیچھے اور دائیں بائیں جھول رہا تھا۔

''ی... ی... ی...'' جب وہ احاطے میں داخل ہوا، اس کے منہ سے سیٹی جیسی آواز، جو بمشکل سنائی دے رہی تھی، نکل رہی تھی۔ اس کے چہرے پر ایک ایسے شخص کی، جسے کارکردگی دکھانے کے بعد توقع ہوتی ہے کہ اب اسے آرام کا موقع میسر آ جائے گا، مسرت اور تسکین جھلک رہی تھی۔ اس نے اپنا بایاں پاؤں رکاب سے باہر نکالا اور اپنے سارے جسم کو بے قابو انداز سے جھلاتے اور ماتھے پر شکنیں ڈالتے پورا زور لگا دیا۔ یوں اس نے اپنا جسم زین تک پہنچا دیا۔ پھر وہ گھٹنے پر جھکا اور کراہتا ہوا قازقوں اور ایجوٹنٹوں کے، جو اسے سہارا دینے کے لیے تیار کھڑے تھے، بازوؤں میں جا گرا۔

اس نے جوں توں کر کے اپنے آپ کو سنبھالا اور آنکھیں بھینچ کر اپنے گرد و پیش نظر ڈالی۔ اس کی نگاہ پرنس آندرے پر پڑی لیکن معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے پہچان نہیں سکا اور وہ افتاں و خیزاں برآمدے کی طرف چل دیا۔

''سی... سی... سی...'' اس نے پھر سیٹی بجائی اور دوبارہ پرنس آندرے کی طرف دیکھا۔

جیسا کہ بوڑھے اشخاص کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، اسے پرنس آندرے کے چہرے کا اس شخص کے ساتھ، جو اس کے حافظے میں محفوظ تھا، تعلق قائم کرنے میں چند سیکنڈ لگ گئے۔

''پرنس، تم کیسے؟ مائی ڈیئر بوائے، کیا حال ہے تمھارا، ادھر آؤ...'' اس نے تھکے تھکے لہجے سے کہا اور بھاری قدموں سے زینہ، جو اس کے بوجھ تلے چرچرا رہا تھا، چڑھنے لگا۔

اس نے کوٹ کے بٹن کھولے اور برآمدے میں بنچ پر بیٹھ گیا۔

''خیر، تمھارے والد محترم کیسے ہیں؟''

''مجھے کل ان کے انتقال کی خبر ملی تھی،'' پرنس آندرے نے یک بیک کہا۔

کوتوزوف کو سخت دھچکا لگا اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس نے اپنی ٹوپی اتاری اور سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔

''خداوندا انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائیں! ہم سب خداوند کی مرضی کے تابع ہیں!'' اس نے آہ بھری، گہری سانس لی اور توقف کیا۔ ''میں ان سے محبت کرتا اور ان کا احترام کرتا تھا اور میں سچے دل سے تمھارے ساتھ ہمدردی کرتا ہوں۔''

اس نے پرنس آندرے کو اپنی آغوش میں لے لیا، اسے اپنے فربہ سینے سے بھینچا اور اسے یونہی تھامے وہیں کھڑا رہا۔ جب اس نے اسے چھوڑا، پرنس آندرے نے دیکھا کہ اس کے پلپلے ہونٹ کپکپا رہے ہیں اور اس کی آنکھیں اشکوں سے لبریز ہیں۔

''چلو۔ میرے کمرے میں چلو۔ ہم ذرا باتیں کریں گے،'' اس نے کہا۔

لیکن عین اسی دم دینی سوف جو اب دشمن کی طرح اپنے اعلیٰ افسروں سے بھی بالکل خائف نہیں تھا، ایجوٹنٹوں کی، جنھوں نے اسے روکنے کی کوشش کی تھی، غصیلی کانا پھوسیوں کے باوجود اپنے مہمیز کھنکھناتے بے خوف و خطر زینہ چڑھ آیا۔ کوتوزوف نے، جس نے سہارے کے لیے اپنے ہاتھ بنچ پر رکھے ہوئے تھے، اس پر ناپسندیدگی کی نگاہ ڈالی۔ دینی سوف نے اپنا تعارف کرایا اور زوردار لہجے سے کہا کہ وہ وطن کی بہبود کے سلسلے میں ہز سیرین ہائی نس کو ایک اہم معاملے کی اطلاع دینا چاہتا ہے۔ کوتوزوف نے دینی سوف کو تھکی تھکی نظروں سے دیکھا، خفگی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے ہاتھ اوپر اٹھائے، انھیں ایک دوسرے کے اوپر اپنے پیٹ پر رکھا اور اس کی بات دہرانے لگا:

''وطن کی بہبود کے لیے؟ ہونہہ، کیا ہے؟ بولو!''

دینی سوف لڑکیوں کی طرح شرما گیا (اس کے مونچھوں سے بھرپور، سرد و گرم چشیدہ اور مے کشانہ چہرے پر رنگ کا آنا کچھ عجیب معلوم ہو رہا تھا۔) اور وہ بڑی جرأت و دلیری سے سمولنسک اور ویازما کے مابین دشمن کے مواصلاتی رابطوں کے انقطاع کے بارے میں اپنے منصوبے پر روشنی ڈالنے لگا۔ دینی سوف کا وطنِ مالوف یہی خطہ

تھا اور وہ اس کے چپے چپے سے خوب آگاہ تھا۔ منصوبہ لاریب دلکش معلوم ہو رہا تھا اور خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ وہ اسے یقین کی پختگی سے بیان کر رہا تھا۔ کوتوزوف بیٹھا اپنے ہی پاؤں کو گھورتا رہا۔ کبھی کبھی وہ درختوں سے گھرے قریبی بنگلے کے احاطے پر نظر ڈال لیتا جیسے اسے امید ہو کہ وہاں سے کوئی ناخوشگوار چیز نکل آئے گی اور وہ واقعی، جب دیئی سوف کا بیان جاری تھا، ایک جرنیل، جس کے ہاتھ میں چرمی تھیلا تھا، اس بنگلے سے برآمد ہو گیا۔

''کیا!'' کوتوزوف نے دیئی سوف کے بیان کے بیچ میں حیرت سے کہا۔ ''اتنی جلدی تیار ہو گئے؟''

''تیار، یوئر ہائی نس،'' جرنیل نے کہا۔

کوتوزوف نے یوں سر کو جنبش دی جیسے وہ یہ کہنا چاہتا ہو: ''بھلا ایک آدمی یہ سب کچھ کیسے کامیابی سے بھگتا سکتا ہے؟'' اور وہ دوبارہ دیئی سوف کا بیان سننے لگا۔

''روسی افسر کی حیثیت سے میں اپنی عزت کی قسم کھا کر آپ سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں نپولین کا مواصلاتی رابطہ منقطع کر سکتا ہوں۔''

''تمھارا کوارٹر ماسٹر جنرل کرل آندریوچ سے کیا رشتہ ہے؟'' کوتوزوف نے اسے ٹوکتے ہوئے پوچھا۔

''یوئر ہائی نس، وہ میرے چچا ہیں۔''

''اوہ! ہماری آپس میں دوستی ہے،'' کوتوزوف نے خوشگوار لہجے سے کہا۔ ''ٹھیک، ٹھیک، مائی ڈیئر بوائے۔ تم یہیں ہیڈ کوارٹرز میں ہی ٹھہرو۔ ہم کل بات کریں گے۔''

اس نے دیئی سوف کی طرف اپنے سر کو جنبش دی اور دوسری جانب متوجہ ہو گیا۔ اس نے کاغذات پکڑنے کے لیے، جو ڈیوٹی جنرل کونا وتسن اس کے لیے لایا تھا، اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''یوئر ہائی نس، آپ اندر تشریف نہیں لانا چاہیں گے؟'' ڈیوٹی جرنیل نے آزردہ لہجے سے دریافت کیا۔ ''وہاں آپ نے منصوبوں کا جائزہ لینا اور متعدد کاغذات پر دستخط فرمانا ہیں۔''

دروازے پر ایک ایجوٹنٹ آیا اور اس نے اطلاع دی کہ اندر ہر چیز تیار ہے، لیکن صریحاً نظر آ رہا تھا کہ کوتوزوف اندر جانے سے قبل تمام امور سے فراغت حاصل کر لینا چاہتا ہے۔ اس نے ناک بھوں چڑھائی۔

''نہیں،'' اس نے کہا۔ ''مائی ڈیئر بوائے، میز یہیں اٹھوا لاؤ۔ میں یہیں ان پر نظر ڈال لوں گا۔ ابھی جانا نہیں،'' اس نے پرنس آندرے کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

پرنس آندرے برآمدے میں ٹھہرا رہا اور ڈیوٹی جرنیل کی رپورٹ سنتا رہا۔ جب اس کی خواندگی ہو رہی تھی، پرنس آندرے کو نیم وا دروازے کے پیچھے ریشمی لباس کی سرسراہٹ اور کسی خاتون کی سرگوشیوں کی آواز سنائی دی۔ اس طرف متعدد مرتبہ جھانکنے کے بعد اسے ایک خوش وضع خاتون کی، جس کا جسم بھرا بھرا اور چہرہ سرخ و سپید تھا، جھلک دکھائی دی۔ وہ گلابی ڈریس میں ملبوس تھی اور اس کے سر پر بنفشی رنگ کا رومال تھا۔ اس کے ہاتھ میں پلیٹ تھی۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کمانڈر انچیف کی اندر آمد کی منتظر ہے۔ کوتوزوف کے ایجوٹنٹ نے پرنس آندرے کو

زیرلب بتایا کہ جس پادری کا یہ مکان ہے، یہ اس کی رفیقۂ حیات ہے اور بحیثیت میزبان ہز ہائی نس کی روٹی اور نمک[32] سے تواضع کرنا چاہتی ہے۔

''اس کے شوہر نے صلیب تھامے گرجے میں ہز سیرین ہائی نس کا استقبال کیا تھا اور اب وہ گھر میں ان کا استقبال کرے گی... اچھی خاصی قبول صورت چیز ہے،'' ایجوٹنٹ نے مسکراتے ہوئے اضافہ کیا۔

ان الفاظ پر کوتوزوف نے نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا۔ وہ جرنیل کی رپورٹ [جو زیادہ تر تساریوو۔زائمش چے کے مقام پر (فوجی دستوں کی) پوزیشنوں کی نکتہ چینی پر مشتمل تھی] بعینہٖ اسی طرح سن رہا تھا جس طرح اس نے دینی سوف کا بیان یا سات سال پہلے اوسٹرلٹس کے معرکے سے قبل جنگی کونسل کی بحث سنی تھی۔ وہ بیّن طور پر محض اس لیے سنتا تھا کیونکہ اس کے کان تھے۔ اگرچہ اس کے ایک کان میں سن[33] کی پتی ٹھنسی ہوئی تھی، پھر بھی اس کے کانوں میں آواز پڑ ہی جاتی۔ تاہم نہ صرف یہ بات اظہر من الشمس تھی کہ جرنیل خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہتا، اسے کوئی چیز نہ حیران کرسکتی تھی اور نہ اسے کسی قسم کی دلچسپی لینے پر آمادہ کرسکتی تھی اور یہ امر بالکل واضح تھا کہ جو کچھ اسے بتایا جارہا تھا، اسے وہ پہلے ہی معلوم تھا اور وہ سن محض اس لیے رہا تھا کیونکہ وہ اسی طرح سننے پر مجبور تھا جس طرح وہ گرجے میں عبادت کے دوران میں سننے پر مجبور ہوتا تھا۔ دینی سوف نے جو کچھ کہا تھا، اس سے دانش مندی کا اظہار ہوتا تھا اور اس کی باتیں برمحل تھیں۔ جو کچھ جرنیل کہہ رہا تھا، وہ اس سے بھی زیادہ دانش مندانہ اور برمحل تھا لیکن یہ واضح تھا کہ کوتوزوف دانش اور علم دونوں کو بنظر حقارت دیکھتا تھا۔ پرنس آندرے نے کمانڈر انچیف کے چہرے کا بغور مطالعہ کیا اور اسے وہاں جو واحد تاثر نظر آیا، وہ بوریت، دروازے کے پیچھے نسوانی کھسر پھسر کا مفہوم جاننے کا تجسس اور مجلسی آداب کے مطابق رویہ اختیار کرنے کی خواہش کا ملغوبہ تھا۔ یہ بالکل ظاہر تھا کہ کوتوزوف کو نہ صرف علم اور عقل سے نفرت ہے بلکہ دینی سوف نے جس حب الوطنی کے جذبے کا اظہار کیا تھا، وہ اس سے بھی بدکتا تھا۔ تاہم وہ ان چیزوں سے اپنی کسی دانش مندی، جذبے یا علم کی بنا پر متنفر نہیں تھا (کیونکہ اس نے ان میں سے کسی کا بھی اظہار کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی)، بلکہ اس کی وجہ کچھ اور تھی۔ اسے ان چیزوں سے محض اس لیے نفرت تھی کیونکہ وہ عمر رسیدہ ہو چکا تھا اور زندگی میں بہت کچھ دیکھ چکا تھا۔

رپورٹ میں کوتوزوف نے اپنی طرف سے جس بات کا اضافہ کرنے کی ہدایت کی، اس کا تعلق اس لوٹ کھسوٹ سے تھا جو روسی افواج نے کی تھی۔ رپورٹ کے اختتام پر جرنیل نے دستخطوں کے لیے اس کے سامنے ایک دستاویز رکھی۔ ایک جاگیردار نے ایک فوجی کمانڈر کو درخواست دی تھی کہ فوجیوں نے اس کی جئی کی فصل کاٹ لی ہے، اس کی ادائیگی ہونا چاہیے اور یہ دستاویز اس ادائیگی کے بارے میں تھی۔ جب کوتوزوف کو اس کے متعلق بتایا گیا، اس نے اپنے ہونٹ چاٹے اور نفی میں سر ہلا دیا۔

''چولھے میں پھینک دو اسے ۔۔ آگ لگادو! مائی ڈیئر فیلو، میں تمھیں قطعی طور پر بتائے دیتا ہوں،'' اس نے کہا۔ ''ایسی تمام چیزوں کو نذر آتش کر دیا کرو۔ انھیں جی بھر کر فصلیں کاٹنے اور لکڑی جلانے دو! یہ میرا حکم نہیں ہے

اور نہ میں اس کی اجازت دیتا ہوں، لیکن میں ان کی حرکات پر کوئی سزا بھی نافذ نہیں کر سکتا۔ اس کا کوئی علاج نہیں۔ جب آدمی درخت کاٹتا ہے، چھیلنیں ادھر ادھر اڑیں گی ہی۔'' اس نے ایک بار پھر دستاویز پر نظر ڈالی۔ ''اُف، ان جرمنوں کو چھوٹی سے چھوٹی بات قاعدے قانون کے مطابق کرنے کا خبط ہے!'' وہ نفی میں سر ہلاتا بڑبڑایا۔

16

''اچھا، کام ختم ہو گیا!'' کوتوزوف نے آخری کاغذ پر دستخط کرتے ہوئے کہا۔ وہ بے ڈھنگے انداز سے اٹھا، اپنی موٹی گردن کی شکنیں درست کیں اور پہلے کی نسبت بشاش طریق سے دروازے کی طرف بڑھا۔

پادری کی اہلیہ نے، جس کا چہرہ شرم وحیا سے گلنار ہو رہا تھا، جھپٹ کر پلیٹ اٹھائی لیکن اتنی دیر تیاری کرنے کے باوجود وہ اسے مناسب وقت پر پیش کرنے میں ناکام رہی۔ وہ خاصا جھک کر آداب بجالائی اور اس نے پلیٹ اسے تھما دی۔

اس نے اپنی آنکھیں بھینچیں، مسکرایا، پیار سے اس کی ٹھوڑی پر ٹھوکا دیا اور کہنے لگا:

''واہ، کیا حسن ہے! تھینک یو، مائی ڈیئر!''

اس نے اپنی جیب سے چند طلائی سکے نکالے اور اسے دینے کے لیے پلیٹ پر رکھ دیے۔

''اچھا، یہاں تمھاری کیسے گزر رہی ہے؟'' اس نے اس کمرے کے، جو اس کے لیے سجایا گیا تھا، دروازے کی جانب جاتے ہوئے کہا۔

پادری کی اہلیہ، جس کے سرخ وسپید چہرے پر گڑھے پڑ رہے تھے اور مسکراہٹ دوڑ رہی تھی، اس کے پیچھے پیچھے کمرے میں چلی گئی۔ ایجوٹنٹ برآمدے میں پرنس آندرے کے پاس آیا اور اس نے اسے دوپہر کے کھانے کی دعوت دی۔ آدھ گھنٹہ بعد کوتوزوف کے بلانے پر جب پرنس آندرے اندر گیا، اس نے اسے آرام کرسی پر پاؤں پسارے لیٹے دیکھا۔ اس نے اب بھی وہی کوٹ پہنا ہوا تھا اگرچہ اب اس کے بٹن کھلے تھے۔ اس کے ہاتھ میں فرانسیسی ناول تھا۔ جب پرنس آندرے اندر آیا، اس نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ جو صفحہ وہ پڑھ رہا تھا، وہاں نشان کے طور پر اس نے کاغذ تراش رکھ دیا۔ پرنس آندرے نے سرورق سے دیکھا کہ یہ مادام ڈگانلی[34] کا ''لے شوالئے دوسینے'' ہے۔

''اچھا، بیٹھو، بیٹھو، ادھر آ جاؤ۔ چلو، کچھ باتیں ہو جائیں،'' کوتوزوف نے کہا۔ ''مجھے بہت افسوس ہوا، بہت زیادہ افسوس ہوا۔ مگر مائی ڈیئر فیلو، اب تم مجھے ہی اپنا باپ سمجھو، پدرِ ثانی...''

پرنس آندرے کو اپنے باپ کے انتقال کے متعلق جو کچھ معلوم ہو سکا اور اس نے بالڈ ہلز میں، جب وہ گھوڑے پر وہاں گیا تھا، جو کچھ دیکھا تھا، وہ اس نے کوتوزوف کو بتلایا۔

''ان لوگوں نے ہمیں کن حالوں میں پہنچا دیا ہے!'' کوتوزوف اچانک مضطرب لہجے میں چیخ پڑا۔ نظر آ رہا تھا کہ پرنس آندرے نے اسے جو باتیں بتائی تھیں، ان سے اس پر یہ واضح ہو گیا تھا کہ روس کن حالات میں سے

گزر رہا ہے۔ ''لیکن مجھے کچھ مہلت دو، کچھ مہلت دو!'' اس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر وحشت برس رہی تھی۔ بظاہر وہ ایک ایسے موضوع پر، جس نے اس کے جذبات میں زبردست کھلبلی مچا دی تھی، تفصیل سے گفتگو کرنے سے گریزاں تھا۔ ''میں نے تمھیں اس لیے بلایا تھا کیونکہ میں تمھیں اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں۔''

''یور ہائی نس، میں آپ کا ممنون ہوں۔ لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ میں اب سٹاف ورک کے لیے موزوں نہیں رہا،'' پرنس آندرے نے کچھ اس انداز سے مسکراتے ہوئے کہا کہ کوتوزوف فوراً تاڑ گیا کہ دال میں کچھ کالا ضرور ہے۔

کمانڈر انچیف نے اسے استفہامیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے،'' پرنس آندرے نے مزید کہا، ''کہ میں اپنی رجمنٹ سے مانوس ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنے افسروں سے انس ہے اور میرا خیال ہے کہ میرے جوان مجھے پسند کرنے لگے ہیں۔ مجھے رجمنٹ چھوڑتے افسوس ہوگا۔ آپ نے مجھے اپنے پاس رکھنے کی پیشکش کر کے میری جو عزت افزائی فرمائی ہے، اس کے لیے میں آپ کا تہہ دل سے مشکور ہوں اور اگر میں آپ کی پیشکش قبول نہیں کر رہا تو یقین مانیے ...''

کوتوزوف کے پھولے پھولے چہرے پر ایک ایسا تاثر نمودار ہو گیا جو فراست اور شفقت سے معمور تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اس میں نہایت لطیف طنز کی آمیزش بھی تھی۔ اس نے بلکونسکی کو ٹوک دیا۔

''مجھے افسوس ہے۔ میرا خیال تھا تم میرے بڑے کام آتے۔ مگر تم ٹھیک کہتے ہو، بالکل ٹھیک کہتے ہو! (صحیح) آدمیوں کی یہاں اتنی ضرورت نہیں ہے۔ مشیر ہمیشہ بکثرت دستیاب ہو جاتے ہیں لیکن (صحیح) آدمیوں کا بڑا توڑا ہے۔ جس طرح تم رجمنٹ میں کام کر رہے ہو، اگر یہ تمام مشورے والے بھی وہاں اس طرح خدمات سرانجام دیں تو رجمنٹوں کی کایا پلٹ جائے۔ اوسٹرلٹس میں تم نے جو کارنامہ سرانجام دیا تھا، وہ مجھے یاد ہے... بالکل یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ تم نے اوسٹرلٹس میں علم تھام رکھا تھا!'' کوتوزوف نے کہا اور اس یاد پر پرنس آندرے کا سارا چہرہ خوشی سے تمتمانے لگا۔

کوتوزوف نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور اسے اپنے قریب گھسیٹ لیا۔ اس نے اپنے گال اس کے سامنے کر دیا تاکہ وہ اس پر بوسہ دے سکے اور ایک بار پھر پرنس آندرے کو بوڑھے شخص کی آنکھوں میں آنسو تیرتے نظر آئے۔ اگرچہ وہ جانتا تھا کہ کوتوزوف کے آنسو بات بے بات نکل آتے ہیں اور وہ اس سے اس لیے خاص طور پر پیار اور شفقت سے پیش آ رہا ہے کہ کیونکہ اسے جو صدمہ برداشت کرنا پڑا تھا، اس پر وہ اس سے ہمدردی کا اظہار کرنا چاہتا ہے، پھر بھی اوسٹرلٹس کے واقعے کے یاد کیے جانے پر اسے خوشی بھی ہوئی اور اس کی انا کی بھی تسکین ہو گئی۔

''جاؤ اپنی صوابدید کے مطابق عمل کرو، خدا تمھارا حامی و ناصر ہو۔ میں جانتا ہوں کہ تم نے جو رستہ منتخب کیا ہے، وہ عزو وقار کا رستہ ہے۔'' اس نے توقف کیا۔ ''بخارسٹ[35] میں تم مجھے بہت یاد آئے۔ مجھے ایسے شخص کی ضرورت تھی جسے میں بھیج ...'' اور کوتوزوف موضوع تبدیل کر کے ترکوں کے ساتھ جنگ اور معاہدۂ امن کے، جو طے پا چکا تھا، متعلق بات کرنے لگا۔ ''ہاں، مجھے بڑی ملامتیاں سنائی گئی ہیں،'' اس نے کہا۔ ''اس وقت بھی جب جنگ شروع

ہوئی اور اس وقت بھی جب معاہدۂ امن طے پایا... لیکن انت بھلا، سو بھلا۔ ہر کام صحیح وقت پر انجام پا گیا۔ Tout vient a point a celui qui sait attendre* وہاں بھی مشیروں کی اسی طرح بھرمار تھی جس طرح کہ یہاں ہے۔'' وہ ایک بار پھر اس موضوع پر، بظاہر جس کے بارے میں وہ بہت سوچتا رہا تھا، گفتگو کرنے لگا۔ ''اخ، یہ مشیر، یہ مشیر!'' اس نے کہا۔ ''اگر ہم نے ان سب کی باتوں پر توجہ دی ہوتی تو ہم ابھی تک ترکی میں ہی ہوتے۔ ہم نہ امن کا معاہدہ طے کر پاتے اور نہ ابھی تک جنگ ختم ہوئی ہوتی۔ ہمیشہ جلد بازی، اور جلد بازی، جلد بازی جتنی زیادہ، رفتار اتنی ہی کم! اگر کامنسکی کا پہلے ہی انتقال نہ ہو چکا ہوتا، وہ لازماً کسی مصیبت میں پھنس جاتا۔ اس نے تیس ہزار آدمیوں کے ساتھ قلعوں اور قلعہ بند شہروں پر طوفانی چڑھائی کر دی تھی۔ قلعوں پر قبضہ کرنا آسان ہے لیکن مہم کو کامیابی سے منزلِ مراد تک پہنچانا مشکل ہے، اور اس مقصد کے لیے طوفانی چڑھائیوں اور اندھادھند حملوں سے کام نہیں بنتا۔ اس کے لیے صبر و تحمل اور وقت کی ضرورت ہے۔ کامنسکی نے رست چک[36] پر قبضہ کرنے کے لیے جوان بھیجے لیکن میں نے صرف ان دو — صبر و تحمل اور وقت — سے کام لیا اور اس کی نسبت کہیں زیادہ قلعہ بند شہروں کو فتح کیا۔ اور ان ترکوں کو گھوڑے کھانے پر مجبور کر دیا!'' اس نے اپنے سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اور میری بات یاد رکھو، فرانسیسیوں کا بھی یہی حشر ہوگا!'' وہ کہتا چلا گیا۔ اس کا لہجہ تند سے تندتر ہوتا چلا گیا اور وہ اپنی چھاتی پیٹنے لگا۔ ''میں انھیں گھوڑے کھانے پر مجبور کر دوں گا!'' اور ایک بار پھر اس کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

''لیکن ہمیں لڑنا تو پڑے گا ہی! یا نہیں؟'' پرنس آندرے نے پوچھا۔

''غالباً۔ اگر یہ شخص یہی اصرار کرتا رہا، پھر اس سے مفر ممکن نہیں ہوگا۔ لیکن، مائی ڈیئر بوائے، یقین مانو، ان دو — صبر و تحمل اور وقت — سے زیادہ طاقتور حلیف اور کوئی نہیں — وہ سب کچھ سرانجام دیں گے۔ مصیبت یہ ہے... کہ ہمارے مشیر اس انداز سے نہیں سوچتے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ کرو اور بعض کہتے ہیں وہ کرو... آدمی کرے کیا؟'' اس نے یوں پوچھا جیسے وہ اس سے جواب کی توقع کر رہا ہو۔ ''خیر تم کیا کروانا چاہو گے؟'' اس نے ایک بار پھر پوچھا اور اس کی آنکھوں میں کچھ اس قسم کی چمک پیدا ہو گئی جیسے اسے معلوم ہو۔ ''کیا کرنا چاہیے اور میں کیا کر رہا ہوں، یہ میں تمھیں بتائے دیتا ہوں۔ "**Donsle doute, moncher" اس نے کچھ توقف کیا اور کہا: "abstiens-toi"*** اس نے یہ الفاظ عمداً چبا چبا کر کہے۔

''اچھا، مائی ڈیئر بوائے، خدا حافظ۔ میں تہہ دل سے تمھارے غم میں برابر کا شریک ہوں۔ میں تمھارے لیے ہائی نس، پرنس یا کمانڈر انچیف نہیں ہوں بلکہ بمنزلہ باپ ہوں۔ اگر کبھی تمھیں کسی چیز کی ضرورت پیش آئے، سیدھے میرے پاس چلے آنا۔ مائی ڈیئر بوائے، خدا حافظ۔''

---

* جسے انتظار کرنا آ گیا، اسے سب کچھ مل گیا۔

** مائی ڈیئر فیلو، جب تم شک میں پڑ جاؤ

*** پھر کچھ نہ کرو

وہ ایک بار پھر پرنس آندرے سے لپٹ گیا اور اس نے اس کا بوسہ لیا۔ اور پھر پیشتر اس کے کہ پرنس آندرے اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا، کوتوزوف نے اطمینان کی گہری سانس لی اور مادام ژ گانلی کا ناول ''لے شوالیے دو سینے'' جو وہ قبل ازیں پڑھ رہا تھا، دوبارہ اٹھا لیا۔

پرنس آندرے کے لیے یہ توضیح کرنا کہ ایسا کیسے اور کیوں ہے، ممکن نہیں تھا لیکن حالات عموماً جس ڈھب پر جا رہے تھے اور انھیں جس شخص کی تحویل میں دیا گیا تھا، کوتوزوف کے ساتھ اس ملاقات کے بعد وہ ان کے بارے میں مطمئن اپنی رجمنٹ میں واپس چلا گیا۔ اس بوڑھے شخص میں ــ جس کی نفسانی خواہشات کی آگ اب سرد پڑ چکی تھی اور اگر وہ ایسی ویسی کوئی حرکت کرتا بھی تھا، محض عادتاً ایسا کرتا تھا اور جس میں دانش (جو واقعات کو باہم مربوط کرتی اور نتائج مستنبط کرتی ہے) کی جگہ صرف واقعات کے بہاؤ کا پرسکون انداز سے غور وفکر کرنے کی صلاحیت تھی ــ اسے ذاتی مطلب برآری کا فقدان جتنا واضح نظر آنے لگا، اتنا ہی اسے یقین ہونے لگا کہ انجام کار سب کچھ ویسے ہی ہوگا جیسے کہ ہونا چاہیے۔ ''وہ اپنی طرف سے کوئی چیز متعارف نہیں کرائے گا۔ وہ منصوبے بنائے گا اور نہ کسی چیز کی ابتدا کرے گا،'' پرنس آندرے نے سوچا۔ ''لیکن وہ ہر بات سنے گا، سب کچھ یاد رکھے گا اور ہر چیز کو اپنے مقام پر رکھے گا۔ وہ کسی سودمند چیز کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنے گا اور کسی ضرررساں چیز کو قبول نہیں کرے گا۔ وہ جانتا ہے کہ کوئی چیز، جو اس کی اپنی مرضی سے کہیں زیادہ طاقتور اور کہیں زیادہ اہم ہے، موجود ہے ــ اور یہ چیز واقعات کا ناگزیر بہاؤ ہے۔ وہ انھیں دیکھ سکتا ہے، ان کی اہمیت سمجھ سکتا ہے اور ان کی اہمیت سمجھنے کے بعد وہ ان میں ٹانگ اڑانے، ذاتی خواہشات کی پیروی کرنے یا کسی دوسری چیز کو ہدف بنانے سے گریز کر سکتا ہے۔ سب سے بڑھ کر،'' پرنس آندرے نے سوچا، ''آدمی کو اس لیے اس پر اعتماد ہونے لگتا ہے کیونکہ مادام ژ گانلی کے ناولوں اور اپنی فرانسیسی کہاوتوں کے باوجود وہ روسی ہے اور کیونکہ جب اس نے یہ کہا تھا: 'انھوں نے ہمیں کن حالوں میں پہنچا دیا ہے،' تو اس کی آواز کانپنے لگی تھی اور جب اس نے یہ کہا تھا کہ 'میں انھیں گھوڑے کھانے پر مجبور کر دوں گا۔' اس کی چیخ نکل گئی تھی۔''

ان جذبات کا دھندلے دھندلے انداز سے کم وبیش سبھی کو تجربہ ہو رہا تھا۔ چنانچہ درباری سازشوں کے باوجود جب کوتوزوف کا بحیثیت کمانڈر انچیف تقرر عمل میں آیا، تو اسے اتفاق رائے اور عمومی پسندیدگی کی سند مل گئی۔

17

زار کی ماسکو سے روانگی کے بعد اس شہر کی زندگی اپنی سابقہ جانی پہچانی ڈگر پر رواں دواں ہو گئی۔ اس نے اپنا معمول کا انداز اس حد تک دوبارہ اختیار کر لیا کہ ان حالیہ ایام کو، جن کے دوران میں حب الوطنی کے ولولے اور جوش وخروش کا اظہار کیا گیا تھا، یاد رکھنا مشکل ہو گیا۔ اب یہ یقین کرنا محال تھا کہ روس کو واقعی کوئی خطرہ درپیش ہے اور یہ کہ انگلش کلب کے ارکان مادر وطن کے فرزند ہیں اور وہ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے کمربستہ ہیں۔ امپر اطور کے قیام کے

دوران میں حب الوطنی کے جس والہانہ جوش وخروش کا مظاہرہ کیا گیا تھا، اس کی یاد صرف ایک چیز سے تازہ ہوتی تھی اور وہ یہ مطالبہ تھا کہ لوگ جوانوں کی بھرتی اور نقد رقوم کی ادائیگی کی صورت میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ جونہی اس سلسلے میں وعدہ ہو جاتا، وہ قانونی اور سرکاری حیثیت اختیار کر جاتا اور اس کا پورا کرنا ناگزیر ہو جاتا۔

اگرچہ غنیم ماسکو کے قریب سے قریب تر آتا جارہا تھا، اہالیان شہر کسی صورت یہ تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں تھے کہ ان کے لیے صورت حال نازک سے نازک تر ہوتی جارہی ہے، اس کے برعکس ان کا رویہ پہلے کی نسبت روز بروز غیر سنجیدہ سے غیر سنجیدہ تر ہوتا جارہا تھا جیسا کہ ہمیشہ ان لوگوں کے، جنھیں اپنے سروں پر تباہی و بربادی کا خطرہ منڈلاتا نظر آتا ہو، ساتھ ہوتا ہے۔ جب خطرے کی گھنٹی بجنے لگتی ہے اور اس کی آواز قریب سے سنائی دینے لگتی ہے، انسانی روح میں مدام دو آوازیں برابر کی قوت سے بولنا شروع کر دیتی ہیں۔ ایک آواز اسے بڑے معقول انداز سے سمجھاتی ہے کہ وہ خطرے کی نوعیت پر غور کرے اور اس سے بچنے کے ذرائع تلاش کرے۔ دوسری اس سے بھی زیادہ معقول انداز اختیار کرتی ہے اور اسے بتاتی ہے کہ خطرے کے متعلق سوچ بچار کرنا تکلیف دہ اور افسردہ کن ہے کیونکہ ہر بات کا پیشگی اندازہ لگانا اور واقعات کی عمومی پیش قدمی کے آگے بند باندھنا کسی انسان کے بس میں نہیں ہے، چنانچہ بہتر یہی ہے کہ وہ، جو ناخوشگوار ہے، جب تک بالکل ہی سر پر آموجود نہ ہو، آدمی کو اسے نظر انداز کرتے رہنا چاہیے اور اس کے بجائے اسے صرف اس پر، جو خوشگوار ہے، دھیان دیتے رہنا چاہیے۔ اگر آدمی تنہا ہو تو وہ عام طور پر پہلی آواز پر کان دھرتا ہے لیکن اپنے ساتھی انسانوں کی صحبت میں وہ دوسری آواز کی پیروی کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ اب ماسکو کے باسیوں کا بھی کچھ یہی حال تھا۔ جس قسم کا رونق میلا اور عیش وعشرت کا سماں اس سال ماسکو میں دیکھنے میں آیا، مدتوں سے دیکھنے میں نہیں آیا تھا۔

رستوپ چن کے جہازی سائز کے اشتہار نما یک ورقی خبرنامے منظر عام پر آتے رہتے تھے۔ ان کے اوپر ایک مے خانے، ایک کلال اور ماسکو کے ایک شہری موسوم بہ کارپشکا چچی گی رن[37] — ایک ریزرو فوجی سپاہی، جو پب میں کچھ زیادہ ہی پی لیتا ہے لیکن جب اسے معلوم ہوتا ہے کہ بوناپارت کا ارادہ ماسکو پر چڑھائی کرنے کا ہے، وہ بڑے جلال میں آجاتا ہے اور فرانسیسیوں کو مرصّع ومسجّع زبان میں گالیاں سنانے لگتا ہے۔ وہ مے خانے کے باہر آتا ہے اور ہجوم کے، جو دروازے کے باہر عقاب کی تصویر (شاہی نشان) کے نیچے جمع ہو چکا ہوتا ہے، جذبات کو برانگیختہ کرنے کے لیے زوردار تقریر کرنے لگتا ہے — کی چوب کاری کی تصاویر چھپی ہوتی تھیں۔ ان خبرناموں کو اتنے ہی ذوق وشوق سے پڑھا جاتا تھا اور ان کے متعلق اسی طرح بحثیں ہوتی تھیں جس طرح کہ واسیلی لووچ پوشکن[38] کی نظمیں پڑھی جاتی اور بحث کا موضوع بنتی تھیں۔

ان خبرناموں کو پڑھنے کے لیے کلب کے ارکان کامن روم میں اکٹھا ہوا کرتے تھے۔ کارپشکا چچی گی رن کی زبان سے جس طرح فرانسیسیوں کا مضحکہ اڑوایا جاتا تھا، بعض لوگوں کو وہ پسند آتا تھا۔ وہ کہتے: "وہ ہماری روسی گوبھی کھا کھا کر غباروں کی طرح پھول جائیں گے، روسی پورج کھا کھا کر ان کے پیٹ پھٹ جائیں گے اور

ہماری گو بھی کا سوپ ان کا کام تمام کر دے گا۔ وہ سب کے سب بونے ہیں۔ ہماری ایک کسان عورت ان میں سے تین تین کو بیک وقت اپنی تنگلی پر اٹھائے گی اور انھیں دور پھینک دے گی۔'' دوسروں کو یہ اندازِ گفتگو پسند نہ آتا۔ ان کے خیال کے مطابق یہ عامیانہ اور احمقانہ تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ رَستوپ چن نے چن چن کر تمام فرانسیسیوں، بلکہ دیگر تمام غیر ملکیوں کو بھی، شہر سے نکال دیا ہے اور یہ کہ ان میں سے بعض نپولین کے جاسوس اور ایجنٹ تھے لیکن یہ باتیں اس لیے سنائی جاتی تھیں تا کہ ان کے بہانے موقع کی مناسبت سے رستوپ چن کے ٹھٹھول کو دہرایا جا سکے۔ جب غیر ملکیوں کو اس جہاز میں، جو نژنی جا رہا تھا، سوار کرا دیا گیا، رستوپ چن نے فرانسیسی میں ان سے کہا تھا:*

"Rentrez en vousmeme, entrez dans la barque et n'en faites pas une barque de Charon,"[39]

اس قسم کی باتیں بھی ہو رہی تھیں کہ تمام سرکاری دفاتر ماسکو سے باہر منتقل کرا دیے گئے ہیں اور اس کے ساتھ شن شن کے فی البدیہہ طنزیہ جملے کا اضافہ کر دیا جاتا تھا۔ ''کم از کم اس بات کے لیے ہمیں نپولین کا شکر گزار ہونا چاہیے۔'' کہا جاتا تھا کہ مامونوف نے جو رجمنٹ فراہم کرنا ہے، اس پر اس کے آٹھ ہزار روبل اٹھیں گے لیکن بزدخوف اپنی رجمنٹ پر اس سے زیادہ خرچ کر رہا ہے لیکن بزدخوف جو کچھ کر رہا ہے، اس میں بہترین بات یہ ہے کہ وہ خود وردی پہنے گا اور اپنی رجمنٹ کی قیادت کرے گا۔ اس طرح لوگوں کو جو کھیل تماشا دیکھنے کو ملے گا، اس پر انھیں پھوٹی کوڑی بھی ادا نہیں کرنا پڑے گی۔

''تمھیں کسی پر ذرا ترس نہیں آتا،'' جُولی دروبتیسکایا نے اپنی نرم و نازک انگلیوں سے، جن میں اس نے انگوٹھیاں پہنی ہوئی تھیں، چند الجھے ہوئے دھاگوں کو سمیٹتے اور ان کا گولہ بناتے ہوئے کہا۔

جولی نے الوداعی محفل سجا رکھی تھی۔ وہ اگلے روز ماسکو سے روانہ ہونے کی تیاریاں کر رہی تھی۔

''Bezukhovestridicule**، لیکن وہ بہت شفیق اور نیک فطرت انسان ہے۔ آخر اس قدر Caustique*** ہونے میں کیا لطف آتا ہے؟''

''جرمانہ!'' ایک نوجوان شخص نے، جو ملیشیا کی وردی میں ملبوس تھا، با آواز بلند کہا، جولی اسے monChevalier**** کہتی تھی۔ وہ اس کے ساتھ نژنی جا رہا تھا۔

ماسکو کے بہت سے دوسرے حلقوں کی طرح جولی کے ٹولے نے بھی متفقہ طور پر یہ طے کر لیا تھا کہ وہ روزی

* اپنے کام سے کام رکھیں۔ جہاز میں سوار ہو جائیں لیکن دھیان سے، کہیں کیرن (39) کی کشتی میں سوار نہ ہو جانا۔

** بزدخوف مضحک ہے۔

*** طنز آمیز (طنز کے نشتر چلانے میں کیا لطف آتا ہے؟)

**** my knight۔ قرونِ وسطیٰ میں صنف نازک کے پرزور حامی کو نائٹ کہتے تھے۔

کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں بولیں گے اور وہ لوگ جو غلطی کر بیٹھتے اور فرانسیسی بول جاتے، انھیں ''مجلس برائے رضا کارانہ چندہ جات'' کو جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔

''Gallicism[40] کا دگنا جرمانہ!'' ایک مصنف نے جو وہاں موجود تھا، کہا، 'کیا لطف آتا ہے!' روسی ترکیب نہیں ہے۔''

''تمھیں کسی پر ذرا ترس نہیں آتا،'' جولی نے مصنف کے الفاظ کو نظر انداز کرتے ہوئے نوجوان سے کہا۔ ''Castique کی غلطی میں مانتی ہوں اور تمھیں سچی بات بتانے کے 'لطف' کی خاطر بھی میں جرمانہ ادا کرنے کو تیار ہوں، لیکن جہاں تک فرانسیسی ساخت کے جملے اور ترکیبیں استعمال کرنے کا تعلق ہے، ان کی ذمے دار مجھ پر عاید نہیں ہوتی،'' اس نے مصنف کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''میرے پاس نہ اتنا وقت ہے اور نہ اتنا پیسہ کہ پرنس گالتسین کی طرح روسی سیکھنے کے لیے کوئی اتالیق رکھ لوں۔ لو، وہ آ گئے!'' اس نے مزید کہا۔ ''Quandon*... نہیں، نہیں،'' اس نے ملیشیا کے نوجوان سے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''اب کے میں تمھارے جال میں نہیں آؤں گی۔ آفتاب کا ذکر آیا اور اس کی کرنیں روشنی بکھیرنے لگیں!'' اس نے پیئر کی جانب ملنساری سے مسکرا کر کہا۔ ''ہم ابھی آپ کا ذکر کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آپ کی رجمنٹ مامونوف کی رجمنٹ سے یقیناً بہتر ہوگی۔'' اس نے چرب زبانی سے صریحاً کذب بیانی کرتے ہوئے، جو مالدار، مراعات یافتہ اور پنشن ایبل طبقے کی خواتین کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، مزید کہا۔

''افوہ، مجھ سے میری رجمنٹ کے بارے میں بات نہ کریں،'' پیئر نے اپنی میزبان کی دست بوسی کرتے ہوئے اور اس کے قریب نشست پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس سے بالکل بیزار ہو چکا ہوں۔''

''اس کی کمان یقیناً آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہوگی؟'' جولی نے ملیشیا کے افسر کی طرف دزدیدہ، طنزیہ انداز سے دیکھتے ہوئے کہا۔

موخو الذکر پیئر کی موجودگی میں طنزیہ رویہ اپنانے کی طرف قطعاً مائل نہیں تھا اور اس کے چہرے سے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر جولی کی مسکراہٹ کا مطلب کیا ہے۔ اپنی غیر حاضر دماغی اور نیک فطرت کے باوجود پیئر کی شخصیت میں کچھ ایسی بات تھی کہ جو شخص بھی اس کے منہ پر اس کا مذاق اڑانے کی کوشش کرتا، اسے ناکامی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آتا۔

''نہیں،'' پیئر نے اپنے بھاری بھرکم، بھیم شحیم جثے پر ہنستے ہوئے نظر ڈال کر کہا۔ ''میں فرانسیسیوں کا بہت آسان نشانہ ثابت ہوں گا اور اس کے علاوہ مجھے یقین نہیں، کہ میں گھوڑے پر سوار ہو بھی سکوں گا یا نہیں۔''

جولی کے مہمان گپ شپ کے موضوع کے طور پر جن لوگوں کو منتخب کرتے تھے، ان میں رستوف بھی شامل تھے۔

''سنا ہے کہ ان کے حالات بہت ابتر ہو گئے ہیں،'' جولی نے کہا۔ ''اور ان کا — میرا مطلب ہے کہ کاؤنٹ

---

* اگر چہ، تاہم

کا۔ رویہ بالکل غیر معقول ہے۔ ''رزوموو سکی ماسکو کے قریب مکان اور جاگیر خریدنا چاہتے تھے لیکن بیل منڈھے چڑھ ہی نہیں رہی۔ وہ حد سے زیادہ قیمت مانگ رہے ہیں۔''

''نہیں، میرا خیال ہے کہ سودا چند دنوں میں طے پا جائے گا۔'' ایک مہمان نے کہا، ''حالانکہ اب ماسکو کے قرب و جوار میں کچھ خریدنا نرا پاگل پن ہے۔''

''کیوں؟'' جولی نے پوچھا۔ ''ماسکو کو یقیناً کوئی خطرہ درپیش نہیں۔ کیا خیال ہے آپ کا؟''

''پھر آپ کیوں جا رہی ہیں؟''

''میں؟ کیا عجیب و غریب سوال ہے۔ میں جا رہی ہوں کیونکہ... خیر، کیونکہ ہر کوئی جا رہا ہے۔ اور اس کے علاوہ میں کوئی جون آف آرک[41] یا امیزن[42] تو ہوں نہیں۔''

''ارے ہاں، بالکل بالکل۔ مجھے (کپڑے کی) چند اور پٹیاں دے دو۔''

''اگر انھوں نے اس سودے میں سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا، وہ اپنے تمام قرضے باآسانی ادا کر سکیں گے،'' ملیشیا کے افسر نے رستوف کا ذکر کرتے ہوئے کہا۔

''بڑے میاں آدمی تو اچھے ہیں لیکن بہت pauvresire* ہیں۔ لیکن وہ اتنے عرصے سے شہر میں کیوں مقیم ہیں؟ وہ مدتوں پہلے گاؤں جانے کے لیے پر تول رہے تھے۔ نتالی کی طبیعت بھی دوبارہ بحال ہو گئی ہے۔ نہیں؟'' جولی نے شوخی سے مسکراتے پوچھا۔

''وہ اپنے چھوٹے بیٹے کا انتظار کر رہے ہیں،'' پیئر نے جواب دیا۔ ''وہ ابولنسکی کے قازق دستوں میں شامل ہو گیا تھا اور بیلایا تسرکوف[43] بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں رجمنٹ کی تشکیل ہو رہی ہے۔ لیکن اب اس کا تبادلہ میری رجمنٹ میں ہو گیا ہے اور وہ بس عنقریب یہاں پہنچنے والا ہے۔ کاؤنٹ تو بہت عرصہ پہلے روانہ ہو چکے ہوتے، تاہم جب تک ان کا بیٹا نہیں آ جاتا، دنیا کی کوئی طاقت کاؤنٹس کو جانے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔''

''میری ایک روز قبل ارخاروفوں کے ہاں ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ نتالی کا رنگ روپ پھر سے نکھر آیا ہے اور اس کی زندہ دلی عود کر آئی ہے۔ اس نے ہمیں محظوظ کرنے کے لیے گانا بھی گایا تھا۔ بعض لوگ کتنی آسانی سے ہر مشکل پر قابو پا لیتے ہیں!''

''کس مشکل پر قابو؟'' پیئر نے خفگی سے پوچھا۔

جولی مسکرا دی۔ ''کاؤنٹ، آپ جانتے ہیں کہ آپ جیسے بااخلاق اور خواتین کی آن پر جان نچھاور کرنے والے سورما صرف مادام دَ سوزا[44] کے ناولوں میں ہی پائے جاتے ہیں!''

''سورما! کیا مطلب ہے تمھارا؟'' پیئر نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

''اف، مائی ڈیئر کاؤنٹ، اب چھوڑیں نا!

---

* ناکام باپ یا آقا

Cest la fable de tout Moscou. Je vous admire, maparole d'honneur."*

''جرمانہ! جرمانہ!'' ملیشیا کے افسر نے چلاتے ہوئے کہا۔

''اف، بہت اچھا۔ آج کل تو آدمی اپنی زبان بھی نہیں کھول سکتا۔ کیا بور زمانہ ہے!''

''سارا ماسکو کس کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے؟'' پیئر نے غصے سے پھنکارتے ہوئے پوچھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''چھوڑیں کاؤنٹ، آپ جانتے ہی ہیں!''

''نہیں، میں نہیں جانتا،'' پیئر نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ آپ کی نتالی کے ساتھ ہمیشہ سے کتنی اچھی دوستی چلی آ رہی ہے اور چنانچہ... لیکن میری ویرا سے زیادہ دوستی رہی ہے — وہی ڈیئر ویرا!''

''نہیں، مادام۔'' پیئر نے جھنجلاہٹ اور تکدر کے لہجے میں بات جاری رکھتے ہوئے کہا: ''میں نے کاؤنٹس رستووا کے نائٹ کا کردار ہرگز نہیں سنبھالا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایک ماہ ہونے کو آیا ہے، میں ان کے گھر ہی نہیں گیا۔ لیکن مجھے سمجھ نہیں آتا کہ یہ ظلم —''

''Oui s' excuse—s' accuse''** جولی نے مسکراتے اور کپڑے کی پٹی فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ اور یہ یقین کرنے کے لیے کہ وہ حرفِ آخر کہہ رہی ہے، اس نے جھٹ پٹ موضوع تبدیل کر دیا۔ ''ہاں چلتے چلتے یہ عرض کر دیتی ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بے چاری ماریا بلکونسکایا کل ماسکو پہنچی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ان کے والد خدا کو پیارے ہو گئے ہیں؟''

''واقعی؟ کہاں ہے وہ؟ میں اس سے ملنا چاہوں گا،'' پیئر نے کہا۔

''میں نے گزشتہ شام اس کے ساتھ گزاری تھی۔ وہ آج یا کل صبح ماسکو کے قریب اپنی جاگیر پر چلی جائے گی۔ اپنا بھتیجا بھی اپنے ساتھ لے جا رہی ہے۔''

''بتاؤ، کیسی ہے وہ؟'' پیئر نے پوچھا۔

''بالکل ٹھیک ٹھاک۔ بس ذرا غمگین ہے۔ لیکن آپ کو معلوم ہے کہ اسے بچایا کس نے؟ بالکل رومانی داستان ہے۔ نکولائی رستوف نے۔ وہ محصور ہو چکی تھی۔ وہ اسے ہلاک کرنا چاہتے تھے اور اس کے چند ملازمین زخمی ہو گئے — وہ سرپٹ بھاگتا اندر آیا اور اس نے اسے بچا لیا!''

''ایک اور رومان!'' ملیشیا کے افسر نے کہا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ یہ عام خروج ہوا ہی اس لیے کہ ہماری تمام ادھیڑ عمر کنواری خواتین کی شادیاں ہو سکیں۔ ایک کاتش ہے اور دوسری یہ پرنسس بلکونسکایا ہے۔''

---

* سارا ماسکو جانتا ہے۔ مجھے واقعی آپ پر حیرت ہو رہی ہے۔

** معافی کی خواستگار ہوں، اپنا قصور مانتی ہوں۔

"آپ کو معلوم ہے کہ مجھے واقعی یہ پختہ یقین ہے کہ وہ Jeune un petit peu amoureuse du hommer?*"

"جرمانہ! جرمانہ! جرمانہ!"

"لیکن آدمی یہ بات روسی میں کیسے بیان کر سکتا ہے؟"

18

جب پیئر گھر واپس آیا، اسے دو خبر نامے، جو اسی روز موصول ہوئے تھے، تھمادیے گئے۔

پہلے میں یہ بتایا گیا تھا کہ یہ افواہ کہ کاؤنٹ رستوپ چن نے لوگوں کو ماسکو چھوڑنے سے منع کر دیا ہے، غلط ہے، اس کے برعکس وہ اس بات پر خوش ہے کہ خواتین اور تجار کی بیویاں شہر کو خیر باد کہہ رہی ہیں۔ "اس سے خوف و ہراس میں کمی ہوگی اور ادھر ادھر کی گپ شپ میں تخفیف ہوگی۔" 'خبر نامہ' میں کہا گیا تھا۔ "تاہم میں یہ بات دعویٰ سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ لفنگا شہر میں قدم نہیں رکھ سکے گا اور اگر وہ یہاں آگیا تو بے شک میری گردن اڑا دی جائے۔" ان الفاظ سے پیئر پر پہلی مرتبہ بالکل واضح انداز سے منکشف ہوا کہ فرانسیسی ماسکو میں آیا ہی چاہتے ہیں۔ دوسرے خبر نامے میں اعلان کیا گیا تھا کہ ہمارا فوجی ہیڈ کوارٹر ویازما[45] میں ہے، کاؤنٹ ونٹ لسنگے روڈے[46] نے فرانسیسیوں کو شکست فاش سے دوچار کر دیا ہے لیکن چونکہ ماسکو کے اکثر شہری اپنے آپ کو ہتھیار بند کرنا چاہتے ہیں، اسلحہ خانے میں ان کے لیے ہتھیار موجود ہیں، شمشیریں، پستول اور بندوقیں سستے داموں حاصل کی جا سکتی ہیں۔" ان خبر ناموں کا لہجہ مضحکہ خیز حد تک ٹھٹھول سے اتنا بھرپور نہیں تھا جتنا کہ ان خبر ناموں کا ہوتا تھا جن میں تچی گی رن کے اقوال و آرا منقول کیے جاتے تھے۔ پیئر ان پر ہر پہلو سے غور و فکر کرتا رہا۔ وہ بھیانک طوفانی بادل، جن کی اس کی روح نے پوری قوت سے تمنا کی تھی لیکن جو غیر ارادی طور پر اسے دہشت زدہ کیے دے رہے تھے، صریحاً قریب آ رہے تھے۔

"کیا میں ملازمت اختیار کر لوں اور فوج میں شامل ہو جاؤں یا مجھے انتظار کرنا چاہیے؟" اس نے سویں مرتبہ اپنے آپ سے پوچھا۔

اس نے میز سے تاش کی گڈی اٹھائی اور پیشنس کھیلنے کے لیے پتے بچھا دیے۔

"اگر اس بازی میں صحیح پتے نکل آئے،" اس نے پتے پھینٹنے کے بعد انھیں ذرا کی ذرا ہاتھ میں تھامنے اور

---

* "وہ آج کل کچھ کچھ کسی بانکے چھورے سے اٹکی ہوئی ہے۔"
اصل فرانسیسی جملے میں جو لطف اور کاٹ ہے، کسی دوسری زبان میں اس کا اظہار ممکن نہیں۔ Jeune homme (نوخیز شخص) عورت کا وہ محبوب ہوتا ہے جو عمر میں اس سے خاصا چھوٹا ہو۔ جولی کہنا یہ چاہتی ہے کہ پرنس ماریا تو خاصی بڑی عمر کی ہو چکی ہے لیکن وہ ایک ایسے نوجوان (نکولائی رستوف) کی محبت میں گرفتار ہو گئی ہے جو بلحاظ عمر اس سے کافی چھوٹا ہے۔ جولی کے لہجے میں طنز ہی نہیں، تلخی بھی ہے کیونکہ کسی زمانے میں وہ خود بھی نکولائی رستوف پر ڈورے ڈالتی رہی تھی۔ (پہلی کتاب، حصہ اول، باب نمبر 9، 22)۔ (مترجم)

سر اٹھا کر اوپر دیکھنے کے بعد اپنے آپ سے کہا۔ ''اگر اس بازی میں جیت ہو گئی تو اس کا مطلب یہ ہو گا... کیا مطلب ہو گا؟''

پیشتر اس کے کہ وہ مطلب، کا فیصلہ کر پاتا، اسے اپنے سٹڈی روم کے دروازے پر بڑی پرنس کی آواز سنائی دی۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی کہ آیا وہ اندر آسکتی ہے۔

''اس کا مطلب یہ ہو گا کہ مجھے لازماً فوج میں چلا جانا چاہیے،'' اس نے نتیجہ اخذ کیا۔ ''آئیں، اندر آجائیں،'' اس نے پرنس سے کہا۔

صرف سب سے بڑی پرنس، جس کی کمر لمبی اور چہرہ پتھریلا تھا، ابھی تک پیئر کے گھر میں رہ رہی تھی۔ اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔

''mon cousin* میں مخل ہونے کی معافی چاہتی ہوں۔ اس کے لہجے میں سرزنش بھی تھی اور اس سے پریشانی کا اظہار بھی ہو رہا تھا۔ ''تم جانتے ہو کہ اب وقت آگیا ہے کہ تم کسی فیصلے پر پہنچ جاؤ۔ کیا ہونے والا ہے؟ ہر شخص ماسکو کو خیرباد کہہ چکا ہے اور لوگ ہنگامے کر رہے ہیں۔ ہم ابھی تک یہاں کیوں ٹھہرے ہوئے ہیں؟''

''ma cousine**، اس کے برعکس مجھے تو ہر شے تسلی بخش دکھائی دے رہی ہے،'' پیئر نے دل لگی کے لہجے میں کہا۔ پرنس کے محسن کے کردار میں اسے جو شرمندگی اور الجھن ہوتی تھی، اس پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے اس قسم کا لہجہ اختیار کرنے کی عادت ہو گئی تھی۔

''ہاں، بہت تسلی بخش، انتہائی تسلی بخش، واقعی! آج صبح ہی مجھے وارواراایوانوونا بتا رہی تھی کہ ہماری فوج کیسے کیسے کارنامے سرانجام دے رہی ہے! اس کی نیک نامی میں اضافہ ہو رہا ہے! رہے عام لوگ، وہ حتمی طور پر باغی ہو رہے ہیں اور کسی کی بات نہیں سن رہے— میری اپنی خادمہ مجھ سے گستاخی سے پیش آنے لگی ہے۔ اگر حالات اسی طرح رہے، پھر وہ دن دور نہیں جب وہ ہمارا قتل عام شروع کر دیں گے۔ اب تو گلی کوچوں میں چلنا پھرنا بھی محفوظ نہیں رہا۔ لیکن بدترین بات یہ ہے کہ فرانسیسی کوئی دن یہاں پہنچا چاہتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہاں کس چیز کا انتظار کر رہے ہیں؟ mon کزن، میں تم سے صرف ایک چیز کی التجا کر رہی ہوں،'' پرنس نے کہا: ''مجھے پیٹرزبرگ پہنچانے کا انتظام کر دو۔ میں خواہ کیسی ہی کیوں نہ ہوں، مجھے بوناپارٹ کی حکومت کے زیر سایہ زندگی گزارنا منظور نہیں۔''

''ارے چھوڑیں، ma cousine، آپ کو اس قسم کی معلومات کہاں سے مل جاتی ہیں؟ اس کے برعکس—''

''میں تمھارے نپولین کے سامنے گردن خم نہیں کروں گی! دوسرے چاہیں تو بے شک کرتے پھریں لیکن... اگر تم میرا یہ کام نہیں کرو گے—''

---

* میرے ماموں زاد بھائی

** میری پھوپی زاد، فرانسیسی میں اگر مرد سے بات کی جائے تو mon استعمال ہو گا لیکن عورت کے لیے ma۔ اور اسی طرح Cousin مذکر ہے اور Cousine مؤنث۔

"کروں گا، ضرور کروں گا۔ میں ابھی حکم دیے دیتا ہوں۔"

صریحاً پرنس کو یہ پریشانی ہو رہی تھی کہ کوئی نہیں جس پر وہ اپنا غصہ جھاڑ سکے۔ وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑائی اور کرسی کے بالکل کنارے پر بیٹھ گئی۔

"لیکن آپ کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے،" پیئر نے کہا۔ "شہر میں بالکل امن وسکون ہے اور خطرے کی ہلکی سی علامت بھی نہیں۔ میں ابھی ابھی یہ پڑھ رہا تھا..." اس نے اسے خبرنامے دکھائے۔ "کاؤنٹ رستوپ چن لکھتا ہے کہ فرانسیسی شہر میں داخل نہیں ہو سکیں گے اور اگر وہ داخل ہو گئے تو بے شک اس کی گردن مار دی جائے۔"

"اف، تمھارا یہ کاؤنٹ!" پرنس نے کینہ پرور لہجے میں بات کرتے ہوئے کہا۔ "وہ منافق ہے، لفنگا ہے، اور اس نے خود لوگوں کو اکسایا ہے کہ وہ فساد برپا کریں۔ کیا اس نے اپنے ان احمقانہ خبر ناموں میں یہ نہیں لکھا کہ وہ جس شخص کو، خواہ وہ کوئی بھی ہو، چاہیں، سر کے بالوں سے پکڑیں اور گھسیٹتے ہوئے حوالات پہنچا دیں؟ (کیا احمقانہ بات ہے!) 'جو شخص یہ کام کرے گا، وہ کہتا ہے، 'عزت واحترام اور شان وشوکت سے سرفراز ہوگا!' اب تم خود دیکھ لو کہ اس قسم کی ترغیبات نے ہمیں کہاں پہنچا دیا ہے۔ وار دارا ایوانوونا نے مجھے بتایا ہے کہ وہ ہجوم کے ہاتھوں ہلاک ہونے سے بال بال بچی کیونکہ اس کے منہ سے فرانسیسی کے چند الفاظ نکل گئے تھے۔"

"خیر، پھر بھی... آپ ہر بات دل کو لگا لیتی ہیں..." پیئر نے پیشنس کی بازی کے لیے پتے پھیلاتے ہوئے کہا۔

اگرچہ اس بازی میں صحیح پتے نکل آئے لیکن پیئر فوج میں شامل نہ ہوا۔ وہ سنسان شہر میں مقیم رہا۔ شہر پر گھبراہٹ، بے یقینی اور دہشت کی فضا چھائی ہوئی تھی اور وہ کسی مہیب شے کے وقوع پذیر ہونے کا منتظر تھا۔

اگلے روز شام کے قریب پرنس روانہ ہو گئی اور پیئر کا سٹیوارڈ اسے اطلاع دینے آیا کہ رجمنٹ کے لیے ہتھیار اور دوسرا ساز وسامان خریدنے کے لیے جو رقم درکار ہے، وہ ایک آدھ جاگیر بیچے بغیر حاصل کرنا ناممکن ہے۔ سٹیوارڈ کی یہ عادت بن گئی تھی کہ وہ موقع بے موقع پیئر کو یہ جتاتا رہتا تھا کہ رجمنٹ کو مسلح کرنے اور اس کے لیے ساز وسامان فراہم کرنے اور اس قسم کے جو دیگر من موجی منصوبے اس کے ذہن میں آتے رہتے ہیں، وہ ایک روز اس کی بربادی کا موجب بنیں گے۔ پیئر نے اس کی بات سنی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ پر قابو پا سکا۔

"اچھا، پھر بیچ دو،" اس نے کہا۔ "اب کیا ہو سکتا ہے۔ میں اپنے قول سے نہیں پھر سکتا۔"

صورت حال جتنی زیادہ خراب ہوتی، خاص طور پر اس کے اپنے معاملات کی، پیئر کو اتنی ہی زیادہ خوشی محسوس ہوتی، اور اتنا ہی زیادہ اس پر یہ واضح ہو جاتا کہ جس آفت کا اسے انتظار تھا، اس کی گھڑی آ پہنچی ہے۔ جن لوگوں کو وہ جانتا تھا، ان میں سے اب شاید ہی کوئی شہر میں باقی رہ گیا ہوگا۔ جولی جا چکی تھی، پرنس ماریا جا چکی تھی۔ اس کے قریبی دوستوں میں صرف رستوف ابھی تک وہیں قیام پذیر تھے، لیکن وہ انھیں ملنے نہیں جاتا تھا۔

اپنا دھیان بٹانے کے لیے پیئر اس روز ورنت ساوو گاؤں چلا گیا۔ وہ اس عظیم غبارے کو، جو دشمن کو تباہ

کرنے کے لیے لے پچ [47(الف)] تعمیر کر رہا تھا، دیکھنا چاہتا تھا۔ آزمائشی غبارہ اگلے روز چھوڑا جانا تھا۔ غبارہ ابھی تیار نہیں ہوا تھا لیکن پیئر کو معلوم تھا کہ اسے زار کی خواہش پر تعمیر کیا جا رہا ہے۔

زار نے کاؤنٹ رستوپ چن کو لکھا تھا:

جونہی لے پچ کی تیاری مکمل ہو جائے، اس کے چھکڑے کے لیے قابل اعتماد اور سمجھ دار اشخاص کا عملہ اکٹھا کر لو اور کوتوزوف کو اطلاع دینے کے لیے ایلچی روانہ کر دو۔ اسے میں اس سلسلے میں مطلع کر چکا ہوں۔

ہاں، اتنی مہربانی کرو اور لے پچ کو اچھی طرح سمجھا دو کہ اس نے اولیں بار اپنا غبارہ کہاں اتارنا ہے۔ اس ضمن میں اسے پوری احتیاط برتنا ہوگی مبادا اس سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور وہ دشمن کے ہاتھ چڑھ جائے۔ یہ بہت ضروری ہے کہ وہ اپنی نقل و حرکت کمانڈر انچیف کی نقل و حرکت کے ساتھ مربوط کرے۔

ورنت ساوو سے واپسی پر جب پیئر اپنی گاڑی میں بلوتنایا سکوائر میں سے گزر رہا تھا، اسے بہت بڑا ہجوم، جو لابنوئے پلیس [47(ب)] میں اکٹھا ہو چکا تھا، نظر آیا۔ وہ رک گیا اور اپنی دروشکی سے باہر نکل آیا۔ ایک فرانسیسی خانساماں، جس پر جاسوسی کا الزام لگایا گیا تھا، کوڑے کھا رہا تھا۔ کوڑوں کی سزا ابھی ابھی ختم ہوئی تھی اور جلاد اس بچ سے، جس پر بٹھا کر کوڑے لگائے جاتے تھے، ایک لحیم شحیم شخص کو کھول رہا تھا۔ اس کی مونچھیں سرخ، جرابیں نیلی اور لانبی، اور کوٹ سبز تھا۔ وہ اس طرح آہ و بکا کر رہا تھا کہ اس کی حالت دیکھ کر ترس آتا تھا۔ ایک اور ہجوم قریب کھڑا تھا۔ وہ دبلا پتلا اور زرد رو شخص تھا۔ چہروں سے اندازہ ہوتا تھا کہ دونوں فرانسیسی ہیں۔ پیئر کا چہرہ بھی اتنا ہی پیلا ہو گیا جتنا کہ دبلے پتلے شخص کا تھا۔ وہ کہنیاں چلاتا ہجوم میں آگے بڑھنے لگا۔

''یہ کیا ہے؟ یہ کون ہیں؟ انھوں نے کیا کیا ہے؟'' وہ بار بار پوچھ رہا تھا۔

لیکن ہجوم ـــ کلرکوں، دستکاروں، دکانداروں، کسانوں اور عورتوں، جو چغوں اور اوورکوٹوں میں ملبوس تھے ـــ کے سامنے جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے اتنے انہماک سے دیکھنے میں مصروف تھے کہ کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا۔ لحیم شحیم آدمی ناک بھوں چڑھاتا اور کندھے اچکاتا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ مصیبت اور تکلیف میں صبر و تحمل سے کام لینا جانتا ہے۔ وہ ادھر ادھر دیکھے بغیر اپنا کوٹ پہننے لگا۔ پھر وہ اچانک رونے لگا۔ وہ اس پر شرمندہ ضرور تھا لیکن وہ رو ایسے رہا تھا جیسے کوئی تنومند بالغ شخص رو سکتا ہے۔ ہجوم میں شامل لوگ اونچے سروں میں باتیں کرنے لگے۔ پیئر کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس طرح رحم و ہمدردی کے جذبات کا گلا گھونٹ دینا چاہتے ہوں۔

''وہ کسی پرنس کا خانساماں ہے...''

''ایں، موسیو، روسی چٹنی فرانسیسیوں کے لیے قدرے ترش ہے... دانت کھٹے ہو جاتے ہیں!'' ایک کلرک

نے، جس کے چہرے پر جھریاں ہی جھریاں تھیں اور جو پیئر کے قریب کھڑا تھا، فرانسیسی کو روتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

کلرک نے تیزی سے ادھر ادھر نگاہ گھمائی۔ بظاہر اسے توقع تھی کہ اس کے مذاق کو پسند کیا جائے گا۔ بعض لوگ ہنس پڑے لیکن اکثر منہ بنائے جلاد کی، جو دوسرے آدمی کا لباس اتار رہا تھا، طرف دیکھتے رہے۔

پیئر کا دل بھر آیا اور اس کا گلا رندھنے لگا۔ اس کا ماتھا شکن آلودہ ہو گیا۔ جب وہ واپس اپنی دروشکی کی طرف جا رہا تھا اور وہاں پہنچنے کے بعد اس میں بیٹھ رہا تھا، وہ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ گاڑی چلتی رہی اور اس کا بدن کپکپاتا رہا۔ متعدد مرتبہ وہ اتنی اونچی آواز سے چلایا کہ کوچوان کو مڑ کر پوچھنا پڑا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' پیئر نے، جب کوچوان لبیانکا سٹریٹ کی طرف مڑا، چلا کر پوچھا۔

''آپ کے حکم کے مطابق گورنر جنرل کے ہاں،'' کوچوان نے جواب دیا۔

''احمق! گدھا!'' پیئر نے کوچوان کو ڈانٹ پلاتے ہوئے (ویسے وہ یہ حرکت کم ہی کیا کرتا تھا) باآواز بلند کہا۔ ''میں نے کہا تھا: 'گھر۔' کوڑھ مغز، ذرا تیز چلو!'' پھر وہ اپنے آپ سے زیر لب کہنے لگا: ''مجھے آج ہی یہاں سے نکل جانا چاہیے۔''

اس جگہ کو، جہاں لوگوں کو سزائیں دی جا رہی تھیں، ان فرانسیسیوں کو، جنھیں سزائیں دی گئی تھیں، اور اس ہجوم کو، جو وہاں اکٹھا ہو گیا تھا، دیکھ کر پیئر نے پختہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ماسکو میں ہرگز مزید قیام نہیں کر سکتا، بلکہ اسے اسی روز روانہ ہو جانا اور جا کر فوج میں شامل ہو جانا چاہیے۔ وہ اپنے ان خیالوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ اسے محسوس ہوا کہ وہ (اپنی منزل مقصود کے بارے میں) کوچوان کو بتا چکا تھا اور اگر اس نے نہیں بتایا تھا پھر اسے خود معلوم ہو جانا چاہیے تھا۔

گھر پہنچ کر پیئر نے اپنے ہیڈ کوچوان یوستافیوچ — یہ شخص سب کچھ جانتا تھا، ہر کام کر سکتا تھا اور ماسکو کا بچہ بچہ اس سے واقف تھا — کو بتایا کہ وہ فوج میں شامل ہونے کے لیے اسی روز موژیسک[48] روانہ ہو جائے گا، چنانچہ اس کے سواری کے گھوڑے آگے بھیج دیے جائیں۔ یہ سارے انتظامات ایک دن میں مکمل نہیں کیے جا سکتے تھے، چنانچہ یوستافیوچ کی درخواست پر اس نے اپنی روانگی ایک دن کے لیے ملتوی کر دی تاکہ وہ گھوڑے، جو راستے میں تبدیل کرنا تھے، پیشگی بھیجے جا سکیں۔

خراب موسم کے بعد چوبیس تاریخ کو مطلع صاف ہو گیا اور ڈنر کے بعد پیئر ماسکو سے روانہ ہو گیا۔ پرخوش کو ''گاؤں میں، جہاں وہ رات کو گھوڑے تبدیل کرنے کے لیے رک گیا تھا، اسے معلوم ہوا کہ اس شام زبردست معرکہ بپا ہوا تھا (یہ شیوار دینو کی لڑائی تھی)۔ اسے معلوم ہوا کہ فائرنگ اتنی دھواں دار تھی کہ پرخوش کو دو میں دھرتی کانپنے لگی تھی۔ لیکن جیت کس کی ہوئی، اس کے متعلق کوئی اسے کچھ نہ بتا سکا۔ اگلی صبح طلوع آفتاب کے سمے پیئر موژیسک کے قریب پہنچ گیا۔

موژیسک میں کوئی مکان ایسا نہیں تھا جس میں فوجی مقیم نہ ہوں۔ ہوٹل میں پیئر کی ملاقات اپنے سائیس اور

کوچوان سے ہوئی۔ وہاں بھی کوئی کمرا خالی نہیں تھا۔ ہوٹل بھی فوجیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔

قصبے اوراس کے مضافات میں یا تو فوجی مقیم تھے یا ادھر ادھر رواں دواں تھے۔ جدھر نگاہ جاتی تھی قازق، پیادہ اور گھڑسوار فوجی، چھکڑے، توپ گاڑیاں اور گولے بارود کے ریہڑے نظر آ رہے تھے۔ پیئر جتنا تیز چل سکتا تھا، آگے ہی آگے چلتا گیا۔ وہ ماسکو سے جتنا زیادہ دور ہوتا جارہا تھا اور فوجیوں کے اس سمندر کے جتنا زیادہ درمیان میں گھستا جارہا تھا، اتنی ہی زیادہ اس کی تشویش بڑھتی جارہی تھی اور وہ اتنا ہی زیادہ ایک نئے اور خوشگوار جذبے سے، جس کا ازیں پیشتر اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، مغلوب ہوتا جارہا تھا۔ یہ جذبہ اس جذبے سے، جو اسے زار کی آمد کے موقع پر سلابودا محل میں محسوس ہوا تھا، ملتا جلتا تھا۔ اس کے دل میں یہ سوچ آ رہی تھی کہ کچھ کرنے اور قربانی دینے کی اشد ضرورت ہے۔ اب وہ اس خوش کن یقین سے آگاہ تھا کہ وہ ہر چیز—سہولیات، دولت، بلکہ زندگی بذات خود بھی—جو انسانی مسرت کی تشکیل کرتی ہے، لایعنی ہے، اور انسان اسے بڑی خوشی سے ٹھکرا سکتا ہے، خاص طور پر جب وہ ان خطوط پر سوچتا ہو کہ... کن خطوط پر، پیئر اس بارے میں کچھ کہنے سے قاصر تھا اور اس نے یہ متعین کرنے کی کوئی کوشش نہ کی کہ اسے کس شخص یا کس چیز کی خاطر ہر چیز قربان کر دینے میں یہ انوکھی مسرت محسوس ہو رہی ہے۔ قربانی کس کے لیے تھی، اس سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا، یہ فی نفسہٖ قربانی تھی جو اسے یہ نیا اور پرمسرت جذبہ فراہم کر رہی تھی۔

19

شیواردینو مورچے[49] کی لڑائی چوبیس اگست کو لڑی گئی، پچیس کو فریقین میں سے کسی نے بھی ایک گولی تک نہ چلائی اور چھبیس کو بارودینو[50] کا معرکہ برپا ہوا۔

شیواردینو اور بارودینو کی لڑائیاں کیسے لڑی گئیں، کیوں لڑی گئیں، ان کے لڑنے کے لیے فریق مخالف کو کیوں للکارا گیا اور مخالف فریق نے لڑائی کی دعوت کیوں قبول کی؟ بارودینو کی لڑائی کا مقصد کیا تھا؟ اس میں نہ روسیوں کے لیے اور نہ فرانسیسیوں کے لیے مطلق کوئی معانی تھے۔ جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، اس کا فوری نتیجہ یہ برآمد ہوا اور برآمد بھی لازماً یہی ہونا تھا کہ ہمیں ماسکو کی تباہی کے قریب تر پہنچا دیا گیا (اور یہ وہ چیز تھی جس سے ہم دنیا کی کسی بھی دوسری شے کے مقابلے میں زیادہ خائف تھے)۔ اور جہاں تک فرانسیسیوں کا تعلق ہے، ان کی ساری فوج تباہی کے قریب تر پہنچ گئی (اور وہ بھی دنیا کی کسی بھی دیگر شے کے مقابلے میں اس سے زیادہ خائف تھے)۔ انجام بالکل واضح نظر آ رہا تھا، پھر بھی نپولین نے لڑائی کا طبل بجا دیا اور کوتوزوف نے اس کا جواب دینے کی ہامی بھر لی۔

اگر فوجی کمانڈروں نے عقل سے کام لیا ہوگا تو معلوم یہی ہوگا کہ نپولین پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی ہوگی کہ تیرہ سو میل پیش قدمی کرنے اور ایک ایسی لڑائی کی، جس میں اس کی ایک چوتھائی فوج کے ہلاک ہونے کا

احتمال تھا، دعوت دینے کے بعد وہ یقینی شکست کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور کوتوزوف پر بھی یہ بات بالکل اسی طرح واضح ہوگئی ہوگی کہ لڑائی کی دعوت قبول کرنے اور اپنی چوتھائی فوج کی جانیں خطرے میں ڈالنے کے بعد اسے یقینی طور پر ماسکو سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ حسابی طور پر بات کوتوزوف کے لیے بالکل اسی طرح واضح ہوگی جس طرح مجھ پر یہ بات واضح ہے کہ ڈرافٹ کی بازی میں اگر میرا ایک مہرہ بھی کم پڑ جائے اور میں اپنے ایک ایک مہرے کی قربانی دے کر دشمن کا ایک ایک مہرہ ہتھیا تا رہوں، نتیجہ لازماً میری شکست کی صورت میں برآمد ہوگا۔ چنانچہ مجھے اپنے مہرے کی قربانی پر دشمن کا مہرہ ہتھیانے سے گریز کرنا چاہیے۔ جب میرے حریف کے پاس سولہ مہرے ہوں اور میرے پاس چودہ، تو میں اس کی نسبت صرف 8/1 کمزور ہوں لیکن اگر میں تیرہ مہرے گنوا دوں، پھر وہ مجھ سے تین گنا مضبوط ہو جائے گا۔

بارودینو کی لڑائی تک ہماری اور فرانسیسی افواج کے مابین تقریباً پانچ اور چھ کا توازن تھا لیکن اس لڑائی کے بعد یہ توازن ایک اور دو کا ہوگیا۔ دوسرے الفاظ میں لڑائی سے پہلے ان کے ایک لاکھ بیس ہزار فوجیوں کے مقابلے میں ہماری نفری ایک لاکھ تھی۔ لیکن لڑائی کے بعد ان کے ایک لاکھ کے مقابلے میں ہمارے پاس پچاس ہزار رہ گئے۔ پھر بھی زیرک اور تجربے کار کوتوزوف نے لڑائی کی دعوت قبول کر لی جب کہ نپولین نے، جسے عسکری نابغہ کہا جاتا ہے، لڑائی کی دعوت دے دی، یوں اس نے اپنی چوتھائی فوج کٹوا دی اور اپنا محاذ پہلے سے کہیں زیادہ بڑے علاقے پر پھیلا دیا۔ اگرچہ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسے توقع تھی کہ اس کے ماسکو پر قبضہ کرنے کے بعد جنگ ختم ہو جائے گی، تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شواہد کافی حد تک اس کے برعکس تھے۔ نپولین کے مورخین خود ہمیں بتاتے ہیں کہ وہ سمولنسک کے آگے رک جانا چاہتا تھا، محاذ کی وسعت پذیری میں جو خطرات پنہاں تھے، وہ ان سے بخوبی آگاہ تھا اور وہ جانتا تھا کہ ماسکو پر قبضہ ہو جانے کے بعد جنگ ختم نہیں ہوگی کیونکہ اس نے سمولنسک میں دیکھ لیا تھا کہ روسی شہر کس حالت میں اس کے لیے چھوڑے جا رہے ہیں اور اس نے مذاکرات کا ڈول ڈالنے کے لیے جو متعدد اعلانات کیے تھے، ان میں سے اسے ایک کا بھی جواب نہیں ملا تھا۔

بارودینو کے مقام پر لڑائی کی دعوت دے کر اور اسے قبول کر کے نپولین اور کوتوزوف نے غیر منطقی اور اپنے ارادوں کے برعکس طرز عمل اختیار کیا۔ بعد میں مورخین نے کمانڈروں کی پیش بینی اور عبقریت کے ایسے ایسے ثبوت، جنھیں نہایت عیاری اور پرکاری سے گھڑا گیا تھا تاکہ وہ ان حقائق پر، جو پہلے ہی پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے تھے، منطبق ہو سکیں، فراہم کر دیے، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ نے عالمی واقعات کو ظہور میں لانے کے لیے جن لوگوں کو اپنے آلۂ کار کے طور پر (بے شک یہ لوگ غیر ارادی طور پر آلۂ کار بنے) استعمال کیا، ان میں یہ جرنیل سب سے زیادہ بے خبر تھے اور ان کا طرز عمل سب سے زیادہ غلامانہ اور حلقہ بگوشانہ تھا۔

متقدمین نے ہمارے لیے ایپک نظموں کی جو مثالیں چھوڑی ہیں، ان میں کہانی کی ساری دلچسپی ہیرو کے گرد گھومتی ہے اور ہم آج تک اپنے اذہان کو اس تصور کے عادی بنانے میں ناکام رہے ہیں کہ ہمارے عہد کے

لیے اس قسم کی تاریخ بے معنی ہے۔

جہاں تک دوسرے سوال کا تعلق ہے کہ بارودینو اور اس سے قبل شوار دینو کی لڑائی کیوں لڑی گئی، تو اس کے بارے میں بالکل قطعی اور جانی پہچانی لیکن کاملاً غلط وضاحت موجود ہے۔ سبھی مورخین اس معاملے کو یوں پیش کرتے ہیں:

روسی فوج نے (وہ کہتے ہیں) سمولنسک سے پسپائی اختیار کرنے کے بعد عمومی لڑائی بکنے لیے ایسا مقام، جو ان کے لیے انتہائی سازگار ہوتا، منتخب کرنے کی کوشش کی اور انھیں یہ میدان بارودینو میں ملا۔

روسیوں نے (وہ کہتے ہیں) سمولنسک سے ماسکو جانے والی شاہراہ کے بائیں جانب اور اس کے تقریباً زاویہ قائمہ پر بارودینو سے یوتستا گاؤں تک اس میدان میں اونچی زمین پر پیشگی مضبوط مورچے تعمیر کر لیے۔

دشمن کی نقل و حرکت کا مشاہدہ کرنے کے لیے (وہ کہتے ہیں) اس میدان کے سامنے شیوار دینو کے مورچے کے اوپر مضبوط بیرونی چوکی تعمیر کی گئی۔ چوبیس تاریخ کو (ہمیں بتایا جاتا ہے) نپولین نے اس بیرونی چوکی پر قبضہ کر لیا اور چھبیس تاریخ کو اس نے تمام روسی فوج پر، جو بارودینو کے میدان میں اپنی پوزیشنیں سنبھال چکی تھی، ہلّہ بول دیا۔

مورخین یہی کہتے ہیں اور جیسا کہ ہر وہ شخص، جو حقائق کی چھان پھٹک کرنے کی تکلیف گوارا کرتا ہے، سمجھ سکتا ہے، یہ سب کچھ بالکل غلط ہے۔

روسیوں نے انتہائی سازگار میدان تلاش کرنے کی جستجو نہیں کی تھی۔ اس کے برعکس سمولنسک سے پسپائی کے دوران میں ان کا گزر متعدد ایسے مقامات سے، جو بارودینو سے کہیں بہتر تھے، ہوا تھا۔ وہ ان میں سے کسی مقام پر بھی نہ ٹھہرے کیونکہ کوتوزوف کسی ایسے مقام پر، جو اس کا اپنا منتخب کردہ نہیں تھا، قابض نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ لڑائی کے عوامی مطالبے نے ابھی اتنی شدت اختیار نہیں کی تھی، میلورادووچ ابھی تک اپنی ملیشیا کے ساتھ نہیں پہنچا تھا اور ان کے علاوہ متعدد دیگر اسباب بھی کارفرما تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس سڑک کے ساتھ ساتھ روسی فوج پسپا ہو رہی تھی، اس پر بے شمار مقامات تھے جو مورچوں کی تعمیر کے لیے انتہائی موزوں تھے اور بارودینو کا وہ مقام، جہاں معرکہ بپا ہوا، مورچوں کی تعمیر کے لیے انتہائی موزوں تو کیا ہوتا، وسیع و عریض روسی مملکت کے کسی بھی دوسرے مقام سے، جسے آپ نقشے پر انگل پچو بن لگا کر منتخب کر سکتے ہیں، کسی صورت بہتر نہیں تھا۔

روسیوں نے نہ صرف جرنیلی سڑک کے بائیں طرف اور اس کے زاویہ قائمہ پر بارودینو کے میدان (یعنی وہ مقام جہاں لڑائی لڑی گئی) میں نہ صرف مضبوط مورچے تعمیر کرنے سے گریز کیا بلکہ 25 اگست 1812 تک انھوں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ یہاں لڑائی لڑے جانے کا کوئی امکان ہے۔ اس کا اظہار ایک تو اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ 25 اگست سے قبل وہاں مورچوں کی تعمیر نہیں ہوئی تھی اور جن کی پچیس اور چھبیس اگست کو تعمیر شروع ہوئی بھی، وہ بھی پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکے۔ دوسری بات شیوار دینو کے مورچے کا مقام ہے۔ چونکہ یہ اس میدان کے، جہاں لڑائی

لڑنے کی ہامی بھری گئی، عین سامنے واقع تھا، اس کے کوئی معانی نہیں تھے۔ کسی دوسری چوکی کی نسبت اس مورچے کو کیوں اتنا زیادہ مضبوط بنایا گیا؟ چوبیس تاریخ کی شام تک اسے بچانے کے لیے تمام ممکن کوششیں کیوں بروئے کار لائی گئیں اور چھ ہزار افراد کی قربانی کیوں دی گئی؟ دشمن کی نقل وحرکت کا مشاہدہ کرنے کے لیے قازقوں کی صرف ایک گشتی پارٹی کافی ہوتی۔ یہ بات کہ جس مقام پر لڑائی لڑی گئی، اس کے متعلق پیشگی سوچ بچار نہیں کیا گیا تھا اور یہ کہ شیواردینو کا مورچہ اس مقام کی بیرونی چوکی نہیں تھا، اس کا تیسرا ثبوت ہمارے پاس یہ حقیقت ہے کہ پچیس تاریخ بار کلے دَتولی اور باگ راتیاں کو یہی یقین تھا کہ شیواردینو کا مورچہ میدان کارزار کا بایاں پہلو ہے اور خود کوتوزوف اس رپورٹ میں، جو لڑائی کے فوراً بعد تحریر کی گئی، شیواردینو کے مورچے کو بایاں پہلو قرار دیتا ہے۔ یہ تو بہت بعد میں، جب جنگ کے بارے میں تفصیلی روداد یں اطمینان اور فراغت سے تحریر کی گئیں کہ یہ غیر صحیح اور عجیب وغریب دعاوی گھڑے گئے (ان کا مقصد غالباً کمانڈر انچیف کی فاش غلطیوں کی پردہ پوشی کرنا تھا کیونکہ اسے ایک ایسے شخص کے، جس سے کوئی غلطی سرزد نہیں ہو سکتی، روپ میں پیش کیا جانا مقصود تھا) کہ شیواردینو کا مورچہ بیرونی چوکی تھا (جبکہ درحقیقت یہ بائیں بازو میں محض ایک مضبوط مورچہ تھا) اور یہ کہ بارودینو کی لڑائی اس میدان میں، جسے ہم نے پہلے ہی منتخب کر لیا تھا اور وہاں اپنی پوزیشنیں مستحکم بنالی تھیں، لڑی گئی، حالانکہ جس میدان میں گھمسان کا رن پڑا، اس کے متعلق نہ تو پیشگی قطعاً کچھ سوچا گیا اور نہ وہاں کوئی خاص مضبوط مورچے تعمیر کیے گئے۔

صریحاً معاملہ کچھ اس طرح وقوع پذیر ہوا۔ دریائے کالوچا کے — جو جرنیلی سڑک کو زاویہ قائمہ پر نہیں بلکہ حادہ زاویہ بنا کر قطع کرتا ہے — کنارے ایک میدان منتخب کر لیا گیا، چنانچہ بایاں پہلو شیواردینو، دایاں نووایا گاؤں کے قریب اور قلب بارودینو میں کالوچا اور وائی نا دریاؤں کے سنگم پر بنا۔ جو شخص بھی سوچے بغیر کہ لڑائی حقیقتاً کس طرح لڑی گئی تھی، جب بارودینو کے میدان پر نظر دوڑائے گا، اسے یہ مقام، جسے دریائے کالوچا نے محفوظ بنا دیا تھا، ایک ایسی فوج کے لیے، جس کا مقصد اس دشمن کو، جو سمولنسک شاہراہ پر ماسکو کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا، روکنا تھا، واضح انتخاب دکھائی دے گا۔

چوبیس تاریخ کو نپولین گھوڑے پر والیوئے وو گاؤں کی جانب روانہ ہوا۔ تاریخ کی کتابوں کے علی الرغم اسے یوتستا گاؤں سے بارودینو تک کوئی روسی پوزیشن نظر نہ آئی (اسے کوئی روسی پوزیشن نظر آ ہی نہیں سکتی تھی کیونکہ اس کا کوئی وجود ہی نہیں تھا) اور نہ اسے روسی فوج کی کوئی بیرونی چوکی دکھائی دی۔ وہ تو محض اس وقت، جب وہ روسی سپاہ کے عقبی دستوں کا تعاقب کر رہا تھا، اچانک روسی پوزیشن کے بائیں پہلو کے — شیواردینو کا مورچہ — قریب آ پہنچا اور روسیوں کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ وہ اپنی فوجیں دریائے کالوچا کے پار لے گیا ہے۔ روسیوں کے پاس چونکہ اتنا وقت نہیں رہ گیا تھا کہ وہ عمومی لڑائی چھیڑ دیتے، انھوں نے اس مقام سے، جس پر انھوں نے قبضہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اپنا بایاں بازو پیچھے ہٹا لیا اور ایک ایسی پوزیشن پر جس کا انھوں نے نہ تو پیشگی سوچا تھا اور نہ جس کی قلعہ بندی کی تھی، چلے گئے۔ جب نپولین اپنی سپاہ شاہراہ کی بائیں جانب دریائے کالوچا کے پار لے گیا،

اس نے ہونے والی ساری لڑائی دائیں سے بائیں (روسیوں کی جانب سے) پہنچا دی اور اس نے اسے اس میدان میں، جو یوتستا، سیمونوسک اور بارودینو کے مابین واقع ہے، منتقل کر دیا۔ پوزیشن کے اعتبار سے اس میدان کو روس کے کسی دوسرے مقام پر کوئی فوقیت حاصل نہیں ہے۔ اور چھبیس اگست کو جو معرکہ بپا ہوا، وہ سارے کا سارا یہیں ہوا۔ جس لڑائی کا ارادہ کیا گیا تھا اور جو فی الواقع لڑی گئی، اس کا تخمینی خاکہ[51] کتاب کے آخر میں شامل کر دیا گیا ہے۔

اگر نپولین چوبیس تاریخ کی شام گھوڑے پر کالوچا نہ گیا ہوتا اور نہ اس نے اس وقت شیوار دینو کے مورچے پر فوری حملے کا حکم دیا ہوتا، بلکہ اسے اگلی صبح تک اٹھا دیا ہوتا، تو کسی کو اس بارے میں یہ مطلق شبہہ نہ ہوتا کہ یہ مورچہ ہمارا بایاں پہلو تھا اور لڑائی وہیں لڑی جاتی، جہاں ہمیں اس کے لڑے جانے کی توقع تھی۔ اس صورت میں ہم نے شاید شیوار دینو کے مورچے کا دفاع اور بھی زیادہ ڈٹ کر کیا ہوتا، ہم نے نپولین کے قلب یا میمنے کو اپنے حملے کی زد میں لے لیا ہوتا اور عام لڑائی پچیس تاریخ کو اس مقام پر، جس کے بارے میں ہم نے پیشگی سوچ لیا تھا اور جس میں ہم نے دمدمے اور مورچے تعمیر کر لیے تھے، ہوئی ہوتی۔ لیکن ہمارے میسرے پر حملہ ہمارے عقبی دستوں کی پسپائی یعنی گردنیوا گاؤں کی جھڑپ کے فوراً بعد شام کو ہوا اور چونکہ روسی کمانڈروں نے تب یعنی 24 کی شام کو عام لڑائی شروع کرنا نہ چاہی یا وہ کر نہیں سکتے تھے، چنانچہ بارودینو کی لڑائی کا اولین اور اہم ترین معرکہ چوبیس کو پہلے ہی ہارا جا چکا تھا اور چھبیس تاریخ کو جو شکست ہوئی، یہ شکست واضح طور پر اس کا پیش خیمہ بنی۔

شیوار دینو کے مورچے کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد ہمیں 25 تاریخ کو معلوم ہوا کہ ہمارے میسرے کے لیے کوئی پوزیشن ہی نہیں رہی۔ چنانچہ ہمیں مجبوراً اپنے میسرے کو واپس بلانا اور اسے بہ عجلت اس جگہ، جہاں وہ پہنچ سکا، مورچے اور دمدمے تعمیر کرنے کے لیے کہنا پڑا۔

لیکن روسی فوج کے دفاع کے لیے جو دمدمے اور مورچے تعمیر کیے گئے، 26 اگست کو وہ نہ صرف ادھورے اور کمزور تھے، بلکہ اس صورت حال میں جو خطرات اور دشواریاں پنہاں تھیں، ان کی شدت میں اس حقیقت سے مزید اضافہ ہو گیا کہ روسی جرنیلوں نے، جنھیں پوری طرح اندازہ ہی نہیں ہو پایا تھا کہ آخر ہوا کیا ہے (یعنی بائیں پہلو پر ہماری پوزیشن کا ہاتھ سے نکل جانا اور ہونے والی لڑائی کا میدان دائیں سے بائیں منتقل ہو جانا)، نوو ایا گاؤں سے یوتستا تک اپنا توسیع شدہ محاذ برقرار رکھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انھیں عین لڑائی کے دوران میں اپنی فوجوں کو دائیں سے بائیں جانب منتقل کرنا پڑا اور یوں لڑائی کا پورا عرصہ روسیوں کو ساری فرانسیسی فوج کا، جو ہمارے میسرے کے خلاف جھونک دی گئی تھی، سامنا کرنا پڑا جبکہ ان کی نفری حریف کی نفری سے آدھی تھی۔ (یوتستا کے سامنے پونیاتوسکی[52] اور دائیں بازو پر یواروف[53] کی کارروائیاں اصل لڑائی سے بالکل مختلف چیزیں تھیں۔)

چنانچہ بارودینو کی لڑائی ہرگز اس طور نہیں لڑی گئی جس طرح مورخین نے اسے پیش کیا ہے (مورخین نے جو رویہ اختیار کیا، اس کا مقصد کمانڈروں کی غلطیوں کی پردہ پوشی کرنا تھا حالانکہ ان کے اس رویے سے اس شہرت اور ناموری میں، جو روسی افواج اور عوام کے حصے میں آنا چاہیے تھی، کمی واقع ہو گئی ہے)۔ بارودینو کی لڑائی، اس میدان

میں، جسے احتیاط سے منتخب کیا گیا تھا اور جس میں مضبوط مورچے بنائے گئے تھے، نہیں لڑی گئی اور اس میں جو سپاہ لڑی، نہ وہ دشمن کے مقابلے میں بس ذرا ہی کمزور تھی۔ بلکہ شیوار دینو مورچے کے ہاتھ سے جاتے رہنے کی وجہ سے روسیوں کو ایک ایسے میدان میں، جو کھلا تھا اور جس میں مورچے نہ ہونے کے برابر تھے، برسرپیکار ہونا پڑا۔ پھر ان کی سپاہ کی تعداد بھی فرانسیسیوں کے مقابلے میں صرف نصف رہ گئی تھی۔ بہ الفاظ دیگر انھیں جن حالات میں لڑنا پڑا، ان میں دس گھنٹے تک لڑتے رہنے اور معاملے کو کسی فیصلہ کن انجام تک پہنچنے سے روکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، بلکہ فوج کو تین گھنٹے بھی مکمل تباہی اور بھگدڑ سے بچائے رکھنے کا تصور محال تھا۔

20

پچیس تاریخ کی صبح پیئر موژیسک سے روانہ ہوا۔ شہر سے سڑک بل کھاتی کلیسا کے قریب سے گزرتی بہت اونچی عمودی پہاڑی کی ڈھلوان پر پہنچتی تھی۔ یہ کلیسا ڈھلوان کے دائیں جانب پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔ اس وقت اس میں عبادت ہو رہی تھی اور گھنٹیاں بجائی جا رہی تھیں۔ پیئر کی گاڑی جب ڈھلوان پر پہنچی، وہ نیچے اتر آیا اور پیدل چلنے لگا۔ ایک گھڑسوار رجمنٹ، جس کے آگے آگے سرود خواں تھے، پہاڑی سے نیچے اتر رہی تھی۔ چھکڑوں کا ایک قافلہ پہاڑی پر اس کی جانب آ رہا تھا۔ ان چھکڑوں میں وہ فوجی، جو گزشتہ روز کی جھڑپ میں زخمی ہو گئے تھے، سوار تھے۔ شور و غل مچاتے اور گھوڑوں کو چابکوں سے پیٹتے کسان کوچوان مسلسل سڑک کے کبھی دائیں اور کبھی بائیں کنارے ڈھلکتے رہے۔ چھکڑے، جن میں تین تین چار چار زخمی سپاہی لیٹے یا بیٹھے ہوئے تھے، پتھروں پر، جنھیں عمودی ڈھلوان پر کچھ اس طرح پھینک دیا گیا تھا کہ سڑک نما چیز بن گئی تھی، ہچکولے کھا رہے تھے۔ مجروحین کو، جن کے زخموں پر چیتھڑوں کی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور جن کے چہرے زرد، ہونٹ بھنچے ہوئے اور بھویں سکڑی ہوئی تھیں، جب دھچکے لگتے، وہ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے اور مضبوطی سے چھکڑوں کے کنارے پکڑ لیتے۔ وہ تقریباً سبھی کے سبھی پیئر کے سفید ہیٹ اور سیاہ نیل کوٹ کو معصومانہ اور بھولے بھالے تجسس سے نگاہیں گاڑ کر دیکھتے جا رہے تھے۔

پیئر کا کوچوان غصے سے چلا چلا کر چھکڑوں کے ڈرائیوروں سے کہہ رہا تھا کہ وہ سڑک کے ایک طرف رہیں۔ گھڑسوار رجمنٹ نے، جو اپنے سرود خوانوں سمیت پہاڑی سے نیچے اتر رہی تھی، پیئر کی گاڑی کو آلیا اور اس کے راستے میں رکاوٹ بن گئی۔ پیئر نے دیکھا کہ وہ سڑک کے اس کنارے پر، جو پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا تھا، پھنس گیا ہے، چنانچہ وہ رکنے پر مجبور ہو گیا۔ سورج کی کرنیں، اس جگہ، جہاں سے سڑک کے لیے پہاڑی کاٹی گئی تھی، پہنچنے سے معذور تھیں۔ چنانچہ یہ سرد اور مرطوب تھی لیکن اوپر اگست کی روشن دھوپ چمک رہی تھی اور گھنٹیاں نشاط انگیز آوازیں بلند کر رہی تھیں۔ زخمیوں سے لدا ایک چھکڑا سڑک کے کنارے پیئر کے قریب رک گیا اور کوچوان درخت کی چھال کے کھردرے جوتے پہنے ہانپتا کانپتا اپنے چھکڑے کے عقب کی جانب بھاگا، اس نے ایک پہیے کے نیچے پتھر رکھا (ان پہیوں میں ٹائر نہیں تھے) اور اپنے کوتاہ قامت گھوڑے کے ساز کے تسمے درست کرنے لگا۔

ایک معمر زخمی سپاہی نے، جس کا ایک بازو گلے کی پٹی میں لٹک رہا تھا اور جو چھکڑے کے پیچھے پیچھے پیدل آ رہا تھا، تندرست ہاتھ سے زخمی ہاتھ پکڑا اور مڑ کر پیئر کی جانب دیکھنے لگا۔

''بھائی جان، ہمیں یہیں اتار دیا جائے گا یا ماسکو پہنچایا جائے گا؟'' اس نے پوچھا۔

پیئر اپنے خیالات میں اس قدر مستغرق تھا کہ اسے سوال سنائی نہ دیا۔ کبھی وہ اس گھڑ سوار رجمنٹ کی طرف، جو سڑک پر زخمیوں کے قافلے کی سمت قدم بڑھائے آ رہی تھی اور کبھی اس چھکڑے کی طرف، جس کے قریب وہ کھڑا تھا اور جس میں دو اشخاص بیٹھے اور ایک لیٹا ہوا تھا، دیکھنے لگتا۔ اسے یوں لگا جیسے اس سوال کا حل، جس میں وہ مستغرق تھا، اسی میں موجود ہے۔ چھکڑے میں جو دو اشخاص بیٹھے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ ان میں سے ایک کے گال پر زخم آیا ہے۔ اس کا سارا سر پٹیوں میں مستور تھا اور اس کا ایک رخسار پھول کر شیر خوار بچے کے سر جتنا ہو گیا تھا۔ اس کی ناک اور منہ مڑ کر ٹیڑھے ہو گئے تھے۔ یہی فوجی جوان کلیسا پر نگاہیں جمائے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہا تھا۔ دوسرا رنگروٹ نوخیز لڑکا تھا۔ اس کے بال سرخ تھے اور اس کا رنگ اتنا سفید تھا جیسے اس کے مہین چہرے پر خون کی رمق تک نہ ہو۔ وہ پیئر پر نظریں گاڑے نیک دلی سے مسکرا رہا تھا۔ تیسرا اوندھے منہ پڑا تھا، اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اب گھڑ سوار رجمنٹ کے سرود خوان چھکڑے کے برابر پہنچ چکے تھے۔

اف، علاقہ غیر میں رہتے رہتے
میں گورکھ دھندے میں پھنس گیا ہوں...

وہ عسکری رقص کی دھن میں الاپ رہے تھے۔

گویا کہ ان کے جواب میں لیکن مختلف قسم کی شگفتہ مزاجی کے لحن میں گھنٹیوں کی فلزاتی دھنوں کی صدائے بازگشت اوپر بلندیوں پر سنائی دے رہی تھی۔ سورج کی گرم کرنوں نے سامنے کی ڈھلان کو ایک اور طرح کی شگفتگی میں نہا دیا تھا، لیکن پہاڑی کے نیچے جہاں پیئر چھکڑے، جس میں زخمی جوان تھے، اور ہانپتے کانپتے کوتاہ قامت گھوڑے کے قریب کھڑا تھا، سیلن، تاریکی اور افسردگی کا راج تھا۔

پھولے گال والے فوجی جوان نے غصیلی نگاہوں سے گھڑ سواروں سرود خوانوں کی طرف دیکھا۔

''آہ، یہ بانکے!'' اس نے حقارت سے کہا۔

''میں نے آج محض فوجی ہی نہیں، کسان بھی دیکھے ہیں! کسان — جی ہاں، انھیں بھی جانا پڑ رہا ہے،'' فوجی جوان نے، جو چھکڑے کے پیچھے کھڑا تھا، پیئر سے اداس مسکراہٹ سے کہا۔ ''آج کل وہ مختلف لوگوں کے مابین تمیز نہیں کر رہے، ان کا ارادہ ساری قوم کو ان کے خلاف لا کھڑے کرنے کا ہے — ایک لفظ میں اس کا نام ماسکو ہے!... وہ اسے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔''

اگرچہ فوجی سپاہی کی گفتگو بے ربط تھی لیکن پیئر سمجھ گیا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے اور اس سے اتفاق کا اظہار کرنے کے لیے اس نے اپنا سر ہلا دیا۔

سڑک دوبارہ صاف ہوگئی۔ پیئر پہاڑی سے نیچے اترا اور اپنی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی چل پڑی اور وہ سڑک کے دونوں اطراف دیکھتا رہا کہ شاید کوئی جان پہچان کا آدمی مل جائے لیکن اسے صرف عسکریوں کے غیر شناسا چہرے نظر آرہے تھے۔ ان عسکریوں کا تعلق فوج کے مختلف شعبوں سے تھا اور وہ سب کے سب حیرت اور اچنبھے سے اس کے سفید ہیٹ اور ٹیل کوٹ کو گھور گھور کر دیکھ رہے تھے۔

اڑھائی تین میل طے کرنے کے بعد بالآخر اسے ایک واقف کار مل ہی گیا۔ اس نے بڑے تپاک سے اس سے علیک سلیک کی۔ یہ شخص ڈاکٹر تھا اور فوج کے ایک طبی یونٹ کا سربراہ۔ وہ بند بگھی میں پیئر کی جانب آرہا تھا۔ گاڑی میں اس کے ساتھ ایک نوجوان ڈاکٹر بیٹھا تھا۔ اس نے پیئر کو پہچان لیا اور اپنے قازق کوچوان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔

''کاؤنٹ، یوئر ایکسی لینسی — آپ یہاں کیسے آگئے؟'' ڈاکٹر نے دریافت کیا۔

''میں ذرا دیکھنا چاہتا تھا...''

جی ہاں، دیکھنے کے لیے تو بہت کچھ ہوگا۔''

پیئر نیچے اتر آیا اور ڈاکٹر سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ اس کا ارادہ جنگ میں شریک ہونے کا ہے۔ ڈاکٹر نے بزوخوف کو مشورہ دیا کہ وہ کوتوزوف سے براہ راست بات کرے۔

''خدا معلوم آپ جنگ کے دوران میں کس کس غیر معروف جگہ پھرتے رہیں، پر ایسا کیوں ہوا؟'' اس نے اپنے نوجوان ساتھی کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ہزسیرین ہائی نس آپ کو جانتے ہیں اور انھیں آپ کا خیر مقدم کر کے خوشی ہوگی۔ میرے دوست، آپ کو بس یہی کرنا چاہیے۔''

معلوم ہوتا تھا کہ ڈاکٹر تھکاوٹ سے نڈھال ہو رہا ہے اور جلدی میں ہے۔

''تو آپ کا یہ خیال ہے... لیکن میں آپ سے ایک مزید بات پوچھنا چاہتا ہوں — ہماری پوزیشن صحیح طور پر کہاں ہے؟'' پیئر نے کہا۔

''ہماری پوزیشن،'' ڈاکٹر نے کہا۔ ''یہ میرے دائرہ کار میں نہیں ہے۔ آپ براستہ تاتارینووا چلے جائیں۔ وہاں خوب کھدائی ہو رہی ہے۔ ٹیلے پر چڑھ جائیں، وہاں سے آپ کو سب کچھ نظر آجائے گا۔''

''وہاں سے سب کچھ نظر آسکتا ہے؟... اگر آپ مہربانی کرسکیں —''

لیکن ڈاکٹر نے اس کا سلسلۂ کلام منقطع کر دیا اور اپنی بگھی کی طرف چل پڑا...

''میں آپ کے ساتھ چلتا اور مجھے اس میں خوشی بھی بہت ہوتی۔ لیکن کیا کروں، خداوند میرا بھلا کرے، میں یہاں تک پھنسا ہوا ہوں،'' اس نے اپنے گلے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''میں سر پر پاؤں رکھے کور کمانڈر کی

طرف بھاگا جا رہا ہوں۔ آپ کو معلوم ہے کہ صورت حال کیا بن گئی ہے؟ کاؤنٹ، آپ جانتے ہیں کہ کل لڑائی ہو گی۔ ایک لاکھ کی سپاہ میں ہمیں کم از کم بیس ہزار افراد کے زخمی یا ہلاک ہونے کی توقع ہے اور ہمارے پاس چھ ہزار کے لیے بھی سٹریچر، چار پائیاں، خدمت گار اور ڈاکٹر نہیں ہیں۔ ہمارے پاس یقیناً دس ہزار چھکڑے ہیں، لیکن ہمیں دوسری اشیا کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن ہم سے جو کچھ بن پڑا، ہم ضرور کریں گے۔"

پیئر نے جب یہ سوچا کہ ان ہزاروں جیتے جاگتے، تندرست وتوانا، نوجوان اور بوڑھے اشخاص کا، جو اس کے ہیٹ کو دیکھ کر محظوظ بھی ہو رہے تھے اور حیران بھی، یہ مقدر بن چکا ہے کہ ان میں سے بیس ہزار لازماً ہلاک یا زخمی ہو جائیں گے (اور شاید یہ بالکل وہی ہوں جنھیں وہ دیکھ چکا ہے)، تو اسے یہ بات بہت عجیب لگی اور اس کے دل پر گہرا اثر ہوا۔

"ہو سکتا ہے کہ کل ان کی موت واقع ہو جائے۔ پھر ان کے لیے موت کے علاوہ کسی اور چیز کے بارے میں سوچنا کیسے ممکن ہے؟" تب اس کے ذہن میں آپ ہی آپ خیالات کا سلسلہ جڑنے لگا اور اسے موژیسک پہاڑی کی ڈھلوان — زخمیوں سے لدے پھندے چھکڑے، سورج کی ترچھی کرنیں، کھنکھناتی گھنٹیاں اور گیت الاپتے گھڑسوار — بالکل واضح شکل میں یاد آنے لگی۔

"گھڑسوار میدان جنگ کی طرف بڑھ رہے ہیں۔ رستے میں ان کی مڈھ بھیڑ زخمیوں سے ہو جاتی ہے۔ چلتے چلتے وہ انھیں آنکھ مارتے ہیں اور ایک لحظے کے لیے بھی یہ نہیں سوچتے کہ ان کے ساتھ کیا بیتنے والی ہے۔ ان میں سے تقریباً بیس ہزار کے مقدر میں مرنا لکھا ہے، پھر بھی وہ میرے ہیٹ کو متحیر نگاہوں سے دیکھتے ہیں! کتنی عجیب بات ہے!" پیئر نے تاتارینووا کی سمت جاتے ہوئے سوچا۔

سڑک کے بائیں طرف کسی زمیندار کے گھر کے سامنے گاڑیوں، ویگنوں، اردلیوں اور سنتریوں کا ہجوم کھڑا تھا۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں کمانڈر انچیف مقیم تھا، لیکن جب پیئر وہاں پہنچا، وہ وہاں موجود نہیں تھا اور اس کا سٹاف بھی، تقریباً سارے کا سارا غائب تھا۔ سبھی گرجے میں عبادت میں شریک ہونے گئے ہوئے تھے۔ پیئر آگے گورکی[54] کی طرف چل دیا۔

پہاڑی کے اوپر سے گزرتے جب وہ گاؤں کی ننھی منی سڑک پر پہنچا، اسے پہلی مرتبہ ملیشیا کے کسان نظر آئے۔ وہ سفید قمیصوں میں ملبوس تھے اور ان کی ٹوپیوں پر صلیب نما بیج ٹکے ہوئے تھے۔ وہ زور زور سے چلا اور ہنس رہے تھے، ان کے پسینے بہہ رہے تھے مگر وہ بڑے ذوق شوق سے سڑک کے دائیں طرف پہاڑی ٹیلے پر، جو گھاس سے ڈھکا ہوا تھا، اپنے کام میں مصروف تھے۔ بعض کھدائی کر رہے تھے، بعض چوبی تختوں پر مٹی سے لدے ریہڑے دھکیل رہے تھے اور بعض بیکار کھڑے تھے۔

ٹیلے کے اوپر دو افسر کھڑے تھے اور وہ جوانوں کو ہدایات دے رہے تھے۔ پیئر نے جب ان کسانوں کو، جو بظاہر ابھی تک فوجیوں کی حیثیت سے اپنی انوکھی پوزیشن سے محظوظ ہو رہے تھے، دیکھا، اسے وہ زخمی، جنھیں اس

نے موژیسک پہاڑی پر دیکھا تھا، یاد آ گئے اور تب ایک زخمی سپاہی نے جو یہ کہا تھا: ''ان کا ارادہ ساری قوم کو ان کے خلاف لا کھڑے کرنے کا ہے،'' اب اسے اس کا مطلب سمجھ میں آیا۔ پیئر کو باریش کسانوں کے، جو عجیب و غریب اور بھدے بوٹ پہنے ہوئے تھے، جن کی گردنوں سے پسینہ بہہ رہا تھا، جن کے سینوں پر یہاں وہاں ٹیڑھے میڑھے انداز سے کھلے بٹنوں کی قمیصیں لٹک رہی اور یوں ان کی دھوپ میں جھلسی ہوئی ہنسلیاں ننگی ہو رہی تھیں، اس عجیب و غریب منظر نے جس پرزور انداز سے اس پر موقع کی نزاکت اور اہمیت واضح کی، کسی اور چیز نے، جو اس نے دیکھی یا سنی تھی، نہیں کی تھی۔

21

پیئر گاڑی سے اترا اور محنت مشقت کرتے ملیشیا کے جوانوں کے قریب سے گزرتا ٹیلے پر، جس کے متعلق ڈاکٹر نے اسے بتایا تھا کہ وہ وہاں سے میدان جنگ کا مشاہدہ کر سکتا ہے، چڑھ گیا۔

صبح کے تقریباً گیارہ بج چکے تھے۔ سورج اس کے ذرا بائیں جانب اور عقب میں تھا۔ صاف شفاف اور لطیف فضا میں اسے چاروں اطراف وہ تاحد نظر وسیع و عریض منظر، جو کسی بیضوی تھیٹر کی طرح اس کے سامنے تھا اور دھوپ میں چمک رہا تھا، دکھائی دے رہا تھا۔

ماسکو سمولنسک شاہراہ اس بیضوی تھیٹر کو اوپر اور بائیں جانب کاٹتے گزر رہی تھی اور سامنے کی طرف ایک گاؤں میں، جس کے گرجے (یہ گرجا ٹیلے کے سامنے تقریباً پانچ سو گز دور نشیب میں واقع تھا) کی عمارت سفید تھی، داخل ہو جاتی تھی۔ اس گاؤں کا نام بارودینو تھا۔ یہاں سے شاہراہ نزدیکی پل پر سے دریا کو عبور کرتی، پہاڑیوں میں اوپر نیچے بل کھاتی، بلند سے بلند تر ہوتی جاتی اور تقریباً چار میل آگے ایک بستی میں، جس کا نام والیوئے وو تھا اور جس میں اس وقت نپولین مقیم تھا، پہنچ جاتی تھی۔ والیوئے وو سے آگے سڑک فر اور برچ کے درختوں کے، جن کے پتے زرد ہو رہے تھے، جنگل میں غائب ہو گئی تھی۔ اس جنگل میں شاہراہ کے دائیں جانب خاصے فاصلے پر کالوچا کی خانقاہ کی صلیب اور مینارِ جرس دھوپ میں چمک رہے تھے۔ اس ساری نیلگوں وسعت میں جنگل اور سڑک کے دونوں اطراف یہاں وہاں پڑاؤں کے الاؤں سے اٹھتا دھواں اور فوجیوں کے — ہمارے اور دشمن کے — غیر واضح جمگھٹے نظر آ رہے تھے۔ دائیں سمت کالوچا اور مسکوا دریاؤں کی گزرگاہوں کے ساتھ ساتھ جو زمین تھی، وہ کٹی پھٹی اور پہاڑی تھی۔ پہاڑیوں کے مابین تنگ گھاٹیوں میں سے بزدباوو اور زاخارینو کے دیہات نظر آ رہے تھے۔ بائیں طرف کا علاقہ نسبتاً زیادہ ہموار تھا۔ وہاں اناج کی فصلوں اور سیمونووسک قصبے کے، جسے نذر آتش کر دیا گیا تھا، دھواں اگلتے کھنڈرات دیکھے جا سکتے تھے۔

پیئر نے اپنے دائیں بائیں جو کچھ دیکھا، وہ اتنا غیر واضح تھا کہ اس کی نگاہوں کے سامنے جو منظر تھا، اس کا کوئی حصہ اس کی توقعات پر پورا نہ اتر سکا۔ اس نے اپنے ذہن میں جس قسم کے میدان جنگ کی تصویر بنائی تھی، وہ

اسے کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں صرف چراگاہیں، جنگلات، پہاڑیوں کے مابین گھاٹیاں، پڑاؤوں میں جلنے والے الاؤوں کا دھواں، دیہات، ٹیلے اور ندی نالے تھے۔ کوشش کے باوجود، اسے اس منظر میں، جس میں زندگی پورے زوروشور سے رواں دواں تھی، کوئی عسکری ''پوزیشن'' نظر نہ آئی۔ وہ تو اپنے اور غنیم کے فوجیوں کے مابین بھی کوئی فرق نہ کر سکا۔

''مجھے کسی شخص سے، جوان چیزوں کو جانتا ہے، دریافت کرنا چاہیے،'' اس نے سوچا اور وہ ایک افسر سے، جو اس کے بھاری بھرکم، غیر فوجی جثے کو تجسّس کی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا، مخاطب ہوا۔

''کیا آپ مجھے یہ بتا سکیں گے کہ اس سامنے گاؤں کا کیا نام ہے؟'' پیئر نے کہا۔ ''نوازش ہوگی۔''

''بردینو، کیا اس کا یہی نام نہیں؟'' افسر نے اپنے ساتھی سے پوچھا۔

''بارودینو،'' دوسرے نے تصحیح کی۔

افسر صریحاً خوش تھا کہ اسے بات کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ چنانچہ وہ پیئر کے قریب ہو گیا۔

''وہ ہمارے جوان ہیں؟'' پیئر نے سامنے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اور ان سے کچھ آگے فرانسیسی ہیں،'' افسر نے کہا۔ ''وہ رہے ادھر، آپ انھیں دیکھ سکتے ہیں۔''

''کہاں؟ کہاں؟'' پیئر نے پوچھا۔

''آپ انھیں ننگی آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں... ادھر دیکھیں!''

افسر نے دھوئیں کی جانب، جو دریا کے پار بائیں طرف اٹھ رہا تھا، اشارہ کیا اور اس کے چہرے پر وہی گمبھیر اور درشت تاثر، جو پیئر ان بے شمار جوانوں کے، جن سے اس کی مڈبھیڑ ہوئی تھی، چہروں پر دیکھ چکا تھا، نمایاں ہو گیا۔

''ہونہہ، تو وہ فرانسیسی ہیں! اور ادھر؟'' پیئر نے بائیں جانب ایک ٹیلے کی طرف، جس کے قریب کچھ فوجی نظر آ رہے تھے، اشارہ کیا۔

''وہ ہمارے ہیں۔''

''واقعی؟ اور وہ ادھر؟'' پیئر نے دور فاصلے پر، ایک اور ٹیلے کی طرف، جس پر خاصا بڑا درخت تھا، اشارہ کیا۔ اس ٹیلے سے کچھ ہی دور گھاٹی میں ایک گاؤں تھا۔ وہاں پڑاؤ میں مزید الاؤ دھواں اگل رہے تھے اور کوئی سیاہ چیز نظر آ رہی تھی۔

''وہ بھی اسی کا ہے،'' افسر نے کہا۔ (یہ شیوارد ینو کا مورچہ تھا۔) ''کل یہ ہمارا تھا لیکن اب اس کا ہے۔''

''پھر ہماری پوزیشن کا کیا بنا؟''

''ہماری پوزیشن؟'' افسر نے دل جمعی سے مسکراتے ہوئے دہرایا۔ ''میں اس کے متعلق آپ کو واضح طور پر بتا سکتا ہوں کیونکہ اپنے تقریباً تمام مورچے اور دمدمے میں نے ہی تعمیر کرائے ہیں۔ ادھر، آپ دیکھ رہے ہیں نا؟ وہ ہمارا قلب ہے، بارودینو میں، ادھر، بالکل سامنے'' اس نے بالکل سامنے کے گاؤں کی، جس میں سفید گرجا تھا، جانب

اشارہ کیا۔ ''یہ ہے وہ مقام، جہاں سے ہم دریائے کالوچا عبور کرتے ہیں۔ آپ ادھر دیکھیں، گھاٹی میں، جہاں کٹے ہوئے خشک گھاس کے گٹھے قطاروں میں پڑے ہیں — وہاں پل ہے۔ وہ ہمارا قلب ہے۔ ہمارا میمنہ ادھر ہے،'' اس نے انتہائی دائیں سمت دور ایک نالے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں دریائے مسکوا ہے۔ وہاں ہم نے تین مورچے تعمیر کرائے ہیں۔ بہت مضبوط ہیں۔ ہمارا میسرہ...'' یہاں افسر نے توقف کیا۔ ''خیر، آپ کو معلوم ہوگا کہ سمجھانا ذرا مشکل ہے... کل ہمارا میسرہ شیواردینو میں تھا — وہ دیکھیں، جہاں اوک کا درخت ہے۔ لیکن اب ہم نے اپنا میسرہ واپس بلالیا ہے۔ اب یہ وہاں ہے — آپ کو وہ گاؤں اور دھواں نظر آرہا ہے نا؟ وہ سیمیونووسک ہے۔ ہاں، بالکل وہیں،'' اس نے رایفسکی ٹیلے کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن اس بات کا کوئی خاص امکان نہیں کہ لڑائی وہاں ہوگی۔ وہ اپنے دستوں کو، جو وہاں لے گیا ہے، وہ محض اس کی چال ہے۔ وہ غالباً مسکوا کے دائیں جانب چلا جائے گا لیکن یہ (معرکہ) خواہ کہیں بھی بپا ہو، کل بے شمار آدمی نابود ہو جائیں گے!'' افسر نے کہا۔

جب افسر یہ توضیحات پیش کر رہا تھا، ایک سن رسیدہ سارجنٹ وہاں آگیا اور اس کی گفتگو کے ختم ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ تاہم معلوم ہوتا تھا کہ اس موقع پر اسے اس کا آخری جملہ پسند نہیں آیا اور اس نے اس کی بات کاٹ دی۔

''مٹی اٹھانے کی ٹوکریاں منگوالیں،'' اس نے کرختگی سے کہا۔

افسر نے اپنا کلیجا تھام لیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہے کہ آدمی دل میں تو بے شک یہ سوچتا رہے کہ کتنے جوان موت کی بھینٹ چڑھ جائیں گے لیکن اسے اس ضمن میں کوئی کلمہ زبان پر نہیں لانا چاہیے۔

''اچھا، کمپنی نمبر 3 کو دوبارہ بھیج دو،'' اس نے عجلت سے جواب دیا۔ ''اور آپ کون ہیں؟ ڈاکٹر؟''

''نہیں، میں کچھ بھی نہیں ہوں،'' پیئر نے جواب دیا اور وہ ایک بار پھر ملیشیا کے جوانوں کے برابر سے گزرتا پہاڑی سے نیچے اتر گیا۔

''اف، یہ لعنتی لوگ!'' افسر نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور وہ ناک پکڑے جلدی جلدی کام میں مصروف لوگوں کے پاس سے گزرتا اس کے پیچھے چلا گیا۔

''وہ آگئے!... وہ اسے لا رہے ہیں... وہ رہی وہ!... وہ ایک منٹ میں یہاں پہنچ جائیں گے۔'' اچانک آوازیں کہتی سنائی دینے لگیں اور اس کے ساتھ افسر، فوجی اور ملیشیا کے جوان سڑک پر آگے کی طرف بھاگنے لگے۔

بارودینو سے کلیسا کا جلوس پہاڑی پر چڑھتا آرہا تھا۔ گرد آلود سڑک پر سب سے آگے آگے پیادہ فوج کی بٹالین آرہی تھی۔ جوانوں کے سر ننگے تھے اور وہ ترتیب سے قطاریں بنائے باز و لہراتے چلے آرہے تھے۔ ان کے عقب میں لحن سے مناجات پڑھنے کی صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔

باقاعدہ فوج اور ملیشیا کے جوان ننگے سر پیئر کے برابر سے جلوس کا استقبال کرنے دوڑ پڑے۔

''وہ اسے لا رہے ہیں! ہماری محافظ، ہماری آئیبریائی مادرِ خداوند![55]'' کسی نے باآواز بلند کہا۔

''سمولنسک کی مادرِ خداوند،'' دوسرے نے تصحیح کی۔

ملیشیا کے جوان، وہ بھی جو گاؤں میں تھے اور وہ بھی جو توپ خانے پر کام کر رہے تھے، اپنے بیلچے پھینک پھانک جلوس کا استقبال کرنے کے لیے لپکے۔ بٹالین کے عقب میں، جو گرد آلود سڑک پر مارچ کرتی آرہی تھی، پادری چغے پہنے چلے آرہے تھے۔ ان میں سے ایک کوتاہ قامت شخص راہبوں کے جبے میں ملبوس تھا اور اس کی جلو میں خادمین کلیسا اور سرود خواں تھے۔ ان کے پیچھے سپاہی اور افسر بہت بڑا ایقونہ، جس کا چہرہ سانولا تھا اور جس کے اوپر منقش دھات کا غلاف تھا، اٹھائے چلے آرہے تھے۔ یہ ایقونہ سمولنسک سے لایا گیا تھا اور تب سے فوج کی تحویل میں تھا۔ ایقونے کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں فوجی سپاہی گروہ در گروہ ننگے سر بھاگے آتے اور اس کے قریب اتنا جھک جاتے کہ ان کی پیشانیاں زمین کو چھونے لگتیں۔

جب وہ پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے، وہ رک گئے۔ ان اشخاص کی جگہ، جنھوں نے ایقونے کو لنن کی پٹیوں سے، جو اس کے اردگرد لپیٹ دی گئی تھیں، تھام رکھا تھا، دوسروں نے لے لی، سرود خوانوں نے عود دان دوبارہ جلا دیے اور عبادت شروع ہوگئی۔ سورج کی جھلسا دینے والی کرنیں عموداً آرہی تھیں۔ تازہ، نرم رو، بادِ نسیم ننگے سروں پر بالوں کے ساتھ اٹھکیلیاں کر رہی تھی اور وہ ربن، جن سے ایقونے کو آراستہ کیا گیا تھا، پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کھلے آسمان تلے سرود خوانی دبی دبی معلوم ہو رہی تھی۔ ننگے سر افسروں، فوجیوں اور ملیشیا کے جوانوں پر مشتمل بہت بڑے ہجوم نے ایقونے کے اردگرد گھیرا ڈال رکھا تھا۔ بڑے پادری اور سرود خوانوں کے پیچھے اعلیٰ شخصیات کھڑی تھیں۔ ان کے لیے الگ جگہ بنا دی گئی تھی۔ ایک گنجا جرنیل، جس کی گردن میں سینٹ جارج کا تمغہ لٹک رہا تھا، بڑے پادری کے بالکل عقب میں کھڑا تھا۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کا نشان نہیں بنا رہا تھا (وہ صریحاً جرمن تھا)[56] اور صبر و تحمل سے عبادت کے اختتام پذیر ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ غالباً اس کی دانست میں روسی عوام کے جذبہ حب الوطنی کو بیدار کرنے کے لیے اس عبادت کا انعقاد ناگزیر تھا۔ ایک اور جرنیل عسکری پوز بنائے کھڑا تھا۔ وہ اپنے گرد و پیش نظریں دوڑا رہا اور اپنے سینے کے سامنے بہ عجلت صلیب کے نشانات بنا رہا تھا۔ پیئر کسانوں کے بیچ میں کھڑا تھا۔ اس نے افسروں میں سے متعدد شناسا اشخاص کو پہچان لیا لیکن اس نے ان کی طرف دیکھنے سے احتراز کیا۔ اس کی ساری توجہ جوانوں کے، جو سب کے سب پورے انہماک سے ایقونے کی زیارت کرنے میں مشغول تھے، چہروں کی سنجیدگی دیکھنے پر مرکوز تھی۔ جونہی تھکے ماندے سرود خوانوں نے، جو اس روز بیسویں مرتبہ مناجات الاپ رہے تھے، نیم دلی اور مشینی انداز سے بول اٹھائے: ''اے مادرِ خداوند اپنے غلاموں کو مصیبت سے بچا'' اور پادری اور اس کے نائب نے بیچ میں اپنی طرف سے لقمہ دیا: ''کیونکہ خداوند کے زیرِ سایہ اسی طرح تیری طرف بھاگے آتے ہیں جیسے ناقابلِ تسخیر فصیل اور پشت پناہ کی طرف۔'' تو ہر چہرے سے یہ ہویدا ہونے لگا کہ آنے والا لمحہ اپنا اندر جو گمبھیرتا سموئے ہوئے ہے، وہ اس سے بخوبی آگاہ ہے۔ پیئر نے یہ آگہی ان جوانوں کے، جن سے اس کا آمنا سامنا موژ ئیسک کے نزدیک پہاڑی کے دامن میں ہوا تھا، چہروں پر دیکھی تھی اور یہی اسے چلتے چلتے بار بار ان لوگوں کے، جن سے اس کی اس روز

ملاقات ہوئی تھی، خدوخال سے ٹپکتی نظر آئی تھی۔ (سرودخوانوں کو سننے کے بعد) سروں کو کثرت سے جھکایا جانے اور بالوں کو جھٹکے دے دے کر چہروں سے پرے ہٹایا جانے لگا۔ اور جب لوگ اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنارہے تھے، ان کے آہیں بھرنے اور اپنے سینوں کو تھپتھپانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

ایقونے کے اردگرد لوگوں کا جو ہجوم تھا، وہ اچانک چھٹنے اور پیئر پر دباؤ ڈالنے لگا۔ کوئی شخص ایقونے کی جانب آرہا تھا۔ جس عجلت اور پھرتی سے لوگ اس کے لیے راستہ بنارہے تھے، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی اہم شخصیت ہے۔

یہ کوتوزوف تھا۔ وہ میدان جنگ کا جائزہ لینے نکلا تھا اور واپس تا تارینووا جارہا تھا لیکن عبادت میں شرکت کے لیے رک گیا۔ پیئر نے اس کی نرالی شکل سے، جو اسے دوسروں سے ممتاز کررہی تھی، فوراً پہچان لیا۔

اپنے حد سے زیادہ بھاری بھرکم جسم، جس پر اس نے اوورکوٹ پہن رکھا تھا، سفید برہنہ سر، فربہ اور پھسپھسے چہرے اور زخمی آنکھ کے ساتھ کوتوزوف جھولتا اور تیز تیز قدم اٹھاتا دائرے میں آگے بڑھا اور پادری کے پیچھے آکھڑا ہوا۔ اسے جس انداز سے سینے پر صلیب کا نشان بنانے کی عادت ہوچکی تھی، اس نے اس سے یہ نشان بنایا، وہ اتنا نیچے جھکا کہ اس کا ہاتھ زمین کو چھونے لگا، تب اس نے گہری سانس لی اور اپنا سر خم کردیا۔ کوتوزوف کے عقب میں بے نگ سین اور اس کے سٹاف کے ارکان تھے۔ کمانڈر انچیف کی موجودگی کے، جس نے تمام اعلیٰ افسروں کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی تھی، باوجود فوج اور ملیشیا کے جوان اس کی طرف دیکھے بغیر دعائیں مانگنے میں مصروف رہے۔

جب عبادت ختم ہوگئی، کوتوزوف ایقونے کے قریب پہنچا، بھاری بھرکم اور بے ڈول انداز سے اپنے گھٹنوں پر جھکا اور زمین پر سجدہ ریز ہوگیا۔ وہ کافی دیر تک اٹھنے کی کوشش کرتا رہا لیکن اس کے ضعف اور وزن نے رکاوٹ ڈال دی۔ زور لگانے سے اس کا سفید سر پھڑکنے لگا۔ آخرکار وہ اٹھنے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے معصومانہ اور بچگانہ انداز سے اپنے ہونٹ باہر نکالے اور ایقونے کو بوسہ دیا۔ وہ ایک بار پھر نیچے جھکا اور اس نے اپنے ہاتھ سے زمین کو چھوا۔ دوسرے جرنیلوں نے اس کی مثال کی پیروی کی۔ ان کے بعد افسر اور فوجی جوان آگے بڑھنے، ایک دوسرے کو دھکیلنے اور آپس میں گتھم گتھا ہونے لگے۔ ہیجانی کیفیت میں ان سب کی سانسیں پھولنے لگیں۔

22

پیئر بھیڑ میں پھنس گیا اور لڑکھڑاتا، ڈگمگاتا اس کے ساتھ ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ اس نے نگاہ اٹھا کر اپنے گردوپیش دیکھا۔

''کاؤنٹ! پیوتر کرلووچ! آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' کسی نے چلا کر کہا۔

پیئر نے اپنے چاروں اطراف دیکھا۔ بورس بتیسکوئے ہاتھوں سے گھٹنے پونچھتا (غالباً وہ بھی ایقونے کے سامنے سجدہ ریز ہوا تھا) اور مسکراتا پیئر کی جانب آیا۔ بورس کا لباس اتنا نفیس اور شستہ تھا کہ اگر وہ ذرا سا گھسا ہوا نہ ہوتا، تو کسی کو گمان بھی نہ گزرتا کہ وہ بھی جنگ میں شریک ہے۔ اس نے اوورکوٹ پہنا ہوا تھا اور کوتوزوف کی طرح

اس کا چابک اس کے شانے پر لٹک رہا تھا۔

دریں اثنا کوتوزوف گاؤں پہنچ چکا تھا۔ وہاں وہ قریب ترین مکان کے سائے میں بنچ پر بیٹھ گیا تھا۔ یہ بنچ ایک قازق بھاگم بھاگ اٹھا لایا تھا اور دوسرے نے عجلت سے اس پر غالیچہ بچھا دیا تھا۔ اجلی اور مرصع وردیوں میں ملبوس بہت بڑے عملے کے ارکان نے کمانڈر انچیف کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا۔

الیقونہ، ہجوم کی معیت میں، آگے جا چکا تھا۔

پیئر کوتوزوف سے کوئی تیس قدم دور رک گیا اور بورس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ اسے بتا رہا تھا کہ اس کا ارادہ جنگ کے دوران میں وہیں موجود رہنے اور میدان جنگ کا جائزہ لینے کا ہے۔

''میں آپ کو بتاتا ہوں کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے،'' بورس نے کہا۔ ''پڑاؤ میں قیام کے دوران میں آپ کی میزبانی کا شرف مجھے حاصل ہوگا۔ جس مقام پر کاؤنٹ بے نگ سین تعینات ہوں گے، وہاں سے آپ ہر چیز کا بہترین انداز سے جائزہ لے سکیں گے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں ان کے سٹاف پر ہوں۔ میں اس بارے میں ان سے ذکر کر دوں گا۔ اگر آپ میدان جنگ کا چکر لگانا چاہتے ہیں، بسم اللہ، آپ ہمارے ساتھ چلے چلیں۔ ہم میسرے کی طرف جانے ہی والے ہیں۔ اور پھر جب ہم واپس آئیں گے، مجھے امید ہے کہ آپ رات ہمارے ساتھ بسر کریں گے اور ہم تاش کی بازی کا انتظام کر دیں گے۔ بہر حال آپ دمتری سر جی وچ کو تو جانتے ہی ہوں گے۔ وہ وہاں مقیم ہیں۔'' اور اس نے گورکی کے تیسرے مکان کی طرف اشارہ کیا۔

''لیکن میں میمنہ دیکھنا چاہوں گا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ یہ بہت مضبوط ہے،'' پیئر نے کہا۔ ''میں دریائے مسکوا سے دورے کا آغاز کرنا چاہتا ہوں اور سارے میدان جنگ کا چکر لگانے کا خواہش مند ہوں۔''

''خیر، آپ یہ کام بعد میں کر سکتے ہیں لیکن اصل چیز میسرہ ہے...''

''ٹھیک، ٹھیک۔ اور پرنس بلکونسکی کی رجمنٹ کہاں ہے؟ مجھے بتا سکتے ہیں؟'' پیئر نے پوچھا۔

''آندرے نکولائی وچ کی؟ ہم ان کے قریب سے گزریں گے اور میں خود آپ کو ان کے پاس لے چلوں گا۔''

''تم میسرے کے متعلق کیا کہہ رہے تھے؟''

''سچی بات یہ ہے (اور یہ بات میرے اور آپ کے درمیان ہی رہنا چاہیے) کہ میسرے کے حالات کیسے ہیں، انھیں معلوم کرنے کی کوئی صورت نہیں ہے،'' بورس نے اپنی آواز دھیمی کرتے اور رازدارانہ انداز سے کلام کرتے ہوئے کہا۔ ''کاؤنٹ بے نگ سین کا جو کچھ کرنے کا ارادہ تھا، یہ اس سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا۔ وہاں جو پہاڑی ہے، وہ اس پر مختلف انداز سے مورچے اور دمدمے تعمیر کرانا چاہتے تھے... لیکن...'' بورس نے اپنے کندھے جھٹکائے۔ ''لیکن ہز سیرین ہائی نس نے ان کی تجویز ماننے سے انکار کر دیا یا پھر کسی نے انھیں کوئی پٹی پڑھا دی۔ بہر حال، آپ سمجھ گئے ہوں گے...'' بورس اپنی بات ختم نہ کر سکا کیونکہ اسی وقت کوتوزوف کا ایجوٹنٹ کیساروف پیئر کے پاس آ گیا۔ ''اخاہ، پائسی سر جی وچ،'' بورس نے فی البدیہہ مسکراتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''میں

ابھی ابھی کاؤنٹ کو میدان جنگ کی تفصیل بتا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر آدمی کی عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ ہز سیرین ہائی نس نے فرانسیسیوں کے عزائم کے بارے میں پیشگی اتنا درست اندازہ کیسے لگالیا!''

''تمھارا مطلب میسرے سے ہے؟'' کیساروف نے پوچھا۔

''جی، بالکل، بالکل۔ اب ہمارا میسرہ انتہائی مضبوط ہو گیا ہے۔''

اگرچہ کوتوزوف نے اپنے عملے کے تمام فالتو ارکان کی چھٹی کرادی تھی لیکن بورس نے کچھ ایسا چکر چلایا کہ تبدیلیوں کے بعد بھی وہ ہیڈ کوارٹرز میں ہی ٹکا رہا۔ وہ کاؤنٹ بے نگ سین کے ساتھ نتھی ہو گیا۔ باقی لوگوں کی طرح، جن کے تحت اس نے خدمات سرانجام دی تھیں، بے نگ سین بھی اسے انمول شخص سمجھتا تھا۔

اعلیٰ کمان دو فریقوں میں منقسم تھی اور انھیں باآسانی ایک دوسرے سے ممیز کیا جاسکتا تھا۔ ایک فریق کوتوزوف کا اور دوسرا چیف آف سٹاف بے نگ سین کا تھا۔ بورس کا تعلق موخر الذکر دھڑے سے تھا اور اس سے بہتر کوئی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ کوتوزوف کا تملقانہ احترام کیسے کیا جاسکتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ تاثر کیسے دیا جاسکتا ہے کہ بڈھا بے کار محض ہے اور سب کچھ بے نگ سین کے ہاتھ میں ہے۔ اب جب کہ جنگ کی فیصلہ کن گھڑی سر پر آ پہنچی تھی، اس کا نتیجہ یا تو کوتوزوف کے زوال اور اختیارات کی بے نگ سین کو منتقلی کی صورت میں نکلنا تھا اور یا اگر کوتوزوف لڑائی میں فاتح بھی قرار پا گیا، پھر بھی عام اذہان پر یہ تاثر قائم کیا جاسکتا تھا کہ یہ سب کچھ بے نگ سین کی وجہ سے ہوا۔ بہرحال کل کے معرکے کے بعد متعدد اہم اعزازات تقسیم ہوں گے اور نئے لوگ اگلی صف میں آجائیں گے۔ چنانچہ اس روز بورس پر اعصابی شگفتگی کا نشہ طاری رہا۔

کیساروف کے بعد کئی اور واقف کار پیئر سے ملنے آئے اور اسے اتنا موقع ہی نہ ملتا کہ وہ ماسکو کے بارے میں ان تمام سوالات کے، جو اس سے پوچھے جاتے، جوابات دے سکتا اور یا وہ ان کہانیوں کو، جو وہ اس کے گوش گزار کرنا چاہتے تھے، سن سکتا۔ ہر چہرے پر ہیجان اور خوف کی کیفیت نمایاں تھی۔ تاہم پیئر کو یہ محسوس ہوا کہ جن چہروں پر ہیجانی کیفیت جھلک رہی ہے، ان میں سے بعض چہرے ان لوگوں کے ہیں جو زیادہ تر ذاتی کامیابی کے مسئلوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں، تاہم وہ اپنے ذہن سے ان دیگر اشخاص کے چہروں کو، جن کی ہیجانی کیفیت ان کے ذاتی مفادات کی آئینہ دار نہیں تھی بلکہ اس کا سبب موت و حیات کے عالم گیر مسائل تھے، محو نہیں کرسکتا تھا۔ کوتوزوف کے گرد و پیش جو لوگ جمع تھے، اسے ان کے بیچ میں پیئر کی شکل نظر آگئی۔

''اسے میرے پاس لاؤ'' کوتوزوف نے کہا۔

جب ایک ایجوٹنٹ نے پیئر کو ہز سیرین ہائی نس کی خواہش سے مطلع کیا، وہ اس کے بنچ کی طرف چل پڑا۔ لیکن ملیشیا کا ایک جوان اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ گیا۔ یہ دلوخوف تھا۔

''یہ شخص یہاں کیسے پہنچ گیا؟'' پیئر نے دریافت کیا۔

''یہ اتنا بڑا سگِ عیار ہے کہ سیندھ لگا کر ہر جگہ پہنچ جاتا ہے،'' پیئر کو جواب ملا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ اس کی

تنزلی کر کے اسے عام سپاہی بنا دیا گیا تھا اور اب یہ ایک بار پھر ابھرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ یہ کبھی کوئی تجویز پیش کر دیتا ہے اور کبھی کوئی۔ اور رات کو رینگتا و ینگتا دشمن کے گشتی دستوں تک پہنچ جاتا ہے... یہ ماننا پڑے گا کہ آدمی ہے جی دار!"

پیئر نے ہیٹ اتارا اور احتراماً کوتوزوف کے سامنے سرخم کر دیا۔

"میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں نے یوئر سیرین ہائی نس کو رپورٹ پیش کی تو آپ مجھے باہر نکال دیں گے یا فرمائیں گے: 'جو کچھ تم مجھے بتانا چاہتے ہو، وہ مجھے پہلے ہی معلوم ہے۔' لیکن بہرحال اس صورت میں میرا کچھ نہیں بگڑے گا..." دلوخوف کہہ رہا تھا۔

"ٹھیک، بالکل ٹھیک!"

"اگر میں ٹھیک ہوں، پھر مجھے مادرِ وطن کی خدمت کا موقع ملنا چاہیے۔ اس کی خاطر میں اپنی جان پر کھیلنے کے لیے تیار ہوں۔"

ٹھیک... بالکل ٹھیک!"

"اگر یوئر سیرین ہائی نس کو کسی ایسے شخص کی، جو اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتا ہو، ضرورت ہو، پھر مجھے یاد فرما لیں۔ شاید میں یوئر سیرین ہائی نس کے کسی کام آسکوں۔"

"ٹھیک... بالکل ٹھیک!" کوتوزوف نے دہرایا۔ وہ ہنستی مسکراتی آنکھوں سے، جنھیں اس نے سکیڑ رکھا تھا، پیئر کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دریں اثنا بورس درباریوں کی نفاست اور پھرتی سے پیئر کی جانب کھسک کر کوتوزوف کے قریب جا کھڑا ہوا اور اپنی آواز بلند کیے بغیر انتہائی فطری انداز میں، جیسے وہ گفتگو کا سلسلہ، جو کسی وجہ سے کٹ گیا تھا، دوبارہ بحال کر رہا ہو، پیئر سے کہنے لگا:

"ملیشیا کے جوانوں نے صاف ستھری سفید قمیصیں پہن لی ہیں اور موت کو گلے لگانے کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ کاؤنٹ، کیا دلیری، کیا شجاعت ہے!"

بورس نے یہ بات اس واضح عزم کے ساتھ کہ اسے ہز سیرین ہائی نس کے کانوں تک پہنچانا ہے، پیئر سے کہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس سے کوتوزوف کی توجہ اس کی جانب منتقل ہو جائے گی اور ایسا ہی ہوا۔

"تم ملیشیا کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟" اس نے بورس سے پوچھا۔

"یوئر سیرین ہائی نس، وہ کل کے لیے تیار ہو رہے ہیں — انھوں نے موت کو گلے لگانے کے لیے سفید قمیصیں پہن لی ہیں۔"

"آہ!... حیرت انگیز اور لاجواب لوگ!" کوتوزوف نے آنکھیں میچتے اور سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔ "لاجواب لوگ!" اس نے اپنی بات کا اعادہ کیا اور آہ بھری۔

''تو تم بارود کی بو سونگھنا چاہتے ہو!'' اس نے پیئر سے کہا۔ ''ہاں۔ خوشگوار مہک ہے۔ مجھے تمھاری بیگم کا مداح ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کی طبیعت ٹھیک ہے؟ میرا ٹھکانا تمھارے لیے حاضر ہے۔''

جیسا کہ بڈھے کھنگڑ لوگوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، کوتوزوف بے دھیانی کے عالم میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا جیسے وہ یہ بھول گیا ہو کہ وہ کیا کہنا یا کرنا چاہتا ہے۔

پھر بظاہر جیسے اسے یاد آ گیا ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے، اس نے اپنے ایجوٹنٹ کے بھائی آندرے سر جی وچ کیساروف کو ہاتھ کے اشارے سے بلایا۔

''وہ اشعار... مارین[57] کے وہ اشعار... ہونہہ، کیا ہیں وہ؟ وہی، جو اس نے گیراکوف کے متعلق لکھے تھے؟ 'تم کور کو لیکچر پلاتے رہتے ہو...' ہاں، ہاں، سناؤ نا!'' اس نے کہا۔ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ قہقہے لگانے کی تیاریاں کر رہا ہے۔

کیساروف نے اشعار سنائے۔ کوتوزوف مسکراتا اور اشعار کی لے کے ساتھ اپنا سر دھنتا رہا۔

جب پیئر نے کوتوزوف سے اجازت لی، دلوخوف اس کے پاس آیا اور اس نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں پکڑ لیا۔

''کاؤنٹ، تم سے یہاں مل کر بہت خوشی ہوئی،'' اس نے اجنبیوں کی موجودگی کو نظرانداز کرتے ہوئے نمایاں عزم صمیم اور سنجیدگی سے با آواز بلند کہا۔ ''ایک ایسے وقت، جب صرف خدا ہی جانتا ہے کہ کل ہم میں سے کس کس کے مقدر میں زندہ بچ رہنا لکھا ہے، مجھے خوشی ہے کہ مجھے تمھیں یہ بتانے کا موقع دستیاب ہو گیا ہے کہ ہم دونوں کے مابین جو غلط فہمی ہو گئی تھی، اس کے متعلق مجھے کتنا افسوس ہے اور یہ کہ مجھے امید ہے کہ میرے بارے میں تمھارے دل میں کوئی بدگمانی نہیں ہو گی۔ میری تم سے یہی التجا ہے کہ تم مجھے معاف کر دو۔''

پیئر نے مسکرا کر دلوخوف کی جانب دیکھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔ دلوخوف کی آنکھوں میں آنسو جھلکنے لگے۔ وہ پیئر سے بغل گیر ہو گیا اور اس کے بوسے لینے لگا۔

بورس اپنے جرنیل کو کچھ بتا چکا تھا اور کاؤنٹ بے نِگ سین پیئر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے اسے تجویز پیش کی کہ محاذ کا جائزہ لینے وہ ان کے ساتھ چلے۔

''آپ کے لیے یہ بہت دلچسپ رہے گا،'' اس نے کہا۔

''جی، واقعی۔'' پیئر نے جواب دیا۔

آدھے گھنٹے بعد کوتوزوف واپس تاتارینووا کی طرف چل دیا اور بے نِگ سین اور اس کا عملہ، جس میں پیئر بھی شامل تھا، محاذ کے معائنے پر نکل گئے۔

23

گورکی سے اتر کر بے نِگ سین اس شاہراہ پر ہو لیا جو اس پل کی طرف، جو اس افسر کے بقول، جس نے ٹیلے پر پیئر کو

بتایا تھا کہ وہ ہماری پوزیشن کے عین قلب میں واقع ہے اور جہاں دریا کے کنارے تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کے گٹھے قطاروں میں پڑے تھے، جاتی تھی۔ انھوں نے پل عبور کیا اور بارودینو گاؤں میں داخل ہو گئے۔ وہاں سے وہ بائیں طرف مڑ گئے اور جوانوں اور توپوں کی بے پناہ تعداد کے قریب سے گزرتے ایک اونچے ٹیلے پر پہنچ گئے۔ وہاں ملیشیا کے جوان کھدائی کر رہے تھے۔ اس مورچے کو ابھی تک کوئی نام نہیں دیا گیا تھا لیکن بعدازاں اس نے رائیف سکی مورچے یا توپ خانے کے ٹیلے کے لقب سے شہرت پائی۔

پیئر نے اس ٹیلے کی طرف کوئی خاص توجہ نہ دی۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ بارودینو کے سارے میدان میں اس نے اس کے لیے انتہائی یادگار مقام بننا ہے۔ انھوں نے نالا عبور کیا اور سیمیونووسک میں داخل ہو گئے۔ وہاں فوجی جوان مکانوں اور مودی خانوں کے شہتیر گھسیٹ گھسیٹ کر کہیں لے جا رہے تھے۔ اس کے بعد وہ پہاڑی کے اوپر چڑھے، نیچے اترے، رائی کے کھیت میں سے گزرے (کھیت میں رائی کے پودے یوں کچلے پڑے تھے جیسے وہاں ژالہ باری ہوئی ہو) اور نو ساختہ راستے پر، جسے ہل پھرے کھیت کے شیاڑوں پر توپ خانے سے بنایا تھا، چلتے بلند و بالا دمدموں کے، جنھیں "تیر" کہا جاتا تھا، قریب پہنچ گئے۔ ان دمدموں کی تعمیر ابھی جاری تھی۔

بے نگ سین دمدموں کے قریب رک گیا اور اس کے بالمقابل شیوار دینو مورچے کو، جو کل تک ہمارا تھا، دیکھنے لگا۔ وہاں متعدد گھڑ سوار نظر آ رہے تھے۔ افسروں نے بتایا کہ وہاں نپولین ہے یا موغا۔ چنانچہ سب لوگ بڑے شوق سے گھڑ سواروں کے چھوٹے سے ہجوم کو دیکھنے لگے۔ پیئر نے ادھر نگاہیں گاڑ دیں۔ وہ یہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان لوگوں میں، جن کی شکلیں بمشکل دکھائی دے رہی تھیں، نپولین کون ہے۔ آخر کار گھڑ سوار پہاڑی سے نیچے اتر گئے اور نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

بے نگ سین ایک جرنیل کی طرف، جو اس کے قریب آ گیا تھا، متوجہ ہوا اور اس کے سامنے اپنی افواج کی مکمل پوزیشن کی توضیح کرنے لگا۔ پیئر بھی سن رہا تھا۔ اس نے اپنی پوری صلاحیتیں صرف کر دیں کہ لڑائی کے، جو سر پر کھڑی تھی، اہم نکات اس کے پلے پڑ جائیں، لیکن اسے یہ معلوم کر کے سخت جھنجھلاہٹ ہوئی کہ یہ کام اس کی ذہنی صلاحیتوں سے ماورا ہے۔ اس الجھی ڈور کا کوئی سرا اس کے ہاتھ نہ آیا۔ بے نگ سین بولتا بولتا چپ ہو گیا۔ اس نے جب دیکھا کہ پیئر سن رہا ہے، اس نے اچانک اس سے مخاطب ہو کر کہا:

"میرا خیال ہے کہ آپ کو اس میں دلچسپی کی کوئی بات نظر نہیں آئی ہو گی۔"

"اوہ، اس کے برعکس یہ انتہائی دلچسپ ہے،" پیئر نے کہا۔ اس کے جواب میں کوئی خاص صداقت نہیں تھی۔

وہ تیر نما بیرونی دمدموں سے بائیں طرف مزید آگے نکل گئے۔ وہ جس سڑک پر جا رہے تھے، وہ برچ کے کوتاہ قامت درختوں کے گھنے جنگل میں سے بل کھاتی گزر رہی تھی۔ جنگل کے بیچ میں سے ایک بھورا خرگوش، جس کے پاؤں سفید تھے، جست لگا کر باہر آیا لیکن گھوڑوں کے ٹاپوں کی آوازوں سے اتنا لرزہ براندام ہوا کہ ہوش و حواس کھو بیٹھا اور وہ کچھ دیر تک سڑک پر ان کے آگے آگے کودتا پھاندتا چلتا رہا۔ سب لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول

ہوگئی اور وہ قہقہے لگانے لگے۔ صرف اس وقت جب متعدد آوازیں چلا چلا کر اسے خبردار کرنے لگیں، وہ بھاگ کر ایک طرف ہوگیا اور جنگل میں غائب ہوگیا۔ جنگل میں کوئی ڈیڑھ میل چلنے کے بعد وہ کھلے میدان میں پہنچے۔ وہاں بائیں بازو کا دفاع کرنے کے لیے تچ کوف کی کور کے دستے مقیم تھے۔

یہاں میسرے کے بالکل اختتام تک پہنچنے کے بعد جنرل بے نگ سین نے بڑے جوش وخروش سے خاصی طویل تقریر کی اور جیسا کہ پیئر کو محسوس ہوا، اس نے زبردست عسکری اہمیت کے احکام دیے۔ تچ کوف کی سپاہ کے سامنے بلند زمین تھی۔ وہاں فوج کا کوئی سپاہی تعینات نہیں تھا۔ بے نگ سین نے خاصی اونچی آواز میں اس فروگزاشت پر نکتہ چینی کی۔ اس کا کہنا تھا کہ اتنے بلند مقام کو، جہاں سے گردوپیش کے علاقے پر نظر رکھی جا سکتی ہے، یونہی چھوڑ دینا اور سپاہ کو اس کے دامن میں متعین کر کے مطمئن ہو جانا نرا پاگل پن ہے۔ متعدد جرنیلوں نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ ان میں سے ایک خاص طور پر بہت گرم تھا اور اس نے عسکری جلال سے کہا کہ اگر دستے وہیں تعینات رہے، جہاں کہ وہ ہیں، ان کے کشتوں کے پشتے لگ جائیں گے۔ بے نگ سین نے اپنی ذمے داری پر کور کو حکم دیا کہ وہ بلندی پر چلی جائے۔

بائیں بازو پر فوج کی اس تقسیم وترتیب نے پیئر کو پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اس شک وشبے میں مبتلا کر دیا کہ فوجی امور اس کی دسترس سے باہر ہیں۔ جب اس نے بے نگ سین اور دوسرے جرنیلوں کو پہاڑی کے دامن میں دستوں کی پوزیشن پر نکتہ چینی کرتے سنا، وہ ان کا استدلال سمجھتا بھی تھا اور ان سے اتفاق بھی کرتا تھا لیکن محض اسی وجہ کی بنا پر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ جس شخص نے انھیں متعین کیا تھا، اس سے اتنی بڑی اور صریح غلطی کیوں کر سرزد ہوئی۔

پیئر کو یہ معلوم نہیں ہو سکتا تھا کہ ان دستوں کو وہاں اس لیے تعینات کیا گیا تھا کیونکہ یہ وہاں سے کسی کو نظر نہیں آ سکتے تھے، اس لیے وہ دشمن پر، جب وہ آگے آتا، اچانک حملہ کر سکتے تھے۔ بے نگ سین کو اس کا علم نہیں تھا۔ اس نے اپنے تصورات کے مطابق دستوں کو آگے پہنچا دیا اور اس بارے میں کمانڈر انچیف کو کچھ نہ بتایا۔

24

25 اگست کی اس چمکیلی شام کو پرنس آندرے اپنی رجمنٹ کے پڑاؤ کے انتہائی آخری سرے پر کنیاز کوو گاؤں کے ایک بوسیدہ چھپر تلے اپنی کہنی کے بل لیٹا ہوا تھا۔ شکستہ دیوار کے ایک شگاف میں سے اسے چوبی باڑ کے ساتھ تیس تیس سالہ برچ درختوں کی قطار نظر آ رہی تھی۔ ان درختوں کی نچلی شاخیں کاٹ دی گئی تھیں۔ ان سے آگے ایک کھیت تھا۔ اس میں جئی کے پولوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ پاس ہی جھاڑیاں تھیں۔ ان کے نزدیک کیمپ فائر۔۔۔ جوانوں کے عارضی مطبخ۔۔۔ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

اس امر کے باوجود کہ پرنس آندرے کو اب اپنی زندگی محدود، بیکار اور بوجھل محسوس ہو رہی تھی، پھر بھی لڑائی

سے ایک روز پیشتر اسے اسی قسم کی پریشانی لاحق ہو رہی تھی اور اس کا مزاج بعینہٖ اسی طرح برہم ہو رہا تھا جیسا کہ سات سال قبل اوسٹرلٹس میں اس کے ساتھ ہوا تھا۔

اگلے روز کی لڑائی کے بارے میں اسے احکام وصول ہو چکے تھے اور وہ اپنی رجمنٹ کو ہدایات دے چکا تھا۔ اب اس کے پاس کچھ مزید کرنے کو نہیں تھا۔ لیکن اس کے خیالات، جو سادہ ترین، واضح ترین اور لہٰذا خطرناک ترین قسم کے تھے، اسے کسی پہلو چین نہیں لینے دے رہے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب تک جن لڑائیوں میں شریک ہو چکا ہے، ان میں کل کا معرکہ مہیب ترین ہوگا اور زندگی میں اولیں بار موت کا امکان اس کے روبرو آ کھڑا ہوا — یہ امکان جس طرح اس کے ذہن میں نمودار رہوا، اس کا نہ تو اس کی دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق تھا اور نہ اس بات سے کہ اس کی موت کا دوسروں پر کیا اثر ہوگا، بلکہ اس کا تعلق محض اس کی اپنی ذات اور اپنی روح سے تھا — اور یہ امکان اتنے واضح، صریح اور ہیبت ناک انداز سے ابھرا کہ یہ تقریباً ٹھوس حقیقت معلوم ہونے لگا۔ اور وہ تمام چیزیں، جو اس سے قبل اس کے لیے سوہان روح بنی رہی تھیں اور جنھوں نے اس کی توجہ کو پوری طرح اپنی طرف مبذول کیے رکھا تھا، وہ ادراک کی اس بلندی پر اچانک سرد، سفید روشنی میں منور ہو گئیں۔ ان (چیزوں) کا نہ کوئی سایہ تھا، نہ تناظر اور نہ خطوط کہ انھیں ایک دوسرے سے ممیّز کیا جا سکتا۔ اسے اپنی تمام زندگی طلسمی لالٹین (میجک لینٹرن) کی تصاویر کے ایک سلسلے کی مانند دکھائی دی۔ طلسمی لالٹین کی تصاویر کی طرح وہ اپنی زندگی (کی تصاویر) کو بھی مصنوعی روشنی میں شیشے میں سے دیکھتا رہا تھا۔ اب شیشے کے بغیر اور دن کی صاف روشنی میں اسے یہ تصاویر یوں دکھائی دیں جیسے وہ بھدے انداز سے لیپ پوت دی گئی ہوں۔ ''ہاں، ہاں، وہ رہیں وہ، وہ جھوٹی شبیہیں، جو میرے اندر ہلچل مچاتی رہیں، مجھے اپنا گرویدہ بناتی رہیں اور مجھے ستاتی رہیں۔'' اس نے زندگی کی طلسمی لالٹین کی بڑی بڑی تصاویر پر نظر ثانی کرتے اور اسے موت کا جو واضح ادراک ہوا، اس کی دن جیسی سرد، سفید روشنی میں انھیں دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا: ''وہ رہیں وہ، بھدے رنگوں سے بنائی گئی بھدی تصویریں، جو کبھی پرشکوہ اور پراسرار معلوم ہوتی تھیں۔ عزت واحترام، عظمت و جلال، فلاحِ عامہ، عشقِ زن، خود مادرِ وطن — مجھے یہ تصاویر مہتمم بالشان دکھائی دیتی تھیں اور کتنے عمیق مفاہیم سے بھرپور معلوم ہوتی تھیں! اور صبح کی، جو مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ میرے لیے طلوع ہو رہی ہے، سرد، سفید روشنی میں یہ سب کچھ کتنا سیدھا سادا، بے رنگ اور بھونڈا نظر آ رہا ہے۔'' اپنی زندگی کی تین عظیم اندوہ ناکیوں — ایک عورت سے اس کا عشق، اپنے باپ کا انتقال اور فرانسیسیوں کی روس پر چڑھائی، جس کی بنا پر انھوں نے اس کے آدھے ملک کو روند ڈالا تھا — نے خاص طور پر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرالی۔ ''محبت... وہ نوخیز دوشیزہ، جو مجھے باطنی قوتوں سے لبریز دکھائی دیتی تھی! مجھے اس سے کتنا عشق تھا! میں اس کے ساتھ مسرت اور محبت کے رومانی منصوبے بناتا رہا۔ واہ! میں بھی کیا طفلِ نادان تھا!'' اس نے بڑی تلخی سے آہ بھرتے ہوئے باآوازِ بلند کہا۔ ''سچی بات یہ ہے کہ مجھے کسی قسم کی مثالی محبت کا یقین ہو گیا تھا اور میں یہ سمجھنے لگا تھا کہ یہ محبت میری عدم موجودگی کے پورے بارہ مہینوں کے دوران میں اسے میری وفادار بنائے رکھے گی! (مجھے خیال گزرا کہ) کہانیوں کی فاختہ کی طرح وہ

میری جدائی میں گھل گھل کر کمزور و ناتواں ہو رہی ہو گی... لیکن یہ سب تصورات کتنی زیادہ بے سمجھی پر مبنی تھے۔... اتنی زیادہ ناسمجھی اور نادانی پر کہ آدمی کا جی متلانے لگے!

"میرے باپ نے بھی بالڈ ہلز کی تعمیر کرائی اور سمجھنے لگا کہ یہ جگہ اس کی ہے۔ یہ زمین، یہ ہوا، یہ کسان اس کے ہیں۔ لیکن نپولین آیا اور اس کے وجود سے بے خبر اس نے سب کچھ اٹھا کر یوں ایک طرف پھینک دیا جیسے کوئی شخص لکڑی کا کوئی ٹکڑا اٹھا کر ایک جانب پھینک دیتا ہے۔ اور میرے باپ کا بالڈ ہلز اور اس کی ساری زندگی چکنا چور ہو گئی۔ پرنس ماریا کہتی ہے کہ ہم پر آزمائش کی جو گھڑی آئی ہے، وہ عالم بالا سے آئی ہے۔ لیکن آزمائش کیسی؟ میرا باپ تو یہاں (اب) رہا نہیں اور نہ وہ کبھی دوبارہ آئے گا۔ کبھی نہیں! اس کا وجود مٹ چکا ہے، پھر یہ آزمائش کس کی ہے؟ مادر وطن، ماسکو کی تباہی! اور کل میں ہلاک ہو جاؤں گا۔ شاید فرانسیسیوں کے ہاتھوں بھی نہیں، بلکہ اپنے ہی کسی شخص کے ہاتھوں، بالکل اس فوجی جوان جیسے، جس نے کل جب بندوق چلائی تھی، گولی میرے کان کے قریب سے سنسناتی گزر گئی تھی، کسی شخص کے ہاتھوں کہ وہ بندوق چلائے اور میں اتفاقاً گولی کی زد میں آ جاؤں!۔ پھر فرانسیسی آئیں گے، مجھے سر اور ایڑیوں سے پکڑیں گے اور کسی گڑھے میں پھینک دیں گے، اس لیے کہ کہیں ان کی ناکوں کے عین سامنے میرے جسم سے سڑاند نہ اٹھنے لگے۔ اور زندگی یوں ہی رواں رہے گی، حالات بے شک نئے ہوں گے لیکن دوسروں کو ان حالات میں ویسے ہی کوئی انوکھا پن دکھائی نہیں دے گا جیسے ہمیں آج کے حالات میں دکھائی نہیں دیتا لیکن مجھے ان (نئے حالات) کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو گا کیونکہ میرا وجود عدم وجود ہو چکا ہو گا۔"

وہ ٹکٹکی باندھ کر قطار میں برچ کے درخت دیکھنے لگا۔ ان کے سبز اور زرد پتے ساکن تھے اور ان کی سفید چھالیں دھوپ میں چمک رہی تھیں۔ "کل موت واقع ہو جائے گی، ہلاکت اپنا کام دکھا جائے گی... میرا وجود عدم وجود بن جائے گا... لاد چلے گا بنجارہ... اور یہ سارا ٹھاٹ، یوں کا توں موجود رہے گا... اور میں؟ میں نہیں ہوں گا۔"

اس نے اپنے بغیر زندگی کا تصور کیا۔ برچ کے درخت، جن میں سے کہیں روشنی چھن چھن کر گزر رہی تھی اور کہیں ان کے سائے پڑ رہے تھے، اون کی طرح کے سفید بادل، پڑاؤ کے الاؤ۔ ایکا ایکی اس کے گرد و پیش ہر چیز کی کایا پلٹ گئی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا کہ ہر چیز نے اپنا چولا تبدیل کر لیا ہے، وہ اس کی طرف ناپاک ارادوں سے دیکھ رہی ہے اور خطرے کی تلوار بن کر اس کے سر پر لٹک رہی ہے۔ اس کا جسم کپکپانے اور ٹھٹھرنے لگا۔ وہ جلدی سے اٹھا، باہر نکلا اور ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔

جب وہ دوبارہ سائبان میں داخل ہوا، اسے آواز سنائی دی۔ آواز کہیں باہر سے آئی تھی۔

سرخ ناک والا کیپٹن، تموخن، جو ازیں پیشتر دلوخوف کا کمپنی کمانڈر تھا لیکن اب افسروں کی تعداد میں کمی آ جانے کے سبب بٹالین کمانڈر بن چکا تھا، شرماتا لجاتا سائبان میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے ایک ایجوٹنٹ اور رجمنٹ کا بخشی تھا۔

پرنس آندرے جھٹ پٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، وہ جس کام کے سلسلے میں آئے تھے، اس نے اس کے بارے

میں ان کی بات توجہ سے سنی، انھیں چند مزید ہدایات دیں اور انھیں رخصت کیا چاہتا تھا کہ اسے سائبان کے باہر جانی پہچانی تتلاتی آواز سنائی دی۔

''بیڑا غرق!'' کسی شخص نے کسی چیز سے ٹھوکر کھاتے ہوئے کہا۔

پرنس آندرے نے سائبان کے باہر دیکھا اور اسے پیئر دکھائی دیا۔ وہ ایک کھمبے سے جو زمین پر پڑا تھا، ٹکرا گیا تھا اور گرنے سے بال بال بچا تھا۔ پرنس آندرے عام طور پر ایسے لوگوں سے، جن کا تعلق اس کے اپنے طبقے سے تھا، ملنا پسند نہیں کرتا تھا اور پیئر تو اسے خاص طور پر ایک آنکھ نہیں بھاتا تھا کیونکہ اسے دیکھ کر اسے وہ تمام روح فرسا واقعات، جن میں وہ اپنے ماسکو کے گزشتہ قیام کے دوران میں گزرا تھا، یاد آجاتے تھے۔

''تم؟ تم نے تو مجھے چکرا ہی دیا'' اس نے کہا۔ ''یہاں کیسے آنا ہوا؟ میں نے تو کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم سے کبھی یہاں ملاقات ہوگی!''

جب وہ یہ سب کچھ کہہ رہا تھا اس کا چہرہ اور آنکھیں چغلی کھا رہی تھیں کہ اس میں مروت نام کی کوئی شے نہیں رہی — اس کا رویہ سرد مہرانہ، بلکہ جیسا کہ پیئر نے آنا فانا بھانپ لیا، قطعی مخاصمانہ تھا۔ وہ بڑے شوق اور ولولے سے سائبان میں آیا تھا لیکن جب اس نے پرنس آندرے کی شکل دیکھی، اس کا جی بجھ گیا اور اس پر بےکلی سوار ہوگئی۔

''میں آیا تھا — خیر، تمھیں معلوم ہے — میں آیا تھا... مجھے اس میں دلچسپی پیدا ہوگئی،'' پیئر نے کہا۔ اس نے اس روز لفظ دلچسپی سوچے سمجھے بغیر بار بار استعمال کیا تھا۔ ''میں لڑائی دیکھنا چاہتا تھا۔''

''اخاہ! ارے ہاں، تمھارے فری میسن برادران کا جنگ کے متعلق کیا خیال ہے؟ وہ اس کے آگے بند کیسے باندھیں گے؟'' پرنس آندرے نے طنزیہ انداز سے پوچھا۔ ''خیر، ماسکو میں کیا ہو رہا ہے؟ میرے گھر والوں کا کیا حال ہے؟ آخرش وہ ماسکو پہنچ گئے ہیں؟'' اس نے سنجیدگی سے دریافت کیا۔

''ہاں، پہنچ گئے ہیں۔ مجھے اس بارے میں جولی دروبتیسکوئے نے بتایا تھا۔ میں گیا بھی لیکن ملاقات نہ ہو سکی۔ وہ تمھاری ماسکو کے قریب جاگیر پر چلے گئے تھے۔''

25

افسر رخصت ہونا چاہتے تھے لیکن پرنس آندرے نے، جسے بظاہر اپنے دوست کے ساتھ تنہا رہنے میں تامل تھا، انھیں ٹھہرنے اور چائے پینے کی دعوت دے دی۔ بنچ بچھا دیے گئے اور چائے منگوالی گئی۔ افسران کچھ کچھ حیرت و استعجاب سے پیئر کے بھاری بھرکم اور کوہ پیکر جثے کو دیکھتے اور ماسکو اور اپنی فوج کی ترتیب کے، جس کا اس نے گھوڑے پر مشاہدہ کیا تھا، بارے میں اس کی باتیں سنتے رہے۔ پرنس آندرے منہ میں گھنگنیاں ڈالے بیٹھا رہا۔ اس کا چہرہ اتنا گمبھیر اور ڈراؤنا تھا کہ پیئر نے بلکونسکی کے بجائے زیادہ تر خوش خصال کمانڈر تموخن سے مخاطب ہونے میں ہی خیریت سمجھی۔

''تو تم ہماری افواج کی ساری تقسیم و ترتیب سمجھ گئے ہو؟'' پرنس آندرے نے اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

''ہاں یعنی کہ۔ کیا مطلب ہے تمھارا؟'' پیئر نے کہا۔ ''میں چونکہ فوجی کمانڈر تو ہوں نہیں، اس لیے میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ پھر بھی عمومی نقشہ میری سمجھ میں آ گیا ہے۔''

''اچھا، پھر کسی بھی دوسرے شخص کی نسبت تم زیادہ جانتے ہو،'' پرنس آندرے نے فرانسیسی میں کہا۔

''اف!'' پیئر نے کنکھیوں سے پرنس آندرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ اسے بڑی الجھن ہو رہی تھی۔ ''خیر، کوتوزوف کی تقرری کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟''

''میں نے اس تقرری کو خوش آئند قرار دیا تھا۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا،'' پرنس آندرے نے جواب دیا۔

''اور یہ بتاؤ کہ بارکلے دَتولی کے متعلق تمھاری کیا رائے ہے؟ خدا جانے ماسکو میں لوگ اس کے بارے میں کیا کیا باتیں بنا رہے ہیں۔ تمھارے خیال میں وہ کیسا شخص ہے؟''

''ان لوگوں سے پوچھ لو،'' پرنس آندرے نے افسروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پیئر نے کچھ ایسی کریمانہ مسکراہٹ سے تموخن کی طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کیا شے ہے؟ (ویسے تموخن سے جو شخص بھی مخاطب ہوتا تھا، وہ غیر ارادی طور پر ایسے ہی مسکراتا تھا۔)

''یوئر ایکسی لینسی، جب ہز سیرین ہائی نس نے عہدہ سنبھالا، یہ اندھیرے میں روشنی کی کرن تھی،''[58] تموخن نے اپنے کرنل کی طرف مسلسل شرمیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایسا کیوں!'' پیئر نے پوچھا۔

''میں عرض کرتا ہوں۔ صرف ہیزم سوختنی اور چارہ لیں۔ جب ہم سوینسیانی سے پسپا ہو رہے تھے، ہم میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ ہم کہیں سے کوئی ٹہنی، گھاس کا تنکا یا ایسی ہی کوئی چیز اٹھا لیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں کہ ہم تو وہاں سے بھاگ رہے تھے اور یہ سب کچھ اسے مل جانا تھا۔ یوئر ایکسی لینسی، میں نے ٹھیک کہا یا نہیں؟'' اس نے دوبارہ اپنے پرنس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''ہم میں اتنا حوصلہ ہی نہیں تھا۔ اس قسم کی حرکت پر ہمارے دو افسروں کا کورٹ مارشل ہو گیا۔ خیر، جب سے ہز سیرین ہائی نس نے کمان سنبھالی ہے، کسی طرح کا الجھاؤ باقی نہیں رہا، ہر چیز واضح اور صاف ہو گئی ہے۔ اب ہمیں روشنی نظر آ گئی ہے...''

''پھر اس کی ممانعت کیوں کی گئی تھی؟''

تموخن بوکھلا گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سوال کا کیسے جواب دے۔ پیئر نے یہی سوال پرنس آندرے سے پوچھ لیا۔

''تاکہ وہ علاقہ، جو ہم خالی کر رہے تھے، کہیں خرابے کا منظر پیش نہ کرنے لگے،'' پرنس آندرے نے جلے کٹے لہجے سے کہا۔ ''بے عیب اصول یہ ہے: تاخت و تاراج کرنے سے احتراز کرو اور اپنی سپاہ کو کبھی لوٹ مار کا عادی نہ

بناؤ۔ سمولنسک میں بھی (اس بار کلے ڈتولی) نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کہ فرانسیسی ہمیں نرغے میں لے سکتے ہیں یا ہمارے میمنے اور میسرے پر شدید دباؤ ڈال سکتے ہیں کیونکہ اس کے پاس ہم سے کہیں بڑی فوج تھی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا'' پرنس آندرے نے تیکھی آواز میں یوں چلاتے ہوئے کہا جیسے اس کے ضبط کے سب بندھن ٹوٹ گئے ہوں۔ ''لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکا کہ ہم روسی سرزمین کے تحفظ کے لیے پہلی مرتبہ لڑ رہے تھے، یہ کہ ہمارے جوان ایک ایسے جذبے سے سرشار تھے جو اس سے پہلے میں نے ان میں کبھی نہیں دیکھا تھا، یہ کہ ہم متواتر دو یوم سے فرانسیسیوں کے حملے پسپا کرتے آرہے تھے اور یہ کہ اس کامیابی نے ہماری قوت میں دس گناہ اضافہ کر دیا تھا۔ مگر اس نے کیا کیا؟ اس نے ہمیں پیچھے ہٹنے کا حکم دے دیا اور ہم نے جو تگ و دو کی تھی اور جو نقصانات برداشت کیے تھے، وہ سب کے سب بیکار گئے۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہوگا کہ وہ ہمیں کبھی دغا دے گا۔ اس نے حتیٰ الامکان پوری کوشش کی کہ ہر کام بہترین انداز سے سرانجام پائے اور اس نے سب کچھ پہلے ہی سوچ لیا تھا، لیکن بالکل یہی وجہ ہے کہ وہ اس عہدے کے لیے موزوں نہیں۔ وہ اس لیے موزوں نہیں کہ اس نے جو کام کرنا ہوتا ہے، اس کا وہ خوب سوچ سمجھ کر پیشگی منصوبہ بنا لیتا ہے، اتنی باریکیوں میں چلا جاتا ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بھی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتا، جرمنوں کا یہی شعار ہے میں کیسے سمجھاؤں... فرض کرو کہ تمھارے والد کے پاس جرمن (وردی پوش) ملازم ہے۔ ملازم وہ بہت اچھا ہے۔ تم اپنے والد کی ضروریات کا اتنا خیال نہیں رکھ سکتے جتنا کہ وہ رکھتا ہے۔ یہاں تک تو بات ٹھیک ہے۔ لیکن اگر تمھارے والد کسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو جاتے ہیں، تو ملازم کی چھٹی کر دو گے اور اپنے اناڑی اور بے ڈھنگے ہاتھوں سے خود ان کی تیمارداری کرو گے۔ کسی ماہر اور چابک دست شخص کی نسبت، جو ان کے لیے اجنبی ہے، تم ان کے لیے زیادہ تقویت اور سہولت کا باعث بنو گے۔ یہی حال بارکلے ڈتولی کا ہے، جب تک روس پر برا وقت نہیں پڑا تھا، غیر ملکی اس کی خدمت کر سکتا تھا اور اعلیٰ پایے کا وزیر ثابت ہو سکتا تھا، لیکن جونہی اس (روس) پر برا وقت آپڑا، اسے اس شخص کی، جس نے اس کی کوکھ سے جنم لیا ہو، ضرورت لاحق ہوگئی۔ مگر تمھارے کلب میں اس پر غداری کی چھاپ لگا دی جاتی ہے! لیکن اسے بدنام کرنے کا صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوگا کہ جو لوگ یہ غلط الزام تراشی کر رہے ہیں، بعد ازاں اتنا شرمندہ ہوں گے کہ وہ ایکا ایکی اسے یا تو ہیرو بنا دیں گے یا نابغۂ روزگار ثابت کر دیں گے، اور یہ بھی اس کے ساتھ ایک طرح کی ناانصافی ہوگی۔ وہ دیانت دار اور قاعدے قانون کی سختی سے پابندی کرنے والا جرمن ہے۔''

''یہ تو سبھی مانتے ہیں کہ وہ قابل جرنیل ہے۔''

''مجھے نہیں معلوم کہ 'قابل جرنیل' کسے کہتے ہیں؟'' پرنس آندرے نے طنزیہ لہجے سے جواب دیا۔

''قابل جرنیل؟'' پیئر کہنے لگا۔ ''خیر، قابل جرنیل وہ ہوتا ہے جو ہر قسم کے احتمالات کا پیشگی اندازہ لگا لیتا ہے اور... خیر، دشمن کے عزائم بھانپ جاتا ہے۔''

''لیکن یہ تو ناممکن ہے،'' پرنس آندرے نے یوں کہا جیسے یہ نکتہ مدتوں پہلے طے ہو چکا ہو۔

پیئر بہ نگاہِ حیرت اسے دیکھنے لگا۔

''پھر بھی کیا یہ نہیں کہا جاتا کہ جنگ شطرنج کے کھیل کی مانند ہے؟''

''ہاں، ہے،'' پرنس آندرے نے جواب دیا۔ ''مگر دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ شطرنج میں ہر چال کے بارے میں تم جتنا عرصہ چاہو، سوچ سکتے ہو، وقت کی کوئی قید نہیں۔ ایک مزید فرق یہ ہے کہ شطرنج میں گھوڑے پیادے سے ہمیشہ طاقت ور ہوتے ہیں اور دو پیادے ایک پیادے پر بھاری ہوتے ہیں، جب کہ جنگ میں بٹالین بعض اوقات ڈویژن پر بھاری ہوتی ہے اور بعض اوقات کمپنی سے مار کھا جاتی ہے۔ فوجوں کی باہمی قوت کے بارے میں یقین سے کبھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں،'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''کہ اگر حالات کا انحصار ان انتظامات پر، جو سٹاف طے کرتا ہے، ہوتا تو بجائے اس کے کہ میں یہاں رجمنٹ میں خدمات سرانجام دیتا (اور مجھے ان حضرات کے ساتھ کام کرنے پر فخر ہے)، میں بھی وہیں ہوتا اور ان انتظامات میں ہاتھ بٹا رہا ہوتا، اور میں سمجھتا ہوں کہ کل کی لڑائی کا انحصار ہم پر ہوگا، نہ کہ ان پر... کامیابی کا انحصار افواج کی تقسیم و ترتیب، ہتھیاروں، بلکہ تعداد پر بھی، نہ کبھی رہا ہے اور نہ کبھی ہوگا... پوزیشن پر تو شاذ ہی کبھی رہا ہے۔''

''پھر اس کا انحصار کس چیز پر ہے؟''

''مجھ میں، ان میں'' اس نے تموخن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''اور ہر جوان میں جو جذبہ ہے، اس پر۔''

پیئر نے سرسری نگاہوں سے تموخن کی، جو بوکھلاہٹ اور دہشت زدگی کے عالم میں ٹکٹکی باندھے اپنے کمانڈر پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، جانب دیکھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ پرنس آندرے اپنی سابقہ کم سخنی اور چپ کے مقابلے میں اب جوش میں آ چکا ہے۔ وہ خیالات، جنھوں نے اچانک اس کے ذہن پر یلغار کر دی تھی، ظاہر تھا کہ اب وہ ان کا اظہار کیے بنا رہ نہیں سکتا تھا۔

''لڑائی وہی فریق جیتتا ہے جس نے جیتنے کا تہیہ کر لیا ہو۔ ہمیں اوسٹرلٹس کی لڑائی میں کیوں شکست ہوئی؟ فرانسیسیوں کے زخمیوں اور ہلاک شدگان کی تعداد تقریباً اتنا ہی تھی جتنا کہ ہماری۔ لیکن دن ابھی آدھا بھی نہیں گزرا تھا کہ ہم نے اپنے آپ سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہم ہار رہے ہیں— چنانچہ ہم ہار گئے۔ اور ہم یہ اس لیے کہہ رہے تھے کیونکہ ہمارے سامنے لڑائی کا کوئی مقصد نہیں تھا اور ہم حتیٰ الامکان جلد از جلد میدان جنگ سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ 'ہم ہار گئے ہیں— چلو، بھاگ چلیں!' اور ہم بھاگ پڑے۔ اگر ہم نے شام تک زبانیں بند رکھی ہوتیں، پھر خدا معلوم اس لڑائی کا کیا انجام ہوتا۔ لیکن کل ہم یہ نہیں کہیں گے۔ تم ہماری تقسیم و ترتیب کے متعلق باتیں کر رہے ہو۔ تمھارا خیال ہے کہ ہمارا میسرہ کمزور ہے اور ہمارا میمنہ ضرورت سے زیادہ دور تک پھیلا ہوا ہے، یہ سب نری بکواس ہے، اس کے کوئی معانی ہی نہیں نکلتے۔ لیکن کل ہمیں کس چیز کا سامنا ہے؟ دس کروڑ مختلف امکانات: جن کا فیصلہ موقع پر ہی ہو جائے گا کہ ہم دوڑتے ہیں یا وہ دوڑتے ہیں، یہ شخص مارا جاتا ہے یا وہ۔ لیکن اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے، وہ نری تفریح ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں کی معیت میں تم نے آج محاذ کا چکر لگایا اور افواج کی

تقسیم و ترتیب کا معائنہ کیا ہے، وہ نہ صرف یہ کہ معاملات میں مددگار ثابت نہیں ہو رہے بلکہ الٹا روڑے اٹکا رہے ہیں۔ انھیں بس اپنے حلوے مانڈے سے غرض ہے۔''

''اس موقع پر'' پیئر نے ناپسندیدگی کے لہجے سے کہا۔

''بالکل اس موقع پر،'' پرنس آندرے نے اس کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ان کے خیال کے مطابق یہی تو موقع ہے جب حریف کے پاؤں تلے سے زمین کھسکائی جا سکتی ہے یا انعام میں کوئی مزید تمغہ یا پٹی حاصل کی جا سکتی ہے۔ میرے نزدیک کل کا مطلب یہ ہے کہ ایک لاکھ فرانسیسی اور ایک لاکھ روسی سپاہی جنگ کرنے کے لیے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ان دو لاکھ انسانوں کی جنگ ہوگی اور کامیابی اس فریق کے قدم چومے گی جو دوسرے کی نسبت زیادہ شدت سے لڑے گا اور اپنے آپ کو بچانے کی کم سے کم فکر کرے گا۔ اور اگر تم جاننا چاہو تو میں تمھیں بتا سکتا ہوں کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو اور وہ لوگ، جو چوٹی پر بیٹھے ہیں، خواہ کتنی ہی گڑبڑ کیوں نہ کریں، کل کی لڑائی میں، ہم ہی جیتیں گے، دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے، کل کی لڑائی میں میدان ہمارے ہی ہاتھ رہے گا!''

''یور ایکسی لینسی، آپ صحیح فرماتے ہیں، سولہ آنے صحیح!'' تموخن نے زور دے کر کہا۔ ''اب اپنے آپ کو بچانے کی فکر کس کو ہے؟ یقین مانیں، میری بٹالین کے جوان ووڈکا کو ہاتھ بھی لگانے کے لیے تیار نہیں! اب اس کا وقت نہیں رہا، وہ کہتے ہیں۔''

سب خاموش ہو گئے۔

افسران اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ پرنس آندرے ایجوٹنٹ کو آخری احکام دیتا ان کے ساتھ سائبان سے باہر چلا گیا۔ جب افسران چلے گئے، پیئر کھسک کر پرنس آندرے کے قریب ہو گیا۔ وہ اس کے ساتھ گفتگو شروع کیا ہی چاہتا تھا کہ انھیں سائبان سے کچھ ہی دور سڑک پر تین گھوڑوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ پرنس آندرے نے مڑ کر ادھر دیکھا اور اس نے وول ٹسوگن اور کلاؤس وٹس[59] کو پہچان لیا۔ ان کے ساتھ ایک قازق تھا۔ وہ آپس میں باتیں کرتے جا رہے تھے۔ جب وہ پرنس آندرے اور پیئر کے برابر سے گزرے، تب بھی ان کی گفتگو جاری رہی۔ گفتگو کے کچھ حصے ان کے کانوں تک بھی پہنچ گئے۔

''جنگ خاصے وسیع و عریض علاقے میں پھیلا دینا چاہیے۔ یہ میرا نقطۂ نظر ہے اور میں اس کا پرچار کرتے کبھی نہیں تھکوں گا،'' ان میں سے ایک جرمن میں کہہ رہا تھا۔

''چونکہ مقصد دشمن کو کمزور کرنا ہے، اس لیے (محاذ پھیلانے سے) عام شہری باشندوں کا جو نقصان ہوگا، اسے ملحوظ خاطر نہیں رکھا جا سکتا۔''

''بالکل نہیں!''

''جنگ خاصے وسیع و عریض علاقے پر پھیلا دینا چاہیے،'' جب وہ گزر گئے پرنس آندرے نے غیظ و غضب سے نتھنے پھلا کر کہا۔ ان کے اس وسیع و عریض علاقے، میں میرا ایک باپ تھا، ایک بیٹا تھا، ایک بہن تھی، لیکن انھیں کیا،

ان کے لیے سب برابر ہے۔ یہی بات ابھی ابھی میں تم سے کہہ رہا تھا۔ یہ جرمن حضرات کل کی جنگ تو کیا جیتیں گے، جہاں تک ان کے بس میں ہوا، الٹا گند ضرور مچا دیں گے، کیونکہ ان کے جرمن دماغوں میں صرف نظری باتیں بھری ہوئی ہیں، اور کچھ نہیں۔ اور یہ نظری باتیں بیکار محض ہیں اور کل جس چیز کی ضرورت ہے، ان کے قلوب اس سے خالی ہیں۔ لیکن وہ تموخن کے دل میں موجود ہے۔ انھوں نے سارا یورپ ہتھیلی پر رکھ کر اسے پیش کر دیا ہے اور اب ہمیں سبق پڑھانے چلے آئے ہیں۔ کیسے پائے کے اساتذہ ہیں! واہ!'' اور ایک بار پھر اس کی آواز تیکھی ہوگئی۔

''تو تمھارے خیال میں کل کی لڑائی ہم جیتیں گے؟'' پیئر نے دریافت کیا۔

''بالکل، بالکل،'' پرنس آندرے نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ ''اگر میرے پاس اختیار ہوتا، تو ایک کام ضرور کرتا،'' اس نے پھر بولنا شروع کر دیا۔ ''میں قیدی بنانے کا جھنجھٹ نہ پالتا۔ آخر قیدی بنانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ یہ دورِ شجاعت کے قصے ہیں۔ فرانسیسیوں نے میرے گھر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے اور اب وہ ماسکو کو تاخت و تاراج کرنے جا رہے ہیں۔ انھوں نے میرے ساتھ دست درازی کی ہے اور ہر لمحے میرے ساتھ دست درازی کیے جا رہے ہیں۔ وہ میرے دشمن ہیں۔ میرے خیال کے مطابق وہ سب خطا کار ہیں اور بالکل یہی سوچ تموخن اور باقی ساری فوج کی ہے۔ انھیں کیفرِ کردار تک پہنچانا ہی چاہیے۔ ٹلزٹ میں خواہ کچھ ہی کیوں نہ کہا گیا ہو، چونکہ وہ میرے دشمن ہیں، وہ میرے دوست ہو ہی نہیں سکتے۔''

''اے ہاں، بالکل،'' پیئر نے چمکتی آنکھوں سے پرنس آندرے کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے پوری طرح متفق ہوں!''

پیئر کو محسوس ہوا کہ وہ سوال جس نے اسے موژیسک پہاڑی پر اور بقیہ سارا دن پریشان کیے رکھا تھا، اب واضح طور پر اور پوری طرح حل ہوگیا ہے، اب اس جنگ اور پیش آئند معرکے کا مکمل مفہوم اور اہمیت اس کی سمجھ میں آگئے ہیں۔ اس نے اس روز جو کچھ دیکھا تھا اور گزرتے گزرتے اس نے چہروں پر جن معنی خیز اور درشت تاثرات کا مشاہدہ کیا تھا، وہ سب اسے نئی روشنی میں نظر آرہے تھے۔ ان تمام جوانوں میں، جنھیں اس نے اس روز دیکھا تھا، اسے حب الوطنی کی جو دبی دبی حرارت (فزکس کے علما کے بقول حرارتِ خفی) نظر آئی تھی، اب اس کے معانی اس پر روشن ہوگئے اور اسے معلوم ہوگیا کہ جس دل جمعی اور بظاہر شگفتگی کے ساتھ وہ موت کا سامنا کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں، اصل میں ہے کیا۔

''اگر قیدی بنانے کا سلسلہ ترک کر دیا جائے،'' پرنس آندرے نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا، ''تو صرف اسی سے جنگ کی ساری ہیئت تبدیل ہو جائے گی اور یہ اتنی سفاک نظر نہیں آئے گی جتنی کہ اب آتی ہے۔ موجودہ صورت میں، ہم جنگ کے ساتھ محض انکھیلیاں کر رہے ہیں۔ اور خباثت بس یہی ہے۔ دوسروں کو بس جتا رہے ہیں کہ ہم بڑے سُور بیر ہیں، شجیع ہیں، کمزوروں پر ہاتھ نہیں اٹھاتے، بس زور آوروں سے ٹکر لیتے ہیں۔ اس قسم کی عالی ظرفی اور حساسیت اس خاتون کی، جس پر مذبوح بچھڑے کو دیکھ کر غشی طاری ہو جاتی ہے، عالی ظرفی اور

حساسیت سے مشابہ ہے۔ وہ اتنی شفیق اور نرم دل ہے کہ اس سے خون دیکھا نہیں جاتا، لیکن بچھڑے کے گوشت کے قتلے، بھنے ہوئے ہوں یا تلے ہوئے، مزلے لے لے کر کھاتی ہے۔ یہ لوگ ہمیشہ جنگ کے قواعد وضوابط، شجاعانہ رویے، امن کے جھنڈوں، زخمیوں پر رحم وکرم، وغیرہ وغیرہ، کے ڈھول پیٹتے رہتے ہیں۔ یہ سب زبانی جمع خرچ ہے اور نری بکواس۔ میں نے 1805 میں شجاعانہ رویے اور امن کے جھنڈے دیکھے تھے۔ وہ ہمیں اور ہم انھیں چکر دیتے رہے... وہ لوگوں کے گھروں میں لوٹ مار مچاتے ہیں، جعلی کرنسی چلاتے ہیں اور سب سے بدتریں حرکت یہ کرتے ہیں کہ ہمارے بچوں اور باپوں کو سنگینوں پر پروتے ہیں اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ اس کے بعد جنگ کے قواعد وضوابط پر عمل کرنے اور دشمن کے ساتھ عالی ظرفی برتنے کی باتیں کرتے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قیدی بنانے کا ڈھونگ ختم کر دیا جائے، مارو اور مر جاؤ! جس قسم کے مصائب جھیلنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں، اگر کوئی دوسرا شخص..."

پرنس آندرے، جس کا یہ خیال تھا کہ جس طرح انھوں نے سمولنسک پر قبضہ کیا ہے، اگر وہ اسی طرح ماسکو پر قابض ہو جائیں، اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اب ایکا ایکی اسے محسوس ہوا جیسے اس کے گلے کی رگیں سکڑ گئی ہوں اور اس نے اپنا استدلالی بیان ادھورا چھوڑ دیا، خاموشی سے ادھر ادھر متعدد چکر لگائے لیکن جب اس نے اپنی گفتگو کا دوبارہ آغاز کیا، اس کی آنکھیں بے تابی سے جگمگا رہی تھیں اور اس کے ہونٹ لرز رہے تھے۔

"اگر جنگ میں اس قسم کے شجاعانہ رویے اور عالی ظرفی کی روایت نہ پڑتی، تو جس طرح ہم اب جنگ کرتے ہیں، کبھی نہ کرتے۔ ہم جنگ کا صرف اس وقت نام لیتے جب ہمیں یہ یقین ہوتا کہ یقینی موت کے منہ میں جانا کچھ معنی رکھتا ہے۔ پھر جنگیں محض اس لیے نہ لڑی جاتیں کیونکہ پاول ایوانچ نے میخائیل ایوانچ کی توہین کر دی تھی۔ پھر اگر موجودہ جنگ کی طرح کوئی جنگ لڑی جاتی، تو وہ صحیح معنوں میں جنگ ہوتی اور سپاہیوں کا جوش وخروش بھی مختلف قسم کا ہوتا۔ پھر ویسٹ فالیا[60] اور ہسے کے باشندے، جن کی نپولین ہمارے خلاف قیادت کر رہا ہے، کبھی اس کے پیچھے پیچھے روس نہ آتے اور نہ ہم، جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہو جاتا کہ کیوں، آسٹریا اور پرشیا جاتے۔ جنگ کسی شائستہ تفریح کا نام نہیں، بلکہ یہ زندگی کی خبیث تریں چیز ہے۔ ہمیں اس کی تفہیم کرنا چاہیے اور اسے بچوں کا کھیل نہیں بنانا چاہیے۔ ہمیں اس ہول ناک حقیقت کو فرزانگی اور سنجیدگی سے دیکھنا چاہیے۔ ان سب باتوں کا ماحصل یہ ہے: ابلہ فریبی سے دامن چھڑائیں، جنگ کو جنگ رہنے دیں، اسے چھیڑِ خوباں نہ بنائیں، جیسا کہ ہم اب کر رہے ہیں کہ یہ بیکاروں اور کم ظرفوں کی تفریح بن گئی ہے...

"جتنی قدر ومنزلت فوجی طبقے کی ہوتی ہے، کسی اور کی نہیں ہوتی۔ اور جنگ کیا ہے؟ جدل میں فتح ونصرت کے لیے کیا درکار ہے؟ اور عسکری دنیا کے اخلاقی معیار کیا ہیں؟ جنگ کا مقصد ومنشا قتل ہے[61] اور اس میں جو ہتھیار استعمال ہوتے ہیں، وہ ہیں: جاسوسی، غداری، غداری کی ترکیب، فوج کی ضروریات پوری کرنے کے لیے لوٹ مار، غارت گری کے ذریعے ملک کے باشندوں کی تباہی وبربادی، چالبازی اور دھوکا دہی، جنھیں عسکری چالیں کہا جاتا ہے۔ عسکری دنیا کی امتیازی خصوصیات فقدانِ آزادی یا دوسرے لفظوں میں نظم وضبط کا شکنجہ، بے شغلی جو زبردستی

عاید کی جاتی ہے، جہالت، سفاکی اور بربریت، عیاشی اور مے خوری ہیں۔ لیکن ان سب امور کے باوجود یہ بلند ترین طبقہ ہے اور سب اس کی عزت و توقیر کرتے ہیں۔ چینیوں کو چھوڑ کر باقی دنیا کے تمام امپراطور خود بھی فوجی وردی زیب تن کرتے ہیں اور اعلیٰ ترین اعزازات ان لوگوں کی، جنھوں نے زیادہ سے زیادہ انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہوتا ہے، جھولی میں ڈال دیتے ہیں۔

''وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کے لیے ایک دوسرے کے آمنے سامنے آتے ہیں۔۔ہم بھی کل اسی طرح ایک دوسرے کے روبرو آئیں گے۔۔۔وہ ہزاروں، لاکھوں انسانوں کو اجل کے حوالے کرتے ہیں یا انھیں زندگی بھر کے لیے معذور بنا دیتے ہیں۔ کشتوں کے پشتے (وہ تعداد بھی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں) لگانے کے بعد دعائے شکر ادا کرتے ہیں اور فتح کے ڈنکے بجاتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہوتا ہے کہ وہ جتنے زیادہ لوگوں کو ہلاک کریں گے، اتنے ہی زیادہ نیک نام ہوں گے۔ سوچو، خداوند انھیں کیسے دیکھ اور سن سکتا ہے!'' پرنس آندرے نے تیکھی اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز میں چیختے ہوئے کہا۔ ''آہ، میرے دوست، حالیہ کچھ عرصے سے زندگی میرے لیے وبال بن گئی ہے۔ مجھے نظر آرہا ہے کہ میں ضرورت سے کچھ زیادہ ہی سمجھنے بوجھنے لگا ہوں۔ نیکی اور بدی کے درخت کا پھل کھانے سے آدمی کا کچھ بھلا نہیں ہوتا۔۔۔آہ، خیر، یہ صورت حال زیادہ دیر رہنے کی نہیں!'' اس نے مزید کہا۔

''تاہم تمھیں تو نیند آرہی ہے۔ رات اتنی گزر چکی ہے کہ مجھے بھی جا کر سو جانا چاہیے۔ تم واپس گورکی چلے جاؤ'' پرنس آندرے نے اچانک کہا۔

''ارے نہیں!'' پیئر نے جواب دیا۔ اس کی آنکھوں میں رحم اور خوف و ہراس دونوں جھلک رہے تھے۔

''تمھیں لازماً چلے جانا چاہیے۔ لڑائی سے پہلے آدمی کو جی بھر کر سونے کی ضرورت ہوتی ہے،'' پرنس آندرے نے کہا۔ وہ تیزی سے پیئر کی جانب آیا، اس نے اسے سینے سے لگایا اور اس کا بوسہ لیا۔

''خدا حافظ، اب جاؤ!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''ہماری آئندہ ملاقات ہوگی یا نہیں۔۔'' وہ جھٹ پٹ پیچھے ہٹا اور سائبان کے اندر چلا گیا۔

تاریکی چھا چکی تھی اور پیئر کو یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ پرنس آندرے کے چہرے پر غصہ جھلک رہا ہے یا شفقت۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ کھڑا رہا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ اسے اس کے پیچھے پیچھے اندر چلے جانا یا وہاں سے واپس لوٹ آنا چاہیے۔ ''نہیں، وہ یہ نہیں چاہتا۔'' پیئر اس نتیجے پر پہنچا: ''لیکن میں جانتا ہوں کہ یہ ہماری آخری ملاقات ہے،'' اس نے گہری آہ بھری اور گھوڑے پر سوار واپس گورکی کی طرف چل دیا۔

سائبان کے نیچے پرنس آندرے دری پر لیٹا ہوا تھا لیکن نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے تخیل میں ایک کے بعد دوسری تصویر آنے لگی۔

ایک تصویر کے بارے میں وہ بہت دیر تک سوچتا اور خوش ہوتا رہا۔ اسے پیٹرز برگ کی ایک شام بہت واضح انداز سے یاد آئی۔ نتاشا بڑے جوش و خروش اور شگفتگی سے اسے بتا رہی تھی کہ گزشتہ گرمیوں کے دوران میں وہ کھنبیاں

تلاش کرنے نکلی تھی لیکن وسیع و عریض جنگل میں راستہ بھول گئی۔ وہ اسے گھنے جنگل، اپنے تحسسات اور شہد کی مکھیوں کے رکھوالے سے، جس سے اس کی سرراہے ملاقات ہوگئی تھی، اپنی گفتگو کے بارے میں بے ربط انداز سے باتیں کررہی تھی لیکن وہ گھڑی گھڑی یہ کہنے کے لیے کہ ''نہیں، میں نہیں بتاسکتی، میں ٹھیک طرح سے یہ قصہ بیان نہیں کرسکتی... نہیں، آپ سمجھ نہیں رہے،'' خود ہی اپنا سلسلۂ کلام منقطع کردیتی حالانکہ پرنس آندرے اسے بار بار یقین دلارہا تھا کہ وہ اس کی بات سمجھ رہا ہے اور اسے معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اسے کیا بتانے کی کوشش کررہی ہے۔ لیکن نتاشا اپنے الفاظ سے مطمئن نہیں تھی۔ وہ یہ محسوس کررہی تھی کہ اسے اس روز جس قسم کے شدید شاعرانہ جذبات کا تجربہ ہوا تھا، وہ ان کی ازسرنو تخلیق کرنا چاہتی ہے، لیکن الفاظ ہیں کہ اس کے قابو میں نہیں آرہے اور جو کچھ وہ کہنا چاہتی ہے، اس کا مناسب طور پر ابلاغ نہیں کرپارہی۔ ''بڑے میاں اتنے پرکشش اور دل آویز تھے اور جنگل میں اتنی تاریکی تھی... اور ان کے چہرے پر اتنی گھلاوٹ تھی... نہیں، میں صحیح طور پر بیان نہیں کرسکتی،'' اس نے کہا تھا اور اس کے ساتھ اس کا چہرہ لالوں لال ہوگیا تھا۔ پرنس اب پھر اسی پرمسرت انداز میں مسکرانے لگا جس طرح وہ تب مسکرایا تھا جب اس نے نتاشا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا تھا۔ ''میں اس کی بات سمجھ گیا تھا،'' اس نے سوچا۔ ''میں نہ صرف اس کی بات سمجھ گیا تھا، بلکہ یہ اس کی باطنی اور روحانی قوت، اس کا خلوص، اس کا بھولپن اور معصومیت ہی تو تھی جس سے مجھے اتنا پیار تھا اور میں اس پر جی جان سے فدا ہوگیا تھا۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی یہ باطنی خوبیاں اس کے جسم کا ناگزیر جزو بن چکی ہیں اور انھیں اس سے علیحدہ کرنا ناممکن ہے۔ اسی لیے میں اس سے محبت کرتا اور خوش ہوتا تھا...'' اور یک لخت اسے یاد آیا کہ وہ کیا چیز تھی جس نے اس کی محبت کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ''اسے ان چیزوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں تھی، اسے اس طرح کی نہ کوئی چیز نظر آئی اور نہ وہ انھیں سمجھ سکا۔ اسے تو جو کچھ نظر آیا، وہ خوبصورت، صحت مند، تازہ رو، نوخیز دوشیزہ تھی،... جس کے ساتھ اس نے اپنے مقدر کو وابستہ کرنا اپنے شایان شان نہ سمجھا... اور میں؟... اور وہ ابھی تک زندہ ہے اور زندگی سے حظ اٹھا رہا ہے!''

اور پرنس آندرے یوں بدک کر اٹھ کھڑا ہوا جیسے کھولتے پانی سے اس کا جسم جھلس گیا ہو اور وہ ایک بار پھر اپنے سائبان کے سامنے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔

26

بارودینو کی لڑائی سے ایک روز قبل 25 اگست کو فرانسیسی امپراطور کے محل کا منتظم موسیو ڈبوسے (de Beausset) اور کرنل فبوئیر (Fabvier) میڈرڈ سے والیوئے وو میں نپولین کے ہیڈکوارٹرز پہنچے۔

درباری وردی پہننے کے بعد مسیو ڈبوسے نے حکم دیا کہ وہ امپراطور کے لیے جو بکس لایا ہے، وہ اس کے پاس لایا جائے، اور وہ نپولین کے خیمے کے بیرونی کمرے میں چلا گیا۔ وہاں وہ بکس کھولنے میں مصروف ہوگیا اور اس

• یعنی اناطول کوراگن

کے ساتھ ساتھ نپولین کے ایڈی کانگوں سے، جنھوں نے اس کے اردگرد گھیرا ڈال لیا تھا، باتیں کرنے لگا۔
فبوئیر خیمے سے باہر ہی رہا اور اپنی جان پہچان کے چند جرنیلوں کے ساتھ گپ شپ لڑاتا رہا۔
امپراطور نپولین ابھی تک اپنی خوابگاہ سے باہر نہیں آیا تھا۔ وہ نہلائی دھلائی سے فارغ ہو رہا تھا۔ ہلکے پھلکے انداز سے کھنکارتے اور ناک بھینچ کر آوازیں نکالتے اس نے پہلے اپنی کمر اور بعد میں اپنا فربہ گداز اور بالوں سے بھرا ہوا سینہ برش کے، جس سے اس کا ذاتی خدمت گار اس کے جسم کی رگڑائی کر رہا تھا، آگے کر دیا۔ ایک اور خدمت گار بوتل کے دہانے پر انگلی رکھے امپراطور کے بدن پر، جس کے اتنے ناز اٹھائے جاتے تھے، یوڈی کلون چھڑک رہا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ صرف وہی جانتا ہے کہ یوڈی کلون کہاں اور کتنا استعمال کرنا ہے۔ نپولین کے چھوٹے اور پانی سے تر ژولیدہ بال اس کی پیشانی ڈھانکے ہوئے تھے، تاہم اس کے چہرے سے، جو اگرچہ پیلا اور پھولا پھولا تھا، یہ عیاں ہو رہا تھا کہ وہ جسمانی طور پر بالکل شانت ہے۔
''کرتے رہو، ذرا اور زور سے، کرتے رہو!'' اس نے اپنے خدمت گار سے، جو اس کے جسم پر برش پھیر رہا تھا، غرا کر کہا، اور اس کے جسم کی رگیں تن گئیں۔
ایک ایڈی کانگ، جو اسے یہ بتانے آیا تھا کہ گزشتہ روز کے معرکے میں کتنے اشخاص کو قیدی بنایا گیا تھا، اپنا پیغام پہنچانے کے بعد دروازے کے قریب کھڑا واپس جانے کی اجازت کے ملنے کا انتظار کر رہا تھا۔ نپولین نے برا سامنہ بنایا اور قہر آلود نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔
''کوئی قیدی ویدی نہیں!'' اس نے ایڈی کانگ کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔ ''وہ ہمیں مجبور کر رہے ہیں کہ ہم انھیں صفحۂ ہستی سے مٹا دیں۔ ہمیں کیا، بیڑا تو روسی فوج کا ہی غرق ہوگا... کرتے جاؤ، ذرا اور زور لگاؤ... اور زور لگاؤ!'' اس نے اپنی کمر جھکاتے اور اپنے فربہ کندھے خدمت گار کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔ ''بہت اچھا۔ موسیو دَبوسے اور فبوئیر کو یہیں بلا لو،'' اس نے اپنی گردن کو خم دیتے ایڈی کانگ سے کہا۔
''بہت اچھا، عالی جاہ!'' ایڈی کانگ نے جواب دیا اور خیمے کے دروازے میں غائب ہو گیا۔
دونوں خدمت گاروں نے پھرتی سے ہز میجسٹی کو گارڈز کی نیلی وردی پہنائی اور نپولین مضبوط اور تیز قدم اٹھاتا استقبالیہ میں چلا گیا۔
دریں اثنا دَبوسے دروازے کے بالکل سامنے دو کرسیوں پر وہ تحائف، جو امپراطورہ نے بھیجے تھے، سجا رہا تھا لیکن نپولین نے لباس تبدیل کرنے اور باہر آنے میں اتنی تیزی دکھائی کہ دَبوسے کو اتنا وقت ہی نہ ملا کہ وہ تحائف کی ٹھیک طرح آرائش کر سکتا اور یوں اسے حیران کر سکتا۔
نپولین آناً فاناً بھانپ گیا کہ ان تحائف کا مقصد کیا ہے اور اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ انھیں ابھی تک ترتیب نہیں دیا جا سکا۔ انھیں اسے حیران کر کے جو خوشی ہوتی، وہ انھیں اس سے محروم نہیں کرنا چاہتا تھا، چنانچہ اس نے جھوٹ موٹ یہ ظاہر کیا کہ اس نے دَبوسے کو دیکھا ہی نہیں اور اس نے اشارے سے فبوئیر کو اپنے پاس بلا لیا۔

یورپ کے دوسرے کنارے سلامانکا[62] میں اس کی فوجیں جس دلیری اور جاں نثاری سے جنگ کر رہی تھیں، فبوئیر اس کے بارے میں اسے رپورٹ پیش کر رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کے سپاہیوں پر ایک ہی دھن سوار ہے کہ وہ اپنے امپراطور کا دل موہ سکیں لیکن ان کے قلوب میں یہ خوف سمایا ہوا ہے کہ وہ کہیں اسے خوش کرنے میں ناکام نہ ہو جائیں۔ وہاں جو جنگ ہوئی تھی، اس کا نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا۔ فبوئیر کے بیان کے دوران میں نپولین طنزیہ جملے کستا رہا جیسے وہ اسے یہ جتانا چاہتا ہو کہ اسے یہ قطعاً توقع نہیں تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں حالات یوں دگرگوں ہو جائیں گے۔

''مجھے اس کی تلافی ماسکو میں کرنا ہوگی،'' نپولین نے کہا۔ ''میں بعد میں تم سے ملاقات کروں گا۔'' اور اس نے ڈبوسے کو اپنے پاس بلایا۔ ڈبوسے جس چیز سے نپولین کو حیران کرنا چاہتا تھا، وہ اس دوران میں اس کی تیاری مکمل کر چکا تھا۔ وہ دونوں کرسیوں پر کچھ رکھ اور ڈھانپ چکا تھا۔

ڈبوسے جس طرح کورنش بجالایا وہ صرف سابقہ شاہی خاندان بوغ بوں کے مصاحبین ہی بجالانا جانتے تھے۔ پھر وہ آگے بڑھا اور اس نے نپولین کی خدمت میں ملفوف خط پیش کر دیا۔

نپولین اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس نے دل لگی سے اس کا کان اینٹھ دیا۔

''تم بہت جلد پہنچے ہو، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔ خیر، پیرس میں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے پوچھا اور ایکا ایکی اس کے چہرے سے سابقہ خشونت کافور ہو گئی اور اس کی جگہ گرم جوشی کا اظہار ہونے لگا۔

''عالی جاہ، سارا پیرس آپ کی عدم موجودگی پر ملول اور اداس ہے،'' ڈبوسے نے جواب دیا اور یہی موزوں جواب تھا۔

اگرچہ نپولین جانتا تھا کہ ڈبوسے نے یہی یا اس سے ملتی جلتی بات ہی کہنا تھی، اور اگرچہ ان لمحات کے دوران میں، جب اس پر عقل و دانش کا غلبہ ہوتا تھا، اسے معلوم ہوتا تھا کہ ڈبوسے نے جو کچھ کہا ہے، وہ درست نہیں ہے، لیکن اس وقت وہ اس کی بات سن کر خوشی سے پھولے نہ سمایا۔ اس نے ایک بار پھر ڈبوسے کے کان مروڑ کر اس کی عزت افزائی کی۔

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے اتنا لمبا سفر کرایا۔''

''عالی جاہ، مجھے توقع تھی کہ ماسکو سے ادھر آپ کہیں نہیں ملیں گے،'' ڈبوسے نے جواب دیا۔

نپولین مسکرایا۔ اس نے بے دھیانی سے اپنا سر اٹھایا اور دائیں طرف دیکھا۔ ایک ایڈی کانگ نسوار کی طلائی ڈبیا اٹھائے دبے پاؤں تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے اسے اس کی خدمت میں پیش کر دیا۔ نپولین نے ڈبیا پکڑ لی۔

''ہاں، تم بڑے خوش قسمت ہو کہ تمھارا کہا پورا ہو گیا ہے،'' اس نے نسوار کی کھلی ڈبیا ناک کے آگے لاتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں سفر کا شوق ہے اور تم تین دنوں میں ماسکو دیکھ لو گے۔ تمھیں غالباً ایشیائی دارالحکومت دیکھنے کی

توقع نہیں تھی۔ تمھارے لیے یہ خوشگوار تفریحی دورہ ہوگا۔''

ڈبوسے کے سفر کے شوق (جس کا اسے اس وقت تک خود کوئی اندازہ نہیں تھا) پر جو یوں توجہ فرمائی گئی، اس پر وہ بطور شکریہ دوبارہ کورنش بجالایا۔

''اخاہ، یہ ہمارے لیے کیا لائے ہو؟'' نپولین نے دریافت کیا۔ وہ یہ دیکھ چکا تھا کہ اس کے درباریوں کی نظریں کسی ڈھکی ہوئی چیز پر مرکوز ہیں۔

اپنی پشت امپراطور کی جانب کیے بغیر ڈبوسے درباری پھرتی کے ساتھ دو قدم پیچھے ہٹا، تھوڑا سا مڑا اور اس نے پلک جھپکنے میں سرپوش پرے ہٹا دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے باآواز بلند کہا:

''یوئر میجسٹی کے لیے امپراطورہ کا تحفہ۔''[63]

یہ ایک بچے کی تصویر تھی۔ یہ بچہ نپولین اور اس کی دوسری بیوی کے، جو آسٹریا کے امپراطور کی دختر تھی، ہاں تولد ہوا تھا۔ اسے ہر شخص بلاسبب ''شاہ روم'' کہتا تھا۔ اس کی تصویر (فرانسیسی مصور) یںغاغ نے بنائی تھی اور اس کے رنگ بہت شوخ تھے۔ ننھا بچہ بے حد خوبصورت تھا، اس کے بال گھونگھریالے تھے اور اس کی آنکھیں حضرت مریم کی اس تصویر کے، جو پوپ سکسٹس[64] چہارم نے بنوائی تھی، شیر خوار مسیح کی آنکھوں سے مشابہ تھیں۔ اسے تصویر میں گیند اور چھڑی سے کھیلتے دکھایا گیا تھا۔ گیند کرۂ ارض اور چھڑی عصا کی علامت تھی۔

تصویر میں مصور نے نام نہاد شاہِ روم کو جس طرح کرۂ ارض پر چھید کر کے اسے چھڑی پر اٹھاتے دکھایا تھا، اگرچہ یہ پوری طرح واضح نہیں تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے، لیکن ہر اس شخص کی طرح، جس نے یہ تصویر پیرس میں دیکھی تھی، نپولین کو بھی یہ بالکل قابل فہم اور انتہائی دلفریب نظر آ رہی تھی۔

''شاہ روم!'' وہ تصویر کی طرف باوقار اور پرتمکین انداز سے اشارہ کر کے پکار اٹھا۔ ''واہ واہ! سبحان اللہ! کیا بات ہے!''

ہر اطالوی کی طرح نپولین میں بھی یہ خداداد ملکہ موجود تھا کہ وہ جب جی چاہتا نہایت آسانی سے اپنے چہرے کے تاثرات تبدیل کر لیتا۔ چنانچہ وہ تصویر کی طرف بڑھا اور اس کے چہرے پر متفکرانہ ملائمت چھا گئی۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس موقع پر جو کچھ بھی کہے گا اور کرے گا، اسے تاریخی اہمیت حاصل ہو جائے گی اور اس کے دل میں خیال آیا کہ بہترین کام جو وہ کر سکتا ہے یہ ہے کہ وہ اس سے بالکل عام قسم کی پدری شفقت کا اظہار کرے (حالانکہ اس کے رعب و جلال کا یہ عالم تھا کہ اس کا شیر خوار بچہ بھی کرۂ ارض کے ساتھ گیند اور چھڑی کا کھیل سکتا تھا)۔ شدتِ جذبات سے اس کی آنکھیں نم ناک ہو گئیں۔ وہ آگے بڑھا، اس نے کرسی کی تلاش میں ادھر ادھر دیکھا (کہیں سے ایک کرسی، جیسے خود بخود، اس کے نیچے آ گئی) اور وہ تصویر کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس کے واحد اشارے پر تمام افسران پنجوں کے بل چلتے کمرے سے باہر نکل گئے اور عظیم آدمی کو اپنے جذبات سے نپٹنے کے لیے تنہا چھوڑ گئے۔

وہ کچھ دیر یونہی بیٹھا رہا۔ پھر اس نے کینوس کے کھردرے روشن حصوں پر انگلی پھیری۔ کیوں؟ یہ وہ خود بھی

نہیں جانتا تھا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ڈبوسے اور ڈیوٹی افسر کو آواز دی۔ اس نے حکم دیا کہ وہ تصویر باہر لے جائیں اور اس کے خیمے کے سامنے رکھ دیں تا کہ وہاں متعین گارد ''شاہ روم'' اور اپنے محبوب امپراطور کے فرزند دلبند اور جانشین کا دیدار کرنے کی سعادت سے محروم نہ رہیں۔

Vive l' Empereur! Vive le roi de Rome! Empereur*

کے پر جوش نعروں سے گونج اٹھی۔

ناشتے کے بعد نپولین نے ڈبوسے کی موجودگی میں فوج کے نام فرمانِ یوم لکھوا دیا۔ ''مختصر لیکن بلیغ!'' اس نے اس اعلان کو، جو اس نے فی البدیہہ لکھوایا تھا اور جس میں اس نے کسی قسم کی ترمیم و تصحیح نہیں کی تھی، پڑھتے ہوئے کہا۔ اس کا متن درج ذیل ہے:

''جوانو، اس لڑائی کی آرزو تمھیں بہت دنوں سے تھی۔ فتح کا انحصار تم پر ہے۔ ہمارے لیے یہ ازبس ضروری ہے۔ اس سے ہمیں وہ سب کچھ — آرام دہ رہائش گاہیں اور اپنے وطن جلد واپسی — '' جس کی ہمیں ضرورت ہے، مل جائے گا۔ اپنے فرائض بالکل اسی طرح، جس طرح تم نے اوسٹرلٹس، فریڈلانٹ[65]، وِتبسک اور سمولنسک میں ادا کیے تھے، بجا لاؤ۔ ایسے ایسے کارنامے سرانجام دو کہ آنے والی نسلیں بڑے فخر سے ان کا ذکر کیا کریں۔ خدا کرے کہ تم میں سے ہر ایک کے متعلق یہ کہا جایا کرے: 'اس شخص نے ماسکو کے دروازوں پر عظیم لڑائی میں حصہ لیا تھا۔'

''ماسکو...'' نپولین نے دہرایا۔ اس نے موسیو ڈبوسے کو، جو سفر کا اتنا شوقین تھا، اپنے ساتھ چلنے کی دعوت دی۔ وہ خود اٹھا اور ادھر جدھر گھوڑے کھڑے تھے اور جن پر زینیں کسی جا چکی تھیں، قدم بڑھانے لگا۔

''یور مجسٹی، آپ بے حد شفیق اور کریم ہیں!'' امپراطور نے ڈبوسے کو اپنے ساتھ چلنے کی جو دعوت دی تھی، اس نے اس کے جواب میں کہا۔ یہ الگ بات ہے کہ نیند سے اس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں اور وہ سونا چاہتا تھا۔ اسے ڈھنگ سے سواری کرنا بھی نہیں آتا تھا اور ویسے گھوڑوں سے اس کی جان جاتی تھی۔

لیکن نپولین مسافر کو سر سے اشارہ کر چکا تھا اور ڈبوسے کو مجبوراً گھوڑے پر سوار ہونا پڑا۔ جب نپولین خیمے سے باہر آیا، اس کے بیٹے کی تصویر کے سامنے گارد کے نعرے اور بھی بلند ہو گئے۔

''اسے اٹھا کر لے جاؤ'' اس نے شاہانہ وقار سے تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ابھی اس کی عمر اتنی چھوٹی ہے کہ اسے میدان جنگ کی ہوا نہیں لگنا چاہیے۔''

ڈبوسے نے گہری سانس لی، آنکھیں بند کیں اور اپنا سر جھکا دیا۔ یہ اس امر کی علامت تھی کہ وہ امپراطور

* امپراطور زندہ باد! شاہ روم زندہ باد! امپراطور زندہ باد!

کے الفاظ سمجھتا ہے اور ان کا احترام کرتا ہے۔

27

نپولین کے مورخین کے مطابق اس نے 25 اگست کا سارا دن گھوڑے کی پشت پر گزارا۔ وہ علاقے کا معائنہ اور اس کے مارشلوں نے اسے جو منصوبے پیش کیے تھے، ان کا مطالعہ کرتا رہا اور ذاتی طور پر جرنیلوں کو احکام دیتا رہا۔

روسیوں نے دریائے کالوچا کے ساتھ ساتھ اپنی فوجوں کو جس انداز سے ترتیب دیا تھا، چوبیس تاریخ کو شیواردینو کا مورچہ ہاتھ سے نکل جانے کے بعد اس میں رخنہ پیدا ہو گیا تھا اور فوج کا کچھ حصہ۔ میسرہ۔ پیچھے ہٹا لیا گیا تھا۔ کچھ علاقے میں مورچے اور دمدمے تعمیر نہیں کیے جا سکے تھے اور نہ وہاں دریا کی آڑ میسر تھی۔ دوسرے علاقوں کی نسبت وہاں زمین زیادہ کھلی اور ہموار تھی۔ فوجی اور غیر فوجی، ہر شخص پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ فرانسیسی حملے کا زور اسی علاقے میں ہونا چاہیے۔ آدمی کے دل میں یہی خیال آتا ہے کہ اس نتیجے پر پہنچنے کے لیے امپراطور اور اس کے مارشلوں کو نہ کوئی خاص سوچ بچار کرنے اور نہ کوئی خاص کوشش یا تردد کرنے کی ضرورت تھی۔ اور رہی وہ مخصوص اور بلند ذہنی صلاحیت، جسے جینئس (genius) کہا جاتا ہے اور جسے لوگ نپولین سے منسوب کرنے کی طرف مائل رہتے ہیں، اس کی تو قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اس کے باوجود ان مورخین نے، جنھوں نے اس واقعے کو بیان کیا، ان لوگوں نے، جنھوں نے اس وقت اس کے اردگرد گھیرا ڈال رکھا تھا اور اس نے خود بھی قطعی مختلف انداز سے سوچا۔

نپولین نے گھوڑے پر پھر میدان کا چکر لگایا، عمیق سوچ بچار کے ساتھ علاقے کا جائزہ لیا۔ کبھی وہ شک اور کبھی پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر کو جنبش دیتا۔ اپنے فیصلوں پر پہنچنے کے لیے اس نے دل ہی دل میں جو استدلال کے زبردست انبار لگائے تھے، اس نے اپنے جرنیلوں کو، جو اس کے ہم رکاب تھے، ان کے متعلق کچھ نہ بتایا۔ اس نے بس احکام کی صورت میں انھیں اپنے فیصلوں سے آگاہ کر دیا۔ جب داؤو نے، جسے اب پرنس آف ایک موہل کہا جاتا تھا، تجویز پیش کی کہ روسیوں کے میسرے کو الٹ پلٹ دیا جائے، نپولین نے جواب دیا: "نہیں، ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔" لیکن اس نے یہ نہ بتایا کہ ایسا کیوں نہ کیا جائے۔ اس کے برعکس جب جنرل کومپاں (Compans) نے، جسے "تیر نما" دمدموں پر حملہ کرنا تھا، بتایا کہ وہ اپنا ڈویژن جنگل میں سے گزار کر لے جائے گا، حالانکہ ڈیوک آف ایلچانگاں[66] نے دبی دبی زبان سے کہا بھی کہ اس طرح جنگل میں سے گزرنا خواہ مخواہ خطرات مول لینے کے مترادف ہے اور اس سے فوجوں کی ترتیب میں رخنہ پڑ سکتا ہے، نپولین نے اس کے منصوبے کو منظور کر لیا۔

شیواردینو کے مورچے کے سامنے علاقے کا معائنہ کرنے کے بعد نپولین کچھ دیر ساکت وصامت غور وفکر کرتا رہا۔ پھر اس نے دو مقامات کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اگلے روز روسی مورچوں پر بم باری کرنے کے لیے وہاں دو بیٹریاں تعینات کر دی جائیں اور اس نے ان کی سیدھ میں ان جگہوں کی بھی، جہاں فیلڈ آرٹلری

نصب کیا جانا تھا، نشان دہی کر دی۔

یہ اور دوسرے احکام صادر کرنے کے بعد وہ اپنے خیمے میں واپس آ گیا اور لڑائی میں فوج کو جس طرح ترتیب دیا جانا تھا، اسے اسی طرح تحریر کیا گیا جس طرح کہ اس نے لکھوایا۔

یہ ترتیب، جس کا ذکر فرانسیسی مورخین فرطِ مسرت سے جھوم جھوم کر اور دوسرے انتہائی احترام سے کرتے ہیں، مندرجہ ذیل تھی:

پو پھٹنے پر دو نئے توپ خانے (آرٹلری)، جو رات کے دوران میں پرنس آف ایک موہل کے زیر قبضہ میدان میں نصب کیے جائیں گے، بخالف سمت میں غنیم کے دو توپ خانوں پر گولہ باری کریں گے۔

اسی وقت پہلی کور کے توپ خانے کا کمانڈر جنرل پغنیتی، جنرل کومپاں کی ڈویژن کی تیس گجنالوں، جنرل دیسے (Desaix) اور جنرل فغیاں (Friant) کی ڈویژنوں کی تمام ہووٹزروں (howitzers) کو لے کر آگے بڑھے گا، فائرنگ کھولے گا اور غنیم کے توپ خانے (بیٹری) پر گولے برسانے لگے گا۔ یوں دشمن کی اس بیٹری کے خلاف حملے میں مندرجہ ذیل مصروفِ کار ہوں گی۔

گارڈز کی آرٹلری کی چوبیس توپیں

کومپاں کی ڈویژن کی تیس توپیں

فغیاں اور دیسے کی ڈویژنوں کی آٹھ توپیں

کل تعداد: باسٹھ توپیں

تیسری کور کی آرٹلری کا کمانڈر جنرل فوشے (Fouche) تیسری اور آٹھویں کور کی ہووٹزریں، جن کی تعداد سولہ بنی ہے، اس بیٹری کے، جس نے بائیں بازو کے مورچوں اور دمدموں پر گولہ باری کرنا ہے، پہلوؤں پر نصب کرے گا۔ یوں اس بیٹری میں چالیس توپیں اور ہووٹزریں شامل ہو جائیں گی۔

جنرل سوغبیئے (Sorbier) پوری طرح تیار ہوگا اور جونہی حکم نامہ کا پہلا لفظ اس کے کانوں تک پہنچا، وہ گارڈز کی آرٹلری کی تمام ہووٹزروں کے ساتھ غنیم کے مورچوں اور دمدموں کی کسی ایک قطار پر چڑھائی کر دے گا۔

گولہ باری کے دوران میں پرنس پونیاتوسکی[67] جنگل میں سے گزرتا گاؤں کی طرف پیش قدمی کرے گا اور غنیم کی پوزیشن کو تہس نہس کر دے گا۔

جنرل کومپاں جنگل میں سے آئے گا اور مورچے نمبر 1 پر قبضہ کرلے گا۔

کارروائی کا آغاز مندرجہ بالا خطوط پر ہوگا، بعدازاں غنیم کی حرکات وسکنات کے مطابق مزید احکام جاری کیے جائیں گے۔

جونہی میمنے کی توپوں کی آواز سنائی دے گی، میسرے کی توپیں گولے برسانا شروع کردیں گے۔ موغاں (Morand) کی ڈویژن اور وائسرائے[68] کی ڈویژن کے ماہر نشانچی جونہی یہ دیکھیں گے کہ میمنے کا حملہ شروع ہوگیا ہے، وہ زبردست فائرنگ کرنے لگیں گے۔

وائسرائے گاؤں[69] پر قبضہ کرے گا، اس کے تین پلوں پر اپنی سپاہ گزارے گا اور جس پہاڑی پر موغاں اور ییغاغ (Gerard) کے ڈویژن تعینات ہیں، وہاں تک پیش قدمی کرے گا اور پھر یہ سب اس کی کمان میں مورچے کی طرف بڑھیں گے اور فوج کے باقی دستوں کے برابر صف بندی کرلیں گے۔

اور یہ سب کچھ نظم وضبط سے کیا جائے اور جہاں تک ممکن ہو، دستوں کو خواہ مخواہ لڑائی میں نہ جھونکا جائے بلکہ انھیں بطور محفوظ روکے رکھا جائے۔

شاہی کیمپ نزد موژیسک
چھ ستمبر 1812[70]

اگر آدمی نپولین کی عبقریت سے مرعوب نہ ہو تو فوجوں کی یہ تقسیم وترتیب انتہائی ژولیدہ اور گنجلک نظر آئے گی۔ یہ ترتیب چار نکات یا چار احکام پر مشتمل تھی۔ ان میں سے کسی ایک پر بھی نہ تو عمل ہوا اور نہ ہوسکتا تھا۔

اس تقسیم وترتیب میں یہ کہا گیا کہ

نمبر 1: نپولین کے منتخب کردہ مقامات پر جو بیٹریاں نصب کی جانا تھیں، ان کے برابر بالکل سیدھ میں پغنیتی اور فوشے نے اپنی توپیں گاڑنا تھیں۔ ان تمام توپوں کی کل تعداد ایک سو دو بنتی تھی۔ ان سب نے روسیوں کے 'تیرنما' دمدموں پر گولی باری کرنا تھا۔ ایسا نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ نپولین نے جو مقامات منتخب کیے تھے، وہاں سے گولے روسیوں کے دمدموں تک پہنچ ہی نہیں سکتے تھے اور یوں ایک سو دو توپوں سے جو گولہ باری کی گئی وہ بیکار ثابت ہوئی۔ وہ موثر تبھی بنیں جب نزدیک تریں کمانڈر نے انھیں نپولین کے احکام کے علی الرغم آگے بڑھادیا۔

حکم نمبر 2 یہ تھا کہ پونیاتوسکی جنگل میں سے گزرتا گاؤں کی جانب پیش قدمی کرے گا اور روسیوں کے میسرے کو تہس نہس کردے گا۔ ایسا نہ ہوسکتا تھا اور نہ ہوا کیونکہ جب پونیاتوسکی جنگل میں سے گزرتا گاؤں کی جانب پیش قدمی کرنے لگا، اس کا سامنا تچ کوف سے ہوگیا۔ روسی جرنیل نے اس کا راستہ روک لیا۔ یوں وہ روسی پوزیشن کو تہس نہس نہیں کرسکتا تھا اور نہ وہ اس سے ہوئی۔

حکم نمبر 3 کے مطابق جنرل کومپاں نے جنگل میں سے گزر کر نمبر ایک مورچے پر قبضہ کرنا تھا۔ جنرل کومپاں اس مورچے پر قابض نہ ہوسکا بلکہ اسے پیچھے دھکیل دیا گیا کیونکہ جب وہ جنگل سے باہر آیا، اسے گریپ شاٹ فائرنگ کا سامنا کرنا پڑا اور اسے از سرنو اپنی صفیں ترتیب دینا پڑیں۔ نپولین کو اس بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔

حکم نمبر 4 میں یہ کہا گیا تھا کہ وائسرائے گاؤں پر قبضہ کرے گا، اس کے تینوں پلوں پر سے اپنی سپاہ گزارے گا اور اس حد تک پہاڑی پر پیش قدمی کرے گا کہ وہ موغاں اور ییغاغ (جن کی حرکات وسکنات کے بارے میں کوئی ہدایات نہیں دی گئی تھیں) کے ڈویژنوں کی سیدھ میں آجائے۔ پھر یہ تمام ڈویژن اس کی زیر قیادت رلیف سکی مورچے پر حملہ کریں گے اور باقی لشکر کی سیدھ میں آجائیں گے۔

جہاں تک آدمی کا دماغ کام کرتا ہے، جو بات سمجھ میں آتی ہے — یہ بات گنجلک عبارت سے اتنی واضح نہیں ہوتی جتنی ان کوششوں سے ہوتی ہے جو وائسرائے نے ان احکام کی، جو اسے ملے تھے، تعمیل میں کی تھیں — وہ یہ ہے کہ وائسرائے کو بائیں طرف سے گاؤں میں سے گزر کر (شیوار دینو کے) مورچے تک پہنچنا تھا جبکہ موغاں اور ییغاغ کو بیک وقت محاذ سے پیش قدمی کرنا تھی۔

تقسیم وترتیب کے دوسرے نکات کی طرح اس پر بھی نہ عمل ہوسکتا تھا اور نہ ہوا۔ وائسرائے بارودینو میں سے تو گزر گیا، لیکن وہاں سے اسے دریائے کالوچا تک پیچھے دھکیل دیا گیا اور وہ پیش قدمی نہ کرسکا۔ موغاں اور ییغاغ کے ڈویژن بھی مورچے پر قبضہ نہ کرسکے بلکہ انھیں پسپا کردیا گیا۔ رلیف سکی مورچے پر صرف لڑائی کے بالکل آخر میں قبضہ نہ ہوسکا اور وہ بھی گھڑسوار دستے نے کیا۔ (اس حملے کے بارے میں نپولین نے غالباً نہ تو کچھ سوچا تھا اور نہ اس کے متعلق اسے کوئی اطلاع ملی۔) چنانچہ تقسیم وترتیب کے کسی بھی حکم پر نہ تو عمل ہوا اور نہ ہوسکتا تھا۔ تقسیم وترتیب کے اعلان میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ کارروائی کا آغاز مندرجہ بالا خطوط پر ہوگا، بعدازاں غنیم کی حرکات وسکنات کے مطابق مزید احکام جاری کیے جائیں گے۔ اس سے شاید یہ نتیجہ اخذ کرلیا جائے کہ لڑائی کے دوران میں تمام اقدامات نپولین ہی نے کرنا تھے لیکن ایسا نہیں ہوا اور نہ ہوسکتا تھا کیونکہ لڑائی کے سارے عرصے کے دوران میں نپولین اتنا دور تھا کہ (جیسا کہ بعدازاں معلوم ہوا) اسے یہ علم ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ لڑائی کیا رخ اختیار کرے گی اور معرکے کے دوران میں اس کے ایک حکم کی بھی تعمیل نہ ہوسکی۔

28

متعدد مورخین دعویٰ کرتے ہیں کہ فرانسیسی بارودینو کی لڑائی جیتنے میں اس لیے ناکام رہے کیونکہ نپولین کو زکام ہوگیا تھا اور اگر اسے زکام نہ ہوا ہوتا، اس نے لڑائی سے قبل اور لڑائی کے دوران میں جو احکام دیے، ان سے اس کی

* بعد میں یہ مورچہ (redoubt) رلیف سکی مورچے کے نام سے مشہور ہوا۔ اسی حصے کے باب نمبر 23 کا پہلا پیرا اور باب نمبر 31 کا درمیانی حصہ دیکھیں۔ فرانسیسیوں نے بعد میں اس کا نام la fatale redoute (خونی مورچہ) رکھا۔ (مترجم)

عبقریت کا مزید ثبوت فراہم ہوتا، روس کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی اور دنیا کا نقشہ زیروزبر ہو جاتا۔ وہ مورخین، جو اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ روس نے جو شکل وصورت اختیار کی ہے، وہ فرد واحد — پیٹر اعظم[71] — کے منشاء ومرضی کے مرہون منت ہے اور وہ، جن کا ایمان یہ ہے کہ فرانس کی یہ جو کایا کلپ ہوئی کہ وہ ری پبلک (جمہوریہ) سے امپراطور بن گیا اور فرانسیسی افواج (ماردھاڑ کرتی) روس میں داخل ہو گئیں، اس کا سبب بھی فرد واحد — نپولین — ہی تھا، انھیں یہ دلیل کہ روس اس لیے نیست ونابود نہیں ہوا بلکہ طاقت کے طور پر موجود رہا کیونکہ نپولین کو 26 اگست کو زکام ہو گیا تھا، منطقی اور قابل یقین نظر آئے گی۔

اگر بارودینو میں لڑائی کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار نپولین کی مرضی پر ہوتا اور اگر اس بات کا انحصار کہ وہ یہ حکم دے یا وہ، اس کے منشا پر ہوتا، پھر یہ امر بالکل واضح ہو جائے گا کہ وہ زکام، جو اس کے منشا کے اظہار پر اثرانداز ہوا، غالباً روس کی نجات کا سبب بن جاتا ہے اور نتیجتاً اس کا وہ خدمت گار، جو چوبیس تاریخ کو اس کے واٹر پروف بوٹ لانا بھول گیا تھا، روس کا نجات دہندہ قرار پاتا ہے۔ اس طرز استدلال کے مطابق اس قسم کا استنباط اسی طرح غیر متنازعہ فیہ ٹھہرتا ہے جس طرح والتیر کا یہ استخراج، جو اس نے مذاق میں وضع کیا تھا (یہ جانے بغیر کہ وہ مذاق کر رہا ہے)، کہ سینٹ بارتھولومیو[72] کے یوم پر جو قتل عام[73] ہوا تھا، اس لیے ہوا تھا کہ کیونکہ اس روز چارلس نہم[74] کو بدہضمی ہو گئی تھی۔ لیکن وہ لوگ، جو یہ نہیں مانتے کہ روس کی تشکیل ایک شخص — پیٹر اعظم — کی مرضی سے عمل میں آئی تھی یا یہ کہ فرانسیسی امپراطوریہ کی تخلیق اور روس کے ساتھ جنگ کا آغاز ایک شخص — نپولین — کے ہاتھوں ہوا تھا، انھیں یہ استدلال نہ صرف بودا بلکہ انسانی فطرت کے سراسر خلاف معلوم ہوتا ہے۔ اس سوال کا کہ تاریخی واقعات کا کون موجب بنتا ہے، ایک اور جواب ہمارے سامنے آتا ہے۔ دنیوی واقعات کیا رخ اختیار کریں گے، اس جواب کے مطابق اس کا تعین عالم بالا میں ہو چکا ہے اور اس کا انحصار ان لوگوں کے، جو ان واقعات کی تشکیل میں حصہ لیتے ہیں، مشترکہ منشا پر ہوتا ہے۔ نپولین جیسے لوگ ان واقعات کا رخ متعین کرنے میں جو کردار ادا کرتے ہیں، وہ خالصتاً سطحی اور خیالی ہوتا ہے۔

پہلی نظر میں یہ مفروضہ خواہ کتنا ہی عجیب کیوں نظر نہ آئے کہ سینٹ بارتھولومیو کے یوم پر جو قتل عام ہوا، اس میں چارلس نہم کی مرضی کا کوئی دخل نہیں تھا، حالانکہ اس کا حکم اسی نے دیا تھا اور اس کا خود بھی یہی خیال تھا، کہ یہ محض اس کے حکم پر ہوا، اور یہ مفروضہ بھی کہ بارودینو کے میدان میں اسی ہزار انسانوں کا جو قتل ہوا، وہ نپولین کے منشا پر نہیں ہوا حالانکہ لڑائی کا حکم بھی اسی نے دیا تھا اور یہ کس طرح لڑی جانا تھی، اس کا منصوبہ بھی اسی نے بنایا تھا، خواہ کتنا ہی عجیب کیوں نظر نہ آئے، انسانی عزوشرف، جو مجھے بتاتا ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اگر عظیم نپولین سے بڑے درجے کا نہیں تو کم ازکم اس سے کم تر درجے کا انسان بھی نہیں ہے، یہ تقاضا کرتا ہے کہ مسئلے کا یہ حل تسلیم کر لیا جائے اور تاریخی تحقیق اس کی وافر مقدار میں تصدیق کرتی ہے۔

بارودینو کی لڑائی میں نپولین نے نہ تو کسی شخص پر گولی چلائی اور نہ کسی کو ہلاک کیا۔ یہ سب کچھ عسکریوں نے

کیا۔ چنانچہ قتل وغارت اس کے ہاتھوں نہیں ہوئی۔

بارودینو میں فرانسیسی فوج اس لیے روسی فوجیوں کو ہلاک کرنے اور ان کے ہاتھوں ہلاک ہونے نہیں گئے تھے کیونکہ انھیں اس کا حکم نپولین نے دیا تھا بلکہ اس میں ان کی اپنی مرضی کا دخل تھا۔ ان کی نظریں جب اس فوج پر، جو ان کے ماسکو کے راستے میں دیوار بن گئی تھی، پڑیں، وہ۔۔ فرانسیسی سپاہی، جن میں فرانسیسی ہی نہیں، اطالوی، جرمن اور پولستانی بھی شامل تھے۔۔۔ جو بھوک سے نڈھال ہو چکے تھے، جن کے لباس تار تار ہو رہے تھے اور جن کا جنگوں نے بھرکس نکال دیا تھا، محسوس کرنے لگے کہ شراب کی بوتل کھل چکی ہے اور اب اسے لازماً پیا جانا چاہیے۔ اگر اس وقت نپولین انھیں روسیوں سے لڑنے سے منع کرتا، تو وہ اسے ہلاک کر دیتے اور خود روسیوں کے خلاف نبرد آزما ہو جاتے کیونکہ اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار تھا ہی نہیں۔

اور جب انھوں نے نپولین کا اعلان سنا جس میں اس نے انھیں یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ میدان جنگ میں جو قتل وغارت کریں گے، اس کا معاوضہ انھیں یوں ملے گا کہ آئندہ نسلیں انھیں یہ خراج تحسین پیش کریں گی کہ یہ شخص جنگِ ماسکو میں شریک تھا، وہ اسی طرح "Vive l' Empereurl" کے نعرے بلند کرنے لگے جس طرح انھوں نے اس کے بیٹے کی تصویر، جس میں اسے کرۂ ارض پر چھید کر کے اسے کھلونا نما چھڑی پر چڑھاتے ہوئے دکھایا گیا تھا، دیکھ کر لگائے تھے اور جس طرح وہ ہر اس بے سروپا اور بے تکی بات پر، جو انھیں بتائی جاتی، اس قسم کے نعروں سے اپنے گلے پھاڑ لیتے۔ اب ان کے پاس رہ بھی کیا گیا تھا سوائے اس کے کہ وہ چیخ چیخ کر "Vive l' Empereur!" کے نعرے لگائیں، میدان جنگ میں کودیں اور لڑیں تا کہ انھیں ماسکو میں خوراک مل سکے اور وہ فاتحین کی طرح وہاں آرام کر سکیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے ساتھی انسانوں کو جو قتل کیا، وہ نپولین کے احکام پر نہیں کیا۔

اور جس نے جنگ کا رخ متعین کیا، وہ نپولین نہیں تھا کیونکہ اس کے تو کسی حکم کی تعمیل ہی نہیں ہوئی تھی اور لڑائی کے دوران میں اسے یہ بالکل معلوم نہیں تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے کیا ہو رہا ہے۔ چنانچہ جس طریقے سے ان لوگوں نے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارا، اس کا فیصلہ نپولین کے منشا مطابق نہیں ہوا تھا بلکہ اس کی مرضی سے ماورا، ان ہزاروں اشخاص کی، جو اس مشترکہ کارروائی میں شریک تھے، مرضیوں کے مطابق متعین ہوا۔ نپولین کو صرف محسوس یہ ہو رہا تھا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اس کی مرضی سے ہو رہا ہے۔ چنانچہ اس سوال کی کہ اسے زکام ہوا تھا یا نہیں، تاریخی اعتبار سے اسی طرح کوئی اہمیت نہیں جس طرح بار برداری کے دستوں کے کسی ادنیٰ ترین سپاہی کے زکام کی نہیں۔

نپولین کو 26 اگست کو جو زکام ہوا تھا، اس کی اہمیت یوں بھی اس لیے کم ہو جاتی ہے کہ جن مختلف مصنفین نے جو یہ دعاوی کیے ہیں کہ اس نے بحالتِ زکام جس طرح اپنی فوجوں کو ترتیب دیا اور لڑائی کے دوران میں اس نے جو احکام دیے، وہ اس کے اس سے پہلے کے طریق کار سے لگا نہیں کھاتے، بالکل غلط ہیں۔

یہ تقسیم و ترتیب، جس کا اوپر حوالہ دیا گیا ہے، اس کی سابقہ صف بندیوں سے، جنھوں نے اسے فتوحات

طالسطائی کا اپنے ہاتھ کا بنایا ہوا نقشہ

R. Moskva
Maloe
Novoe
Bezzubovo
R. Voyna
Zakharino
to Moscow
Borodino
Gorki
Dvor
Svyyagino
Tatarinovo
Knyazkovo
High Road from Smolensk
Raevsky Redoubt
Psarevo
Valuevo
Alexinka
Streamlet
R. Kalocha
Semenovsk
Shevardino
Kamenka
from Smolensk to Moscow
Shevardino Redoubt
Doronino
Old Road
Utitsa
Mishina

	Proposed	Actual
Russian Position		
French Position		

بارودینو

دلائی تھیں، کسی لحاظ سے بھی فروتر نہیں ہے بلکہ حقیقتاً ان سے برتر ہے۔ لڑائی کے دوران میں اس نے جو مفروضہ احکام دیے، وہ اس کے سابقہ مواقع کے احکام سے بدتر نہیں تھے بلکہ مخصوص اعتبار سے اس کی شخصیت کے آئینہ دار تھے۔ وہ بدتر اس لیے نظر آتے ہیں کیونکہ بارودینو کی لڑائی پہلی لڑائی ہے جس میں نپولین فتح سے ہم کنار ہونے میں ناکام رہا۔ ایسی تمام صف بندیاں اور احکام، جو چاہے کتنے ہی بہترین ہوں اور جن پر چاہے کتنا ہی غور و فکر کیا گیا ہو، اگر فتح پر منتج نہ ہوں، گھٹیا معلوم ہونے لگتے ہیں اور ہر فوجی ماہر بر خود غلط انداز سے ان پر تنقید کر سکتا ہے۔ ایسے ہی اگر بدترین صف بندیاں اور احکام فتح کا سبب بنیں، وہ نہایت عمدہ معلوم ہونے لگتے ہیں اور ان کی خوبیاں ثابت کرنے کے لیے سنجیدہ اور پڑھے لکھے اشخاص کتابوں پر کتابیں لکھ مارتے ہیں۔

اوسٹرلٹس کی لڑائی کے لیے وے روٹر نے افواج کی تقسیم و ترتیب کا جو منصوبہ وضع کیا تھا، وہ اپنی نوعیت کا کامل نمونہ تھا لیکن پھر بھی اس پر نکتہ چینی ہوئی — اس پر نکتہ چینی اس لیے ہوئی کیونکہ یہ ہر لحاظ سے کامل تھا، اس میں معمولی سے معمولی جزئیات کا ضرورت سے زیادہ خیال رکھا گیا تھا۔

بارودینو میں اختیار و اقتدار کے نمائندے کی حیثیت سے نپولین نے اپنا کردار اسی خوش اسلوبی سے نبھایا جس طرح وہ دوسری لڑائیوں میں نبھاتا رہا تھا بلکہ یہاں اس کی کارکردگی پہلے کی نسبت کچھ بہتر ہی تھی اس نے جنگ کی پیش رفت میں کسی قسم کا رخنہ نہیں ڈالا، وہ نسبتاً معقول استدلال کرنے پر راغب تھا۔ وہ کسی قسم کے الجھاؤ میں گرفتار نہیں ہوا، اس نے کوئی متضاد طرزِ عمل اختیار نہیں کیا، وہ گھبرایا یا گڑبڑایا نہیں اور نہ اس نے میدان جنگ سے فرار حاصل کرنا چاہا بلکہ اس نے اپنی بے عیب قوت فیصلہ اور عظیم عسکری تجربے کو بروئے کار لا کر کامل سکون اور پوری اہلیت سے اپنا کردار ادا کیا کہ بظاہر یہی تاثر دیا کہ اصل کمان اسی کے ہاتھ میں ہے۔

29

صفوں کا دوسری مرتبہ نہایت احتیاط سے جائزہ لینے کے بعد نپولین نے کہا:

"شطرنج کے مہرے سج گئے ہیں، کل کھیل شروع ہو جائے گا۔"

اس نے پنچ[75] پیش کرنے کا حکم دیا اور ڈبوسے کو بلا بھیجا۔ وہ اس کے ساتھ پیرس کے متعلق گفتگو کرنے اور اسے ان بعض تبدیلیوں کے، جو وہ امپراطورہ کے محل میں کرنا چاہتا تھا، بارے میں آگاہ کرنے لگا۔ اس نے دربار کی باریک سے باریک تفصیل یاد رکھنے کی جس صلاحیت کا مظاہرہ کیا، اس پر منتظمِ قصر بھی ششدر رہ گیا۔

اس نے معمولی معمولی باتوں میں دلچسپی کا اظہار کیا، ڈبوسے کے شوقِ سفر کا مذاق اڑایا اور وہ یوں گپ شپ لگا رہا تھا جیسے کوئی مشہور و معروف، پراعتماد اور تجربے کار سرجن اپنی آستینیں چڑھاتے اور ایپرن پہنتے لگا تا ہے جبکہ مریض آپریشن ٹیبل پر جکڑا جا رہا ہوتا ہے۔ "ہر چیز میری دسترس میں ہے، میرا ذہن بالکل صاف ہے، اس میں کسی قسم کا الجھاؤ نہیں اور جب کام کا مرحلہ آئے گا، میں اسے یوں سر انجام دوں گا کہ کوئی دوسرا کاہے کو دے سکے گا، لیکن فی الحال

میں پھکڑ بازی کرسکتا ہوں۔ میں جتنی زیادہ کھل کر پھکڑ بازی کروں گا، اتنا ہی زیادہ پرسکون محسوس کروں گا۔ میں جتنا زیادہ پرسکون ہوں گا، تمھیں اتنا ہی زیادہ اطمینان اور اعتماد ہوگا اور اتنا ہی زیادہ تمھیں میری عبقریت پر حیرت ہوگی۔''

نپولین نے پنچ کا دوسرا گلاس ختم کیا اور کارِ سنجیدہ سے، جو اس کے خیال کے مطابق اسے اگلے روز درپیش ہوگا، نپٹنے سے قبل آرام کرنے چلا گیا۔

جو کام اس کا منتظر تھا، وہ اس کے متعلق سوچ بچار میں اتنا مستغرق تھا کہ وہ سو نہ سکا، اور زکام کے باوجود، جو شام کی رطوبت کی وجہ سے مزید بگڑ گیا تھا، صبح تین بجے اٹھ کھڑا ہوا اور زور زور سے ناک سڑکتا اپنے خیمے کے بڑے کمپارٹمنٹ میں چلا گیا۔ وہاں اس نے دریافت کیا کہ کہیں روسی فوج پیچھے تو نہیں ہٹ گئی۔ اسے بتایا گیا کہ غنیم کی صف بندی یوں کی توں موجود ہے۔ اس نے پسندیدگی سے اپنے سر کو جنبش دی۔

ڈیوٹی پر مامور ایجوٹنٹ خیمے کے اندر آیا۔

''اچھا، غاپ، کیا خیال ہے آج ہمیں کامیابی ہوگی؟'' نپولین نے اس سے پوچھا۔

''عالی جاہ، اس میں شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں۔''

نپولین نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔

''عالی جاہ، آپ کا اپنا وہ جملہ، جو آپ نے سمولنسک میں میرے سامنے کہا تھا، یاد ہے؟'' غاپ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

''بوتلِ مے ناب کھل چکی ہے، اب اسے لازماً نوش کیا جانا چاہیے۔''

نپولین کی جبیں شکن آلود ہوگئی۔ وہ ہاتھ پر سر جھکائے کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔

''یہ بے چاری سپاہ،'' اس نے اچانک کہا۔ ''سمولنسک کی نسبت اس کی تعداد میں خاصی تخفیف ہوگئی ہے۔ غاپ، تقدیر چھٹی ہوئی فاحشہ ہے۔ میں نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور اب مجھے اس کا تجربہ ہونے لگا ہے۔ لیکن گارڈز، غاپ، گارڈز تو ٹھیک ٹھاک ہیں؟'' اس نے ٹٹول کر دریافت کیا۔

''عالی جاہ، بالکل۔''

نپولین نے کھانسی کی گولی نکالی، اسے منہ میں رکھا اور گھڑی پر نظر ڈالی۔ نیند اس سے کوسوں دور تھی اور صبح کا ابھی دور دور تک نشان نہیں تھا۔ مزید احکام بھی نہیں تھے کہ انھیں سمجھانے اور دینے میں ہی وقت کٹ جاتا کیونکہ وہ سب کے سب جاری کیے جا چکے تھے اور اب ان پر عمل ہو رہا تھا۔

''گارڈز کی رجمنٹوں میں بسکٹ اور چاول تقسیم کر دیے گئے ہیں؟'' اس نے درشتی سے پوچھا۔

''جی، عالی جاہ!''

''چاول بھی؟''

غاپ نے جواب دیا کہ وہ چاولوں کے متعلق امپراطور کا حکم پہنچا چکا ہے لیکن نپولین نے اپنا سر یوں غیر تسلی

بخش انداز سے ہلایا جیسا اسے شک ہو کہ اس کی ہدایات پر عمل ہوا بھی یا نہیں۔ ایک خدمت گار پنچ لے کر اندر حاضر ہوا۔ نپولین نے حکم دیا کہ ایک گلاس غاپ کے لیے بھی لایا جائے۔ خود اس نے خاموشی سے اپنے گلاس میں سے چند چسکیاں لیں۔

''مجھے نہ ذائقے کا احساس ہو رہا ہے اور نہ خوشبو کا'' اس نے اپنے گلاس کو سونگھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس نزلے سے تنگ آ چکا ہوں۔ وہ دوا کی باتیں کرتے ہیں لیکن ان کی دواؤں کا فائدہ؟ ان سے زکام کا علاج تو ہوتا نہیں۔ کوغ ویساغ نے مجھے کھانسی کی یہ گولیاں دی تھیں لیکن ان سے رتی برابر فائدہ نہیں ہوا۔ یہ ڈاکٹر کس مرض کی دوا ہیں؟ ان سے کسی چیز کا علاج نہیں ہوتا۔ ہمارا جسم زندہ رہنے کی مشین ہے۔ یہ اسی مقصد کے لیے بنا ہے اور یہی اس کی فطرت ہے۔ اس میں زندگی بلا روک ٹوک جاری رہنے دیں، یہ اپنا دفاع خود کر لے گا۔ اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، تو یہ اپنی لڑائیاں کہیں بہتر انداز سے لڑ سکے گا، بہ نسبت اس صورت کے کہ آپ اس میں ادویات ٹھونس ٹھونس کر بھرتے رہیں اور یوں اسے مفلوج کرتے رہیں۔ ہمارا جسم کسی بے عیب گھڑی کی، جو خاص مدت کے لیے بنائی جاتی ہے، مانند ہے۔ اگر گھڑی ساز کی آنکھوں پر پٹی بندھی ہو، وہ اسے کھول نہیں سکتا۔ ٹامک ٹوئیاں مار کر اسے محض آگے پیچھے کرسکتا ہے۔ میں نے کہا ہمارا جسم زندہ رہنے کی مشین ہے، بس باقی اللہ اللہ خیر سلاّ۔''

نپولین کو اشیا کی تعریف متعین کرنے کا بڑا چسکا تھا۔ وہ ایک دفعہ یہ کام شروع کر دیتا، پھر اسے نئی نئی باتیں سوجھنے لگتیں۔ اب بھی یہی ہوا۔ غیر متوقع طور پر اس کے ذہن میں نیا خیال آ گیا۔

''غاپ، تمھیں معلوم ہے کہ عسکری فن کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ ''یہ کسی مخصوص وقت میں غنیم سے مضبوط تر ہونے کا فن ہے۔ Vaoila tout*۔''

غاپ نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کل ہمیں کوتوزوف سے نپٹنا ہوگا۔'' نپولین نے کہا۔ ''دیکھ لیں گے! تمھیں یاد ہے کہ براؤناؤ میں فوج کی کمان اس کے ہاتھ میں تھی لیکن وہ مورچوں کا معائنہ کرنے کے لیے ایک مرتبہ بھی گھوڑے پر سوار نہیں ہوا تھا۔ اچھا، دیکھ لیں گے۔''

اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ چار بج چکے تھے لیکن اسے ابھی تک نیند کی خواہش محسوس نہیں ہوئی تھی۔ پنچ ختم ہو چکا تھا اور کرنے کو کچھ تھا نہیں۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے ادھر ادھر چند چکر لگائے، گرم اوورکوٹ پہنا، سر پر ہیٹ رکھا اور باہر نکل گیا۔ رات تاریک اور مرطوب تھی۔ بوندا باندی ہو رہی تھی لیکن اتنی ہلکی کہ بمشکل احساس ہو پاتا تھا۔ قریب ہی فرانسیسی گارڈز کے الاؤ خوب روشنی دے رہے تھے لیکن دور فاصلے پر روسیوں کے الاؤ دھوئیں میں محض ٹمٹما رہے تھے۔ ہر طرف سکوت طاری تھا اور فرانسیسی سپاہیوں کے، جو پہلے ہی اپنے اپنے مقام کی طرف رواں دواں تھے، قدموں کی چاپ اور ان کی وردیوں کی سرسراہٹ صاف سنائی دے رہی تھی۔

---

* اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔

نپولین اپنے خیمے کے سامنے ادھر ادھر گھومتا رہا۔ وہ روشن الاؤوں کو دیکھ رہا اور قدموں کی چاپ سن رہا تھا، اور جب وہ ایک سنتری کے، جو پشم دار ٹوپی پہنے اس کے خیمے کے سامنے پہرہ دے رہا تھا، اور جو نپولین کو دیکھ کرتن کر سیاہ مینار کی طرح سیدھا کھڑا ہو گیا تھا، قریب آیا، وہ اس کے روبرو رک گیا۔

''تم کس سال بھرتی ہوئے تھے؟'' اس کے اندازِ تکلم میں مصنوعی طور پر فوجیوں کا مخصوص اکھڑ پن بھی تھا اور گھلاوٹ بھی۔ وہ عام سپاہیوں سے ہمیشہ اسی لہجے میں بات کرتا تھا۔

اس شخص نے مناسب جواب دیا۔

''واہ، پرانے کھلاڑی ہو! تمھاری رجمنٹ کو چاول مل گئے تھے؟''

''جی ہاں، عالی جاہ!''

نپولین نے پسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر کو جنبش دی اور آگے چل پڑا۔

❦

ساڑھے پانچ بجے نپولین گھوڑے پر شیوار دینو گاؤں کی طرف روانہ ہو گیا۔

پو پھٹ رہی تھی اور اجالا پھیلنے لگا تھا۔ مشرق کی طرف آسمان پر واحد بادل ٹک رہا تھا۔ صبح کی دھندلی روشنی میں کیمپوں کے الاؤ اگرچہ جل رہے تھے لیکن وہ بجھنے کے قریب تھے۔ وہاں کوئی متنفس نہیں تھا۔

دائیں جانب واحد توپ کے گولہ داغے جانے کی آواز سنائی دی اور چاروں اطراف محیط خاموشی میں ڈوب گئی۔ کئی منٹ گزر گئے۔ دوسرے اور تیسرے دھماکے سے فضا لرز گئی۔ دائیں سمت کہیں قریب ہی سے چوتھی اور پانچویں توپ کی دھماکہ خیز صدائے بازگشت سنائی دی۔

ابتدائی گولوں کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ دوسری توپوں کے گولے اگلنے کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔ ان کی شدت میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور وہ ایک دوسرے میں مدغم ہو رہی تھیں۔

نپولین اور اس کا عملہ گھوڑوں پر سوار شیوار دینو کے مورچے کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں وہ نیچے اتر آیا۔ کھیل کا آغاز ہو چکا تھا۔

30

پرنس آندرے سے ملاقات کرنے کے بعد جب پیئر گورکی واپس آیا، اس نے اپنے سائیس کو حکم دیا کہ وہ گھوڑے تیار رکھے اور اسے علی الصبح جگا دے۔ پھر وہ فوراً ہی ایک کونے میں سکرین کے، جو بورس نے اسے دی تھی، پیچھے سو گیا۔

جب وہ اگلی صبح بیدار ہوا، ہر شخص جا چکا تھا اور جھونپڑا نما مکان خالی ڈھنڈار پڑا تھا۔ چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں کے پٹ کھڑکھڑا رہے تھے اور اس کا سائیس اس کے قریب اسے زور زور سے ہلا رہا تھا۔

''یورَ ایکسی لینسی! یورَ ایکسی لینسی! یورَ ایکسی لینسی!...'' سائیس مسلسل تکرار کیے اور پیئر کی طرف دیکھے بغیر زور زور سے اس کا کاندھا ہلائے جا رہا تھا جیسے اسے بالکل امید نہ رہی ہو کہ وہ اسے کبھی جگا سکے گا۔

''کیا؟ شروع ہو گئی؟ وقت آ گیا؟'' پیئر نیند میں بڑبڑایا۔

''جناب، دیکھیں تو سہی، فائرنگ شروع ہو چکی ہے۔ آوازیں سنائی دے رہی ہیں،'' سائیس نے کہا۔ وہ فوج میں رہ چکا تھا۔ ''تمام حضرات پہلے ہی جا چکے ہیں۔ اور ہز سیرین ہائی نس کو تشریف لے جائے تو مدتیں گزر چکی ہیں۔ وہ گھوڑے پر سوار تھے۔''

پیئر نے جھٹ پٹ کپڑے تبدیل کیے اور بھاگ کر پورچ میں چلا گیا۔ باہر فضا نکھری نکھری، تازہ اور شبنم آلود تھی۔ مطلع صاف اور روشن تھا۔ سورج ایک بادل کی نقاب، جس نے اسے ڈھانک رکھا تھا، پھاڑ کر ابھی ابھی برآمد ہوا تھا۔ اس کی کرنیں بادلوں میں شگاف بناتی، سامنے کے مکانوں کی چھتوں اور دیواروں، سڑک کی شبنم آلود گرد، چوبی باڑوں اور پیئر کے گھوڑوں پر، جو مکان کے سامنے کھڑے تھے، منعکس ہو رہی اور انھیں منور کر رہی تھیں۔ باہر کھلے آسمان تلے توپوں کی گھن گرج زیادہ واضح انداز سے سنائی دے رہی تھی۔ گھوڑے پر سوار ایک ایجوٹنٹ اپنے قازق کی معیت میں فراٹے بھرتا قریب سے گزر گیا، لیکن جاتے جاتے پیئر سے کہہ گیا: ''کاؤنٹ، وقت ہو گیا ہے! وقت ہو گیا ہے!''

پیئر نے اپنے سائیس کو حکم دیا کہ وہ گھوڑا لے کر اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے اور خود گلی میں پیدل چلتا اس ٹیلے کی طرف، جہاں سے اس نے گزشتہ روز میدان جنگ کا جائزہ لیا تھا، چل پڑا۔ وہاں فوجی افسروں کا ہجوم اکٹھا ہو چکا تھا اور پیئر نے سٹاف کے ارکان کو فرانسیسی میں باتیں کرتے سنا۔ اسے وہاں کوتوزوف بھی نظر آیا۔ اس نے اپنے سفید سر پر سفید ٹوپی، جس کے اردگرد سرخ فیتہ لگا ہوا تھا، پہنی ہوئی تھی اور اس کی گدی، جس پر سفید بال تھے، اس کے شانوں کے مابین جھکی ہوئی تھی۔ کوتوزوف دوربین میں سے سامنے شاہراہ پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔

جب پیئر ٹیلے کی چوٹی پر پہنچنے کے لیے قدمچے چڑھ رہا تھا، اس نے نگاہیں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ منظر اتنا حسین اور خوبصورت تھا کہ وہ مبہوت رہ گیا۔ یہ وہی وسیع و عریض منظر تھا جس کی اس نے گزشتہ روز تحسین کی تھی لیکن اب تاحد نظر سارے کا سارا علاقہ فوجیوں سے پٹا پڑا تھا اور توپوں سے جو دھواں نکل رہا تھا، اس نے اس پر چادر تان دی تھی۔ درخشندہ سورج کی، جو پیئر کے عقب میں قدرے بائیں جانب اوپر اٹھ رہا تھا، ترچھی کرنوں نے صاف شفاف صبح کو اپنی گلابی سنہری روشنی سے، جس میں کہیں کہیں سیاہ سایوں کی دھاریاں نظر آ رہی تھیں، ڈھانپ دیا تھا۔ دور کے جنگلات، جو اس لمبے چوڑے منظر کی حد بندی کر رہے تھے، یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے وہ زردی مائل سبز رنگ کے قیمتی پتھروں کو تراش کر وجود میں لائے گئے ہوں۔ اس کے لہراتے، بل کھاتے بیرونی خطوط میں، جن کی یک رخی شکل افق کے قریب نمودار ہو رہی تھی، والیوائے وو سے آگے سمولنسک شاہراہ نے، جہاں اس وقت فوج ہی فوج نظر آ رہے تھے، شگاف ڈال رکھا تھا۔ سامنے کی سرزمین میں اناج کی فصلوں کے سنہری کھیت اور درختوں کے جھنڈ جگمگا رہے تھے۔ سامنے، دائیں، بائیں، جدھر نگاہ اٹھتی، فوج ہی فوج دکھائی دیتے۔ سارا منظر

زندگی سے بھرپور تھا اور عظمت و جلال کا مرقع تھا۔ یہ کہ کبھی ایسا منظر دیکھنے کو ملے گا، اس کی توقع ہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ لیکن پیئر کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ بذات خود میدان جنگ، بارودینو اور دریائے کالوچا کے دونوں اطراف تنگ گھاٹیوں اور وادیوں کا، جن میں ندی نالے بہہ رہے تھے، منظر تھا۔

دریائے کالوچا، بارودینو اور اس کے دونوں اطراف کے اوپر — خاص طور پر بائیں ہاتھ جہاں ڈولنا ندی دلدلی زمین میں سے گزرتی دریائے کالوچا میں شامل ہوتی ہے — ہلکی دھند چھائی ہوئی تھی۔ جگمگاتی دھوپ میں یہ دھند پھیلتی، بکھرتی، پگھلتی اور روشن ہوتی جا رہی تھی۔ ہر وہ چیز، جو اس میں سے نظر آ رہی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ جادو کے زور سے رنگین ہوگئی ہے اور اس کے خدوخال واضح ہو گئے ہیں۔ توپوں کا دھواں اس دھند میں مدغم ہو رہا تھا۔ سارے زمینی منظر پر صبح کے سورج کی جگمگاتی کرنیں دھند اور دھوئیں میں سے گزرتی پانی، شبنم اور پیادہ فوج کی، جس کے دریا کے کناروں اور بارودینو میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے، سنگینوں کو تابدار بنا رہی تھیں۔ اس شفاف دھند میں ایک سفید کلیسا، اکا دکا مکانوں کی چھتیں، عسکریوں کے زبردست جمگھٹے، گولہ بارود کی سبز پیٹیاں اور توپیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ دھند اور دھواں مسلسل حرکت کر رہے تھے لیکن معلوم ہوتا تھا کہ ان کی کوئی منزل نہیں ہے۔ ان کے ساتھ ساتھ ہر چیز بھی یا تو حرکت کر رہی تھی یا حرکت کرتی نظر آ رہی تھی۔ جس طرح دھند نے بارودینو کے آس پاس گھاٹیوں اور وادیوں پر چادر تان رکھی تھی، بعینہٖ اس سے اوپر اور اس سے آگے، خاص طور پر بائیں طرف دور ہٹ کر، پورے محاذ کے ساتھ ساتھ جنگلوں، کھیتوں، وادیوں، بلند سطحوں اور پہاڑیوں کی چوٹیوں پر توپوں کے دھوئیں کے بادل یوں اوپر اٹھ رہے تھے کہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں سے آ رہے ہیں یا کس چیز سے نکل رہے ہیں۔ یہ بادل اکیلے اکیلے، کبھی ان کے پرے کے پرے، کبھی پتلے اور کبھی گھنے، دور دور تک پھیل رہے تھے، ہلکورے کھا رہے تھے، آپس میں گھل مل رہے تھے بھنور بنا رہے تھے اور نظروں سے اوجھل ہو رہے تھے۔

اگر یہ کہا جائے کہ منظر کی خوبصورتی اور زیبائی دھوئیں کے ان اٹھتے مرغولوں اور توپوں کی گھن گرج کی، جو ان کے ساتھ بلند ہو رہی تھی، رہینِ منت تھی، تو یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی لیکن حقیقت یہی تھی۔

''پھو!'' اچانک دھوئیں کا گولہ فضا میں بلند ہوا۔ اس کا رنگ بنفشی سے سرمئی اور سرمئی سے دودھیا سفید ہو گیا۔ ایک سیکنڈ بعد دھماکے کی دنادن سنائی دی۔

''پھو، پھو!'' دھوئیں کے دو اور بادل اوپر اٹھے، وہ ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرائے اور آپس میں مدغم ہو گئے۔ ساتھ ہی دنادن کی آوازیں سنائی دیں۔ یوں آنکھ نے جو کچھ دیکھا تھا، کانوں نے اس کی تصدیق کر دی۔

پیئر نے مڑ کر دھوئیں کے پہلے مرغولے کی جانب دیکھا۔ ایک ثانیہ قبل اس مرغولے کا دھواں گہرا اور ٹھوس گیند کی مانند تھا۔ اب اس کی جگہ دھوئیں کے غباروں نے لے لی تھی اور وہ ایک طرف ادھر ادھر آوارہ گھوم رہے تھے۔

اور ''پھو...!'' (وقفہ) ''پھو، پھو'' پہلے تین اور ان کے بعد چار مزید فضا میں بلند ہوئے۔ جب کوئی مرغولہ اوپر اٹھتا، اس کے جواب میں اتنے ہی وقفے کے بعد دنادن کی وہی ٹھوس، بالکل صحیح، پرشکوہ آواز سنائی دیتی! کبھی معلوم ہوتا

کہ دھوئیں کے یہ بادل سطح فلک پر صبار فتار بھاگ رہے ہیں اور کبھی یوں نظر آتا کہ وہ وہیں نقش ہو گئے ہیں جبکہ جنگل، کھیت اور جگمگاتی سنگینیں تیز رفتاری سے دوڑتی ان سے آگے نکل گئی ہیں۔ بائیں جانب کے کھیتوں اور جھاڑیوں پر دھوئیں کے یہ عظیم بادل مسلسل نمودار ہو رہے تھے اور ان کی جلو میں گھڑ، گھڑڑڑ، گھڑ، گھڑڑڑ کی ہیبت ناک آوازیں ابھر رہی تھیں جبکہ ان کے کہیں قریب ہی پہاڑیوں اور گھاٹیوں پر دستی بندوقوں کا حقیر دھواں اپنی بہار دکھانے کی کوشش ضرور کر رہا تھا، لیکن وہ گول گیند کا پیکر اختیار نہیں کر پا رہا تھا۔ تاہم ان بندوقوں کی نحیف و ناتواں دنادن ضرور سنائی دے جاتی تھی۔ ''تڑاق، تڑ، تڑ، تڑا، تڑاق!'' دستی بندوقیں دھڑا دھڑ چیخ رہی تھیں لیکن توپوں کی مترنم گونج کے مقابلے میں ان کی آواز خاصی مدھم بھی تھی اور آہنگ سے محروم بھی۔

پیئر کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس جگہ پہنچ جائے جہاں جگمگاتی سنگینیں اور توپیں تھیں، دھواں اٹھ رہا تھا، شور و غل ہو رہا تھا اور نقل و حرکت جاری تھی۔ اس نے کوتوزوف اور اس کے عملے کی جانب دیکھا۔ وہ اپنے تاثرات کا دوسروں کے تاثرات سے موازنہ کرنا چاہتا تھا۔ ان سب کا دھیان بھی میدان جنگ کی طرف تھا اور اسے خیال گزرا کہ ان کے جذبات و احساسات بھی بالکل وہی ہیں جو اس کے اپنے ہیں۔ ہر چہرہ جوش و خروش کی اس مخفی حرارت سے، جو اس نے گزشتہ روز دیکھی تھی اور جس کا مفہوم وہ پرنس آندرے کے ساتھ اپنی گفتگو کے دوران میں پوری طرح سمجھ چکا تھا، دمک رہا تھا۔

''مائی ڈیئر فیلو، جائیں، آپ جائیں، مسیح آپ کا حامی و ناصر ہو!'' کوتوزوف ایک جرنیل سے، جو اس کے قریب کھڑا تھا، کہہ رہا تھا لیکن اس کی نگاہیں میدان جنگ پر مرکوز تھیں۔

حکم ملنے کے بعد جرنیل پیئر کے برابر سے گزرتا ٹیلے سے نیچے اترنے لگا۔

''چوراہے کی طرف!'' جرنیل نے درشتی اور سرد مہری سے اس سٹاف افسر کو، جس نے اس سے دریافت کیا تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے، جواب دیا۔

''میں بھی، میں بھی ادھر ہی جاؤں گا!'' پیئر نے سوچا اور اسی سمت چل پڑا۔

جرنیل اپنے گھوڑے پر، جو اس کا قازق اس کے پاس لایا تھا، سوار ہو گیا۔ پیئر اپنے سائیس کی، جو اس کے گھوڑے تھامے کھڑا تھا، طرف بڑھا اور یہ دریافت کرنے کے بعد کہ ان میں سب سے نرم خو کون سا ہے، وہ اس پر چڑھ گیا۔ اس نے گھوڑی کی ایال مضبوطی سے پکڑی اور اپنی ایڑیوں سے اس کے پیٹ کو دبایا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا چشمہ ڈھلک رہا ہے لیکن وہ نہ ایال چھوڑ سکتا تھا اور نہ لگام، اور وہ جرنیل کے پیچھے سرپٹ بھاگنے لگا۔ اسے دیکھ کر سٹاف افسر مسکرانے لگے۔

31

پہاڑی کے دامن میں پہنچنے کے بعد جرنیل تیزی سے بائیں طرف مڑ گیا اور پیئر کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ پیئر

پیادہ بٹالین کی، جواس کے آگے آگے جا رہی تھی، صفوں میں جا گھسا۔ اس نے ان سے آگے نکلنے اور دائیں یا بائیں ہونے کی کوشش کی لیکن ہر جگہ فوجی ہی فوجی تھے۔ ان سب کے چہروں بشروں سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ گہری سوچ بچار میں مستغرق ہیں اور کوئی پراسرار لیکن بظاہر کوئی اہم کام سرانجام دینے کا تہیہ کیے ہوئے ہیں۔ وہ سب کے سب اس لحیم شحیم آدمی کو، جس نے سفید ہیٹ پہنا ہوا تھا اور جو کسی نامعلوم وجہ سے انھیں اپنی گھوڑی کے قدموں تلے کچلنے کے درپے دکھائی دیتا تھا، غصیلی اور قہر آلود نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''تم بٹالین کے عین درمیان میں کیوں گھوڑی دوڑائے پھر رہے ہو؟'' ایک شخص نے چلا کر اس سے پوچھا۔

دوسرے نے اپنی دستی بندوق کی سنگین کے سرے سے اس کی گھوڑی کو کچوکا دیا، پیئر، جو زین کی اگلی موٹھ پر سر جھکائے ہوئے تھا اور جسے اپنی گھوڑی کو روکنے میں سخت دقت پیش آ رہی تھی، ہوا سے باتیں کرتا سپاہیوں سے آگے سیدھا اس جگہ، جو خالی تھی، پہنچ گیا۔

اس کے آگے پل تھا۔ وہاں چند فوجی کھڑے تھے اور فائرنگ کر رہے تھے۔ پیئر ان کے قریب پہنچ گیا۔ اگرچہ اسے معلوم نہیں تھا لیکن وہ دریائے کالوچا کے اس پل پر، جو گورکی اور بارودینو کے مابین واقع تھا، پہنچ گیا تھا۔ لڑائی کے پہلے مرحلے میں فرانسیسی بارودینو پر قبضہ کرنے کے بعد اس (پل) پر حملہ کر رہے تھے۔ پیئر نے دیکھا کہ اس کے سامنے پل ہے اور وہاں چند سپاہی پل کے دونوں اطراف اور چراگاہ میں، تازہ تازہ کٹی ہوئی گھاس کے گٹھوں کی قطاروں کے مابین، جو اس نے گزشتہ روز دیکھی تھیں، دھوئیں میں کچھ کر رہے ہیں۔ حالانکہ وہاں مسلسل فائرنگ ہو رہی تھی، اسے قطعاً یہ خیال نہ آیا کہ وہ لڑائی کے عین مرکز میں پہنچ گیا ہے۔ اسے نہ ان گولیوں کی، جو چاروں اطراف سے سنسناتی گزر رہی تھیں اور نہ ان گولوں کی، جو اس کے سر کے اوپر ہی اوپر گزرتے جا رہے تھے، آوازیں سنائی دیں اور نہ اسے دریا کی دوسری جانب دشمن دکھائی دیا۔ کافی دیر بعد اسے چند زخمی اور ہلاک شدگان نظر آئے حالانکہ ان میں سے کئی ایک اس سے زیادہ دور نہیں گرے تھے۔ اس نے مسکرا کر اپنے گردوپیش دیکھا۔ اس کی یہ مسکراہٹ وہاں ہر دم اس کے چہرے پر رہی۔

''یہ شخص صفوں کے آگے کیا کر رہا ہے؟'' کسی نے چلا کر پوچھا۔

''بائیں طرف!... دائیں طرف ہٹ جاؤ!'' کوئی اسے با آواز بلند کچھ کہہ رہا تھا اور کوئی کچھ۔

پیئر دائیں طرف ہو گیا اور غیر متوقع طور پر اس کی مڈھ بھیڑ جنرل رایف سکی کے ایک ایجوٹنٹ سے ہو گئی۔ ایجوٹنٹ نے اس کی جانب یوں دیکھا جیسے وہ اسے کچا ہی چبا جائے گا۔ وہ اس پر برسنے ہی والا تھا کہ وہ اسے پہچان گیا اور اس نے گردن کو خم دے کر اسے سلام کیا۔

''آپ یہاں کیسے آ گئے؟'' اس نے پوچھا اور وہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے آگے بڑھ گیا۔

پیئر کو احساس ہوا کہ وہ غلط جگہ آ گیا ہے اور یہاں وہ کسی کام بھی نہیں آ سکتا۔ اسے یہ خوف ستانے لگا کہ وہ خواہ مخواہ دوسروں کی راہ کا روڑا بن گیا ہے۔ چنانچہ اس نے گھوڑی کو ایڑ لگائی اور بہ سرعت ایجوٹنٹ کے پیچھے بھاگنے لگا۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟ میں آپ کے ساتھ آ سکتا ہوں؟'' اس نے پوچھا۔

''ایک منٹ، صرف ایک منٹ،'' ایجوٹنٹ نے جواب میں کہا۔ وہ گھوڑا دوڑاتے ایک ہٹے کٹے کرنل کے، جو چراگاہ میں کھڑا تھا، پاس پہنچا۔ اس نے اسے کوئی پیغام دیا اور واپس پیئر کی طرف پلٹ آیا۔

''کاؤنٹ، آپ یہاں کیسے پہنچ گئے؟'' اس نے خندہ روئی سے پوچھا۔ ''ابھی تک ٹوہ لگاتے پھر رہے ہیں؟''

''بالکل، بالکل،'' پیئر نے جواب دیا۔

لیکن ایجوٹنٹ نے اپنا گھوڑا گھمایا اور آگے چلنے لگا۔

''یہاں صورت حال اتنی خراب نہیں،'' ایجوٹنٹ نے خیال ظاہر کیا۔ ''لیکن بائیں طرف، جہاں باگ راتیاں ہیں، گھمسان کا رن پڑ رہا ہے!''

''واقعی؟'' پیئر نے کہا۔ ''کہاں؟''

''تو آئیں میرے ساتھ، ہمارے ٹیلے پر چلتے ہیں۔ وہاں سے ہمیں سارا منظر نظر آ سکتا ہے۔ ہماری بیٹری کی حالت ابھی اتنی مخدوش نہیں ہوئی،'' ایجوٹنٹ نے کہا۔ ''چلیں گے؟''

''بالکل، میں آپ کا ضرور ساتھ دوں گا،'' پیئر نے اپنے سائیس کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہیں گھماتے ہوئے کہا۔

صرف اب، پہلی مرتبہ، پیئر کی نظر صحیح معنوں میں زخمی اشخاص پر پڑی۔ وہ یا تو بری طرح لڑکھڑاتے، ڈگمگاتے، خود جا رہے تھے یا انہیں سٹریچروں پر لے جایا جا رہا تھا۔ اسی چراگاہ میں، جس میں سے وہ ایک دن پہلے گھوڑے پر گزرا تھا، معطر گھاس کی قطاروں کے مابین ایک سپاہی پڑا تھا۔ اس کی ٹانگیں ٹیڑھی میڑھی ہو رہی تھیں، اس کا سر بے ہنگم انداز سے پیچھے کو ڈھلکا ہوا تھا اور اس کی پچھے دار مخروطی فوجی ٹوپی اس کے قریب پڑی تھی۔

''وہ اسے اٹھاتے کیوں نہیں؟'' پیئر پوچھنا چاہتا تھا لیکن جب اس نے ایجوٹنٹ کے درشت چہرے کو اسی طرف مڑتے دیکھا، اس نے اپنی زبان پر قابو رکھا اور کچھ کہنے سے احتراز کیا۔

پیئر کو اپنا سائیس کہیں نظر نہ آیا اور وہ ایجوٹنٹ کی معیت میں گھاٹی میں سے گزرتا رلیف سکی مورچے کی طرف چل پڑا۔ اس کی گھوڑی ایجوٹنٹ کے گھوڑے کا ساتھ نہ دے سکی اور وہ کچھ پیچھے رہ گئی۔ وہ اسے قدم قدم پر اچھال بھی رہی تھی۔

''کاؤنٹ، معلوم ہوتا ہے کہ آپ گھوڑے پر سواری کے عادی نہیں ہیں،'' ایجوٹنٹ نے گلا پھاڑ کر کہا۔

''نہیں، یہ بات نہیں ہے، لیکن اس کی چال کچھ ایسی ہے کہ خواہ مخواہ جھٹکے لگتے ہیں۔'' اس کے لہجے سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اچھی خاصی الجھن میں پھنسا ہوا ہے۔

''ارے، یہ تو زخمی ہو چکی ہے!'' ایجوٹنٹ نے چلا کر کہا۔ ''اگلی بائیں ٹانگ، گھٹنے کے اوپر۔ بلاشبہ اسے گولی لگی ہے۔ کاؤنٹ، میں آپ کو مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ آپ کی فائرنگ میں بسم اللہ ہو گئی ہے!''

چھٹی کور سے آگے دھوئیں میں سے گزرتے وہ آرٹلری کے، جسے آگے کر دیا گیا تھا اور جو اتنی زبردست گولہ باری کر رہی تھی کہ کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے، عقب میں چھوٹے سے جنگل میں پہنچ گئے۔ وہاں خنکی بھی تھی اور خاموشی بھی۔ چاروں اطراف موسم خزاں کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''جنرل یہیں ہیں؟'' ایجوٹنٹ نے مورچے کے قریب پہنچ کر کہا۔

''ایک منٹ پہلے تو یہیں تھے۔۔۔ وہ ادھر چلے گئے ہیں،'' کسی نے دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ایجوٹنٹ نے پیئر کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ سمجھ نہ پا رہا ہو کہ اس کا کیا کیا جائے۔

''میری فکر نہ کریں۔ اجازت ہو تو میں ٹیلے کے اوپر چلا جاتا ہوں۔''

''ہاں، بالکل، بالکل! آپ کو وہاں سے ہر چیز بخوبی نظر آ جائے گی۔ پھر وہاں خطرہ بھی کم ہے۔ میں آپ کی خیریت دریافت کرنے آؤں گا۔''

پیئر بیٹری کے قریب چلا گیا اور ایجوٹنٹ گھوڑے پر آگے نکل گیا۔ ان کی دوبارہ ملاقات نہ ہوئی۔ کہیں بہت بعد میں پیئر کو معلوم ہوا کہ ایجوٹنٹ اس روز ایک بازو سے محروم ہو گیا تھا۔

پیئر جس ٹیلے پر چڑھا، وہ بہت مشہور ہوا۔ (بعدازاں روسی اسے بیٹری کا ٹیلا یا رایف سکی مورچہ کے نام سے پکارنے لگے اور فرانسیسیوں کے نزدیک یہ la grande redoute, la fatale redoute, la doute du centre بن گیا۔)• اس کے آس پاس ہزاروں اشخاص یا تو اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھے یا عمر بھر کے لیے معذور ہو گئے۔ فرانسیسی اسے کلیدی پوزیشن قرار دیتے تھے۔

یہ مورچہ ایک ٹیلے پر مشتمل تھا۔ اس کے تین اطراف خندقیں کھدی ہوئی تھیں۔ خندقوں میں دس توپیں نصب تھیں۔ مٹی کی دیواروں میں جو شگاف رکھے گئے تھے، یہ انھیں میں سے گولہ باری کر رہی تھیں۔

ٹیلے کی سیدھ میں دونوں اطراف مزید بجنالیں نصب تھیں۔ وہ بھی فائرنگ کر رہی تھیں۔ توپوں کے عقب میں ذرا پیچھے امدادی پیادہ سپاہ کھڑی تھی۔ جب پیئر اس ٹیلے پر چڑھا، اسے یہ مطلق خیال نہیں تھا کہ یہ جگہ، جہاں کوئی خاص بڑی بڑی خندقیں نہیں کھودی گئی تھیں اور جہاں سے گنتی کی صرف چند توپیں فائرنگ کر رہی تھیں، لڑائی کا اہم ترین مقام ہے۔ اس کے برعکس اس کی دانست میں اسے لڑائی میں کوئی خاص وقعت حاصل نہیں تھی کیونکہ اتفاق سے وہ خود وہاں موجود تھا۔

جب پیئر ٹیلے کے اوپر پہنچ گیا، وہ اس خندق کے، جس کے اندر توپیں نصب تھیں، آخری کنارے پر بیٹھ گیا اور جو کچھ اس کے گردوپیش ہو رہا تھا، غیر شعوری طور پر خوشی سے مسکراتا اسے دیکھنے لگا۔ کبھی کبھار وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا اور بیٹری کے آس پاس چکر کاٹنے لگتا۔ اس کے چہرے پر اس وقت بھی وہی مسکراہٹ کھیل رہی ہوتی۔ اس کی کوشش یہ ہوتی کہ اس کی وجہ سے ان سپاہیوں کے کام میں، جو مسلسل اس کے قریب سے بھاگ بھاگ کر گولے بارود

• پرشکوہ مورچہ، خونی مورچہ، مرکزی مورچہ

کی تھیلیاں لا رہے، انھیں توپوں میں بھر رہے اور توپیں واپس اپنے صحیح مقام پر نصب کر رہے تھے، کسی قسم کی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ بیٹری کی توپیں بلا توقف یکے بعد دیگرے داغی جا رہی تھیں۔ ان کے چلنے پر وہ شور وغل بپا ہوتا کہ کانوں کے پردے پھٹنے لگتے اور اڑوس پڑوس کا سارا علاقہ دھوئیں کی لپیٹ میں آ جاتا۔

امدادی فوج کے پیادہ سپاہیوں کے برعکس جو پیچھے کھڑے تھے اور جن کی خوف سے جان نکلی جا رہی تھی، یہاں بیٹری میں، جہاں چند گنے چنے جوان، جنھیں خندق نے دوسروں سے الگ تھلگ کر دیا تھا، تن دہی سے اپنے اپنے کام میں مصروف تھے، یا ان کے چہروں پر شوق اور والہانہ جوش و جذبے کی کیفیت نمایاں تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک ہی خاندان کے افراد ہیں اور بھائی چارے کی فضا میں مصروف کار ہیں۔

جب پیئر سفید ہیٹ پہنے بن بلائے مہمان کی طرح وہاں پہنچا، تو ابتدا میں اس کی غیر فوجی شکل وصورت جوانوں کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ وہ دوڑتے دوڑتے جب اس کے قریب سے گزرتے، کنکھیوں سے اسے دیکھتے اور تعجب کرنے لگتے، اور بعض اوقات ان کے کانوں میں خطرے کی گھنٹیاں بھی بجنے لگتیں۔ آرٹلری کا دراز قد سینئر افسر، جس کی ٹانگیں لمبی اور چہرے پر چیچک کے داغ تھے، آخری توپ کی کارکردگی کا جائزہ لینے کے بہانے چلتا چلتا پیئر کے پاس پہنچا اور اسے تجسس کی نگاہوں سے دیکھنے لگا۔

ایک نوعمر کوتاہ قامت افسر، جس کا چہرہ بیضوی تھا، جس کی ابھی مسیں تک بھیگی نہیں تھیں اور جو بظاہر ابھی ابھی کیڈٹ کور سے آیا تھا، بڑی تن دہی سے دونوں توپوں کو، جو اس کی تحویل میں دی گئی تھیں، چلوا رہا تھا۔ وہ بڑی درشتی سے پیئر سے مخاطب ہوا اور بولا:

"حضرت، اگر آپ اجازت دیں تو میں آپ سے عرض کروں گا کہ آپ ایک طرف ہٹ کر کھڑے ہوں۔ آپ یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

جب جوانوں نے پیئر کی طرف دیکھا، انھوں نے سر ہلا کر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا لیکن جب انھیں احساس ہوا کہ سفید ہیٹ پہنے یہ شخص تو کچھ بھی نہیں کر رہا، وہ یا تو چپ چاپ خندق کی ڈھلوان پر بیٹھ جاتا ہے، شرمیلے اور خوش خلق انداز سے مسکراتا جوانوں کے گزرنے کے لیے راستہ بنا دیتا ہے اور یا پھر فائرنگ کے نیچے بیٹری کے اردگرد یوں سکون سے ادھر ادھر چکر لگانے لگتا ہے جیسے وہ کسی خیابان میں چہل قدمی کر رہا ہو، تو انھیں یقین ہو گیا کہ اس سے انھیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچے گا اور ان کی مخاصمانہ حیرت دھیرے دھیرے اس نوع کی دوستانہ اور شوخ تعلق داری میں تبدیل ہو گئی جو فوجی سپاہی کتوں، مرغوں، بکریوں اور ان کی طرح کے دوسرے جانوروں کے لیے، جو ان کے ساتھ رجمنٹ کی کامیابیوں اور ناکامیوں دونوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں، محسوس کرتے ہیں۔ جوانوں نے پیئر کو کسی قسم کا دھوم دھڑکا کیے بغیر چپ چاپ اپنے خاندان کا رکن تسلیم کر لیا، اسے اپنا بھائی بنا لیا، پیار سے اسے، "ہمارا جنٹلمین" کا لقب دے دیا اور اس کے متعلق آپس میں ہنسی مذاق کرنے لگے۔

پیئر سے کوئی دو قدم کے فاصلے پر گولے نے زمین کا سینہ چیر دیا۔ اس کے کپڑوں پر جو گرد وغبار آ پڑا، اسے

جھاڑتے پونچھتے اس نے مسکرا کر اپنے گردو پیش دیکھا۔

''جناب، آپ کو ڈر کیوں نہیں لگا؟ واقعی، یہ تو حیرت کی بات ہے!'' ایک سپاہی نے جس کا چہرہ سرخ اور شانے چوڑے چکلے تھے، مسکراتے ہوئے پیئر سے پوچھا۔ مسکرانے سے اس کے سفید اور مضبوط دانت نمایاں ہو گئے۔

''اچھا، تمھیں ڈر لگا تھا؟'' پیئر نے پوچھا۔

''بالکل۔ آپ کو کیا امید تھی؟'' سپاہی نے جواب دیا۔ ''آپ کو معلوم ہے کہ وہ رحم کرنا نہیں جانتا۔ وہ آپ کے جسم سے ٹکراتا ہے اور آناً فاناً آپ کی آنتیں اڑ کر باہر آ جاتی ہیں۔ ایسے میں آدمی ڈرے نہ، تو اور کیا کرے؟'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

متعدد جوان پیئر کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان کے چہروں سے دوستی کا اظہار بھی ہو رہا تھا اور وہ محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ پتا نہیں کیوں لیکن بہرحال انھیں یہ امید نہیں تھی کہ اسے بھی دوسروں کی طرح باتیں کرنا آتا ہوگا۔ اور جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ وہ باتیں کر لیتا ہے، وہ بہت خوش ہوئے۔

''ہمارا تو کام ہی یہی ہے— ہم فوجی ہیں۔ لیکن کسی جنٹلمین میں— اور آپ تو ویسے بھی سچے اور کھرے جنٹلمین ہیں— اس وصف کا ہونا قابل تعریف بات ہے!''

''اپنی اپنی جگہوں پر!'' نوعمر افسر نے، ان جوانوں سے جنھوں نے پیئر کے گرد گھیرا ڈال لیا تھا، چلاتے ہوئے کہا۔

صاف نظر آ رہا تھا کہ یہ نوعمر افسر پہلی یا دوسری مرتبہ اس قسم کی ڈیوٹی سرانجام دے رہا ہے۔ چنانچہ افسروں اور ماتحتوں، دونوں کے ساتھ، اس کا رویہ قواعد و ضوابط کے عین مطابق اور انتہائی رسم پرستانہ تھا۔

سارے میدان جنگ میں، خاص طور پر بائیں جانب اس علاقے میں جہاں باگ راتیاں کے تیر نما دمدمے تھے، توپوں کی گھن گرج اور بندوقوں کی تڑتڑاہٹ شدید سے شدید تر ہوتی جا رہی تھی، لیکن جہاں پیئر کھڑا تھا، وہاں سے دھوئیں کی بنا پر بمشکل ہی کوئی چیز نظر آ سکتی تھی۔ ویسے بھی اس کی ساری توجہ بیٹری کے جوانوں کے اس مختصر حلقے پر، جو باقیوں سے الگ تھلگ ہو چکا تھا، مرکوز تھی۔ میدان جنگ کے مناظر دیکھ کر اور آوازیں سن کر اسے ابتداً جو غیر شعوری مسرت ہوئی تھی، اب اس کی جگہ ایک اور جذبے نے لے لی تھی۔ یہ کیفیت اس پر بالخصوص اس وقت سے طاری تھی جب اس نے ایک فوجی کو چراگاہ میں پڑے دیکھا تھا۔ اب خندق کی ڈھلوان پر بیٹھے وہ آنکھ اٹھا کر ان جوانوں کے، جو اس کے آس پاس موجود تھے، چہروں کا مشاہدہ کرنے لگا۔

دس بجے تک بیس آدمی اٹھا کر لے جائے چکے تھے، دو توپیں ناکارہ ہو چکی تھیں، بیٹری پر گرنے والے گولوں کی تعداد اور رفتار میں اضافہ ہو چکا تھا اور گولیاں فضا میں سنسناتی اور گنگناتی گزر رہی تھیں۔ لیکن بیٹری پر جو جوان متعین تھے، معلوم ہوتا تھا کہ انھیں ان چیزوں کی قطعاً کوئی پروا نہیں، وہ مسکراتے اور آپس میں چہلیں کرتے چاروں اطراف بھاگے پھر رہے تھے۔

''واہ واہ، بالکل اناناس ہے!'' ایک سپاہی نے گرینیڈ کو، جو فضا میں سنسناتا ان کی طرف آرہا تھا، دیکھ کر کہا۔
''ادھر نہیں، میری جان! — ادھر کوشش کرو جہاں پیادہ فوج ہے۔'' دوسرے نے گولے کو اڑ کر آگے جاتے اور عقب کی سپاہ کے مابین گرتے دیکھ کر کہا، اور کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

''تمھارا دوست معلوم ہوتا ہے!'' تیسرے نے ایک کسان کو توپ کے گولے سے، جو برق رفتاری سے اوپر ہی اوپر جارہا تھا، بچنے کے لیے نیچے جھکتے دیکھ کر کہا اور اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

چند نوجوان خندق کی دیوار سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ وہ یہ دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سامنا کیا ہو رہا ہے۔
''انھوں نے اگلی صفیں پیچھے ہٹالی ہیں۔ دیکھو لو، وہ پیچھے ہٹ گئی ہیں!'' وہ دیوار کے اوپر اشارے کرتے کہہ رہے تھے۔

''اپنے کام سے کام رکھو!'' ایک بوڑھے سارجنٹ نے چلّا کر انھیں کہا۔ ''اگر وہ پیچھے ہٹ گئے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ لڑائی اب پیچھے ہو رہی ہے۔''

اور اس نے ایک جوان کو شانے سے پکڑا اور گھٹنا مار کر اسے آگے دھکیل دیا۔ وہ سب کھلکھلا کر ہنس پڑے۔
''توپ نمبر 5 — پوزیشن سنبھال لو!'' ایک طرف سے حکم کی آواز سنائی دی۔
''خبردار، ہوشیار، سب مل کر زور لگاؤ!'' چند جوان توپ دھکیل رہے تھے اور شگفتگی سے چلّا چلّا کر ایک دوسرے کی ہمت بندھا رہے تھے۔

''ارے، اس گولے سے تو ہمارے جنٹلمین کا ہیٹ ہی اڑ چلا تھا!'' سرخ چہرے والے دل لگی باز نے کھیسیں نکالتے اور پیئر سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے کہا۔ ''اُف، تم سے کوئی کام ڈھنگ سے نہ ہوا!''
اس نے ایک گولے کو، جو توپ کے پہیے سے ٹکرا گیا اور ایک آدمی کی ٹانگ اڑا لے گیا تھا، ملاحیاں سنتے ہوئے کہا۔

''ارے لومڑو!'' ایک اور جوان نے ہنستے ہوئے ملیشیا کے آدمیوں سے کہا جو توپوں کے مابین جھک کر زخمی شخص کو اٹھانے آئے تھے۔ ''تو یہ دال دلیا تمھیں پسند نہیں آیا؟ یا آیا؟ ارے کوؤ! ڈر رہے ہو؟'' انھوں نے گلے پھاڑ کر ملیشیا کے جوانوں سے کہا جو اس سپاہی کے، جس کی ٹانگ اڑ گئی تھی، سامنے کھڑے پس و پیش کر رہے تھے۔
''اب چلو نا، بھائیو!'' انھوں نے کسانوں کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں، انھیں یہ پسند نہیں آیا۔''

پیئر نے دیکھا کہ جب بھی توپ کا کوئی گولہ مورچے سے آکر ٹکراتا یا کوئی شخص زخمی یا ہلاک ہو کر گرتا، جوانوں میں پہلے کی نسبت زیادہ مسرت کی لہر دوڑ جاتی۔ جس طرح جب بادل گرجتے ہیں اور بجلی چمکتی ہے، تو ان کے اندر چھپی ہوئی آگ کا شعلہ روشن سے روشن تر اور اس کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جاتی ہے، اسی طرح ان جوانوں کے اندر جو آگ بھڑک رہی تھی، اس کے شعلے تیز سے تیز تر ہوتے جا رہے تھے اور ان کی شدت ان کے چہروں پر منعکس ہو رہی تھی۔ یہ گویا اس امر کی علامت تھی کہ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، انھیں اس کی قطعاً کوئی پروا نہیں۔ پیئر نے میدان

جنگ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور نہ اسے یہ جاننے کی کوئی فکر تھی کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ وہ تو سراسر آگ کے متعلق، جس کی شدت میں ہر لحہ اضافہ ہو رہا تھا اور جو اسے اپنی روح میں بھی بھڑکتی محسوس ہو رہی تھی، سوچ بچار کرنے میں محو تھا۔

جنگل میں اور کامینکا ندی کے کنارے کے ساتھ ساتھ جو پیادہ دستے متعین تھے، دس بجے وہ پیچھے ہٹ گئے۔ وہ زخمیوں کو اپنی دستی بندوقوں پر اٹھائے بیٹری کے قریب سے بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ ایک جرنیل اپنے عملے کی معیت میں ٹیلے کے اوپر آیا، اس نے کرنل سے کچھ بات کی، خشم آلود نگاہوں سے پیئر کو دیکھا، بیٹری کے پیچھے جو امدادی پیادہ فوج کھڑی تھی، اسے نیچے لیٹ جانے کا حکم دیا تاکہ وہ فائرنگ کی زد میں آنے سے بچ جائے اور دوبارہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد بیٹری کے دائیں جانب پیادہ فوج کی صفوں سے طبل کے بجنے اور چلا چلا کر حکم دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ بیٹری پر متعین جوانوں کو پیادہ سپاہی آگے بڑھتے نظر آئے۔

پیئر نے خندق کی دیوار کے پار دیکھا۔ ایک چہرے پر اس کی نظر بطور خاص ٹھہر گئی۔ یہ ایک زرد رو نوجوان افسر تھا۔ اس کی شمشیر نچلی جانب لٹک رہی تھی اور وہ بے چینی سے اپنے گرد و پیش نگاہیں دوڑاتا پیچھے کی جانب جا رہا تھا۔

پیادہ فوج کی صفیں دھوئیں میں غائب ہو گئیں لیکن ان کی طویل نعرے بازی اور دستی بندوقوں کی صبار فتار فائرنگ کی آوازیں ابھی تک سنائی دے رہی تھیں۔ چند منٹ بعد ادھر سے زخمی اشخاص اور سٹریچر اٹھانے والوں کا اچھا خاصا ہجوم واپس آتا دکھائی دیا۔ بیٹری پر جو بم گر رہے تھے، ان کی تعداد میں یک بیک اضافہ ہو گیا۔ یہاں وہاں بے شمار زخمی اور ہلاک شدگان پڑے تھے لیکن ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ توپوں کے ارد گرد جو جوان تھے، وہ پہلے سے بھی زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کرنے لگے تھے۔ اب وہ پیئر کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں دے رہے تھے۔ ایک دو مرتبہ کسی شخص نے بڑے غصے سے گلا پھاڑ کر اس سے کہا کہ وہ خواہ مخواہ بیچ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔ سینئر افسر کا چہرہ خشم گین ہو چکا تھا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا کبھی ایک توپ کے پاس چلا جاتا اور کبھی دوسری کے۔ نوعمر افسر کے گال اور زیادہ تمتمانے لگے تھے اور وہ پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ حزم و احتیاط سے احکام دینے لگا تھا۔ وہ سپاہی، جو توپوں پر خدمات سرانجام دے رہے تھے، تیزی سے مڑتے، گولے بھرتے اور یوں چھلانگیں لگاتے ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے جیسے ان کے پاؤں کے نیچے سپرنگ لگے ہوں۔ وہ اپنے فرائض مستعدی سے ضرور ادا کر رہے تھے لیکن ذہنی طور پر کشیدگی محسوس کرنے لگے تھے۔

طوفانی بادل ان کے سروں کے اوپر پہنچ چکا تھا اور وہ آگ، جو پیئر نے روشن ہوتے دیکھی تھی، اب ہر چہرے پر منعکس ہو رہی تھی۔ وہ کرنل کے قریب کھڑا تھا کہ اتنے میں نوعمر افسر، سموری ٹوپی ہاتھ پر رکھے، اپنے اعلیٰ افسر کی طرف دوڑتا ہوا آیا۔

''جناب عالی! میں نہایت ادب سے گزارش کروں گا کہ صرف آٹھ راؤنڈ باقی رہ گئے ہیں۔ کیا ہم فائرنگ جاری رکھیں؟'' اس نے پوچھا۔

''گریپ شاٹ!'' کرنل چلایا۔ وہ خندق کی دیوار کے اوپر دیکھ رہا تھا اور اس نے سوال نظرانداز کر دیا۔

اچانک کچھ ہوا، نوجوان افسر نے ہچکی لی، اس کا جسم دوہرا ہو گیا اور وہ یوں زمین پر ڈھیر ہو گیا جیسے کوئی پرندہ، جس کے بازو پر گولی لگی ہو، گرتا ہے۔ پیئر کی نگاہوں کے سامنے ہر چیز دھندلا گئی، تاریک ہو گئی، پراسرار اور بھیانک شکل اختیار کر گئی۔

گولے کے بعد گولہ سنسناتا گزر رہا تھا، کوئی دیوار سے ٹکرا جاتا، کوئی کسی فوجی سے اور کوئی کسی توپ سے۔ پیئر نے یہ آوازیں ازیں پیشتر شاید ہی کبھی سنی ہوں گی لیکن اب اسے ان کے علاوہ اور کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بیٹری کے دائیں طرف فوجی جوان ''ہرّا، ہرّا'' کے نعرے لگاتے بھاگ رہے تھے، پیئر کو احساس ہوا کہ وہ اگلی نہیں بلکہ پچھلی جانب جا رہے ہیں۔

''سب گریپ شاٹ فائر کریں!'' افسر نے چلا کر کہا۔

سارجنٹ لپک جھپک اس کے پاس پہنچا اور دہشت زدہ سرگوشی میں (بالکل اسی طرح، جس طرح کوئی بٹلر ڈنر پارٹی پر اپنے آقا کو بتائے کہ جس انگوری شراب کا اس نے حکم دیا تھا، وہ ختم ہو چکی ہے) بتانے لگا کہ کارتوس ختم ہو چکے ہیں۔

''لفنگے! بدمعاش! یہ چاہتے کیا ہیں؟'' افسر نے منہ سے جھاگ اڑاتے اور پیئر کی جانب مڑتے ہوئے کہا۔ افسر کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا اور اس کا پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں پڑ رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں غضب کی چمک آ گئی تھی۔

''بھاگ کر محفوظ دستوں کے پاس جاؤ اور وہاں سے گولوں اور بارود کے بکس اٹھا لاؤ'' اس نے پیئر کے اوپر ہی اوپر ایک نوجوان کو غصیلی نگاہوں سے دیکھتے اور دہاڑتے ہوئے کہا۔

''میں جاتا ہوں!'' پیئر نے کہا۔

کوئی جواب دیے بغیر کرنل لمبے لمبے ڈگ بھرتا دوسری طرف چلا گیا۔

''فائرنگ بند کر دو... ٹھہرو!'' اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔

وہ جوان، جسے گولہ بارود لانے کا حکم دیا گیا تھا، پیئر سے ٹکرایا۔

''آہ، جناب عالی، یہ جگہ آپ کے لیے موزوں نہیں،'' اس نے کہا اور بھاگتا بھاگتا ڈھلوان سے نیچے اترنے لگا۔

پیئر اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ اس جگہ سے، جہاں نوعمر افسر گرا پڑا تھا اور اسے وہیں پڑا رہنے دیا گیا تھا، پہلو بچا کر آگے نکل گیا۔

ایک، دو، تین، یکے بعد دیگرے گولے اس کے سر کے اوپر سے گزر گئے۔ ایک اس کے سامنے، دوسرا برابر اور تیسرا پیچھے گرا اور زمین سے ٹکرا گیا۔ پیئر ڈھلوان پر بھاگتا رہا۔ ''میں کہاں جا رہا ہوں؟'' گولہ بارود کے سبز

چھکڑوں کے قریب پہنچنے پر اس نے یک دم اپنے آپ سے پوچھا اور وہیں رک گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ واپس جائے یا آگے۔ اچانک اسے زبردست دھکا لگا اور وہ پچھلی جانب زمین پر گر پڑا۔ عین اسی لمحے نہایت زبردست شعلہ چمکا اور اس کی آنکھیں خیرہ ہو گئیں۔ دھماکہ ہوا اور وہ شور اٹھا کہ اسے محسوس ہوا کہ اس کے کانوں کے پردے پھٹ گئے ہیں۔

جب اسے ہوش آیا، وہ اپنے ہاتھوں پر جھکا زمین پر بیٹھا تھا۔ گولے بارود کا چھکڑا، جو اس کے پاس کھڑا تھا، غائب ہو چکا تھا۔ سوختہ گھاس پر محض چند جھلسے ہوئے سبز تختے اور چیتھڑے ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے۔ ایک گھوڑا چھکڑے کے بچے کھچے ٹکڑے گھسیٹتا سرپٹ بھاگا جا رہا تھا جبکہ دوسرا پیئر کی طرح زمین پر لیٹا ہوا تھا اور ایسی فلک شگاف اور لمبی چیخیں بلند کر رہا تھا کہ برداشت نہیں ہوتی تھیں۔

32

پیئر پر اتنی دہشت طاری ہوئی کہ اس کے لیے وہاں ٹھہرنا ناممکن ہو گیا۔ وہ جست لگا کر اٹھا اور یوں واپس بیٹری کی طرف بھاگا کہ گویا کہ جن مہیب چیزوں میں وہ محصور ہو چکا تھا، ان سے بچنے کی وہی واحد پناہ گاہ تھی۔

جب وہ خندق میں داخل ہوا، اس نے دیکھا کہ فائرنگ بند ہو چکی ہے اور بیٹری خاموش ہے لیکن وہاں فوجی جوان کسی اور کام میں مصروف ہیں۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یہ معلوم کر سکتا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ اسے کرنل اپنی طرف پشت کیے لیٹا نظر آیا جیسے وہ کسی چیز کا جائزہ لے رہا ہو۔ اس کی نظر ایک فوجی جوان پر پڑی۔ جسے وہ ازیں پیشتر بھی دیکھ چکا تھا۔ وہ چلا چلا کر ''دوستو، بھائیو، بھائیو، دوستو!'' پکارے جا رہا تھا اور اپنے آپ کو چند آدمیوں سے، جنھوں نے اسے اپنے شکنجے میں لے رکھا تھا، چھڑانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ اسے کچھ اور بھی نظر آیا اور وہ عجیب تھا۔

اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ یہ سمجھ سکتا کہ کرنل ہلاک ہو چکا ہے، یہ کہ جو شخص ''دوستو، بھائیو'' کی رٹ لگا رہا ہے، قیدی بنایا جا چکا ہے اور یہ کہ ایک اور آدمی کی کمر میں سنگین گھونپی جا چکی ہے، کیونکہ جونہی وہ بھاگتا دوڑتا ٹیلے کے اوپر پہنچا، نیلی وردی میں ملبوس ایک لاغر اندام اور زرد رو شخص، جس کا پسینہ بہہ رہا تھا، ہاتھ میں تلوار تھامے اور منہ سے کچھ چلاتے تیزی سے اس کی طرف بڑھا۔ جب وہ دونوں ادھر ادھر دیکھے بغیر ایک دوسرے کی طرف سرپٹ بھاگے آ رہے تھے، پیئر نے تصادم سے بچنے کے لیے جبلی طور پر اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیے اور اس شخص (وہ فرانسیسی افسر تھا) کے کندھے اور حلق کس کر پکڑ لیے۔ افسر نے تلوار نیچے پھینک دی اور اس نے پیئر کو کالر سے پکڑ لیا۔

سراسیمگی کے عالم میں وہ دونوں کئی سیکنڈ ایک دوسرے کے اجنبی چہروں کی طرف دیکھتے رہے۔ دونوں کو یہ سمجھنے میں دقت پیش آ رہی تھی کہ انھوں نے کیا کیا ہے یا انھیں اس کے بعد کیا کرنا ہے۔ ''کیا میں نے اسے یا اس نے مجھے قیدی بنا لیا ہے؟'' دونوں یہی سوچ رہے تھے لیکن بظاہر فرانسیسی یہ یقین کرنے کے لیے زیادہ مائل تھا کہ

خود وہی قیدی بن چکا ہے کیونکہ دہشت کے جبلی ردعمل کے طور پر پیئر کا ہاتھ اس کے حلق پر اپنی گرفت سخت سے سخت کرتا جا رہا تھا۔ فرانسیسی کچھ کہنے کی کوشش کر رہا تھا کہ توپ کا گولہ ہول ناک حد تک ان کے قریب سے سنسناتا گزرا۔ فرانسیسی تیزی سے نیچے جھکا کہ پیئر کو محسوس ہوا کہ اس کا سر اڑ گیا ہے۔

پیئر بھی نیچے جھک گیا اور اس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے چھوڑ دیے۔ مزید سوچے بغیر کہ کس نے کسے قیدی بنایا ہے، فرانسیسی واپس بیٹری کی طرف بھاگا اور پیئر سر پر پاؤں رکھے ڈھلوان سے نیچے اترنے لگا۔ وہ بار بار زخمیوں اور ہلاک شدگان کے ساتھ ٹکرایا اور ہر مرتبہ اسے یہی محسوس ہوا کہ وہ اس کی ٹانگیں پکڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تاہم ابھی وہ پہاڑی کے دامن میں نہیں پہنچا تھا کہ اس کا سامنا روسی فوجیوں کے گھنے ہجوم سے ہو گیا۔ وہ لڑکھڑاتے، ٹھوکریں کھاتے اور پاگلوں کی طرح خوشی کے نعرے لگاتے بیٹری کی جانب بھاگے جا رہے تھے۔ [یہ وہ حملہ تھا جس کا سہرا (روسی جرنیل) یرمالوف نے اپنے سر باندھ لیا تھا۔ اس نے بانگ دہل یہ اعلان کیا کہ یہ محض اس کی دلیری اور خوش قسمتی تھی کہ اس قسم کا کارنامہ سرانجام دینا ممکن ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی جیب میں چند سینٹ جارج کراس (تمغے)* تھے۔ اس نے وہ ٹیلے پر پھینک دیے اور یوں فوجیوں میں اشتعال پھیلا دیا۔]

فرانسیسی، جو بیٹری پر قابض ہو چکے تھے، فرار ہو گئے۔ ہمارے جوانوں نے "ہرا" کا نعرہ لگاتے اتنی دور تک ان کا تعاقب کیا کہ انھیں روکنا مشکل ہو گیا۔

بیٹری سے قیدی نیچے لائے گئے۔ ان میں ایک زخمی فرانسیسی جرنیل بھی تھا۔ اس کے گرد افسروں نے گھیرا ڈال رکھا تھا۔ دونوں روسی اور فرانسیسی (پیئر نے چند روسیوں کو پہچان لیا) گروہ در گروہ چلتے یا رینگتے آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض کو سٹریچروں پر لایا جا رہا تھا۔ کرب اور اذیت سے ان کے چہروں کی شکلیں بگڑ گئی تھیں۔ پیئر ٹیلے پر، جہاں اس نے ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزارا تھا، دوبارہ چڑھ گیا۔ اس مختصر خاندانی حلقے میں سے، جس نے اسے اپنا بنا لیا تھا، ایک فرد بھی باقی نہیں بچا تھا۔ ہلاک شدگان میں متعدد ایسے اشخاص تھے جنھیں وہ جانتا نہیں تھا لیکن بعض کو اس نے پہچان لیا۔ خندق کے آخری سرے پر نوعمر افسر خون کے تالاب میں ابھی تک جوں کا توں سمٹا سکڑا پڑا تھا۔ سرخ رو سپاہی کے عضلات ابھی تک پھڑک رہے تھے لیکن وہ اسے وہیں چھوڑ گئے تھے۔

پیئر ڈھلوان پر نیچے کی جانب بھاگنے لگا۔

"اب انھیں یہ سب کچھ لازماً بند کر دینا چاہیے۔ انھوں نے جو کچھ کیا ہے، اس پر یقیناً ان کے دل دہل گئے ہوں گے۔" اس نے سوچا اور وہ بے مقصد سٹریچر اٹھانے والوں کے جلوس کے، جو میدان جنگ سے پرے جا رہا تھا، پیچھے پیچھے چلنے لگا۔

لیکن دھوئیں کی چادر کے پیچھے پیچھے سورج ابھی تک بلندی پر موجود تھا اور سامنے، خاص طور پر بائیں

---

* اس زمانے میں تمغے اور دوسرے اعزازات تقسیم کرنے کے لیے تقریبات کا اہتمام نہیں کیا جاتا تھا۔ قصہ زمین برسر زمین، وہیں میدان جنگ میں دیے جاتے تھے۔ اس لیے اگر جرنیل کی جیب میں چند تمغے تھے، تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ (مترجم)

جانب، سمیونووسک کے اردگرد، ہنوز دھوئیں میں ہنگامہ خیز ہلچل ہو رہی تھی اور توپوں اور بندوقوں کی گھن گرج اور تڑتڑاہٹ سست تو کیا پڑتی، اور بھی شدید تر ہوتی جا رہی تھی، بالکل اس آدمی کی طرح جو آخری چیخ مارتے وقت اپنی بچی کھچی قوت ساری کی ساری استعمال کر دیتا ہے۔

33

بارودینو لڑائی کا بڑا معرکہ بارودینو گاؤں اور باگ راتیاں کے تیر نما دمدموں کے مابین سات ہزار فٹ وسیع علاقے پر لڑا گیا۔ (اس نیم قطرے سے باہر ایک جانب روسیوں کی فرانسیسیوں سے ایک مختصر جھڑپ دوپہر کے وقت یواروف کے گھڑسوار دستے کے ذریعے ہوئی تھی اور دوسری جانب ایک معرکہ پونیاتوسکی اور تچ کوف کے دستوں کے مابین یوتستا سے آگے برپا ہوا تھا، لیکن میدان جنگ کے مرکزی حصے میں جو کچھ ہوا، اس کے مقابلے میں یہ دونوں جھڑپیں خاصی ہلکی پھلکی تھیں اور ان کا اصل لڑائی پر کوئی خاص اثر بھی نہ ہوا۔) بارودینو اور تیر نما دمدموں کے مابین جنگل کے پڑوس میں یہی وہ کھلا قطعہ زمین تھا جو دونوں اطراف سے بخوبی نظر آتا تھا اور جہاں اس روز کا اصل معرکہ انتہائی سادہ اور بے حد اناڑی طریقے سے لڑا گیا۔

لڑائی کا آغاز دونوں اطراف سے سینکڑوں توپوں کی گولہ باری سے ہوا۔

پھر جب سارا میدان دھوئیں کی چادر میں لپٹ چکا تھا، کومپاں اور دیسے کے دو ڈویژن فرانسیسی میمنے سے تیر نما دمدموں کی طرف بڑھے جبکہ وائسرائے (موغا) کا لشکر بائیں جانب بارودینو پر ہلہ بولنے چل پڑا۔

شیواردینو کے مورچے سے، جہاں نپولین کھڑا تھا، تیر نما دمدمے کوئی دو تہائی میل اور بارودینو سے ناک کی سیدھ میں تقریباً ڈیڑھ میل دور تھے۔ چنانچہ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا، نپولین کو نظر نہیں آ سکتا تھا، خاص طور پر اس لیے بھی کہ دھوئیں نے دھند میں خلط ملط ہو کر سارے علاقے کو نگاہوں سے اوجھل کر دیا تھا۔ دیسے کے جوان، جو تیر نما دمدموں کی طرف بڑھ چکے تھے، صرف اس وقت تک دکھائی دیتے رہے جب تک وہ اس گھاٹی میں، جو ان کے اور تیر نما دمدموں کے مابین واقع تھی، داخل نہ ہو گئے۔ جونہی وہ گھاٹی میں داخل ہوئے، تیر نما دمدموں پر توپوں اور بندوقوں کا دھواں اتنا دبیز ہو گیا کہ آگے کی جانب اس نے ساری ڈھلوان پر چادر سی ڈال دی۔ کبھی کبھار دھوئیں میں کوئی سیاہ چیز، غالباً انسانوں کی جھلک یا سنگینوں کی چمک، دیکھنا ممکن ہو جاتا تھا لیکن شیواردینو کے مورچے سے یہ اندازہ لگانا ممکن نہیں تھا کہ وہ متحرک ہیں یا ساکن کھڑے ہیں اور نہ یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ وہ فرانسیسی ہیں یا روسی۔

سورج بلند ہو رہا تھا اور خوب چمک رہا تھا۔ اس کی ترچھی کرنوں نے نپولین کا چہرہ پوری طرح روشن کر دیا تھا۔ اس نے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر سایہ کیا اور تیر نما دمدموں کی طرف دیکھنے لگا۔ ان دمدموں کے سامنے دھوئیں کی چادر خاصی نیچی تنی ہوئی تھی۔ بعض اوقات یوں نظر آتا تھا کہ دھواں حرکت کر رہا ہے اور بعض اوقات یوں دکھائی دیتا کہ فوجی دستے آگے پیچھے جا رہے ہیں۔ کبھی کبھار فائرنگ میں ایک آدھ چیخ سنائی دے جاتی لیکن یہ بتانا

ناممکن تھا کہ وہاں ہو کیا رہا ہے۔

ٹیلے پر کھڑے کھڑے نپولین دو چشمی دوربین میں سے دیکھنے لگا۔ دوربین کے ننھے منے دائرے میں سے اسے دھواں اور فوجی، کبھی اپنے اور کبھی روسی، دکھائی دینے لگے لیکن جب اس نے دوبارہ ننگی آنکھ سے دیکھنے کی کوشش کی، وہ یہ نہ بتا سکا کہ اس نے انھیں کہاں دیکھا تھا۔

وہ ٹیلے سے نیچے اتر آیا اور اس کے سامنے آگے پیچھے چکر لگانے لگا۔ گاہے بگاہے وہ رک جاتا، فائرنگ کی آوازیں سنتا اور میدان جنگ کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگتا۔

جہاں وہ کھڑا تھا، نہ وہاں سے اور نہ ٹیلے سے، جس پر چند جرنیل چڑھ گئے تھے، یہ معلوم کرنا ممکن تھا کہ نیچے کیا ہو رہا ہے بلکہ تیر نما دمدموں پر جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی اصلیت کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ بس یہی نظر آتا کہ وہاں فرانسیسی اور روسی — ان میں کوئی زخمی تھا، کوئی ہلاک ہو چکا تھا، کوئی زندہ تھا اور کوئی ہوش وحواس سے عاری ہو چکا تھا۔ کبھی باری باری اور کبھی اکٹھے قابض ہو جاتے تھے۔ اور کوئی توپوں اور بندوقوں کی سات گھنٹے کی مسلسل فائرنگ کے مابین وہاں کبھی روسی، کبھی صرف فرانسیسی، کبھی گھڑسوار اور کبھی پا پیادہ دستے دکھائی دیتے۔ وہ میدان میں نمودار ہوتے، فائرنگ کرتے، نیچے گرتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے، گتھم گتھا ہوتے، ان کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ ایک دوسرے کا کیا کریں، شور وغل مچاتے اور دوبارہ پیچھے بھاگ جاتے۔

اس کے فرستادہ ایجوٹنٹ اور مارشلوں کے اردلی افسر مسلسل میدان جنگ سے سرپٹ گھوڑے دوڑاتے اس کے آس پاس آ رہے اور معرکے کی پل پل کی اطلاعات بہم پہنچا رہے تھے۔ تاہم یہ سب اطلاعات پرفریب تھیں، اس لیے بھی کہ لڑائی کی گرما گرمی میں یہ بتانا ناممکن تھا کہ کسی خاص لمحے میں وہاں کیا ہو رہا تھا، بلکہ اس لیے بھی کہ متعدد ایجوٹنٹ میدان کارزار میں جاتے ہی نہیں تھے، وہ محض وہی کچھ، جو انھوں نے دوسروں سے سنا ہوتا تھا، دہرا دیتے تھے۔ جب کوئی ایجوٹنٹ ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کر کے پہنچتا، حالات تبدیل ہو چکے ہوتے اور جو خبر وہ لایا ہوتا، اس میں سے حقیقت کا عنصر غائب ہو چکا ہوتا۔ مثلاً ایک ایجوٹنٹ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے نپولین کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسے بتانے لگا کہ بارودینو فتح ہو گیا ہے اور دریائے کالوچا کا پل فرانسیسیوں کے قبضے میں آ گیا ہے۔ اپنی خبر سنانے کے بعد اس نے نپولین سے دریافت کیا ''یور میجسٹی، کیا ہماری فوج پل عبور کر کے اس طرف چلی آئے؟'' نپولین نے جواب دیا: ''نہیں، وہ دوسری سمت عسکری صف بندی کر لیں اور اگلے حکم کا انتظار کریں۔'' لیکن اس حکم کے دیے جانے سے پیشتر ہی بلکہ ایجوٹنٹ کی بارودینو سے روانگی کے تقریباً فوراً ہی بعد روسی دوبارہ پل پر قابض ہو چکے تھے اور اسے نذر آتش کر چکے تھے۔ اور یہ بالکل اسی جھڑپ کے دوران میں ہوا، جب لڑائی کے آغاز پر پیئر وہاں موجود تھا۔

تیر نما دمدموں سے ایک اور ایجوٹنٹ برق رفتاری سے گھوڑا دوڑاتا آیا۔ اس کا منہ فق تھا اور شکل سے بدحواسی ٹپک رہی تھی۔ وہ نپولین کے پاس یہ اطلاع لے کر آیا تھا کہ فرانسیسیوں نے جو حملہ کیا تھا، وہ ناکام ہو چکا ہے، کومپاں

زخمی اور داوؤ ہلاک ہو چکا ہے، لیکن عین اس وقت جب ایجوٹنٹ کو یہ بتایا گیا کہ حملہ ناکام ہو گیا ہے، اور ایک فرانسیسی یونٹ دمدموں پر دوبارہ قابض ہو چکا تھا، اور داوؤ زندہ تھا، اسے محض معمولی زخم آئے تھے۔ اس قسم کی غلط سلط اطلاعات کی اساس پر نپولین احکام دیتا رہا۔ ان احکام پر یا تو ان کے جاری ہونے سے پہلے ہی عمل ہو چکا ہوتا، یا پھر ان کی تعمیل ہو ہی نہیں سکتی تھی اور ہوئی بھی نہیں۔

وہ مارشل اور جرنیل، جو میدان جنگ کے تو قریب تھے لیکن نپولین کی طرح اصل لڑائی میں شریک نہیں تھے اور صرف کبھی کبھار ان مقامات تک، جو فائرنگ کی زد میں آتے تھے، چلے جاتے تھے، نپولین سے مشورہ کیے بغیر خود ہی فوجوں کی اکھاڑ پچھاڑ کرتے اور اس بارے میں کہ فائرنگ کہاں سے کی جائے، کس پر کی جائے، گھڑ سوار دستوں نے کب حملہ کرنا ہے اور پیادہ دستوں نے کب تیزی دکھانا ہے، احکام دیتے رہے۔ ان کے احکام پر بھی شاذ ہی عمل ہوا اور ہوا بھی تو صرف جزوی طور پر۔

لیکن جو کچھ ہوا، وہ اس سے، جس کا حکم دیا گیا تھا، قطعی مختلف تھا۔ جن سپاہیوں کو آگے بڑھنے کا حکم ملا، ان پر جب گریپ شاٹ فائرنگ ہوئی، وہ پیچھے ہٹ آئے۔ جن سپاہیوں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنی جگہوں پر ڈٹے رہیں، انھوں نے جب روسیوں کو نمودار ہوتے دیکھا جس کی انھیں توقع نہیں تھی، وہ بعض اوقات پیچھے بھاگ آتے اور بعض اوقات آگے دوڑ پڑتے۔ اور رہے گھڑ سوار، وہ کسی کے حکم کے بغیر ہی بھاگتے روسیوں کا سرپٹ تعاقب کرنے لگے۔ اس طرح دو گھڑ سوار رجمنٹیں برق رفتاری سے سمیونووسک گھاٹی میں سے گزرتی جونہی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچیں، مڑیں اور جس رفتار سے گئی تھیں، اسی رفتار سے واپس آ گئیں۔ اسی طرح پیادہ دستوں کو جن جن مقامات کی سمت جانے کا حکم دیا گیا، وہ ان کی بجائے دوسری جگہوں کا رخ کرتے رہے۔

توپیں کب اور کہاں لے جانا ہیں؟ پیادہ سپاہ نے کب فائرنگ کا آغاز کرنا ہے؟ گھڑ سوار دستوں نے کب روسی پیادہ فوج کو روندنا ہے؟ — اس قسم کے احکام وہ افسر، جو متعلقہ یونٹوں کے قریب ترین تھے، دیتے رہے، نپولین چھوڑ، انھوں نے ان کے بارے میں نے (Ney)، داوؤ یا موغا سے بھی کوئی مشورہ نہ کیا۔ انھیں یہ قطعاً اندیشہ نہیں تھا کہ احکام کی تعمیل نہ کرنے یا اپنی من مانی کرنے پر انھیں کوئی سزا ملے گی کیونکہ لڑائی میں جو چیز داؤں پر لگی ہوتی ہے وہ انسان کی عزیز ترین متاع — اس کی اپنی زندگی — ہوتی ہے اور چونکہ بچاؤ بعض اوقات پیچھے ہٹنے میں اور بعض اوقات آگے بھاگنے میں نظر آتا ہے، اس لیے وہ اشخاص، جو اس جگہ، جہاں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا، موجود تھے، وقتی لہر کے تحت صورت حال سے عہدہ برآ ہوتے رہے۔

تاہم حقیقت یہ ہے کہ اس طرح کبھی آگے بڑھنے اور کبھی پیچھے ہٹنے سے سپاہ کی مجموعی صورت حال نہ بہتر ہوئی اور نہ ابتر۔ انھوں نے ایک دوسرے کے خلاف جو حملے کیے یا دھاوے بولے، اس سے کوئی خاص نقصان نہ ہوا۔ جو بھی نقصان ہوا، اموات وقوع پذیر ہوئیں یا لوگوں کو چوٹیں اور زخم آئے، وہ سب توپوں کے گولوں اور دستی بندوقوں کی گولیوں کا کیا دھرا تھا، جن کی کھلے میدان میں چاروں اطراف بوچھاڑ ہو رہی تھی۔ جونہی سپاہی اس

میدان میں پہنچتے، وہ فائرنگ کی زد میں آجاتے، وہ بھاگتے، ایک دوسرے سے ٹکراتے، ٹھوکریں کھاتے نیچے گرتے اور گر گر کر آگے بڑھتے یا پیچھے ہٹتے۔ لیکن ان کے پیچھے ہٹتے ہی ان کے سینئر افسر، جو عقب میں کھڑے ہوتے، جھٹ پٹ نظم و ضبط بحال کرتے اور انھیں دوبارہ فائرنگ کے علاقے میں بھیج دیتے۔ وہاں اندیشۂ موت کے غلبے تلے سارا نظم و ضبط دھرے کا دھرا رہ جاتا اور وہ بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح اندھا دھند ادھر ادھر بھاگنا شروع کر دیتے۔

34

نپولین کے جرنیل — داوو، نے (Ney) اور موغا، جو فائرنگ کے علاقے کے قریب تھے اور بعض اوقات اس کے اندر بھی چلے جاتے تھے — ایک سے زیادہ مرتبہ اپنے ضبط و نظم کے انتہائی پابند فوجی جوانوں کے زبردست لشکروں کو ادھر لے گئے لیکن ان کے سابقہ معرکوں میں جو کچھ ہوتا رہا تھا، یہاں اس کے بالکل برعکس ہوا۔ بجائے اس کے کہ انھیں غنیم کی فوجوں میں بھگدڑ مچنے اور ان کی بے ترتیب پسپائی کی خبریں ملتیں، نظم و ضبط کے خوگر یہ لشکر خود بے ترتیب اور ہراساں زدہ ہجوموں کی صورت میں واپس آجاتے تھے۔ جرنیل ان کی دوبارہ صف بندی کرتے لیکن ان کی تعداد بتدریج کم ہو رہی تھی۔ دوپہر کے قریب موغا نے اپنا ایجوٹنٹ نپولین کے پاس بھیجا۔ اس نے کمک فراہم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

جب موغا کا ایجوٹنٹ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا نپولین کو یہ یقین دلانے، کہ اگر ہز میجسٹی انھیں ایک اور ڈویژن مہیا کر دیں، وہ روسیوں کو مار بھگائیں گے، اس کے پاس پہنچا، وہ پہاڑی کے دامن میں بیٹھا پنچ سے شغل کر رہا تھا۔

"کمک!" نپولین نے گمبھیر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ اس کی نگاہیں ایجوٹنٹ پر مرکوز تھیں۔ ایجوٹنٹ خوش شکل اور خوش اندام نوجوان تھا اور اس کے سیاہ گھونگریالے بال موغا کی طرح اس کے شانوں پر پر لٹک رہے تھے۔

"کمک!" نپولین نے دل میں سوچا۔ "انھیں کمک کی ضرورت کیوں پیش آگئی حالانکہ نصف فوج پہلے ہی کمزور روسی سپاہ کے، جو مورچے بھی نہیں بنا سکی تھی، نبرد آزما ہے؟"

"جاؤ، شاہ نیپلز کو بتا دو،" نپولین نے درشتی سے کہا، "کہ ابھی دوپہر بھی نہیں ہوئی اور مجھے ابھی اپنی بساط بھی ٹھیک طرح سے نظر نہیں آ رہی۔ جاؤ..."

لمبے بالوں والے خوبرو ایجوٹنٹ نے اپنے ہیٹ سے ہاتھ ہٹائے بغیر زور سے آہ بھری اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ادھر، جہاں انسانوں کا قتل عام ہو رہا تھا، چل پڑا۔

نپولین اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے کولین کوخ (Caulaincourt) اور بیخ تیئے (Berthier) کو بلایا اور ان کے ساتھ ایسے موضوعات کے متعلق، جن کا جنگ سے کوئی تعلق نہیں تھا، گفتگو کرنے لگا۔

گفتگو کے دوران میں، جس میں نپولین کو دلچسپی کا سامان نظر آنے لگا تھا، بیخ تیئے کی نظر ایک جرنیل پر

پڑی، جواپنے عملے کے ہمراہ ادھر آ رہا تھا۔ جرنیل کے صبا رفتار گھوڑے کے منہ سے جھاگ بہہ رہا تھا اور وہ پسینے سے شرابور تھا۔ اس جرنیل کا نام بیلیاخ (Belliard) تھا۔ وہ گھوڑے سے اترا، تیز تیز قدم اٹھاتا امپراطور کی طرف بڑھا اور بڑی جرأت سے کمک فراہم کرنے کی ضرورت بیان کرنے لگا۔ اس نے اپنی عزت کی قسم کھا کر کہا کہ اگر انھیں ایک مزید ڈویژن مل جائے، روسی تہس نہس ہو جائیں گے۔

نپولین نے کندھے جھٹکائے اور وہ جواب دیے بغیر چہل قدمی کرتا رہا۔ بیلیاخ بڑے زور شور اور بلند آہنگ لہجے سے عملے کے جرنیلوں سے، جو اس کے اردگرد اکٹھا ہو گئے تھے، خطاب کرنے لگا۔

''بیلیاخ، تم بہت جلد باز ہو،'' نپولین نے دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ''جب گھمسان کا رن پڑ رہا ہو، غلطی نہایت آسانی سے ہو جاتی ہے۔ جاؤ، ایک بار پھر حالات کا جائزہ لو اور اس کے بعد میرے پاس آنا۔''

پیشتر اس کے کہ بیلیاخ نظروں سے اوجھل ہوتا، میدان جنگ کے ایک اور علاقے سے پیغام رساں ہواسے باتیں کرتا پہنچ گیا۔

''ہونہہ! اب کیا ہوا؟'' نپولین نے ایک ایسے شخص کی طرح، جسے مسلسل پریشان کیا جا رہا ہو اور وہ اب تنگ آ چکا ہو، جھلا کر کہا۔

"sire,le prince*۔۔۔ ایجوٹنٹ نے کہنا شروع کیا۔

''کمک مانگ رہا ہے؟'' نپولین نے غصے سے بازو لہراتے ہوئے کہا۔

ایجوٹنٹ نے ہاں میں سر ہلا دیا اور رپورٹ پیش کرنے لگا، امپراطور نے منہ دوسری طرف پھیر لیا، دو قدم اٹھائے، رکا، واپس آیا اور اشارے سے بیغ تییئے کو بلایا۔

''ہمیں انھیں کمک فراہم کرنا ہی پڑے گی؟'' وہ سمجھ گیا کہ اب اس کے بغیر اور کوئی چارہ ہی نہیں۔ ''تمھارے خیال میں کسے بھیجا جائے؟'' اس نے بیغ تییئے سے پوچھا۔ (اس کے متعلق اس نے بعد میں کہا تھا: ''اس مولے کو شہباز میں نے ہی بنایا تھا۔'')

عالی جاہ، کلاغاپید (Clarapede) کا ڈویژن بھیج دیں۔ بیغ تییئے نے جواب دیا۔ اسے تمام ڈویژنوں، رجمنٹوں اور بٹالینوں کی تعداد زبانی معلوم تھی۔

نپولین نے سر ہلا کر اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔

ایجوٹنٹ گھوڑا دوڑاتا ہوا کلاغاپید کے ڈویژن کی طرف چل پڑا اور چند منٹ بعد نوجوان گارڈ، جو ٹیلے کے عقب میں متعین تھے، آگے بڑھنے لگے۔ نپولین انھیں چپ چاپ دیکھتا رہا۔

''نہیں،'' اس نے ایکا ایکی بیغ تییئے سے چلا کر کہا، ''میں کلاغاپید نہیں بھیج سکتا۔ فغیاں (Friant) کا ڈویژن بھیج دو۔''

---

* عالی جاہ، پرنس

اگر چہ کلا غا پید کی بجائے فغیاں کا ڈویژن بھیجنے سے کسی قسم کا کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ صاف ظاہر تھا کہ ایک کو واپس بلانے اور دوسرے کو روانہ کرنے سے تاخیر بھی ہوتی اور دقت بھی پیش آتی، اس کے حکم کی فی الفور تعمیل ہوئی۔ نپولین یہ سمجھنے میں ناکام رہا کہ اپنی فوج کے سلسلے میں اس کا کردار اس ڈاکٹر کا تھا جو اپنے نسخوں سے فطرت کے عمل میں مزاحم ہوتا ہے — وہ اس کردار کو سمجھتا بھی تھا اور اس کی مذمت بھی کرتا تھا۔

دوسروں کی طرح فغیاں کا ڈویژن بھی میدان جنگ کے دھوئیں میں غائب ہو گیا۔ ہر طرف سے مسلسل ایجوٹنٹ آرہے، اور وہ سب، جیسے انھوں نے مل کر سازش کر رکھی ہو، ایک ہی بات کہے جا رہے تھے۔ جو کوئی آتا، کمک کا مطالبہ لے کر آتا اور یہی دعویٰ کرتا کہ روسی اپنی جگہ ڈٹے ہوئے ہیں اور ایسی ہول ناک فائرنگ کر رہے ہیں کہ میدانِ کارزار جہنم کا نقشہ پیش کر رہا ہے اور فرانسیسی سپاہ اس میں پگھلتی اور ناپید ہوتی جا رہی ہے۔

نپولین کیمپ سٹول پر بیٹھا تھا اور اپنی سوچوں میں مستغرق تھا۔

موسیو دَبوسے، جو سفر کا شوقین تھا اور جس کے منہ میں صبح سے کھیل تک اڑ کر نہیں گئی تھی، امپراطور کے پاس آیا اور اس نے نہایت احترام سے لنچ کرنے کی تجویز پیش کی۔

''مجھے یقین ہے کہ میں اس موقع پر یوئر میجسٹی کو فتح کی مبارک باد پیش کر سکتا ہوں،'' اس نے کہا۔

نپولین نے منفی انداز سے سر کو جنبش دی۔ موسیو دَبوسے نے فرض کر لیا کہ نپولین کی نفی کا تعلق فتح سے ہے، لنچ سے نہیں، چنانچہ اس نے کچھ بے تکلفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے اطمینان اور نیم ظریفانہ انداز سے کہا: ''اگر لنچ دستیاب ہو، پھر بادیٔ النظر میں ایسی کوئی معقول وجہ دکھائی نہیں دیتی کہ یہ لنچ کھایا کیوں نہ جائے۔''

''دفع ہو جاؤ...'' نپولین نے اکھڑ پن سے کہا اور اپنی پیٹھ پھیر لی۔

دَبوسے کے چہرے پر پُرحمکنت مسکراہٹ، جس میں وجد آفریں مسرت، تاسف اور ملال بھی کچھ شامل تھا، پھیل گئی اور وہ دبے پاؤں دوسرے جرنیلوں کی طرف چل پڑا۔

نپولین پر جس قسم کا اضمحلال طاری تھا، اس کی گرفت میں وہ جواری آتا ہے جو طویل عرصے تک اتنا خوش قسمت رہا ہو کہ نتائج و عواقب کی پروا کیے بغیر اپنی پونجی داؤں پر لگاتا اور ہر بار جیتتا رہا ہو کہ اچانک ایک روز، عین اس وقت جب وہ اپنی کامیابی کے تمام امکانات کا جائزہ لے چکا اور ان پر مطمئن ہو چکا ہوتا ہے، اسے پتا چلتا اور قدم قدم پر محسوس ہونے لگتا ہے کہ وہ جتنا زیادہ اپنے کھیل کے بارے میں سوچتا ہے، اتنا ہی زیادہ ہارتا جاتا ہے۔

اس کی سپاہ وہی تھی، اس کے جرنیل وہی تھے، تیاریاں وہی تھیں، فوجوں کی تقسیم و ترتیب اسی طرح کی گئی تھی، وہی ''مختصر اور زوردار اعلان'' کیا گیا تھا، وہ خود بھی وہی تھا — وہ یہ سب کچھ جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ اپنے کام میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تجربے کار اور ماہر ہے — پھر دشمن بھی وہی تھا۔ اس کی اس سے اوسٹرلٹس اور فریڈلانٹ میں مڈھ بھیڑ ہو چکی تھی۔ پھر اس کا ہیبت ناک جھانپڑ پراسرار انداز سے ناطاقتی اور ضعف کا شکار کیوں ہو گیا ہے؟

اس کے تمام سابقہ داؤ پیچ اور چالیں، جو ہمیشہ کامیابی سے ہم کنار ہوئی تھیں، پہلے ہی استعمال کی جا چکی تھیں۔ اس نے حسب معمول آج بھی اپنی بیٹریاں ایک مقام پر مجتمع کر دی تھیں، غنیم کی صفوں میں شگاف ڈالنے کے لیے اپنے محفوظ دستے جھونک دیے تھے اور اپنے ''فولادی جوانوں'' کو گھوڑوں پر سوار ہو کر حملے کا حکم دے دیا تھا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ فتح کی نوید نہیں ملی تھی بلکہ چاروں اطراف سے ایک ہی قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں کہ جرنیل ہلاک ہو رہے ہیں یا زخمی، کمک کی اشد ضرورت ہے، روسیوں کو مار بھگانا ناممکن ہے اور یہ کہ اس کی اپنی سپاہ بدنظمی اور انتشار کا شکار ہو رہی ہے۔

پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ وہ دو تین احکام جاری کرتا تھا، ایک دو جملے کہتا تھا اور اس کے مارشل اور ایجوٹنٹ مبارک باد پیش کرنے بھاگے آتے تھے۔ ان کے چہرے مسرت سے کھلے جاتے تھے اور وہ مزے لے لے کر مالِ غنیمت کی تفصیل سنایا کرتے تھے: دشمن کی پوری کی پوری کور قیدی بنالی گئی ہے، غنیم کے لاتعداد علم، تمغے، توپیں اور دیگر سامان حرب ہاتھ لگا ہے اور موغا تو ہاتھ جوڑ کر درخواست کیا کرتا تھا کہ گھڑسوار دستوں کو کھلی چھٹی دے دی جائے تا کہ وہ ساز و سامان کے چھکڑے ہانک کر لے آئیں۔ لودی[76] مارینگو، آرکولا، جینا، اوسٹرلٹس، واگرام، کون کون سا مقام تھا جہاں یہ نہیں ہوا مگر اب؟ اب اس کی فوج پر کچھ عجیب واردات بیت رہی تھی۔

تیر نما دمدموں پر قبضے کی خبر ملنے کے باوجود نپولین یہ دیکھ رہا تھا کہ حالات اس طرح کے نہیں ہیں ــ بالکل نہیں ہیں ــ جیسا کہ گزشتہ لڑائیوں میں ہوتے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہا ہے، دوسرے بھی، جو اس کے گرد و پیش جمع تھے اور جنھیں مختلف جنگوں کا تجربہ تھا، وہی کچھ محسوس کر رہے ہیں۔ ان سب کے حوصلے پست ہو چکے تھے اور وہ ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا، صرف ڈبو سے اس کی اہمیت کا اندازہ لگانے میں ناکام رہا تھا۔ لیکن نپولین، جس کی لڑتے لڑتے عمر گزر گئی تھی، خوب اچھی طرح سمجھتا تھا کہ اگر پورا زور لگانے اور آٹھ گھنٹے میدان جنگ میں گزارنے کے بعد بھی حملہ آور قوت لڑائی میں فتح یاب نہیں ہوتی، تو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے۔ وہ جانتا تھا کہ یہ عملاً شکست کے مترادف ہے اور یہ کہ لڑائی کے اس نازک مرحلے میں معمولی سا حادثہ اسے اور اس کی فوج کو تباہی سے دوچار کر سکتا ہے۔

اس نے جب اپنے ذہن میں اس ساری عجیب و غریب روسی مہم کے بارے میں غور کیا، جس میں دو ماہ کی مدت کے دوران میں ایک بھی لڑائی جیتی نہیں گئی تھی، ایک بھی پرچم یا توپ پر قبضہ ہوا نہ کوئی فوجی کور زیر حراست آئی، اس نے جب اپنے گرد و پیش کے اشخاص کے چہروں پر ڈھکی چھپی آزردگی دیکھی اور اسے یہ خبریں موصول ہوئیں کہ روسی ابھی تک میدان جنگ میں ڈٹے ہوئے ہیں ــ اس پر ایسا مہیب اور ہولناک جذبہ غالب آ گیا جیسے اس نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہو اور وہ ان تمام ناموافق اور نامساعد احتمالات کے بارے میں سوچنے لگا جو امکانی حد تک اس کی بربادی کا سبب بن سکتے تھے۔ ہو سکتا ہے کہ روسی اس کے میسرے پر دھاوا بول دیں، اس کے قلب میں شگاف ڈال دیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ توپ کا کوئی آوارہ گولہ خود اسے ہلاک کر دے۔ یہ سب کچھ ممکن

تھا۔ گزشتہ لڑائیوں میں وہ صرف فتح کے امکانات کے بارے میں سوچا کرتا تھا لیکن اب لاتعداد امکانی سانحات آپ ہی آپ اس کو سوجھ رہے تھے اور ان سب کے وقوع پذیر ہونے کے خدشات اس کے دل میں سر اٹھا رہے تھے۔ جی ہاں، یہ بالکل ایسے خواب کی مانند تھا جس میں آدمی یہ دیکھتا ہے کہ کوئی قاتل اس پر حملہ کر رہا ہے، وہ اپنے حملہ آور سے نپٹنے کے لیے اسے زبردست گھونسا رسید کرنا چاہتا ہے جس کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہ اسے چت کر دے گا لیکن جب وہ بازو اوپر اٹھاتا ہے، اسے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں تو اتنی سکت ہی نہیں اور اس کا بازو یوں نیچے گرتا ہے، جیسے وہ بازو نہ ہو، چیتھڑا ہو۔ اپنی اس بے بسی کی حالت میں اس پر یقینی موت کی دہشت سوار ہونے لگتی ہے۔

نپولین پر جو دہشت طاری ہوئی، اس کا باعث یہ خبر ہی تھی کہ روسیوں نے فرانسیسی میسرے پر حملہ کر دیا تھا۔ وہ ٹیلے کے دامن میں سر نہوڑائے اور کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے چپ چاپ کیمپ سٹول پر بیٹھا تھا۔ برتھیئے اس کے پاس آیا۔ اس نے مشورہ دیا کہ حالات معلوم کرنے کے لیے انھیں خود گھوڑوں پر محاذ جنگ کے قریب گھومنا پھرنا چاہیے۔

''کیا؟ کیا کہا تم نے؟'' نپولین نے پوچھا۔ ''ٹھیک ہے۔ انھیں کہو میرا گھوڑا لے آئیں۔''

وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور سمیونووسک کی طرف چل پڑا۔

اس سے پہلے نہ نپولین نے اور نہ اس کے جرنیلوں نے کبھی اتنا بھیانک منظر دیکھا تھا اور نہ اتنے چھوٹے میدان میں انھیں کبھی اتنی لاشیں نظر آئی تھیں۔ توپوں کی گھن گرج، جو دس گھنٹے گزرنے کے بعد بھی، ختم نہیں ہوئی تھی، کانوں کو عاجز کر رہی تھی اور منظر کو بالکل اسی طرح مخصوص معنویت دے رہی تھیں جیسے tableaux vivants[77] کی سنگت میں موسیقی دیتی ہے۔ نپولین گھوڑے پر سمیونووسک کی پہاڑی کی چوٹی پر پہنچا اور دھوئیں کے بادلوں میں اسے ناشناسا رنگوں کی وردیوں میں ملبوس سپاہیوں کی صفیں نظر آئیں۔ وہ روسی تھے۔

پہاڑی اور سمیونووسک گاؤں کے درمیان مربوط صفیں بنائے کھڑے تھے۔ سارے محاذ پر ان کی توپیں مسلسل دہاڑ رہی تھیں اور فضا کو دھواں دار بنا رہی تھیں۔ یہ اب لڑائی نہیں رہی تھی بلکہ قتل عام تھا جس کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں نہ فرانسیسیوں کا کوئی بھلا تھا اور نہ روسیوں کا۔

نپولین نے لگام کھینچ کر گھوڑا روک لیا اور ایک بار پھر اپنی ادھیڑ بن میں کھو گیا جس سے برتھیئے نے اسے جگایا۔ اس کے روبرو اور دائیں بائیں جو کچھ ہو رہا تھا، وہ اسے روک نہیں سکتا تھا حالانکہ بظاہر یہ سب کچھ اسی کا کیا دھرا تھا اور اس کے جاری رہنے کا انحصار بھی اسی پر تھا۔ کامیابی کے فقدان کے پیش نظر اسے پہلی مرتبہ یہ سب غیر ضروری اور ہولناک نظر آیا۔

ایک جرنیل گھوڑا دوڑاتے نپولین کے پاس آیا۔ اس نے بڑی جرأت سے اپنی قیادت میں اولڈ گارڈز کو معرکے میں لڑانے کی پیشکش کی۔ نے (Ney) اور برتھیئے نے، جو نپولین کے قریب کھڑے تھے، آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کیا اور اس قسم کی لچر اور بے ہودہ تجویز پر مسکرا دیے۔

نپولین کا سر جھک گیا اور وہ تا دیر خاموش کھڑا رہا۔

"میرا اپنے گارڈز کو فرانس سے آٹھ سو لیگ دور تہس نہس کرانے کا کوئی ارادہ نہیں،" اس نے کہا۔
اس نے اپنا گھوڑا موڑا اور شیوار دینو کی سمت واپس چل پڑا۔

35

کوتوزوف سر جھکائے اور اپنے بھاری بھرکم جسم کو ڈھیلا چھوڑے غالیچے میں لپٹے اسی بنچ پر بیٹھا تھا، جہاں پیئر نے صبح اسے دیکھا تھا۔ وہ کوئی احکام جاری نہیں کر رہا تھا بلکہ جب بھی اسے کوئی تجویز پیش کی جاتی، وہ اس پر محض اپنی رضا مندی یا نا رضا مندی کا اظہار کرنے پر اکتفا کرتا۔

"ہاں، ہاں، یہی کرو۔" وہ مختلف تجاویز کے بارے میں جواب دیتا۔ "ہاں، ہاں، برخوردار، ذرا جاؤ اور اپنی آنکھوں سے دیکھ آؤ۔" وہ اپنے مصاحبین میں سے کبھی ایک سے اور کبھی دوسرے سے کہتا۔ یا "نہیں، بالکل نہیں، بہتر ہے کہ ہم انتظار کریں۔" جو اطلاعات اس کے پاس لائی جاتیں، وہ انھیں سنتا اور اگر کوئی ماتحت ہدایات کا طالب ہوتا، وہ اسے مناسب ہدایات دیتا۔ لیکن جب وہ رپورٹیں سن رہا ہوتا، بظاہر یہی نظر آتا کہ اسے ان میں اتنی دلچسپی نہیں جتنی ان کی ادائیگی یا رپورٹ سنانے والے کے لہجے سے ہے۔

طول طویل فوجی تجربے نے اسے یہ ذہن نشین کرا دیا تھا اور پیرانہ سالی کی دانش مندی نے اسے یہ باور کرا دیا تھا کہ جب لاکھوں انسان موت و حیات کے معرکے میں برسرِ پیکار ہوں، کسی فردِ واحد کے لیے ان سب کو ہدایات دینا ناممکن ہے، اور وہ جانتا تھا کہ لڑائی کے نتیجے کا انحصار نہ اس بات پر ہوتا ہے کہ کمانڈر انچیف فوجوں کی تقسیم کس طرح کرتا ہے اور مختلف دستے کہاں کہاں تعینات کرتا ہے اور نہ اس بات پر کہ توپیں کتنی استعمال ہوئی ہیں یا اشخاص کتنے ہلاک ہوئے ہیں، بلکہ اس کا انحصار اس غیر مرئی قوت پر ہوتا ہے۔ جسے فوج کا جذبہ کہا جاتا ہے، وہ اسی قوت پر دھیان دیتا تھا، حتی المقدور اس کی رہنمائی کرتا اور اسے صحیح راستے پر ڈالتا تھا۔

کوتوزوف کے چہرے بشرے سے عام طور پر یہی ظاہر ہوتا کہ وہ نہایت انہماک اور سکون سے توجہ دے رہا ہے اور اگر اس کے بوڑھے اور ناتواں جسم کے لیے تھکن پر قابو پانا مشکل ہو جاتا، تو اس کا اظہار یوں ہوتا کہ اس کے چہرے کی رگیں تن جاتیں۔

گیارہ بجے اسے یہ خبر پہنچائی گئی کہ جن تیر نما دمدموں پر فرانسیسیوں نے قبضہ کر لیا تھا، انھیں دوبارہ چھڑا لیا گیا ہے لیکن پرنس باگ راتیاں زخمی ہو گیا ہے۔ کوتوزوف کی سسکی نکل گئی اور اس نے افسوس کا اظہار کرنے کے لیے اپنے سر کو جنبش دی۔

"گھوڑا بھگاؤ، پرنس پیوتر ایوانووچ[78] کے پاس جاؤ اور تفصیلات معلوم کرو،" اس نے اپنے ایک ایجوٹنٹ سے کہا۔ پھر وہ ڈیوک آف ورٹم برگ[79(الف)] کی طرف، جو اس کے پیچھے کھڑا تھا، متوجہ ہوا اور بولا:

"یوئر ہائی نس، آپ پہلی فوج کی کمان سنبھال لیں گے؟"

ڈیوک کی روانگی کے کچھ ہی دیر بعد ۔ درحقیقت اتنی جلدی کہ وہ سمیونووسک پہنچ بھی نہیں پایا ہوگا ۔ اس کا ایجوٹنٹ واپس آ گیا اور بتانے لگا کہ ڈیوک کو مزید فوج درکار ہے۔

کوتوزوف کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس نے دختوروف کو پیغام بھجوا دیا کہ فوج کی کمان وہ سنبھال لے اور ڈیوک کو۔ جس کے متعلق اس نے یہ کہا کہ اس نازک موقع پر اسے اس کی اشد ضرورت ہے۔ واپس بھیج دے۔[79(ب)]

جب کوتوزوف کو یہ اطلاع ملی کہ موغا کو قیدی بنا لیا گیا ہے،[80] وہ مسکرا دیا۔

''حضرات، ذرا انتظار کر لیں،'' اس نے کہا۔ ''جنگ کا پانسا ہمارے حق میں پلٹ چکا ہے۔ موغا کی گرفتاری سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ تاہم خوشیاں منانے سے پہلے کچھ دیر انتظار کرنا بہتر ہے۔''

پھر بھی اس نے عام فوجیوں تک یہ خبر پہنچانے کے لیے اپنا ایک ایجوٹنٹ بھیج دیا۔

جب بائیں بازو سے شربینن (Shcherbinin) گھوڑا دوڑاتے یہ خبر لایا کہ فرانسیسیوں نے تیر نما دمدموں اور سمیونووسک پر قبضہ کر لیا ہے، کوتوزوف نے لڑائی کی آوازوں اور شربینن کے چہرے کے تاثرات سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ خبر بری ہے اور وہ یوں اٹھ کر کھڑا ہو گیا جیسے اپنی ٹانگیں سیدھی کرنا چاہتا ہو۔ اس نے شربینن کو بازو سے پکڑا اور اسے ایک طرف لے گیا۔

''مائی ڈیئر فیلو،'' اس نے یرمالوف سے کہا ''دیکھیں کہ کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں۔''

کوتوزوف گورکی میں تھا اور یہ گاؤں روسی پوزیشنوں کے وسط میں تھا۔ نپولین نے ہمارے میسرے پر حملہ کرایا تھا، اسے کئی بار پسپا کیا جا چکا تھا۔ جہاں تک قلب کا تعلق ہے، فرانسیسی بارودینو سے آگے نہیں بڑھ سکتے تھے اور ان کے اپنے میسرے کو یواروف کے سواروں نے مار بھگایا تھا۔

لگ بھگ تین بجے فرانسیسی حملے رک گئے۔ جو لوگ میدان جنگ سے آئے تھے اور جو کوتوزوف کے اردگرد حلقہ بنائے کھڑے تھے، ان سب کے چہروں پر شدید تناؤ کے آثار نظر آ رہے تھے۔ اس روز جو کامیابی حاصل ہوئی تھی، وہ اس کی توقعات سے بڑھ کر تھی اور وہ اس پر مطمئن تھا۔ تاہم بڑے میاں کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ کئی بار اس کا سر یوں جھولا جیسے وہ ابھی نیچے گر پڑے گا اور اسے غنودگی آ گئی۔ اس کے سامنے اس کا ڈنر رکھ دیا گیا۔

جب کوتوزوف ڈنر کھا رہا تھا، ایجوٹنٹ وول سٹوگن، جسے پرنس آندرے نے اتفاقاً یہ کہتے سنا تھا، ''لڑائی وسیع علاقے پر پھیلا دینا چاہیے۔'' اور جس سے باگ راتیاں اتنی شدید نفرت کرتا تھا، گھوڑا دوڑاتے آیا۔ وول ٹسوگن کو بارکلے دَتولی نے بھیجا تھا اور وہ بائیں بازو پر لڑائی کی صورت حال کے بارے میں اطلاع دینے آیا تھا۔ زیرک اور تیز فہم دَتولی نے زخمیوں کی ٹولیوں کو پیچھے بھاگتے اور فوج کے عقب کو تتر بتر ہوتے دیکھ کر تمام حالات کا جائزہ لیا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ لڑائی ہاری جا چکی ہے۔ چنانچہ اس نے اپنے چہیتے افسر کو اس خبر کے ساتھ کوتوزوف کے پاس بھیج دیا۔

کوتوزوف نے، جسے مرغ کی ٹانگ چبانے میں دقت پیش آ رہی تھی، ایسی نگاہوں سے، جو دل لگی کے

احساس سے سکڑ گئی تھیں، وول ٹسوگن کو دیکھا۔

وول ٹسوگن نے لاابالی طریق سے اپنی ٹانگیں تان کر سیدھی کیں اور نیم تمسخرانہ انداز سے مسکراتا کوتوزوف کے قریب پہنچا۔ اس نے سلام کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن وہ بمشکل ٹوپی کو چھو رہا تھا۔ وہ ہز سیرین ہائی نس سے کسی حد تک مصنوعی بے نیازی کا برتاؤ کر رہا تھا جس کا مقصد یہ دکھانا تھا کہ اعلیٰ تربیت یافتہ فوجی کی حیثیت سے اس نے یہ فریضہ روسیوں کے سپرد کر دیا ہے کہ وہ اس کام کے نہ کاج کے پیرِ فرتوت کو دیوتا بنا کر اس کی پرستش کرتے رہیں لیکن وہ خود خوب سمجھتا ہے کہ وہ کس قسم کے شخص سے نبٹ رہا ہے۔ "Der alte Herr"* (جرمن جب بھی اس کا آپس میں ذکر کرتے، اسی لقب سے کرتے)، ''خوب مزے کر رہا ہے، اسے کسی چیز کی فکر ہی نہیں۔'' وول ٹسوگن نے سوچا اور کوتوزوف کے سامنے جو ڈشیں پڑی تھیں، انھیں درشت نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بائیں بازو کی صورت حال کے بارے میں، جیسا کہ بارکلے دَتولی نے اسے بتایا تھا اور جیسا کہ اس نے خود دیکھا تھا، ''بڈھے صاحب'' کو رپورٹ پیش کرنے لگا۔

''ہماری پوزیشن کے تمام مقامات دشمن کے ہاتھوں میں چلے گئے ہیں اور اسے پیچھے نہیں دھکیلا جا سکتا کیونکہ اسے پیچھے دھکیلنے کے لیے سپاہ درکار ہے اور سپاہ ہمارے پاس ہے نہیں۔ جوان فرار ہو رہے ہیں اور انھیں روکنا ناممکن ہو گیا ہے۔''

کوتوزوف ہڈی چباتے چباتے رک گیا اور اسے یوں تعجب سے دیکھنے لگا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آیا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ وول ٹسوگن نے جب ''بڈھے صاحب'' کی گھبراہٹ دیکھی، وہ مسکرایا اور گویا ہوا:

''میں سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میں نے دیکھا ہے، اگر میں نے اسے یوئر ہائی نس سے چھپانے کی کوشش کی، تو یہ صحیح کام نہیں ہوگا... فوج کے پاؤں اکھڑ چکے ہیں اور وہ افراتفری میں تتر بتر ہو رہی ہے—''

''کیا دیکھا ہے—کیا دیکھا ہے تم نے؟'' کوتوزوف نے چلا کر پوچھا۔ اس نے شعلہ بار نگاہوں سے وول ٹسوگن کو دیکھا، عجلت سے اپنی جگہ سے اٹھا اور اس کی طرف بڑھا۔ ''تمھیں—تمھیں یہ جرأت کیسے ہوئی؟'' اس نے گلوگیر لہجے سے کہا اور اپنے کانپتے ہوئے بازو تہدیدآمیز انداز سے اوپر اٹھائے۔ ''حضور، تمھیں میرے سامنے اس قسم کی بات کرنے کی جرأت کیسے ہوئی؟ تمھیں اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ جاؤ اور جا کر بارکلے کو میری طرف سے بتا دو کہ ان کی اطلاعات صحیح نہیں ہیں۔ لڑائی حقیقتاً کیا رخ اختیار کر رہی ہے، اس کے متعلق مجھے، کمانڈر انچیف کو، ان سے بہتر علم ہے۔''

وول ٹسوگن ترکی بہ ترکی جواب دینا چاہتا تھا لیکن کوتوزوف نے اسے ٹوک دیا۔

''دشمن بائیں جانب سے پیچھے دھکیل دیا گیا ہے اور دائیں جانب اسے شکست دی جا چکی ہے۔ حضور، اگر تمھیں ڈھنگ سے کچھ نظر نہیں آتا، پھر جو کچھ تمھیں معلوم ہے، اس کا ذکر کرنے کی زحمت نہ کرو۔ چنانچہ مہربانی

* بڈھا صاحب

فرمائو، واپس جنرل بارکلے کے پاس جاؤ اور انھیں بتاؤ کہ میرا ارادہ کل دشمن پر حملہ کرنے کا ہے،'' کوتوزوف نے کہا۔
سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ جو واحد آواز سنائی دے رہی تھی، وہ بوڑھے جرنیل کے ہانپنے کی تھی۔
''انھیں تمام مقامات سے پسپا کیا جا چکا ہے۔ اس کے لیے میں خداوند کا شکر بجا لاتا ہوں اور اپنی بہادر افواج کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ دشمن پٹ چکا ہے اور کل ہم اسے روس کی مقدس سرزمین سے باہر دھکیل دیں گے،'' کوتوزوف نے کہا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ اچانک اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور اس کی آہ نکل گئی۔

دول ٹسوگن نے کندھے اچکائے، ہونٹ سکیڑے اور چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ اسے ''بڈھے صاحب'' کے خبط پر تعجب ہو رہا تھا۔

''آہا، میرا ہیرو آ گیا! بہت اعلیٰ!'' کوتوزوف نے ایک لحیم شحیم اور خوبرو جرنیل کو، جس کے بال سیاہ تھے اور جو اسی لمحے پہاڑی پر پہنچا تھا، دیکھ کر کہا۔

یہ رائیف سکی تھا۔ وہ سارا دن بارودینو میدان کے انتہائی خطرناک مقام پر موجود رہا تھا۔
رائیف سکی نے اطلاع دی کہ سپاہ مضبوطی سے قدم جمائے اپنی جگہ کھڑی ہے اور فرانسیسی مزید حملے کرنے کا خطرہ مول نہیں لے رہے۔
اس کی بات سن کر کوتوزوف نے فرانسیسی میں کہا:
''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ بعض دوسرے لوگوں کے خیالات کے برعکس تمھاری رائے میں ہم پیچھے ہٹنے پر مجبور نہیں ہوں گے۔''
''بالکل نہیں، یوئر ہائی نس، اس کے برعکس میں یہ سمجھتا ہوں کہ جس لڑائی کا ابھی فیصلہ نہ ہوا ہو، اس میں کامیابی اس فریق کے حصے میں آتی ہے، جو اپنی جگہ پر ڈٹا رہتا ہے،'' رائیف سکی نے جواب دیا۔ ''اور میرے خیال میں...''

''کیساروف!'' کوتوزوف نے اپنے ایجوٹنٹ کو آواز دی۔ ''بیٹھو اور کل کے لیے فوج کے نام فرمان لکھو۔ اور تم'' اس نے دوسرے ایجوٹنٹ کی طرف مخاطب ہو کر کہا، ''تم گھوڑے پر جنگ کے محاذ پر جاؤ اور اعلان کر دو کہ کل ہم حملہ کریں گے۔''

جب کوتوزوف رائیف سکی سے باتیں کر رہا اور فرمانِ یوم لکھوا رہا تھا، وول ٹسوگن واپس آ گیا اور اس نے کہا کہ فیلڈ مارشل نے جو حکم جاری کیا ہے، جنرل بارکلے دَتولی اس کی توثیق چاہتے ہیں۔
کوتوزوف نے وول ٹسوگن کی جانب دیکھے بغیر ہدایت کی کہ حکم تحریر کر دیا جائے۔ سابق کمانڈر انچیف کو اس کی یوں ضرورت تھی کیونکہ وہ ہر قسم کی ذمے داری سے پہلو بچانا چاہتا تھا۔
اور اس پراسرار یک جہتی کے ذریعے، جس کی تعریف متعین کرنا ناممکن ہے مگر جو پوری فوج میں یکساں

مزاجی کیفیت، جسے فوج کا جذبہ یا ولولہ کہا جاتا ہے، برقرار رکھتی ہے اور جو جنگ کا سب سے بڑا وسیلہ فراہم کرتی ہے، کوتوزوف کا فرمان آناً فاناً فوج کے تمام حصوں تک پہنچا دیا گیا۔

الفاظ — فرمان کی صحیح شکل — جب زنجیر کی آخری کڑی تک پہنچے، ہرگز وہ نہیں تھے جو ابتدا میں استعمال ہوئے تھے۔ مختلف یونٹوں میں منہ زبانی جو فرمان گردش کر رہا تھا، وہ قطعاً اس صورت میں نہیں تھا جس صورت میں کوتوزوف نے اسے جاری کیا تھا لیکن اس کے الفاظ کا مفہوم فوج کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ ضرور گیا کیونکہ جو کچھ اس نے کہا تھا وہ کسی زیرک سوچ بچار کا نتیجہ نہیں تھا بلکہ ایک ایسے احساس کا اظہار تھا، جو کمانڈر انچیف اور ہر روسی کے دل کی آواز تھا۔

اور جب انھیں معلوم ہوا کہ کل انھیں حملہ کرنا ہے اور جس چیز پر وہ یقین کرنا چاہتے تھے، اس کی فوج کے اعلیٰ ترین حلقوں سے تصدیق ہوئی ہے، تھکے ماندہ اور گھبراہٹ کے شکار جوانوں کو نیا حوصلہ اور اطمینان حاصل ہو گیا۔

36

پرنس آندرے کی رجمنٹ ریزرو دستوں میں شامل تھی۔ اگرچہ ان دستوں پر آرٹلری کی زبردست فائرنگ ہوتی رہی، تاہم ایک بجے تک ان سے کوئی کام نہ لیا گیا اور یہ سمیونووسک کے عقب میں بیکار کھڑے رہے۔ ایک بجے کے قریب پرنس آندرے کی رجمنٹ کو، جو اس وقت تک دو سو سے زائد جوانوں سے محروم ہو چکی تھی، رائی کے روندے ہوئے کھیت میں آگے بڑھایا گیا۔ یہ کھیت سمیونووسک اور بیٹری کی پہاڑی کے مابین درّے میں تھا۔ یہی وہ مقام تھا جہاں اس روز ہزاروں انسان خاک وخون میں غلطاں ہو گئے اور جہاں ایک اور دو بجے کے درمیان غنیم کی سینکڑوں توپیں شدید گولہ باری کر رہی تھیں۔

یہیں رجمنٹ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی ہلے اور ایک بھی گولی چلائے بغیر اپنی مزید تہائی نفری سے محروم ہو گئی۔ سامنے، خاص طور پر دائیں جانب، توپوں کی دنادن مسلسل گونج رہی تھی اور اس پراسرار خطۂ زمین پر، جو مستقلاً دھوئیں کی چادر میں لپٹا ہوا تھا، سنسناتے توپوں کے تیز رفتار گولے اور سیٹیاں بجاتے نسبتاً کم رفتار گرینیڈ متواتر اڑتے چلے آرہے تھے۔ کبھی کبھی پندرہ منٹ تک گولے اور گرینیڈ (کوئی گزند پہنچائے بغیر) جوانوں کے سروں کے اوپر ہی اوپر گزرتے رہتے جیسے وہ انھیں وقتی طور پر مہلت دینا چاہتے ہوں لیکن دوسرے لحات کے دوران میں ایک منٹ کے اندر اندر رجمنٹ کے متعدد جوان ڈھیر ہو جاتے اور ان کے اجسام کے پرخچے اڑ جاتے۔ لاشیں مسلسل گھسیٹ گھسیٹ کر ہٹائی جاتی رہیں اور مجروحین کو اٹھا اٹھا کر پیچھے پہنچایا جاتا رہا۔

ہر نئے دھماکے کے ساتھ باقیوں کے زندہ بچ رہنے کے امکانات کم تر ہو جاتے۔ رجمنٹ کی بٹالینوں کے حساب سے صف بندی کی گئی تھی۔ بٹالین اور بٹالین کے مابین تین سو قدم کا فاصلہ تھا۔ پھر بھی ساری رجمنٹ کی ذہنی کیفیت ایک سی تھی۔ سبھی کو ایک ہی نوعیت کی چپ لگی ہوئی تھی اور سبھی پر یکساں قسم کی افسردگی طاری تھی۔ صفوں

میں شاید ہی کوئی شخص بات کرتا تھا اور وہ بھی اس وقت، جب کوئی گولہ یا گرینیڈ براہ راست ان پر گرتا اور ''سٹریچر، سٹریچر'' کی آوازیں بلند ہونے لگتیں، فی الفور خاموش ہو جاتا۔

اپنے افسروں کے حکم پر جوانوں نے زیادہ تر وقت زمین پر بیٹھ کر گزارا۔ ایک نے اپنی سموری ٹوپی اتاری، نہایت احتیاط سے اس کی لائننگ ڈھیلی کی اور اس کے دھاگے دوبارہ کس دیے۔ دوسرے نے کچھ مٹی اپنی ہتھیلی پر مسلی اور اپنی سنگین چمکانے لگا۔ تیسرے نے اپنی کارتوسوں کی پیٹی آگے پیچھے کھینچی اور اس کے بکسوئے کس دیے۔ چوتھے نے اپنی ٹانگوں کی پٹیاں کھولیں، ان کی شکنیں درست کیں، انھیں ایک بار پھر ٹانگوں پر باندھا اور اپنے بوٹ دوبارہ اوپر چڑھا لیے۔ بعض ہل پھرے کھیت کے ڈھیلوں یا فصل کے بچے کھچے اور مڑے تڑے ڈنٹھلوں سے گھروندے تعمیر کرتے رہے۔ سبھی اس قسم کی یا ان سے ملتی جلتی سرگرمیوں میں مصروف و منہمک نظر آ رہے تھے۔ جب جوان ہلاک یا زخمی ہو جاتے، سٹریچر اٹھا کر صفوں سے باہر لے جائے جاتے۔ ہمارے بعض جوان محاذ جنگ سے پیچھے ہٹ کر آتے یا دھوئیں میں دشمن کے فوجیوں کے پرے کے پرے دکھائی دیتے، ان پر کوئی شخص ذرا بھی دھیان نہ دیتا۔ لیکن جب ہماری آٹلری یا گھڑسوار فوج آگے بڑھتی، یا پیادہ فوج اوپر جاتی دکھائی دیتی، چاروں اطراف سے تحسین و آفرین کے کلمات سنائی دینے لگتے۔ تاہم سب سے زیادہ پرجوش توجہ ان خارجی واقعات کو دی جاتی، جن کا لڑائی سے نام کو بھی تعلق نہیں ہوتا تھا، گویا کہ ان جوانوں کو، جن کے حوصلے خاصے پست ہو چکے تھے، روزمرہ کی زندگی کی غیر اہم معمولات میں ہی تسکین مل رہی تھی۔

رجمنٹ کے سامنے سے آرٹلری کی بیٹری گزری۔ ایک گھوڑی کی، جو بارود کے چھکڑے میں جتی ہوئی تھی، ٹانگ راس میں پھنس گئی۔

''ابے، دیکھتے نہیں، گھوڑی کی ٹانگ راس میں پھنس گئی ہے... اس کی ٹانگ چھڑاتے کیوں نہیں؟... ابے، گر پڑے گی... تمھارے دیدے نہیں؟'' محاذ جنگ کے ساتھ ساتھ اس قسم کا تبصرہ سارا دن جاری رہا۔

ایک اور وقت سب کی توجہ چھوٹے سے شتری کتے کی جانب مبذول ہوگئی — خدا جانے وہ کہاں سے آ ٹپکا تھا۔ وہ اپنی دم اکڑائے رجمنٹ کے سامنے خاصا تیز بھاگا جا رہا تھا۔ اچانک اس کے قریب توپ کا گولہ گرا۔ اس نے زور سے چیخ ماری، ٹانگوں میں دم دبائی اور اتنی تیز رفتار سے بھاگنے لگا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ہوا سے باتیں کر رہا ہے۔ ساری رجمنٹ کا ہنس ہنس کر برا حال ہو گیا اور تمام جوان زور زور سے چیخنے اور نعرے لگانے لگے۔ لیکن اس قسم کے تفریحی مشاغل صرف چند منٹ جاری رہتے اور ان انسانوں کے، جو کھائے پیے بغیر آٹھ گھنٹوں سے بیکار بیٹھے تھے اور جن پر پیہم موت کا خوف سوار تھا، زرد اور پژمردہ چہرے مزید زرد اور پژمردہ ہو جاتے۔

رجمنٹ کے دوسرے لوگوں کی طرح پرنس آندرے کا چہرہ بھی زرد اور پژمردہ تھا۔ وہ جئی کے کھیت کے آگے چراگاہ میں، سر جھکائے اور ہاتھ پشت پر باندھے، ایک سرے سے دوسرے سرے تک چکر لگا رہا تھا۔ اس کے پاس جاری کرنے کے لیے کوئی حکم نہیں تھا اور نہ اسے کوئی کام تھا۔ ہر چیز خود بخود ہو رہی تھی۔ محاذ سے لاشیں گھسیٹ کر اور

مجروحین اٹھا کر لائے جاتے۔ جب یہ سب کچھ ہو جاتا، صفیں اپنے آپ درست ہو جاتیں۔ اگر کوئی فوجی جوان بھاگ کر پیچھے جاتا، فوراً ہی واپس پلٹ آتا۔ پہلے پہل پرنس آندرے نے اپنا یہ فرض گردانا کہ وہ اپنے جوانوں کا حوصلہ بلند رکھے اور ان کے سامنے مثال پیش کرے۔ چنانچہ وہ بار بار صفوں کے مابین چکر لگاتا رہا، لیکن اسے بہت جلد یقین ہو گیا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا اور انھیں اس سے کچھ بھی سیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں دیگر فوجی جوانوں کی طرح اس کی روح کی تمام قوتیں غیر شعوری طور پر اپنے ذہن کو صورت حال کی ہولناکیوں سے دور رکھنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ وہ پاؤں گھسیٹتا، گھاس میں سرسراہٹ پیدا کرتا اور اس گرد و غبار کے بارے میں، جو اس کے بوٹوں پر جم گیا تھا، سوچتا چراگاہ میں ادھر ادھر گھوم پھر رہا تھا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ان پگڈنڈیوں پر، جو گھسیاروں کے قدموں نے وہاں بنا دی تھی، چلنے لگتا۔ تب وہ اپنے قدم گننے اور دل میں یہ حساب لگانے لگتا کہ اسے ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے لیے چراگاہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کتنے چکر لگانا ہوں گے۔ کبھی وہ افسنتین کے، جن کے پودے کھیت کی باڑ کے ساتھ ساتھ اگے ہوئے تھے، پھول توڑتا، انھیں اپنی ہتھیلیوں کے مابین مسلتا اور ان کی تند و تیز، تلخ ترش اور شیریں خوشبو سونگھتا۔ گزشتہ روز اس نے عرق ریزی سے خیالات کا جو محل کھڑا کیا تھا، اب اس کا کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ وہ کسی چیز کے بھی بارے میں قطعاً کچھ نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ ایسے کانوں سے، جو ایک ہی قسم کی آوازیں سن سن کر پک چکے تھے، سنتا اور گونا گوں اقسام کے بموں، گولوں اور گولیوں کے، جو سنسناتی اور سیٹیاں بجاتی اڑی جا رہی ہوتیں، مابین امتیاز کرنے کی کوشش کرنے لگتا اور پہلی بٹالین کے جوانوں کے اکتا دینے والی حد تک شناسا چہروں کو تکنے لگتا۔ "وہ آئی... یہ ہم پر گرے گی!" اس نے دھوئیں سے لبریز علاقے میں کسی اڑتی چیز کی سنسناہٹ سن کر سوچا۔ "ایک! ایک اور! مزید ایک... وہ گری..." وہ رک گیا اور صفوں پر نظریں دوڑانے لگا۔ "نہیں، یہ آگے نکل گئی ہے... لیکن وہ، وہ کسی سے ٹکرا گئی ہے!" اور وہ ایک بار پھر چکر کاٹنے لگا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ سولہ قدموں میں دوسرے سرے پر پہنچ جائے۔

سرسراہٹ سنائی دی اور دھماکے سے کچھ گرا! اس سے پانچ قدم دور توپ کے گولے نے زمین کا سینہ شق کر دیا۔ اس پر کپکپاہٹ طاری ہو گئی اور خوف نے اس پر غلبہ پا لیا۔ اس نے سرسری نگاہوں سے صفوں کی جانب دیکھا۔ شاید کچھ لوگ اس کا نشانہ بن گئے تھے۔ دوسری بٹالین کے قریب خاصا بڑا ہجوم اکٹھا ہو گیا تھا۔

"ایجوٹنٹ!" اس نے چلا کر آواز دی۔ "ان لوگوں سے کہو کہ ایک جگہ اتنا جمگھٹا نہ کریں۔"

ایجوٹنٹ نے حکم کی تعمیل کی اور پرنس آندرے کی جانب چل پڑا۔ دوسری طرف سے بٹالین کمانڈر آ گیا۔ وہ گھوڑے پر سوار تھا۔

"بچ کر!" ایک سپاہی نے چلا کر کہا۔ اس کی آواز میں دہشت تھی۔ اور کسی پرندے کی طرح جو پھڑ پھڑاتا زمین کی طرف لپکتا ہے، ایک شیل قریب قریب کوئی شور کیے بغیر پرنس آندرے سے صرف دو قدم پرے جا گرا، سب سے پہلے گھوڑے نے، جسے اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ خوف کا اظہار کرنا صحیح ہے یا غلط، اپنا ردعمل ظاہر

کیا۔ اس کے نتھنے پھڑ پھڑائے، اس نے اپنی اگلی ٹانگیں اوپر اٹھائیں اور اپنے سوار، میجر، کو تقریباً گراتا بھاگ کھڑا ہوا۔ گھوڑے کی دہشت جوانوں میں بھی سرایت کر گئی۔

''نیچے لیٹ جاؤ!'' ایجوٹنٹ نے چلا کر کہا اور خود بھی زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

پرنس آندرے نے تامل کیا۔ دھواں اگلتا شیل، جو ہل پھرے کھیت اور چراگاہ کے درمیان افسنتین کے پودوں کے جھنڈ پر گرا تھا، اس کے اور منہ کے بل لیٹے ایجوٹنٹ کے مابین لٹو کی طرح گھومنے لگا۔

''کیا یہ موت بن سکتا ہے؟'' پرنس آندرے نے کچھ ایسی حسرت سے، جس کا وہ عادی نہیں تھا، گھاس، افسنتین اور پھر دھوئیں کی اس پتلی لکیر کی طرف دیکھا، جو گھومتے، چکر کاٹتے سیاہ گولے سے مرغولے کی شکل میں اوپر اٹھ رہی تھی۔ ''میں مر نہیں سکتا، میں مرنا نہیں چاہتا، میں زندگی سے پیار کرتا ہوں... مجھے اس گھاس، اس زمین، اس ہوا سے پیار ہے...''

عین اس وقت، جب یہ خیالات اس کے ذہن میں آ رہے تھے، اسے یاد آیا کہ لوگ اس کی جانب دیکھ رہے ہیں۔

''محترم، یہ بڑی شرم کی بات ہے!'' اس نے ایجوٹنٹ سے کہا۔ ''یہ کس قسم کی۔۔''

اس نے اپنی بات مکمل نہ کی۔ زبردست دھماکہ ہوا اور ایسی آوازیں سنائی دیں جیسے دریچے کے چوکھٹے کو پاش پاش کیا جا رہا ہو۔ اس کے ساتھ بارود کی گلا گھونٹ دینے والی بو پھیل گئی۔ پرنس آندرے کو جھٹکا لگا، وہ ایک طرف اچھلا اور اپنا بازو فضا میں اٹھاتا منہ کے بل نیچے آ گرا۔

متعدد افسر اس کی طرف بھاگے۔ اس کے پیٹ کی داہنی جانب سے خون کا فوارہ ابل پڑا اور گھاس رنگین ہونے لگی۔

ملیشیا کے جوان، جنھیں طلب کیا گیا تھا، سٹریچر اٹھائے، افسروں کے پیچھے کھڑے ہو گئے۔ پرنس آندرے منہ اوندھا کیے چھاتی کے بل گھاس پر لیٹا ہوا تھا اور اسے سانس لینے میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

''اب انتظار کس بات کا؟ آگے آؤ!''

کسان آگے بڑھے۔ انھوں نے پرنس آندرے کے کندھوں اور ٹانگوں پر ہاتھ ڈالے لیکن وہ بری طرح کراہ رہا تھا۔ ملیشیا کے جوانوں نے آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کیا اور اسے پھر نیچے لٹا دیا۔

''انھیں اٹھاؤ، اٹھاؤ، اٹھاؤ انھیں، اٹھاؤ!'' کسی نے چلا چلا کر کہا۔

انھوں نے دوبارہ اسے کندھوں سے پکڑا، اوپر اٹھایا اور سٹریچر پر لٹا دیا۔

''اف، میرے خدایا، میرے خدایا!... کہاں؟ پیٹ میں؟''

''بس، یہ اب گئے!... اف، خدایا!'' افسر چیخ پکار کرتے سنائی دیے۔

''یہ زن زن کرتا میرے کان کے بالکل قریب سے گزر گیا۔ بس ذرا سی خراش آئی!'' ایجوٹنٹ نے کہا۔

کسانوں نے سٹریچر اپنے کندھوں پر درست کیا اور اس پگڈنڈی پر چلنے لگے، جو ڈریسنگ سٹیشن کے چکر کاٹتے کاٹتے ان کے پاؤں نے بنادی تھی۔

''قدم سے قدم ملا کر چلو!... یہ کسان!'' ایک افسر نے گلا پھاڑ کر کہا۔ اس نے ان میں سے ایک کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا تا کہ وہ بے ربط قدموں میں، جن سے سٹریچر ہچکولے کھا رہا تھا، کسی طور تال میل پیدا کر سکے۔

''فیودر، قدم ملا کر چلو! اے، فیودر!'' سب سے اگلے کسان نے کہا۔

''سن لیا! ملا لیے ہیں!'' پچھلے نے کہا۔ وہ خوش تھا کہ اس کے قدم باقیوں سے مل گئے ہیں۔

''یوئر ایکسی لینسی! اُف! پرنس!'' تموخن نے کپکپاتی آواز میں کہا۔ وہ بھاگم بھاگ آیا تھا اور اب سٹریچر پر نگاہیں جمائے ہوئے تھا۔

''پرنس آندرے نے آنکھیں کھولیں اور سٹریچر کی، جس پر اس کا سر پچھلی جانب ڈھلک گیا تھا، گہرائیوں میں سے متکلم کی جانب دیکھا اور اس کے پپوٹے دوبارہ بند ہو گئے۔

ملیشیا کے جوان پرنس آندرے کو جنگل کے قریب مرہم پٹی کے مرکز میں لے گئے۔ ڈریسنگ سٹیشن تین خیموں پر مشتمل تھا، جنھیں برچ کے درختوں کے جھنڈ کے قریب گاڑا گیا تھا۔ خیموں کے پردے اٹھا کر پیچھے باندھ دیے گئے تھے۔ ایمبولینس گاڑیاں اور گھوڑے درختوں کے بیچ میں کھڑے تھے۔ گھوڑے دانہ کھا رہے تھے اور ان کی گٹھلیوں سے جو دانے باہر گر پڑتے تھے، انھیں اٹھانے کے لیے چڑیاں نیچے جھپٹ پڑتی تھیں۔ کوے، جنھیں خون کی بو آ رہی تھی، درختوں کے آس پاس منڈلا رہے تھے اور انھوں نے اپنی کائیں کائیں سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ خیموں کے چاروں اطراف پانچ ایکڑ سے زیادہ رقبے پر مختلف لباس پہنے لوگ کھڑے، بیٹھے یا لیٹے ہوئے تھے۔ ان کے ابدان خون آلود تھے۔ سٹریچر بردار ہجوم در ہجوم کھڑے انھیں مغموم نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ جن افسروں کا کام نظم وضبط کی پابندی کرانا تھا، وہ انھیں منتشر کرنے کی بہتیری کوشش کرتے لیکن ناکام رہتے۔ یہ لوگ اپنے سٹریچروں سے ٹیک لگائے، بڑی توجہ اور انہماک سے یوں سامنے نظریں جمائے ہوئے تھے جیسے وہ اس منظر کی، جس کا وہ مشاہدہ کر رہے تھے، پیچیدہ اہمیت سمجھنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ خیموں سے بلند اور غصیلی چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں اور ان میں پر ملال سسکیوں اور آہوں کی آمیزش ہو رہی تھی۔ وقفے وقفے کے بعد ڈاکٹر کا اسسٹنٹ پانی لینے یا یہ بتانے کہ اب کسے اندر لایا جائے، بھاگم بھاگ باہر آتا۔ جو مجروحین خیموں کے باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے، بھرّائی ہوئی آوازوں میں آہیں بھر رہے تھے، رو رہے تھے، چلا رہے تھے، کفر بک رہے تھے اور ووڈکا کی بھیک مانگ رہے تھے۔ بعضوں کی کیفیت ہذیانی ہو رہی تھی۔

پرنس آندرے کے حمال، مجروحین کو، جن کے زخموں کی ابھی تک مرہم پٹی نہیں ہوئی تھی، پاؤں تلے روندتے رجمنٹ کے کمانڈر کی حیثیت سے اسے ایک خیمے کے قریب لے آئے، یہاں وہ رک گئے اور ہدایات کا انتظار کرنے لگے۔ پرنس آندرے نے اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن کافی عرصے تک وہ بالکل سمجھ نہ پایا کہ اس کے گرد وپیش کیا ہو

رہا ہے۔ اسے چراگاہ، افسنتین کا جھنڈ، ہل پھرا کھیت، لٹو کی طرح گھومتا سیاہ گولہ یاد آئے اور اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس کے دل میں زندہ رہنے کی پرجوش امنگ اچانک بیدار ہوگئی تھی۔

اس سے کوئی دو قدم کے فاصلے پر ایک دراز قد اور خوب رو نان کمشنڈ افسر، جس کے بال سیاہ تھے، سر پر پٹی باندھے درخت کے تنے سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ اس کے سر اور ایک ٹانگ میں گولیوں کے زخم تھے۔ وہ بہت اونچی آواز میں باتیں کر رہا تھا اور سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا رہا تھا۔ زخمیوں اور سٹریچر برداروں کا خاصا بڑا ہجوم اس کے ارد گرد جمع ہو گیا تھا اور وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اسے نہایت شوق سے سن رہا تھا۔

''ہم نے اسے مار مار کر اس کا وہ بھرکس نکالا کہ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ اٹھا۔ بلکہ ہم نے خود بادشاہ کو بھی پکڑ لیا۔'' اس نے اپنے گرد وپیش دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ بہت جوش میں آچکا تھا اور اس کی آنکھیں جگمگانے لگی تھیں۔ ''یقین مانیں اگر اس وقت ریزرو دستے آجاتے، تو ڈھونڈے اس کا نام ونشاں تک نہ ملتا۔''

متکلم کے قریب جو لوگ تھے، ان سب کی طرح پرنس آندرے کی آنکھوں میں بھی چمک آگئی تھی۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا اور اسے قدرے اطمینان کا احساس ہو رہا تھا۔

''لیکن اب یہ سب کچھ بے معنی نہیں ہوگیا؟'' اس نے سوچا۔ ''وہاں حالات کس قسم کے ہوں گے ... اور یہاں صورت حال کیا ہے؟ مجھے زندگی کو خیر باد کہنے میں اتنا تامل کیوں تھا؟ اس زندگی میں کوئی چیز ایسی ہے جسے میں سمجھ نہیں پایا اور نہ اب مجھے اس کی سمجھ آرہی ہے۔''

37

ایک ڈاکٹر خیمے سے باہر آیا۔ اس کا ایپرن اور ہاتھ خون سے تربتر تھے۔ وہ انگوٹھے اور چھنگلی سے سگار پکڑے ہوئے تھا تاکہ اس پر خون کے دھبے نہ پڑسکیں۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور زخمیوں کے اوپر ہی اوپر چاروں اطراف نگاہیں گھمائیں۔ بظاہر وہ تھوڑی دیر کے لیے کام سے چھٹکارا چاہتا تھا۔ جب وہ اپنی گردن ادھر ادھر گھما چکا، اس نے آہ بھری اور نیچے دیکھنے لگا۔

''بہت اچھا، آجاؤ۔'' اس نے اپنے اسٹنٹ کو، جس نے اس کی توجہ پرنس آندرے کی طرف دلائی تھی، جواب دیا اور اس سے کہا: ''ہاں، انھیں اندر لے آؤ۔''

جو مجروحین، اپنی باری کے منتظر تھے، بڑبڑانے لگے۔

''معلوم ہوتا ہے کہ اگلی دنیا میں بھی انھیں بڑے لوگوں کا راج ہوگا۔''

پرنس آندرے کو اندر پہنچانے کے بعد میز پر لٹا دیا گیا۔ یہ میز ابھی ابھی خالی ہوئی تھی اور ڈریسر اسے دھو رہا تھا۔ کیمپ میں کیا کچھ تھا، وہ اسے پوری طرح سمجھ نہ سکا۔ چاروں اطراف جو دل خراش آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور خود اس کے اپنے پیٹ اور ٹانگ میں جو درد ہو رہا تھا، اس سے اس کی توجہ بٹ جاتی تھی۔ اپنے گرد وپیش اسے جو

چیز بھی نظر آتی، معلوم ہوتا کہ وہ ایک ہی عمومی تاثر میں گھل مل گئی ہے کہ خیمہ اسی طرح برہنہ اور خوں چکاں اجسام سے بھرا نظر آتا ہے جس طرح چند ہفتے قبل اگست کی اس گرم شام اسے سمولنسک روڈ کے قریب غلیظ تالاب میں اجسام سے پر دکھائی دیا تھا۔ ہاں، یہ بھی اسی قسم کا گوشت پوست تھا، وہی Chair a canon*، جسے دیکھ کر اس کے دل پر دہشت سوار ہو گئی تھی۔ کچھ یوں نظر آتا تھا کہ جو کچھ وہ اب دیکھ رہا تھا، اسے اس کی پیشگی خبر ہو گئی تھی۔

خیمے میں تین میزیں تھیں۔ دو فارغ نہیں تھیں۔ تیسری پر انھوں نے پرنس آندرے کو لٹا دیا۔ کچھ دیر کے لیے جب اسے تنہا چھوڑ دیا گیا، وہ غیر ارادی طور پر یہ دیکھنے لگا کہ دوسری میزوں پر کیا ہو رہا ہے۔ جو میز اس کے قریب ترین تھی، اس پر ایک تاتار بیٹھا تھا۔ اس کے قریب جو وردی پڑی تھی، اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ غالباً قازق ہے۔ اسے چار سپاہیوں نے تھام رکھا تھا جب کہ ڈاکٹر چشمہ چڑھائے اس کی گٹھیلی گندمی کمر میں چیرا دے رہا تھا۔

''ہائے، ہائے! ارے مار دیا!'' تاتار واویلا کر رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنا گندمی چہرہ اوپر اٹھایا، جس پر چھوٹی اور چپٹی ناک تھی اور جس کے رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ اپنے سفید دانت ننگے کیے۔ اس کا جسم بل کھانے اور پھڑکنے لگا، اور اس نے کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی بڑی لمبی چیخ ماری۔

دوسری میز کے ارد گرد لوگوں کا جمگھٹا تھا۔ اس پر ایک بھاری بھرکم لحیم شحیم شخص سر نہوڑائے پڑا تھا۔ پرنس آندرے کو اس کے سر کی ساخت، شکل اور اس کے بالوں کی رنگت اور گھنگھریالے پن میں عجیب قسم کی شناسائی نظر آئی۔ اسے نیچے دبائے رکھنے کے لیے متعدد ڈریسر اس کے سینے پر جھکے ہوئے تھے۔ اسے جب دورہ پڑتا، اس کی ایک لمبی، سفید اور فربہ ٹانگ پر تشنج کی کیفیت طاری ہو جاتی اور وہ پھڑکنے لگتی۔ وہ آدمی سسکیاں لے رہا تھا اور اس پر لرزہ طاری تھا۔ دو سرجن — ان میں ایک زرد رو تھا اور اس کا جسم کانپ رہا تھا — اس کی دوسری ٹانگ کے ساتھ، جو لہولہان تھی، چپ چاپ کچھ کر رہے تھے۔

جب معنگ ڈاکٹر تاتار سے، جس پر اوورکوٹ ڈال دیا گیا تھا، فراغت پا چکا، وہ ہاتھ پونچھتا پرنس آندرے کی طرف آیا۔ اس نے پرنس آندرے پر اچٹتی نظر ڈالی اور عجلت سے پیچھے ہٹ گیا۔

''ان کے کپڑے اتار دو۔ جلدی کرو۔ میرا منہ کیا تک رہے ہو؟'' اس نے غصے سے اسسٹنٹ سے چلا کر کہا۔

جب اسسٹنٹ آستینیں چڑھائے پھرتی سے پرنس آندرے کے بٹن کھولنے اور اس کے کپڑے اتارنے لگا، اسے اپنی بالکل ابتدائی طفولیت کا زمانہ، جو اب قصہ پارینہ بن چکا تھا اور ماضی کے دھندلکوں میں کھو چکا تھا، یاد آ گیا۔ ڈاکٹر زخم کے اوپر جھکا، اس نے آلہ چھو کر اس کی گہرائی معلوم کی اور لمبی سانس لی۔ پھر اس نے کسی کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ پرنس آندرے کے پیٹ میں جو ناقابل برداشت درد ہو رہا تھا، اس نے اس پر بے ہوشی طاری کر دی۔ جب اسے ہوش آیا، اس کی ٹانگ سے ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں کی کرچیاں نکالی جا چکی تھیں، کٹا پھٹا گوشت قطع کیا جا چکا تھا اور زخم پر پٹی باندھی جا چکی تھی۔ اس کے چہرے پر پانی چھڑکا جا رہا تھا۔ جونہی اس نے آنکھیں کھولیں،

---

* توپ کا چارہ

ڈاکٹر اس کے اوپر جھکا، اس کے ہونٹوں پر بوسہ دیا اور ایک لفظ کہے بغیر بالتعجیل وہاں سے کھسک گیا۔

پرنس آندرے جس قسم کے کرب میں سے گزرا تھا، اس کے بعد اسے جو سکون نصیب ہوا، اس کا اسے مدتوں تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اس کی زندگی کے بہترین اور انتہائی مسرت بخش لمحات — خاص طور پر ابتدائی طفولیت کا عہد، جب اس کے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اسے بستر پر لٹا دیا جاتا تھا، نرس گا گا کر اسے لوریاں سناتی، وہ اپنا سر تکیے میں چھپا لیتا اور محض یہ احساس کہ وہ زندہ ہے، اس کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑا دیتا — اس کے ذہن میں گردش کرنے لگے جیسے وہ ماضی کی چیزیں نہ ہوں، بلکہ عصر حاضر کی حقیقت ہوں۔

ڈاکٹر کسی زخمی پر پوری توجہ اور انہماک سے کام کر رہے تھے۔ اس زخمی کا سر آندرے کو جانا پہچانا معلوم ہوا۔ وہ اسے اوپر اٹھا رہے اور اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''مجھے دکھاؤ، مجھے دکھاؤ — ہائے، ہائے... ہا۔ ئے!'' اس کی آہوں اور کراہوں سے دہشت زدگی کا اظہار ہو رہا تھا اور جس انداز سے وہ نالہ و شیون بپا کر رہا تھا، اس سے مترشح ہو رہا تھا کہ وہ بنیادی طور پر گھٹیا اور اوچھا آدمی ہے۔

اس شخص کی ہائے وائے سن کر پرنس آندرے کا جی چاہنے لگا کہ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دے۔ چونکہ وہ کوئی کارنامہ سرانجام دیے بغیر اس جہان فانی سے رخصت ہو رہا تھا، یا اسے یہ زندگی اتنی عزیز تھی کہ وہ اس سے ہاتھ دھونا نہیں چاہتا تھا، یا اسے بچپن کا وہ زمانہ، جو لوٹ کر کبھی واپس نہیں آ سکتا تھا، یاد آ رہا تھا، یا یہ کہ وہ اذیت میں مبتلا تھا، دوسرے لوگ اذیت میں مبتلا تھے، یا یہ شخص اتنے رقت انگیز انداز سے ہائے وائے کر رہا تھا — وجہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ بہر حال بچوں کی طرح رونا، معصوم، تقریباً مسرت سے بھرپور، آنسو بہانا چاہتا تھا۔

مجروح شخص کو اس کی قطع شدہ ٹانگ دکھا دی گئی۔ اس پر خون جما ہوا تھا اور پاؤں میں بوٹ تھا۔

''میرے خدایا! یہ کیا ہے؟ یہ یہاں کیوں ہے؟'' پرنس آندرے نے اپنے آپ سے پوچھا۔

اس مصیبت کے مارے، سسکیاں بھرتے، بے حوصلہ شخص میں، جس کی ٹانگ ابھی ابھی قطع کی گئی تھی، پرنس آندرے نے اناطول کوراگن کو پہچان لیا۔ یہ بالکل اناطول تھا جسے انھوں نے بازوؤں میں تھام رکھا تھا اور جسے وہ پانی کا گلاس پیش کر رہے تھے لیکن جس کے کپکپاتے سوجے ہوئے ہونٹ اس کا کنارہ پکڑنے سے عاجز تھے۔ اناطول کی آہ نکل گئی اور اس کا جسم بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا۔ ''ہاں، یہ وہی ہے! ہاں، اس شخص کا کسی نہ کسی طور مجھ سے گہرا اور تکلیف دہ تعلق ہے،'' پرنس آندرے نے سوچا۔ تاہم وہ ابھی تک صحیح طور پر یہ اندازہ نہیں کر سکا تھا کہ اس نے اپنے سامنے جس شخص کو دیکھا ہے، وہ فی الحقیقت ہے کون۔ ''اس شخص کا میرے بچپن سے، میری زندگی سے کیا تعلق ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن اسے جواب نہ مل سکا۔ اچانک بچپن، پاکیزگی اور محبت کی اس مملکت میں بالکل نئی اور غیر متوقع یاد در آئی اور پرنس آندرے کے ذہن میں گھومنے لگی۔ اسے وہ نتاشا یاد آئی، جس سے وہ اولین بار 1810 میں بال پر ملا تھا۔ مہین گردن، دبلے پتلے بازو، سہا سہا ہشاش بشاش چہرہ، جو جوش مسرت سے بے خود ہونے کے لیے تیار تھا۔ اور اس کے دل میں اس کے لیے محبت اور شفقت کا جذبہ بیدار ہو گیا، جو پہلے

کی نسبت کہیں زیادہ توانا اور جاندار تھا۔ اب اسے وہ تعلق یاد آیا جو اس کے اور اس شخص کے مابین تھا، جو آنسوؤں میں سے، جن سے اس کی سوجی ہوئی آنکھیں لبریز تھی، اسے دیکھ رہا تھا اور اس مخمصے میں پھنسا ہوا تھا کہ یہ کون ہے۔ پرنس آندرے کو سب کچھ یاد آ گیا اور اس کے مسرت سے معمور دل میں اس شخص کے لیے زبردست محبت اور رحم کا چشمہ پھوٹ پڑا۔

پرنس آندرے کو اب مزید ضبط کا یارانہ رہا۔ سارے بندھن ٹوٹ گئے۔ وہ بے اختیار اپنے ساتھی انسانوں کے لیے، اپنے لیے، ان کی اور اپنی غلطیوں پر، محبت اور شفقت کے آنسو بہانے لگا۔

''عفو، رحم اور محبت، اپنے بھائیوں کے لیے، ان کے لیے جو ہم سے محبت کرتے ہیں اور ان کے لیے جو ہم سے نفرت کرتے ہیں، محبت ہمارے دشمنوں کے لیے — ہاں، وہی محبت، جس کی خداوند نے روئے زمین پر تبلیغ کی، جو پرنس ماریا نے مجھے سکھانے کی کوشش کی اور جسے میں سمجھ نہ سکا — زندگی سے دست کشی اختیار کرنا مجھے جو اچھا نہ لگا، وہ محض اسی کی وجہ سے تھا، اگر میں مزید زندہ رہا تو میرے لیے یہی کچھ باقی رہ جائے گا مگر اب بہت تاخیر ہو چکی ہے، مجھے معلوم ہے۔''

38

ایک طرف میدان جنگ، جو لاشوں اور زخمیوں سے پٹا پڑا تھا، بھیانک منظر پیش کر رہا تھا۔ ادھر نپولین کو سر میں گرانی محسوس ہو رہی تھی، اوپر سے اسے خبر ملی کہ تقریباً بیس جرنیل جنھیں وہ ذاتی طور پر جانتا تھا، ہلاک شدگان یا مجروحین میں شامل ہیں۔ پھر اسے یہ احساس بھی کھائے جا رہا تھا کہ اس کی فوج، جس کی کبھی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، اب بے دست و پا ہو چکی ہے۔ یہ سب باتیں مل ملا کر نپولین پر، جسے عام طور پر اپنی ذہنی قوت کا امتحان لینے کے لیے (جیسا کہ وہ سمجھتا تھا) زخمیوں اور ہلاک شدگان کے بارے میں دیر تک سوچ بچار کرنا پسند تھا، غیر متوقع انداز سے اثر انداز ہوئیں۔ نپولین بڑی سے بڑی مصیبت میں کبھی گھبرایا نہیں تھا۔ اس کے خیال میں اس کے اسی وصف سے اس کی عظمت اور وقعت تشکیل پاتی تھی، لیکن اس روز میدان جنگ کا مہیب اور لرزہ خیز منظر وہ بھی برداشت نہ کر سکا۔ اس نے میدان کارزار سے بہ عجلت روانہ ہونے میں ہی عافیت جانی اور وہ شیواردینو کے ٹیلے کی جانب چل پڑا۔ وہاں وہ کیمپ سٹول پر بیٹھ گیا اور نگاہیں جھکا کر غیر ارادی طور پر فائرنگ کی آواز سننے لگا۔ اس کا چہرہ پیلا، پھولا ہوا اور بھاری تھا۔ آنکھوں کی چمک کافور ہو چکی تھی، ناک سرخ ہو رہی تھی اور جب وہ بات کرتا، اس کی آواز بھرّا جاتی۔

وہ تکلیف دہ آزردگی کے ساتھ اس کارزار کے، جس کی ابتدا تو اس کے ہاتھوں ہوئی تھی لیکن جسے ختم کرنا اس کے بس کی بات نہ رہا تھا، اختتام پذیر ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ زندگی کے اس جعلی سراب پر، جس کا وہ اتنے عرصے سے پانی بھرتا چلا آیا تھا، وقتی طور پر ہی، قدرتی انسانی جذبہ حاوی ہو گیا۔ اس نے میدان جنگ میں جن اموات اور مصائب کا مشاہدہ کیا تھا، وہ انھیں اپنی ذات میں محسوس کرنے لگا۔ اسے اپنے سر اور سینے میں جس گرانی کا احساس ہو

رہا تھا، اس سے اسے یہ اندازہ ہوا کہ یہ موت اور مصیبت خود اسے بھی اپنے شکنجے میں جکڑ سکتی ہے۔ اس لمحے اسے ماسکو، نصرت یا نام و نمود کی کوئی تمنا باقی نہیں رہ گئی تھی۔ (اسے مزید نام و نمود کی ضرورت ہی کیا تھی؟) واحد چیز، جس کی اب اسے خواہش تھی، وہ آرام، سکون اور فراغت تھے لیکن جب وہ سمیونووسک کی پہاڑی پر تھا، آرٹلری کے کمانڈر نے اسے تجویز پیش کی تھی کہ اس بلند مقام پر متعدد بیٹریاں نصب کر دی جائیں تاکہ روسیوں پر، جو کنیاز کادو کے سامنے اکٹھے ہو گئے تھے، شدید فائرنگ کی جا سکے، تو اس نے رضامندی کا اظہار کر دیا تھا اور اس نے حکم دیا تھا کہ اس فائرنگ کے نتائج سے اسے آگاہ کیا جاتا رہے۔

ایک ایجوٹنٹ گھوڑا بھگاتا نپولین کے پاس پہنچا اور اس نے بتایا کہ ہز میجسٹی کے حکم پر دو سو توپیں روسیوں پر فائرنگ کر رہی ہیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے، اپنی جگہ ڈٹے کھڑے ہیں۔

''ہماری فائرنگ سے ان کی صفوں کی صفیں نیست و نابود ہو رہی ہیں لیکن وہ ہیں کہ وہاں سے ہل ہی نہیں رہے۔''

''اور چاہئیں؟'' نپولین نے بیٹھی ہوئی آواز سے پوچھا۔

''کیا فرمایا، عالی جاہ؟'' ایجوٹنٹ نے کہا، جو نپولین کے الفاظ صحیح طور پر نہیں سن سکا تھا۔

''انھیں اور چاہئیں؟'' نپولین نے بیٹھی ہوئی آواز میں اپنے الفاظ ترش روئی سے دہرائے۔ ''دے دو!''

اس کے حکم کے بغیر ہی (اس نے یہ حکم محض اس لیے دیا تھا کہ کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس سے اسی کی توقع کی جا رہی ہے) پہلے ہی اس کی خواہش کی تکمیل ہو رہی تھی اور وہ ایک بار پھر عظمت کے خوابوں کی مصنوعی دنیا میں کھو گیا اور اس نے (کولھو کے بیل کی طرح، جو یہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے، اپنی مرضی سے کر رہا ہے) بلا چون و چرا اس سفاک، ضرر رساں، ملال انگیز اور انسانیت کش کردار کو، جس کی انجام دہی اس کا مقدر تھا، دوبارہ سنبھال لیا۔

اس شخص کا، جس پر کسی دوسرے شخص کی نسبت، اس سب کچھ کا جو ہو رہا تھا، کہیں زیادہ بھاری بوجھ لدا ہوا تھا، ذہن اور ضمیر محض اس روز اور اس لمحے ہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہے تھے بلکہ اپنی زندگی کے آخری لحات تک وہ اچھائی، خوبصورتی، سچائی یا اپنے افعال کی، جو اچھائی اور سچائی کے بالکل منافی تھے، اہمیت سمجھنے میں ناکام رہا۔ وہ ہر اس چیز سے، جو انسان میں انسانیت پیدا کرتی ہے، اتنا دور رہا کہ اس کی معنویت اس کے پلے ہی نہ پڑ سکی۔ بھلے آدھی دنیا اس کے افعال کی تعریف میں رطب اللساں رہے، وہ یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ چنانچہ وہ سچائی، اچھائی، خوبصورتی اور ہر قسم کی انسانیت سے قطع تعلق کرنے پر مجبور رہا۔

اس روز جب وہ میدان جنگ کا، جو مقتولوں اور زخمیوں سے پٹا پڑا تھا (اس کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی کے مطابق ہوا ہے)، چکر لگا رہا تھا اور یہ معلوم کر رہا تھا کہ ایک فرانسیسی کے مقابلے میں کتنے روسی گھائل یا ہلاک ہوئے ہیں اور جب اسے یہ اندازہ ہوا کہ روسیوں کا اتلافِ جسم و جان فرانسیسیوں سے پانچ گنا زیادہ ہے، تو اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا اور وہ فریب نفس میں مبتلا ہو گیا، میں اور اس نے سرخوشی کے عالم میں یہ لکھ کر پیرس بھیجا: ''میدان جنگ نہایت زبردست منظر پیش کر رہا تھا'' کیونکہ وہاں ہزار لاشیں پڑی تھیں۔ اس کی یہ ذہنی کیفیت اس پر اسی روز

وارد نہیں ہوئی تھی، بلکہ سینٹ ہیلینا[81] کے جزیرے کی پرسکون تنہائی میں، جہاں اس نے یہ کہا تھا کہ اس کا ارادہ فرصت کے اوقات اپنے عظیم کارناموں کی تفصیل قلم بند کرنے میں صرف کرنے کا ہے، اس نے تحریر کیا:

''روسی جنگ کو عصرِ جدید کی مقبول ترین جنگ ہونا چاہیے تھا۔ یہ جنگ عقلِ سلیم اور حقیقی مفادات کی جنگ تھی۔ اس کے ذریعے سب کے لیے شانتی اور تحفظ فراہم کرنا، امن قائم کرنا اور پرانی قدروں کو محفوظ کرنا مقصود تھا۔

اس جنگ کے پس پردہ عظیم مقصد کارفرما تھا کہ بے یقینیاں ختم کی جائیں اور تحفظ کی ابتدا کی جائے۔ اس سے نیا افق طلوع ہو جاتا نئی کوششوں کا، جو سب کی بھلائی اور خوشحالی کے لیے ہوتیں، آغاز ہو جاتا۔ یورپی نظام پہلے ہی قائم ہو چکا تھا، اب اسے صرف منظم کرنے کا کام باقی رہ گیا تھا۔

اگر ان نکات کی تکمیل ہو جاتی اور ہر جگہ امن قائم ہو جاتا، میں بھی اپنی کانگرس[82] منعقد کرتا اور اپنا میثاقِ مقدس[83] معرضِ وجود میں لے آتا۔ یہ تصورات میرے تھے، چرا دوسروں نے لیے۔ خود مختار حکمرانوں کے اس عظیم اجتماع میں ہم اپنے مفادات پر خاندان کی طرح بحث ومباحثہ کرتے اور اپنی اپنی اقوام کے سامنے اسی طرح جواب دہ ہوتے جس طرح منشی اپنے آقا کے سامنے ہوتا ہے۔

اس طرح یورپ صحیح معنوں میں ایک حقیقت بن جاتا اور وہ قوم واحد کے سانچے میں ڈھل جاتا۔ جو شخص جہاں بھی سفر کرتا، اپنے آپ کو مشترکہ وطن میں پاتا۔ میں اصرار کرتا کہ ان تمام دریاؤں میں، جن میں جہازرانی ہو سکتی ہے، سب کو جہاز چلانے کی آزادی ہو، سمندروں پر سب کی مشترکہ حکمرانی ہو اور موجودہ عظیم افواج میں اس حد تک تخفیف کر دی جائے کہ وہ حکمرانوں کی محض باڈی گارڈ بن کر رہ جائیں۔

عظیم، طاقتور، پرامن، پرشکوہ، جلیل القدر وطن، فرانس کی گود میں واپس پہنچ کر میں یہ اعلان کر دیتا کہ اس کی سرحدیں اٹل اور ناقابلِ تبدیل ہیں، مستقبل کی جنگیں خالصتاً دفاعی ہوں گی، تمام نئی توسیعات وطن دشمن گردانی جائیں گی۔ میں اپنے بیٹے کو امپراطوریہ کے امور میں اپنا ساجھی بنا لیتا۔ میری آمریت ختم ہو جاتی اور اس کی آئینی حکمرانی کا دور شروع ہو جاتا...

پیرس دنیا کا صدر مقام بن جاتا اور فرانسیسی اقوام عالم کے لیے باعثِ رشک بن جاتے!...

پھر میری فرصت کے اوقات، بڑھاپے کے ایام اور وہ زمانہ، جب میرا بیٹا حکمرانی کے آداب سیکھ رہا ہوتا، امپراطورہ کی معیت میں امپراطوریہ کے کونے کونے کا دورہ کرنے میں صرف کرتا۔ سچے دیہاتی باشندوں کی طرح ہمیں کوئی جلد بازی نہ ہوتی، ہمارے پاس اپنے گھوڑے ہوتے اور ہم آرام آرام سے سفر کرتے۔ لوگوں کی شکایات سنتے، زیادتیوں کا مداوا کرتے، جہاں کہیں جاتے، عوام کی بہبود کے لیے کام کرتے اور جگہ جگہ سرکاری عمارات تعمیر کراتے۔

اس شخص نے، جسے مشیتِ ایزدی نے اقوام کے جلاّد کا افسوس ناک اور ناگزیر کردار ادا کرنے کے لیے پیشگی چن لیا تھا، اپنے آپ کو قائل کر لیا کہ اس کے افعال کا محرک اقوام کی فلاح و بہبود ہے، وہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کے مقدر کو کنٹرول کر سکتا اور اپنے اختیارات کو بروئے کار لا کر انھیں فوائد سے بہرہ ور کر سکتا ہے۔

''ان چار لاکھ اشخاص میں سے، جنھوں نے وستولا عبور کیا (اس نے جنگ روس کے متعلق مزید لکھا)، نصف آسٹریائی، پرشیائی، سیکسن، پولستانی، بواریائی[84]، ورٹم برگی، میکلن برگی، ہسپانوی، اطالوی اور نیپلی تھے۔ اصل شاہی فوج کا تیسرا حصہ ولندیزیوں، بلجیموں، رائن لینڈ کے باسیوں، پیدمونتیوں سوستانیوں، جنیویوں، تسکانیوں، رومیوں، اور بریمن اور ہمبرگیوں وغیرہ کے بتیسویں فوجی ڈویژن پر مشتمل تھا۔ ان میں وہ لوگ، جو فرانسیسی بولتے تھے، ان کی تعداد بمشکل ایک لاکھ چالیس ہزار ہوگی۔ روسی مہم میں فرانس کے پچاس ہزار سے کم افراد لقمۂ اجل بنے جب کہ ولنا سے پسپائی اختیار کرنے کی تاریخ سقوطِ ماسکو تک روسیوں کا جانی نقصان فرانس سے چار گناہ زیادہ تھا۔ ماسکو کی آتش زدگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ روسیوں کو ایک لاکھ انسانوں کی قربانی دینا پڑی۔ یہ لوگ جنگلوں میں سردی اور بھوک پیاس سے ہلاک ہوئے۔ اور آخر میں روسیوں کو ماسکو سے دریائے اودر تک کوچ کے دوران میں موسم کی سختیاں بھی جھیلنا پڑیں۔ جب وہ ولنا پہنچے، ان کی تعداد گھٹتے گھٹتے پچاس ہزار رہ گئی اور کالیش[85] میں تو صرف اٹھارہ ہزار پہنچ جائے۔

اس کا خیال تھا کہ روس کے ساتھ جو جنگ ہوئی، وہ اس کے منشا کا نتیجہ تھی۔ جنگ میں جو ہولناکیاں روا رکھی گئیں، وہ اس کی روح کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں۔

جو کچھ وقوع پذیر ہوا، اس نے بڑی جرأت سے اس کی کامل ذمہ داری قبول کی اور اس کے پراگندہ ذہن نے اس کا جواز اس یقین میں ڈھونڈ لیا کہ جو لاکھوں اشخاص موت سے ہم کنار ہوئے، ان میں فرانسیسیوں کی تعداد بواریائیوں یا ہسیوں کی نسبت کم تھی۔

39

مختلف وردیوں میں ملبوس ہزاروں افراد مختلف صورتوں میں کھیتوں اور چراگاہوں —یہ کھیت اور چراگاہیں داوی دوف خاندان اور بعض شاہی غلاموں کی ملکیت تھیں اور ان میں صدیوں سے بارودینو، گورکی، شیوارڈینو اور سیمونووسک کے دیہات کے باشندے فصلیں بوتے اور مویشی چراتے آ رہے تھے— میں مرے پڑے تھے۔ ڈریسنگ سٹیشنوں کے ارد گرد تقریباً تین تین ایکڑ زمین اور گھاس خون سے تربتر ہو چکی تھی۔ مجروح اور غیر مجروح اشخاص کے، جن کا تعلق مختلف یونٹوں سے تھا اور جن کے چہروں پر وحشت ٹپک رہی تھی، ہجوم گھٹتے گھسٹتے پیچھے ہٹ رہے تھے۔

ایک فوج کے جوان موژیسک کی جانب اور دوسری کے والیوائے وو کی طرف پلٹ رہے تھے۔ بعض ہجوموں کو ان کے افسر آگے لے جا رہے تھے جب کہ کچھ اپنی اپنی جگہوں پر ڈٹے ہوئے تھے اور متواتر فائرنگ کر رہے تھے۔

سارے میدان میں، جہاں قبل ازیں صبح کی دھوپ میں سنگینیں چمک رہی تھیں، دھوئیں کے ہلکے پھلکے مرغولے اوپر فضا میں اٹھ رہے تھے، اور پہلے جو اتنا حسین اور درخشاں تھا، اب وہاں کہرے، نمی اور دھوئیں کی چادر تنی ہوئی اور شورے اور خون کی عجیب وغریب سڑاند رچی بسی ہوئی تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھا چکے تھے اور زخمی، ہلاک شدہ، خوف زدہ، تھکے ماندے اور ضعیف الارادہ انسانوں پر پانی کی بوندیں برسنے لگی تھیں، جیسے وہ ان سے کہہ رہی ہوں:

''لوگو، کافی ہو گئی ہے، کافی ہو گئی ہے!... اپنی فکر کرو! یہ تم کیا کر رہے ہو؟''

بھوک اور آرام کے فقدان سے نڈھال دونوں اطراف کے انسانوں کے ذہنوں میں شکوک سر اٹھانے لگے تھے کہ آیا انھیں ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے اور کشتوں کے پشتے لگانے کا عمل جاری رکھنا چاہیے یا نہیں۔ ہر چہرے پر تذبذب کی علامات پڑھی جا سکتی تھیں اور ہر دل میں ایک ہی سوال اٹھ رہا تھا: ''میں کیوں، کس کے لیے، (دوسروں کو) ہلاک کر رہا ہوں اور ہلاک ہو رہا ہوں؟... تم جو جی چاہے کرو، جسے چاہو، مارو، میرا دل بھر چکا ہے!'' شام ہوتے ہوتے یہ خیال ہر دل میں پختہ ہو چکا تھا۔ یہ لوگ جو کچھ کر رہے تھے، کسی بھی لمحے اس کی دہشت ان پر اس حد تک سوار ہو سکتی تھی کہ وہ اچانک ہر چیز چھوڑ چھاڑ سکتے اور جدھر منہ اٹھاتے، ادھر بھاگ سکتے تھے۔

ان لوگوں نے جو کچھ کیا تھا، اگرچہ لڑائی کے اختتام پر اس کی ہولناکی ان پر پوری طرح واضح ہو چکی تھی اور اگر وہ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر راہ فرار اختیار کر لیتے، انھیں بڑی راحت ہوتی، لیکن کوئی پراسرار، ناقابل ادراک قوت انھیں اپنے قابو میں رکھے ہوئے تھی اور بچے کھچے توپچی — ہر تین میں صرف ایک زندہ بچا تھا —، جن کے ابدان پسینے میں شرابور اور خون و بارود میں لتھڑے ہوئے تھے، اب بھی گولے لا رہے، انھیں توپوں میں بھر رہے، نشانے باندھ رہے اور فلیتوں کو آگ لگا رہے تھے، حالانکہ حال ان کا یہ تھا کہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھا رہے اور تھکن سے ہانپ رہے تھے۔ دونوں اطراف سے توپوں کے گولے ابھی تک اسی تیز رفتاری سے اڑ رہے تھے اور اسی سفاکانہ انداز سے انسانی اجسام کے چیتھڑے اڑا رہے تھے، اور وہ لرزہ خیز شغل، جو افراد کی نہیں ذات خداوندی کی، جو انسانوں اور عالموں پر حکومت کرتی ہے، مرضی سے پایہ تکمیل تک پہنچتا ہے، جاری تھا۔

جو شخص بھی روسی فوج کے عقب میں بدنظمی دیکھتا، یہی کہتا کہ فرانسیسی اگر ذرا سی اور کوشش کریں، روسی سپاہ چشم زدن میں نگاہوں سے اوجھل ہو جائے گی۔ اور جو شخص فرانسیسی فوج کا عقب دیکھتا، وہ یہ خیال ظاہر کرتا کہ روسی تھوڑی سی اور کوشش کریں، تو فرانسیسیوں کا دھڑن تختہ ہو جائے گا۔ تاہم نہ فرانسیسیوں اور نہ روسیوں نے یہ کوشش کی۔ جنگ کا شعلہ آہستہ آہستہ جل کر بھسم ہو گیا۔

روسیوں نے یہ کوشش اس لیے نہ کی کہ کیونکہ وہ فرانسیسیوں پر دھاوا نہیں بول رہے تھے۔ لڑائی کے شروع میں وہ محض ماسکو جانے والی شاہراہ پر کھڑے تھے اور یوں غنیم کے راستے میں دیوار بن گئے تھے۔ اور معرکے کے اختتام

پر بھی وہ وہاں بالکل اسی طرح کھڑے تھے جس طرح کہ وہ ابتدا میں کھڑے تھے۔ لیکن اگر روسیوں کا مقصد فرانسیسیوں کو اپنی پوزیشنوں سے نکال باہر کرنا بھی تھا تو ان میں اتنی ہمت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ یہ آخری کوشش کر گزرتے کیونکہ تمام روسی سپاہ کی زبردست دھنائی ہو چکی تھی اور ایک بھی فوجی یونٹ ایسا نہیں تھا جسے لڑائی کے دوران میں نقصان نہ اٹھانا پڑا ہو اور روسیوں کو محض اپنی پوزیشنوں پر ڈٹے رہنے کے لیے اپنی آدھی فوج کٹوانا پڑ گئی۔

فرانسیسی، جنھیں اپنی پندرہ سالہ فتوحات یاد تھیں، جن کا ایمان تھا کہ نپولین ناقابل تسخیر ہے اور جنھیں علم تھا کہ وہ میدان جنگ کے کچھ حصے پر قابض ہو چکے ہیں، اپنی صرف چوتھائی نفری سے محروم ہوئے تھے۔ ان کے گارڈز ۔ جن کی تعداد بیس ہزار تھی ۔ ابھی تک جنگ میں شریک نہیں کیے گئے تھے۔ وہ آسانی سے یہ کوشش کر سکتے تھے۔ چونکہ انھوں نے حملہ کیا ہی اس مقصد کے پیش نظر تھا کہ انھوں نے روسیوں کو اپنی پوزیشنوں سے نکال باہر کرنا ہے، انھیں یہ کوشش کرنا چاہیے تھی کیونکہ جب تک روسی ماسکو جانے والی سڑک پر سد راہ بنے کھڑے تھے، فرانسیسیوں کا مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا اور انھوں نے جو کوششیں کی تھیں اور جو نقصانات اٹھائے تھے، وہ سب بیکار جا رہے تھے۔ لیکن فرانسیسیوں نے یہ کوشش نہ کی۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ اگر نپولین گارڈز کو، جنھیں کوئی نقصان برداشت نہیں کرنا پڑا تھا، استعمال میں لے آتا، وہ لڑائی جیت جاتا۔ اگر نپولین نے گارڈز کو میدان جنگ میں دھکیل دیا ہوتا، پھر کیا ہوتا، اس طرح کی باتیں کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی یہ پوچھے کہ اگر بہار خزاں میں آ جائے، پھر کیا ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا تھا۔ نپولین نے اپنے گارڈز کو اس لیے نہیں روکے رکھا کیونکہ وہ انھیں استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے انھیں اس لیے روکا کیونکہ وہ انھیں استعمال کر ہی نہیں سکتا تھا۔ فرانسیسی فوج کے تمام جرنیل، افسر اور جوان جانتے تھے کہ عسکریوں کا جذبہ ہر آن سست پڑتا جا رہا ہے اور ان حالات میں گارڈز کو لڑائی میں دھکیلنا بیکار تھا۔

یہ صرف اکیلا نپولین ہی نہیں تھا جسے اس بھیانک حقیقت کا احساس ہو رہا تھا کہ اس کی طاقتور فوج بے بسی کا شکار ہو گئی ہے بلکہ اس کی سپاہ کے تمام جرنیلوں اور جوانوں کو، خواہ وہ لڑائی میں شریک ہوئے تھے یا نہیں اور جنھیں گزشتہ معرکوں (جن میں اِس لڑائی کی نسبت صرف دسویں حصہ زور لگانے سے وہ دشمن کو مار بھگاتے تھے) کا تجربہ تھا، اسی وحشت ناک احساس سے دوچار ہونا پڑ رہا تھا۔ اب ان کا واسطہ ایک ایسے حریف سے پڑا تھا جو اپنی نصف نفری کٹوانے کے بعد بھی اپنی جگہ بت بنا کھڑا تھا اور وہ لڑائی کے اختتام پر بھی اتنا ہی ناقابل تسخیر تھا جتنا کہ اس سے پہلے تھا۔ حملہ آور فرانسیسی فوج کی اخلاقی قوت ختم ہو چکی تھی۔ روسیوں کو بارودینو میں جو کامرانی نصیب ہوئی، وہ اس قسم کی کامرانی نہیں تھی جس کا تعین چند ڈنڈوں کے، جن کے سروں پر کپڑے کی دھجیاں لپٹی ہوتی ہیں اور جنھیں عرف عام میں پرچم کہا جاتا ہے، ہاتھ میں آ جانے سے ہوتا ہے یا زمین کے ٹکڑے پر، جہاں فوجیوں کی جماعت کھڑی رہی تھی یا کھڑی تھی، قبضہ ہونے سے ہوتا ہے۔ یہ فتح اخلاقی فتح تھی ۔ اس قسم کی فتح، جو دشمن کو یہ یقین دلا دیتی ہے کہ اس کے حریف کو اس پر اخلاقی برتری حاصل ہے اور وہ خود اخلاقی طور پر نامردی کا شکار ہو چکا ہے۔

فرانسیسی فوج کوایک ایسے جنونی درندے کی طرح، جسے اپنے حملے کے دوران میں مہلک زخم آجاتا ہے، محسوس ہونے لگا کہ اس کا آخری وقت قریب آپہنچا ہے لیکن جس طرح روسی فوج، جو تعداد میں فرانسیسی فوج کا نصف تھی، ڈگمگانے پر مجبور تھی، وہ (فرانسیسی فوج) نہ رکنے پر مجبور تھی۔ اسے شروع میں جو مہمیز مل چکا تھا، اس کی بدولت وہ ماسکو کی طرف چل سکتی تھی اور چلی لیکن وہاں پہنچنے کے بعد اسے اس زخم کی وجہ سے، جو اسے بارودینو میں لگا تھا، روسیوں کی کسی قسم کی کوشش کے بغیر ہی لازماً نیست ونابود ہونا تھا اور اس کا اتنا خون نکلنا تھا کہ اس کے بچ نکلنے کی کوئی صورت رہ ہی نہیں جاتا تھی۔ بارودینو کی لڑائی کا براہ راست نتیجہ یہ تھا کہ نپولین کو بلا سبب ماسکو سے بھاگنا اور اسے اسی شاہراہ سمولنسک کے ساتھ ساتھ، جس پر چل کر وہ ماسکو پہنچا تھا، واپسی کا سفر اختیار کرنا تھا۔ یوں پانچ لاکھ افراد پر مشتمل فوج کو تباہ وبرباد ہونا اور نپولیائی فرانس کو، جسے پہلی مرتبہ جذبے اور جی داری کے اعتبار سے اپنے برتر حریف سے پنجہ آزمائی کرنا پڑی تھی، زوال پذیر ہونا تھا۔

نپولین کی سلطنت

حصہ سوم

1
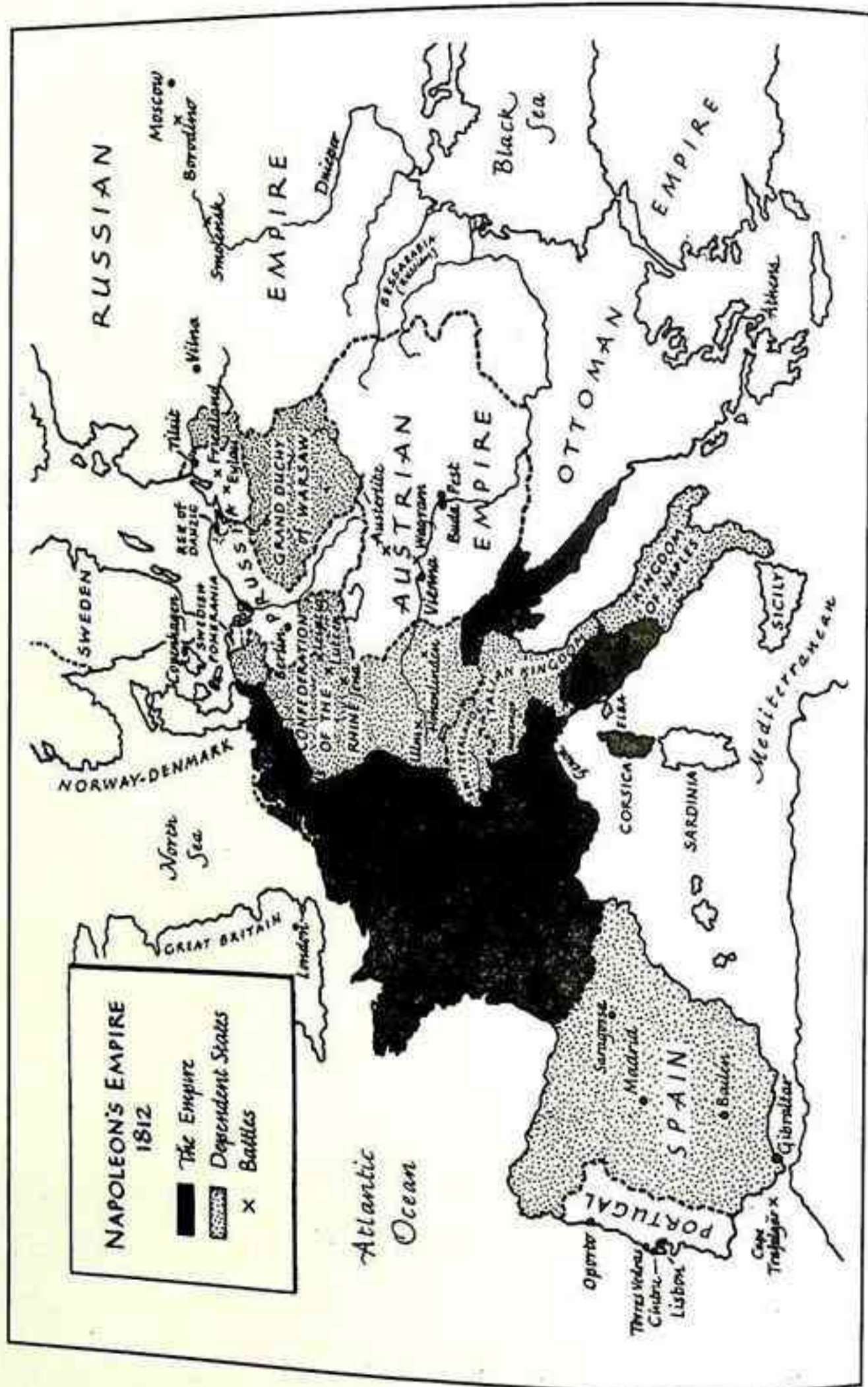
انسانی ذہن کے لیے حرکت کے مطلق تسلسل کا ادراک کرنا ناممکن ہے۔ کسی بھی قسم کی حرکت کے قوانین صرف تبھی انسان کی سمجھ میں آتے ہیں جب وہ اس حرکت کو من مانے طریقے سے توڑ لیتا ہے، اسے اکائیوں میں تقسیم کر دیتا ہے اور پھر ان کا بغور مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن جب وہ حرکت مسلسل کو من مانے انداز سے غیر مسلسل اکائیوں میں منقسم کرتا ہے، اس کا یہی فعل خاصی بڑی انسانی غلطی کا سبب بن جاتا ہے۔

متقدمین کے اس گمراہ کن مغالطے[1] سے ایک دنیا آگاہ ہے کہ اخیلیوس[2] اس کچھوے کو، جو اس سے پہلے روانہ ہوا تھا، کبھی نہ پکڑ سکا، حالانکہ اس کی رفتار کچھوے کی رفتار سے دس گنا زیادہ تھی۔ جس مدت کے دوران میں اخیلیوس اس فاصلے کو، جو اس کے اور کچھوے کے درمیان ہوتا ہے، طے کرتا ہے، کچھوا اس فاصلے کے دسویں حصے کے برابر اور آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ جب اخیلیوس اس دسویں حصے کا سفر ختم کرتا ہے، کچھوے کو سویں حصے کی برتری حاصل ہو جاتی ہے اور یوں یہ سلسلہ لامتناہی ہو جاتا ہے۔ متقدمین کو یہ مسئلہ لاینحل معلوم ہوتا تھا۔ اس استخراج کی، کہ اخیلیوس کبھی کچھوے کو پکڑ نہیں سکتا، مہملیت کی وجہ محض یہ ہے کہ حرکت کو من مانے انداز سے مختلف اکائیوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے جب کہ اخیلیوس اور کچھوا مسلسل حرکت کر رہے ہیں۔

حرکت کو مختصر سے مختصر تر اور مزید مختصر تر اکائیوں میں تقسیم کر کے ہم مسئلے کے حل کی طرف محض قدم بڑھاتے ہیں، اس تک رسائی حاصل نہیں کر پاتے۔ اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ خردترین مقدار موجود ہے، اس مقدار کو دس دس کی ضرب یا تقسیم سے بڑھایا یا گھٹایا جا سکتا ہے، اور ضرب اور تقسیم کا یہ سلسلہ لامحدود طور پر پھیلایا جا سکتا ہے۔ پھر جب ہم ضرب و تقسیم کے اس عمل سے حاصل کردہ نتیجے پر پہنچیں گے، ہمیں مسئلے کا حل مل جائے گا۔ ریاضی کی ایک نئی شاخ معرض وجود میں آئی ہے۔ اس شاخ نے خردترین مقداروں سے نپٹنے کا فن پا لیا ہے، چنانچہ یہ حرکت کے دیگر کہیں زیادہ پیچیدہ مسائل کے، جو ازیں پیشتر لاینحل معلوم ہوتے تھے، حل پیش کرنے لگی ہے۔

ریاضی کی یہ نئی شاخ، جس سے متقدمین لاعلم تھے، حرکت کے مسائل سے عہدہ برآ ہوتے وقت یہ تسلیم کرتی ہے کہ خردترین مقداریں موجود ہو سکتی ہیں اور یوں وہ حرکت کی شرط عظیم (مطلق تسلسل) پورا کر دیتی ہے۔ اس

سے اس ناگزیر غلطی کی تصحیح ہو جاتی ہے جس کا انسانی ذہن، اگر وہ حرکت مسلسل کی بجائے حرکت کو مختلف اکائیوں میں بانٹ کر اس کا جائزہ لیتا ہے، ارتکاب کیے بنا رہ ہی نہیں سکتا۔

تاریخی حرکت کے قوانین دریافت کرنے کے سلسلے میں عین مین یہی اصول کام آتا ہے۔

بنی نوع انسان کی پیش رفت (یا حرکت)، جیسا کہ اس کا طریقہ ہے، ان گنت انسانی عزائم کی رہین منت ہوتی ہے، مسلسل جاری رہتی ہے۔

تاریخ کا مقصد اس پیش رفت (یا حرکت) کے قوانین کی تفہیم ہے لیکن حرکت مسلسل کے ان قوانین کی، جو انسانی عزائم کا حاصل کل ہوتے ہیں، تفہیم کے لیے انسانی ذہن حرکت (یا پیش رفت) کو حرکت مسلسل تصور نہیں کرتا بلکہ وہ من مانے انداز سے اسے جدا جدا اکائیوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔

واقعات تو مسلسل پیش آتے رہتے ہیں اور ان کا سلسلہ کہیں رکتا نہیں۔ مورخ کا پہلا طریق کار یہ ہے کہ وہ ان مسلسل واقعات میں سے چند ایک کو من مانے انداز سے چن لیتا ہے، انھیں دوسروں سے الگ تھلگ کر دیتا ہے اور پھر ان پر غور و فکر کرتا ہے حالانکہ کسی واقعے کی نہ ابتدا ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے کیونکہ ہر واقعہ کسی قسم کے انقطاع کے بغیر دوسرے واقعے کی کوکھ سے جنم لیتا ہے۔ دوسرا طریق کار یہ ہے کہ کسی فردِ واحد— بادشاہ یا سپہ سالار— کے افعال کا جائزہ لیا جاتا ہے جیسے اس کے افعال بے شمار افراد کے عزائم کے حاصل کل کے مساوی ہوں حالانکہ لاتعداد افراد کے ارادوں کا حاصل کُل کا کسی واحد تاریخی شخصیت کے افعال سے اظہار ہو ہی نہیں سکتا۔

علم تاریخ جوں جوں آگے بڑھ رہا ہے، وہ متواتر خُرد سے خُرد تر اکائیوں کا جائزہ لینے لگا ہے اور وہ اس طریقے سے سچائی تک رسائی حاصل کرنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا ہے۔ لیکن یہ اکائی خواہ کتنی ہی خورد کیوں نہ ہو، ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ مفروضہ کہ کوئی اکائی دوسری سے الگ تھلگ ہے، یہ مفروضہ کہ کسی واقعے کی کوئی ابتدا ہے، یا یہ مفروضہ کہ انسانی عزائم کسی واحد تاریخی کردار کے افعال کے ذریعے اظہار پاتے ہیں، فی نفسہٖ غلط ہے۔

تاریخ سے جو نتائج مستنبط ہوتے ہیں، انھیں توڑ پھوڑ کر خاک میں اس طرح ملا دینے کے لیے، کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے، نقاد کو کوئی خاص تردد نہیں کرنا پڑتا۔ اس کے لیے بس اتنا ہی کافی ہے کہ وہ مشاہدے کے موضوع کے لیے بس کوئی بڑی یا چھوٹی اکائی منتخب کر لے— اور اس انتخاب کا اسے پورا پورا حق حاصل ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ اپنے مشاہدے کے لیے جو بھی اکائی منتخب کرتی ہے، من مانے طریقے سے کرتی ہے۔

مشاہدے کے لیے تاریخ کی خُرد ترین اکائی (تاریخ کی جزئیات یعنی انسانوں کے متجانس رجحانات) لے کر اور انھیں باہمی طور پر مربوط کرنے کا فن حاصل کر کے (یعنی ان خُرد ترین اکائیوں کا حاصلِ کُل معلوم کر کے) ہم تاریخ کے قوانین دریافت کرنے کی امید کر سکتے ہیں۔

یورپ میں انیسویں صدی کے پہلے پچاس سال لاکھوں انسانوں کی غیر معمولی نقل وحرکت کا منظر پیش کرتے ہیں۔ لوگ اپنے روایتی اشغال کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ بھاگم بھاگ یورپ کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچتے ہیں۔ ایک دوسرے کو لوٹتے اور خون میں نہلاتے ہیں۔ کامیابیوں سے ہم کنار اور مایوسیوں سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور چند سالوں کے لیے زندگی کا سارا چلن منقلب ہو جاتا ہے اور قومی تحریک کا روپ دھار لیتا ہے۔ یہ تحریک پہلے زور پکڑتی ہے اور پھر مدھم پڑنے لگتی ہے۔ آدمی کے ذہن میں سوال ابھرتا ہے: اس تحریک کے پس پردہ کیا عوامل کارفرما تھے اور یہ کن قوانین کے تابع تھی؟

اس سوال کے جواب میں مورخین ہمیں چند درجن انسانوں کے، جو پیرس کی ایک عمارت میں رہائش پذیر تھے، اقوال وافعال کا مرقع پیش کر دیتے ہیں۔ وہ ان اقوال واعمال کو "انقلاب" کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ہمیں نپولین اور متعدد دیگر اشخاص کی، جو اس کے حامی یا مخالف تھے، زندگیوں کی تفصیلی داستان سنانے لگتے ہیں۔ ان میں بعض آدمیوں نے دوسروں کو جس طرح متاثر کیا تھا، وہ اس کا بھی تذکرہ کرتے ہیں اور ہمیں یہ نوید سناتے ہیں: "یہ تھیں وہ باتیں جو اس تحریک کا باعث بنیں اور یہ اس کے قوانین ہیں۔"

لیکن انسانی ذہن نہ صرف اس قسم کی وضاحت پر یقین کرنے سے انکار کرتا ہے بلکہ دوٹوک اعلان کرتا ہے کہ تعبیر وتشریح کا یہ طریقہ درست نہیں کیونکہ اس میں کمزور شے کو عظیم ترشے کا سبب قرار دیا گیا ہے۔ یہ انسانوں کے انفرادی عزائم کا حاصلِ کُل تھا جو انقلاب اور نپولین کو منصۂ شہود پر لانے کا موجب بنا اور انھی عزائم کے حاصل کل نے پہلے انھیں برداشت کیا اور بعد میں انھیں تباہی کے غار میں دھکیل دیا۔

"لیکن جب کبھی اور جہاں کہیں فتوحات ہوتی ہیں، وہاں فاتح بھی ہوتے ہیں اور جب کبھی اور جہاں کہیں انقلاب برپا ہوتے ہیں، عظیم انسان منظرِ عام پر نمودار ہو جاتے ہیں۔" تاریخ فتویٰ سناتی ہے۔ "جی ہاں۔" عقل انسانی جواب دیتی ہے۔ "جب کبھی فاتح نمودار ہوا، اپنی جلو میں جنگیں لے کر آیا لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ فاتحین جنگوں کا باعث بنے تھے یا کسی فردِ واحد کے ذاتی اشغال میں جنگ کے قوانین دریافت کرنا ممکن ہے۔"

جب کبھی میں اپنی گھڑی پر نظر ڈالتا ہوں اور سوئی دس کے ہندسے کی طرف اشارہ کرتی دکھائی دیتی ہے، میرے کانوں میں قریبی گرجے کی گھنٹیوں کے بجنے کی آوازیں آنے لگتی ہیں لیکن محض اس لیے کہ گھنٹیاں اس وقت بجنا شروع ہوئیں جب میری گھر کی سوئی دس کے ہندسے پر پہنچتی ہے، مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ گھنٹیاں اس لیے حرکت میں آتی ہیں کیونکہ میری گھڑی کی سوئیاں خاص نقطے پر پہنچ چکی ہوتی ہیں۔

میں جب کبھی سٹیم انجن کو متحرک ہوتے دیکھتا ہوں، مجھے سیٹی کی آواز سنائی دیتی ہے، والو (Valve) کھلتے اور پہیے گھومتے دکھائی دیتے ہیں لیکن مجھے یہ نتیجہ اخذ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں کہ سٹیم انجن اس لیے متحرک ہوتا ہے کہ سیٹی بجنے لگی ہے یا پہیے گھومنے لگے ہیں۔

کسان کہتے ہیں کہ بہار کے آخری ایام میں ٹھنڈی ہوا اس لیے چلتی ہے کیونکہ موسم کے اس حصے میں اوک

کے درختوں میں کونپلیں پھوٹنا شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہر موسم بہار میں جب اوک کے درختوں میں کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں، ٹھنڈی ہوا ضرور چلتی ہے اور اگرچہ مجھے یہ معلوم نہیں کہ اوک کے درختوں کی کونپلوں کے پھوٹنے پر ٹھنڈی ہوا کیوں چلنے لگتی ہے، میں کسانوں کی اس رائے سے اتفاق نہیں کر سکتا کہ کونپلوں کا پھوٹنا ٹھنڈی ہوا کے چلنے کا سبب ہے کیونکہ ہوا کی قوت کونپلوں کے اثر و رسوخ سے بالاتر ہے۔ مظاہرِ حیات کے ساتھ اس قسم کے جو واقعات پیش آتے ہیں، میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پیچھے محض اتفاقات کا دخل ہوتا ہے اور میری سمجھ میں یہ بات آتی ہے کہ میں اپنی گھڑی کی سوئیوں، سٹیم انجن کے والوؤں اور پہیوں، اور اوک کی کونپلوں کا خواہ کتنی ہی دیر تک اور کتنے ہی غور سے مطالعہ کروں، میں یہ معلوم نہیں کر سکتا کہ گھنٹیوں کے بجنے، سٹیم انجنوں کے متحرک ہونے اور موسم بہار میں ٹھنڈی ہواؤں کے چلنے کے اسباب کیا ہیں۔ مجھے یہ معلوم کرنے کے لیے اپنا نقطۂ نظر پوری طرح تبدیل کرنا ہوگا اور ان قوانین کا، جو گھنٹیوں کے بجنے، سٹیم انجنوں کے متحرک ہونے اور ہواؤں کے چلنے کے عمل کو منضبط کرتے ہیں، مطالعہ کرنا ہوگا۔ تاریخ کو بھی یہی کرنا چاہیے اور اس سمت میں پہلے ہی کوششیں کی جا چکی ہیں۔

تاریخ کے قوانین کا مطالعہ کرنے کے لیے ہمیں اپنے مشاہدے کا موضوع یکسر تبدیل کرنا ہوگا۔ ہمیں بادشاہوں، وزیروں اور جرنیلوں کو ایک طرف رکھ دینا چاہیے اور ان متجانس اور خُرد ترین عناصر کا، جو عام لوگوں پر اثر انداز ہوتے ہیں، مطالعہ کرنا چاہیے۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ تاریخ کے قوانین کی تفہیم کے لیے اس طرف پیش رفت کرنا انسان کے لیے کہاں تک ممکن ہے لیکن یہ بالکل عیاں ہے کہ صرف اسی ذریعے سے تاریخ کے قوانین کی دریافت ممکن ہے۔ مورخین نے مختلف بادشاہوں، وزیروں اور جرنیلوں کے اعمال و افعال کو بیان کرنے اور ان اعمال و افعال کے متعلق اپنے نظریات وضع کرنے کے لیے جو مساعی کی ہیں، ان کے مقابلے میں انھوں نے اس سمت میں اپنی کوششوں کا صرف دس لاکھواں حصہ صرف کیا ہے۔

2

ایک درجن یورپی ممالک کی افواج روس پر یلغار کر دیتی ہیں۔ روسی سپاہ اور علاقے کے بادشاہ پیچھے ہٹتے جاتے ہیں اور تصادم سے گریز کرتے رہتے ہیں تاآنکہ وہ سمولنسک پہنچ جاتے ہیں۔ وہاں بھی وہ یہی رویہ اختیار کرتے ہیں اور سمولنسک سے بارودینو آ جاتے ہیں۔ فرانسیسی ماسکو کی جانب بڑھنے لگتے ہیں اور ان کی رفتار تیزی پکڑنے لگتی ہے۔ وہ جوں جوں اپنی منزل مقصود کے قریب سے قریب تر آتے جا رہے ہیں، توں توں ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی ہے، بالکل اسی طرح جس طرح وہ چیز، جو اوپر سے نیچے گر رہی ہو، جوں جوں زمین کے قریب تر آتی جاتی ہے توں توں اس کی رفتار بھی تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ ان کے پیچھے فاقہ زدہ، معاند ملک کے سینکڑوں میل ہیں اور ان کے آگے محض چند میل، جو ان کے اور ان کی منزل مقصود کے مابین حائل ہیں۔ نپولین کی فوج کے ایک ایک سپاہی کو اس کا شعور ہے اور یلغار محض اپنی ہی رفتار کے بل پر جاری ہے۔

روسی فوج جتنا زیادہ پیچھے ہٹتی ہے، دشمن کے خلاف اس کے عناد میں اتنی ہی زیادہ شدت آنے لگتی ہے۔ پیچھے ہٹنے سے اس کی قوت گھٹتی نہیں بلکہ بڑھتی ہے اور وہ پہلے کی نسبت مضبوط تر ہو جاتی ہے۔ بارودینو میں تصادم ہوتا ہے۔ دونوں میں سے کوئی فوج بھی تباہ و برباد نہیں ہوتی، لیکن تصادم کے فوراً بعد روسی فوج ناگزیر طور پر بالکل اسی طرح پسپائی اختیار کرتی ہے جس طرح وہ گیند، جو کسی ایسے گیند سے، جو اس سے بھی زیادہ تیز رفتار سے اس کی طرف فضا میں اڑتی آرہی ہو، ٹکرا جاتی ہے اور اپنی پچھلی جانب لڑھکنے لگتی ہے۔ اور بالکل اسی ناگزیر انداز سے یلغاری گیند، جو اتنی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی آئی تھی، خاصے فاصلے تک از خود (اگرچہ تصادم نے اسے اس کی قوت سے محروم کر دیا ہوتا ہے) آگے لڑھکتی جاتی ہے۔

روسی پسپا ہو جاتے ہیں اور اسی میل دور ماسکو کی دوسری سمت چلے جاتے ہیں۔ فرانسیسی ماسکو پہنچ جاتے ہیں اور وہاں پڑاؤ ڈال لیتے ہیں۔ اس کے بعد پانچ ہفتے تک ایک بھی لڑائی نہیں ہوتی۔ فرانسیسی ماسکو سے ہلنے کا نام بھی نہیں لیتے۔ کسی درندے کی طرح، جسے کاری زخم آئے ہوں اور وہ اپنے زخموں کو چاٹ رہا ہو، وہ ہاتھ پاؤں توڑے وہیں قیام پذیر رہتے ہیں اور پھر آناً فاناً کسی ظاہری وجہ کے بغیر راہِ فرار اختیار کر لیتے ہیں۔ وہ بھاگم بھاگ کالوگا روڈ کا رخ اختیار کرتے ہیں اور (فتح حاصل کرنے کے باوجود، کیونکہ بیچ میں مالا یاروسلاوتس میں جو معرکہ بپا ہوا تھا، اس میں میدان انھیں کے ہاتھ میں رہا تھا) کوئی سنجیدہ لڑائی لڑے بغیر انتہائی تیز رفتاری سے واپس، سمولنسک، سمولنسک سے آگے ولنا اور ولنا سے آگے بیریزینا[3] تک چلے جاتے ہیں۔ وہ بیریزینا کے قریب بھی نہیں رکتے، بلکہ وہاں سے بھی مزید پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔

چھبیس اگست کی شام کو کوتوزوف اور ساری روسی فوج کو یقین ہو گیا تھا کہ بارودینو کی لڑائی جیتی جا چکی ہے۔ کوتوزوف نے زار کے نام اپنے مراسلے میں یہی تاثر دیا تھا۔ اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ دشمن کا قلع قمع کرنے کے لیے تازہ لڑائی کی تیاری کی جائے۔ یہ اس نے اس لیے نہیں کیا کیونکہ وہ کسی کو دھوکا دینا چاہتا تھا، بلکہ اس لیے کیونکہ وہ، ہر اس شخص کی طرح جس نے لڑائی میں حصہ لیا تھا، جانتا تھا کہ دشمن شکست کھا چکا ہے۔

لیکن اس تمام شام اور اگلے روز لگاتار اطلاعات موصول ہوتی رہیں کہ فوج کو جو نقصانات برداشت کرنا پڑے ہیں، ان کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ آدھی فوج کٹ چکی تھی اور ثابت ہو گیا تھا کہ ایک اور لڑائی قطعی ناممکن ہے۔ لڑائی اس وقت تک لڑنا ناممکن تھا جب تک تمام محاذوں سے اطلاعات موصول نہ ہو جاتیں، زخمی اٹھا نہ لیے جاتے، جو گولہ بارود صرف ہو گیا تھا، اس کی کمی پوری کرنے کے لیے نیا ذخیرہ نہ پہنچ جاتا، ہلاک شدگان کا شمار نہ ہو جاتا، مقتول افسروں کی جگہ نئے افسروں کا تقرر نہ ہو جاتا اور جوانوں کو خوراک اور آرام نہ مل جاتا۔

دریں اثنا اگلی ہی صبح فرانسیسی فوج اپنے آپ روسیوں کی جانب پیش قدمی کرنے لگی (اسے کوئی تحریک دینے کی ضرورت نہیں تھی، وہ اپنے ہی زور پر آگے بڑھ رہی تھی اور اس کی رفتار اس فاصلے کے، جو اس کے اور اس کی منزل مقصود کے مابین رہ گیا تھا، مربع کے تناسب معکوس سے بڑھ رہی تھی)۔ کوتوزوف اگلی صبح حملہ کرنا چاہتا تھا

اور ساری فوج اس کی ہم خیال تھی لیکن حملے کی خواہش ہی کافی نہیں ہوتی، حملے کا امکان بھی موجود ہونا چاہیے اور یہ امکان موجود نہیں تھا۔ وہ ایک دن کی پسپائی کے دوران میں جتنا فاصلہ طے کر سکتے تھے، اس سے کم تر طے کرنے میں خطرات پوشیدہ تھے۔ یہی حال دوسرے اور تیسرے دن ہوا، ان دو ایام کے دوران میں وہ جتنا پیچھے ہٹ سکتے تھے، انھیں ہٹنا پڑا اور یوں پیچھے ہٹتے ہٹتے وہ بالآخر یکم ستمبر کو ماسکو پہنچ گئے اور جب وہ ماسکو پہنچ گئے، جذبے کی شدت کے باوجود، جو تمام یونٹیں محسوس کر رہی تھیں، حالات کی قوت نے انھیں ماسکو سے بھی آگے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور یوں وہ ایک اور یوم کے فاصلے تک پیچھے ہٹ گئی اور ماسکو کو غنیم کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔

وہ لوگ، جنھیں یہ فرض کرنے کی عادت پڑ چکی ہے کہ جرنیل معرکوں اور لڑائیوں کے منصوبے بالکل اسی طرح بناتے ہیں جس طرح ہم میں سے کوئی بھی اپنے سٹڈی روم میں نقشے کے سامنے بیٹھ کر یہ قیاس آرائی کرنے لگتا ہے کہ اس یا اس لڑائی میں ہم صورت حال سے کس طرح عہدہ برآ ہوتے، ہمارے اذہان میں یہ سوالات خود بخود در آتے ہیں: کوتوزوف نے پسپائی کے دوران میں یہ یا وہ کیوں نہ کیا؟ فلی[4] پہنچنے سے قبل وہ دشمن کے مقابلے میں کہیں ڈٹا کیوں نہیں؟ ماسکو کو تقدیر کے حوالے کرنے سے پہلے اس نے فوراً ہی کالوگا روڈ پر قبضہ کیوں نہ کیا؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ لوگ، جو اس انداز سے سوچنے کے عادی ہیں، وہ ان حالات کو، جن سے دامن نہیں چھڑایا جا سکتا اور جو کسی بھی کمانڈر انچیف کے دائرہ عمل کو محدود کر دیتے ہیں، بھول جاتے ہیں یا انھیں ان کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ کمانڈر انچیف کی مصروفیت کی اس مصروفیت سے، جس کا تصور ہم اپنے ڈرائنگ روم میں ٹانگیں پسار کر کرتے ہیں، قطعاً کوئی مشابہت نہیں ہوتی۔ ہم اپنے سامنے نقشہ پھیلا کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے ذہن میں کسی لڑائی کا، جو کسی خاص مقام پر کسی خاص وقت کے دوران میں فریقین کی فوجوں کی خاص تعداد کے ساتھ لڑی گئی تھی، خاکہ بناتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ کمانڈر انچیف نے یہ کیا ہوگا یا وہ کیا ہوگا۔ کمانڈر انچیف ہمیشہ ہر آن بدلتے واقعات میں گھرا ہوتا ہے اور نتیجتاً وہ کسی لمحے بھی اس پوزیشن میں نہیں ہوتا کہ وہ واقعہ جو ظہور پذیر ہو رہا ہوتا ہے، اس کی پوری اہمیت پر غور کر سکے۔ واقعہ غیر محسوس طور پر لحظہ بہ لحظہ متشکل ہوتا رہتا ہے اور واقعات کی اس تدریجی، بلا روک ٹوک شکل پذیری کے دوران میں کمانڈر انچیف ریشہ دوانیوں، پریشانیوں، احتمالات، احکام، منصوبوں، مشوروں، دھمکیوں اور دغا بازیوں کے انتہائی پیچیدہ کھیل کا مرکزی نقطہ ہوتا ہے اور وہ لگاتار لاتعداد متضاد سوالات کے جوابات فراہم کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔

وہ لوگ، جنھیں عسکری امور میں درک حاصل ہے، بڑی سنجیدگی سے ہمیں بتاتے ہیں کہ کوتوزوف کو اپنی فوج فلی پہنچنے سے بہت پہلے کالوگو روڈ پر لے جانا چاہیے تھی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی شخص نے اس کے سامنے اس قسم کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن کمانڈر انچیف کو عام طور پر، بالخصوص نازک صورت حال کے دوران میں، ایک نہیں، درجنوں منصوبے ملتے رہتے ہیں۔ یہ سبھی منصوبے سپہ گری[5] (strategy) اور مصافیات (tactics) کے اصولوں پر مبنی ہوتے ہیں اور سبھی ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں۔

بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ کمانڈر انچیف کا کام محض یہ ہے کہ وہ ان میں سے کسی ایک منصوبے کو منتخب کر لے۔ لیکن وہ یہ بھی نہیں کر سکتا۔ وقت اور واقعات انتظار نہیں کرتے۔ آئیں، ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ 28 تاریخ کو اسے کالوگا روڈ کی جانب کوچ کرنے کی تجویز ملتی ہے لیکن عین اسی لمحے میلورادووچ کا ایک ایجوٹنٹ سرپٹ گھوڑا دوڑائے آتا ہے اور اس سے دریافت کرتا ہے کہ آیا وہ فرانسیسیوں سے پنجہ لڑانا چاہتا ہے یا پیچھے ہٹنا چاہتا ہے۔ اس کا مطالبہ ہے کہ اسے فوراً، اسی وقت حکم دیا جائے۔ اور پسپائی کا جو حکم دیا جاتا ہے، وہ ہمیں اس مقام سے، جہاں شاہراہ کالوگا روڈ کی طرف مڑتی ہے، آگے لے جاتا ہے۔ ایجوٹنٹ کی روانگی کے بعد محکمہ رسد کا افسر پہنچ جاتا ہے۔ وہ پوچھتا ہے کہ سامان رسد کہاں پہنچایا جانا ہے۔ ادھر چیف میڈیکل افسر یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ زخمیوں کو کہاں لے جانا ہے۔ پیٹرزبرگ سے ایلچی ملک معظم کا مراسلہ لے کر آتا ہے۔ اس میں اس امکان کو سرے سے مسترد کر دیا جاتا ہے کہ ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف کمانڈر انچیف کا حریف اپنے جوڑ توڑ میں مصروف ہے اور غیر محسوس طریقے سے اس کے پاؤں تلے کی زمین کھسکانے کی کوشش کر رہا ہے (اور اس قسم کے اشخاص ایک سے زیادہ ہوتے ہیں)۔ وہ ایک نیا منصوبہ پیش کر دیتا ہے اور اس کا یہ منصوبہ اس منصوبے کے، جس میں کالوگا روڈ کے ساتھ ساتھ پسپائی اختیار کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا، بالکل متضاد ہوتا ہے۔ اور ستم بالائے ستم یہ کہ کمانڈر انچیف کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہوتی جا رہی ہیں اور اسے تازہ دم ہونے کے لیے آرام کی شدید ضرورت ہے۔ اتنے میں ایک قابل جرنیل، جسے اعزازات کی تقسیم کے دوران میں نظر انداز کر دیا گیا تھا، اپنی شکایت لے کر پہنچ جاتا ہے۔ پھر علاقے کے باشندے التجائیں کر رہے ہیں کہ ان کی حفاظت کا بندوبست کیا جائے۔ جس افسر کو علاقے کے خدوخال کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ ایک ایسی رپورٹ لے کر حاضر ہو جاتا ہے جو اس رپورٹ کے، جو اس سے پہلے بھیجے گئے افسر نے پیش کی تھی، بالکل برعکس ہوتی ہے۔ ایک جاسوس، ایک قیدی اور ایک جرنیل، جو ریکی کر کے آئے ہیں، غنیم کی افواج کی پوزیشن ایک دوسرے سے مختلف انداز میں بیان کرتے ہیں۔ کمانڈر انچیف کو اس نوع کے جن ناگزیر حالات میں کام کرنا پڑتا ہے، جو لوگ انھیں فراموش کر دیتے ہیں یا انھیں سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں، وہ، مثلاً فلی میں، فوج کی پوزیشن بیان کرتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ کمانڈر انچیف یکم ستمبر کو نہایت آسانی سے یہ فیصلہ کر سکتا تھا کہ اسے ماسکو کو اپنے حال پر چھوڑ دینا چاہیے یا اس کا دفاع کرنا چاہیے، جب کہ روسی فوج کے پاس، جو کہ ماسکو سے چار میل سے بھی کم فاصلے پر مقیم تھی، اس قسم کا انتخاب سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ پھر اس سوال کا کب فیصلہ ہوا؟ اس کا فیصلہ دریسا میں، سمولنسک میں یا اغلباً چوبیس تاریخ کو شیوار دینو میں، چھبیس کو بارودینو میں اور بارودینو سے فلی تک پسپائی کے دوران میں ہر یوم، ہر گھڑی اور ہر منٹ ہوتا رہا۔

3

بارودینو سے پسپائی اختیار کرنے کے بعد روسی فوج نے فلی میں پڑاؤ ڈال دیا۔ یرمالوف،[6] جسے ریکی کرنے بھیجا گیا

تھا، گھوڑے پر کمانڈر انچیف کے پاس آیا۔

''اس پوزیشن پر لڑنے کا کوئی امکان نہیں۔'' اس نے کہا۔

کوتوزوف ہکا بکا ہو کر اسے دیکھنے لگا اور اس سے بولا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، اسے ایک بار پھر دہرائے۔ جب وہ اپنے الفاظ دہرا چکا، کوتوزوف نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''مجھے اپنا ہاتھ پکڑاؤ!'' اس نے کہا۔ پھر اس نے اس کا ہاتھ پکڑا، اسے الٹایا تا کہ وہ اس کی نبض محسوس کر سکے اور بولا: ''مائی ڈیئر فیلو، معلوم ہوتا ہے کہ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ذرا سوچو کہ تم کیا کہہ رہے ہو؟''

دروگومیلوف گیٹ سے چار میل دور کوتوزوف پکلونائیا پہاڑی پر اپنی گاڑی سے نیچے اترا اور سڑک کے کنارے بینچ پر بیٹھ گیا۔ اس کے اردگرد جرنیلوں کی اچھی خاصی بھیڑ جمع ہوگئی۔ کاؤنٹ رستوپ چن، جو ماسکو سے آیا تھا، اس میں شامل ہو گیا۔ داناؤں کی یہ جماعت مختلف گروہوں میں بٹ گئی اور آپس میں پوزیشن کے حسن و قبح، فوج کی کیفیت، مختلف تجویز کردہ منصوبوں، ماسکو کی صورت حال اور عسکری امور کے بارے میں عمومی بحث کرنے لگی۔ اگرچہ نہ تو انھیں اس مقصد کے لیے بلایا گیا تھا اور نہ اسے یہ نام دیا گیا تھا، ہر شخص یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ جنگی کونسل ہی ہے۔ گفتگوئیں عوامی مفاد کے مسائل تک محدود رہیں۔ اگر کسی شخص نے ذاتی نوعیت کی کوئی بات پوچھی بھی یا بتائی بھی، تو اس نے یہ سرگوشیوں میں کیا اور گفتگو کا رخ فوراً ہی عمومی تشویش کے موضوعات کی طرف مڑ گیا۔ ان تمام اشخاص میں سے نہ تو کسی نے کوئی ہنسی مذاق کی بات کی اور نہ کوئی ہنسا، بلکہ کسی چہرے پر مسکراہٹ تک دکھائی نہ دی۔ ان سب کی صریحاً کوشش یہی تھی کہ وہ موقع کی نزاکت کے مطابق ہمت اور دلیری کا مظاہرہ کریں۔ ان تمام گروہوں کے اشخاص آپس میں باتیں بھی کرتے جا رہے تھے لیکن ساتھ ساتھ وہ یہ کوشش بھی کر رہے تھے کہ وہ کمانڈر انچیف (جس کا بینچ سارے ہجوم کا نقطۂ ماسکہ تھا) کے قریب رہیں اور اس طرح بات کریں کہ ان کی آواز اس تک پہنچ جائے۔

کمانڈر انچیف سنتا رہا۔ اس کے گردوپیش جو کچھ ہو رہا تھا، وہ کبھی کبھار اس کے متعلق پوچھ لیتا لیکن وہ نہ تو کسی گفتگو میں شریک ہوا اور نہ اس نے کسی رائے کا اظہار کیا۔ زیادہ تر وہ کسی ایک یا دوسرے گروپ کی باتیں سننے کے بعد مایوسی کے انداز سے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا گویا جو کچھ وہ سننا چاہتا تھا، وہ وہی نہیں کہہ رہے تھے۔

بعض اس پوزیشن کے متعلق جو منتخب کی گئی تھی، رائے زنی کر رہے تھے۔ وہ فی نفسہٖ پوزیشن کی اتنی تنقیص نہیں کر رہے تھے جتنا ان اشخاص کی، جنھوں نے اس کا انتخاب کیا تھا، دانشورانہ صلاحیتوں کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا رہے تھے۔ دوسروں کا استدلال یہ تھا کہ قبل ازیں خاصی بڑی غلطی کا ارتکاب کیا جا چکا ہے اور لڑائی تین یوم پہلے لڑی جانا چاہیے تھی۔ بعضوں کی گفتگو کا موضوع سلامانکا کی لڑائی تھی۔ اس کے بارے میں ایک فرانسیسی جرنیل، کغوساغ (Crosart)، جو ہسپانوی وردی میں ملبوس تھا، انھیں معلومات فراہم کر رہا تھا۔ (یہ فرانسیسی اور ایک جرمنی پرنس، جو بعض دیگر جرمن پرنسوں کی طرح روسی فوج میں خدمات سرانجام دے رہا تھا، ساگراگوسا کے محاصرے کے بارے میں بحث کر رہے تھے اور اس امکان پر غور کر رہے تھے کہ کیا ماسکو کا اسی طریقے سے دفاع کیا جا سکتا

ہے یا نہیں۔) کاؤنٹ رستوپ چن چوتھے گروپ کو بتار ہا تھا کہ وہ شہری ملیشیا کے شانہ بہ شانہ لڑنے اور ماسکو کے دروازوں کے سامنے اپنی جان قربان کرنے کے لیے تیار ہے، تاہم وہ یہ افسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا کہ جو کچھ ہو رہا ہے، اسے اس کے بارے میں لاعلم رکھا گیا ہے کیونکہ اگر اسے اس بارے میں ذرا جلدی کچھ معلوم ہو جاتا تو حالات مختلف ہوتے۔۔۔ پانچویں گروپ کے لوگ اپنی عسکری بصیرت کی نمائش کر رہے تھے۔ ان کی بحث کا نکتہ یہ تھا کہ فوج کو اب کون سی سمت اختیار کرنا ہوگی۔ رہا چھٹا گروپ، اس کی گفتگو سراسر فضولیات پر مبنی تھی۔

کوتوزوف کے چہرے کے تاثرات سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ وہ اپنے ہی خیالات میں مستغرق ہے اور بہت افسردہ ہے۔ اس کے نزدیک اس ساری گفتگو کا ماحصل صرف یہ تھا کہ وہ لاکھ سر پٹکیں، صحیح معنوں میں ماسکو کا دفاع قطعی ناممکن ہے۔ یہ دفاع اس اعتبار سے قطعی ناممکن تھا کیونکہ اگر کوئی جنونی کمانڈر لڑائی کا حکم دے بھی دیتا تو بھی اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا کہ انتشار کی کیفیت تو ضرور رونما ہو جاتی لیکن لڑائی کسی صورت نہ ہوتی۔ لڑائی اس لیے نہ ہوتی کیونکہ اعلیٰ کمان کے تمام افسروں نے نہ صرف یہ تسلیم کر لیا تھا کہ اپنی پوزیشن کا دفاع نہیں کیا جا سکتا بلکہ ان کی گفتگو کا آخری نقطہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا کہ پوزیشن کا ترک کرنا تو ناگزیر ہو ہی چکا ہے، البتہ مسئلہ یہ ہے کہ اس پوزیشن کو ترک کرنے کے بعد انھیں کیا کرنا ہوگا۔ جس لڑائی میں کمانڈروں کو امید کی کوئی رمق نظر نہیں آتی تھی، وہ اس میں اپنے دستوں کی قیادت کیسے کر سکتے تھے؟ ماتحت افسران ہی نہیں بلکہ عام سپاہی بھی (وہ بھی اپنے نتائج اخذ کرتے ہیں) یہ سمجھتے تھے کہ اپنی پوزیشن پر ڈٹے رہنا ناممکن ہے۔ چنانچہ جب انھیں یہ یقین ہو چکا ہو کہ شکست ان کا مقدر ہے، ایسے میں ان سے لڑنے کی توقع کرنا خام خیالی کے علاوہ اور کچھ نہ ہوتا۔ مانا کہ بے نگ سین اصرار کرتا رہا کہ پوزیشن کا دفاع کیا جانا چاہیے اور دوسرے اس کے متعلق بحث مباحثے میں الجھے رہے لیکن ان باتوں کی فی نفسہٖ کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی۔ ان چیزوں کی اگر کوئی اہمیت تھی، تو فقط یہ تھی کہ یہ سازشوں اور مناقشوں کے لیے عذر فراہم کرتی تھیں اور یہ کوتوزوف جانتا تھا۔

بے نگ سین، جس نے پوزیشن کا انتخاب کیا تھا، اپنی روسی حب الوطنی کی بڑے زور شور سے نمائش کر رہا تھا (کوتوزوف کے کان میں جب بھی اس کا کوئی فرمودہ پڑتا تھا، اسے جھرجھری آجاتی تھی)۔ اس کا اصرار تھا کہ ماسکو کا دفاع لازماً کیا جانا چاہیے۔ وہ کیا چاہتا تھا، وہ کوتوزوف پر روزِ روشن کی طرح عیاں تھا۔ اگر دفاع ناکام رہا تو سارا الزام کوتوزوف کے سر جو دشمن سے مقابلہ کیے بغیر سپاہ کو نجشنک پہاڑیوں[8] تک لے آیا تھا، دھرا جا سکے گا۔ اگر یہ کامیاب رہا تو اس کا سہرا وہ اپنے سر باندھ لے گا۔ اگر مقابلہ نہ کیا گیا، وہ ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑنے کے جرم سے اپنا دامن چھڑا لے گا۔

لیکن بڑے میاں کے ذہن میں اس وقت اس سازش کا مسئلہ نہیں تھا۔ اس کی توجہ یکسر ایک خوفناک سوال پر مرکوز تھی اور یہی وہ سوال تھا جس کا جواب اسے کسی سے نہیں مل رہا تھا۔ اس کے سامنے اب واحد سوال صرف یہ تھا: ''کیا میں نے واقعی نپولین کو ماسکو پر چڑھ دوڑنے دیا ہے اور یہ میں نے کب کیا؟ اس کا فیصلہ کب ہوا کیا یہ کل کی

بات ہو سکتی ہے جب میں نے بلاتوف کو پسپائی کا حکم دیا تھا یا پرسوں شام کی، جب مجھے اونگھ آ گئی تھی اور میں نے بے نگ سین کو کہہ دیا تھا کہ وہ احکام جاری کر دے؟ یا یہ اس سے بھی پہلے کی بات ہے؟ یہ ہولناک معاملہ کب طے ہوا تھا؟ کب؟ کہ ماسکو اس کے حال پر چھوڑ دیا جائے، فوج پیچھے ہٹ آئے اور اس سلسلے میں حکم لازماً جاری کر دیا جائے۔"

کوتوزوف کے نزدیک اس قسم کا ہولناک حکم جاری کرنا فوج کی کمان سے دست برداری اختیار کرنے کے مترادف تھا۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ طاقت اور اختیارات کا دلدادہ تھا اور انھیں استعمال کرنا اس کی گھٹی میں داخل ہو چکا تھا (پرنس پرازوروسکی (Prozorovsky) کو، جس کے تحت اس نے ترکی میں خدمات سرانجام دی تھیں، جو اعزازات عطا کیے گئے تھے، ان پر اسے اپنی تذلیل محسوس ہوئی تھی)، اسے یہ یقین ہو چکا تھا کہ روس کا تحفظ کرنا اس کا مقدر بن چکا ہے اور یہی وجہ تھی کہ امپراطور کی خواہش کے علی الرغم اور عوام الناس کی خواہش کے پیش نظر اسے کمانڈر انچیف مقرر کیا گیا تھا۔ اس کا یہ ایمان تھا کہ ان مشکل حالات میں صرف وہی ایک شخص ہے جو فوج کی قیادت کر سکتا ہے اور پوری دنیا میں وہ اکیلا شخص ہے جو بلا خوف و خطر ناقابل مفتوح نپولین کا مقابلہ کرنے کا اہل ہے۔ اور جو حکم اس نے جاری کرنا تھا، اس کا تصور ہی اسے لرزہ براندام کیے ہوئے تھے۔ تاہم کسی فیصلے پر پہنچنا ناگزیر تھا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس کے اردگرد جو گفتگوئیں ہو رہی تھیں اور جن میں ضرورت سے زیادہ آزادروی کا مظاہرہ کیا جانے لگا تھا، ان کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے۔

اس نے سینئر جرنیلوں کو ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

"میرا فیصلہ اچھا ہے یا برا، مجھے اسی پر انحصار کرنا ہوگا۔" اس نے فرانسیسی میں ان سے کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ بینچ سے اٹھا، گھوڑے پر سوار ہوا اور فلی کی طرف چل پڑا، جہاں اس کی گاڑیاں اس کی منتظر تھیں۔

4

سہ پہر کے دو بجے آندرے سادوستیانوف نامی کسان کے عام سے مکان کے بہترین اور کشادہ ترین کمرے میں جنگی کونسل کے ارکان اکٹھے ہوئے۔ اس کسان کا خاندان خاصا بڑا تھا اور اس کے ارکان — مردوں، عورتوں اور بچوں — کی عقبی کمروں میں بھیڑ لگ گئی۔ آندرے کی چھ سالہ پوتی، مالاشا، جسے ہز سیرین ہائی نس پیار سے چمکارتے، پچکارتے رہے تھے اور جسے اس نے چائے نوشی کے دوران میں شکر کی ڈلی دی تھی، سامنے کے کمرے میں پیچھے رہ گئی اور آتش دان پر چڑھی بیٹھی تھی۔ مالاشا شرمیلی مسرت سے، جرنیلوں کے، جب وہ یکے بعد دیگرے کمرے میں داخل ہو رہے اور ایقونوں کے نیچے فراخ بنچوں پر بیٹھ رہے تھے، چہروں، وردیوں اور اعزازات کو دیکھ رہی تھی۔ خود "دادا ابا"، جیسا کہ مالاشا دل ہی دل میں کوتوزوف کو کہہ رہی تھی، ان سے الگ تھلگ آتش دان کے نیچے تاریک کونے میں بیٹھا تھا۔ فولڈنگ آرم چیئر پر اس کا بھاری بھرکم جسم بے ہنگم انداز سے پڑا تھا۔ وہ بار بار اپنا گلا کھنکار رہا اور کوٹ کا کالر درست کر رہا تھا۔ اگرچہ اس کا کالر کھلا تھا، پھر بھی یوں لگ رہا تھا کہ وہ اس کی گردن میں چبھ رہا

ہے۔ کمرے میں داخل ہونے کے بعد افسر ایک ایک کر کے اس کے پاس پہنچتے۔ وہ بعضوں کے ساتھ ہاتھ ملاتا اور بعضوں کے سامنے محض گردن کو خم دے دیتا۔ اس کا ایجوٹنٹ، کیساروف، کوتوزوف کے بالمقابل کھڑکی کا پردہ ہٹایا چاہتا تھا کہ اس نے جھنجھلا کر ہاتھ سے اشارہ کیا اور کیساروف کو اندازہ ہو گیا کہ ہز سیرین ہائی نس یہ نہیں چاہتے کہ کوئی ان کا چہرہ دیکھے۔

کسان کی چیڑ کی میز کے، جس پر نقشے، منصوبے، کاغذات اور پنسلیں پڑی تھیں، اردگرد اتنا ہجوم ہو گیا تھا کہ اردلی ایک اور بینچ اٹھا لائے اور انھوں نے اسے میز کے قریب رکھ دیا۔ یرمالوف، کیساروف اور ٹول، جو ابھی ابھی پہنچا تھا، اس بینچ پر بیٹھ گئے۔ ایوتوفوں کے عین نیچے سب سے آگے بارکلے دَتولی براجمان تھا۔ اس کے گلے میں سینٹ جارج کراس (تمغہ) لٹک رہا تھا۔ اس کی پیشانی اس کی گنجی کھوپڑی کا حصہ بن چکی تھی اور وہ زرد رو اور بیمار نظر آ رہا تھا۔ وہ دو ہفتے کسی قسم کے بخار میں پھنکتا رہا تھا اور اب بھی کانپ رہا تھا۔ اس کے قریب یواروف بیٹھا تھا۔ یواروف دبی دبی زبان میں (سبھی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے) اسے کوئی معلومات فراہم کر رہا تھا اور تیزی سے اپنے ہاتھ کو جنبش دے رہا تھا۔ کوتاہ قامت، گول مٹول دختوروف بھویں اٹھائے اور پیٹ پر ہاتھ باندھے نہایت توجہ سے سن رہا تھا۔ دوسری طرف اوسترمان طالسطائی اپنے چوڑے چکلے سر کو ہاتھوں پر رکھے بیٹھا تھا۔ وہ بظاہر اپنے ہی خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کے خدوخال نمایاں اور آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ رائیف سکی، جیسا کہ اس کی عادت تھی، اپنے بالوں کو آگے کی طرف مروڑ تروڑ کر اپنی کنپٹیوں پر ان کے کنڈل بنا رہا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ بے تابی سے کبھی دروازے کی جانب اور کبھی کوتوزوف کی طرف دیکھنے لگتا تھا۔ کوناوونتسن کے خوبصورت، پرعزم اور شفیق چہرے کو کایاں اور نرم و ملائم تبسم نے منور کر رکھا تھا۔ اس کی نگاہیں مالاشا کی نگاہوں سے ٹکرا گئیں اور اس نے کچھ اس انداز سے اسے آنکھ ماری کہ ننھی منی بچی مسکرانے لگی۔

وہ بے نگ سین کا، جو پوزیشن کا تازہ جائزہ لینے کے بہانے آرام آرام سے لذیذ ڈنر سے لطف اندوز ہو رہا تھا انتظار کر رہے تھے۔ وہ چار سے چھ بجے تک اس کے منتظر رہے۔ اس تمام عرصے کے دوران میں انھوں نے بحث مباحثے اور غور و خوض سے اجتناب کیا اور آپس میں غیر متعلقہ امور کے بارے میں زیر لب سرگوشیاں کرتے رہے۔

صرف اس وقت جب بے نگ سین کمرے میں داخل ہوا، کوتوزوف کونے سے اٹھا اور میز کے قریب آ گیا لیکن وہ اتنا قریب بھی نہ آیا کہ موم بتیوں کی روشنی اس کے چہرے پر پڑنے لگتی۔

بے نگ سین نے کارروائی کا آغاز اس سوال سے کیا: "کیا ہمیں روس کے قدیم، مقدس دارالسلطنت سے مقابلہ کیے بغیر دست بردار ہو جانا ہے یا ہمیں اس کا دفاع کرنا ہے؟" اس کے بعد خاصی دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ ہر پیشانی شکن آلود تھی۔ صرف کبھی کبھار کوتوزوف کی کھانسی یا غصیلی کھنکار اس سکوت کو توڑ دیتی۔ تمام نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ مالاشا بھی "دادابا" کو بغور دیکھ رہی تھی۔ وہ کسی دوسرے شخص کی نسبت اس کے زیادہ قریب تھی اور اسے صاف نظر آ رہا تھا کہ اس کے ماتھے پر کس طرح بل پڑ رہے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ابھی ابھی رو دے گا لیکن

یہ کیفیت زیادہ عرصہ برقرار نہ رہی۔

''روس کا قدیم، مقدس دار السلطنت!'' اس نے طیش کے عالم میں بے نگ سین کے الفاظ دہرا کر کہا۔ اس کے انداز سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ ان الفاظ کے پیچھے جو منافقت کارفرما تھی، وہ اسے بے نقاب کر رہا ہے۔ ''یور ایکسی لینسی، مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت مرحمت فرمائیں کہ کسی روسی کے لیے اس سوال کے کوئی معانی نہیں بنتے۔'' (اس کا بھاری بھرکم جسم آگے کی جانب ڈھلک گیا۔) ''اس قسم کا سوال پیش نہیں کیا جا سکتا، یہ بے معنی ہے۔ میں نے ان حضرات کو یہاں آنے کی جو زحمت دی ہے، اس کا مقصد عسکری نوعیت کا سوال اٹھانا اور اس پر بحث کرنا ہے۔ وہ سوال یہ ہے: روس کے تحفظ کا انحصار اس کی فوج پر ہے۔ کیا یہ بہتر ہے کہ مقابلے کی دعوت قبول کر کے فوج اور ماسکو دونوں کو خطرے کی بھینٹ چڑھا دیا جائے یا یہ کہ مقابلہ کیے بغیر ماسکو سے دست برداری اختیار کر لی جائے؟ میں آپ صاحبان کی رائے اس سوال کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔'' اور وہ دوبارہ بے اختیار اپنی کرسی میں دھنس گیا۔

بحث شروع ہو گئی۔ بے نگ سین سمجھ رہا تھا کہ وہ ابھی تک بازی ہارا نہیں۔ اس نے بارکلے اور دیگر اشخاص کی اس رائے سے تو اتفاق کیا کہ فلی کے مقام پر دفاعی لڑائی لڑنا ناممکن ہے، تاہم اس نے اپنی روسی حب الوطنی اور ماسکو سے اپنی محبت کا اظہار یہ تجویز پیش کر کے کیا کہ رات کو افواج کو دائیں سے بائیں جانب منتقل کر دیا جائے اور اگلی صبح فرانسیسیوں کے دائیں پہلو پر ہلہ بول دیا جائے۔ اس کی تجویز کے بارے میں حاضرین کی رائے بٹ گئی، کچھ لوگ اس کے حق میں اور کچھ خلاف دلائل دینے لگے۔ یرمالوف، دختوروف اور رالیف سکی بے نگ سین سے متفق تھے۔ آیا ان کے اعصاب پر یہ خواہش بھوت بن کر سوار ہو چکی تھی کہ دار السلطنت سے ہاتھ اٹھانے سے پہلے کچھ نہ کچھ قربانی ضرور دینا چاہیے یا ان کے اس موقف کے پس پردہ ان کی ذاتی امنگیں کام کر رہی تھیں، وجہ خواہ کوئی بھی ہو لیکن نظر یہ آتا تھا کہ ان جرنیلوں کو یہ اندازہ ہی نہیں ہے کہ حالات ناگزیر طور پر جو رخ اختیار کر رہے ہیں، اسے ان کی موجودہ بحث و تمحیص تبدیل نہیں کر سکتی اور یہ کہ ماسکو عملاً پہلے ہی ترک کیا جا چکا ہے۔ دوسرے جرنیل یہ بات سمجھ رہے تھے۔ وہ صرف اس سمت کے متعلق، جو فوج کو پسپائی کے دوران میں اختیار کرنا تھی، بات کر رہے تھے۔

مالاشا نے، جس کی نظریں اس پر، جو اس کے سامنے ہو رہا تھا، مرکوز تھیں، کونسل کی کارروائی کو مختلف طریقے سے جانچا۔ اسے لگا کہ یہ ''دادا ابا'' اور لمبے کوٹ (اس نے اپنے دل میں بے نگ سین کو یہی نام دیا تھا) کے مابین ذاتی نزاع کا مسئلہ ہے۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ وہ جب بھی ایک دوسرے سے بات کرتے ہیں، غصے سے لال پیلے ہو جاتے ہیں اور وہ دل ہی دل میں ''دادا ابا'' کی طرف داری کر رہی تھی۔ گفتگو کے عین درمیان میں ''دادا ابا'' نے جس عجلت اور عیاری سے بے نگ سین کی طرف دیکھا تھا، وہ اس سے چھپا نہ رہ سکا اور اس کے معاً بعد اسے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ''دادا ابا'' نے بے نگ سین سے کوئی ایسی بات کہہ دی کہ اسے اپنی حیثیت کا اندازہ ہو گیا۔ اس کا چہرہ ایکا ایکی لالوں لال ہو گیا اور وہ انتہائی طیش کے عالم میں کمرے میں ادھر ادھر چکر لگانے لگا۔ وہ چیز جو تیر بن کر اس

کے دل پر لگی تھی، وہ اس کی اس تجویز کے بارے میں، کہ فرانسیسیوں کے دائیں پہلو پر حملہ کرنے کے لیے فوج کو راتوں رات دائیں سے بائیں جانب منتقل کر دیا جائے، کوتوزوف کا دھیما اور پرسکون تبصرہ تھا:

''حضرات، میں کاؤنٹ کی تجویز پر صاد نہیں کر سکتا۔ غنیم کے قرب میں فوج کو ادھر سے ادھر منتقل کرنا خطرے سے خالی نہیں اور عسکری تاریخ اس نقطۂ نظر کی تائید کرتی ہے۔ مثلاً...'' کوتوزوف رک گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ سوچ رہا ہے جیسے وہ کوئی نظیر ڈھونڈ رہا ہو۔ پھر اس نے گھنا بن کر چمکتی آنکھوں سے بے نگ سین کی جانب دیکھا اور کہنے لگا: ''مثلاً فریڈلانٹ کا معرکہ لیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ کاؤنٹ کو اچھی طرح یاد ہوگا... اس میں ہمیں محض اس لیے پوری کامیابی حاصل نہ ہو سکی کیونکہ ہم نے افواج کی نئے سرے سے تقسیم وترتیب دشمن کے بالکل قریب کی تھی...''

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اگرچہ اس کا دورانیہ صرف ایک لمحہ تھا لیکن ان سب کو لامحدود طور پر طویل نظر آ رہا تھا۔

بحث پھر شروع ہو گئی، لیکن اس میں بار بار وقفے آنے لگے اور ہر شخص کو محسوس ہونے لگا کہ اب کہنے کے لیے مزید کچھ نہیں رہ گیا۔

ایک وقفے کے دوران میں کوتوزوف نے گہری آہ بھری جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو۔ سب کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔

"Ehbien, messieurs!*" اس نے کہا۔ ''مجھے نظر آ رہا ہے کہ فیصلے کا بار مجھے ہی اٹھانا ہوگا۔'' پھر وہ آہستہ آہستہ اپنی کرسی سے اٹھا اور میز کے قریب آ گیا۔ ''حضرات، میں آپ کی آراء سن چکا ہوں۔ آپ میں سے چند ایک مجھ سے اتفاق نہیں کریں گے لیکن میں...'' وہ رک گیا۔ ''میرے امپراطور اور وطن نے مجھے جو اختیارات سونپے ہیں، انھیں بروئے کار لاتے ہوئے میں... پسپائی کا حکم دیتا ہوں۔''

اس کے بعد جرنیل چپ چاپ اسی گمبھیر متانت کے ساتھ، جو تجہیز و تکفین کی رسوم کی ادائیگی کے بعد بوقت روانگی لوگوں پر طاری ہو جاتی ہے، منتشر ہونے لگے۔

بعض جرنیل اپنے کمانڈر انچیف سے کچھ کہنے کے لیے رک گئے۔ کونسل کے اجلاس میں وہ جس لہجے سے بات کر رہے تھے، اس کے برعکس اب وہ بالکل مختلف اور دھیمے انداز سے بول رہے تھے۔

مالاشا، جس کا بہت دیر سے سپر انتظار ہو رہا تھا، اپنے ننھے منے پاؤں حزم و احتیاط سے چھجے پر رکھتی آتش دان سے، جس پر اس کے لیے سونے کی جگہ بنی ہوئی تھی، نیچے اتری اور جرنیلوں کی ٹانگوں کے بیچ میں سے کھسکتی باہر بھاگ گئی۔

جرنیلوں کو فارغ کرنے کے بعد کوتوزوف خاصی دیر تک میز پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا رہا اور مسلسل اس ہولناک

* اچھا، حضرات

سوال پر غور کرتا رہا: "ماسکو کو اپنے حال پر چھوڑنا کب ناگزیر ہوا تھا؟ کب؟ اور اس کا الزام کس پر آتا ہے؟"

"مجھے... مجھے اس کی توقع نہیں تھی!" اس نے اپنے ایجوٹنٹ شنیدر سے، جب وہ خاصی رات گزرنے کے بعد اس کے کمرے میں آیا، کہا۔ "مجھے اس کی توقع نہیں تھی! میں نے کبھی یہ سوچا بھی نہیں تھا کہ ایسا ہوگا!"

"یور ہائی نس! آپ کو کچھ دیر آرام کر لینا چاہیے۔" شنیدر نے کہا۔

"لیکن ابھی قصہ ختم نہیں ہوا! ترکوں کی طرح وہ بھی گھوڑوں کا گوشت کھانے پر مجبور ہوں گے!" کوتوزوف نے اس کی بات کا جواب دیے بغیر کہا، اور اس نے اپنے فربہ ہاتھ سے زور سے میز پر مکا مارا۔ "وہ بھی... اگر صرف..."

5

دریں اثنا ایک ایسے واقعے میں، جو اہمیت کے اعتبار سے فوج کی مقابلے کے بغیر پسپائی سے بھی زیادہ بڑا تھا۔ یعنی ماسکو کا انخلا اور آتش زدگی۔ رستوپ چن نے، جسے عام طور پر اس طرح پیش کیا جاتا ہے کہ یہ سب کچھ اس کی ہدایات کے مطابق ہوا تھا، کوتوزوف سے بالکل مختلف رویہ اختیار کر رکھا تھا۔

بارودینو کی لڑائی کے بعد یہ واقعہ۔ ماسکو کا انخلا اور آتش زدگی۔ بالکل اسی طرح اٹل تھا جس طرح مقابلے کے بعد فوج کی پسپائی ناگزیر ہوگئی تھی۔

ہر روسی اس کی پیش گوئی کر سکتا تھا، کسی عقلی استدلال کی بنا پر نہیں بلکہ اس جذبے کی اساس پر، جو ہم سب کو اور ہمارے آباء واجداد کو خلقی طور پر ودیعت ہوا ہے۔

جو کچھ ماسکو میں ہوا، وہ سمولنسک سے لے کر آگے تک روسی سرزمین کے ہر قصبے، قریے اور گاؤں میں ہوا۔ اس میں رستوپ چن اور اس کے خبر ناموں کا کوئی دخل نہیں تھا۔ قوم خاص نوعیت کی بے تعلقی سے دشمن کی منتظر تھی۔ نہ کہیں فساد ہوا اور نہ ہنگامہ آرائی۔ کسی کی نکسیر تک نہ پھوٹی۔ تمام لوگ تحمل اور سکون سے اپنے مقدر کا انتظار کرتے رہے۔ انھیں احساس تھا کہ ان کے اندر ایسی قوت موجود ہے کہ جب یہ مہیب وقت آئے گا، وہ انھیں بتا دے گی کہ انھیں کیا کرنا ہے۔ اور جونہی دشمن قریب پہنچتا، معاشرے کا خوش حال اور مالدار طبقہ اپنی املاک اور جائیدادیں چھوڑ چھاڑ راہِ فرار اختیار کر لیتا جب کہ مفلس اور نادار لوگ وہیں ٹکے رہتے اور جو کچھ باقی بچ رہتا، اسے نذرِ آتش اور تباہ کرتے رہتے۔

یہ شعور کہ یہی ہوگا اور ہمیشہ یہی ہوتا رہے گا، ہر روسی کے دل پر نقش تھا اور نقش ہے۔ 1812 کے دوران میں ماسکو کے اعلیٰ طبقے کے ہر فرد کو یہ شعور۔ نہیں، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ پیشگی اندازہ تھا کہ شہر پر (دشمن کا) قبضہ ہو جائے گا۔ ان لوگوں نے، جو اتنا پہلے کہ جولائی یا شروع اگست میں ہی رختِ سفر باندھ کر ماسکو سے روانہ ہونا شروع ہوگئے تھے، یہ دکھا دیا تھا کہ انھیں اسی چیز کی توقع تھی۔ یہ لوگ، جتنا کچھ اٹھا سکتے تھے، اٹھا کر اور اپنے مکانات اور

آدھوں آدھ املاکِ منقولہ وہیں چھوڑ کر، فرار ہو گئے۔ انھوں نے یہ سب کچھ حب الوطنی کے اس خفی جذبے کے تحت کیا جن کا اظہار نہ الفاظ، نہ مادر وطن کے لیے اپنے بچوں کی قربانی اور نہ اس نوع کے دیگر غیر فطری افعال سے ممکن ہے بلکہ یہ کچھ اس طرح سیدھے سادے اور خلقی انداز سے منظر عام پر آتا ہے کہ دوسروں کو اس کا پتا بھی نہیں چلتا اور اس کے نتائج بھی نہایت مستحکم اور قوی ثابت ہوتے ہیں۔

''خطرے سے راہ فرار اختیار کرنا شرم ناک حرکت ہے۔ صرف بزدل ماسکو سے بھاگ رہے ہیں۔'' انھیں بتایا جاتا تھا۔ خبر ناموں میں رستوپ چِن ان پر زور دیتا رہتا تھا کہ وہ ماسکو سے نکل کر اپنے ماتھوں پر کلنک کا ٹیکہ لگوا رہے ہیں۔ انھیں اس بات پر شرمندگی ضرور ہوتی تھی کہ ان پر بزدلی کا ٹھپا لگایا جارہا ہے، انھیں اپنی اس روانگی پر خفت بھی محسوس ہوتی تھی مگر وہ پھر بھی جارہے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کے علاوہ اور کوئی صورت ہی نہیں۔ وہ کیوں جارہے تھے؟ یہ مفروضہ تو بالکل ہی قائم نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس لیے جارہے تھے کیونکہ رستوپ چِن نے، ان مظالم کی، جو اس کے خیال میں نپولین نے مفتوحہ ممالک کے باشندوں پر روا رکھے تھے، داستانیں سنا سنا کر انھیں خوف زدہ کر دیا تھا۔ سب سے پہلے جن لوگوں نے رختِ سفر باندھا، وہ متموّل اور تعلیم یافتہ تھے اور وہ خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ نپولین کے قبضے کے دوران میں ویانا اور برلن کو ذرا آنچ نہیں آئی تھی اور ان شہروں کے باسی سحر انگیز اور پرکشش فرانسیسیوں کی صحبت میں جنھیں اس زمانے میں روسی، خاص طور پر خواتین، اتنی پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھتی رہی تھیں، خوشگوار وقت گزارتے رہے ہیں۔

روسی ماسکو سے اس لیے نکل گئے تھے کیونکہ ان کے سامنے مسئلہ یہ نہیں تھا کہ فرانسیسی راج کے دوران میں ان کا وقت اچھا گزرے گا یا برا۔ ان کے نزدیک فرانسیسیوں کے زیرِ تسلط زندگی گزارنے کا تصور بھی محال تھا، اس سے بدترین بات اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ بارودینو کی لڑائی سے پہلے ہی نکلنا شروع ہو گئے اور اس لڑائی کے بعد ان کے نکلنے کی رفتار میں اور بھی تیزی آ گئی۔ اگرچہ رستوپ چِن ان سے شہر کے دفاع کی اپیلیں کرتا رہا اور ماسکو کے گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے اس عزم کا اظہار کرتا رہا کہ وہ مادرِ خداوند کا آئیبر یائی ایقونہ میدان جنگ میں لے جائے گا، فرانسیسیوں پر ایسے غبارے چھوڑے گا کہ ان کا نام ونشاں باقی نہ رہے گا اور اس قسم کی دوسری احمقانہ باتوں سے اپنے خبر ناموں کے صفحات پُر کرتا رہا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انھیں معلوم تھا کہ جنگ کرنا فوج کا کام ہے اور اگر وہ یہ نہیں کر سکتی، پھر ان پر یہ لازم نہیں آتا کہ وہ نوخیز لڑکیوں اور غلاموں کو لے کر تین پربت پر پہنچ جائیں اور نپولین کے خلاف صف آرا ہو جائیں۔ اگرچہ انھیں اپنی املاک کو تباہ و برباد ہونے کے لیے یوں چھوڑنے پر بڑا ملال ہو رہا تھا لیکن وہ جانتے تھے کہ انھیں شہر سے نکلنا ہی ہوگا۔ اور وہ نکل گئے لیکن انھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہ سوچا کہ ان کا اس وسیع وعریض اور مال و دولت سے بھرپور شہر کو یوں چھوڑنا کتنی زبردست معنویت کا حامل ہوگا۔ بس وہ چلے گئے لیکن شہر کو شعلوں کے حوالے کر گئے (چوبی عمارتوں پر مشتمل کسی عظیم شہر کے باشندے اگر اسے چھوڑ کر بھاگ جائیں، اسے لازماً شعلوں کی نذر ہونا پڑے گا)۔ ان میں سے ہر ایک اپنی مرضی سے گیا لیکن ان کے اس

طور جانے کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ وہ عظیم الشان واقعہ ظہور پذیر ہوا جو سدا روسی قوم کے ماتھے کا جھومر بنا رہے گا۔ وہ خاتون، جو اس مبہم احساس کے تحت، کہ وہ اپنے اوپر بونا پارٹ کا حکم نہیں چلنے دے گی اور جسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ کہیں کاؤنٹ رستوپ چن کے حکم پر اسے روک ہی نہ لیا جائے، اپنے حبشی خدمت گاروں اور مسخروں کے ہمراہ دوسروں سے بہت پہلے جون میں ہی اپنی جاگیر واقع ساراتوف روانہ ہوگئی تھی، بالکل سیدھے سادے اور فطری انداز سے کارِ عظیم میں، جس نے روس کو تحفظ فراہم کیا، ہاتھ بٹا رہی تھی۔

تاہم رستوپ چن، جو پہلے ان لوگوں کو، جو شہر چھوڑ کر جا رہے تھے، ملاحیاں سناتا رہتا تھا اور پھر جس نے سرکاری دفاتر شہر سے باہر منتقل کر دیے تھے، اب اس نے خود شرابی للو پنجوں میں ناکارہ ہتھیار تقسیم کر دیے۔ ایک روز اس نے حکم دیا کہ ایقونوں کے ساتھ جلوس نکالا جائے، لیکن اگلے روز جب پادری اوگستین نے ایقونوں اور مقدس نشانیوں کے ساتھ باہر آنا چاہا، تو اس نے اسے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے ماسکو کے تمام نجی چھکڑے اپنے قبضے میں لے لیے اور ان میں سے ایک سو چھتیس پر وہ اس غبارے کو، جو لے پخ نے تعمیر کیا تھا، لدوا کر لے گیا۔ پھر اس نے اشاروں کنایوں میں بتایا کہ وہ ماسکو کو نذرِ آتش کر دے گا اور اعلان کیا کہ وہ اپنا گھر اپنے ہاتھوں جلا کر راکھ کر چکا ہے۔ اس کے بعد اس نے فرانسیسیوں کے نام ایک مراسلہ تحریر کیا اور انھیں برا بھلا کہا کہ انھوں نے اس کے بچپن کے گھر کو مسمار کر دیا ہے۔ کبھی وہ ماسکو کو نذرِ آتش کرنے کا پروگرام بناتا اور کبھی کانوں کو ہاتھ لگاتا اور کہتا: ''توبہ توبہ، میں بھلا یہ حرکت کیسے کر سکتا ہوں!'' کبھی وہ لوگوں کو حکم دیتا ہے کہ وہ تمام جاسوسوں کو پکڑ لیں اور اس کے سامنے پیش کر دیں۔ جب لوگ اس کے حکم کی تعمیل کرتے، وہ انھیں لعنت ملامت کرنے لگتا کہ انھوں نے یہ حرکت کیوں کی ہے۔ پہلے اس نے تمام فرانسیسی باشندوں کو شہر سے باہر نکال دیا اور پھر مادام اوبخ شالمے (ماسکو میں تمام فرانسیسیوں کی مرکزی شخصیت) کو ٹھہرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ فردِ جرم عائد کیے بغیر معمر پوسٹ ماسٹر واجب التعظیم کلیوچاریف کی گرفتاری اور جلا وطنی کا حکم دے دیا۔ ایک مرتبہ اس نے فرانسیسیوں کے خلاف لڑنے کے لیے لوگوں کو تین پربت پر اکٹھا کر لیا، پھر ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے اس نے ایک آدمی ان کے حوالے کر دیا تاکہ وہ اسے قتل کر سکیں اور خود گھوڑے پر سوار ہو کر عقبی دروازے سے باہر نکل گیا۔ کبھی وہ اعلان کرتا کہ وہ سقوطِ ماسکو کا صدمہ برداشت نہیں کر سکے گا اور داعیِ اجل کو لبیک کہہ دے گا۔ پھر وہ اپنی بیاضوں میں، جن میں وہ اس معاملے میں اپنے کردار کے متعلق یادداشتیں رقم کرتا رہتا تھا، فرانسیسی میں اشعار[9] لکھنے لگتا۔ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا، یہ شخص اس کی معنویت سمجھنے میں قطعاً ناکام رہا۔ اس کے دل میں صرف ایک ہی دھن سمائی ہوئی تھی کہ وہ کوئی ایسا کام کرے جو لوگوں کو متحیر کر دے اور اس کی دلیرانہ حب الوطنی کی دھاک بٹھا دے۔ ماسکو کے انخلا اور آتش زدگی کے تاریخ ساز اور ناگزیر واقعے میں اس کا کردار بالکل بچگانہ تھا۔ وہ اپنے حقیر و ناتواں ہاتھوں سے اس عظیم الشان عوامی سیل کے آگے، جو اسے اپنے ساتھ بہائے لیے جا رہا تھا، کبھی بند باندھنے لگتا اور کبھی اس کی رفتار میں اضافہ کرنے کی سعی کرتا۔

6

ہیلین، جو دربار کے ساتھ ولنا سے واپس پیٹرز برگ لوٹ آئی تھی، مخمصے میں گرفتار تھی۔

پیٹرز برگ میں اسے ایک عظیم المرتبت شاہی مصاحب کی، جو امپراطوریہ میں کسی بلند ترین منصب پر بھی فائز تھا، سرپرستی حاصل تھی۔ تاہم ولنا میں اپنے قیام کے دوران میں اس نے ایک غیر ملکی شہزادے کے ساتھ جسمانی تعلقات استوار کر لیے تھے۔ جب وہ پیٹرز برگ واپس آئی، شاہی مصاحب اور شہزادہ دونوں وہاں موجود تھے۔ دونوں اپنے اپنے حقوق جتا رہے تھے اور ہیلین کو اپنی معاشرتی زندگی میں ایک نئی الجھن کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے تعلقات دونوں کے ساتھ برقرار رہیں اور کسی کے ساتھ بگاڑ کی نوبت نہ آئے۔

وہ چیز، جو کسی دوسری عورت کے لیے اگر ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتی، کاؤنٹس بزوخوا نے اسے کبھی پرکاہ کے برابر بھی اہمیت نہ دی۔ اس کی شہرت ہوشیار ترین عورت کی تھی اور یہ بے سبب نہیں تھی۔ کذھب صورت حال سے پیچھا چھڑانے کے لیے اگر وہ رازداری، سخن طرازی یا حیلہ جوئی سے کام لیتی، اپنے مقدمے کو خود ہی خراب کر لیتی کیونکہ یہ اعترافِ جرم ہوتا، لیکن ہیلین نے، صحیح معنوں میں عظیم انسان کی طرح، کہ وہ جو جی چاہے کر سکتا ہے، فوراً یہ رویہ اختیار کر لیا کہ وہ راستی پر ہے۔ اور وہ صدق دل سے اس پر یقین رکھتی تھی۔ اور باقی تمام لوگ خطاکار ہیں۔

جب نوجوان غیر ملکی شہزادے نے پہلی مرتبہ اسے طعنہ دینے کا حوصلہ کیا، اس نے اپنا خوبصورت سر اوپر اٹھایا اور اس کی طرف نیم متوجہ ہو کر پرسکون لہجے سے بولی:

"آپ کا رویہ بالکل مردوں کا ہے۔ خود غرض اور سفاک! مجھے یہی توقع رکھنا چاہیے تھی۔ عورت آپ کے لیے سب کچھ قربان کر دیتی ہے، مصائب جھیلتی ہے، دکھ اٹھاتی ہے اور اسے انعام یہ ملتا ہے! یور ہائی نس، آپ کو یہ حق کہاں سے مل گیا کہ آپ مجھ سے میری دوستیوں اور تعلقات کا حساب مانگیں؟ یہ وہ شخص ہے جو میرے لیے میرے باپ سے بڑھ کر ہے۔"

شہزادہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہیلین نے اس کی بات کاٹ دی۔

-Ehbien,oui* اس نے کہا، "میرے متعلق اس کے جو جذبات ہیں، شاید یکسر پدرانہ نہیں لیکن اس سے میرے لیے یہ وجہ جواز نہیں بنتی کہ میں اپنے دروازے اس پر بند کر دوں۔ میں کوئی مرد تھوڑے ہی ہوں کہ مہربانیوں کا جواب ناشکرے پن سے دوں۔ اور یور ہائی نس، آپ یہ بات اچھی طرح پلے باندھ لیں کہ ان تمام باتوں کے لیے، جن کا تعلق میرے ذاتی جذبات سے ہے، میں صرف خداوند اور اپنے ضمیر کے سامنے جواب دہ ہوں۔" اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس نے اپنا ہاتھ اپنی خوش قطع اور خوشنما چھاتیوں پر رکھا، جو اب پوری طرح بھر چکی تھیں، اور آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔

---

* ارے ہاں!

''لیکن خدا کے لیے میری بات تو سنو۔''

''مجھ سے شادی کر لیں اور میں آپ کی باندی بن جاؤں گی!''

''مگر یہ ناممکن ہے!''

''مجھ سے شادی کر کے آپ کی شان میں بٹا لگتا ہے۔ آپ کے لیے یہ پاتال میں گرنے کے مترادف ہے۔ آپ۔'' اور ہیلین زار و قطار رونے لگی۔

شہزادے نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی لیکن ہیلین نے، جیسے وہ دکھ سے نڈھال ہو رہی ہو، روتے اور ہچکیاں لیتے پر زور انداز سے کہا: ''دنیا کی کوئی طاقت مجھے شادی کرنے سے روک نہیں سکتی، ایسی مثالیں موجود ہیں۔'' (اس زمانے تک ایسی مثال خال خال ہی ملتی تھیں۔ اس نے البتہ نپولین اور بعض دیگر شخصیات کے حوالے دیے۔) ''میں نے اپنے خاوند کے ساتھ کبھی میاں بیوی کے تعلقات قائم نہیں کیے۔ مجھے تو محض قربانی کا بکرا بنایا گیا تھا۔'' اس نے مزید کہا۔

''لیکن ادھر قوانین ہیں... مذہب...'' شہزادے نے نیم دلی سے کہا۔ لیکن وہ اسے جو تحریص دے رہی تھی، وہ اس کے سامنے پہلے ہی ہتھیار ڈال چکا تھا۔

''قوانین، مذہب!... اگر یہ اس قسم کی صورت حال کا مداوا نہیں کر سکتے، پھر ان کے گھڑے جانے کا فائدہ؟''

شہزادے کی اندر کی سانس اندر اور باہر کی باہر رہ گئی۔ اسے تعجب اس بات پر تھا کہ خود اسے اس قسم کا آسان حل کیوں نہ سوجھا۔ اس نے سوسائٹی آف جیزس[10] کے صالح ارکان سے، جن کے ساتھ اس کے قریبی تعلقات تھے، مشورہ طلب کیا۔

چند دنوں کے بعد ایک پرشکوہ دعوت (ہیلین کو کامینی جزیرے پر اپنے گرمائی بنگلے میں اس قسم کی دعوتیں منعقد کرنے کا چسکا پڑ چکا تھا) میں اس کی خدمت میں کسی موسیو یوالبغ (Jobert) کو پیش کیا گیا۔ موسیو یوالبغ کا دور شباب گزر چکا تھا۔ اس کے بال برف کی مانند سفید تھے اور اس کی سیاہ آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ وہ[11] un Jesuite a robe courte* تھا۔ چکا چوند روشنیوں میں موسیقی کی دھنوں کے مابین وہ باغیچے میں خاصی دیر تک اس سے خداوند، یسوعؑ، اور قلبِ مقدس[12] سے محبت کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ (اس کا دعویٰ تھا کہ) رومن کیتھولک مذہب واحد سچا مذہب ہے۔ یہ مذہب اس دنیا اور آخرت میں جو تسکین فراہم کرتا ہے، اس نے اس پر بھی سیر حاصل تبصرہ کیا۔ ہیلین بہت متاثر ہوئی۔ ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی اور موسیو یوالبغ کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور ان کی آوازیں کپکپانے لگیں۔ دریں اثنا ڈانس کا آغاز ہوا چاہتا تھا اور ہیلین کا ہم رقص اسے بلانے آ گیا اور یوں اس کی اپنے مستقبل کے directeur de conscience** سے گفتگو منقطع ہو گئی۔ لیکن اگلی شام موسیو یوالبغ اکیلا

---

* a Jesuit in walking dress: عام لوگوں کے لباس میں یسوعی۔ (حاشیہ نمبر 11 دیکھیں۔)

** ضمیر کا ہدایت کار

ہی اسے ملنے آ گیا اور اس کے بعد وہ اس کے گھر اکثر آنے جانے لگا۔

ایک روز وہ کاؤنٹس کو رومن کیتھولک چرچ میں لے گیا۔ وہاں وہ عشائے ربانی کی میز کے سامنے، جہاں اسے پہنچایا گیا تھا، دوزانو ہو گئی۔ پُرکشش فرانسیسی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھے اور جیسا کہ ہیلین نے خود بعد میں بتایا، اسے محسوس ہوا جیسے ہوا کا تازہ جھونکا اس کی روح میں داخل ہو گیا ہو۔ اس کے سامنے اس کی توجیہہ یوں کی گئی کہ یہ *la grace ہے۔

پھر اس کے پاس ایک abbe[13] — **un abbe a robe longue — لایا گیا۔ وہ اس سے اس کے گناہوں کے اعترافات سنتا رہا اور اس نے اسے اس کے تمام گناہوں کی معافی دے دی۔ اگلے روز اسے ایک چھوٹا سا ڈبا موصول ہوا۔ اس میں عشائے ربانی کی روٹی تھی۔ یہ اس نے کھانا تھی۔ چند روز بعد ہیلین کو یہ سن کر بہت تسلی ہوئی کہ اسے سچے رومن کیتھولک مذہب میں داخل کر لیا گیا ہے اور یہ کہ خود پوپ اس کے مقدمے کی سماعت کرے گا اور اسے خاص دستاویز بھیجے گا۔

ان ایام کے دوران میں ہیلین کے گردوپیش جو کچھ ہو رہا تھا اور اس کے ساتھ جس قسم کا برتاؤ کیا جا رہا تھا، ذہین اور سمجھدار اشخاص اتنی زیادہ تعداد میں اس پر جو توجہ دے رہے تھے اور اس توجہ کا اظہار جن خوشگوار اور شائستہ صورتوں میں ہو رہا تھا، اور اب وہ اپنے آپ کو جس معصومیت اور پاک دامنی کی حالت میں پا رہی تھی (اس مدت کے دوران میں وہ صرف سفید ڈریس، جس پر سفید جھالریں ٹانکی ہوئی تھیں، پہنتی رہی)، ان تمام امور سے اسے بہت مسرت ہو رہی تھی۔ تاہم اس مسرت نے اسے اپنے مُدعا سے ایک لمحے کے لیے بھی غافل نہ ہونے دیا۔ جیسا کہ عیاری کے مقابلوں میں ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے کہ احمق شخص نسبتاً تیز طرار آدمی کو پچھاڑ دیتا ہے، ہیلین یہ بھانپ گئی کہ اس کے کیتھولک مذہب میں داخل کیے جانے کے بعد اس کے ساتھ جس قسم کا سلوک روا رکھا جا رہا ہے اور اسے جس طرح چکنی چپڑی باتوں سے بہلایا جا رہا ہے، اس کا بڑا مقصد اس سے یسوعی اداروں کے لیے رقوم بٹورنا ہے (جس کے متعلق اسے متعدد مرتبہ اشاروں کنایوں میں بتایا جا چکا تھا)۔ چنانچہ اس نے کسی قسم کی رقم ادا کرنے سے پہلے ان تمام مختلف رسوم کی ادائیگی کا مطالبہ کیا جو اس کی اپنے شوہر سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ اس کی عقل کے مطابق کسی بھی مذہب کی غرض و غایت محض اتنی تھی کہ وہ ایسے آداب اور دیدہ زیب رسوم کی محافظت کرتا ہے جن کی آڑ میں انسان اپنی خواہشات کی بلا روک ٹوک تسکین کر سکے۔ اور اس مقصد کے پیش نظر اس نے اس پادری سے اصرار کیا تھا جو اس کے گناہوں کے اعترافات سننے آتا تھا کہ وہ اسے اس سوال کا جواب دے کہ وہ کس حد تک شادی کے بندھنوں میں بندھی ہے۔

وہ ڈرائنگ روم میں ایک دریچے کے سامنے بیٹھے تھے۔ شام کا دھندلکا پھیل چکا تھا۔ دریچے میں سے

---

* خدا کی دین

** لمبے چغے میں ملبوس پادری

پھولوں کی مہک آ رہی تھی۔ ہیلین سفید ڈریس میں ملبوس تھی۔ شانوں اور سینے پر یہ ڈریس اتنا مہین اور شفاف تھا کہ وہ اس میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ سرخ وسپید اور خوب پلے ہوئے پادری کی داڑھی مونچھ صفاچٹ، ٹھوڑی فربہ اور گداز اور پیشانی خندہ تھی۔ وہ اپنے سفید ہاتھ عاجزی سے ایک دوسرے کے اوپر گھٹنوں پر ٹکائے ہیلین کے بالکل قریب بیٹھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر لطیف مسکراہٹ تیر رہی تھی اور وہ گاہے گاہے محتاط نظریں، جن میں اس کے حسن و جمال کے لیے نرم و حلیم تحسین سمائی ہوئی تھی، اس کے چہرے پر ڈال لیتا اور اس کے ساتھ ساتھ زیر بحث موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کی تشریح کرتا جاتا۔

ہیلین کی جب اس کے گھونگریالے بالوں، فربہ، صفاچٹ چہرے، نرم گداز اور قدرے سانولے رخساروں پر نظر پڑتی، وہ پر اضطراب انداز سے مسکرا دیتی۔ اسے ہر آن یہی فکر دامن گیر رہتی کہ گفتگو نے اب بھی پلٹا کھایا، اب بھی پلٹا کھایا۔ لیکن پادری اگرچہ لاریب اپنے ہم نشیں کے حسن و جمال اور قرب سے محظوظ ہو رہا تھا، لیکن وہ اس معاملے کو جس خوش اسلوبی سے نپٹا رہا تھا، اس سے خود ہی مسحور ہو رہا تھا۔

اس کا استدلال کچھ ان خطوط پر چل رہا تھا۔

''تم جس کام کا بیڑا اٹھا رہی تھیں، تمھیں اس کی اہمیت کا کوئی علم نہیں تھا۔ چنانچہ تم نے ایک ایسے شخص کے ساتھ ازدواجی وفاداری کا عہد و پیمان باندھا جس نے شادی کی مذہبی معنویت میں کسی قسم کا اعتقاد رکھے بغیر رشتہ مناکحت استوار کر لیا اور یوں اس نے مقدس اشیا کی بے حرمتی کے جرم کا ارتکاب کیا۔ اس شادی کی دوہری معونیت ہونا چاہیے تھی، اس میں اس کا فقدان تھا۔ تاہم اس کے باوجود تم نے جو ایجاب و قبول کیا، اس کی پابندی کرنا تم پر لازم ٹھہرتا تھا۔ تم نے اس سے انحراف کیا ہے۔ ایسا کر کے تم کس چیز کی مرتکب ہوئی ہو: peche veniel ou— peche mortel گناہِ صغیرہ یا گناہِ کبیرہ؟ اگر تمھارے اس فعل میں ارادۂ بد شامل نہیں تھا، پھر یہ گناہ صغیرہ ہے۔ اب اگر تم بچوں کو جنم دینے کے ارادے سے ازسرِنو شادی کر لو، تمھارا گناہ معاف ہو سکتا ہے۔ لیکن سوال پھر دوہری نوعیت کا ہے۔ اولاً...''

لیکن ہیلین نے، جو بور ہو رہی تھی، اچانک مسحور کن انداز سے مسکراتے ہوئے کہا:

''مگر میرا خیال ہے کہ اب جب کہ میں نے سچا دین قبول کر لیا ہے، جھوٹے مذہب نے مجھ پر جو فرائض عائد کیے تھے، ان کی پابندی مجھ پر لازم نہیں رہی۔''

ہیلین کا روحانی مشیر یہ دیکھ کر ہک دک رہ گیا کہ مسئلہ اس کے سامنے اتنا ہی سادگی سے پیش کیا گیا ہے جتنی سادگی سے کولمبس نے انڈے کو (ایک طرف سے پچکا کر) کھڑا کرنے کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس کی شاگرد نے جس غیر متوقع تیزی سے ترقی کی منازل طے کی تھیں، اسے دیکھ کر وہ خوش ضرور ہوا لیکن اس نے اتنی دانشورانہ مساعی کے بعد استدلال کی جو عمارت تعمیر کی تھی، وہ اسے ترک کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا۔

''کاؤنٹس، آئیں، ہم ایک دوسرے کو سمجھ لیں...'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور وہ اپنی روحانی دختر کے

دلائل کا ابطال کرنے لگا۔

7

ہیلین سمجھ گئی کہ کلیسائی نقطہ نظر سے معاملہ بالکل سادہ اور آسان ہے اور یہ کہ اس کے روحانی مشیر محض اس لیے روڑے اٹکا رہے ہیں کیونکہ انھیں یہ اندیشہ لاحق ہے کہ پتا نہیں سیکولر حکام اس مسئلے کے بارے میں کیا رویہ اختیار کریں۔

چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچی کہ اس معاملے میں اونچے طبقے کی رائے ہموار کیے بنا چارہ نہیں۔ اس نے معمر عالی مرتب مصاحب کے دل میں رقابت کا جذبہ پیدا کیا اور اس سے وہی کچھ کہا جو وہ اپنے دوسرے امیدوار سے کہہ چکی تھی۔ یعنی اس نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی کہ اگر وہ بلاشرکت غیرے اس کی الفت پر حق جتانا چاہتا ہے تو اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ وہ اس سے شادی کر لے۔

ایک ایسی عورت کے ساتھ، جس کا خاوند ابھی بقید حیات تھا، شادی کی تجویز سن کر سن رسیدہ شاہی مصاحب بھی ابتدأ اتنا ہی سراسیمہ ہوا جتنا کہ نوجوان شہزادہ ہوا تھا۔ لیکن جب ہیلین نے اپنے اس غیر متزلزل یقین کا اظہار کیا کہ معاملہ اتنا ہی سادہ اور مطابق فطرت ہے جتنا نا کتخدا دوشیزہ سے نکاح کرنا، تو وہ بھی متاثر ہو گیا۔ اگر وہ ذرا بھی ہچکچاہٹ، مکروفن یا خجالت کا مظاہرہ کرتی تو اس میں کوئی کلام نہیں کہ اسے اپنے مقصد کے حصول میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑتا۔ تاہم اس نے نہ صرف یہ کہ رازداری یا شرم کی کوئی علامت ظاہر نہ ہونے دی بلکہ اس کے برعکس اس نے بڑی سادگی اور بے ریائی سے پورا معاملہ اپنے بے تکلف دوستوں (اس کا مطلب تمام پیٹرز برگ ہے) کے سامنے بیان کر دیا اور انھیں بتا دیا کہ پرنس اور عالی مرتبت مصاحب دونوں نے اس کے ساتھ شادی کی درخواست کی ہے، وہ دونوں سے پیار کرتی ہے اور کسی ایک کو بھی دکھ پہنچانے سے خوف کھاتی ہے۔

ایکا ایکی سارے پیٹرز برگ میں افواہ پھیل گئی، یہ نہیں کہ ہیلین اپنے خاوند سے طلاق لینا چاہتی ہے (اگر خبر کی نوعیت یہ ہوتی تو بے شمار اشخاص اس کے اس غیر قانونی ارادے کے خلاف پرزور احتجاج کرتے)، بلکہ یہ کہ ناشاد اور پرکشش ہیلین اس مخمصے میں گرفتار ہے کہ اپنے دو امیدواروں میں سے کس کو شادی کے لیے ترجیح دے۔ اب مسئلہ یہ نہیں تھا کہ آیا اس قسم کی شادی ہو بھی سکتی ہے یا نہیں، بلکہ محض یہ تھا کہ بہتر رشتہ کون سا ہے اور شاہی دربار میں اس معاملے کے متعلق کیا رویہ اختیار کیا جائے گا۔ بلاشبہ ایسے بے لوچ اور سخت گیر افراد بھی موجود تھے جو اس مشکل مسئلے کی تہہ تک پہنچنے اور اس سے عہدہ برآ ہونے کی صلاحیت سے عاری تھے، اور انھیں اس قضیے میں شادی کی مقدس رسم کی بے حرمتی نظر آتی تھی، لیکن وہ اقلیت میں تھے اور انھوں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔ تاہم جہاں تک اکثریت کا تعلق ہے، وہ ہیلین کی خوش بختی میں دلچسپی لیتی رہی اور آپس میں یہ بحث کرتی رہی کہ دونوں میں سے شادی کا بہتر امیدوار کون ہو سکتا ہے۔ جہاں تک اس معاملے کا تعلق ہے کہ اس عورت کے لیے، جس کا شوہر

ابھی تک زندہ ہو، شادی رچانا صحیح ہے یا غلط، اس کے بارے میں کچھ نہ کہا گیا۔ وہ کہتے تھے کہ اس مسئلے کا فیصلہ ان لوگوں نے، جو ''مجھ سے یا تم سے زیادہ عقل مند'' ہیں، کر دیا ہے اور اس فیصلے کی صحت کے متعلق شک وشبے کا اظہار کرنا اپنی حماقت اور معاملہ فہمی (savoir faire) کے فقدان کا ڈھنڈورا پیٹنے کے مترادف ہے۔

صرف ماریا دمتریونا آخردیسموا نے، جو ان گرمیوں میں اپنے ایک بیٹے سے ملنے چلی آئی تھی، ایسی رائے، جو مقبول نقطہ نظر کے قطعی منافی تھی، ظاہر کرنے کا حوصلہ کیا۔ کسی بال پر اس کی جب ہیلین سے ملاقات ہوئی، اس نے اسے کمرے کے عین درمیان میں ہی روک لیا اور عام خاموشی کے بیچ اپنے اکھڑ لہجے میں گویا ہوئی:

''ہونہہ، تو ان بیبیوں نے، جن کے خاوند ابھی زندہ ہیں، دوبارہ شادیاں رچانا شروع کر دیا ہیں! تم شاید سمجھتی ہو کہ تم نے کوئی نئی اختراع کی ہے مگر بی بی، سنو، اس معاملے میں تم پچھڑ گئی ہو۔ اس کام کو شروع ہوئے مدتیں بیت چکی ہیں۔ تمام قحبہ خانوں میں یہی کچھ ہوتا ہے!'' ان الفاظ کی ادائیگی کے ساتھ ہی ماریا دمتریونا نے اپنے مخصوص تہدیدی انداز سے اپنی پوری آستینیں اوپر چڑھالیں اور اپنے اردگرد خشم ناک نگاہوں سے دیکھتی اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی کمرے کے پار دوسری طرف چلی گئی۔

اگرچہ لوگ ماریا دمتریونا سے خوف کھاتے تھے، پیٹرز برگ میں اسے ایک قسم کی مسخری خاتون سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ اس نے جو کچھ کہا، کسی نے اس پر مطلق توجہ نہ دی۔ البتہ اس بھونڈے اور عامیانہ لفظ پر، جو اس نے آخر میں استعمال کیا تھا، سب چونکے اور وہ اسے سرگوشیوں میں یوں دہرانے لگے جیسے اس خاتون کی گفتگو کا اصل نکتہ اسی لفظ میں بند ہو۔

پرنس واسیلی، جو حال ہی میں یہ بھولنے لگا تھا کہ وہ کیا کہہ چکا ہے اور ایک ہی بات کو سو مرتبہ دہراتا رہتا تھا، جب بھی اس کی اپنی بیٹی سے ملاقات ہوتی، وہ اس سے کہتا:

''ہیلین، مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔'' اور وہ اس کا ہاتھ نیچے گھسیٹ لیتا اور اسے ایک طرف لے جاتا۔ ''میرے کانوں میں بعض منصوبوں کے بارے میں... تمھیں معلوم ہی ہے کہ یہ کیا ہیں... افواہیں پہنچی ہیں۔... خیر جانِ من، تمھیں معلوم ہی ہے کہ میرا پدری دل یہ جان کر باغ باغ ہو جاتا ہے کہ تم... تمھیں اپنے دکھوں میں سے گزرنا پڑا ہے... لیکن Chere enfant* ... تمھیں صرف اپنے دل سے مشورہ کرنا چاہیے۔ مجھے بس یہی کہنا تھا۔'' اور ایک ایسے جذبے کو، جو ان مواقع پر بالکل یکساں ہوتا تھا، اپنے نہاں خانہِ دل میں چھپا کر وہ اپنا گال اپنی بیٹی کے گالوں سے لگا دیتا اور وہاں سے چل دیتا۔

بلبین، جس کی یہ شہرت، کہ وہ بے حد چالاک اور ہوشیار شخص ہے، ابھی تک برقرار تھی اور جو ہیلین کا دوست تھا۔ اس قسم کا بے لوث دوست، جنھیں روشن دماغ خواتین ہمیشہ کسی نہ کسی طرح اپنے پلو سے باندھنے کا اہتمام کر لیتی ہیں، ایسا مرد دوست، جو صرف دوست ہی رہتا ہے، اسے خلوتی کبھی نہیں بنایا جاتا۔ اس نے ایک روز غیر رسمی

* میری پیاری بیٹی

اجتماع میں اس سارے معاملے کے بارے میں اسے اپنی رائے سے آگاہ کیا۔

"بلیبن، سنو۔" (وہ اس قسم کے دوستوں کو ہمیشہ ان کے خاندانی نام سے پکارتی تھی) اور اس نے اپنی سفید انگلیوں سے، جن میں اس نے انگوٹھیاں پہن رکھی تھیں، اس کے کوٹ کی آستین کو چھوا۔ "مجھے بالکل اسی طرح، جس طرح تم اپنی ہمشیرہ کو بتاؤ گے، بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟ دونوں میں سے کون؟"

بلیبن کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ مسکرایا اور سوچنے لگا۔

"تمھیں معلوم ہے کہ تمھاری بات سن کر مجھے کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔" اس نے کہا۔ "سچے دوست کی طرح میں نے اس معاملے کے بارے میں بار بار غور وفکر کیا ہے۔ تم جانتی ہو کہ اگر تم نے شہزادے" (عمر کے اعتبار سے چھوٹا) "سے نکاح پڑھوالیا" اور اس نے اپنی انگلی ٹیڑھی کی، "تو تم دوسرے سے شادی کرنے کا موقع ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گنوا دو گی۔ مزید برآں، دربار کی ناراضگی مفت میں مول لے لو گی۔ تمھیں معلوم ہے کہ یہاں ایک قسم کا تعلق بہرحال موجود ہے۔ لیکن اگر تم معمر کاؤنٹ سے عقد کر لو، تم اس کی زندگی کے آخری ایام مسرتوں سے بھر دو گی اور اس کے بعد ایک بہت بڑے نواب کی بیوہ کی حیثیت سے... اگر شہزادہ تم سے شادی کر لے، پھر کوئی نہیں کہہ سکے گا کہ اس نے انمل اور بے جوڑ رشتہ جوڑا ہے۔" بلیبن نے کہا اور اس کے چہرے کی شکنیں معدوم ہو گئیں۔

"تم بالکل سچے دوست ہو!" ہیلین نے کہا اور اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ اس نے ایک بار پھر اس کی آستین کو چھوا اور بولی: "لیکن تم جانتے ہو کہ مجھے ان دونوں سے پیار ہے اور میں ان دونوں میں سے کسی کے جذبات کو بھی ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتی۔ میں ان دونوں کی راحت کے لیے اپنی جان کی بھینٹ بھی دے سکتی ہوں!"

بلیبن نے یوں اپنے کندھے اچکائے جیسے وہ کہنا چاہتا ہو کہ اس الجھن میں تو وہ بھی اس کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔

"کیا استاد عورت ہے!" اس نے سوچا۔ "یہ ہوئی نہ بات! اسے کہتے ہیں معاملے کو سیدھے طریق سے پیش کرنا۔ وہ بیک وقت تینوں کے ساتھ عروسی تعلقات قائم کرنا چاہتی ہے۔"

"لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمھارے شوہر کا اس معاملے میں کیا خیال ہے؟" اس کی ساکھ اتنی مضبوط ہو چکی تھی کہ اس قسم کے بھولے بھولے سوالات پوچھنے سے اس کی شہرت پر کوئی حرف نہ آتا۔ "کیا وہ مان جائیں گے؟"

"اوہ، وہ؟ اجی وہ تو مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں — وہ میرے لیے سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائیں گے۔" ہیلین نے کہا۔ وجہ تو معلوم نہیں کیا تھی لیکن وہ سمجھتی یہی تھی کہ پیئر بھی اس کی پرستش کرتا ہے۔

بلیبن کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ کوئی پھڑکتا ہوا جملہ سوچ رہا ہے۔

"تمھیں طلاق دینے پر بھی آمادہ ہو جائیں گے؟" اس نے کہا۔

ہیلین کی ہنسی چھوٹ گئی۔

وہ لوگ، جنھیں ہیلین کی مجوزہ شادی کے قانونی اعتبار سے درست ہونے کے بارے میں شبہ تھا، ان میں ہیلین کی ماں پرنسس کوراگنا بھی شامل تھی۔ وہ متواتر اپنی بیٹی سے حسد کی آگ میں جلتی بھنتی رہی تھی اور اب جب

کہ اس کے حسد کا باعث وہ شخص تھا جو اس کے اپنے دل کے اتنا قریب تھا، وہ اس تصور سے سمجھوتا نہ کر پائی۔ اس نے ایک روسی پادری سے پوچھا: "کیا طلاق کا کوئی امکان ہے؟ خاوند کی زندگی میں دوسری شادی ہو سکتی ہے؟" اور جب اس نے جواب دیا کہ یہ ناممکن ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ پادری نے اس ضمن میں انجیل مقدس کی آیات کا حوالہ دیا جن میں (پادری کے خیال کے مطابق) اس قسم کی شادی کو واضح طور پر باطل ٹھہرایا گیا تھا۔

ان دلائل سے، جو پرنسس کے مطابق ناقابل تردید تھے، مسلح ہو کر وہ ایک روز علی الصبح اپنی بیٹی کے گھر کی جانب چل پڑی کیونکہ یہی وہ وقت تھا جب وہ گھر میں اکیلی ہوگی۔

ہیلین نے اپنی ماں کے اعتراضات سنے اور ان کے جواب میں خوش اخلاق لیکن طنزیہ انداز سے مسکرادی۔

"لیکن یہاں یہ صاف لکھا ہوا ہے: 'جو اس (عورت) سے' جسے طلاق مل چکی ہو، شادی کرے گا..." ادھیڑ عمر پرنسس نے کہا۔

"ہائے، maman•، فضول باتیں مت کرو۔ تم کچھ نہیں سمجھتیں۔ میرا جو مقام ہے، اس میں مجھ پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔" ہیلین نے اپنی ماں سے فرانسیسی میں کہا۔ اس کے خیال کے مطابق فرانسیسی موقع سے زیادہ مناسبت رکھتی تھی۔ کیونکہ اگر وہ روسی استعمال کرتی تو یہی محسوس ہوتا کہ وہ اپنی بات واضح نہیں کر سکی۔

"لیکن جان من..."

"ہائے، maman، آپ سمجھتی کیوں نہیں؟

"مقدس باپ[14] جنھیں عام لوگوں کو ان کے وعدوں، قسموں اور فرائض کی پابندیوں سے آزاد کرنے کا اختیار حاصل ہے۔"

اس مرحلے پر وہ خاتون، جو ہیلین کی مصاحبہ کی حیثیت سے اس کے گھر میں رہتی تھی، یہ بتانے آئی کہ "ہز ہائی نیس ڈرائنگ روم میں تشریف فرما ہیں اور آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں، میں نہیں آؤں گی۔ جاؤ، انھیں جا کر بتا دو کہ میں ان سے بے حد خفا ہوں کیونکہ انھوں نے مجھ سے جو وعدہ کیا تھا، انھوں نے وہ پورا نہیں کیا۔"

"Comtess••، ہر گناہ کی بخشش ہوتی ہے۔" ایک نوجوان شخص نے، جس کے بال ہلکے بھورے، چہرہ کتابی اور ناک لمبی تھی، کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

ادھیڑ عمر پرنسس احتراماً اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور آداب بجا لائی۔ نوجوان شخص نے اس پر قطعاً کوئی توجہ نہ دی اور وہ چپکے سے باہر نکل گئی۔

"ہاں، وہ راستی پر ہے۔" ادھیڑ عمر پرنسس نے سوچا۔ ہز ہائی نیس کی آمد سے اس کے تمام پختہ یقین پادر ہوا

• اماں

•• کاؤنٹس

ہو گئے تھے۔ "وہ راستی پر ہے۔ لیکن ہمیں اپنی جوانی میں ۔۔ جو کبھی لوٹ کر واپس نہیں آ سکتی ۔۔ اس طرح کیوں نہ سوجھا؟ حالانکہ یہ بالکل سیدھی سی بات ہے۔" اس نے سوچا اور وہ اپنی گاڑی پر سوار ہو گئی۔

اوائل اگست میں ہیلین کے معاملات طے ہو گئے اور اس نے اپنے خاوند (جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ اس پر بری طرح فریفتہ ہے) کے نام خط تحریر کیا۔ اس میں اس نے اسے مطلع کیا کہ اس کا ارادہ این این سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا ہے اور اس نے واحد سچا مذہب اختیار کر لیا ہے۔ اس نے اس سے درخواست کی کہ طلاق کے لیے جو بھی کارروائیاں ضروری ہیں، وہ انھیں پایۂ تکمیل تک پہنچا دے۔ یہ کارروائیاں کیا تھیں، ان کی تشریح اس کے خط کے مطابق اس شخص نے کرنا تھی، جو اس کا مکتوب لے کر جا رہا تھا۔ "اور، مائی ڈیئر، میری خداوند سے یہ دعا ہے کہ وہ آپ کو اپنے مقدس اور طاقتور حفظ و اماں میں رکھے ۔۔ آپ کی دوست، ہیلین۔"

یہ خط پیئر کے گھر اس وقت پہنچایا گیا، جب وہ بارودینو کے میدان جنگ میں پہنچ چکا تھا۔

8

جب بارودینو کی لڑائی اختتام کو پہنچ رہی تھی، پیئر دوسری مرتبہ رایئف سکی بیٹری سے بھاگ اٹھا اور سپاہیوں کے ہجوم کی معیت میں گھاٹی کے ساتھ ساتھ کنیاز کاوو کی سمت میں چلنے لگا۔ جب وہ ڈریسنگ سٹیشن پر پہنچا اور اسے وہاں ہر طرف خون ہی خون دکھائی دیا اور زخمیوں کے کراہنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں، اس کے لیے وہاں ٹھہرنا محال ہو گیا۔ چنانچہ وہ لپک جھپک آگے چلنے لگا، لیکن وہ اب بھی سپاہیوں کے نرغے میں گھرا ہوا تھا۔

اب پیئر کی صرف ایک ہی تمنا تھی اور وہ اسے بصمیم قلب پورا کرنا چاہتا تھا۔ وہ ان تمام ہیبت ناک مناظر سے، جن سے دن بھر اس کا واسطہ پڑ رہا تھا، فرار حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ وہ زندگی کے روزمرہ کے معمولات کی جانب لوٹنا اور اپنے کمرے میں اپنے بستر پر پرسکون گہری نیند سونا چاہتا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ زندگی کے عام معمولات میں ہی اپنے آپ کو اور ان تمام باتوں کو، جو اس نے دیکھی تھیں اور جن کا اسے تجربہ ہوا تھا، سمجھ سکے گا۔ لیکن زندگی کے یہ عام معمولات کہیں بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔

جس سڑک پر وہ گامزن تھا، اگرچہ اب وہاں گولے اور گولیاں اس کے سر کے اوپر سے نہیں گزر رہے تھے، تاہم اپنے چاروں اطراف اسے اب بھی وہی مناظر، جو اس نے میدان جنگ میں دیکھے تھے، نظر آ رہے تھے۔ وہاں وہی مصائب زدہ، تھکے ماندے اور بعض اوقات عجیب انداز سے تکلیف کے احساس سے عاری سپاٹ چہرے دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف وہی خون، وہی فوجی اوورکوٹ، وہی فائرنگ کی آوازیں تھیں۔ اور یہ آوازیں اگرچہ خاصے فاصلے سے آ رہی تھیں لیکن وہ اب بھی دلوں پر دہشت بٹھا رہی تھیں یہی نہیں، بلکہ ان پر مستزاد، وہاں جان لیوا

گرمی اور گرد تھی۔

موژیسک شاہراہ پر تقریباً دو میل پیدل چلنے کے بعد پیئر سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔

جھٹ پٹے کا وقت ہو چکا تھا اور توپوں کی گھن گرج قصہ پارینہ بن چکی تھی۔ پیئر نیچے لیٹ گیا اور کہنی پر سر ٹکائے کافی دیر تک تاریکی میں اپنے قریب غیر واضح شکلیں آگے بڑھتے دیکھتا رہا۔ اس کے ذہن میں بار بار یہ خیال آتا کہ توپ کا گولہ مہیب انداز سے سنسناتا برق رفتاری سے اس کی جانب بڑھتی چلا آ رہا ہے۔ اسے جھرجھری آ جاتی اور وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھتا۔ اسے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہ وہاں کتنی دیر سے پڑا ہے۔

نصف شب کے قریب تین سپاہی نمودار ہوئے۔ وہ اپنے پیچھے چند جھاڑیاں گھسیٹے لا رہے تھے۔ وہ اس کے قریب بیٹھ گئے اور آگ جلانے لگے۔ پھر انھوں نے آگ پر کیتلی رکھی اور اس میں چند ٹوٹے پھوٹے رس اور کچھ چربی ڈالی۔ روغنی خوراک کی اشتہا آور مہک دھوئیں کی بو میں گھل مل گئی۔ پیئر اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے لمبی سانس لی۔ تینوں سپاہی اس سے بے نیاز کھانے اور آپس میں باتیں کرنے میں مشغول ہو گئے۔

''تم کون ہو؟'' اچانک ایک سپاہی نے پیئر سے پوچھا۔ جس انداز سے اس نے یہ سوال پوچھا، اس کا بظاہر مطلب یہ تھا اور پیئر کے ذہن میں بھی یہی مفہوم آیا: ''اگر تم بھوکے ہو، ہم تمھیں کچھ کھانے کو دے دیں گے۔ صرف اتنا بتا دو کہ تم آدمی ایماندار ہو یا نہیں۔''

''میں — میں —'' پیئر نے کہنا شروع کیا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اسے اپنے سماجی مرتبہ حتی الامکان کم تر کر کے پیش کرنا ہوگا تا کہ وہ ان سپاہیوں کا قرب حاصل کر سکے اور وہ اس کی باتیں سمجھ سکیں۔ ''میں — درحقیقت ملیشیا کا افسر ہوں لیکن میرے آدمی یہاں نہیں ہیں۔ میں گھوڑے پر لڑائی میں شریک ہوا تھا لیکن اپنے آدمیوں سے بچھڑ گیا۔''

''واقعی؟'' ایک سپاہی نے پوچھا۔

دوسرے نے اپنے سر کو یوں جنبش دی جیسے اسے اس کے بیان پر شک ہو۔

''اچھا! اگر تم چاہو تو بھرتا حاضر ہے، کچھ کھا لو۔'' پہلے سپاہی نے کہا۔ اس نے چوبی چمچہ چاٹ کر صاف کیا اور پیئر کو تھما دیا۔

پیئر آگ کے قریب بیٹھ گیا اور کیتلی میں سے آمیزہ کھانے لگا۔ اس نے اب تک جتنے کھانے کھائے تھے، ان سب میں سے اسے یہ لذیذ ترین محسوس ہوا۔ جب وہ کیتلی پر جھکا بڑے بڑے چمچ بھر کر نادیدوں کی طرح کھا رہا تھا، آگ کی روشنی اس کے چہرے پر منعکس ہونے لگی اور سپاہی اسے چپ چاپ بغور دیکھنے لگے۔

''اب بتاؤ کہ تمھیں کہاں جانا ہے؟'' ایک نے پوچھا۔

''موژیسک۔''

''کوئی رئیس ہو؟ ہے نا؟''

''ہاں۔''

''تمھارا نام کیا ہے؟''

''پیوتر کرلووچ۔''

''خیر، پیوتر کرلووچ، ہمارے ساتھ آؤ، ہم تمھیں وہاں پہنچا دیں گے۔''

پیئر اور سپاہی موژیسک کی جانب چل پڑے۔ اندھیرا اتنا زیادہ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ جب وہ وہاں پہنچے اور شہر میں داخل ہونے کے لیے عمودی پہاڑی پر چڑھنے لگے، مرغوں کی بانگیں شروع ہو گئیں۔ پیئر کے ذہن میں ہی نہ رہا کہ اس کا ہوٹل پہاڑی کے دامن میں ہے۔ چنانچہ وہ سپاہیوں کے ساتھ ساتھ چلتا رہا اور اپنے ہوٹل سے آگے نکل گیا۔ وہ اس قدر بوکھلایا ہوا تھا کہ اگر پہاڑی کے عین درمیان میں اچانک اس کی مڈھ بھیڑ اپنے سائیس سے نہ ہو جاتی تو وہ اسے یاد بھی نہ آتا۔ سائیس اس کی تلاش میں سارے شہر میں مارا مارا پھر تا رہا تھا اور اب واپس ہوٹل آ رہا تھا۔ اس نے پیئر کو اس کے ہیٹ سے، جو اندھیرے میں دھندلا دھندلا دکھائی دے رہا تھا، پہچان لیا۔

''یور ایکسی لینسی!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''ہم تو امید کھو بیٹھے تھے! یہ آپ پیدل کیوں چل رہے ہیں؟ اب آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟''

''ارے ہاں...'' پیئر بڑبڑایا۔

سپاہی رک گئے۔

''تو تمھیں اپنے آدمی مل گئے؟'' ایک نے کہا۔ ''اچھا، خدا حافظ!... پیوتر کرلووچ۔ یہی نام تھا نا؟''

''خدا حافظ، پیوتر کرلووچ!'' دوسروں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

''خدا حافظ!'' پیئر نے جواب دیا اور اپنے سائیس کے ساتھ ہوٹل کی طرف چل پڑا۔

''مجھے انھیں کچھ دینا چاہیے۔'' اس نے اپنی جیبیں ٹٹولتے ہوئے سوچا۔ ''نہیں، نہ دینا ہی بہتر ہے۔'' باطنی آواز نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ہوٹل میں کوئی کمرا خالی نہیں تھا۔ سب مہمانوں سے پُر تھے۔ پیئر صحن میں چلا گیا۔ اس نے سر سے پاؤں تک اپنا جسم ڈھانپا اور اپنی گاڑی میں لیٹ گیا۔

9

پیئر نے بمشکل تکیے پر سر ٹکایا ہوگا کہ اسے محسوس ہوا کہ نیند اس پر غلبہ پا رہی ہے۔ پھر اچانک اتنے واضح انداز سے کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا، اسے توپوں کی گھن گرج اور گرتے گولوں کی تڑاق پڑاق سنائی دینے اور بارود اور خون کی بو اس کے نتھنوں میں گھسنے لگی۔ اس پر ہیبت طاری ہو گئی اور موت کے خوف نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا۔ دہشت نے اس بری طرح اسے جکڑ لیا کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے اپنا سر چغے سے باہر نکال لیا۔ صحن پر

گمبھیر سکوت کا راج تھا۔صرف کوئی اردلی کیچڑ میں چھپ چھپ کر رہا اور صدر دروازے پر دربان کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔پیئر کے سر کے اوپر ہوٹل کی بالائی منزل کے کمروں کے چھجوں میں چند کبوتر، جنھیں پیئر نے اپنی حرکات وسکنات سے گڑبڑادیا تھا، اپنے پر پھڑپھڑانے لگے۔سارے صحن میں خشک گھاس، گوبر اور تارکول کی تیز اور پرسکون بو رچی بسی تھی۔دو چھجوں کے مابین اسے تاروں بھرا صاف شفاف آسمان نظر آرہا تھا۔

''خدا کا شکر ہے کہ یہ مصیبت تو ختم ہوئی!'' پیئر نے دوبارہ اپنا سر ڈھانپتے ہوئے سوچا۔''اف، یہ خوف بھی کتنی بھیانک چیز ہے اور میں نے کتنی ڈھٹائی سے اس کے سامنے سرنگوں کر دیا! اور وہ...وہ آخر دم تک مستقل مزاجی اور سکون سے اپنا کام کرتے رہے...'' اس نے سوچا۔

پیئر کے ذہن میں وہ سے مراد وہ فوجی تھے جنھوں نے بیٹری پر خدمات سرانجام دی تھیں، وہ جنھوں نے اسے کھانا کھلایا تھا، اور وہ جنھوں نے ایقونے کے سامنے دعائیں مانگی تھیں۔وہ، وہ عجیب اور انوکھے لوگ تھے جن کے متعلق اسے اب تک کچھ معلوم نہیں تھا۔اب وہ اس کے ذہن میں باقی تمام مخلوقات سے واضح اور غیرمبہم انداز سے الکل الگ تھلگ تھے، نمایاں تھے۔

''فوجی سپاہی بننا!'' پیئر نے نیند کی آغوش میں جاتے ہوئے سوچا۔''اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اپنے پورے وجود کے ساتھ اجتماعی زندگی میں شامل ہو گئے ہیں اور اس میں گھل مل گئے ہیں، جس چیز نے آپ کو وہ کچھ بنایا ہے، جو کہ آپ ہیں، اس کو آپ نے کاملاً اپنے رگ وپے میں سمولیا ہے۔لیکن اس باہر کے انسان پر جو فضول، بے ضرورت، سفاک بوجھ لدا ہوتا ہے، اسے کیسے اتار کر پھینکا جائے؟ کوئی وقت تھا جب میں یہ کام کرسکتا تھا۔جیسا کہ میری خواہش تھی میں اپنے باپ سے قطع تعلق کرسکتا تھا۔دلوخوف سے جب میں نے ڈوئیل لڑی، تب بھی مجھے سپاہی کی حیثیت سے فوج میں خدمات سرانجام دینے کے لیے بھیجا جاسکتا تھا۔''

اوران سوتے جاگتے کے خوابوں کے دوران میں ایکاایکی انگلش کلب کی ضیافت، جس میں اس نے دلوخوف کو للکارا تھا، کوندے کی طرح اس کے ذہن میں لپکی۔پھر اسے تر ژھوک میں اپنے محسن کے ساتھ اچانک مڈھ بھیڑ یاد آئی۔یہاں تک پہنچنے کے بعد اس کے دماغ میں لاج کے باضابطہ اور سنجیدہ اجلاس کی، جو انگلش کلب میں منعقد ہوا تھا، تصویر ابھری۔کوئی ہستی، جو اس کے دل ودماغ میں بسی ہوئی تھی، میز کے آخری سرے پر بیٹھی تھی۔''ہاں، یہ وہی ہیں! وہ میرے محسن ہیں! لیکن ان کا تو یقیناً انتقال ہو گیا تھا!'' پیئر نے سوچا۔''ہاں ان کا انتقال ہو گیا تھا اور مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ زندہ ہیں۔مجھے کتنا افسوس ہے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور مجھے کتنی خوشی ہے کہ وہ دوبارہ زندہ ہو گئے ہیں!'' میز کی ایک جانب اناطول، دلوخوف، نیس وتسکی، دینی سوف اور ان جیسے دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ (جس طبقے سے ان لوگوں کا تعلق تھا، خواب کی حالت میں اس کے ذہن میں اس کے خدوخال اتنے ہی واضح تھے جتنے کہ اس طبقے کے، جن میں وہ لوگ شامل تھے جنھیں وہ اپنے ذہن میں وہ کہتا تھا۔) اور اس نے ان لوگوں، اناطول، دلوخوف، وغیرہم، کو با آواز بلند بلاّ گلاّ مچاتے اور گانا گاتے سنا۔تاہم اس غل غپاڑے میں بھی اسے اپنے

محسن کے مسلسل باتیں کرنے کی آواز سنائی دیتی رہی اور اس کے الفاظ کی گونج بھی اتنی ہی موثر، وزنی اور غیر منقطع تھی جتنا کہ میدان جنگ کا شور شرابا۔ مگر یہ کانوں کو بھلی لگتی اور دل کو تسکین دیتی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا محسن کیا کہہ رہا تھا، پیئر کو اس کی سمجھ نہیں آرہی تھی لیکن وہ خوب جانتا تھا (اس کے خواب میں خیالات کی انواع بھی بالکل واضح تھیں) کہ وہ نیکی اور آن (وہی فوجی) جیسا ہونے کے امکان کے بارے میں گفتگو کر رہا ہے اور وہ آپنے بھولے بھالے، بے ریا، شفیق، پر عزم چہروں کے ساتھ، اس کے محسن کے چاروں اطراف حلقہ بنائے کھڑے ہیں۔ اگرچہ وہ شفیق تھے، مگر انھوں نے پیئر کی جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا، اسے پہچانا تک نہیں۔ پیئر ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا اور ان کے ساتھ باتیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا لیکن اسی لمحے اسے محسوس ہوا کہ اس کی ٹانگیں ننگی ہیں اور انھیں سردی لگ رہی ہے۔

پیئر شرمندہ ہو گیا اور وہ ایک ہاتھ سے ٹانگیں، جن سے دراصل چغا کھسک گیا تھا، ڈھانپنے کی کوشش کرنے لگا۔ چغے کو دوبارہ ٹھیک ٹھاک کرنے کے دوران میں اس نے اپنی آنکھیں ایک لحظے کے لیے کھولیں۔ اسے وہی ہوٹل کی بالائی منزل کے کمرے، وہی کھمبے اور وہی صحن دکھائی دیا لیکن اب ہر شے نیلگوں روشنی میں لپٹی ہوئی تھی اور اوس یا پالے میں جگمگا رہی تھی۔

''پو پھٹ گئی ہے۔'' پیئر نے سوچا۔ ''لیکن جو کچھ میں چاہتا ہوں، وہ یہ تو نہیں..... میں اپنے محسن کی باتیں سننا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔'' اس نے ایک بار پھر اپنے جسم کے گرد چغا لپیٹ لیا لیکن اب اسے نہ اپنے محسن اور نہ لاج کا کوئی نام ونشاں نظر آیا۔ جو کچھ باقی رہ گیا تھا، وہ خیالات تھے جنھیں کسی ابہام کے بغیر واضح انداز سے الفاظ کا چولا پہنا دیا گیا تھا، وہ خیالات، جنھیں کوئی شخص بیان کر رہا تھا یا جنھیں وہ خود ہی متشکل کر رہا تھا۔

پیئر نے جب بعد ازاں ان خیالات کو یاد کیا، اس حقیقت کے باوجود کہ یہ خیالات ان تاثرات کے، جو اس روز اس کے ذہن پر مرتسم ہوئے تھے، پیدا کردہ تھے، اسے یقین کامل تھا کہ ان کا اظہار کسی ایسی ہستی کے ذریعے ہوا ہے جو اس کی اپنی ذات سے ماورا تھی۔ اسے کچھ یوں محسوس ہوا کہ حالت بیداری میں وہ اس نوع کے خیالات سوچنے اور ان کا اظہار کرنے کی صلاحیت سے کبھی بہرہ ور نہیں رہا تھا۔

''انسانی آزادی قوانینِ خداوندی کے تابع ہوتی ہے لیکن اس متابعت کا مشکل ترین مرحلہ وہ ہوتا ہے جب انسان کو جنگ کی بھٹی میں سے گزرنا پڑتا ہے۔'' آواز نے کہا تھا۔ ''انسان سچا اور کھرا تبھی بن سکتا ہے جب وہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ اس (ذات قدسی) سے فرار ناممکن ہے۔ اور وہ سچے اور کھرے ہیں۔ وہ باتیں نہیں بناتے بلکہ عمل کرتے ہیں۔ وہ لفظ، جو زبان سے ادا ہو گیا، روپا ہے، لیکن جو لفظ ادا نہیں کیا گیا، سونا ہے۔ انسان جب تک موت سے خائف رہتا ہے، کسی چیز پر تغلب حاصل نہیں کر سکتا، لیکن جو اس سے خوف نہیں کھاتا، وہ سب پر غالب آجاتا ہے۔ اگر دکھ نہ ہوں، انسان کو کبھی معلوم نہ ہو سکے کہ اس کی صلاحیتوں کی انتہا کیا ہے، وہ اپنے آپ کو شناخت نہ کر سکے۔'' (پیئر خواب میں سوچتا یا سنتا رہا۔) ''دشوار ترین کام اپنی روح میں کُل کی معنویت

کو یکجا کرنے کے قابل ہونا ہے۔ کُل کو یکجا کرنا؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''نہیں، یکجا کرنا نہیں۔ خیالات میں یکجائی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ تاہم انھیں اس طرح اکٹھا کیا جاسکتا اور قابلِ مصرف بنایا جاسکتا ہے، جس طرح گھوڑے کو گاڑی میں جوت کر دونوں کو اکٹھا کر دیا جاتا اور قابلِ استعمال بنا دیا جاتا ہے۔ ضرورت بس اسی بات کی ہے! ہاں، گھوڑا گاڑی کی طرح آپس میں جوت دیا جائے، جوت دیا جائے...'' پیئر نے دوبارہ اپنے آپ سے کہا۔ وہ وجد سے سرشار ہو رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، یہی الفاظ، صرف یہی الفاظ اس کو صحیح انداز سے بیان کر رہے ہیں اور انھوں نے اس سارے مسئلے کو، جس نے اسے اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا، حل کر دیا ہے۔

''ہاں، ہمیں چاہیے کہ ہم انھیں گھوڑا گاڑی کی طرح آپس میں جوت دیں، جوتنے کا وقت آگیا ہے۔''

''یورَ ایکسی لینسی، گھوڑے جوتنے کا وقت ہوگیا ہے، یورَ ایکسی لینسی، گھوڑے جوتنے کا وقت ہوگیا ہے!''

کوئی آواز اس کے الفاظ دہرا رہی تھی۔ ''گھوڑے جوتنے کا وقت ہوگیا ہے، جوتنے کا وقت ہوگیا ہے...''

یہ اس کے سائیس کی آواز تھی۔ وہ اسے جگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ سورج پوری آب و تاب سے پیئر کے چہرے پر چمک رہا تھا۔ اس کی نظریں غلیظ صحن پر پڑیں۔ صحن کے عین درمیان میں سپاہی اپنے مریل گھوڑوں کو پانی پلا رہے اور صدر دروازے میں سے چھکڑے باہر نکال رہے تھے۔ پیئر کو گھن آگئی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کیں اور بعجلت دوبارہ گاڑی کی نشست پر لیٹ گیا۔

''نہیں، یہ نہیں... یہ وہ نہیں جو میں دیکھنا اور سمجھنا چاہتا ہوں۔ میں وہ سمجھنا چاہتا ہوں جو مجھ پر خواب میں منکشف ہوا تھا۔ صرف ایک اور سیکنڈ کی دیر تھی اور میں سب کچھ سمجھ جاتا۔ مگر میں کیا کروں؟ سب کچھ ایک دوسرے کے ساتھ جوت دوں؟ لیکن میں سب کچھ کیسے جوت سکتا ہوں؟'' اور پیئر کو یہ جان کر بہت دکھ ہوا کہ اس نے خواب میں جو کچھ دیکھا اور سنا تھا، اس کی معنویت معدوم ہو چکی ہے۔

اس کے سائیس، کوچوان اور ہوٹل کے مالک نے اسے بتایا کہ ایک افسر خبر لایا ہے کہ فرانسیسی موژیسک کی طرف پیش قدمی کر رہے ہیں اور ہماری افواج پیچھے ہٹ رہی ہیں۔

پیئر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گھوڑے جوتنے اور گاڑی اپنے پیچھے لانے کا حکم دیا۔ وہ خود پیدل ہی شہر میں سے گزرنے لگا۔

سپاہ شہر سے رخصت ہو رہی تھی اور تقریباً دس ہزار زخمیوں کو وہیں چھوڑے جا رہی تھی۔ یہ زخمی صحنوں میں، مکانوں کے دریچوں کے سامنے اور گلیوں میں، جہاں انھوں نے اپنے چھکڑوں کے اردگرد جمگھٹا کر رکھا تھا، دکھائی دے رہے تھے۔ وہ چلا رہے تھے، گالیاں بک رہے تھے اور ایک دوسرے سے ہاتھا پائی کر رہے تھے۔ پیئر نے ایک زخمی جرنیل کو، جسے وہ جانتا تھا، اپنی گاڑی میں، جو اس سے آملی تھی، نشست پیش کی۔ سفر کے دوران میں اسے اپنے برادرِ نسبتی اناطول اور آندرے کے انتقال کی خبریں ملیں۔

10

پیئر تیس اگست کو ماسکو پہنچا۔ وہ ابھی بمشکل شہر کے دروازوں کے قریب پہنچا تھا کہ رستوپ چن کا ایجوٹنٹ اسے ملنے آ گیا۔

''ہم ہر جگہ آپ کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔'' ایجوٹنٹ نے کہا۔ ''کاؤنٹ فوری آپ سے ملنے کے خواہش مند ہیں۔ ان کی درخواست ہے کہ ایک انتہائی اہم معاملے کے سلسلے میں آپ ان سے بلا تاخیر ملاقات فرمائیں۔''

پیئر نے گھر گئے بغیر کرائے کی گاڑی پکڑی اور گورنر جنرل کے مسکن کی طرف چل پڑا۔

کاؤنٹ رستوپ چن اسی صبح ساکول نکی میں اپنے گرمائی بنگلے سے واپس آیا تھا۔ اس کا پیش دالان اور استقبالیہ کمرہ افسروں سے پٹا پڑا تھا، جنھیں یا تو بلایا گیا تھا یا پھر وہ خود ہی ہدایات لینے چلے آئے تھے۔ واسلچی کوف[15] اور پلاتوف پہلے ہی کاؤنٹ سے مل چکے تھے اور اسے تفصیل سے بتا چکے تھے کہ ماسکو کا دفاع ناممکن ہے اور شہر کو دشمن کے حوالے کرنا ہی ہوگا۔ اگرچہ شہر کے باشندوں سے یہ خبر چھپائی گئی تھی، لیکن رستوپ چن کی طرح افسران۔ مختلف محکموں کے سربراہان۔ کو خوب علم تھا کہ ماسکو عنقریب دشمن کی تحویل میں چلا جائے گا اور ذاتی ذمے داری سے بچنے کے لیے وہ رستوپ چن سے یہ دریافت کرنے چلے آئے تھے کہ انھیں اپنے اپنے محکموں سے کیسے نپٹنا ہے۔

جب پیئر استقبالیہ کمرے میں داخل ہو رہا تھا، فوج کا ایلچی کاؤنٹ کے پرائیویٹ کمرے سے باہر نکل رہا تھا۔ اس پر سوالات کی جو بوچھاڑ ہوئی، ان کے جواب میں اس نے بے بسی سے محض اپنا بازو لہرایا اور کمرے میں سے گزرتا باہر چلا گیا۔

استقبالیہ کمرے میں انتظار کے دوران میں پیئر نے تھکی ہاری نگاہوں سے مختلف حکام۔ بوڑھے اور نوجوان، فوجی اور غیر فوجی، اہم اور غیر اہم۔ پر، جو وہاں جمع تھے، نظر ڈالی۔ وہ سبھی پریشان اور آزردہ خاطر دکھائی دے رہے تھے۔ وہ اپنی نشست سے اٹھا اور عہدے داروں کے ایک گروہ میں، جس میں اس نے اپنے ایک واقف کار کو پہچان لیا تھا، جا شامل ہوا۔ پیئر سے علیک سلیک کرنے کے بعد وہ دوبارہ اپنی باتوں میں مشغول ہو گئے۔

''اگر انھیں شہر سے باہر بھیج دیا جائے اور بعد میں دوبارہ واپس لے آیا جائے، تو اس سے کوئی ہرج واقع نہیں ہوگا لیکن حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''لیکن ادھر دیکھو، انھوں نے کیا لکھا ہے۔'' دوسرے نے مطبوعہ پرچے کی طرف، جو اس کے ہاتھ میں تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ اور بات ہے۔ یہ عوام کے لیے ہے۔'' پہلے نے جواب دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' پیئر نے پوچھا۔

''اوہ، ایک اور خبر نامہ۔''

پیئر اسے لے کر پڑھنے لگا:

''ان افواج سے، جو ان کی جانب بڑھ رہی ہیں، جلد از جلد ملنے کی خاطر، ہز سیرین ہائی نس موژیسک میں سے گزرے ہیں اور انھوں نے اتنی مضبوط مورچہ بندیاں قائم کر لی ہیں کہ دشمن کے لیے انھیں روندنا آسان نہیں ہو گا۔ انھیں یہاں سے گولہ بارود سمیت اڑتالیس توپیں بھیجی جا چکی ہیں اور ہز سیرین ہائی نس نے اعلان فرمایا ہے کہ جب تک ان کے جسم میں خون کا آخری قطرہ موجود ہے، وہ ماسکو کا دفاع کرتے رہیں گے، بلکہ وہ شہر کے گلی کوچوں میں بھی لڑائی لڑنے کے لیے تیار ہیں۔ برادران من، اس بات سے قطعاً نہ گھبرائیں کہ عدالت ہائے انصاف بند کر دی گئی ہیں، ان کا یہاں سے منتقل کیا جانا ضروری تھا لیکن خاطر جمع رکھیں، ہم مفسدوں اور فتنہ پردازوں سے نپٹنا اور انھیں سبق سکھانا جانتے ہیں۔ جب وقت آئے گا، مجھے شہر اور دیہات کے جری اور دلیر جوانوں کی ضرورت پیش آئے گی۔ میں ایک دو دن پیشتر طلبی نامے بھیج دوں گا لیکن فی الحال ایسی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ چنانچہ میں چپ ہوں۔ کلہاڑی بہت مفید ہتھیار ہے۔ شکاری برچھی بھی بری نہیں مگر سہ شاخہ سب سے زیادہ موزوں رہے گا۔ فرانسیسی رائی کے گٹھے سے زیادہ وزنی نہیں ہوتا۔ کل میں ڈنر کے بعد مادر خداوند کا آئبیریائی الیقوینہ سینٹ کیتھرین ہسپتال میں زخمیوں کے پاس لے جاؤں گا۔ وہاں ہم کچھ پانی کو متبرک بنائیں گے، اس سے وہ بھی چند دنوں کے اندر اندر شفایاب ہو جائیں گے۔ اب میری طبیعت بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ میری ایک آنکھ میں تکلیف ہو گئی تھی لیکن اب میں دونوں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں۔''

''لیکن مجھے تو فوجیوں نے یہی بتایا تھا کہ شہر میں جنگ کرنا ناممکن ہے۔'' پیئر نے کہا، ''اور یہ کہ ہماری پوزیشن ـــ''

''بالکل، اور ہم بھی تو یہی کہہ رہے ہیں۔'' پہلے شخص نے کہا۔

''اور اس کا کیا مطلب ہے: 'میری ایک آنکھ میں تکلیف ہو گئی تھی لیکن اب میں دونوں آنکھوں سے دیکھ سکتا ہوں'؛'' پیئر نے پوچھا۔

''پرنس کی آنکھ میں گوہانجنی نکل آئی تھی۔'' ایجوٹنٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''اور جب میں نے انھیں بتایا کہ لوگ دریافت کرنے آ رہے ہیں کہ انھیں کیا آزار ہے، تو وہ بہت پریشان ہوئے۔ کاؤنٹ، ہاں، خوب یاد آیا۔'' اس نے اچانک مسکراتے ہوئے پیئر سے مخاطب ہو کر کہا: ''سنا ہے کہ آپ کو کچھ گھریلو پریشانیاں لاحق ہیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ کاؤنٹس، آپ کی زوجہ محترمہ ـــ''

''مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔'' پیئر نے بے نیازی سے کہا۔ ''لیکن آپ نے کیا سنا ہے؟''

''خیر، آپ کو معلوم ہی ہے کہ لوگ کیسی کیسی باتیں گھڑ لیتے ہیں۔ میں صرف وہی کچھ دہرا سکتا ہوں جو میں نے سنا ہے۔''

''اور آپ نے کیا سنا ہے؟''

''لوگ کہتے ہیں'' ایجوٹنٹ نے اسی طرح مسکراتے ہوئے کہا، ''کہ کاؤنٹس، آپ کی زوجہ محترمہ، بیرون ملک جانے کی تیاریاں کررہی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ نری بکواس ہے...''

''ممکن ہے۔'' پیئر نے بے دھیانی سے اپنے گردوپیش دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اور وہ صاحب کون ہیں؟'' اس نے کوتاہ قامت، بزرگ سال شخص کی طرف، جس کی گھنی داڑھی اور بھویں برف کی طرح صاف شفاف تھیں، اور جو صاف ستھرے نیلے کوٹ میں ملبوس تھا، اشارہ کرکے پوچھا۔

''وہ؟ اوہ، وہ کاروباری ہے۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ ہوٹل کا مالک ویریش چاگن ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے اعلان نامے کی کہانی سن لی ہوگی۔''

''اچھا، تو یہ ہے وہ ویریش چاگن!'' پیئر نے بوڑھے آدمی کے چہرے کو یوں بغور جانچتے ہوئے کہا جیسے وہ وہاں غداری کی علامت تلاش کررہا ہو۔

''یہ وہ شخص خود نہیں ہے۔۔ یہ اس شخص کا، جس نے وہ اعلان نامہ تحریر کیا تھا، باپ ہے۔'' ایجوٹنٹ نے کہا۔ ''وہ نوجوان زیرِ حراست ہے اور میرا خیال ہے کہ اسے اچھی خاصی مصیبت بھگتنا پڑے گی۔''

ایک پست قامت، سن رسیدہ شخص، جس نے سینے پر تمغہ سجا رکھا تھا اور ایک دوسرا سرکاری منصب دار، جو اصلاً جرمن تھا اور جس نے گلے میں صلیب لٹکائی ہوئی تھی، گروپ میں آشامل ہوئے۔

''آپ کو معلوم ہے'' ایجوٹنٹ نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''یہ بڑی پیچیدہ کہانی ہے۔ اعلان نامہ کوئی دو ماہ قبل منظرِ عام پر آیا تھا۔ کاؤنٹ کو اس کے متعلق مطلع کیا گیا تھا۔ انھوں نے تفتیش کا حکم دے دیا۔ گاوریلو ایوانچ نے تحقیقات کا کام سنبھالا۔ اعلان نامہ پورے تریسٹھ ہاتھوں میں گزرا تھا۔ وہ ایک شخص کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا: 'تمھیں یہ کس نے دیا تھا؟' 'فلاں نے'، وہ دوسرے کے پاس جاتا اور اس سے پوچھتا: 'تمھیں یہ کس نے دیا تھا؟' 'فلاں نے۔' اور یوں کرتے کراتے وہ اس نیم تعلیم یافتہ تجارت پیشہ شخص تک۔۔ جو آپ کو معلوم ہی ہے کہ بالکل نکما آدمی ہے۔۔ پہنچ گیا۔'' ایجوٹنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس سے سوال کیا گیا: 'تمھیں یہ کس نے دیا تھا؟' اور اصل بات یہ ہے کہ ہمیں خوب معلوم تھا کہ اسے یہ کس سے ملا تھا۔ اسے یہ صرف پوسٹ ماسٹر سے ہی مل سکتا تھا، تاہم یہ بات بالکل عیاں تھی کہ ان دونوں نے آپس میں کوئی سانٹھ گانٹھ کرلی تھی۔ 'کسی نے بھی نہیں۔' وہ کہتا ہے۔ 'یہ میں نے خود لکھا تھا۔' اسے دھمکیاں دی گئیں، پیار دلاسے سے سمجھایا گیا لیکن وہ گل محمد اپنی بات پر اڑا رہا اور یہی کہتا رہا: 'یہ میں نے خود لکھا تھا۔' چنانچہ یہ معاملہ اسی صورت میں کاؤنٹ کے گوش گزار کردیا گیا۔ کاؤنٹ نے اسے بلوایا۔ 'تمھیں یہ اعلان نامہ کس نے دیا تھا؟' 'میں نے خود لکھا تھا۔' خیر، آپ کاؤنٹ کو تو جانتے ہی ہیں۔'' ایجوٹنٹ نے فخر و مسرت سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ان کا پارہ آسمان پر چڑھ گیا۔۔ اس شخص کی جسارت ملاحظہ فرمائیں۔ کس ڈھٹائی سے جھوٹ بول رہا ہے اور ٹس سے مس نہیں ہوتا!''

"ارے! میرا خیال ہے کہ کاؤنٹ اس معاملے میں کلیوچاریف کو پھنسانا چاہتے ہوں گے۔" پیئر نے کہا۔
"بالکل نہیں!" ایجوٹنٹ نے گھبرا کر جواب دیا۔ "اس معاملے سے قطع نظر کلیوچاریف پہلے ہی اتنے گناہوں کا ارتکاب کر چکا تھا کہ اس کے لیے ان کا بار اٹھانا مشکل ہوگیا۔ یہی وجہ ہے کہ اسے شہر سے نکال دیا گیا۔ مگر اصل بات یہ ہے کہ کاؤنٹ آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ 'تم میں اتنی عقل کہاں کہ یہ خود لکھ سکو۔' وہ کہتے ہیں۔ وہ ہیمبرگ گزٹ کا پرچہ، جو میز پر پڑا تھا، اٹھاتے ہیں۔ اور کہتے ہیں: 'اصل عبارت یہ ہے! یہ تم نے خود نہیں لکھی تھی بلکہ ترجمہ کی تھی — اور ترجمہ بھی بہت بھدا ہے کیونکہ احمق کے بچے، تمھیں فرانسیسی بھی نہیں آتی!' اور آپ کے خیال میں وہ کیا جواب دیتا ہے۔ 'نہیں۔ میں کوئی اخبار وخبار نہیں پڑھتا۔ یہ میں نے خود ہی لکھا تھا۔' 'اگر یہ بات ہے' پھر تم غدار ہو۔ میں تم پر مقدمہ چلواؤں گا اور تمھیں پھانسی پر لٹکواؤں گا۔ اب بتاؤ، یہ تمھیں کس نے دیا تھا؟' 'میں کوئی اخبار وخبار نہیں پڑھتا۔ یہ میں نے خود ہی لکھا تھا۔' اور معاملہ یہیں اٹک گیا۔ کاؤنٹ نے اس کے باپ کو بھی بلوا بھیجا لیکن ڈھیٹ آدمی پھر بھی اپنی بات پر اڑا رہا۔ اس پر مقدمہ چلا اور اسے قید بامشقت کی سزا سنائی گئی۔ اب اس کا باپ اس کی سفارش کرنے آیا ہے لیکن اس کا صاحبزادہ بڑا بدذات شخص ہے۔ اس قسم کے لوگوں سے آپ بخوبی آگاہ ہیں — ادنیٰ دکاندار کی بگڑی اولاد، پھنے خاں، نت نئی لڑکیاں پھانسنے کا شوقین، یہاں وہاں سے دو چار الفاظ سیکھ لیے اور اپنے تئیں سمجھ لیا کہ ہم افلاطون ہو گئے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ باپ کا یہاں کامینی پل پر معمولی سا ریستوران ہے — وہاں خداوند کا خاصا بڑا ایقونہ ہے۔ ایقونے میں خداوند کے ایک ہاتھ میں عصا اور دوسرے میں جواہرات سے مرصع صلیبی گلوب ہے۔ اس کا صاحبزادہ یہ ایقونہ چند دنوں کے لیے اٹھا کر گھر لے گیا۔ معلوم ہے وہاں اس نے کیا کیا؟ اس نے کسی لفنگے مصور کو بلایا..."

11

یہ نئی حکایت ابھی شروع ہی ہوئی تھی کہ پیئر کو گورنر جنرل نے طلب کر لیا۔
وہ کاؤنٹ رستوپ چن کے سٹڈی روم میں چلا گیا۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوا، گورنر جنرل ناک بھوں چڑھا رہا اور اپنے ہاتھ سے اپنی پیشانی اور آنکھیں مل رہا تھا۔ ایک پست قامت شخص اس سے کچھ کہہ رہا تھا لیکن جونہی پیئر اندر آیا، وہ چپ ہوگیا اور باہر نکل گیا۔
"اخاہ، تم تو چھپے رستم نکلے! کیا حال ہیں تمھارے؟" رستوپ چن نے کوتاہ قامت شخص کے باہر چلے جانے کے بعد پیئر سے علیک سلیک کرتے ہوئے کہا۔ "ہم نے تمھاری شجاعت کی داستانیں سنی ہیں، لیکن میں نے تمھیں یہاں آنے کی جو زحمت دی ہے، وہ اس لیے نہیں کہ میں ان کے بارے میں تم سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔ آپس کی بات ہے، mon cher*' میں تم سے صرف یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ تم فری میسن ہو؟" اس نے ذرا ترش روئی سے کہا گویا یہ

* مائی ڈیئر

کوئی ملامت انگیز بات تھی لیکن اس کے باوجود وہ اس کی خطا معاف کرنے پر تلا ہوا تھا۔

پیئر چپ رہا۔

"mon cher" میں بہت باخبر شخص ہوں۔ میں جانتا ہوں کہ کہیں سے بھی اینٹ اکھاڑو، اس کے نیچے سے ایک عدد میسن نکل آئے گا لیکن مجھے امید ہے کہ تمھارا شمار ان لوگوں میں نہیں ہوتا جو بنی نوع انسان کے تحفظ کے بہانے روس کی جڑیں کاٹنے کی پوری سعی کر رہے ہیں۔"

"ہاں، میں میسن ہوں۔" پیئر نے جواب دیا۔

"mon cher" دیکھا، میں نے کیا کہا تھا! تمھیں یقیناً معلوم ہوگا کہ سپیرانسکی اور ماگ نتسکی جہاں سے آئے تھے، انھیں وہیں واپس بھیج دیا گیا ہے۔ یہی سلوک کلیوچاریف اور ان لوگوں کے ساتھ، جو ہیکل سلیمانی کی تعمیر کی آڑ میں اپنے مادرِ وطن کے ہیکل کو مسمار کرنے کی مساعی کر رہے تھے، کیا جا چکا ہے۔ تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی کچھ وجوہ تھیں اور اگر ہمارے پوسٹ آفس کا ڈائریکٹر خطرناک آدمی نہ ہوتا، میں اسے یونہی شہر سے نہ نکال دیتا۔ میرے علم میں آیا ہے کہ شہر سے باہر نکلنے کے لیے تم نے اسے گاڑی مہیا کی تھی اور چند کاغذات، جو اس نے تمھیں بحفاظت اپنے پاس رکھنے کے لیے دیے تھے، تم نے انھیں بطور امانت اپنے پاس رکھا ہوا ہے۔ میں تمھیں پسند کرتا ہوں اور تمھیں کسی قسم کا گزند نہیں پہنچانا چاہتا۔ چونکہ تمھاری عمر مجھ سے نصف ہے، میں باپ کی طرح تمھیں مشورہ دوں گا کہ تم اس نوع کے آدمیوں سے قطع تعلق کر لو اور خود بھی حتی الامکان جلد از جلد یہاں سے کہیں باہر چلے جاؤ۔"

"لیکن کاؤنٹ، کلیوچاریف کا جرم کیا تھا؟" پیئر نے پوچھا۔

"یہ میرا معاملہ ہے اور تمھیں اس بارے میں اعتراض کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔" رستوپ چن نے گلا پھاڑ کر کہا۔

"اگر اس پر نپولین کے اعلان نامے کی تشہیر کرنے کا الزام ہے، تو اسے ثابت نہیں کیا جا سکا۔" پیئر نے (رستوپ چن کی جانب دیکھے بغیر) کہا۔ "اور ویریش چاگن ـــ"

"اچھا، اگر ذکر چل ہی نکلا ہے، پھر سنو!" رستوپ چن نے ناک بھوں چڑھاتے اور پہلے کی نسبت کہیں زیادہ اونچی آواز میں چلاتے ہوئے اسے ٹوک دیا۔ "ویریش چاگن نمک حرام اور غدار ہے اور اسے وہی سزا ملے گی جس کا وہ مستحق ہے۔" اس نے ایک ایسے شخص کی، جسے کوئی بھولی بسری تذلیل یاد آ گئی ہو، خصومت اور کینے سے کہا۔ "مگر میں نے تمھیں یہاں دوسروں کے معاملات کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے نہیں بلایا۔ تمھیں میں مشورہ ـــ یا حکم، اگر تمھاری ترجیح یہی ہے ـــ دینا چاہتا ہوں۔ تم سے میں یہی کہوں گا کہ کلیوچاریف جیسے اشخاص سے اپنے تمام تعلقات ختم کر دو اور شہر سے نکل جاؤ۔ میں ہر اس شخص کا دماغ درست کر دوں گا جس نے ـــ" پھر غالباً اسے احساس ہوا کہ وہ بزدخوف پر، جس نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تھا، برس رہا ہے، اس نے دوستانہ انداز سے پیئر کا ہاتھ پکڑا اور فرانسیسی میں بولا: "ہم پر مصیبت عظمیٰ نازل ہوا چاہتی ہے۔ ان حالات میں ہر کہ و مہ سے، جو منہ

اٹھائے مجھ سے ملنے چلا آتا ہے، جی حضوری گفتگو نہیں کر سکتا۔ بعض اوقات میرا سر لٹو کی طرح گھومنے لگتا ہے۔ خیر، moncher، اب تمھارا ذاتی طور پر کیا کرنے کا ارادہ ہے؟''

''جی کچھ بھی نہیں۔'' پیئر نے نہ نظریں اوپر اٹھائیں اور اس کے چہرے پر جو سوچ بچار جھلک رہا تھا، نہ اس میں کوئی تبدیلی کی۔ بس ویسے ہی جواب دے دیا۔

کاؤنٹ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔

''mon cher، میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ حتی الامکان جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ بس مجھے تم سے یہی کہنا تھا۔ وہ شخص، جو کانوں سے سن لیتا ہے، کتنا خوش نصیب ہوتا ہے۔ مائی ڈیئر فیلو، خدا حافظ۔ ارے ہاں!'' اس نے پیئر کو پیچھے سے آواز دی۔ ''یاد آیا۔ کیا یہ درست ہے کہ کاؤنٹس سوسائٹی آف جیزس کے پادریوں کے پھندے میں پھنس گئی ہے؟''

پیئر نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ وہ غصے سے پھنکارتا رستوپ چن کے کمرے سے باہر نکل آیا۔ جتنا غصہ آج اسے آرہا تھا، زندگی بھر کاہے کو آیا ہوگا۔

❦

پیئر کے گھر پہنچنے سے پہلے ہی خاصا اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس شام آٹھ مختلف اشخاص اسے ملنے آئے۔ ان میں کسی کمیٹی کا سیکرٹری، اس کی ملیشیا بٹالین کا کرنل، اس کا سٹیوارڈ، اس کا بٹلر اور چند سائل شامل تھے۔ ان سب کو اس سے کوئی نہ کوئی کام تھا جو اسے نپٹانا تھا۔ ان کے مسائل نہ تو پیئر کی سمجھ میں آئے اور نہ اسے ان میں کوئی دلچسپی تھی۔ وہ محض اس لیے جوابات دیتا رہا تاکہ وہ ان سے جان چھڑا سکے۔ جب آخر کار وہ اکیلا رہ گیا، اس نے اپنی بیوی کا خط کھولا اور پڑھنے لگا۔

''وہ — بیٹری کے سپاہی... پرنس آندرے ہلاک ہو گیا... معمر آدمی... انسان سچا اور کھرا تبھی بن سکتا ہے جب وہ مشیت ایزدی کے سامنے سر تسلیم خم کر دے... دکھ ناگزیر ہے... ہر چیز کا مفہوم... جوت دینا چاہیے... میری بیوی شادی کر رہی ہے... آدمی کو چاہیے کہ وہ بھول جائے اور سمجھنے کی کوشش کرے...'' اور وہ کپڑے تبدیل کیے بغیر بستر پر جا گرا اور پلک جھپکنے میں خواب خرگوش میں کھو گیا۔

جب وہ اگلی صبح بیدار ہوا، اس کا بٹلر اسے مطلع کرنے آیا: ''کاؤنٹ رستوپ چن نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ آپ شہر سے جا چکے ہیں یا جانے کی تیاریاں کر رہے ہیں، خاص پولیس افسر بھیجا تھا۔''

کوئی ایک درجن اشخاص، جنھیں پیئر سے کوئی نہ کوئی کام تھا، ڈرائنگ روم میں اس سے ملاقات کا انتظار کر رہے تھے۔ اس نے جھٹ پٹ لباس تبدیل کیا لیکن ان سے ملاقات کے لیے ڈرائنگ روم میں جانے کے بجائے وہ عقبی پورچ میں سے گزرتا مین گیٹ سے باہر نکل گیا۔

وہ ایسا غائب ہوا کہ جب تک ماسکو تباہ و برباد نہ ہوگیا، وہ اپنے گھر کے کسی فرد کو نظر نہ آیا اور نہ کسی کو یہ معلوم ہوسکا کہ وہ کہاں ہے حالانکہ اسے تلاش کرنے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا گیا تھا۔

12

رستوف یکم ستمبر، یعنی دشمن کے شہر میں داخل ہونے سے ایک روز پہلے تک، ماسکو میں مقیم رہے۔ پیتیا کے قازقوں کی اوبالینسکی رجمنٹ میں شامل ہونے اور اس کے بیلایا تسرکوف، جہاں رجمنٹ کی تربیت ہو رہی تھی، جانے کے بعد کاؤنٹس پر پریشانی کے دورے پڑنے لگے۔ یہ احساس کہ اس کے دونوں بیٹے فوج میں ہیں، دونوں کے اس کے سایہ عاطفت سے دور ہو چکے ہیں، آج یا کل دونوں میں سے کوئی بھی۔ بلکہ اس کی ایک سہیلی کی بیٹوں کی طرح دونوں ہی۔ ہلاک ہوسکتا ہے، ان گرمیوں کے دوران میں تکلیف دہ صراحت کے اس کے ذہن میں ابھرتا رہا۔ اس نے نکولائی کو واپس لانے کے لیے تگ و دو کی، خود پیتیا کے پیچھے جانا یا اسے پیٹرزبرگ میں کہیں تعینات کرانا چاہا، لیکن یہ تمام صورتیں ناممکن تھیں۔ پیتیا صرف اسی صورت میں واپس آسکتا تھا کہ اس کی رجمنٹ بھی ادھر آتی۔ دوسری صورت یہ تھی کہ اسے کسی دوسری رجمنٹ میں، جو باقاعدہ جنگ میں شریک تھی، تبدیل کرا دیا جاتا اور یوں اس کی واپسی کی راہ ہموار ہو جاتی۔ نکولائی فوج میں کہیں خدمات سرانجام دے رہا تھا اور اس خط کے بعد، جس میں اس نے پرنسس ماریا سے اپنی ملاقات کا تفصیل سے حال بیان کیا تھا، اس کے بارے میں کوئی خبر نہیں آئی تھی۔ کاؤنٹس کو بےخوابی کی شکایت لاحق ہوگئی تھی اور اگر اسے نیند آتی بھی تو وہ بس یہی خواب دیکھتی رہتی کہ اس کے دونوں بیٹے ہلاک ہوگئے ہیں۔

متعدد صلاح مشوروں اور گفتگوؤں کے بعد کاؤنٹ کو آخر کار ایک ترکیب سوجھ گئی۔ وہ اس کے ذریعے کاؤنٹس کی پریشانیوں کا کسی حد تک مداوا کرسکتا تھا۔ اس نے پیتیا کا اوبالینسکی کی رجمنٹ سے بزدخوف کی رجمنٹ میں، جو ماسکو کے نزدیک زیر تربیت تھی، تبادلہ کرالیا۔ اگرچہ پیتیا کو اب بھی فوج میں ہی رہنا تھا، کاؤنٹس کو اتنی تسلی ہوگئی کہ اس کا کم از کم ایک بیٹا اس کی آنکھوں کے سامنے رہے گا اور اسے امید ہوگئی کہ وہ پیتیا کے معاملات کچھ اس نہج سے ترتیب دے سکے گی کہ اسے کہیں جانا نہیں پڑے گا بلکہ وہ اسے ہمیشہ ایسے مقامات پر، جہاں اس کے جنگ میں شریک ہونے کا کوئی امکان نہیں ہوگا، تعینات کراتی رہے گی۔ جب تک نکولائی اکیلا خطرے کی زد میں تھا، کاؤنٹس کو یہی محسوس ہوتا رہا (اور اس بارے میں وہ ہر دم اپنے آپ کو مطعون کرتی رہی) کہ وہ اپنے تمام دوسرے بچوں کے مقابلے میں اپنے پہلوٹھی کے بیٹے کو زیادہ چاہتی ہے۔ لیکن جب اس کا چھوٹا بیٹا، جو لاابالی تھا اور پڑھنے لکھنے میں کودن، جو ہر وقت گھر میں چیزوں کی توڑ پھوڑ کرتا رہتا اور ہر شخص کے لیے وبال جان بنا رہتا، وہی پیتیا، جس کی ناک چھوٹی اور چپٹی تھی، جس کی سیاہ آنکھوں میں ہر وقت شوخی اور شرارت بھری رہتی تھی، اور جس کے تازہ گلابی گالوں پر سبزہ خط کے آثار نمودار ہونا شروع ہوگئے تھے۔ جب وہ ان لمبے تڑنگے، خوفناک اور ظالم مردوں میں،

جو کسی چیز کے متعلق جنگ کر رہے تھے اور بظاہر اس سے لطف اندوز ہو رہے تھے، جا ملا، پھر اس کی ماں کو اپنی ساری اولاد کے مقابلے میں اس سے زیادہ، کہیں زیادہ پیار ہو گیا۔ اس کے چہیتے پیتا کے ماسکو واپسی کا وقت جوں جوں قریب آتا گیا، کاؤنٹس کے اضطراب میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہونے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس پر مسرت لمحے کی آمد سے پہلے ہی ملک عدم سدھار جائے گی۔ سونیا کی ہی نہیں، بلکہ اپنی عزیز از جان نتاشا، یہاں تک کہ اپنے شوہر کی موجودگی بھی، اسے کھلنے لگی۔ ''مجھے بھلا ان سے کیا لینا ہے، مجھے صرف پیتا چاہیے!'' وہ سوچتی۔

اگست کے آخری دنوں میں رستوفوں کو نکولائی کا ایک اور خط موصول ہوا۔ اس نے یہ خط وارانیژ[16] صوبے سے، جہاں اسے نئے گھوڑے حاصل کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، تحریر کیا تھا۔ لیکن اس خط نے کاؤنٹس کے خدشات کو دور کرنے میں کوئی مدد نہ دی۔ یہ جان کر کہ نکولائی خطرے کی زد سے باہر نکل چکا ہے، وہ پیتا کے بارے میں اور بھی مشوش رہنے لگی۔

اگرچہ بیس اگست تک وہ تمام لوگ، جن سے رستوفوں کی صاحب سلامت تھی، ماسکو کو خیر باد کہہ چکے تھے اور اگرچہ ہر شخص نے کاؤنٹس کو قائل کرنے کے لیے پورا زور لگا دیا کہ انھیں حتی الامکان جلد از جلد وہاں سے رخصت ہو جانا چاہیے، کاؤنٹس کسی کی نہیں مانتی تھی۔ اس نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک اس کا نورِ نظر، سرورِ قلب، راج دلارا پیتا واپس نہیں آجاتا، وہ وہاں سے ہلنے کا نام تک نہیں لے گی۔ خدا خدا کر کے وہ اٹھائیس تاریخ کو پہنچ ہی گیا۔ جس مریضانہ جوشیلے پیار و محبت سے ماں نے اس کا خیر مقدم کیا، اس سے سولہ سالہ افسر کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس کا ارادہ تو یہی تھا کہ وہ کبھی اسے اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے گی، پھر بھی اس کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ اس کے اس عزم کی بھنک پیتا کے کانوں تک نہ پہنچے۔ تاہم پیتا اس کی نیت بھانپ گیا۔ اسے جبلی طور پر یہ اندیشہ لاحق ہو گیا کہ کہیں اپنی ماں کی موجودگی میں اس پر ''کمزوری غلبہ نہ پالے'' اور وہ ''عورتوں کا سا رویہ اختیار نہ کر لے'' (جیسا کہ وہ اپنے دل میں سوچتا تھا)، وہ اس سے سرد مہری کا برتاؤ کرنے اور اس کے سامنے آنے سے گریز کرنے لگا۔ اپنے ماسکو کے قیام کے دوران میں وہ محض نتاشا سے ننھی رہا۔ اس کے لیے اس کا دل ہمیشہ برادرانہ پیار سے، جو خاص نوعیت کا تھا اور پرستش کی حد تک پہنچ چکا تھا، لبریز رہا۔

چونکہ سہل انگاری کاؤنٹ رستوف کی گھٹی میں داخل ہو چکی تھی، چنانچہ 28 اگست تک ان کی روانگی کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ ان کا گھریلو سامان ڈھونے کے لیے ریازان اور ماسکو کی جاگیروں سے جو چھکڑے آنا تھے، وہ بھی تیس تاریخ سے پہلے نہ پہنچے۔

اٹھائیس سے اکتیس اگست تک ماسکو میں بڑی گہما گہمی کا سماں رہا۔ ہر روز ہزاروں افراد، جو بارودینو میں زخمی ہوئے تھے، درو گومیلوف دروازے میں سے ماسکو کے اندر لائے جاتے اور شہر کے مختلف علاقوں میں پہنچائے جاتے رہے۔ دوسرے دروازوں میں سے ہزاروں گاڑیاں اور چھکڑے شہر کے باسیوں اور ان کے اموال و املاک کو باہر لے جاتے رہے۔ رستوپچن کے خبر ناموں کے باوجود، یا ان کے طفیل یا ان کے عمل دخل کے بغیر، انتہائی عجیب و غریب

اور ایک دوسری کے قطعاً متضاد افواہیں شہر میں گردش کرتی رہیں۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ کسی کو شہر سے نکلنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ ان کے برعکس دوسرے یہ دعویٰ کرتے تھے کہ کلیساؤں سے ایقونے ہٹا لیے گئے ہیں اور ہر شخص کو شہر چھوڑنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ کچھ لوگوں کے مطابق بارودینو کے بعد ایک اور لڑائی ہو چکی ہے اور اس میں فرانسیسیوں کا پلیتھن نکال دیا گیا ہے، جب کہ دوسروں کے بقول ساری روسی فوج ملیامیٹ ہو چکی ہے۔ کچھ کا اِدّعا تھا کہ ماسکو ملیشیا، جس کی قیادت کلیسائی حکام کر رہے ہیں، تین پربت جا رہی ہے جب کہ دوسرے سرگوشیوں میں بتاتے پھر رہے تھے کہ آرچ بشپ اوگستن[17] کو شہر سے نکلنے سے منع کر دیا گیا ہے، غدار گرفتار کر لیے گئے ہیں، کسان اودھم مچاتے پھر رہے ہیں اور ان لوگوں کو، جو شہر چھوڑ کر جا رہے ہیں، لوٹ رہے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

لیکن یہ سب زبانی جمع خرچ تھا جب کہ اصل حقیقت (اگرچہ فلی میں کونسل کا اجلاس، جس میں ماسکو کے اتراک کا فیصلہ کیا گیا تھا، ابھی تک منعقد نہیں ہوا تھا) یہ تھی کہ وہ لوگ جو شہر چھوڑ کر بھاگ رہے تھے اور وہ جو وہیں مقیم تھے، دونوں، بے شک وہ کھلے عام اس کا اقرار نہیں کرتے تھے، یہ محسوس کرتے تھے کہ ماسکو کو یقیناً دشمن کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا جائے گا اور انھیں حتی الامکان جلد از جلد وہاں سے نکل جانا اور اپنے اموال کو بچا لینا چاہیے۔ عام تاثر یہی تھا کہ ایک روز آناً فاناً سب کچھ زیروزبر ہو جائے گا اور زبردست تبدیلیاں سروں پر منڈلا رہی ہیں لیکن ستمبر کی پہلی تاریخ تک حالات کا دھارا جوں کا توں بہتا رہا اور کچھ بھی تبدیل نہ ہوا۔ اس مجرم کی طرح، جسے پھانسی کے تختے کی جانب لے جایا جا رہا ہو اور جو جانتا ہے کہ ایک آدھ منٹ بعد اس کی زندگی کا لازماً خاتمہ ہو جائے گا لیکن وہ پھر بھی اپنے گردوپیش دیکھتا رہتا ہے اور اس کے سر پر جو ٹوپی ٹیڑھی رکھی ہوتی ہے، اسے سیدھی کرتا رہتا ہے، بعینہٖ ماسکو بھی اپنے آپ اپنی جانی پہچانی ڈگر پر چلتا رہا حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اس کی تباہی کی گھڑی کوئی دور نہیں جب اس کی زندگی کے تمام روایتی اور تسلیم شدہ حالات تہس نہس ہو جائیں گے۔

ماسکو پر قبضے سے پیشتر جو تین دن گزرے، ان کے دوران میں سارا رستوف گھرانا روزمرہ کی مختلف انواع کی سرگرمیوں میں منہمک رہا۔ خاندان کا سربراہ کاؤنٹ رستوف اپنی گاڑی میں مسلسل شہر میں گھومتا اور جو افواہیں گردش کر رہی ہوتیں، انھیں اکٹھا کرتا رہا۔ جب وہ گھر میں ہوتا، اپنی روانگی کی تیاریوں کے سلسلے میں سطحی اور عاجلانہ ہدایات دیتا رہتا۔

کاؤنٹس، جو اشیا کو چھانٹنے اور بندھوانے کے امور کی نگرانی کرتی اور ہر شخص پر زلہ گراتی رہتی، متواتر پیتا کا تعاقب کرتی رہتی لیکن وہ کبھی اس کے ہاتھ نہ آتا اور اپنا سارا وقت نتاشا کی معیت میں گزار دیتا۔ اس پر ماں اپنی بیٹی سے حسد کرتی اور جلتی بھنتی رہتی۔ صرف سونیا واحد ہستی تھی جو سامان بندھوانے کا عملی فریضہ سرانجام دے رہی تھی لیکن سونیا گزشتہ چند روز سے غیر معمولی طور پر کھچی کھچی اور اداس اداس رہنے لگی تھی۔ نکولائی کے اس خط کی، جس میں اس نے پرنسس ماریا کے ساتھ اپنی ملاقات کی تفصیل بیان کی تھی خواندگی کے دوران میں کاؤنٹس نے اس کی موجودگی میں اپنی مسرت کا کھلے بندوں اظہار کیا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس کے بیٹے اور پرنسس ماریا کی اس اتفاقیہ ملاقات

میں خدائی ہاتھ شامل تھا۔

"جب نتاشا کی بلکونسکی کے ساتھ سگائی ہوئی تھی،" کاؤنٹس نے کہا تھا، "سچ پوچھیں مجھے قطعاً کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی، لیکن میری ہمیشہ یہ آرزو رہی ہے کہ نکولائی پرنس ماریا سے شادی کرلے اور میرا دل کہتا تھا کہ وہ یہ شادی ضرور کرے گا۔ اور یہ کتنی خوش کن بات ہوگی!"

سونیا محسوس کرتی تھی کہ یہ بات درست ہے کہ رستوفوں کے حالات میں صرف ایک ہی صورت میں بہتری آسکتی ہے کہ نکولائی کسی متمول خاتون سے شادی کرلے اور اس ضمن میں پرنس سے جوڑ نہایت موزوں ہے۔ لیکن اس قسم کا تصور خود اس کے اپنے لیے بہت تلخ تھا۔ تاہم اپنے حزن وملال کے باوصف یا اس کے سبب اس نے گھریلو سامان کا چھانٹوانے اور بندھوانے کے مشکل معاملات کی نگرانی کی ذمے داری اپنے کندھوں پر لے لی اور سارا سارا دن مشغول رہنے لگی۔ جب کسی نوعیت کی ہدایات دینے کی نوبت آتی، کاؤنٹ اور کاؤنٹس نوکروں چاکروں کو اس کی جانب بھیج دیتے۔ اس کے برعکس پیتیا اور نتاشا اپنے والدین کی مدد تو کیا کرتے، الٹا ہر ایک کے لیے وبال جان بنے رہے اور نادانستہ ان کے کاموں میں رکاوٹ ڈالتے رہے۔ تقریباً سارا دن گھر ان کے بھاگتے قدموں، شوروشغب اور بے ساختہ قہقہوں کی آوازوں سے گونجتا رہا۔ وہ اس لیے نہیں قہقہے لگاتے اور شوروغل بپا کرتے تھے کہ قہقہے لگانے اور غل غپاڑا مچانے کا کوئی جواز تھا بلکہ اس لیے کیونکہ خندہ آرائی اور شگفتہ مزاجی ان کے خمیر میں رچ بس چکی تھی۔ جو کچھ بھی وقوع پذیر ہوتا، اس میں انھیں کہیں نہ کہیں مسرت کا پہلو نظر آجاتا۔ پیتیا کی خوشی کا اس لیے کوئی ٹھکانا نہ تھا کیونکہ جب وہ گھر سے رخصت ہوا تھا، وہ ابھی محض لڑکا تھا اور جب واپس آیا (جیسا کہ ہر شخص اسے بتاتا تھا) وہ خوبرو نوجوان آدمی کے روپ میں ڈھل چکا تھا، کیونکہ وہ گھر آچکا تھا، کیونکہ وہ بیلا یا تسرکوف کو، جہاں کسی قسم کی جلد لڑائی کا کوئی خطرہ نہیں تھا، خیرباد کہہ چکا تھا اور ماسکو، جہاں ہردم یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ لڑائی اب ہوئی کہ اب ہوئی، پہنچ چکا تھا۔ لیکن اس کی شگفتہ روئی کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ نتاشا کی، جس کی وہ ہردم نقل اتارتا رہتا تھا، مسرت سے باچھیں کھلی رہنے لگی تھیں۔ نتاشا اس لیے خوش تھی کیونکہ وہ خاصا طویل عرصہ ملول ومغموم رہی تھی اور جو چیز اس کے غم واندوہ کا باعث بنی تھی، اب اس کی یاد دلانے کے لیے کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ وہ اس لیے بھی مسرور ودل شاد تھی کیونکہ اس کے پاس ایک ایسی ہستی تھی جو اس سے دیوانہ وار پیار کرتی اور ایک طرح سے اس کی پرستش کرتی تھی۔ دیوی دیوتاؤں کی طرح دوسروں سے پرستش کرانا وہ چکنائی (lubricant) تھی جو اس کی جسمانی مشین کے پہیوں کے لیے نہایت ضروری تھی تاکہ وہ ہچکولے کھائے بغیر ہموار طریقے سے آگے چلتے رہیں، اور پیتیا اس کی پرستش کرتا تھا۔ لیکن سب سے بڑھ کر وہ اس لیے شاداں وفرحاں تھی کیونکہ جنگ ماسکو کے دروازوں پر دستک دے رہی تھی، عنقریب شہر کے قرب وجوار میں برپا ہوا چاہتی تھی، ہتھیار تقسیم ہو رہے تھے، ہر شخص ادھر ادھر بھاگم بھاگ پھر رہا تھا اور عمومی اعتبار سے کوئی غیر معمولی چیز وقوع پذیر ہو رہی تھی اور جو چیز غیر معمولی ہو، وہ ہمیشہ ہیجان پذیر، خاص طور نوجوانوں کے لیے تو بالکل ہی ہیجان پذیر ہوتی ہے۔

13

اکتیس اگست بروز ہفتہ روستوفوں کے گھر میں افراتفری کا عالم تھا۔ تمام دروازے کھلے تھے۔ فرنیچر یا تو باہر نکال لیا گیا تھا یا ادھر ادھر رکھ دیا گیا تھا۔ آئینے اور تصاویر اتار لی گئی تھیں۔ کمروں میں جابجا ٹرنک دھرے تھے۔ ہر طرف خشک گھاس، لپیٹنے والے کاغذ اور رسیوں کے ڈھیر لگے تھے۔ زرعی کسان اور گھریلو غلام فرشوں پر رپ رپ چلتے سامان ڈھو رہے تھے۔ صحن میں کسانوں کے چھکڑوں کا ہجوم تھا۔ بعض کھچا کھچ لادے جا چکے تھے، بعض ابھی خالی تھے۔

نوکروں چاکروں اور کسانوں کی، جو اپنے اپنے چھکڑے لے کر آئے تھے، پوری فوج تھی۔ ان کی باتوں کی آوازیں اور قدموں کی چاپ صحن اور سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ کاؤنٹ صبح کا گھر سے باہر گیا ہوا تھا۔ ادھر گھر میں جو شور و غل اور ہنگامہ بپا تھا، اس سے کاؤنٹس کے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ وہ سرکے میں بھیگی پٹی اپنے سر پر باندھے نئی نشست گاہ میں لیٹی ہوئی تھی۔ پیتیا گھر پر نہیں تھا۔ وہ ایک دوست سے ملنے چلا گیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ ملیشیا سے کسی ایسی رجمنٹ میں، جو جنگ میں شریک تھی، تبادلہ کرانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ سونیا بال روم میں تھی۔ وہ اپنی نگرانی میں چینی اور بلور کے برتن بندھوا رہی تھی۔ نتاشا اپنے اجڑے بجڑے کمرے میں فرش پر بیٹھی تھی۔ اس کے چاروں اور ڈریس، ربن اور پٹکے بکھرے پڑے تھے۔ وہ ٹکٹکی باندھے فرش کو دیکھ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں بال پر پہننے کا پرانا ڈریس تھا۔ اس کا فیشن اب متروک ہو چکا تھا لیکن یہ وہی ڈریس تھا جو اس نے پیٹرز برگ میں اپنے اولین بال میں پہنا تھا۔

نتاشا کا ضمیر اسے کچوکے لگا رہا تھا کہ جب گھر میں ہر شخص مصروف ہے، وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھی ہے۔ صبح کے دوران میں اس نے متعدد مرتبہ کچھ نہ کچھ کرنے کی سعی کی جس سے دوسروں کو کچھ مدد مل جاتی لیکن اس قسم کے کام اسے ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے اور جب تک کسی کام میں اس کا صحیح معنوں میں جی نہ لگتا، وہ کام کرنا اس کے بس کی بات نہ تھی۔ جب چینی کے برتن باندھے جا رہے تھے، وہ سونیا کے ساتھ چمٹی رہی۔ وہ ہاتھ بٹانا چاہتی تھی لیکن بہت جلد اس نے یہ ارادہ ترک کر دیا اور اپنی چیزیں باندھنے واپس اپنے کمرے میں چلی گئی۔ پہلے پہل اسے یہ خیال بہت سہانا معلوم ہوا کہ وہ اپنے تمام ڈریس اور ربن نوکرانیوں میں تقسیم کر دے، لیکن پھر جو کچھ باقی بچ رہا، جب اسے باندھنے کی نوبت آئی، تو اسے یہ کام اکتا دینے والا نظر آیا۔

"دنیاشا، تم ہی باندھ دو! ڈیئر، باندھ دو گی نا؟"

اور جب دنیاشا نے یہ سب کچھ کرنے کی آناً فاناً ہامی بھر لی، نتاشا نے اپنا پرانا بال ڈریس ہاتھوں میں پکڑا اور فرش پر بیٹھ گئی۔ وہ ایسی چیزوں کے، جن کا ان اشیاء سے، جو اس وقت اس کے خیالات میں سمائی جانا چاہیے تھیں، قطعاً کوئی تعلق نہیں تھا، خواب دیکھنے لگی۔ اپنے ان خوابوں سے وہ اس وقت بیدار ہوئی جب ملحقہ کمرے سے اسے خادماؤں کے ٹر ٹر باتیں کرنے اور ان کے عقبی پورچ کی طرف تیز تیز قدموں چلنے کی آوازیں سنائی دیں۔

نتاشا اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کھڑکی میں سے باہر جھانکنے لگی۔ چھکڑوں کی، جن میں زخمی لدے ہوئے تھے، بہت بڑی قطار باہر سڑک پر رک گئی تھی۔

نوکرانیاں، وردی پوش خدمت گار، نرسیں، باورچی، کوچوان، برتن مانجھنے والیاں، سبھی صدر دروازے پر کھڑے ٹکٹکی باندھے زخمیوں کو دیکھ رہے تھے۔

نتاشا نے سفید جیبی رومال سر پر ڈالا، دونوں ہاتھوں سے اس کے سرے پکڑے اور سڑک کی جانب بھاگنے لگی۔

بوڑھی منتظمہ خانہ (ہاؤس کیپر) ماورا کزمی نیشنا صدر دروازے پر کھڑے ہجوم میں سے نکلی اور ایک چھکڑے کی طرف، جس کے اوپر زیزفون کے ریشے کے ٹاٹ کا پردہ تنا ہوا تھا، چل دی۔ چھکڑے کے اندر ایک زرد رو افسر لیٹا ہوا تھا۔ وہ اس سے باتیں کرنے لگی۔ نتاشا، جو ابھی تک رومال کے سرے پکڑے ہوئے تھی، شرماتے لجاتے چند قدم آگے بڑھی، رکی اور ہاؤس کیپر کی باتیں سننے لگی۔

''تو تمہارا ماسکو میں کوئی نہیں؟'' ماورا کزمی نیشنا نے پوچھا۔ ''تمہیں کسی گھر میں جگہ مل جائے، تو آرام سے رہو گے۔... مثلاً یہ ہمارا گھر ہے... مالک باہر جا رہے ہیں۔''

''پتا نہیں وہ اجازت دیں گے بھی یا نہیں۔'' افسر نے مری ہوئی آواز میں جواب دیا۔ ''وہ ادھر ہمارے کمانڈنگ افسر ہیں — ان سے پوچھ لو۔'' اور اس نے ایک ہٹے کٹے میجر کی طرف، جو چھکڑوں کی قطار سے آگے واپس سڑک پر جا رہا تھا، اشارہ کیا۔

نتاشا نے زخمی افسر کی خوف زدہ آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور جھٹ پٹ میجر کی جانب چل پڑی۔

''زخمی ہمارے گھر میں ٹھہر سکتے ہیں؟'' اس نے پوچھا۔

میجر اپنا ہاتھ اٹھا کر ٹوپی تک لے گیا اور مسکرانے لگا۔

''مادموزیل، آپ کسے ٹھہرانا چاہتی ہیں؟'' میجر نے آنکھیں سکیڑتے اور مسکراتے ہوئے پوچھا۔

نتاشا نے دھیمے لہجے میں اپنا سوال دہرایا۔ حالانکہ وہ ابھی تک اپنے رومال کے سرے پکڑے ہوئے تھی، لیکن اس کے اطوار میں اور چہرے پر اتنی سنجیدگی اور متانت تھی کہ میجر نے مسکرانا بند کر دیا۔ پہلے اس نے کچھ سوچا جیسے اپنے آپ سے پوچھ رہا ہو کہ یہ کس حد تک ممکن ہے اور پھر اس نے ہاں میں جواب دے دیا۔

''ہاں، کیوں نہیں؟ وہ ٹھہر سکتے ہیں!'' اس نے کہا۔

نتاشا نے اپنے سر کو ذرا سا خم دیا۔ پھر وہ ماورا کزمی نیشنا کی طرف، جو زخمی افسر کے قریب کھڑی تھی اور غم آلود لہجے میں اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کر رہی تھی، متوجہ ہوئی۔

یہ ٹھہر سکتے ہیں — وہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھہر سکتے ہیں!'' نتاشا نے زیر لب کہا۔

وہ چھکڑا، جس میں افسر لیٹا ہوا تھا، ہانک کر ستونوں کے صحن میں پہنچا دیا گیا اور پوار سکایا سٹریٹ کے بعض دیگر باسیوں کی دعوت پر زخمیوں کے درجنوں چھکڑے گھروں کی دہلیزیں پار کرنے لگے۔

صاف نظر آرہا تھا کہ اپنے روزمرہ کے معمول سے ہٹ کر اب جو نتاشا کو نئے لوگوں سے واسطہ پڑا، اس پر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ وہ اور مادرا کزمی نیشنا حتی الامکان زیادہ سے زیادہ زخمی اپنے صحن میں لانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

''تاہم ہمیں آپ کے پاپا کو بتا دینا چاہیے۔'' مادرا کزمی نیشنا نے کہا۔

''فکر نہ کرو، فکر نہ کرو۔ آخر اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ایک ہی دن کی تو بات ہے۔ وہ ہم ڈرائنگ روم میں گزار سکتے ہیں۔ اپنے کمرے، ہم انھیں دے سکتے ہیں۔''

''بیٹی، کیا بات کرتی ہو؟ اگر ہم انھیں بغلی حصہ، نوکروں کی رہائش گاہیں اور بڑی نرس کا کمرہ بھی دینا چاہیں، پھر بھی ہمیں اجازت لینا ہوگی۔''

''اچھا، میں پوچھ لیتی ہوں۔''

نتاشا لپک جھپک گھر میں چلی گئی اور پنجوں کے بل چلتی نشست گاہ کے دروازے کے، جو نیم وا تھا، قریب پہنچ گئی۔ اندر سے سرکے اور ہوف مینز ڈراپس[18] کی مہک آرہی تھی۔

''ماما، آپ سو رہی ہیں؟''

''یہاں کوئی کیسے سو سکتا ہے؟'' کاؤنٹس نے غنودگی کے عالم میں جو ابھی ابھی اس پر طاری ہوئی تھی، آنکھیں کھولتے ہوئے کہا۔

''ماما ڈارلنگ!'' نتاشا نے اپنی ماں کے قریب جھکتے اور اپنا گال اس کے گال سے لگاتے ہوئے کہا۔ ''میں شرمندہ ہوں۔ میں کبھی دوبارہ یہ حرکت نہیں کروں گی۔ میں نے خواہ مخواہ آپ کو جگا دیا! مجھے مادرا کزمی نیشنا نے بھیجا ہے۔ اصل میں وہ کچھ زخمی لوگوں — افسروں — کو یہاں لائے ہیں۔ آپ انھیں یہاں ٹھہرنے کی اجازت دے دیں گی؟ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ انھیں اجازت دے دیں گی!'' اس نے یہ سب کچھ ایک ہی سانس میں کہہ دیا۔

''کون افسر؟ کسے یہاں لایا گیا ہے؟ مجھے کچھ سمجھ نہیں آیا۔'' کاؤنٹس نے کہا۔

نتاشا ہنس پڑی۔ کاؤنٹس کے لبوں پر بھی خفیف مسکراہٹ آگئی۔

''مجھے معلوم تھا کہ آپ انھیں آنے دیں گی — میں ابھی جاتی ہوں اور انھیں بتاتی ہوں۔'' نتاشا نے اپنی ماں کا بوسہ لیا، چھلانگ لگائی اور دروازے کی جانب بھاگ پڑی۔

دالان میں اس کا سامنا اپنے باپ سے ہو گیا۔ وہ بری خبر کے ساتھ گھر لوٹا تھا۔

''ہم ضرورت سے زیادہ عرصہ یہاں ٹکے رہے ہیں!'' وہ غیر شعوری طور پر جھلایا ہوا تھا۔ ''کلب بند ہو گیا ہے اور پولیس جا رہی ہے۔''

''پاپا، میں نے چند زخمیوں کو گھر میں ٹھہرنے کی دعوت دی ہے۔ آپ کو اعتراض تو نہیں؟'' نتاشا نے کہا۔

''نہیں۔ کیا فرق پڑتا ہے!'' کاؤنٹ نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ ''لیکن یہ فروعی بات ہے۔ میری تم سے درخواست ہے کہ معمولی باتوں کے چکر میں نہ پڑو۔ سامان باندھنے بندھوانے میں ہاتھ بٹاؤ اور یہاں سے نکل چلو۔ ہمیں یہاں سے جانا ہوگا۔ کل تک لازماً جانا ہوگا...''

اور کاؤنٹ نے اس سے ملتی جلتی ہدایات اپنے بٹلر اور دوسرے نوکروں کو دیں۔

پیتا ڈنر کے وقت گھر پہنچا اور جو خبریں وہ سن کر آیا تھا، انھیں بیان کرنے لگا۔ اس نے بتایا کہ آج کل لوگ کریملن سے ہتھیار لا رہے ہیں اور اگرچہ رستوپ چن کے خبرنامے میں یہی کہا گیا تھا کہ وہ خطرے کا اعلان ایک دو دن پہلے کر دے گا، شہر میں ہر کس و ناکس کو معلوم ہے کل سبھی کو مسلح ہو کر تین پربت پہنچنا ہے۔ خیال ہے کہ وہاں گھمسان کا رن پڑے گا۔

کاؤنٹس کا بیٹا جب یہ باتیں بڑے جوشیلے اور ولولہ انگیز انداز سے سنا رہا تھا، وہ کپکپانے لگی تھی اور اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنا شروع ہوگئی تھیں۔ وہ سمجھ گئی کہ اگر اس نے پیتا کو اس لڑائی میں شرکت سے باز رکھنے کے لیے ذرا بھی لب کشائی کی (وہ جانتی تھی کہ یہ موقع دستیاب ہونے پر وہ کتنا خوش ہے)، وہ شیوۂ مردانگی، آن اور وطن کے بارے میں کوئی بات کہنے لگے گا۔ کوئی بے معنی، ہٹیلی اور مردانہ بات، جس کی تردید کرنا ناممکن ہوگا اور اس (کاؤنٹس) کے سارے منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ چنانچہ اس امید پر کہ وہ پیتا کو اپنا محافظ اور سلامتی کا ضامن بنا کر اپنے ساتھ لے جا سکے گی، اس نے اپنے بیٹے کے سامنے اپنی زبان بند رکھی۔ لیکن ڈنر کے بعد وہ کاؤنٹ کو ایک طرف لے گئی اور اس سے منت سماجت کے انداز میں کہنے لگی: ''مجھے فوراً، اور اگر ممکن ہو تو آج رات ہی، یہاں سے لے چلو۔'' جہاں تک عورت کے پیار کا تعلق ہے، وہ جبلی عیاری سے کام لیتی ہے۔ چنانچہ کاؤنٹس نے بھی کہا، جس نے اس وقت تک ذرا بھی گھبراہٹ کا اظہار نہیں ہونے دیا تھا: ''اگر ہم آج ہی روانہ نہ ہوئے، خوف سے میری جان نکل جائے گی۔'' اور وہ بناوٹ سے کام نہیں لے رہی تھی، اب وہ واقعی ہر چیز سے خائف تھی۔

14

مادام شوس نے، جو اپنی بیٹی سے ملنے گھر سے باہر گئی ہوئی تھی، جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اس نے میاس نتسکایا سٹریٹ میں، کلال کی دکان کے باہر جو منظر دیکھا تھا، اس کی تفصیل بیان کر کے اس نے کاؤنٹس کے اندیشوں کو مزید ہوا دے دی۔ اس نے واپسی کے لیے جس سڑک کا انتخاب کیا تھا اس پر اس کے لیے گزرنا محال ہوگیا کیونکہ دکان کے سامنے شرابی ہجوم دنگا فساد کر رہا تھا۔ چنانچہ اس نے گاڑی پکڑی اور بغلی گلی میں سے گھر واپس آئی۔ راستے میں کوچوان نے اسے بتایا کہ لوگ شراب کے چوبی پیپے توڑ توڑ کر کھول رہے ہیں کیونکہ انھیں ایسا کرنے کا حکم ملا ہے۔

ڈنر کے بعد سارا رستوف گھرانا بڑے ذوق وشوق سے بہ عجلت اپنا سامان باندھنے اور روانگی کی تیاریاں کرنے لگا۔ معمر کاؤنٹ میں ایکا ایکی کام کرنے کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ وہ بھاگم بھاگ کبھی صحن میں آتا اور کبھی پھراتی

ہی پھرتی سے اندر چلا جاتا۔ وہ چلا چلا کر تابڑتوڑ نوکروں چاکروں، جو پہلے ہی خاصی تیزی دکھا رہے تھے، ژولیدہ ہدایات دے رہا تھا اور ان پر مزید تیزی سے کام کرنے کا زور دے رہا تھا۔ صحن میں کام کی نگرانی پیتا نے اپنے ذمے لے لی۔ کاؤنٹ کے متضاد احکام نے سونیا کو الجھاؤ میں ڈال دیا اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ خدمت گار کمروں میں بھاگے پھر رہے، آپس میں تُو تکار کر رہے اور شور و غل مچا رہے تھے۔ نتاشا بھی اسی والہانہ جوش و خروش سے، جو وہ ہر اس کام میں دکھاتی تھی جسے وہ اپنے ہاتھ میں لیتی تھی، مصروف عمل ہو گئی۔ شروع شروع میں سامان باندھنے کے کام میں اس کے عمل دخل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھا گیا۔ کسی شخص کو بھی یہ توقع نہیں تھی کہ وہ شوخی و شرارت کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکتی ہے۔ چنانچہ اس کی ہدایات پر سنجیدگی سے دھیان نہ دیا گیا، لیکن اس نے اپنی ہدایات پر عمل کروانے کے لیے اتنے اصرار اور جوش و خروش کا مظاہرہ کیا، بلکہ بعض اوقات اسے اتنا غصہ آیا کہ وہ قریب قریب روہنکھی ہو گئی، مگر آخر کار وہ ان سے اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کا پہلا کارنامہ، جس کی تکمیل کے لیے اسے ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑا لیکن جس نے اس کا اختیار مسلّم کر دیا، قالینوں کا بندھوانا تھا۔ کاؤنٹ رستوف کے گھر میں بیش بہا ایرانی قالینوں اور باتصویر گوبلاں پردوں[19] کا اچھا خاصا ذخیرہ تھا۔ جب نتاشا نے آغازِ کار کیا، بال روم میں دو خاصے بڑے صندوق پڑے تھے۔ ان کے ڈھکن کھلے تھے۔ ایک میں چینی کے برتن اور دوسرے میں قالین بند تھے اور تقریباً بھرے ہوئے تھے۔ میزوں پر چینی کے مزید برتن پڑے تھے۔ ابھی مزید برتن نعمت خانے سے لائے جانا تھے۔ ان کے لیے تیسرے صندوق کی ضرورت تھی اور نوکر یہ لینے گئے ہوئے تھے۔

''سونیا، ٹھہرو — ہم یہ سب کچھ دو میں ہی بند کر سکتی ہیں۔'' نتاشا نے کہا۔

''بی بی جی، ناممکن۔ ہم پہلے ہی کوشش کر چکے ہیں۔'' بٹلر نے کہا۔

''نہیں، ذرا ایک منٹ ٹھہریں۔''

اور نتاشا کاغذوں میں لپٹی پلیٹیں اور ڈشیں صندوق سے باہر نکالنے لگی۔

''ڈشیں قالینوں کے ساتھ اس صندوق میں رکھ دیں۔''

''اگر ہم صرف قالین ہی تینوں صندوقوں میں رکھنے میں کامیاب ہو گئے، تو بڑے خوش قسمت ہوں گے۔'' بٹلر نے کہا۔

''نہیں۔ ذرا ٹھہریں!'' اور نتاشا بڑی پھرتی اور مہارت سے چیزیں چھانٹنے لگی۔ ''ان کی ہمیں ضرورت نہیں۔'' اس نے ساختہ کیف چند پلیٹوں کے متعلق کہا۔ ''اور یہ، ہاں — انھیں لازماً قالینوں کے ساتھ رکھنا چاہیے۔'' اس نے ساختہ سیکسنی ڈشوں کے متعلق کہا۔

''نتاشا، جانے دو!'' کچھ نہ کرو! ہم سب کچھ بند کر لیں گے۔'' سونیا نے سرزنش کی۔

''بی بی جی کی عمر ہی کیا ہے!'' بٹلر پکارا۔

لیکن نتاشا نے ہار نہ مانی۔ اس نے تمام چیزیں باہر نکال لیں اور انھیں پھرتی سے دوبارہ صندوقوں میں رکھنے

لگی اس نے فیصلہ کر لیا کہ گھٹیا روسی قالین اور غیر ضروری چینی کے برتن لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ جب صندوقوں سے تمام اشیا نکال لی گئیں، وہ انھیں دوبارہ رکھنے لگے۔ اور ہوا یہ کہ سستی چیزیں، جنھیں ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں تھی، چھانٹ کر علیحدہ کر دی گئیں تو باقی قیمتی سامان دونوں صندوقوں میں سما گیا۔ صرف اس صندوق کا، جس میں قالین تھے، ڈھکن بند نہیں ہو رہا تھا۔ اس میں سے ایک دو چیزیں نکالی جا سکتی تھیں لیکن نتاشا اپنی مرضی منوانے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ بار بار چیزیں الٹتی پلٹتی، انھیں دوبارہ رکھتی اور نیچے گھسیڑنے کی کوشش کرتی۔ اس نے بٹلر اور پیتیا سے۔ جس کی مدد حاصل کرنے میں وہ کامیاب رہی تھی۔ ڈھکن دبوایا اور خود بھی بے جگر سے زور لگایا۔

"نتاشا، اتنا ہی کافی ہے۔" سونیا نے کہا۔ "میں نے مان لیا کہ تم ٹھیک کہتی تھیں۔ بس اوپر کا قالین باہر نکال لو۔"

"میں نہیں نکالوں گی!" نتاشا نے کہا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے چہرے سے، جس پر پسینہ بہہ رہا تھا، بال پیچھے ہٹائے اور دوسرے سے قالین نیچے دبانے لگی۔ "پیتیا، تم بھی زور لگاؤ۔ واسیلچ، تم بھی۔ اور، ذرا اور!" اس نے با آواز بلند کہا۔

قالین ہار مان گئے اور ڈھکن بند ہو گیا۔ نتاشا خوشی سے تالیاں بجانے اور منمنانے لگی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، لیکن یہ کیفیت صرف ایک آدھ سیکنڈ جاری رہی۔ وہ فی الفور نئے کام میں جت گئی۔ اب نوکر چاکر بھی اس پر پوری طرح اعتماد کرنے لگے۔ جب انھوں نے کاؤنٹ کو بتایا کہ نتالیا الیچنا نے اس کی بعض ہدایات منسوخ کر دی ہیں، اس نے کوئی برا نہ منایا۔ اب ملازمین اس سے یہ دریافت کرنے آنے لگے کہ آیا اس کے خیال میں فلاں چھکڑا پوری طرح لد چکا ہے اور آیا اس پر رسے باندھے جا سکتے ہیں۔ نتاشا کی نگرانی کا یہ فائدہ ہوا کہ کام خاصی تیز رفتاری سے ہونے لگا، فالتو اشیا نکالی جانے اور انتہائی قیمتی چیزیں کم سے کم جگہ میں بند کی جانے لگیں۔

اگرچہ وہ اس روز گئی رات تک جانفشانی سے کام میں جتے رہے، پھر بھی وہ سب کچھ نہ باندھ سکے۔ کاؤنٹس کو نیند آ گئی۔ کاؤنٹ نے روانگی اگلے دن تک اٹھا دی اور خود بھی سو گیا۔

سونیا اور نتاشا لباس تبدیل کیے بغیر نشستی کمرے میں لیٹ گئیں۔

اس شب ایک اور زخمی گاڑی میں پوارسکایا سٹریٹ لایا گیا اور ماورا کزمی نیشنا، جو صدر دروازے پر کھڑی تھی، اسے اٹھوا کر رستوفوں کے صحن میں لے آئی۔ اس کا خیال تھا کہ یہ لازماً کوئی اہم شخص ہوگا۔ اسے کالاش میں لایا گیا تھا۔ اس کی گاڑی کا چھجا اوپر اٹھا دیا گیا تھا اور اسے چاروں اطراف سے برساتی سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ ڈرائیور کے برابر بکس پر پرتمکنت وردی پوش خدمت گار بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پچھلے چھکڑے میں ایک ڈاکٹر اور دو سپاہی آ رہے تھے۔

"آپ ہمارے گھر آ جائیں۔ آئیں نا۔ مالک جا رہے ہیں اور سارا مکان خالی ہو جائے گا۔" بڑھیا نے خدمت گار سے کہا۔

''اچھا، شاید۔'' اس نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں امید نہیں کہ ہم انھیں زندہ سلامت گھر لے جا سکیں گے۔ ماسکو میں ہمارا اپنا گھر ہے لیکن یہاں سے بہت دور۔ اور اب وہاں رہ بھی کوئی نہیں رہا۔''

''تشریف لائیں۔ مالک کے گھر میں اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ آئیں، تشریف لائیں۔'' مادر اکزمی بیشنا نے کہا۔ ''صاحب کی حالت واقعی بہت خراب ہے؟'' اس نے پوچھا۔

خدمت گار نے مایوسی کے عالم میں اپنا ہاتھ لہرایا۔

''کوئی امید نہیں۔ ہمیں ڈاکٹر سے پوچھنا ہوگا۔'' اور بوڑھا خدمت گار بکس سے نیچے اترا اور پچھلے چھکڑے کی جانب چل دیا۔

''بہت اچھا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

بوڑھا خدمت گار کالاش کی طرف لوٹ آیا۔ اس نے اندر جھانک کر دیکھا اور یاس سے سر ہلانے لگا۔ پھر اس نے کوچوان کو حکم دیا کہ وہ گاڑی کو صحن کے اندر لے چلے اور وہ خود مادر اکزمی بیشنا کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''یا یسوع مسیح!'' وہ بڑبڑائی اور ان سے بولی کہ وہ زخمی کو گھر کے اندر لے چلیں۔ ''مالک کوئی اعتراض نہیں کریں گے...'' اس نے کہا۔

مگر صورت حال کا تقاضا یہ تھا کہ زخمی کو اوپر کی منزل پر جانے سے احتراز کیا جائے۔ چنانچہ وہ اسے بغلی حصے میں لے گئے اور اسے اس کمرے میں، جو مادام شوس کے تصرف میں تھا، لٹا دیا۔

زخمی شخص پرنس آندرے بلکونسکی تھا۔

15

ماسکو کے آخری دن کا سورج طلوع ہوا۔ خزانی صبح کا آسمان صاف تھا اور دھوپ چمک رہی تھی۔ اس روز اتوار تھا اور عام اتواروں کی طرح عبادت کے لیے ہر جگہ گرجاؤں کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی تک کسی بھی شخص کو یہ اندازہ نہیں ہوا کہ شہر پر کیا قیامت گزرنے والی ہے۔

شہر کی معاشرتی کیفیت کیا تھی، اس کا اظہار صرف دو علامتوں سے ہوتا تھا: چھوٹی امت یعنی مفلوک الحال طبقے کی بے چینی اور اشیا کی قیمتیں۔ اس روز کارخانوں کے مزدور، گھریلو غلام اور کسان تڑکے تڑکے ہجوم در ہجوم تین پربت کی جانب چل پڑے۔ وہاں کلرکوں، دینی مدارس کے طلبا اور شرفا کی اچھی خاصی تعداد ان ہجوموں میں شامل ہوگئی۔ رستوپ چن کا، جو اپنی شکل دکھانے میں ناکام رہا، کچھ دیر انتظار کرنے اور دلوں میں یہ یقین کر لینے کے بعد، کہ ماسکو کا سقوط ہوا چاہتا ہے، وہ تتر بتر ہونے لگے اور مے خانوں اور ریستورانوں کا رخ کرنے لگے۔ اس روز قیمتیں بھی صورت حال کی غمازی کر رہی تھیں۔ ہتھیاروں، چھکڑوں، گھوڑوں اور اشرفیوں کی قیمتیں بڑھتی رہی

جب کہ کاغذی نوٹوں اور اشیائے تعیش کی گرتی رہیں۔ چنانچہ دوپہر تک متعدد ایسے ریہڑا بانوں کی مثالیں سامنے آنے لگیں کہ وہ جو قیمتی سامان، مثلاً کپڑے کے تھان، ڈھو رہے ہیں، ان کا کرایہ وصول کرنے کی بجائے ان میں سے نصف اشیا اپنے پاس رکھ رہے ہیں۔ کسانوں کے گھوڑے پانچ پانچ سو روبل میں بکنے لگے جب کہ فرنیچر، آئینوں اور کانسی کی اشیا کی وہ بے قدری ہوئی کہ کوئی بھی انھیں خاطر میں نہیں لاتا تھا۔

رستوفوں کے متین، سنجیدہ اور قدیم الوضع گھر میں زندگی کے تمام سابقہ احوال کے انہدام کا بمشکل احساس ہوتا تھا۔ ان کے ہاں گھریلو غلاموں کی جو فوج ظفر موج تھی، اس پر نئے حالات کا جو اثر ہوا، اس کا اظہار صرف اتنا ہوا کہ رات کے دوران میں ان میں سے تین کہیں غائب ہو گئے، لیکن سرقہ کسی چیز کا نہ ہوا۔ اور جہاں تک ان کی املاک کی قدر و قیمت کا تعلق ہے، کسانوں کے جو تیس چھکڑے ان کی زرعی جاگیروں سے آئے تھے، وہ بذات خود انمول خزانہ ثابت ہوئے اور دوسروں کے رشک و حسد کا سبب بنے۔ لوگوں نے ان کے لیے انھیں بڑی بڑی رقوم پیش کیں۔ رستوفوں کو گھوڑوں اور چھکڑوں کے لیے نہ صرف بڑی بڑی رقوم کی پیشکشیں موصول ہوئیں بلکہ گزشتہ شام اور یکم ستمبر کی ساری صبح ان کے صحن میں اردلیوں اور نوکروں چاکروں کا، جنھیں زخمی افسروں نے بھیجا تھا، تانتا بندھا رہا اور زخمی افسر خود بھی گھسٹتے گھسٹاتے روستوفوں اور پڑوسیوں کے گھروں سے، جہاں انھیں ٹھہرایا گیا تھا، باہر آئے اور ملازموں کی منت سماجت کرنے لگے کہ انھیں گاڑیوں اور چھکڑوں میں بٹھا لیا جائے تاکہ وہ ماسکو سے باہر نکل سکیں۔ بٹلر، جس کے پاس ان درخواستوں کو پہنچایا گیا، اگرچہ زخمیوں سے ہمدردی جتاتا تھا لیکن اس نے جی کڑا کر کے ان درخواستوں کو مسترد کر دیا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ وہ اس قسم کی درخواستوں کو کاؤنٹ تک پہنچانے کا کبھی حوصلہ نہیں کر پائے گا۔ زخمیوں کو پیچھے چھوڑنا کتنا ہی تاسف انگیز سہی، لیکن یہ امر روز روشن کی طرح عیاں تھا کہ اگر ایک چھکڑا دے دیا گیا، پھر کوئی وجہ نہیں کہ دوسرا یا تیسرا اور یوں کرتے کراتے آخری چھکڑا اور اس کے بعد اپنی گاڑیاں بھی کیوں نہ زخمیوں کے حوالے کر دی جائیں۔ تیس چھکڑے تمام زخمیوں کو بچانے کے لیے کافی نہیں ہوں گے اور قیامت صغریٰ کے دوران میں، جن کا سامنا سب کو کرنا پڑ رہا تھا، آدمی کو اپنا اور اپنے خاندان کا سوچنا پڑتا ہے۔ بٹلر اپنے مالک کی جانب سے یوں استدلال کر رہا تھا۔

اس صبح جاگنے کے بعد کاؤنٹ الیا آندریچ اپنی خواب گاہ سے دبے پاؤں باہر نکلا کہ کہیں کاؤنٹس کی، جسے صرف تڑکے نیند آئی تھی، آنکھ نہ کھل جائے۔ وہ بنفشی ریشمی ڈریسنگ گاؤن پہنے پورچ میں آیا۔ لدے ہوئے چھکڑے صحن میں کھڑے تھے۔ گاڑیاں زینے کے قریب پہنچا دی گئی تھیں۔ بٹلر بیرونی دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر اردلی اور ایک زرد رو نوجوان افسر سے، جس کا بازو گلے کی پٹی میں لٹک رہا تھا، باتیں کر رہا تھا۔ بٹلر نے جب اپنے آقا کو دیکھا، اس نے دونوں کی جانب واضح اور واجب التعمیل اشارہ کیا کہ دونوں وہاں سے چلے جائیں۔

"ہونہہ، واسیلچ، سب تیاریاں مکمل ہو گئیں؟" کاؤنٹ نے اپنا گنجا سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔ اس نے اردلی اور افسر پر مشفقانہ نظر ڈالی (کاؤنٹ ہمیشہ نئے چہرے دیکھنا پسند کرتا تھا) اور اپنی گردن کو ذرا سا خم دیا۔

''یوئر ایکسی لینسی، ہم چٹکی بجاتے گھوڑے جوت سکتے ہیں۔''

''بہت خوب۔ جونہی کاؤنٹس بیدار ہوئیں اور خداوند کی مرضی ہوئی، ہم چل پڑیں گے! برادران، کیا بات ہے؟''اس نے افسر کی جانب متوجہ ہو کر مزید کہا۔'' آپ میرے مکان میں مقیم ہیں؟''

افسر نزدیک آ گیا اور ایکا ایکی اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

''کاؤنٹ... خدا کے لیے... مجھے اپنے کسی چھکڑے کے کونے کھدرے میں جگہ دے دیں! میں بالکل خالی ہاتھ ہوں... مجھے سامان کے ساتھ سفر کرنے میں کوئی اعتراض نہیں...''

افسر نے اپنی بات ختم بھی نہ کی تھی کہ اردلی اپنے افسر کی جانب سے وہی التجا دہرانے لگا۔

''بالکل، بالکل!'' کاؤنٹ نے تعجیل سے کہا۔''مجھے بہت خوشی ہوگی، بہت خوشی ہوگی۔ واسیلچ، تم انتظام کر دینا۔ ایک دو چھکڑے خالی کرا لو... مثلاً وہ... یا... خیر، جس کی بھی ضرورت ہو...'' کاؤنٹ نے مبہم سا حکم دے دیا۔ لیکن شکریے کے طور پر افسر کا چہرہ جس طرح تمتمانے لگا، اس نے حکم پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ کاؤنٹ نے اپنے اردگرد نظر دوڑائی۔ اسے ہر جگہ — صحن، صدر دروازوں، بغلی حصے کے دریچوں میں — زخمی اور اردلی دکھائی دے۔ سب کی نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں اور وہ پورچ کی جانب آ رہے تھے۔

''یوئر ایکسی لینسی، آپ گیلری میں تشریف لے چلیں۔'' بٹلر نے کہا۔''تصویروں کے متعلق کیا حکم ہے؟''

کاؤنٹ اس کے ساتھ اندر چلا گیا۔ وہ زخمیوں کی، جو ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے، درخواستیں قبول کرنے کے متعلق اپنا حکم دہراتا جا رہا تھا۔

''خیر، تم جانتے ہو کہ ہم کچھ سامان اتار سکتے ہیں۔'' اس نے دھیمے اور رازدارانہ لہجے سے کہا جیسے اسے اندیشہ ہو کہ کہیں اس کی بات دوسروں کے کانوں میں نہ پڑ جائے۔

نو بجے کاؤنٹس بیدار ہو گئی اور ماتریونا تموفیونا، جو مالکہ کی شادی سے پہلے اس کی ذاتی خادمہ تھی اور اب اس کے لیے ایک قسم کی چیف پولیس وومن کے فرائض سرانجام دیتی تھی، اسے یہ بتانے آئی کہ مادام شوس غصے سے لال پیلی ہو رہی ہے اور یہ کہ چھوٹی بیبیوں کے گرمائی ڈریس غالباً پیچھے نہیں چھوڑے جا سکتے۔ پوچھ گچھ کرنے پر کاؤنٹس کو معلوم ہوا کہ مادام شوس اس لیے خفا ہے کہ کیونکہ اس کا ٹرنک چھکڑے سے اتار دیا گیا ہے۔ ویسے بھی تمام چھکڑوں کی رسیاں کھولی جا رہی تھیں اور سامان اتارا جا رہا تھا تاکہ زخمیوں کے لیے، جنھیں کاؤنٹ نے اپنی سادگی کی بنا پر ساتھ لے جانے کی ہامی بھر لی تھی، جگہ بنائی جا سکے۔ کاؤنٹس نے اپنے شوہر کو بلا بھیجا۔

''مائی ڈیئر، کیا معاملہ ہے؟ میں نے سنا ہے کہ سامان اتارا جا رہا ہے۔''

''ma chere*، تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ میں اسی سلسلے میں تم سے بات کرنا چاہتا تھا... ڈیئر لٹل کاؤنٹس... میرے پاس ایک افسر آیا تھا... وہ سب ہاتھ جوڑ رہے ہیں کہ میں انھیں زخمیوں کے لیے چند چھکڑے دے دوں...

* مائی ڈیئر

چند اشیا ہی کا تو معاملہ ہے، انھیں باآسانی بعد میں بھی خریدا جا سکتا ہے۔ لیکن سوچو، اگر انہیں یہیں چھوڑ دیا گیا، پھر ان کا کیا بنے گا!... وہ یہاں عین ہمارے صحن میں ہیں — ہم نے خود انھیں یہاں آنے کی دعوت دی تھی... اور ان میں بھی افسر بھی ہیں... ma chere، تم جانتی ہو، میرا واقعی یہ خیال ہے... کہ انھیں اپنے ساتھ لے چلیں... آخر جلدی کیا ہے؟''

کاؤنٹ، جیسا کہ اس کی عادت تھی، جب بھی روپے پیسے کا معاملہ ہوتا، ہمیشہ ڈرتے جھجکتے بات کرتا۔ اب بھی وہ اسی انداز سے گفتگو کر رہا تھا۔ کاؤنٹس اس لہجے سے خوب آگاہ تھی۔ یہ غیر متغیر طور پر ہمیشہ ایسے منصوبے کا، جو اس کے بچوں کے مفادات کے لیے مضرت رساں ہوتا، پیش خیمہ ہوتا تھا: مثلاً کسی نئی گیلری یا یادگاہ کی تعمیر، کسی پرائیویٹ تھیٹر یا آرکسٹرا کا افتتاح۔ چنانچہ اس قسم کے ڈرے سہمے لہجے میں جس بات کا ڈھکا چھپا یا کھلا اعلان ہوتا، وہ ہمیشہ اس کی مخالفت کرنا اپنا فرض گردانتی۔

اس نے جھٹ پٹ ایسا انداز اختیار کر لیا جیسے وہ اپنی قسمت پر صابر و شاکر ہو لیکن دل میں سخت اذیت محسوس کر رہی ہو اور اپنے شوہر سے بولی:

''کاؤنٹ، میری بات سنیں۔ آپ معاملات میں ایسی بدنظمی کرتے ہیں کہ گھر میں کچھ نہیں بچا۔ اور اب آپ ہماری — سب بچوں کی — املاک کوڑے کے ڈھیر میں پھینکنا چاہتے ہیں! کیوں؟ آپ نے خود مجھے بتایا تھا کہ اس گھر میں جو ساز و سامان ہے، اس کی قیمت ایک لاکھ روبل ہے۔ مائی ڈیئر، میں آپ کی بات نہیں مان سکتی، میں اس پر صاد نہیں کر سکتی۔ آپ کا جو جی چاہے، کہیں، لیکن زخمیوں کی دیکھ بھال حکومت کا کام ہے۔ انھیں یہ معلوم ہے۔ سامنے والے لاپوخنوں کو لیں — دو روز قبل وہ سب کچھ یہاں سے لے گئے تھے۔ یہ ہے دوسرے لوگوں کا حال۔ صرف ہمیں اس قسم کے احمق ہیں۔ اگر آپ کو میرا خیال نہیں، کم از کم اپنے بچوں کا خیال کر لیں۔''

کاؤنٹ نے بے چارگی کے عالم میں فضا میں ہاتھ بلند کیے اور کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔

''پاپا، کیا بات ہے؟'' نتاشا نے، جو اس کے پیچھے پیچھے اپنی اماں کے کمرے تک آئی تھی، پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ یہ تمھارا مسئلہ نہیں!'' کاؤنٹ جھلا کر بڑبڑایا۔

''لیکن میں سن چکی ہوں۔'' نتاشا نے کہا۔ ''ماما کو کیا اعتراض ہے؟''

''تم اس پھڈے میں کیوں ٹانگ اڑا رہی ہو؟'' اس کے باپ نے چلا کر کہا۔

نتاشا کھڑکی کی جانب چل دی اور سوچنے لگی۔

''پاپا، برگ بھائی ہمیں ملنے آ رہے ہیں۔'' اس نے دریچے میں سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔

16

رستوف کا داماد برگ اب کرنل تھا۔ اس نے اپنی وردی پر ولادی میر اور آننا دونوں آرڈروں[20] کے امتیازی نشانات اپنی

وردی پر چسپاں کر رکھے تھے اور وہ ابھی تک فوج دوم کے اول ڈویژن کے نائب کمانڈر کے چیف آف سٹاف کے اسسٹنٹ کے پرسکون اور طمانیت بخش عہدے پر فائز تھا۔

وہ یکم ستمبر کو چھٹی پر ماسکو آیا تھا۔ اسے ماسکو میں کوئی کام نہیں تھا، لیکن اس نے دیکھا کہ فوج کا ہر شخص ماسکو جانے کے لیے، جہاں معلوم ہوتا تھا کہ انھیں کوئی نہ کوئی کام ہے، چھٹی لے رہا ہے، اس نے بھی خاندانی اور ذاتی امور کی دیکھ بھال کے لیے چھٹی کی درخواست دینا ضروری خیال کیا۔

برگ اپنے سسر کے گھر اپنی صاف ستھری اور بنی سنوری ٹم ٹم میں آیا۔ اس میں دو صحت مند اور توانا چتکبرے گھوڑے، جو عین مین ایک خاص پرنس کے گھوڑوں سے مشابہ تھے، جتے ہوئے تھے۔ صحن میں جو چھکڑے کھڑے تھے، اس نے انھیں بغور دیکھا اور جب وہ سیڑھیاں چڑھ رہا تھا، اس نے صاف ستھرا جیبی رومال نکالا اور اس میں گرہ باندھ دی۔[21]

وہ ہلکے پھلکے لیکن بے قرار قدم اٹھاتا استقبالیہ کمرے سے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا، کاؤنٹ سے بغل گیر ہوا، نتاشا اور سونیا کے ہاتھوں پر بوسہ دیا اور بہ عجلت ''ڈیئر ماما'' کی طبیعت کے بارے میں دریافت کرنے لگا۔

''طبیعت، اس زمانے میں!'' کاؤنٹ نے با آواز بلند کہا۔ ''چھوڑو بھئی، ہمیں کوئی خبر سناؤ۔ فوج پیچھے ہٹ رہی ہے یا کوئی اور لڑائی ہوگی؟''

''پاپا، ہمارے وطن کی تقدیر کا فیصلہ خدائے لم یزل کے ہاتھوں میں ہے۔ فوج میں شجاعت کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور سبھی لوگ کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہیں اور اب بھی اس کے رہنما اجلاس کر رہے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ آگے کیا ہوگا لیکن، پاپا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ فوج کے جذبۂ شجاعت کو، جو ازمنۂ قدیم سے اس کا طرۂ امتیاز چلا آ رہا ہے اور جس کا انھوں نے۔ جس کا اس نے (اس نے اپنی تصحیح کی) چھبیس تاریخ کی لڑائی میں مظاہرہ کیا تھا، الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ پاپا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں'' (اس نے بالکل اسی انداز سے اپنے سینے پر دو ہتڑ مارا جس طرح اس نے ایک جرنیل کو، جس نے بعینہٖ یہی تقریر کی تھی، مارتے دیکھا تھا۔ لیکن برگ سے اس سلسلے میں ذرا تاخیر ہوگئی۔ اسے یہ دو ہتڑ ''روسی فوج'' کے الفاظ کے ساتھ مارنا چاہیے تھا۔) ''میں لگی لپٹی رکھے بغیر آپ کو بتا رہا ہوں کہ ہم کمانڈر جوانوں کو ہلاشیری تو کیا دیتے، الٹا ہمیں انھیں روکنے میں بڑی دقت پیش آئی۔ ... جی ہاں، انھوں نے جو شجاعانہ کارنامے سرانجام دیے، اس سے پرانے وقتوں کی بہادری کی داستانیں تازہ ہوگئیں ...'' اور وہ تڑ تڑ بولتا چلا گیا۔ ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اپنے دستوں کے سربراہ کی حیثیت سے جنرل بارکلے دتولی ہر دم اپنی جان ہتھیلی پر لیے پھرتے رہے۔ ہماری کور دامن کوہ پر تعینات تھی۔ آپ خود صورت حال کا تصور کر سکتے ہیں!''

اور برگ طوطے کی طرح لڑائی کے متعلق وہ سب سنی سنائی باتیں، جو اسے یاد رہ گئی تھیں، دہرانے لگا۔ نتاشا اس پر یوں نگاہیں جمائے دیکھ رہی تھی جیسے وہ وہاں کسی مسئلے کا جواب تلاش کر رہی ہو۔ اس کی اس لگاتار توجہ سے وہ ٹپٹا گیا۔

"بہ اعتبار مجموعی ہمارے روسی سورماؤں نے جس رستمی کا مظاہرہ کیا، اس کا الفاظ میں احاطہ نہیں کیا جاسکتا اور نہ اس کی تعریف وتوصیف ممکن ہے!" برگ نے نتاشا کی جانب اچٹتی نظروں سے یوں دیکھتے ہوئے کہا جیسے وہ اس کی رضا جوئی کے لیے بے قرار ہو اور اس کی منہمک نگاہوں کے جواب میں لبوں پر تبسم لے آیا۔ "روس ماسکو میں نہیں ہے، وہ تو اپنے سپوتوں کے قلوب میں رچا بسا ہے۔ کیوں پاپا، ایسا نہیں؟" اس نے کہا۔

اس لمحے کاؤنٹس نشستی کمرے سے ڈرائنگ روم میں آئی۔ اس کی صورت پر پژمردگی اور خفگی برس رہی تھی۔ برگ جھٹ پٹ اٹھ کر کھڑا ہو گیا، اس نے اس کا ہاتھ چوما، اس کی صحت کے بارے میں پوچھا اور وہیں کھڑا رہا۔ ہمدردی کے اظہار کے طور پر وہ محض اپنے سر کو ادھر ادھر جنبش دینے لگا۔

"سچ پوچھیں، ماما، یہ ایام ہر روسی کے لیے بھاری ہیں۔ لیکن آپ کیوں پریشان ہیں؟ ابھی وقت ہے، آپ آسانی سے یہاں سے نکل سکتے ہیں..."

"سمجھ میں نہیں آتا کہ ان نوکروں کے ارادے کیا ہیں؟" کاؤنٹس نے اپنے خاوند کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ "انھوں نے ابھی ابھی مجھے بتایا ہے کہ فی الحال کچھ بھی تیار نہیں۔ کسی کو سب کچھ اپنے ہاتھ میں لے لینا چاہیے۔ جب اس قسم کی افتاد پڑتی ہے، متنکا یاد آتا ہے۔ یہ معاملہ ختم ہوتا نظر نہیں آتا۔"

کاؤنٹ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو روک لیا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور دروازے کی جانب چل دیا۔

دریں اثنا برگ اپنا رومال نکال چکا تھا۔ وہ اپنی ناک چھنکنا چاہتا تھا کہ اس کی نظر گانٹھ پر پڑی۔ اس نے کچھ سوچا اور پر معنی انداز سے سر کو جنبش دی۔

"پاپا، میں آپ سے کچھ مانگنے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔

"ھمم..." کاؤنٹ کا واحد جواب تھا۔

"میں ابھی ابھی یسو یوف کے گھر کے سامنے سے گزر رہا تھا،" برگ نے ہنستے ہوئے کہا، "کہ سٹیوارڈ، میں اس شخص کو جانتا ہوں، بھاگتا بھاگتا باہر آیا اور مجھ سے پوچھنے لگا کہ میں کچھ خریدنا چاہوں گا۔ میں عرض کروں گا کہ میں محض تجسس کی خاطر اندر چلا گیا۔ وہاں مجھے آرائشی الماری اور ڈریسنگ ٹیبل نظر آئے۔ آپ کو خوب یاد ہو گا کہ ویرا کیا چاہتی تھی اور اس بارے میں تو ہماری تُو تُو میں میں بھی ہوئی تھی۔" (جب برگ نے الماری اور ڈریسنگ ٹیبل کا ذکر چھیڑا، غیر شعوری طور پر اس کے لہجے میں طمانیت جھلکنے لگی جو اس امر کی غماز تھی کہ اپنی دانست میں وہ اپنے گھریلو معاملات جس قابل تحسین انداز سے چلا رہا تھا، اس پر وہ بے حد خوش ہے۔) "الماری بہت خوبصورت ہے۔ درازیں آسانی سے کھل جاتی ہیں۔ اس میں خفیہ انگریزی دراز ہے۔ ویرا کی دیر سے تمنا ہے کہ اس قسم کی الماری اس کے پاس بھی ہو۔ میں اسے یہ تحفہ دے کر حیران کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے صحن میں چھکڑے دیکھے تھے۔ بس ایک مجھے عنایت کر دیں۔ میں اس کے مالک کو منہ مانگی رقم دے دوں گا اور..."

کاؤنٹ کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور اس نے کھنکار کر اپنا گلا صاف کیا۔

''کاؤنٹس سے پوچھ لو۔ میں نے حکم نہیں دیتا۔''

''اگر آپ کے لیے کوئی مشکل ہو، پھر تکلیف نہ کریں۔'' برگ نے کہا۔ ''میں صرف ڈیئر ویرا کی خاطر خریدنا چاہتا تھا۔''

''تم سب جہنم میں جاؤ۔ جہنم میں، جہنم میں، جہنم میں!'' معمر کاؤنٹ نے چلاّ کر کہا۔ ''میرا سر گھوم رہا ہے!'' اور وہ کمرے سے باہر نکل گیا۔

کاؤنٹس رونے لگی۔

''ہاں، ماما، یہ ایام واقعی بہت کٹھن ہیں!'' برگ نے کہا۔

نتاشا اپنے باپ کے ساتھ باہر نکل گئی۔ پھر جیسے اس کے لیے کسی معاملے کے بارے میں فیصلہ کرنا دشوار ہو رہا ہو، وہ پہلے تو اپنے باپ کے پیچھے باہر گئی، پھر واپس مڑی اور دوڑتی بھاگتی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگی۔

پیتا پورچ میں تھا۔ وہ نوکروں میں ہتھیار تقسیم کر رہا تھا۔ انھیں ان کے ساتھ ماسکو سے باہر جانا تھا۔ لدے ہوئے چھکڑے ابھی تک صحن میں کھڑے تھے۔ دو کی رسیاں کھولی جا چکی تھیں اور ایک پر ایک زخمی افسر اپنے اردلی کی مدد سے سوار ہو رہا تھا۔

''تمھیں معلوم ہے کہ معاملہ کیا ہے؟'' پیتا نے نتاشا سے پوچھا۔

نتاشا جانتی تھی کہ وہ یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ ان کے والدین میں جھگڑا کس بات پر ہوا ہے۔ وہ چپ رہی۔

''اس لیے کیونکہ پاپا تمام چھکڑے زخمیوں کو دینا چاہتے تھے۔'' پیتا نے کہا۔ ''واسیلچ نے مجھے بتایا تھا۔ میرے خیال میں۔''

''میرے خیال میں'' نتاشا قریب قریب چیخ رہی تھی، ''میرے خیال میں یہ سب کچھ نہایت مکروہ، گھناؤنا اور نفرت انگیز ہے۔'' اس نے اپنے بھائی کو غیظ و غضب سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اتنا... پتا نہیں کیا! کیا ہم سب جرمنوں کی طرح گھٹیا لوگ ہیں؟''

متشنج ہچکیوں سے اس کا گلا کپکپانے لگا اور اس اندیشے کے پیش نظر کہ کہیں اس کے غصے کی قوت کمزور یا تحلیل نہ ہو جائے، وہ مڑی اور اندھا دھند سیڑھیاں پھلانگنے لگی۔

برگ کاؤنٹس کے قریب بیٹھا تھا اور پسرانہ احترام کی نمائش سے اسے تسلی دلاسا دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ کاؤنٹ ہاتھ میں پائپ پکڑے کمرے میں چکر لگا رہا تھا۔ اتنے میں نتاشا، جس کی غصے سے شکل بگڑ رہی تھی، بگولے کی طرح کمرے میں داخل ہوئی اور بلا تاخیر ماں کی طرف لپکی۔

''یہ نری رذالت ہے! پرلے درجے کا گھٹیا پن ہے!'' وہ پوری قوت سے چلا رہی تھی۔ ''آپ سے یہ توقع نہیں تھی کہ آپ اس قسم کا حکم دیں گی!''

برگ اور کاؤنٹس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ ہو کیا رہا ہے۔ ٹک ٹک دیدم، دم نہ کشیدم، وہ تصویر حیرت بنے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگے۔ کاؤنٹ دریچے کے قریب کھڑا تھا لیکن اس کے کان ادھر ہی تھے۔

''ماما، یہ ناممکن ہے۔ دیکھیں، صحن میں کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے چلاّ کر کہا۔ ''وہ یہیں رہ جائیں گے۔''

''کیا ہوا تمھیں؟ 'وہ' کون ہیں؟ کیا چاہتی ہو؟''

''میں زخمیوں کی بات کر رہی ہوں! ماما آپ ایسا نہیں کر سکتیں! یہ شرم ناک بات ہے!۔ ماما ڈارلنگ، یہ اخلاقاً درست نہیں ہے... مجھے معاف کر دیں، ڈیئرسٹ... ماما، ہمیں یہ سب چیزیں کیا کرنا ہیں۔ صرف یہ دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ ماما، ہم یہ نہیں کر سکتے۔''

کاؤنٹ گردن گھمائے بغیر نتاشا کی گفتگو سن رہا تھا۔ اس نے ناک سڑکی اور اپنا منہ کھڑکی کی طرف کر لیا۔

کاؤنٹس نے غور سے اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ اسے احساس ہوا کہ بیٹی کو ماں سے کتنی شرم آ رہی ہے۔ وہ سمجھ گئی کہ اس پر ہیجانی کیفیت کیوں طاری ہے اور اسے یہ تفہیم بھی ہو گئی کہ اس کا شوہر کیوں اس سے نظریں چرا رہا ہے اور وہ پریشانی کے عالم میں اپنے گرد و پیش دیکھنے لگی۔

''اف، جو جی میں آئے، کرو! کیا میں کسی کے کام میں مخل ہو رہی ہوں؟'' اس نے کہا۔ وہ فی الفور ہار نہیں ماننا چاہتی تھی۔

''ماما، ڈارلنگ، مجھے معاف فرما دیں!''

لیکن کاؤنٹس نے اپنی بیٹی کو دھکیل کر پرے کر دیا اور خود کاؤنٹ کے پاس چلی گئی۔

''mon cher، آپ جس طرح مناسب سمجھیں، کریں... آپ جانتے ہیں کہ مجھے ان باتوں کی سمجھ کہاں۔'' اس نے نگاہیں جھکائے خطاکارانہ انداز سے کہا۔

''چوزے... چوزے مرغی کو سبق پڑھا رہے ہیں...'' کاؤنٹ بڑبڑایا۔ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے اور وہ اپنی بیوی سے، جسے اس کی چھاتی میں اپنا منہ چھپا کر صحیح معنوں میں مسرت ہونے لگی تھی، بغل گیر ہو گیا۔

''پاپا! ماما! میں جا کر دیکھوں؟ اجازت؟'' نتاشا نے با آواز بلند کہا۔ ''جن چیزوں کی ہمیں واقعی ضرورت ہے، وہ ہم اب بھی اپنے ساتھ لے جا سکتے ہیں۔''

کاؤنٹ نے سر سے اشارہ کیا اور نتاشا یک دم نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ اچکتی پھدکتی بال روم میں سے گزرتی استقبالیہ کمرے میں پہنچی اور وہاں سے وہ اسی تیزی سے، جس تیزی سے وہ بچپن میں آنکھ مچولی کھیلتے بھاگا کرتی تھی، سیڑھیاں اترتی صحن میں پہنچ گئی۔

نوکروں چاکروں نے نتاشا کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ لیکن جو عجیب و غریب حکم وہ لے کر آئی تھی، اس پر انھیں

یقین نہیں آ رہا تھا تا آنکہ کاؤنٹ نے بنفس نفیس اپنی بیوی کے نام پر ان ہدایات کی تصدیق نہ کر دی کہ ٹرنک واپس سٹور روم میں پہنچا دیے جائیں اور چھکڑے زخمیوں کے سپرد کر دیے جائیں۔ جس طرح پندرہ منٹ پہلے انھیں اس بات میں کوئی قباحت نظر نہیں آ رہی تھی کہ زخمی چھوڑ دیے جائیں اور گھریلو سامان لاد لیا جائے، اسی طرح اب انھیں نئی ہدایات عجیب معلوم نہیں ہو رہی تھیں بلکہ اس کے برعکس انھیں کوئی دوسری راہ عمل ممکن ہی نظر نہیں آتی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے کام میں بڑے ذوق وشوق سے جت گئے۔ انھیں یہ سب کچھ عین فطری دکھائی دے رہا تھا۔

پورا گھرانا، گویا اس بات کی تلافی کرنے کے لیے کہ انھوں نے یہ کام پہلے کیوں نہ کیا، پورے جوش وخروش سے زخمیوں کو چھکڑوں میں سوار کرانے میں مصروف ہو گیا۔ فوجی گھسٹتے گھسٹاتے کمروں سے باہر آنے اور چھکڑوں کے ارد گرد ہجوم کرنے لگے۔ ان کے چہرے بے شک پیلے تھے لیکن اب وہ مسرت سے دمک رہے تھے۔ خبر پھیل گئی کہ رستوفوں کے چھکڑوں میں جگہ مل سکتی ہے، چنانچہ اڑوس پڑوس کے مکانوں میں مقیم زخمیوں نے ان کے صحن پر یلغار کر دی۔ بعض مجروحین ان سے التجا کرنے لگے کہ چھکڑوں سے ٹرنک نہ اتارے جائیں، بلکہ انھیں محض ان کے اوپر بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے۔ لیکن جب ایک مرتبہ سامان اتارنے کا سلسلہ شروع ہو گیا، اسے روکا نہ جا سکا۔ اب اس بات کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی تھی کہ تمام کی تمام یا نصف اشیا وہیں چھوڑی جا رہی ہیں۔ چینی کے برتنوں، کانسی کی اشیا، تصویروں اور آئینوں سے بھرے بکس، جنھیں گزشتہ شب اتنی احتیاط سے باندھا گیا تھا، صحن میں ادھر ادھر بکھرے پڑے تھے، لیکن اس کے باوجود ان کی پیہم یہی کوشش تھی کہ فلاں فلاں چیز اتار لی جائے تاکہ زخمیوں کے لیے ایک اور، ایک اور، مزید ایک اور چھکڑا خالی ہو جائے اور وہ اپنی سعی میں کامیاب رہتے۔

"ہمارے پاس چار مزید آدمیوں کی گنجائش ہے۔" سٹیوارڈ نے کہا۔ "وہ میرا چھکڑا لے سکتے ہیں، ورنہ ان کا کیا بنے گا؟"

"جس چھکڑے میں میری وارڈ روب ہے، وہ انھیں دے دو۔" کاؤنٹس نے کہا۔ "دنیاشا میری گاڑی میں بیٹھ سکتی ہے۔"

الماری اتار لی گئی اور چھکڑا پڑوس کے چوتھے مکان سے زخمی اٹھانے کے لیے بھیج دیا گیا۔ نوکروں چاکروں سمیت گھر کے تمام فراد کی خوشی سے باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔ نتاشا کی مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایسا سرور اسے کافی عرصے سے نہیں ملا تھا۔

"اسے کس سے باندھیں؟" ایک نوکر نے پوچھا۔ وہ ایک گاڑی کے پیچھے تنگ پائیدان پر ٹرنک جمانے کی کوشش کر رہا تھا۔ "ہمیں کم از کم ایک چھکڑا رکھ لینا چاہیے۔"

"اس میں کیا ہے؟" نتاشا نے پوچھا۔

"کاؤنٹ کی کتابیں۔"

"اسے رہنے دو۔ واسیلیچ سنبھال لے گا۔ اس کی ضرورت نہیں۔"

فٹن مسافروں سے کھچا کھچ بھر چکی تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ کاؤنٹ پیوترالیچ (پیتیا) کہاں بیٹھے گا۔

''ڈرائیور کے ساتھ۔ پیتیا، تم ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ جاؤ۔ بیٹھ جاؤ گے نا؟'' نتاشا نے باآواز بلند پوچھا۔

اس تمام عرصے کے دوران میں سونیا بھی مصروف رہی تھی لیکن اس کی مساعی کا مرکز ومحور نتاشا سے قطعی مختلف تھا۔ جو اشیا چھوڑ جانا تھیں، کاؤنٹس کی خواہش کے مطابق وہ انھیں سینت سینت کر رکھ رہی اوران کی فہرست بنا رہی تھی۔ وہ اب بھی اس بات کا پورا اہتمام کر رہی تھی کہ جتنی زیادہ سے زیادہ اشیا ساتھ لے جائی جا سکتی ہیں، لے جائی جائیں۔

17

دو بجے دوپہر تک رستوفوں کی چاروں گاڑیاں ٹھسا ٹھس لد چکی اور صدر دروازے پر روانگی کے لیے تیار کھڑی تھیں۔ ایک ایک کر کے چھکڑے، جن میں زخمی سوار تھے، قطار بنائے صحن سے باہر آنے لگے۔

سونیا اور ایک خادمہ بے حد کشادہ اور سربہ فلک گاڑی کے پائیدان پر کھڑی کاؤنٹس کے لیے آرام دہ نشست بنانے سنوارنے میں مصروف تھیں کہ ناگاہ سونیا کی نظر اس کالاش پر پڑی جس پر پرنس آندرے لیٹا ہوا تھا اور جو پورچ میں سے گزر رہی تھی۔

''یہ کالاش کس کی ہے؟'' اس نے گاڑی کی کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے پوچھا۔

''ایں، بی بی جی، آپ نے نہیں سنا؟'' خادمہ نے جواب دیا۔ ''زخمی پرنس۔ انھوں نے رات یہاں گھر میں گزاری تھی اور اب وہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔''

''کون ہیں یہ؟ کیا نام ہے ان کا؟''

''وہی ہمارے سابقہ منگیتر، پرنس بلکونسکی!'' خادمہ نے زور سے آہ بھری۔ ''سنا ہے کہ وہ آخری دموں پر ہیں۔''

سونیا نے گاڑی سے چھلانگ لگائی اور کاؤنٹس کی جانب بھاگی۔ کاؤنٹس ٹوپی پہنے اور شال اوڑھے سفر کے لیے تیار ہو چکی تھی اور تھکے ماندے انداز سے ڈرائنگ روم کے چکر کاٹ رہی تھی۔ وہ گھر کے دیگر افراد کا انتظار کر رہی تھی تاکہ روایت کے مطابق وہ قبل از سفر وہاں اکٹھے ہو جائیں اور بند دروازوں کے پیچھے خاموشی سے دعائیں مانگیں۔ نتاشا کمرے میں نہیں تھی۔

"maman"*، سونیا نے کہا۔ ''پرنس آندرے یہاں ہیں۔ وہ زخمی ہیں اور زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے ہیں۔ وہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں۔''

کاؤنٹس کو سخت دھچکا لگا اور وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگی۔ اس نے مضبوطی سے سونیا کا بازو پکڑا اور اپنے گرد و پیش نگاہیں دوڑانے لگی۔

---

* ماماں، اماں

''نتاشا؟'' اس نے زیر لب کہا۔

ان ابتدائی لمحات کے دوران میں ان دونوں کے لیے خبر کا صرف ایک ہی مفہوم تھا۔ وہ اپنی نتاشا کو جانتی تھیں۔ یہ آدمی ان دونوں کو پسند تھا لیکن انھیں اس سے کتنی ہی ہمدردی کیوں نہ سہی، اس کے مقابلے میں اس اطلاع کا نتاشا پر کیا اثر ہوگا، اس کا خوف کہیں زیادہ وزنی تھا۔

''نتاشا کو ابھی نہیں معلوم مگر وہ ہمارے ساتھ جا رہے ہیں،'' سونیا نے کہا۔

''تم نے کہا تھا کہ لب مرگ ہے؟''

سونیا نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

کاؤنٹس نے سونیا کو اپنے بازوؤں میں لے لیا اور زار وقطار رونے لگی۔

''خداوند کے ڈھنگ[22] معلوم کرنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے!'' اس نے سوچا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ مشیت ایزدی اپنی قدرت کاملہ کا اظہار اس سب کچھ میں، جو وقوع پذیر ہو رہا تھا، کر رہی ہے۔

''ماما، سب تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں۔۔۔ کیا بات ہے؟'' نتاشا کدکڑے لگاتی بھاگی آ رہی تھی۔ شوخی اور شگفتگی اس کی نس نس سے پھوٹ رہی تھی۔

''کچھ نہیں۔'' کاؤنٹس نے جواب دیا۔ ''اگر سب تیاریاں مکمل ہو گئی ہیں، پھر آؤ، چلیں۔''

اپنے مضطرب چہرے کو چھپانے کے لیے کاؤنٹس اپنے ہینڈ بیگ پر جھک گئی۔ سونیا نتاشا سے بغل گیر ہونے اور اس کے رخسار چومنے لگی۔ نتاشا اسے بنظر تحسین دیکھنے لگی۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔۔۔ کچھ نہیں۔۔۔''

''کوئی بہت بری خبر، میرے متعلق؟۔۔۔ بات کیا ہے؟'' نتاشا وجدانی لہجے میں اصرار کر رہی تھی۔

سونیا نے زور سے آہ بھری اور اپنی زبان بند رکھی۔ کاؤنٹ، مادام شوس، ماورا کزمی نیشنا اور واسیلچ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے۔ جب سب دروازے بند ہو گئے، وہ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے کی جانب دیکھے بغیر کئی لمحے خاموش رہے۔

سب سے پہلے کاؤنٹ اٹھا۔ اس نے گہری اور لمبی سانس لی اور ایقونے کے سامنے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنانے لگا۔ دوسروں نے اس کی تقلید کی۔ پھر کاؤنٹ نے ماورا کزمی نیشنا اور واسیلچ سے معانقہ کیا۔ ان دونوں نے ماسکو میں ہی ٹھہرے رہنے تھا اور جب انھوں نے کاؤنٹ کا ہاتھ تھام کر اس پر بوسہ دیا، اس نے انھیں تھپکی دی اور تسلی دلاسے اور پیار کے چند مبہم الفاظ کہے۔ کاؤنٹس عبادت کے کمرے میں چلی گئی۔ سونیا نے اسے ایقونوں کے سامنے، جو کہیں کہیں دیواروں پر لٹکے رہنے دیے گئے تھے، (انتہائی قیمتی ایقونے، جن کے ساتھ خاندانی روایات وابستہ تھیں، ساتھ جا رہے تھے۔)، جھکے ہوئے پایا۔

جونوکر چاکر ساتھ جارہے تھے۔۔ان سب کو پیتیا نے تلواروں اور نیزوں سے مسلح کر دیا تھا۔۔وہ پتلونوں کی مُہریاں اونچے بوٹوں میں ٹھونسے، پیٹیاں اور کمر بند کسے، ان ملازمین سے جنھیں پیچھے چھوڑا جارہا تھا، پورچ اور صحن میں وداع ہورہے تھے۔

جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، بوقتِ روانگی متعدد اشیا بھول گئیں یا غلط بکسوں میں بند ہو گئیں اور دو خدمت گاروں کو، جنھوں نے کاؤنٹس کو سوار ہونے میں مدد دینا تھی، گاڑی کے دروازے اور پائیدان کے دونوں اطراف کھڑے ہو کر خاصی دیر انتظار کرنا پڑا جب کہ خادمائیں کشن ڈھوتی رہیں اور مکان اور گاڑیوں کے مابین مختلف بنڈلوں کی آمدورفت بھی جاری رہی۔

''جب تک ان کی زندگی ہے، یہ سدا کچھ نہ کچھ بھولتے ہی رہیں گے!'' کاؤنٹس نے کہا۔''تم جانتی ہو کہ میں اس طرح نہیں بیٹھ سکتی۔''

اور دنیا شا روتی صورت بنائے اور دانت بھینچے، کہ کہیں اس کے منہ سے جواب نہ نکل جائے، کود کر گاڑی میں داخل ہوئی اور تکیے وغیرہ دوبارہ درست کرنے لگی۔

''اف، یہ نوکر چاکر!'' کاؤنٹ نے کہا۔

بوڑھا کوچوان یفیم واحد شخص تھا جس پر کاؤنٹس کو اعتبار تھا کہ وہ ڈھنگ سے گاڑی چلاتا ہے۔ وہ بکس پر بیٹھ گیا۔ اس نے اتنا بھی نہ کیا کہ ذرا یہ دیکھ لیتا کہ اس کے عقب میں کیا ہورہا ہے۔ تیس سال کے تجربے نے اسے یہ سکھا دیا تھا کہ ابھی انھیں یہ کہنے میں، کہ ''چلو، خداوند ہماری مدد فرمائے!'' کچھ وقت لگے گا، بلکہ یہ کہنے کے بعد بھی اسے کم از کم دو مرتبہ روکا جائے گا کیونکہ کوئی نہ کوئی چیز رہ جائے گی اور اس کا منگوایا جانا ضروری ہوگا۔ اس کے بعد کاؤنٹس بنفسِ نفیس گاڑی سے سر باہر نکالے گی اور اسے خداوند کا واسطہ دے گی کہ وہ پہاڑی سے اترتے وقت گاڑی احتیاط سے چلائے۔ اسے یہ سب کچھ معلوم تھا، چنانچہ وہ گھوڑوں کی نسبت (خاص طور پر مشکی فالکن، جو قریب تھا، زمین پر ٹھوکریں مار رہا اور لگام کا دہانہ چبا رہا تھا) کہیں زیادہ صبر و تحمل سے انتظار کر رہا تھا۔ آخر کار سب لوگ بیٹھ گئے، پائیدان لپیٹ دیا گیا، دھماکے سے دروازہ بند ہوگیا، جو سفری بکس رہ گیا تھا، منگوایا جا چکا اور کاؤنٹس نے جو کچھ کہنا تھا، کہا جا چکا تھا، تب یفیم نے آہستہ سے ہیٹ اتارا اور اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنایا۔ اسپ سوار معاون اور دیگر تمام ملازمین نے اس کی تقلید کی۔

''خداوند ہماری مدد فرمائے!'' اس نے ہیٹ پہنتے ہوئے کہا۔''چلو!''

اسپ سوار معاون نے گھوڑوں کو چابک دکھایا، دائیں طرف کے گھوڑے نے اس کے کالر کو جھٹکا دیا، اوپر کے سپرنگ چرچرائے اور کوچ جھولنے لگی۔ جب کوچ جھٹکے کھاتی صحن سے غیر ہموار سڑک پر آئی، وردی پوش ملازم نے جست لگائی اور چلتی گاڑی کے بکس پر سوار ہوگیا۔ دوسری گاڑیاں بھی اسی طرح جھٹکے کھاتی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑیں اور جلوس کی شکل میں سڑک پر چلنے لگیں۔ جب گاڑیاں سامنے کے گرجے کے بالمقابل گزریں، تمام

گاڑیوں کے مسافروں نے اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنائے۔ جن ملازمین نے ماسکو میں ہی قیام کرنا تھا، وہ مسافروں کو الوداع کہنے گاڑیوں کی دونوں جانب پیدل چل رہے تھے۔

نتاشا کو اب جس قسم کے پر مسرت احساس کا تجربہ ہو رہا تھا، اس سے قبل کبھی نہیں ہوا تھا۔ وہ کاؤنٹس کے قریب بیٹھی تھی اور ٹکٹکی باندھے اجڑے اور پر ہیجان شہر کی دیواروں کو، جو پیچھے رہتی جا رہی تھیں، دیکھ رہی تھیں۔ کبھی کبھار وہ گاڑی کی کھڑکی سے سر باہر نکالتی، کبھی پیچھے اور کبھی آگے نظریں دوڑاتی اور اسے اپنے سامنے چھکڑوں کی، جن میں زخمی فوجی سوار تھے، اور جو ان کے آگے آگے جا رہے تھے، قطار دکھائی دیتی۔ قطار میں تقریباً سب سے آگے اسے پرنس آندرے کی کالاش کی چھت، جو اوپر اٹھی ہوئی تھی، نظر آ سکتی تھی۔ اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اس میں کون سوار ہے لیکن ہر بار جب وہ جلوس کو تکتی، اس کی نگاہیں اسی گاڑی کو تلاش کرنے لگتیں۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب سے آگے ہو گی۔

کدرینو (محلے) کی نکت سکایا، پریسنایا اور پدنوونسکایا سڑکوں سے رستوفوں کی گاڑیوں سے ملتی جلتی گاڑیوں کے متعدد دیگر قافلے برآمد ہونے لگے اور جب وہ سادوایا سٹریٹ میں داخل ہوئے، ساری سڑک پر دو دو گاڑیاں اور چھکڑے ایک دوسرے کے برابر برابر چل رہے تھے۔

جب وہ سخاریف مینار کا چکر کاٹ رہے تھے، نتاشا، جس کی متجسس، مستعد اور چوکس نگاہیں پیدل اور گاڑیوں میں سوار لوگوں کا جائزہ لے رہی تھیں، اچانک تعجب اور مسرت سے چلا اٹھی:

"خدایا! ماما، سونیا، دیکھو، دیکھو۔ یہ تو وہی ہیں!"

"کون؟ کون؟"

"دیکھو، یہ واقعی بزوخوف ہیں!" نتاشا نے با آواز بلند کہا۔ وہ اپنا سر گاڑی کی کھڑکی سے باہر لٹکائے ہوئے تھی اور ٹکٹکی باندھے لمبے تڑنگے اور بھیم شحیم شخص کو دیکھ رہی تھی۔ اس شخص کے جسم پر کوچوانوں کا کوٹ تھا لیکن اس کی چال ڈھال اور طور طریق سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اس نے بھیس ضرور بدل رکھا ہے مگر اصلاً اس کا تعلق طبقۂ اشراف سے ہے۔ وہ سخاریف مینار کی محراب کے نیچے سے گزر رہا تھا اور اس کے ساتھ ایک زرد رو اور بے ریش پست قامت شخص، جو موٹے کھردرے اونی کوٹ میں ملبوس تھا، چل رہا تھا۔

"یہ واقعی بزوخوف ہیں۔ انھوں نے کوچوانوں کا کوٹ پہنا ہوا ہے اور ان کے ساتھ کوئی عجیب الہیئت ٹھگنا شخص ہے۔" نتاشا نے کہا۔ "لو دیکھ لو، خود دیکھ لو!"

"نہیں، یہ وہ نہیں ہیں! کیوں احمقانہ باتیں کر رہی ہو؟"

"ماما، میں سر کٹوانے کے لیے تیار ہوں۔" نتاشا نے تیکھی آواز سے چلاتے ہوئے کہا۔ "رہی شرط؟ میری بات مانیں، یہ وہی ہیں! رکو! گاڑی روکو!" اس نے کوچوان سے کہا۔

لیکن کوچوان رک نہیں سکتا تھا کیونکہ میش چانسکایا سٹریٹ سے مزید گاڑیاں آ رہی تھیں اور لوگ چلا چلا کر

رستوفوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ آگے چلیں اور راستہ مت روکیں۔

تاہم جب وہ ذرا اور آگے گئے، تمام رستوفوں کو پیئر — یا غیر معمولی طور پر اس سے کوئی مشابہ شخص۔ نظر آ گیا۔ اس کے بدن پر کوچوانوں کا کوٹ تھا اور وہ سر جھکائے اور سنجیدہ صورت بنائے سڑک پر پیدل جا رہا تھا۔ اس کے ساتھ پست قامت بے ریش بوڑھا شخص تھا جو وردی پوش ملازم معلوم ہوتا تھا۔ بوڑھے آدمی کو کسی کا سر نظر آیا، جو گاڑی کی کھڑکی سے باہر لٹک رہا تھا اور ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھے جا رہا تھا۔ اس نے مؤدبانہ انداز سے پیئر کی کہنی کو چھوا، اس کی توجہ گاڑی کی طرف دلائی اور اس سے کچھ کہا۔ پیئر اپنے خیالات میں اتنا محو تھا کہ جو کچھ اس سے کہا گیا تھا، اس کو سمجھنے میں اسے کچھ وقت لگا۔ جب آخر کار بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے نگاہ اٹھا کر اس طرف دیکھا جس طرف بوڑھے نے اسے متوجہ کیا تھا، اور اس کے دل میں جو اولیں ترنگ آئی، اس نے اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیے۔ یوں وہ گاڑی کی طرف چل پڑا۔ ابھی اس نے دس بارہ قدم ہی اٹھائے ہوں گے کہ بظاہر یہی نظر آیا کہ اسے کچھ یاد آ گیا ہے اور اس کے بڑھتے ہوئے قدم وہیں رک گئے۔

نتاشا کھڑکی کے باہر جھکی ہوئی تھی اور اس کا چہرہ شرارت آمیز پیار سے دمک رہا تھا۔

"پیوتر کرلووچ، ادھر آئیں! ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے! بڑا اچھا ہوا!" نتاشا نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے با آواز بلند کہا۔ "آپ کیا کر رہے ہیں؟ یہ آپ نے کیا پہن رکھا ہے؟"

پیئر نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا اور گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بے ہنگم انداز سے اسے چوما۔

"کاؤنٹ، کیا بات ہے؟" کاؤنٹس نے ہمدردانہ انداز سے پوچھا۔

"کیا؟ کیا؟ کیوں؟ — مجھ سے مت پوچھیں۔" پیئر نے کہا اور نظریں گھما کر نتاشا کو دیکھنے لگا جس کی چمکتی دمکتی اور پرمسرت نگاہیں (جن کا احساس اسے ان کی طرف دیکھے بغیر ہو رہا تھا) اس پر طلسمی کیفیت طاری کر رہی تھیں۔

"آپ کیا کر رہے ہیں — یا آپ کا ارادہ ماسکو میں ہی ٹھہرنے کا ہے؟"

پیئر ہچکچایا۔

"ماسکو میں؟" اس نے ذومعنی انداز سے الفاظ دہرائے۔ "ہاں، ماسکو میں۔ اچھا، خدا حافظ۔"

"کاش میں مرد ہوتی — پھر میں لازماً آپ کے ساتھ ٹھہر جاتی! کتنا مزہ آتا" نتاشا نے کہا۔ "ماما، مجھے یہیں رہنے دیں!"

پیئر نے بے دھیانی سے نتاشا کی جانب دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ کاؤنٹس نے اسے ٹوک دیا۔

"سنا ہے آپ لڑائی میں شامل تھے؟..."

"ہاں، میں گیا تھا۔" پیئر نے کہا۔ "کل ایک اور لڑائی ہوگی۔" اس نے کہنا شروع کیا لیکن نتاشا نے اس کی بات کاٹ دی۔

"کاؤنٹ، کیا بات ہے؟ آپ وہ نہیں جو آپ ہوا کرتے تھے۔"

"اف، مجھ سے مت پوچھیں، مت پوچھیں! خود مجھے کچھ پتا نہیں۔کل ...مگر نہیں! خدا حافظ! خدا حافظ!" وہ بڑبڑایا۔"بڑا برا وقت ہے!" وہ گاڑی کے پیچھے ہوگیا اور فٹ پاتھ پر چڑھ گیا۔

نتاشا نے اپنا سر کافی دیر تک کھڑکی میں سے باہر لٹکائے رکھا۔اس کا چہرہ پرمسرت، پیار بھری اور قدرے تمسخرانہ مسکراہٹ سے دمک رہا تھا۔

18

پیئر جب دو روز پیشتر اپنے گھر سے غائب ہوا تھا، وہ اس وقت سے اب تک اپنے آں جہانی محسن آئی اوسف الیکسی وچ بازدیف کے خالی مکان میں مقیم رہا تھا۔بات کچھ یوں ہوئی۔

اپنی ماسکو واپسی اور رستوپ چن سے ملاقات کے بعد جب وہ اگلی صبح بیدار ہوا، اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے اور اس سے تقاضا کیا کیا جا رہا ہے۔اور پھر جب اسے یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ اس کے جو ملاقاتی استقبالیہ کمرے میں بیٹھے ہیں، ان میں ایک فرانسیسی بھی شامل ہے جو اس کی بیوی کاؤنٹس ہیلینا واسیلیونا کا خط لے کر آیا تھا، اس پر یک دم اسی بوکھلاہٹ اور بے چارگی کا احساس غالب آ گیا، جس کا وہ اکثر شکار رہتا تھا۔اسے محسوس ہوا کہ اب سب کچھ ختم ہو گیا ہے، کوئی کل سیدھی نہیں رہی، ہر چیز الٹ پلٹ ہو چکی ہے، کرچی کرچی ہو رہی ہے، کوئی صحیح ہے نہ غلط، مستقبل جھاڑ جھنکاڑ ہے اور صورت حال سے چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں۔غیر فطری انداز سے مسکراتے اور اپنے آپ سے بڑبڑاتے وہ بے چارگی کی تصویر بنے پہلے تو صوفے پر بیٹھ گیا، پھر اٹھا، دروازے کی جانب بڑھا اور پٹ کی درز میں سے استقبالیہ کمرے میں جھانک کر دیکھنے لگا۔تب مایوسی کے عالم میں سر ہلاتا واپس آیا اور کتاب اٹھا کر ورق گردانی کرنے لگا۔اس کا سٹیوارڈ دوسری مرتبہ اسے یہ بتانے آیا تھا کہ جو فرانسیسی اس کی اہلیہ کا خط لے کر آیا ہے، اس سے ملنے کے لیے بہت کلپ رہا ہے، وہ فوری ملاقات کرنا چاہتا ہے خواہ یہ ایک منٹ ہی کی کیوں نہ ہو۔اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ کوئی شخص بازدیف کی بیوہ کا پیغام لے کر آیا ہے کہ چونکہ وہ خود گاؤں جا رہی ہے، اس لیے وہ چاہتی ہے کہ پیئر اس کے شوہر کی کتابیں اپنی تحویل میں لے لے۔

"ہاں، ہاں، ابھی آیا، ذرا ٹھہرو... یا نہیں... نہیں، جاؤ اور ان سے کہو کہ میں ابھی حاضر ہوا!" پیئر نے کہا۔

لیکن جونہی سٹیوارڈ کمرے سے باہر نکلا، پیئر نے اپنا ہیٹ، جو میز پر پڑا تھا، اٹھایا اور دوسرے دروازے میں سے گزرتا سٹڈی روم سے باہر نکل گیا۔غلام گردش خالی تھی۔وہ اس میں سے گزرتا زینے کے پاس پہنچا۔اس کی بھویں تنی ہوئی تھیں اور وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی پیشانی رگڑ رہا تھا۔وہ نیچے اترنے لگا اور سیڑھیوں کے مابین پہلے چبوترے پر پہنچا۔ہال پورٹر سامنے کے دروازے کے قریب کھڑا تھا۔چبوترے سے دوسرا زینہ عقبی دروازے کی جانب اترتا تھا۔وہ سیڑھیاں نیچے اترا اور صحن کی طرف چلنے لگا۔کسی نے اسے دیکھا نہیں تھا، لیکن سڑک پر متعدد

گاڑیاں کھڑی تھیں اور جونہی وہ صدر دروازے پر پہنچا، کوچوان اور گیٹ کیپر دونوں کی نظریں اس پر پڑیں اور انھوں نے ٹوپیاں اتار کر اسے سلام کیا۔ پیئر اس امر سے آگاہ تھا کہ ان کی نگاہیں اس پر مرکوز ہیں اور اس نے شترمرغ کا، جو دوسروں کی نظروں سے بچنے کے لیے اپنا سر جھاڑی میں چھپا لیتا ہے، رویہ اختیار کر لیا۔ اس نے سر جھکایا، رفتار بڑھائی اور تیز تیز چلنے لگا۔

اس صبح جو امور اس کی فوری توجہ کے متقاضی تھے، ان میں اسے بازدیف کی کتابیں اور کاغذات چھانٹنا اہم تریں کام معلوم ہوا۔

اس نے اولین گاڑی، جو اسے نظر آئی، کرائے پر لی اور کوچوان سے کہا کہ وہ اسے Patriarch's[23] Ponds لے چلے جہاں بازدیف کا مکان واقع تھا۔

وہ مڑ مڑ کر اپنے گرد و پیش لدے ہوئے چھکڑوں کی طویل قطاروں کو، جو چاروں اطراف سے نکل نکل کر ماسکو سے باہر جا رہے تھے، دیکھتا اور اپنے بھاری بھرکم جسم کا توازن برقرار رکھنے کی کوشش کرتا رہا تاکہ وہ کہیں درو شکی سے، جس کی چولیں ڈھیلی تھیں، باہر نہ گر پڑے۔ وہ اس بچے کی طرح، جو سکول سے بھاگ آیا ہو، سرور و مطمئن تھا اور اسی کیفیت میں کوچوان سے باتیں کرنے لگا۔

کوچوان نے اسے بتایا کہ آج کریملن میں ہتھیار تقسیم کیے جا رہے ہیں اور کل لوگوں کو تین پربت گیٹ کے آگے بھیج دیا جائے گا اور وہاں زبردست لڑائی ہو گی۔

جب وہ Patriarch's Ponds پہنچے، پیئر کو مکان پہچاننے میں، جہاں وہ کچھ عرصے سے گیا نہیں تھا، کچھ دشواری پیش آئی۔ وہ صدر دروازے کے قریب پہنچا۔ اس کی دستک کے جواب میں زرد رو بے ریش بوڑھا گیراسم باہر آیا، جسے اس نے پانچ سال قبل ترژھوک میں آئی اوسف بازدیف کی معیت میں دیکھا تھا۔

''کوئی گھر پر ہے؟'' پیئر نے پوچھا۔

''یور ایکسی لینسی، موجودہ حالات کے پیش نظر سوفیا دانیلوونا اور بچے اپنی دیہی جاگیر پر، جو کہ ترژھوک میں ہے، چلے گئے ہیں۔''

''میں بہر حال اندر آنا چاہتا ہوں۔'' پیئر نے کہا۔ ''مجھے کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھنا ہیں۔''

''ضرور تشریف لائیں۔ آپ کے لیے اس گھر کے دروازے ہمیشہ کے لیے کھلے ہیں۔ میرے مرحوم آقا۔ خداوند انھیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ کے بھائی ماکار الیکسی وچ نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن، حضور، آپ جانتے ہیں کہ اب وہ خاصے ضعیف ہو چکے ہیں۔'' بوڑھے ملازم نے کہا۔

پیئر کو معلوم تھا کہ اس کے محسن کا بھائی نیم پاگل اور عادی بلانوش ہے۔

''ہاں، ہاں، مجھے معلوم ہے۔'' پیئر نے کہا اور وہ مکان کے اندر داخل ہو گیا۔

ایک گنجا، دراز قامت شخص، جس کی ناک سرخ تھی اور جو ڈریسنگ گاؤن اور پاؤں میں صرف موزے پہنے

ہوے تھا، پیش دالان میں کھڑا تھا۔ پیئر کو دیکھ کر وہ غصے میں کچھ بڑبڑایا اور پاؤں پٹختا غلام گردش میں چلنے لگا۔
''حضور، کبھی یہ بڑے صاحب دماغ ہوا کرتے تھے، لیکن آپ جانتے ہیں کہ اب یہ ضعیف ہو گئے ہیں۔''
گیراسم نے کہا۔ ''آپ سٹڈی روم دیکھنا چاہتے ہیں؟ جب سے یہ بند ہوا ہے، کسی نے اسے چھیڑا نہیں۔ سوفیا دانیلوونا نے مجھے حکم دیا تھا کہ آپ کے ہاں سے کوئی صاحب تشریف لائیں، تو میں یہ کتابیں اس کے حوالے کر دوں۔''

پیئر تیرہ وتار وسٹڈی روم میں چلا گیا۔ اپنی محسن کی زندگی میں جب اسے اس کمرے میں آنے کا اتفاق ہوتا تھا، اس پر کپکپی طاری ہو جایا کرتی تھی۔ آئی اوسف بازدیف کے انتقال کے بعد کسی نے بھی اس کمرے میں قدم نہیں رکھا تھا۔ ہر چیز پر گرد کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور درودیوار پر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ افسردگی ٹپک رہی تھی۔

گیراسم نے دروازے کا صرف ایک پٹ کھولا اور دبے پاؤں باہر چلا گیا۔ پیئر نے کمرے کا چکر لگایا اور اس الماری کے سامنے، جس میں مسودے دھرے ہوے تھے، جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک مسودہ، جو کبھی جماعت کی اہم ترین اور مقدس ترین دستاویزات میں شمار ہوتا تھا، باہر نکالا۔ یہ سکاٹ لینڈ کی لاجوں کے خود مرتبہ قوانین میں سے چند ایک پر مشتمل تھا۔ اس پر بازدیف کے حواشی اور تشریحات قلم بند تھیں۔ وہ گرد آلود میز کے سامنے بیٹھ گیا، اس نے دستاویزات اپنے سامنے رکھیں، انھیں کھولا اور بند کر دیا۔ پھر اس نے انھیں ایک طرف دھکیل دیا، اپنا سر کہنی پر ٹکایا اور سوچ بچار میں مستغرق ہو گیا۔

گیراسم نے متعدد مرتبہ دبے پاؤں کمرے کے اندر جھانک کر دیکھا اور اسے ہر بار پیئر اسی شکل میں نظر آیا۔ دو سے زیادہ گھنٹے گزر گئے۔ گیراسم نے جرأت سے کام لیا، وہ دروازے کے قریب پہنچا اور اس نے اس کی توجہ مبذول کرانے کے لیے قدرے بلند آواز میں کچھ کہا، تاہم پیئر کو اس کی آواز سنائی نہ دی۔

''یوئر ایکسی لینسی، کوچوان کی چھٹی کر دوں؟''

''ارے، ہاں!'' پیئر نے چونک کر اور عجلت سے اٹھتے ہوے کہا۔ ''سنو،'' اس نے گیراسم کے کوٹ کا بٹن پکڑتے اور بوڑھے کی جانب، جس کی آنکھیں فرطِ مسرت سے منور اور نم ناک ہو رہی تھیں، دیکھتے ہوے مزید کہا: ''سنو، تمھیں معلوم ہے کہ کل لڑائی ہونے والی ہے...''

''جی، لوگ کہتے تو یہی ہے۔'' گیراسم نے جواب دیا۔

''میری تم سے بس یہی درخواست ہے کہ کسی کو مت بتانا کہ میں کون ہوں اور جو کچھ میں کہتا ہوں، بس چپ چاپ وہی کرتے جانا۔''

''جی، حضور۔'' گیراسم نے کہا۔ ''آپ کچھ کھانا پینا پسند فرمائیں گے؟''

''نہیں، لیکن مجھے تم سے کچھ اور چاہیے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم مجھے دیہاتیوں کے کپڑے اور ایک پستول لا دو۔'' پیئر نے غیر متوقع طور پر شرماتے ہوے کہا۔

''جی، حضور۔'' گیراسم نے ایک منٹ سوچنے کے بعد جواب دیا۔

پیئر نے بقیہ دن اکیلے اپنے محسن کے سٹڈی روم میں گزارا۔ وہ بے چینی سے کمرے کے چکر کاٹتا اور اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اس رات اس کا بستر وہیں لگا دیا گیا۔

گیراسم کو اپنی زندگی کے دوران میں بے شمار عجیب وغریب اشیا سے واسطہ پڑ چکا تھا، چنانچہ پیئر نے جب اس گھر میں ڈیرا ڈال لیا، اسے مطلقاً کوئی حیرت نہ ہوئی۔ اس نے اس صورت حال کو بہ سکونِ قلب تسلیم کر لیا بلکہ بظاہر وہ خوش تھا کہ اسے کسی کی خدمت کا موقعہ میسر آرہا ہے۔ اس نے اسی شام پیئر کے لیے کوچوانوں کا کوٹ اور ٹوپی حاصل کر لی۔ اس نے یہ سوچا تک نہیں کہ آخر ان اشیا کی ضرورت کیا ہے۔ اور وعدہ کیا کہ وہ اگلے روز اس کے لیے پستول بھی لے آئے گا۔ اسی شام ماکار الیکسی وچ غلام گردش میں پاؤں پٹختا ایک دو مرتبہ سٹڈی روم کے دروازے تک آیا اور وہاں کھڑے ہو کر دل جویانہ انداز سے ٹکٹکی باندھ کر پیئر کو دیکھتا رہا، لیکن جونہی پیئر کا رخ اس کی طرف ہوا، اس نے ڈریسنگ گاؤن اپنے جسم کے اردگرد لپیٹا، اس پر شرمیلی اور غصیلی نظر ڈالی اور تیزی سے رفوچکر ہو گیا۔

اور رستوفوں سے پیئر کا سامنا تب ہوا جب وہ کوچوانوں کا کوٹ پہنے، جو گیراسم اس کے لیے لایا تھا اور جسے اس نے دھواں دے کر وبائی مادوں سے صاف کیا تھا، اس کی معیت میں پستول خرید نے سخاریف مارکیٹ جا رہا تھا۔

19

کوتوزوف نے ریازان روڈ تک براستہ ماسکو پسپائی کا حکم یکم ستمبر کو جاری کیا۔

ہراول دستوں نے اسی رات کوچ کیا۔ وہ کسی قسم کی تعجیل کے بغیر آہستہ آہستہ ثابت قدمی سے سفر کرتے رہے، مگر بوقت سحر جب وہ دروگومیلوف پل کے قریب پہنچے اور اس کی دوسری سمت چڑھائی چڑھنے اور گلی کوچوں میں آنے جانے والوں کے راستے میں مزاحم ہونے لگے، ان پر عقب سے دوسری فوجوں کے بے پناہ ہجوم کا دباؤ بڑھنے لگا، تب غیر واجب جلد بازی اور خوف و ہراس ان پر غالب آ گیا۔ سبھی پل، دریا کے پایاب راستوں اور کشتیوں پر پل پڑے۔ خود کوتوزوف شہر کے عقبی گلی کوچوں میں گاڑی دوڑاتا ماسکو کی دوسری سمت پہنچ سکا۔

دو ستمبر کو صبح دس بجے دروگومی لوف مضافات میں صرف عقبی سپاہ کی چند رجمنٹیں باقی رہ گئی تھیں، ورنہ بھیڑ بھڑکا ختم ہو چکا تھا۔ فوج ماسکو کی دوسری سمت اور اس سے آگے نکل چکی تھی۔

اسی وقت۔۔۔ دو ستمبر کی دس بجے صبح۔۔۔ نپولین اپنی افواج کے مابین پکلونا پہاڑی پر کھڑا ٹکٹکی باندھے اپنے سامنے کا منظر دیکھنے میں محو تھا۔ چھبیس اگست سے دو ستمبر تک، یعنی بارودینو کی لڑائی سے فرانسیسیوں کے ماسکو میں داخلے تک اس ہنگامہ خیز اور یادگار ہفتے کے ہر روز خزاں کا غیر معمولی موسم فضا پر محیط رہا: جب آفتاب بلندی پر نہیں بلکہ نشیب پر آویزاں ہوتا ہے اور موسم بہار کی نسبت زیادہ حرارت خارج کرتا ہے، جب ہر چیز صاف شفاف اور غیر مکدر فضا میں یوں دمکنے لگتی ہے کہ آنکھیں چندھیا جاتی ہیں اور معطر خزانی ہوا میں سانس لینے سے پھیپھڑے تازہ دم اور توانا ہو جاتے ہیں، جب راتیں بھی نیم گرم ہو جاتی ہیں اور جب ان تاریک اور خوشبودار راتوں کے دوران میں طلائی

ستارے پیہم فلک سے گرتے، ہمیں ڈراتے اور محظوظ کرتے ہیں۔

دو ستمبر کو دس بجے صبح موسم کی یہ کیفیت ابھی تک برقرار تھی۔ نور سحر کی سج دھج طلسم افزا تھی۔ پکلونایا پہاڑی پر کھڑے ہو کر دیکھنے سے اپنے دریا، گلستانوں اور کلیساؤں سمیت ماسکو کا وسیع وعریض منظر کچھ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کوئی جیتی جاگتی شے ہو اور سورج کی روشنی میں اس کے گنبد اور برجیاں ستاروں کی طرح جھلملا رہی تھیں۔

اس اجنبی شہر کا، جس کا طرز تعمیر انوکھا اور بے تکا تھا اور ایسا کہ اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، نظارہ کرنے پر نپولین کے قلب میں قدرے حاسدانہ اور اضطراب انگیز تجسس بیدار ہو گیا۔ انسانوں کو اس طرح کے تجسس کا احساس تب ہوتا ہے جب وہ زندگی کی کسی ایسی ان جانی صورت کا، جو ان کی موجودگی کو خاطر میں نہیں لاتی، تصور دھیان میں لاتے ہیں۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس شہر کی رگ رگ میں زندگی دھڑک رہی ہے۔ ایسی علامتیں، جن کا الفاظ میں احاطہ کرنا تو مشکل ہے لیکن وہ موجود ضرور ہوتی ہیں، وہ دور ہی سے ہمیں ذی حیات اشیا کو مردہ اور بے جان چیزوں سے ممیز کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ نپولین کو بھی شہر میں زندگی کی دھڑکنوں کا سراغ مل سکتا تھا۔ کچھ یوں کہنا چاہیے کہ ایک لحاظ سے اس نے اس عظیم اور حسین شہر کو سانس لیتے محسوس کیا۔

"Cette ville asiatique aux innombrables eglises, Moscou la sainte. La voila donc enfin, Cette fameuse ville! Il etait temps,"*

نپولین نے کہا اور گھوڑے سے اترتے ہوئے اس نے حکم دیا کہ ماسکو کا نقشہ اس کے سامنے بچھا دیا جائے اور اس کے ترجمان للوغینی دآئیدے ول کو اس کے پاس لایا جائے۔

''وہ شہر جو غنیم کے قبضے میں چلا جائے، بالکل اس دوشیزہ کی مانند ہوتا ہے، جس کی آبرو لوٹ لی گئی ہو۔'' اس نے سوچا۔ (وہ یہ بات قبل ازیں سمولنسک میں تچ کوف سے کہہ چکا تھا۔) اور اس نقطۂ نظر سے پہلی بار اس مشرقی حسن کو، جو اس کی نگاہوں کے سامنے جلوہ افروز تھا، ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔ خود اسے یہ بات عجیب محسوس ہو رہی تھی کہ اس کی اس آرزو کی، جو وہ مدتوں سے دل میں پال رہا تھا، لیکن جو بظاہر ناممکن الحصول نظر آتی تھی، بالآخر تکمیل ہو گئی ہے۔ صبح کی شفاف روشنی میں وہ شہر سے نقشے کی طرف اور نقشے سے واپس شہر کی جانب دیکھنے لگتا۔ وہ ایک ایک تفصیل کی تصدیق کر رہا تھا اور یہ یقین کہ اب یہ اس کے قبضے میں ہے، اس کے دل میں ہل چل مچا رہا اور اس پر ہیبت طاری کر رہا تھا۔

''لیکن بجز اس کے اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟'' اس نے عالم محویت میں سوچا۔ ''یہ دارالحکومت میرے قدموں تلے پڑا ہے اور اپنے مقدر کا انتظار کر رہا ہے۔ الیکساندر اب کہاں ہے اور وہ کیا سوچ رہا ہے؟ محیر العقول، خوبصورت اور پرشکوہ شہر! محیر العقول اور پرشکوہ لمحہ! اب وہ میرے بارے میں کس انداز سے سوچتے ہیں؟'' اس نے اپنے فوجی جوانوں کو دھیان میں لا کر سوچا۔ ''یہ رہا وہ شہر — ان سب تشکیک پسندوں کا انعام۔'' اس نے ان لوگوں کو، جو اس

---

* لاتعداد کلیساؤں کا یہ ایشیائی شہر، ماسکو مقدس! آخر کار ہم یہاں پہنچ ہی گئے۔ تو یہ ہے وہ شہرۂ آفاق شہر! لطف اندوز ہونے کا وقت آ گیا۔

کے قریب تھے اور ان دستوں کو، جو اس کی طرف آ رہے تھے اور صف بندی کر رہے تھے، سرسری نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''میرا ایک لفظ، میرے ہاتھ کی ایک جنبش، زاروں کے اس قدیم دارالسلطنت کو نیست و نابود کر سکتی ہے لیکن مفتوحین کے لیے میرا جذبۂ ترحم جھٹ پٹ بیدار ہو جاتا ہے۔ مجھے دریا دلی اور صحیح معنوں میں عظمت کا اظہار کرنا چاہیے۔ لیکن نہیں،'' اچانک اس کے ذہن میں خیال گزرا، ''یہ بات صحیح نہیں ہو سکتی کہ میں واقعی ماسکو میں ہوں۔ تاہم وہ میرے قدموں تلے پڑا ہے اور دھوپ میں اس کے گنبد اور صلیبیں جگمگا اور تھرتھرا رہی ہیں۔ لیکن میں اس کے ساتھ کوئی جور و تعدّی نہیں کروں گا۔ بربریت اور استبداد کی ان قدیم یادگاروں پر میں منصف مزاجی اور عفو و درگزر کے عظیم الفاظ کندہ کروں گا۔ ...اور یہی وہ رویہ ہے جو الیکساندر کے لیے سب سے زیادہ روح فرسا ہوگا۔ میں اسے خوب جانتا ہوں۔'' (جو کچھ وقوع پذیر ہوا تھا، نپولین کے نزدیک اس کی معنویت صرف یہ تھی کہ یہ الیکساندر سے اس کا ذاتی مقابلہ تھا۔) ''کریملن — ہاں، وہ رہا کریملن، ہاں — میں اس کی رفعتوں سے انھیں منصفانہ قوانین فراہم کروں گا، میں انھیں سچی تہذیب کا مفہوم سکھاؤں گا اور بویاروں[24] کے ساتھ ایسے حسن سلوک سے پیش آؤں گا کہ ان کی نسلیں اپنے فاتح کو پیار و محبت سے یاد کریں گی۔ میں ان کے وفد کو بتاؤں گا کہ میں نے جنگ چاہی تھی، نہ چاہتا ہوں، میں نے جنگ محض ان کے دربار کی غلط پالیسی کے خلاف کی ہے۔ میں الیکساندر کو عزیز گردانتا ہوں اور اس کا احترام کرتا ہوں، اور میں ماسکو میں اپنے اور اپنی اقوام کے شایان شان امن کی شرائط قبول کر لوں گا۔ جنگ نے جو رخ اختیار کیا ہے، مجھے اس سے فائدہ اٹھانے کی خواہش نہیں اور یوں میں کسی معزز فرماں رواں کی خودداری کو کوئی ٹھیس نہیں پہنچاؤں گا۔ 'بویارو' میں ان سے کہوں گا، 'مجھے جنگ کی کوئی تمنا نہیں، میں تو اپنی تمام رعایا کے لیے امن اور خوشحالی کا متمنی ہوں۔' بہرحال مجھے معلوم ہے کہ ان کی موجودگی مجھ پر وجدانی کیفیت طاری کر دے گی اور جیسا کہ میں ہمیشہ کرتا آیا ہوں، میں ابہام سے پاک، پرتاثیر اور پروقار گفتگو کروں گا۔ لیکن کیا یہ صحیح ہے کہ میں ماسکو میں ہوں؟ ہاں، وہ سامنے واقع ہے۔''

''بویاروں کو میرے پاس لے آؤ۔'' اس نے اپنے عملے سے مخاطب ہو کر کہا۔

ایک جرنیل زرق برق وردیوں میں ملبوس ایجوٹنٹوں کی جماعت کی معیت میں فی الفور بویاروں کو بلانے کے لیے گھوڑا دوڑانے لگا۔

دو گھنٹے گزر گئے۔ نپولین دوپہر کا کھانا کھا چکا تھا اور دوبارہ پکلونایا پہاڑی پر اسی جگہ کھڑا وفد کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بویاروں کے سامنے جو تقریر کرنا تھی، وہ اس کے ذہن میں واضح صورت اختیار کر چکی تھی۔ نپولین کی اپنی دانست میں اس کی یہ تقریر وقار اور عظمت و جلالت سے مرصع تھی۔

ماسکو کے متعلق اس نے جس دریا دلی کا مظاہرہ کرنے کا ارادہ کیا تھا، وہ آپ ہی اس کی رو میں بہہ گیا۔ اس نے اپنے تخیل میں une reunion dans le palais des Czars* کے، جن میں روسی زعما امرا طور فرانس

* زاروں کے محل میں اسمبلی

کے درباریوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھیں گے، انعقاد کے ایام کا تعین بھی کر لیا تھا۔ ذہنی طور پر اس گورنر کا، جو لوگوں کے قلوب موہ لینے کے فن سے آگاہ تھا، نام بھی سوچ لیا تھا۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ ماسکو میں متعدد خیراتی ادارے موجود ہیں، اس نے یہ تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ان سب کو فیاضی سے مستفیض کرے گا۔ اس نے یہ سوچ لیا تھا کہ جس طرح افریقہ میں اسے عبا پہننا اور مسجد میں بیٹھنا پڑا تھا، یہاں ماسکو میں اسے زاروں کے انداز میں روپیہ پانی کی طرح بہانا ہوگا۔ اور روسیوں کے قلوب کو فیصلہ کن طریق سے مسخر کرنے کے لیے اس نے یہ ٹھان لیا کہ وہ ان تمام خیراتی اداروں پر جلی حروف میں یہ الفاظ کندہ کرا دے گا: یہ ادارہ میری پیاری ماں کے نام منسوب کیا جاتا ہے۔ نہیں صرف اتنا کافی ہوگا:

MAISON DE MA MERE* — تمام فرانسیسیوں کی طرح اس کے لیے یہ تصور کرنا بھی ممکن نہیں تھا کہ "ma chere, ma pauvre, ma tendre mere"** کے بغیر بھی دوسروں کو متاثر کیا جا سکتا ہے۔

''لیکن کیا میں واقعی ماسکو میں ہوں؟ ہاں، یہ میرے سامنے تو واقع ہے۔ لیکن وفد نے آنے میں تاخیر کیوں کر دی ہے؟'' اسے تعجب ہو رہا تھا۔

دریں اثناء امپراطور کے عملے کے عقب میں مارشل اور جرنیل سرگوشیوں میں صلاح مشورے کر رہے تھے۔ ان کے رنگ فق تھے اور چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ جن لوگوں کو وفد لانے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ یہ خبر لائے تھے کہ ماسکو خالی ہو چکا ہے اور تمام باشندے، بیشتر پیدل ہی، شہر چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ وہ اشخاص، جو آپس میں تبادلہ خیالات کر رہے تھے، بہت پریشان اور مضطرب تھے۔ انھیں پریشانی اس بات کی نہیں تھی کہ شہر کے باسی وہاں سے فرار ہو گئے تھے (بے شک بذات خود یہ حقیقت بہت سنگین تھی)۔ انھیں جس مسئلے نے حواس باختہ کر دیا تھا، وہ یہ تھا کہ امپراطور کو اس کی اطلاع کیسے دی جائے — تاکہ وہ یہ محسوس نہ کریں کہ وہ ایک قسم کی ناخوشگوار صورت حال میں، جسے فرانسیسی ridicule*** کہتے ہیں، پھنس گئے ہیں — کہ وہ اس تمام عرصے کے دوران میں بویاروں کا بے سود انتظار کرتے رہے ہیں اور یہ کہ شرابیوں کے بے ہنگم ہجوموں کے علاوہ شہر میں عملاً کوئی شخص نہیں رہا۔ بعض کا خیال تھا کہ جیسے تیسے کسی نہ کسی قسم کا وفد اکٹھا کرنا کاملاً ضروری ہے جب کہ دوسروں کو اس سے اتفاق نہیں تھا۔ وہ کہتے تھے کہ امپراطور کو احتیاط اور سلیقے سے خبر بد کے لیے تیار کیا جائے اور پھر اصل حقیقت ان کے گوش گزار کر دی جائے۔

''انھیں بہر حال بتانا تو پڑے گا ہی۔'' عملے کے بعض ارکان نے کہا۔ "mais messieurs...****"

صورت حال یوں اور بھی کڈھب ہو گئی تھی کیونکہ امپراطور دریا دلی کے جن منصوبوں پر عمل کرنا چاہتا تھا، ان پر غور و فکر کرنے کے بعد اب وہ بچھے ہوئے نقشے کے سامنے چکر کاٹ رہا تھا۔ چلتے میں وہ کبھی کبھار اپنی آنکھوں کے

---

* عمارت بنام مادرم۔
** مائی ڈیئر، میرے پیارے، مائی ڈیئر ماما (پیاری اماں)
*** مضحکہ خیز
**** but my lords (لیکن حضرات)

اوپر ہاتھ سے سایہ کرتا اور اپنے چہرے پر فخر و مباہات کا تبسم سجائے ماسکو کی طرف جانے والی شاہراہ کو بغور دیکھنے لگتا۔

"لیکن یہ ناممکن ہے..." نپولین کے عملے کے ارکان تکرار کیے جا رہے تھے۔ وہ اپنے کندھے اچکاتے مگر اس بھیانک لفظ — la ridicule کو اپنی زبان پر لانے کی جرأت سے اپنے آپ کو عاری پاتے۔

تاہم امپراطور نے، جو اس بیکار انتظار سے اکتا چکا تھا اور جس کی اداکارانہ جبلّت اسے پکار پکار کر بتا رہی تھی کہ طوالت کھنچ جانے کے سبب پرشکوہ لمحہ اپنے جاہ و جلال سے محروم ہوتا جا رہا ہے، ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اشاراتی توپ کا واحد دھماکہ ہوا اور حملہ آور فوج آگے بڑھنے اور تورکالوگا اور درد گومیلوف دروازوں میں سے شہر کے اندر داخل ہونے لگی۔ ان سب کی یہی کوشش تھی کہ وہ دوسروں سے آگے نکل جائیں۔ کوئی تیز تیز چل رہا تھا، کوئی دلکی لگا رہا تھا اور کوئی سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ یوں ان کی رفتار تیز سے تیز تر ہوتی جا رہی تھی۔ گرد و غبار کے بادل اٹھنے لگے اور وہ ان میں چھپنے لگے۔ ان کے شور و غل سے کانوں کے پردے پھٹے جا رہے تھے اور فضا مرتعش ہو رہی تھی۔

جس قسم کی دھن نپولین کے فوجی دستوں پر سوار تھی، اس کی لپیٹ میں وہ خود بھی آ گیا۔ اس نے گھوڑا پکڑا اور ان کے ساتھ درو گومیلوف گیٹ پہنچ گیا۔ یہاں وہ دوبارہ گھوڑے سے نیچے اتر آیا اور وفد کے انتظار میں خاصی دیر تک کامیر کولیو سکی فصیل کے قریب ادھر ادھر چکر کاٹتا رہا۔

20

دریں اثنا ماسکو خالی ڈھنڈار بن چکا تھا۔ یوں شہر میں اب بھی لوگ موجود تھے۔ غالباً آبادی کا پچاسواں حصہ پیچھے رہ گیا تھا۔ لیکن شہر خالی تھا اور یہ اسی طرح خالی تھا جس طرح شہد کی مکھیوں کا چھتا ملکہ کی عدم موجودگی کے سبب خالی اور مرگ پذیر ہو جاتا ہے۔

بے ملکہ چھتا روحِ حیات سے یکسر عاری ہوتا ہے، بے شک سطحی نظروں سے دیکھنے میں یہ دوسرے چھتوں کی طرح زندگی سے بھرپور دکھائی دیتا ہے۔

دوپہر کی دھوپ کی حدت میں شہد کی مکھیاں بے ملکہ چھتے کے اوپر اسی خوش دلی سے منڈلاتی پھرتی نظر آتی ہیں جس طرح وہ ذی حیات چھتوں کے اوپر منڈلاتی دکھائی دیتی ہیں۔ وہ اسی انداز سے اڑتی، اس کے اندر آتی اور باہر جاتی ہیں اور دور سے شہد کی مہک بھی محسوس ہوتی ہے، لیکن آدمی کو اس کا ذرا احتیاط سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے؟ اور اسے صاف معلوم ہو جائے گا کہ اس میں زندگی کی کوئی رمق باقی نہیں رہی۔ مکھیوں کے اندر داخل ہونے اور باہر نکلنے کا انداز وہ نہیں ہوتا جو پہلے تھا اور مکھیاں پالنے والے شخص کو اس بات کا شدت سے احساس ہونے لگتا ہے کہ آواز اور مہک دونوں میں پہلے کی نسبت نمایاں فرق آ گیا ہے۔ جب وہ بیمار چھتے کی دیوار کو کھٹکھٹاتا ہے تو ہزاروں مکھیاں بجائے اس کے کہ پہلے کی طرح آناً فاناً متفقہ ردعمل کا اظہار کریں، بھنبھناتی ہوئی آئیں، تہدیدی انداز سے اپنے

پروں کو پھیلائیں اور انھیں بہ سرعت جھلاتے کٹکٹاتی اور زندہ وتوانا غنغناہٹ پیدا کریں، ان کی کھوکھلی اور بے ربط بھنبھناہٹ، جو اجاڑ چھتے کے مختلف حصوں سے آتی ہے، اس کا استقبال کرتی ہے۔ اس نے چھتے تک پہنچنے کے لیے جو سیڑھی لگائی ہوتی ہے، اس پر کھڑے ہونے پر بجائے اس کے کہ اسے اندر سے حسب سابق شہد اور زہر کی سہانی خوشبو آئے، اور (مکھیوں کے) جم غفیر کی حرارت سانس بن کر اس کے نتھنوں میں گھسے، ہوتا کیا ہے، ویرانی اور بوسیدگی کی بھبک شہد کی مہک سے مخلوط ہو کر باہر آتی ہے۔ کمریں جھکائے اور خطرے کی گھنٹیاں بجاتے چوکیدار، جو چھتے کے دفاع کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں، اب ان کا نام ونشان بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ کھولتے پانی کی گنگناہٹ سے مشابہ چھتے کے اندر رونق اور مصروفیت کی مظہر جو دھیمی اور ہموار بھنبھناہٹ سنائی دیا کرتی تھی، اب وہ ناپید ہو چکی ہے اور اس کی جگہ بدنظمی کی بے ترتیب اور کرخت سرسراہٹ نے لے لی ہے۔ شہد میں لتھڑی سیاہ لمبوتری قزاق مکھیاں ڈرتی سہمتی وزدیدہ انداز سے اڑتی چھتے کے اندر گھستی اور باہر نکلتی پھر رہی ہیں۔ وہ ڈنک نہیں مارتیں بلکہ رینگتی رانگتی خطرے سے پرے ہٹ جاتی ہیں۔ پہلے شہد سے لدی پھندی مکھیاں چھتے میں داخل ہوتیں اور خالی ہاتھ باہر اڑ جاتیں۔ اب وہ باہر آتی ہیں تو لدی پھندی ہوتی ہیں۔ مکھیاں پالنے والا زیریں خانہ کھولتا ہے اور چھتے کے نچلے حصے پر نظر دوڑاتا ہے۔ پہلے مشقت سے نڈھال سیاہ اور چمکیلی مکھیاں بڑے بڑے جھرمٹ بنائے، ایک دوسری کے پروں سے چمٹے، فرش کے اوپر لٹکی رہتی اور محنت شاقہ کی غیر مختتم بھنبھناہٹ پیدا موم باہر نکالتی رہتی تھیں، اب ان کے بجائے چڑمرائی اونگھتی مکھیاں چھتے کے فرش اور دیواروں پر بے دلی سے بلا مقصد گھومتی نظر آتی ہیں۔ صاف ستھرے انداز سے موم سے جڑے فرش پر، جس کی ازیں پیشتر پھڑ پھڑاتے پر صفائی کرتے تھے، اب موم کے ٹکڑے، غلاظت، مردہ مکھیاں اور وہ مکھیاں، جو زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہیں اور جن کے لیے اپنی ٹانگیں ہلانا بھی دشوار ہے، ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ کسی نے انھیں وہاں سے ہٹانے کا کوئی تردد نہیں کیا۔

مکھیاں پالنے والا بالائی خانہ کھولتا ہے اور چھتے کے اوپر کے حصے کا جائزہ لیتا ہے۔ مکھیوں کی پیوستہ صفوں کے بجائے جو چھتے کے دندانے دار خانوں کے باریک سوراخ کو بند رکھتی اور نومولود اجسام کو حرارت پہنچاتی رہتی تھیں، اسے خانوں کی فن کارانہ اور پیچیدہ ساخت تو ضرور نظر آتی ہے لیکن ان کی سابقہ شان وشوکت کا کوئی نشان بھی نظر نہیں آتا۔ ہر چیز آلائش زدہ ہے اور غفلت کی شکار ہے۔ سیاہ قزاق مکھیاں چھپ چھپ کر لوٹ کی تلاش میں تیزی سے ادھر ادھر بھاگی پھر رہی ہیں جب کہ گھر کی نگران پست قامت مکھیاں، جن کے ابدان اور جذبے یوں مرجھا چکے ہیں جیسے وہ بہت بوڑھی ہو گئی ہوں، ادھر ادھر رینگتی پھر رہی اور قزاقوں کی مزاحمت کرنے کے لیے کچھ نہیں کر رہی کیونکہ ان کی امنگیں مر چکی ہیں اور ان کے زندہ رہنے کے احساسات ختم ہو چکے ہیں۔ نر مکھیاں، چھوٹی اور بڑی بھڑیں، تتیے، بھونڈ اور تتلیاں بے مقصد ادھر ادھر پھڑ پھڑاتی اور چھتے کی دیواروں سے ٹکراتی پھر رہی ہیں۔ یہاں وہاں خانوں میں، جن میں شہد اور نومولود مردہ مکھیاں پڑی ہیں، کبھی کبھار غصیلی بھنبھناہٹ سنائی دے جاتی ہے۔ کہیں کہیں ایک دو مکھیاں، عادت اور اضطراری جذبے کے دباؤ کے تحت نومولودوں کے خانے صاف کرتی دکھائی

دیتی ہیں۔ وہ اپنی ہمت سے بڑھ کر زور لگاتی معلوم ہوتی ہیں اور بڑی جانفشانی سے مردہ مکھیاں باہر گھسیٹ رہی ہیں۔ کیوں؟ یہ انھیں خود بھی معلوم نہیں۔ دوسرے کونے میں دو معمر مکھیاں آلکسی سے آپس میں گتھم گتھا ہو رہی ہیں یا اپنے اجسام جھاڑ پونچھ رہی یا ایک دوسرے کے منہ میں نوالے ڈال رہی ہیں۔ وہ خود بھی نہیں جانتیں کہ ان کے عزائم معاندانہ یا دوستانہ ہیں۔ کسی اور جگہ مکھیوں کا جھرمٹ ایک دوسرے کے در پے آزار ہو رہا ہے۔ جب کوئی نخچیر لڑکھڑاتا ہے، سب اس پر پل پڑتی ہیں اور اس کا بھرکس نکال دیتی ہیں، اور نخچیر، جو پر کی طرح ہلکا ہے، مضمحل ہو کر یا جان سے ہاتھ دھو کر نیچے لاشوں کے ڈھیر پر آ گرتا ہے۔ مکھیاں پالنے والا نومولودوں کے خانوں کا جائزہ لینے کے لیے دونوں مرکزی خانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا ہے۔ بجائے اس کے کہ اسے پشت سے پشت ملائے اور تولید کے ارفع و اعلیٰ اسرار کی پاسبانی کرتے ہزاروں مکھیوں کے گنجان اور سیاہ حلقے نظر آئیں، اسے صرف سینکڑوں افسردہ، نیم مردہ اور نیم خوابیدہ مکھیاں دکھائی دیتی ہیں۔ وہ مقام جو کبھی مقدس پناہ گاہ تھا اور جس کی وہ تندہی سے پاسبانی کرتی رہی تھیں، اب اس کا وجود ختم ہو چکا ہے اور وہ خود، تقریباً ساری کی ساری، بے خبری میں موت کی آغوش میں جا چکی ہیں۔ ان سے موت اور بوسیدگی کی بدبو آ رہی ہے۔ صرف چند ایک ہی حرکت کرتی ہیں، اوپر اٹھتی ہیں، اڑتی ہیں اور بے دلی سے غنیم کے سر پر بیٹھتی ہیں لیکن ان میں اتنا بل بوتا نہیں ہوتا کہ اسے ڈنک مار سکیں۔ رہی باقی، وہ جاں بحق ہو چکی ہیں اور یوں نیچے گرتی ہیں جیسے فلس ماہی۔ مکھیاں پالنے والا چھتا بند کر دیتا ہے، چاک سے اس پر نشان بناتا ہے اور جب اسے موقع ملتا ہے، اسے توڑ دیتا اور نذرِ آتش کر دیتا ہے۔[25]

چنانچہ جب تھکا ماندہ، مضطرب اور کبیدہ خاطر نپولین کامیر کولیریسکی فصیل کے قریب ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا اور وفد کا۔ جس کی آمد آداب کی تعمیل کے لیے رسمی سہی لیکن اس کے نقطۂ نظر سے لابدی تھی۔ انتظار کر رہا تھا، ماسکو بھی اسی طرح خالی تھا۔

ماسکو کے مختلف کونوں کھدروں میں ابھی چند اشخاص موجود تھے۔ وہ بے مقصد ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے اور یہ جانے بغیر کہ کیوں، دیرینہ عادات کے موافق عمل کر رہے تھے۔

اور جب گھما پھرا کر نپولین کو یہ اطلاع پہنچائی گئی کہ ماسکو سنسان اور ویران ہو چکا ہے، اس نے اطلاع دہندہ کو قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، پیچھے ہٹا اور دوبارہ چپ چاپ چکر کاٹنے لگا۔

''میری گاڑی!'' اس نے کہا۔

وہ ڈیوٹی پر موجود اڈی کانگ کے برابر گاڑی میں بیٹھ گیا اور مضافات کی سمت چل پڑا۔

''ماسکو سنسان ہو گیا!'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یقین نہیں آتا کہ مہم کا یہ نتیجہ نکلا ہے!''

وہ شہر میں نہ گیا بلکہ مضافاتی بستی درگومیلوف کے ایک ہوٹل میں قیام پذیر ہو گیا۔

"Coup de theatre"* نہیں آیا تھا۔

---

* لفظی ترجمہ: تھیئٹر کی ضرب۔ غیر متوقع اور ڈرامائی لمحہ جو صورت حال کو یکسر تبدیل کر دیتا ہے۔

21

روسی دستے دو بجے صبح سے دو بجے دوپہر تک ماسکو میں سے گزرتے رہے اور اپنی رو میں شہر چھوڑ کر جانے والے باشندوں اور زخمیوں کی آخری کھیپوں کو بھی بہا لے گئے۔

اس نقل و حرکت کے دوران میں سب سے زیادہ بھیڑ بھڑکا کامینی، ماسکو اور یاؤزا پلوں پر رہا۔

جب فوجی دستے کریملن کے گرد چکر کاٹ کر گزرنے کے لیے دو حصوں میں منقسم ہو کر ماسکو اور کامینی پلوں پر ہجوم کیے ہوئے تھے، فوجی جوانوں کی خاصی بڑی تعداد نے اس بھیڑ بھاڑ اور تاخیر سے فائدہ اٹھایا۔ وہ آنکھ چرا کر دبے پاؤں پلوں سے واپس مڑنے اور واسیلی بلاژنی چرچ کے قریب سے گزر کر بارووتسکی گیٹ میں سے ہوتے پہاڑی پر چڑھ کر ریڈ سکوائر[26] پہنچنے لگے۔ ان کی کوئی وجدانی صلاحیت انھیں بتا رہی تھی کہ ادھر جو کچھ بھی ہاتھ لگا، اسے یہاں سے اٹھا کر لے جانا کوئی مشکل امر نہیں ہوگا۔ جس قسم کے ہجوم دکانوں پر ''سیل'' کے دنوں میں دیکھنے میں آتے ہیں، بازار[27] کے رستوں اور گلیوں میں جمع ہو گئے۔ لیکن اب نہ دکانداروں کی میٹھی اور رسیلی آوازیں گاہکوں کو اندر آنے کی دعوت دے رہی تھیں، نہ خوانچہ فروش شیریں تانیں لگا رہے تھے اور نہ وہاں رنگ برنگے اور زرق برق ملبوسات زیب تن کیے خواتین کے جمگھٹے تھے۔ اب وہاں وردیوں اور اوورکوٹوں میں ملبوس صرف سپاہی تھے۔ انھوں نے اپنے ہتھیار پھینک پھانک دیے تھے۔ وہ مسقف گلیوں خالی ہاتھ داخل ہوتے اور دبے پاؤں لدے پھندے واپس آتے۔ دکاندار اور ان کے کارندے (جواب خال خال رہ گئے تھے) فوجیوں کے مابین یوں بھاگے پھر رہے تھے جیسے ان کی سٹی گم ہو گئی ہو۔ وہ دکانوں کے تالے کھولتے، انھیں دوبارہ بند کرتے اور خود ہی اپنا مال جھولیاں بھر بھر کر باہر لاتے۔ بازار کے سامنے چوک میں فوجیوں کو ایک مقام پر اکٹھا کرنے کے لیے طبلچی اپنے طبل بجا رہے تھے، لیکن طبلوں کی آوازیں لوٹ مار کرنے والے جوانوں کو مجتمع کرنے کے بجائے دور سے دور تر بھگا رہی تھیں۔ دکانوں اور گلیوں میں فوجی جوانوں میں وہ اشخاص بھی، جن کے سر منڈے[28] ہوئے تھے اور جنھوں نے سزا یافتہ قیدیوں کے سرمئی کوٹ پہن رکھے تھے، گھل مل گئے تھے۔ دو افسران، جن میں سے ایک نے وردی پر سکارف لپیٹا ہوا تھا اور جو مریل سرمئی گھوڑے پر سوار تھا، اور دوسرا اوورکوٹ پہنے ہوئے اور پیدل تھا، الینکا سٹریٹ کی نکڑ پر کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ ایک تیسرا افسر سرپٹ گھوڑا دوڑاتے ان کے پاس آیا۔

''جنرل نے حکم دیا ہے کہ ان لوگوں کو لازماً بلا تاخیر بھگا دیا جائے۔ ان کی حرکتیں شرمناک ہیں۔ آدھے جوان ادھر ادھر تتر بتر ہو گئے ہیں!... تم، تم کہاں جا رہے ہو؟... اور تم؟...'' اس نے پیادہ فوج کے تین سپاہیوں سے، جو اپنی بندوقیں پھینک کر اور اپنے اوورکوٹوں کے نچلے حصے اوپر اٹھائے اس کے قریب سے آنکھ بچا کر مسقف بازار میں گھسنے کی کوشش کر رہے تھے، چلا کر کہا۔ ''بدمعاشو، رک جاؤ!''

''خود دیکھ لو۔ ذرا نہیں روک کر دکھاؤ!'' دوسرے افسروں میں سے ایک نے بھنا کر جواب دیا۔ ''کچھ نہیں

ہو سکتا! ہمارے لیے صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ پیشتر اس کے کہ باقی بھی لگام چھڑا کر بھاگ نکلیں، ہم تیزی سے آگے نکل چلیں۔"

"ہم آگے کیسے جا سکتے ہیں؟ وہ پل پر پھنسے ہوئے ہیں۔ آگے جانے کا راستہ ہی نہیں ملتا۔ کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اُن کے اور اِن کے مابین حصار بنا لیا جائے تاکہ باقیوں کو بھاگنے سے روکا جا سکے۔"

"آگے جاؤ اور انھیں وہاں سے بھگاؤ!" سینئر افسر نے چلا کر کہا۔

جس افسر کی وردی پر سکارف تھا، وہ گھوڑے سے اترا، اس نے ایک طبلچی کو بلایا اور وہ مسقف راہداری میں، جس کے دونوں اطراف دکانیں تھیں، داخل ہو گیا۔ چند ایک جوان ہجوم کی صورت میں بھاگنے لگے۔ ایک دکاندار، جس کے رخساروں پر ناک کے نزدیک پھنسیاں تھیں اور جس کے فربہ چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص ٹھنڈے دماغ کا مالک، اپنا الو سیدھا کرنے کے لیے جمع تفریق کا ماہر اور کٹ حجتی ہے، طمطراق سے بازو لہراتا بہ عجلت افسر کے پاس پہنچا۔

"حضور!" اس نے کہا۔ "دیا کریں، ہمیں بچائیں، آپ کی نوازش ہوگی۔ ہم خسیس نہیں ہیں۔ ہم چھوٹی موٹی خدمت کے لیے ہر وقت تیار ہیں، یہ ہمارے لیے باعث سعادت ہے۔ آئیں، تشریف لائیں، میں آپ کی خدمت میں کپڑے کا تھان، اگر حضور پسند فرمائیں، تو دو تھان پیش کرنے کے لیے تیار ہوں — ہمارے لیے باعث سعادت ہوگا۔ مگر یہ جو کچھ ہو رہا ہے، یہ تو نری ڈکیتی ہے۔ حضور، دیا کریں، کم از کم اتنی دیر کے لیے یہاں سنتری کھڑے کر دیں کہ ہم اپنی دکانیں ہی بند کر سکیں..."

متعدد دکانداروں نے افسر کے گرد گھیرا ڈال لیا۔

"ہونہہ، جی جی کرنے کا فائدہ؟" ان میں سے ایک دبلے پتلے شخص نے کہا جس کا چہرہ کرخت تھا۔ "جس شخص کا سر کٹ جائے، وہ یہ واویلا نہیں کرتا: 'ہائے میرے بال!'" پھر وہ شخص، جہاں افسر کھڑا تھا، وہاں سے پیچھے ہٹا اور اپنے بازو کو زور زور سے لہراتے با آواز بلند پکارنے لگا: "جو جی چاہے، اٹھا لو!"

"ایوان سیدورچ، تمھیں اس قسم کی باتیں کرنا زیب نہیں دیتا!" پہلے دکاندار نے غصے سے چلا کر کہا۔ "حضور، اندر تشریف لے چلیں۔"

"باتیں؟ ہونہہ۔" دبلے پتلے آدمی نے چیخ کر کہا۔ "یہاں میری تین دکانیں ہیں۔ ان میں ایک لاکھ روبل کا مال بھرا ہوا ہے۔ جب فوج چلی جائے گی، اسے بچایا جا سکے گا؟ نہیں، بھائیو، خدا کی مشیت انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے!"

"حضور، آئیں، تشریف لائیں!" پہلے دکاندار نے دوزانو ہو کر کہا۔

افسر شش و پنج میں پڑ گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اس کا چہرہ چغلی کھا رہا تھا کہ اسے فیصلہ کرنے میں دشواری پیش آ رہی ہے۔

"یہاں میرا کیا کام؟" اس نے اچانک چلا کر کہا، گھوڑے کو ایڑ لگائی اور تیزی سے مسقف گلی میں سے گزرنے لگا۔

ایک کھلی دکان سے ہاتھا پائی اور گالی گلوچ کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور جب افسر اس کے قریب پہنچا، ایک سرمنڈے شخص کو، جس نے سرمئی دیہاتی کوٹ پہن رکھا تھا، دھکا دے کر باہر پھینک دیا گیا۔

یہ شخص دہرا ہو گیا اور افسر اور دکانداروں کے قریب سے گزرتا آگے بھاگ گیا۔ جو فوجی جوان دکان کے اندر تھا، افسر اس پر جھپٹ پڑا لیکن عین اسی لمحے اس زبردست ہجوم سے، جو مسکوا پل پر اکٹھا ہو گیا تھا، ہولناک چیخیں بلند ہونے لگیں اور افسر چوک کی جانب بھاگنے لگا۔

"کیا ہوا؟ کیا ہوا؟" وہ پوچھنے لگا لیکن اس کا ساتھی پہلے ہی سر پر پاؤں رکھے واسیلی بلاژنی چرچ کے قریب سے گزرتا ادھر دوڑا جا رہا تھا جدھر سے شور و غل کی آوازیں آ رہی تھیں۔

افسر اپنے گھوڑے سے اترا اور اس کے پیچھے چل پڑا۔ جب وہ پل کے نزدیک پہنچا، اس نے دیکھا کہ دو توپیں گاڑیوں سے علیحدہ ہو گئی ہیں، پیادہ سپاہی پل عبور کر رہے ہیں، متعدد چھکڑے الٹے پڑے ہیں، چند اشخاص کے چہروں پر وحشت ٹپک رہی ہے اور کچھ فوجی جوان قہقہے لگا رہے ہیں۔ توپوں کے نزدیک گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں دو گھوڑے جتے ہوئے تھے۔ گاڑی کے پیچھے چار روسی النسل شکاری کتے تھے۔ ان کے گلوں میں پٹے تھے۔ وہ ڈرے سہمے پہیوں سے چمٹے ہوئے تھے۔ گاڑی میں اتنا سامان لدا ہوا تھا کہ چھوٹی موٹی پہاڑی بن گئی تھی، اور سامان کے عین اوپر بچوں کی کرسی کے قریب جس کی ٹانگیں فضا میں معلق تھیں، ایک دیہاتی عورت بیٹھی تھی۔ عورت کی جان پر بنی ہوئی تھی اور اس نے اپنے واویلے سے آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ افسر کو اس کے رفقا نے بتایا کہ عورت اور ہجوم اس لیے چیخ چنگھاڑ رہے ہیں کیونکہ جب جنرل یرمالوف ادھر سے گزرا اور اسے یہ معلوم ہوا کہ جوان چھپ چھپا کر بھاگ رہے ہیں اور دکانوں میں لوٹ مار مچا رہے ہیں، جب کہ غیر فوجی لوگ پل پر بھیڑ لگائے ہوئے ہیں، وہ آگ بگولا ہو گیا۔ اس نے گاڑیوں سے دو توپیں اتروائیں اور یوں ظاہر کرنے لگا جیسے وہ پل پر گولہ باری کرنا چاہتا ہو۔ ہجوم گاڑیوں کو الٹتا پلٹتا، ایک دوسرے کو ٹھوکریں لگاتا، پاؤں تلے کچلتا اور دیوانہ وار چیخیں بلند کرتا پل پار کر گیا۔ یوں راستہ صاف ہو گیا اور فوجی آگے بڑھنے لگے۔

22

دریں اثنا جہاں تک اصل شہر کا تعلق ہے، وہ خالی ہو چکا تھا۔ گلیوں میں شاید ہی کوئی متنفس نظر آتا ہو گا۔ دروازے اور دکانیں سب بند تھیں۔ صرف کہیں کہیں ہوٹلوں کے قرب و جوار میں کسی اکیلے دکیلے شرابی کے غل غپاڑے یا گانے کی آواز سنائی دے جاتی۔ سڑکوں اور گلیوں سے گاڑیاں عنقا ہو چکی تھیں اور قدموں کی چاپ نایاب۔ پوارسکایا سٹریٹ کاملاً سنسان اور ویران تھی۔ رستوفوں کے گھر کے وسیع و عریض صحن میں گھاس اور لید کے ڈھیر لگے ہوئے تھے اور کوئی

ذی روح نظر نہیں آتا تھا۔ بڑے ڈرائنگ روم میں، جس میں فرنیچر، پردے اور دیگر آرائشی اشیا جوں کی توں رہنے دی گئی تھیں، صرف دو اشخاص۔۔یارڈ پورٹر اگنات اور واسیلیچ کا پوتا مشکا، جو گھر کے چھوٹے موٹے کام کرتا تھا اور اپنے دادا کے ساتھ ماسکو میں ہی ٹھہر گیا تھا۔۔ موجود تھے۔ مشکا نے کلاوی کارڈ کھول لیا تھا اور اس کی انگلی اناڑی پن سے اس کے تار چھیڑ رہی تھی۔ یارڈ پورٹر دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے قد آدم آئینے کے سامنے کھڑا تھا اور دل جمعی سے مسکرا رہا تھا۔

''بہت مزے دار ہے! کیا خیال ہے، چچا اگنات؟'' چھوکرے نے ایکا ایکی دونوں ہاتھوں سے ساز کے پردوں کے تختے پر ضرب لگاتے ہوئے کہا۔

''خوب، خوب!'' اگنات نے جواب دیا۔ اپنے چہرے پر مسکراہٹ پھیلتی دیکھ کر وہ خود مبہوت ہو رہا تھا۔

''بدتمیز! بے شرم! بے حیا!'' ماورا کزمی نیشنا نے دہاڑتے ہوئے کہا۔ وہ یوں دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوئی تھی کہ انھیں کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ ''اس بھینسے کو دیکھو، اپنا بوتھا دیکھ کر کیا کھیسیں نکال رہا ہے! تو تم یہ کرنے یہاں آئے ہو! ادھر سارا کام یوں کا توں پڑا ہے اور واسیلیچ بے چارے کا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ ٹھہرو، میں تمھاری خبر لیتی ہوں!''

اگنات نے دانت نکالنا بند کیا، اپنی پیٹی درست کی اور آنکھیں جھکائے چپ چپ باہر نکل گیا۔

''خالہ، میں نے تو محض ہاتھ لگایا تھا۔'' چھوکرا کہنے لگا۔

''آوارہ گرد! یہ ہاتھ واتھ لگانا چھوڑو۔'' ماورا کزمی نیشنا نے دھمکی آمیز انداز سے ہاتھ لہراتے ہوئے کہا۔ ''جاؤ، دادا کے لیے سماوار چڑھادو۔''

ماورا کزمی نیشنا نے کلاوی کارڈ سے گرد پونچھی، اسے بند کیا، گہری آہ بھری، کمرے سے باہر نکلی اور دروازے پر تالا لگا دیا۔

صحن میں پہنچ کر وہ رک گئی اور سوچنے لگی کہ اب اسے کہاں جانا چاہیے: ''نوکروں کے کوارٹروں میں جا کر واسیلیچ کے ساتھ چائے پیئوں یا سٹور روم میں جا کر اشیا سمیٹوں جو ابھی تک ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔''

گلی میں کسی کے تیز تیز چلنے کی چاپ سنائی دی۔ کوئی شخص صدر دروازے پر رکا۔ اس کا ہاتھ کھٹکا گھما رہا اور اسے کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ماورا کزمی نیشنا گیٹ کی جانب چل دی۔

''کس سے ملنا ہے؟''

''کاؤنٹ۔۔الیا آندریچ رستوف۔''

''اور آپ کون ہیں۔''

''ایک افسر۔'' ''میں ان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔'' خوشگوار نستعلیق روسی آواز نے جواب دیا۔

ماورا کزمی نیشنا نے تالا کھولا اور تقریباً اٹھارہ سالہ نوجوان افسر، جس کا چہرہ بیضوی اور ساخت کے اعتبار سے رستوفوں سے اچھا خاصا ملتا جلتا تھا، صحن میں داخل ہوا۔

''حضور، وہ تو تشریف لے جا چکے ہیں۔ وہ کل شام روانہ ہوئے تھے۔'' ماورا کزمی نیشنا نے شفقت سے کہا۔

نوجوان افسر گیٹ کے قریب کھڑا تھا۔ وہ یہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ وہ وہیں کھڑا رہے یا اندر چلا جائے۔

''اف، یہ تو بہت برا ہوا!'' اس نے زبان چٹخاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کل آنا چاہیے تھا... کیسی غلطی ہوئی!...''

ماورا کزمی نیشنا نوجوان افسر کے جانے پہچانے رستوفی خدوخال، اس کے بوسیدہ کوٹ اور پھٹے پرانے بوٹوں کا انہاک اور ہمدردی سے جائزہ لے رہی تھی۔

''آپ کو کاؤنٹ سے کیا کام تھا؟'' اس نے پوچھا۔

''اچھا، خیر... اب کیا ہو سکتا ہے!'' اس نے ذرا جھلا کر کہا اور اپنا ہاتھ یوں گیٹ پر رکھا جیسے وہ واپس جانا چاہتا ہو۔

وہ ایک بار پھر کشمکش و پیچ میں پڑ گیا۔

''بات دراصل یہ ہے،'' وہ ایکا ایکی بولنے لگا، ''میں کاؤنٹ کا قرابت دار ہوں۔ وہ مجھ پر ہمیشہ شفقت فرماتے رہے ہیں اور یہ بات تو آپ کو بھی معلوم ہو گئی ہو گی'' اس نے بلاجھجک شگفتہ دلی سے مسکراتے اپنے کوٹ اور بوٹوں پر نظر ڈالی، ''کہ میرے کپڑے تار تار ہو رہے ہیں اور ہاتھ میں دمڑی بھی نہیں۔ میں کاؤنٹ سے مدد مانگنے آیا تھا۔''

''حضور، آپ ایک منٹ، بس ایک منٹ انتظار فرمائیں...'' وہ بولی۔

جونہی افسر نے دروازے سے ہاتھ اٹھایا، وہ واپس مڑی اور اپنی بوڑھی ٹانگوں کو تیزی سے گھسیٹتی عقبی صحن میں سے گزرتی نوکروں کے کوارٹروں کی طرف چل پڑی۔

جب ماورا کزمی نیشنا اپنا کوارٹر کی جانب بھاگی جا رہی تھی، نوجوان افسر سر جھکائے صحن میں ادھر ادھر چکر لگا رہا تھا۔ اس کے لبوں پر ہلکا سا تبسم تھا اور وہ بار بار اپنے بوسیدہ بوٹوں کو دیکھ رہا تھا۔

''کتنا برا ہوا، انکل سے ملاقات ہی نہ ہو سکی۔ یہ بڑھیا کتنی اچھی ہے! اور اپنی رجمنٹ تک پہنچنے کے لیے میں مختصر ترین راستہ کس سے پوچھوں گا؟ وہ اب تک لازماً گوژسکی گیٹ پر پہنچ گئی ہو گی۔'' اس نے سوچا۔

اتنے میں ماورا کزمی نیشنا مکان کے کونے میں نظر آئی۔ وہ جھینپ ضرور رہی تھی لیکن اس کے چہرے پر عزم و ہمت ٹپک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لپٹا لپٹایا رومال تھا۔ ابھی وہ افسر سے چند قدم دور تھی کہ اس نے رومال کھولا، پچیس 25 روبل کا سفید نوٹ[30] نکالا اور جھٹ پٹ افسر کو تھما دیا۔

''اگر ہز ایکسی لینسی گھر پر ہوتے... رشتے دار ہونے کے ناتے... وہ ضرور بالضرور... مگر یہ جو برا وقت آن پڑا ہے...'' ماورا کزمی نیشنا گڑبڑا رہی تھی اور اس کے منہ سے پوری بات نہیں نکل رہی تھی۔

افسر نے نہ پس و پیش کیا اور نہ جلد بازی دکھائی، اس نے بس نوٹ پکڑا اور اس کا شکریہ ادا کرنے لگا۔

''اگر کاؤنٹ گھر پر ہوتے...'' ماورا کزمی نیشنا معذرت خواہانہ انداز سے بڑبڑائی۔ ''حضور، یسوع مسیح آپ کے حامی وناصر ہوں! خداوند آپ کو صحیح سلامت رکھیں!'' اس نے گردن جھکا کر اور اسے الوداع کرتے ہوئے کہا۔

افسر مسکراتا اور اپنا سر ہلاتا، جیسے اسے اپنے آپ پر ہنسی آ رہی ہو، سونی گلیوں میں تیز تیز دوڑتا یاؤزا پل کی سمت بھاگنے لگا تا کہ وہ اپنی رجمنٹ سے جا ملے۔

لیکن ماورا کزمی نیشنا کچھ دیر نم ناک آنکھوں کے ساتھ بند گیٹ کے قریب کھڑی رہی۔ وہ محویت کے عالم میں اپنے سر کو ادھر ادھر گھما پھرا رہی تھی، اجنبی نوعمر افسر کے لیے اس کے دل میں یکا یک مادرانہ شفقت اور ہمدردی کے جذبات موجزن ہو گئے تھے۔

23

وارِوار کا محلے کی ایک مکمل عمارت سے، جس کی نچلی منزل میں ریستوران اور مے خانہ تھا، نشے میں دھت لوگوں کے دنگا فساد کرنے اور گانے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ایک تنگ اور غلیظ کمرے میں میزوں کے سامنے بنچوں پر کارخانوں کے دس بار مزدور بیٹھے تھے۔ وہ مخمور و مدہوش تھے۔ ان کے اجسام پسینے میں نہائے ہوئے تھے، ان کی آنکھیں چندھی ہو رہی تھیں اور ان کے منہ کھلے ہوئے تھے، وہ کوئی گیت نما چیز گا رہے تھے۔ ان کی آوازیں بے سری، انمل اور بے جوڑ تھیں۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اس لیے نہیں گا رہے کیونکہ انھیں نغمہ سرائی کی خواہش تھی، بلکہ وہ محض اس لیے اپنے گلے پھاڑ رہے تھے کیونکہ وہ یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ انھیں نشہ اچھی طرح چڑھ چکا ہے اور وہ خوب مزے کر رہے ہیں۔ ان میں سے ایک شخص، جو نوجوان اور دراز قد تھا، جس کے بال سنہری تھے اور جو صاف ستھرے نیلے کوٹ میں ملبوس تھا، دوسروں کے اوپر چڑھا کھڑا تھا۔ سیدھی اور ستواں ناک کے سبب اس کا چہرہ خوبصورت ہو سکتا تھا بشرطیکہ اس کے لب باریک، بھنچے ہوئے اور پھڑکتے نہ ہوتے اور اس کی آنکھیں بے نور، غصیلی اور ایک جگہ ٹھہری ہوئی نہ ہوتیں۔ وہ ان کے اوپر کھڑا تھا اور بظاہر کوئی خیال اس کے ذہن پر قابض تھا کیونکہ وہ نہایت سنجیدگی اور درشتی سے اپنے ایک سفید بازو سے، جس کی آستین کہنی تک چڑھی ہوئی تھی، تال دے رہا تھا جب کہ وہ اپنی غلیظ انگلیاں غیر فطری انداز سے پھیلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے کوٹ کی آستین بار بار نیچے ڈھلک جاتی اور وہ ہر بار بائیں ہاتھ سے اسے نہایت احتیاط سے دوبارہ اوپر اڑس دیتا جیسے اس کے سفید نیلے بازو کا، جسے وہ لہرا رہا تھا، برہنہ رہنا نہایت ضروری تھا۔ گانے کے بیچ میں ہاتھا پائی کرنے اور چیخنے چلانے کی آوازیں پورچ اور غلام گردش میں سنائی دینے لگیں۔ دراز قد نوجوان نے اپنا بازو لہرایا۔

''رک جاؤ!'' وہ تحکمانہ انداز سے چلایا۔ ''لڑکو، باہر دنگا ہو رہا ہے!'' اور وہ اپنی آستین اوپر اڑستا باہر پورچ کی طرف چل دیا۔

مزدور اس کے پیچھے پیچھے باہر نکل آئے۔ یہ لوگ دراز قد نوجوان کی قیادت میں صبح سے ریستوراں میں

شراب نوشی کر رہے تھے۔ وہ ریستوراں کے مالک کے لیے کارخانے سے چند کھالیں لائے تھے اور اس کھکھیڑ کے عوض ان کی تواضع شراب سے کی گئی تھی۔ پڑوس کے لوہار خانے کے چند آہن گروں کے کانوں میں ریستوراں میں دھما چوکڑی مچنے اور رنگ رلیاں منائے جانے کی آوازیں پڑیں۔ انھیں خیال گزرا کہ شاید وہاں لوٹ مار ہو رہی ہے۔ چنانچہ انھوں نے ٹھان لیا کہ وہ بھی دھونس سے اندر داخل ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ پورچ میں جھگڑے کی شکل میں برآمد ہوا۔

ریستوراں کا مالک دروازے پر ایک لوہار سے گتھم گتھا ہو رہا تھا اور عین اس وقت جب کارخانے کے مزدور باہر آئے، لوہار نے اپنے آپ کو مالک ریستوراں سے چھڑا تو لیا لیکن وہ منہ کے بل فٹ پاتھ پر گر پڑا۔

ایک اور لوہار دروازے کی جانب لپکا اور اس نے ریستوران کے مالک کو اپنی چھاتی سے دھکا دے دیا۔

جس نوجوان نے اپنی آستین اوپر چڑھا رکھی تھی، اس نے لوہار کے منہ پر گھونسا مارا اور پاگلوں کی طرح چلانے لگا:

''لڑکو، ادھر آؤ! یہ ہمارے آدمیوں کی دھنائی کر رہے ہیں!''

اس اثنا میں پہلا لوہار اٹھ کر کھڑا ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے خراش رسیدہ چہرے کو چھیل ڈالا تا کہ اس سے خون بہنے لگے اور پھر با آواز بلند واویلا بپا کرنے لگا:

''مدد! قتل!... آدمی کا خون ہو گیا! مدد!...''

''خداوند، رحم! مار دیا، وہ مار دیا! آدمی جان سے گیا — قتل ہو گیا!'' ایک عورت، جو قریبی دروازے سے دوڑتی باہر آئی تھی، چلا چلا کر کہہ رہی تھی۔

لہولہان لوہار کے گرد ہجوم اکٹھا ہو گیا۔

''لوگوں کو لوٹ لوٹ کر تمھارا دل نہیں بھرا؟ ان کے کپڑے تک اتروا چکے ہو'' کسی نے ریستوران کے مالک سے کہا۔ ''اور اب تم نے آدمی بھی قتل کر دیا ہے! قاتل، خونی!''

دراز قد نوجوان سیڑھیوں پر کھڑا تھا۔ وہ اپنی چندھی آنکھیں گھما پھرا کر کبھی ریستوران کے مالک کو اور کبھی لوہار کو دیکھنے لگتا گویا سوچ رہا ہو کہ اسے ان میں سے کس کے ساتھ ہاتھا پائی کرنا چاہیے۔

''خونی!'' اس نے اچانک چلا کر ریستوران کے مالک سے کہا۔ ''لڑکو، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دو!''

''مجھے باندھو گے، تم مجھے باندھو گے!'' مالک ریستوران نے دہاڑتے ہوئے کہا اور جو آدمی اس کی طرف لپکے تھے، اس نے انھیں پرے دھکیل دیا۔ پھر اس نے عجلت سے اپنی ٹوپی اتاری اور اسے نیچے پھینک دیا۔

جیسے اس کا یہ فعل کسی پراسرار اور منحوس معنویت کا حامل ہو، کارخانے کے مزدور، جو اس کے گرد گھیرا ڈال رہے تھے، گومگو کی کیفیت میں جہاں تھے، وہیں رک گئے۔

''بچو، مجھے قانون آتا ہے، خوب آتا ہے! میں یہ معاملہ پولیس کمشنر کے سامنے پیش کروں گا۔ تمھارا خیال

ہے کہ میں ان کے پاس نہیں جاؤں گا؟ تمھیں ان دنوں لوگوں کے گھروں اور ہوٹلوں میں ڈاکے مارنے کی اجازت نہیں مل گئی!'' ریستوران کے مالک نے اپنی ٹوپی اٹھاتے ہوئے چلا کر کہا۔

''آؤ، چلیں!... آؤ، چلیں!'' ریستوران کے مالک اور دراز قد نوجوان نے یکے بعد دیگرے کہا، اور وہ دونوں اکٹھے سڑک پر چلنے لگے۔

لہولہان لوہار ان کے برابر برابر چلنے لگا اور دوسرے تمام لوگ ان کے پیچھے ہو لیے۔ وہ سب باتیں کر رہے اور چیخ چلا رہے تھے۔

ماروسیکا سٹریٹ کے نکڑ پر، خاصے بڑے مکان کے سامنے، جس کے کواڑ بند تھے اور جس پر جفت ساز کا سائن بورڈ لٹک رہا تھا، تقریباً اٹھارہ بیس جفت ساز کھڑے تھے۔ ان کے اجسام دبلے پتلے اور نحیف و نزار تھے۔ ان کے چہروں پر اداسی ٹپک رہی تھی۔ وہ اوور آل اور بوسیدہ کوٹ پہنے ہوئے تھے۔

''وہ ہمیں معقول مزدوری کیوں نہیں دیتا؟'' ایک لاغر محنت کش، جس کی داڑھی چھدری اور بھویں تنی ہوئی تھیں، کہہ رہا تھا۔ ''وہ ہمارا خون نچوڑ لیتا ہے۔۔۔ پھر سمجھ لیتا ہے کہ حساب برابر ہو گیا! وہ سارا ہفتہ ہمیں سبز باغ دکھاتا رہا اور اب ہمیں چکمہ دے کر خود نو دو گیارہ ہو گیا ہے۔''

جب اس کی نظر ہجوم اور لہولہان لوہار پر پڑی، وہ چپ ہو گیا اور سبھی جفت ساز تجسس کی خاطر راہ چلتی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔

''آپ لوگ کہاں جا رہے ہیں؟''

''تھانے، اور کہاں؟''

''کیا ہمارے ساتھیوں کو سچ مچ مار پڑی تھی؟''

''تمھارا کیا خیال ہے؟ خود دیکھ لو کہ لوگ کیا کہہ رہے ہیں!''

سوالات و جوابات کا تبادلہ ہونے لگا۔ ریستوران کے مالک نے ہر آن بڑھتے ہجوم کا فائدہ اٹھایا۔ وہ پیچھے رہ گیا اور واپس اپنے ریستوران چلا گیا۔

دراز قد نوجوان کو علم نہ ہو سکا کہ اس کا دشمن غائب ہو چکا ہے۔ وہ اپنا برہنہ باز و لہراتا اور ہجوم کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتا مسلسل بولتا چلا گیا۔ بیشتر لوگوں نے اس کے گرد گھیرا ڈال رکھا تھا جیسے انھیں توقع ہو کہ ان کے اذہان میں جو سوالات ابھر رہے ہیں، وہ ان کے جوابات فراہم کر دے گا۔

''وہ مجھے حکم دکھا دے۔۔۔ مجھے قانون بتا دے۔ آخر حکم کس مرض کی دوا ہیں! مسیحی بھائیو، میں نے ٹھیک کہا نا؟'' لانبا نوجوان کہہ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اتنی ہلکی مسکراہٹ تھی کہ بمشکل نظر آتی تھی۔ ''اس کا خیال ہے یہاں کوئی حاکم نہیں؟ حاکموں کے بغیر گاڑی کیسے چلے گی؟ اگر وہ نہ ہوں، پھر ہمیں لوٹنے والوں کی کمی نہیں رہے گی!''

''فضول باتیں بنانے کا فائدہ؟'' ہجوم کی دوسری جانب سے آواز سنائی دی۔ ''تمھارا خیال ہے وہ ماسکو

یونہی چھوڑ جائیں گے؟ کوئی شخص تمھیں الّو بنا رہا ہے اور تم اس کے پیچھے لگ گئے ہو! کیا یہاں فوجیوں کی کوئی کمی ہے؟ وہ اُسے اندر نہیں دیں گے۔ حاکموں کا یہی تو کام ہے۔ تمھارے لیے بہتر یہی ہے کہ جو کچھ لوگ کہہ رہے ہیں، اسے دھیان سے سنو۔'' ہجوم میں سے بعض لوگوں نے لانبے نوجوان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

چائنا ٹاؤن[31] کی دیوار کے قریب ایک اور ٹولی، ایک شخص کے گرد، جو کھردرے اون کا کوٹ پہنے ہوئے تھا، حلقہ بنائے کھڑی تھی۔ اس شخص کے ہاتھ میں کاغذ تھا۔

''یوکاز — وہ یوکاز پڑھ رہے ہیں... یوکاز پڑھ رہے ہیں!'' ہجوم میں لوگوں کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور وہ بھی فرمان خواں کی جانب بھاگنے لگے۔

موٹے کھردرے کوٹ میں ملبوس شخص اکتیس اگست کا خبرنامہ پڑھ رہا تھا۔ جب ہجوم اس کے گرد گھیرا بنانے لگا، وہ بدحواس ہو گیا لیکن لانبے نوجوان کے، جو بھیڑ میں راستہ بناتا تیزی سے اس کے قریب پہنچ چکا تھا، مطالبے پر وہ ایک بار پھر کپکپاتی آواز میں شروع سے خبرنامہ سنانے لگا۔

''ان بدمعاشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے فوج کو امداد بہم پہنچانے کے سلسلے میں کل صبح سویرے میں ہز سیرین ہائی نس'' (''ہز سیرین ہائی نس'' لانبے نوجوان نے سنجیدگی سے دہراتے ہوئے کہا۔ اس کے ماتھے پر شکنیں اور چہرے پر مسکراہٹ تھی۔) ''سے صلاح مشورہ کرنے جا رہا ہوں۔ یہ بدکار، جو ہمارے وطن میں آگھسے ہیں، انھیں جہنم رسید کرنے اور ان کا نام و نشان مٹانے کے لیے...'' فرمان خواں پڑھتا گیا اور پھر رک گیا، (''دیکھا'' نوجوان نے جذبۂ کامرانی سے مغلوب ہو کر با آواز بلند کہا، ''وہ آپ کے سامنے ہر چیز صاف صاف بیان کر دینا چاہتا ہے۔'') ''ہم بھی کچھ نہ کچھ ضرور کریں گے۔ میں ڈنر کے وقت تک واپس آجاؤں گا، پھر ہم کل کام میں جت جائیں گے، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائیں گے اور انھیں نیست و نابود کر دیں گے۔''

آخری الفاظ مکمل خاموشی سے سنے گئے۔ مایوسی کے عالم میں لانبے نوجوان کا منہ لٹک گیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اختتامی جملے کسی کی سمجھ میں نہیں آئے ہیں۔ یہ جملہ کہ ''میں ڈنر کے وقت تک واپس آجاؤں گا،'' فرمان خوان اور سامعین دونوں کو خاص طور پر بہت برا لگا تھا۔ لوگوں کی ذہنی کیفیت بہت بلند ہو چکی تھی اور یہ جملہ اتنا پامال اور قابل فہم تھا کہ ہر کوئی آسانی سے اسے سمجھ سکتا تھا۔ یہ بات تو ان میں سے کوئی بھی کہہ سکتا تھا، اعلیٰ حکام جو فرمان اور اعلان جاری کرتے ہیں، ان میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں آنا چاہیے تھی۔

وہ سب افسردہ اور خاموش کھڑے تھے۔ لانبے نوجوان نے اپنے ہونٹ ہلائے اور ذرا آگے پیچھے جھولا۔

''کیوں نہ اس سے پوچھ لیا جائے؟ وہ رہا وہ خود... وہ، ادھر! کیوں نہ اسی سے پوچھ لیں؟ وہ خود بتائے گا...''

اچانک ہجوم میں آوازیں سنائی دینے لگیں، اور سب کی توجہ چیف آف پولیس کی گاڑی کی طرف مبذول ہو گئی۔ گاڑی دو گھوڑ سوار فوجیوں کی حفاظت میں چوک کی جانب آ رہی تھی۔

• یوکاز (Ukaz): زار کا فرمان یا اعلان، جو بجائے خود قانون کے مترادف ہوتا تھا۔ انگریزی میں اسے ukase لکھا جاتا ہے۔

چیف آف پولیس نے اس صبح کاؤنٹ رستوپ چن کے حکم کی تعمیل میں دریائی بجروں اور کشتیوں کو نذر آتش کر دیا تھا اور اس خدمت کے معاوضے کے طور پر اسے خاصی موٹی رقم، جو اس وقت اس کی جیب میں تھی، ہاتھ آئی تھی۔ اب اس نے ہجوم کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ اس نے کوچوان کو گاڑی روکنے کا حکم دیا۔

''یہ کون لوگ ہیں؟'' اس نے ان اشخاص سے، جو ڈرتے جھجکتے اکیلے اکیلے اس کی درو شکی کی طرف آرہے تھے، ڈانٹ کر پوچھا۔ ''میں پوچھتا ہوں، یہ بھیڑ کیسی ہے؟''

''حضور، یہ...'' موٹے کھردرے اون کے کوٹ میں ملبوس کلرک کہنے لگا، ''حضور، ہز ایکسی لینسی کاؤنٹ کے اعلان کی پیروی میں یہ لوگ خدمات سرانجام دینا چاہتے ہیں، یہ اپنی جانوں کی قربانی دینے سے بھی دریغ نہیں کریں گے۔ یہاں دنگا فساد نہیں ہو رہا بلکہ جیسا کہ ہز ایکسی لینسی کاؤنٹ نے فرمایا ہے...''

''کاؤنٹ کہیں نہیں گئے، وہ یہیں ہیں۔ آپ لوگوں کے بارے میں حکم جاری کر دیا جائے گا۔'' چیف آف پولیس نے جواب دیا۔ ''چلو، گاڑی چلاؤ!'' اس نے کوچوان کو حکم دیا۔

ہجوم رک گیا اور جن لوگوں نے افسر کی بات سنی تھی، ان کے گرد اکٹھا ہونے لگا۔ ہر کوئی درو شکی کی طرف، جو چل پڑی تھی، آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔

دریں اثنا چیف آف پولیس نے اپنے گردوپیش نظر ڈالی۔ اس کے منہ پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اس نے کوچوان سے کچھ کہا اور گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا۔

''دوستو، ہمارے ساتھ ہاتھ ہو گیا! آئیں، ہم خود کاؤنٹ کے پاس چلتے ہیں!'' لانبے نوجوان نے گلا پھاڑ کر کہا۔

''وہ جانے نہ پائے!... وہ ہمیں جواب دے!... اسے روکو!...'' ہجوم میں سے آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

آپس میں اونچے اونچے باتیں کرتے اور چیف آف پولیس کا تعاقب کرتے وہ لب یانکا سٹریٹ کی سمت چل پڑے۔

''دیکھو، یہ بڑے لوگ — اشراف اور تجار — سب چلے گئے ہیں اور ہمیں موت کے منہ میں دھکیل گئے ہیں۔ کیوں؟ ہم آخر کیا ہیں — کتے؟'' ہجوم میں یکے بعد دیگرے مختلف آوازیں کہے جا رہی تھیں۔

24

یکم ستمبر کی شام کو کوتوزوف سے ملاقات کرنے کے بعد کاؤنٹ رستوپ چن واپس آ گیا۔ وہ غصے سے جل بھن کر کباب ہو رہا تھا کیونکہ اسے جنگی کونسل کے اجلاس میں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی، اس نے شہر کے دفاع کے لیے امداد کی جو پیشکش کی تھی، اسے نظر انداز کر دیا گیا تھا اور پھر کیمپ میں یہ جو بالکل نیا اور انوکھا نقطۂ نظر — کہ شہریوں کا سکون اور حب الوطنی کا والہانہ جذبہ نہ صرف ثانوی اہمیت کا حامل ہے بلکہ کاملاً غیر متعلق اور بے وقعت

بھی ہے۔ اس کے سامنے آیا، اس نے بھی اسے دم بخود کر دیا تھا۔ ان تمام باتوں سے اس کے دل کو سخت ٹھیس لگی، اسے ان میں اپنی ہتک کا پہلو نظر آیا اور وہ بالکل بھونچکا رہ گیا۔ چنانچہ وہ واپس ماسکو لوٹ آیا۔

سپر کے بعد وہ لباس تبدیل کیے بغیر صوفے پر لیٹ گیا۔ رات بارہ اور ایک بجے کے درمیان اسے قاصد نے جگا دیا جو کوتو زوف کا خط لے کر آیا تھا۔ خط میں کہا گیا تھا کہ چونکہ فوج ماسکو کی دوسری جانب ریازان روڈ کے آس پاس جا رہی ہے، چنانچہ وہ اتنی مہربانی فرمائے کہ شہر میں سپاہ کی رہنمائی کرنے کے لیے پولیس افسران بھیج دے۔ کاؤنٹ رستوپ چن کے لیے یہ کوئی نئی اطلاع نہیں تھی۔ اس کے سامنے جو مختلف شواہد آئے تھے، ان سے اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جائے گا۔ گزشتہ روز پکلونایا پہاڑی پر کوتوزوف سے اس کی جو ملاقات ہوئی تھی، نہ صرف اس سے اس کا عندیہ ملا تھا، بلکہ بارودینو کی لڑائی کے بعد جتنے بھی جرنیل ماسکو آئے تھے، ان سب نے بیک زبان یہی کہا تھا کہ دوبارہ جم کر لڑائی کرنا ناممکن ہوگا اور اس کے بعد رستوپ چن کی منظوری سے سرکاری املاک راتوں کو شہر سے باہر منتقل کی جاتی رہیں اور نصف آبادی شہر چھوڑ کر چلی گئی۔ پھر بھی اس اطلاع نے، جو محض رقعے کی صورت میں اسے پہنچائی گئی تھی اور جو کوتوزوف کے حکم پر مشتمل تھی، اور وہ بھی ایک ایسی شب، جب وہ پہلی مرتبہ ڈھنگ سے سویا تھا لیکن اس کی نیند میں خلل اندازی کر دی گئی تھی، اسے حیران بھی کیا اور غصہ بھی دلایا۔

اس زمانے میں کاؤنٹ رستوپ چن سے جو افعال سرزد ہوئے، اپنی یادداشتوں میں ان کی توضیح کرتے ہوئے وہ بہ تکرار کہتا ہے کہ ان ایام میں اس کے سامنے دو مقاصد تھے: ماسکو میں امن چین کی فضا بحال رکھنا اور شہریوں کی روانگی میں عجلت دکھانا۔ اگر رستوپ چن کے ان دوہرے مقاصد کو صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا ہر عمل بے داغ معلوم ہوگا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ پھر مقدس نشانیاں، بزرگوں کے تبرکات، اسلحہ جات، گولہ بارود اور غلے کے ذخائر کیوں منتقل نہ کیے گئے؟ شہر کے ہزاروں باشندوں کو اس غلط فہمی میں، کہ ماسکو کا ہر قیمت پر دفاع کیا جائے گا، مبتلا کر کے کیوں فریب دیا گیا؟ کیا یوں انھیں تباہی کے غار میں نہیں دھکیلا گیا؟ کاؤنٹ رستوپ کا جواب یہ ہے: ''ماسکو میں امن وسکون کی فضا بحال رکھنے کی خاطر۔'' اگر یہی بات تھی تو پھر سرکاری دفاتر سے ڈھیروں بے سود دستاویزات، لے پخ کا غبارہ اور دیگر اشیا کیوں منتقل کی گئیں۔ کاؤنٹ رستوپ چن اس کی وضاحت بدیں الفاظ کرتا ہے: ''تا کہ شہر میں کچھ بھی باقی نہ رہے۔'' آدمی بس اتنا مفروضہ گھڑ لے کہ امنِ عامہ کو خطرہ لاحق ہے، پھر ہر فعل جائز قرار دیا جا سکتا ہے۔

فرانس کے عہدِ خونیں کے دوران میں تمام گھناؤنی کارروائیاں امن عامہ کے نام پر کی گئی تھیں۔ پھر 1812 میں ماسکو کے امن عامہ کے بارے میں کاؤنٹ رستوپ چن کے خدشات کی اساس کیا تھی؟ یہ مفروضہ کیوں تراشا گیا کہ بغاوت کا امکان موجود ہے؟ شہر کے باشندے باہر جا رہے تھے اور ان کی جگہ پسپائی اختیار کرنے والی فوج لے رہی تھی، اس سے فساد کا اندیشہ کیوں محسوس ہوا؟

جب بھی روس کے کسی شہر میں غنیم کی فوج داخل ہوئی، کبھی کسی نے یہ نہیں سنا کہ ماسکو یا ملک کے کسی دوسرے

مقام پر بغاوت یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز رونما ہوئی ہے۔ یکم اور دو ستمبر کو ماسکو میں ابھی تک دس ہزار افراد موجود تھے اور سوائے اس ہجوم کے جو گورنر جنرل کے محل کے احاطے میں جمع ہوا تھا۔ اور یہ لوگ بھی اس لیے آئے تھے کہ خود اس نے انھیں اکسایا تھا، کہیں کچھ نہیں ہوا تھا۔ بارودینو کی لڑائی کے بعد جب یہ بات یقینی یا بہرحال امکانی ہوگئی تھی کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جاسکے گا، اگر رستوپ چن ہتھیاروں اور خبرناموں کی تقسیم کے ذریعے لوگوں کو جذبات بھڑکانے کے بجائے شہر سے تبرکات، گولہ بارود اور روپیہ پیسہ باہر منتقل کرنے کے اقدامات کرتا اور عوام کو صاف صاف بتا دیتا کہ شہر دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے گا، پھر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی، کہ جس اندیشے میں۔ کہ لوگ دنگا فساد کریں گے۔ وہ مبتلا ہے، اس کا کوئی خاص جواز موجود نہیں ہے۔

رستوپ چن جوشیلا، جلد باز، شگفتہ مزاج اور خود اعتماد شخص تھا۔ وہ ہمیشہ انتظامیہ کے اعلیٰ ترین حلقوں سے متعلق رہا۔ وہ محب الوطن ضرور تھا لیکن جن لوگوں کے متعلق اس کا خیال تھا کہ وہ ان پر حکومت کر رہا ہے، وہ انھیں مطلق سمجھ نہ پایا۔ اپنی دانست میں وہ چونکہ روسی قلب کا گورنر تھا، چنانچہ وہ اسی دن سے، جس روز دشمن سمولنسک میں داخل ہوا، سمجھنے لگا کہ وہ قومی جذبات کے دھارے کو جس طرف چاہے، موڑ سکتا ہے۔ ہر سرکاری منتظم کی طرح اس کا بھی یہ خیال تھا کہ ماسکو کے شہریوں کے خارجہ افعال وہی معین کرتا ہے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ یہ بھی سمجھنے لگا کہ اپنے خبرناموں اور اشتہاروں کے ذریعے وہ ان کے ذہنی رویوں کی بھی تشکیل کر رہا ہے حالانکہ یہ خبرنامے اور اشتہار ایسی بازاری اور عامیانہ زبان میں تحریر کیے جاتے تھے جس کا استعمال لوگ اپنے اپنے طبقے میں بھی معیوب تصور کرتے ہیں اور ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ اعلیٰ حکام اسے کیوں استعمال کر رہے ہیں۔ ایک ایسے رہنما کا، جو عوام الناس کو اپنے پیچھے لگا سکتا ہو، مہتم بالشان کردار کرنے پر کاؤنٹ رستوپ چن کو اتنا سرور حاصل ہوا اور اسے اس کا اتنا چسکا پڑ گیا کہ اسے یہ علم ہی نہ ہوسکا کہ اس نوع کی حرکات سے اجتناب کرنا اور کسی قسم کے سورماپن کی نمائش کیے بغیر ماسکو خالی کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اسے اچانک احساس ہوا کہ اس کے پاؤں تلے زمین کھسک رہی ہے لیکن وہ قطعی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ ماسکو ایک نہ ایک دن چھوڑنا پڑے گا مگر آخری لمحے تک اسے یہ یقین نہ آیا کہ واقعی ایسا ہوگا، چنانچہ اس نے اس ضمن میں کسی طرح کی کوئی تیاری نہ کی۔ شہر کے باشندوں نے اس کی خواہش کے علی الرغم ترکِ سکونت کی اور اگر سرکاری دفاتر دوسرے مقامات پر منتقل ہوئے، تو سرکاری عہدے داروں کے اصرار پر ہوئے، اس نے بادل ناخواستہ ان کی بات مانی۔ وہ اس کردار میں، جو اس نے اپنے لیے تخلیق کیا تھا، پوری طرح مستغرق تھا۔ اُن اشخاص کی طرح، جنھیں قدرت نے قوی قوت متخیلہ ودیعت کی ہوتی ہے، اسے مدتوں پہلے معلوم تھا کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جائے گا، لیکن یہ علم محض اس کے ذہن میں مقید تھا، اپنے قلب کی گہرائیوں میں اسے اس کا کوئی یقین نہیں تھا اور یوں وہ اپنے آپ کو نئی صورت حال کے تقاضوں کے مطابق نہ ڈھال سکا۔

اس کی تمام مشقت طلب اور زوردار سرگرمیوں (یہ الگ بات ہے کہ یہ کتنی بار آور تھیں یا لوگوں نے ان سے

کتنا اثر قبول کیا) کا محور صرف یہ تھا کہ فرانسیسیوں سے خود اسے جو نفرت تھی، وہی عوام الناس کے قلوب میں ابھار دی جائے اور وہ اس کی ذات پر اعتماد کرنے لگیں۔

لیکن جب حالات نے اپنی صحیح تاریخی وسعت اختیار کر لی، جب فرانسیسیوں سے نفرت کے اظہار کے لیے زبانی کلامی وعادی ناکافی ثابت ہونے لگے، جب لڑائی کے ذریعے بھی اس نفرت کا اخراج ناممکن ہو گیا، ماسکو کو جو واحد سوال درپیش تھا، جب اس کے سلسلے میں خود اعتمادی کسی کام نہ آئی، جب ماسکو کی ساری آبادی، جیسے اس نے ایکا کر لیا ہو، اپنی تمام املاک چھوڑ چھاڑ اور اپنے اس منفی رویے سے اپنے قومی جذبے کی قوت ثابت کر کے، جوق در جوق شہر سے باہر نکل گئی ہو، تب وہ کردار، جو رستوپ چن نے اپنے لیے منتخب کیا تھا، ایکا ایکی بے معنی ہو گیا۔ اسے یک دم محسوس ہوا کہ وہ اکیلا ہے، ناتواں ہے اور مضحکہ خیز ہے، اور اس کے کھڑے ہونے کے لیے زمین نہیں ہے۔

جب رستوپ چن کو کوتوزوف کا سرد مہرانہ اور واجب التعمیل رقعہ وصول کرنے کے لیے جگایا گیا، وہ اپنے آپ کو جتنا زیادہ قصوروار گردانتا، اسے اپنے آپ پر اتنا ہی زیادہ غصہ آنے لگتا۔ جو کچھ (اشیائے مملکت) خاص طور پر اس کی تحویل میں دیا گیا تھا اور جسے اسے باہر منتقل کر دینا چاہیے تھا، ابھی تک ماسکو میں پڑا تھا اور اسے اب باہر لے جانے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا تھا۔

''یہ کس کا قصور ہے؟ معاملات نے جو یہ صورت اختیار کی ہے، اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے؟'' وہ سوچ رہا تھا۔ ''مجھ پر نہیں، یقیناً مجھ پر نہیں! میں نے سب تیاریاں مکمل کر لی تھیں۔ ماسکو پوری طرح میری گرفت میں تھا اور اب انھوں نے ہماری کیا گت بنائی ہے! پاجی! بدمعاش! غدار!'' اس نے سوچا لیکن پاجی، بدمعاش اور غدار کون تھے، وہ ان کی واضح طور پر نشان دہی نہ کر سکا مگر وہ ان لوگوں پر، جو کوئی بھی وہ تھے، نفریں بھیجنے پر مجبور تھا کیونکہ اس کی دانست میں یہی لوگ اس باطل اور واہیات صورت حال کے، جس میں وہ اپنے آپ کو پا رہا تھا، ذمے دار تھے۔

اس ساری رات کاؤنٹ رستوپ چن احکام، جن کی خاطر ماسکو کے تمام علاقوں سے لوگ اس کے پاس آ رہے تھے، جاری کرتا رہا۔ جو اشخاص ہر دم اس کے گرد گھیرا ڈالے رکھتے تھے، انھوں نے کبھی اسے اتنا افسردہ اور چڑچڑا نہیں دیکھا تھا۔

''یور ایکسی لینسی، صوبائی رجسٹرار کے محکمے سے کوئی شخص آیا ہے، ڈائرکٹر ہدایات مانگ رہے ہیں... پادریوں کی مجلس منتظمہ سے، سینیٹ سے، یونیورسٹی سے، لاوارث بچوں کے ادارے سے... نائب اسقف نے ایلچی... فلاں صاحب پوچھ رہے ہیں... فائر بریگیڈ کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ جیل کے وارڈن دریافت کر رہے ہیں... پاگل خانے کے سپرنٹنڈنٹ...'' ساری رات اس قسم کے استفسارات کاؤنٹ تک پہنچائے جاتے رہے۔

ان استفسارات کے وہ بھنا کر جوابات دیتا رہا۔ اس کے رویے سے مترشح ہو رہا تھا کہ اب اس سے حکم لینے کی ضرورت نہیں رہی، یہ کہ کسی نے اس کی تیاریوں پر، جو اس نے اتنی احتیاط سے کی تھیں، پانی پھیر دیا ہے اور اب جو کچھ وقوع پذیر ہوگا، اس کی تمام تر ذمے داری کسی نہ کسی کو اپنے سر لینا ہوگی۔

''اس احمق کو بتادو کہ وہ جہاں ہے، وہیں رہے اور اپنی دستاویزوں کی حفاظت کرے۔'' اس نے رجسٹرار کے محکمے کے استفسار کے جواب میں کہا۔ ''ان فائر بریگیڈ والوں نے کیا بک بک لگا رکھی ہے؟ ان کے پاس گھوڑے ہیں — وہ ولادی میر دفع ہو جائیں۔ وہ انھیں یہاں فرانسیسیوں کے لیے تو چھوڑ کر نہیں جاسکتے!''
''یورا ایکسی لینسی، پاگل خانے کے سپر نٹنڈنٹ آئے ہیں۔ آپ کا کیا حکم ہے؟''
''میرا حکم؟ سب چلے جائیں — پاگلوں کے رسے کھول دیں اور انھیں شہر میں کھلا چھوڑ دیں۔ اگر پاگل ہماری فوجوں کے کمانڈر مقرر ہو سکتے ہیں، پھر خداوند کی مرضی یہی ہو سکتی ہے کہ ان پاگلوں کو بھی رہا کر دیا جائے۔''
جب اس سے دریافت کیا گیا کہ جیل کے سزا یافتہ قیدیوں کا کیا کیا جائے، اس نے وارڈن سے غصے سے چلا کر کہا:
''تمھارا خیال ہے کہ میں تمھاری حفاظت کے لیے دو بٹالین فوج مہیا کر دوں گا — کہاں ہے یہ فوج؟ ان سب کو چھوڑ دو۔ بس!''
''یورا ایکسی لینسی، ان میں سے بعض سیاسی قیدی ہیں — میش کوف، ویریش چاگن —''
''ویریش چاگن! کیا اسے ابھی تک پھانسی پر نہیں لٹکایا گیا؟'' رستوپ چن نے دہاڑتے ہوئے پوچھا۔ ''اسے میرے پاس لاؤ!''

25

صبح ہو گئی اور فوجی شہر میں سے گزرنے لگے۔ جو شہری کاؤنٹ سے ہدایات لینے کے خواہش مند تھے، نو بجے تک وہ بھی اپنے ان ارادوں سے دست کش ہو چکے تھے۔ جو لوگ شہر سے باہر منتقل ہو سکتے تھے، وہ اپنی مرضی سے عازم سفر ہونے لگے اور جو لوگ وہیں ٹھہرے رہے، فیصلہ کر رہے تھے کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔
کاؤنٹ نے اپنی گاڑی میں گھوڑے جوتنے کا حکم دیا۔ اس کا ارادہ ساکول نکی جانے کا تھا۔ وہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے سٹڈی روم میں بیٹھا تھا۔ وہ بالکل چپ چاپ تھا اور اس کی طبیعت سخت منغض ہو رہی تھی۔
امن اور سکون کے زمانے میں ہر منتظم کو یہ زعم ہوتا ہے کہ اس کی زیر تحویل پورے معاشرے کا کارخانہ محض اسی کی مساعی کے طفیل چل رہا ہے۔ اسے یہ جو شعور ہوتا ہے کہ اس کی ذات بے مثل و بے بدل ہے، وہی اس کی محنتوں اور کوششوں کا انعام ہوتا ہے۔ جب تک تاریخی سمندر غیر متلاطم اور پر سکون رہتا ہے، منتظم ملاح، جو اپنی کمزور و ناتواں کشتی عوام الناس کے جہاز سے نتھی کر کے اس کے ساتھ چمٹا اور آگے چلتا رہتا ہے، فطری طور پر یہ تصور کرنے لگتا ہے کہ جس جہاز کے ساتھ وہ چپکا ہوا ہے، وہ اسی کی مساعی سے متحرک ہے۔ لیکن طوفان ذرا اٹھا نہیں، سمندر ذرا متلاطم ہوا نہیں اور عظیم جہاز کو ہچکولے ذرا آنا شروع ہوئے نہیں، پھر اس قسم کی خام خیالی ممکن نہیں رہتی۔ جہاز اپنی زبردست اور آزاد قوت کے بل بوتے پر آگے چلتا رہتا ہے، جس رسی سے کشتی کو جہاز کے ساتھ منسلک کیا گیا

تھا، اب وہ اس تک پہنچ ہی نہیں پاتی اور منتظم مختارِ کُل اور منبعِ قوت بننے کے بجائے بے بضاعت، غیر اہم، کمزور اور بے کار محض شخص بن جاتا ہے۔

رستوپ چن یہی کچھ محسوس کر رہا تھا اور اسی سبب وہ جھلایا ہوا تھا۔

عین اسی دم، جب ایجوٹنٹ کاؤنٹ کو بتانے آیا کہ گاڑی تیار ہے، چیف آف پولیس، جسے ہجوم نے روک لیا تھا، پہنچ گیا۔ دونوں آدمیوں کے چہرے اترے ہوئے تھے اور چیف آف پولیس نے یہ بتانے کے بعد کہ اس نے کاؤنٹ کے احکام کی تعمیل کر دی ہے، اسے مطلع کیا کہ اس کے احاطے میں لوگوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہو گیا ہے اور وہ اس سے ملنا چاہتا ہے۔

جواب میں ایک لفظ کہے بغیر رستوپ چن اٹھ کر کھڑا ہو گیا، تیز تیز قدم اٹھاتا اپنے روشن اور ٹھاٹ باٹ سے آراستہ ڈرائنگ روم میں سے گزرتا بالکنی کے دروازے تک پہنچا، چٹخنی پر ہاتھ رکھا اور چھوڑ دیا۔ پھر وہ دریچے کی سمت بڑھا۔ وہاں سے اسے ہجوم کا منظر بہتر طور پر دکھائی دے رہا تھا۔ لانبا نوجوان آگے کھڑا تھا۔ وہ گمبھیر صورت بنائے اپنے بازو فضا میں لہرا رہا اور باتیں کر رہا تھا۔ لہولہان لوہار مغموم صورت بنائے اس کے قریب کھڑا تھا۔ بند کھڑکیوں میں سے آوازوں کی بھنبھناہٹ سنائی دے رہی تھی۔

''گاڑی تیار ہے؟'' رستوپ چن نے دریچے سے پیچھے ہٹتے ہوئے پوچھا۔

''جی ہاں، یوئر ایکسی لینسی۔'' ایجوٹنٹ نے جواب دیا۔

رستوپ چن دوبارہ بالکنی کے دروازے کے قریب چلا گیا۔

''لیکن یہ چاہتے کیا ہیں؟'' اس نے چیف آف پولیس سے پوچھا۔

''یوئر ایکسی لینسی، وہ کہتے ہیں کہ وہ آپ کے احکام کی تعمیل کرنے اور فرانسیسیوں سے ٹکر لینے کے لیے تیار ہیں، اور وہ غداری کے بارے میں کوئی نعرہ لگا رہے تھے۔ لیکن، یوئر ایکسی لینسی، یہ ہجوم ہے بڑا سرکش۔ میں نے بڑی مشکلوں سے اس سے پنڈ چھڑایا۔ یوئر ایکسی لینسی، اگر اجازت ہو تو میں یہ عرض کروں۔''

''آپ جا سکتے ہیں، مجھے آپ کے مشوروں کی ضرورت نہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے!'' رستوپ چن نے غصے سے چلا کر کہا۔

وہ بالکنی کے دروازے کے قریب کھڑا ہجوم کو دیکھتا رہا۔ ''یہ ہے جو انھوں نے روس کے ساتھ کیا ہے! یہ ہے جو انھوں نے میرے ساتھ کیا ہے!'' رستوپ چن نے سوچا۔ اس کی روح میں غصے کا ایسا طوفان، جس پر قابو پانا اس کے لیے ناممکن تھا، موج زن ہو رہا تھا۔ یہ غصہ کسی ایسے شخص کے، جس پر، جو کچھ ہو رہا تھا، اس کا الزام دھرا جا سکے، خلاف تھا۔ جیسا کہ گرم مزاج لوگوں کے ساتھ اکثر ہوتا ہے، ابھی وہ قربانی کا بکرا، جس پر وہ اپنا عتاب نازل کر سکتا، تلاش کر رہا تھا، وہ خود ہی اپنے غصے میں جل بھن کر کباب ہونے لگا۔ ''ہونہہ، تو یہ آ گئے۔ کمینوں، رذیلوں کی بھیڑ، معاشرے کی تلچھٹ!'' وہ ہجوم پر نگاہیں جمائے سوچ رہا تھا۔ ''اجڈ، گنوار، رذیل، اپنی کم عقلی کے سبب خواہ مخواہ

مشتعل ہورہے ہیں۔ انھیں قربانی کا بکرا چاہیے۔'' اس نے لانبے شخص کو بازو لہراتے ہوئے دیکھ کر سوچا۔ اور یہ خیال اس لیے اس کے ذہن میں آیا کیونکہ وہ خود کسی قربانی کے بکرے کی، جس پر وہ اپنا غصہ جھاڑ سکتا، تلاش میں تھا۔

''گاڑی تیار ہوگئی؟'' اس نے دوبارہ پوچھا۔

''جی ہاں، یور ایکسی لینسی۔ ویریش چاگن کے بارے میں آپ کا کیا حکم ہے؟ وہ پورچ میں انتظار کر رہا ہے۔'' ایجوٹنٹ نے کہا۔

''آہا!'' رستوپ چن نے یوں کہا جیسے اسے اچانک کچھ یاد آ گیا ہو۔

اس نے شتابی سے دروازہ کھولا اور پر عزم قدم اٹھاتا بالکنی میں آ گیا۔ ایکا ایکی باتوں کی بھنبھناہٹ ختم ہو گئی، ٹوپیاں اور ہیٹ اتر گئے اور تمام نگاہیں کاؤنٹ کی جانب اٹھ گئیں۔

''جوانو! آداب عرض!'' کاؤنٹ نے چست اور بلند لہجے سے کہا۔ ''آپ کی تشریف آوری کا شکریہ۔ میں ابھی آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں، لیکن پہلے ذرا ایک شرپسند سے نپٹ لیں۔ ہمیں اس پاجی کو، جو ماسکو کی اس بربادی کا ذمے دار ہے، سزا دینا ہوگی۔ آپ میرا انتظار کریں!''

کاؤنٹ نے کھٹاک سے دروازہ بند کیا اور پہلے کی طرح تیز تیز قدم اٹھاتا کمرے میں واپس چلا گیا۔

ہجوم اطمینان اور پسندیدگی کی فضا میں کھسر پھسر کرنے لگا۔

''دیکھتے جاؤ، وہ ان سب بدمعاشوں سے نپٹ لے گا!... تم کہتے تھے کہ فرانسیسی ...وہ سب کھرا کھوٹا ہمیں دکھا دے گا۔'' ہجوم میں شامل لوگ کہہ رہے تھے جیسے وہ اعتبار کے فقدان کے لیے ایک دوسرے کو لعنت ملامت کر رہے ہوں۔

چند منٹ بعد ایک افسر تیز تیز چلتا سامنے کے دروازے میں سے باہر آیا، اس نے حکم دیا اور گھوڑسواروں نے صفیں بنالیں۔ ہجوم بالکنی سے پیچھے ہٹ آیا اور پورچ کی طرف بڑھنے لگا۔ رستوپ چن غصیلے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا پورچ کی جانب آ رہا تھا۔ وہ اپنے گردوپیش یوں نظریں گھما پھرا رہا تھا جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا ہو۔

''کہاں ہے وہ؟'' اس نے آگ بگولا ہو کر پوچھا۔ ابھی یہ الفاظ اس کے منہ سے نکلے ہی تھے کہ اس کی نگاہ ایک نوجوان شخص پر پڑی۔ یہ شخص دو گھوڑسواروں کے مابین مکان کے کونے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کی گردن پتلی تھی اور اس کا نصف سر، جسے مونڈ دیا گیا تھا، چھوٹے چھوٹے بالوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ وہ پھٹا پرانا نیلا کوٹ، جس کے اندر لومڑ کی کھال کا استر لگا ہوا تھا اور جو کسی زمانے میں بہت نفیس اور شاندار ہوگا، پہنے ہوئے تھا۔ اس کی غلیظ پتلون موٹے اور کھردرے کپڑے کی بنی ہوئی تھی اور یہ وہی تھی جو عام طور پر سزا یافتہ مجرموں کو پہنائی جاتی تھی۔ اس نے یہ پتلون اپنے پتلے اور بے پالش جوتوں میں، جن کی ایڑیاں گھس چکی تھیں، اڑس رکھی تھی۔ اس کی لاغر اور کمزور ٹانگوں میں بھاری بیڑیاں تھیں۔ اس سے اس کے لیے صحیح انداز سے قدم اٹھانا دشوار ہو رہا تھا اور اس کا جہاں پاؤں پڑتا، وہ اسے وہیں رکھتا چلا آ رہا تھا۔

''آہا!'' رستوپ چن نے عجلت سے اس نوجوان سے نظریں پرے ہٹاتے اور پورچ کے زینے کے نچلے حصے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ''اسے وہاں کھڑا کردو!''

اپنی بیڑیاں جھنجھناتا نوجوان بدقت ادھر بڑھا جدھر اشارہ کیا گیا تھا۔ اس نے دو مرتبہ اپنی لانبی گردن دائیں بائیں گھمائی، ایک انگلی سے کوٹ کا تنگ کالر، جو اس کا گلا چھیل رہا تھا، سیدھا کیا۔ پھر اس نے گہری آہ بھری، ہاتھوں سے یوں اشارہ کیا جیسے وہ اپنی قسمت پر قانع ہو۔ اس کے ہاتھ اتنے نرم و نازک تھے کہ وہ کسی مزدور کے نہیں ہوسکتے تھے۔ اس نے انھیں ایک دوسرے کے اوپر پیٹ پر رکھ لیا۔

نوجوان کو سیڑھیوں پر کھڑا ہونے میں چند سیکنڈ لگے۔ اس دوران میں مکمل سکوت طاری رہا۔ مجمع کے صرف عقبی حصے میں، جہاں ایک ہی جگہ لوگ آگے آنے کے لیے دھکم پیل کر رہے تھے، آہوں، کراہوں اور غراہٹوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

رستوپ چن ناک بھوں چڑھائے اپنے ہاتھ سے اپنا چہرہ مسل رہا تھا اور نوجوان کے سیڑھیوں پر پہنچنے کا انتظار کر رہا تھا۔

''دوستو!'' اس نے کھنکھناتی آواز میں کہا۔ ''یہ شخص — ویریش چاگن — وہ بدمعاش ہے جو ماسکو کی تباہی کا ذمے دار ہے!''

سموری استر کے کوٹ میں ملبوس نوجوان اطاعت شعارانہ انداز سے سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ ایک دوسرے کے اوپر پیٹ پر رکھے ہوئے تھے۔ اس کا جسم قدرے خمیدہ تھا۔ اس کا بے حد دبلا پتلا اور فاقہ زدہ نوجوان چہرہ، جس کی نصف مُنڈے ہوئے سر نے شکل بگاڑ دی تھی اور جس پر یاس کی پرچھائیاں چھائی ہوئی تھیں، نیچے ڈھلکا ہوا تھا۔ کاؤنٹ کے اولین الفاظ پر اس نے اپنا سر آہستہ آہستہ اوپر اٹھایا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہو یا کم از کم اس سے نظریں ملانا چاہتا ہو، لیکن رستوپ چن نے اس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ نوجوان کے کان کے پیچھے ایک نیلی وریدہ پھولی اور اس کی لانبی اور دبلی گردن پر رسی کی طرح نظر آنے لگی، اور ایکا ایکی اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

تمام نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس نے ہجوم پر نظر دوڑائی اور اسے ان کے چہروں پر جو تاثرات دکھائی دیے، جیسے ان سے اس کی ہمت بندھ گئی ہو، وہ ڈراتے جھجکتے اداسی سے مسکرایا، پھر اس نے اپنا سر دوبارہ جھکا لیا اور اپنی بے چینی کو چھپانے کے لیے سیڑھیوں پر اپنے پاؤں آگے پیچھے گھسیٹنے لگا۔

''اس نے اپنے زار اور اپنے وطن سے غداری کی ہے۔ یہ بونا پارت سے ملا ہوا ہے۔ تمام روسیوں میں یہ واحد شخص ہے جس نے روس کے نام پر بٹا لگایا ہے اور صرف اسی کی وجہ سے ماسکو تباہی کے غار میں گر رہا ہے۔'' رستوپ چن نے تیکھے اور پرسکون لہجے میں کہا۔ اچانک اس نے ویریش چاگن کو، جو حسب سابق عجز و انکسار کی تصویر بنا کھڑا تھا، سرسری نگاہوں سے دیکھا اور جو کچھ اسے نظر آیا، اس نے جیسے اس پر جنون طاری کر دیا ہو، اس نے اپنا بازو فضا میں بلند کیا اور تقریباً چیختے ہوئے لوگوں سے بولا: ''اس سے جیسے مناسب سمجھیں، سلوک کریں! میں اسے

آپ کے حوالے کرتا ہوں!''

لوگ خاموش رہے۔ وہ محض دھکم پیل کرتے ایک دوسرے کے قریب سے قریب تر ہونے لگے۔ دھکوں کا دباؤ ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ اس ''گل گھوٹو'' اور مضرت رساں فضا میں سانس لینا، آگے یا پیچھے حرکت کرنا اور اس دوران میں کسی ان جانی، مبہم اور مہیب چیز کے وقوع پذیر ہونے کی توقع کرنا، یہ سب کچھ اذیت ناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لوگ، جو سب سے آگے کھڑے تھے، انھوں نے، جو کچھ ان کے سامنے ہو رہا تھا، دیکھا اور سنا تھا، وہ تمام کے تمام آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے، تک دیدم دم نہ کشیدم کی تصویر بنے کھڑے تھے۔ ان کی پوری کوشش یہ تھی کہ ان پر پیچھے سے جو دباؤ پڑ رہا ہے، وہ اس کے سامنے ڈٹے رہیں اور اپنی جگہوں پر کھڑے رہیں۔

''مار مار کر اس کا کچومر نکال دو... اس غدار کا نام و نشان تک مٹا دو، اسے اتنا موقع نہ دو کہ یہ روس کے نام پر بٹا لگا سکے!'' رستوپ چن نے چلا کر کہا۔ ''اس کی بوٹی بوٹی کر دو! یہ میرا حکم ہے!''

ہجوم نے رستوپ چن کے اصل الفاظ پر اتنا دھیان نہ دیا جتنا کہ اس کے غضب ناک لہجے پر۔ لوگ کراہے، آہیں بھرتے آگے بڑھے لیکن پھر رک گئے۔

''کاؤنٹ!...'' ویریش چاگن کی ڈری سہمی لیکن ڈرامائی آواز نے اس وقتی سکوت کو توڑ دیا۔ ''کاؤنٹ! ہم دونوں کے اوپر ایک خدا ہے...''

اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور ایک بار پھر اس کی پتلی گردن پر درید میں خون بھر گیا اور وہ پھول گئی۔ اس کے چہرے پر تیزی سے ایک رنگ آنے اور دوسرا جانے لگا۔ وہ جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے ختم نہ کر سکا۔

''اس کی تکا بوٹی کر دو! میں حکم دیتا ہوں!'' رستوپ چن نے دوبارہ گلا پھاڑتے ہوئے کہا۔ اچانک اس کا چہرہ اتنا ہی پیلا پڑ گیا جتنا کہ ویریش چاگن کا تھا۔

''تلواریں نکال لو!'' گھوڑ سواروں کے افسر نے اپنی شمشیر سونتتے ہوئے حکم دیا۔

ہجوم میں کھڑے لوگوں کو ایک بار پھر زور زور سے دھکے پڑنے لگے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ لوگ، جو آگے کھڑے تھے، اب وہ تاب مقاومت نہ لا سکے اور لڑکھڑاتے گرتے پڑتے آگے کھسکنے لگے، جہاں تک کہ وہ برج کے زینے کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ لانبا نوجوان چہرہ پتھریلا بنائے اور بازو کو سیدھا اوپر اٹھائے اب ویریش چاگن کے قریب کھڑا تھا۔

''اس پر تلواریں چلا دو!'' گھوڑ سواروں کا افسر پھنکارا۔

اور ایک فوجی جوان نے، جس کا آتش غضب سے چہرہ بگڑ گیا تھا، اپنی شمشیر کے کند سرے سے ویریش چاگن کے سر پر ضرب لگائی۔

''ہائے!'' حیرت واستعجاب سے ویریش چاگن کی گھٹی گھٹی چیخ نکل گئی۔ وہ دہشت کے عالم میں اپنے گرد و پیش نظریں دوڑانے لگا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیوں کیا گیا ہے۔

استعجاب و دہشت کی ایسی ہی کراہ ہجوم میں گردش کرنے لگی۔

''یا خداوند!'' کسی کی ملول آواز سنائی دی۔

ویریش چاگن کے منہ سے حیرت و استعجاب کی جو پکار نکلی تھی، (اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا)، اس کے بعد اس نے درد کی تاب نہ لا کر دلدوز چیخ بلند کی اور یہی چیخ اسے لے ڈوبی۔ انسانی جذبات پر، جواب تک ہجوم کی راہ میں دیوار بنے ہوئے تھے، اتنا دباؤ پڑا کہ ان پر قابو رکھنا ناممکن ہوگیا۔ اچانک بند ٹوٹ گیا۔ جب ایک دفعہ جرم کا آغاز ہوگیا، اس کا تکمیل تک پہنچنا ناگزیر تھا۔ لعنت ملامت کی دل خراش کراہیں ہجوم کے غضب ناک اور مجنونانہ شور وغل میں غرق ہوگئیں۔ ساتویں اور آخری طوفانی موج کی طرح، جو جہاز کو پرزے پرزے کر دیتی ہے، بھیڑ کے عقب سے جو آخری اور ناقابل مقاومت لہر ابھری، جو بھی اس کے سامنے آیا اسے اپنے ساتھ بہا کر لے گئی اور سب اس کی لپیٹ میں آگئے۔

گھوڑ سوار ایک اور ضرب لگانے کی تیاری کر رہا تھا کہ ویریش چاگن خوف و دہشت سے چیختے چلاتے اور اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپتے ہجوم کی طرف بھاگ اٹھا۔ لمبوترے نوجوان نے، جس کے ساتھ وہ جا ٹکرایا تھا، اس کی مہین گردن کو اپنی گرفت میں لے لیا اور وحشیانہ انداز سے چیختا چلاتا دھکم پیل کرتے ہجوم کے، جس پر جنون طاری ہو چکا تھا، نیچے گر پڑا۔

بعض لوگ ویریش چاگن اور دوسرے لمبوترے نوجوان کو پیٹنے اور ان کے بخیے ادھیڑنے لگے۔ وہ لوگ، جو پاؤں تلے کچلے جا رہے تھے، اور جو محض لانبے نوجوان کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے، چیخ پکار کرنے لگے، لیکن اس چیخ پکار کا صرف ایک ہی نتیجہ برآمد ہوا کہ ہجوم کی دیوانگی میں مزید اضافہ ہوگیا۔ خاصا وقت گزر جانے کے بعد ہی گھوڑ سوار کارخانے کے لہولہان اور نیم مردہ مزدور کو چھڑانے میں کامیاب ہوسکے۔ ہجوم نے جس کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اگرچہ وہ اسے بلاتاخیر انجام تک پہنچانے کے لیے مضطربانہ تگ و دو کر رہا تھا، مگر ان لوگوں کو، جو ویریش چاگن کو گھونسے اور ٹھڈے مار رہے تھے، اس کا گلا گھونٹ رہے تھے اور اس کے جسم کا قیمہ بنانے میں مصروف تھے، اسے موت کے منہ میں دھکیلنے میں خاصا وقت صرف کرنا پڑا۔ ان پر چاروں اطراف سے دباؤ پڑ رہا تھا۔ اس دباؤ کی تاب نہ لا کر وہ بیچ میں جھولنے لگتے اور یوں ان کے لیے اسے ہلاک کرنا یا زندہ چھوڑ دینا ناممکن ہو جاتا۔

''کیوں نہ اس پر کلہاڑی کا وار کیا جائے؟... اس کا کچومر نکال دو... غدار، حرام زادے نے یسوع کو بیچ دیا!... ابھی سانس لے رہا ہے... ڈھیٹ ہڈی ہے... اپنے کیے کی سزا پا رہا ہے... کلہاڑی چلا کر دیکھو!... ابھی مرا نہیں؟''

صرف تب جب نخچیر نے ہاتھ پاؤں مارنا ترک کر دیا، اس کی ہائے وائے بند ہوگئی اور موت کی طویل اور نپی تلی کھڑ کھڑاہٹ شروع ہوگئی، ہجوم میں شامل لوگ، جو منہ کے بل پڑی لہولہان لاش کے گرد حصار بنائے ہوئے تھے، تیزی سے ادھر ادھر ہٹنے لگے۔ ہر شخص باری باری اس کے قریب جاتا، جو کچھ کیا گیا تھا، اسے دیکھتا، خوف و دہشت سے مغلوب ہو جاتا، کانوں کو ہاتھ لگاتا، توبہ توبہ کرتا، ہکا بکا دوسروں کو دھکیلتا اور پیچھے ہٹ جاتا۔

''یا خداوند! یہ لوگ نرے درندے ہیں! وہ بچ کیسے سکتا تھا!'' ہجوم میں باتیں ہو رہی تھیں۔ ''ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی، مسیں بھی نہیں بھیگی ہوں گی! ضرور کسی تاجر کا لخت جگر ہوگا۔ کس قسم کے لوگ ہیں یہ!... سنا ہے کہ یہ اصل آدمی تھا بھی نہیں... کیا مطلب کہ اصل آدمی نہیں تھا؟... اف، خداوند!... گناہوں سے قطعاً نہیں ڈرتے...'' وہی لوگ اب کف افسوس مل رہے تھے اور لاش پر، جس کی مہین گردن تقریباً نیم بریدہ، چہرہ نیلا اور خون و خاک سے آلودہ تھا اور جوان کی نگاہوں کے سامنے پڑی تھی، ترس کھا رہے تھے۔

ایک محنتی اور فرض شناس پولیس افسر نے، یہ سمجھتے ہوئے کہ ہز ایکسی لینسی کے احاطے میں لاش کی موجودگی نازیبا ہے، گھوڑسواروں کو حکم دیا کہ وہ اسے گھسیٹ کر گلی میں لے جائیں۔ زرہ بکتر سے لیس دو گھوڑسواروں نے زخموں سے چور اور مسخ شدہ ٹانگیں پکڑیں اور لاش کو زمین پر گھسیٹنے لگے۔ لمبی گردن پر خون اور کیچڑ میں لتھڑے ہوئے نیم منڈے سر کا رخ، جب وہ زمین پر گھسٹ رہا تھا، کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف ہو جاتا۔ لاش کو دیکھ کر ہجوم دبکنے اور پیچھے ہٹنے لگا۔

جب ویریش چاگن نیچے گرا اور ہجوم وحشیانہ انداز سے چیختا چلاتا اس پر پل پڑا، رستوپ چن کا رنگ یک دم فق ہو گیا، کاٹو تو بدن میں لہو نہیں، بجائے اس کے کہ وہ عقبی دروازے کی طرف جاتا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی، وہ لمبے لمبے قدم اٹھاتا غلام گردش میں، جو زیریں منزل کے کمروں کی جانب جاتی تھی، چلنے لگا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا اور اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیوں۔ کاؤنٹ کا چہرہ زرد ہو چکا تھا اور اس کا نچلا جبڑا مضطربانہ انداز سے جس طرح پھڑک رہا تھا، اس کے لیے اس پر قابو پانا ممکن نہیں رہا تھا۔

''یور ایکسی لینسی، اس طرف... آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں؟ حضور، اس طرف...'' اس کے عقب میں کوئی ڈری سہمی اور کپکپاتی آواز کہہ رہی تھی۔

کاؤنٹ رستوپ چن میں جواب دینے کی ہمت نہیں تھی۔ اس کی کالاش عقبی دروازے کے قریب کھڑی تھی۔ ہجوم کی چیخ پکار، جو دور سے آ رہی تھی، وہاں بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ عجلت سے گاڑی میں بیٹھ گیا اور کوچوان سے کہنے لگا کہ وہ اسے ساکول نکی میں اس کے دیہی مکان پر لے چلے۔

جب وہ میاس نتسکایا سٹریٹ میں داخل ہوئے اور ہجوم کے شور و غل کی آوازیں آنا بند ہو گئیں، کاؤنٹ کو پشیمانی نے آگھیرا۔ اپنے ماتحتوں کے سامنے اس نے جس گھبراہٹ اور خوف کا مظاہرہ کیا تھا، وہ اسے یاد آنے لگا اور وہ اس پر عدم اطمینان کا اظہار کرنے لگا۔ یہ hoi polloi• بہت خوفناک۔ بہت نفرت انگیز ہیں۔'' اس نے فرانسیسی میں اپنے آپ سے کہا۔ ''بھیڑیوں کی طرح ان کی تشفی بھی صرف ماس سے ہو سکتی ہے...'' ''کاؤنٹ، ہم دونوں کے اوپر ایک خدا ہے۔'... اچانک ویریش چاگن کے یہ الفاظ اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ اسے جھرجھری آ گئی اور اس کی طبیعت مکدر ہو گئی۔ لیکن یہ کیفیت محض عارضی تھی اور کاؤنٹ رستوپ چن حقارت سے اپنے اوپر مسکرا دیا۔ ''مجھے

• چھوٹی امت۔ للو پنجو

دوسری ذمے داریاں نبھانا تھیں، ہجوم کو ٹھنڈا کرنا تھا۔ فلاح عام کے لیے کئی دیگر اشخاص مٹ چکے ہیں اور مٹ رہے ہیں۔'' اور وہ ان سماجی فرائض کے متعلق سوچنے لگا جو اس کے خاندان کی، اس شہر کی، جو اس کی تحویل میں دیا گیا تھا، اور خود اس کی ذات کی طرف سے اس پر عائد ہوتے تھے۔ جب اس نے اپنی ذات کا تصور کیا، تو اس نے اپنی آپ کو فیودر واسیلی وچ رستوپ چن نہیں گردانا (اس نے اس بات کو پتھر کی لکیر سمجھ لیا تھا کہ فیودر واسیلی وچ رستوپ چن اپنے آپ کو* le bien public کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔)، بلکہ ماسکو کا گورنر جنرل، حاکم مجاز کا نمائندہ خیال کیا جسے زار نے اختیارات کلی تفویض کیے تھے۔ ''اگر میں خالی خولی فیودر واسیلی وچ ہوتا، پھر میرا طریق کار مختلف ہوتا لیکن گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنی زندگی اور وقار کا تحفظ کرنا میرا فرض بنتا تھا۔''

اب جب کہ ہجوم کی لرزہ خیز چیخیں اس کے کانوں سے ٹکرانا بند ہو گئی تھیں، اپنی گاڑی کے لچکیلے سپرنگوں پر ہلکے پھلکے انداز سے جھولتے جھلاتے رستوپ چن جسمانی طور پر پرسکون ہو گیا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، جسمانی تسکین دماغ کو ایسے عقلی دلائل، جو ضمیر کو مطمئن کر سکیں، ڈھونڈنے پر اکساتی ہے۔ رستوپ چن کو جس خیال نے اطمینان فراہم کیا، وہ کوئی نیا نہیں تھا۔ جب سے یہ عالم رنگ و بو وجود میں آیا ہے اور انسانوں نے ایک دوسرے کے گلے کاٹنے کے کام کا آغاز کیا ہے، جس کسی نے بھی اس قسم کے جرم کا ارتکاب کیا ہے، اس نے سدا اسی خیال میں — 'le bien public' دوسرے لوگوں کی مفروضہ بھلائی — پناہ ڈھونڈی ہے۔

وہ شخص، جو شدید جذبات کی رو میں بہہ کر کوئی قدم نہیں اٹھاتا، اسے کبھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ بھلائی ہے کیا۔ لیکن وہ شخص، جس نے کسی جرم کا ارتکاب کیا ہوتا ہے، اسے ہمیشہ پورا یقین ہوتا ہے کہ یہ بھلائی کہاں ہے۔ اور رستوپ چن کو اب اس کا علم ہو چکا تھا۔

وہ جس فعل کا مرتکب ہوا تھا، اس کے متعلق سوچ بچار کرنے کے دوران میں اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنا تو دور کی بات ہے، وہ الٹا اطمینان قلب محسوس کرنے لگا کہ اس نے مجرم کو سزا دینے اور ہجوم کو ٹھنڈا کرنے کے اس موقع سے کامیابی سے فائدہ اٹھایا۔

''ویریش چاگن پر مقدمہ چلایا گیا تھا اور اسے سزائے موت سنائی گئی تھی۔'' رستوپ چن نے سوچا (حالانکہ سینیٹ نے اسے محض قید با مشقت کی سزا دی تھی)۔ ''وہ جاسوس اور غدار تھا۔ جب تک اسے سزا نہ مل جاتی، میں اسے چھوڑ نہیں سکتا تھا۔ اور یوں میں نے ایک تیر سے دو شکار کر لیے: میں نے ہجوم کو شکار پیش کر کے ٹھنڈا کر دیا اور مفسد کو اس کے اپنے کیے کی سزا دے دی۔''

اپنے دیہی مکان پر پہنچ کر کاؤنٹ اپنے گھریلو کاموں میں مصروف ہو گیا اور اس کا سکون قلب پوری طرح لوٹ آیا۔

آدھ گھنٹے بعد وہ ساکول نکی کے میدان میں برق رفتاری سے اپنی گاڑی دوڑا رہا تھا۔ اس کا ذہن سابقہ

---

* عوامی فلاح و بہبود

واقعات کے بارے میں قطعاً نہیں سوچ رہا تھا بلکہ اب اس کی توجہ مستقبل اور آئندہ واقعات پر مرکوز تھی۔ اس کی منزل یاؤزا پل تھا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ کوتوزوف وہیں کہیں ملے گا۔ کاؤنٹ رستوپ چن اپنے ذہن میں ان جلی کٹی اور طعن و تشنیع سے بھرپور باتوں کی ریہرسل کر رہا تھا جو وہ کوتوزوف کو سنانا چاہتا تھا کیونکہ اس نے اسے فریب دیا تھا۔ وہ اس شاطر و عیار بوڑھے درباری کو محسوس کرا دے گا کہ دارالسلطنت کو اس کے حال پر چھوڑ دینے سے مصائب کا جو پہاڑ ٹوٹے گا اور روس کو جس کامل تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا (جیسا کہ رستوپ چن کا اس بارے میں خیال تھا)، اس کی تمام تر ذمے داری اس کے پیرانہ کندھوں پر ہوگی۔ وہ کوتوزوف سے جو کچھ کہنا چاہتا تھا، اس کے بارے میں پیشگی سوچتے ہوئے وہ گاڑی میں اپنی نشست پر بیٹھا شدتِ جذبات سے اتنا مغلوب ہوا کہ بل کھانے اور خشم ناک نگاہوں سے اپنے چاروں اطراف دیکھنے لگا۔

ساکول نکی کے میدان پر ہو کا عالم طاری تھا۔ صرف ایک کونے میں محتاج گھر اور پاگل خانے کے سامنے سفید لباس پہنے لوگوں کی ٹولیاں نظر آ رہی تھیں جب کہ ان سے مشابہ چند دیگر اشخاص شور و غل کرتے اور زور زور سے بازو اور ہاتھ لہراتے اکیلے دکیلے بے مقصد ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔

ان میں سے ایک سیدھا اس سڑک کی جانب، جس پر کاؤنٹ رستوپ چن کی گاڑی جا رہی تھی، بھاگا آ رہا تھا۔ ان پاگلوں کو، جنھیں کھلا چھوڑ دیا گیا تھا، خاص طور پر اس شخص کو، جو ان کی طرف دوڑا آ رہا تھا، کاؤنٹ، اس کا کوچوان اور اس کے محافظ مسلح سوار تشویش اور تجسس کے ملے جلے مبہم احساس سے دیکھنے لگے۔

اس کی لانبی اور دبلی پتلی ٹانگیں، جتنا تیز دوڑ سکتی تھیں، افتاں و خیزاں اتنا تیز دوڑتا اور اپنا ڈریسنگ گاؤن پھڑپھڑاتا، اپنی نگاہیں رستوپ چن پر جمائے، وہ کرخت آواز میں چلاّ اور اسے رکنے کے اشارے کر رہا تھا۔ پاگل کے گمبھیر اور شدت جذبات سے مغلوب چہرے پر، جس پر یہاں وہاں داڑھی کے بالوں کے اونچے نیچے گچھے تھے، وحشت برس رہی اور زردی کھنڈ رہی تھی۔ اس کی سیاہ بلوری آنکھیں، جن کی سفیدی زعفران کی طرح نارنگی تھی، دیوانگی سے گھوم رہی تھیں۔

"میں کہتا ہوں، ٹھہرو! رکو!" کانوں کے پردے پھاڑ دینے والی آواز بلند ہوئی اور وہ ایک بار پھر ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کرتا تاکیدی لہجے میں چیخنے چلانے لگا۔ اس کا دم پھول رہا تھا۔

وہ کالاش کے قریب پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا۔

"وہ تین مرتبہ مجھے قتل کر چکے ہیں اور تین مرتبہ میں مُردوں کی دنیا کی سے واپس آیا ہوں۔ انھوں نے مجھے سنگسار کیا، مجھے صلیب پر چڑھایا... میں پھر زندہ ہو جاؤں گا... میں پھر زندہ ہو جاؤں گا... انھوں نے میرا جسم تکا بوٹی کر دیا ہے... مملکت خداوند زیروزبر ہو جائے گی... میں تین مرتبہ اسے ملیامیٹ کر دوں گا اور تین مرتبہ اس کی تعمیر نو کروں گا۔" وہ چلاّ چلاّ کر کہہ رہا تھا۔ اس کی آواز کرخت سے کرخت تر ہوتی جا رہی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے کاؤنٹ رستوپ چن کا رنگ بعینہٖ اسی طرح فق ہو گیا جس طرح اس وقت ہوا تھا جب ہجوم

نے وریش چاگن پر چڑھائی کردی تھی۔ اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

''تیز چلو۔ اور تے۔ زا!'' اس نے لڑکھڑاتی آواز میں کوچوان سے کہا۔

گاڑی میدان میں سرپٹ بھاگنے لگی لیکن کاؤنٹ رستوپ چن کو دور فاصلے سے جنونی اور یاس انگیز چیخیں سنائی دیتی رہیں جب کہ اسے اپنے سامنے موٹے جھوٹے اون کے کوٹ میں ملبوس ''غدار'' کے متعجب، دہشت زدہ اور خون چکاں چہرے کے سوا اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

اگرچہ یہ ذہنی تصویر حال کی چیز تھی لیکن رستوپ چن کو اب محسوس ہوا کہ اس کے نقوش اس کے قلب پر بہت گہرے کندہ ہیں۔ اس پر یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی کہ وقت اس یاد کے خونی نقوش کبھی نہیں دھندلا سکے گا بلکہ اس کے برعکس وہ جتنا زیادہ عرصہ زندہ رہے گا، اتنے ہی زیادہ سفاکانہ اور منتقمانہ انداز سے یہ اس کے دل کو چھلنی کرتی رہے گی۔ اسے ابھی تک یہی محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اپنے الفاظ ''اس کی تکا بوٹی کردو! میں حکم دیتا ہوں!'' کی آواز اس کے کانوں میں گونج رہی ہے۔

''میں نے یہ الفاظ منہ سے کیوں نکالے؟ وہ ناگہاں کسی نہ کسی طرح ادا ہوگئے۔ مجھے انھیں کہنا نہیں چاہیے تھا۔'' اس نے سوچا۔ ''پھر کچھ بھی وقوع پذیر نہ ہوتا۔'' جس مسلح سوار نے پہلی ضرب رسید کی تھی، اسے اس کا چہرہ نظر آیا۔ ابتداً اس چہرے پر خوف و ہراس ہویدا تھا، پھر یہ اچانک خون آشام ہوگیا۔ سمور کے استر سے مزین کوٹ پہنے نوجوان کے خدوخال پر جو ساکت اور ڈری سہمی ملامت نمودار ہوئی تھی، وہ بھی اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ ''لیکن میں نے جو کچھ کیا، اپنی مرضی سے نہیں کیا، مجھے یہ مجبوراً کرنا پڑا، میرے لیے اور کوئی چارۂ کاری نہیں تھا.... ہجوم، غدار... فلاحِ عامہ...'' وہ سوچ رہا تھا۔

❖

فوج ابھی تک یاؤزا پل پر ہجوم کیے ہوئے تھے۔ دن گرم تھا۔ چیں بہ جبیں اور آزردہ کوتوزوف پل کے قریب بینچ پر بیٹھا تھا اور اپنے چھانٹے سے ریت پر لکیریں بنا رہا تھا کہ ایک کالاش کھڑکھڑاتی اور شوروغل کرتی تیزی سے اس کے پاس آئی۔ ایک شخص جرنیل کی وردی پہنے اور اپنی ٹوپی پر کلغی سجائے کوتوزوف کے قریب پہنچا۔ اس کی آنکھیں، جن میں کبھی غصہ اور کبھی خوف جھلکنے لگتا، بے چینی سے آگے پیچھے گھوم رہی تھیں۔ اس نے فرانسیسی میں اس سے کچھ کہا۔ یہ شخص کاؤنٹ رستوپ چن تھا۔ اس نے کوتوزوف کو بتایا کہ ملک کا دارالسلطنت ماسکو ناپید ہو چکا ہے اور وہاں فوج کے علاوہ اور کچھ باقی نہیں رہا۔

''اگر یور ہائی نس نے مجھے یہ یقین نہ دلایا ہوتا کہ آپ ماسکو سے لڑائی کے بغیر دست بردار نہیں ہوں گے، تو حالات مختلف ہوتے اور یہ سب کچھ وقوع پذیر نہ ہوتا۔''

کوتوزوف نے رستوپ چن کی طرف یوں دیکھا جیسے، وہ جو کچھ اس سے کہا گیا تھا، اس کا مفہوم سمجھ نہ سکا ہو

اور وہ اس خاص مفہوم کو جو اس وقت اس شخص کے، جو اس سے مخاطب ہوا تھا، چہرے پر لکھا ہوا تھا، پڑھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہو۔ رستوپ چن پراگندہ ذہن ہو گیا اور اس نے خاموشی اختیار کر لی۔ کوتوزوف کی تجسس نگاہیں ابھی تک رستوپ چن کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنے سر کو ہلکی سی جنبش دی اور دھیمی آواز میں بولا:

''نہیں، میں ماسکو سے لڑائی کیے بغیر دست بردار نہیں ہوں گا۔''

کوتوزوف نے جب یہ الفاظ کہے، کیا وہ کسی بالکل ہی مختلف چیز کے بارے میں سوچ رہا تھا یا یہ جانتے ہوئے کہ یہ بے معنی ہیں، اس نے جان بوجھ کر کہے تھے، بہر حال رستوپ چن نے کوئی جواب نہ دیا اور وہ شتابی سے پیچھے ہٹ گیا۔ اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ بات تھی کہ ماسکو کے گورنر جنرل، کاؤنٹ رستوپ چن، نے قازقوں کا چھانٹا اٹھایا، پل کی طرف بڑھا اور جن گاڑیوں نے وہاں راستہ روک رکھا تھا، ان کے مابین چیختا چلاتا اپنی گاڑی ہانکنے لگا۔

26

کوئی چار بجے سہ پہر موغا کے دستے ماسکو میں داخل ہونے لگے۔ سب سے آگے ورٹم برگ کے ہوزاروں کا دستہ تھا۔ ان کے پیچھے پیچھے شاہ نیپلز بنفس نفیس آ رہا تھا۔ اس کے ساتھ ایجوٹنٹوں کی فوج ظفر موج تھی۔

موغا آرباط سنٹر کے قریب، جو کراماتی سینٹ نکولا[33] کے گرجے سے زیادہ دور نہیں، رک گیا اور ہراول دستے نے شہر کے ''قلعے'' 'la Kremlin'[34] کو جس حالت میں پایا تھا، اس کے متعلق اس کی رپورٹ کا انتظار کرنے لگا۔

شہر کے باسیوں کی، جنھیں ماسکو میں چھوڑ دیا گیا تھا، ایک ٹولی موغا کے گرد اکٹھی ہو گئی۔ وہ اس لمبے بالوں والے اجنبی کمانڈر کو، جو طلائی تمغوں اور پروں سے لدا پھندا تھا، ڈرتے شرماتے، نگاہیں گاڑے، حیرت و تحیر سے دیکھ رہے تھے۔

''میں پوچھتا ہوں، یہ ان کا زار ہے؟... برا تو نہیں؟'' لوگ دھیمی آوازوں میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے۔

ایک ترجمان نے ایک معمر قلی سے پوچھا کہ کریملن زیادہ دور تو نہیں۔ قلی کو ایک توانا مانوس پولستانی لہجے نے چکرا دیا، دوسرے اسے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ترجمان روسی بول رہا ہے۔ چنانچہ قلی مطلق سمجھ نہ سکا کہ اس سے کیا کہا جا رہا ہے اور وہ دوسروں کے پیچھے جا چھپا۔

موغا، جو گھوڑے پر سوار تھا، ترجمان کے قریب آیا اور اس سے کہنے لگا: ''ان سے پوچھو کہ روسی فوج کہاں ہے۔'' ایک روسی سمجھ گیا کہ ان سے کیا پوچھا جا رہا ہے اور متعدد آوازیں بیک وقت جواب دینے لگیں۔ ہراول دستے کا ایک افسر گھوڑا دوڑاتا موغا کے پاس آیا اور اس نے اسے بتایا کہ قلعے کے دروازوں میں رکاوٹیں کھڑی ہیں اور غالباً فوج وہاں گھات میں بیٹھی ہے۔

''اچھا!'' موغا نے کہا۔ پھر وہ اپنے ایک ایجوٹنٹ کی طرف متوجہ ہوا اور اسے حکم دیا کہ دروازوں پر گولہ باری کرنے کے لیے چار ہلکی توپیں آگے بھیج دی جائیں۔

فوج کا جو کالم موغا کے پیچھے تھا، اس میں سے توپ خانہ برآمد ہوا اور خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھنے لگا۔ جب وہ آرباط سٹریٹ کے ساتھ ساتھ چلتا وزدویژینکا سٹریٹ کے آخری سرے پر پہنچا، وہ رک گیا اور چوک میں صف بندی کرنے لگا۔ متعدد فرانسیسی افسروں نے اپنی نگرانی میں مختلف جگہوں پر توپیں نصب کرائیں اور دوربینوں سے کریملن کا جائزہ لینے لگے۔

کریملن میں شام کی عبادت کے لیے گھنٹیاں بج رہی تھیں اور گھنٹیوں کی اس آواز نے فرانسیسیوں کو الجھاؤ میں ڈال دیا۔ انھوں نے سمجھا کہ گھنٹیاں اس لیے بجائی جارہی ہیں تاکہ لوگوں کو اطلاع مل جائے اور وہ اپنے اپنے ہتھیار سنبھال لیں۔ پیدل فوج کے چند جوان کتافیا گیٹ کی سمت بھاگے۔ اس کے آرپار شہتیروں اور تختوں کا پردہ تنا ہوا تھا۔ جونہی ایک افسر اپنے چند جوانوں کے ساتھ دروازے کی طرف لپکا، دروازے کے نیچے سے قدیم الوضع دستی بندوق کی دو گولیاں سنسناتی آئیں۔ توپوں کے قریب ایک جرنیل کھڑا تھا۔ اس نے باآواز بلند افسر کو کوئی حکم دیا اور وہ اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ آئے۔

دروازے کی سمت سے تین مزید گولیوں کی آواز سنائی دی۔

ایک گولی ایک فرانسیسی فوجی کی ٹانگ کو چھوتی ہوئی آگے نکل گئی اور رکاوٹ کے عقب سے مختلف لوگوں کے چیخنے چلانے کی عجیب آوازیں سنائی دینے لگیں۔ فرانسیسی جرنیل، افسروں اور جوانوں کے چہروں پر جو پرسکون شگفتگی نمایاں تھی، معاً اس کی جگہ، جیسے انھیں اس کا حکم دیا گیا ہو، عزم وانہماک نے لے لی کہ وہ معرکہ آرائی کرنے اور مصائب برداشت کرنے کے لیے پوری طرح تیار ہیں۔ مارشل سے لے کر معمولی سپاہی تک ان سب کے لیے یہ محض وزدویژینکا یا لکھوایا سڑکیں، کتافیا یا تروئتسکی گیٹ نہیں تھے بلکہ یہ ایک نیا میدان جنگ تھا جہاں لاریب خون کی ندیاں بہہ سکتی تھیں۔ وہ سب لڑائی کے لیے سربکف ہوگئے۔ دروازے کے عقب سے شوروغل کی آوازیں تھم گئیں۔ توپیں آگے بڑھا دی گئیں۔ توپچیوں نے توپوں کے فتیلوں سے راکھ جھاڑی۔ ایک افسر نے فائرنگ کا حکم دیا اور ٹوٹ کر مختلف سمتوں میں بکھر جانے والے دو گولے یکے بعد دیگرے سنسناتے آئے، دروازے کے پتھروں اور شہتیروں اور تختوں پر مشتمل چوبی رکاوٹ سے ٹکرائے، اور چوک کے اوپر دھوئیں کے دو بادل لہریں بنانے لگے۔

پتھریلے کریملن کے اوپر گولے داغے جانے کی صدائے بازگشت کو ختم ہوئے ایک دو سیکنڈ ہی گزرے ہوں گے کہ فرانسیسیوں کو اپنے سروں کے اوپر عجیب وغریب آواز سنائی دی۔ ہزاروں کوے دیواروں سے اڑے اور انھوں نے فضا میں دائرہ بنا لیا۔ وہ قاؤں قاؤں کر رہے اور پرشور انداز سے اپنے پر پھڑپھڑا رہے تھے۔ عین اسی دم دروازے سے اکلوتی انسانی پکار بلند ہوئی اور دھوئیں میں ایک آدمی کی، جس کا سر ننگا اور جس کے جسم پر لمبا دیہاتی کوٹ تھا، شکل دکھائی دی۔ اس نے اپنی دستی بندوق اٹھائی اور فرانسیسیوں پر نشانہ باندھ لیا۔ اسی لمحے افسر نے اپنا

فائرنگ کا حکم پھر دہرایا اور دو توپوں اور ایک دستی بندوق کے داغے جانے کا شور وغل بیک وقت بلند ہوا۔ دروازہ پھر دھوئیں میں چھپ گیا۔

اس کے بعد دروازے کے پیچھے مزید کوئی چیز حرکت کرتی نظر نہ آئی اور فرانسیسی فوج کے پیادہ جوان اور افسر دروازے کی جانب بڑھنے لگے۔ دروازے میں تین زخمی اور چار ہلاک شدگان پڑے تھے۔ دو آدمی دیہاتی کوٹ پہنے دیوار کے ساتھ ساتھ زنامینکا سٹریٹ کی سمت بھاگے جا رہے تھے۔

"انھیں پرے ہٹا دو۔" افسر نے شہتیروں اور لاشوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور فرانسیسی فوجی سپاہیوں نے زخمیوں کو ٹھکانے لگانے کے بعد لاشیں دیوار کے پار پھینک دیں۔

یہ آدمی کون تھے، کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ ان کے متعلق بس یہی کہا گیا: "انھیں پرے ہٹا دو۔" چنانچہ انھیں اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا گیا لیکن بعد میں اٹھا لیا گیا تا کہ وہ گل سڑ کر بدبو نہ دینے لگیں۔ تیغ واحد مورخ ہے جس نے ان کے بارے میں چند خوبصورت الفاظ تحریر کیے ہیں: "قسمت کے مارے، مقدر کے ہیٹے، یہ اشخاص کسی طور مقدس قلعے کے اندر گھس آئے۔ انھوں نے اسلحہ خانے سے بندوقیں اٹھائیں اور فرانسیسیوں پر گولیاں چلا دیں۔ ان میں سے چند ایک کو شمشیروں سے جہنم واصل کر دیا گیا اور کریملن کو ان کے وجود سے پاک کر دیا گیا۔"

موغا کو اطلاع پہنچا دی گئی کہ راستہ صاف کر دیا گیا ہے۔ فرانسیسی دروازوں میں داخل ہو گئے اور سینیٹ (Senate) سکوائر میں خیمے نصب کرنے لگے۔ سپاہی سینیٹ ہاؤس سے کرسیاں باہر پھینکنے اور الاؤ جلانے لگے۔

دوسرے دستے کریملن میں سے گزر کر ماروسیکا، لُب یانکا اور پکروو کا سڑکوں پر خیمے گاڑنے لگے اور چند ایک نے وزدویژینکا، نکولسکایا اور تورسکایا سڑکوں پر ڈیرے ڈال لیے۔ چونکہ کسی بھی گھر کا مالک کہیں دکھائی نہ دیا، اس لیے دستور کے مطابق فوجیوں کو مکینوں کے ساتھ نہ ٹھہرایا گیا بلکہ انھیں خیموں میں ہی رکھا گیا۔

اگرچہ فرانسیسیوں کی حالت پتلی تھی، ان کی وردیاں تار تار ہو رہی تھیں، فاقہ کشی اور تھکاوٹ نے انھیں نڈھال کر دیا تھا، ان کے اجسام میں کوئی خاص جان نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنی اصل تعداد سے صرف ایک تہائی رہ گئے تھے، اس کے باوجود وہ ماسکو میں نظم وضبط سے داخل ہوئے۔ یہ مضمحل اور خستہ حال فوج تھی لیکن اس کے جارحانہ رویے میں کوئی کمی نہیں آئی تھی، یہ اب بھی لڑنے مرنے کے لیے تیار تھی اور اپنے حریفوں کے لیے خطرے کی تلوار بنی ہوئی تھی۔ لیکن یہ فوج صرف اس وقت تک فوج رہی جب تک یہ اپنے مختلف پڑاؤوں میں قیام کے لیے منتشر نہیں ہو گئی۔ جونہی رجمنٹیں مختلف ٹکڑیوں میں بٹیں اور فوجی متموّل لیکن خالی گھروں کے مابین منتشر ہوئے، فوج ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے جاتی رہی اور اس کی جگہ آدھا تیتر اور آدھا بٹیر قسم کی چیز وجود میں آ گئی۔ یہ جن لوگوں پر مشتمل تھی، وہ عام شہری تھے نہ فوجی، بلکہ ان پر جنھیں عرف عام میں قزاق کہا جاتا ہے، کا گمان ہوتا تھا۔ چنانچہ جب پانچ چھ ہفتوں کے قیام کے بعد ان لوگوں کی ماسکو سے روانگی عمل میں آئی، ان کی صورت فوج کی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ وہ محض قزاقوں کی بھیڑ بن چکے تھے۔ وہ سب کے سب ایسی اشیا سے، جو ان کی دانست میں قیمتی یا مفید تھیں، لدے پھندے تھے۔

جب وہ ماسکو سے رخصت ہوئے، ان میں سے ہر شخص کا مقصد، جیسا کہ اب تک ہوتا رہا تھا، تسخیر ملک نہیں تھا، بلکہ جو کچھ اس کے ہاتھ آیا تھا، اسے اپنی تحویل میں رکھنا تھا۔ اس بندر کی طرح، جو اپنا پنجہ صراحی کے تنگ دہانے میں ڈال دیتا ہے اور چند گری دار میوے سمیٹنے کے بعد اس ڈر سے مٹھی نہیں کھولتا کہ کہیں مال غنیمت ہاتھ سے نہ جاتا رہے اور یوں اپنی بربادی کا باعث آپ بن جاتا ہے، ماسکو سے کوچ کے وقت فرانسیسیوں کا ملیا میٹ ہونا ان کا مقسوم بن چکا تھا کیونکہ وہ اپنی لوٹ اپنے ساتھ گھسیٹتے لے جا رہے تھے۔ جس طرح بندر کے لیے مٹھی بھر میوہ چھوڑنا ناممکن تھا، ایسے ہی اس سے، جو انھوں نے لوٹا تھا، دستبردار ہونا ان کے لیے ناممکن تھا۔ جب کوئی فرانسیسی رجمنٹ ماسکو کے کسی محلے میں داخل ہوتی، دس منٹ کے اندر اندر یہ کیفیت ہو جاتی کہ ایک بھی افسر یا عام سپاہی ڈھونڈے سے نہ ملتا۔ مکانوں کے دریچوں میں سے فوجی اوورکوٹ اور جسی جوتے پہنے آدمی مختلف کمروں میں اٹھلے گیلے پھرتے اور ہنستے نظر آتے تھے۔ تہہ خانوں اور سٹوروں میں وہ اشیائے خورد و نوش پر ہاتھ صاف کرتے، صحنوں میں اصطبلوں اور گیراجوں کے تالے کھولتے یا توڑتے، باورچی خانوں میں آگ جلاتے اور اپنی آستینیں چڑھائے آٹا گوندھتے، ڈبل روٹیاں پکاتے اور مختلف قسم کے سالن تیار کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچوں اور عورتوں کو ڈراتے دھمکاتے، بہلاتے پھسلاتے یا انھیں محظوظ کرتے۔ اس قسم کے آدمی دکانوں، مکانوں، غرضیکہ ہر جگہ بکثرت نظر آتے۔ لیکن فوج؟ اس کا اب کہیں نام و نشان نہیں تھا۔

فرانسیسی کمانڈروں نے پے در پے احکام جاری کیے۔ ان میں فوجیوں کو شہر میں منتشر ہونے، اہلیانِ ماسکو کے ساتھ متشددانہ رویہ اختیار کرنے اور ہر قسم کی لوٹ مار کرنے کی سختی سے ممانعت کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ یہ اعلان کیا گیا کہ شام کو سب کی حاضری ہوا کرے گی۔ لیکن اس نوعیت کے تمام اقدامات کے باوجود جوان، جو ابھی کل تک منظم فوج کی شکل میں مربوط تھے، متموّل اور خالی شہر میں، جو اشیائے تعیشات اور سامان اُکل و شُرب سے پُر تھا، دندناتے پھرتے رہے۔ جس طرح بھوکے مویشیوں کا ریوڑ بنجر کھیت میں گزرتے وقت اکٹھا رہتا ہے لیکن جونہی وہ کسی ہری بھری چراگاہ میں داخل ہوتا ہے، اس پر قابو پانا ناممکن ہو جاتا ہے اور ہر مویشی جدھر سینگ سمائے، ادھر چل پڑتا ہے، ایسے ہی اس فوج کے افراد اس متموّل شہر کے مختلف علاقوں میں دور دور تک پھیل گئے۔

ماسکو اپنے مکینوں سے خالی ہو چکا تھا اور فوجی اس میں یوں منجذب ہو گئے جس طرح پانی ریت میں ہو جاتا ہے۔ وہ کریملن سے، جہاں وہ سب سے پہلے پہنچے تھے، مختلف سمتوں میں بکھر گئے۔ گھوڑسوار کسی تجارت پیشہ شخص کے خالی مکان میں داخل ہوتے۔ وہاں تمام ضروریات زندگی موجود ہوتیں۔ اصطبل اور فالتو گھوڑے بھی مل جاتے، تاہم ان کا دل نہ بھرتا اور وہ ملحقہ مکان کی طرف چل پڑتے، جو انھیں بہتر معلوم ہوتا۔ بہت سوں نے کئی کئی مکان ہتھیا لیے۔ وہ چاک سے ان پر اپنا نام تحریر کرتے اور ان کی خاطر دوسری کمپنیوں سے تو تو میں میں بلکہ ہاتھا پائی تک کرتے۔ فوجی سپاہی جونہی کسی جگہ پڑاؤ ڈالتے، شہر دیکھنے گلی کوچوں کی طرف بھاگ اٹھتے اور جب انھیں معلوم ہوتا کہ مکین ہر چیز جوں کی توں چھوڑ گئے ہیں، ان کی رالیں ٹپکنے لگتیں اور وہ دیوانہ وار ان عمارتوں کی جانب، جہاں

سے بیش قیمت اشیا بلا دام اٹھائی جا سکتی تھیں، لپکنا شروع ہو جاتے۔ افسر جوانوں کو روکنے ان کے پیچھے پیچھے جاتے لیکن غیر ارادی طور پر خود بھی اسی رو میں بہہ جاتے۔ بگھی بازار کی دکانیں بگھیوں اور دوسری گاڑیوں سے اٹی ہوئی تھیں، اور جرنیل اپنے لیے کوچیں اور کالاشیں منتخب کرنے کے لیے جوق در جوق ادھر کا رخ کرنے لگے۔ شہر کے باشندوں کی ایک حقیر تعداد وہیں رہ گئی تھی، وہ اس امید پر، کہ وہ یوں لوٹ مار سے محفوظ رہیں گے، کمانڈنگ افسروں کو اپنے گھروں میں مدعو کرنے لگے۔ دھن دولت کی وہاں لہر بہر تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ کبھی ختم نہیں ہو سکے گی۔ شہر کے جن حصوں پر فرانسیسی قابض تھے، ان کے اردگرد متعدد ایسے علاقے تھے جہاں ابھی تک کسی کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہاں اس سے بھی زیادہ مال و منال ہاتھ آئے گا اور یوں ماسکو فوج کو زیادہ سے زیادہ اپنی لپیٹ میں لیتا گیا۔ جس طرح جب خشک زمین پر پانی انڈیلا جاتا ہے، پانی اور خشک زمین دونوں غائب ہو جاتے ہیں، صرف کیچڑ باقی رہ جاتا ہے، ایسے ہی جب فاقہ کش فوج متمول خالی شہر میں داخل ہوئی، نہ شہر رہا نہ فوج۔ ہر طرف آگ بھڑک رہی تھی یا لٹیروں کی ٹولیاں گشت کر رہی تھیں۔[33]

❦

ماسکو جل کر راکھ کا ڈھیر ہو گیا۔ فرانسیسی اس کا الزام au patriotisme feroce de Rostopchine* پر دھرتے ہیں جب کہ روسی فرانسیسیوں کی بربریت کو اس کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں، تاہم ماسکو کی آتش زدگی کسی فرد واحد یا چند اشخاص کے ٹولے کے کھاتے میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ ماسکو اس لیے نذر آتش ہوا کیونکہ اس میں ایسے حالات پیدا کر دیے گئے تھے کہ ان میں ہر وہ شہر، جس کی تعمیر سنگ و خشت کے بجائے لکڑی سے عمل میں آئی ہو، — اس بات سے قطع نظر کہ شہر میں ایک سو تیس گھٹیا فائر انجن موجود تھے یا نہیں — ناگزیر طور پر راکھ کا ڈھیر بن جاتا۔ جس طرح لکڑی کی چھیلنوں کا ڈھیر، جو متواتر کئی دن تک شعلوں کی زد میں رہے، لازماً جل کر خاکستر ہو جاتا ہے، بعینہٖ متروکہ ماسکو نے جل کر راکھ ہونا ہی تھا۔ جو شہر چوبی عمارتوں پر مشتمل ہو، بھلے وقتوں میں بھی، جب اس کے باشندے اپنے گھروں میں مقیم ہوں اور محکمہ پولیس اپنے فرائض سرانجام دے رہا ہو، بمشکل کوئی دن ایسا گزرتا ہے جب اس میں کہیں نہ کہیں آگ کے شعلے بھڑک نہ اٹھتے ہوں، وہ نذر آتش ہونے سے کیسے بچ سکتا ہے جب اس کے مکین اسے خالی کر چکے ہوں اور ایسے فوجی اس پر قابض ہوں جو ہر طرف پائپ پیتے پھرتے ہوں، سینیٹ سکوائر میں سینیٹ کی کرسیاں جلا کر الاؤ روشن کرتے ہوں اور دن میں دو مرتبہ اپنے لیے کھانا پکاتے ہوں؟ زمانۂ امن میں آپ کسی بھی ضلع کے چند دیہات میں فوج کا محض عارضی پڑاؤ ڈلوا دیں، پھر آپ کو معلوم ہوگا کہ اس ضلع میں آگ لگنے کے واقعات میں یک دم اضافہ ہو گیا ہے۔ ان حالات میں ایک ایسے شہر میں، جس کی عمارتیں چوبی ہوں، جس کے باسی اسے اس کے حال پر چھوڑ کر جا چکے ہوں اور جس پر غیر ملکی فوج کا قبضہ ہو چکا ہو، وہاں آگ لگنے

* رستوپ چن کی جارحانہ اور سفاکانہ حب الوطنی

کے امکانات کتنے زیادہ بڑھ جائیں گے؟ ایسے میں Le patriotisme feroce de Rostopchine اور فرانسیسیوں کی بربریت خارج از بحث ہے۔ ماسکو فوجیوں کے پائپوں، چولھوں اور الاؤوں اور غنیم کے سپاہیوں کی، جو ایسے گھروں میں مقیم تھے، جو ان کے اپنے نہیں تھے، لاپروائیوں سے نذر آتش ہوا۔ اگر کہیں دانستہ آتش زنی کی واردات ہوئی بھی (اور یہ امر خاصا مشکوک ہے کیونکہ بادی النظر میں کوئی وجہ ایسی دکھائی نہیں دیتی کہ کوئی شخص اس قسم کی حرکت کا مرتکب ہوتا کیونکہ آگ بہر حال تکلیف دہ اور مضرت رساں ہوتی ہے)، تو اسے سبب قرار نہیں دیا جاسکتا کیونکہ آتش گیر مادوں کے بغیر بھی یہی کچھ ہوتا۔

رستوپ چن کی جارحانہ اور سفاکانہ حب الوطنی پر الزام دھرنے سے فرانسیسیوں کی اور شر پسند بوناپارت کو ذمے دار ٹھہرانے سے یا چند سال بعد اپنے عوام کے ہاتھوں مجاہدانہ مشعلیں تھمانے سے روسیوں کی اناہ کی خواہ کتنی ہی تسکین کیوں نہ ہوتی، یہ قیاس نہ کرنا ناممکن ہے کہ آتش زدگی کا یہ براہ راست سبب نہیں تھا کیونکہ ماسکو کا نذر آتش ہونا اسی طرح یقینی تھا جس طرح اس شہر، کارخانے یا مکان کا، جس کے مالک اسے چھوڑ کر جاچکے ہوں اور جس میں اجنبیوں کو قیام کرنے اور اپنا دال دلیا پکانے کی کھلی چھٹی حاصل ہو، خاکستر ہونا لازمی امر ہے۔ ٹھیک ہے کہ ماسکو کو اس کے اپنے شہریوں نے آگ کی بھینٹ چڑھایا لیکن انھوں نے نہیں جو وہاں مقیم رہے تھے بلکہ انھوں نے جو اس سے منہ موڑ گئے تھے۔ جب ماسکو پر دشمن کا قبضہ ہوگیا، وہ برلن، ویانا یا دوسرے شہروں کی طرح کوئی نقصان اٹھانے سے محض اس لیے نہ بچ سکا کیونکہ اس کے باشندے مہمان نوازی کی روایات پر عمل کرتے ہوئے نمک روٹی لے کر فرانسیسیوں کی خدمت میں حاضر ہونے اور شہر کی چابیاں ان کے سپرد کرنے کے بجائے اسے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔

27

فرانسیسیوں کا شہر میں جو انجذاب عمل میں آرہا تھا، اس کا دائرہ کار مسلسل بڑھتا اور پھیلتا رہا۔ تاہم جس حصے میں پیئر مقیم تھا، وہاں تک وہ دو ستمبر کی شام کو ہی پہنچ سکے۔

گزشتہ دو دن تنہائی اور اس قسم کے غیر معمولی حالات میں گزارنے کے بعد پیئر کی ذہنی کیفیت دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگی تھی۔ اس کے دماغ پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی۔ اسے خود معلوم نہیں تھا کہ اسے اس خیال نے کب یا کس طرح پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیا تھا لیکن اب اسے نہ ماضی کی کوئی چیز یاد تھی اور نہ حال کی کسی چیز کی سمجھ تھی۔ اسے اپنے گرد و پیش جو نظر آتا یا سنائی دیتا تھا، اسے یوں معلوم ہوتا جیسے یہ کوئی خواب کا قصہ ہو۔

پیئر گھر سے محض اس لیے بھاگا تھا کیونکہ وہ زندگی کے پیچ در پیچ تقاضوں سے، جنھوں نے اسے اپنے جال میں پھانس لیا تھا اور جن کی اس حالت میں، جس میں وہ اس وقت تھا، گرہیں کھولنا اس کے بس کی بات نہ تھی، فرار حاصل کرنا چاہتا تھا۔ وہ آئی او سف الیکسی وچ کے ہاں بظاہر اس کی کتابیں اور کاغذات چھاننے گیا تھا لیکن اصل حقیقت کچھ اور تھی۔ وہ وہاں اس لیے گیا تھا کیونکہ وہ زندگی کے پر آشوب ہنگاموں سے نجات کی کوئی صورت ڈھونڈنا

چاہتا تھا۔ اس کے ذہن میں بازدیف کی جو یادیں تھیں، وہ متین، پرسکون اور ابدی خیالات کی دنیا سے وابستہ تھیں اور یہ چیزیں اس پُر اضطراب الجھاؤ کے، جس میں وہ اپنے آپ کو پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا، قطعی برعکس تھیں۔ اسے پرسکون پناہ کی تلاش تھی اور یہ اسے آئی اوس الیکسی وچ کے سٹڈی روم میں میسر آ گئی۔ جب وہ سٹڈی روم کے مرگ آسا سکوت میں اپنے محسن کی گرد آلود میز پر کہنیاں ٹکائے بیٹھا تھا، اس کے ذہن میں گزشتہ چند روز کی پرسکون اور معنی خیز یادیں اور تاثرات پیہم یکے بعد دیگرے ابھرنے لگے۔ ان میں بارودینو کی لڑائی کی یادیں خاص طور پر شامل تھیں اور ان انسانوں کی، جن کی تصاویر اس کی روح پر نقش تھیں اور جو اس کی نظر میں وہ وہ تھے، صداقت شعاری، سادگی اور کس بل کے مقابلے میں اسے اپنی بے وقعتی اور بطالت کا مبہم سا احساس ہوا۔ جب گیراسم نے اسے اس کی محویت سے جگایا، اس کے ذہن میں خیال آیا کہ وہ ماسکو کے عوامی دفاع میں، جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ اس کا منصوبہ بنایا جا چکا ہے، حصہ لے گا۔ اور اسی مقصد کے پیش نظر اس نے گیراسم سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اسے دہقانی کوٹ اور پستول لا کر دے۔ اس نے اسے رازدارانہ طور پر یہ بھی بتایا تھا کہ اس کا ارادہ اپنی شناخت پوشیدہ رکھنا اور آئی اوسف کے گھر میں مقیم رہنے کا ہے۔ پھر تنہائی اور عدم مصروفیت (پیئر نے متعدد میسنوں کے مسودوں پر اپنی توجہ مرکوز کرنے کی کوشش کی لیکن وہ ہر بار ناکام رہا) کے پہلے روز کے دوران میں اس کا ذہن بار بار مبہم انداز سے اس خیال۔ کہ نپولین کے نام کے ساتھ اس کا نام پراسرار انداز سے منسلک ہے اور یہ بات بڑی معنویت کی حامل ہے۔ کی طرف پلٹتا رہا، جو پہلے بھی[35] اس کے ذہن میں آ چکا تھا۔ یہ خیال کہ اس (یعنی l' russe Besuhof) کے مقدر میں the Beast (یعنی نپولین) کے اختیارات و قوت کو ختم کرنا لکھا جا چکا ہے، ابھی تک محض ان چند سپنوں میں سے ایک تھا، جو اپنے پیچھے کوئی نشان چھوڑے بغیر دبے پاؤں اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

جب پیئر کوٹ خرید چکا (اس نے اسے محض ماسکو کے عوامی دفاع میں شریک ہونے کے لیے خریدا تھا) اس کا سامنا رستوفوں سے ہو گیا اور نتاشا نے اس سے دریافت کیا: ''آپ ماسکو میں ہی ٹھہریں گے؟ بہت خوب!'' اس کے ذہن میں یہ خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا کہ اگر ماسکو دشمن کے قبضے میں چلا بھی جائے، پھر بھی اس کا وہاں قیام کرنا اور جو فعل سرانجام دینا اس کا مقدر بن چکا ہے، اسے پایۂ تکمیل تک پہنچانا واقعی عظیم کارنامہ ہوگا۔

اگلے روز اس کے ذہن میں صرف ایک ہی خیال گردش کر رہا تھا کہ وہ کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھے گا اور اس دنیا میں جو کچھ وہ کر رہے ہیں، وہ اس سے کم تر پر قناعت نہیں کرے گا۔ اسی اُدھیڑ بن میں وہ ہجوم کے ساتھ تین پربت پہنچ گیا۔ لیکن جب وہ مکان میں واپس آیا، اسے یقین ہو چکا تھا کہ ماسکو کا دفاع نہیں کیا جائے گا۔ اسے اچانک محسوس ہوا کہ جو بات ازیں پیشتر امکان کے دائرے میں نظر آتی تھی، اب اس کا سرانجام دینا کاملاً واجب اور ناگزیر ہو گیا ہے۔ اسے اپنی شناخت چھپا کر ماسکو میں ہی ٹھہرنا چاہیے، کسی نہ کسی طرح نپولین تک رسائی حاصل کرنا اور اسے کیفر کردار تک پہنچانا چاہیے۔ چنانچہ یوں یا تو خود اسے موت سے ہمکنار ہو جانا چاہیے یا پھر سارے یورپ کے مصائب کا، جو اس کے خیال کے مطابق سراسر نپولین کے پیدا کردہ تھے، خاتمہ کر دینا چاہیے۔

1809 میں ایک جرمن طالب علم نے بونا پارت کو ہلاک کرنے کی جو کوشش کی تھی، پیئر کو اس کی ساری تفصیلات کا علم تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس طالب علم کو گولی ماردی گئی تھی۔ اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے سلسلے میں اسے جن خطرات کا سامنا تھا، انھوں نے اس کے جذبات کو اور بھی برانگیختہ کر دیا تھا۔

یکساں شدت کے حامل دو جذبات اسے کشاں کشاں اس مقصد کی طرف دھکیلے لیے جا رہے تھے۔ اس کا پہلا احساس یہ تھا کہ عام بپتا کے پیش نظر اس کے لیے دکھ سہنا اور قربانی دینا لابدی ہو گیا ہے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے پچیس تاریخ کو اسے موژیسک کا رخ کرنے اور وہاں سے میدان جنگ کے اس حصے میں، جہاں گھمسان کا رن پڑ رہا تھا، جانے پر اکسایا تھا، اور اسی نے اسے گھر سے فرار ہونے، ہر قسم کے تعیشات اور آسائشوں پر، جو اس کی گھٹی میں پڑ چکی تھیں، لات مار کر لباس تبدیل کیے بغیر سخت صوفے پر سونے اور وہی کھانا، جو گیراسم کھاتا تھا، کھانے کی ترغیب دی تھی۔ اس کے دوسرے جذبے کا تعلق اس مبہم اور مخصوص روسی حقارت سے تھا، جو ہر اس چیز سے، جو روایتی، مصنوعی اور مسلّمہ ہو، روا رکھتے ہیں — بہ الفاظ دیگر روسی ہر اس چیز کو، جو انسانوں کی اکثریت کو دنیا کی بہترین شے نظر آتی ہے، پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے ہیں۔ پیئر کو اس عجیب و غریب اور مسحور کن احساس کا تجربہ سلابودا محل میں ہوا تھا جب اسے ایکا ایکی محسوس ہوا کہ دولت، طاقت اور زندگی کا — وہ اشیا جن کے حصول اور تحفظ کے لیے انسان سردھڑ کی بازی لگا دیتے ہیں — اگر کوئی مول ہے تو وہ صرف اس مسرت کے برابر ہے، جو انھیں تیاگ کر حاصل ہوتی ہے۔

یہ وہی اضطراری جذبہ ہے جو رضاکارانہ طور پر بھرتی ہونے والے شخص کو اپنی آخری دمڑی شراب نوشی پر صرف کرنے اور شراب میں دُھت آدمی کو بظاہر بے سبب آئینے اور دریچوں کے شیشے توڑنے پر اکساتا ہے حالانکہ اسے معلوم ہوتا ہے کہ اسے یہ حرکت اتنی مہنگی پڑے گی کہ اس نقصان کا ازالہ کرنے کے لیے اس کی جیب میں جو پیسا دھیلا ہے، اسے اس سے یکسر محروم ہونا پڑے گا۔ یہ وہ جذبہ ہے جو انسان سے ایسے ایسے افعال سرانجام دلانے کا سبب بنتا ہے جو (عام آدمیوں کے نقطۂ نظر سے تو) مجنونانہ دکھائی دیتے ہیں، لیکن دراصل وہ اس کے ذاتی اختیار اور قوت کی آزمائش ہوتے ہیں اور زندگی کے ایسے اعلیٰ ارفع معیار کی، جو عام انسانوں کی رسائی سے بہت دور ہوتا ہے، موجودگی کی شہادت دیتے ہیں۔

جس روز سلابودا محل میں پیئر کو اس احساس کا اولین بار تجربہ ہوا، سو وہ دن اور یہ دن، وہ مسلسل اس کے زیر اثر رہا لیکن صرف اب کہیں اسے اس سے کامل اطمینان ہوا۔ مزید برآں، موجودہ لمحے میں پیئر کو اپنے منصوبے میں ان اقدامات سے، جو وہ اس سمت میں پہلے ہی کر چکا تھا، تقویت حاصل ہوئی اور انھوں نے اسے اس سے دست بردار ہونے سے روکے رکھا۔ وہ اپنے گھر سے فرار ہوا، اس نے دہقانی کوٹ اور پستول خریدا، اور رستوفوں کے سامنے اعلان کیا کہ وہ ماسکو میں ہی ٹھہرا رہے گا۔ چنانچہ دوسروں کی طرح اگر اس نے اب ماسکو چھوڑا، تو اس کے یہ تمام افعال نہ صرف بے معنی بلکہ رذیل اور مضحک بھی قرار پائیں گے (اور یہ وہ نکتہ تھا جس کے بارے میں وہ

بہت زیادہ حساس تھا)۔

جیسا کہ ہمیشہ ہوتا ہے، پیئر کی جسمانی حالت اس کی ذہنی کیفیت سے میل کھاتی تھی۔ موٹا جھوٹا کھانا، جس کا وہ عادی نہیں تھا، ووڈ کا، جو وہ ان دنوں پیتا تھا، مے انگور اور سگاروں کی عدم دستیابی، میلا کچیلا اور غیر تبدیل شدہ لباس، اور تقریباً پوری دو راتوں کی، جو اس نے گدّے، چادر اور تکیے کے بغیر گزاری تھیں، بے خوابی — ان سب باتوں نے مل ملا کر اسے اعصابی چڑچڑے پن میں، جو دیوانگی کی سرحدوں کو چھوتی تھی، مبتلا رکھا۔

❦

سہ پہر کے دو بج چکے تھے۔ فرانسیسی پہلے ہی ماسکو میں داخل ہو چکے تھے۔ پیئر کو اس کا علم تھا لیکن کوئی عملی قدم اٹھانے کے بجائے وہ محض اپنے منصوبے کے متعلق سوچتا اور اس کی چھوٹی سے چھوٹی جزئیات پر غور و فکر کرتا رہا۔ اپنے تخیل میں وہ نپولین کو کوئی ضرب پہنچانے یا اسے ہلاک کرنے کے بارے میں کوئی واضح تصویر نہ بنا سکا لیکن جہاں تک اس کے اپنے فنا ہونے اور اولوالعزمانہ انداز سے تکالیف برداشت کرنے کا تعلق ہے، اس کے بارے میں اس کے ذہن میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور وہ غیر معمولی صراحت اور افسردگی سے اس پر تفصیل سے سوچ بچار کرتا رہا۔

''ہاں، مجھے سب کی خاطر اکیلے ہی اس منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا یا خود فنا ہو جانا ہوگا!'' اس نے سوچا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس تک رسائی حاصل کروں گا... اور پھر اچانک... پستول سے یا خنجر سے؟ مگر یہ بات اتنی اہم نہیں۔ 'تمھیں یہ سزا میں نہیں بلکہ مشیتِ ایزدی دے رہی ہے۔' میں اسے بتاؤں گا۔'' پیئر نے ان الفاظ کو، جو اس نے نپولین سے اسے ہلاک کرتے وقت کہنا تھے، دھیان میں لاتے ہوئے سوچا۔ ''ہونہہ، تو پھر پکڑ لو مجھے اور چڑھا دو پھانسی!'' وہ سوچتا اور اپنے آپ سے باتیں کرتا رہا۔ اس کے چہرے پر اداسی ضرور چھائی ہوئی تھی لیکن اس پر عزم بھی جھلک رہا تھا اور اس نے اپنا سر نیچے جھکا رکھا تھا۔

جب پیئر کمرے کے درمیان میں کھڑا ان خطوط پر سوچ رہا تھا، سٹڈی روم کا دروازہ کھلا اور دہلیز پر ماکار الیکسی وچ کی شکل نمودار ہوئی۔ ماکار الیکسی وچ قبل ازیں ڈرا ڈرا سہما سہما دکھائی دیا کرتا تھا لیکن اب اس کی کایا ہی پلٹ چکی تھی۔ اس کے ڈریسنگ گاؤن کے بٹن کھلے تھے اور وہ نیچے کی طرف ڈھلک رہا تھا۔ اس کا چہرہ سرخ اور مسخ ہو رہا تھا۔ وہ لاریب نشے میں غرق تھا۔ پیئر کو دیکھ کر پہلے تو وہ سٹپٹایا لیکن جب اس نے پیئر کو یوں جھینپتے دیکھا جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو، وہ یک دم شیر ہو گیا اور اپنی لاغر ٹانگوں پر لڑکھڑاتا کمرے کے وسط کی طرف بڑھا۔

''ان کی ترکی تمام ہو گئی ہے!'' اس نے رازدارانہ انداز سے گلوگرفتہ آواز میں کہا۔ ''میں بتائے دیتا ہوں کہ میں ان کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گا۔ میں بتائے دیتا ہوں... حضور، میں نے ٹھیک کہا یا نہیں؟''

وہ چپ ہو گیا۔ پھر ناگاہ اس کی نظر میز پر رکھے پستول پر پڑی۔ اس نے حیرت انگیز پھرتی سے آگے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور غلام گردش میں بھاگنے لگا۔

گیراسم اور دربان نے، جو ماکارالیکسی وچ کا تعاقب کر رہے تھے، اسے پیش دالان میں روک لیا اور اس سے پستول واپس لینے کی کوشش کرنے لگے۔ پیئر بھی غلام گردش میں آگیا۔ اسے نیم پاگل بوڑھے شخص پر ترس بھی آیا اور اس سے گھن بھی محسوس ہوئی۔ ماکارالیکسی وچ تیوریاں چڑھائے پستول سے چمٹا رہا اور پوری کوشش کرتا رہا کہ دوسرے اسے چھین نہ سکیں۔ پھر اس نے کرخت آواز میں یوں چیخ مار کر کچھ کہا جو بظاہر اس کے خیال کے مطابق نہایت ولولہ انگیز تھا۔

''ہتھیار، ہتھیار اٹھاؤ! تختے کھڑے کردو اور ان کا راستہ روک لو! نہیں، تم یہ نہیں لے سکو گے!'' اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چلاتے ہوئے کہا۔

''حضور، اب جانے دیں، کافی ہوگئی ہے، کافی ہوگئی ہے، اب جانے دیں! چھوڑ دیں، حضور، جناب...'' گیراسم نے احتیاط سے ماکارالیکسی وچ کو کلائی سے پکڑتے اور اسے دروازے کی جانب لے جانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم کون ہو؟ بوناپارت؟...'' ماکارالیکسی وچ نے چیخ کر پوچھا۔

''حضور، یہ آپ کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ آپ اپنے کمرے میں تشریف لے چلیں، آپ تھک چکے ہیں۔ لائیں، پستول مجھے دے دیں۔''

''ذلیل، حرام خور، بھاگ جاؤ! مت لگاؤ ہاتھ مجھے! یہ دیکھتے ہو؟'' ماکارالیکسی وچ نے چلاتے اور پستول فضا میں لہراتے ہوئے کہا۔ ''ان کے راستے میں تختے کھڑے کردو!''

''انھیں پکڑلو!'' گیراسم نے دربان کے کان میں کہا۔

انھوں نے ماکارالیکسی وچ کو بازوؤں سے پکڑا اور اسے گھسیٹ کر دروازے کی جانب لے گئے۔

پیش دالان ہاتھا پائی اور نشے سے چور ہانپتی کانپتی کرخت اور ناشائستہ آوازوں سے گونجنے لگا۔

اچانک پورچ میں ایک اور تیکھی نسوانی آواز کی گونج سنائی دی اور باورچن بھاگتی لپکتی پیش دالان میں داخل ہوگئی۔

''وہ آگئے! رحیم و کریم خداوند!... یا خداوند! وہ چار ہیں، گھوڑوں پر!'' وہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔

گیراسم اور دربان نے ماکارالیکسی وچ کو چھوڑ دیا اور اس سکوت میں، جو اس کے بعد غلام گردش میں چھا گیا تھا، بیرونی دروازے پر متعدد ہاتھوں کے دستک دینے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

28

پیئر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ جب تک وہ اپنے منصوبہ کو عملی جامہ نہیں پہنا لیتا، وہ کسی شخص کو نہ تو اپنی ذات کے بارے میں کچھ بتائے گا اور نہ یہ کہ اسے فرانسیسی آتی ہے۔ وہ اب غلام گردش کے نیم وا دروازے کے پاس کھڑا تھا اور یہ ارادہ کر

رہا تھا کہ جونہی فرانسیسی اندر داخل ہوے، وہ ادھر ادھر روپوش ہو جائے گا، مگر فرانسیسی آ گئے اور پیئر جہاں کھڑا تھا، وہیں کھڑا رہا۔ غیر مغلوب تجس نے اسے ہلنے نہ دیا۔

وہ دو تھے۔ ایک افسر، دراز قامت، خوبرو اور بانکا سجیلا، دوسرا بظاہر معمولی لشکری یا اردلی، کوتاہ قامت، دبلا پتلا، دھوپ میں جھلسا ہوا۔ اس کے گال پچکے ہوے تھے اور اس کے چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ افسر آگے آگے آ رہا تھا۔ وہ چھڑی پر جھکا ہوا تھا اور قدرے لنگڑا رہا تھا۔ جب وہ چند قدم اٹھا چکا، وہ رک گیا۔ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہ فیصلہ کر چکا ہے کہ یہ مکان ٹھیک ٹھاک ہے۔ وہ سپاہیوں کی جانب، جو صدر دروازے میں کھڑے تھے، متوجہ ہوا اور انھیں بلند اور تحکمانہ انداز سے حکم دینے لگا کہ وہ گھوڑے وہیں روک لیں۔ جب وہ اس کام سے فارغ ہو گیا، اس نے اپنی کہنی کو خم دیا، دھونس آمیز انداز سے بازو سے اشارہ کیا، مونچھوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنی ٹوپی کو خفیف سا چھوا۔

"Bonjour, la compagnie!"* اس نے مسکراتے اور اپنے گرد و پیش نظریں دوڑاتے ہوے شگفتگی سے کہا۔

کسی نے جواب نہ دیا۔

"Vous etes le bourgeois?"** افسر نے گیراسم سے پوچھا۔

گیراسم افسر کا منہ تکنے لگا۔ وہ مضطرب بھی تھا اور متجسس بھی۔

"Quarter, quartier, logement!" افسر نے قلیل الجثہ آدمی پر لطف و کرم کی نگاہیں ڈالتے ہوے کہا۔ "Les Francais sont de bons enfants. Que diable! Voyons! Ne nous fachons pas, mon vieux!***

اس نے تھر تھر کانپتے اور چپ سادھے گیراسم کے کندھے کو تھپتھپاتے ہوے کہا۔ ''ہونہہ، اس گھر میں کسی کو بھی فرانسیسی نہیں آتی؟'' اس نے ایک بار پھر فرانسیسی میں پوچھا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا اور اس کی آنکھیں پیئر کی آنکھوں سے چار ہو گئیں۔

پیئر دروازے سے پرے ہٹ گیا۔

افسر ایک بار پھر گیراسم کی طرف متوجہ ہوا۔ اس نے اسے حکم دیا کہ اسے مکان کے کمرے دکھائے جائیں۔

''مالک یہاں نہیں ہیں — میں سمجھتا نہیں... میں آپ کی...'' گیراسم نے الفاظ کی ترتیب تبدیل کرتے ہوے انھیں زیادہ قابل فہم بنانے کی کوشش کرتے ہوے کہا۔

افسر ابھی تک مسکرائے جا رہا تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ گیراسم کی ناک کے سامنے پھیلایا۔ اس سے وہ یہ ظاہر

---

* سب کو آداب

** یہاں کے مالک تم ہو؟

*** مکان، مکان — رہائش کے لیے جگہ۔ فرانسیسی بھلے مانس ہیں۔ کیا مصیبت ہے! ابز رگو جانے دیں، غصہ تھوک دیں۔

کرنا چاہتا تھا کہ وہ بھی اس کی بات نہیں سمجھا، اور وہ لنگڑاتے لنگڑاتے اس دروازے کی جانب، جہاں پیئر کھڑا تھا، چل پڑا۔ پیئر وہاں سے ہٹنا اور کہیں روپوش ہو جانا چاہتا تھا کہ ناگاہ اس کی نگاہ ماکار الیکسی وچ پر پڑی جو ہاتھ میں پستول پکڑے باورچی خانے کے کھلے دروازے میں کھڑا تھا۔ ماکار الیکسی وچ نے پاگلوں کی عیاری سے کام لیا، بغور فرانسیسی کو دیکھا، پستول اوپر اٹھایا اور شست باندھ لی۔

''ان کے آگے تختے کھڑے کر دو!'' نشے سے دھت شخص نے لبلبی دبانے کی کوشش کرتے ہوئے چلا کر کہا۔

چیخ کی آواز سن کر فرانسیسی ادھر مڑا اور اسی ثانیے پیئر نے مخمور آدمی کو دبوچ لیا۔ عین اس وقت جب پیئر نے پستول پکڑا اور اس کا رخ اوپر کی طرف کیا، ماکار الیکسی وچ آخر کار لبلبی دبانے میں کامیاب ہو گیا۔ ایسا شور بلند ہوا کہ انھیں محسوس ہوا کہ ان کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے اور اس کے ساتھ ہی وہ سب دھوئیں کے بادل میں چھپ گئے۔ فرانسیسی کا رنگ فق ہو گیا اور وہ دروازے کی طرف بھاگ پڑا۔

پیئر اپنا یہ ارادہ بھول گیا کہ وہ یہ ظاہر نہیں ہونے دے گا کہ اسے فرانسیسی آتی ہے۔ اس نے پستول چھین لیا اور اسے فرش پر پھینک دیا۔ پھر وہ افسر کی طرف بھاگا اور اس سے فرانسیسی میں پوچھنے لگا:

آپ زخمی تو نہیں ہوئے؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں،'' افسر نے اپنے سراپے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا، ''لیکن اس مرتبہ میں بال بال بچا۔'' اس نے دیوار کے اکھڑے پلستر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزید کہا۔ ''کون ہے یہ شخص؟'' اس نے پیئر کو درشت نگاہوں سے گھورتے ہوئے کہا۔

''جو کچھ ہوا ہے، اس سے مجھے بہت دکھ پہنچا ہے۔'' پیئر نے جھٹ پٹ کہا۔ اس نے جو کردار ادا کرنے کا ارادہ کیا تھا، اسے وہ مطلق بھول چکا تھا۔ ''یہ پاگل ہے۔ اس بدنصیب کو یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہا تھا۔''

افسر ماکار الیکسی وچ کے قریب آیا اور اسے کالر سے پکڑ لیا۔

ماکار الیکسی وچ منہ کھولے دیوار کے ساتھ لگا کھڑا تھا۔ وہ یوں جھول رہا تھا جیسے اسے نیند آ رہی ہو۔

''بدمعاش! تمھیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا'' فرانسیسی نے اسے چھوڑتے ہوئے کہا۔ ''فتح کے بعد ہم فرانسیسی بہت رحمدل ہو جاتے ہیں لیکن ہم غداروں کو معاف نہیں کرتے۔'' اس نے طرح دار لیکن پرزور انداز سے اپنا بازو لہراتے ہوئے کہا تاہم اس کے چہرے بشرے پر جو وقار جھلک رہا تھا، اس سے مترشح ہو رہا تھا کہ آثار اچھے نہیں۔

پیئر فرانسیسی میں افسر کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ مدہوش پاگل سے باز پرس کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فرانسیسی پہلے تو منہ لٹکائے چپ چاپ سنتا رہا، پھر ایکا ایکی مسکرانے لگا اور پیئر کی طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ ایک دو سیکنڈ اسے بغور دیکھتا رہا۔ پھر اس کا رویہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ ہو گیا اور اس کے چہرے سے نظر آنے لگا کہ وہ بہت جذباتی ہو رہا ہے۔ اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''تم نے میری جان بچائی ہے۔ تم لازماً فرانسیسی ہو گے!'' اس نے کہا۔

فرانسیسی کے لیے یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ صرف فرانسیسی ہی کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دے سکتے ہیں، بالکل بدیہی بات تھی اور اس کی — تیرھویں لائٹ رجمنٹ کے کپتان موسیو غام بال (Ramballe) کی — زندگی بچانا تو واقعی عظیم کارنامہ تھا۔

تاہم یہ منطق اور اس پر مبنی افسر کا اعتقاد خواہ کتنا ہی غیر متنازعہ کیوں نہ سہی، پیئر نے اس کے غبارے سے ہوا نکالنا مناسب سمجھا۔

''میں روسی ہوں!'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''ارے جاؤ، یہ بات کسی اور سے کہنا!'' فرانسیسی نے مسکراتے اور پیئر کی ناک کے سامنے اپنی انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ ''اس بارے میں تم عنقریب مجھے سب کچھ بتاؤ گے اور میں بہت غور سے سنوں گا۔ اپنے ہم وطن سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ خیر، اب یہ بتاؤ کہ اب ہم اس شخص کا کیا کریں؟'' اس نے پیئر سے پوچھا جیسے بھائی بھائی سے کوئی بات پوچھتا ہو۔

اس کا لہجہ اور نگاہیں کہہ رہی تھیں کہ پیئر بے شک فرانسیسی نہ ہو لیکن جب اسے بلند ترین انسانی لقب حاصل ہو گیا، پھر اسے یقیناً اس سے دست بردار ہونے کی کوشش نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے آخری سوال کے جواب میں پیئر نے ایک بار پھر اسے بتایا کہ ماکار الیکسی وچ کون ہے اور یہ کہ اس کی آمد سے ذرا قبل مدہوش پاگل نے کس طرح اس کا بھرا ہوا پستول اڑا لیا تھا اور وہ کس طرح اسے اس سے واپس لینے میں ناکام رہے تھے کیونکہ انھیں اس کا وقت ہی نہیں مل سکا تھا۔ اس نے افسر سے درخواست کی کہ وہ اسے کوئی سزا نہ دے۔

فرانسیسی نے اپنا سینہ پھلایا اور نوابی انداز سے اپنا ہاتھ لہرایا۔

''تم نے میری جان بچائی ہے۔ تم فرانسیسی ہو۔ تم مجھے کہتے ہو کہ میں اسے معاف کر دوں؟ میں تمھاری درخواست مان لیتا ہوں۔ اس شخص کو یہاں سے لے جاؤ۔'' اس نے اپنے لہجے پر زور دے کر تیز تیز بات کرتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے اس آدمی کا، جسے اس نے ترقی دے کر فرانسیسی بنا دیا تھا کیونکہ اس نے اس کی جان بچائی تھی، بازو تھاما اور اس کے ساتھ کمرے میں چلا گیا۔

صحن میں جو فوجی کھڑے تھے، انھوں نے جب گولی چلنے کی آواز سنی، وہ یہ معلوم کرنے کہ کیا ہوا ہے، پیش دالان میں آ گئے اور کہنے لگے کہ وہ مجرموں کو سزا دینے کے لیے تیار ہیں لیکن افسر نے انھیں سختی سے روک دیا۔

''جب تمھاری ضرورت پیش آئے گی، تمھیں بلا لیا جائے گا۔'' اس نے کہا۔

فوجی واپس چلے گئے۔ دریں اثناء اردلی، جو موقع پا کر باورچی خانہ دیکھنے چلا گیا تھا، دوبارہ اندر آ گیا اور افسر کے پاس جا کھڑا ہوا۔

''کپتان، باورچی خانے میں سوپ اور بھنی ہوئی ران پڑی ہے۔ حکم ہو تو آپ کی خدمت میں حاضر کر دوں؟'' اس نے کہا۔

"ہاں، اور کچھ انگور لے آؤ۔" کپتان نے جواب دیا۔

29

جب فرانسیسی افسر پیئر کے ہمراہ کمرے کے اندر چلا گیا، مؤخرالذکر کرنے ایک بار پھر اسے یہ یقین دلانا کہ وہ فرانسیسی نہیں ہے، اپنا فرض گردانا اور اسے بتایا کہ وہ وہاں سے جانا چاہتا ہے، لیکن افسر نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس کا رویہ انتہائی شائستہ، خوش خلق، متواضع اور ہملنسانا تھا، اور پیئر نے اس کی جو جان بچائی تھی، اس پر وہ اتنے سچے دل سے اس کا ممنون تھا کہ پیئر اس کی درخواست مسترد کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا، اور وہ جس اولین کمرے میں داخل ہوئے تھے، وہ اس کے ساتھ وہیں بیٹھ گیا۔ پیئر نے جو بار بار اقرار واثق کیا تھا کہ وہ فرانسیسی نہیں ہے، بظاہر کپتان اسے سمجھ نہیں پار ہا تھا۔ یہ بات اس کے فہم وادراک میں نہیں آرہی تھی کہ کوئی شخص اس قابلِ تحسین لقب کو مسترد کیسے کر سکتا ہے۔ وہ محض کندھے اچکا کر رہ گیا اور بولا کہ اگر پیئر واقعی روسی سمجھے جانے پر مصر ہے، تو پھر یونہی سہی، تاہم جہاں تک اس کے اپنے جذبات کا تعلق ہے، اس کے دل میں اس کے لیے ہمیشہ تشکر کے جذبات موج زن رہیں گے کیونکہ اس نے اس کی جان بچائی تھی۔

اگر قدرت نے اس شخص کو دوسروں کے جذبات سمجھنے کی ذرا سی صلاحیت بھی ودیعت کی ہوتی اور اس لمحے اسے اپنے ہم نشیں کے احساسات کا خفیف سا علم بھی ہوتا، غالباً پیئر اسے چھوڑ کر جا چکا ہوتا، لیکن اپنی ذات کے علاوہ وہ جس شگفتہ انداز سے ہر دوسری چیز کے بارے میں بے حس تھا، اس نے پیئر کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور وہ وہیں بیٹھا رہا۔

"فرانسیسی یا بھیس بدلے روسی پرنس۔" اس نے پیئر کے نفیس، اگرچہ گندے، لباس اور اس کی انگلی پر انگوٹھی کو بنظر غائر دیکھتے ہوئے کہا، "میری زندگی تمھاری مرہونِ منت ہے اور میں تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ فرانسیسی دو باتیں — ہتک اور خدمت — کبھی فراموش نہیں کرتے۔ میں تمھاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا ہوں۔ میں اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

افسر کی آواز، اس کے چہرے کے تاثرات اور اس کی حرکات وسکنات میں اتنی نیک نیتی اور شرافت (اس لفظ کے فرانسیسی معنوں میں) تھی کہ پیئر نے غیر شعوری طور پر تبسم کا جواب تبسم سے دیا اور جو ہاتھ اس کی جانب بڑھایا گیا تھا، اس نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اسے دبانے لگا۔

"تیرھویں لائٹ رجمنٹ کا کیپٹن غام بال اور ساتویں ستمبر[36] کے واقعے کے بعد Legion d' Honneur[37] کا Chevalier"۔ اس نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ اسے اتنی خاطر جمع تھی کہ اس کی مسکراہٹ، جس نے اس کے ہونٹوں کو شکن آلود بنا دیا تھا، دبائے دبتی نہیں تھی۔ "کیا اب آپ برائے مہربانی مجھے یہ بتانے کی زحمت گوارا کریں گے کہ اس جنونی کی گولی جسم میں گھسیڑے ایمبولینس میں لیٹے ہونے کی بجائے مجھے یوں خوش گوار انداز

سے کس ذاتِ بابرکات سے ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو رہا ہے؟''

شرمانے اور کوئی نام گھڑنے کی کوشش کرنے کے بعد پیئر نے جواب دیا کہ وہ یہ بتانے سے معذور ہے کہ وہ کون ہے۔ وہ اپنا تشخص کیوں پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا، وہ اس کی وجہ بیان کیا ہی چاہتا تھا کہ فرانسیسی نے اسے ٹوک دیا۔

''خیر، جانے دیں،!'' وہ پکار اٹھا۔''میں سمجھ گیا۔ آپ کوئی افسر ہیں... شاید سٹاف افسر۔ آپ ہمارے خلاف ہتھیار اٹھا چکے ہیں۔ اس سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ میں اپنی زندگی کے لیے آپ کا ممنون احسان ہوں۔ میرے لیے یہی کافی ہے۔ میں سرتاپا آپ کی خدمت کے لیے حاضر ہوں۔ آپ کا تعلق اشراف سے ہے؟'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز میں استفسار کی ہلکی سی جھلک تھی۔

پیئر نے اپنا سر جھکا دیا۔

''آپ کا مسیحی نام؟ وہ بھی آپ بتانا چاہیں تو۔ اس سے زیادہ میں کچھ پوچھنا نہیں چاہتا۔ موسیو پیئر، یہی کہا نا آپ نے؟... بہت اعلیٰ، میں بس یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔''

جب ران، آملیٹ، سماوار، ووڈکا اور کچھ انگوری شراب آ گئی، جو فرانسیسی کسی تہہ خانے سے لائے تھے، رام بال نے پیئر کو شرکت طعام کی دعوت دی اور خود جھٹ پٹ کسی صحت مند اور بھوک سے نڈھال شخص کی طرح حریصانہ کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ وہ اپنے مضبوط دانتوں سے خوب چبا چبا کر لقمے نگل رہا اور بار بار ہونٹ چٹخار رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تعریفی کلمات بھی کہتا جا رہا تھا: ''بہت اعلیٰ، بہت لذیذ!'' دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ سرخ اور پسینے سے شرابور ہو گیا۔ پیئر کو بھوک لگی تھی اور وہ برضا و رغبت دعوت میں شریک ہو گیا۔ موریل (اردلی) نیم گرم پانی لے آیا اور اس نے سرخ انگوری شراب کی بوتل اس میں رکھ دی۔ باورچی خانے میں اسے کواس[38] کی بوتل مل گئی۔ وہ اسے بھی اٹھا لایا تاکہ وہ اس کا ذرا مزہ لے سکیں۔ فرانسیسی اس مشروب سے پہلے ہی آشنا تھے اور وہ اس کا نام بھی رکھ چکے تھے۔ وہ اسے limonade de cochon* کہتے تھے۔ موریل (Morel) نے اس کا ذکر اچھے الفاظ میں کیا۔ مگر چونکہ کپتان کے پاس انگوری شراب تھی (یہ ان کے ماسکو آتے ہاتھ لگی تھی)، اس نے کواس موریل کے لیے چھوڑ دی اور خود سفید فرانسیسی شراب بوغدو (Bordeaux) سے شغل کرنے لگا۔ اس نے بوتل کے گرد دسترخوان لپیٹا اور اپنے اور پیئر کے لیے شراب انڈیلنے لگا۔ کپتان کی اشتہا رفع ہو چکی تھی اور شراب نے اسے مزید چاق چوبند کر دیا۔ طعام کے دوران میں وہ مسلسل ادھر ادھر کی ہانکتا رہا۔

''جی، موسیو پیئر، آپ نے چونکہ مجھے اس پاگل کے ہاتھوں مرنے سے بچایا ہے... چنانچہ منّت کے طور پر بڑھیا موم بتی میرے ذمے ہے، یہ میں آپ کی نذر کر دوں گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میرے جسم میں پہلے ہی گولیوں کی کمی نہیں۔ ایک تو یہاں ہے، یہ مجھے واگرام[39] میں لگی تھی۔'' (اس نے اپنے پہلو کو چھوا)۔ ''اور یہ سمولنسک میں۔

---

* واہیات شراب۔ (لفظی ترجمہ = مشروبِ خنزیر)

(اس نے اپنے رخسار پر زخم کے نشان کی طرف اشارہ کیا۔) ''اور ایک اس ٹانگ میں ہے۔آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ حرکت کرنے میں متامل ہے۔ یہ میں نے سات تاریخ کولا اسکووا[40] کی عظیم لڑائی میں کھائی تھی۔ Sacre Dieu!* یہ واقعی بڑی زبردست لڑائی تھی! آپ کو یہ ضرور دیکھنا چاہیے تھی۔ آگ کا طوفان۔ بلاخیز تھا! میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ آپ لوگوں نے ہمارا سخت مقابلہ کیا۔ آپ اس پر فخر کر سکتے ہیں۔ اور ma parole**، اس خراش کے باوجود، جو مجھے وہاں آئی تھی، میں اس طرح کی لڑائی میں دوبارہ حصہ لینے کے لیے تیار ہوں۔ جن لوگوں نے یہ موقع گنوا دیا، مجھے ان پر ترس آتا ہے۔''

''میں وہاں تھا،'' پیئر نے کہا۔

''ارے نہیں۔ واقعی؟ یہ تو اور بھی اچھا ہوا!'' فرانسیسی نے کہا۔ ''آپ واقعتاً جی دار دشمن ہیں۔ جو لوگ عظیم مورچے پر متعین تھے، انھوں نے پامردی سے مقابلہ کیا اور ہمیں ناکوں چنے چبوا دیے۔ مجھ پر خدا کی پھٹکار، اگر اس میں کوئی مبالغہ ہو۔ میں نے اس مورچے پر تین مرتبہ حملہ کیا۔ یہ بات اتنی ہی صحیح ہے جتنی کہ یہ کہ میں یہاں بیٹھا ہوں۔ تین مرتبہ ہم توپوں کے عین نزدیک پہنچ گئے لیکن تینوں ہی بار ہمیں یوں پیچھے دھکیل دیا گیا جیسے ہم گوشت پوست کے نہیں بلکہ گتّے کے سپاہی ہوں۔ موسیو پیئر، یہ بہت دلچسپ مقابلہ تھا۔ خدا کی قسم، آپ کے توپچیوں کی کارکردگی مثالی تھی۔ میں نے ان کی صفیں یکے بعد دیگرے نصف درجن مرتبہ بالکل قریب سے دیکھیں، وہ یوں قدم سے قدم ملا کر چلتے تھے جیسے پیریڈ کر رہے ہوں۔ بڑی آن بان تھی ان کی! ہمارے شاہ نیپلز، جو کھوٹے کھرے میں تمیز کرنا جانتے ہیں، پکار اٹھے: 'آفریں باد بریں ہمتِ مردانہ تو!... 'خوب، بہت خوب! تو آپ ہمارے ہم پیشہ بھائی ہیں!'' وہ ذرا کی ذرا رکا اور مسکرایا۔ ''یہ تو اور بھی اچھا ہوا، موسیو پیئر، یہ تو اور بھی اچھا ہوا! لڑائی میں خونخواروں اور مہ جبینوں کے — ناز بردار۔'' (اور اس نے آنکھ ماری اور وہ مسکرانے لگا۔) ''یہ ہوتے ہیں فرانسیسی، کیوں موسیو پیئر؟''

کپتان اتنا ملنسار، کند ذہن، مطمئن و شاد اور بھولا تھا کہ پیئر نے اسے ہشاش بشاش انداز سے دیکھتے ہوئے جواب میں تقریباً آنکھ ماردی۔ غالباً لفظ ''ناز بردار'' نے کپتان کے خیالات کا رخ ماسکو کے حالات کی طرف موڑ دیا۔

''بر سبیلِ تذکرہ، یہ تو فرمائیں، کیا یہ درست ہے کہ ماسکو کی تمام خواتین شہر چھوڑ گئی ہیں، بڑی اوٹ پٹانگ سی حرکت ہے۔ آخر انھیں ڈر کس بات کا تھا؟''

''اگر روسی پیرس میں داخل ہو جائیں، فرانسیسی خواتین شہر سے چلی نہیں جائیں گی؟'' پیئر نے سوال کیا۔

''آہاہا! واہ خوب!'' وہ پکار اٹھا۔ وہ دل کھول کر ہنسا اور اس نے پیئر کے کندھے پر دھپّا مارا۔ ''پیرس؟... لیکن پیرس — پیرس...''

---

* خدایا!

** my word قسم ہے مجھے اپنے قول کی

''دنیا کا بہترین شہر ہے۔'' پیئر نے اس کی ادھوری بات مکمل کر دی۔

کپتان نے نگاہ اٹھا کر پیئر کی طرف دیکھا۔ اس کی یہ عادت تھی کہ فقرہ بیچ میں چھوڑ دیتا اور اپنی ہنستی مسکراتی خوش باش نگاہیں گاڑ کر گھورنے لگتا۔

''واہ! اگر آپ نے مجھے یہ نہ بتایا ہوتا کہ آپ روسی ہیں تو میں حلفاً کہہ سکتا تھا کہ آپ پیرسی ہیں! آپ میں وہ... مجھے معلوم نہیں کہ کیا...'' اسے یہ خراجِ تحسین پیش کرنے کے بعد وہ خاموش ہو گیا اور ایک بار پھر اسے ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگا۔

''میں پیرس ہو آیا ہوں۔ میں نے وہاں چند سال گزارے تھے،'' پیئر نے کہا۔

''بالکل، اس میں کس کافر کو شک ہے۔ پیرس... جو شخص پیرس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا، حیوانوں سے کیا گزرا ہے۔ پیرسی کو آپ میلوں دور سے پہچان سکتے ہیں۔ پیرس تالما[41] ہے، دوشینوا ہے، پوتیے ہے، سوغبوں ہے، خیابانوں کا شہر ہے۔'' اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اس نے بات کی تان جس جملے پر توڑی ہے، وہ تو بالکل پھسپھسا ہے، اس نے عجلت سے مزید کہا: ''کُل عالم میں صرف ایک ہی پیرس ہے۔ آپ پیرس ہو بھی آئے، پھر بھی روسی رہے۔ خیر، اس سے میری نگاہوں میں آپ کی قدر و قیمت کم نہیں ہوئی۔''

کچھ تو اس مے نوشی کا اثر تھا جو پیئر نے کی تھی، پھر اس نے اپنے افسردہ خیالات کا تانا بانا بنتے ایامِ تنہائی گزارے تھے، چنانچہ وہ اس ہنس مکھ اور بھلے مانس شخص کی باتوں سے محظوظ ہوئے بنا نہ رہ سکا۔

''آپ کی خواتین کا ذکر مکرر ہو جائے— سنا ہے، وہ حسین و جمیل ہیں۔ ادھر فرانسیسی فوجیں شہر میں داخل ہوئیں اور ادھر وہ گھاس کے میدانوں میں جا چھپیں، بالکل واہیات حرکت ہے! ان دوشیزاؤں نے کتنا خوبصورت موقع کھو دیا ہے! اب تمھارے دیہاتی کسان— خیر، چھوڑو، یہ دوسری بات ہے۔ لیکن آپ تو مہذب انسان ہیں، آپ کو ہمارے متعلق اس سے بہتر علم ہونا چاہیے تھا۔ ہم نے ویانا، برلن، میڈرڈ، نیپلز، روم، وارسا— بھی دنیا کے چنیدہ شہر ہیں، اپنے اپنے ممالک کے دارالسلطنت— ہم نے ان پر قبضہ کیا۔ ایک عالم ہم سے خوف کھاتا ہے لیکن ہم سے محبت کی جاتی ہے۔ ہمیں جاننا بری بات نہیں ہے۔ پھر ہمارے امپراطور—'' اس نے کہنا شروع کیا مگر پیئر نے اسے ٹوک دیا۔

''امپراطور؟...'' پیئر نے دہرایا اور اچانک اس کے چہرے پر افسردگی اور شرمساری کے آثار نمودار ہو گئے۔

''کیا امپراطور...؟''

''امپراطور؟ وہ سرتاپا دریا دل، شفیق، منصف مزاج، دلدادۂ نظم، عبقری ہیں— میں سچ کہہ رہا ہوں کہ وہ یہ سب کچھ ہیں۔ یہ باتیں، میں، غام بال، آپ کو بتا رہا ہوں۔ آٹھ سال قبل بالکل یہی شخص، جسے آپ اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں، اس کا دشمن تھا۔ میرا باپ emigré* کاؤنٹ ہے۔... لیکن اس شخص نے مجھے کاملاً مسخر کر لیا، میں

* تارکِ وطن

پوری طرح اس کی گرفت میں آ گیا۔ وہ فرانس کو شان وشکوہ اور جاہ وجلال کا جو لبادہ پہنا رہا تھا، میں اس سے آنکھیں نہ چرا سکا۔ جب مجھے صحیح معنوں میں یہ احساس ہوا کہ اس کا مقصد کیا ہے، جب میں نے دیکھا کہ وہ ہمارے لیے پھولوں کی سیج بچھا رہا ہے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے اپنے آپ سے کہا: 'یہ تو بادشاہوں جیسے کام ہیں!' اور میں نے اپنا تن من اس کے سپرد کر دیا۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا، اب اسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ ارے ہاں، mon cher*، وہ تمام زمانوں کا، خواہ ان کا تعلق ماضی سے ہو یا مستقبل سے، عظیم ترین انسان ہے۔"

"کیا وہ ماسکو میں ہیں؟" پیئر نے ڈرتے جھینپتے پوچھا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

فرانسیسی تاڑ گیا کہ دال میں لازماً کچھ کالا ہے، تاہم وہ مسکرا پڑا۔

"نہیں، ان کی تشریف آوری کل ہو گی۔" اس نے جواب دیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

اتنے میں گیٹ سے متعدد اشخاص کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور ان کی گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ موریل اندر آیا اور اس نے کپتان کو اطلاع بہم پہنچائی کہ ورتم برگ کے چند ہوزار آئے ہیں اور وہ اسی صحن میں، جہاں کپتان کے گھوڑے بندھے ہیں، اپنے گھوڑے باندھنا چاہتے ہیں۔ مشکل یہ آن پڑی تھی کہ ہوزاروں کو جو کچھ فرانسیسی میں کہا جا رہا تھا، وہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

غام بال نے ان کے سینئر نان کمشنڈ افسر کو بلایا اور بڑی درشتی سے اس سے پوچھا کہ اس کا تعلق کس رجمنٹ سے ہے، اس کا کمانڈنگ افسر کون ہے اور اسے یہ حق کس نے دیا ہے کہ جس مکان پر پہلے ہی کسی اور کا قبضہ ہو چکا ہے، اس پر اپنا دعویٰ جتائے۔ جرمن کی فرانسیسی ایسی ویسی تھی۔ اس نے پہلے دو سوالات کے جواب میں اپنی رجمنٹ اور اپنے کمانڈنگ افسر کے نام بتا دیے۔ لیکن تیسرے سوال کے، جو اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، جواب میں اپنی ٹوٹی پھوٹی فرانسیسی کے چند الفاظ ملا کر جرمن زبان میں بتایا کہ وہ اپنی رجمنٹ کا کوارٹر ماسٹر ہے اور اس کے کرنل نے اسے حکم دیا ہے کہ وہ اس گلی کے تمام مکانات کو اپنے قبضے میں لے لے۔ پیئر کو جرمن آتی تھی۔ جرمن جو کچھ کہہ رہا تھا، اس نے اس کا ترجمہ کپتان کو سنایا اور کپتان نے جو جواب دیا، اس کا مفہوم جرمن کو بتایا، جرمن سے جو کچھ کہا گیا، جب اس کا مطلب اس پر واضح ہو گیا، وہ اپنے دعوے سے دست بردار ہو گیا اور اپنے آدمیوں کو کہیں اور لے گیا۔ کپتان پورچ میں چلا گیا اور با آواز بلند چند احکام دینے لگا۔

جب وہ کمرے میں واپس آیا، اس نے دیکھا کہ پیئر سر تھامے اسی جگہ بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر غم واندوہ کے آثار نظر آ رہے تھے، اور وہ واقعی اذیت میں مبتلا تھا۔ جونہی کپتان باہر نکلا اور وہ اکیلا رہ گیا، یک دم اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے اور وہ جس صورت حال میں پھنس گیا تھا، اس کا اسے احساس ہونے لگا۔ بات یہ نہیں تھی کہ ماسکو پر غیروں کا قبضہ ہو گیا تھا اور نہ یہ کہ مسرت سے سرشار یہ فاتحین اس کے مالک بن بیٹھے تھے اور اس کے ساتھ مربیانہ انداز سے پیش آ رہے تھے۔ فی نفسہٖ یہ باتیں تکلیف دہ ضرور تھیں لیکن فی الحال یہ اس کے لیے اتنی کرب ناک نہیں

---

* مائی ڈیئر

تھیں جتنا کرب ناک اس کا یہ احساس تھا کہ وہ کمزور اور ناتواں ہے۔ ے انگور کے چند جام، جو اس نے لنڈھائے تھے اور وہ گفتگو، جو اس نے اس خوش طبع شخص کے ساتھ کی تھی، اس ہمہ گیر افسردگی کی کیفیت کو، جو گزشتہ چند روز سے اس پر طاری تھی اور جو اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ناگزیر تھی، کافور کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔ پستول، خنجر اور دہقانی کوٹ، سبھی کچھ تیار رکھا تھا۔ نپولین کو اگلے روز شہر میں داخل ہونا تھا۔ پیئر کو اب بھی یہ یقین تھا کہ اس موذی کو موت کے گھاٹ اتارنا کارِ ثواب ہے اور اس سے عامتہ الناس کا بھلا ہوگا۔ لیکن اب اُسے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچا سکے گا۔ اس نے پورا زور لگایا کہ وہ اپنی کمزوری کا اعتراف نہ کرے لیکن اسے یہ مدھم سی آگاہی تھی کہ وہ اس پر غالب نہیں آسکتا اور یہ کہ ماضی قریب میں اس کے دل میں انتقام، خفیہ قتل اور قربانی ذات کے جو بھیانک خیالات در آئے تھے، پہلے ہی شخص سے ملاقات کے بعد پادر ہوا ہو گئے تھے۔

کپتان کمرے کے اندر آیا۔ وہ قدرے لنگڑا رہا اور کوئی دھن گنگنا رہا تھا۔

فرانسیسی کی بسیار گوئی، جو ازیں پیشتر پیئر کے لیے خاصی پرلطف تھی، اب اسے زہر معلوم ہونے لگی۔ وہ دھن، جو وہ گنگنا رہا تھا، اس کی چال اور اس کا مونچھوں کو بل دینے کا انداز، اب سبھی اس کے اعصاب پر سوار ہو رہے تھے۔

''میں ابھی اور فوراً یہاں سے چلا جاؤں گا۔ میں اس کے ساتھ مزید ایک لفظی بات بھی نہیں کروں گا۔'' پیئر نے سوچا۔ لیکن جب وہ اس قسم کی باتیں سوچ رہا تھا، وہ اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں، وہیں بیٹھا رہا۔ ضعف و ناتوانی کے عجیب و غریب احساس نے اسے کرسی پر چپکائے رکھا۔ وہ اٹھنا اور جانا چاہتا تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے ایک انچ بھی حرکت نہ کر سکا۔

اس کے برعکس کپتان شگفتہ خاطر نظر آرہا تھا۔ اس نے دو مرتبہ کمرے کے آر پار چکر کاٹے۔ اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں اور وہ اپنی مونچھوں کو یوں تاؤ دے رہا تھا جیسے وہ کسی پُرلطف خیال پر مسکرا رہا ہو۔

''ورٹم برگیوں کا کرنل خاصا دلچسپ آدمی ہے،'' اس نے رائے زنی کی۔ ''ہے تو جرمن... اس کے باوجود اچھا آدمی ہے... ویسے ہے جرمن۔'' وہ پیئر کے سامنے بیٹھ گیا۔ ''تو آپ کو جرمن بھی آتی ہے، واقعی؟''

پیئر مہر بلب اسے دیکھتا رہا۔

'''جائے پناہ' کی جرمن کیا ہے؟''

''جائے پناہ۔'' پیئر نے دہرایا۔ '''جائے پناہ' کی جرمن unterkunft ہے۔''

''اس کا تلفظ کیا ہے؟'' کپتان نے عجلت سے کہا۔ اس کے لہجے میں قدرے بے اعتمادی تھی۔

"unterkunft"، پیئر نے دوبارہ کہا۔

''آنترکوف (onterkoff)'' کپتان نے کہا اور ہنستی مسکراتی شرارتی آنکھوں سے تادیر ٹکٹکی باندھ کر پیئر کو دیکھتا رہا۔ ''یہ جرمن بھی نرے کاٹھ کے الو ہیں۔'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے؟''

موسیو پیئر؟ چلیں، چھوڑیں، آئیں، ماسکو کی ارغوانی شراب کی ایک آدھ بوتل اور چکھیں۔ ٹھیک؟ موریل گرم کر دے گا۔ موریل؟'' اس نے شگفتگی سے آواز دی۔

موریل موم بتیاں اور انگوری شراب کی بوتل لے آیا۔ موم بتی کی روشنی میں جب کپتان کی نظر پیئر کے چہرے پر پڑی، اسے اپنے ہم نشیں کے چہرے پر اندوہ و تکلیف کے آثار نظر آئے اور وہ بہت حیران ہوا۔ غام بال متفکر ہو گیا اور اس کے دل میں سچی ہمدردی کے جذبات امنڈ آئے۔ وہ پیئر کے قریب آیا اور اس کے اوپر جھک گیا۔

''نصیبِ دشمناں، یہ اداسی کیسی؟'' اس نے پیئر کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے کہا۔ ''کیا اس خادم سے کوئی گستاخی ہو گئی؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا آپ کو مجھ سے کوئی شکایت ہے؟'' اس نے پیئر سے پوچھا۔ ''شاید اس کا سبب موجودہ صورت حال ہے؟''

پیئر نے کوئی جواب نہ دیا لیکن اس نے مشفقانہ انداز سے فرانسیسی کو دیکھا۔ اسے اس کے چہرے پر جو ہمدردی کی جھلک دکھائی دی تھی، اس نے اس کا دل موم کر دیا تھا اور وہ خوش ہو گیا۔

''Parole d' honneur*، میں آپ کا جو ممنون احسان ہوں، اس کا تو ذکر ہی کیا، مجھے آپ واقعی پسند ہیں۔ میرے لائق کوئی خدمت؟ آپ حکم فرمائیں، بندہ حاضر ہے۔ میں آپ کی خاطر جان بھی دے سکتا ہوں۔ میں یہ سب کچھ دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ رہا ہوں!'' اس نے اپنی چھاتی کو ٹھونکتے ہوئے کہا۔

''شکریہ!'' پیئر بڑبڑایا۔

کپتان نے اسے اسی طرح ہمہ تن انہماک سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے کہا جس طرح اس نے اس وقت اسے دیکھا تھا جب اس نے ''پناہ گاہ'' کی جرمن معلوم کرنا چاہا تھا اور اچانک اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

''خیر، اس صورت میں آپ کے ساتھ دوستی کا جام پینا چاہتا ہوں!'' اس نے شگفتہ روئی سے کہا اور وہ دو گلاسوں میں انگوری شراب انڈیلنے لگا۔

پیئر نے گلاس پکڑا اور غٹا غٹ چڑھا گیا۔ غام بال نے بھی اپنا گلاس خالی کر دیا۔ اس نے ایک بار پھر پیئر کا ہاتھ دبایا اور میز پر کہنی ٹکا دی۔ اس کے رویے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ متفکر اور مغموم ہے۔

''ہاں، میرے دوست، اس نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا۔ ''قسمت کی دیوی من موجی ہے، گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آیا ہو گا کہ میں ایک روز فوج کی ملازمت اختیار کروں گا اور بونا پارٹ کے، جیسا کہ ہم انھیں ان دونوں کہا کرتے تھے، ڈریگونوں کا کپتان بن جاؤں گا۔ تاہم دیکھ لیں، میں ان کی معیت میں یہاں ماسکو میں موجود ہوں۔ mon cher، میں یہ عرض کر دوں،'' اس نے ایک ایسے شخص کے، جو لمبی کتھا سنانے کی تیاریاں کر رہا ہو، گمبھیر اور جچے تلے لہجے میں کہا، ''کہ ہمارا خاندان فرانس کے قدیم ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے۔''

---

*قسم ہے مجھے اپنی عزت کی۔

اس نے جس صاف گو، بے ریا، بے تصنع اور بھولے بھالے انداز سے پیئر کو اپنے اسلاف، بچپن، لڑکپن اور شباب، اپنے عزیز و اقارب اور اپنے خانگی اور مالی معاملات کی کہانی سنائی، وہ صرف کوئی فرانسیسی ہی بیان کر سکتا ہے — اس بیان میں لاریب "ma pauvre mere"* اہم کردار ادا کر رہی تھی۔

''لیکن یہ سب چیزیں زندگی کا محض ماحول فراہم کرتی ہیں۔ اصل چیز محبت ہے — محبت! کیوں موسیو پیئر، میں نے ٹھیک کہانا؟'' اس کی شگفتگی میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ ''ایک اور گلاس؟''

پیئر ایک بار پھر اپنا گلاس غٹا غٹ پی گیا اور اس نے تیسری مرتبہ اپنا گلاس بھر لیا۔

"Oh, les femmes, les femmes!"** اور کپتان نم ناک آنکھوں سے پیئر کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے اور اپنی محبتوں اور معاشقوں کے قصے بیان کرنے لگا۔

ایک تو کپتان ویسے ہی خوب رو تھا، اس کے چہرے پر اطمینان و دل جمعی جھلک رہی تھی اور اوپر سے خواتین کے ذکر پر اس کا لب و لہجہ والہانہ مسرت اور جوش و خروش سے معمور تھا۔ ان سب باتوں سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے معاشقوں کی تعداد اچھی خاصی ہو گی اور واقعتاً یہ تعداد کافی زیادہ تھی۔ اگرچہ اس کے معاشقوں کی تمام کہانیوں پر وہ شہوت پرستی، جس میں فرانسیسیوں کو محبت کی مخصوص دلکشی اور شعریت نظر آتی ہے، سایہ فگن تھی، تاہم اس نے اپنی کہانی کچھ اس انداز سے سنائی جیسے اسے سو فیصدی یقین ہو کہ اس کی ذات ہی وہ واحد ذات تھی جس نے محبت کی تمام لذتوں کو پرکھا، چکھا اور جوان سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوئی تھی، اور اس نے عورتوں کے سراپے کچھ ایسے رجھا لینے والے انداز سے بیان کیے کہ پیئر پوری دلچسپی سے سنتا رہا۔

صاف ظاہر تھا کہ جس محبت (L'amour) کا فرانسیسی اتنے جوش و خروش سے ذکر کر رہا تھا، وہ ڈو نادان اور سیدھی سادی محبت نہیں تھی جو پیئر نے کبھی اپنی بیوی کے لیے محسوس کی تھی اور نہ یہ وہ رومانی محبت تھی (جس کے شعلوں کو وہ ابھی تک ہوا دے رہا تھا) جو وہ نتاشا کے لیے محسوس کرتا تھا۔ غام بال ان دونوں انواع کی محبتوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ اس کے نزدیک ان میں سے ایک اجڈ گنواروں کا خاصہ تھی اور دوسری گوڑھ مغزوں کا۔ فرانسیسی کی نظروں میں جو l'amour قابل تحسین تھی، وہ اصلاً اس کے عورت کے ساتھ غیر فطری تعلقات اور عدم مطابقتوں کے اجتماع پر مشتمل تھی اور اس کے خیال میں یہی چیز جذبے کو صحیح دلکشی بخشتی تھی۔

چنانچہ اس نے ایک پینتیس سالہ فسوں ساز مارکیز[42] کے ساتھ اپنے معاشقے کی رقت انگیز داستان بیان کی۔ موصوف نے صرف مارکیز کے ساتھ عشق پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس نے سحر آفریں مارکیز کی چندے آفتاب چندے ماہتاب سترہ سالہ بھولی بھالی اور معصوم دختر کو بھی اپنے دام الفت میں گرفتار کر لیا۔ ماں بیٹی ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر اسے سر آنکھوں پر بٹھاتیں اور دونوں میں اسے اپنی طرف راغب کرنے کے لیے

---

* میری بے چاری اماں!

** اف، عورتیں، عورتیں۔

برابر کی دوڑ لگی ہوئی تھی۔ انجام کار ماں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس نے اپنے ہاتھوں اپنی محبت کی چتا جلائی اور شادی کے لیے اپنی بیٹی اپنے عاشق کو پیش کر دی۔ اگر چہ یہ سارا معاملہ ماضی کی بھولی بسری یاد بن چکا تھا لیکن اب بھی اس کے ذکر سے کپتان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پھر اس نے ایک اور واقعہ سنایا۔ اس میں خاوند نے عاشق کا اور خود اس نے۔۔۔ جو کہ عاشق تھا۔۔۔ خاوند کا کردار سنبھال لیا تھا۔ اس کے بعد تو قصوں کا طومار بندھ گیا اور اس نے جرمنی کی، جہاں ''پناہ گاہ'' کو unter kunft کہتے ہیں، جہاں خاوند Sauer kraut[43] کھاتے ہیں اور جہاں کی دوشیزاؤں کے بال کچھ زیادہ ہی سنہری ہوتے ہیں، یادیں تازیں کرتے ہوئے چند ظریفانہ حکایات سنائیں۔

اور آخر میں اس نے پولینڈ میں اپنی تازہ ترین مہم کا قصہ سنایا۔ یہ قصہ اس کے ذہن میں ابھی تک پوری طرح محفوظ تھا۔ جب وہ یہ سنا رہا تھا، اس کا چہرہ تمتما رہا اور وہ بار بار ہاتھوں سے اشارے کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ اس نے کسی طرح ایک پولستانی کی جان بچائی تھی (جانیں بچانے کے واقعات کپتان کی کہانیوں کی بکثرت آتے تھے۔) پولستانی نے اپنی سحر ساز زوجہ، جو بہ باطن پیرس پر فریفتہ تھی، اس کی تحویل میں دے دی اور خود فرانسیسی فوج میں بھرتی ہو گیا۔ کپتان خوش قسمت تھا۔ سحر ساز پولستانی خاتون اس کے ساتھ فرار ہونا چاہتی تھی مگر کپتان دریا دل نکلا۔ اس نے ان الفاظ کے ساتھ کہ ''میں نے آپ کی جان بچائی تھی اور اب آپ کی عزت بھی لوٹا رہا ہوں!'' اسے اس کے شوہر کو واپس کر دیا۔ یہ الفاظ دہرانے کے بعد کپتان نے اپنے آنسو پونچھے اور اپنے آپ کو زور سے جھٹکا دیا جیسے وہ اس کمزوری کو، جو اس رقت انگیز یاد کے ساتھ اس پر غالب آ رہی تھی، فراموش کر دینا چاہتا ہو۔

جب رات خاصی گزر چکی ہو اور مے آتشیں بھی اپنا رنگ دکھا رہی ہو، ایسے میں مردوں کا جیسا کہ اکثر وتیرہ ہوتا ہے، پیئر بھی کپتان کی باتیں سنتا رہا اور جو کچھ اس سے کہا جا رہا تھا، اگر چہ وہ اسے سن اور سمجھ رہا تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ اپنی ذاتی یادوں میں کھویا رہا، جو کسی وجہ سے ایکا ایکی اس کے ذہن میں یلغار کرنے لگی تھیں۔ معاشقوں کی یہ داستانیں سنتے سنتے اسے غیر متوقع طور پر نتاشا کے ساتھ اپنی محبت کی یاد آنے لگی۔ اس کے ساتھ مناظر کا ایک سلسلہ اس کے ذہن میں ابھرنے لگا اور وہ دل ہی دل میں ان مناظر کا عام بال کے قصوں کے ساتھ موازنہ کرنے لگا۔ جب کپتان معاشقے اور فرض کے مابین کشمکش بیان کرنے لگا، سخاریف مینار کے قریب اپنی مرکز محبت کے ساتھ آخری ملاقات کی ذرا ذرا تفصیل پیئر کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس وقت اس ملاقات نے اس پر کوئی خاص اثر نہیں چھوڑا تھا۔۔۔ اور وہ دن اور یہ دن، اس نے اس کے بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا، لیکن اب اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ ملاقات ایک نوع کی شعریت اور اہمیت سے مملو تھی۔

''پیوتر کرلووچ، ادھر آئیں، ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے۔'' اس کے یہ الفاظ اب بھی اس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ اسے اس کی آنکھیں، اس کی مسکراہٹ، اس کی سفری ٹوپی اور اس کے نیچے اس کے پریشان بالوں کی لٹ دکھائی دے رہی تھی۔۔۔ اور اسے ان تمام چیزوں میں کوئی ایسی بات، جو کسی نہ کسی طرح رقت انگیز اور حسرت ناک تھی، نظر آ رہی تھی۔

سحر ساز پولستانی خاتون کا قصہ سنانے کے بعد کپتان نے پیئر سے سوال کیا: ''کیا آپ کو بھی کبھی اپنی محبت کی خاطر یوں اپنی بھینٹ دینے کی تحریک ہوئی ہے؟ یا قانونی شوہر کے ساتھ رقابت کا کوئی تجربہ ہوا ہے؟''

پیئر کے سامنے یہ سوال چیلنج بن کر آیا۔ اس نے اپنا سر اٹھایا اور وہ اچانک ان خیالات کو، جن سے اس کا ذہن معمور تھا، بیان کرنے کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ وہ بالتفصیل بتانے لگا کہ عورت کے ساتھ محبت کے متعلق اس کے تصورات قدرے مختلف ہیں۔ اس نے بتایا کہ اس نے اپنی ساری زندگی میں صرف ایک عورت کے ساتھ محبت کی ہے اور وہ اب بھی صرف اسی کے ساتھ محبت کرتا ہے لیکن وہ کبھی اس کی نہیں ہو سکتی۔

"tiensl"* کپتان نے اظہار تعجب کیا۔

تب پیئر نے اسے بتایا کہ وہ کس طرح اوائل شباب سے اس عورت کے ساتھ محبت کرتا چلا آیا ہے لیکن وہ کبھی اسے اپنا بنانے کے متعلق سوچنے کا حوصلہ نہ کر سکا کیونکہ وہ بالکل ہی نوخیز ہے اور رہا وہ خود، وہ ناجائز اولاد تھا اور خاندانی نام سے محروم۔ بعدازاں جب اسے نام بھی مل گیا اور ڈھیروں دولت بھی، وہ پھر بھی اس کے بارے میں سوچنے کی جرأت نہ کر سکا کیونکہ وہ اس سے بے پناہ پیار کرتا ہے اور اسے تمام مخلوق، بالخصوص اپنے آپ سے، بلندتر سمجھتا ہے۔

جب پیئر اتنا کچھ کہہ چکا۔ اس نے کپتان سے پوچھا کہ آیا وہ اس کی بات سمجھ رہا ہے۔

کپتان نے کچھ اس قسم کا عندیہ دیا جس کا مفہوم یہ بنتا تھا کہ وہ بھلے اس کی بات نہ سمجھتا ہو لیکن پیئر سے اس کی یہی التجا ہے کہ وہ اپنی کہانی جاری رکھے۔

''افلاطونی محبت ـــ شیخ چلی کے منصوبے...'' وہ بڑبڑایا۔

یہ اس شراب کا اثر تھا، جو اس نے پی تھی، صاف گوئی کی انگیخت یا یہ خیال کہ یہ آدمی ان اشخاص کو، جن کا اس کہانی سے تعلق بنتا تھا، نہ جانتا ہے اور نہ کبھی جان سکے گا، یا ان تمام باتوں کا مجموعی نتیجہ تھا، بہر حال واقعہ یہ ہے کہ پیئر کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی۔ مے نوشی سے اس کی زبان میں قدرے لکنت ضرور آ گئی تھی اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کی روشن و تاباں آنکھیں دور کہیں ماضی میں جھانک رہی ہیں لیکن وہ بولتا چلا گیا اور اپنی پوری داستان حیات سناتا رہا: اپنی شادی، نتاشا کی اس کے بہترین دوست کے ساتھ محبت، نتاشا کی اُس کے ساتھ بے وفائی اور نتاشا کے ساتھ خود اس کے اپنے سیدھے سادے تعلقات، اس نے کچھ بھی نہ چھپایا بلکہ عام بال کے زور دینے پر اس نے وہ دوسری باتیں ـــ معاشرے میں اپنا مقام بلکہ اپنا نام بھی ـــ جو ابتدا میں اس نے پردۂ اخفا میں رکھنے کی کوشش کی تھی، اگل دیں۔

پیئر کی کہانی میں کپتان کو کسی بھی دوسری چیز کی نسبت جس بات نے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ یہ حقیقت تھی کہ وہ بے حد امیر کبیر شخص تھا، ماسکو میں اس کے دو محل نما مکانات تھے اور پھر بھی وہ ماسکو سے فرار ہوئے بغیر یہ

---

* واقعی؟

سب کچھ تیاگ چکا تھا، اس نے صرف اپنا نام اور معاشرے میں اپنا مقام چھپایا تھا۔

رات کافی بیت چکی تھی۔ وہ دونوں اٹھے اور باہر گلی میں نکل گئے۔ شب نیم گرم اور قدرے روشن تھی۔ مکان کے بائیں طرف پیوترو کا سٹریٹ میں پہلی آگ کی، جو ماسکو میں اچانک بھڑک اٹھی تھی، لو نظر آ رہی تھی۔ دائیں جانب دور آسمان پر اولیس راتوں کا چاند معلق تھا اور فلک کی دوسری جانب وہ دم دار ستارہ، جو پیئر کے ذہن میں اس کی محبت کے ساتھ منسلک تھا، اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک رہا تھا۔ گیراسم، باورچی اور دو فرانسیسی گیٹ پر کھڑے آپس میں چہلیں کر رہے اور ہنس رہے تھے۔ وہ دو مختلف زبانوں میں گفتگو کر رہے اور ایک دوسرے کی بات قطعاً سمجھ نہیں رہے تھے، پھر بھی وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ شہر میں جو آگ جل رہی تھی، وہ اس کی لو دیکھ رہے تھے۔

وسیع و عریض شہر میں کہیں دور، بہت دور آگ لگی ہوئی تھی لیکن اتنے فاصلے پر وہ بالکل معمولی معلوم ہو رہی تھی اور اس سے قطعاً یہ اشارہ نہیں مل رہا تھا کہ یہ بہت بڑے خطرے کی علامت ہے۔

بلند و بالا، ستاروں سے مزین، آسمان، چاند، دم دار ستارہ اور آگ کی لو، پیئر نے یہ سب کچھ غور سے دیکھا اور اسے اپنے اندر مسرت بخش اور نرم و نازک جذبہ انگڑائیاں لیتا محسوس ہوا۔ ''یہ سب کچھ کتنا خوبصورت اور دل آویز ہے! انسان کو اس سے زیادہ اور کیا چاہیے؟'' اس نے سوچا۔ اور اچانک اسے اپنا عزم یاد آ گیا، اس کا سر گھومنے لگا اور وہ خود کو اتنا کمزور و ناتواں محسوس کرنے لگا کہ وہ باڑ کے ساتھ کھڑا ہو گیا کہ کہیں وہ نیچے نہ گر پڑے۔

اپنے نئے دوست سے اجازت چاہے بغیر وہ گیٹ سے پیچھے ہٹنے لگا، لڑکھڑاتے قدموں چلتا اپنے کمرے میں آیا، صوفے پر لیٹا اور پلک جھپکنے میں نیند کی آغوش میں چلا گیا۔

30

دو ستمبر کو جو اولین آگ بھڑکی، ماسکو کے بھگوڑے شہریوں اور پسپائی اختیار کرنے والے فوجیوں کو اس کی لو مختلف سڑکوں سے نظر آئی۔ اس موقع پر ان کے قلوب میں جو جذبات ابھرے، وہ بھی متنوع اقسام کے تھے۔

رستوفوں اور ان کے قافلے نے وہ رات ماسکو سے چودہ میل دور میتش چی میں گزاری۔ وہ یکم ستمبر کو اتنی تاخیر سے روانہ ہوئے تھے، سڑک پر فوجیوں اور گاڑیوں کا اتنا جمگھٹا تھا اتنی زیادہ اشیا بھول گئی تھیں اور انھیں لانے کے لیے ملازموں کو واپس بھیجنا پڑا تھا کہ انھوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ پہلی رات ماسکو سے صرف تین میل دور کسی مقام پر گزاریں گے۔ اگلی صبح وہ دیر سے جاگے اور سفر کے دوران میں انھیں بار بار تاخیر کا سامنا کرنا پڑا چنانچہ وہ میتش چی کلاں سے آگے نہ جا سکے۔ اس رات دس بجے تک رستوف اور مجروحین، جو ان کے ساتھ سفر کر رہے تھے، اس قصبے کے مکانوں اور صحنوں میں ڈیرے جما چکے تھے۔ اپنے آقاؤں کی ضروریات فراہم کرنے کے بعد رستوفوں کے ملازموں اور کوچوانوں، اور زخمی افسروں کے اردلیوں نے کھانا کھایا، گھوڑوں کو دانہ چارہ ڈالا اور پورچوں میں آ گئے۔

قریبی مکان میں رایف سکی کا ایجوٹنٹ لیٹا ہوا تھا۔ اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ چکی تھی۔ درد کی شدت نے

اسے بے حال کر دیا تھا اور وہ مسلسل ہائے وائے کر رہا تھا۔ خزانی شب کی تاریکی میں اس کی کراہیں مہیب آوازیں پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے گزشتہ رات رستوفوں کے ساتھ ایک ہی صحن میں گزاری تھی۔ کاؤنٹس کا دعویٰ تھا کہ اس کی چیخ پکار کی وجہ سے وہ پلک تک جھپکا نہیں سکی تھی اور وہ میتش چی میں نسبتاً کم آرام دہ مکان میں محض اس لیے منتقل ہوئی ہے کیونکہ وہ زخمی شخص سے اپنا پنڈ چھڑانا اور اس سے دور رہنا چاہتی ہے۔

اچانک رات کی تاریکی میں ایک ملازم کو اونچی کوچ کے اوپر، جو پورچ کے سامنے کھڑی تھی، ایک اور آگ کی لو دکھائی دی۔ ایسی ہی ایک لو پہلے ہی خاصی دیر سے نظر آ رہی تھی اور ہر شخص کو معلوم ہو گیا تھا کہ میتش چی خُرد جل رہا ہے— ان کا خیال تھا کہ اسے مامانوف کے قازقوں نے آگ لگائی ہوگی۔

"دوستو، ادھر دیکھو، ایک اور آگ!" اردلی نے توجہ دلائی۔

سبھی کی نگاہیں ادھر مبذول ہو گئیں۔

"ہاں، سنا ہے کہ مامانوف کے قازقوں نے میتش چی خُرد کو نذر آتش کر دیا ہے۔"

"نہیں۔ یہ میتش چی خُرد نہیں ہے! وہ تو بہت دور ہے۔"

"یہ لازماً ماسکو ہوگا!"

دو آدمی پورچ سے باہر نکلے، انھوں نے کوچ کا چکر کاٹا اور دوسری طرف سیڑھیوں پر بیٹھ گئے۔

یہ آگ تو بہت دور ہے اور بائیں طرف نظر آ رہی ہے۔ کیوں؟ میتش چی اُدھر ہے اور یہ بالکل دوسری سمت ہے۔"

کئی مزید اشخاص پہلے دو کے پاس آ گئے۔

"دیکھو، کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے!" ایک نے کہا۔ "دوستو، یہ آگ ماسکو میں ہی کہیں لگی ہے— یہ یا تو سُوش چیوسکی محلے میں لگی ہوئی ہے یا پھر رگوژسکی میں۔"

کسی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور کچھ دیر بھی چپ چاپ اس نئی زبردست آگ کو، جو دُور فاصلے پر بھڑک رہی تھی، ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔

کاؤنٹ کا وردی پوش ملازم دانیلو تیریئنچ (جسے سب بڑے میاں کہتے تھے)، اس گروہ کے پاس آیا اور چلا کر مِشکا سے کہنے لگا:

"ارے نکھٹو، نکھد، یہ تو منہ پھاڑے کیا دیکھ رہا ہے؟ ...ابھی کاؤنٹ آواز دیں گے اور وہاں بندہ ہے نہ پرندہ۔ جاؤ اور جا کر کاؤنٹ کے کپڑے جھاڑ پونچھ کر تیار رکھو۔"

"میں تو پانی لینے باہر آیا تھا— "مشکا نے کہا۔

"دانیلو تیریئنچ، کیا خیال ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ آگ ماسکو میں لگی ہوئی ہے۔ ہے نا؟" ایک خدمت گار نے پوچھا۔

دانیلو تیرینچ نے کوئی جواب نہ دیا اور کافی دیر تک بھی خاموش رہے۔ شعلے جھلملاتے رہے اور روشنی دور تک پھیل گئی۔

''خداوند، رحم فرمائے... ہوا اور یہ خشک موسم...'' ایک اور شخص نے کہا۔

''دیکھو، کتنی تیزی سے پھیل رہی ہے۔ اف، خداوند! اب تو کوے بھی اڑنے لگے ہیں۔ خداوند، ہم غریب گنہگاروں پر رحم فرما!''

''وہ اسے بجھادیں گے، ڈرومت!''

''اسے کون بجھائے گا؟'' دانیلو تیرینچ، جواب تک خاموش کھڑا تھا، کہتا سنائی دیا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہے۔ ''بھائیو، یہ ماسکو ہے۔'' اس نے کہا۔ ''ہماری مادر ماسکو، سفید...'' اس کی آواز لڑکھڑا گئی اور وہ یک دم بوڑھے آدمیوں کی طرح سسکیاں لینے اور آنسو بہانے لگا۔

اور وہ جس خیرہ کن روشنی کو دیکھ رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے انھیں اسی کا انتظار تھا۔ آمین، دعاؤں کے الفاظ اور معمر کاؤنٹ کے وردی پوش ملازم کی سسکیاں سنائی دینے لگیں۔

31

وردی پوش ملازم اندر چلا گیا اور اس نے کاؤنٹ کو اطلاع دی کہ ماسکو جل رہا ہے۔ کاؤنٹ نے اپنا ڈریسنگ گاؤن پہنا اور خود دیکھنے باہر نکل آیا۔ سونیا اور مادام شوس، جنھوں نے ابھی تک اپنے لباس تبدیل نہیں کیے تھے، اس کے ساتھ تھیں۔ نتاشا اور کاؤنٹس اکیلی اندر رہ گئیں۔ (پیتیا اب خاندان کے ساتھ نہیں تھا۔ وہ اپنی رجمنٹ کے ساتھ، جو ترونٹستا[44] کی طرف کوچ کررہی تھی، آگے جاچکا تھا۔)

کاؤنٹس نے جب سنا کہ ماسکو شعلوں کی لپیٹ میں آچکا ہے، وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نتاشا القونوں کے نیچے بینچ پر (اس جگہ جہاں وہ آمد پر ڈھیر ہوگئی تھی) بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ سامنے خلا میں گھور گھور کر دیکھ رہی تھی۔ اس کے باپ نے جو کچھ کہا تھا، اس پر اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی، اس کا دھیان تین مکان پرے ایجوٹنٹ کی مسلسل ہائے وائے پر لگا ہوا تھا۔

''کتنی بھیانک آگ ہے!'' سونیا نے صحن سے واپس آکر کہا۔ وہ سردی اور خوف سے کپکپا رہی تھی۔ ''مجھے یقین ہے کہ ماسکو جل کر بھسم ہوجائے گا۔ آسمان پر مہیب سرخی چھائی ہوئی ہے۔ نتاشا، تم بھی دیکھو۔ تمھیں کھڑکی میں سے سب کچھ نظر آجائے گا۔'' اس نے اپنی کزن سے کہا۔ وہ بڑے صبر و تحمل سے اس کا دھیان بٹانے کی کوشش کررہی تھی۔

لیکن نتاشا اس کی جانب یوں تک رہی تھی جیسے اس کی سمجھ میں بالکل نہ آرہا ہو کہ اس سے کیا کہا جارہا ہے اور اس نے ایک بار پھر اپنی نگاہیں اس کونے پر، جہاں سٹوو پڑا تھا، جمادیں۔ حواس باختگی کی یہ کیفیت اس پر صبح سویرے

سے ہی طاری تھی جب سونیا نے کسی ناممکن التوجیہہ سبب کے باعث، جس پر کاؤنٹس کو تعجب بھی ہوا اور جھلاہٹ بھی آئی، نتاشا کو پرنس آندرے کے زخموں اور ان کے ساتھ سفر کرنے والے افسروں کی قطار میں اس کی موجودگی کے متعلق بتانا ضروری سمجھا۔ کاؤنٹس کو سونیا پر جو غصہ آیا، اتنا شاید کبھی کسی پر نہیں آیا ہوگا۔ سونیا روتی اور معافیاں مانگتی رہی اور اب، جیسے وہ اپنے جرم کی تلافی کرنا چاہتی ہو، وہ پہلے کی نسبت دوچند اپنی کزن کی طرف متوجہ تھی۔

''نتاشا، دیکھو، کتنی ہول ناک آگ لگی ہے!'' اس نے کہا۔

''کیا جل رہا ہے؟'' نتاشا نے پوچھا۔ ''ارے ہاں، ماسکو۔''

اور اس نے اپنا رخ یوں کھڑکی کی طرف کر لیا جیسے وہ سونیا سے جان بھی چھڑانا چاہتی ہو اور اس کے جذبات کو ٹھیس بھی نہ پہنچانا چاہتی ہو لیکن اس کے دیکھنے کا انداز کچھ اس قسم کا تھا کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکتی اور اس کے بعد اس نے اپنی سابقہ وضع دوبارہ اختیار کر لی۔

''لیکن تم نے یہ دیکھی تو ہے نہیں!''

''ہاں، میں واقعی دیکھ چکی ہوں۔'' نتاشا نے کچھ ایسے لہجے سے کہا جیسے وہ ان سے التجا کر رہی ہو کہ وہ اسے تنگ نہ کریں اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔

کاؤنٹس اور سونیا پر واضح ہو گیا کہ نتاشا جس کیفیت میں سے گزر رہی ہے، اس میں ماسکو یا ماسکو کی آتش زنی اس کے لیے کوئی معانی نہیں رکھتی۔

کاؤنٹ واپس آ گیا اور پارٹیشن کے پیچھے لیٹ گیا۔ کاؤنٹس نتاشا کے پاس پہنچی اور اس نے اپنے ہاتھ کی پشت اس کے سر پر پھیری۔ اس کی یہ عادت تھی کہ جب کبھی اس کی بیٹی کی طبیعت علیل ہوتی، وہ اسی طرح اس کا سر سہلایا کرتی تھی۔ پھر اس نے یہ دیکھنے کے لیے کہ کہیں اسے بخار تو نہیں، اپنے ہونٹ اس کی پیشانی پر رکھ دیے اور آخر کار وہاں بوسہ ثبت کر دیا۔

''تمھارا جسم یخ ہو رہا ہے۔ تم سر سے پاؤں تک کانپ رہی ہو۔ بہتر ہے کہ تم لیٹ جاؤ۔'' اس نے کہا۔

''لیٹ جاؤں؟ بہت اچھا، لیٹ جاتی ہوں۔ میں ابھی لیٹ جاتی ہوں۔'' نتاشا نے کہا۔

اس صبح جب نتاشا کو بتایا گیا کہ پرنس آندرے ان کے ساتھ سفر کر رہا ہے، اس نے ابتداً محض سوالات پوچھنے پر اکتفا کیا: وہ کہاں جا رہے ہیں؟ وہ کیسے زخمی ہوئے؟ ان کی حالت تشویش ناک ہے؟ کیا میں انھیں دیکھ سکتی ہوں؟ لیکن جب اسے بتایا گیا کہ وہ اسے نہیں دیکھ سکتی کیونکہ اسے خاصے گہرے زخم آئے ہیں تاہم اس کی زندگی کو کوئی خطرہ نہیں، اس نے سوالات پوچھنا بلکہ لب کشائی کرنا ہی بند کر دیا۔ صاف عیاں تھا کہ وہ جو کچھ اسے بتا رہے ہیں، اسے اس پر کوئی اعتبار نہیں اور اسے یہ یقین ہو چکا ہے کہ وہ گھما پھرا کر جس طرح بھی بات کرے، اسے یہی جوابات دیے جائیں گے۔ وہ سارا دن کوچ کے کونے میں ساکت اور چپ چاپ بیٹھی رہی تھی۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھیں جس انداز سے خلا کو گھورتی رہی تھیں، کاؤنٹس اس سے بخوبی آگاہ تھی اور اس سے بے حد خوف زدہ۔ اور

اب بھی وہ اسی انداز سے اس معمولی مکان میں بینچ پر بیٹھی تھی۔ وہ سر نیہوڑائے مغموم واداس کسی ادھیڑ بن میں مصروف تھی، کوئی منصوبہ بنا رہی تھی یا پہلے ہی کسی فیصلے پر پہنچ چکی تھی۔ اتنا تو کاؤنٹس جان گئی تھی لیکن یہ فیصلہ کیا تھا، اس کے بارے میں اسے کچھ بھی معلوم نہیں تھا اور یہی وہ چیز تھی جس سے اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا اور اسے خوف نے اپنے آہنی شکنجے میں جکڑ لیا تھا۔

''نتاشا، ڈارلنگ، کپڑے بدل لو اور میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔'' (صرف کاؤنٹس کے لیے پلنگ پر بستر بچھایا گیا تھا۔ مادام شوس اور دونوں لڑکیوں نے فرش پر گھاس بچھا کر لیٹنا تھا۔)

''نہیں، ماما، میں یہیں گھاس پر لیٹ جاؤں گی۔'' نتاشا نے بھنا کر جواب دیا۔ وہ اٹھی، کھڑکی کے پاس گئی اور اسے کھول دیا۔

ایجوٹنٹ کی ہائے وائے کھلی کھڑکی میں سے اور بھی واضح طور پر سنائی دینے لگی۔ اس نے اپنا سر جھکایا اور کھڑکی میں سے باہر نکالا۔ رات کی ہوا مرطوب تھی۔ کاؤنٹس نے دیکھا کہ وہ سسکیاں لے رہی ہے اور اس کے نازک اور مہین شانے بے طرح کانپ رہے ہیں۔ نتاشا کو معلوم تھا کہ جو شخص ہائے وائے کر رہا ہے، وہ پرنس آندرے نہیں ہے۔ اسے معلوم تھا کہ جس احاطے میں وہ خود مقیم ہیں، اسی میں پرنس آندرے قیام پذیر ہے۔ وہ پورچ کی دوسری طرف کی عمارت میں تھا، لیکن اس پر ہول اور پیہم ہائے وائے سے اس کی اپنی سسکیاں نکلنا شروع ہو گئی تھیں۔ کاؤنٹس نے سونیا سے نگاہوں کا تبادلہ کیا۔

''لیٹ جاؤ، ڈارلنگ، لیٹ جاؤ، جانی، ڈارلنگ!'' کاؤنٹس نے نتاشا کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آؤ نا، اور یہاں پلنگ پر لیٹ جاؤ۔''

''جی ہاں، جی ہاں، ابھی آئی...'' نتاشا نے کہا اور وہ اپنے پیٹی کوٹ کے بند کھولنے لگی۔

جب وہ اپنا ڈریس اتار اور ڈریسنگ کوٹ پہن چکی، وہ بستر پر، جو فرش پر بچھایا گیا تھا، آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے باریک بالوں کی مینڈھی کندھے کے اوپر سے اگلی جانب جھٹکائی، اسے کھولا، اس کی لانبی، پتلی اور آزمودہ کار انگلیوں نے ان بالوں کو پھرتی اور مشاقی سے تین لڑوں میں تقسیم کیا، انھیں گوندھا اور مینڈھی دوبارہ باندھ دی۔ اس دوران میں اس کی گردن عادتاً دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں طرف گھومتی رہی لیکن اس کی بے چین، مضطرب اور پھٹی پھٹی نگاہیں اسی غیر متبدل شدت سے اپنے سامنے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہیں۔ جب وہ شبینہ لباس پہن چکی، وہ چپ چاپ گھاس کے اوپر بچھی چادر کے اس کنارے پر، جو دروازے کے قریب تر تھا، ڈھلک گئی۔

''نتاشا، تم درمیان میں لیٹ جاؤ۔'' سونیا نے کہا۔

''نہیں، میں یہیں ٹھیک ہوں۔'' نتاشا بڑبڑائی۔ ''تم بھی لیٹ جاؤ۔'' اس نے تاؤ کھا کر کہا اور اپنا منہ تکیے میں چھپا لیا۔

کاؤنٹس، مادام شوس اور سونیا نے عجلت سے اپنا اپنا لباس تبدیل کیا اور لیٹ گئیں۔ ایقونوں کے سامنے ننھا منا

لیمپ جل رہا تھا اور کمرے کو صرف وہی روشن کر رہا تھا۔ لیکن صحن میں اس آگ کی، جو ڈیڑھ میل دو میتش چی مُرد میں بھڑک رہی تھی، چکا چوند روشنی پھیلی ہوئی تھی اور ایجوٹنٹ کی لگاتار چیخ پکار کے علاوہ، جو ابھی تک سنائی دے رہی تھی، سڑک کے پار ایک مے کدے سے، جس میں ماما نوف کے قازق بزور شمشیر داخل ہو گئے تھے، نشے میں چور لوگوں کے غل غپاڑے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

نتاشا کافی دیر تک ان آوازوں کو، جو احاطے کے اندر اور باہر سے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، سُنتی اور بے حس و حرکت لیٹی رہی۔ پہلے اس نے اپنی اماں کو آہیں بھرتے، دعائیں مانگتے اور پلنگ کو اس کے نیچے چرچراتے، پھر مادام شوس کے جانے پہچانے سیٹیاں بجاتے خراٹوں اور سونیا کی مدھم سانسوں کی آوازیں سنیں۔ کاؤنٹس نے نتاشا کو آواز دی۔ نتاشا دم سادھے پڑی رہی۔

''ماما، میرا خیال ہے کہ وہ سو گئی ہے۔'' سونیا نے کانا پھوسی کی۔

مختصر خاموشی کے بعد کاؤنٹس نے پھر کچھ کہا لیکن اب کے کسی نے اسے جواب نہ دیا۔

کچھ دیر میں نتاشا کو اپنی اماں کی باقاعدہ سانسوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ اگرچہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا ننھا منا برہنہ پاؤں، جو لحاف سے باہر نکل گیا تھا، ننگے فرش پر یخ بستہ ہو گیا ہے، اس نے اپنی جگہ سے کوئی حرکت نہ کی۔

کسی شگاف میں کوئی جھینگر یوں چہچہا رہا تھا جیسے وہ کل عالم پر اپنی فتح کا جشن منا رہا ہو۔ دور فاصلے پر کسی مرغ نے بانگ دی اور قریب سے دوسرے کا جواب آیا۔ مے کدے میں شور و غل تھم گیا۔ صرف ایجوٹنٹ کی ہائے وائے سنائی دے رہی تھی۔ نتاشا اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''سونیا، سو گئی ہو؟... ماما؟'' اس نے زیرِ لب کہا۔

اسے لگا کہ کوئی بھاری بھرکم چیز زور زور سے مکان کی دیواروں سے ٹکرا رہی ہے اور اس کے یوں ٹکرانے سے تال دار آوازیں پیدا ہو رہی ہیں۔ یہ دراصل اس کے اپنے دل کی، جو دہشت، وحشت اور محبت سے پھٹا جا رہا تھا، بلند آہنگ دھڑکن تھی۔

اس نے دروازہ کھولا، دبے پاؤں دہلیز پار کی اور ٹھنڈی مرطوب زمین پر پاؤں رکھا۔ ٹھنڈی ہوا نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا اور تازہ دم محسوس کرنے لگی۔ راستہ ٹٹولتے اس کا برہنہ پاؤں ایک خفتہ شخص سے جا ٹکرایا۔ وہ اس کے اوپر سے کود گئی اور اس نے اس مکانچے کا، جس میں پرنس آندرے لیٹا ہوا تھا، دروازہ کھولا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ دور کونے میں پلنگ کے قریب، جس پر کوئی آدمی لیٹا ہوا تھا، بینچ پر چربی کی موم بتی پڑی تھی۔ اس کا فتیلہ خاصا موٹا تھا اور سلگ رہا تھا۔

نتاشا صبح سے ہی، جب اسے پرنس آندرے کے زخموں اور اس کی وہاں موجودگی کے بارے میں بتایا گیا تھا، ٹھان چکی تھی کہ خواہ کچھ بھی ہو، وہ اس سے ملاقات ضرور کرے گی۔ وہ یہ تو نہیں جانتی تھی کہ یہ ملاقات کیوں ضروری

ہے لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ یہ ملاقات خود اس کے اپنے لیے باعث اذیت ہوگی اور اس سے اسے اور بھی یقین ہوگیا کہ یہ لابدی ہے۔

وہ سارا دن یہ امید پالیتی رہی کہ وہ اس رات اس سے ملاقات کر سکے گی لیکن جب وہ ساعت آ پہنچی، اس کے دل پر دہشت طاری ہوگئی کہ پتا نہیں اسے وہاں دیکھنے کو کیا ملے۔ اس کی صورت مسخ ہو چکی تھی، کس حد تک؟ اس کا باقی کیا بچا ہے؟ کیا وہ اس ایجوٹنٹ کی طرح پیہم آہ و بکا کر رہا ہوگا؟ ہاں، وہ بالکل اسی کی مانند ہوگا۔ اس کے تخیل میں وہ مجسم دہشت ناک آہ و بکا تھا۔ جب اسے کونے میں میں غیر واضح صورت دکھائی دی اور اس نے غلطی سے اس کے گھٹنوں کو، جو کمبل کے نیچے اوپر اٹھے ہوئے تھے، کندھے سمجھ لیا، اس کے ذہن میں لرزہ خیز جسم کا خاکہ ابھرا اور وہ دہشت کے عالم میں مانندِ بت ساکت کھڑی رہی۔ لیکن ایک اضطراری جذبے نے، جسے جھٹکنا اس کے بس کی بات نہیں تھی، اسے آگے گھسیٹ لیا۔ اس نے پہلے ایک محتاط قدم آگے بڑھایا اور پھر دوسرا۔ اس نے اپنے آپ کو کمرے کے درمیان میں پایا۔ وہاں سفری سامان کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ایقونوں کے نیچے بینچوں پر ایک اور شخص — یہ تموخن تھا — لیٹا ہوا تھا۔ دو دوسرے — ڈاکٹر اور وردی پوش ملازم — فرش پر دراز تھے۔

وردی پوش ملازم اٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے زیر لب کچھ کہا۔ تموخن، جو زخمی ٹانگ میں درد کی وجہ سے جاگ رہا تھا، سفید شمیز، ڈریسنگ کوٹ اور شبینہ ٹوپی پہنے لڑکی کے اجنبی ہیولے کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ وردی پوش ملازم کی خواب آلود اور خوف زدہ پکار — "کیا ہے؟ کیا چاہتی ہو؟" — نے محض نتاشا کی رفتار بڑھانے کا کام کیا اور وہ بہ سرعت اس جسم کی طرف بڑھی جو کونے میں پڑا تھا۔ اگر چہ وہ جسم انسانی شکل وصورت سے اس قدر غیر مشابہ تھا کہ اسے دیکھ کر دل پر ہول طاری ہوتا تھا، وہ اسے دیکھنے پر تلی ہوئی تھی۔ وہ وردی پوش ملازم سے آگے نکلی، موم بتی کا گل نیچے گرا اور اسے پرنس آندرے واضح طور پر نظر آ گیا۔ وہ ہاتھ پھیلائے بستر پوش پر لیٹا ہوا تھا اور بالکل ویسا ہی نظر آ رہا تھا جیسا وہ اسے ہمیشہ دیکھتی رہی تھی۔

وہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا کہ وہ ہمیشہ ہوا کرتا تھا۔ تاہم بخار کی وجہ سے اس کے چہرے کی تمتماہٹ، اس کی آنکھوں کی، جو وفورِ مسرت سے اس پر گڑی ہوئی تھیں، چمک دمک، اور خاص طور پر اس کی گردن کی، جو اس کی شبینہ قمیص کی نچلی جانب ڈھلکے ہوئے کالر کے اوپر نظر آ رہی تھی، بچوں کی سی ملائمت نے اسے نرالے انداز سے وہ طفلانہ معصومیت عطا کر دی تھی جو نتاشا نے اس سے پہلے اس میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ اس کے قریب پہنچی اور پھرتیلے، لچکیلے اور دوشیزانہ انداز سے اس کے سامنے دوزانو ہوگئی۔

وہ مسکرایا اور اس نے اپنا ہاتھ اس کی جانب بڑھا دیا۔

32

جس روز بارودینو کے میدان جنگ کے ڈریسنگ سٹیشن میں پرنس آندرے کو دوبارہ ہوش آیا، اس کے بعد سات ایام

گزر چکے تھے۔ اس تمام مدت کے دوران میں وہ تقریباً مسلسل نیم بے ہوش رہا تھا۔ ڈاکٹر کی رائے کے مطابق اس کے بخار اور انتڑیوں کی سوجن کی وجہ سے، جو زخمی ہو گئی تھیں، یہ بات یقینی ہو گئی تھی کہ وہ جان بر نہیں ہو سکے گا۔ تاہم ساتویں روز اس نے مزے لے لے کر چائے کے ساتھ توس کھایا اور ڈاکٹر نے دیکھا کہ اس کا بخار کم ہو گیا ہے۔ وہ اس صبح دوبارہ ہوش میں آیا تھا۔ ان کی ماسکو سے روانگی کے بعد پہلی رات خاصی گرم تھی اور پرنس آندرے کی لاش میں ہی لیٹا رہا تھا لیکن میتش چی میں اس نے خود تقاضا کیا تھا کہ اسے مکان کے اندر لے جایا جائے اور چائے پلائی جائے۔ اٹھا کر لے جائے جانے کے دوران میں اسے جو اذیت پہنچی، اس نے اس کی چیخیں نکال دیں اور وہ دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ جب اسے عارضی قیام گاہ میں بستر پر لٹایا گیا، وہ کافی دیر آنکھیں موندے بے حس و حرکت لیٹا رہا۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور نرمی سے سرگوشی کی: ''چائے نہیں ملے گی؟'' اس نے روزمرہ کی اس معمولی تفصیل کو جو اس طرح یاد رکھا، اس سے ڈاکٹر ہکا بکا رہ گیا۔ اس نے پرنس آندرے کی نبض دیکھی اور اسے یہ دیکھ کر تعجب بھی ہوا اور افسوس بھی کہ یہ پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی ہے۔ وہ غیر مطمئن اس لیے تھا کیونکہ وہ تجربے سے جانتا تھا کہ پرنس آندرے زندہ نہیں رہ سکتا اور یہ کہ اگر اس کا اب انتقال نہ ہوا، اسے بعد میں پہلے کی نسبت زیادہ اذیت ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ پرنس آندرے کے ساتھ جو شخص سفر کر رہا تھا، وہ اس کی رجمنٹ کا سرخ ناک والا میجر تموخن تھا۔ وہ ماسکو میں اس کا ہم رکاب ہوا تھا۔ اسے بارودینو کی لڑائی میں ٹانگ پر زخم آیا تھا اور اس کے ساتھ اسے بھی لے جایا جا رہا تھا۔ ان کے ہمراہ ڈاکٹر، پرنس آندرے کا وردی پوش ملازم، اس کا کوچوان اور دو اردلی تھے۔

پرنس آندرے کو چائے پیش کی گئی۔ وہ اُسے بڑے شوق سے پیتا اور اپنی بے چین و مضطرب نگاہوں سے اپنے سامنے دروازے کی جانب دیکھتا رہا جیسے وہ کچھ سمجھنے یا یاد کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

''مجھے اور نہیں چاہیے۔ تموخن یہیں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

تموخن بینچ کے کنارے کے ساتھ ساتھ گھسٹتا اس کی طرف بڑھا۔

''یور ایکسی لینسی، میں یہاں ہوں۔''

''تمھارا زخم کیسا ہے؟''

''میرا؟ جناب، میں بالکل ٹھیک ہوں۔ مگر آپ کی طبیعت کیسی ہے؟''

پرنس آندرے دوبارہ سوچ بچار میں کھو گیا جیسے اپنا حافظہ کھنگال رہا ہو۔

''یہاں کوئی کتاب مل سکتی ہے؟''

''کیسی کتاب؟''

''اناجیل اربعہ۔ میرے پاس نہیں ہے۔''

ڈاکٹر نے وعدہ کیا کہ وہ یہ اس کے لیے کہیں سے ڈھونڈ لائے گا اور پرنس سے دریافت کرنے لگا کہ اب اس کی طبیعت کیسی ہے اور اسے کیا محسوس ہو رہا ہے۔ پرنس آندرے نے اس کے تمام سوالات کے جوابات ہوش مندی

لیکن بے دلی سے دیے۔ اس کے بعد اس نے کہا کہ چونکہ اسے بے کلی اور شدید درد ہو رہا ہے، اس لیے وہ چاہتا ہے کہ اس کے نیچے گاؤ تکیہ رکھ دیا جائے۔ ڈاکٹر اور وردی پوش ملازم نے اوورکوٹ، جس میں وہ لپٹا ہوا تھا، اوپر اٹھایا۔ اس کے زخم میں پیپ پڑ چکی تھی، کھال گل سڑ چکی تھی اور اس سے بساند خارج ہو رہی تھی۔ دونوں نے اس پر منہ بنایا۔ ڈاکٹر نے اس ہول ناک جگہ کا بغور معائنہ کیا۔ کسی چیز نے اسے سخت فکر مند کر دیا۔ اس نے مرہم پٹی میں چند تبدیلیاں کیں اور زخمی کو الٹا کر دیا۔ اس پر وہ بلبلانے لگا اور دوبارہ بے ہوش ہو گیا۔ اس پر ہذیانی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ان سے بار بار تقاضا کر رہا تھا کہ وہ فوراً کتاب لائیں اور اس کے تکیے کے نیچے رکھ دیں۔

''اس سے تمھارا کیا بگڑے گا؟'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''کہہ جو دیا کہ یہ میرے پاس نہیں ہے۔ جائیں نا، مہربانی فرمائیں اور لے آئیں۔ ایک منٹ کے لیے سہی لیکن میرے نیچے رکھ دیں۔'' وہ دل دوز آواز میں التجا کر رہا تھا۔

ڈاکٹر ہاتھ دھونے غلام گردش میں چلا گیا۔

''تم لوگوں میں ضمیر نام کی کوئی شے باقی نہیں رہی،'' اس نے وردی پوش ملازم سے کہا، جو اس کے ہاتھوں پر پانی انڈیل رہا تھا۔ ''ادھر میں نے ایک آدھ سیکنڈ کے لیے اپنی آنکھ ادھر ادھر کی نہیں۔۔۔اور ادھر تم لوگوں نے اسے جھٹ پٹ زخم پر لٹایا نہیں۔۔۔۔وہ اتنی اذیت میں مبتلا ہے کہ سمجھ میں آتا کہ وہ اسے برداشت کیسے کر رہا ہے!''

''خداوند یسوع مسیح کی قسم، میں یہی سمجھا کہ ہم نے ان کے نیچے کچھ رکھ دیا ہے۔'' وردی پوش ملازم نے کہا۔

پرنس آندرے کہاں تھا اور اس پر کیا بیتی تھی، اس کا احساس اسے پہلی مرتبہ اس وقت ہوا جب اس کی کالاش میتش چی رکی۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ کس طرح زخمی ہوا تھا۔ درد کے باعث وہ ایک بار پھر اس وقت بے ہوش ہو گیا تھا جب اسے اٹھا کر مکانچے کے اندر لے جایا جا رہا تھا۔ یہاں وہ دوبارہ ہوش میں آ گیا۔ جب وہ چائے پی رہا تھا، اس کے دوران میں اسے دوبارہ وہ سب کچھ، جو اس پر بیتا تھا، یاد آنے لگا۔ اسے انتہائی واضح طور پر وہ ساعت یاد آ گئی جب ڈریسنگ سٹیشن کے اندر ایک ایسے شخص کے، جس سے اسے شدید نفرت تھی، مصائب دیکھ کر اس کے ذہن میں نئے خیالات، جو مسرت کی نوید سنا رہے تھے، در آئے تھے اور یہ خیالات اگرچہ مبہم اور غیر واضح تھے لیکن انھوں نے ایک بار پھر اس کی روح پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسے یاد آیا کہ اب اس کے پاس مسرت کا نیا سرچشمہ ہے اور یہ کہ اس کی یہ مسرت کسی نہ کسی طور اناجیل اربعہ سے منسلک ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کتاب مانگی تھی۔ لیکن جس انداز سے اسے لٹایا گیا تھا، اس سے اسے تکلیف پہنچنا شروع ہو گئی تھی اور جب اسے دوبارہ الٹایا گیا، اس سے اس کا ذہن منتشر ہو گیا، اور صرف رات کے کامل سکوت میں وہ تیسری مرتبہ ہوش میں آیا۔ اس کے اردگرد تمام لوگ محوِ خواب تھے۔ غلام گردش کے پار کوئی جھینگر چہچہا رہا تھا۔ گلی میں کوئی شخص گانا گا رہا اور شور و غل کر رہا تھا۔ میز، الیقونوں اور دیواروں پر تل چٹے سرسرا رہے تھے۔ خزاں کی خاصی موٹی مکھی غڑاپ سے تکیے پر گری اور اس کے قریب چربی کی موم بتی کے، جس کے فتیلے نے کھمبی کی صورت اختیار کر لی تھی، اردگرد پھڑپھڑانے لگی۔

اس کی ذہنی کیفیت عام انسانوں کی سی نہیں رہی تھی۔ صحت مند آدمی کو عام طور پر بیک وقت بہت سی باتیں یاد

آتی، محسوس ہوتی اور سوجھتی ہیں لیکن اس میں اتنی طاقت اور قوت ارادی ہوتی ہے کہ وہ خیالات یا واقعات کا کوئی تسلسل منتخب کر لیتا ہے اور اسی پر وہ اپنی ساری توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ صحت مند شخص انتہائی استغراق کے عالم میں بھی، کسی شخص سے، جو اس سے ملاقات کی غرض سے آتا ہے، شائستگی سے بات کرنے کے لیے اپنا سلسلۂ خیالات توڑ سکتا ہے اور اس کے بعد اسے دوبارہ جوڑ سکتا ہے۔ لیکن اس مفہوم میں پرنس آندرے نارمل کیفیت میں نہیں تھا۔ اس کی تمام ذہنی صلاحیتیں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ واضح اور فعال تھیں لیکن وہ اس کی قوت ارادی سے الگ تھلگ روبہ عمل تھیں۔ ایک ہی وقت میں انتہائی غیر متجانس خیالات اور تصورات اسے ذہنی طور پر مصروف رکھتے۔ بعض اوقات اس کا ذہن اچانک اتنی قوت، صراحت، گہرائی اور گیرائی سے کام کرنے لگتا کہ تندرستی کے زمانے میں بھی اس نے نہیں کیا تھا، پھر ایکا ایکی اس کی ذہنی مصروفیت میں کوئی غیر متوقع خیال رخنہ ڈال دیتا اور اس میں اتنی سکت نہ رہتی کہ وہ دوبارہ اپنے تصورات کا سلسلہ جوڑ سکتا۔

''ہاں، مجھ پر ایک نئی مسرت — مسرت جو انسان کا ناقابل انتقال حق ہے — کا انکشاف ہوا تھا۔'' اس نے پرسکون مکانچے کی نیم تاریکی میں لیٹے لیٹے اور بے چین و مضطرب نگاہوں سے اپنے سامنے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے ہوئے اپنے آپ سے کہا۔ ''وہ مسرت جو مادی قوتوں کی رسائی سے بالاتر ہے اور ان مادی اور خارجی اثرات سے، جو انسان پر اپنا عکس ڈالتے ہیں، متاثر نہیں ہوتی، صرف روح کی مسرت ہے اور محبت کرنے والوں کے ہی حصے میں آتی ہے! اسے محسوس کرنا ہر انسان کے بس میں ہے لیکن اس کی واضح صورت تشکیل کرنا اور اسے ودیعت کرنا صرف خدائی فعل ہے۔ لیکن خداوند نے اسے کیسے ودیعت کیا اور اس کا بیٹا کیوں...''

اور خیالات کے اس سلسلے میں یک دم خلل واقع ہو گیا اور پرنس آندرے کو (یہ جانے بغیر کہ یہ واہمہ تھا یا حقیقت) نرم و گداز سرگوشیاں کرتی آواز سنائی دی جو اپنے نپے تلے آہنگ کے ساتھ مسلسل ''پتی۔ پتی۔ پتی۔ پھر تی۔ تی۔'' کا ورد کر رہی تھی۔ اس زیر لب موسیقی کی آواز کی سنگت میں اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کے چہرے پر، اس کے عین درمیانی حصے پر باریک سوئیوں پر چھپلنوں کی اثیری عمارت اٹھائی جا رہی ہو۔ اس کے دل میں یہ خیال گزرا کہ اسے نہایت احتیاط سے اپنا توازن برقرار رکھنا چاہیے (حالانکہ یہ بہت مشکل کام تھا) کہیں یہ اوپر اٹھتی عمارت دھڑام سے نیچے نہ گر پڑے۔ تاہم کبھی یہ عمارت نیچے گرنے لگتی اور کبھی مدھم سریلی موسیقی کی آواز کی سنگت میں اوپر اٹھنا شروع ہو جاتی۔ ''یہ بڑھ رہی ہے، پھیل رہی ہے، اونچی ہو رہی ہے، کشادہ ہو رہی ہے!'' پرنس آندرے اپنے آپ سے کہہ رہا تھا۔ جب وہ موسیقی کی مدھم تانیں سن رہا تھا اور اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سوئیوں کی یہ عمارت اوپر اٹھ رہی اور ارد گرد پھیل رہی ہے، بیچ بیچ میں اسے موم بتی کے گرد و پیش روشنی کا سرخ ہالا نظر آنے لگتا اور اسے حل چٹوں کی سرسراہٹ اور مکھی کی، جو غڑاپ سے کبھی اس کے تکیے اور کبھی اس کے چہرے پر گرتی تھی، بھنبھناہٹ سنائی دینے لگتی ہے۔ جب بھی مکھی اس کے چہرے سے ٹکراتی، اسے جلن کا احساس ہونے لگتا لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران رہ جاتا کہ اگرچہ یہ عین اس حصے سے، جہاں سے عمارت کی تعمیر شروع ہوئی تھی، ٹکراتی ہے، وہ اسے منہدم نہیں کرتی۔

لیکن اس کے علاوہ ایک اور اہم چیز تھی اور یہ دروازے کے قریب کوئی سفید چیز — ابوالہول کا مجسمہ — تھی اور یہ بھی اس کے ذہن پر بوجھ بنی ہوئی تھی۔

"لیکن یہ شاید میز پر میری قمیص ہے،" پرنس آندرے نے سوچا۔ "اور وہ میری ٹانگیں ہیں اور وہ دروازہ ہے لیکن یہ ہمیشہ پھیلتا اور بلند کیوں ہوتا رہتا ہے اور یہ 'پتی - پتی - پتی' اور 'تی - تی - تی؟' ... کافی ہو چکی ہے، رک جاؤ! خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ!" پرنس آندرے نے نڈھال ہو کر پُر زور التجا کی۔ اچانک اس کے ذہن سے بادل چھٹ گئے اور جذبہ وخیال سطح پر تیرنے لگے۔ سب کچھ غیر معمولی انداز سے توانا اور واضح تھا۔

"ہاں، محبت۔" (اس نے دوبارہ سوچا — اور اس کی اس سوچ میں کوئی ابہام نہیں تھا، کوئی الجھاؤ نہیں تھا۔) "لیکن وہ محبت نہیں جس کے پیچھے کوئی غرض کارفرما ہوتی ہے، جس کا مقصد کسی چیز کا حصول ہوتا ہے یا اس کا کوئی سبب ہوتا ہے، بلکہ وہ محبت، جس سے میں پہلی بار اس وقت آشنا ہوا جب میں نے موت کے تجربے میں سے گزرنے کے دوران میں اپنے دشمن کو دیکھا اور مجھے اس پر (غصہ نہیں بلکہ) پیار آیا۔ میں نے محبت کا وہ جذبہ، جو روح کا اصل خمیر ہوتا ہے اور جس کا کوئی معروض نہیں ہوتا، محسوس کیا، اور وہی روحانی سُرور اب دوبارہ محسوس کر رہا ہوں۔ اپنے پڑوسی سے محبت کرنا، اپنے دشمن سے محبت کرنا، ہر چیز سے محبت کرنا — خداوند سے اور جن جن عورتوں میں وہ جلوہ گر ہوتا ہے، ان سے محبت کرنا ہے۔ وہ شخص، جو آپ کو عزیز ہو، اس سے انسانی محبت کی جا سکتی ہے لیکن دشمن سے محبت کرنے کے لیے ہمیں الوہی محبت درکار ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ جب مجھے محسوس ہوا کہ میں اس شخص سے پیار کرتا ہوں تو مجھے اتنی بے پایاں مسرت ہوئی۔ اس کا کیا بنا؟ کیا وہ زندہ ہے؟ ... انسانی محبت نفرت میں تبدیل ہو سکتی ہے لیکن الوہی محبت غیر متبدل ہے۔ کوئی بھی چیز، حتیٰ کہ خود موت بھی اسے فنا نہیں کر سکتی۔ یہ تو روح کا صحیح خمیر ہے۔ تاہم میں نے زندگی میں کتنے لوگوں سے نفرت کی ہے؟ اور ان سب میں سے کسی سے نہ مجھے اتنی محبت ہوئی اور نہ نفرت جتنی کہ اُس سے۔"

اور اس نے اپنے ذہن میں نتاشا کی واضح صورت بنائی۔ لیکن اب کے اس کے ذہن میں نتاشا کا جو ہیولیٰ ابھرا، وہ ماضی کی نتاشا نہیں تھی۔ ماضی کی نتاشا صرف دلکشی کا مرقع تھی اور اس کی یہی دلکشی اسے مسرت سے سرشار کر دیتی تھی۔ اب پہلی مرتبہ وہ اس کی روح کو بھی اپنے تصور میں لایا۔ اور یوں وہ اس کے جذبات واحساسات، اس کے دکھ، اس کی شرمساری اور اس کی ندامت کی تفہیم کر سکا اور پہلی مرتبہ اس کی سمجھ میں آیا کہ اس نے اسے مسترد کر کے اس پر کتنا ظلم کیا تھا، اس سے قطع تعلق کر کے اس پر کیا ستم ڈھایا تھا۔ "کاش میرے لیے یہ ممکن ہوتا کہ میں ایک بار پھر اس کی صورت دیکھ سکتا! صرف ایک بار اس کی آنکھوں میں جھانک سکتا اور کہہ سکتا..."

"پتی - پتی - پتی، اور تی - تی — دنا دن!" غڑاپ سے مکھی گری اور ایکا ایکی پرنس آندرے کی توجہ ایک دوسری دنیا، حقیقت اور ہذیان کی دنیا، کی طرف منتقل ہو گئی۔ وہاں کوئی عجیب وغریب چیز منظر عام پر آ رہی تھی۔

• "اس" سے یہاں مراد نتاشا ہے

عمارت اب بھی اوپر ہی اوپر اٹھتی جا رہی تھی اور منہدم نہیں ہوئی تھی، کوئی چیز اب بھی پھیل رہی تھی، موم بتی اپنے سرخ ہالے کے حصار میں اب بھی جل رہی تھی اور قمیص سے مشابہ ابوالہول دروازے کے قریب پڑا تھا۔ یہ سب چیزیں تو موجود تھیں لیکن اب ان کے علاوہ کوئی اور چیز چرچرائی، بادِ نسیم کا ہلکا پھلکا جھونکا آیا اور دروازے پر کوئی نیا سفید ابوالہول نمودار ہوا۔ یہ وہاں کھڑا تھا اور اس ابوالہول کا چہرہ نتاشا کے، جس کے بارے میں وہ ابھی ابھی سوچ رہا تھا، چہرے کی طرح زردی مائل اور اُس کی آنکھیں اس کی آنکھوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

''اور یہ دوامی ہذیان کتنا تکلیف دہ ہے!'' پرنس آندرے نے سوچا۔ وہ اپنے تخیل کے پردے پر اس چہرے کے نقول کھرچ دینا چاہتا تھا۔

لیکن وہ چہرہ خیالی نہیں، اصلی تھا اور وہ اس کے سامنے ڈٹا رہا۔ وہ اس کے قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ پرنس آندرے خالص خیال کی سابق دنیا میں لوٹ جانا چاہتا تھا لیکن وہ ناکام رہا اور ہذیان نے ایک بار پھر اسے اپنی مملکت میں گھسیٹ لیا۔ سرگوشیاں کرتی نرم و لطیف آواز کی سریلی بھنبھناہٹ جاری رہی۔ کوئی چیز سکڑ رہی تھی، پھیل رہی تھی اور چہرہ اس کے سامنے تھا۔ پرنس آندرے نے یہ یاد کرنے کے لیے کہ یہ کون ہے، اپنی تمام توانائیاں مجتمع کرلیں۔ اس نے خفیف سی حرکت کی اور ایکا ایکی اس کے کانوں میں گھنٹیاں بجنے لگیں، آنکھوں میں غبار آ گیا اور اس آدمی کی طرح، جو پانی میں ڈوب رہا ہو، وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ جب اس کے اوسان بحال ہوئے، نتاشا، وہی جیتی جاگتی نتاشا، جس پر وہ سب لوگوں سے زیادہ اپنی یہ نئی، خالص، الوہی محبت، جو اس پر منکشف ہوئی تھی، نثار کرنا چاہتا تھا، اس کے سامنے دوزانو ہو رہی تھی۔ اسے احساس ہوا کہ یہ حقیقی، جیتی جاگتی نتاشا ہے اور اسے کوئی تعجب نہ ہوا بلکہ وہ چپ چاپ خوشی سے جھومنے لگا۔ نتاشا گھٹنوں پر جھکی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پاؤں وہیں زمین میں گڑ گئے ہیں اور وہ اپنی جگہ سے حرکت نہیں کر سکتی۔ وہ ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی اور اپنی سسکیوں پر قابو پانے کی سرتوڑ کوشش کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد اور ساکت تھا، اس کی صرف ٹھوڑی اور ہونٹ قدرے تھرتھرا رہے تھے۔

پرنس آندرے نے اطمینان کی سانس لی، وہ مسکرایا اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''تم؟'' اس نے کہا۔ ''زہے نصیب!''

نتاشا نے پھرتی لیکن حزم و احتیاط سے اس کے اور قریب آ گئی۔ وہ ابھی تک گھٹنوں کے بل جھکی ہوئی تھی۔ اس نے ہوشیاری سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، اپنا چہرہ اس کے اوپر جھکایا اور اس پر دھڑا دھڑ بوسے ثبت کرنے لگی لیکن اس کے لب اسے بمشکل چھو رہے تھے۔

''مجھے معاف کر دیں!'' اس نے اپنا سر اٹھاتے اور اس پر اپنی نگاہیں گاڑتے سرگوشی کی۔ ''مجھے معاف کر دیں!''

''میں تم سے محبت کرتا ہوں!'' پرنس آندرے نے کہا۔

''مجھے معاف...''

''معافی کس بات کی؟'' پرنس آندرے نے استفسار کیا۔

''میں نے جو کچھ کیا ہے مجھے...مجھے اس کی معا...!'' نتاشا نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ اس کی آواز اتنی مدھم تھی کہ بمشکل سنائی دیتی تھی۔ وہ عجلت سے اس کے ہاتھوں کو اپنے بوسوں سے ڈھانپنے لگی۔ اس کے ہونٹ ان کے ساتھ نہایت ملائمت سے مس ہو رہے تھے۔

''لیکن میں تم سے پہلے کی نسبت زیادہ۔ بہتر محبت کرنے لگا ہوں۔'' پرنس آندرے نے اس کا چہرہ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکنا چاہتا تھا۔

وہ آنکھیں، جن میں خوشی کے آنسو چھلک رہے تھے، اسے ڈرتے جھجکتے دیکھ رہی تھیں۔ ان میں دردمندی تھی اور پرمسرت محبت۔ نتاشا کا دبلا پتلا، زرد چہرہ، متورّم ہونٹوں سمیت، رعنائی سے عاری تھا۔ دیکھنے میں یہ بھیانک معلوم ہوتا تھا۔ لیکن پرنس آندرے نے اس چہرے کو دیکھا ہی نہیں۔ وہ صرف روشن وتاباں آنکھیں، جو خوبصورت تھیں، دیکھ رہا تھا۔ انھیں اپنے عقب میں باتوں کی آواز سنائی دی۔

وردی پوش ملازم پیوتر اب پوری طرح بیدار ہو چکا تھا۔ اس نے ڈاکٹر کو جگایا۔ تموخن، جو اپنے بے لباس جسم کو چادر میں اچھی طرح لپیٹے اور ہاتھ پاؤں سمیٹے، گٹھڑی بنا بینچ پر پڑا تھا، ٹانگ میں درد کے باعث بالکل سو نہیں سکا تھا، اس کے قریب جو کچھ ہو رہا تھا، وہ کافی دیر سے اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' ڈاکٹر نے اپنے فرشی بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''مادام، مہربانی فرمائیں اور تشریف لے جائیں۔''

کاؤنٹس کو اپنی بیٹی کی غیر حاضری کا علم ہو چکا تھا۔ اس نے (اس کی تلاش میں) اپنی خادمہ بھیجی تھی۔ وہ بھی اب وہاں پہنچ گئی تھی اور دروازے پر دستک دے رہی تھی۔

ایک ایسے شخص کی طرح، جو نیند میں چلنے پھرنے کا عادی ہو، نتاشا بھی ہڑبڑا کر اپنے ہوش وحواس میں آ گئی۔ وہ باہر نکل گئی اور اپنے کمرے میں پہنچنے کے بعد روتی دھوتی اپنے بستر پر گر پڑی۔

اس دن کے بعد اپنے بقیہ سارے سفر کے دوران میں رستوف جہاں کہیں رکتے یا شب بسری کے لیے پڑاؤ کرتے، نتاشا زخمی بلکونسکی کی پٹی کے ساتھ چمٹی رہتی اور ڈاکٹر کو یہ اقرار کرتے ہی بن پڑی کہ وہ کبھی یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کوئی نوجوان لڑکی اتنے تحمل کا مظاہرہ کر سکتی ہے یا کسی زخمی شخص کی تیمارداری میں اتنی مہارت دکھا سکتی ہے۔

اگرچہ کاؤنٹس کو یہ سوچ سوچ کر بہت وحشت ہوتی تھی کہ پرنس آندرے راستے میں ہی اس کی بیٹی کے بازوؤں میں دم دے دے گا (جس کا ڈاکٹر کے خیال کے مطابق کافی احتمال تھا)، وہ نتاشا کی مخالفت نہ کر سکی۔ اگرچہ اس کے دل میں یہ خیال آتا تھا کہ زخمی شخص اور نتاشا کے مابین محبت آمیز تعلقات کی تجدید سے ان کی سابقہ

سگائی، بشرطیکہ وہ صحت یاب ہو گیا، بحال ہو سکتی ہے، کسی نے بھی — اور پرنس آندرے اور نتاشا نے تو بالکل ہی نہیں — اس کا کوئی ذکر نہ کیا۔ زندگی اور موت کا مسئلہ، جو حل نہیں ہو رہا تھا اور جو بلکونسکی کو ہی نہیں بلکہ سارے روس کو اپنی لپیٹ میں لیے ہوئے تھا، اس قسم کے تمام امور کے راستے میں رکاوٹ بنا ہوا تھا۔

33

تین ستمبر کو پیئر تاخیر سے جاگا۔ اس کے سر میں درد ہو رہا تھا۔ لباس تبدیل کیے بغیر وہ جن کپڑوں میں سویا تھا، وہ اس کے بدن کو چھیل رہے تھے اور ایک مبہم سا خیال کہ گزشتہ روز اس سے کوئی شرم ناک حرکت سرزد ہوئی تھی، اس کے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ یہ شرم ناک حرکت اس کی وہ گفتگو تھی جو اس نے گزشتہ روز کیپٹن غام بال کے ساتھ کی تھی۔

اس کی گھڑی پر گیارہ بج رہے تھے لیکن عجیب بات یہ تھی کہ باہر اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ پیئر اٹھا، اس نے اپنی آنکھیں ملیں اور جب اس کی نظر پستول پر پڑی جس کے دستے پر نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور جسے گیراسم نے دوبارہ میز پر رکھ دیا تھا، اسے یاد آیا کہ وہ کہاں ہے اور اسے اس روز کیا کرنا ہے۔

”لیکن مجھے تاخیر نہیں ہو گئی؟“ اس نے سوچا۔ ”نہیں، وہ یقیناً دوپہر سے پہلے ماسکو میں داخل نہیں ہو گا۔“

پیئر نے اس روز کیا کرنا تھا، اس کے بارے میں اس نے اپنے آپ کو سوچنے کا موقع نہ دیا، البتہ اس نے عمل کرنے میں پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے اپنے کپڑوں کی شکنیں دور کیں، پستول اٹھایا اور وہ روانہ ہوا چاہتا تھا کہ پہلی مرتبہ اسے یہ خیال آیا کہ وہ کھلے بندوں ہاتھوں میں پستول اٹھائے گلی کوچوں میں یقیناً نہیں جا سکے گا۔ اتنا بڑا پستول بڑے کوٹ میں بھی چھپانا مشکل ہو گا۔ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ پستول اپنی پیٹی میں رکھ لے یا بازو کے نیچے دبا لے اور کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ مزید برآں، پستول سے گولی چلائی جا چکی تھی اور اسے اتنا موقعہ نہیں مل سکتا تھا کہ وہ اس میں نئی گولی بھر لے۔ ”کوئی بات نہیں، خنجر سے کام چل جائے گا۔“ اس نے اپنے آپ سے کہا حالانکہ جب وہ اپنے منصوبے کی تکمیل کے متعلق سوچ رہا تھا، وہ ایک سے زیادہ مرتبہ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ 1809 میں جس طالب علم نے نپولین کو ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی، اس کی بڑی غلطی یہ تھی کہ اس نے خنجر استعمال کیا تھا۔ لیکن چونکہ نظر یہ آتا تھا کہ پیئر کا بڑا مقصد اتنا اپنے منصوبے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا نہیں تھا جتنا اپنے آپ پر یہ ثابت کرنا تھا کہ وہ اس سے دست بردار نہیں ہو گا بلکہ اس کو مکمل کرنے کے لیے اس سے جو کچھ بن پڑا، وہ اسے کر گزرے گا۔ چنانچہ اس نے بہ عجلت کند اور کھدرا خنجر اٹھایا، اسے سبز نیام میں، جو اس نے پستول کے ساتھ سخاریف مارکیٹ سے خریدا تھا، ڈالا اور اسے اپنی واسکٹ کے نیچے چھپا لیا۔

اپنے دیہاتی کوٹ کے اوپر پٹکا باندھنے اور سر پر نیچی ٹوپی رکھنے کے بعد پیئر غلام گردش میں چلنے لگا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ نہ تو کسی قسم کی آواز پیدا کرے اور نہ اس کی کپتان سے مڈھ بھیڑ ہو اور یوں وہ باہر گلی میں نکل گیا۔

جس آگ کو اس نے گزشتہ روز اتنی بے توجہی سے دیکھا تھا، وہ رات کے دوران میں خاصی پھیل چکی تھی۔

ماسکو کے مختلف علاقوں میں آگ بھڑک رہی تھی کیرج رو* (Carriage Row)، دریا کے پار، بازار اور پوارسکایا سٹریٹ کی عمارتیں، مسکوا دریا میں بجرے اور درو گومیلوف پل کے قریب عمارتی لکڑی کے ٹال، سبھی دھڑا دھڑ اجل رہے تھے۔

پیئر نے بغلی گلی کوچوں میں سے گزر کر پوارسکایا سٹریٹ پہنچنا اور وہاں سے آرباط سٹریٹ کے ساتھ ساتھ چلتے چلتے کراماتی سینٹ نکولا کے گرجے میں داخل ہونا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے منصوبے کی تکمیل اسی مقام پر کرے گا۔ اکثر مکانوں کے صدر دروازوں پر تالے پڑے ہوئے تھے اور ان کے دریچے اور دروازے بند تھے۔ گلی کوچوں سنسان تھے۔ فضا میں دھواں اور آتش زنی کی بو پھیلی ہوئی تھی۔ وقتاً فوقتاً اس کی روسیوں سے، جن کے چہروں پر خوف اور پریشانی جھلک رہی تھی، مڈھ بھیڑ ہو جاتی۔ فرانسیسی سڑک کے عین بیچوں بیچ چل پھر رہے تھے۔ ان کے انداز سے یہ مترشح ہو رہا تھا جیسے وہ شہر میں نہیں بلکہ کیمپ میں ہوں۔ روسی اور فرانسیسی دونوں ہی پیئر کو بہ نگاہ حیرت دیکھتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کا جثہ طویل القامت اور بھاری بھرکم تھا۔ دوسرے اس کے چہرے اور حلیے سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ وہ سخت اذیت میں مبتلا ہے اور اپنے خیالات میں اتنا منہمک ہے کہ اگر کوئی اس کے قریب آیا، وہ پنجے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ جائے گا۔ پھر روسی اس لیے بھی اسے گھور گھور کر دیکھ رہے تھے کہ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا تعلق کس طبقے سے ہو سکتا ہے۔ فرانسیسی جب اسے دیکھتے، وہ اس لیے بوکھلا جاتے کیونکہ دوسرے روسیوں کے برعکس، جو انھیں خوف یا تجس کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے، پیئر ان کی طرف توجہ ہی نہیں دے رہا تھا۔ ایک مکان کے گیٹ کے سامنے تین فرانسیسی بعض روسیوں کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے پیئر کو روک لیا اور اس سے پوچھنے لگے کہ آیا اسے فرانسیسی آتی ہے۔

پیئر نے نفی میں سر ہلایا اور آگے چل دیا۔ ایک اور بغلی گلی میں ایک سنتری نے، جو گولہ بارود کے سبز چھکڑے کے قریب پہرہ دے رہا تھا، اسے با آواز بلند پکارا لیکن صرف اسی وقت، جب آواز تہدید آمیز انداز سے دہرائی گئی اور بندوق کے اوپر اٹھائے جانے کی کھٹاک سنائی دی، اسے اندازہ ہوا کہ اسے مخالف سمت کے فٹ پاتھ پر چلنا چاہیے۔ وہ اپنے گرد و پیش کچھ دیکھ رہا تھا نہ سن۔ وہ اپنا عزم صمیم یوں اٹھائے اٹھائے پھر رہا تھا جیسے یہ کوئی اجنبی اور بھیانک چیز ہو۔ وہ جلدی میں تھا کیونکہ اسے یہ اندیشہ لاحق ہو رہا تھا کہ کہیں وہ اسے گنوا نہ دے۔ لیکن اپنی اس ذہنی کیفیت کو اس مقام تک، جدھر وہ جا رہا تھا، یوں کا توں برقرار رکھنا اس کے مقدر میں نہیں تھا۔ اگر راستے میں کوئی ایسی چیز، جو اس کے عزائم کی تکمیل میں رکاوٹ بن سکتی تھی، نہ بھی وقوع پذیر ہوئی ہوتی، تو بھی وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکتا کیونکہ نپولین کو مضافاتی بستی درو گومیلوف سے کریملن پہنچنے کے لیے آرباط میں سے گزرے چار گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے۔ اب وہ شاہی سٹڈی روم میں بیٹھا تھا۔ وہ سخت جھنجھلایا ہوا تھا اور آگ بجھانے، لوٹ مار کا سد باب کرنے اور مقامی باشندوں کی ڈھارس بندھانے کے لیے جو فوری اقدامات کیے جانا

* روسی میں Gostinnoy Dvor

ضروری تھا، ان کے متعلق تفصیلی اور قطعی احکام صادر کر رہا تھا۔ مگر پیئر کو اس بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس روز جس کام کے کرنے کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کا دھیان پوری طرح اسی میں لگا ہوا تھا اور وہ اس اذیت میں مبتلا تھا جس کا تجربہ صرف انھی لوگوں کو ہوتا ہے جو ایسا کام کرنے پر مُصر رہتے ہیں جس کا انجام دینا ان کے لیے ناممکن ہوتا ہے — ناممکن اس لیے نہیں کیونکہ کام فی نفسہٖ دشوار ہوتا ہے بلکہ اس لیے کیونکہ یہ ان کی اپنی فطرت سے کوئی میل نہیں کھاتا — اسے اذیت اس لیے ہو رہی تھی کیونکہ اسے یہ خوف کھائے جا رہا تھا کہ کہیں وہ عین موقع پر کمزوری کا شکار نہ ہو جائے اور یوں اس کی پاداش میں اپنی عزت نفس سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

اگرچہ وہ نہ کچھ دیکھ رہا تھا اور نہ سن، وہ اپنی جبلّت کے زور پر صحیح راستے پر چلتا رہا۔ چنانچہ وہ ان بغلی گلی کوچوں میں، جو پوارسکایا سٹریٹ میں جا ملتے تھے، ادھر ادھر نہ بھٹکا۔

وہ جوں جوں اس سڑک کے قریب آتا گیا، توں توں دھوئیں کا بادل ہر جگہ دبیز ہوتا گیا اور اسے آگ کی تپش بھی محسوس ہونے لگی۔ کہیں کہیں آگ کے شعلے مکانوں کی چھتوں کے عقب میں لہراتے بل کھاتے اوپر اٹھ رہے تھے۔ ان گلیوں میں اس کا سامنا مزید لوگوں سے ہوا اور یہ لوگ کہیں زیادہ مضطرب تھے۔ اگرچہ پیئر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے اردگرد کوئی غیر معمولی چیز وقوع پذیر ہو رہی ہے لیکن اسے یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ وہ آگ کے نزدیک پہنچ رہا ہے۔ پوارسکایا سٹریٹ ایک جانب خاصے وسیع و عریض کھلے میدان اور دوسری جانب پرنس گروزنسکی کے محل نما مکان کے باغات میں گھری ہوئی تھی۔ جب پیئر میدان کے بیچوں بیچ ایک پگڈنڈی پر جا رہا تھا، اسے اچانک اپنے قریب کسی عورت کے زار و قطار رونے کی آواز سنائی دی۔ اسے یوں جھٹکا لگا جیسے وہ خواب سے بیدار ہوا ہو۔ وہ ٹھٹک گیا اور اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا۔

پگڈنڈی کے ایک جانب گرد آلود اور دھوپ میں جھلسی ہوئی گھاس پر ہر قسم کی گھریلو اشیا کے — پلنگ، پروں سے بھرے ہوئے لحاف، سماوار، الیقونے اور ٹرنک — ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ٹرنکوں کے قریب زمین پر ایک لاغر اندام عورت، جو جوانی کی حدود پار کر چکی تھی اور جس کے لمبے بالائی دانت باہر کو نکلے ہوئے تھے، سیاہ چغا اور ٹوپی پہنے بیٹھی تھی۔ اس عورت پر تشنج کی سی کیفیت طاری تھی اور اس کا جسم آگے پیچھے جھول رہا تھا۔ وہ بڑبڑا رہی اور آنسو بہا رہی تھی۔ دس دس بارہ بارہ سال کی دو ننھی منی بچیاں، جن کے ابدان میلی کچیلی سکرٹوں اور چغوں میں ڈھنپے ہوئے تھے اور جن کے زرد اور خوف زدہ چہروں پر بوکھلاہٹ نمایاں تھی، ٹکٹکی باندھے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھیں۔ سب سے چھوٹا بچہ، تقریباً سات سالہ لڑکا، اوورکوٹ اور بہت بڑی ٹوپی، جو بظاہر اس کی اپنی نہیں تھی، پہنے ہوئے تھا اور بوڑھی نرس کے بازوؤں میں چیخ چلا رہا تھا۔ غلیظ نوعمر خادمہ، جس کی ٹانگیں برہنہ تھیں، ٹرنک پر بیٹھی تھی۔ اس کے زردی مائل بھورے بال، جن کے سرے آگ سے جھلس چکے تھے، نیچے لٹک رہے تھے اور وہ ان کی ایک لٹ ہاتھ میں پکڑے سونگھ رہی تھی۔ اس عورت کا خمیدہ اور پست قامت شوہر سول ملازم کی وردی میں ملبوس تھا۔ اس کی مونچھیں ساسیج کی شکل کی تھیں۔ چوکور ٹوپی کے نیچے اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ اس کے بے

سنورے بال اس کی کنپٹیوں پر نظر آ رہے تھے۔ وہ ٹرنکوں کو، جو ایک دوسرے کے اوپر پڑے تھے، چھانٹ رہا اور ان کے نیچے سے چند ملبوسات باہر گھسیٹ رہا تھا۔

جونہی اس عورت نے پیئر کو دیکھا، وہ قریب قریب اس کے پاؤں پر گر پڑی۔

''خداوند کریم — نیک دل مسیحی بھائی!۔ حضور، مجھے بچائیں، میری مدد فرمائیں!'' اس نے آہوں اور سسکیوں کے مابین کہا۔ ''میری ننھی! میری بیٹی... میری سب سے چھوٹی بیٹی پیچھے رہ گئی ہے... آگ میں جل کر راکھ ہوگئی ہے... اوں۔ اوں۔ اوں... میں نے اسی لیے تمھیں پالا پوسا تھا... اوں۔ اوں۔ اوں!''

''ماریا نکولائیونا، چپ کرو۔'' اس کے شوہر نے کہا۔ ''اسے ضرور ہمشیرہ لے گئی ہوں گی۔ ورنہ وہ اور کہاں ہوسکتی ہے؟'' اس نے مزید کہا۔ وہ اجنبی کے سامنے صرف اپنی براءت کرانا چاہتا تھا۔

''تم آدمی نہیں، عفریت ہو! انسانیت کے نام پر دھبہ ہو!'' عورت نے آتش غضب سے جل بھن کر کہا۔ ایکا ایکی اس کے آنسو تھم گئے۔ ''تمھارے سینے میں دل نہیں۔ تمھیں اپنی اولاد سے کوئی پیار نہیں۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا، وہ اس کو آگ کے شعلوں سے ضرور بچا کر لے آتا... لیکن یہ؟ یہ پتھر کا بنا ہوا ہے — یہ نہ آدمی ہے اور نہ باپ ہے۔ حضور، آپ نیک انسان ہیں۔'' وہ سسکیاں بھرتی اور تیز تیز بولتی پیئر کی جانب متوجہ ہوئی۔ ''پڑوسیوں کے مکان میں آگ لگی اور ہوا اسے ہماری طرف لے آئی۔ خادمہ چلائی۔ 'آگ!' اور ہم اپنی چیزیں سمیٹنے دوڑ پڑے... بس ہم یہی کچھ باہر نکال سکے۔ ایقونے، میرا جہیز کا پلنگ۔ باقی سب کچھ جل گیا۔ ہم نے بچوں کو پکڑا، لیکن ننھی کاتیا کا کچھ پتا نہیں چل رہا۔ ہائے، میرے خدایا! اوں۔ اوں!'' وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔ ''میری ننھی، میری منی، میری پیاری گڑیا! ہائے، وہ جل گئی، بھسم ہوگئی!''

''مگر اسے آپ نے چھوڑا کہاں تھا؟'' پیئر نے دریافت کیا۔

اس کے چہرے پر ہمدردی اور دلچسپی کے آثار دیکھ کر عورت کو امید بندھ چلی کہ یہ شخص اس کی مدد کرے گا۔

''حضور، خداوند آپ کا بھلا کرے!'' اس نے چلا کر کہا اور وہ اس کی ٹانگوں کے ساتھ چمٹ گئی۔ ''میرے محسن، مجھے اس مصیبت سے نکال لیں... آنِسکا چھنال، اٹھو اور انھیں رستہ بتاؤ۔'' وہ نوعمر خادمہ پر برس پڑی۔ وہ چلا رہی تھی اور غصے کے عالم میں اس کا منہ پورے کا پورا کھل گیا اور یوں اس کے لیے دانتوں کی مزید نمائش ہونے لگی۔

''مجھے راستہ بتا دو، ہاں، راستہ بتا دو۔ میں — کچھ کرتا ہوں!'' پیئر نے ہانپتے ہوئے تیزی سے کہا۔

غلیظ نوکرانی ٹرنک کے عقب سے آگے آئی، اس نے اپنی لٹ اوپر کی، ٹھنڈی سانس بھری اور اپنی گھٹی ہوئی ٹانگوں پر چلتی پیئر کے آگے ہوگئی اور پگڈنڈی عبور کرنے لگی۔

پیئر کو یوں محسوس ہوا جیسے طویل بے ہوشی کے بعد وہ اچانک دوبارہ زندہ ہوگیا ہو۔ اس کی آنکھیں زندگی کی حرارت سے چمکنے لگیں۔ اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور لمبے لمبے اور تیز تیز قدم اٹھاتا لڑکی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ اس نے آن واحد میں اسے جا لیا اور پوارسکایا سٹریٹ پر پہنچ گیا۔ ساری سڑک سیاہ دھوئیں کے بادل میں لپٹی ہوئی تھی۔

کہیں کہیں آگ کے شعلے دھوئیں کی دبیز چادر کو پھاڑ کر اوپر اٹھ رہے تھے۔ زبردست آگ کے سامنے بے حساب مخلوق اکٹھی ہو چکی تھی۔ سڑک کے درمیان میں ایک فرانسیسی جرنیل کھڑا تھا اور جو لوگ اس کے ارد گرد گھیرا بنائے ہوئے تھے، وہ ان سے کچھ کہہ رہا تھا۔ پیئر خادمہ کی معیت میں اسی جانب آ رہا تھا لیکن فرانسیسی سپاہیوں نے اسے روک لیا۔

"on ne passe pas!"* ایک شخص نے با آواز بلند کہا۔

''انکل، اس طرف۔'' ملازمہ چلائی۔ ''ہم نکولینوں کے مکان میں سے گزر کر گلی میں چلے جائیں گے!''

پیئر واپس مڑا۔ وہ گاہے بگاہے چھوٹی موٹی چھلانگ لگا دیتا تا کہ وہ ملازمہ سے پیچھے نہ رہ جائے۔ لڑکی نے بھاگ کر سڑک پار کی، بائیں طرف گلی میں مڑی اور تین مکان گزرنے کے بعد وہ تیزی سے دائیں جانب کے صحن میں داخل ہو گئی۔

''قریب ہی ہے۔'' اس نے کہا اور بھاگم بھاگ صحن عبور کرتے اس نے چوبی باڑ میں گیٹ کھولا۔ وہ وہاں رک گئی اور اس نے ہاتھ سے عمارت کے چھوٹے چوبی حصے کی طرف، جہاں زبردست آگ بھڑک رہی تھی، اشارہ کیا۔ ایک حصہ گر چکا تھا اور دوسرا دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ کھڑکیوں کے شگافوں میں سے اور چھت کی نچلی سمت سے آنکھیں چندھیا دینے والے شعلے نکل رہے تھے۔

جونہی پیئر چھوٹے گیٹ کے قریب پہنچا، معاً تپتی ہوا کا جھونکا اس کی طرف لپکا اور وہ غیر ارادی طور پر پیچھے ہٹ گیا۔

''کہاں ہے؟ تمھارا مکان کہاں ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''اوں اوں...'' لڑکی نے واویلا کرتے ہوئے چوبی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ رہا۔ ہم وہیں رہا کرتے تھے۔... ہماری جان، ہماری ننھی کاتیا، میری ننھی مالکہ!... یقیناً تو جل کر راکھ ہو چکی ہوگی... اوں۔ اوں۔ اوں...'' آنسکا نے دہائی دی۔ آگ کو دیکھ کر اسے محسوس ہوا کہ اسے بھی اپنے جذبات کا لازماً اظہار کرنا چاہیے۔

پیئر چھوٹے چوبی حصے کی طرف بھاگا لیکن آگ کی حدت اتنی شدید تھی کہ وہ چکر کاٹنے پر مجبور ہو گیا۔ وہ خاصے بڑے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ ابھی اس مکان کے صرف ایک حصے میں چھت کے نیچے آگ لگی تھی اور وہ جل رہا تھا۔ فرانسیسیوں کا خاصا بڑا ہجوم اس کے آس پاس اکٹھا ہو چکا تھا۔ پہلے پہل پیئر سمجھ نہ سکا کہ یہ لوگ، جو مکان سے کوئی چیز گھسیٹ کر باہر لا رہے تھے، کیا کرنا چاہتے ہیں لیکن جب اس نے اپنے روبرو ایک فرانسیسی فوجی کو ایک دہقان کو کند شمشیر سے پیٹتے اور اس سے لومڑ کی پوستین کا کوٹ چھیننے کی کوشش کرتے دیکھا، اسے مبہم سا اندازہ ہوا کہ وہ لوٹ مار کر رہے ہیں لیکن اس کے پاس اس قسم کی باتوں کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں تھا۔

گرتی دیواروں اور چھتوں کی دھڑا دھڑی اور کھڑکھڑاہٹ، شعلوں کی شوں شوں اور چھن چھن، ہجوم کی جوشیلی

---

* اس طرف سے نہیں

چیخ پکار، دھوئیں کا، منظر جو کبھی گاڑھے سیاہ بادلوں کی شکل میں نیچے ہی نیچے منڈلانے لگتا اور کبھی آگ کی لپٹوں سے مل کر بصورت جھاگ اوپر لہرانے لگتا، کہیں کہیں سرخ شعلوں کے پشتارے (جو یوں معلوم ہوتے جیسے سنہری مچھلیاں دیواروں پر رینگ رہی ہوں) — ان سب نے چاروں اطراف کی بھاگ دوڑ سے مل کر پیئر کے ذہن کو اسی ہیجان خیز انداز سے متاثر کیا جس طرح آتش عظیم عام طور پر کیا کرتی ہے۔ تاہم پیئر کے ذہن پر اس کا اثر خاص طور پر شدید ہوا کیونکہ آگ کے منظر کو دیکھ کر اسے آناً فاناً یہ احساس ہوا کہ وہ خیالات، جو آسیب کی طرح اس کے دماغ پر سوار تھے، اسے ان سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو نوجوان، خوش باش، باعزم اور پھرتیلا محسوس کرنے لگا۔ وہ چوبی عمارت کی دوسری جانب بھاگا۔ وہ دوڑتا دوڑتا اس حصے میں، جو ابھی تک صحیح سلامت کھڑا تھا، داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے اپنے سر کے تقریباً اوپر متعدد اشخاص کے چیخنے چلانے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے ساتھ ہی تڑاخ سے کوئی چیز چٹخی اور اسے اپنے بالکل قریب کسی بھاری چیز کے گرنے کی جھنجھناہٹ سنائی دی۔

پیئر نے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا اور اسے مکان کی کھڑکیوں میں چند فرانسیسی نظر آئے، جنھوں نے درازدار الماری، جو دھات کی اشیا سے بھری ہوئی تھی، نیچے پھینکی تھی۔ بعض دوسرے فرانسیسی فوجی، جو نیچے کھڑے تھے، الماری کے قریب آئے۔

''یہ شخص کیا چاہتا ہے؟'' ایک فرانسیسی نے پیئر کی جانب اشارہ کرتے ہوئے باآواز بلند کہا۔

''اس مکان کے اندر ایک بچی ہے۔'' پیئر نے چلا کر فرانسیسی میں کہا۔ ''تم نے کوئی بچی دیکھی ہے؟''

''یہ کیا کہہ رہا ہے؟ چلو، نکلو یہاں سے۔'' متعدد اشخاص نے دہاڑتے ہوئے کہا اور ایک سپاہی، جسے بظاہر یہ اندیشہ تھا کہ کہیں پیئر ان سے کوئی چاندی یا کانسی کی چیز نہ چھین لے، تہدیدی انداز سے اس کی طرف بڑھا۔

''بچی؟'' اوپر سے ایک فرانسیسی چلایا۔ ''مجھے باغ میں کسی کی منمناہٹ سنائی دی تھی۔ شاید یہ چھوکری اسی کی ہے۔ ... ہمیں انسانیت سے کام لینا چاہیے۔''

''کہاں ہے؟ کہاں ہے یہ؟'' پیئر نے پوچھا۔

''وہاں — ادھر۔'' کھڑکی سے فرانسیسی نے مکان کے عقبی باغیچے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ٹھہرو، میں آرہا ہوں۔''

اور چند سیکنڈ بعد سیاہ چشم فرانسیسی نے، جس نے خالی خولی قمیص پہن رکھی تھی اور جس کے رخسار پر دھجی چپکی ہوئی تھی، واقعی کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دی، اس نے پیئر کے کندھے پر تھپکی دی اور اس کے ہمراہ باغیچے کی جانب بھاگنے لگا۔

''دوستو، جلدی کرو۔'' اس نے اپنے ساتھیوں سے چلا کر کہا۔ ''تپش بڑھتی جارہی ہے!''

مکان کے عقب میں بھاگتا بھاگتا فرانسیسی پگڈنڈی کی طرف لپکا، جس پر ریت بچھی ہوئی تھی، اس نے پیئر کا بازو کھینچا اور اس کی توجہ مذکورہ جگہ کی طرف دلائی۔ وہاں ایک تین سالہ ننھی منی بچی، جس کے گلے میں گلابی

فراک تھا، باغیچے کے بینچ کے نیچے پڑی تھی۔

''وہ رہی تمھاری چھوکری۔'' فرانسیسی نے کہا۔ ''موئو، خدا حافظ۔ ہم سب کو ایک دوسرے کی مدد کرنا چاہیے، آخر ہم سب نے ایک روز مرنا ہے۔'' اور فرانسیسی واپس اپنے ساتھیوں کی طرف بھاگ گیا۔

خوشی سے پیئر کا دم پھول گیا۔ وہ ننھی منی بچی کی طرف لپکا اور اس نے اسے اپنے ہاتھوں میں اٹھانا چاہا۔ لیکن بچی، جس کا چہرہ زرد اور جو شکل وصورت سے خنازیر کی مریضہ دکھائی دیتی تھی، اجنبی کو دیکھتے ہی اپنی ماں کی طرح غیر دلکش انداز سے چیخنے چلانے اور وہاں سے بھاگنے کی کوشش کرنے لگی۔ تاہم پیئر نے اسے دبوچ لیا اور اپنے بازوؤں میں اٹھا لایا۔ وہ پوری قوت سے چیخنے، اپنے ننھے منے ہاتھوں کی مدد سے پیئر کے بازوؤں سے آزاد ہونے اور اپنے ہونٹوں سے (اس کے منہ سے رال بہہ رہی تھی) انھیں کاٹنے کی سعی کرنے لگی۔ پیئر پر اسی قسم کی دہشت اور کراہت کا احساس غالب آنے لگا جیسا اسے کسی غلیظ اور بدبودار چھوٹے جانور کے لمس سے ہوتا تھا۔ اسے اپنے اوپر قابو پانے کے لیے بڑی کوشش کرنا پڑی ورنہ شاید وہ بچی کو وہیں پٹخ دیتا اور وہ اسے اٹھائے اٹھائے بڑے مکان کی طرف بھاگنے لگا۔

تاہم وہ جس راستے سے آیا تھا، اس پر واپس جانا ممکن نہیں تھا۔ خادمہ آنسکا کا دور دور تک کہیں نام ونشان تک نظر نہیں آ رہا تھا۔ پیئر نے ترحم اور حقارت کے ملے جلے جذبات سے بچی کو، جس کا بدن گیلا تھا اور جو دلدوز چیخیں مار رہی تھیں، جس قدر ممکن ہوا، پیار سے اپنے ساتھ چمٹائے رکھا اور کسی دوسرے راستے کی تلاش میں باغ میں سے گزرنے لگا۔

34

مختلف مکانوں کے صحن پھلانگتا اور مخالف سمت کی گلیاں عبور کرتا اپنا ننھا منا بوجھ اٹھائے جب پیئر پوارسکایا سٹریٹ کے کنارے گروزنسکی باغات میں پہنچا، وہاں انسانوں کی اتنی بھیڑ اور اشیا کے، جنھیں مختلف مکانوں سے گھسیٹ گھساٹ کر باہر لایا گیا تھا، اتنے ڈھیر لگے تھے، کہ وہ پہلے پہل اس جگہ کو پہچان نہ سکا۔ روسی خاندان کے علاوہ، جنھوں نے اپنے کاٹھ کباڑ سمیت وہاں پناہ لے رکھی تھی، وہاں انواع واقسام کے ملبوسات پہنے متعدد فرانسیسی فوجی سپاہی بھی موجود تھے۔ پیئر نے ان کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ اسے سول ملازم کا خاندان ڈھونڈنے کی جلدی تھی تاکہ وہ بچی کو اس کی ماں کے حوالے کر سکے، خود واپس جا سکے اور کسی دوسرے کو بچنے میں مدد دے سکے۔ پیئر کو محسوس ہو رہا تھا کہ ابھی اسے اور بہت کچھ کرنا ہے اور جلدی کرنا ہے۔ آگ کی تپش اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا تھا اور کسی دوسرے موقع کی نسبت اسے اس وقت جوانی، جوش واشتیاق اور عزم صمیم کا احساس، جس کی لپیٹ میں وہ تب آیا تھا جب وہ بچی کو بچانے بھاگا تھا، کہیں زیادہ شدت سے ہو رہا تھا۔

بچی کا رونا دھونا اب بند ہو چکا تھا۔ وہ اس کے بازو پر بیٹھی تھی۔ اس کے ننھے منے ہاتھ اس کے کوٹ کے

ساتھ چمٹے ہوئے تھے اور وہ اپنے چاروں طرف کسی چھوٹے جنگلی جانور کی طرح دیکھ رہی تھی۔ پیئر ہلکے ہلکے مسکراتا گاہے گاہے اس پر سرسری نگاہ ڈال لیتا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے اس ڈرے سہمے، ننھے منے زرد چہرے پر رقت انگیز معصومیت سے ملتی جلتی کوئی چیز نظر آ رہی ہے۔

اسے اس جگہ، جہاں اس نے سول ملازم اور اس کی بیوی کو چھوڑا تھا، دونوں میں سے کوئی بھی نظر نہ آیا۔ ہجوم میں میں تیز تیز چلتے اور ان لوگوں کے، جن سے اس کی مڈھ بھیڑ ہوتی، چہروں کا بغور جائزہ لیتے پیئر کی نگاہ غیر شعوری طور پر کسی جارجیائی یا آرمینی خاندان پر پڑ گئی۔ یہ خاندان خوبصورت مشرقی خدوخال کے مالک پیرانہ سال مرد، جس نے بھیڑ کی پوستین کا نیا کوٹ اور نئے بوٹ پہنے ہوئے تھے، اسی وضع کی سن رسیدہ عورت اور نوعمر دوشیزہ پر مشتمل تھا۔ سب سے آخری — نوعمر دوشیزہ — اپنے کمان کی طرح کے خمیدہ ابروؤں، اپنی لطیف رنگت اور اپنے کتابی، شہابی اور ہر قسم کے جذبات سے عاری چہرے کی غیر معمولی خوبصورتی کے باعث اسے مشرقی حسن و جمال کا کامل مرقع معلوم ہوئی۔ ہجوم اور اپنے ادھر ادھر بکھرے سامان کے بیچ میں بیٹھی، بھڑکیلے ساٹن کا فرغل پہنے اور سر پر بنفشی رومال سجائے وہ نرم و نازک اور بدیسی پودے کی، جسے اپنی سرزمین سے اکھاڑ کر برف پر پھینک دیا گیا ہو، یاد دلا رہی تھی۔ وہ بڑھیا سے ذرا پیچھے چند گٹھڑیوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے لانبی پلکوں کے نیچے اپنی بادام کی شکل کی سیاہ غزالی آنکھیں اپنے سامنے زمین پر گاڑ رکھی تھیں۔ بظاہر وہ اپنے حسن سے آگاہ معلوم ہوتی تھی اور اسی بنا پر خوف زدہ تھی۔ پیئر اس کا چہرہ دیکھ کر اتنا متاثر ہوا کہ چوبی باڑ کے ساتھ ساتھ تیز تیز چلتے اس نے متعدد بار پیچھے مڑ کر اس پر نگاہ ڈالی۔ جب وہ باڑ کے آخری سرے پر پہنچا اور جن لوگوں کی اسے تلاش تھی انھیں کہیں نہ پایا، وہ رک گیا اور اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا۔

بازوؤں میں بچی اٹھائے پیئر اور بھی نمایاں ہو گیا تھا اور روسیوں کا، جن میں مرد اور عورتیں دونوں شامل تھیں، ایک گروہ اس کے اردگرد اکٹھا ہو گیا۔

"محترم، آپ کا کوئی ساتھی کھو گیا ہے؟ شکل و صورت سے تو آپ کسی اونچے خاندان کے فرد معلوم ہوتے ہیں، ہیں نا؟ یہ بچی کس کی ہے؟"

پیئر نے بتایا کہ بچی کسی عورت کی ہے۔ وہ سیاہ لبادے میں ملبوس تھی اور اپنے دوسرے بچوں کے ساتھ بالکل اسی جگہ بیٹھی تھی۔ اس نے پوچھا کہ آیا کوئی شخص اسے جانتا ہے اور یہ کہ وہ کہاں چلی گئی ہے۔

"واہ، یہ لازماً آنفی روف ہوں گے۔" بوڑھے نائب پادری نے ایک چیچک رو کسان عورت سے مخاطب ہو کر کہا۔ "خداوند رحم فرمائے، خداوند رحم فرمائے!" اس نے پیشہ ورانہ گھن گرج سے کہا۔

"آنفی روف؟ نہیں۔" عورت نے کہا۔ "بالکل نہیں۔ آنفی روف آج صبح سویرے چلے گئے تھے۔ یہ یا تو ماریا نکولائیونا کی بچی ہو گی یا ایوانوفوں کی۔"

"وہ کہتا ہے، کسی عورت، اور ماریا نکولائیونا عام عورت تھوڑے ہی ہے، وہ تو لیڈی ہے۔" ایک گھریلو غلام

نے حاشیہ آرائی کی۔

''انھیں جانتے ہو؟ دھان پان جسم، بڑے بڑے دانت۔'' پیئر نے کہا۔

''یہ بالکل ماریانکولائیونا ہی ہے۔ جب یہ بھیڑیے ہم پر جھپٹے تھے، وہ لوگ باغ میں چلے گئے تھے۔'' کسان عورت نے فرانسیسی فوجیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''خداوند، ہم پر رحم فرما!'' نائب پادری نے الحانی لہجے سے کہا۔

''آپ اس طرف تشریف لے جائیں، وہ ادھر ہیں۔ وہ رہی وہ، وہ واویلا کر رہی ہے، اپنے آپے میں نہیں ہے!'' کسان عورت نے مزید کہا۔ ''ہاں، وہ رہی وہ، ادھر، بالکل سامنے۔''

لیکن پیئر کا دھیان اس عورت کی بات پر نہیں تھا۔ چند قدم دور جو کچھ ہو رہا تھا، کچھ سیکنڈوں سے اس کی توجہ اس طرف مبذول ہو چکی تھی۔ وہ آرمنی خاندان اور دو فرانسیسی فوجی سپاہیوں کو، جو اس کے قریب جا چکے تھے، بغور دیکھ رہا تھا۔ ایک فوجی ناٹے قد کا تیز طرار شخص شخص تھا۔ اس نے نیلا کوٹ پہنا ہوا تھا اور اس کے اوپر اس نے پیٹی کی جگہ رسی باندھی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر شبینہ ٹوپی تھی اور اس کے پاؤں ننگے تھے۔ دوسرا، جس کی شکل وصورت نے پیئر کی توجہ کو خاص طور پر اپنی جانب مبذول کرایا تھا، لانبا اور لاغر تھا۔ اس کے کندھے خمیدہ، بال بھورے، چال سست اور چہرہ احمقانہ تھا۔ اس نے موٹے اور کھردرے اونی دھاگے کا کوٹ، نیلی پتلون اور ٹوٹے پھوٹے بڑے بڑے ہسی بوٹ پہنے ہوئے تھے۔ نیلے کوٹ میں ملبوس برہنہ پا پست قامت فرانسیسی آرمنیوں کے پاس پہنچا، ان سے کچھ کہا اور آؤ دیکھا نہ تاؤ، اس نے جھٹ بوڑھے کی ٹانگیں پکڑ لیں۔ بوڑھا حتیٰ الامکان جلد از جلد اپنے بوٹ اتارنے لگا۔ دوسرا سپاہی، جیبوں میں ہاتھ ڈالے، آرمنی دوشیزہ کے سامنے جا کھڑا ہوا اور چپ چاپ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

''اے، ادھر، یہ بچی پکڑنا۔'' پیئر نے بچی کو کسان عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے تحکمانہ انداز سے کہا۔ ''اس بچی کو اس کے ماں باپ کے پاس لے جاؤ۔ اسے وہیں چھوڑ آؤ!'' اس نے بچی کو، جو چیخنے چلانے لگی تھی، زمین پر لٹاتے اور تقریباً گلا پھاڑتے ہوئے کہا، اور دوبارہ فرانسیسیوں اور آرمنیوں کو دیکھنے لگا۔

بوڑھا اب ننگے پاؤں بیٹھا تھا۔ فرانسیسی نے ابھی ابھی اس سے دوسرا بوٹ پکڑا تھا اور اب وہ دونوں جوتوں کو ایک دوسرے سے ٹکرا رہا تھا۔ بوڑھے نے گلوگیر آواز میں کچھ کہا لیکن پیئر کو جو کچھ ہو رہا تھا، اس کی محض جھلک دکھائی دی۔ اس کی ساری توجہ موٹا جھوٹا اونی کوٹ پہنے فرانسیسی پر مبذول تھی۔ یہ فرانسیسی اس عرصے کے دوران میں جھولتا جھولتا نوجوان دوشیزہ کے قریب پہنچ چکا تھا اور جیبوں سے ہاتھ نکال کر اس کی گردن اپنی گرفت میں لے چکا تھا۔

حسین وجمیل آرمنی دوشیزہ لانبی پلکیں جھکائے ہلے جلے بغیر اسی انداز سے اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ فوجی جو کچھ اس کے ساتھ کر رہا ہے، اس نے اسے نہ دیکھا ہے اور نہ محسوس کیا ہے۔

پیئر اور فرانسیسیوں کے مابین جو چند قدموں کا فاصلہ تھا، جب تک وہ اسے طے کرتا، لانبا قزاق دوشیزہ کا

نیکلس کھسوٹ چکا تھا۔ لڑکی نے اپنا گلا پکڑا اور پوری قوت سے دلدوز چیخ ماری۔

''اس لڑکی کو چھوڑ دو!'' پیئر نے لانبے اور خمیدہ فوجی کو کندھوں سے پکڑتے اور اسے ایک طرف دھکا دیتے ہوئے غصیلی اور بھرّائی ہوئی آواز سے کہا۔

سپاہی گر پڑا، جوں توں کر کے اٹھا اور بھاگ پڑا۔ مگر اس کے ساتھی نے بوٹ نیچے پھینکے، اپنی تلوار پر ہاتھ رکھا اور تہدیدی انداز سے پیئر کی جانب بڑھا۔

''ہونہہ، سنبھلو، یہاں نٹ کھٹیاں نہیں چلیں گی!'' وہ دہاڑا۔

پیئر غصے سے اتنا کھول رہا تھا کہ اسے تن بدن کا ہوش نہ رہا اور اس کی قوت میں دس گنا اضافہ ہو گیا۔ وہ برہنہ پا فوجی کی طرف بڑھا اور پیشتر اس کے کہ وہ اپنی تلوار سونت سکتا، اس نے اسے زمین پر پٹخ دیا اور اس پر گھونسوں کی بارش کر دی۔ ہجوم نعرہ ہائے تحسین بلند کرنے لگا اور اسی دم نیزہ بردار فرانسیسی گھوڑ سواروں کا گشتی دستہ سڑک کا موڑ کاٹتا وہاں پہنچ گیا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھے اور انھوں نے پیئر اور فرانسیسی کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اس کے بعد کیا ہوا، پیئر کو کچھ یاد نہ رہا۔ اسے صرف اتنا معلوم تھا کہ وہ کسی کی پٹائی کر رہا تھا اور خود اس سے پٹ رہا تھا، یہ کہ آخر کار اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا دی گئی، فرانسیسی فوجیوں کے ایک گروہ نے اسے اپنے نرغے میں لے لیا اور اس کی جامہ تلاشی لی۔

''لیفٹیننٹ، اس کے پاس خنجر ہے۔'' پیئر نے اولیں الفاظ سنے۔

''ہائیں، ہتھیار!'' افسر پکارا۔ اور اس نے برہنہ پا فرانسیسی کی جانب، جسے پیئر کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا تھا، متوجہ ہو کر کہا: ''بہت خوب۔ یہ بات یاد رکھنا اور فوجی عدالت کو بتانا۔'' اس کے بعد وہ پیئر سے مخاطب ہوا اور پوچھنے لگا: ''فرانسیسی بول لیتے ہو؟''

پیئر نے اپنے ارد گرد خونخوار نظروں سے دیکھا اور کوئی جواب نہ دیا۔ اس کا چہرہ لازماً بھیانک ہو گا کیونکہ افسر نے زیر لب کچھ کہا اور چار مزید گھوڑ سوار آگے بڑھے۔ وہ پیئر کے دونوں جانب کھڑے ہو گئے۔

''فرانسیسی بول لیتے ہو؟'' افسر نے اپنے اور پیئر کے مابین فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے اپنی بات پھر دہرائی۔

''ترجمان کو بلاؤ۔''

سویلین روسی لباس پہنے ایک کوتاہ قامت شخص عام سپاہیوں کی صف سے آگے بڑھا۔ اس کے لباس اور گفتگو سے پیئر جھٹ پٹ پہچان گیا کہ وہ ماسکو کی دکانوں میں کام کرنے والا کوئی فرانسیسی سیلز مین ہے۔

''یہ کوئی عام شخص معلوم نہیں ہوتا۔'' ترجمان نے پیئر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

''اونہہ! مجھے تو یہ کوئی آتش زن معلوم ہوتا ہے۔'' افسر نے کہا۔ ''اس سے پوچھو کہ یہ ہے کون؟''

''آپ کون ہیں؟'' ترجمان نے فرانسیسی لہجے میں روسی بولتے ہوئے کہا۔ ''آپ کو افسر کے سوال کا جواب دینا ہو گا۔''

''میں کون ہوں؟ یہ میں تمھیں نہیں بتاؤں گا۔ میں تمھارا اسیر ہوں۔ مجھے لے چلو۔'' پیئر نے اچانک فرانسیسی میں کہا۔

''اوہو!'' افسر قہر آلود نگاہوں سے دیکھتا بڑبڑایا۔ ''اچھا، پھر چلو!''

گھوڑسواروں کے اردگرد لوگوں کا جمگھٹا ہو چکا تھا۔ چیچک رو کسان عورت بچی اٹھائے پیئر کے قریب کھڑی تھی۔ جب گشتی دستہ روانہ ہونے لگا، وہ آگے بڑھی۔

''مائی ڈیئر، یہ لوگ تمھیں کہاں لے جا رہے ہیں؟'' اس نے کہا۔ ''اور یہ ننھی منی بچی — ننھی منی بچی۔ اگر یہ ان کی ہوئی، پھر میں اس کا کیا کروں؟''

''یہ عورت کیا چاہتی ہے؟'' افسر نے دریافت کیا۔

پیئر یوں نظر آ رہا تھا جیسے وہ نشے میں ہو۔ جس بچی کو اس نے بچایا تھا، اسے دیکھ کر اس کی مسرت دوچند ہو گئی۔

''یہ کیا چاہتی ہے؟'' وہ چلا کر بولا۔ ''وہ میرے پاس میری ننھی منی بچی لا رہی ہے۔ اسے میں نے ابھی ابھی آگ کے شعلوں سے بچایا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''خدا حافظ!''

اور قطعاً یہ جانے بغیر کہ اس نے یہ بے مقصد جھوٹ کیوں اگل دیا تھا، وہ فاتحانہ شان سے فرانسیسی فوجیوں کے مابین چلنے لگا۔

فرانسیسی جرنیل دوغوس نیل (Durosnel) کے احکام پر جو فرانسیسی گشتی دستے لوٹ مار روکنے اور سب سے بڑھ کر آتش زنوں کو گرفتار کرنے کے لیے روانہ کیے گئے تھے، یہ ان میں سے ایک تھا۔ اس روز اعلیٰ فرانسیسی حکام کا عام خیال یہ تھا کہ ماسکو میں آگ لگنے کے جو واقعات ہو رہے ہیں، ان کے پس پردہ آتش زنوں کا ہاتھ ہے۔ مختلف سڑکوں پر گشت کرنے کے بعد اس گشتی دستے نے پانچ مزید روسی — ایک دکاندار، مذہبی مدارس کے دو طالب علم، ایک کسان اور ایک خانگی غلام — اور متعدد دیگر اشخاص، جو لوٹ مار میں مصروف تھے، گرفتار کر لیے۔ جب انھیں رات گزارنے کے لیے زوبوسکی بند پر واقع وسیع و عریض مکان میں، جو بطور حوالات استعمال کیا جا رہا تھا، لایا گیا، پیئر کو دوسروں سے الگ تھلگ کر دیا گیا اور اس پر سخت پہرا بٹھا دیا گیا۔

چوتھی کتاب

حصہ اول

1

اس عرصے کے دوران میں پیٹرز برگ کے اونچے حلقوں میں رومانتسیف ،فرانسیسیوں ،ماریا فیودرونا ،زار یوچ اور دوسرے لوگوں کے گروہوں کے مابین پیچیدہ نوعیت کی جنگ برپا تھی۔ اگر چہ اس میں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ شدت آچکی تھی لیکن وہ حسب معمول لیموں نچوڑوں کی بھنبھناہٹ میں ڈوب چکی تھی۔تاہم پیٹرز برگ کی آرام طلب اور عیش کوش زندگی، جسے زندگی کے صرف واہموں اور پرچھائیوں سے واسطہ تھا، اپنے لگے بندھے انداز سے جاری تھی۔ چنانچہ روسی قوم، اب جن خطرات اور مشکلات میں گھر چکی تھی، اس کا ادراک کرنے کے لیے کہیں زیادہ کوشش درکار تھی۔ وہی استقبالیے اور بال تھے، وہی فرانسیسی تھیئٹر ، وہی درباری مفادات اور سرکاری محکموں میں وہی گروہ بندیاں اور سازشیں۔ صرف اعلیٰ ترین حلقوں میں اصل صورت حال کی نزاکت اور مشکلات کو ذہن میں رکھنے کی سعی کی جاتی تھی۔ ان صبر آزما حالات میں دونوں امپراطوریں[1] جو مختلف رویے اپنائے ہوئے تھیں، لوگ صرف سرگوشیوں میں ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ مادر ملکہ ماریا فیودرونا کو ان تعلیمی اور فلاحی اداروں کی، جو اس کی سرپرستی میں چل رہے تھے، بہبود کی بہت فکر تھی۔ اس نے حکم دیا کہ انھیں قازان منتقل کر دیا جائے۔ (ان اداروں کا سامان پہلے ہی باندھا جا چکا تھا۔) تاہم جب امپراطورہ ایلساوتا الیکسیونا سے دریافت کیا گیا، ''آپ کیا احکام صادر فرمانا چاہیں گی؟'' تو اس نے اپنے مخصوص جذبۂ حب الوطنی سے جواب دیا کہ وہ سرکاری اداروں کے بارے میں کوئی ہدایات نہیں دے سکتی کیونکہ یہ معاملات فرماں روائے مملکت کے حیطۂ اختیارات میں آتے ہیں، لیکن جہاں تک اس کی اپنی ذات کا تعلق ہے، وہ سب سے آخر میں پیٹرز برگ کو خیر باد کہے گی۔

آنا پاولونا کے ہاں چھبیس اگست کو، عین اس روز جب بارودینو کی لڑائی جاری تھی، محفل منعقد ہوئی۔ اس محفل کی سب سے بڑی کشش یہ تھی کہ اس میں اس مراسلے کی، جو ماسکو کے عزت مآب بشپ نے زار کو سینٹ سرجی[2] کے الیقونے کے ساتھ ارسال کیا تھا، خواندگی ہونا تھی۔ یہ خط کلیسائی اور حب الوطنانہ بلاغت کا نمونہ تصور کیا گیا تھا۔ پرنس واسیلی نے، جس کے فن خطابت کی بڑی دھوم تھی (وہ امپراطورہ کے ہاں بھی ایک سے زیادہ مرتبہ اس کی خواندگی کر چکا تھا۔)، اسے پڑھ کر سنانا تھا۔ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ بلند اور مترنم لہجے سے الفاظ کی ادائیگی کرتا تھا۔

کبھی اس کے لہجے میں اتنی یاس ہوتی کہ وہ فریاد کرتا نظر آتا اور کبھی اس میں نوحہ خواں کی ملائمت در آتی۔ تاہم جہاں تک معانی کا تعلق ہے، وہ ان کی رتی برابر پروانہ کرتا۔ وہ کس لفظ کو فریاد کناں کے اور کس کو نوحہ خواں کے انداز سے ادا کرتا، یہ محض اتفاق کی بات ہوتی۔ جیسا کہ آنناپاولونا کی محفلوں کا ابدی دستور تھا، یہ خواندگی سیاسی اہمیت کی حامل تھی۔ اس شام متعدد شخصیات کی آمد متوقع تھی۔ مقصد انھیں ان کے فرانسیسی تھیٹروں میں جانے پر شرمندہ کرنا اور ان کے دلوں اور دماغوں میں حب الوطنی کے جذبات ابھارنا تھا۔ لوگوں کی اچھی خاصی تعداد پہلے ہی پہنچ چکی تھی لیکن جب آنناپادولونا نے دیکھا کہ وہ تمام اشخاص، جن کی موجودگی وہ ضروری تصور کرتی تھی، ابھی تک نہیں آئے، اس نے خواندگی مؤخر کردی اور عمومی گفتگو چلنے دی۔

پیٹرزبرگ میں اس دن کی اہم ترین خبر کاؤنٹس بزوخووا کی علالت تھی۔ اس کی طبیعت چند روز قبل غیر متوقع طور پر بگڑ گئی تھی۔ وہ متعدد محفلوں میں، جنھیں وہ اپنی موجودگی سے رونق بخشا کرتی تھی، شریک نہیں ہو سکی تھی، اور سننے میں آیا تھا کہ وہ کسی بھی شخص کو اپنے گھر آنے کی اجازت نہیں دے رہی۔ پیٹرزبرگ کے نامی گرامی ڈاکٹروں کی بجائے، جو عام طور پر اس کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے، اس نے اپنے آپ کو ایک اطالوی ڈاکٹر کی تحویل میں دے دیا تھا۔ وہ اس کا کسی نئے اور غیر معمولی طریقے سے علاج کر رہا تھا۔

یہ بات ہر کہ ومہ کے علم میں تھی کہ اس کی علالت کا سبب وہ مشکل تھی جو اسے بیک وقت دو شوہروں کے ساتھ نکاح کرنے کے سلسلے میں پیش آ رہی تھی اور یہ کہ اطالوی علاج کا مقصد اس مشکل کا دور کرنا تھا۔ تاہم آنناپاولونا کی موجودگی میں کسی شخص کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ اس قسم کا کوئی خیال اپنے دل میں بھی لا سکے، یہ ظاہر کرنا کہ وہ اس کے متعلق جانتا ہے تو بہت دور کی بات تھی۔

''سنا ہے کہ بے چاری کاؤنٹس کی طبیعت سخت خراب ہے۔ ڈاکٹر کا خیال ہے کہ وہ وجع الصدر[3] میں مبتلا ہے۔''

''وجع الصدر؟ یہ تو بڑا نامراد مرض ہے!''

سنا ہے کہ وجع الصدر کی وجہ سے رقیبوں میں صلح ہو گئی ہے...''

لفظ ''وجع الصدر'' مزے لے لے کر دہرایا گیا۔

''سنا ہے کہ بوڑھے کاؤنٹ کی حالت بہت ابتر ہے، دیکھ کر ترس آتا ہے۔ جب ڈاکٹر نے اسے بتایا کہ مرض بہت خطرناک ہے، وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر رو دیا۔''

''اوہ، اس سے تو بڑا زبردست نقصان ہوگا۔ کیا من موہنی خاتون ہے!''

''تم لوگ بے چاری کاؤنٹس کی باتیں کر رہے ہو؟'' آنناپاولونا نے ایک ٹولی کے مابین بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے اس کی علالت کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی غرض سے آدمی بھیجا تھا۔ مجھے بتایا گیا ہے کہ اب اس کی حالت قدرے بہتر ہے۔ اوہ، اس میں کلام نہیں کہ پوری دنیا میں اس سے بڑھ کر آپ کو سحر انگیز خاتون نہیں ملے گی۔'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ اپنی اس گرم جوشی پر وہ خود مسکرا رہی تھی۔ ''گو ہمارا تعلق

مختلف کیمپوں سے ہے لیکن یہ بات مجھے اس کی وہ تحسین کرنے سے نہیں روکتی، جس کی وہ مستحق ہے۔ بے چاری قسمت کی ہیٹی ہے!'' آنناپاولوونا نے مزید کہا۔

یہ فرض کرتے ہوئے کہ کاؤنٹس کی علالت پراسرار کا جو پردہ پڑا ہوا تھا، آنناپاولوونا نے اپنے ان الفاظ سے اسے قدرے سرکا دیا ہے، ایک ناعاقبت اندیش نوجوان نے جرأت رندانہ سے کام لے کر تعجب کا اظہار کیا کہ نامی گرامی ڈاکٹروں کو بلایا تک نہیں گیا اور ان کے بجائے کاؤنٹس کا علاج کوئی عطائی کر رہا ہے، اسے اندیشہ تھا کہ کہیں وہ کوئی خطرناک ادویات تجویز نہ کر دے۔

''ہوسکتا ہے کہ تمھیں مجھ سے بہتر معلومات حاصل ہوں۔'' آنناپاولوونا نے ناتجربہ کار نوجوان کو زہر آلود نگاہوں سے گھورتے ہوئے بے اعتنائی سے جواب دیا۔ ''لیکن مجھے انتہائی مستند ذرائع نے بتایا ہے کہ یہ ڈاکٹر غیر معمولی طور پر ہوشیار اور پڑھا لکھا شخص ہے۔ وہ ملکہ ہسپانیہ کا ذاتی معالج ہے۔''

اس نوجوان کو چاروں شانے چت گرانے کے بعد آنناپاوولونا ایک دوسری ٹولی کی طرف متوجہ ہوئی۔ وہاں بلبین آسٹرویوں کے متعلق گفتگو کر رہا تھا۔ اپنی پیشانی پر شکن ڈالنے کے بعد وہ بظاہر کوئی پھڑکتا ہوا جملہ کہہ کر دوبارہ پرسکون ہونا چاہتا تھا۔

''مجھے تو یہ بہت مزے کی چیز معلوم ہوتا ہے۔'' اس نے ایک سفارتی مراسلے کی طرف، جو ویانا ارسال کیا گیا تھا، اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ [اس مراسلے کے ساتھ چند آسٹروی پرچم[4] جنھیں وٹ گین شٹائین نے فرانسیسیوں سے چھینا تھا، بھیجے گئے تھے۔ وِٹ گین شٹائن کو پیٹرز برگ میں ''پیوتر پول کا ہیرو'' کہا جانے لگا تھا۔]

''کیا؟ کیا کہا؟'' آنناپاوولونا نے کہا۔ وہ اس کے ظریفانہ جملے کو پہلے بھی سن چکی تھی۔ اب جو اس نے مداخلت کی، تو اس کا اثر یہ ہوا کہ سامعین نے چپ سادھ لی۔

اور بلبین نے سفارتی مراسلے کے، جو اس کے اپنے ذہن کی پیداوار تھا، مندرجہ ذیل اصل الفاظ دہرائے:

''امپراطور یہ پرچم،'' اس نے کہا، ''یہ دوستانہ پرچم، جو بھٹک گئے تھے اور غلط شاہراہ پر پائے گئے تھے، واپس کر رہا ہے۔'' اس نے اپنی پیشانی کی شکنیں دور کرتے ہوئے کہا۔

''دلچسپ، دلچسپ،'' پرنس واسیلی نے کہا۔

''شاید یہ شاہراہ وارسا جاتی ہے...'' پرنس ایپولیت نے غیر متوقع طور پر با آواز بلند کہا۔

تمام لوگوں کی نگاہیں اس کی طرف اٹھ گئیں۔ کسی کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا مطلب کیا تھا۔ پرنس اپولیت نے بھی اپنے گردوپیش یوں دیکھا جیسے وہ بہت محظوظ ہو رہا ہو۔ دوسرے لوگوں کی طرح خود اسے بھی یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا کہنا چاہتا تھا۔ اپنی سفارتی ملازمت کے دوران میں اس کے مشاہدے میں یہ چیز آئی تھی کہ جو باتیں اضطراری پر کہہ دی جاتی ہیں، وہ بذلہ سنجی کا شاہکار ثابت ہوتی ہیں، چنانچہ وہ ہر موقع پر پہلی بات، جو اس کے ذہن میں آتی تھی، کہہ دیتا تھا۔ ''ممکن ہے اس مرتبہ کی بات بہت اچھی ثابت ہو۔'' وہ سوچتا۔ ''اگر ایسا نہ بھی ہوا، پھر بھی ان میں

سے کوئی نہ کوئی شخص اس کا کوئی نہ کوئی مفہوم نکال ہی لے گا!" پرنس اپیولیت کے جملے کے بعد جو کذھب خاموشی چھائی، اس کے دوران میں وہ آدمی، جس کی حب الوطنی مطلوبہ معیار پر پوری نہیں اترتی تھی اور جس کا آنا پاولوونا کو انتظار تھا۔ کمرے میں داخل ہونا۔ آنا پاولوونا اسے دیکھ کر مسکرائی اور وہ پرنس اپیولیت کی جانب انگلی لہراتے ہوئے پرنس واسیلی سے ملتجی ہوئی کہ وہ مسودے کی، جو دو موم بتیوں کے سامنے میز پر پڑا تھا، خواندگی شروع کردے۔ سب حاضرین خاموش ہو گئے۔

"والا تبار، عالی قدر، امپراطور معظم!" پرنس واسیلی نے درشت لہجے سے آغاز کیا۔ اس نے اپنے سامعین کی طرف کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے وہ دریافت کرنا چاہتا ہو کہ کسی کو اس سے اختلاف تو نہیں اور وہ اس کے برعکس کچھ کہنا تو نہیں چاہتا، لیکن کسی نے کچھ نہ کہا۔ "ماسکو، ہمارا قدیمی پایہ تخت، نیا یروشلم، اپنے مسیحا کو خوش آمدید کہتا ہے،" اس نے اچانک لفظ اپنے پر خاص زور دیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح ماں اپنے جوشیلے بیٹوں کو خوش آمدید کہتی ہے اور ان سے بغل گیر ہوتی ہے۔ "دھند کے جو بادل اکٹھے ہو رہے ہیں، ان میں سے اسے (ماسکو کو) آپ کے عہد زریں کی درخشانی و تابانی نظر آتی ہے اور وہ وفور مسرت سے نغمہ سرا ہوتا ہے: 'ہوشعنا[5] مبارک ہیں وہ جو قدم رنجہ فرماتے ہیں!'"

پرنس واسیلی نے آخری الفاظ یوں ادا کیے جیسے وہ نوحہ پڑھ رہا ہو۔

بلبین نے نہایت انہماک سے اپنے ناخنوں کا معائنہ کیا اور سامعین میں سے متعدد اشخاص مرعوب دکھائی دیے جیسے انھیں تعجب ہو کہ ان سے کیا خطا سرزد ہو گئی ہے۔ آنا پاولوونا نے اگلے الفاظ بالکل اس عورت کی طرح، جو عشائے ربانی پر منہ ہی منہ میں مناجات پڑھتی رہتی ہے، پیشگی ادا کر دیے:

"اگر گستاخ اور ڈھیٹ جولیت..." وہ زیر لب کہہ رہی تھی۔

پرنس واسیلی نے اپنی خواندگی جاری رکھی:

"اگر گستاخ اور ڈھیٹ جولیت فرانس کی سرحدوں سے نکل کر مملکت روس کو محصور کرتا ہے اور اپنی جلو میں موت کی وحشتیں اور دہشتیں لاتا ہے، کوئی پروا نہیں، سیدھا سادا عقیدہ، جو روسی داؤد کا فلاخن[6] ہے، چشم زدن میں اس کے خونخوار تکبر سمیت اس کا سر اڑا دے گا۔ تقدس مآب سینٹ سرجی کا یہ ایقونہ جو، ہمارے وطن عزیز کی فلاح و بہبود کے لیے اتنا سرگرم عمل ہے، یوئر امپیریل میجسٹی کی خدمت اقدس میں پیش کیا جا رہا ہے۔ میں بہت دکھ سے یہ عرض کرتا ہوں کہ میرے ضعف اور ناتوانی نے، جو روز بروز بڑھتے جا رہے ہیں، مجھے اس قابل نہیں چھوڑا کہ میں خود آپ کی بارگاہ میں حاضر ہو سکوں اور آپ کی انتہائی واجب الاحترام اور بابرکات ذات کی زیارت کر کے اپنے دل کو ٹھنڈک پہنچا سکوں۔ میں بصمیم قلب گڑگڑا کر خداوند کے حضور دعا کرتا ہوں کہ قادر مطلق راست مندوں کے درجات بلند فرمائے اور یوئر میجسٹی کی آرزوؤں کو اپنے فضل و کرم سے شرف قبولیت بخشے۔"

"Quelle force! Quel style!"* قاری اور مصنف دونوں کی یکساں تعریف میں آوازیں بلند ہوئیں۔

* کیا زور بیاں ہے! کیا اسلوب ہے!

اس فصاحت اور بلاغت نے آنا پاولونا کے مہمانوں کو سرشار کر دیا اور ان کے اندر نئی روح پھونک دی۔ وہ خاصی دیر تک اپنی مادر وطن کے حالات کے بارے میں آپس میں بحث و تمحیص کرتے رہے اور اگلے چند روز کے اندر جو لڑائی لڑی جانا تھی، اس کے نتیجے کے متعلق مختلف قیاسات کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔

"آپ دیکھیں گے کہ کل زار کی سال گرہ پر ہمیں خبر مل جائے گی۔" آنا پاولونا نے کہا۔ "میرا دل کہتا ہے کہ خبر خوش کن ہی ہوگی۔"

2

اور سچی بات یہ ہے کہ آنا پاولونا نے جو پیش گوئی کی تھی، وہ صحیح ثابت ہوئی۔ اگلے روز امپراطور کی سال گرہ کے اعزاز میں محل میں خصوصی عبادت کا انتظام کیا گیا تھا، اس کے دوران میں پرنس ولکونسکی کو شاہی گرجے سے باہر بلایا گیا اور اسے کوتوزوف کا مراسلہ پہنچایا گیا۔ کوتوزوف نے اپنی یہ رپورٹ لڑائی کے روز تاتارینووا[7] کے مقام پر لکھی تھی اور اس نے اطلاع دی تھی کہ روسی ایک قدم بھی پیچھے نہیں ہٹے، یہ کہ فرانسیسیوں کے نقصانات ہمارے نقصانات سے کہیں زیادہ ہیں اور یہ کہ وہ یہ مراسلہ میدان جنگ سے عجلت میں رقم کر رہا ہے اور اسے اتنا وقت نہیں مل سکا کہ وہ تازہ ترین معلومات اکٹھی کر سکتا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ فتح لازماً روسیوں کی ہوئی ہوگی۔ چنانچہ گرجے سے باہر نکلے بغیر جھٹ پٹ خالق کائنات کا شکر ادا کیا گیا کہ اس نے (روسیوں کو) اپنی نصرت سے سرفراز کیا اور (انھیں) فتح سے ہم کنار کیا۔

آنا پاولونا کی پیشگوئی کی تکمیل ہوگئی اور اس روز تمام شہر میں فرحت بخش تعطیل کی کیفیت طاری رہی۔ ہر شخص کو یقین تھا کہ ہمیں فتح کامل نصیب ہوئی ہے اور اس میں کسی چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ نپولین قیدی بنا لیا گیا ہے، اسے تخت سے معزول کر دیا گیا ہے اور فرانس میں نیا حکمران مقرر کر دیا گیا ہے۔

وہ واقعات جو بیسیوں میل دور پیش آتے ہیں، درباری ماحول میں اور اتنی دوری سے ان کی وسعت اور قوت کا صحیح اندازہ لگانا انتہائی دشوار ہوتا ہے۔ عمومی واقعات کا تانا بانا ناگزیر طور پر کسی انفرادی وقوعے کے گرد تشکیل پاتا ہے۔ چنانچہ اب درباریوں کو جو خوشی ہو رہی تھی، اس کا تعلق جتنا اس چیز سے تھا کہ فتح حاصل ہوگئی ہے، اتنا ہی اس حقیقت سے بھی تھا کہ (فتح کی) خبر زار کی سال گرہ کے موقع پر موصول ہوئی ہے۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا کہ کوئی ایسی چیز، جس کا آدمی کو سان، ہونہ گمان، کامیابی سے ترتیب دے دی گئی ہو۔ کوتوزوف نے اپنی رپورٹ میں چند ہلاک شدگان کا ذکر بھی کیا تھا اور دوسرے لوگوں کے علاوہ ان میں تچ کوٹ، باگ راتیاں اور کوتائی سوف کے نام بھی درج کیے تھے۔ جہاں تک واقعے کے افسوس ناک پہلو کا تعلق ہے، یہاں پیٹرز برگ کی دنیا میں ایک بار پھر وہ ناگزیر طور پر صرف ایک وقوعہ — کوتائی سوف کی ہلاکت — پر مرکوز تھا۔ ہر شخص اسے جانتا تھا، زار اسے پسند کرتا تھا۔ وہ نوجوان تھا

اور دلچسپ تھا۔ اس روز باہمی ملاقاتوں کے دوران میں لوگ بدیں الفاظ ایک دوسرے سے گفتگو کرتے تھے:
''کیا حیرت انگیز اتفاق ہے! عین عبادت کے دوران میں خوش خبری موصول ہوئی! لیکن کوتائی سوف کی موت کتنا بڑا صدمہ ہے! حیف، صد حیف! دل پر چھریاں چل گئیں!''
''میں نے کوتوزوف کے متعلق آپ کو کیا بتایا تھا؟'' پرنس واسیلی پیغمبرانہ فخر وابتہاج سے کہتا نہ تھکتا۔ ''میں نے ہمیشہ یہی کہا کہ وہ واحد شخص ہے جس میں نپولین کو شکست دینے کی صلاحیت ہے۔''
لیکن اگلے روز فوج سے کوئی خبر اخبار موصول نہ ہوئی اور عام لوگوں کے اذہان میں تفکرات سر اٹھانے لگے۔ امید وبیم کی کیفیت میں زار جس اذیت میں مبتلا تھا، درباریوں کو اس اذیت سے اذیت ہو رہی تھی۔
''ذرا زار کی حالت کا اندازہ تو لگائیں!'' وہ کہہ رہے تھے اور گزشتہ روز کی طرح کوتوزوف کی تعریف و ستائش میں رطب اللسان ہونے کے بجائے اب وہ اسے ملاحیاں سنا رہے تھے کہ اس نے امپراطور کو پریشانیوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ پرنس واسیلی اب اپنے ممدوح کے بارے میں ڈینگیں مارنے سے گریز کرنے لگا اور جب کبھی کمانڈر انچیف کا ذکر آتا، وہ چپ سادھ لیتا۔

مزید برآں، گویا کہ کائنات کی ہر چیز پیٹرز برگ کے اشراف کو پریشانیوں اور خدشات میں مبتلا کرنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھی ہو، شام کے قریب ایک اور ہول ناک خبر کا اعلان ہو گیا۔ کاؤنٹس بزخووا کا یکایک اس لرزہ خیز مرض سے، جس کے بارے میں باتیں بنا کر لوگوں کو بہت لطف آتا تھا، انتقال ہو گیا ہے۔ بڑے بڑے اجتماعات میں ہر کس وناکس یہ سرکاری کہانی دہراتے نہ تھکتا کہ کاؤنٹس پر وجع الصدر کا شدید دورہ پڑا اور وہ اس سے جان بر نہ ہو سکی، تاہم بے تکلف احباب کے حلقوں میں کچھ اس قسم کی تفصیلات منظر عام پر آنے اور گفتگو کا موضوع بننے لگی تھیں کہ ملکہ ہسپانیہ کے ذاتی معالج نے خاص نتائج حاصل کرنے کے لیے خاص قسم کی ادویات کی خفیف خوراکیں تجویز کی تھیں لیکن ہیلین مجوزہ حدود سے تجاوز کر گئی، اس نے ادویات کی خاصی بڑی مقدار نگل لی اور وہ کسی قسم کی مدد ملنے سے پہلے ہی جاں بحق ہو گئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ معمر کاؤنٹ کو اس کے بارے میں شکوک لاحق ہونا شروع ہو گئے تھے اور دوسری یہ کہ اس کے شوہر (وہی ''بدذات، آوارہ اور بدچلن'' پیئر) نے اس کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ پرنس واسیلی اور معمر کاؤنٹ اطالوی ڈاکٹر کے خلاف کارروائی کرنا چاہتے تھے لیکن مؤخر الذکر نے بدقسمت کاؤنٹس کے کچھ ایسے خطوط دکھائے کہ انھوں نے جھٹ پٹ سارا معاملہ ٹھپ کرا دیا۔

لوگوں کی گفتگو عام طور پر تین افسوس ناک موضوعات پر — امپراطور کے لیے اطلاعات کی عدم دستیابی، کوتائی سوف کی ہلاکت اور ہیلین کا انتقال — مرکوز رہتی تھی۔

کوتوزوف کے مراسلے کی وصولی کے چوتھے روز ماسکو کا ایک جاگیردار پیٹرز برگ پہنچا اور جنگل کی آگ کی طرح سارے پیٹرز برگ میں یہ خبر پھیل گئی کہ ماسکو فرانسیسیوں کے حوالے کر دیا گیا ہے۔ یہ خبر بہت بھیانک تھی! زار بڑی مصیبت میں پھنس گیا تھا! کوتوزوف پر غداری کا ٹھپا لگ چکا تھا اور پرنس واسیلی، جو از یں پیشتر اس کی تعریفیں

کرتا نہیں تھکتا تھا، اب یہ سب کچھ بھول بھال ان لوگوں سے، جو اس کی بیٹی کے انتقال پر اس کے پاس تعزیت کرنے آتے تھے، گفتگو کے دوران میں یہ کہنے لگا کہ اس اندھے اور بدقماش بڈھے سے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ (ویسے اگر اپنے غم میں اسے وہ سب کچھ، جو وہ اس سے پہلے کہا کرتا تھا، یاد نہیں رہا تھا تو وہ قابل معافی تھا۔)

''مجھے تو اچنبھا اس بات پر ہو رہا ہے کہ روس کی تقدیر اس قسم کے آدمی کے ہاتھوں میں تھما دی گئی۔''

جب تک خبر سرکاری نہیں تھی، اس کے بارے میں شک وشبہ کرنا ممکن تھا لیکن چوبیس گھنٹے بعد کاؤنٹ رستوپ چن کی طرف سے مندرجہ ذیل اطلاع موصول ہوئی:

''پرنس کوتوزوف کے ایجوٹنٹ نے مجھے ایک مراسلہ دیا ہے۔ اس میں مطالبہ کیا گیا ہے کہ فوج کو ریازان روڈ تک بحفاظت پہنچانے کے لیے پولیس افسر مہیا کیے جائیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ نہایت افسوس سے ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑ رہے ہیں۔ کوتوزوف کے طرز عمل نے دارالسلطنت اور آپ کی مملکت کا فیصلہ کر دیا ہے۔ قوم کو جب یہ معلوم ہوگا کہ وہ شہر، جو روس کی عظمت کی نمائندگی کرتا ہے اور جس میں آپ کے بزرگوں کے اجساد خاکی دفن ہیں، دشمن کے قبضے میں چلا گیا ہے، وہ سرتاپا کانپنے لگے گی۔ میں فوج کے پیچھے جا رہا ہوں۔ میں نے یہاں سے سب کچھ باہر بھجوا دیا ہے اور اب میرے لیے صرف ایک ہی کام رہ گیا ہے کہ مادر وطن کی حالت زار پر آنسو بہاتا رہوں۔''

اس مراسلے کی وصولی کے بعد امپراطور نے پرنس ولکونسکی کو مندرجہ ذیل شاہی مکتوب کے ساتھ کوتوزوف کے پاس بھیجا:

''پرنس میخائیل الاری اونا وچ، مجھے انتیس اگست سے آپ کی طرف سے کوئی خبر موصول نہیں ہوئی۔ دریں اثنا مجھے یکم ستمبر کو براستہ یاروسلاول[8] ماسکو کے گورنر جنرل کی فرستادہ یہ تکلیف دہ اطلاع ملی کہ آپ نے فوج کے ساتھ ماسکو چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس خبر نے مجھ پر جو اثر کیا ہوگا، اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں اور آپ کی خاموشی نے میرے تحیر میں اضافہ کر دیا ہے۔ میں اس مکتوب کے ساتھ ایجوٹنٹ جنرل ولکونسکی کو بھیج رہا ہوں تاکہ آپ سے صحیح صحیح معلوم کیا جا سکے کہ فوج کی حالت کیا ہے اور وہ کون سی وجوہات تھیں کہ آپ یہ اذیت ناک فیصلہ کرنے پر مجبور ہوئے۔''

3

ماسکو سے دست برداری اختیار کیے جانے کے نو روز بعد کوتوزوف کا ایلچی مصدقہ رپورٹ لے کر، کہ ماسکو کیوں چھوڑنا پڑا، پیٹرزبرگ پہنچا۔ ایلچی فرانسیسی تھا اور اس کا نام میشو (Michaud) تھا۔ اسے روسی نہیں آتی تھی اور وہ تھا بھی غیر ملکی، لیکن خود اس کے اپنے بقول وہ ''بہ دل وجان'' روسی تھا۔

امپراطور نے اسے بلاتاخیر اپنے محل کے، جو کامینی (Kamenny) جزیرے پر واقع تھا، سٹڈی روم میں

اذنِ باریابی بخشا۔ میشو جنگ چھڑنے سے قبل کبھی ماسکو نہیں گیا تھا اور اسے روسی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا تھا، لیکن جب وہ ماسکو کی آتش زنی کی، جس کے شعلوں نے اس کا راستہ منور کر دیا تھا، خبر لے کر (جیسا کہ اس نے تحریر کیا) "notre tres gracieux souvrain"* کی خدمت میں حاضر ہوا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے دل و دماغ شدید طور پر متاثر ہو چکے ہیں۔

موسیو میشو کی جھنجھلاہٹ کا باعث جو چیز بنی تھی، اگرچہ وہ اس بات سے، جو روسیوں کے غم واندوہ کا سبب بنی تھی، مختلف تھی، تاہم جب اسے زار کے سٹڈی روم میں پہنچایا گیا، اس کے چہرے پر کچھ اس طرح کا ملال تھا کہ امپراطور نے جھٹ پٹ سوال کیا:

''کرنل، میرے لیے بری خبر لائے ہو؟''

''عالی جاہ، بہت بری۔'' میشو نے آہ بھرتے اور اپنی نظریں جھکاتے ہوئے کہا۔

"L' abandon de Moscou."**۔

''کیا انھوں نے لڑے بغیر میرا قدیمی دارالسلطنت دشمنوں کے حوالے کر دیا ہے؟'' اس نے جلدی سے پوچھا۔ ایکا ایکی اس کا چہرہ لال انگارا ہو گیا۔

میشو نے نہایت احترام کے ساتھ کوتوزوف کا پیغام اس کے سپرد کر دیا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ ماسکو سے پہلے لڑائی لڑنا ناممکن ہو گیا تھا اور چونکہ اب اس کے سامنے دو ہی راستے رہ گئے تھے کہ وہ ماسکو اور فوج دونوں گنوا دے یا صرف ماسکو، چنانچہ اسے مجبوراً موخر الذکر سے ہاتھ اٹھانا پڑے۔

امپراطور میشو کی طرف دیکھے بغیر چپ چاپ سنتا رہا۔

''دشمن شہر میں داخل ہو گیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''جی ہاں، عالی جاہ، لیکن ماسکو اب تک راکھ کا ڈھیر بن چکا ہوگا۔ جب میں وہاں سے روانہ ہوا تھا، وہ پورے کا پورا شعلوں کی لپیٹ میں آ چکا تھا۔'' میشو نے بڑے پرزور لہجے سے جواب دیا لیکن جب اس نے آنکھ اٹھا کر امپراطور کی جانب دیکھا، تو وہ بے حد ٹپٹایا کہ یہ اس نے کیا کہہ دیا ہے۔

امپراطور کی سانس اکھڑ رہی تھی اور وہ دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس کا زیریں لب کپکپانے لگا اور اس کی خوبصورت نیلی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

لیکن یہ کیفیت صرف ایک ثانیہ رہی۔ اچانک اس کے ماتھے پر بل پڑ گئے جیسے وہ اپنی کمزوری پر پیچ و تاب کھا رہا ہو۔ اس نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور پر استقلال لہجے سے گویا ہوا:

''کرنل، جو کچھ ہو رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مشیت ایزدی ہم سے عظیم قربانیوں کا مطالبہ کر رہی

---

* اپنے کریم النفس فرماں روا

** ماسکو کا اتراک

ہے... میں تمام امور میں اس کی مشیت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر میشو، یہ تو بتاؤ کہ جب تم وہاں سے رخصت ہوئے، میری فوج کی، جب اس نے ذرا سی مزاحمت کیے بغیر میرے قدیمی دارالسلطنت کو دشمن کے قبضے میں جاتے دیکھا، (ذہنی) کیفیت کیسی تھی؟ کیا تم نے بے حوصلگی کے آثار دیکھے؟''

جب میشو نے دیکھا کہ امپراطور کا سکون لوٹ آیا ہے، وہ مطمئن ہو گیا لیکن وہ اس کے دوٹوک اور نوکیلے سوال کا جواب دینے کے لیے پوری طرح آمادہ نہیں تھا۔

''عالی جاہ! کیا آپ مجھے بلاکم وکاست بات کرنے کی، جو فوجیوں کا وتیرہ ہوتا ہے، اجازت مرحمت فرمائیں گے؟'' اس نے مہلت حاصل کرنے کے لیے کہا۔

''کرنل، میں ہمیشہ اسی چیز کا تقاضا کرتا رہا ہوں۔'' امپراطور نے جواب دیا۔ ''مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میں صحیح صحیح جاننا چاہتا ہوں کہ حالات کس نہج پر جا رہے ہیں۔''

میشو دریں اثنا اپنا جواب سوچ چکا تھا۔ وہ مؤدبانہ انداز بھی اختیار کیے رکھنا چاہتا تھا اور قدرے سخن سازی بھی برتنا چاہتا تھا۔ اس کے لبوں پر خفیف سا تبسم، جو بمشکل نظر آ سکتا تھا، آیا اور اس نے عرض کیا: ''عالی جاہ! جب میں وہاں سے روانہ ہوا تھا، کمانڈروں سے لے کر ادنیٰ سپاہیوں تک، تمام فوج کے منہ لٹکے ہوئے تھے اور وہ زبردست خوف و دہشت میں مبتلا تھے۔''

''کیوں؟ کس لیے؟'' امپراطور نے درشتی سے اس کی بات کاٹ کر کہا اور اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔ ''مصیبت سے گھبرا کر میرے روسی دل چھوڑ بیٹھے ہیں؟... نہیں، کبھی نہیں!''

میشو نے جو جملہ سوچا تھا، اس کے ادا کرنے کے لیے اسے بس اسی کا انتظار تھا۔

''عالی جاہ!'' اس نے مؤدبانہ شگفتگی سے کہا: ''انھیں ڈر صرف اس بات کا ہے کہ کہیں یور میجسٹی اپنی طبعی نیکوخصالی سے مار نہ کھا جائیں اور صلح پر آمادہ ہو جائیں۔ ورنہ جہاں تک ان کا اپنا تعلق ہے، ان کا خون کھول رہا ہے اور وہ نہایت بے قراری سے اس لمحے کا، جب انھیں دوبارہ نبرد آزما ہونے کا موقع ملے گا، انتظار کر رہے ہیں۔'' روسی قوم کے اس نمائندے نے کہا۔ ''اور وہ اپنی زندگیوں کا نذرانہ پیش کر کے یہ ثابت کرنے کے لیے بے چین ہیں کہ وہ آپ کے کتنے جاں نثار ہیں۔...''

''اخاہ!'' امپراطور نے کہا۔ اس کا اطمینان لوٹ آیا تھا اور اس کی آنکھوں میں شفقت جھلک رہی تھی۔ اس نے میشو کے شانے پر تھپکی دی اور بولا: ''کرنل تم نے مجھے میرا اطمینانِ قلب لوٹا دیا ہے۔''

اس نے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ دیر خاموش بیٹھا رہا۔

''خیر، اب تم فوج میں واپس چلے جاؤ۔'' اس نے تن کر بالکل سیدھے بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس نے میشو پر شاہانہ لیکن مشفقانہ نظر ڈالی اور بولا: ''میرے دلیر اور شجیع فوجی جوانوں — بلکہ جہاں کہیں بھی تم جاؤ، میری تمام رعایا — کو بتاؤ کہ جب میرے پاس ایک بھی فوجی نہیں بچے گا، میں پھر بھی ہار نہیں مانوں گا۔ میں اپنے چہیتے اشراف اور

معزز کسانوں کی قیادت کا فریضہ خود سنبھال لوں گا، اور اپنی مملکت کے تمام وسائل بروئے کار لاؤں گا۔ جو کچھ میرے دشمن سمجھتے ہیں، میرے حیطۂ اختیار میں اس سے کہیں زیادہ کچھ ہے۔'' امپر اطور نے کہا۔ اس کے جوش وخروش میں ہر لحظہ اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ''لیکن اگر مالکِ ارض و سما نے لوحِ محفوظ پر یہ تحریر کر دیا ہے،'' امپر اطور نے جذبات سے کانپتے ہوئے اپنی خوبصورت اور شفیق آنکھیں آسمان کی جانب اٹھائیں اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''میرے خاندان کا اپنے بزرگوں کے تخت پر جلوہ افروز ہونے کا وقت ختم ہو گیا ہے، میں اپنے زیرِ اختیار تمام وسائل کو پوری طرح استعمال کرنے کے بعد اپنی داڑھی یہاں تک بڑھا لوں گا'' (زار نے اپنا ہاتھ اپنی چھاتی پر رکھا) ''اپنے ادنیٰ ترین کسانوں میں شامل ہو جاؤں گا اور ان کے ساتھ آلو کھا کر گزارہ کر لیا کروں گا لیکن اپنے وطن اور اپنی عزیز از جان قوم کے ماتھوں پر جن کی قربانیوں کی قدر کرنا مجھے آتا ہے، کلنک کا ٹیکا نہیں لگنے دوں گا۔''

یہ الفاظ مضطرب لہجے سے ادا کرنے کے بعد امپر اطور نے یک دم اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا جیسے وہ میشو سے اپنے آنسو، جو اس کی آنکھوں میں امنڈ آئے تھے، چھپانا چاہتا ہو۔ وہ اٹھا اور اپنے سٹڈی روم کے انتہائی آخری سرے کی سمت چل دیا۔ وہاں وہ خاصی دیر کھڑا رہا۔ پھر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا واپس آیا، اس نے میشو کی کلائی پکڑی اور اسے زور سے بھینچا۔ اس کا نرم وگداز اور خوبصورت چہرہ تمتمار ہا تھا اور اس کی آنکھیں عزم اور آتش غضب سے دہک رہی تھیں۔

''کرنل میشو، میں یہاں جو کچھ کہہ رہا ہوں، اسے بھلانا نہیں۔ شاید کسی روز تمہیں یہ باتیں یاد آئیں اور تم اپنے دل میں خوشی محسوس کرو...... نپولین یا میں،'' امپر اطور نے اس کی چھاتی کو چھوتے ہوئے کہا۔ ''اب ہم دونوں بیک وقت تخت نشیں نہیں رہ سکتے۔'' اب میں اس کی فطرت سمجھ گیا ہوں، وہ مجھے دوبارہ فریب نہیں دے سکے گا....''

اور امپر اطور کی گفتگو میں دوبارہ وقفہ آ گیا۔ اس کی پیشانی کی لکیریں گہری ہوتی جارہی تھیں۔

میشو نے، جو ''اگرچہ غیر ملکی تھا لیکن بہ دل و جان روسی تھا،'' جب یہ الفاظ سنے اور اسے امپر اطور کی آنکھوں میں عزم صمیم کی جھلک نظر آئی، اسے اس باوقار موقع پر یوں محسوس ہوا (جیسا کہ اس نے بعد میں بیان کیا) کہ وہ ''خوشی سے دیوانہ'' ہو جائے گا، اور اس نے اپنے اور روسی عوام کے، جن کا وہ اپنے آپ کو نمائندہ تصور کرتا تھا، جذبات کو بدیں الفاظ بیان کیا:

''عالی جاہ!'' اس نے کہا، ''یور میجسٹی نے اس وقت قوم کے شان و شکوہ اور یورپ کی نجات کو یقینی بنا دیا ہے!''

امپر اطور نے سر کی جنبش سے میشو کو رخصت ہونے کا اشارہ دیا۔

4

ہم جو اس زمانے میں سانس نہیں لے رہے جب آدھا روس دشمن کے قبضے میں جا چکا تھا، ماسکو کے باشندے دور دراز کے صوبوں میں بھاگے جا رہے تھے اور مادر وطن کے دفاع کے لیے جبری لام بندی کا سلسلہ جاری تھا، یہ تصور

کرنے لگتے ہیں کہ ادنیٰ و اعلیٰ تمام روسی قربانیاں دینے، مادر وطن کا تحفظ کرنے یا اس کی بربادی پر آنسو بہانے میں مصروف تھے۔ اس زمانے کے تمام قصے کہانیاں اور بیانات بلا استثنا روسیوں کی حب الوطنی، قربانی و ایثار، مایوسی و ناامیدی، کرب و اندوہ اور اولوالعزمی و جرأت سے بھرے پڑے ہیں۔ لیکن درحقیقت ایسا تھا نہیں۔ ہمیں یہ سب کچھ اس لیے نظر آتا ہے کیونکہ ہم اس دور کے محض عمومی نوعیت کے تاریخی مسائل کو نگاہوں کے سامنے رکھتے ہیں اور اس عہد کے لوگوں کے جو ذاتی اور انسانی مفادات تھے، انھیں خاطر میں نہیں لاتے۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ کسی بھی زمانے کے لوگوں کے لیے اپنے ذاتی مفادات عمومی نوعیت کے مسائل سے کہیں زیادہ اہم ہوتے ہیں کیونکہ انھیں کی وجہ سے ان عمومی مسائل کو، جو ملک و قوم سے بحیثیت مجموعی متعلق ہوتے ہیں، کبھی محسوس نہیں کیا جاتا۔ بلکہ درحقیقت ان کی موجودگی سے اغماض برتا جاتا ہے۔ واقعات کس نہج پر جا رہے تھے، لوگوں کی اکثریت کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا بلکہ بیشتر آبادی زیادہ تر اس فکر میں غلطاں رہتی تھی کہ ان کے فوری ذاتی مفادات کا کیا بنے گا اور صرف یہی لوگ تھے جن کی مصروفیات اس زمانے میں نہایت مفید ثابت ہوئیں۔ وہ اشخاص، جنھوں نے حالات کی عمومی نہج کو سمجھنے کی کوشش کی اور ذاتی ایثار و الوالعزمی کے بل بوتے پر اس میں شریک ہونے کی کوشش کی، وہ معاشرے کے انتہائی ناکارہ ارکان تھے۔ انھیں ہر شے زیر و زبر ہوتی نظر آتی تھی اور انھوں نے عمومی فلاح و بہبود کے لیے جو کچھ کیا، وہ بالکل احمقانہ اور بے کار ثابت ہوا۔ پیئر اور مامانوف کی رجمنٹیں اس کی مثال ہیں۔ انھوں نے روسی دیہات میں لوٹ مار کی اور نوجوان لڑکیاں پٹیوں کے لیے جو کپڑا بنتی تھیں، وہ اسے چھین کر لے جاتیں اور یوں یہ کپڑا کبھی زخمیوں تک نہ پہنچ پاتا، علیٰ ہذا القیاس۔ وہ لوگ بھی، جنھیں فلسفیانہ موشگافیاں بھگارنے اور اپنے جذبات کے اظہار کرنے کا شوق تھا، جب روس کے اس زمانے کے حالات کو زیر بحث لاتے، لامحالہ اپنی گفتگوؤں میں منافقت اور دروغ گوئی کے عناصر داخل کر دیتے یا پھر ان اشخاص پر، جن پر ان چیزوں کے، جن کا ذمے دار کسی کو بھی نہیں ٹھہرایا جا سکتا تھا، خواہ مخواہ الزامات لگانے، کیچڑ اچھالنے اور ان کے خلاف اپنے بغض کی نمائش کرنے لگتے۔ وہ قانون جو ہمیں علم کے پیڑ کے پھل کا ذائقہ چکھنے کی ممانعت کرتا ہے، تاریخی واقعات میں خاص طور پر آشکار ہوتا ہے۔ صرف غیر شعوری فعل ثمر آور ہوتا ہے اور وہ شخص، جو کسی تاریخی واقعے میں کردار ادا کرتا ہے، کبھی اس کی اہمیت نہیں سمجھتا اور اگر وہ سمجھنے کی کوشش کرتا ہے، تو پھر وہ اس پر اثر انداز ہونے کی اہلیت کھو بیٹھتا ہے۔

اس زمانے میں روس میں جو واقعات ظہور پذیر ہو رہے تھے، جو اشخاص ان میں جتنا زیادہ حصہ لے رہے تھے، ان کی اہمیت ان کے لیے اتنی ہی زیادہ ناقابل فہم تھی۔ ماسکو سے دور دراز واقع صوبجات اور پیٹرز برگ میں ملیشیا کی وردیوں میں ملبوس خواتین و حضرات روس اور اس کے قدیم دارالسلطنت کی تقدیر پر آٹھ آٹھ آنسو بہاتے تھے اور اپنی قربانیوں اور اس نوع کی دیگر چیزوں کا ڈھنڈورا پیٹتے رہتے تھے، لیکن جہاں تک فوج کا تعلق ہے جو ماسکو کو چھوڑ کر جا رہی تھی، اس کے افراد ماسکو کے بارے میں شاذ ہی بات کرتے یا سوچتے تھے اور جب وہ مڑ کر آتش زنی کا منظر دیکھتے تھے، ان میں سے کوئی بھی خدا کو حاضر ناظر جان کر یہ قسم نہیں کھاتا تھا کہ وہ فرانسیسیوں سے

انتقام لے گا۔ ان سب کی سوچوں کا محور اپنی تنخواہ، اگلا پڑاؤ، کینٹین میں کام کرنے والی دوشیزہ ماتریشوکا اور اسی قبیل کی دوسری باتیں ہوتی تھیں۔

نکولائی رستوف نے اپنے وطن کے دفاع میں جو فعال اور خاصے طویل عرصے تک حصہ لیا تھا، وہ کسی قربانی کے خیال سے نہیں بلکہ محض اتفاقاً لیا تھا کیونکہ جس زمانے میں اس نے فوجی ملازمت اختیار کی تھی، اس کے دوران میں جنگ چھڑ گئی تھی۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ روس میں جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا، اس پر وہ نہ تو کسی قسم کی مایوسی کا اظہار کرتا تھا اور نہ افسردہ کن نتائج اخذ کرتا تھا۔ اگر اس سے پوچھا جاتا کہ روس کی موجودہ صورت حال کے بارے میں اس کی کیا رائے ہے، تو اس کا جواب ہوتا کہ اس کے متعلق سوچنا اس کا کام نہیں، اس مقصد کے لیے کوتوزوف اور دوسرے لوگ موجود ہیں، تاہم اس نے یہ ضرور سنا ہے کہ رجمنٹوں کو نفری اور دوسرے لوازمات کے سلسلے میں جو نقصانات برداشت کرنا پڑے ہیں، ان کی پوری طرح تلافی کی جانا ہے اور یہ کہ جنگی کارروائیاں ابھی مزید کچھ عرصہ جاری رہیں گی۔ ان حالات میں اگر دو سال میں اسے رجمنٹ کی کمان سونپ دی گئی، تو اسے کوئی تعجب نہیں ہوگا۔

مسئلے کے بارے میں اس قسم کا انداز فکر اختیار کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب یہ اعلان کیا گیا کہ ڈویژن کے لیے نئے گھوڑے درکار ہیں اور ان کی فراہمی کا بندوبست کرنے کے لیے اسے وارانیز بھیجا جارہا ہے تو اسے نہ صرف یہ کہ کوئی افسوس نہ ہوا کہ اسے متوقع لڑائی میں حصہ لینے کی سعادت سے محروم کیا جارہا ہے بلکہ الٹا اس کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ اس نے اپنی اس خوشی کو چھپانے کا کوئی تردد نہ کیا اور نہ اس کے رفقاء کو اس کی خوشی پر کوئی اعتراض تھا۔

بارودینو کی لڑائی سے چند روز پیشتر نکولائی کو ضروری رقم اور پروانہ جات موصول ہوگئے۔ اس نے چند ہوزار پہلے ہی بھیج دیے اور اس کے بعد وہ ڈاک کے گھوڑوں کے ساتھ خود روانہ ہوگیا۔

ایک ایسے علاقے سے، جسے فوج، اس کی چارہ اور چبینا اکٹھا کرنے والی جماعتوں، رسد گاڑیوں اور چلتے پھرتے ہسپتالوں نے اجاڑ دیا تھا، جان چھڑا کر نکولائی جب اس خطۂ زمین میں داخل ہوا جہاں عسکری جوانوں، فوجی گاڑیوں اور لشکری پڑاؤوں کے غلیظ آثار کی جگہ کسان مردوں اور عورتوں کے دیہات، مالکان زمین کے بڑے بڑے مکانات، زرعی قطعات، جن میں ڈھور ڈنگر گھاس چرتے پھر رہے تھے، اور ڈاک کی چوکیاں قائم تھیں، جن میں منشی متصدی اونگھ رہے تھے، تو اسے جو خوشی ہوئی، اس کا اندازہ صرف وہی لوگ لگا سکتے ہیں جنھیں یہ معلوم ہو کہ فعال ملازمت کے دوران میں مسلسل کئی کئی ماہ فوجی ماحول میں زندگی بسر کرنا کیا معانی رکھتا ہے۔ وہ یوں خوش ہو رہا تھا جیسے اس نے یہ سب کچھ پہلی بار دیکھا ہو۔ جس چیز نے اسے خاص طور پر حیران اور خوش کیا، وہ نوجوان اور صحت مند خواتین کا یہ منظر تھا کہ اب ان میں سے ایک ایک کے ارد گرد دس بارہ بارہ افسران منڈلا نہیں رہے تھے۔ یہ عورتیں بھی خوش تھیں کہ راہ چلتا افسران کے ساتھ ہنسی مذاق کر رہا ہے۔

نکولائی وارانیژ رات کو پہنچا۔ خوشی اس کی نس نس سے پھوٹ رہی تھی۔ وہ ہوٹل میں چلا گیا۔ وہاں اس نے ان تمام اشیا کا آرڈر دیا، جن سے وہ کیمپ میں اتنا عرصہ محروم رہا تھا۔ اگلے روز اس نے خوب رگڑ رگڑ کر شیو بنائی،

فوجی وردی زیب تن کی اور مقامی حکام سے ملاقات کرنے چل پڑا۔

(مقامی) ملیشیا کا کمانڈر سویلین جرنیل تھا۔ وہ بزرگ آدمی تھا اور بظاہر اپنے عسکری عہدے اور مرتبے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے نکولائی کا اکھڑ انداز سے استقبال کیا (اس کا خیال تھا کہ یہ مخصوص فوجی انداز ہے)۔ وہ بڑے جارحانہ انداز سے اس سے یوں پوچھ گچھ کرنے لگا جیسے یہ اس کا حق ہو۔ وہ اس کے کسی جواب پر پسندیدگی کا اظہار کرتا اور کسی پر ناک بھوں چڑھاتا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ حالات کا رخ جانچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

ملیشیا کے کمانڈر سے وہ گورنر کے پاس چلا گیا۔ گورنر کوتاہ قامت، پھرتیلا، خوش خلق اور سیدھا سادا شخص تھا۔ اس نے نکولائی کو گھوڑوں کے ان فارموں کے متعلق بتایا، جہاں سے گھوڑے دستیاب ہو سکتے تھے۔ اس نے شہر کے گھوڑوں کے سوداگر اور شہر سے چودہ میل دور ایک زمیندار کا پتا دیا، جس کے پاس بہترین گھوڑے تھے، اس نے وعدہ کیا کہ وہ اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔

''تم کاؤنٹ ایلیا آندریچ کے صاحبزادے ہو؟ میری بیوی کی تمھاری والدہ کے ساتھ گہری دوستی تھی۔ ہم ہر جمعرات کو گھر پر ہوتے ہیں — آج جمعرات ہے، چنانچہ بلا تکلف ہمارے ہاں چلے آؤ'' گورنر نے کہا جب نکولائی رخصت ہونا چاہ رہا تھا۔

گورنر سے رخصت لینے کے بعد نکولائی نے اپنی گاڑی کے لیے جھٹ پٹ ڈاک کے گھوڑے کرائے پر لیے اور اپنے کوارٹر ماسٹر کی معیت میں بہ سرعت رفتار اس زمیندار سے ملنے چل دیا۔ جو گھوڑوں کے فارم کا مالک تھا، وارانیژ میں اپنے قیام کے ابتدائی مرحلے میں نکولائی کو ہر کام آسان اور خوشگوار معلوم ہوا اور جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ اگر آدمی کی طبیعت حاضر ہو اور اس کی ذہنی کیفیت شگفتہ ہو، ہر کام با آسانی اور بطریق احسن سرانجام دیا جا سکتا ہے، یہ بات نکولائی پر بھی صادق آ رہی تھی۔ اس کے کسی کام میں کوئی رکاوٹ نہیں پڑ رہی تھی۔

زمیندار سابقہ گھوڑ سوار فوجی نکلا۔ وہ غیر شادی شدہ تھا، شکاری تھا اور گھوڑوں کا نبض شناس اور قدر دان۔ اس کے ہاں خوبصورت خلوت کدہ، سو سالہ مصالحے دار برانڈی، ہنگری کی کہنہ انگور اور پر شکوہ گھوڑے تھے۔

مختصر تبادلہ خیالات کے بعد نکولائی نے چھ ہزار روبل کے عوض سترہ بہترین (سانڈ) گھوڑے خرید لیے۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ فوج کے لیے جو نئے نکور گھوڑے خریدے گا، یہ ان کے لیے نمونے کا کام دیں گے۔ ڈٹ کر کھانا کھانے اور ہنگری کی شراب قدرے ضرورت سے زیادہ پینے کے بعد رستوف نے زمیندار سے، جس سے اب وہ دوستانہ تعلقات استوار کر چکا تھا، معانقہ کیا اور پورے اطمینان و سرور سے انتہائی گھٹیا سڑکوں پر بے پناہ رفتار سے سفر کرنے لگا۔ وہ بار بار کوچوان پر زور دے رہا تھا کہ وہ اپنی رفتار اور تیز، اور تیز کرے تا کہ وہ اس محفل میں، جس کا اہتمام گورنر کر رہا تھا، وقت پر پہنچ سکے۔

نکولائی نے لباس تبدیل کیا، سر پر ٹھنڈا پانی ڈالا، جسم پر سینٹ (scent) چھڑکا اور گورنر کے ہاں پہنچ گیا۔ اسے ذرا تاخیر ضرور ہو گئی تھی تاہم وہ دل ہی دل میں یہ مقولہ دہرا رہا تھا کہ ''نہ پہنچنے سے تاخیر سے پہنچنا بہرحال بہتر ہے۔''

یہ اجتماعی رقص کی محفل نہیں تھی اور نہ رقص کے بارے میں کچھ کہا گیا تھا تاہم ہر شخص جانتا تھا کہ کاتریناپیوترونا کلاوی کارڈ پر والز اور سکاٹش رقص کی دھنیں بجائے گی اور رقص بھی ہو گا۔ چنانچہ تمام لوگ اجتماعی رقص میں شرکت کرنے کے ملبوسات پہن کر آئے تھے۔

1812 میں قصباتی زندگی کا پہیہ حسب معمول رواں دواں تھا۔ واحد فرق صرف یہ آیا تھا کہ ماسکو سے متعدد متمول خاندانوں کی آمد کی وجہ سے قصبات میں نئی روح پھنک گئی تھی اور وہاں پہلے کی نسبت کہیں زیادہ چمک دمک اور چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ جیسا کہ روس میں ہر جگہ ہو رہا تھا، لوگوں کو نتائج و عواقب کی قطعاً کوئی پروا نہیں رہ گئی تھی، عمومی انداز فکر یہ ہو گیا تھا "بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست۔" جو ہونا ہے ہوتا رہے گا، جو لمحہ ہاتھ میں ہے، اس سے کیوں نہ لطف اٹھایا جائے۔ بایں ہمہ محافل میں گپ شپ کے موضوعات ناگزیر طور پر تبدیل ہو گئے تھے۔ پہلے لوگ موسم اور باہمی دوستوں اور شناسا احباب کی باتیں کیا کرتے تھے، اب ان کی جگہ ماسکو، فوج اور نپولین نے لے لی تھی۔

گورنر کے مہمانوں کا تعلق وارنیژ کے اعلیٰ ترین طبقوں سے تھا۔

محفل میں خواتین اچھی خاصی تعداد میں موجود تھیں۔ ان میں سے متعدد وہ تھیں جن سے وہ ماسکو میں واقف تھا۔ لیکن جہاں تک مرد شرفا کا تعلق ہے، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جو کسی لحاظ سے تمغہ سینٹ جارج یافتہ اور بااخلاق، بامروت اور شائستہ ہوزار کاؤنٹ رستوف سے لگا کھا سکتا۔ مردوں میں ایک اطالوی قیدی شامل تھا۔ جو فرانسیسی فوج میں خدمات سرانجام دیتا رہا تھا، نکولائی کو محسوس ہوا کہ اس قیدی کی موجودگی نے روسی ہیرو کی حیثیت سے اس کی اپنی اہمیت بڑھا دی ہے۔ کچھ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اطالوی ایک جیتی جاگتی ٹرافی ہے (جو روسیوں کے ہاتھ آ گئی تھی)۔ محفل میں موجود ہر شخص کے چہرے بشرے سے یہی تاثر مترشح ہو رہا تھا۔ وہ اس (اسیر) افسر کے ساتھ دوستانہ لیکن باوقار اور لیے دیے انداز سے پیش آیا۔

جونہی نکولائی ہوزاروں کی وردی میں ملبوس سینٹ اور مے انگور کی خوشبوئیں بکھیرتا اندر داخل ہوا اور مقولہ "نہ پہنچنے سے تاخیر سے پہنچنا بہرحال بہتر ہے" خود بھی کہہ اور متعدد دوسرے اشخاص سے بھی سن چکا، لوگوں کی اچھی خاصی بھیڑ نے اس کے گرد گھیرا ڈال دیا۔ تمام نگاہیں اسی پر مرکوز تھیں اور اسے معاً احساس ہوا کہ صوبے میں اسے موزوں مقام — سب کا منظور نظر — حاصل ہو گیا ہے۔ اس مقام پر فائز ہونا ہمیشہ ہی پرلطف رہا ہے لیکن طویل محرومیوں کے بعد تو اس کا نشہ ہی کچھ اور تھا۔ ڈاک چوکیوں، دیہاتی ہوٹلوں اور زمیندار کے خلوت کدے میں خادمائیں اس کی ادنیٰ توجہ پر پھولے نہ سماتی تھیں لیکن یہاں گورنر کی ضیافت میں بھی لاتعداد نوعمر شادی شدہ حسینائیں اور پری تمثال نوخیز دوشیزائیں (جیسا کہ اسے محسوس ہوا) بڑی بے تابی سے اس کی نگاہِ التفات کی منتظر تھیں۔ نوجوان خواتین اور الھڑ مٹیاریں اس سے عشوہ طرازیاں کر رہی اور اس سے پیار و محبت کی پینگیں بڑھانے کی سعی کر رہی تھیں۔ جہاں تک بزرگ خواتین کا تعلق ہے، ان کی پہلے دن سے ہی یہ کوشش تھی کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس تنذر

نوجوان ہوزار کو شادی کے بندھنوں میں باندھ دیں اور اسے گھر بسانے پر مجبور کر دیں۔ ان میں گورنر کی بیوی بھی شامل تھی۔ اس نے رستوف کا استقبال قریبی قرابت دار کی حیثیت سے کیا اور اسے نکولس کے نام سے خطاب کیا۔

کاترینا پیوترونا نے واقعتاً والز اور سکاٹش رقص کی دھنیں بجائیں اور جب رقص کا آغاز ہوا، نکولائی نے اپنی مہارت سے مفصلات کے اعلیٰ طبقے کے افراد کے قلوب مزید موہ لیے۔ وہ جب عدیم المثال بے باکی اور بے تکلفی سے رقص کر رہا تھا، اس نے ان سب کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ جس انداز سے اس نے اس روز رقص کیا، اس پر وہ خود بھی متعجب تھا۔ اس نے ماسکو میں کبھی اس طرح رقص نہیں کیا تھا اور اس قسم کا انتہائی بے باک اور بے تکلف انداز خود اس کی اپنی نظروں میں نازیبا اور معیوب ٹھہرتا لیکن یہاں یہ ضروری محسوس ہوا کہ وہ انھیں کسی ایسی چیز سے متحیر کر دے جو غیر معمولی ہو، کوئی ایسی چیز، جو مفصلات کے لیے تو بالکل نئی ہو لیکن جسے وہ یہ ماننے پر مجبور ہو جائیں کہ دارالسلطنت میں یہ معمول کی بات ہے۔

اس شام کے دوران میں نکولائی نے اپنی توجہ زیادہ تر ایک صوبائی افسر کی بیوی پر مرکوز رکھی، جس کا جسم بھرا بھرا اور نرم و گداز، چہرہ روشن جمال، آنکھیں نیلی اور بال سنہری تھے۔ وہ نوجوان، جو چسکا لے رہے ہوں، بڑی سادگی سے اس بات پر ایمان لے آتے ہیں کہ دوسروں کی بیویاں انھیں کے لیے تخلیق ہوئی ہیں۔ رستوف کی بھی کچھ یہی کیفیت تھی۔ چنانچہ وہ اس خاتون کے ساتھ چپکا رہا اور اس کے شوہر کے ساتھ کچھ اس طرح کا دوستانہ برتاؤ کرتا رہا جیسے دونوں کے مابین کوئی مفاہمت ہو گئی ہو اور اس سلسلے میں کوئی بات کیے بغیر وہ اچھی طرح سمجھ گئے ہوں کہ نکولائی اور اس شخص کی شریک حیات کی آپس میں خوب نبھے گی۔ تاہم آثار یہ بتا رہے تھے کہ شوہر کو اس سے اتفاق نہیں اور اس نے رستوف کے ساتھ رکھائی سے پیش آنے کی کوشش کی۔ لیکن رستوف کی بے تکلفانہ سادگی اتنی بے پایاں تھی کہ بعض اوقات میاں بھی اس کی خوش طبعی کے سامنے سینہ سپر ہو جاتا، مگر جب محفل کے اختتام پر بیوی کے چہرے پر پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تمتماہٹ اور بشاشت نظر آنے لگی، خاوند پیلا پڑ گیا اور وہ پہلے سے زیادہ بجھ گیا۔ کچھ یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ان دونوں کو قدرت نے بشاشت کی جو تھوڑی بہت مقدار عطا کی ہے، اس میں بیوی کا حصہ بڑھ گیا ہے، اور اسی تناسب سے شوہر کا کم ہو گیا ہے۔

5

نکولائی جسم کو قدرے آگے جھکائے بازوؤں والی کرسی پر دراز تھا۔ وہ ریشمی بالوں اور روشن جمال چہرے والی خاتون کے عین اوپر جھکا ہوا تھا اور کچھ اس انداز سے اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہا تھا جس کا حقیقت سے دور دور کا بھی تعلق نہیں تھا۔

اپنی ٹانگوں کو، جن پر اس نے گھوڑسواری کی تنگ برجس پہنی ہوئی تھی، بانکپن سے ہلاتے جھلاتے، چاروں اطراف سینٹ کی خوشبوئیں بکھیرتے اور اپنی خوبرو ہم نشیں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے، اپنے منہ

میاں مٹھو بنتے اور اپنی سڈول ٹانگوں کی، جن پر اس نے بالکل صحیح سائز کے بوٹ پہنے ہوئے تھے، تحسین کرتے نکولائی اسے بتا رہا تھا کہ اس کا ارادہ وارانیژ کی ایک خاص خاتون کو اڑا لے جانے کا ہے۔

''وہ کیسی ہے؟''

''حسن کی دیوی، سحر طراز۔ اس کی آنکھیں'' (نکولائی نے اپنی نگاہیں اس پر گاڑ دیں) ''نیلگوں، چہرہ رشکِ قمر اور اس کا جسم'' (اس نے اس کے سراپے پر نظر ڈالی) ''ڈیانا کے جسم کی مانند ہے...''

خاوندان کے قریب آیا اور منہ بسور کر اپنی بیوی سے پوچھنے لگا کہ وہ کیا باتیں کر رہے ہیں۔

''اخاہ، نکیتا ایوانچ!'' نکولائی نے احتراماً کھڑے ہو کر با آواز بلند کہا۔

اور وہ کچھ اس انداز سے جیسے اس کی خواہش ہو کہ جس قسم کا مذاق وہ کر رہا تھا، نکیتا ایوانچ بھی اس میں برابر کا شریک ہو جائے، اسے بتانے لگا کہ اس کا ارادہ سنہری بالوں والی حسینہ کو اڑا لے جانے کا ہے۔

دونوں میاں بیوی مسکرانے لگے۔ میاں کی مسکراہٹ گمبھیر اور بیوی کی بشاش تھی۔

گورنر کی مروت پسند بیوی ان کے قریب آئی۔ اس کے چہرے پر ناپسندیدگی کے آثار تھے۔

''نکولس، آنّا اگناتیونا تمھیں ملنا چاہتی ہیں۔'' اس نے یہ نام کچھ اس لہجے سے لیا کہ رستوف چشم زدن میں بھانپ گیا کہ آنّا اگناتیونا کوئی اہم شخصیت ہے۔ ''نکولس، آؤ، تم نے کہا تھا کہ میں تمھیں اس نام سے پکار سکتی ہوں۔ کہا تھا نا؟''

''بالکل، ma tante•، لیکن یہ محترمہ ہیں کون؟''

''آنّا اگناتیونا مال ونتسیوا۔ اس نے تمھارے بارے میں اپنی بھانجی سے... کہ تم نے کیسے اس کی جان بچائی تھی... سنا ہے... بوجھ سکتے ہو؟''

''میں نے تو بے شمار لوگوں کو بچایا ہے!''

''اس کی بھانجی، پرنسس بلکونسکایا۔ وہ یہاں اپنی خالہ کے ساتھ وارانیژ میں ہے۔ ارے، تم شرما کیوں رہے ہو؟ ہائیں کہیں تم...''

''نہیں، بالکل نہیں۔ ma tante — میں آپ کو یقین دلاتا ہوں...''

''بہت خوب، بہت خوب! ارے، کیسے لڑکے ہو تم؟''

گورنر کی بیوی اسے ایک دراز قد اور بہت بھاری بھرکم کہن سال خاتون کے پاس لے گئی، جس نے سر پر نیلا رومال اوڑھ رکھا تھا۔ وہ پرنسس ماریا کی خالہ مال ونتسیوا تھی۔ وہ دولت میں کھیلتی تھی، بال بچوں کے جھنجھٹ سے آزاد تھی اور بیوگی کے دن گزار رہی تھی۔ اس نے اپنی ساری عمر وارانیژ میں بتا دی تھی۔ وہ ابھی ابھی شہر کی نامی گرامی ہستیوں کے ساتھ تاش کی بازی سے فارغ ہوئی تھی۔ جب رستوف اس کے پاس پہنچا، وہ اٹھ کر کھڑی ہو چکی اور

• مائی آنٹی (خالہ جان)

بازی کے بعد اپنا حساب کتاب چکا رہی تھی۔ وہ اپنی آنکھیں بھینچے اس کا درشتی اور سنجیدگی کے ساتھ سرتاپا جائزہ لینے لگی اور اس کے ساتھ ساتھ اس جرنیل کو جیاں سناتی رہی، جس نے اسے مات دی تھی۔

''mon cher، تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی ہے۔'' اس نے نکولائی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''مجھے امید ہے کہ تم مجھے ملنے آؤ گے۔''

بارعب معمر خاتون نے پرنس ماریا اور اس کے مرحوم باپ کے بارے میں، جسے وہ بظاہر پسند نہیں کرتی تھی، چند مختصر کلمات کہے اور نکولائی (معلوم ہوتا تھا کہ وہ بھی اس کی نگاہوں میں جچا نہیں ہے) سے دریافت کرنے لگی کہ اس کے پاس پرنس آندرے کی کوئی خبر ہے۔ اس کے بعد ایک بار پھر اس نے اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور اسے وہاں سے ہٹنے کا اشارہ کر دیا۔

نکولائی نے آنے کا وعدہ کیا اور جب وہ سلام کرنے جھکا، اس کا چہرہ دوبارہ سرخ ہو گیا۔ پرنس ماریا کے ذکر پر رستوف کو یوں محسوس ہوا کہ وہ جھینپ رہا بلکہ ڈر رہا ہے کیوں؟ یہ وہ خود بھی نہ سمجھ سکا۔

جب نکولائی مال ونتسیوا سے مل کر واپس آیا، وہ ایک بار پھر رقص کرنا چاہتا تھا لیکن گورنر کی کوتاہ قامت اہلیہ نے اپنا فربہ اور گداز ہاتھ اس کی آستین پر رکھا اور اس سے کہا کہ وہ اس سے کچھ گفتگو کرنا چاہتی ہے۔ وہ اسے اپنے نشستی کمرے میں لے گئی۔ وہاں جو لوگ موجود تھے، وہ جھٹ پٹ وہاں سے باہر نکل گئے تاکہ وہ کہیں ان کی تنہائی میں مخل نہ ہوں۔

''mon cher*، تم جانتے ہو،'' گورنر کی اہلیہ نے اپنے ننھے منّھے شفیق چہرے پر سنجیدگی بکھیرتے ہوئے کہا، ''کہ یہ تمھارے لیے موزوں رشتہ ہوگا۔ کیا تم یہ چاہو گے کہ اس کا انتظام میں کر دوں؟''

''ma tante، کس سے؟'' نکولائی نے پوچھا۔

''میں پرنس سے تمھارا رشتہ کرا دوں گی۔ کاترینا پیوترونا للی کا نام لیتی ہے لیکن میں کہتی ہوں، نہیں — کاؤنٹ، چاہو تو میں سلسلۂ جنبانی کروں؟ تمھاری امی بہت مشکور ہوں گی۔ سچ، وہ بہت پرکشش لڑکی ہے۔ اور اس کی شکل اتنی گئی گزری نہیں...''

''بالکل نہیں!'' نکولائی نے یوں کہا جیسے اسے یہ تصور ہی بہت ناگوار گزرا ہو۔ ''ma tante، میں سچے فوجی کی طرح اپنے آپ کو کسی پر ٹھونستا نہیں اور جو مل جائے، اسے کبھی ٹھکراتا نہیں۔'' جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، پیشتر اس کے کہ اسے اس پر غور کرنے کا موقع ملتا، اس نے کہہ دیا۔

''لیکن تمھیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ ایسا معاملہ نہیں کہ اسے مذاق میں اڑا دیا جائے۔''

''بالکل نہیں!''

''ہاں، ہاں۔'' گورنر کی بیوی نے یوں کہا جیسے وہ اپنے آپ سے ہم کلام ہو۔ ''لیکن mon cher، ایک

* مائی ڈیئر

بات اور، تم اس سرخ بالوں والی خاتون سے کچھ زیادہ ہی نتھی ہو رہے ہو۔ دیکھو، خاوند بے چارہ منہ چھپاتا پھر رہا ہے، سچ...''

''اجی، نہیں۔ ہم دونوں میں تو بڑی گاڑھی چھننے لگی ہے۔'' نکولائی نے بھولپن سے جواب دیا۔ اس نے یہ سوچا ہی نہیں تھا کہ جو دل لگی اس کے لیے اتنی خوشگوار ہو سکتی ہے، دوسرے کے لیے وہ اور تو سب کچھ ہو سکتی ہے، خوشگوار ہرگز نہیں۔

''لیکن یہ میں نے گورنر کی اہلیہ سے کیا احمقانہ بات کہہ دی!'' سپر پر اچانک نکولائی کو خیال آیا۔ ''اور اب وہ واقعی رشتہ طے کرانے میں مصروف ہو جائے گی... اور سونیا...؟''

اور جب وہ گورنر کی اہلیہ سے اجازت لے رہا تھا، وہ مسکرائی اور ایک بار پھر اس سے کہنے لگی: ''اچھا، پھر یاد رکھنا!'' اب اس سے رہا نہ گیا اور وہ اسے ایک طرف لے گیا۔

''ma tante، ذرا سنیں۔ صحیح بات یہ ہے...''

''mon cher، کیا بات ہے؟ آؤ، ذرا یہاں بیٹھ جاتے ہیں۔''

اچانک نکولائی کے دل میں خواہش، اضطراری تحریک، ابھری کہ وہ اپنا راز دل (جو وہ کبھی اپنی والدہ، ہمشیرہ یا کسی دوست کو نہ بتاتا) اس کے خاتون کے سامنے کہہ دے، جو اس کے لیے تقریباً اجنبی تھی۔ بعد ازاں جب اس نے اس صاف گوئی کو یاد کیا جس کا نہ اس سے کسی نے تقاضا کیا تھا اور نہ جس کی وہ کوئی توجیہ کر سکتا تھا، تاہم جو اس کے لیے انتہائی اہم نتائج کی حامل تھی، اسے یوں محسوس ہوا۔ جیسا کہ اس قسم کی مثالوں میں ہر شخص کو محسوس ہوتا ہے۔ کہ اس پر احمقانہ ترنگ سوار ہو گئی تھی۔ تاہم صاف گوئی کے اس دورے نے بعض دیگر بے وقعت اور حقیر واقعات کے ساتھ مل کر اس کے اور اس کے تمام خاندان کے لیے نہایت دوررس نتائج پیدا کیے۔

''ma tante، بات دراصل یہ ہے کہ maman* کافی عرصے سے مجھ پر زور دے رہی ہیں کہ میں کسی صاحب حیثیت دوشیزہ سے شادی کر لوں لیکن مجھے روپے کی خاطر بیاہ کرنے کے تصور سے بھی گھن آتی ہے۔''

''آ، ہاں، یہ بات میں اچھی طرح سمجھ سکتی ہوں...'' گورنر کی اہلیہ نے کہا۔

''لیکن پرنسس بلکونسکایا۔ یہ دوسرا معاملہ ہے۔ میں آپ سے سچ عرض کر رہا ہوں: پہلی بات تو یہ ہے کہ میں انھیں بہت پسند کرتا ہوں، مجھے ان میں کشش محسوس ہوتی ہے اور پھر ان حالات میں۔ اتنے عجیب انداز سے ان سے ملنے کے بعد میرے ذہن میں اکثر یہ خیال آیا ہے کہ یہ تقدیر ہے، خاص طور پر اگر آپ یہ یاد کریں کہ maman طویل مدت سے انھی خطوط پر سوچتی چلی آ رہی ہیں لیکن میری ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ حالات نے ہمیشہ کچھ ایسا رخ اختیار کیا کہ ہماری ملاقات نہ ہو سکی۔ اور پھر جب تک نتاشا کی ان کے بھائی کے ساتھ منگنی برقرار رہی، میرا ان کے ساتھ شادی کرنے کا سوال پر سوچنا بھی خارج از بحث تھا۔ پھر کرنا خدا کا کیا ہوا

* اماں۔

کہ میری ان کے ساتھ عین ان ایام میں ملاقات ہوئی جب نتاشا کی سگائی ٹوٹ چکی تھی... خیر، پھر سب کچھ... آپ سمجھ گئی ہیں نا؟... میں نے ان باتوں کا ذکر نہ کسی سے کیا ہے اور نہ کروں گا۔ صرف آپ سے...''

گورنر کی اہلیہ نے ممونیت کے اظہار کے طور پر اس کی کہنی دبائی۔

''آپ میری کزن سونیا کو جانتی ہیں؟ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔ میں اسے شادی کرنے کا قول دے چکا ہوں اور میں اپنے قول کی پاسداری کروں گا۔... پھر آپ سمجھ گئی ہیں نا کہ اس بات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ۔'' نکولائی نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا اور اس کا چہرہ لال سرخ ہو گیا۔

''Mon cher, mon cher، مسائل سے عہدہ برآ ہونے کا یہ خوب انداز ہے! دیکھو، سونیا کے پاس پھوڑی کوڑی بھی نہیں اور تم خود کہتے ہو کہ تمھارے پاپا کے حالات بالکل دگرگوں ہیں۔ پھر تمھاری ماما کا کیا بنے گا؟ وہ شاید جان بر نہ ہو سکیں۔ ایک بات تو یہ ہوئی۔ پھر سونیا۔ اگر اس لڑکی کے سینے میں دل ہے، اس کے لیے یہ کس قسم کی زندگی ہو گی؟ تمھاری اماں مایوسی کی اتھاہ کھائیوں میں، خاندان کے سارے معاملات چوپٹ... نہیں، mon cher، تمھیں اور سونیا کو ان چیزوں کی سمجھ ہونا چاہیے۔''

نکولائی چپ رہا۔ اس کے لیے یہ دلائل وجہ تسکین تھے۔

''پھر بھی، ma tante، ایسا نہیں ہو سکتا۔'' اس نے مختصر خاموشی کے بعد ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''علاوہ ازیں، پرنس مجھے قبول کریں گی بھی؟ ایک اور بات بھی ہے، وہ اس وقت سوگ منا رہی ہیں۔ ایسی باتیں سوچنا اچھا نہیں۔''

''تمھارا خیال ہے کہ میں تمھاری چٹ منگنی پٹ بیاہ کرا دوں گی؟ عقل کے ناخن لو، ہر کام کرنے کا طریقہ ہوتا ہے۔'' گورنر کی اہلیہ نے کہا۔

ma tante، آپ کو مشاطگی کا فن آتا ہے!'' نکولائی نے اس کے فربہ گداز ننھے منے ہاتھ پر بوسہ ثبت کرتے ہوئے کہا۔

6

رستوف سے ملاقات کے بعد ماسکو پہنچنے پر پرنس ماریا کو وہاں اپنا بھتیجا، اس کا ٹیوٹر اور پرنس آندرے کا خط ملا۔ خط میں اسے ہدایت کی گئی تھی کہ وہ وارانیژ میں چلی جائے، جہاں ان کی خالہ مال ونسیوا رہتی تھی۔ سفر کے انتظامات، اپنے بھائی کے بارے میں پریشانی، نئے لوگوں کے ساتھ نئے گھر میں زندگی کی ترتیب و تہذیب، اپنے برادرزادے کی تعلیم کا بندوبست، ان تمام باتوں نے مل جل کر پرنس ماریا کے دل میں ترغیب سے ملے جلتے جذبے کا گلا گھونٹ دیا، جس نے اسے اپنے باپ کی علالت کے دوران میں اور اس کے انتقال، اور خاص طور پر رستوف سے ملاقات کے بعد، اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ وہ ملول تھی، مغموم تھی اور اب پرسکون ماحول میں اسے اپنے باپ کی وفات، جو

اس کے ذہن میں روس کے زوال سے وابستہ تھی، اور بھی شدت سے محسوس ہونے لگی۔ اس کی طبیعت اکھڑی اکھڑی رہنے لگی۔ اسے مسلسل یہ غم کھائے جارہا تھا کہ اس کا ایک ہی قریبی عزیز، اس کا بھائی، باقی رہ گیا ہے اور وہ بھی سخت خطرے میں گھرا ہوا ہے۔ پھر اسے اپنے بھتیجے کی تعلیم وتربیت کی فکر بھی تھی۔ وہ ہمیشہ یہی سمجھتی رہی کہ یہ بڑا مشکل کام ہے اور وہ اس کی اہل نہیں۔ تاہم اپنے قلب کی گہرائیوں میں وہ خود سے مطمئن تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ وہ اپنے ذاتی خوابوں اور خواہشوں کا گلا گھونٹ چکی ہے، جو رستوف کی آمد سے اس کے نہاں خانہ دل میں سر اٹھانے کے قریب تھیں۔

محفل کے اگلے روز گورنر کی اہلیہ مال ونتسیوا کے گھر پہنچی اور خالہ کے ساتھ اپنے منصوبے کے بارے میں گفتگو کرنے کے بعد اس نے اظہار خیال کیا کہ اگرچہ موجودہ حالات کے پیش نظر رسمی منگنی کی تقریب کے انعقاد کے متعلق سوچا بھی نہیں جا سکتا، تاہم لڑکے لڑکی کی ملاقات ہونا چاہیے اور انھیں ایک دوسرے کو جاننے کا موقع فراہم کیا جانا چاہیے۔ جب خالہ نے رضامندی دے دی، گورنر کی اہلیہ پرنسس ماریا کی موجودگی میں رستوف کی باتیں کرنے اور بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفیں کرنے لگی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ جب پرنسس کا ذکر آیا، وہ بے طرح جھینپ گیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ پرنسس ماریا یہ باتیں سن کر خوش نہیں ہوئی، الٹا اسے دکھ پہنچا۔ اس کی داخلی ہم آہنگی تلپٹ ہو گئی اور ایک بار پھر آرزوئیں، شکوک، ملامتِ نفس اور امیدیں سر اٹھانے لگیں۔

رستوف کی آمد سے قبل جو دو روز گزرے، ان کے دوران میں پرنسس ماریا ہمہ وقت اس ادھیڑبن میں مصروف رہی کہ اسے اس کے ساتھ کس قسم کا رویہ اختیار کرنا چاہیے۔ پہلے تو اس نے یہ فیصلہ کیا کہ جب وہ اس کی خالہ سے ملنے آئے گا، وہ ڈرائنگ روم کا رخ ہی نہیں کرے گی۔ اتنے شدید سوگ کی حالت میں اس کے لیے مہمانوں کا استقبال کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ پھر اس نے سوچا کہ اس (رستوف) نے اس کے لیے جو کچھ کیا تھا، اس کے بعد اگر وہ اس قسم کا رویہ اپنائے گی تو یہ بدتمیزی ہوگی۔ تب اسے خیال آیا کہ اس کی خالہ اور گورنر کی اہلیہ خود اس کے اپنے اور رستوف کے بارے میں کچھ امیدیں پال رہی ہیں (ان کے الفاظ اور وقتاً فوقتاً ان کی نگاہیں اس شبے کو تقویت پہنچاتی تھیں)۔ مگر اس نے اپنے آپ سے کہا: ''میں تو ازل کی پاپن ہوں، تبھی تو میں ان خواتین کے بارے میں اس طرح سوچتی ہوں۔ ان سے قطعاً یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ میری موجودہ حالت کے پیش نظر جب میں ابھی سوگ منا رہی ہوں، وہ یہ رشتہ طے کرانے کا خیال بھی اپنے دل میں لائیں گی کیونکہ اس سے میرے باپ کی یاد کی، بلکہ خود میری اپنی، توہین ہوگی۔'' پرنسس ماریا نے تصور کیا: ''فرض کریں، میں ان سے ملنے چلی جاتی ہوں، وہ مجھ سے اور میں ان سے کیا کہوں گی؟'' اس نے ان الفاظ کا احاطہ کرنے کی کوشش کی جو رستوف اس سے اور وہ اس سے کہے گی۔ اسے دونوں کے جملے کبھی تو غیر مناسب طور پر سردمہر معلوم ہونے لگتے اور کبھی معانی سے بھرپور۔ اور سب سے بڑھ کر اسے یہ خوف کھائے جارہا تھا کہ جونہی وہ اس سے ملے گی، اس پر بوکھلاہٹ طاری ہو جائے گی اور اس کے دل کی بات اس کے چہرے پر عیاں ہو جائے گی۔

لیکن جب اتوار کو کلیسا سے واپسی کے بعد وردی پوش ملازم ڈرائنگ روم میں اطلاع دینے آیا کہ ''کاؤنٹ رستوف تشریف لائے ہیں''، پرنس نے کسی قسم کی بوکھلاہٹ کا اظہار نہ کیا، صرف اس کے چہرے پر قدرے حیا کی سرخی دوڑ گئی اور اس کی آنکھوں میں نئی چمک آ گئی۔

''خالہ، آپ ان سے ملی ہیں؟'' وہ پرسکون لہجے میں پوچھنے لگی۔ وہ خود حیران تھی کہ ظاہری طور پر اس میں یہ دل جمعی اور بے ساختگی کہاں سے آ گئی ہے۔

جب رستوف کمرے میں داخل ہوا، پرنس ماریا نے گھڑی کی گھڑی اپنی گردن نیچے جھکا لی جیسے وہ مہمان کو اتنی مہلت دینا چاہتی ہو کہ وہ اس کی خالہ سے علیک علیک کر لے اور پھر عین اس وقت، جب نکولائی اس کی جانب متوجہ ہوا، اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور بہ چشمِ فروزاں اس کی نگاہوں کا سامنا کیا۔ وہ اپنی نشست سے ذرا اوپر اٹھی (اس کی حرکات میں رعنائی اور رکھ رکھاؤ تھا)، خندہ روئی سے اپنا مہین اور نرم و نازک ہاتھ اس کی طرف بڑھایا اور ایک ایسی آواز میں، جو اولیس بار نئے، عمیق اور نسوانی لہجے سے لرز رہی تھی، باتیں کرنے لگی۔ مادموزیل بوغین کا، جو کمرے میں موجود تھی، حیرت واستعجاب سے منہ کھلے کا کھلے رہ گیا۔ اس امر کے باوصف کہ وہ مردوں پر ڈورے ڈالنے کے فن میں یکتا تھی لیکن جس شخص کو وہ اپنے دامِ تزویر میں پھانسنا چاہتی، اس سے ملاقات پر وہ بھی اس سے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکتی۔

''یا تو سیاہ رنگ اس پر خاص طور پر پھبتا ہے یا پھر مجھے پتا ہی نہیں چل سکا اور یہ واقعی پہلے کی نسبت زیادہ جاذبِ نظر ہو گئی ہے اور سب سے بڑھ کر۔۔ کیا savoir faire* ہے، کیا رعنائی ہے!'' مادموزیل بوغین نے سوچا۔

اگر پرنس ماریا سوچ بچار کر سکتی تو اس میں جو تبدیلی آئی تھی، اسے دیکھ کر وہ مادموزیل بوغین سے بھی زیادہ ششدر رہ جاتی۔ جونہی اس کی نظریں اس پیارے اور محبوب چہرے پر پڑیں، کسی نئی حیاتی قوت نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اور اسے اپنے قول و فعل میں بے ساختگی برتنے پر مجبور کر دیا۔ جس لمحے رستوف کمرے میں داخل ہوا، پرنس ماریا کا چہرہ منقلب ہو گیا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے نقش و نگار سے مزین فانوس، جب اندر سے روشن کیا جاتا ہے، جگمگا اٹھتا ہے اور غیر متوقع طور پر اس کے مختلف خانوں کی نازک، نفیس اور پیچیدہ رنگین آرائش کی، جو اس وقت تک بھونڈی، مگھم اور بے معنی نظر آتی تھی، دم بخود کر دینے والی خوبصورتی آشکار ہو جاتی ہے۔ اس کا آلائشوں سے پاک، روحانی، داخلی کرب، جس سے وہ اب تک دوچار رہی تھی، پہلی مرتبہ سطح پر نمودار ہوا۔ اس کی تمام روحانی جستجوئیں، اس کا ذہنی اضطراب، نیکی اور فضیلت کے لیے اس کی ساری مساعی، اس کی عاجزی اور فروتنی، ایثار و قربانی اور محبت ۔۔ یہ سب کی سب ان تابندہ آنکھوں، مہین مسکراہٹ اور اس کے نرم و لطیف چہرے کے ہر ریشے میں جھلملا رہی تھیں۔

رستوف نے یہ سب کچھ اتنا واضح طور پر دیکھا جیسے وہ اسے جنم جنم سے جانتا ہو۔ اسے محسوس ہوا کہ جو ہستی

* صحیح موقع پر صحیح کام کرنے کی صلاحیت۔ معاملہ فہمی (tact)۔

اس کے سامنے موجود ہے، ہر اس ہستی سے، جس سے وہ ازیں پیشتر ملا تھا، قطعی مختلف اور برتر ہے، بلکہ خود اس سے بھی بہتر ہے۔

ان کی گفتگو سیدھی سادی، ہر قسم کے الجھاؤ سے پاک اور عام فہم تھی۔ باقی لوگوں کی طرح انھوں نے بھی جنگ کے متعلق باتیں کیں اور اس ضمن میں انھیں جن آلام میں سے گزرنا پڑا، ان کے ذکر میں دوسروں کی طرح انھوں نے بھی غلو سے کام لیا۔ ان کی گزشتہ ملاقات بھی زیر بحث آئی ــ یہاں نکولائی نے موضوع تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے گورنر کی شفیق اہلیہ اور اپنے عزیز و اقارب کی باتیں کیں۔

پرنسس ماریا نے اپنے بھائی کے متعلق گفتگو کرنے سے احتراز کیا، بلکہ جونہی اس کی خالہ پرنس آندرے کا نام اپنی زبان پر لائی، اس نے باتوں کا رخ کسی اور طرف پھیر دیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ روس کے مصائب کے ذکر میں وہ بناوٹ سے کام لے سکتی ہے لیکن اس کا بھائی اس کے اتنا قریب تھا کہ اس کے ذکر میں وہ سطحی انداز نہ اپنا سکتی ہے اور نہ اپنانے پر مائل ہے۔ نکولائی سے اس کا یہ رویہ چھپا نہ رہ سکا کیونکہ وہ اپنی عادت کے برعکس اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک ادا کا باریک بینی سے مشاہدہ کر رہا تھا اور جو کچھ اس نے دیکھا، اس سے وہ یہ نتیجہ اخذ کر چکا تھا کہ پرنسس ماریا کی شخصیت غیر معمولی ہے اور زندگی میں ایسے لوگوں سے روز روز ملاقات نہیں ہوتی۔

جب دوسرے لوگ نکولائی سے پرنسس ماریا کے متعلق بات کرتے تھے، وہ کانوں کان سرخ ہو جاتا تھا اور اسے عجیب طرح کی خفت محسوس ہونے لگتی (اس کا ذکر آنے پر پرنسس ماریا کی بھی بالکل یہی کیفیت ہو جاتی تھی۔)، بلکہ جب وہ خود اس کے بارے میں سوچتا، تب بھی اس کی یہی حالت ہو جاتی تھی، تاہم اس کی موجودگی میں اسے کسی نوع کی قطعاً کوئی گھبراہٹ نہ ہوئی۔ اگرچہ وہ خوب سوچ سمجھ کر آیا تھا کہ ''آج میں فلاں بات کروں گا اور اس طریقے سے کروں گا۔'' لیکن جب موقع آیا، وہ اپنے آپ کو اس طرح کے رٹے رٹائے جملوں تک ہی محدود نہ رکھ سکا بلکہ جو بات بھی اس کے دھیان میں آئی، اس نے اس کا نہایت روانی اور برجستگی سے اظہار کر دیا۔

جب اس مختصر ملاقات کے دوران میں کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی، جیسا کہ ایسے مواقع پر، جہاں بچے ہوں، لوگ ہمیشہ کرتے ہیں، نکولائی پرنس آندرے کے نوعمر بیٹے کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ اسے بہلانے پھسلانے اور اس سے پوچھنے لگا کہ آیا وہ ہوزار بننا پسند کرے گا۔ اس نے لڑکے کو اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور پرنسس ماریا کو ایک نظر دیکھنے کے بعد خوش باش انداز سے ادھر ادھر گھمانے لگا۔ وہ ایسی نگاہوں سے، جن میں ملائمت، مسرت اور جھینپ تھی، بچے کو، جس سے اسے پیار تھا، اس شخص کے، جس سے اسے محبت تھی، بازوؤں میں دیکھتی رہی۔ نکولائی نے اسے یوں دیکھتے دیکھ لیا اور ایسے جیسے وہ اس کی معنویت سمجھ گیا ہو، سرور و انبساط سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور وہ نیک نیت لیکن چنچل انداز سے اس کے دھڑا دھڑ بوسے لینے لگا۔

چونکہ پرنسس ماریا ابھی تک سوگ منا رہی تھی، اس لیے وہ بڑے لوگوں کی محافل میں شریک نہیں ہوتی تھی، اور نکولائی نے اس کے ہاں دوبارہ جانا مناسب نہ سمجھا۔ تاہم گورنر کی بیوی رشتہ طے کرانے کے کام میں جتی رہی۔

پرنس ماریا نکولائی کی اور نکولائی پرنس ماریا کی جو تعریفیں کرتا، وہ انھیں اور دونوں کے احساسات وجذبات ایک سے دوسرے تک پہنچاتی رہی۔ اس کا اصرار تھا کہ نکولائی پرنس ماریا کے سامنے اپنے عزائم کا اظہار کردے۔ اس مقصد کے پیش نظر اس نے عبادت صبح سے قبل بشپ کے گھر میں دونوں کی ملاقات کا اہتمام کیا۔

اگرچہ رستوف نے گورنر کی بیوی کو صاف صاف بتا دیا تھا کہ وہ پرنس ماریا کے سامنے اس قسم کی کوئی بات نہیں کہے گا، اس نے آنے کا وعدہ کرلیا۔

جس طرح ٹلزٹ میں رستوف نے اپنے آپ کو اس چیز کو، جسے ہر شخص صحیح تصور کرتا تھا، صحیح تسلیم کرنے میں کسی قسم کے شک وشبہ میں مبتلا نہیں ہونے دیا تھا، اگرچہ اب اس کے ذہن وقلب میں مختصر لیکن سچی کشمکش ضرور ہوئی کہ وہ اپنی زندگی کو اپنی سمجھ بوجھ کے مطابق ترتیب دے یا حالات کے دھارے کے سامنے سپر انداز ہوجائے، اس نے اب بھی بعینہٖ مؤخرالذکر راستے کو منتخب کرنے میں ہی عافیت جانی اور اس قوت کے آگے سر تسلیم خم کردیا، جس کے متعلق اسے احساس تھا کہ وہ اسے یوں اپنے ساتھ بہائے لیے جارہی ہے کہ وہ اس کے ساتھ زور آزمائی نہیں کرسکتا۔ وہ جانتا تھا کہ سونیا کے ساتھ عہدو پیمان باندھنے کے بعد پرنس ماریا کے سامنے اپنے جذبات کا اظہار کرنا پرلے درجے کی کمینگی ہوگی اور وہ جانتا تھا کہ اس سے کمینگی کا ارتکاب کبھی نہیں ہوسکے گا۔ لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا (یا کم از کم اپنے دل میں محسوس کرتا تھا) کہ حالات کی قوت اور ان لوگوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر وہ نہ صرف یہ کہ وہ کوئی غلط کام نہیں کررہا بلکہ کوئی نہایت اہم فریضہ — اتنا اہم کہ اس نے زندگی میں اس سے اہم تر کوئی کام نہیں کیا ہوگا — سرانجام دے رہا ہے۔

اگرچہ پرنس ماریا سے ملاقات کے بعد ظاہری طور پر اس کے طرز حیات میں کوئی فرق نہیں آیا تھا لیکن اپنی سابقہ تفریحات میں اب اسے خاک لطف نہ آتا اور وہ اکثر اپنے آپ کو اسی (پرنس ماریا) کے متعلق سوچتا پاتا۔ لیکن اس نے اس کے بارے میں کبھی اس انداز سے نہیں سوچا جس انداز سے وہ ان تمام نوجوان خواتین کے بارے میں، جن سے اس کی ملاقات اونچے طبقے کی محافل میں ہوتی تھی، سوچا کرتا تھا، اور نہ اب وہ سونیا کے متعلق تادیر سوچتا اور سوچتا بھی تو پہلے کی طرح اس پر وجد کی کوئی کیفیت طاری نہ ہوتی۔ تقریباً تمام ذی عزت اور راست باز نوجوانوں کی مانند وہ ان میں سے ہر نوجوان خاتون کا یوں تصور باندھتا کہ وہ مستقبل میں اس کی بیوی بنے گی اور اس کے ساتھ اس کی شادی شدہ زندگی کیسے گزرے گی، اس کے تمام مناظر — ڈریسنگ گاؤن، سماوار کے پیچھے بیوی، بیوی کی گاڑی، maman اور پاپا کے ساتھ ننھے منے بچے، اس کی بیوی کے ساتھ ان کا رویہ، وغیرہ وغیرہ — اس کی نگاہوں کے سامنے گھوم جاتے، اور مستقبل کی ان تصویروں سے اسے لطف آتا۔ لیکن جب وہ پرنس ماریا کے متعلق سوچتا، جس کے ساتھ وہ اس کی سگائی کرنے پر کمربستہ ہوچکے تھے، وہ مستقبل کی شادی شدہ زندگی کا کوئی نقشہ ترتیب نہ دے سکتا۔ اگر وہ کوشش کرتا بھی، تو اسے یہ سب کچھ غیر موزوں اور باطل معلوم ہونے لگتا، اس سے صرف اس کی بے چینی میں اضافہ ہوتا۔

7

بارودینو کی لڑائی اور اس لڑائی میں ہمارے جو لوگ زخمی یا ہلاک ہوئے تھے، ان کی دہشت ناک خبر وسط ستمبر[10] میں وارانیژ پہنچی اور اس دہشت ناک خبر نے توسب کے دل ہلا دیے کہ ماسکو ہاتھ سے جاتا رہا ہے۔ پرنس ماریا نے اپنے بھائی کے زخمی ہونے کی خبر اخباروں میں پڑھی ضرور تھی لیکن اس بارے میں اسے کوئی مصدقہ اطلاع نہیں ملی تھی۔ چنانچہ وہ خود اس (بھائی) کی تلاش میں جانے کی تیاریاں کرنے لگی۔ (پرنس ماریا کے ان ارادوں کی اطلاع نکولائی کو دوسروں سے ملی تھی، خود اس کی اس سے دوبارہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔)

رستوف نے جب بارودینو کی لڑائی اور اتراکِ ماسکو کی خبر سنی، اسے نہ مایوسی نے گھیرا اور نہ اس پر غیظ و غضب، انتقام یا اس نوع کا کوئی دوسرا جذبہ سوار ہوا لیکن ایکا ایکی وارانیژ کی کسی بھی چیز میں اس کے لیے دلچسپی اور لطف کا کوئی سامان نہ رہا، بلکہ الٹا اسے اکتاہٹ ہونے لگی۔ اس کا ضمیر اسے تقریباً کچوکے لگانے لگا اور اس کی طبیعت میں انقباض پیدا ہو گیا۔ جو گفتگوئیں وہ سنتا، ان میں اسے ریاکاری کی بو آتی۔ اسے علم نہیں تھا کہ وہ ان واقعات کے بارے میں کیا رائے قائم کرے اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ جب وہ واپس رجمنٹ میں جائے گا، تبھی ہر چیز اس پر واضح ہوگی۔ وہ گھوڑے خریدنے کے کام میں عجلت دکھانے لگا اور اکثر اپنے ملازم اور کوارٹر ماسٹر پر خواہ مخواہ برسنے لگتا۔

نکولائی کی روانگی سے چند روز پیشتر کسی روسی فتح کے موقع پر کلیسا میں خصوصی نمازِ شکرانہ کا اہتمام کیا گیا۔ وہ اس میں شریک ہوا۔ وہ گورنر کے قدرے پیچھے کھڑا تھا۔ پوری عبادت کے دوران میں اس کے چہرے پر عسکری متانت چھائی رہی اور وہ انتہائی متنوع موضوعات کے بارے میں سوچتا رہا۔ جب عبادت ختم ہوگئی، گورنر کی بیوی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے بلایا۔

''تم پرنس سے ملے ہو یا نہیں؟'' اس نے ایک خاتون کی طرف، جو طائفۂ موسیقی کی دوسری جانب کھڑی تھی، سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

اس نے چشم زدن میں پرنس ماریا کو پہچان لیا۔ اس کے چہرے کا ایک رخ اس کے ہیٹ کے نیچے نظر آ رہا تھا لیکن وہ اس کے چہرے سے اس کی اتنی شناخت نہ کر سکا جتنا خواستگاری، ترحم اور ہیبت کے احساس سے جو معاً اس پر حاوی ہو گیا تھا۔ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ پرنس ماریا اپنے خیالات میں مستغرق ہے۔ وہ گرجے سے نکلنے سے پہلے آخری بار اپنے سینے پر صلیب کا نشان بنا رہی تھی۔

نکولائی حیرت و استعجاب سے ٹکٹکی باندھ کر اس کے چہرے کو دیکھنے لگا۔ یہ وہی چہرہ تھا جو وہ پہلے دیکھ چکا تھا۔ اس پر وہی عمومی شائستہ داخلی، روحانی کرب نمایاں تھا لیکن اب یہ بالکل نئی قسم کی روشنی سے درخشاں و تاباں تھا۔ اس پر غم و محن، دعا اور امید کچھ اس طور جھلک رہے تھے کہ آدمی متاثر ہوئے بنا نہیں رہ سکتا تھا۔ جس طرح پہلے اس نے اس کی موجودگی میں کسی قسم کی ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، وہ ایک بار پھر گورنر کی بیوی سے شبہ ملنے کا انتظار کیے بغیر

اس کی طرف چل پڑا اور اپنے آپ سے یہ پوچھے بغیر کہ اس کا گرجے کے اندر اس سے یوں مخاطب ہونا صحیح اور مناسب ہے بھی یا نہیں، اسے بتانے لگا کہ وہ اس کے مصائب کے بارے میں سن چکا ہے اور دل کی گہرائیوں سے اس کے ساتھ ہمدردی کرتا ہے — جونہی نکولائی کی آواز پرنسس ماریا کے کانوں میں پڑی، وہ اپنا دکھ سکھ بھول گئی اور اس کا سارا چہرہ نمایاں انداز سے تمتمانے لگا۔

''پرنسس، میں ایک بات آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں'' رستوف نے کہا، ''اور وہ یہ ہے کہ اگر پرنس آندرے نکولائی وچ بقید حیات نہ ہوتے، ان کا نام لازماً سرکاری گزٹ میں چھپتا کیونکہ وہ کرنل ہیں۔''

پرنسس نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی مطلق سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے لیکن اس کے چہرے پر جو ہمدردی جھلک رہی تھی، اس نے اس کا جی خوش کر دیا۔

''اور مجھے بے شمار اشخاص کے متعلق معلوم ہے کہ انھیں بم کا ٹکڑا (سرکاری گزٹ میں اسے شیل کہا گیا تھا) لگا، وہ یا تو موقع پر ہی ہلاک ہو گئے یا پھر انھیں بالکل معمولی زخم آئے۔'' نکولائی نے کہا۔ ''ہمیں اچھی خبر کی امید رکھنا چاہیے اور مجھے یقین ہے کہ —''

پرنسس ماریا نے اسے ٹوک دیا۔

''اف، یہ کتنی ہیبت —'' وہ بولنے لگی لیکن اس کے اضطراب نے اسے اپنی بات ختم نہ کرنے دی۔ اس نے کمال رعنائی سے اپنا سر اس کے سامنے جھکا دیا (اس کی موجودگی میں اس کی ہر حرکت میں رعنائی اور زیبائی ہوتی تھی)، اور اس پر تشکر و امتنان کی نگاہ ڈالتے اپنی خالہ کے پیچھے پیچھے چل دی۔

اس شام نکولائی کسی سے ملنے نہ گیا بلکہ گھوڑوں کے تاجر کا حساب کتاب چکانے اپنی قیام گاہ پر ہی ٹھہرا رہا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہوا، رات اتنی بیت چکی تھی کہ کسی کے ہاں جانے کا وقت نہیں رہا تھا لیکن اتنی بھی گہری نہ ہوئی تھی کہ وہ سونے کی غرض سے بستر پر دراز ہو جاتا۔ وہ خاصی دیر تک اپنے کمرے میں چکر لگاتا اور اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ یہ کام وہ شاذ و نادر ہی کرتا تھا۔

سمولنسک کے قریب پہلی ملاقات کے دوران میں پرنسس ماریا نے اس پر خوشگوار اثر چھوڑا تھا۔ ایک تو ان کی ملاقات اتنے غیر معمولی حالات میں ہوئی، پھر ایک مرتبہ اس کی ماں نے بھی اس سے کہا تھا کہ اس کے لیے یہ رشتہ موزوں رہے گا۔ ان باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اپنے خیالوں میں اس میں خصوصی دلچسپی لینے لگا۔ جب وارانیژ میں اس کی اس سے دوبارہ ملاقات ہوئی، اس نے اس پر جو تاثر چھوڑا، وہ نہ صرف خوشگوار تھا بلکہ قوی بھی تھا۔ اس مرتبہ اسے اس میں جو خاص قسم کا اخلاقی حسن نظر آیا، اس نے اس کے دل پر گہرا اثر کیا، تاہم وہ وہاں سے روانگی کی تیاریاں کر رہا تھا اور اسے اس خیال سے قطعاً کوئی ملال نہیں ہوا تھا کہ وارانیژ کو خیرباد کہنے سے وہ پرنس کو دیکھنے کے موقع سے محروم ہو جائے گا، لیکن اسے محسوس ہوا کہ اس صبح اس کی گرجے میں جو اچانک اس سے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی، وہ یوں اس کے دل پر راسخ ہو گئی ہے کہ اس کے اطمینان قلب کے لیے ٹھیک نہیں ہے۔ اس کا زرد، نرم و لطیف اور

اداس چہرہ، اس کی درخشاں آنکھیں، اس کی کومل اور رعنائی سے بھرپور حرکات وسکنات اور خاصی طور پر وہ عمیق اور ملائم افسردگی، جو اس کے سارے خدوخال میں جاری وساری تھی، اسے بے چین ومضطرب کر رہی تھی اور اس کے دل میں ہمدردی کے جذبات پیدا کر رہی تھی۔ مردوں میں اسے جن اشخاص کے چہروں پر پُرتمکین روحانی زندگی کا پَرتو نظر آتا، وہ اسے برداشت نہ کر پاتا (یہی وجہ ہے کہ وہ پرنس آندرے کو پسند نہیں کرتا تھا): وہ اسے حقارت سے فلسفہ آرائی یا تخیل پسندی کہتا تھا۔ لیکن پرنسس ماریا کی افسردگی کامل روحانی دنیا کی گہرائی منکشف کرتی تھی، یہ دنیا اس کے لیے اجنبی تھی اور اسی لیے اتنی پرکشش کہ وہ بے اختیار اس کی طرف کھنچا چلا جا رہا تھا۔

''بڑی محیرّالعقول لڑکی ہے! صحیح معنوں میں فرشتہ صفت!'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''میں آزاد کیوں نہیں؟— سونیا سے قول وقرار کرنے کی جلدی کیا تھی؟'' اور وہ غیرارادی طور پر ان دونوں کے مابین موازنہ کرنے لگا۔ ایک میں ان روحانی اوصاف کا، جن سے وہ خود تہی دامن تھا، فقدان اور دوسری میں ان کی فراوانی۔ اس نے یہ تصور کرنے کی کوشش کی کہ اگر وہ آزاد ہوتا، پھر معاملات کی صورت کیا ہوتی۔ وہ کس طرح اسے شادی کی تجویز پیش کرتا اور وہ کس طرح اس کی رفیقہ حیات بن جاتی لیکن نہیں، وہ اس قسم کی خیال آرائی نہیں کر سکتا۔ اس کا دل بیٹھنے لگا اور اس کے ذہن میں کوئی واضح تصویر نہ ابھر سکی۔ مدتوں پہلے اس نے مستقبل میں سونیا کے ساتھ زندگی بتانے کی تصویر بنائی تھی اور یہ سب کچھ محض اس لیے سیدھا سادا اور غیرمبہم تھا کیونکہ اس کے متعلق ہر پہلو سے سوچا جا چکا تھا اور وہ سونیا کو اچھی طرح جانتا تھا۔ لیکن پرنسس ماریا کے ساتھ مستقبل کیسا ہوگا، اس کی ذہن میں تصویر بنانا ناممکن تھا کیونکہ وہ اسے سمجھتا نہیں تھا، اس سے صرف محبت کرتا تھا۔

سونیا کے بارے میں وہ جو خواب دیکھا کرتا تھا، وہ نشاط انگیز ہوتے تھے اور ان سے ایک قسم کے کھلنڈرے پن کا تاثر جھلکتا تھا۔ مگر پرنسس ماریا کے بارے میں خواب بننا مشکل تھا اور اس میں اسے قدرے خوف بھی محسوس ہوتا تھا۔

''کیا انداز تھا عبادت کا!'' وہ سوچ رہا تھا۔ ''معلوم ہوتا تھا کہ اس کی ساری روح عبادت میں جذب ہو گئی ہے۔ ہاں، اس قسم کی عبادت پہاڑوں کو ہلا دیتی ہے اور مجھے یقین ہے کہ اس کی عبادت لازماً قبول ہو گئی ہوگی۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں، میں اس کے لیے دعا کیوں نہیں کرتا؟'' اس نے یک دم اپنے آپ سے پوچھا۔ ''میں کیا چاہتا ہوں؟ رستگاری— میں چاہتا ہوں کہ سونیا مجھے آزاد کر دے۔ ... وہ ٹھیک کہتی تھی۔'' گورنر کی اہلیہ نے جو کچھ کہا تھا، اس نے اسے یاد کرتے ہوئے سوچا۔ ''سونیا سے شادی کر کے کلفت کے علاوہ کچھ ہاتھ نہیں آئے گا۔ الجھنیں اور بکھیڑے، اماں کی کبیدہ خاطری... کاروباری مشکلات... گتھیاں... گتھیاں اور ہیبت ناک الجھاوے! علاوہ ازیں مجھے اس سے محبت نہیں— اس طرح نہیں جس طرح کہ ہونا چاہیے۔ یا خداوند! مجھے اس اذیت ناک اور مایوس کن صورت حال سے چھٹکارا دلا!'' وہ ایکا ایکی دعا مانگنے لگا۔ ''ہاں، دعا کوہساروں کو ہلا سکتی ہے لیکن اس کے لیے ضروری ہے کہ آدمی ایقان کی دولت سے مالامال ہو اور وہ اس طرح دعا نہ مانگے جس طرح بچپن میں نتاشا اور میں مانگا کرتے تھے کہ برف چینی میں تبدیل ہو جائے اور پھر بہتے بہتے صحن میں آ جائے تاکہ ہم اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔

نہیں، اب میں حقیر اور بے وقعت اشیا کے لیے دعا نہیں مانگ رہا۔'' اس نے اپنا پائپ کونے میں رکھتے اور ہاتھ باندھے ایقونوں کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ اور پرنس ماریا کے تصور نے اس کا دل پگھلا دیا اور وہ اس طریقے سے دعا مانگنے لگا کہ کافی عرصے سے نہیں مانگی تھی۔ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہوگئیں اور اس کا گلا رندھ گیا کہ لاوروشکا چند کاغذات اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔

''الو کی دم، جب میں نے تمھیں بلایا ہی نہیں، تم منہ اٹھائے اندر کیوں چلے آرہے ہو؟'' نکولائی نے بہ عجلت اپنا رویہ تبدیل کرتے ہوئے کہا۔

''گورنر کی طرف سے۔'' لاوروشکا نے خواب آلود آواز میں کہا۔ ''ان کا ایلچی آیا ہے۔ آپ کا خط بھی ہے۔''

''بہت اچھا، شکریہ۔ تم جا سکتے ہو۔''

نکولائی نے دونوں خطوط اٹھا لیے۔ ایک اس کی ماں کا تھا اور دوسرا سونیا کا۔ اس نے انھیں ان کے طرز تحریر سے پہچان لیا۔ اس نے پہلے سونیا کا خط کھولا۔ اس نے محض چند سطور پڑھی تھیں کہ اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا اور خوف و مسرت سے اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں۔

''نہیں، یہ ممکن نہیں ہے!'' وہ با آواز بلند پکار اٹھا۔

اس کے لیے چپ چاپ بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ دونوں ہاتھوں میں خط پکڑے اور اسے پڑھتے کمرے میں چکر لگانے لگا۔ اس نے اس پر سرسری نظر ڈالی، ایک مرتبہ پڑھا اور پھر دوسری مرتبہ، اپنے کندھے اچکائے، بازو ہوا میں اچھالے اور کمرے کے درمیان میں ساکت و صامت کھڑا ہو گیا۔ اس کا منہ کھلا تھا اور وہ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔ وہ جو کچھ اس اعتماد کے ساتھ کہ خداوند اس کی سنے گا، دعا میں مانگ رہا تھا، وہ اب پورا ہو چکا تھا،[11] لیکن نکولائی اتنا ششدر ہوا جیسے یہ کوئی انہونی اور ناشدنی بات ہو، جیسے اسے اس کی کوئی توقع نہ ہو، جیسے کہ یہی حقیقت کہ یہ سب کچھ اتنا جھٹ پٹ ہوا، یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہو کہ یہ خدا کی، جس سے وہ دعائیں مانگ رہا تھا، طرف سے نہیں ہوا بلکہ محض اتفاقاً ہو گیا ہے۔

وہ گرہ، جس نے اسے بے دست و پا بنا رکھا تھا اور جو بظاہر یوں معلوم ہوتی تھی کہ کاٹے کٹے گی نہیں، سونیا کے اس خط سے، جس کا کوئی سان گمان نہیں تھا اور جس کے لیے (اس کا یہی خیال تھا) اس نے کوئی التجا نہیں کی تھی، قطع ہو گئی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ انھوں نے حال ہی میں جو مصائب جھیلے ہیں، رستوفوں کو عملاً اپنی ماسکو کی تمام جائیداد سے جس طرح ہاتھ دھونا پڑے ہیں اور کاؤنٹس یہ جو بار بار تقاضا کرتی رہتی ہے کہ نکولائی کو پرنس بلکونسکایا سے شادی کر لینا چاہیے، پھر گزشتہ کچھ عرصے سے وہ خود اس کے ساتھ جس سرد مہری اور بے اعتنائی سے پیش آتا رہا ہے، ان تمام باتوں سے مل ملا کر اسے یہ فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اس نے اس کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا تھا، وہ اس سے اسے خلاص کر دے اور اسے مکمل آزادی دے دے۔

میرے لیے یہ سوچنا ہی نہایت تکلیف دہ امر ہے (اس نے تحریر کیا تھا) کہ میں اس خاندان میں، جس نے میرے ساتھ اتنا اچھا سلوک کیا ہے، نفاق یا رنج والم کا سبب بنوں اور میرے پیار کا اس کے علاوہ اور کوئی مقصد نہیں کہ میں جن لوگوں سے محبت کرتی ہوں، ان کے لیے مسرت فراہم کروں۔ چنانچہ، نکولس، میں تم سے التجا کرتی ہوں کہ تم اپنے آپ کو مجھ سے آزاد سمجھو اور یہ بھی جان لو کہ سب باتوں کے باوجود مجھ سے بڑھ کر تم سے کوئی سچی محبت نہیں کر سکتا۔

تمھاری سونیا

دونوں خطوط تروئستا کے مقام سے تحریر کیے گئے تھے۔ کاؤنٹس نے اپنے خط میں ماسکو میں اپنے آخری ایام، روانگی، آتش زدگی اور اپنی ساری جائیداد کے اتلاف کی روداد بیان کی تھی۔ اس نے اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ پرنس آندرے زخمی ہو چکا ہے اور دوسرے زخمیوں کے ساتھ ان کے ہمراہ سفر کر رہا ہے، اس کی حالت نازک ہے لیکن ڈاکٹر کا کہنا ہے اب اس کے سنبھلنے کی امید کچھ بڑھ گئی ہے، سونیا اور نتاشا اس کی تیمارداری کر رہی ہیں۔

اگلے روز نکولائی نے اپنی والدہ کا خط اٹھایا اور پرنس ماریا سے ملنے چل پڑا۔ اس جملے کے کہ "نتاشا اس کی تیمارداری کر رہی ہے" امکانی مطالب کیا ہو سکتے تھے، دونوں نے ان کے بارے میں ایک لفظ بھی نہ کہا۔ تاہم یہ اسی خط کا اعجاز تھا کہ نکولائی اچانک پرنس سے اتنا بے تکلف ہو گیا جیسے وہ جنم جنم سے ایک دوسرے کے رفیق ہوں۔

اگلے صبح کاؤنٹ رستوف نے پرنس ماریا کو یاروسلاول کے سفر پر روانہ کیا اور چند روز بعد خود اپنی رجمنٹ میں شامل ہونے کی غرض سے چل پڑا۔

8

نکولائی کے نام سونیا کا خط، جو اس کی دعاؤں کے جواب میں موصول ہوا تھا، تروئستا کے مقام سے لکھا گیا تھا۔ اسے جس چیز نے یہ تحریر کرنے کی تحریک دی تھی، وہ یہ تھی: یہ خیال کہ نکولائی کو کسی متمول دوشیزہ سے شادی کرنا چاہیے، کاؤنٹس کے ذہن پر کابوس کی طرح سوار ہو گیا تھا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے اسی کا ورد کرتی رہتی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس شادی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ سونیا ہے اور کاؤنٹس کے گھر میں، خاص طور پر اس وقت سے جب رستوف کا وہ خط موصول ہوا تھا، جس میں اس نے باگوچارافو میں پرنس ماریا سے اپنی ملاقات کی تفصیل بیان کی تھی، اس کی زندگی روز بروز تلخ سے تلخ تر ہوتی جا رہی تھی۔ کاؤنٹس کو جب بھی موقع ملتا، وہ طنز و تعریض کے تیر چلانے یا کوئی ایسی بات کہنے سے نہ چوکتی، جس سے سونیا کی خودداری کو ٹھیس پہنچ سکتی تھی۔

لیکن ماسکو کو خیرباد کہنے سے چند روز پیشتر وہ حالات کی رفتار سے اتنی پریشان اور دل گیر ہوئی کہ اس نے سونیا کو بلایا اور اس کی زجر و توبیخ کرنے اور اس سے کسی قسم کا مطالبہ کرنے کے بجائے اس سے دل فگار انداز اور

آبدیدہ آنکھوں سے التجا کرنے لگی کہ وہ قربانی دے اور خاندان نے اس کے لیے جو کچھ کیا ہے، اس کا معاوضہ یوں ادا کرے کہ نکولائی کے ساتھ اپنی سگائی ختم کر دے۔

''جب تک تم مجھ سے یہ وعدہ نہیں کرتیں، مجھے لمحہ بھر قرار نہیں آئے گا۔'' اس نے کہا۔

سونیا کی شدت جذبات سے حالت غیر ہوگئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس نے اشکوں، آہوں اور سسکیوں کے مابین کہا کہ وہ سب کچھ کرے گی، سب کچھ کرنے کے لیے رضامند ہے لیکن اس نے کوئی دوٹوک وعدہ نہ کیا کیونکہ اس سے جس چیز کا تقاضا کیا جارہا تھا وہ اس کی ہامی بھرنے کے لیے قلبی طور پر اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکی۔ جس خاندان نے اس کی پرورش و پرداخت کی تھی، وہ اس کی خاطر قربانی دینے کے لیے اپنے آپ کو مجبور پاتی تھی۔ دوسروں کے لیے قربانیاں دینا سونیا کی فطرت ثانی بن چکی تھی۔ گھر میں اس کا مقام کچھ ایسا تھا کہ وہ محض قربانی دے کر ہی اپنی قدر و قیمت جتا سکتی تھی اور وہ نفس کشی اور اپنے حقوق سے دست برداری کی عادی ہوگئی تھی۔ اس نے اب تک جتنی قربانیاں دی تھیں، انھوں نے اسے اس حقیقت الامری سے آگاہ کر دیا تھا کہ انھوں نے نہ صرف دوسروں بلکہ خود اس کی اپنی نگاہوں میں اس کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے اور اس احساس پر اس کا دل خوشی سے جھوم اٹھتا۔ یوں وہ خود کو نکولائی کے لیے، جسے وہ دنیا کی ہر چیز سے بڑھ کر پیار کرتی تھی، زیادہ سزاوار سمجھنے لگتی۔ لیکن اب اس سے جس نوع کی قربانی کا مطالبہ کیا جارہا تھا، اس کا مطلب اسی چیز سے دست برداری اختیار کرنا ہوگا جو اس کی ان قربانیوں کا پورا صلہ تھا اور جس سے اس کی تمام زندگی عبارت تھی۔ اور پہلی بار اسے ان لوگوں پر غصہ آیا جنھوں نے اس کی محض اس لیے دست گیری کی تھی تاکہ وہ اسے مزید کرب ناک آزمائشوں میں سے گزار سکیں۔ اسے نتاشا پر رشک آتا تھا جسے کبھی اس قسم کے تجربوں سے گزرنا نہیں پڑا تھا، جسے کبھی قربانی دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی، بلکہ جب وہ دوسروں کو اپنے لیے قربانی دینے کے لیے مجبور کرتی، تب بھی ہر کسی کی آنکھ کا تارا بنی رہتی تھی۔ اور سونیا کو پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اسے نکولائی سے جو پاکیزہ اور خاموش محبت ہے، اس کی وجہ سے اس کے اندر ایسا پر جوش جذبہ پرورش پا رہا ہے جو اصول، نیکی یا مذہب سے زیادہ قوی ہے۔ اسی جذبے کے زیر اثر سونیا نے، جس کی دست نگری کی زندگی نے اسے اخفا پسند بنا دیا تھا، کاؤنٹس کو مبہم عمومی اصطلاحوں میں جواب دینے کے بعد اس سے مزید گفتگو کرنے سے احتراز برتا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ جب تک نکولائی سے اس کی ملاقات نہیں ہو جاتی، وہ انتظار کرے گی۔ اس کے پیش نظر جو خیال تھا، وہ یہ نہیں تھا کہ وہ اسے آزادی دے دے گی بلکہ اس کے برعکس وہ اسے دوامی طور پر اپنے ساتھ منسلک کرنا چاہتی تھی۔

ماسکو میں رستوفوں کے آخری ایام کی گہما گہمی اور خوف و دہشت نے ان افسردہ خیالات کا گلا گھونٹ دیا تھا جو سونیا کے دل و دماغ پر کابوس کی طرح سوار رہتے تھے۔ وہ خوش تھی کہ عملی مصروفیات میں اسے ان سے پناہ مل گئی ہے، مگر جب اسے اپنے گھر میں پرنس آندرے کی موجودگی کا علم ہوا، اس امر کے باوجود کہ اسے نتاشا اور اس (پرنس آندرے) پر اصلی اور کھرا ترس آیا تھا، وہ اس پر مسرت اور توہمانہ جذبے کی گرفت میں آ گئی کہ خداوند اسے

نکولائی سے علیحدہ کرنے کا ارادہ نہیں رکھتا۔ وہ جانتی تھی کہ نتاشا کو پرنس آندرے کے علاوہ اور کسی شخص سے محبت نہیں ہے اور اس نے اس سے محبت کرنا کبھی ترک نہیں کیا ہے۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان ہولناک حالات میں انھیں یک جا کر دیا جائے، وہ ایک بار پھر دیوانہ وار ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جائیں گے اور پھر نکولائی اس قرابت داری کے سبب، جو ان کے مابین استوار ہوگی، پرنس ماریا کے ساتھ شادی نہیں کر سکے گا۔ ماسکو کے آخری اور سفر کے ابتدائی ایام کے دوران میں جو وحشت ناک واقعات ظہور پذیر ہوئے، ان کے باوجود یہی وہ جذبہ، یہی وہ آگہی تھی کہ قدرت مطلقہ اس کے ذاتی معاملات میں دخیل ہو رہی ہے، جس نے سونیا کے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کھلا دی۔

رستوفوں نے سفر کے دوران میں ترؤیتسا خانقاہ میں پورے دن قیام کیا۔

خانقاہ کے ہوسٹل میں انھیں تین کمرے تفویض کر دیے گئے۔ ان میں سے ایک میں پرنس آندرے، جس کی حالت اس روز بہتر تھی، مقیم ہو گیا۔ نتاشا اس کے پاس بیٹھی تھی۔ کاؤنٹ اور کاؤنٹس ملحقہ کمرے میں موجود تھے اور مؤدبانہ انداز سے خانقاہ کے منتظم (prior) کے ساتھ، جو اپنے پرانے شناساؤں اور محسنوں سے ملنے آیا تھا، مصروف گفتگو تھے۔ سونیا بھی وہیں تھی۔ وہ اس تجسس میں گھلی جا رہی تھی کہ پرنس آندرے اور نتاشا کیا باتیں کر رہے ہیں۔ اسے دروازے کی جھری میں سے ان کی باتوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پرنس آندرے کے کمرے کا دروازہ کھلا اور نتاشا باہر آئی۔ اس کی کیفیت ہیجانی ہو رہی تھی۔ اس نے دیکھا ہی نہیں کہ وہاں راہب موجود ہے۔ وہ اس کا استقبال کرنے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اور اپنے بازو کو فراخ آستین سے ڈھانپ رہا تھا۔ نتاشا سیدھی سونیا کے پاس گئی اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

''نتاشا، کیا سوچ رہی ہو؟ ادھر آؤ!'' کاؤنٹس نے کہا۔

نتاشا دعا لینے راہب کے قریب ہو گئی۔ راہب نے اسے مشورہ دیا کہ وہ استمداد کے لیے خداوند اور خانقاہ کے مربی سینٹ[12] سے رجوع کرے۔

جونہی راہب رخصت ہوا، نتاشا نے اپنی سہیلی کا ہاتھ پکڑا اور اس کے ساتھ خالی کمرے میں چلی گئی۔

''سونیا، سنتی ہو، وہ زندہ رہیں گے۔ زندہ رہیں گے نا؟'' اس نے کہا۔ ''میں کتنی خوش ہوں اور کلفت زدہ بھی کتنی! سونیا ڈارلنگ، ہر شے جوں کی توں ہے۔ کاش، وہ صرف زندہ رہیں۔ ان کا انتقال نہیں... کیونکہ... کیونکہ...'' اور نتاشا کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

''ہاں، مجھے معلوم تھا! شکر خداوند!'' سونیا بڑبڑائی۔ ''وہ زندہ رہیں گے۔''

سونیا اپنی سہیلی سے کم مضطرب نہیں تھی۔ اس میں جتنا مؤخرالذکر کے خدشات اور اذیتوں کو دخل تھا اتنا ہی اس کے ذاتی خیالات کو، جن میں وہ کسی کو اپنا ہم راز نہیں بناتی تھی، بلکتے اور سسکتے وہ نتاشا کی بلائیں لینے اور اسے تسلیاں دینے لگی۔

''کاش، وہ زندہ رہے!'' اس نے دل میں سوچا۔

رونے دھونے، باتیں کرنے اور آنسو پوچھنے کے بعد دونوں سہیلیاں پرنس آندرے کے کمرے میں دروازے تک گئیں۔ نتاشا نے اسے نہایت احتیاط سے کھولا اور کمرے میں جھانکنے لگی۔ نیم وا دروازے کے قریب سونیا اس کے پہلو میں کھڑی تھی۔

پرنس آندرے تین تکیوں کے سہارے لیٹا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ زرد اور آنکھیں بند تھیں۔ وہ انھیں باقاعدہ سانس لیتا نظر آ رہا تھا۔

''اف، نتاشا!'' سونیا نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔ اس نے اپنی کزن کا ہاتھ اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور دروازے سے پیچھے ہٹ گئی۔

''کیا؟ کیا ہوا؟'' نتاشا نے پوچھا۔

''یہ وہ — یہ وہی —'' سونیا نے کہا۔ اس کا رنگ فق ہو چکا تھا اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

نتاشا نے دھیمے سے دروازہ بند کر دیا اور سونیا کے ساتھ کھڑکی کے قریب چلی گئی۔ وہ ابھی تک سمجھ نہیں پائی تھی کہ مؤخر الذکر اسے کیا بتانے کی سعی کر رہی ہے۔

''تمھیں یاد ہے۔'' سونیا نے کہا۔ اس کے چہرے پر سنجیدگی اور خوف جھلک رہا تھا۔ ''تمھیں یاد ہے کہ جب میں نے تمھاری خاطر آئینے میں دیکھا تھا — کرسمس پر، اترادنایا میں؟ تمھیں یاد ہے میں نے کیا دیکھا تھا؟''

''ہاں، ہاں!'' نتاشا نے چلا کر کہا۔ اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور اسے دھندلا سا یاد آنے لگا کہ سونیا نے کچھ اس قسم کی بات کہی تھی کہ پرنس آندرے لیٹا ہوا ہے۔

''تمھیں یاد ہے؟'' سونیا نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ ''میں نے اس وقت انھیں دیکھا تھا اور اس بارے میں سبھی کو، تمھیں اور دونیاشا کو بھی، بتایا تھا۔ میں نے انھیں بستر پر لیٹے دیکھا تھا۔'' اس نے ایک ایک تفصیل پر، جو وہ بیان کر رہی تھی، انگلی لہراتے ہوئے کہا۔ ''میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بند ہیں۔ ان کا جسم بعینہٖ گلابی لحاف میں لپٹا ہوا تھا اور ان کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلا رہی تھی کہ جو کچھ وہ کہہ رہی تھی اس کی ایک ایک تفصیل عین مین وہی تھی جو اس نے دیکھی تھی۔

درحقیقت تب اس نے کچھ بھی نہیں دیکھا تھا، بلکہ جو بات پہلے اس کے ذہن میں آئی، وہی اس نے بیان کر دی تھی۔ لیکن جو کچھ اس نے تب گھڑا تھا، کسی بھی دوسری یاد کی طرح اب اسے مبنی برحقیقت نظر آ رہا تھا۔ اسے نہ صرف وہ کچھ یاد آیا جو اس نے انھیں بتایا تھا — یہ کہ اس نے مڑ کر اسے دیکھا تھا اور وہ مسکرایا تھا اور وہ کسی سرخ سی چیز میں لپٹا ہوا تھا — بلکہ اب اسے پختہ یقین ہو چکا تھا کہ تب اس نے دیکھا بھی اور دوسروں کو بتایا بھی تھا کہ اس کا جسم گلابی لحاف میں ڈھکا ہوا ہے — ہاں، گلابی — اور یہ کہ اس کی آنکھیں بند ہیں۔

''ہاں، ہاں، یہ گلابی تھا۔'' نتاشا نے کہا۔ اسے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ اسے یاد ہے کہ اس نے گلابی ہی کہا تھا اور اسے رویا کا یہ جزو انتہائی غیر معمولی اور پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔

''لیکن اس کا مطلب کیا ہے؟'' اس نے سوچتے ہوئے کہا۔

''اف، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ یہ سب کچھ بے حد عجیب ہے!'' سونیا نے اپنا سر پکڑتے ہوئے کہا۔

چند منٹ بعد پرنس آندرے نے گھنٹی بجائی اور نتاشا اس کے پاس چلی گئی۔ لیکن سونیا، جس پر وجد اور ہیجان کی کچھ ایسی کیفیت طاری تھی، جس کا ازیں پیشتر اسے کبھی تجربہ نہیں ہوا تھا، کھڑکی کے قریب کھڑی رہی اور جو کچھ ہوا تھا، اس کے نرالے پن کے بارے میں سوچتی رہی۔

❦

اس روز فوج کو خطوط ارسال کرنے کا موقع میسر تھا اور کاؤنٹس اپنے بیٹے کے نام خط لکھ رہی تھی۔

''سونیا،'' کاؤنٹس نے، جب اپنی بھانجی کو اپنے قریب سے گزرتے دیکھا، خط سے نظریں اٹھا کر کہا۔ ''سونیا، تم نکولینکا کو کچھ نہیں لکھو گی؟''

اس نے اپنا سوال نرم اور لرزتی آواز میں پوچھا تھا اور سونیا نے ان تھکی تھکی نگاہوں میں، جو چشمے کے اوپر جھانک رہی تھیں، وہ سب کچھ پڑھ لیا جس کا کاؤنٹس ان الفاظ کے ذریعے اظہار کرنا چاہتی تھی۔

ان نگاہوں میں منت سماجت تھی، بھیک مانگنے کی مجبوری پر شرمندگی کا احساس تھا، انکار کا خوف تھا اور اگر یہ انکار ہو گیا، پھر ان میں ایسی نفرت کے بھڑکنے کا احتمال تھا جو کبھی نہیں مٹ سکے گی۔

سونیا کاؤنٹس کے پاس پہنچی، نیچے جھکی اور اس نے اس کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

''ہاں، maman، میں لکھتی ہوں۔''

اس روز جو کچھ وقوع پذیر ہوا اور خاص طور پر جس پراسرار انداز سے اس کے رویا کی تعبیر صحیح ثابت ہوئی، اس سے سونیا بہت متاثر ہوئی، اس پر ہیجانی کیفیت طاری ہو گئی اور اس کا دل موم ہو گیا۔ اب جب کہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ پرنس آندرے کے ساتھ نتاشا کے تعلقات کی تجدید نکولائی کی پرنسس ماریا کے ساتھ شادی کی راہ میں مزاحم ہو گی، اسے یہ احساس ہونے لگا کہ اس کا قربانی کا جذبہ، جس کی وہ اتنی خوگر چکی تھی اور جس کے سہارے اسے زندہ رہنا اچھا لگتا تھا، پھر لوٹ آیا ہے۔ اپنے اس احساس سے اس کا دل جھومنے لگا۔ اسے خوشی اس بات کی تھی کہ وہ نہایت عالی ظرفی کا مظاہرہ کر رہی ہے اور اس نے اسی کیفیت میں وہ دل کو پسیج دینے والا خط تحریر کر دیا۔ تحریر کے دوران میں بار بار اس کے آنسو نکل آتے اور اس کی مخملیں سیاہ آنکھوں میں دھندلاہٹ آ جاتی اور لکھائی کا کام رک جاتا۔ کہ نکولائی کو جب وہ موصول ہوا، وہ بھونچکا رہ گیا۔

9

جس افسر اور سپاہیوں نے پیئر کو حراست میں لیا تھا، انھوں نے فوجی حوالات میں، جہاں وہ اسے لے گئے تھے،

اس کے ساتھ معاندانہ برتاؤ کیا لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اس کا احترام بھی کیا۔ انھوں نے اس کے ساتھ جو رویہ اختیار کیا، اس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ انھیں یقین نہیں ہے کہ وہ کون ہے (ہوسکتا ہے وہ کوئی اہم شخص ہی ہو)، لیکن حال ہی میں اس کے ساتھ ان کا جو جھگڑا ہوا تھا، اس پر انھیں اس سے عناد بھی تھا۔

تاہم جب اگلی صبح گارڈ کی تبدیلی عمل میں آئی، پیئر کو محسوس ہوا کہ نئی گارڈ ــ افسروں اور جوانوں دونوں ــ کو اس میں وہ دلچسپی نہیں جوان لوگوں کو تھی جنھوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ جو لوگ اگلی صبح ڈیوٹی پر آئے، انھیں دیہاتی کوٹ میں ملبوس اس ہٹے کٹے، بھاری بھرکم اور منہ زور شخص میں، جس نے لوٹ مار کرنے والے فوجی جوان اور عسکری دستے کے ساتھ اتنا زبردست مقابلہ کیا تھا اور جس نے بچی کی جان بچانے کے بارے میں وہ وجد آفریں الفاظ ادا کیے تھے، کوئی خاص بات نظر نہ آئی۔ انھیں وہ روسی قیدیوں میں، جنھیں اعلیٰ حکام کے پر کسی وجہ سے گرفتار کیا اور حوالات میں ڈالا گیا تھا، محض نمبر سترہ دکھائی دے رہا تھا۔ انھیں پیئر میں اگر کوئی قابلِ اعتنا بات نظر آئی بھی، تو یہ تھی کہ وہ گھبرائے یا شرمائے بغیر پورے انہماک سے اپنی سوچوں میں مستغرق تھا یا پھر اس کا فرانسیسی، جو انھیں حیران کن حد تک خوبصورت معلوم ہوئی، بولنے کا انداز تھا۔ تاہم اسے اسی روز دوسرے مشتبہ اشخاص کے ساتھ، جنھیں حراست میں لیا گیا تھا، بند کر دیا گیا کیونکہ اسے جس علیحدہ کمرے میں رکھا گیا تھا، وہ کسی افسر کے لیے درکار تھا۔

پیئر کے ساتھ جو روسی نظر بند کیے گئے تھے، ان سب کا تعلق انتہائی نچلے طبقے سے تھا۔ وہ سب بھانپ گئے کہ وہ اشراف میں سے ہے۔ یوں ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ پھٹکا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ وہ فرانسیسی بولتا تھا۔ پیئر جب انھیں اپنا مذاق اڑاتے سنتا، وہ غمگین ہو جاتا۔

اسی شام پیئر کو معلوم ہوا کہ تمام قیدیوں (جن میں لاریب وہ خود بھی شامل تھا) پر آتش زنی کے الزام میں مقدمہ چلے گا۔ تیسرے روز اسے دوسروں کے ہمراہ ایک اور عمارت میں لے جایا گیا۔ وہاں ایک فرانسیسی جرنیل بیٹھا تھا، جس کی سفید مونچھیں تھیں، دو کرنیلوں اور چند دیگر فرانسیسیوں کے ساتھ، جن کی آستینوں پر فیتے چسپاں تھے۔ دوسروں کی طرح پیئر سے بالکل صحیح انداز سے، جو رواجاً قیدیوں کے ساتھ تفتیش کے دوران میں اختیار کیا جاتا ہے، کرید کرید کر پوچھا گیا کہ وہ کون ہے، کہاں گیا تھا اور کس مقصد کے پیشِ نظر گیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔

اس پوچھ گچھ کے دوران میں معاملے کے اصل پہلو کو نظر انداز کر دیا گیا اور یوں اس اصل پہلو کے دریافت کیے جانے کے امکان کو دائمی طور پر خارج کر دیا گیا اور جس طرح مقدمے کی کارروائی کے دوران میں عموماً ہوتا ہے، سوالات پوچھنے کا واحد مقصد صرف ایک ایسا ذریعہ تلاش کرنا تھا جس کے ذریعے ججوں کی یہ خواہش تھی کہ وہ ملزموں کے جوابات کچھ اس انداز سے حاصل کریں جو مطلوبہ نتیجہ تک پہنچنے یعنی انھیں مجرم ٹھہرانے میں ممد و معاون ثابت ہو۔ جونہی پیئر کوئی ایسی بات کہنا شروع کرتا جو اس مقصد کے حصول کے لیے نامساعد ہوتی، اسے بولنے تو دیا جاتا لیکن اس کی بات پر کوئی دھیان نہ دیا جاتا اور یوں وہ جو کچھ کہتا، بالکل بیکار جاتا۔ مزید برآں پیئر کو وہی کچھ محسوس ہو رہا تھا جو ملزم مقدمے کے دوران میں ہمیشہ محسوس کرتا ہے ــ وہ اس الجھن میں گرفتار تھا کہ اس سے یہ سوالات

کیوں پوچھے جا رہے ہیں۔ اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ اس سے جس خاص انداز سے سوالات پوچھے جا رہے ہیں، اس سے وہ یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ اس کے ساتھ بڑی کرم فرمائی سے پیش آ رہے ہیں یا مروت برت رہے ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ ان لوگوں کے قبضہ وقدرت میں ہے، اسے بزور شمشیر یہاں لایا گیا ہے، محض زور شمشیر نے انھیں اس سے ان سوالات کے جوابات اگلوانے کا حق دیا ہے اور یہ کہ اس کارروائی کا واحد مقصد اسے مجرم ٹھہرانا ہے۔ چونکہ ان کے پاس اسے مجرم قرار دینے کا اختیار حاصل ہے اور ان کی خواہش بھی یہی ہے، چنانچہ مصلحت کے تحت پوچھ گچھ کرنے اور مقدمہ چلائے جانے کا جو ڈھونگ رچایا جا رہا ہے، وہ غیر ضروری ہے۔ صاف ظاہر تھا کہ جواب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو، نتیجہ سزا کی صورت میں ہی نکلے گا۔ جب پیئر سے دریافت کیا گیا کہ گرفتاری کے وقت وہ کیا کر رہا تھا، اس نے قدرے دردناک انداز سے جواب دیا کہ اس نے ایک بچی کو شعلوں سے بچایا تھا اور وہ اسے اس کے والدین کو لوٹانے کی سعی کر رہا تھا۔ اس نے لوٹ مار کرنے والے شخص کے ساتھ دھینگا مشتی کیوں کی تھی؟ پیئر کا جواب تھا کہ وہ ایک خاتون کی ''محافظت'' کر رہا تھا اور جس خاتون کی بے حرمتی کی جا رہی ہو، اس کی ''محافظت'' کرنا ہر مرد کا فرض ہے۔ اور یہ کہ... انھوں نے اسے ٹوک دیا کیونکہ (ان کے خیال کے مطابق) وہ موضوع سے ہٹ گیا تھا۔ وہ زیر آتش مکان کے، جہاں گواہوں نے اسے دیکھا تھا، کیا کر رہا تھا؟ اس نے جواب دیا کہ وہ یہ دیکھنے گیا تھا کہ ماسکو میں کیا ہو رہا ہے۔ انھوں نے دوبارہ اسے ٹوک دیا۔ انھوں نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں گیا تھا۔ سوال یہ تھا کہ وہ آگ کے قریب کیا کر رہا تھا؟ ''تم کون ہو؟'' انھوں نے پہلے سوال کا، جس کا اس نے جواب دینے سے انکار کر دیا تھا، اعادہ کرتے ہوئے دریافت کیا اور اس نے ایک بار پھر اپنا موقف دہرایا کہ وہ اس سوال کا جواب دینے سے قاصر ہے۔

''اسے ذہن میں رکھیں۔۔ اس کی یہ حرکت بڑی نامعقول ہے، سخت نامعقول۔'' سفید مونچھوں اور سرخ چہرے والے جرنیل نے کرختگی سے کہا۔

چوتھے روز زبووسکی فصیل کے قریب متعدد عمارتیں آگ کی لپیٹ میں آگئیں۔

پیئر اور تیرہ دیگر اشخاص کو کریمائی گھاٹ کے نزدیک ایک تاجر کے مکان کے بگھی خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ جب وہ گلی کوچوں میں سے گزر رہے تھے، دھوئیں کی وجہ سے، جو سارے شہر کو اپنی لپیٹ میں لیے معلوم ہوتا تھا، وجہ سے پیئر کے لیے سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ چاروں اطراف آگ کے مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ ماسکو کے اندر آتش ہو جانے کی کیا اہمیت تھی، وہ سمجھ نہ سکا۔ چنانچہ جب کہیں اسے آگ دکھائی دیتی، وہ دہشت سے مغلوب ہو جاتا۔

اس نے کریمائی گھاٹ کے قریب بگھی خانے میں مزید چار روز گزارے۔ اس دوران میں اسے فرانسیسی فوجیوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ جو لوگ وہاں نظر بند ہیں، وہ فیصلے کے منتظر ہیں اور مارشل یہ فیصلہ کسی بھی لمحے سنا سکتا ہے۔ یہ مارشل کون تھا، پیئر کو فوجیوں سے معلوم نہ ہو سکا۔ ان کے نزدیک وہ بظاہر کوئی عالی منصب اور پراسرار

با اختیار شخص تھا۔

آٹھ ستمبر سے قبل کے، جب قیدیوں کو دوبارہ پوچھ گچھ کے لیے لے جایا گیا، یہ ابتدائی ایام پیئر کے لیے سخت تریں تھے۔

10

آٹھ ستمبر کو بگھی خانے میں ایک افسر آیا۔ گارد اس کے ساتھ جس احترام سے پیش آئی، اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ کوئی خاصا بلند مرتبہ شخص ہے۔ اس شخص کے، جو غالباً سٹاف افسر تھا، ہاتھ میں فہرست تھی۔ وہاں جو روسی موجود تھے، وہ ان کے نام پکارنے لگا۔ جب پیئر کی باری آئی، تو اس نے کہا: "وہ شخص، جو اپنا نام نہیں بتاتا۔" اس نے تساہل اور بے توجہی سے قیدیوں پر نظر ڈالی اور گارڈ کے انچارج افسر کو حکم دیا کہ وہ انھیں مارشل کی خدمت میں پیش کرنے سے پہلے ان کی نہلائی دھلائی کرائے اور انھیں صاف ستھرے کپڑے پہنا دے۔

ایک گھنٹے بعد فوجیوں کا دستہ نمودار ہوا اور پیئر کو تیرہ دوسرے اشخاص کے ہمراہ دیویچی فیلڈ پہنچا دیا۔ اس روز بارش کے بعد مطلع صاف تھا، دھوپ نکلی ہوئی تھی اور فضا غیر معمولی طور پر نتھری نتھری تھی۔ دھوئیں کے بادل اس دن کی طرح، جب اسے زبوودسکی فصیل کے گارڈ ہاؤس سے منتقل کیا گیا تھا، نیچے نہیں جھکے ہوئے تھے بلکہ پرے بنا کر پاکیزہ فضا میں اوپر اٹھ رہے تھے۔ اب تند و تیز آگ کے شعلے نظر نہیں آ رہے تھے تاہم ہر سمت سے دھوئیں کے مرغولے جانب فلک بلند ہو رہے تھے۔ جہاں تک پیئر کی نظر کام کر سکتی تھی، سارا ماسکو وسیع و عریض بھسم شدہ کھنڈر دکھائی دے رہا تھا۔ محلوں کے محلے نیست و نابود ہو چکے تھے، صرف سٹوو، چمنیوں کی دیواریں یا پتھر کے مکانوں کی کالک شدہ دیواریں کھڑی تھیں۔

پیئر ٹکٹکی باندھے کھنڈرات دیکھتا رہا۔ جو محلے اس کے جانے پہچانے تھے، اب وہ اس سے پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ کہیں کہیں اسے وہ گرجے دکھائی دیے، جو آگ کی لپیٹ میں نہیں آئے تھے۔ کریملن کو بھی کوئی گزند نہیں پہنچا تھا اور اس کی سفید عمارتیں دور فاصلے پر اپنے میناروں اور (زار) ایوان اعظم کے گھنٹہ گھر سمیت "لشکارے" مار رہی تھیں قریب ہی نوو ودیویچی کانونٹ کا گنبد جگمگا رہا تھا اور اس کی گھنٹیوں کی مترنم آواز نے پیئر کو یاد دلایا کہ آج اتوار ہے اور کنواری مریمؑ کی عید میلاد کا دن۔ لیکن اس تہوار کو منانے والوں کا دور دور تک کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر طرف سوختہ کھنڈرات تھے اور چند ایک روسی، جو انھیں راستے میں دکھائی دیے، آشفتہ حال اور خوف زدہ لوگ تھے۔ وہ جونہی فرانسیسیوں کو دیکھتے، فوراً روپوش ہونے کی کوشش کرتے۔

اس میں کوئی کلام نہیں کہ روسی نشیمن تاراج اور تباہ و برباد ہو چکا تھا، لیکن پیئر کو غیر شعوری طور پر محسوس ہو رہا تھا کہ روسی نظم کی جگہ بالکل مختلف اور بے لوچ فرانسیسی نظم قائم ہو چکا ہے۔ اسے اس کا احساس ان فوجیوں کی شکلیں دیکھ کر ہوا، جو باقاعدہ صفیں بنائے اسے اور دوسرے مجرموں کو اپنی حفاظت میں لیے شادمانی اور مستعدی سے قدم

اٹھاتے چل رہے تھے۔ اسے اس کا اندازہ اس بلند مرتبہ فرانسیسی افسر کو دیکھ کر ہوا، جو دو گھوڑوں والی گاڑی میں طنطنے سے بیٹھا تھا۔ (اس کی گاڑی ایک فوجی ہانک رہا تھا اور یہ انھیں راستے میں ملی تھی۔) اسے یہ جمغفل موسیقی کی شگفتہ دھنوں سے، جو کھیت کی بائیں جانب سے ہوا کے دوش پر ان کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، سن کر محسوس ہوا۔ اور اسے اس کی تفہیم خاص طور پر قیدیوں کی اس فہرست سے ہوئی تھی جو اس فرانسیسی افسر نے، جو اس صبح نمودار ہوا تھا، پڑھ کر سنائی تھی۔ پیئر کی گرفتاری فوجیوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی، پھر اسے درجنوں دوسرے اشخاص کے ہمراہ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کیا گیا تھا اور اسے کچھ یوں لگا تھا جیسے شاید وہ اسے بھول چکے ہیں یا انھوں نے اس کی شناخت کسی اور شخص کے ساتھ گڈمڈ کر دی ہے۔ لیکن نہیں، ایسا نہیں تھا۔ اس نے پوچھ گچھ کے دوران میں جو جوابات دیے تھے، وہ گھوم گھما کر اس توصیفی جملے کی صورت میں واپس آ گئے تھے: ''وہ شخص جو اپنا نام نہیں بتاتا۔'' اور وہ اسے اسی تسمیہ کے ساتھ، جو اسے اتنا بھیانک معلوم ہوتا تھا، کہیں اور لے جا رہے تھے۔ ان کے چہروں سے بلا کی خود اعتمادی جھلک رہی تھی کہ پیئر اور دوسرے قیدی بالکل وہی لوگ ہیں، جو انھیں مطلوب ہیں اور یہ کہ وہ انھیں صحیح مقام کی طرف لے جا رہے ہیں۔ پیئر کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی حقیر اور بے وقعت کھپاچ ہے جو کسی مشین کے پہیوں کے بیچ میں گر پڑی ہے۔ اسے اس مشین کی ساخت کے بارے میں تو کچھ پتا نہیں تھا لیکن وہ ضرور جانتا تھا کہ وہ بالکل صحیح طریقے سے کام کر رہی ہے۔

اسے اور دیگر مجرموں کو دیویچی فیلڈ کے دائیں جانب خاصے بڑے مکان میں لے جایا گیا، جس کے ساتھ وسیع و عریض باغیچہ ملحق تھا اور جو کانونٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔ یہ پرنس شیر باتوف کا مکان تھا۔ یہاں وہ اکثر بطور مہمان آیا کرتا تھا۔ اسے فوجیوں کی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ اب اس پر ''ڈیوک آف ایک موہل، مارشل داوُد[13] قابض ہے۔''

انھیں دروازے پر پہنچا دیا گیا اور ایک ایک کر کے اندر لے جایا گیا۔ جو لوگ اندر گئے، ان میں پیئر چھٹا تھا۔ اسے ڈیوڑھی، شیشہ راہداری اور پیش دالان میں سے گزارا گیا۔ یہ سب اس کے جانے پہچانے تھے۔ بالآخر وہ سٹڈی روم میں، جو خاصا طویل اور جس کی چھت قدرے نیچی تھی، پہنچ گئے۔ دروازے کے باہر ایک ایجوٹنٹ کھڑا تھا۔

کمرے کے بالکل آخری سرے پر داوُد بیٹھا تھا۔ اس کی ناک پر چشمہ تھا اور وہ میز کے اوپر جھکا ہوا تھا۔ پیئر چلتے چلتے اس کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ داوُد بظاہر کسی دستاویز کا، جو اس کے سامنے میز پر پڑی تھی، مطالعہ کر رہا تھا۔ اس نے نگاہیں اوپر اٹھائے بغیر مدھم آواز میں پوچھا:

''کون ہو تم؟''

پیئر خاموش رہا کیونکہ وہ ایک لفظ بھی ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ اس کے نزدیک داوُد محض فرانسیسی جرنیل نہیں تھا بلکہ ایک ایسا شخص تھا جو اپنی سفاکی کے سبب بدنام تھا۔ اس کے جذبات سے عاری چہرے کو۔ داوُد کسی سخت گیر سکول ماسٹر کی طرح بیٹھا تھا۔ وہ کچھ عرصہ صبر و تحمل سے بیٹھنے اور جواب کا انتظار کرنے کے آمادہ تھا۔ دیکھتے ہوئے پیئر کو محسوس ہوا کہ ایک سیکنڈ کی تاخیر اس کے لیے مہلک ثابت ہو سکتی ہے، لیکن اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ کیا

کیا۔ اس نے اولین تفتیش کے دوران میں جو کچھ کہا تھا، وہ اسے دہرانے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہ کر سکا لیکن اپنے مقام اور مرتبے کا انکشاف کرنا خطرناک بھی تھا اور سبکی آمیز بھی۔ وہ مہر بلب کھڑا رہا۔ لیکن پیشتر اس کے کہ وہ کسی نتیجے پر پہنچتا، داؤو نے اپنا سر اوپر اٹھایا، چشمہ پیشانی پر دھکیلا اور اپنی آنکھیں ٹیڑھی کرتا اسے دیکھنے لگا۔

''میں اس شخص کو جانتا ہوں،'' اس نے سرد مہر اور سوچے سمجھے لہجے میں کہا۔ نظر آتا تھا کہ اس کا مقصد پیئر کو مرعوب کرنا ہے۔

پیئر کی کمر پر جو کپکپی طاری تھی، اب اس نے اس کے سر کو شکنجے کی طرح کس لیا۔

''جرنیل، آپ مجھے نہیں جان سکتے، میری آپ سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

''یہ روسی جاسوس ہے،'' داؤو نے ایک اور جرنیل سے، جسے پیئر نے دیکھا نہیں تھا، مخاطب ہو کر پیئر کو ٹوک دیا۔

داؤو نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ غیر متوقع طور پر اپنی آواز میں کھنک پیدا کرتے پیئر تیز تیز بولنے لگا:

'non,"monseigneur" اسے ایکا ایکی یاد آ گیا تھا کہ داؤو ڈیوک ہے۔ "non, monseigneur,"* آپ مجھے نہیں جان سکتے۔ میں ملیشیا کا افسر ہوں اور ماسکو سے باہر نہیں گیا۔''

''تمھارا نام؟'' داؤو نے دہرایا۔

''بزوخوف۔''

''میرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تم جھوٹ نہیں بول رہے۔''

''موسیو!'' پیئر نے چلا کر کہا۔ پیئر کا لہجہ ملتجیانہ تھا، غصیلا نہیں۔

داؤو نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور اسے متجسسانہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ دونوں کئی سیکنڈ ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کرتے رہے اور انھی نگاہوں نے پیئر کی جان بچا دی۔ جنگ اور عدالتی کرے کے حالات کے قطع نظر نظروں کے اس تبادلے نے دونوں آدمیوں کے مابین انسانی روابط استوار کر دیے۔ اس وقت ان دونوں کو مبہم طور پر لاتعداد اشیا کا ادراک ہوا اور انھیں احساس ہوا کہ وہ دونوں آدم کی اولاد ہیں اور بھائی ہیں۔

جب داؤو نے، کاغذات سے، جن پر انسانوں کی زندگیوں اور ان کے معاملات کی بصورتِ اعداد صراحت کی گئی تھی، نگاہیں اوپر اٹھائیں، اسے پہلی نظر میں پیئر محض ایک اور کیس معلوم ہوا اور اس نے ضمیر کی خلش محسوس کیے بغیر اسے گولی سے اڑائے جانے کا حکم سنا دیا ہوتا لیکن اب اسے وہ انسان دکھائی دیا۔ اس نے لحظہ بھر کے لیے سوچا۔

''تم یہ کیسے ثابت کر سکتے ہو کہ تم سچ بول رہے ہو؟'' داؤو نے سرد مہری سے پوچھا۔

پیئر کو غام بال یاد آیا۔ اس نے اس کا نام، رجمنٹ، سڑک اور وہ مکان بتایا جہاں وہ مل سکتا تھا۔

''تم جو کہتے ہو، وہ ہو نہیں۔'' داؤو مصر رہا۔

کانپتی، لڑکھڑاتی آواز میں پیئر اپنے بیانات کی صحت کے ثبوت پیش کرنے لگا۔

---

* نہیں، موسیو

لیکن اس لمحے ایک ایجوٹنٹ اندر آیا اور اس نے داوُو کے کان میں کچھ کہا۔

ایجوٹنٹ جو خبر لایا تھا، داوُو اچانک اس پر کھل اٹھا اور اپنی وردی کے بٹن کھولنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ پیئر کو بالکل بھول گیا ہے۔

جب ایجوٹنٹ نے اسے قیدی کے بارے میں یاد دہانی کرائی، اس کی تیوری پر بل پڑ گئے۔ اس نے پیئر کی جانب گردن گھمائی اور سر کے اشارے سے کہا کہ وہ اسے باہر لے جائیں۔ لیکن وہ اسے کہاں لے جائیں گے، یہ پیئر کو معلوم نہیں تھا۔ کیا وہ اسے بگھی خانے لے جائیں گے یا مقتل، جس کی طرف اس کے ساتھیوں نے، جب وہ دیوپچی فیلڈ عبور کر رہے تھے، اشارہ کر کے بتایا تھا؟

اس نے اپنی گردن گھمائی اور دیکھا کہ ایجوٹنٹ ایک اور سوال پوچھ رہا ہے۔

''ہاں، بالکل!'' داوُو نے کہا۔

''لیکن اس ''ہاں'' کا کیا مطلب تھا، پیئر کو معلوم نہیں تھا۔

پیئر کو کچھ یاد نہ رہا کہ اس کے بعد وہ کہاں گیا تھا، کیسے گیا تھا، راستہ طویل تھا یا مختصر۔ اس کے حواس مختل ہو چکے تھے اور اس پر بوکھلاہٹ طاری تھی۔ اسے اپنے گرد و پیش کچھ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ بس دوسروں کی طرح اس کی ٹانگیں متحرک تھیں اور جب وہ رکتے، وہ بھی رک جاتا۔

اس سارے عرصے کے دوران میں اس کے ذہن پر بس ایک ہی خیال سوار رہا۔ کون۔ کون تھا وہ، جس نے فی الحقیقت اسے سزائے موت دی تھی؟ یہ اس کمشن کے، جنھوں نے اس سے اولین پوچھ گچھ کی تھی، ارکان تو نہیں ہو سکتے تھے — ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے اس خواہش کا اظہار کیا ہو اور غالباً ان کے ایسا کرنے کا امکان بھی نہیں تھا۔ یہ داوُو بھی نہیں تھا۔ اس نے تو اسے ایسے انسانی انداز سے دیکھا تھا! اگر ایک آدھ ساعت اور گزر جاتی، ممکن ہے کہ داوُو کو یہ احساس ہو جاتا کہ وہ غلطی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ لیکن عین اسی دم ایجوٹنٹ آن وارد ہوا اور اس نے دخل در معقولات کر دی۔ اور بظاہر ایجوٹنٹ کے عزائم برے نہیں تھے حالانکہ وہ اندر آنے سے احتراز کر سکتا تھا۔ پھر اسے کون سوئے دار لے جا رہا، اسے ہلاک کر رہا اور اس کی، پیئر کی، اس کی تمام یادوں، امنگوں، امیدوں اور خیالوں سمیت، زندگی کے درپے ہو رہا ہے؟ یہ کون کر رہا ہے؟ پیئر کو محسوس ہوا کہ کوئی بھی شخص یہ کام نہیں کر رہا۔

اس کا ذمے دار نظام — باہمی طور پر پے در پے مربوط واقعات کا ظہور — ہے۔

یہ کسی نوع کا نظام ہے جو اسے — پیئر کو — موت کے گھاٹ اتار رہا ہے، اسے اس کی زندگی سے، ہر چیز سے، محروم کر رہا ہے، اسے نیست و نابود کر رہا ہے۔

11

قیدیوں کو شیر باتوف کے مکان سے سیدھا دیوپچی فیلڈ اور وہاں سے کانونٹ کے بائیں طرف کچن گارڈن لے جایا

گیا۔ وہاں وہ لاٹھ نصب تھی، جس کے ساتھ آدمی کو باندھ کر زندہ جلا دیا جاتا تھا یا اسے گولی مار دی جاتی تھی۔ لاٹھ سے پرے تازہ تازہ کھدا ہوا گڑھا تھا۔ اس کے قریب مٹی کا ڈھیر پڑا تھا اور لوگوں کا خاصا بڑا ہجوم نیم دائرہ بنائے کھڑا تھا۔ ہجوم میں روسی خال خال ہی تھے۔ یہ زیادہ تر نپولین کے فوجیوں پر مشتمل تھا، جو اس وقت ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ ان میں جرمنی، اطالوی، فرانسیسی بھی شامل تھے اور انھوں نے طرح طرح کی وردیاں پہنی ہوئی تھیں۔ لاٹھ کے دائیں بائیں فرانسیسی فوجیوں کی صفیں تھیں۔ انھوں نے نیلی وردیاں، جن کے شانوں پر فیتے چسپاں تھے، اونچے بوٹ اور شاکوٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔

مجرم فہرست کے مطابق قطار میں کھڑے تھے۔ (پیئر چھٹے نمبر پر تھا۔) انھیں لاٹھ کے قریب لایا گیا۔ اچانک ان کی دونوں جانب متعدد طبل بجنے لگے۔ ان کی آواز پر پیئر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی روح جزوی طور پر نوچ کھسوٹ لی گئی ہو۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے عاری ہو گیا۔ وہ صرف دیکھ اور سن سکتا تھا اور اس کی صرف ایک ہی خواہش باقی رہ گئی تھی — کہ یہ بھیانک چیز، جسے وقوع پذیر ہونا ہے، جلد از جلد وقوع پذیر ہو جائے۔ اس نے اپنے گردوپیش اپنے ساتھیوں پر نظر ڈالی اور ان کے چہروں کا بغور جائزہ لیا۔

قطار میں سب سے آگے دو سزا یافتہ قیدی کھڑے تھے۔ ان کے سر منڈے ہوئے تھے۔ ایک لمبوترا اور دبلا پتلا تھا۔ دوسرے کا رنگ سانولا، جسم گٹھیلا، بال موٹے اور لمبے اور ناک چپٹی تھی۔ نمبر 3 خانگی غلام تھا۔ اس کی عمر پینتالیس سال کے لگ بھگ، بال کھچڑی اور جسم بھاری بھرکم اور خوب پلا ہوا تھا۔ چوتھا کسان تھا۔ اس کی شکل وجیہ، داڑھی بھری بھری اور ہلکی زرد اور آنکھیں سیاہ تھیں۔ پانچواں مل مزدور تھا۔ وہ اٹھارہ سالہ لاغر نوخیز لڑکا تھا اور وہ ڈھیلے ڈھالے کوٹ میں ملبوس تھا۔

پیئر نے فرانسیسیوں کو آپس میں صلاح مشورے کرتے سنا کہ انھیں ایک ایک کر کے یا جوڑوں کی صورت میں گولی ماری جائے۔ ''جوڑے بنا کر'' سینئر افسر نے سرد مہر اور سپاٹ لہجے سے کہا۔ سپاہیوں کی صفوں میں ہلچل پیدا ہوئی۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ عجلت کا مظاہرہ کر رہے ہیں — اس طرح نہیں جس طرح جوان اس حکم کی، جو ان کی سمجھ میں آتا ہے، تعمیل کرنے میں شتابی دکھاتے ہیں، بلکہ اس طرح جس طرح وہ اس کام کو، جو ہوتا تو ضروری ہے لیکن وہ انھیں نہ سمجھ میں آتا ہے اور نہ پسند، نپٹانے میں جلد بازی کرتے ہیں۔

ایک فرانسیسی افسر، جس کے گلے میں سکارف تھا، قیدیوں کی قطار کے دائیں طرف آیا اور اس نے فرانسیسی اور روسی دونوں زبانوں میں سزا کا حکم پڑھ کر سنایا۔

فرانسیسی فوجیوں کے جوڑے مجرموں کے قریب آئے اور افسر کے حکم پر دو سزا یافتگان کو، جو قطار میں سب سے آگے تھے، پرے لے گئے۔ جب سزا یافتگان لاٹھ کے قریب پہنچے، وہ وہاں رک گئے۔ جب وہاں تھیلے لائے جا رہے تھے، وہ اپنے گردوپیش گم صم یوں دیکھ رہے تھے جیسے زخمی پرندہ قریب آتے شکاری کو دیکھتا ہے۔ ان میں سے ایک اپنے سینے پر بار بار صلیب کا نشان بناتا رہا، جب کہ دوسرا اپنی کمر کھرچتا اور اپنے ہونٹوں پر تبسم نما چیز پیدا

کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھرتی سے انگلیاں گھماتے فوجی ان کی آنکھوں پر پٹیاں باندھنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے ان کے سر تھیلوں میں لپیٹ دیے اور انھیں لاٹھ کے ساتھ باندھ دیا۔

ایک درجن ماہر نشانچی دستی بندوقیں اٹھائے پر اعتماد اور نپے تلے قدم اٹھاتے صفوں سے باہر آئے اور لاٹھ سے آٹھ قدم ادھر رک گئے۔ پیئر نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا تا کہ جو کچھ ہونے والا تھا، وہ اسے دیکھ نہ سکے۔ ایکا ایکی چٹاخ پٹاخ اور گھن گرج سنائی دی۔ اسے یہ آوازیں بجلی کی مہیب سے مہیب کڑک سے زیادہ پرشور محسوس ہوئیں۔ فضا میں دھواں تھا اور فرانسیسی فوجی، جن کے ہاتھوں میں رعشہ اور چہروں پر پیلاہٹ تھی، گڑھے کے نزدیک کچھ کر رہے تھے۔

دو اور قیدی آگے لے جائے گئے۔ ان کی نگاہیں بھی اسی طرح چپ چاپ اپنے تحفظ کے لیے اپیل کر رہی تھیں۔ انھوں نے ٹکٹکی باندھ کر تماشائیوں کی جانب دیکھا، لیکن بے سود۔ کیا ہونے والا تھا، بظاہر وہ نہ اسے سمجھ پا رہے تھے اور نہ انھیں اس کا یقین آ رہا تھا۔ انھیں اس کا اس لیے یقین نہیں آ سکتا تھا کیونکہ صرف وہی جانتے تھے کہ زندگی ان کے لیے کیا معانی رکھتی ہے۔ نتیجتاً نہ انھیں سمجھ آ رہا تھا اور نہ یقین کہ یہ ان سے کیوں چھینی جا رہی ہے۔

ایک بار پھر پیئر نے ادھر نہ دیکھنے کی کوشش کی اور اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ایک بار پھر زبردست دھماکے کی آواز فضا میں گونجی اور اسی لمحے اسے دھواں، خون اور فرانسیسیوں کے، جو لاٹھ کے قریب دوبارہ کچھ کر رہے تھے اور ان کے ہاتھ ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، زرد اور خوف زدہ چہرے نظر آئے۔ پیئر کی سانس دھونکنی کی طرح چل رہی تھی اور اس نے اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی جیسے وہ پوچھ رہا ہو ''اس کا کیا مطلب ہے؟'' یہی سوال ان تمام نگاہوں میں، جن سے اس کی نظریں ٹکرائیں، جھلک رہا تھا۔

تمام روسیوں، تمام فرانسیسی فوجیوں اور افسروں کے چہروں پر اسے بلا استثنا وہی تشویش، دہشت اور کشمکش نظر آئی جو اسے اپنے قلب میں محسوس ہو رہی تھی۔ ''لیکن جو کچھ یہاں ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے؟ جس اذیت میں میں مبتلا ہوں، اسی میں یہ ہیں۔ کون؟ کون؟'' کوندے کی طرح یہ خیال اس کے ذہن میں لپکا۔

''چھیاسویں یونٹ کے نشانچی۔ آگے آئیں!'' کسی نے چلا کر کہا۔

پانچواں قیدی، جو پیئر سے آگے تھا، اکیلا باہر لے جایا گیا۔ پیئر کو اندازہ نہ ہو سکا کہ اس کی جان بچ گئی ہے اور یہ کہ اسے اور دوسروں کو، جنھیں چھوڑ دیا گیا تھا، محض اس لیے وہاں لایا گیا تھا تا کہ وہ دوسروں کو گولی سے اڑائے جانے کا منظر دیکھ سکیں۔ جو کچھ اس کے سامنے ہوا، اس کی اس پر جو دہشت سوار ہوئی، اس میں ہر دم اضافہ ہوتا جا رہا تھا، مسرت اور تسکین کا احساس عنقا ہو چکا تھا۔ جو کچھ وہاں ہو رہا تھا وہ اسے بس ٹکٹکی باندھے دیکھے جا رہا تھا۔ پانچواں شخص، جس نے ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہنا ہوا تھا، کارخانے کا مزدور تھا۔ جونہی انھوں نے اس پر ہاتھ رکھے، وہ دہشت سے اچھل کر پیچھے ہٹ گیا اور پیئر کے ساتھ چمٹ گیا۔ (پیئر پر کپکپی طاری ہو گئی اور اس نے بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو اس سے چھڑایا۔) اس نوجوان سے چلا نہیں جاتا تھا۔ انھوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا اور گھسیٹنے

لگے۔ وہ چیخ چلا اور شور وغل کر رہا تھا۔ جب وہ اسے لاٹھ کے قریب لے گئے، وہ یک لخت خاموش ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی بات اچانک اس کی سمجھ میں آ گئی ہو۔ پتا نہیں اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا چیخنا چلانا لاحاصل ہے یا اسے یہ خیال آ گیا کہ وہ لوگ اسے ہلاک نہیں کر سکیں گے، بہر حال وہ لاٹھ کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور انتظار کرنے لگا کہ دوسروں کی طرح اس کی آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی جائے۔ وہ زخمی درندے کی طرح جگمگاتی آنکھوں سے اپنے گرد و پیش دیکھنے لگا۔

پیئر کے لیے اب دوسری طرف منہ پھیرنا اور اپنی آنکھیں میچنا ناممکن ہو گیا تھا۔ اس پانچویں قتل پر باقی ہجوم کی طرح اس کا تجسس اور ہیجان نقطۂ عروج تک پہنچ گیا۔ پہلے چار اشخاص کی مانند یہ نوجوان بھی پرسکون دکھائی دینے لگا۔ وہ اپنا ڈھیلا ڈھالا کوٹ اپنے جسم پر کسنے اور ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں سے کھرچنے لگا۔

جب وہ اس کی آنکھوں پر پٹی باندھنے لگے، اس نے خود ہی گرہ، جو اس کے سر کی پشت میں چبھ رہی تھی، درست کی۔ پھر جب انھوں نے اس کی پشت خون آلود لاٹھ کے ساتھ لگا کر اسے کھڑا کیا، اس نے پیچھے ٹیک لگا لی اور جب اسے یہ صورت کڈھب نظر آئی، اس نے اپنا جسم سیدھا کیا، اپنے پاؤں ایک دوسرے کے برابر ٹکائے اور آرام سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔ پیئر نے اپنی نظریں اس پر جمائے رکھیں اور وہ اس کی معمولی سے معمولی حرکت پر بھی دھیان دیتا رہا۔

حکم لازماً دیا گیا ہو گا، اس کے بعد آٹھ دستی بندوقوں کے چلنے کی آواز سنائی دی ہو گی، لیکن اس کے بعد پیئر خواہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرتا، اسے یاد نہ آ سکتا کہ اس نے گولی چلنے کی معمولی آواز بھی سنی تھی۔ اسے صرف یہ دکھائی دیا کہ کارخانے کا مزدور ان رسیوں پر، جنھوں اسے تھام رکھا تھا، ڈھلک گیا ہے، دو جگہوں سے خون کا فوارہ بہہ نکلا ہے، ڈھلکتے جسم کے بوجھ تلے رسیاں ٹوٹ گئی ہیں اور نوجوان شخص یوں گرنے لگا جیسے وہ گر نہ رہا ہو بلکہ بیٹھ رہا ہو۔ اس کا سر غیر فطری انداز سے ایک جانب جھک گیا اور اس کی ٹانگ اس کے جسم کے نیچے خمیدہ ہو گئی۔ پیئر لاٹھ کی جانب بھاگ پڑا۔ کسی نے اسے نہ روکا۔ مل مزدور کے ارد گرد زرد رو اور خوف زدہ لوگ کھڑے کچھ کر رہے تھے۔ داڑھی مونچھوں والے ایک ادھیڑ عمر فرانسیسی کا، جب وہ رسیاں کھول رہا تھا، نچلا جبڑا کپکپا رہا تھا۔ جسم نیچے ڈھیر ہو گیا۔ فوجیوں نے اسے عجلت اور بھونڈے انداز سے گھسیٹا اور گڑھے میں دھکیل دیا۔

ان سب کو واضح طور پر اور بلا شک و شبہ معلوم تھا کہ وہ مجرم ہیں، اس لیے انھیں اپنے جرائم کی نشانیاں جلد از جلد ڈھانپ دینا چاہئیں۔

پیئر نے گڑھے میں جھانکا اور دیکھا کہ مل مزدور گڑھے میں لیٹا ہوا ہے۔ اس کے گھٹنے اس کے سر کے ساتھ لگے ہوئے تھے اور اس کا ایک بازو دوسرے سے اونچا تھا، اور وہ بازو مسلسل پھڑک رہا تھا، کبھی اوپر اٹھ رہا اور کبھی نیچے گر رہا تھا۔ اس کے جسم پر بیلچوں سے مٹی ڈالنے کا کام پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ایک فوجی نے غصیلی اور اذیت زدہ آواز میں چلا کر پیئر سے کہا کہ وہ پیچھے چلا جائے، لیکن اس کی بات پیئر کی سمجھ میں نہ آئی۔ وہ لاٹھ کے قریب

منڈلاتا رہا اور کسی نے اسے وہاں سے نہ ہٹایا۔

جب گڑھا پر ہو گیا، حکم کی آواز گونجی۔ پیئر کو واپس اس کی جگہ لے جایا گیا اور فرانسیسی فوجی، جو لاٹھ کے دونوں اطراف کھڑے تھے، قدرے مڑے اور نپے تلے قدموں سے وہاں سے چل پڑے۔ چوبیس ماہر نشانچی، جو دائرے کے درمیان میں کھڑے تھے، جب ان کی کمپنیاں ان کے برابر سے گزرنے لگیں، اپنی بندوقیں، جو خالی ہو چکی تھیں، تھامے دوڑنے لگے اور اپنی اپنی جگہوں پر واپس چلے گئے۔

پیئر مبہوت نگاہوں سے ان ماہر نشانچیوں کو دیکھتا رہا، جو دائرے سے جوڑوں کی صورت میں بھاگے تھے۔ ایک کے سوا سبھی دوبارہ اپنی اپنی کمپنی میں شامل ہو گئے تھے۔ ایک نوجوان سپاہی، جس کا رنگ بالکل فق ہو چکا تھا، شاکو ٹوپی پیچھے ڈھلک چکی تھی اور بندوق زمین پر پڑی تھی، اب بھی گڑھے کے قریب اسی جگہ کھڑا تھا، جہاں سے اس نے گولی چلائی تھی۔ وہ اس شخص کی طرح، جو نشے سے چور ہو، ڈگمگایا اور اپنے آپ کو گرنے سے بچانے کے لیے چند قدم آگے بڑھا اور پھر پیچھے ہٹا۔ ایک معمر نان کمشنڈ افسر صفوں سے باہر بھاگا، اس نے اسے کلائی سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا واپس اپنی کمپنی میں لے گیا۔ روسیوں اور فرانسیسیوں کا ہجوم چھٹنے لگا۔ سب خاموش سر جھکائے واپس جا رہے تھے۔

''آگ لگانے کا کیا انجام ہوتا ہے، وہ انھوں نے دیکھ لیا ہے۔ اب وہ عبرت پکڑیں گے۔'' ایک فرانسیسی نے تبصرہ کیا۔

پیئر نے نگاہ گھما کر متکلم کی جانب دیکھا۔ وہ کوئی فوجی جوان تھا اور جو کچھ کیا گیا تھا، اس سے پنڈ چھڑانے کے لیے تسکین کا کوئی ذریعہ ڈھونڈنے کی کوشش کر رہا تھا، لیکن جو بات اس نے شروع کی تھی، اسے ختم کیے بغیر اس نے مایوسی کے عالم میں بازو لہرایا اور اپنی راہ چل پڑا۔

12

سزائے موت کی تکمیل کے بعد پیئر کو دوسرے قیدیوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور اسے تنہا ایک تنگ، ویران اور غلیظ گرجے میں محبوس کر دیا گیا۔

دن ڈھلے پہرے پر مامور نان کمشنڈ افسر دو سپاہیوں کی معیت میں اندر آیا اور اس نے اسے بتایا کہ اسے معافی دے دی گئی ہے اور اب اسے جنگی قیدیوں کی بارک میں پہنچا دیا جائے گا۔ پیغام سمجھے بغیر پیئر اپنی جگہ سے اٹھا اور فوجیوں کے ساتھ چل پڑا۔ وہ اسے کھلے میدان کی بالائی جانب لے گئے۔ وہاں جھلسے ہوئے شہتیروں، لٹھوں اور کڑیوں کو یوں توں جوڑ جاڑ کر چند سائبان کھڑے کر دیے گئے تھے۔ وہ اسے ایک سائبان کے اندر لے گئے۔ تاریکی میں لگ بھگ بیس آدمی پیئر کے ارد گرد جمع ہو گئے۔ وہ یہ سمجھے بغیر کہ وہ کون ہیں، وہاں کیوں ہیں یا اس سے کیا چاہتے ہیں، ہونقوں کی طرح انھیں تکنے لگا۔ ان کے الفاظ اسے ضرور سنائی دے رہے تھے لیکن وہ ان کا

مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔ اس کے لیے ان کے نہ کوئی معانی تھے اور نہ ان کا اس سے کوئی تعلق۔ وہ اس سے جو سوالات پوچھتے تھے، وہ ان کے جوابات تو دے دیتا تھا لیکن اسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ ان جوابات کو کون لوگ سن رہے ہیں یا وہ ان کے کیا مطالب اخذ کر رہے ہیں۔ وہ ان کے چہروں اور شکلوں کو دیکھتا اور وہ اسے یکساں انداز سے بے معنی دکھائی دیتے۔

پیئر نے جب سے انسانوں کو ان انسانوں کے ہاتھوں، جنھیں یہ کام کرنے کا کوئی شوق نہیں تھا، قتل ہونے کا مہیب منظر دیکھا تھا، اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی روح کا مین سپرنگ (بڑی کمانی)، جس پر ہر چیز کا انحصار تھا اور جو ہر چیز یوں بنا کر پیش کرتا تھا جیسے وہ جیتی جاگتی ہو، اچانک ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا ہو اور بے سود ملبے کا ڈھیر بن گیا ہو۔ اگر چہ خود اسے اس کی آگہی نہیں تھی، لیکن کائنات کی صحیح نظم و ترتیب، انسانیت، اپنی روح اور خدا پر اس کا ایمان، سبھی کچھ غارت ہو چکا تھا۔ وہ اس طرح کی ذہنی کیفیت میں پہلے بھی گزرتا رہا تھا لیکن اتنی شدت کے ساتھ کبھی نہیں۔ ماضی میں جب کبھی اس نوع کے شکوک و شبہات اس کے ذہن پر حملہ آور ہوتے تھے تو ان کا سبب اس کی اپنی غلطیاں اور حماقتیں ہوتی تھیں اور اسے محسوس ہوا کرتا تھا کہ وہ ان شکوک اور مایوسیوں کا درماں اپنی ذات میں تلاش کر سکتا ہے۔ تاہم اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ خود اس سے کوئی خطا سرزد نہیں ہوئی، پھر بھی دنیا اس کی نظروں کے سامنے مسمار ہو گئی ہے اور صرف بے معنی کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ زندگی پر اسے جو ایقان تھا، اس کی بازیابی اب اس کے بس میں نہیں رہی۔

تاریکی میں آدمی اس کے اردگرد کھڑے تھے۔ غالباً اس میں کوئی بات تھی جس میں انھیں دلچسپی تھی۔ وہ اسے کچھ بتا رہے تھے، اس سے کچھ پوچھ رہے تھے، پھر وہ اسے کہیں لے گئے اور آخر کار اسے معلوم ہوا کہ وہ سائبان کے کونے میں پہنچ گیا ہے۔ یہاں وہ لوگوں میں محصور تھا۔ وہ ہنس رہے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''اور چنانچہ، میرے دوستو... خود پرنس جو...'' سائبان کے دوسرے کونے میں کوئی شخص کہہ رہا تھا اور وہ لفظ جو پر خاص زور دے رہا تھا۔

دیوار کے قریب پرالی کے ڈھیر پر ساکت و خاموش بیٹھے پیئر اپنی آنکھیں کبھی کھولتا اور کبھی بند کرتا۔ لیکن وہ جونہی انھیں بند کرتا، ہل مزدور کا بھیانک چہرہ۔۔۔ چونکہ اس چہرے پر سادگی ٹپک رہی تھی، اس لیے یہ اور بھی مہیب معلوم ہو رہا تھا۔۔۔ اور متامل قاتلوں کی صورتیں، جو داخلی اضطراب کی بنا پر اور بھی ڈراؤنی ہو گئی تھیں، اس کے سامنے تیرنے لگتیں۔ وہ جھٹ پٹ اپنی آنکھیں کھول دیتا اور خالی خالی انداز سے اپنے گردو پیش اندھیرے میں گھورنے لگتا۔

اس کے قریب ایک پست قامت شخص خمیدہ شکل بنائے بیٹھا تھا۔ اسے اس کی موجودگی کا احساس پسینے کی شدید بو سے ہوا۔ وہ جب حرکت کرتا، یہ اس کے جسم سے خارج ہونے لگتی۔ یہ آدمی تاریکی میں اپنی ٹانگوں کے ساتھ کچھ کر رہا تھا اور اگر چہ پیئر کو اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا، اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مسلسل اچٹتی نگاہوں سے

اسے دیکھ رہا ہے۔ جب پیئر کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوگئیں، اس نے دیکھا کہ یہ شخص اپنی ٹانگوں سے پٹیاں اتار رہا ہے اور وہ جس طریقے سے یہ کام کر رہا تھا، اس سے پیئر کو اس میں دلچسپی پیدا ہوگئی۔

ڈوری کھولنے کے بعد، جس سے ٹانگ کے اردگرد پٹی بندھی ہوئی تھی، اس نے احتیاط سے اس کا گولہ بنایا اور پیئر پر اچنتی نظر ڈالنے کے بعد دوسری ٹانگ پر کام کرنے میں جت گیا۔ ابھی اس کا ایک ہاتھ پہلی ڈوری اوپر اٹھائے ہوئے تھا کہ اس کا دوسرا ہاتھ دوسری ٹانگ کے اردگرد بندھی ڈوری کھولنے میں مصروف ہوگیا۔ اس طرح اس نے تیز، پھرتیلی اور چکردار حرکات سے، جن میں کوئی وقفہ نہیں آتا تھا، ٹانگ کی تمام پٹیاں اتار دیں اور انھیں اپنے سر کے اوپر دیوار میں نصب کھونٹیوں پر ٹانگ دیا۔ پھر اس نے چاقو نکالا، اس سے کچھ کاٹا، چاقو بند کیا، اسے سرہانے کے نیچے رکھا، آرام سے اپنے بازو، اپنے گھٹنوں کے گرد حمائل کیے، جو اوپر اٹھے ہوئے تھے اور ٹکٹکی باندھ کر سیدھا پیئر کو دیکھنے لگا۔ پیئر کو اس شخص کی پھرتیلی اور چکردار حرکات، اپنے کونے میں باترتیب اور باسلیقہ انتظامات، بلکہ اس کی بو میں بھی کسی خوشگوار، فرحت بخش اور کامل شے کا احساس ہونے لگا اور وہ اس پر سے اپنی نگاہیں نہ اٹھا سکا۔

''حضور، آپ کو بڑے مصائب جھیلنا پڑے ہیں، درست؟'' یک لخت پست قامت شخص نے دریافت کیا۔

اس سپاٹ لہجے میں اتنی سادگی اور ترحم تھا کہ گو پیئر نے جواب دینا چاہا لیکن اس کا جبڑا کانپنے اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ پست قامت شخص نے پیئر کو اتنا موقع ہی نہ دیا کہ وہ اپنی پراگندہ خیالی کا مظاہرہ کر سکتا بلکہ جھٹ پٹ اسی خوشگوار لہجے میں مزید کہنے لگا:

''دوست، کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔'' اس نے نرم اور شفقت آمیز لہجے میں کہا جس میں بوڑھی کسان عورتیں باتیں کرتی ہیں۔ ''دوست کڑھنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ دکھ تکلیف گھڑی دو گھڑی رہتے ہیں لیکن زندگی تاابد جاری رہتی ہے۔ مائی ڈیئر، یونہی سلسلہ چلتا رہتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری یہاں خوب نبھ رہی ہے۔ ویسے ان لوگوں میں اچھے بھی ہیں اور برے بھی۔'' اس نے کہا اور پھرتی سے گھٹنوں کے بل مڑا، اٹھا اور سائبان کی دوسری جانب چل پڑا۔

''آہاہا! لفنگی، تو پھر واپس آ گئی؟'' پیئر کو وہی آواز سائبان کے دوسرے سرے سے آتی سنائی دی۔ ''بدذات، تو تُو آ گئی ہے! تو میں تجھے یاد ہوں! ہونہہ! اچھا، اچھا! کافی ہوگیا ہے، اب جانے دو۔'' اور فوجی سپاہی ایک چھوٹی سی کتیا کو، جو اس پر اچھل رہی تھی، پرے دھکیلتے ہوئے اپنی جگہ واپس آ گیا اور بیٹھ گیا۔ وہ چیتھڑے میں لپٹی کوئی چیز ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھا۔

''محترم، انھیں ذرا چکھ کر دیکھیں۔'' اس نے مؤدبانہ لہجہ، جو اس نے شروع میں استعمال کیا تھا، دوبارہ اختیار کرتے ہوئے کہا اور چیتھڑا کھولتے ہوئے پیئر کو چند بھنے ہوئے آلو تھما دیے۔ ''ڈنر میں ہمیں سوپ ملا تھا لیکن ان آلوؤں کا جواب نہیں!''

پیئر نے دن بھر کچھ نہیں کھایا تھا اور آلوؤں کی خوشبو اسے انتہائی خوشگوار محسوس ہوئی۔ اس نے سپاہی کا شکریہ

ادا کیا اور انھیں کھانے لگا۔

''آپ انھیں اس طرح کیوں کھا رہے ہیں؟'' سپاہی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''انھیں یوں کھائیں۔''

اس نے آلو پکڑا، اپنا کھٹکے دار شکاری چاقو کھولا، ہتھیلی پر آلو رکھ کر دو مساوی ٹکڑوں میں کاٹا، چیتھڑے سے کچھ نمک ان پر چھڑکا اور انھیں پیئر کو تھما دیا۔

''آلو لاجواب ہیں!'' اس نے اپنی بات دہرائی۔ ''آپ انھیں اس طرح کھانے کی کوشش کریں۔''

پیئر نے سوچا کہ اس نے ایسی لذیذ چیز پہلے کبھی نہیں کھائی تھی۔

''اوہ، میں ٹھیک ٹھاک ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''لیکن انھوں نے ان بے چاروں کو کیوں گولی ماردی؟ آخری کی عمر بمشکل بیس سال ہوگی۔''

''ٹٹ، ٹٹ، کتنا بڑا گناہ، کتنا بڑا گناہ!'' پست قد آدمی عجلت سے یوں کہا جیسے الفاظ سدا اس کے منہ میں تیار رہتے ہوں اور انکل پچوز قند لگا کر باہر نکل آتے ہوں۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی: ''اور یہ آپ ماسکو میں کیوں ٹھہرے رہے؟''

''میرا خیال تھا کہ وہ اتنی جلدی نہیں آسکیں گے۔ میں محض اتفاقاً ٹھہرا رہا۔'' پیئر نے کہا۔

''بھائی جان، آپ ان کے ہتھے کیسے چڑھ گئے؟ انھوں نے آپ کو اپنے گھر سے پکڑا تھا؟''

''نہیں، میں آگ کا منظر دیکھنے باہر نکلا تھا۔ انھوں نے وہیں سے مجھے پکڑلیا، اپنے ساتھ لے گئے اور مجھ پر آتش زنی کے الزام میں مقدمہ کھڑا کر دیا۔''

''جب (عدالتوں میں) فیصلے ہوتے ہیں، ناانصافی بھی ہوجاتی ہے۔'' چھوٹے آدمی نے خیال آرائی کی۔

''اور آپ یہاں کافی دنوں سے ہیں؟'' پیئر نے آخری آلو چباتے ہوئے کہا۔

''میں؟ انھوں نے مجھے پچھلے اتوار پکڑا تھا۔ وہ مجھے ماسکو کے ایک ہسپتال سے لائے تھے۔''

''آپ فوجی ہیں؟''

''ہم آپشیران رجمنٹ کے سپاہی ہیں۔ میں بخار سے پھنک رہا تھا۔ انھوں نے کبھی ہمیں کچھ نہیں بتایا۔ ہم وہاں لگ بھگ بیس تھے۔ ہمارے ذہن وگمان میں بھی نہیں آیا تھا۔ ہم نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا....''

''جب آپ اپنے آپ کو یہاں دیکھتے ہیں، آپ کو اذیت محسوس ہوتی ہے؟''

''بالکل، مائی ڈیئر، بالکل۔ میرا نام پلاطون ہے اور خاندانی نام کاراتائیف۔'' اس نے مزید کہا۔ بظاہر وہ پیئر کے لیے آسانی فراہم کرنا چاہتا تھا کہ اسے اس سے مخاطب ہونے میں کوئی دقت نہ پیش آئے۔ ''رجمنٹ کے آدمی مجھے ''شکرہ'' کہتے ہیں۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ تکلیف محسوس نہ کریں؟ ماسکو۔ شہروں کی ماں ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ یہ سب کچھ دیکھیں بھی اور غمگین بھی نہ ہوں؟ کیڑا گوبھی کا پھول آہستہ آہستہ کترتا رہتا ہے لیکن اپنا کام مکمل کرنے سے پہلے فنا ہوجاتا ہے۔ ہمارے بزرگ ہمیں یہی بتایا کرتے تھے۔'' اس نے بالعجیل اپنی بات میں

اضافہ کیا۔

''کیا؟ کیا کہا آپ نے؟'' پیئر نے پوچھا۔

''کس نے؟ میں نے؟ میں کہتا ہوں: نادر چہ خیالیم فلک در چہ خیال۔'' کاراتائیف نے جواب دیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے دوبارہ وہی دہرا دیا ہے جو وہ اس سے پہلے کہہ چکا تھا اور چشم زدن میں مزید کہنے لگا: ''حضور، آپ کے باپ دادا کی کوئی جاگیر ہے؟ اپنا کوئی مکان؟ آپ لازماً خوش نصیب انسان ہوں گے! گھر میں بیوی ہوگی؟ اور آپ کے بوڑھے ماں باپ زندہ ہوں گے؟'' اس نے دریافت کیا۔

اگرچہ وہاں تاریکی اتنی زیادہ تھی کہ پیئر کے لیے کچھ دیکھنا مشکل تھا لیکن اسے محسوس ہوا کہ بوڑھا سپاہی جب یہ سوالات پوچھ رہا تھا، دھیمی دھیمی، شفیق مسکراہٹ سے اس کے ہونٹ سکڑ گئے ہوں گے۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس بات کا دکھ ہو رہا ہے کہ پیئر والدین، خاص طور پر ماں، کی شفقت سے محروم ہے۔

''صلاح مشورے کے لیے شریک حیات، پرتپاک خیر مقدم کے لیے خوشدامن، لیکن آدمی کی اپنی ماں سے بڑھ کر کوئی ہستی پیاری نہیں ہوتی۔'' اس نے کہا۔ ''خیر، کوئی بچے وچے؟'' وہ اپنی کہتا چلا گیا۔

پیئر نے ایک بار پھر جب منفی جواب دیا، یوں لگا کہ اسے سخت دکھ ہوا ہے اور اس نے جھٹ پٹ کہا۔

''خیر، فکر نہ کریں۔ آپ ابھی جوان ہیں۔ خداوند نے چاہا تو بچے بھی ہو جائیں گے۔ صرف صلح صفائی سے رہیں...''

''لیکن اب تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' پیئر کہے بغیر نہ رہ سکا۔

''اف، میرے بھائی، کوئی نہیں جانتا کہ مقدر میں کیا لکھا ہے،'' پلاطون نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ ''بھکاری کی گدڑی یا جیل کی عقوبتیں۔''

وہ پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا اور کھنکار کر گلا صاف کرنے لگا۔ معلوم ہوتا تھا کہ لمبی داستان سنانے کی فکر میں ہے۔

''خیر، پیارے دوست، بات کچھ یوں تھی۔ میں ابھی اپنے گھر میں رہتا تھا۔'' اس نے ابتدا کی۔ ''ہمارا کھاتا پیتا گھرانا تھا۔ خدا کا دیا سب کچھ تھا۔ زمین کافی تھی۔ کسانوں کی حالت اچھی تھی۔ ہمارا گھر ایسا تھا کہ خدا کا شکر ادا کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ جب ہم فصل کی کٹائی کرنے جاتے، ہم ابا سمیت سات ہوتے۔ ہم اصلی کسان تھے۔ پھر ایک روز...''

اور پلاطون کاراتائیف طول طویل کہانی سنانے لگا کہ کس طرح ایک روز وہ سوختنی لکڑی کے حصول کے لیے کسی دوسرے شخص کے ذخیرے میں چلا گیا، کس طرح رکھوالے کے ہتھے چڑھا، کس طرح اس کی کوڑوں سے پٹائی ہوئی، اس پر مقدمہ چلا اور اسے فوج میں خدمات سرانجام دینے پر بھیج دیا گیا۔

''خیر، میرے بھائی!'' اور مسکراہٹ سے اس کا لہجہ تبدیل ہو گیا۔ ''ہمارا خیال تھا کہ ہم پر افتاد آ پڑی ہے لیکن اصلاً یہ رحمت ثابت ہوئی۔ اگر مجھ سے یہ گناہ سرزد نہ ہوا ہوتا تو فوج میں میرے بھائی کو جانا پڑتا۔ اور آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میرا یہ بھائی مجھ سے چھوٹا ہے اور پانچ بچوں کا باپ ہے۔ میرا کیا ہے، میں نے تو صرف بیوی

پیچھے چھوڑی ہے۔ میری ایک ننھی منی بیٹی تھی لیکن میرے فوج میں آنے سے پہلے ہی وہ خدا کو پیاری ہو چکی تھی۔ میں ایک مرتبہ چھٹی پر گھر گیا اور آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ خوشحالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ باڑا مویشیوں سے بھرا ہوا تھا۔ عورتیں گھر پر تھیں۔ دو بھائی روزی کمانے باہر گئے ہوئے تھے۔ صرف سب سے چھوٹا میخائیلو گھر پر تھا اور میرے باپ نے مجھ سے کہا: 'میرے سارے بچے میرے لیے برابر ہیں۔ انگلی خواہ کسی کی ٹوٹے، چوٹ میرے دل پر پڑتی ہے۔ اگر انھوں نے فوج میں بھرتی کے لیے پلاطون کے بال نہ کاٹے ہوتے، میخائیلو کو جانا پڑتا۔' اس نے ہم سب کو اکٹھا کیا۔ آپ یقین کریں گے؟۔ اور اس نے ہم سب کو ایقونوں کے سامنے کھڑا کر دیا۔ 'میخائیلو'، اس نے کہا، 'ادھر آؤ اور اس کے قدموں پر جھک جاؤ اور ہاں، چھوکری، تو بھی اپنا سر جھکا دے، اور میرے پوتو، پوتیو، تم بھی۔ سمجھ گئے؟' اس نے کہا۔... تو حضور، بات کچھ یوں ہے۔ تقدیر کی اپنی وجوہات ہوتی ہیں لیکن ایک ہم ہیں کہ ہر وقت حرف گیری کرتے رہتے ہیں اور شکایتوں کے طومار باندھتے رہتے ہیں۔... یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے، غلط ہے... دوست، ہماری مسرت آبی جال (drag-net) کے پانی کی مانند ہے: جال کو کھینچیں — یہ پھیل جائے گا۔ باہر نکالیں — خالی ہوگا! اس کا حال بس یہی ہے۔''

اور پلاطون نے پرالی پر اپنے بیٹھنے کا انداز بدل لیا۔

مختصر خاموشی کے بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''خیر، میرا خیال ہے کہ آپ کو نیند آ رہی ہے۔'' اس نے کہا۔ وہ اپنے سینے پر صلیب کے نشان بنانے اور بار بار دہرانے لگا:

''مولا یسوع مسیح، یا پیر و مرشد نکولا، فرولا اور لاورا[14]! مولا یسوع مسیح یا پیر و مرشد نکولا، فرولا اور لاورا! مولا یسوع مسیح، ہم پر رحم فرما، ہماری دستگیری کر اور ہمیں اپنی پناہ میں لے لے!'' اس نے اپنی دعا ختم کرتے ہوئے کہا۔ اس کے بعد وہ فرش پر سجدہ ریز ہوا، اٹھا، آہ بھری اور دوبارہ پرالی پر بیٹھ گیا۔ ''اس کا حال بس یہی ہے۔ خداوند، مجھے پتھر کی طرح لٹا اور ڈبل روٹی کی طرح اٹھا۔'' وہ بڑبڑایا۔ پھر وہ لیٹ گیا اور اپنا جسم کوٹ میں ڈھانپنے لگا۔

''یہ آپ کیا دعا پڑھ رہے تھے؟'' پیئر نے پوچھا۔

''ہونہہ؟'' پلاطون بڑبڑایا جس کی پلکیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں، بڑبڑایا۔ ''میں کیا کہہ رہا تھا؟ میں خداوند سے دعا مانگ رہا تھا۔ آپ دعا نہیں مانگتے؟''

''بالکل۔ مانگتا ہوں۔'' پیئر نے کہا۔ ''لیکن آپ یہ فرولا اور لاورا کی کیا بات کر رہے تھے؟''

''جی، جی!'' پلاطون نے فوراً جواب دیا۔ ''وہ گھوڑوں کے محافظ ولی ہیں۔ ہمیں ان بے چارے مویشیوں پر بھی رحم کھانا چاہیے۔ ذرا اس ننھی منی حرافہ کو دیکھیں، بالکل سکڑی پڑی ہے۔ ننھی منی کتیا، سکڑ سمٹ کر اپنے جسم کو حرارت پہنچا رہی ہے!'' کاراتائیف نے کتیا کے، جو اس کے قدموں کے نیچے لیٹی ہوئی تھی، بدن کو سہلاتے ہوئے کہا اور ایک بار پھر پہلو بدل کر سو گیا۔

کہیں دور فاصلے پر چیخم چاخ اور شور وغل کی آوازیں سنائی دیں۔ سائبان کے شگافوں میں سے آگ کی خیرہ کن روشنی نظر آ رہی تھی لیکن اس کے اندر تاریکی اور خاموشی کا راج تھا۔ پیئر کافی دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ تاہم وہ آنکھیں کھولے پلاطون کے، جو اندھیرے میں اس کے قریب لیٹا ہوا تھا، با آہنگ خراٹے سنتے رہا اور اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ دنیا، جو چکنا چور ہو چکی تھی، ایک بار پھر اس کی روح میں انگڑائیاں لے رہی ہے لیکن اب اس میں نیا حسن آ گیا تھا اور وہ نئی اور مستحکم بنیادوں پر استوار تھی۔

13

پیئر کو جو سائبان تفویض ہوا اور جہاں اس نے چار ہفتے گزارے، وہاں جو دوسرے قیدی تھے، ان میں تیئس فوجی جوان، تین افسر اور دو غیر فوجی عہدیدار تھے۔

بعد ازاں جب کبھی وہ انھیں یاد کرتا، ان کی محض دھندلی دھندلی صورتیں اس کی نگاہوں کے سامنے آتیں۔ صرف کاراتائیف ایک ایسا شخص تھا جس کا نقش اس کے دل پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کی شکل اسے واضح طور پر یاد تھی اور یہ یاد اس کے لیے بیش بہا سرمایہ بن گئی تھی۔ ہر وہ چیز — شفیق اور تو ندیل — جو سرتاپا روسی کہلائی جا سکتی تھی، وہ اس کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ جب اگلے روز پو پھٹے پیئر کی نظر اپنے پڑوسی پر پڑی تو اس کے اولین تاثر کی، کہ وہ کوئی گول مٹول شخص ہوگا، پوری طرح تصدیق ہوگئی۔ فرانسیسی فوجی کوٹ، جس کے گرد اس نے رسی بطور پیٹی باندھی ہوئی تھی، ٹوپی اور زیزفون درخت کی چھال کے جوتوں میں اس کا پورا جسم گول مٹول تھا۔ اس کا سر کاملاً گول تھا۔ اس کی پشت، چھاتی، کندھے اور بازو، جنھیں وہ ہر وقت یوں اٹھائے رکھتا جیسے وہ ابھی کسی نہ کسی سے بغل گیر ہو جائے گا، گول تھے، اور اس کا دوستانہ تبسم اور بڑی بڑی، نرم ولطیف بھوری آنکھیں گول تھیں۔

آزمودہ کار فوجی کی حیثیت سے اس نے جن جن مہموں میں حصہ لیا تھا اور ان کے متعلق اس نے جو کہانیاں سنائی تھیں، ان سے مترشح ہوتا تھا کہ اس کی عمر پچاس برس سے تجاوز کر چکی ہے۔ خود اسے قطعاً معلوم نہیں تھا کہ اس کی عمر کیا ہے اور اس کا تعین کرنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے موتیوں کی طرح صاف شفاف دانت، جو، جب بھی وہ ہنستا — اور یہ حرکت وہ اکثر کرتا —، دو نیم دائروں کی صورت میں دکھائی دینے لگتے، بالکل ٹھیک ٹھاک اور صحت مند تھے۔ اس کی داڑھی میں یا سر پر ایک بھی سفید بال نہیں تھا اور جب آدمی اس کے سراپے پر نظر ڈالتا، تو یہی محسوس ہوتا کہ اس کا جسم، لچکیلا، مضبوط اور گٹھیلا ہے اور وہ ہر قسم کی صعوبتیں برداشت کرنے کی ہمت سے بہرہ ور ہے۔

اس امر کے باوجود کہ اس کے چہرے پر باریک باریک جھریاں نمودار ہو چکی تھیں، وہاں شباب اور معصومیت جھلک رہی تھی، اور جب وہ بات کرتا سپاٹ لہجے کے باوجود اس کے منہ سے پھول جھڑتے لیکن اس کی گفتار کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی بے ساختگی اور برجستگی تھی۔ یہ بالکل واضح تھا کہ جو کچھ وہ کہتا یا کہنے والا ہوتا، اس میں اس کی سوچ کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے سامعین اس کی گفتار کی تیز رفتاری اور برجستگی کی تاب نہ

لا سکتے اور وہ اس کی بات ماننے پر مجبور ہو جاتے۔

اسیری کے ابتدائی ایام میں اس نے کچھ اس نوع کی جسمانی قوت اور پھرتی کا مظاہرہ کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھکن اور علالت جیسے الفاظ کے مفاہیم سے نا آشنا ہے۔ ہر رات لیٹنے سے پہلے وہ دعا کرتا: ''مجھے پتھر کی طرح لٹا اور ڈبل روٹی کی طرح اٹھا۔'' اور ہر صبح بیدار ہونے کے بعد وہ اپنے شانوں کو جھٹکاتا اور کہتا: ''لیٹو تو سکڑ جاؤ، اٹھو تو جسم کو جھٹکے دو۔'' اور واقعہ یہ ہے کہ جب وہ لیٹتا، بالکل پتھر بن جاتا اور اسے اپنے گرد و پیش کی کوئی سدھ بدھ نہ رہتی، اور جب وہ جاگتا، اسے اپنے بدن کو محض جھٹکا دینے کی ضرورت پیش آتی اور وہ بالکل اسی طرح جھٹ پٹ ہر کام کے لیے تیار ہو جاتا جس طرح بچے آنکھیں کھولتے ہی کھیل کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ اسے ہر کام کرنا آتا تھا اور اگر اس کا کام اتنا اچھا نہیں ہوتا تھا، تو اتنا برا بھی نہیں ہوتا تھا۔ وہ سبزیاں اور گوشت بھونتا، روٹیاں پکاتا، کپڑے سیتا، رندہ پھیرتا اور جوتوں کی مرمت کرتا۔ وہ ہمہ وقت مصروف رہتا، صرف رات کو باتیں کرتا (باتیں کرنے میں اسے بہت لطف آتا) اور گانے گاتا۔ وہ گویوں کے، جنھیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا گانا سنا جا رہا ہے، انداز میں نہیں گاتا تھا بلکہ پرندوں کی طرح چہچہاتا تھا، محض اس لیے کیونکہ اس کے لیے اس قسم کی آوازیں نکالنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ دوسروں کے لیے انگڑائی لینا یا ٹہلنا ضروری ہوتا ہے۔ اور اس کے حلق سے جو آوازیں نکلتیں، وہ شیریں، غم آلود اور قریب قریب نسوانی ہوتیں اور ایسے مواقع پر اس کے چہرے پر گمبھیر سنجیدگی طاری ہو جاتی۔

وہ اسیری کے ایام میں سے گزر رہا تھا اور اس نے اپنی داڑھی کھلی چھوڑ دی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ہر اجنبی اور عسکری چیز سے، جو اس پر زبردستی لاد دی گئی تھی، اپنا دامن چھڑا چکا ہے اور اس نے غیر شعوری طور پر اپنے سابقہ دہقانی طور طریقے دوبارہ اپنا لیے ہیں۔

''میں فوجی ضرور ہوں لیکن اس وقت چھٹی پر ہوں — چنانچہ میں اپنی قمیص برجس کے اندر نہیں ٹانکتا، باہر رکھتا ہوں،''[15] وہ کہا کرتا۔

اس نے فوجی سپاہی کی حیثیت سے جو زندگی گزاری تھی، اس کے بارے میں باتیں کرنا اسے پسند نہیں تھا۔ تاہم وہ شکوہ شکایت نہیں کرتا تھا اور بڑے فخر سے بتاتا رہتا تھا کہ فوجی ملازمت کے ان تمام برسوں کے دوران میں اسے کبھی کوڑوں کی سزا نہیں ملی تھی۔ وہ جو کوئی قصہ کہانی بیان کرتا، اسکا تعلق اس کی زندگی کے اس دور سے ہوتا جب بقول اس کے وہ ''عیسائی''[16] کی طرح رہ رہا تھا۔ اپنی دہقانی زندگی کی یہ یادیں بظاہر اسکے لیے بہت قیمتی تھیں۔

اپنی گفتگو میں وہ جن ضرب الامثال کو بار بار استعمال کرتا، عام فوجیوں کے برعکس ان میں بیشتر بھونڈی، عامیانہ یا تہذیب کے دائرے سے باہر نہ ہوتیں بلکہ عموماً یہ وہ لوک کہاوتیں ہوتیں کہ اگر انھیں سیاق و سباق سے الگ کر دیا جائے تو وہ معنی و مفہوم سے عاری معلوم ہونے لگتی ہیں لیکن اگر انھیں موقع محل کی مناسبت سے استعمال کیا جائے، تو ان سے عمیق عقل و دانش کا اظہار ہوتا ہے۔

کسی گزشتہ موقع پر اس نے جو کچھ کہا ہوتا، وہ دوسری مرتبہ عموماً اس کے بالکل برعکس بات کرتا لیکن پھر بھی دونوں

ہی باتیں درست ہوتیں۔ اسے باتیں کرنا پسند تھا اور وہ باتیں کرتا بھی خوب تھا۔ وہ اپنی گفتگو کو پیار کی ایسی اصطلاحات اور روایتی ضرب الامثال سے مزین کرتا کہ پیئر سوچنے لگتا کہ وہ یہ سب کچھ خود ہی گھڑ رہا ہے۔ لیکن اس کی گفتگو کی سب سے بڑی دلکشی یہ تھی کہ جب وہ انتہائی معمولی واقعات کا بھی ذکر کرتا۔ ان میں اکثر وہ ہوتے جو خود پیئر کے مشاہدے میں آئے ہوتے تھے لیکن اس نے ان پر کوئی توجہ نہیں دی ہوتی تھی۔ ان میں پروقار خوبصورتی در آتی۔ کبھی کبھار ایک فوجی سپاہی جی بھر کر خیالی داستانیں (یہ سب ایک جیسی ہوتیں) سناتا۔ انھیں سن کر اسے بہت لطف آتا، مگر سب سے زیادہ اسے حقیقی زندگی کے واقعات سننا سنانا مرغوب تھا۔ جب کبھی اسے اس قسم کے قصے سننے کو ملتے، وہ خوشی سے مسکرانے لگتا۔ کبھی کبھار وہ ایک آدھ لقمہ دے دیتا یا کوئی سوال پوچھ لیتا۔ اس سب کچھ کا مقصد یہ ہوتا کہ جو کچھ اس کے سامنے بیان کیا جا رہا ہے، وہ اس میں سے اپنے لیے کوئی خوبصورت اخلاقی پہلو تلاش کر سکے۔

پیئر کی نظروں میں وابستگیوں، دوستیوں اور محبتوں کے جو مفاہیم تھے، کاراتائیف ان سے ناآشنا تھا۔ لیکن وہ ہر اس شے سے، خاص طور پر انسانوں سے، جن سے روزمرہ زندگی میں اس کا واسطہ پڑتا تھا، پیار کرتا تھا، ان سے ہمدردانہ سلوک کرتا تھا، کسی خاص انسان سے نہیں، بلکہ ان تمام انسانوں سے، جن کے ساتھ اس کا اتفاقاً میل جول ہو جاتا تھا۔ اسے اپنی کتیا، اپنے ساتھیوں، فرانسیسیوں اور پیئر سے، جو اس کا پڑوسی تھا، محبت تھی۔ کاراتائیف پیئر کے ساتھ جس مشفقانہ اور محبت آمیز انداز سے پیش آتا تھا (یوں جبلی طور پر وہ پیئر کی روحانی زندگی کو خراج تحسین پیش کرتا تھا)، اس کے باوجود اسے محسوس ہوتا تھا کہ انھیں اگر ایک دوسرے سے الگ ہونا پڑا، تو اسے ایک لمحے کے لیے بھی کوئی دکھ نہیں ہوگا۔ اور کاراتائیف کے بارے میں پیئر بھی ایسا ہی محسوس کرنے لگا۔

دوسرے تمام قیدیوں کی نگاہوں میں کاراتائیف محض معمولی سپاہی تھا۔ وہ اسے "شکرہ" یا "پلاتوشا" کہتے، نیک نیتی اور بے ریائی سے اس کے ساتھ دل لگی کرتے اور چھوٹے موٹے کام کروانے کے لیے اسے ادھر ادھر بھیجتے رہتے، لیکن پیئر کی نظروں میں وہ سدا وہی رہا جو وہ اسے پہلی رات دکھائی دیا تھا: سادگی اور صداقت کے جوہر مجرد کا اتھاہ، ناقابل فہم، کھرا، دائمی چلتا پھرتا مرقع۔

پلاطون کاراتائیف کو اپنی دعاؤں کے علاوہ اور کوئی چیز زبانی یاد نہیں تھی۔ وہ جب کسی بات کا آغاز کرتا، معلوم ہوتا کہ اسے مطلق پتا نہیں کہ وہ اسے کیسے ختم کرے گا۔

بعض اوقات پیئر اس کی باتوں کے مفہوم سے یوں چونک جاتا کہ وہ اسے دہرانے کے لیے کہتا۔ لیکن اس نے ایک ثانیہ قبل جو کچھ کہا ہوتا، وہ اسے دوبارہ کبھی یاد نہ کر پاتا۔ بالکل اسی طرح وہ پیئر کو اپنے پسندیدہ گانے کے بول کبھی نہ بتا سکا۔ پیاری اماں، برچ کا چھوٹا درخت اور میں گھلتا جا رہا ہوں جیسے الفاظ اور تراکیب کا وہ ذکر تو ضرور کرتا لیکن ان میں نہ کوئی ربط ہوتا اور نہ ان کے کوئی معانی نکلتے۔ وہ سیاق و سباق سے ماورا الفاظ کو نہ سمجھ سکتا اور نہ ان کی معنویت اس پر آشکار ہوتی۔ اس کا ہر قول اور ہر فعل ایک ایسی قوت کا مظہر تھا جس کی اسے کوئی تفہیم نہیں تھی اور یہی اس کی زندگی تھی۔ مگر خود اس کی اپنی نظروں میں علیحدہ وجود کی حیثیت سے اس کی زندگی کے کوئی معانی نہیں

بنتے تھے۔ اس میں معانی تبھی پیدا ہوتے جب یہ کُل کا جز ہو جاتی اور اس کا اسے ہمہ وقت احساس رہتا۔ اس کے اقوال اور افعال اس سے اسی سلاست، بے ساختگی اور ناگزیر انداز سے سرزد ہوتے جس طرح پھول سے خوشبو نکلتی ہے۔ کسی لفظ یا فعل کو اگر الگ الگ کر کے دیکھا جاتا تو اس کی قدر و قیمت یا اہمیت کا اسے کوئی اندازہ نہ ہو سکتا۔

14

جب پرنس ماریا کو نکولائی کے ذریعے معلوم ہوا کہ اس کا بھائی رستوفوں کے ساتھ یاروسلاول میں ہے، تو اس بات کے باوجود کہ اس کی خالہ نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی، وہ بلا توقف اس کے پاس جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ وہ نہ صرف خود وہاں جا رہی تھی بلکہ اپنے بھتیجے کو بھی اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ سفر آسان تھا یا مشکل، ممکن تھا یا ناممکن، اس نے اس کے بارے میں نہ کچھ پوچھا اور نہ کچھ جاننے کا تردد کیا: اس کی دانست میں اس کا یہ فرض بنتا تھا کہ وہ نہ صرف خود اپنے بھائی کے، جو غالباً اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہا ہے، پاس پہنچے بلکہ اس کے بیٹے کو بھی اس تک پہنچانے کے لیے جو کچھ اس سے بن پڑے، کرے۔ چنانچہ اس نے سامان سفر باندھنا شروع کر دیا۔ اگر پرنس آندرے نے بذات خود اس کے ساتھ کوئی رابطہ قائم نہیں کیا تھا، تو پرنس ماریا کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہو سکتی تھی کہ وہ اتنا کمزور ہو گیا ہو گا کہ اس کے لیے خط تحریر کرنا ممکن نہ رہا ہو گا یا پھر اس نے یہ سوچا ہو گا کہ سفر اتنا طویل ہے کہ اس کی ہمشیرہ کے لیے کٹھن اور پُرخطر ثابت ہو سکتا ہے۔

چند دنوں میں پرنس ماریا کی روانگی کی تیاریاں مکمل ہو گئیں۔ اس کا کاروانِ سفر بھاری بھرکم اور کشادہ خاندانی کوچ، برتسکا اور سامان کے چھکڑے پر مشتمل تھا۔ مادموزیل بوغین، نکولشکا اور اس کا ٹیوٹر، اس کی اپنی بوڑھی نرس، تین خادمائیں، تیخون اور نوجوان وردی پوش ملازم اس کے ساتھ ہو لیے۔ اس کی خالہ نے اپنا قاصد ان کے ہمراہ کر دیا۔

سیدھا راستہ ماسکو میں سے جاتا تھا لیکن ادھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، چنانچہ پرنس ماریا جو راستہ اختیار کرنے پر مجبور ہوئی، وہ چکر کاٹ کر لپیتسک، ریازان، ولادی میر اور شویا میں سے گزرتا تھا۔ یہ راستہ بے حد لمبا، دشوار اور صعوبتوں سے بھرپور تھا کیونکہ اس پر ڈاک کے گھوڑے آسانی سے دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ ریازان کے قریب، جہاں سننے میں آیا تھا کہ فرانسیسی دیکھنے میں آئے ہیں، یہ واقعتاً خطرناک بھی تھا۔

اس صبر آزما سفر کے دوران میں مادموزیل بوغین، دیسال اور پرنس ماریا کے نوکر چاکر اس کی ہمت، حوصلے اور توانائی کو دیکھ کر اش اش پکار اٹھے۔ وہ سب سے آخر میں سوتی، سب سے پہلے بیدار ہوتی اور کوئی مشکل اس کی راہ کھوٹی نہ کر سکتی۔ یہ اس کی جانفشانی اور ہمت کا اعجاز تھا کہ اس کے رفیقان سفر کے حوصلے بھی جوان ہو گئے اور وہ دوسرے ہفتے کے اختتام پر یاروسلاول کے نواح میں پہنچ گئے۔

وارانیژ میں قیام کے آخری ایام پرنس ماریا کی زندگی کا انتہائی مسرت بخش زمانہ تھا۔ اسے رستوف سے جو محبت تھی، اب اس پر نہ اسے کوئی پریشانی تھی اور نہ ذہنی طور پر کوئی اذیت ہوتی تھی۔ اس نے اس کی ساری روح کو سرشار

کر دیا تھا، یہ اس کی ذات کا اٹوٹ حصہ بن چکی تھی اور اب وہ اس کے خلاف کوئی جدوجہد نہیں کرتی تھی۔ حالیہ دنوں میں اسے یقین ہو چکا تھا۔ اگرچہ اس نے کبھی کھلے لفظوں میں اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ کہ وہ محبت کرتی ہے اور اس سے محبت کی جا رہی ہے۔ نکولائی کے ساتھ اپنی آخری ملاقات کے دوران میں، جب وہ اسے یہ بتانے کے لیے آیا تھا کہ اس کا بھائی رستوفوں کی معیت میں ہے، اس نے اپنے آپ کو اس کا قائل کیا تھا۔ اگرچہ اس بات کا امکان ضرور تھا کہ پرنس آندرے کی (اگر وہ صحت یاب ہو گیا) نتاشا سے دوبارہ سگائی ہو سکتی ہے، لیکن اس نے اس کے بارے میں اشارتاً بھی ایک لفظ تک نہیں کہا تھا، البتہ پرنس ماریا کو اس کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ وہ ان خطوط پر سوچ ضرور رہا ہے۔ تاہم اس امکان کے باوجود اس کے اپنے متعلق اس کے رویے۔ خواستگارانہ، نرم خویانہ اور محبت آمیز۔ میں نہ صرف کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی بلکہ پرنس ماریا کو بعض اوقات محسوس ہوتا کہ ان کے مابین جو خاندانی روابط ہیں، وہ ان پر بہت خوش ہے کیونکہ ان کی وجہ سے اسے اپنی محبت کے آزادانہ اظہار کا موقع مل جاتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس کی زندگی میں یہ پہلا اور واحد موقع آیا ہے جب وہ کسی کی محبت میں گرفتار ہوئی ہے اور اسے محسوس ہوتا تھا کہ اسے اپنی محبت کا جواب محبت سے مل رہا ہے اور حالات کی اس نہج پر وہ مسرور و مطمئن تھی۔

لیکن اپنی داخلی زندگی کے ایک دائرے میں اسے جو یہ مسرت حاصل ہو رہی تھی، وہ اسے اپنے بھائی کے بارے میں مشوش ہونے سے نہ روک سکی۔ اس کے برعکس اس روحانی طمانیت کے طفیل اسے ذہنی طور پر اتنی آزادی اور فراغت مل گئی کہ وہ جی بھر کر اس کی فکر کر سکے۔ وارانیژ سے بوقت روانگی وہ اتنے شدید کرب میں مبتلا تھی کہ جن لوگوں نے اسے رخصت کیا، انھیں اس کے مغموم و متفکر چہرے کو دیکھ کر یقین ہونے لگا کہ منزل مقصود پر پہنچنے سے پہلے ہی اس کی طبیعت ناساز ہو جائے گی۔ لیکن سفر کے دوران میں اسے جن مشکلات اور آزمائشوں کا سامنا کرنا پڑا، ان سے وہ بحسن و خوبی عہدہ برآ ہوئی اور یوں اس کا دھیان بٹ گیا، اسے غم و اندوہ سے کافی حد تک نجات مل گئی اور (ذہنی طور پر) خاصی تقویت حاصل ہو گئی۔

جیسا کہ عام طور پر سفر کے دوران میں ہوتا ہے، پرنس ماریا صرف خود سفر ہی کے بارے میں سوچتی رہتی تھی، اس کا مقصد کیا تھا، وہ اس کے ذہن سے نکل چکا تھا، مگر جب وہ یاروسلاول کے قریب پہنچے، یہ خیال کہ جہاں وہ جا رہی ہے وہاں کس قسم کے حالات اس کے منتظر ہوں گے۔ مستقبل کی کسی تاریخ کو نہیں بلکہ بالکل اسی شام کو۔ اس کے ذہن میں گردش کرنے اور اس کے لیے سوہان روح بننے لگا۔

یہ دریافت کرنے کے لیے رستوف یاروسلاول میں کہاں مقیم ہیں اور پرنس آندرے کی طبیعت کیسی ہے؟ پرنس ماریا نے اپنا ایلچی پہلے ہی ادھر روانہ کر دیا تھا۔ جب اس کی بھاری بھرکم کوچ قصبے کے دروازے میں داخل ہو رہی تھی، ایلچی واپس آ رہا تھا۔ اس نے جب پرنس ماریا کا چہرہ، جس پر وحشت اور مردنی چھائی ہوئی تھی، کھڑکی میں سے دیکھا تو اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

''یور ایکسی لینسی، میں نے ہر چیز معلوم کر لی ہے۔ رستوف چوک میں ایک تاجر برونیکوف کے مکان میں

قیام پذیر ہیں۔ یہ مکان دریائے والگا کے کنارے پر واقع ہے اور یہاں سے کوئی خاص دور نہیں ہے،'' ایلچی نے بتایا۔

پرنس ماریا پر کپکپاہٹ طاری تھی اور وہ نگاہیں گاڑے مستفسرانہ انداز سے اسے دیکھے جارہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جس بات کو جاننے کے لیے وہ اتنی بے قرار ہے، وہی وہ اسے کیوں نہیں بتارہا: کہ اس کا بھائی کیسا ہے؟ اس کی طرف سے سوال پوچھنے کا فریضہ مادموزیل بوغین نے سرانجام دیا۔

''اور پرنس؟''

''ہزایکسی لینسی اسی مکان میں مقیم ہیں۔''

''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ سلامت ہیں۔'' پرنس ماریا نے دل میں سوچا اور دھیمی آواز سے پوچھا: ''ان کی طبیعت کیسی ہے؟''

''نوکر بتاتے ہیں کہ ان کی حالت یوں کی توں ہے۔''

''حالت یوں کی توں ہے۔'' اس کا مطلب کیا تھا، پرنس نے نہیں پوچھا۔ اس نے سات سالہ نکولشکا پر، جو اس کے روبرو بیٹھا تھا اور قصبے کو دیکھ کر خوش ہورہا تھا، عاجلانہ، تقریباً خفی، نظر ڈالی اور اپنا سر نیچے جھکا لیا، اور جب تک کھڑ کھڑاتی، ہچکولے کھاتی اور دائیں بائیں جھولتی بھاری بھرکم کوچ رک نہ گئی، اس نے اسے اوپر نہ اٹھایا۔ کھٹاکھٹ پائیدان نیچے کھسکا۔

کوچ کا دروازہ کھلا۔ بائیں طرف پانی — کشادہ دریا — اور دائیں طرف پورچ تھا۔ گیٹ پر چند اشخاص — نوکر چاکر اور ایک نوجوان دوشیزہ — موجود تھے۔ دوشیزہ کا چہرہ گلابی تھا اور اس کی سیاہ زلفیں مینڈھی میں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ مسکرا رہی تھی۔ پرنس ماریا کو محسوس ہوا کہ اس کی مسکراہٹ ناگوار طور پر مصنوعی ہے۔ (یہ سونیا تھی۔) پرنس ماریا دوڑتی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ ''آئیں، اندر آجائیں!'' دوشیزہ نے اسی بناوٹی تبسم سے کہا۔ اور پرنس ماریا نے دیکھا کہ وہ ہال میں پہنچ گئی ہے۔ اس کے سامنے ایک ادھیڑ عمر خاتون، جس کے خدوخال سے مشرقیت ٹپک رہی تھی، تیز تیز قدم اٹھاتی اس کا استقبال کرنے چلی آرہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے دیکھ کر بہت متاثر ہوئی ہے۔ یہ کاؤنٹس تھی۔ وہ پرنس ماریا سے بغل گیر ہوگئی اور اسے دھڑا دھڑ چومنے لگی۔

"Mon enfant!"*، اس نے زیرلب کہا۔

"jo vous aime et vous connais de puis longtemps."

اپنے اضطراب کے باوجود، جو پرنس ماریا پر طاری تھا، اسے اندازہ ہوگیا کہ ہو نہ ہو یہ کاؤنٹس ہے اور اسے اس سے لازماً کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے۔ اسے قطعاً کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ کیوں کر ہوا، بہرحال اس نے اسی لہجے میں، جس سے خود اسے مخاطب کیا گیا تھا، کسی نہ کسی طور فرانسیسی میں ہی چند شائستہ کلمات ادا کردیے اور پھر پوچھنے لگی:

''وہ کیسے ہیں؟''

---

* میری بچی، تم مجھے بے حد عزیز ہو اور میں تمھیں مدتوں سے جانتی ہوں۔

''ڈاکٹر کہتا ہے کہ اب فکر کی کوئی بات نہیں۔'' کاؤنٹس نے کہا، لیکن ان الفاظ کی ادائیگی کے دوران میں ہی اس کی نگاہیں آسمان کی جانب اٹھ گئیں۔ اس کے اس رویے سے اس کے الفاظ کی تردید ہوگئی۔

''وہ کہاں ہیں؟ میں ان سے مل سکتی ہوں؟'' پرنس نے دریافت کیا۔

''کیوں نہیں، پرنس، مائی ڈیئر، کیوں نہیں! یہ ان کا صاحب زادہ ہے؟'' کاؤنٹس نے نکولشکا کی جانب، جو دیسال کے ساتھ اندر آیا تھا، متوجہ ہو کر کہا۔ ''ہم سب کی رہائش کا بندوبست کرلیں گے۔ مکان خاصا بڑا ہے۔ اخاہ، کتنا پیارا بچہ ہے!''

کاؤنٹس پرنس ماریا کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ وہاں سونیا مادموزیل بوغین کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ کاؤنٹس بچے سے لاڈ پیار کرنے اور اسے پچکارنے لگی۔ کاؤنٹ بھی پرنس کا استقبال کرنے اندر آ گیا۔ پرنس ماریا نے جب اسے آخری بار دیکھا تھا، اس کے مقابلے میں وہ اب خاصا بدل چکا تھا۔ تب وہ چاق چوبند، ہشاش بشاش اور پر اعتماد نظر آیا تھا مگر اب اس کی حالت قابل رحم تھی۔ وہ بوڑھا ہو گیا تھا اور اس کے چہرے پر سراسیمگی برس رہی تھی۔ جب تک وہ پرنس ماریا سے باتیں کرتا رہا، وہ اپنے گردوپیش یوں دیکھتا رہا جیسے ہر کہہ ومہ سے پوچھ رہا ہو کہ آیا وہ صحیح طریقے سے کام کر رہا ہے۔ ماسکو اور اپنی جائیداد کی بربادی کے بعد اسے جس طرح اپنے لگے بندھے معمول سے دستکش ہونا پڑا، اس کا اس پر اتنا شدید اثر ہوا تھا کہ معلوم ہونے لگا کہ وہ اپنی اہمیت کے احساس سے بھی محروم ہو گیا ہے اور محسوس کرنے لگا ہے کہ اب زندگی میں اس کے لیے کوئی مزید مقام نہیں رہا۔

پرنس ماریا ذاتی طور پر بڑی پریشان اور مضطرب تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ حتی الامکان جلد از جلد اپنے بھائی کے پاس پہنچ جائے اور وہ اس بات پر پیچ وتاب کھا رہی تھی کہ اس وقت جب اس کی واحد آرزو اپنے بھائی سے ملاقات کرنا ہے، یہ لوگ اس کے راستے کی دیوار بن گئے ہیں، اسے خوش کرنے کے لیے طرح طرح کے جتن کر رہے ہیں اور اس کے بھتیجے کی جھوٹی تعریفیں کر رہے ہیں۔ ان تمام امور کے باوجود پرنس نے اس کا، جو اس کے گردوپیش ہو رہا تھا، جائزہ لیا اور اسے احساس ہوا کہ وہ جس قسم کے نئے ماحول میں پہنچ گئی ہے، اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ وقتی طور پر اس سے سمجھوتا کر لے۔ وہ جانتی تھی کہ ایسا کیے بغیر گزارہ نہیں اور اگرچہ یہ اس کے لیے تکلیف دہ تھا لیکن اسے ان لوگوں سے کوئی پرخاش نہیں تھی۔

''یہ میری بھانجی ہے۔'' کاؤنٹ نے سونیا کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ آپ کی اس سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔''

پرنس ماریا سونیا کی طرف متوجہ ہوئی۔ اس کے دل میں اس لڑکی کے خلاف عناد کا جو جذبہ پیدا ہوا تھا، اس نے اسے کچلنے کی کوشش کی اور اس کا منہ چوم لیا۔ تاہم اسے تکلیف دہ حد تک یہ محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ خود اس کے اپنے دل میں ہے، اس میں اور ان لوگوں کی، جو اس کے اردگرد موجود ہیں، ذہنی کیفیت کے مابین وسیع خلیج حائل ہے۔

''وہ کہاں ہیں؟'' اس نے ایک مرتبہ پھر پوچھا۔ اب کے اس کے مخاطب وہ سبھی تھے۔

''وہ نچلی منزل میں ہیں۔ نتاشا ان کے پاس ہے۔'' سونیا نے جواب دیا اور اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''ہم نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ اس وقت ملاقات مناسب رہے گی، خادمہ بھیج دی ہے... پرنس، آپ بہت تھک گئی ہوں گی؟''

پرنس ماریا جھنجھلا گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ وہ کاؤنٹس سے دوبارہ پوچھنا ہی چاہتی تھی کہ اس کا کمرا کہاں ہے کہ دروازے کے قریب ہلکے پھلکے اور تیز رو قدموں کی تقریباً خوش و خرم آہٹ سنائی دی۔ پرنس نے مڑ کر دیکھا اور اسے نتاشا۔ جو مدتوں قبل ماسکو کی ملاقات کے دوران میں اسے سخت ناپسند آئی تھی۔ دکھائی دی۔ وہ قریب قریب دوڑتی کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

ابھی اس نے نتاشا پر بمشکل سرسری نظر ڈالی ہو گی کہ اسے اندازہ ہو گیا کہ غم و اندوہ میں وہ اس کی سچی رفیق اور نتیجتاً دوست ہے۔ وہ اٹھی اور اس سے ملنے سرپٹ بھاگی۔ وہ اس سے بغل گیر ہو گئی اور اس کے شانے پر سر رکھ کر ٹپ ٹپ آنسو بہانے لگی۔

جونہی نتاشا کو، جو پرنس آندرے کے سرہانے بیٹھی تھی، پرنس ماریا کی آمد کا علم ہوا، وہ چپکے سے اٹھی اور تیز قدموں، جن کی چاپ میں پرنس ماریا کو شگفتگی جھلکتی معلوم ہوئی تھی، چلتی اس کے پاس آ گئی۔

جب وہ دوڑتے دوڑتے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی، اس کے پریشان و مضطرب چہرے پر صرف ایک ہی تاثر نمایاں تھا اور یہ تاثر اس بے پایاں محبت کا تھا جو اسے اس سے، پرنس ماریا اور ہر اس چیز سے تھی، جس کا تعلق اس شخص سے تھا جس سے اسے محبت تھی۔ اس تاثر میں دردمندی تھی، دوسروں کی خاطر تکالیف جھیلنے کا جذبہ تھا اور تن من سے ان کی خدمت کرنے کی آرزو تھی۔ صاف عیاں تھا کہ اس وقت نتاشا کے دل میں اپنی ذات یا پرنس آندرے کے ساتھ اپنے ذاتی تعلقات کے متعلق سوچ کا شائبہ تک نہیں تھا۔

پرنس ماریا نے یہ سب کچھ اپنے حساس وجدان کی مدد سے بیک نظر بھانپ لیا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر یوں روتی رہی کہ اس کے دکھ کا اظہار بھی ہوتا رہا اور اس اظہار سے اس کی تسکین کا سامان بھی بہم پہنچتا رہا۔

''ماری، آؤ ان کے پاس چلتے ہیں۔'' نتاشا نے کہا اور اسے دوسرے کمرے کی طرف لے گئی۔

پرنس ماریا نے اپنا سر اٹھایا، آنکھیں پونچھیں اور پھر نتاشا کی طرف متوجہ ہوئی۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ اس سے سب کچھ معلوم کر لے گی اور جان لے گی۔

''کیسے...'' اس نے اپنی بات کا آغاز کیا لیکن وہ بیچ میں ہی رک گئی۔

اسے محسوس ہوا کہ نہ اس کا سوال اور نہ اس کا جواب الفاظ کے قالب میں ڈھالا جا سکتا ہے۔ جو کچھ وہ جاننا چاہتی ہے، نتاشا کا چہرہ اور آنکھیں اسے زیادہ واضح اور بہتر انداز سے بتا سکتی ہیں۔

نتاشا نے اپنی نگاہیں اس پر مرکوز کر رکھی تھیں لیکن معلوم ہوتا تھا کہ اس پر خوف کا غلبہ ہے اور وہ اس شک و شبہے میں مبتلا ہے کہ آیا اسے وہ سب کچھ، جو خود اسے معلوم ہے، بتا دینا چاہیے یا نہیں۔ کچھ یوں نظر آ رہا تھا کہ ان

درخشندہ آنکھوں کے سامنے، جو چھیدتی ہوئی اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچتی جا رہی تھیں، سچ، پورا سچ، جیسا کہ خود اس نے دیکھا تھا، بیان نہ کرنا ناممکن ہے۔ اور ایکا ایکی اس کے لب تھرتھرائے، اس کے چہرے پر بھدی لکیریں، جنھوں نے اس کا حلیہ بگاڑ دیا، نمایاں ہوگئیں۔ اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں ڈھانپ لیا اور سسکیاں بھرنے لگی۔

پرنس ماریا سمجھ گئی۔

لیکن وہ اب بھی پر امید تھی اور اگرچہ اسے اپنے الفاظ میں کوئی یقین نہیں تھا، اس نے پوچھ ہی لیا:

''نگران کا زخم کیسا ہے؟ ان کی عمومی حالت کیسی ہے؟''

''تم۔۔۔تم خود دیکھ لوگی۔'' نتاشا صرف اتنا ہی کہہ سکی۔

وہ کچھ دیر نچلی منزل میں اس کے کمرے کے نزدیک بیٹھی رہیں تاکہ وہ اپنے آنسوؤں کو روک سکیں اور اس کے کمرے میں جانے سے پہلے اپنا سکون بحال کرسکیں۔

''ان کی علالت کی روش کیا رہی ہے؟ ان کا زخم... کب سے بگڑنا شروع ہوا؟ یہ کب ہوا؟'' پرنس ماریا نے پوچھا۔

نتاشا نے بتایا کہ شروع میں شدید بخار اور جان لیوا درد نے، جس میں وہ مبتلا تھا، اس کی حالت تشویش ناک بنا دی تھی، تاہم جب وہ تروئستا پہنچے، اسے افاقہ ہونے لگا۔ اس وقت ڈاکٹر کو صرف ایک بات۔۔۔ فسادِ نسج (gangrene)۔۔۔ کا اندیشہ تھا۔ تاہم یہ خطرہ بھی ٹل گیا ہے۔ جب وہ یاروسلاول پہنچے، زخم میں ایک بار پھر پیپ پڑنے لگی (نتاشا اس قسم کی باتیں جانتی تھی) اور ڈاکٹر نے بتایا کہ پیپ پڑنے کا عمل اپنی فطری میعاد پوری کرنے کے بعد ختم ہو جائے گا۔ اس کے بعد بخار ہونے لگا لیکن اس کا خیال تھا کہ یہ خطرناک نہیں۔

''لیکن دو روز قبل'' نتاشا نے اپنی سسکیاں دبانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، ''یہ کیفیت اچانک ہوگئی۔ مجھے نہیں معلوم کہ کیوں، مگر میرا مطلب کیا ہے، یہ تم خود دیکھ لوگی۔''

''وہ کمزور ہوگئے ہیں؟ لاغر ہوگئے ہیں؟'' پرنس ماریا نے پوچھا۔

''نہیں۔ یہ بات نہیں... صورت حال اس سے کہیں بدتر ہے۔ تم دیکھ لوگی۔ ہائے ماریا، وہ بے حد اچھے ہیں۔ وہ زندہ نہیں رہ سکتے، زندہ نہیں رہ سکتے کیونکہ...''

15

جب نتاشا نے اپنے معمول کے انداز سے دروازہ کھولا اور پرنس ماریا کو پہلے اندر جانے دیا، پرنس کی ہچکیاں نکل گئیں اور اس کا گلا رندھ گیا۔ اگرچہ اس نے اپنے آپ کو تیار کرنے کی سعی کامل کی تھی اور اب بھی اس کی یہی کوشش

تھی کہ اس کے جذبات کا شیرازہ منتشر نہ ہونے پائے، وہ جان چکی تھی کہ جب اس کی نظر اس پر پڑے گی، اسے اپنے آنسوؤں پر اختیار نہیں رہے گا۔

نتاشا نے جو یہ کہا تھا کہ ''یہ کیفیت اچانک ہوگئی،'' تو وہ اس کا مطلب سمجھ گئی تھی۔ اس نے اس کا مفہوم یہ لیا تھا کہ وہ اچانک ڈھیلا پڑ گیا ہے اور اس کے مزاج کی یہ نرمی اور عاجزی اس امر کی علامت ہے کہ موت کی آمد آمد ہے۔ جب وہ دروازے کی جانب قدم بڑھا رہی تھی، اس نے اپنے تخیل میں اپنے بچپن کے آندریوشا کے چہرے کا تصور باندھا۔ جس سے وہ اپنے ایام طفولیت میں خوب آشنا تھی۔ اس وقت اس چہرے پر نرمی، ملائمت، تازگی اور دردمندی جھلکا کرتی تھی لیکن بعد کے سالوں میں یہ آثار شاذ ہی وہاں کبھی دکھائی دیے۔ چنانچہ جب کبھی اس کے یہ اوصاف عود کر آتے، وہ بے حد متاثر ہوتی۔ وہ جانتی تھی کہ بستر مرگ پر جس طرح اس کے باپ نے اس کے ساتھ بڑے ملائم اور شیریں لہجے سے باتیں کی تھیں، وہ بھی اس کی تقلید میں اسی انداز سے گفتگو کرے گا، وہ اسے برداشت نہیں کر پائے گی اور اس کی موجودگی میں ہی پھوٹ کر رونے لگی گی۔ تاہم جلد یا بدیر یہ تو ہونا ہی ہے اور وہ کمرے کے اندر چلی گئی۔ اس کی کوتاہ بین آنکھیں جوں جوں اس کی شکل واضح طور پر دیکھنے اور اس کے خدوخال پہچاننے لگیں، توں توں اس کی سسکیاں بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئیں۔ پھر اسے اس کا چہرہ نظر آیا اور اس کی نظریں اس کی نظروں سے ٹکرا گئیں۔

وہ تکیوں کے سہارے دیوان پر لیٹا ہوا تھا۔ وہ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا جس کا استر گلہری کی پوستین کا تھا۔ وہ سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا اور اس کے چہرے پر زردی کھنڈ رہی تھی۔ وہ اپنے ایک مہین اور سفید شفاف ہاتھ میں رومال پکڑے ہوئے تھے جب کہ وہ دوسرے سے باریک باریک مونچھوں کو، جو اس نے اگالی تھیں، سہلا رہا تھا۔ جب وہ اندر آئیں، اس کی نگاہیں ان پر مرکوز ہوگئیں۔

جب پرنس ماریا نے اس کے چہرے کو دیکھا اور ان کی نظریں آپس میں متصادم ہوئیں، اس کے قدموں کی رفتار ڈھیلی پڑ گئی، آنسو خشک ہو گئے اور سسکیاں تھم گئیں۔ جونہی اسے اس کے چہرے اور آنکھوں کے تاثرات دکھائی دیے، وہ سہم گئی اور یکایک اپنے آپ کو مجرم تصور کرنے لگی۔

''لیکن میں نے کیا جرم کیا ہے؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔ ''کیونکہ تم زندہ ہو اور زندوں کے بارے میں سوچ رہی ہو، جب کہ میں...'' اس کی سرد مہر اور سخت گیر نظروں نے جواب دیا۔

جب وہ نتاشا اور اپنی ہمشیرہ کا عمداً جائزہ لے رہا تھا اس کی عمیق ٹکٹکی میں، جو بظاہر کسی خارجی وجود کی طرف نہیں بلکہ قدرے اس کی اپنی ذات پر مرکوز نظر آتی تھی، ایک طرح کا مخاصمانہ تاثر ہویدا ہو رہا تھا۔

''ماری، کیسی ہو؟ تم یہاں کیسے پہنچ گئی ہو؟'' اس نے ایک ایسی آواز میں پوچھا جو اتنی ہی پرسکون اور لاتعلق تھی جتنی کہ اس کی ٹکٹکی۔

اگر اس نے کچھ اس طرح چیخ ماری ہوتی جیسے وہ ہر چیز سے مایوس ہو گیا ہو، پرنس ماریا اتنی دہشت زدہ نہ

ہوتی جتنی وہ اس کے لہجے سے ہوئی۔

''نکولشکا کو اپنے ساتھ لائی ہو؟'' اس نے اسی پر سکون اور ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں پوچھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنا حافظہ تازہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

''آپ کیسے ہیں؟'' پرنس ماریا نے پوچھا۔ وہ خود متعجب تھی کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

''مائی ڈیئر، یہ سوال تمھیں ڈاکٹر سے پوچھنا چاہیے۔'' اس نے جواب دیا۔ وہ بظاہر خوش خلق بننے کی سعی کر رہا تھا اور صرف ہونٹوں سے بات کر رہا تھا۔ (صاف عیاں تھا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا، اوپرے دل سے کہہ رہا تھا۔ اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔) اس نے کہا:

''مائی ڈیئر، تمھاری آمد کا شکریہ۔''

پرنس ماریا نے اس کا ہاتھ دبایا۔ وہ یہ دباؤ برداشت نہ کر سکا اور اسے قدرے جھرجھری آ گئی۔ وہ چپ تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ وہ کیا کہے۔ دو روز قبل اس میں جو تبدیلی آئی تھی، وہ اسے سمجھ گئی تھی۔ اس کے الفاظ، اس کے لہجے اور اس کی قریب قریب مخاصمانہ نظر میں تمام دنیوی علائق و اشیا سے وہ بیگانگی، جو زندوں کو اتنی دہشت ناک معلوم ہوتی ہے، محسوس کی جا سکتی تھی۔ صاف عیاں تھا کہ زندہ اشیا کو سمجھنا اس کے لیے ناممکن ہو گیا ہے، پھر بھی یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان کی تفہیم میں اس لیے ناکام نہیں ہوا کیونکہ وہ اس صلاحیت سے محروم ہو چکا ہے بلکہ اس لیے کیونکہ وہ کچھ اور — جو زندہ نہیں سمجھتے اور نہ سمجھ سکتے ہیں — سمجھنے لگا ہے اور جس میں وہ کاملاً جذب ہو چکا ہے۔

''ہاں، تم دیکھ رہی ہو نا کہ قضا و قدر نے ہمیں کیسے عجیب و غریب انداز سے اکٹھا کر دیا ہے۔'' اس نے مہر سکوت توڑتے اور نتاشا کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہر وقت میرا خیال رکھتی ہیں۔''

پرنس ماریا نے اس کی بات سنی لیکن اسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ پرنس آندرے جیسا حساس اور رقیق القلب شخص اس لڑکی کے سامنے، جس سے وہ محبت کرتا ہے اور جو اس سے محبت کرتی ہے، اس قسم کی بات کیسے کہہ سکتا ہے؟ اگر اسے زندہ رہنے کی آس ہوتی، وہ یہ الفاظ اس نوع کے سرد مہر اور جراحت کش لہجے سے کبھی ادا نہ کر سکتا۔ اگر اسے یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کا انجام قریب ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے بارے میں ہمدردی کی ایک رتی بھی محسوس کرنے میں یوں ناکام رہتا، اس کی موجودگی میں اس کی طرح کی بات کہہ بھی کیسے سکتا؟ ان باتوں کی صرف ایک ہی توضیح ہو سکتی ہے: کہ وہ ہر شے سے لاتعلق ہو چکا ہے، اس لیے لاتعلق کیونکہ اس پر کہیں زیادہ اہمیت کی حامل کوئی چیز منکشف ہو چکی ہے۔

ان کے مابین جو گفتگو ہو رہی تھی، وہ بے نظم اور جوش و جذبے سے عاری تھی اور اس میں خواہ مخواہ بار بار وقفے آ جاتے تھے۔

''ماری براستہ ریازان آئی ہے،'' نتاشا نے کہا۔

پرنس آندرے کو احساس ہی نہ ہو سکا کہ نتاشا نے اس کی ہمشیرہ کو ماری کہا ہے اور خود نتاشا کو اس کا وقوف

اسے اس (پرنس آندرے) کی موجودگی میں اس نام سے پکارنے کے بعد ہوا۔

''واقعی؟'' اس نے کہا۔

''اسے لوگوں سے معلوم ہوا تھا کہ ماسکو کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنایا جا چکا ہے اور اس (ماسکو) کی حالت ایسی ہے گویا...''

نتاشا رک گئی۔ گفتگو کرنا ناممکن تھا۔ بظاہر وہ سننے کی کاوش کر رہا تھا تاہم اس سے یہ کام ہو نہیں پا رہا تھا۔

''ہاں، سنا ہے کہ وہ جل کر راکھ کا ڈھیر بن چکا ہے۔ بہت برا ہوا'' اس نے سیدھا اپنے سامنے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے اور بے دھیانی سے اپنی مونچھوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''اور ہاں ماری، تو تمھاری کاؤنٹ نکولائی سے ملاقات ہو چکی ہے؟'' پرنس آندرے نے یک لخت کہا۔ نظر یہ آتا تھا کہ وہ ان کا دل رکھنے کے لیے کچھ نہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ''اس نے یہاں خط بھیجا تھا اور لکھا تھا کہ وہ تمھیں بہت پسند کرنے لگا ہے۔'' وہ سادگی اور سکون سے کہتا چلا گیا۔ دکھائی دیتا تھا کہ زندوں کے لیے اس کے الفاظ جس پیچیدہ معنویت کے حامل ہیں، وہ اس کا ادراک کرنے سے قاصر ہے۔ ''اگر تم بھی اسے پسند کرتی ہو تو یہ بہت اچھی بات ہوگی.. تم اس سے شادی کر سکو گی۔'' اس نے قدرے تیزی سے مزید کہا، گویا وہ اس بات پر خوش ہو کہ جو کچھ وہ کہنا چاہتا تھا، وہ کہنے کے لیے بالآخر اسے الفاظ مل گئے ہیں۔

جو کچھ اس نے کہا پرنس ماریا نے سن لیا لیکن اس کے لیے ان الفاظ کے اور کوئی معانی نہیں تھے، سوائے اس کے کہ ان سے اس امر کا مزید ثبوت ملتا تھا کہ وہ دنیاوی علائق سے کتنا دور ہو چکا ہے۔

''میرے متعلق بات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟'' پرنس ماریا نے کہا اور نتاشا کو اچٹتی نگاہوں سے دیکھا۔

نتاشا کو آگہی تھی کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے لیکن خود اس نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے سے احتراز کیا۔ ایک بار پھر تینوں خاموش تھے۔

''آندرے، کیا آپ پسند کریں گے۔'' پرنس ماریا نے اچانک لڑکھڑاتی زبان سے کہا۔ ''کیا آپ نکولشکا سے ملنا پسند کریں گے؟ وہ ہمیشہ آپ کے متعلق باتیں کرتا رہتا ہے۔''

پرنس آندرے کے چہرے پر پہلی مرتبہ ہلکی سی مسکراہٹ، جو بمشکل نظر آ رہی تھی، دکھائی دی، لیکن پرنس ماریا، جو اس کے چہرے سے خوب شناسا تھی، یہ دیکھ کر دہشت زدہ رہ گئی کہ اس کی یہ مسکراہٹ اپنے بیٹے کے لیے محبت یا انبساط کا اظہار نہیں تھی بلکہ ایک طرح کی شریفانہ طنز تھی۔ وہ جان گئی کہ اس نے اس کے ذریعے اسے یہ جتا دیا ہے:

''تم نے میرے جذبات کو جگانے کے لیے آخری حربہ استعمال کر ہی لیا!''

''ہاں، نکولائی سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوگی۔ وہ ٹھیک ہے نا؟''

جب نکولشکا کو پرنس آندرے کے پاس لایا گیا، وہ خوف زدہ نگاہوں سے ٹکٹکی باندھ کر اپنے باپ کو دیکھنے لگا گر وہ رویا نہیں کیونکہ کوئی دوسرا شخص رو نہیں رہا تھا۔ پرنس آندرے نے اسے چوما لیکن بظاہر اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ اس سے کیا کہے۔

جب وہ نوعمر بچے کو وہاں سے دوسرے کمرے میں لے گئیں، پرنس ماریا ایک بار پھر اپنے بھائی کے پاس آئی اور اس نے اسے بوسہ دیا۔ اب اس میں اپنے آنسو ضبط کرنے کی مزید سکت نہیں رہی تھی اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

وہ بڑے انہماک سے اسے دیکھنے لگا۔

''تم نکولشکا کے لیے رو رہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

پرنس ماریا نے روتے روتے اپنے سر کو جنبش دی۔

''ماری، تمھیں انجیل مقدس کی وہ آیا...'' اس نے کہنا شروع کیا، پھر دفعتاً خاموش ہو گیا۔

''آپ نے کیا کہا تھا؟''

''کچھ نہیں۔ تمھیں یہاں رونا نہیں چاہیے۔'' اس نے اسے اسی سرد مہرانہ انداز سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

جب پرنس ماریا رونے لگی تھی، وہ سمجھ گیا تھا کہ وہ اس کے لیے رو رہی ہے کیونکہ نکولشکا بن باپ کے رہ جائے گا۔ وہ کسمسانے اور پورا زور لگانے لگا کہ کسی طرح زندگی کی طرف دوبارہ لوٹ آئے اور ان کے نقطۂ نظر سے حالات کا جائزہ لے سکے۔

''ہاں، انھیں یہ افسوس ناک معلوم ہوگا۔'' اس نے سوچا۔ ''مگر یہ بات ہے کتنی سادہ!''

''فضائی پرندے نہ بیج بوتے ہیں، نہ فصل کاٹتے ہیں، پھر بھی تمھارا آسمانی باپ انھیں دانہ دنکا کھلاتا ہے۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور یہی بات وہ پرنس ماریا سے کہنا چاہتا تھا۔ ''لیکن نہیں، وہ اس کی تفسیر اپنے انداز سے کریں گی اور اصل بات کی تہہ تک نہیں پہنچ سکیں گی۔ وہ سمجھتی ہی نہیں کہ ان کے یہ جذبات، جنھیں وہ اتنی قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہیں — ہمارے وہ تمام خیالات جو ہمیں اتنے اہم معلوم ہوتے ہیں — دراصل کسی اہمیت کے حامل نہیں۔ ہم ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔'' اور وہ خاموش رہا۔

پرنس آندرے کا نوخیز بیٹا سات سال کا تھا۔ وہ بمشکل حروف کی شناخت کر سکتا تھا اور اس کا علم تقریباً صفر تھا۔ اس دن کے بعد اسے چکی میں پسنا پڑا، اسے علم، تجربہ اور بصیرت حاصل ہوئی۔ لیکن جو کچھ اس نے بعد میں حاصل کیا اگر اس وقت اس کی مِلک میں ہوتا تو بھی اس نے اپنے باپ، پرنس ماریا اور نتاشا کے مابین جو منظر دیکھا، اسے

اس کی معنویت کا اس سے زیادہ صحیح اور زیادہ عمیق ادراک نہ ہوتا جتنا کہ تب ہو گیا تھا۔ وہ اسے مکمل طور پر سمجھ گیا تھا اور جب وہ آنسو بہائے بغیر کمرے سے باہر نکلا، وہ سیدھا نتاشا کے پاس آیا جو اس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی، اور شرماتے شرماتے اپنی خوبصورت اور متفکر آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ پھر اس کا بالائی ہونٹ، جو اوپر اٹھ گیا تھا، کپکپایا، اس نے اپنا سر اس کے جسم کے ساتھ لگایا اور رونے لگا۔

اس دن سے وہ دیسال اور کاؤنٹس سے، جو اس کی ناز برداریاں کرتی رہتی تھی، کنی کترانے اور پہلو بچانے لگا۔ وہ یا تو خلوت گزیں رہتا یا پھر ڈرتے جھجکتے پرنسس ماریا یا نتاشا کے چلا جاتا جس سے وہ اپنی پھوپھی سے بھی زیادہ محبت کرتا معلوم ہوتا تھا، اور اپنے شرمیلے اور خاموش انداز سے ان کے ساتھ چمٹ جاتا۔

جب پرنسس ماریا اپنے بھائی کے کمرے سے باہر آئی، نتاشا کے چہرے نے جو کچھ اسے بتایا تھا، وہ اسے بخوبی سمجھ چکی تھی۔ وہ اب نتاشا کے ساتھ اپنے بھائی کی بحالی صحت کے بارے میں امید افزا باتیں نہیں کرتی تھی۔ وہ اس کے دیوان کے قریب بیٹھنے کے لیے اس سے باری لیتی، آنسو نہ بہاتی بلکہ مسلسل دعائیں مانگتی رہتی۔ اس کی روح ہر دم اس ہستی سے، جو لا یزال ہے اور ہمارے فہم و ادراک سے بالا، اور جو اتنے محسوس انداز سے قریب المرگ شخص کے اوپر منڈلا رہی تھی، لو لگائے رکھتی۔

16

پرنس آندرے کو نہ صرف یہ معلوم تھا کہ وہ چراغ سحری ہے بلکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ یہ چراغ تیزی سے بجھتا جا رہا ہے، نصف کے قریب بجھ چکا ہے۔ اسے یہ وثوق تھا کہ وہ دنیوی اشیا سے بیگانہ ہو چکا ہے اور اسے اپنا وجود عجیب و غریب اور مسرور کن انداز سے ہلکا پھلکا لگنے لگا تھا۔ جو کچھ وقوع پذیر ہوتا تھا، وہ اس کا بہ صبر و تحمل اور بلا تردد منتظر تھا۔ وہ مہیب، ابدی، ان جانی اور دُور دست چیز، جو کچھ بھی وہ تھی۔ جس کی موجودگی کی اسے پوری زندگی آگہی رہی تھی۔ اب اس کے بالکل قریب تھی اور جس عجیب و غریب انداز سے اسے اپنے وجود کے ہلکا پھلکا ہونے کا تجربہ ہوا تھا، اسی کی بنا پر یہ تقریباً قابل تفہیم بن گئی اور ٹھوس صورت اختیار کر گئی تھی...

❖

ماضی میں موت کے تصور سے ہی اس کے پسینے چھوٹنے لگتے تھے۔ اسے دو مرتبہ اس اذیت ناک احساس۔ موت کی، اختتام کی دہشت کا۔ تجربہ ہو چکا تھا لیکن اب یہ خوف اس کے لیے معانی کھو چکا تھا۔

پہلی مرتبہ تب اسے اس کا احساس ہوا تھا جب گولا لٹو کی طرح اس کے سامنے گھوما تھا اور اس نے کھیت، جس کی فصل تازہ تازہ کٹی تھی، جھاڑیوں اور آسمان کی جانب دیکھا تھا اور وہ جان گیا تھا کہ وہ موت کے روبرو کھڑا ہے۔ زخمی ہونے کے بعد جب وہ دوبارہ ہوش میں آیا تھا، چشم زدن میں اس کی روح کے اندر ابدی، بے قید محبت

کی کونپل پھوٹ پڑی تھی اور اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ وہ زندگی کے بندھنوں سے، جو زنجیر پا بن جاتے ہیں، آزاد ہو گیا ہے۔ تب اسے موت کا خوف رہا تھا اور نہ خیال۔

زخمی ہونے کے بعد اس نے تنہائی، اذیت اور جزوی ہذیان کے جو لمحے بتائے تھے، ان کے دوران میں اس نے ابدی محبت کے اصول کے بارے میں، جس کا اس پر نیا نیا انکشاف ہوا تھا، جتنا زیادہ گہرائی میں جا کر سوچا تھا، اتنا ہی زیادہ وہ غیر شعوری طور پر زندگی کو تیاگتا چلا گیا تھا۔ ہر شخص اور ہر شے سے محبت کرنے، محبت کی خاطر ہمیشہ اپنے آپ کو قربان کر دینے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ صرف کسی خاص شخص سے محبت کی جائے یا صرف ارضی حیات کی خاطر زندہ رہا جائے۔ اور محبت کا یہ اصول جتنا زیادہ اس کے دل و دماغ میں رچتا اور اس کے رگ و پے میں سرایت کرتا چلا گیا تھا، وہ اتنا ہی زیادہ زندگی سے قطع تعلق کرتا چلا گیا تھا اور اتنے ہی زیادہ مکمل انداز سے اس نے اس ہیبت ناک رکاوٹ کو، جو محبت کی عدم موجودگی میں زندگی اور موت کے مابین سدّ راہ بن کر کھڑی ہو جاتی ہے، تہس نہس کر دیا تھا۔ اس پہلے دور میں، جب کبھی اسے یہ یاد آیا کہ اسے مرنا ہوگا، اس نے اپنے آپ سے یہی کہا تھا: ''کیوں نہیں؟ بھلا اس سے بہتر بات اور کیا ہوگی؟''

لیکن میتش چی میں وہ رات گزارنے کے بعد جب وہ نیم ہذیانی کیفیت میں اسے دیکھ چکا، جس کے متعلق اس کے دل میں یہ شدید تمنا تھی کہ وہ اس کے سامنے آ جائے، محبت کے خاموش آنسو بہا چکا اور اس کا ہاتھ اپنے لبوں پر دبا چکا، ایک خاص عورت کے لیے محبت ایک بار پھر غیر محسوس طریقے سے اس کے دل میں سرایت کرنے اور زندگی کے ساتھ اس کا رشتہ دوبارہ جوڑنے لگی۔ اور مسرت بخش اور پریشان کن خیالات اسے ستانے لگے۔ اس نے وہ لمحہ یاد کیا، جب اس نے ڈریسنگ سٹیشن میں کوراگن کو دیکھا تھا، مگر تب اس کے دل میں جن احساسات نے سر اٹھایا تھا، اب وہ انھیں اپنے اوپر طاری نہ کر سکا۔ اسے یہ سوال کہ ''آیا وہ (کوراگن) زندہ ہے؟'' اذیت دینے لگا لیکن وہ اس کے متعلق استفسار کرنے کا حوصلہ نہ دکھا سکا۔

❖

اس کی علالت اپنا میعادی جسمانی سفر پورا کرتی رہی۔ لیکن نتاشا نے جب یہ کہا تھا: ''یہ کیفیت اچانک ہوگئی۔'' تو اس کا اشارہ جس کیفیت کی طرف تھا، وہ پرنسس ماریا کی آمد سے دو روز قبل ظہور پذیر ہوئی تھی۔ یہ ممات و حیات کے مابین آخری روحانی کشمکش تھی اور اس میں ممات فاتح قرار پائی تھی۔ اسے غیر متوقع طور پر پتا چلا کہ اس محبت کی بدولت جو اسے نتاشا سے ہوئی ہے، زندگی اس کے لیے بیش بہا ہے اور انجانے غیر پہچانے آئندہ سے دوچار ہونے سے پہلے دہشت کی ایک آخری یلغار بھی، گو ایسی یلغار جس نے بالآخر مات کھا جانا تھا۔

یہ کیفیت بوقت شام رونما ہوئی۔ ڈنر کے بعد اسے حسب معمول معمولی بخار ہو گیا تھا۔ اس کے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور وہ اتنے واضح تھے کہ فطرتاً اتنے ہوتے نہیں۔ سونیا میز کے قریب بیٹھی تھی۔ وہ اونگھنے لگا۔

ایکا ایکی بے پناہ مسرت کا احساس اس پر غالب آ گیا۔

''واہ، وہ آ گئی ہے!''

اور حقیقتاً نتاشا ابھی ابھی کمرے میں داخل ہوئی اور سونیا کی جگہ پر بیٹھی تھی۔

جب سے اس نے اس کی تیمارداری شروع کی تھی، اسے ہمیشہ جبلی طور پر اس کی موجودگی کی اسی طرح آگاہی ہوتی رہی تھی۔ وہ بازوؤں والی کرسی پر بیٹھی تھی، جو وہاں ترچھی پڑی تھی تاکہ موم بتی کی روشنی اس تک نہ پہنچ سکے اور زنانہ جرابیں بن رہی تھی۔ (ایک روز پرنس آندرے کے منہ سے نکل گیا تھا کہ کوئی شخص بھی اس بوڑھی نرس کی طرح، جو مریض کے سرہانے بیٹھی زنانہ جرابیں بنتی رہتی تھی، تیمارداری نہیں کر سکتا۔ جرابیں بننے کے عمل میں کوئی بات ضرور ہے کہ مریض کو بڑی تسکین ملتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد نتاشا نے جرابیں بننا سیکھ لیا۔) سلائیاں اس کی پتلی پتلی اور سرعت سے حرکت کرتی انگلیوں میں کٹکٹا رہی تھیں۔ اس کا مغموم و متفکر چہرہ، جو ایک طرف جھکا ہوا تھا، اسے واضح طور پر نظر آ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے ذرا سا ہلی اور اون کا گولا اس کی گود سے نیچے لڑھک گیا۔ وہ گھبرا گئی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس نے اچٹتی نگاہ اس پر ڈالی، موم بتی کے سامنے اپنے ہاتھ کا پردہ بنایا، محتاط، لچکیلے اور پھرتیلے انداز سے نیچے جھکی، گولا اٹھایا اور دوبارہ پہلے کی طرح بیٹھ گئی۔

وہ حرکت کیے بغیر اس پر نگاہیں گاڑے رہا۔ اس نے دیکھا کہ نیچے جھکنے کے بعد وہ لمبی اور گہری سانس لینا چاہتی ہے لیکن اس نے ایسا کرنے سے احتراز برتا اور بڑے نظم و ضبط سے سانس لیتی رہی۔

ترونتسا خانقاہ میں انھوں نے ماضی کے بارے میں باتیں کی تھیں اور اس نے اسے بتایا تھا کہ اگر وہ زندہ رہا، وہ اپنے زخم کے لیے ہمیشہ خداوند کا شکر ادا کرتا رہے گا کیونکہ یہ زخم ہی تھا جس نے انھیں دوبارہ ملا دیا تھا لیکن اس کے بعد انھوں نے پھر کبھی مستقبل کا ذکر نہ کیا۔

''کیا ایسا ہو سکتا تھا... یا نہیں؟'' اس نے اس کی جانب دیکھتے اور آہنی سلائیوں کی کٹ کٹ سنتے سوچا۔ ''تقدیر نے عجیب و غریب انداز سے ہمیں اسی لیے ملایا تھا کہ میں زندگی کو ہی خدا حافظ کہہ دوں؟ زندگی کی صداقت مجھ پر اسی لیے منکشف کی گئی ہے کہ مجھ پر یہ ظاہر کیا جا سکے کہ میں نے ساری زندگی بطالت میں گزاری ہے؟ میں دنیا کی کسی بھی چیز کی نسبت اس (نتاشا) سے زیادہ پیار کرتا ہوں۔ اگر میں اس سے محبت کرتا ہوں، پھر مجھے کیا کرنا ہوگا؟'' اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور غیر ارادی طور پر اس کی کراہ نکل گئی۔ یوں کراہنے کی عادت اسے اپنے مصائب و آلام کے دور میں ہوئی تھی۔

اس کی آواز سن کر نتاشا نے اپنی جراب نیچے رکھ دی اور اس کی طرف جھک گئی۔ جب اسے اچانک اس کی آنکھیں جگمگاتی دکھائی دیں، وہ ہولے ہولے اس کی طرف گئی اور اس کے اوپر خمیدہ ہو گئی۔

''آپ سو نہیں رہے؟''

''نہیں، میں تمھیں کافی دیر سے دیکھ رہا ہوں۔ میں نے تمھاری آمد محسوس کر لی تھی۔ تمھاری موجودگی میں مجھے

جس قسم کی شیریں طمانیت... جس روشنی... کا احساس ہوتا ہے، کسی اور کی موجودگی میں نہیں ہوتا۔ میں خوشی کے آنسو بہا سکتا ہوں۔''

نتاشا اس کے اور قریب ہوگئی۔ وجد آور مسرت سے اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

''نتاشا، میں تم سے حد سے زیادہ محبت کرتا ہوں۔ مجھے دنیا کی کسی اور شے سے اتنی محبت نہیں جتنی کہ تم سے ہے۔''

''اور میں...'' اور ایک سیکنڈ کے لیے اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ''لیکن حد سے زیادہ کیوں؟'' اس نے پوچھا۔

''حد سے زیادہ کیوں؟... خیر، تمھارا اپنا کیا خیال ہے؟ تم اپنے دل میں، اپنے دل کی گہرائیوں میں کیا محسوس کرتی ہو؟ — کیا میں زندہ رہوں گا؟ تمھارا کیا خیال ہے؟''

''مجھے اس کا یقین ہے، یقین ہے!'' نتاشا نے تقریباً چیختے اور پرجوش انداز سے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑتے ہوئے کہا۔

وہ چندے خاموش رہا۔

''یہ کتنی اچھی بات ہوگی!'' اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس پر بوسہ ثبت کر دیا۔

نتاشا خوش بھی تھی اور مضطرب بھی۔ یک دم اسے احساس ہوا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، اسے سکوت چاہیے۔

''لیکن آپ سوئے نہیں۔'' اس نے اپنی خوشی کو دباتے ہوئے کہا۔ ''سونے کی کوشش کریں... پلیز!''

پرنس آندرے نے اس کا ہاتھ دبایا اور چھوڑ دیا۔ وہ موم بتی کے پاس چلی گئی اور بالکل اسی طرح بیٹھ گئی جس طرح وہ پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے دو مرتبہ مڑ کر اس کی جانب دیکھا اور دونوں مرتبہ اس کی جگمگاتی آنکھیں خود اسی پر مرکوز تھیں۔ اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اپنی جراب بنے گی اور اس سے پہلے ہرگز اس کی طرف نہیں دیکھے گی۔

اور اس کے بعد اس نے واقعی اپنی آنکھیں بند کر لیں اور وہ سو گیا۔ وہ بالکل تھوڑے سے کے لیے سویا اور گھبرا کر جاگ گیا۔ اسے ٹھنڈے پسینے آرہے تھے۔

جب اس کی آنکھ لگی تھی، وہ ابھی تک اسی موضوع — حیات و ممات، لیکن زیادہ تر ممات — کے بارے میں سوچ رہا تھا، جس میں اس کا دماغ ہمیشہ الجھا رہتا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اس کے قریب تر پہنچ گیا ہے۔

''محبت؟ محبت کیا ہے؟'' اس نے سوچا۔ ''محبت موت کے راستے میں رکاوٹ بن جاتی ہے۔ محبت زندگی ہے، وہ سب کچھ، وہ ہر چیز، جو میں سمجھ سکا ہوں، محض اس لیے سمجھ سکا ہوں کیونکہ میں محبت کرتا ہوں۔ ہر وہ چیز جو موجود ہے، اس لیے موجود ہے کیونکہ میں محبت کرتا ہوں۔ سب کچھ صرف محبت سے منسلک ہے۔ محبت خدا ہے اور اگر میں مرجاتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں — محبت کا ایک ذرہ — ہمہ گیر اور ابدی سرچشمے کی طرف لوٹ

جاؤں گا۔"

یہ خیالات اسے تسکین بخش معلوم ہوئے۔ لیکن یہ محض خیالات تھے۔ ان میں کسی چیز کا فقدان تھا۔ وہ ضرورت سے زیادہ یک طرفہ اور ذاتی، ضرورت سے زیادہ تجریدی اور پراگندہ تھے۔ اور وہ اسی سابقہ اضطراب اور ابہام کا شکار ہو گیا۔ اسے نیند آ گئی۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ فی الواقع جس کمرے میں تھا، اسی میں لیٹا ہوا ہے، لیکن وہ زخمی نہیں ہوا بلکہ صحیح سلامت ہے۔ لاتعداد لوگ، حقیر اور غیر اہم لوگ، اس کے سامنے نمودار ہوتے ہیں۔ وہ ان کے ساتھ باتیں کرتا ہے، کسی معمولی مسئلے پر ان سے بحث کرتا ہے۔ وہ وہاں سے کسی اور جگہ جانے کے لیے پر تول رہے ہیں۔ پرنس آندرے کو مبہم طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ بے وقعت اور غیر اہم ہے، اسے ان سے کہیں زیادہ وقیع اور اہم مسائل درپیش ہیں۔ لیکن وہ باتیں کرتا رہتا ہے اور سطحی، کھوکھلی بذلہ سنجی سے انھیں حیران پریشان کر دیتا ہے۔ یہ تمام لوگ بتدریج، غیر محسوس انداز سے غائب ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور ان کی جگہ واحد مسئلہ — بند دروازہ — لے لیتا ہے۔ وہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور دروازے کی چٹخنی چڑھانے اور اس پر تالا لگانے کے لیے اس کی طرف بڑھتا ہے۔ ہر چیز کا انحصار اس بات پر ہے کہ وہ وقت پر تالا لگانے میں کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔ وہ چل پڑتا ہے، تیز تیز قدم اٹھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی ٹانگیں جواب دے جاتی ہیں، وہ حرکت نہیں کرتیں اور اگرچہ اسے معلوم ہے کہ وہ دروازہ بند کرنے کے لیے وقت پر نہیں پہنچ سکے گا، وہ دیوانہ وار اپنی ساری توانائیاں بروئے کار لے آتا ہے۔ اذیت ناک خوف اسے اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور یہ خوف موت کا خوف ہے۔ یہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہے۔ جب وہ بے کسی کے عالم میں اور بے ہنگم انداز سے دروازے کی جانب رینگ رہا تھا، اس منحوس چیز نے اس سے پہلے ہی دروازے کے خلاف زور آزمائی شروع کر دی تھی اور زبردستی اندر داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ کوئی غیر انسانی چیز — موت — بزور اندر داخل ہو رہی ہے، اسے لازماً روکا جانا چاہیے۔ وہ دروازہ پکڑ لیتا ہے، اپنا پورا زور لگا دیتا ہے تاکہ اسے کھلنے سے روک سکے — اب اسے تالا لگانا ممکن نہیں رہا — لیکن اس کی کاوشیں کمزور و ناتواں اور بے اثر ہیں اور وہ دہشت انگیز چیز باہر سے دروازے کو اتنی قوت سے دھکیلتی ہے کہ وہ کھل جاتا ہے اور دوبارہ بند ہو جاتا ہے۔

وہ ایک بار پھر اسے باہر سے دھکا دیتی ہے۔ وہ آخری بار کوشش کرتا ہے، فوق البشر انداز سے زور لگاتا ہے لیکن اس کی تمام مساعی بے کار ثابت ہوتی ہیں۔ دروازے کے دونوں پٹ چر چرائے بغیر کھل جاتے ہیں۔ وہ اندر داخل ہو جاتی ہے۔ یہ موت ہے اور پرنس آندرے کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

لیکن عین اس لمحے جب اس کی موت واقع ہوئی، پرنس آندرے کو یاد آیا کہ وہ تو سویا ہوا تھا اور عین اس لمحے جب اس کی موت واقع ہوئی، اس نے زور لگایا اور وہ بیدار ہو گیا۔

"ہاں، وہ موت تھی۔ میری موت واقع ہو گئی تھی — اور میں بیدار ہو گیا۔ ہاں، موت بیداری ہے!"

اور ایکا ایکی اس کی روح روشنی میں سیراب ہوگئی اور وہ نقاب جو اس کے اور غائب کے مابین حائل تھا، اس کی روحانی بصیرت کے سامنے سے ہٹا لیا گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ قوتیں جو اس کے اندر محبوس تھیں، آزاد ہوگئی ہیں اور تب سے اس عجیب وغریب ہلکے پھلکے پن نے، جو وہ اپنے اندر محسوس کر رہا تھا، دوبارہ اس کا ساتھ نہ چھوڑا۔

جب ٹھنڈے پسینے میں نہائے وہ بیدار ہوا اور اس نے دیوان پر جنبش کی، نتاشا اس کے قریب آئی اور پوچھنے لگی: ''کیا بات ہے؟'' اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا، بس عجیب انداز سے اسے دیکھتا رہا۔

یہ تھا جو پرنس ماریا کی آمد سے دو روز قبل پیش آیا تھا۔ جیسا کہ ڈاکٹر کا کہنا تھا: اس دن سے بخار، جو اس کے جسم کو گھلا رہا تھا، بے قابو ہوگیا اور اس نے مہلک صورت اختیار کر لی۔ تاہم ڈاکٹر جو کچھ کہتا تھا، نتاشا کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اسے محض ہولناک نفسیاتی علامتیں نظر آ رہی تھیں اور اس کے نزدیک وہ کہیں زیادہ قابل اعتبار تھیں۔

اس روز نیند سے سے بیداری پرنس آندرے کے لیے زندگی سے بیداری کا آغاز ثابت ہوئی۔ اور جتنی مدت زندگی کی تھی اس کے تناسب سے یہ بیداری اسے کچھ زیادہ طویل محسوس نہ ہوئی بلکہ کہنا چاہیے کہ بس اتنی ہی طویل تھی جتنی خواب دیکھنے میں گزری مدت کے مقابلے میں نیند سے بیداری معلوم ہوئی تھی۔

❦

اس نسبتاً سست رو بیداری میں کوئی چیز نہ ہولناک تھی اور نہ پر تشدد۔

اس کے آخری ایام اور گھڑیاں سیدھے سادے عام انداز سے گزر گئے۔ پرنس ماریا اور نتاشا، جو ہر دم اس کی پٹی کے ساتھ جڑی رہتی تھیں، دونوں کو یہی گمان گزرا۔ وہ نہ روئیں اور نہ ان پر کپکپی طاری ہوئی۔ اور اواخر میں خود انھیں محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کی نہیں (اب وہ کہاں تھا، وہ تو کہیں اور جا چکا تھا) بلکہ اس کی قریب ترین یاد۔ اس کے جسم — کی خدمت کر رہی ہیں۔ اس چیز کا ان دونوں کو اتنی شدت سے شعور تھا کہ وہ موت کے خارجی اور ہیبت ناک پہلو سے متاثر نہ ہوئیں اور انھیں اپنے غم میں مزید گھلنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ وہ نہ اس کی موجودگی میں اور نہ اس سے پرے روتی تھیں اور نہ اس کے متعلق آپس میں کوئی بات کرتی تھیں۔ انھیں محسوس ہو رہا تھا کہ جو کچھ وہ سمجھ پائی ہیں، اسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

اس سے (گناہوں کا) اعتراف کرایا گیا اور اسے پاک روٹی کھلائی گئی۔ ہر شخص اسے وداع کرنے آیا۔ جب اس کے بیٹے کو اس کے پاس لایا گیا، اس نے اپنے لب اس کے لبوں پر چسپاں کر دیے اور پھر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس نے یہ اس لیے نہیں کیا کیونکہ اسے دکھ ہو رہا تھا یا ترس آ رہا تھا (پرنس ماریا اور نتاشا اس کا مفہوم سمجھ گئیں)، بلکہ محض اس لیے کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس سے جو توقع کی گئی تھی، وہ اس نے پوری کر دی ہے۔ لیکن جب اس سے کہا گیا کہ وہ بچے کے سر پر ہاتھ پھیرے اور اس کے حق میں دعائے خیر کرے، اس نے وہی کیا جو اس سے کہا گیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اپنے گرد وپیش یوں دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ اس کے کرنے کا کوئی کام رہ تو نہیں گیا۔

جب اس پر جان کنی کی کیفیت طاری ہوئی اور اس کی روح نے قفس عنصری سے پرواز کی، پرنس ماریا اور نتاشا دونوں وہاں موجود تھیں۔

جب نعش کو بے حس و حرکت پڑے اور ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھنڈے ہوتے کچھ دیر بیت گئی، پرنس ماریا نے پوچھا: ''قصہ ختم ہوگیا؟''

نتاشا اس کے قریب گئی، اس نے میت کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھا اور پھرتی سے انھیں بند کر دیا۔ اس نے انھیں بند تو کر دیا لیکن انھیں چوما نہیں، بلکہ وہ اس چیز — اس کے جسم — کے ساتھ چمٹ گئی جو اسے سب سے زیادہ اس کی یاد دلاتی تھی۔

''وہ کہاں چلے گئے ہیں؟ وہ اب کہاں ہیں؟...''

❖

جب میت جسے نہلایا اور کفن پہنچایا جا چکا تھا، میز پر تابوت میں پڑی تھی، ہر شخص اسے وداع کرنے آیا۔ وہ بھی رو رہے تھے۔

نکولشکا اس لیے رو رہا تھا کیونکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا اور اسی وجہ سے اس کا دل چھلنی ہو رہا تھا۔
کاؤنٹس اور سونیا اس لیے آنسو بہا رہی تھیں کیونکہ انھیں نتاشا پر ترس آ رہا تھا اور کیونکہ اس کا وجود باقی نہیں رہا تھا۔
رہا کاؤنٹ، اسے اس لیے رونا آ رہا تھا کیونکہ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا اپنا انجام قریب آ گیا ہے اور بہت جلد اسے بھی اسی ہیبت ناک راستے پر چلنا ہوگا۔

نتاشا اور پرنس ماریا بھی رو رہی تھیں لیکن وہ اس لیے نہیں رو رہی تھیں کہ انھیں ذاتی طور پر کوئی دکھ پہنچا تھا۔ وہ اس لیے رو رہی تھیں کہ موت کے اس سادہ اور باوقار اسرار کے سبب، جو ان کے روبرو ظہور ہوا تھا، ان کی روحوں پر جذباتی ہیجان اور ہیبت طاری ہوگئی تھی۔

حصہ دوم

1

انسان کسی بھی واقعے کی تمام وجوہ کا ادراک نہیں کرسکتا، لیکن ان وجوہ کی تہہ تک پہنچنے کی خواہش اس کی روح میں فطرتاً موجود ہوتی ہے۔ جو واقعہ بھی پیش آتا ہے اس کے پیچھے متعدد اور پیچیدہ حالات کارفرما ہوتے ہیں۔ ان حالات کو اگر ایک دوسرے سے الگ الگ کر دیکھا جائے، تو ان میں سے ہر ایک اس واقعے کی وجہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ عقل انسانی حالات کے تعدّد اور پیچیدگیوں کی تحقیق کیے بغیر وجہ سے مشابہ جو ظن وتخمین سب سے پہلے اس کے سامنے آتا ہے، اسے جھپٹ لیتی ہے اور فتویٰ صادر کر دیتی ہے کہ ''بس وجہ یہی ہے۔''

تاریخی واقعات کے سلسلے میں جو (جن میں انسانوں کے افعال مشاہدے کا موضوع بنتے ہیں) قدیم ترین ظن وتخمین لگایا گیا، وہ یہ تھا کہ یہ دیوتاؤں کی مرضی تھی۔ بعد میں یہ ان اشخاص کی، جو واقعات میں سب سے نمایاں ہوتے ہیں اور جنھیں تاریخ کے ہیرو قرار دیا جاتا ہے، مرضی بن گئی۔ لیکن اگر ہم کسی بھی تاریخی واقعے کی سطح کے نیچے جھانک کر دیکھیں اور اس سارے جم غفیر کے افعال کو اپنی مرضی کے تابع بنانا تو کجا، تاریخی ہیرو خود ان کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کا خیال یہ ہو کہ تاریخی واقعات کی تشریح اس انداز سے کی جائے یا اس سے، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ لیکن اس شخص کے، جو یہ کہتا ہے کہ مغربی اقوام نے مشرق کی سمت اس لیے کوچ کیا کیونکہ نپولین یہ چاہتا تھا اور اس شخص کے، جو یہ کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہوا کیونکہ ایسا ہونا ہی تھا، مابین وہی فرق عظیم پایا جاتا ہے جو ان اشخاص کے، جو یہ کہتے ہیں کہ زمین ساکن ہے اور سیارے اس کے گرد گھومتے ہیں اور ان اشخاص کے، جو یہ کہتے ہیں کہ ''ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ کسی چیز نے زمین کو اپنی جگہ تھام رکھا ہے لیکن ہمیں یہ ضرور معلوم ہے کہ زمین اور دیگر سیاروں کی حرکت معین کرنے کے قوانین موجود ہیں،'' مابین پایا جاتا ہے۔ تمام وجوہات میں سے ایک وجہ کے سوا کسی تاریخی واقعے کی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ لیکن واقعات کو جو قوانین متعین کرتے ہیں، وہ لازماً موجود ہوتے ہیں۔ ان میں سے بعض قوانین کی بابت ہم بالکل لاعلم ہیں اور بعض کے سلسلے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے ہیں۔ ان قوانین کا انکشاف صرف تبھی ممکن ہوگا جب ہم بالآخر کسی شخص کی مرضی میں وجہ دریافت کرنے کی کوشش ترک کر دیں گے، بالکل اسی طرح جس طرح سیاروں کی حرکت کے قوانین کی دریافت تبھی ممکن ہوئی جب

انسان اس تصور سے، کہ زمین ساکن ہے، دست بردار ہوا۔

❖

مورخین کے مطابق بارودینو کی لڑائی، ماسکو پر دشمن کے قبضے اور اس کی آگ سے تباہی کے بعد 1812 کی جنگ کا اہم ترین واقعہ ریازان سے کالوگا شاہراہ اور وہاں سے تارُوتینو کیمپ تک روسی فوج کی نقل و حرکت تھی۔ اس نقل و حرکت کو دریائے کراسنایا پاکھرا کے پار "فلینک مارچ"[1] کے گمراہ کن نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ مورخین عبقریت کے اس کارنامے کا سہرا مختلف کمانڈروں کے سر باندھتے ہیں اور صحیح معنوں میں اس سہرے کا مستحق کون ہے، اس بارے میں ان میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ غیر ملکی مورخین بھی۔ بلکہ فرانسیسی مورخین بھی۔ جب اس فلینک مارچ کا ذکر کرتے ہیں تو روسی کمانڈروں کی عبقریت کا اعتراف کرتے ہیں۔ تاہم یہ سمجھنا انتہائی دشوار ہے کہ عسکری مصنفین اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی، اس مخصوص فلینک مارچ کو، جس نے روس کو بچایا اور نپولین کا بیڑا غرق کیا، کسی فرد واحد کے فکر عمیق کا نتیجہ قرار دینے پر کیوں مصر ہیں۔

اولاً یہ سمجھنا ہی مشکل ہے کہ اس فلینک مارچ میں عبقریت اور بصیرت کا دخل ہی کیا ہے کیونکہ یہ تفہیم کرنے کے لیے جب فوج حملوں کا نشانہ بن رہی ہو، تو اس کے لیے بہترین صورت یہ ہے کہ وہاں چلی جائے جہاں رسد کی فراوانی ہو، کسی خاص ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہے، اور ایک تیرہ سالہ کند ذہن چھوکرا بھی یہ قیاس آرائی کر سکتا ہے کہ جب 1812 میں فوج نے ماسکو سے پسپائی اختیار کی، اس کے لیے بہترین صورت یہی ہو سکتی تھی کہ وہ کالوگا روڈ چلی جاتی۔ چنانچہ اول تو یہ سمجھنا ہی ناممکن ہے کہ مورخین نے منطق کے کس اصول کے تحت یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ چال گہری دانش مندی کی حامل تھی۔ دوم، یہ سمجھنا تو اور بھی دشوار ہے کہ وہ روس کی نجات اور فرانسیسیوں کے زوال کو اس چال سے کیونکر منسوب کرتے ہیں، کیونکہ اگر اس چال سے پیشتر، اس کے روبہ عمل آنے کے دوران میں یا اس کے بعد دیگر واقعات پیش آئے ہوتے تو یہ (چال) روسیوں کے لیے تباہ کن اور فرانسیسیوں کے لیے سود مند ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر روسیوں کی حالت واقعی اس مارچ کے ساتھ ہی بہتر ہونا شروع ہو گئی تھی، تو اس سے کسی طرح بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ مارچ ہی اس بہتری کا سبب تھا۔

دوسری قسم کے حالات میں یہ مارچ روسی فوج کو کسی قسم کا فائدہ پہنچانے میں ناکام ہی نہ رہتا بلکہ الٹا اس کی تباہی کا سبب بن جاتا۔ اگر ماسکو جل کر خاکستر نہ ہوتا، پھر کیا ہوتا؟ اگر موغا روسیوں کا نشانِ راہ نہ کھوتا؟ اگر نپولین ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا نہ رہتا پھر؟ اگر، جیسا کہ بے نگ سین اور بارکلے دِتولی نے مشورہ دیا تھا، روسی فوج کراسنایا پاکھرا کے کنارے لڑائی کے لیے صف آرا ہو جاتی تو؟ اگر فرانسیسی، جب روسی پاکھرا ندی کی دوسری جانب کوچ کر رہے تھے، حملہ کر دیتے پھر؟ نپولین نے جس توانائی کا مظاہرہ سمولنسک میں کیا تھا، اگر بعد ازاں تاروتینو پہنچنے پر وہ اس کے دسویں حصے سے بھی حملہ کر دیتا، پھر؟ اگر فرانسیسی پیٹرز برگ پر چڑھائی کر دیتے، پھر؟... اگر ان میں سے

کوئی بھی امکانی صورت پیش آجاتی تو وہی فلینک مارچ، جو نجات کا سبب بنا، تباہی کا موجب بن سکتا تھا۔

تیسرا اور مشکل ترین نکتہ یہ ہے کہ تاریخ کے طالب علم جان بوجھ کر یہ سمجھنے سے پہلوتہی کرتے ہیں کہ اس فلینک کوچ کو کسی شخص واحد سے منسوب نہیں کیا جا سکتا، کسی نے اس کا پیشگی اندازہ نہیں لگایا تھا اور فلی کی سمت پسپائی کی طرح یہ اپنی کامل صورت میں کسی کو سجھائی نہیں دیا تھا بلکہ ــــ لحظہ بہ لحظہ، قدم بہ قدم، واقعہ بہ واقعہ ـــ انتہائی مختلف انواع کے بے شمار واقعات کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوا اور اپنی کامل صورت میں صرف اسی وقت نظر آیا جب اس کی تکمیل ہو چکی تھی اور یہ ماضی کا حصہ بن چکا تھا۔

فلی میں جو کونسل[2] منعقد ہوئی تھی، اس میں تمام کمانڈروں کے اذہان میں صرف یہی خیال سمایا ہوا تھا کہ پسپائی کے لیے بالکل سیدھا راستہ (یعنی نژنی روڈ) اختیار کیا جائے۔ اس کے ثبوت میں یہ شہادت موجود ہے کہ کونسل کی اکثریت نے اس کے حق میں ووٹ دیا تھا، اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کونسل کے اجلاس کے بعد کمانڈر انچیف اور شعبہ رسد کے انچارج لانسکوائے کے مابین جو گفتگو ہوئی تھی، وہ بچے بچے کو معلوم ہے۔ لانسکوائے نے کمانڈر انچیف کو مطلع کیا تھا کہ فوجی رسد زیادہ تر تولا اور ریازان کے صوبوں میں دریائے اوکا کے کنارے مختلف مقامات پر جمع کی گئی ہے اور اگر فوج نے نژنی روڈ کے ساتھ ساتھ پسپائی اختیار کی تو دریائے اوکا،[3] جس کا پاٹ بہت چوڑا ہے، اسے اپنی رسد سے الگ تھلگ کر دے گا کیونکہ سردیوں کا آغاز ہو جانے کے بعد اس دریا کو عبور نہیں کیا جا سکتا۔ پسپائی کے لیے جو راستہ ــــ نژنی روڈ ــــ ابتداً منتخب کیا گیا تھا، وہ بالکل فطری معلوم ہوتا تھا۔ اس سے گریز کرنے کی کیوں ضرورت پیش آئی، یہ اس کی پہلی علامت ہے۔ فوج ریازان روڈ کے اڑوس پڑوس، زیادہ تر جنوباً اور اپنی رسد کے مقامات کے قریب تر کوچ کرتی رہی بعد ازاں فرانسیسیوں کی بے عملی (انھیں یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ روسی فوج کہاں چلی گئی ہے)، تولا کے اسلحہ ساز کارخانوں کے دفاع کے متعلق تشویش اور سب سے بڑھ کر اپنی رسد کے مقامات کے قریب رہنے کے فوائد نے فوج کو مزید جنوب کی طرف جانے پر مجبور کر دیا اور وہ تولا روڈ پر چل پڑی۔ جب مجبوری کے کوچ نے فوج کو پاکھراندی کے پار تولا روڈ پر ڈال دیا، روسی کمانڈروں نے قصبہ پدولسک میں قیام کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اس وقت تاروتینو میں پوزیشن سنبھالنے کا خیال بھی ان کے اذہان میں نہیں آیا تھا۔ تاہم لاتعداد واقعات نے، جن میں فرانسیسی سپاہ کا، جو ازیں پیشتر روسی فوج سے بچھڑ چکی تھی، از سر نو منظر عام پر آنا، معرکے کے لیے صف آرائی کے منصوبوں کا بنایا جانا اور سب سے بڑھ کر صوبہ کالوگا میں رسد کا بہتات سے مہیا ہونا، شامل تھے، ہماری فوج کو مجبور کر دیا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ جنوب کی طرف چلی جائے، تولا روڈ عبور کرے، کالوگا روڈ پہنچے اور وہاں سے تاروتینو کا رخ کرے۔ (تاروتینو ان سڑکوں کے، جن کے ساتھ ساتھ رسد کے ڈپو قائم تھے، مابین واقع تھا۔) جس طرح صحیح صحیح یہ بتانا مشکل ہے کہ ماسکو سے دست برداری اختیار کرنے کا فیصلہ کب ہوا یا کس نے کیا تھا، اسی طرح یہ دعویٰ کرنا بھی کہ تاروتینو جانے کا فیصلہ کب ہوا یا کس نے کیا، ناممکن ہے۔ لاتعداد مختلف عناصر کے منصۂ شہود پر آنے کے بعد ہی، جب فوج وہاں پہنچ گئی، لوگوں نے اپنے آپ کو یہ یقین دلانا شروع کیا کہ یہی وہ چیز

ہے جس کی انھیں خواہش تھی اور جس کی انھوں نے پیش بینی کر لی تھی۔

2

مشہور فلینک مارچ صرف اس چیز پر مشتمل تھا: روسی فوج، جو عملہ آوروں سے بچنے کے لیے سیدھے رخ پسپا ہو رہی تھی، جونہی فرانسیسی سپاہ کی پیش قدمی رکی، اپنے اصل اور سیدھے راستے سے ہٹ گئی اور جب اسے معلوم ہوا کہ اس کا تعاقب نہیں ہو رہا، وہ فطرتاً اس علاقے کی طرف، جہاں رسد وافر مقدار میں دستیاب تھی، کھنچی چلی گئی۔

اگر ہم یہ تصور کرنے کے بجائے کہ روسی فوج کی قیادت نابغۂ روزگار کمانڈروں کے ہاتھوں میں تھی، صرف ایک ایسی فوج کا، جس کا کوئی قائد نہیں تھا، نقشہ ذہن میں جمائیں، پھر یہ سوچیں کہ اس فوج نے کیا کیا ہوتا۔ یہ فوج صرف اتنا کرتی کہ وہ اس خطے میں، جہاں رسد فراواں مقدار میں دستیاب تھی اور جو ملک کا زرخیز ترین اور خوشحال ترین علاقہ تھا، نیم دائرہ بناتی واپس ماسکو کی طرف چل پڑتی۔

نژنی روڈ سے ریازان، تولا اور کالوگا شاہراہوں کی جانب یہ نقل و حرکت اتنی فطری تھی کہ روسی فوج کا ساتھ چھوڑنے اور لوٹ مار کرنے والے بھی اسی سمت میں بھاگنے لگے اور دارالسلطنت پیٹرزبرگ کے حکام نے بھی کوتوزوف سے یہی راستہ منتخب کرنے کا مطالبہ کیا۔ تاروتینو پہنچنے پر کوتوزوف کو زار کا مراسلہ ملا۔ اس میں اسے ایک طرح کی جھاڑ پلائی گئی تھی کہ وہ فوج کو ریازان روڈ کیوں لے گیا تھا اور اسے کالوگا روڈ کے بالمقابل عین اس مقام پر، جہاں وہ زار کا خط پہنچنے سے پہلے ہی پڑاؤ ڈال چکا تھا، قبضہ کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔

بارودینو کی لڑائی اور مہم نے مجموعی طور پر روسی فوج کو جس سمت میں پسپا ہونے پر مجبور کر دیا تھا، وہ اس جانب بھاگتی رہی۔ جب خطرہ ٹل گیا اور بھاگنے کی ضرورت ختم ہو گئی کیونکہ اب اس کا تعاقب نہیں ہو رہا تھا، فوج نے وہ پوزیشن، جو (ان حالات میں) اس کے لیے فطری تھی، اختیار کر لی۔

کوتوزوف کا وصف، جیسا کہ کہا جاتا ہے، یہ نہیں تھا کہ اس نے عبقریت کی حامل حربی چال چلی تھی بلکہ اس کا کمال یہ تھا کہ وہ واحد شخص تھا جس نے جو کچھ وقوع پذیر ہو چکا تھا، اس کی معنویت سمجھ لی تھی۔ وہ واحد آدمی تھا جس نے ان ایام میں فرانسیسی فوج کی عدم مشغولیت کا صحیح مفہوم اخذ کیا۔ وہ واحد شخص تھا جو یہ دعویٰ کرتا رہا کہ بارودینو کی لڑائی میں روسیوں کو فتح حاصل ہوئی تھی۔ صرف وہی۔ کمانڈر انچیف کی حیثیت سے اس سے یہ توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ جارحانہ کارروائیوں کی حمایت کرے گا — ایک آدمی تھا جس نے روسی فوج کو بے سود جھڑپوں میں الجھنے سے روکنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو اس کے بس میں تھا۔

بارودینو میں جو درندہ زخمی ہوا تھا، وہیں پڑا تھا جہاں راہ فرار اختیار کرنے والے شکاری نے اسے چھوڑا تھا، مگر آیا وہ ابھی تک زندہ اور توانا تھا یا محض مکر کر رہا تھا، شکاری کو اس کا کوئی علم نہ ہو سکا۔ ایکا ایکی اس درندے کی کراہیں سنائی دینے لگیں۔

زخمی درندے (فرانسیسی فوج) کے کراہنے اوراس کی حالت کے تشویش ناک صورت اختیار کر جانے کا اندازہ اس بات سے ہوا کہ اس نے صلح کے لیے سلسلہ جنبانی کا آغاز کیا اور اس ضمن میں لوغستوں[4] کو تجاویز دے کر کوتوزوف کے پڑاؤ میں بھیج دیا۔

نپولین نے اپنی معمول کی خوداعتمادی کے ساتھ، کہ جو کچھ وہ سوچتا ہے درست ہوتا ہے، کوتوزوف کو جو الفاظ اس کے ذہن میں آئے، تحریر کر دیے حالانکہ وہ بالکل بے معنی تھے۔

"موسیول پرنس کوتوزوف[*] (اس نے تحریر کیا): میں آپ کے ساتھ باہمی دلچسپی کے مختلف مسائل کے بارے میں تبادلہ خیالات کرنے کے لیے اپنا ایک ایجوٹنٹ جنرل بھیج رہا ہوں۔ یوئر ہائی نس سے میری التجا ہے کہ یہ آپ سے جو کچھ عرض کرے، خاص طور پر جب یہ آپ کے ادب واحترام کے بارے میں، جو آپ کے لیے میرے دل میں کافی عرصے سے موجود رہا ہے، جن خیالات وجذبات کا اظہار کرے، آپ اس کا اعتبار کریں۔ چونکہ اس خط کا اور کوئی مقصد نہیں ہے، چنانچہ، موسیول پرنس کوتوزوف، میں خداوند سے دعا گو ہوں کہ وہ آپ کو اپنے مقدس اور کریمانہ حفظ وامان میں رکھے۔

نپولین،

ماسکو، 30 اکتوبر 1812

کوتوزوف نے جواب دیا:

اگر میرے متعلق کسی کے دل میں یہ خیال بھی آ گیا کہ میں نے اس قسم کا سمجھوتا کرنے کی پہل کی تھی، ہمارے اخلاف مجھ پر ہمیشہ لعنت بھیجتے رہیں گے۔ میری قوم کا جذبہ اس وقت یہی ہے۔

تاہم اپنی سپاہ کو غنیم پر حملہ کرنے سے روکنے کے لیے وہ اپنے تمام اختیارات بروئے کار لاتا رہا۔

اس مہینے نے، جو فرانسیسیوں نے ماسکو میں لوٹ مار کرنے میں اور روسیوں نے تاروتینو میں پڑاؤ ڈال کر خاموش پڑے رہنے میں گزارا، دونوں فوجوں کی اضافی قوت (جذبے اور تعداد دونوں اعتبار سے) میں تبدیلی پیدا کر دی اور اس کے نتیجے کے طور پر روسی سپاہ کی برتری واضح ہو گئی۔

اگرچہ روسیوں کو فرانسیسیوں کی حالت اور تعداد کے متعلق کوئی معلومات حاصل نہیں تھیں، جونہی یہ تبدیلی رونما ہوئی، لاتعداد علامتوں نے حملہ کرنے کی ضرورت اجاگر کر دی۔ علامات یہ تھیں: لوغستوں کا امن مشن: تاروتینو میں رسد

* Monsieur le prince Koutouzov

کی فراوانی: فرانسیسیوں کی عدم مشغولیت اور بدنظمی کے بارے میں اطلاعات (جو چاروں اطراف سے موصول ہورہی تھیں): ہمارے دستوں کی نفری میں روز بروز اضافہ: خوشگوار موسم: طویل آرام (جس سے روسی جوان لطف اندوز ہوچکے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ جس کام کے لیے انھیں بھرتی کیا گیا تھا، وہ اسے سرانجام دینے کے لیے بے صبر ہورہے تھے): یہ جاننے کا تجسس کہ فرانسیسی فوج میں، جسے اتنے عرصے سے دیکھا نہیں گیا تھا، کیا ہو رہا ہے: ہماری بیرونی چوکیوں کی جرأت و دلیری (اس کا مظاہرہ فرانسیسیوں کے بالکل قریب ریکی کر کے کیا جارہا تھا): فرانسیسیوں پر کسانوں اور گوریلا دستوں کی آسان فتوحات (ان کی وجہ سے دوسروں میں رشک وحسد کے جذبات ابھر رہے تھے): انتقام کی خواہش (جب تک فرانسیسی ماسکو میں مقیم رہے، یہ تمام روسی قلوب میں بھڑکتی رہی) اور سب سے بڑھ کر یہ دھندلا شعور کہ فوجوں کی اضافی قوت تبدیل ہوچکی ہے اور اب نردیں ہمارے ہاتھ میں آچکی ہیں (یہ شعور ہر فوجی جوان کے ذہن میں نمو پا رہا تھا)۔ یوں مخالف افواج کی اضافی قوت میں ٹھوس تبدیلی آچکی تھی اور پیش قدمی ناگزیر ہوگئی تھی۔ جس طرح جب منٹ کی سوئی پورے دائرہ کا سفر مکمل کرلیتی ہے، گھنٹہ ٹنٹنانے لگتا ہے، بعینہٖ ان علامتوں نے تبدیلی کا گجر بجانا شروع کردیا تھا۔ اس تبدیلی کا عکس اونچے حلقوں کی مصروفیات، باتوں اور شکایتوں میں نظر آنے لگا تھا۔

3

روسی فوجوں کی کمان کوتوزوف اور اس کے سٹاف کے ہاتھوں میں تھی اور ادھر پیٹرزبرگ سے امپراطور اپنے احکام ارسال کرتا رہتا تھا۔ اتراک ماسکو کی خبر پیٹرزبرگ پہنچنے سے پہلے ہی پوری مہم کا تفصیلی منصوبہ بنایا اور کوتوزوف کو اس کی رہنمائی کے لیے بھیجا جاچکا تھا۔ اگرچہ یہ منصوبہ اس مفروضے پر ترتیب دیا گیا تھا کہ ماسکو ابھی تک ہمارے قبضے میں ہے، (کوتوزوف کے) سٹاف نے اس پر صاد کردیا اور اسے لائحۂ عمل کے طور پر قبول کرلیا۔ البتہ کوتوزوف نے صرف یہ تبصرہ کیا کہ جو منصوبے دور بیٹھ کر بنائے جائیں، انھیں عملی جامہ پہنانا مشکل ہوتا ہے۔ چنانچہ ان مشکلات کو، جن کے پیش آنے کا احتمال ہوسکتا تھا، دور کرنے کے لیے اسے تازہ ہدایات ارسال کردی گئیں۔ اسی پر اکتفانہ کیا گیا بلکہ مزید عملہ بھی روانہ کردیا گیا، جس کا کام کوتوزوف کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنا اور ان کے متعلق رپورٹیں بھیجنا تھا۔

علاوہ ازیں روسی افواج کی پوری اعلیٰ کمان کی از سرِ نو تنظیم کی گئی۔ وہ عہدے پر کیے جانا تھے، جو باگ راتیاں (جو ہلاک ہوگیا تھا) اور بارکلے (جو ناراض ہوگیا تھا اور فوج سے ریٹائر ہوچکا تھا) نے خالی کیے تھے۔ اس مسئلے کو کہ آیا ب کی جگہ الف اور د کی جگہ ب یا اس کے برعکس الف کی جگہ د وغیرہم کی تعیناتی بہتر رہے گی، سنجیدہ غور و فکر کا مستحق سمجھا گیا۔۔۔ اس قسم کی تبدیلیوں سے الف یا ب کی تسلی تو شاید ہوجاتی لیکن اسے پیش یوں کیا گیا جیسے ان سے کچھ زیادہ حاصل کرنا مقصود تھا۔

کوتوزوف اور اس کے چیف آف سٹاف، بے نِگ سین کے مابین مخاصمت، امپراطور کے با اعتماد نمائندوں

کی موجودگی اوران نئے تبادیوں وتقرریوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ مختلف گروہوں کے مابین سازشوں کا سلسلہ معمول سے زیادہ پیچیدہ صورت اختیار کر گیا۔ الف ب کی، ب ج کی اور ج د کی ہر ممکن طریقے اور انداز سے ٹانگ کھینچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جوڑ توڑ کی ان تمام کارروائیوں میں سازش کا موضوع عام طور پر یہ ہوتا تھا کہ جنگ کیسے لڑی جائے۔ یہ اشخاص بزعمِ خویش یہ سمجھتے تھے کہ جنگ کی لگام ان کے ہاتھوں میں ہے حالانکہ جنگ ان لوگوں سے بالا بالا اپنے ناگزیر راستے پر جا رہی تھی۔ اس راستے کی ان کی تجاویز کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں تھی، اسے تو عوام کا بنیادی رویہ متعین کر رہا تھا۔ یہ تمام تجاویز ایک دوسری سے متضاد و متصادم تھیں اور صرف اونچے حلقوں میں انھیں آئندہ پیش آنے والے واقعات کا عکاس تصور کیا جاتا تھا۔

''پرنس میخائیل الاری اوناوچ،'' زار نے دو اکتوبر کو ایک مراسلے میں تحریر کیا جو کوتوزوف کو تاروتینو کی لڑائی کے بعد موصول ہوا:

ماسکو دو ستمبر سے دشمن کے قبضے میں ہے۔ تمھاری آخری رپورٹوں پر بیس تاریخ مندرج تھی۔ اس عرصے کے دوران میں نہ صرف یہ کہ دشمن کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور قدیمی دار السلطنت کو چھڑانے کی کوئی کوششیں نہیں ہوئی، بلکہ تمھاری آخری رپورٹوں کے مطابق تم مزید پیچھے پسپا ہو گئے ہو۔ سرپوخوف[5] پر پہلے ہی غنیم کے دستوں کا قبضہ ہو چکا ہے اور تولا خطرے کی زد ہے جہاں مشہور و معروف اسلحہ خانہ، جو فوج کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ جنرل ونٹ ٹنگے روڈے کی (فرستادہ) اطلاعات سے مجھے معلوم ہوا ہے کہ دشمن کی ایک کور، جس کی نفری دس ہزار ہے، پیٹرزبرگ روڈ کی طرف بڑھ رہی ہے۔ دوسری، جس کی تعداد ہزاروں افراد ہے، دمتروف کو گھیرے میں لے رہی ہے۔ تیسری ولادی میر روڈ پر نقل و حرکت کر رہی ہے۔ چوتھی نے، جس کی تعداد اور قوت اچھی خاصی ہے، روزا اور موژیسک کے مابین ڈیرے ڈال لیے ہیں۔ خود نپولین ابھی پچیس تاریخ تک ماسکو میں تھا۔ ان تمام اطلاعات کے پیشِ نظر، جب دشمن کی افواج بڑی بڑی ٹکڑیوں میں منقسم ہو چکی ہیں اور جب نپولین اور اس کے گارڈ ابھی ماسکو میں ہیں، کیا یہ ممکن ہے کہ دشمن کی وہ فوج، جو تمھارا سامنا کر رہی ہے، اتنی طاقتور ہے کہ تم اس کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے عاجز ہو؟ اس کے برعکس یہ فرض کیا جا سکتا ہے کہ اغلباً چند دستے یا زیادہ سے زیادہ ایک کور تمھارا تعاقب کر رہی ہے اور دشمن کی یہ سپاہ اس فوج سے، جو تمھاری تحویل میں ہے، کہیں کمزور ہے۔ قرائن سے یہی نظر آتا ہے کہ اگر تم ان مواقع سے فائدہ اٹھاتے تو تم اس پر حملہ کر کے اسے ملیامیٹ کر سکتے یا کم از کم اسے پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے تھے اور ان صوبوں کے، جن پر اسے وقت غنیم قابض ہے، خاصے بڑے حصوں پر دوبارہ قبضہ کر سکتے تھے، اور اس طرح تولا اور اندرون ملک دیگر قصبوں کو جو خطرہ لاحق ہے، اس کا دفعیہ کر سکتے تھے۔ اگر دشمن کسی بھی تعداد میں اپنی فوج کے کسی حصے کا رخ پیٹرزبرگ کی طرف موڑنے اور یوں دار السلطنت کے لیے،

جہاں سپاہ کی معقول نفری جمع رکھنا ناممکن ہے، خطرے کا سبب بننے میں کامیاب ہوگیا، تو اس کی ذمے داری سراسر تمھارے سر ہوگی، کیونکہ اگر تم اس فوج کو، جو تمھارے سپرد کی گئی ہے، صحیح طریقے سے استعمال کرو، عزم صمیم اور زور شور سے اپنا فرض نبھاؤ، تو تمھارے پاس اتنے ذرائع ہیں کہ تم کسی مزید تباہی کا تدارک کر سکتے ہو۔ یاد رکھو کہ تم نے ابھی تک ماسکو کے ہاتھ سے نکل جانے کا جواب دینا ہے جس پر سارا ملک سوگوار ہے۔ تمھیں تجربہ ہو چکا ہے کہ میں تمھیں انعامات واکرامات سے نوازنے کے لیے آمادہ رہتا ہوں۔ اس آمادگی میں کوئی کمی نہیں آئے گی لیکن مجھے اور روس کو تم سے یہ توقع کرنے کا حق حاصل ہے کہ تم جوش و جذبے اور استقامت کا مظاہرہ کروگے اور کامیابی حاصل کروگے۔ تمھاری ذہانت، عسکری صلاحیتیں اور تمھاری زیر کمان افواج کی جرأت و دلیری امید دلاتی ہیں کہ تم عنقریب کامیابی سے ہمکنار ہوگے۔

لیکن یہ خط— یہ اس امر کی واضح علامت تھا کہ پیٹرز برگ میں بھی متخالف افواج کی اضافی قوت کا احساس ہونے لگا تھا— ابھی راستے میں ہی تھا کہ دشمن سے ایک جھڑپ ہوگئی کیونکہ اب کوتوزوف فوج کو جارحانہ کارروائی کرنے سے باز نہیں رکھ سکا تھا۔

2 اکتوبر کو ایک قازق نے، جس کا نام شاپووالوف تھا اور جو گشتی دستے کا رکن تھا، ایک خرگوش ہلاک اور دوسرا زخمی کر دیا۔ زخمی خرگوش کے تعاقب میں وہ جنگل میں بہت دور نکل گیا اور پھرتے پھراتے غیر متوقع طور پر موغا کے میسرے کے قریب پہنچ گیا جو کسی قسم کے پہرے کے بغیر وہاں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ قازق نے ہنس ہنس کر اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ فرانسیسیوں کے ہتھے چڑھنے سے بال بال بچا۔ ایک لیفٹیننٹ نے بھی یہ کہانی سن لی اور اس نے اپنے کمانڈر کو جا سنائی۔

قازق کو بلایا گیا اور اس پر جرح کی گئی۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر قازق افسران چند گھوڑے پکڑنا چاہتے تھے لیکن ان میں سے ایک نے، جس کی اعلیٰ حکام سے شناسائی تھی، ایک جرنیل کو، جو سٹاف میں شامل تھا، اس واقعے کی اطلاع دے دی۔ حال ہی میں سٹاف کے ارکان کے باہمی تعلقات انتہائی کشیدہ ہو چکے تھے۔ چند روز پیشتر سٹاف کا ایک رکن جنرل یرمالوف بے نِگ سین کے پاس گیا تھا اور اس نے اس سے التجا کی تھی کہ وہ کمانڈر انچیف پر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرے اور اسے حملہ کرنے کے لیے آمادہ کرے۔

"اگر میں تمھیں جانتا نہ ہوتا تو مجھے خیال آتا کہ تم جس چیز کا مطالبہ کر رہے ہو، تم درحقیقت وہ چاہتے نہیں ہو۔ میرا صرف مشورہ دینے کی دیر ہے اور ہز سیرین ہائی نس یقیناً اس کے بالکل الٹ کام کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔"

جو خبر قازق لایا تھا اور جس کی گشتی دستے نے تصدیق کر دی تھی، اس بات کا ثبوت تھی کہ حملے کی مناسب گھڑی آگئی ہے۔ کس کر بندھا ہوا تار ڈھیلا ہوگیا، چرخیاں گھر گھر کرنے اور گھنٹہ ٹنٹنانے لگا۔ اپنے تمام تر ظاہری اختیارات، دانش، تجربے اور علم کے باوجود کوتوزوف نے بے نگ سین (جو زار کو نجی رپورٹیں ارسال کرتا رہتا تھا) کے

رقعے، ان خواہشات، جو عام مفروضے کے مطابق امپراطور کی تھیں، اس اطلاع، جو قازق لایا تھا اور اس تمنا پر، جس کا اظہار تمام جرنیلوں نے یکساں انداز سے کیا تھا، غور کیا اور اس نے وہ کام کرنے کا، جو اس کی اپنی نظروں میں بے سود اور ضرر رساں تھا، حکم دے دیا اور اس حقیقت پر، جو تکمیل تک پہنچ چکی تھی، مہر تصدیق ثبت کر دی۔

4

بے نگ سین کا رقعہ اور قازق کی رپورٹ کہ فرانسیسیوں کا میسرہ پہرے کے بغیر ہے، اس امر کی محض آخری علامتیں تھیں کہ حملہ کرنا ناگزیر ہو گیا ہے اور اس کام کے لیے اکتوبر کی پانچ تاریخ طے پا گئی۔

چار تاریخ کی صبح کو توزوف نے افواج کی تقسیم و ترتیب کے منصوبے پر دستخط کر دیے۔ ٹول نے اسے پڑھ کر یرمالوف کو سنایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ضروری انتظامات کرے۔

''بہت اچھا، بہت اچھا۔ فی الحال میرے پاس وقت نہیں ہے۔'' یرمالوف نے کہا اور باہر نکل گیا۔

ٹول نے تقسیم و ترتیب کا جو منصوبہ بنایا تھا، وہ بہت اچھا تھا۔ اوسٹرلٹس کی طرح ہر چیز کاغذ پر تحریر کر دی گئی تھی۔ ویسے اس مرتبہ جرمن زبان استعمال نہیں کی گئی تھی۔

''پہلا کالم ان ان مقامات کی طرف اور دوسرا ان ان مقامات کی طرف کوچ کرے گا'' وغیرہ وغیرہ۔ کاغذ پر یہ تمام کالم مقررہ اوقات پر متعینہ مقامات پر پہنچ جاتے ہیں اور دشمن کا قلع قمع کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ تقسیم و ترتیب میں عام طور پر ہوتا ہے، ہر چیز قابل تحسین انداز سے سوچی گئی تھی اور جیسا کہ عموماً ہوتا ہے ایک بھی کالم صحیح وقت پر صحیح مقام پر نہ پہنچ سکا۔

جب ضرورت کے مطابق منصوبے کی نقول تیار ہو گئیں، ایک افسر کو حکم دیا گیا کہ وہ انھیں یرمالوف کو پہنچا دے تاکہ وہ تجاویز کو عملی جامہ پہنچا سکے۔ یہ افسر نوجوان تھا، اس کا تعلق ہارس گارڈز سے تھا اور وہ کوتوزوف کا اردلی افسر تھا۔ جو مشن اس کے سپرد کیا گیا تھا، اس پر بہت خوش تھا۔ وہ یرمالوف کی قیام گاہ کی طرف چل پڑا۔

''وہ کہیں باہر گئے ہوئے ہیں،'' یرمالوف کے اردلی نے جواب دیا۔

ہارس گارڈز کا افسر اس جرنیل کے ہاں چلا گیا، جہاں یرمالوف اکثر پایا جاتا تھا۔

''نہیں، وہ یہاں نہیں آئے اور نہ خود جرنیل اندر ہیں۔'' اسے بتایا گیا۔

افسر ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور کسی اور کے ہاں چل دیا۔

''نہیں، وہ اندر نہیں ہیں۔''

''خدا کرے کہ اس تاخیر کے لیے مجھے ذمے دار نہ ٹھہرایا جائے! کیا مصیبت ہے!'' افسر نے سوچا۔

وہ سارے پڑاؤ کے چکر کاٹتا پھرا۔ ایک شخص نے اسے بتایا کہ اس نے یرمالوف کو چند جرنیلوں کے ساتھ گزرتے دیکھا ہے۔ دوسروں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ لازماً اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچ گیا ہوگا۔ افسر نے کھانا کھائے

کے لیے کہیں رکے بغیر شام کے چھ بجے تک اپنی تلاش جاری رکھی۔ نہ یرمالوف ملا اور نہ کوئی بتا سکا کہ وہ کہاں مل سکتا ہے۔ اپنے ایک رفیق کار کے ہاں جلدی جلدی کچھ زہر مار کرنے کے بعد افسر دوبارہ ہراول دستوں میں میلورادووچ کو تلاش کرنے نکل پڑا۔ میلورادووچ بھی نہ ملا لیکن یہاں اسے بتایا گیا کہ وہ جنرل کیکن کے ہاں بال میں شریک ہونے گیا ہے اور اغلباً یرمالوف بھی وہیں ہے۔

''مگر کہاں؟''

''ارے ادھر، یچکینو میں۔'' ایک قازق افسر نے دور کسی رئیس کے دیہی مکان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''کیا۔ ہماری صفوں کے پار؟''

''ہماری دو رجمنٹیں بیرونی چوکیوں کی طرف بھیج دی گئی ہیں اور وہاں آج خوب داد عیش دے رہی ہیں۔ صحیح معنوں میں مزے لیے جا رہے ہیں۔ دو بینڈ ہیں۔ تین گلوکاروں کے طائفے ہیں۔...''

افسر ہماری صفوں کے پار یچکینو چلا گیا۔ ابھی وہ دور ہی تھا کہ اس کے کانوں میں فوجی جوانوں کے رقص کی دل آویز اور چنچل دھنوں کی آوازیں پڑنے لگیں۔ وہ کورس گا رہے تھے۔

''چرا... گاہوں میں... چرا... گا گاہوں میں!'' نغمے کے ساتھ ساتھ سیٹیاں بج رہی تھیں اور توربان[6] کی آوازیں چیخ چہاڑے میں ڈوب رہی تھیں۔

جوں جوں افسر سنتا گیا، توں توں اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہوتا گیا۔ لیکن اسے یہ خوف بھی کھائے جا رہا تھا کہ اسے اہم حکم پہنچانے کی جو ذمے داری سونپی گئی تھی، اس سے عہدہ برآ ہونے میں تاخیر کا الزام اس کے سر آئے گا۔ اب تقریباً نو بج چکے تھے۔ وہ گھوڑے سے اترا اور خاصے بڑے دیہی مکان کے، جو فرانسیسی اور روسی صفوں کے مابین یوں کا توں کھڑا رہا تھا، پورچ کی طرف پیدل چل پڑا۔ پیش دالان اور ریفریشمنٹ روم میں باوردی ملازمین اشیائے خورونوش اٹھائے ادھر ادھر گھوم پھر رہے تھے۔ گلوکاروں کے طائفے دریچوں کے نیچے کھڑے تھے۔ افسر کو اندر آنے کی اجازت مل گئی اور اسے چشم زدن میں فوج کے بڑے بڑے جرنیل وہاں اکٹھے نظر آ گئے۔ ان میں یرمالوف کی بھاری بھرکم اور بارعب شخصیت بھی شامل تھی۔ ان سب کے کوٹوں کے بٹن کھلے تھے۔ ان کے چہرے دمک رہے تھے اور ان سے جوش و خروش کا اظہار ہوتا تھا۔ وہ نیم دائرہ بنائے کھڑے اور کھل کر قہقہے لگا رہے تھے۔ کمرے کے درمیان میں ایک پست قامت اور خوب رو جرنیل، جس کا چہرہ سرخ تھا، پھرتی اور جوش و جذبے سے trepak رقص کر رہا تھا۔

''کھی، کھی! واہ، واہ! بہت خوب نکولائی ایوانوچ، واہ، واہ، واہ!''

ایسے موقع پر اتنا اہم کام لے کر پہنچنے پر افسر اپنے آپ کو دوہرا مجرم تصور کرنے لگا اور وہ شاید انتظار کرنے کو ترجیح دیتا لیکن اس پر ایک جرنیل کی نظر پڑ گئی اور یہ سن کر کہ وہ کس سلسلے میں آیا ہے، اس نے یرمالوف کو مطلع کر دیا۔ یرمالوف تیوریاں چڑھائے آگے آیا، افسر نے جو کچھ کہنا تھا، اس نے وہ سنا اور ایک لفظ کہے بغیر اس سے

کاغذات وصول کر لیے۔

''وہ محض اتفاقاً تو ادھر نہیں گیا ہوگا، کیا خیال ہے تمھارا؟'' ہارس گارڈز کے ایک افسر نے پوچھا، جو سٹاف میں شامل تھا۔ ''ارے بالکل نہیں۔ اس نے یہ حرکت جان بوجھ کر کی کیونکہ وہ کانووتسن کو مصیبت میں پھانسنا چاہتا ہے۔ کل جو گڑبڑ ہوگی وہ تم خود دیکھ لو گے۔''

5

اگلی صبح نحیف ونزار، بڈھا پھوس کوتوزوف تڑکے ہی بیدار ہو گیا۔ اس نے عبادت کی، وردی پہنی اور اس آگہی کے ساتھ کہ اسے لڑائی کی نگرانی کرنا ہے جسے وہ پسند نہیں کرتا تھا، اپنی کالاش میں سوار ہوا اور لتاشاوکا گاؤں سے چل پڑا۔ جو تاروتینو سے ساڑھے تین میل دور تھا، اس مقام کی طرف، جہاں حملہ کرنے والے دستوں نے جمع ہونا تھا۔ وہ اونگھنے لگتا، پھر جاگ پڑتا اور دائیں طرف فائرنگ کی، جو شاید یہ ظاہر کر سکے کہ لڑائی کا آغاز ہو گیا ہے، آوازیں سننے کی کوشش کرنے لگتا۔ مگر چاروں اطراف خاموشی کا دور دورہ تھا۔ مرطوب اور بادلوں میں مستور خزانی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جب کوتوزوف تاروتینو پہنچا، اس نے سواروں کو اپنے گھوڑوں کو پانی پلانے کے لیے اس سڑک کے، جس پر وہ خود آ رہا تھا، پار لے جاتے دیکھا۔ کوتوزوف نے اپنی چندھی آنکھوں سے ان پر نظر ڈالی، اپنی گاڑی روکی اور ان سے پوچھنے لگا کہ ان کا تعلق کس رجمنٹ سے ہے۔ وہ اس کالم کا حصہ تھے جسے بہت دیر پہلے محاذ پر ہونا اور شب خون مارنے میں مصروف ہونا چاہیے تھا۔

''شاید کوئی غلطی ہو گئی ہے،'' بوڑھے کمانڈر انچیف نے سوچا۔

لیکن ذرا ہی آگے اسے پیادہ رجمنٹیں نظر آئیں۔ ان کے ہتھیار ایک جگہ ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے اور نوجوان جانگیے پہنے اپنا دلیا پکانے اور سوختنی لکڑی ڈھونے میں مصروف تھے۔ اس نے ایک افسر کو بلایا۔ اس نے اسے بتایا کہ انھیں پیش قدمی کرنے کا کوئی حکم نہیں ملا۔

''یہ کیسے۔۔'' کوتوزوف نے کہنا شروع کیا لیکن اس نے اپنے آپ کو روک لیا اور سینئر افسر کو بلا بھیجا۔

وہ اپنی کالاش سے نیچے اتر آیا اور انتظار کے دوران میں اپنا سر جھکائے اور زور زور سے سانس لیتا آگے پیچھے چکر لگاتا رہا۔ جب آئی خین آیا، جو جنرل سٹاف کا افسر تھا اور جسے اس نے بلایا تھا، کوتوزوف غصے سے لال بھبوکا ہو گیا، اسے لیے نہیں کہ اس غلطی کا الزام اس افسر پر عاید ہوتا تھا بلکہ اس لیے کیونکہ اس کی نظروں میں وہ اتنا اہم ضرور تھا کہ وہ اس پر اپنا غصہ جھاڑ سکتا تھا۔ کپکپاتے ہانپتے بوڑھے آدمی پر غیظ وغضب کا وہ دورہ پڑ گیا جس میں وہ بعض اوقات زمین پر لوٹنے پوٹنے لگتا تھا۔ وہ نیچے جھاڑ کر آئی خین کے پیچھے پڑ گیا، مکے لہرا لہرا کر اسے دھمکیاں دینے، اس پر چیخنے چنگھاڑنے اور اسے ننگی گالیاں دینے لگا۔ ایک اور افسر، کیپٹن بروزن کا بھی یہی حشر ہوا جو سراسر بے قصور تھا اور جو محض اتفاق سے ادھر آ نکلا تھا۔

"یہ تم کس قسم کے Canaille* ہو؟ میں سب کی کھالیں ادھڑوا دوں گا! لچے، لفنگے کہیں کے!" اس نے زبیٹھی ہوئی آواز میں چلا کر کہا۔ اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگی تھیں۔ لیکن وہ ابھی تک اپنا باز و لہرائے جا رہا تھا۔

اس کی جسمانی حالت قابل رشک نہیں تھی۔ اب وہ مزید بدتر ہو گئی تھی۔ وہ کمانڈر انچیف تھا، ہز سیرین ہائی نس کہلاتا تھا، اس کے متعلق ہر شخص یہ کہتا تھا کہ جو اختیارات اسے حاصل ہیں، آج تک روس میں کسی شخص کو نہیں ملے اور اس کا حال یہ ہو گیا کہ وہ ساری فوج کا نشانۂ تضحیک بن گیا! "آج مجھے عبادت ختم کرنے میں اتنی جلد بازی نہیں کرنا چاہیے تھی اور نہ چھوٹی چھوٹی جزئیات پر غور کرنے کے لیے ساری رات جاگتے رہنا چاہیے تھا!" اس نے سوچا۔ "جب میں محض نوآموز افسر تھا، کسی شخص کی مجال نہیں تھی کہ وہ میرا اس طرح مذاق اڑاتا... اور اب!" وہ صحیح معنوں میں اپنے جوڑ جوڑ میں درد محسوس کرنے لگا جیسے اسے جسمانی سزا ملی ہو اور وہ غصے اور اذیت سے چیخیں مارنے لگا۔ بہت جلد اس کی ہمت جواب دینے لگی اور اپنے گرد و پیش نظریں دوڑانے کے بعد اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اتنا زیادہ کچھ کہہ گیا ہے جو اسے کہنا نہیں چاہیے تھا۔ وہ اپنی کالاش میں سوار ہو گیا اور چپ چاپ واپس چلا گیا۔

جب ایک مرتبہ اس کا غبار نکل گیا، اسے دوبارہ غصہ نہ آیا۔ وہ ناتوانی سے اپنی آنکھیں جھپکاتا تمام عذر اور تاویلیں سنتا رہا (یرمالوف اسے اگلے روز تک ملنے نہ آیا۔) بے نگ سین، کانوونِتسن اور ٹول نے اصرار کیا کہ جس منصوبے پر عمل درآمد کے سلسلے میں گڑبڑ ہو گئی ہے، اسے اگلے روز بروئے کار لایا جانا چاہیے اور کوتوزوف کو ایک بار پھر ان کی ہاں میں ہاں ملانا پڑی۔

6

اگلے روز شام تک فوجی دستے اپنے اپنے متعینہ مقامات پر جمع ہو گئے اور رات کے دوران میں پیش قدمی کرنے لگے۔ یہ خزانی رات تھی۔ آسمان پر گہرے اودے بادل چھائے ہوئے تھے لیکن پانی نہ برسا۔ اگرچہ زمین مرطوب تھی مگر اس پر کیچڑ نہیں تھی اور فوجی دستے کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر آگے بڑھتے رہے۔ صرف کبھی کبھار توپوں کے ٹکرانے کی ہلکی آواز سنائی دے جاتی۔ جوانوں کو اونچے لہجوں میں باتیں کرنے، پائپ پینے یا آگ جلانے کی ممانعت تھی اور ان کی کوشش یہی تھی کہ وہ گھوڑوں کو بھی ہنہنانے سے باز رکھیں۔ مہم کی رازداری نے اس کی جاذبیت میں اضافہ کر دیا تھا۔ کوچ کے دوران میں جوانوں کے چہروں پر شگفتگی اور زندہ دلی جھلک رہی تھی۔ متعدد کالم یہ فرض کرتے ہوئے کہ وہ اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے ہیں۔ رک گئے۔ انھوں نے اپنے ہتھیاروں کے نیچے ڈھیر لگا دیے اور خود ٹھنڈی زمین پر بیٹھ گئے۔ دوسرے (اور یہ اکثریت میں تھے) ساری رات چلتے رہے اور بظاہر ان مقامات پر، جہاں انھیں نہیں جانا چاہیے تھا، پہنچ گئے۔

کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف واحد شخص تھا جو اپنے قازقوں (ان کا دستہ سب سے کم اہم تھا) کی معیت میں

* لچا، لفنگا، بدمعاش

صحیح وقت پر صحیح جگہ پہنچا۔ وہ اور اس کے ساتھی اس راستے رک گئے جو سترومیلا وو گاؤں سے قصبہ دمتر وسک کی طرف جاتا تھا۔

جب پو پھٹنے لگی، کاؤنٹ کارلوف۔ دینی سوف کو، جسے اونگھ آ گئی تھی، جگا دیا گیا۔ فرانسیسی فوج کا ایک بھگوڑا اس کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ وہ پونیا توسکی کی کور کا پولستانی سارجنٹ تھا اور اس نے پولستانی زبان میں انھیں بتایا کہ وہ اپنی فوج سے اس لیے فرار ہوا ہے کیونکہ ملازمت میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں ہوا تھا۔ اسے مدتوں پہلے (کمشنڈ) افسر بنا دیا جانا چاہیے تھا کیونکہ وہ ان سب سے زیادہ دلیر تھا لیکن وہ ابھی تک سارجنٹ ہی تھا۔ اب وہ انھیں اس لیے چھوڑ کر آیا ہے کیونکہ وہ ان سے بدلہ لینا چاہتا ہے۔ اس نے بتایا کہ جہاں وہ ہیں، موغا شب گزاری کے لیے وہاں سے صرف پون میل دور قیام پذیر ہے اور اگر وہ انھیں صرف سو جوانوں پر مشتمل حفاظتی دستہ فراہم کر دیں، وہ اسے زندہ پکڑ لائے گا۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے اپنے ساتھی افسروں کے ساتھ صلاح مشورہ کیا۔ پیشکش اتنی دلکش تھی کہ اسے ٹھکرانا ممکن نہیں تھا۔ ہر شخص نے جانے کے لیے رضا کارانہ اپنے آپ کو پیش کر دیا کیونکہ وہ سبھی کوشش کرنے کے حق میں تھے۔ خاصے لمبے بحث مباحثے اور تو تو میں میں کے بعد طے پایا کہ میجر جنرل گریکوف اور دو قازق رجمنٹیں پولستانی بھگوڑے کے ساتھ جائیں گے۔

''ٹھہرو، یاد رکھو۔'' کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے سارجنٹ کو رخصت کرتے ہوئے کہا: ''اگر تم نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے، میں تمھیں کتے کی موت مروا دوں گا۔ لیکن جو کچھ تم نے کہا ہے اگر وہ سچ ثابت ہوا، پھر تمھیں سو اشرفیاں انعام میں ملیں گی۔''

سارجنٹ نے کوئی جواب نہ دیا اور عزم بالجزم کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور گریکوف کے ساتھ چل پڑا، جس کے جوان جھٹ پٹ اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ جنگل میں غائب ہو گئے۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف صبح سویرے کی سردی میں کانپ رہا تھا اور جو کچھ وہ اپنے ذمے داری پر کر رہا تھا، اس نے اسے ہیجانی کیفیت میں مبتلا کر دیا تھا۔ وہ گریکوف کو خدا حافظ کہنے کے بعد جنگل سے واپس آ گیا اور مڑ کر حریف کے پڑاؤ کو دیکھنے لگا، جو صبح کی سپیدی اور پڑاؤ کے بجھتے ہوئے الاؤوں کی پر فریب روشنی میں نظر آنے لگا تھا۔ ہمارے دوسرے کالموں کو اس کے دائیں ہاتھ کھلی ڈھلوان پر نظر آنا چاہیے تھا۔ اس نے اس سمت میں دیکھا۔ اگرچہ یہ کالم بہت فاصلے سے دکھائی دے جانا چاہیے تھے مگر ان کا دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ فرانسیسی پڑاؤ میں ہل چل شروع ہو گئی ہے اور اس کے اس مشاہدے کی تصدیق اس کے تیز نظر ایجوٹنٹ نے کر دی۔

''اف، واقعی بہت دیر ہو گئی ہے،'' کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے پڑاؤ کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ جونہی وہ شخص، جس پر ہم نے اعتبار کیا ہوتا ہے، نظروں سے اوجھل ہوتا ہے، ہمیں گھدبدی ہونے لگتی ہے کہ کہیں ہمارے ساتھ ہاتھ ہی نہ ہو گیا ہو۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ اسے تو بالکل غیر مبہم طور پر یقین ہو گیا کہ سارجنٹ فریب کار تھا، وہ اس سے جی بھر کر جھوٹ بول گیا ہے اور

خدا معلوم دونوں رجمنٹوں کو کہاں لے گیا ہے۔ ان رجمنٹوں کی عدم موجودگی میں حملے کا سارا منصوبہ غارت ہو جائے گا۔ کوئی اتنے بڑے عسکری انبوہ میں اس کے کمانڈر انچیف کو زبردستی کیسے اٹھا کر لا سکتا ہے؟

''مجھے یقین ہے کہ یہ بدمعاش ہمیں جُل دے گیا ہے،'' کاؤنٹ نے کہا۔

''انھیں اب بھی واپس بلایا جا سکتا ہے۔'' اس کے ایک سٹاف افسر نے کہا۔ دشمن کے پڑاؤ کی طرف دیکھتے ہوئے کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف کی طرح اس کے دل میں بھی اس مہم کے بارے میں شبہات سر اٹھانے لگے تھے۔

''ہا! واقعی؟... تمھارا کیا خیال ہے؟ انھیں جانے دینا چاہیے یا نہیں؟''

''آپ انھیں واپس بلانا چاہتے ہیں؟''

''ہاں، نہیں واپس بلا لاؤ، واپس بلا لاؤ!'' کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر اچانک فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کام میں بہت تاخیر ہو جائے گی۔ پہلے ہی اچھی خاصی روشنی ہو چکی ہے۔''

اور ایجوٹنٹ گریکوف کے پیچھے جنگل میں سرپٹ گھوڑا دوڑانے لگا۔ جب گریکوف واپس آ گیا، کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف اس مہم کو منسوخ کرنے، پیادہ کالموں کا، جو ابھی تک نظر نہیں آئے تھے، بے سود انتظار کرنے اور پھر دشمن کے اتنا قریب ہونے کی وجہ سے ہیجانی کیفیت میں مبتلا ہو چکا تھا (اس کے تمام عسکریوں کی بھی یہی حالت تھی)۔ اس نے حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

''سوار ہو جاؤ!'' اس نے سرگوشیوں میں حکم دیا۔

عسکریوں نے اپنی اپنی پوزیشنیں سنبھال لیں اور اپنے سینوں پر صلیب کے نشانات بنانے لگے۔

''آگے بڑھو! خدا تمھارا حامی و ناصر ہو!''

''ہر۔را۔ا۔ا!'' نعرے سے جنگل گونجنے لگا اور قازق اپنی شمشیریں آگے جھکائے یکے بعد دیگرے یوں آگے بڑھنے لگے جیسے کوئی انھیں بوری سے باہر انڈیل رہا ہو۔ انھوں نے ہنستے مسکراتے ندی کے اوپر چھلانگیں لگائیں اور پڑاؤ کی جانب بھاگنے لگے۔

جس اولین فرانسیسی سپاہی کی نظر قازقوں پر پڑی، مایوسی اور خوف کے عالم میں اس کی چیخ نکل گئی۔ پڑاؤ میں افراتفری برپا ہو گئی۔ نیم غنودہ اور نیم برہنہ لوگ بگنالیں، دستی بندوقیں چھوڑ چھاڑ، جس کا جدھر منہ سمایا، ادھر بھاگ پڑے۔

فرانسیسی اپنے پیچھے کیا چھوڑ گئے تھے یا قازقوں کے گرد و پیش کیا پڑا تھا، اگر وہ اس کی پروا نہ کرتے، انھوں نے موغا کو پکڑ لیا ہوتا اور جو کچھ وہاں موجود تھا، وہ بھی ان کے قبضے میں آ جاتا۔ افسروں نے ان سے یہی کچھ کرانے کی کوشش کی لیکن ایک بار جب مال غنیمت اور قیدی قازقوں کے ہاتھ لگ گئے، انھیں وہاں سے ہلانا ناممکن ہو گیا۔ کسی نے احکام کی پروا نہ کی۔ پرچموں کے علاوہ پندرہ سو قیدی، اڑتیس بندوقیں اور قازقوں کے نقطۂ نظر سے اہم ترین ــ گھوڑے، زینیں، جھولیں اور ایسی ہی دیگر اشیا قبضے میں آ گئیں۔ ان سب اشیا کو سمیٹنا، قیدیوں اور بندوقوں کو

سنبھالنا اور مال غنیمت کو تقسیم کرنا تھا۔ خوب شور وغل ہوا اور آپس میں سر پھٹول تک نوبت پہنچ گئی۔ قازقوں کی ساری توجہ اسی کام پر مرکوز تھی۔

چونکہ فرانسیسیوں کا تعاقب نہیں کیا گیا تھا، وہ از سر نو اکٹھے ہونے اور صف بندی کرنے لگے۔ اس کے بعد انھوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف نے۔ جو ابھی تک پیادہ کالموں کا انتظار کر رہا تھا، مزید پیش قدمی نہ کی۔

دریں اثنا تقسیم و ترتیب کے مطابق کہ "پہلا کالم روانہ ہوگا" وغیرہ وغیرہ، دیر گرفتہ کالموں کے دستے، جن کی کمان بے نگ سین کے ہاتھوں میں تھی اور جن کی رہنمائی ٹول کے ذمے تھی، مناسب وقت پر روانہ ہو چکے تھے اور معمول کے مطابق کہیں نہ کہیں تو پہنچ گئے لیکن اس جگہ نہیں، جہاں انھیں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ ہوتا چلا آیا ہے، جوان روانہ تو خوش خوش ہوئے تھے مگر اب ان کے قدم سست پڑ گئے تھے اور بے اطمینانی کا اظہار ہونے لگا تھا۔ کسی کو کچھ پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور بالآخر وہ پیچھے مڑنے لگے۔ ایجوٹنٹ اور جرنیل ادھر ادھر گھوڑے دوڑاتے پھر رہے تھے، چیخ چنگھاڑ رہے تھے، غصے سے لال پیلے ہو رہے تھے اور آپس میں جھگڑ رہے تھے اور کہہ رہے تھے: "ہم غلط سمت میں آ نکلے ہیں اور ہمیں دیر بھی ہو گئی ہے۔" وہ ایک دوسرے سے دشنام طرازی کر رہے تھے اور انجام کار نقل و حرکت کی خاطر آگے بڑھنے لگے۔ "ہم کہیں نہ کہیں تو پہنچیں گے ہی!" اور وہ واقعی کہیں تو پہنچ ہی گئے لیکن اس جگہ نہیں جہاں انھیں پہنچنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور چند ایک جو آخر کار صحیح مقام پر پہنچے بھی، تو اتنی تاخیر سے کہ ان کا آنا نہ آنا برابر ہو گیا۔ صرف اتنا ہوا کہ وہ اپنے اوپر فائرنگ کرانے عین وقت پر آ گئے۔ ٹول، جس نے اس لڑائی میں وہی کردار ادا کیا جو وے روٹر نے اوسٹرلٹس میں کیا تھا، جاں فشانی سے ادھر ادھر گھوڑا دوڑائے پھرتا رہا لیکن وہ جہاں بھی گیا، اسے معاملات زیر وزبر نظر آئے۔ یوں پھرتے پھراتے جنگل میں اس کا سامنا (جنرل) باگووت کی کور سے ہو گیا۔ دن خاصا چڑھ آیا تھا جب کہ باگووت کی کور کو اس سے بہت پہلے کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف کے دستے کے ساتھ جا ملنا چاہیے تھا۔ اس ناکامی پر ٹول کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور یہ فرض پورا کرتے ہوئے کہ کوئی نہ کوئی تو اس ناکامی کا ذمے دار ہوگا، وہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتے کور کمانڈر کے پاس پہنچا اور اسے سخت سست سنانے لگا۔ اس نے تو اسے یہ بھی کہہ دیا کہ اسے گولی مار دینا چاہیے۔ جنرل باگووت دھیمے مزاج کا سخت کوش اور تجربہ کار لڑاکا سپاہی تھا۔ اس تاخیر، افراتفری اور متضاد احکام نے اس پر بھی جھلاہٹ طاری کر دی تھی۔ یہ دیکھ کر کہ اپنے مزاج کے برعکس وہ بھی طیش میں آ گیا ہے، ہر شخص کی سٹی گم ہو گئی۔

"میرا کسی بھی شخص سے درس لینے کا کوئی ارادہ نہیں، تاہم کسی بھی دوسرے شخص کی طرح میں موت کو گلے لگانا جانتا ہوں۔" اس نے کہا اور ایک ہی ڈویژن کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

آگے بڑھتے بڑھتے جب یہ جری جرنیل غنیم کی فائرنگ کی زد میں آیا، وہ رکا نہیں بلکہ اپنے جوانوں کے ساتھ مزید آگے چلا گیا۔ اپنی ہیجانی کیفیت میں اس نے یہ سوچا ہی نہیں کہ محض ایک ڈویژن فوج کے ساتھ میدان

کارزار میں کودنے سے کچھ حاصل بھی ہوگا یا نہیں۔ غصیلی کیفیت میں میں اسے جن چیزوں کی ضرورت تھی، وہ صرف خطرہ، توپوں کے گولے اور بندوق کی گولیاں ہی تو تھیں۔ گولیوں کی پہلی بوچھاڑ میں ایک گولی اس کے جسم کے پار ہوگئی اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اس کے متعدد جوان بھی اس کے ساتھ کھیت رہے۔ اس کی ڈویژن چندے فائرنگ کا سامنا کرتی رہی مگر حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔

7

دریں اثنا ایک اور کالم کو سامنے سے فرانسیسیوں پر حملہ کر دینا چاہیے تھا لیکن اس کالم کے ساتھ کوتوزوف تھا۔ وہ خوب جانتا تھا کہ اس لڑائی سے، جس کا ڈول اس کی مرضی کے خلاف ڈالا گیا تھا، افراتفری اور انتشار کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ چنانچہ جہاں تک اس کے بس میں تھا، اس نے اپنی سپاہ پیچھے روکے رکھی اور کوئی پیش قدمی نہ کی۔

کوتوزوف اپنے پست قامت سرمئی گھوڑے پر چپ چاپ چلتا رہا۔ اسے حملے کی جو تجویز بھی پیش کی جاتی، وہ اس کا بڑے دھیمے لہجے سے جواب دے دیتا۔

''لفظ 'حملہ' ہر وقت آپ لوگوں کی زبان پر رہتا ہے لیکن آپ حضرات یہ نہیں سوچتے کہ ہم میں پیچیدہ چالیں چلنے کی سکت نہیں ہے۔'' اس نے میلورادووچ سے کہا، جس نے حملہ کرنے کی اجازت مانگی تھی۔

''آپ لوگ آج صبح موغا کو قیدی نہ بنا سکے اور نہ وہاں وقت پر پہنچ سکے۔ اب کرنے کو کچھ نہیں رہا،'' اس نے ایک اور جرنیل کو جواب دیا۔

جب کوتوزوف کو مطلع کیا گیا کہ فرانسیسیوں کے عقب میں اب دو پولستانی بٹالینیں ہیں جب کہ قازقوں کے بیان کے مطابق ازیں پیشتر ایک بھی نہیں تھی، اس نے ترچھی نگاہوں سے یرمالوف کی طرف دیکھا جس سے اس نے گزشتہ روز کلام نہیں کیا تھا۔

''ادھر یہ لوگ ہر وقت 'حملہ، حملہ، حملہ' کی رٹ لگائے رکھتے ہیں اور طرح طرح کے منصوبے پیش کرتے رہتے ہیں لیکن جب عمل کا وقت آتا ہے، کچھ بھی تیار نہیں ہوتا اور دشمن، جسے پیشگی اطلاع مل چکی ہوتی ہے، مناسب انتظامات کر لیتا ہے۔''

یہ الفاظ سن کر یرمالوف نے اپنی آنکھیں سکیڑیں اور اس کے لبوں پر خفیف مسکراہٹ آگئی۔ اسے معلوم تھا کہ جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے، طوفان گزر چکا ہے اور کوتوزوف محض اتنا اشارہ دے کر مطمئن ہو جائے گا۔

''وہ مجھے نشانہ بنا کر محظوظ ہو رہا ہے،'' یرمالوف نے رایئف سکی سے، جو اس کے قریب کھڑا تھا، گھٹنے کو ٹھوکا لگاتے ہوئے زیر لب کہا۔

اس کے کچھ ہی دیر بعد یرمالوف کوتوزوف کے قریب آیا اور بصد احترام کہنے لگا:

''یور ایکسی لینسی، ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ دشمن ابھی گیا نہیں۔ اگر آپ حملے کا حکم دے دیں... ورنہ گارڈز کو

بارود کی بو تک سونگھنے کا موقع نہیں ملے گا۔''

کوتوزوف نے کوئی جواب نہ دیا تاہم اسے جب اطلاع ملی کہ موغا کی سپاہ پیچھے ہٹ رہی ہے، اس نے آگے بڑھنے کا حکم دے تو دیا لیکن وہ ہر سو گز چلنے کے بعد پون پون گھنٹے کے لیے رک جاتا۔

آرلوف۔ دینی سوف کے قازق جو کچھ کر چکے تھے، ساری لڑائی کا حاصل اس سے زیادہ کچھ نہ نکلا۔ باقی فوج کے سینکڑوں آدمی محض مفت میں گنوا دیے گئے۔

البتہ اس لڑائی کا یہ نتیجہ ضرور برآمد ہوا کہ کوتوزوف کو ایک تمغے سے، جو ہیرے سے مرصع تھا، نواز دیا گیا، بے نگ سین کو چند جواہرات اور ایک ہزار روبل انعام میں عطا ہوگئے۔ دوسرے جرنیلوں کو اپنے اپنے مرتبے کے مطابق تسلی بخش اعزازات مل گئے اور جھڑپ کے بعد سٹاف میں مزید تبدیلیاں کر دی گئیں۔

''ہمارے ہاں کام ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔۔۔ ہر چیز اتھل پتھل کر دی جاتی ہے۔'' روسی افسروں اور جرنیلوں نے تاروتینو کی لڑائی کے بعد رائے ظاہر کی۔ جیسا کہ آج کل لوگ کرتے ہیں انھوں نے اپنی اس رائے کا اظہار کھلے لفظوں میں تو نہ کیا البتہ اتنا ضرور اشارہ دے دیا کہ کوئی احمق شخص غلطیوں پر غلطیاں کیے جا رہا ہے۔ ورنہ جہاں تک ان کا اپنا تعلق ہے، وہ تمام معاملات مختلف انداز سے سنبھال لیتے۔ تاہم جو لوگ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، یا تو انھیں معلوم ہی نہیں ہوتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں، یا پھر وہ اپنے آپ کو دیدہ دانستہ فریب دیتے ہیں۔ کوئی لڑائی بھی۔۔۔ خواہ یہ تاروتینو میں لڑی گئی ہو، بارودینو میں یا اوسٹرلٹس میں۔۔۔ اس طرح نہیں لڑی جاتی جس طرح کہ منصوبہ سازوں کو اس کی توقع ہوتی ہے۔ یہ تو حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنا رخ متعین کرتی ہے۔

لڑائی کیا رخ اختیار کرے گیا، اس کا انحصار آزادانہ کام کرنے والی لاتعداد قوتوں (کیونکہ آدمی لڑائی کے دوران میں، جہاں مسئلہ حیات و ممات کا ہوتا ہے، جتنا آزاد ہوتا ہے، اتنا کہیں بھی نہیں ہوتا) پر ہوتا ہے اور اس کے رخ کا کبھی پیشگی اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور یہ کبھی کسی واحد قوت کے فیصلوں یا ہدایات کے مطابق متعین نہیں کیا جا سکتا۔

اگر مختلف رخوں میں چلائی جانے والی بہت سی قوتیں بیک وقت اپنے اپنے انداز میں کسی معین قالب پر اثر انداز ہوں، تو قالب جس رخ پر چل نکلے گا وہ ان میں سے کسی بھی قوت کا راستہ نہ ہوگا۔۔۔ وہ ہمیشہ ایک درمیانی بلکہ یوں کہیے، مختصر ترین راستہ اختیار کرے گا، وہی راستہ جس کی نمائندگی میکانیات میں قوتوں کے متوازی الاضلاع کا وتر کرتا ہے۔

مورخین، بالخصوص فرانسیسی مورخین نے جس طرح واقعات کو بیان کیا ہے، اگر ان میں ہمیں جنگیں اور لڑائیاں کسی پیشگی طے شدہ منصوبے کے مطابق پایہ تکمیل تک پہنچتی نظر آتی ہیں تو ان سے جو واحد نتیجہ ہم اخذ کر سکتے ہیں، وہ یہ ہے کہ یہ بیانات صحیح نہیں ہیں۔

تاروتینو کی لڑائی سے بظاہر اس ہدف کی، جو ٹول کے پیش نظر تھا، تحصیل نہیں ہوئی۔ اس نے فوج کی تقسیم و ترتیب کا ایک منصوبہ بنایا تھا اور وہ اس منصوبے کے مطابق لڑائی لڑنا چاہتا تھا۔ جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا، اس کے

ذہن میں اس قسم کی کوئی بات نہیں تھی جیسا کہ کاؤنٹ آرلوف۔ دینی سوف کے ذہن میں آئی (وہ موغا کو قیدی بنانا چاہتا تھا)، نہ وہ پوری فرانسیسی فوج کو ایک ہی ہلے میں تہس نہس کرنا چاہتا تھا (جیسا کہ بے نگ سین اور دوسروں نے شاید سوچا ہو)، نہ اس کا مقصد اس افسر کا مقصد تھا جو لڑائی میں محض شہرت اور ناموری کمانا چاہتا تھا اور نہ اس کا ہدف قازقوں (جو مال غنیمت وہ حاصل کر چکے تھے، وہ اس پر اکتفا نہیں کر رہے تھے بلکہ مزید ہاتھ مارنا چاہتے تھے) کے ہدف سے کوئی مطابقت رکھتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر لڑائی کا مقصد واقعی وہی تھا جو نتیجے کی شکل میں ہمارے سامنے آیا اور جس کے اس زمانے کے تمام روسی متمنی تھے ــ فرانسیسیوں کو روس سے باہر دھکیلنا اور ان کی فوج کو نیست و نابود کرنا ــ پھر یہ بالکل ظاہر ہے کہ تاروتینو کی لڑائی (محض اس لیے کہ اس میں جو کچھ ہوا، اس کی منصوبے کے ساتھ کوئی مطابقت نہیں تھی) عین مین وہی چیز تھی جس کی جنگ کے اس مرحلے میں ضرورت تھی۔ اس لڑائی کا فی الواقعی جو نتیجہ برآمد ہوا، اس سے زیادہ برمحل اور باموقع نتیجے کا تصور کرنا مشکل ہی نہیں، ناممکن بھی ہے۔ کم سے کم طاقت صرف کرنے اور کامل انتشار و افراتفری کے مابین معمولی نقصانات اٹھانے کے بعد ساری جنگ کے انتہائی اہم نتائج حاصل کر لیے گئے: پسپائی پیش قدمی میں تبدیل ہوگئی، فرانسیسیوں کی کمزوری آشکار ہوگئی اور نپولین کی فوجوں کو راہ فرار اختیار کرنے کے لیے جس دھکے کی ضرورت تھی، وہ دے دیا گیا۔

8

نپولین de la Moscowa* کی شاندار فتح کے بعد ماسکو میں داخل ہوتا ہے۔ اس کی فتح کے بارے میں کوئی شبہ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ میدان کارزار فرانسیسیوں کے قبضے میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ روسی پسپا ہو جاتے ہیں اور اپنا دارالسلطنت اس کے حال پر چھوڑ جاتے ہیں۔ ماسکو، جس میں اشیائے خورونوش، ہتھیاروں اور گولہ بارود کی فراوانی ہے اور جس کی دولت بے حد و حساب ہے، نپولین کے قبضے میں چلا جاتا ہے۔ روسی فوج، جو قوت کے اعتبار سے فرانسیسی فوج کا صرف نصف ہے، پورے مہینے کے دوران میں ایک بھی جارحانہ کارروائی کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ نپولین کی پوزیشن اس سے زیادہ باوقار ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ بچی کھچی روسی فوج پر دگنی قوت سے حملہ کر سکتا ہے اور اسے نیست و نابود کر سکتا ہے، اپنے حق میں صلح کے لیے مذاکرات کر سکتا ہے اور انکار کی صورت میں پیٹرز برگ کی طرف کوچ کر سکتا اور اس کے لیے خطرہ بن سکتا ہے اور اگر اس میں کسی وجہ سے ناکامی ہوتی ہے سمولنسک یا ولنا واپس جا سکتا ہے یا ماسکو میں ہی قیام پذیر رہ سکتا ہے۔ الغرض فرانسیسی فوج اس وقت جس باوقار پوزیشن میں تھی، اسے برقرار رکھنے کے لیے کسی غیر معمولی عبقریت کی ضرورت نہیں تھی۔ صرف انتہائی سیدھے سادے اور آسان ترین اقدامات اٹھانے جانا چاہئیں تھے: عسکریوں کو لوٹ مار کرنے سے روکا جاتا، گرم ملبوسات اور وردیاں تیار کرائی جاتیں (ماسکو میں اتنا کپڑا موجود تھا کہ تمام فوج کی ضروریات پوری ہو سکتی تھیں) اور رسد کی فراہمی کا منظم طریقے سے بندوبست کیا جاتا (خود

* مسکوا۔ فرانسیسی بارودینو کو مسکوا کہتے تھے۔

فرانسیسی مصنفین کا بیان ہے کہ اس وقت ماسکو میں اتنی اشیائے خورد نوش موجود تھیں کہ چھ مہینے فوج کا گزارہ ہو سکتا تھا)۔ اس کے باوجود نابغوں کے نابغے نپولین نے، جسے مورخین کے دعووں کے مطابق فوج پر مکمل کنٹرول حاصل تھا، ان میں سے ایک بھی کام نہ کیا۔

اس نے نہ صرف ان میں سے کوئی کام نہ کیا بلکہ اس کے برعکس اس نے ان راستوں میں سے، جو اس کے سامنے کھلے تھے، صرف وہ منتخب کیا جو انتہائی احمقانہ اور تباہ کن تھا۔

اس کے سامنے متعدد مختلف صورتیں موجود تھیں۔ وہ سردیاں ماسکو میں گزار سکتا تھا۔ پیٹرز برگ یا نزنی نوو گورد کا رخ کر سکتا تھا یا نسبتاً ذرا زیادہ شمالی یا جنوبی راستہ اختیار کر کے واپس جا سکتا تھا (مثلاً وہ اس سڑک پر، جس پر بعد میں کوتوزوف اپنی فوج لے گیا، سفر کر سکتا تھا)۔ مگر اس نے حقیقتاً جو کچھ کیا، اس سے زیادہ احمقانہ اور تباہ کن بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اکتوبر تک ماسکو میں پڑا رہا۔ یوں اس نے فوج کو شہر میں لوٹ مار کرنے کا موقع فراہم کیا۔ پھر کچھ حیص بیص کے بعد کہ اسے ماسکو میں کچھ فوج چھوڑنا چاہیے یا نہیں، وہ شہر سے نکل گیا اور لڑائی لڑے بغیر کوتوزوف کے قریب پہنچ گیا۔ اس کے بعد وہ دائیں جانب مڑا اور اتنی دور چلا گیا کہ مالا یاروسلاوتس پہنچ گیا۔ یہاں بھی اس نے نہ غنیم کی صفوں میں شگاف ڈالنے اور نہ اس سڑک کو، جس پر کوتوزوف نے سفر کیا تھا، اختیار کرنے کی کوشش کی، اس کے برعکس وہ موژیسک سمولنسک سڑک پر پڑ گیا، جو بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ جیسا کہ انجام کار ثابت ہوا، فوج کے لیے اس سے زیادہ احمقانہ یا ضرر رساں اقدام اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اگر نپولین کا مقصد اپنی فوج کو نیست و نابود کرانا تھا، روسی فوج اس ضمن میں کیا کرتی، اسے تو چھوڑیں، حربیات کا ہوشیار ترین ماہر بھی ایسے اقدامات تجویز نہ کر سکتا جو بے خطا انداز سے اور مکمل طور پر اس مقصد کو پورا کر سکتے۔

نپولین نے، جسے نابغۂ روزگار کہا جاتا ہے، یہی کیا۔ لیکن یہ دعویٰ کرنا کہ نپولین نے اپنی فوج اس لیے تباہ کرا دی کیونکہ وہ اسے تباہ کرانا چاہتا تھا یا اس لیے کیونکہ وہ انتہائی احمق تھا، اتنا ہی خلاف انصاف ہو گا جتنا یہ ادعا کرنا غلط ہو گا کہ وہ اپنی فوج کو اس لیے ماسکو لایا کہ وہ اسے وہاں لانا چاہتا تھا یا یہ کہ وہ انتہائی ہوشیار اور نابغۂ روزگار شخص تھا۔

دونوں صورتوں میں اس کے ذاتی افعال اسی طرح کسی اہمیت سے معریٰ تھے جس طرح کہ کسی معمولی سپاہی کے۔ وہ محض ان قوانین کی، جنھوں نے اس واقعے کا متعین کیا، متابعت کر رہے تھے۔

جب مورخین یہ کہتے ہیں کہ نپولین کی صلاحیتوں کو ماسکو میں زنگ لگنا شروع ہو گیا تھا (محض اس لیے کیونکہ نتائج نے اس کے افعال کو صحیح ثابت نہیں کیا تھا)، تو وہ بالکل غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ نپولین نے، جیسا کہ وہ اس سے پہلے کرتا چلا آیا تھا اور جیسا کہ اس نے بعد میں 1813 میں کیا،[8] اپنی ساری قابلیت اور توانائی اپنی اور اپنی فوج کی بہتری کے لیے صرف کر دی۔ مصر، اطالیہ، آسٹریا اور پرشیا کی طرح اس کی یہاں بھی کارروائیاں کم متحیر کن نہیں تھیں۔ تاہم ہم یقین کے ساتھ یہ بات نہیں کہہ سکتے کہ مصر میں — جہاں "چالیس صدیاں"[9] اس کے دشکوہ وجلال کا مشاہدہ کر رہی تھیں" — اس کی عبقریت کس حد تک بے عیب تھی کیونکہ وہاں اس نے جتنے بھی کارنامے سرانجام

دیے، وہ گلہم صرف فرانسیسوں نے بیان کیے ہیں۔ ہم آسٹریا اور پرشیا میں اس کی عبقریت کا محاکمہ نہیں کر سکتے کیونکہ ہمیں اپنی معلومات کے لیے فرانسیسی یا جرمن مصادر پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور جب پوری کور کسی قسم کا مقابلہ کیے بغیر نا قابل فہم انداز سے سپر انداز ہو جاتی ہو اور محاصرہ بھی نہ ہو، پھر بھی قلعوں کے قلعے اس کے رحم و کرم پر چھوڑ دیے جاتے ہوں، پھر جرمنوں کو لامحالہ اس جنگ کی، جو ان کی سرزمین پر لڑی گئی، توضیح کے لیے اس کی عبقریت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

لیکن خدا کا شکر ہے کہ ہمارے لیے اپنی خجالت کی پردہ پوشی کے لیے اس کی عبقریت کو تسلیم کرنا ضروری نہیں ہے۔ ہم نے اس معاملے کا سیدھے سادے اور راست نما انداز سے جائزہ لینے کی قیمت چکائی ہے اور ہم اس حق سے دست بردار نہیں ہوں گے۔

ماسکو کے قیام کے دوران میں اس نے جو کچھ کیا، وہ اتنا ہی تحیر انگیز اور پر از ذہانت تھا جتنے کہ کسی اور مقام پر اس کے افعال تھے۔ داخلے کے دن سے روانگی کی گھڑی تک وہ حکم پر حکم دیتا رہا اور منصوبے پر منصوبہ بناتا رہا۔ شہر کے باشندوں یا کسی وفد کی عدم موجودگی اس کے حوصلے پست نہ کر سکی۔ مسئلہ اپنی فوج کی بہبود کا ہو یا اپنے دشمنوں کی کارروائیوں کا، روسی عوام کی فلاح کا ہو یا پیرس میں معاملات کی دیکھ بھال کا، یا متوقع امن کی شرائط سے متعلق متقضیات کا، اس کی نظروں سے کچھ بھی اوجھل نہیں تھا۔

9

جہاں تک عسکری امور کا تعلق ہے، نپولین نے ماسکو میں داخل ہونے کے معاً بعد جنرل سیاس تیانی[10] کو روسی فوج کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے سخت احکام دیے، مختلف شاہراہوں پر فوجی کوریں روانہ کیں اور کوتوزوف کو ڈھونڈنے کا فریضہ موغا کے سپرد کیا۔ پھر اس نے کریملن کے دفاع کو مضبوط بنانے کے لیے سوچ سمجھ کر ہدایات دیں اور روس کی ساری سرزمین پر مستقبل کی جنگ لڑنے کا شاندار منصوبہ بنایا۔

جہاں تک سفارتی امور کا تعلق ہے، اس نے کیپٹن یا کوولیف[11] کو بلایا (کیپٹن یا کوولیف کو لوٹ لیا گیا تھا۔ وہ چیتھڑوں سے بدن ڈھانپے پھر رہا تھا۔ وہ ماسکو سے نکلنا چاہتا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے؟) اور اس کے سامنے اپنی پالیسی اور فیاضی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ امپراطور الیکساندر کے نام ایک مکتوب تحریر کیا جس میں اس نے اپنے دوست اور بھائی کو یہ بتانا اپنا فرض گردانا کہ رستوپ چن ماسکو کے امور سلیقے سے نمٹانے میں ناکام رہا ہے اور یا کوولیف کو پیٹرزبرگ روانہ کر دیا۔

پھر اس نے اسی طرح اپنے خیالات اور دریا دلی کی وضاحت طوطلمن[12] کے سامنے کی اور اس بوڑھے شخص کو بھی مذاکرات کے لیے پیٹرزبرگ بھیج دیا۔

اس کے بعد اس نے اپنی توجہ قانونی اور عدالتی امور کی طرف مبذول کی۔ مختلف مقامات پر آگ بھڑکنے

کے واقعات رونما ہورہے تھے۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ مجرموں کو تلاش کیا جائے اور انھیں گولی ماردی جائے۔ شرپسند رستوپ چن کو یہ سزا ملی کہ اس کے ذاتی مکان کو نذر آتش کر دیا گیا۔

انتظامی امور کے سلسلے میں اس نے ماسکو کو آئین عطا کیا اور اس کے حکم پر شہر میں بلدیہ کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے بعد اس نے مندرجہ ذیل اعلان جاری کیا:

ماسکو کے شہریو!

آپ کے مصائب گمبھیر ہیں لیکن ہز میجسٹی دی امپررا اینڈ کنگ ان کا خاتمہ کرنے کے متمنی ہیں۔ ہیبت ناک مثالوں نے آپ پر یہ واضح کر دیا ہوگا کہ وہ حکم عدولی اور جرم کی کیا سزا دیتے ہیں۔ بدنظمی ختم کرنے اور عامتہ الناس کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے سخت اقدامات کیے گئے ہیں۔ خود آپ میں سے ابوی انتظامیہ منتخب کر لی گئی ہے۔ اسی انتظامیہ پر آپ کی بلدیہ یا شہری حکومت مشتمل ہوگی۔ یہ آپ کا خیال رکھے گی اور آپ کی ضروریات اور آپ کے مفادات کی نگرانی کرے گی۔ اس کے ارکان کا امتیازی نشان سرخ ربن ہوگا۔ یہ شانوں کے آرپار پہنا جائے گا اور شہر کا میئر سفید کمر بند بھی استعمال کرے گا۔ تاہم جب یہ ارکان ڈیوٹی پر نہیں ہوں گے، وہ سرخ ربن صرف بائیں بازو پر پہنیں گے۔

شہر کی پولیس سابقہ نظام کے مطابق ہی منظم کی گئی ہے اور اس کی چوکسی کی بدولت امن وامان کی صورت حال پہلے ہی بہتر ہوگئی ہے۔ حکومت نے دو کمشنر جنرل یا پولیس چیف مقرر کیے ہیں۔ شہر کے مختلف وارڈوں میں بیس کمشنر یا پولیس انسپکٹر تعینات کیے گئے ہیں۔ آپ ان کی شناخت، سفید ربن سے کر سکیں گے جو وہ اپنے بائیں بازو کے گرد پہنیں گے۔ مختلف مسالک کے متعدد گرجے کھلے ہیں اور ان میں مذہبی رسوم اور عبادت کی ادائیگی کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری ہے۔ آپ کے شہر کے باشندے ہر روز اپنے گھروں کو واپس آ رہے ہیں اور انھیں امداد اور تحفظ فراہم کرنے کے احکام جاری کیے جا چکے ہیں کیونکہ ان کے مصائب نے انھیں ان کا مستحق بنا دیا ہے۔ حکومت نے یہ اقدامات شہر میں امن وامان کی بحالی اور آپ کے حالات کو سنوارنے کی غرض سے کیے ہیں۔ اور اس مقصد کے حصول کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنی کوششوں سے انھیں تقویت پہنچائیں۔ ممکن ہو تو ان مصائب کو، جو آپ کو اٹھانا پڑے ہیں، بھول جائیں اور یہ امید کریں کہ قسمت آپ پر پہلے کی نسبت کم سختی کرے گی۔ آپ یقین کریں کہ ان لوگوں کو، جو آپ کی جانوں اور بچے کھچے مال واسباب کو نقصان پہنچانے کی کوشش کریں گے، انھیں لازماً اٹل اور شرم ناک موت کا سامنا کرنا پڑے گا اور آخری بات یہ ہے کہ آپ کے اذہان میں اس بارے میں قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں ہونا چاہیے کہ ان (جان و مال) کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے گا کیونکہ یہ عظیم ترین اور منصف ترین فرماں رواں کا منشا ہے۔ سپاہیو اور شہریو، آپ کا تعلق خواہ کسی بھی قوم سے ہو— عوامی اعتماد (کی فضا)، جو

کسی بھی مملکت کی خوش حالی کا منبع ہوتی ہے، دوبارہ قائم ہو جانے دیں۔ بھائیوں کی طرح رہیں، ایک دوسرے کی امداد کریں اور ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کریں، بدمعاشوں کے عزائم کو خاک میں ملانے کے لیے متحد ہو جائیں۔ فوجی اور سول حکام کے احکام کی تعمیل کریں اور بہت جلد آپ کے آنسو بہنا بند ہو جائیں گے۔

جہاں تک فوج کا تعلق ہے، نپولین نے حکم دیا، کہ وہ ماسکو میں باری باری داخل ہوں، لوٹ مار کریں اور اشیائے خورد و نوش اکٹھی کریں تا کہ بعد میں فوج کی ضروریات پوری کی جاسکیں۔

مذہب کے بارے میں نپولین نے حکم دیا کہ پادریوں کو واپس لایا جائے اور گرجا گھروں میں عبادت کا سلسلہ بحال کر دیا جائے۔

تجارتی سرگرمیاں بحال کرنے اور فوج کو رسد پہنچانے کے سلسلے میں مندرجہ ذیل اعلان جگہ جگہ چسپاں کر دیا گیا۔

اعلان

ماسکو کے امن پسند شہریو، دست کارو اور محنت کشو، جنھیں فلک شعبدہ باز نے گھیر گھار کر شہر سے باہر دھکیل دیا اور دھرتی کے تتر بتر کاشت کارو، جنھیں بے جا خوف و ہراس اپنے کھیتوں کے قریب نہیں آنے دیتا، سنو! اس دارالسلطنت میں امن و سکون بحال ہو رہا ہے اور نظم و نسق دوبارہ قائم کیا جا رہا ہے۔ یہ احساس کرتے ہوئے کہ ان کے ساتھ عزت و احترام کا سلوک ہو رہا ہے، آپ کے ہم وطن بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی پناہ گاہوں سے باہر آ رہے ہیں۔ ان کے یا ان کے اموال کے خلاف جو بھی متشددانہ کارروائی ہوتی ہے، اس پر فی الفور توجہ دی جاتی ہے اور اس قسم کی حرکت کے مرتکبین کو بلا تاخیر سزا دی جاتی ہے۔ ہز میجسٹی امپرر اینڈ کنگ ان کا تحفظ کرتے ہیں، اور آپ میں سے کسی کو بھی، سوائے ان کے جو ان کے احکام کی خلاف ورزی کرتے ہیں، اپنا دشمن نہیں سمجھتے۔ وہ آپ کے مصائب و آلام کا خاتمہ کرنے اور آپ کے گھر بار اور خاندان آپ کو لوٹانے کے خواہش مند ہیں۔ چنانچہ ان کے فیض رساں اقدامات کو عملی جامہ پہنانے میں ہاتھ بٹائیں اور بلا خوف و خطر ہمارے پاس چلے جائیں۔ شہریو، پورے اعتماد کے ساتھ اپنے گھروں میں واپس آ جائیں، آپ کو بہت جلد اپنی ضروریات پوری کرنے کے ذرائع میسر آ جائیں گے! جفاکش کاریگرو اور پیشہ ورو، اپنے اپنے کام پر لوٹ آئیں، آپ کی دکانیں اور مکان، جن کی گاردیں حفاظت کر رہی ہیں، آپ کا انتظار کر رہے ہیں اور آپ کو آپ کی محنت کا پورا پورا معاوضہ دیا جائے گا۔ اور کسانو، آپ بھی جنگلوں سے، جہاں آپ دہشت کے سبب چھپے ہوئے ہیں، کسی قسم کے اندیشے میں مبتلا ہوئے بغیر اپنے گھروں میں واپس آ جائیں، یقین رکھیں، آپ کو مکمل تحفظ فراہم کیا جائے گا۔ شہر میں منڈیاں قائم کر دی گئی ہیں اور کسان اپنے فالتو ذخائر اور پیداوار

وہاں لاسکتے ہیں۔ یہ کہ انھی فروخت کی پوری آزادی حاصل ہو، حکومت نے مندرجہ ذیل اقدامات کیے ہیں:

1- آج کے دن سے کسانوں، کاشتکاروں، دیہاتیوں اور ماسکو کے مضافات کے باشندوں کو دو مقررہ منڈیوں—ماخودایا سٹریٹ اور پولٹری مارکیٹ—میں بلاخوف وخطر ہر قسم کی اشیا لانے کی اجازت ہوگی۔

2- ان سے اشیا ایسی قیمتوں پر، جن پر فروخت کنندہ اور خریدار دونوں متفق ہوں گے، خریدی جائیں گی۔ تاہم اگر فروخت کنندہ کو مناسب قیمت نہ ملے، اسے بلا روک اپنی اشیا اپنے گاؤں واپس لے جانے کی اجازت ہوگی۔

3- ہر ہفتے اتوار اور بدھ کے روز بڑی منڈیاں لگا کریں گی۔ ان ایام میں چھکڑوں کی حفاظت کے لیے شہر سے باہر مناسب فاصلوں پر کافی تعداد میں فوجی دستے تعینات کیا جایا کریں گے۔ 4- منڈیوں کے اختتام پر بھی اسی قسم کے اقدامات کیا جایا کریں گے تاکہ کسانوں، ان کے گھوڑوں اور گاڑیوں کو واپسی کے سفر کے دوران میں کسی نوع کی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ 5- عام تجارت کی بحالی کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں گے۔

شہر اور دیہاتوں کے باسیو، کاریگر داور پیشہ ورو، آپ کا تعلق خواہ کسی بھی قوم سے ہو—آپ سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ آپ ہز میجسٹی امپرر اینڈ کنگ کے پدرانہ منصوبوں کو عملی شکل دیں اور عوامی بھلائی کے مقصد کو آگے بڑھانے میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ اپنا احترام و اعتماد ان کے قدموں میں بچھا دیں اور ہمارے ساتھ یک جہتی کی فضا تخلیق کرنے میں کسی قسم کی سستی نہ کریں۔

عسکریوں اور عامۃ الناس کے حوصلے بلند کرنے کے لیے فوج کا باقاعدگی سے معائنہ کیا جاتا، سلامی لی جاتی اور اعزازات تقسیم کیے جاتے۔ شہریوں کی ڈھارس بندھانے اور ان کی دل جوئی کرنے کے لیے امپراطور گھوڑے پر گلی کوچوں کے چکر لگاتا اور سرکاری امور میں مشغولیت کے باوجود تھیٹروں میں، جو اس کے حکم پر قائم کیے گئے تھے، ڈرامے دیکھنے جاتا۔

جہاں تک مخیّر کاموں کا، جو فرماں رواؤں کا اعلیٰ ترین وصف سمجھے جاتے ہیں، تعلق ہے، نپولین ان میں بھی کسی سے پیچھے نہیں تھا اور وہ سب کچھ، جو اس کے بس میں ہوتا، لازماً کرتا تھا۔ اس نے خیراتی اداروں پر الفاظ Maison de ma Mere*[13] کندہ کرا دیے—یوں اس نے فرماں روا کی فیاضی کا رشتہ فرزندانہ سعادت مندی سے جوڑ دیا۔ وہ لقیط خانے[14] گیا اور جن یتیم بچوں کی جانیں اس نے بچائی تھیں، انھیں اپنے سفید ہاتھ چومنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ اس نے طوطلمین کے ساتھ باتیں کیں اور اس نے، جیسا کہ تیغ فصاحت کے دریا بہاتے ہوئے لکھتا ہے، حکم دیا کہ فوجیوں کو جعلی روسی کرنسی میں، جو اس نے تیار کرائی تھی، ادائیگی کی جائے۔

ایک ایسے فعل سے، جو خود اس کے اور فرانسیسی فوج کے شایانِ شاں تھا، ایسے اقدامات کو موثر بناتے ہوئے

* میں یہ عمارت اپنی ماں کے نام منسوب کرتا ہوں۔

اس نے ان لوگوں میں، جن کے گھر بار بھسم ہو گئے تھے، امداد تقسیم کرائی۔ لیکن چونکہ خوراک اتنی بیش بہا نعمت تھی کہ اس سے غیر ملکیوں کو، جو زیادہ تر دشمنوں پر مشتمل تھے، نوازا نہیں جا سکتا تھا، نپولین نے انھیں رقوم فراہم کرنے کو ترجیح دی تا کہ وہ ان سے باہر سے اشیائے خورد و نوش خرید سکیں اور یوں ان میں کاغذ کے روبل بانٹ دیے گئے۔

جہاں تک عسکری امور کا تعلق ہے، فوجی فرائض سے غفلت برتنے اور لوٹ مار کرنے والوں کو سخت سزائیں دینے کے متعلق مسلسل احکام جاری ہوتے رہے۔

10

لیکن یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ یہ اقدامات، کوششیں اور منصوبے۔ اس قسم کے حالات میں ان سے ملتے جلتے جو اقدامات اور مساعی کی جاتی ہیں اور جو منصوبے بنائے جاتے ہیں، یہ ان سے کسی طرح فروتر نہیں تھے۔ اصل معاملے پر کسی طرح اثر انداز نہ ہو سکے۔ ان کا حال گھڑیوں کی ان سوئیوں کی طرح تھا جن کا اگر ڈائیل کے نیچے مشینری سے رابطہ منقطع کر دیا جائے، تو وہ چرخیوں کو مصروف کیے بغیر بے مقصد اور من مانے طریقے سے گھومتی رہتی ہیں۔

جہاں تک عسکری مسائل کا تعلق ہے، گو اس کے منصوبے کو نابغۂ روزگار شخص کی تخلیق کہا جاتا ہے اور تیئر اس کے متعلق بدیں الفاظ اظہار خیال کرتا ہے: ''اس کی عبقریت نے اس سے زیادہ عمیق، دانش مندانہ اور قابل تحسین چیز کبھی وضع نہیں کی تھی۔'' اور وہ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ عبقریت کے اس شہکار کو چار اکتوبر سے نہیں بلکہ سولہ اکتوبر سے منسوب کرنا چاہیے، موسیو فین[15] کے ساتھ مناظرے میں الجھ جاتا ہے۔ اس منصوبے پر نہ تو کبھی عمل ہوا اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہ صورت حال کے حقائق سے کوئی لگا نہیں کھاتا تھا۔ کریملن کے دفاع کو مضبوط بنانے کا منصوبہ، جس کی خاطر la Mosquee* (جیسا کہ نپولین واسیلی بلاژینی کلیسا کو پکارتا تھا) کو زمین بوس کیا جانا تھا، بالکل ہی بیکار ثابت ہوا۔ کریملن کے نیچے سرنگ بچھانے سے صرف اتنا ہوا کہ نپولین کی جو یہ خواہش تھی کہ جب ماسکو سے اس کی روانگی عمل میں آئے، کریملن کو دھماکوں سے اڑا دیا جائے گا، پوری ہو گئی۔ اس کا رویہ بالکل اس بچے کا تھا، جو چاہتا ہے کہ جس فرش پر گرنے سے وہ زخمی ہوا ہے، اس کی خوب پٹائی کی جائے۔ روسی فوج کے تعاقب کرنے کا، جس کی نپولین کو اتنی فکر تھی، وہ نتیجہ بر آمد ہوا جس کی ڈھونڈے سے مثال نہیں ملتی۔ فرانسیسی جرنیلوں کا ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل (روسی) فوج سے رابطہ منقطع ہو گیا اور وہ اس کا اتا پتا معلوم کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے۔ اور تیئر کے بقول بالآخر موغا کی مہارت، اور بظاہر عبقریت، ہی کام آئی اور ساٹھ ہزار افراد کی فوج یوں ڈھونڈ لی گئی جیسے گھاس

---

* مسجد

کے ڈھیر میں سے سوئی تلاش کی جاتی ہے۔

رہے سفارتی امور، نپولین کے تمام دلائل کہ اس نے طوطلمن اور یاکوولیف (جس کی سب سے بڑی خواہش یہ تھی کہ اسے کسی طرح اوورکوٹ اور سواری مل جائے)، دونوں کے ساتھ بڑا فیاضانہ اور منصفانہ سلوک کیا تھا، دھرے کے دھرے رہ گئے۔ الیکساندر نے نہ تو ان ایلچیوں سے ملاقات کی اور نہ اس پیغام کا، جو یہ لائے تھے، کوئی جواب دیا۔

انتظامی امور کا حال یہ ہوا کہ بلدیہ کے قیام کے باوجود لوٹ مار کی روک تھام نہ کی جا سکی اور اس کا فائدہ ان معدودے چند اشخاص کو ہوا جو اس بلدیہ میں کام کرتے تھے۔ وہ نظم ونسق بحال کرنے کے بہانے خود ماسکو میں لوٹ مار کرنے لگے اور اپنی جائیدادوں کا تحفظ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

جہاں تک مذہبی امور کا تعلق ہے، مصر میں نپولین کے مسجد میں جانے سے معاملہ آسانی سے طے پا گیا تھا۔ یہاں اس قسم کے کوئی نتائج برآمد نہ ہوئے۔ دو تین پادریوں نے، جو ماسکو میں مل گئے تھے، نپولین کی خواہشات کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی لیکن ان میں سے ایک کے، جب وہ عبادت کرا رہا تھا، ایک فرانسیسی سپاہی نے تھپڑ دے مارا اور دوسرے کے بارے میں ایک فرانسیسی افسر نے رپورٹ دی: ''مجھے جو پادری ملا، میں نے اسے دعائے عشائے ربانی پڑھنے کی دعوت دی۔ اس نے گرجے کی صفائی کی اور اسے مقفل کر دیا۔ اسی رات دروازے دوبارہ زبردستی کھولے گئے، قفل توڑ دیے گئے، کتابیں پھاڑ دی گئیں اور اسی قسم کی دیگر تخریبی کارروائیاں کی گئیں۔''

تجارت کا یہ حشر ہوا کہ جفاکش کاریگروں اور کسانوں کے نام جو اعلان نامہ جاری ہوا، اس کا کوئی جواب نہ ملا۔ جفاکش کاریگروں کا تو کہیں نام ونشان بھی نہ ملا اور کسان ان کمشنروں پر، جنھوں نے اپنے اعلان ناموں کے ساتھ شہر سے خاصی دور باہر جانے کی جرأت کی، پل پڑے اور ان کی تکابوٹی کر ڈالی۔

عوام اور سپاہ کی تفریح کے لیے جو تھیٹر شروع کیے گئے، انھیں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ جو تھیٹر کریملن اور پوزنایاکوف ہاؤس میں قائم کیے گئے تھے، انھیں فوراً بند کرنا پڑا کیونکہ اداکاروں اور اداکاراؤں کو لوٹنے کا سلسلہ چل نکلا تھا۔

مخیرانہ کارروائیاں بھی مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔ اصلی اور جعلی کاغذی نوٹ، جن کی ماسکو میں بھرمار ہو گئی تھی، اپنی قدر و قیمت کھو بیٹھے۔ جو فرانسیسی مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے، انھیں سونے کے علاوہ کسی اور چیز سے کوئی سروکار نہیں تھا۔ نہ صرف یہ کہ جعلی نوٹوں کی، جنھیں نپولین نے اتنی دریا دلی سے ضرورت مندوں تقسیم کیا تھا، کوئی قدر و قیمت نہیں تھی، سونے کے مقابلے میں چاندی بھی اپنی معیاری قیمت کھو بیٹھی۔

یہ کہ حکام جو احکام جاری کرتے تھے، وہ قطعاً غیر موثر ثابت ہوتے تھے، اس کی اچنبھے میں ڈال دینے والی مثال یہ ہے کہ نپولین کی کوششوں کے باوجود لوٹ مار کا سلسلہ جاری رہا اور نظم ونسق بھی بحال نہ کیا جا سکا۔

فوجی حکام نے جو رپورٹیں پیش کیں، ان میں سے چند ایک مندرجہ ذیل ہیں:

لوٹ مار روکنے کے احکام کے باوجود اس کا سلسلہ جاری ہے۔ نظم و نسق ابھی تک بحال نہیں ہو سکا اور کوئی تاجر بھی ایسا نہیں ملے گا جو جائز طریقے سے کاروبار کرتا ہو۔ صرف لشکر کے بنئے کاروبار چلانے کی جرأت کرتے ہیں اور وہ مسروقہ مال فروخت کرتے ہیں۔

میرے وارڈ میں تیسری کور کے سپاہیوں کی لوٹ مار جاری ہے۔ بدقسمت باشندے تہہ خانوں میں چھپے ہوے ہیں، وہ ان کی بچی کھچی اشیا لوٹنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے بلکہ اتنی سنگدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ انھیں اپنی شمشیروں سے زخمی بھی کر جاتے ہیں۔ میں نے اس قسم کے متعدد واقعات اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔

سوائے اس کے کہ سپاہی لوٹ مار کر رہے ہیں، اور کوئی اطلاع نہیں ہے۔۔۔9 اکتوبر

قزاقی اور لوٹ مار کا سلسلہ جاری ہے۔ ہمارے وارڈ میں چوروں کا گروہ مصروف عمل ہے۔ ان کا طاقت سے قلع قمع کیا جانا ضروری ہے۔

امپراطور اس بات پر بے حد ناراض ہیں کہ لوٹ مار کی ممانعت کے سخت احکام کے باوجود لٹیرے گارڈز مسلسل کریملن کی جانب آتے دکھائی دے رہے ہیں۔ گزشتہ شب اور امروز اولڈ گارڈز نے جس لاقانونیت کا مظاہرہ کیا اور لوٹ مار کی جو حرکات کیں، وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ تھیں۔ امپراطور کو یہ دیکھ کر انتہائی ملال ہو رہا ہے کہ ان کی حفاظت کے لیے جو منتخب سپاہی متعین کیے گئے تھے اور جنھیں دوسروں کے سامنے نظم و ضبط کی مثال پیش کرنا چاہیے تھی، اس حد تک نافرمانی کرنے لگے ہیں کہ جن تہہ خانوں اور گوداموں میں فوج کے لیے رسد رکھی جاتی ہے، وہ ان کے بھی تالے توڑ لیتے ہیں۔ دوسرے اس حد تک ضلالت کے گڑھوں میں گر چکے ہیں کہ وہ پہرے پر مامور سنتریوں اور افسروں کے احکام کی تعمیل کرنے سے انکار کر دیتے ہیں، وہ ان کے ساتھ دشنام طرازی کرتے اور انھیں مارنے پیٹنے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

محل کے گرینڈ مارشل نے (گورنر نے تحریر کیا) سخت شکایت کی ہے کہ بار بار منع کرنے کے باوجود سپاہی تمام احاطوں میں بلکہ امپراطور کے دریچوں کے سامنے بھی حوائج ضروریہ سے فارغ ہوتے رہتے ہیں۔

یہ فوج ان مویشیوں کے ریوڑ کی مانند تھی جو سہ تڑا کر بھاگ اٹھتے ہیں اور وہیں گھاس اور چارا، جو انھیں فاقہ کشی سے بچا سکتا ہے، پاؤں تلے روند ڈالتے ہیں۔ جوں جوں ماسکو میں اس کے قیام کا عرصہ دراز ہوتا جا رہا تھا، توں توں اس کا شیرازہ بکھرتا جا رہا تھا اور وہ اپنی طاقت سے محروم ہوتی جا رہی تھی۔

لیکن یہ وہاں سے ہلی نہیں۔

اسے فرار کی صرف اسی وقت سوجھی جب سمولنسک شاہراہ پر اس کی باربرداری کے گاڑیوں کے پکڑے

جانے اور تاروتینو میں معرکہ بپا ہونے کی خبروں سے اس میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ تاروتینو کی لڑائی کی خبر غیر متوقع طور پر نپولین کو اس وقت ملی جب وہ فوجی دستوں کا معائنہ کرنے میں مصروف تھا۔ اس اطلاع نے، جیسا کہ تیئر ہمیں بتاتا ہے، اس کے دل میں روسیوں کو سزا دینے کی خواہش بیدار کر دی اور اس نے، جیسا کہ ساری فوج مطالبہ کر رہی تھی، روانگی کا حکم جاری کر دیا۔

ماسکو سے فرار کے وقت فوجی اپنا سارا مال غنیمت اپنے ساتھ لے گئے۔ نپولین نے بھی اپنا ذاتی tresor* اپنے ساتھ لے جانا تھا۔ مال و اسباب سے لدے پھندے چھکڑوں کو دیکھ کر، جو فوج کی آزادانہ نقل و حرکت میں رکاوٹ بن رہے تھے، (بقول تیئر) نپولین پر ہیبت طاری ہو گئی۔ تاہم اپنے تمام تر جنگی تجربے کے باوجود اس نے فالتو چھکڑوں کو نذر آتش کرنے کا حکم نہ دیا حالانکہ ماسکو کی طرف کوچ کے دوران میں وہ ایک خاص مارشل کے چھکڑوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کر چکا تھا۔ وہ کالاشوں اور عام گاڑیوں کو، جن پر فوجی سوار تھے، دیکھتا اور کہتا: ''یہ تو بہت اچھی بات ہوئی — یہ گاڑیاں سامان رسد، بیماروں اور زخمیوں کو لے جانے میں استعمال ہو سکتی ہیں۔''

اس فوج کی حالت اس زخمی درندے کی حالت سے مشابہ تھی جسے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی آخری گھڑی آپہنچی ہے لیکن جسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کر کیا رہا ہے۔ نپولین اور اس کے فوجیوں کے ماسکو میں داخل ہونے اور ان کے تباہی کے غار میں گرنے کے درمیانی وقفے کے دوران میں ان کی چالوں اور مقاصد کا مطالعہ کرنا مہلک طور پر زخمی درندے کی اچھل کود اور کپکپاہٹ کا مطالعہ کرنے کے مترادف ہے۔ جب زخمی درندے کو سرسراہٹ سنائی دیتی ہے، اکثر اوقات وہ سیدھا شکاری کی بندوق کی طرف بھاگتا ہے، آگے لپکتا ہے، پیچھے ہٹتا ہے اور یوں خود ہی برق رفتاری سے اپنے انجام کو قریب لے آتا ہے۔ نپولین پر جب ساری فوج کا دباؤ پڑا، تو اس نے یہی کیا۔ تاروتینو کی لڑائی کی سرسراہٹ نے درندے کو خوف و ہراس میں مبتلا کر دیا اور وہ سرعت رفتار سے گولی کی طرف بھاگا، شکاری کے قریب پہنچا، واپس مڑا، پھر آگے بھاگا اور دوبارہ واپس مڑا، اور کسی بھی جنگلی درندے کی طرح اس ناموافق اور پرخطر راستے پر چل پڑا، جو شکاری کا جانا پہچانا تھا اور جہاں وہ آسانی سے اس کی بو سونگھ کر اس کی موجودگی کا پتا لگا سکتا تھا۔

اس تمام عرصے کے دوران میں نپولین نے، جسے ہمارے سامنے اس ساری نقل و حرکت کے قائد کے طور پر پیش کیا جاتا ہے (بعینہٖ اس طرح جس طرح جہاز کے اگلے حصے پر نصب چوبی مجسمہ وحشیوں کو اس کا ناخدا معلوم ہوتا ہے)، اس بچے کا رویہ اپنائے رکھا جو گاڑی کے اندر لگی پٹی کو پکڑ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہی گاڑی چلا رہا ہے۔

11

چھ اکتوبر کو صبح سویرے پیئر سائبان سے باہر آیا، واپس مڑا، دروازے کے قریب رکا اور ایک کتیا کے ساتھ، جس کا قد کوتاہ، جسم لمبا، رنگ تقریباً اُودا، ٹانگیں چھوٹی اور گھٹنوں کے قریب ذرا ٹیڑھی تھیں، چہلیں کرنے اور کھیلنے رک

* treasure (خزانہ)

گیا۔ کتیا اس کے ارد گرد اچھل کود کر رہی تھی۔

اس منحنی کتیا نے ان کے سائبان میں ڈیرا ڈال لیا تھا اور وہ رات کو کاراتائیف کے قریب سوتی تھی۔ اگر چہ وہ بعض اوقات شہر میں مٹر گشت کرنے نکل پڑتی تھی لیکن وہ ہمیشہ واپس آجاتی تھی۔ اس کا غالباً کبھی کوئی مالک نہیں تھا اور نہ اب تھا اور نہ اس کا کوئی نام تھا۔ فرانسیسی اسے azor قصہ گو سپاہی Femgalka، اور کاراتائیف اور دوسرے Grey یا Floppy کہتے تھے۔ یہ بات کہ اس کا نہ کوئی مالک تھا، نہ نام، نہ نسل اور نہ کوئی خاص رنگ، اس تقریباً اودی کتیا کو قطعاً پریشان نہیں کرتی تھی۔ اس کی روئیں دار دم کلغی کی طرح دائرہ بنائے سیدھی کھڑی رہتی تھی۔ اس کی ٹیڑھی میڑھی ٹانگیں اس کے اتنے تسلی بخش طریقے سے کام آتی تھیں کہ وہ اکثر اوقات اپنی ایک پچھلی ٹانگ بڑی آن اور رعنائی سے اوپر اٹھا لیتی اور اپنی بقایا تین ٹانگوں پر یوں آسانی سے اور تیزی سے ادھر ادھر بھاگتی پھرتی جیسے اسے اپنی چاروں ٹانگیں استعمال کرنے سے عار آتی ہو۔ وہ ہر چیز سے محظوظ ہونے کا طریقہ ڈھونڈ لیتی۔ کبھی وہ خوشی سے منمناتی قلابازیاں کھاتی پھرتی، کبھی سنجیدہ اور پر فکر صورت بنائے دھوپ سینکنے لگتی، کبھی کوئی لکڑی کا ٹکڑا یا تنکا اٹھاتی اور اس کے ساتھ کھیلنا شروع کر دیتی اور کبھی یونہی کدکڑے لگاتی پھرتی۔

پیئر کا لباس اب غلیظ، بوسیدہ اور تار تار قمیص (یہ اس کی اپنی سابقہ پوشاک کی واحد بچی کھچی نشانی تھی)، فوجی پتلون، جس کے پائنچوں پر وہ حرارت حاصل کرنے کی غرض سے کاراتائیف کے مشورے پر رسی باندھ لیتا تھا، اور دیہاتی کوٹ و ٹوپی پر مشتمل تھا۔ اس عرصے کے دوران میں جسمانی اعتبار سے پیئر میں کافی تبدیلیاں رونما ہو گئی تھیں۔ اگر چہ وہ اب بھی خاصا تنومند اور توانا نظر آتا تھا کہ یہ وصف اسے خاندان سے ورثتاً ملا تھا لیکن وہ اب پہلے کی طرح لحیم شحیم نہیں تھا۔ داڑھی اور مونچھوں نے اس کے چہرے کے زیریں حصے کو ڈھانپ لیا تھا اور اس کے لانبے، ژولیدہ بال، جن میں جوئیں ہی جوئیں تھیں، اس کے سر کے گرد یوں لپٹے رہتے تھے جیسے اس نے ٹوپی اوڑھ رکھی ہو۔ اس کی آنکھوں میں عزم اور سکون جھلکنے لگا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ جاندار انداز سے چوکس ہیں۔ ماضی میں اس کی آنکھوں نے کبھی اس قسم کا تاثر نہیں دیا تھا۔ پہلے انھیں دیکھ کر یہی محسوس ہوتا تھا کہ یہ شخص کاہل اور ست الوجود ہے مگر اب یوں دکھائی دینے لگا تھا کہ وہ عمل اور مدافعت کے لیے آمادہ ہے اور اس میں اس کی ہمت بھی ہے۔ اس کے پاؤں ننگے تھے۔

پیئر کبھی اپنے سامنے میدان کو، جس میں اس روز گاڑیاں اور سوار گزر رہے تھے، دیکھنے لگتا اور کبھی اس کی نظریں دریا کے پار افق پر ٹک جاتیں۔ پھر وہ کتیا کا، جو اسے جھوٹ موٹ کاٹنے کا ڈرامہ رچا رہی تھی، جائزہ لینے لگتا یا پھر اپنے برہنہ پاؤں کا، جنھیں وہ خوشی کے عالم میں کبھی ادھر اور کبھی ادھر منتقل کرتا جا رہا تھا، اور ان کے غلیظ موٹے انگوٹھوں کا مشاہدہ کرنے لگتا۔ وہ جب بھی اپنے ننگے پاؤں دیکھتا، اس کے چہرے پر شانتی اور شگفتگی نمودار ہو جاتی۔ اپنے ان برہنہ پاؤں کو دیکھ کر اسے وہ سب کچھ، جس کا اسے ان ہفتوں کے دوران میں تجربہ ہوا تھا اور جو اس نے سیکھا تھا، یاد آجاتا اور اس کی یہ یادیں اس کا دل خوش کر دیتیں۔

گزشتہ چند روز سے موسم معتدل اور مطلع صاف چلا آ رہا تھا۔ صبح کو البتہ ہلکا پالا ضرور پڑتا تھا۔ یہ وہ موسم تھا جسے فرانسیسی* l' Ete de st. Martin[16] اور (روسی؟) ''بڑی بوڑھیوں کی گرمیاں'' کہتے ہیں۔

باہر کھلی فضا میں دھوپ میں حرارت کا احساس ہوتا تھا۔ صبح کے پالے کی تقویت بخش تازگی کے ساتھ مل کر جو ابھی تک فضا میں موجود تھی، یہ حرارت خاص طور پر فرحت بخش تھی۔

دور و نزدیک ہر چیز پر، وہ طلسمی، بلوریں چمک دمک تھی جو صرف انھی خزانی ایام میں نظر آتی ہے۔ دور فاصلے پر گاؤں، گرجے اور وسیع و عریض سفید مکانوں سمیت کنجشک پہاڑیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ بے برگ درخت، ریت، پتھروں اور اینٹوں کے مکانات، گرجے کے سبز کلس اور سفید مکانوں کے زاویوں کے بیرونی خطوط شفاف فضا میں غیر فطری انداز سے چمک رہے اور واضح طور پر نظر آ رہے تھے۔ جہاں پیئر اور قیدیوں کے سائبان تھے، ان کے بالکل قریب محل نما عمارت کے، جس پر فرانسیسی قابض تھے، جانے پہچانے آثار دیکھے جاسکتے تھے۔ وہاں چوبی باڑ کے ساتھ lilac کے پودے کھڑے تھے۔ ان کے پتوں کی زمردیں رنگت ابھی تک جوں کی توں برقرار تھی۔ اس بے ابر، نتھری نتھری، ساکن اور درخشندہ فضا میں یہ نیم سوختہ اور تباہ شدہ مکان بھی، جو ابر آلود موسم میں بھدا اور ڈراؤنا معلوم ہوتا تھا، اتنا خوبصورت تھا کہ آنکھوں میں ٹھنڈک پڑتی محسوس ہوتی تھی۔

ایک فرانسیسی کارپورل اپنے کوٹ کے بٹن لاپروائی سے بند کیے، سر پر شبینہ ٹوپی اوڑھے اور منہ میں چھوٹا پائپ دبائے سائبان کی نکڑ میں آیا اور دوستانہ انداز سے آنکھیں جھپکاتا پیئر کے پاس پہنچا۔

''جی، موسیو، کرل،'' (فرانسیسی پیئر کو اسی نام سے پکارتے تھے)، ''کیا شاندار دھوپ ہے! معلوم ہوتا ہے بہار آ گئی ہے۔''

اور کارپورل نے دروازے کے ساتھ ٹیک لگالی اور پیئر کو پائپ پیش کرنے لگا۔ اگرچہ پیئر ہمیشہ انکار کرتا رہتا تھا، وہ اپنی پیشکش دہراتا رہتا تھا۔

''ایسے موسم میں آدمی کا جی چاہتا ہے کہ وہ رختِ سفر باندھے اور چل پڑے...'' اس نے بات شروع کی۔

پیئر نے اس سے پوچھا کہ اس نے فرانسیسیوں کی روانگی کے بارے میں کیا سنا ہے اور کارپورل نے اسے بتایا کہ تقریباً ساری سپاہ کوچ کر رہی ہے اور قیدیوں کے متعلق ہدایات اسی روز متوقع ہیں۔ پیئر کے سائبان میں ایک روسی سپاہی، جس کا نام سکالوف تھا، قریب المرگ تھا۔ پیئر نے کارپورل سے دریافت کیا کہ اس کا کیا کرنا چاہیے۔ کارپورل نے جواب دیا کہ پیئر کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، ایسے مریضوں کے لیے ان کے پاس چلتے پھرتے اور مستقل دونوں طرح کے ہسپتال موجود ہیں اور مجموعی طور پر حکام نے ہر ممکن صورت حال سے نپٹنے کا سامان کر رکھا ہے۔

''اس کے علاوہ، موسیو کرل، آپ جانتے ہیں کہ آپ کو کیپٹن سے صرف ایک لفظ کہنے کی ضرورت ہے۔

* سینٹ مارتاں کا موسم۔

اخ، وہ... وہ ایسا آدمی ہے جو کبھی کچھ نہیں بھولتا۔"

کارپورل جس کیپٹن کا ذکر کر رہا تھا، وہ اکثر پیئر کے ساتھ گپ شپ لڑاتا رہتا تھا اور اسے ہر قسم کی رعایتوں سے نوازتا رہتا تھا۔

"دیکھو، سینٹ ٹامس۔[17] اس نے ایک روز مجھ سے کہا، کرل پڑھا لکھا آدمی ہے اور فرانسیسی بولتا ہے۔ وہ روسی نواب ہے، تقدیر کے چکر میں آ گیا ہے لیکن آدمی جی دار ہے۔ اسے کھرے کھوٹے میں تمیز کرنا آتا ہے.... اگر اسے کسی چیز کی ضرورت پیش آئے، بس اسے میرے پاس بھیج دینا۔ میں اسے انکار نہیں کروں گا۔ اگر آدمی خود تعلیم یافتہ ہو، پھر وہ تعلیم یافتہ اور شائستہ لوگوں کی قدر کرتا ہے۔' موسیو کرل، میں یہ سب کچھ آپ کے بھلے کے لیے بتا رہا ہوں۔ اگلے روز جو صورت حال پیش آئی — اگر آپ بیچ میں نہ پڑتے، معاملہ بہت بگڑ جاتا۔"

اس طرح کچھ دیر مزید گپ شپ کرنے کے بعد کارپورل رخصت ہو گیا۔ (اس نے جس معاملے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ قیدیوں اور فرانسیسی سپاہیوں کے مابین جھگڑا تھا۔ اس میں پیئر اپنے ساتھیوں کو سمجھانے بجھانے میں کامیاب رہا تھا۔)

بعض قیدیوں نے پیئر کو کارپورل کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ لیا تھا۔ وہ جھٹ پٹ اس کے پاس آئے اور پوچھنے لگے کہ وہ کیا کہہ رہا تھا۔ پیئر کو فوج کی ماسکو سے روانگی کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا تھا، جب وہ اسے اپنے ساتھیوں کو بتا رہا تھا، ایک لاغر اندام، زرد رو اور درماندہ حال فرانسیسی سپاہی ان کے پاس آیا۔ اس نے شرماتے گھبراتے تیزی سے سلام کے انداز میں انگلیاں پیشانی تک اٹھائیں اور پیئر سے پوچھنے لگا کہ آیا سپاہی "پلاتوشے"* جسے اس نے قمیص سلائی کے لیے دی تھی، سائبان میں ہی ہے۔

فرانسیسی سپاہیوں میں کپڑا اور بوٹوں کا چمڑا پچھلے ہفتے ہی تقسیم کیا گیا تھا اور انھوں نے یہ اشیا سلائی کے لیے قیدیوں کے سپرد کر دی تھیں۔

"میرے عزیز دوست، تیار ہے، تیار ہے۔" کاراتائیف نے اسے مطلع کیا۔ وہ ابھی ابھی دروازے کے قریب آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صاف ستھرے انداز سے تہہ کی ہوئی قمیص تھی۔

نیم گرم موسم کی وجہ سے اور کام کی سہولت کی غرض سے کاراتائیف نے پتلون اور بوسیدہ قمیص کے علاوہ، جس کا رنگ دھوئیں کی کالک کی طرح سیاہ تھا، اور کچھ نہیں پہنا ہوا تھا۔ اس کے بال کارکنوں کے انداز میں زیزفون کی چھال کی رسی سے بندھے ہوئے تھے اور اس کا گول مٹول چہرہ معمول سے زیادہ گول مٹول اور پر از شفقت نظر آ رہا تھا۔

"وعدہ وعدہ ہی ہے۔ میں نے جمعے کا وعدہ کیا تھا اور میں نے وعدہ پورا کر دکھایا ہے۔ یہ رہی آپ کی قمیص،" پلاطون نے مسکراتے ہوئے کہا اور اس نے جو قمیص بنائی تھی، اس کی تہیں کھول دیں۔

* Platoche: پلاطون (افلاطون) کا فرانسیسی نام

فرانسیسی نے بے چینی سے ادھر ادھر نظریں دوڑائیں اور پھر ایسے جیسے وہ تذبذب پر قابو پانے کی کوشش کر رہا ہو، اس نے اپنی وردی اتار دی اور قمیص پہن لی۔ وردی کے نیچے وہ اپنے دبلے پتلے اور زرد جسم پر چکنی پھول دار ریشمی واسکٹ پہنے ہوئے تھا، مگر وہاں قمیص نام کی کوئی شے نہیں تھی۔ صاف نظر آرہا تھا کہ اسے ڈر اس بات کا تھا کہ جو قیدی اسے دیکھ رہے ہیں، اس کی حالت پر ہنس پڑیں گے۔ اس نے برق رفتاری سے اپنا سر قمیص کے اندر گھسیڑ دیا۔ کسی قیدی نے ایک لفظ تک نہ کہا۔

''آپ کے بالکل پوری آئی ہے!'' پلاطون بار بار کہے جارہا اور قمیص کو نیچے کھینچتا جارہا تھا۔

فرانسیسی نے جب اپنا سر اور بازو قمیص میں داخل کر لیے، وہ اپنی نگاہیں اوپر اٹھائے اسے اور اس کی سیونوں کا بغور جائزہ لینے لگا۔

''عزیز دوست، آپ جانتے ہیں کہ یہ درزی کی دکان تو ہے نہیں اور جیسا کہ لوگ کہتے ہیں میرے پاس صحیح قسم کے اوزار بھی نہیں۔ اگر آپ کا اوزار صحیح نہ ہو، آپ جوں بھی نہیں مار سکتے۔'' پلاطون نے اپنی گول مٹول ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے کام سے بہت خوش تھا۔

"C' est bien, c'est bien, merci"* فرانسیسی نے کہا۔ ''لیکن کچھ نہ کچھ کپڑا تو بچ ہی گیا ہوگا...''

''جب یہ آپ کے جسم پر قرینے سے جم جائے گی، یہ اور بھی موزوں نظر آنے لگے گی۔'' بظاہر وہ ابھی تک اپنے ہاتھ کے کام کی تحسین کر رہا تھا۔ ''آپ اس میں بہت اچھے لگیں گے اور آپ کو آرام بھی بہت رہے گا...''

''Merci, merci, mon vieux** ...اور بقیہ کپڑا؟'' فرانسیسی نے ایک بار پھر کہا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ایک نوٹ نکالا اور کاراتائیف کے حوالے کر دیا۔ ''اب جو کچھ بچا ہے، مجھے دے دو۔''

پیئر بھانپ گیا کہ فرانسیسی جو کچھ کہہ رہا ہے، پلاتون جان بوجھ کر اس کے متعلق انجان بنا ہوا ہے اور وہ مداخلت کیے بغیر انھیں دیکھتا رہا۔ فرانسیسی نے کاراتائیف کو جو پیسے دیے تھے، اس نے ان کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام کے گن گاتا رہا۔ فرانسیسی بچے کھچے ٹکڑوں کی واپسی کا تقاضا کرتا رہا اور اس نے پیئر سے کہا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے، وہ اس کا ترجمہ کر دے۔

''اس نے یہ ٹکڑے کیا کرنا ہیں؟'' کاراتائیف نے پوچھا۔ ''ہمارے تو کچھ کام ہی آجاتے، ہم انہیں ٹانگوں پر ہی لپیٹ لیں گے، خیر کوئی پروا نہیں۔''

اچانک کاراتائیف کا منہ لٹک گیا۔ اس نے اپنی قمیص کے اندر سے ٹکڑوں کی پوٹلی نکالی اور فرانسیسی کی طرف دیکھے بغیر اسے تھما دی۔

''واہ ری قسمت!'' وہ بڑبڑایا اور واپس چل پڑا۔

---

* ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، شکریہ

** شکریہ، شکریہ، میرے دوست (بڑے میاں)

فرانسیسی نے کپڑے پر نظر ڈالی، کچھ دیر سوچا، پھر اس نے استفہامیہ انداز سے پیئر کی طرف دیکھا اور گویا کہ پیئر نے اسے نظروں ہی نظروں میں اسے کچھ بتا دیا ہو، شرمندگی سے اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے تیکھی آواز سے پکارا:

"پلاتوشے، ادھر آؤ۔۔۔ پلاتوشے! یہ تم اپنے پاس ہی رکھ لو!" اس نے کہا اور دھجیاں کاراتائیف کو واپس کر دیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ مڑا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

"کیا بات ہے! دیکھیں نا!" کاراتائیف نے اپنے سر کو جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ "لوگ کہتے ہیں کہ یہ کافر ہیں۔ لیکن یہ تو کافر نہیں، اس کی بھی روح ہے۔ بزرگ ٹھیک ہی کہتے تھے: 'جس ہاتھ پر پسینہ آتا ہے، وہ کھلا (سخی) ہاتھ ہوتا ہے: خشک ہاتھ بند مٹھی (کنجوس) ہوتا ہے۔' اس کی اپنی کمر ننگی تھی، پھر بھی اس نے یہ مجھے واپس کر دیے۔"

کاراتائیف فکرمند انداز سے مسکرایا اور کچھ دیر نگاہیں گاڑے کپڑے کے ٹکڑے دیکھتا رہا۔

"لیکن، مائی ڈیئر، ان سے ٹانگیں اچھی طرح ڈھک جائیں گی۔" اس نے کہا اور سائبان میں واپس چلا گیا۔

12

پیئر کے قیدی بنائے جانے کے بعد چار ہفتے گزر چکے تھے۔ اگرچہ فرانسیسیوں نے اسے افسروں کے سائبان میں منتقل کرنے کی پیشکش کی تھی، وہ عام سپاہیوں کے سائبان میں ہی مقیم رہا، جہاں انھوں نے اسے پہلے روز بھیجا تھا۔

انسان احتیاج، عسرت اور تنگ دستی کو جس انتہائی حد تک برداشت کر سکتا ہے، ماسکو کے آتش زدہ اور تباہ شدہ شہر میں پیئر کو اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ لیکن ایک تو اس کی صحت اچھی اور کاٹھی مضبوط تھی (جس کا اسے اس وقت تک کوئی احساس نہیں تھا) اور دوسرے اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی کہ یہ احتیاجات اور تنگ دستیاں اتنے دبے پاؤں اور اس قدر بتدریج انداز سے اس کی زندگی میں داخل ہوئیں کہ یہ بتانا مشکل ہو گیا کہ ان کا آغاز کب ہوا۔ چنانچہ اپنی اس حالت پر وہ نہ صرف یہ کہ کڑھا نہیں بلکہ اسے بمسرت برداشت کرتا رہا۔ اور بالکل یہی وہ زمانہ تھا جب اسے وہ سکون، آسودہ خاطری اور اطمینان قلب، جس کے لیے وہ اتنے عرصے سے بیکار ہاتھ پاؤں مارتا رہا تھا، نصیب ہو گیا۔ اپنی زندگی کے دوران میں وہ مختلف طریقوں سے اس ذہنی سکون اور داخلی ہم آہنگی کے، جسے وہ بارودینو کی لڑائی میں سپاہیوں میں دیکھ کر اتنا متاثر ہوا تھا، حصول کے لیے کوششیں کرتا رہا تھا۔ اس نے اسے مخیر کاموں میں، فری میسنری میں، شہری زندگی کی عیاشیوں اور طرب سنجیوں میں، شراب و کباب میں، ایثار ذات کے دلیرانہ کارناموں میں اور نتاشا کے لیے اپنی رومانی محبت میں ڈھونڈنا چاہا تھا۔ اس نے اسے تعقل اور فلسفیانہ مباحث میں تلاش کیا تھا۔ لیکن اس کی تمام مساعی اور تجربات نے اسے ناکامی کے سوا اور کچھ نہیں دیا تھا۔ اور اب اسے یہ ذہنی طمانیت اور داخلی ہم آہنگی، جب اس نے اس کے متعلق سوچا تک نہیں تھا، موت کی ہولناکیوں کے ذریعے، عسرت و تنگ دستی کے ذریعے اور جو کچھ اسے کاراتائیف میں نظر آیا تھا، اس کے ذریعے حاصل ہو گئی۔ ان دہشت ناک لمحات نے، جن

میں اسے تب گزرنا پڑا تھا جب لوگوں کو مقتل میں گولیاں ماری جا رہی تھیں، ان پریشان کن خیالات واحساسات کو، جو ماضی میں اسے بے انتہا اہم معلوم ہوتے تھے، ایک لحاظ سے (یا گویا کہ) اس کے تخیل اور حافظے سے ہمیشہ کے لیے کھرچ دیا گیا تھا۔ اس کے دل میں کبھی یہ خیال تک نہ آیا کہ اسے روس، جنگ، سیاست یا نپولین کے بارے میں سوچ بچار کرنا یا ان کے متعلق فکرمند ہونا چاہیے۔ اس پر بات واضح ہوگئی تھی کہ اس کا ان تمام چیزوں میں مطلق کوئی دخل نہیں ہے، کسی نے اسے ان معاملات کا محاکمہ کرنے کو نہیں کہا، چنانچہ وہ ان کے متعلق کوئی فیصلہ کن بات نہیں کہہ سکتا۔ ''روس اور موسم گرما کا — آگ اور پانی کی طرح — آپس میں کوئی میل نہیں۔'' وہ کاراتائیف کے الفاظ، جو غیر معمولی انداز سے تسکین بخش تھے، دہراتے ہوئے سوچتا۔ اپنا نپولین کو قتل کرنے کا منصوبہ اور مکاشفہ کے حیوان کے پراسرار اعداد کا حساب اب اسے نہ صرف بالکل بے معنی بلکہ مضحکہ خیز بھی نظر آیا۔ اپنی بیوی پر اسے جو غصہ آیا کرتا تھا اور ہر دم جو یہ فکر لاحق رہتی تھی کہ کہیں اس کے نام کو بٹا نہ لگ جائے، اب اسے محسوس ہونے لگا کہ یہ تو بالکل معمولی اور احمقانہ باتیں تھیں۔ اسے کیا پڑی تھی کہ وہ اس فکر میں دبلا ہوتا رہتا کہ وہ عورت یہاں یا وہاں اپنی پسند کی زندگی بسر کر رہی ہے؟ کسی شخص کے لیے — خاص طور پر اس کے اپنے لیے — اس بات کی کیا اہمیت ہے کہ انھیں معلوم ہو گیا ہے یا نہیں کہ اس کا نام کاؤنٹ بزدخوف ہے۔

اس کی پرنس آندرے کے ساتھ جو گفتگو ہوئی تھی، وہ اسے اکثر یاد کرتا اور اپنے دوست کے ساتھ اتفاق کرتا۔ فرق بس یہ تھا کہ وہ پرنس آندرے کے خیالات کی تعبیر ذرا مختلف انداز سے کرتا۔ پرنس آندرے کا یہ ایمان تھا اور وہ اس کا اظہار کرنے سے چوکتا بھی نہیں تھا کہ مسرت منفی چیز ہے لیکن وہ یہ بات ذرا تلخ اور طنزیہ انداز سے کہتا تھا، گویا کہ وہ درحقیقت یہ کہہ رہا ہو کہ ہمارے قلوب پر مثبت مسرت کی آرزو محض اس لیے نقش کر دی گئی ہے تاکہ ہمیں ہمیشہ اذیت پہنچتی رہے اور اس کا حصول کبھی ممکن نہ رہے۔ لیکن پیئر اس کی سچائی ہر قسم کے ذہنی شکوک کو ماورائے طاق رکھ کر تسلیم کرتا تھا۔ آلام ومصائب کی عدم موجودگی، بنیادی ضروریات کی تکمیل اور نتیجتاً اپنے پیشے — یعنی اپنے طرز حیات — کے انتخاب میں آزادی: پیئر کو محسوس ہو رہا تھا کہ اگر آدمی کو یہ چیزیں میسر آ جائیں تو وہ مسرت کی انتہائی بلندیوں کو چھو سکتا ہے اور زندگی میں یہاں پہلی مرتبہ اسے کھانے، پینے، سونے، اپنے آپ کو گرم کرنے اور اپنے ہم جنسوں کے ساتھ گفتگو کرنے میں صحیح لطف آیا اور ان کی اصل قدر و قیمت معلوم ہوئی کیونکہ اب وہ کھاتا اس لیے تھا کیونکہ اسے بھوک لگتی تھی، پیتا تھا کیونکہ اسے پیاس لگتی تھی، سوتا تھا کیونکہ اسے نیند آتی تھی، اسے حرارت کی ضرورت محسوس ہوتی تھی کیونکہ اسے سردی لگتی تھی اور وہ باتیں کرتا تھا کیونکہ اس کا باتیں کرنے اور انسانی آواز سننے کو جی چاہتا تھا۔ اب جب کہ پیئر اچھی خوراک، صفائی ستھرائی کے لوازمات اور آزادی سے محروم ہو چکا تھا، اسے معلوم ہوا کہ اگر آدمی کی یہ ضروریات پوری ہو جائیں تو اسے کامل مسرت مل سکتی ہے۔ رہا پیشے یعنی طرز حیات کا انتخاب، تو اب جب کہ یہ انتخاب محدود ہو چکا تھا، اسے یہ معاملہ اتنا آسان نظر آیا کہ وہ یہ بھول گیا کہ اگر زندگی کی آسائشوں کی بہتات ہو جائے تو آدمی کو اپنی ضروریات کی تسکین ہو جانے سے جو حظ ملتا ہے، وہ جاتا رہتا ہے اور اگر پیشے کے

انتخاب میں ضرورت سے زیادہ آزادی میسر آجائے — اسے یہ آزادی اپنی تعلیم، دولت اور سماجی حیثیت کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی — تو پیشے کا انتخاب لاینحل طور پر دشوار ہو جاتا ہے اور پیشہ اختیار کرنے کی خواہش ہی نہیں بلکہ امکان بھی ناپید ہو جاتا ہے۔

اب پیئر ہر وقت صرف یہ خواب دیکھتا رہتا تھا کہ اسے کب آزادی حاصل ہوگی۔ تاہم اسیری کے اس مہینے کے دوران میں اسے جن پُر شدت اور مسرت سے بھرپور تحسسات کا تجربہ ہوا، جن کی دوبارہ یافت ناممکن تھی، اور سب سے بڑھ کر اسے جو کامل طمانیت اور مکمل داخلی آزادی ملی، صرف یہیں ملی، وہ بعدازاں تاحیات اس کا ذکر پورے جوش وخروش سے کرتا رہا۔

اپنی اسیری کے پہلے روز پیئر جب علی الصبح بیدار ہوا، وہ پو پھٹتے اپنے سائبان سے باہر نکلا اور اس نے نوودیوپچی کانونٹ کے قُبّے اور صلیبیں، جو ابتداً نسبتاً تاریک تھیں، گردآلود گھاس پر سفید یخ بستہ شبنم، کنجنگ پہاڑیوں کی ابھرواں چوٹیاں اور بل کھاتے دریا کے، جو دور قرمزی آفاق میں غائب ہو رہا تھا، درختوں سے گھرے ہوئے کنارے دیکھے، جب اسے تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا اور Jackdaws* کو ماسکو سے کھیتوں کے پار اڑتے سنا اور جب بعدازاں مشرق سے روشنی نمودار ہوئی اور سورج کا گولا فاتحانہ انداز سے بدلی کی کوٹ سے باہر آیا، اور قُبّے، صلیبیں، یخ بستہ شبنم، دریا اور بعیدی آفاق دھوپ میں جگمگانے لگے، پیئر کو زندگی میں نئی وجد آور مسرت اور قوت کا وہ احساس ہونے لگا جس سے وہ ازیں پیشتر ناآشنا تھا۔

اور یہ احساس نہ صرف اس کی اسیری کی بقیہ مدت کے دوران میں اس کے ساتھ رہا بلکہ جوں جوں اس کی مشکلات میں اضافہ ہوتا گیا، یہ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا گیا۔

سائبان میں پیئر کی آمد کے فوراً بعد ہی اس کے ساتھی اسیروں نے اس کے متعلق جو اعلیٰ رائے قائم کی تھی، اس نے اس کے ہر کام کرنے کے لیے مستعدی اور اخلاقی چوکسی کے احساس کو مزید قوی بنا دیا۔ وہ مختلف زبانیں جانتا تھا، فرانسیسی اس کا احترام کرتے تھے، وہ مانگے جانے پر ہر چیز (اسے افسروں کا تین روبل فی ہفتہ الاؤنس ملتا تھا) سادگی اور پھرتی سے دوسروں کو دے دیتا تھا، اپنے ساتھی قیدیوں کے ساتھ نرمی اور شفقت سے پیش آتا تھا، وہ زبردست جسمانی قوت کا مالک تھا (اس کا مظاہرہ اس نے سپاہیوں کے سامنے انگلیوں سے دیواروں میں کیلیں ٹھونک کر کیا) اور اس میں کام کیے بغیر ساکن بیٹھے رہنے اور سوچ بچار میں مصروف رہنے کی صلاحیت تھی (اس کی یہ صلاحیت دوسروں کے لیے ناقابل فہم تھی) — ان اوصاف کی بنا پر وہ عام سپاہیوں کو قدرے پراسرار اور برتر مخلوق معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عین مین وہی خوبیاں — اس کی جسمانی قوت، زندگی کی آسائشوں کے متعلق اس کا تحقیر آمیز رویہ، اس کی غیر حاضر دماغی اور سادگی — اگر عملی دنیا میں اس کے لیے ضرر رساں نہیں تھیں، تو بھی اس کے لیے رکاوٹ اور ندامت کا باعث ضرور بنتی تھیں، اب انھوں نے ہی اسے ان لوگوں کے مابین ہیرو کا درجہ دے دیا، اور پیئر کو

* کوے سے ملتا جلتا سیاہ یورپی پرندہ

محسوس ہوا کہ ان کی اس رائے نے اس کے کندھوں پر ذمے داریاں لاد دی ہیں۔

13

فرانسیسیوں کا انخلا چھ اور سات اکتوبر کی درمیانی رات کو شروع ہوا۔ باورچی خانے اور سائبان مسمار کر دیے گئے، چھکڑوں پر مال و اسباب لاد دیا گیا اور فوجی دستے اور سامان کی گاڑیاں کوچ کرنے لگیں۔

سات بجے صبح ایک فرانسیسی فوجی قافلے کے سپاہی سروں پر شاکو ٹوپیاں پہنے، دستی بندوقیں، سفری تھیلے اور وزنی بوریاں اٹھائے سائبانوں کے سامنے کھڑے تھے۔ وہ روانگی کے لیے تیار تھے اور ان کی شگفتہ فرانسیسی گفتگو، جس میں وہ گاہے بگاہے گالیوں کی آمیزش کر رہے تھے، تمام صفوں میں سنائی دے رہی تھی۔

سائبان میں تمام لوگوں نے کپڑے اور جوتے پہن لیے تھے اور پیٹیاں کس لی تھیں۔ اب وہ محض روانگی کے حکم کے منتظر تھے۔ صرف لاغر اندام، نحیف و نزار اور زرد رو بیمار سپاہی، سکالوف، جس کی آنکھوں کے گرد حلقے بن چکے تھے، اپنے کونے میں لیٹا ہوا تھا۔ اس نے نہ اوورکوٹ پہنا تھا اور نہ بوٹ۔ اس کی آنکھیں، جو اس کے استخوانی چہرے پر بہت نمایاں تھیں، اپنے ساتھیوں کو مستفسرانہ انداز سے گھور رہی تھیں لیکن کوئی بھی اس کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا اور وہ باقاعدہ وقفوں سے کراہنے لگتا تھا۔ نظر یہ آ رہا تھا کہ اس کی آہوں کا سبب اس کی تکلیف (وہ پیچش میں مبتلا تھا) نہیں تھی بلکہ اسے دکھ اور خوف اس بات کا تھا کہ وہ اکیلا رہ جائے گا۔

پیئر اپنی کمر کے گرد پیٹی کے بجائے رسی باندھے اور پاؤں میں وہ جوتے پہنے، جو کاراتائیف نے اس کے لیے بنائے تھے (چمڑا ایک فرانسیسی سپاہی اپنے جوتوں کی مرمت کے لیے چائے کی پیٹیوں سے اکھاڑ کر لایا تھا)، بیمار آدمی کے پاس گیا اور آلتی پالتی مار کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔

"سکالوف، تمھیں معلوم ہے کہ وہ سب کے سب نہیں جا رہے۔ ان کا یہاں ہسپتال ہے۔ تم ہماری نسبت غالباً بہتر رہو گے،" پیئر نے کہا۔

"اف خدایا! اس سے تو میری موت واقع ہو جائے گی! اف خدایا!" سپاہی نے نسبتاً اونچی آواز سے کراہتے ہوئے کہا۔

"میں ابھی جاتا ہوں اور ایک بار پھر ان سے پوچھتا ہوں،" پیئر نے اٹھتے اور سائبان کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

ابھی وہ دروازے کے قریب پہنچا ہی ہو گا کہ وہی کارپورل، جس نے ایک روز پیشتر اسے پایپ پیش کیا تھا، دو اور سپاہیوں کے ساتھ وہاں آ گیا۔ کارپورل اور سپاہی سفری وردیوں میں ملبوس تھے۔ ان کی پشتوں پر سفری تھیلے لٹک رہے تھے اور انھوں نے سروں پر شاکو ٹوپیاں، جن کے فیتے ان کی ٹھوڑیوں پر بندھے ہوئے تھے، اوڑھ رکھی تھیں۔ ٹوپیاں پہننے سے ان کے شناسا چہرے ناشناسا دکھائی دینے لگے تھے۔

کارپورل کو دروازہ بند کرنے کا حکم ملا تھا۔ باہر نکالے جانے سے پہلے قیدیوں کی گنتی ہونا تھی۔
''کارپورل، اس بیمار آدمی کا کیا بنے گا؟'' پیئر نے پوچھا۔
لیکن ابھی اس نے اپنی بات ختم کی تھی کہ اس کے دل میں وسوسہ پیدا ہو گیا کہ یہ وہی کارپورل ہے جسے وہ جانتا تھا یا یہ کوئی اور شخص ہے کیونکہ کارپورل اس وقت اپنے آپ سے بالکل مختلف نظر آ رہا تھا۔ مزید برآں، جس وقت پیئر استفسار کر رہا تھا، اچانک دونوں اطراف سے طبل کی تیکھی ڈھم ڈھم سنائی دی۔ پیئر کا سوال سن کر کارپورل کی بھویں تن گئیں اور اس نے بے معنی گالی بکتے کھٹاک سے دروازہ بند کر دیا۔ سائبان میں نیم تاریکی چھا گئی اور دونوں اطراف کے طبلوں کی آوازوں میں مریض کی کراہیں ڈوب گئیں۔
''پھر آ گئی!... وہ پھر آ گئی!'' پیئر نے اپنے آپ سے کہا اور غیر ارادی طور پر اس کی کپکپی چھوٹ گئی۔ کارپورل کے تبدیل شدہ چہرے میں، اس کے لب و لہجے میں، طبلوں کے دلوں کو دہلا دینے اور کانوں کے پردے پھاڑ دینے والے شور و غل میں، پیئر نے اس پراسرار، جابر و متمرد قوت کی، جو لوگوں کو ان کی مرضی کے خلاف اپنے ہم جنسوں کا قتل کرنے پر اکساتی اور مجبور کرتی ہے، شناخت کر لی۔ یہ وہی قوت تھی جس کا اس نے مقتل میں لوگوں کو گولیوں سے ہلاک کرنے کے موقع پر مشاہدہ کیا تھا۔ اس قوت سے خوف کھانا یا اس سے بچنے کی کوشش کرنا اور ان اشخاص کی، جو اس کے آلۂ کار کی حیثیت سے خدمات سرانجام دیتے ہیں، منت سماجت کرنا یا ان کے پاؤں پڑنا بیکار تھا۔ یہ بات پیئر کی سمجھ میں آ چکی تھی۔ آدمی کے بس میں اب یہی تھا کہ وہ انتظار کرے اور برداشت کرے۔ وہ دوبارہ علیل شخص کے قریب نہ گیا اور نہ اس نے اس کی جانب مڑ کر دیکھا۔ وہ سائبان کے دروازے کے قریب خاموش کھڑا ناک بھوں چڑھاتا رہا۔
جب دروازہ کھلا اور قیدی بھیڑوں کے ریوڑ کی طرح بے ترتیب ہجوم بنائے دروازے میں پھنس گئے، پیئر دھکے مارتا آگے بڑھا اور اسی کیپٹن کے پاس پہنچا جس کے متعلق کارپورل نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ اس کی خاطر سب کچھ کرنے کو تیار ہو جائے گا۔ کیپٹن نے بھی سفری وردی زیب تن کر رکھی تھی۔ پیئر کو اس کے ٹھنڈے چہرے پر بھی (جابر و متمرد قوت کی) وہی علامت نظر آ گئی، جس کی شناخت اس نے کارپورل کے الفاظ اور طبلوں کی ڈھم ڈھم میں کی تھی۔
''چلو، چلو!'' کیپٹن کہہ رہا تھا۔ وہ بری طرح چیں بجبیں ہو رہا اور قیدیوں کا، جن کی اس کے قریب بھیڑ لگتی جا رہی تھی، بغور جائزہ لے رہا تھا۔
پیئر جانتا تھا کہ اس کی مساعی لاحاصل رہیں گی، پھر بھی وہ اس کے پاس چلا گیا۔
''ہونہہ، کیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔ وہ پیئر کو یوں دیکھ رہا تھا جیسے اس نے پہچانا ہی نہ ہو کہ وہ کون ہے۔
پیئر نے اسے بیمار آدمی کے متعلق بتایا۔
''وہ چل سکتا ہے، لعنتی کہیں کا؟'' کیپٹن نے کہا۔ ''چلو، چلو!'' وہ پیئر کی طرف دیکھے بغیر قیدیوں کو حکم دیتا رہا۔

''وہ چل نہیں سکتا، وہ آخری گھڑیاں گن رہا ہے۔'' پیئر نے پھر بات شروع کی۔

''ذرا مہربانی فرمائیں۔'' کیپٹن نے غیظ و غضب سے چلاتے اور بھویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

ڈھم۔ڈھما۔ڈھم، ڈھم۔ڈھما۔ ڈھم... طبل دھڑادھڑ کھڑکھڑا رہے تھے اور پیئر کو اندازہ ہو گیا کہ پراسرار قوت پوری طرح ان لوگوں کو اپنی گرفت میں لے چکی ہے اور اب مزید کچھ کہنا سننا بیکار ہے۔

قیدیوں میں جو افسر تھے، انھیں عام سپاہیوں سے علیحدہ کر دیا گیا اور انھیں آگے چلنے کا حکم سنا دیا گیا۔ افسروں کی تعداد تقریباً تیس تھی۔ پیئر بھی انھیں میں شامل تھا۔ سپاہیوں کی نفری تین سو تھی۔

افسر دوسرے سائبانوں سے آئے تھے اور وہ سارے کے سارے پیئر کے لیے اجنبی تھے۔ ان کے ملبوسات اس کے اپنے لباس سے کہیں بہتر تھے۔ انھوں نے اسے اور اس کے عجیب و غریب جوتوں کو لاتعلقی اور شبے کی نظروں سے دیکھا۔ اس سے کچھ ہی فاصلے پر ایک بھاری بھرکم میجر جا رہا تھا، جس کا چہرہ زرد، پھولا پھولا اور کبیدہ تھا۔ وہ قازانی ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس تھا، جس پر اس نے پیٹی کے بجائے تولیہ باندھ رکھا تھا۔ بظاہر یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس کے ساتھی قیدی اس کا احترام کرتے ہیں۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ، جس میں تمباکو کی تھیلی تھی، سینے کے اوپر ڈریسنگ گاؤن کے اندر گھسیڑ رکھا تھا اور وہ دوسرے ہاتھ سے پائپ کی ڈنڈی مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔ میجر کا دم پھول چکا تھا اور وہ بار بار پھونکیں مار رہا تھا۔ بیچ بیچ میں وہ ہر شخص پر غرانے اور اس کے بارے میں شکوہ شکایت کرنے لگتا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اسے دھکے دیے جا رہے ہیں اور دوسرے لوگ خواہ مخواہ تیزی دکھا رہے ہیں حالانکہ تیزی دکھا کر کہاں جانا ہے اور بے جا حیران ہو رہے ہیں جب کہ حیران ہونے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ ایک اور شخص، ایک دبلا پتلا ناٹا افسر، ہر شخص سے کچھ نہ کچھ کہے جا رہا اور قیاس آرائیاں کرتا جا رہا تھا کہ اب انھیں کہاں لے جایا جائے گا اور وہ اس روز کہاں تک جانے میں کامیاب ہوں گے۔ ایک سرکاری کارندہ، جس کے جسم پر فوج کے محکمہ رسد کی وردی اور پاؤں میں فلیٹ بوٹ تھے، سڑک کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک بھاگا پھر رہا تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ ماسکو کے کھنڈرات کے مناظر اچھی طرح دیکھ لے۔ جو سوختہ علاقے اس کے مشاہدے میں آتے تھے، وہ ان کے متعلق دوسروں کو بتاتا جاتا تھا کہ اب وہ شہر کا فلاں محلہ اور اب فلاں محلّہ دیکھ سکتے ہیں۔ ایک تیسرا افسر، جو لہجے کے اعتبار سے پولستانی معلوم ہوتا تھا، محکمہ رسد کے کارندے سے اختلاف کرنے لگتا اور دعوے سے کہتا کہ وہ ماسکو کے مختلف علاقوں کی شناخت کرنے میں غلطیوں کا ارتکاب کر رہا ہے۔

''یہ تم کس بات پر جھگڑ رہے ہو؟'' میجر نے بھنا کر پوچھا۔ ''یہ نکولا ہے یا ولاس، اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ تمھیں نظر نہیں آتا کہ سب کچھ جل کر راکھ بن چکا اور یوں ختم ہو چکا ہے؟... تم دھکے کیوں دے رہے ہو — سڑک کافی چوڑی نہیں؟'' اس نے ایک آدمی سے، جو اسے قطعاً دھکے نہیں دے رہا تھا، پیچھے مڑ کر کہا۔

''ہائیں، ہائیں، ہائیں! انھوں نے یہ کیا کر دیا ہے؟'' چاروں اطراف قیدی سوختہ اور نیم سوختہ کھنڈرات دیکھ دیکھ کر ہائے وائے پکار رہے تھے۔ ''زامسک واریچہ محلے، اور زبوو محلے، اور کریملن میں... دیکھو، آدھا بھی نہیں رہ

گیا... ہاں میں نے تمھیں بتایا نہیں تھا کہ دریا کے پار سارا علاقہ خاکستر ہو گیا ہے۔ اب خود دیکھ لو، بالکل جل چکا ہے۔"

"ہونہہ، تمھیں معلوم ہے کہ یہ خاکستر ہو چکا ہے، پھر اس کے متعلق باتیں بنانے کا فائدہ؟" میجر نے کہا۔

جب وہ خامونکی محلے (یہ ماسکو کے ان معدودے چند محلوں میں شامل تھا، جو جلنے سے بچ گئے تھے) میں ایک گرجے کے قریب پہنچے، قیدیوں کا سارا ہجوم ایک طرف سمٹ گیا۔ وہ سب برا بھلا کہنے اور شدید نفرت کا اظہار کرنے لگے۔

"اف، سُوّروں کے بچے!... کافروں کی اولاد... ہاں، یہ لاش ہے، پکی بات ہے کہ لاش ہی ہے... اور انھوں نے اس کے چہرے پر کالک مل دی ہے! حرام زادے!"

پیئر بھی کھسکتا کھسکتا گرجے کے قریب پہنچ گیا۔ وہاں وہ چیز موجود تھی جو ان مغلظات کا باعث بنی تھی۔ یہ گرجے کی باڑ کے ساتھ جھکی ہوئی تھی۔ پیئر کو یہ دھندلی دھندلی نظر آئی۔ اسے اپنے ساتھیوں کے، جنھوں نے اسے زیادہ واضح انداز سے دیکھا تھا، الفاظ سے معلوم ہوا کہ یہ کوئی انسانی لاش ہے۔ کسی نے اس کے منہ پر کالک مل دی تھی اور وہ اسے دیوار کے ساتھ کھڑا کر گیا تھا۔

"چلو، آگے چلو! لعنت ہو تم پر!... چلو، آگے چلو!... تیس ہزار شیطانو!" انھوں نے محافظ گارڈ کو مغلظات لڑھکاتے سنا اور فرانسیسی سپاہیوں نے قیدیوں کو، جو لاش دیکھنے کھڑے ہو گئے تھے، ہانکنے کے لیے اپنی تلواریں سونت لیں۔

14

اپنے محافظوں کی معیت میں قیدی اکیلے خامونکی محلے کے گلی کوچوں میں گزر رہے تھے۔ ان کے پیچھے گاڑیاں اور چھکڑے آ رہے تھے، جو اس قافلے کے سپاہیوں کی ملکیت تھے۔ لیکن جب وہ خوردنی اشیا کی دکانوں کے قریب پہنچے، وہ آرٹلری کی توپ گاڑیوں کے، جو کھچا کھچ لدی ہوئی تھیں، لمبے چوڑے جلوس میں پھنس گئے۔ ان توپ گاڑیوں کے بیچ میں کہیں کہیں کوئی نجی گاڑی بھی نظر آ جاتی تھی۔

وہ سب کے سب پل پر رک گئے اور جو گاڑیاں اور لوگ آگے تھے، ان کے گزرنے کا انتظار کرنے لگے۔ پل سے قیدیوں کو اپنے آگے اور پیچھے حرکت پذیر چھکڑوں کا تانتا بندھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ دائیں طرف، جہاں کالوگا روڈ نیس کوچنی باغات کے گرد چکر کاٹتی تھی، تاحد نظر فوجی ہی فوجی اور چھکڑے ہی چھکڑے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ (جنرل) بوآغنے[18] کی کور کے دستے تھے۔ یہ باقی سب سے پہلے روانہ ہوئے تھے۔ ان کے عقب میں دریا کے کنارے کے ساتھ ساتھ اور کامنی پل کے پار نے (Ney) کی سپاہ اور گاڑیاں تھیں۔

داؤو کے دستے، جن کی تحویل میں قیدی تھے، کریمیائی پل پر سے گزر رہے تھے اور ان میں سے چند ایک پہلے ہی کالوگا روڈ پر پھیل چکے تھے۔ تاہم سامان کے چھکڑوں کا سلسلہ اتنا طویل تھا کہ بوآغنے کے قافلے کی گاڑیوں

کی آخری قطار ابھی ماسکو سے نکل کر کالوگا روڈ پر پہنچنے نہیں پائی تھی کہ نئے کی سپاہ کے ہراول دستے گریٹ اوڈکا سٹریٹ سے برآمد ہونا شروع ہو گئے۔

کریمیائی پل عبور کرنے کے بعد قیدیوں پر گاڑیوں اور فوجیوں کا اتنا دباؤ پڑنے لگا کہ وہ ایک وقت میں صرف چند قدم ہی چل سکتے۔ وہ رکتے اور پھر آگے چل پڑتے۔ جب وہ چند سو قدموں کا فاصلہ، جو پل کو کالوگا روڈ سے جدا کرتا ہے (اس میں انھیں ایک گھنٹے سے زیادہ صرف کرنا پڑا)، طے کر چکے اور اس چوک میں پہنچے جہاں کالوگا روڈ اور زامسک وار یچا محلے کی سڑکیں ملتی ہیں، وہ رک گئے اور ایک دوسرے میں پھنس کر کھڑے ہو گئے۔ اس چوراہے پر انھیں کئی گھنٹے یونہی کھڑے رکھا گیا۔ سمندر کی گھن گرج کی طرح چاروں اطراف سے گاڑیوں کے پہیوں کی کھڑکھڑاہٹ، قدموں کی رپ رپ اور گالی گلوچ سے بھرپور غصیلی آوازیں پیہم سنائی دے رہی تھیں۔

پیئر ایک نیم سوختہ مکان کی دیوار کے ساتھ پچکا کھڑا اور شور و غل کو سنتا رہا جو اس کے تخیل میں طبلوں کی ڈھم ڈھم میں جذب ہو رہا تھا۔

منظر کا بہتر انداز سے مشاہدہ کرنے کے لیے متعدد قیدی افسر نیم سوختہ مکان کی اس دیوار کے اوپر چڑھ گیا، جس کے ساتھ پیئر ٹیک لگائے کھڑا تھا۔

"بھیڑ ہی بھیڑ ہے!... ان ہجوموں کی طرف دیکھو... انھوں نے گنوں پر بھی سامان لاد لیا ہے! اور ادھر دیکھو—پوستینیں!..." وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔ "ذرا دیکھو تو سہی، یہ گدھ کیا کچھ لوٹے لے جا رہے ہیں!... ادھر دیکھو، اس شخص نے اپنے چھکڑے کے پیچھے کیا لاد رکھا ہے؟... ارے، یہ تو ایقونوں کی دفتیاں ہیں۔ خدا کی قسم... یہ لازماً جرمن ہوں گے... اور وہ شخص کون ہے؟ اپنا ہی کوئی کسان معلوم ہوتا ہے... حرامی کہیں کا!... اور اس شخص کو دیکھو، کتنا لدا پھندا ہے۔ اس سے تو چلا بھی نہیں جاتا... اف، میرے خدایا، وہ دروشکیاں بھی اڑا لائے ہیں! وہ نظر آیا؟— وہ جوان ٹرنکوں پر بیٹھا ہے۔ خدایا!... ان میں دھینگا مشتی شروع ہو گئی ہے!...

"یہ ہوئی نا بات، مارو اس کی تھوتھنی پر— اس کی تھوتھنی پر! اگر یہی حال رہا، پھر ہم شام پڑنے سے پہلے روانہ بھی نہیں ہو سکیں گے۔ دیکھو، ادھر دیکھو— یہ لازماً نپولین کے ہوں گے، واہ واہ، لاجواب گھوڑے ہیں، مونوگرام کے ساتھ تاج کا نشان بھی نقش ہے! چلتا پھرتا مکان نظر آتا ہے!... اس شخص کا بھاری بھرکم تھیلا گر گیا ہے اور اسے پتا بھی نہیں چلا!... مار کٹائی شروع ہو گئی ہے!... اس عورت نے شیر خوار بچہ اٹھا رکھا ہے اور اس کی شکل بھی اتنی بری نہیں۔ بی بی، میرا خیال ہے کہ یوں کوئی تمھیں روکے گا بھی نہیں... ذرا دیکھو تو سہی، یہ سلسلہ شیطان کی آنت کی طرح دراز ہوتا جا رہا ہے؟ کہیں رکنے کا نام ہی نہیں لیتا! روسی چھوکریاں، خدا کی قسم، بالکل روسی ہیں! گاڑیوں میں— کیا مزے سے ڈٹی بیٹھی ہیں!"

جیسا کہ خامونکی گرجے کے سامنے ہوا تھا، قیدیوں میں ایک بار پھر تجسس کی لہر دوڑ گئی اور وہ مار امار سڑک پر آگے بڑھنے لگے۔ پیئر کے ساتھیوں کو جس چیز میں دلچسپی پیدا ہو گئی تھی، وہ اپنے قد کی بدولت ان کے سروں کے

اوپر ہی اوپر اسے دیکھنے میں کامیاب رہا۔ گولہ بارود کی گاڑیوں کے مابین تین کالاشائیں پھنسی ہوئی تھیں۔ ان میں سرخی پاؤڈر لگائے اور بھڑ کیلے ملبوسات پہنے عورتیں ایک دوسری میں ٹھنسی بیٹھی تھیں اور تیکھی آوازوں میں چلا چلا کر کچھ کہہ رہی تھیں۔

جب سے پیئر نے پراسرار قوت کو مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوتے پہچانا تھا، اسے کوئی چیز بھی — نہ تو وہ لاش، جس کا چہرہ مذاقاً کالا کر دیا گیا تھا، نہ یہ عورتیں، جنھیں یہاں سے نکل بھاگنے کی جلدی تھی اور نہ ماسکو کے سوختہ کھنڈرات — عجیب یا بھیانک معلوم نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ اب جو کچھ بھی وہ دیکھتا تھا، اس کا اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوتا تھا۔ کچھ یوں نظر آتا تھا کہ اس کی روح کسی صبر آزما جدوجہد میں گزرنے کی تیاریاں کر رہی ہے اور کسی ایسے تاثر کو، جو اسے مضمحل کردے، قبول کرنے سے انکاری ہے۔

عورتوں کی گاڑیاں آگے نکل گئیں۔ ان کے پیچھے مزید گاڑیاں، سپاہی، گولے بارود کے چھکڑے، سپاہی، گاڑیاں، گولے بارود کے چھکڑے، سپاہی، آتے رہے۔ گاہے بگاہے عورتیں بھی نظر آ جاتیں۔

پیئر نے ان لوگوں کو ان کی انفرادی حیثیت سے نہیں پہچانا، وہ صرف ان کی عمومی نقل وحرکت کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی نادیدہ قوت ان تمام انسانوں اور گھوڑوں کو ان کی مرضی کے خلاف آگے دھکیل رہی ہے۔

اس ایک گھنٹے کے دوران میں، جب پیئر انھیں دیکھ رہا تھا، اسے یہی محسوس ہوا کہ ان سب پر، جو مختلف گلی کوچوں سے چلے آ رہے تھے، صرف ایک ہی دھن سوار ہے کہ وہ حتیٰ الامکان جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ دھکم دھکا کر رہے تھے، ان کے جذبات کا لاوا ابل رہا تھا اور ان کی آپس میں دھینگا مشتی شروع ہو گئی تھی۔ ان کے سفید دانت چمک رہے تھے، ابرو تنے ہوئے تھے اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ مغلظات کا تبادلہ کر رہے تھے۔ ہر چہرے پر ایک ہی قسم کا ناعاقبت اندیش عزم اور سرد مہر سفاکی کی جھلک رہی تھی۔ اور یہ وہ چیزیں تھیں جو پیئر نے صبح اس وقت، جب طبل بج رہے تھے، کارپورل کے چہرے پر دیکھی تھیں۔

جب قافلے کا کمانڈنگ افسر اپنے جوانوں کو مجتمع کرنے میں کامیاب ہوا، اس سے شام ہو چکی تھی۔ وہ چیختے چلاتے اور دھینگا مشتی کرتے چھکڑوں کے بیچ میں گھس گیا اور جب قیدی چاروں اطراف سے گھیرے میں آگئے، وہ اور اس کے ساتھی انھیں ہانکتے کالوگا روڈ پر نکل آئے۔

وہ کہیں رکے اور آرام کیے بغیر بہت تیز تیز چلتے رہے اور صرف اس وقت رکے جب سورج غروب ہونے لگا تھا۔ چھکڑے ایک دوسرے کے قریب کھڑے کر دیے گئے اور فوجیوں نے شب بسری کی تیاریاں شروع کر دیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر شخص جھلاہٹ اور بے اطمینانی کا مارا ہوا ہے۔ چاروں اطراف سے تادیر گالیوں، قسموں، معاندانہ شور وغل اور مار کٹائی کی آوازیں آتی رہیں۔ ایک گاڑی جو قافلے کے عقب میں آ رہی تھی، ایک چھکڑے سے ٹکرا گئی اور اس نے اپنا بم اس میں پھنسا دیا۔ متعدد جوان بھاگے بھاگے آئے، انھوں نے گھوڑوں کو ایک طرف دھکیلا اور ان کے سروں پر ڈنڈے برسانے لگے۔ دوسرے آپس میں الجھ گئے اور پیئر نے دیکھا کہ ایک جرمن تلوار سے زخمی ہو

گیا ہے۔

جب یہ لوگ روانہ ہوے تھے، انھیں آگے جانے کی اتنی جلدی اور شوق تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے سروں پر کوئی بھوت سوار ہو گیا ہے، مگر اب جب وہ خزانی شام کے سرد دھند لکے میں کھیتوں کے عین بیچ میں ڈیرے ڈالے پڑے تھے، یوں نظر آنے لگا جیسے انھیں شدید جھٹکا لگا ہے، ان کی اچانک آنکھ کھل گئی ہے اور ان سب کو ایک ہی قسم کے ناخوش گوار احساس کا تجربہ ہو رہا ہے: ''ہائیں، ہم یہ کیا کر بیٹھے ہیں!'' اب جب کہ وہ رک گئے تھے، قرائن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ یہ سمجھ گئے ہیں کہ انھیں ابھی تک یہ معلوم ہی نہیں کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اور یہ کہ ان کی جان آسانی سے نہیں چھوٹے گی، بلکہ انھیں راستے میں بے شمار مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا۔

بوقت روانگی قیدیوں کے ساتھ محافظوں کا رویہ اچھا نہیں تھا لیکن یہاں پڑاؤ میں وہ ان کے ساتھ اور بھی بدسلوکی سے پیش آنے لگے۔ یہاں پہلی مرتبہ قیدیوں کو گھوڑوں کا ماس کھانے کو ملا۔

افسروں سے لے کر ادنیٰ سپاہیوں تک سب کا رویہ کچھ اس قسم کا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ انھیں قیدیوں کے ساتھ کوئی ذاتی عناد ہے۔ پہلے وہ ان کے ساتھ جس دوستانہ انداز سے پیش آتے رہے تھے، ان کا یہ سلوک اس کے بالکل متضاد تھا۔

ان کی اس عداوت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہو گیا جب قیدیوں کی گنتی کے دوران میں یہ معلوم ہوا کہ ماسکو سے روانگی پر جو افراتفری مچی تھی، اس کے دوران میں ایک روسی سپاہی، جس نے درد قولنج کا بہانہ کیا تھا، فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پیئر نے دیکھا کہ ایک فرانسیسی ایک اور روسی سپاہی کو محض اس لیے بیدردی سے پیٹ رہا ہے کہ وہ بھٹک کر سڑک سے کچھ زیادہ ہی پرے چلا گیا تھا اور اس نے اپنے دوست کیپٹن کو ایک نان کمشنڈ افسر کو جھاڑ پلاتے اور دھمکیاں دیتے سنا کہ قیدی کے بھاگ جانے پر اس کا کورٹ مارشل کیا جائے گا۔ جب نان کمشنڈ افسر نے یہ عذر پیش کیا کہ قیدی بیمار تھا اور چلنے پھرنے سے معذور، افسر نے جواب دیا کہ حکم یہ تھا کہ جو لوگ پیچھے رہ جائیں، انھیں گولی ماردی جائے۔ پیئر کو محسوس ہوا کہ وہ اندھی قوت، جو مقتل میں اس پر غالب آگئی تھی لیکن جس کا اسیری کے دوران میں اسے کوئی احساس نہیں ہوا تھا، ایک بار پھر اس کے وجود کو اپنے شکنجے میں کس چکی ہے۔ یہ اسے خوف زدہ کر رہی تھی لیکن اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ یہ ہلاکت خیز قوت اسے کچلنے کی جتنی زیادہ کوشش کرتی ہے، اس کی اپنی قوت حیات اس کے باطن کے اندر اتنی ہی زیادہ نمو پا رہی اور مضبوط تر ہوتی جا رہی ہے۔

پیئر نے رائی کے آٹے کے سوپ کے ساتھ گھوڑے کا گوشت کھایا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ گپ شپ کرنے لگا۔

انھوں نے ماسکو میں جو کچھ دیکھا تھا، فرانسیسی ان کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کر رہے تھے، پیچھے رہ جانے والوں کو گولی مار دینے کا جو حکم دیا گیا تھا اور جو انھیں بھی سنا دیا گیا تھا، پیئر اور دوسرے لوگوں نے ان باتوں کے متعلق آپس میں کوئی تبادلۂ خیالات نہ کیا۔ ان کی حالت جس طرح دم بدم بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی، معلوم ہوتا

تھا کہ اس کا توڑ کرنے کے لیے انھوں نے خاص طور پر عالی حوصلگی، من چلے پن اور شگفتہ مزاجی کا نقاب اوڑھ لیا ہے۔ انھوں نے بھولی بسری باتوں کو تازہ کیا، کوچ کے دوران میں جو مضحک مناظر ان کے مشاہدے میں آئے تھے، ان کا اعادہ کیا لیکن انھوں نے اپنی موجودہ قابل رحم حالت کا بھولے سے بھی ذکر نہ کیا۔

سورج کبھی کا غروب ہو چکا تھا۔ آکاش پر کہیں کہیں ستارے ٹمٹمار ہے تھے، افق پر، جہاں مہ کامل طلوع ہو رہا تھا، کچھ اس طرح سرخ لو بھڑک اٹھی جیسے کہیں زبردست آگ لگ گئی ہو، اور سرمئی دھند میں عظیم الشان احمریں گولہ عجیب وغریب انداز سے آگے پیچھے جھولنے لگا۔ پیئر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے نئے ساتھیوں کو شب بخیر کہا اور الاؤوں کے بیچ میں سے چلتا سڑک کے دوسرے کنارے پہنچ گیا، جہاں اسے بتایا گیا تھا کہ عام قیدی ٹھہرائے گئے ہیں۔ اس کا ان کے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔ سڑک پر اسے فرانسیسی سنتری نے روک لیا اور اسے حکم دیا کہ وہ واپس چلا جائے۔

پیئر واپس تو آ گیا لیکن وہ الاؤ کے قریب اپنے ساتھیوں کے پاس نہ گیا بلکہ ایک چھکڑے کے، جس میں سے گھوڑے کھول لیے گئے تھے اور جہاں کوئی متنفس نہیں تھا، نزدیک چلا گیا۔ وہ آلتی پالتی مار کر چھکڑے کے ایک پہیے کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اور سر جھکائے اپنے خیالات میں مستغرق کافی دیر تک ساکت بیٹھا رہا۔ ایک گھنٹے سے اوپر گزر گیا۔ کوئی شخص بھی اس کے سکون میں دخیل نہ ہوا۔ اچانک وہ اتنے زور زور سے اور اتنی خوش طبعی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگا کہ تمام لوگ حیرت واستعجاب کے عالم میں اپنے چاروں اطراف دیکھنے اور سوچنے لگے کہ بظاہر یہ تنہا شخص کون ہے جو اتنی زندہ دلی سے قہقہے لگا رہا ہے۔

''ہا، ہا، ہا!'' پیئر ہنس رہا تھا۔ اور اس نے با آواز بلند اپنے آپ سے کہا: ''اس سپاہی نے مجھے گزرنے نہ دیا۔ انھوں نے مجھے پکڑ لیا اور بند کر دیا۔ انھوں نے مجھے قیدی بنا رکھا ہے۔ یہ 'مجھے' کون ہے؟... مجھے؟ مجھے — میری غیر فانی روح! ہا، ہا، ہا!...'' اور وہ ہنستا رہا، ہنستا رہا، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ایک آدمی اٹھا اور یہ دیکھنے آیا کہ یہ عجیب اور لحیم وشحیم آدمی اکیلا کس چیز پر ہنس رہا ہے۔ پیئر نے ہنسنا بند کر دیا۔ وہ اٹھا، اس شخص کے قریب سے گزرتا آگے نکل گیا اور اپنے اردگرد پیش دیکھنے لگا۔

وسیع وعریض، بے پایاں شبینہ پڑاؤ، جس میں کچھ دیر پہلے الاؤوں میں لکڑیاں چیخ رہی تھیں اور باتوں کی بھنبھناہٹ گونج رہی تھی، خاموش ہو چکا تھا۔ الاؤوں کے سرخ شعلے ماند پڑ گئے تھے اور آگ آہستہ آہستہ بجھتی جا رہی تھی۔

اوپر درخشاں آسمان پر چودھویں کا چاند اپنی پوری آب وتاب سے آویزاں تھا۔ کیمپ کی حدود سے پرے جنگل اور کھیت، جو پہلے نظروں سے اوجھل تھے، اب دور سے دکھائی دینے لگے تھے۔ ان کھیتوں اور جنگلوں کے پار تابندہ، جھلملاتا، ٹمٹماتا افق نگاہوں کو اپنی طرف دعوت دے رہا تھا۔ پیئر آسمان پر دور، بہت دور، ٹمٹماتے اور پیچھے ہٹتے ستاروں کو بغور دیکھتا رہا۔

"یہ سب کچھ میرا ہے، یہ سب کچھ میرے اندر ہے اور یہ سب کچھ میں ہوں!" اس نے سوچا۔ "اور انھوں نے یہ سب کچھ پکڑا اور اسے سائبان کے اندر، جسے شہتیروں سے محصور کر دیا گیا تھا، بند کر دیا!"
وہ مسکرایا اور اپنے ساتھیوں کے قریب لیٹنے اور سونے کے لیے واپس چل پڑا۔

15

اکتوبر کے اوائل میں نپولین نے صلح کی تجاویز کے ساتھ ایک اور ایلچی کوتوزوف کے پاس بھیجا۔ اس نے غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مراسلے میں مقام تحریر ماسکو لکھا حالانکہ وہ اس وقت کالوگا روڈ پر سفر کر رہا تھا اور جہاں کوتوزوف نے ڈیرے ڈال رکھے تھے، وہاں سے کوئی خاص دور نہیں تھا۔ کوتوزوف نے اس مراسلے کا بھی وہی جواب دیا جو اس نے پہلے مراسلے کا دیا تھا جو لوغستوں لایا تھا۔ اس نے لکھا کہ صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس کے ایک دو روز بعد جنرل دروخوف کے گوریلے دستوں کی، جو تاروتینو کے بائیں جانب کارروائیوں میں مصروف تھے، رپورٹ موصول ہوئی کہ چند فرانسیسی رجمنٹیں فامنسکایا (گاؤں) کے آس پاس دیکھی گئی ہیں۔ ان کا تعلق جنرل بغوسیئے (Broussier) کی ڈویژن سے ہے اور چونکہ باقی فرانسیسی فوج کے ساتھ ان کا رابطہ منقطع ہو چکا ہے، اس لیے ان کا با آسانی قلع قمع ہو سکتا ہے۔ سپاہی اور افسر ایک بار پھر زور شور سے عملی کارروائی کا مطالبہ کرنے لگے۔ تاروتینو کے مقام پر جو آسان فتح حاصل ہوئی تھی، سٹاف کے جرنیلوں کو یاد آ گئی اور ان کا جوش و خروش ابلنے لگا۔ انھوں نے کوتوزوف سے اصرار کیا کہ دروخوف کی تجویز پر عمل کیا جائے۔ کوتوزوف کا خیال تھا کہ جارحانہ کارروائی کی ضرورت نہیں۔ تاہم نتیجہ ناگزیر طور پر مفاہمت کی صورت میں برآمد ہوا۔ بغوسیئے پر حملہ کرنے کے لیے مختصر جمعیت روانہ کر دی گئی۔

عجیب اتفاق ہے کہ یہ فریضہ، جو انتہائی کٹھن اور اہم ثابت ہوا، دختوروف کے سپرد کیا گیا۔ دختوروف منکسر المزاج پست قامت جرنیل تھا۔ کسی (مورخ) نے بھی اس کا ذکر اس انداز سے نہیں کیا کہ وہ جنگی منصوبے ترتیب دیتا تھا، رجمنٹوں کے آگے دوڑتا تھا اور توپوں پر تمغوں کی بارش کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ سب لوگوں کا یہی خیال تھا اور وہ کہتے بھی یہی رہتے تھے کہ وہ ضعیف الارادہ اور بصیرت سے محروم شخص ہے۔ لیکن اوسٹرلٹس سے 1813 تک روسیوں اور فرانسیسیوں کے مابین جتنے معرکے بپا ہوتے ہیں، جہاں کہیں بھی مشکل صورت حال پیدا ہوتی ہے، ہمیں کمان ہمیشہ اس کے ہاتھ میں نظر آتی ہے۔ اوسٹرلٹس کے معرکے میں وہ اوگڈ ڈیم سے سب سے آخر میں روانہ ہوتا ہے۔ اس کے چاروں اطراف بھگدڑ مچی ہوئی ہے۔ لوگ فرار ہو رہے ہیں یا ہلاک ہو رہے ہیں اور عقب میں ایک جرنیل بھی نظر نہیں آ رہا، لیکن وہ ہے کہ رجمنٹیں اکٹھی کر رہا ہے اور جو کچھ بچایا جا سکتا ہے، بچانے کی کوشش کر رہا ہے۔ وہ بخار میں پھنک رہا ہے لیکن بیس ہزار آدمی لے کر نپولین کی پوری فوج کے خلاف نبرد آزما ہونے اور سمولنسک کا دفاع کرنے چل پڑتا ہے۔ سمولنسک میں اسے مالاخوف گیٹ کے قریب شدت بخار میں ذرا اونگھ آ

جاتی ہے کہ اس کے کان میں شہر پر گولہ باری کی آواز پڑتی ہے، وہ فوراً جاگ جاتا ہے۔ اور سمولنسک سارادن غنیم کے خلاف ڈٹا رہتا ہے۔ بارودینو کی لڑائی میں جب باگ راتیاں ہلاک ہو جاتا ہے، ہمارے میسرے کے نوّے (90) فیصد جوان ہلاک یا زخمی ہو جاتے ہیں اور فرانسیسی آرٹلری اپنی ساری فائرنگ کا رخ اسی طرف کر دیتی ہے، کوتوزوف نے اس جانب پہلے کسی اور شخص کو بھیج کر جس غلطی کا ارتکاب کیا تھا، وہ اس کا ازالہ کرنے میں دیر نہیں کرتا۔ وہ جھٹ پٹ اس ''ضعیف الارادہ اور بے بصیرت'' شخص کو ادھر روانہ کرتا ہے کیونکہ اسے اس کے علاوہ کوئی اور موزوں آدمی نظر نہیں آتا۔ پست قامت، نرم خو دختوروف وہاں جاتا ہے اور بارودینو کی لڑائی روسی فوج کا عظیم ترین سرمایہ بن جاتی ہے۔ نظم ونثر دونوں میں بے شمار ہیروؤں کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے گئے ہیں لیکن دختوروف کی تعریف میں شاید ہی کسی نے ایک آدھ لفظ کہا ہوگا۔

اور یہ دختوروف ہی ہے جسے پہلے فامنسکایا اور وہاں سے مالا یاروسلاوتس بھیجا جاتا ہے جہاں فرانسیسیوں کے خلاف آخری لڑائی لڑی گئی اور یہیں سے لاریب فرانسیسی فوج کی شکست وریخت کا آغاز ہوا۔ جنگ کے اس دور کے بے شمار عبقریوں اور ہیروؤں کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے ہیں لیکن مجال ہے کہ کوئی شخص بھول کر بھی دختوروف کا نام لے لے اور اگر اس کا کہیں ذکر کیا بھی جاتا ہے تو محض خانہ پری کے لیے اور وہ بھی بڑے مبہم انداز سے۔ مورخوں اور وقائع نگاروں کی یہی خاموشی اس کی خوبیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

جو شخص مشین کی ساخت نہیں سمجھتا، اس کے لیے یہ تصور کرنا دشوار ہے کہ مشین کا اہم ترین پرزہ وہ کتل نہیں جو اتفاقاً اس میں گر پڑتی ہے اور ادھر ادھر اچھل رہی اور اس کے کام میں رکاوٹ بن رہی ہوتی ہے بلکہ چرخ دندانی (Cogwheel) ہے جو شور وغل پیدا کیے بغیر مسلسل گھومتا رہتا ہے۔

دس اکتوبر یعنی اس روز جب دختوروف فامنسکایا کی آدھی مسافت طے کر چکا تھا اور جو احکام اسے ملے تھے، ان کی ایماندارانہ انداز سے تعمیل کرنے کے لیے ارستوو گاؤں میں رک گیا تھا، پوری فرانسیسی فوج مریضوں کی طرح کبھی چلتی اور کبھی رکتی اس جگہ پہنچ گئی، جہاں موغانے پڑاؤ ڈال رکھا تھا۔ بظاہر تو یہی دکھائی دیتا تھا کہ اس کا ارادہ معرکہ آرائی کرنے کا ہے لیکن وہ ایکا ایکی اور کسی ظاہری وجہ کے بغیر بائیں طرف مڑ گئی اور کالوگا روڈ پر چڑھ گئی۔ یہاں سے اس کا رخ فامنسکایا کی طرف ہو گیا، جہاں اس وقت تک صرف بغوبیئے قیام پذیر تھا۔ اس وقت دختوروف کی کمان میں دروخوف کے گوریلوں کے علاوہ صرف دو اور چھوٹے چھوٹے دستے تھے۔ ان دستوں کے کمانڈر فگنر اور سیسلاون تھے۔

گیارہ اکتوبر کی شام کو سیسلاون ارستوو ہیڈکوارٹرز پہنچا۔ اس کے ساتھ فرانسیسی گارڈز کا ایک گرفتار شدہ سپاہی تھا۔ قیدی نے بتایا کہ اس روز جو سپاہ فامنسکایا پہنچی تھی، وہ ساری فرانسیسی فوج کا ہراول ہے اور نپولین اس کے ساتھ ہے۔ اس نے یہ اطلاع بھی دی کہ تمام کی تمام فوج چار روز قبل ماسکو کو خیرباد کہہ چکی تھی۔ اسی شام ایک گھریلو غلام، جو بارووسک سے آیا تھا، یہ خبر لایا کہ اس نے بہت بڑی فوج قصبے میں داخل ہوتے دیکھی تھی۔ دختوروف

کے دستے کے چند قازقوں نے اطلاع دی کہ انھوں نے فرانسیسی گارڈز کو بارووسک کی طرف کوچ کرتے دیکھا ہے۔ ان کی تمام اطلاعات سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا تھا کہ جہاں انھیں ایک ڈویژن فوج سے مڈھ بھیڑ ہونے کی توقع تھی، وہاں اب پوری فرانسیسی فوج پہنچ چکی ہے۔ یہ فوج ماسکو سے غیر متوقع سمت — پرانی کالوگا روڈ — سے سفر کرتی آئی تھی۔ دختوروف کوئی کارروائی کرنے سے گریزاں تھا کیونکہ اس پر یہ واضح نہیں تھا کہ ان حالات میں اس پر کیا فرض عائد ہوتا ہے۔ اسے فامنسکا یا پر حملہ کرنے کا حکم ملا تھا لیکن اس وقت وہاں صرف جنرل بغوسیئے موجود تھا جب کہ اب وہاں ساری فرانسیسی فوج مجتمع ہو چکی تھی۔ یرمالوف اپنی صوابدید کے مطابق کارروائی کرنا چاہتا تھا لیکن دختوروف نے صاف انکار کر دیا۔ اس کا اصرار تھا کہ اسے اس معاملے کی اطلاع ہز سیرین ہائی نس کو دینا اور اس سے (تازہ) ہدایات حاصل کرنا ہوں گے۔ چنانچہ (کمانڈر انچیف کے) سٹاف کے نام مراسلہ بھیجنے کا فیصلہ ہو گیا۔

اس مقصد کے لیے ایک باصلاحیت افسر بالخوویتی نوف کو منتخب کیا گیا۔ تحریری مراسلے کے علاوہ اس نے سارے معاملے کے متعلق زبانی رپورٹ بھی پیش کرنا تھی۔ بالخوویتی نوف کو مراسلہ اور ہدایات بوقت نیم شب ملیں اور وہ ایک قازق اور فالتو گھوڑوں کے ساتھ سرپٹ جنرل سٹاف کی طرف بھاگنے لگا۔

16

یہ موسم خزاں کی نیم گرم اندھیری رات تھی۔ چار دن سے پانی برس رہا تھا۔ دو مرتبہ گھوڑے تبدیل کرنے اور نہیں کیچڑ آلود چپچپی سڑک پر ڈیڑھ گھنٹے میں بیس میل سرپٹ دوڑانے کے بعد بالخوویتی نوف تقریباً دو بجے لیتا شیوکا (گاؤں) پہنچ گیا۔ ایک جھونپڑی نما مکان کے، جس کی جعفری کی باڑ پر ''جنرل سٹاف'' کی تختی لٹک رہی تھی، وہ گھوڑے سے نیچے اترا، لگام چھوڑی اور تاریک راہداری میں داخل ہو گیا۔

''ڈیوٹی جرنیل، ابھی اور اسی وقت، نہایت ہی اہم پیغام ہے!'' اس نے کسی شخص سے، جو گھبرا گیا تھا اور خرخرا رہا تھا، چلا کر کہا۔

''ان کی طبیعت آج شام سخت خراب ہو گئی تھی۔ وہ تین راتیں سو نہیں سکے تھے۔'' اردلی نے سرگوشیوں میں احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ''بہتر ہے کہ پہلے کیپٹن کو جگا لیں۔''

''پیغام اشد ضروری ہے — جنرل دختوروف نے بھیجا ہے۔'' بالخوویتی نوف نے اندھیرے میں کھلے دروازے کی طرف رستہ ٹٹولتے ہوئے کہا اور ایک کمرے میں، جس میں اردلی اس سے پہلے جا چکا تھا اور کسی کو جگا رہا تھا، داخل ہو گیا۔

''جناب عالی، جناب عالی! ایلچی۔''

''کیا؟ کیا؟ کس کا؟'' کسی نے اونگھتے ہوئے کہا۔

''دختوروف اور الیکسی پیوتروچ (یرمالوف) کی طرف سے۔ نپولین فامنسکا یا پہنچ گیا ہے۔'' بالخوویتی نوف

نے کہا۔ اسے اندھیرے میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا کہ کون بول رہا ہے لیکن اس نے آواز سے فرض کرلیا کہ وہ (جنرل) کانووٹنسن ہی ہوگا۔

جس شخص کو جگایا گیا تھا، اس نے جمائی لی اور ہاتھ پاؤں اکڑائے (تاکہ پٹھے جاگ جائیں)۔

''میں انھیں جگانا نہیں چاہتا۔'' اس نے کوئی چیز ٹٹولتے ہوئے کہا۔ ''وہ بیمار آدمی ہیں اور (جو کچھ تم کہہ رہے ہو) ہوسکتا ہے وہ محض افواہ ہی ہو۔''

''(میرے پاس) یہ مراسلہ ہے۔'' بالخوویتی نوف نے کہا۔ ''مجھے حکم ہے کہ میں یہ فی الفور ڈیوٹی جرنیل کو پہنچا دوں۔''

''ذرا ٹھہرو، میں موم بتی جلاتا ہوں۔ ... ملعونو، یہ تم چیزیں کہاں چھپا دیتے ہو؟'' اس شخص نے، جو اپنے ہاتھ پاؤں کھینچ کھانچ رہا تھا، اردلی سے کہا۔ وہ کانووٹنسن کا ایجوٹنٹ شریبن تھا۔ ''مل گئی ہے، مل گئی ہے۔'' اس نے مزید کہا۔

اردلی چقماق رگڑ رہا تھا اور شریبن ہاتھوں سے ٹٹول ٹٹول کر شمع ڈھونڈ رہا تھا۔

''عجیب مصیبت ہے! کیڑوں موڑوں کی اولاد!'' اس نے نفرت سے کہا۔

شعلوں کی روشنی میں بالخوویتی نوف کو شریبن کے نوخیز چہرے کی جھلک دکھائی دی۔ شریبن کے ہاتھ میں چھوٹا سا شمع دان تھا اور ایک دوسرا شخص کونے میں سویا پڑا تھا۔ یہ کانووٹنسن تھا۔

جب گندھک کے ٹکڑوں کے، جنھیں چقماق سے سلگایا گیا تھا، شعلے پہلے نیلے اور پھر سرخ ہوگئے، شریبن نے چربی کی شمع جلائی۔ تل چٹے، جو اسے کتر رہے تھے، فرار ہوگئے۔ اور ایلچی کی طرف دیکھنے لگا۔ بالخوویتی نوف کے تمام کپڑوں پر کیچڑ ہی کیچڑ تھا اور اس نے آستین سے منہ پونچھ کر اسے بھی میلا کرلیا تھا۔

''آپ کو یہ اطلاع کس نے دی ہے؟'' شریبن نے لفافہ پکڑتے ہوئے پوچھا۔

''اطلاع قابل اعتبار ہے۔'' بالخوویتی نوف نے جواب دیا۔ ''قیدیوں، قازقوں اور مخبروں، سبھی نے یکساں بیان دیا ہے۔''

''پھر تو مجبوری ہے۔ انھیں جگانا ہی ہوگا۔'' شریبن نے کہا۔ وہ اٹھا اور خوابیدہ شخص کی طرف چل پڑا جو ٹوپی اوڑھے خاصے بڑے فوجی اوورکوٹ کے نیچے لیٹا ہوا تھا۔ ''پیوتر وچ!'' اس نے پکارا۔ (کانووٹنسن نے کوئی حرکت نہ کی۔) ''آپ کو ہیڈ کوارٹرز یاد کیا جا رہا ہے!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے یہ الفاظ اسے یقیناً جگا دیں گے۔

اور ہوا بھی یہی۔ شبینہ ٹوپی میں ملفوف سر جھٹ پٹ اوپر اٹھا۔ کانووٹنسن کے خوبصورت چہرے پر، جس کے رخسار بخار کی وجہ سے تمتمار ہے تھے، گھڑی کی گھڑی کچھ اس قسم کا تاثر ہویدا ہوا جیسے وہ کہیں دور، بہت دور، خوابوں کی دنیا میں کھویا ہوا ہو۔ پھر وہ آناً فاناً چونک پڑا اور اس کے چہرے پر معمول کے مطابق سکون اور غیر متزلزل

عزم جھلکنے لگا۔

''اچھا، یہ کیا ہے؟ کس نے بھیجا ہے؟'' اس نے جھٹ پٹ پوچھا لیکن اس کے لہجے میں تعجیل کا شائبہ تک نہیں تھا اور وہ روشنی میں آنکھیں جھپکانے لگا۔

افسر کی رپورٹ سننے کے دوران میں اس نے مراسلہ کھولا اور اسے پڑھنے لگا۔ اس نے مراسلے کی خواندگی بمشکل ختم کی ہوگی کہ اس نے اپنی ٹانگیں، جو لانبی جرابوں میں لپٹی ہوئی تھیں، مٹی کے فرش پر نیچے اتاریں اور بوٹ پہننے لگا۔ پھر اس نے شبینہ ٹوپی اتاری، کنگھی سے کنپٹیوں پر بال درست کیے اور ٹوپی دوبارہ پہن لی۔

''تمھیں یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر تو نہیں لگی؟ آؤ، ہز سیرین ہائی نس کے پاس چلتے ہیں۔''

کانووٹنسن فی الفور سمجھ گیا کہ مراسلہ انتہائی اہم ہے اور ذرا سا وقت بھی ضائع نہیں کیا جا سکتا۔ اس نے نہ سوچا اور نہ اپنے آپ سے پوچھا کہ خبر اچھی ہے یا بری۔ اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ جنگ کے سارے معاملے کے بارے میں اس کا رویہ نہ تو تعقل اور نہ دانش کے، بلکہ کسی اور چیز کے تابع تھا۔ اس کے دل میں یہ پختہ یقین تھا، اگرچہ اس نے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا، کہ سب ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا، لیکن آدمی کو اس پر انحصار نہیں کرنا چاہیے اور اس کا ذکر تو بالکل ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ اسے محض اپنا کام کرتے رہنا چاہیے اور یہ وہ کرتا تھا اور اپنی ساری توانائیاں اس پر صرف کر دیتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ 1812 کے نام نہاد ہیروؤں — بارکلیوں، رایف سکیوں، یرمالووفوں، پلاتوفوں اور میلارادووچوں — کی فہرست میں دختوروف کی طرح پیوتروچ کانووٹنسن کا نام بھی محض اخلاقاً درج کر لیا گیا ہے۔ دختوروف کی طرح اس کی بھی شہرت یہی تھی کہ وہ محدود قابلیت اور علم کا مالک ہے۔ دختوروف کی طرح اس نے بھی کبھی جنگی منصوبے نہیں بنائے تھے لیکن وہ ہمیشہ اس جگہ، جہاں صورت حال مشکل ترین ہوتی تھی، پایا جاتا تھا اور جس روز اسے ڈیوٹی جرنیل مقرر کیا گیا تھا، اسی دن سے اس نے یہ عادت بنالی تھی کہ وہ دروازہ کھول کر سوتا تھا اور اس نے حکم دے رکھا تھا کہ جونہی کوئی ایلچی آئے، اسے فوراً جگا دیا جائے۔ لڑائی کے دوران میں وہ مستقلاً اس جگہ، جہاں فائرنگ ہو رہی ہوتی تھی، موجود ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ کوتوزوف اسے ڈانٹتا رہتا تھا اور اسے محاذ پر بھیجنے سے خوف کھاتا تھا۔ اور دختوروف کی طرح کانووٹنسن بھی غیر نمایاں چرخ دندانی تھا جو کسی قسم کا شور وغل یا کھڑکھڑاہٹ کیے بغیر مشین کا اہم پرزہ بن جاتا ہے۔

کانووٹنسن مرطوب اور تاریک رات میں اپنے جھونپڑے نما مکان سے باہر آیا۔ وہ چیں بہ جبیں ہو رہا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اس کے سر درد میں اضافہ ہو گیا تھا۔ دوسرے اس کے ذہن میں یہ ناخوشگوار خیال گردش کرنے لگا کہ معلوم نہیں کہ شاف، بالخصوص بے نگ سین کا، جس کا تاروتینو کی لڑائی کے بعد سے کوتوزوف سے اینٹ کتے کا بیر چل رہا تھا، ردعمل کیا ہو۔ وہ تجویز پر تجویز پیش کریں گے، لڑیں گے، جھگڑیں گے، احکام جاری کریں گے اور پھر ان پر قلم پھیر دیں گے۔ اور یہ پیش اندیشگی اس کے لیے ناگوار تھی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ یہ صورت حال ناگزیر ہے۔

اور واقعتاً ہوا بھی یہی۔ ٹول نے جسے وہ یہ خبر پہنچانے گیا تھا، جھٹ پٹ اس جرنیل کے سامنے، جو اس کے ساتھ قیام پذیر تھا، اپنے نظریات کی تشریح بیان کرنا شروع کر دی تا آنکہ کانووننسن کا، جو خاموشی سے اس کی تقریر سن رہا تھا، پیمانۂ صبر لبریز ہونے لگا اور اس نے اسے یاد دلایا کہ انھیں ہز سیرین ہائی نس کے پاس جانا چاہیے۔

17

تمام سن رسیدہ اشخاص کی طرح کوتوزوف کو اس رات کوئی خاص نیند نہ آئی۔ وہ دن کے دوران میں اکثر اوقات غیر متوقع طور پر اونگھنے لگتا لیکن رات کو جب وہ اپنا لباس تبدیل کیے بغیر بستر پر لیٹتا تھا، نیند اس کی نگاہوں سے کوسوں دور بھاگ جاتی اور وہ اپنی گھڑیاں سوچنے میں گزار دیتا۔

چنانچہ اب بھی وہ اسی انداز سے اپنے پلنگ پر دراز تھا۔ اس نے اپنے لمبے چوڑے اور بھاری بھرکم سر کو، جس کی شکل مسخ ہو چکی تھی، اپنے لجلجے اور گداز ہاتھوں سے سہارا دے رکھا تھا۔ اس کی ایک آنکھ اندھیرے میں جھانک رہی تھی اور وہ خود سوچ بچار میں مستغرق تھا۔

جب سے بے نگ سین نے، جو زار کے ساتھ خط کتابت کرتا رہتا تھا اور جس کا کسی دوسرے شخص کی نسبت سٹاف پر زیادہ اثر تھا، اس کے قریب پھٹکنا بند کر دیا تھا، کوتوزوف لاحاصل جارحانہ کارروائیوں میں اپنی سپاہ کی قیادت کرنے کے بارے میں کم فکر کرنے لگا تھا۔ تاروتینو کی لڑائی میں اور اس سے ایک روز پہلے کے وقوعے سے اسے جو سبق ملا تھا، اسے اب تک اس کی کسک محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ دوسروں نے اس سے کچھ اثر قبول کیا ہوگا۔

"انھیں یہ سمجھ لینا چاہیے" اس نے سوچا، "کہ ہم صرف اسی صورت میں پٹ سکتے ہیں کہ ہم جارحانہ کارروائیوں میں ملوث ہو جائیں۔ صبر و تحمل اور وقت میرے دو شجیع اور دلیر ساتھی ہیں۔" وہ جانتا تھا کہ سیب کی رنگت جب تک سبز ہو، اسے توڑنا نہیں چاہیے، پکنے پر یہ خود بخود گر پڑے گا۔ اگر آپ سیب کے پکنے سے پہلے اسے توڑیں گے، آپ سیب بھی خراب کریں گے، درخت کا بھی ستیاناس کریں گے اور اپنے دانت بھی کھٹے کریں گے۔ تجربہ کار شکاری کی طرح وہ جانتا تھا کہ درندہ زخمی ہو چکا ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح کہ روسی فوج کی پوری قوت اسے زخمی کر سکتی تھی۔ لیکن آیا اسے جو زخم آیا ہے، وہ کاری ہے یا نہیں، ابھی اس سوال کا جواب دیا جانا تھا۔ لوغستوں اور باغ تیلامی (Barthelemy) اس کے پاس (ایلچی بنا کر) بھیجے گئے تھے اور ادھر گوریلوں نے اسے اپنی اطلاعات فراہم کی تھیں۔ ان حقائق سے اسے تقریباً یقین ہو گیا تھا کہ زخم مہلک ہے، تاہم ابھی مزید ثبوت درکار تھا اور اس کے لیے ضروری تھا کہ انتظار کیا جائے۔

"یہ بھاگ کر دیکھنا چاہتے ہیں کہ یہ اسے کتنا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ذرا صبر کرو، تم خود دیکھ لوگے۔ چالوں اور حملوں کی یہ غیر مختتم گفتگو!" اس نے سوچا۔ "کس لیے؟ اپنی ٹوپی میں سرخاب کا پر لگانے کے لیے اپنے آپ کو دوسروں

سے نمایاں بنانے کے لیے! جیسے لڑائی نہ ہوئی، دلچسپ فوجی مشقیں ہوئیں! وہ بالکل بچوں کی مانند ہیں۔ ان سے اگر پوچھا جائے کہ ہوا کیا ہے تو وہ کوئی سمجھدارانہ جواب دینے سے قاصر رہیں گے کیونکہ وہ تو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ کتنی اچھی طرح لڑ سکتے ہیں۔ لیکن اصل نکتہ اب یہ نہیں ہے۔

''اور یہ حضرات کیسی کیسی اچھوتی اور انوکھی تجاویز میرے سامنے پیش کرتے رہتے ہیں! جب یہ دو تین احتمالی صورتوں کے متعلق سوچ لیتے ہیں'' (اس کے ذہن میں وہ عمومی منصوبہ تھا جو اسے پیٹرز برگ سے بھیجا گیا تھا)، ''یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ انھوں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔ لیکن احتمالی صورتیں ایک دو تھوڑے ہوتی ہیں، ان کی تعداد تو گنی ہی نہیں جا سکتی۔''

یہ حل طلب سوال کہ بارودینو میں جو زخم پہنچایا گیا تھا، وہ کاری ہے یا نہیں، پورے ایک مہینے سے کوتوزوف کے ذہن میں کلبلا رہا تھا۔ ایک طرف فرانسیسی ماسکو پر قبضہ کر چکے تھے۔ دوسری طرف روسی کمانڈر انچیف کو یہ پختہ یقین ہو چکا تھا کہ وہ ضرب، جو اس نے اور روسی قوم نے اپنی پوری قوت صرف کر کے لگائی تھی، رائیگاں نہیں جا سکتی، وہ لازماً کاری ہوگی۔ لیکن بہر حال ثبوت درکار تھے اور ان کا وہ ایک مہینے سے انتظار کر رہا تھا۔ لیکن انتظار کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ وہ بہت انتظار کر چکا تھا اور اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا چاہتا تھا۔ بے خواب راتوں کے دوران میں وہ بستر پر لیٹے لیٹے بالکل وہی کچھ کرنے لگا تھا جس کے لیے وہ نوجوان جرنیلوں کو مطعون کرتا رہتا تھا۔ امکانی طور پر کس کس قسم کی صورتیں پیش آ سکتی تھیں، وہ ان کا اسی طرح تصور باندھتا رہتا تھا جس طرح کہ اس سے کم عمر کے لوگ کرتے تھے لیکن فرق یہ تھا کہ وہ ان پر کسی قسم کے مفروضوں کی بنیاد نہیں رکھتا تھا اور نہ وہ اس کے ذہن میں دو دو تین تین کے حساب سے آتی تھیں بلکہ اس کے نزدیک ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی تھی۔ اور وہ جتنا زیادہ سوچتا تھا، امکانات کی تعداد میں اتنا ہی زیادہ اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ نپولین کی فوج اجتماعی طور پر یا ٹکڑیوں میں بٹ کر پیٹرز برگ کے خلاف، خود اس کے اپنے خلاف اور اس کی فوج کو دائیں یا بائیں طرف گھیرے میں لینے کے سلسلے میں جو چالیں چل سکتی اور کارروائیاں کر سکتی تھی، وہ ان تمام کا جائزہ لیتا رہتا۔ اس نے اس امکان (اور اس سے وہ سب سے زیادہ خائف تھا) کے بارے میں بھی سوچا کہ اس سے نپٹنے کے لیے نپولین خود اسی کا ہتھیار استعمال کر سکتا ہے۔ یعنی وہ ماسکو میں اپنا قیام بڑھا سکتا اور یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ خود کیا اقدام کرتا ہے، انتظار کر سکتا ہے۔ کوتوزوف کے ذہن میں یہ بات بھی آئی کہ نپولین کی فوج براستہ میدین[19] اور یخ نوف واپس جا سکتی ہے، لیکن ایک بات، جس کا وہ پیشگی اندازہ نہ لگا سکا، وہی وقوع پذیر ہوگئی۔ ماسکو سے روانگی کے بعد سفر کے پہلے گیارہ دنوں کے دوران میں فرانسیسی فوج نے کچھ اس قسم کی بھاگڑ اور افراتفری کا مظاہرہ کیا جیسے وہ اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھی ہو اور اس پر تشنج کے دورے پڑنے لگے ہوں اور یہی وہ بھگدڑ تھی جس نے اس چیز۔ فرانسیسیوں کی کامل تباہی اور ہلاکت۔ کو، جس کا اس نے ابھی تک سوچنے کا حوصلہ نہیں کیا تھا، ممکن بنا دیا۔ بغوسیئے کی ڈویژن کے بارے میں دروخوف کی رپورٹ، نپولین کی فوج کی صعوبتوں کے متعلق گوریلوں کی اطلاعات، ماسکو سے روانہ ہونے کے لیے فوجوں کے اکٹھا کیے

جانے کی افواہیں — ان تمام امور و واقعات سے اس مفروضے کی تصدیق ہو رہی تھی کہ فرانسیسی فوج تباہی کے کنارے تک پہنچ چکی ہے اور وہ بھاگنے کی تیاریاں کر رہی ہے۔ لیکن یہ محض مفروضات تھے۔ یہ نسبتاً کم عمر اشخاص کو تو اہم نظر آ سکتے تھے لیکن کوتوزوف کو نہیں۔ اپنے ساٹھ سالہ تجربے کی بنا پر اسے معلوم تھا کہ افواہوں پر کتنا انحصار کرنا چاہیے۔ وہ جانتا تھا کہ انسان جب کسی چیز کی آرزو کرتے ہیں، وہ تمام شواہد کو بڑی چابک دستی سے اس طرح ترتیب دے لیتے ہیں، کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں، وہ اس کی تائید اور تصدیق کرتے نظر آتے ہیں لیکن ان حالات میں جو شواہد ان کی خواہش کے خلاف جاتے ہیں، انھیں وہ نہایت آسانی سے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ کوتوزوف اس کی جتنی زیادہ امید کرتا تھا، وہ اتنا ہی زیادہ شک میں گرفتار ہونے لگتا تھا۔ اس کی تمام ذہنی صلاحیتیں محض ایک مسئلے پر صرف ہو رہی تھیں۔ اس کے نزدیک باقی سب کچھ زندگی کے عام معمول کے مطابق تھا۔ وہ اپنے سٹاف کے ارکان کے ساتھ جو گفتگوئیں کرتا تھا، تاروتینو میں قیام کے دوران میں مادام دَ سٹیل[20] کے نام جو خطوط تحریر کرتا تھا، انعامات اور تمغوں کی جو تقسیم کرتا تھا، پیٹرزبرگ کے حکام کے ساتھ جو خط کتابت کرتا تھا، وغیرہ وغیرہ، یہ سب سرگرمیاں عام معمولات کا حصہ تھیں۔ مگر فرانسیسیوں کی تباہی، جس کا صرف اسے پیشگی اندازہ تھا، اس کی واحد دلی تمنا تھا۔

گیارہ اکتوبر کی شب وہ اپنی کہنی سر کے نیچے رکھے لیٹا ہوا تھا اور اس کے متعلق سوچ بچار میں غرق تھا۔

ملحقہ کمرے میں ہلچل ہوئی اور اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ ٹول، کانوونِتسن اور بالخوویتی نوف اندر آ چکے تھے۔

''ایہہ، کون ہے؟ اندر آ جاؤ، اندر آ جاؤ! کیا خبر لائے ہو؟'' فیلڈ مارشل نے انھیں آواز دی۔

وردی پوش ملازم شمع روشن کرنے لگا۔ اس کے دوران میں ٹول نے اسے مراسلے کے مندرجات سے آگاہ کیا۔

''کون لایا ہے یہ؟'' کوتوزوف نے کہا۔ اتنے میں شمع جل گئی اور اس کی روشنی میں ٹول یہ دیکھ کر بہت متاثر ہوا کہ اس کے چہرے پر سرد مہر درشتی جھلک رہی ہے۔

''یوئر ہائی نس، اس بارے میں کسی شک و شبے کی گنجائش نہیں۔''

''اسے اندر بلاؤ، اسے اندر بلاؤ!''

کوتوزوف اپنی ایک ٹانگ بستر سے باہر لٹکائے بیٹھا تھا اور اس کی بھاری بھرکم توند اس کی دوسری ٹانگ پر، جسے اس نے دوہرا کر رکھا تھا، آرام کر رہی تھی۔ اس نے ایلچی کو بہتر طور پر دیکھنے کے لیے اپنی صحیح سلامت آنکھ یوں بھینچی جیسے اسے امید ہو کہ جو کچھ وہ جاننا چاہتا ہے، وہ اس طرح اس کے چہرے پر پڑھ سکے گا۔

''میرے دوست، بولو، مجھے بتاؤ۔'' اس نے اپنی قمیص کو، جس کے بٹن کھلے ہوئے تھے، سمیٹتے ہوئے اپنی نحیف اور بوڑھی آواز میں بالخوویتی نوف سے کہا۔ ''قریب آ جاؤ، قریب آ جاؤ۔ یہ میرے لیے تم کیا خبر لائے ہو؟ ایں؟ نپولین ماسکو سے نکل آیا ہے؟ تمھیں یقین ہے؟ ایں؟''

بالخوویتی نوف کو جو جو اطلاعات پہنچانے کا حکم دیا گیا تھا، وہ شروع سے ان کی تفصیلات بیان کرنے لگا۔

''جلدی، جلدی بولو، جلدی! مجھے اذیت نہ پہنچاؤ،'' کوتوزوف نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔
بالخووِیتی نوف نے ایک ایک بات اس کے گوش گزار کر دی۔ اس نے جو کچھ کہنا تھا، جب کہہ چکا، وہ چپ ہو گیا اور حکم کا انتظار کرنے لگا۔ ٹول کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کوتوزوف نے اسے روک دیا۔ اس نے خود کچھ کہنے کی کوشش کی۔ اس کے چہرے پر تبدیلیاں رونما رونے لگیں اور وہاں جھریاں نمودار ہو گئیں۔ اس نے ٹول کی جانب اپنا بازو لہرایا اور کمرے کی مخالف سمت چل پڑا، جہاں تاریکی میں ایقونوں کی غیر واضح صورتیں دکھائی دے رہی تھیں۔
''میرے مولا، میرے خالق، تو نے ہماری دعائیں سن لی ہیں...'' اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسری میں پھنساتے ہوئے کپکپاتی آواز میں کہا۔ ''روس بچ گیا۔ مولا، میں تیرا شکر ادا کرتا ہوں!'' اور اس کی آنکھوں سے اشک رواں ہو گئے۔

18

جب کوتوزوف کو فرانسیسیوں کی ماسکو سے روانگی کی خبر ملی، اس دن سے مہم کے اختتام تک، اس کی تمام سرگرمیاں اپنے فوجی دستوں کو دشمن پر، جو تباہی کے غار میں لڑھک رہا تھا، بے سود حملے کرنے، اس کے خلاف گھاتیں لگانے اور اس کے ساتھ جھڑپیں مول لینے سے روکنے پر مرکوز ہو گئیں۔ اس سلسلے میں وہ اپنے اختیارات، مکر و فریب، منت سماجت، غرضیکہ ہر طریقہ اور ہتھکنڈا بروئے کار لایا۔ دختوروف مالایاروسلاوتس چلا جاتا ہے لیکن کوتوزوف اصل فوج کے ساتھ خاصا عرصہ وہیں پڑا رہتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ کالوگا خالی کرالیا جائے۔۔ اس کا خیال ہے کہ ہو سکتا ہے کہ انھیں اس قصبے سے آگے تک پسپائی اختیار کرنا پڑے۔
ہر جگہ کوتوزوف پسپا ہوتا جاتا ہے لیکن غنیم اس کی پسپائی کا انتظار کیے بغیر مخالف سمت بھاگتا جاتا ہے۔
نپولین کے مورخین ہمارے سامنے تاروتینو اور مالایاروسلاوتس میں اس کے ماہرانہ داؤ و پیچ کا نقشہ کھینچتے ہیں اور پھر قیاس آرائیاں کرتے ہیں کہ اگر وہ زرخیز اور متمول جنوبی صوبوں میں گھسنے میں کامیاب ہو جاتا، پھر کیا ہوتا۔
لیکن اس بات سے قطع نظر کہ نپولین کے ان جنوبی صوبوں میں پیش قدمی کرنے کے راستے میں کوئی چیز مزاحم نہ تھی (روسی فوج نے سڑک کھلی چھوڑ دی تھی)، مورخین یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کی فوج کو نہیں بچا سکتی تھی کیونکہ اس میں ناگزیر تباہی کے جراثیم سرایت کر چکے تھے۔ وہ فوج۔۔ جسے ماسکو میں فراواں مقدار میں رسد میسر آ چکی تھی لیکن جس نے اسے محفوظ کرنے کے بجائے پاؤں تلے کچل دیا تھا اور جو سمولنسک پہنچنے کے بعد اشیائے خورونوش کا ذخیرہ کرنے کے بجائے انھیں لوٹنے میں مصروف ہو گئی تھی، وہ فوج کالوگا میں کس طرح اپنی کھوئی ہوئی طاقت دوبارہ حاصل کر سکتی تھی کیونکہ کالوگا میں جو روسی آباد تھے، وہ اہالیان ماسکو سے مختلف نہیں تھے اور وہاں کی آگ بھی انھی خصوصیات کی حامل تھی کہ جس چیز کو بھی لگائی جاتی، اسے بھسم کر دیتی؟
یہ فوج کہیں بھی اپنی کھوئی ہوئی طاقت بحال نہیں کر سکتی تھی۔ کچھ ایسے تھا جیسے بارودینو کی لڑائی اور ماسکو کی

لوٹ مار کے بعد اس میں شکست وریخت کے کیمیائی عناصر داخل ہونے لگے تھے۔

وہ جو پہلے فوج تھی، اب افراد میں بٹ چکی تھی اور یہ افراد اپنے قائدین کے ہمراہ بھاگے پھر رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ جائیں، تو کہاں جائیں۔ نپولین اور اس کے تمام لشکریوں کے قلوب میں صرف ایک ہی خواہش موجزن تھی کہ وہ سب کے سب یاس و ناامیدی کی جس دلدل میں پھنس گئے ہیں (اور جس کا انھیں احساس بھی تھا، بے شک دھندلا دھندلا ہی سہی)، اس سے جلد از جلد چھٹکارا حاصل کریں۔

چنانچہ نوبت بہ ایں جا رسید کہ مالایاروسلاوتس کے اجلاس میں جب جرنیل جھوٹ موٹ یہ ظاہر کر رہے تھے کہ وہ آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہیں اور بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے تھے، سب سے آخر میں جس شخص نے رائے دی، وہ منہ پھٹ جنرل موتو[21] تھا اور اس نے لگی لپٹی رکھے بغیر وہ بات کہہ دی جو ہر شخص کے ذہن میں تھی۔۔۔ ''ہمارے سامنے صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی ہے کہ یہاں سے حتی الامکان جلد از جلد نکل جائیں۔'' اس کے ان الفاظ نے سب کی زبانیں گنگ کر دیں اور جس بات کو وہ بھی صحیح تسلیم کرتے تھے، اس کے خلاف کوئی شخص، حتیٰ کہ خود نپولین بھی، لب کشائی نہ کر سکا۔

اگرچہ ہر شخص جانتا تھا کہ ان کے لیے روس سے نکلنا ناگزیر ہو چکا ہے، اس کے باوجود انھیں یہ تسلیم کرنے میں عار محسوس ہو رہا تھا کہ پسپائی کے بغیر چارہ نہیں۔ اس احساس شرمندگی پر غالب آنے کے لیے انھیں کسی خارجی دھچکے کی ضرورت تھی اور مناسب وقت پر اس دھچکے کا بھی اہتمام ہو گیا۔ اور یہ، جیسا کہ فرانسیسی کہا کرتے تھے، "le hourra de l' Empereur"[22] کا نعرہ تھا۔

جرنیلوں کے اجلاس کے اگلے روز صبح سویرے نپولین گھوڑے پر سوار ہوا اور دستوں کا معائنہ کرنے اور سابقہ اور متوقع لڑائی کے میدان کا جائزہ لینے کے بہانے اپنے چند مارشلوں اور محافظوں کی جلو میں اپنے لشکر کی صفوں میں چکر لگانے لگا۔ قازقوں کی ایک پارٹی کا، جو مال غنیمت کی تلاش میں ادھر ادھر گھوم رہی تھی، اتفاقاً امپراطور سے آمنا سامنا ہو گیا۔ انھوں نے اسے قریب قریب پکڑ ہی لیا تھا لیکن نپولین کو قازقوں کے ہتھے چڑھنے سے جس چیز نے بچایا، وہ وہی تھی جو فرانسیسیوں کی تباہی کا موجب بن رہی تھی، یعنی مال غنیمت کی ہوس۔ تاروتینو کی طرح یہاں بھی قازقوں نے لوٹ مار شروع کر دی اور یوں انھوں نے اپنے حریف کو بچ نکلنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انھوں نے نپولین کو تو نظر انداز کر دیا اور خود مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گئے۔ نپولین اپنی جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔

اگر les enfants du Don* خود امپراطور کو اس کی اپنی فوج کے بیچ میں سے اتنی آسانی سے اچکنے میں کامیاب ہو سکتے تھے، پھر یہ واضح ہو گیا کہ اب جلد از جلد قریب ترین جانی پہچانی سڑک تک پہنچنے کے علاوہ اور کوئی صورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔ نپولین اب چالیس سال کا ہو چکا تھا اور اس کی توند نکل آئی تھی۔ اب اس میں وہ پھرتی

* دریائے ڈان کے بیٹے (یعنی قازق جو زیادہ تر اس کے کنارے آباد تھے)۔

اور بے خوف جرأت نہیں رہی تھی جو کبھی ہوا کرتی تھی۔ وہ اشارہ سمجھ گیا اور قازقوں نے اسے جس طرح ڈرایا تھا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے موتوں کے ساتھ اتفاق کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہوئی اور جیسا کہ مورخین ہمیں بتاتے ہیں، اس نے سمولنسک روڈ پر موژیسک کی سمت پسپا ہونے کا حکم جاری کر دیا۔

یہ درست ہے کہ نپولین نے موتوں کی رائے سے اتفاق کیا اور یہ بھی درست ہے کہ فوج پسپا ہوئی، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پسپائی کا سبب نپولین کا حکم بنا، بلکہ جو چیز سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو قوتیں پوری فوج پر اثر انداز ہو رہی تھیں اور اسے موژیسک (سمولنسک) روڈ اختیار کرنے پر مجبور کر رہی تھیں، وہ بیک وقت اسے بھی اپنے اثر میں لے رہی تھیں۔

19

جب انسان دیکھتا ہے کہ وہ حرکت کر رہا ہے تو وہ اپنے اس تحرک کا ہمیشہ کوئی نہ کوئی جواز ڈھونڈ لیتا ہے۔ انسان سینکڑوں میل کا فاصلہ تبھی طے کر سکتا ہے اگر اسے یہ یقین ہو کہ ان سینکڑوں میل کے اختتام پر کوئی اچھی چیز اس کی منتظر ہے۔ اس کے پاس موعودہ زمین کا لازماً امکان ہونا چاہیے، تبھی وہ اپنا سفر جاری رکھ سکتا ہے (ورنہ اس کی ہمت راستے میں ہی جواب دے جائے گی)۔ جب فرانسیسیوں نے روس پر چڑھائی کی، ان کی موعودہ زمین ماسکو تھی لیکن جب وہ پسپا ہوئے، تو یہ ان کا آبائی وطن تھی۔ مگر یہ آبائی وطن بہت دور تھا اور وہ آدمی جسے چھ سات سو میل کا سفر درپیش ہو، اسے اپنے ذہن سے آخری منزل کا خیال نکالنا اور دل میں یہ طے کرنا ہوگا: ''آج میں تیس میل چلوں گا، کسی جگہ ٹھہروں گا اور وہاں رات گزاروں گا۔'' سفر کے پہلے مرحلے کے دوران میں یہ مقامِ آرام اس کی آخری منزل اس کی نگاہوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ اس کی تمام امیدیں اور خواہشیں محض اسی (مقام) پر مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اور ہر شخص میں فرداً فرداً جو جبلی انگیخیں نظر آتی ہیں، وہ ہجوم میں حد سے زیادہ بڑھ جاتی ہیں۔

فرانسیسیوں کے لیے، جو پرانی سمولنسک روڈ پر سفر کر رہے تھے، آخری منزل — اپنی آبائی سرزمین — بہت ہی زیادہ دور تھی اور ان کی فوری منزل، جس کی طرف ان کی امیدیں اور خواہشیں، جو ہجوم میں بے پناہ حد تک بڑھ چکی تھی، کشاں کشاں لیے جا رہی تھیں، سمولنسک تھی۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انھیں معلوم تھا کہ وہاں کثیر المقدار رسد اور تازہ دم فوج ان کی منتظر ہے اور نہ کسی نے انھیں اس قسم کی بات بتائی تھی (اس کے برعکس خود نپولین بھی اور فوج کے اعلیٰ افسران بھی جانتے تھے کہ وہاں رسد کم یاب ہے)، بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ واحد چیز تھی جو انھیں آگے جانے اور اپنی موجودہ مشکلات کو برداشت کرنے کی ہمت اور حوصلہ دے سکتی تھی۔ نتیجتاً وہ جو جانتے تھے اور جو نہیں جانتے تھے، دونوں ہی یکساں طور پر اپنے آپ کو فریب دے رہے تھے اور سمولنسک کی طرف یوں بڑھ رہے تھے جیسے یہی موعودہ سرزمین ہو۔

جب ایک مرتبہ فرانسیسی شاہراہ پر چڑھ گئے، وہ اپنی مقررہ منزل کی طرف بھاگنے میں کچھ اس قسم کی ہمت کا

مظاہرہ کرنے لگے کہ آدمی اسے دیکھ کر حیران پریشان رہ جاتا اور ان کی رفتار تو اتنی تیز تھی کہ کسی نے کاہے کو دیکھی یا سنی ہوگی۔ مشترکہ انگیخت کے علاوہ، جس نے انھیں بصورت ہجوم متحد کر رکھا تھا اور جو انھیں قوت اور حوصلے کی خاص مقدار فراہم کر رہی تھی، ان کی بہت بڑی تعداد بھی ان کے لیے مددگار ثابت ہو رہی تھی اور انھیں اکٹھا کیے رکھے ہوئے تھی۔ جیسا کہ قانونِ کششِ ثقل کا تقاضا ہے، ان کا حجم کبیر انفرادی انسانی ذرات کو اپنی طرف کھینچے لیے جا رہا تھا۔ وہ تعداد میں سینکڑوں ہزار تھے لیکن وہ یوں حرکت کر رہے تھے جیسے وہ واحد قوم ہوں۔

ان میں سے ہر شخص کی صرف ایک ہی خواہش تھی کہ وہ ہتھیار ڈال دے اور قیدی بن جائے تاکہ اس ابتلا اور خوف و دہشت سے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔ لیکن ایک طرف ان کی اس مشترکہ انگیخت کی قوت انھیں ایک ہی سمت — بہ جانب سمولنسک، جو ان کا منزل مقصود تھا — کھینچے جا رہی تھی اور دوسری طرف یہ حقیقت تھی کہ فوجی کو رکسی کمپنی کے سامنے سپر انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ اگرچہ فرانسیسی ادنیٰ ترین قابل قبول عذر پر باقی فوج سے علیحدہ ہونے اور ہتھیار ڈالنے کے مواقع سے فائدہ اٹھانے میں تامل نہیں کرتے تھے لیکن ایسے مواقع بار بار نہیں آتے تھے۔ ایک تو ان کی تعداد بہت زیادہ تھی، دوسرے وہ بصورت جمعیت برق رفتاری سے سفر کرتے تھے۔ چنانچہ کسی کے بچھڑنے کے امکانات بہت محدود ہو جاتے تھے۔ یہ فرانسیسی حجم کبیر تیزی سے آگے نکل جانے کے لیے جس طرح اپنی تمام توانائیاں صرف کر رہا تھا، اس نے روسیوں کے لیے ان کی رفتار میں رخنہ انداز ہونا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن بنا دیا تھا۔ جب کسی جسم میں شکست و ریخت کا عمل شروع ہوتا ہے، کوئی بھی مشینی انتشار اس عمل کی رفتار ایک خاص حد سے زیادہ تیز نہیں کر سکتا۔

برف کا ڈلا آناً فاناً نہیں پگھلایا جا سکتا۔ اس کے لیے وقت کی خاص میعاد مقرر ہے اور جب تک یہ میعاد پوری نہ ہو جائے، آپ جتنی حرارت چاہیں، استعمال کر لیں، برف کا ڈلا پگھلے گا نہیں۔ اس کے برعکس حرارت کی مقدار میں جتنا زیادہ اضافہ ہوگا، باقی ماندہ برف اتنی ہی زیادہ سخت ہو جائے گی۔

روسی کمانڈروں میں صرف کوتوزوف یہ بات سمجھتا تھا۔ جب سمولنسک روڈ کے ساتھ ساتھ فرانسیسیوں کی پسپائی نے فرار کی واضح شکل اختیار کر لی، کانوونتسن نے گیارہ اکتوبر کی رات کو جس چیز کا پیشگی اندازہ لگایا تھا، وہ وقوع پذیر ہونے لگی۔ روسی فرانسیسی فوج کے تمام اعلیٰ افسروں کو گھیرے میں لینے، انھیں پکڑنے، گرفتار کرنے، پٹخنیاں دینے اور یوں کارہائے نمایاں سرانجام دینے کے لیے مرے جا رہے تھے اور وہ سبھی چلا چلا کر کارروائی شروع کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔

حملے کو روکنے کے لیے صرف کوتوزوف نے اپنے تمام اختیارات (اور کمانڈر انچیف کے یہ اختیارات محدود ہوتے ہیں) استعمال کیے۔

وہ اس وقت انھیں، جیسا کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں، یہ نہیں کہہ سکتا تھا: ''ان سے الجھنے، ان کے راستے میں مزاحم ہونے، اپنے آدمی مروانے اور ان بدقسمت مصائب کے ماروں کا قتل عام کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ جب

ان کی فوج کی ایک تہائی نفری ماسکو سے ویازما تک کے سفر کے دوران میں کسی لڑائی کے بغیر ہی ناپید ہوگئی ہے، پھر ایسی کارروائیوں کا فائدہ؟'' اس کی بجائے اس نے اپنی تمام عمر کے دوران میں جو حکمت دانائی حاصل کی تھی، اس نے اسے بروئے کار لاتے ہوئے انھیں وہ کچھ بتایا جو وہ سمجھ سکتے تھے۔ اس نے انھیں بتایا کہ بعض اوقات سنہری پل آپ کی اپنی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ اس کی باتیں سن کر وہ اس کا مذاق اڑانے اور اس پر بہتان باندھنے لگے۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، بس زخمی درندے پر، جس پر نزع کا عالم طاری تھا، پل پڑنے کی جلدی کی اور اس کی تکا بوٹی کرنے اور خوشی کے شادیانے بجانے لگے۔

یرمالوف، میلورادووچ، پلاتوف اور دوسروں نے جب ویازما کے آس پاس اپنے آپ کو فرانسیسیوں کے قریب پایا، وہ ان کے دستوں کا ایک دوسرے سے رابطہ منقطع کرنے اور ان پر حملہ کرنے کی خواہش پر قابو نہ پا سکے۔ بجائے اس کے کہ وہ اپنے ارادوں سے کوتوزوف کو مطلع کرتے، انھوں نے کورا کاغذ لفافے میں بند کیا اور اسے بھیج دیا۔

اگرچہ کوتوزوف نے فوج کو روکنے کی پوری کوشش کی، کسی نے اس کی نہ سنی۔ ہمارے لشکریوں نے فرانسیسیوں پر حملہ کر دیا اور ان کے راستے میں مزاحم ہونے کی کوشش کرنے لگے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ہماری پیادہ رجمنٹیں طبلوں کی تھاپ اور موسیقی کی لے پر آگے بڑھیں۔ انھوں نے ہزاروں کو قتل کیا اور ان کے اپنے جوان ہزاروں میں قتل ہوئے۔

لیکن جہاں تک پسپائی کا تعلق ہے — نہ تو کسی کو روکا جاسکا اور نہ کسی کا رخ دوسری طرف موڑا جاسکا۔ اور جہاں تک فرانسیسی فوج کا تعلق ہے، اس نے خطرے کی بو سونگھتے ہوئے اپنی صفیں ایک دوسرے کے قریب کر لیں اور اگرچہ اس کے جوان متواتر فرار ہوتے رہے، سمولنسک کی جانب اس کا ہلاکت خیز سفر جاری رہا۔

حصہ سوم

1

بارودینو کی لڑائی، ماسکو پر فرانسیسیوں کا قبضہ اور کسی مزید تصادم کے بغیر فرانسیسیوں کا فرار۔ ان سب کو تاریخ کے انتہائی سبق آموز واقعات میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

تمام مورخین اس بات پر متفق ہیں کہ مملکتوں اور قوموں کی ایک دوسرے کے ساتھ کشمکش کا خارجی اظہار جنگوں کی صورتوں میں ہوتا ہے اور یہ کہ مملکتوں اور قوموں کی سیاسی قوت بالکل اسی نسبت سے بڑھتی یا گھٹتی ہے جس نسبت سے انھیں جنگ میں کامیابی یا ناکامی ہوتی ہے۔

اس قسم کی تاریخی روداد خواہ کتنی ہی عجیب کیوں نہ نظر آئے کہ کسی بادشاہ یا امپراطور کا کسی دوسرے بادشاہ یا امپراطور سے جھگڑا ہوا، اس نے فوج اکٹھی کی، دشمن کے خلاف برسرپیکار ہوا، تین، پانچ یا دس ہزار افراد کو موت کے گھاٹ اتارا، لڑائی جیتی اور پوری سلطنت اور قوم کو، جو لاکھوں یا کروڑوں افراد پر مشتمل ہوتی ہے، اپنا مطیع ومنقاد بنالیا، اور یہ بات خواہ کتنی ہی ناقابل فہم کیوں نہ ہو کہ فوج کی شکست۔ جس کی تعداد قوم کی کل تعداد کے سویں حصے کے برابر بھی نہیں ہوتی۔ لوگوں کو اطاعت قبول کرنے پر مجبور کردیتی ہے، لیکن تاریخ کے حقائق (جہاں تک ہمیں معلوم ہیں) اس بیان کی صداقت کی تصدیق کرتے ہیں کہ کسی فوج کی کسی دوسری فوج کے خلاف زیادہ یا کم کامیابی اس قوم کی طاقت میں اضافے یا تخفیف کا بنیادی سبب یا کم از کم اہم علامت بن جاتی ہے۔ ایک فوج کو کامیابی نصیب ہوتی ہے اور معاً فاتح قوم کے حقوق میں اضافہ ہوجاتا ہے اور اس کے مقابلے میں ہزیمت خوردہ قوم کو نقصانات اٹھانا پڑتے ہیں۔ ایک فوج شکست سے دوچار ہوتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ قوم شکست کی وسعت کے تناسب سے اپنے حقوق سے محروم ہوجاتی ہے۔ اور اگر اس کی فوج مکمل شکست کھاجاتی ہے، قوم کاملاً غلام بن جاتی ہے۔

تاریخ کے مطابق عہد عتیق سے لے کر موجودہ زمانے تک یہی کچھ ہوتا چلا آیا ہے، نپولین کی تمام جنگیں اس اصول کی تصدیق کرتی ہیں۔ جس نسبت سے آسٹروی فوج شکست کھاتی ہے، اسی تناسب سے آسٹریا کو اپنے حقوق سے دست بردار ہونا پڑتا ہے اور فرانس کے حقوق اور طاقت میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ جینا اور اورشٹٹ کے مقامات پر فرانسیسیوں کی فتوحات پرشیا کے آزادانہ وجود کا خاتمہ کردیتی ہیں۔

لیکن اچانک 1812 میں ایک نئی صورت حال وجود میں آتی ہے۔ فرانسیسی ماسکو کے قریب فتح سے ہم کنار ہوتے ہیں اور ماسکو پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کوئی مزید لڑائی بھی نہیں ہوتی لیکن وجود روس کا ختم نہیں ہوتا، اس کے برعکس پہلے چھ لاکھ افراد پر مشتمل فرانسیسی فوج اور اس کے بعد خود نپولیائی فرانس عنقا ہو جاتا ہے۔ تاریخی اصول کو صحیح ثابت کرنے کے لیے حقائق کو توڑ مروڑ کر یہ دعویٰ کرنا کہ بارودینو کی لڑائی کے بعد میدان جنگ روسیوں کے ہاتھ رہا یا یہ کہ فرانسیسی فوج کے ماسکو سے انخلا کے بعد متعدد لڑائیاں ہوئیں، اور انھیں کے سبب نپولین کی سپاہ ملیا میٹ ہوئی، تاریخ کا منہ چڑانے کے برابر ہے کیونکہ حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔

بارودینو میں فرانسیسیوں کی فتح کے بعد نہ صرف یہ کہ ایک بھی عام لڑائی نہیں ہوئی بلکہ کوئی ایسی جھڑپ بھی، جسے اہم کہا جا سکے، نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود فرانسیسی فوج کا وجود ختم ہو گیا۔ اس کے معانی کیا ہوے؟ اگر اس قسم کا کوئی واقعہ چین کی تاریخ میں پیش آیا ہوتا، تو ہم شاید یہ کہتے: ''چھوڑیں، یہ تاریخی سچائی نہیں ہو سکتی۔'' (جب کوئی چیز مورخ کے خود ساختہ معیار پر پوری نہیں اترتی، وہ اسی قسم کی ہیرا پھیریوں سے کام لیتا ہے۔) اگر معاملہ کسی معمولی جھڑپ کا ہوتا جس میں فوجیوں کی صرف محدود تعداد نے حصہ لیا ہوتا، تو ہم اسے ایک استثنا قرار دے سکتے تھے۔ لیکن ہم اس واقعے سے آنکھیں نہیں چرا سکتے، یہ ہمارے آبا کی آنکھوں کے سامنے پیش آیا اور ان کے نزدیک یہ ان کے وطن کی بقا اور فنا کا مسئلہ تھا، پھر یوں بھی یہ معلوم جنگوں میں اہم تریں ہے۔

1812 کی جنگ کے زمانے نے — بارودینو کی لڑائی سے فرانسیسیوں کے اخراج تک — یہ ثابت کر دیا کہ اگر آپ ایک لڑائی جیت جاتے ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ نہیں نکلے گا کہ آپ نے ملک بھی تسخیر کر لیا ہے بلکہ یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ تسخیر کا امکان ہی پیدا ہو گیا ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ طاقت، جو عوام کے مقدر کا فیصلہ کرتی ہے نہ فاتحین کے پاس ہوتی ہے اور نہ فوجوں اور لڑائیوں میں اسے ڈھونڈا جا سکتا ہے، بلکہ یہ کہیں اور ہی ہوتی ہے۔

فرانسیسی مورخین فرانسیسی فوج کی ماسکو سے روانگی سے قبل کی حالت بیان کرتے ہوے دعویٰ کرتے ہیں کہ Grande Armee* میں سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا، صرف گھوڑسوار سپاہ، توپ خانے اور بار برداری کے دستوں کی حالت کچھ پتلی تھی کیونکہ گھوڑوں اور جانوروں کے لیے چارہ دستیاب نہیں تھا۔ اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں تھا کیونکہ اس علاقے کے کسانوں نے خشک گھاس فرانسیسیوں کے سپرد کرنے کے بجائے اسے نذر آتش کرنا زیادہ بہتر خیال کیا۔

فتح کے بعد عموماً جو نتائج برآمد ہوتے ہیں، وہ یہاں ظہور پذیر نہ ہوے کیونکہ الف، ب، ج، اور ان جیسے ہزاروں دوسرے کسانوں نے، جنھیں حب الوطنی کا جذبہ چھو کر نہیں گزرا تھا — جب فرانسیسی ماسکو خالی کر گئے، وہ لوٹ مار کی غرض سے اپنے چھکڑوں سمیت شہر میں آ دھمکے تھے — اپنی گھاس ماسکو لانے سے گریز کیا حالانکہ انھیں بہت اچھی قیمتیں پیش کی گئی تھیں۔

* عظیم فوج

آئیں، ہم دو اشخاص کا تصور ذہن میں لائیں، جو شمشیر زنی کے فن کے قواعد کے مطابق ڈوئیل لڑنے آئے ہیں۔ وہ کچھ دیر سے آپس میں مقابلہ کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کے واروں کو خالی دے رہے تھے۔ اچانک ایک حریف کو احساس ہوتا ہے کہ وہ زخمی ہو گیا ہے۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ یہ مذاق نہیں ہے بلکہ موت وحیات کا مسئلہ ہے۔ وہ اپنی شمشیر نیچے پھینک دیتا ہے اور سب سے پہلے جو ڈنڈا اس کے ہاتھ آجاتا ہے، اٹھا لیتا ہے اور اسے فضا میں لہرانے لگتا ہے۔ آئیں، پھر ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ جس مبارز نے اپنا مقصد حاصل کرنے کے لیے اتنی دانائی سے بہترین اور سادہ ترین ہتھیار استعمال کیا، اسے بیک وقت شجاعت اور روایات کا بھی پاس تھا۔ تاہم وہ حقائق پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور یہ دعویٰ کرنے لگتا ہے کہ اس نے شمشیر زنی کے فن کے قواعد کی پابندی کرتے ہوئے اپنی فتح شمشیر کے زور پر حاصل کی ہے۔ آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس قسم کی ڈوئیل کی یہ کہانی ہمارے لیے کتنی نا قابل فہم اور پُر از پراگندہ خیالی ہوگی۔

وہ شمشیر زن، جس نے ڈوئیل فن کے قواعد کے مطابق لڑنے پر اصرار کیا، فرانسیسی فوج تھی۔ اس کے جس حریف نے تلوار پھینک کر ڈنڈا اٹھایا تھا، روسی قوم تھی۔ جو کچھ ہوا، جن لوگوں نے اس کی توضیح شمشیر زنی کے اصولوں کے مطابق کرنے کی کوشش کی، وہ وہ مورخین ہیں جنھوں نے اس واقعے کے بارے میں تصانیف قلم بند کی ہیں۔

سمولنسک کی آتش زنی کے بعد ایک ایسی جنگ شروع ہوئی جس میں روایتی جنگوں سے کوئی مشابہت نہیں پائی جاتی۔ قصبوں اور دیہاتوں کی آتش زنی، ہر لڑائی کے بعد پسپائی، بارودینو کی ضرب، اس کے بعد پھر پسپائی، ماسکو کا اتراک اور آتش زدگی، قزاقوں اور لٹیروں کی کارروائیاں، بار برداری کی گاڑیوں پر قبضے، گوریلا جنگ — یہ سب چیزیں قواعد سے انحرافات تھے۔

نپولین کو اس کا شعور تھا اور جب اس نے ماسکو میں شمشیر زنی کے صحیح اصولوں کی پاسداری شروع کی اور اپنے خلاف حریف کی شمشیر کی جگہ اس کا ڈنڈا اٹھتے دیکھا، وہ مسلسل کوتوزوف اور امپراطور الیکسانڈر سے احتجاج کرتا رہا کہ جنگ تمام مسلمہ قواعد کے خلاف لڑی جا رہی ہے (جیسے لوگوں کو موت کے گھاٹ اتارنے کے بھی کوئی قواعد ہوتے ہیں)۔ فرانسیسیوں کے اعتراضات کے باوجود کہ جنگ میں قواعد کی پابندی نہیں کی جا رہی اور اس حقیقت کے باوصف کہ اعلیٰ مناصب پر فائز بعض روسیوں کو ڈنڈا گھمانا قدرے معیوب معلوم ہوا — وہ چاہتے تھے کہ en quarte[1] یا en[2] tierce میں صحیح پوزیشن اختیار کی جائے اور en prime[3] میں پھرتی اور مشاقی سے ضرب لگائی جائے، وغیرہ وغیرہ — عوامی جنگ کا ڈنڈا کسی کے ذوق، کسی قسم کے قواعد یا کسی اور چیز کو خاطر میں نہ لاتے اپنے پورے تخویف آمیز اور پُرشکوہ انداز سے اٹھا، بالکل احمقانہ سادگی لیکن مکمل موثر طریقے سے اٹھتا اور برستا رہا اور اس وقت تک فرانسیسیوں کا کچومر نکالتا رہا جب تک حملہ آوروں کی ساری فوج تہس نہس نہ ہوگئی۔

وہ قوم بہت خوش نصیب ہے جو اپنے فراخ دل فاتح کو فن کے اصولوں کے مطابق سلیوٹ نہیں کرتی اور نہ رسوم کی پیروی کرتے ہوئے نفاست اور شائستگی کے ساتھ اپنی شمشیر کا دستہ اس کی خدمت میں پیش کرتی ہے — جیسا

کہ فرانسیسیوں نے 1813[4] میں کیا۔ وہ قوم بہت خوش اقبال ہے جو آزمائش کی گھڑی میں یہ پوچھے بغیر کہ دوسروں نے اس سے مشابہ صورتوں کے لیے کیا قواعد وضع کیے ہیں، سیدھے سادے اور ماہرانہ انداز سے، جو پہلا ڈنڈا اس کے ہاتھ آتا ہے، اٹھالیتی ہے اور ضرب پر ضرب لگاتی چلی جاتی ہے تا آنکہ اس کی روح میں جو احساسِ ہتک اور انتقامی جذبہ بھرا ہوتا ہے، وہ سرد ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ حقارت اور رحم کے جذبات لے لیتے ہیں۔

2

جنگ و جدل کے نام نہاد قواعد سے جو انحرافات کیے جاتے ہیں، ان میں نمایاں تریں اور سود مند تریں وہ کارروائی ہے جو دور دور بکھرے ہوئے گروہ ان لوگوں کے خلاف کرتے ہیں جو بڑی فوج بنا کر اور آپس میں بہت قریب رہ کر لڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی کارروائی ہمیشہ ان جنگوں میں، جو قومی روپ دھار لیتی ہیں، دیکھنے میں آتی ہے۔ اس طرح کی کارروائیوں میں لوگوں کا ایک گروہ دوسرے گروہ کے خلاف برسرِ پیکار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بٹ جاتے ہیں اور جہاں کہیں انھیں موقع ملتا ہے، وہ علیحدہ علیحدہ حملے کرتے رہتے ہیں۔ اگر حریف برتر ہوا اور اس سے انھیں خطرہ لاحق ہوا، تو وہ جھٹ پٹ بھاگ جاتے ہیں اور جونہی دوبارہ موقع ملا، پھر حملہ کر دیتے ہیں۔ ہسپانیہ میں گوریلوں نے، کاکیشیا میں پہاڑی قبیلوں[5] نے اور 1812 میں روسیوں نے یہی کچھ کیا۔

لوگ اس قسم کی لڑائی کو "گوریلا جنگ" کہتے ہیں اور فرض کر لیتے ہیں کہ جب انھوں نے اس کا نام رکھ دیا ہے، پھر ہر چیز خود بخود واضح ہو جانا چاہیے۔ لیکن اس قسم کی جنگ کسی قسم کے قواعد کے تحت نہیں لڑی جاتی بلکہ مصافیات کے ایک جانے پہچانے کلیے کی، جسے بے خطا تصور کیا جاتا ہے، براہِ راست نقیض کرتی ہے۔ کلیہ یہ کہتا ہے: حملہ آور فریق کو اپنی تمام افواج ایک مقام پر مرتکز کر لینا چاہئیں تا کہ وہ بوقتِ لڑائی اپنے حریف سے زیادہ مضبوط ہو۔

گوریلا جنگ (جیسا کہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے، ہمیشہ کامیاب رہتی ہے) اس کلیے کے بالکل الٹ کارروائی کا نام ہے۔ یہ تناقض اس لیے پیدا ہوتا ہے کیونکہ عسکری سائنس یہ مفروضہ قائم کر لیتی ہے کہ فوج کی قوت اس کی تعداد کی نسبت سے ہوتی ہے۔ عسکری سائنس کہتی ہے کہ جتنی زیادہ فوج کی تعداد ہوگی اتنی ہی زیادہ اس کی قوت ہوگی۔

Les gros bataillons ont toujours raison*۔

عسکری سائنس کا محولہ بالا دعویٰ بالکل ایسے ہی ہے جیسے میکانیات میں مقدارِ حرکت (مومینٹم[6]) کی تعریف محض مقدارِ مادہ (mass) کے حوالے سے کر دی جائے اور یہ اعلان کر دیا جائے کہ متحرک جسم کی مقدارِ حرکت اس کی مقدارِ مادہ (یا حجم) کی برابری یا نابرابری کے حساب سے مساوی یا غیر مساوی ہے۔

لیکن مومینٹم (مقدارِ حرکت) مادے کی مقدار (mass) اور ولاسٹی (جسم کی خاص سمت میں رفتار) کے

* خدا بڑی فوجوں کا ساتھ دیتا ہے۔

حاصل ضرب کے برابر ہوتا ہے۔

چنانچہ عسکری معاملات میں فوج کی قوت اس کی تعداد (mass) اور کسی نامعلوم شے ایکس (x) کے حاصل ضرب کے برابر ہوتی ہے۔

تاریخ میں ایسی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ فوج کا حجم اس کی قوت سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا اور ہمیں چھوٹی فوجیں بڑی فوجوں کو شکست دیتی نظر آتی ہیں۔ عسکری سائنس کا جب ان مثالوں سے سامنا ہوتا ہے، وہ مبہم انداز سے اس نامعلوم عنصر کی موجودگی تسلیم کر لیتی ہے اور وہ اسے کبھی افواج کی ہندسی تقسیم و ترتیب میں، کبھی بہتر ہتھیاروں میں اور کبھی (بلکہ زیادہ تر) کمانڈروں کی عبقریت میں ڈھونڈنے لگتی ہے لیکن ان تمام عناصر کو گنوانے کے بعد بھی وہ نتائج، جو تاریخی حقائق کے مطابق ہوں، حاصل نہیں ہوتے۔

اس نامعلوم ایکس کو معلوم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اس باطل نقطۂ نظر کو (جو محض "ہیروؤں" کی انا کی تسکین کے لیے گھڑا گیا ہے)، کہ جنگ کے دوران میں اعلیٰ حکام جو ہدایات صادر کرتے ہیں، وہ موثر ثابت ہوتی ہیں، ترک کر دیں۔

یہ نامعلوم ایکس فوج کا جذبہ ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسے یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ وہ افراد، جن پر فوج مشتمل ہوتی ہے، وہ کس حد تک — کم یا زیادہ — لڑنے اور خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ وہ کسی عبقری کی قیادت میں لڑ رہے ہیں یا غیر عبقری کی، دو صفیں بنا کر لڑ رہے ہیں یا تین، ڈنڈوں سے لڑ رہے ہیں یا رائفلوں سے، جو ایک منٹ میں تیس گولیاں اگل سکتی ہے، وہ لشکری جنھیں لڑنے کا شوق ہوتا ہے، خود ہی اپنے اردگرد ایسے حالات پیدا کر لیتے ہیں جو لڑائی میں ان کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوتے ہیں۔

فوج کا جذبہ وہ عنصر ہے کہ اگر اسے اس کی تعداد (mass) سے ضرب دے دی جائے، تو اس کی (صحیح) قوت دریافت ہوجائے گی۔ اس نامعلوم عنصر کی — فوج کا جذبہ — اہمیت کی تعریف اور توضیح کرنا سائنس کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔

یہ مسئلہ تبھی حل ہوسکتا ہے کہ اگر ہم ان حالات کو — فوج کی تقسیم و ترتیب کے لیے کمانڈر کا منصوبہ، آلات حرب اور دیگر فوجی ساز و سامان وغیرہ —، جن کے اندر یہ جذبہ مصروف عمل نظر آتا ہے، من مانے اور بے اصولی کے انداز سے اس نامعلوم ایکس کا بدل بنانا چھوڑ دیں کیونکہ اس میں ہماری غلطی یہ ہوتی ہے کہ ہم انھیں اہم عنصر سمجھ لیتے ہیں۔ ہمیں اس نامعلوم ایکس کو وہی کچھ ماننا اور تسلیم کرنا ہوگا جو کہ در حقیقت وہ ہے — خطرہ مول لینے کی کم و بیش فعال خواہش۔ صرف تبھی معلوم تاریخی حقائق کو (حسابی) مساوات کے ذریعے ظاہر کر کے اور اس نامعلوم عنصر کی اضافی اقدار کا موازنہ کر کے ہم فی نفسہٖ اس نامعلوم کی تعریف و تشریح کر سکیں گے۔

دس اشخاص، رجمنٹیں اور ڈویژنیں پندرہ اشخاص، رجمنٹوں یا ڈویژنوں کا صفایا کر دیتی ہیں — یعنی ان سب کو ہلاک کر دیتی یا گرفتار کر لیتی ہیں —، جب کہ خود انھیں صرف چار سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ چنانچہ ایک فریق کو چار

کا اور دوسرے فریق کو پندرہ کے پندرہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح چار پندرہ کے برابر ہوے اور ہم انھیں 4 ایکس = 15 وائی لکھ سکتے ہیں۔ یوں 4 : 15 :: وائی : ایکس ہوا یا بہ الفاظ دیگر ایکس کا جو تعلق وائی سے ہے، وہی پندرہ کا چار سے ہے۔ اگرچہ اس مساوات سے نامعلوم عنصر کی اقدار معلوم نہیں ہوتیں، لیکن یہ دونا معلوم کے مابین تناسب ضرور بتا دیتی ہے۔ گوناگوں تاریخی اکائیوں (لڑائیوں، جنگوں، زمانۂ جنگ) کو ان مساوات کے ذریعے ظاہر کر کے اعداد کے ایسے سلسلے تک پہنچا جا سکتا ہے جن میں قوانین موجود ہوں گے اور کسی نہ کسی وقت انھیں دریافت کیا جا سکے گا۔

مصافیات کا یہ اصول کہ فوج کو حملہ بصورت ہجوم (mass) کرنا چاہیے لیکن پسپائی کے لیے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ جانا چاہیے، نادانستہ طور پر اس صداقت کی تصدیق کر دیتا ہے کہ فوج کی قوت اس کے جذبے پر منحصر ہوتی ہے۔ جہاں فائرنگ ہو رہی ہو، وہاں تک آدمی کو لے جانے کے لیے حملہ روکنے کی نسبت زیادہ نظم وضبط (ڈسپلن) کی ضرورت پیش آتی ہے اور اس ڈسپلن کا حصول تبھی ممکن ہے اگر عسکری کندھے سے کندھا ملا کر آگے بڑھیں۔ لیکن یہ اصول فوج کے جذبے کو خاطر میں نہیں لاتا، چنانچہ یہ پیہم مغالطہ دہ ثابت ہوتا ہے اور حقائق کے ساتھ، جب سپاہ کے جذبے میں کمی بیشی واقع ہوتی ہے (جیسا کہ تمام قومی جنگوں میں ہوتا ہے)، نمایاں تضاد پیش کرتا ہے۔

1812 میں جب فرانسیسی پسپا ہو رہے تھے، اگرچہ مصافیات کے اصولوں کے مطابق انھیں اپنا دفاع کرنے کے لیے چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم ہو جانا چاہیے تھا، وہ بصورت ہجوم (mass) اکٹھے ہو گئے کیونکہ فوج کا جذبہ اتنا گر چکا تھا کہ صرف حجم ہی ان میں یک جہتی برقرار رکھ سکتا تھا۔ اس کے برعکس (مصافیات کے اصولوں کے مطابق) روسیوں کو بصورت ہجوم ان پر حملہ کرنا چاہیے تھا لیکن فی الحقیقت وہ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں بٹ گئے کیونکہ ان کا جذبہ اتنا بلند ہو چکا تھا کہ اشخاص احکام کے بغیر انفرادی حیثیت سے فرانسیسیوں کو ضربیں پہنچانے لگے اور کسی کو یہ ضرورت محسوس نہ ہوئی کہ وہ انھیں مصائب اور خطرات کا سامنا کرنے کے لیے مجبور کرے۔

3

یہ نام نہاد گوریلا جنگ فرانسیسیوں کے سمولنسک میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوئی۔

پیشتر اس کے کہ حکومت اس جنگ کو سرکاری طور پر تسلیم کرتی، قازق اور کسان غنیم کے ہزاروں لشکریوں کو۔ ان میں کچھ لوٹ مار کی غرض سے بڑی فوج سے بچھڑ گئے تھے اور کچھ چارے چبینے کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گئے تھے۔ موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ قازقوں اور کسانوں نے انھیں اسی جبلی انداز سے قتل کیا جس طرح کتے کسی بھٹکے ہوے پاگل کتے کو گھیر گھار کر اور پریشان کر کے مار دیتے ہیں۔ ڈینس داویدوف[7] اپنی روسی جبلت کے ساتھ پہلا شخص

تھا جس نے اس خوفناک ڈنڈے کی، جو عسکری قواعد کے علی الرغم فرانسیسیوں کو ملیامیٹ کر رہا تھا، اہمیت کو پہچانا اور جنگ کے اس طریقۂ کار کو باقاعدہ بنانے کے سلسلے میں جو اولین قدم اٹھایا گیا، اس کا سہرا اسی کے سر بندھتا ہے۔

چوبیس اگست کو داویدوف کا پہلا گوریلا دستہ منظم کیا گیا اور اس کے بعد دوسروں کی تشکیل شروع ہو گئی۔ جوں جوں مہم آگے بڑھتی گئی، توں توں ان دستوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔

گوریلوں نے Grande Armee (عظیم فوج) کو بتدریج تباہی سے دوچار کیا۔ انھوں نے مرجھائے ہوئے درخت (فرانسیسی فوج) کے پتوں کو، جو از خود گر پڑے تھے، جھاڑو سے صاف کر دیا اور بعض اوقات وہ خود درخت کو بھی جھنجھوڑ دیتے تھے۔ اکتوبر میں جب فرانسیسیوں نے سمولنسک کی طرف بھاگنا شروع کیا، ان جتھوں کی تعداد سینکڑوں ہو چکی تھی۔ وہ سب کے سب حجم اور خصوصیات کے اعتبار سے ایک دوسرے سے مختلف تھے اور ان میں جو لوگ شامل تھے، وہ بھی بھانت بھانت کے تھے۔ ان میں سے چند ایک نے تو باقاعدہ فوج کی شکل صورت اختیار کر لی۔ ان کے پیادہ اور گھوڑ سوار دستے تھے، باقاعدہ سٹاف تھا اور انھیں زندگی کی ضروریات اور سہولیات بھی میسر تھیں۔ بعض محض قازق گھوڑ سواروں پر مشتمل تھے اور بعض محض کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا گروہ تھے۔ ان میں پیدل، گھوڑ سوار، یا زمیندار اور کسان شامل تھے اور ان کی موجودگی کا کسی کو خاص علم بھی نہ ہو سکا۔ ایسے ہی ایک جتھے نے، جس کی قیادت کوئی نائب پادری کر رہا تھا، ایک ماہ کے اندر اندر سینکڑوں قیدی پکڑ لیے۔ پھر ایک عورت واسلیسا تھی۔ وہ ایک دیہاتی مکھیا کی بیوی تھی۔ اس نے سینکڑوں فرانسیسیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔

اکتوبر کے آخری ایام میں یہ گوریلا جنگ پورے زوروں پر تھی۔ اگرچہ ابتدائی مرحلے میں یہ بے قاعدہ دستے اپنی دلیری اور نڈرتا پر خود حیران و ششدر رہتے تھے، پھر بھی ان پر ہر دم یہ خوف سوار رہتا کہ فرانسیسی انھیں اپنے گھیرے میں لے لیں گے اور قیدی بنا لیں گے۔ وہ گھوڑوں سے زینیں اتارے بغیر جنگلوں میں چھپے رہتے، گھوڑوں سے شاذ ہی نیچے اترتے اور ہر وقت توقع رکھتے کہ ان کا تعاقب کیا جائے گا۔ یہ دور اب گزر چکا تھا۔ اکتوبر کے اواخر تک اس جنگ نے واضح صورت اختیار کر لی تھی اور ہر شخص جان چکا تھا کہ فرانسیسیوں کے خلاف کس طرح کا خطرہ مول لیا جا سکتا ہے اور کس طرح کا نہیں۔ دستوں کے صرف وہی کمانڈر، جو اپنے سٹاف افسروں کی معیت میں نقل و حرکت کرتے تھے اور قواعد کے مطابق اپنے اور فرانسیسیوں کے مابین معقول فاصلہ رکھتے تھے، اب بھی بعض چیزوں کو ناممکن خیال کرتے تھے۔ جہاں تک چھوٹے جتھوں کا تعلق ہے، وہ اپنی کارروائیوں کا آغاز بہت پہلے کر چکے تھے اور فرانسیسیوں کا کافی دنوں تک قریب سے مشاہدہ کر چکے تھے۔ چنانچہ وہ بعض ایسی چیزیں بھی، جن کے متعلق بڑے دستوں کے کمانڈر سوچ بھی نہیں سکتے تھے، قابل عمل سمجھتے تھے۔ قازق اور کسان، جو فرانسیسیوں میں گھستے رہتے تھے، اب سب کچھ ممکن خیال کرنے لگے تھے۔

دینی سوف انھیں بے قاعدہ فوجیوں میں شامل تھا۔ اس کا اپنا جتھا تھا۔ بائیس اکتوبر کو اس کے جتھے کے گوریلوں کا جوش و خروش اپنی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ دینی سوف اور اس کے ساتھی صبح سویرے سے متحرک تھے۔ وہ سارا دن جنگل

میں چھپے، جو شاہراہ کے ساتھ ساتھ واقع تھا، فرانسیسیوں کے بہت بڑے قافلے کو، جس میں گھوڑ اسوار فوج کے سازوسامان کی گاڑیاں اور روسی قیدی شامل تھے، دیکھ رہے تھے اور جس قدر ممکن تھا، وہ ان کے قریب رہتے اور ان کے ساتھ ساتھ آگے چلتے جا رہے تھے۔ یہ قافلہ باقی فوج سے بچھڑ چکا تھا اور جیسا کہ مخبروں اور قیدیوں کی زبانی بھی تصدیق ہوگئی، خاصے بڑے حفاظتی دستے کے ساتھ سمولنسک جا رہا تھا۔ نہ صرف دینی سوف اور دلوخوف (جو خود بھی ایک چھوٹے جتھے کا سربراہ تھا اور دینی سوف کے قریب سرگرم عمل تھا) کو بلکہ بعض بڑے دستوں کے کمانڈروں کو، جن کے اپنے سٹاف تھے، باربرداری کے اس قافلے کی موجودگی کا علم تھا اور دینی سوف کے الفاظ میں وہ ''اس کے لیے اپنے دانت تیز کر رہے تھے۔'' ان میں سے دو کمانڈروں — ایک پولستانی اور دوسرا جرمن — نے تقریباً بیک وقت اسے دعوت دی کہ باربرداری کے اس قافلے پر حملہ کرنے کے لیے وہ ان کے ساتھ مل جائے۔

''نہیں دوست، میری جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش نہیں ہے۔'' اس نے ان پیغامات کو پڑھنے کے بعد کہا اور اس نے جرمن کو لکھا: ''میری دلی خواہش تھی کہ اتنے بہادر اور مشہور جرنیل کی قیادت میں خدمات سرانجام دینے کی سعادت نصیب ہوتی، لیکن کیا کیا جائے، میں پہلے ہی پولستانی جرنیل کی ماتحتی[8(الف)] قبول کر چکا ہوں، چنانچہ آپ کی قیادت میں کام کر کے جو خوشی حاصل ہوتی، مجھے اس سے مجبوراً دستکش ہونا پڑ رہا ہے۔'' اس نے اسی قسم کا جواب پولستانی جرنیل کو بھیج دیا اور اسے اطلاع دے دی کہ وہ جرمن جرنیل کی ماتحتی میں کام کر رہا ہے۔

معاملات کو یوں نپٹانے کے بعد دینی سوف اور دلوخوف نے یہ تہیہ کر لیا کہ وہ اعلیٰ افسروں کو اطلاع دیے بغیر اپنے چھوٹے چھوٹے جتھوں کے ساتھ اس قافلے پر حملہ کریں گے اور اسے پکڑ لیں گے۔ بائیس اکتوبر کو یہ قافلہ میکولینو گاؤں سے شام شیوو گاؤں کی طرف سفر کر رہا تھا۔ دونوں قریوں کے مابین سڑک کی بائیں جانب بڑے بڑے جنگلات تھے۔ اگرچہ بعض مقامات پر یہ جنگلات سڑک سے پون میل یا اس سے زیادہ ہٹ جاتے تھے لیکن دوسری جگہوں پر یہ سڑک کے بالکل ساتھ مل جاتے تھے۔ دینی سوف اور اس کے ساتھی سارا دن ان جنگلوں میں چلتے رہے۔ بعض اوقات وہ ان جنگلوں میں خاصا پیچھے چلے جاتے لیکن بعض اوقات وہ بالکل ان کے کناروں پر آجاتے لیکن متحرک فرانسیسیوں کو کبھی اپنی نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتے۔ اس صبح دینی سوف کے جتھے کے قازقوں نے دو چھکڑے، جن پر زینیں لدی ہوئی تھیں، پکڑ لیے تھے اور انھیں جنگل میں لے گئے تھے۔ یہ چھکڑے میکولینو سے کچھ ہی دور، جہاں جنگل سڑک کے بالکل قریب آگیا تھا، کیچڑ میں پھنس گئے تھے۔ اس سمے سے شام تک وہ فرانسیسیوں کی نقل و حرکت کا بغور جائزہ لیتے رہے لیکن انھوں نے ان کے ساتھ کسی قسم کی چھیڑ خانی کرنے سے احتراز کیا۔ دینی سوف چاہتا تھا کہ انھیں خوف و ہراس میں مبتلا کیے بغیر خاموشی سے شام شیوو پہنچنے دیا جائے اور پھر دلوخوف (جسے اس شام مشورے کے لیے شام شوو سے پون میل دور جنگل کے رکھوالے کے جھونپڑے میں آنا تھا) کے ساتھ مل کر علی الصبح فرانسیسیوں پر ہلہ بول دیا جائے اور جس طرح برف کا تودا آناً فاناً پہاڑ سے نیچے لڑھکتا ہے اور کسی کو بھاگنے کی مہلت نہیں دیتا، اسی طرح ان پر دو اطراف سے اچانک حملہ کیا جائے، ایک ہی ضرب سے ان کے پاؤں

اکھاڑ دیے جائیں اور سب کو پکڑ لیا جائے۔

انھوں نے اپنے عقب میں میکولینو سے کوئی ڈیڑھ میل آگے چھ قازق کھڑے کر دیے تاکہ اگر فرانسیسیوں کے کوئی نئے کالم آ رہے ہوں، تو وہ ان کی اطلاع دے سکیں۔

اسی طرح شام شیوو سے آگے دلوخوف نے سڑک کی نگرانی کرنا تھی تاکہ یہ معلوم کیا جا سکے کہ دوسرے فرانسیسی دستے کتنے فاصلے پر ہیں۔ ان کا اندازہ تھا کہ بار برداری کا قافلہ پندرہ سو نفوس پر مشتمل ہے۔ دینی سوف کے پاس دو سو آدمی تھے اور تقریباً اتنے ہی دلوخوف کے جتھے میں شامل تھے۔ لیکن یہ عددی فرق دینی سوف کا حوصلہ پست نہ کر سکا۔ وہ صرف یہ جاننے کا متمنی تھا کہ فرانسیسیوں کے قافلے میں کس قسم کے دستے شامل ہیں اور یہ معلوم کرنے کے لیے اسے ایک عدد ''زبان'' — یعنی غنیم کے قافلے کا کوئی شخص — پکڑنا تھی۔ چھکڑوں پر اس صبح کا حملہ اتنی جلد بازی میں کیا گیا تھا کہ ان کے ساتھ جو فرانسیسی تھے، وہ سبھی مارے گئے تھے، صرف ایک طبلچی لڑکا، جس کی ابھی مسیں بھی بھیگنے نہیں پائی تھیں، زندہ ہاتھ آیا تھا اور چونکہ وہ قافلے سے بچھڑ چکا تھا، اس لیے وہ اس کے بارے میں کچھ بھی نہ بتا سکا۔

دینی سوف کا خیال تھا کہ اگر اس نے دوسری مرتبہ حملہ کیا، تو عین ممکن ہے کہ سارا قافلہ خبردار ہو جائے اور وہ یہ خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کسان — تیخون شیرباتی — کو شام شیوو بھیجنے کا فیصلہ کیا تاکہ وہ جس طرح بن پڑے، فرانسیسی کوارٹر ماسٹروں میں سے، جنھیں بطور ہراول آگے روانہ کر دیا گیا تھا، کسی ایک کو پکڑنے کی کوشش کرے۔

4

یہ خزاں کا نیم گرم بارانی دن تھا۔ آسمان اور افق دونوں کا رنگ گدلے پانی کی طرح کا تھا۔ بعض اوقات یوں معلوم ہونے لگتا کہ دھند نیچے اتر رہی ہے اور بعض اوقات تیز اور ترچھی بارش ہونے لگتی۔

دینی سوف نے پشمینے کا چغا اور سمور کی ٹوپی، جس سے پانی نیچے بہہ رہا تھا، پہن رکھی تھی۔ وہ لاغر اندام اصیل گھوڑے پر سوار تھا، جس کے دونوں پہلو اندر کو دھنسے ہوئے تھے۔ اپنے گھوڑے کی طرح، جو اپنا سر اور کنوتیاں پچھلی جانب ڈھلکائے ہوئے تھا، وہ بھی ترچھی اور موسلا دھار بارش میں سکڑا سمٹا ہوا تھا اور بے چینی سے اپنے سامنے جھانک رہا تھا۔ اس کے چہرے پر، جو دبلا ہو چکا تھا اور چھوٹی، گھنی اور سیاہ داڑھی سے ڈھپا ہوا تھا، خشونت برس رہی تھی۔

دینی سوف کے ہمراہ اس کا قازق حلیف ایسول لووائسکی تھا۔ دینی سوف کی طرح اس کے جسم پر بھی پشمینے کا چغا اور سمور کی ٹوپی تھی۔ وہ صحت مند، خوبصورت اور جفاکش ڈان گھوڑے پر سوار تھا۔

ایسول لووائسکی کا جسم لمبا تڑنگا اور تختے کی طرح چوڑا تھا۔ اس کے بال بھورے، چہرہ زرد، اور آنکھیں چمکیلی

اور چھوٹی تھیں۔اس کے چہرے، انداز نشست و برخاست اور چال ڈھال سے مترشح ہوتا تھا کہ یہ آدمی دھیما اور خود اعتماد ہے۔اگر چہ یہ بتانا تو مشکل تھا کہ ایک گھوڑے اور سوار کی کون سی خصوصیت اسے دوسرے سے ممیز کرتی ہے لیکن ایک نظر دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ جہاں تک دینی سوف کا تعلق ہے، وہ پانی میں شرابور ہو رہا ہے، اس پر بے چینی نے غلبہ پا رکھا ہے اور وہ محض ایک ایسا شخص معلوم ہو رہا ہے، جو گھوڑے پر بس بیٹھا ہوا ہے۔اس کے برعکس ایسول کو کوئی پریشانی نہیں تھی اور ہمیشہ کی طرح آسودہ خاطر تھا۔وہ بس گھوڑے پر بیٹھا ہوا آدمی نہیں تھا بلکہ وہ اور گھوڑا ایک ہی وجود بن گئے تھے، ایک ایسا وجود جو دوہری قوت (سوار اور گھوڑے دونوں کی) کا مالک تھا۔

ان سے ذرا آگے ایک کسان گائیڈ جا رہا تھا۔وہ پیدل تھا اور بارش میں بالکل تربتر تھا۔وہ دیہاتیوں کا خاکستری کوٹ اور سفید ٹوپی پہنے ہوئے تھا۔

ان کے ذرا پیچھے ایک مریل اور سوکھے سڑے کرغیزی ٹٹو پر، جس کی دم جھاڑی اور ایال لمبی تھی اور جس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا، ایک نوجوان افسر، جو نیلے فرانسیسی کوٹ میں ملبوس تھا، سوار تھا۔

اس کے برابر برابر ایک ہوزار آرہا تھا۔اس کے پیچھے بوسیدہ فرانسیسی وردی اور نیلی ٹوپی پہنے ایک لڑکا گھوڑے کی سرین پر بیٹھا اور اس کے ساتھ چپکا ہوا تھا۔سردی سے لڑکے کے ہاتھ سرخ ہو رہے تھے اور وہ اپنے ننگے پاؤں کو حرارت پہنچانے کے لیے انھیں زور زور سے گھما پھرا رہا تھا۔اس کے ابروؤں کے بال کھڑے تھے اور وہ حیران حیران نگاہوں سے اپنے اردگرد دیکھ رہا تھا۔یہ وہی فرانسیسی طبلچی لڑکا تھا جو اس روز صبح پکڑا گیا تھا۔

ان سب کے پیچھے جنگل کے کچے، تنگ، گیلے اور کٹے پھٹے راستے کے ساتھ ساتھ تین تین چار چار کی ٹولیاں بنائے ہوزار اور ان کے قازق آرہے تھے۔ان میں سے بعض پشمینے کے چغوں اور بعض فرانسیسی اوورکوٹوں میں ملبوس تھے۔چند ایک نے اپنے سروں پر گھوڑوں کی جھولیں لپیٹ رکھی تھیں۔اس بات سے قطع نظر کہ گھوڑے کمیت تھے یا تلیا، موسلا دھار بارش میں سبھی مشکی معلوم ہو رہے تھے۔عجیب بات یہ تھی کہ ان کی ایالوں کے نیچے، جہاں سے مسلسل پانی نچلی جانب گر رہا تھا، ان کی گردنیں بالکل دبلی پتلی دکھائی دے رہی تھیں۔گھوڑوں سے بادلوں کی صورت میں بھاپ اوپر اٹھ رہی تھی۔ملبوسات، زینیں، لگامیں۔۔غرضیکہ ہر چیز زمین اور ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح، جو جگہ جگہ نیچے بکھرے پڑے تھے، تربتر، وزنی اور پھسلواں ہو چکی تھی۔آدمی سکڑے سمٹے بیٹھے تھے اور کوشش کر رہے تھے کہ اپنی جگہ سے بالکل نہ ہلیں تاکہ پانی کے جو قطرے رس رس کر ان کی جلدوں تک پہنچ چکے تھے، وہ ذرا گرم ہو جائیں اور مزید ٹھنڈا پانی ان کی نشستوں، گھٹنوں یا گردنوں تک رسائی حاصل نہ کر سکے۔قازقوں کی قطار کے بیچوں بیچ دو چھکڑے، جنھیں فرانسیسی گھوڑے اور قازقوں کے اسپ، جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں، کھینچ رہے تھے، درختوں کے ٹھنٹھوں اور شاخوں پر کھڑکھڑاتے چلے آرہے تھے۔جب وہ گڑھوں اور کھڈوں کے اوپر سے گزرتے، پانی اچھال دیتے اور چھینٹے اڑتے اڑتے دور تک چلے جاتے۔

دینی سوف کے گھوڑے نے راستے میں پانی کے کھڈ سے بچنے کے لیے ناگاہ جھوک کھائی اور اپنے سوار کا گھٹنا

درخت سے ٹکرا دیا۔

''ارے، شیطان کے بچے!'' دینی سوف غضب ناک ہو کر چلایا اور اس نے دانت کچکچاتے ہوئے گھوڑے کو تین مرتبہ چابک رسید کیا۔ مار کھا کر گھوڑا اچھلا اور خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں کے اوپر کیچڑ کے چھینٹے اڑانے لگا۔

ایک تو چھاجوں پانی برس رہا تھا اور ادھر پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے (ان میں سے کسی نے صبح سے کچھ نہیں کھایا تھا)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دینی سوف کا مزاج برہم ہونے لگا۔ مگر اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ اسے ابھی تک دلوخوف کی کوئی خبر نہیں ملی تھی اور جس شخص کو اس نے ''زبان'' پکڑنے کے بھیجا تھا، وہ بھی ہنوز واپس نہیں آیا تھا۔

''بار برداری کے قافلے پر حملہ کرنے کا اس طرح کا موقع ہمیں اور نہیں ملے گا۔ اس پر تن تنہا ہلہ بولنا کچھ زیادہ ہی خطرناک ہے لیکن اگر ہم نے اپنا منصوبہ ایک دن کے لیے بھی ملتوی کر دیا، کوئی بڑا گوریلا دستہ ہماری آنکھوں کے سامنے اسے اچک لے گا۔'' دینی سوف نے سوچا۔ وہ پیہم سامنے جھانکتا جا رہا تھا اور توقع کر رہا تھا کہ دلوخوف کا ایلچی اب آیا، کہ اب آیا۔

جب دینی سوف جنگل میں ایک ایسے راستے پر پہنچا جس کے ساتھ ساتھ وہ دائیں طرف خاصا دور تک دیکھ سکتا تھا، وہ رک گیا۔

''کوئی آ رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

ایسول نے اس سمت میں دیکھا، جس طرح دینی سوف نے اشارہ کیا تھا۔

''یہ تو دو ہیں — ایک افسر اور دوسرا اس کا قازق۔ لیکن یہ مفروضہ قائم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ خود کرنل ہی ہے۔'' ایسول نے کہا۔ وہ اس قسم کے الفاظ، جنھیں قازق نہیں جانتے تھے، استعمال کرنے کا بہت شوقین تھا۔

دونوں گھوڑ سوار، جو ڈھلوان سے نیچے اتر رہے تھے، نگاہوں سے اوجھل ہو گئے لیکن چند منٹ بعد وہ دوبارہ نظر آنے لگے۔ آگے آگے افسر آ رہا تھا۔ اس کا گھوڑا تھکے ماندے انداز سے بھاگ رہا تھا اور وہ اپنا چابک بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ اس کے بال پریشان تھے اور وہ خود پانی میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کی پتلون آہستہ آہستہ کھسکتی کھسکاتی گھٹنوں پر اکٹھی ہو گئی تھی۔ اس کے پیچھے پیچھے اس کا قازق، جو رکابوں میں پاؤں پھنسائے کھڑا تھا، آ رہا تھا۔ افسر بالکل نوخیز چھوکرا تھا۔ اس کا چوڑا چکلا چہرہ گلابی اور اس کی آنکھیں تیز اور ہشاش بشاش تھیں۔ وہ گھوڑا دوڑاتا دینی سوف کے پاس پہنچا اور اس نے گیلا لفافہ اسے تھما دیا۔

''جنرل کی طرف سے،'' افسر نے کہا۔ ''معافی چاہتا ہوں کہ میں اسے خشک حالت میں آپ تک نہ پہنچا سکا۔''

دینی سوف نے تیوریاں چڑھاتے لفافہ پکڑا اور کھول دیا۔

''وہ بار بار ہمیں ڈراتے رہے کہ راستہ بہت خطرناک ہے،'' افسر نے، جب دینی سوف مراسلہ پڑھنے میں مصروف تھا، ایسول سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لیکن کماروف —'' اس نے اپنے قازق کی طرف اشارہ کیا۔ ''کماروف اور میں تیار تھے۔ ہمارے پاس دو دو پستول ہیں — مگر یہ کون ہے؟'' اس نے ایکا ایکی فرانسیسی طبلچی لڑکے کو دیکھتے

ہوے کہا۔ ''قیدی؟ آپ لوگ پہلے ہی کارروائی کر چکے ہیں؟ میں اس سے بات کر سکتا ہوں؟''

''رستوف! پیتیا!'' دینی سوف نے مراسلہ پڑھنے کے بعد باآواز بلند کہا۔ ''ارے، تم نے بتایا کیوں نہیں کہ تم کون ہو؟'' اور اس نے خندہ روئی سے اپنا ہاتھ افسر کی طرف بڑھا دیا۔

افسر پیتیا رستوف تھا۔

تمام راستہ پیتیا دینی سوف کے ساتھ بالغ اشخاص اور افسروں کے شایان شاں رویہ اپنانے کی سبیلیں سوچتا آ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اپنی سابقہ واقفیت کا کوئی حوالہ دینا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن جونہی دینی سوف اسے دیکھ کر مسکرایا، وہ کھل اٹھا اور اس کے ساتھ شرمانے لگا۔ وہ اپنے افسرانہ اطوار بھول گیا اور بتانے لگا کہ وہ کس طرح فرانسیسیوں کے برابر گھوڑا دوڑاتا آیا تھا، جب اسے یہ فریضہ سونپا گیا، وہ کتنا خوش ہوا تھا اور وہ کیسے پہلے ہی دیازما کے قریب ایک جھڑپ میں حصہ لے چکا تھا اور ایک ہوزار نے کس طرح وہاں کارنمایاں سرانجام دیا تھا۔

''خیر، تم سے مل کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے،'' دینی سوف نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا اور اس کے چہرے پر پہلے کی طرح پریشانی جھلکنے لگی۔

''مائیخل فیوک لیسیچ،'' اس نے ایسول سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''اسے پھر اسے جرمن نے بھیج دیا ہے۔ یہ اس کی ماتحتی میں کام کر رہا ہے۔''

اور دینی سوف نے ایسول کو بتایا کہ اس مراسلے میں، جو ابھی ابھی اس کے حوالے کیا گیا تھا، جرمن جرنیل نے اپنی سابقہ درخواست کا اعادہ کیا تھا کہ باربرداری کے قافلے پر حملہ کرنے کے لیے انھیں آپس میں مل جانا چاہیے۔

''اگر ہم نے کل تک اس پر قبضہ نہ کیا، وہ ہماری آنکھوں کے عین سامنے اسے ہم سے چھین لے گا۔'' اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

جب دینی سوف ایسول سے باتیں کر رہا تھا، پیتیا دینی سوف کے سرد مہرانہ لہجے سے مضطرب ہو گیا۔ اور اس نے فرض کر لیا کہ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی پتلون کی حالت ٹھیک ٹھاک نہیں ہے۔ وہ دزدیدہ انداز سے اسے اپنے اوورکوٹ کے نیچے چھپانے اور اس کے ساتھ ساتھ، جس قدر ممکن ہوا، عسکری رویہ اختیار کیے رکھنے کی کوشش کرنے لگا۔

''یوئر آنر، میرے لیے کیا حکم ہے؟'' اس نے سلیوٹ کے انداز میں اپنا ہاتھ اوپر اٹھاتے اور ایجوٹنٹ اور جرنیل کا تماشا، جس کے لیے وہ راستے میں ریہرسل کرتا آیا تھا، دوبارہ رچاتے ہوئے کہا۔ ''یا مجھے یوئر آنر کے ساتھ ٹھہرنا ہوگا؟''

''حکم؟...'' دینی سوف نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''خیر، کیا تم کل تک ٹھہر سکتے ہو؟''

''جی ہاں، بالکل... میں آپ کے ساتھ ٹھہر سکتا ہوں؟'' پیتیا نے چیخ کر کہا۔

''لیکن تمھارے جرنیل نے تم سے کیا کہا تھا؟ فی الفور واپس آنے کے لیے؟'' دینی سوف نے پوچھا۔

پیتیا شرما گیا۔

''انھوں نے مجھے کوئی ہدایات نہیں دی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ میں ٹھہر...'' اس نے مستفسرانہ انداز سے پوچھا۔

''پھر ٹھیک ہے،'' دینی سوف نے کہا۔

اور اپنے آدمی کی طرح متوجہ ہو کر اس نے ایک ٹولی کو حکم دیا کہ وہ جنگل کے رکھوالے کے جھونپڑے کے قریب چلی جائے جہاں انھیں رکنا تھا، اور کرغیزی گھوڑے پر سوار افسر (جو ایجوٹنٹ کے فرائض سرانجام دیتا تھا) سے کہا کہ وہ جائے اور معلوم کرے کہ دلوخوف کہاں ہے اور کیا وہ اس شام آئے گا بھی یا نہیں۔ دینی سوف کا اپنا ارادہ ایسول اور پیتیا کے ساتھ جنگل کے کنارے تک جانا اور شام شیوو پہنچنے کا تھا تا کہ وہ فرانسیسی پڑاؤ کی، جس پر انھوں نے اگلے روز حملہ کرنا تھا، ترتیب اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے۔

''خیر، بزرگوار،'' اس نے کسان گائیڈ سے کہا، ''ہمیں شام شیوو لے چلو۔''

دینی سوف، پیتیا، ایسول، متعدد قازقوں اور اس ہوزار کی، جس کی تحویل میں قیدی تھا، معیت میں ندی کے پار بائیں طرف جنگل کے کنارے کی سمت میں گھوڑا بڑھانے لگا۔

5

بارش تھم چکی تھی، صرف دھند پڑ رہی تھی یا درختوں سے پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ دینی سوف، پیتیا اور ایسول چپ چاپ کسان کے پیچھے پیچھے جا رہے تھے۔ کسان کے سر پر سفید ٹوپی تھی اور اس کے پاؤں کی انگلیاں باہر کی طرف نکلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنے زیزفون کی چھال کے جوتوں میں جڑوں اور گیلے پتوں پر کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر اچھلتا کودتا انھیں جنگل کے کنارے کی جانب لیے جا رہا تھا۔

وہ ڈھلوان کی چوٹی پر رکا، اپنے گردوپیش نگاہ دوڑائی اور اس طرف، جدھر پتوں اور پودوں کا پردہ نسبتاً کم گھنا تھا، چل پڑا۔ وہ ایک اوک کے درخت کے قریب، جس نے ابھی تک اپنے پتے نہیں گرائے تھے، ساکن کھڑا ہو گیا اور پراسرار انداز سے ہاتھ سے اشارے کرتا انھیں اپنی طرف بلانے لگا۔

دینی سوف اور پیتیا اس کی جانب چل پڑے۔ جس جگہ کسان کھڑا تھا، وہاں سے فرانسیسیوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ جنگل سے ذرا ہی آگے ڈھلوان کی اترائی میں اناج کی فصل ربیع کا کھیت تھا۔ ایک ندی کے پار، جس کے کنارے بالکل سیدھے کھڑے تھے، دائیں طرف ایک چھوٹا سا گاؤں اور جاگیردار کا مکان تھا۔ اس مکان کی چھت شکستہ تھی۔ گاؤں میں، مکان میں، باغیچے میں، کنوئیں کے اردگرد، جوہڑ کے اڑوس پڑوس، سارے ٹیلے پر اور اس سڑک کے ساتھ ساتھ جو پل سے گاؤں کو جاتی تھی اور پانچ سو گز سے زیادہ دور نہیں تھی، پہاڑی تک جھلملاتی دھند میں لوگوں کے ہجوم نظر آ رہے تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ کسی ایسی زبان میں جو روسی نہیں تھی، باتیں کر رہے اور گھوڑوں کو، جو اپنے چھکڑوں کے ساتھ پہاڑی پر چڑھنے کے لیے زور لگا رہے تھے، پچکار رہے تھے۔ ان کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

''قیدی کو ادھر لاؤ،'' دینی سوف نے فرانسیسیوں سے نگاہیں اٹھائے بغیر تقریباً زیرِ لب کہا۔

ایک قازق گھوڑے سے اترا، اس نے قیدی لڑکے کو اٹھایا، زمین پر کھڑا کیا اور پھر اسے دینی سوف کے پاس لے گیا۔ دینی سوف نے فرانسیسیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لڑکے سے پوچھا کہ سامنے کی سپاہ کون سی ہے اور اس کے پرے کون سی؟ لڑکے نے اپنے یخ بستہ ہاتھ جیبوں میں گھسیڑے، نگاہیں اوپر اٹھائیں، ڈرتے کانپتے دینی سوف کی طرف دیکھا، اور جو کچھ وہ جانتا تھا، وہ من وعن بتانے کی ظاہری خواہش کے باوجود ژولیدہ جوابات دینے لگا۔ جو کچھ دینی سوف پوچھ رہا تھا، وہ اس کی محض توثیق کرتا جا رہا تھا۔ دینی سوف تیوریاں چڑھاتا اس سے پرے چلا گیا اور اپنی قیاس آرائیوں کے متعلق ایسول کو آگاہ کرنے لگا۔

پیتا کبھی طبلچی کو، کبھی دینی سوف کو، کبھی ایسول کو اور کبھی گاؤں میں اور سڑک پر فرانسیسیوں کو دیکھنے لگتا۔ وہ بار بار گردن گھماتا اور کوشش کرتا کہ کوئی اہم چیز چھوٹنے نہ پائے۔

''دلو خوف آئے نہ آئے، ہمیں کوشش لازماً کرنا ہوگی... کیا خیال ہے؟'' دینی سوف نے کہا۔ خوشی سے اس کی آنکھیں جگمگا رہی تھیں۔

''یہ بہت مناسب جگہ ہے،'' ایسول نے کہا۔

''ہم اپنے پیادہ ساتھیوں کو نیچے — دلدل کے قریب — بھیج دیں گے،'' دینی سوف نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''وہ رینگتے رینگتے باغیچے تک پہنچ جائیں گے۔ تم وہاں سے اپنے قازقوں کے ساتھ گھوڑوں پر چلو گے۔'' اس نے گاؤں کے پار جنگل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''اور میں یہاں سے اپنے ہوزاروں کے ساتھ روانہ ہوں گا۔ علامتی گولی کے چلنے —''

''اس گھاٹی کے قریب جانا مناسب نہیں رہے گا — وہاں دلدل ہے۔'' ایسول نے کہا۔ ''گھوڑے کیچڑ میں پھنس جائیں گے۔ ہمیں مزید بائیں طرف جانا ہوگا۔''

جب وہ آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے، جوہڑ کے قریب ڈھلوان میں گولی چلنے کی آواز سنائی دی، دھوئیں کا پہلے ایک اور پھر دوسرا مرغولہ بلند ہوا اور سینکڑوں بظاہر خوش باش فرانسیسیوں کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ سبھی بیک زبان چیخ چلا رہے تھے۔ دینی سوف اور ایسول فوراً پیچھے ہٹ گئے۔ وہ ان کے اتنا قریب تھے کہ انھیں خیال گزرا کہ شاید اس غل غپاڑے اور فائرنگ کا سبب وہ خود ہیں تاہم گولیوں کے چلنے اور فرانسیسیوں کے چیخ پکار کرنے کا ان سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ پہاڑی کے نیچے کوئی شخص، جو کسی طرح کے سرخ لباس میں ملبوس تھا، دلدل میں بھاگا آ رہا تھا۔ صاف ظاہر تھا کہ فرانسیسی اسی پر گولیاں چلا رہے ہیں اور اسی کو دیکھ کر چیخ پکار کر رہے ہیں۔

''ہائیں، یہ تو ہمارا تیخون ہے!'' ایسول نے کہا۔

''ارے، وہی ہے! بالکل وہی ہے!''

''پکا بدمعاش ہے!'' دینی سوف نے کہا۔

''وہ بچ نکلے گا!'' ایسول نے کہا۔

وہ جس آدمی کو تیخون کہہ رہے تھے، وہ دوڑتا دوڑتا ندی تک پہنچ چکا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی اس نے پانی میں چھلانگ لگا دی۔ پانی فضا میں اچھلا اور تیخون کچھ دیر کے لیے اس میں غائب ہو گیا۔ پھر وہ چاروں ہاتھ پاؤں استعمال کرتے کنارے کے اوپر چڑھا اور سرپٹ بھاگنے لگا۔ بھیگنے سے اس کی شکل کچھ یوں ہو گئی تھی جیسے اس کے جسم پر کسی نے سیاہ رنگ پھیر دیا ہو۔ جو فرانسیسی اس کا تعاقب کر رہے تھے، رک گئے۔

''بڑا پھرتیلا ہے!'' ایسول نے کہا۔

''لفنگا ہے!'' دینی سوف نے پہلے کی طرح جھلا کر کہا۔ ''اور یہ اتنا عرصہ کہاں رہا ہے؟''

''یہ کون ہے؟'' پیتیا نے پوچھا۔

''یہ ہمارا پلاستون[9] ہے۔ میں نے اسے 'زبان' پکڑنے کے لیے بھیجا تھا۔''

''بالکل، بالکل،'' دینی سوف کے پہلے ہی لفظ پر پیتیا نے یوں سر ہلاتے ہوئے کہا جیسے اسے سب کچھ معلوم ہو گیا ہو حالانکہ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔

❖

تیخون شرباتی جتھے کے انتہائی کارآمد آدمیوں میں شامل تھا۔ وہ دریائے گژات کے نزدیک پکرووسک گاؤں سے آیا تھا۔ اپنی گوریلا کارروائیوں کے آغاز میں دینی سوف پکرووسک گیا تھا۔ اس نے معمول کے مطابق گاؤں کے مکھیا کو طلب کیا اور اس سے پوچھا تھا کہ اسے فرانسیسیوں کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے۔ عام دیہاتی مکھیاؤں کی طرح اس مکھیا کا رویہ بھی کچھ ایسا تھا جیسے وہ اپنا دفاع کرنا چاہتا ہو۔ اس نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور کہا: ''نہ صاحب نہ، مجھے تو کچھ بھی معلوم نہیں ہے، میں نے نہ کچھ دیکھا ہے اور نہ سنا ہے۔'' لیکن جب دینی سوف نے اسے سمجھایا کہ اس کا مقصد فرانسیسیوں کو ہلاک کرنا ہے اور اسی لیے وہ اس سے پوچھ رہا ہے کہ ان میں سے کوئی بھٹک کر ادھر تو نہیں آ نکلے، تو مکھیا نے جواب دیا کہ بعض ''لٹیرے'' یقیناً آئے تھے لیکن اس قسم کے امور سے صرف تیخون شرباتی نمٹتا ہے۔ دینی سوف نے تیخون کو اپنے پاس بلایا۔ اس نے اس کی کارروائیوں کی تعریف کی۔ اس کے بعد اس نے مکھیا کی موجودگی میں زار اور وطن کے ساتھ وفاداری اور فرانسیسیوں سے نفرت (جو اس کے خیال میں ہر روسی کے دل میں ہونا چاہیے تھی) کے بارے میں چند کلمات کہے۔

''ہم فرانسیسیوں کو کوئی گزند نہیں پہنچاتے،'' تیخون نے کہا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ دینی سوف کی باتیں سن کر مرعوب ہو گیا ہے۔ ''ہم چند لڑکوں نے تفریح ضرور کی تھی۔ وہ 'لٹیرے' تھے۔ ہم نے پندرہ بیس کو اگلے جہان پہنچا دیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے انھیں اور کوئی تکلیف نہیں دی تھی...''

دینی سوف جب اگلے روز پکرووسک سے روانہ ہوا، وہ اس کسان کے متعلق سب کچھ بھول بھال چکا تھا،

لیکن اسے اطلاع دی گئی کہ تیخون اس کی پارٹی کے ساتھ نتھی ہو گیا ہے اور اصرار کر رہا ہے کہ وہ اسے اپنے ساتھ لے چلیں۔ دینی سوف نے اجازت دے دی۔

شروع شروع میں تیخون الاؤ جلانے، پانی ڈھونے، مردہ گھوڑوں کی کھالیں اور ادھیڑنے وغیرہ جیسے کٹھن اور کھردرے کام کیا کرتا تھا لیکن اس نے بہت جلد ثابت کر دیا کہ اسے گوریلا جنگ پسند ہے اور اس کا طبعی میلان بھی اسی طرف ہے۔ رات کے وقت وہ مالِ غنیمت کی تلاش میں نکل جاتا اور کچھ نہ کچھ فرانسیسی ملبوسات اور ہتھیار لے آتا۔ جب اسے حکم دیا جاتا کہ وہ فرانسیسی قیدی بھی لائے، تو وہ ایک دو وہ بھی پکڑ لاتا۔ دینی سوف نے اس کی مشقت طلب کاموں سے، جو وہ کر رہا تھا، چھٹی کرا دی اور جب کبھی خود ریکی پر نکلتا، اسے بھی اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ اس نے اسے قازقوں میں شامل کر لیا۔

تیخون کو گھڑ سواری پسند نہیں تھی۔ وہ جہاں بھی جاتا، ہمیشہ پیدل جاتا لیکن وہ گھڑ سواروں سے کبھی پیچھے نہ رہا۔ اس کے ہتھیاروں میں مسکٹون[10] (اسے وہ مذاقاً اپنے ساتھ اٹھائے پھرتا تھا)، پائیک[11] اور کلہاڑی شامل تھے۔ مؤخرالذکر وہ اسی طرح استعمال کرتا تھا جس طرح بھیڑیا اپنے دانت استعمال کرتا ہے۔ وہ اس سے اپنی پوستین کی ٹوپی سے پسّو نکال لیتا، بڑی بڑی ہڈیاں چرمر کر دیتا، لکڑیاں کاٹتا اور اس کا دستہ پکڑ کر چھوٹے چھوٹے کیل اور چمچے بناتا۔ وہ یہ تمام کام پوری صحت اور صفائی سے کرتا۔ اسے نہ تو کوئی دقت پیش آتی اور نہ اس سے کوئی معمولی سے معمولی غلطی سرزد ہوتی۔ دینی سوف کے پیروکاروں میں اسے خصوصی اور غیر معمولی مقام حاصل تھا۔ جب کوئی ایسا کام درپیش ہوتا جو کڑا یا کریہہ ہوتا۔ مثلاً کندھا دے کر چھکڑے کو کیچڑ سے نکالنا، دم پکڑ کر گھوڑے کو دلدل سے باہر کھینچنا اور اس کی کھال ادھیڑنا، فرانسیسیوں کے مابین چوری چھپے گھسنا یا ایک دن میں تیس تیس میل پیدل چلنا۔ ہر شخص ہنستے ہوئے تیخون کی طرف اشارہ کرنے لگتا۔

''اس شیطان کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ اس کی کاٹھی گھوڑے کی طرح مضبوط ہے،'' وہ اس کے متعلق کہتے۔

ایک مرتبہ وہ ایک فرانسیسی کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ فرانسیسی نے اس پر گولی چلا دی اور اس کا چوتڑ زخمی کر دیا۔ اس کا زخم، جس کا وہ اندر باہر صرف ووڈکا چھڑک کر علاج کرتا تھا، سارے دستے کے لیے شگفتہ مذاق کا موضوع بن گیا، اور خود تیخون اس قسم کے مذاق میں جی جان سے شریک ہوتا تھا۔

''کیوں دوست، مزہ آیا؟ آخر انھوں نے تمھاری کھنچائی کر ہی دی!'' قازق اس کے ساتھ دل لگی کرتے۔

تیخون عمداً لوٹنے پوٹنے اور طرح طرح کی شکلیں بنانے لگتا جیسے اسے بہت تکلیف ہو رہی ہو۔ وہ یوں بنے لگتا جیسے اس کا خون کھول رہا ہو اور وہ فرانسیسیوں کو انتہائی مضحکہ انداز سے بے نقط سنانے لگتا۔ اس واقعے کا تیخون پر صرف اتنا اثر ہوا کہ وہ شاذ و نادر ہی کوئی قیدی پکڑ کر لاتا۔

تیخون جتھے کا سب سے زیادہ جی دار اور کام کا آدمی تھا۔ حملے کے مواقع تلاش کرنے میں اس سے بڑھ کر کوئی پھرتی کا مظاہرہ نہ کر سکتا اور نہ اس سے زیادہ کوئی فرانسیسی پکڑ سکا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قازقوں نے اسے اپنی دل لگی

کا نشانہ بنالیا اور اس نے یہ کردار بخوشی قبول کرلیا۔

اب گزشتہ رات تیخون کو "زبان" پکڑنے کے لیے شام شیوو بھیجا گیا تھا۔ لیکن یا تو یہ وجہ ہوئی کہ ایک قیدی پکڑنے سے اس کی تسلی نہ ہوئی یا پھر وہ رات بھر سویا رہا، تاہم وہ دن کے وقت رینگتا رینگتا فرانسیسیوں کے عین بیچ میں گھس گیا اور جیسا کہ دینی سوف پہاڑی سے دیکھ چکا تھا، انھوں نے "دریافت" کرلیا تھا۔

6

فرانسیسیوں کو اتنا قریب دیکھ کر دینی سوف ان پر اگلے روز ہلّہ بولنے کا پختہ فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ کچھ دیر ایسول کے ساتھ اس موضوع پر باتیں کرتا رہا۔ اس کے بعد اس نے گھوڑا موڑا اور واپس چل دیا۔

"چلو، دوست، اب ہم چلتے ہیں اور کپڑے وپڑے سکھاتے ہیں،" اس نے پیتا سے کہا۔

جونہی وہ رکھوالے کے جھونپڑے کے قریب پہنچے، دینی سوف رک گیا اور جنگل میں جھانکنے لگا۔ درختوں کے بیچوں بیچ ایک آدمی، جس کے بدن پر چھوٹا کوٹ، پاؤں میں زیرفونی جوتے اور سر پر قازانی ٹوپی تھی، اپنی بڑی ٹانگوں سے بآسانی لمبے لمبے قدم اٹھاتا اور اپنے لانبے بازو فضا میں لہراتا ان کی سمت میں چلا آرہا تھا۔ اس کے کندھے پر مسکون اور کمر بند میں کلہاڑی لٹک رہی تھی۔ جونہی اس کی نگاہ دینی سوف پر پڑی، اس نے بہ عجلت کوئی چیز جھاڑیوں میں پھینک دی، اپنے پانی سے شرابور ہیٹ کو اس کے ڈھیلے ڈھالے کنارے سے پکڑا اور اپنے کمانڈر کی طرف بڑھا۔ یہ تیخون تھا۔ اس کا جھریوں اور چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا چہرہ اپنی چھوٹی چھوٹی اور پچکی ہوئی آنکھوں سمیت اطمینان بخش شگفتگی سے دمک رہا تھا۔ اس نے اپنی گردن اوپر اٹھا رکھی تھی اور وہ دینی سوف کو یوں ٹکٹکی باندھ کر دیکھ رہا تھا جیسے وہ اپنے ہنسی دبانے کی کوشش کررہا ہو۔

"ہونہہ، یہ تم کہاں چلے گئے تھے؟" دینی سوف نے پوچھا۔

"کہاں؟ فرانسیسیوں کے پیچھے اور کہاں؟" تیخون نے بھاری لیکن شیریں اور دھیمی آواز میں جواب دیا۔

"تمھیں دن دیہاڑے رینگتے پھرنے کی کیا سوجھی تھی؟ گدھا کہیں کا! خیر، تم کسی کو پکڑ کر کیوں نہیں لائے؟"

"میں نے ایک پکڑا تو تھا۔"

"کہاں ہے وہ؟"

"دیکھیں، میں نے اسے روشنی کی پہلی لکیر نمودار ہونے پر پکڑا تھا،" تیخون نے کہا۔ اس نے اپنے پاؤں، جن کی انگلیاں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور جن میں اس نے زیرفون کے جوتے پہنے ہوئے تھے، اچھی طرح پھیلا لیے۔ "اور میں اسے جنگل میں لے گیا۔ پھر میں نے دیکھا کہ یہ کام کا آدمی نہیں ہے۔ چنانچہ میں نے بہتر سمجھا کہ ایک اور... جو ذرا زیادہ کام کا ہو، پکڑ لاؤں۔"

"دیکھا؟ پکا بدمعاش ہے؟ بالکل پکا بدمعاش!" دینی سوف نے ایسول سے کہا۔ "تم پہلے کو کیوں نہ لائے؟"

''اسے لانے کا فائدہ کیا تھا؟'' تیخون نے غصے سے کھولتے ہوئے جھٹ پٹ بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''اس سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ آپ کا خیال ہے مجھے پتا نہیں کہ آپ کو کیا چاہیے؟''

''کیسا دھونسیا ہے!... خیر؟''

''میں دوسرے کی تلاش میں نکل گیا۔'' تیخون نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں اس طرح جنگل میں رینگتا چلا گیا اور پھر نیچے لیٹ گیا۔'' اور یہ دکھانے کے لیے کہ اس نے یہ سب کچھ کیسے کیا تھا، وہ یک دم پھرتی اور صفائی سے زمین پر لیٹ گیا۔ ''ایک ادھر آ نکلا اور میں نے اس پر جھپٹا مار دیا — اس طرح۔'' اور تیخون نے چشم زدن میں چھلانگ لگائی اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''میں کہتا ہوں: 'کرنل کے پاس چلو۔' وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر چیخیں مارنے لگتا ہے اور اچانک وہاں چار اور آ جاتے ہیں۔ وہ اپنی تلواریں سونت لیتے ہیں اور تیزی سے میری طرف بڑھتے ہیں۔ چنانچہ میں کلہاڑی پکڑتا ہوں اور ان پر اس طرح جھپٹتا ہوں۔ 'کیا ارادے ہیں؟' میں پوچھتا ہوں۔ یسوع، آپ مدد کرے۔ کافی ہو گئی ہے!'' تیخون نے با آواز بلند کہا۔ اس نے اپنی چھاتی آگے بڑھائی اور تہدیدی انداز سے ناک بھوں چڑھانے لگا۔

''ارے ہاں، ہم نے تمھیں پہاڑی سے پانی کے گڑھوں میں چھلانگیں مار کر بھاگتے دیکھا تھا،'' ایسول نے اپنی جگمگاتی آنکھیں سکیڑتے ہوئے کہا۔

پیتیا کا زور زور سے ہنسنے کو جی چاہتا تھا لیکن اس نے دیکھا کہ دوسروں نے قہقہہ لگانے سے گریز کیا ہے، چنانچہ وہ بھی چپ رہا۔ وہ تیزی سے کبھی تیخون، کبھی ایسول اور کبھی دینی سوف کے چہرے کو تکنے لگتا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا کہ یہ سب کیا ہے۔

''احمق مت بنو!'' دینی سوف نے غصے سے کھانستے ہوئے کہا۔ ''تم پہلے کیوں نہ آئے؟''

تیخون ایک ہاتھ سے اپنی کمر اور دوسرے سے اپنا سر کھجانے لگا، اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چہرہ دمکنے اور اس پر احمقانہ مسکراہٹ پھیلنے لگی۔ اس کا منہ کھل گیا اور سامنے ایک شگاف، جو ایک دانت نکل جانے کی وجہ سے بن گیا تھا، ظاہر ہو گیا (یہی وجہ ہے کہ اسے شرباتی — 'بوڑا' — کہا جاتا تھا)۔ دینی سوف مسکرانے لگا اور پیتیا خوش دلی سے کھلکھلا کر ہنسنے لگا۔ خود تیخون بھی اس ہنسی میں شامل ہو گیا۔

''لیکن وہ کسی کام کا نہ تھا،'' تیخون نے کہا۔ ''اس کے کپڑے — بالکل ہی گئے گزرے تھے! میں اسے کیسے لا سکتا تھا؟ یوئر آنر، پھر وہ بدتمیز بھی بہت تھا۔ 'معلوم ہے' وہ کہتا ہے، 'میں خود جرنیل کا بیٹا ہوں' میں نہیں جاؤں گا، وہ کہتا ہے۔''

''تم بالکل وحشی ہو!'' دینی سوف نے کہا۔ ''میں اس سے کچھ پوچھنا —''

''مگر میں نے اس سے سوال جواب کیے تھے،'' تیخون نے کہا۔ ''وہ کہتا ہے۔ مجھے کوئی خاص پتا نہیں ہے۔ ہماری تعداد تو بہت زیادہ ہے، وہ کہتا ہے۔ 'لیکن بیشتر لوگ نکمے ہیں — اصلی فوجی نہیں ہیں۔' وہ کہتا ہے۔ 'ان کے

سامنے ذرا زور سے چلاؤ' وہ کہتا ہے، 'اور تم ان سب کو پکڑ لو گے۔'' تیخون نے شگفتگی اور بے باکی سے دینی سوف کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔

''جب تمھیں بے بھاؤ کی پڑیں گی۔ تمھیں سبق مل جائے گا کہ احمقانہ حرکتیں کرنے کا نتیجہ کیا ہوتا ہے!'' دینی سوف نے بیدردی سے کہا۔

''مگر آپ اس قدر بگڑ کیوں رہے ہیں؟'' تیخون نے احتجاج کیا۔ ''جیسے میں نے آپ کے یہ فرانسیسی کبھی دیکھے ہی نہیں! ذرا اندھیرا چھا لینے دیں، پھر دیکھیں۔ آپ کو جو کچھ چاہیے، میں لے آؤں گا۔ اگر آپ چاہیں، میں تین بھی لا سکتا ہوں۔''

''اچھا، آؤ چلیں۔'' دینی سوف نے کہا۔ رکھوالے کے جھونپڑے تک وہ سارا راستہ منہ بند کیے رہا اور ناک بھوں چڑھاتا رہا۔

تیخون پیدل ہی ان کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ پیتیا نے قازقوں کو بوٹوں کی ایک جوڑی کے متعلق، جو اس نے جھاڑیوں میں پھینک دی تھی، اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور اس کا مضحکہ اڑاتے سنا۔

تیخون کی کہانی سن کر اور اس کی مسکراہٹ دیکھ کر پیتیا پر جو ہنسی کا دورہ پڑا تھا، جب وہ اس سے سنبھلا، اچانک کوندے کی طرح اس کے ذہن میں یہ خیال لپکا کہ تیخون نے آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا اور اس پر اس کی طبیعت منغض ہونے لگی۔ اس نے مڑ کر طفل نما قیدی طبلچی کی طرف دیکھا اور اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ تاہم اس کی یہ کیفیت محض لمحاتی تھی۔ اس نے یہ ضروری سمجھا کہ وہ اپنا سر اٹھا کر چلے، اپنا حوصلہ قائم رکھے اور آئندہ روز کی جھڑپ کے بارے میں ایسول سے اہم آدمی کے انداز سے سوال و جواب کرے تاکہ اسے ان لوگوں کے سامنے، جن کے مابین وہ اپنے آپ کو پا رہا تھا، کھسیانا نہ ہونا پڑے۔

جس افسر کو دلوخوف کا اتا پتا معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، وہ یہ خبر لے کر آیا کہ دلوخوف بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور عنقریب ان سے آملے گا۔

دینی سوف کا چہرہ فی الفور کھل اٹھا۔ پھر اس نے پیتیا کو اپنے پاس بلایا۔

''ادھر آؤ اور مجھے اپنے بارے میں بتاؤ'' اس نے کہا۔

7

اپنے والدین کی ماسکو سے روانگی کے بعد پیتیا نے ان سے رخصت لی اور اپنی رجمنٹ میں جا شامل ہوا۔ کوئی زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ایک جرنیل نے، جو خاصے بڑے گوریلا دستے[12] کا کمانڈر تھا، اسے اپنا اردلی افسر مقرر کر لیا۔ جب سے اسے کمشن ملا تھا، خاص طور پر جب سے وہ فعال فوج میں شامل ہوا اور دیازما کی لڑائی میں شریک ہوا تھا، اس پر مسلسل وجد کی کیفیت طاری رہنے لگی تھی کہ وہ جوان ہو گیا ہے اور وفور مسرت سے اسے ہر دم یہ شوق لگا رہتا تھا

کہ حقیقی رستمی کا کارنامہ سرانجام دینے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس نے فوج میں جو کچھ دیکھا اور اسے جو تجربہ حاصل ہوا، اس پر وہ بے پناہ خوش تھا لیکن اس کے ساتھ اسے ہمیشہ خلش رہی کہ انتہائی جرأت اور سرفروشی کے کارنامے وہاں سرانجام دیے جاتے ہیں جہاں اتفاق سے وہ خود موجود نہیں ہوتا، اور جہاں وہ نہیں ہوتا تھا، وہاں پہنچنے کی کی اسے ہمیشہ جلدی ہوتی تھی۔

اکیس اکتوبر کو جب اس کے جرنیل نے کسی شخص کو دینی سوف کے پاس بھیجنے کی خواہش کا اظہار کیا، پیتا نے اتنے دلدوز انداز سے جانے کی التجا کی کہ جرنیل انکار نہ کر سکا۔ لیکن جب وہ پیتا کو رخصت کر رہا تھا، اسے ویازما میں اس کا احمقانہ طرز عمل یاد آ گیا۔ اسے جہاں بھیجا گیا تھا، وہاں پہنچنے کے لیے بجائے اس کے کہ وہ سڑک کے ساتھ ساتھ جاتا، وہ سرپٹ گھوڑا دوڑاتا میدان جنگ میں عین وہاں پہنچ گیا جہاں فرانسیسیوں کی فائرنگ ہو رہی تھی اور وہاں اس نے پستول سے دو گولیاں بھی داغ دیں۔ اس واقعے کو دھیان میں رکھتے ہوئے جرنیل نے پیتا کو واضح الفاظ میں حکم دیا کہ دینی سوف خواہ کیسی ہی جھڑپ کے منصوبے بنائے، اس نے اس میں شریک نہیں ہونا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جب دینی سوف نے اس سے پوچھا تھا کہ وہ ٹھہر سکتا ہے تو شرمندگی کے احساس سے اس کا رنگ لالوں لال ہو گیا تھا اور وہ ذہنی طور پر پریشان ہو گیا تھا۔ جب تک پیتا جنگل کے کنارے تک نہیں پہنچا تھا، اس کا ارادہ یہی تھا کہ وہ جرنیل کی ہدایات پر لفظاً اور معناً عمل کرے گا اور فوراً واپس آ جائے گا۔ مگر جب اس نے فرانسیسیوں کو دیکھا، تیخون سے ملا اور اسے معلوم ہوا کہ اس رات یقیناً حملہ ہوگا، اس نے اسی جلد بازی سے، جس سے نوجوان اپنے فیصلے تبدیل کر لیتے ہیں، تہیہ کر لیا کہ اس کا جرنیل، جس کا وہ اب تک احترام کیا کرتا تھا، واہیات جرمن ہے، اصل ہیرو دینی سوف ہے، ایسول اور تیخون بھی ہیرو ہیں اور یہ کہ اگر اس نازک گھڑی میں وہ ان کا ساتھ چھوڑ گیا، تو یہ بڑی شرمناک حرکت ہوگی۔

جب دینی سوف، پیتا اور ایسول گھوڑوں پر رکھوالے کے جھونپڑے میں پہنچے، اندھیر چھانے لگا تھا۔ جُھٹ پُٹ کی مدھم روشنی میں گھوڑے، جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں، قازق اور ہوزار نظر آ رہے تھے۔ قازقوں اور ہوزاروں نے جنگل کے بیچ کھلے میدان میں کام چلاؤ پناہ گاہیں کھڑی کر لی تھیں اور اب وہ جنگل کی گھاٹی میں، جہاں سے فرانسیسیوں کو دھواں نظر نہیں آ سکتا تھا، الاؤ دہکا رہے تھے۔ تنگ جھونپڑے کے دروازے پر ایک قازق اپنی آستینیں چڑھائے بھیڑ کا گوشت کاٹ رہا تھا۔ جھونپڑے کے اندر تین افسر کواڑ کی میز بنا رہے تھے۔ پیتا نے اپنے گیلے کپڑے اتارے، خشک کرنے کے لیے انھیں اپنے قازق کے حوالے کیا اور جھٹ پٹ ڈنر ٹیبل لگانے میں افسروں کا ہاتھ بٹانے لگا۔

دس منٹ میں میز تیار ہو گئی اور اس پر کپڑا بچھا دیا گیا۔ میز پر ووڈکا، رم کی بوتل، سفید ڈبل روٹی، بُھنا ہوا گوشت اور نمک رکھ دیا گیا۔ افسروں کے ساتھ میز پر بیٹھ کر اور اپنی چکنی انگلیوں سے لذیذ چربیائے گوشت کو توڑتے ہوئے پیتا مسرت کے ساتویں آسمان پر پہنچ چکا تھا۔ اس کے دل میں سب انسانوں کے لیے بچگانہ محبت کا چشمہ پھوٹ پڑا

تھا اور نتیجتاً اسے یقین ہو گیا کہ دوسرے بھی اس کے ساتھ اسی قسم کا پیار کرتے ہیں۔

''واسیلی دمیترچ، اگر میں آپ کے ساتھ مزید ایک روز ٹھہر جاؤں،'' اس نے دینی سوف سے کہا، ''تو کوئی خاص ہرج تو نہیں ہو گا؟ آپ کا کیا خیال ہے؟ یا ہو گا؟'' اور اس کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگا: ''آپ کو معلوم ہے کہ مجھے حکم دیا گیا تھا کہ میں پتا لگاؤں اور میں پتا لگا رہا ہوں ـــ صرف اتنی مہربانی فرمائیں کہ مجھے عین ـــ اصل ـــ مجھے انعام وغیرہ کی کوئی پروا نہیں ـــ میں صرف یہ چاہتا ہوں ـــ''

پیتا نے اپنے دانت بھینچے، سر پچھلی جانب جھکایا، بازو لہرایا اور اپنے گرد و پیش نظر دوڑائی۔

''اصل چیز...'' دینی سوف نے مسکراتے ہوئے اس کے الفاظ دہرائے۔

''مجھے کسی چیز کی مطلق کمان دے دیں تاکہ میں واقعی... کمان کر سکوں۔'' پیتا نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کے لیے اس سے کیا فرق پڑے گا؟... ارے، آپ کو چاقو چاہیے؟'' اس نے ایک افسر کی طرف، جو گوشت کا قتلہ کاٹنے کی کوشش کر رہا تھا، متوجہ ہو کر کہا۔

اس نے اسے اپنا جیبی چاقو دے دیا۔ افسر کو چاقو پسند آیا اور اس نے اس کی تحسین کی۔

''اسے اپنے پاس رکھ لیں۔ میرے پاس اس جیسے اور بہت ہیں۔'' پیتا نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''اف خدایا! میں تو بھول ہی گیا تھا۔'' اس نے ایک دم چلا کر کہا۔ ''میرے پاس بہت عمدہ منقیٰ ہے ـــ دانے کے بغیر کشمش۔ ہمارے ہاں نئے آدمی نے کنٹین کا دھندا سنبھالا ہے ـــ اس کے پاس اس قسم کی اعلیٰ ترین اشیا ہوتی ہیں۔ اس سے میں نے دس پاؤنڈ منقیٰ خریدا تھا۔ مجھے میٹھی چیزیں بہت پسند ہیں۔ آپ کو چاہیے؟''

پیتا بھاگتا بھاگتا باہر ''گلی'' میں اپنے قازق کے پاس گیا اور چند تھیلیاں اٹھا لایا۔ ان میں تقریباً پانچ پاؤنڈ منقیٰ تھا۔

''حضرات، شوق فرمائیں۔ کچھ نہ کچھ تو ضرور لیں۔ آپ کو کافی پاٹ تو نہیں چاہیے؟'' اس نے ایسول سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ''میں نے اپنی کنٹین سے خریدا تھا۔ بہت بڑھیا ہے۔ اس کے مالک کے پاس نہایت عمدہ اشیا ہوتی ہیں اور وہ بہت دیانت دار ہے اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ میں یقیناً آپ کو بھیج دوں گا۔ شاید آپ کے چقماق ٹھیک کام نہیں کر رہے، شاید وہ گھس گھس کر اپنی افادیت کھو بیٹھے ہیں ـــ کبھی کبھی ایسا ہو ہی جاتا ہے۔ میں اپنے ساتھ چند ایک لایا ہوں۔ یہ رہے وہ ـــ'' اور اس نے انھیں ایک بیگ دکھایا۔ ''اس میں سو چقماق ہیں۔ بہت سستے مل گئے تھے۔ جتنے جی چاہے، لے لیں اور اگر پسند آئیں تو بے شک سارے ہی رکھ لیں...''

اچانک پیتا کو یہ سوچ کر پریشانی ہونے لگی کہ اس کی زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔ وہ چپ ہو گیا اور شرم سے اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہونے لگی۔

اس نے سوچنے کی کوشش کی کہ کہیں اس سے کوئی اور حماقت تو سرزد نہیں ہوئی اور دن بھر کے واقعات یاد کرنے کے بعد اس کے ذہن میں فرانسیسی طبلچی لڑکے کا خیال آیا۔

''ہم سب تو یہاں خوب مزے میں ہیں، مگر اس کا کیا بنا؟ انھوں نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے؟ کیا انھوں نے اسے کچھ کھانے کو دیا ہے؟ کیا انھوں نے اس کے ساتھ برا سلوک کیا ہے؟'' وہ یہ سب کچھ جاننا چاہتا تھا مگر چھماقوں کے متعلق اتنا کچھ کہنے کے بعد اس کی زبان کو تالا لگ گیا تھا اور اب اسے بات کرتے خوف آ رہا تھا۔

''پوچھنے کو تو میں پوچھ ہی لوں،'' اس نے سوچا،''لیکن یہ کہیں گے: 'چونکہ یہ خود لڑکا ہے' اس لیے دوسرے لڑکے پر ترس کھا رہا ہے، کل میں انھیں دکھا دوں گا کہ میں بالک ہوں یا... پتا نہیں اگر میں پوچھ بیٹھا تو مجھے کوئی شرمندگی تو نہیں ہوگی؟'' پیتیا نے سوچا۔''خیر مجھے کوئی پروا نہیں۔'' اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا اور اس پر خوف و دہشت نے غلبہ پا لیا۔ وہ افسروں کے چہروں پر طنز کے آثار تلاش کرنے لگا اور آخر کار اضطراری طور پر اس کی زبان کھل ہی گئی۔

''میں قیدی لڑکے کو بلا لاؤں... اور اسے کچھ کھانے کو دے دوں... شاید...؟'' اس نے کہا۔

''ہاں، ہاں، کیوں نہیں؟ بیچارہ چھوٹا سا تو ہے،'' دینی سوف نے کہا۔ بظاہر اسے اس یاددہانی میں کوئی شرم ناک بات نظر نہ آئی۔''اس کا نام ونساں بوسے ہے۔ اسے بلوا لو۔''

''میں جاتا ہوں،'' پیتیا نے کہا۔

''ہاں ہاں، بے چارہ چھوٹا سا تو ہے،'' دینی سوف نے دوبارہ کہا۔

جب دینی سوف نے یہ الفاظ کہے، پیتیا دروازے میں کھڑا تھا۔ وہ افسروں کے بیچ میں سے کھسکتا کھسکتا دینی سوف کے بالکل قریب پہنچ گیا۔

''بڑے بھائی، آپ کی اس عنایت کے لیے مجھے آپ سے گلے ملنا چاہیے!'' اس نے با آواز بلند کہا۔''اوہ، آپ کتنے اچھے ہیں، کتنے مہربان ہیں!''

اور دینی سوف سے معانقہ کرنے کے بعد وہ باہر صحن کی طرف بھاگ گیا۔

''بوسے! ونساں!'' وہ دروازے کے قریب کھڑے ہو کر چلایا۔

''جناب، کیا چاہیے؟'' کسی کی اندھیرے میں آواز سنائی دی۔

پیتیا نے جواب دیا کہ اسے وہ فرانسیسی لڑکا چاہیے جسے اس روز قیدی بنایا گیا تھا۔

''اخاہ، ویسینی؟'' کسی کی اندھیرے میں آواز سنائی دی۔

لڑکے کے نام ونساں کو قازق ازیں پیشتر ہی ویسینی اور کسان سپاہی ویسینایا[13] میں تبدیل کر چکے تھے۔ ان دونوں ناموں سے بہار اور تر و تازگی کا تاثر ابھرتا تھا اور یہ نوخیز لڑکے کی شکل و صورت پر صادق آتا تھا۔

''وہ یہاں الاؤ کے پاس آگ تاپ رہا ہے۔ ویسینایا... ویسینی!'' تاریکی میں ان کی آوازیں آگے پیچھے گونج رہی تھیں اور وہ بھی ہنس رہے تھے۔

''بڑا تیز لونڈا ہے۔'' ایک ہوزار نے کہا جو پیتیا کے قریب کھڑا تھا۔''کچھ دیر ہوئی ہم نے اسے کچھ کھانے کو دیا تھا۔ بھوک سے اس کا برا حال تھا۔''

اندھیرے میں قدموں کی چاپ سنائی دی اور طبلچی لڑکا دروازے کی طرف آتا دکھائی دیا۔ اس کے ننگے پاؤں کیچڑ کے چھینٹے اڑا رہے تھے۔

"Ah, C'st vous!"* پیتا نے کہا۔

"Voulez-vous manger? N'ayez pas peur, on ne vous fera pas de mal,"**

اس نے لڑکے کے ہاتھ پر پیار سے ہاتھ رکھتے اور شرماتے ہوئے مزید کہا۔ "Entrez, entrez,"***

"Merci, monsieur"**** طبلچی لڑکے نے کپکپاتی، تقریباً بچگانہ آواز میں کہا اور وہ دروازے کی چوکھٹ پر اپنے کیچڑ آلود پاؤں صاف کرنے لگا۔

پیتا طبلچی لڑکے سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس میں اس کی جرأت نہیں تھی۔ وہ اس کے قریب دروازے کے اندر متذبذب کھڑا تھا۔ پھر اس نے اندھیرے میں لڑکے کا ہاتھ پکڑا اور اسے دبانے لگا۔

''اندر آجاؤ، اندر آجاؤ'' اس نے نرمی سے کانا پھوسی کرتے ہوئے کہا۔

''اف، سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کے لیے کیا کروں!'' پیتا نے سوچا اور اس نے دروازہ کھولتے ہوئے لڑکے کو پہلے اندر جانے دیا۔

جب طبلچی لڑکا جھونپڑے میں پہنچ گیا، پیتا اس سے کچھ فاصلے پر بیٹھ گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس پر زیادہ توجہ دینا وقار کے منافی ہوگا لیکن اس کی جیب میں جو رقم تھا، وہ اس پر اپنی انگلیاں پھیرتا رہا اور سوچتا رہا کہ یہ لڑکے کو دینا باعث شرم تو نہیں ہوگا۔

8

دینی سوف کے حکم پر طبلچی لڑکے کو کچھ ووڈکا اور بھنا ہوا گوشت دے دیا گیا۔ اس کے بعد اسے روسی کوٹ پہنا دیا گیا تا کہ اسے دوسرے قیدیوں کے پاس بھیجنے کی بجائے اپنی ٹولی میں رکھا جا سکے۔ دریں اثنا دلوخوف پہنچ گیا اور پیتا کی توجہ طبلچی لڑکے سے دوسری طرف مبذول ہو گئی۔

پیتا دلوخوف کی روسی فوج میں غیر معمولی شجاعت اور فرانسیسیوں کے ساتھ اس کے سفاکانہ رویے کی بے شمار کہانیاں سن چکا تھا۔ چنانچہ جونہی دلوخوف جھونپڑے میں داخل ہوا، اس کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں اور وہ انھیں دوسری طرف ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم وہ تن کر سیدھا بیٹھا رہا اور کچھ اس قسم کا پوز بنانے لگا جیسے وہ خود بھی دلیری میں کسی سے کم نہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ اس لیے کر رہا تھا تا کہ وہ یہ ظاہر کر سکے کہ وہ دلوخوف جیسے شخص کی

---

* تم آگئے!

** کچھ کھانے کو چاہیے؟ ڈرو مت، وہ تمھیں کچھ نہیں کہیں گے۔

*** اندر آجاؤ، اندر آجاؤ۔

**** شکریہ، موسیو۔

صحبت میں بیٹھنے کے لیے ناموزوں شخص نہیں۔

پتیا دلوخوف کی سادہ وضع قطع دیکھ کر ششدر رہ گیا۔

دینی سوف قازقوں کے کوٹ میں ملبوس تھا۔ وہ باریش تھا اور اس کے سینے پر کراماتی سینٹ نکولا کا ایقونہ آویزاں تھا۔ اس کے رویے اور گفتگو کے انداز سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ غیر معمولی حیثیت کا آدمی ہے۔ لیکن دلوخوف، جو ماسکو میں اپنے جسم پر ایرانی ملبوسات کی نمائش کیا کرتا تھا، اب اپنی شکل وصورت سے گارڈز کا انتہائی فرض شناس اور پابند شعار شخص دکھائی پڑتا تھا۔ اس کی داڑھی مونچھ بالکل صفاچٹ تھیں۔ وہ گارڈز کا کوٹ، جس کے اندر اون بھری ہوئی تھی، پہنے ہوئے تھا۔ اس کے کاج میں آرڈر آف سینٹ جارج (تمغہ) آویزاں تھا۔ اس کے سر پر عام فوجی ٹوپی سیدھی رکھی ہوئی تھی۔ اس نے اپنا پشمینے کا اوورکوٹ کمرے کے ایک کونے میں اتارا، کسی شخص سے علیک سلیک کیے بغیر سیدھا دینی سوف کے پاس گیا اور اس سے زیرِ تجویز مسئلے کے بارے میں سوال جواب کرنے لگا۔

دینی سوف نے اسے باربرداری کے قافلے، بڑے فوجی دستوں کے عزائم، پتیا کی وساطت سے موصول شدہ پیغام اور دونوں جرنیلوں کے نام اپنے جوابات کے بارے میں اسے مطلع کیا۔ اس کے بعد اس نے اسے ان معلومات سے آگاہ کیا جو اسے فرانسیسی قافلے کے متعلق حاصل ہو سکی تھیں۔

"یہ تو سب ٹھیک ہے لیکن ہمیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ ان کے ساتھ کس قسم کی فوج ہے اور اس کی تعداد کتنی ہے،" دلوخوف نے کہا۔ "ہمیں جا کر دیکھنا ہوگا۔ ان کی تعداد معلوم کیے بغیر ہم کسی قسم کی کارروائی کا آغاز نہیں کر سکتے۔ میں ہر کام مناسب طریقے سے کرنا چاہتا ہوں۔ آپ حضرات میں سے کوئی شخص میرے ساتھ گھوڑے پر فرانسیسی پڑاؤ میں جانا چاہے گا؟ میں فالتو وردی لایا ہوں۔"

"میں—میں—میں آپ کے ساتھ چلوں گا!" پتیا نے چلا کر کہا۔

"تمھارے جانے کی کوئی خاص ضرورت تو نہیں ہے،" دینی سوف نے دلوخوف سے مخاطب ہو کر کہا۔ "اور جہاں تک اس کا تعلق ہے، اسے تو میں کسی قیمت پر بھی جانے نہیں دوں گا۔"

"میں تو جانا چاہوں گا!" پتیا نے احتجاج کیا۔ "میں کیوں نہ جاؤں؟"

"کیونکہ اس کی کوئی وجہ نہیں۔"

"میرا خیال ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گے کیونکہ... کیونکہ... میں جا رہا ہوں، بس قصہ ختم۔ آپ مجھے اپنے ساتھ لے چلیں گے نا؟" اس نے دلوخوف کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔

"کیوں نہیں؟" دلوخوف نے بے دھیانی سے جواب دیا۔ وہ دراصل طبلچی لڑکے کا چہرہ غور سے دیکھنے میں محو تھا۔

"یہ لونڈا بہت دنوں سے تمھارے پاس ہے؟" اس نے دینی سوف سے پوچھا۔

"یہ آج ہی پکڑا گیا تھا، لیکن اسے کچھ معلوم نہیں ہے۔ اسے میں اپنے پاس ہی ٹھہرا رہا ہوں۔"

"اوہ، اور باقیوں کا کیا کرتے ہو؟" دلوخوف نے دریافت کیا۔

''باقیوں کا کیا کرتا ہوں؟ انھیں حکام بالا کے پاس بھیج دیتا ہوں اور رسید لے لیتا ہوں!'' دینی سوف نے اچانک تمتماتے ہوئے کہا۔ ''میں پورے اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرے ضمیر پر کسی قسم کا بوجھ نہیں کیونکہ میرے ہاتھ ایک بھی آدمی کے خون سے رنگین نہیں ہوئے۔ فوجی کی حیثیت سے اپنی عزت کو داغدار ــ میں ذرا صاف گوئی سے کام لے رہا ہوں ــ داغدار بنانے کے بجائے کیا یہ بہتر نہیں کہ آپ حفاظتی دستے کی تحویل میں تیس قیدی شہر بھیج دیں؟ بلکہ اگر تین سو بھی ہوں تو بھی کیا مشکل ہے؟''

''ضمیر و میر کی باتیں اگر یہ سولہ سالہ چھوکرا کاؤنٹ کرے تو اسے زیب دیں گی،'' دلوخوف نے سردمہر حقارت سے کہا۔ ''لیکن اب وقت آگیا ہے کہ ان تم طور طریقوں پر لعنت بھیج دو۔''

''یہ میرا نام بیچ میں کیوں آگیا؟ میں نے تو کچھ بھی نہیں کہا تھا، صرف اتنا عرض کیا تھا کہ میں لازماً آپ کے ساتھ چلوں گا،'' پیتیا نے شرماتے شرماتے کہا۔

''دوست، میں اور تم اتنا کچھ دیکھ چکے ہیں کہ اب ہمیں اس قسم کی خوش اخلاقیوں کا مظاہرہ کرنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں،'' دلوخوف جان بوجھ کر ایک ایسے موضوع پر، جس کے متعلق اسے معلوم تھا کہ دینی سوف اس کے ذکر پر تلملائے گا، باتیں کیے جا رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس میں خاص لطف آرہا ہے۔ ''بھلا یہ تو بتاؤ کہ تم نے یہ لونڈا کیوں رکھ چھوڑا ہے؟'' اس نے اپنے سر کو ناپسندیدگی کے انداز سے جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے نا کہ اسے دیکھ کر تمھیں ترس آتا ہے؟ ہمیں تمھاری ان 'رسیدوں' کا پتا ہے۔ ''تم سو آدمی بھیجتے ہو اور وہاں صرف تیس پہنچتے ہیں۔ باقی راستے میں یا تو بھوک سے مر جاتے ہیں یا ہلاک کر دیے جاتے ہیں۔ تو پھر کیا یہ بہتر نہیں کہ انھیں یہیں ٹھکانے لگا دیا جائے؟''

ایسول نے اپنی ہلکی رنگت کی آنکھیں بھینچتے ہوئے پسندیدگی کا اظہار کیا۔

''اصل نکتہ یہ نہیں ہے۔ یہاں اس بارے میں کوئی بحث نہیں ہو سکتی۔ میں ان کے خون کو اپنے ضمیر کا بوجھ نہیں بنانا چاہتا۔ تم کہتے ہو کہ وہ راستے میں مر جاتے ہیں۔ بہت اچھا۔ لیکن ان کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا۔''

دلوخوف ہنس پڑا۔ ''تمھارا خیال ہے وہ مجھے یا تمھیں یونہی چھوڑ دیں گے؟ انھیں بیس سے زیادہ مرتبہ مجھے پکڑنے یا ہلاک کرنے کا حکم دیا جا چکا ہے۔ اگر وہ مجھے ــ یا تمھیں بھی ــ پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو وہ تمھارے تمام تر شجاعانہ رویے کے باوجود بلا توقف ہمیں قریب ترین درخت پر لٹکا دیں گے۔'' وہ رک گیا۔ ''خیر، چھوڑو، ہمیں اپنا کام شروع کر دینا چاہیے۔ میرے قازق سے کہو کہ وہ میرا اگھوڑا اٹھا لائے۔ میرے پاس دو فرانسیسی وردیاں ہیں۔ اچھا، تو تم میرے ساتھ آرہے ہو؟'' اس نے پیتیا سے پوچھا۔

''میں؟ بالکل، بالکل۔ یقیناً۔'' پیتیا نے دینی سوف کی طرف دیکھتے ہوئے با آواز بلند کہا۔ اس کا چہرہ تمتمانے لگا اور اس کے قریب قریب آنسو نکل آئے۔

جب دلوخوف قیدیوں کو ٹھکانے لگانے کے بارے میں دینی سوف سے چخ چخ کر رہا تھا، پیتیا کو پھر وہی بے چینی

اور بے کلی محسوس ہونے لگی تھی۔ ایک بار پھر اسے واضح طور پر سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان کی گفتگو کا موضوع کیا ہے۔
''اگر بالغ، عاقل اور مشہور لوگ اس طرح سوچتے ہیں، پھر وہ ٹھیک ہی سوچتے ہوں گے، ٹھیک ہی سوچتے ہوں گے،'' اس نے سوچا۔ ''لیکن سب سے بڑی بات یہ ہے کہ دینی سوف کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں بیٹھنا چاہیے کہ میں اس کا ماتحت ہوں اور وہ جس طرح چاہے، مجھے حکم دے سکتا ہے۔ میں دلوخوف کے ساتھ لازماً فرانسیسی کیمپ میں جاؤں گا۔ اگر وہ جا سکتا ہے، تو میں بھی جا سکتا ہوں!''

دینی سوف نے پیتیا کو ہر ممکن طریقے سے روکنے کی کوشش کی لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ کوئی کام انکل پچّو نہیں کرتا بلکہ خوب سمجھ کر اور صحیح طریقے سے کرتا ہے اور اس نے ذاتی خطرے کی کبھی پروا نہیں کی۔

''کیونکہ یہ بات تو آپ بھی مانیں گے کہ اگر ہمیں یقین سے یہ معلوم نہ ہو کہ ان کی صحیح صحیح تعداد کیا ہے تو ہمیں شاید سینکڑوں جانوں کی قربانی دینا پڑے اور ہم تو صرف دو ہیں۔ علاوہ ازیں میرا جانے کو بہت جی چاہتا ہے اور میں یقیناً جاؤں گا، چنانچہ مجھے روکنے کی کوشش نہ کریں،'' اس نے کہا۔ ''اس سے صورت حال بگڑے گی ہی...''

9

فرانسیسی اوورکوٹ اور شاکو پہننے کے بعد پیتیا اور دلوخوف گھوڑوں پر سوار ہوئے اور جنگل کے اس حصے کی طرف چل پڑے، جو درختوں سے خالی تھا اور جہاں سے دینی سوف نے فرانسیسی پڑاؤ کا جائزہ لیا تھا۔ انھوں نے گھپ اندھیرے میں جنگل عبور کیا اور ایک گھاٹی میں اتر گئے۔ جب وہ پہاڑی کے دامن میں پہنچے، دلوخوف نے قازقوں کو، جو ان کے ساتھ آ رہے تھے، وہیں انتظار کرنے کا حکم دیا اور خاصی تیز رفتار سے سڑک کے ساتھ ساتھ پل کی جانب چل پڑا۔ پیتیا، جس کا دل بلّیوں اچھل رہا تھا، اس کے برابر برابر آ رہا تھا۔

اگر ہم پکڑے گئے، میں زندہ ان کے ہاتھ نہیں آؤں گا۔ میرے پاس پستول ہے۔'' پیتیا نے سرگوشی کی۔

''روسی مت بولو،'' دلوخوف نے بہ عجلت زیر لب کہا اور انھیں اسی لمحے للکار "Qui vive"* اور ساتھ ہی دستی بندوق کی ٹک سنائی دی۔

پیتیا بدحواس ہو گیا اور اس نے اپنے پستول کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"Lanciers du 6 -me,"** دلوخوف نے جواب دیا۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار نہ تیز کی اور نہ ہلکی۔

تاریکی میں پل پر سنتری کا دھندلا سایہ دکھائی دیا۔

"Mot d'ordre?"***

---

* کون ہے؟

** چھٹی رجمنٹ کے نیزہ بردار سوار

*** پاس ورڈ (وہ لفظ جو فوج اور بعض دوسرے اداروں میں اپنے آدمیوں کی شناخت کے لیے مقرر کر لیا جاتا ہے۔)

دلوخوف نے گھوڑے کی لگام کھینچ لی اور خراماں خراماں آگے بڑھا۔

"Dites donc, le Colonel Gerard est ici?"* اس نے پوچھا۔

"Mot d' ordre?" سنتری نے جواب دیے بغیر راستہ روکتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

"Quand un officier fait sa ronde, les sentinelles ne demandent pas le mot d' ordre..."**

دلوخوف نے اچانک لال پیلے ہوتے اور سیدھے سنتری پر چڑھائی کرتے ہوئے کہا۔

اور سنتری کے، جو ایک طرف ہٹ گیا تھا، جواب کا انتظار کیے بغیر وہ خراماں خراماں پہاڑی پر چڑھ گیا۔

اندھیرے میں کسی آدمی کی دھندلی شکل کو سڑک پار کرتے دیکھ کر دلوخوف نے اسے روک لیا اور اس سے پوچھنے لگا کہ کمانڈر اور افسران کہاں ہیں۔ یہ شخص عام سپاہی تھا اور کندھے پر بوری اٹھائے جا رہا تھا۔ وہ رکا، دلوخوف کے گھوڑے کے قریب آیا، اس نے دوستانہ انداز سے گھوڑے کو تھپکی دی اور سیدھے سادے انداز سے بتانے لگا کہ کمانڈر اور افسران دائیں طرف ذرا اور اونچائی پر فارم (فارم سے اس کی مراد گاؤں کے زمیندار کا مکان تھا) کے صحن میں ہیں۔

سڑک کے ساتھ ساتھ، جس کے دونوں اطراف الاؤوں کے اردگرد فرانسیسیوں کی گفتگوئیں سنی جا سکتی تھیں، مزید آگے چلتے ہوئے دلوخوف زمیندار کے مکان کے صحن کی جانب مڑ گیا۔ اس نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے گیٹ پار کیا، صحن میں پہنچ کر نیچے اترا اور بہت بڑے دہکتے الاؤ کے پاس پہنچا، جس کے اردگرد متعدد اشخاص بیٹھے تھے اور زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ آگ کے کنارے دیگچے میں کچھ ابل رہا تھا اور ایک سپاہی، جس کے سر پر چھجے دار ٹوپی اور جسم پر نیلا کوٹ تھا، اس کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ آگ کی روشنی میں اس کی شکل واضح طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ وہ دیگچے میں ram rod[14] پھیر رہا تھا۔

"وہ بہت کڈھب آدمی ہے۔ اس سے کچھ اگلوانا بہت دشوار کام ہے،" ایک افسر، جو آگ کی دوسری جانب تاریکی میں بیٹھا ہوا تھا، کہہ رہا تھا۔

"وہ انھیں جل دے کر نکل آئے گا!" دوسرے نے ہنستے ہوئے کہا۔

انھیں جب دلوخوف اور پیتیا کے قدموں کی چاپ سنائی دی، وہ دونوں خاموش ہو گئے اور اندھیرے میں جھانک جھانک کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔ دلوخوف اور پیتیا گھوڑوں کی لگامیں تھامے آگ کی جانب آ رہے تھے۔

"Bonjour, messieurs!"*** دلوخوف نے صاف اور کھنک دار آواز میں کہا۔

---

* یہ بتاؤ، کرنل بیغاغ یہیں ہیں؟

** جب افراد راؤنڈ پر نکلتے ہیں، سنتری ان سے پاس ورڈ نہیں پوچھتے۔

*** حضرات، آداب عرض

جو افسر آگ کی دوسری جانب سائے میں بیٹھے تھے، ان میں ہل چل مچ گئی اور ایک افسر، جس کی گردن لانبی تھی، الاؤ کا چکر کاٹتا دلوخوف کی طرف آیا۔

کلے ماں (Clement)، تم؟'' اس نے پوچھا۔ ''بھلے آدمی۔۔۔'' لیکن اسے فوراً ہی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا اور وہ خاموش ہو گیا۔ اس نے ماتھے پر قدرے بل ڈال کر دلوخوف کا اجنبیوں کی طرح استقبال کیا اور اس سے پوچھنے لگا: ''میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

دلوخوف نے بتایا کہ وہ اور اس کا ساتھی اپنی رجمنٹ کو ڈھونڈنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ان میں سے کسی شخص سے خاص طور پر مخاطب ہوئے بغیر پوچھنے لگا: ''آپ میں سے کسی صاحب کو چھٹی رجمنٹ کا کچھ اتا پتا معلوم ہے؟'' کوئی شخص بھی اسے کچھ نہ بتا سکا اور پیتیا کو محسوس ہونے لگا کہ افسران انھیں مخاصمت اور شک و شبے کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔

کئی سیکنڈ خاموشی چھائی رہی۔

''اگر آپ کا خیال تھا کہ آپ کو سپر مل جائے گا، تو آپ بہت دیر سے آئے ہیں۔'' ایک شخص نے، جو الاؤ کے عقب میں ذرا فاصلے پر تھا، دبی دبی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

دلوخوف نے جواب دیا کہ انھیں بھوک نہیں ہے اور انھیں اسی رات لازماً آگے جانا ہے۔

اس نے اپنا گھوڑا اس سپاہی کے حوالے کیا جو دیگچے میں سلاخ پھیر رہا تھا اور خود لمبی گردن والے افسر کے قریب اکڑوں بیٹھ گیا۔ افسر نے دلوخوف کے چہرے سے نظریں نہ اٹھائیں اور اس سے دوبارہ پوچھنے لگا کہ اس کا تعلق کس رجمنٹ سے ہے۔ دلوخوف نے یوں ظاہر کیا جیسے اسے سوال سنائی نہ دیا ہو اور اس نے جواب دینے سے گریز کیا۔ تاہم اس نے جیب سے چھوٹا سا فرانسیسی پائپ نکالا، اسے سلگایا اور افسروں سے پوچھنے لگا کہ آگے راستے میں قازقوں کا خطرہ تو نہیں۔

''یہ قازق تو جگہ جگہ موجود ہیں،'' آگ کی دوسری جانب کے افسر نے جواب دیا۔

دلوخوف نے کہا کہ قازقوں سے خطرہ اسے اور اس کے ساتھی جیسے بھٹکے اور بچھڑے ہوئے اشخاص کو ہے اور دریافت طلب انداز سے مزید کہنے لگا کہ وہ غالباً کسی بڑے دستے پر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کریں گے۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔

''اب وہ یقیناً اٹھ کھڑا ہو گا،'' پیتیا ہر لمحے یہی سوچ رہا تھا۔ وہ الاؤ کے قریب کھڑا گفتگو سن رہا تھا۔

لیکن دلوخوف نے گفتگو، جو بند ہو چکی تھی، دوبارہ شروع کر دی۔ اس نے بلا جھجک پوچھ لیا کہ ان کی بٹالین میں کتنے آدمی ہیں، بٹالینوں کی کل تعداد کتنی ہے اور ان کے پاس قیدی کتنے ہیں۔ روسی قیدیوں کے بارے میں دریافت کرتے ہوئے دلوخوف نے کہا:

''ان لاشوں کو ساتھ ساتھ گھسیٹے پھرنا کتنا کٹھن اور کریہہ کام ہے! بہتر ہے کہ ان سؤروں کو گولی مار دی جائے۔''

اور وہ اتنے عجیب وغریب انداز سے کھلکھلا کر ہنسنے لگا کہ پیتا کا دل بیٹھنے لگا۔ اسے خیال آیا کہ اب فرانسیسی اس کی اصلیت بھانپ جائیں گے اور وہ غیر ارادی طور پر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

لیکن دلوخوف کی رائے اور ہنسی پر کسی نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا اور ایک فرانسیسی افسر، جوان کی نظروں سے اوجھل تھا (وہ اوورکوٹ میں لپٹا پڑا تھا)، سرگوشیوں میں اپنے ساتھی سے کچھ کہنے لگا۔ دلوخوف اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس نے سپاہی کو آواز دی جوان کے گھوڑوں کی لگامیں پکڑے کھڑا تھا۔

''یہ ہمارے گھوڑے واپس کریں گے یا نہیں؟'' پیتا نے سوچا اور وہ جبلی طور پر خود بخود کھسک کر دلوخوف کے قریب ہو گیا۔

گھوڑے لوٹا دیے گئے۔

''حضرات، شب بخیر،'' دلوخوف نے کہا۔

پیتا بھی "Bonsoir"* کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے منہ سے ذراسی آواز بھی نہ نکل سکی۔ افسران آپس میں کانا پھوسیاں کر رہے تھے اور دلوخوف نے گھوڑے پر، جو نچلا نہیں کھڑا ہو رہا تھا، سوار ہونے میں خاصی دیر لگا دی۔ پھر وہ بہت آہستہ آہستہ صحن سے باہر نکل آئے۔ پیتا دلوخوف کے برابر آ رہا تھا۔ اس کا جی تو بہت چاہتا تھا کہ پیچھے مڑ کر دیکھے کہ کہیں فرانسیسی ان کا تعاقب تو نہیں کر رہے، لیکن وہ اس کا حوصلہ نہ کر سکا۔

جب وہ دوبارہ سڑک پر آئے، دلوخوف کھلے دیہاتی علاقے کی طرف واپس جانے کے بجائے گاؤں کے بیچوں بیچ گزرنے لگا۔ ایک جگہ وہ رک گیا اور سننے لگا۔

''تمھیں کچھ سنائی دیا؟'' اس نے پوچھا۔

پیتا نے روسی آواز پہچان لیں اور اسے روسی قیدیوں کی اپنے الاؤوں کے اردگرد دھندلی شکلیں دکھائی دیں۔ پیتا اور دلوخوف پہاڑی سے نیچے اترے اور پل پر پہنچ گئے۔ وہ سنتری کے قریب سے گزرے۔ سنتری نے ان سے ایک لفظ تک نہ کہا اور منہ پھلائے ادھر ادھر گھومتا رہا۔ وہ گھاٹی میں، جہاں قازق ان کے منتظر تھے، پہنچ گئے۔

''اچھا، اب خدا حافظ۔ دینی سوف کو بتا دینا۔ سویرے پہلی گولی کی آواز پر،'' دلوخوف نے کہا۔ وہ اپنے گھوڑے کو مہمیز لگایا چاہتا تھا کہ پیتا نے اسے بازو سے پکڑ لیا۔

''اوہ!'' اس نے گلا پھاڑ کر کہا۔ ''آپ کتنے بڑے ہیرو ہیں! لاجواب! جلیل القدر! مجھے آپ سے کتنی محبت ہے!''

''ٹھیک ہے، یار، ٹھیک ہے!'' دلوخوف نے کہا لیکن پیتا اسے چھوڑ نہیں رہا تھا اور دلوخوف نے اندھیرے میں دیکھا کہ وہ جھکا ہوا ہے اور اس سے بغل گیر ہونا چاہتا ہے۔ دلوخوف نے اس کا بوسہ لیا اور ہنس پڑا۔ اس نے اپنا گھوڑا موڑا اور رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

---

* شب بخیر۔

10

جب پیتیا رکھوالے کے جھونپڑے کے قریب پہنچا، اسے دینی سوف دروازے پر مل گیا۔ وہ اسی کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ مترڈد اور پریشان بھی تھا اور اپنے آپ کو کوس بھی رہا تھا کہ اس نے پیتیا کو آخر جانے ہی کیوں دیا۔

''خداوند کا شکر ہے!'' اس نے چلا کر کہا۔ ''خداوند کا شکر ہے!'' اس نے پیتیا کی وجد آفریں کہانی سنتے ہوئے دوبارہ کہا۔ ''لیکن تمھارا ستیاناس ہو، تمھاری وجہ سے مجھے بالکل نیند نہیں آئی! خیر، خداوند کا شکر ہے۔ اب لیٹ جاؤ۔ ہم صبح ہونے سے پہلے اب بھی جھپکی لے سکتے ہیں۔''

''جی نہیں،'' پیتیا نے کہا۔ ''مجھے نیند نہیں آرہی۔ علاوہ ازیں، میں اپنے آپ کو جانتا ہوں ۔ اگر میں سو گیا، پھر میرا خدا ہی حافظ۔ ایک اور بات یہ ہے کہ مجھے لڑائی سے پہلے سونے کی عادت نہیں ہے۔''

پیتیا کچھ دیر جھونپڑے کے اندر بیٹھا رہا۔ وہ اپنی مہم کی تفصیلات یاد کر کے بہت خوش ہو رہا تھا اور اگلے روز کیا ہو گا، اس کا اپنے ذہن میں واضح نقشہ بنا رہا تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ دینی سوف سو گیا ہے، وہ اٹھا اور باہر چلا گیا۔

باہر ابھی خاصا اندھیرا تھا۔ بارش تھم چکی تھی لیکن درختوں سے ابھی تک پانی کے قطرے گر رہے تھے۔ رکھوالے کے جھونپڑے سے کچھ ہی دور قازقوں کی عارضی جھونپڑیاں اور ان کے بندھے ہوئے گھوڑوں کی شکلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ جھونپڑے کے عقب میں دو چھکڑے اور ان کے قریب ان کے گھوڑے کھڑے تھے۔ نیچے گھاٹی میں بجھتے ہوئے الاؤوں میں کوئلے ابھی تک دہک رہے تھے۔ سارے کے سارے قازق اور ہوزار سوئے نہیں تھے۔ کہیں کہیں سے کانا پھوسیوں سے ملتی جلتی آوازیں آرہی تھیں اور وہ درختوں سے گرنے والے قطروں اور گھوڑوں کی جگالی کی آوازوں میں مدغم ہو رہی تھیں۔

پیتیا باہر آ گیا، اس نے اندھیرے میں جھانک کر دیکھا اور چھکڑوں کے پاس چلا گیا۔ کوئی شخص چھکڑوں کے نیچے خراٹے لے رہا تھا۔ ان کے اردگرد گھوڑے، جن پر زینیں کسی ہوئی تھیں، کھڑے تھے اور جئی کھا رہے تھے۔ پیتیا نے اندھیرے میں اپنا گھوڑا پہچان لیا۔ اسے وہ کاراباخ[15] کہتا تھا (حالانکہ بہ اعتبار نسل یہ یوکرینی تھا) اور اس کے قریب چلا گیا۔

''اچھا، کاراباخ، کل ہم کچھ کام کریں گے!'' اس نے پیار سے اپنی ناک گھوڑے کی ناک اور تھوتھنی سے رگڑی اور اس کا بوسہ لیا۔

''جناب، آپ سوئے نہیں؟'' ایک قازق نے پوچھا۔ وہ چھکڑے کے نیچے بیٹھا تھا۔

''نہیں، میں... تمھارا نام لیخاچیف ہے؟ ٹھیک؟ تمھیں معلوم ہے کہ میں ابھی ابھی آیا ہوں۔ ہم فرانسیسی پڑاؤ میں گئے تھے۔''

اور پیتیا نے قازق کو نہ صرف مہم کی تمام تفصیلات بتائیں بلکہ اس نے اسے یہ بھی بتایا کہ وہ کیوں گیا تھا اور یہ

کہ وہ اٹکل پچو انداز سے کام کرنے کے بجائے اپنی زندگی کو خطرہ میں ڈالنا کیوں بہتر سمجھتا تھا۔

"بہر حال آپ کو کچھ آرام کر لینا چاہیے،" قازق نے کہا۔

"نہیں، مجھے اس کی عادت ہو چکی ہے۔" پیتیا نے کہا۔ "تمھارے پستولوں کے چقماق[16] ٹھیک ٹھاک ہیں؟۔ گھس تو نہیں گئے۔ میں اپنے ساتھ چند ایک لایا تھا۔ تمھیں چاہئیں؟ لینے ہیں تو لے لو۔"

قازق نے چھکڑے کے نیچے سے اپنا سر باہر نکالا۔ وہ پیتیا کو اچھی طرح دیکھنا چاہتا تھا۔

"کیونکہ میں ہر کام صحیح انداز سے کرنے کا عادی ہوں،" پیتیا نے کہا۔ "بعض لوگ تیاری کے بغیر اٹکل پچو کام کرتے ہیں اور بعد میں پچھتاتے ہیں۔ مجھے یہ پسند نہیں ہے۔"

"ٹھیک،" قازق نے کہا۔

"ارے ہاں، ایک اور بات — میرے عزیز دوست، ذرا اتنی تکلیف کرو کہ میری تلوار ذرا سان پر چڑھا دو، یہ کند ہو گئی ہے —" (لیکن پیتیا اپنا جھوٹ مکمل نہ کر سکا۔) "یہ کبھی تیز نہیں کی گئی۔ تم کر سکتے ہو؟"

"بالکل کر سکتا ہوں۔"

لیخاچیف اٹھا اور گٹھڑ ٹٹولنے لگا۔ آن کی آن میں پیتیا کو سان پر فولاد کی حربی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ چھکڑے پر چڑھ گیا اور اس کے کنارے پر بیٹھ گیا۔ قازق چھکڑے کے نیچے تلوار تیز کر رہا تھا۔

"جوان سو رہے ہیں؟" پیتیا نے پوچھا۔

"کچھ سو رہے ہیں، کچھ — ہماری طرح — جاگ رہے ہیں۔"

اس لڑکے کا کیا حال ہے؟"

"وسینی؟ وہ ادھر گھاس پر لیٹا ہوا ہے۔ پہلے تو وہ بہت ڈرا ہوا تھا لیکن اب گھوڑے بیچ کر سو رہا ہے۔ وہ بہت خوش تھا۔"

پیتیا خاصی دیر خاموش رہا اور مختلف آوازیں سنتا رہا۔ اسے تاریکی میں قدموں کی آہٹ سنائی دی اور ایک دھندلی دھندلی صورت نظر آئی۔

"یہ تم کیا تیز کر رہے ہو؟" اس شخص نے چھکڑے کے قریب آ کر پوچھا۔

"ان صاحب کی شمشیر۔"

"ٹھیک ہے،" اس شخص نے کہا۔ پیتیا کے خیال میں وہ کوئی ہوزار تھا۔ "پیالہ تمھارے پاس تو نہیں رہ گیا تھا؟"

"پہیے کے پاس پڑا ہے۔"

ہوزار نے پیالہ اٹھا لیا۔ "دن نکلنے ہی والا ہوگا،" اس شخص نے جمائی لیتے ہوئے کہا اور واپس چلا گیا۔

پیتیا کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ جنگل میں ہے، دینی سوف کے جتھے میں ہے، سڑک سے پون میل دور ہے، فرانسیسیوں سے چھینے ہوئے چھکڑے پر بیٹھا ہے جس کے نزدیک گھوڑے بندھے ہوئے تھے، اس چھکڑے کے نیچے

قازق لیخا چیف اس کی شمشیر تیز کر رہا ہے، اس کے دائیں طرف جو بہت بڑا سیاہ دھبا ہے، وہ رکھوالے کا جھونپڑا ہے، نیچے بائیں طرف دہکتا ہوا مقام بجھتا ہوا الاؤ ہے، جو آدمی ابھی ابھی پیالہ لے کر گیا تھا، پیاسا ہوزار تھا۔ مگر وہ ان تمام باتوں کو نہ جانتا تھا اور نہ جاننا چاہتا تھا۔ وہ طلسمی مملکت میں، جہاں کوئی چیز حقیقت سے لگا نہیں کھاتی، پہنچ چکا تھا۔ ممکن ہے کہ بڑا سا سیاہ دھبا در حقیقت جھونپڑا ہی ہو لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی اتھاہ غار ہو جو تحت الثریٰ تک پہنچ جاتا ہو۔ ممکن ہے کہ سرخ جگہ الاؤ ہو لیکن یہ کسی دیو قامت عفریت کی آنکھ بھی تو ہو سکتی ہے۔ شاید وہ، یعنی پیتیا، واقعی چھکڑے پر بیٹھا ہوا ہے اور عین ممکن ہے کہ وہ قطعاً چھکڑے پر نہ بیٹھا ہو بلکہ کسی سر بفلک مینار پر چڑھ چکا ہو اور اگر وہ نیچے گر پڑا تو ہو سکتا ہے کہ زمین پر پہنچنے سے پہلے وہ پورا دن یا پورا مہینہ فضا میں ہی اڑتا رہے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ سدا محو پرواز رہے اور کبھی نیچے نہ پہنچ سکے! چھکڑے کے نیچے شاید قازق لیخا چیف بیٹھا ہے لیکن یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ دھرتی کا شفیق تریں، بہادر تریں، حیرت انگیز تریں، عظیم تریں انسان ہو جس کے بارے میں کسی کو کچھ معلوم ہی نہ ہو۔ وہ شخص، جو پانی لینے آیا تھا اور واپس گھاٹی میں چلا گیا تھا، ممکن ہے ہوزار ہو اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ گھاٹی میں گیا ہی نہ ہو بلکہ غائب ہو گیا ہو، فضا میں تحلیل ہو گیا ہو اور اس کا وجود عدم وجود بن چکا ہو۔

اب پیتیا کو خواہ کچھ ہی کیوں نہ نظر آتا، اسے قطعاً کوئی حیرت نہ ہوتی۔ وہ طلسمی مملکت میں پہنچ چکا تھا اور وہاں ہر چیز ممکن تھی۔

اس نے نگاہیں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ زمین کی طرح آسمان بھی طلسمی مملکت بن چکا تھا۔ مطلع صاف ہو رہا تھا اور درختوں کی چوٹیوں پر بادلوں کی ٹکڑیاں یوں بھاگی پھر رہی تھیں جیسے وہ ستاروں کے چہروں سے نقاب الٹ رہی ہوں۔ بعض اوقات یوں معلوم ہونے لگتا کہ بدلیاں چھٹ چکی ہیں اور نظروں کے سامنے نتھرے نتھرے سیاہ آسمان کا خاصا بڑا قطعہ نمودار ہو جاتا۔ کبھی یوں دکھائی دیتا کہ سر کے اوپر آسمان بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے اور کبھی وہ اتنا نیچے آ جاتا معلوم ہوتا کہ ایسے لگتا ہے جیسے آدمی اس تک پہنچ سکتا اور اسے ہاتھ سے چھو سکتا ہے۔

پیتیا کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور اس کا جسم قدرے جھول گیا۔

درختوں سے پانی کی بوندیں گر رہی تھیں۔ باتوں کی دھیمی دھیمی بھنبھناہٹ سنائی دینے لگی۔ گھوڑے ہنہنائے اور ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرانے لگے۔ کوئی شخص خراٹے بھرنے لگا۔

کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ، کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ... سان پر شمشیر سنسنا رہی تھی اور ایکا ایکی پیتیا کو خوش آہنگ اور سریلے آرکسٹرا کی آواز سنائی دی۔ وہ کسی اجنبی، شیریں، پر وقار مناجات کی دھن بجا رہا تھا۔ اگرچہ پیتیا نے نہ تو کبھی موسیقی کی تعلیم پائی تھی اور نہ اس نے کبھی اس کے بارے میں سوچا تھا لیکن وہ اتنا ہی کن رس تھا جتنی کہ نتاشا اور نکولائی سے تو کہیں زیادہ۔ چنانچہ جو نغمہ اچانک اس کے کانوں میں رس گھولنے لگا تھا، اس میں اس کے لیے خصوصی تازگی اور دلکشی تھی۔ موسیقی کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔ نغمے میں وسعت آتی جا رہی تھی اور وہ کبھی ایک ساز سے اور کبھی دوسرے سے نکلنے لگتا۔ جو کچھ بج رہا تھا، وہ کثیرت الصوت (fugue) نغمہ تھا۔[17]

پیتا کے فرشتوں کو بھی معلوم نہیں تھا کہ fugue کیا ہوتا ہے۔ ہر ساز۔ کبھی وائلن، کبھی ہارن، لیکن وائلن اور ہارن سے کہیں زیادہ نفیس اور پاکیزہ — اپنا پارٹ ادا کر رہا تھا اور پیشتر اس کے کہ ایک ساز کی دھن انجام تک پہنچتی، وہ دوسرے ساز کی آواز میں، جو تقریباً یہی دھن شروع کر دیتا، مدغم ہو جاتی۔ دوسرے کے بعد تیسرا اور تیسرے کے بعد چوتھا آواز میں آواز ملانے لگتا اور پھر سب مل کر یک زباں ہو جاتے، وہ دوبارہ الگ الگ ہو جاتے اور اس کے بعد پھر مدغم ہو جاتے۔ کبھی سنجیدہ کلیسائی راگ چھڑ جاتا اور کبھی فتح و نصرت کا درخشندہ تابندہ نغمہ بجنے لگتا۔

"افوہ، میں ضرور کوئی خواب دیکھتا رہا ہوں گا،" پیتا نے اگلی جانب جھوک کھاتے ہوئے سوچا۔ "یہ میرے کانوں تک محدود ہے۔ شاید یہ میری اپنی تخلیق کردہ موسیقی ہے، خیر، میری موسیقی، جاری رہو۔ اور اب!..."

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور مختلف سمتوں سے آوازیں، جیسے وہ کہیں بہت دور سے آرہی ہوں، مرتعش ہونے لگیں۔ وہ بڑھتے بڑھتے نغمات میں ڈھل گئیں، علیحدہ علیحدہ ہوئیں اور ایک بار پھر آپس میں گھل مل کر اسی شیریں اور سنجیدہ مناجات کی صورت اختیار کر گئیں۔ "اوہ، مزہ آگیا۔ یہ اتنی ہی دلکش اور خوبصورت ہیں جتنی کہ مجھے پسند ہیں اور جتنی میں چاہتا ہوں!" پیتا نے اپنے آپ سے کہا۔ وہ اس عظیم الشان آرکسٹرا کو ہدایات دینے کی کوشش کرنے لگا۔

"اب خاموش ہو جاؤ... دھیمے دھیمے ختم ہو جاؤ!" اور آوازیں اس کا حکم بجالائیں۔ "اب اونچی، اور اونچی، اور تیز ہو جاؤ، اتنی کہ روح خوشی سے سرشار ہو جائے!" اور نامعلوم گہرائیوں سے آوازیں اٹھنے اور پھیلنے لگیں اور دل پر وجد طاری کرنے لگیں۔ "آوازو، اب آپس میں مل جاؤ!" پیتا نے حکم دیا۔ بہت دور سے اسے پہلے مردوں کی اور پھر عورتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ وہ بتدریج بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھیں، جہاں تک وہ نقطۂ عروج تک پہنچ گئیں۔ پیتا پر وجد بھی طاری تھی اور ہیبت بھی اور اس کی روح اس حیرت انگیز حسن سے سیراب ہو رہی تھی۔

اور یہ آوازیں وکٹری مارچ کی دھنوں، درختوں کے پتوں سے گرتی پانی کی بوندوں کی ٹپ ٹپ اور سنسناتی شمشیر کی کھٹ کھٹ، کھٹا کھٹ میں مدغم ہو گئیں... گھوڑے ایک بار پھر آپس میں الجھنے اور ہنہنانے لگے لیکن اب کے انھوں نے آہنگ میں کوئی گڑبڑ نہیں کی بلکہ اس کا جز و بن گئے۔

پیتا کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ سب کچھ کتنا عرصہ جاری رہا، وہ تو بس اس سے لطف لیتا رہا۔ وہ خود تو لطف اندوز ہو ہی رہا تھا لیکن اسے افسوس بھی ہو رہا تھا کہ اس لطف اندوزی میں کوئی دوسرا شخص اس کا شریک نہیں تھا۔ اسے لیخا چیف نے جگا دیا۔

"یہ رہی جناب، بالکل تیار ہے۔ کسی بھی فرانسیسی کے اس سے دو ٹکڑے کیے جا سکتے ہیں۔"

پیتا نے آنکھیں کھول دیں۔ "اجالا نمودار ہو رہا ہے — واقعی اجالا نمودار ہو رہا ہے!" اس نے با آواز بلند کہا۔

گھوڑے، جو پہلے نگاہوں سے اوجھل تھے، اب سر سے دم تک نظر آرہے تھے اور ننگی ننگی شاخوں کے بیچ میں آبی روشنی جھلملانے لگی تھی۔ پیتا نے اپنے آپ کو ہلایا جلایا، نیچے چھلانگ لگائی، جیب سے روبل نکالا اور لیخا چیف کے حوالے کر دیا۔ پھر اس نے اپنی شمشیر کو نیام میں بند کرنے سے پہلے آزمائش کی خاطر فضا میں لہرایا۔ قازق اپنے

گھوڑے کھول رہے تھے اور کاٹھیوں کے بند باندھ رہے تھے۔

''کمانڈر آگئے!'' لیخاچیف نے کہا۔

دینی سوف رکھوالے کے جھونپڑے سے باہر نکلا۔ اس نے پیتیا کو بلایا اور اسے تیار ہونے کا حکم دیا۔

11

جوانوں نے نیم تاریکی میں اپنے اپنے گھوڑوں کی شناخت کی، کاٹھیوں کے بند کس کر باندھے اور اپنی کمپنی تشکیل کر لی۔ دینی سوف رکھوالے کے جھونپڑے کے قریب کھڑا آخری ہدایات دے رہا تھا۔ جتھے کے سینکڑوں پیادہ سپاہی کیچڑ میں چھپ چھپ کرتے سڑک کی طرف بڑھنے لگے۔ پلک جھپکنے میں وہ درختوں اور صبح سویرے کی دھند میں غائب ہو گئے۔ ایسول نے قازقوں کو اپنی طرف سے ہدایات دیں۔ پیتیا اپنے گھوڑے کی لگام تھامے کھڑا تھا اور بے صبری سے سوار ہونے کے حکم کا انتظار کر رہا تھا۔ پانی کے چھپاکے مارنے کے بعد اس کا چہرہ، خاص طور پر اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سردی کی لہر دوڑتی محسوس ہوئی اور اس کا سارا جسم یوں کپکپانے اور تھرتھرانے لگا جیسے اسے تال دی جا رہی ہو۔

''تیاریاں ہو گئیں؟'' دینی سوف نے پوچھا۔ ''اچھا، گھوڑے لے آؤ۔''

گھوڑے نکال لیے گئے۔ دینی سوف اپنے قازق پر گرم ہونے لگا کیونکہ اس کی زین کے بند ڈھیلے تھے۔ اس نے اسے بے نقط سنائیں اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ پیتیا نے رکاب میں پاؤں رکھا۔ گھوڑے نے، جیسا کہ اس کی عادت تھی، کچھ اس قسم کی حرکت کی جیسے وہ اس کی ٹانگ کاٹنا چاہتا ہو لیکن پیتیا نے جست لگائی اور کاٹھی پر بیٹھ گیا۔ اسے یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ اس کا اپنا بھی وزن ہے۔ اس نے پیچھے مڑ کر ہوزاروں پر نظر ڈالی جو اس کے عقب میں تاریکی سے نکل کر آگے جا رہے تھے، اور اپنا گھوڑا بڑھا کر دینی سوف کے قریب آیا۔

واسیلی دمترچ، میرے ذمے کوئی کام لگا دیں... مہربانی فرمائیں... خدا کے لیے...!'' اس نے کہا۔

معلوم ہوتا تھا کہ دینی سوف بالکل بھول چکا ہے کہ وہاں پیتیا نام کا کوئی شخص بھی موجود ہے۔ اس نے گردن گھما کر اسے سرسری نگاہوں سے دیکھا۔

''میرا صرف ایک ہی مطالبہ ہے،'' اس نے درشتی سے جواب دیتے ہوئے کہا، ''کہ میرا حکم مانتے رہو اور کہیں بھی آگے دھکم دھکا کرنے کی کوشش نہ کرو۔''

اس نے پیتیا سے مزید ایک لفظ بھی نہ کہا اور سارا راستہ چپ چاپ چلتا رہا۔ جب وہ جنگل کے کنارے پر پہنچے، کھلے کھیتوں میں روشنی واضح طور پر نمودار ہو چکی تھی۔ دینی سوف نے ایسول کے کانوں میں کچھ کہا اور قازق پیتیا اور دینی سوف سے آگے نکلنے لگے۔ جب وہ سب آگے چلے گئے، دینی سوف نے گھوڑے کو مہمیز لگایا اور پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ گھوڑے اکڑوں ہو گئے اور اپنے سواروں سمیت پھسلتے پھسلتے نیچے وادی کی طرف جانے لگے۔ پیتیا

دینی سوف کے ہم رکاب رہا۔ اس کے سارے جسم کی کپکپاہٹ میں ہر دم اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ اجالا بڑھتا جارہا تھا اور صرف دور کی اشیا ابھی تک دھند میں نگاہوں سے اوجھل تھیں۔ جب دینی سوف وادی میں پہنچا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور گردن کے اشارے سے اپنے قریب تریں قازق کو بلایا۔

''سگنل!'' اس نے کہا۔

قازق نے اپنا بازو اوپر اٹھایا اور وادی میں گولے چلنے کی آواز گونجی۔ پلک جھپکنے میں سرپٹ بھاگتے گھوڑوں کی ٹاپیں اور مختلف اطراف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ اور اس کے بعد مزید گولیاں چلیں۔

گھوڑوں کی ٹاپوں اور چیخ پکار کی آوازیں سنتے ہی پیتیا نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا، اس کی باگیں ڈھیلی چھوڑیں اور دینی سوف کی، جو گلا پھاڑ پھاڑ کر اسے اپنی طرف بلا رہا تھا، پروا کیے بغیر سرپٹ آگے بھاگنے لگا۔ جس وقت گولی چلائی گئی تھی، پیتیا کو یوں محسوس ہوا کہ اچانک مطلع اتنا صاف ہوگیا ہے جتنا کہ دوپہر کو ہوتا ہے۔

وہ اپنا گھوڑا پل کی جانب دوڑانے لگا۔ اس کے آگے آگے قازق جارہے تھے۔ ان کی رفتار بے حد تیز تھی۔ پل پر پیتیا کا تصادم ایک قازق سے ہوگیا جو پیچھے رہ گیا تھا، لیکن وہ آگے نکل گیا۔ اسے اپنے سامنے فوجی سپاہی۔ اس کے خیال میں یہ فرانسیسی تھے۔ نظر آئے۔ وہ سڑک کے پار دائیں سے بائیں بھاگ رہے تھے۔ ان میں سے ایک کیچڑ میں پھسل گیا اور اس کے گھوڑے کے کھروں تلے آگیا۔

قازق ایک جھونپڑے کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے اور وہاں کچھ کر رہے تھے۔ ہجوم کے درمیان میں سے خوفناک چیخ بلند ہوئی اور پیتیا کو جو سب سے پہلے چیز نظر آئی، وہ کسی فرانسیسی کا زرد چہرہ اور کپکپاتا جبڑا تھا۔ وہ برچھی کا ڈنڈا، جس سے اس کا نشانہ لیا گیا تھا، مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

''ہرا!... ساتھیو... ہمارا...'' پیتیا چلایا اور اپنے ہیجان زدہ گھوڑے کی باگیں ڈھیلی چھوڑتا سرپٹ گاؤں کی طرف بھاگنے لگا۔

اسے اپنے آگے گولیوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ قازق، ہوزار اور خستہ حال روسی قیدی، جو سڑک کے دونوں اطراف سے بھاگتے آئے تھے، کبھی چیخ چلا رہے تھے اور اس شور وغل میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ایک فرانسیسی، جو شکل وصورت سے جی دار آدمی معلوم ہوتا تھا، جس کے جسم پر نیلے رنگ کا کوٹ تھا، جس کا سر ننگا تھا، چہرہ کپکپا رہا تھا اور جس کی بھویں تنی ہوئی تھیں، ہوزاروں کا حملہ روک رہا تھا۔ جس وقت پیتیا گھوڑا دوڑاتے وہاں پہنچا، فرانسیسی نیچے گر چکا تھا۔ ''واہ ری قسمت، ایک بار پھر موقع ہاتھ سے نکل گیا!'' پیتیا کے ذہن میں کوندے کی طرح خیال آیا اور وہ آتش پا اس جگہ پہنچ گیا جہاں دھڑا دھڑ فائرنگ ہو رہی تھی۔ گولیاں زمیندار کے اس مکان کے صحن سے آرہی تھیں، جہاں وہ گزشتہ رات دلوخوف کے ساتھ گیا تھا۔ وہاں فرانسیسی باغیچے میں، جس میں بے تحاشا جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں، جعفری کی باڑ کے پیچھے ڈٹے ہوئے تھے اور قازقوں پر، جو گیٹ کے قریب جمگھٹا کیے ہوئے تھے، گولیاں چلا رہے تھے۔ پیتیا اپنا گھوڑا دوڑاتا گیٹ تک پہنچا۔ وہاں اسے دلوخوف کا، جو چیخ چیخ

کر اپنے آدمیوں کو احکام دے رہا تھا، سبزی مائل زرد چہرہ نظر آیا۔

''گھوم پھر کر ادھر چلے جاؤ اور پیادہ سپاہیوں کا انتظار کرو!'' وہ اپنے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر کہہ رہا تھا۔

''انتظار؟... ہر۔ا۔ا۔ہ!'' پیتیا نے پوری قوت سے نعرہ لگایا اور ایک سیکنڈر کے بغیر ادھر، جدھر سے فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں اور جہاں دھواں دبیز تریں تھا، سرپٹ بھاگتا چلا گیا۔ متعدد بندوقوں کے بیک وقت داغے جانے کی آواز سنائی دی، سنسناتی گولیاں نکلیں اور بھد سے کسی چیز سے ٹکرا گئیں۔ دلوخوف اور قازق گھوڑے دوڑاتے پیتیا کے پیچھے صحن میں داخل ہو گئے۔ چند فرانسیسیوں نے تھرتھراتے گاڑھے دھوئیں میں اپنے بازو نیچے گرا لیے اور قازقوں سے ملنے جھاڑیوں سے باہر آ گئے جب کہ دوسرے دامن کوہ میں جوہڑ کی طرف بھاگ گئے۔ پیتیا گھوڑا صحن میں سرپٹ دوڑاتا پھر رہا تھا لیکن باگوں کو پکڑنے کے بجائے وہ اپنے دونوں ہاتھ عجیب وغریب انداز سے تیز تیز گھما رہا تھا۔ اس کا جسم مسلسل ایک طرف کھسکتا اور کاٹھی سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ بھاگتے بھاگتے اس کے گھوڑے کا پاؤں الاؤ پر جا پڑا جس کے کوئلے ابھی تک دہک رہے تھے۔ وہ وہیں رک گیا اور پیتیا دھڑام سے گیلی زمین پر گر پڑا۔ اگرچہ اس کا سر بے حس وحرکت تھا، قازقوں کو اس کے ہاتھ اور ٹانگیں یوں گھومتی دکھائی دیں جیسے اس پر تشنج کا دورہ پڑ رہا ہو۔ گولی اس کی کھوپڑی چیرتی نکل گئی تھی۔

ایک سینئر فرانسیسی افسر سے، جو اپنی شمشیر پر سفید رومال باندھے مکان سے باہر آ گیا تھا اور جس نے ہتھیار ڈالنے کا اعلان کر دیا تھا، بات چیت کرنے کے بعد دلوخوف گھوڑے سے نیچے اترا اور پیتیا کے پاس پہنچا جو بازو پھیلائے زمین پر ساکت پڑا تھا۔

''مارا گیا!'' اس نے تیوریاں چڑھاتے ہوئے کہا اور دینی سوف سے ملنے، جو اسی کی جانب آ رہا تھا، گیٹ کی طرف چل پڑا۔

''کیا؟ ہلاک ہو گیا؟'' دینی سوف پیتیا کے جسم کو لاریب بے جان انداز سے پڑے دیکھ کر چلایا۔ اس نے اسے دور سے ہی پہچان لیا تھا۔

''مارا گیا!'' دلوخوف نے اپنے الفاظ کچھ یوں دوبارہ دہرائے جیسے ان کی ادائیگی سے اسے اطمینان حاصل ہو گیا ہو اور وہ تیزی سے (فرانسیسی) قیدیوں کی طرف چل پڑا۔ قازق اس سے زیادہ تیز نکلے، وہ پہلے ہی قیدیوں کے گرد حصار بنا چکے تھے۔ ''ہم ان کے ساتھ کوئی رورعایت نہیں کریں گے...'' اس نے چلا کر دینی سوف سے کہا۔

دینی سوف نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ پیتیا کے قریب آیا، گھوڑے سے نیچے اترا اور اس نے اس کے خون آلود اور کیچڑ سے لتھڑے ہوئے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا جس کا ازیں پیشتر ہی رنگ سفید ہو چکا تھا۔

''مجھے میٹھی چیزیں ہمیشہ ہی پسند رہی ہیں۔ بہت اچھا منقّی ہے... سارا لے لیں...'' اسے اس کے الفاظ یاد آئے۔

اور قازقوں نے حیرت سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ انھیں کچھ اس طرح کی آواز سنائی دی جیسے کسی کتے کی خوف

سے چیخ نکل گئی ہو۔ یہ چیخ دینی سوف کی تھی۔ چیخ مارتے ہی دینی سوف تیزی سے پیچھے ہٹا، جعفری کی باڑ کی طرف گیا اور اسے مضبوطی سے پکڑ لیا۔

دینی سوف اور دلوخوف نے جن روسی قیدیوں کو رہائی دلائی، ان میں پیئر بزوخوف بھی تھا۔

12

ماسکو سے اپنے سارے سفر کے دوران میں فرانسیسی حکام نے قیدیوں کی جماعت کو، جن میں پیئر شامل تھا، مزید کوئی حکم نہ دیا۔ ماسکو سے یہ جماعت جن فوجی دستوں اور سامان کے چھکڑوں کے ساتھ روانہ ہوئی تھی، 22 اکتوبر سے پہلے ہی یہ ان سے علیحدہ ہو چکی تھی۔ جن چھکڑوں پر بسکٹ اور رس لدے ہوئے تھے اور جو سفر کی ابتدائی منزلوں میں ان کے ساتھ تھے، ان میں سے نصف قازق پکڑ کر لے جا چکے تھے اور بقیہ نصف آگے نکل چکے تھے۔ جو سوار گھوڑوں سے اتر کر ان کے آگے آگے پیدل چل رہے تھے، ان میں سے ایک بھی باقی نہیں رہا، وہ بھی کے بھی غائب ہو چکے تھے۔ شروع کے ایام میں قیدیوں کو اپنے آگے جو توپ خانہ نظر آتا تھا، اب اس کی جگہ مارشل جونو (Junot) کے باربرداری کے لاتعداد چھکڑوں کے قافلے نے لے لی تھی۔ ان کی حفاظت ویسٹ فالیا کے فوجی کر رہے تھے۔ قیدیوں کے عقب میں گھوڑ سوار فوج کے ساز و سامان کی گاڑیاں آ رہی تھیں۔

دیازما تک فرانسیسی فوج تین کالموں میں چلتی رہی لیکن اس کے بعد اس نے ہجوم کی صورت اختیار کر لی۔ ماسکو سے روانگی کے بعد پیئر نے پہلے پڑاؤ میں جس بدنظمی کی علامتیں دیکھی تھیں، وہ اب اپنی آخری حدوں کو چھو رہی تھی۔

جس سڑک کے ساتھ ساتھ وہ سفر کر رہے تھے، اس کے دونوں کناروں پر جگہ جگہ گھوڑوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ خستہ حال جوان، جو مختلف رجمنٹوں سے بچھڑ گئے تھے اور پیچھے رہ گئے تھے، مسلسل ادھر ادھر ہوتے رہے۔ کبھی وہ سفر کرتے کالم میں شامل ہو جاتے اور کبھی دوبارہ پیچھے رہ جاتے۔

سفر کے دوران میں خطرے کی غلط گھنٹیاں بجائی جاتی رہیں۔ حفاظتی دستے کے سپاہی اپنی دستی بندوقیں اٹھاتے، گولیاں چلاتے، پوری رفتار سے بھاگتے اور ایک دوسرے کو پاؤں تلے کچل دیتے۔ اس کے بعد وہ پھر اکٹھے ہو جاتے اور ایک دوسرے سے گالی گلوچ کرنے لگتے کہ خواہ مخواہ خوف و ہراس پھیلا دیا ہے۔

یہ تینوں یونٹ ـــ گھوڑ سواروں کے ساز و سامان کے چھکڑے، قیدیوں کی جماعت اور جونو کا باربرداری کا قافلہ ـــ ابھی تک اکٹھے سفر کر رہے تھے مگر ہر گروپ کے کچھ نہ کچھ افراد متواتر غائب ہو رہے تھے اور ان کی تعداد تیزی سے کم ہوتی جا رہی تھی۔

جہاں تک گھوڑ سواروں کے ساز و سامان کے چھکڑوں کا تعلق ہے، ابتدا میں ان کی تعداد ایک سو بیس تھی۔ اب ان میں سے صرف ساٹھ رہ گئے تھے، باقی یا تو چھن چکے تھے یا پھر انھیں راستے میں ہی چھوڑ دیا گیا تھا۔ جونو کے بھی بعض چھکڑے یا تو پکڑے گئے تھے یا انھیں بھی پیچھے چھوڑنا پڑا۔ تین چھکڑوں پر مارشل داوُد کی کور سے بھاگے

ہوے سپاہیوں نے حملہ کر دیا اور انھیں بھگا کر لے گئے۔ جرمنوں کی باتوں سے پیئر کو معلوم ہوا کہ قیدیوں کی نسبت چھکڑوں کے اس قافلے کی حفاظت کے لیے زیادہ بڑی گارد لگائی گئی ہے اور یہ کہ ان کے ایک ساتھی جرمن سپاہی کو خود مارشل کے حکم پر گولی ماردی گئی تھی کیونکہ اس کا ایک نقرئی چمچہ اس شخص کے سامان سے برآمد ہوا تھا۔

ان دونوں یونٹوں کے مقابلے میں قیدیوں کی تعداد میں کہیں زیادہ کمی واقع ہوئی تھی۔ ماسکو سے جو تین سو تیس افراد روانہ ہوے تھے، اب ان میں سے سو سے بھی کم باقی رہ گئے تھے۔ حفاظتی دستے کے لیے گھوڑسواروں یا جونو کے سامان کی نسبت قیدیوں کا بوجھ زیادہ تکلیف دہ تھا۔ یہ بات تو ان کی سمجھ میں آتی تھی کہ کاٹھیاں یا جونو کے چمچے کسی نہ کسی کام آ سکتے ہیں لیکن یہ کہ سردی اور بھوک کے ستائے ہوے سپاہی اپنے ہی جیسے سردی اور بھوک کے مارے ہوے روسی قیدیوں پر، جن کی سردی سے قلفی جمتی جا رہی تھی اور جو چلتے چلتے سڑک پر گر پڑتے تھے (اس صورت میں انھیں حکم تھا کہ وہ انھیں گولی مار دیں)، پہرہ دیتے رہیں، حکام کا یہ رویہ نہ صرف ان کے لیے ناقابل فہم تھا بلکہ قابل نفرین بھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ حفاظتی دستے کے فوجیوں کو یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا ہے کہ وہ خود جن برے حالات میں سے گزر رہے ہیں، ان سے کہیں ان کے قلوب گداز نہ ہو جائیں اور وہ ان قیدیوں پر ترس نہ کھانے لگیں اور یوں اپنی ابتر حالت کو مزید ابتر بنا لیں۔ چنانچہ وہ ان قیدیوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ سختی کرنے اور ان کے ساتھ بدمزاجی سے پیش آنے لگے۔

داروگوبژ میں قافلے کے فوجی سپاہیوں نے قیدیوں کو تو اصطبل میں بند کر دیا اور خود اپنے ہی سامان رسد کو لوٹنے چل دیے۔ بعض قیدیوں نے دیوار کے نیچے سینندھ لگائی اور نکل بھاگے مگر پکڑے گئے اور انھیں گولی ماردی گئی۔

ماسکو سے روانگی پر افسروں کو باقی قیدیوں سے علیحدہ کر لیا گیا تھا لیکن یہ انتظام زیادہ دیر نہ چل سکا اور ختم کرنا پڑا۔ جو پیدل چل سکتے تھے، وہ سب اکٹھے چلتے تھے اور تیسری منزل کے بعد پیئر دوبارہ کاراتائیف کے ساتھ جا ملا۔ کاراتائیف کے ساتھ ٹیڑھی ٹانگوں اور کاسنی رنگت والی کتیا بھی تھی جس نے اسے اپنا مالک منتخب کیا تھا۔

ماسکو سے کوچ کے تیسرے روز کاراتائیف اس بخار میں مبتلا ہو گیا جس نے اسے ماسکو میں ہسپتال میں رکھا تھا۔ وہ جوں جوں کمزور ہوتا گیا، پیئر توں توں اس سے دور رہنے لگا۔ وہ ایسا کیوں کرتا تھا، اس کی وجہ تو اسے خود بھی معلوم نہیں تھی لیکن جب کاراتائیف کی حالت خراب ہونے لگی، پیئر کو اس کے قریب جانے کے لیے بڑا اپنا مارنا پڑتا تھا۔ تاہم جب وہ اس کے پاس جاتا بھی اور کاراتائیف کی دھیمی دھیمی کراہیں، جو وہ پڑاووں میں پڑے پڑے نکالتا رہتا تھا، اس کے کانوں میں پڑتیں اور اس کے جسم سے جو بو خارج ہوتی، اس کی ناک میں گھس جاتی، وہ وہاں سے اٹھ جاتا اور اس کا خیال بھی اپنے دل میں نہ لاتا۔

جب پیئر سائبان میں مقید تھا، اس نے اپنے دل سے نہیں بلکہ اپنے پورے وجود سے یہ بات سیکھی تھی کہ انسان مسرت کے لیے تخلیق کیا جاتا ہے، یہ مسرت اس کے اپنے اندر موجود ہوتی ہے اور انسان کی فطری ضروریات پوری ہونے پر حاصل ہو جاتی ہے اور یہ کہ ناخوشی کا باعث احتیاج نہیں بلکہ بہتات بنتی ہے۔ اور اپنے اس گزشتہ

تین ہفتوں کے سفر کے دوران میں اس پر ایک اور نئی اور تسکین بخش صداقت کا انکشاف ہوا تھا کہ دنیا میں کوئی بھی چیز ایسی نہیں جس سے آدمی کو خوف کھانے کی ضرورت ہو۔ اس نے یہ سیکھ لیا تھا کہ جس طرح کوئی صورت حال ایسی نہیں جس میں انسان خوش اور مطلقاً آزاد رہ سکتا ہو، اسی طرح کوئی صورت حال ایسی نہیں جس میں اسے ناخوش یا ناآزاد رہنے کی ضرورت پیش آئے۔ اسے معلوم ہوا کہ مصائب اور آزادی کی اپنی حدود ہوتی ہیں اور یہ حدود بہت جلد آ جاتی ہیں۔ جو آدمی پھولوں کی سیج پر سوتا ہے، اگر ایک پتی بھی مسلی جائے تو اسے اتنی ہی تکلیف پہنچتی ہے جتنی کہ خود اسے ننگی مرطوب زمین پر لیٹنے سے ہوتی ہے کہ ایک پہلو کو تو سردی لگ رہی ہے جب کہ دوسرے کو حرارت مل رہی ہے۔ گئے دنوں میں جب وہ تنگ جوتے پہن کر رقص کیا کرتا تھا تو بھی اس کی حالت اتنی ہی کربناک ہوتی تھی جتنی کہ اس وقت تھی جب اسے ننگے پاؤں چلنا پڑ رہا تھا (اس کے جوتے مدتوں پہلے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے)، جن پر جگہ جگہ چھالے پڑے ہوئے تھے۔ اس پر یہ راز کھلا کہ جب اس نے اپنی بیوی سے شادی کی تھی (اس کا خیال تھا کہ اس نے یہ شادی اپنی مرضی سے کی تھی)، تب بھی وہ اسی طرح آزاد نہیں تھا جس طرح کہ وہ اب نہیں ہے جب اسے رات کو اصطبل میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ان تمام چیزوں میں سے، جنھیں اس نے بعد میں اپنے مصائب کا نام دیا اور جن کا اس وقت اسے شاید ہی کبھی احساس ہوا ہوگا، بدترین چیز یہ تھی کہ اس کے پاؤں ننگے تھے، زخمی ہو چکے تھے اور ان کی بوائیاں پھٹ گئی تھیں۔ (اسے گھوڑے کا گوشت لذیذ اور مقوی معلوم ہوتا تھا۔ وہ نمک کی بجائے جو بارود استعمال کرتے تھے، اس میں شورے کی بو بھی خوشگوار لگتی تھی۔ سردی بھی کڑاکے کی نہیں پڑ رہی تھی بلکہ دن کے وقت سفر کے دوران میں جسم ویسے ہی گرم رہتا تھا اور رات بھر الاؤ جلتے رہتے تھے۔ جوئیں اس کا خون ضرور پیتی تھیں لیکن وہ اس کے بدن کو حرارت پہنچانے میں مدد بھی دیتی تھیں۔) شروع شروع میں جو چیز اس کے لیے برداشت کرنا دشوار تھی، وہ اس کے پاؤں کی حالت تھی۔

سفر کے دوسرے روز پیئر جب الاؤ کی روشنی میں اپنے پاؤں کا جائزہ لے چکا، اسے خیال آیا کہ اس کے لیے شاید ایک قدم بھی اٹھانا دشوار ہوگا لیکن جب سب لوگ اٹھ کر کھڑے ہو گئے، وہ لنگڑاتا لنگڑاتا ان کے ساتھ چلنے لگا اور جب اس کا جسم گرم ہو گیا، اسے درد کا احساس بھی جاتا رہا۔ شام کو اس کے پاؤں کی حالت اور بھی خستہ و خراب نظر آنے لگی۔ تاہم اب وہ انھیں دیکھنے سے گریز کرتا اور دوسری چیزوں کے بارے میں سوچنے لگتا۔

انسان کے اندر زندہ رہنے اور مصائب کی بھٹی میں سے گزر کر بچ رہنے کی کتنی قوت ہے، اس کا اندازہ پیئر کو صرف اب ہوا۔ اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ انسان میں فطرتاً یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنی توجہ ایک چیز سے دوسری چیز کی طرف منتقل کر کے بالکل اسی طرح اپنا تحفظ کر سکتا ہے جس طرح سیفٹی والو بائلر کا کرتا ہے کہ جونہی بھاپ (سٹیم) کا دباؤ خاص حد سے بڑھتا ہے، وہ فالتو بھاپ خارج کر دیتا ہے۔

جو قیدی پیچھے رہ جاتے تھے، انھیں کس طرح گولی مار کر ہلاک کر دیا جاتا تھا، پیئر نے اس قسم کی کوئی چیز نہ دیکھی اور نہ سنی حالانکہ ایک سو سے زیادہ افراد کو اسی طرح فنا کے گھاٹ اتارا جا چکا تھا۔ کاراتائیف روز بروز کمزور

سے کمزور تر ہوتا جا رہا تھا اور لا ریب اس کا بھی یہی انجام ہونا تھا لیکن پیئر اس کے بارے میں کبھی کچھ نہیں سوچتا تھا اور اپنے متعلق تو وہ اس سے بھی کم سوچتا تھا۔ اس کے حالات جتنے زیادہ سنگین اور مستقبل جتنا زیادہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا، اس کے ذہن میں جو خوش کن اور تسکین بخش خیالات، یادیں اور تخیلے آتے تھے، وہ اس کی موجودہ ابتر حالت سے اتنے ہی زیادہ ماورا ہوتے جا رہے تھے۔

13

بائیس تاریخ کو بوقت دوپہر پیئر اپنے پاؤں اور ناہموار زمین پر نظریں جمائے گدلی اور پھسلواں سڑک پر چلتا پہاڑی پر چڑھ رہا تھا۔ کبھی کبھار وہ نگاہیں اٹھا کر جانے پہچانے ہجوم کو دیکھ لیتا، جو اس کی ذات کا اتنا ہی حصہ بن چکا تھا جتنے کہ اس کے پاؤں تھے۔ ٹیڑھی ٹانگوں اور اودی رنگت والی کتیا سڑک کے کنارے کنارے اچھلتی کودتی چلی آ رہی تھی۔ بعض اوقات وہ اپنی پھرتی اور اطمینان کا ثبوت دینے کے لیے اپنی ایک پچھلی ٹانگ اوپر اٹھا لیتی اور تین ٹانگوں پر پھدکنے لگتی۔ اس کے بعد وہ دوبارہ چاروں ٹانگوں پر دوڑنا شروع کر دیتی اور ان کوؤں پر، جو مردار نوچ رہے ہوتے، بھونکنے لگتی۔ بونی کتیا کی جلد اور بال ماسکو کی نسبت کہیں زیادہ چمکیلے ہو گئے تھے اور اس کے مزاج میں کہیں زیادہ شگفتگی آ گئی تھی۔ چاروں اطراف مختلف حیوانات کی لاشیں پڑی تھیں ــ انسانوں سے لے کر گھوڑوں تک کی ــ جو گلنے سڑنے کے مختلف مراحل سے گزر رہی تھیں۔ چونکہ انسانوں کی وجہ سے بھیڑیے قریب نہیں پھٹک سکتے تھے، کتیا پیٹ بھر کر کھا سکتی تھی۔

صبح سے بارش ہو رہی تھی اور اگرچہ بظاہر یہی نظر آ رہا تھا کہ یہ کسی بھی وقت تھم سکتی ہے اور مطلع صاف ہو سکتا ہے لیکن مختصر وقفے کے بعد یہ پہلے کی نسبت زیادہ زوروں سے پڑنے لگی۔ تربتر سڑک مزید پانی جذب نہیں کر سکتی تھی اور اس کی لیکوں میں پانی نالوں کی طرح بہہ رہا تھا۔

پیئر دائیں بائیں نظریں دوڑاتا، تین تین کر کے اپنے قدموں کو گنتا اور اپنی انگلیوں پر ان کا حساب ملاتا چلا جا رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں بادلوں سے مخاطب ہوتا اور بار بار ان سے کہتا: ''برسو، اور برسو، جی بھر کر برسو!''

بظاہر وہ یہی سمجھ رہا تھا کہ وہ کچھ نہیں سوچ رہا لیکن اس کے باطن کی گہرائیوں میں اس کی روح کسی اہم اور تسکین بخش چیز کا تصور باندھ رہی تھی۔ یہ چیز انتہائی دقیق روحانی استخراج تھا اور یہ اس نے گزشتہ رات کاراتائیف کی گفتگو سے کیا تھا۔

گزشتہ رات پیئر پڑاؤ میں الاؤ کے قریب بیٹھا تھا۔ آگ بجھنے اور پیئر کو ٹھنڈ محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور اگلے الاؤ کے پاس چلا گیا۔ وہاں ابھی تک آگ خوب بھڑک رہی تھی اور وہیں پلاطون کاراتائیف اپنے سر اور سارے جسم کو اپنے اوورکوٹ سے، جیسے یہ کوئی پادریوں کا چغا ہو، ڈھانپے بیٹھا تھا اور اپنی خوشگوار اور متاثر کن آواز میں، جو ضعف و نقاہت کی وجہ سے کمزور و ناتواں ہو گئی تھی، قیدی سپاہیوں کو ایک کہانی سنا رہا تھا جو پیئر

ازیں پیشتر سن چکا تھا۔ رات ڈھل چکی تھی اور یہ وہ سمے تھا جب کاراتائیف کا بخار عام طور پر اتر چکا ہوتا تھا اور وہ خاص طور پر ہشاش بشاش نظر آنے لگتا تھا۔ جب پیئر آگ کے قریب پہنچا اور اس نے پلاطون کی کمزور اور مریضانہ آواز سنی اور اس کے رقت انگیز چہرے کو دیکھا جو آگ کی روشنی میں منور ہو گیا تھا۔ یک لخت اس کے دل پر تیر لگا۔ اس شخص پر اسے جو ترس آیا، اس نے خود اسے خوف میں مبتلا کر دیا اور عین ممکن ہے کہ وہ وہاں سے چمپت ہو جاتا لیکن پڑاؤ میں اور کوئی الاؤ نہیں تھا۔ چنانچہ وہ وہیں بیٹھ گیا اور کوشش کرنے لگا کہ اس کی نظر پلاطون پر نہ پڑے۔

''اچھا، تمھاری طبیعت کیسی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''میری طبیعت کیسی ہے؟ اگر ہم بیماری پر جزبز ہونے لگیں، خداوند ہمیں موت نہیں عطا کرے گا۔'' کاراتائیف نے کہا اور جھٹ پٹ اپنی کہانی،[18] جو وہ سنا رہا تھا، دوبارہ شروع کر دی۔

''چنانچہ، بھائی...'' اس نے آغاز کیا۔ اس کے زرد اور مریل چہرے پر مسکراہٹ اور اس کی آنکھوں میں مخصوص قسم کی پر مسرت روشنی تھی۔ ''چنانچہ، بھائی...''

پیئر کو یہ کہانی خاصے عرصے سے معلوم تھی۔ کاراتائیف اسے اکیلے کوئی نصف درجن مرتبہ سنا چکا تھا اور وہ جب بھی یہ کہانی سناتا تھا، بڑے جوشیلے اور جذباتی انداز سے سناتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے اس کے سنانے میں خاص لطف محسوس ہو رہا ہے۔ کہانی سے اچھی طرح آگاہ ہونے کے باوجود پیئر اسے یوں سن رہا تھا جیسے یہ کوئی نئی چیز ہو اور اس کے سنانے کے دوران میں کاراتائیف کو جس پرسکون بہجت و مسرت کا تجربہ ہو رہا تھا، وہ اپنے آپ پیئر کو منتقل ہو رہا تھا۔

یہ کہانی ایک بوڑھے سوداگر کی تھی۔ وہ اپنے خاندان کے ساتھ پارسائی اور خدا خوفی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ایک روز کرنا خدا کا کیا ہوا کہ وہ اپنے ایک دولت مند تاجر دوست کے ساتھ میلہ دیکھنے چلا گیا۔

ان دونوں نے ایک ہوٹل میں قیام کیا اور دونوں بستر استراحت پر دراز ہو گئے۔ اگلی صبح معلوم ہوا کہ دولت مند تاجر کا گلا کٹ چکا ہے اور اس کا روپیہ پیسہ لٹ چکا ہے۔ بوڑھے سوداگر کے تکیے کے نیچے سے ایک خون آلود چھری برآمد ہوئی۔ اس پر مقدمہ چلایا گیا، اسے کوڑے لگائے گئے اور اس کے نتھنے چیر دیے گئے۔ کاراتائیف کے الفاظ میں ''یہ سب کچھ قاعدے کے مطابق تھا''۔ اور اسے قید با مشقت کی سزا سنا دی گئی۔

''چنانچہ، میرے بھائی،'' (پیئر کہانی کے اس مقام پر پہنچا تھا) ''دس یا دس سے زیادہ سال گزر گئے۔ بوڑھا آدمی قید با مشقت بھگت رہا ہے۔ وہ راضی برضا ہے۔ اور ہونا بھی یہی چاہیے۔ اور کبھی کوئی برا کام نہیں کرتا۔ وہ خداوند سے صرف ایک ہی دعا کرتا ہے کہ وہ اسے موت دے دے۔ خیر، ایک روز تمام قیدی ایک جگہ اکٹھے ہو جاتے ہیں، جیسا کہ ہم یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ ان میں بوڑھا سوداگر بھی شامل ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرنے لگتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انھیں کس کس جرم کی سزا ملی ہے اور وہ خداوند کی نگاہوں میں کیوں گنہگار ہیں۔ ایک نے ایک آدمی کی اور دوسرے نے دو آدمیوں کی جان لی تھی، تیسرے نے ایک مکان کو آگ لگائی تھی جب کہ

ایک اور خالی خولی آوارہ گرد تھا اور اس نے کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ 'بڑے میاں' آپ نے کیا کیا تھا؟، وہ بوڑھے آدمی سے پوچھتے ہیں۔ 'آپ یہاں کیوں ہیں؟'' 'میرے پیارے بھائیو'، اس نے کہا، 'میں اپنے اور دوسرے کے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔ مگر میں نے نہ تو کسی کی جان لی ہے اور نہ کسی کا مال لوٹا ہے۔ میں نے صرف ایک ضرورت مند بھائی کی مدد کرنے کی کوشش کی تھی۔ میرے بھائیو، میں سوداگر تھا اور میرے پاس خداوند کا دیا بہت کچھ تھا۔' اور اس پر جو کچھ بیتا تھا، وہ انھیں سب کچھ تفصیل سے بتانے لگا۔ 'جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے،' اس نے کہا، 'مجھے کسی چیز کا ملال نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ خداوند میرے نفس کو سدھارنا چاہتا تھا۔ مجھے صرف اپنی بوڑھی بیوی اور بچوں کا افسوس ہے۔' اور بوڑھے کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اب ہوا یہ کہ جس شخص نے دوسرے سوداگر کو ٹھکانے لگایا تھا، عین ان لوگوں کے بیچ میں تھا۔ 'بڑے میاں' یہ کہاں کا واقعہ ہے؟' وہ پوچھتا ہے۔ 'کب اور کس مہینے؟' اور اس نے اس کے متعلق ایک ایک بات تفصیل سے پوچھی۔ اس کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ چنانچہ وہ اسی حالت میں بوڑھے کے قریب آیا — اور اس کے پاؤں پر گر پڑا! 'بڑے میاں' محض میری وجہ سے آپ کو یہ دکھ اٹھانا پڑا۔ میں سولہ آنے سچ عرض کر رہا ہوں! آپ کو بالکل ناجائز سزا ملی۔ دوستو،' اس نے کہا، 'اس آدمی کو خواہ مخواہ ایذائیں دی جا رہی ہیں۔ یہ جرم میں نے کیا تھا۔' اس نے بوڑھے سے مخاطب ہو کر کہا۔ 'اور جب آپ سوئے پڑے تھے، میں نے چھری آپ کے تکیے کے نیچے رکھ دی تھی۔ بڑے میاں، مجھے معاف کر دیں۔' اس نے گڑگڑا کر کہا۔ 'میں یسوع مسیح کا واسطہ دیتا ہوں!'''

کاراتائیف رک گیا۔ وہ مسکرا رہا تھا اور خوشی اس کی رگ رگ سے پھوٹ رہی تھی۔ اس نے الاؤ کی طرف بغور دیکھا اور لکڑیاں سمیٹ دیں۔

''اور بوڑھے آدمی نے کہا: 'خداوند تمھیں معاف کر دے گا۔ اس کی نظروں میں ہم سب گنہگار ہیں اور میں اپنے گناہوں کی سزا بھگت رہا ہوں۔' اور وہ زار و قطار رونے لگا۔ ... خیر، میرے دوستو، تمھارا کیا خیال ہے؟'' کاراتائیف نے مزید کہا اور وجد آور مسرت سے اور بھی یوں کھل گیا جیسے کہانی کی ساری دلکشی اور اصل نکتہ اس بات میں مضمر تھا، جو وہ اب کہنے والا تھا۔ ''میرے دوستو، تمھارا کیا خیال ہے؟ — قاتل حکام کے پاس گیا اور اس نے ان کے سامنے اعتراف کیا: 'میرے ضمیر پر چھ انسانوں کے قتل کا بوجھ ہے۔' (وہ بہت بڑا پاپی تھا۔) 'لیکن مجھے سب سے زیادہ افسوس اس ضعیف شخص کا ہوا ہے۔ اسے میری وجہ سے ناجائز مصائب برداشت نہ کرنے دیں۔' اس نے جو جو اعترافات کیے تھے، وہ سب لکھ لیے گئے اور کاغذات مناسب طریقے سے حکام بالا کی خدمت میں بھیج دیے گئے۔ جہاں کاغذات بھیجے گئے تھے، وہ جگہ بہت دور تھی۔ چنانچہ کارروائی کے شروع ہونے میں یعنی کاغذات کی خانہ پری میں حکام نے بہت زیادہ وقت صرف کر دیا، مگر آخر کار یہ زار تک پہنچ گئے۔ کچھ عرصے کے بعد زار کا فرمان آ گیا: 'سوداگر کو رہا کر دیا جائے اور اس کے لیے جو معاوضہ تجویز کیا گیا ہے، وہ اسے ادا کر دیا جائے۔' کاغذات پہنچ گئے اور بوڑھے کی ڈھنڈیا پڑ گئی۔ 'بوڑھا کہاں ہے، وہی جو ناجائز اور خواہ مخواہ سزا بھگت رہا ہے؟ زار کا حکم آ گیا ہے۔'

اور وہ اسے تلاش کرتے رہے!'' کاراتائیف کا جبڑا کانپنے لگا۔ ''لیکن خداوندا سے پہلے ہی معاف کر چکا تھا۔ اور وہ اسے پیارا ہو چکا تھا۔۔ تو یہ ہوا، میرے پیارے دوستو!'' کاراتائیف نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا۔ وہ کافی دیر خاموش بیٹھا رہا اور مسکرا مسکرا کر اپنے سامنے ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔

اور پیئر کے دل کا کنول کھل اٹھا لیکن یہ فی نفسہٖ کہانی کا اثر نہیں تھا بلکہ یہ کہانی کی پراسرار اہمیت، اسے سناتے ہوئے کاراتائیف کا چہرہ جس پر وقار مسرت سے دمکنے لگا تھا، وہ اور اس کی اس مسرت کی باطنی معنویت تھی، جس نے اسے یہ خوشی عطا کی تھی۔

14

"A vos places"* اچانک آواز گونجی۔

قافلے کے فوجیوں اور قیدیوں میں روح پرور ہلچل مچل گئی اور سب لوگوں کو توقع بندھ گئی کہ کوئی نشاط انگیز اور پروقار چیز وقوع پذیر ہوا چاہتی ہے۔ چاروں اطراف حکم کی آوازیں بلند ہونے لگیں اور بائیں جانب سے طرح دار وردیوں میں ملبوس سواروں کا جتھا قیدیوں کے گرد چکر کاٹتا اپنے عمدہ گھوڑے دوڑاتا نمودار ہوا۔ اعلیٰ حکام کی آمد پر لوگوں پر کھنچاؤ کی جو کیفیت طاری ہو جاتی ہے، وہ یہاں بھی ہر چہرے پر دکھائی دے رہی تھی۔ قیدیوں کی بھیڑ ایک جگہ اکٹھی ہو گئی اور انھیں سڑک کے پار دھکیل دیا گیا۔ قافلے کے فوجیوں نے صفیں ترتیب دے لیں۔

"L' Empereur! L' Empereur! Le marechal! de duc!"**

طرح دار گھوڑ سوار ابھی بمشکل گزرے ہوں گے کہ ایک گاڑی، جسے چھ سرمئی گھوڑے کھینچ رہے تھے، کھڑکھڑاتی آگے نکل گئی۔ پیئر کو ایک شخص کی، جس کے سر پر تکونا ہیٹ تھا اور جس کے بھرے بھرے خوبصورت سفید چہرے پر طمانیت کھیل رہی تھی، جھلک نظر آئی۔ یہ کوئی مارشل تھا۔ جب اس کی نگاہیں پیئر کے تومند اور بارعب جسم پر پڑیں، اس نے تیوریاں چڑھالیں اور منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

پیئر کو اس کی نظروں میں ہمدردی کے آثار دکھائی دیے لیکن اسے محسوس ہوا کہ وہ انھیں چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

باربرداری کے انچارج جرنیل نے اپنے لاغر گھوڑے کو چابک رسید کیا اور گاڑی کے پیچھے پیچھے بھاگنے لگا۔ اس کے سرخ چہرے پر تردد کے آثار نمایاں تھے۔ متعدد افسران ٹولی بنا کر کھڑے ہو گئے اور ان کے اردگرد فوجی سپاہیوں کی بھیڑ جمع ہو گئی۔ ہر شخص کے چہرے پر ہیجانی کیفیت اور پریشانی ہویدا تھی۔

''اس نے کیا کہا تھا؟ اس نے کیا کہا تھا؟'' پیئر نے انھیں ایک دوسرے سے پوچھتے سنا۔

* صفیں بنالو۔

** امپراطور! مارشل! ڈیوک!

جب مارشل گزر رہا تھا، تمام قیدی بے ترتیب ہجوم کی صورت میں اکٹھے ہو گئے تھے اور پیئر کی نظر کاراتائیف پر پڑ گئی تھی۔ اس نے اس صبح اسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے چھوٹے اوورکوٹ میں برچ کے درخت کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ابھی تک وہی مسرت جھلک رہی تھی جو گزشتہ رات تاجر کی، جسے بے گناہ سزا بھگتنا پڑی تھی، کہانی سنانے کے دوران میں وہاں رقصاں تھی لیکن اب وہ پروقار سکون سے دمک بھی رہا تھا۔

کاراتائیف نے اپنی گول گول شفیق آنکھیں پیئر کی طرف منتقل کر دیں۔ اب وہ اشکوں سے لبریز تھیں۔ وہ لاریب پیئر سے کچھ التجا کر رہی تھیں۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا تھا کہ وہ پیئر سے کچھ کہنا چاہتا ہے مگر پیئر کو وسوسوں نے گھیر لیا۔ وہ جھوٹ موٹ یوں ظاہر کرنے لگا جیسے اسے معلوم ہی نہ ہو سکا ہو کہ اس کی نگاہیں کیا کہہ رہی ہیں اور وہ جھٹ پٹ وہاں سے پرے کھسک گیا۔

جب قیدی دوبارہ روانہ ہوئے، پیئر نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کاراتائیف ابھی تک سڑک کے کنارے برچ کے درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ دو فرانسیسی اس کے بالکل قریب کھڑے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ پیئر نے دوبارہ پیچھے مڑ کر نہ دیکھا اور لنگڑاتا لنگڑاتا پہاڑی پر چڑھنے لگا۔

عقب میں اس مقام سے، جہاں کاراتائیف بیٹھا تھا، گولی چلنے کی آواز آئی۔ پیئر نے اسے واضح طور پر سنا لیکن عین اس لمحے اسے یاد آیا کہ اس نے ابھی تک یہ حساب نہیں لگایا کہ سمولنسک کتنی منازل دور ہے۔ اس نے یہ حساب مارشل کی آمد سے پہلے شروع کیا تھا۔ اس نے گنتی دوبارہ شروع کر دی۔ اتنے میں دو فرانسیسی، جن میں سے ایک کے ہاتھ میں سموکنگ گن تھی، پیئر کے قریب سے دوڑتے آگے نکل گئے۔ دونوں کے رنگ فق تھے۔ ان میں سے ایک نے ڈرتے ڈرتے پیئر پر سرسری نگاہ ڈالی۔ اور پیئر کو اس کے چہرے پر اس سے ملتا جلتا تاثر نظر آیا جو اس نے مقتل میں نوجوان فوجی کے چہرے پر دیکھا تھا۔ پیئر نے فوجی جوان کی طرف دیکھا اور اسے یاد آیا کہ یہ تو وہی شخص ہے جس نے دو روز پیشتر آگ پر اپنی قمیص خشک کرتے کرتے جھلسالی تھی اور انھوں نے بری طرح اس کا مذاق اڑایا تھا۔

ان کے پیچھے، جہاں کاراتائیف بیٹھا تھا، کتیا رقت انگیز آواز میں چیخنے چلانے لگی۔ ”احمق کی بچی، یہ چلا کیوں رہی ہے؟“ پیئر نے سوچا۔

اس کے ساتھی قیدیوں نے بھی، جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے، اس کی طرح مڑ کر اس جگہ کی طرف، جہاں گولی چلائی گئی تھی اور کتیا بھونک رہی تھی، دیکھنے سے احتراز کیا مگر ان سب کے چہرے گمبھیر نظر آ رہے تھے۔

15

گھڑسواروں کے ساز و سامان سے لدے پھندے چھکڑے، مارشل کی بار برداری کی گاڑیاں اور قیدی شام شیوو گاؤں میں رک گئے۔ تمام لوگ الاؤوں کے اردگرد جمع ہو گئے۔ پیئر آگ کے قریب چلا گیا۔ وہاں اس نے گھوڑے کا بھنا ہوا گوشت کھایا اور آگ کی طرف پشت کر کے نیچے لیٹ گیا۔ چشم زدن میں اسے نیند آ گئی۔۔۔ یہ

بالکل اسی طرح کی نیند تھی جیسی اسے بارودینو کی لڑائی کے بعد موژیسک میں آئی تھی۔

ایک بار پھر حقیقی واقعات اس کے خوابوں میں گڈمڈ ہو گئے اور ایک بار پھر کوئی، وہ خود یا کوئی اور شخص، اس کے خیالات وتصورات کو الفاظ کا جامہ پہنانے لگا۔ درحقیقت یہ وہی خیالات وتصورات تھے جو موژیسک میں اس کے ذہن میں در آئے تھے۔

''زندگی (ہی) سب کچھ ہے۔ زندگی خداوند ہے۔ ہر چیز تبدیل ہوتی اور آگے پیچھے حرکت کرتی رہتی ہے اور یہ حرکت خداوند ہے اور جب تک زندگی ہے، الوہیت کے وقوف میں راحت ہے۔ زندگی سے محبت کرنا خداوند سے محبت کرنا ہے۔ مشکل تریں اور بابرکت تریں کام اپنے مصائب، ناواجب مصائب، کے دوران میں زندگی سے پیار کرنا ہے۔''

''کاراتائیف!'' پیئر کے ذہن میں آیا۔

اور ایکا ایکی اس کے سامنے مدتوں کا فراموش کردہ شریف النفس بوڑھا آدمی، جو سوئٹزرلینڈ میں اسے جغرافیے کے اسباق دیا کرتا تھا، یوں آ کھڑا ہوا جیسے وہ جیتا جاگتا انسان ہو۔ ''ٹھہرو!'' پست قامت بوڑھے نے کہا اور اس نے پیئر کو گلوب (globe) دکھایا۔ یہ گلوب جیتے جاگتے اور تھرتھراتے گیند کی مانند تھا جس کی کوئی مستقل ابعاد نہیں ہوتیں۔ اس کی ساری کی ساری سطح قطروں پر مشتمل تھی، جنھیں خوب اچھی طرح دبا کر یک جا کر دیا گیا تھا۔ یہ قطرے ادھر ادھر متحرک تھے اور ایک دوسرے سے جگہیں تبدیل کر رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے کبھی مل کر ایک ہو جاتے یا کبھی ایک پھٹ کر بہت سوں میں منقسم ہو جاتا۔ ہر قطرہ پھیلنے اور حتی الامکان زیادہ سے زیادہ جگہ گھیرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تاہم دوسرے بھی اس سے ہیٹا نہیں رہنا چاہتے تھے، وہ بھی یہی تگ ودو کر رہے تھے۔ وہ اسے بھینچتے، بعض اوقات اسے نیست ونابود کر دیتے اور بعض اوقات خود اس میں جذب ہو جاتے۔

''یہ زندگی ہے،'' بوڑھے استاد نے کہا۔

''کتنی آسان اور واضح!'' پیئر نے سوچا۔ ''مجھے اس کا پہلے علم کیوں نہ ہوا؟''

''مرکز میں خداوند ہے، اور ہر قطرہ پھیلنے کی سعی کرتا ہے تاکہ وہ اسے (خداوند کو) انتہائی ممکنہ حد تک منعکس کر سکے۔ اور یہ بڑھتا ہے، پھیلتا ہے، دوسروں میں جذب ہوتا ہے، سطح سے غائب ہو جاتا ہے، گہرائیوں میں ڈوبتا ہے اور دوبارہ نمودار ہو جاتا ہے۔ یہی کچھ کاراتائیف کے ساتھ ہوا۔ وہ پھیلا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میرے بچے، تم سمجھ گئے نا؟'' استاد نے دریافت کیا۔

''سمجھ گئے؟[19] لعنت ہو تم پر!'' کوئی آواز گونجی اور پیئر کی آنکھ کھل گئی۔

اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ایک فرانسیسی، جس نے ابھی ابھی ایک روسی سپاہی کو دھکیل کر پرے کر دیا تھا، اکڑوں بیٹھا گوشت کا پارچہ بھون رہا تھا، جو اس نے بندوق صاف کرنے والی سلاخ پر ٹانک رکھا تھا۔ اس نے اپنی آستینیں اوپر چڑھا رکھی تھیں اور اس کے سرخ نیلے ہاتھ، جن پر بالوں کی بہتات تھی، اپنی چھوٹی چھوٹی

انگلیوں کے ساتھ نہایت مشاقی سے سلاخ گھما پھرا رہے تھے۔ دہکتے ہوئے کوئلوں کی روشنی میں اس کا سانولا، آزردہ چہرہ اور شکن آلود پیشانی صاف نظر آ رہی تھی۔

"اے کوئی فرق نہیں پڑتا!" اس نے اچانک ایک سپاہی کی طرف، جو اس کے پیچھے کھڑا تھا متوجہ ہو کر کہا۔ "بدمعاش، لٹیرے! دفع ہو جاؤ!"

سلاخ کو گھماتے پھراتے فرانسیسی نے پیئر کو افسردہ نگاہوں سے دیکھا۔ پیئر نے منہ دوسری طرف پھیر لیا اور اندھیرے میں جھانکنے لگا۔ ایک روسی قیدی، وہی سپاہی جسے فرانسیسی نے پرے دھکیل دیا تھا، آگ کے قریب بیٹھا اپنے ہاتھ سے کوئی چیز تھپک رہا تھا۔ پیئر نے ذرا غور سے دیکھا۔ یہ اودی رنگت کی کتیا تھی اور اور سپاہی اس کی دم ہلا جلا رہا تھا۔

"ارخ، یہ آ گئی..." پیئر نے کہا۔ "اور پلاط—" اس نے کچھ کہنا چاہا لیکن وہ اپنی بات مکمل نہ کر سکا۔

ایکا ایکی یادیں ہجوم در ہجوم اس کے ذہن میں کلبلانے اور آپس میں خلط ملط ہونے لگیں — درخت کے نیچے بیٹھے پلاطون کا اسے دیکھنے کا انداز، اس جگہ سے گولی چلنے کی آواز، کتیا کا واویلا، اس کے قریب بھاگتے ہوئے دو فرانسیسیوں کے مجرم چہرے، دھواں اگلتی بندوق، موجودہ پڑاؤ سے کاراتائیف کی غیر حاضری — اور یہ امر کہ کاراتائیف ہلاک ہو چکا ہے، اس کے ذہن میں جا نشیں ہوا چاہتا تھا کہ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ کہاں سے ایک شام کی یاد جو اس نے کیف میں اپنے مکان کے برآمدے میں ایک خوب رو پولستانی خاتون کے ساتھ گزاری تھی، اس کے دماغ میں آ گھسی، اور اس نے اس روز کے واقعات و تاثرات کا آپس میں تعلق قائم کیے یا ان سے کوئی نتائج اخذ کیے بغیر اپنی آنکھیں بند کر لیں اور موسم گرما کے دیہاتی مناظر، نہانے دھونے کے عمل اور اس مائیاتی تھرتھراتے گلوب کی یادوں میں گڈمڈ ہو گئے اور وہ کسی بے جان شے کی طرح پانی میں غرق ہونے لگا یہاں تک کہ اس پانی نے اس کے سر کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

❦

طلوع آفتاب سے قبل شور و غل اور سنسناتی گولیوں کی آوازوں نے اسے جگا دیا۔ فرانسیسی سپاہی اس کے قریب سے آگے بھاگے جا رہے تھے۔

"قازق!" ان میں سے ایک نے چلا کر کہا اور ایک ثانیے بعد روسیوں کے ہجوم نے پیئر کو گھیر لیا۔

کافی دیر تک اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ اسے اپنے چاروں اطراف اپنے ساتھی خوشی کے آنسو بہاتے اور سسکیاں بھرتے نظر آئے۔

"بھائیو، پیارو، دوستو!" بوڑھے سپاہی قازقوں اور ہوزاروں سے گلے مل رہے اور چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

قیدیوں کے ارد گرد ہوزاروں اور قازقوں کا ہجوم اکٹھا ہو گیا۔ وہ والہانہ انداز سے انھیں ملبوسات، بوٹ اور

ڈبل روٹیاں پیش کر رہے تھے۔ پیئر ان کے مابین بیٹھا آنسو بہاتا اور سسکیاں بھرتا رہا۔ شدت جذبات سے اس کا گلا رندھ چکا تھا اور اس کے منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکل رہا تھا۔ جو پہلا سپاہی اس کے قریب آیا، وہ اس سے بغل گیر ہو گیا اور روتے روتے اس کا منہ چومنے لگا۔

❦

دلوخوف زمیندار کے خستہ مکان کے گیٹ پر کھڑا رہا۔ اس نے غیر مسلح فرانسیسیوں کے ہجوم کو اپنے پاس سے گزرنے اور باہر نکل جانے دیا۔ جو کچھ ہوا تھا، اس نے فرانسیسیوں کو ہیجان میں مبتلا کر دیا تھا اور وہ آپس میں زور شور سے باتیں کر رہے تھے۔ جب وہ دلوخوف کے، جو چھانٹے سے اپنے بوٹوں کی گرد جھاڑ رہا اور انھیں سرد مہر اور پتھریلی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، قریب سے گزرتے، انھیں اس کی نگاہوں میں امید کی کوئی کرن نظر نہ آتی اور وہ خاموشی اختیار کر لیتے۔ دلوخوف کا ایک قازق دوسری طرف کھڑا تھا۔ وہ قیدیوں کی گنتی کر رہا تھا۔ جب سینکڑا پورا ہو جاتا، وہ چاک سے گیٹ پر نشان لگا دیتا۔

''کتنے؟'' دلوخوف نے پوچھا۔

''دوسرا سینکڑا جا رہا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

"Filez, filez!"* دلوخوف کہے جا رہا تھا (اس نے یہ لفظ فرانسیسیوں سے سیکھا تھا) اور جب اس کی نگاہیں فرانسیسی کی نگاہوں سے چار ہوتیں، ان میں سفاکی جھلکنے لگتی۔

دینی سوف، جس کا سر ننگا اور چہرہ افسردہ تھا، قازقوں کے، جو پیتا رستوف کی لاش اٹھائے جا رہے تھے، پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ قازقوں نے باغیچے میں گڑھا کھود لیا تھا اور اب ان کا رخ اسی کی جانب تھا۔

16

28 اکتوبر سے پالا پڑنے لگا اور اس دن سے فرانسیسیوں کے فرار نے اور بھی الم ناک صورت اختیار کر لی۔ وہ یا تو کڑاکے کی سردی کے ہاتھوں فنا ہو رہے تھے یا پڑاؤوں میں الاؤوں کے قریب بیٹھ بیٹھ کر اپنے آپ کو بھون اور ہلاک کر رہے تھے، جب کہ گاڑیاں، جنھیں سموری لبادوں میں مستور کوچوان چلا رہے تھے، امپراطور، بادشاہوں اور ڈیوکوں کا مال غنیمت لادے ان سے آگے نکلتی جا رہی تھیں، تاہم فرانسیسی فوج کے فرار اور انتشار کا جو عمل ماسکو سے بوقت روانگی شروع ہوا تھا، وہ اصلاً اسی طرح جاری رہا۔

ماسکو سے ویازما پہنچتے پہنچتے 73 ہزار افراد پر مشتمل فرانسیسی فوج کی (ان میں گارڈز شامل نہیں۔ انھوں نے ساری جنگ کے دوران میں لوٹ مار کے علاوہ اور کوئی کام نہیں کیا تھا۔) نفری گھٹتے گھٹتے صرف چھتیس ہزار رہ گئی حالانکہ مختلف

* قطار بنا کر، قطار بنا کر

لڑائیوں میں جو اشخاص ہلاک ہوئے تھے، ان کی تعداد پانچ ہزار سے زیادہ نہیں بنتی تھی۔ اگر اس کو تدریجی عمل کا ابتدائی مرحلہ تصور کر لیا جائے، پھر اس کے بعد درجہ وار جو کچھ ہوا، اس کا ریاضیاتی اعتبار سے بالکل صحیح صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ سردی کی شدت کی کمی بیشی، روسیوں کے تعاقب، سڑکوں کی رکاوٹوں یا کسی بھی دوسری بیان کردہ صورت حال سے قطع نظر ماسکو سے ویازما، ویازما سے سمولنسک، سمولنسک سے بیریزینا اور بیریزنا سے ولنا تک فرانسیسی سپاہ اسی نسبت سے گھٹتی اور تباہ ہوتی رہی۔ بجائے اس کے کہ فرانسیسی فوج ویازما سے آگے بھی تین ہی کالموں میں سفر کرتی، اس کی ساری نفری آپس میں خلط ملط ہوگئی اور اس نے ہجوم کی صورت اختیار کر لی، اور آخر تک اس کی یہی کیفیت رہی۔ اس سلسلے میں بیخ تیئے نے اپنے امپراطور کو مندرجہ ذیل رپورٹ ارسال کی (ویسے ہمیں معلوم ہے کہ جب کمانڈنگ افسران فوج کی حالت بیان کرتے ہیں، وہ کس طرح سچائی سے انحراف کرتے ہیں):

> گزشتہ دو تین دنوں کے سفر کے مختلف مراحل کے دوران میں مجھے مختلف کوروں کی حالت کا مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کی یوئر میجسٹی کو رپورٹ پیش کرنا اپنا فرض گردانتا ہوں۔ تقریباً ساری کی ساری سپاہ انتشار اور بدنظمی کا شکار ہو چکی ہے۔ قریب قریب ہر رجمنٹ کی یہ کیفیت ہے کہ اس کی صرف چوتھائی نفری اپنے پرچم تلے سفر کر رہی ہے۔ جہاں تک باقی افراد کا تعلق ہے، وہ خوراک تلاش کرنے کی امید میں اور نظم وضبط کی پابندیوں سے بچنے کے خیال سے جدھر منہ اٹھاتے ہیں، چل پڑتے ہیں۔ عام طور پر ان سب کا یہ خیال ہے کہ سمولنسک ایک ایسا مقام ہے جہاں انھیں سنبھالا مل سکتا ہے۔ گزشتہ چند دنوں کے دوران میں متعدد جوانوں کو اپنے ہتھیار اور کارتوس پھینکتے دیکھا گیا ہے۔ یوئر میجسٹی بالآخر کیا کرنا پسند کریں گے، اس سے قطع نظر یوئر میجسٹی کی سپاہ کے حالات صرف اسی صورت میں بہتر بنائے جاسکتے ہیں کہ تمام فوج کو سمولنسک میں اکٹھا کر لیا جائے۔ اور وہاں اولین اقدام یہ کیا جائے کہ گھوڑوں کے بغیر گھڑسوار دستوں، غیر ضروری مال واسباب، توپ خانے کے سامان، جو موجودہ لشکر کی ضروریات سے کہیں زیادہ ہے، اور اس قسم کی دوسری اشیاء سے چھٹکارا حاصل کیا جائے۔ بھوک اور تھکاوٹ نے جوانوں کا کچومر نکال دیا ہے۔ اور انھیں محض چند روز کے آرام ہی کی نہیں، بلکہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے کے لیے، خوراک کی بھی (اشد) ضرورت ہے۔ ان گزشتہ چند ایام کے دوران میں بے شمار اشخاص سڑکوں پر یا پڑاؤوں میں موت سے ہم آغوش ہو چکے ہیں۔ حالات روز بروز مسلسل بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور اندیشہ لاحق ہونے لگا ہے کہ اگر ان کی اصلاح کی کوئی سبیل نہ کی گئی، پھر لڑائی کی صورت میں ہم اپنی سپاہ کو کنٹرول نہیں کر سکیں گے۔
>
> 9 نومبر: سمولنسک سے بہ فاصلہ بیس میل

فرانسیسی گرتے پڑتے جب اپنے خوابوں کی موعودہ سرزمین، سمولنسک پہنچے، وہ خوراک کے حصول کے لیے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارنے اور اپنی ہی رسد کو لوٹنے لگے۔ اور جب سب کچھ لٹ پٹ چکا، وہ مزید آگے بھاگنے لگے۔

وہ آگے جا تو رہے تھے لیکن انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں۔ اور اس ناطے نپولین کو تو بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہے ہیں کیونکہ اسے حکم دینے والا کوئی نہیں تھا۔ تاہم اس کی اور اس کے حواریوں کی عادات میں سرمو فرق نہ آیا: وہ بدستور احکام، مراسلے، رپورٹیں اور فرمان ہائے یوم تحریر کرتے رہے، ایک دوسرے سے Prince d'Eckmuhl, mon cousins sire* roi de Naples' جیسے القابات و خطابات سے مخاطب ہوتے اور اس قسم کی دوسری باریکیوں میں الجھے رہے۔ لیکن یہ احکام اور رپورٹیں محض کاغذی کارروائیاں تھیں، ان پر عمل کوئی نہیں کرتا تھا کیونکہ انھیں عملی جامہ پہنایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ اور اگرچہ وہ ایک دوسرے کو میجسٹی، ہائی نس، کزن وغیرہ کہتے رہتے تھے، وہ سبھی محسوس کر رہے تھے کہ وہ بدبخت اور قابل نفرین لوگ ہیں کیونکہ وہ بے شمار برائیوں کے مرتکب ہوئے ہیں اور اب اپنے کیے کا پھل پا رہے ہیں۔ فوج کے بارے میں اپنی جھوٹ موٹ کی تشویش کے باوجود ہر شخص صرف اپنی ذات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ کہ یہاں سے اپنے آپ کو جلد از جلد کیسے نکالا اور بچایا جا سکتا ہے۔

17

ماسکو سے دریائے نیمین تک پسپائی کے دوران میں فرانسیسی اور روسی فوجوں کی نقل و حرکت آنکھ مچولی کے (روسی) کھیل سے مشابہ تھی۔ اس کھیل میں ہوتا یہ ہے کہ دو کھلاڑیوں کی آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک کبھی کبھار گھنٹی بجا دیتا ہے تاکہ دوسرے کو اس کا پتا نشان معلوم ہو جائے۔ شروع شروع میں وہ یہ گھنٹی بے دھڑک بجاتا رہتا ہے، لیکن جب وہ مشکل میں پھنس جاتا ہے، پھر وہ چپکے سے ادھر ادھر کھسکنے کی کوشش کرتا ہے اور اکثر اوقات جب وہ یہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ وہ حریف کے قابو میں آنے سے بچ گیا ہے، وہ دوڑتا دوڑتا سیدھا اس کے بازوؤں میں آ گرتا ہے۔

ابتدا میں جب فرانسیسی فوج ابھی کالوگا روڈ کے آس پاس تھی، وہ بہانگ دہل چلتی رہی، لیکن بعد ازاں جب اس نے سمولنسک روڈ پر سفر شروع کیا، اس نے اپنی گھنٹی کا ٹلکن کس کر پکڑ لیا اور اکثر اوقات جب وہ یہ سمجھنے لگتی تھی کہ وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو رہی ہے، وہ سیدھی روسی سپاہ سے ٹکرا جاتی۔

فرانسیسی جس تیزی سے بھاگے جا رہے تھے اور روسی جس عجلت سے ان کا تعاقب کر رہے تھے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑے نڈھال ہو گئے۔ چنانچہ دشمن کے ٹھور ٹھکانے کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض سے جو اصل

* عالی جاہ، مائی کزن (برادرم)، پرنس آف ایک موہل، شاہ نیپلز

ذریعہ — گھڑسواروں کی ریکی — کام آتا ہے، وہ دستیاب نہ رہا۔ مزید برآں دونوں افواج جس تواتر اور سرعت سے اپنی پوزیشنیں تبدیل کرتی رہیں، اس کا انجام یہ ہوا کہ جو معلومات حاصل ہوتیں، وہ ہمیشہ بعد از وقت ثابت ہوتیں۔ اگر ایک روز یہ اطلاع ملتی کہ کل دشمن فلاں مقام پر دیکھا گیا ہے، تو تیسرے دن، جب اس اطلاع پر عمل ہو سکتا تھا، معلوم ہوتا کہ وہ دو دن کے فاصلے پر مزید آگے نکل گیا ہے اور اب بالکل مختلف مقام پر پہنچ گیا ہے۔

ایک فوج بھاگ رہی تھی اور دوسری اس کا تعاقب کر رہی تھی۔ سمولنسک سے آگے فرانسیسیوں کے سامنے متعدد سڑکیں موجود تھیں۔ آدمی کو خیال آتا ہے کہ اپنے چار روزہ قیام کے دوران میں انھوں نے غنیم کا اتا پتا معلوم کر لیا ہوگا، کوئی سودمند منصوبہ وضع کر لیا ہوگا اور کوئی نئی بات سوچ لی ہوگی۔ لیکن چار دن کے آرام کے بعد کسی قسم کی چال، تدبیر یا منصوبے کے بغیر بھیڑ دوبارہ پٹے پٹائے راستے پر دوڑنے لگی۔ انھوں نے دائیں دیکھا نہ بائیں، بلکہ قدیم ترین — اور بدترین — شاہراہ پر، جو کراسنایا[20] اور اورشا[21] میں سے گزرتی ہے، ہو لیے۔

فرانسیسیوں کو توقع تھی کہ دشمن سامنے سے نہیں، بلکہ عقب سے حملہ کرے گا، چنانچہ انھوں نے اپنی پسپائی کی رفتار مزید تیز کر دی۔ اس کوشش میں کچھ گروہ بہت آگے نکل گئے اور کچھ خاصا پیچھے رہ گئے۔ یوں مختلف گروہوں کے مابین فاصلہ بڑھنے لگا اور بڑھتے بڑھتے چوبیس گھنٹے تک پھیل گیا۔ سب سے آگے امپراطور، اس کے پیچھے (مختلف محروسہ ممالک کے) بادشاہ اور ان کے پیچھے ڈیوک تھے۔ روسی فوج کا خیال تھا کہ نپولین دریائے دنیپر عبور کرنے کے بعد دائیں طرف مڑ جائے گا — اور اس کے لیے واحد معقول راستہ بھی یہی تھا — چنانچہ وہ خود دائیں طرف مڑ گئی اور کراسنایا کے قریب شاہراہ پر چڑھ گئی۔ اور یہاں آنکھ مچولی کے کھیل کی طرح فرانسیسیوں کی ہمارے ہراول دستوں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی۔ فرانسیسیوں کو جب یوں غیر متوقع طور پر دشمن کا سامنا کرنا پڑا، ان کی مت ماری گئی۔ اور وہ جہاں تھے، خوف و ہراس کے عالم میں وہیں رک گئے۔ اس کے بعد وہ دوبارہ بھاگنے لگے لیکن اپنے ان ساتھیوں کو، جو عقب میں تھے، دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ گئے۔ تین دن تک فرانسیسی فوج کی مختلف ٹکڑیاں — پہلے وائسرائے (موغا)، پھر داؤو اور اس کے بعد نے (Ney) کے دستے — الگ الگ روسی فوج سے متصادم ہوتی رہیں۔ ان سب نے ایک دوسرے کا ساتھ چھوڑا، اپنے سامان اور توپ خانوں سے ہاتھ اٹھایا، اپنے نصف آدمیوں سے منہ موڑا اور دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ روسیوں سے بچنے کے لیے وہ نیم دائرہ بناتے دائیں طرف مڑے اور صرف راتوں کو سفر کرنے لگے۔

نے سب سے آخر میں تھا۔ وہ اس لیے پیچھے رہ گیا تھا کیونکہ وہ بارود سے سمولنسک کی فصیلیں گرا رہا تھا۔ (یہ فصیلیں کسی کا کچھ نہیں بگاڑ رہی تھیں اور نہ کسی کے راستے میں مزاحم تھیں۔ فرانسیسیوں کی اپنی حالت خاصی خستہ و خراب تھی۔ اس کے باوجود یا اس کی وجہ سے وہ اس فرش کو، جسے انھوں نے خود نقصان پہنچایا تھا، سزا دینا چاہتے تھے۔) نپولین سے وہ اورشا پہنچ کر ملا۔ اس کی کور دس ہزار افراد پر مشتمل تھی لیکن کراسنایا کی جھڑپ کے بعد اس کے ساتھ صرف ایک ہزار اشخاص رہ گئے۔ وہ باقی نفری اور توپیں وہیں چھوڑ آیا، چوری چھپے راتوں کو سفر کرتا رہا اور اس

نے دریائے دنیپر ایک ایسے مقام سے عبور کیا جہاں جنگل خاصا گھنا تھا۔

اورشا سے انھوں نے ولنا کا رخ کیا۔ متعاقب سپاہ کے ساتھ ان کا ابھی تک آنکھ مچولی کا کھیل جاری تھا۔ جب وہ دریائے بیریزینا کے کنارے پہنچے، وہ ایک بار پھر ژولیدہ فکری کا شکار ہو گئے۔ بہت سے دریا میں ڈوب گئے۔ بہت سوں نے ہتھیار ڈال دیے لیکن جو دریا عبور کرنے میں کامیاب ہو گئے، وہ تیزی سے آگے بھاگتے رہے۔ ان کے سپریم کمانڈر نے سموری کوٹ پہنا، سلیج پر سوار ہوا اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑ چھاڑ کر اکیلا ہی ہوا ہو گیا۔ باقیوں میں سے جو بھاگ سکتے تھے، بھاگ گئے، جن میں ہمت نہیں رہی تھی، انھوں نے یا تو ہتھیار ڈال دیے یا مر کھپ گئے۔

18

مہم کا یہ حصہ فرانسیسیوں کے فرار پر مشتمل ہے۔ اس کے دوران میں انھوں نے اپنے آپ کو نیست و نابود کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ان کے بس میں تھا۔ اس تاریخ سے، جب انھوں نے کالوگا روڈ پر سفر کا آغاز کیا، اس تاریخ تک، جب ان کا قائد انھیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گیا، اس بے ترتیب ہجوم کی ایک بھی نقل و حرکت ایسی نہیں ہے جو سمجھ میں آتی ہو۔ چنانچہ آدمی کو خیال آتا ہے کہ ان مورخین کو، جو انبوہ کے افعال کو فرد واحد کی مرضی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، مہم کے اس دور میں اپنا نظریہ منطبق کرنا ناممکن معلوم ہوا ہوگا۔ لیکن نہیں۔ مؤرخین نے اس مہم کے بارے میں کتابوں کا پہاڑ برابر انبار لگا دیا ہے۔ ان سب میں ہمیں یہ بتایا گیا ہے کہ نپولین نے فوج کی کیسے تقسیم و ترتیب کی، کیسی کیسی چالیں چلیں، فوج کی رہنمائی کے لیے کیسے کیسے منصوبے وضع کیے اور مارشلوں نے کس نوعیت کی عسکری عبقریت کا مظاہرہ کیا۔

نپولین نے جب مالا یاروسلاوتس سے پسپائی کا آغاز کیا، اسے ایک ایسی سڑک تک رسائی حاصل تھی، جو ایک ایسے علاقے سے گزرتی تھی جہاں رسد بکثرت دستیاب تھی اور اس کی متوازی شاہراہ تک، جس پر بعد ازاں کوتوزوف نے اس کا تعاقب کیا۔ اس کی یہ پسپائی قطعی غیر ضروری تھی اور اس نے اس کے لیے جو سڑک منتخب کی، وہ بالکل تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ تاہم ہمیں یہ سمجھایا جاتا ہے کہ پسپائی اور شاہراہ کا انتخاب دونوں گہری سوچ بچار کا نتیجہ تھے۔ سمولنسک سے اورشا تک اس کی پسپائی کے پیچھے بھی اسی قسم کے عمیق غور و فکر کا ذکر کیا جاتا ہے۔ پھر کراسنایا میں اس کی رستمی کی داستان بیان کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہاں وہ غنیم سے پنجہ لڑانے اور ذاتی طور پر کمان سنبھالنے کے لیے تیار تھا۔ اس نے برچ کی چھڑی پکڑی اور اعلان کیا:

"J'ai assez fait l'empereur, il est temps de faire le general."*

اس نے یہ الفاظ کہے، فوج کو، جو مختلف ٹکڑیوں میں بٹ چکی تھی، مقدر کے حوالے کیا اور خود بلا توقف سر پر پاؤں رکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔

* امپراطور کی حیثیت سے تو میں خاصے طویل سے فرائض سرانجام دے رہا ہوں۔ اب وقت آ گیا ہے کہ میں جرنیل بن کر بھی دکھاؤں۔

پھر ہمیں مارشلوں، بالخصوص نے (Ney) کے حوصلے، جرأت اور عالی ظرفی کی داستان سنائی جاتی ہے۔ اس کی عالی ظرفی یہ تھی کہ اس نے اپنے پرچم، توپ خانہ اور نوے فیصد لشکری پیچھے چھوڑے اور خود راتوں کو جنگلوں میں بل کھاتے راستوں پر چلتا اور چوری چھپے دریائے دنیپر عبور کرتا اور شا بھاگ گیا۔

اور اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ یہ عظیم امپراطور اپنی دلیر فوج کو بیچ منجدھار میں چھوڑ کر قطعی طور پر فرار ہو گیا، لیکن مورخین اس کے اس فعل کو بھی عظیم کارنامہ اور عبقریت کا شاہ کار بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس کا یہ قطعی فرار بھی، جسے عام زبان میں پرلے درجے کی ذلالت کہا جائے گا، مورخین کی نگاہ میں حق بجانب ٹھہرتا ہے۔

جب تاریخی استدلال کے لچک دار دھاگوں کو مزید کھینچنا ممکن نہیں رہتا، مورخین کسی نہ کسی طرح ان افعال پر بھی، جو ان چیزوں کے، جنھیں بنی نوع انسان صحیح، اور منصفانہ بھی، قرار دیتے ہیں، قطعی متضاد ہوتے ہیں، ''عظمت'' کا نشان ثبت کر دیتے ہیں کیونکہ ''عظیم'' کبھی خطار کار نہیں ہوتا، انتہائی مہلک غلطی کے لیے بھی اسے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

"C'est grand!"* مورخین فیصلہ سنا دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی نیکی اور بدی کا وجود ختم ہو جاتا ہے، صرف "grand" اور "pas grand"** باقی رہ جاتے ہیں۔ grand نیک ہے اور pas grand بد۔ ان کی سمجھ بوجھ کے مطابق grand بعض مخصوص قسم کے چوپایوں کی خصوصیت ہے جنھیں وہ ''ہیرو'' کا نام دیتے ہیں۔ جب نپولین گرم سموری کوٹ پہن کر فرار ہو کر گھر پہنچ جاتا ہے اور اپنے رفقا اور دوسرے لوگوں کو جنھیں وہ (اپنی دانست میں) خود وہاں لایا تھا، نیست و نابود ہونے کے لیے چھوڑ دیتا ہے، اپنے اس فعل کو وہ que c'est grand*** گردانتا ہے اور اس کی آتما شانت ہو جاتی ہے۔

"Du sublime au ridicule il n'y a qu'un pas,"****

وہ کہا کرتا تھا (وہ اپنے آپ کو 'جلیل' تصور کرتا تھا۔) اور پورے پچاس سال سے پوری دنیا یہی جگالی کیے جا رہی ہے:

"Sublime! Grand! Napoleon le Grand!"

Du sublime au ridicule il n'y a qu'un pas!

اور کسی اللہ کے بندے کو بھولے سے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس عظمت کو، جو راستی اور ناراستی کے پیمانے پر پورا نہیں اترتی، تسلیم کرنا یہ اعتراف کرنے کے برابر ہے کہ آپ خود لاشے ہیں اور بے پناہ حد تک گھٹیا اور ارذل ہیں۔

* وہ عظیم ہے۔

** نا عظیم۔

*** یہ عظیم کارنامہ تھا۔

**** From the sublime to the ridiculous there is only one step. جلیل اور مضحک کے مابین صرف ایک قدم کا فاصلہ ہوتا ہے۔

ہمارے لیے، جنھیں یسوع نے نیکی اور بدی کا معیار فراہم کر دیا ہے، دنیا کی کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کے لیے ہمارے پاس پیمانہ نہ ہو۔ اور جہاں سادگی، نیکی اور صداقت عدم موجود ہوں، وہاں عظمت بھی موجود نہیں ہو سکتی۔

19

وہ کون سا روسی ہے جسے 1812 کی مہم کے آخری دور کی روداد پڑھنے کے بعد تاسف، عدم اطمینان اور پریشانی کے ناخوشگوار احساس کا تجربہ نہیں ہوا ہوگا؟ کون ہے جس نے اپنے آپ سے یہ نہیں پوچھا: جب ہماری تینوں افواج کو عددی برتری حاصل تھی اور انھوں نے فرانسیسیوں کو گھیرے میں لے لیا تھا، جب بے ترتیب، فاقہ کش اور یخ بستہ فرانسیسی ہجوم اور در ہجوم ہتھیار ڈال رہے تھے اور جب (جیسا کہ مورخین ہمیں بتاتے ہیں) روسیوں کا مقصد ہی فرانسیسیوں کو روکنا، ان کے فرار کے راستے منقطع کرنا اور ان سب کو زیر حراست لینا تھا، پھر ان سب کو پکڑ ا یا ملیامیٹ کیوں نہ کیا گیا؟

روسی فوج نے عددی کمتری کے باوجود بارودینو میں فرانسیسیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا لیکن جب فرانسیسیوں کو پکڑنا اس کا مقصد قرار پایا اور وہ انھیں تین اطراف سے اپنے گھیرے میں لے چکی، پھر وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کیوں ناکام رہی؟ کیا فرانسیسی ہم سے اتنا ہی زیادہ برتر تھے کہ ہماری سپاہ، جو تعداد اور حوصلے کے اعتبار سے ان سے کہیں بہتر حالت میں تھی، انھیں شکست نہ دے سکی؟ ایسا کیوں ہوا اور کیسے ہوا؟

تاریخ (یا اس نام سے جو چیز بھی منسوب ہے) ان سوالات کے جواب میں کہتی ہے کہ اس کی وجہ یہ تھی کہ کوتوزوف، ترماسوف، چگا گوف یا فلاں فلاں جرنیل فلاں فلاں چال چلنے میں ناکام رہے۔

لیکن انھوں نے یہ چالیں کیوں نہ چلیں؟ اگر وہ پہلے سے طے شدہ منصوبے پر عمل کرنے میں ناکام رہے، ان پر مقدمات کیوں نہ چلائے گئے اور انھیں سزائیں کیوں نہ دی گئیں؟ تاہم اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ کوتوزوف، چگا گوف اور دیگر اشخاص ان روسی ناکامیوں کے ذمہ دار تھے، پھر بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب کراسنایا اور بیریزینا دونوں مقامات پر ہمیں عددی برتری حاصل تھی، فرانسیسی فوج اپنے امپراطور، بادشاہوں اور مارشلوں سمیت پکڑی کیوں نہ گئی حالانکہ روسیوں کا مقصد ہی یہی تھا؟

روسی عسکری مصنفین اس عجیب وغریب صورت حال کی وضاحت بدیں الفاظ کرتے ہیں: "اس کا سبب یہ تھا کہ کوتوزوف نے جارحانہ کارروائی کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔" ان کا یہ دعویٰ بالکل لایعنی اور بے تکا ہے کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ کوتوزوف ویازما اور تاروتینو کے مقامات پر سپاہ کو حملے کرنے سے روک نہیں سکا تھا۔

روسی فوج جس نے کم تر تعداد کے باوجود بارودینو میں دشمن کا، جب وہ اپنی قوت اور وسائل کے ساتھ میدان میں اترا تھا، بھرکس نکال دیا تھا۔ پھر اس نے کراسنایا اور بیریزینا میں اپنی برتر تعداد کے باوجود فرانسیسیوں کے غیر منظم ہجوموں سے کیوں شکست کھائی؟[22]

اگر روسیوں کا مقصد نپولین اور اس کے مارشلوں (کے راستے) کا انقطاع کرنا اور انھیں گرفتار کرنا تھا ـــ اور یہ مقصد نہ صرف ناکام بنا دیا گیا بلکہ اس کے حصول کی تمام کوششوں پر بڑے توہین آمیز انداز سے پانی پھیر دیا گیا۔ پھر مہم کے اس دور کو اگر فرانسیسی اپنی فتوحات کا سلسلہ بنا کر پیش کرتے ہیں، تو وہ ٹھیک ہی کرتے ہیں اور روسی مورخین کا یہ دعویٰ کہ اس دور میں کامرانیاں ہمارے حصے میں آئی تھیں، غلط ٹھہرتا ہے۔

روسی عسکری مصنفین جہاں تک منطقی تقاضوں کا ساتھ دے سکتے ہیں، ان نتائج کو تسلیم کر لیتے ہیں اور وہ جرأت و دلیری، جاں نثاری وغیرہ کے متعلق شاعرانہ طرزِ بیان اختیار کرنے کے باوجود بادلِ ناخواستہ یہ ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ماسکو سے فرانسیسیوں کی پسپائی نپولین کے لیے فتوحات اور کوتوزوف کے لیے شکستوں کے سلسلے پر محیط ہے۔

لیکن قومی پندار کو کاملاً ایک طرف رکھنے کے بعد آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس نتیجے میں تضاد پایا جاتا ہے، کیونکہ فرانسیسیوں کی فتوحات کے سلسلے نے انھیں بالکل نیست و نابود کر دیا جب کہ روسیوں کی شکستیں دشمن کی کامل تباہی اور ان کے اپنے وطن کی آزادی کا باعث بنیں۔

اس تضاد کی وجہ یہ ہے کہ مورخین نے فرماں رواؤں اور جرنیلوں کے خطوط، یادداشتوں پر مبنی کتابوں، مختلف رپورٹوں اور منصوبوں وغیرہ کی مدد سے واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد 1812 کی مہم کے اس دور کے ساتھ ایک مقصد وابستہ کر دیا، جس کا حقیقتاً کوئی وجود نہیں تھا ـــ مبینہ طور پر یہ مقصد نپولین، اس کے مارشلوں اور فوج کا انقطاع اور گرفتاری تھا۔

اس قسم کا مقصد نہ کبھی تھا اور نہ کبھی ہو سکتا تھا کیونکہ اس قسم کا مقصد بالکل لایعنی ہوتا اور اس کا حصول قطعی ناممکن۔ یہ لایعنی اس لیے تھا کیونکہ

اول: نپولین کی غیر منظم فوج پوری ممکنہ رفتار سے بھاگ رہی تھی، یعنی وہ بالکل وہی کام کر رہی تھی جو ہر روسی اس سے کرانا چاہتا تھا۔ چنانچہ جب فرانسیسی سرعتِ رفتار سے بھاگ ہی رہے تھے، پھر ان کے خلاف تمام انواع کی کارروائیاں کرنے سے حاصل کیا ہوتا؟

دوم: جن لوگوں کی تمام توانائیاں بھاگنے پر مرکوز تھیں، ان کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنا احمقانہ فعل ہوتا۔

سوم: فرانسیسی فوج کو ملیامیٹ کرنے کے لیے اپنے جوانوں کی قربانی دینا لایعنی اور فضول حرکت ہوتی کیونکہ کسی بھی سڑک پر رکاوٹیں کھڑی نہ ہونے کے باوجود اور کسی خارجی مداخلت کے بغیر ہی وہ اتنی تیزی سے اپنے آپ کو تباہ کر رہی تھی کہ وہ جب دسمبر کے مہینے میں سرحد پار کرنے میں کامیاب ہوئی، اس کی نفری اصل تعداد کا صرف سواں حصہ رہ گئی تھی۔

چہارم: امپراطور، بادشاہوں اور ڈیوکوں کو قیدی بنانے کی خواہش کرنا احمقانہ بات ہوتی۔ جیسا کہ اس زمانے کے انتہائی تجربے کار اور منجھے ہوئے سفارت کاروں (یوزف ڈ میسترغ[23] اور دیگر) نے صحیح اندازہ لگایا، ان کی

گرفتاری روس کے لیے حد درجہ شرمندگی اور خفت کا باعث بنتی۔ پوری فرانسیسی کور کو گرفتار کرنے کی خواہش اس سے بھی زیادہ احمقانہ ہوتی کیونکہ خود ہماری فوج جب کراسنایا پہنچی، گھٹتے گھٹتے آدھی رہ گئی تھی اور فرانسیسی کور کو بحفاظت لانے کے لیے پوری ڈویژن درکار ہوتی اور حالت یہ تھی کہ خود ہمارے جوانوں کو ہمیشہ پورا راشن نہیں ملتا تھا اور قیدی پہلے ہی فاقوں مر رہے تھے۔

جن لوگوں نے عقل خرچ کر کے نپولین (کے فرار کے راستے) کا انقطاع کرنے اور اسے زیر حراست لینے کے مفروضہ منصوبے بنائے، ان کی حالت اس باغبان کی مانند تھی جو مویشیوں کے ریوڑ کو، جو اس کے گل بوٹوں کو پاؤں تلے روندرہا ہوتا ہے، اپنے باغ سے نکالنے کے بعد ان کی پٹائی شروع کر دیتا ہے۔ باغبان کا رویہ صحیح قرار دینے کے لیے صرف یہی دلیل دی جا سکتی ہے کہ وہ بہت طیش میں آ گیا تھا۔ لیکن جن لوگوں نے یہ بیان کردہ منصوبے تجویز کیے، ان کے حق میں تو یہ دلیل بھی نہیں دی جا سکتی کیونکہ کیاریاں اجڑنے سے ان کا اپنا کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔

احمقانہ کارروائی ہونے کے علاوہ نپولین اور اس کی فوج کا انقطاع ویسے بھی ناممکن تھا۔

اول: یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ جیسا کہ تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ میدان جنگ کے دو تین میل کے دائرے کے اندر مختلف رجمنٹوں کی نقل و حرکت کو منصوبے کے عین مطابق بنانا ناممکن ہوتا ہے، چنانچہ یہ احتمال کہ چچاگوف، کوتوزوف اور وٹ گنشٹائن معینہ وقت پر معین مقام پر ایک دوسرے کے ساتھ آ ملیں گے، اتنا بعید تھا کہ ناممکن کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے کوتوزوف کو، جب اسے پیٹرزبرگ کے حکام کا ارسال کردہ منصوبہ ملا، یہ کہنا پڑا کہ فوجوں کی تقسیم و ترتیب کے بارے میں جو منصوبے دور افتادہ مقامات پر بیٹھ کر بنائے جائیں، مطلوبہ نتائج حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔

دوم: یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ نپولین کی فوج جس سرعت رفتار سے واپس جارہی تھی، اسے روکنے کے لیے اس فوج سے، جو روسیوں کے پاس تھی، نسبتاً کہیں بڑی فوج درکار ہوتی۔

سوم: یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ عسکری اصطلاح ''منقطع کرنا'' بالکل بے معنی ہے۔ آدمی ڈبل روٹی کا ٹکڑا تو قطع کر سکتا ہے، فوج کو نہیں۔ فوج کو منقطع کرنا۔ یا اس کے راستے میں رکاوٹ کھڑی کرنا ناممکن سی بات ہے کیونکہ گرفتاری سے بچنے کی گنجائش ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ راتیں بھی آتی ہیں جب کچھ بھی نظر نہیں آ سکتا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا محض کراسنایا اور بیریزینا کی مثالوں سے ہی عسکری منصوبہ سازوں نے اقرار کر لیا ہوگا۔ جس طرح ابابیل کو صرف اسی صورت میں پکڑا جا سکتا ہے کہ وہ آئے اور آرام سے آپ کے ہاتھ پر بیٹھ جائے۔ یہی حال فوجیوں کا ہے۔ انھیں صرف تبھی گرفتار کیا جا سکتا ہے اگر وہ گرفتار ہونے پر راضی ہو جائیں اور جرمنوں کی طرح حربی اصولوں اور چالوں کے مطابق ہتھیار ڈالنے پر تیار ہو جائیں۔ مگر فرانسیسیوں نے جب یہ اندازہ لگایا کہ گرفتاری دینے سے انھیں کچھ حاصل نہیں ہوگا تو انھوں نے بالکل صحیح اندازہ لگایا تھا کیونکہ وہ جس طرح فرار کے دوران میں وہ سردی اور بھوک سے مر رہے تھے، گرفتاری کی صورت میں بھی ان کا یہی حال ہونا تھا۔

چہارم (اور یہ بڑی وجہ ہے): یہ اس لیے ناممکن تھا کیونکہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے، کوئی جنگ ان سے زیادہ ہول ناک حالات میں، جو 1812 میں کارفرما تھے، نہیں لڑی گئی۔ روسی فوج نے فرانسیسیوں کے تعاقب میں ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتی تھی اور اگر کرتی تو اپنے آپ کو تباہ کر لیتی۔ تاروتینو سے کراسنایا تک کوچ کے دوران میں یہ پچاس ہزار افراد سے محروم ہو گئی۔ کوئی بیمار پڑ گیا اور کوئی ادھر ادھر کھسک گیا۔ یہ تعداد خاصے بڑے صوبائی شہر کی آبادی کے برابر ہے۔ یوں آدھی نفری لڑائی لڑے بغیر ہی سپاہ کا ساتھ چھوڑ گئی۔

اور مہم کا یہی وہ دور ہے — جب فوج کے پاس بوٹوں اور پوستین کے کوٹوں کی قلت تھی، رسد کا توڑا تھا اور ووڈ کا نایاب تھا: جب اسے مہینوں سے راتیں تقریباً صفر درجہ حرارت میں برف پر پڑاؤوں میں گزارنا پڑ رہی تھیں: جب دن صرف سات یا آٹھ گھنٹوں پر محیط ہوتا تھا اور باقی وقت رات کا سمے رہتا تھا جس کے دوران میں ڈسپلن موثر انداز سے قائم نہیں رکھا جا سکتا: جب فوجی جوانوں کو چند گھنٹوں کے لیے نہیں، جیسا کہ لڑائی میں ہوتا ہے، بلکہ متواتر مہینوں سے موت (اور موت ڈسپلن کی پابند نہیں ہوتی) کے منہ میں دھکیلا جا رہا تھا اور سردی اور فاقہ کشی کی وجہ سے انھیں اپنا ایک ایک منٹ موت کے خلاف جان لیوا جدوجہد میں صرف کرنا پڑ رہا تھا: جب نصف فوج صرف ایک مہینے کے دوران میں لقمہ اجل بن گئی — ادھر مورخین ہمیں یہ بتاتے ہیں کہ مہم کے اس دور میں میلورادووچ کو ایک جانب سے، چگاگوف کو دوسری جانب سے اور ترماسوف کو کسی اور جانب سے (گھٹنوں گھٹنوں برف میں چل کر) فلینک مارچ کرنا چاہیے تھا، یا فلاں جرنیل کو (فلاں مقام پر) فرانسیسیوں کو "شکست فاش" اور فلاں کو ان کا "انقطاع" کرنا چاہیے تھا، وغیرہ وغیرہ۔

روسیوں نے، جن کی نصف تعداد موت کا شکار ہو گئی تھی، قوم کے شایانِ شان نتیجہ حاصل کرنے کے لیے وہ سب کچھ کیا جو وہ کر سکتے تھے یا انھیں کرنا چاہیے تھا اور انھیں محض اس لیے قصوروار نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ دوسرے روسی اپنے گرم اور آرام دہ کمروں میں بیٹھے تجاویز پیش کر رہے تھے کہ انھیں وہ کچھ کرنا چاہیے جو کہ ناممکن تھا۔

حقائق اور تاریخی داستانوں کے مابین یہ عجیب و غریب اور ہمارے ناقابلِ فہم تناقضات محض اس لیے جنم لیتے ہیں کیونکہ مورخین نے اس موضوع پر خامہ فرسائی کرتے وقت خود واقعات کی تاریخ نہیں لکھی بلکہ مختلف جرنیلوں کے خوش آئند احساس و جذبات کی ترجمانی کر دی ہے یا ان کی خوبصورت تقریروں کو نئے الفاظ کا لبادہ پہنا دیا ہے۔

میلورادووچ نے کیا کہا، اس یا اس جرنیل کو کیا کیا اعزازات عطا ہوئے، اس یا اس کمانڈر نے کیا قیاس آرائی کی: ان مورخین کو یہ باتیں زیادہ اہم اور دلکش معلوم ہوتی ہیں، لیکن انھیں پچاس ہزار انسانوں میں، جو ہسپتالوں میں ایڑیاں رگڑتے رہے یا منوں مٹی تلے دفنا دیے گئے، دلچسپی کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا کیونکہ ان کے مسائل ان کی تحقیقات کے دائرے میں نہیں آتے۔

تاہم ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم جرنیلوں کی رپورٹوں اور منصوبوں کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دیں اور ان ہزاروں اشخاص کی، جنھوں نے ان واقعات میں براہ راست حصہ لیا تھا، نقل و حرکت پر توجہ دیں اور وہ تمام مسائل جو ازیں پیشتر

لاینحل نظر آتے تھے، بہت آسانی سے حل ہو جائیں گے اور ان میں قطعاً کوئی الجھاؤ اور پیچیدگی نظر نہیں آئے گی۔

نپولین اور اس کی فوج کے ''انقطاع'' کرنے کا خیال دس بارہ اشخاص کے علاوہ کسی اور کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ اس قسم کے منصوبے یا مقصد کا کوئی وجود نہیں ہوسکتا تھا کیونکہ یہ لایعنی تھا اور عملاً اس کا حصول ناممکن تھا۔

قوم کے سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا، اپنی سرزمین سے حملہ آوروں کو نکالا جائے۔ بنیادی طور پر یہ مقصد اپنے آپ حاصل ہو گیا کیونکہ فرانسیسی فرار ہونے لگے تھے اور ضرورت صرف اس بات کی تھی کہ ان کے اس فرار میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالی جائے۔ ثانیاً، یہ گوریلا جنگ سے حاصل ہو گیا، جو فرانسیسیوں کو نیست و نابود کر رہی تھی۔ ثالثاً اس کا حصول یوں بھی ممکن ہو گیا کہ روسی فوج فرانسیسیوں کا تعاقب کر رہی تھی اور اگر ان کا فرار رک جاتا، تو وہ اپنی طاقت استعمال کرنے کے لیے تیار تھی۔

روسی فوج کو بالکل اسی طرح کارروائی کرنا تھی جس طرح بھاگتے جانور کے لیے چھانٹا استعمال ہوتا ہے۔ اور تجربے کار کوچوان جانتا ہے کہ بھاگتے ہوئے جانور کے سر پر ضرب لگانے کی نسبت دھمکی کے طور پر چھانٹے کا اٹھائے رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

حصہ چہارم

1

جب آدمی اس جانور کو دیکھتا ہے، جو جاں کنی کی حالت میں ہو، وہ دہشت کی گرفت میں آ جاتا ہے۔ ایک چیز، جو خود اس سے مشابہ ہوتی ہے، عین اس کی آنکھوں کے سامنے معدوم ہو رہی ہوتی ہے — اپنا وجود کھو رہی ہوتی ہے۔ لیکن جب موت سے ہم کنار ہونے والی مخلوق انسان ہو اور انسان بھی وہ، جو آپ کو دل و جان سے پیارا ہو، آپ کی موجودگی میں اس کی زندگی کے چراغ کے گُل ہونے پر آپ پر جو دہشت سوار ہونا ہوتی ہے، وہ تو ہوتی ہی ہے، اس کے علاوہ آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ آپ کے اندر کچھ ٹوٹ گیا ہے اور آپ کو روحانی گھاؤ آیا ہے۔ جسمانی گھاؤ کی طرح یہ گھاؤ بھی بعض اوقات مہلک ثابت ہوتا ہے اور بعض اوقات مندمل ہو جاتا ہے مگر یہ ہمیشہ اندر ہی اندر رِستا رہتا ہے اور جونہی کسی اذیت ناک خارجی لمس سے اس کا واسطہ پڑتا ہے، یہ اندر کی طرف سمٹ جاتا ہے۔

پرنس آندرے کے انتقال کے بعد نتاشا اور پرنسس ماریا دونوں یکساں اسی طرح محسوس کرتی تھیں۔ ان کے دل بجھ چکے تھے اور انھوں نے موت کے خوف کے سامنے، جو ہر وقت ان کے سروں پر منڈلاتا رہتا تھا، اپنی آنکھیں میچ لی تھیں۔ یوں وہ زندگی کا سامنا کرنے کا حوصلہ کھو بیٹھی تھیں۔ ان کی پوری کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ کسی ایسی چیز کے، جو ذرا بھی درشت یا تکلیف دہ ہوتی، قریب بھی نہ پھٹکیں۔ ہر چیز — گلی میں تیزی سے گزرتی ہوئی گاڑی، ڈنر کے لیے بلاوا، خادمہ کا استفسار کہ کون سا ڈریس نکالا جائے اور سب سے بدتر ہمدردی کے غیر مخلصانہ اور رسمی بول — جلتی پر تیلی کا کام کرتے، زخم ہرے کر جاتے، ہتک آمیز معلوم ہوتے اور اس اشد ضروری سکوت میں مخل ہوتے، جس میں وہ دونوں گمبھیر، ہیبت ناک کلیسائی موسیقی، جو ابھی تک ان کے تخیلات میں گونج رہی تھی، سن رہی ہوتیں اور ان پراسرار، بے کنار مناظر میں جو ایک لحظہ کے لیے ان کی نگاہوں کے سامنے وا ہو گئے تھے، جھانکنے میں رکاوٹ بن جاتے۔

صرف اسی وقت، جب انھیں تنہائی میسر آتی، وہ اس طرح کی دست درازیوں اور اذیت ناک چھیڑ خانیوں سے محفوظ و مامون ہوتیں۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بھی شاذ ہی بات کرتی تھیں اور جب کرتی بھی تھیں، تو انتہائی غیر اہم موضوعات کے متعلق اور مستقبل کے بارے میں تو بالکل ہی کوئی اشارہ بھی کرنے سے گریز کرتی تھیں۔ مستقبل کے کسی امکان کا اعتراف کرنا انھیں اس کی یاد کی توہین معلوم ہوتا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ نہایت

حزم واحتیاط سے ہر اس چیز کا، جس کا مرحوم کے ساتھ کسی نوع کا بھی کوئی تعلق بنتا تھا، ذکر کرنے سے پہلوتہی برتی تھیں۔ انھیں یوں نظر آتا تھا کہ جو کچھ ان پر بیتا ہے اور جس کچھ کے تجربے میں سے انھیں گزرنا پڑا ہے، اسے الفاظ میں بیان کرنا ناممکن ہے۔ اور اس کی زندگی کی تفصیلات کا ہر حوالہ اس بھید کے، جو ان کی نگاہوں کے سامنے پایہ تکمیل تک پہنچا تھا، شکوہ وجلال اور تقدس کی بے حرمتی کے مترادف ہے۔

وہ ان باتوں میں جس طرح پیہم ضبط ونفس سے کام لے رہی تھیں، جس طرح ہر اس بات سے، جو اس کے ذکر پر منتج ہو، مسلسل اور ایماندارانہ انداز سے پہلوتہی کر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے لیے ایک حد قائم کر لی تھی کہ وہ اس سے آگے نہیں بڑھیں گی اور بات کدھر سے کیوں نہ آ رہی ہو، وہ اس حد پر پہنچ کر لازماً رک جاتی تھیں۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ جو کچھ وہ محسوس کر رہی ہوتیں، وہ اور صحت اور صراحت کے ساتھ ان کے اذہان میں روشن ہو جاتا۔

جس طرح خالص اور کامل مسرت ناپید ہے، اسی طرح خالص اور کامل غم کا بھی کوئی وجود نہیں۔ حالات و واقعات نے پرنس ماریا کو ایک ایسے مقام پر لا کھڑا کیا تھا کہ وہ اپنے معاملات میں کاملاً خود مختار اور اپنے سیاہ وسپید کی بلا شرکت غیرے مالک بن چکی تھی۔ پھر وہ اپنے برادر زادے کی سرپرست اور اس کی دینی ماں تھی، چنانچہ زندگی کے تقاضوں نے اسے غم واندوہ کی دنیا سے، جس میں وہ گزشتہ دو ہفتوں سے رو رہی تھی، پہلے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اسے عزیز واقارب کے خطوط مل رہے تھے، اسے ان کے جوابات دینا تھے۔ جس کمرے میں نکولشکا کو ٹھہرایا گیا تھا، وہ مرطوب تھا اور وہ کھانسنے لگا تھا۔ ان کے (گھریلو) امور کے بارے میں اطلاعات سے لیس آل پاچ یاروسلاول آ پہنچا تھا۔ اس کا مشورہ اور تجویز یہ تھی کہ وہ واپس ماسکو چلی چلے، وزدویژنکا سٹریٹ میں ان کے مکان کو کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، صرف معمولی مرمتوں کی ضرورت تھی۔ زندگی ساکن نہیں کھڑی رہتی اور آدمی کے لیے زندہ رہنا ضروری ہے۔ اگرچہ سوچ بچار کی الگ تھلگ مملکت سے، جس میں پرنس ماریا اب تک بودوباش اختیار کیے ہوئے تھی، باہر نکلنا اس کے لیے تکلیف دہ تھا اور نتاشا کو اس کے حال پر چھوڑ کر جانے سے افسوس اور تقریباً شرم محسوس ہو رہی تھی، زندگی کے معمولات اور تفکرات کا تقاضا یہ تھا کہ وہ ان پر توجہ دے اور اپنے منشا کے علی الرغم اسے ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا۔ اس نے آل پاچ کے ساتھ حسابات کا جائزہ لیا، اپنے بھتیجے کے بارے میں دیسال سے صلاح مشورے کیے اور ماسکو روانہ ہونے کے لیے انتظامات اور تیاریاں شروع کر دیں۔

نتاشا تنہا رہ گئی اور جب سے پرنس ماریا نے اپنی روانگی کی تیاریاں شروع کی تھیں، وہ اس سے بھی کٹی کاٹنے لگی تھی۔

پرنس ماریا نے کاؤنٹس سے درخواست کی کہ وہ نتاشا کو اس کے ہمراہ ماسکو جانے کی اجازت دے دے۔ ماں باپ دونوں نے اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ ساتھ ان کی بیٹی کی جسمانی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔ انھیں امید تھی کہ تبدیلی آب وہوا اور ماسکو کے ڈاکٹروں کے مشورے اس کے لیے سودمند رہیں گے۔

جب یہ تجویز نتاشا کے سامنے رکھی گئی، اس نے صاف انکار کر دیا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گی۔ مہربانی فرمائیں اور مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں۔'' اس نے کہا اور کمرے سے باہر بھاگ گئی۔ اس کے لیے اپنے آنسوؤں کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ اس کے ان آنسوؤں سے غم واندوہ کا کم اور جھلاّہٹ اور خفگی کا زیادہ اظہار ہو رہا تھا۔

جب نتاشا کو محسوس ہوا کہ پرنس ماریا اس کا ساتھ چھوڑ گئی ہے اور وہ اپنے رنج ومحن میں اکیلی رہ گئی ہے، وہ اپنا بیشتر وقت اپنے کمرے میں گزارنے لگی۔ وہ صوفے کے ایک کونے پر گٹھڑی بن کر بیٹھ جاتی، اپنی اعصاب زدہ انگلیوں سے کوئی چیز مسلتی یا ٹکڑے ٹکڑے کرتی رہتی اور اپنے سامنے جس چیز پر اس کی نگاہ پڑتی، ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگتی۔ یہ تنہائی اسے اذیتیں پہنچاتی، اس کا کچومر نکال دیتی، لیکن یہ اس کی ضرورت تھی۔ جونہی کوئی شخص کمرے میں داخل ہوتا، وہ جھٹ پٹ بیدار ہو جاتی، اپنی پوزیشن تبدیل کرتی، کوئی کتاب یا سلائی کی چیز اٹھا لیتی اور بے صبری سے دخل انداز کیے جانے کا انتظار کرنے لگتی۔

اسے ہر دم یہی محسوس ہوتا کہ وہ اس چیز کی، جس پر اس کی روحانی نظر — ایسے پر ہیبت استفسار سے، جو اس کی ہمت وقوت سے کہیں بڑھ کر تھا — مرکوز ہے، کسی بھی لمحے تفہیم کرنے، اس کے اندر جھانکنے میں کامیاب ہو سکتی ہے۔

دسمبر کے اواخر میں ایک روز نتاشا، جو سوکھ کر کانٹا ہو چکی تھی، سیاہ اونی ڈریس میں ملبوس، لاپروائی سے بالوں کی مینڈھی بنائے صوفے کے کنارے پر پھسکڑا مارے بیٹھی تھی۔ عالم اضطراب میں وہ اپنے پٹکے کے سروں کو کبھی مروڑنے اور کبھی سیدھا کرنے لگتی۔ اس کی نگاہیں دروازے کے ایک کونے پر جمی ہوئی تھیں۔

وہ ٹکٹکی باندھے گویا اس جگہ کو، جہاں — زندگی کا دوسرا کنارہ — وہ چلا گیا تھا، دیکھ رہی تھی اور زندگی کا وہ کنارہ، جس کے متعلق اس نے پہلے کبھی سوچا بھی نہیں تھا اور جو اسے اتنا دور اور غیر احتمالی معلوم ہوتا تھا، اب زندگی کے اس کنارے کے مقابلے میں، جہاں یا تو محض سُونا پن اور ویرانی ہے اور یا دکھ ہی دکھ اور اہانت ہی اہانت ہے، کہیں زیادہ قریب، قابل تفہیم اور جانا پہچانا دکھائی دے رہا تھا۔

وہ ٹکٹکی باندھے اس دنیا میں، جہاں اسے معلوم تھا کہ وہ موجود ہے، جھانک رہی تھی لیکن جس طرح وہ اس دنیا میں نظر آتا تھا، اس کے علاوہ وہ اپنے ذہن میں اس کی اور کوئی تصویر بنانے سے قاصر تھی۔ وہ اسے بعینہٖ اسی طرح دیکھ رہی تھی، جس طرح کہ وہ میتش چی، ترائستا اور اور یاروسلاول میں اسے دیکھتی رہی تھی۔

اس نے اس کا چہرہ دیکھا، اس کی آواز سنی، اس کے الفاظ اور اپنے الفاظ دہرائے جو اس نے اس سے کہے تھے۔ بعض لمحات کے دوران میں وہ ان الفاظ کا تصور کرنے لگتی جو ہو سکتا ہے اس نے کہے ہوں اور ہو سکتا ہے کہ نہ کہے ہوں لیکن جن کے کہے جانے کا پورا امکان تھا۔

وہ آرام کرسی پر اپنے مخملیں چغے میں، جس کے اندر پوستین کا استر لگا ہوا تھا، لیٹا ہوا ہے۔ اس کا سر اس کے مہین اور زرد ہاتھ کا سہارا لیے ہوئے ہے۔ اس کا سینہ خوفناک حد تک کھوکھلا ہے، اس کے کندھے اوپر کو اٹھے ہوئے ہیں اور وہ قدرے اگلی جانب جھکا ہوا ہے۔ اس کی پیلی پیشانی پر لکیر نمودار ہوتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔ اس کے

ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں اور اس کی آنکھیں جگمگا رہی ہیں۔ اس کی ایک ٹانگ برق رفتاری سے لرز رہی ہے لیکن یہ لرزش بمشکل دکھائی دیتی ہے۔ نتاشا کو معلوم ہے کہ اس کی روح فرسا درد کے ساتھ کھینچا تانی ہو رہی ہے۔ "یہ کس قسم کا درد ہے؟ یہ انھیں کیوں چمٹ گیا ہے؟ وہ کیا محسوس کر رہے ہیں؟ یہ انھیں کتنی اذیت پہنچا رہا ہوگا؟" نتاشا نے سوچا۔ وہ تاڑ گیا کہ وہ اسے دیکھ رہی ہے۔ اس نے اپنی نظریں اوپر اٹھائیں اور لبوں پر مسکراہٹ لائے بغیر بولنے لگا:

"ایک بات بڑی بھیانک معلوم ہوتی ہوگی کہ آدمی اپنے آپ کو اذیت میں مبتلا شخص کے ساتھ نتھی کر لے۔ یہ تو دائمی تعذیب نظر آتی ہوگی۔" اور وہ ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔ نتاشا کو اس کی ٹکٹکی دوبارہ دکھائی دیتی ہے۔ اور اس نے حسب معمول پیشتر اس کے کہ وہ اپنے جواب کے متعلق کچھ سوچ سکتی، جھٹ پٹ کہا: "یہ سدا نہیں رہ سکتا۔ یہ جاری نہیں رہے گا۔ آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔ پوری طرح ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اس نے جس طرح تب اسے دیکھا تھا، اسی طرح وہ اب اسے دیکھ رہی تھی اور جو کچھ اس نے تب محسوس کیا تھا، اپنے تخیل میں دوبارہ اسی طرح محسوس کر رہی تھی۔ اس کے الفاظ سن کر وہ تب جس طرح تا دیر مغموم و محزون اور درشت انداز سے اسے دیکھتا رہا تھا، وہ اسے یاد آ گیا اور اس کی ٹکٹکی میں جو اتھاہ مایوسی اور زجر و توبیخ تھی، وہ اس کا مفہوم سمجھ گئی۔

"میں یہ مان گئی تھی" اس نے اپنے آپ سے کہا، "کہ اگر وہ ہمیشہ اسی طرح اذیت میں مبتلا رہے، تو یہ بڑی بھیانک بات ہوگی۔ میں نے یہ بات اس وقت اس لیے کہی تھی کیونکہ میں انھیں بتانا چاہتی تھی کہ یہ بات ان کے لیے بھیانک ہوگی لیکن انھوں نے اس کا یہ مطلب اخذ کیا کہ یہ بات میرے لیے بھیانک ہوگی۔ وہ اس وقت ابھی زندہ رہنا چاہتے تھے۔ وہ موت سے خائف تھے۔ اور میں نے اپنی بات بڑے بے ہنگم اور احمقانہ انداز سے کہی۔ میرا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا، میں بالکل مختلف چیز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ اگر میں وہ کہہ دیتی جو میں سوچ رہی تھی تو مجھے یہ کہنا چاہیے تھا: اگر میری نگاہوں کے سامنے ان پر ہر وقت جاں کنی کا عالم طاری رہے، لگاتار جاری رہے، جو کچھ کہ میں اب ہوں، اس کے مقابلے میں تب میں کہیں زیادہ خوش ہوتی۔ اب۔ اب تو کچھ بھی نہیں رہا، کوئی شخص نہیں رہا۔ کیا انھیں معلوم تھا؟ نہیں، انھیں معلوم نہیں تھا اور نہ کبھی معلوم ہوگا۔ اور اب اس کا کبھی مداوا نہیں ہو سکے گا، کبھی نہیں۔"

اور ایک بار پھر وہ اس سے وہی الفاظ کہہ رہا تھا لیکن اس مرتبہ نتاشا نے اسے اپنے تخیل میں مختلف جواب دیا۔ اس نے اسے ٹوک دیا اور بولی: "آپ کے لیے بھیانک ہوگی، میرے لیے نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ میرے لیے زندگی میں آپ کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اور آپ کے ساتھ اذیت میں مبتلا ہونا میرے لیے زندگی کی سب سے بڑی راحت ہوگی۔" اور اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے بعینہ اسی طرح دبانے لگا جس طرح اس نے موت سے چار روز پہلے اس ہولناک شام کو دبایا تھا۔ اور وہ اپنے تخیل میں وہ نرم، کومل اور محبت بھرے الفاظ، جو وہ اس وقت کہہ سکتی تھی، لیکن صرف اب کہہ رہی تھی: "میں آپ سے... آپ سے محبت کرتی ہوں، آپ سے محبت کرتی ہوں۔" وہ کہے جا

رہی تھی، وہ کپکپا رہی اور اپنے ہاتھ مسل رہی تھی اور شدید اذیت کے عالم میں اپنے دانت بھینچ رہی تھی۔
غم واندوہ کی تلخ وترش حلاوت اس پر غالب آ گئی اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔ ایکا ایکی اس نے اپنے آپ سے پوچھا: "یہ میں کس سے باتیں کر رہی ہوں؟ وہ کہاں ہیں اور اب وہ کیا ہیں؟"

اور ایک بار پھر ہر چیز بے رنگ اور اذیت ناک گتھی میں الجھ گئی۔ اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی اور اس نے پورا زور لگا کر، اتنا کہ اس کی رگیں تن گئیں، اس نے اس دنیا میں، جس میں وہ تھا، جھانکنے کی کوشش کی۔... "اور ہاں۔ ہاں۔ میں یقیناً اب سر کی تہہ تک پہنچ جاؤں گی۔" اس نے سوچا۔ لیکن عین اس لمحے، جب اسے یہ محسوس ہو رہا تھا کہ غیر فہم آشکار ہوا چاہتا ہے، دروازے کے ہینڈل کے زور سے کھڑکھڑائے جانے کی آواز تکلیف دہ انداز سے اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کی ملازمہ دنیاشا اپنی مالکہ کی پروا کیے بغیر کمرے میں آ دھمکی۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

"اپنے پاپا کے پاس چلیں — فوراً، ابھی!" اس نے عجیب وغریب اور ہیجانی لہجے سے کہا۔ "مصیبت پیوترالیچ — خط —" وہ بمشکل کہہ پائی اور اس کی ہچکی نکل گئی۔

2

نتاشا ان دنوں نہ صرف ہر کس وناکس سے الگ تھلگ رہنے کی آرزومند تھی بلکہ اپنے خاندان کے ارکان کے ساتھ وہ خاص طور پر بیگانگی برتنے لگی تھی۔ وہ بھی — اس کا باپ، اس کی ماں، اور سونیا — اس کے اتنے قریب تھے، اتنے جانے پہچانے تھے، اتنے روزمرہ کی چیز تھے کہ وہ جو کچھ کہتے یا محسوس کرتے، اسے یہی لگتا کہ وہ اس دنیا کی، جس میں وہ حالیہ دنوں میں مقید ہو گئی تھی، بے حرمتی کر رہے ہیں۔ وہ نہ صرف ان سے لاتعلق ہو گئی تھی بلکہ ان کے ساتھ ایک طرح کا مخاصمانہ برتاؤ بھی کرنے لگی تھی۔ اس نے پیوترالیچ اور مصیبت کے الفاظ سنے ضرور لیکن وہ ان کے مفہوم کی تہہ تک پہنچنے میں ناکام رہی۔

"کیسی مصیبت؟ انھیں کیا مصیبت پیش آ سکتی ہے؟ وہ اپنی جانی پہچانی، گھسی پٹی، پیش پاافتادہ زندگی بسر کر رہے ہیں، اور بس!" اس نے اپنے آپ سے کہا۔

جب وہ بال روم میں داخل ہوئی، اس کا باپ دوڑتا دوڑتا اس کی والدہ کے کمرے سے باہر آ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر جھریاں نمایاں ہو رہی تھیں اور وہ آنسوؤں میں بھیگا ہوا تھا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ کمرے سے بھاگا بھاگا اس لیے باہر نکل آیا تھا کیونکہ وہ اپنی سسکیوں کو، جو اس کا گلا گھونٹ رہی تھیں، مزید نہیں روک سکتا تھا، وہ کھل کر رونا اور اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا تھا۔ جب اس کی نظر نتاشا پر پڑی، اس نے بے بسی سے اپنے بازوؤں سے اشارہ کیا، اس کا بدن بید مجنوں کی طرح کانپنے لگا، اس کی کرب ناک چیخیں نکل گئیں اور اس کے نرم وگداز گول مٹول چہرے کی شکل مسخ ہو گئی۔

''پت۔ پتیا۔ جاؤ، جاؤ۔ وہ۔ وہ بلا رہی ہے۔'' اور وہ بچوں کی طرح بلکتا، اپنی کمزور ٹانگوں پر لڑکھڑاتا کرسی کے قریب پہنچا اور ہاتھوں میں چہرہ چھپاتا اس پر تقریباً گر پڑا۔

اچانک نتاشا کو یوں محسوس ہوا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو یا کسی نے اس کے دل پر گھونسا مار دیا ہو۔ اس کے وجود کے اندر درد کی شدید ٹیسیں اٹھنے لگیں اور اسے اپنے باطن میں کوئی چیز چرچرتی، کرچی کرچی ہونے لگی۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اس پر جاں کنی کا عالم طاری ہو گیا ہو۔ بلکہ درد کی اس اذیت ناک چبھن کے معاً بعد اسے یوں لگا جیسے اسے اس گھٹن سے، جو اس کے دل و دماغ پر بوجھ بنی ہوئی تھی اور جس نے زندگی کے ساتھ اس کا رشتہ منقطع کر رکھا تھا، نجات مل گئی ہو۔ اپنے باپ کی حالت دیکھ کر اور دروازے کے عقب میں اپنی ماں کی خوف ناک اور کرخت چیخ سن کر وہ یک لخت اپنے آپ کو اور اپنے غم کو بھول گئی۔

وہ اپنے باپ کی جانب بھاگی لیکن اس نے کمزور ناتواں انداز سے اس کی ماں کے دروازے کی طرف ہاتھ ہلاتے ہوئے اسے ادھر جانے کا اشارہ کیا۔ پرنسس ماریا، جس کا رنگ فق ہو چکا اور جبڑا کپکپا رہا تھا، کاؤنٹس کے کمرے سے باہر آئی۔ اس نے نتاشا کا ہاتھ پکڑا اور اس سے کچھ کہا۔ نتاشا نے اسے دیکھا نہ اس کی بات سنی۔ وہ آتش بار دروازے کی طرف لپکی، ایک لمحے کے لیے رکی جیسے اس کی اپنے وجود کے ساتھ کشمکش ہو رہی ہو اور پھر اپنی ماں کی جانب دوڑ پڑی۔

کاؤنٹس عجیب و غریب بے ہنگم انداز سے صوفے پر لیٹی ہوئی تھی اور اپنا جسم اکڑائے دیوار سے سر ٹکرا رہی تھی۔ سونیا اور خادمائیں اسے بازوؤں سے پکڑے ہوئے تھیں۔

''نتاشا! نتاشا! ... نتاشا!'' کاؤنٹس نے چیختے ہوئے کہا۔ ''یہ صحیح نہیں ہے... صحیح نہیں ہے... وہ جھوٹ بول رہے ہیں... نتاشا!'' اس نے دل دوز چیخ ماری اور دوسروں کو پرے دھکیل دیا۔ ''چلے جاؤ، سب چلے جاؤ۔ یہ صحیح نہیں ہے! ہلاک ہو گیا! ... کیا بکواس ہے! ہا، ہا، ہا! ... یہ صحیح نہیں ہے!''

نتاشا کرسی کے قریب دو زانو ہو گئی، اپنی ماں کے اوپر جھکی اور اس نے اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔ اس نے غیر متوقع قوت کے ساتھ اسے اوپر اٹھایا، اس کے چہرے کا رخ اپنی طرف کیا اور اس کے ساتھ چمٹ گئی۔

''ماما! ... ڈارلنگ ... میں یہاں ہوں، ڈیئرسٹ ماما،'' وہ مسلسل کہتی رہی۔

اس نے اپنی ماں کو چھوڑا نہیں بلکہ نرمی سے اس کے ساتھ جدوجہد آزمائی کرتی رہی۔ اس نے تکیے اور گرم پانی لانے کا حکم دیا۔ اپنی ماں کے ڈریس کے بٹن کھولے اور اسے پھاڑ ڈالا۔

''مائی ڈیئرسٹ، ڈارلنگ ... ماما، میری جان،'' وہ علی التواتر بڑبڑاتی رہی اور اس کے سر، ہاتھوں اور چہرے پر بوسوں کی بارش کرنے لگی، اور خود اسے اپنے آنسو، جنھیں روکنا ناممکن ہوتا جا رہا تھا، اپنی ناک اور چہرے پر ٹپ ٹپ گرتے محسوس ہونے لگے۔

کاؤنٹس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ دبایا، اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی۔ یکایک وہ خلاف

معمول سرعت سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے خالی خالی نگاہوں سے اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا اور جب اس کی نظریں نتاشا پر پڑیں، وہ پوری قوت سے اس کا سر اپنے سینے سے چمٹانے لگی۔ پھر اس نے اپنی بیٹی کا چہرہ، جو دکھ سے جھر جھرا رہا تھا، اپنی طرف گھمایا اور تا دیر اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی۔

''نتاشا، تم مجھ سے محبت کرتی ہو؟'' اس نے نرم و لطیف اور پر اعتماد انداز سے سرگوشی کی۔ ''نتاشا، تم تو مجھے فریب نہیں دو گی؟ تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتا دو گی؟''

نتاشا نے، جس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں، اس کی جانب دیکھا۔ اس کی نظروں میں محبت ہی محبت تھی لیکن ان میں منت سماجت بھی تھی کہ وہ معافی کی خواستگار ہے۔

''ماما... ڈیئرسٹ۔'' وہ بار بار کہہ رہی تھی۔ وہ اپنی محبت کی پوری طاقت صرف کر رہی تھی تا کہ وہ حد سے زیادہ غم کو، جو اس کی ماں کی جان جوکھم میں ڈال رہا تھا، خود سمیٹ سکے۔

اس کی ماں یہ ماننے سے صاف انکاری تھی کہ وہ اپنے چہیتے بیٹے کے بغیر جو عین عالم شباب میں ہلاک ہو گیا تھا، زندہ رہ سکتی ہے۔ اس نے حقیقت کے خلاف بے سود ہاتھ پاؤں مارتے مارتے ایک بار پھر ہذیان میں پناہ لے لی۔

نتاشا کو کچھ یاد نہ رہا کہ وہ دن، وہ رات یا اس سے اگلا دن اور اگلی رات کیسے گزرے۔ وہ نہ سوئی اور نہ اس نے ماں کی پٹی چھوڑی۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کی صابر اور ان تھک محبت نے اس کی ماں کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اس کی یہ محبت نہ کسی چیز کی وضاحت کر رہی تھی اور نہ کسی قسم کا اطمینان دلا رہی تھی لیکن وہ اسے زندگی کی طرف واپس بلا رہی تھی۔

تیسری رات کاؤنٹس چند منٹوں کے لیے پرسکون ہو گئی۔ نتاشا نے اپنا سر اس کے صوفے کے بازو سے ٹکا دیا اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ صوفہ چرچرایا اور نتاشا نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ کاؤنٹس بستر پر بیٹھی تھی اور نرم لہجے میں باتیں کر رہی تھی۔

''میں کتنی خوش ہوں کہ تم واپس آ گئے ہو؟ تم تھک گئے ہو گے! چائے پیو گے؟'' نتاشا اس کے قریب ہو گئی۔

''تم کتنے خوبصورت ہو گئے ہو! مردانگی کا پیکر معلوم ہوتے ہو!'' کاؤنٹس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی۔

''ماما، یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں...؟''

''نتاشا، وہ جا چکا ہے، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا!''

وہ اپنی بیٹی سے ہم آغوش ہو گئی اور پہلی مرتبہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

3

پرنسس ماریا نے اپنی روانگی ملتوی کر دی۔ سونیا اور کاؤنٹ نے نتاشا کی جگہ باری لینے کی کوشش کی لیکن انھیں کوئی کامیابی

نہ ہوئی۔ وہ سمجھ گئے کہ صرف وہی اپنی ماں کو مجنونانہ مایوسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گرنے سے بچا سکتی ہے۔ نتاشا تین ہفتے اپنی ماں کے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ وہ وہیں آرام کرسی پر سو جاتی، اسے کھلاتی پلاتی اور اس سے بے تکان باتیں کرتی رہتی کیونکہ اس کی کومل اور نرم و لطیف آواز واحد شے تھی جس سے کاؤنٹس کے اعصاب کو تسکین ملتی تھی۔

اس کی ماں کی روح کو جو گھاؤ آیا تھا، وہ کبھی مندمل نہ ہو سکا۔ پیتا کی موت اس سے اس کی آدھی زندگی چھین کر لے گئی تھی۔ جب خبر موصول ہوئی، وہ پچاس برس کی تازہ دم اور بظاہر صحت مند عورت تھی۔ ایک مہینے کے بعد وہ اپنے کمرے سے اس حالت میں باہر آئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ نیم مردہ ہے اور زندگی میں اس کے لیے کوئی کشش باقی نہیں رہ گئی ہے — وہ بوڑھی ہو گئی تھی۔ تاہم وہی زخم، جس نے کاؤنٹس کو گور کنارے پہنچا دیا تھا، نتاشا کے لیے نئی زندگی کا پیام لایا۔

روحانی زخم، جو روحانی جسم کے کرچی کرچی ہونے کے سبب آتا ہے، جسمانی زخم کی مانند ہوتا ہے۔ بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے، لیکن اسی کی طرح اس کے کنارے بتدریج آپس میں مل جاتے ہیں اور اس کا اندمال ہو جاتا ہے۔ تاہم روحانی اور جسمانی دونوں اقسام کے زخم صرف داخلی حیات بخش قوت کے طفیل مندمل ہو سکتے ہیں۔

بالکل اسی طرح نتاشا کا زخم مندمل ہوا۔ اسے یقین ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی کا انجام قریب ہے۔ لیکن غیر متوقع طور پر اپنی ماں سے اس کی محبت نے اسے جتا دیا کہ زندگی کا جوہر — محبت — ابھی اس کے اندر فعال ہے۔ محبت بیدار ہو گئی، زندگی نے انگڑائی لی۔

پرنس آندرے کے آخری ایام نے پرنسس ماریا اور نتاشا کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا۔ اس تازہ غم واندوہ نے ان میں مزید یگانگت پیدا کر دی۔ پرنسس ماریا نے اپنی روانگی ملتوی کر دی اور وہ نتاشا کی یوں خبر گیری کرنے لگی جیسے وہ کوئی بیمار بچی ہو۔ نتاشا نے جو تین ہفتے اپنی ماں کے کمرے میں گزارے تھے، انھوں نے اس کی صحت کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔

ایک روز پرنسس ماریا نے دیکھا کہ نتاشا عین دوپہر کے وقت یوں کپکپا رہی ہے جیسے اسے بخار ہو۔ وہ اسے اپنے کمرے میں لے گئی اور اسے پلنگ پر لیٹنے کے لیے مجبور کر دیا۔ نتاشا لیٹ تو گئی، مگر جب پرنسس ماریا نے پردے گرا دیے اور خود باہر جانے لگی، اس نے اسے واپس بلا لیا۔

"ماری، مجھے نیند نہیں آ رہی۔ میرے پاس بیٹھ جاؤ۔"

"تم تھک چکی ہو۔ کوشش کرو کہ تمھیں نیند آ جائے۔"

"نہیں، نہیں۔ تم مجھے یہاں کیوں لائی ہو۔ وہ میرا پوچھ رہی ہوں گی۔"

"ان کی حالت بہت بہتر ہے۔ آج وہ بالکل اسی طرح باتیں کر رہی تھیں جس طرح وہ عام طور پر کیا کرتی تھیں۔"

نتاشا نیم تاریک کمرے میں بستر پر لیٹ گئی اور بغور پرنسس ماریا کا چہرہ دیکھنے لگی۔

"کیا یہ ان سے مشابہ ہے؟" نتاشا نے سوچا۔ "ہاں، ہے بھی اور نہیں بھی۔ اس میں کوئی اچھوتی اور انوکھی

بات ہے جو محض اسی سے مخصوص ہے۔ یہ کوئی بالکل نئی اور ان جانی ہستی ہے، اور یہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ اس کے دل میں کیا ہے؟ کامل اچھائی۔ لیکن یہ ہے کیا؟ — یہ سوچتی کیا ہے؟ اس کی میرے متعلق کیا رائے ہے؟ ہاں، یہ خوبصورت دوشیزہ ہے۔''

''ماشا'' اس نے جھجکتے جھینپتے پرنس ماریا کا ہاتھ اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ماشا، تم یہ تو نہیں سوچتیں کہ میں بد ہوں۔ سوچتی ہو؟ ماشا، ڈارلنگ، مجھے تم سے کتنا پیار ہے! کیوں نہ ہم سچی اور دلی سہیلیاں بن جائیں؟''

اور نتاشا نے اپنے بازو پرنس ماریا کے گلے میں حمائل کر دیے اور بے تحاشا اس کا چہرہ اور ہاتھ چومنے لگی۔ نتاشا کے جذبات کے اس اظہار پر پرنس ماریا کو حجاب بھی آیا اور خوشی سے اس کے دل کا کنول بھی کھل گیا۔

اور اس دن ان دونوں کے مابین اس کومل اور جوشیلی دوستی نے جنم لیا جو صرف خواتین کے مابین پائی جاتی ہے۔ وہ لگاتار ایک دوسرے کو چومتی اور آپس میں پیار بھری باتیں کرتی رہتیں اور اپنا بیشتر وقت ایک دوسرے کی صحبت میں گزارتیں۔ اگر ایک باہر چلی جاتی، دوسری بے کل ہو جاتی اور ترنت اس کے پاس پہنچ جاتی۔ انھیں خلوت کی نسبت ایک دوسرے کی ہم نشینی میں زیادہ سکون ملتا۔ دونوں کے مابین دوستی سے بڑھ کر تعلقات استوار ہو گئے۔ زندگی کا یہ منفرد احساس صرف ایک دوسرے کی صحبت میں ہی ممکن تھا۔

بعض اوقات وہ گھنٹوں خاموش رہتیں اور بعض اوقات جب وہ رات کو بستروں میں گھستیں، باتوں کا سلسلہ شروع ہو جاتا اور صبح تک جاری رہتا۔ وہ زیادہ تر ان چیزوں کی باتیں کرتیں جو مدتوں پہلے ماضی کا حصہ بن چکی تھیں۔ پرنس ماریا اپنے بچپن، اپنی ماں، اپنے باپ اور اپنے خوابوں کی باتیں کرتی اور نتاشا نے، جو گئے دنوں میں تفہیم کے لاپروایانہ اور پر اطمینان فقدان کے باعث ریاضت اور توکل کی زندگی اور مسیحی ایثار کی شعریت سے کوسوں دور بھاگتی رہی تھی، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اب وہ پرنس ماریا کے ساتھ چاہت کے رشتے میں بندھ چکی ہے، اپنے ماضی سے بھی محبت کرنا اور زندگی کا وہ پہلو بھی، جس کا ازیں پیشتر اس کے ذہن میں کوئی تصور نہیں تھا، سمجھنا سیکھ لیا۔ اس نے یہ کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ عاجزی اور نفس کشی کا اطلاق اپنی ذات پر بھی ہونا چاہیے کیونکہ وہ دوسری قسم کی مسرتیں ڈھونڈنے کی عادی ہو چکی تھی، تاہم جب اسے یہ اوصاف، جو ماضی میں اس کے لیے ناقابل تفہیم تھے، دوسری میں نظر آئے، وہ انھیں سمجھنے اور ان پر دیدہ و دل نثار کرنے لگی۔ جہاں تک پرنس ماریا کا تعلق ہے، اس نے جب نتاشا سے اس کے بچپن اور اوائل عمری کے قصے سنے، اس کی نگاہوں کے سامنے بھی زندگی کا نیا پہلو — زندگی اور اس سے لطف اندوز ہونے میں یقین آشکار ہو گیا۔، جو پہلے کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

وہ اب بھی اس کا ذکر کرنے سے اجتناب برتتی تھیں کیونکہ انھیں یہ خوف دامن گیر رہتا تھا کہ اپنے رفیع و جلیل جذبات کو الفاظ کا جامہ پہنا کر وہ انھیں نجس کر دیں گی (انھیں یہی محسوس ہوتا تھا)۔ مگر اس خاموشی کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ اسے بھولنے لگیں (حالانکہ اگر کوئی دوسرا شخص ان سے یہ بات کہتا، تو انھیں کبھی یقین نہ آتا)۔

نتاشا اتنی لاغر، زرد اور جسمانی اعتبار سے اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ ان سب کو اس کی صحت کی فکر لگی رہتی تھی اور ان

کی اس فکر سے وہ بہت خوش ہوتی تھی۔ مگر بعض اوقات اس پر نہ صرف موت بلکہ بیماری، خراب صحت اور اپنی خوبصورتی سے محروم ہونے کا خوف غالب آ جاتا۔ جب کبھی اس کی نظر اپنے برہنہ بازو پر پڑتی اور اسے بغور دیکھتی، وہ اس کی لاغری پر ششدر رہ جاتی، یا پھر جب وہ صبح کے وقت آئینے میں اپنا مہین، زرد اور بیمار چہرہ دیکھتی، اسے یہ بالکل بھیانک نظر آتا۔ وہ سوچتی کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود بے پایاں اداسی اس کا گھراؤ کر لیتی۔

ایک روز جب وہ جلد جلد سیڑھیاں چڑھ رہی تھی، اس کا دم پھول گیا۔ چشم زدن میں اسے نیچے اترنے اور تیزی سے دوبارہ اوپر چڑھنے کا بہانہ مل گیا۔ وہ اپنی توانائی کا امتحان لینا اور نتیجہ دیکھنا چاہتی تھی۔

ایک اور مرتبہ جب اس نے دنیاشا کو بلانا چاہا، بڑی بوڑھیوں کی طرح اس کی آواز لرزنے اور چیخنے لگی۔ اس نے اسے (حالانکہ اسے اس کے قدموں کی آواز سنائی دے رہی تھی) پاٹ دار آواز سے پکارا جس سے وہ گانا گایا کرتی تھی اور خود ہی اپنی آواز کو دھیان سے سنا۔

اسے نہ شبہ ہوا اور نہ اس کے خیال میں یہ ممکن تھا لیکن کیچڑ کی ناقابل عبور تہہ کے نیچے، جس نے اس کی روح کو ڈھانپ رکھا تھا، پہلے ہی گھاس کی نرم و نازک کونپلیں پھوٹنا شروع ہو گئی تھیں۔ ان کونپلوں نے پھل پھول کر اپنی جاندار شادابی سے اس کے غم و اندوہ کو، جو اس کو اپنے بوجھ تلے دبائے ہوئے تھا، اس طرح ڈھانک لینا تھا کہ اس نے نظروں سے اوجھل ہو جانا اور بالآخر فراموش ہو جانا تھا۔ زخم اندر سے مندمل ہونا شروع ہو گیا تھا۔

جنوری کے اختتام پر پرنسس ماریا ماسکو روانہ ہو گئی اور کاؤنٹس نے اصرار کیا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلی جائے اور وہاں ڈاکٹروں سے مشورہ کرے۔

4

روسی فوج فرانسیسیوں پر ٹوٹ پڑنے، ان کا راستہ کاٹنے وغیرہ کے لیے بے قرار ہو رہی تھی۔ کوتوزوف نے اسے روکنے کی بہتیری کوشش کی لیکن اس کا کچھ بس نہ چلا۔ چنانچہ ویازما میں تصادم ہو گیا۔ اس تصادم کے بعد فرانسیسی دوبارہ بھاگنے اور روسی ان کا تعاقب کرنے لگے، مگر کراسنایا تک دونوں کے مابین کوئی لڑائی نہ ہوئی۔ فرار کی رفتار اتنی تیز تھی کہ روسی فرانسیسیوں کا ساتھ نہ دے سکے اور پیچھے رہ گئے۔ سواروں اور توپ خانوں کے گھوڑے بیمار پڑنے اور ہلاک ہونے لگے، اور فرانسیسیوں کی نقل و حرکت کے بارے میں جو اطلاعات موصول ہوتی تھیں، وہ ناقابل اعتبار ہوتی تھیں۔

تقریباً ستائیس میل فی یوم کے لگاتار سفر نے روسیوں کا اتنا کچومر نکال دیا تھا کہ وہ اس سے زیادہ تیز جا ہی نہیں سکتے تھے۔

روسی فوج تھکاوٹ سے کتنا نڈھال ہو چکی تھی، اس کا اندازہ لگانے کے لیے صرف اس حقیقت کی اہمیت کا اعتراف کرنا ضروری ہے کہ تاروتینو سے روانگی کے موقع پر اس کی نفری ایک لاکھ تھی، اگرچہ راستے میں صرف پانچ ہزار

افراد ہلاک یا زخمی ہوئے اور ایک سو سے کم قیدی بنے۔ لیکن جب یہ کراسنایا پہنچی، اس کی تعداد صرف پچاس ہزار رہ گئی تھی۔

روسی تعاقب کی تیز رفتاری ہماری فوج کے لیے اتنی ہی تباہ کن تھی جتنا کہ فرانسیسیوں کا فرار ان کی فوج کے لیے تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ روسی فوج کا سفر رضا کارانہ تھا، فرانسیسی سپاہ کی طرح اس کے سر پر کامل تباہی کی تلوار نہیں لٹک رہی تھی۔ پھر جو روسی اپنی فوج سے بچھڑ جاتے، وہ اپنے ہی لوگوں کے مابین موجود ہوتے۔ اس کے برعکس جو فرانسیسی پیچھے رہ جاتے، وہ دشمن کے ہتھے چڑھ جاتے۔ نپولین کی سپاہ میں جو تخفیف ہو رہی تھی، اس کی بڑی وجہ اس کی نقل و حرکت کی تیزی تھی۔ اس کا نا قابل تردید ثبوت یہ ہے کہ روسی فوج میں بھی اس سے ملتی جلتی تعداد میں کمی واقع ہو رہی تھی۔

تاروتینو اور ویازما کی طرح کوتوزوف کی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں، جہاں تک اس کا بس چلتا تھا، اس امر پر مرکوز تھیں کہ فرانسیسیوں کی نقل و حرکت کی مہلک رفتار میں کسی قسم کی کوئی کھنڈت نہ ڈالی جائے (حالانکہ پیٹرز برگ کے حکام اور فوج کے جرنیل یہی چاہتے تھے)، بلکہ اسے مزید تیز کیا جائے اور اپنی فوج کی نقل و حرکت کی رفتار میں کمی لائی جائے۔

برق رفتار پیش قدمی کے باعث فوجیوں کو جس طرح کی تھکاوٹ برداشت کرنا پڑی اور جو نقصانات برداشت کرنا پڑے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتار میں پہلے کی سی تیزی برقرار نہ رہی۔ لیکن رفتار کو کم کرنے کے لیے کوتوزوف کے ہاتھ ایک اور وجہ بھی آ گئی۔ روسی فوج کا اہم مقصد فرانسیسی فوج کا تعاقب تھا۔ مگر وہ کون سی سڑک اختیار کریں گے، یہ کسی کو معلوم نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ ہماری سپاہ ان کے جتنا زیادہ قریب پہنچتی تھی، اسے اتنا ہی زیادہ فاصلہ طے کرنا پڑتا تھا۔ فرانسیسیوں کے تعاقب میں ان کے اور اپنے مابین کچھ فاصلہ رکھ کر ہی وہ ان ٹیڑھی میڑھی لکیروں کے بیچ، جو غنیم بناتا جا رہا تھا، سیدھا راستہ نکال سکتی اور اس تک پہنچ سکتی تھی۔ ہمارے جرنیل جتنی بھی پُرکارانہ چالیں تجویز کرتے تھے، ان میں جوانوں کو ایزادی سفر طے کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا حالانکہ واحد معقول طریقہ یہ تھا کہ انھیں کم سے کم فاصلے کا سفر کرنا پڑے۔ ماسکو سے ولنا تک ساری مہم کے دوران میں کوتوزوف کی تمام تر مساعی کا مقصد اسی قسم کا طریقہ کار وضع کرنا رہا۔ وہ یہ کام بے قاعدگی یا وقفوں وقفوں سے نہیں، بلکہ اتنے تسلسل سے کر رہا تھا کہ اس نے ایک بار بھی اس سے انحراف نہ کیا۔

کوتوزوف استدلال یا علم (سائنس) کے بل پر نہیں، بلکہ اپنے کاملاً روسی قلب و روح سے وہی کچھ جانتا اور محسوس کرتا تھا جو ہر روسی عسکری جانتا اور محسوس کرتا تھا کہ فرانسیسی پٹ چکے ہیں، دشمن فرار ہو رہا ہے اور اسے لازماً (وطن کی سرزمین سے) باہر دھکیل دینا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے اپنے عام فوجیوں کی طرح ان مصائب و مشکلات کا بھی اندازہ تھا جو ایک ایسی مہم نے کھڑی کر دی تھیں جس کی سال کے اس موسم میں تیز رفتاری کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔

مگراب جب کہ کسی قسم کی معرکہ آرائی بھیانک اور بے معنی چیز بن چکی تھی، جرنیل (خاص طور پر وہ جو روسی نہیں تھے)، جو اپنا قد بڑھانا، دنیا کو ششدر کرنا اور کسی نہ کسی وجہ سے ایک آدھ بادشاہ یا ڈیوک کو گرفتار کرنا چاہتے تھے، رائے دینے لگے کہ لڑائی کرنے اور کسی نہ کسی پر فتح پانے کا یہ انتہائی موزوں وقت ہے۔ جب وہ یکے بعد دیگرے مختلف قسم کی چالیں چلنے کی تجاویز پیش کرتے، کوتوزوف محض کندھے جھٹک کر رہ جاتا کیونکہ ان کے منصوبوں کو جن عسکریوں نے عملی جامہ پہنانا تھا، ان کے پاس مناسب جوتے تھے نہ مناسب کپڑے، وہ نیم فاقہ کشی میں مبتلا تھے، لڑائی کے بغیر ان کی تعداد کم ہو کر نصف رہ گئی تھی اور انھیں سرحد تک پہنچنے کے لیے اس مسافت سے، جو وہ پہلے ہی طے کر چکے تھے، کہیں زیادہ طویل مسافت ماپنا تھی۔

جرنیلوں کی اپنی ٹوپیوں میں سرخاب کے پر لگانے، چالیں چلنے، دشمن میں جھپٹنے اور اس کا راستہ منقطع کرنے کی یہ خواہش اس وقت خاص طور پر نمایاں ہو کر سامنے آتی تھی جب روسیوں کی اتفاقاً فرانسیسی فوج سے مڈھ بھیڑ ہو جاتی تھی۔

یہی کچھ کراسنایا میں ہوا۔ انھیں امید تھی کہ یہاں انھیں فرانسیسیوں کے تین کالموں میں سے ایک مل جائے گا، لیکن کرنا خدا کا یہ ہوا کہ یہاں ان کا ٹکراؤ خود نپولین سے ہو گیا جو سولہ ہزار کی نفری کے ساتھ سفر کر رہا تھا۔ کوتوزوف نے اس تباہ کن تصادم سے بچنے اور اپنے دستوں کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کی لیکن اس کے باوجود تھکاوٹ سے چور روسی فوج کے جوان تین دن تک فرانسیسیوں کے بے ترتیب غول کا قتل عام کرتے رہے۔

ٹول نے تقسیم و ترتیب کا منصوبہ تحریر کیا: "پہلا کالم فلاں فلاں مقام کی طرف پیش قدمی کرے گا۔" وغیرہ وغیرہ۔ اور حسب معمول کچھ بھی منصوبے کے مطابق نہ ہوا۔ پرنس یوجین آف ورٹم برگ پہاڑی سے فرانسیسیوں کے ہجوم پر، جو اس کے قریب سے بھاگے جا رہے تھے، مسلسل فائرنگ کراتا رہا۔ اس نے کمک طلب کی لیکن یہ کمک نہ آئی۔ روسیوں سے بچنے کے لیے فرانسیسی تتر بتر ہو گئے۔ وہ رات کو جنگل میں جا چھپے اور جہاں تک ممکن ہوا چکر کاٹ کر فرار ہوتے رہے۔

میلورادووچ نے — جو اپنے کو chevalier san peur et sans reproche* کہلواتا تھا اور جسے فرانسیسیوں کے ساتھ مذاکرات کرنے کا بڑا شوق تھا — ، جو ہمیشہ اعلان کرتا رہا تھا کہ اسے اپنے دستوں کے رسد کے معاملات میں قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور جو، جب کبھی اس کی ضرورت پیش آتی، کہیں ملتا ہی نہیں تھا، ان کے پاس اپنے ایلچی بھیجے اور ان سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے ہتھیار ڈال دیں۔ وہ وقت ضائع کرتا اور اسے جو احکام دیے گئے تھے، انھیں عملی جامہ پہنانے سے گریز کرتا رہا۔

"لڑکو، میں یہ کالم تمھیں تحفتاً پیش کرتا ہوں،" اس نے گھوڑے پر اپنے سواروں کے قریب پہنچ کر اور ان کی توجہ فرانسیسیوں کی جانب مبذول کراتے ہوئے کہا۔

* نڈر اور مطعون مجاہد

اور سوار اپنے استخوانی گھوڑوں کو، جو بمشکل قدم اٹھا سکتے تھے، مہمیزوں اور شمشیروں سے ٹھوکے لگاتے کالم کی طرف، جو انھیں تحفتاً پیش کیا گیا تھا، گرتے پڑتے بڑھے۔ اور یہ کالم کیا تھا؟ برف گزیدہ، بُرودت زدہ اور فاقہ کش فرانسیسیوں کی بے ترتیب بھیڑ تھی اور اس کالم نے، جو انھیں تحفتاً پیش کیا گیا تھا، جھٹ پٹ اپنے ہتھیار پھینکنے اور اسیری کے لیے رضا مند ہو گئے کیونکہ وہ یہ کام مدتوں سے کرنا چاہتے تھے۔

کراسنایا میں انھوں نے چھبیس ہزار قیدی اور سینکڑوں گجنالیس پکڑیں۔ ایک چھڑی بھی ان کے ہاتھ آئی۔ انھوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، پلک جھپکنے میں اسے ''عصائے مارشل'' کا نام دے دیا اور آپس میں جھگڑنے لگے کہ نمایاں ترین کارکردگی کس کی رہی ہے۔ اگرچہ انھیں افسوس تھا کہ وہ نپولین، کسی مارشل یا اسی طرح کے کسی ہیرو کو گرفتار نہیں کر سکے ہیں اور اپنی اس ناکامی کے لیے وہ ایک دوسرے، بالخصوص کوتوزوف کو، موردالزام ٹھہراتے تھے، پھر بھی وہ اپنے کارنامے پر پھولے نہ سماتے تھے۔

یہ اشخاص، جو اپنے جذبات کی رو میں بہہ گئے تھے، انتہائی پر ملال قانونِ جبر کے کور چشم آلہ کار تھے لیکن اپنے آپ کو ہیرو تصور کر رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ وہ انتہائی قابل تحسین اور شاندار کام سرانجام دے رہے ہیں۔ وہ کوتوزوف پر علانیہ نکتہ چینی کرتے تھے اور کہتے تھے کہ وہ مہم کے آغاز ہی سے انھیں نپولین کو ملیامیٹ کرنے سے روکتا رہا ہے، اسے اپنی نفسانی خواہشات پورا کرنے کے علاوہ اور کسی چیز میں دلچسپی نہیں، وہ کپڑوں کے کارخانوں کے قرب و جوار سے آگے جانے کو تیار نہیں ہوتا کیونکہ اسے وہاں بہت آرام محسوس ہوتا ہے، اس نے کراسنایا میں پیش قدمی اس لیے روک دی تھی کیونکہ جب اسے معلوم ہوا کہ نپولین خود وہاں موجود ہے، اس کے اوسان بالکل ہی خطا ہو گئے، اس کی غالباً اس کے ساتھ خفیہ مفاہمت ہو گئی ہے اور وہ اس سے رشوت[1] وصول کر چکا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

کوتوزوف کے صرف معاصرین ہی جذبات کی رو میں بہہ کر اس قسم کی گفتگو نہیں کرتے تھے، متاخرین اور تاریخ نے نپولین کو تو سر آنکھوں پر بٹھایا ہے اور اسے grand* کہا ہے۔ جہاں تک کوتوزوف کا تعلق ہے، اس کے بارے میں غیر ملکیوں کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ مکار، بدچلن، عیاش اور نحیف و نزار سازشی درباری تھا لیکن خود روسیوں کے نزدیک وہ نہ اِلّا الّذِی تھا نہ اَلّا الّذِی، وہ اسے محض کٹھ پتلی سمجھتے ہیں اور اسے صرف اس لیے مفید مطلب گردانتے ہیں کیونکہ اس کا نام روسی تھا۔

5

1812-1813 کے دوران میں کوتوزوف پر سنگین غلطیاں کرنے کے الزامات کھلم کھلا لگائے جاتے رہے۔ امپراطور اس سے ناخوش تھا۔ اور تاریخ کی ایک تازہ ترین کتاب،[2] جو اعلیٰ ترین حکام کے ایما پر لکھی گئی تھی، کہا گیا کہ کوتوزوف مکار درباری دروغ گو تھا، نپولین کا نام سنتے ہی اس کے پسینے چھوٹنے لگتے تھے اور اس نے کراسنایا اور بریزینا میں جن

* عظیم۔ برتر

مہلک غلطیوں کا ارتکاب کیا، اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ روسی فوج کو فرانسیسیوں پر فتح پانے سے جو شان وشوکت حاصل ہوتی، وہ اس سے محروم ہوگئی۔

یہ ہے مقدر، عظیم اشخاص—grands hommes—کا نہیں جنھیں روسی ذہن قبول نہیں کرتا، بلکہ ان گنے چنے اور مدام تنہا انسانوں کا، جو مشیت ایزدگی کا ادراک کرنے کے بعد اپنی مشیت کو اس کے تابع بنا دیتے ہیں۔ انھیں محض اس لیے ہجوم کی نفرت وحقارت کا نشانہ بننا پڑتا ہے کیونکہ انھیں اعلیٰ تر قوانین کا شعور ہوتا ہے۔

یہ بات کتنی عجیب اور ہولناک ہے کہ روسی مورخین تاریخ کے حقیر ترین آلۂ کار نپولین تو، جو جلاوطنی کے دنوں میں بھی انسانی عزت ووقار سے عاری رہا، بڑھ چڑھ کر تعریف وتحسین کرتے ہیں اور اس پر جی جان سے فدا ہوتے ہیں، لیکن انھیں کوتوزوف—وہ شخص جس نے 1812 کے دوران میں اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں شروع سے آخر تک، بارودینو سے ولنا تک، گفتار اور کردار کے اعتبار سے ایک مرتبہ بھی اپنے آپ سے بے وفائی نہیں کی، جو ایثار اور قربانیٔ ذات کی ایک ایسی مثال پیش کرتا ہے جو تاریخ میں شاذ ونادر ہی ملتی ہے اور موجودہ واقعات کی مستقبل میں کیا اہمیت ہوگی، اس کا حال میں درک کرتا ہے۔ انھیں کوتوزوف کوئی پھسپھسی اور قابل رحم چیز نظر آتا ہے اور جب وہ اس کا اور 1812 کا ذکر کرتے ہیں، ہمیشہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ ان واقعات کے بارے میں وہ قدرے منفعل اور شرمسار ہیں۔

(مورخین کے) اس (رویے) کے باوجود کسی ایسی تاریخی ہستی کا، جس نے اپنی ساری صلاحیتیں اور قوتیں اتنے استقلال اور تسلسل سے واحد ہدف کے حصول پر لگادی ہوں، سراغ لگانا محال ہے اور کسی ایسے ہدف کا، جو پوری قوم کے لیے سرمایۂ افتخار اور اس کے منشا سے اتنا ہم آہنگ ہو، تصور تو اور بھی مشکل ہے۔ پھر تاریخ میں ایسی مثال تو شاید ڈھونڈنے سے بھی نہ ملے کہ کسی تاریخی شخصیت کا ہدف اتنی کامیابی سے مکمل ہوا ہو جتنا کہ وہ ہوا جس پر کوتوزوف نے اپنی تمام مساعی مرکوز کر رکھی تھیں۔

کوتوزوف نے کبھی اس قسم کی بڑ نہیں ہانکی کہ ''چالیس صدیاں اہرام سے نیچے جھانک رہی ہیں''، نہ اس نے کبھی ان قربانیوں کا، جو اس نے وطن کی خاطر دیں، ذکر کیا اور نہ اس نے کبھی یہ جتایا کہ وہ کیا کر چکا ہے یا اس کا کیا کرنے کا عزم ہے۔ اصولاً وہ کبھی اپنے متعلق بات نہیں کرتا تھا، وہ نہ ڈوں کی لیتا تھا اور نہ بننے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ ہمیشہ انتہائی سیدھا سادا اور عام آدمی دکھائی دیتا تھا، اپنی بیٹیوں اور مادام دَستیل کے نام خطوط لکھتا رہتا تھا، ناولوں کی ورق گردانی کرتا تھا، خوب رو خواتین کی صحبت پسند کرتا تھا، جرنیلوں، افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ ہنسی مذاق کرتا تھا اور جو لوگ اس کے ساتھ بحث کرنے کی کوشش کرتے تھے، کبھی ان کی تردید نہیں کرتا تھا۔ جب کاؤنٹ رستوپ چین سرپٹ گاڑی دوڑاتا یاؤزا پل پر کوتوزوف کے پاس پہنچا، اپنی زبان سے اسے ماسکو کی تباہی کا مجرم ٹھہرایا اور کہا: ''آپ نے وعدہ نہیں کیا تھا کہ آپ لڑائی کے بغیر ماسکو سے ہاتھ نہیں اٹھائیں گے۔؟'' اگرچہ ماسکو کو پہلے ہی ترک کیا جا چکا تھا، کوتوزوف نے جواب دیا: ''میں لڑائی کے بغیر ماسکو سے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔'' جب

آراک چیف زار کا یہ پیغام لے کر پہنچا کہ یرمالوف کو توپ خانے کا سربراہ مقرر کر دینا چاہیے، کوتوزوف نے جواب دیا: ''ہاں، میں بھی یہی سوچ رہا تھا۔'' حالانکہ ایک ثانیہ پیشتر وہ اس کے بالکل الٹ کہہ چکا تھا۔ اگر رستوپ چن ماسکو کی تباہی و بربادی اس کے کھاتے میں ڈالتا تھا، تو اس سے اس کی صحت پر یا خود رستوپ چن کی صحت پر کیا اثر پڑتا تھا؟ رہی یہ بات کہ توپ خانے کا سربراہ کون مقرر ہوتا ہے، اس کے نزدیک اس کی اہمیت تو اور بھی کم تھی۔

اس مردِ ضعیف نے — جسے زندگی کے تجربے نے یہ باور کرا دیا تھا کہ خیالات اور الفاظ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کرنے کے لیے انسانوں کی مدد ضرور کرتے ہیں لیکن انھیں عمل پر آمادہ نہیں کرتے — اوپر کی مثالوں میں ہی نہیں اس طرح کی بے معنی باتیں یا الفاظ نہیں کہے بلکہ جب کبھی ضرورت پیش آتی، وہ اس قسم کی پھل جھڑیاں اور شگوفے، جو سب سے پہلے اس کے ذہن میں وارد ہو جاتے تھے، چھوڑتا رہتا تھا۔

لیکن اس امر کے باوجود کہ یہ آدمی الفاظ کے استعمال کے بارے میں اتنا غیر محتاط تھا، اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی کے دوران میں اپنی زبان سے ایسا ایک لفظ بھی نہ کہا جو اس مقصد وحید سے، جس کے حصول کے لیے وہ جنگ کے سارے عرصے میں کام کرتا رہا تھا، مطابقت نہ رکھتا ہو۔ اگرچہ اسے یہ تلخ یقین تھا کہ وہ جو کچھ کہے گا، اسے سمجھا نہیں جائے گا اور وہ اپنے اصل خیالات کا اظہار کرنے میں متامل بھی رہتا تھا، اس کے باوجود اس نے انتہائی مختلف حالات میں ایک سے زیادہ مرتبہ ان کا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ دکھائی۔ اس کے اس رویے کی ابتدا بارودینو کی لڑائی سے ہوتی ہے۔ وہ واحد شخص تھا جو یہ دعویٰ کرتا تھا کہ بارودینو کی لڑائی میں روس کو فتح حاصل ہوئی ہے۔ وہ مرتے دم تک اس اِدّعا سے دست بردار نہ ہوا اور اس کا زبانی اور اپنے مراسلوں اور رپورٹوں میں بار بار اعادہ کرتا رہا۔ وہ واحد شخص تھا جو سرِ عام کہتا تھا کہ سقوطِ ماسکو سقوطِ روس نہیں ہے۔ امن کی جو تجاویز لوغستان لے کر آیا تھا، ان کا اس نے یہ جواب دیا: صلح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ اس وقت میری قوم کی مرضی یہی ہے۔ فرانسیسیوں کی پسپائی کے دوران میں وہ واحد شخص تھا جو یہ کہتا تھا: ہماری چالیں بے سود ہیں؛ ہر چیز ہماری خواہشات سے بڑھ کر خود بخود تکمیل کے مرحلے طے کر رہی ہے: یہ کہ ہمیں دشمن کو ''پل زریں'' پیش کرنا چاہیے (اور انھیں اپنے آپ کو خود ہی تباہ کر لینے دینا چاہیے): یہ کہ تاروتینو، ویازما اور کراسنایا کی لڑائیوں میں سے کسی کی بھی ضرورت نہیں تھی: یہ کہ سرحد تک پہنچنے کے لیے ہمیں اپنی زیادہ سے زیادہ نفری بچانا چاہیے: اور یہ کہ وہ دس فرانسیسیوں کے عوض ایک بھی روسی کی قربانی نہیں دے گا۔

اور یہ درباری، جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ وہ بس یہی کچھ تھا، جو زار کو خوش کرنے کے لیے آراک چیف کے سامنے دروغ گوئی سے کام لیتا ہے، وہ واحد شخص تھا جس نے ولنا میں یہ کہا — حالانکہ اپنی اس بات سے اسے زار کی ناراضگی مول لینا پڑی — کہ سرحد پار جنگ کا سلسلہ جاری رکھنا بیکار اور ضرر رساں ہے۔

یہ کہ اس نے اپنے زمانے میں واقعات کی اہمیت کا ادراک کر لیا تھا، اس کا ثبوت محض اس کے الفاظ سے ہی نہیں ملتا۔ اس کے تمام اعمال — کسی قسم کے خفیف ترین انحراف کے بغیر — واحد اور سہ جہتی مقصد کے حصول کے

لیے وقف تھے: (1) فرانسیسیوں کے ساتھ ٹکر لینے کے لیے اپنی تمام افواج کو ایک مقام پر مجتمع کرنا (2) انھیں شکست دینا اور (3) انھیں روس سے باہر نکالنا۔ اور اس کی کوشش یہی رہی کہ عوام الناس اور فوج کو حتی الوسع کم سے کم مصائب سے دوچار ہونا پڑے۔

اس تاخیر پسند کوتوزوف نے، جس کا ماٹو ''صبر و تحمل اور وقت'' تھا اور جو عاجلانہ اور ناعاقبت اندیشانہ کارروائیوں کا کٹر مخالف تھا، بارودینو میں دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اس مقابلے کے لیے بے مثال سنجیدگی سے تیاریاں کیں۔ یہ کوتوزوف، جس نے اوسٹرلٹس کا معرکہ بپا ہونے سے پہلے ہی یہ اعلان کر دیا تھا کہ اس میں ہمیں شکست ہوگی، واحد شخص تھا جو، جرنیلوں کے اس یقین کے، کہ بارودینو میں ہمیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا اور اس حقیقت کے، کہ فتح حاصل ہونے کے باوجود فوج کو پسپا ہونا پڑا، علی الرغم اور ہر شخص کی رائے کے خلاف آخر دم تک یہ دعویٰ کرتا رہا کہ بارودینو میں ہمیں کامیابی ملی ہے۔ وہ واحد شخص تھا جو پسپائی کے دوران میں یہ اصرار کرتا رہا کہ اب لڑائیاں لڑنے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا، لہٰذا ان سے احتراز واجب ہے، نئی جنگ شروع نہیں ہونا چاہیے اور روس کی سرحدوں کے پار نہیں جانا چاہیے۔

اب جب کہ یہ تمام واقعات اور ان کے نتائج وعواقب ہمارے سامنے ہیں، ان کی معنویت سمجھنا آسان ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ہم ان مقاصد کو، جو زیادہ سے زیادہ ایک درجن اشخاص کے اذہان میں موجود تھے، عوام الناس سے منسوب کرنا چھوڑ دیں۔

پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ یہ بوڑھا شخص واحد آدمی تھا جس نے عمومی رائے کی مخالفت کرتے ہوئے قوم کے لیے واقعات کی معنویت کو اتنے صحیح طریقے سے سمجھ لیا کہ اپنی ملازمت کے دوران میں اس نے ایک مرتبہ بھی اس سے روگردانی نہ کی؟

اپنے زمانے کے واقعات کی صحیح تفہیم کرنے کی اس غیر معمولی صلاحیت سے وہ اس لیے بہرہ ور ہوا کیونکہ اس نے جس جذبے سے اپنی قوم کی امنگوں اور احساسات سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کیا، وہ پاکیزہ اور پرقوت تھا۔

چونکہ عوام الناس نے اس معتوب بوڑھے شخص کے اندر اس جذبے کو پہچان لیا تھا، اس لیے انھوں نے زار کی خواہشات کے علی الرغم اسے اس عجیب وغریب انداز سے قومی جنگ میں اپنا نمائندہ منتخب کر لیا اور صرف یہی وہ جذبہ تھا جس نے اسے بلندترین انسانی مقام پر پہنچا دیا جہاں سے اس، کمانڈر انچیف، نے اپنے تمام اختیارات لوگوں کو قتل یا ملیامیٹ کرنے کے لیے نہیں، بلکہ انھیں بچانے اور ان پر ترس کھانے کے لیے وقف کر دیے۔

اس سیدھے سادے، منکسر المزاج اور چنانچہ صحیح معنوں میں عظیم انسان کو یورپی ہیرو، لوگوں کے نام نہاد رہنما، کے سانچے میں، جو تاریخ کی ایجاد ہے، نہیں ڈھالا جا سکتا۔

چچھوں اور کاسہ لیسوں کے نزدیک کوئی آدمی بھی عظیم نہیں ہو سکتا کیونکہ چچھوں اور کاسہ لیسوں کے عظمت کے اپنے تصورات ہوتے ہیں۔

6

5 نومبر اس لڑائی کا، جسے کراسنایا کی لڑائی کہا جاتا ہے، پہلا دن تھا۔ اس روز جرنیلوں کو جن مقامات پر متعین کیا گیا تھا، وہ وہاں تو نہ گئے لیکن آپس میں خوب الجھتے اور تو تو میں میں کرتے رہے، اور ایجوٹنٹوں کو متضاد احکام دے کر ادھر ادھر بھیجتے رہے۔ یوں کرتے کراتے شام آ گئی اور یہ بالکل واضح ہو گیا کہ دشمن ہر جگہ راہ فرار اختیار کر رہا ہے، چنانچہ لڑائی ہو سکتی ہے اور نہ ہو گی۔ جب حالات نے یہ اختیار کیا، کوتوزوف نے کراسنایا کو خیر باد کہا اور دبرایا چلا گیا، جہاں اس روز ہیڈ کوارٹر منتقل کر دیا گیا۔

اس روز پالا تو خوب پڑ رہا تھا لیکن مطلع صاف تھا۔ کوتوزوف اپنے فربہ کوتاہ قامت سفید گھوڑے پر سوار تھا۔ اس کے پیچھے پیچھے آزردہ اور نامطمئن جرنیلوں کی فوج ظفر موج تھی۔ وہ سب سٹاف میں شامل تھے۔ ان کے منہ لٹکے ہوئے تھے اور وہ آپس میں چہ میگوئیاں کرتے آ رہے تھے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ فرانسیسی (اس روز سات ہزار کی گرفتاری عمل میں آئی تھی) ٹولیوں کی صورت میں پڑاؤ کے الاؤوں کے اردگرد سکڑے بیٹھے تھے اور آگ تاپ رہے تھے۔ دبرایا کے قریب مفلوک الحال قیدیوں کا بہت بڑا گروہ سڑک کے کنارے فرانسیسی توپوں کی طویل قطار کے سامنے کھڑا تھا۔ ان قیدیوں کے جو کچھ بھی ہاتھ لگا، انھوں نے اسے اپنے ابدان کے اردگرد لپیٹ لیا تھا یا اس سے اپنے زخموں پر پٹیاں باندھ لی تھیں۔ ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ دور سے سنائی دے رہی تھی۔ کمانڈر انچیف کی آمد پر وہ سب خاموش ہو گئے اور تمام نگاہیں کوتوزوف پر مرکوز ہو گئیں۔ کوتوزوف کے سر پر سفید ٹوپی، جس پر سرخ ربن آویزاں تھا، رکھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر اوور کوٹ تھا۔ اس اوور کوٹ میں اون بھری ہوئی تھی اور اس کے شانے ابھرے ہوئے تھے۔ وہ سڑک پر چہل قدمی کے انداز سے چل رہا تھا اور ایک جرنیل اسے بتا رہا تھا کہ توپیں اور قیدی کہاں سے پکڑے گئے ہیں۔

معلوم ہوتا تھا کہ کوتوزوف اپنی ادھیڑ بن میں کھویا ہوا ہے اور جو کچھ جرنیل کہہ رہا ہے، اسے سن نہیں رہا۔ اس نے ناراضگی کے انداز سے اپنی آنکھیں بھینچ لیں اور نہایت توجہ اور انہماک سے قیدیوں کو دیکھنے لگا جو خاص طور پر قابل رحم منظر پیش کر رہے تھے۔ اکثر قیدیوں کی ناکیں اور رخسار پالا لگنے سے خراب ہو چکے تھے اور یوں ان کی شکلیں مسخ ہو رہی تھیں۔ آنکھیں تو تقریباً سبھی کی سرخ اور پھولی ہوئی تھیں، اور زخموں کی وجہ سے ان میں پیپ پڑ چکی تھی۔

فرانسیسیوں کا ایک گروپ سڑک کے بالکل قریب کھڑا تھا اور ان کے دو سپاہی۔۔ ان دونوں میں سے ایک کا چہرہ پھنسیوں سے ڈھکا ہوا تھا۔۔ اپنے ہاتھوں سے کچے گوشت کا پارچہ نوچ رہے تھے۔ انھوں نے جس سرسری انداز سے اپنے پاس سے گزرنے والے سواروں کو دیکھا اور اس سپاہی نے، جس کے چہرے پر پھنسیاں ہی پھنسیاں تھیں، جس غضب آلود اور بدخواہانہ طریقے سے ناک بھوں چڑھائی، منہ دوسری طرف پھیرا اور جو کچھ وہ کر رہا تھا، اسے دوبارہ کرنے لگا، اس میں ایک قسم کی حیوانیت پائی جاتی تھی اور اس کے اس رویے کو دیکھ کر دوسروں کو وحشت ہونے لگی۔

کوتوزوف بڑی توجہ سے اور کافی دیر تک ان دونوں سپاہیوں کو دیکھتا رہا۔ اپنے ماتھے پر مزید بل ڈالتے اور آنکھیں مزید بھینچتے اس نے کچھ سوچتے ہوئے اپنا سر ہلا دیا۔ ایک دوسری جگہ اس نے ایک روسی سپاہی کو ہنستے، ایک فرانسیسی سے دوستانہ انداز سے کچھ کہتے اور اس کے کندھے پر تھپکی دیتے دیکھا۔ کوتوزوف نے اپنی دوبارہ وہی شکل بنائی اور اپنا سر ہلا دیا۔

''کیا؟ کیا کہا آپ نے؟'' اس نے جرنیل سے پوچھا جو ابھی تک اپنی رپورٹ سنا رہا تھا۔ جرنیل کمانڈر انچیف کی توجہ چند پرچموں کی طرف لا رہا تھا جو فرانسیسیوں سے چھینے گئے تھے اور پری ابرازینسکی رجمنٹ کے سامنے نصب تھے۔

''اخاہ، پرچم!'' کوتوزوف نے بڑی مشکلوں سے ان خیالات کو، جن میں مستغرق تھا، جھٹکتے ہوئے کہا۔

اس نے بے دھیانی سے اپنے گرد و پیش دیکھا۔ چاروں اطراف سے ہزاروں نگاہیں اسے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھیں۔ سبھی لوگوں کو توقع تھی کہ وہ کچھ نہ کچھ ضرور کہے گا۔

وہ پری ابرازینسکی رجمنٹ کے سامنے رک گیا۔ اس نے آہ بھری اور اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ سٹاف کے ایک رکن نے سپاہیوں کو، جو پرچم تھامے کھڑے تھے، آگے آنے اور انھیں کمانڈر انچیف کے آس پاس نصب کرنے کا اشارہ کیا۔ کوتوزوف چند سیکنڈ خاموش رہا اور پھر بڑی بے دلی سے ان فرائض کے سامنے، جو اس کی حیثیت نے اس پر عاید کر دیے تھے، جھکتے ہوئے اس نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور تقریر کرنے لگا۔ افسروں کے ہجوم نے اس کے اردگرد گھیرا ڈال لیا۔ اس نے ان لوگوں کے حلقے کو بغور دیکھا اور ان میں سے کئی ایک کو پہچان لیا۔

''میں آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں!'' اس نے سپاہیوں سے مخاطب اور افسروں کی جانب دوبارہ متوجہ ہو کر کہا۔ اس کے چاروں اطراف جو سکوت چھایا ہوا تھا، اس میں اس کے الفاظ واضح طور پر سنائی دے رہے تھے۔ ''آپ لوگوں نے جس جاں فشانی اور وفاداری سے خدمات سرانجام دی ہیں، میں اس کے لیے آپ سب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ فتح مکمل ہو گئی ہے اور روس آپ کو فراموش نہیں کرے گا۔ میری خداوند سے دعا ہے کہ وہ آپ کو سدا ایسے ہی عز و وقار اور شان و شکوہ سے سرفراز کرتا رہے!''

وہ رکا اور اس نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی۔

''نیچے کرو، اسے سر سمیت نیچے کرو!'' اس نے ایک سپاہی سے کہا جس نے فرانسیسی جھنڈا، جو وہ پکڑے ہوئے تھا اور جس پر فرانسیسی نشان، عقاب، کندہ تھا، نادانستہ پری ابرازینسکی رجمنٹ کے پرچموں کے سامنے جھکا دیا تھا۔ ''اسے اور نیچا کرو، اور نیچا۔ ہاں، یہ ہوئی نہ بات، جوانو ہرّا!'' اس نے اپنی ٹھوڑی کو تیزی سے ادھر ادھر گھماتے سپاہیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔

''ہرّ۔ر۔را!'' ہزاروں فلک شگاف آوازیں گونجنے لگیں۔

جب سپاہی نعرے لگا رہے تھے، کوتوزوف اپنی زین پر آگے کی طرف جھکا اور اس کی آنکھوں میں نرم و ملائم

اور قدرے طنزیہ چمک آ گئی۔

''جوانو، مجھے...'' نعرے بازی ختم ہونے پر اس نے کہا۔

اچانک اس کی آواز اور چہرے کے تاثرات تبدیل ہو گئے۔ اب کمانڈر انچیف نہیں بلکہ ایک عام آدمی بول رہا تھا، جو اپنے ساتھیوں کو کوئی اہم بات بتانا چاہتا تھا۔

افسروں کے ہجوم اور جوانوں کی صفوں میں عام ہل چل نمودار ہو گئی۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، اسے سننے کے لیے سبھی ہمہ تن گوش ہو گئے۔

''جوانو، مجھے معلوم ہے کہ تمھیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے لیکن کیا کیا جائے، اس کا کوئی علاج نہیں۔ ہمت اور حوصلے سے کام لیں۔ یہ مصیبتیں اب زیادہ عرصہ نہیں رہیں گی۔ ہم اپنے مہمانوں کو رخصت کر دیں گے اور پھر ہم آرام کریں گے۔ زار تمھاری خدمات فراموش نہیں کریں گے۔ بے شک تمھیں مصائب جھیلنا پڑ رہے ہیں لیکن پھر بھی تم اپنے وطن میں ہو، جب کہ یہ — تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ ان کا کیا حشر ہوا ہے۔'' اس نے قیدیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ان کی حالت گئے گزرے سے گئے گزرے بھکاری سے بھی بدتر ہے۔ جب یہ طاقت ور تھے، ہم نے ہار نہیں مانی، مگر اب ہم ان پر ترس بھی کھا سکتے ہیں۔ آخر یہ بھی انسان ہیں۔ کیا خیال ہے، جوانو؟''

اس نے اپنے گرد و پیش دیکھا اور جو کچھ اس نے کہا تھا، اسے اس کے ساتھ ان پر استقلال، مؤدب اور متعجب نظروں میں ہمدردی چھلکتی دکھائی دی۔ کبرسنی کے نرم و لطیف تبسم سے اس کا چہرہ روشن سے روشن تر ہوتا جا رہا تھا اور اس کے اس تبسم سے اس کی آنکھوں اور ہونٹوں کی رگیں کچھ اس طرح کھنچ گئیں کہ وہاں ستاروں کے جھرمٹ کی طرح جھریاں اکٹھا ہو گئیں۔ وہ رک گیا اور اس نے اپنے سر کو یوں جھکا لیا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔

''تاہم پھر بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ انھیں یہاں بلایا کس نے تھا؟ ان کے ساتھ جو ہوا، ٹھیک ہوا۔ ''ہ۔ہ۔ ہرّا—!'' اس نے اچانک اپنی گردن اوپر اٹھا کر با آواز بلند کہا۔

اور پوری مہم کے دوران میں وہ پہلی مرتبہ اچابک لہراتے اور سرپٹ گھوڑا دوڑاتے وہاں سے آگے نکل گیا۔ اس کے عقب میں جوانوں نے صفیں توڑ ڈالیں اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے اور زور زور سے ''ہرّا'' کے نعرے بلند کرنے لگے۔

کوتوزوف کے الفاظ عام سپاہیوں کے بمشکل پلے پڑے تھے۔ فیلڈ مارشل نے کیا کہا تھا، کوئی بھی شخص اسے حتمی طور پر صحیح انداز سے دہرا نہیں سکتا تھا۔ لوگوں کو بس اتنا معلوم تھا کہ اس کی تقریر کا آغاز نہایت سنجیدہ اور گمبھیر انداز سے ہوا تھا لیکن آخر میں اس نے بوڑھے آدمی کی کھلی ڈلی اور بے ریا باتوں کی صورت اختیار کر لی تھی۔ لیکن اس تقریر کے بین السطور جو خلوص جھلک رہا تھا اور اس میں پرشکوہ کامیابی کا جو احساس شامل تھا، اس میں دشمن کے لیے جو رحم کا جذبہ اور ہمارے مقصد کے برحق ہونے کا شعور — جس کا اظہار پیرانہ سال شخص نے اتنے موزوں انداز سے نیک دلانہ دشنام کے ذریعے کیا تھا — شامل تھا، اسے نہ صرف سمجھ لیا گیا بلکہ وہ ہر سپاہی کے اپنے دل کی آواز بھی تھا اور انھوں نے

اس کا اظہار پُر مسرت نعروں سے کیا جو تادیر جاری رہے۔

جب بعدازاں ایک جرنیل نے کمانڈرانچیف سے دریافت کیا: ''آپ کی کالاش منگوائی جائے؟'' جواب دینے کی کوشش میں کوتوزوف کی، جو بہت متاثر دکھائی دیتا تھا ہچکی نکل گئی۔

7

کراسنایا کی لڑائی کے آخری روز، آٹھ نومبر کو، جب لشکری شب بسری کے لیے اپنی عارضی قیام گاہوں میں واپس آئے، جُھٹ پٹے کا وقت ہو رہا تھا۔ سارا دن ہوا بند رہی اور پالا جما رہا تھا۔ بیچ بیچ میں ہلکی پھلکی برف باری بھی ہوتی رہی تھی۔ شام کے قریب مطلع صاف ہونے لگا۔ برف کے گالوں کے درمیان میں سے سیاہ، ارغوانی، ستاروں بھرا آسمان نظر آنے اور سردی میں اضافہ ہونے لگا۔

پیادہ بندوقچیوں کی ایک رجمنٹ، جو تاروتینو سے تین ہزار افراد کی نفری کے ساتھ روانہ ہوئی تھی اور جس کی تعداد اب صرف نو سو رہ گئی تھی، عارضی قیام گاہ (شاہراہ کے کنارے ایک گاؤں) میں سب سے پہلے پہنچی تھی۔ جن کوارٹر ماسٹروں نے رجمنٹ کا استقبال کیا، انھوں نے بتایا کہ تمام جھونپڑے مردہ اور علیل فرانسیسیوں، گھڑسواروں اور سٹاف افسروں سے کھچا کھچ بھرے ہوئے ہیں، صرف رجمنٹل کمانڈر کے لیے ایک جھونپڑا خالی ہے۔

کرنل نے گھوڑا بڑھایا اور اس جھونپڑے میں چلا گیا۔ رجمنٹ پا پیادہ گاؤں میں سے گزرتی آخری جھونپڑوں کے قریب پہنچی اور وہاں اپنے ہتھیاروں کا ڈھیر لگا دیا۔

کسی عظیم الجثہ اور کثیرالاعضا عفریت کی طرح رجمنٹ اپنا بھٹ بنانے اور کھانا تیار کرنے لگی۔ سپاہیوں کی ایک یونٹ گرتی پڑتی، گھٹنوں گھٹنوں برف میں دھنستی، گاؤں کے مشرق میں جنگل کی طرف چل پڑی۔ کچھ ہی دیر کے بعد وہاں سے کلہاڑیوں اور تلواروں کے ساتھ ضربیں لگانے، تنوں کے نیچے گرانے اور ہنس ہنس کر باتیں کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دوسری یونٹ رجمنٹ کے چھکڑوں اور گھوڑوں کے مابین، جنھیں ایک جگہ اکٹھا کر دیا گیا تھا، دیگچے اور رس بسکٹ نکالنے اور جانوروں کو چارا چبینا کھلانے میں مصروف ہوگئی۔ تیسری یونٹ گاؤں میں بکھر گئی۔ اس کے جوان سٹاف افسروں کے لیے رہائش کا بندوبست کرنے، فرانسیسیوں کی لاشیں باہر گھسیٹنے، الاؤ جلانے کے لیے تختے اور خشک لکڑی ڈھونے، اور یوں توں اپنی پناہ گاہیں کھڑی کرنے کے لیے چھتوں سے شہتیر، ڈنڈے، بالے اور گھاس پھوس کھدیڑنے لگے۔

گاؤں کے آخری سرے پر جھونپڑوں کے عقب میں تقریباً پندرہ سپاہی ایک سائبان کی، جس کی چھت پہلے ہی اتاری جا چکی تھی، ٹھاٹر کی خاصی اونچی دیوار ہلانے جلانے اور شگفتہ مزاجی سے چیخنے چلانے میں مصروف تھے۔

''ہیا ہیا، زور لگاؤ بھیا، زور لگاؤ، سب مل کر زور لگاؤ!'' وہ سب چیخ چلا رہے تھے اور رات کی تاریکی میں، خاصی بڑی دیوار، جس میں برف اور پالا جما ہوا تھا، جھولنے اور چرچرانے لگی۔ اس کے زیریں ڈنڈوں کی چٹاخ پٹاخ

میں ہر آن اضافہ ہونے لگا۔ بالآخر دیوار زمیں بوس ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی وہ سپاہی بھی، جو اس کے ساتھ زور آزمائی کر رہے تھے، نیچے گر پڑے، اونچی چیخیں بلند ہوئیں اور ان کے بعد پُر شور قہقہے گونجنے لگے۔

''دو دو مل کر پکڑو!... یہاں ذرا چھید کر دو!... بس ٹھیک ہے... یہ تم دھکے کیوں دے رہے ہو؟''

''ہاں، سب مل کر! نہیں، ذرا ٹھہرو۔ کچھ گانا وانا بھی ہونا چاہیے۔ کیا خیال ہے، دوستو؟''

سبھی خاموش ہو گئے۔ ایک نرم و گداز، مخملیں اور شیریں آواز گونجی اور گانا گانے لگی۔ تیسرے بند کے اختتام پر جب سُر دھیما ہوا اور آواز چپ ہو گئی، بیس آوازیں بیک وقت چنگھاڑنے لگیں: ''او۔ او۔ او! لو، یہ کھسکنے لگی ہے! سب مل کر! زور لگاؤ، دوستو، زور لگاؤ!''

لیکن ان کی متحدہ کوششوں کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہ ہوا، ٹھاٹر بمشکل ایک آدھ انچ کھسکایا جا سکا اور اس کے بعد جو خاموشی چھائی، اس میں ان کے ہانپنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''چھٹی کمپنی والو، شیطانو، دوزخیو، کہاں جا رہے ہو تم؟ یہ تم کھڑے منہ کیا تک رہے ہو!... ذرا ہاتھ بٹاؤ... کبھی تمھیں بھی ہماری ضرورت پڑے گی...''

چھٹی کمپنی کے تقریباً بیس جوان، جو گاؤں کی طرف جا رہے تھے، ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور جعفری کی تقریباً پینتیس فٹ لمبی اور سات فٹ اونچی دیوار گاؤں کی گلی میں گھسیٹی جانے لگی۔ دیوار ڈگمگا رہی، ہانپتے آدمیوں کو اپنے بوجھ تلے دبا رہی اور ان کے کندھوں کو چھلنی کیے جا رہی تھی۔

''چلتے چلو، چلتے چلو، چلو نا!... دیکھو، تمھارے ہاتھ سے چھوٹ رہی ہے... رک کیوں گئے؟... ہاں ٹھیک ہے...'' شگفتہ اور بے معنی مغلظات کا سلسلہ رکنے میں نہیں آ رہا تھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سارجنٹ میجر کی تحکمانہ آواز گونجی۔ وہ اتفاقاً بوجھ گھسیٹتے آدمیوں کے سروں پر پہنچ گیا تھا۔

''یہاں سٹاف کے لوگ موجود ہیں، خود بڑے جرنیل اس جھونپڑے میں تشریف فرما ہیں۔ بدزبانو، شیطانو میں تمھیں سبق سکھا دوں گا!'' اس نے چلاتے ہوئے کہا اور جو اولین شخص اس کی زد میں آیا، اس نے پوری قوت سے اس کی پشت پر گھونسا رسید کر دیا۔ ''کیا تم شور شرابا کم نہیں کر سکتے؟''

جوانوں کو سانپ سونگھ گیا اور ان کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ جس شخص نے گھونسا کھایا تھا، اس نے اپنے خون آلود چہرے پر ہاتھ پھیرا، گھونسا لگنے سے وہ منہ کے بل ٹھاٹر سے ٹکرا گیا تھا اور یوں اس نے اپنا چہرہ چھیل لیا تھا۔

''اس شیطان کے بچے کو گھونسا مارنا آتا ہے۔ میرا منہ لہولہان ہو گیا ہے،'' اس نے سارجنٹ میجر کے جانے کے بعد ڈرے سہمے انداز سے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''تمھیں اچھا نہیں لگا؟ یہ بھی خوب رہی!'' کسی نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا اور سپاہی زیر لب بولتے آگے ہی آگے چلتے رہے۔

تاہم جب وہ گاؤں سے باہر نکل گئے، وہ پہلے کی طرح پھر زور و شور سے بولنے اور بیچ بیچ میں وہی بے معنی

گالیاں اگلنے لگے۔

وہ جس جھونپڑے کے سامنے سے گزرے تھے، وہاں افسران اعلیٰ جمع تھے اور بڑے ذوق وشوق سے دن بھر کے واقعات پر تبصرہ آرائی کر رہے اور اگلے روز کی چالیں سوچ رہے تھے۔ وائسرائے کا راستہ کاٹنے اور اسے گرفتار کرنے کے لیے بائیں جانب فلینک مارچ کی تجویز پیش کی گئی تھی۔

جس وقت لشکری جعفری کی دیوار گھسیٹ کر اپنے ڈیرے پر پہنچے، کھانا پکانے کے لیے جگہ جگہ آگ بھڑک رہی تھی، لکڑی چٹخنے اور برف پگھلنے لگی تھی۔ پڑاؤ میں برف پاؤں تلے روندی جا چکی تھی اور ادھر ادھر گھومتے پھرتے سپاہیوں کے سائے رقص کر رہے تھے۔

جا بجا کلہاڑیاں اور تیشے چل رہے تھے۔ سب کچھ احکام کے بغیر ہو رہا تھا۔ رات کے لیے لکڑیوں کے ڈھیر لگائے جا چکے تھے، افسروں کے لیے عارضی پناہ گاہیں کھڑی کی جا چکی تھیں، پانی ابالنے کے لیے دیگچے چڑھائے جا چکے تھے اور ہتھیار اور دوسرا سامان ترتیب سے رکھا جا چکا تھا۔

شمالی ہوا سے بچنے کے لیے آٹھویں کمپنی کے جوانوں نے جعفری کی دیوار نیم دائرے کی شکل میں کھڑی کر دی، اسے سہارا دینے کے لیے اس کے ساتھ دستی بندوقیں ایستادہ کر دی گئیں اور اس کے سامنے الاؤ جلا دیا گیا۔

(10 بجے) رات کی نوبت بجا دی گئی، حاضری لگائی گئی، کھانا کھایا گیا اور وہ رات گزارنے کے لیے آگ کے لیے ارد گرد اکٹھے ہونے لگے — کچھ لیٹ گئے، کچھ اپنے جوتے مرمت کرنے، کچھ پائپ پینے اور بعض آگ کی تپش میں جوئیں مارنے کے لیے اپنے کپڑے اتارنے لگے۔

8

ان ایام میں جب روسی سپاہیوں کی حالت ناگفتہ بہ تھی — ان کے پاس گرم بوٹوں اور پوستینی کوٹوں کی کمی تھی، منفی اٹھارہ درجہ حرارت[3] میں سروں پر چھت ناپید تھی اور اکثر اوقات ناکافی خوراک ملتی تھی کیونکہ محکمہ رسد تیز رفتاری میں فوج کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ ایسے میں آدمی کو خیال آتا ہے کہ وہ بے پناہ افسردگی اور دل شکستگی کا منظر پیش کرتے ہوں گے۔

لیکن صحیح صورت حال اس کے بالکل برعکس تھی۔ فوج جس زندہ دلی اور شگفتگی کا مظاہرہ کر رہی تھی، وہ اس نے کبھی بہترین عسکری اور مادی حالات میں بھی نہیں کیا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ حقیقت تھی کہ وہ اشخاص، جو کمزوری دکھاتے یا کم حوصلگی کا مظاہرہ کرتے تھے، آئے روز فوج سے بچھڑتے رہتے تھے اور اب صرف وہ لوگ، جو جسمانی اور اخلاقی لحاظ سے سپاہ کے ماتھے کا جھومر تھے، باقی رہ گئے تھے۔

کسی اور جگہ کی نسبت آٹھویں کمپنی کے ٹھاٹر کے عقب میں کہیں زیادہ لشکری جمع تھے۔ ان کے ساتھ دوسارجنٹ

• سوغا

میجر بیٹھے تھے اور دوسروں کے مقابلے میں ان کا الاؤ کہیں زیادہ شدت سے بھڑک رہا تھا۔ پناہ کے پیچھے بیٹھنے کا استحقاق حاصل کرنے کے لیے سوختنی لکڑی لانا ضروری تھا۔

''ارے ماکیف، تم کہاں گم ہو گئے تھے۔ بھیڑیوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گئے تھے؟ جاؤ اور مزید لکڑیاں لاؤ'' ایک سپاہی نے، جس کا چہرہ اور بال سرخ تھے، چلاتے ہوئے کہا۔ دھوئیں کی وجہ سے وہ اپنی آنکھیں ٹیڑھی میڑھی کر رہا اور انھیں برق رفتاری سے جھپکا رہا تھا لیکن آگے سے پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا۔ ''اور تم، Jackdaw*، تم بھی تو کچھ لاؤ،'' اس نے ایک اور سپاہی پر رعب گانٹھتے ہوئے کہا۔

سرخ بالوں والا شخص نہ تو سارجنٹ تھا اور نہ کارپورل۔ لیکن چونکہ وہ سخت جان اور جفاکش تھا، اس لیے وہ دوسروں پر، جو اس سے کمزور تھے، رعب جھاڑتا اور حکم چلاتا رہتا تھا۔ وہ آدمی، جسے Jackdaw کہا گیا تھا، دبلا پتلا اور پست قامت تھا، اور اس کی ناک تیکھی اور سخت تھی۔ وہ فرماں برداری سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور حکم کی تعمیل میں جایا ہی چاہتا تھا کہ آگ کی روشنی میں لکڑیاں اٹھائے ایک نوجوان سپاہی کا چھریرا اور خوبصورت جسم نظر آ گیا۔

''ادھر لے آؤ — یہ ہوئی نا بات!''

انھوں نے لکڑیوں کے ٹکڑے کیے، آگ پر ان کا ڈھیر لگایا، پھر ان پر پھونکیں مارنے اور اپنے اوورکوٹوں کے کونوں سے انھیں ہوا جھلانے لگے۔ شعلے سسیانے اور لکڑیاں چٹخنے لگیں۔ سپاہی آگ کے قریب ہو گئے اور اپنے پائپ جلانے لگے۔ نوجوان خوب رو سپاہی، جو لکڑیاں لایا تھا، دونوں ہاتھ کولھوں پر رکھے اس جگہ، جہاں وہ کھڑا تھا، پھرتی اور مستعدی سے اپنے ٹھنڈے پاؤں پٹخنے لگا۔

''آہ، پیاری ماں، شبنم ٹھنڈی اور شفاف ہے، لیکن بندوقچی کے لیے...'' وہ گانا گانے لگا لیکن لفظ کے ہر ٹکڑے پر یوں آواز نکالتا جیسے وہ گا نہیں بلکہ کھانس رہا ہو۔

''ارے رے رے، دیکھو، تمھارے تلے پرواز کیا چاہتے ہیں!'' سرخ بالوں والے شخص نے چلاتے ہوئے کہا۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ رقاص کے ایک جوتے کا تلا ڈھیلا ہو چکا ہے اور پھڑ پھڑا رہا ہے۔ ''کیا زبردست ناچا ہے!''

رقاص رک گیا، اس نے تلے کا ڈھیلا ٹکڑا کھینچ کر الگ کیا اور آگ میں پھینک دیا۔

''دوست، تم ٹھیک تھے،'' اس نے کہا۔ وہ نیچے بیٹھ گیا، اپنے تھیلے سے فرانسیسی نیلے کپڑے کی کترن نکالی اور اسے اپنے پاؤں کے اوپر باندھ لیا۔ ''ان کا ستیاناس بھاپ میں ہوتا ہے،'' اس نے اپنے پاؤں آگ کی طرف بڑھاتے ہوئے مزید کہا۔

''وہ عنقریب ہمیں نئے دینا شروع کر دیں گے۔ وہ کہتے ہیں کہ انھیں ایک دفعہ گھساؤ تو سہی، پھر وہ دو دو نئے بانٹ دیں گے۔''

''تمھیں معلوم ہے کہ وہ کتے کا تخم بیوقوف واقعی پیچھے رہ گیا ہے،'' ایک سارجنٹ میجر نے کہا۔

* کوے سے ملتا جلتا سیاہ اور خاکستری پرندہ

''میں اتنا عرصہ اس کی نگرانی کرتا رہا،'' دوسرے نے جواب دیا۔

''خیر، وہ بالکل نکما سپاہی تھا...''

''سنا ہے کہ کل حاضری کے دوران میں تیسری کمپنی کے نو آدمی غائب تھے۔''

''جب آدمی کے پاؤں جم کر برف ہو جائیں، وہ چلے گا کیسے؟''

''کیا؟ احمقانہ باتیں مت کرو!'' سارجنٹ میجر نے کہا۔

''شاید تم بھی یہی سوچ رہے ہو!'' ایک بوڑھے آدمی نے اس شخص کی، جس نے برف گزیدہ پاؤں کا ذکر کیا تھا، سرزنش کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کا کیا خیال ہے؟'' تیکھی ناک والے شخص نے، جسے وہ Jackdaw کہتے تھے، اچانک آگ کی دوسری جانب سے اپنی گردن اٹھاتے چیختی اور لرزتی آواز میں کہا۔

''اگر آدمی فربہ اور صحت مند ہو، وہ ان حالات میں دبلا ہو جائے گا، لیکن وہ جو پہلے ہی لاغر ہو، وہ مرے گا نہیں تو اور کیا کرے گا! اب مجھے ہی دیکھ لیں، مجھ میں ذرا سی جان باقی نہیں رہی،'' اس نے یک دم بڑی دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے سارجنٹ میجر سے کہا۔ ''انھیں کہیں کہ وہ مجھے ہسپتال بھیج دیں۔ گٹھیے سے میرا جوڑ جوڑ درد کر رہا ہے۔ اب میں دوسروں کا مزید ساتھ نہیں دے سکتا...''

''چھوڑو یار، کافی کچھ کہہ لیا ہے،'' سارجنٹ میجر نے اطمینان سے جواب دیا۔

سپاہی چپ ہو گیا اور اس نے مزید کچھ نہ کہا۔ باتوں کا سلسلہ چلتا رہا۔

''آج بے شمار فرانسیسی پکڑے گئے ہیں، لیکن ان میں سے ایک کے بھی پاؤں میں وہ، جسے آپ اصلی بوٹ کہتے ہیں، نہیں تھا،'' ایک سپاہی نے گفتگو کا نیا موضوع چھیڑتے ہوئے کہا۔

''ان کے بوٹ قازقوں نے چھین لیے ہیں۔ ہم کرنل کے لیے جھونپڑے کی صفائی کر رہے تھے اور ادھر وہ اس کام میں مصروف تھے۔ انھیں دیکھ کر بڑا ترس آتا تھا،'' رقاص نے کہا۔ ''وہ جب انھیں الٹا پلٹا رہے تھے، معلوم ہوا کہ ابھی ایک زندہ ہے۔ کیا آپ یقین کریں گے کہ وہ اپنی بولی میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔''

''مگر وہ صاف ستھرے لوگ ہیں،'' پہلے آدمی نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''ان کی رنگت بالکل سفید ہے۔ برچ کے تنے کی طرح سفید ــ اور بعض تو اتنے اچھے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے کہ اشراف ہیں۔''

''تو تمھیں کیا توقع تھی؟ وہاں ہر طبقے کے لوگ فوج میں بھرتی کیے جاتے ہیں۔''

''لیکن ہم جو کچھ کہتے ہیں، اس کا ایک لفظ بھی ان کے پلے نہیں پڑتا،'' رقاص نے یوں مسکراتے ہوئے کہا جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ ایسا کیوں ہے۔ ''میں نے اس سے پوچھا کہ 'تمھارا بادشاہ کون ہے؟' اور وہ جواب میں صرف بڑبڑ کرتا رہا۔ عجیب لوگ ہیں!''

''یہ تو واقعی بڑی عجیب بات ہے،'' اس شخص نے، جو ان کی سفید رنگت پر حیران پریشان ہوا تھا، اپنی بات

جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''موژیسک کے آس پاس کے کسان بتا رہے تھے کہ انھوں نے مُردوں کو دفنانا شروع کر دیا ہے۔ تمھیں پتا ہی ہے کہ وہاں لڑائی ہوئی تھی۔ خیر، یہ مُردے وہاں پورے ایک مہینے سے پڑے تھے اور کسان نے مجھے بتایا۔ 'بھائی' یہ کاغذ کی طرح صاف ستھرے اور سفید ہوویں۔ ان کے جسموں سے بارود کی بو بھلے آدے، پر دوسری بو کوئی نہ آوے۔''

سب چپ تھے۔

''یہ ان کی غذا کے سبب ہوگا،'' سارجنٹ میجر نے کہا۔ ''وہ شہزادوں کی طرح رہتے تھے۔''

کسی نے اس کی تردید نہ کی۔

''موژیسک کا وہ کسان، جہاں لڑائی شروع ہوئی تھی، ہمیں بتا رہا تھا کہ دس گاؤوں سے آدمی بلائے گئے ہیں، انھیں مردے ڈھوتے ڈھوتے بیس بائیس دن ہو گئے ہیں اور وہ ابھی تک ان سب کو اٹھا نہیں سکے۔ اور رہے بھیڑیے، وہ کہتا تھا...''

''وہ اصلی لڑائی تھی،'' ایک بوڑھے سپاہی نے کہا۔ ''یاد رکھنے کے قابل۔ مگر اس کے بعد... اس کے بعد کچھ بھی نہ رہا، صرف دکھاوے کی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔''

''خیر، دادا، آپ جانتے ہیں کہ کل ہم نے ان کا پیچھا کیا تھا مگر ان کے ساتھ کوئی مقابلہ نہ ہو سکا۔ جونہی ہم ان کے قریب پہنچے، وہ ہتھیار پھینکنے اور گھٹنوں پر جھک کر گڑگڑانے لگے۔ 'معافی، معافی!' وہ چیخ چیخ کر کہہ رہے تھے۔ مگر یہ صرف ایک واقعہ ہے۔ سنا ہے کہ پلاتوف نے دو دفعہ نپولین کو پکڑ لیا تھا، پر آپ کو معلوم ہے کہ اسے صحیح طلسم نہیں آتا تھا۔ وہ اسے پکڑ ضرور لیتا تھا، مگر وہ اس کے ہاتھ نہیں آتا تھا، پنکھ پکھیرو بن جاتا تھا اور پھر سے اڑ جاتا تھا۔ اور اسے مارنے کی کوئی صورت نہیں۔''

''کائس لیف، تمھاری شکل بتاتی ہے کہ تم پرلے درجے کے جھوٹے ہو۔''

''کیا مطلب، جھوٹا؟ ہونہہ! یہ سولہ آنے ٹھیک ہے۔''

''خیر، اگر وہ میرے ہاتھ آ جاتا، میں اسے ضرور پکڑ لیتا اور اسے زمین میں گاڑ دیتا، بالکل اسی طرح جس طرح کھونٹا گاڑا جاتا ہے۔ ذرا سوچو، اس کی وجہ سے کتنے لوگ مرے ہیں!''

''چھوڑ دیار، اب ہم قصہ ہی پاک کر رہے ہیں، اب وہ یہاں دوبارہ نہیں آئے گا،'' ایک معمر سپاہی نے جمائی لیتے ہوئے کہا۔

گفتگو سست پڑنے لگی اور سپاہی سونے کی تیاریاں کرنے لگے۔

''ان ستاروں کو دیکھو، کیسے چمک رہے ہیں! معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں نے دھلے ہوئے کپڑے سوکھنے کے لیے آسمان پر بچھا دیے ہیں،'' ایک جوان نے کہکشاں کو دیکھ کر اپنے تعجب کا اظہار کیا۔

''بیٹے، یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اگلے سال فصل خوب ہوگی۔''

''ہمیں کچھ اور لکڑی کی ضرورت پڑے گی۔''

''پیچھا گرم کرو تو آ گا جمنے لگتا ہے، عجیب سی صورت ہے۔''

''اف، خداوند!''

''یہ تم دھکے کیوں دے رہے ہو؟ آگ صرف تمھارے لیے ہے؟ ہونہہ، کیسے بچھ کر لیٹا ہوا ہے!''

اس کے بعد جو خاموشی چھائی، اس میں ان لوگوں کے، جو سو گئے تھے، خراٹے گونجنے لگے۔ دوسرے اپنے آپ کو گرم رکھنے کے لیے پہلو بدلتے رہے اور کبھی کبھار آپس میں ایک آدھ لفظ کا تبادلہ کر لیتے۔ کوئی سو قدم کے فاصلے پر ایک اور الاؤ تھا۔ وہاں سے خوش باش قہقہوں کی زبردست گونج آتی سنائی دی۔

''اس پانچویں کمپنی کو دیکھو، کیسے دہاڑ رہے ہیں!'' ایک سپاہی بولا۔ ''اور ہیں بھی کتنے زیادہ!''

ایک آدمی اٹھا اور پانچویں کمپنی کی طرف چل دیا۔

''وہاں بڑی رونق لگی ہوئی ہے،'' اس نے واپس آ کر کہا۔ ''کہیں سے دو فرانسیسی آ گئے ہیں۔ ایک کی تو قلفی جم چکی ہے۔ دوسرا بڑا چہک رہا ہے، گانے گا رہا ہے، واقعی!''

''واہ، چلو چل کر دیکھتے ہیں۔''

اور متعدد سپاہی پانچویں کمپنی کی طرف چل پڑے۔

9

پانچویں کمپنی کا پڑاؤ جنگل کے عین کنارے پر تھا۔ برف کے بالکل بیچ میں زبردست الاؤ جل رہا تھا۔ اور اس نے درختوں کی شاخوں کو، جنھیں منجمد شبنم نے ڈھانک رکھا تھا، منور کر دیا تھا۔

آدھی رات کے قریب پانچویں کمپنی کے جوانوں کو برف پر قدموں کی رپ رپ اور شاخوں کی تراق پڑاق سنائی دی۔

''دوستو، ریچھ!'' ایک آدمی نے کہا۔

آوازیں سننے کے لیے سب کے کان کھڑے اور گردنیں اونچی ہو گئیں۔ آگ کی تیز روشنی میں دو انسانی شکلیں، جو عجیب و غریب ملبوسات میں مستور تھیں اور ایک دوسرے کے ساتھ چمٹی ہوئی تھیں، دکھائی دیں۔

وہ دونوں فرانسیسی تھے اور جنگل میں چھپے ہوئے تھے۔ وہ آگ کے قریب آ گئے اور بیٹھی ہوئی آوازوں میں کسی ایسی زبان میں، جو سپاہیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی، کچھ کہنے لگے۔ ان میں سے ایک دوسرے سے لمبا تھا۔ اس کے سر پر افسروں کی ٹوپی تھی اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں نام کو جان نہیں رہی۔ آگ کے قریب پہنچ کر اس نے بیٹھنے کی کوشش کی لیکن زمین پر گر پڑا۔ دوسرا ٹھٹا کٹا ناٹا سپاہی تھا۔ اس نے اپنے سر کے گرد رومال باندھ رکھا تھا اور وہ دوسرے سے تگڑا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی کو اٹھایا اور اس کے منہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کچھ کہا۔

سپاہیوں نے دونوں فرانسیسیوں کو اپنے گھیرے میں لے لیا، بیمار کے نیچے اوور کوٹ بچھا دیا گیا اور دونوں کے لیے پورج اور ووڈ کا لے آئے۔

درماندہ مضمحل فرانسیسی افسر کا نام غام بال تھا اور دوسرا شخص، جس کے سر کے گرد رومال بندھا ہوا تھا، اس کا اردلی موریل تھا۔

جب موریل ووڈ کا پی چکا اور پورج کھا چکا، وہ اچانک غیر فطری طور پر چہچہانے اور دم لیے بغیر سپاہیوں کے ساتھ باتیں کرنے لگا حالانکہ انھیں مطلق پتا نہیں چل رہا تھا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ غام بال نے کچھ کھانے سے انکار کر دیا اور کہنی پر سر ٹکائے آگ کے قریب چپ چاپ لیٹا اور خالی خالی نگاہوں سے روسیوں کو دیکھتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ گاہے بگاہے اس کی لمبی آہ نکل جاتی اور وہ دوبارہ خاموش ہو جاتا۔ موریل نے اس کے شانوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ سپاہیوں کو سمجھانا چاہتا تھا کہ غام بال افسر ہے اور اسے اپنے جسم کو گرم کرنے کے لیے حرارت کی ضرورت ہے۔ ایک روسی افسر نے، جو پھرتا پھراتا ادھر آنکلا تھا، یہ دریافت کرنے کے لیے کرنل کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ آیا وہ اسے جھونپڑے میں ٹھہرا لے گا تاکہ وہ اپنے جسم کو گرم کر سکے۔ پیغام رساں نے واپس آکر بتایا کہ کرنل نے حکم دیا ہے کہ فرانسیسی افسر کو اس کے پاس بھیج دیا جائے۔ انھوں نے غام بال سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلا جائے۔ وہ اٹھ کر کھڑا تو ہو گیا، مگر جب اس نے چلنے کی کوشش کی، اس کی ہمت جواب دے گئی اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں۔ وہ گرا ہی چاہتا تھا کہ قریب کھڑے ایک سپاہی نے اسے تھام لیا۔

"تو آپ جانا نہیں چاہتے؟" ایک سپاہی نے غام بال کی طرف تمسخرانہ انداز سے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"احمق مسخرہ!... یہ مذاق کرنے کا وقت ہے؟ مٹی کے مادھو، عقل کے ناخن لو! تم نرے مٹی کے مادھو ہو... میں ٹھیک کہہ رہا ہوں!" متعدد آوازیں مسخرے سپاہی کو جھڑکتی سنائی دیں۔

انھوں نے غام بال کے گرد حصار بنا لیا اور اسے دو اشخاص کے بازوؤں پر، جو انھوں نے ایک دوسرے کے اوپر آر پار رکھ لیے تھے، ٹکا دیا۔ وہ اسے اسی طرح اٹھائے جھونپڑے کی طرف چل دیے۔ راستے میں غام بال نے اپنے بازو ان کی گردنوں میں حمائل کر دیے اور بار بار غم آلود لہجے میں کہنے لگا:

"Oh, mes braves, oh mes bons, mes bons amis! voila des hommes! Oh, mes braves, mes braves bons amis!"*

اور وہ بچے کی طرح ایک شخص کے گلے لگ گیا۔

موریل وہیں بیٹھا رہا۔ وہ ہٹا کٹا پست قامت فرانسیسی تھا۔ اس کی آنکھیں سوج چکی تھیں اور ان سے پانی بہہ رہا تھا۔ اس کے گلے میں زنانہ چغا تھا اور اس نے دیہاتی عورتوں کی طرح اپنی ٹوپی کے گرد رومال باندھ رکھا تھا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ وہ نشے میں ہے۔ اس نے اپنا ایک بازو اپنے قریب بیٹھے سپاہی کے گلے میں ڈال دیا اور

* آپ بہت بہادر لوگ ہیں! آپ بہت مہربان اور ہمدرد دوست ہیں! صحیح معنوں میں مرد ہیں! بہادر، مہربان اور ہمدرد دوستو!

کھردری اور شکستہ آواز میں فرانسیسی گیت گانے لگا۔ سپاہی کولھوں پر ہاتھ رکھے اسے بغور دیکھ رہے تھے۔
''ٹھہرو، ذرا ٹھہرو۔ ہمیں سمجھاؤ کہ یہ کیسے چلتا ہے۔ میں بہت جلد اس کا قیافہ لگالوں گا! کیسے چلتا ہے یہ؟''
اس شخص نے کہا — وہ خود گویا بھی تھا اور ٹھٹھولیا بھی —، جس کے گلے میں موریل نے بازو لٹکار کھے تھے۔

Vive Henri Quatre,

Vive ce roi vailant!*

موریل نے آنکھ مارتے ہوئے بول اٹھایا۔

Ce diable a quatre...**

"Vivarikal Vif-seruvary! Sedyablyaka!..." سپاہی نے بازو لہراتے ہوئے (بے معنی) نقالی میں آواز سے آواز ملائی، لیکن اس نے دھن حقیقتاً سمجھ لی تھی۔

''واہ واہ! خوب، خوب! شاباش!'' سامعین کے پرجوش نعرے گونج رہے تھے۔ موریل کے چہرے پر شکنیں نمودار ہوئیں اور وہ ان کے ساتھ ہنسنے لگا۔

''ہاں بھائی، گاتے جاؤ! گاتے جاؤ!''

Qui eut le triple talent,

De boire de battre,

Et d'etre un vert galant...***

''یہ بھی بہت اچھا معلوم ہوتا ہے! ہاں زالیتاییف، اب تم...''

"Kiu..."- زالیتاییف نے رگیں پھیلا کر بڑی مشکلوں سے آواز نکالی۔ "Kiyu-iu-iu..."

وہ پورا زور لگا رہا تھا اور اپنے ہونٹ بھینچتا جا رہا تھا۔

"le-trip-ta-la-de-bu-de-bat-eh-de-tra-va-ga-la!" وہ گا رہا تھا۔

''واہ واہ! کیا بات ہے! بالکل فرانسی کی طرح! واہ!... خوب! کچھ اور کھاؤ گے؟''

''اسے کچھ اور پورج دے دو۔ جب فاقوں پر نوبت آجائے، پھر پیٹ بڑی مشکل سے بھرتا ہے۔''
انھوں نے اسے مزید پورج دے دیا۔ موریل ہنس پڑا اور اس نے تیسرا پیالہ شروع کر دیا۔ تمام سپاہی اسے دیکھ رہے اور خوشی سے دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔ بوڑھوں نے اس قسم کی معمولی باتوں میں دلچسپی لینا اپنے وقار

---

* ہنری چہارم (فرانس کے شاہی خاندان بوغ بوں کا بانی) زندہ باد، وہ دلیر و شجاع بادشاہ، زندہ باد! (فرانسیسی گیت)

** وہ مجسم شیطان

*** وہ سہ جہت صلاحیت کا مالک تھا،
شراب نوشی کے لیے، رزم آرائی کے لیے،
جان جوکھوں میں ڈالنے کے لیے

کے منافی تصور کیا۔ وہ الاؤ کی دوسری جانب لیٹے ہوئے تھے، تاہم کبھی کبھار ایک آدھ اپنی کہنی کے سہارے اوپر اٹھتا اور مسکرا کر موریل پر ایک نظر ڈال لیتا۔

''بہرحال وہ بھی ہمارے جیسے انسان ہیں،'' ایک شخص نے اوورکوٹ اپنے جسم کے گرد لپیٹتے ہوئے کہا۔ ''ڈفسنٹین کی بھی جڑیں ہوتی ہیں، جبھی وہ پھلتی پھولتی ہے۔''

''میرے مولا! مولا! اتنے ستارے! پالے کی نشانیاں...''

خاموشی چھا گئی۔

ستارے، جیسے انھیں معلوم ہو کہ انھیں کوئی نہیں دیکھ رہا، سیاہ آسمان پر اٹکھیلیاں کرنے لگے۔ وہ کبھی ٹمٹمانے، کبھی جھلملانے اور کبھی جگمگانے لگتے۔ یوں نظر آتا تھا جیسے وہ ایک دوسرے سے کسی پُرمسرت راز کی بات کہنے سننے میں مصروف ہوں۔

10

فرانسیسی فوج ریاضی کے سلسلہ تدریج کی باقاعدگی کے ساتھ آہستہ آہستہ غائب ہوتی جارہی تھی۔ اور دریائے بیریزینا کو عبور کرنے کے دوران میں وہ جس طرح نیست و نابود ہوئی، اگرچہ اس کے متعلق اتنا کچھ لکھا جاچکا ہے، مگر وہ اس کی بربادی کی محض درمیانی کڑی تھی، مہم کا قطعاً فیصلہ کن واقعہ نہیں ہے۔ اگر اس کے بارے میں اتنا کچھ تحریر کیا گیا ہے یا ابھی تحریر کیا جارہا ہے، تو جہاں تک فرانسیسیوں کا تعلق ہے، ان کے نزدیک اس کی وجہ محض یہ ہے کہ ان کی فوج یکے بعد دیگرے جن آفات و آلام کا سامنا کرتی چلی آئی تھی، وہ دریا کے شکستہ پل پر اچانک ایک لمحے میں ایک ایسے الم ناک منظر پر منتج ہوئے جو انمٹ انداز سے ذہنوں پر نقش ہوگیا۔ جہاں تک روسیوں کا تعلق ہے، اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ پیٹرزبرگ میں — جو جنگ کے میدانوں سے اتنا دور تھا — نپولین کو دریائے بیریزینا کے کلیدی پھندے میں پھانسنے کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا (اور یہ منصوبہ ایک بار پھر بغوہل نے بنایا تھا)۔ تمام لوگوں کو پکا یقین تھا کہ سب کچھ منصوبے کے مطابق طے پاجائے گا اور اسی لیے وہ یہ اصرار کرتے رہے کہ فرانسیسی فوج صرف دریائے بیریزینا کو عبور کرنے کے دوران میں تباہی سے دوچار ہوئی۔ تاہم حقائق اس کے برعکس ہیں۔ اعداد و شمار سے واضح ہوجاتا ہے کہ فرانسیسیوں کو دریائے بیریزینا عبور کرنے کے دوران میں آدمیوں اور توپوں کا اتنا اتلاف نہیں اٹھانا پڑا جتنا کہ انھیں کراسنایا میں برداشت کرنا پڑا تھا۔

دریائے بیریزینا کے واقعے کی واحد اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ اس نے فیصلہ کن اور شک وشبہ سے بالاتر انداز سے یہ ثابت کردیا کہ دشمن کی پسپائی میں رکاوٹیں ڈالنے کے تمام منصوبے مغالطے پر مبنی تھے اور واحد صحیح طرزِ عمل یہی تھا کہ حریف کا سائے کی طرح صرف تعاقب کیا جائے (کوتوزوف اور عام سپاہی اسی کو اختیار کرنے کا

• ایک قسم کی سخت کڑوی بوٹی۔

تقاضا کرتے رہے تھے)۔ فرانسیسی ہجوم در ہجوم بھاگے جا رہے تھے، ان کی رفتار میں ہر آن اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ان کی تمام توانائیاں خاص منزل مقصود تک پہنچنے میں صرف ہو رہی تھیں۔ وہ کسی زخمی درندے کی طرح دوڑے جا رہے تھے اور ان کے اس برق رفتار فرار کو روکنا ممکن نہیں تھا۔ اس کی شہادت ان انتظامات سے نہیں جو دریاؤں کو عبور کرنے کے لیے کیے گئے تھے، بلکہ جو کچھ پلوں پر ہوا، اس سے ملتی ہے۔ جب پل ٹوٹ گئے، غیر مسلح فوجی، ماسکو سے آنے والے لوگ، عورتیں اور بچے، جو بار برداری کے فرانسیسی قافلوں کے ہمراہ سفر کر رہے تھے، اطاعت قبول کرنے کے بجائے سبھی Vis inertiae[4] کے اصول کے تحت ایک دوسرے کو دھکیلتے کشتیوں اور برف سے ڈھکے ہوئے پانی کی طرف تیزی سے لپکنے لگے۔

ان کے بھاگنے کی (اضطراری) خواہش خالی از معقولیت نہیں تھی۔ بھگوڑوں اور متعاقبین دونوں کی حالت یکساں ناگفتہ تھی۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ رہنے کی صورت میں ہر شخص یہ توقع کر سکتا تھا کہ بوقت ضرورت اسے ان کی مدد حاصل ہو جائے گی اور اسے یہ بھی تسلی تھی کہ وہ اپنوں کے درمیان ہے۔ لیکن وہ لوگ، جو روسیوں کے سامنے سپر انداز ہوتے تھے، حالت تو ان کی بھی خستہ ہی رہتی تھی لیکن ان کے ساتھ ایک مزید ستم یہ ہوتا تھا کہ جب ضروریات زندگی کی تقسیم کا وقت آتا، انھیں نچلی سطح پر رکھا جاتا۔ فرانسیسیوں کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں تھی کہ روسی قیدیوں کو بچانے کی خواہ کتنی ہی خواہش کیوں کریں، پھر بھی نصف بھوک اور سردی سے ہلاک ہو رہے ہیں (ویسے خود روسیوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ان قیدیوں کا کریں کیا)۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ ایسا ہونا ناگزیر ہے، اس کے علاوہ اور کوئی صورت ممکن ہی نہیں۔ انتہائی دردمند اور رحم دل کمانڈر اور دوسرے لوگ، جو قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ وہ فرانسیسی بھی، جو روس کی ملازمت کر رہے تھے۔ اسیروں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ فرانسیسی (قیدی) ان مصائب و مشکلات کی، جن کا سامنا روسیوں کو کرنا پڑ رہا تھا، تاب نہ لا کر فنا ہو رہے تھے۔ اپنے بھوکے سپاہیوں کے، جن کی ہمیں ضرورت تھی، مونہوں سے لقمے چھین کر فرانسیسیوں کے۔ بے شک نہ ان سے کسی ضرر کا اندیشہ تھا، نہ ان سے کسی کو نفرت تھی اور نہ ان کا کوئی قصور تھا، سیدھی سادی بات اتنی تھی کہ ان کی کسی کو ضرورت نہیں تھی۔ سپرد کرنا ممکن نہیں تھا۔ چند روسیوں نے یہ بھی کر دکھایا لیکن ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔

فرانسیسیوں کے عقب میں یقینی بربادی تھی، سامنے امید۔ وہ اپنی کشتیاں جلا چکے تھے۔ ان کے پاس بھاگنے کے علاوہ نجات کی کوئی اور صورت نہیں تھی اور فرانسیسیوں کی پوری قوت اس اجتماعی فرار پر مرکوز تھی۔ بچے کھچے فرانسیسی جتنا زیادہ آگے بھاگتے تھے، خاص طور پر دریائے بیریزینا (کے واقعے) کے بعد، جس سے (منصوبہ پیٹرزبرگ کے نتیجے کے طور پر) روسیوں نے اتنی امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں، ان کی حالت اتنی ہی زیادہ خستہ و خراب ہوتی جاتی تھی اور روسی کمانڈروں کے، جو ایک دوسرے اور بالخصوص کوتوزوف کو مورد الزام ٹھہرا رہے تھے، جذبات اتنے ہی زیادہ بھڑکتے جاتے تھے۔ ان کمانڈروں کو یہ یقین تھا کہ پیٹرزبرگ نے بیریزینا کے سلسلے میں جو منصوبہ بنایا تھا، اس کی ناکامی کا ذمے دار کوتوزوف کو ٹھہرایا جائے گا، چنانچہ وہ اس پر زیادہ سے زیادہ،

اور وہ بھی کھلے عام، عدم اطمینان کا اظہار کرنے اور اسے حقارت و تمسخر کا نشانہ بنانے لگے۔ البتہ اس حقارت و تمسخر کا اظہار مؤدبانہ انداز سے کیا جاتا تھا اور یوں کوتوزوف کے لیے یہ دریافت کرنا بھی کہ آخر اسے ہی قصوروار کیوں ٹھہرایا جا رہا ہے، ناممکن ہو جاتا۔ وہ اس کے ساتھ سنجیدگی کا رویہ اختیار نہیں کرتے تھے۔ جب وہ اسے کوئی رپورٹ پیش کرتے یا اس سے کوئی منظوری حاصل کرنا چاہتے، یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کوئی پرملال رسم ادا کر رہے ہوں لیکن اس کی پیٹھ پیچھے وہ ایک دوسرے کو آنکھیں مارتے اور قدم قدم پر اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔

چونکہ یہ لوگ اس بوڑھے آدمی کو سمجھنے سے قاصر تھے، انھوں نے اپنے اس مفروضے کو کہ اس کے ساتھ بات کرنا بیکار ہے، امرِ مسلمہ تسلیم کر لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے منصوبوں کی گہرائی اور گیرائی تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر اس کے سامنے کوئی تجویز پیش کی جائے تو وہ جواب میں کسی "پل زریں" کا حوالہ دے گا یا یہ کہے گا کہ چیتھڑوں میں ملبوس لوگوں کے ساتھ سرحد پار کرنے کا خیال بھی ذہن میں نہیں لانا چاہیے، وغیرہ وغیرہ۔ وہ یہ سب کچھ پہلے سن چکے تھے (انھیں اس کی باتیں خالی خولی الفاظ معلوم ہوتیں)۔ جو کچھ وہ کہتا تھا (مثلاً رسد کا انتظار کرنا ضروری ہے یا سپاہیوں کے پاس بوٹ نہیں ہیں)، اتنا سیدھا سادا ہوتا تھا اور جب کہ جو کچھ وہ تجویز کرتے تھے، اتنا پر پیچ اور پر از ذہانت ہوتا تھا کہ انھیں واضح طور پر یقین ہونے لگا کہ بڈھا بالکل پھوس ہو گیا ہے اور اس کی مت ماری گئی ہے جب کہ وہ خود نابغے ہیں لیکن کیا کیا جائے ان کے پاس قیادت سنبھالنے کا اختیار نہیں۔

اور جب ذہین و فطین ایڈمرل اور پیٹرزبرگ کا ہیرو وٹ گین شٹائن فوج میں پہنچ گیا، سٹاف کے ارکان کی یہ ذہنی کیفیت اور الزام تراشیوں کی مہم اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ کوتوزوف یہ سب کچھ دیکھتا تھا لیکن وہ محض آہ بھر کر رہ جاتا یا صرف کندھے اچکا دیتا۔ بیریزینا کے واقعے کے بعد وہ صرف ایک مرتبہ جلال میں آیا اور اس نے بے نگ سین کے نام، جو زار کو علیحدہ رپورٹیں بھیجتا رہتا تھا، مندرجہ ذیل نوٹ تحریر کیا:

> یور ایکسی لینسی، چونکہ آپ پر بار بار بیماری کے حملے ہو رہے ہیں، اس لیے برائے مہربانی اس خط کے موصول ہونے پر واپس کالوگا تشریف لے جائیں اور وہاں پہنچنے کے بعد ہز امپریل میجسٹی کے مزید احکام اور پروانہ تقرری کا انتظار فرمائیں۔

لیکن بے نگ سین کی موقوفی ابھی عمل میں آئی ہی تھی کہ گرینڈ ڈیوک کونستانتن پاولوچ، جس نے ابتدائی مہم میں حصہ لیا تھا اور جسے کوتوزوف نے فوج سے نکال دیا تھا، آدھمکا۔ اس نے آتے ہی کوتوزوف کو مطلع کیا کہ زار اس بات پر سخت خفا ہے کہ ہماری افواج کو بالکل معمولی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور ان کی پیش قدمی کی رفتار بھی خاصی سست ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ خود امپراطور چند دنوں تک فوج کے ساتھ آملے گا۔

بوڑھا کوتوزوف جتنا فوجی امور کا ماہر تھا، اتنا ہی درباری معاملات کا رمز شناس تھا۔ یہی کوتوزوف ـــــ جسے

اگست میں زار کی خواہشات کے علی الرغم کمانڈر انچیف منتخب کیا گیا تھا، جس نے گرینڈ ڈیوک اور ولی عہد[5] کو فوج سے نکال دیا تھا، جس نے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے ہوئے امپراطور کی مرضی کے خلاف ماسکو کو اس کے حال پر چھوڑنے کا حکم دیا تھا— فی الفور سمجھ گیا کہ اب اس کا انجام قریب ہے، اس کا کردار ختم ہو چکا ہے اور اس کے مفروضہ اختیارات اس کے پاس نہیں رہے۔ اسے ان باتوں کی تفہیم محض دربار کے رویے سے نہیں ہوئی۔ ایک طرف تو اسے یہ معلوم تھا کہ جس عسکری مہم میں اس نے اپنا کردار ادا کیا ہے، اپنے انجام کو پہنچ چکی ہے اور اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا فریضہ پورا ہو گیا ہے۔ دوسری طرف اسے یہ آگاہی بھی ہونے لگی کہ اس کا بوڑھا جسم تھکن کا شکار ہو رہا ہے اور اسے اب جسمانی آرام کی ضرورت ہے۔

29 نومبر کو کوتوزوف ولنا— اس کے بقول "میرا پیارا ولنا"— میں داخل ہوا۔ اپنی ملازمت کے دوران میں وہ دو مرتبہ ولنا کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس متمول شہر میں جسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، اسے پرانے دوست مل گئے اور پرانے تعلقات کی تجدید ہو گئی۔ ان کے علاوہ اسے زندگی کی آسائشیں، جن سے وہ اتنے طویل عرصے سے محروم چلا آ رہا تھا، میسر آ گئیں۔ اس کے گردوپیش جو جذبات بھڑک رہے تھے، جہاں تک انھوں نے اجازت دی اس نے یک لخت فوج اور مملکت کے تفکرات سے منہ موڑ لیا اور وہی پرسکون روش، جس کا وہ عادی تھا، اختیار کر لی جیسے جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا تھا اور اقلیم تاریخ میں ابھی تک جو کچھ پایۂ تکمیل تک پہنچایا جانا تھا، اس سب کا اس سے اب کوئی تعلق نہ ہو۔

جو لوگ دشمن پر چڑھ دوڑنے اور اس کے راستے میں رکاوٹیں کھڑی کرنے کے پرجوش حامی تھے، ان میں چچاگوف شامل تھا۔ اس نے پہلے یونان اور پھر وارسا میں حریف کو مغالطے میں ڈالنے کی چالیں چلنے کی تجاویز پیش کی تھیں، لیکن جہاں اسے بھیجا جاتا تھا، وہاں جانے کے لیے کبھی تیار نہ ہوتا تھا۔ اس چچاگوف کی شہرت یہ تھی کہ وہ زار سے بے دھڑک گفتگو کرتا ہے اور یہ چچاگوف سمجھتا تھا کہ کوتوزوف اس کے زیر احسان ہے کیونکہ 1811 میں اسے کوتوزوف کے علم کے بغیر ترکی کے ساتھ صلح کا معاہدہ طے کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا اور جب اسے معلوم ہوا کہ صلح نامے پر پہلے ہی دستخط ہو چکے ہیں، اس نے زار کے سامنے تسلیم کر لیا کہ اس کا سہرا کوتوزوف کے سر بندھتا ہے۔ ولنا کے قلعے میں، جہاں کوتوزوف نے قیام کرنا تھا، سب سے پہلے جس شخص نے اس سے ملاقات کی، وہ یہی چچاگوف تھا۔ بحریہ کی غیر رسمی وردی پہنے، جس میں سکاٹش خنجر لٹک رہا تھا، اور ٹوپی بغل میں دبائے اس نے محاذ سے موصولہ رپورٹ اور شہر کی چابیاں کوتوزوف کے سپرد کیں۔ کوتوزوف پر جن الزامات کی بوچھاڑ ہو رہی تھی، وہ ان سے بخوبی آگاہ ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ اس کا رویہ اس پر از حقارت احترامی طرز عمل کا کامل نمونہ تھا جو نوجوان سترے بہترے بڈھے سے روا رکھتے تھے۔

چچاگوف کے ساتھ گفتگو کے دوران میں کوتوزوف نے برسبیل تذکرہ اسے بتایا کہ اس کی چینی کے ظروف

سے لدی ہوئی گاڑیاں، جو باری سوف کے مقام پر دشمن کے قبضے میں چلی گئی تھیں، کسی قسم کے نقصان کے بغیر چھڑا لی گئی ہیں اور اسے لوٹا دی گئی ہیں۔

''آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ یہاں میرے پاس کھانے پینے کا کوئی برتن ورتن نہیں... اس کے برعکس میں آپ کے لیے ہر چیز، بلکہ اگر آپ ضیافت کرنا چاہیں اس کا تمام سامان بھی، مہیا کر سکتا ہوں،'' چگا گوف نے غصے سے پھنکارتے ہوئے کہا۔

وہ اپنے ایک ایک لفظ سے اپنی راست بازی ثابت کرنے پر تلا ہوا تھا اور نتیجتاً اس نے یہ تصور کر لیا کہ کوتوزوف کے ذہن پر بھی یہی دھن سوار ہو گی۔

کوتوزوف نے جواب میں کندھے اچکائے، گھنے اور کائیاں انداز سے مسکرایا اور بولا:

''میرا مطلب وہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں۔''

زار کی خواہشات کے علی الرغم کوتوزوف نے فوج کا بیشتر حصہ ولنا میں روک لیا۔ جو لوگ اس کے قریب تھے، کہتے تھے کہ اس شہر میں اپنے قیام کے دوران میں وہ غیر معمولی طور پر تن آسانی برتنے لگا تھا اور جسمانی اعتبار سے ضعف کا شکار ہو گیا تھا۔ وہ فوج کے امور پر بادل ناخواستہ توجہ دیتا تھا اور اس نے بیشتر معاملات اپنے جرنیلوں کی صوابدید پر چھوڑ دیے تھے۔ زار کی آمد سے قبل اس کے پاس جتنا تھوڑا بہت وقت تھا، اسے وہ سراسر لہو ولعب میں صرف کرنے لگا۔

زار اپنے عملے کے ہمراہ — کاؤنٹ طالسطائی، پرنس ولکونسکی، آراک چیف اور دیگر اشخاص — سات دسمبر کو پیٹرزبرگ سے روانہ ہوا اور گیارہ تاریخ کو ولنا پہنچ گیا۔ وہ اپنے سفری سلیج میں سیدھا قلعے میں چلا گیا۔ کڑاکے کی سردی اور بے پناہ کہرے کے باوجود پوری وردی میں ملبوس تقریباً سو جرنیلوں اور سٹاف افسروں کے علاوہ سمیونووکی رجمنٹ کی گارڈ آف آنر قلعے کے سامنے صف آرا ہو گئی۔

زار کی آمد سے قبل سہ اسپی گاڑی میں، جس کے گھوڑے پسینے میں شرابور تھے، ایک ایلچی پہنچا اور اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگا کر چیختے ہوئے کہا: ''وہ تشریف لا رہے ہیں۔'' کانووِنِسن بھاگا بھاگا پیش دالان میں گیا اور اس نے کوتوزوف کو، جو پورٹر کی کوٹھڑی میں بیٹھا انتظار کر رہا تھا، اطلاع بہم پہنچائی۔

ایک منٹ بعد بلند قامت بوڑھا پوری وردی پہنے، سینے پر اپنے تمام تمغے اور اعزازات سجائے اور اپنی توند پر سکارف لپیٹے بھدے قدم اٹھاتا پورچ میں داخل ہوا۔ اس نے اپنا ہلالی شکل کا ہیٹ سر پر رکھا، دستانے ہاتھ میں پکڑے اور وہ بڑی مشکلوں سے سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ نیچے پہنچ کر اس نے رپورٹ ہاتھ میں تھام لی جو اس نے امپراطور کے لیے تیار کی تھی۔

لوگ ادھر ادھر بھاگے پھر رہے تھے اور آپس میں سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے میں ایک اور سہ اسپی گاڑی برق رفتاری سے آئی اور اس کے بعد سلیج نمودار ہوئی۔ تمام نگاہیں اس پر مرکوز ہو گئیں۔ امپراطور اور ولکونسکی

کی شکلیں دور سے ہی نظر آنے لگی تھیں۔

پچاس سالہ عادت کے باعث اس سب کچھ کا بوڑھے جرنیل پر جسمانی اعتبار سے خاصا پریشان کن اثر پڑا۔ اس نے مضطربانہ انداز سے تو ند پر ہاتھ پھیرا، ہیٹ درست کیا، اپنے حواس کو مجتمع کیا، تن کر سیدھا کھڑا ہوا اور جونہی امپراطور سلیج سے نیچے اترا، اپنی نگاہیں اس کی جانب اٹھائیں، اسے رپورٹ پیش کی اور اپنے نپے تلے اور انتہائی مؤدبانہ انداز سے گفتگو کرنے لگا۔

زار نے عاجلانہ نگاہوں سے اس کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا، ایک لمحے کے لیے اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں لیکن اس نے پلک جھپکنے میں اپنے اوپر قابو پالیا۔ وہ ہاتھ پھیلائے آگے بڑھا اور اس نے بوڑھے جرنیل کو گلے لگالیا۔ ایک بار کسی دیرینہ تاثر، جو اس کے ذہن پر نقش ہو چکا تھا اور تلازمۂ خیالات کی رو کی وجہ سے جن کا اس کے انتہائی ذاتی جذبات سے تعلق تھا۔ کوتوزوف پر اس معانقے کا حسب معمول اثر ہوا اور اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

زار نے افسروں اور سیمیونووسکی رجمنٹ کے جوانوں سے علیک سلیک کی اور ایک بار پھر بوڑھے آدمی کا ہاتھ دباتے اس کے ساتھ قلعے کے اندر چلا گیا۔

جب امپراطور فیلڈ مارشل کے ساتھ تنہا رہ گیا، اس نے دشمن کے تعاقب میں جس سست روی کا مظاہرہ کیا تھا اور کراسنایا اور بیریزینا میں جن غلطیوں کا ارتکاب کیا تھا، ان پر اپنے عدم اطمینان کا اظہار کیا اور اسے ممالک غیر میں اپنی مستقبل کی مہم کے بارے میں اپنے ارادوں سے آگاہ کیا۔ کوتوزوف نے کوئی جواب دینے یا تبصرہ کرنے سے احتراز کیا۔ اس کے چہرے پر وہی اطاعت شعارانہ اور خالی خالی تاثر، جس سے اس نے سات سال قبل اوسترلتس کے میدان جنگ میں امپراطور کے احکام سنے تھے، دوبارہ نمودار ہوگیا۔

جب کوتوزوف سٹڈی روم سے باہر آیا اور سر جھکائے بھاری اور بھدے قدم اٹھاتا بال روم میں سے گزر رہا تھا، ایک آواز نے اسے روک لیا۔

"یور سیرین ہائی نس!" کسی نے کہا۔

کوتوزوف نے اپنی گردن اوپر اٹھائی اور کافی دیر تک کاؤنٹ طالسطائی کی، جو نقرئی کشتی پر کوئی چھوٹی سی چیز رکھے اس کے سامنے کھڑا تھا، آنکھوں میں جھانکتا رہا۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوتوزوف کی سمجھ میں نہیں آرہا کہ اس سے کس بات کی توقع کی جارہی ہے۔

اچانک یوں دکھائی دیا کہ اسے یاد آگیا ہو۔ اس کے فربہ اور پھیپھسے چہرے پر مہین تبسم نمودار ہوا جو بمشکل نظر آرہا تھا۔ وہ احترامی انداز سے ذرا سا جھکا اور اس نے کشتی پر رکھی چیز اٹھالی۔ یہ آرڈر آف سینٹ جارج فرسٹ کلاس[6] تھا۔

11

اگلے روز فیلڈ مارشل نے ضیافت اور بال کا اہتمام کیا۔ امپراطور نے اپنی موجودگی سے اسے رونق بخشی۔ کوتوزوف کو

آرڈر آف سینٹ جارج مل چکا تھا، زار اسے اعلیٰ ترین اعزاز عطا کر چکا تھا لیکن بچے بچے کو معلوم تھا کہ امپراطور فیلڈ مارشل سے خوش نہیں ہے۔ تمام آداب و تکلفات ملحوظ رکھے گئے لیکن ہر کہہ ومہہ جانتا تھا کہ بڑھا قصوروار ہے اور اس نے اپنی نااہلی ثابت کر دکھائی ہے۔ امپراطورہ کیتھرین کے عہد کی قائم کردہ روایت کے مطابق جب کوتوزوف نے بال روم میں داخل ہوتے ہی حکم دیا کہ چھینے ہوئے پرچم امپراطور کے قدموں پر جھکا دیے جائیں، امپراطور نے برا سامنہ بنالیا اور وہ زیر لب کچھ بڑبڑایا۔ جو لوگ اس کے قریب تھے، انھیں ''بڈھا مسخرہ'' کے الفاظ سنائی دیے۔

ولنا میں زار کی ناراضگی میں اس لیے بھی خاص طور پر اضافہ ہو گیا تھا کیونکہ نظر یہ آرہا تھا کہ کوتوزوف آئندہ مہم کی اہمیت سمجھ نہیں سکا یا سمجھنا نہیں چاہتا۔

اگلی صبح جب زار نے ان افسروں سے یہ کہا جو اس کے ارد گرد جمع تھے: ''تم نے روس ہی کو نہیں بلکہ یورپ کو بھی بچالیا ہے،'' تو ہر شخص سمجھ گیا کہ جنگ ابھی ختم نہیں ہوئی۔

کوتوزوف واحد شخص تھا جس نے اس سے اتفاق کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کھلے بندوں کہتا تھا کہ نئی جنگ سے روس کی پوزیشن نہ تو بہتر ہوگی اور نہ اس کی عظمت وجلال میں کوئی اضافہ ہوگا، بلکہ اس سے معاملات بگڑیں گے ہی اور اس کے خیال کے مطابق روس جس بلند وبالا مقام پر فائز ہو چکا ہے، اس سے وہ نیچے آجائے گا۔ اس نے زار کو قائل کرنے کی کوشش کی کہ نئے رنگروٹ بھرتی کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ لوگوں کو جن مشکلات ومصائب میں سے گزرنا پڑ رہا تھا، اس نے ان کا اور اس قسم کی دوسری باتوں کا بھی ذکر کیا۔

فیلڈ مارشل کے اس رویے کے پیش نظر اسے فطری طور پر آئندہ جنگ کی راہ کا روڑا اور رکاوٹ تصور کیا گیا۔

معمر شخص کے ساتھ تصادم سے بچنے کے لیے وہی عیاں وبیاں طریق کار اختیار کیا گیا جو اوسٹرلٹس میں خود اس کے اور روسی مہم کے آغاز پر بارکلے کے ساتھ برتا گیا تھا۔ یعنی امپراطور نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے اور یوں کمانڈر انچیف کو تبدیلی کے بارے میں اطلاع دے کر اسے پریشانی میں مبتلا کیے بغیر اسے بے دست وپا بنا دیا گیا۔

اس مقصد کے پیش نظر اس کے سٹاف کی بتدریج تنظیم نو شروع ہو گئی۔ اس کے حقیقی اختیارات ختم کر دیے گئے اور انھیں امپراطور کو منتقل کر دیا گیا۔ ٹول، یرمالوف اور کانووننسن کو نئے عہدوں پر تعینات کر دیا گیا۔ اب ہر کس وناکس فیلڈ مارشل کی ضعیفی اور اس کی زوال پذیر صحت کے بارے میں بڑھ بڑھ کر باتیں بنانے لگا۔

اور اس کی صحت کو خراب ہونا ہی چاہیے تھا تاکہ اس کی جگہ اس کے جانشین کا تقرر عمل میں لایا جا سکتا، اور سچی بات یہ ہے کہ اس کی صحت واقعی بگڑتی جا رہی تھی۔

اور جس فطری، سیدھے سادے اور تدریجی انداز سے کوتوزوف نے ترکی سے پیٹرزبرگ واپسی پر ملیشیا بھرتی کرنے کے لیے وزارت خزانہ میں فرائض انجام دینا شروع کر دیے تھے اور جب اس کی ضرورت محسوس ہوئی، اس نے دوبارہ فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی، اب جب کہ اس کا کام ختم ہو چکا تھا، بعینہٖ اسی طرح نیا اداکار، جس کی

ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، اس کی جگہ لینے آ گیا۔

1812 کی جنگ روسیوں کے نزدیک قومی اہمیت کی حامل تو تھی ہی اور وہ اسے کبھی فراموش کرنے کے لیے تیار نہیں تھے لیکن اس نے ایک اور۔۔اہمیت۔۔یورپی اہمیت اختیار کرنا تھی۔

پہلے اقوام نے مغرب سے مشرق کی طرف کوچ کیا تھا اور اب انھوں نے مشرق سے مغرب کی طرف نقل و حرکت کرنا تھی۔ اور اس نئی جنگ کے لیے نئے رہنما کی ضرورت تھی اور اس قائد کے اوصاف، نظریات اور محرکات کو کوتوزوف کے اوصاف و نظریات سے مختلف ہونا چاہیے تھا۔

جس طرح روسی کی نجات اور عظمت و جلال کے لیے کوتوزوف ضروری تھا، اسی طرح اقوام کی مشرق سے مغرب کی طرف نقل و حرکت اور روس کی قومی سرحدوں کی تشکیل نو کے لیے الیکسانڈر اول ناگزیر تھا۔

یورپ، توازنِ قوت یا نپولین کا مفہوم کیا ہے، کوتوزوف کی سمجھ میں کبھی نہ آ سکا۔ وہ ان تمام امور کو سمجھ سکتا ہی نہیں تھا۔ دشمن کو نیست و نابود کرنے، روسی سرزمین کو آزاد کرانے اور اپنے وطن کو شان و شکوہ کے بام عروج تک پہنچانے کے بعد روسی قوم کے نمائندے کے لیے روسی کی حیثیت سے کام کرنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اس کے لیے صرف ایک ہی کام رہ گیا تھا کہ وہ اگلے جہان کوچ کر جائے اور وہ اگلے جہان کوچ کر گیا۔

12

جیسا کہ عموماً ہوتا ہے، پیئر کو قیدی کی حیثیت سے جن جسمانی احتیاجات اور ذہنی کھچاؤ کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس نے ان کے پورے اثرات کو اب اپنے مصائب کے ختم ہونے پر ہی محسوس کیا۔ رہائی دلائے جانے کے بعد وہ اوریل[7] چلا گیا اور جب وہ تیسرے روز وہاں سے کیف جانے کی تیاریاں کر رہا تھا، اس کی صحت جواب دے گئی اور وہ تین ماہ بستر علالت پر پڑا رہا۔ ڈاکٹروں کے بقول وہ ''مرض صفرا'' میں مبتلا ہو گیا تھا اور اس امر کے باوجود کہ وہ اس کا علاج کرتے، اس کی فصد کھولتے اور اسے ادویات نگلنے پر مجبور کرتے رہے، وہ صحت یاب ہو گیا۔

اپنی رہائی کے وقت سے بیمار پڑنے تک اس پر جو کچھ بیتا تھا، اس کے ذہن پر اس کا کوئی واضح تاثر ثبت نہیں ہوا تھا۔ اسے محض اتنا یاد رہا کہ مطلع ہر وقت ابر آلود اور تاریک رہتا تھا، کبھی مینہ برسنے لگتا اور کبھی برف باری شروع ہو جاتی تھی۔ جہاں تک اس کی ذات کا تعلق ہے، اسے اپنے اندر شدید تکلیف محسوس ہوتی اور اس کے پاؤں اور پہلوؤں میں ہر وقت درد رہتا۔ اسے دھندلا دھندلا یہ بھی یاد تھا کہ اس کے گرد و پیش مصائب و آلام کے مارے لوگ تھے، افسروں اور جرنیلوں کا تجسس جو اسے تفتیش کی بھٹی میں سے گزار رہے تھے، اسے ہراساں کرتا رہا تھا اور اسے سواری اور گھوڑے تلاش کرنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا لیکن ان سب سے بڑھ کر جو بات اسے یاد تھی، وہ یہ تھی کہ وہ اس تمام عرصے کے دوران میں سوچنے اور محسوس کرنے کی صلاحیتوں سے عاری ہو چکا تھا۔

اپنی رہائی کے بعد اسے پیتا رستوف کی لاش نظر آئی تھی۔ اسی روز اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ بارودینو کی لڑائی

کے اختتام پر کوئی ایک ماہ زندہ رہنے کے بعد پرنس آندرے حال ہی میں یاروسلاول میں رستوفوں کے مکان میں انتقال کر چکا ہے۔ اور دینی سوف نے، جس نے اسے یہ خبر سنائی تھی، بر سبیل تذکرہ اس سے ہیلین کی موت کا بھی ذکر کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ پیئر کو اس کی اطلاع بہت عرصہ پہلے مل چکی ہوگی۔ اس وقت پیئر کو یہ تمام باتیں محض عجیب معلوم ہوئیں اور وہ ان واقعات کی اہمیت سمجھنے میں ناکام رہا۔

اس وقت اس کے ذہن پر صرف ایک ہی دھن سوار تھی کہ وہ ان مقامات سے، جہاں انسان بے دردی سے ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے، حتیٰ الواسع جلد از جلد کہیں دور چلا جائے، کوئی پر سکون مامن تلاش کرے تا کہ وہ اپنی صحت بحال کر سکے اور ان تمام عجیب و غریب نئی باتوں پر، جو اس کے علم میں آئی تھیں، غور و فکر کر سکے۔ لیکن جونہی وہ اوریل پہنچا، اسے بیماری نے آگھیرا اور جب علالت کے بعد اس کے ہوش و حواس بحال ہوئے، اسے اپنے دو ملازم، تیرینتی اور واسکا، جو ماسکو سے آئے تھے، اپنی خدمت پر مامور نظر آئے۔ سب سے بڑی پرنسس بھی، جو ایلیتس میں اس کی جاگیر پر رہائش اختیار کیے ہوئے تھی، اس کی علالت کی خبر سن کر اس کی تیمارداری کرنے پہنچ گئی۔

روبہ صحت ہونے کے ایام کے دوران میں وہ رفتہ رفتہ ہی ان تاثرات سے، جن کا وہ گزشتہ چند ماہ سے عادی ہو چکا تھا، جان چھڑا سکا اور اس خیال کو اپنے ذہن میں بٹھا سکا کہ اب اسے کوئی شخص اگلے روز آگے چلنے پر مجبور نہیں کر سکے گا اور نہ اسے نرم و گرم بستر سے محروم کر سکے گا اور یہ کہ اسے اس کا ڈنر، چائے اور سپر یقیناً ملتا رہے گا۔ تاہم کافی مدت تک اسے اپنے خوابوں میں یہی نظر آتا رہا کہ وہ ابھی تک فرانسیسیوں کی اسیری میں ہے۔ اسی طرح اپنی آزادی حاصل ہونے کے بعد اسے پرنس آندرے کے انتقال، اپنی بیوی کی رحلت اور فرانسیسیوں کی تباہی و بربادی کی جو خبریں سنائی گئی تھیں، وہ ان کی اہمیت بتدریج ہی سمجھ سکا۔

آزادی کا — کامل اور غیر منفک آزادی، جو انسان کو فطرتاً ودیعت ہوتی ہے اور جس کا اسے ماسکو سے روانگی کے بعد پہلے پڑاؤ میں شعور ہوا تھا — پُرمسرت احساس اپنے روبہ صحت ہونے کے ایام کے دوران میں پیئر کی رگ رگ میں سما گیا۔ اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اسے یہ معلوم ہوا کہ یہ داخلی آزادی، جو خارجی حالات کے تابع نہیں رہی تھی، گویا کہ خارجی آزادی کے لیے اضافی ماحول فراہم کر رہی ہے۔ اس عجیب و غریب قصبے میں اس کی کوئی جان تھی نہ پہچان، یہاں وہ تن تنہا تھا۔ کوئی شخص نہ اس سے کسی چیز کا تقاضا کرتا تھا اور نہ اسے کہیں جانے پر مجبور کرتا تھا۔ جو کچھ وہ چاہتا تھا، اسے مل رہا تھا۔ گئے دنوں میں اپنی بیوی کا تصور اس کے لیے ہمیشہ سوہان روح بنا رہا تھا، اب اس کے لیے قطعاً باعثِ آزردگی نہیں رہا تھا کیونکہ اب خود اس کا اپنا وجود باقی نہیں رہا تھا۔

"واہ، کیا خوب! کتنا شاندار!" وہ کہتا جب انتہائی صاف ستھری میز، جس پر لذیذ اور اشتہا آور گائے کے گوشت کا سوپ دھرا ہوتا، دھکیل کر اس کے قریب لائی جاتی، جب وہ رات کو نرم گداز اور صاف ستھرے بستر پر دراز ہوتا یا جب اسے یہ یاد آتا کہ اب نہ اس کی بیوی رہی ہے اور نہ فرانسیسی۔ "واہ، کیا خوب! کتنا شاندار!"

اور اپنی پرانی عادت کے زیر اثر وہ اپنے آپ سے سوال پوچھنے لگتا: "خیر، اب اس کے بعد؟ اب میں کیا کروں گا؟" اور وہ ترت اپنے آپ کو جواب دیتا: "کچھ نہیں، میں زندہ رہوں گا۔ کتنی شاندار بات ہے!"

عین وہی سوال — زندگی کا مقصد — جو ماضی میں اس کے ذہن پر کابوس کی طرح سوار رہا تھا اور جس کا وہ ہمیشہ جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتا رہا تھا لیکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکا تھا، اب اس کے لیے اپنا وجود کھو چکا تھا۔ مقصد حیات کی تلاش محض اتفاقاً یا عارضی طور پر ختم نہیں ہوئی تھی، بلکہ اسے یہ بھی محسوس ہو رہا تھا کہ اب اس کے لیے اس کا کوئی وجود نہیں رہا اور اس کا دوبارہ اس کے سامنے آنا ممکن نہیں رہا۔ مقصد حیات کی عین مین یہی عدم موجودگی تھی جس نے اسے آزادی کا، جس سے اس کی موجودہ شادمانی متشکل ہوئی تھی، کامل اور فرحت افزا احساس بخشا۔

اسے مقصد کی ضرورت اس لیے نہیں رہی تھی کیونکہ اب وہ ایقان کی دولت سے مالا مال ہو چکا تھا — اس کا یہ ایقان کسی قسم کے بندھے ٹکے قواعد، مجموعہ عقائد یا غیر استدلالی اصولوں میں نہیں بلکہ الظاہر والباطن، الحی والقیوم اور لایزال خدا میں تھا۔ ماضی میں وہ اسے ان مقاصد میں، جو وہ اپنے لیے متعین کیا کرتا تھا، تلاش کیا کرتا تھا۔ مقصد کی تلاش محض خدا کی تلاش تھی، اور اپنی اسیری کے دوران میں اسے ایکا ایکی الفاظ یا استدلال کے ذریعے نہیں، بلکہ بلاواسطہ احساس سے، جیسا کہ مدتوں پہلے اس کی آیا نے اسے بتایا تھا، معلوم ہوا: خدا یہاں، وہاں اور ہر جگہ موجود ہے۔ اپنی اسیری کے زمانے میں اس پر انکشاف ہوا کہ جس معمار کائنات کا فری میسن اقرار کرتے تھے، اس کی نسبت کاراتائیف کا خدا عظیم تر، لامحدود تر، ناقابل ادراک تر ہے۔ وہ اپنے آپ کو اس شخص کی مانند محسوس کر رہا تھا جو دور دراز فاصلے میں جھانکنے کے لیے اپنی آنکھوں پر زور ڈال رہا ہوتا ہے لیکن یک دم اسے احساس ہوتا ہے کہ جس چیز کو وہ تلاش کر رہا ہے، وہ تو عین اس کے پاؤں تلے موجود ہے۔ وہ اپنی ساری زندگی لوگوں کے سروں کے اوپر دیکھتا رہا تھا، حالانکہ اسے اپنی آنکھوں پر دباؤ ڈالے بغیر اپنے سامنے دیکھنا چاہیے تھا۔

ماضی میں وہ کسی بھی چیز کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ عظیم ہے، لافانی ہے اور لامتناہی ہے۔ اسے صرف اتنا محسوس ہوتا رہا تھا کہ یہ ضرور کہیں نہ کہیں موجود ہوگی اور وہ اس کی تلاش کرتا رہا تھا۔ جو کچھ اس کے نزدیک تھا اور قابل تفہیم تھا، اسے وہ سب محدود، حقیر، پیش پا افتادہ اور بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ اس نے اپنے لیے ذہنی دوربین مہیا کر لی تھی اور دور فاصلے پر دھندلکوں میں جو حقیر، معمولی اور پیش پا افتادہ چیزیں بھی مستور ہوتی تھیں، اسے وہ اس لیے عظیم اور لامحدود معلوم ہونے لگتی تھیں کیونکہ وہ واضح طور پر دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ یورپی زندگی، سیاست، فری میسنری، فلسفہ اور فلاحی کام اسے اسی انداز سے نظر آتے رہے۔ لیکن اس وقت بھی کمزوری کے لمحات میں، جیسا کہ وہ انھیں گردانتا تھا، اس کا ذہن اس فاصلے سے بھی اشیا کی تہہ تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتا تھا اور اسے وہاں بھی وہی اوچھاپن، دنیاداری، ابلہی اور مہملیت نظر آجاتی تھی۔

لیکن اب جب کہ اس نے ہر چیز میں عظمت، ابدیت اور لامحدودیت دیکھنا سیکھ لیا تھا، چنانچہ اس کے مشاہدے کے لیے، اس کے متعلق اپنے تصور سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس نے فطرتاً اس دوربین کو، جس سے

وہ اب تک لوگوں کے سروں کے اوپر جھانکتا رہا تھا، اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور مزے لے لے کر اپنے گردوپیش کی ہر آن بدلتی، لافانی طور پر عظیم، نا قابل ادراک اور لامتناہی زندگی کا جائزہ لینے لگا۔ اور وہ جتنا اپنے قریب تر دیکھتا تھا، اس کے انبساط واطمینان قلب میں اتنا ہی اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ کس لیے؟ یہ بھیانک سوال، جو ماضی میں اس کے تمام ذہنی حصاروں کی اینٹ سے اینٹ بجاتا رہا تھا، اب اس کے لیے ناموجود ہو چکا تھا۔ کس لیے؟ اس سوال کا سیدھا سادا جواب اب اس کے قلب وروح میں ہر دم تیار رہتا تھا کیونکہ کوئی خدا موجود ہے، وہ خدا جس کی مرضی کے بغیر انسان کے سر سے ایک بال بھی نیچے نہیں گر سکتا۔

13

خارجی طور پر پیئر میں شاید ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی ہوگی۔ دیکھنے میں وہ بالکل ویسا ہی نظر آتا تھا جیسا کہ وہ پہلے تھا۔ پھر وہ غیر حاضر دماغ بھی پہلے ہی کی طرح تھا اور بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دھیان اس چیز میں نہیں جو اس کی نگاہوں کے سامنے موجود ہے بلکہ کسی ایسی چیز میں ہے جو اس کی خاص اپنی ہے۔ اس کی سابقہ اور موجودہ شخصیت میں فرق یہ آیا تھا کہ ماضی میں جو کچھ اس کے سامنے موجود ہوتا تھا یا جو کچھ اس سے کہا جاتا تھا، جب اسے یہ احساس ہوتا کہ اسے اس کا علم نہیں ہو سکا، وہ روتی بسورتی شکل بنائے ابروؤں پر بل ڈالنے لگتا اور کچھ اس قسم کا تاثر دیتے لگتا تھا جیسے وہ دور فاصلے پر کسی چیز کو پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو لیکن کامیاب نہیں ہو رہا۔ اب بھی جو کچھ اس سے کہا جاتا یا اس کے سامنے موجود ہوتا، وہ اس پر کوئی خاص دھیان دیتا نظر نہیں آتا تھا، لیکن اب جو کچھ اس کے سامنے موجود ہوتا یا اس سے کہا جاتا، وہ اسے خفیف اور قدرے طنزیہ مسکراہٹ سے سنتا یا دیکھتا حالانکہ بظاہر یہی نظر آتا تھا کہ اس کی آنکھیں اور کان کسی بالکل مختلف چیز پر لگے ہوئے ہیں۔ اب تک وہ مہربان اور رحم دل لیکن ناشاد ورنجور شخص دکھائی دیتا تھا، چنانچہ لوگ اس سے کنی کترانے پر مائل رہتے تھے۔ اب اس کے لبوں پر ہر دم Joie de vivre* کی مسکراہٹ رقصاں رہتی اور اس کی آنکھوں سے دوسروں کے لیے ہمدردی جھلکتی رہتی اور وہ یہ پوچھتی نظر آتیں: ''کیا وہ میری طرح مطمئن ہیں؟'' ۔ اور لوگوں کو اس کی صحبت میں لطف محسوس ہونے لگا۔

ماضی میں وہ لمبی چوڑی گفتگو کیا کرتا تھا، باتیں کرتے کرتے جوش میں آجاتا تھا اور دوسروں کی بات شاذ ہی سنتا تھا۔ اب گفتگو کے دوران میں اس پر شاید ہی کبھی ہیجانی کیفیت طاری ہوتی ہوگی اور اسے دوسروں کی باتیں سننے کا سلیقہ آگیا تھا۔ چنانچہ لوگ اسے بڑے شوق سے اپنے انتہائی ذاتی اور مخفی راز بھی بتانے لگے۔

پرنس، جس نے پیئر کو کبھی پسند نہیں کیا تھا اور اس کے ساتھ خصوصی مخاصمانہ رویہ اپنائے رکھتی تھی کیونکہ بوڑھے کاؤنٹ کی وفات کے بعد وہ اپنے آپ کو اس کے زیر احسان محسوس کرتی تھی، اب یہی پرنس اوریل میں— جہاں وہ یہ عزم لے کر آئی تھی کہ وہ پیئر پر ثابت کر دے گی کہ اس کے ''ناشکرے پن'' کے باوجود وہ اس کی

* زندہ رہنے کی امنگ اور خوشی

تیمارداری کرنا اپنا فرض سمجھتی ہے۔ مختصر قیام کے بعد یہ دیکھ کر حیران بھی ہوئی اور جھنجھلائی بھی کہ وہ اس کی گرویدہ ہو چکی ہے۔ پیئر نے اپنی پھوپھی زاد کی نگاہوں میں جچنے کے لیے کچھ بھی نہیں کیا تھا، وہ محض دلچسپی سے اس کے طور طریقوں کا مشاہدہ کرتا رہا۔ ماضی میں پرنس کو ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہا کہ پیئر اس کے ساتھ لاابالی انداز سے پیش آتا ہے اور اس کا مذاق اڑاتا ہے۔ چنانچہ وہ جس طرح دوسروں کے ساتھ کرتی تھی، جب اس کے پاس بھی آتی، اپنے آپ میں سمٹ جاتی اور اسے ہمیشہ اپنی فطرت کا جارحانہ پہلو ہی دکھاتی رہتی۔ تاہم اب اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ اس کے قلب کے عمیق ترین گوشوں تک رسائی حاصل کرنے اور انھیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے اور وہ ابتدأ بے اعتبارانہ اور بعد میں متشکرانہ انداز سے اس کے سامنے اپنی سیرت کے مخفی اور مشفقانہ پہلو آشکار کرنے لگی۔

عیار سے عیار شخص بھی پرنس کے شباب کے بہترین دور کی یادیں تازہ کر کے اور ان کے ساتھ ہمدردی جتا کر اتنی کامیابی سے یوں دبے پاؤں اس کا اعتماد حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ تاہم پیئر کی پُر کاری صرف اس بات پر مشتمل تھی کہ وہ تلخئ حیات کی ڈسی ہوئی، آرام کوشی کی زندگی سے کوسوں دور بھاگنے والی، سخت گیر اور (اپنے انداز کے مطابق) غیور و خوددار پرنس کی انسانی صفات منظرِ عام پر لا کر خوشی محسوس کرتا تھا۔

''ہاں، جب یہ بدفطرت لوگوں کے نہیں، بلکہ میرے جیسے لوگوں کے زیرِ اثر ہوتا ہے، یہ نہایت ہی اچھا اور نفیس آدمی بن جاتا ہے،'' پرنس نے سوچا۔

پیئر میں جو تغیر رونما ہوا تھا، اسے اس کے ملازمین نے بھی — تیرینتی اور واسکا — اپنے انداز سے بھانپ لیا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ ''سادہ'' ہو گیا ہے۔ اپنے آقا کا لباس تبدیل کرانے اور اسے شب بخیر کہنے کے بعد تیرینتی اس امید میں اس کے کپڑے اور بوٹ پکڑے وہیں کھڑا رہتا کہ وہ اس سے باتیں کرنے لگے گا اور پیئر یہ بھانپ کر کہ تیرینتی گپ شپ لڑانا چاہتا ہے، عام طور پر اسے اپنے کمرے میں ٹھہرائے رکھتا۔

''خیر، یہ بتاؤ، تم اپنے کھانے پینے کا بندوبست کیسے کرتے تھے؟'' وہ اس سے پوچھتا۔

اور تیرینتی ماسکو کی بربادی اور مرحوم کاؤنٹ کا ذکر لے بیٹھتا اور ٹلنے کا نام تک نہ لیتا۔ وہ بازو پر کپڑے لٹکائے خاصی دیر تک یا خود باتیں کرتا رہتا اور یا پھر پیئر کے قصے سنتا رہتا۔ اس کے دل میں یہ احساس موج زن ہونے لگتا کہ اسے اپنے آقا کا قرب حاصل ہو گیا ہے اور اس کے دل میں اس کے لیے پیار کے جذبات امنڈ آتے۔ اور یہی کچھ سوچتے اور محسوس کرتے وہ بالآخر باہر چلا جاتا۔

جو ڈاکٹر پیئر کا علاج کر رہا تھا، اسے روزانہ دیکھنے آتا تھا۔ اگرچہ معالج کی حیثیت سے وہ یہ جتانا اپنا فرض سمجھتا تھا کہ اس کا ایک ایک منٹ بہت قیمتی ہے اور مصائب زدہ انسانوں کے لیے وقف ہے، وہ پیئر کے پاس گھنٹوں بیٹھا رہتا اور اسے مریضوں کے بارے میں اپنے پسندیدہ قصے کہانیاں سناتا اور ان کی عادات و خصائل اور کردار پر تبصرے کرتا رہتا۔

''ہاں، اس آدمی سے — جو ان لوگوں سے، جن کے ہم قصبات میں عادی ہوتے ہیں، بالکل مختلف ہے —

باتیں کرنے میں بہت لطف آتا ہے۔'' وہ پیئر کے متعلق کہا کرتا۔

اوریل میں اتفاق سے فرانسیسی فوج کے متعدد قیدی موجود تھے اور ڈاکٹر ان میں سے ایک کو، جو نوجوان اطالوی افسر تھا، پیئر سے ملانے اپنے ساتھ لے آیا۔

یہ افسر اکثر آنے جانے لگا۔ وہ پیئر کے ساتھ جس محبت بھرے انداز سے پیش آتا، پرنس اس پر اس کا مذاق اڑاتی۔

یہ اطالوی افسر صرف تبھی خوش و خرم نظر آتا تھا جب وہ پیئر سے ملنے آسکتا، اس سے باتیں کرسکتا، اسے اپنے ماضی، اپنی گھریلو زندگی اور اپنی محبت کے بارے میں بتا سکتا، اور فرانسیسیوں، بالخصوص نپولین، کے خلاف، اپنے دل کا غبار نکال سکتا۔

''اگر تمام روسی ذرا بھی آپ جیسے ہیں،'' وہ پیئر سے کہا کرتا، ''پھر اس قوم کے خلاف جنگ کرنا گستاخی اور بے حرمتی کا مرتکب ہونا ہے۔ حالانکہ آپ نے فرانسیسیوں کے ہاتھوں اتنے زخم اٹھائے ہیں، آپ کے دل میں ان کے خلاف ذرا بھی بغض نہیں ہے!''

پیئر نے اطالوی کا دل محض اس لیے جیت لیا تھا کیونکہ وہ اس کی فطرت کے بہترین پہلو کو اجاگر کرنے اور تحسین کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

اوریل میں پیئر کے قیام کے آخری دنوں میں اس کا پرانا فری میسن واقف کار کاؤنٹ ولارسکی، جس نے 1807 میں اسے لاج میں متعارف کرایا تھا، اسے ملنے آیا۔ ولارسکی نے ایک متمول روسی دوشیزہ سے، جو صوبہ اوریل میں وسیع و عریض جاگیروں کی مالکہ تھی، شادی کی تھی اور وہ خود قصبے کے محکمہ رسد میں ایک عارضی اسامی پر فائز تھا۔

اگرچہ وہ کبھی جگری دوست نہیں رہے تھے لیکن جب ولارسکی کو معلوم ہوا کہ پیئر اس قصبے میں مقیم ہے، وہ اس سے ملاقات کرنے چلا آیا اور آتے ہی اس قسم کی دوستی اور بے تکلفی جتانے لگا جس کا اظہار عموماً لوگ ویرانے میں ایک دوسرے سے ملنے کے بعد کرتے ہیں۔ ولارسکی اوریل میں بوریت کی زندگی گزار رہا تھا اور وہ اپنے حلقے کے آدمی اور، جیسا کہ اس کا خیال تھا، اپنی جیسی دلچسپیوں کے شخص سے مل کر کھل اٹھا۔

لیکن وہ بہت جلد یہ دیکھ کر بہت متعجب ہوا کہ پیئر زمانے سے خاصا پیچھا رہ گیا ہے اور، جیسا کہ اس نے اپنے دل میں سوچا، وہ سردمہری اور انانیت کی دلدل میں پھنس چکا ہے۔

''مائی ڈیئر فیلو، تم تو بالکل دقیانوسی ہوتے جا رہے ہو،'' اس نے کہا۔

اس کے باوجود ولارسکی کو احساس ہوا کہ اسے ماضی کی نسبت اب پیئر کی صحبت میں زیادہ لطف آرہا ہے اور وہ ہر روز اس سے ملنے آنے لگا۔ جہاں تک پیئر کا اپنا تعلق ہے، وہ جب بھی ولارسکی کو دیکھتا اور اس کی باتیں سنتا، اسے یہ امر بہت عجیب اور ناقابل یقین معلوم ہوتا کہ کچھ ہی عرصہ قبل وہ خود اس جیسا ہوا کرتا تھا۔

ولارسکی شادی شدہ تھا۔ اس کا بیشتر وقت خاندانی معاملات نپٹانے، اپنی اہلیہ کی جائیداد کی دیکھ بھال کرنے اور

سرکاری فرائض سرانجام دینے میں صرف ہوتا تھا۔ وہ ان تمام مصروفیات کو زندگی کے راستے کے روڑے تصور کرتا تھا۔ اس کی نگاہوں میں وہ سب قابل تحقیر تھیں کیونکہ ان کا مقصد اس کی اپنی اور اس کے خاندان کی فلاح و بہبود تھا۔ عسکری، انتظامی، سیاسی اور میسنی مسائل مسلسل اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتے رہتے اور وہ ان میں منہمک رہتا۔ رہا پیئر، وہ نہ تو اس کے نظریات کو نشانۂ تنقید بناتا اور نہ انھیں تبدیل کرانے کی کوشش کرتا، وہ اس عجیب و غریب لیکن خوب جانی پہچانی صورت حال کو اپنے پرسکون، پرلطف اور پرتفنن انداز سے، جواب اس کی فطرت ثانیہ بن چکا تھا، دیکھتا رہتا۔

ولارسکی، پرنس، ڈاکٹر اور دوسرے لوگوں کے ساتھ، جن سے اب اس کی ملاقات ہوتی رہتی تھی، پیئر کے تعلقات میں ایک نئی چیز ابھر کر سامنے آئی اور اس سے اسے ان تمام لوگوں کی خیرخواہی حاصل ہوگئی۔ یہ نئی چیز اس امر کا اقرار تھا کہ محض الفاظ سے کسی شخص کے عقائد کو تبدیل کرنا ناممکن ہے اور اب وہ یہ بھی تسلیم کرنے لگا تھا کہ ہر شخص کو اپنے انداز سے سوچنے، محسوس کرنے اور اشیا کا جائزہ لینے کا حق حاصل ہے۔ ہر آدمی کے نظریات کی یہ جائز انفرادیت، جس سے کبھی پیئر تنگ یا پریشان ہوتا رہتا تھا، اب اس کی ہمدردی کی اساس بن گئی جو وہ دوسرے لوگوں کے لیے محسوس کرتا تھا اور اس دلچسپی کی، جو وہ ان میں لیتا تھا۔ انسانوں کے نظریات اور ان کی زندگیوں میں جو تنوع اور بعض اوقات مکمل تضاد، اور ایک اور دوسرے شخص کے مابین جو فرق پایا جاتا ہے، اسے دیکھ کر پیئر محظوظ ہوتا اور وہ نرم و ملائم اور پرتفنن انداز سے مسکرانے لگتا۔

عملی مسائل میں پیئر کو اب مرکز ثقل مل گیا جس سے وہ پہلے محروم تھا۔ ماضی میں تمام مسائل زر، خاص طور پر جب دولت مند شخص کی حیثیت سے اس سے روپے پیسے کے جو مطالبات کیے جاتے تھے، اکثر اسے پریشانی اور اضطراب میں مبتلا کر دیتے تھے اور اسے ان کا کوئی حل نہیں سوجھتا تھا۔ "دوں یا نہ دوں؟" وہ اپنے آپ سے پوچھتا رہتا تھا۔ "میرے پاس روپیہ ہے اور اسے اس کی ضرورت ہے لیکن کسی اور کو اس کی اس سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ سب سے زیادہ ضرورت مند کون ہے؟ شاید دونوں ہی مکار ہیں۔" گئے دنوں میں وہ اس قسم کے تمام قیاسات کا حل تلاش کرنے میں ناکام رہتا تھا اور جو لوگ اس سے مانگنے آتے تھے، جب تک اس کے پاس دینے کو کچھ ہوتا تھا وہ انھیں دیتا رہتا تھا۔ اپنی جائیداد کے سلسلے میں بھی اسے عین مین اسی طرح کی الجھن کا سامنا رہتا تھا۔ ایک شخص اسے ایک اور دوسرا کوئی دوسرا طریق کار تجویز کرتا اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔

اب وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ آج کل اسے ان تمام مسائل کے سلسلے میں نہ تو کوئی الجھن ہوتی ہے اور نہ وہ کسی طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہوتا ہے۔ اب اس کے اندر ایک منصف جاگزیں ہو گیا تھا اور وہ کسی ایسے کلیے کی رو سے، جس سے وہ خود ناواقف تھا، فیصلہ صادر کر دیتا تھا کہ اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔

جہاں تک مسائل زر کا تعلق تھا، ان کے سلسلے میں وہ اب بھی ہمیشہ کی طرح لاپروا اور تغافل شعار تھا لیکن اب وہ پورے اعتماد سے کہہ سکتا تھا کہ اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہیے۔ پہلا موقع، جب اسے اس نئے منصف سے

رجوع کرنا پڑا، تب آیا جب ایک فرانسیسی قیدی، جو بہ اعتبار عہدہ کرنل تھا، اس سے ملنے آیا اور اپنے کارناموں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد اس نے جس بات پر تان توڑی، وہ ایک نوع کے مطالبے کے مترادف تھی کہ پیئر اسے چار ہزار فرانک عطا کرے تاکہ وہ یہ رقم اپنے بیوی بچوں کو بھیج سکے۔ پیئر نے کسی دِقّت یا کوشش کے بغیر اسے کورا جواب دے دیا اور وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ جو کام غیر معمولی طور پر مشکل نظر آیا کرتا تھا، کتنا آسان اور سیدھا سادا ہے۔ عین اسی لمحے، جب اس نے کرنل کا مطالبہ ماننے سے انکار کیا تھا، اس نے یہ تہیہ کر لیا کہ اوریل سے اپنی روانگی کے موقع پر اسے کوئی ایسی ترکیب سوچنا چاہیے جس سے وہ اطالوی افسر کو کچھ رقم، جس کی اسے بظاہر ضرورت تھی، قبول کرنے کی ترغیب دے سکے۔ یہ کہ عملی مسائل کے بارے میں اس کے رویے میں استحکام آ گیا ہے، پیئر کو اس کا مزید ثبوت اپنی بیوی کے قرضے چکانے اور ماسکو کے پڑوس میں اپنے مکان کی تعمیرِ نو کے ضمن میں اپنے فیصلے سے مہیا ہو گیا۔

اس کا سٹیوارڈ اسے ملنے اوریل آ گیا۔ پیئر نے اس کے ساتھ اپنی تخفیف شدہ آمدنی کا حساب لگایا۔ سٹیوارڈ کے تخمینے کے مطابق ماسکو کی آتش زنی سے پیئر کو تقریباً بیس لاکھ روبل کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔

پیئر کے آنسو پونچھنے کے لیے سٹیوارڈ نے اسے حساب کتاب کر کے بتایا کہ ان نقصانات کے باوجود اس کی آمدنی میں کمی کے بجائے اضافہ ہو سکتا ہے، بشرطیکہ وہ اپنی بیوی کے قرضوں کی، جنھیں بے باق کرنا اس کا فرض نہیں بنتا تھا، ادائیگی کرنے سے انکار کر دے اور ماسکو میں اپنے محل اور ماسکو کے قریب اپنے دیہی بنگلے کی تعمیرِ نو سے ہاتھ کھینچ لے کیونکہ ان عمارتوں کی محض دیکھ بھال پر ہی اس کے اسی ہزار روبل سالانہ اٹھ جاتے تھے اور حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔

''ہاں بھائی، تم ٹھیک کہتے ہو۔'' پیئر نے شگفتہ روئی سے کہا۔ ''مجھے ان سب کی بھلا کیا ضرورت ہے؟ تباہ ہونے کے بعد میں پہلے سے زیادہ امیر ہو گیا ہوں۔''

لیکن جنوری میں ماسکو سے ساویلیچ آیا اور اس نے اسے ماسکو کے حالات کے بارے میں آگاہ کیا۔ اس نے اسے ان اخراجات کی تفصیل بھی بتائی جو میرِ تعمیرات کے تخمینوں کے مطابق اس کے شہری اور دیہاتی مکانوں کی تعمیرِ نو پر اٹھنا تھے۔ وہ ان امور کے بارے میں کچھ اس طرح گفتگو کر رہا تھا جیسے یہ پہلے ہی طے ہو چکے ہوں۔ انھی ایام کے دوران میں اسے پرنس واسیلی اور پیٹرزبرگ میں اپنے دوسرے واقف کاروں کے خطوط ملے۔ ان سب میں اس کی بیوی کے قرضوں کا ذکر تھا۔ اور پیئر اس نتیجے پر پہنچا کہ سٹیوارڈ کے مشورے غلط ہیں جن پر اسے ازیں پیشتر بہت خوشی ہوئی تھی، اسے پیٹرزبرگ جا کر اپنے بیوی کے معاملات کو نپٹانا اور ماسکو میں (اپنے مکانات کی) کی تعمیرِ نو کرنا چاہیے۔ ایسا کرنا کیوں ضروری تھا، یہ تو اسے معلوم نہیں تھا لیکن اسے یقین ہو چکا تھا کہ اسے ایسا کرنا چاہیے۔ اس کے اس فیصلے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس کی آمدنی میں تین چوتھائی کمی ہو جائے گی لیکن وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے یہ کام کرنا ہو گا۔

ولارسکی ماسکو جا رہا تھا اور وہ دونوں اکٹھے سفر کرنے پر رضامند ہو گئے۔

اوریل میں، بحالیٔ صحت کے اس تمام عرصے کے دوران میں پیئر کو آزادی، زندگی اور مسرت کا صحیح معنوں میں

لطف محسوس کرنے کا تجربہ ہوتا رہا، لیکن سفر کے دوران میں جب وہ وسیع وعریض دنیا میں داخل ہوا اور اس نے سینکڑوں نئے چہرے دیکھے، اس کا یہ لطف دوبالا ہو گیا۔ اپنے سارے سفر میں اسے یوں محسوس ہوتا رہا جیسے وہ کوئی سکول کا طالب علم ہو جو چھٹیوں میں ادھر ادھر گھوم پھر رہا ہے۔ ہر شخص۔ ڈاک گاڑی کا کوچوان، ڈاک چوکی کا منتظم، سڑک پر اور دیہاتوں میں چلتے پھرتے کسان۔ سب اس کی نگاہوں میں نئی اہمیت اختیار کر گئے۔ ولارسکی کی موجودگی، جو روس کی غربت اور جہالت اور یورپ کے مقابلے میں اس کی پسماندگی پر لگاتار اظہار تاسف کرتا جارہا تھا، پیئر کی مسرت میں محض اضافے کا موجب بن رہی تھی۔ جہاں ولارسکی کو صرف مُردنی دکھائی دے رہی تھی، پیئر کو وہاں غیر معمولی حیات پرور توانائی اور قوت۔ وہ قوت، جس نے ان بسیط وسعتوں اور برفوں کے بیچ میں اس متجانس، انوکھی اور بے مثال قوم کی زندگی کو رواں دواں رکھا ہوا تھا۔ نظر آرہی تھی۔ ولارسکی جو کچھ کہہ رہا تھا، وہ اس کی تردید نہیں کرتا تھا بلکہ بظاہر اس سے اتفاق کرتا نظر آتا تھا۔ یہ ظاہری اتفاق بحث مباحثے سے، جس کا حاصل کچھ نہ ہوتا، پہلو بچانے کا آسان ترین طریقہ تھا۔ وہ اس کی باتیں سنتا اور خوش دلی سے مسکرا دیتا۔

14

جس طرح یہ وضاحت کرنا دشوار ہے کہ جب چیونٹیوں کا دمکوڑا اجڑتا ہے، ان میں بعض وہاں سے کاٹھ کباڑ، انڈے اور لاشیں اٹھائے کیوں اور کدھر بھاگنا شروع کر دیتی ہیں، یا بعض تیز تیز قدموں کیوں واپس آنے، ایک دوسرے سے دھکم پیل کرنے، ایک دوسرے سے آگے نکل جانے کی کوشش کرنے اور ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہونے لگتی ہیں۔ اسی طرح یہ وضاحت کرنا بھی بہت مشکل ہے کہ فرانسیسیوں کی اس مقام سے، جسے ماسکو کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا، روانگی کے بعد روسیوں کے وہاں جوق در جوق واپس آنے کا سبب کیا تھا۔ لیکن جب ہم چیونٹیوں کو اپنے تباہ شدہ دمکوڑے کے آس پاس ہجوم در ہجوم اکٹھا ہوتے دیکھتے ہیں، متلاشی کیڑوں مکوڑوں کا آہنی عزم، توانائی اور ڈھیروں تعداد ثابت کرتی ہے کہ اگرچہ دمکوڑا مسمار ہو چکا ہے، کوئی غیر فنا پذیر، غیر مرئی چیز، جو دمکوڑے کی اصل قوت ہے، ابھی موجود ہے۔ یہی اکتوبر کے مہینے میں ماسکو کی کیفیت تھی۔ اگرچہ وہاں کسی حکومت، کسی کلیسائی نظام اور کسی مقدس شے کا وجود باقی نہیں رہا تھا، لیکن ماسکو وہی ماسکو تھا جو وہ اگست کے دوران میں تھا۔ سب کچھ برباد ہو چکا تھا تاہم کوئی غیر مرئی مگر طاقت ور اور غیر فنا پذیر چیز اب بھی موجود تھی۔

دشمن کے ماسکو سے انخلا کے بعد چاروں اطراف سے جو لوگ بھاگم بھاگ یہاں پہنچے، ان کے مقاصد متنوع اور ذاتی، اور شروع میں، بہیمانہ اور خود غرضانہ تھے۔ ان سب میں صرف ایک جذبہ تحریک مشترک تھا: وہ اس جگہ، جسے ماسکو کہا جاتا تھا، پہنچنا اور وہاں اپنی سرگرمیوں کا آغاز کرنا چاہتے تھے۔

ایک ہفتے کے اندر اندر پندرہ ہزار باشندے ماسکو پہنچ چکے تھے اور اگلے ہفتے ان کی تعداد پچیس ہزار ہو گئی۔ یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا تا آنکہ 1813 کے موسم خزاں تک شہر کی آبادی 1812 سے بھی تجاوز کر گئی۔

سب سے پہلے جوروسی ماسکو میں داخل ہوئے، وہ ونٹ ٹسنگے روڈے کے قازقوں، قرب وجوار کے دیہاتوں کے کسانوں اور شہر کے ان باشندوں پر، جو آس پاس چھپے ہوئے تھے، مشتمل تھے۔ جب واپس پہنچنے والے روسیوں نے دیکھا کہ شہر لٹ پٹ چکا ہے، اپنی باری پر خود انھوں نے لوٹ مار شروع کر دی۔ جس کام کی ابتدا فرانسیسیوں نے کی تھی، وہ انھوں نے جاری رکھا۔ کسانوں کے چھکڑے قافلہ در قافلہ آتے اور ماسکو کے تباہ و برباد مکانوں اور گلی کوچوں میں جو کچھ باقی رہ گیا تھا، اسے لاد کر چلتے بنتے۔ قازق جو کچھ اٹھا سکتے تھے، اٹھا کر اپنے کیمپوں میں لے گئے۔ جہاں تک شہر کے باسیوں کا تعلق ہے، دوسروں کے گھروں سے جو اشیا ہاتھ آتیں، ان پر اس بہانے قبضہ کر لیتے کہ وہ اپنا سامان اکٹھا کر رہے ہیں۔

لیکن لوٹ مار کرنے والے اولین جتھوں کے بعد دوسرے اور تیسرے ٹولے بھی آنا شروع ہو گئے۔ جوں جوں ان کی تعداد بڑھتی گئی، توں توں لوٹ مار مشکل تر ہوتی گئی اور واضح صورتیں اختیار کرنے لگی۔

جب فرانسیسی ماسکو میں داخل ہوئے تھے، انھیں شہر خالی ملا تھا تاہم باقاعدہ شہری زندگی کے لوازمات۔ تجارت، صنعت و حرفت، تعیشات، مقامی حکومت اور مذہب کی مختلف شاخیں۔ موجود تھے۔ یہ ادارے بے جان ضرور تھے لیکن ان کا وجود ختم نہیں ہوا تھا۔ منڈیاں، دکانیں، گودام، اناج خانے، بازار سب اپنی جگہ قائم تھے اور ان میں سے بیشتر سامان کے ذخائر سے بھرے پڑے تھے۔ کارخانے اور ورکشاپیں تھیں۔ سامان عیش و عشرت سے پُر محل اور حویلیاں تھیں، ہسپتال، قید خانے، سرکاری دفاتر، گرجا گھر اور کلیسے تھے۔ فرانسیسیوں کے قیام کی مدت جتنی طوالت پکڑتی گئی، شہر کی یہ صورتیں اتنی ہی ناپید ہوتی چلی گئیں تا آنکہ بالآخر ہر چیز لوٹ مار کا ژولیدہ اور بے جان منظر پیش کرنے لگی۔

جیسے جیسے فرانسیسیوں کی لوٹ مار کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا گیا، ویسے ویسے شہر کی دولت اور اس کی لوٹ مار کرنے والوں کی قوت و توانائی کم سے کم تر ہوتی چلی گئی۔ لیکن دارالسلطنت میں روسیوں کی واپسی کے بعد ان کی لوٹ مار کا سلسلہ جتنا طویل اور ان کی تعداد میں جتنا اضافہ ہوتا گیا، شہر کی دولت اتنی ہی تیزی سے بڑھنے اور عام زندگی اتنی ہی سرعت سے معمول پر آنے لگی۔

لوٹ مار کی غرض سے آنے والوں کے علاوہ بھانت بھانت کے دیگر لوگ بھی وارد ہونے لگے۔ بعض لوگوں کو تجسس کھینچ لایا تھا، بعض سرکاری فرائض سرانجام دینے آئے تھے اور بعض۔ گھروں کے مالک، پادری، اعلیٰ و ادنیٰ حکومتی کارندے، تاجر، اہل حرفہ اور کسان۔ ذاتی مفادات کے پیش نظر چلے آئے تھے۔ کبھی جوق در جوق، قافلہ در قافلہ، یوں پہنچ رہے تھے جیسے خون دل کی طرف بہتا چلا آتا ہے۔

جو کسان لوٹ مار کرنے کی نیت سے خالی چھکڑوں کے ساتھ شہر آ رہے تھے، ایک ہفتے کے اندر اندر حکام نے انھیں روکنا اور انھیں گلی کوچوں سے لاشیں اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ جب دوسرے کسانوں کو معلوم ہوا کہ ان کے بھائی بندوں کی کوششیں ناکام بنا دی گئی ہیں، وہ گندم، جئی اور خشک گھاس لانے لگے۔ ان کا آپس میں سخت مقابلہ

ہونے لگا اور قیمتیں سابقہ دور سے بھی کم ہو گئیں۔ لوہار اور ترکھان زیادہ مزدوری کی امید میں ہر روز ہجوم در ہجوم ماسکو پہنچنے لگے۔ نئے مکانات کی تعمیر اور پرانے اور سوختہ شدگان کی مرمتیں شروع ہو گئیں۔ تاجر اپنا کاروبار سائبانوں اور عارضی دکانوں میں کرنے لگے۔ ریستوران اور نانبائیوں کی دکانیں نیم سوختہ عمارتوں میں کھل گئیں۔ پادریوں نے ان متعدد گرجوں میں، جو آتش زنی سے بچ گئے تھے، عبادت کا سلسلہ شروع کر دیا۔ گرجاؤں کا جو سامان لٹ پٹ گیا تھا، اس کی کمی عطیات سے پوری کر لی گئی۔ سرکاری کلرکوں نے اپنی بانات سے ڈھنپی میزیں اور فائلوں کے کابک چھوٹے چھوٹے کمروں میں سجا لیے۔ فرانسیسی جو سامان اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے، اعلیٰ حکام اور پولیس نے ان کی تقسیم کا بندوبست کر دیا۔ بعض گھروں کے متعلق معلوم ہوا کہ ان میں دیگر مکانوں سے لایا گیا سامان وافر مقدار میں موجود ہے، جب اسے اٹھا کر کریملن کے گرانو ویتیا محل میں لے جایا جانے لگا، ان کے مالکوں کو شکایت لاحق ہوئی کہ ان کے ساتھ ناانصافی ہو رہی ہے، جب کہ دوسروں کا اصرار تھا کہ چونکہ فرانسیسی مختلف مقامات سے سامان اٹھا اٹھا کر اِس یا اُس مکان میں جمع کرتے رہے ہیں، اس لیے یہ تمام کا تمام مالک مکان کے سپرد کرنا انصاف کے تقاضوں کے منافی ہوگا۔ لوگ پولیس سے گالی گلوچ کرنے اور اسے رشوتیں دینے لگے۔ آتش زنی میں انھیں جو نقصانات اٹھانا پڑے تھے، وہ اس کا تخمینہ دس دس گنا بڑھا کر پیش کرنے اور امداد کے طالب ہونے لگے۔ اور کاؤنٹ رستوپ چن اپنے اعلان نامے تحریر کرنے لگا۔

15

پیئر جنوری کے اختتام پر ماسکو پہنچا اور اپنے مکان کے ایک حصے میں، جسے کوئی گزند نہیں پہنچا تھا، قیام پذیر ہو گیا۔ اس نے کاؤنٹ رستوپ چن اور اپنے متعدد دیگر احباب کے ساتھ، جو ماسکو واپس آ گئے تھے، ملاقاتیں کیں اور دو روز بعد پیٹرز برگ جانے کا منصوبہ بنایا۔ ہر شخص فتح کا جشن منا رہا تھا۔ گو شہر تباہ ہو چکا تھا مگر وہ اب از سر نو بیدار ہونے لگا تھا اور اس میں زندگی رواں دواں ہو چکی تھی۔ پیئر کو دیکھ کر ہر شخص خوش ہوتا تھا۔ ہر کوئی اس سے ملاقات کرنا اور پوچھنا چاہتا تھا کہ اس نے کیا کچھ دیکھا ہے۔ پیئر ان سب کے ساتھ انتہائی خوش خلقی سے پیش آتا لیکن اب وہ جبلی طور پر خاصا محتاط ہو گیا تھا اور منہ سے کوئی ایسی بات نہیں نکالتا جس پر بعد میں قائم رہنا مشکل ہو جائے۔ اس قسم کے تمام سوالات ۔ مثلاً اب آپ کا کہاں بود و باش اختیار کرنے کا ارادہ ہے؟ کیا آپ اپنے مکانات نئے سرے سے تعمیر کرائیں گے؟ آپ پیٹرز برگ کب جا رہے ہیں اور اگر میں آپ کو ایک پارسل دوں، آپ برا تو نہیں مانیں گے؟ ۔ خواہ سنجیدہ ہوتے یا غیر سنجیدہ، اس کا یہی جواب ہوتا: "ہاں، شاید" "میرا خیال ہے۔"

اسے معلوم ہوا تھا کہ رستوف کاستروما میں ہیں لیکن نتاشا کا خیال اسے شاید ہی کبھی آیا ہوگا اور اگر کبھی آیا بھی تو محض بھولے بسرے ماضی کی خوشگوار یاد کے طور پر۔ وہ اپنے آپ کو نہ صرف معاشرتی ذمے داریوں سے بلکہ اس احساس سے بھی، جو اس کے خیال کے مطابق اس نے جانتے بوجھتے ہوئے اپنے دل میں بسا لیا تھا، آزاد محسوس

کر رہا تھا۔

ماسکو میں اپنی آمد کے تیسرے روز اسے دروبتیسکوئیوں کی زبانی معلوم ہوا کہ پرنس ماریا ماسکو میں ہے۔وہ پرنس آندرے کی موت، مصائب اور آخری ایام کے بارے میں اکثر سوچتا رہا تھا اور اب یہ تمام باتیں از سرِ نو بڑی صراحت سے اس کے ذہن میں گھومنے لگیں۔ ڈنر پر یہ سننے کے بعد کہ پرنس ماریا ماسکو میں ہے اور وزدوزیزینکا سٹریٹ میں اپنے ذاتی مکان میں رہائش پذیر ہے۔۔جو تباہ ہونے سے بچ گیا تھا۔۔وہ اسی شام اسے ملنے چل دیا۔

جب پیئر اپنی گاڑی میں پرنس ماریا کے مکان کی طرف جا رہا تھا، وہ راستے میں پرنس آندرے، اس کے ساتھ اپنی دوستی اور اس کے ساتھ اپنی مختلف ملاقاتوں، خاص طور پر آخری کے متعلق سوچتا رہا، جو بارودینو میں ہوئی تھی۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ اس کا انتقال اسی تلخ ذہنی کیفیت میں ہوا ہو؟ کیا یہ ممکن ہے کہ موت سے پہلے اس پر زندگی کے معانی منکشف نہ ہوئے ہوں؟'' وہ سوچ رہا تھا۔ اسے کاراتائیف اور اس کی موت یاد آئی اور وہ غیر ارادی طور پر دونوں اشخاص کے مابین موازنہ کرنے لگا۔ وہ اتنے مختلف ہونے کے باوجود اتنے مماثل تھے، اس لیے کہ اسے دونوں سے محبت تھی، دونوں نے زندگی گزاری تھی اور اب وہ دونوں ہی راہی ملک عدم ہو چکے تھے۔

پیئر کی گاڑی جب معمر پرنس کے مکان کے قریب پہنچی، اس کی ذہنی کیفیت انتہائی سنجیدہ ہو چکی تھی۔ مکان صحیح سلامت تھا۔ کہیں کہیں ٹوٹ پھوٹ کے آثار ضرور نظر آ رہے تھے لیکن اس کی عمومی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ جس بوڑھے وردی پوش خدمت گار نے پیئر کا استقبال کیا، اس کے چہرے پر درشتی برس رہی تھی جیسے وہ مہمان کو باور کرانا چاہتا ہو کہ گھر کے معمول میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس نے اسے مطلع کیا کہ پرنس ماریا اپنے اپارٹمنٹ میں تشریف لے جا چکی ہیں اور صرف اتوار کو مہمانوں سے ملاقات فرماتی ہیں۔

''انھیں میری آمد کی اطلاع پہنچا دو۔ شاید وہ مجھ سے ملاقات کر لیں،'' پیئر نے کہا۔

''بہت اچھا، حضور،'' اس شخص نے جواب دیا۔ ''پورٹریٹ گیلری میں تشریف رکھیں۔''

چند منٹ بعد خدمت گار دیسال کی معیت میں واپس آ گیا۔ دیسال نے اسے بتایا: ''پرنس کو آپ سے مل کر بہت خوشی ہوگی۔ وہ معافی چاہتی ہیں کہ وہ آپ کا رسمی انداز سے استقبال نہیں کر سکتیں۔ آپ اوپر ان کے اپارٹمنٹ میں تشریف لے چلیں۔''

اسے پرنس جس کمرے میں ملی، اس کی چھت قدرے نیچی تھی اور وہاں صرف ایک موم بتی جل رہی تھی۔ کمرے میں پرنس کے علاوہ ایک سیاہ پوش خاتون موجود تھی۔ پیئر کو یاد آیا کہ پرنس کے ساتھ ہمیشہ مصاحبہ رہی ہیں، مگر یہ خواتین کون تھیں، یہ اسے نہ کبھی معلوم ہوا اور نہ یاد رہا۔ ''یہ لازماً اس کی کوئی نہ کوئی مصاحبہ ہی ہوگی،'' اس نے سیاہ پوش خاتون کو اچٹتی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے سوچا۔

پرنس اس کا استقبال کرنے کے لیے جھٹ پٹ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''ہاں،'' وہ جب اس کے ہاتھ پر بوسہ دے چکا، وہ اس کے تبدیل شدہ چہرے کا بغور جائزہ کے بعد بولی۔ ''تو

ہماری دوبارہ ملاقات یوں ہونا تھی۔ وہ اکثر، بلکہ آخری دموں تک آپ کا ذکر کرتے رہے۔'' وہ کہتی چلی گئی اور اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک قسم کے تذبذب سے، جو اس وقت پیئر کو عجیب معلوم ہوا، پیئر سے نگاہیں اٹھا کر اپنی رفیقہ کی جانب دیکھنے لگی۔

''جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کو چھڑا لیا گیا ہے، مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ بہت مدت کے بعد کوئی اچھی خبر سننے کو ملی تھی۔''

پرنس نے ایک بار پھر اپنی رفیقہ کی طرف نظر ڈالی اور اب وہ پہلے سے بھی زیادہ مضطرب دکھائی دے رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن پیئر نے دخل اندازی کر دی۔

''ذرا تصور کرو۔ مجھے اس کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا،'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال تھا کہ وہ ہلاک ہو گیا ہو گا۔ مجھے جو کچھ معلوم ہے، وہ میں نے محض دوسروں کی زبانی سنا ہے۔ مجھے صرف اتنا پتا چل سکا کہ اس کی اتفاقاً رستوفوں سے مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی... قسمت کے رنگ ڈھنگ نرالے ہیں!''

پیئر کی زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی اور وہ بڑے جوش و خروش سے گفتگو کر رہا تھا۔ اس نے اچٹتی نگاہوں سے مصاحبہ کو دیکھا۔ اس کی نظریں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ بڑے انہماک اور توجہ سے اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے انداز سے دوستی اور اپنائیت جھلک رہی تھی اور وہ یوں دکھائی دے رہی تھی جیسے وہ بہت سے رازوں کی امین ہو۔ اور جیسا کہ اکثر ہوتا ہے کہ جب آپ بات کر رہے ہوں اور کوئی دوسرا شخص آپ کو اس انداز سے دیکھ رہا ہو، آپ کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ آپ کی گفتگو میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ پیئر کو محسوس ہوا کہ یہ سیاہ پوش مصاحبہ دل آویز، رحم دل اور دوست نواز شخصیت کی مالک ہے اور وہ جس بے روک ٹوک انداز سے پرنس سے گفتگو کر رہا ہے، اس میں کوئی رخنہ نہیں ڈالے گی۔

لیکن جب اس نے رستوفوں کا نام لیا، پرنس ماریا کی بے چینی اور اضطراب اور بھی نمایاں ہو گیا۔ اس نے ایک بار پھر تیزی سے پہلے پیئر کو اور پھر سیاہ پوش خاتون کی جانب دیکھا، اور بولی:

''آپ نے اسے پہچانا نہیں؟''

پیئر نے ایک بار پھر مصاحبہ کے زرد، مہین چہرے، سیاہ آنکھوں اور نرالے دہن پر نظر ڈالی۔ کوئی ہستی، جو اس کے اتنی قریب، اسے اتنی عزیز تھی، کوئی ہستی، جو مدتوں سے فراموش ہو چکی تھی، جو محض دل ربا ہی نہیں تھی بلکہ اس سے بڑھ کر تھی، منہمک نگاہوں سے ٹکٹکی باندھے اسے دیکھ رہی تھی۔

''نہیں، یہ وہ نہیں ہو سکتی!'' اس نے سوچا۔ ''یہ درشت، مسرت بیزار، لاغر، زرد چہرہ، جو اتنا عمر رسیدہ نظر آ رہا ہے، اس کا نہیں ہو سکتا۔ یہ مجھے محض اس کی یاد دلاتا ہے۔''

لیکن عین اس لمحے پرنس ماریا نے کہا:

''نتاشا!''

اور منہمک نگاہوں والا چہرہ مسکرایا۔ جس طرح وہ دروازہ، جو قلابوں کے زنگ آلود ہونے کی وجہ سے بڑی مشکل، کوشش اور زور لگانے سے کھلتا ہے، اسی طرح یہ مسکراہٹ بھی بڑی مشکل، کوشش اور زور لگانے پر آئی تھی۔ اس کھلے دروازے میں سے پیئر کی جانب معطر جھونکا لپکا اور اس کے انگ انگ کو ایسی مسرت سے سرشار کر گیا، جس سے وہ مدتوں سے ناآشنا تھا اور جس کے بارے میں وہ — خاص طور پر وہ اس لمحے — سوچ بھی نہیں رہا تھا۔ یہ بگولے کی طرح آیا، اسے اپنی لپیٹ میں لیا اور اس پر پوری طرح غالب آ گیا۔ جب وہ مسکرائی، شک وشبے کی کوئی گنجائش نہ رہی۔ یہ نتاشا ہی تھی اور وہ اس سے محبت کرتا تھا۔

اس اولین لمحے کے دوران میں پیئر نے غیر ارادی طور پر اس کے، پرنسس ماریا کے اور خود اپنے سامنے ایک ایسے راز سے پردہ ہٹا دیا جس سے وہ خود بھی آگاہ نہیں تھا۔ خوشی سے اس کا چہرہ تمتمانے لگا لیکن اس پر شدید اذیت بھی سایہ فگن تھی۔ اس نے اپنے اضطراب کو چھپانے کی کوشش کی مگر وہ اسے پوشیدہ رکھنے کی جتنی جدوجہد کر رہا تھا، وہ اتنے ہی صریح واضح انداز سے — اتنے صریح وواضح کہ کسی قسم کے کوئی الفاظ بھی اس کا یوں اظہار نہیں کر سکتے تھے — اپنے آپ پر، اس پر، اور پرنسس ماریا پر منکشف کر رہا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے۔

''نہیں، یہ محض اس لیے ہوا کیونکہ مجھے اس سے ملاقات کی قطعاً کوئی توقع نہیں تھی،'' پیئر نے سوچا۔

لیکن جو گفتگو وہ پرنسس ماریا سے کر رہا تھا، اس نے جونہی اسے دوبارہ شروع کرنا چاہا، اس نے ایک بار پھر اچٹتی نگاہوں سے نتاشا کی طرف دیکھا اور اس کا چہرہ پہلے سے بھی زیادہ تمتمانے لگا، اور پہلے سے بھی کہیں زیادہ شدید اضطراب، جس میں مسرت اور خوف کی آمیزش تھی، اس پر غالب آ گیا۔ وہ اپنی گفتگو میں الجھاؤ کا شکار ہونے لگا اور اپنی بات کہتے کہتے بیچ میں رک گیا۔

پیئر نتاشا پر توجہ دینے میں اس لیے ناکام رہا تھا کیونکہ یہ بات اس کے وہم گماں میں بھی نہیں آئی تھی کہ اس کی اس سے وہاں ملاقات ہو سکے گی، اور وہ اسے پہچان اس لیے نہ سکا کیونکہ گزشتہ ملاقات کے بعد کے عرصے میں وہ بے حد تبدیل ہو چکی تھی۔ وہ لاغر اور زرد رو ہو گئی تھی۔ تاہم اسے ناقابل شناخت اس چیز نے نہیں بنایا تھا۔ وہ ناقابل شناخت اس لیے تھی کیونکہ جب وہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا، وہاں تبسم نام کی کوئی علامت نہیں تھی حالانکہ ازیں پیشتر اس کی آنکھیں زندگی کی دبی دبی مسکراہٹ سے ہر دم تاباں وروشن رہتی تھیں۔ اب یہ آنکھیں صرف پر انہماک اور شفیق تھیں، اور پر ملال انداز سے سوال پوچھتی نظر آ رہی تھیں۔

16

''یہ میرے ہاں قیام کرنے آئی ہے،'' پرنسس ماریا نے کہا۔ ''کاؤنٹ اور کاؤنٹس چند دنوں میں یہاں پہنچ جائیں گے۔ کاؤنٹس کی حالت اتنی پتلی ہے کہ انھیں دیکھ کر کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ لیکن نتاشا کا ڈاکٹر سے ملنا ضروری تھا۔ ان کا اصرار تھا کہ یہ میرے ساتھ چلی آئے۔''

''ہاں، ایسا خاندان، جو ناشاد نہ ہو، کہاں ہے؟'' پیئر نے نتاشا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''تمھیں معلوم ہے کہ یہ واقعہ عین اس روز، جب ہمیں رہائی دلائی گئی، پیش آیا تھا؟ میں نے اسے دیکھا تھا، کتنا پیارا لڑکا تھا!''

نتاشا نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی بات کے جواب میں اس کی آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئیں اور وہ روشن و تاباں ہو گئیں۔

''آدمی تسلی دلاسا کیسے دے؟ مناسب الفاظ نہ سوجھتے ہیں، نہ منہ سے ادا ہو سکتے ہیں!'' پیئر نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا۔ ''آخر اتنے شان دار نوجوان کو موت آئی ہی کیوں؟ اس کی تو نس نس سے زندگی پھوٹتی تھی!''

''آپ نے درست فرمایا۔ اگر آدمی کا کوئی ایمان نہ ہو، اس زمانے میں زندہ رہنا دوبھر ہو جائے،'' پرنس ماریا نے خیال ظاہر کیا۔

''بالکل، بالکل، تم بالکل صحیح کہتی ہو،'' پیئر نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

''یہ صحیح کیوں ہے؟'' نتاشا نے پیئر کی آنکھوں میں متجسسانہ جھانکتے ہوئے کہا۔

''یہ تم نے 'کیوں' کیوں کہا؟'' پرنس ماریا نے کہا۔ ''جو (چیز) ہماری منتظر ہے، اس کا محض تصور...''

نتاشا پرنس ماریا کی بات کے ختم ہونے کا انتظار کیے بغیر دوبارہ مستفسرانہ انداز سے پیئر کی جانب دیکھنے لگی۔

''اور کیونکہ'' پیئر نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا، ''صرف وہی شخص، جس کا یہ ایمان ہو کہ ہماری زندگی کسی خدا کے تابع ہے، اس قسم کے نقصان کو، جیسا کہ اسے... اور تمھیں... اٹھانا پڑا، جھیل سکتا ہے۔''

نتاشا نے کچھ کہنے کے لیے اپنا منہ کھولا لیکن وہ یک دم رک گئی۔

پیئر دفعتاً اس سے پرے ہٹ گیا اور ایک بار پھر پرنس ماریا سے مخاطب ہو کر اس سے اپنے دوست کے آخری ایام کے بارے میں پوچھنے لگا۔

پیئر کا ذہنی انتشار اب تقریباً عنقا ہو چکا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی اسے یہ بھی نظر آ رہا تھا کہ وہ اپنی سابقہ آزادی سے بھی ہاتھ دھو چکا ہے۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی اس کی ایک ایک بات اور ایک ایک حرکت کا محاکمہ کر رہا ہے اور یہ وہ حَکَم تھا جس کا فیصلہ روئے زمیں کی تمام اشیا سے زیادہ اہم تھا۔ اب جب وہ گفتگو کر رہا تھا، تول تول کر کر رہا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی سوچتا جا رہا تھا کہ اس کے الفاظ کا نتاشا پر کیا اثر مترتب ہو رہا ہے۔ وہ اسے خوش کرنے کے لیے عمداً کوئی بات نہیں کہہ رہا تھا لیکن جو کچھ اس کے منہ سے نکل رہا تھا، وہ اس پر اس نقطۂ نظر سے سوچ ضرور رہا تھا۔

جیسا کہ اس قسم کی صورتوں میں عموماً ہوتا ہے، پرنس ماریا بادلِ ناخواستہ پیئر کو پرنس آندرے کی اس حالت کے بارے میں بتانے لگی جس میں اس نے اسے دیکھا تھا۔ تاہم پیئر کے سوالات، اس کی پرجوش اور بے چین نگاہوں، اس کے جذبات سے کپکپاتے چہرے نے بتدریج اسے ان تفصیلات کا، جن کو یاد کرنے سے وہ اپنی خاطر بدکتی تھی، ذکر کرنے پر مجبور کر دیا۔

''ہاں، ہاں، اور پھر...'' پیئر اپنا جسم اس کی جانب جھکائے اور پوری توجہ سے اس کی کہانی سنتے ہوئے کہتا

رہا۔ ’’ہاں، ہاں، پھر اسے سکون مل گیا؟ اور اس کا دل گداز ہوگیا؟ وہ بہ دل و جان صرف ایک ہی چیز کے لیے جدوجہد کرتا رہا تھا ــ کہ وہ سرتاپا نیکی کا مجسمہ بن جائے ــ چنانچہ وہ موت سے خائف نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر اس میں کوئی کوتاہیاں تھیں، تو وہ اس کی اپنی پیدا کردہ نہیں تھیں۔ تو اس کا دل گداز ہوگیا؟... کتنی خوشی کی بات ہے کہ اس سے تمھاری دوبارہ ملاقات ہوگئی!‘‘ اس نے اچانک نتاشا کی جانب توجہ مبذول کرتے اور اسے اشک آلود آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ نتاشا کا چہرہ پھڑپھڑایا، اس کی پیشانی پر شکنیں نمودار ہوئیں اور اس نے ایک ثانیے کے لیے اپنی نگاہیں جھکالیں۔ وہ ذرا کی ذرا ہچکچائی کہ اسے کچھ کہنا چاہیے یا نہیں۔

’’ہاں، یہ بڑی خوشی کا مقام تھا،‘‘ اس نے مدھم اور تھرتھراتی آواز میں کہا۔ ’’میرے لیے یہ واقعی بہت بڑی راحت تھی۔‘‘ وہ رکی۔ ’’اور انھوں... انھوں نے مجھے بتایا کہ جب میں ان کے کمرے میں داخل ہوئی، وہ عین اس وقت بالکل اسی چیز کی آرزو کر رہے تھے۔‘‘ نتاشا کا گلا رندھ گیا۔ اس کا چہرہ شرم وحیا سے لالوں لال ہوگیا اور وہ اپنی مٹھیوں سے اپنے گھٹنے زور زور سے دبانے لگی۔ پھر اس نے بڑی کوشش سے، جو صاف نظر آرہی تھی، اپنے جذبات پر قابو پایا، اپنا سر اوپر اٹھایا اور تیز تیز بولنے لگی۔

’’جب ہم ماسکو سے روانہ ہوئے، ہمیں ان کا مطلق علم نہیں تھا۔ مجھ میں ان کے متعلق پوچھنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ پھر اچانک سونیا نے بتایا کہ وہ ہمارے ساتھ سفر کر رہے ہیں۔ مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ان کی حالت کیسی ہے، میری تو صرف ایک ہی تمنا تھی کہ میں انھیں دیکھ سکوں، ان کے قریب جاسکوں،‘‘ اس نے کپکپاتے اور زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا۔

اور انھیں اپنی گفتگو میں کسی قسم کی مداخلت کا موقع دیے بغیر وہ انھیں وہ سب کچھ بتانے لگی جس میں سے اسے اپنے سفر اور یاروسلاول میں قیام کے تین ہفتوں کے دوران میں گزرنا پڑا تھا۔ اس نے ابھی تک کسی سے ان باتوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔

پیئر منہ کھولے اس کی باتیں سن رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ اس دوران میں وہ نہ پرنس آندرے، نہ موت اور نہ باتوں کے متعلق، جو وہ سنا رہی تھی، سوچ رہا تھا۔ وہ بس اس کی کتھا سن رہا تھا اور اس کے سنانے میں وہ جس کرب میں سے گزر رہی تھی، اس پر اسے اس پر ترس آرہا تھا۔

پرنسس ماریا نتاشا کے قریب بیٹھی تھی۔ اپنے آنسو روکنے کی کوشش میں اس کی پیشانی شکن آلود ہو رہی تھی۔ اپنے بھائی اور نتاشا کی محبت کے آخری ایام کی داستان وہ پہلی بار سن رہی تھی۔

صاف نظر آرہا تھا کہ ان کرب ناک مگر بہر حال پُرمسرت دنوں کے متعلق گفتگو کرنا نتاشا کی ضرورت تھی۔ وہ باتیں کیے جارہی تھی اور اپنے انتہائی ذاتی احساسات میں نہایت معمولی معمولی تفصیلات کی آمیزش کرتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ اس کی گفتگو کبھی ختم نہیں ہوگی۔ متعدد مرتبہ وہ ایک ہی بات دو دو بار دہراتی رہی۔

اتنے میں دروازے پر دیسال کی آواز سنائی دی۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ آیا نکولشکا شب بخیر کہنے آسکتا ہے۔

"بس یہی کچھ تھا۔ سب کچھ..." نتاشا نے کہا۔

جونہی نکولشکا اندر داخل ہوا، وہ ترت اٹھ کھڑی ہوئی اور اس نے دروازے کی جانب دوڑ لگا دی جو پردوں میں مستور تھا۔ اسے دروازہ نظر نہ آیا اور اس کے بازو سے اس کا سر ٹکرا گیا۔ اس کی ہلکی سی چیخ نکل گئی جس میں نیم درد اور نیم ملال تھا، اور وہ بھاگتے بھاگتے باہر چلی گئی۔

وہ جس دروازے میں سے غائب ہوئی تھی، پیئر اسے بغور دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے اچانک اس دنیا میں شدید اکلاپے کا احساس کیوں ہونے لگا ہے۔

پرنسس ماریا نے اس کی اپنے بھتیجے کی جانب، جو کمرے میں آ چکا تھا، توجہ دلاتے ہوئے اسے اس کی محویت سے جگا دیا۔

شدید جذبات کے اس لمحے کے دوران میں پیئر نکولشکا کا چہرہ دیکھ کر جو اس کے باپ کے چہرے سے اتنا مشابہ تھا، دیکھ کر اس قدر متاثر ہوا کہ بچے کو چومنے کے بعد وہ ایکا ایکی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دریچے کی طرف چل پڑا۔ وہ پرنسس ماریا سے اجازت لینا چاہتا تھا لیکن وہ اسے جانے نہیں دے رہی تھی۔

"نہیں، میں اور نتاشا بعض اوقات دو بجے سے پہلے نہیں سوتیں۔ لہٰذا آپ تشریف رکھیں۔ میں پر منگواتی ہوں۔ آپ نیچے چلیں، ہم ابھی آتی ہیں۔"

پیئر کے کمرے سے نکلنے سے پہلے پرنسس ماریا نے اس سے کہا:

"اس نے ان کے متعلق پہلی مرتبہ اس قسم کی باتیں کی ہیں۔"

17

پیئر کو کشادہ اور چکاچوند روشن ڈائننگ روم میں پہنچا دیا گیا۔ چند منٹ بعد اسے قدموں کی چاپ سنائی دی اور پرنسس ماریا نتاشا کی معیت میں کمرے میں داخل ہوئی۔ اگرچہ نتاشا کا چہرہ پہلے کی طرح درشت اور گمبھیر دکھائی دے رہا تھا، وہ پرسکون ہو چلی تھی۔ سنجیدہ، متین اور قلبی گفتگو کے بعد ماحول پر جو اداسی اور بوجھل پن چھا جاتی ہے، تینوں کو اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ یہ وہ عالم تھا جب سابقہ گفتگو کو از سر نو شروع کرنا ناممکن ہوتا ہے، چھوٹی چھوٹی اور عام باتیں کرنا مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن بات کرنے کی خواہش اپنی جگہ موجود ہوتی ہے اور چپ رہنا محض تصنع دکھائی دیتا ہے۔ وہ چپ چاپ ڈائننگ ٹیبل کے قریب چلے گئے۔ وردی پوش خدمت گاروں نے کرسیاں پیچھے کھسکائیں اور دوبارہ میز کے ساتھ لگا دیں۔ پیئر نے اپنا نیپکن پھیلایا اور مہر سکوت توڑنے کا تہیہ کرتے ہوئے نتاشا اور پرنسس ماریا کی طرف دیکھا۔ کچھ یوں نظر آ رہا تھا کہ اسی لمحے وہ دونوں بھی اسی نتیجے پر پہنچ چکی ہیں۔ دونوں کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور یہ چمک بتا رہی تھی کہ وہ اپنی اپنی جگہ مطمئن ہیں اور انھیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ زندگی میں غم واندوہ ہی کا راج نہیں، اس میں مسرت بھی پائی جاتی ہے۔

''کاؤنٹ، آپ ووڈکا سے شوق فرماتے ہیں؟'' پرنس ماریا نے پوچھا اور اس کے ان الفاظ سے ایکا ایکی ماضی کی اداسیاں کافور ہوگئیں۔ ''اب آپ ہمیں اپنے بارے میں کچھ بتائیں،'' اس نے کہا۔ ''آپ کے متعلق ناقابل یقین کہانیاں گردش کررہی ہیں۔''

''ہاں،'' پیئر نے لطیف طنزیہ انداز سے، جواب اس کی فطرت ثانیہ بنتا جارہا تھا، مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خود مجھے بھی بڑے بڑے عجوبے۔ ایسی ایسی باتیں جو میں نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچی ہوں گی۔ سننے کو ملتے ہیں۔ ماریا ابراموونا نے مجھے اپنے گھر آنے کی دعوت دی اور میرے ساتھ جو کچھ بیتا تھا یا بیتنا چاہیے تھا، اس کے متعلق مجھے آگاہ کرتی رہی۔ ستیپان ستیپانچ نے بھی میری رہنمائی کی اور مجھے سمجھایا کہ مجھے اپنے تجربات کیسے بیان کرنا چاہئیں۔ ان تمام باتوں سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ دلچسپ آدمی بننا بہت آسان کام ہے (اور میں اب دلچسپ آدمی ہوں)۔ لوگ مجھے مدعو کرتے ہیں اور مجھے خود میرے متعلق بتاتے ہیں۔''

نتاشا مسکرائی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔

''ہم نے سنا ہے،'' پرنس ماریا اس سے پہلے بول پڑی، ''کہ آپ کا ماسکو میں بیس لاکھ کا نقصان ہوا ہے۔ کیا یہ صحیح ہے؟''

''لیکن میں پہلے کی نسبت سہ چند امیر ہوگیا ہوں،'' پیئر نے کہا۔

اگرچہ اپنی بیوی کے قرضے ادا کرنے اور تعمیر نو کا کام شروع کرنے کے فیصلے کے بعد پیئر کے حالات تبدیل ہوگئے تھے، لیکن اس کا پھر بھی یہی دعویٰ تھا کہ وہ پہلے کی نسبت تین گنا متموّل ہوچکا ہے۔

''جو چیز مجھے یقیناً حاصل ہوئی ہے، وہ آزادی ہے،'' اس نے سنجیدگی سے کہنا شروع کیا لیکن کچھ سوچ کر اس نے اپنی بات ادھوری ہی چھوڑ دی۔ اسے محسوس ہورہا تھا کہ گفتگو کے اس موضوع سے انانیت کی بو آرہی ہے۔

''آپ اپنے مکان دوبارہ تعمیر کرارہے ہیں؟''

''ہاں، ساویلچ کا مشورہ ہے کہ مجھے یہ کام لازماً کرنا چاہیے!''

''یہ بتائیں کہ جب آپ ابھی ماسکو میں تھے، آپ کو کاؤنٹس کے انتقال کی خبر نہیں ملی تھی؟'' پرنس ماریا نے پوچھا لیکن اسی دم اس کے چہرے کی رنگت سرخ ہوگئی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ اس نے ''آزادی'' مل جانے کا جو تذکرہ کیا تھا، اس کے بعد معاً بعد اس قسم کا سوال پوچھنا اس کے الفاظ کو ایسے معانی پہنانے کے مترادف ہے جو غالباً اس کے دل میں نہیں تھے۔

''نہیں،'' معلوم ہوتا تھا کہ پرنس ماریا نے آزادی کے متعلق اس کے اشارے کو جو معانی پہنائے تھے، اگر ان میں کوئی کھسیانے پن کی بات تھی، تو وہ اس سے بے خبر تھا۔ ''مجھے یہ خبر اوریل میں ملی تھی۔ مجھے اس سے کتنا دکھ پہنچا، تم لوگ اس کا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ ہم کوئی مثالی جوڑا نہیں تھے؛'' اس نے نتاشا کی طرف دیکھتے اور اس کے چہرے پر یہ تجسس بھانپتے ہوئے کہ وہ اپنی بیوی کے متعلق کس قسم کی گفتگو کرے گا، عجلت سے مزید کہا، ''لیکن اس کی

موت نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ جب دو آدمیوں میں جھگڑا ہوتا ہے، ہمیشہ دونوں ہی قصوروار ہوتے ہیں۔ جب ایک کا رشتۂ حیات منقطع ہو جاتا ہے، دوسرے کو اپنا جرم انتہائی گمبھیر معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اس قسم کی موت... کامل تنہائی، کوئی ساتھی نہیں، سنگی نہیں، کوئی تسلی کے دو بول کہنے والا نہیں! مجھے اس پر بہت، بلکہ بہت زیادہ ترس آیا۔"

اس نے اپنی بات ختم کرتے ہوئے کہا اور وہ نتاشا کے چہرے پر پرمسرت پسندیدگی کی جھلک دیکھ کر خوش ہو گیا۔

"تو آپ ایک بار پھر eligible parti* بن گئے ہیں،" پرنسس ماریا نے کہا۔

پیئر کا رنگ بیر بہوٹی کی طرح سرخ ہو گیا اور وہ کافی دیر یہی کوشش کرتا رہا کہ وہ نتاشا کی طرف نہ دیکھے، مگر جب اس نے اچٹتی نگاہوں سے اس کو دیکھنے کی ہمت کی، اسے اس کے چہرے پر سرد مہری، درشتی، یہاں تک کہ حقارت بھی نظر آئی جیسا کہ اسے خیال گزرا۔

"لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی نپولین سے ملاقات ہوئی تھی اور آپ نے اس سے گفتگو کی تھی۔ واقعی؟" پرنسس ماریا نے دریافت کیا۔

پیئر ہنس پڑا۔

"بالکل نہیں، ایک مرتبہ بھی نہیں، کبھی نہیں! معلوم ہوتا ہے کہ ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ قیدی بننے کا مطلب یہ تھا کہ آپ نپولین کے مہمان بننے جا رہے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ میں نے اسے کبھی دیکھا نہیں میں نے تو اس کا کبھی ذکر بھی نہیں سنا تھا۔ میرا تعلق بہت نچلی سطح کے لوگوں سے تھا!"

سپر اختتام کو پہنچ گیا اور پیئر کو، جس نے شروع میں اپنی اسیری کے بارے میں گفتگو کرنے سے معذرت کر لی تھی، ایسا کرنے پر آمادہ کر لیا گیا۔

"لیکن یہ بات تو درست ہے کہ آپ ماسکو میں اس لیے ٹھہر گئے تھے کیونکہ آپ نپولین کو ہلاک کرنا چاہتے تھے، درست ہے نا؟" نتاشا نے قدرے مسکراتے ہوئے دریافت کیا۔ "جب ہماری ملاقات سخاریف ٹاور کے قریب ہوئی تھی، میں تبھی بھانپ گئی تھی — یاد ہے؟"

پیئر نے اعتراف کیا کہ یہ بات درست ہے اور یہی وہ مقام تھا جہاں سے پرنسس ماریا اور اس سے بھی زیادہ نتاشا کے سوالات نے اسے ان حالات کی، جن میں سے اسے گزرنا پڑا تھا، تفصیلات بتانے کے راستے پر ڈال دیا۔

شروع شروع میں اس کا لہجہ، جس کی اسے ہر شخص، بالخصوص اپنے ساتھ اختیار کرنے کی عادت پڑ گئی تھی، نرم و لطیف اور قدرے طنزیہ تھا۔ تاہم جب وہ ان گھناؤنے واقعات اور مصائب کا، جن کا اس نے مشاہدہ کیا تھا، تذکرہ کرنے لگا، وہ غیر شعوری طور پر جذبات کی رو میں بہہ گیا اور ایک ایسے شخص کی طرح، جو ماضی کے نوکیلے تاثرات کو یاد کرتے اپنے آپ کو دوبارہ ان کے تجربے میں سے گزرتا محسوس کرتا ہے، گھٹے گھٹے انداز سے بولنے لگا۔

پرنسس ماریا اپنے چہرے پر نرم و لطیف تبسم سجائے کبھی پیئر اور کبھی نتاشا کو دیکھنے لگتی۔ اس ساری حکایت کے

* کنواری لڑکیوں کے لیے موزوں بر

دوران میں اسے صرف پیئر اور اس کی اچھائیاں ہی نظر آئیں۔ نتاشا اپنی کہنی پر جھکی ہوئی تھی اور کہانی کے دوران میں اس کے چہرے کے تاثرات میں مسلسل تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں۔ اس کی نگاہیں ہمہ وقت پیئر کے چہرے پر مرکوز رہیں اور اس نے ایک مرتبہ بھی انھیں وہاں سے نہ اٹھایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ وہ خود بھی اس تجربے میں سے گزر رہی ہے۔ نہ صرف اس کی نظریں بلکہ اس کی ہائے وائے اور مختصر سوالات بھی پیئر کو جتا رہے تھے کہ جو کچھ وہ ابلاغ کرنا چاہتا ہے، وہ اسے پوری طرح سمجھ رہی ہے۔ یہ عیاں تھا کہ وہ نہ صرف اس کی، جو وہ بیان کر رہا تھا بلکہ اس کی بھی، جسے وہ بیان کرنا تو چاہتا تھا لیکن جس کے بیان کے لیے اسے موزوں الفاظ نہیں مل رہے تھے، تفہیم کر رہی ہے۔ بچے اور عورت کا واقعہ، جس کا اس نے دفاع کرنے کی کوشش کی تھی، اس نے مندرجہ ذیل انداز میں بیان کیا:

''یہ منظر دہشت ناک تھا۔ ایسے بچے بھی تھے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا، لوگ انھیں چھوڑ بھاگے تھے، بعض تو شعلوں میں... ایک کو تو میری نظروں کے سامنے گھسیٹ گھساٹ کر باہر لایا گیا... بعض عورتیں ایسی تھیں جن کے اجسام سے چیزیں اتار لی گئیں، ان کی بالیاں نوچ لی گئیں۔''

پیئر کے چہرے پر شرم و حیا کی سرخی دوڑنے لگی اور وہ ہچکچانے لگا۔

''پھر گشتی دستہ آ گیا اور وہ تمام لوگ — مرد حضرات — جو لوٹ مار میں ملوث نہیں تھے، گرفتار کر لیے گئے۔ میں بھی انھیں میں شامل تھا۔''

''میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ آپ سب کچھ نہیں بتا رہے۔ آپ نے لازماً کچھ نہ کچھ کیا ہوگا،'' نتاشا نے کہا اور رک گئی۔ ''میرا مطلب ہے کہ کوئی اچھا کام۔'' اس نے مزید کہا۔

پیئر اپنی داستان سناتا رہا۔ جب اس نے ''مقتل'' کا ذکر کیا، وہ تفصیلات گول کرنا چاہتا تھا لیکن نتاشا کا اصرار تھا کہ وہ سب کچھ بتائے اور کسی چیز کو نہ چھوڑے۔

پیئر کاراتائیف کا تذکرہ کرنے لگا لیکن رک گیا۔ یہاں تک پہنچتے پہنچتے وہ کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا تھا اور کمرے میں چکر لگانے لگا تھا۔ نتاشا اپنی نگاہوں سے اس کا تعاقب کر رہی تھی۔

''نہیں! جو کچھ میں نے اس ناخواندہ — سیدھے سادے — آدمی سے سیکھا، وہ تم نہیں سمجھ سکتیں۔''

''بتائیں نا، بتائیں نا، ضرور بتائیں!'' نتاشا نے کہا۔ ''اب وہ کہاں ہے؟''

''انھوں نے اسے مار ڈالا، میری آنکھوں کے تقریباً سامنے۔''

اور پیئر کپکپاتی آواز میں انھیں پسپائی کے آخری ایام، کاراتائیف کی علالت اور اس کی موت کے بارے میں بتانے لگا۔

پیئر انھیں اپنی سرگزشت سناتا رہا۔ اس نے یہ کہانی اس طرح پہلے کسی کو نہیں سنائی تھی اور نہ خود اپنے ذہن میں کبھی اس کی یاد تازہ کی تھی۔ اسے جن حالات میں سے گزرنا پڑا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اس کی معنویت اس پر اب آشکار

ہو رہی ہے۔ اب جب کہ وہ یہ سب کچھ نتاشا کے سامنے بیان کر رہا تھا، اسے اپنی رگ رگ میں وہ نادر الوجود خوشی دوڑتی محسوس ہو رہی تھی جس کا مردوں کو اس وقت احساس ہوتا ہے جب ان کی سامعین خواتین ہوتی ہیں۔ تیز طرار خواتین نہیں، جو جب کوئی بات سن رہی ہوتی ہیں، اس ارادے سے سن رہی ہوتی ہیں کہ جو کچھ وہ سن رہی ہیں، اسے اپنے ذہنوں کو جلا دینے کے لیے یاد رکھ سکیں اور جب موقع ملے، اسے دوسروں کے سامنے دہرا سکیں یا اسے اپنے کسی تصور کے مطابق ڈھال سکیں یا اس پر کوئی تبصرہ کر سکیں جو انھوں نے اپنی ننھی منی ذہنی ورکشاپ میں تیار کیا ہوتا ہے، بلکہ وہ خوشی، جو ان صدق شعار خواتین سے حاصل ہوتی ہے، جنھیں اس میں سے، جس کا اظہار مرد ان کے سامنے کرتے ہیں، منتخب کرنے اور اسے اپنی ذات میں جذب کرنے کا ملکہ ہوتا ہے۔ نتاشا غیر شعوری طور پر ہمہ تن گوش تھی۔ پیئر کا ایک ایک لفظ، اس کی آواز کی خفیف تھرتھراہٹ، اس کی اچٹتی نظر، اس کے چہرے کے چھوٹے سے چھوٹے پٹھے کی پھڑپھڑاہٹ۔ کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس پر اس نے دھیان نہ دیا ہوگا۔ وہ نامکمل الفاظ راستے میں اچک لیتی اور انھیں سیدھا اپنے قلب میں جس کے در وا تھے، لے جاتی اور پیئر کی تمام ذہنی اور جسمانی اذیتوں کے مفاہیم بھانپ جاتی۔

پرنسس ماریا اس کی داستان سمجھ رہی تھی اور اپنے دل میں اس کے ساتھ ہمدردی محسوس کر رہی تھی، مگر اسے کچھ اور بھی نظر آ رہا تھا اور اسی پر اس کی ساری توجہ مرکوز تھی۔ اسے نتاشا اور پیئر کے مابین محبت کا امکان دکھائی دینے لگا تھا اور اس تصور نے، جس کا اسے اولیں بار اندازہ ہو رہا تھا، اس کا دل باغ باغ کر دیا۔

صبح کے تین بج چکے تھے۔ وردی پوش ملازمین گمبھیر اور اداس چہروں کے ساتھ موم بتیاں تبدیل کرنے آئے لیکن کسی نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔

پیئر کی کہانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی اور وہ خاموش ہو گیا۔ نتاشا کی چمکتی دمکتی آنکھیں ابھی تک اس پر مرکوز تھیں جیسے وہ ابھی کوئی مزید بات، جو اس نے شاید ان کہی چھوڑ دی تھی، سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو۔ پیئر پر بوکھلاہٹ طاری تھی لیکن وہ خوش تھا اور کبھی کبھار بڑی ڈھٹائی سے اس پر اچٹتی نظر ڈال لیتا اور سوچنے لگتا کہ گفتگو کا موضوع تبدیل کرنے کے لیے اب اسے کیا کہنا چاہیے۔ پرنسس ماریا چپ تھی۔ کسی کے ذہن میں یہ خیال نہ آیا کہ صبح کے تین بج چکے ہیں اور انھیں سو جانا چاہیے۔

"لوگ قسمت کے شاکی رہتے ہیں کہ انھیں ادبار و مصائب کی بھٹی میں سے گزرنا پڑا،" پیئر نے خیال آرائی کرتے ہوئے کہا، "لیکن اگر اس لمحے مجھ سے پوچھا جائے کہ میں وہی رہنا پسند کروں گا جو میں قیدی بننے سے پہلے تھا یا میں یہ سب کچھ دوبارہ جھیلنے کو ترجیح دوں گا، لامحالہ میرا جواب یہ ہوگا: 'مجھے اسیری اور گھوڑوں کا گوشت منظور ہے، خدارا مجھے اس سے محروم نہ کریں۔' جب ہمیں جانی پہچانی راہوں سے اٹھا کر پرے پھینک دیا جاتا ہے، ہم سمجھنے لگتے ہیں کہ ہمارے ہاتھ پلے کچھ نہیں رہا، لیکن جو کچھ نیا اور اچھا ہوتا ہے، اس کا آغاز تبھی ہوتا ہے (جب ہم ان جانی راہوں پر چلتے ہیں)۔ جب تک سانس ہے، مسرت کا فقدان نہیں۔ ہمارے سامنے بہت کچھ ہے، بہت زیادہ

کچھ ہے۔ یہ بات میں تم سے کہتا ہوں،'' اس نے نتاشا کی جانب متوجہ ہو کر کہا۔

''جی ہاں، بالکل، بالکل،'' اس نے کوئی بالکل مختلف جواب دیتے ہوئے کہا۔ ''مجھے بھی سوائے اس کے کہ میں ہر چیز کے تجربے میں سے دوبارہ گزرنا چاہتی ہوں، کسی اور چیز کی تمنا نہیں۔''

پیئر نگاہیں گاڑ کر اسے دیکھنے لگا۔

''ہاں، مجھے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی تمنا نہیں،'' نتاشا نے اپنی بات دہرائی۔

''نہیں، نہیں!'' پیئر نے چیختے ہوئے کہا۔ ''اگر میں زندہ سلامت ہوں اور زندہ رہنے کی آرزو کر رہا ہوں، تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں — اور نہ تمھارا۔''

ایکا ایکی نتاشا نے اپنا سر جھکایا، دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپا اور زار و قطار رونے لگی۔

''نتاشا، کیا ہوا؟'' پرنسس ماریا نے پوچھا۔

''کچھ نہیں، کچھ نہیں،'' اس نے جواب دیا اور اپنے آنسوؤں کے بیچ پیئر کو دیکھ کر مسکرائی۔ ''شب بخیر، اب سونا چاہیے۔''

پیئر اٹھ کھڑا ہوا اور رخصت ہو گیا۔

❦

نتاشا حسب معمول پرنسس ماریا کے ساتھ اس کے بیڈروم میں چلی گئی۔ پیئر نے انھیں جو کچھ بتایا تھا، وہاں وہ اس کے متعلق تبادلۂ خیالات کرنے لگیں۔ تاہم پرنسس نے پیئر کے بارے میں کسی قسم کی رائے ظاہر کرنے سے احتراز کیا اور نتاشا بھی اس معاملے میں خاموش رہی۔

''اچھا، ماری، شب بخیر،'' نتاشا نے کہا۔ ''ہم ان کا'' (اس کی مراد پرنس آندرے تھا) ''ذکر اس لیے نہیں کرتیں کیونکہ ہمیں یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ اس طرح ہم اپنے جذبات پلید کر لیں گے۔ تاہم مجھے اکثر خیال گزرتا ہے کہ اس طرح ہم انھیں فراموش کرتی جا رہی ہیں۔''

پرنسس ماریا کی سسکی نکل گئی اور اپنی اس سسکی سے اس نے یہ اعتراف کر لیا کہ نتاشا جو کچھ کہہ رہی ہے، ٹھیک کہہ رہی ہے لیکن جو الفاظ اس نے استعمال کیے تھے، اسے ان سے اتفاق نہیں تھا۔

''کیا فراموش کرنا ممکن ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''آج اس بارے میں ساری باتیں کر کے مجھے بہت فائدہ ہوا ہے، دل کا سارا غبار نکل گیا ہے۔ یہ چیز مشکل اور تکلیف دہ ضرور تھی لیکن اچھی تھی۔ بہت اچھی،'' نتاشا نے کہا۔ ''مجھے یقین ہے کہ یہ واقعی ان سے محبت کرتے تھے، جبھی میں نے انھیں سب کچھ بتا دیا... کیا یہ ٹھیک تھا؟'' اس نے اچانک شرمسار ہوتے پوچھا۔

''پیئر کو بتانا؟ ارے ہاں، بالکل، وہ کتنے نفیس اور شستہ آدمی ہیں!'' پرنسس ماریا نے کہا۔

''ماری تمھیں معلوم ہے کہ،'' اچانک نتاشا نے نٹ کھٹ انداز سے مسکراتے (پرنس ماریا نے اس قسم کی مسکراہٹ مدتوں سے اس کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی) اضطراری طور پر کہا۔ ''کچھ یوں نظر آتا ہے کہ یہ کسی نہ کسی طرح کچھ اتنے پاک صاف، بے شکن اور تازہ رُو بن گئے ہیں۔ جیسے ابھی ابھی باتھ سے ڈھل ڈھلا کر باہر نکلے ہوں؟ تم میرا مطلب سمجھتی ہونا؟ میرا مطلب ہے کہ اخلاقی باتھ سے... کیا یہ درست نہیں؟''

''ہاں،'' پرنس ماریا نے کہا۔ ''یہ بے حد سدھر گئے ہیں۔''

''اپنے چھوٹے کوٹ اور خشخشی بالوں کے ساتھ... بالکل ایسے... عین مین ایسے جیسے وہ سیدھے باتھ سے باہر آرہے ہوں... پاپا بعض اوقات۔''

''اب میں سمجھ گئی ہوں کہ وہ'' (پرنس آندرے) ''ان سے زیادہ کسی اور کو کیوں پسند نہیں کرتے تھے،'' پرنسس ماریا نے کہا۔

''ہاں، اور وہ ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ سنا ہے کہ جب مرد ایک دوسرے سے قطعاً مختلف ہوں، تو وہ ایک دوسرے کے بہتر دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ بات بالکل صحیح ہوگی۔ واقعی ان کی ان سے ذرا سی بھی مشابہت نہیں، یا ہے؟''

''نہیں، مگر یہ بہت لاجواب آدمی ہیں۔''

اچھا، شب بخیر۔'' نتاشا نے کہا۔

اور اس کے چہرے پر وہی شوخ اور پُر از شرارت مسکراہٹ یوں تیرتی رہی جیسے اسے وہاں رکھ کر بھلا دیا گیا ہو۔

18

پیئر کو اس رات بہت دیر تک نیند نہ آسکی۔ وہ اپنے کمرے میں چکر کاٹتا رہا۔ کبھی وہ تیوریاں چڑھا لیتا اور کسی دقیق مسئلے کے بارے میں سوچ بچار کرنے لگتا، کبھی وہ کندھے اچکانے لگتا اور کسی کرب کے زیر اثر اس کے رگ پٹھے کھنچنے لگتے، اور کبھی وہ عالم مسرت میں مسکرانے لگتا۔

وہ پرنس آندرے، نتاشا اور ان کی محبت کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ کبھی وہ اس (نتاشا) کے ماضی سے حسد کرنے لگتا، کبھی اسے اپنے اس جذبے پر ندامت ہونے لگتی اور وہ اپنے آپ کو لعنت ملامت کرنے لگتا، اور پھر خود ہی اپنی تقصیر معاف کر دیتا۔ صبح کے چھ بج چکے تھے اور وہ ابھی تک اپنے کمرے میں چکر کاٹ رہا تھا۔

''اگر اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں، پھر کرنا کیا ہوگا؟ کرنا کیا ہوگا؟... پھر یقیناً یہی کرنا ہوگا،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس نے بالعجیل اپنا لباس تبدیل کیا اور بستر میں گھس گیا۔ وہ خوش بھی تھا اور مضطرب بھی لیکن اس کے تمام شکوک اور ہچکچاہٹیں کافور ہو چکی تھیں۔

''ہاں، اس قسم کی خوشی بے شک عجیب اور ناممکن نظر آتی ہے لیکن مجھے اسے اپنی بیوی بنانے کے لیے ہر ممکن

کوشش کرنا چاہیے۔''

چندروز پیشتر پیئر نے بروز جمعہ پیٹرزبرگ جانے کا منصوبہ بنایا تھا۔ جب جمعرات کی صبح اس کی آنکھ کھلی، ساویلیچ سامان باندھنے کے سلسلے میں اس کا مشورہ لینے آیا۔

''پیٹرزبرگ؟ پیٹرزبرگ؟ کیا رکھا ہے وہاں؟ کون ہے وہاں؟'' اس نے سوچے سمجھے بغیر پوچھا جیسے وہ اپنے آپ سے باتیں کر رہا ہو۔ ''ارے ہاں، اس سب کچھ کے وقوع پذیر ہونے سے پیشتر میں نے کسی بنا پر پیٹرزبرگ جانے کا ارادہ کیا تھا'' اسے یاد آیا۔ ''لیکن کیوں؟ اور شاید میں چلا ہی جاؤں۔ یہ کتنا اچھا اور سمجھدار آدمی ہے، ہر چیز کا خیال رکھتا ہے!'' اس نے ساویلیچ کے بوڑھے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''اور اس کی مسکراہٹ کتنی دل فریب ہے!''

''اچھا، ساویلیچ، تمھیں اب بھی اپنی آزادی کی خواہش نہیں؟'' پیئر نے اس سے پوچھا۔

''یوئر ایکسی لینسی، میں آزادی لے کر کیا کروں گا؟ جب مرحوم کاؤنٹ، خدا انھیں جنت نصیب کرے، زندہ تھے، ہمارا اچھا بھلا گزارہ ہو رہا تھا، اور آپ سے بھی ہمیں کوئی شکایت نہیں ہوئی۔''

''مگر اپنے بچوں کے متعلق تمھارا کیا خیال ہے؟''

''یوئر ایکسی لینسی، بچوں کی بھی اچھی بھلی نبھ جائے گی۔ اگر آپ جیسا آقا مل جائے، پھر ڈر کس بات کا؟''

''لیکن، میرے وارث؟'' پیئر نے سمجھایا۔ ''فرض کرو، میں اچانک شادی کر لیتا ہوں... ذرا سوچو، ایسا ہو سکتا ہے،'' اس نے غیر ارادی طور پر مسکراتے ہوئے مزید کہا۔

''یوئر ایکسی لینسی، اگر اجازت ہو تو میں عرض کرنے کی جسارت کروں گا کہ یہ تو بہت ہی اچھی بات ہوگی۔''

''یہ شخص اس معاملے کو کتنا معمولی سمجھتا ہے!'' پیئر نے سوچا۔ ''اسے معلوم ہی نہیں کہ اس کے نتائج و عواقب کتنے بھیانک، کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں۔ جلد بازی سے کام لو یا تاخیر برتو... نتیجہ تو خوفناک ہی نکلتا ہے!''

''یوئر ایکسی لینسی، پھر کیا حکم ہے؟ کل آپ کی روانگی ہوگی؟'' ساویلیچ نے پوچھا۔

''نہیں، میں اسے ذرا ملتوی کرنا چاہتا ہوں۔ میں تمھیں بعد میں بتا دوں گا،'' پیئر نے کہا اور ساویلیچ کو مسکراتے دیکھ کر سوچنے لگا: ''کتنی عجیب بات ہے کہ اب میرے لیے کوئی پیٹرزبرگ نہیں ہے اور یہ کہ سب سے پہلے وہ، دوسرا مسئلہ طے ہونا چاہیے! غالباً اسے اچھی طرح معلوم ہے اور خواہ مخواہ بننے کی کوشش کر رہا ہے۔ کیا مجھے اس سے بات کرنا اور یہ دیکھنا چاہیے کہ اس کی کیا رائے ہے؟'' پیئر نے سوچا۔ ''نہیں، کسی اور وقت سہی۔''

ناشتے پر پیئر نے اپنی پھوپھی زاد کو بتایا کہ وہ گزشتہ روز پرنس ماریا سے ملنے گیا تھا اور وہاں اس کی ملاقات — ''آپ کے خیال میں کس سے — نتاشا رستووا!'' سے ہوئی تھی۔

پرنس کا ردعمل کچھ اس قسم کا تھا جیسے وہ سمجھتی ہو کہ پیئر (بوڑھی) آنا سیمونووا سے کسی زیادہ غیر معمولی ہستی سے تو مل کر نہیں آیا ہوگا۔

''آپ اسے جانتی ہیں؟''

''پرنس سے میری ایک مرتبہ ملاقات ہوئی تھی،'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے سنا ہے کہ اس کا رشتہ نوجوان رستوف سے کرانے کی کوششیں ہو رہی ہیں۔ رستوفوں کے بھاگ جاگ جائیں گے — سنا ہے کہ وہ بالکل کنگال ہو گئے ہیں۔''

''نہیں، میرا مطلب تھا کہ آپ نتاشا رستووا کو جانتی ہیں۔''

''میں نے ان دنوں اس کا قصہ سنا تھا۔ بڑا افسوس ناک معاملہ تھا!''

''نہیں، یہ سمجھ ہی نہیں رہی... یا پھر بن رہی ہے،'' پیئر نے سوچا۔ ''بہتر ہے کہ اس سے بھی کوئی بات نہ کی جائے۔''

پرنس کا تش نے بھی اس کی سفری ضروریات اکٹھا کر لی تھیں۔

''یہ سب لوگ کتنے مہربان ہیں!'' پیئر نے سوچا۔ ''حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ اس معاملے کے ضمن میں ایک ایسے وقت تکلیف اٹھا رہے ہیں جب انھیں یقیناً اس میں کوئی دلچسپی نہیں ہو سکتی۔ اور یہ سب کچھ میرے لیے — میری خاطر کیا جا رہا ہے — ہے نا تعجب انگیز بات!''

اسی روز چیف آف پولیس آیا اور اس نے پیئر کو دعوت دی کہ وہ اپنا نمائندہ گرانووتیا محل بھیج دے تاکہ وہ ان اشیا کو اکٹھا کر سکے، جو ان کے مالکوں کو لوٹائی جانا تھیں۔

''اور یہ شخص بھی،'' پیئر نے چیف آف پولیس کے چہرے کی طرف بغور دیکھتے ہوئے سوچا۔ ''یہ کتنا شستہ اخلاق اور خوش شکل افسر ہے اور کتنا مہربان! ذرا سوچیں کہ اب کتنی معمولی معمولی باتوں کے پریشان ہو رہا ہے! پھر بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ ایمان دار نہیں ہے اور رشوتیں وصول کرتا ہے! کتنی فضول باتیں ہیں! علاوہ ازیں وہ رشوتیں وصول نہ کرے، تو اور کیا کرے؟ اس کی تربیت ہوئی ہی اس انداز سے ہے۔ اور باقی لوگ بھی تو یہی کچھ کرتے ہیں۔ مگر اس کا چہرہ کتنا نظر نواز اور شفیق ہے! اور جب وہ میری طرف دیکھتا ہے، مسکرانے لگتا ہے!''

ڈنر کا وقت ہو رہا تھا۔ پیئر پرنس ماریا کی طرف چل پڑا۔

جب اس کی گاڑی گلی کوچوں میں سوختہ مکانوں کے بچے کھچے آثار کے قریب سے گزر رہی تھی، وہ کھنڈرات کی خوبصورتی دیکھ کر حیران رہ گیا۔ چھتوں پر چمنیوں کی قطاروں اور شہر کے سوختہ علاقوں کی شکستہ و منہدم دیواروں کی، جو تا حد نگاہ پھیلی ہوئی تھیں، دل کشی اور حسن دیکھ کر اسے دریائے رائن[9] اور کولوسی اَم[10] یاد آ گئے۔ راستے میں اسے جو کوچوان اور ان کے مسافر، نئے مکانوں کے لیے لکڑی چیرتے بڑھئی، خوانچہ فروش عورتیں اور دکاندار نظر آتے، سبھی ہشاش بشاش چہروں اور چمکتی دمکتی آنکھوں سے اسے اپنا استقبال کرتے دکھائی دیتے اور یہ کہتے معلوم ہوتے: ''ارے واہ، وہ آ گیا ہے! اب ہم دیکھیں گے کہ اس کی آمد کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔''

جب پیئر پرنس ماریا کے گھر پہنچا، اسے اچانک شکوک نے گھیر لیا اور وہ سوچنے لگا: ''کیا میں واقعی کل رات

یہاں آیا تھا؟ کیا میں واقعی نتاشا سے ملا اور اس سے باتیں کی تھیں؟ شاید یہ سب کچھ میرے تخیل کا کیا دھرا ہے؟ اگر میں اندر گیا، شاید مجھے کوئی بھی نہ ملے۔'' لیکن اس نے بمشکل کمرے میں قدم رکھا ہوگا کہ اسے یک دم احساس ہوا کہ وہ اپنی آزادی سے محروم ہو چکا ہے اور اس احساس کی بنا پر اسے یہ کامل آگہی ملی کہ وہ وہاں موجود ہے۔ وہ گزشتہ رات کی طرح اسی سیاہ ڈریس میں ملبوس تھی جو ہلکے ہلکے بل کھاتا نیچے لٹک رہا تھا، اور اس کے بال بھی اسی انداز سے سنورے ہوئے تھے۔ پھر بھی وہ وہ نہیں تھی جو وہ گزشتہ رات تھی بلکہ کافی مختلف تھی۔ جب وہ گزشتہ روز آیا تھا، اگر تب بھی وہ اسی طرح نظر آتی، پھر وہ اسے پہچاننے میں قطعاً ناکام نہ رہتا۔

وہ بالکل ویسی تھی جب اس نے تب، جب وہ ابھی تقریباً بچی تھی اور جب بعدازاں وہ پرنس آندرے کی منگیتر تھی، اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تیز، استفہامی روشنی جگمگا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے انسیت اور عجیب وغریب قسم کی شرارت ٹپک رہی تھی۔

پیئر نے ان کے ساتھ ڈنر کھایا۔ وہ ساری شام وہیں گزار دیتا لیکن پرنس ماریا نے شام کی عبادت میں شریک ہونے گرجے جانا تھا اور پیئر ان کے ساتھ چل پڑا۔

اگلے روز پیئر جلدی آ گیا، اس نے ان کے ساتھ کھانا کھایا اور ساری شام وہیں بیٹھا رہا۔ اگرچہ پرنس ماریا اور نتاشا اپنے مہمان کو دیکھ کر لاریب خوش ہوتی تھیں اور اگرچہ پیئر کی زندگی کی تمام دلچسپیوں کا محور وہی مکان تھا، انھوں نے جو کچھ کہنا تھا، شام ہوتے ہوتے وہ سب کا سب کہہ چکے تھے۔ اب گفتگو ایک پیش پا افتادہ موضوع سے دوسرے تک منتقل ہونے لگی اور اکثر اوقات اس میں لمبے لمبے وقفے آنے لگے۔ پیئر کو وہاں بیٹھے بیٹھے اتنی دیر ہو چکی تھی کہ پرنس ماریا اور نتاشا آپس میں نگاہوں کا تبادلہ کرنے لگیں۔ بظاہر وہ حیران و پریشان تھیں کہ وہ کب رخصت ہوگا۔ پیئر یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا لیکن وہ اٹھ کر نہیں جا سکتا تھا۔ وہ پریشان کن اور کڈھب صورت حال میں پھنس گیا تھا، پھر بھی وہ دھرنا جمائے وہیں بیٹھا رہا کیونکہ اس کے لیے اٹھنا اور رخصت ہونا ناممکن ہو چکا تھا۔

پرنس ماریا نے جب دیکھا کہ یہ صورت حال ختم نہیں ہوگی، وہ دوسروں سے پہلے اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور سر درد کے بہانے خدا حافظ کہنے لگی۔

''تو آپ کل پیٹرزبرگ جا رہے ہیں؟'' اس نے کہا۔

''نہیں، میں کہیں نہیں جا رہا'' پیئر نے پٹ جواب دیا۔ اس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور قدرے خفگی بھی۔ ''ارے ہاں، پیٹرزبرگ؟ کل۔ لیکن میں ابھی خدا حافظ نہیں کہوں گا۔ میں کل پھر آؤں گا، شاید تمھیں میرے ذمے کوئی کام لگانا یاد آ جائے،'' اس نے مزید کہا اور اس کے چہرے کی رنگت قرمزی ہوگئی۔ وہ پرنس ماریا کے روبرو کھڑا تھا لیکن جانے کا نام تک نہیں لے رہا تھا۔

نتاشا نے اسے اپنے ہاتھ تھمایا، شب بخیر کہا اور باہر نکل گئی۔ تاہم پرنس ماریا جانے کے بجائے وہیں آرام کرسی پر ڈھیر ہوگئی اور اپنی جھیل کی طرح گہری اور درخشاں آنکھوں سے اسے بغور دیکھنے لگی۔ اس کے چہرے پر

سنجیدگی جھلک رہی تھی۔ تاہم اس سے قبل اس کے خد وخال سے جو تھکن ٹپک رہی تھی، اب اس کا وہاں دور دور تک کوئی نشان نہیں تھا۔ اس نے عمیق اور طویل آہ بھری جیسے وہ طویل گفتگو سننے کے لیے تیار ہو رہی ہو۔

جونہی نتاشا کمرے سے باہر نکلی، پیئر کا ذہنی خلفشار اور اضطراب ختم ہو گیا اور اس کی جگہ پُرشوق جوش وجذبے نے لے لی۔

اس نے پھرتی سے اپنی کرسی پرنسس ماریا کے قریب کر لی۔

''ہاں، میں تمھیں بتانا چاہتا تھا،'' اس نے اس کی نگاہوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے انھوں نے اس سے کچھ کہا ہو۔ ''پرنسس، میری مدد کرو۔ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کیا میں امید باندھ سکتا ہوں؟ پرنسس، مائی ڈیئر فرینڈ، مجھے سب کچھ معلوم ہے۔ میں جانتا ہوں کہ میں اس کے قابل نہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ یہ وقت بات کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ لیکن میں اس کا بھائی بننا چاہتا ہوں۔ نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے۔۔۔ مجھ سے کچھ کہا نہیں جاتا۔''

''بات کچھ اس طرح ہے،'' وہ دوبارہ بولنے لگا۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے اپنے اوپر قابو پانے اور باربط گفتگو کرنے میں دِقت پیش آ رہی ہے۔ ''یہ تو مجھے معلوم نہیں کہ میں نے کب اس سے محبت کرنا شروع کیا، لیکن میں نے اپنی ساری زندگی میں اسی سے، صرف اسی سے، محبت کی ہے۔ مجھے اس سے اتنی محبت ہے کہ میرے لیے اس کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہے۔۔۔ میں فی الحال اس سے شادی کی درخواست تو نہیں کر سکتا لیکن یہ خیال کہ شاید وہ کسی روز میری بیوی بن جائے اور میں شاید یہ موقعہ۔۔۔ یہ موقعہ۔۔۔ کہیں گنوا نہ بیٹھوں۔۔۔ مجھے کسی کل چین نہیں لینے دیتا۔ مجھے بتاؤ، کیا میں امید کر سکتا ہوں؟ مجھے بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ ڈیئر پرنسس!'' اس نے کچھ دیر خاموشی کے بعد، جب اس نے کوئی جواب نہ دیا، اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے مزید کہا۔

''آپ نے جو کچھ کہا ہے، میں اسی کے بارے میں سوچ رہی ہوں،'' پرنسس ماریا نے کہا۔ ''میں صرف اتنا کہوں گی کہ آپ نے جو کچھ کہا، صحیح ہے، فی الحال اس سے محبت کے متعلق گفتگو کرنا...''

پرنسس ماریا رک گئی۔ وہ یہ کہنا چاہتی تھی کہ محبت کے متعلق گفتگو کرنا ناممکن ہے لیکن وہ رک اس لیے گئی کیونکہ اس نے گزشتہ دو دنوں کے دوران میں نتاشا میں جو تبدیلی دیکھی تھی، اس سے یہ عندیہ ملتا تھا کہ اگر پیئر نے اپنی محبت کا اقرار کیا تو اس سے اس کی سہیلی کے جذبات کو نہ صرف یہ کہ کوئی ٹھیس نہیں پہنچے گی بلکہ یہی تو وہی چیز ہے جس کی وہ سب سے زیادہ آرزومند ہے۔

''اس سے فی الحال بات کرنا... مناسب نہیں ہوگا۔'' پھر بھی پرنسس نے کہہ ہی دیا۔

''لیکن مجھے کیا کرنا ہوگا؟''

''یہ مجھ پر چھوڑ دیں،'' پرنسس ماریا نے جواب دیا۔ ''مجھے معلوم ہے...''

پیئر پرنسس ماریا کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

''اچھا؟... اچھا؟...'' اس نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے کہ وہ آپ سے محبت کرتی ہے۔آپ سے محبت کرنے لگے گی،'' پرنسس ماریا نے اپنی تصحیح کی۔
ابھی اس کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ پیئر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔اس کے چہرے پر خوف کے سائے لہرا رہے تھے اور اس نے پرنسس کا ہاتھ مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا۔

''تمھیں یہ خیال کیسے آیا؟ تمھارے خیال میں میں امید کر سکتا ہوں؟ واقعی؟''

''ہاں، مجھے اس کا یقین ہے،'' پرنسس ماریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔''اس کے والدین کو خط لکھ دیں۔باقی مجھ پر چھوڑ دیں۔جب مناسب وقت آئے گا، میں اسے بتا دوں گی۔میرا جی چاہتا ہے کہ ایسا ہو جائے اور میرا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسا ہو جائے گا۔''

''نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا! میں کتنا خوش ہوں! نہیں، یہ ممکن نہیں ہے... میں کتنا خوش ہوں! نہیں، یہ ممکن نہیں!'' پیئر پرنسس ماریا کا ہاتھ چومے اور بار بار کہے جا رہا تھا۔

''آپ پیٹرز برگ چلے جائیں، یہ بہترین بات ہوگی۔اور میں آپ کو خط لکھ دوں گی،'' اس نے کہا۔

''پیٹرز برگ؟ یہاں سے چلا جاؤں؟ بہت اچھا، میں چلا جاؤں گا۔لیکن کیا میں کل آ سکتا ہوں اور آپ سے ملاقات کر سکتا ہوں؟''

پیئر اگلے روز خدا حافظ کہنے آیا۔نتاشا میں وہ چلبلاہٹ تو نہیں تھی جو گزشتہ روز دیکھنے میں آئی تھی، مگر جب پیئر اس کی آنکھوں میں جھانکتا اسے محسوس ہونے لگتا کہ وہ ناپید ہو رہا ہے، اب نہ اس کا اپنا کوئی وجود رہا ہے، نہ نتاشا اور نہ کسی اور چیز کا، صرف مسرت ہی مسرت موجود ہے۔''کیا یہ ممکن ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔'' وہ اس کی ہر نگاہ، ہر اشارے اور ہر لفظ پر، جو اسے خوشی سے سرشار کر رہا تھا، اپنے آپ سے کہتا۔

جب خدا حافظ کہتے اس نے اس کا دبلا پتلا اور نازک ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، وہ کچھ دیر اسے تھامے رکھنے سے باز نہ رہ سکا۔

''کیا یہ ممکن ہے کہ یہ ہاتھ، یہ چہرہ، یہ آنکھیں، نسوانی دلکشی کا یہ تمام خزینہ، جو اب میرے لیے اتنا انوکھا اور عجیب ہے—کسی روز ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میرا اپنا ہو جائے گا، میرے لیے اتنا ہی جان پہچانا بن جائے گا جتنا کہ میں اپنے آپ کے لیے ہوں؟... نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا!...''

''کاؤنٹ، خدا حافظ،'' اس نے اس سے کہا۔''مجھے آپ کی واپسی کا شدت سے انتظار رہے گا۔'' اس نے کانا پھوسی کے انداز میں مزید کہا۔

اس کے یہ سیدھے سادے الفاظ، اس کے دیکھنے کا انداز اور اس کے چہرے کے تاثرات اگلے دو مہینوں کے لیے پیئر کے لیے غیر مختتم یادوں، تشریحوں اور بے دردی کے خوابوں کا موضوع بن گئے۔''مجھے آپ کی واپسی کا شدت سے انتظار رہے گا'... بالکل، اس نے بالکل یہی الفاظ کہے تھے، لیکن اس نے یہ کہے کیسے تھے؟ مجھے بالکل یاد ہے—'مجھے آپ کی واپسی کا شدت سے انتظار رہے گا'۔اوہ، میں کتنا خوش ہوں—یہ مجھے کیا ہو رہا ہے؟—میں کتنا

خوش ہوں!'' پیئر اپنے آپ سے کہتا رہتا تھا۔

19

ہیلین کے ساتھ محبت کے اظہار کے دوران میں پیئر کو ضمیر کی جو کسک محسوس ہوا کرتی تھی، اب اس کے دل و دماغ میں اس کا شائبہ بھی نہیں تھا۔

اس وقت جب وہ اپنے آپ سے یہ کہتا تھا: ''اف، میں نے یہ کیوں نہ کہا؟'' یا ''مجھے کس چیز نے یہ کہنے پر اکسایا: 'Je vous aime'*' اسے اس حد تک شرمندگی محسوس ہونے لگتی تھی کہ اس کا جی متلانا شروع ہو جاتا تھا، لیکن اب ان الفاظ کو بار بار دہرانے سے اسے قطعاً کسی قسم کی خفت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس کے برعکس اب وہ اپنے تخیل میں ہر وہ لفظ جو، خود اس نے یا نتاشا نے کہا تھا، بار بار دہراتا تھا، اس کے خد و خال کے ایک ایک ریشے اور اس کی مسکراہٹ کی ایک ایک تفصیل کو دھیان میں لاتا تھا۔ وہ کسی چیز کو نظر انداز کرنے یا کسی بات کا اضافہ کرنے کا خواہش مند نہیں تھا، بلکہ جو کچھ تھا، جیسا تھا، بس اسے جوں کا توں دہراتا رہتا تھا۔ اس نے جو کچھ کرنے کا ارادہ کیا تھا، اس کے درست یا نادرست ہونے کے بارے میں اس کے ذہن میں رتی برابر شبہ نہیں تھا۔ کبھی کبھار صرف ایک بھیانک شک اس کے دماغ میں سر اٹھانے لگتا۔ ''کیا یہ سب کچھ خواب تو نہیں ہے؟ کیا پرنس ماریا کو غلطی تو نہیں لگی؟ کیا میں حد سے زیادہ خود بین یا خود اعتماد تو نہیں؟ یوں تو مجھے پورا یقین ہے۔ لیکن اگر پرنس ماریا اسے بتا دیتی اور جواب میں وہ مسکرانے لگتی ہے اور کہتی ہے: 'کیسی عجیب بات ہے، وہ یقیناً اپنے آپ کو مغالطے میں مبتلا کر رہے ہیں۔ کیا انھیں اندازہ نہیں ہے کہ وہ محض انسان ہیں، دوسرے انسانوں کی طرح عام فانی انسان۔ جب کہ میں بالکل مختلف مخلوق ہوں، بلند و برتر ہستی ہوں؟'''

پیئر کا یہ واحد شک بار بار اس کے ذہن میں آتا اور اسے ڈستا رہا۔ اس نے کسی قسم کا منصوبہ بنانے سے احتراز کیا۔ جس خوشی کا اسے انتظار تھا، وہ اتنی ناقابل یقین تھی کہ اگر اسے یہ حاصل ہو جائے، اس کے بعد اسے کسی چیز کی تمنا باقی نہیں رہ جائے گی۔ اس کے ساتھ باقی سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔

پر مسرت اور غیر متوقع جنون نے، جس کے متعلق پیئر کو یقین تھا کہ وہ اس کا اہل نہیں، اسے اپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ زندگی کے سارے مفاہیم۔ نہ صرف اس کے اپنے بلکہ ساری دنیا کے لیے۔ اس کی اپنی محبت اور نتاشا کے اس کے ساتھ محبت کرنے کے امکان میں سمٹ گئے ہیں۔ بعض اوقات وہ سوچنے لگتا کہ ہر شخص صرف ایک ہی فکر میں۔ اس کی مستقبل کی مسرت۔ غلطاں و پیچاں ہے۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہونے لگتا کہ دوسرے لوگ اس کی کامیابی پر اتنے ہی خوش ہو رہے ہیں جتنا کہ وہ خود ہے لیکن وہ اپنی اس خوشی کو محض چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں اور بہانہ یہ بنا رہے ہیں کہ وہ دوسرے کاموں میں مصروف ہیں۔ اسے ان کے

---

* میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

ایک ایک لفظ اور ایک ایک اشارے میں یہی احساس ہوتا کہ وہ اس کی خوشی کی طرف اشارے کررہے ہیں۔ جن لوگوں سے اس کی مڈھ بھیڑ ہوئی، وہ انھیں اپنی شاداں وفرحاں اور پُر معنی نظروں اور مسکراہٹوں سے یوں متحیر کردیتا جیسے اس کے اور ان کے مابین کوئی خفیہ مفاہمت ہو چکی ہے۔ لیکن جب اسے یہ اندازہ ہوتا کہ لوگوں کو شاید اس کی مسرت سے آگہی نہیں ہے، وہ دل وجان سے ان پر ترس کھانے لگتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کسی نہ کسی طرح انھیں سمجھا دے کہ جن مصروفیات میں وہ الجھے ہوئے ہیں، وہ بالکل بے تکی، مہمل اور فضول ہیں اور آدمی کو زیب نہیں دیتا کہ ان پر توجہ صرف کرے۔

جب اسے مشورہ دیا جاتا کہ اسے سول سروس میں شامل ہوجانا چاہیے یا اس مفروضے پر، کہ عوامی فلاح وبہبود کا انحصار فلاں مسئلے یا فلاں واقعے پر ہے، جنگ یا سیاسی امور کو زیر بحث لایا جاتا، وہ چہرے پر نرم وملائم اور پرازرحم تبسم سجائے دوسروں کی باتیں سنتا رہتا اور اپنے عجیب وغریب تبصروں سے انھیں ہکا بکا کردیتا۔ اس زمانے میں وہ تمام لوگوں کو ــ انھیں بھی، جن کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ زندگی کا صحیح مفہوم (یعنی جو کچھ وہ محسوس کررہا تھا) سمجھتے ہیں اور ان کوتاہ بختوں کو بھی، جن کے اذہان میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں تھا ــ جذبات کی اس تیز روشنی میں، جو خود اس کے اندر فروزاں تھی، دیکھتا تھا اور اسے کسی نوع کی کوشش کیے بغیر جھٹ پٹ ہر شخص میں، جس سے اس کی ملاقات ہوتی تھی، وہ سب کچھ نظر آجاتا تھا، جو اس کی ذات کا قابل ستائش اور قابل محبت پہلو ہوتا تھا۔

جب اس نے اپنی مرحوم بیوی کے کاغذات اور معاملات کا جائزہ لیا، اسے اس پر بہت ترس آیا۔ اس کے علاوہ اس کے دل میں اور کسی قسم کا جذبہ نہ ابھرا۔ اسے رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ جس نوع کی کامل مسرت اب اس کے حصے میں آئی ہے، اس سے وہ سدا ناآشنا رہی۔ رہا پرنس واسیلی، اگرچہ اسے نیا عہدہ اور نیا اعزاز مل چکا تھا اور وہ حد سے زیادہ کبر ونخوت کا مظاہرہ کررہا تھا، اسے وہ قابل رحم، قابل ترس اور بے ضرر آدمی نظر آیا۔

اپنی بعد کی زندگی کے دوران میں پیئر اپنے اس انتہائی پُرمسرت جنون کے زمانے کو یاد کرتا رہتا۔ اس نے اس دور میں انسانوں اور حالات کے متعلق جو آراء قائم کی تھیں، انھیں وہ تاحیات صحیح گردانتا رہا۔ اس نے بعدازاں نہ صرف یہ کہ انھیں ترک نہ کیا، بلکہ اس کے برعکس جب کبھی وہ کسی طرح کے شبے میں گرفتار ہوتا یا اسے کسی داخلی کشمکش کا سامنا کرنا پڑتا، وہ انھی خیالات کی طرف رجوع کرتا جن کا وہ جنون کے زمانے میں پابند تھا، اور وہ ہمیشہ صحیح ثابت ہوتے۔

''ممکن ہے کہ میں اس زمانے میں بہت عجیب وغریب یا مضحکہ خیز نظر آتا رہا ہوں'' وہ سوچا کرتا، ''لیکن میں اتنا پاگل نہیں تھا جتنا کہ میں نظر آیا کرتا تھا۔ اس کے برعکس کسی دوسرے زمانے کی نسبت میں اس وقت زیادہ عقلمند، زیادہ باشعور اور زیادہ بابصیرت تھا اور زندگی کی جن چیزوں اور باتوں کا سمجھنا ضروری ہے، میں انھیں خوب سمجھتا تھا کیونکہ... میں خوش تھا۔''

پیئر کی دیوانگی یہ تھی کہ اب وہ لوگوں سے محبت کرنے سے پہلے ان کے ذاتی اوصاف، جنھیں وہ ان کی ''اچھی

صفات'' کہتا تھا، دریافت کرنے کا انتظار نہیں کرتا تھا: اس کا دل محبت سے چھلک رہا تھا اور وہ بے سبب لوگوں سے محبت کر کے محبت کرنے کے نا قابل تردید اسباب دریافت کرنے میں کبھی ناکام نہ رہا۔

20

اس پہلی شام پیئر کی روانگی کے بعد جب نتاشا نے باچھیں کھلاتے اور شرارت آمیز انداز سے مسکراتے پرنس ماریا سے کہا تھا: ''وہ بالکل یوں... نظر آتے ہیں جیسے ابھی ابھی باتھ سے باہر آئے ہوں... اور اپنے چھوٹے کوٹ اور خشخشی بالوں...'' اسی دم کوئی مخفی اور نا معلوم چیز، جس کی خود اسے کوئی آگہی نہیں تھی لیکن جو نا قابل مقاومت تھی، نتاشا کی روح میں انگڑائیاں لینے لگی۔

اس کی ایک ایک چیز — اس کا چہرہ، اس کی آواز، اس کی چال، اس کی ڈھال، اس کی چتون — ایکا ایکی منقلب ہوگئی۔ وہ یہ دیکھ کر متعجب ہوگئی کہ قوتِ حیات اور امیدِ مسرت سطح پر نمودار ہو چکی ہیں اور تشفی کا مطالبہ کرنے لگی ہیں۔ نتاشا کے ساتھ جو کچھ بیتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ اس اولین شام سے اس کی یادیں اس کے ذہن سے محو ہونے لگی ہیں۔ اب اسے اپنی صورت حال کے متعلق کوئی شکوہ، کوئی شکایت نہیں رہی تھی، وہ اپنے ماضی کے بارے میں منہ سے ایک لفظ بھی نہیں نکالتی تھی اور مستقبل کے سلسلے میں سہانے منصوبے بنانے سے خوف نہیں کھاتی تھی۔ وہ پیئر کے متعلق شاذ ہی کوئی بات کرتی تھی، لیکن جب پرنس ماریا اس کا ذکر کرتی، مدت مدید سے بجھی ہوئی روشنی اس کی آنکھوں میں فروزاں ہو جاتی اور اس کے ہونٹ عجیب وغریب تبسم سے ٹیڑھے ترچھے ہونے لگتے۔

نتاشا میں جو تبدیلی رونما ہوئی تھی، اسے دیکھ کر پرنس ماریا پہلے تو حیران ہوئی، مگر جب اس کا مفہوم اس پر عیاں ہوا، وہ رنجیدہ ہوگئی۔ ''کیا اسے میرے بھائی سے اتنی معمولی محبت تھی کہ وہ اسے اتنی جلدی بھول گئی؟'' وہ اس تبدیلی کے متعلق سوچتے سوچتے اپنے آپ سے پوچھتی۔ مگر جب وہ نتاشا کے پاس آتی، اسے اس پر نہ کوئی غصہ آتا اور نہ وہ اسے کسی طرح بھی موردِ الزام ٹھہراتی۔ قوتِ حیات کی نو بیداری، جس نے نتاشا کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا، بظاہر اتنی زور آور تھی اور خود لڑکی کے لیے اتنی غیر متوقع، کہ اس کی موجودگی میں پرنس ماریا کو محسوس ہونے لگتا کہ اسے اپنے دل میں بھی اسے لعنت ملامت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں۔

نتاشا اتنے کامل اور بے ریا انداز سے اس نئے جذبے کے سامنے سپر انداز ہوئی کہ اس نے اس حقیقت پر، کہ اب وہ مفہوم و محزون نہیں بلکہ شادمان و مسرور ہے، پردہ ڈالنے کی کوئی کوشش نہ کی۔

جب پرنس ماریا اس رات پیئر سے گفتگو کرنے کے بعد واپس اپنے کمرے میں آئی، نتاشا اسے دہلیز پر مل گئی۔

''انھوں نے کوئی بات کی ہے؟ ہاں؟ کی ہے؟'' وہ بار بار پوچھ رہی تھی۔

اور نتاشا کے چہرے پر پر مسرت اور اس کے ساتھ ہی پر ملال تاثر ہویدا ہو گیا، جو اس کی مسرت کے لیے معذرت خواہی کرتا دکھائی دے رہا تھا۔

''میں دروازے کی آڑ سے سننا چاہتی تھی لیکن مجھے معلوم تھا کہ تم مجھے بتادو گی۔''

نتاشا جس انداز سے ٹکٹکی باندھے پرنس ماریا کے چہرے کو دیکھ رہی تھی، بے شک وہ قابلِ فہم اور متاثر کن تھا اور اس کی پریشانی و اضطراب دیکھ کر پرنس ماریا کو افسوس بھی ہوا، تاہم ایک ثانیے کے لیے اس کے الفاظ اس کے دل کو مجروح کر گئے۔ اسے اپنا بھائی اور اس کی محبت یاد آ گئی۔

''لیکن اب کیا ہو سکتا ہے؟ بات اس کے بس کی نہیں ہے،'' پرنس ماریا نے سوچا۔

اگرچہ اس کے چہرے پر ملال اور درشتی جھلک رہی تھی، اس نے وہ سب کچھ، جو پیئر نے کہا تھا، نتاشا کو بتادیا۔ جب نتاشا نے سنا کہ پیئر پیٹرزبرگ جارہا ہے، اسے زمین آسمان گھومتے نظر آئے۔

''پیٹرزبرگ!'' اس نے یوں دہرایا جیسے اس کے پلے کچھ نہ پڑا ہو۔

لیکن پرنس ماریا کے چہرے پر کرب کے آثار دیکھ کر اور ان کی وجوہ سمجھتے ہوئے وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ کی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''ماری،'' اس نے کہا، ''مجھے بتاؤ کہ میں کیا کروں؟ میری اس خوف سے جان نکلی جارہی ہے کہ کہیں میں بدتو نہیں ہوں! تم جو کچھ کہو گی، میں وہی کروں گی، کہو نا—''

''تم ان سے محبت کرتی ہو؟ تمھیں ان سے محبت ہے؟''

''ہاں،'' نتاشا نے سرگوشی کی۔

''پھر رو کیوں رہی ہو؟ میں تمھاری خاطر خوش ہوں،'' پرنس ماریا نے کہا۔ وہ نتاشا کے آنسوؤں سے اتنا متاثر ہوئی کہ اس نے اسے دل سے معاف کر دیا۔

''لیکن یہ ابھی نہیں ہوگا... کسی دن۔ صرف اتنا سوچو کہ جب میں ان کی بیوی بن جاؤں گی اور تم نکولس سے شادی کر لو گی، ہم کتنے خوش ہوں گے۔''

''نتاشا، میں نے تم سے کہا تھا کہ یہ بات اپنی زبان پر نہ لایا کرو۔ چھوڑو اسے، آؤ، ہم تمھارے متعلق باتیں کرتے ہیں۔''

''میں صرف یہ جاننا چاہتی ہوں کہ آخر انھیں پیٹرزبرگ جانے کی کیا ضرورت تھی؟'' نتاشا نے اچانک پوچھا اور پھر عجلت سے خود ہی اپنے سوال کا جواب دینے لگی: ''پر نہیں، نہیں، انھیں ضرور جانا چاہیے... کیوں ماری؟ انھیں ضرور...''

تتمّہ

حصہ اول

1

1812 کی جنگ کو ختم ہوئے سات سال گزر چکے تھے۔ یورپی تاریخ کا طوفانی موجوں سے اچھلتا سمندر اپنے ساحلوں کے اندر اتر چکا اور پر سکون نظر آنے لگا تھا، مگر پراسرار قوتیں (پراسرار اس لیے کیونکہ جو قوانین ان کے افعال متعین کرتے ہیں، ہم ان سے نابلد ہیں)، جو بنی نوع انسان کو متحرک کرتی ہیں، اپنا عمل جاری رکھے ہوئے تھیں۔

اگرچہ تاریخ کے سمندر کی سطح ٹھہری اور غیر متحرک دکھائی دے رہی تھی، انسانوں کی نقل و حرکت وقت کے بہاؤ کی طرح بلا روک ٹوک جاری رہی۔ لوگوں کے مختلف اتحاد وجود میں آئے اور ناپید ہو گئے۔ وہ حالات، جن کی بنا پر سلطنتوں کی تشکیل اور تحلیل ہونا تھا اور جنھیں اقوام کی اکھاڑ پچھاڑ اور انتشار کا سبب بننا تھا، تیاری کے مراحل میں سے گزر رہے تھے۔

تاریخ کا سمندر پہلے کی طرح طوفانی جھکڑوں کے تھپیڑوں سے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک نہیں دھکیلا جا رہا تھا بلکہ یہ اپنی گہرائیوں میں اندر ہی اندر بل کھا رہا اور ابل رہا تھا۔ تاریخی ہستیوں کو موجیں پہلے کی طرح ایک ساحل سے اٹھا کر دوسرے ساحل تک نہیں لے جا رہی تھیں؛ معلوم ہوتا تھا کہ اب وہ گرداب کی طرح ایک ہی مقام پر گھوم رہی ہیں۔ تاریخی شخصیات، جو پہلے افواج کی قیادت کرتی تھیں اور جو جنگوں، مہموں اور لڑائیوں کے احکام دے کر عام لوگوں کی نقل و حرکت کو منعکس کرتی تھیں، اب سیاسی اور سفارتی اتحادوں، قوانین اور معاہدوں کے ذریعے طوفانی نقل و حرکت کا انعکاس کر رہی تھیں۔

مورخین تاریخی ہستیوں کی اس مصروفیت کو رجعتِ قہقری کہتے ہیں۔

ان تاریخی شخصیات نے جو کردار ادا کیا تھا، اس کا ذکر کرتے ہوئے یہ مورخین انھیں کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں کیونکہ ان کا خیال ہے کہ وہ اس چیز کا، جسے وہ رجعتِ قہقری کہتے ہیں، سبب بنے تھے۔ الیکسانڈر اور نپولین سے لے کر مادام دِستیل، پھوتی اس[1] شیلنگ، فِختے[2]، شاتوبریاں[3] اور اس عہد کے باقی مشہور و معروف اشخاص تک، ان کی سخت گیر انصاف کی کرسی کے سامنے سے گزرتے ہیں، ترقی یا رجعت پسندی کے پیمانے پر جانچے اور پرکھے جاتے ہیں، اگر وہ رجعت پسندی کے مجرم قرار پاتے ہیں، انھیں سزا سنا دی جاتی ہے اور اگر وہ ترقی کے علم بردار

ثابت ہوتے ہیں، ان کی بریّت ہو جاتی ہے۔

مورخین کے بیانات کے مطابق اس زمانے میں روس میں بھی رجعت پسندی کو فروغ حاصل ہوا اور ان کی نگاہوں میں اس کا سب سے بڑا مجرم الیکساندر اول ہے — وہی الیکساندر اول، جس کی وہ تحسین بھی کرتے ہیں کیونکہ اس نے اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں لبرل خیالات کی حوصلہ افزائی کی تھی اور روس کو بچایا تھا۔

مدرسے کے طالب علم مضمون نگار سے لے کر عالم فاضل مورخ تک روس کے دانش ور طبقے میں آپ کو ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو الیکساندر پر اپنی حکومت کے آخری عہد کے دوران میں غلط کام کرنے کے الزام میں سنگ باری نہ کرتا ہو۔

"اسے اس یا اس طریقے سے کام کرنا چاہیے تھا۔ فلاں معاملے میں اس کا کردار قابل تحسین تھا لیکن فلاں معاملے میں اس نے بڑی نا اہلی کا مظاہرہ کیا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی دور اور 1812 کے سال کے دوران میں اس نے بڑی سوجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا لیکن اس نے پولینڈ کو آئین[4] عطا کر کے، اتحادِ مقدس[5] کی داغ بیل ڈال کر، اختیارات آراک چیف کے حوالے کر کے، پہلے گالتسن[6] اور اس کی سرِیّت اور بعد ازاں شش کوف[7] اور پھوتی انسان کی حوصلہ افزائی کر کے اس نے سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا۔ اس نے فعال افواج کے معاملات میں دخیل ہو کر اور سیمیونووسکی رجمنٹ[8] توڑ کر دانش مندی کا ثبوت نہیں دیا۔

مورخین اپنے اس زعم میں، کہ انھیں معلوم ہے کہ انسانیت کی بھلائی کس چیز میں مضمر ہے، اسے جو صلواتیں سناتے ہیں، ان کی تفصیل بیان کرنے کے لیے درجن صفحات درکار ہیں۔

ان کی ان دشنام طرازیوں کا مطلب کیا ہے؟

کیا الیکساندر کے وہ افعال — اس کی حکومت کے ابتدائی عہد کے لبرل منصوبے، اس کی نپولین کے خلاف جدوجہد، اس کی ثابت قدمی، جس کا اظہار اس نے 1812 کے دوران میں کیا۔ جن کی مورخین تعریفیں کرتے نہیں تھکتے، انہی مصادر کی — وہ ماحول جس میں اس نے آنکھ کھولی، تعلیم حاصل کی اور زندگی گزاری اور جس نے اس کی شخصیت کی، وہ جیسی کیسی بھی تھی، تشکیل کی — اور جنھوں نے اس سے وہ افعال — مثلاً اتحاد مقدس کی تکمیل، پولینڈ کی بحالی اور 1820 کی رجعت پسندانہ کارروائیاں — سرزد کرائے، جن کی وجہ سے مورخین اسے گردن زدنی قرار دیتے ہیں، پیداوار نہیں؟

ان نکتہ چینیوں کی اصل غایت کیا تھی؟

الیکساندر اول تاریخ کا اہم کردار تھا۔ وہ انسانی طاقت کے ممکنہ طور پر بلند ترین مقام پر فائز ہو چکا تھا اور تاریخ کا چکا چوند روشنیوں کا نقطۂ ماسکہ تھا۔ وہ ریشہ دوانیوں، مکاریوں، خوشامدی رویوں اور خود فریبیوں، جو طاقت و اقتدار کا اجزائے لاینفک ہیں، جیسے طاقتور ترین اثرات کا نشانہ بنا ہوا تھا۔ یورپ میں جو کچھ ہو رہا تھا، اس کے متعلق اسے زندگی کے ہر لمحے میں اپنی ذمہ داریوں کا احساس رہا تھا۔ وہ کوئی داستانی کردار نہیں تھا، بلکہ دوسرے لوگوں کی

طرح جیتا جاگتا گوشت پوست کا انسان تھا۔ اس کے اپنے ذاتی خصائل، عادات اور جذبات تھے، حسن، صداقت اور اچھائی سے وہ اپنے انداز سے متاثر ہوتا تھا۔ پھر یہ وہ شخص تھا جس میں حسنِ سیرت کا فقدان نہیں تھا (مورخین اس سلسلے میں اس پر کوئی الزام نہیں دھرتے)۔ اسے مطعون صرف اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ آج سے پچاس سال قبل انسانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق اس کا تصور وہ نہیں تھا جو موجودہ زمانے کے کسی پروفیسر کا ہوتا ہے جو ابتداء شباب سے پڑھنے پڑھانے کا مشغلہ۔ یعنی کتابوں کا مطالعہ اور ان کے چیدہ چیدہ نکات کی نقول تیار کرنا، لیکچر دینا اور درس و تدریس میں مصروف رہنا۔ اختیار کر لیتا ہے۔

لیکن اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ عام لوگوں کی بھلائی جس چیز میں مضمر ہے، اس کے متعلق الیکساندر کا نقطۂ نظر صحیح نہیں تھا، پھر لامحالہ ہمیں یہ بھی فرض کرنا پڑے گا کہ آج جو مورخ الیکساندر کا محاکمہ کر رہا ہے، خاص مدت گزر جانے کے بعد انسانوں کی بھلائی کے متعلق اس کا نقطۂ نظر بھی غلط قرار پائے گا۔ یہ مفروضہ اس لیے اور بھی فطری اور ناگزیر ہے کیونکہ جب ہم تاریخ کے آگے بڑھنے کے عمل کا جائزہ لیتے ہیں، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی فلاح و بہبود کے متعلق نقطۂ نظر سال بہ سال تبدیل ہوتا رہتا ہے! جو بات آج سے دس سال قبل اچھی معلوم ہوتی تھی، آج وہ محلِ نظر ٹھہرتی ہے اور جو محلِ نظر تھی، اب وہ لائقِ تحسین قرار پاتی ہے۔ پھر مصنف مصنف میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، جو بات ایک کے نزدیک درست ہے، وہ دوسروں کی نگاہوں میں غلط ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ اچھا کیا ہے، برا کیا ہے، اس کے بارے میں ایک ہی زمانے کے اشخاص کے نقطہ ہائے نظر ایک دوسرے کے متضاد ہو سکتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک اتحادِ مقدس کا قیام اور پولینڈ میں آئین کا نفاذ اچھی چیزیں تھیں، اور وہ ان کی وجہ سے الیکساندر کی تعریفیں کرتے تھے، جب کہ دوسروں کے نزدیک یہ بری تھیں، اس لیے وہ اس پر نکتہ چینی کرتے تھے۔

الیکساندر اول یا نپولین کے افعال اور مصروفیتیں سودمند تھیں یا ضرر رساں، اس کے متعلق حتمی رائے قائم کرنا ناممکن ہے کیونکہ سودمند کیا تھا یا ضرر رساں کیا تھا، اس کے متعلق ہم قطعی انداز سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اگر کوئی کارروائی کسی شخص کو خوش کرنے میں ناکام رہتی ہے، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اچھائی کو ماپنے کے لیے اس کے پاس جو محدود پیمانہ ہے، یہ اس پر پورا نہیں اترتی۔ مسئلہ 1812 کے ماسکو میں میرے مکان کے تحفظ کا ہو یا روسی افواج کے شکوہ و جلال کا، پیٹرزبرگ یا دوسری یونیورسٹیوں کے فروغ کا، پولینڈ کی آزادی، یورپ میں توازنِ طاقت یا یورپی روشن خیالی کی خاص قسم کا، ''جسے ترقی'' کہا جاتا ہے۔ میرے نزدیک یہ سب باتیں اچھی ہو سکتی ہیں، اس کے باوجود میرے لیے یہ تسلیم کیے بغیر اور کوئی چارۂ کار ہی نہیں کہ ان اہداف اور مقاصد کے علاوہ تاریخی شخصیت کے افعال کے بعض عمومی مقاصد بھی ہو سکتے ہیں جو میرے فہم کی رسائی سے دور ہیں۔

چلیں ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ وہ چیز، جسے سائنس کہا جاتا ہے، تمام تضادات کو ہم آہنگ کر سکتی ہے اور اس کے پاس درست اور نادرست کے مابین امتیاز کرنے کا غیر متغیر پیمانہ موجود ہے جس کی مدد سے تاریخی شخصیات اور

* مصنف نے یہ ناول 1869 میں مکمل کیا تھا۔ (مترجم)

واقعات کو جانچا پرکھا جاتا ہے۔

چلیں، ہم یہ فرض کر لیتے کہ الیکساندر کے لیے ہر کام مختلف طریقے سے سرانجام دینا ممکن تھا۔ ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے لیے۔۔ان لوگوں کی تجاویز کے مطابق، جو اسے اپنی نکتہ چینیوں کا ہدف بناتے رہتے ہیں اور جو انسانوں کی نقل وحرکت کے قطعی مقاصد کو جاننے کے دعوے دار ہیں۔۔قومیت، آزادی، مساوات اور ترقی (میرا خیال ہے کہ ان سے سب باتوں کا احاطہ ہو جاتا ہے) کے اس پروگرام کے مطابق، جو اس کے موجودہ زمانے کے ناقدین اسے فراہم کرنا پسند کرتے، امورِ حکومت نپٹانا ممکن تھا۔ ہم یہ بھی فرض کر لیتے ہیں کہ یہ پروگرام قابل عمل تھا، اس زمانے میں مرتب کر لیا گیا تھا اور الیکساندر نے اسے عملی جامہ پہنا دیا تھا۔ اگر یہ سب کچھ ہو جاتا، پھر ان تمام لوگوں کی، جو حکومت کے رجحانات کی مخالفت کرتے تھے، سرگرمیوں کا۔۔ان سرگرمیوں کا جو مورخین کی نگاہوں میں خوش آئند اور سود مند تھیں، کیا بنتا۔ ان سرگرمیوں کا کوئی وجود نہ ہوتا، یوں زندگی کی چھل پہل ختم ہو جاتی اور ہر طرف مردنی چھا جاتی۔

اگر ہم نے یہ تسلیم کر لیا کہ انسانی زندگی تعقل کے تابع بنائی جا سکتی ہے، پھر زندگی کے امکانات نیست ونابود ہو جائیں گے۔

2

اگر مورخین کی طرح ہم یہ فرض کر لیں کہ عظیم لوگ مخصوص مقاصد۔۔روس یا فرانسیسیوں کی عظمت وسربلندی، یورپ میں توازن طاقت، انقلاب کے اصولوں کی نشرواشاعت، عمومی ترقی یا اس قسم کی کسی دوسری چیز۔۔کے حصول کے لیے انسانوں کو آمادۂ عمل کرتے ہیں، پھر اتفاق اور عبقریت جیسے تصورات کا سہارا لیے بغیر تاریخی حقائق کی تشریح و تعبیر کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔

اگر انیسویں صدی کے آغاز کی یورپی جنگوں کا مقصد روس کی توسیع اور اس کے اثر ورسوخ میں اضافہ کرنا ہوتا، پھر اس مقصد کی تکمیل ان تمام سابقہ جنگوں اور یورشوں کے بغیر ممکن تھی۔ اگر مقصد فرانس کی توسیع ہوتا، پھر اسے انقلاب یا امپراطوریہ کے بغیر پروان چڑھایا جا سکتا تھا۔ اگر مقصد خیالات کی نشرواشاعت ہوتا، پھر یہ فوجوں کے بجائے چھاپے خانوں کی امداد سے زیادہ موثر انداز سے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ اگر مقصد تہذیب کی ترقی ہوتا، پھر یہ بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ انسانوں اور ان کی املاک کو تباہ وبرباد کیے بغیر تہذیب کو تیزی سے پھیلانے کے نسبتاً بہتر اور زیادہ کارگر ذرائع موجود تھے۔

پھر حالات یوں وقوع پذیر کیوں ہوئے؟ ووں کیوں نہ ہوئے؟

کیونکہ وہ وقوع پذیر ہوئے ہی یوں۔ ’’اتفاق نے صورت حال کو جنم دیا؛ عبقریت نے اسے استعمال کیا۔‘‘ تاریخ کا فتویٰ ہے۔

مگر اتفاق کیا ہے؟ عبقریت کیا ہے؟

الفاظ اتفاق اور عبقریت کسی ایسی چیز پر، جو واقعتاً موجود ہو، دلالت نہیں کرتے، چنانچہ یہ سمجھنا یا سمجھانا کہ وہ اصلاً ہیں کیا، بہت مشکل ہے۔ یہ دونوں مظاہر کی تفہیم کے خاص مرحلے کی محض نشان دہی کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ ایک خاص واقعہ کیوں ظہور پذیر ہوتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میرے لیے اس کا جاننا ممکن نہیں ہے: چنانچہ میں جاننے کی کوشش نہیں کرتا اور میں اتفاق کا ذکر لے بیٹھتا ہوں۔ مجھے کوئی قوت ایسے نتائج، جو عام انسانی فعالیتوں کے دائرہ اختیار میں نہیں ہوتے، معرضِ وجود میں لاتی نظر آنے لگتی ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا اور میں عبقریت کی گردان شروع کر دیتا ہوں۔

بھیڑوں کے ریوڑ کو وہ بھیڑ، جسے گلّہ بان علیحدہ باڑے میں بند کرتا ہے، علیحدہ خوراک کھلاتا ہے اور جو اس طرح دوسروں سے دگنا فربہ ہو جاتی ہے، لازماً عبقری نظر آئے گی۔ اور یہ واقعہ کہ اس بھیڑ کو عام بھیڑوں کے باڑے کے بجائے علیحدہ باڑے میں بند کیا جاتا ہے، اسے دوسروں کی نسبت زیادہ جئی وغیرہ کھلائی جاتی ہے، جب یہ مخصوص بھیڑ خوب موٹی ہو جاتی ہے اور اسے گوشت کے حصول کی خاطر ذبح کر دیا جاتا ہے، تو باقی بھیڑوں کو یہ اتفاقات کے غیر معمولی سلسلے کے ساتھ عبقریت کا سنجوگ معلوم ہونے لگتا ہے۔

لیکن بھیڑوں کو صرف یہ کرنا چاہیے کہ وہ اس تصور سے، کہ جو کچھ ان کے ساتھ کیا جاتا ہے، وہ محض ان کے بھیڑوی مقاصد کو پروان چڑھانے کے لیے کیا جاتا ہے، چھٹکارا حاصل کر لیں؛ انھیں صرف یہ تسلیم کر لینا چاہیے کہ جو کچھ ان کے ساتھ پیش آتا ہے، اس کے ایسے مقاصد بھی ہو سکتے ہیں جو ان کے فہم وادراک سے بالا ہیں، پھر وہ فی الفور سمجھ جائیں گی کہ جو کچھ اس بھیڑ پر، جس خوب کھلا کر موٹا کیا جاتا ہے، گزرتی ہے، اس میں ایک قسم کی ایکتا اور ارتباط پایا جاتا ہے۔ اگر ان میں یہ معلوم کرنے کی، کہ اسے کس مقصد کے لیے موٹا کیا گیا ہے، صلاحیت نہ بھی ہو، انھیں کم از کم یہ ضرور معلوم ہو جائے گا کہ جو کچھ اس بھیڑ کے ساتھ ہوا، محض اتفاقاً نہیں ہوا، پھر انھیں اتفاق اور عبقریت جیسے تصورات کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔

صرف اس دعوے سے کہ جو مقصد ہمیں فی الفور قابلِ تفہیم معلوم ہوتا ہے، ہم اسے حقیقتاً سمجھ گئے ہیں، دست بردار ہونے اور یہ تسلیم کرنے کے بعد ہی کہ قطعی مقصد ہماری تفہیم سے ماورا ہے، ہم تاریخی شخصیات کی زندگیوں میں منطقی تسلسل کو دریافت کر سکیں گے۔ پھر ہم اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اتفاق اور عبقریت فالتو الفاظ ہیں۔

ہمیں صرف اتنا اقرار کرنا ہوگا کہ یورپی اقوام کی جو اتھل پتھل ہوئی، اس کا مقصد ہمیں معلوم نہیں، ہمیں محض سنگین حقائق کا علم ہے — وہ قتل وغارت جو پہلے فرانس میں اور اس کے بعد اطالیہ، افریقہ، پرشیا، آسٹریا، ہسپانیہ اور روس میں ہوا — اور یہ کہ لوگوں کی نقل وحرکت، جو پہلے مغرب سے مشرق کی جانب اور پھر مشرق سے مغرب کی جانب ہوئی، وہی ان تمام واقعات کا لب لباب اور مقصد ہے، پھر ہمیں نہ صرف یہ کہ نپولین یا الیکساندر میں غیر معمولی اوصاف یا عبقریت ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں رہے گی بلکہ ہم انھیں دوسرے انسانوں کی طرح عام انسان ہی سمجھنے

لگیں گے اور ہمارے لیے انھیں کچھ اور تصور کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اور ان چھوٹے چھوٹے واقعات کی، جنھوں نے انھیں وہ کچھ بنا دیا جو کچھ کہ وہ تھے، تشریح و توضیح کے لیے اتفاق کا سہارا لینا تو دور کی بات رہی، یہ اظہر من الشمس ہو جائے گا کہ ان چھوٹے چھوٹے واقعات کا ظہور پذیر ہونا تقاضائے فطرت تھا۔

اگر ہم اس دعوے سے دستبردار ہو جائیں کہ ہمیں قطعی مقصد کا علم ہے، پھر یہ بات ہماری سمجھ میں آ جائے گی کہ جس طرح یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی پودا ان پھولوں یا بیجوں کے علاوہ، جن کے لیے یہ موزوں ہوتا ہے، کسی دوسری قسم کے پھول یا بیج پیدا کر سکتا ہے، اسی طرح کسی ایسے دو اشخاص کا جو اپنے تمام تر خاندانی اور دوسرے حالات و کوائف کی بنا پر اس کام کے لیے، جس کی تکمیل نپولین اور الیکسانڈر کے مقدر میں لکھی جا چکی تھی، زیادہ موزوں ہوتے، تصور بھی ناممکن ہے۔

3

انیسویں صدی کے آغاز میں یورپ میں جو واقعات رونما ہوئے، ان کی اساسی اور اہم ترین خصوصیت یورپی اقوام کے بہ تعداد کثیر لوگوں کی پہلے مغرب سے مشرق اور پھر مشرق سے مغرب کی جانب جنگجویانہ نقل و حرکت ہے۔ اس نقل و حرکت کا آغاز مغرب سے مشرق کی طرف ہوا۔ ماسکو جیسے دور دراز مقام تک اپنی جارحانہ پیش قدمی کو روبہ عمل لانے کے لیے مغربی اقوام کے لیے لازمی تھا کہ وہ اپنے آپ کو ایسے لشکر جرار کے قالب میں ڈھالیں کہ جب ان کا تصادم مشرق کے مسلح گروہ سے ہو، وہ اسے برداشت کر سکیں۔ تمام مسلمہ روایات اور قواعد کو پس پشت ڈال دیں ان کی عسکری نقل و حرکت کے دوران میں ان کا سربراہ ایک ایسا شخص ہو جو تمام دسیسہ کاریوں، قزاقیوں اور خون ریزیوں کو، جن کا ارتکاب ان کی پیش قدمی کرنے کے لیے لازمی تھا، ان کے اور خود اپنے سامنے حق بجانب قرار دے سکے۔

اس قضیے کی ابتدا انقلاب فرانس سے ہوتی ہے۔ پرانا گروہ، جو وسعت اور تعداد کے اعتبار سے اتنا بڑا نہیں تھا، ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ پرانے رواجوں اور روایتوں کو ختم کر دیا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ نئی وسعتوں کا حامل گروپ وجود میں آتا ہے۔ نئی روایات اور نئی رسوم کو پروان چڑھایا جاتا ہے اور ایک ایسا شخص تیار کیا جاتا ہے جو آئندہ کی نقل و حرکت کا سربراہ ہوگا اور جو کچھ کیا جانا ہے، اس کی ذمے داری قبول کرے گا۔

فرانس کے تمام شورش پسند اور فتنہ پرداز گروہوں میں سے ایک شخص، جو عقائد، رسوم اور روایات سے تہی داماں ہے، جس کا نام نہیں اور جو فرانسیسی بھی نہیں، منظر عام پر نمودار ہوتا ہے اور اپنے آپ کو ان میں سے کسی ایک کے بھی ساتھ وابستہ کیے بغیر اتفاقات کی بدولت، جو بظاہر عجیب و غریب معلوم ہوتے ہیں، نمایاں مقام حاصل کر لیتا ہے۔

اس کے رفقائے کار کی نااہلی اور جہالت، اس کے مخالفوں کی کمزوری اور بے مغزی، اس کی دروغ گوئیوں کی بے باکی، اس کی خیرہ کن اور پر اعتماد مگر محدود صلاحیت، سبھی اس کے لیے سازگار ثابت ہوتی ہیں اور اسے اٹھا کر

فوج کا سربراہ بنا دیتی ہیں۔ اس فوج کے، جو اطالیہ روانہ کی جاتی ہے، سپاہیوں کی ذہانت اور مہارت، اس کے مخالفوں کا اس کے خلاف لڑنے سے پس و پیش، اور اس کی اپنی بچگانہ جسارت اور خود پسندی اسے عسکری شہرت دلانے میں ممد ثابت ہوتی ہیں۔ لاتعداد نام نہاد اتفاقات ہر جگہ اس کی جلو میں رہتے ہیں۔ وہ فرانسیسی حکمرانوں کی ناراضگی[9] مول لیتا ہے لیکن یہی ناراضگی انجام کار اس کے لیے سود مند ثابت ہوتی ہے۔ وہ قضا و قدر کے پہلے سے معین کردہ راستے سے بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن ناکام رہتا ہے۔ اسے روس میں ملازمت دینے سے انکار کر دیا جاتا ہے اور ترکی میں اس کی ملازمت[10] حاصل کرنے کی تمام مساعی لاحاصل ثابت ہوتی ہیں۔ اطالیہ میں جنگوں کے دوران میں متعدد مواقع ایسے آتے ہیں جب اس کی تباہی میں کوئی کسر باقی نہیں رہ جاتی لیکن ہر بار وہ غیر متوقع طور پر بچ نکلتا ہے۔ مختلف سفارتی تقاضوں کے پیش نظر روسی افواج[11] جو اس کے وقار کو ملیامیٹ کرنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہیں، یورپی منظر پر اس وقت تک نمودار نہیں ہوتیں جب تک وہ وہاں سے چلا نہیں جاتا۔

اطالیہ سے واپسی کے بعد اسے معلوم ہو جاتا ہے کہ پیرس کی حکومت زوال کے مرحلے طے کر رہی ہے۔ چنانچہ جب اس کا خاتمہ عمل میں آتا ہے، ناگزیر طور پر وہ تمام اشخاص، جو اس میں شامل تھے، نیست و نابود ہو جاتے ہیں۔ اتفاق سے اسے اس پُر خطر صورت حال سے دامن چھڑانے کا موقع یوں مل جاتا ہے کہ اسے بے مقصد اور احمقانہ مہم پر افریقہ بھیج دیا جاتا ہے۔ ایک بار پھر نام نہاد اتفاق اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ناقابل تسخیر مالٹا[12] گولی چلائے بغیر اس کے قدموں پر ڈھیر ہو جاتا ہے اور اس کے انتہائی ناعاقبت اندیشانہ منصوبے پر کامیابی کی مہر ثبت ہو جاتی ہے۔ دشمن کا بحری بیڑا، جو بعد ازاں ایک کشتی بھی گزرنے نہیں دیتا، اتنا بے خبر ہے کہ اس کی پوری فوج کو چپکے سے بچ نکلنے کا موقع مل جاتا ہے۔ افریقہ میں تقریباً غیر مسلح مقامی باشندوں کو لگاتار ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ہر قسم کی شرمناک حرکات روا رکھی جاتی ہیں لیکن وہ لوگ، جو ان جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں، خاص طور پر ان کا قائد، اپنے آپ کو یقین دلاتے ہیں کہ ان کے یہ کارنامے سنہری حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ اس کے نزدیک شان و شوکت اسی کا نام ہے اور وہ اپنے آپ کو سیزر اور سکندر اعظم سے کم تر نہیں سمجھتا۔

شان و شوکت اور عظمت کا یہ آدرش — جو اس بات پر مشتمل ہے کہ آدمی جو کچھ خود کرتا ہے، نہ صرف یہ کہ اسے اس میں کوئی خرابی، غلطی یا برائی نظر نہیں آتی، بلکہ ہر جرم، جس کا وہ ارتکاب کرتا ہے، وہ اس کے لیے فخر و مباہات کا باعث بن جاتا ہے اور وہ اس کے ساتھ ناقابل تفہیم، مافوق الفطرت اہمیت وابستہ کر دیتا ہے — اس آدرش کو، جس نے قضا و قدر کے منشا کے مطابق اس شخص اور اس کے حالیوں موالیوں کی رہنمائی کرنا ہے، اپنی نمو کے لیے افریقہ میں زرخیز زمین مل جاتی ہے۔ وہ جو کچھ کرتا ہے، کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے۔ طاعون اس کے قریب نہیں پھٹکتا، قیدیوں کے ظالمانہ انداز سے قتل عام کا ذمے دار اسے نہیں ٹھہرایا جاتا اور پھر وہ اپنے ساتھیوں کو مصائب و ابتلا میں چھوڑ چھاڑ بچوں کی طرح جس غیر محتاط، غیر معقول اور ناشائستہ انداز سے افریقہ سے روانہ ہوتا ہے، اس پر بھی اسے تحسین و توصیف کا سزاوار ٹھہرایا جاتا ہے اور دشمن کا بحری بیڑا اسے دوبارہ کھسک جانے کا موقع فراہم کر دیتا ہے۔

جب وہ اپنی مجرمانہ کارروائیوں میں کامیابی کے نشے سے سرشار پیرس لوٹتا ہے، ری پبلکن حکومت کا، جو ایک سال قبل اسے تباہ و برباد کر سکتی تھی، انتشار اپنی انتہا تک پہنچ چکا ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کے پاس نہ کوئی منصوبہ ہے اور نہ اس نے اپنے کردار کی، جو اس نے ادا کرنا ہے، کوئی تیاری کی ہوتی ہے، مگر چونکہ اس کا گروہ بندیوں سے دامن صاف ہے، اس لیے ان حالات میں اس کی موجودگی اسے محض بلندیوں تک پہنچانے میں ہی سازگار ثابت ہو سکتی ہے۔

اس کے پاس کوئی منصوبہ نہیں: وہ ہر چیز سے خائف ہے لیکن پارٹیاں اس پر جھپٹا مارتی ہیں اور اسے حکومت سازی میں شریک ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔

تاہم اس کے پاس شان و شوکت اور عظمت کا آدرش ہے (اسے اس نے اطالیہ اور مصر میں پروان چڑھایا تھا)، وہ باؤلے انداز سے اپنی ستائش کرتا ہے، بڑی جسارت اور ڈھٹائی سے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے اور کھلے بندوں جھوٹ بولنے پر شرمندہ نہیں ہوتا۔ چنانچہ وہ واحد شخص ہے جو اسے، جو کیا جانا ہے، حق بجانب ٹھہرا سکتا ہے۔

اس کی اس مقام کے لیے، جو اس کا منتظر ہے، ضرورت ہے۔ چنانچہ اسے اس کے ارادے کے علی الرغم، اس کے تذبذب، اس کی کسی منصوبے سے تہی دامنی اور ان تمام کبیرہ غلطیوں کے باوجود جن کا وہ مرتکب ہوتا ہے، اس سازش میں، جس کا مقصد اقتدار پر قبضہ کرنا ہے، گھسیٹ لیا جاتا ہے اور سازش کامیابی سے ہم کنار ہو جاتی ہے۔

اسے جیسے تیسے قانون ساز ادارے کے اجلاس میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور وہ بھاگنے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ بے وفائی ہوئی ہے۔ وہ بے ہوشی کا ڈرامہ رچاتا ہے اور بے معنی باتیں کرتا ہے۔ اس کی یہ بے معنی باتیں اس کی تباہی کا سبب بننا چاہیے تھیں لیکن فرانس کے حکمران، جو کبھی باوقار اور ژرف نگاہ ہوا کرتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کردار ختم ہو چکا ہے، چنانچہ وہ اس سے بھی زیادہ منتشر خیالی کا شکار ہو جاتے ہیں اور اپنے اقتدار کو بچانے اور اس شخص کو کچلنے کے لیے انھیں جو کچھ کہنا چاہیے تھا، وہ اسے زبان پر لانے میں ناکام ہو جاتے ہیں۔

اتفاق، لاکھوں کروڑوں اتفاقات، اسے اقتدار سے بہرہ ور کر دیتے ہیں اور تمام لوگ، جیسے وہ آپس میں سمجھوتہ کر چکے ہوں، اس اقتدار کی توثیق کرنے کے لیے دست تعاون بڑھا دیتے ہیں۔ اتفاق فرانس کے حکمرانوں کا، جو اس کے آگے پانی بھرتے ہیں، کردار متشکل کرتا ہے۔ اتفاق روس کے زار پاول اول کا کردار، جو اس کا اقتدار تسلیم کر لیتا ہے، تشکیل کرتا ہے۔ اتفاق اس کے خلاف سازش[13] کی تدبیر نکالتا ہے۔ یہ سازش نہ صرف ناکام رہتی ہے بلکہ اس کے اقتدار کو استحکام بخش دیتی ہے۔ اتفاق ڈیوک آف آں غیاں کو اس کی تحویل میں دے دیتا ہے اور غیر متوقع طور پر اسے ہلاک کرنے پر اکساتا ہے۔ یوں وہ انتہائی ٹھوس اور قابل قبول دلائل سے ہجوم کو باور کرا دیتا ہے کہ اسے اس کا حق حاصل ہے کیونکہ اس کے پاس طاقت ہے۔ اگرچہ وہ انگلستان پر حملہ کرنے کے لیے اپنے تمام وسائل مجتمع کر لیتا ہے (اگر وہ یہ حملہ کرتا، وہ لاریب تباہی کے غار میں گر جاتا) مگر اتفاق کچھ ایسا چکر چلاتا ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے اور ناگہانی طور پر میک اور آسٹریوں کے خلاف

چڑھائی کر دیتا ہے۔ وہ خدا کے بندے لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ اتفاق اور عبقریت اوسٹرلٹس کے میدان میں اسے فتح دلا دیتے ہیں، اور اتفاق کا کرشمہ ملاحظہ فرمائیں کہ تمام لوگ، نہ صرف فرانسیسی بلکہ سارے یورپی۔ انگریزوں کے ماسوا جو آئندہ پیش آنے والے واقعات میں کوئی حصہ نہیں لیتے۔ اس کے ہم نوا بن جاتے ہیں۔ وہ اس کے جرائم کے سلسلے میں اپنی ساری نفرتیں اور کراہتیں فراموش کر دیتے ہیں اور اس کی حاکمیت، اس کے خطاب، جو اس نے خود ہی اپنے آپ کو عطا کیا ہوتا ہے اور اس کے شان وشوکت اور عظمت کے آدرش کے سامنے، جو ان سب کو شاندار اور معقول نظر آتا ہے، گھٹنے ٹیک دیتے ہیں۔

مغربی قوتیں 1805، 1806، 1807، اور 1808 کے دوران میں مشرق کی طرف متعدد بار جارحانہ یلغار کرتی ہیں۔ کچھ معلوم ہوتا ہے جیسے وہ عزائم اور صلاحیتوں کی آزمائش کرنا اور آئندہ کی نقل وحرکت کی تیاریاں پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہوں۔ انسانوں کی جس فوجی جمعیت نے فرانس میں تشکیل پائی ہوتی ہے، 1811، میں جب وسطی یورپ کے مختلف ممالک کے باشندے اس میں شامل ہو جاتے ہیں، وہ ہجومِ بے کراں کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ جوں جوں اس جمعیت کے حجم میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، توں توں اس شخص کے، جو اس نقل وحرکت کا سربراہ ہے، اقتدار کے جائز ہونے کا جواز ملتا جاتا ہے۔ اس عظیم نقل وحرکت سے پہلے دس سال کا جو عرصہ گزرتا ہے، اس کے دوران میں یہ آدمی یورپ کے تمام تاج داروں کے ساتھ تعلقات استوار کر لیتا ہے۔ دنیا کے ان ننگِ خلائق اور بے توقیر حکمرانوں کے پاس اپنا کوئی آدرش نہیں جو عقل کے معیار پر پورا اترتا ہو اور جس سے وہ نپولین کے شان وشوکت اور عظمت کے بے معنی آدرش کا توڑ کر سکتے ہوں۔ وہ اپنی بے وقعتی کی نمائش کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے ہیں اور بھاگم بھاگ اس سے شرفِ باریابی حاصل کرتے ہیں۔ عظیم آدمی کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے شاہ پرشیا اپنی بیوی اس کی خدمت میں بھیج دیتا ہے۔ آسٹریا کا امپراطور یہ بات اپنے لیے سرمایۂ عزّ وافتخار تصور کرتا ہے کہ یہ شخص قیصر کی بیٹی کو اپنے بستر کی زینت بناتا ہے۔ پوپ، جو ان تمام امور کا، جنھیں اقوام مقدس تصور کرتی ہیں، نگہبان ہے، اس عظیم آدمی کا رتبہ بلند کرنے کے لیے اسے مذہب کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ خود نپولین اپنے آپ کو اپنے کردار کی ادائیگی کی تیاری کے لیے اتنا کچھ نہیں کرتا جتنا کہ وہ لوگ، جو ہر وقت اس کے آگے پیچھے پھرتے رہتے ہیں، اسے اس کی جو توقع پذیر ہو رہا ہے اور جو توقع پذیر ہونا ہے، ذمے داری سنبھالنے کی تحریص دیتے ہیں۔ اس کا کوئی اقدام، کوئی فریب کاری، کوئی حیلہ سازی ایسی نہیں جسے عظیم کارنامہ بنا کر پیش کرنے میں اس کے یہ حواری ایک منٹ کی بھی تاخیر روا رکھتے ہوں۔ جرمنوں کو اس کی عزت افزائی کرنے کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی طریقہ نہیں سوجھتا کہ وہ جینا اور اورشٹٹ کے مقامات پر اپنے ہی خلاف اس کی فتوحات کا جشن منائیں۔ نہ صرف وہ خود عظیم ہے بلکہ اس کے آباؤ اجداد، اس کے بھائی، اس کے سوتیلے بیٹے اور اس کے سالے بھی عظیم ہیں۔ اس کے پاس جو تھوڑی بہت عقل رہ گئی ہے، اسے اس سے بھی محروم کرنے اور اس سے اپنا مہیب اور ڈراؤنا کردار ادا کرانے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا۔ جب وہ تیار ہو جاتا

ہے، افواج بھی تیاری کے مراحل طے کر چکی ہوتی ہیں۔

یلغار کا سلسلہ بہ جانب مشرق شروع ہو جاتا ہے اور اپنی آخری منزل —ماسکو— پہنچ جاتا ہے۔ دارالسلطنت پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ روسی افواج کو جو نقصانات برداشت کرنا پڑ رہے ہیں، وہ غنیم کی سپاہ کو اوسٹرلٹس سے لے کر واگرام تک کہیں بھی اٹھانا نہیں پڑے تھے۔ اتفاق اور عبقریت، جواب تک اتنے تسلسل سے اسے یکے بعد دیگرے فتوحات سے ہم کنار کراتے چلے آئے تھے اور اسے قضا و قدر کی پہلے سے معین کردہ منزل تک پہنچا چکے تھے، یک دم اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں اور اتفاقات معکوس کا— بارودینو میں اس کے زکام سے لے کر یخ بستہ کہروں اور ان شعلوں تک، جنھوں نے ماسکو کو جلا کر راکھ کر دیا— نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اب عبقریت کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتی، اس کی جگہ بے مثال حماقتوں اور فرومائیگیوں کا اظہار ہونے لگتا ہے۔

حملہ آور راہ فرار اختیار کرتے ہیں، واپس مڑتے ہیں اور سر پر پاؤں رکھ کر دوبارہ بھاگنا شروع کر دیتے ہیں۔ اب اتفاقات نپولین کا ساتھ نہیں دیتے بلکہ مسلسل اس کے خلاف مصروف عمل رہتے ہیں۔

پہلے نقل و حرکت مغرب سے مشرق کی جانب ہوئی تھی اور اب نقل و حرکتِ معکوس مشرق سے مغرب کی طرف شروع ہو جاتی ہے۔ دونوں میں زبردست مشابہت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ 1805، 1807، اور 1809 میں ہوا تھا، مشرق سے مغرب کی جانب کی عظیم نقل و حرکت سے قبل بھی ابتدائی اور محتاط کوششیں بروئے کار لائی جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح لوگ مل جل کر بے حد و حساب بڑے گروہ تشکیل کرتے ہیں، اسی طرح وسطی یورپ کے باشندے اس میں شمولیت اختیار کرتے ہیں، اسی طرح عین درمیان میں تذبذب کا مظاہرہ ہوتا ہے اور اسی طرح ہر آن بڑھتی ہوئی رفتار کے ساتھ منزل تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔

پیرس، جو کہ منزل مقصود ہے، اب پاؤں تلے پڑا ہے۔ نپولین کی حکومت اور فوج کو نیست و نابود کر دیا جاتا ہے۔ نپولین کی بذات خود کوئی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اب اس کے تمام افعال اور کارروائیاں صریحاً فرومایہ اور قابل رحم ہیں۔ لیکن ایک بار پھر وہ ناقابل تشریح اتفاق دخل انداز ہوتا ہے۔ اتحادیوں کو نپولین سے بے پناہ نفرت ہے اور وہ اسے اپنے مصائب و آلام کا ذمے دار ٹھہراتے ہیں۔ جب وہ اسے طاقت اور اختیارات سے محروم کر دیتے ہیں، اس کے جرائم اور عیاریوں کا بھانڈا بیچ چوراہے پھوڑ چکتے ہیں، انھیں وہ وہی نظر آنا چاہیے تھا جیسا کہ وہ دس سال قبل اور ایک سال بعد —راندۂ قانون قزاق— دکھائی دیا۔ لیکن اسے اتفاق کی بوالعجبی کہیں کہ کسی کو بھی اس چیز کا خیال تک نہ آیا اور اسے جزیرے میں، جو فرانس سے صرف دو دن کے بحری فاصلے پر واقع ہے، بھیج دیا جاتا ہے۔ کسی وجہ سے اسے اس کی مملکت قرار دے دیا جاتا ہے، اسے محافظ مہیا کر دیے جاتے ہیں اور لاکھوں کی رقوم[14] اس کی تحویل میں دے دی جاتی ہیں۔

4

قوموں کا سیلاب تھمنا شروع ہو جاتا ہے۔ بحر عظیم کی لہریں پیچھے ہٹ جاتی ہیں اور اپنے عقب میں پرسکون سطح چھوڑ

جاتی ہیں۔ اس سطح پر سفارت کار، جو اپنے تئیں سمجھتے ہیں کہ یہ سکون ان کی مساعی کے طفیل ہوا ہے، چھوٹے چھوٹے بھنور بنانے لگتے ہیں۔

لیکن پر سکون سمندر دوبارہ متلاطم ہو جاتا ہے۔ سفارت کار خیال کرنے لگتے ہیں کہ قوتوں کا یہ نیا دباؤ ان کے اختلافات کا شاخسانہ ہے۔ وہ اپنی حکومتوں کے مابین جنگ کی پیش گوئی کرتے ہیں۔ انھیں صورت حال لاینحل معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جو لہر انھیں اٹھتی اور بل کھاتی محسوس ہوتی ہے، وہ ادھر سے، جدھر سے انھیں اس کے آنے کی توقع ہوتی ہے، نہیں آتی۔[15] یہ لہر وہی لہر ہے جو پہلے بھی اٹھی تھی اور اسی مقام سے — پیرس — جہاں سے یہ پہلے نمودار ہوئی تھی، دوبارہ نمودار ہوتی ہے۔ یہ مغرب سے اٹھنے والی آخری لہر ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ سفارت کاروں کی نگاہوں میں جو مسائل لاینحل تھے، وہ حل ہو جاتے ہیں اور اس زمانے کی عسکری نقل و حرکت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

وہ شخص، جس نے فرانس کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی، کسی سازش اور سپاہیوں کے بغیر واپس فرانس پہنچ جاتا ہے۔ کوئی بھی محافظ اسے زیر حراست لے سکتا ہے لیکن عجیب اتفاق پیش آتا ہے۔ ایک بھی شخص اس کے راستے کی دیوار نہیں بنتا۔ بلکہ سبھی کے سبھی، جو کل اسے پھٹکار کرتے تھے اور ایک ماہ کے اندر اندر دوبارہ اسے پھٹکار کریں گے، اس کا دیوانہ وار استقبال کرتے ہیں اور اس کے قدموں میں بچھ بچھ جاتے ہیں۔

آخری اجتماعی ایکٹ کا جواز پیش کرنے کے لیے ابھی اس آدمی کی ضرورت ہے۔

ایکٹ دکھایا جاتا ہے۔ ایکٹر اپنے کردار کا آخری حصہ ادا کرتا ہے۔ اسے لباس اتارنے اور سرخی پاؤڈر صاف کرنے کا حکم ملتا ہے۔ اس کے بعد اس کی مزید ضرورت باقی نہیں رہے گی۔

اور کئی سال گزر جاتے ہیں، ان کے دوران میں یہ شخص اپنے جزیرے پر عالم تنہائی میں اپنی قابل رحم مضحک تمثیل خود اپنے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ وہ شرم ناک انداز سے ریشہ دوانیاں کرتا ہے اور دروغ بافیوں سے اپنے اعمال کو صحیح ثابت کرنے کی، حالانکہ اب ان کا جواز پیش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہی، تگ ودو میں مصروف رہتا ہے۔ وہ دنیا کو دکھا رہا ہے کہ جب تک کوئی نادیدہ ہاتھ اس کی اس کے افعال میں رہنمائی کرتا رہا، جسے لوگ غلطی سے اسے اس کی طاقت محمول کرتے رہے، اصل میں تھا کیا۔

سٹیج منیجر، جو ڈرامے کو اس کے اختتام تک پہنچا چکا ہے اور اداکار کو اس کے ڈرامائی ملبوسات اور میک اپ سے محروم کر چکا ہے، اسے ہمارے سامنے اس کے اصلی روپ میں پیش کرتا ہے۔

''دیکھا آپ نے کہ آپ کن چیزوں کو صحیح مانتے رہے ہیں! وہ اصل میں تھا کیا، اسے آپ اب دیکھ سکتے ہیں، وہ آپ کے سامنے کھڑا ہے! اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ آپ جس نقل و حرکت میں حصہ لیتے رہے ہیں، اس کا باعث وہ نہیں، میں تھا۔''

لیکن نقل و حرکت کی قوت سے لوگوں کی آنکھیں اتنی چندھیا چکی تھیں کہ وہ طویل مدت گزر جانے کے بعد

ہی اصل حقیقت بھانپ سکے۔

الیکساندر اول کے کردار میں جو مشرق سے مغرب کی جانب نقل وحرکت معکوس کا سربراہ تھا، کہیں زیادہ استقرار اور محکمی تھی۔ اور اس نے جو کچھ کیا، اس کا کیا جانا اٹل تھا۔

جس شخص نے دوسروں پر تفوق حاصل کرنا اور مشرق سے مغرب کی جانب نقل وحرکت معکوس کی قیادت کرنا ہے، اسے کن صفات سے بہرہ ور ہونا چاہیے؟

اس شخص میں انصاف پسندی کا مادہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہونا اور اسے یورپی معاملات میں ہمدردی کے احساس سے سرشار ہونا چاہیے، لیکن اس کی ہمدردی ذاتیات سے مبرا اور گھٹیا مفادات کی آلائشوں سے مصفا ہونا چاہیے۔ اسے اپنے ہم سروں — اپنے عہد کے دیگر حکمرانوں اور بادشاہوں — پر اخلاقی برتری حاصل ہونا چاہیے، اور اسے نپولین کے خلاف ذاتی شکایت ہونا چاہیے اور الیکساندر اول میں یہ تمام صفات موجود ہیں۔ اس کی زندگی میں لاتعداد نام نہاد اتفاقات — اس کی تعلیم وتربیت اور اس کی اس کے ابتدائی دور کی لبرل ازم، اس کے مشیر، جو اس کے گرد حصار بنائے رکھتے تھے، اوسٹرلٹس، ٹلزٹ اور ارفورٹ — دخیل رہے ہیں اور انھیں کی بدولت وہ اپنا کردار ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔

قومی جنگ کے دوران میں وہ غیر فعال رہتا ہے کیونکہ اس کی ضرورت پیش نہیں آتی لیکن جونہی عام یورپی جنگ کی ضرورت واضح صورت اختیار کرتی ہے، وہ وقت معینہ پر اپنا مقام سنبھال لیتا ہے، اقوام یورپ کو متحد کرتا ہے اور منزل کی جانب ان کی رہنمائی کرتا ہے۔

منزل آجاتی ہے۔ 1815 کی جنگ کے اختتام پر وہ انسانی طاقت کے بلند ترین مقام پر فائز ہو جاتا ہے۔ وہ اس طاقت کو کس طرح استعمال کرتا ہے؟

الیکساندر اول وہ شخص ہے جس نے یورپ میں مصالحت کنندہ کا کردار ادا کیا، جو اپنی حکومت کے روز اول سے اپنی رعایا کی فلاح وبہبود کے لیے کوشاں رہا، جو اپنے وطن میں لبرل اصلاحات کا اولین علم بردار تھا، اب جب کہ وہ تمام ممکنہ اختیارات کا مالک نظر آتا ہے اور یوں اس کی رعایا کے حالات زندگی بہتر کرنے کے امکانات ظاہر ہونے لگے ہیں — یہ اس وقت کی بات ہے جب نپولین جلاوطنی کے دوران میں بچگانہ اور باطن منصوبے وضع کر رہا ہے کہ اگر اس سے اقتدار نہ چھنتا، تو انسانوں کی بھلائی کے لیے وہ کیا کچھ کر رہا ہوتا —، الیکساندر اول کو، جو اپنا فریضہ ادا کر چکا ہے اور اسے اپنے اوپر خدا کا ہاتھ محسوس ہوتا ہے، اچانک مفروضہ اختیار واقتدار کی بے وقعتی کا اندازہ ہو جاتا ہے، وہ اس سے منہ موڑ لیتا ہے اور اسے قابل نفریں لوگوں کے سپرد کر دیتا ہے جن سے وہ گھن کھاتا ہے[16] اور کہتا ہے:

"'اپنے لیے نہیں، اپنے لیے نہیں، لیکن تیرے نام پر۔[17] میں بھی آپ باقی لوگوں کی طرح انسان ہوں۔ مجھے انسانوں کی طرح زندہ رہنے اور اپنی روح اور خدا کے متعلق سوچنے دیں۔'"

جس طرح سورج اور ایتھر کا ہر ذرہ اپنی ذات میں جرمِ کامل ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کُل کا، جو اتنا بسیط ہے کہ انسان کے فہم و ادراک سے ماورا ہے، محض جزو ہے، اسی طرح ہر شخص اپنے باطن میں اپنے اپنے مقاصد اٹھائے پھرتا ہے اور اس کے باوجود کہ اس کے یہ مقاصد محض ذاتی نوعیت کے ہیں، وہ انھیں اس لیے اٹھائے پھرتا ہے تاکہ عمومی مقصد کی، جو انسان کے لیے ناقابل تفہیم ہے، تکمیل ہو سکے۔

شہد کی مکھی جب پھول پر منڈلاتی ہے، بچے کو ڈنک مار دیتی ہے۔ چنانچہ بچہ مکھیوں سے ہراساں ہو جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ مکھی کا کام لوگوں کے ڈنک مارنا ہے۔ شاعر مکھی کو پھول کے کٹورے سے رس پیتے دیکھ کر وجد میں آ جاتا ہے اور پکار اٹھتا ہے کہ مکھی کا کام پھولوں کا رس نچوڑنا ہے۔ شہد کی مکھیاں پالنے والا جب مکھی کو زرگل (pollen) اکٹھے کرتے اور چھتے میں لے جاتے دیکھتا ہے، پکار اٹھتا ہے کہ مکھی کا کام شہد اکٹھا کرنا ہے۔ مکھیوں کی افزائش کرنے والا ایک دوسرا شخص، جس نے جھنڈ کا غور سے مطالعہ کیا ہوتا ہے، پکارتا ہے کہ مکھی زرگل مکھیوں کے بچوں کو غذا فراہم کرنے اور ملکہ مکھی کو توانا کرنے کے لیے چراتی ہے۔ ماہر نباتیات دیکھتا ہے کہ مکھی آتی ہے، نر پھول کا زرِگل اکٹھا کرتی اور اسے دوسرے پودے کے بقچۂ گل میں داخل کر دیتی ہے۔ یوں وہ موٴخر الذکر کو بار آور بنا دیتی ہے۔ اسے مکھی کے وجود کا یہی مقصد نظر آتا ہے۔ ایک اور ماہر پودوں کو زرگل سے آلودہ ہونے کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اسے معلوم ہوتا ہے کہ مکھی اس کام میں مدد دیتی ہے اور وہ کہہ سکتا ہے کہ مکھی کا یہی مقصد ہے۔ لیکن مکھی کس مقصد کے لیے وجود میں آئی ہے؟ یہ پہلے، دوسرے یا تیسرے فعل کی جو انسان کو دکھائی دیتا ہے، انجام دہی سے ختم نہیں ہو جاتا۔ ممکنہ مقاصد کے انکشاف کے لیے عقل انسانی جتنی بلندیوں پر پہنچتی ہے، اتنا ہی زیادہ یہ واضح ہونے لگتا ہے کہ حتمی مقصد ہمارے فہم و ادراک سے بالا ہے۔

شہد کی مکھی کی زندگی کے دیگر مظاہر حیات سے کیا تعلق ہے، انسان اس کے بارے میں محض قیاس آرائی کر سکتا ہے، اس سے زیادہ اس کے بس میں کچھ نہیں۔ اور یہی بات تاریخی شخصیات اور اقوام کے مقصد پر صادق آتی ہے۔

5

نتاشا کی بزوخوف سے شادی، جو 1813 میں انجام پائی، رستوفوں کی پرانی نسل کے لیے آخری خوش آئند واقعہ تھا۔ اسی سال کاؤنٹ الیا آندریچ رستوف کا انتقال ہو گیا اور جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، باپ کی موت کے بعد خاندان کا شیرازہ بکھر گیا۔

سال گزشتہ کے واقعات — ماسکو کی آتش زدگی، شہر سے فرار، پرنس آندرے کا انتقال، نتاشا کی یاس، پیتیا کی ہلاکت اور بوڑھی کاؤنٹس کا رنج و غم — سبھی یکے بعد دیگرے کاؤنٹ کو چرکے لگاتے رہے۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان واقعات کا مفہوم سمجھ نہیں رہا یا ان کا سمجھنا اس کے بس میں نہیں رہا۔ اس نے عملاً سر تسلیم خم کر دیا تھا جیسے اسے توقع ہو کہ وہ مزید چرکوں سے جان بر نہیں ہو سکے گا یا انھیں دعوت دے رہا ہو کہ وہ آئیں اور اس کا خاتمہ کر دیں۔ اب کبھی

وہ ہراساں، پریشاں اور بدحواس دکھائی دیتا اور کبھی غیر فطری انداز سے چہکنے اور نئے نئے منصوبے بنانے لگتا۔

نتاشا کی شادی کے انتظامات نے اسے کچھ عرصہ مصروف رکھا۔ وہ ڈنروں اور سپروں کے احکام دیتا اور ہشاش بشاش نظر آنے کی بین کوشش کرتا۔ ماضی میں اس کی شگفتگی جس طرح دوسروں میں سرایت کراتی اور انھیں شگفتہ بنادیتی تھی، اب اس میں وہ بات نہیں رہی تھی اور اپنی تاثیر سے محروم ہو چکی تھی۔ اس کے برعکس یہ ان لوگوں میں، جو اسے جانتے اور اس سے محبت کرتے تھے، اس کے لیے محض ترحم کے جذبات ابھارتی تھی۔

پیئر اور اس کی دلہن کی روانگی کے بعد وہ ڈھے گیا اور ڈپریشن کی شکایت کرنے لگا۔ چند روز میں اس کی طبیعت بگڑنے لگی اور وہ بستر سے لگ گیا۔ ڈاکٹر کے تسلی دلاسوں کے باوجود اسے شروع میں ہی احساس ہو گیا تھا کہ اب اسے دوبارہ اٹھنا نصیب نہیں ہوگا۔ دو ہفتے کپڑے تبدیل کیے بغیر کاؤنٹس اس کی پٹی سے لگ کر بیٹھی رہی۔ ہر مرتبہ جب وہ اسے دوا دارو دیتی، وہ خاموشی سے اس کے سر پر بوسہ دیتا اور اس کی سسکیاں نکل جاتیں۔ اپنی زندگی کے آخری روز اس نے اپنی بیوی اور غیر حاضر بیٹے سے معافی مانگی کہ اس نے ان کی جائیداد للّوں تللّوں میں اڑا دی ہے۔ اس کا یہی گناہ عظیم اس کے ضمیر پر بوجھ بنا ہوا ہے۔ مقدس روٹی اور شراب چکھنے کے بعد اور سر پر آخری مسح کرانے کے بعد وہ چپ چاپ انتقال کر گیا۔ اس سے اگلے روز رستوفوں کے کرائے کے مکان میں مرحوم کی آخری رسومات میں شریک ہونے کے لیے ملنے ملانے والوں کا ہجوم جمع ہو گیا۔ وہ دوست، جو اکثر اس کے گھر دعوتیں اڑانے اور رقص کرنے آیا کرتے تھے، اب یکجان ہو کر ضمیر کی کسک محسوس کرنے لگے اور جیسے وہ اپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے جتن کر رہے ہوں، کہنے لگے:

"بھلے وہ آدمی کیسا ہی تھا، تھا شریف النفس۔ آج کل ایسے لوگ کہاں ملتے ہیں... اور ہم میں سے کون ہے جو یہ دعویٰ کر سکے کہ وہ خامیوں سے مبّرا ہے!"

عین اس وقت جب کاؤنٹ کے مالی معاملات اتنے الجھ گئے تھے کہ یہ تصور کرنا ناممکن ہو گیا تھا کہ اگر وہ مزید ایک سال زندہ رہا پھر کیا ہوگا، وہ یک لخت انتقال کر گیا۔

جب نکولائی کو اپنے باپ کی وفات کی خبر ملی، وہ روسی فوج کے ساتھ پیرس میں تھا۔ اس نے جھٹ پٹ اپنی ملازمت سے استعفیٰ دیا، اس کی منظوری کا انتظار کیے بغیر چھٹی لی اور ماسکو روانہ ہو گیا۔

کاؤنٹ کے مالی معاملات کا اس کی موت کے ایک مہینے کے اندر اندر بھانڈا پھوٹ گیا۔ چھوٹے چھوٹے قرضوں کی، جن کے متعلق کسی کو سان گمان بھی نہیں تھا، بھاری مجموعی مالیت نے ہر شخص کو ہکا بکا کر دیا۔ قرضوں کی رقوم اس کی جاگیر اور جائیداد کی مالیت سے دگنا بنتی تھیں۔

دوسروں اور رشتہ داروں نے نکولائی کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی وراثت سے دست برداری کا اعلان کر دے۔ لیکن نکولائی کو یہ اقدام اپنے باپ کی یادوں پر، جو اس کے نزدیک مقدس تھیں، کلنک کا ٹیکا معلوم ہوا۔ چنانچہ اس نے دست برداری کے متعلق کوئی بات سننے سے صاف انکار کر دیا۔ اس نے وراثت اور اس کے ساتھ قرضے ادا

کرنے کی ذمے داری قبول کر لی۔

جب تک کاؤنٹ بقید حیات رہا، اس کی سہل پسند نیک فطرت قرض خواہوں کو مبہم لیکن پرزور انداز سے متاثر کرتی رہی اور انھیں کبھی اس کے سامنے دم مارنے کی مجال نہ ہوئی مگر اب انھوں نے نکولائی کا گھراؤ کر لیا اور سب بیک وقت اپنے اپنے دعاوی پر اصرار کرنے لگے۔ جیسا کہ اس قسم کے معاملات میں ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے، مختلف اشخاص کے مابین اختلافات سر اٹھانے لگے کہ سب سے پہلے وصولی کا حق کسے حاصل ہے اور مِتنکا جیسے لوگ، جن کے پاس تحفتاً دیے گئے پرونوٹ تھے، اب چم چچڑ قسم کے قرض خواہ ثابت ہونے لگے۔ نکولائی کو کوئی مہلت نہ دی گئی اور نہ اسے سکون سے کچھ سوچنے کا موقعہ فراہم کیا گیا اور جو اشخاص بوڑھے کاؤنٹ پر، جو ان کے نقصانات (اگر انھیں نقصانات کہا جا سکتا ہے) کا ذمے دار تھا، ترس کھاتے تھے، اب بے دردی سے بظاہر بے قصور وارث کا، جس نے رضا کارانہ ان کی ادائیگیاں کرنے کی ذمے داری اپنے سر لے لی تھی، ناک میں دم کرنے لگے۔

نکولائی جو منصوبہ بھی بناتا، اس میں اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا۔ جاگیر اور جائیداد اصل قیمت سے آدی قیمت پر فروخت ہوئیں اور نصف قرضوں کی ادائیگی ابھی باقی تھی۔ جن قرضوں کو وہ جائز گردانتا تھا، ان کو بے باق کرنے کے لیے اس نے اپنے بہنوئی برزخوف کی طرف سے تیس ہزار روبل کی رقم کی پیشکش قبول کر لی۔ اور باقی ماندہ قرضوں کی عدم ادائیگی کی بنا پر جیل بھیجے جانے کے امکان سے بچنے کے لیے جیسا کہ قرض خواہ دھمکیاں دے رہے تھے اس نے دوبارہ سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔

فوج میں، جہاں پہلی اسامی خالی ہونے پر اسے کرنل کے عہدے پر فائز کر دیا جاتا، واپس جانا خارج از بحث تھا کیونکہ اس کی ماں اسے زندگی کا آخری سہارا سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی۔ چنانچہ اس امر کے باوجود کہ اسے ماسکو میں ان لوگوں کے مابین، جو بھلے دنوں میں اس سے ملتے ملاتے رہتے تھے، رہنے میں تامل تھا اور سول ملازمت سے نفرت تھی، اس نے ماسکو کے ایک سرکاری محکمے میں عہدہ قبول کر لیا، اپنی وردی، جو اسے جی جان سے پیاری تھی، اتار کر ایک طرف رکھ دی اور اپنی ماں اور سونیا کے ساتھ شہر کے ایک نسبتاً مفلوک الحال محلے کے چھوٹے سے مکان میں اٹھ آیا۔

اس زمانے میں نتاشا اور پیئر پیٹرزبرگ میں رہائش پذیر تھے اور انھیں نکولائی کے حالات کا واضح طور پر کوئی خاص علم نہیں تھا۔ اپنے بہنوئی سے رقم ادھار لینے کے بعد نکولائی نے اپنی مفلسی اور تنگ دستی کو، جو اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی تھیں، ان سے چھپانے کی پوری کوشش کی تھی۔ اس کے حالات کی ابتری کی ایک وجہ اور بھی تھی۔ اسے اپنی بارہ سو روبل کی تنخواہ میں نہ صرف اپنا گزارہ کرنا اور سونیا کے اخراجات برداشت کرنا تھے بلکہ اپنی ماں کی ضروریات کا کچھ اس طور خیال رکھنا تھا کہ اسے ان کی غربت کا کوئی احساس نہ ہو سکے۔ کاؤنٹس پر تعیش اشیا کے بغیر، جن کی وہ بچپن سے عادی تھی، زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے بیٹے کی مشکلات کا اندازہ لگائے بغیر وہ مسلسل کسی دوست کو بلانے کے لیے گاڑی (جس کا رکھنا اب ان کے بس میں نہیں رہا تھا)، اپنے لیے کھانے کی کوئی مزیدار چیز، اپنے

بیٹے کے لیے ے انگوریا تماشا، سونیا یا خود نکولائی کے لیے کوئی خلافِ توقع تحفہ خریدنے کے لیے رقوم کے مطالبات کرتی رہتی تھی۔

سونیا گھر کا کام کاج کرتی تھی، اپنی خالہ کی خدمت کرتی تھی، اس کے ناز اٹھاتی تھی، اس کے ان کہے بغض وعداوت کو برداشت کرتی تھی اور بوڑھی کاؤنٹس سے خاندان کی غربت چھپانے کے لیے نکولائی کی مدد کرتی تھی۔ سونیا نکولائی کی ماں کے لیے جو کچھ کر رہی تھی، اس کے لیے وہ اپنے آپ کو اس کا زیرِ احسان تصور کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ اس کی تلافی کیسے کرے گا۔ وہ اس کے صبر و تحمل، خلوص اور اندھے پیار کی قدر تو کرتا تھا لیکن اس سے دور رہنے کی کوشش بھی کرتا تھا۔

معلوم ہوتا تھا کہ وہ دل ہی دل میں اسے ملامت کرتا رہتا ہے کیونکہ اس کا طرزِ عمل اتنا بے عیب تھا کہ اسے کسی طور برا بھلا نہیں کہا جا سکتا تھا۔ جن اوصاف کی بنا پر لوگوں کو عزت و احترام کا مستحق ٹھہرایا جاتا ہے، وہ اس میں بدرجۂ اتم موجود تھے لیکن یہ بھی اسے اس سے محبت کرنے پر آمادہ نہ کر سکے۔ اسے ہر دم یہی محسوس ہوتا رہتا کہ وہ اس کی جتنی زیادہ قدر کرتا ہے، اس سے اس کی محبت اتنی ہی کم ہوتی جاتی ہے۔ جب اس نے اسے خط لکھا تھا اور اپنی طرف سے تمام بندھنوں سے آزاد کر دیا تھا، اس نے اس کے الفاظ کو لغوی معنوں میں لے لیا تھا اور اب اس کا رویہ کچھ اس قسم کا ہو گیا تھا، جیسے ان دونوں کے مابین جو کچھ بیتا تھا، وہ زمانہ قدیم کی کوئی بھولی بسری بات ہو اور کسی صورت میں بھی اس کی تجدید نہیں ہو سکتی۔

نکولائی کے حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے تھے۔ اپنی تنخواہ میں سے کچھ پس انداز کرنے کی امید نقش بر آب ثابت ہو رہی تھی۔ بچت کرنا تو دور کی بات تھی، الٹا اسے اپنی ماں کی فرمائشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے چھوٹے موٹے قرضے اٹھانا پڑ رہے تھے۔ اسے اس مصیبت سے چھٹکارے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ کسی متموّل خاتون سے شادی کرنے کے تصور ہی سے، جیسا کہ اسے اس کی رشتے دار خواتین سمجھاتی رہتی تھیں، اسے گھن آتی تھی۔ نجات کی دوسری صورت ـــ اس کی ماں کی موت ـــ اس کے کبھی ذہن میں نہ آئی۔ اسے کسی چیز کی آرزو نہیں رہی تھی، کسی چیز کی امید نہیں رہی تھی اور زبان پر شکوہ شکایت لائے بغیر اپنے حالات کو برداشت کر کے اسے اپنے قلب کی گہرائیوں میں ایک نوع کی سنگین اور پر ملال تسکین کا تجربہ ہوتا رہتا تھا۔ وہ اپنے پرانے دوستوں سے، جو اس سے ہمدردی جتاتے اور امداد کی کرب ناک پیشکشیں کرتے رہتے تھے، کنی کترانے کی کوشش کرتا تھا، ہر قسم کی تفریحات اور کھیل تماشوں سے دور بھاگتا تھا، اور گھر میں بھی اپنی ماں کے ساتھ تاش کی بازی لگانے، خاموشی سے کمرے میں چکر کاٹنے اور ایک کے بعد دوسرا پائپ پینے کے علاوہ اور کچھ نہیں کرتا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی اداسی اور آزردگی کو برقرار رکھنے کے لیے نہایت حزم و احتیاط سے داخلی جنگ لڑ رہا ہے اور صرف یہی چیز اسے اپنے گمبھیر حالات سے عہدہ برآ ہونے میں اس کی مدد کر رہی تھی۔

6

جاڑوں کے آغاز پر نسس ماریا ماسکو آ گئی۔ شہر میں جو افواہیں اور خبریں گردش کر رہی تھیں، ان میں سے اسے رستوفوں کے حالات سے آگاہی ہوئی اور اسے یہ بھی معلوم ہوا کہ کس طرح بیٹا، جیسا کہ لوگ کہہ رہے ہیں، ''اپنی ماں کی خاطر سولی پر ٹنگا ہوا ہے۔''

''مجھے ان سے بالکل اسی چیز کی توقع تھی،'' پرنسس ماریا نے اپنے آپ سے کہا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے اس سے جو محبت ہے، اس سے اس کی توثیق ہوگئی ہے اور اس پر وہ بے حد مسرور تھی۔ اس کی رستوفوں کے ساتھ جو بے تکلفی تھی اور جس نے اسے تقریباً ان کے گھر کا ایک فرد بنا دیا تھا، اسے ذہن میں لاتے ہوئے اس نے فیصلہ کیا کہ ان سے ملاقات کرنا اس کا فرض بنتا ہے لیکن جب اسے وارانیژ میں نکولائی کے ساتھ اپنے تعلقات کی نوعیت یاد آئی، وہ وسوسوں میں گھر گئی اور اسے ان کے ہاں جانے کے خیال سے وحشت ہونے لگی۔ تاہم ماسکو میں اپنی آمد کے چند ہفتے بعد وہ ان سے ملنے چلی گئی حالانکہ اس کے لیے اسے اپنی طبیعت پر جبر کرنا پڑا تھا۔

سب سے پہلے اس کی نکولائی سے علیک سلیک ہوئی کیونکہ اس کے کمرے میں سے گزرے بغیر کاؤنٹس کے کمرے میں جانا ناممکن تھا۔ پرنسس ماریا کو توقع تھی کہ اس سے مڈھ بھیڑ ہوتے ہی وہ کھل اٹھے گا لیکن اس پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر سرد مہری، روکھا پن اور نخوت جھلکنے لگی۔ اس نے اس سے پہلے اسے اس کیفیت میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اس سے اس کی خیر خیریت دریافت کی، اسے اپنی ماں کے کمرے میں لے گیا اور ابھی انھیں وہاں بیٹھے پانچ منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ اٹھ کر باہر چلا آیا۔

جب پرنسس کاؤنٹس کے کمرے سے برآمد ہوئی، نکولائی نے ایک بار پھر اس کا نمایاں طور پر رسمی اور لیے دیئے انداز سے استقبال کیا اور اسے دروازے تک پہنچانے باہر آیا۔ جب اس نے اس کی ماں کی صحت کے بارے میں کوئی بات کی، اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ ''اس سے تمھیں کیا؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو،'' اس کی نظریں کہتی دکھائی دے رہی تھیں۔

''آخر یہ یہاں کیا ٹوہ لگاتے پھر رہی ہے؟ یہ چاہتی کیا ہے؟ مجھ سے یہ mesdames* اور ان کی مروتیں قطعاً برداشت نہیں ہوتیں!'' اس نے سونیا کی موجودگی میں باآواز بلند کہا۔ صاف نظر آرہا تھا کہ پرنسس کی گاڑی کی روانگی کے بعد اسے اپنی جھنجھلاہٹ پر قابو پانے میں مشکل پیش آرہی ہے۔

''اف نکولس، آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' سونیا نے قدرے بلند آہنگ لہجے سے کہا۔ ویسے اس کے دل میں لڈو پھوٹ رہے تھے اور اس سے اپنی مسرت چھپائے چھپ نہیں رہی تھی۔ ''وہ اتنی نیک دل ہیں اور maman**

---

* بیگمات۔ mesdames مادام کی جمع ہے اور بعض اوقات غیر شادی شدہ خواتین کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

** اماں۔

ان پر اتنے صدقے واری ہوتی رہتی ہیں!''

نکولائی نے کوئی جواب نہ دیا اور پرنس کے دوبارہ ذکر سے احتراز کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ تاہم اس کی آمد کے بعد بوڑھی کاؤنٹس ہر روز اس کا بار بار تذکرہ لے بیٹھتی۔

وہ اس کی تعریفوں کے پل باندھتی، اپنے بیٹے سے اصرار کرتی کہ اسے لازماً اس سے ملنے جانا چاہیے اور خود بھی اس سے ملاقات کی خواہش کا بار بار اظہار کرتی لیکن وہ جب بھی اس کا نام زبان پر لاتی، اس کا مزاج ہمیشہ برہم ہو جاتا۔

جب نکولائی کی والدہ پرنس کا ذکر چھیڑتی، وہ خاموش رہنے کی کوشش کرتا اور اس کی یہ خاموشی اسے برافروختہ کر دیتی۔

''وہ بہت لائق فائق اور قابل تعریف نوجوان خاتون ہے،'' وہ کہا کرتی۔ ''تمھیں اس کے ہاں جانا اور اس سے ملاقات کرنا چاہیے۔ اس سے تمھیں کم از کم کسی شخص سے تو ملنے ملانے کا موقعہ میسر آ جائے گا۔ میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ صرف ہماری شکلیں دیکھ دیکھ کر تم لازماً بور ہونے لگے ہو گے۔''

''مگر، ماما، میں لوگوں سے قطعاً ملنا ملانا نہیں چاہتا۔''

''تمھیں تو لوگوں سے میل ملاپ کا بڑا شوق ہوتا تھا اور اب صرف ایک ہی رٹ لگائے جا رہے ہو: 'میں کسی سے ملنا ملانا نہیں چاہتا۔' مائی ڈیئر، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم آخر چاہتے کیا ہو؟ گھڑی میں تم بور ہو جاتے ہو اور گھڑی میں پکارنے لگتے ہو کہ تمھیں لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں۔''

''پر میں نے تو کبھی نہیں کہا کہ میں بور ہو رہا ہوں۔''

''خیر، تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ تم اس کی صورت بھی دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ بہت اچھی لڑکی ہے اور تم اس کے ہمیشہ گرویدہ رہے ہو۔ اب پتا نہیں کہ اچانک تمھارے دماغ میں کیا خناس گھس گیا ہے۔ تم مجھ سے باتیں چھپاتے رہتے ہو۔''

''نہیں، ماما، بالکل نہیں۔''

''اگر میں تمھیں کوئی ناگوار کام کرنے کو کہتی تو۔ لیکن میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ تمھیں جواباً اس کے گھر ضرور جانا چاہیے۔ خیر، میرا خیال ہے کہ محض شائستگی کا تقاضا یہی ہے... اچھا، مجھے جو کچھ کہنا تھا، میں نے کہہ دیا ہے، اب میں مزید ایک لفظ بھی نہیں کہوں گی کیونکہ اب تم اپنے راز اپنی ماں سے بھی چھپانے لگے ہو۔''

''بہت اچھا، اگر آپ کی یہی خواہش ہے، میں چلا جاؤں گا۔''

''خیر، میرے لیے یہ کوئی اہم بات نہیں ہے۔ میں تو صرف تمھارے بھلے کا سوچ رہی ہوں۔''

نکولائی نے آہ بھری، دانتوں سے مونچھوں کو کاٹا اور اپنی ماں کی توجہ کسی دوسری چیز کی طرف مبذول کرانے کے لیے (تاش کے کھیل) پیشنس کے لیے پتے بچھا دیے۔

یہی گفتگو اگلے روز، اس سے اگلے روز اور پھر اس سے اگلے روز دہرائی گئی۔

رستوفوں کے ہاں چکر لگانے اور غیر متوقع طور پر نکولائی کے سرد مہر رویے کا سامنا کرنے کے بعد پرنس ماریا نے اپنے آپ سے اعتراف کیا کہ وہ ملاقات کے لیے پہل نہ کرنے کی خواہش میں حق بجانب تھی۔

''مجھے اس کے علاوہ کسی اور چیز کی توقع ہی نہیں تھی،'' اس نے اپنی مدد کے لیے اپنے پندار کو آواز دیتے ہوے کہا۔ ''میرا اس سے کوئی تعلق واسطہ نہیں، میں تو محض بزرگ کاؤنٹس سے، جو ہمیشہ مجھ پر مہربان رہی ہیں اور جن کے میں بے شمار احسانات کے بوجھ تلے دبی ہوئی ہوں، ملنے گئی تھی۔''

لیکن اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے اس کے دل کو تسلی نہ ہوئی۔ وہ جب کبھی اس ملاقات کے متعلق سوچتی، پشیمانی سے ملتا جلتا جذبہ اس کے دل کی کلی کو کملا دیتا۔ اگر چہ وہ اپنے نہاں خانۂ قلب میں تہیہ کر چکی تھی کہ وہ کبھی دوبارہ رستوفوں کے گھر کا رخ نہیں کرے گی اور اس سارے معاملے کو فراموش کر دے گی، اسے ہر دم یہی محسوس ہوتا رہتا کہ وہ کڈھب اور گول مول صورت حال میں پھنس گئی ہے۔ جب وہ اپنے آپ سے پوچھتی کہ آخر اسے پریشانی کس بات کی ہے، وہ یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتی کہ اس کا باعث اس کی رستوف سے ملاقات ہے۔ ''انھوں نے میرے ساتھ جور کمی اور سرد مہر رویہ اپنایا، اس کا ان کے میرے متعلق جذبات سے کوئی تعلق نہیں (اس کا مجھے یقین ہے) بلکہ اس کی تہہ میں کوئی اور بات پوشیدہ ہے۔ یہ بات کیا ہے، مجھے اس کا سراغ لگانا ہوگا ورنہ مجھے سکون نہیں مل سکے گا۔''

ایک روز بیچ جاڑوں میں جب وہ سٹڈی روم میں بیٹھی اپنے بھتیجے کے اسباق کی نگرانی کر رہی تھی، اسے اطلاع بہم پہنچائی گئی کہ رستوف ملنے آیا ہے۔ یہ خبر سن کر اس نے پختہ عزم کر لیا کہ وہ کسی طور نہ تو اپنے دل کی کیفیت ظاہر ہونے دے گی اور نہ کسی قسم کے اضطراب کو اپنے قریب پھٹکنے دے گی۔ اس نے مادموزیل بوغین کو بلایا اور اس کے ساتھ نیچے ڈرائنگ روم میں چلی گئی۔

وہ رستوف کے چہرے کو اولین سرسری نگاہوں سے دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ محض شائستگی کے تقاضے پورے کرنے کے لیے آیا ہے اور اس نے تہیہ کر لیا کہ وہ اس کے ساتھ جس لہجے میں بات کرے گا، وہ خود بھی وہی اختیار کرے گی۔

وہ کاؤنٹس کی صحت، مشترکہ دوستوں اور واقف کاروں اور جنگ کی تازہ ترین خبروں کے متعلق تبادلۂ خیالات کرتے رہے اور جب مجلسی آداب کے تقاضوں کے مطابق دس منٹ گزر گئے جب مہمان رخصت ہو سکتا ہے، نکولائی خدا حافظ کہنے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

پرنس نے مادموزیل بوغین کے تعاون سے گفتگو کا مرحلہ اچھی خاصی کامیابی سے طے کر لیا تھا لیکن عین آخری لمحے پر، جب نکولائی جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہو گیا تھا، وہ اس قسم کی باتیں کر کے جن میں اسے نام کو بھی دلچسپی نہیں تھی، اتنا تھک چکی تھی اور یہ سوچ رہی تھی کہ آخر زندگی میں اتنی کم خوشی صرف اسی کے حصے میں کیوں آئی ہے، کہ اس پر غائب دماغی نے غلبہ پا لیا اور وہ اپنی جگہ بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کی درخشاں آنکھیں ٹکٹکی باندھے سامنے دیکھ رہی تھیں اور اسے یہ اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا ہے۔

نکولائی نے اچٹتی نگاہوں سے اسے دیکھا اور یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ اس نے اس کے استغراق کو دیکھا ہی نہیں، اس نے مادموزیل بوغین سے کچھ کہا اور ایک بار پھر طائرانہ نظریں پرنسس ماریا پر ڈالیں۔ وہ یوں ہی تو بے حس و حرکت بیٹھی تھی اور اس کے نرم و شفیق چہرے سے گہرے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسے یک دم اس پر ترس آ گیا اور اسے مبہم سا احساس ہونے لگا کہ اس کے چہرے پر جو دکھ جھلک رہا ہے، اس کا باعث شاید وہ خود ہی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس کی مدد کرے، اس سے کوئی خوشگوار بات کہے لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہے تو کیا کہے۔

''پرنسس، خدا حافظ!'' اس نے کہا۔

وہ ہڑبڑا گئی، اس کا چہرہ سرخ ہو گیا اور اس نے لمبی آہ بھری۔

''اوہ، معافی چاہتی ہوں،'' اس نے یوں کہا جیسے وہ ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوئی ہو۔ ''کاؤنٹ، آپ چل بھی دیے!...اچھا، پھر خدا حافظ! اوہ، کاؤنٹس کا کُشن...''

''ایک منٹ ٹھہریں، میں ابھی لاتی ہوں،'' مادموزیل بوغین نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے اور کبھی کبھار اچٹتی نگاہوں سے ایک دوسرے کو دیکھ لیتے۔

''جی، پرنسس۔'' نکولائی نے آخر کار اداس انداز سے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہماری باگوچارافو میں جو پہلی ملاقات ہوئی تھی، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ کل کی بات ہو۔ لیکن تب سے پلوں کے نیچے کتنا ہی پانی بہہ چکا ہے! اس وقت ہم سب کو یہی محسوس ہوتا تھا کہ ہم پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہیں۔ تاہم جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے، میں اس وقت کو واپس بلانے کے لیے کیا کچھ دینے کو تیار نہیں ہوں!...لیکن اسے بلانا ناممکن ہے۔''

پرنسس کی درخشاں آنکھیں اس کے چہرے پر مرکوز تھیں اور وہ اسے بغور دیکھ رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کے الفاظ کا ڈھکا چھپا مفہوم سمجھنے کی کاوش کر رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کے اس کے اپنے بارے میں کیا جذبات ہیں۔

''جی ہاں،'' اس نے کہا۔ ''لیکن کاؤنٹ، آپ کے پاس ماضی پر آنسو بہانے کی کوئی وجہ نہیں۔ جہاں تک میں آپ کی موجودہ زندگی کا اندازہ لگا سکی ہوں، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ آپ اسے یاد کر کے مطمئن ہو جاتے ہوں گے کیونکہ آپ نے ایثار و قربانی کی جو روش...''

''مجھے آپ کی تحسین قبول نہیں،'' اس نے اچانک اسے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''اس کے برعکس میں تو ہر دم اپنے آپ کو ملامت کرتا رہتا ہوں۔ خیر، یہ کسی لحاظ سے بھی دلچسپ یا خوش آئند موضوع نہیں۔''

اس کے چہرے پر دوبارہ وہی سرد مہری اور روکھا پن جھلکنے لگا۔ لیکن پرنسس ماریا نے اس شخص کی، جسے وہ جانتی تھی اور جس سے وہ پیار کرتی تھی، ایک جھلک دیکھ لی تھی۔ چنانچہ جو کچھ وہ اب کہہ رہی تھی، اسی شخص سے کہہ رہی تھی۔

''میرا خیال تھا کہ آپ مجھے یہ کہنے کی اجازت دے دیں گے،'' اس نے کہا۔ ''آپ اور میں۔ آپ کا خاندان اور میں ایک دوسرے کے اتنا قریب آ گئے تھے کہ مجھے خیال آیا کہ آپ میری ہمدردی کو بے محل تصور نہیں کریں گے،

لیکن میں غلطی پر تھی۔'' اور ایکا ایکی اس کی آواز کپکپانے لگی۔ ''مجھے معلوم نہیں کہ کیوں'' اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے کہا، ''لیکن آپ بالکل مختلف نظر آتے ہیں اور...''

''کیوں: کی ایک ہزار ایک وجوہ ہوسکتی ہیں۔'' اس نے لفظ ''کیوں'' پر خاص زور دیتے ہوئے کہا۔ ''پرنس، آپ کا شکریہ۔'' اس نے ملائمت سے مزید کہا۔ ''بعض اوقات بڑی مشکل پیش آجاتی ہے۔''

''تو یہ ہے کیوں! تو یہ ہے کیوں!'' کسی باطنی آواز نے پرنس ماریا سے کہا۔ ''مجھے ان سے جو محبت ہوئی تھی، وہ ان کی محض خوش باش، شفیق اور بے ریا آنکھوں اور چہرے اور ان کی ظاہری وجیہ شکل وصورت سے ہی نہیں ہوئی تھی بلکہ میں نے ان کی عالی منش، پرعزم اور ایثار کیش روح کو بھی پہچان لیا تھا،'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ ''یہ اب مفلوک الحال ہیں اور میں متمول... ہاں، یہی واحد وجہ ہے... ہاں، اگر یہ بات نہ ہوتی...'' اور اس کے سابقہ نرم و ملائم انداز کو یاد کرتے اور اس کے شفیق اور غم آلود چہرے کو دیکھتے ہوئے اسے یک لخت اس کی سرد مہری کا سبب معلوم ہوگیا۔

''لیکن، کاؤنٹ، کیوں، آخر کیوں؟'' اس نے لاشعوری طور پر اس کے قریب کھسکتے ہوئے باآواز بلند پوچھا۔ ''مجھے بتائیں، لازماً بتائیں!''

وہ چپ تھا۔

''کاؤنٹ، میں آپ کی یہ کیوں نہیں سمجھ سکی،'' اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن میرا دل بہت بوجھل ہے... مجھے اس کا اعتراف کرنے میں کوئی باک نہیں۔ آخر کوئی وجہ تو ہوگی جو آپ مجھے اپنی سابقہ رفاقت سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اسی چیز سے میرے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے۔'' اس کی آواز رندھ رہی اور اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ ''زندگی میں میرے حصے میں اتنی کم خوشیاں آئی ہیں کہ کوئی ضیاع بھی میری برداشت سے باہر ہے... میں معافی چاہتی ہوں، خدا حافظ!'' اچانک بند ٹوٹ گئے، اس کی آنکھوں سے اشکوں کا سیل رواں ہوگیا اور وہ دروازے کی جانب چل پڑی۔

''پرنس، ٹھہریں، خدا کے لیے!'' وہ اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے چلایا ''پرنس!''

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ چند سیکنڈ پتھر کے بت بنے ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکتے رہے اور وہ، جو ناممکن اور دور دراز معلوم ہوتا تھا، ایکا ایکی ممکن، اٹل اور بہت قریب دکھائی دینے لگا۔

7

1814 کے جاڑوں میں نکولائی نے پرنس ماریا سے شادی کر لی اور اپنی ماں، بیوی اور سونیا کے ساتھ بالڈ ہلز منتقل ہوگیا۔

اپنی بیوی کی جائیداد کا معمولی سے معمولی حصہ فروخت کیے بغیر اس نے چار سالوں میں اپنے تمام قرضے بے باق

کردیے۔ اپنے ایک کزن کے انتقال پر اسے اس کی وراثت میں سے کچھ حصہ موصول ہوگیا اور اس نے پیئر کا ادھار بھی واپس کر دیا۔

مزید تین برسوں کے دوران میں اس نے اپنے معاملات کچھ اس خوبی سے سلجھائے کہ وہ 1820 میں بالڈہلز سے ملحق ایک نسبتاً چھوٹا فارم خریدنے میں کامیاب ہوگیا اور اپنی اترادنایا کی آبائی جاگیر کے دوبارہ حصول کے لیے، جس کا وہ ہر دم خواب دیکھتا رہتا تھا۔ گفت وشنید شروع کر چکا تھا۔

اس نے جاگیر کا انتظام وانصرام ضرورت کے تحت سنبھالا تھا لیکن قلیل مدت میں اسے فارمنگ کا کچھ ایسا چسکا پڑ گیا کہ یہ اس کی پسندیدہ اور تقریباً واحد مصروفیت بن گئی۔

نکولائی سیدھا سادا کسان تھا۔ اسے جدتوں سے، خاص طور پر وہ جو انگلستان سے آرہی اور رواج پا رہی تھیں، کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ زراعت کے متعلق نظری رسالوں اور کتابچوں کا مذاق اڑاتا۔ اسے گھریلو فیکٹریاں قائم کرنے، پیداوار کے مہنگے طریقے اختیار کرنے اور قیمتی بیج خریدنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اپنے آپ کو زراعت کے کسی خاص شعبے تک محدود نہ کرتا۔ وہ کسی ایک حصے کا نہیں بلکہ مجموعی طور پر سارے فارم کا مفاد پیش نظر رکھتا۔ اس کے خیال میں اہم ترین چیز زمین کی نائٹروجن، فضا کی آکسیجن، خاص قسم کے آلاتِ کشاورزی یا قدرتی کھادیں نہیں تھیں بلکہ وہ کسان تھے جو زمین پر کام کرتے تھے۔ جب نکولائی نے فارمنگ کا کام سنبھالا اور اس نے اس کے مختلف شعبوں کا جائزہ لینا شروع کیا، یہ کسان تھا جس پر اس نے خصوصی توجہ مبذول کی۔ اس کی نظر میں کسان محض آلہ نہیں تھا بلکہ وہ خود اپنی علت غائی اور اس کا حَکم تھا۔ شروع شروع میں اس نے کسانوں کا بہ نظرِ عمیق مطالعہ کیا اور یہ سمجھنے کی کوشش کرتا رہا کہ وہ چاہتے کیا ہیں اور ان کے نزدیک کام کرنے کے بہترین طریقے کیا ہیں۔ وہ جھوٹ موٹ تو یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ انھیں احکام وہدایات دے رہا ہے جب کہ فی الحقیقت وہ ان سے ان کے طور طریقے، ان کی گفتگو کے ڈھنگ اور اچھائی اور برائی کے بارے میں ان کے پیمانے معلوم کر رہا اور انھیں اپنے اندر جذب کر رہا ہوتا تھا۔ جب اسے کسانوں کے اطوار اور آرزوؤں سے آشنائی ہوگئی، جب اس نے ان کی زبان میں گفتگو کرنا اور ان کے الفاظ کے ڈھکے چھپے معانی اخذ کرنا سیکھ لیا اور یوں جب وہ اپنے آپ کو ان جیسا محسوس کرنے لگا، صرف تبھی وہ ان کے ساتھ پورے اعتماد سے نپٹنے لگا۔ بہ الفاظ دیگر ان کی طرف سے اس پر جو فرائض عائد ہوتے تھے، انھیں نبھانے لگا۔ اور نکولائی کے نظم ونسق کے نہایت شاندار نتائج برآمد ہوئے۔

املاک کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد اس نے کسی خداداد بصیرت کے طفیل فی الفور اور بے خطا انداز سے بالکل انھیں اشخاص کو بیلف، گاؤں کے نمبردار اور نمائندے مقرر کیا کہ اگر کسانوں کو اپنی مرضی کا اختیار ہوتا، وہ بھی انھیں کو منتخب کرتے اور ان لوگوں کو تبدیل کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی۔ کھاد کی کیمیاوی خصوصیات کا تجربہ کرنے اور آمدنی واخراجات (وہ حساب کتاب کا ذکر طنزیہ انداز سے کیا کرتا تھا) کے تخمینے لگانے سے قبل اس نے یہ معلوم کیا کہ کسانوں کے پاس مویشی کتنے ہیں اور اس نے تمام ذرائع سے ان کی تعداد میں اضافہ کیا۔ وہ کسانوں کے

خاندان کو منقسم نہیں ہونے دیتا تھا بلکہ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ حتی الامکان مل جل کر رہیں۔ وہ کاہل الوجود، عیاش، بدکردار اور کمزور لوگوں کے ساتھ سختی سے پیش آتا تھا اور انھیں برادری سے خارج کرنے کے لیے کوشاں رہتا تھا۔

اسے کسانوں کے چارے اور غلے کی فصلوں کی بوائی اور کٹائی کی اتنی ہی چنتا رہتی تھی جتنی کہ خود اپنی فصلوں کی۔ اور بہت کم ایسے زمیندار تھے جو اپنی فصلوں کی بوائی اور کٹائی اتنی جلدی یا اتنے منافع بخش طریقے سے کرتے تھے جتنا کہ وہ۔

اسے گھریلو ملازمین کے، جنھیں وہ ''نرمگس'' کہتا تھا، معاملات میں دخل اندازی ناپسند تھی اور ہر شخص یہ کہتا تھا کہ وہ انھیں ڈھیل دے کر ان کی عادات بگاڑ رہا ہے۔ جب کسی گھریلو غلام کے متعلق کوئی فیصلہ، خاص طور پر اسے سزا دینے کا معاملہ، درپیش ہوتا، وہ ہمیشہ ڈانوں ڈول رہتا اور گھر میں ہر شخص کی رائے طلب کرنے لگتا۔ لیکن جب کسی کسان کی جگہ کسی گھریلو غلام کی فوج میں جبری بھرتی ممکن ہوتی، وہ ذرا بھی حیص بیص کا مظاہرہ نہ کرتا۔ جہاں تک کسانوں سے عہدہ برآ ہونے کا تعلق ہے، وہ پورے اعتماد کے ساتھ ان سے بات کرتا اور کسی معاملے میں بھی کسی قسم کی ہچکچاہٹ نہ دکھاتا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ جو حکم بھی دے گا، چند ایک کے علاوہ اسے باقی سب کی رضامندی حاصل ہو جائے گی۔

وہ ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر کسی شخص سے سختی کرتا تھا، نہ اسے سزا دیتا تھا اور نہ من کی موج میں آ کر کسی سے نرمی برتتا تھا یا اسے انعام و اکرام سے نوازتا تھا۔ وہ یہ تو نہیں بتا سکتا تھا کہ ''کیا کرنا چاہیے یا کیا نہیں کرنا چاہیے'' کے ماپنے کا اس کے پاس پیمانہ کیا ہے لیکن اس کے دل و دماغ میں اس کے بارے میں کوئی الجھاؤ نہیں تھا اور وہ مستقل مزاجی سے اس کے مطابق عمل کرتا تھا۔

جب اسے کسی ناکامی یا بے قاعدگی پر غصہ آتا، وہ کہا کرتا: ''یہ ہمارے روسی کسان...'' اور تصور کرنے لگتا کہ وہ انھیں برداشت نہیں کر سکتا۔

تاہم وہ ''ہمارے ان روسی کسانوں'' سے بہ دل و جان محبت کرتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نہ صرف ان کے طور طریقے سمجھنے میں کامیاب رہا بلکہ اس نے فارمنگ کے وہ طریقے بھی اختیار کر لیے جو منفعت بخش تھے۔

کاؤنٹس ماریا اپنے شوہر کے اس بے پایاں شوق کو اپنا رقیب تصور کرتی تھی۔ اسے ملال اس بات کا تھا کہ وہ اس میں اس کی ساجھے دار نہیں بن سکتی۔ یہ دنیا اس کے لیے بہت اجنبی اور دور دراز تھی۔ چنانچہ اس کے شوہر کو جو مسرتیں اور کلفتیں ملتی تھیں، وہ ان کی تفہیم کرنے سے قاصر تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ تڑکے تڑکے اٹھنے اور ساری صبح کھیتوں یا کھلیانوں میں فصلوں کی بوائی، کٹائی یا گہائی کرنے کے بعد جب وہ اس کے ساتھ چائے پینے آتا ہے تو وہ اتنا خوش، تیز طرّار اور جوشیلا کیوں نظر آنے لگتا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ماتوی ارمیتین جیسے کفایت شعار اور کھاتے پیتے کسان کی، جو اپنے گھر والوں کے ساتھ ساری ساری رات پُولے ڈھوتا رہتا تھا، تعریفوں کے پل کیوں باندھتا ہے یا جب یہ بتاتا ہے کہ خود اس نے دوسروں سے، بہت پہلے اپنے پُولے خرمن میں

اکٹھے کر لیے ہیں، تو اس پر وجد آفریں مسرت کیوں طاری ہو جاتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جب جئی کے نوخیز پودوں پر، جو گرمی میں جل بھن رہے ہوتے ہیں اور عطش عطش پکار رہے ہوتے ہیں، گرم اور بھاری برکھا برسنے لگتی ہے، وہ کھڑکی میں سے چھلانگ لگا کر اور برآمدے میں کھڑے ہو کر کیوں اپنی مونچھوں تلے مسکرانے اور خوشی سے آنکھیں جھپکانے لگتا ہے۔ اور یہ بات بھی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ جب گھاس یا فصل کی کٹائی یا گہائی کے دوران میں ہوائیں تہدید آمیز بادلوں کو اڑ کر دور لے جاتی ہیں اور وہ تمتماتے اور دھوپ میں جھلسے ہوئے چہرے، پسینہ بہاتے جسم اور جنتیانا اور افسنتین کی پتیوں اور بیجوں کی خوشبو سے مہکتے سر کے ساتھ گھر آتا ہے تو چہکتا ہوا کیوں کہتا ہے: ''خیر، اگر ایک دن اور مل گیا، میرا اور کسانوں کا غلہ محفوظ ہو جائے گا۔'' اور یہ چیز اس کے بالکل پلے نہیں پڑتی تھی کہ اپنی رقیق القلبی اور اس کی خواہشات کا پیشگی اندازہ لگانے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہونے کے باوجود وہ جب کسانوں یا ان کی بیویوں کی جانب سے، جو کسی کام سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اس سے سفارش کرانے کے درپے رہتی تھیں، اسے کوئی عرض داشت پیش کرتی ہے، تو وہ تقریباً ہٹیلا کیوں ہو جاتا ہے۔ نکولس، جس کا رویہ اس کے ساتھ اتنا محبت آمیز اور دوستانہ ہوتا ہے، آخر اتنی ہٹ دھرمی سے اس کی بات ماننے سے کیوں انکار کر دیتا ہے اور بڑی خفگی سے اس سے التجا کرنے لگتا ہے کہ ان معاملات سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ اس پھڈے میں اپنی ٹانگ نہ اڑایا کرے۔ وہ محسوس کرنے لگتی کہ اس کی اپنی ایک علیحدہ دنیا ہے جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتا ہے اور جس کے قوانین وضوابط اس کی سمجھ سے بالاتر ہیں۔

بعض اوقات اسے سمجھنے کی کوشش میں وہ اس کے ساتھ اس کے کام کے بارے میں گفتگو کرنے لگتی اور اسے بتاتی کہ وہ اپنے زرعی غلاموں کی فلاح و بہبود کے سلسلے میں کتنی کھکھیڑیں اٹھا رہا ہے، تو وہ جھنجھلا جاتا اور جواب دیتا: ''بالکل نہیں۔ اس قسم کی کوئی بات کبھی میرے ذہن میں نہیں آتی۔ میں ان کی بھلائی کے لیے ذرا بھی تردد نہیں کرتا! اپنے ہمسائے کے ساتھ نیکی کرنا وغیرہ — اونہہ، یہ سب رومانی خرافات اور بڑی بوڑھیوں کے روایتی احمقانہ توہمات ہیں! میں تو صرف یہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے بچوں کو کبھی کاسۂ گدائی نہ پکڑنا پڑے اور میری خواہش ہے کہ جب تک میں زندہ ہوں، ہمارے حالات میں کوئی کجی نہ آئے، وہ ڈھنگ سے چلتے رہیں۔ بس! اور اس مقصد کے لیے کڑا ڈسپلن اور نظام اپنانا نہایت ضروری ہے۔ بس اتنی سی بات ہے!'' وہ بڑے یقین واعتماد کے ساتھ اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہتا۔ ''اور ہاں، یہ مقصد تبھی حاصل ہو سکتا ہے اگر عدل وانصاف سے کام لیا جائے۔'' وہ اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے کہتا۔ ''کیونکہ اگر کسان ننگا بھوکا ہے اور اس کے پاس صرف ایک گھوڑا ہے اور وہ بھی مریل اور ضعیف و ناتواں پھر وہ اپنے لیے مفید ہے نہ میرے لیے۔''

اور اس میں کوئی شک نہیں کہ چونکہ نکولائی کبھی اس واہمے میں گرفتار نہیں ہوتا تھا کہ وہ نیکی کی خاطر دوسروں کے لیے کچھ کر رہا ہے، چنانچہ وہ جو کچھ کرتا تھا ہمیشہ بار آور ثابت ہوتا تھا۔ اس کی دولت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔ اڑوس پڑوس کے جاگیرداروں کے زرعی غلام آتے اور اس کے پاؤں پڑتے کہ وہ انھیں خرید لے اور اس کے

انتقال کے کافی عرصے گزرنے کے بعد بھی کسان اس کے نظم ونسق کا بڑے احترام سے ذکر کرتے رہے۔ ''وہ صحیح آقا تھے... کسانوں کی بہتری پہلے اور اپنی بعد میں۔ اور ہاں، وہ کسی قسم کی بے تکلفی یا رُورعایت کے قائل نہیں تھے.... ہاں، وہ صحیح آقا تھے۔''

8

جاگیر کے نظم ونسق کے سلسلے میں ایک بات یہ تھی جس سے وہ عاجز آچکا تھا، کہ غصہ اس کی ناک پر دھرا رہتا تھا اور اس کی گھونسوں کے آزادانہ استعمال کی پرانی عادت، جو اس نے ہوزاروں سے سیکھی تھی، جوں کی توں برقرار تھی۔ شروع شروع میں تو اسے اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی لیکن اپنی شادی کے دوسرے سال تادیب وسزا کے اس طریقے کے متعلق اس کی رائے اچانک تبدیل ہوگئی۔

گرمیوں کے دوران میں اس نے ایک روز باگوچارافو کے نمبردار کو بلایا۔ یہ شخص درون کے انتقال کے بعد اس اسامی پر تعینات ہوا تھا اور اس پر دھوکا دہی، بددیانتی اور بے قاعدگیوں کے متعدد الزامات تھے۔ نکولائی اس سے پوچھ گچھ کرنے پورچ میں چلا گیا اور نمبردار کے ابتدائی جوابات کے بعد گھونسوں اور چیخوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ جب وہ لنچ کرنے اپنی بیوی کے پاس آیا جو کشیدہ کاری کے فریم پر جھکی ہوئی تھی اور حسب معمول اسے اپنی دن بھر کی کارروائی بتانے لگا، اس نے دوسری باتوں کے علاوہ سرراہے باگوچارافو کے نمبردار کا بھی ذکر کردیا۔ کاؤنٹس ماریا کی رنگت پہلے تو سرخ ہوئی اور پھر پیلی پڑ گئی۔ وہ سر جھکائے اور ہونٹ بھینچے بیٹھی رہی، اور اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

''کیسا گستاخ بدمعاش ہے!'' وہ اس کا محض نام یاد آنے پر بھڑک اٹھا۔ ''اگر اس نے مجھے بتادیا ہوتا کہ وہ نشے میں مدہوش ہے اور اسے کچھ نظر نہیں آرہا۔ لیکن ماری، کیا بات ہے؟ تمھیں کیا ہوا؟'' اس نے اچانک پوچھا۔

کاؤنٹس ماریا نے اپنا سر جھکا لیا اور کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن اس نے عجلت سے اسے دوبارہ نیچے جھکا لیا اور اس کے ہونٹ ایک بار پھر بھینچ گئے۔

''جان من، کیا بات ہے؟''

کاؤنٹس ماریا کے جب بھی آنسو نکلتے، اس کی معمولی شکل وصورت حسین وجمیل نظر آنے لگتی۔ وہ درد یا جھنجلاہٹ کی حالت میں کبھی نہیں روتی تھی۔ اسے رونا صرف اس وقت آتا تھا جب اسے کوئی ملال ہوتا یا اسے کسی پر ترس آرہا ہوتا۔ اور جب وہ روتی تھی، اس کی درخشاں آنکھوں میں کچھ ایسی کشش پیدا ہو جاتی کہ بڑے بڑوں کے قلوب موم ہو جاتے اور انھیں اس کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہی بنتی۔

جب نکولس نے اس کا ہاتھ پکڑا، وہ اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکی اور زاروقطار رونے لگی۔

''نکولس، میں نے آپ کو دیکھا تھا۔ وہ غلطی پر تھا لیکن آپ۔ نکولس، آپ نے کیوں۔'' اور اس نے اپنا چہرہ

ہاتھوں میں چھپالیا۔

نکولائی چپ رہا لیکن اس کا چہرہ لالوں لال ہوگیا۔ وہ اس کے پہلو سے اٹھا اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ رو کیوں رہی ہے لیکن وہ فی الفور اپنے آپ کو اس کی رائے سے متفق نہیں کر اسکتا تھا کیونکہ جس چیز کا وہ بچپن سے عادی چلا آرہا تھا اور جو اس کے نزدیک روزمرہ کا معاملہ تھی، وہ اس کے نزدیک غلط ہو ہی نہیں سکتی تھی۔

''یہ نری جذباتیت ہے، بڑی بوڑھیوں کا خرافاتی توہم ہے یا وہ ٹھیک کہتی ہے؟'' وہ اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔ پیشتر اس کے اس مسئلے کا وہ خود کوئی فیصلہ کرسکتا، اس نے ایک بار پھر اس کے چہرے کو، جس پر حزن وملال اور محبت ٹپک رہی، سرسری نگاہوں سے دیکھا اور یک لخت اسے احساس ہوا کہ وہ ٹھیک کہتی ہے اور یہ کہ وہ خود ہی اپنے ساتھ زیادتی کا مرتکب ہورہا ہے۔

''ماری،'' اس نے اس کے قریب جاکر نرمی سے کہا، ''یہ حرکت دوبارہ کبھی نہیں ہوگی۔ میں وعدہ کرتا ہوں۔ کبھی نہیں۔'' اس نے کسی چھوٹے بچے کی طرح معافی مانگتے ہوئے دوبارہ کہا۔

کاؤنٹس ماریا کے آنسو تھے کہ تھمنے ہی نہیں تھے بلکہ اب ان کی روانی میں اور بھی اضافہ ہوگیا۔ اس نے اپنے شوہر کا ہاتھ پکڑا اور اسے چومنے لگی۔

''نکولس، یہ آپ کی انگوٹھی کا نقش کب ٹوٹا تھا؟'' اس نے موضوع تبدیل کرنے کے لیے کہا۔ وہ اپنے خاوند کی انگلی کی طرف دیکھ رہی تھی جس میں وہ انگوٹھی پہنے ہوئے تھا۔ اس انگوٹھی میں لے اوکُون[18] کے سر کا نقش آویزاں تھا۔

''آج صبح — اس وقت جب — اوہ، ماری، مجھے اس کی مت یاد دلاؤ!'' اور ایک بار پھر اس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ''میں تم سے پکا وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ یہ حرکت کبھی نہیں ہوگی۔ اور یہ مجھے ہمیشہ یاد دلاتی رہے گی۔'' اس نے شکستہ انگوٹھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

اور اس کے بعد جب کبھی دیہاتی نمبرداروں یا منیجروں سے گفتگو کے دوران میں نوبت گرماگرمی تک پہنچتی اور نکولائی کو اپنا خون جوش کھاتے محسوس ہوتا یا اس کی مٹھیاں بھنچنے لگتیں، وہ اپنی انگوٹھی مروڑنے لگتا اور اس شخص کے سامنے، جس نے اسے اشتعال دلایا ہوتا، اپنی نگاہیں جھکا لیتا، تاہم سال میں دو ایک مرتبہ وہ سب کچھ بھول بھال جاتا، پھر وہ رونی صورت بنائے اپنی بیوی کے پاس جاتا، اس کے سامنے (اپنی غلطی کا) اعتراف کرتا اور ایک بار پھر وعدہ کرتا: ''بس یہ آخری مرتبہ ہے، آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔''

''ماری، تم مجھے ضرور حقارت کی نظروں سے دیکھتی ہوگی۔ ٹھیک ہے نا؟'' وہ کہتا۔ ''میں ہوں ہی اس لائق۔''

''اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ اتنے مضبوط نہیں کہ اپنے اوپر قابو رکھ سکیں، پھر جتنی جلدی ہوسکے وہاں سے اٹھ جایا کریں اور کہیں اور چلے جایا کریں، کہیں اور چلے جایا کریں۔'' وہ اپنے شوہر کو تسلی دینے کے لیے غم گین لہجے سے جواب دیتی۔

صوبے کے شرفاء میں نکولائی کی عزت تو ہوتی تھی لیکن اسے پسند نہیں کیا جاتا تھا۔ وہ اپنے طبقے کے لوگوں

کی مقامی سیاست میں کوئی دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض کی نگاہوں میں وہ خود بین اور دوسروں کے نزدیک وہ احمق تھا۔ موسم بہار میں فصلوں کی بوائی سے لے کر موسم خزاں میں ان کی کٹائی تک اس کی ساری سرگرمیوں کا محور اس کی زمین ہوتی تھی۔ خزاں کے دوران میں وہ اسی باضابطہ سنجیدگی کے ساتھ شکار میں مصروف ہو جاتا اور ایک یا بعض اوقات دو ماہ کے لیے اپنے کتوں کے ساتھ باہر چلا جاتا۔ سردیوں میں وہ اپنی دوسری جاگیروں کا دورہ کرتا یا کتابیں پڑھ کر اپنا وقت گزارتا۔ وہ زیادہ تر تاریخی کتب کا مطالعہ کرتا اور ان کی خرید پر ہر سال مقررہ رقم صرف کرتا۔ جیسا کہ وہ کہا کرتا تھا، وہ ''سنجیدہ کتابوں کی لائبریری'' بنا رہا تھا اور اس نے یہ اصول وضع کر لیا تھا کہ وہ جو کتاب بھی خریدے گا، اس کا مطالعہ ضرور کرے گا۔ وہ متین صورت بنائے اپنی لائبریری میں بیٹھا پڑھتا رہتا۔ شروع میں اس نے اس کام کو اپنے اوپر بطور فرض عائد کیا تھا لیکن وقت کے ساتھ ساتھ یہ اس کی عادت بنتا گیا اور اسے اس میں خاص قسم کا لطف آنے لگا۔ اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ''سنجیدہ کام'' میں مشغول ہے۔ اپنے کاروباری دوروں کے ماسوا وہ سردیوں کا بیشتر وقت اپنے افرادِ خانہ کے ساتھ گھر پر گزارتا تھا۔ وہ خاندان کے ہر مشغلے اور بچوں کی اپنی ماں کے ساتھ مصروفیات میں برابر کا حصہ لیتا تھا۔ وہ بتدریج اپنی بیوی کے قریب تر ہوتا گیا اور اس کی ذات میں نت نئے اوصاف تلاش کر لیتا تھا۔

سونیا ان کی شادی کے وقت سے ہی ان کے ساتھ رہ رہی تھی۔ تاہم اس کے اور سونیا کے بیچ جو کچھ گزرا تھا، وہ شادی سے پہلے ہی اپنی بیوی اس کے متعلق بلا کم و کاست بتا چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو موردِ الزام ٹھہرایا، اپنی کزن کی بڑھ چڑھ کر تعریفیں کیں اور پرنسس ماریا سے التجا کی کہ وہ اس کے ساتھ پیار اور شفقت کا برتاؤ کرے۔ نکولائی نے سونیا کے ساتھ جو زیادتی کی تھی، کاؤنٹس ماریا کو اس کا پورا پورا احساس تھا اور وہ خود کو مجرم گردانتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس کی دولت نکولائی کے انتخاب پر اثر انداز ہوئی ہے۔ اسے سونیا میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی اور وہ اس کی گرویدہ ہونے کی بھرپور کوشش کرتی تھی لیکن کامیاب نہ ہو سکی۔ بلکہ اسے اکثر محسوس ہوتا کہ اس کے دل میں اس کے خلاف بغض اور عداوت ہے اور وہ اپنے اس جذبے کو جھٹک نہ سکی۔

ایک روز وہ اپنی سہیلی نتاشا سے سونیا اور اس کے ساتھ اپنے غیر منصفانہ رویے کے متعلق باتیں کر رہی تھی۔

''تمھیں معلوم ہے،'' نتاشا نے کہا، ''تم تو ہمیشہ انا جیل کی تلاوت کرتی رہتی ہو۔ ان میں ایک عبارت ہے اور یہ سونیا پر پوری طرح صادق آتی ہے۔''

''واقعی؟'' کاؤنٹس ماریا نے حیران ہو کر پوچھا۔

'''جس کے پاس ہے، اسے دیا جائے گا اور جس کے پاس نہیں ہے، اس کے پاس جو ہے، وہ بھی اس سے لے لیا جائے گا۔' یاد آیا؟ یہ وہ ہے جس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ کیوں؟ مجھے معلوم نہیں ہے۔ اس میں شاید انانیت کا فقدان ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے۔ لیکن اس سے لے لیا گیا ہے، سب کچھ لے لیا گیا ہے۔ مجھے بعض اوقات اس پر بے پناہ ترس آتا ہے۔ مجھے اس بات کی شدید فکر رہتی تھی کہ نکولس اس سے شادی کر لے گا لیکن میرا

ماتھا ہمیشہ ٹھنکتار ہتا تھا کہ ایسا ہوگا نہیں۔[19] وہ بے ثمر پھول ہے۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس طرح کے پھول سٹرابیری کے پودوں پر پائے جاتے ہیں۔ بعض اوقات اسے دیکھ کر مجھے بے حد دکھ ہوتا ہے اور بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ جس طرح میں یا تم محسوس کرتی ہو، وہ اس طرح محسوس ہی نہیں کرتی۔''

اگرچہ کاؤنٹس ماریا نے نتاشا کو سمجھایا تھا کہ اناجیل کی عبارت کا مفہوم کچھ اور ہے لیکن وہ اپنی سہیلی کی تشریح و تفسیر سے متفق ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ واقعتاً نظر یہی آتا تھا کہ سونیا کو اپنی پوزیشن تکلیف دہ معلوم نہیں ہوتی، وہ بے ثمر پھول کی طرح اپنی قسمت پر قانع تھی۔ کچھ یوں دکھائی دیتا تھا کہ اسے افرادِ خانہ کی بجائے بحیثیت مجموعی پورے خاندان سے زیادہ لگاؤ ہے۔ بلی کی طرح اس نے اپنے آپ کو افراد سے نہیں بلکہ گھر سے وابستہ کر لیا تھا۔ وہ کاؤنٹس کی خدمت کرتی، بچوں کے آگے پیچھے رہتی، ان سے چونچلے کرتی اور ان کی عادتیں بگاڑتی، اور ہمیشہ چھوٹے موٹے کام، جنھیں انجام دینے کا اسے خاص درک حاصل تھا، کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ لیکن اس کی تمام خدمات کو معمول کی بات سمجھا جاتا تھا اور اس کے عوض میں اس سے شکریے کے دو بول بھی شاید ہی کوئی کہتا ہوگا۔

بالڈ ہلز میں گھر کی تعمیر، اگرچہ اس پیمانے پر تو نہیں جس پر بوڑھے پرنس نے اسے بنایا تھا، تاہم نئے سرے سے کی گئی۔

تعمیر کا کام تنگی ترشی کے دنوں میں شروع ہوا تھا، اس لیے اس میں ضرورت سے زیادہ سادگی[20] کا خیال رکھا تھا۔ مکان بے شک بہت وسیع و عریض تھا تاہم اس کی چوبی تعمیر پرانی سنگی بنیادوں پر ہی کی گئی اور دیواریں صرف اندر سے پلستر کی گئیں۔ کشادہ کمروں کے فرش ڈیل[21] کے تھے اور سادہ سخت صوفے، بازوؤں والی کرسیاں اور میزیں اپنے برچوں کی لکڑی سے اپنے ہی غلام ترکھانوں نے بنائیں۔ مکان کے ساتھ گھریلو ملازمین کے کمرے اور مہمانوں کے اپارٹمنٹ تعمیر کیے گئے۔ بعض اوقات رستوفوں اور بلکونسکیوں کے رشتے داروں کے پورے خاندان سولہ سولہ گھوڑوں اور درجنوں نوکروں کے ساتھ براجمان ہو جاتے اور مہینوں ہلنے کا نام نہ لیتے۔ اس کے علاوہ سال میں چار مرتبہ میزبان اور اس کی اہلیہ کے نام دنوں اور سالگرہ پر ایک ایک دو دو دنوں کے لیے تقریباً سو سو مہمان بھی آ جاتے۔ سال کے بقیہ مہینوں کے دوران میں زندگی اپنے غیر شکستہ معمول کے مطابق چلتی رہتی، روزمرہ کے دھندے جاری رہتے اور جاگیر کی پیداوار سے ناشتوں، لنچوں، ڈنروں اور سپروں کا سلسلہ رواں دواں رہتا۔

9

یہ سینٹ نکولائی کے تہوار سے ایک روز پہلے 5 دسمبر 1820 کا ذکر ہے۔ اس سال نتاشا، اپنے شوہر اور بچوں کے ہمراہ، اوائل خزاں سے اپنے بھائی کے ہاں مقیم تھی۔ پیئر اپنے کسی کام کے سلسلے میں پیٹرزبرگ گیا ہوا تھا۔ وہ روانگی سے قبل بتا گیا تھا کہ وہ تین ہفتوں کے بعد واپس آ جائے گا لیکن وہ وہاں سات ہفتے مقیم رہا اور اب کسی بھی لمحے اس کی آمد متوقع تھی۔

پانچ دسمبر کو بز دخوف خاندان کے علاوہ نکولائی کا پرانا دوست ریٹائرڈ جنرل واسیلی دمتریچ دینی سوف رستوفوں کے ہاں ٹھہرا ہوا تھا۔

نکولائی کو معلوم تھا کہ چھ تاریخ کو، اس کے نام دن، جب گھر مہمانوں سے بھرا ہوگا، اس سے یہ توقع کی جائے گی کہ وہ اپنا تاتاری چغا اتار دے گا، فراک کوٹ اور نوک دار تنگ جوتے پہنے گا، گاڑی میں سوار ہوگا اور نئے گرجے، جو اسی نے تعمیر کرایا تھا، جائے گا، اپنے مہمانوں کا، جو اسے مبارک باد دینے آئیں گے، استقبال اور خاطر تواضع کرے گا، اور ان کے ساتھ شرفاء کے انتخاب[22] اور فصلوں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرے گا۔ یہ سب تو ٹھیک تھا، تاہم اس کا خیال تھا کہ یوم پیدائش سے پہلا دن اسے اپنے روایتی انداز سے گزارنے کا حق حاصل ہے۔

ڈنر سے پہلے اس نے ریازان جاگیر کے، جو اس کی بیوی کے بھتیجے کی ملکیت تھی، بیلف کے ساتھ اس کے مالی امور کا جائزہ لیا، دو کاروباری خطوط تحریر کیے اور اناج گوداموں، مویشیوں کے باڑوں اور گھوڑوں کے اصطبلوں کا چکر لگایا۔ چونکہ اگلے روز بڑے سینٹ کا دن تھا اور اس موقع پر توقع یہی کی جاتی تھی کہ لوگ خوب ڈٹ کر پئیں گے اور نشے میں غرق ہو جائیں گے، چنانچہ اس صورتِ حال کے تدارک کے لیے اس نے احتیاطی تدابیر اختیار کیں۔ ان تمام مصروفیتوں میں اسے اتنی تاخیر ہو گئی کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ خلوت میں گفتگو کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ وہ سیدھا ڈنر ٹیبل پر پہنچ گیا اور لمبی میز کے سامنے جس کے ارد گرد بیس اشخاص کے بیٹھنے کی گنجائش تھی، اپنی نشست سنبھال لی۔ میز پر اس کی والدہ، اس کی بزرگ رفیقہ بائیلووا، اپنے تینوں بچوں، ان کی گورنس اور ٹیوٹر سمیت اس کی بیوی، اپنے ٹیوٹر کے ہمراہ اس کا بھتیجا، سونیا، دینی سوف، اپنے تین بچوں اور ان کی گورنس کی معیت میں نتاشا، مرحوم پرنس کا میر تعمیرات بوڑھا میخائیل ایوانچ، جو ریٹائرمنٹ کے بعد بالڈ ہلز میں ہی زندگی کے بقیہ ایام گزار رہا تھا، موجود تھے۔

کاؤنٹس ماریا اس کے سامنے میز کی دوسری جانب بیٹھی تھی۔ جونہی اس کے شوہر نے اپنی نشست سنبھالی اور جس انداز سے اپنا نیپکن اٹھایا اور جس طرح یک لخت اپنا گلاس اور جامِ ے، جو اس کے سامنے پڑے تھے، پیچھے دھکیلے، وہ سمجھ گئی کہ اس کا مزاج اسی طرح برہم ہے جس طرح کہ بعض اوقات ــ خاص طور پر سوپ سے پہلے ــ جب وہ فارم سے سیدھا ڈنر ٹیبل پر آتا تھا، اس کا ہوتا تھا۔ کاؤنٹس ماریا اس کی اس ذہنی کیفیت سے بخوبی آشنا تھی اور اگر اس وقت اس کا اپنا مزاج شگفتہ ہوتا، وہ خاموشی سے انتظار کرتی رہتی تا آنکہ وہ اپنے پیالے میں سوپ ڈال لیتا۔ اس کے بعد ہی وہ اس سے گفتگو شروع کرتی اور عام طور پر کچھ اس ڈھب سے بات کرتی کہ اسے تسلیم کرتے ہی بن پڑتی کہ اس کی خفگی بے سبب ہے۔ لیکن آج وہ اس قسم کا رویہ اختیار کرنا بھول گئی اور اسے یہ سوچ کر شدید دکھ ہوا کہ وہ اس کے ساتھ خواہ مخواہ ناراض ہے۔ اس نے اس سے دریافت کیا کہ وہ کہاں رہا۔ اس کے بعد اس نے پوچھا کہ آیا فارم پر سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ جس لہجے میں بات کر رہی تھی، وہ بالکل غیر فطری تھا۔ اس پر نکولائی جھنجھلا گیا اور اس نے روکھے پن سے جواب دیا۔

''تو میرا اماتا ٹھیک ہی ٹھنکا تھا۔'' پرنس ماریا نے سوچا۔ ''لیکن یہ مجھ سے خفا کیوں ہیں؟''
اسے اس کے لہجے میں ایک طرح کی مخاصمت اور گفتگو ختم کرنے کی خواہش جھلکتی نظر آئی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کا اپنا لہجہ غیر فطری نظر آرہا ہے لیکن وہ اس سے متعدد مزید سوالات پوچھنے سے گریز نہ کرسکی۔

دینی سوف کے طفیل گفتگو نے بہت جلد عمومی رخ اختیار کرلیا اور اس میں شگفتگی آگئی۔ جب وہ دسترخوان سے اٹھے اور بوڑھی کاؤنٹس کا شکریہ[23] ادا کرنے اس کے پاس گئے، کاؤنٹس ماریا نے اپنا ہاتھ اپنے شوہر کی طرف بڑھایا، اس کا بوسہ لیا اور اس سے پوچھنے لگی کہ وہ اس سے ناراض کیوں ہے۔

''تمھارے ذہن میں ہمیشہ عجیب و غریب باتیں کلبلاتی رہتی ہیں۔ ارے بھئی، تمھارے ساتھ ناراض ہونے کا خیال تک میرے دماغ میں نہیں آیا'' اس نے جواب دیا۔

مگر کاؤنٹس ماریا نے لفظ ''ہمیشہ'' کے یہ معانی اخذ کیے: ''ہاں، میں ناراض ہوں لیکن کیوں؟ میں اس کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھتا۔''

نکولائی اور اس کی بیوی کے مابین اتنی ہم آہنگی اور یگانگت تھی کہ سونیا اور بوڑھی کاؤنٹس کو بھی، جو دونوں ان سے جلتی تھیں اور ان کے مابین اختلاف کی خلیج حائل کر کے خوش ہو جاتیں، ان پر طعنہ زنی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ نہ آتا۔ تاہم ان میاں بیوی کے مابین بھی بعض اوقات ایک دوسرے سے مخاصمت ہو ہی جاتی۔ ایک دوسرے کی صحبت میں انتہائی مسرت و شادمانی کے ایام گزارتے گزارتے انھیں عناد اور مغائرت کے جذبات اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ اس قسم کے لمحات زیادہ تر اس زمانے میں آتے جب پرنس ماریا امید سے ہوتی اور اس وقت وہ اسی کیفیت میں سے گزر رہی تھی۔

''اچھا، "messieurs et mesdames*"، نکولائی نے شگفتگی اور خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے خاصی بلند آواز سے کہا۔ (کاؤنٹس ماریا کو محسوس ہوا کہ وہ یہ سب کچھ اس کے جذبات کو ٹھیس پہنچانے کے لیے کر رہا ہے۔) ''میں آج صبح چھ بجے سے بھاگا پھر رہا ہوں۔ کل کا دن میرے لیے خاصا سخت ہوگا۔ چنانچہ آج میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔'' اور اپنی بیوی سے ایک بھی لفظ کہے بغیر وہ چھوٹے سٹنگ روم میں چلا گیا اور صوفے پر لیٹ گیا۔

''ہمیشہ ایسے ہی ہوتا ہے۔'' کاؤنٹس ماریا نے سوچا۔ ''وہ میرے علاوہ ہر ایک سے باتیں کرتے ہیں۔ میں سمجھ گئی... میں سمجھ گئی۔ میں انھیں، خاص طور پر جب میری یہ حالت ہو، گھناؤنی معلوم ہوتی ہوں۔'' وہ آئینے میں اپنے جسم کا، جو ہر روز پھیلتا جارہا تھا اور اپنے زرد، سوکھے سڑے چہرے کا، جس پر اس کی آنکھیں معمول سے بڑی دکھائی دے رہی تھیں، جائزہ لینے لگی۔

اسے ہر بات — دینی سوف کے فلک شگاف قہقہے اور غل غپاڑا، نتاشا کی ٹرٹر اور سب سے بڑھ کر سونیا کا اسے دیکھنے کا انداز — ناگوار محسوس ہو رہی تھی۔

* حضرات و خواتین

کاؤنٹس ماریا کو جب غصہ آتا تھا، تو وہ سب سے پہلے سونیا کو اس کا سبب ٹھہراتی تھی۔
وہ کچھ دیر مہمانوں کے پاس بیٹھی رہی۔ وہ کیا کہہ رہے تھے، اس کا ایک لفظ بھی اس کے پلے نہیں پڑ رہا تھا۔ پھر وہ اٹھی اور نرسری میں چلی گئی۔

بچے ایک گاڑی میں، جو کرسیاں جوڑ کر بنائی گئی تھی، بیٹھے ہوئے تھے اور "ہم ماسکو جا رہے ہیں" کھیل رہے تھے۔ انھوں نے اسے بھی اپنے ساتھ بیٹھنے کی دعوت دی۔ وہ بیٹھ تو گئی اور کچھ دیر ان کے کھیل میں شریک بھی رہی، لیکن اپنے خاوند اور اپنے ساتھ اس کی غیر معقول ناراضگی کا تصور اس کے لیے پیہم سوہانِ روح بنا رہا۔ وہ اٹھی اور بدقت تمام پنجوں کے بل چلتی چھوٹے سٹنگ روم کی طرف چل دی۔

"شاید وہ سو نہیں رہے اور ہم اس معاملے کو گفتگو کے ذریعے سلجھا سکتے ہیں،" اس نے اپنے آپ سے کہا۔
اس کا بڑا بیٹا آندروشا اپنی ماں کی نقل اتارتا اور پنجوں کے بل چلتا اس کے پیچھے پیچھے آ گیا لیکن پرنس ماریا کو اس کے یوں چلے آنے کا کوئی احساس نہ ہوا۔

"Chere Marie," سونیا نے، جس سے ڈرائنگ روم میں مڈھ بھیڑ ہو گئی تھی، اس سے مخاطب ہو کر کہا۔
"میرا خیال ہے کہ وہ سو رہے ہیں — انھیں اتنی تھکاوٹ جو ہو گئی تھی۔ کہیں آندروشا انھیں جگا نہ دے۔" (اس کی شکل دیکھ کر پرنس ماریا کو محسوس ہوا: "یہ میرا پیچھا ہی نہیں چھوڑتی، میں جہاں بھی جاتی ہوں، وہیں آ ٹپکتی ہے۔")
کاؤنٹس ماریا نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور جب اس کی نظر آندروشا پر پڑی، اسے احساس ہوا کہ سونیا ٹھیک کہتی ہے لیکن محض اسی وجہ سے اس کا چہرہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا اور وہ بڑے بیّن انداز سے کوشش کرنے لگی کہ اس کی زبان سے کوئی تلخ ترش بات نہ نکل جائے۔ وہ منہ بند رکھنے میں کامیاب تو ہو گئی مگر سونیا پر توجہ دینے کے امکان سے بچنے کے لیے اس نے آندروشا کو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ وہ کسی قسم کا شور و غل پیدا کیے بغیر اس کے پیچھے پیچھے چلا آئے اور خود دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ سونیا دوسرے دروازے سے باہر نکل گئی۔
جس کمرے میں نکولائی سو رہا تھا، وہاں سے اس کی سانسوں کی باقاعدہ آوازیں آ رہی تھیں جن کے زیر و بم میں معمولی سے معمولی تغیر سے اس کی بیوی بخوبی آشنا تھی۔ جب وہ کان لگائے یہ آوزیں سن رہی تھی، وہ اپنے تخیل میں اس کی بے شکن اور خوبصورت پیشانی، اس کی مونچھیں اور اس کا پورا چہرہ دیکھ سکتی تھی جس کا وہ اکثر رات کے سکوت میں، جب وہ سویا پڑا ہوتا تھا، جائزہ لیتی رہتی تھی۔ اچانک نکولائی نے کروٹ بدلی اور کھنکار کر گلا صاف کیا۔ عین اسی لمحے باہر دروازے پر آندروشا کی آواز گونجی:

"پاپا، ماما یہاں کھڑی ہیں!"
کاؤنٹس کی جان ہوا ہو گئی، اس کی رنگت پیلی پڑ گئی اور وہ بدحواسی کے عالم میں بچے کو اشارے کرنے لگی۔ بچہ خاموش ہو گیا اور ایک لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی جو اس کے لیے عذاب سے کم نہ تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر نکولائی کو کچی نیند سے جگا دیا جائے، تو وہ جلال میں آ جاتا ہے۔ ایک بار پھر اسے دروازے میں سے اس کے

دوبارہ کھنکار کر گلا صاف کرنے اور کروٹ بدلنے کی آواز سنائی۔ اس کے ساتھ ہی وہ غصیلی آواز سے دہاڑا:

''ایک منٹ آرام نہیں ملتا۔ ماری، تم ہو؟ اسے یہاں کیوں لائی ہو؟''

''میں تو دیکھنے آئی تھی اگر... مجھے معلوم ہی نہ ہوسکا... میں معافی چاہتی ہوں...''

نکولائی کھانسا اور اس نے مزید کچھ نہ کہا۔

کاؤنٹس ماریا پیچھے ہٹ گئی اور بچے کو واپس نرسری میں لے گئی۔ پانچ منٹ بعد ننھی منی سیاہ چشم سہ سالہ نتاشا، جو اپنے باپ کی چہیتی تھی، اپنے بھائی سے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ پاپا چھوٹے سٹنگ روم میں محو استراحت ہیں، بھاگتی دوڑتی اپنے باپ کے پاس چلی گئی اور اس کی ماں کو پتا بھی نہ چل سکا۔ ننھی منی سیاہ چشم بچی نے بے دھڑک چرچراتا دروازہ کھولا، اپنی ننھی منی توانا ٹانگوں سے پھرتی سے آگے بڑھی اور جس پہلو پر اس کا باپ لیٹا ہوا تھا۔ وہ اپنی پشت اس کی طرف کیے گئے ہوئے تھا۔ اس کا جائزہ لینے کے بعد پنجوں کے بل اوپر اٹھی اور اس کے ہاتھ پر، جو اس کے سر کے نیچے تھا، بوسہ ثبت کردیا۔ نکولائی نے کروٹ بدلی۔ اس کے چہرے پر نرم و ملائم تبسم بکھرا ہوا تھا۔

''نتاشا، نتاشا!'' کاؤنٹس ماریا نے خوف زدگی کے عالم میں دروازے کی اوٹ میں سے زیرلب کہا: ''پاپا سونا چاہتے ہیں۔''

''نہیں، ماما، بالکل نہیں۔'' چھوٹی بچی نے پورے اعتماد سے کہا۔ ''وہ ہنس رہے ہیں۔''

نکولائی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے پاؤں فرش پر ٹکائے اور اپنی بیٹی کو بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

''ماشا، اندر آجاؤ۔'' اس نے اپنی بیوی سے کہا۔

کاؤنٹس ماریا اندر چلی گئی اور اپنے خاوند کے قریب بیٹھ گئی۔

''میں نے دیکھا ہی نہیں کہ یہ میرے پیچھے پیچھے آرہی ہے۔'' اس نے ڈرتے جھجکتے کہا۔ ''میں نے صرف۔''

نکولائی نے اپنی بیٹی کو ایک بازو سے تھامے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور اس کے معذرت خواہانہ انداز کو دیکھ کر اپنا دوسرا بازو اس کی کمر کے گرد حمائل کردیا اور اس کے بالوں کو چوم لیا۔

''ماما کا بوسہ لے لوں؟'' اس نے نتاشا سے پوچھا۔

نتاشا شرما گئی اور مسکرانے لگی۔ ''ایک بار پھر!'' اس نے اس مقام کی طرف، جہاں نکولائی نے بوسہ ثبت کیا تھا، تحکمانہ انداز سے اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا۔

''مجھے معلوم نہیں کہ تم نے یہ کیسے فرض کرلیا کہ میرا موڈ خراب ہے۔'' اس نے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا جو اسے معلوم تھا کہ اس کی بیوی کے ذہن میں ہے، جواب دیتے ہوئے کہا۔

''آپ تصور بھی نہیں کرسکتے کہ جب آپ اس طرح نظر آتے ہیں، مجھے کتنی کوفت ہوتی ہے، کتنے اکلاپے کا احساس ہونے لگتا ہے۔ مجھے ہمیشہ محسوس ہوتا رہتا ہے کہ۔''

''ماری، چپ کرو۔ کیا فضول باتیں لے بیٹھی ہو! تمھیں شرم نہیں آتی؟'' اس نے چہکتے ہوئے کہا۔

''مجھے ہمیشہ یہی محسوس ہوتا رہتا ہے کہ آپ مجھ سے محبت نہیں کر سکتے، کہ میں اتنی بدصورت... ہمیشہ... اور اب... اور اب میری یہ حالت...''

''کتنی نامعقول ہو تم! ہم ان سے، جو خوش شکل ہیں، محبت نہیں کرتے بلکہ خوش شکل وہ ہوتے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں۔ یہ تو صرف مالوینا[24] جیسی عورتیں ہوتی ہیں جن سے محبت اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ حسین و جمیل ہیں۔ لیکن کیا میں اپنی بیوی سے محبت کرتا ہوں؟ نہیں، میں اس سے محبت نہیں کرتا لیکن... سمجھ میں آتا کہ میں تمھیں کیسے سمجھاؤں۔ لیکن جب تم موجود نہیں ہوتیں یا جب ہمارے مابین اس قسم کی کوئی چیز حائل ہو جاتی ہے، مجھے محسوس ہونے لگتا ہے کہ میں کہیں کھو گیا ہوں، بے دست و پا ہو گیا ہوں۔ کیا میں اپنی انگلی سے محبت کرتا ہوں؟ نہیں، مجھے اس سے کوئی محبت نہیں لیکن ذرا اسے کاٹنے کی کوشش کرو!''

''میں خود اس طرح کی نہیں ہوں لیکن میں آپ کا مطلب سمجھ گئی ہوں۔ تو آپ مجھ سے خفا نہیں ہیں؟''

''بے حد خفا!'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے انگلیوں سے اپنے بال درست کیے اور کمرے میں گھومنے پھرنے لگا۔

''ماری، تمھیں معلوم ہے کہ میں کیا سوچ رہا ہوں؟'' اس نے کہنا شروع کیا۔

اب جب کہ ان کے مابین صلح ہو گئی تھی، وہ فی الفور اپنی بیوی کی موجودگی میں با آواز بلند سوچنے لگا۔ اس نے یہ تک نہ پوچھا کہ آیا وہ سننے کے لیے مائل ہے۔ اس کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ اس کے ذہن میں ایک خیال آ گیا تھا، اس لیے وہ بھی اس کی مالک تھی۔ اور اس نے اسے بتایا کہ وہ پیئر کو یہاں بہار تک قیام کرنے کے لیے رضامند کرنا چاہتا ہے۔

جب تک اس کی بات ختم نہ ہوئی، وہ سنتی رہی۔ اس نے کچھ رائے زنی کی اور اپنی باری آنے پر خود با آواز بلند سوچنے لگی۔ اس کی سوچوں کا محور اس کے بچے تھے۔

''اس میں ابھی سے عورت کے آثار نظر آنے لگے ہیں،'' اس نے نتاشا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرانسیسی میں کہا۔ ''آپ ہم عورتوں کو ملامت کرتے رہتے ہیں کہ ہم منطقی نہیں ہیں۔ یہ رہی ہماری منطق۔ میں کہتی ہوں: 'پاپا سونا چاہتے ہیں۔' اور وہ کہتی ہے: 'نہیں، بالکل نہیں، وہ ہنس رہے ہیں۔' اور وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔'' پرنسس ماریا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بالکل، بالکل!''

اور نکولائی نے اپنی بیٹی کو اپنے مضبوط و توانا بازوؤں میں اٹھایا، اوپر فضا میں اچھالا اور اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ اس نے اس کی ٹانگیں پکڑیں اور کمرے میں چکر لگانے لگا۔ باپ بیٹی دونوں کے چہروں پر بے فکر مسرت رقصاں تھی۔

''مگر آپ جانتے ہیں کہ آپ شاید ناانصافی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ آپ کو اس کے ساتھ کچھ زیادہ ہی پیار ہے،'' اس کی بیوی نے فرانسیسی میں سرگوشی کی۔

''ہاں، مگر میں کیا کر سکتا ہوں؟... میں کوشش کرتا ہوں کہ اس کا اتنا کھلا اظہار نہ کروں...''
عین اسی لمحے انھیں دروازہ کھلنے اور کسی کے ہال اور پیش دالان میں چلنے کی آواز سنائی دی۔ معلوم ہوتا تھا کوئی باہر سے اندر آیا ہے۔

''کوئی آیا ہے۔''

''مجھے یقین ہے کہ یہ پیئر ہوں گے۔ میں جا کر دیکھتی ہوں۔'' کاؤنٹس ماریا نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔
جب وہ چلی گئی، نکولائی اپنی بیٹی کو کندھے پر اٹھائے کمرے میں دوڑنے اور حظ اٹھانے لگا۔ جب اس کی سانس پھولنے لگی، اس نے عجلت سے بچی کو، جس کا ہنسی سے برا حال ہو رہا تھا، نیچے اتارا اور اپنے سینے سے چمٹا لیا۔ اپنی اچھل کود سے اس کا دھیان رقص کی طرف مبذول ہو گیا اور وہ اپنی بیٹی کے گول مٹول ننھے منے پرمسرت چہرے کو دیکھ کر سوچنے لگا کہ جب وہ بڑھاپے کی دہلیز پار کر جائے گا، وہ کیسی نظر آیا کرے گی۔ وہ اسے محافل میں لے جایا کرے گا اور اس کے ساتھ اسی طرح مازورکا ڈانس کیا کرے گا جس طرح اس کا باپ اپنی بیٹی کے ساتھ ڈینیل کوپر رقص کیا کرتا تھا۔

''وہی ہیں، نکولس، وہی ہیں۔'' چند منٹ بعد کاؤنٹس ماریا نے واپس آ کر اطلاع دی۔ ''اب ہماری نتاشا میں نئی روح پھنک گئی ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ کس طرح کھلی جا رہی اور اتنا عرصہ غیر حاضر رہنے پر انھیں کس طرح ڈانٹ ڈپٹ رہی تھی؟ خیر، آؤ چلیں، جلدی کریں، چلیں نا بھئی! اب تم دونوں ایک دوسرے کا پیچھا چھوڑ دو۔'' اس نے اپنی بیٹی کی طرف، جو اپنے باپ کے بازوؤں سے چمٹی ہوئی تھی، دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔
کاؤنٹس ماریا سٹنگ روم میں رک گئی۔
''مجھے کبھی، کبھی یقین نہ آتا کہ زندگی میں اتنی خوشی نصیب ہو سکتی ہے،'' اس نے اپنے آپ سے زیر لب کہا۔ اس کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا مگر اس کے ساتھ ہی اس کی آہ نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں ایک طرح کا پرسکون ملال جھلک رہا تھا جیسے اسے محسوس ہو رہا ہو کہ اس خوشی کے علاوہ، جس کا اسے تجربہ ہو رہا تھا، ایک اور نوع کی خوشی موجود ہے جس کا حصول اسی زندگی میں ناممکن ہے، اور جس کے متعلق وہ اس وقت غیر ارادی طور پر سوچ رہی تھی۔

10

نتاشا کی شادی 1813 کے اوائل بہار میں ہوئی تھی اور 1820 تک وہ تین بیٹیوں اور ایک بیٹے کی، جس کی اسے شدید آرزو تھی اور جسے وہ اب اپنا دودھ پلا رہی تھی، ماں بن چکی تھی۔ اس کا تن و توش پھیل گیا تھا اور وہ خاصی فربہ ہو گئی تھی۔ اب اس چوڑی چکلی اور مضبوط کاٹھی کی نوجوان ماں میں اس دبلی پتلی اور شوخ و چنچل نتاشا کو، جو وہ کبھی ہوا کرتی تھی، پہچاننا مشکل تھا۔ اس کے خدوخال پہلے کی نسبت زیادہ واضح صورت اختیار کر چکے تھے اور اس کے تیوروں میں ایک طرح کا ٹھہراؤ، ملائمت اور سکون جھلکنے لگا تھا۔ اس کے چہرے پر ہر دم جو چلبلاہٹ رقصاں رہتی

تھی اور جو پہلے اس کی اصل دلکشی متشکل کیا کرتی تھی، اب ناپید ہو چکی تھی۔ اب اس کا صرف چہرہ اور جسم نظر آتا تھا۔ جہاں تک اس کی روح کا تعلق ہے، اب اس کا اظہار بمشکل ہی ہوتا ہوگا۔ اس کو دیکھ کر آدمی کے دل میں جو تاثر نقش ہوتا تھا، وہ یہ تھا کہ یہ عورت صحت مند، دلکش اور ثمر آور ہے۔ آتش کہن اب شاذ ہی اس کے اندر روشن ہوتی تھی۔ ایسا صرف تبھی ہوتا تھا جب اس کا خاوند، جیسا آج ہوا، طویل غیر حاضری کے بعد گھر واپس آتا تھا، جب اس کا کوئی علیل بچہ صحت یاب ہوتا تھا، جب وہ اور کاؤنٹس ماریا پرنس آندرے کی باتیں کرتی تھیں (وہ اپنے شوہر کی موجودگی میں پرنس آندرے کا کبھی نام تک نہیں لیتی تھی کیونکہ اس کا خیال تھا کہ وہ پرنس آندرے کی یادوں پر حسد کے انگاروں پر لوٹنے لگتا ہے)، یا پھر ان گنے چنے مواقع پر، جب کوئی چیز اسے نغمہ سرائی کی ترغیب دیتی تھی (ویسے شادی کے بعد وہ کم کم ہی گاتی تھی)۔ ان معدودے چند لحات کے دوران میں جب یہ پرانا شعلہ اس کے کومل اور بھرے بھرے جسم میں جگمگاتا تھا، وہ پہلے کی نسبت کہیں زیادہ پرکشش نظر آنے لگتی تھی۔

جب سے نتاشا کی شادی ہوئی تھی، وہ اور اس کا خاوند ماسکو، پیٹرز برگ، ماسکو کے قریب اپنی جاگیر یا اس کی ماں — یعنی نکولائی — کے گھر میں رہتے چلے آئے تھے۔ نوجوان کاؤنٹس بزدخووا اونچے طبقے کی محافل میں شاذ و نادر ہی نظر آتی تھی اور جن لوگوں سے اس کی وہاں ملاقات ہوتی تھی، وہ اسے کوئی خاص پسند نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ نہ ملنسار تھی اور نہ کسی کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش کرتی تھی۔ بات یہ نہیں تھی کہ نتاشا کو تنہائی پسند تھی — اسے معلوم ہی نہیں تھا کہ اسے یہ پسند ہے یا نہیں بلکہ اس کا خیال تھا کہ اسے یہ پسند نہیں — لیکن اس کے حمل، اس کی زچگیاں، بچوں کی پرورش و پرداخت اور اپنے شوہر کی زندگی کے ایک ایک لمحے میں اس کی رفاقت، ایسی چیزیں تھیں جن کی بنا پر وہ سمجھتی تھی کہ جب تک وہ محافل میں گھومنا پھرنا ترک نہیں کرے گی، وہ اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکے گی۔

وہ تمام لوگ، جو اسے اس زمانے سے جانتے تھے جب ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی تھی، اس میں یہ تبدیلی دیکھ کر انگلیاں دانتوں میں دبا لیتے تھے جیسے ان کا واسطہ کسی محیّر العقول اور غیر معمولی چیز سے پڑ گیا ہو۔ صرف معمر کاؤنٹس کو، جس کی مادرانہ جبلّت اسے بتاتی رہتی تھی کہ نتاشا کی تلون مزاجی کا سبب محض یہ ہے کہ اسے شوہر اور بچوں کی ضرورت ہے — اور خود نتاشا نے بھی ایک مرتبہ اترادنا یا میں یہی بات مذاق سے زیادہ سنجیدگی سے کہی تھی — اسے ان لوگوں کی، جو اس کی بیٹی کو کبھی سمجھ نہیں پائے تھے، حیرت دیکھ کر اچنبھا ہوتا تھا اور وہ مسلسل کہتی رہتی تھی: ''مجھے ہمیشہ معلوم تھا کہ وہ مثالی بیوی اور ماں بنے گی۔''

''صرف ایک بات ہے کہ وہ اپنے شوہر اور بچوں کی محبت میں تمام حدود پھلانگ جاتی ہے۔'' کاؤنٹس مزید کہتی۔ ''چنانچہ یہ صریحاً احمقانہ بن جاتی ہے۔''

نتاشا اس سنہری اصول کو، جس کی آٹھوں گانٹھ کمیت لوگ، بالخصوص فرانسیسی، تلقین کرتے رہتے ہیں، جوتی کی نوک پر نہیں مارتی تھی۔ یہ اصول کہتا ہے: ''شادی کے بعد نوجوان لڑکی کو اپنی باگیں ڈھیلی نہیں کرنا چاہئیں۔

(رقص، موسیقی، سلائی کڑھائی جیسے فنون میں) اپنی مہارتوں سے صرفِ نظر نہیں کرنا چاہیے۔ اسے دوشیزگی کے زمانے سے بھی زیادہ اپنی شکل وصورت کا خیال رکھنا اور اپنے آپ کو اپنے خاوند کے لیے اتنا ہی جاذبِ نظر اور پرکشش بناتے رہنا چاہیے جتنا کہ وہ شادی سے پہلے اس کے لیے ہوتی تھی۔ اس کے برعکس نتاشا اپنی تمام سحر طرازیوں سے، جن میں سے ایک — اس کی گلوکاری — غیر معمولی طور پر موثر تھی، دست بردار ہوگئی تھی۔ اس نے اسے ترک کیا ہی اس لیے تھا کیونکہ اس میں اتنی بے پناہ کشش تھی کہ لوگ دیوانہ وار اس کی طرف کھنچے چلے آتے تھے۔ وہ اس بات کی قطعاً کوئی پروا نہیں کرتی تھی کہ اس کے اطوار دوسروں کی نگاہوں میں پسندیدہ ہیں یا نہیں، اس کی گفتگو موقع محل کے مطابق اور لطافتوں سے مملو ہے یا نہیں۔ نہ اسے ذاتی تزئین وآرائش میں کوئی دلچسپی رہ گئی تھی اور نہ وہ اپنے آپ کو کچھ اس انداز سے اپنے خاوند کے سامنے پیش کرنے کا، کہ وہ ہمہ وقت اسی پر ریجھتا رہے، کوئی شوق پالتی تھی۔ وہ یہ بھی تردد نہیں کرتی تھی کہ وہ اپنے خاوند سے جو مطالبات کرتی ہے، کہیں ان کے پورا کرنے میں اس کے آرام میں تو کوئی خلل نہیں پڑے گا یا اسے کسی قسم کی پریشانی تو لاحق نہیں ہوگی۔ درحقیقت وہ ان میں سے ہر اصول کی دھجیاں بکھیرتی رہتی تھی۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ پہلے وقتوں میں دوسروں کے قلوب ونظر میں گھر کرنے کے لیے اسے اس کی جبلت جن فسوں کاریوں اور عشوہ طرازیوں کو اختیار کرنے کی ترغیب دیتی تھی، اب اس کے خاوند کو مضحکہ خیز معلوم ہوں گی۔ وہ اولیں لمحے سے بہ دل وجان اپنے شوہر کے سامنے سرنگوں ہوچکی تھی اور اپنی فطرت اور روح کا کوئی گوشہ ایسا نہیں تھا جو اس نے اس کے سامنے بے نقاب نہ کردیا ہو۔ اسے محسوس ہوتا تھا کہ ان کے درمیان جو رشتہ ہے، وہ ان رومانی اور شعری جذبات کے، جنھوں نے اسے (پیئر کو) اس کی طرف مائل کیا تھا، سہارے قائم نہیں بلکہ اس کا وجود کسی اور چیز کا مرہونِ منت ہے جس کی توضیح مشکل ہے لیکن جو اتنا ہی مضبوط ہے جتنا کہ اس کی اپنی روح اور جسم کا رشتہ۔

اپنے خاوند کو رجھانے کے لیے مختلف طریقوں سے اپنا بالوں کو نکھارنا، نرم وملائم بنانا اور انھیں لمبا کرنا، فیشن ایبل ملبوسات پہننا اور رومانی گانے گانا اسے اتنا ہی عجیب لگتا جیسے وہ یہ ساری تزئین وآرائش خود اپنے آپ کو رجھانے کے لیے کررہی ہو۔ دوسروں کی خاطر اپنی زیب وزیبائش کرنے میں اسے شاید لطف آتا — یہ وہ نہیں جانتی تھی — لیکن اس کے لیے اس کے پاس کوئی وقت نہیں تھا۔ اس نے اپنے گلوکاری، اپنے ملبوسات یا اپنی گفتگو میں زبان و بیان کی نزاکتیں پیدا کرنے کے معاملات میں جو بے توجہی برتنا شروع کردی تھی، تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے پاس اس طرح کے کاموں کے لیے قطعاً کوئی فرصت نہیں تھی۔

سب لوگ اس حقیقت سے کما حقہ آگاہ ہیں کہ آدمی میں کسی چیز میں، خواہ وہ بظاہر کتنی ہی حقیر اور معمولی کیوں نہ ہو، تن من سے جذب ہونے کی صلاحیت موجود ہے اور یہ بات بھی سبھی جانتے ہیں کہ کوئی چیز بھی اتنی حقیر اور معمولی نہیں ہوتی کہ اگر آدمی اس پر اپنی پوری توجہ مبذول کردے، وہ لامحدود وسعتیں اختیار نہ کرسکے۔

وہ چیز، جس میں نتاشا سرتاپا غرق ہوچکی تھی، وہ اس کا خاندان تھا۔ ایک اس کا شوہر تھا۔ اس کا اس نے اس

طرح خیال رکھنا تھا کہ وہ ہمہ تن اسی کا اور گھر کا ہو کر رہ جائے۔ دوسرے اس کے بچے تھے۔ انھیں اس نے پیٹ میں اٹھائے اٹھائے پھرنا، جنم دینا، اپنا دودھ پلانا اور پالنا پوسنا ہوتا تھا۔

وہ جس چیز میں مستغرق تھی، وہ جتنا زیادہ، اپنے دماغ سے ہی نہیں بلکہ اپنی پوری روح اور اپنے پورے وجود کے ساتھ، اس کی گہرائی میں جاتی تھی، وہ اس کی نگاہوں کے سامنے اتنی ہی زیادہ وسعت پذیر ہو جاتی تھی اور اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے اسے اپنی صلاحیتیں اتنی ہی ناتواں اور ناکافی معلوم ہونے لگتی تھیں۔ چنانچہ اس نے ان سب کو اسی ایک چیز پر مرکوز کر دیا تھا۔ پھر بھی اسے اتنا وقت نہیں ملتا تھا کہ وہ اس سب کچھ کو، جو اس کی نگاہوں میں لابدی تھا، پایہ تکمیل تک پہنچا سکتی۔

آج کی طرح اس زمانے میں بھی عورتوں کے حقوق، میاں بیوی کے تعلقات، ان کی آزادیوں اور حقوق کے بارے میں بحثیں اور مناظرے ہوتے تھے، ڈھونڈ ڈھونڈ کر دلائل لائے جاتے تھے لیکن آج کی طرح انھیں ابھی مسائل کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ بات یہ نہیں تھی کہ نتاشا کو ان میں دلچسپی نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ تھی کہ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آتا تھا کہ یہ چیزیں ہیں کیا۔

آج کی طرح اس زمانے میں بھی یہ مسائل صرف ان لوگوں کا دردِ سر تھے جنھیں شادی میں اس تلذذ کے علاوہ، جو بیاہے جوڑے ایک دوسرے سے حاصل کرتے ہیں، اور کچھ نظر نہیں آتا۔ بہ الفاظ دیگر وہ شادی کی مبتدیات سے تو آگاہ ہیں لیکن اس کی اصل غایت — خاندان — سے بے خبر ہیں۔

اس قسم کے مباحثے اور سوالات، جو اس سوال سے مشابہ ہیں کہ آدمی اشیائے خورونوش سے زیادہ سے زیادہ لذت کس طرح حاصل کر سکتا ہے، ان لوگوں کے لیے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ خورونوش کا مقصد اس غذایت کا حصول ہے جو یہ فراہم کرتی ہے، اور شادی کا مقصد خاندان کا قیام ہے، نہ تب موجود تھے اور نہ اب موجود ہیں۔

اگر خورونوش کا مقصد جسم کو غذا فراہم کرنا ہے، تو اس شخص کو جو اپنی ضرورت سے دگنی خوراک کھاتا ہے، لذت تو شاید زیادہ مل جاتی ہوگی لیکن اس طرح وہ اپنا مقصد حاصل نہیں کر سکے گا کیونکہ اس کا معدہ دگنی خوراک ہضم نہیں کر سکے گا۔

اگر شادی کا مقصد خاندان کا قیام ہے، پھر اس شخص کو، جو متعدد بیویوں یا شوہروں کا متمنی ہے، تلذذ تو غالباً بہت مل جائے گا مگر اس صورت میں اس کا کوئی خاندان وجود میں نہیں آئے گا۔

اگر خوراک کا مقصد حصول غذائیت ہے اور شادی کا مقصد خاندان کی تنصیب ہے، پھر مسئلہ صرف یہ رہ جاتا ہے کہ آدمی کو صرف اتنی خوراک کھانا چاہیے جتنی کہ اس کا معدہ ہضم کر سکتا ہے، اسے اس سے زیادہ کے قریب بھی پھٹکنا نہیں چاہیے اور مرد کو صرف ایک عورت اور عورت کو صرف ایک مرد سے نکاح کرنا چاہیے تاکہ خاندان وجود میں آ سکے — نہ مرد کو ایک سے زیادہ عورتوں کی اور نہ عورت کو ایک سے زیادہ مردوں کی ضرورت ہے۔ نتاشا کو خاوند کی ضرورت تھی، اسے خاوند مل گیا اور اس خاوند نے اسے بچے فراہم کر دیے۔ اور اسے نہ صرف یہ کہ کسی اور یا بہتر خاوند

کی ضرورت محسوس نہ ہوئی بلکہ جب اس کی تمام روحانی توانائیاں اس خاوند اور خاندان کی خدمت پر مرکوز تھیں، وہ نہ تو یہ تصور کرسکتی تھی اور نہ اسے یہ تصور کرنے میں کوئی دلچسپی تھی کہ اگر حالات مختلف ہوتے، پھر کیا ہوتا۔

نتاشا کو دوسرے لوگوں کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے کا قطعاً کوئی چسکا نہیں تھا لیکن اس چیز کے فقدان نے اس کی نگاہوں میں اپنے رشتہ داروں — اپنے بھائی اور کاؤنٹس ماریا، اپنی ماں اور سونیا — کی صحبت کی قدر و قیمت بڑھادی۔ اسے ان لوگوں کی موجودگی میں صحیح لطف آتا تھا کیونکہ اسے ان کے سامنے کوئی تکلف نہیں برتنا پڑتا تھا، وہ ان کے پاس نرسری سے لمبے لمبے ڈگ بھرتی اس حالت میں آسکتی تھی کہ وہ ڈریسنگ گاؤن میں ملبوس ہے، سر کے بال پریشان ہیں اور ہاتھ میں پوتڑا (nappy) ہے جس پر سبز کی بجائے زرد دھبے پڑے ہیں لیکن چہرے پر مسرت و شادمانی جھلک رہی ہے کیونکہ یہ لوگ اسے اطمینان دلا سکتے ہیں کہ بچے کی حالت بہت بہتر ہے۔

نتاشا اپنے بارے میں اس حد تک غفلت کا شکار بن چکی تھی اور اس کا لباس، اس کا بال بنانے کا انداز، اس کی بے محل باتیں اور اس کا جلاپا — وہ سونیا سے، گورنس سے اور ہر عورت سے، خواہ وہ خوبصورت ہو یا بدصورت، حسد کرتی تھی — اس کے دوستوں کے مابین مسلسل مذاق کا موضوع بنے رہتے تھے۔ عام رائے یہ تھی کہ پیئر اپنی جورو کا غلام ہے اور اس کا اشاروں پر رقص کرتا ہے، اور یہ بات بالکل ٹھیک تھی۔ اپنی شادی کے ابتدائی ایام میں ہی نتاشا نے اپنے دعاوی جتادیے تھے۔ پیئر اپنی بیوی کی یہ رائے، کہ اس کے ایک ایک لمحے کی مالک وہ خود اور اس کا خاندان ہے، سن کر بہت حیران ہوا کیونکہ اس کے لیے یہ بالکل نئی بات تھی۔ اپنی بیوی کے مطالبات نے اسے ششدر کر دیا لیکن ان سے اس کی انا کو تسکین بھی ملی اور اس نے اس کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

پیئر کی فرماں برداری اتنی مکمل تھی کہ کسی دوسری عورت کے ساتھ چہلیں کرنا یا جھوٹ موٹ کی محبت جتانا تو بہت دور کی بات تھی، اس میں تو اتنا بھی دم خم نہیں تھا کہ اس کے ساتھ بات کرتے وقت ذرا مسکرا ہی دے، اور نہ اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ بغیر معقول وجہ محض تفریحاً کلب میں ڈنر کرآئے، ترنگ میں آکر یونہی رقم خرچ کر ڈالے یا کاروباری مصروفیات — ان مصروفیات میں اس کی بیوی اس کے دانش ورانہ مشاغل بھی شامل کرتی تھی۔ وہ انھیں سمجھتی تو بالکل نہیں تھی لیکن انھیں اہمیت بہت دیتی تھی — کے علاوہ کسی اور عذر کی بنا پر زیادہ دیر گھر سے غیر حاضر رہ سکے۔ اس کے عوض میں پیئر کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ اپنے گھر میں اپنی ہی نہیں بلکہ سارے خاندان کی زندگی جس نہج سے چاہے، ترتیب دے سکتا تھا۔ اپنے گھر میں نتاشا اپنے خاوند کی باندی تھی اور جب وہ سٹڈی روم میں لکھنے پڑھنے کے کام میں مصروف ہوتا تھا، گھر کا ہر فرد پنجوں کے بل چلتا تھا۔ پیئر جب بھی کسی چیز کے لیے ذرا سی رغبت یا میلان کا عندیہ دیتا، فوراً اس کی خدمت میں حاضر کر دی جاتی۔ اس نے خواہش کا اظہار کیا نہیں کہ نتاشا نے اسے پورا کرنے کے لیے دوڑ لگائی نہیں۔

گھر کا پورا نظم و نسق مالک کے مفروضہ احکام، یعنی اس کی خواہشات کے مطابق چلتا تھا۔ نتاشا ان کا پیشگی اندازہ لگانے کی کوشش کرتی رہتی تھی۔ ان کے طرز حیات، ان کے رہائش مقامات، ان کے دوست احباب اور

تعلقات، نتاشا کی مصروفیات، بچوں کی پرورش و پرداخت — ان تمام امور میں پیئر کی نہ صرف بیان کردہ بلکہ ان خواہشات کا بھی، جن کا اندازہ نتاشا اس کی گفتگوؤں سے لگاتی رہتی تھی، خیال رکھا جاتا تھا۔ وہ اس کی خواہشات کی بنیادی باتوں کو بالکل صحیح طریقے سے مستنبط کرتی تھی، اور جب ایک مرتبہ وہ ان نتائج پر پہنچ جاتی تھی، پھر وہ بڑے استقلال سے ان سے چمٹی رہتی تھی اور جب خود پیئر اپنے ارادوں میں کسی نوع کی تبدیلی لانے کی خواہش کرتا تھا، وہ اسی کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کرتی تھی۔

چنانچہ ایک مشکل وقت میں، جسے پیئر کبھی فراموش نہیں کر سکا، جب اپنی پہلی بچی کی پیدائش کے بعد، جو بالکل دھان پان تھی، تین مختلف انائیں آزمائی گئیں اور نتاشا پریشانیوں سے بیمار پڑ گئی، پیئر نے ایک روز اسے روسو کے خیالات سے آگاہ کیا جن سے وہ خود متفق تھا کہ دودھ پلانے کے لیے اناؤں کی خدمات حاصل کرنا بالکل غیر فطری اور ضرر رساں بات ہے۔ نتاشا نے اس بات کو پلے باندھ لیا۔ جب اگلی بچی پیدا ہوئی، اپنی ماں، ڈاکٹروں اور اپنے شوہر کی بھی مخالفت کے باوجود — وہ بھی اس کے بچوں کو اپنا دودھ پلانے کے اس لیے مخالف تھے کیونکہ یہ چیز اس زمانے میں نہ کسی نے سنی تھی اور نہ گنی تھی اور مضر تصور کی جاتی تھی — وہ اپنی مرضی کرنے پر تلی رہی اور اس نے اپنے سارے بچوں کو خود اپنا دودھ پلایا۔

اکثر ایسا ہوتا کہ جھنجھلاہٹ کے لمحات میں میاں بیوی میں چخ چخ ہو جاتی لیکن تکرار کے خاصے دنوں بعد پیئر یہ دیکھ کر حیران بھی ہوتا اور خوش بھی کہ اس کی بیوی لفظاً بھی اور عملاً بھی اسی خیال کو، جس کے خلاف اس نے زور شور سے جھگڑا کیا ہوتا تھا، عملی جامہ پہنا رہی ہے تاہم جھگڑے کی گرماگرمی کے دوران میں وہ جن فالتو اور بیکار محض باتوں کا اضافہ کر دیتا تھا، انھیں نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

شادی کے سات سال بعد پیئر کو مسرت بخش اور پختہ یقین ہو گیا کہ وہ برا آدمی نہیں ہے۔ اسے اس کا احساس یوں ہوا کیونکہ اسے اپنی بیوی کی ذات، اعمال اور رویوں میں اپنا ہی عکس دکھائی دیتا تھا۔ جہاں تک اس کا اپنا تعلق ہے، اسے یہ احساس ستاتا رہتا تھا کہ اس کی ذات میں اچھائیاں اور برائیاں کچھ اس طرح آپس میں متداخل و مدغم ہو گئی ہیں کہ انھیں ایک دوسری سے الگ کرنا ناممکن ہے مگر اسے اپنی بیوی میں اپنی ذات کا صرف وہی حصہ، جو واقعی اچھا تھا، نظر آتا تھا کیونکہ ہر وہ چیز، جو کاملاً اچھی نہیں ہوتی تھی، مسترد کر دی جاتی تھی۔ اس کی یہ سوچ کسی منطقی خیال کا نہیں بلکہ کسی بالکل دوسری چیز کا — بلاواسطہ، پراسرار غور و فکر — نتیجہ تھی۔

11

رستوفوں کے ہاں قیام کے دوران میں کوئی دو ماہ قبل پیئر کو کسی پرنس فیودر کا خط ملا تھا۔ اس خط میں اس سے پیٹرزبرگ پہنچنے کی استدعا کی گئی تھی کیونکہ کسی سوسائٹی کے، پیئر جس کے سرکردہ بانیوں میں شامل تھا، بعض اہم امور کے متعلق، جن پر ارکان تشویش میں مبتلا تھے، بحث و تمحیص ہونا تھی۔

خط پڑھنے کے بعد نتاشا نے (وہ اپنے شوہر کے تمام خطوط پڑھا کرتی تھی) خود تجویز پیش کی کہ گو وہ اس کی عدم موجودگی کو شدت سے محسوس کرے گی، اسے پیٹرز برگ کا دورہ کرنا چاہیے۔ اگرچہ اسے اپنے شوہر کے تجریدی اور دانشورانہ مشاغل کی مطلق کوئی سمجھ نہیں آتی تھی، وہ انھیں زبردست اہمیت دیتی تھی اور اس پر ہر دم یہ خوف سوار رہتا تھا کہ کہیں وہ اس کی ان مصروفیات میں رکاوٹ تو نہیں بن رہی۔ خط پڑھنے کے بعد جب پیئر نے ڈرتے سہمتے اس پر استفہامی نظر ڈالی، اس نے اپنا ردعمل یوں ظاہر کیا کہ وہ اس سے جانے کی التجائیں کرنے لگی لیکن اس نے ایک شرط لگا دی کہ وہ اپنی واپسی کی واضح تاریخ بتائے۔ اسے چار ہفتوں کی چھٹی مل گئی۔

اس کی واپسی کی جو تاریخ طے ہوئی تھی، اسے بیتے دو ہفتے گزر چکے تھے۔ تب سے نتاشا پر خوف و دہشت، ڈپریشن اور جھنجھلاہٹ کے دورے پڑ رہے تھے۔

دینی سوف، جواب ریٹائرڈ جرنیل تھا اور موجودہ حالات سے قطعی غیر مطمئن، انھیں دو ہفتوں کے دوران میں پہنچا تھا۔ وہ نتاشا کو دیکھتا تھا اور یوں ملول و متعجب ہوتا تھا جیسے وہ کسی ایسی چیز کی، جو کبھی بہت محبوب ہوا کرتی تھی، بدہیئت مشابہت دیکھ رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عورت، جس نے کبھی اسے اپنے سحر میں پھانس لیا تھا، بوریت اور پژمردگی کی شکار ہے، باتوں کے انگل پچو جوابات دیتی ہے اور صرف نرسری کے متعلق گفتگو کرتی ہے۔ اسے اس میں نہ کچھ اور نظر آیا اور نہ اس نے اس کی زبان سے کچھ اور سنا۔

نتاشا اس سارے عرصے کے دوران میں غم و غصے کی آگ میں جلتی بھنتی رہی۔ جب اس کی ماں، بھائی، سونیا یا کاؤنٹس ماریا پیئر کی وکالت کرتے اور اس کی واپسی کی تاخیر کے اسباب گھڑتے، اس کا مزاج اور بھی گرم ہو جاتا اور اس کے غم و اندوہ میں مزید اضافہ ہو جاتا۔

"یہ بحث مباحثے نری بکواس ہیں ــ بالکل واہیات۔ ان کا کوئی اور چھور نہیں۔ اور یہ سوسائٹیاں تو عقل سے بالکل کوری ہیں!" اور وہ بالکل انھی معاملات کو، جنھیں وہ بے پناہ اہمیت دیتی تھی، رگیدنا شروع کر دیتی۔

اور اپنے دل کا غبار نکالنے کے بعد وہ اپنے اکلوتے بیٹے پیتا کو دودھ پلانے نرسری چلی جاتی۔ جب وہ تین ماہ کی ننھی منی جان اس کی چھاتیوں سے لپٹی ہوتی اور اسے اس کے ہونٹوں کی حرکت اور اس کی ننھی منی ناک کی منمناہٹ محسوس ہوتی، اسے ان سے بڑھ کر اور کوئی چیز اتنی تسکین بخش اور معقول نظر نہ آتی۔ وہ ننھی جان اس سے کہتی: "تم خفا ہو، تم حاسد ہو، تم اس سے بدلہ لینا چاہتی ہو اور تم خوف زدہ ہو، لیکن یہاں میں ہوں ــ اور میں ہی وہ ہوں!" اور یہ بات ناقابل تردید تھی، یہ صحیح ہی نہیں تھی بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہی تھی۔

بے قراری کے ان دو ہفتوں کے دوران میں نتاشا نے تسکین کے لیے اتنی زیادہ مرتبہ اس طفل شیر خوار کی طرف رجوع کیا اور اس پر اتنی زیادہ توجہ دی کہ اسے ضرورت سے کہیں زیادہ دودھ پلاتی رہی اور یوں وہ بیمار پڑ گیا۔ اس کی علالت پر اس کے ہوش و حواس گم ہو گئے تاہم بالکل یہی وہ چیز تھی جس کی اسے ضرورت تھی۔ اس کی نگہداشت کرنے سے اس کے لیے خاوند کے متعلق اپنی تشویش برداشت کرنا آسان ہو گیا۔

جب سامنے کے دروازے پر پیئر کی سلیج کی آواز سنائی دی، وہ بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور بوڑھی نرس، جسے اپنی مالکہ کو خوش کرنے کا گر آتا تھا، چہرے پر تبسم سجائے برق رفتاری سے کمرے میں داخل ہوگئی۔

''وہ آگئے؟'' نتاشا نے سرگوشیوں میں پوچھا۔ وہ ہلتے ڈرتی تھی کہ کہیں بچہ، نیند سے جس کی آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں، جاگ نہ جائے۔

''مادام، آقا تشریف لے آئے ہیں،'' نرس نے کانا پھوسی کی۔

نتاشا کی کیفیت ہیجانی ہوگئی اور غیر ارادی طور پر اس کا پاؤں ہلنے لگا۔ مگر جست لگا کر اٹھنے اور بھاگ کر باہر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بچے نے اپنی مہین آنکھیں کھولیں اور اس کی طرف یوں دیکھنے لگا جیسے پوچھ رہا ہو، ''تم یہیں ہو؟'' اور ایک بار پھر مزے مزے اپنے ہونٹ چٹخانے لگا۔

نتاشا نے نہایت حزم واحتیاط سے اپنی چھاتی چھڑائی، بچے کو دو ایک بار آگے پیچھے جھلایا، پھر اسے نرس کے حوالے کیا اور تیزی سے دروازے کی طرف بڑھی۔ لیکن وہاں پہنچتے ہی وہ رک گئی اور پیچھے مڑ کر یوں دیکھا جیسے اس کا ضمیر اسے ملامت کر رہا ہو کہ وہ اپنی خوشی کی خاطر بچے کو یوں اچانک چھوڑ بھاگی ہے۔ نرس اپنی کہنیاں بلند کیے بچے کو پالنے کے جنگلے سے اوپر اٹھا رہی تھی۔

''جی، مادام، آپ تشریف لے جا سکتی ہیں، بالکل تشریف لے جا سکتی ہیں۔ کوئی فکر نہ کریں، تشریف لے جائیں،'' وہ سرگوشیوں میں کہہ رہی تھی۔ اس کے اندازِ تکلم میں وہی بے تکلفی جھلک رہی تھی جو مالکہ اور نرس کے مابین استوار ہو جاتی ہے۔

نتاشا ہلکے پھلکے قدم اٹھاتی پیش دالان کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔ دینی سوف کو، جو ہاتھ میں پائپ پکڑے سٹڈی روم سے باہر آ رہا تھا، پہلی مرتبہ پرانی نتاشا دوبارہ نظر آئی۔ رخشندہ وشاداں روشنی کے سیلاب نے اس کے چہرے کی ہیئت ہی تبدیل کر دی تھی۔

''وہ آگئے ہیں!'' اس نے اس کے قریب سے برق رفتاری سے گزرتے ہوئے نعرہ بلند کیا اور دینی سوف کو محسوس ہوا کہ خود اسے بھی خوشی ہو رہی ہے کہ پیئر، جسے وہ پسند نہیں کرتا تھا، آگیا ہے۔

نتاشا جب بھاگتی دوڑتی پیش دالان میں داخل ہوئی، اسے پوستین کے کوٹ میں لپٹا لمبا تڑنگا شخص نظر آیا جو اپنا سکارف کھول رہا تھا۔

''وہی ہیں! واقعی وہی ہیں! وہ آگئے ہیں!'' اس نے اپنے آپ سے کہا اور سرعت سے بھاگتے ہوئے وہ اس سے بغل گیر ہوگئی اور اس کا سر اپنی چھاتیوں میں بھینچ لیا۔ پھر وہ پیچھے ہٹی اور ٹکٹکی باندھ کر اس کے سرخ وسپید اور مسرور چہرے کو دیکھنے لگی جو یخ بستہ کہرے سے ڈھکا ہوا تھا۔

''ہاں، یہ وہی ہیں، خوش اور مطمئن...''

اچانک اسے وہ اذیت ناک گھڑیاں یاد آگئیں، جو اس نے اس کے انتظار میں گزشتہ دو ہفتوں کے دوران

میں بتائی تھیں۔ جس خوشی سے اس کا چہرہ جگمگا رہا تھا، وہ غائب ہو گئی۔ اس کے ابروؤں پر بل پڑ گئے، ضبط کا بند ٹوٹ گیا اور ملامتوں اور تلخ الفاظ کے سیلاب نے پیئر کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

''ہاں، آپ کے لیے تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے، جبھی تو آپ اتنے خوش ہیں۔ آپ گلچھرے اڑاتے رہے ہیں، عیش کرتے رہے ہیں... لیکن میں؟ میرے بارے میں کیا خیال ہے؟ کم از کم بچوں کا ہی کچھ خیال کیا ہوتا۔ میں دودھ پلا رہی ہوں۔ میرا دودھ خراب ہو گیا۔ پیتا موت کے دروازے پر پہنچ گیا۔ لیکن آپ؟ آپ کو کیا، آپ تو مزے کر رہے تھے، ہاں، مزے...''

پیئر جانتا تھا کہ وہ قصوروار نہیں ہے، وہ اس سے پہلے آ ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ طوفانِ غیظ و غضب نازیبا ہے اور ایک دومنٹ میں فرو ہو جائے گا۔ لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وہ جانتا تھا کہ وہ خود بے حد خوش ہے۔ اس کا مسکرانے کو جی چاہتا تھا لیکن وہ ایسا کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس کے چہرے پر بے چارگی اور خوف جھلک رہا تھا اور اس نے طوفان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا۔

''میں سچ کہتا ہوں کہ میرا اس سے پہلے آنا ممکن نہیں تھا۔ پیتا کیسا ہے؟''

''وہ اب ٹھیک ہے۔ اب چلیں! آپ کو شرم نہیں آتی؟ کاش آپ کو معلوم ہوتا کہ آپ کے بغیر میری کیا حالت ہوئی! میں نے کس عذاب میں یہ وقت گزارا!''

''تم ٹھیک ہو؟''

''چلیں، اب چلیں!'' اس نے اس کا بازو چھوڑے بغیر کہا۔ اور وہ دونوں اپنے اپارٹمنٹ کی طرف چل پڑے۔

جب نکولائی اور اس کی بیوی پیئر کو ڈھونڈنے نکلے، انھیں وہ نرسری میں ملا۔ وہاں وہ اپنے شیر خوار بچے کو، جو دوبارہ جاگ گیا تھا، اپنے بھاری بھرکم دائیں ہاتھ پر اچھال جھلا رہا تھا۔ بچے کے، جس کا بے دانت منہ کھلا تھا، چوڑے چکلے چہرے پر خوشی کی مسکراہٹ تھی۔ طوفان بہت مدت پہلے تھم چکا تھا۔ نتاشا کے چہرے پر دھوپ کی سی جگمگاہٹ تھی۔ وہ نگاہیں گاڑے اپنے خاوند اور بچے کو دیکھ رہی تھی اور مسرت سے اس کی باچھیں کھلی جا رہی تھیں۔

''آپ پرنس فیودر سے جو کچھ کہنا چاہتے تھے، سب کہہ دیا؟'' نتاشا پوچھ رہی تھی۔

''ہاں، بالکل۔''

''آپ دیکھتے ہیں کہ وہ اپنی گردن بلند کر سکتا ہے۔'' (نتاشا کی مراد بچہ تھا) ''لیکن اس نے میری تو جان ہی ہوا کر دی تھی!... اور آپ کی پرنس سے ملاقات ہوئی؟ کیا یہ ٹھیک ہے کہ وہ۔۔۔ کی محبت میں گرفتار ہے؟''

''ہاں، کیا تم تصور کر سکتی ہو۔۔۔''

اس مقام پر نکولائی اور پرنس ماریا اندر داخل ہوئے۔ پیئر ابھی تک بچے کو بازوؤں میں اٹھائے ہوئے تھا۔ وہ اسی حال میں نیچے جھکا، اس نے ان کے بوسے لیے اور ان کے سوالات کے جوابات دیے۔ اگرچہ انھیں ایک دوسرے کے ساتھ بہت سی دلچسپ باتوں کے بارے میں تبادلۂ خیالات کرنا تھا لیکن نظر یہ آ رہا تھا کہ فی الحال انھیں

بچے کو ہی جو ٹوپی کے نیچے جھولتے ڈگمگاتے سر کے ساتھ پیئر کی تمام توجہ کو اپنی طرف مبذول کیے ہوئے تھا، موضوع گفتگو بنانا پڑے گا۔

''کتنا پیارا ہے!'' پرنسس ماریا نے بچے کی طرف دیکھتے اور اس کے ساتھ لاڈ پیار کرتے ہوئے کہا۔ ''نکولس، ایک بات میری سمجھ میں نہیں آتی،'' اس نے اپنے خاوند کی طرف مڑتے ہوئے مزید کہا: ''آخر آپ کو ان ننھے منے انتہائی خوبصورت اعجوبوں میں کوئی کشش کیوں نظر نہیں آتی۔''

''ہاں، بالکل نظر نہیں آتی۔ میں ان کی طرف مائل ہو ہی نہیں سکتا'' نکولائی نے سرد مہری سے بچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''گوشت کا لوتھڑا ہی تو ہے۔ چھوڑو پیئر، آؤ چلیں۔''

''اس کے باوجود وہ بہت محبت کرنے والے باپ ہیں،'' کاؤنٹس ماریا نے اپنے شوہر کا دفاع کرتے ہوئے کہا۔ ''لیکن وہ یہ محبت ایک دو سال کے بعد جتلاتے ہیں۔''

''اور ادھر پیئر کتنی شاندار آیا ہیں۔'' نتاشا نے کہا۔ ''وہ کہتے ہیں کہ ان کا ہاتھ بنا ہی بچوں کے بیٹھنے کے لیے ہے۔ دیکھ لو۔''

''اونہہ، صرف اس کے لیے نہیں...'' پیئر نے اچانک ہنستے ہوئے کہا اور پھرتی سے بچہ دوبارہ نرس کو تھما دیا۔

12

جیسا کہ ہر بڑے گھرانے میں ہوتا ہے، بالڈ ہلز میں متعدد چھوٹی چھوٹی دنیائیں آباد تھیں جو ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھیں۔ اگرچہ ان میں سے ہر ایک کی اپنی اپنی انفرادیت تھی اور وہ دوسروں کے معاملات میں دخل نہیں دیتی تھیں لیکن وہ سب آپس میں مل کر ہم آہنگ کُل میں ڈھل جاتی تھیں۔ گھر میں جو بھی واقعہ پیش آتا، وہ افسوس ناک ہوتا یا خوش آئند، وہ ان سب دنیاؤں کے لیے اہم ہوتا تھا لیکن اس پر خوشی منانے یا آنسو بہانے کی وجوہ ہر ایک کی اپنی اپنی ہوتی تھیں اور یہ وجوہ دوسروں کی وجوہ سے مختلف ہوتی تھیں۔

چنانچہ پیئر کی آمد اہم اور خوش آئند واقعہ تھا اور اس سے سبھی متاثر ہوئے تھے۔

جب پیئر واپس آیا نوکر چاکر۔ جو اپنے آقاؤں کے انتہائی قابل اعتبار منصف ہوتے ہیں کیونکہ وہ انھیں ان کے الفاظ یا احساسات وخیالات سے نہیں جانچتے جن کا وہ اظہار کرتے ہیں، نہیں جانچتے بلکہ ان کے افعال اور زندگی کے متعلق رویوں کو دیکھ کر فیصلہ سناتے ہیں۔ اس لیے خوش تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جب وہ آتا ہے، ان کا آقا اپنی جاگیر اور املاک کا ہر روز چکر لگانا ترک کر دیتا ہے، اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آجاتا ہے، وہ خوش رہتا ہے اور دوسروں کے ساتھ شفقت اور مہربانی کا برتاؤ کرتا ہے۔ وہ اس لیے بھی مسرور تھے کیونکہ انھیں دعوت کے روز توقع سے بڑھ کر اعلیٰ تحائف ملتا تھے۔

گورنسیں اور بچے اسے دیکھ کر اس لیے خوش تھے کیونکہ گھرانے کی تفریحی اور دیگر تقریبات میں جس طرح وہ

انھیں شامل کرتا تھا، کوئی اور نہیں کرتا تھا۔ صرف وہی کلاوی کارڈ پر ecossaise* (اسے بس یہی ایک دھن بجانا آتی تھی!) کو بجا سکتا ہے جس کے متعلق اس کا دعویٰ تھا کہ اس کی سنگت میں ہر قسم کا رقص کیا جا سکتا ہے، بجا سکتا ہے۔ پھر ان سب کو یہ بھی یقین تھا کہ وہ ان کے لیے تحائف لایا ہوگا۔

ہلکے بھورے گھونگریالے بالوں اور خوبصورت آنکھوں والا نکولینکا بلکونسکی، جواب پندرہ سال کا دبلا پتلا، نازک اندام اور ذہین لڑکا تھا، خوشی سے پھولا نہیں سما رہا تھا کیونکہ ''انکل پیئر،'' جیسا کہ وہ اسے کہا کرتا تھا، اس کی والہانہ محبت اور تحسین کا مرکزی نقطہ تھا۔ اسے پیئر سے جو محبت تھی، وہ کسی نے اس کے دل میں نہیں بٹھائی تھی اور اس کی پیئر سے ملاقات بھی شاذ و نادر ہی ہوتی تھی۔ اس کی پھوپھی اور سرپرست کاؤنٹس ماریا نے پوری کوشش کی تھی کہ جس طرح وہ خود اپنے شوہر سے محبت کرتی ہے، اسی طرح نکولینکا بھی اس سے محبت کرنے لگے۔ نکولینکا اپنے انکل کو پسند تو کرتا تھا تاہم اس کی اس پسند میں قدرے حقارت کی بھی آمیزش ہوتی تھی۔ البتہ پیئر کی وہ پرستش کرتا تھا۔ وہ اپنے انکل نکولائی کی طرح نہ تو ہوزار بننا چاہتا تھا اور نہ اسے (تمغہ) سینٹ جارج حاصل کرنے والوں کی فہرست میں اپنا نام شامل کرانے کا شوق تھا۔ وہ پیئر کی طرح پڑھا لکھا، عقل مند اور شفیق انسان بننے کا خواہش مند تھا۔ پیئر کی موجودگی میں اس کا چہرہ ہمیشہ خوشی سے دمکتا رہتا اور جب پیئر اس سے مخاطب ہوتا، وہ شرما جاتا، اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا اور اسے اپنا دم رکتا محسوس ہوتا۔ پیئر جو کچھ کہتا تھا، وہ اس کا ایک ایک لفظ بغور سنتا اور بعد ازاں دیسال کی مدد سے یا تن تنہا اسے یاد کرتا اور اس کے مفاہیم پر غور کرتا۔ پیئر کی سابقہ زندگی اور 1812 سے قبل کے زمانے کی اس کی آزردگی (اس کے متعلق اس نے اتفاقیہ طور پر دوسروں کی ادھوری باتیں سن کر اپنے ذہن میں مبہم، رومانی تصویر بنائی تھی)، اس کی اسیری، نتاشا (جس کا وہ خود بھی خاص طور پر گرویدہ تھا) سے اس کی محبت اور سب سے بڑھ کر پیئر کی اس کے باپ سے، جو اسے یاد نہیں تھا، دوستی — ان تمام باتوں نے مل ملا کر پیئر کو اس کی نگاہوں میں ہیرو اور سینٹ بنا دیا تھا۔

وہ اپنے باپ اور نتاشا کے بارے میں ادھر ادھر سے جو باتیں سنتا تھا، پیئر جس جوش و جذبے سے مرحوم کا ذکر کرتا تھا، نتاشا جس پر از ملائمت احترام سے اس کے متعلق گفتگو کرتی تھی، ان سے نکولینکا نے، جو محبت کیا ہوتی ہے، کے بارے میں خود کچھ کچھ سوچنے سمجھنے لگا تھا، اپنے ذہن میں یہ خیال بٹھا لیا کہ اس کا باپ نتاشا سے محبت کرتا تھا اور یہ کہ جب وہ بستر مرگ پر دراز تھا، اس نے اسے اپنے دوست کے سپرد کر دیا تھا۔ یہ باپ، جس کی لڑکے کے ذہن میں کوئی یاد نہیں تھی، اس کے لیے دیوتا کا درجہ رکھتا تھا۔ اسے تصور میں لانا محال تھا لیکن وہ جب بھی اس کے متعلق سوچتا تھا، اس کے دل پر آری چل جاتی تھی اور وجد آفریں مسرت اور غم سے اس کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آتے تھے۔

چنانچہ پیئر کی واپسی پر لڑکا بھی خوش تھا۔

گھر میں جو مہمان مقیم تھے، وہ بھی پیئر کو دیکھ کر خوش ہو گئے کیونکہ وہ جس محفل میں بیٹھتا تھا، اسے گرما دیتا تھا۔ اس کی بیوی تو رہی ایک طرف، گھر کے سبھی بالغ افراد اس کی آمد پر بہت مسرور تھے کیونکہ وہ ایک ایسا رفیق تھا

* سکاچستانی (دھن)۔ تفصیل کے لیے دوسری کتاب کے حصہ اول کا حاشیہ نمبر 29 دیکھیں۔

جس کی موجودگی زندگی کی گاڑی کو زیادہ ہموار اور پر سکون انداز سے رواں دواں رکھنے میں مددگار ثابت ہوتی تھی۔

بڑی بیبیاں اس سے اس لیے خوش تھیں کیونکہ وہ ان کے لیے تحائف لایا تھا لیکن انھیں اس سے بھی بڑی خوشی اس بات کی تھی کہ اب نتاشا اپنے حواس میں آجائے گی۔

پیئر ان مختلف دنیاؤں کے رویوں کو سمجھتا تھا اور اس نے ان کی توقعات پوری کرنے میں کوئی تاخیر نہ کی۔

اگرچہ وہ انتہائی غائب دماغ اور بھلکڑ آدمی تھا، وہ ایک فہرست کی مدد سے، جو اس کی بیوی نے تیار کی تھی، ہر چیز خرید لایا تھا، وہ ان اشیا کو بھی، جن کی خریداری اس کی ساس اور برادر نسبتی نے اس کے ذمے لگائی تھی، نہ مادام بائیلووا کے ڈریس کے لیے کپڑا اور نہ اپنے بھتیجوں کے کھلونے لانا بھولا تھا۔

اپنی شادی کے ابتدائی ایام میں، جب اس کی بیوی اس سے یہ توقع کرتی تھی کہ وہ ان اشیاء کو یاد رکھے گا جن کی خریداری کی اس نے ہامی بھری ہوتی تھی، تو اسے یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی تھی اور جب پہلی غیر حاضری کے دوران میں اسے کچھ بھی لانا یاد نہ رہا، اس کی بیوی نے جس گمبھیر انداز سے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا، اس نے اسے ہکا بکا کر دیا۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ اس کا عادی ہوتا چلا گیا۔ وہ جانتا تھا کہ نتاشا اپنے لیے کبھی کچھ نہیں مانگتی اور جب وہ خود رضا کارانہ پیشکش کرتا ہے، تب صرف دوسروں کی فرمائشوں کی تکمیل اس کے ذمے لگاتی ہے۔ یوں اسے گھر کے ہر فرد کے لیے تحائف کی اس خریداری میں غیر متوقع اور بچگانہ لطف آنے لگا اور اب وہ کچھ بھی نہیں بھولتا تھا۔ اب اگر اسے اپنی بیوی کی نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑتا تھا، تو صرف اس بات پر کہ وہ ضرورت سے زیادہ اشیا خرید لاتا ہے اور یوں فضول خرچی کا مرتکب ہوتا ہے۔ نتاشا اپنی ذات اور لباس کے بارے میں لاپروائی برتتی تھی اور بن ٹھن کر نہیں رہتی تھی۔ (دوسرے لوگوں کی نگاہوں میں یہ اس کی خامیاں لیکن پیئر کے نزدیک یہ اس کی خوبیاں تھیں۔) نتاشا نے اپنی ان ''خامیوں'' میں اب جزرسی کا بھی اضافہ کر لیا۔

جب سے پیئر نے ایک ایسے خاندان کے، جس کا حجم سال بہ سال بڑھتا جا رہا تھا، سربراہ کی حیثیت سے زندگی گزارنا شروع کی تھی، اس کے اخراجات میں اضافہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر بہت حیران ہوا کہ اب وہ پہلے کی نسبت آدھے رہ گئے ہیں اور اس کے مالی معاملات میں، خاص طور پر اس کی پہلی بیوی کے قرضوں کی وجہ سے، جو فتور آیا تھا، حال ہی میں ان میں بہتری کے آثار نمودار ہونے لگے ہیں۔

اخراجات زندگی اس لیے کم ہو گئے تھے کیونکہ اب ان پر قدغنیں لگ چکی تھیں۔ اس قسم کا طرز حیات، جو آدمی کو جب اور جہاں اس کا جی چاہے، جانے یا مختلف کام کرنے کی اجازت دیتا ہے اور جو انتہائی مہنگا تعیش ہے، اس کے اختیار میں نہیں رہا تھا اور نہ اب اسے اس کی کوئی آرزو رہی تھی۔ پیئر کو محسوس ہوتا تھا کہ اب اس کا طرز زندگی مستقلاً طے ہو چکا ہے، اس میں تاحین حیات کوئی تبدیلی نہیں آئے گی اور اسے تبدیل کرنا اس کے بس میں نہیں رہا ہے۔ چنانچہ یہ نیا انداز کفایت شعارانہ ثابت ہوا۔

چہرے پر مسرت اور تبسم سجائے پیئر اپنی خرید کردہ اشیاء کی چھانٹی کر رہا تھا۔

''اس کے متعلق کیا خیال ہے؟'' اس نے دکاندار کی طرح ڈریس کا کپڑا پھیلاتے ہوئے کہا۔

نتاشانے، جو اپنی بڑی بیٹی کو گھٹنے پر ٹکائے اس کے سامنے بیٹھی تھی، اپنی جگمگاتی آنکھیں اپنے خاوند سے ان اشیاء کی طرف منتقل کیں جو وہ اسے دکھا رہا تھا۔

''یہ بائیلووا کے لیے ہے؟ بہت خوبصورت ہے۔'' اس نے کپڑے کو ٹٹول کر اس کی کوالٹی کا اندازہ لگایا۔ ''ایک روبل فی آرشین[25] ہوگا۔''

پیئر نے اسے قیمت بتائی۔

''بہت زیادہ ہے!'' نتاشانے حاشیہ آرائی کی۔ ''خیر، maman* اور بچے بہت خوش ہوں گے! آپ کو چاہیے تھا کہ آپ میرے لیے یہ نہ لاتے۔'' اس نے کنگھی نما طلائی کلپ کی، جس پر موتی جڑے ہوئے تھے اور جس کا نیا نیا فیشن چلا تھا، تحسین کرتے ہوئے کہا۔ وہ اپنی مسکراہٹ چھپانا چاہتی تھی لیکن ناکام رہی۔

''مجھے آدیل نے ورغلایا تھا۔ وہ بار بار اصرار کرتی رہی کہ مجھے یہ لازماً خریدنا چاہیے،'' پیئر نے اپنی صفائی پیش کی۔

''میں اسے پہنوں گی کب؟'' نتاشانے اسے جوڑے میں پھانستے ہوئے کہا۔ ''چلیں، جب ہم ماشا کو محافل میں لے جانا شروع کریں گے، کام آئے گا۔ شاید اس وقت تک اس کا فیشن چلتا رہے۔ آئیں، اب چلیں۔''

تحائف سمیٹنے کے بعد وہ پہلے نرسری میں اور پھر معمر کاؤنٹس کے پاس چلے گئے۔

جب پیئر اور نتاشا بغلوں میں پارسل دبائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، کاؤنٹس حسبِ معمول بائیلووا کے ساتھ بیٹھی پیشنس کھیل رہی تھی۔

کاؤنٹس ساٹھ سے اوپر نکل چکی تھی۔ اس کے بالوں میں اچھی خاصی سفیدی جھلکنے لگی تھی۔ اس کے سر پر جو ٹوپی تھی، اس میں جھالریں تھیں اور یہ جھالریں اس کے چہرے کے اردگرد لٹک رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر جھریاں پڑ چکی تھیں، اوپر کا ہونٹ نچلی جانب ڈھلک چکا تھا اور اس کی بصارت میں فرق آ گیا تھا۔

اپنے بیٹے اور شوہر کی مختصر عرصے میں یکے بعد دیگرے اموات کے بعد اسے محسوس ہونے لگا تھا کہ اسے اتفاقاً دنیا میں بھلا دیا گیا ہے۔ اب اسے زندگی کا نہ کوئی مقصد نظر آتا تھا اور نہ اس میں کوئی دلچسپی رہ گئی تھی۔ وہ کھاتی تھی، پیتی تھی یا آنکھیں کھولے لیٹی رہتی تھی لیکن وہ زیست کر نہیں رہی تھی۔ زندگی اب اس پر اپنا کوئی نقش نہیں چھوڑتی تھی۔ اسے اس میں سکون کے علاوہ اور کسی چیز کی تمنا نہیں رہ گئی تھی اور یہ سکون اسے صرف موت ہی فراہم کر سکتی تھی لیکن جب تک موت نہیں آتی اسے بہرطور جینا تھا، یعنی اپنا وقت اور حیاتی قوتیں کسی مصرف میں لانا تھیں۔ ایک انوکھی خصوصیت، جو صرف نوعمر بچوں اور بہت ہی بوڑھے اشخاص میں نظر آتی ہے، وہ اس کا بدرجہ اتم اظہار کرتی تھی: اس کا وجود کسی بدیہی مقصد کے بغیر تھا لیکن اپنی فعالیتوں اور میلانات کو بروئے کار لانے کی ضرورت اپنی جگہ موجود تھی۔

* اماں

اسے کھانا، سونا، سوچنا، بولنا، رونا، کچھ دستی کام کرنا اور کبھی کبھار اپنے غصے کی نمائش کرنا پڑتی تھی، علیٰ ہذا القیاس، اور یہ سب اس لیے کیونکہ اس کا معدہ تھا، دماغ تھا، عضلات واعصاب تھے اور ایک عدد جگر تھا۔ جب لوگ زندگی کی توانائیوں سے سرشار ہوتے ہیں، کسی خارجی تحرک کے زیر اثر اپنی جدوجہد کا رخ کسی مقصد کے حصول کی طرف موڑ دیتے ہیں اور اس جدوجہد کے دوران میں ان اعضاء کے افعال کا مقصد ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے لیکن کاؤنٹس کو کوئی خارجی تحرک مصروف عمل نہیں کرتا تھا۔ وہ باتیں اس لیے کرتی تھی کیونکہ جسمانی طور پر اس کے لیے اپنی زبان اور پھیپھڑوں کو استعمال کرنا ضروری تھا۔ وہ اس طرح روتی تھی جس طرح بچے روتے ہیں کیونکہ انھیں ناک سُڑکنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ توانا اور صحت مند لوگوں کو جو چیز آخری مقصد معلوم ہوتی ہے، اس کے لیے محض بہانہ تھی۔

چنانچہ سویرے سویرے — خاص طور پر اگر اس نے گزشتہ روز کوئی زیادہ ہی مرغن چیز کھائی ہوتی — اسے خفگی کا اظہار کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگتی، اور اس مقصد کے لیے وہ آسانی سے دستیاب بہانہ — بائیلووا کا بہراپن — منتخب کر لیتی۔

وہ کمرے کے دوسرے کونے سے مدھم آواز میں کہنا شروع کرتی:

''مائی ڈیئر، معلوم ہوتا ہے کہ آج کا دن نسبتاً زیادہ گرم ہے،'' وہ بڑبڑاتی۔

اور جب مادام بائیلووا جواب دیتی: ''یقیناً، یقیناً وہ آگئے ہیں۔'' وہ بڑبڑاتی: ''خدایا، یہ کتنی بہری اور احمق ہے!''

دوسرا بہانہ اس کی نسوار تھی۔ کبھی یہ اسے بالکل ہی خشک اور کبھی مرطوب دکھائی دیتی اور کبھی وہ کہتی کہ اسے باریک نہیں پیسا گیا۔ جھنجھلاہٹ اور خفگی کے ان دوروں کے بعد اس کے چہرے پر زردی کھنڈ جاتی۔ اس کی خادماؤں کو بے خطا علامتوں سے معلوم ہو جاتا تھا کہ بائیلووا کب دوبارہ بہری ہو جائے گی، کب نسوار مرطوب یا کاؤنٹس کا چہرہ کب دوبارہ پیلا پڑ جائے گا۔ جس طرح اپنے چڑچڑے پن سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اسے کوئی نہ کوئی بہانہ درکار ہوتا تھا، اسی طرح اسے اپنے سوچنے سمجھنے کی بچی کھچی صلاحیتوں کے اظہار کے لیے کوئی عذر چاہیے ہوتا تھا اور یہ مقصد پیشنس کے کھیل سے پورا ہو جاتا تھا۔ جب اسے رونے کی خواہش ہوتی، مرحوم کاؤنٹ بہانہ بن جاتا۔ جب اسے پریشان ہونے کی ضرورت پڑتی، نکولائی اور اس کی صحت آڑے آتے۔ جب اس کے سر میں کوئی کینہ توز بات کہنے کا سودا سماتا، کاؤنٹس ماریا بہانہ بن جاتی۔ جب اس کے صوتی اعضاء (Vocal organs) کو ورزش کی ضرورت محسوس ہوتی (اور یہ ضرورت عام طور پر ڈنر کے بعد تاریک کمرے میں قیلولہ کرنے کے بعد تقریباً سات بجے پیش آتی)، تو اس کا عذر یہ ہوتا کہ وہ اپنے عزیزوں کو کچھ بھولی بسری باتیں سنانا چاہتی ہے حالانکہ وہ یہ گھسی پٹی اور پیش پا افتادہ باتیں متعدد بار انھی لوگوں کو سنا چکی ہوتی تھی۔

اگرچہ بڑھیا کی کیفیت کو گھر کا ہر فرد سمجھتا تھا لیکن کھلے بندوں کوئی اس کا ذکر نہیں کرتا تھا اور اس کی ضروریات پوری کرنے کے لیے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی جاتی تھی۔ صرف کبھی کبھار نکولائی، پیئر، نتاشا اور کاؤنٹس ماریا کے

درمیان اداس، نیم متبسم نگاہوں کا جو تبادلہ ہوتا، اس سے صاف معلوم ہو جاتا کہ وہ اس کی حالت سے آگاہ ہیں۔

مگر ان کی نگاہیں کچھ اور بھی کہتی تھیں: وہ یہ کہتی تھیں کہ وہ زندگی میں اپنا کردار کھو چکی ہے، جو کچھ انھیں نظر آ رہا ہے، وہ اس کی مکمل شخصیت نہیں ہے اور کسی روز خود ان کا اپنا حشر بھی یہی ہوگا، یہ کہ انھیں اس کی خواہشات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر کے اور اپنے اوپر قابو پا کر خوشی ہوتی ہے اور یہ کہ کبھی وہ انھیں اتنی عزیز ہوا کرتی تھی اور انھیں کی طرح اس کی نس نس سے زندگی کی کرنیں پھوٹا کرتی تھیں لیکن اب انھیں اس پر ترس آتا ہے۔

"Memento mori*"، یہ نگاہیں کہتی تھیں۔

گھر کے صرف وہی افراد، جو واقعتاً کٹھور یا احمق تھے، یا پھر ننھے منے بچے، اس کی یہ کیفیت سمجھنے میں ناکام رہتے تھے اور اس سے دور دور رہتے تھے۔

13

جب پیئر اور اس کی بیوی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے، کاؤنٹس کو ذہنی ورزش کرنے کے لیے پیشنس کھیلنے کی جولت پڑی ہوئی تھی، اب وہ پھر اس کی ضرورت محسوس کر رہی تھی اور چنانچہ (اگرچہ اس نے انھیں الفاظ کی، جن سے وہ پیئر یا اپنے بیٹے کا، جب وہ کچھ دنوں کی غیر حاضری کے بعد واپس آتے تھے، استقبال کرتی تھی، جگالی کرتے ہوئے کہا: "ٹھیک وقت پر، مائی ڈیئر، ٹھیک وقت پر آئے ہو۔ ہمیں بہت دنوں سے تمھارا انتظار تھا۔ خیر، خداوند کا شکر ہے کہ تم گھر پہنچ گئے ہو!" اور اس نے اپنے تحائف اپنے ایک اور گھسے پٹے ہوئے جملے سے وصول کیے: "تحفے کی بذاتِ خود کوئی اہمیت نہیں ہوتی... خیر، تمھارا شکریہ کہ تم مجھ جیسی بڑھیا کا خیال رکھتے ہو...")۔ صاف نظر آ رہا تھا کہ اسے اس موقع پر پیئر کی آمد پسند نہیں آئی تھی کیونکہ اس کی توجہ تاش کے پتوں سے بھٹک گئی تھی۔ جب وہ اپنی پیشنس کی گیم ختم کر چکی تب ہی وہ تحائف کی طرف متوجہ ہوئی۔ یہ تحائف ان اشیا پر مشتمل تھے: ایک تاش کے پتوں کا ڈبا، جو اعلیٰ کاریگری اور مہارت کا نمونہ تھا، ایک کپ ساختہ سیوغے بمعہ ڈھکن جس پر گڈریوں کی تصویر منقش تھی، اور نسوار کی طلائی ڈبیا جس پر کاؤنٹ کی تصویر بنی ہوئی تھی (پیئر نے یہ تصویر پیٹرز برگ کے ایک تصویرچہ ساز مصور سے بنوائی تھی)۔ کاؤنٹس کا بڑے عرصے سے اس قسم کی ڈبیا کے لیے جی للچا رہا تھا لیکن چونکہ اس وقت اس کا رونے کو جی نہیں چاہتا تھا، اس نے لاپروایانہ انداز سے تصویر پر طائرانہ نظر ڈالی اور یوں اس کی توجہ کا مرکز پتوں کا ڈبا ہی رہا۔

"مائی ڈیئر، شکریہ، تم نے میرا دل خوش کر دیا ہے،" اس نے ہمیشہ کی طرح کہا۔ "مگر سب سے بہترین چیز یہ ہے کہ تم اپنے آپ کو لے آئے ہو۔ میں نے ایسی بات کبھی دیکھی نہ سنی ہے۔ تمھیں اپنی بیوی کو خوب ڈانٹ پلانا چاہیے! بھلا تم یقین کرو گے کہ جب تم کہیں چلے جاتے ہو، یوں معلوم ہونے لگتا ہے کہ اس پر جنوں بھوتوں نے قبضہ کر لیا

* لفظی ترجمہ: "یاد رکھیں آپ نے مرنا ہے۔" یہ الفاظ اس چیز (مثلاً کھوپڑی یا ایسی نمائشی چیز جو موت کی علامت ہو) کے لیے، جسے دیکھ کر انسان کو موت یا فنا یاد آ جائے، استعمال کیے جاتے ہیں۔

ہے۔ اسے نہ کچھ سجھائی دیتا ہے اور نہ کچھ یاد رہتا ہے۔" وہ حسب معمول اپنی پرانی راگنی الاپتی رہی۔ "آنا آئمونیا،"
اس نے اپنی رفیقہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا، "دیکھو، میرا بیٹا میرا لیے پتوں کا کیسا خوبصورت ڈبا لایا ہے!"

مادام بائیلوونا نے تحائف کی تعریف کی اور اپنے ڈریس کا کپڑا دیکھ کر تو وہ جامے میں پھولی نہیں سما رہی تھی۔

اگرچہ پیئر، نتاشا، نکولائی اور کاؤنٹس ماریا نے ایک دوسرے سے بہت کچھ کہنا سننا تھا لیکن وہ یہ باتیں بوڑھی کاؤنٹس کی موجودگی میں نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے نہیں کہ اس سے کوئی چیز چھپائی جاتی تھی بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زمانے سے اتنا پیچھے رہ گئی تھی کہ اگر وہ اس کے سامنے گفتگو کرتے، انھیں غیر متعلقہ باتوں کے جوابات دینا پڑتے اور جو چیز پہلے ہی بار بار دہرائی جا چکی ہوتی، اس کی خاطر اسے پھر دہرانا پڑتا تھا۔ فلاں آدمی کا انتقال ہو گیا ہے، فلاں نے شادی کر لی ہے۔ وہ سنتی تھی اور فوراً بھول جاتی تھی۔ تاہم وہ ڈرائنگ روم میں سماوار کے اردگرد بیٹھے چائے پیتے رہے اور پیئر کاؤنٹس کے مختلف سوالات کے جوابات دیتا رہا: کیا پرنس واسیلی بوڑھا ہو گیا ہے؟ کیا کاؤنٹس ماریا الیکسیو ینا نے دعا سلام بھیجا ہے اور ابھی تک انھیں یاد کرتی ہے؟ اور وہ اس قسم کی دوسری باتیں، جن میں کسی کو، بلکہ خود اسے بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی، پوچھتی رہی۔

اس قسم کی گفتگو، جس میں اگرچہ کسی کو دلچسپی نہیں تھی لیکن اس سے پیچھا نہیں چھڑایا جا سکتا تھا، چائے کے سارے عرصے کے دوران میں چلتی رہی۔ خاندان کے سارے افراد گول میز کے گرد، جس پر سماوار دھرا تھا، بیٹھے تھے (چائے کی تقسیم کا سارا انتظام سونیا کے ہاتھ میں تھا)۔ بچے اپنے ٹیوٹروں اور گورنسوں کے ساتھ پہلے ہی چائے پی چکے تھے اور ملحقہ کمرے سے ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈرائنگ روم میں ہر شخص اپنی معمول کی نشست سنبھالے ہوئے تھا۔ نکولائی سٹوو کے قریب ایک چھوٹی میز کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی بارزوئی کتیا مِلکا (پہلی مِلکا کی بیٹی)، جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں اس کے کالا سرمئی چہرے پر پہلے سے بھی کہیں زیادہ نمایاں ہو رہی تھیں، اس کے قریب آرام کرسی پر لیٹی ہوئی تھی۔ دینی سوف، جس کے گھونگھریالے بالوں، مونچھوں اور گل مچھوں میں سفیدی جھلکنے لگی تھی، جرنیل کا چست کوٹ پہنے، جس کے بٹن کھلے تھے، پہنے کاؤنٹس ماریا کے قریب فرد کش تھا۔ پیئر اپنی بیوی اور کاؤنٹس کے درمیان میں بیٹھا تھا اور ایسے موضوعات پر، جن کے متعلق اسے معلوم تھا کہ بڑھیا کو ان میں دلچسپی ہو سکتی ہے اور وہ انھیں سمجھ بھی سکتی ہے، گفتگو کر رہا تھا۔ وہ اونچے طبقے کی سطحی دلچسپیوں اور بڑھیا کے ان معاصرین کے متعلق، جن سے ان کا حلقہ متشکل ہوتا تھا، باتیں کر رہا تھا۔ (بڑھیا کا یہ حلقہ کبھی حقیقتاً جیتا جاگتا اور واضح گروپ ہوا کرتا تھا مگر اب اس کے ارکان ادھر ادھر بکھر چکے تھے، اسی کی طرح اپنی زندگیوں کی آخری گھڑیاں بتا رہے تھے اور انھوں نے اپنے زمانہ شباب میں جو کچھ بویا تھا، اس کی فصل کی آخری بالیاں اکٹھی کر رہے تھے۔ بڑھیا کے نزدیک اس کے انھیں معاصرین سے اصل اور قابل توجہ دنیا متشکل ہوتی تھی۔)

نتاشا کو پیئر کے جوش و خروش سے اندازہ ہوا کہ اس کا سفر بہت دلچسپ رہا ہے اور یہ کہ اس نے انھیں بہت کچھ بتانا ہے جو وہ کاؤنٹس کے سامنے بیان نہیں کر سکتا تھا۔ دینی سوف، جو خاندان کا رکن نہیں تھا، پیئر کی اس دور اندیشی

کو نہ سمجھ سکا اور چونکہ وہ خود حالات سے مطمئن نہیں تھا، اس لیے وہ بار بار پیئر سے اصرار کرتا رہا کہ وہ اسے آراک چیف اور بائبل سوسائٹی کے متعلق بتائے اور یہ بھی بتائے کہ سمیونووسکی رجمنٹ پر کیا گزرا۔ ایک دو مرتبہ پیئر اس کے بہکاوے میں آ گیا اور ان موضوعات کے متعلق اس سے گفتگو کرنے لگا لیکن نکولائی اور نتاشا نے اسے دوبارہ پٹڑی پر چڑھا دیا اور وہ اس سے پرنس ایوان اور ماریا انتونوونا کی صحت کے بارے میں پوچھنے لگے۔

"لیکن گوسنر[26] اور مادام تاتاوینووا[27] — ان کی احمقانہ کارروائیاں اسی طرح جاری ہیں؟" دینی سوف نے پوچھا۔

"بالکل جاری ہیں!" پیئر نے کہا۔ "بلکہ حالات پہلے سے بھی بدتر ہو گئے ہیں! بائبل سوسائٹی کا عمل دخل ساری حکومت میں سرایت کر چکا ہے!"

"mon cher ami*، کیا کہا؟" کاؤنٹس نے پوچھا۔ وہ اپنی چائے ختم کر چکی تھی اور کھانے کے بعد اب بظاہر ترش مزاجی کے اظہار کے لیے بہانہ تلاش کر رہی تھی۔ "یہ تم حکومت کے بارے میں کیا کہہ رہے تھے؟"

"maman**، آپ جانتی ہیں کہ پرنس الیکساندر گالتسن نے ایک سوسائٹی قائم کی ہے اور لوگ کہتے ہیں کہ اسے بہت اثر رسوخ حاصل ہو گیا ہے،" نکولائی نے، جسے باتوں کا اپنی ماں کی زبان میں ترجمہ کرنے کا ہنر آتا تھا، دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔

"آراک چیف اور گالتسن" پیئر نے کوتاہ اندیشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا، "اب عملاً حکومت ہیں اور حکومت بھی کیسی؟ انھیں ہر جگہ بس سازشیں اور ریشہ دوانیاں ہی نظر آتی ہیں اور وہ ہر چیز سے خوف زدہ ہیں۔"

"لیکن پرنس*** الیکساندر نکولائی وچ کی خطا کیا ہے؟ وہ انتہائی قابل توقیر انسان ہیں۔ بھلے دنوں میں میری ماریا انتونوونا کے ہاں اس سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔" کاؤنٹس نے شکایتی لہجے سے کہا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ کمرے میں سب لوگ چپ سادھے بیٹھے ہیں، وہ اور بھی ناراض ہو گئی۔ "آج کل ہر شخص کو نکتہ چینی کا بڑا شوق چرایا ہوا ہے۔ بائبل سوسائٹی — اس میں کیا خرابی ہے؟" اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی اور (اس کے ساتھ باقی لوگ بھی کھڑے ہو گئے تھے) وہ منہ پھلائے سٹنگ روم میں اپنی میز کی طرف چل پڑی۔

اس کی روانگی کے بعد ماحول پر جو قدرے افسردہ کن خاموشی چھائی، اس میں ملحقہ کمرے سے بچوں کی باتوں اور قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کوئی مسرت بخش جوشیلی بات ہو رہی ہے۔

"ختم! ختم!" ننھی نتاشا کی شاداں و فرحاں چیخ سب سے بلند تھی۔

پیئر نے کاؤنٹس ماریا اور نکولائی کے ساتھ نگاہوں کا تبادلہ کیا۔ (اس نے نتاشا سے ایک لمحے کے لیے بھی اپنی نظریں نہیں ہٹائی تھیں) اور خوشی سے مسکرانے لگا۔

---

* میرے عزیز دوست۔

** اماں

*** گالتسن

''یہ تو بڑی پیاری آواز ہے!'' اس نے کہا۔

''اس کا مطلب ہے کہ آننا ماکارونا نے اپنی جراب ختم کر لی ہے،'' کاؤنٹس ماریا نے کہا۔

''میں دیکھ کر آتا ہوں۔'' پیئر نے جست لگاتے ہوئے کہا۔ ''تمھیں معلوم ہے کہ میں اس غنائی آواز کا خاص طور پر کیوں دلدادہ ہوں؟'' اس نے دروازے کے قریب رکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ہمیشہ پہلی چیز ہوتی ہے جو مجھے بتاتی رہتی ہے کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ آج جب میں واپس آ رہا تھا، میری گاڑی جوں جوں گھر کے قریب آتی گئی، توں توں میری بے چینی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ پھر جب میں پیش دالان میں داخل ہوا، مجھے آندروشا کا کھنکھناتا قہقہہ سنائی دیا اور میں جان گیا کہ سب ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''مجھے معلوم ہے، مجھے معلوم ہے کہ تم اس طرح کیوں محسوس کرتے ہو،'' نکولائی نے کہا۔ ''لیکن میں تمھارے ساتھ بالکل نہیں جاؤں گا۔ یہ جرابیں مجھے بطور تحفہ ملنا ہیں اور اس طرح ملنا ہیں جیسے مجھے معلوم ہی نہ ہو کہ یہ میرے لیے ہیں۔''

پیئر بچوں کے پاس چلا گیا اور قہقہوں اور شور وغل کی آوازیں پہلے سے بھی زیادہ بلند ہو گئیں۔

''آننا ماکارونا، ادھر آئیں۔'' پیئر کی آواز کہتی سنائی دی۔ ''ادھر آئیں، یہاں کمرے کے درمیان میں۔ یہ حکم ہے۔ ایک، دو، اور جب میں تین کہوں۔ ۔ ۔ یہ ٹھیک ہے۔ تم وہیں کھڑے رہو اور تم میرے بازوؤں میں آجاؤ'' پیئر نے کہا اور کمرے میں کامل سکوت چھا گیا۔ ''تین'' اور بچوں کی وجد آفریں چیخوں سے کمرے کے در و دیوار ہلنے لگے۔

''دو ہیں، دو ہیں!'' وہ چلا چلا کر کہہ رہے تھے۔

اور واقعی جرابیں دو ہی تھیں۔ انھیں آننا ماکارونا نے کسی خفیہ طریقے سے، جو صرف اسے ہی معلوم تھا، بیک وقت ایک ہی سلائیوں پر بنا تھا اور جب وہ مکمل ہو گئیں، اس نے بچوں کی موجودگی میں بڑے فاتحانہ انداز سے ایک کو دوسری میں سے باہر نکال لیا۔

14

اس کے کچھ دیر بعد بچے شب بخیر کہنے آئے۔ انھوں نے سب کے بوسے لیے، ٹیوٹروں اور گورنسوں نے جھک کر سلام کیا اور وہ سب باہر چلے گئے۔ صرف دیسال اور اس کا شاگرد وہیں ٹھہرے رہے۔ دیسال نے لڑکے کے کان میں کہا:

''آؤ، نیچے چلیں۔''

''نہیں، موسیو دیسال، میں اپنی پھوپھی سے درخواست کروں گا کہ وہ مجھے یہیں رکنے کی اجازت دے دیں'' بلکونسکی نے بھی کانا پھوسی کرتے ہوئے جواب دیا۔

''matante*، مجھے یہیں رکنے کی اجازت مرحمت فرمائیں،'' اس نے اپنی پھوپھی کے پاس جا کر کہا۔

---

* پھوپھی جان۔

اس کے چہرے پر منت سماجت، بے چینی اور مسرت جھلک رہی تھی۔ کاؤنٹس ماریا نے اسے طائرانہ نگاہوں سے دیکھا اور پیئر کی جانب دیکھنے لگی۔

''جب آپ یہاں موجود ہوتے ہیں، اس کا ہلنے کو جی نہیں چاہتا۔''

''موسیو دیسال، میں اسے سیدھا آپ کے پاس لے آؤں گا۔ شب بخیر۔'' پیئر نے سوِستانی ٹیوٹر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا اور مسکراتے ہوئے نکولینکا کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ''ابھی ہم دونوں کی کوئی ملاقات نہیں ہوئی ہے... یہ یوں یوں بڑا ہو رہا ہے، توں توں بالکل اسی کی طرح ہوتا جا رہا ہے،'' اس نے کاؤنٹس ماریا کی طرف گردن گھماتے ہوئے کہا۔

''پاپا کی طرح،'' لڑکے نے پوچھا۔ اس کے چہرے کی رنگت بالکل سرخ ہو گئی اور وہ بڑے انہماک سے پیئر کی طرف دیکھنے لگا۔

پیئر نے ہاں میں سر ہلا دیا اور اس نے اپنا سلسلۂ کلام دوبارہ وہیں سے، جہاں سے یہ بچوں کی آمد پر منقطع ہوا تھا، شروع کر دیا۔ کاؤنٹس ماریا کوئی اونی چیز بن رہی تھی۔ نتاشا اپنے شوہر پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ نکولائی اور دینی سوف اٹھ کر کھڑے ہو چکے تھے۔ انھوں نے اپنے اپنے پائپ منگوائے، انھیں اپنے اپنے منہ میں دبایا اور پیئر پر سوالات کی بوچھاڑ کرتے مزید چائے لینے سونیا کی طرف چل دیے۔ جس کی شکل پر اضمحلال برس رہا تھا لیکن جو استقلال سے سماوار کے پاس ڈٹی ہوئی تھی۔ گھونگریالے بالوں والا نازک اندام لڑکا ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں جا رہا تھا۔ وہ کبھی کبھار اپنا گھونگھریالا سر، جو اس کی مہین گردن کے اوپر، جو کالر کے دوہرے کیے جانے کے باعث صاف نظر آ رہی تھی، ٹکا ہوا تھا، موڑ کر پیئر کی جانب دیکھنے لگتا یا کپکپانے اور زیرِ لب اپنے آپ سے کچھ کہنے لگتا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے بالکل نئے اور طوفانی جذبات کا تجربہ ہو رہا ہے۔

گفتگو کا رخ اعلیٰ سرکاری حلقوں کے سکینڈلوں کی طرف مڑ گیا جنھیں لوگوں کی اکثریت داخلی سیاست کا انتہائی دلچسپ پہلو تصور کرتی ہے۔ دینی سوف، جو حکومت سے غیر مطمئن تھا کیونکہ اسے اپنی ملازمت میں مایوسیوں سے دوچار ہونا پڑا تھا، پیٹرز برگ کی ان باتوں کو، جو اس کی نگاہوں میں حماقتیں تھیں، توجہ سے سن رہا اور خوش ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ تلخ و ترش تبصرے بھی کرتا جا رہا تھا۔

''پرانے زمانے میں اگر آپ کچھ بننا چاہتے تھے، آپ کو جرمن ہونا چاہیے تھا۔ اب آپ کو تاتاوینوا اور مادام کرودے نر[28] کے اشاروں پر ناچنا اور ایکارٹش ہاؤزن[29] اور اس کے مریدوں کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس سے تو بہتر ہے کہ بے چارے بونا پارٹ کو دوبارہ کھل کھیلنے کا موقع دے دیا جائے۔ وہ ان کے ذہنوں سے یہ سب خرافات نکال دے گا۔ یہ بات کبھی سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی کہ سمیونووسکی رجمنٹ کی کمان شوارٹس جیسے شخص کو سونپ دی جائے گی۔'' اس نے دہاڑتے ہوئے کہا۔

نکولائی اگرچہ ہر چیز میں نقص تلاش کرنے کی طرف مائل نہیں تھا، تاہم حکومت پر نکتہ چینی کرنا اسے بھی باوقار

اور موزوں طرزِ عمل نظر آیا۔ الف کو فلاں محکمے کا وزیر اور ب کو فلاں صوبے کا گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا ہے، یا زار نے یہ کہا ہے اور فلاں فلاں وزیر نے کچھ اور، اس کے نزدیک انتہائی اہم امور تھے۔ چنانچہ اس نے ان امور میں دلچسپی لینا اور پیئر سے سوال جواب کرنا اپنا فرض گردانا۔ یوں دینی سوف اور نکولائی جو سوالات پوچھتے تھے، ان کی وجہ سے اعلیٰ سرکاری حلقوں کے بارے میں گفتگو کا معیار عام گپ شپ سے خاصا اونچا رہا۔

لیکن نتاشا کو، جسے اپنے خاوند کے طور طریقوں اور خیالات سے کماحقہ آگاہی تھی، احساس ہوا کہ پیئر کافی دیر تک گفتگو کا رخ کسی اور سمت پھیرنا اور اپنے خیالات کا، جن کے بارے میں وہ شدت سے محسوس کرتا تھا اور جن کے متعلق وہ اپنے نئے دوست پرنس فیودور سے مشورہ کرنے پیٹرز برگ گیا تھا، اظہار کرنا چاہتا ہے لیکن کامیاب نہیں ہو رہا۔ چنانچہ اس نے اس کی مدد کرنے کا تہیہ کر لیا اور اس سے پوچھنے لگی: ''پرنس فیودور کے ساتھ آپ کے معاملات[30] طے ہو گئے؟''

''یہ کیا قصہ ہے؟'' نکولائی نے پوچھا۔

وہی مرغ کی ایک ہی ٹانگ۔'' پیئر نے اپنے گرد و پیش نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''ہر شخص یہی راگ الاپے جا رہا ہے کہ حالات اتنے خراب ہو چکے ہیں کہ انھیں یوں کا توں نہیں چھوڑا جا سکتا اور تمام مخلص لوگوں کا فرض بنتا ہے کہ وہ حتیٰ الامکان ان کے توڑ کی کوشش کریں۔''

''اور مخلص لوگ کیا کر سکتے ہیں؟'' نکولائی نے قدرے خفگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کیا جا سکتا ہے؟''

''خیر، یہ...''

''آؤ، سٹڈی روم میں چلتے ہیں۔''

نتاشا کو، جو کافی دیر سے اپنے شیر خوار بچے کے بلاوے کی منتظر تھی، نرس کی آواز سنائی دی اور وہ نرسری کی طرف چلی گئی۔ کاؤنٹس ماریا بھی اس کے پیچھے پیچھے چل دی۔ مرد سٹڈی روم میں چلے گئے اور نکولینکا بلکونسکی اپنے پھوپھا کی نظروں سے بچتا بچاتا چپکے سے کمرے میں کھسک آیا اور دریچے کے قریب تاریک گوشے میں رائٹنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھ گیا۔

''خیر، آپ کے خیال میں اب کیا کرنا چاہیے؟'' دینی سوف نے پوچھا۔

''ایک اور بے سروپا اور تہی مغز منصوبہ!'' نکولائی نے گرہ لگائی۔

''بات یہ ہے...'' پیئر بیٹھا نہیں بلکہ کمرے میں چکر لگاتا رہا۔ کبھی وہ رک جاتا، کبھی الفاظ اس کے منہ سے پوری طرح ادا نہ ہو پاتے اور وہ ہتلانے لگتا، اور کبھی وہ ہاتھوں اور بازوؤں سے اشارے کرنے لگتا۔ ''پیٹرز برگ میں صورت حال یہ ہے: زار نے ہر چیز سے کنارہ کشی اختیار کر لی ہے۔ وہ سرتاپا سریّت میں ڈوب چکا ہے۔'' (پیئر اب سریت کسی شخص میں بھی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔) ''وہ صرف سکون و آشتی کا متمنی ہے۔ اور اسے یہ سکون ان لوگوں میں ہی مل سکتا ہے جن کا کوئی دین ایمان نہیں، ضمیر نہیں اور جو ہر چیز کو کاٹتے اور اس کا گلا گھونٹتے پھر رہے

ہیں—ان لوگوں سے میری مراد ماگ نتسکی، آراک چیف اوران کے چیلے چانٹے ہیں—تم مجھ سے اتفاق کروگے" اس نے نکولائی سے مخاطب ہو کر کہا، "اگر تم خود اپنی زمینوں کی دیکھ بھال نہیں کروگے اور صرف سکون وآشتی کے پیچھے بھاگتے رہوگے، تو تمھارا بیلف جتنا زیادہ سنگ دل ہوگا، تمھارا الّو اتنی ہی آسانی سے سیدھا ہو جائے گا۔"

"آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" نکولائی نے دریافت کیا۔

"یہی کہ ہر چیز کا ستیاناس ہو رہا ہے۔ عدالتوں میں اندھیر مچا ہوا ہے۔ فوج میں کوڑوں کی سزاؤں کے علاوہ اور رہ ہی کیا گیا ہے؟ عسکری بستیوں میں ڈرل پر زور ہے یا پھر جبری مشقت لی جا رہی ہے۔ تہذیب اور روشن خیالی کا قلع قمع کیا جا رہا ہے۔ جو شخص ذرا نوجوان ہے اور جسے اپنی عزت کا ذرا پاس ہے، اسے عقوبت کی چکی میں پیسا جا رہا ہے۔ ہر شخص کو نظر آ رہا ہے کہ یہ سلسلہ تادیر جاری نہیں رہ سکتا۔ دباؤ اتنا شدید ہے کہ کچھ نہ کچھ لازماً ٹوٹ کر رہے گا۔" پیئر نے کہا۔ (اس کا انداز[31] ان لوگوں کا تھا جو، جب سے حکومتیں وجود میں آئی ہیں، یہی کچھ کہتے چلے آ رہے ہیں۔) "میں نے پیٹرزبرگ میں انھیں ایک بات بتائی۔"

"کسے؟" دینی سوف نے پوچھا۔

"آپ کو معلوم ہے کہ کسے؟" پیئر نے معنی خیز نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "پرنس فیودور اور ان سب لوگوں کو۔ کلچر اور خیراتی کاموں کی حوصلہ افزائی کرنا بہت اچھی بات ہے۔ یہ مقصد بہت بھلا ہے، لیکن موجودہ حالات کسی اور چیز کے متقاضی ہیں۔"

اس موقع پر نکولائی کو احساس ہوا کہ اس کا بھتیجا کمرے میں موجود ہے۔ اس کے چہرے پر ملال آ گیا اور وہ لڑکے کے پاس گیا۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"کیوں نہیں؟ اسے بیٹھا رہنے دو۔" پیئر نے نکولائی کو کلائی سے پکڑتے اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے انھیں بتایا کہ اتنا کافی نہیں ہے۔ اب کسی اور چیز کی ضرورت ہے۔ آپ کسی چیز کے وقوع پذیر ہونے کا انتظار کر رہے ہیں مگر دریں اثنا جس تار پر ضرورت سے زیادہ دباؤ پڑ رہا ہے، وہ کسی بھی لمحے ٹوٹ سکتا ہے۔ جب بھی لوگوں کو یہ توقع ہونے لگے کہ تباہی ناگزیر ہے، حتیٰ الوسع زیادہ سے زیادہ لوگوں کو آپس میں تعاون اور عام تباہی کے خلاف مزاحمت کرنا چاہیے۔ قوم کے نوجوان طبقے کو دام تزویر میں پھانسا اور اسے بدعنوانیوں کی راہ پر ڈالا جا رہا ہے۔ کسی کو عورت، کسی کو اعزاز واکرام، کسی کو اونچے عہدے یا روپے پیسے کا لالچ دیا جا رہا ہے اور وہ بھی اس ٹولے میں شامل ہوتے جا رہے ہیں۔ جہاں تک میرے اور آپ جیسے آزاد طبع، آزاد ذہن اور آزاد رو اشخاص کا تعلق ہے—ایسے لوگ اب کہیں بھی نظر نہیں آتے۔ میں نے ان سے کہا: اپنی سوسائٹی کا دائرہ وسیع کرو، mot d' order کو واحد خوبی تصور نہ کرو بلکہ آزادروی اور عمل پر زور دو۔"

* Watchword: اصولی قول: لفظ یا الفاظ جن سے کسی جماعت کا نصب العین ظاہر ہوتا ہو۔

نکولائی منہ پھلائے اپنے بھتیجے سے پرے ہٹ گیا، اس نے تنگ مزاجی سے کرسی گھسیٹی اور اس پر بیٹھ گیا۔ وہ کبھی کبھار بے قراری سے غراتا اور اس کی پیشانی کی شکنیں دراز ہو جاتیں۔

''لیکن عمل کس بات پر؟'' اس نے چلاتے ہوئے پوچھا۔ ''اور تم حکومت کے متعلق کیا رویہ اپناؤ گے؟''

''وہی جو مؤیدین کا ہوتا ہے۔ اگر حکومت اجازت دے دے، پھر سوسائٹی کو خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی۔ نہ صرف یہ کہ ہم حکومت کے معاند نہیں بلکہ ہم تو سچے قدامت پسندوں ــ صحیح معنوں میں شرفا ــ کی جماعت ہیں۔ اس کا مقصد محض کسی پوگاچیف[32] کو منظر عام پر آنے نہ دینا، میرے اور تمھارے بچوں کے قتل عام کو روکنا اور آراک چیف کے راستے میں دیوار کھڑی کرنا ہے تاکہ وہ مجھے کسی عسکری بستی میں نہ بھیج سکے۔ ہم سب مشترکہ بھلائی اور عام لوگوں کے تحفظ کے لیے ایک دوسرے سے تعاون کر رہے ہیں۔''

''ہاں، لیکن یہ ہے تو خفیہ جماعت، چنانچہ مخاصم اور خطرناک ٹھہری، اس سے خیر کی توقع نہیں جا سکتی،'' نکولائی نے کہا۔ اس کی آواز لحظہ بہ لحظہ بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

''کیوں؟ کیا ٹوگنٹ بنٹ،[33] جس نے یورپ کو بچایا تھا'' (اس زمانے میں لوگوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ برملا اعلان کر سکتے کہ یورپ کو روس نے بچایا ہے۔'') کسی خطرناک چیز کی پیداوار تھی؟ ٹوگنٹ بنٹ نکوکاری کا اتحاد ہے، اس کا مطلب اخوت، محبت، باہمی امداد ہے... یہ وہی کچھ ہے جس کا مسیح نے صلیب پر پرچار کیا تھا۔''

نتاشا، جو اس گفتگو کے دوران میں واپس آ چکی تھی، شاداں و فرحاں اپنے خاوند کو دیکھ رہی تھی۔ اسے خوشی اس بات کی نہیں تھی جو وہ کہہ رہا تھا ــ اس میں تو اسے دلچسپی بھی نہیں تھی کیونکہ اسے یہ بات بالکل سیدھی سادی معلوم ہو رہی تھی اور وہ اسے بہت مدتوں سے جانتی تھی۔ (اسے یہی معلوم ہو رہا تھا کیونکہ اسے اس کا سرچشمہ ــ پیئر کا قلب و روح ــ جہاں سے یہ نکل رہی تھی، معلوم تھا۔) وہ خوش اس کے پرجوش اور پرشوق چہرے کو دیکھ کر ہو رہی تھی۔

لڑکا، جس کی دبلی پتلی گردن، دوہرے کیے ہوئے کالر سے باہر نکلی ہوئی تھی اور جسے ہر کوئی فراموش کر چکا تھا، پیئر کو دیکھ کر اور بھی زیادہ خوش ہو رہا تھا۔ پیئر کا ایک ایک لفظ اس کے دل پر نقش ہو رہا تھا۔ اس کی مضطرب اور بے چین انگلیاں ادھر ادھر حرکت کر رہی تھیں اور بے دھیانی میں اس سے اپنے پھوپھا کی مہر لگانے کی لاکھ اور قلموں کا ڈبا ٹوٹ گیا۔

''یہ وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ جرمن ٹوگنٹ بنٹ وہ ہے جو میں بتا رہا ہوں اور یہی چیز میں بجھا رہا ہوں۔''

''نہیں، میرے دوست، ٹوگنٹ بنٹ ان ساسیج خوروں کے لیے تو ٹھیک ہو گا لیکن مجھے اس کی سمجھ نہیں آ رہی۔ مجھ سے تو یہ صحیح طریقے سے ادا بھی نہیں ہوتا۔'' دینی سوف نے بلند آہنگ اور جارحانہ لہجے سے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں مانتا ہوں کہ یہاں کے حالات بہت دگرگوں ہیں اور ہر چیز میں بدعنوانی سرایت کر چکی

ہے۔ پھر بھی تمھارا یہ ٹوگنٹ بنٹ میری سمجھ میں نہیں آ رہا اور نہ مجھے اس کی پروا ہے۔ رہا بنٹ، (بغاوت) یہ دوسرا معاملہ ہے۔ یہاں میں تمھاری تائید کرتا ہوں۔"

پیئر مسکرا دیا، نتاشا ہنسنے لگی لیکن نکولائی نے پیئر کو یہ سمجھانے کی ذمے داری سنبھال لی کہ کسی انقلاب کی توقع نہیں کی جا سکتی اور وہ جس خطرے کی نشان دہی کر رہا ہے، وہ اس کے اپنے ذہن کی پیداوار ہے۔ پیئر اس کے برخلاف دلائل دے رہا تھا۔ چونکہ اس کی ذہنی اور استدلالی صلاحیتیں کہیں زیادہ برتر تھیں اور وہ اس کی نسبت کہیں زیادہ آسانی سے دلائل کا انبار لگا سکتا تھا، نکولائی کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ وہ پٹ رہا ہے۔ اس پر اس کے غصے میں مزید اضافہ ہو گیا کیونکہ اپنے دل میں اسے کامل یقین تھا کہ اس کی رائے بالکل ٹھیک ہے۔ وہ اس نتیجے پر اپنی عقل سے نہیں بلکہ عقل سے کہیں زیادہ طاقتور چیز کی مدد سے پہنچا تھا۔

"میں ایک بات تمھیں بتائے دیتا ہوں،" اس نے اٹھتے اور اپنی مضطرب اور پھڑپھڑاتی انگلیوں سے اپنا پائپ کونے میں کھڑا کرنے کی کوشش کرتے اور آخر کار جھلا کر اسے پرے پھینکتے ہوئے کہا، "کہ میں اسے ثابت نہیں کر سکتا۔ تم کہتے ہو کہ یہاں سب کچھ بوسیدہ اور متعفن ہو چکا ہے، اور بغاوت کے آثار نمودار ہو رہے ہیں۔ مجھے یہ کہیں نظر نہیں آتے۔ تم یہ بھی کہتے ہو کہ تمھارا حلف وفاداری مشروط ہے۔ اس کا میرے پاس یہ جواب ہے: جیسا کہ تمھیں معلوم ہے کہ تم میرے بہترین دوست ہو لیکن اگر تم نے کوئی خفیہ جماعت بنائی اور حکومت کے خلاف کسی کارروائی میں — خواہ اس کی نوعیت کیسی ہی ہو — شریک ہوئے، میں جانتا ہوں کہ میرا فرض حکومت کی اطاعت کرنا ہے اور اگر آراک چیف نے مجھے حکم دیا کہ میں تمھارے خلاف کسی سکواڈرن کی قیادت کروں اور تمھیں تہس نہس کر دوں، تو میں ایک سیکنڈ کے لیے بھی کسی تذبذب کا مظاہرہ نہیں کروں گا اور یہ کر گزروں گا۔ اور تم اس بارے میں جتنے چاہو، جی بھر کر دلائل دیتے رہو۔"

اس کے بعد محفل پر کڈھب خاموشی چھا گئی۔ سب سے پہلے نتاشا نے اسے توڑا، اور وہ اپنے خاوند کا دفاع کرنے اور اپنے بھائی کو آڑے ہاتھوں لینے لگی۔ اس کا دفاع کمزور تھا اور اس سے اناڑی پن ٹپکتا تھا، لیکن وہ اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ گفتگو دوبارہ شروع ہو گئی، تاہم نکولائی کے مخاصمانہ لہجے سے جو ناخوشگواری پیدا ہوئی تھی، وہ اب ناپید ہو گئی۔

جب وہ سپر کھانے کے لیے اٹھ کر کھڑے ہوئے، نکولینکا بلکونسکی، جس کا چہرہ پیلا تھا لیکن آنکھیں چمک رہی تھیں، پیئر کے پاس پہنچا۔

"انکل پیئر... آپ... نہیں... اگر پاپا زندہ ہوتے، تو وہ آپ سے اتفاق کرتے؟" اس نے پوچھا۔

اور پیئر کو یک لخت احساس ہوا کہ گفتگو کے دوران میں اس لڑکے کے ذہن میں خیالات وجذبات کا کتنا غیر معمولی،

• دینی سوف نے جرمن لفظ bund (اتحاد) کو روسی لفظ bunt (ہنگامہ، فساد، بغاوت) میں تبدیل کر دیا ہے اور یوں ذومعنویت پیدا کر دی ہے۔

پیچیدہ، طاقت ور اور آزادانہ عمل جاری رہا ہوگا، اور جو کچھ اس کی زبان سے نکلا تھا، اسے یاد کرتے ہوئے اسے افسوس ہوا کہ اس نوجوان نے وہ سب کچھ سن لیا۔ تاہم اس کی تسلی کے لیے اسے کچھ نہ کچھ جواب دیتے ہی بن پڑی۔

''ہاں، میرا خیال ہے،'' اس نے بادل ناخواستہ کہا اور سٹڈی روم سے باہر نکل گیا۔

لڑکے کی نظر نیچے پڑی اور اسے پہلی مرتبہ احساس ہوا کہ اس نے اشیا کا کیا ستیاناس کر دیا ہے۔ شرمندگی سے اس کا رنگ سرخ ہوگیا اور وہ نکولائی کے قریب گیا۔

''انکل، میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ مجھ سے یہ سب کچھ... غیر ارادی طور پر ہوگیا،'' اس نے شکستہ قلموں اور لاکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

نکولائی غصے سے ہڑبڑا گیا۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے،'' اس نے ٹکڑے نیچے پھینکتے ہوئے کہا۔

اور صاف نظر آرہا تھا کہ اسے اپنے غیظ و غضب پر قابو پانے میں مشکل پیش آرہی ہے، تاہم وہ لڑکے سے پرے ہٹ گیا۔

''تمھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا،'' اس نے کہا۔

15

سپر پر سیاست اور سوسائیٹیوں کی کوئی بات نہ ہوئی۔ اب گفتگو کا موضوع۔ جو نکولائی کو سب سے زیادہ پسند تھا۔ 1812 کی یادیں بن گئیں۔ یہ موضوع دینی سوف نے چھیڑا تھا اور اس کے متعلق پیئر کی باتیں خاص طور پر دلچسپ اور پرلطف تھیں۔ سپر کے اختتام پر خاندان کے افراد انتہائی دوستانہ ماحول میں ایک دوسرے سے الگ ہوئے۔

سٹڈی روم میں کپڑے تبدیل کرنے اور سٹیوارڈ کو، جو اس کا انتظار کر رہا تھا، ہدایات دینے کے بعد نکولائی ڈریسنگ گاؤن پہنے بیڈروم میں چلا گیا۔ وہاں اس کی بیوی ابھی تک لکھنے کی میز پر بیٹھی تھی۔

''ماری، کیا لکھ رہی ہو؟'' نکولائی نے پوچھا۔

کاؤنٹس کے چہرے پر سرخی دوڑ گئی۔ اسے اندیشہ تھا کہ جو کچھ وہ لکھ رہی ہے، اسے اس کا شوہر سمجھ پائے گا نہ پسند کرے گا۔

جو کچھ وہ لکھ رہی تھی، اسے وہ اپنے خاوند سے چھپانے کو ترجیح دیتی لیکن ساتھ ہی وہ خوش بھی تھی کہ اس نے اس کا راز دریافت کر لیا ہے اور اب اسے بتانا ہی ہوگا۔

''نکولس، یہ میری ڈائری[34] ہے۔'' اس نے اسے نیلی نوٹ بک تھما دی جو غیر لرزیدہ ہاتھ سے جلی حروف میں تحریر کی گئی عبارتوں سے پر تھی۔

''ڈائری؟...'' نکولائی نے قدرے طنزیہ انداز سے کہا اور ڈائری پکڑ لی۔

یہ فرانسیسی میں تھی۔

چار دسمبر: آج صبح جب اندروشا (اس کا بڑا بیٹا) بیدار ہوا، وہ کپڑے تبدیل نہیں کرنا چاہتا تھا اور مادموزیل لوئیسے نے مجھے بلا بھیجا۔ وہ کسی کا کہا نہیں مان رہا تھا اور ضد کر رہا تھا۔ میں نے دھمکیاں آزمائیں لیکن ان کا نتیجہ صرف یہ برآمد ہوا کہ وہ پہلے سے بھی زیادہ غصہ کھانے لگا۔ پھر میں نے معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ میں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا اور دوسرے بچوں کو جگانے میں نرس کی مدد کرنے لگی۔ اندروشا کو میں نے بتایا کہ مجھے اس سے کوئی محبت نہیں ہے۔ وہ کافی دیر چپ چاپ کھڑا رہا جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ کیا ہو گیا۔ پھر اس نے پلنگ سے چھلانگ لگائی، اپنی شبینہ قمیص میں بھاگتا میرے پاس آیا اور بے تحاشا رونے لگا۔ مجھے اسے چپ کرانے میں کافی وقت لگا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ اسے جس بات سے اذیت پہنچ رہی ہے، وہ اس کا یہ احساس تھا کہ اس نے مجھے ناراض کر لیا ہے۔ میں نے شام کو اسے اس کا کارڈ دے دیا۔ وہ ایک بار پھر زار زار رونے اور مجھے چومنے لگا۔ پیارے آدمی اس سے سب کچھ کرا سکتا ہے۔

''اس 'کارڈ' کا کیا مطلب ہے؟'' نکولائی نے پوچھا۔

''میں شام کو بڑے بچوں کو ان کے رویے اور طرزِ عمل پر نمبر دیتی ہوں۔''

نکولائی نے روشن و تاباں آنکھوں میں، جو اس پر مرکوز تھیں، جھانک کر دیکھا اور دوبارہ صفحے الٹ پلٹ کرنے اور انھیں پڑھنے لگا۔ ڈائری میں ہر وہ چیز مندرج تھی جو ماں کے نزدیک بچوں کی زندگیوں میں اہم تھی۔ ان باتوں سے جو وہ درج کرتی تھی، ایک تو ان کے کردار پر روشنی پڑتی تھی، اور دوسرے تدریسی طریقوں پر عمومی خیالات کا اظہار ہوتا تھا۔ بیشتر مندرجات انتہائی معمولی تفصیلات پر مشتمل تھے لیکن ماں یا باپ، جب کہ وہ پہلی بار اپنے بچوں کے متعلق ڈائری پڑھ چکا تھا، ایسا نہیں سمجھتے تھے۔

پانچ دسمبر کا اندراج اس طرح تھا:

دسترخوان پر متیا کا رویہ اکھڑ اور ضدی تھا۔ پاپا نے کہا کہ اسے پڈنگ نہیں ملے گی اور اسے دی بھی نہیں گئی۔ جب دوسرے کھا رہے تھے، اس کا منہ لٹکا ہوا تھا اور وہ انھیں ندیدوں کی طرح دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر بچوں کو میٹھی چیزوں سے محروم رکھا جائے، تو ان میں محض حرص و ہوس بڑھتی ہے۔ مجھے نکولائی کو یہ بات بتانا ہو گی۔

نکولائی نے کاپی نیچے رکھ دی اور اپنی بیوی کی جانب دیکھنے لگا۔ درخشاں آنکھیں اسے استفہامی انداز سے ٹکٹکی

باندھے دیکھ رہی تھیں: انھیں یہ ڈائری پسند آئے گی یا ناپسند؟ وہ بلاشک وشبہ وہ اسے پسند ہی نہیں کریں گے بلکہ اپنی بیوی کی تحسین بھی کریں گے۔

''اسے غالباً اتنی باریکیوں میں نہیں پڑنا چاہیے تھا یا شاید اسے لکھنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں تھی،'' نکولائی سوچ رہا تھا۔ لیکن اس مسلسل اور ان تھک روحانی کاوش نے، جس کا واحد مقصد اپنے بچوں کی اخلاقی اصلاح تھا، اس کا دل باغ باغ کر دیا۔ اگر نکولائی اپنے احساسات کا تجزیہ کر سکتا، اسے معلوم ہو جاتا کہ اسے اپنی بیوی کے ساتھ جو نرم وملائم، مفتخرانہ اور یقینی محبت تھی، اس کی اساس اس کے اسی جذبۂ ہیبت پر تھی جو اس کے دل میں اس کی روحانیت اور اس رفیع وبرتر اخلاقی دنیا کو دیکھ کر پیدا ہوتی تھی جس میں وہ تو رہتی تھی لیکن جو خود اس کی رسائی سے دور تھی۔

اسے اس بات پر ناز تھا کہ اس کی بیوی اتنی ذہین، سمجھ دار اور نیکوکار ہے اور روحانی اقلیم میں اس کے مقابلے میں اسے اپنی بے بضاعتی کا پورا احساس تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر اسے خوشی اس امر پر تھی کہ اس قسم کی روح کی مالک خاتون نہ صرف اس کی ہے بلکہ اس کی اپنی ذات کا حصہ ہے۔

''مائی ڈیئر سٹ، مجھے یہ بہت، بہت پسند آئی ہے!'' اس نے معنی خیز نظروں سے دیکھتے ہوئے اپنا فیصلہ سنایا اور مختصر وقفے کے بعد مزید کہا: ''آج میں نے اچھی خاصی بدتمیزی کا مظاہرہ کیا۔ تم سٹڈی روم میں موجود نہیں تھیں۔ میری اور پیئر کی تکرار ہو گئی اور مجھے اپنے غصے پر قابو نہ رہا لیکن اسے قائل کرنا اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ کسی بچے کو! سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر نتاشا اسے اپنی مٹھی میں نہ رکھے، پھر اس کا بنے گا کیا؟ بھلا تم تصور کر سکتی ہو کہ وہ پیٹرزبرگ کیوں گیا تھا؟... انھوں نے ایک جما—''

''ہاں، مجھے معلوم ہے، نتاشا نے مجھے بتایا تھا۔''

''اچھا، تو تمھیں معلوم ہے،'' نکولائی نے کہا۔ بحث وتکرار کی محض یاد پر ہی اس کا خون دوبارہ کھولنے لگا تھا۔ ''اس نے مجھے قائل کرنے کی کوشش کی کہ ہر راست باز آدمی کا یہ فرض بنتا ہے کہ وہ حکومت کی مخالفت کرے حالانکہ وفاداری اور فرض شناسی کا حلف— مجھے افسوس ہے کہ تم وہاں موجود نہیں تھیں۔ ہوا یہ کہ وہ سب کے سب— دینی سوف اور نتاشا بھی— مجھ پر برسنے لگے... نتاشا تو نری احمق ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہے کہ وہ اسے اپنی چھنگلیا پر نچاتی پھرتی ہے لیکن جب بحث وتمحیص ہوتی ہے، خود تو اسے کوئی بات سوجھتی نہیں— بس جو کچھ وہ کہتا ہے اس کی جگالی کر دیتی ہے۔'' نکولائی نے اس ناقابلِ مزاحمت میلان کے سامنے، جو ہمیں اپنے عزیزوں اور پیاروں پر نکتہ چینی کی ترغیب دیتا ہے، سپر انداز ہوتے ہوئے مزید کہا۔

نکولائی کو معلوم نہیں تھا کہ جو کچھ وہ نتاشا کے بارے میں کہہ رہا تھا، لفظ بہ لفظ اس کے اپنی بیوی سے تعلقات پر منطبق ہوتا تھا۔

''ہاں، یہ تو میرے مشاہدے میں آیا ہے،'' کاؤنٹس ماریا نے کہا۔

''جب میں نے انھیں بتایا کہ فرض اور حلفیہ وفاداری کو سب پر فوقیت حاصل ہے، وہ خدا معلوم جواب میں کیا کہنے

اور ثابت کرنے لگا۔افسوس، تم وہاں موجود نہیں تھیں۔ تم کیا کہتیں؟''

''میری رائے میں آپ سولہ آنے ٹھیک تھے۔ پیئر کہتے ہیں کہ ہر شخص مصیبت میں مبتلا ہے، اسے ایذائیں پہنچائی جارہی اور بدعنوان بنایا جارہا ہے اور یہ کہ ہمسائے کی مدد کرنا ہمارا فرض بنتا ہے۔ لاریب وہ کہتے بالکل ٹھیک ہیں،'' کاؤنٹس ماریا نے کہا۔ ''لیکن وہ بھول جاتے ہیں کہ ہمارے اپنے قریب بھی کچھ لوگ ہیں، ان کے ہم پر حقوق ہیں اور خود خداوند نے بھی ہمیں ان کے متعلق فرائض کے بارے میں آگاہ کیا ہے، یہ کہ ہم اپنے آپ کو خطرے میں ڈال سکتے ہیں لیکن اپنے بچوں کو نہیں۔''

''بالکل ٹھیک، بالکل ٹھیک۔ عین مین یہی بات میں نے پیئر سے کہی تھی،'' نکولائی نے کہا۔ اسے واقعی یقین تھا کہ اس نے بالکل یہی بات کہی تھی۔ ''لیکن وہ اپنی رائے پر۔ ہمسائے سے محبت اور عیسائیت۔ اصرار کرتا رہا۔ اور وہ یہ سب باتیں نکولینکا کی موجودگی میں کرتا رہا جو سٹڈی روم میں آ گیا تھا اور بیٹھا میری چیزیں توڑ تا رہا تھا۔''

''نکولائی، آپ کو معلوم ہے کہ مجھے اکثر نکولینکا کے بارے میں بڑی پریشانی رہتی ہے،'' کاؤنٹس ماریا نے کہا۔ ''وہ غیر معمولی طور پر ذہین اور سمجھدار لڑکا ہے اور مجھے ہمیشہ دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ میں اپنے بچوں کی خاطر اسے نظر انداز کرتی رہتی ہوں۔ ہم سب کے اپنے بچے اور رشتے دار ہیں مگر اس کا تو کوئی بھی نہیں۔ وہ ہمیشہ الگ تھلگ اپنے خیالات میں مستغرق رہتا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ تمھیں اس کی وجہ سے اپنے آپ کو ملامت کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ مائیں جو ٹوٹ کر اپنے بچوں سے پیار کرتی ہیں، وہ بھی ان کے لیے اتنا کچھ نہیں کرتیں جو تم نے اس کے لیے کیا ہے اور اب بھی کر رہی ہو۔ اور ہاں، میں خوش ہوں کہ تم یہ سب کچھ کر رہی ہو۔ وہ اچھا لڑکا ہے، اچھا لڑکا ہے!'' نکولائی نے دہراتے ہوئے کہا حالانکہ قلبی طور پر اسے اس سے کوئی لگاؤ نہیں تھا لیکن وہ ہمیشہ یہ ماننے کے لیے وہ اچھا لڑکا ہے، تیار رہتا تھا۔

''پھر بھی میں وہ تو نہیں ہوں جو ماں ہو سکتی ہے،'' کاؤنٹس ماریا نے کہا۔ ''مجھے محسوس ہوتا رہتا ہے کہ میں وہ نہیں ہوں اور یہی احساس میرے دل کو موس رہتا ہے۔ وہ بہت نفیس لڑکا ہے لیکن میں اس کے متعلق اندیشوں میں گھری رہتی ہوں۔ اگر اسے دوست اور ساتھی مل جائیں، اس کے حق میں بہت اچھا رہے گا۔''

''خیر، اب اس میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔ میں اگلی گرمیوں میں اسے پیٹرز برگ لے جاؤں گا،'' نکولائی نے کہا۔ ''ہاں، پیئر ہمیشہ خواب دیکھتا رہتا ہے اور ہمیشہ خواب دیکھتا رہے گا۔'' اس نے سٹڈی روم کے مباحثے کی طرف، جس نے صاف معلوم ہوتا تھا کہ اسے ذہنی طور پر پریشان کر دیا تھا، دوبارہ پلٹتے ہوئے کہا۔ ''خیر، یہ میرا مسئلہ نہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ اگر آراک چیف اور دوسرے لوگ بدمعاش ہیں، مجھے اس سے کیا؟ میرا مسئلہ تو یہ تھا کہ جب میں نے شادی کی، میرا بال بال قرضے میں جکڑا ہوا تھا اور مجھے جیل بھجوائے جانے کی دھمکیاں مل رہی تھیں اور ادھر میری ماں تھی کہ اسے نہ کچھ نظر آتا تھا اور نہ وہ کچھ سمجھتی تھی۔ پھر تم ہو، ہمارے بچے ہیں، ہمارے معاملات ہیں۔ جب میں صبح سے شام تک زمینوں پر کام کرتا یا دفتر میں مغز ماری کرتا رہتا ہوں، تو کیا یہ سب کچھ میں اپنی

خوشی کی خاطر کرتا ہوں؟ نہیں مجھے معلوم ہے کہ مجھے محنت مشقت کرنا ہوگی تا کہ میری ماں آرام سے رہ سکے، میں تمھارے احسانات کا بدلہ چکا سکوں اور یہ بات یقینی بنا سکوں کہ غربت کی جس دلدل میں میں پھنس گیا تھا، ہمارے بچے اس سے محفوظ رہیں۔"

پرنسس ماریا اسے بتانا چاہتی تھی کہ انسان صرف روٹی کے سہارے زندہ نہیں رہتا اور یہ کہ وہ اس کام کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیتا ہے لیکن وہ جانتی تھی کہ اسے یہ بات بالکل نہیں کہنا چاہیے اور اس سے حاصل بھی کچھ نہیں ہوگا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس پر بوسہ ثبت کر دیا۔ نکولائی نے اس کے اس انداز کو اس کی محض پسندیدگی اور اپنے خیالات کی توثیق تصور کیا۔ اور چند منٹ خاموشی سے غور و فکر کرنے کے بعد وہ با آواز بلند سوچنے لگا۔

"ماری، تمھیں معلوم ہے کہ" اس نے کہا، "الیامتروفانچ" (وہ اس کا ایک سٹیوارڈ تھا) "آج تا مبوف جاگیر سے واپس آیا ہے۔ وہ مجھے بتاتا ہے کہ اب ہمیں جنگلات کے لیے اسی ہزار روبل پیش کیے جا رہے ہیں۔"

اور نکولائی بڑے جوشیلے انداز سے اترادنایا جاگیر دوبارہ خریدنے کے امکانات کے متعلق گفتگو کرنے لگا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس میں زیادہ تاخیر نہیں ہوگی۔ "اگر مجھے زندگی کے مزید دس سال مل گئے، میں بچوں کو ان کی ضروریات کے مطابق کافی کچھ مہیا کر دوں گا۔"

کاؤنٹس ماریا اپنے خاوند کی باتیں سنتی رہی، جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، وہ اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ جب وہ اس بلند آہنگ انداز سے سوچتا ہے، وہ اس سے ہمیشہ پوچھتا رہتا ہے کہ وہ بھلا کیا کہہ رہا تھا اور اگر اسے معلوم ہو جائے کہ اس کا دھیان کسی اور طرف ہے، وہ تلملانے لگتا ہے۔ لیکن اسے اس کی باتوں پر توجہ دینے کے لیے اپنے آپ کو مجبور کرنا پڑتا تھا کیونکہ جو کچھ وہ کہہ رہا ہوتا تھا، اس میں اسے نام کو بھی دلچسپی نہیں ہوتی تھی۔ وہ اسے دیکھ رہی تھی اور اگرچہ یہ بات پوری طرح تو درست نہیں تھی کہ اس کا دھیان کسی اور طرف تھا، تاہم اس میں کوئی کلام نہیں کہ اس کے احساسات کہیں اور بھٹک رہے تھے۔ اسے اس شخص کے ساتھ، جس کے متعلق اس کا خیال تھا کہ جو کچھ وہ سمجھتی ہے، وہ اسے کبھی سمجھ نہیں سکے گا، ملائم اور اطاعت شعارانہ محبت تھی۔ اور چونکہ جو کچھ وہ سمجھتی تھی، وہ اسے کبھی سمجھ نہیں پاتا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ یہی چیز اس کے ساتھ اس کی محبت کو اور شدید بنا دیتی ہے اور اس میں گرم جوش ملائمت کی چاشنی کا اضافہ کر دیتی ہے۔ اس احساس کے علاوہ، جس میں وہ سرتاپا غرق تھی اور جو اس کے خاوند کے منصوبوں کو پوری طرح سمجھنے میں حارج ہو رہا تھا، ایسے خیالات، جن کا جو کچھ وہ کہہ رہا تھا، اس سے کوئی تعلق نہیں بنتا تھا، اس کے ذہن میں برق رفتاری سے گردش کر رہے تھے۔ اس کی سوچوں کا محور اس کا بھتیجا تھا (اس کے شوہر نے پیئر کی گفتگو کے دوران میں اس کی جس ہیجانی کیفیت کا ذکر کیا تھا، اس نے اس کے دل و دماغ پر گہرا نقش چھوڑا تھا) اور اسے اس کی حلیم اور حساس فطرت کے مختلف پہلو یاد آنے لگا۔ اپنے بھتیجے کے متعلق سوچتے سوچتے اس کا دھیان اپنے بچوں کی طرف چلا گیا۔ اس نے اس کا موازنہ ان کے ساتھ نہیں کیا بلکہ وہ یہ موازنہ

اپنے بچوں کے متعلق اپنے احساسات اور اس کے متعلق اپنے احساسات کے مابین کرنے لگی، اور اسے یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ نکولینکا کے متعلق اس کے احساسات میں کسی چیز کا فقدان ہے۔

بعض اوقات اسے خیال گزرتا کہ اپنے بچوں اور نکولینکا کے مابین اس کے احساسات کا فرق ان کی عمروں کے مابین تفاوت کی پیداوار ہے، لیکن وہ اپنے آپ کو اس کا مجرم تصور کرتی تھی اور اب اس نے دل میں قسم کھائی کہ وہ تلافی کرنے کی کوشش کرے گی اور ناممکن کو ممکن بنادے گی۔ وہ اس زندگی میں اپنے شوہر، اپنے بچوں، نکولینکا اور جس طرح مسیح نے بنی نوع انسان سے محبت کی تھی، اسی طرح اپنے ساتھی انسانوں سے محبت کرے گی۔ کاؤنٹس ماریا کی روح سدا لامحدود، ابدی اور مطلق ذات تک رسائی کی آرزو کرتی رہتی تھی، چنانچہ اسے کبھی سکون نہیں ملتا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ اس قسم کی درشتی جھلکتی رہتی تھی جیسے اس کی روح، جو جسم کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی، بلند و بالا اور مخفی اذیت میں مبتلا ہو۔ نکولائی ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگا۔

''میرے خدایا، اگر یہ فوت ہوگئی، ہمارا کیا بنے گا؟ جب اس کے چہرے پر اس قسم کے تاثرات نمایاں ہونے لگتے ہیں، میرے دل میں اسی قسم کے وسوسے سر اٹھانے لگتے ہیں!'' اس نے سوچا۔ وہ ایقونے کے روبرو کھڑا ہو گیا اور شبینہ دعا مانگنے لگا۔

16

جب نتاشا اور پیئر کو تنہائی میسر آئی، وہ بھی آپس میں بالکل اسی طرح گفتگو کرنے لگے جس طرح کہ صرف میاں بیوی ہی کر سکتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ ایک ایسے طریقے سے، جو منطق کے تمام اصولوں کی نفی کرتا ہے اور جس میں مقدمات (کبریٰ و صغریٰ)، استخراجات اور نتائج سے کوئی مدد نہیں لی جاتی، یوں اپنے خیالات کا باہمی تبادلہ کرنے لگے کہ گو وہ بہت تیز تیز باتیں کر رہے تھے، انھیں ایک دوسرے کا مدعا سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی۔ نتاشا اپنے خاوند کے ساتھ اس قسم کی گفتگو کی اتنی عادی ہو چکی تھی کہ اگر پیئر باتوں کے دوران میں منطقی طرز بیان اختیار کر لیتا، تو اسے یہ اس امر کی واضح علامت معلوم ہونے لگتا کہ ان دونوں کے مابین لازماً کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے۔ جب وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے عقلی دلائل کے بل بوتے پر کوئی چیز ثابت کرنے لگتا اور اس کی مثال پر عمل کرتے ہوئے وہ خود بھی اسی راہ پر چل نکلتی، اس کا ماتھا ٹھنکنے لگتا کہ اب ان کے درمیان جھگڑا ہو کر رہے گا۔

جونہی وہ دونوں خلوت میں اکٹھے ہوئے، نتاشا، جس کی سرور و محبت سے آنکھوں کی پتلیاں پھیل رہی تھیں، کھسکتے کھسکتے اس کے بالکل قریب ہوگئی۔ اس نے یک لخت اس کا سر پکڑا، اپنی چھاتیوں سے لگایا، بھینچا اور کہنے لگی:

''اب آپ میرے ہیں، صرف میرے، اب میں آپ کو جانے نہیں دوں گی''۔ اور اسی لمحے ان دونوں کے مابین وہ گفتگو شروع ہوگئی جو منطق کے تمام قوانین کے یکسر برعکس تھی، اس لیے برعکس کیونکہ اس کے دوران میں بالکل ہی

مختلف موضوعات بیک وقت زیر بحث آنے لگے۔ متعدد موضوعات پر بیک وقت گفتگو واضح تفہیم میں کوئی رکاوٹ نہ بنی بلکہ یہ اس بات کی واضح نشانی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔

جس طرح خواب میں اس احساس کے ماسوا، جو خواب پر حاوی ہوتا ہے، ہر چیز غیر حقیقی، بے ربط اور متضاد ہوتی ہے، اسی طرح خیالات کے اس تبادلے میں، جو منطق کے تمام قوانین کی نفی کر رہا تھا، میاں بیوی جو الفاظ استعمال کر رہے تھے، وہ بذات خود منطقی اور واضح نہیں تھے لیکن انھیں جو جذبہ اگلوا رہا تھا، وہ مربوط اور الجھاؤ سے پاک تھا۔

نتاشا نے پیئر کو بتایا کہ اس کے بھائی کے گھر کے معمولات کیسے چل رہے ہیں، اپنے شوہر کے بغیر اس کی حالت کتنی خستہ وخراب رہی ہے، وہ جی نہیں رہی تھی بلکہ محض گھسٹ رہی تھی اور وہ ماریا کی پہلے سے بھی کتنی زیادہ گرویدہ ہو چکی ہے کیونکہ وہ خود اس کی نسبت ہر لحاظ سے کہیں بہتر ہستی ہے۔ اس نے ماریا کی برتری کا اقرار پورے خلوص سے کیا تھا، لیکن اس نے بین السطور یہ بھی جتلا دیا کہ پیئر کی نگاہوں میں ماریا یا کسی دوسری عورت کے مقابلے میں ترجیح خود اسے ہی حاصل رہے گی اور اب جب کہ وہ پیٹرزبرگ میں اتنی زیادہ تعداد میں دوسری عورتوں سے مل کر آیا ہے، وہ یہ چاہے گی کہ وہ اپنے اس عہد کا ازسرنو اقرار کرے۔

چنانچہ پیئر نے اسے بتایا کہ پیٹرزبرگ میں خواتین کی موجودگی میں اسے شام کی محفلیں اور ڈنر کتنے ناگوار گزرتے رہے ہیں۔

''مجھ میں عورتوں کے ساتھ گپ شپ لڑانے کا سلیقہ باقی نہیں رہا،'' اس نے کہا۔''مجھے ہمیشہ بڑی کوفت ہوتی رہی، خاص طور پر اس لیے بھی کیونکہ میں بے حد مصروف تھا۔''

نتاشا نے اسے بڑے غور سے دیکھا اور کہنے لگی:

''ماریا واقعی بہت نفیس ہے! جس طرح وہ بچوں کو سمجھتی ہے، اس پر قربان ہونے کو جی چاہتا ہے! معلوم ہوتا ہے کہ اسے ان کی روحوں میں جھانکنے کا ملکہ حاصل ہے۔ مثلاً کل میتا ضد کر رہا تھا۔''

''وہ بالکل اپنے باپ پر گیا ہے!'' پیئر بیچ میں بول پڑا۔

نتاشا کو معلوم تھا کہ اس نے میتا کی نکولائی سے مشابہت کے بارے میں یہ بات کیوں کہی ہے۔ اپنے برادر نسبتی سے تو تکار کی یاد اس کے لیے ناخوشگوار تھی اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ نتاشا کا اس بارے میں کیا خیال ہے۔

''نکولائی کی کمزوری یہ ہے کہ جب تک کسی بات کو عمومی سند نہیں مل جاتی، وہ کبھی اس سے متفق نہیں ہوتا۔ مگر میں سمجھتی ہوں کہ آپ جن چیزوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، ان سے نئے رستے کھلتے ہیں،'' اس نے پیئر کا جملہ، جو اس نے کبھی استعمال کیا تھا، دہراتے ہوئے کہا۔

''نہیں، سچی بات یہ ہے کہ نکولائی کے لیے خیالات اور مباحث محض تفریح طبع کی چیزیں ہیں — بلکہ تقریباً تضیع اوقات ہیں،'' پیئر نے کہا۔''یہاں وہ لائبریری اکٹھی کر رہا ہے اور اس نے یہ اصول بنا لیا ہے کہ جب تک وہ

سابقہ خرید کردہ کتاب نہیں پڑھ لے گا، ہرگز نئی نہیں خریدے گا۔ سسمونڈی،[35] رُوسو اور مونٹس کیو،[36] مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تم جانتی ہو کہ میں نے کس طرح۔'' وہ اپنی نکتہ چینی کو قدرے نرم بنانا چاہتا تھا لیکن نتاشا نے یہ جتانے کے لیے کہ اس کی ضرورت نہیں ہے، اسے ٹوک دیا۔

''تو آپ سمجھتے ہیں کہ اس کے لیے خیالات محض تفریح طبع کی چیز ہیں...''

''ہاں، اور میرے لیے باقی سب کچھ محض تفریح طبع کی چیزیں ہیں۔ جب تک میرا پیٹرز برگ میں قیام رہا، مجھے ہر شخص یوں نظر آتا رہا جیسے میں انھیں خواب میں دیکھ رہا ہوں۔ جب میں کسی خیال میں مستغرق ہو جاتا ہوں، مجھے باقی سب کچھ تضیع اوقات معلوم ہوتا ہے۔''

''مجھے بہت افسوس ہے کہ جب آپ بچوں سے مل رہے تھے، میں وہاں نہیں تھی!'' نتاشا نے کہا۔ ''سب سے زیادہ کون خوش تھا؟ لسا، میں دعوے سے کہہ سکتی ہوں۔''

''ہاں۔'' پیئر نے جواب دیا اور جو کچھ اس کے ذہن میں تھا، دوبارہ اس پر بات کرنے لگا۔ ''نکولائی کہتا ہے کہ ہمیں سوچنا نہیں چاہیے لیکن مجھ سے ایسا نہیں ہو سکتا۔ علاوہ ازیں، جب میں پیٹرز برگ میں تھا، مجھے محسوس ہو رہا تھا (یہ بات میں تم سے کہہ سکتا ہوں) کہ اگر میں وہاں نہ ہوتا تو سارا معاملہ گڑبڑ ہو جاتا۔ ہر شخص اپنی بات منوانے پر تلا ہوا تھا۔ لیکن میں ان سب کو متحد کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر میرے خیالات میں کوئی الجھاؤ نہیں، وہ بالکل سیدھے سادے ہیں اور آسانی سے سمجھ میں آ سکتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں اس یا اس چیز کی مخالفت کرنا چاہیے۔ ممکن ہے کہ ہم غلطی پر ہوں۔ لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں، وہ یہ ہے: وہ لوگ جنھیں راستی سے پیار ہے، انھیں ایک جھنڈے — فعال نکوکاری کا جھنڈا — تلے متحد ہو جانا چاہیے۔ پرنس سرجی نفیس آدمی ہے اور ہوشیار بھی۔''

نتاشا کو پیئر کے خیالات کی عظمت کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہوتا لیکن ایک بات اسے پریشان کر رہی تھی:

''کیا یہ شخص، جو معاشرے کے لیے اتنا اہم ہے، جس کا کوئی بدل نہیں، میرا خاوند بھی ہو سکتا ہے؟ یہ کیسے ہو گیا؟'' اسے یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی تھی اور وہ اس بارے میں اپنے وسوسوں کا اظہار اس سے کرنا چاہتی تھی۔ ''وہ کون لوگ ہیں جو یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ وہ دوسروں سے زیادہ سمجھ دار اور ہوشیار ہے؟'' اس نے اپنے ذہن میں ان تمام اشخاص کا، جن کا پیئر احترام کرتا تھا، جائزہ لیتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھا۔ وہ جو باتیں کہتا رہتا تھا، ان سے اندازہ لگاتے ہوئے وہ اس نتیجے پہنچی کہ جن لوگوں کو وہ عزت کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، ان میں پلاطون کاراتائیف سرفہرست ہے۔

''آپ کو معلوم ہے کہ میں کیا سوچ رہی تھی؟'' اس نے پوچھا۔ ''پلاطون کاراتائیف کے متعلق۔ وہ کس طرح سوچتا؟ آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ اسے پسند کرتا؟''

• پیئر کہنا یہ چاہتا تھا کہ نکولائی ایک طرف تو انقلابی مصنفین کی کتابیں پڑھتا ہے، دوسری طرف عملی زندگی میں رجعت پسندی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔

پیئر یہ سوال سن کر ذرا بھی حیران نہ ہوا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ اس کی بیوی کے خیالات کی رو کس سمت میں جا رہی ہے۔
''پلاطون کاراتائیف؟'' اس نے کہا اور گہرے سوچ بچار میں کھو گیا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ یہ تصور کرنے کی کوشش کر رہا ہے کہ اس معاملے میں کاراتائیف کی کیا رائے ہوتی۔'' بات اس کی سمجھ میں نہ آتی... یا شاید وہ سمجھ ہی جاتا۔''

''مجھے آپ سے بے پناہ پیار ہے!'' نتاشا نے یک لخت با آواز بلند کہا۔'' بے پناہ! بے حد وحساب!''
''نہیں، اسے یہ بات پسند نہ آتی،'' پیئر نے غور وفکر کے بعد کہا۔'' وہ جس چیز کو پسندیدگی کی نظروں سے دیکھتا، وہ ہماری خاندانی زندگی ہے۔ وہ ہمیشہ ہر چیز میں خوش اسلوبی، سکون اور مسرت ڈھونڈتا رہتا تھا اور میں بڑے فخر سے اس سے کہہ سکتا تھا: 'ذرا ہماری طرف دیکھو'... رہی یہ بات کہ تمھیں میری غیر حاضری بہت ناگوار گزرتی ہے، تو میں اگر تمھیں یہ بتاؤں کہ مفارقت کے بعد مجھے تم سے اور بھی محبت ہو جاتی ہے، تو تم شاید یقین نہیں کرو گی۔''
''ہاں، میں کہنا یہ چاہتی تھی۔'' نتاشا نے اپنی بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا۔
''نہیں، بات یہ نہیں ہے۔ کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا جب میں تمھاری محبت اپنے دل میں محسوس نہیں کرتا اور کوئی شخص اس سے زیادہ محبت نہیں کر سکتا۔ لیکن جدائی کے بعد یہ خاص الخاص چیز بن جاتی ہے۔... خیر، تمھیں معلوم ہی ہے...'' اس نے اپنی بات ختم نہ کی کیونکہ ان کی نگاہوں نے، جن کا ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو رہا تھا، باقی سب کچھ کہہ دیا تھا۔
''لوگ کہتے ہیں کہ بہترین مسرت ہنی مون کے دنوں اور شادی کے ابتدائی دور میں ملتی ہے۔ بالکل لایعنی اور واہیات بات ہے!'' نتاشا نے اچانک اونچے لہجے میں کہا۔'' اس کے برعکس بہترین کا وقت تو اب آیا ہے۔ صرف آپ کہیں جایا نہ کریں! آپ کو یاد ہے کہ ہم آپس میں کیسے جھگڑا کرتے تھے؟ اور غلطی ہمیشہ میری ہوتی تھی، ہمیشہ میری! اور ہمارا جھگڑا کس بات پر ہوتا تھا۔ مجھے تو کچھ یاد بھی نہیں۔''
''ہمیشہ ایک ہی بات،'' پیئر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ر س۔''
''مت لیں اس کا نام! مجھ سے برداشت نہیں ہوتا!'' نتاشا نے کہا اور اس کی آنکھیں بے مہر اور انتقامی حرارت سے دہکنے لگیں۔ ''آپ اس سے ملے تھے؟'' اس نے قدرے توقف کے بعد پوچھا۔[37]
''نہیں، اگر میری اس سے ملاقات ہو بھی جاتی، میں اسے پہچان نہ پاتا۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہے۔
''اوہ، آپ کو معلوم ہے کہ جب آپ سٹڈی روم میں باتیں کر رہے تھے، میری نظریں آپ پر لگی ہوئی تھیں،'' نتاشا نے مہر سکوت توڑتے ہوئے کہا۔ ان دونوں کے مابین جو کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اسے دور کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ ''آپ دونوں — آپ اور بچہ'' (اس کا اشارہ اپنے بیٹے کی طرف تھا) — '' کے مابین وہی مشابہت ہے جو مٹر کے دو دانوں میں ہوتی ہے۔ ارے، میرے واپس جانے کا وقت ہو گیا۔... میرا

دودھ اتر رہا ہے... آپ کو چھوڑتے مجھے دکھ ہو رہا ہے۔"

ایک بار پھر دونوں کئی لمحے خاموش رہے۔ پھر اچانک ان کی نظریں چار ہوئیں اور دونوں بیک وقت بولنے لگے۔ پیئر کے لہجے میں خود اطمینانی اور جوش و خروش جھلک رہا تھا جب کہ نتاشا خوشی سے مسکرا رہی تھی۔ شروع تو وہ دونوں ہی بیک وقت ہوئے تھے لیکن دونوں ہی رک گئے تاکہ دوسرے کو اپنی بات ختم کرنے کا موقع مل سکے۔

"نہیں، تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟ کہو، کہونا۔"

"نہیں، آپ — میری بات بالکل لایعنی تھی۔"

پیئر نے جو بات شروع کی تھی وہ اس نے ختم کر دی۔ پیٹرز برگ میں اپنی کامیابی پر اسے جو اطمینان اور خوشی ہوئی تھی، یہ اس کا تتمہ تھا۔ اس وقت اسے محسوس ہو رہا تھا کہ روسی معاشرے اور کل دنیا کو ایک نئی جہت دینے کے لیے اسے منتخب کر لیا گیا ہے۔

"میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ ایسے تمام خیالات، جو زبردست نتائج پیدا کرتے ہیں، ہمیشہ سیدھے سادے اور عام فہم ہوتے ہیں۔ میری خواہش صرف یہ ہے کہ اگر بدخصلت اور بدکردار لوگ متحد ہو سکتے اور طاقت بن سکتے ہیں، پھر راست باز لوگ بھی یہی کریں۔ دیکھا، کتنی سیدھی سادی بات ہے؟"

"ہاں۔"

"اور تم کیا کہنا چاہتی تھیں؟"

"ارے کچھ نہیں، کچھ نہیں — بالکل لایعنی بات۔"

"خیر، جو کچھ بھی ہو، اب کہہ ڈالو۔"

"ارے، کچھ نہیں، واقعی کچھ نہیں،" نتاشا کے چہرے پر اب پہلے سے بھی زیادہ درخشاں تبسم پھیل چکا تھا اور اس کا رواں رواں دمکنے لگا تھا۔ "میں تو صرف پیتا کے بارے میں بتانا چاہ رہی تھی۔ آج انا اسے لینے میرے پاس آئی اور وہ ہنسنے لگا، اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور وہ میرے ساتھ چمٹ گیا — میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ اس کا خیال تھا کہ وہ اس طرح چھپ رہا ہے۔ وہ بے حد پیارا بچہ ہے! ارے، وہ رو رہا ہے۔ اچھا، خدا حافظ۔" اور وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

❖

دریں اثناء نچلی منزل میں نکولینکا بلکونسکی کے کمرے میں حسب معمول چھوٹا لیمپ جل رہا تھا۔ (لڑکے کو اندھیرے سے ڈر آتا رہتا تھا اور وہ اسے اس کے اس خوف سے چھٹکارا نہیں دلا سکے تھے۔) دیسال چار تکیوں کے اوپر سر ٹکائے سو رہا تھا اور اس کی رومی ناک سے تال میل سے خراٹوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ نکولائی ابھی ابھی ہڑبڑا کر جاگا تھا۔ وہ ٹھنڈے پسینے میں نہایا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں پوری طرح کھلی تھیں اور وہ ٹکٹکی باندھے سیدھا سامنے دیکھ رہا

تھا۔ اسے ڈراؤنے خواب نے جگایا تھا۔

اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اور انکل پیئر اس قسم کے خود (ہیلمٹ)، جس کی تصویر اس کی پلوٹارک[38] کی کتاب ''متوازی زندگیاں'' میں تھی، پہنے ہوئے ہیں اور بہت بڑے لشکر کی قیادت کر رہے ہیں۔ فوج ترچھے سفید دھاگوں پر مشتمل تھی۔ ان دھاگوں سے ساری فضا معمور تھی۔ یہ دھاگے مکڑی کے دھاگوں کی مانند تھے جو موسم خزاں میں ادھر ادھر اڑتے پھرتے ہیں۔ دیسال انھیں• le fil de la vierge کہتا تھا۔ ان کے سامنے شان و شوکت تھی۔ وہ بھی ان دھاگوں سے بالکل مشابہ تھی لیکن ان سے قدرے مضبوط تھی۔ وہ اور پیئر محو پرواز تھے اور بہت خوش تھے۔ وہ لحظہ بہ لحظہ اپنی منزل کے قریب سے قریب تر ہوتے جا رہے تھے۔ اچانک وہ دھاگے، جو انھیں اڑائے لیے جا رہے تھے، ڈھیلے پڑنے اور آپس میں الجھنے لگے۔ ان کے سامنے انکل نکولائی کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ درشت اور انداز تہدید آمیز تھا۔

''یہ تمھاری حرکت ہے؟'' اس نے چند ٹوٹے پھوٹے قلموں اور لاکھ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''میں تم سے محبت کرتا تھا لیکن میں آراک چیف کے حکم کا بندہ ہوں اور تم میں سے جس نے ایک بھی قدم آگے بڑھایا، میں اسے ہلاک کر دوں گا۔'' نکولینکا نے پیئر کی تلاش میں اپنے گرد و پیش دیکھا لیکن پیئر اب وہاں نہیں تھا، اس کی جگہ اس کا باپ — پرنس آندرے — وہاں کھڑا تھا۔ اس کے باپ کی کوئی شکل تھی نہ صورت، لیکن وہ وہاں موجود تھا۔ جب نکولینکا نے اسے دیکھا، محبت نے اس کی قوت سلب کر لی، اسے محسوس ہونے لگا کہ وہ بالکل بے بس ہو چکا ہے اور اس کے جسم میں نہ ہڈیاں ہیں اور نہ گودا۔ اس کے باپ نے اسے تھپکایا، سہلایا، اسے تسلیاں دیں اور اس کی حالت پر ترس کھایا لیکن انکل نکولائی ان کے قریب سے قریب تر آتا جا رہا تھا۔ نکولینکا کو دہشت نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا اور اس کی آنکھ کھل گئی۔

''میرے والد!'' اس نے سوچا (اگرچہ گھر میں پرنس آندرے کے دو پورٹریٹ تھے لیکن نکولینکا کبھی اپنے ذہن میں اس کی کوئی تصویر نہ بنا سکا۔) ''میرے پاپا میرے پاس ہیں۔ انھوں نے مجھے سہلایا اور پیار کیا تھا۔ وہ میرے ساتھ خوش تھے۔ انھوں نے انکل پیئر کو پسند فرمایا تھا۔ جو کچھ انکل پیئر کہیں گے، میں وہی کروں گا۔ موسیس سکیوولا[39] نے اپنا ہاتھ جلا لیا تھا، اس قسم کا کوئی واقعہ میرے ساتھ کیوں نہیں پیش آتا؟ میں جانتا ہوں کہ میرے سب گھر والے چاہتے ہیں کہ میں تعلیم حاصل کروں اور میں حاصل کروں گا۔ لیکن کوئی روز آئے گا جب میں اسے مکمل کر لوں گا، پھر میں کوئی کام کروں گا۔ میں خداوند سے صرف ایک چیز کا طلب گار ہوں: جو کچھ پلوٹارک (کی کتاب) کے آدمیوں کے ساتھ پیش آیا، وہی میرے ساتھ پیش آئے۔ جو کچھ انھوں نے کیا تھا، میں بھی وہی کروں گا، بلکہ بہتر انداز سے کروں گا۔ ہر شخص مجھے جاننے لگے گا، مجھ سے محبت کرے گا اور میری تحسین کرے گا۔'' اچانک نکولینکا کو محسوس ہوا کہ اس کے سینے میں آہیں اٹھ رہی ہیں اور وہ رونے لگا۔

• کنواری کا دھاگہ

"Etes vous indispose?"* اسے دیسال کی آواز سنائی دی۔

"Non"** نکولینکا نے جواب دیا اور وہ دوبارہ تکیے پر لیٹ گیا۔

"وہ نیک اور مہربان ہیں اور میں ان کا شیدائی ہوں،" اس نے دیسال کے متعلق سوچا۔ "لیکن انکل پیئر؟ وہ کتنے لاجواب آدمی ہیں! اور میرے والد؟ پاپا، پاپا، ہاں، میں کوئی نہ کوئی کارنامہ ایسا ضرور سرانجام دوں گا کہ وہ بھی مطمئن ہو جائیں..."

---

* تمھاری طبیعت خراب ہے؟

** نہیں تو

حصہ دوم

1

تاریخ کا موضوع اقوام اور بنی نوع انسان کی حیات ہے۔ بنی نوع انسان تو بہت دور کی بات ہے، کسی واحد قوم کی زندگی کو بھی گرفت میں لانا اور الفاظ کا جامہ پہنانا — صحیح صحیح بیان کرنا — ناممکن نظر آتا ہے۔

کسی قوم کی زندگی کو، جو بظاہر گرفت میں نہیں آتی، گرفت میں لانے اور بیان کرنے کے لیے مورخینِ قدیم نے یکساں سیدھا سادا طریقہ اختیار کیا۔ وہ انفرادی اشخاص کی، جو لوگوں پر حکومت کرتے تھے، سرگرمیوں کو موضوعِ بحث بنا لیتے تھے اور سمجھ لیتے تھے کہ ان کی سرگرمیاں من حیث الجماعت پوری قوم کی سرگرمیوں کا احاطہ کر لیتی ہیں۔

رہے یہ سوالات: ان افراد نے اقوام کو اپنی خواہشات کے مطابق کس طرح عمل کرنے پر مجبور کیا اور خود ان افراد کے منشا کی رہنمائی کس نے کی؟ قدما نے پہلے سوال کا جواب ایک ایسے دیوتا یا معبود کے، جو اقوام کو چنیدہ اشخاص کی مرضی کے تابع بنا دیتا ہے، وجود کا اقرار کر کے دیا۔ دوسرے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ یہی معبود ان چنیدہ اشخاص کی رہنمائی کرتا ہے تاکہ ان مقاصد کی، جنھیں مقدر کیا جا چکا ہے، تکمیل ہو سکے۔

قدما کا خیال تھا کہ اس عقیدے کو، کہ معبود بنی نوع انسان کے معاملات میں براہِ راست دخیل ہوتا ہے، تسلیم کر لینے سے یہ سوالات خود بخود حل ہو جاتے ہیں۔

جدید تاریخ کے نظریے میں ان دونوں دعاوی کو مسترد کر دیا گیا ہے۔

بادی النظر میں تو یہی خیال گزرے گا کہ متقدمین کے اس عقیدے کو، کہ انسان کسی دیوتا کا محکوم ہے یا اقوام کی کسی پیشگی طے شدہ مقصد کی طرف رہبری کی جاتی ہے، مسترد کر دینے کے بعد جدید تاریخ اقتدار کے محض تظاہر کی ہی نہیں، بلکہ ان وجوہ کا بھی، جو اس اقتدار کو وجود میں لاتی ہیں، مطالعہ کرے گی۔ لیکن جدید تاریخ نے اس کا بیڑا نہیں اٹھایا۔ اگرچہ وہ نظری اعتبار سے قدما کے موقف کو مسترد کر چکی ہے مگر عملاً وہ ابھی تک ان ہی کی لکیر پیٹے جا رہی ہے۔

اب یہ تو نہیں کہا جاتا کہ انسان خدا کی طرف سے عطا کردہ اختیارات سے بہرہ ور ہیں اور مشیت خداوندی ان کی براہِ راست رہبری کرتی ہے۔ اس کی بجائے جدید تاریخ نے غیر معمولی اور فوق البشر صلاحیتوں کے مالک ہیرو

تراش لیے ہیں یا مطلق العنان شہنشاہوں سے اخبار نویسوں تک ہر درجے اور صنف کے ہیولے کھڑے کر دیے ہیں اور دعویٰ یہ ہے کہ عوام کی رہنمائی کا فریضہ یہ لوگ سرانجام دیتے ہیں۔ یہودی، یونانی یا رومی اقوام کے خدا کی طرف سے مقرر کردہ مقاصد کی بجائے، جو قدما کی نظروں میں بنی نوع انسان کے مقاصد قرار پاتے تھے، جدید تاریخ فرانسیسی، جرمن یا انگریز قوم کی صلاح و بہبود یا جب یہ بہت اونچا سوچتی ہے، تمام انسانوں کی (جن سے عام طور پر مراد وہ اقوام ہوتی ہیں جو ایک بڑے براعظم کے چھوٹے سے شمال مغربی گوشے میں آباد ہیں) فلاح و بہبود اور تہذیب و آراستگی اپنے مقاصد بنا لیتی ہے۔

جدید تاریخ نے کوئی نیا تصور، — جو قدما کے عقاید کی جگہ لے سکتا، پیش کیے بغیر ان کا نظریہ مسترد کر دیا ہے۔ بظاہر مورخین بادشاہوں کے الوہی[1] اختیار کے دعوے کو جھٹلاتے نظر آتے ہیں اور متقدمین کی طرح ''تقدیر'' کے قائل بھی معلوم نہیں ہوتے۔ ان کا رویہ صورت حال کا منطقی تقاضا ہے لیکن حقیقتاً پہنچتے وہ بھی ان ہی نتائج پر ہیں مگر اس کے لیے وہ راستہ مختلف اختیار کرتے ہیں — بہ الفاظ دیگر وہ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ 1- قوموں کی قیادت افراد کرتے ہیں اور 2- ایک منزلِ مقصود موجود ہے اور اقوام اور بنی نوع انسان اس کی جانب بڑھ رہے ہیں۔

گبن[2] سے بکل[3] تک تمام جدید مورخین بظاہر ایک دوسرے سے اختلاف کرتے نظر آتے ہیں اور دیکھنے میں ان کے خیالات میں نیا پن پایا جاتا ہے، لیکن اصلاً ان کی تصنیفات کی اساس انھی دو قدیم اور اٹل مفروضوں پر قائم ہے۔

اول: مورخ ان افراد کی، جنھوں نے اس کے خیال کے مطابق انسانوں کی رہنمائی کی ہے اور ان سے اپنی بات منوائی ہے (ایک مورخ صرف شاہی حکمرانوں، فوجی کمانڈروں اور وزیروں کو اس زمرے میں شمار کرتا ہے، جب کہ دوسرا حکمرانوں کے علاوہ شعلہ بیان مقرروں، علماء و فضلاء، مصلحین، شعراء اور فلسفیوں کو بھی شامل کر لیتا ہے) سرگرمیاں بیان کرتا ہے۔ دوم: مورخین یہ فرض کر لیتے ہیں کہ جس منزل مقصود کی جانب اقوام کی رہنمائی کی جاتی ہے، وہ اس سے آگاہ ہیں۔ ایک کے نزدیک یہ رومی، ہسپانوی یا فرانسیسی امپراطوریہ کی سرفرازی ہے۔ دوسرے کے خیال میں یہ حریت، مساوات اور خاص قسم کی تہذیب ہے، جس کا سکہ دنیا کے ایک چھوٹے سے خطے موسوم بہ یورپ میں چل رہا ہے۔

1789 میں پیرس میں بے چینی کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ بڑھتی ہے، پھیلتی ہے اور اقوام کی مغرب سے مشرق کی جانب نقل و حرکت میں اظہار کا راستہ بنا لیتی ہے۔ اس نقل و حرکت کا رخ بار بار مشرق کی طرف موڑا جاتا ہے۔ مشرق سے مغرب کی طرف جوابی نقل و حرکت ہوتی ہے اور دونوں کا آپس میں تصادم ہو جاتا ہے۔ 1812 میں مغرب سے مشرق کی سمت میں نقل و حرکت اپنی انتہائی حد — ماسکو — پر منتج ہوتی ہے۔ پھر نقل و حرکت کا رخ مشرق سے مغرب کی طرف ہو جاتا ہے۔ دونوں میں حیرت انگیز مماثلت پائی جاتی ہے۔ دوسری نقل و حرکت عین مین پہلی نقل و حرکت کی طرح وسطی یورپ کی اقوام کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے اور انھیں اپنے ساتھ بہا لے جاتی ہے۔ جوابی نقل و حرکت پہلی حرکت کے نقطۂ آغاز پر — پیرس — پر منتج ہوتی ہے اور اس کا زور ٹوٹ جاتا ہے۔

چوبیس سال پر محیط اس زمانے میں لاتعداد کھیت بلا کاشت چھوڑ دیے جاتے ہیں؛ مکانوں کو نذر آتش کر دیا جاتا ہے؛ تجارت اپنی جہت تبدیل کر لیتی ہے؛ لاکھوں انسان ترک وطن کرتے ہیں؛ فلاکت و نکبت کا شکار ہوتے ہیں یا مال و دولت سے تجوریاں بھر لیتے ہیں؛ اور لاکھوں عیسائی، جو اپنے پڑوسی سے محبت کے اصول کا دم بھرتے ہیں، ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔

اس سب کچھ کا مطلب کیا ہے؟ ایسا کیوں ہوا؟ آخر وہ کون سی چیز تھی جس نے ان لوگوں کو مکانات نذر آتش کرنے اور ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کی ترغیب دی؟ کس طاقت نے انسانوں کو یہ طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کیا؟ ان واقعات کی وجوہ کیا تھیں؟ یہ بالکل جبلی، سیدھے سادے اور انتہائی جائز سوالات ہیں، جو بنی آدم، جب انھیں اس زمانے کی یادگاروں اور قصے کہانیوں سے واسطہ پڑتا ہے، اپنے آپ سے پوچھتے ہیں۔

ان سوالات کے جوابات کے لیے ہم علم تاریخ کی طرف، جس کا مقصد اقوام اور انسانوں کو اپنے آپ کو جاننا سکھانا ہے، رجوع کرتے ہیں۔

اگر تاریخ متقدمین کے نظریے سے چمٹی رہتی تو وہ کہتی: معبود نے اپنے بندوں کو جزا یا سزا دینے کے لیے نپولین کو اقتدار سے سرفراز فرمایا اور اپنے الوہی مقاصد کی تکمیل کے لیے اس کے منشا کی رہنمائی کی۔ اور یہ جواب کافی اور شافی ہوتا۔ آپ نپولین کی الوہی معنویت کو مانیں یا نہ مانیں، لیکن وہ شخص جو اس کو مانتا ہے، اس کے لیے اس زمانے کی تاریخ قطعاً ناقابل فہم نہیں ہوگی اور نہ اسے اس میں کوئی تناقض نظر آئے گا۔

لیکن موجودہ تاریخ اس طریقے سے جواب نہیں دے سکتی۔ سائنس متقدمین کے اس تصور کو صحیح تسلیم نہیں کرتی کہ خدا یا دیوتا بندوں کے امور میں براہ راست دخیل ہوتا ہے، چنانچہ تاریخ کو جواب ہائے دیگر دینا ہوں گے۔

جب تاریخ کا نیا مدرسۂ فکر ان سوالات کے جوابات دیتا ہے، تو وہ کہتا ہے: "آپ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ اس نقل و حرکت کا مطلب کیا ہے، اس کا سبب کیا چیز بنی اور کون سی طاقت ان واقعات کو ظہور میں لائی؟" تو سنیں:

"لوئی چہاردہم[4] بڑا متکبر اور خرد ماغ شخص تھا۔ اس کی فلاں فلاں داشتائیں تھیں اور فلاں فلاں اس کے وزیر تھے اور وہ فرانس پر بڑے گھٹیا طریقے سے حکومت کرتا تھا۔ لوئی کے جانشین بھی کمزور لوگ تھے اور ان کا حکومت کرنے کا انداز بھی بڑا شرمناک اور گھٹیا تھا۔ اور ان کے فلاں فلاں چہیتے اور فلاں فلاں داشتائیں تھیں۔ مزید برآں، اس زمانے میں بعض اشخاص کتابیں تحریر کر رہے تھے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر پیرس میں کوئی دو درجن اشخاص اکٹھے ہوئے اور وہ اس قسم کی گفتگو کرنے لگے: تمام انسان آزاد اور برابر ہیں۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرانس کے طول و عرض میں لوگ ایک دوسرے کو تہ تیغ کرنے اور فنا کے گھاٹ اتارنے لگے۔ انھوں نے بادشاہ کو بھی نہ بخشا اور بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح اس کی بھی گردن ماردی۔ اس زمانے میں فرانس میں ایک نابغۂ روزگار شخص — نپولین — موجود تھا۔ اس نے ہر شخص کو اپنا مطیع بنالیا — یوں کہیں کہ چونکہ وہ بہت بڑا عبقری تھا، اس لیے اس نے لوگوں کی بہت بڑی تعداد کو ہلاک کر دیا۔ کسی وجہ سے وہ افریقیوں کا قتل عام کرنے چل پڑا۔ اس نے ان افریقیوں کو اتنی بڑی تعداد میں

قتل کیا اور اس کام میں ایسی ہوشیاری اور چالاکی کا مظاہرہ کیا کہ جب وہ فرانس واپس آیا، اس نے ہر شخص کو حکم دیا کہ وہ اس کی اطاعت کرے اور ہر شخص اس کی اطاعت کرنے لگا۔ اس نے اپنے آپ کو امپراطور بنایا اور ایک بار پھر اطالیہ، آسٹریا اور پرشیا میں لوگوں کو قتل کرنے چل پڑا۔ ان ممالک میں بھی اس نے بے شمار اشخاص کو ہلاک کر دیا۔ ادھر روس میں ایک امپراطور الیکساندر تھا۔ اس نے یورپ میں نظم بحال کرنے کا عزم کر لیا، چنانچہ وہ نپولین کے خلاف برسرِ پیکار ہو گیا۔ لیکن 1807 میں اس نے اچانک نپولین سے دوستی گانٹھ لی تاہم 1811 میں وہ دوبارہ اس سے جھگڑ پڑا۔ اس کے بعد دونوں نے لاتعداد اشخاص کو ہلاک کرنے کا شغل اختیار کر لیا۔ نپولین نے چھ لاکھ نفوس اکٹھے کیے اور روس پر چڑھائی کر دی۔ اس نے ماسکو تسخیر کر لیا لیکن اس کے بعد وہ یک دم ماسکو سے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے فرار کے بعد امپراطور الیکساندر نے شطائن[5] اور دوسرے لوگوں کے مشورے پر یورپ کے امن کے دشمن کے خلاف یورپی ممالک کو متحد کیا۔ نپولین کے تمام اتحادی دیکھتے ہی دیکھتے اس کے دشمن بن گئے اور اس نے جو فرانسیسی افواج مجتمع کی تھیں، وہ ان پر چڑھ دوڑے۔ اتحادیوں نے نپولین پر فتح پائی، پیرس میں داخل ہوئے اور انھوں نے نپولین کو تخت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے اسے جزیرہ ایلبا میں بھیج دیا۔ اور اس حقیقت کے باوجود کہ پانچ سال قبل ہر شخص کہتا تھا (اور ایک سال بعد کہے گا) کہ وہ قزاق اور قانون کا بھگوڑا ہے، انھوں نے اسے امپراطور کے خطاب سے محروم نہ کیا اور اس کے ساتھ پورے عزت و احترام کا برتاؤ کیا۔ تب لوئی ہژدہم[6]، جو اس وقت تک فرانسیسیوں اور اتحادیوں دونوں کے لیے محض نشانۂ تضحیک تھا، حکومت کرنے لگا۔ جہاں تک نپولین کا تعلق ہے، اس نے پہلے تو garde vieille* کے سامنے آنسو بہائے، پھر تخت سے دست برداری کا اعلان کیا اور جلاوطن ہو گیا۔ پھر عیار اور چلتر باز مدبروں اور سفارت کاروں نے (خاص طور پر تالی غاں[7] نے، جو مشہور بازوؤں والی کرسی پر کسی دوسرے سے پہلے بیٹھنے اور اس طرح فرانس کی سرحدوں کی توسیع کرانے میں کامیاب ہو گیا) ویانا میں مذاکرات[8] کا اہتمام کیا اور یوں انھوں نے اقوام کو خوش یا ناخوش کر دیا۔ اچانک بادشاہوں اور سفارت کاروں میں جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ وہ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے کے لیے اپنی اپنی افواج کو حکم دیا ہی چاہتے تھے کہ نپولین ایک بٹالین کی معیت میں فرانس پہنچ گیا اور فرانسیسی، جو ایک منٹ پہلے اس سے نفرت کا اظہار کرتے تھے، بلاتاخیر اس کے سامنے سرنگوں ہو گئے۔ اس پر اتحادی بادشاہ جلال میں آ گئے اور انھوں نے فرانس کے خلاف دوبارہ علمِ جنگ بلند کر دیا۔ انھوں نے نابغۂ روزگار نپولین کو شکست دی، ایکا ایکی اسے قزاق ٹھہرایا اور سینٹ ہیلینا کے جزیرے پر بھیج دیا۔ جلاوطن اپنے وطن عزیز و اقارب اور محبوب فرانس سے دور، بہت دور، اس چٹانی جزیرے پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر گیا اور اپنے عظیم کارناموں کی میراث آئندہ نسلوں کے لیے چھوڑ گیا۔ جہاں تک یورپ کا تعلق ہے، وہاں رجعتِ قہقری کا عمل شروع ہو گیا اور مطلق العنان حکمران ایک بار پھر اپنی اپنی رعایا پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنے لگے۔

---

* old guard نپولین کی شاہی گارد کا نام۔

اگر آپ یہ سمجھیں کہ یہ تاریخی واقعات پر طنزیا ان کا مضحک خاکہ ہے، تو آپ غلطی کریں گے۔ اس کے برعکس یہ ان متضاد جوابات کی، جو سوالات سے نپٹنے اور انھیں صحیح طریقے سے حل کرنے سے قاصر ہیں، نرم و ملائم تلخیص ہے۔ یہ جوابات تمام مورخین کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان مورخین میں سبھی اقسام کے لوگ شامل ہیں: وہ جنھوں نے محض اپنی یادداشتیں سپرد قلم کیں، وہ جو محض انفرادی ممالک کی تاریخ لکھتے ہیں، وہ جو تاریخ کو عالمی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں اور جو اس عہد کی تاریخ "کلچر" کے حوالے سے (یہ تاریخ کی نئی قسم ہے) بیان کرتے ہیں۔

یہ جوابات ہمیں اس لیے عجیب وغریب اور مہمل نظر آتے ہیں کیونکہ جدید تاریخ بہرے آدمی کی طرح ایسے سوالات کے، جو کسی نے اس سے نہیں پوچھے، جوابات دینے پر اصرار کرتی ہے۔

اگر تاریخ کا مقصد بنی نوع انسان اور اقوام کی حرکت، تدریجی ترقی یا ارتقا کی تفصیل بیان کرنا ہے، تو اس ضمن میں جو پہلا سوال۔ اگر اس کا جواب فراہم نہ کیا جائے، پھر باقی سب کچھ ناقابل فہم بن جائے گا۔ پوچھا جانا چاہیے، وہ مندرجہ ذیل ہے:

وہ کون سی قوت ہے جو انسانوں کو متحرک کرتی ہے؟

جدید مورخ بڑا زور لگانے اور خون پسینہ بہانے کے بعد اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ نپولین نابغۂ عظیم تھا، لوئی چہاردہم بہت متکبر تھا یا فلاں اشخاص نے فلاں کتب تحریر کی تھیں۔

ہوسکتا ہے کہ یہ سب کچھ بالکل اسی طرح ہو اور عام آدمی اس سے متفق ہونے کے لیے رضامند ہے، لیکن جو سوال پوچھا گیا تھا، یہ اس کا جواب نہیں ہے۔ یہ سب باتیں بڑی دلچسپ ہوسکتی ہیں بشرطیکہ ہم ایک ایسی الوہی قوت کو، جو اپنے وجود کے لیے کسی کی محتاج نہ ہو، تسلیم کرلیں اور یہ مان لیں کہ وہ نپولین، لوئیوں یا مصنفین کے ذریعے متواتر اقوام کی رہنمائی کررہی ہے۔ لیکن ہم اس قسم کی قوت کو تسلیم نہیں کرتے اور چنانچہ نپولین، لوئیوں اور مصنفین کے متعلق بات کرنے سے پہلے ہمیں ان اشخاص اور اقوام کی حرکت یا تدریجی ترقی کے مابین جو تعلق پایا جاتا ہے، وہ دکھایا جانا چاہیے۔

اگر الوہی قوت کی جگہ کسی دوسری قوت کو دیا جاتا ہے، پھر اس امر کی وضاحت ہونا چاہیے کہ یہ نئی قوت کس چیز پر مشتمل ہے کیونکہ تاریخ کی ساری دلچسپی کا محور یہی قوت ہے۔

تاریخ یہ فرض کرتی معلوم ہوتی ہے کہ یہ قوت عیاں بالذات ہے اور ہر شخص اس سے آگاہ ہے لیکن اسے معلوم سمجھنے کی ہر خواہش کے باوجود ہر وہ شخص، جو متعدد تاریخی تصنیفات کا مطالعہ کرچکا ہو، یہ شک کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آیا اس قوت سے، جس کی ہر مورخ اپنے اپنے انداز سے تفہیم کرتا ہے، ہر کہہ ومہہ واقعی آگاہ ہے؟

2

وہ کون سی قوت ہے جو اقوام کو متحرک کرتی ہے؟

سوانح نگاروں اور انفرادی اقوام کے مورخین کے خیال میں یہ قوت ایسی طاقت ہے جو حکمرانوں اور ہیروؤں میں خلقی طور پر موجود ہوتی ہے اور ان کی ذات کا لاینفک جزو ہوتی ہے۔ ان لوگوں نے جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطابق کوئی واقعہ محض اس لیے ظہور پذیر ہوتا ہے کیونکہ کسی نپولین، کسی الیکساندر یا عموی طور پر ان اشخاص کا، جن کی داستان ہائے حیات وہ قلم بند کر رہے ہوتے ہیں، منشا یہی تھا۔ اس قسم کے مورخین اس سوال کے، کہ وہ کون سی قوت ہے جو واقعات کے منظر عام پر آنے کا موجب بنتی ہے، جو جوابات دیتے ہیں وہ صرف اسی صورت میں تسلی بخش ہو سکتے ہیں جب کسی واقعے کو صرف ایک ہی مورخ نے بیان کیا ہو۔ لیکن جونہی واقعے کو بیان کرنے والے مورخین کی تعداد ایک سے زیادہ ہو جائے، ان کا تعلق بھی مختلف اقوام سے ہو اور ان کے نظریات بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوں، پھر وہ جو جوابات مہیا کریں گے وہ فی الفور معانی سے محروم ہو جائیں گے کیونکہ وہ اس قوت کی تفہیم نہ صرف مختلف بلکہ اکثر ایک دوسرے سے متضاد انداز سے کرتے ہیں۔ ایک مورخ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں واقعہ نپولین کی قوت کے طفیل ظہور پذیر ہوا جب کہ دوسرا اسے الیکساندر کی قوت کا کرشمہ قرار دیتا ہے اور تیسرا اسے کسی تیسرے شخص کی قوت سے منسوب کر دیتا ہے۔ مزید برآں، اس قسم کے مورخین جب اس طاقت کی، جس پر کسی شخص کا اقتدار مبنی ہوتا ہے، وضاحت شروع کرتے ہیں وہ ایک دوسرے کی تردید کرنے لگتے ہیں۔ تیئر[9]، جو بونا پارٹ کا مداح ہے، کہتا ہے کہ نپولین کے اقتدار کی اساس اس کی نکوکاری اور عبقریت تھی۔ اس کے برعکس لاں فے[10] کا، جو ری پبلکن نظریات کا حامی ہے، دعویٰ ہے کہ یہ اس کی منافقت اور اس کی لوگوں کو اُلو بنانے کی مہارت پر مبنی تھا۔ چنانچہ اس قسم کے مورخین باہمی طور پر ایک دوسرے کے نظریات کی ہی بیخ کنی نہیں کرتے، بلکہ اس قوت کے، جو واقعات کو منصۂ شہود پر لانے کا موجب بنتی ہے، تصور کی بھی بیخ کنی کر دیتے ہیں اور تاریخ کے بنیادی سوال کا کوئی جواب فراہم نہیں کرتے۔

وہ مورخین، جو تاریخ کو عالمی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں اور تمام اقوام کا ذکر کرتے ہیں، یہ تسلیم کرتے نظر آتے ہیں کہ اس قوت کے متعلق جو واقعات کی موجب بنتی ہے، متخصص مورخین کے نظریے میں منطقی مغالطہ پایا جاتا ہے۔ وہ اسے ایسی قوت (یا اقتدار)، ان متعدد طاقتوں کا حاصل جمع ہوتی ہے جو مختلف جہتوں میں سرگرم عمل ہوتی ہیں۔ جب عالمی نقطۂ نظر کے حامل مورخین (جنھیں عمومی مورخین کہا جاتا ہے) کسی جنگ کی تفصیلات بیان کرتے ہیں یا یہ بتاتے ہیں کہ فلاں قوم کی گردن میں غلامی کا طوق کیسے پڑا، وہ زیر بحث واقعے کا سبب کسی شخص واحد کے اقتدار (یا طاقت) میں تلاش نہیں کرتے بلکہ یہ دیکھتے ہیں کہ واقعے سے متعلق مختلف اشخاص نے باہمی طور پر ایک دوسرے کے افعال کو کس طرح متاثر کیا اور اسی تعامل میں وہ واقعے کی وجہ کا کھوج لگاتے ہیں۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اس نقطۂ نظر کے مطابق تاریخی شخصیات کی قوت (یا اقتدار) کو، جو بے شمار طاقتوں کا حاصل ضرب ہوتی ہے، ایسی قوت (یا اقتدار) جو فی نفسہٖ واقعات کو جنم دیتی ہو، تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اکثر و بیشتر صورتوں میں ہوتا یہی ہے کہ عمومی مورخین ابھی تک قوت (یا اقتدار) کے تصور کو ایک ایسی طاقت کے طور پر، جو فی نفسہٖ واقعات کو جنم دیتی ہے، تسلیم کیے جا رہے ہیں۔ اور واقعات کے ساتھ اس کا وہی تعلق قائم کیے جا رہے ہیں جو

علت کا معلول سے ہوتا ہے۔ ہم ان مورخین کو ایک لمحے کے دوران میں تو یہ کہتے دیکھتے ہیں کہ تاریخی شخصیت اپنے زمانے کی پیداوار ہوتی ہے اور اس کا اقتدار (یا قوت) مختلف طاقتوں کا ماحصل۔ لیکن اگلے ہی لمحے ان کے نزدیک یہ اقتدار (یا قوت) ایک ایسی طاقت بن جاتی ہے جو فی نفسہٖ واقعات کو جنم دیتی ہے۔ مثلاً گروینس[11]، شلوسر[12] اور دوسرے ایک جگہ تو یہ ثابت کرتے ہیں کہ نپولین انقلاب (فرانس)، 1789 کے افکار، وغیرہ وغیرہ، کی پیداوار تھا اور دوسری جگہ یہ ڈھول پیٹنا شروع کر دیتے ہیں کہ 1812 کی مہم اور بعض دوسرے واقعات جنھیں وہ پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے، محض نپولین کے گمراہ منشا کی پیداوار تھے اور یہ کہ 1789 کے اصل تصورات وافکار نپولین کے سن کی موج کی نذر ہو گئے۔ انقلاب کے تصورات اور اس عہد کے عمومی مزاج نے نپولین کے اقتدار (یا قوت) کو جنم دیا لیکن نپولین کے اقتدار نے انقلاب کے تصورات اور اس عہد کے عمومی مزاج کا گلا گھونٹ دیا۔

یہ عجیب وغریب تناقض اتفاقی واقعہ نہیں ہے۔ اس سے نہ صرف قدم قدم پر ہمارا واسطہ پڑتا ہے بلکہ عمومی مورخین کی کتابیں کی کتابیں ایسے ہی تناقضات کے پورے سلسلے پر مشتمل ہوتی ہیں۔ یہ تناقضات محض اس لیے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ یہ مورخین تجربے کے میدان میں داخل تو ہو جاتے ہیں لیکن آگے بڑھنے کی بجائے بیچ میں رک جاتے ہیں۔

وہ طاقت، جو مختلف طاقتوں کے باہم دیگر اکٹھا ہونے سے وجود میں آتی ہے، اس کے وجود میں آنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ جن اجزائے ترکیبی کے اختلاط کا نتیجہ ہے، ان کا مجموعہ حاصلِ جمع کے برابر ہو۔ عمومی مورخین اس شرط کو کبھی خاطر میں نہیں لاتے۔ نتیجتاً حاصل جمع طاقت کی تشریح کرنے کے لیے وہ ناکافی اجزاء ترکیبی کے علاوہ ایک اور طاقت کو، جس کی وہ کوئی وضاحت نہیں کرتے لیکن جو حاصل جمع کو متاثر کرتی ہے، تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

مختصص مورخین جب 1813 کی مہم یا بوغ بونوں کی حکومت کی بحالی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ لگی لپٹی رکھے بغیر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ الیکساندر کا منشا ان واقعات کے ظہور پذیر ہونے کا سبب بنا۔ لیکن عمومی مورخ گروینس متخصصین کی رائے کی تردید کرتے ہوئے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ 1813 کی مہم اور بوغ بونوں کی حکومت کی بحالی صرف الیکساندر کے منشا کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان میں شٹائن، میٹرنِش[13]، مادام دَسیتل[14]، تالی غاں[15]، فِشٹے[16]، شاتوبغیاں[17] اور دوسرے لوگوں کی سرگرمیوں کا ہاتھ بھی تھا۔ وہ بیّن طور پر الیکساندر کے منشا کو اس کے اجزائے ترکیبی ــ تالی غاں، شاتوبغیاں اور دیگر ــ میں تقسیم کر دیتا ہے لیکن صاف ظاہر ہے کہ ان اجزاء ترکیبی کا ــ شاتوبغیاں، تالی غاں، مادام دَسیتل اور دیگر ــ حاصل جمع یعنی ان کا تعامل مجموعی نتیجے کے، جو لاکھوں فرانسیسیوں کے بوغ بونوں کی اطاعت کی صورت میں ظہور پذیر ہوا، برابر نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ شاتوبغیاں، مادام دَسیتل اور دوسروں نے ایک دوسرے سے بعض الفاظ کہے۔ ان الفاظ نے ان کے باہمی تعلقات کو ضرور متاثر کیا ہو گا لیکن ان سے لاکھوں انسانوں کی اطاعت کی کوئی توضیح نہیں ہوتی۔ چنانچہ اس بات کی وضاحت کرنے کے لیے کہ ان اجزائے ترکیبی کا تعامل لاکھوں لوگوں کی اطاعت کی شکل میں کیسے برآمد ہوا ــ یعنی اجزائے ترکیبی کی طاقتوں نے، جو معینہ مقدار الف کے

برابر ہیں، مجموعی نتیجہ جو ایک ہزار الف کے برابر ہے، کیسے برآمد کیا۔ مورخ اسی طاقت — قوت (یا اقتدار)۔ کا، جس کا وہ ازیں پیشتر انکار کر چکا ہے، سہارا لینے اور اسے طاقتوں کا حاصل جمع تسلیم کر لینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسے یہ ماننا پڑتا ہے کہ ایک ایسی طاقت موجود ہے، جس کی وہ تشریح نہیں کرتا جو حاصل جمع پر اثر انداز ہوتی ہے۔ عمومی مورخین بالکل یہی کچھ کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ نہ صرف متخصص مورخین کی بلکہ خود اپنی بھی تردید کرتے رہتے ہیں۔

دیہاتی لوگ، جنھیں واضح طور پر یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بارش کیوں ہوتی ہے، جب انھیں بارش کی خواہش ہوتی ہے تو وہ یہ کہتے ہیں: ''ہوائیں بادل اڑائے لیے جا رہی ہیں۔'' اور جب انھیں صاف موسم درکار ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں: ''ہوا چل پڑی ہے، لگتا ہے بارش ہوگی۔'' یہی حال عمومی مورخین کا ہے۔ انھیں جب مناسب معلوم ہوتا ہے یا جب یہ بات ان کے نظریات پر منطبق ہو جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اقتدار (یا قوت) واقعات کا نتیجہ ہے، لیکن دوسرے مواقع پر، جب انھیں اس کے برعکس بات کرنا ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ اقتدار (یا قوت) واقعات کو جنم دیتا ہے۔

مورخین کا ایک تیسرا طبقہ ہے۔ یہ کلچر (ثقافت) کے نام نہاد مورخ ہیں۔ وہ عمومی مورخین کے، جو بعض اوقات litterateurs* اور qrandes dames** کو واقعات کو جنم دینے والی طاقتوں کی حیثیت سے تسلیم کر لیتے ہیں، نقش قدم پر چلتے ہوئے اس طاقت کی اور بھی مختلف طریقے سے تشریح کرتے ہیں، انھیں اس چیز میں، جسے کلچر کا نام دیا جاتا ہے، ذہنی فعالیت نظر آتی ہے۔

کلچر کے مورخین کامل استقامت کے ساتھ اپنے مورثین — عمومی تاریخ کے مصنفین — کا تتبع کرتے ہیں کیونکہ اگر تاریخی واقعات کی تشریح اس طرح کی جا سکتی ہے کہ فلاں اور فلاں شخص نے ایک دوسرے کے ساتھ فلاں اور فلاں قسم کا برتاؤ، کیا پھر ان کی تشریح یوں کیوں نہیں ہو سکتی کہ فلاں فلاں اشخاص نے فلاں فلاں کتابیں لکھیں؟ ہر اہم واقعہ کے ساتھ جو لاتعداد نشانیاں وابستہ ہوتی ہیں، ان میں سے یہ مورخین تابع تعقل سرگرمیوں (ذہنی و عقلی فعالیت) کی نشانی منتخب کر لیتے ہیں اور چلا چلا کر اعلان کرنے لگتے ہیں کہ واقعے کا سبب یہی تابع تعقل سرگرمیاں ہیں۔ لیکن ان کی یہ ثابت کرنے کی، کہ واقعات کا سبب لوگوں کی تابع تعقل سرگرمیوں اور قوموں کی سرگرمیوں کے مابین کوئی تعلق موجود ہوتا ہے اور اس بات سے متفق ہونا تو قطعی ناممکن ہے کہ بنی نوع انسان کے افعال تعقلی سرگرمیوں کے تابع رہے ہیں کیونکہ بے شمار واقعات اس مفروضے کی تردید کرتے ہیں (مثلاً انقلاب فرانس کو لیں۔ اس میں جس سنگدلانہ انداز سے انسانی خون بہایا گیا، وہ نظریہ مساوات انسانی کا شاخسانہ تھا۔ پھر لاتعداد ظالمانہ جنگیں لڑیں گئیں یا لوگوں کو پھانسیوں پر چڑھایا گیا اور یہ سب کچھ محبت کا درس دینے کے نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہوا۔)

چلیں، ہم یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ ان مصنفین کی کتابیں جن پُرکارانہ دلائل سے بھری پڑی ہیں، وہ سب درست

---

* مصنفین۔ ادباء

** باوقار یا ٹھسے دار خواتین

ہیں، ہم یہ بھی تسلیم کر لیتے ہیں کہ اقوام پر کسی غیر متعین قوت کا، جسے خیال (idea) کہا جاتا ہے، سکہ چلتا ہے، لیکن تاریخ کے اہم اور بنیادی سوال کا جواب پھر بھی نہیں ملتا، یا پھر بادشاہوں کے اقتدار اور مشیروں اور دوسرے لوگوں کے اثر و رسوخ کے ساتھ ساتھ، جسے سب سے پہلے عمومی مورخین نے موضوعِ بحث بنایا ہے، ہمیں ایک اور نئی طاقت — خیال — کا ذکر کرنا پڑے گا۔ اس نئی طاقت — خیال — کا عوام الناس سے کیا تعلق ہے، یہ بات وضاحت طلب ہے۔ آدمی یہ بات تو سمجھ سکتا ہے کہ چونکہ نپولین کے پاس اقتدار تھا، اس لیے فلاں واقعہ ظہور پذیر ہو گیا۔ کچھ کوشش کے بعد آدمی یہ بات بھی تسلیم کر سکتا ہے کہ نپولین اور بعض دیگر بااثر عوامل مل جل کر کسی واقعے کے پیش آنے کا سبب بنے لیکن ایک کتاب نے، جس کا نام "de Contrat Social"[18] ہے، فرانسیسیوں پر یہ اثر کیسے ڈال دیا کہ وہ ایک دوسرے کے گلے کاٹنے لگے، یہ بات اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اس تعلق کی، جو اس نئی طاقت کا واقعے کے ساتھ اتفاقاً قائم ہو گیا ہے، تشریح نہیں کر دی جاتی۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ان تمام لوگوں کے مابین جو ایک دوسرے کے معاصر ہوتے ہیں، ایک تعلق موجود ہوتا ہے، چنانچہ جس طرح انسانی تحریکوں اور تجارت، صنعت و حرفت، باغبانی یا کسی بھی دوسری چیز کے مابین جس کا آپ نام لینا چاہیں، تعلق تلاش کیا جا سکتا ہے، اسی طرح انسانوں کی تابعِ تعقل سرگرمیوں اور ان کی تاریخی تحریکوں کے مابین بھی کسی نہ کسی نوع کا تعلق دریافت کرنا ممکن ہے، لیکن کلچر کے مورخین کو انسانوں کی تابعِ تعقل سرگرمیاں کیوں پوری تاریخی تحریک کا سبب یا اظہار نظر آتا ہیں، آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ صرف مندرجہ ذیل امور نے انھیں یہ نتیجہ اخذ کرنے پر آمادہ کیا ہوگا:

1- چونکہ تاریخ عالم فاضل اشخاص قلم بند کرتے ہیں، اس لیے ان کے لیے یہ سوچنا بالکل فطری اور خوشگوار بات ہے کہ ان کے طبقے کے لوگوں کی سرگرمیاں انسانی تحریکوں کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہیں۔ اگر تاجر، کسان یا فوجی سپاہی اس قسم کا دعویٰ کریں تو ان کے لیے بھی یہ بات عین فطری اور خوشگوار ہوگی (تاہم وہ یہ دعویٰ جتاتے نہیں ہیں کیونکہ تاجر اور فوجی سپاہی تاریخ کی کتابیں تحریر نہیں کرتے۔)

2- روحانی اشغال، روشن خیالی، تہذیب، کلچر، خیالات و افکار سبھی مبہم اور غیر واضح تصورات ہیں اور ان کی آڑ میں ایسے الفاظ با آسانی استعمال کیے جا سکتے ہیں جن کے مفاہیم اور بھی غیر متعین ہوتے ہیں اور جنھیں یوں کسی بھی نظریے میں بے تامل متعارف کرایا جا سکتا ہے۔

اس سوال کو تو جانے دیں کہ اس قسم کی تاریخ کی کتابوں کی اصلی قدر و قیمت کیا ہے (ممکن ہے کہ بعض لوگوں کے مقاصد کے لیے یہ مفید اور کار آمد ہوں)، کلچر کی تاریخیں، جن کے عمومی تاریخیں زیادہ سے زیادہ قریب آنے کی کوشش کر رہی ہیں، محض اس حقیقت کے پیشِ نظر قابلِ ذکر ہیں کہ وہ واقعات کے اسباب کے طور پر مختلف مذہبی، فلسفیانہ اور سیاسی نظریات کی سنجیدگی اور باریک بینی سے چھان پھٹک تو ضرور کرتی ہیں لیکن انھیں جونہی کسی اصلی تاریخی واقعے (مثلاً 1812 کی مہم) سے واسطہ پڑتا ہے، وہ غیر ارادی طور پر اسے قوت کے استعمال کا نتیجہ قرار دینے

لگتی ہیں — بلکہ صاف صاف کہہ دیتی ہیں کہ یہ مہم نپولین کے منشا کی پیداوار تھی۔ کلچر کے مورخین جب اس قسم کی بات کہتے ہیں، وہ غیر شعوری طور پر اپنی تردید آپ کرنے لگتے ہیں اور وہ یہ ثابت کر دیتے ہیں کہ ان کی وضع کردہ نئی طاقت کسی طرح بھی تاریخی واقعات کی تشریح نہیں کرتی اور یہ کہ تاریخ کی تشریح، صرف اسی قوت کا، جسے وہ بظاہر تسلیم نہیں کرتے، ذکر کر کے ہی ہو سکتی ہے۔

3

ریل کا انجن حرکت کر رہا ہے۔ ایک شخص سوال اٹھاتا ہے: ''اسے کون متحرک کرتا ہے؟'' کسان اس کا جواب دیتا ہے: ''اسے شیطان حرکت دے رہا ہے۔'' دوسرا شخص کہتا ہے: ''یہ اس لیے حرکت کر رہا ہے کیونکہ اس کے پہیے گھوم رہے ہیں۔'' تیسرا دعویٰ کرتا ہے: ''حرکت کا سبب وہ دھواں ہے جسے ہوا اڑائے لیے جا رہی ہے۔''

کسان کو جھٹلانا ممکن نہیں ہے۔ جو شخص اسے جھٹلانا چاہے گا، اسے اس کے سامنے یہ ثابت کرنا پڑے گا کہ شیطان کا کوئی وجود نہیں ہے یا کسی دوسرے کسان کو اسے یہ سمجھانا پڑے گا کہ انجن کو حرکت شیطان نہیں، بلکہ کوئی جرمن دے رہا ہے، صرف تبھی جب انھیں یہ معلوم ہوگا کہ ان کی باتوں میں تضاد ہے، ان پر یہ راز کھلے گا کہ وہ دونوں غلط ہیں۔ لیکن وہ شخص، جو یہ دلیل دیتا ہے کہ انجن اس لیے حرکت کر رہا ہے کیونکہ پہیے گھوم رہے ہیں، وہ اپنی تردید آپ کر رہا ہے، کیونکہ جب ایک مرتبہ اس نے تجزیہ شروع کر دیا، اسے آگے جانا اور یہ بتانا ہوگا کہ پہیے کیوں گھوم رہے ہیں۔ اور جب تک وہ یہ دریافت نہیں کر لیتا کہ انجن کی حرکت کا سبب بائلر میں بھاپ کا دباؤ ہے، اسے سبب دریافت کرنے کی جستجو سے ہاتھ اٹھانے کا کوئی حق حاصل نہیں۔ جو شخص یہ توضیح کرتا ہے کہ انجن کی حرکت کا باعث وہ دھواں ہے جسے ہوا عقبی رخ اڑائے لیے جا رہی ہے، وہ یہ سمجھ گیا ہے کہ پہیوں کا نظریہ مسئلہ حل نہیں کرتا۔ چنانچہ اسے جو پہلی خصوصیت نظر آتی ہے، وہ اسے اپنے ذہن میں بٹھا لیتا ہے اور اپنی باری آنے پر اسے بطور توجیہ پیش کر دیتا ہے۔

انجن کیوں حرکت ہے، اس کی تشریح صرف تبھی ممکن ہے کہ ایک ایسی طاقت کا تصور کیا جائے جو زیر مشاہدہ حرکت سے پوری مناسبت رکھتی ہو۔

قومیں ہمہ وقت متحرک رہتی ہیں، وہ آگے بڑھتی یا پیچھے ہٹتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک ایسی طاقت کا تصور کیا جائے جو قوموں کی پوری حرکت سے مناسبت رکھتی ہو۔

تاہم اس تصور کو پیش کرنے کے لیے مختلف مصنفین ایک دوسری سے بالکل ہی مختلف طاقتوں کا ذکر کرنے لگتے ہیں لیکن وہ جن جن طاقتوں کو اپنی بحث کا موضوع بناتے ہیں، ان کی زیر مشاہدہ تحریک سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی۔ جس طرح کسان کو انجن میں شیطان دکھائی دیتا ہے، اسی طرح بعض مصنفین کو ہیروؤں میں ایک ایسی طاقت نظر آنے لگتی ہے جو انھیں خلقی طور پر ودیعت ہوئی ہوتی ہے۔ کچھ کے نزدیک یہ طاقت پہیوں کی حرکت کی طرح

متعدد دوسری طاقتوں کا حاصل ہوتی ہے، اور بعض کو یہ دھوئیں کی طرح، جسے ہوا اڑائے لیے جا رہی ہے، یہ ذہنی کاوشوں کا اثر معلوم ہوتی ہے۔

جب تک تاریخوں کا موضوع صرف انفرادی اشخاص — وہ سیزر ہوں یا سکندر اعظم، لوتھر ہوں یا والتیر — رہیں گے اور ان تمام — کاملاً تمام کے تمام — لوگوں کو، جو واقعے میں شریک ہوتے ہیں، زیر بحث نہیں لایا جائے گا، اس طاقت کو، جو دوسرے لوگوں کو اپنی سرگرمیوں کا رخ کسی خاص مقصد کے حصول کی طرف موڑنے پر مجبور کرتی ہے، کسی فرد واحد سے منسوب نہ کرنا ناممکن ہے۔ اور اس قسم کا واحد تصور، جس سے مورخین آگاہ ہیں، وہ اقتدار (یا قوت) کا تصور ہے۔

یہ تصور وہ واحد ذریعہ ہے جس کی مدد سے تاریخ کے مواد سے، اس انداز سے جس طرح اس کی فی زمانہ تشریح و تعبیر کی جاتی ہے، نپٹا جا سکتا ہے اور جو شخص، جیسا کہ بکل نے کیا، تاریخی مواد سے عہدہ برآ ہونے کے کسی دوسرے طریقے کو دریافت کیے بغیر اس ذریعے سے منہ موڑ لیتا ہے، وہ اپنے آپ کو اس سے نپٹنے کے واحد طریقے سے محروم کر لیتا ہے۔ تاریخی واقعے کی تشریح کے لیے اقتدار (یا قوت) کے تصور کی ضرورت بہترین انداز سے عمومی تاریخ کے مصنفین اور کلچر کے مورخین خود ثابت کر دیتے ہیں۔ وہ دعویٰ تو اقتدار کے تصور کو مسترد کرنے کا کرتے ہیں لیکن ناگزیر طور پر وہ قدم قدم پر اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

بنی نوع انسان کی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں اب تک تاریخ زر رائج الوقت کی — اس میں کاغذی نوٹ اور دھاتی سکے دونوں شامل ہے — مانند رہی ہے۔ سوانحی اور قومی تواریخ زر کاغذی ہیں۔ جب تک کاغذی نوٹوں کے متعلق یہ سوال نہ اٹھایا جائے کہ ان کے پیچھے ضمانت کیا ہے، وہ چلتے رہتے ہیں، لوگ انھیں قبول کرتے رہتے ہیں اور وہ اپنا مقصد پورا کر جاتے ہیں۔ ان سے کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا بلکہ فائدہ ہی ہوتا ہے۔ یہی حال ان سوانحی اور قومی تواریخ کا ہے۔ ان میں جو نظریات بیان کیے جاتے ہیں، جب تک ان پر انگلی نہیں اٹھائی جائے گی، یہ بکتی رہیں گی، لوگ انھیں پڑھتے رہیں گے اور یہ اپنا مقصد پورا کرتی رہیں گی۔ ان سے کسی کا کچھ بگڑے گا نہیں، فائدہ ہی ہوگا۔ اگر ہم صرف اتنا کریں کہ یہ پوچھنا بھول جائیں کہ ہیروؤں کا منشا واقعات کو کس طرح جنم دیتا ہے، تیئر اور اس کی قبیل کے دیگر مصنفین کی تاریخیں دلچسپ اور سبق آموز ہی معلوم نہیں ہوں گی بلکہ ان میں شعریت کی چاشنی بھی مل جائے گی۔ لیکن جس طرح کاغذی نوٹوں کی صحیح قدر و قیمت کے متعلق اس لیے شکوک ابھرنے لگتے ہیں کیونکہ ان کا بنانا آسان ہے، لہٰذا یہ ضرورت سے زیادہ بنا دیے جاتے ہیں یا پھر اس لیے کیونکہ لوگ انھیں سونے میں تبدیل کرانے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس قسم کی تواریخ کی صحیح قدر و قیمت کے متعلق اس لیے شکوک و شبہات سر اٹھانے لگتے ہیں کیونکہ یہ بہت زیادہ تعداد میں لکھی جاتی ہیں یا کوئی شخص کمال سادگی سے پوچھ بیٹھتا ہے کہ نپولین کو کس طاقت نے یہ کرنے کے قابل بنایا؟ — دوسرے الفاظ میں وہ تفہیم کے مروجہ زر کاغذی کو کھرے سونے میں تبدیل کرانا چاہتا ہے۔

عمومی تواریخ کے مصنفین اور کلچر کے مورخین ان لوگوں کی مانند ہیں جو زر کاغذی کے عیوب کو پیش نظر رکھتے

ہوئے اسے سونے کی نسبت کسی گھٹیا دھات کے سکوں سے تبدیل کرانا چاہتے ہوں۔ اس قسم کے سکے کھنکنا تو سکتے ہیں لیکن اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ زر کاغذی سے ناواقف دھوکا کھا سکتے ہیں لیکن ان گھٹیا دھات کے سکوں سے کسی کو بھی اُلو نہیں بنایا جا سکتا۔ جس طرح سونا صرف تبھی سونا ہے جب اسے محض تبادلہ اشیاء کے لیے استعمال نہ کیا جائے بلکہ اس کا کوئی صحیح مصرف تلاش کیا جائے۔ اسی طرح عمومی مورخین صرف اسی وقت قدر کی نگاہ سے دیکھے جا سکیں گے جب وہ تاریخ کے اس بنیادی اور انتہائی اہم سوال کا جواب فراہم کر دیں گے: قوت (یا اقتدار) کیا ہے؟ عمومی مورخین اس سوال کے متضاد جوابات دیتے ہیں جب کہ کلچر کے مورخین اس سوال کو اٹھا کر پرے پھینک دیتے ہیں اور کسی بالکل ہی مختلف چیز کا جواب دینے لگتے ہیں۔ جس طرح نقلی سونے کے سکے صرف اسی قوم میں مروج ہو سکتے ہیں جس کے افراد اسے سونا ماننے پر تیار ہو جائیں یا پھر ان لوگوں میں ان کا چلن ہو سکتا ہے جو جاہل مطلق ہوتے ہیں اور جنھیں سونے کی ماہیت کا کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسی طرح عمومی مورخین اور کلچر کے مورخین کو، جو تاریخ کے بنیادی سوالات کے جوابات دینے میں ناکام رہتے ہیں، صرف یونیورسٹیوں میں یا ایسے لوگوں میں، جنھیں بقول ان کے اپنے ''سنجیدہ کتب کے مطالعے'' کا شوق ہوتا ہے، مقبولیت حاصل ہو سکتی ہے اور اس طرح وہ اپنے بعض مقاصد حاصل کر سکتے ہیں۔

4

متقدمین کو یقین تھا کہ خدائی مرضی سے کسی قوم کے منشا کو کسی چنیدہ شخص کے تابع بنا دیا جاتا ہے اور اس چنیدہ شخص کی مرضی کو دیوتا یا معبود کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ نے اس نظریے کو تو مسترد کر دیا ہے لیکن جب تک وہ ان دو میں سے ایک چیز کا انتخاب نہیں کرتی، وہ تضاد کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکے گی: یا تو وہ متقدمین کے اس عقیدے کو تسلیم کر لے کہ معبود انسانی معاملات میں دخیل ہوتا ہے، یا پھر وہ اس طاقت کے مفہوم کی جسے قوت یا اقتدار کہا جاتا ہے اور جو تاریخی واقعات کو جنم دیتی ہے، غیر مبہم تشریح کرے۔

متقدمین کے عقیدے کی طرف رجوع کرنا ناممکن ہے کیونکہ اسے پاش پاش کیا جا چکا ہے۔ چنانچہ اقتدار (یا قوت) کا مطلب کیا ہے، اس کی تشریح کرنا ضروری ہو گیا ہے۔

''نپولین نے فوج بھرتی کی اور اسے جنگ کرنے کا حکم دیا۔'' ہم اس بیان سے مانوس ہو چکے ہیں۔ چنانچہ یہ نقطۂ نظر ہمارے اذہان میں اتنا راسخ ہو چکا ہے کہ جب ہم سے یہ سوال پوچھا جاتا ہے: ''نپولین کی زبان سے چند الفاظ نکلنے کے بعد چھ لاکھ انسان جنگ پر کیوں آمادہ ہو گئے؟'' تو وہ ہمیں بے معنی اور احمقانہ معلوم ہونے لگتا ہے۔

''بھئی، اس کے پاس اقتدار تھا، چنانچہ اس نے جو حکم دیا، اس پر عمل ہوا۔'' ہمارا جواب ہوتا ہے۔

اگر ہم یہ یقین کر لیں کہ اقتدار خدا کی دین ہے، پھر یہ جواب تسلی بخش ہو گا۔ لیکن جونہی ہم اسے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں، یہ طے کرنا ضروری ہو جاتا ہے کہ یہ اقتدار، جو ایک شخص کو دوسروں پر حاصل ہوتا ہے، ہے کیا؟

یہ اقتدار کسی قوی آدمی کا کسی کمزور آدمی پر جسمانی غلبہ تو ہو نہیں سکتا۔ ایسا غلبہ، جس کی اساس ہرکولیس[19] کی قوت کی طرح جسمانی طاقت کے استعمال یا استعمال کی دھمکی پر ہوتی ہے۔ اور نہ اس کی اساس اخلاقی قوت کے تغلب پر ہو سکتی ہے، جیسا کہ بعض مورخین، جو یہ کہتے ہیں کہ تاریخ کی سرکردہ شخصیات ہیروؤں کے قالب میں ڈھلی ہوتی ہیں کیونکہ انھیں قلب و دماغ کی غیر معمولی صلاحیت موسوم بہ عبقریت ودیعت ہو چکی ہوتی ہے، اپنی سادگی کی بنا پر سمجھتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس اقتدار (یا قوت) کی اساس اخلاقی طاقت پر نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ نپولین جیسے اشخاص کا، جن کے اخلاقی اوصاف کے بارے میں اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ذکر چھوڑیں، تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ لوئی یاز دہم یا میٹرنش[20] جیسے لوگ بھی، جو اپنے جیسے لاکھوں لوگوں پر حکومت کرتے تھے، کسی خاص اخلاقی اوصاف سے بہرہ ور نہیں تھے، اس کے برعکس عمومی اعتبار سے وہ ان لوگوں سے، جن پر وہ حکومت کرتے تھے، کئی لحاظ سے بہ اعتبار اخلاق کم تر تھے۔

اگر اقتدار کا سرچشمہ اس شخص کے، جو اس کا مالک ہے، نہ جسمانی اور نہ اخلاقی اوصاف میں موجود ہے، پھر یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ اسے کہیں اور۔ اقتدار پر فائز شخص کے عوام الناس کے ساتھ تعلقات میں۔ تلاش کرنا پڑے گا۔

علمِ قانون (Jurisprudence) میں اقتدار کا بالکل یہی مفہوم اخذ کیا جاتا ہے۔ علم قانون تاریخ کا bureau d' echange[21]* ہے اور تاریخ کے تصور اقتدار کو خالص سونے میں تبدیل کرنے کی ذمے داری لیتا ہے۔

اقتدار عوام کا اجتماعی منشا ہے۔ اسے رضا بالاظہار یا رضا بالسکوت کے ذریعے ان کے چنیدہ حکمرانوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے۔

علم قانون کے دائرے میں جو اس بات پر غور و فکر کرتا ہے کہ ریاست اور اس کے اقتدار کی تشکیل کیسے ہونا چاہیے (اگر یہ تشکیل واقعی ممکن ہے)، یہ سب کچھ غیر مبہم طور پر واضح ہے، لیکن اس کا اطلاق اصل تاریخ پر کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اقتدار (قوت) کی تعریف کی وضاحت کر دی جائے۔

ریاست اور اقتدار کے متعلق علم قانون کا انداز فکر وہی ہے جو متقدمین کا آگ کے بارے میں تھا۔ یعنی وہ اسے ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جو مطلقاً موجود ہے لیکن تاریخ کی نگاہوں میں ریاست اور اقتدار بالکل اسی طرح محض مظاہر ہیں جس طرح جدید فزکس کے نزدیک آگ عنصر نہیں بلکہ مظہرہ (phenomenon) ہے۔

تاریخ اور علم قانون کے نقطہ ہائے نگاہ کے اس بنیادی اختلاف سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم قانون ان امور پر تو کہ اس کی رائے میں اقتدار ہے کیا (وہ اسے غیر متغیر اور وقت کی قیود سے آزاد تصور کرتا ہے) اور اس کی تشکیل کیسے ہونا چاہیے، تفصیل سے بحث کرتا ہے لیکن تاریخ جو یہ سوال اٹھاتی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ اقتدار میں جو تبدیلیاں آتی رہتی ہیں، ان کا کیا مفہوم بنتا ہے، وہ اس کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

* بیورو آف ایکس چینج۔ وہ دکان یا ادارہ جو ایک ملک کی کرنسی کو کسی دوسرے ملک کی کرنسی میں تبدیل کرنے کا کام کرتا ہے۔

اگر اقتدار عوام کے اجتماعی منشا کا نام ہے جو ان کے حکمرانوں کو منتقل کر دیا جاتا ہے، تو کیا پوگا چیف عوام کے منشا کا نمائندہ تھا؟ اگر نہیں، پھر نپولین اول کیوں تھا؟ نپولین سوم[22]، جب اسے بولون[23] میں گرفتار کیا گیا، مجرم کیوں تھا؟ اور وہ، جنھیں اس نے بعد میں زندانوں میں ڈالا، مجرم کیوں تھے؟

کیا محلاتی انقلابات — جن میں بعض اوقات صرف دو یا تین اشخاص شریک ہوتے ہیں — لوگوں کا منشا نئے حکمران کو منتقل کر دیتے ہیں؟ کیا بین الاقوامی تعلقات میں عوام الناس کا منشا بھی ان کے فاتح کو منتقل ہو جاتا ہے؟ کیا 1808 میں رائن کی کنفیڈریشن[24] کا منشا نپولین کو منتقل ہو گیا تھا؟ کیا 1809 میں، جب ہماری افواج فرانسیسیوں کے ساتھ مل کر آسٹریا کے خلاف برسرپیکار ہوئی تھیں، روسی عوام کا منشا نپولین کو منتقل ہو گیا تھا؟

ان سوالات کے تین مختلف طریقوں سے جوابات دیے جا سکتے ہیں۔

1- یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عوام کا منشا حکمران یا حکمرانوں کو، جنھیں انھوں نے چنا ہوتا ہے، ہمیشہ غیر مشروط طور پر منتقل ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک مرتبہ جو شخص یا اشخاص برسراقتدار آ گئے، ان کے خلاف ہر نئی قوت کے ظہور اور ان کے خلاف ہر قسم کی جدوجہد کو اصل قوت (برسراقتدار شخص یا اشخاص) کی نافرمانی تصور کیا جائے۔

2- یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عوام کا منشا حکمرانوں کو مشروط طور پر منتقل ہوتا ہے اور یہ شرائط غیر مبہم اور معلوم ہوتی ہیں، اور یہ بتایا جائے کہ حکمرانوں کے اختیارات پر جو قدغنیں لگائی گئی ہیں، یا ان کے ساتھ جو ٹکر لے گئی ہے اور یا ان کے اختیارات ہی کو جو ختم کر دیا گیا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ حکمرانوں نے ان شرائط کو، جن کے تحت انھیں اقتدار منتقل ہوا تھا، پورا نہیں کیا تھا۔

3- یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عوام کا منشا حکمرانوں کو منتقل تو مشروط طور پر ہی ہوتا ہے لیکن شرائط غیر واضح اور مبہم ہوتی ہیں۔ چنانچہ متعدد حکمرانوں کے برسراقتدار آنے، کشمکش میں گرفتار رہنے اور زوال سے دوچار ہونے کی وجہ یہ تھی کیونکہ انھوں نے ان نامعلوم اور غیر واضح شرائط کو، جن کی بنا پر عوام کا منشا دوسروں سے انھیں منتقل ہوا تھا، مکمل طور پر یا جزوی طور پر پورا نہیں کیا تھا۔

یہ ہیں وہ تین طریقے جن کے ذریعے مورخین عوام کے اپنے حکمرانوں کے ساتھ تعلقات کی وضاحت کرتے ہیں۔

بعض مورخین — وہی سوانحی اور تخصیصی مورخین، جن کا ذکر پہلے ہی ہو چکا ہے — جب اپنی سادگی کی وجہ سے اقتدار کے مفہوم کے مسئلے کو سمجھنے میں ناکام ہو جاتے ہیں، یہ یقین کرتے نظر آنے لگتے ہیں کہ عوام کا منشا غیر مشروط طور پر تاریخی شخصیات کو منتقل ہو جاتا ہے اور چنانچہ جب وہ کسی خاص ریاست کو زیر بحث لاتے ہیں، وہ یہ فرض کر لیتے ہیں کہ مخصوص قوت (برسراقتدار شخص یا طبقہ) واحد، مطلق اور حقیقی قوت ہوتی ہے اور جو دوسری طاقت اس کی مخالفت کرتی ہے، وہ قوت نہیں ہے، بلکہ قوت کی نافرمان ہے — محض تشدد ہے۔

ان کا یہ نظریہ تاریخ کے قدیم ترین اور پرامن زمانوں کے حالات بیان کرنے کے لیے تو موزوں ہے، لیکن

اس میں قباحت یہ ہے کہ جب اس کا اطلاق اقوام کی زندگیوں کے پیچیدہ اور طوفانی ادوار پر کیا جاتا ہے جن کے دوران میں مختلف قوتیں بیک وقت ابھرتی اور ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوتی ہیں، تو موروثی بادشاہت کو جائز سمجھنے والا مورخ یہ ثابت کردے گا کہ کونونشن[25]، ڈائرکٹری اور بوناپارٹ قانونی اعتبار سے جائز مقتدرہ کے محض باغی تھے۔ اس کے برعکس وہ مورخ، جو جمہوری تصورات میں یقین رکھتا ہے، یہ استدلال کرے گا کہ کونونشن ہی صحیح معنوں میں اختیارات کی جائز مالک تھی، جب کہ وہ، جو نپولین کا حامی ہے، اس کی امپراطوریہ کو جائز ٹھہرائے گا اور باقی سب کو مقتدرہ کے باغی قرار دے گا۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ مورخین جس نوع کی تاویلیں کرتے ہیں، وہ باہمی طور پر متناقض ہیں۔ وہ بالکل ہی نو عمر بچوں کو تو مطمئن کر سکتی ہیں، کسی اور کو نہیں۔

یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ تاریخ کا یہ نظریہ باطل ہے، مورخین کا ایک طبقہ یہ کہتا ہے کہ اقتدار کی اساس عوام کے منشا کا اپنے حکمرانوں کو مشروط انتقال پر قائم ہوتی ہے اور یہ کہ تاریخی قائدین کو جو اقتدار ملتا ہے، وہ اس شرط پر ملتا ہے کہ وہ اس پروگرام پر عمل کریں گے جو عوام کے منشا نے رضا بالسکوت سے انھیں تجویز کیا ہوتا ہے، مگر یہ مورخین یہ نہیں بتاتے کہ یہ پروگرام کن چیزوں پر مشتمل ہوتا ہے اور جب بتاتے بھی ہیں تو ایک دوسرے کی تردید کرنے لگتے ہیں۔

کسی قوم کی ترقی کی منزل مقصود کس چیز سے متشکل ہوتی ہے، اس کے متعلق ہر مورخ کا اپنا نظریہ ہوتا ہے اور اسی کے مطابق وہ اپنے ذہن میں فرانس یا کسی دوسرے ملک کے شہریوں کی عظمت، ثروت، حریت یا روشن خیالی کے پروگرام کے خاکے کا تصور باندھتا ہے۔ اس پروگرام۔ چلیں، ہم یہ تسلیم کرلیتے ہیں کہ اس قسم کا کوئی عمومی پروگرام موجود ہوتا ہے۔ کی نوعیت کے بارے میں مختلف مورخین کی آراء میں جو تضادات پائے جاتے ہیں، اگر انھیں نظر انداز کر دیا جائے، تو بھی تاریخ کے حقائق تقریباً ہمیشہ ہی اس نظریے کی تردید کرتے نظر آئیں گے۔

اگر شرائط، جن کے تحت اقتدار کی منتقلی عمل میں لائی جاتی ہے، لوگوں کی ثروت، حریت یا روشن خیالی ہیں، پھر یہ کیسے ممکن ہوا کہ لوئی چہاردہم اور ''خوفناک'' ایوان[26] تو اپنے عہدہائے حکومت آرام و سکون سے گزار دیتے ہیں اور کوئی ان کا بال بھی بیکا نہیں کرتا جب کہ لوئی شانزدہم اور چارلس اول[27] کے اپنے ہی عوام ان کے سر کاٹ دیتے ہیں؟ اس سوال کا اس طرح کے مورخین یہ جواب دیتے ہیں کہ لوئی چہاردہم کے افعال کا خمیازہ جو پروگرام کے منافی تھے، لوئی شانزدہم کو بھگتنا پڑا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ لوئی چہاردہم یا لوئی پانزدہم[28] کیوں بچ گئے اور نزلہ لوئی شانزدہم پر ہی کیوں گرا؟ اصل کے بجائے دوسرے حکمرانوں کے خلاف جو اس قسم کا ردعمل ظاہر ہوتا ہے، وہ کن عوامل کی بنا پر ہوتا ہے؟ ان سوالات کے نہ کوئی جوابات ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں۔ پھر یہ نقطۂ نظر اس بات کی بھی کوئی وضاحت نہیں کرتا کہ اجتماعی منشا صدیوں تک بعض حکمرانوں اور ان کے ورثاء کی تحویل میں کیوں رہتا ہے اور پھر ایکا ایکی پچاس سال کے عرصے کے دوران میں یہ باری باری کونونشن، ڈائرکٹری، نپولین، الیکسانڈر اور لوئی شانزدہم اور اس کے بعد دوبارہ نپولین، شارل دہم[29] لوئی فلپ[30]، ری پبلکن حکومت اور نپولین سوم کو کیوں منتقل ہوتا رہتا ہے؟

اس مختصر عرصے کے دوران میں، جب بین الاقوامی تعلقات، فتوحات اور اتحادوں کی وجہ سے صورت حال

بہت پیچیدہ ہوتی جارہی تھی، عوام کا منشا جس تیز رفتاری سے ایک فرد سے دوسرے فرد کو منتقل ہوتا رہا، مورخین جب اس کی تشریح وتفسیر کرنے بیٹھتے ہیں، وہ بادلِ ناخواستہ ہی سہی، بہرحال یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوجاتے ہیں کہ ان میں سے بعض صورتوں میں عوام کا منشا باقاعدہ طریقے سے ان کے حکمرانوں کو منتقل نہیں ہوا۔ بلکہ ان میں سے بعض لوگ کسی سفارت کار، بادشاہ یا پارٹی رہنما کی عیاری، پُرکاری، حماقت یا کمزوری کی وجہ سے محض اتفاقاً حکمران بن گئے۔ چنانچہ یہ مورخین تاریخ کے بیشتر واقعات کو— خانہ جنگیوں، انقلابات، فتوحات— عوام کے منشا کی آزادانہ منتقلی کا نتیجہ قرار نہیں دیتے بلکہ وہ یہ ادعا کرتے ہیں کہ یہ واقعات اس لیے پیش آئے کیونکہ کسی فردِ واحد یا چند افراد کے منشا نے غلط رخ اختیار کرلیا یا بہ الفاظِ دیگر یہ کہا جاسکتا ہے کہ دوسرے لوگوں نے ناجائز طریقوں سے اقتدار پر قبضہ کرلیا۔ چنانچہ ان مورخین کو بھی ایسے واقعات، جو ان کے نظریات پر پورے نہیں اترتے، نظر تو آجاتے ہیں لیکن وہ انھیں مستثنیات قرار دے دیتے ہیں۔

یہ مورخین ان نباتیات کے ماہرین کی مانند ہیں جو یہ مشاہدہ کرنے کے بعد کہ بعض پودوں کے بیج جب پھوٹتے ہیں تو ابتداً دو پتیاں نمودار ہوتی ہیں اور جب یہی دونوں پتیاں بڑھ کر بڑا پودا بنتی ہیں، یہ دعویٰ کرنے لگیں کہ ہر وہ چیز جو اگتی اور نشوونما پاتی ہے، اپنا آغاز دو ہی پتیوں سے کرتی ہے اور جن پودوں— پام، کھمبی، بلکہ اوک بھی، جس کی تناور ہونے کے بعد دو پتیوں سے قطعاً کوئی مشابہت نہیں رہتی— کی شروعات دو پتیوں سے نہیں ہوتی، وہ نظریے سے محض انحراف ہیں۔

تیسرے طبقے کے مورخین یہ اعتراف کرتے ہیں کہ عوام کا منشا مشروط طور پر تاریخی شخصیات کو منتقل ہوتا ہے لیکن یہ شرائط کیا ہوتی ہیں، ہمیں ان کے بارے میں کوئی علم نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تاریخی رہنماؤں کے پاس اقتدار محض اس لیے ہوتا ہے کیونکہ وہ عوام کے منشا کو، جو انھیں منتقل ہوچکا ہوتا ہے، پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں۔

لیکن اگر اس طاقت کی مالک جو عوام کو متحرک کرتی ہے، مالک تاریخی شخصیات نہیں، بلکہ خود عوام ہیں، پھر ان رہنماؤں کی کیا اہمیت رہ جاتی ہے؟

یہ مورخین ہمیں بتاتے ہیں کہ تاریخی شخصیات عوامی منشا کو منعکس کرتی ہیں۔ ان رہنماؤں کی سرگرمیاں عوام کی سرگرمیوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

مگر اس صورتِ حال میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا ان رہنماؤں کی تمام سرگرمیاں عوام کے منشا کے اظہار کا ذریعہ بنتی ہیں یا ان کا محض ایک خاص پہلو یہ کام سرانجام دیتا ہے؟ اگر رہنماؤں کی تمام سرگرمیاں (اعمال وافعال)، جیسا کہ بعض مورخین فرض کرلیتے ہیں، عوام کے منشا کے اظہار کا بذریعہ بنتی ہیں، پھر نپولین اور کیتھرین جیسے حکمرانوں کی زندگیوں کے بارے میں کتابیں ان کے درباروں کے سیکنڈلوں کی جن چھوٹی سے چھوٹی تفصیلات سے پر ہیں، انھیں قوم کی سرگرمیوں کا اظہار کہنا چاہیے، جو صاف ظاہر ہے کہ بالکل لغو بات ہے۔ لیکن اگر، جیسا کہ بعض نام نہاد فلسفی مورخین یقین سے دعویٰ کرتے ہیں، تاریخی شخصیات کی سرگرمیوں کا کوئی پہلو ہی عوام کی زندگی کو منعکس

کرتا ہے، پھر سب سے پہلے ہمیں یہ معلوم کرنا پڑے گا کہ قوم کی زندگی کس چیز پر مشتمل ہوتی ہے۔

اس طبقے کے مورخین کو جب اس مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، وہ حتیٰ الامکان زیادہ سے زیادہ واقعات کا احاطہ کرنے کے لیے انتہائی مُغلق، غیر مرئی اور تعمیمی تجرید وضع کر لیتے ہیں اور پھر اس تجرید کو انسانی نقل و حرکت کا مقصد قرار دے دیتے ہیں۔ انتہائی عام تعمیمات، جنھیں تقریباً سارے مورخین اختیار کر لیتے ہیں، یہ ہیں: حریت، مساوات، روشن خیالی، ترقی، تہذیب اور ثقافت۔ اس قسم کی کسی تعمیم کو گھڑ کر اور اسے بنی نوع انسان کی سرگرمیوں کا مقصد قرار دے کر مورخین ان اشخاص کا — بادشاہان، وزرا، جرنیلوں، مصنفین، مصلحین، پوپ، صحافیوں — جنھوں نے اپنے پیچھے سب سے زیادہ یادگاریں چھوڑی ہوتی ہیں، اس نقطۂ نظر سے مطالعہ شروع کر دیتے ہیں کہ ان کے خیال کے مطابق ان شخصیات نے زیر بحث تجرید کو آگے بڑھانے یا اس کی راہ میں روڑے اٹکانے میں کس حد تک موثر کردار ادا کیا۔ لیکن چونکہ یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ بنی نوع انسان کا نصب العین حریت، مساوات، روشن خیالی یا تہذیب و ثقافت ہے، اور چونکہ حاکموں اور بنی آدم کو روشن خیالی اور تہذیب کی راہ دکھانے کے دعوے داروں کے ساتھ عوام کا رشتہ محض اس متنازعہ فیہ مفروضے پر مبنی ہے کہ عوام کا اجتماعی منشا ہمیشہ ان اشخاص کو، جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب رہتے ہیں، منتقل ہوتا رہتا ہے، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ ان لاکھوں انسانوں کی سرگرمیوں کو جو ترکِ سکونت کر کے ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے رہتے ہیں، مکانوں کو نذر آتش کرتے ہیں، کاشتکاری سے منہ موڑ لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو بے دردی سے موت کے گھاٹ اتارتے ہیں، ان دس بارہ اشخاص کی، جو مکانوں کو آگ نہیں لگاتے، جنھیں قلبہ رانی سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور نہ جن کا قتل و غارت سے کوئی تعلق بنتا ہے، سوانح حیات میں کوئی جگہ نہیں دی جاتی۔

تاریخ اسے ہر موڑ پر ثابت کرتی ہے۔ اٹھارویں صدی کے اختتام پر مغربی اقوام جس بے چینی کا شکار ہوئیں اور انھوں نے جانب مشرق جو کوچ شروع کیا، کیا اسے لوئی چہاردہم، پانزدہم، شانزدہم، ان کی داشتاؤں اور وزیروں کی سرگرمیوں، یا نپولین، روسو، دِدِرو،[31] بوماغ شائی[32] اور دوسروں کی زندگیوں کی تفصیل بتا کر بیان کیا جا سکتا ہے؟

کیا روسی عوام کی قازان اور سائبیریا کی جانب نقل و حرکت کی تشریح خوف ناک ایوان کی مریضانہ ذہنیت اور اس کی کربسکی[33] کے ساتھ خط کتابت سے ہو جاتی ہے؟

صلیبی جنگوں کے دوران میں یورپی لوگوں نے مشرق کی طرف جو کوچ کیا، کیا اس کی تشریح گودفئے[34] اور اس کی قبیل کے دوسرے لوگوں، لوئیوں اور ان کی داشتاؤں کی زندگیوں اور سرگرمیوں کے بیان سے ہو جاتی ہے؟ کسی مقصد اور کسی قیادت کے بغیر آوارہ گردوں اور پطرس راہب[35] کی معیت میں اقوام نے مغرب سے مشرق کی جانب جو سفر کیا، وہ ہمارے لیے ابھی تک ناقابل فہم ہے۔ اور یہ بات تو بالکل ہی سمجھ میں نہیں آتی کہ جب تاریخی شخصیات اس نقل و حرکت کا عقلی اور مذہبی مقصد — یروشلم کی آزادی — واضح طور پر بیان کر چکی تھیں، اسے ختم کیوں کر دیا گیا۔ پوپ، بادشاہ اور فوجی مہم جُو سبھی مختلف اقوام کے باشندوں پر زور دے رہے تھے کہ انھیں مقدس سرزمین کو آزاد کرانے

کے لیے کمرہمت باندھ لینا چاہیے لیکن لوگ تھے کہ کانوں کو ہاتھ لگا رہے تھے کیونکہ وہ نامعلوم وجہ، جس نے انھیں ادھر جانے کی ترغیب دی تھی، اب موجود نہیں رہی تھی۔ مورخین نے گودفغے اور منے سنگروں[36] کی داستانیں تو رقم کر دی ہیں لیکن یہ انھیں لوگوں کی داستانیں ہیں، جہاں تک عوام الناس کی زندگی اور عزائم کا تعلق ہے، ان کا کچھ پتا نہیں چلتا۔

مصنفین اور مصلحین کی سوانح ہائے حیات تو اقوام کی زندگی پر اور بھی کم روشنی ڈالتی ہیں۔

کلچر کی تاریخ ہمیں کسی مصنف یا مصلح کے مہیجات، اس کے حالاتِ زندگی اور خیالات سے آگاہ کرتی ہے۔ ہمیں یہ تو معلوم ہوجاتا ہے کہ لوتھر[37] گرم مزاج تھا اور اس نے یہ اور یہ بات کہی، روسو کسی پر اعتماد نہیں کرتا تھا اور اس نے فلاں اور فلاں کتاب لکھی لیکن ہمیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تحریکِ اصلاحِ مذہب کے بعد لوگوں نے ایک دوسرے کا قتل عام کیوں کیا یا انھوں نے انقلابِ فرانس کے دوران میں ایک دوسرے کو گلوٹین پر کیوں چڑھایا۔

اگر ہم دونوں اقسام کی تاریخوں کو یک جا کردیں جیسا کہ جدید ترین مورخین کرتے ہیں، ہمیں حکمرانوں اور قلم کاروں کی تاریخیں تو مل جائیں گی لیکن عوام کی زندگیوں کی تاریخ پھر بھی ہاتھ نہیں آئے گی۔

5

اقوام کی زندگی معدودے چند اشخاص کی زندگیوں میں شامل نہیں ہوتی کیونکہ ان اشخاص اور اقوام کے مابین تعلق دریافت نہیں کیا جاسکا۔ یہ نظریہ کہ یہ تعلق کسی قوم کے اجتماعی منشا کی خاص تاریخی شخصیات کو منتقلی پر مبنی ہے، ایسا مفروضہ ہے جسے تاریخ کی شہادت سے ثابت نہیں کیا جاسکا۔

عوام الناس کے اجتماعی منشا کی تاریخی شخصیات کو منتقلی کا نظریہ علم قانون کے دائرے میں تو شاید بہت کچھ واضح کرسکے اور شاید اس کے مقاصد کے لیے ضروری ہے، لیکن جونہی انقلابات، فتوحات یا خانہ جنگیوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے—یعنی جب تاریخ کی ابتدا ہوتی ہے، تاریخ پر اس کا اطلاق کرنے سے کسی چیز کی وضاحت نہیں ہوتی۔

یہ نظریہ محض اس لیے ناقابل تردید معلوم ہوتا ہے کیونکہ عوام الناس کے منشا کی منتقلی کے عمل کی تصدیق نہیں ہوسکتی اور تصدیق اس لیے نہیں ہوسکتی کیونکہ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔

اس امر سے قطع نظر کہ واقعے کی نوعیت کیا ہے اور اس کے وقوع پذیر ہونے میں کس کا ہاتھ ہے، یہ نظریہ ہمیشہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ اس واقعے میں قیادت فلاں شخص نے کی تھی کیونکہ اجتماعی منشا اسے تفویض ہوچکا تھا۔

یہ نظریہ تاریخ کے سوالات کے جوابات دیتا ہے، وہ اس شخص کے جوابات سے ملتے جلتے ہیں جو مویشیوں کے ریوڑ کی حرکات کا مشاہدہ کرنے کے بعد لیکن چراگاہ کے مختلف حصوں میں گھاس کی کمی بیشی یا گلہ بان کے ہنکارے کی طرف دھیان دیے بغیر یہ فیصلہ صادر کردے کہ مویشی جس سمت میں جارہے ہیں، اس لیے جارہے ہیں کیونکہ جو مویشی اتفاق سے ان سب کے آگے ہے، وہ ادھر جارہا ہے۔

''ریوڑ اس لیے اس سمت میں جارہا ہے کیونکہ جو مویشی سب سے آگے ہے اور ان کی قیادت کررہا ہے، وہ انھیں ادھر لیے جارہا ہے اور دوسرے تمام مویشیوں کا اجتماعی منشا اس رہنما کی تحویل میں آچکا ہے۔'' اس قسم کا جواب پہلے زمرے کے مورخین دیتے ہیں وہی جو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اقتدار کی منتقلی غیر مشروط ہوتی ہے۔

''اگر ریوڑ کی قیادت کرنے والے مویشی تبدیل ہوجاتے ہیں، تو ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ تمام مویشی یہ دیکھنے کے بعد کہ ان کا رہنما اس سمت میں، جو پورے ریوڑ نے مل کر منتخب کی ہوتی ہے، لے جارہا ہے یا نہیں، اپنا اجتماعی منشا ایک رہنما سے دوسرے رہنما کو منتقل کردیتے ہیں۔'' یہ جواب ان مورخین کا ہوتا ہے جو یہ فرض کر لیتے ہیں کہ عوام الناس کا اجتماعی منشا چند شرائط کے تحت، جنھیں وہ معلوم تصور کر لیتے ہیں، حکمرانوں کو تفویض ہوچکا ہوتا ہے۔ (مشاہدے کے اس طریقے میں اکثر ہوتا یہ ہے کہ مشاہد اس سمت سے، جسے وہ خود ترجیح دیتا ہے، متاثر ہو کر ان اشخاص کو رہنما سمجھ بیٹھتا ہے جو عوام الناس کے سمت تبدیل کرنے کی وجہ سے اب آگے نہیں رہتے بلکہ کسی پہلو پر یا بعض اوقات عقب میں بھی، نظر آنے لگتے ہیں۔)

''اگر اگلے مویشی مسلسل تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور سارے ریوڑ کی سمت پیہم تغیر سے دوچار ہوتی رہتی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ کسی معین سمت میں جانے کے لیے ریوڑ نے اپنا منشا ان مویشیوں کے سپرد کردیا ہوتا ہے جو ہماری توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں اور یہ دیکھنے کے لیے کہ ریوڑ کس سمت میں جارہا ہے، ہمیں ان تمام مویشیوں کی، جو ریوڑ کے چاروں اطراف چلتے نظر آتے ہیں، نقل و حرکت کا جائزہ لینا ہوگا۔'' یہ ادعا تیسرے زمرے کے مورخین کا ہے جو بادشاہوں سے لے کر صحافیوں تک تمام تاریخی کرداروں کو اپنے زمانے کے ترجمان سمجھ لیتے ہیں۔

عوام الناس کے منشا کی منتقلی کا نظریہ محض الفاظ کا ہیر پھیر ہے — یعنی سوال کو دوسرا جامہ پہنا دیا گیا ہے۔

تاریخی واقعات کا موجب کون ہوتا ہے؟ قوت (یا اقتدار)۔

اقتدار کیا ہے؟ اقتدار عوام الناس کے اجتماعی منشا کا نام ہے جو فرد واحد کو تفویض کردیا جاتا ہے۔

عوام الناس کا منشا کس شرط پر فرد واحد کو منتقل ہوتا ہے؟ اس شرط پر کہ وہ شخص مجموعی طور پر تمام لوگوں کے منشا کا اظہار کرے۔

یعنی اقتدار اقتدار ہے — یعنی اقتدار ایک ایسا لفظ ہے جس کے معانی ہمیں معلوم نہیں۔

❖

اگر انسانی علم کا دائرہ تجریدی سوچ بچار تک محدود ہوتا، پھر علم قانون اقتدار (قوت) کی جو توضیح کرتا ہے، اس کو تنقید کی کسوٹی پر پرکھنے کے بعد بنی نوع انسان اس نتیجے پر پہنچ جاتے کہ اقتدار محض ایک لفظ ہے اور حقیقتاً اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن واقعات کو جانچنے پرکھنے اور سمجھنے کے لیے انسان کے پاس تجریدی استدلال کے علاوہ ایک اور اوزار — تجربہ (experience) — ہے۔ اس کی وساطت سے وہ اپنے غور و فکر کے نتائج کی تصدیق کرسکتا ہے۔ اور

تجربہ ہمیں بتاتا ہے کہ اقتدار خالی خولی لفظ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی چیز ہے جو حقیقتاً موجود ہوتی ہے اور سب کو نظر آتی رہتی ہے۔

اس حقیقت کا تو ذکر ہی کیا کہ انسانوں کی کسی بھی اجتماعی سرگرمی کے ذکر میں اقتدار کا تصور لازماً بیان ہوگا، تاریخ اور معاصر واقعات کے مشاہدے دونوں سے اقتدار کا وجود ثابت ہوتا ہے۔

جب کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے، ایک شخص یا چند اشخاص منظر عام پر نمودار ہو جاتے ہیں۔ بظاہر یہی نظر آتا ہے کہ واقعہ انھیں کے منشا کے طفیل ظہور پذیر ہوا ہے۔ نپولین سوم فرمان جاری کرتا ہے اور فرانسیسی عازمِ میکسیکو[38] ہو جاتے ہیں۔ پرشیا کا بادشاہ اور بسمارک[39] احکام جاری کرتے ہیں اور فوج بوہیمیا[40] میں داخل ہو جاتی ہے۔ نپولین حکم دیتا ہے اور فوج روس میں گھس جاتی ہے۔ الیکساندر اول حکم دیتا ہے اور فرانسیسی بوربونوں کی اطاعت قبول کر لیتے ہیں۔ تجربہ ہمیں سکھاتا ہے کہ جب کبھی کوئی واقعہ پیش آتا ہے، اسے ہمیشہ کسی فرد واحد یا متعدد افراد کے منشاء، جنھوں نے فرمان جاری کیا ہوتا ہے کہ ایسا ہونا چاہیے۔ منسلک کر دیا جاتا ہے۔

مورخین انسانی امور میں الوہی مداخلت کو تسلیم کرنے کی اپنی پرانی عادت کے مطابق واقعے کا سبب کسی شخص کی مرضی کے اظہار جسے اقتدار ودیعت ہوا ہوتا ہے، میں تلاش کرنے لگتے ہیں لیکن اس مفروضے کی تصدیق نہ عقل سے ہوتی ہے اور نہ تجربے سے۔

ایک طرف غور وفکر (عقل) سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آدمی اپنے جس منشا کا۔ اس کے الفاظ۔ اظہار کرتا ہے محض جزو ہے اور چنانچہ کسی ناقابل تفہیم اور مافوق الفطرت طاقت۔ معجزے۔ کو فرض کیے بغیر یہ تسلیم کرنا ناممکن ہو جاتا ہے کہ الفاظ لاکھوں اشخاص کی نقل وحرکت کا فوری سبب بن سکتے ہیں۔ دوسری طرف اگر ہم یہ تسلیم کر بھی لیں کہ الفاظ واقعات کا سبب بن سکتے ہیں، تاریخ ثابت کرتی ہے کہ تاریخی شخصیات کے منشا کے اظہار سے بیشتر صورتوں میں کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوتا یعنی ان کے احکام کو اکثر عملی جامہ نہیں پہنایا جاتا اور بعض اوقات تو وہ جس چیز کا حکم دیتے ہیں، اس کے بالکل برعکس ظہور پذیر ہوتا ہے۔

انسانی معاملات میں الوہی مداخلت کو تسلیم کیے بغیر ہم قوت (یا اقتدار) کو واقعات کا سبب تسلیم نہیں کر سکتے۔

تجربے کے نقطۂ نگاہ سے اقتدار محض وہ تعلق ہے جو کسی شخص کے منشا کے اظہار اور دوسروں کے ذریعے اس منشا کی تکمیل کے مابین موجود ہوتا ہے۔

اس تعلق کی شرائط کی تصریح کرنے سے پہلے ہمیں معبود کے نہیں بلکہ انسان کے حوالے سے منشا کے اظہار کا تصور قائم کرنا پڑے گا۔

اگر احکام دینے اور اپنی منشا (مشیت) کا اظہار کرنے والا معبود ہے (جیسا کہ پرانے مکتبۂ فکر کی تاریخ ہمیں یقین دلاتی رہتی ہے)، پھر یہ مشیت اپنے اظہار کے لیے کبھی وقت (زمان) کی محتاج نہیں ہو سکتی اور نہ کوئی زمانی یا دنیوی چیز اس کے اظہار کا سبب بن سکتی ہے کیونکہ معبود پر واقعے کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ لیکن جب ہم ان احکام کا،

جو انسانوں کے منشا کا۔ جنھیں وقت کے اندر کام کرنا پڑتا ہے اور جنھیں ایک دوسرے سے ربط وضبط رکھنا پڑتا ہے۔ اظہار ہوتے ہیں، ذکر کرتے ہیں، تو ہم اگر احکام کا واقعات کے ساتھ تعلق سمجھنا چاہتے ہیں، تو ہمیں دو شرائط کو پھر سے لاگو کرنا ہوگا: 1- جو واقعات پیش آتے ہیں اور جو شخص احکام دیتا ہے، ان دونوں کا وقت کے ساتھ غیر مقطوع تعلق ہوتا ہے۔ یہ وہ شرط ہے۔ جس کی ہر وہ چیز، جو وقوع پذیر ہوتی ہے، تابع ہوتی ہے۔ (دوسرے الفاظ میں کوئی چیز وقت سے آزاد نہیں ہو سکتی۔) 2-اس شخص کے، جو احکام دیتا ہے اور ان اشخاص کے مابین، جو اس کے احکام کو عملی جامہ پہناتے ہیں، ناگزیر تعلق ہوتا ہے۔

6

صرف معبود کی، جو وقت کا تابع نہیں ہوتا، مشیت کے اظہار کی واقعات کے پورے سلسلے سے، جو سالوں یا صدیوں پر محیط ہوتا ہے، کوئی نسبت ہو سکتی ہے، اور صرف معبود ہی، جو کسی کا محتاج نہیں ہوتا، اپنی مشیت واحدہ کے ذریعے انسانوں کی حرکت کی سمت کا تعین کر سکتا ہے۔ رہا انسان، وہ وقت کے تابع ہوتا ہے اور بذات خود واقعے میں شریک ہوتا ہے۔

جب ہم پہلی شرط کو۔ جس کا تعلق وقت ہے۔ جسے پہلے نظر انداز کر دیا گیا تھا، دوبارہ لاگو کرتے ہیں، تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی سابقہ حکم کے بغیر کسی بھی نئے حکم کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔ یہ سابقہ حکم ہی آخری حکم کی تعمیل کو ممکن بناتا ہے۔

کوئی حکم فی البدیہہ منظر عام پر نہیں آتا (اس کے لیے کسی خارجی مُہیّج کا ہونا ضروری ہے) اور نہ یہ واقعات کے پورے سلسلے پر حاوی ہوتا ہے۔ ہر حکم کسی دوسرے حکم کا شاخسانہ ہوتا ہے، یہ واقعات کے پورے سلسلے کا احاطہ نہیں کرتا بلکہ اس کا تعلق کسی واقعے کے محض ایک لمحے سے ہوتا ہے۔

مثلاً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نپولین نے افواج کو جنگ شروع کرنے کا حکم دے دیا، تو ہم یکے بعد دیگرے دیے جانے والے احکام کے، جن کا ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق تھا، پورے سلسلے کو ایک ہی جملے میں سمو دیتے ہیں۔ نپولین روس پر حملے کی کمان نہیں کر سکتا تھا اور نہ اس نے کی۔ ایک روز اس نے حکم دیا کہ فلاں فلاں مراسلے تحریر کیے جائیں اور انھیں ویانا، برلن اور پیٹرز برگ بھیج دیا جائے۔ اگلے روز اس نے بعض فرمان اور احکام بری اور بحری افواج اور محکمہ رسد کو بھجوانے کا اہتمام کیا۔ یوں یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ ان احکام کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی اور ان کا یہ سلسلہ واقعات کے اس سلسلے کے، جو فرانسیسی فوجوں کی روس پر چڑھائی پر ختم ہوا، عین مطابق تھا۔

نپولین اپنے سارے عہد حکومت کے دوران میں انگلستان پر حملہ کرنے کے سلسلے میں احکام جاری کرتا رہا اور وہ اس مہم کی تیاری پر جتنا وقت اور کوشش صرف کرتا رہا، اتنا اس نے کسی اور مہم پر نہیں کیا تھا، لیکن اپنے پورے عہد حکومت میں اس نے ایک مرتبہ بھی اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی کوئی سعی نہ کی، اس کی بجائے اس نے

روس پر حملہ کر دیا حالانکہ روس وہ ملک تھا جس کے ساتھ اتحاد میں منسلک ہونے کو وہ سودمند قرار دیتا تھا (اپنے اس یقین کا وہ بار بار اعادہ کرتا رہا)۔ اگر اس نے انگلستان پر حملہ نہیں کیا اور محض روس کو اپنا نشانہ بنانے پر اکتفا کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ پہلی صورت میں اس کے احکام کی رفتار اور واقعات کی رفتار میں کوئی مطابقت نہیں تھی جب کہ دوسری صورت میں تھی۔

حکم کی تعمیل یقینی بنانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ حکم وہ دیا جائے جس کو عملی جامہ پہنانا ممکن ہو۔ لیکن یہ جاننا ناممکن ہے کہ کس حکم پر عمل درآمد کرایا جا سکتا ہے اور کس پر نہیں۔ یہ بات نہ صرف نپولین کے روس پر حملے کے، جس میں لاکھوں افراد نے حصہ لیا، بارے میں صحیح ہے بلکہ انتہائی سادہ اور غیر پیچیدہ واقعے پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ دونوں صورتوں میں لاکھوں رکاوٹیں پیدا ہو سکتی ہیں جو حکم کی تعمیل میں مزاحم ہو سکتی ہیں۔ ہر حکم، جس کی تعمیل ہوتی ہے، ان لاتعداد احکام میں سے، جو بلا تعمیل رہ جاتے ہیں، ایک ہوتا ہے۔ تمام ناممکن العمل احکام کی واقعات کی رفتار سے کوئی مطابقت نہیں ہوتی اور یوں ان کی تعمیل نہیں ہو پاتی۔ صرف قابل عمل احکام آپس میں مل کر یکے بعد دیگرے احکام کا سلسلہ بنتے ہیں اور چونکہ وہ واقعات کی رفتار کے مطابق ہوتے ہیں، اس لیے ان پر عمل بھی ہو جاتا ہے۔

ہم غلط طور پر جو یہ تصور کر لیتے ہیں کہ واقعے کا سبب وہ حکم ہوتا ہے جو اس کے وقوع پذیر ہونے سے پیشتر دیا جاتا ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی واقعہ ظہور پذیر ہو جاتا ہے، تو ہم ان ہزاروں احکام میں سے، جو واقعے سے پیشتر جاری ہوتے ہیں، چند ایک کو جو واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں اور جن پر عمل ہو چکا ہوتا ہے، اپنی توجہ کا مرکز بنا لیتے ہیں اور دوسروں کو، جن پر عمل نہیں ہو پاتا کیونکہ ان پر عمل ہو ہی نہیں سکتا تھا، فراموش کر دیتے ہیں۔ علاوہ ازیں اس معاملے میں ہماری غلطی کا بڑا باعث یہ حقیقت ہے کہ واقعات تو لاتعداد پیش آتے ہیں، ان میں کوئی چھوٹا ہوتا ہے اور کوئی بڑا، اور یہ ہوتے بھی متنوع (جب فرانسیسی فوجیوں نے روس پر یلغار کی تھی تو یہی کچھ ہوا تھا)، مگر جب ہم تاریخ رقم کرنے بیٹھتے ہیں، ہم ان واقعات کے پورے سلسلے کی اس نتیجے کے مطابق، جو انھوں نے پیدا کیا ہوتا ہے، تعمیم کر کے واحد واقعے میں ڈھال دیتے ہیں اور اس سے ملتی جلتی تعمیم کر کے احکام کے پورے سلسلے کو یوں یک جا کر دیتے ہیں کہ وہ منشا کا واحد اظہار بن جاتے ہیں۔

ہم کہتے ہیں کہ نپولین روس پر حملہ کرنا چاہتا تھا اور اس نے یہ حملہ کر دیا۔ تاہم اصل حقیقت یہ ہے کہ نپولین جو کچھ کرتا کراتا رہا، ہمیں اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس کی اس خواہش کے اظہار سے ذرا بھی مشابہ ہو۔ ہمیں جو کچھ معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ وہ یا تو انتہائی مختلف النوع اور غیر واضح احکام دیتا رہا یا پھر اپنے منشا کا مبہم انداز سے اظہار کرتا رہا۔ اس کے جن احکام پر عمل نہ ہو سکا، وہ لاتعداد سلسلوں پر مشتمل ہیں اور احکام کے جس واحد سلسلے کو، جس کا تعلق 1812 کی مہم سے ہے، عملی جامہ پہنایا جا سکا، اسے بھی جو عملی جامہ پہنایا گیا، وہ اس لیے نہیں تھا کہ یہ احکام دوسرے احکام سے، جن کی تعمیل نہ ہو سکی، کسی لحاظ سے مختلف تھے بلکہ اس لیے کیونکہ احکام کا یہ خاص سلسلہ ان واقعات کے، جو فرانسیسیوں کے روس میں داخل کا باعث بنے، سلسلے کے عین مطابق تھا۔ یہ بالکل ایسے ہی تھا جیسے نقش ساز

تختی (stencil) کی مدد سے نقوش یا حروف چھاپنے کے کام میں ہوتا ہے۔ تختی حروف یا نقوش اس لیے نہیں چھاپتی کہ رنگ اس کے اس یا اس رخ پر یا کسی خاص طریقے سے لگایا جاتا ہے بلکہ اس لیے کیونکہ تختی پر جو نقوش یا حروف کھدے ہوتے ہیں، ان پر رنگ اچھی طرح بھر دیا جاتا ہے۔

چنانچہ جب ہم وقت کے اندر واقعات کے ساتھ احکام کے تعلق کا جائزہ لیتے ہیں، ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حکم کسی صورت میں بھی کسی واقعے کا سبب نہیں بنتا۔ حکم اور واقعہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم ہیں، اگر ایک عدم موجود ہو، دوسرے کا بھی کوئی وجود نہیں ہوسکتا۔

یہ باہمی انحصار کیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر وہ حکم، جو معبود نہیں بلکہ انسان دیتا ہے، جن دو شرائط کے تابع ہے، ان میں دوسری شرط بحال کردی جائے۔ یعنی یہ تسلیم کرلیا جائے کہ جو آدمی حکم جاری کرتا ہے، وہ واقعے میں لازماً شریک ہوتا ہے۔

کمانڈر کا ان اشخاص کے ساتھ عین مین یہی وہ تعلق ہے، جو "اقتدار" (یا "قوت") کہلاتا ہے۔ اس تعلق کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:

مشترکہ کارروائی کے لیے انسان ہمیشہ خاص نوعیت کے گروہ بنالیتے ہیں۔ مشترکہ کارروائی کے مقاصد کیا ہونا چاہئیں، اس بارے میں اختلافات ہوسکتے ہیں لیکن کارروائی میں حصہ لینے والوں کا باہمی تعلق ہمیشہ جوں کا توں رہتا ہے، اس میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔

مشترکہ کارروائی کے لیے جو لوگ گروہ بناتے ہیں، ان کے مابین کچھ اس قسم کا تعلق استوار ہوجاتا ہے کہ اکثریت تو کارروائی میں براہ راست شریک ہوتی ہے لیکن اقلیت کا کردار اتنا براہ راست نہیں ہوتا۔

ان تمام گروہوں میں، جو لوگ مشترکہ کارروائی کے لیے تشکیل کرتے ہیں، نمایاں ترین اور واضح ترین مثال فوج پیش کرتی ہے۔

ہر فوج مختلف مراتب کے حامل اشخاص پر مشتمل ہوتی ہے۔ سب سے زیادہ تعداد ادنیٰ ترین رتبے کے ملازمین — عام سپاہیوں — کی ہوتی ہے۔ ان کے بعد ان سے رتبے کے اعتبار سے قدرے بلند لوگ — کارپورل اور نان کمشنڈ افسر — آتے ہیں اور ان کی تعداد اول الذکر کے مقابلے میں خاصی کم ہوتی ہے۔ ان سے بھی اونچے افسر تعداد میں اور بھی کم ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ چلتے چلتے اعلیٰ ترین عسکری کمان تک پہنچ جاتا ہے اور یہ صرف ایک شخص میں مرکوز ہوتی ہے۔

فوجی تنظیم کا صحیح طور پر مخروطے (cone) سے موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ اس کا زیریں حصہ، جس کا قطر سب سے بڑا ہوتا ہے، عام سپاہیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ مخروطے کی طرح اس سے اوپر کا حصہ، جو فوج کے اگلے درجے کے لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے، بتدریج تنگ ہوتا جاتا ہے اور یوں تنگ ہوتے ہوتے بالکل چوٹی تک پہنچ جاتا ہے اور یہ نقطہ کمانڈر انچیف کی نمائندگی کرتا ہے۔

سپاہی، جن کی تعداد سب سے زیادہ ہوتی ہے، زیریں حصے اور اساس کی تشکیل کرتے ہیں۔ جہاں تک عام سپاہی کا تعلق ہے، وہ خنجر اور شمشیر گھونپتا ہے، لوگوں کے سر قلم کرتا ہے اور اعضا کاٹتا ہے، آگیں لگاتا اور لوٹ مار کرتا ہے۔ وہ ان تمام کارروائیوں کے لیے اپنے سے اوپر کے اشخاص کے احکام وصول کرتا ہے لیکن خود کبھی کوئی حکم نہیں دیتا۔ نان کمشنڈ افسر (یہ افسر سپاہیوں کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں) ان کارروائیوں میں سپاہی سے کم حصہ لیتا ہے لیکن خاص تعداد میں احکام ضرور دیتا ہے۔ کمشنڈ افسر براہ راست کارروائی میں نان کمشنڈ افسر سے بھی کم شریک ہوتا ہے لیکن احکام اس سے کہیں زیادہ دیتا ہے۔ جرنیل کچھ بھی نہیں کرتا، بس فوج کی کمان کرتا ہے اور خود شاذ و نادر ہی کبھی کوئی ہتھیار استعمال کرتا ہے۔ کمانڈر انچیف براہ راست کبھی کسی کارروائی میں شریک نہیں ہوتا۔ وہ کثیر التعداد افواج کی نقل و حرکت کے بارے میں محض عمومی احکام جاری کرتا ہے۔ زراعت ہو، تجارت ہو، یا کوئی انتظامی محکمہ — انسان جہاں بھی مشترکہ کارروائی کے لیے گروہ بندی کرتے ہیں، افراد کے مابین اسی قسم کا تعلق استوار ہو جاتا ہے۔

چنانچہ مخروطے کے تمام متصل حصوں کو — فوج، کسی انتظامی یا سرکاری ادارے کے زیریں ترین سے اعلیٰ ترین تمام درجوں کو — مبالغہ آمیز انداز سے ایک دوسرے سے علیحدہ کیے بغیر ہم ایک ایسا قانون دریافت کر لیتے ہیں جس کے ذریعے انسان مشترکہ کارروائی کرنے کے لیے کچھ اس طرح آپس میں تعلقات قائم کر کے متحد ہو جاتے ہیں کہ جو اشخاص کارروائی میں جتنا زیادہ براہ راست شریک ہوتے ہیں، ان کی تعداد اتنی ہی کم ہوتی ہے اور ان کے پاس حکم دینے کا اختیار اتنا ہی کم ہوتا ہے، اس کے برعکس وہ اشخاص، جو کارروائی میں براہ راست جتنا کم حصہ لیتے ہیں، ان کی تعداد اتنی ہی کم ہوتی ہے اور ان کے پاس حکم دینے کا اختیار اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔ اس طریقے سے وہ ادنیٰ ترین درجے سے اعلیٰ ترین درجے تک پہنچ جاتے ہیں اور اس اعلیٰ ترین درجے یا مقام پر جو شخص فائز ہوتا ہے، اس کا براہ راست کارروائی میں سب سے کم حصہ ہوتا ہے اور باقی تمام اشخاص کے مقابلے میں وہ اپنی توانائی زیادہ تر دوسروں کو احکام دینے کے لیے وقف کر دیتا ہے۔

ان اشخاص کے، جو احکام دیتے ہیں اور ان اشخاص کے مابین جو احکام کی تعمیل کرتے ہیں، یہی وہ تعلق ہے جس میں اس تصور کی، جسے اقتدار (طاقت) کہا جاتا ہے، اصل روح مضمر ہوتی ہے۔

وقت کی، جس کے اندر تمام واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، شرط بحال کرنے کے بعد ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکم کی تعمیل صرف تبھی ممکن ہے جب واقعات کے سلسلے کے ساتھ اس کا تعلق بنتا ہو۔ اسی طرح ان اشخاص کے، جو احکام دیتے ہیں اور ان اشخاص کے مابین، جو ان احکام کی تعمیل کرتے ہیں، تعلق کی لازمی شرط بحال کرنے کے بعد ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ خود صورت حال کی نوعیت ہوتی ہی کچھ اس طرح کی ہے کہ جو اشخاص احکام دیتے ہیں، وہ عملی کارروائی میں کم سے کم حصہ لیتے ہیں اور ان کی سرگرمیوں کا دائرہ محض احکام دینے تک محدود ہوتا ہے۔

7

جب کوئی واقعہ ظہور پذیر ہوتا ہے، لوگ اس کے متعلق مختلف آراء اور امیدوں کا اظہار کرنے لگتے ہیں، اور چونکہ واقعہ بہت سے اشخاص کی اجتماعی کارروائی کا نتیجہ ہوتا ہے، ان میں سے ایک آدھ رائے یا امید کا پورا ہونا، خواہ تقریباً ہی سہی، امر یقینی ہے۔ چنانچہ ان میں سے جب کوئی رائے پوری ہو جاتی ہے، اسے واقعے کے ساتھ یوں منسلک کر دیا جاتا ہے کہ وہ واقعے کے ظہور پذیر ہونے سے پہلے کا حکم دکھائی دینے لگتی ہے۔

چند اشخاص شہتیر گھسیٹ رہے ہیں۔ اسے کب اور کیسے گھسیٹنا ہے، اس کے متعلق ان میں سے ہر ایک اپنی اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ وہ شہتیر گھسیٹ کر مقررہ مقام پر لے جاتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک شخص نے جو کچھ کہا ہوتا ہے، یہ کام اس کے مطابق پایۂ تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ یوں سمجھیں کہ اس نے حکم دیا تھا۔ یہاں ہمیں حکم اور اقتدار اپنی ابتدائی صورت میں نظر آتے ہیں۔

جو شخص اپنے بازوؤں کے ساتھ سب سے زیادہ زور لگا رہا تھا، وہ جو کچھ کر رہا تھا، اس کے بارے میں وہ دوسروں کی نسبت سب سے کم سوچنے کے قابل تھا، نہ وہ یہ تصور کر سکتا تھا کہ ان کی اس مشترکہ کارروائی کا نتیجہ کیا برآمد ہوگا اور نہ وہ کوئی حکم دینے کی اہلیت سے بہرہ ور تھا۔ وہ شخص، جو زیادہ تر حکم دے رہا تھا، چونکہ اس کا بیشتر وقت اور صلاحیتیں لفظی اور زبانی مصروفیات پر صرف ہو رہی تھیں، اس لیے اسے باقیوں کی نسبت براہ راست دستی کام کرنے کا کم موقعہ ملا۔

جب انسانوں کا خاصا بڑا گروہ اپنی سرگرمیوں کا محور کوئی مشترکہ منصوبہ بنالیتا ہے، پھر ان کے مابین یہ تقسیم کار اور بھی واضح صورت اختیار کر لیتی ہے کیونکہ وہ اشخاص، جن کی سرگرمیاں ہدایات اور احکام دینے تک محدود ہوتی ہیں، اصل کام میں براہ راست بہت کم حصہ لیتے ہیں۔

جب کوئی شخص اکیلا کام کرتا ہے، اس کے ذہن میں چند ایسی باتیں ہوتی ہیں جنھیں وہ ہمیشہ پیش نظر رکھتا ہے کیونکہ اسے یہ پختہ یقین ہوتا ہے کہ انھیں باتوں نے ماضی میں اس کے افعال کی رہنمائی کی تھی، یہی اس کے موجودہ افعال کا جواز پیش کرتی ہیں اور یہی اس کی اپنے مستقبل کے منصوبے وضع کرنے میں مدد دیتی ہیں۔

بالکل اسی انداز سے انسانوں کے گروہ ان اشخاص کو، جو براہ راست کارروائی میں شریک نہیں ہوتے، یہ موقع فراہم کر دیتے ہیں کہ وہ اس کام کے بارے میں، جو وہ مشترکہ طور پر کر رہے ہوتے ہیں، غور و فکر کریں، اس کا جواز ڈھونڈیں اور (اس کی کامیابی یا ناکامی کے متعلق) قیاس آرائیاں کریں۔

معلوم یا نامعلوم وجوہ کے پیش نظر فرانسیسی ایک دوسرے کو ذبح اور ملیامیٹ کرنے لگتے ہیں۔ یہ واقعہ پیش تو آ گیا لیکن اس کا جواز کیا تھا، اس کی وضاحت ضروری تھی۔ چنانچہ اس کا جواز یہ گھڑا گیا کہ یہ حریت، مساوات اور فرانس کی بہبود کے لیے ناگزیر تھا۔ لوگ ایک دوسرے کی گردنیں ناپنا بند کر دیتے ہیں اور اس کا جواز یہ پیش کیا جاتا

ہے کہ اس قسم کی حرکتوں سے ہاتھ اٹھانا اس لیے ضروری تھا تا کہ اختیارات کی مرکزیت قائم کی جاسکتی، یورپ کے خلاف مدافعت استوار کی جاسکتی اور اس قسم کے دوسرے کام پایۂ تکمیل تک پہنچائے جاسکتے۔ لوگوں کا مغرب سے مشرق کی جانب کوچ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنے ہم جنسوں کو موت کے گھاٹ اتارنے لگتے ہیں۔ اس واقعے کو جائز ٹھہرانے کے لیے فرانس کی سطوت، انگلستان کی کمینگی اور اس قسم کی دوسری خوشنما ترکیبوں اور اصطلاحوں کا استعمال شروع ہو جاتا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ واقعات کی یہ توجیہات عمومی مفہوم سے عاری اور باہم دیگر متضاد ہوتی ہیں — جیسے مثال کے طور پر یہ بات بالکل ناقابل فہم اور متناقض ہے کہ آپ ایک شخص کے حقوق تو تسلیم کرلیں لیکن اس کے نتیجے کے طور پر اسے ہلاک کر دیں یا آپ تذلیل تو انگلستان کی کرنا چاہتے لیکن خون لاکھوں روسیوں کا بہاتے ہیں۔ تاہم اپنے زمانے میں ان توجیہات کی لازماً بڑی اہمیت ہوتی ہے۔

اس قسم کی توجیہات ان اشخاص کو، جو واقعات کا سبب بنتے ہیں، اخلاقی ذمے داری سے خلاصی دلا دیتی ہیں۔ اپنے زمانے میں یہ وہی کام کرتی ہیں جو جاروب نما آلے، جنھیں ریل کی پٹڑی سے برف ہٹانے کے لیے انجن کے آگے لگایا جاتا ہے، سرانجام دیتے ہیں۔ وہ آدمی کے راستے سے اس کی اخلاقی ذمے داریاں ہٹا دیتی ہیں۔ ان توجیہات کے بغیر اس سادہ ترین سوال کا، جو تاریخ کے ہر واقعے کا جائزہ لینے کے دوران میں پیدا ہوتا رہتا ہے، کوئی جواب مہیا نہیں ہو سکے گا: لاکھوں انسان جنگ وقتال جیسے اجتماعی جرائم کا ارتکاب کیوں کرتے ہیں؟

یورپ کی موجودہ سیاسی اور معاشرتی زندگی نے جو پیچیدہ صورتیں اختیار کر لی ہیں، کیا ان کی موجودگی میں کوئی شخص کسی ایسے واقعے کا تصور کر سکتا ہے جسے بادشاہوں، وزیروں، قانون ساز اداروں یا اخباروں نے تجویز نہ کیا ہو، یا اس کا حکم اور فرمان نہ جاری کیا ہو؟ کیا کوئی ایسی اجتماعی کارروائی ہے جس کا راز سیاسی اتحاد، حب الوطنی توازن طاقت یا تہذیب کے حوالے سے نہ دیا جا سکتا ہو؟ چنانچہ جو واقعہ بھی ظہور پذیر ہوتا ہے، ناگزیر طور پر کسی خواہش کے ساتھ، جس کا اظہار کیا جا چکا ہو، تطابقت اختیار کر لیتا ہے اور جب اسے جواز مل جاتا ہے، وہ کسی شخص واحد یا چند اشخاص کے منشا کا روپ دھار لیتا ہے۔

جہاز خواہ کسی سمت میں چلے، اس کے پیش حصے کے پانی سے ٹکرانے سے جو لہر ابھرے گی، وہ ہمیشہ اس کے آگے رہے گی۔ جو لوگ جہاز پر سوار ہیں، انھیں سمندر میں جو واحد حرکت نظر آئے گی، وہ اسی لہر کی حرکت ہوگی۔

اس لہر کی حرکت کا بغور جائزہ لینے اور اس کا جہاز کی حرکت سے موازنہ کرنے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو قائل کر سکیں گے کہ یہ سراسر جہاز کے آگے بڑھنے سے مشروط ہے اور یہ کہ ہم سے غلطی کا ارتکاب اس حقیقت کی بنا پر ہوا کہ ہم خود غیر محسوس طور پر متحرک تھے۔

اگر ہم تاریخی شخصیات کے آگے بڑھنے کے عمل کا لحظہ بہ لحظہ مشاہدہ کریں (یعنی جو کچھ وقوع پذیر ہوتا ہے، اس کی ناگزیر شرط — وقت کے اندر حرکت کا تسلسل — پیش نظر رکھیں) اور تاریخی شخصیات کے عوام الناس کے ساتھ تعلق کو نظر انداز نہ کریں، ہمیں یہاں بھی وہی کچھ نظر آئے گا (جو کچھ ہمیں لہر کے سلسلے میں دکھائی دیا تھا)۔

جب جہاز ایک ہی سمت میں چلتا رہتا ہے، اس سے آگے لہر میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوگی، وہ مسلسل جوں کی توں رہے گی لیکن جونہی جہاز اپنا رخ تبدیل کرتا ہے، یہ بھی تبدیل ہو جائے گی۔ تاہم جہاز جس طرف چاہے، اپنا رخ تبدیل کرلے، لہر اس کی حرکت کا پیشگی اندازہ لگائے گی اور یوں ہمیشہ ہی اس کے آگے آگے رہے گی۔

خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے، نظر ہمیشہ یہی آئے گا کہ پہلے سے اس کا صحیح صحیح اندازہ لگایا جاچکا اور اس کے وقوع پذیر ہونے کا فرمان جاری ہو چکا ہے۔ جہاز جس طرف چاہے، مڑ جائے، لہراتی، بل کھاتی اور جھاگ اڑاتی لہر، جو نہ تو جہاز کا رخ متعین کرتی ہے اور نہ اس کی رفتار میں کوئی اضافہ کرتی ہے، رہے گی ہمیشہ اس کے آگے ہی، اور دور سے ہمیں یہی معلوم ہوتا رہے گا کہ یہ نہ صرف اپنے آپ حرکت کر رہی ہے بلکہ جہاز کی حرکت کا باعث بھی یہی ہے۔

تاریخی شخصیات اپنے منشا کا اظہار مختلف احکام، فرامین اور فرمودات کے ذریعے کرتی ہیں۔ مورخین ان کے ان احکام کا، جن کا واقعے سے تعلق بنتا ہے، جائزہ لیتے ہیں اور یہ مفروضہ قائم کر لیتے ہیں کہ واقعات ان احکام کے تابع تھے۔ لیکن خود واقعات اور اس تعلق کا، جو تاریخی شخصیات کا عوام الناس سے بنتا ہے، جائزہ لینے کے بعد ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ تاریخی شخصیات اور ان کے احکام واقعات کے تابع ہوتے ہیں۔ اس استخراج کا ناقابل تردید ثبوت اس حقیقت میں موجود ہے کہ خواہ کتنے ہی احکام کیوں نہ دیے جائیں، واقعہ اس وقت تک ظہور پذیر نہیں ہوتا جب تک اس کے دیگر اسباب موجود نہ ہوں۔ لیکن جونہی کوئی واقعہ ــ خواہ یہ کیسا ہی کیوں نہ ہو ــ رونما ہوتا ہے، پھر مختلف اشخاص کی متعدد خواہشات میں سے، جن کا بار بار اظہار کیا جاتا ہے، چند ایک لازماً ایسی مل جائیں گی جو اپنے مفہوم اور ادائیگی کے وقت کے اعتبار سے ایسے احکام دکھائی دینے لگیں گی جن کا تعلق واقعے سے ثابت ہوتا ہے۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد ہم تاریخ کے ان دو انتہائی ضروری اور بنیادی سوالات کے براہ راست اور مثبت جوابات دے سکتے ہیں:

(1) اقتدار (قوت) کیا ہے؟

(2) کون سی طاقت عوام کو متحرک کرتی ہے؟

(1) اقتدار وہ تعلق ہے جو کسی خاص شخص کا دوسرے اشخاص سے ہوتا ہے۔ اس میں ہوتا یہ ہے کہ یہ شخص اجتماعی کارروائی کے ضمن میں جتنی زیادہ آراء کا اظہار کرتا ہے، جتنی زیادہ قیاس آرائیاں کرتا ہے اور اس کے حق میں جتنے زیادہ دلائل دیتا ہے، اس (کارروائی) میں اس کا اپنا حصہ اتنا ہی کم ہوتا ہے۔

(2) بعض مورخین سمجھتے ہیں کہ اقتدار، تابعِ تعقل سرگرمیاں یا دونوں مل کر اقوام کو متحرک کرنے کا باعث بنتی ہیں لیکن حقیقتاً ایسا نہیں ہے۔ اقوام کو جو چیزیں متحرک کرتی ہیں، وہ ان تمام لوگوں کی، جو واقعے میں شریک ہوتے ہیں، سرگرمیاں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اس انداز سے آپس میں اشتراک کرتے ہیں کہ جو اشخاص واقعے

میں جتنا زیادہ براہ راست حصہ لیتے ہیں، ان کی ذمے داری اتنی ہی کم ہوتی ہے۔ اس کے برعکس جو اشخاص واقعے میں جتنا کم براہ راست حصہ لیتے ہیں، ان کی ذمے داری اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے۔

اخلاقی اعتبار سے واقعے کا سبب وہ شخص بنتا ہے جو اقتدار کا مالک ہوتا ہے اور جسمانی اعتبار سے اس کا سبب وہ اشخاص ٹھہریں گے جو صاحب اقتدار کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں لیکن چونکہ اخلاقی سرگرمی کا جسمانی سرگرمی کے بغیر تصور بھی ناممکن ہے، چنانچہ واقعے کا سبب نہ ایک فریق بنتا ہے نہ دوسرا، بلکہ دونوں مل کر اس کو وجود میں لاتے ہیں۔

بہ الفاظِ دیگر سبب کے تصور کا اطلاق ان مظاہر پر نہیں ہوتا جن کا ہم جائزہ لے رہے ہیں۔

آخری تجزیے میں ہم غیر مختتم دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں — یہ وہ انتہائی آخری حد ہے جہاں انسانی عقل و فکر کی ہر قلم رو، اگر وہ اپنے موضوع کے متعلق غیر سنجیدہ رویہ اختیار نہیں کرنا چاہتی، لازماً پہنچ جاتی ہے۔ بجلی حرارت پیدا کرتی ہے اور حرارت سے بجلی پیدا ہوتی ہے۔ جواہر (atoms) ایک دوسرے کو اپنی طرف کشش کرتے ہیں اور جواہر ایک دوسرے سے دور بھاگتے ہیں۔

بجلی اور حرارت اور مختلف جواہر کے تعامل (interaction) کا ذکر کرتے ہوئے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ایسا کیوں ہوتا ہے، اور ہم کہہ دیتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہے کیونکہ اس کے علاوہ کسی دوسری صورت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، اسے ایسا ہی ہونا چاہیے کیونکہ یہ قانون ہے۔ اسی بات کا تاریخی مظاہر پر اطلاق ہوتا ہے۔ جنگیں یا انقلابات کیوں وقوع پذیر ہوتے ہیں؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ ان میں سے کسی ایک کو برپا کرنے کے لیے لوگ خاص شکل میں اکٹھے ہو جاتے ہیں اور اسی شکل میں وہ مل جل کر کام کرتے ہیں اور ہم کہتے ہیں کہ ایسا اس لیے ہوتا ہے کیونکہ اس کے علاوہ کسی اور صورت کا تصور ناممکن ہے یا بہ الفاظ دیگر کیونکہ یہی قانون ہے۔

8

اگر تاریخ کا تعلق محض خارجی مظاہر سے ہوتا، اس سیدھے سادے اور غیر مبہم قانون تک پہنچنا ہی کافی ہوتا اور ہمارا استدلال ختم ہو جاتا۔ لیکن قانونِ تاریخ کا تعلق انسان سے ہے۔ مادے کا ذرہ ہمیں یہ نہیں بتا سکتا کہ اسے نہیں معلوم کہ کشش و تنافر کا قانون کیا ہے اور یہ کہ آیا یہ قانون صحیح ہے یا غلط۔ لیکن انسان، جو تاریخ کا موضوع ہے، صاف صاف کہتا ہے: 'میں آزاد ہوں' اور چنانچہ میں قوانین کے تابع نہیں ہوں۔

اگر چہ انسان کی خود اختیاری (free will) کے مسئلے کو تاریخ میں کھول کر بیان نہیں کیا جاتا لیکن اس کی موجودگی کا احساس قدم قدم پر ہوتا ہے۔

تمام سنجیدہ فکر مورخین کو غیر ارادی طور پر اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تاریخ میں جتنے بھی تضادات و ابہامات پائے جاتے ہیں اور اس نے جو بھی غلط راستہ منتخب کیا ہے، اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس مسئلے کو حل نہیں کیا گیا۔

اگر ہر شخص اپنی مرضی کا مختار ہوتا، یعنی وہ جو اس کا جی چاہتا، کر سکتا، ساری تاریخ غیر مربوط واقعات کا سلسلہ ہوتی۔

اگر ایک ہزار سال کے دوران میں دس لاکھ میں سے ایک شخص کے پاس بھی اپنی مرضی سے عمل کرنے کا اختیار ہوتا، یعنی وہ جو اس کا جی چاہتا، کر سکتا، تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ ان قوانین کی، جو انسانی افعال کو معین کرتے ہیں، خلاف ورزی میں اس کا ایک بھی آزادانہ فعل تمام انسانوں کے لیے کسی طرح کے قوانین کی موجودگی کے امکان کو نیست و نابود کر دیتا۔

لیکن اگر انسانی افعال کو معین کرنے کے لیے ایک بھی قانون موجود ہے، پھر خود اختیاری کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا کیونکہ اس صورت میں انسانی اختیار اس قانون کے تابع ہوگا۔

خود اختیاری کا مسئلہ اسی تضاد نے پیدا کیا ہے۔ قدیم ترین زمانوں سے بہترین انسانی دماغ اس مسئلے میں الجھے رہے ہیں اور قدیم ترین زمانوں سے ہی اسے انتہائی زبردست اہمیت حاصل رہی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ مشاہدے کے موضوع کی حیثیت سے انسان کو — دینی، تاریخی، اخلاقی یا فلسفیانہ — خواہ کسی بھی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، ہمارا واسطہ ایک ایسے آفاقی قانونِ جبر سے پڑتا ہے جس کے — باقی تمام موجود اشیا کی طرح — وہ تابع ہے۔ لیکن جب ہم انسان کو اپنے داخل میں سے دیکھتے ہیں — یعنی جب ہم انسان کو ذات کے بارے میں اپنے داخلی شعور کے موضوع کی حیثیت سے پرکھتے ہیں — ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔

یہ داخلی شعور وقوفِ ذات (self-cognition) کا، جو عقل سے بالکل علیحدہ اور ماورا ہے، سرچشمہ ہے۔ اپنی عقل کے ذریعے انسان اپنی ذات کا مشاہدہ کرتا ہے لیکن صرف شعور کے ذریعے اسے اپنی ذات کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔

شعورِ ذات کے بغیر نہ تو کوئی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور نہ عقل کے کسی استعمال کا تصور ممکن ہے۔

کسی چیز کا مشاہدہ کرنے، اسے سمجھنے اور اس سے نتائج اخذ کرنے کے لیے انسان کو سب سے پہلے یہ شعور ہونا چاہیے کہ وہ زندہ ہے۔ انسان کو اپنے زندہ ہونے کا شعور صرف اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ اس کے دل میں اپنی مرضی کرنے کی خواہش پیدا ہوتی ہے، یعنی اسے اپنے اختیار* (volition) کا شعور ہوتا ہے۔ لیکن انسان اپنی مرضی کی، جو اس کی زندگی کی بنیادی، مرکزی اور انتہائی اہم چیز کی تشکیل کرتی ہے، یوں شناخت کرتا ہے (اور وہ صرف شناخت ہی کر سکتا ہے) کہ وہ آزاد ہے۔

اگر انسان اپنے آپ کو اپنے مشاہدے کا موضوع بنا لے (مثلاً وہ یہ دیکھے کہ اسے کھانا کھانے کی لازماً ضرورت کیوں پیش آتی ہے، اس کا دماغ کیسے کام کرتا ہے یا اسی قسم کی کوئی دوسری چیز)، اسے معلوم ہوگا کہ اس کی

---

* کسی چیز کے بارے میں خود فیصلہ کرنے کی قوت۔ انگریزی میں یہ لفظ فرانسیسی کی وساطت سے لاطینی لفظ volito (جو خود velle= خواہش کرنا) سے مشتق ہے)، سے آیا ہے۔ ممکن ہے روسی میں بھی اس کی کوئی شکل مروج ہو۔

مرضی ایک مستقل قانون کے تابع ہے اور یہ قانون جس تواتر سے اس کی مرضی کی رہنمائی کرتا رہتا ہے، وہ اس سے یہی سمجھے گا کہ یہ اس کی مرضی کو محدود کرتا ہے لیکن کسی چیز کو محدود تبھی کیا جا سکتا ہے اگر وہ ابتدأ آزاد ہو۔ انسان کو اپنی مرضی محض اس لیے محدود نظر آتی ہے کیونکہ اسے یہ شعور ہی نہیں کہ یہ آزاد ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی ہو سکتی ہے۔

آپ کہتے ہیں: ''تم آزاد نہیں۔'' لیکن میں نے اپنا بازو اوپر اٹھا لیا ہے اور اب میں اسے نیچے گراتا ہوں۔ ہر شخص سمجھتا ہے کہ یہ غیر منطقی جواب آزادی کا ناقابل تردید ثبوت ہے۔

یہ جواب ایسے شعور کا اظہار ہے جو عقل کے تابع نہیں ہے۔

اگر آزادی کا شعور علم ذات کا علیحدہ اور خود مختار سرچشمہ نہ ہوتا، یہ تعقل اور تجربے (experience) کے تابع ہوتا، لیکن حقیقتاً اس قسم کی متابعت کا کوئی وجود نہیں ہوتا، یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ موجود ہو سکتی ہے۔

پے در پے تجربے (experiements) کرنے اور سوچ بچار کی بھٹی میں سے گزرنے کے بعد انسان پر یہ انکشاف ہوتا ہے کہ مشاہدے کے موضوع کی حیثیت سے وہ بعض قوانین کے تابع ہے اور اسے ان کی اطاعت کرنا پڑتی ہے۔ جب ایک مرتبہ اسے کششِ ثقل اور غیر نفوذ پذیری[41] کے قوانین سے آگاہی ہو جاتی ہے، وہ ان کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیتا ہے اور کبھی ان کے خلاف مزاحمت نہیں کرتا۔ لیکن تجربوں اور غور و فکر کا یہ سلسلہ اس پر یہ ثابت کر دیتا ہے کہ اسے اپنے داخل میں جس کامل آزادی کا شعور ہوتا ہے، وہ ناممکن ہے اور یہ کہ اس کا ہر فعل اس کی نامیاتی ساخت، اس کے کردار اور ان محرکات کے، جو اسے کچھ کرنے کے لیے اکساتے ہیں، تابع ہوتا ہے۔ تاہم تجربات اور دلائل انسان کو جن نتائج تک پہنچاتے ہیں، وہ ان کے سامنے کبھی سرِ تسلیم خم نہیں کرتا۔

تجربے اور استدلال سے یہ جاننے کے بعد کہ پتھر نیچے گرتا ہے، انسان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ یہ بات بالکل صحیح ہے اور وہ اس کے متعلق کسی شک و شبے کا اظہار نہیں کرتا۔ اسے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس نے جو قانون دریافت کیا ہے، تمام صورتوں میں اسی کے مطابق عمل ہو گا۔

لیکن اسی طرح فیصلہ کن انداز سے یہ جاننے کے باوجود کہ اس کی مرضی قوانین کے تابع ہے، وہ اس کا نہ یقین کرتا ہے اور نہ کر سکتا ہے۔

تجربہ اور سوچ بچار انسان پر خواہ کتنی ہی مرتبہ یہ کیوں نہ ثابت کر دے کہ جن حالات میں اور جس کردار کے ساتھ اس نے ایک کام کیا تھا، انھی حالات میں اور اسی کردار کے ساتھ وہ بعینہٖ وہی کچھ کرے گا جو اس نے پہلے کیا تھا، تاہم انسان کو اس کا یقین نہیں آتا اور وہ سمجھنے لگتا ہے کہ انھیں حالات میں اور اسی کردار کے ساتھ وہ جو جی چاہے اور جس طرح چاہے، کر سکتا ہے، حالانکہ اگر وہ ہزارویں مرتبہ بھی کوشش کرے، نتیجہ وہی نکلے گا جو پہلی بار برآمد ہوا تھا۔

تجربے اور استدلال سے، خواہ کتنے ہی ناقابل تردید انداز سے کسی شخص پر، خواہ وہ باشعور ہو یا بے شعور، یہ ثابت کیوں نہ کر دیا جائے کہ جب حالات بالکل مماثل ہوں اور ان میں مو برابر فرق نہ ہو، عمل کی دو مختلف راہوں کا

تصور کرنا ناممکن ہے، وہ یہی محسوس کرتا ہے کہ اس بے معنی تصور کے بغیر کہ وہ آزاد ہے، اس کے ذہن میں زندگی کی کوئی تصویر آتی ہی نہیں۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ یہ بات خواہ کتنی ہی ناممکن کیوں نہ ہو، ہے یہ ایسی ہی ہے کیونکہ آزادی کے اس تصور کے بغیر اس کے لیے نہ صرف زندگی کی تفہیم کرنا ناممکن ہوگا بلکہ اس کے لیے ایک لمحے کے لیے بھی زندہ رہنا ناممکن ہوگا۔

وہ زندہ نہیں رہ سکے گا کیونکہ زندگی کے بارے میں اس کی تمام امنگوں اور دلچسپیوں کا محور محض یہ ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ آزادی کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہے۔ امارت اور غربت، شہرت اور گمنامی، حاکمیت اور محکومی، توانائی اور ناتوانی، صحت اور علالت، تہذیب اور جہالت، کام اور فراغت، شکم سیری اور فاقہ کشی، خیر اور شر، آزادی کے محض اعلیٰ تر یا ادنیٰ تر درجات ہیں۔

آزادی سے محروم شخص کا تصور صرف زندگی سے محروم شخص کی حیثیت سے ہی کیا جاسکتا ہے۔

جس طرح عقل کے لیے یہ تصور کرنا ناممکن ہے کہ ایک ہی وقت میں دو کام سرانجام دیے جاسکتے ہیں یا علت کے بغیر معلول کا وجود ہوسکتا ہے، اسی طرح اسے آزادی کا تصور بے معنی تناقض معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ شعور عقل کے تابع نہیں ہے۔

آزادی کا یہ غیر متزلزل، ناقابل تردید شعور — جو کسی تجربے یا استدلال کے تابع نہیں ہے، جسے تمام مفکرین تسلیم اور بلا استثنا ہر کس و ناتواں محسوس کرتا ہے اور جس کے بغیر انسان کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے — سوال کا دوسرا پہلو تشکیل کرتا ہے۔

انسان قادر مطلق، علیم و خبیر اور رحیم و کریم خدا کی تخلیق ہے۔ گناہ، جس کا تصور انسان کے آزادی کے شعور سے پیدا ہوتا ہے، کیا ہے؟ یہ مسئلہ دینیات کا ہے۔

انسان کے اعمال عمومی اور غیر متغیر قوانین کے، جنھیں اعداد و شمار کے ذریعے بیان کیا جاسکتا ہے، تابع ہیں۔ معاشرے کی طرف سے انسان پر کیا ذمے داری عاید ہوتی ہے جس کا تصور اس کے آزادی کے شعور کے تصور کا نتیجہ ہے؟ یہ مسئلہ علم قانون کا ہے۔

انسان کے اعمال اس کی طبعی خصلت و سیرت اور ان محرکات کا، جو اس پر اثر انداز ہوتے ہیں، نتیجہ ہوتے ہیں۔ ضمیر اور نیکی و بدی کا احساس، جو آزادی کے شعور کا تتمہ ہے، کیا ہے؟ یہ مسئلہ اخلاقیات کا ہے۔

بنی آدم کی عمومی زندگی کے تعلق سے انسان ان قوانین کا، جو زندگی کو متعین کرتے ہیں، تابع معلوم ہوتا ہے لیکن اگر اسی انسان کو اس تعلق سے علیحدہ کردیا جائے، تو وہ آزاد نظر آنے لگتا ہے۔ اقوام اور بنی آدم کی سابقہ زندگی کے بارے میں کیا رائے قائم کی جائے؟ — انسان کے آزاد یا غیر آزاد افعال کا نتیجہ؟ یہ مسئلہ تاریخ کا ہے۔

صرف ہمارے اس ہم چوما دیگرے نیست زمانے میں جب جہالت کے طاقت ور ترین ہتھیار کی بدولت — مطبوعہ مواد کی وسیع پیمانے پر اشاعت و ترویج — علم کو عام مقبولیت حاصل ہو رہی ہے، خود اختیاری کا مسئلہ ایک ایسی

سطح پر، جس پر خود مسئلہ موجود نہیں رہ سکتا، رکھا گیا ہے۔ ہمارے عہد میں نام نہاد ''ترقی یافتہ'' اشخاص کی اکثریت نے۔ یعنی ہجومِ جہلا۔ علوم طبعی کے ماہرین کی تحقیقات کا، جو سارے مسئلے کے حل کے لیے اس کے صرف ایک پہلو تک محدود ہیں، نتیجہ (صحیح) تسلیم کرلیا ہے۔

وہ کہتے ہیں، لکھتے ہیں اور چھاپتے ہیں کہ روح اور آزادی کا کوئی وجود نہیں کیونکہ انسان کی زندگی کا اظہار اس کے عضلات کی حرکات سے ہوتا ہے اور عضلاتی حرکات اعصاب کی فعلیت سے مشروط ہوتی ہیں۔ روح اور آزادی کا اس لیے کوئی وجود نہیں کیونکہ کسی نامعلوم زمانے کے دوران میں ہم بوزنوں* سے انسان بنے تھے۔ جب وہ یہ ادعا کرتے ہیں انھیں یہ قطعاً معلوم نہیں ہوتا جس قانونِ جبر کو وہ اب عضویات (فزیالوجی) اور تقابلی حیوانیات کی امداد سے ثابت کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں، اسے ہزاروں سال قبل نہ صرف تمام مذاہب اور تمام مفکرین نے تسلیم کرلیا تھا بلکہ انھوں نے اس سے کبھی انکار نہیں کیا۔ ان کی سمجھ میں یہ بات آتی ہی نہیں کہ اس معاملے میں طبعی علوم کا کردار اس کے صرف ایک پہلو پر روشنی ڈالنے تک محدود ہے۔ کیونکہ اگر مشاہدے کے نقطۂ نظر سے عقل اور منشا دماغ کی محض ریزشیں (secretions) ہیں اور اگر انسان ارتقا کے عمومی قانون کا اتباع کرتے ہوئے کسی نامعلوم زمانے کے دوران میں ادنیٰ جانوروں سے ترقی کر کے ہی اوپر آیا ہے، یہ سب کچھ صرف نئے زاویے سے اس صداقت پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے جس کا تمام مذہبی اور فلسفیانہ نظریات ہزاروں سال سے اقرار کرتے چلے آئے ہیں۔ کہ عقل کے نقطۂ نظر سے انسان قانونِ جبر کا تابع ہے، لیکن وہ مسئلے کے، جس کا آزادی کے شعور پر مبنی ایک دوسرا، مخالف رخ ہے، حل کو ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھاتا۔

اگر انسان کسی زمانے میں بوزنوں سے وجود میں آیا تھا، تو یہ بات اتنی ہی قابل فہم ہے جتنی کہ یہ کہ کسی معلوم زمانے میں اسے مٹھی بھر مٹی سے تخلیق کیا گیا تھا (پہلی صورت میں نامعلوم مقدار وقت ہے، دوسری میں ابتدائے آفرینش)۔ رہا یہ سوال کہ انسان کے آزادی کے شعور کو قانونِ جبر کے ساتھ، جس کے وہ تابع ہے، کس طرح ہم آہنگ کیا جائے، تو اسے تقابلی عضویات یا حیوانیات کی مدد سے حل نہیں کیا جاسکتا کیونکہ مینڈک، خرگوش اور بندر میں ہمیں صرف عضلاتی اور اعصابی فعالیتیں نظر آتی ہیں جب کہ انسان میں عضلاتی اور اعصابی فعالیتوں کے علاوہ شعور بھی موجود ہوتا ہے۔

ماہرین فطرت اور ان کے حاشیہ بردار، جن کا خیال ہے کہ وہ اس مسئلے کو حل کررہے ہیں، ان پلستر کاروں کی مانند ہیں جنھیں گرجے کی دیواروں کی ایک جانب پلستر کرنے پر لگا دیا جائے مگر وہ نگران کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر ضرورت سے زیادہ جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہوئے دریچوں، ایقونوں، ووڈ ورک** اور زیرِ تکمیل دیواروں پر بھی پلستر کردیں اور خوشی سے پھولے نہ سمائیں کہ پلستر کاروں کے اپنے نقطۂ نظر سے ہر چیز ہموار اور صاف ستھری ہو گئی ہے۔

---

* بوزنہ (ape): بے دم کا بندر۔

** Woodwork۔ دیواروں کو خوبصورت بنانے کے لیے لکڑی کا استعمال۔

9

جبر و اختیار کے اس مسئلے کو حل کرنے کے سلسلے میں تاریخ کو دوسرے علوم پر، جنھوں نے اس میں دلچسپی لی ہے اور اسے سلجھانے کی کوشش کی ہے، یہ تفوق حاصل ہے کہ اس کے نزدیک اس مسئلے کا تعلق انسان کی خود اختیاری کی اصل روح سے نہیں بلکہ اس بات سے ہے کہ ماضی میں اور بعض خاص حالات میں اس خود اختیاری نے اپنے آپ کو حقیقتاً جو آشکار کیا، اسے ہم پیش کس طرح کرتے ہیں۔

اس سوال کے سلسلے میں دوسرے علوم کے مقابلے میں تاریخ کا مقام وہی ہے جو تجریدی علوم کے مقابلے میں تجرباتی علوم کا ہے۔

اس اعتبار سے تاریخ کا موضوع انسان کا ارادہ ہے بلکہ ہمارا اسے پیش کرنے کا انداز ہے۔

چنانچہ جبر اور اختیار کے مابین عدم موافقت کی بنا پر جو ناقابل حل چیستاں سامنے آتا ہے، وہ تاریخ کے لیے اس طرح موجود نہیں ہے جس طرح کہ دینیات، اخلاقیات اور فلسفے کے لیے ہے۔ تاریخ انسانی زندگی کو پیش کرنے کے اس انداز کا جائزہ لیتی ہے جس میں ان دونوں تناقضات کی یک جائی پہلے ہی وقوع پذیر ہو چکی ہے۔

حقیقی زندگی میں ہر تاریخی واقعہ، ہر انسانی فعل تناقض کے کسی احساس کے بغیر غیر مبہم اور واضح انداز سے سمجھ لیا جاتا ہے حالانکہ ہر واقعہ جزوی طور پر جبری اور جزوی طور پر آزاد معلوم ہوتا ہے۔

جبر و اختیار کس طرح یک جا ہوتے ہیں اور دونوں تصورات کی اصل روح کس چیز سے تشکیل پاتی ہے، اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے دوسرے علوم جو راستہ اختیار کرتے ہیں، فلسفۂ تاریخ اس کے مخالف راستہ اختیار کر سکتا ہے اور اسے کرنا بھی چاہیے۔ خود جبر اور اختیار کے تصورات کی تعریف (وتشریح) کرنے اور پھر زندگی کے مظاہر کو ان تعریفات (وتشریحات) کے مطابق ترتیب دینے سے پہلے تاریخ کو جبر و اختیار کی تعریف (وتشریح) واقعات کے اس وسیع وعریض ذخیرے کی روشنی میں کرنا چاہیے جس سے وہ پوری طرح آگاہ ہے اور جو ہمیشہ انھی دونوں عناصر کے محتاج ہوتے ہیں۔

آدمی واحد ہو یا متعدد، ان کے افعال کو خواہ کسی انداز سے پیش کیا جائے، ہم ہمیشہ یہی سمجھتے ہیں کہ ان کے افعال جزوی طور پر اختیار اور جزوی طور پر قانون جبر کا نتیجہ ہیں۔

ہم اقوام کے ترک سکونت کا ذکر کر رہے ہوں یا وحشی قبائل کی یلغاروں کا، نپولین سوم کے فرمانوں کا یا اس شخص کے، جو ایک گھنٹہ قبل سیر پر نکلا تھا، متعدد راستوں میں سے کسی ایک راستے کے انتخاب کا، ہمیں کہیں معمولی سا تضاد بھی نظر نہیں آتا۔ ان لوگوں کے افعال کس حد تک جبر کے تابع اور کس حد تک اختیار کی پیداوار ہیں، ہمیں اس کا واضح احساس ہو جاتا ہے۔

اختیار کی حد کیا ہے، اس کے متعلق ہمارے نقطۂ نظر میں اکثر اختلاف پایا جاتا ہے کیونکہ ہر شخص مظاہر (وواقعات)

کا اپنے انداز سے جائزہ لیتا ہے لیکن ہمیں ہر انسانی فعل میں یکساں انداز سے جبر واختیار کی خاص یک جائی نظر آتی ہے۔ ہر اس فعل میں، جس کی ہم تفتیش کرتے ہیں، ہمیں خاص مقدار میں جبر اور خاص مقدار میں اختیار کارفرما دکھائی دیتا ہے اور ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ جس فعل میں ہمیں اختیار جتنا زیادہ نظر آتا ہے، جبر اتنا ہی کم ہو جاتا ہے اور جس فعل میں جبر جتنا زیادہ ہوگا، اختیار اتنا ہی کم ہوگا۔

جبر سے اختیار کا تناسب اس نقطۂ نظر کے مطابق، جس سے ہم کسی فعل کا جائزہ لیتے ہیں، گھٹتا بڑھتا رہتا ہے لیکن یہ تناسب ہمیشہ معکوس ہوتا ہے۔

ایک شخص ڈوب رہا ہے۔ وہ (جان بچانے کے لیے) کسی دوسرے شخص کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے اور اسے نیچے گھسیٹ لیتا ہے۔ ایک ماں بھوکی ہے۔ وہ اپنے بچے کو دودھ پلاتے پلاتے نڈھال ہو جاتی ہے اور خوراک چرا لیتی ہے۔ ایک آدمی کو تربیت کے ذریعے نظم وضبط کا خوگر بنا دیا جاتا ہے۔ وہ حکم ملتے ہی کسی نہتے شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے۔ یہ تمام لوگ اس شخص کو، جسے ان حالات کا، جن میں سے یہ گزر رہے ہیں، علم ہے، کم قصوروار نظر آتے ہیں یعنی اس کے خیال میں انھیں آزادیٔ عمل کم حاصل ہے اور وہ قانونِ جبر کے زیادہ تابع ہیں، مگر اس شخص کو، جسے ان کے حالات سے کوئی آگاہی نہیں تھی اور جسے یہ معلوم نہیں تھا کہ آدمی خود ڈوب رہا تھا، ماں بھوکی تھی اور سپاہی احکام کا پابند تھا، وہ زیادہ آزاد دکھائی دیتے ہیں۔ اسی طرح ایک اور شخص ہے۔ اس نے بیس سال قبل قتل کا ارتکاب کیا تھا اور تب سے وہ معاشرے میں پرامن اور بے خطا زندگی گزار رہا ہے۔ وہ اس شخص کے مقابلے میں، جس نے اس کے جرم کا جائزہ اس کے ارتکاب کے اگلے روز ہی لیا تھا، اس شخص کو، جو اس کے جرم کا اس کے ارتکاب کے بیس سال کا عرصہ گزرنے کے بعد جائزہ لے رہا ہے، قانونِ جبر کا زیادہ تابع نظر آتا ہے۔ اسی طرح کسی پاگل، مدہوش یا انتہائی مشتعل شخص کا ہر فعل اس شخص کو، جو فاعل کی ذہنی کیفیت سے آگاہ ہے، اس شخص کی نسبت، جسے اس سلسلے میں کچھ بھی معلوم نہیں ہے، آزاد کم اور جبری زیادہ نظر آتا ہے۔ ان تمام صورتوں میں آزادی کے تصور میں، اس نقطۂ نگاہ کے مطابق، جس سے فعل کا جائزہ لیا جا رہا ہو، اضافہ یا تخفیف ہو جاتی ہے اور اسی تناسب سے جبر کے تصور میں تخفیف یا اضافہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جبر کا پلڑا جتنا بھاری ہوگا، آزادی کا اتنا ہی ہلکا ہوگا۔ اس کے برعکس جبر کا پلڑا جتنا ہلکا ہوگا، آزادی کا اتنا ہی بھاری ہوگا۔

مذہب، انسانوں کی عام سوجھ بوجھ، علم قانون اور خود تاریخ جبر واختیار کے مابین اس تعلق کو یکساں سمجھتے ہیں۔

ان تمام امور میں، جن کے سلسلے میں جبر واختیار کے مابین تناسب کے متعلق ہمارے تصور میں کمی بیشی ہوتی رہتی ہے، بلا استثنا تین باتیں قابل توجہ ہیں۔

(1) جو آدمی فعل سرانجام دیتا ہے، اس کا خارجی دنیا سے تعلق۔

(2) اس کا وقت (زمان) سے تعلق۔

(3) اس کا ان وجوہ سے، جو فعل کا باعث بنیں، تعلق۔

(1) انسان کا خارجی دنیا کے ساتھ کیا تعلق ہے، ہم جس نسبت سے اس کی تفہیم کر پائیں گے اسی نسبت سے ہماری قوتِ فیصلہ متاثر ہوگی۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہمارے فیصلے کا انحصار اس بات پر ہوگا کہ آدمی کا، ہر اس چیز کے ساتھ، جو اس کے گردوپیش موجود ہے، جو تعلق ہے، ہم اسے کتنے واضح انداز سے سمجھتے ہیں، کم یا زیادہ؟ چیزوں پر اس انداز سے (یعنی ان کے خارجی دنیا سے تعلق کے حوالے سے) سوچ بچار کرنے کے بعد ہی ہم پر یہ بات آشکار ہوتی ہے کہ ڈوبنے والا آدمی اس آدمی کی نسبت، جو خشک زمین پر کھڑا ہے، آزاد کم ہے اور جبر کے زیادہ تابع ہے۔ اس سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ شخص، جو گنجان آباد محلے میں رہائش پذیر ہے اور خاندانی، سرکاری یا کاروباری فرائض میں جکڑا ہوا ہے، اس شخص کی نسبت، جو دوسروں سے الگ تھلگ تنہائی کی زندگی بسر کر رہا ہے، لاریب آزاد کم اور جبر کا پابند زیادہ ہوگا۔
اگر ہم کسی شخص کو تنہا تصور کریں، اپنے ماحول سے اس کے کسی تعلق کو خاطر میں نہ لائیں، ہمیں اس کا ہر فعل آزاد معلوم ہوگا۔ لیکن اگر ہم اس کے گردوپیش کی کسی بھی چیز سے اس کے تعلق کو پیش نظر رکھیں۔ یہ چیز کوئی بھی ہوسکتی ہے، کوئی شخص، جس سے وہ گفتگو کرتا ہے، کتاب، جس کا وہ مطالعہ کرتا ہے، کام، جس میں وہ مصروف ہے، بلکہ وہ ہوا بھی، جس میں وہ سانس لیتا ہے یا روشنی، جو اس کے اردگرد کی اشیا پر پڑتی ہے۔، اس کے ساتھ اس کے تعلق کا جائزہ لیں، ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ ان میں سے ہر ایک صورت اس پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کی فعالیت کے کم از کم ایک پہلو پر اپنا حکم چلاتی ہے۔ اور ہمیں یہ اثرات جتنی زیادہ کثیر تعداد میں نظر آئیں گے، وہ ہمیں اتنا ہی کم آزاد دکھائی دے گا اور جس جبر کے وہ تابع ہے، وہ اتنا ہی زیادہ واضح معلوم ہونے لگے گا۔

(2) دوسری صورت میں ہمارے نتائج اس بات سے متاثر ہوں گے کہ انسان کا دنیا کے ساتھ زمانی تعلق کتنا واضح ہے۔ یعنی وقت کے دوران میں انسان کا فعل جو مخصوص مقام حاصل کرتا ہے، اس کے متعلق ہمارا ادراک کتنا واضح اور بیّن ہے۔ یہی وہ صورت ہے جو انسانِ اوّل کے ہبوط کا باعث بنتی ہے، جس کے نتیجے میں نسل انسانی وجود میں آتی ہے اور بظاہر اتنی بھی آزاد نظر نہیں آتی جتنا کہ آج کوئی آدمی شادی کرنے کے معاملے میں آزاد معلوم ہوتا ہے۔ یہی وہ صورت ہے جو اس امر کی توضیح کرتی ہے کہ ان انسانوں کی، جو صدیوں پہلے زندگی گزار رہے تھے اور جو وقت کی وساطت سے میرے ساتھ منسلک ہیں، زندگیاں اور افعال مجھے اتنے آزاد نظر نہیں آسکتے جتنے کہ کسی معاصر شخص کے کیونکہ اس معاصر شخص کی زندگی اور افعال کے نتائج ابھی مجھے معلوم نہیں۔
اس صورت میں جبر اور اختیار کے متعلق ہمارے تصور کی کم یا بیش وسعت کا انحصار وقت کی کم یا بیش مدت پر ہے جو فعل کی انجام دہی اور اس کے بارے میں ہمارے محاکے کے درمیان گزرا ہے۔
اگر میں اس فعل کا، جو میں نے ایک لمحہ قبل بالکل ان حالات میں، جو میرے موجودہ حالات کے تقریباً مماثل

تھے، سرانجام دیا تھا، جائزہ لوں، مجھے اپنا یہ فعل لاریب آزاد معلوم ہوگا۔ لیکن اگر میں اس فعل کا، جو میں نے ایک ماہ قبل سرانجام دیا تھا، جائزہ لوں، تو اب چونکہ میرے حالات مختلف ہوگئے ہیں، میں یہ تسلیم کیے بنا نہیں رہ سکتا کہ اگر وہ فعل سرانجام نہ دیا گیا ہوتا، تو اس کے بہت سے نتائج، جو سودمند، خوش گوار بلکہ ضروری ثابت ہوئے، برآمد نہ ہوتے۔ اگر میں کسی ایسے فعل کو، جو بہت عرصہ پہلے، دس سال یا اس سے زیادہ مدت قبل، سرانجام دیا گیا تھا، دھیان میں لاؤں تو اپنے اس فعل کے نتائج مجھ پر اور بھی زیادہ واضح شکل میں ظاہر ہوں گے اور میرے لیے یہ تصور کرنا مشکل ہو جائے گا کہ اگر وہ فعل سرانجام نہ دیا گیا ہوتا، پھر کیا ہوتا۔ میری یادداشت جتنا زیادہ پیچھے جائے گی یا۔ اور یہ ایک ہی بات ہے۔ میں اپنا محاکمہ جتنے زیادہ عرصے کے لیے ملتوی کرتا ہوں، اپنے فعل کی آزادی کے متعلق میرا عقیدہ اتنا ہی زیادہ متزلزل ہو جائے گا۔

تاریخ میں بھی بالکل یہی عمل کارفرما ہوتا ہے، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ انسانوں کے عمومی معاملات میں ان کی خود اختیاری جو حصہ لیتی ہے، اس کے بارے میں ہمارے عقائد میں بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ اپنے زمانے کا کوئی واقعہ ہمیں لامحالہ ان اشخاص کا، جو اس سے متعلق ہوتے ہیں، کیا دھرا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن وہ واقعہ، جو بہت مدت قبل ظہور پذیر ہوا تھا، اس کے سلسلے میں ہمارے پاس اتنا وقت ہوتا ہے کہ ہم اس کے نتائج وعواقب کے متعلق جو ناگزیر تھے، سوچ سکیں۔ چونکہ ہم نے یہ نتائج خاصا عرصہ سوچ بچار کرنے کے بعد اخذ کیے ہوتے ہیں، چنانچہ ان کے علاوہ کوئی دوسری چیز ممکن ہی نظر نہیں آتی۔ واقعات کی تحقیق وتفتیش کے سلسلے میں ہم جتنا زیادہ پیچھے جائیں گے، وہ اتنے ہی کم بے قاعدہ نظر آئیں گے۔

آسٹریا اور پرشیا کی جنگ ہمیں بلاشک وشبہ بسمارک کے عیارانہ رویے کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے۔ (موجودہ دور سے) اس طرح کی مزید مثالیں بھی دی جاسکتی ہے۔

نپولیائی جنگیں ہمیں اب بھی ان کے ہیروؤں کے منشا کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں (اگرچہ اس بارے میں ہمارا یقین قدرے ڈھلمل ہونے لگا ہے)، لیکن جب ہم صلیبی جنگوں تک پہنچتے ہیں، ہمیں وہ ایک ایسا واقعہ نظر آنا لگتی ہیں جو تاریخ میں واضح مقام حاصل کر چکا ہے اور جس کے بغیر یورپ کی جدید تاریخ کا تصور بھی محال ہے، حالانکہ صلیبی جنگوں کے وقائع نگاروں کو وہ واقعہ محض بعض افراد کے منشا کا نتیجہ معلوم ہوتا تھا۔ جہاں تک اقوام کی ترک سکونت کا تعلق ہے، آج یہ بات کسی شخص کے وہم وگمان میں بھی نہیں آتی کہ یورپ کی تزئین نو اٹیلا[42] کی ترنگ کا نتیجہ ہے۔ تاریخ میں ہمارے مشاہدے کا موضوع وقت کے اعتبار سے جتنا زیادہ پیچھے ہوتا جاتا ہے، ان لوگوں کے، جن کا تعلق واقعے سے تھا، منشا کی آزادی اتنی ہی زیادہ مشکوک نظر آنے لگتی ہے اور جبر کا قانون اتنا ہی زیادہ آشکار ہونے لگتا ہے۔

(3) تیسرا عنصر، جو ہمارے محاکمے پر اثرانداز ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم اسباب کے، جن کا عقل مطالبہ کرتی ہے، غیر مختتم سلسلے کو کس حد تک اپنے فہم وادراک کی گرفت میں لا سکتے ہیں۔ اسباب کے اس سلسلے میں ہر قابل تفہیم واقعے (اور چنانچہ ہر انسانی فعل) کا، جو کچھ بیت چکا ہے، اس کے نتیجے (معلول) اور جو کچھ پیش آنے والا

ہے، اس کی وجہ (علت) کے طور پر اپنا واضح مقام ہونا چاہیے۔

یہ اسی اصول کا صدقہ ہے کہ ہم عضویاتی، نفسیاتی اور تاریخی قوانین سے، جو مشاہدے سے اخذ کیے جاتے ہیں اور جن کے ذریعے انسان کو کنٹرول کیا جاتا ہے، جتنا بہتر طور پر آگاہ ہوتے ہیں اور فعل کی عضویاتی، نفسیاتی اور تاریخی وجوہ کو جتنے زیادہ صحیح انداز سے سمجھتے ہیں، اور ہمارے زیرِ تفتیش فعل جتنا زیادہ سادہ اور اس کے فاعل کا دماغ اور کردار جتنا زیادہ کم پیچیدہ دکھائی دیتا ہے، ہمیں اپنے اور دوسروں کے افعال جبر کے اتنے ہی زیادہ تابع اور اتنے ہی کم آزاد معلوم ہوتے ہیں۔

جب ہمیں کسی فعل کی ــــ وہ اچھا ہو یا برا، یا ان دونوں میں سے کچھ بھی نہ ہو، یعنی اس کا اخلاقیات سے کوئی واسطہ نہ ہو ــــ علت کی قطعاً کوئی تفہیم نہیں ہوتی، ہم اس کے ساتھ خود اختیاری کی خاصی بڑی مقدار منسوب کر دیتے ہیں۔ جرم کے سلسلے میں ہم شدومد سے اس فعل کی سزا کا مطالبہ کرنے لگتے ہیں۔ نیک کام کے سلسلے میں ہم اس کی خوبی بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں۔ لیکن وہ کام، جو اچھا ہے نہ برا، اس میں ہمیں کہیں زیادہ انفرادیت، اپج اور آزادی دکھائی دینے لگتی ہے۔ لیکن فعل کی لاتعداد وجوہ میں سے ہمیں اگر ایک کا بھی علم ہو جائے، ہمیں فی الفور ایک خاص نوعیت کے جبر کا احساس ہونے لگتا ہے اور جرم کی سزا دینے، نیک کام کرنے کی خوبی کا اعتراف کرنے اور پراپج فعل کو آزاد قرار دینے پر ہمارا اصرار کم ہو جاتا ہے۔ یہ کہ مجرم نے مُخربِ اخلاق ماحول میں پرورش پائی تھی، اس لیے ہماری نگاہوں میں اس کے جرم کی شدت کم ہو جاتی ہے۔ ماں باپ کا ایثار یا ایسا ایثار، جس میں تلافی کا امکان ہو، خواہ مخواہ کے ایثار کے مقابلے میں زیادہ قابلِ تفہیم ہے اور اس لیے خواہ مخواہ کے ایثار کے مقابلے میں ہمدردی کا کم مستحق اور خود اختیاری کا کم نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ اگر ہمیں یہ معلوم ہو جائے کہ کسی فرقے یا جماعت کے بانی یا کسی موجد کا راستہ کس چیز نے ہموار کیا تھا، ہم اس سے کوئی زیادہ متاثر نہیں ہوتے۔ اگر ہمارے پاس مثالوں کا حیطہ خاصا وسیع ہو، اگر ہمارا مشاہدہ مسلسل انسانوں کے افعال کی علت و معلول کے مابین باہمی تعلق تلاش کرنے پر مرکوز رہے، ہمیں ان کے افعال جبر کا جتنا زیادہ اور خود اختیاری کا جتنا کم نتیجہ معلوم ہوں گے، ہم علت اور معلول کو اتنے ہی زیادہ صحیح انداز سے آپس میں منسلک کر سکیں گے۔ اگر وہ افعال جن کا جائزہ لیا جا رہا ہے، سیدھے سادے ہیں اور اس قسم کے افعال کافی زیادہ تعداد میں ہمارے زیرِ مشاہدہ ہیں، ان کے ناگزیر ہونے کے متعلق ہمارا تصور اور بھی غیر مشروط ہو جائے گا۔ بددیانت باپ کے بیٹے کا بددیانت کردار، کسی عورت کی بداعمالی جو بری صحبت میں پھنس گئی ہو، اصلاح یافتہ شرابی کی دوبارہ مے نوشی اور اس قسم کے دیگر افعال ــــ ہم ان کی وجوہ سے جتنا زیادہ اچھی طرح واقف ہوں گے، یہ ہمیں اتنے ہی کم آزاد نظر آئیں گے۔ اگر وہ شخص، جس کے افعال کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، بچوں، پاگلوں یا ضعیف العقلوں کی طرح ذہنی ارتقا کے بالکل ابتدائی مراحل میں سے گزر رہا ہو، ہمیں، جنھیں فعل کی وجوہ اور زیرِ بحث ذہانت اور کردار کی سادگی کا علم ہے، فی الفور جبر کا عنصر اتنا زیادہ اور خود اختیاری اتنی کم نظر آئے گی کہ جونہی ہمیں اس وجہ کا علم ہوگا جو فعل کا باعث بنی، ہم اس کے نتیجے کی پیش گوئی کر سکیں گے۔

تمام قوانین وضوابط یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ایسے حالات موجود ہوتے ہیں کہ جرم کا بار مجرم پر نہیں ڈالا جاسکتا اور وہ اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ سزا میں نرمی برتی جائے۔ اس رعایت کی توجیہہ (منطقی اساس) انھیں تین عناصر سے کی جاتی ہے۔ وہ فرد، جس کے فعل کا محاکمہ کیا جارہا ہے، اپنے فعل کا کس حد تک ذمے دار ہے، کم یا زیادہ؟ اس سوال کے جواب کا انحصار ان باتوں پر ہے کہ ان حالات کا، جن میں اس نے اپنا فعل سرانجام دیا تھا، ہمیں کتنا علم ہے، کم یا زیادہ؟ فعل کے ارتکاب اور اس کی تحقیق کے درمیان جو مدت گزری ہے، وہ کتنی ہے، کم یا زیادہ؟ اور پھر جو وجوہ فعل کی انجام دہی کا باعث بنیں، انھیں ہم کس حد تک سمجھ سکے ہیں، کم یا زیادہ؟

10

چنانچہ جبر واختیار کے متعلق ہمارا تصور کسی شخص کے خارجی دنیا کے ساتھ کم یا زیادہ تعلق، وقت کے اعتبار سے کم یا زیادہ دوری یا ان وجوہ پر، جو ہمیں اس کی زندگی کے کسی واقعے میں کارفرما نظر آتی ہیں، کم یا زیادہ انحصار کے مطابق گھٹتا یا بڑھتا رہتا ہے۔

چنانچہ اگر ہم مشاہدے کے لیے کسی شخص کی زندگی کا وہ مقام منتخب کرلیں جہاں اس کے خارجی دنیا کے ساتھ تعلقات بہترین طور پر معلوم ہوں، جہاں فعل کی سرانجام دہی اور ہمارے محاکمے کے مابین وقفہ حتیٰ الامکان طویل ترین ہو، اور جہاں فعل کی وجوہ حتیٰ الامکان سہل ترین انداز سے دستیاب ہوں، ہم زیادہ سے زیادہ جبر اور کم سے کم خوداختیاری کے تصور تک پہنچ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ہم اپنے مشاہدے کے لیے کسی ایسے شخص کو منتخب کرلیں جس کا خارجی حالات پر انحصار حتیٰ الامکان کم سے کم ہو اور اس کے اس فعل کی، جو وقت کے اعتبار سے ہمارے زمانے سے قریب ترین زمانے میں سرانجام دیا گیا ہو، وجوہ ہمیں قطعاً معلوم نہ ہوں، ہم کم سے کم جبر اور زیادہ سے زیادہ خوداختیاری کے تصور تک پہنچ جاتے ہیں۔

اس قسم کی باتوں سے کہ اس شخص کے خارجی دنیا سے تعلق کا ہمیں واضح طور پر علم ہے یا ہم اس تعلق کا کھوج لگانے میں قطعاً ناکام رہے ہیں، فعل کے ارتکاب اور اس پر محاکمے کے دوران میں وقفہ طویل ترین ہے یا مختصرترین، یا فعل کی وجوہ قابل تفہیم ہیں یا ناقابل تفہیم، اور اپنا نقطۂ نظر بار بار تبدیل کرنے کے باوجود ہم یہ دعویٰ نہیں کرسکتے کہ دونوں میں سے کسی ایک معاملے میں بھی جبر زیادہ کارفرما ہے یا خوداختیاری کا عمل دخل زیادہ ہے۔

(1) ہم ایک ایسے شخص کا، جو خارجی دنیا کے اثرات سے مستثنیٰ ہو، تصور باندھنے کے لیے خواہ کتنا ہی زور لگائیں، یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ آپ سپیس• میں بھی رہیں اور آزادی کا بھی سوچیں۔ آدمی کا ہر فعل، جو وہ انجام دیتا ہے، ناگزیر طور پر اس کے گردوپیش اور اس کے جسم سے مشروط ہوتا ہے۔ میں اپنا بازو اوپر اٹھاتا ہوں اور اسے نیچے چھوڑ دیتا ہوں۔ مجھے اپنا فعل آزاد دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں: کیا میں

• سپیس (Space) کا ترجمہ عام طور پر مکان یا خلائے بسیط کیا جاتا ہے۔ کائنات کی ہر موجود چیز یہیں پائی جاتی ہے۔

اسے ہر سمت میں اٹھا سکتا ہوں؟ تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اسے جس سمت میں اٹھایا ہے، وہاں میرے گرد و پیش کی اشیا یا میرے اپنے جسم کی ساخت میرے اس فعل میں کم سے کم مزاحم ہوئی ہے۔ اگر میں نے تمام ممکنہ سمتوں میں سے خاص سمت کا انتخاب کیا، تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس طرف رکاوٹ سب سے کم تھی۔ میرے فعل کے کاملاً آزاد ہونے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس کا کسی طرح کی رکاوٹ سے قطعاً کوئی واسطہ نہ پڑتا۔ کسی ایسے آدمی کا، جو مطلقاً آزاد ہو، تصور قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم اسے فضائے بسیط (سپیس) سے ماورا تصور کریں اور یہ ناممکن ہے۔

(2) ہم محاکے کے وقت کو ارتکابِ فعل کے وقت کے خواہ کتنا ہی قریب کیوں نہ لے آئیں، ہم وقت سے ماورا آزادی کا تصور کبھی نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اگر میں کسی ایسے فعل کا، جو ایک سیکنڈ قبل انجام دیا گیا تھا، جائزہ لوں، تو بھی مجھے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ آزاد نہیں تھا کیونکہ یہ وقت کے اس لمحے کے ساتھ، جس کے دوران میں اسے سرانجام دیا گیا تھا، منسلک ہے۔ کیا میں اپنا بازو اوپر اٹھا سکتا ہوں؟ میں اسے اوپر اٹھاتا ہوں، لیکن میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں: کیا میں اس لمحے کے دوران میں، جو پہلے ہی گزر چکا ہے، اپنا بازو اوپر اٹھانے سے گریز کر سکتا تھا؟ اپنے آپ کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ ہاں میں گریز کر سکتا تھا، میں اسے اگلے لمحے اوپر نہیں اٹھاتا۔ مگر میں اپنے آپ کو جو اس فعل کے انجام دینے سے روک رہا ہوں، اس کا پہلے لمحے سے، جب میں نے سوال پوچھا تھا، کوئی تعلق نہیں، وہ لمحہ گزر چکا ہے کیونکہ اسے روکنا میرے اختیار سے باہر ہے اور اب یہ بازو نہ وہ بازو ہے جسے میں نے اوپر اٹھایا تھا اور نہ میرے گرد و پیش کی فضا وہ فضا ہے جس میں میں نے اسے اوپر اٹھایا تھا۔ وہ لمحہ، جس میں (بازو کو) پہلی حرکت دی گئی تھی، بیت چکا ہے اور اسے واپس بلانا ناممکن ہے۔ اس لمحے کے دوران میں صرف ایک ہی حرکت (یا کام) کر سکتا تھا اور میں جو حرکت (یا کام) بھی کرتا، وہ صرف ایک ہی ہو سکتی تھی۔ رہی یہ بات کہ ایک لمحے بعد میں نے اپنا بازو اوپر نہیں اٹھایا، اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ میں اس لمحے کے دوران میں بھی اسے اوپر اٹھانے سے گریز کر سکتا تھا اور چونکہ ایک وقت میں میں صرف ایک ہی حرکت (یا کام) کر سکتا ہوں، چنانچہ میں نے اس لمحے کے دوران میں جو کچھ کیا، اس کے علاوہ اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے آزاد تصور کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کا تصور زمانہ حال میں کیا جائے جو ماضی اور مستقبل کے مابین حد بندی کرتا ہے۔ یعنی جس کا وقت سے کوئی تعلق نہیں اور یہ ناممکن ہے۔

(3) کسی فعل کی وجوہ کی تفہیم میں جو مشکلات حائل ہوتی ہیں، انھیں کتنا ہی بڑھا چڑھا کر پیش کیا جائے، کامل آزادی یعنی وجہ کی عدم موجودگی کا تصور کبھی ہمارے ذہن میں نہیں آسکے گا۔ جب آدمی کوئی فعل سرانجام دیتا ہے، وہ اس کا پہلے ارادہ کرتا ہے۔ اس نے یہ ارادہ کیوں کیا، اس کی کچھ نہ کچھ وجوہ ہوتی ہیں۔ ان وجوہ تک ہماری رسائی کتنی ہی ناممکن کیوں نہ ہو، عقل کا اولین تقاضا یہی ہوتا ہے کہ وجہ فرض کی جائے اور اس کا کھوج لگایا جائے کیونکہ وجہ کے بغیر کسی واقعے کا تصور ناممکن ہے۔ میں وجہ سے ماورا کوئی فعل سرانجام دینے کے

لیے اپنا بازو اوپر اٹھاتا ہوں، لیکن میری یہ خواہش کہ میں بلا وجہ کوئی فعل سرانجام دینا چاہتا ہوں، میرے اس فعل کی وجہ ہے۔

چلیں ہم یہ تصور کر لیتے ہیں کہ کوئی ایسا شخص، جو تمام اثرات سے سراسر مستثنٰی ہے، موجود ہے اور ہم اس کے ایک ایسے اہم فعل کا، جو حال ہی میں سرانجام دیا گیا ہے اور جس کے متعلق ہم یہ فرض کر لیتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی وجہ نہیں تھی، جائزہ لے رہے ہیں، اگر ہم جبر کے عنصر کو گھٹا کر خفیف ترین مقدار تک، جو صفر کے برابر ہوتی ہے، لے آئیں، پھر بھی ہم انسان کے کامل آزاد ہونے کا تصور قائم نہیں کر سکتے، کیونکہ وہ چیز، جو خارجی دنیا سے متاثر نہ ہوتی ہو، وقت کی قید سے آزاد ہو اور جو وجوہ سے بے نیاز ہو، انسان نہیں ہو سکتی۔

اسی طرح ہم کسی ایسے شخص کا، جو آزادی سے بالکل تہی داماں ہو، کبھی تصور نہیں کر سکتے۔

(1) ہم ان مکانی حالات کے متعلق جن میں انسان مقیم ہے، اپنے علم میں خواہ کتنا ہی اضافہ کر لیں، یہ علم کبھی مکمل نہیں ہو سکتا کیونکہ ان حالات کی تعداد اسی طرح لامحدود ہے جس طرح کہ خود خلائے بسیط (سپیس) لامتناہی ہے۔ چنانچہ جب تک ان تمام حالات کی، جو انسان کو متاثر کر سکتے ہیں، تعریف (وتوضیح) نہیں کی جاتی، مطلق جبر کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا اور آزادی کی خاص مقدار موجود رہتی ہے۔

(2) ہم جس فعل کا جائزہ لے رہے ہیں، اس کے ارتکاب اور اس پر محاکمے کے اوقات کے مابین فاصلہ خواہ کتنا ہی زیادہ بڑھا دیں، یہ دورانیہ محدود رہے گا جب کہ وقت غیر محدود ہے، اور چنانچہ اس اعتبار سے بھی مطلق جبر کا کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔

(3) کسی فعل کی وجوہ کے سلسلے تک ہمیں خواہ کتنی ہی رسائی کیوں نہ حاصل ہو جائے، پورے کا پورا سلسلہ کبھی ہماری دسترس میں نہیں آسکے گا کیونکہ یہ غیر مختتم ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر ہم مطلق جبر کا تصور قائم نہیں کر سکتے۔

علاوہ ازیں مابقا خود مختاری کو گھٹا کر صفر کے برابر لانے کے بعد، ہم بعض صورتوں میں ـــ مثلاً لب مرگ آدمی، بچہ در رحم مادر یا ضعیف العقل شخص ـــ خود مختاری کی کامل عدم موجودگی کو تسلیم کر بھی لیں، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم انسان کے تصور ہی کو، جس کا ہم جائزہ لے رہے ہیں، ملیامیٹ کر دیں گے کیونکہ اگر خود مختاری کا کوئی وجود نہیں، پھر انسان کا بھی کوئی وجود نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کسی ایسے شخص کا تصور جو کاملاً قانون جبر کے تابع ہو اور جسے مطلق کوئی آزادی حاصل نہ ہو، اتنا ہی ناممکن ہے جتنا کہ کامل طور پر آزاد آدمی کا تصور۔

چنانچہ ایسے انسانی فعل کا، جو سراسر قانونِ جبر کے تابع ہو اور جس میں آزادی کا شائبہ تک نہ پایا جاتا ہو، تصور کرنے کے لیے ہمیں یہ فرض کرنا پڑے گا کہ ہمیں فضائے بسیط کے لامتناہی حالات، وقت کے لامتناہی دورانیے اور وجوہات کے لامتناہی سلسلے کا علم ہے۔

کسی ایسے آدمی کا، جو مطلقاً آزاد ہو اور قانونِ جبر کے تابع نہ ہو، تصور کرنے کے لیے ہمیں یہ تصور کرنا پڑے گا کہ یہ شخص بالکل تنہا ہے اور زمان و مکان اور وجوہ کی قیود سے آزاد ہے۔

پہلی صورت میں اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ خود مختاری کے بغیر جبر کا وجود ہو سکتا ہے، تو ہمارے لیے جبر کی تعریف خود قانونِ جبر سے کرنا ممکن ہوتا۔ یعنی مواد کے بغیر محض ہیئت کا تصور کیا جا سکتا۔

دوسری صورت میں اگر جبر کے بغیر خود مختاری کا وجود ہو سکتا تو ہم زمان و مکان اور وجوہ کی قیود سے ماورا خود مختاری کا تصور کر سکتے اور چونکہ یہ غیر مشروط اور لامحدود ہوتی، اس لیے فی نفسہ یہ لاشے ہوتی یعنی ہیئت کے بغیر محض مواد ہوتی۔

عمومی اعتبار سے ہم پھر ان دو مبادیات تک پہنچ جاتے — زندگی کے ناقابل تفہیم جوہر اور اس جوہر کی تعریف کرنے والے قوانین — جن پر کائنات کے بارے میں انسان کے سارے نقطۂ نظر کی تشکیل ہوتی ہے۔

عقل کہتی ہے کہ 1- فضائے بسیط (سپیس) مادے کی تمام شکلوں کے ساتھ، جو اسے مرئی بناتے ہیں، لامتناہی ہے، اس کے علاوہ اس کا اور کوئی تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ 2- وقت ایک لمحے کے توقف کے بغیر بتدریج آگے ہی آگے بڑھتا رہتا ہے، اس کے علاوہ اس کا اور کوئی تصور ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ 3- علت و معلول کے مابین تعلق کی نہ کوئی ابتدا ہے اور نہ کوئی انتہا۔

شعور کہتا ہے: 1- صرف میں ہی میں ہوں اور باقی جو کچھ موجود ہے، وہ صرف میں ہے، لہٰذا میں میں تمام فضائے بسیط شامل ہے۔ 2- میں رواں وقت کو حال کے ثابت (fixed) لمحے سے ماپتا ہوں، صرف اسی لمحے میں مجھے یہ آگہی ہوتی ہے کہ میں زندہ ہوں، لہٰذا میں وقت (زمان) سے ماورا ہوں۔ 3- میں علت (وجہ) سے آزاد ہوں کیونکہ میں اپنے آپ کو اپنی زندگی کے ہر تظاہر کی علت سمجھتا ہوں۔

عقل جبر کے قوانین بیان کرتی ہے۔ شعور خود اختیاری کی حقیقت کا اظہار کرتا ہے۔

آزادی، جس پر کوئی چیز قدغن نہیں لگاتی اور نہ اسے محدود کرتی ہے، وہ شے ہے، جس کی جانچ پرکھ کی جاتی ہے اور جبر وہ شے ہے جو جانچ پرکھ کرتی ہے۔ آزادی مواد ہے، جبر ہیئت ہے۔

وقوف کے دونوں ذرائع کو، جو آپس میں مواد اور ہیئت کی طرح منسلک ہیں، ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کے بعد ہی ہم آزادی اور جبر کے ان تصورات تک پہنچتے ہیں جن میں وہ دونوں باہمی طور پر ایک دوسرے سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے اور علیحدہ علیحدہ ہونے کے سبب ناقابل فہم بن جاتے ہیں۔

ان دونوں کو صرف یک جا کرنے کے بعد ہی ہمیں انسان کی زندگی کا واضح تصور ملتا ہے۔

ان دونوں تصورات سے، جو اپنے امتزاج سے باہمی طور پر ایک دوسرے کی ہیئت اور مواد کی حیثیت سے تعریف (وتوضیح) کرتے ہیں، علیحدہ زندگی کا کوئی تصور ممکن نہیں۔

ہمیں انسانی زندگی کے بارے میں جو کچھ معلوم ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اختیار کا جبر کے ساتھ یعنی شعور کا عقل کے قوانین کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔

ہمیں فطرت کی خارجی دنیا کے متعلق جو کچھ معلوم ہے، وہ محض یہ ہے کہ فطرت کی قوتوں کا جبر کے ساتھ یعنی

زندگی کے جوہر کا عقل کے قوانین کے ساتھ کوئی خاص تعلق ہے۔

فطرت کی عظیم طاقتیں ہمارے دائرے سے باہر ہیں اور ہمیں ان کا شعور نہیں ہے۔ ہم ان طاقتوں کو کششِ ثقل، جمود (inertia)، برق، غریزی قوت (vital force) وغیرہ کہتے ہیں لیکن انسان میں ہمیں زندگی کی طاقت کا شعور ہے اور ہم اسے خود اختیاری کہتے ہیں۔

لیکن جس طرح ہم کششِ ثقل کی طاقت کو، جو فی نفسہ نا قابل تفہیم ہے لیکن محسوس ہر شخص کو ہوتی ہے، صرف اس حد تک سمجھ سکتے ہیں جس حد تک ہم قوانین جبر کو، جن کے یہ تابع ہے، سمجھتے ہیں (ہمارا یہ علم اس ابتدائی دریافت سے کہ تمام اجسام کا وزن ہوتا ہے، نیوٹن کے قوانین تک محدود ہے)، اسی طرح خود اختیاری کی طاقت، جو فی نفسہ نا قابل تفہیم ہے لیکن جس سے آگاہ ہر کوئی ہے، صرف اس حد تک ہمارے لیے قابلِ ادراک ہے جس حد تک ہمیں قوانین جبر کا علم ہے جس کے یہ تابع ہے (اور ہمارا یہ علم اس حقیقت سے شروع ہوتا ہے کہ ہر شخص کو موت آتی ہے اور وہ معاشیات اور تاریخ کے انتہائی پیچیدہ قوانین تک جا پہنچتا ہے)۔

سارا علم زندگی کے جوہر (essence) کو محض عقل کے قوانین کے تحت لانے کا نام ہے۔

دوسری ہر طاقت سے انسان کی خود اختیاری اس لحاظ سے مختلف ہے کہ انسان کو اس کا براہ راست شعور ہے لیکن عقل کی نگاہوں میں یہ کسی دوسری طاقت سے کسی طرح بھی مختلف نہیں ہے۔ کششِ ثقل، برق یا کیمیائی اِلف (affinity) کی طاقتوں کے مابین جو امتیاز کیا جاتا ہے، وہ اس لیے کیا جاتا ہے کیونکہ عقل ان کی الگ الگ تعریف (وتوضیح) کرتی ہے۔ اسی طرح عقل انسان کی خود اختیاری کی طاقت اور فطرت کی دوسری طاقتوں کے مابین جو حدِ فاصل کھینچتی ہے، وہ اس تعریف سے متعین ہوتی ہے جو عقل اس کی کرتی ہے۔ خود اختیاری، جس کا جبر سے کوئی تعلق نہ ہو یعنی جس کا عقل کے قوانین سے، جو اس کی تعریف (وتوضیح) کرتے ہیں، کوئی نسبت نہ ہو، کسی اعتبار سے بھی کششِ ثقل، حرارت یا اس طاقت سے، جو چیزیں اگاتی ہے، مختلف نہیں ہے — کیونکہ زندگی کا محض لمحاتی، نا قابل تعریف تجس (sensation) ہے۔

جس طرح اس طاقت کا، جو اجسامِ فلکی کو متحرک رکھتی ہے، نا قابل تعریف جوہر، اور حرارت و برق یا کیمیائی اِلف کی طاقتوں یا غریزی طاقت کا نا قابل تعریف جوہر، فلکیات، فزکس، کیمسٹری، نباتیات اور حیوانیات وغیرہ کا موضوع تشکیل کرتا ہے، اسی طرح خود اختیاری کی طاقت کا جوہر تاریخ کا مواد تشکیل کرتا ہے۔ لیکن جس طرح ہر علم (سائنس) یہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے کہ زندگی کا جوہر کس کس طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے، جب کہ فی نفسہٖ جوہر صرف مابعد الطبیعیات کا موضوع بن سکتا ہے، اسی طرح تاریخ یہ جائزہ لیتی ہے کہ انسان کی خود اختیاری کی طاقت زمان و مکان کی متعین کردہ حدود کے اندر رہتے اور علت پر انحصار کرتے کس کس طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے جب کہ فی نفسہٖ خود اختیاری مابعد الطبیعیات کا موضوع ہے۔

تجرباتی علوم کی وساطت سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوتا ہے، ہم اسے قوانینِ جبر کہتے ہیں۔ جو ہمیں معلوم نہیں

ہوتا اسے ہم غریزی طاقت (vital force) کا نام دیتے ہیں۔ زندگی کا جوہر کیا ہے؟ کچھ تو ہمیں معلوم ہے لیکن کچھ ہمیں معلوم نہیں ہے۔ غریزی طاقت اس نامعلوم بقایا کا اظہار ہے۔

یہی حال تاریخ کا ہے۔ جو کچھ ہمیں معلوم ہو جاتا ہے، اسے ہم قوانینِ جبر کہہ دیتے ہیں اور جو ہمیں معلوم نہیں ہوتا، اسے ہم خود اختیاری قرار دے دیتے ہیں۔ تاریخ کے نزدیک خود اختیاری محض ایک ایسا لفظ ہے جس کا مفہوم انسانی زندگی کے وہ قوانین ہیں جنھیں ہم نہیں جانتے۔

11

تاریخ یہ جائزہ لیتی ہے کہ انسان کی خود اختیاری زمان و مکان کی حدود کے اندر رہتے اور علت پر انحصار کرتے کس کس طرح اپنے آپ کو ظاہر کرتی ہے، بہ الفاظ دیگر یہ اس آزادی کی تعریف (وتوضیح) عقل کے قوانین کے ذریعے کرتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسی حد تک علم (سائنس) ہے جس حد تک یہ خود اختیاری ان قوانین سے متعین ہوتی ہے۔

انسان کی خود اختیاری کو ایک ایسی طاقت تسلیم کرنا، جو واقعات پر اثر انداز ہونے کی اہلیت سے بہرہ ور ہو، یعنی قوانین کے تابع نہ ہو، تاریخ کے لیے وہی بات ہوگی جیسے فلکیات میں یہ تسلیم کر لیا جائے کہ کوئی آزاد طاقت اجرام فلکی کو متحرک کر رہی ہے۔

اس قسم کا مفروضہ قوانین یعنی کسی بھی قسم کی سائنس کے وجود کے امکان کو تلپٹ کر دے گا۔ اگر آزادانہ حرکت کرنے والا ایک بھی جسم موجود ہے، پھر کیپلر[43] اور نیوٹن[44] کے قوانین کی نفی ہو جاتی ہے اور اجرام فلکی کی حرکت کا کوئی تصور باقی نہیں رہ جاتا۔ اگر ایک بھی ایسا فعل، جو خود اختیاری کا نتیجہ تھا، موجود ہے، پھر کسی بھی تاریخی قانون کا وجود نہیں ہو سکتا اور نہ تاریخی واقعات کا کوئی تصور قائم کیا جا سکتا ہے۔

تاریخ کا واسطہ انسانی منشا کی حرکت کے خطوط سے ہے۔ ان خطوط کا ایک سرا نامعلوم میں مستور ہے، جب کہ دوسرے سرے پر یہ شعور ہے کہ انسان کی خود اختیاری زمانہ حال میں عمل پذیر ہوتی ہے، یہ زمان و مکان میں مقید ہوتی ہے اور اس کے روبہ عمل ہونے کا انحصار علت پر ہوتا ہے۔

حرکت کا یہ میدان ہماری نگاہوں کے سامنے جتنا زیادہ پھیلتا جاتا ہے، حرکت کے قوانین اتنے ہی زیادہ واضح ہوتے جاتے ہیں۔ ان قوانین کو دریافت کرنا اور ان کی تعریف (وتوضیح) کرنا تاریخ کا مسئلہ ہے۔

جس نقطہ نظر سے علم تاریخ اب اپنے موضوع کا مطالعہ کرتا ہے ــ وہ واقعات و مظاہر کی وجوہ خود اختیاری میں تلاش کرتا ہے ــ اس کی مدد سے ان قوانین کی سائنسی تشکیل ناممکن کام ہے، کیونکہ انسان کی خود اختیاری کو خواہ کتنا ہی محدود کر دیا جائے، جونہی ہم اسے ایک ایسی طاقت کی، جو کسی قانون کی تابع نہیں ہے، حیثیت سے تسلیم کرتے ہیں، قانون کا وجود ناممکن ہو جاتا ہے۔

خود اختیاری کے اس عنصر کو اتنا کم کرنے، اتنا کم کرنے کہ صرف خفیف ترین مقدار ہی باقی رہ جائے، یعنی

اسے بے حد و حساب چھوٹی مقدار تصور کرنے کے بعد ہی ہم اپنے آپ کو یہ یقین دلا سکیں گے کہ وجوہات مطلقاً ناقابل حصول ہیں اور پھر وجوہات تلاش کرنے کی بجائے تاریخ تاریخی قوانین کی دریافت اپنا مسئلہ بنا لے گی۔

ان قوانین کی تلاش مدتوں پہلے شروع ہو گئی تھی۔ فکر کے نئے اسالیب، جنھیں تاریخ کو لازماً اپنانا چاہیے، وضع کیے جا رہے ہیں۔ اس کے ساتھ خود تباہی کا عمل بھی جاری ہے۔ پرانی قسم کی تاریخ جو سدا واقعات کی وجوہ کی چیڑ پھاڑ کرتی اور انھیں مختلف اجزاء میں منقسم کرتی رہی ہے، اب اس خود تباہی کی طرف مائل ہو رہی ہے۔

تمام انسانی علوم نے یہی راستہ اختیار کیا ہے۔ تمام علوم میں صحیح ترین علم، ریاضی، نے انتہائی چھوٹی مقداروں تک پہنچنے کے بعد تقطیع کا یہ عمل ترک کر دیا ہے اور اب اس نے نامعلوم، انتہائی چھوٹی مقداروں کو سالم مقداروں میں تبدیل کرنے کا عمل شروع کر دیا ہے۔ تسبیب کا تصور ترک کرنے کے بعد ریاضی قوانین، یعنی خفیف ترین عناصر کے مشترکہ اوصاف، تلاش کرنے لگی ہے۔

دوسرے علوم بھی غور و فکر کا یہی راستہ، اگرچہ اس کی شکل مختلف ہے، اختیار کر رہے ہیں۔ نیوٹن نے جب کششِ ثقل کا قانون مدوّن کیا، اس نے یہ نہیں کہا کہ سورج یا زمین میں کشش کا وصف پایا جاتا ہے۔ اس نے صرف یہ کہا کہ بڑے سے بڑے اجسام سے لے کر چھوٹے سے چھوٹے اجسام تک کا وصف یہ ہے کہ وہ ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچتے ہیں یعنی اس نے اس سوال کو کہ اجسام حرکت کیوں کرتے ہیں، اٹھا کر ایک طرف رکھ دیا اور بے انتہا بڑے جسم سے لے کر انتہائی چھوٹے جسم تک میں جو مشترکہ وصف پایا جاتا ہے، اسے بیان کر دیا۔ طبعی علوم یہی کچھ کرتے ہیں یعنی وہ تسبیب کے چکر میں نہیں پڑتے، صرف قوانین تلاش کرتے ہیں۔ تاریخ بھی اسی راستے پر چل پڑی ہے۔ اگر تاریخ کا موضوع اقوام اور بنی نوع انسان کی زندگی ہے، افراد کی زندگیوں کے واقعات کا بیان نہیں، اسے بھی تسبیب کے تصور کو اٹھا کر ایک طرف رکھنا اور ایسے قوانین کو، جو خود اختیاری کے مساوی اور غیر منفک طور پر ایک دوسرے سے مربوط انتہائی چھوٹے عناصر میں مشترک طور پر موجود ہیں، تلاش کرنا ہو گا۔

12

جونہی کوپرنیکس[45] کا قانون دریافت اور ثابت ہو گیا، محض اس حقیقت کے اعتراف سے کہ گھومتی زمین ہے، سورج نہیں، قدما نے اپنے اذہان میں کائنات کا جو نقشہ ترتیب دیا تھا، وہ اسی وقت ملیامیٹ ہو گیا۔

اگر اس قانون کو غلط ثابت کر دیا جاتا، اجسام کی حرکت کے بارے میں پرانے تصورات کو برقرار رکھنا شاید ممکن ہوتا۔ لیکن اس کو غلط ثابت کیے بغیر بطلیموسی[46] دنیاؤں کا مطالعہ جاری رکھنا ناممکن معلوم ہوتا۔ تاہم کوپرنیکس کے قانون کی دریافت کے بعد بھی بطلیموسی دنیاؤں کا مطالعہ کافی مدت جاری رہا۔

جونہی کسی شخص نے یہ کہا اور ثابت کر دکھایا کہ پیدائش یا جرائم کی شرح ریاضیاتی قوانین کے تابع ہے، یا حکومت کی یہ یا وہ شکل مخصوص جغرافیائی، سیاسی یا معاشی حالات متعین کرتے ہیں، یا دھرتی کے ساتھ اس کے

باسیوں کے مخصوص تعلقات اقوام کے ترک سکونت کا باعث بنتے ہیں۔ اسی وقت وہ اساسات، جن پر تاریخ کی عمارت کھڑی کی گئی تھی، اصلاً منہدم ہو گئیں۔

ان نئے قوانین کو غلط ثابت کر کے تاریخ کا سابقہ نقطہ نظر برقرار رکھنا شاید ممکن ہوتا، لیکن جب تک انھیں غلط ثابت نہیں کیا جاتا، تاریخی واقعات کا اس طرح مطالعہ جاری رکھنا جیسے وہ کسی شخص کی خود اختیاری کی من مانی پیداوار ہوں، ناممکن معلوم ہوگا۔ کیونکہ اگر بعض جغرافیائی، نسلی، ثقافتی یا معاشی حالات کے نتیجے کے طور پر فلاں یا فلاں قسم کی حکومت قائم ہو گئی یا بعض اقوام کی ترک سکونت عمل میں آئی، پھر ان اشخاص کی، جنھیں بظاہر اس طرح کی حکومت کے قیام یا ترک سکونت کا باعث بنا کر پیش کیا جاتا ہے، خود اختیاری کو ان واقعات کا سبب نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

اس کے باوجود شماریات، جغرافیے، معاشیات، تقابلی لسانیات اور ارضیات کے قوانین کے پہلو بہ پہلو قدیم تاریخ کا مطالعہ جاری ہے حالانکہ یہ قوانین ان اصولوں کی، جن پر یہ (قدیم تاریخ) کاربند ہے، تکذیب کرتے ہیں۔

طبعی علوم میں جدید اور قدیم تصورات کے مابین تصادم کافی مدت تک اور بڑی ڈھٹائی سے جاری رکھا گیا۔ دینیات پرانے نظریات کی پاسبان تھی اور وہ نئے نظریات کے علم برداروں کو الزام دیتی تھی کہ وہ مکاشفہ کی پائمالی کے مرتکب ہو رہے ہیں، لیکن جب صداقت نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے، دینیات نے پہلے کی طرح نئی زمین پر اپنی عمارت استوار کر لی۔

تاریخ کے جدید اور قدیم تصورات کے مابین کشمکش بھی خاصے طویل عرصے سے جاری ہے اور فریقین میں سے کوئی بھی اپنے موقف سے ایک انچ پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہے۔ یہاں بھی دینیات اسی انداز سے قدیم نظریات کی پاس داری کر رہی ہے اور جدید نظریات کے علم برداروں پر مکاشفہ کو پامال کرنے کا الزام لگا رہی ہے۔

دونوں صورتوں میں اور دونوں اطراف یہ کشمکش جذبات مشتعل کرتی ہے اور صداقت کا گلا گھونٹتی ہے۔ ایک فریق کو یہ اندیشہ اور خوف لاحق ہو رہا ہے کہ وہ عمارت جو صدیوں میں تعمیر کی گئی تھی، وہ ڈھے رہی ہے جب کہ دوسرے فریق کے سر میں تباہی کا سودا سمایا ہوا ہے۔

ان لوگوں کو، جو طبعی علوم کی ابھرتی ہوئی صداقتوں کے خلاف محاذ بنائے ہوئے تھے، یہ محسوس ہوتا تھا کہ اگر انھوں نے ان صداقتوں کو تسلیم کر لیا، ان کا خدا، تخلیقِ کائنات اور نون کے بیٹے یشوعؑ[47] کے معجزے پر ایمان تہس نہس ہو جائے گا۔ جہاں تک کوپرنیکس اور نیوٹن کے حامیوں کا ۔ مثلاً والتیر ۔ تعلق ہے، ان کا خیال تھا کہ فلکیات کے قوانین نے مذہب کا خاتمہ کر دیا ہے اور اس (والتیر) نے کششِ ثقل کے قانون کو مذہب کے خلاف بطور ہتھیار استعمال کیا۔

بالکل اسی طرح اب یوں نظر آتا ہے کہ ہمارے بس قانونِ جبر کو تسلیم کرنے کی دیر ہے اور روح، نیکی و بدی کے تصورات، مملکتی اور کلیسائی ادارے، جنھیں ان تصورات پر تعمیر کیا گیا ہے، زمین بوس ہو جائیں گے۔

جس طرح والتیر نے اپنے زمانے میں کیا تھا، آج قانونِ جبر کے خواہ مخواہ کے حمایتی اس قانون کو مذہب کے

خلاف بطور ہتھیار استعمال کرتے ہیں حالانکہ کوپر نیکس کے فلکیاتی قانون کی طرح تاریخ کا قانونِ جبر کلیسائی اور مملکتی اداروں کو تباہ نہیں کرتا (یہ محض واہمہ ہے)، بلکہ ان بنیادوں کو، جن پر یہ ادارے قائم ہیں، زیادہ مضبوط بناتا ہے۔

جیسا کہ فلکیات کے مسئلے کے ساتھ تب ہوا، ایسے ہی تاریخ کے مسئلے کے بارے میں جو اختلاف رائے پایا جاتا ہے، اس کی اساس اس مطلق اکائی کے، جو مرئی مظاہر کو ماپنے کے لیے پیمانے کا کام دیتی ہے، تسلیم کرنے یا نہ کرنے پر ہے۔ فلکیات میں یہ معیاری پیمانہ زمین کی غیر حرکت پذیری تھی اور تاریخ میں یہ فرد کی آزادی۔ خود اختیاری — ہے۔

جیسا کہ فلکیات میں ہوا، زمین کی حرکت کو تسلیم کرنے میں جو دشواری پیش آ رہی تھی، وہ یہ تھی کہ زمین کو ساکن اور سیاروں کو متحرک تسلیم کرنے سے ذہن میں جو احساس تفاخر پیدا ہوتا تھا، اس سے دست بردار ہونا پڑتا تھا، اسی طرح تاریخ میں یہ تسلیم کرنا کہ فرد زمان و مکان اور تعلیل کے قوانین کے تابع ہے، اس چیز کے مترادف ہے کہ آدمی کو اپنی شخصیت کے آزاد ہونے کا جو بے ساختہ احساس ہوتا ہے، وہ اس سے دست بردار ہو گیا ہے۔ لیکن جس طرح فلکیات کے نئے نقطۂ نظر نے کہا: ''یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں زمین کی حرکت محسوس نہیں ہوتی لیکن اسے بے حرکت تسلیم کر کے ہم بالکل احمقانہ نتائج اخذ کرنے کے مرتکب ہوں گے، تاہم اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ یہ حرکت (جو ہمیں محسوس نہیں ہوتی) موجود ہے، تو ہم قوانین تک پہنچ جائیں گے۔'' اسی طرح تاریخ کا جدید نقطۂ نظر کہتا ہے: ''یہ ٹھیک ہے کہ ہمیں اپنی متابعت محسوس نہیں ہوتی لیکن اگر ہم یہ تسلیم کر لیں کہ ہم آزاد ہیں، ہم محض احمقانہ نتائج اخذ کریں گے، تاہم اگر ہم یہ اعتراف کر لیں کہ ہم خارجی دنیا، زمان و مکان اور تعلیل کے تابع ہیں، ہماری قوانین تک رسائی ہو جائے گی۔''

پہلی صورت میں فضائے بسیط میں غیر حقیقی ناحرکتی کے تحسس سے دست برداری اختیار کرنا پڑتی تھی اور ایسی حرکت کو، جو ہمیں محسوس نہیں ہوتی، تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ بعینہٖ موجودہ معاملے میں یہ ضروری ہے کہ ہم اس آزادی کے، جو موجود نہیں، تصور سے دست بردار ہو جائیں اور اس متابعت کا، جس کا ہمیں شعور نہیں، اقرار کر لیں۔

ضمیمہ

''جنگ اور امن'' کے متعلق چند باتیں

(طالسطائی کا یہ مضمون 1868 میں ایک جریدے ''رشین آرکائیوز'' میں شائع ہوا تھا۔)

اس کتاب کی، جس پر میں نے زندگی کے بہترین حالات میں پانچ سال مسلسل اور غیر معمولی طور پر سخت محنت کی ہے، اشاعت پر میں اس کے متعلق اپنا نقطۂ نظر بیان کرنا اور اس طرح ان غلط فہمیوں کا، جو قاری کے ذہن میں پیدا ہوسکتی ہیں، ازالہ کرنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ اس کتاب کے قارئین کو اس میں کوئی ایسی بات نظر آئے یا وہ اس میں کوئی ایسی بات تلاش کریں جو میں کہنا نہیں چاہتا تھا یا جسے میں کہنے سے قاصر رہا ہوں اور میں ان کی توجہ اس چیز کی طرف، جو میں کہنا تو چاہتا تھا لیکن کتاب کے تقاضوں کے پیش نظر پوری شرح وبسط سے بیان نہ کرسکا، مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ نہ تو میرے پاس اتنا وقت تھا اور نہ مجھ میں اتنی صلاحیت تھی کہ جس بات کا میں نے بیڑا اٹھایا تھا، اس کا میں پوری طرح احاطہ کرسکتا، اور اب میں ایک تخصیصی جریدے کی مہمان نوازی کا فائدہ اٹھا کر ان لوگوں کے سامنے، جنھیں اس میں کوئی دلچسپی ہوسکتی ہے، مصنف کا نقطۂ نظر (اگرچہ وہ مختصر اور نامکمل ہے) پیش کررہا ہوں۔

(1) ''جنگ اور امن کیا ہے؟ (رسمی معنوں میں) نہ تو یہ ناول ہے اور نہ نظم، اور یہ تاریخی وقائع نگاری تو بالکل ہی نہیں ہے۔ ''جنگ اور امن'' وہی کچھ ہے جسے مصنف اس شکل میں، جس میں اسے بیان کیا گیا ہے، بیان کرنا چاہتا تھا اور بیان کرنے کے قابل ہوا۔ فنی تخلیق میں روایتی ہیئت سے اغماض برتنے کے متعلق اس قسم کا اعلان، اگر یہ پیشگی سوچا سمجھا نہ ہوتا یا اس طرح کی کوئی نظیر موجود نہ ہوتی، من مانا معلوم ہوتا۔ لیکن پوشکن کے زمانے سے روسی ادب کی تاریخ یورپی اصناف سے انحراف کی نہ صرف متعدد مثالیں فراہم کرتی ہے، بلکہ اس کے متضاد ایک بھی مثال پیش نہیں کرتی۔ گوگول کی ''بے جان روحیں'' (Dead Souls) سے دستوئیفسکی کے ''مُردوں کا مسکن'' (House of the Dead) تک اوسط درجے سے بلند ایک بھی فنی نثر پارہ ایسا نہیں ملے گا جس پر ناول، ایپک یا افسانے کی صنف کا موزوں انداز سے اطلاق کیا جاسکتا ہو۔

(2) عہد کی خصوصیات: جب اس کتاب کا پہلا حصہ اشاعت پذیر ہوا، میرے بعض قارئین نے مجھے بتایا کہ یہ اس میں واضح انداز سے بیان نہیں ہوئیں۔ اس سرزنش کا میرا جواب یہ ہے: لوگوں کو میرے ناول میں عہد کی جو خصوصیات — زرعی غلامی کی ہولناکیاں، بیویوں کے چار دیواری سے باہر نکلنے پر پابندی، بالغ بیٹوں کی کوڑوں سے پٹائی، سالتی کووا[1]، وغیرہ وغیرہ — نظر نہیں آئیں، مجھے ان کا بخوبی علم ہے۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ عہد کی یہ خصوصیات، جو جس طرح ہمارے تخیلات میں موجود ہیں، اس طرح درست ہیں اور میں انھیں دہرانا نہیں چاہتا۔ خطوط، روزنامچوں اور روایات کا مطالعہ کرنے کے بعد مجھے اس قسم کی سفاکیاں، چیرہ دستیاں اور ہولناکیاں ان سے زیادہ نہیں ملیں جو ہمیں آج یا کسی دوسرے دور میں ملتی ہیں۔ اس زمانے میں بھی لوگ ایک دوسرے سے محبت کرتے اور خار کھاتے تھے، صداقت اور خیر کی جستجو کرتے تھے، جذبات کی رو میں بہتے تھے، اور اونچے طبقوں کے لوگ اسی قسم کی پیچیدہ ذہنی اور اخلاقی زندگی بسر کرتے تھے جس طرح کی وہ آج کل کرتے ہیں بلکہ ان میں سے بعض کا طرز حیات آج کے لوگوں سے بھی زیادہ شستہ اور مہذب تھا۔ اگر ہمیں اس عہد کی کج رویوں اور بھونڈے تشدد پر یقین آنے لگا ہے، تو اس کی وجہ محض یہ ہے کہ اس زمانے کی جو روایات، یادداشتیں، کہانیاں اور ناول ہمیں منتقل ہوئے ہیں، زیادہ تر تشدد اور سفاکانہ رویوں کی غیر معمولی صورتوں کا اندراج کرتے ہیں۔ یہ مفروضہ قائم کر لینا کہ اس عہد کی بالادست خصوصیت مفسدہ پردازی تھی، اتنا ہی خلاف انصاف ہے جتنا اس شخص کا، جسے پہاڑی کے پار دیکھتے ہوئے درختوں کی چوٹیوں کے علاوہ اور کچھ نظر نہ آئے، یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ اس علاقے میں درختوں کے ماسوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ اس عہد کی (جیسا کہ ہر دور کے ساتھ ہوتا ہے) اپنی خصوصیات تھیں اور یہ خصوصیات بالائی طبقے کی دوسرے طبقوں کے ساتھ زبردست مغائرت، اس زمانے کے مذہبی فلسفے، تعلیمی بوالعجبیوں، فرانسیسی زبان استعمال کرنے کی عادت اور اسی نوع کی دیگر باتوں کا نتیجہ تھیں۔ یہی وہ خصوصیات ہیں جنھیں میں نے مقدور بھر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

(3) روسی کتاب میں فرانسیسی زبان کا استعمال: میری کتاب میں روسی اور فرانسیسی دونوں ہی بعض اوقات روسی اور بعض اوقات فرانسیسی کیوں بولتے ہیں؟ روسی کتاب میں لوگوں کو فرانسیسی بولتے اور لکھتے دیکھ کر سرزنش کرنا ایسے ہی ہے جیسے کوئی شخص تصویری خاکے (پورٹریٹ) میں سیاہ دھبے (سائے)، جو فطرت میں موجود نہیں ہوتے، دیکھ کر مصور پر لعن طعن کرنے لگے۔ مصور نے تصویری خاکے پر جو سایہ ابھارا ہے، اگر بعض لوگوں کو وہ سیاہ دھبے نظر آتے ہیں تو اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اسے صرف تبھی قصوروار ٹھہرایا جا سکے گا اگر وہ یہ سایہ غلط یا گھٹیا انداز سے ابھارتا ہے۔ انیسویں صدی کے ابتدائی سالوں کا تذکرہ کرتے اور ایک خاص طبقے کے روسیوں، نپولین اور بعض دوسرے فرانسیسیوں کی، جن کا اس عہد کی زندگی میں اتنا براہ راست حصہ تھا، کردار نگاری کرتے ہوئے میں غیر ارادی طور پر کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گیا اور یہ لوگ جس انداز سے

اپنے فرانسیسی طرزِ فکر کا اظہار کرتے تھے، اسے جوں کا توں رقم کر دیا۔ چنانچہ اس بات سے انکار کیے بغیر کہ میں نے مُوقلم سے جو سیاہ نشان لگائے ہیں، غالباً غیر صحیح اور بھونڈے ہیں، میں ان لوگوں سے، جنھیں نپولین کبھی فرانسیسی اور کبھی روسی بولتے احمق معلوم ہوتا ہے، صرف اتنا عرض کروں گا کہ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کریں کہ انھیں یہ بات محض اس لیے احمقانہ نظر آتی ہے کہ اس شخص کی طرح، جو پورٹریٹ دیکھ رہا ہے، انھوں نے بھی سارا چہرہ، جس پر روشنیاں اور سائے دونوں موجود ہیں، دیکھنے کی بجائے، ناک کے نیچے سیاہ نشان ڈھونڈ نکالا ہے۔

(4) کتاب میں اشخاص کے نام: بلکونسکی، دروبتیسکوئے، بلبین، کوراگن اور دیگر نام جانے پہچانے روسی نام معلوم ہوتے ہیں۔ جب میں داستانی کرداروں کا تاریخی کرداروں سے آمنا سامنا کرا رہا تھا، مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں نے کسی کاؤنٹ رستوپ چن کو کسی پرنس پرانسکی، ستریلیسکی یا اس قسم کے دیگر فرضی ناموں والے پرنسوں اور کاؤنٹوں سے ہم کلام ہوتے دکھایا، تو یہ نام کانوں کو بھلے معلوم نہیں ہوں گے۔ اگرچہ بلکونسکی یا دروبتیسکوئے ولکونسکی یا تروبتیسکوئے نہیں ہیں لیکن ان ناموں کی آوازیں روسی امرا کے طبقے میں جانی پہچانی اور قدرتی معلوم ہوتی ہیں۔ میں اپنے تمام کرداروں کے لیے بزوخوف اور رستوف جیسے نام، جو سننے میں اجنبی اور غلط محسوس نہیں ہوتے، گھڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکا اور اس مشکل پر قابو پانے کے لیے مجھے اس کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نظر نہ آیا کہ میں ایسے نام، جن سے روسی کان صحیح معنوں میں آشنا ہیں، انکل پچولوں اور ان کے چند حروف تبدیل کر دوں۔ میرے گھڑے ہوئے اور اصل ناموں کے مابین جو مشابہت پائی جاتی ہے، اسے دیکھ کر اگر کسی شخص کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ میں فلاں یا فلاں اصل شخص کا تذکرہ کرنا چاہتا تھا، تو مجھے بہت افسوس ہوگا اور مجھے یہ افسوس خاص طور پر اس لیے بھی ہوگا کیونکہ اس ادبی فعالیت میں، جو اصلی اشخاص کی، جو اس دنیا میں موجود ہیں یا موجود رہے ہیں، خاکہ کشی پر مشتمل ہے اور اس فعالیت میں، جس میں میرا وقت گزرا، کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔

ماریا دمتریونا آخروسیموا اور دینی سوف واحد کردار ہیں جنھیں میں نے غیر ارادی طور پر اور بلا سوچے سمجھے وہ نام دے دیے جو اس عہد کے دو خاص طور پر نمایاں اور پرکشش اشخاص کے ناموں سے مشابہ تھے۔ یہ میری غلطی تھی اور اس کا باعث ان دونوں ہستیوں کا اپنا مخصوص کردار بنا، تاہم میری یہ غلطی ان کے محض تعارف تک محدود ہے اور میرے قارئین غالباً مجھ سے اتفاق کریں گے کہ ناول میں ان کی شخصیتوں کے ساتھ جو کچھ منسوب کیا گیا ہے، اس کی ان کی زندگی کے اصل حقائق سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ جہاں تک باقی کرداروں کا تعلق ہے، وہ تمام تر ایجادِ بندہ ہیں اور جہاں تک میرا تعلق ہے، میرے لیے ان کا روایتاً یا حقیقتاً کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔

(5) تاریخی واقعات کے بارے میں میرے اور دوسروں کے بیانات میں اختلاف: یہ اختلافات اتفاقیہ نہیں، بلکہ ناگزیر تھے۔ جب کوئی مورخ اور کوئی فن کار کسی تاریخی عہد کا تذکرہ کرتا ہے، تو اس کے سامنے دو بالکل مختلف

اقسام کے فرائض ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی مورخ، اگر وہ کسی تاریخی شخصیات کو کاملاً پیش کرنے اور زندگی کے مختلف پہلوؤں کے ساتھ اس کے جو تعلقات ہیں، ان کی پیچیدگی کو پوری شرح و بسط سے بیان کرنے کی کوشش کرے گا، تو وہ غلطی کرے گا، اسی طرح اگر فن کار اس شخص کی ہر دم تاریخی اہمیت اجاگر کرنے کی سعی کرتا ہے، تو وہ اپنا فرض نبھانے میں ناکام رہے گا۔ کوتوزوف ہمہ وقت دوربین سے مسلح نہیں رہتا تھا، نہ وہ اسے مسلسل دشمن پر گاڑے رکھتا تھا اور نہ وہ ہمیشہ سفید گھوڑے کی پشت پر بیٹھا رہتا تھا۔ رستوپ چن ہمیشہ مشعل سے ورانووسکی ہاؤس[2] کو آگ نہیں لگاتا رہتا تھا (اس نے درحقیقت یہ کام کبھی نہیں کیا تھا) اور امپراطورہ ماریا فیوڈرونا ہر وقت سموری کوٹ پہنے ضابطۂ تعزیرات کی کتاب ہاتھ میں تھامے کھڑی نہیں رہتی تھی لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ عام لوگوں کے تخیل میں ان کی یہی تصاویر جاگزیں ہیں۔

جب مورخ کسی مقصد کے حصول پر غور کرتا ہے، اسے یہ ہیروؤں کا کارنامہ معلوم ہوتا ہے، لیکن فن کار کے نزدیک، جو آدمی کی زندگی کے تمام پہلوؤں کے ساتھ تعلقات کو زیر بحث لاتا ہے، نہ کوئی ہیرو ہو سکتا ہے اور نہ ہونا چاہیے۔

مورخ بعض اوقات صداقت کو مجبوراً توڑ مروڑ دیتا ہے تاکہ وہ تاریخی شخصیات کے اعمال کو اس واحد تصور کے، جو اس نے اس کی ذات کے ساتھ منسوب کیا ہوتا ہے، تابع بنا سکے۔ اس کے برعکس فن کار کو اس تصور کا واحد ہونا اپنے مسئلے کے لیے غیر متناسب معلوم ہوتا ہے اور وہ کسی اداکار کو نہیں بلکہ کسی انسان کو سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

خود واقعات کے بیان میں یہ اختلاف اور بھی نمایاں اور ضروری ہو جاتا ہے۔

مورخ کو واقعے کے نتائج سے جب کہ فنکار کو امرِ واقعہ سے نپٹنا ہوتا ہے۔ جب مورخ کسی لڑائی کا ذکر کرتا ہے، تو وہ کہتا ہے: ''فلاں اور فلاں فوج کا میسرہ فلاں اور فلاں گاؤں پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھایا گیا اور اس نے دشمن کی صفوں کو تہس نہس کر دیا لیکن خود پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا۔ پھر گھڑ سوار فوج نے، جسے حملہ کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا، غنیم کو مغلوب کر لیا...'' وغیرہ وغیرہ۔ لیکن فن کار کے نزدیک یہ الفاظ معانی سے مُعرّیٰ ہیں اور واقعے کی روح تک نہیں پہنچتے۔ فن کار یا تو اپنے تجربے سے یا خطوط، یادداشتوں اور دوسروں کی بیان کردہ تفصیلات کی مدد سے واقعے کا اپنے ذہن میں خاکہ بناتا اور اس کی تفہیم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اکثر اوقات (لڑائی کی مثال لیں) یہ ہوتا ہے کہ فلاں یا فلاں فوج کی کارروائی سے مورخ جو نتائج مستنبط کرتا ہے، وہ فن کار کے اخذ کردہ نتائج کے بالکل برعکس ثابت ہوتے ہیں۔ دونوں کے اخذ کردہ نتائج میں جو بُعد پایا جاتا ہے، اس کی وضاحت ان ماخذوں سے بھی ہو جاتی ہے جن سے وہ استفادہ کرتے ہیں۔ جہاں تک مورخ کا تعلق ہے (لڑائی کی مثال جاری ہے)، اس کا بڑا ماخذ کمانڈر انچیف اور کمانڈنگ افسروں کی رپورٹیں ہوتی ہیں۔ فن کار اس قسم کے ماخذوں سے کچھ حاصل نہیں کر سکتا، وہ اسے کچھ نہیں بتاتے اور نہ اس کے سامنے کسی چیز کی وضاحت کرتے ہیں۔ اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ

فن کار اس لیے ان سے منہ موڑ لیتا ہے کیونکہ ان میں اسے کذب بیانی کی، جو ناگزیر ہوتی ہے، بو آتی ہے۔ اس حقیقت کو تو چھوڑیں کہ لڑائی کے بعد دونوں فریق اسے ایک دوسرے سے تقریباً متضاد انداز سے پیش کرتے ہیں، رزم کے ہر بیان میں جھوٹ کی لازماً آمیزش ہوتی ہے اور اس دروغ گوئی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ لڑائی میں جو لوگ شریک ہوتے ہیں، ان کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے، وہ میلوں لمبے محاذ پر بکھرے ہوتے ہیں اور خوف، شرم اور موت کے اثرات تلے شدید اخلاقی ہیجان کے تابع ہوتے ہیں لیکن ان کے افعال کو بیان چند الفاظ میں کرنا ہوتا ہے۔

لڑائیوں کے تذکروں میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں فلاں افواج کو فلاں فلاں مقامات پر حملہ کرنے کی غرض سے روانہ کیا گیا اور پھر انھیں واپس آنے کا حکم دے دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کے بیانات میں گویا یہ فرض کر لیا جاتا ہے کہ اس نظم وضبط کا، جو پیریڈ گراؤنڈ پر ہزاروں انسانوں کو فرد واحد کے منشا کے تابع بنا دیتا ہے، وہاں بھی وہی اثر ہوگا جہاں مسئلہ زندگی اور موت کا ہوتا ہے۔ جس شخص نے کبھی جنگ میں شرکت کی ہو، وہ خوب جانتا ہے کہ یہ بات کتنی غیر صحیح ہے* اس کے باوجود رپورٹوں کی بنیاد اسی مفروضے کو بنایا جاتا ہے اور انھیں رپورٹوں پر عسکری داستانوں کی عمارتیں کھڑی کر لی جاتی ہیں۔ لڑائی کے فوراً بعد، اس سے اگلے روز یا رپورٹیں تیار کرنے سے ایک دن پہلے فوج کی مختلف یونٹوں کے مابین گھومیں پھریں اور کسی بھی سپاہی اور سینئر یا جونیئر افسر سے پوچھیں کہ حالات کیسے رہے۔ ان لوگوں کو جو کچھ تجربہ ہوا اور انھوں نے جو کچھ دیکھا ہوگا، وہ آپ کو بلا کم وکاست بتا دیا جائے گا۔ ان کی باتیں سن کر آپ کے ذہن میں پر شکوہ، پیچیدہ، بے پایاں طور پر متنوع، افسردہ کن اور غیر واضح تصور پیدا ہوگا اور کسی شخص سے بھی۔ کمانڈر انچیف سے تو سب سے کم۔ آپ کو یہ معلوم نہیں ہو سکے گا کہ سارا معاملہ کیا تھا۔ دو تین روز بعد رپورٹیں جمع کرانے کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ گفتار پسند ایسی ایسی باتیں سنانے لگتے ہیں جو انھوں نے کہیں دیکھی ہوتی ہیں نہ سنی۔ آخر میں ایک عمومی رپورٹ تیار کی جاتی ہے اور اس رپورٹ میں فوج کا عمومی نقطہ نظر تشکیل دیا جاتا ہے۔ ہر شخص اپنے شکوک وشبہات اور اعتراضات کا اس پر فریب لیکن واضح اور دائمی طور پر تعریفی رپورٹ سے تبادلہ کر کے خوش ہو جاتا ہے۔ کسی بھی شخص سے، جو لڑائی میں شریک ہوا ہو، ایک دو ماہ بعد استفسار کریں، اب آپ کو اس کے بیان میں اس خام لیکن اہم مواد کا، جو پہلے اس کی باتوں میں موجود تھا، کوئی نشان نہیں ملے گا۔ اب اس کے جوابات رپورٹ کے مطابق ہوں گے۔ چنانچہ بارودینو کی لڑائی کے بارے میں اس میں شریک جوشیلے اور تیز طرار اشخاص نے جو باتیں مجھے بتائیں وہ ہو بہو یکساں اور ایک جیسی تھیں۔ ان میں اور

* جب میرے ناول کے پہلے حصے میں شیون گرابرن کی لڑائی کی تفصیلات شائع ہوئیں، مجھے کسی شخص نے اس پر نکولائی نولائیوچ موراویف کارسکی کا تبصرہ سنایا۔ کمانڈر انچیف نے اپنے تبصرے (جس سے میرے یقین کی تائید ہوتی ہے) میں کہا تھا: ''میں نے لڑائی کی اس سے زیادہ صحیح تفصیل اور کہیں نہیں پڑھی۔ میں اپنے تجربے کی روشنی میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ لڑائی کے دوران میں کمانڈر انچیف کے احکام کی تعمیل ناممکن ہے۔'' (مصنف کا حاشیہ)

موراویف کارسکی (1866-1794) کی جنگ میں شریک تھا۔ جب 1855-1854 میں طالسطائی کی اس سے ملاقات ہوئی۔ وہ کاکیشیا کا گورنر جنرل اور وہاں کی فوج کا کمانڈر انچیف تھا۔ (مترجم)

میخائیلو وسکی دانی لیوسکی، گلنکا اور دوسرے اشخاص کی تیار کردہ جھوٹی رپورٹوں میں بال برابر فرق نہیں تھا۔ ان کی تفصیلات میں بھی یکسانیت تھی حالانکہ یہ باتیں کرنے والے محاذ جنگ پر ایک دوسرے سے میلوں دور تھے۔

سیبستا پول[3] کے سقوط کے بعد توپ خانے کے کمانڈر کرائی ژانووسکی نے مجھے فصیل شہر کے تمام برجوں پر تعینات افسروں کی رپورٹیں بھیجیں اور حکم دیا کہ میں ان تمام مختلف رپورٹوں (یہ بیس سے زیادہ تھیں) کو پیش نظر رکھ کر جامع رپورٹ تیار کروں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے ان کی نقول نہ بنائیں۔ یہ ان سیدھی سادی، ناگزیر عسکری دروغ گوئیوں کی، جن سے رپورٹیں تیار کی جاتی ہیں، بہترین مثال ہوتیں۔ میرا خیال ہے کہ میرے متعدد رفقا، جنھوں نے یہ رپورٹیں تحریر کی تھیں، ان سطور کو پڑھ کر جب انھیں یہ یاد آئے گا کہ انھوں نے اعلیٰ افسر کے حکم پر وہ کچھ لکھ دیا تھا، جس کا انھیں خود علم نہیں تھا، خوب ہنسیں گے۔ جن لوگوں کو جنگ کا تجربہ ہے، وہ جانتے ہیں کہ روسی جنگ کے دوران میں تو اپنے فرائض بڑی جانفشانی اور اہلیت سے انجام دیتے ہیں لیکن جب معاملہ لاف وگزاف اور دروغ گوئی پر، جو اس مقصد کے لیے ناگزیر ہے، مبنی رپورٹیں لکھنے کا آتا ہے، وہ بالکل پھسڈی رہ جاتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری افواج میں رپورٹیں اور مراسلے تیار کرنے کا کام وہ اشخاص کرتے ہیں جن کی پیدائش غیر ممالک میں ہوئی ہوتی ہے۔

میں یہ سب کچھ یہ ثابت کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں کہ عسکری رُودادوں میں، جو فوجی مورخین کے لیے مواد فراہم کرتی ہیں، دروغ بیانیوں کی آمیزش ناگزیر ہوتی ہے اور اس طرح میں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ تاریخی واقعات کی تفہیم میں فن کاروں اور مورخوں کے مابین جو اکثر اختلافات رونما ہوتے ہیں، ان سے پیچھا کیوں چھڑایا نہیں جا سکتا۔ لیکن تاریخی واقعات کے بیان میں اس لازمی غلطی کے علاوہ مجھے اس عہد کی، جس سے میرا سروکار تھا، تاریخوں میں مبالغہ آرا طرز تحریر کی خاص قسم دیکھنے کو ملی ہے (یہ غالباً اختصار کی خاطر مختلف واقعات کو آپس میں مدغم کرنے اور ان واقعات کے الم ناک مفہوم کے ساتھ تطابقت پیدا کرنے کی عادت کا نتیجہ ہے) جس میں دروغ بافی اور کج روی واقعات کے محض بیان تک محدود نہیں رہیں بلکہ انھوں نے ان کی تشریح وتوضیح اور معنویت کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جب میں اس عہد کے متعلق دو ضخیم تاریخی کتب کا، جو تیئر اور میخائیلووسکی وانی لیوسکی نے سپرد قلم کی تھیں، مطالعہ کرتا ہوں، مجھے اکثر حیرانی اور پریشانی ہونے لگتی ہے کہ اس نوعیت کی کتابیں چھاپی اور پڑھی جا سکتی ہیں۔ اس بات سے قطع نظر کہ دونوں کتابوں میں یکساں واقعات کو ماخذوں کے حوالوں سے نہایت سنجیدہ اور معنی خیز لیکن ایک دوسرے سے کلی مختلف انداز سے پیش کیا گیا ہے، ان میں مجھے ایسی ایسی باتیں نظر آئیں جنھیں پڑھنے کے بعد میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں ہنسوں یا روؤں کیونکہ مجھے یاد آجاتا تھا کہ یہ اس عہد کے متعلق وقیع تصنیفات میں شمار ہوتی ہیں اور ان کے قارئین کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے۔ میں مشہور مصنف تیئر کی کتاب سے صرف ایک مثال کا حوالہ دوں گا۔ یہ بتانے کے بعد کہ نپولین کس طرح اپنے ساتھ جعلی روسی نوٹ لایا تھا، وہ کہتا ہے:

Relevant l'emploi de ces moyens par un acte de

bienfaisance digne de lui et de l'armée francaise, il fit distribuer des secours aux incendiés. Mais les étant trop precieux pour étre donnés longtemps á ces étrangers, la plupart ennemis, Napoléon aima mieux leur fournir de l'argent, et il leur fit distribuer des roubles papier.

اگر میں اس عبارت کو متن سے علیحدہ پڑھوں، میں ہکا بکا رہ جاؤں، اس لیے نہیں کہ یہ اخلاقیات سے معریٰ ہے بلکہ محض اس لیے کیونکہ محض اس لیے کیونکہ یہ نری حماقت کا شاہکار ہے۔ لیکن اگر آپ پوری کتاب کا مطالعہ کریں تو آپ کو قطعاً کسی قسم کا اچنبھا نہیں ہوگا کیونکہ اس میں جس براہ راست مفہوم سے عاری مبالغہ آمیز لفاظی سے کام لیا گیا ہے، یہ اس کے عین مطابق ہے۔

چنانچہ فن کار اور مورخ کے وظائف قطعاً مختلف ہیں۔ لہٰذا اگر قاری کو واقعات یا اشخاص کے بیان میں میری کتاب کسی مورخ کی کتاب سے مختلف نظر آئے، تو اسے کوئی حیرانی نہیں ہونا چاہیے۔

لیکن فن کار کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تاریخی شخصیات اور واقعات کے مقبول عام تصور کی اساس خیالی باتوں پر نہیں بلکہ تاریخی دستاویزات پر ہوتی ہے جنھیں جس حد تک مورخین یکجا کرنے اور ترتیب دینے میں کامیاب رہے ہوں۔ اگرچہ فن کار ان دستاویزات کو مختلف انداز سے سمجھتا اور پیش کرتا ہے، مورخ کی طرف اسے بھی تاریخی مواد سے رہنمائی حاصل کرنا چاہیے۔ میرے ناول میں جہاں بھی تاریخی شخصیات باتیں کرتی یا روبہ عمل ہوتی ہیں، میں نے اپنی طرف سے کوئی چیز نہیں گھڑی بلکہ میں نے تاریخی مواد، جس کی میں نے کتاب کی تحریر کے دوران میں پوری لائبریری اکٹھا کر لی تھی، استعمال کیا ہے۔ میں یہاں ان کتابوں کے ناموں کے حوالے دینا ضروری نہیں سمجھتا، لیکن جو کچھ میں کہتا ہوں، اس کے ثبوت میں کسی وقت بھی ان کے حوالے دے سکتا ہوں۔

(6) چھٹی اور آخری بات، جو میرے نزدیک انتہائی اہم ہے، یہ ہے کہ میرے تصور کے مطابق تاریخی واقعات میں نام نہاد عظیم شخصیات کے ساتھ انتہائی خفیف اہمیت منسوب کی جانا چاہیے۔

اتنے الم ناک دور کا، جو اپنے واقعات کی اہمیت کے اعتبار سے اتنا مالا مال ہے، جو خود ہمارے زمانے کے اتنا قریب ہے اور جس کے متعلق اتنی متنوع روایات ابھی تک بیان کی جا رہی ہیں، مطالعہ کرنے کے بعد مجھ پر یہ بیّن حقیقت آشکار ہوئی کہ ہماری عقل تاریخی روایات کی، جب وہ ظہور پذیر ہوتے ہیں، ادراک نہیں کر سکتی۔ یہ کہنا (اور ہر شخص کو یہ بات بہت آسان معلوم ہوتی ہے) کہ 1812 کے واقعات اس لیے پیش آئے کیونکہ نپولین بہ اعتبار مزاج تغلّب پسند تھا اور امپراطور الیکساندر کے جذبۂ وطن پرستی میں کوئی لچک نہیں تھی، اتنا ہی بے معنی ہے جتنا یہ ادّعا کرنا کہ رومی سلطنت کا سقوط اس لیے عمل میں آیا کیونکہ فلاں ناکندہ تراش اور وحشی شخص نے اپنی قوم کی مغرب پر چڑھائی کے دوران میں قیادت کی تھی یا ں فلاں رومی امپراطور نے اپنی سلطنت پر سلیقے سے حکومت نہیں کی تھی یا یہ کہ کوئی بہت بڑا ٹیلا، جسے ہموار کیا جا رہا تھا، اس لیے زمین بوس ہوا کیونکہ آخری مزدور نے اس پر کدال چلائی تھی۔

اس قسم کا واقعہ، جس میں لاکھوں لوگ ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار ہوئے اور جس میں انھوں نے پانچ لاکھ اشخاص کو موت کے گھاٹ اتار دیا، کسی فردِ واحد کے منشا کا نتیجہ نہیں ہوسکتا۔ جس طرح فردِ واحد کے لیے ٹیلے کو ہموار کرنا ممکن نہیں تھا، اسی طرح فردِ واحد پانچ لاکھ اشخاص کی اموات کا باعث کیسے بن سکتا تھا؟ لیکن یہ واقعہ کیوں پیش آیا؟ ایک مورخ کہتا ہے کہ اس کا سبب فرانسیسیوں کا جارحانہ جذبہ اور روسیوں کی حب الوطنی تھی۔ دوسرے جمہوری عناصر کو، جو نپولین کے جتھے بیرونِ ملک اپنے ساتھ لائے تھے، اور روس کی یورپ کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کی ضرورت کو، اس کا باعث قرار دیتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔ لیکن لاکھوں اشخاص ایک دوسرے کا کشت و خون کیوں کرنے لگے؟ انھیں ایسا کرنے کے لیے کس نے اکسایا تھا؟ بظاہر تو یہی نظر آتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو یہ واضح طور پر معلوم تھا کہ اس سے کسی کو کچھ حاصل نہیں ہوگا بلکہ سب کے لیے بدتریں ہی ثابت ہوگا۔ پھر انھوں نے ایسا کیوں کیا؟ اب جب کہ یہ لایعنی واقعہ گزر چکا ہے، اس کی وجوہ کے بارے میں لاتعداد قیاس آرائیاں کی جاسکتی ہیں اور کی جارہی ہیں، لیکن ان وضاحتوں کی بے پناہ تعداد اور مقصد کے بارے میں ان سب کا اتفاق صرف یہی ثابت کرتا ہے کہ وجوہات لاتعداد تھیں اور ان میں سے کوئی بھی واحد وجہ کہلانے کی مستحق نہیں۔

لاکھوں افراد نے کیوں ایک دوسرے کو موت کے گھاٹ اتارا حالانکہ جب سے دنیا وجود میں آئی ہے، یہ بات معلوم ہے کہ ایسا کرنا جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے معیوب فعل ہے؟ کیونکہ یہ قانونِ جبر کا تقاضا تھا اور اس کا کیا جانا ناگزیر تھا۔ اس فعل کو سرانجام دے کر انسانوں نے اس اساسی حیواناتی (zoological) قانون کی تکمیل کر دی جس پر شہد کی مکھیاں، جب وہ موسم خزاں میں ایک دوسرے کو ہلاک کرتی ہیں، عمل درآمد کرتی ہیں اور جو نر جانوروں کے ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے کا موجب بنتا ہے۔ اس دہشت ناک سوال کا اور کوئی جواب نہیں دیا جاسکتا۔

یہ صداقت نہ صرف بدیہی ہے بلکہ ہر شخص کے شعور میں فطرتاً اس حد تک موجود ہے کہ اگر انسان کے اندر ایک اور جذبہ، جو اسے یقین دلاتا رہتا ہے کہ وہ ہر اس لمحے، جس کے دوران میں وہ کوئی فعل سرانجام دیتا ہے، آزاد ہے، جاری و ساری نہ ہوتا، اس کا ثابت کرنا لاحاصل ہوتا۔

جب ہم تاریخ کے بارے میں وسیع التناظر نقطۂ نظر اختیار کرتے ہیں، ہمیں لاریب ایک ابدی قانون کا، جس کے باعث واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں، یقین ہو جاتا ہے۔ لیکن جب ہم اس کا ذاتی نقطۂ نظر سے جائزہ لیتے ہیں ہمیں اس کے بالکل متضاد چیز کا یقین ہو جاتا ہے۔

وہ شخص، جو کسی دوسرے شخص کو ہلاک کرتا ہے، نپولین، جو دریائے نیمین عبور کرنے کا حکم دیتا ہے، میں یا آپ، جو فوج میں بھرتی کی درخواست پیش کرتے ہیں یا اپنے بازو کو اوپر اٹھاتے یا نیچے گراتے ہیں ہیں، سبھی کو لاریب اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ہمارا ہر فعل معقول وجوہ اور ہماری اپنی خود اختیاری پر مبنی ہوتا ہے اور یہ کہ اس کے کرنے یا نہ کرنے کا انحصار خود ہم پر ہوتا ہے۔ یہ تیقن خلقی طور پر اس حد تک ہم سب میں موجود اور ہمارے لیے اتنا انمول ہوتا ہے کہ تاریخ کی شہادتوں اور جرائم کے اعداد و شمار (جو ہمیں دوسروں کے عمل میں آزادی کے فقدان

کا یقین دلاتے ہیں) کے باوجود ہم اپنی آزادی کے شعور کو اتنی توسیع دیتے ہیں کہ اس میں اپنے تمام اعمال شامل کر لیتے ہیں۔

یہ تضاد لاینحل نظر آتا ہے۔ جب میں کوئی کام کرتا ہوں، مجھے یقین ہوتا ہے کہ میں اسے اپنی مرضی سے سرانجام دے رہا ہوں مگر جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اس فعل کا بنی نوع انسان کی عمومی زندگی (اس کی تاریخی معنویت کے اعتبار سے) سے کیا تعلق ہے، تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ اس فعل کا سرانجام دیا جانا پہلے سے مقدر تھا اور ناگزیر تھا، پھر غلطی کہاں ہوئی؟

ماضی میں سرانجام دیے گئے کام کی مفروضہ آزادانہ وجوہ کے پورے سلسلے کو بعد میں فراہم کرنے کی انسان میں جو صلاحیت پائی جاتی ہے، اس کے جو نفسیاتی مشاہدے کیے گئے ہیں (میں اپنی کسی دوسری تحریر میں اس کی زیادہ تفصیل سے وضاحت کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں)، ان سے اس مفروضے کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ انسان کو جو یہ شعور ہے کہ وہ کسی خاص کام کرنے میں آزاد ہے، وہ غیر صحیح ہے، لیکن یہی نفسیاتی مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ افعال کا ایک اور سلسلہ بھی ہے۔ ان افعال میں انسان کو آزادی کا شعور ان کی انجام دہی کے بعد ہی نہیں بلکہ اسی دم ہوتا ہے اور کسی قسم کے شک وشبے کے بغیر ہوتا ہے۔ مادہ پرست جو جی چاہے، کہتے رہیں، اس کے باوجود میں لاریب کوئی کام، اگر اس کا تعلق محض میری اپنی ذات سے ہو، کر سکتا ہوں یا کرنے سے اجتناب برت سکتا ہوں۔ میں نے لاریب اپنی مرضی سے اپنا بازو اوپر اٹھایا ہے یا نیچے کیا ہے۔ میں آناً فاناً لکھنا بند کر سکتا ہوں، آپ آناً فاناً پڑھنا ترک کر سکتے ہیں۔ میں یقیناً اپنی مرضی سے اور تمام رکاوٹوں سے آزاد اپنے خیالات امریکا یا اپنے پسندیدہ ریاضیاتی مسئلے کی طرف منتقل کر سکتا ہوں۔ اپنی آزادی کا امتحان لینے کے لیے میں اپنا بازو فضا میں بلند کر سکتا اور اسے زبردستی نیچے کر سکتا ہوں۔ میں نے ایسا کر لیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک ایک بچہ کھڑا ہے اور میں اپنا ہاتھ اس کے اوپر اٹھاتا ہوں اور اسی قوت کے ساتھ اسے بچے کے سر سے نیچے کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ کام نہیں کر سکتا۔ ایک کتا بچے کی طرف لپکتا ہے اور میں کتے کی طرف ہاتھ اٹھانے سے باز نہیں رہ سکتا۔ میں پریڈ میں شامل ہوں اور میں رجمنٹ کی حرکت وسکنات کے مطابق عمل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جنگی کارروائی کے دوران میں میں اپنی رجمنٹ کے ساتھ حملے میں شریک ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا یا جب میرے چاروں اطراف بھگدڑ مچی ہو، میں بھاگنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ نہیں رہ سکتا۔ جب میں کسی ملزم کے وکیل کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوتا ہوں، مجھے جو کچھ کہنا ہوتا ہے، میں اسے کہے بغیر یا جانے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر کوئی مکا میری آنکھ کی طرف آ رہا ہو، تو میں اسے جھپکائے بنا نہیں رہ سکتا۔

چنانچہ افعال کی دو اقسام ہوئیں: بعض کا انحصار میرے منشا پر ہوتا ہے اور بعض کا نہیں اور وہ غلطی، جو تناقض کا باعث بنتی ہے، محض اس وجہ سے سرزد ہوتی ہے کہ میں اپنے شعورِ آزادی کو (جو ہر اس فعل کے، جس کا تعلق میری انا، میرے وجود کی بلند ترین تجرید، سے ہوتا ہے، کاملاً ہم رکاب رہتا ہے) ایسے افعال کی طرف منتقل کر دیتا ہوں جو میں

نے دوسروں کی معیت میں سرانجام دیے ہوتے ہیں اور جن کا انحصار دوسروں کے منشاؤں کا میرے منشا سے متوافق ہونے پر ہوتا ہے۔ آزادی اور محکومی کی حدود متعین کرنا بہت مشکل ہے اور ان حدود کا تعین کرنا نفسیات کا واحد اور بنیادی مسئلہ ہے لیکن ہماری زیادہ سے زیادہ آزادی اور ہماری زیادہ سے زیادہ محکومی کا اظہار جن صورتوں میں ہوتا ہے، ان کا مشاہدہ کرنے کے بعد ہم یہ دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہماری فعالیت جتنی زیادہ تجریدی اور چنانچہ دوسروں کی فعالیت سے جتنا کم منسلک ہوگی، یہ اتنی ہی زیادہ آزاد ہوگی۔ اس کے برعکس ہماری فعالیت دوسروں کی فعالیت سے جتنا زیادہ منسلک ہوگی، یہ اتنی ہی کم آزاد ہوگی۔

دوسروں کے ساتھ مضبوط تریں، بالکل ہی ناقابل تحلیل، انتہائی تکلیف دہ اور پائیدار رشتہ وہ ہے جسے دوسروں پر اختیار (اقتدار) کہا جاتا ہے لیکن اس کا صحیح مطلب دوسروں کی انتہائی زیادہ دست نگری (محکومی) ہے۔

اپنی اس کتاب کی تحریر کے دوران میں جب مجھے صحیح یا غلط اس بات کا پورا یقین ہوگیا تو قدرتی طور پر میں۔ جب میں 1805، 1807 اور خاص طور پر 1812 کے واقعات کا، جن میں قانونِ* مقدر انتہائی نمایاں انداز سے آشکار ہوتا ہے، ذکر کرنے بیٹھا — ان اشخاص کے، جو اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ وہ واقعات کا رخ متعین کر رہے ہیں لیکن جنھوں نے دوسرے شرکا کی نسبت انسانی فعالیت میں کم آزادی کا مظاہرہ کیا، افعال کے ساتھ کوئی اہمیت منسوب نہ کرسکا۔ مجھے ان لوگوں کی سرگرمیوں میں صرف اس لیے دلچسپی تھی کیونکہ ایک تو وہ یہ مثال، پیش کرتے تھے کہ قانونِ مقدر، جو میرے خیال کے مطابق تاریخ کی رہبری کرتا ہے، کس طرح روبہ کار ہوتا ہے۔ دوسرے ان کے افعال سے اس نفسیاتی قانون کی وضاحت ہوتی تھی جو آدمی کو مجبور کرتا ہے کہ اس نے جو کام انتہائی مجبوری کے عالم میں کیے ہوئے ہیں، بعد میں اپنے آپ پر یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ اپنے اعمال و افعال میں بالکل خودمختار تھا، اپنے تخیل میں تصورات کا پورا سلسلہ گھڑ لے۔

• ''یہ بات قابل غور ہے کہ جن لوگوں نے 1812 کی جنگ کے بارے میں کچھ لکھا ہے، ان سب کو اس واقعے میں کوئی خاص اور ناگزیر تقدیری چیز نظر آئی ہے۔'' (طالسطائی کا اپنا حاشیہ)

حواشی

پہلی کتاب

حصہ اول

1- جینوآ وا اور لوکا: انیسویں صدی میں اطالیہ پندرہ خود مختار ریاستوں میں منقسم تھا۔ نپولین نے ان میں سے دو۔۔ جینوآ وا اور لوکا۔۔ پر جون 1805 میں قبضہ کر لیا۔ وہ خود دسمبر 1804 میں فرانس کا شہنشاہ بنا تھا۔

2- بوناپارت: نپولین کا خاندانی نام بوناپارت تھا لیکن آنا شیرر اور اس کے حلقے کے ارکان اسے از رہ تضحیک "بواناپارت" (کارسیکا کا نقلی شہنشاہ) کہتے تھے۔ (ناموں پر نوٹ دیکھیں۔)

3- محفل شب: اصل لفظ فرانسیسی زبان کا Soiree ہے، جس کے معانی "شام" ہیں۔ جنگ عظیم اول سے قبل جب تفریح کے مواقع کم دست یاب تھے، مختلف اشخاص، بالخصوص خواتین، محافل شام منعقد کیا کرتے تھے۔ ان میں عموماً طبقۂ امرا کے افراد، ادیب، فن کار، سیاست دان اور دوسرے سرکردہ اصحاب شریک ہوتے تھے۔ ان محافل میں گپ شپ بھی ہوتی تھی، گانا بجانا بھی اور رقص بھی۔ یہ تمام امور شرکائے محفل خود ہی سرانجام دیتے اور یوں محظوظ ہونے کے مواقع فراہم کر لیتے۔ ایسی بعض محافل تاریخ میں یادگار حیثیت اختیار کر گئی ہیں۔

4- فلو: فرانسیسی لفظ grippe ہے اور روسی بول چال میں یہی استعمال کرتے تھے۔

5- مراسلہ: فرانس کے خلاف انگلستان، آسٹریا، روس اور پرشیا پر مشتمل ایک نیا محاذ تشکیل پا رہا تھا۔ اس پر نپولین نے غیر متوقع طور پر انگلستان کو صلح کی پیشکش کر دی۔ مؤخر الذکر کی درخواست پر زار الیکساندر نے این۔ این۔ نوواسلت سیف کو بطور مصالحت کنندہ روانہ کر دیا۔ نوواصلت سیف ابھی برلن پہنچا تھا کہ جینوآ وا پر نپولین کے قبضے کی خبر موصول ہو گئی اور وہ وہیں سے واپس لوٹ آیا۔

6- نو سرا سانپ: یہاں اصل لفظ hydra استعمال ہوا ہے۔ یونانی دیومالا میں hydra آبی سانپ تھا۔ اس کے نو سر تھے۔ جب اس کا ایک سر کاٹا جاتا، تو اس کی جگہ دو نئے اگ آتے۔ اسے ہرکولیس نے قتل کیا تھا۔

7- مالٹا: بحیرہ روم کے اس جزیرے پر انگریزوں نے 1800 میں قبضہ کیا تھا۔

8- پرشیا: انیسویں صدی کے وسط تک موجودہ جرمنی خود مختار ریاستوں میں منقسم رہا۔ ان میں سب سے بڑی پرشیا تھی۔

-9 ہارڈن برگ (Hardenberg) اور ہوگ وٹس (Haugwitz): دونوں پرشیا کے وزیر تھے۔ انھوں نے 1795 اور 1805 میں نپولین کے ساتھ معاہدوں پر دستخط کیے تھے۔ تاہم جلد ہی وہ فرانس کے خلاف جنگ پر آمادہ ہو گئے (آنا پاولوونا ان کی اس تبدیلی قلب کو ماننے کے لیے تیار نہیں)۔ 1806 میں پرشیا نپولین کے خلاف جنگ میں کود پڑا اور جے نا (Jena) کے مقام پر شکست کھائی۔

-10 روغاں (Rohan): فرانسیسی جاگیرداروں کا گھرانہ۔ اس خاندان کا ایک فرد آں غی روغاں فوجی خدمات کے عوض 1603 میں ڈیوک بنایا گیا اور دوسرا لوئی رینے روغاں 1777 میں کارڈینل مقرر ہوا۔ انقلاب فرانس کے بعد وہ جرمنی بھاگ گیا۔

-11 مونت موغینسی (Montmorency): فرانسیسی جاگیرداروں کا قدیمی گھرانہ۔ اس کے بعض افراد اب بھی جنوبی امریکا کے مختلف ممالک میں اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں۔

-12 محافل میں آنا جانا: اونچے مغربی گھرانوں کی لڑکیوں کو خاص عمر تک پہنچے سے پہلے مخلوط محفلوں اور رقص و سرود کی مجلسوں میں شرکت کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ جب وہ عمر کی یہ حد عبور کر لیتی تھیں، پھر ان پر عاید یہ پابندیاں ختم ہو جاتی تھیں۔ گھر سے اس طرح باہر نکلنے کو انگریزی میں Come out کہتے ہیں۔

-13 (جوہان کاسپر) لاواتر: سوئٹزرلینڈ کا مفکر، شاعر، مضمون نگار اور مذہبی رہنما۔ چہرہ شناسی پر اس کی کتاب بہت مقبول ہوئی تھی۔

-14 صلیب: عیسائیوں کا مقدس ترین نشان، جس پر ان کے عقیدے کے مطابق حضرت عیسیٰ کو ہلاک کیا گیا تھا۔ اس لیے صلیب اٹھانا (to bear one's cross) کا مطلب مشکلات، ناخوشگوار صورت حال اور ناپسندیدہ شخص کو برداشت کرنا ہے۔

-15 (سینٹ) پیٹرز برگ: یہ پیٹر اعظم نے 1803 میں آباد کیا تھا۔ 1914 میں اس کا جرمن نام روسی زبان میں پیوتر گرات اور 1924 میں لینن گراڈ رکھ دیا گیا۔ سوویت یونین کے خاتمے کے بعد اس کا پرانا نام پیٹرز برگ بحال کر دیا گیا ہے۔

-16 ڈریس: مغربی خواتین کا لباس، جس میں شلوکا (bodice) اور سکرٹ یکجا ہوتے ہیں۔

-17 ڈیوک آف آں غیاں: اس نوجوان ڈیوک کا تعلق فرانس کے سابق شاہی خاندان بوغ بوں سے تھا۔ اس پر الزام تھا کہ اس نے 1804 میں نپولین کو قتل کرنے کی سازش میں حصہ لیا تھا۔ اسے اغوا کیا گیا، غیر جانبدار علاقے میں پہنچایا گیا، ''بے قاعدہ'' فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور گولی سے اڑا دیا گیا۔

-18 مادام یوغیئی (Georges): نامور فرانسیسی اداکارہ۔ ڈراموں میں حزینہ کردار ادا کرتی تھی۔ 1808 اور 1812 کے درمیانی سالوں میں وہ پیٹرز برگ اور ماسکو میں اپنے فن کے جوہر دکھاتی رہی۔ نتاشا کی اس سے ہیلین کے ڈرائنگ روم میں ملاقات ہوئی تھی۔ (دوسری کتاب، حصہ پنجم، باب 13)

-19 گارڈز یا امپریل (شاہی) گارڈز: روسی زار پیٹر اعظم نے اپنی فوج پرشیا کے نمونے پر منظم کی تھی۔ پرشیائی حکمرانوں کی طرح اس نے بھی فوج کے اندر فوج تشکیل کی اور اسے امپریل گارڈز کا نام دیا۔ اس کے گھڑسواروں کی سات

رجمنٹیں تھیں اور ان کی وفاداری براہ راست زار سے تھی۔ ہر رجمنٹ کو کسی شخص یا جگہ کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ دوسری کا نام ''ہز میجسٹی رجمنٹ'' تھا۔

20- کوتوزوف: (1745 تا 1813) روسی جرنیل، جو بعد میں افواج کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا اور نپولین کے خلاف لڑا، امپراطورہ کیتھرین کے زمانے میں ترکوں کے خلاف جنگوں میں حصہ لے چکا تھا۔ ایک معرکے میں سخت زخمی ہوا اور اپنی ایک آنکھ بھی گنوا بیٹھا۔ پیٹرزبرگ کا گورنر جنرل مقرر ہوا لیکن امپراطور الیکساندر کسی بات پر ناراض ہو گیا اور وہ تین سال زیرِ عتاب رہا۔ پچاس ہزار افراد پر مشتمل جو فوج آسٹریا بھیجی جا رہی تھی، اب اسے دوبارہ اس کا سربراہ تعینات کر دیا گیا تھا۔

21- لوئی شانزدہم: فرانسیسی بادشاہ، انقلاب فرانس، اسے اور اس کی ملکہ دونوں کو ہڑپ کر گیا۔

22- کاندے: ڈیوک آف آس غیاں کے خاندان کا نام کاندے (Conde) تھا۔

23- بغومیر: (1) انقلاب فرانس کے کچھ عرصے بعد 1795 میں پانچ ارکان پر مشتمل ادارے نے، جسے ''ڈائرکٹری'' کا نام دیا گیا، عنان حکومت سنبھالی۔ نپولین نے دو ڈائرکٹروں اور اپنے بھائی لوسیاں کی، جو پانچ سو ارکان کی کونسل کا صدر تھا، مدد سے اٹھارہ بغومیر بمطابق 9 نومبر 1799 کو اس کا تختہ الٹ دیا اور خود فرانس کا مطلق العنان حکمران بن گیا۔ امپراطور کا لقب اس نے بعد میں اختیار کیا، فی الحال اس نے اپنے لیے قونصل (Consul) کا لقب اختیار کیا۔ (ب) انقلاب فرانس کے بانیوں نے 22 ستمبر 1792 سے نیا کیلنڈر نافذ کیا۔ بغومیر اس کا دوسرا مہینہ تھا۔

24- قتل عام: نپولین نے ان قیدیوں کو، جن کی تعداد بارہ سو تھی، افریقہ میں نہیں بلکہ فلسطین کی بندرگاہ جافہ میں ترکی عثمانوں کے خلاف جنگ کے دوران میں قتل کیا تھا۔ بعض مورخین نے اسے انتقامی کارروائی قرار دیا ہے۔

25- آرکول: اس مقام پر نپولین 1796 میں آسٹریا کی فوجوں کے خلاف صف آرا ہوا تھا۔ جنگ کے دوران میں جب اس کی فوجیں پسپائی اختیار کرنے لگیں، اس نے پرچم چھینا اور اپنی رہنمائی میں اپنی افواج دریا کے پار لے گیا۔

26- گواہ: روسیوں کے ہاں یہ رواج تھا کہ وہ ایک دوسرے سے شرط لگاتے وقت آپس میں ہاتھ ملاتے تھے۔ تیسرا شخص گواہ کے طور پر ان کے ہاتھ ایک دوسرے سے علیحدہ کرتا تھا۔ (ماڈ)

27- سمسون (Samson): بائبل کے مطابق اپنے زمانے کا طاقتور ترین انسان۔ قدیم یہودیوں کا ہیرو۔ (پرانا عہد نامہ: قضاۃ: ابواب: 14 تا 16)

28- رستوف: رستوف خاندان کے اکثر ارکان بلحاظ کردار طالسطائی کے اپنے ہی خاندان کے مختلف ارکان سے ملتے جلتے ہیں۔ کاؤنٹ الیا رستوف مصنف کے دادا اور کاؤنٹس اس کی دادی سے مشابہ ہے۔ نکولائی کے چند خصائص اس کے اپنے باپ کے ہیں۔ نتاشا اس کی سالی تانیا بیرس اور ویرا ایک دوسری سالی سے ملتی جلتی ہے۔ نکولائی سے سونیا کے تعلقات میں طالسطائی کے باپ اور اس کی سرپرست تاتانیا ایرگلسکایا کے مابین تعلقات کی مشابہت موجود ہے۔ (ماڈ)

29- رادزیوی لوف: سوویت یونین کی جنوبی مغربی اور پولینڈ کے صوبے گالیشیا کی جنوب مشرقی سرحد پر واقع تھا۔

30- یومِ نام: مشرقی یورپ کے وہ باشندے، جو رومن کیتھولک تھے یا ایسٹرن آرتھوڈوکس چرچ کے پیرو کار تھے، عام طور

پر اپنے بچوں کے نام کسی سینٹ کے نام پر رکھتے تھے۔ جس شخص کا نام جس سینٹ کے نام پر ہوتا، وہ اس سینٹ کے عرس کے موقع پر اپنے گھر ضیافت کا اہتمام کرتا۔ یوں اس روز کو یوم نام کہا جاتا تھا۔

-31 ہوزار (hussars) ''پس منظر'' دیکھیں۔

-32 آخری فرائض: اس سے آنا میخائیلوونا کی مراد رسم تدہین ہے۔ رومن کیتھولک اور مشرقی کلیسا میں اس رسم کے تحت عام آدمیوں کی بوقت نزع اور بادشاہوں کی بوقت تاجپوشی مقدس روغن سے مالش کی جاتی ہے۔

-33 ولیم پٹ جونیئر: ان دنوں (1805) برطانیہ کا وزیر اعظم تھا۔

-34 بولاں: رود بار انگلستان کے ساحل پر فرانسیسی بندرگاہ۔

-35 ویلنیو: پیئر شاغل ولنیو (villeneuve): فرانسیسی ایڈمرل۔ فرانسیسی اور ہسپانوی بحری افواج کا کمانڈر۔ اسے وائی کاؤنٹ نیلسن کی انگریزی بحریہ کے ہاتھوں 1805 میں سپین کی جنوبی بندرگاہ ٹریفالگر کے مقام پر شکست ہوئی تھی۔

-36 مدیرا: ایک قسم کی سفید انگوری شراب، جو پرتگال کے جزیرے واقع بحراقیانوس مدیرا میں کشید کی جاتی ہے۔

-37 آخروسیموا: ماریا دمتریونا آخروسیموا بہ اعتبار کردار این۔ ڈی۔ افروسیموا (1753 تا 1826) سے، جو اپنے زمانے میں ماسکو کے اعلیٰ حلقوں میں نمایاں مقام کی حامل تھی، خاصی مشابہت رکھتی ہے۔ (ماڈ)

-38 جرمن: برگ جرمن نژاد روسی تھا۔

-39 قازق: قازق نسلاً تاتاری ہیں اور زیادہ تر بحراسود کے شمال میں آباد ہیں۔ ان کی ایک کثیر تعداد روس کی ریاست ماسکو، لیتھوانیا اور پولینڈ میں زرعی غلاموں کی حیثیت سے کام کرتی رہی۔ آہستہ آہستہ ان کے جوہر کھلے اور روسیوں نے انھیں فوج میں بھرتی کرنا شروع کر دیا۔ گھڑسواری میں ان کا جواب نہیں تھا۔ زاروں نے انھیں اپنی اپنی ریاستیں، جنھیں محدود اختیار حاصل تھے، قائم کرنے کی اجازت دے دی لیکن سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں جوں جوں روسی مملکت پھیلتی گئی، قازق اپنی آزادی سے محروم ہوتے گئے، تا آنکہ روسی انقلاب کے بعد کھیتی باڑی کے اجتماعی فارموں میں وہ اپنے الگ وجود سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے۔

زاروں کے عہد میں قازق سمور کی ٹوپیاں، کھلے پاجامے اور مہمیزوں سے لیس جوتے پہنا کرتے تھے۔ ہر قازق کو فوج میں بیس سال خدمات سرانجام دینا پڑتی تھیں اور ہر قبیلہ اپنی اپنی رجمنٹ بھرتی کراتا تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں تین لاکھ قازق روسی افواج میں شامل تھے۔ قازق چونکہ خوش شکل ہوتے تھے، دلکش وردیاں پہنتے تھے اور شوریدہ سری ان کے خمیر میں شامل تھی، اس لیے روسی زبان میں ان کے متعلق لاتعداد خوبصورت کہانیاں اور ناول تحریر کیے گئے ہیں۔

-40 سواروف: الیکساندر واسیلی وچ سواروف (1729 تا 1800): روسی فیلڈ مارشل تھا۔ اس نے ترکوں (1787 تا 1789)، پولستانیوں (1794) اور اٹلی میں فرانسیسیوں (98-1799) کے خلاف جنگیں کیں۔ 1799 میں روس کا اتحادی آسٹریا اسے سامانِ رسد پہنچانے میں ناکام رہا اور اسے سوئٹزرلینڈ میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ پھر بھی اس کی بیس ہزار ہزار پر مشتمل فوج اسی ہزار فرانسیسیوں کے گھیرے میں سے نکلنے میں کامیاب ہوگئی۔

41- بوسٹن: تاش کا کھیل۔ اس میں چار کھلاڑی شریک ہوتے ہیں اور دو گڈیاں استعمال ہوتے ہیں۔

42- اجازت: مشرقی کلیسا میں پچیرے، ممیرے، خلیرے وغیرہ رشتے دار آپس میں شادی نہیں کر سکتے۔ اور اگر وہ اس قسم کی شادی کرنا چاہیں، انھیں کلیسا کے اعلیٰ ترین حاکم اسقف اعظم سے خصوصی اجازت لینا پڑتی ہے۔ (ماڈ)

43- اینگلیز (anglaise): انگلستان کا ایک لوک رقص۔ اس میں رقاص ایک دوسرے کے سامنے دو قطاروں میں کھڑے ہو کر رقص کیا کرتے تھے۔ اس کی بے شمار نرتیں یا چالت پھرتیں تھیں۔ ان نرتوں کے نام عجیب و غریب اور من مانے طریقے سے رکھے جاتے۔ ماڈ کا خیال ہے کہ طالسطائی نے اینگلیز کے رموز اپنی خاندانی روایات سے تحصیل کیے تھے۔

44- تجہیز و تکفین: مغرب میں لوگ اپنے مرحوم عزیز و اقارب کی تجہیز و تکفین خود نہیں کرتے بلکہ پیشہ ور لوگوں یا فرموں کی خدمات حاصل کرتے ہیں انھیں undertakers کہتے ہیں۔ ہمارے گورکن صرف قبر کھودتے ہیں لیکن undertakers میت کو تیار کرتے، اسے کفن پہناتے، تابوت میں بند کرتے، جنازے کے جلوس اور مذہبی رسوم کا اہتمام کرتے، اسے دفناتے یا جلاتے اور قبر پر پھول چڑھاتے ہیں اور یوں سبھی کچھ کرتے ہیں۔

45- کریم آف ٹارٹر (Cream of tartar): اصل نام پوٹاشیم بائی ٹارٹریٹ (potassium bitartrate) ہے۔ دانوں یا سفوف کی شکل میں ملتا ہے۔ بیکنگ (baking) پاؤڈر اور جلاب کی ادویات میں استعمال ہوتا ہے۔

46الف۔ ایقونات: واحد ایقونہ (icon): حضرت عیسیٰؑ، حضرت مریمؑ، فرشتے یا سینٹ کی تصویر یا چھوٹا مجسمہ ایقونہ کہلاتا ہے۔ مغربی یورپ کے رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ مسالک ایقونوں کے مخالف ہیں۔ لیکن روس، یونان اور مشرقی یورپ کے ان ممالک میں، جہاں کے باشندے ایسٹرن آرتھوڈوکس مسلک کے پیروکار ہیں، ان کا عام رواج ہے۔ گھروں کی بیرونی دائیں چوکھٹ کے قریب حضرت عیسیٰؑ اور بائیں چوکھٹ کے قریب حضرت مریمؑ کے مجسمے نصب کیے جاتے ہیں۔ گھروں کے اندر تصاویر اور مجسمے دونوں رکھے جاتے ہیں۔ ایقونات بہت مقدس تصور کیے جاتے ہیں اور ان کا حد درجہ احترام کیا جاتا ہے۔ لیکن ان کی پرستش نہیں ہوتی۔ لیسکوف نے اپنی ایک کہانی میں ایقونوں کے متعلق طویل اور دلچسپ معلومات دی ہیں

46ب۔ والتیر کرسی: بیماروں کے لیے کرسی نما صوفہ۔

47- پرنس نکولائی آندریوچ بلکونسکی کے متعدد خصائص طالسطائی کے نانا نکولائی سرگویوچ ولکونسکی سے مشابہ ہے۔ تاہم بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ امپراطورہ کیتھرین کے عہد کے نامور ماہر حرب فیلڈ مارشل ایم ایف کامینسکی سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ پرنس ماریا طالسطائی کی والدہ ماریا نکولیانا ولکونسکایا (مصنف ابھی دو سال کا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا تھا) کی مثیل ہے۔ بالڈ ہلز پرنس ولکونسکی کے یاسنایا پولیانا سے، جو بعد میں طالسطائی کے حصے میں آیا، مشابہ ہے۔

48- ایلوائز: اشارہ روسو کے ناول La Nouvelle Heloise کی طرف ہے۔ ناول کی ہیروئن کا نام بھی جولی ہے۔ ماڈ کا خیال ہے کہ طالسطائی کو پرنس ماریا اور جولی کے مابین خط کتابت کا تصور دو روسی خواتین ایم اے ولکووا اور وی آئی لانسکایا کے مابین مراسلت (1812 تا 1818) سے سوجھا تھا۔ طالسطائی نے اسے مسودے کی صورت میں پڑھا تھا۔

49- کلید اسرار: اس کتاب کا پورا نام A Key to the Mysteries of Nature(کلید اسرار فطرت) ہے۔اس کا مصنف ایک جرمن شخص اکارٹ شوسن (1752 تا 1803) تھا۔اس کا موضوع سریت تھا۔1805 میں اس کا روسی میں ترجمہ ہوا۔عام لوگوں کے علاوہ میسنوں میں خاص طور پر مقبول ہوئی۔

50- تصویر چہ: (miniature) چھوٹے سائز کی پینٹنگ۔ایرانی اور مغل مصوری میں اس کے عام نمونے ملتے ہیں۔

51- کوچ: چار پہیوں کی بند گھوڑا گاڑی۔اس میں چار سے چھ گھوڑے جوتتے ہیں۔

52- برتسکا: ایک روسی ٹپ دار گاڑی۔اسے صرف ایک گھوڑا کھینچتا ہے۔

53- مک ہیل زین کی فوج: معمر پرنس جرمن نژاد روسی جرنیل وٹ گین شٹائن کے فرانسیسی افواج پر سہ اطرافی حملے کے بارے میں دریافت کر رہا ہے۔روسی اور آسٹروی دستوں کے ہمراہ مک ہیل زین مشرقی جانب سے حملہ آور ہوگا تاکہ پرشیا کو جنگ میں گھسیٹا جا سکے۔طالسطائی شمالی سمت سے آگے بڑھے گا اور کوتوزوف جنوبی روسی فوج اور بوریا (جرمن ریاست) کی سپاہ کے ساتھ گالیشیا (آسٹریا کے زیر قبضہ پولستانی صوبہ) میں محاذ آرائی کرے گا۔ شمالی اطالیہ میں آسٹروی فوج اور وسطی اطالیہ میں روسی کور، جس میں برطانوی اور اطالیہ کی ریاست نیپلز کے دستے شامل ہوں گے، قیام کرے گی۔(ماڈ)

54- رُورِک: نویں صدی تک روس نام کا کوئی ملک موجود نہیں تھا۔اسی صدی کے دوران میں موجود روس کے شمالی علاقوں میں سکنڈے نیویا (ناروے اور سویڈن) کے باشندے جنھیں وائی کنگ (روسی انھیں وارنگیائی یا رس کہتے تھے اور یہی ملک کے نام رشیا یا روس کا سبب بنے) کہا جاتا ہے، روس پر حملہ آور ہونے لگے۔رورک (Rurik) سکنڈے نیویا کا ایک نیم داستانی قبائلی سردار تھا اور وہ 860 کی دہائی میں شمال مغربی روس کا حکمران تھا۔اسے بعدازاں روس کے شاہی خاندان کا بانی تسلیم کر لیا گیا (باب ''روسی تاریخ'' بھی دیکھیں)

55- پاتومکن: پرنس گریگوری الیکسا ندروچ پاتومکن (1739 تا 1791): روسی سیاست دان اور جرنیل۔امپراطورہ کیتھرین دوم اس کی معشوقہ تھی۔ترکوں سے کریمیا اسی نے 1787۔1791 کی جنگ میں ہتھیایا تھا۔

56- موغو: (Jean Victor Moreau) (1763 تا 1813): فرانسیسی جرنیل۔اس نے آسٹروی فوج کو شکست دی لیکن نپولین کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں گرفتار ہوا اور ملک بدر ہوا۔

57- فریڈرک: فریڈرک ولیم دوم (1744 تا 1797): شاہ پرشیا (1786 تا 1797): اس نے دوسرے ممالک کے علاقوں کو ہتھیانے کی پالیسی بنائی تھی اور روس اور پرشیا کے مابین پولینڈ کی تقسیم میں خاصے رقبے پر ہاتھ مارا۔آسٹریا کے ساتھ مل کر انقلابی فرانسیسی کے خلاف بھی محاذ بنایا۔

58- Hofs-kriegs-wurst-schnapps-Rath: کباب وشراب کی جنگی کونسلیں۔یہ کونسلیں کام کی باتیں کم کرتی تھی اور ایک دوسرے پر نکتہ چینی زیادہ کرتی تھیں۔البتہ کام ودہن کی تسکین کا سامان بہم پہنچانے میں بہت مستعد تھیں۔

59- پاہلن: جرمن نژاد پی۔اے۔پاہلن زار پاول کے عہد میں پیٹرزبرگ کا گورنر جنرل تھا اور پاول کے قتل میں بھی شریک تھا۔

60- ارلوف: یہ دو بھائی تھے اور فوجی عہدیدار۔ انھوں نے کمزور دل پیوتر سوم کے خلاف کامیاب بغاوت کی اور اس کی بیوی امپراطورہ کیتھرین دوم کو تخت نشین ہونے میں مدد دی۔

61- پاوڈر مونکی (powder monkey): بحری جنگی جہازوں کا ملازم چھوکرا۔ اس کا کام توپوں تک گولہ بارود پہنچانا ہوتا تھا۔ اشارہ نپولین کی کوتاہ قامتی کی طرف ہے۔

62- اچاکوف: دریائے دنیپر کے دہانے پر ترکوں کا قلعہ۔ کوتوزف نے 1787-1791 کے دوران میں اس پر چڑھائی کی تھی۔

63- کاؤنٹس زوب وا کے دانت: روسی میں زوب کے معانی ''دانت'' ہیں۔

64- میخائیل الاری اوناوچ: مراد کوتوزوف ہے۔

65- لمبارڈ ہاؤس کا بانڈ: لمبارڈ ایک جرمن قبیلہ تھا۔ اس نے اٹلی کے شمالی علاقے پر قبضہ کیا، اس کا نام لمبارڈی رکھا اور وہاں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کے ارکان مرتہن اور بینک کار تھے۔ اس کے افراد بینک کاری کے سلسلے میں سارے یورپ میں پھیل گئے۔ لندن کے عین وسط میں، جو برطانیہ کے سرمایہ کاروں اور بینک کاروں کا گڑھ ہے، ان کے نام پر آباد لمبارڈ سٹریٹ اب بھی موجود ہے۔

حصہ دوم

1- آرچ ڈچی آف آسٹریا: 1453 سے آسٹریا کے شہزادے آرچ ڈیوک (چیف ڈیوک) کہلاتے چلے آرہے تھے۔ شاہی فرمان کے مطابق جو علاقہ آرچ ڈیوک کی تحویل میں دیا جاتا تھا، وہ آرچ ڈچی کہلاتا تھا۔ آسٹریا آج کل سمٹ کر چھوٹا سا ملک (کل رقبہ بتیس ہزار مربع میل) رہ گیا ہے لیکن پہلی جنگ عظیم تک یہ روس کے بعد یورپ کا سب سے بڑا ملک تھا اور مملکت آسٹرو۔ ہنگری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس میں آسٹریا اور ہنگری کے علاوہ چیکوسلواکیہ، پولینڈ، رومانیہ اور یوگوسلاویہ کے بیشتر علاقے شامل تھے۔ آرچ ڈیوک آف آسٹریا عام طور پر ولی عہد سلطنت ہوتا تھا۔

2الف۔ براؤناؤ: جرمنی کی سرحد کے قریب ایک آسٹروی قصبہ۔

2ب۔ کالاش (Calash): گھوڑا گاڑی۔ اس کے پہیے نیچے ہوتے ہیں اور چھت مرضی کے مطابق اتاری اور چڑھائی جا سکتی ہے۔

3- کروشیائی: کروشیا (croatia) کا باسی۔ کروشیا پچھلے دنوں یوگوسلاویہ کا صوبہ تھا۔ اس زمانے میں یہ آسٹروی ہنگری سلطنت میں شامل تھا۔ اب اس نے آزاد حیثیت اختیار کر لی ہے۔

4- اسماعیل: ایک ترکی قصبہ۔

5- ٹانگوں کی پٹیاں: فوجی سپاہی جرابوں کی بجائے ٹانگوں پر اونی پٹیاں باندھا کرتے تھے۔ انگریز کے دور حکومت میں برصغیر میں بھی فوج اور پولیس دونوں میں اس کا رواج تھا۔

6- کوارٹر ماسٹر: فوجی عہدے دار، اس کا کام قیام گاہوں، رسد، وردیوں وغیرہ کی فراہمی ہوتا ہے۔

7- اپنی گاڑیوں میں: کوتوزوف کی سپاہ بہت سست رفتاری سے راوز یویلوف سے آئی تھی۔ ادھر نپولین شروع ستمبر میں دریائے رائن کے کنارے پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ آسٹرویوں نے روسیوں کی رفتار تیز کرنے کے لیے اپنی گاڑیاں فراہم کر دی تھیں۔ (ماڈ)

8- شاکو: ایک قسم کی لمبی مخروطی فوجی ٹوپی۔ اس کے سامنے چھجا اور اوپر پروں کی کلغی ہوتی ہے۔

9- اشرفی: زاروں کے عہد میں روسی کا طلائی سکہ "امپریل" کہلاتا تھا۔

10- ویانا کی جانب: میک کے شکست کھا جانے کے بعد کوتوزوف نے واپس ویانا کی جانب پسپائی اختیار کی۔ راستے میں فرانسیسیوں نے جنرل موغا (Murat) کی زیر قیادت اس کی فوج پر متعدد حملے کیے لیکن اس نے ان سب کو پسپا کر دیا۔ 23 اکتوبر (پرانا کیلنڈر) کو اس نے طوفانی دریا انیس عبور کیا۔ موغا سارا دن ان روسی دستوں کو، جو باگ راتیاں (Bagration) کی قیادت میں تھے، ہراساں کرتا رہا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ دریا عبور نہ کرنے پائیں۔ راستے میں تو وہ انھیں روک نہ سکا، تاہم وہ روسی فوجوں کے تقریباً پہلو بہ پہلو پل کے قریب پہنچ گیا اور پل کو اپنے قبضے میں لینے کے لیے تگ ودو کرنے لگا۔ جیسا کہ ناول میں بیان کیا گیا ہے، روسی دستے دریا عبور کر گئے اور پاولوگرات ہوزاروں نے اسے کسی نہ کسی طرح آگ لگا دی۔

جنرل موغا مصر میں نپولین کے ساتھ تھا۔ جس بغاوت کے نتیجے میں نپولین برسر اقتدار آیا، اس میں وہ بھی شامل تھا۔ 1800 میں اس نے نپولین کی ہمشیرہ سے نکاح کیا اور 1808 میں نپولین نے اسے نیپلز کا بادشاہ بنا دیا۔ تاہم اس خطاب سے اس کی امنگیں پوری نہ ہوئیں اور وہ ہمیشہ غیر مطمئن رہا۔ طالسطائی جگہ جگہ اس کے اس خطاب کا طنزیہ انداز سے ذکر کرتا ہے۔

11- ناآختہ گھوڑا (Stallion): بالغ گھوڑا۔ عام طور پر افزائش نسل کے کام آتا ہے۔

12- حرف بہ حرف: وہ لوگ جو کسی قانون، حکم یا معاہدے پر حرف بہ حرف (to the letter) عمل کرتے ہیں، وہ یہ نہیں دیکھتے کہ قانون، حکم یا معاہدے کا منشا یا روح کیا ہے، بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس میں لکھا کیا ہے اور جو لکھا ہوتا ہے، اسے پتھر کی لکیر سمجھتے ہیں اور صرف اسی کے مطابق عمل کرتے ہیں۔

13- گجنالیس اور گریپ شاٹ: فرہنگ دیکھیں۔

14- ولادی میر (St.Vladimir) یا ولادی میر اعظم (925 تا 1015) روس کا پہلا عیسائی حکمران۔ اس کا پایہ تخت کیف تھا۔

15- لم باخ وغیرہ: اواخر اکتوبر میں ان تینوں مقامات پر جو جھڑپیں ہوئیں، ان میں روسی دستوں کی قیادت باگ راتیاں اور فرانسیسیوں کے ہراول دستہ کی موغا نے کی۔ تینوں جھڑپوں کا مقصد فرانسیسیوں کو قریب آنے سے روکنا تھا۔

16- جنرل فیلڈ مارشل: بعض ممالک میں یہ دونوں عہدے اکٹھے استعمال کیے جاتے ہیں۔

17- بوہیمیا: آج کل چیکوسلواکیا میں شامل ہے۔ اس زمانے میں آسٹریا کے قبضے میں تھا۔

18- ملاقات: دونوں حکمرانوں کے مابین یہ ملاقات اکتوبر 1805 میں برلن میں ہوئی۔ معاہدہ بھی طے پا گیا لیکن نتیجہ

کچھ نہ نکلا۔

-19 کامپوفورمیو (Campo Formio): شمالی اطالیہ کا ایک گاؤں: یہاں فرانسیسیوں اور آسٹرویوں کے مابین 1797 میں ایک معاہدہ طے پایا تھا۔ اس کے تحت آسٹریا اپنے بعض علاقوں میں سے فرانس کے حق میں دست بردار ہو گیا تھا۔

-20 بوناپارٹ: خود نپولین فرانسیسی جزیرے کارسیکا میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کے والدین اطالوی تھے۔ ان کا تعلق ایک قدیم اطالوی خاندان بوناپارت (Buona parte) سے تھا۔ بوناپارت کی فرانسیسی شکل بوناپارٹ (Bona parte) خود نپولین نے اختیار کی تھی۔ لیکن بعض روسی اسے ازرہ تضحیک بوناپارت ہی کہتے تھے۔ ناول کا آغاز بھی اسی طنزیہ نام سے ہوتا ہے۔ (ناموں پر نوٹ بھی دیکھیں)

-21 مقدس: ماضی میں یورپ کے بعض ممالک اور ادارے اپنے نام کے ساتھ لفظ مقدس (Holy) کا اضافہ کر لیتے تھے، مثلاً مقدس رومی سلطنت (Holy Roman Empire) یا Holy See (پوپ کا صدر مقام)۔

-22 ہز میجسٹی آف سارڈینیا: سارڈینیا بحیرہ روم میں اطالوی جزیرہ ہے۔ نپولین نے اس پر 1796 میں قبضہ کیا تھا۔ اس سے پہلے یہ آسٹریا کے ماتحت تھا۔

-23 لندن: اس زمانے میں سفارت کاروں کے لیے لندن میں تعیناتی کوئی خاص کشش نہیں رکھتی تھی۔ پیرس، ویانا، برلن، پیٹرز برگ وغیرہ کہیں بہتر شہر متصور ہوتے تھے۔

-24 دون واں (Don Juan): مغربی ادب کا ایک داستانی کردار۔ اس کی ابتدا ہسپانوی ڈرامہ نگار ترسو دمیلونا کے ایک کھیل سے ہوئی۔ رفتہ رفتہ دوسرے ادیبوں اور موسیقاروں نے اسے اپنا لیا۔ (فرانسیسی ڈرامہ نگار) مولیئر نے اس کے بارے میں ڈرامہ، (آسٹروی موسیقار) موٹسارٹ نے اوپیرا اور (جرمن شاعر) رچرڈ سٹراس نے نظم لکھی۔ روایت کے مطابق دون واں عورتوں کا شکاری تھا۔ وہ عورتوں کو ورغلاتا، اپنی ہوس کا نشانہ بناتا اور پھر انھیں چھوڑ دیتا۔ اس نے ایسی ہی ایک عورت کے باپ کو قتل کر دیا۔ چند مہینے بعد وہ ذرا پچھتایا اور اس نے باپ کے مجسمے کو دعوت پر اپنے گھر بلایا۔ مجسمہ پہنچ گیا لیکن وہ اسے گھسیٹ کر جہنم میں لے گیا تا کہ اسے اس کے سابقہ گناہوں کی سزا مل سکے۔ لارڈ بائرن اور جارج برنارڈ شا نے بھی اسے بالترتیب اپنی نظم اور کھیل کا موضوع بنایا لیکن یہاں وہ شکاری کم ہے اور نخچیر زیادہ۔

-25 ڈیموستھینیز: ڈیموستھینیز سکندر اعظم کے باپ فلپ کا ہم عصر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے زبردست مقرر آج تک پیدا نہیں ہوا۔ شروع میں اس کی آواز کم زور تھی اور وہ ہکلاتا بھی تھا۔ اس نے اس کا علاج یہ کیا کہ پہاڑوں میں نکل جاتا، منہ میں کنکریاں ڈال لیتا اور تقریر کی مشق کرتا رہتا۔ رفتہ رفتہ وہ اپنے فن کا یکتائے روزگار شخص بن گیا۔

-26 موراوی بل: موراویا آج کل چیکوسلواکیا کا صوبہ ہے اور برن اس کا صدر مقام ہے۔

-27 آرڈر آف ماریا ٹریسا: تمغہ۔ ماریا ٹریسا اپنے باپ چارلس ششم کی وفات کے بعد آسٹریا کی حکمران (آرچ ڈچس) بن گئی۔ اس کا عہد حکومت 1740 سے 1780 تک محیط ہے۔ امپراطور فرانٹس اس کا پوتا تھا۔

-28 چیمبرلین: ایک سرکاری عہدیدار جس کے ذمے شاہی محل کے تمام امور کا انتظام وانصرام ہوتا ہے۔ حاجب۔

29- گاسکن: فرانس کے صوبے گاسکنی کا باشندہ۔

30- تولوں (Toulon): جنوب مشرق فرانس کی بندرگاہ اور بحری اڈہ۔ انقلاب فرانس کے بعد شاہ پرستوں کا گڑھ تھا۔ 1793 میں نپولین نے، جب وہ توپ خانے کا کیپٹن تھا، اس کا محاصرہ کیا اور اپنی پہلی عسکری کامیابی حاصل کی۔ اس کے نتیجے کے طور پر اسے جرنیل بنا دیا گیا۔ پرنس آندرے بھی ایسے ہی خواب دیکھ رہا ہے۔

31- در فشطنی: مصنف نے یہاں لفظ gasconade جس کے معنی شیخی خوری ہے، استعمال کیا ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں شیخوں کی شیخی اور پٹھانوں کی ڑ مشہور ہے، اسی طرح گاسکنوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھیں شیخیاں بگھارنے اور دور کی کوڑی لانے میں ید طولیٰ حاصل ہے۔ چنانچہ انھوں نے یورپی زبانوں کو لفظ gasconade بمعنی bravado's wagger'boas-fulness, دیا ہے۔ (بحوالہ یونیورسل ڈکشنری اور السٹریٹڈ ورلڈ انسائیکلوپیڈیا)

32- طالسطائی نے یہ خط تیئر (Thiers) کی کتاب Histoire du Consulate ed de l'Emtire سے نقل کیا ہے۔ 25 بغومیغ چار نومبر کے مطابق ہے۔ تیئر کے حالات کے متعلق ''تمتہ'' (حصہ دوم) کا حاشیہ نمبر 9 دیکھیں۔

33- تولوں: اوپر حاشیہ نمبر 30 ملاحظہ فرمائیں۔

34- استراخانی ٹوپی: بھیڑ کے بچوں کی پوستین کی ٹوپی۔ استراخان دریائے وولگا کے کنارے روسی شہر ہے۔ یہاں جو پوستین تیار کی جاتی ہے، اس پر پشم بھی ہوتی ہے۔

35- لہجہ مشرقی تھا: باگ راتیاں سابقہ روسی ریاست (موجودہ آزاد ملک) جارجیا کا، جس کی سرحد شمالی ترکی سے ملتی ہے اور جو انیسویں صدی تک ترکی ہی کا حصہ تھی، باشندہ تھا۔ باگ راتیاں جارجیاں کے قدیم حکمرانوں کا خاندانی نام تھا۔ (ماڈ)

36- بشکل مربع (Square): سامان کے لیے بیچ میں خالی جگہ کے اردگرد آدمی کھڑے کر دیے جاتے تھے۔ ان کے چہرے اندر کو ہوتے تھے تاکہ وہ افسروں کے، جو خالی جگہ پر کھڑے ہوتے تھے، احکام سن سکیں۔

37- نیچے اترنے لگے: یہ وہ یورش تھی جس کے متعلق فرانسیسی مورخ تیئر (Thiers) لکھتا ہے: ''روسیوں نے جرأت اور شجاعت کا مظاہرہ کیا اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہوئی اور یہ جنگ میں کم کم ہی ہوتی ہے کہ دو پیادہ فوجیں بڑے عزم و ارادے کے ساتھ آگے بڑھ رہی تھیں۔ تصادم سے پہلے ان میں سے کوئی بھی ہار ماننے کے لیے تیار نہیں تھا۔'' اور سینٹ ہیلینا میں اسیری کے دوران میں نپولین نے کہا: ''بعض روسی بٹالینیوں نے کامل بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔'' (طالسطائی کا اپنا حاشیہ بحوالہ ماڈ اور روزمیری ایڈمنڈز)

38- وڈھ: فصلوں کی کٹائی کے بعد پودوں کے کچھ حصے کھیت پر باقی رہ جاتے ہیں۔ اس کھیت کو پنجابی میں ''وڈھ'' اور فارسی میں ''کاہبان'' کہتے ہیں۔

حصہ سوم

1- جنٹل مین آف بیڈ چیمبر: مصاحب شاہ۔ برطانیہ میں اسے لارڈ آف بیڈ چیمبر کہتے ہیں۔

-2 کونسلر آف سٹیٹ: زاروں کے روس میں سول سروس کے گیارہ طبقوں میں سے پانچویں کا رکن۔ (ماڈ)

-3 سٹیوارڈ: جائیداد کا منتظم۔

-4 چانسلر: یہ لاطینی لفظ Cancellarius سے مشتق ہے۔ یہ رومی شہنشاہ کا ایک طرح کا وزیر ہوتا تھا اور اسے Cancellarius اس لیے کہتے تھے کیونکہ وہ درخواست دہندگان کی کثیر تعداد سے بچنے کے لیے ایک قسم کی سکرین (Cancellus) کے پیچھے بیٹھا کرتا تھا۔ جرمنی اور آسٹریا کے وزرائے اعظم آج بھی چانسلر کہلاتے ہیں۔

-5 آزاد کسان: عام طور پر روسی کسان مکمل طور پر جاگیرداروں کے رحم وکرم پر ہوتے تھے اور ایک قسم کے غلام ہوتے تھے۔ انھیں serf کہا جاتا تھا۔ ان کے خاندان کا ہر فرد چوبیس گھنٹے جاگیردار کی خدمت کرتا تھا اور انھیں اور نہ ان کے اخلاف کو جاگیردار کی مرضی کے بغیر کہیں جانے یا زمین چھوڑنے کی آزادی ہوتی تھی۔ تاہم کسانوں کی ایک محدود تعداد ایسی بھی تھی جو جس جاگیردار کی چاہتے زمین کاشت کرتے اور جب جی چاہتا، چھوڑ کر کہیں اور چلے جاتے۔ یہ خدمات کی بجائے زمین کا لگان ادا کرتے تھے۔ انھیں freemen (آزاد) کہا جاتا تھا۔

-6 کارسیٹ (Corset): یورپی عورتوں کا ایک قسم کا چست زیر جامہ۔ کمر اور کولھوں کے گرد یہ بالکل کسا ہوتا ہے۔ یہ پہنا اس لیے جاتا ہے تاکہ جسم تنا رہے اور سڈول نظر آئے۔

-7 سٹیپ (stepe): روس میں یوکرین سے لے کر جنوب مغربی سائبیریا تک وسیع وعریض ہموار قطعہ زمین ہے۔ اسے سٹیپ کہا جاتا ہے۔ یہاں صرف گھاس اگتی ہے۔ درخت میلوں تک نظر نہیں آتا۔

-8 ایلینا: ہیلین کا پیار کا نام۔

-9 چیمبرلین (Chamberlain): وہ درباری جو شاہی گھرانے کے گھریلو امور کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

-10 رائن: مغربی یورپ کا طویل ترین دریا۔ یہ جرمنی کے جس علاقے میں بہتا ہے، اسے رائن لینڈ یا وادی رائن کہتے ہیں۔ یورپ کی نفیس ترین اور مشہور ترین سفید شرابیں یہیں کشید کی جاتی ہیں۔

-11 پیرس وہیلن: ہیلن دیوتاؤں کے دیوتا زیوس اور یونانی ریاست سپارٹا کی ملکہ لیڈا کی بیٹی اور سپارٹا کے حکمران منیلیاس کی شریک حیات تھی۔ وہ اپنے زمانے کی حسین ترین عورت تصور ہوتی تھی۔ اسے ٹرائے (ترکی) کے شہزادے پیرس نے اغوا کرلیا۔ اس پر یونانی ریاستوں اور ٹرائے کے مابین گھمسان کا رن پڑا۔ یہ جنگ دس سال جاری رہی۔ بالآخر یونانی مکروفریب سے جیت گئے۔ انھوں نے ٹرائے کو آگ لگا دی اور ہیلن کو اپنے ساتھ واپس یونان لے گئے۔ یہ جنگ بارہ سو سال قبل مسیح برپا ہوئی تھی لیکن باقی قصہ مشکوک ہے۔ یونانی شاعر ہومر کی شاہکار نظم Iliad اسی قصے پر مبنی ہے۔

-12 گرین ہاؤس: اکثر یورپی ممالک میں سردیوں میں برف باری ہوتی رہتی اور بارشوں کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ اس لیے کھیتوں میں کوئی چیز اگائی نہیں جا سکتی۔ سبزیاں اور بعض ضروری پودے اگانے کے لیے گھروں سے ملحقہ باغات اور عوامی پارکوں میں خاص عمارتیں، جن کی دیواریں اور چھتیں شیشے کی ہوتی ہیں، بنالی جاتی ہیں۔ انھیں گرین ہاؤس کہتے ہیں۔

13- نیم غلام (serf): جاگیرداروں کے زرعی اور گھریلو کارندے۔ وہ اپنی مرضی سے مالک کی ملازمت چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ انھیں یا تو کوئی دوسرا شخص خرید لیتا یا پھر انھیں اپنی آزادی کے لیے خاص رقم ادا کرنا پڑتی اور اس کی بھی عموماً اجازت نہیں ملتی تھی۔ (حاشیہ نمبر 5 بھی دیکھیں)

14- بیرونی عمارتیں: یورپی جاگیردار اپنی جاگیروں پر ہی اپنے محل تعمیر کیا کرتے تھے۔ محل سے قدرے فاصلے پر کارندوں کے مکانات اور بیرونی عمارتیں ہوتی تھیں۔ یہ عمارتیں گوداموں اور اصطبلوں کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔

15- سکرین: یخ بستہ ہواؤں سے بچنے کے لیے بیڈ کے چاروں اطراف مسہری نما پردہ۔

16- حساسیت (sensibility): دوسرے لوگ جو کچھ کہتے یا کرتے ہیں، اس سے باآسانی متاثر یا ناراض ہونے کا رجحان۔

17- اسماعیلوف رجمنٹ: طالسطائی نے اس ضخیم ناول میں بہت کم غلطیاں کی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس سے بھول چوک ہوگئی ہے کیونکہ حصہ اول کے ساتویں باب میں ہمیں یہ بتایا تھا کہ بورس کا تبادلہ سیمی نوف رجمنٹ میں ہوا تھا۔ (ماڈ)

18- زار یوچ: گرینڈ ڈیوک زار یوچ کانستانتن، کمانڈر گارڈز۔ گرینڈ ڈیوک روسی زار کے بیٹوں اور پوتوں کا خطاب ہوتا تھا اور اس کا ولی عہد، جو بھائی ہو یا بیٹا، زار یوچ (زار کا بیٹا) بھی کہلاتا تھا۔ یہ گرینڈ ڈیوک زار الیکساندر کا بھائی تھا۔

19- الفانسے کارلووچ: برگ جرمن نژاد روسی ہے۔ اس لیے اس کے نام میں روسی اور جرمن دونوں اجزا شامل ہیں۔

20- ہُن: ایک وحشی قوم تھی۔ اس نے چوتھی پانچویں صدی میں یورپ کو تاخت و تاراج کیا تھا۔ غیر جرمن اقوام جرمنوں کو حقارت سے ہن کہتی ہیں۔

21- گالیشیا: وسطی یورپ کی ایک ریاست۔ بارھویں صدی میں روسیوں نے فتح کی اور چودھویں صدی میں پولینڈ کے قبضے میں آئی۔ اٹھارھویں صدی میں آسٹریا نے اپنی مملکت میں شامل کر لی۔ جنگ عظیم اول کے بعد دوبارہ پولینڈ کو مل گئی۔ جنگ عظیم دوم کے بعد مشرقی گالیشیا روس کے حوالے کر دیا گیا۔

22- آرنوت: یورپ کے واحد مسلمان ملک البانیہ کے، جو سلطنت عثمانیہ کو بے قاعدہ دستے فراہم کیا کرتا تھا، "باشندوں کو ترک آرنوت (غالباً بھاڑے کے سپاہی) کہا کرتے تھے۔" (ماڈ)

23- ایسن (Essen): جرمنی کا شہر۔ انیسویں صدی میں صنعتی مرکز بن گیا تھا۔

24- وے روٹر (Weyrother): آسٹروی چیف آف سٹاف۔

25- شوارٹسن برگ (Schwartzenberg): پرنس کارل وون شوارٹسن برگ۔ آسٹروی جرنیل۔

26- قونصل: انقلاب فرانس کے کچھ سالوں بعد 1795 میں نیا نظام حکومت وجود میں آیا۔ بادشاہت ختم کر دی گئی۔ پانچ سو افراد پر مشتمل کونسل منتخب ہوئی لیکن اصل اختیار پانچ اشخاص کے ہاتھ میں تھا۔ یہ ڈائرکٹر کہلاتے تھے اور ان کا نظام حکومت 'ڈائرکٹری'۔ 1799 میں نپولین نے یہ نظام ختم کر دیا اور نیا نظام Consulate تشکیل دیا۔ وہ خود فرسٹ قونصل بن گیا۔ دوسرے دو قونصل اس کے نائب تھے۔ بیس مئی 1804 کو اس نے امپراطور کا لقب اختیار کر لیا اور یوں یہ نظام بھی ختم ہو گیا۔

-27 تھیئٹریت (Theartricality): خودنمائی اور مصنوعی لب ولہجہ، جواداکاروں کے ساتھ منسوب کیا جاتا ہے۔

-28 ایل زاس (Alsace): مغربی جرمنی سے ملحق مشرقی فرانس کا خطہ۔

-29 گرینڈ مارشل: میر دربار۔

-30 ہر (herr): جناب یا مسٹر کا ہم معنی جرمن لفظ۔

-31 ومپ فن وغیرہ: ومپ فن، لک ٹین شٹائن اور ہوہن لوئے (Honhenloe) جرمن نژاد، لانژغوں (Langeron) فرانسیسی نژاد اور پرش پرش پولستانی نژاد روسی جرنیل تھے۔ ماڈ کے مطابق پرش پرش کا پورا نام پرزے بزیوسکی تھا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

-32 کوبیل نٹس وغیرہ: یہ لڑائی، جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، قصبے اوسٹرلٹس کے قریب ہوئی۔ اس زمانے میں یہ علاقہ آسٹروی مملکت کا حصہ تھا۔ اب یہ موجودہ چیکوسلویکیا کا حصہ ہے۔ آسٹروی جرمن بولتے تھے، اس لیے شہروں اور قصبوں کے نام بھی جرمن تھے۔ چیکوسلویکیا نے یہ سارے نام تبدیل کر دیے ہیں۔ اب اوسٹرلٹس کو سلاوکوف اور برن کو برے ناؤ (برین گن یہیں ایجاد ہوئی تھی) کہتے ہیں۔ کوبیل نٹس، سوکولٹس اور دوسرے قصبوں کے نام بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔

-33 پرنس آندرے جس مسئلے — ''کہ موت آدمی کی عظیم ترین مساعی اور بہترین امیدوں پر پانی پھیر سکتی ہے'' — سے آنکھیں چرانے کی کوشش کر رہا ہے، ماڈ کے خیال کے مطابق اس نے سولہ سال بعد طالسطائی کی زندگی میں انقلاب برپا کر دینا تھا۔ تفصیل طالسطائی کی کتاب ''اعتراف'' (A Confession) کے باب سوم میں دیکھی جا سکتی ہے۔

-34 خیابان تورسکایا: ماسکو کی سڑک۔

-35 پیالہ (pan): یہ پیالہ قدیم طرز کی بندوقوں میں ہوتا تھا۔ اسی سے محاورہ flash in the pan (پرانی بندوق کی طرح ابتدائی زور وشور دکھانے اور کوئی دیرپا اثر چھوڑے بغیر ختم ہو جانا) بنا۔

-36 ہولابرون: طالسطائی نے اس لڑائی کی تفصیل جنگ شون براگرن کے نام سے بیان کی ہے (حصہ دوم ابواب نمبر 16 تا 21)۔

-37 بوہیمیا: بوہیمیا پندرھویں صدی تک آزاد ملک تھا۔ پندرھویں صدی میں پہلے یہ ہنگری اور پھر آسٹروہنگری سلطنت کا جزو بنا۔ جنگ عظیم اول کے اختتام پر اسے چیکوسلویکیا میں شامل کر دیا گیا۔ اب اس کا نام چے خی (Chechy) ہے۔

-38 کرسکی: روسی شہر کرسک کا باشندہ۔ اس شہر اور اس کے گردونواح کے علاقے کی اپنی رجمنٹ تھی۔ بعد میں اس شہر نے یوں عالم گیر شہرت حاصل کی کہ یہاں روسیوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران میں ٹینکوں کی عظیم ترین لڑائی میں جرمنوں کو شکست دی تھی۔

-39 ساسیج خور (sausage-eater): ساسیج جانوروں کی آنتوں میں قیمہ اور مصالحے بھر کر بنائے جاتے ہیں۔ روسی جرمنوں کو ''ساسیج خور'' کہہ کر ان کا مذاق اڑاتے تھے۔

-40 زارتسین میڈو: پیٹرزبرگ کی پریڈ گراؤنڈ۔ زار الیکساندر اور کوتوزوف کے مابین یہ گفتگو ایک روسی مورخ میخائلوفسکی

دانیلفسکی کی کتاب ''جنگ 1805 '' سے ہو بہو نقل کی گئی ہے۔ تاہم گفتگو کے دوران میں متکلمین جس ردعمل۔ کوتوزوف کے بالائی ہونٹ کا پھڑپھڑانا اور اس کا اپنے کندھے اچکانا۔ کا اظہار کرتے ہیں، وہ طالسطائی کی اپنی اختراع ہے۔ (ماڈ)

-41 ہاتھ: ہمارے ہاں بالشت کا پیمانہ تقریباً نو انچ یا چار گرہ کے برابر ہوتا ہے۔ مغرب میں یہ چار انچ (یا 10،76 سینٹی میٹر) کے برابر ہوتا ہے اور عام طور پر گھوڑے کی اونچائی ظاہر کرنے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

-42 نائٹ (knight): قرون وسطیٰ میں یورپی ممالک میں بعض اشخاص کو، جن کا تعلق اعلیٰ خاندانوں سے ہوتا تھا، جو تلوار کے دھنی اور شجاعت میں اپنی مثال آپ سمجھے جاتے تھے، تربیت کے مختلف مراحل میں سے گزارنے کے بعد بادشاہ وقت خصوصی فوجی مناصب پر فائز کرتے تھے۔ انھیں نائٹ کہا جاتا تھا۔ ان کی بہت قدر افزائی ہوتی تھی اور وہ معاشرے میں عزت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔

-43 بند: ڈیم۔ یورپ کے اکثر و بیشتر دریا محض ندی نالے ہیں۔ ان ندیوں پر بند بنا کر پانی روک لیا جاتا اور آٹا پیسنے کی پن چکیاں چلائی جاتی تھیں۔

دوسری کتاب

حصہ اول

-1 وارانیژ: ماسکو کے جنوب میں واقع ہے۔ یہاں نکولائی رستوف اور پرنسس ماریا بلکونسکایا کے مابین زندگی کی اہم ترین ملاقات ہوگی۔

-2 جنجر بریڈ (ginger bread) شیریں کیک یا بسکٹ۔ بسکٹ عام طور پر کسی آدمی یا جانور کی شکل کے ہوتے ہیں اور ان میں ادرک کی خوشبو شامل ہوتی ہے۔

-3 دلکی گھوڑا (trotter): اصلاً یہ گھوڑا ایک قسم کی دوڑ جسے ہارنیس (harness) ریس کہا جاتا ہے، دوڑایا جاتا ہے۔ اس دوڑ میں گھوڑے ایک ہلکی پھلکی دو پہیہ گاڑی بنام سلکی (sulky) میں، جس میں صرف ایک ہی نشست ہوتی ہے اور جسے صرف ایک ہی گھوڑا کھینچتا ہے، جتے ہوتے ہیں۔

-4 انگلش کلب: یہ کلب اٹھارویں صدی میں امپراطورہ کیتھرین کے زمانے میں ماسکو میں شروع ہوا تھا۔ پیٹرز برگ کے دارالسلطنت قرار دیے جانے پر ماسکو کی حیثیت ثانوی ہوگئی تھی اور ماڈ کے الفاظ میں ماسکو پیٹرز برگ کا ''غیر سرکاری حریف'' بن گیا تھا۔ چنانچہ شہر کے امرا اور رؤسا اس کلب میں اکثر اکٹھے ہوتے اور دلوں کے پھپھولے پھوڑا کرتے تھے۔

-5 ایسپاریگس (asparagus): ایک قسم کا پودا جس کے پتے نہیں صرف شاخیں ہوتی ہیں۔ یہ شاخیں بہت لذیذ ہوتی

ہیں اور بطور سبزی استعمال ہوتی ہیں۔ پودے کی بوائی کے تین سال بعد یہ شاخیں کاٹی جا سکتی ہیں لیکن نئی شاخیں پھوٹنے کا عمل آٹھ دس سال جاری رہتا ہے۔

-6 کھیرا (Cucumber): ہوتا کھیرے جیسا لیکن حجم میں اس سے خاصا بڑا ہوتا ہے۔ کھیرے کی طرح بطور سلاد استعمال ہوتا ہے۔

-7 تاج خروس: (Cockscomb) ایک پھول جو مرغ کی کلغی کی مانند ہوتا ہے۔

-8 پیٹی: patty

-9 انڈے کی ساس (mayonnaise): انڈے کی زردی پھینٹ کر اس میں تیل، سرکے یا لیموں کے رس کی آمیزش کر کے تیار کرتے ہیں اور کریم میں ملا کر سلاد کے اوپر اس کی تہہ جماتے ہیں۔

-10 sterlet: ایک قسم کی مچھلی جو بحیرہ کیسپیئن میں پائی جاتی ہے۔

-11 کاؤنٹ رستوپ چن وغیرہ: کاؤنٹ رستوپ چن (1763 تا 1826) نے بعد میں (جلد دوم) ماسکو کا گورنر جنرل اور کمانڈر انچیف مقرر ہونا ہے۔ پرنس یوری دلگاروکی زار پال کے عہد میں ماسکو میں کمانڈر انچیف رہ چکا تھا۔ کاؤنٹ آئی آئی مارکوف زارینہ کیتھرین کے عہد کا جرنیل تھا۔ اے۔ این۔ ویازیمسکی ایک اعلیٰ افسر اور مصنف پرنس پی۔اے۔ ویازیمسکی کا باپ تھا اور پی۔ ایس۔ والیویف ماہر آثار قدیمہ تھا۔

-12 ڈریس کوٹ: وہ کوٹ جو خاص خاص مواقع پر پہنا جائے۔

-13 قصیدہ: باگراتیاں کے اعزاز میں اس دعوت کا ذکر اس زمانے کے ایک شخص ایس۔ پی۔ زخاریف نے اپنے روزنامچے کے 4 مارچ 1806 کے اندراج میں کیا ہے۔ طالسطائی نے اس میں کچھ اضافے اپنی طرف سے کر دیے ہیں۔ قصیدہ ذرا بے ہنگم روسی زبان میں لکھا گیا تھا اور اس کا مصنف نکولوف 1806 تک بینائی سے محروم ہو چکا تھا اور یوں وہ خود اسے پڑھ کر نہیں سنا سکتا تھا۔ (ماڈ)

-14 ٹائی ٹس (39 تا 81): ٹائی ٹس (Titus) سن 79 تا 81 میں روم کا شہنشاہ تھا۔ اس نے 70 میں اپنے باپ کے ساتھ یہودیوں کی بغاوت کو فرو کیا، یروشلم پر قبضہ کیا اور ہیکل سلیمانی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ اسی کے عہد میں پومپیائی کا شہر لاوے میں دبا تھا۔ اس کی موت کے بعد اسے "darling of human race" قرار دیا گیا اور ''سینٹ'' کے مرتبے پر فائز کیا گیا۔

-15 رھفی اس (Rhipheus): ایک قسم کی بہت خوبصورت تتلی۔

-16 کوتوزوف: اس کوتوزوف کا کمانڈر انچیف کوتوزوف سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ (ماڈ)

-17 سیکنڈ: گزشتہ صدی کے اختتام تک یورپ کے تقریباً تمام ہی ممالک میں ڈوئیل (duel) لڑنے کا رواج تھا۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا کہ دوسرے شخص نے اس کی عزت پر حملہ کیا ہے، وہ اسے اپنے حمایتی کے، جسے سیکنڈ کہا جاتا تھا، ذریعے چیلنج بھیج دیتا۔ جس شخص کو چیلنج دیا جاتا، اسے یہ قبول کرنا پڑتا ورنہ اسے بدنامی کا سامنا کرنا پڑتا اور وہ لوگوں کی نگاہوں میں بزدل ٹھہرتا۔ ڈوئیل کے انتظامات طرفین کے سیکنڈ کرتے۔ ڈوئیل شمشیر سے لڑی جائے یا پستول سے، اس کا

اختیار اس شخص کو، جسے چیلنج دیا جاتا، ہوتا تھا۔ عام طور پر ڈوئیل مخالف کے زخمی ہونے پر ختم ہو جاتی تھی لیکن بعض اوقات اس کا انجام ہلاکت بھی ہوتا۔ روسی زبان کا عظیم شاعر پوشکن بعمر 38 سال ڈوئیل ہی میں ہلاک ہوا تھا۔ خود طالسطائی نے اپنے ہم عصر ناول نگار ترگنیف کو ڈوئیل کا چیلنج دیا تھا۔

-18 اناطول: ماڈ کا بیان ہے کہ ناول کے ابتدائی مسودات میں طالسطائی نے بالکل واضح انداز سے بیان کیا تھا کہ ہیلین اور اس کے بھائی اناطول کے مابین نازیبا تعلقات تھے تاہم آخری مسودے میں اس نے تبدیلیاں کر دیں اور اب اس بارے میں صرف اشارے کنائے باقی رہ گئے ہیں۔

-19 لوئی شانزدہم (1754 تا 1793): فرانس کا بادشاہ۔ وہ اور اس کی ملکہ انقلاب فرانس کی بھینٹ چڑھے۔

-20 روبسپیئر (Robespierre) (1758 تا 1794): انقلاب فرانس کا رہنما۔ اس نے انقلاب دشمنوں کو چن چن کر گلوٹین پر چڑھایا اور اسی الزام میں خود بھی سزائے موت کا مستوجب ٹھہرا۔

-21 وسطی اور شمالی مشرقی روس: روس کے اس علاقے کو "گریٹ رشیا" کہا جاتا ہے۔ یہیں کی زبان روس کی سرکاری زبان ہے۔

-22 Fruschtique اصل جرمن لفظ fruhstuck (ناشتہ) ہے۔ ان پڑھ باورچن نے اسے fruschtique بنا دیا۔

-23 مولداوی: مولداویا (Moldavia) کا باشندہ۔ مولداویا، جس کا بیشتر حصہ روس نے 1812 میں رومانیہ سے چھینا تھا، سوویت یونین کی ایک ری پبلک تھی۔ کشی نیف اس کا صدر مقام ہے۔ سوویت یونین کی شکست و ریخت کے بعد اب یہ بھی ایک آزاد مملکت کا روپ دھار چکی ہے۔

-24 شیر خوار کے بال: روس میں جب بپتسمے کی رسم ادا کی جاتی تھی، پادری بچے کے چند بال کاٹ لیتا تھا اور انھیں جلتی موم بتی کے موم سے چپٹا دیتا تھا۔ اگر یہ موم بپتسمے کے پانی کے برتن میں، جس کی شکل پیالہ نما ہوتی تھی، ڈوب جاتا، تو اسے بدشگونی تصور کیا جاتا۔ (ماڈ)

-25 نپولین کے ساتھ جنگ: 1806 کے دوران میں نپولین سارا سال نئی جنگ کی تیاریاں کرتا رہا۔ اواخر ستمبر میں اس نے اورشٹٹ اور جینا کے مقامات پر پرشیا کی افواج کو شکست دی اور برلن پر قبضہ کر لیا۔ روسیوں کو کمک پہنچانے کا موقع ہی نہ مل سکا کیونکہ فرانسیسی دریائے وسٹولا پر ان کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ تاہم نئے خطرے سے نپٹنے کے لیے زار الیکساندر نے فوج اور ملیشیا میں نئی بھرتی کا فرمان جاری کر دیا۔ ماڈ کے بقول ملیشیا کے 4/5 حصے کو بندوقوں کے بجائے pikes (ایک قسم کی بلم) سے مسلح کیا جاتا تھا۔

-26 تہوار روز دوازدہم: اس تہوار کو انگریزی میں Epihany اور بعض اوقات چھوٹی کرسمس بھی کہتے ہیں۔ (اس سے پہلی رات شب دوازدہم کہلاتی ہے۔ یہ تہوار کرسمس سے بارہ روز بعد چھ جنوری کو منایا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ اس روز تین چیزیں وقوع پذیر ہوئیں: (1) حضرت عیسیٰؑ کو بپتسمہ دیا گیا (2) تین مجوسی علماء کی آمد۔ انھوں نے حضرت عیسیٰؑ کے ظہور کی تصدیق کی (3) فلسطین کے قصبے الجلیل میں ایک شادی ہوئی۔ شادی میں شراب ختم ہو گئی۔ حضرت عیسیٰؑ نے پانی کے مشکوں کو شراب میں تبدیل کر دیا۔ یہ تہوار ان تینوں واقعات کی یاد میں منایا جاتا ہے۔

27- نائٹ: وہ شخص جو خواتین کی حفاظت اور حمایت اپنا فرض گردانتا ہو۔

28- pas de chale: رقص شال: ایک قسم کا فرانسیسی رقص۔

29- ecossaise وغیرہ: ecossaise کے لفظی معانی سکاچستانی (وہ شخص یا چیز جس کا تعلق سکاٹ لینڈ سے ہو) ہیں۔ اصلاً یہ موسیقی کی دھن تھی۔ پھر اس کی لے پر جوشیلا رقص وجود میں آیا۔ سکاٹ لینڈ سے یہ دونوں چیزیں فرانس، جو اس زمانے میں بھی یورپ کا ثقافتی مرکز تھا اور فرانس سے یورپ کے باقی ممالک میں پہنچیں۔

anglaise (لفظی معانی انگلش) پر پہلی کتاب کے حصہ اول میں پہلے ہی حاشیہ دیا جا چکا ہے۔ مازور کا پولینڈ سے شروع ہوا۔ یہ بھی موسیقی کی دھن کا بھی نام ہے اور رقص کا بھی۔ دھن اور رقص دونوں بہت تیز اور جوشیلے ہوتے ہیں۔

30- دوپتی تاش (piquet): تاش کا ایک کھیل جو دو اشخاص کے مابین کھیلا جاتا ہے۔ اس میں اکا (جو تاش کا سب سے اونچا پتا مانا جاتا ہے) چھوڑ کر ستے سے نیچے تمام پتے نکال دیے جاتے ہیں اور یوں بتیس (32) پتوں سے کھیلا جاتا ہے۔

31- زیورات کا ڈبا: (انگلش Casket، فرنچ Cassette)۔ یہ ڈبا منقش ہوتا تھا۔ موجودہ کیسٹ اسی لفظ کی دین ہے۔

32- پرونوٹ: پتا نہیں یہ لفظ کہاں سے آیا ہے۔ شاید پرامیسری نوٹ (promissory note) کو بگاڑ کر بنایا گیا ہو۔ انگریزی میں اس قسم کے معاہدے کو IOU (I owe you) (میں آپ کا مقروض ہوں) بھی کہتے ہیں۔

33- پیشنس (patience): تاش کا ایک کھیل۔ عام طور پر اسے صرف فرد واحد کھیلتا ہے۔

34- ساحرہ: دینی سوف میں شاعر اور نپولین کے خلاف تحریک مزاحمت (1812) کے ہیرو داویدوف (1784 تا 1839) کے بعض اوصاف موجود ہیں لیکن یہ اشعار اس کے کلام میں نہیں ملتے۔ (ماڈ)

35- بارکارول (barca rolle): وینس کے مانجھیوں کا گیت۔ اس کی نقل میں جو دھن بنائی جائے، وہ بھی بارکارول کہلاتی ہے۔ اطالوی میں barca کشتی یا بجرے کو کہتے ہیں اور بارکارول (اطالوی barca ruolo) کشتی ران کو۔

حصہ دوم

1- مادام دَسوزا: مادام دَسوزا (1761 تا 1836): ایک فرانسیسی ناول نگار تھی۔ اس کے جس ناول کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، اس کا نام Emilie et Alphonse (ایمیلی اور الفانسے) ہے۔ ماڈ کا بیان ہے کہ طالسطائی نے ''جنگ اور امن'' کے ابتدائی مسودوں میں مادام دَسوزا کے ساتھ ایک انگریز ناول نگار مسز (این) ریڈکلف (1764 تا 1823) کا بھی، جو ڈراؤنے اور مہم جویانہ ناول لکھا کرتی تھی، ذکر کیا تھا۔ طالسطائی کی والدہ کی نسل ان دونوں خواتین کے ناول بہت ذوق شوق سے پڑھتی تھی۔

2- الٹا کر: ''روس کے زرعی غلام اور کسان اپنے چائے کے مگ الٹا کر رکھتے تھے۔ یہ اس بات کا اشارہ ہوتا تھا کہ انھیں مزید چائے نہیں چاہیے۔'' (ہمارے قبائلی پٹھان بھی اسی روایت پر عمل کرتے ہیں: مترجم)۔ ''روسی کسان اور زرعی غلام گڑ کی ڈلیاں چائے میں حل نہیں کرتے تھے بلکہ بچت کی خاطر چسکیوں کے ساتھ تھوڑی تھوڑی کترتے

رہتے تھے۔''(ماڈ)

3- فری میسنوں کی برادری: ''روس میں فری میسنوں کی تحریک کا آغاز سترھویں صدی کے اواخر یا اٹھارھویں صدی کے آغاز میں ہوا۔ 1760 تک بے شمار اعلیٰ حکام اس کے ارکان بن چکے تھے۔ میسنوں کی مقامی شاخ لاج کہلاتی ہے اور اکثر و بیشتر روسی لاجوں کا جرمن یا انگریزی جماعتوں سے تعلق تھا۔ (کتاب سوم کے آٹھویں باب میں جن نام نہاد سکاچستانی لاجوں کا ذکر آئے گا، وہ اصلاً جرمن ہی تھیں۔) امپراطورہ کیتھرین نے 1790 میں ان لاجوں کو بند کر دیا تھا لیکن الیکساندر کے عہد حکومت میں تحریک پھر زندہ ہوگئی اور اس کے بہت دوررس اثرات مرتب ہوئے۔''(ماڈ)

4- ناوی کوف: این آئی ناوی کوف (1744 تا 1818) سرگرم فری میسن تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ صحافی تھا اور زرعی غلامی کا سخت مخالف۔ اسے 1792 میں قید کی سزا ملی لیکن کیتھرین کی وفات کے بعد 1796 میں رہا کر دیا گیا۔

5- مارتی نیست (Martinists): ایک فرانسیسی مصنف ایل۔ سی۔ دساں ماغناں (Martin) کے پیروکار۔ یہ لوگ مخفی علوم کو جدید زمانے کے حالات پر منطبق کرنے کے دعویدار تھے۔ ناوی کوف (حاشیہ نمبر 4) نے ماغناں کی کتاب Des erreurs et de la verite (اغلاط و حقائق) کا روسی میں ترجمہ کیا تھا۔

6- ٹامس آ کیمپس (Thomas a Kempis) (1380 تا 1471): ایک جرمن راہب۔ اس کی دینی تصنیف ''پیروئ مسیح'' (De Imitatione Christe) آج بھی پڑھی جاتی ہے۔

7- صرف سچ بولنا ہوگا: طالسطائی نے فری میسنوں کی رسومات کی تفصیلات ماسکو کے رومانتسیف میوزیم کی کتابوں اور مسودوں سے، جہاں کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے، اخذ کی تھیں۔ 1866 کے اواخر میں اپنی اہلیہ کے نام خط میں اس نے لکھا تھا: ''کافی پینے کے بعد میں رومانتسیف میوزم چلا گیا اور وہاں تین بجے تک میسنوں کے دلچسپ مسودات پڑھتا رہا۔ میں تمھیں بتا نہیں سکتا کہ ان کے مطالعہ کے بعد مجھ پر اضمحلال (depression)، جس سے میں ابھی تک چھٹکارا نہیں پا سکا، کیوں طاری ہوگیا۔ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ یہ سب میسن نرے احمق ہیں۔''(ماڈ) لاہور میں بھی فیصل چوک میں فری میسنوں کی لاج تھی۔ اس کی پراسراریت کی وجہ سے عام لوگ اسے جادو گھر کہا کرتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو کے عہد حکومت میں پاکستان میں فری میسن تحریک پر پابندی لگا دی گئی کیونکہ اس کا ایک بڑا مقصد بیت المقدس میں ہیکلِ سلیمان کی تعمیر نو بھی ہے۔ یوں اسے یہودیوں کی خفیہ تنظیم کہا جاتا۔ شروع میں اسے پاکستان آرٹس کونسل کی ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بنایا جانا تھا مگر جب نواز شریف پہلی مرتبہ پنجاب کے وزیر اعلیٰ مقرر ہوئے، انھوں نے اسے اپنا دفتر بنالیا۔ پرویز الٰہی نے چڑیا گھر کا کچھ حصہ بھی اس میں شامل کر لیا۔

8الف۔ ماغا (1743 تا 1793): (Jean paul Marat): فرانسیسی صحافی اور انقلابی سیاستدان۔ تربیت کے اعتبار سے وہ ڈاکٹر تھا اور سائنسی مضامین اور کتب تحریر کیا کرتا تھا۔ 1789 میں اس نے ایک اخبار نکالا اور انقلاب کی حمایت کرنے لگا۔ وہ محنت کشوں کا ہیرو تھا اور نیشنل کنونشن (جس نے بادشاہت کا خاتمہ کیا اور لوئی شانزدہم کو سزائے موت دی) کا رکن منتخب ہوا۔ تاہم اس کے مخالفوں نے اسے قتل کروا دیا۔

8ب۔ روسی میں اس کا تلفظ بورلیس ہے۔

9- مجوزہ معاہدہ: یہ معاہدہ، جس کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے، فرانس اور پرشیا کے مابین طے پانا تھا اور آسٹریا نے اس کی پابندی کرنا تھی۔ اس سلسلے میں دونوں ممالک کے مابین اپریل 1807 میں برٹمین شٹائن کے مقام پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ جون میں فریڈ لانٹ کا معرکہ پیش آ گیا۔ اس سے پہلے 27 جنوری کو روسی فوجوں، جس کی کمان بے نگ سین کر رہا تھا اور فرانسیسی فوجوں کے مابین پروئے سش آئی لاؤ کے مقام پر جنگ، جس میں کسی فریق کا پلہ بھاری ثابت نہیں ہوا تھا، ہو چکی تھی۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ روس اور فرانس کے امپراطوروں کے مابین ملاقات کی (جس کا ذکر آگے باب نمبر 19 میں آئے گا) صورت میں نکلا۔ (نیچے حاشیہ جات نمبر 15 اور 34 ملاحظہ فرمائیں۔)

10- عظیم دانش ور: یہاں طالسطائی سے غالباً پھر بھول چوک ہوئی ہے۔ اسی باب میں چند سطور اوپر ڈنمارک کے ناظم الامور کو "عظیم دانش ور" کہا گیا تھا۔ یہاں متکلم غالباً شیتوف ہے جس کا تعارف گوناگوں "خوبیوں کا مالک" کے طور پر کرایا گیا تھا۔

11- d'Urope: اس کا تلفظ ڈیغوپ ہو سکتا ہے۔

12- گلوگاؤ: ایک یورپی قصبہ ہے۔ آج کل پولینڈ میں ہے۔

13- فریڈرک (دوم) اعظم: (1712 تا 1786): پرشیا کا بادشاہ (1740 تا 1786)۔ اس نے سات سالہ جنگ میں اپنے حریفوں کو مات دی اور پرشیا کو یورپ کی بڑی طاقتوں میں شمار کرا دیا۔ والیتر اور متعدد دیگر ادیب، شعرا اور فنکار اس کے دربار سے وابستہ تھے۔

14- چیپل (Chapel): گرجا یا کلیسا کا وہ مقام، جس کا اپنا مائدہ مقدسہ ہوتا ہے، جہاں نجی یا انفرادی عبادت کی جاتی ہے اور بعض دیگر مذہبی رسوم کی ادائیگی ہوتی ہے۔ درسگاہوں، شفاخانوں، جیلوں اور بعض اوقات گھروں میں چھوٹے گرجے تعمیر کر لیے جاتے ہیں یا عبادت کے لیے کمرا مخصوص کر دیا جاتا ہے، انھیں بھی چیپل کہا جاتا ہے۔

15- ایلاؤ (پورا نام پروئے سش۔ آئی لاؤ): ایک گاؤں (پہلے مشرقی پرشیا اور آج کل نو آزاد ملک بائیلوروس میں شامل ہے)۔ یہاں روسی اور فرانسیسی فوجوں کے مابین 27 جنوری 1807 کو لڑائی لڑی گئی۔ روسی فوجوں کی کمان بے نگ سین کر رہا تھا اور ان کے ایک تہائی جوان کھیت رہے۔ نپولین کو بھی بھاری نقصان اٹھانا پڑا۔ دونوں فریق فتح کے دعویدار تھے۔ (اوپر حاشیہ نمبر 9 دیکھیں۔)

16- پلتسک: پولینڈ کے دارالحکومت وارسا کے شمال میں ایک قصبہ۔

17- آسترولینکا: پولینڈ کا ایک اور قصبہ۔ وارسا کے شمال مشرق میں واقع ہے۔

18- کاست روما اور کریمیا: کاست روما ماسکو کے شمال مشرق میں اور کریمیا سابق روسی ریاست اور اب آزاد ملک یوکرین کا حصہ ہے۔ کریمیا 1475 میں عثمانی ترکوں کے قبضے میں آیا۔ 1873 میں اسے روس نے فتح کر لیا اور وہاں کے تاتاریوں کو جلاوطن کر دیا۔ عربی لفظ "کریم" سے بنا ہے۔

19- خانقاہ موقوفہ (Chantry): وہ خانقاہ، گرجا یا مائدہ مقدسہ، جہاں مرحومین کے لیے دعائے مغفرت مانگی جاتی ہے۔ "روس میں سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کے ایام ایک ہی تاریخ کو منائے جاتے ہیں، اس لیے پیئر کے یہ دونوں سینٹ

مربی تھے۔'' (ماڈ)

20- فر(fir): سرو سے ملتا جلتا سدا بہار درخت۔ سفید فر تین سو فٹ بلند ہو جاتا ہے۔ موسیقی کے آلات بنانے میں بھی کام آتا ہے۔

21- برچ: نصف کرۂ شمالی کا خوبصورت اور کارآمد درخت۔ لکڑی اور چھلکا دونوں کام آتے ہیں۔ چھلکے سے ٹوکریاں اور چھوٹی کشتیاں اور لکڑی سے فرنیچر بنتا ہے۔ یہ درخت برصغیر میں نہیں ہوتا تاہم کولنز (Collins) انگلش ڈکشنری کہتی ہے کہ لفظ 'برچ' سنسکرت لفظ ''بھرج'' (bhurja) سے مشتق ہے۔

22- مارشل (Marechal de la noblesse): شرفا اور بڑے زمینداروں کا منتخب نمائندہ۔ (ماڈ)

23- سمولنسک: ماسکو کے جنوب مغرب میں روس کا نویں صدی سے اہم تجارتی مرکز۔ یہاں نپولین کی سپاہ اور روسی فوج کے مابین گھمسان کا رن پڑے گا۔

24- یخنانوفو (موجودہ نام یخنوف)۔ ماسکو اور سمولنسک کے مابین ایک قصبہ۔

25- بال مونڈیں: اٹھارھویں صدی کے اواخر میں امپراطورہ کیتھرین نے زرعی غلاموں کو عملاً جاگیرداروں کا غلام بنا دیا تھا۔ جاگیردار اپنے غلاموں کو ظالمانہ سزا دے سکتے تھے اور انھیں سائبیریا جلاوطن کر سکتے تھے۔ جن غلاموں کو سائبیریا بھیجا جاتا تھا، ان کے سر ایک طرف سے مونڈ دیے جاتے تھے تاکہ اگر وہ فرار ہوں تو آسانی سے پکڑے جا سکیں (اے این ولسن اور ماڈ)۔

26- ہرڈر (Johann Gottfried Herder) (1744 تا 1803): جرمن فلسفی اور شاعر۔ شروع میں کانٹ کا شاگرد تھا اور بعد میں اس کا ناقد بن گیا۔ اس نے ایک قسم کی مذہبی انسانیت پسندی (humanism) کو، جو اس کے شیکسپیئر، ہومر اور بائبل کے مطالعے پر مبنی تھا، فروغ دیا۔

27- ''اللہ لوگ'' (God's folk): طالسطائی کی پھوپھی کاؤنٹس الیکساندرا الی نیچنا آستن ساکن، جس نے طالسطائی کی والدہ کے انتقال کے بعد اسے اور اس کے بہن بھائیوں کو اپنی تحویل میں لے لیا تھا، اس قسم کے نیم پاگل اور عجیب وغریب لوگوں کو، جو قریہ بہ قریہ گھومتے پھرتے رہتے تھے، بہت پسند کرتی تھی اور اکثر ان کی خاطر مدارت کرتی رہتی تھی۔ ''یہ بے گھر اور بے درخانہ بدوش لوگ زمانۂ قدیم سے روس میں موجود ہیں۔ انھیں ارضی رشتوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں ہوتا اور نہ ان کا کوئی پیشہ ہوتا ہے۔ بے نام خواہش انھیں جگہ بہ جگہ گھماتی پھراتی رہتی ہے۔ یہ جپسی نہیں ہوتے لیکن جپسیوں کی طرح گاؤں بہ گاؤں اور شہر بہ شہر پھرتے رہتے ہیں... ان کی بادیہ پیمائی کا مفہوم کسی کو بھی معلوم نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی شخص ان سے پوچھ لے کہ وہ کہاں یا کیوں جا رہے ہیں، وہ کوئی جواب نہیں دے پائیں گے... اس کے علاوہ شاید اور کوئی ٹھوس وجہ نہیں ہوتی کہ وہ اپنے ماضی یا گھر کی یادوں (toska یا nostalgia) سے فرار حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خالصتاً روسی تجربہ ہے، اسے نہ الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے، نہ سمجھایا جا سکتا ہے اور نہ اکثر اس کا کوئی مقصد ہوتا ہے۔'' (طالسطائی بحوالہ Alex de Gonge: لائف اینڈ ٹائمز آف راسپوتین)۔ طالسطائی نے اس قسم کا ایک کردار گریشا، جسے وہ روسی میں yurodivy (پاکباز بدھو= holy

idiot) کہتا ہے، اپنے ناول Childhood (''بچپن'') میں پیش کیا ہے۔ گریشا کا جسم بھونڈا اور گندہ، آنکھیں وحشت زدہ اور گفتگو بے ربط ہے۔ طالسطائی نے اوائل عمری میں اس قسم کے لوگ اپنے گھر لازماً دیکھے ہوں گے۔

-28 پلاتوف: جنرل ایم۔ آئی پلاتوف (1775 تا 1818): روسی جرنیل: سواروف اور کوتوزوف کے ساتھ مختلف جنگوں میں شریک رہا۔

-29 مارشل ویدی نو: ایک فرانسیسی فوجی افسر۔

-30 نہ انسانوں کو رسد فراہم کی گئی اور نہ گھوڑوں کے لیے چارہ چھینا: ماڈ نے روسی مورخ میخائے لوفسکی دانیلفسکی کی کتاب ''06-1807 کی جنگوں کی تفصیلات'' کے حوالے سے لکھا ہے: ''موسم بہار میں اناج کی قلت نے ہائی کمان کو آلکس بنا دیا اور فوجی انتظامیہ میں جو خرابیاں رونما ہونے لگی تھیں، وہ انھیں روکنے میں ناکام ہو گئے۔ ایک مرتبہ بے نگ سین نے فوج میں فاقہ کشی کی رپورٹ کے جواب میں لکھا: 'برداشت کا ملکہ ہونا چاہیے۔ خود میرے ڈنر پر صرف تین کھانے ہوتے ہیں۔' اشیائے خورونوش خریدنے کے لیے رقم فراہم کر دی جاتی لیکن جہاں خریدنے کے لیے اشیا ہی موجود نہ ہوں، وہاں رقم کیا کرتی۔ بعض اوقات جرنیل ایک دوسرے کی رسد کی گاڑیاں ہتھیا لیتے اور بے نگ سین کے ہراول دستے تک ڈبل روٹی شاید ہی کبھی پہنچتی۔ جوانوں کے اجسام پھولنے اور ان کی اموات ہونے لگیں۔ ہسپتالوں کا حال ناگفتنی تھا۔''

-31 سوائی کا (Svay Ka): اسے انگریزی میں quoits کہتے ہیں۔ quoit لوہے یا رسی کا چھلا ہوتا ہے۔ یہ چھلا کھونٹی کے گرد پھینکا جاتا ہے۔ نمبر اس کھلاڑی کو ملتے ہیں جو چھلا کھونٹی کے گرد لپیٹنے میں کامیاب رہتا ہے۔

-32 تلیانن: یہ وہی تلیانن ہے جس نے رستوف کا پرس چرایا تھا۔ (کتاب اول، حصہ اول، باب چہارم)

-33 ٹائفس (typhus): ایک قسم کا متعدی بخار جسے مختلف اقسام کے جراثیم پسوؤں، جوؤں اور دیمک کے ذریعے پھیلاتے ہیں۔ اس مرض میں شدید سر درد ہوتا ہے، بخار سے جسم پھنکتا ہے اور اس پر ارغوانی دانے نکل آتے ہیں۔ مریض افسردگی کا شکار ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس پر ہذیانی کیفیت بھی طاری ہو جاتی ہے۔

-34 ٹلزٹ (Tilsit)۔ موجودہ نام ساوتسک (Sovetsk)۔ دریائے نیمین پر روسی فیڈریشن کا تجارتی، صنعتی اور تہذیبی مرکز۔ پہلے یہ شہر مشرقی پرشیا میں شامل تھا۔ ٹلزٹ میں روسی اور فرانسیسی امپراطوروں کی تیرہ جون کو جو ملاقات ہوئی اس میں معاہدہ امن، جو پانچ سال برقرار رہنا تھا، طے پایا۔ دو گھنٹے کی اس ملاقات میں شاہ پرشیا کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ اگلے روز اسے مذاکرات میں شامل تو کر لیا گیا لیکن نپولین اس کے ساتھ بہت حقارت سے پیش آیا۔ ماڈ کے مطابق روسی رجمنٹ کے پاس نقرئی برتن نہیں تھے۔ یوں وہ فرانسیسی رجمنٹ کی طرح ٹھاٹ دار دعوت منعقد نہ کر سکے۔ (اور پر حواشی جات نمبر 9 اور 15 ملاحظہ فرمائیں)۔

-35 خدمت گار: خدمت گار سے مراد کوئی گھریلو قسم کا ملازم نہیں۔ یورپی ممالک کے بادشاہ امرا اور روسا کے خاندانوں کے افراد منتخب فوجی عہدوں پر تعینات کرتے تھے۔ انھیں جنٹل مین سولجر (یا نائٹ) کہا جاتا تھا۔ لیکن ہر شخص نائٹ نہیں بن سکتا تھا۔ اسے مختلف مراحل میں سے گزرنا پڑتا تھا۔ نوعمر لڑکے پہلے کسی نائٹ کی خدمت کرتے تھے (جیسے

ہماں ہاں کاتبوں اور کاریگروں کے شاگرد ہوتے ہیں)، اس وقت یہ خدمت گار (page) کہلاتے تھے۔ اس کے بعد وہ squire بنتے تھے۔ پھر کہیں نائٹ بننے کی باری آتی تھی۔

36- لیجن آف آنر: فرانس کا اعلیٰ ترین اعزاز۔

37- آرڈر آف سینٹ آندرے: زاروں کے عہد کے روس کا اعلیٰ ترین اعزاز۔

38- گیلس (واحد: gallus جمع: galluses): معلوم نہیں یہ انگریزی کا علاقائی لفظ جو gallows (پھانسی کا تختہ) سے مشتق ہے، اردو میں کیسے داخل ہو گیا۔ مہذب انگریز اور امریکی braces استعمال کرتے ہیں۔ ویسے اب گیلس کا رواج کم ہی رہ گیا ہے۔

حصہ سوم

1- ارفورٹ (Erfurt): وسط جرمنی کا ایک قدیم شہر۔ تجارتی اور صنعتی مرکز۔ اس کی یونیورسٹی میں، جو 1393 میں قائم ہوئی لیکن 1816 میں بند ہو گئی، پروٹسٹنٹ تحریک کے بانی مارٹن لوتھر نے تعلیم پائی تھی۔

2- چھٹکارا لگان (quitrent): روسی جاگیرداروں کے کارندے عملاً ان کے غلام (serf) تھے۔ وہ نسل بہ نسل ان کی زمینوں پر کام کرتے اور کسی بھی دوسری جگہ نہ جا سکتے۔ چھٹکارا لگان کے نظام کے تحت انھیں ایک قطعہ اراضی دے دیا جاتا، وہ اس پر بطور مزارع کام کرتے، جو بچت ہوتی، اس میں سے وہ مزید رقوم مالک کو دیتے اور جب چند سالوں کے بعد وہ طے شدہ رقم ادا کر دیتے، انھیں اجازت ہوتی کہ وہ چاہیں تو خود مختار مزارع کی حیثیت سے سابق مالک کی زمینوں پر کاشتکاری کرتے رہیں، چاہے کہیں اور چلے جائیں۔

3- ریازان: ماسکو کے جنوب مشرق میں واقع روسی شہر۔

4- باکس: یورپی ممالک میں بارش سے بچنے کے لیے گاڑی میں سواریوں کی نشستیں چاروں اطراف سے بند ہوتی تھیں اور اوپر چھت ہوتی تھی۔ کوچوان الگ نشست پر، جو سواریوں کی نشستوں سے نسبتاً اونچی ہوتی تھی، بیٹھتا تھا۔ اسے باکس کہتے تھے۔

5- آلڈر: نصف کرہ شمالی کا بید سے ملتا جلتا درخت۔ زیادہ تر دلدلی علاقوں میں پایا جاتا ہے۔

6- پرواز کرنے لگوں: "طالسطائی نے سات یا آٹھ سال کی عمر میں اٹھارہ گز (چون فٹ) اونچی کھڑکی میں سے پرواز کرنے کی کوشش کی تھی اور جب وہ نیچے گرا، اندرون سر اچھی خاصی چوٹیں آئیں۔" (ماڈ)

7- سپے رانسکی: ایم۔ ایم۔ سپے رانسکی (1772 تا 1839) دیہاتی پادری کا بیٹا تھا۔ اس نے اپنی صلاحیتوں کے بل بوتے پر سول سروس میں زبردست اور بہ سرعت ترقی کی۔ 1818 میں وہ زار کا مشیر برائے داخلی امور مقرر ہوا۔ اس نے روس میں مالیاتی اور انتظامی امور میں اصلاحات کا بیڑا اٹھایا۔ اس کے 1809 کے منصوبے پر، جس میں دور رس اصلاحات تجویز کی گئی تھیں، صرف جزوی طور پر عمل ہوا۔ اس نے قوانین کی اصلاح کے لیے جو کمشن مقرر کیا تھا،

پرنس آندرے نے (آگے باب چھ میں اس کا ذکر آئے گا) اس پر کام کرنا ہے۔ سپے رانسکی نے اصلاحات قوانین کا مسودہ قوانین نپولین (Code Napoleon) سے اخذ کیا تھا۔ ماسکو کے حکام اور سرکردہ شہری، جن کی قیادت رستوپ چن کر رہا تھا، اس کے سخت خلاف تھے۔ رستوپ چن کہتا تھا کہ وہ روس کی بدروح (evil genius) اور فری میسنوں کا لیڈر ہے۔ اسے 1812 میں نپولین کے حملے سے ذرا پہلے نوکری سے نکال دیا اور شہر بدر کر دیا گیا۔

8- اسیسر (Assessor): شعبہ محصولات کا افسر۔ اس کا کام محصولات کی تخمین کرنا ہوتا تھا۔ سول سروس کے گیارہ درجوں میں اس کا درجہ چھٹا اور سٹیٹ کونسلر کا پانچواں ہوتا تھا۔ اسیسر بلحاظ عہدہ لیفٹیننٹ کرنل اور سٹیٹ کونسلر کرنل کے برابر ہوتا تھا۔

9- کونسل آف سٹیٹ: ایک قسم کا قانون ساز ادارہ۔

10- آراک چیف (Arakcheyev): کاؤنٹ الیکسی آراک چیف (1769 تا 1834): زار الیکساندر کا فوجی مشیر تھا۔ اس کی تقرری اس امر کی علامت تھی کہ اب زار اصلاحات سے تائب ہو چکا ہے اور رجعت پسند بن گیا ہے۔ آراک چیف کی بدنامی کا ایک سبب وہ عسکری بستیاں بھی تھیں جہاں کے باسیوں کو سخت تعزیری قوانین کے تحت فوجی خدمات بھی سرانجام دینا پڑتی تھیں اور زراعت کا کام بھی کرنا پڑتا تھا، نہ صرف پوشکن اور اس کے معاصر دانشور بلکہ اکثر جرنیل بھی ان بستیوں کو سخت ناپسند کرتے تھے۔

11- ''سیلا آندریچ''۔ ''سیلا'' کا مطلب ''قوت'' ہے۔ چنانچہ ''سیلا آندریچ'' کا مفہوم ''زور آور آندریچ'' ہوا۔

12- کاؤنٹ (وی۔ پی) کوچوبی (1778 تا 1834): 1802 سے 1807 تک روس کا وزیر داخلہ رہا۔

13- امپراطورہ کیتھرین: امپراطورہ کیتھرین دوم (1729 تا 1796)، جسے کیتھرین اعظم بھی کہا جاتا ہے، نسلاً جرمن شہزادی تھی۔ اس نے روس کے ولی عہد سے جو 1762 میں پیوتر سوم کے نام سے تخت نشین ہوا، شادی کی۔ پیوتر سوم کمزور حکمران تھا۔ چند ہی مہینوں کے اندر کیتھرین نے اسے معزول کیا (اور بعد میں اسے مروا دیا) اور خود حکمران بن بیٹھی۔ اس کے عہد حکومت میں بہت سے علاقے فتح ہوئے اور روس میں شامل ہوئے۔ روس کا موجودہ نقشہ اسی کا رہین منت ہے۔ اس کا سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ اس نے ان علاقوں (مثلاً یوکرین) میں بھی، جہاں زرعی غلاموں کا کوئی تصور نہیں تھا، یہ نظام رائج کر دیا۔ اب زرعی کارندے ''مالک کی اجازت کے بغیر کہیں نہیں جا سکتے تھے۔ جاگیردار ان کا مالک بن گیا۔ اگرچہ اندازوں میں تھوڑا بہت اختلاف پایا جاتا ہے لیکن کہا جاتا ہے کہ اس کے عہد حکومت کے اختتام تک روس کی آدھی آبادی غلام بن چکی تھی اور یہ غلام امریکا کے حبشی غلاموں کی سی زندگی گزارتے تھے۔'' (اے۔ این۔ ولسن)

14- مونتیس کیو (Charles Louis Montesquieu) (1689 تا 1755): فرانس کا نامور ماہر قانون اور سیاسی مفکر۔ اس کا شمار فرانسیسی روشن خیالی کی تحریک کے اولین اکابر میں ہوتا ہے۔ اس کی دو کتابیں بہت مشہور ہوئیں۔ ''خطوط فارس'' (1721) میں بادشاہت کے نظام پر ڈھکی چھپی چوٹیں کی گئی ہیں، اور ''روح قوانین'' میں حکومت کی مختلف صورتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ماڈ کے بقول سپے رانسکی خود بھی ''روح قانون'' کا مداح تھا۔

15- جسٹینین (483 تا 565): بازنطینی شہنشاہ (527 تا 565)۔ اس نے رومی قوانین پر نظر ثانی کرائی اور نئے قوانین،

جو اس کے نام پر ضابطہ جستینین کہلاتے ہیں، وضع کرائے۔ قسطنطنیہ کا مشہور زمانہ گرجا سینٹ صوفیہ، جواب مسجد ہے، اسی کے عہد میں تعمیر ہوا تھا۔

16- گندھک، پارہ اور نمک: ماڈ کے بقول اس زمانے کے بعض روسی میسن کیمیا گری میں بہت دلچسپی لیتے تھے۔

17- فرقہ عقلیہ و جمہوریہ (Illuminati): اس فرقے کی بنیاد جرمنی کے ایک شہر ویز ہاپٹ میں سن 1776 میں رکھی گئی۔ فری میسنری کی طرح یہ بھی خفیہ فرقہ تھا۔ اس کے پیروکار جمہوریت اور روشن خیالی کا پرچار کرتے تھے، خدا کو مانتے تھے لیکن تنزیل (revelation) کے منکر تھے۔ 1785 میں حکومت نے اس فرقے پر پابندی لگادی۔

18- تین دن: "طالسطائی نے چند مواقع پر کھلے بندوں تقریر کرنے کی کوشش کی تھی لیکن اس کا تجربہ کبھی خوشگوار ثابت نہ ہوا۔ یہ واقعہ اس کے اسی قسم کے تجربے کی یاد دلاتا ہے۔" (ماڈ)

19- کاؤنٹ رومانتسیف: 1807 میں روس کا وزیر خارجہ تھا۔ 1809 میں وہ چانسلر (وزیر اعظم) مقرر ہوا۔

20- کولین کورخ (Caulaincourt): مارکوئیس ڈ کولین کورخ 1807 سے 1811 تک پیٹرز برگ میں فرانسیسی سفیر تھا۔

21- ارفورٹ (اوپر حاشیہ نمبر 1 ملاحظہ فرمائیں): یہ ملاقات 1808 کے موسم خزاں میں الیکساندر، نپولین اور شاہ پرشیا کے مابین ہوئی تھی۔ اس میں نپولین نے فرانس اور روس کے مابین معاہدے کی تجویز پیش کی تھی تاہم الیکساندر نے روسی عوام کے ردعمل کے پیش نظر یہ تجویز مسترد کر دی، "البتہ جب نپولین نے یہ وعدہ کیا کہ وہ یورپی معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا، الیکساندر نے اسے فن لینڈ اور اگر ہو سکے تو دریائے ڈینیوب کے خطے میں ترکی کے علاقے پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔" (ماڈ)

22- پرنس دَ لینے (de Ligne)۔ (1735 تا 1841): فرانسیسی فوجی افسر، سفارت کار اور مصنف۔ وہ کچھ عرصہ روس میں مقیم رہا اور امپراطورہ کیتھرین کے دورۂ کریمیا (1787) میں اس کے ساتھ رہا۔

23- آدونائی (Adonai): یہودی خدا کو آدونائی یا Jehovah (یا ہو) کہتے ہیں۔ اصلاً عبرانی زبان میں خدا کے لیے چار حرفی لفظ (tetragrammaton) جسے انگریزی میں YHWH یا JHVH (Yahweh or Jehovah) لکھا جاتا ہے، استعمال ہوتا ہے۔ چونکہ فری میسنری تحریک بنیادی طور پر یہودی ذہن کی پیداوار ہے، اسے پراسرار بنانے کے لیے اس قسم کے الفاظ استعمال کیے گئے۔

24- الوہیم (Elohim): خدا کا ایک اور عبرانی نام۔ "پرانا عہد نامہ" میں یہ نام بار بار استعمال ہوا ہے۔ اصلاً یہ عبرانی لفظ Eloah (عربی الٰہ) کی جمع ہے۔

25- نغمۂ سلیمانی: "پرانا عہد نامہ" میں ایک طویل ڈرامائی عشقیہ نظم شامل ہے۔ اسے عام طور پر حضرت سلیمان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اسے "گیتوں کا گیت" یا "غزل الغزلات" (Song of Songs) بھی کہا جاتا ہے۔

26- لیوونیا: کسی زمانے میں یہ بحیرہ بالٹک کے کنارے آزاد مملکت تھی۔ آج کل اس کا کچھ حصہ سابق روسی ریاست لتویا اور کچھ استونیا میں شامل ہے۔ یوں اب اس کا نام بھی باقی نہیں رہا۔ (لتویا اور استونیا اب آزاد مملکتیں بن چکی ہیں۔)

27- جنٹل مین: وہ شخص جس کا تعلق معاشرے کے اونچے اور نجیب طبقے سے ہو۔

28- لگان: انیسویں صدی کے تمام عرصے میں روسی حکومت کا یہ دستور رہا کہ وہ جن اشخاص کو ان کی خدمات کے عوض انعام واکرام دینا چاہتی تھی یا اپنے منظور نظر لوگوں کو نوازنا چاہتی تھی، انھیں بعض سرکاری زمینوں کا لگان وصول کرنے کا اختیار دے دیتی تھی۔ (ماڈ)

29- گھونگر پٹیاں (Curl papers): ایک قسم کے نرم ملائم کاغذ۔ بالوں کو گھونگریالے بنانے کے لیے ان میں لٹیں خاص طریقے سے لپیٹ دی جاتی ہیں۔

30- ایک جوڑ کو: نتاشا بند ہاتھ کے جوڑوں اور پوروں سے مہینے شمار کر رہی ہے۔ انگلیوں کے جوڑ ان مہینوں کی، جن کے 31 دن ہوتے ہیں اور پور ان مہینوں کی، جن کے ایام 31 سے کم ہوتے ہیں، نمائندگی کر رہے ہیں۔ ماڈ کا خیال ہے کہ اگست تک پہنچنے کے لیے اسے ذرا ہیرا پھیری کرنا پڑے گی۔

31- کاروبنی (Maria Luigi Cherubini) (1760 تا 1843): اطالوی موسیقار۔ وہ بنیادی طور پر اوپیرا کی موسیقی ترتیب دیتا تھا۔ اس نے زندگی کا بیشتر حصہ پیرس میں گزارا۔

32- ماریا آنتونونا: ماریا آنتونونا نارشکینا (1779 تا 1854): کافی عرصہ الیکسانڈر کی معشوقہ رہی۔

33- میر تشریفات (Master of Ceremonies) وہ عہدیدار جو سرکاری تقریبات، ضیافتوں اور رسمی مواقع پر تمہیدی کلمات کہتا ہے اور دوسرے مقررین کا تعارف کراتا ہے۔

34- گرویس (A.A. Gervais): وزارت خارجہ کا اہل کار اور سپے رانسکی کا رشتے دار تھا۔

35- ماگ نتسکی (M.L. Magnitsky): (1778 تا 1855): سپے رانسکی کا دوست اور گٹھ جوڑ میں اس کا مددگار تھا۔ اسے 1812 میں جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

36- ستالی پن (A.A. Stolypin): سینیٹ کا ممبر اور امیر کبیر زمیندار تھا۔

نوٹ: بیرن ایم اے کارف کی کتاب "حیات کاؤنٹ سپے رانسکی" (1861) میں سپے رانسکی کی بیٹی کی یادداشتیں بھی شامل ہیں، طالسطائی نے انھیں یہاں اپنے ڈھب سے استعمال کیا ہے اور خوب بھد اڑائی ہے۔ (ماڈ)

37- پورٹ: تیز سرخ وشیریں شراب۔ کھانے کے بعد پی جاتی ہے۔

38- نپولین کے اقدامات: نپولین نے 1807 میں ہسپانوی و پرتگالی جزیرہ نما پر یورش کر دی تھی۔ اگلے سال اس نے اپنے بھائی جوزف کو، جو اس وقت شاہ نیپلز تھا، فردی نند ہفتم کی جگہ ہسپانیہ کا بادشاہ بنا دیا۔ تاہم 1810 میں برطانوی جرنیل ڈیوک آف ولنگٹن کی فوج اور ہسپانوی گوریلوں نے فرانسیسیوں کا ناطقہ بند کرنا شروع کر دیا اور 1813 میں انھیں مکمل طور پر ملک سے نکال باہر کیا۔

39- بوسٹن (boston): آکشن برج (auction bridge) سے ملتا جلتا تاش کا کھیل۔ ماڈ کے مطابق یہ کھیل امریکا کی جنگ آزادی کے دوران میں فرانسیسی افسروں نے امریکی شہر بوسٹن (ریاست میساچوسٹس) میں ایجاد کیا تھا۔ آج کل غالباً یہ کہیں بھی نہیں کھیلا جاتا۔

40- ترکی میں ہلاک ہو گیا: تلزٹ کا معاہدہ طے پا جانے کے بعد روسیوں نے ایک بار پھر سلطنت عثمانیہ کے خلاف کا کیشیا

اور دریائے ڈینیوب کی وادیوں میں جنگ چھیڑ دی تھی۔ شروع میں انھیں خاصی ہزیمت اٹھانا پڑی۔ تاہم جب کوتوزوف کمانڈر انچیف مقرر ہوگیا، پھر انھیں کچھ کامیابیاں حاصل ہوگئیں۔

حصہ چہارم

-1 کریمن چگ: سابق روسی ریاست یوکرین (اب آزاد ملک) کا (آج کل) ایک ریلوے جنکشن۔ پہلے معمولی قصبہ تھا۔

-2 کیف: یوکرین کا صدر مقام اور سابق سوویت یونین کا تیسرا بڑا شہر۔ روایتاً عیسائیت کا گڑھ سمجھا جاتا ہے۔

-3 کلیہ مربع معکوس (Inverse Squar Law)۔ اس کلیے کے تحت کشش ثقل، تنویر (illumination) وغیرہ کی شدت فاصلے کے مربع (کسی عدد کو اسی عدد سے ضرب دینا، مثلاً تین کا مربع 3X3=9 ہوگا) کے تناسب معکوس (ایک چیز جتنی کم ہوگی، دوسری اتنی ہی بڑھ جائے گی) کے مطابق کم ہوجائے گی۔

-4 رائی (Rye): ایک قسم کا غلہ، جو شمالی یورپ میں پیدا ہوتا ہے۔ کھایا بھی جاتا ہے اور اس سے وسکی شراب بھی بنتی ہے۔

-5 بک ویٹ (buckwheat): ایک قسم کا اناج۔ عام طور پر گھوڑوں اور مرغیوں کو کھلایا جاتا ہے۔ امریکا میں اس کی ٹکیاں ناشتے میں کھائی جاتی ہیں۔ ناڑا: فصل کٹنے کے بعد پودوں کا جو حصہ زمین کے اوپر رہ جاتا ہے، اسے پنجابی میں ''مُنڈھ'' انگریزی میں stubble اور پلاٹس (platt) کے مطابق اردو میں ''ناڑا'' کہتے ہیں۔

-6 شکار کے لیے... بہتر سحر نہیں ہوسکتی: ''جس قسم کے سگ ہائے تازی یا شکاری کتوں کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ بھاگنے میں پھرتیلے نہیں ہوتے لیکن ان کی قوت شامہ بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی قوت شامہ سے شکار کا کھوج لگاتے ہیں اور اسے گھیر گھار کر مطلوبہ سمت میں لے آتے ہیں۔ شکار کو پکڑنے اور ہلاک کرنے کا فریضہ بارزوئی کتے (نیچے حاشیہ نمبر 7 دیکھیں) سرانجام دیتے ہیں۔ بارزوئی کتے کی قوت شامہ بہت معمولی ہوتی ہے اور شکار کا تعاقب تبھی کرتا ہے جب وہ اسے دیکھ لیتا ہے۔ شکار اسے دکھانا پڑتا ہے۔ تعاقب کرتے کرتے وہ بعض اوقات اس کی نظروں سے اوجھل ہوجاتا ہے، تب بھی شکاری کو اس کی توجہ اس کی طرف دلانا پڑتی ہے۔ اگر شکار مردہ ہونے کا ڈرامہ کرے، بارزوئی کتے کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔'' (ماڈ) باب ششم میں اسی قسم کا ایک واقعہ بیان کیا جائے گا۔ تعاقب کے دوران میں خرگوش اچانک بیٹھ جائے گا اور بارزوئی کتا اسے پکڑنے سے محترز رہے گا۔

-7 بارزوئی کتا: ایک روسی کتا۔ اس کا قد کاٹھ خاصا بڑا لیکن جسم نسبتاً دبلا پتلا ہوتا ہے۔ اس کا سر تنگ اور نوک دار اور اس کے جسم پر سفید بال ہوتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی نسل بھیڑیے کے ملاپ سے چلی تھی۔ روسی زبان میں بارزوئی کے معانی ''تیز رفتار'' ہیں۔ اوپر حاشیہ نمبر 6 بھی دیکھیں۔

-8 سرکیشیائی: وہ چیز یا شخص جس کا تعلق سرکیشیا سے ہو۔ سرکیشیا قفقاز کے قریب روس کا ایک جنوب مغربی علاقہ ہے اور آبادی بھی زیادہ تر قفقازی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں کے باشندے لاثانی حسن و جمال کے مالک ہیں۔ کوہ قاف کی

پریاں بھی شاید یہیں کی تھیں۔

-9 آرچ ڈیکن (archdeacon): کلیسا، بالخصوص کلیسائے انگلستان کا ایک اعلیٰ عہدیدار۔ یہ بشپ (اسقف) کے نائب کے طور پر کام کرتا ہے۔

-10 ''پڑ'': آج کل تو خیر تھریشر (thresher) کا زمانہ ہے لیکن کچھ ہی عرصہ قبل بھوسے سے اناج الگ کرنے کے لیے بیل اور دوسرے جانور استعمال ہوتے تھے اور جس جگہ یہ کام ہوتا تھا، اسے پنجابی میں ''پڑ'' اور انگریزی میں threshing floor کہتے ہیں۔ اردو کا متبادل کہیں سے نہیں مل سکا۔

-11 باردو: سرخ یا سفید انگوری شراب، جو فرانس کی جنوب مغربی بندرگاہ بارود (Bordeaux) کے اردگرد کے علاقے میں کشید کی جاتی ہے۔

-12 مسخرہ: روس کے جاگیردار بادشاہوں کی طرح اپنے دیہاتی مکانوں میں مسخرے رکھا کرتے تھے اور یہ رواج انیسویں صدی کے آخر تک جاری رہا۔ ماڈ کا بیان ہے کہ 1862 میں جب طالسطائی کی بیوی شادی کے بعد اس کے دیہی مسکن یاسنایا پولیانا آئی، اسے وہاں آلیشا ''دیگچی'' ملا جس کے متعلق طالسطائی نے بعد میں نہایت الم ناک کہانی لکھی۔ یہ آلیشا ایک قسم کا مسخرہ ہی تھا۔

-13 سوالوٹیل (Swallow tail): اسے ٹیل کوٹ یا ٹیلز (tails) بھی کہتے ہیں۔ کسی زمانے میں مکمل ایوننگ ڈریس کا جزو ہوتا تھا۔

-14 ساؤنڈنگ بورڈ: ایک قسم کی پتلی تختی جو باجوں میں آواز کو بڑھانے کے لیے لگا دیتے ہیں۔

-15 فنگر بورڈ: گٹار، وائلن اور ان کی طرح کے دوسرے باجوں میں سخت لکڑی کی لمبی تختی، جس پر تاریں انگلیوں سے روکی جاتی ہیں۔

-16 چھوٹی ویگن (wagonette): گھوڑا گاڑی۔ اس کی عقبی جانب دو مسافروں کی نشستیں ہوتی تھیں۔ کوچوان اگلی جانب بیٹھتا تھا۔

-17 دروشکی (droshky): چار پہیوں کی گھوڑا گاڑی۔ اس کی چھت نہیں ہوتی تھی۔ کسی زمانے میں روس میں عام چلتی تھی۔

-18 ڈملر: افسانوی کردار نہیں بلکہ جیتا جاگتا انسان تھا۔ اس زمانے میں ماسکو میں موسیقی کی تعلیم دیا کرتا تھا۔ (ماڈ)

-19 تیرہ درجے فارن ہائیٹ: اس زمانے میں روس میں فرانسیسی ماہر طبعیات رینے درایومر (Reaumur) کا مقیاس الحرارت، جو اسی کے نام سے موسوم ہے، مروج تھا۔ اس پیمانے کے مطابق نقطہ انجماد صفر درجہ اور نقطہ کھولاؤ اسی 80 درجے ہوتا ہے۔ یوں طالسطائی نے منفی تیرہ درجے فارن ہائیٹ کو منفی بیس درجے رایومر لکھا ہے۔

-20 مرغا... دانے اٹھالاؤ: وہ ان چیزوں کے ذریعے اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا چاہتی تھی۔ ماڈ کے مطابق کرسمس پر دانہ کھلانے کے بعد مرغوں کو چلا پھرا کر قسمت کا حال معلوم کرنے کا عام دستور تھا۔

-21 اودیسہ (Odessa): بحیرہ اسود کے کنارے یوکرین کی بندرگاہ اور صنعت و حرفت، فنون اور سیاحت کا اہم مرکز۔ اسے چودھویں صدی میں تاتاریوں نے آباد کیا تھا۔ پھر یہ ترکوں کے قبضے میں آ گیا۔ اب یہ زبردست بحری اڈہ ہے۔

22- مڈغاسکر موجودہ نام (مالا گاسی): جنوب مشرقی افریقہ کا جزیرہ۔ 1896 میں فرانس کے ہتھے چڑھا، 1960 میں آزادی ملی اور 1975 میں جمہوریہ قرار دیا گیا۔

23- دلو۔ دلو (Aquarius or Water-Carrier) یا کنبھ۔ علم نجوم میں آسمان کا گیارھواں برج، اس میں سورج بیس جنوری کو داخل ہوتا ہے اور اٹھارہ فروری تک رہتا ہے۔ نتاشا جس اوپیرا کی دھن بجا رہی ہے، اس کا نام بھی Water-Carrier تھا اور یہ انتخاب اس کی موجودہ ذہنی کیفیت کے عین مطابق ہے۔

24- فیلڈ (John Field) (1782 تا 1837): آئرش پیانو نواز اور موسیقار۔ وہ 1804 سے 1831 تک پیٹرزبرگ میں مقیم رہا۔ وہ اپنی شبینہ دھنوں (=noctumes وہ دھنیں جو شام یارات کی کیفیت کو اجاگر کرتی ہیں) کے لیے بہت مشہور ہوا۔ روسی ناول نگار اور شاعر پاسترناک نے اپنی خود نوشت سوانح میں لکھا ہے کہ فرانسیسی نژاد پولستانی موسیقار شوپاں (Chopin) نے فیلڈ کی دھنوں کو نئے مفاہیم عطا کیے۔

25- سوانگی: یہاں انگریزی مترجمین نے انگریزی لفظ mummer، جو بذات خود فرانسیسی لفظ mummar سے مشتق ہے، استعمال کیا ہے۔ فرانسیسی لفظ کے معنی to pantomime ہیں۔ pantomime ایک قسم کا خاموش ڈراما ہوتا تھا۔ اس کا آغاز روم سے ہوا تھا۔ اس ڈرامے میں صرف ایک ہی اداکار سارے کردار ادا کرتا تھا۔ پس منظر میں ساز بجائے جاتے اور گانے گائے جاتے تھے۔ mummer میلوں ٹھیلوں میں سوانگ بھر کر مزاحیہ حرکات سے لوگوں کے دل خوش کیا کرتے یا خاموش ڈرامے کیا کرتے تھے۔ طالسطائی نے بھی شاید یہی لفظ استعمال کیا ہوگا۔

26- Idiot: یورپی زبانوں کا مشترک لفظ۔ نفسیات میں یہ اس شخص کو، جو ذہنی طور پر پسماندہ ہو، کہتے ہیں (یونانی میں اس کے معانی "عام آدمی" ہیں)۔ عام بول چال میں احمقانہ حرکت کرنے والے شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

27- ٹرویکا (Troika): ایک قسم کی سہ اسپی روسی گاڑی، جس میں دو کے بجائے تین گھوڑے پہلو بہ پہلو جتے ہوتے ہیں۔

28- چوبی تختہ (runner): برف گاڑیوں (sledges) میں پہیوں کے بجائے ایک قسم کے تختے لگے ہوتے ہیں۔ گاڑی ان پر پھسلتی آگے بڑھتی ہے۔

حصہ پنجم

1- آئبیریائی: جس کا تعلق آئبیریا سے ہو۔ یوں مشہور آئبیریا یورپ کا وہ جنوب مغربی علاقہ ہے، جو موجودہ ہسپانیہ اور پرتگال پر مشتمل ہے۔ لیکن کسی زمانے میں سابق روسی ریاست جارجیا کا مشرقی علاقہ بھی آئبیریا کے نام سے جانا جاتا تھا اور یہاں آئبیریا سے مراد یہی علاقہ ہے۔ یہاں عیسائیت چوتھی صدی عیسوی میں آئی۔ پہلے یہ آزاد مملکت تھا۔ بارہویں صدی میں منگولوں نے اسے تاخت و تاراج کیا۔ 1555 میں ترکوں اور ایرانیوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ پہلے ڈیڑھ سو سال روس میں شامل رہا اور سوویت یونین کے حصے بخرے ہونے کے بعد اب یہ آزاد ملک بن گیا ہے۔ سٹالن اسی علاقے کا باشندہ تھا۔

2- مارگو (margoux): فرانس کی جنوبی بندرگاہ بوردو کے قریب ایک گاؤں۔ کہا جاتا ہے کہ یہاں بہترین سرخ انگوری شراب کشید کی جاتی ہے اور اسی نام سے موسوم ہے۔

3- غیر شرعی حبالہ عقد: نپولین نے 1809 میں اپنی پہلی بیوی جوزیفین کے ساتھ اپنی شادی کالعدم قرار دے دی کیونکہ اس کے بطن سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس کا یہ فعل رومن کیتھولک مسلک میں، جس کا وہ پیرو کار تھا، ناجائز ٹھہرا کیونکہ اس مسلک میں میاں بیوی کے مابین طلاق نہیں ہو سکتی۔ بہرحال اس کے بعد نپولین نے زار الیکساندر کی ہمشیرہ آنا سے شادی کرنے کے لیے سلسلہ جنبانی کی لیکن جب ناکامی ہوئی، اس نے مارچ 1801 میں آسٹریا کی آرچ ڈچس ماری لوئیسے سے نکاح کر لیا۔

4- چودہ جون: یہ اشارہ غالباً اس جنگ کی طرف ہے جو فرانسیسیوں اور ہسپانیوں کے مابین چودہ جون 1809 کو ہوئی تھی اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا تھا۔

5- آستریا (تلفظ: آست ری آ) لاج اور ''متلاشیان من وسلویٰ''۔ میسوں کی یہ دونوں لاجیں پیٹرز برگ میں قائم تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں یوں کرتی تھیں کہ ایک دوسرے کی مذمت کرتی رہتی تھیں۔ (ماڈ) آستریا اصل میں انصاف کی یونانی دیوی ہے۔

6- اصلی سکاٹش غالیچہ: ایک غالیچہ، جس پر علامتی نشانات بنے ہوئے تھے۔ ہر لاج کے ساز و سامان میں اس کی موجودگی ضروری تصور کی جاتی تھی۔ تمام لاجیں قدیم ترین اور انتہائی واجب الاحترام میسن لاجوں سے اس قسم کے غالیچے، منشور (چارٹر) اور رسوم کے کتابچے حاصل کرنے میں ایک دوسرے سے سخت مقابلہ کرتی تھیں۔ (ماڈ)

7- کوڑے مار مار کر ہلاک کر دیا: اے۔ این۔ ولسن کے بیان کے مطابق امپراطورہ کیتھرین نے جو مذہبی پالیسی اختیار کی، اس نے روس کو ''دینی ریاست'' (theocracy) میں تبدیل کر دیا۔ اب اس میں رواداری کی کوئی گنجائش باقی نہ رہی اور جو لوگ اختلاف کرتے تھے، ان پر وہ مظالم ڈھائے گئے کہ ہسپانیہ میں عربوں کی حکومت کے خاتمے کے بعد مذہبی عدالتوں نے، جو ''ملحدوں'' کے استیصال کے لیے قائم کی گئی تھیں، جو سفاکیاں روا رکھی تھیں، ان کے سامنے وہ بھی ماند پڑ گئیں۔

8الف۔ ڈیوک آف اولڈن برگ: اس زمانے میں وسطی یورپ، بالخصوص جرمنی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں، جنھیں ڈچیاں (duchies) کہا جاتا تھا، بٹا ہوا تھا۔ ہر ڈچی کا حکمران ڈیوک کہلاتا تھا۔ ایسی ہی ایک ڈچی جرمنی کی مشہور بندرگاہ ہیمبرگ کے قریب اولڈن برگ تھی۔ اس کا ڈیوک امپراطور الیکساندر کا برادر نسبتی تھی۔ نپولین نے 1810 میں اس ڈچی اور اس سے ملحقہ علاقوں پر اس لیے قبضہ کر لیا تھا کیونکہ اس نے برطانیہ کی ناکہ بندی کے لیے جو براعظمی نظام (Continental System) قائم کیا تھا، اس نے اس کی خلاف ورزی کی تھی۔

8ب۔ پوپ کی باری: نپولین نے 1801 میں پوپ پائس کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا۔ اس کے تحت اس نے پوپ کے کچھ علاقے، جن پر وہ قبضہ کر چکا تھا، پوپ کو واپس کر دیے اور اس کے عوض پوپ نے فرانسیسی حکومت کو آرچ بشپ اور بشپ مقرر کرنے کا اختیار دے دیا۔ بعد میں معاہدے پر عمل درآمد کرنے میں مشکلات پیش آنے لگیں اور پوپ نے

نپولین کا براعظمی نظام (اوپر کا حاشیہ دیکھیں) تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ پوپ نے 10 جون 1809 کو نپولین کو رومن کیتھولک فرقے سے خارج کر دیا اور نپولین نے 6 جولائی کو پوپ کو گرفتار کر کے جیل میں بند کر دیا۔

-9 نغمہ و سرود کی ایستادہ محفل (promenade Concert): اس قسم کی محافل میں بعض حاضرین کو کھڑے رہنا پڑتا ہے۔

-10 اشعار گوئی کے مقابلے (bouts-rimes): ''غیر منسلک قوافی۔ ایسے قوافی، جو بیتوں سے منسلک نہ ہوں۔ سترہویں صدی سے وقتاً فوقتاً غیر منسلک قوافی یا پہلے سے سوچے ہوئے قوافی پر فی البدیہہ اشعار یا نظم کہنا ایک دلچسپ مشغلہ رہا ہے۔'' کلیم الدین احمد: فرہنگ ادبی اصطلاحات مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی۔

-11 پینزا: ماسکو کے جنوب مشرق میں ایک روسی شہر۔

-12 نیژنی نوگورد: موجودہ روس کا دوسرا بڑا شہر۔ ماسکو کے مشرق میں دریائے وولگا اور دریائے اوکا کے سنگھم پر واقع ہے۔ زاروں کے عہد میں یہاں بہت بڑا تجارتی میلہ منعقد ہوتا تھا۔ مشہور روسی ادیب گورکی یہیں پیدا ہوا تھا اور سٹالن کے عہد میں (1923 میں) اسی کے نام پر اسے گورکی کہا جانے لگا۔ اب اس کا پرانا نام بحال کر دیا گیا۔

-13 جیلوں اور قید خانوں میں پہنچ جاتی: ''قیدیوں کو اکثر ضروریات زندگی سے محروم رہنا پڑتا اور ان کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے ہاتھ بٹانا عیسائیوں کا مذہبی فریضہ تھا۔'' (ماڈ)

-14 رم (rum): ایک شراب جو گنے کے رس سے بنتی ہے۔

-15 'مہا لفنگی': اصل میں آخروسیموا نتاشا اور سونیا کو جس ڈریس میکر (وہ خاتون جو اپنے یا دوسری عورتوں کے ملبوسات تیار کرتی ہے) کے ہاں لے جانا چاہتی تھی، وہ فرانسیسی خاتون تھی اور اس کا نام Aubert Chalme تھا۔ آخروسیموا اسے مزاحیہ انداز سے ذو معنی لفظ بنا دیتی ہے اور اس کا تلفظ روسی لفظ 'ober-shelma' جس کے معنی arch-rogue (پرلے درجے کا یا چھٹا ہوا بدمعاش) ہیں، کرتی ہے۔ (ہنری گفرڈ)

-16 سکوائر: شہر کے گنجان آباد علاقوں میں اچھے خاصے باغ کے چاروں اطراف اونچی اونچی رہائشی عمارات بنی ہوتی ہیں، انھیں سکوائر (square) کہتے ہیں۔ وسطی لندن میں ایسے متعدد سکوائر ہیں۔ ماسکو میں بھی ہوں گے۔

-17 اونچے اور گھنے: اصل میں بال بنانے کا یہ انداز فرانسیسی بادشاہ لوئی پانزدہم کی داشتہ مارکیز ڈی پاپادوغ نے ایجاد کیا تھا اور اسی کے نام پر pam padour کہلاتا ہے۔ اس میں بالوں کے نیچے پیڈ رکھا جاتا ہے اور ان کی اس طرح تہیں جمائی جاتی ہیں کہ وہ اونچے بھی اور گھنے بھی دکھائی دینے لگتے ہیں۔ بعد میں مرد بھی اس کی نقل اتارنے لگے۔

-18 چولی (bodice): یورپی عورتوں کا پہناوا، جو کندھے سے کمر تک ہوتا ہے۔ شلوکا۔

-19 پرامپٹر (prompter): بعض اوقات ڈرامے کے دوران میں اداکار اپنے مکالمے بھول جاتے ہیں۔ سٹیج کے عقب سے انھیں ایک شخص لقمہ دیتا ہے۔ اسے پرامپٹر کہا جاتا ہے۔

-20 ہارن (Harn): ایک باجہ، جو جانوروں کے سینگوں سے بنایا جاتا اور منہ سے بجایا جاتا تھا۔ اب یہ دھات سے بنا ہے اور ایک نلکی پر، جس کا ایک سرا تنگ اور دوسرا فراخ ہوتا ہے، مشتمل ہوتا ہے۔

-21 کنٹرا بیس (Contra bass): اسے ڈبل بیس بھی کہا جاتا ہے۔ وائلن خاندان کا سب سے بڑا تانت دار باجہ۔

عام طور پر کلاسیکی موسیقی میں استعمال ہوتا تھا، لیکن اب جاز اور ڈانس بینڈ میں بھی اس کا عمل دخل بڑھ گیا ہے۔

-22 مصاحب خاص: یہاں تمام انگریزی ترجموں میں لفظ page (پیج) استعمال کیا گیا ہے۔ جیسا کہ اوپر (حصہ دوم کے حاشیہ نمبر 35) میں لکھا جا چکا ہے کہ پیج وہ نوجوان ہوتا تھا، جو نائٹ بننے کی تربیت لے رہا ہوتا تھا۔ انگریزی میں یہ لفظ بذریعہ فرانسیسی اطالوی لفظ paggio سے، جو بذات خود یونانی لفظ paidion سے مشتق ہے، آیا ہے۔ ممکن ہے کہ روسی زبان میں بھی استعمال ہوتا ہو۔ ہیلین بورس کو اپنا پیج اس لیے کہتی ہے کہ وہ اسے عشق و عاشقی کے رموز بتاتی رہی ہے؟

-23 مجیرا (Cymbal): مجیرے پیتل کی چھوٹی کٹوریاں ہوتی ہیں۔ انھیں طبلے کے ساتھ تال دینے کے لیے دونوں ہاتھوں میں لے کر بجاتے ہیں۔ Cymbals پیتل کی پتلی پتلی مدور اشیا ہوتی ہیں۔ انھیں چھڑی سے یا آپس میں ٹکرا کر آواز پیدا کی جاتی ہے۔

-24 بارہ نیم سرتیوں کا سرگم (Chromatic scale): مغربی موسیقی میں سرگم (سکیل) بارہ سروں یا سرتیوں کی تدریج ہوتی ہے۔ سکیل مختلف اقسام کے ہوتے ہیں لیکن بڑے دو میجر اور مائنر سکیل کہلاتے ہیں۔ ان میں سے ہر سکیل میں پانچ بڑے سر اور دو نیم سرتیاں ہوتی ہیں۔ کرومیٹک سکیل بارہ نیم سرتیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

-25 نغمۂ ہفتم (seventh): موسیقی کا ایک سر۔

-26 کاسٹیوم (Costume): کسی خاص زمانے یا ملک کا سرتاپا مکمل لباس۔ بعض اوقات اس میں بال بنانے کا انداز بھی شامل ہوتا ہے۔

-27 مگدلین۔ مریم مگدلینی ایک بدکار عورت تھی۔ اس نے بعد میں توبہ کر لی اور یوں بخشش کی مستحق ٹھہری۔ مغربی زبانوں میں لفظ مگدلین ''اصلاح یافتہ کسبی'' کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ لوقس کی انجیل (نیا عہد نامہ) کے ساتویں باب کے آخر میں اس کا واقعہ یوں بیان ہوا ہے: پھر کسی فریسی نے اس سے درخواست کی کہ ''میرے ساتھ کھانا کھا۔'' پس وہ اس فریسی کے گھر جا کر کھانا کھانے بیٹھا o تو دیکھو ایک بدچلن عورت، جو اس شہر کی تھی، یہ جان کر کہ وہ اس فریسی کے گھر میں کھانا کھانے بیٹھا ہے، سنگ مرمر کے عطردان میں عطر لائی o اور اس کے پاؤں کے پاس روتی ہوئی پیچھے کھڑی ہو کر اس کے پاؤں آنسوؤں سے بھگونے لگی اور اپنے سر کے بالوں سے ان کو پونچھا اور اس کے پاؤں بہت چومے اور ان پر عطر ڈالا۔ اس کی دعوت کرنے والا فریسی یہ دیکھ کر اپنے جی میں کہنے لگا کہ ''اگر یہ شخص نبی ہوتا تو جانتا کہ جو اسے چھوتی ہے، وہ کون اور کیسی عورت ہے کیونکہ بدچلن ہے o'' یسوع نے جواب میں اس سے کہا۔ ''اے شمعون، مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے،'' اس نے کہا۔ ''اے استاد کہہ o'' ''کسی ساہوکار کے دو قرض دار تھے۔ ایک پانسو دینار کا اور دوسرا پچاس کا o جب ان کے پاس ادا کرنے کو کچھ نہ رہا، تو اس نے دونوں کو بخش دیا o پس ان میں سے کون اس سے زیادہ محبت رکھے گا؟'' شمعون نے جواب میں کہا: ''میری دانست میں وہ جسے اس نے زیادہ بخشا۔'' اس نے اس سے کہا، ''تو نے ٹھیک فیصلہ کیا o'' اور اس عورت کی طرف پھر کر اس نے شمعون سے کہا، ''کیا تو اس عورت کو دیکھتا ہے؟ میں تیرے گھر میں آیا۔ تو نے میرے پاؤں دھونے کو پانی نہ دیا مگر اس نے میرے پاؤں آنسوؤں سے بھگو دیے اور اپنے بالوں سے پونچھے۔ تو نے مجھ کو بوسہ نہ دیا مگر اس نے جب سے میں

آیا ہوں، میرے پاؤں چومنا نہ چھوڑا o تو نے میرے سر میں تیل نہ ڈالا مگر اس نے میرے پاؤں پر عطر ڈالا ہے o اس لیے میں تجھ سے کہتا ہوں کہ اس کے گناہ جو بہت تھے، معاف ہوئے کیونکہ اس نے بہت محبت کی مگر جس کے تھوڑے گناہ معاف ہوئے، وہ تھوڑی محبت کرتا ہے۔"

طالسطائی نے خط کشیدہ آیت میں ترمیم کر کے اسے اپنے مقصد کے لیے استعمال کرلیا ہے۔

28- چرچ آف ازمپشن (Assumption): عیسائی عقیدے کے مطابق حضرت مریم کا جسمانی حالت میں بہشت میں پہنچایا جانا۔ اس واقعہ کی یاد میں 15 اگست کو مذہبی تہوار منایا جاتا ہے۔

29- تور: (Tver): ماسکو کے قریب ایک گاؤں۔

30- Ecossaise: ایک قسم کے تیز سکاٹش رقص کی فرانسیسی شکل۔ فرانسیسی میں سکاٹ لینڈ کو Ecosse اور سکاٹش کو ecossais کہتے ہیں۔ مؤنث کے لیے ecossaise استعمال ہوتا ہے۔ (اوپر حصہ اول حاشیہ نمبر 29 بھی دیکھیں۔)

31- grossvater: ایک جرمن رقص۔

32- گنتارا (abacus): کیلکولیٹر کی ایجاد سے پہلے گنتی کے لیے گنتارا، جو ایک فریم، تاروں اور گولیوں پر مشتمل ہوتا تھا، استعمال ہوتا تھا۔ بعض ممالک میں اس پر بچوں کو گنتی بھی سکھائی جاتی تھی۔

33- مدیرا: ایک قسم کی سفید شراب، جو پرتگال کے زیر حکومت جزیروں کے مجموعے "مدیرا" (شمال مغربی افریقہ)، میں بنائی جاتی ہے۔

34- آؤ، ذرا بیٹھ جائیں: روسیوں کے ہاں یہی رواج تھا۔ (ماڈ)

35- ستیوشکا: اس زمانے کی ماسکو کی مشہور و معروف جپسی گلوکارہ۔ (ماڈ)

36- سپے رانسکی ... اچانک جلاوطنی اور مبینہ غداری: سپے رانسکی پر حصہ سوم کے چوتھے باب میں پہلے ہی حاشیہ دیا جا چکا ہے۔ سپے رانسکی خاصے بڑے عہدے پر فائز تھا لیکن اس سے کوتاہی یہ ہوئی کہ اس نے نہ تو اپنے دوست بنائے اور نہ حمایتی۔ رقیبوں نے امپراطور الیکساندر سے چغلی کھائی، اور والئی سلطنت ان کے بھرے میں آ گیا اور 1812 میں سپے رانسکی سائبیریا کے سرحدی گاؤں پرم میں جلاوطن کر دیا گیا۔ 1814 میں زار نے اسے نووگورد کے نزدیک اپنی چھوٹی سی جاگیر پر آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ ایک بار پھر اس کا ستارہ چمکا۔ 1816 میں اسے پینزا اور تین سال بعد سائبیریا کا گورنر مقرر کیا گیا۔ 1821 میں وہ واپس پیٹرز برگ آ گیا۔ زار نکولس اول کے عہد میں اسے روسی قوانین کا خلاصہ مرتب کرنے کا حکم دیا گیا۔ انتقال سے کچھ عرصہ قبل اسے کاؤنٹ بنایا گیا۔

تیسری کتاب

حصہ اول

1- طالسطائی نے اس جلد میں جنگ اور فلسفہ تاریخ کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے بار بار موضوع سے انحراف کیا ہے۔ یہ باب اس قسم کے پہلے انحراف پر مشتمل ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ تیسری اور چوتھی کتاب کا تقریباً چھٹا حصہ ان انحرافات سے پر ہے۔

2- براعظمی نظام: نپولین نے برطانیہ کا اقتصادی محاصرہ کرنے اور اپنی شرائط منوانے کے لیے بحیرہ بالٹک سے بحرہ ایڈریاٹک تک اپنی تمام اتحادی اور طفیلی ریاستوں کو 1806 میں برطانیہ سے تجارت کرنے کی ممانعت کر دی۔ اس کے جواب میں برطانیہ نے ان تمام ممالک کا اپنے طور پر اقتصادی مقاطعہ کر دیا۔ اسے براعظمی نظام (Continental System) کہا جاتا ہے۔ بعد میں سمگلنگ نے اس نظام میں دراڑیں ڈال دیں۔ روس بھی اس نظام کا مخالف تھا۔

3- میٹرنش (Furs von Metternich) (1773 تا 1859): آسٹروی سیاست دان۔ 1809 سے 1848 تک اپنے ملک کا وزیر خارجہ رہا۔ پہلے وہ نپولین کا حامی تھا اور اس نے نپولین کی شادی امپراطور آسٹریا کی بیٹی سے کرادی۔ بعد میں وہ نپولین کے خلاف ہو گیا۔

4- ڈیوک آف اولڈن برگ ورومانشیف: ان دونوں پر حواشی دوسری کتاب میں دیے جا چکے ہیں۔

5- تالیغاں (Charles Talleyrand) (1754۔1838): فرانسیسی سفیر اور سیاست دان۔ 1807 تک نپولین کا وزیر خارجہ رہا۔ بعد میں اس سے ناراض ہو گیا۔

6- بورغ بوں خاندان (Bourbouns): فرانس کا شاہی خاندان۔ 1589 سے 1792 تک برسر اقتدار رہا۔ پھر انقلاب فرانس نے اس کا تختہ الٹ دیا۔

7- روس اور آسٹریا کا معاہدہ: اس کے تحت دونوں نے نپولین کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کا فیصلہ کیا تھا لیکن 1807 میں ٹلزٹ کے مقام پر نپولین اور الیکساندر کے مابین جو معاہدہ طے پایا تھا، یہ اس کی نفی کرتا تھا۔ جب نپولین کو اس کی بھنک پڑی، روس نے میمورنڈم 178 میں اس کی صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

8- وجوہات: نپولین نے روس پر چڑھائی کیوں کی، اس کی چند وجوہات یہ تھیں:

نپولین اور الیکساندر دونوں ہی یورپ کی قیادت کے دعویدار تھے اور اسی نے دونوں کے مابین غلط فہمیوں کو جنم دیا۔ نپولین نے جب آسٹریا کے امپراطور کی بیٹی سے شادی کی، الیکساندر کو یہ بات پسند نہ آئی۔ روس براعظمی نظام کا مخالف تھا۔ 1809 میں نپولین نے ایک معاہدے کے تحت مغربی گالیشیا کا علاقہ گرینڈ ڈچی آف وارسا کے سپرد کردیا۔ اس سے الیکساندر کو خیال ہوا کہ نپولین شاید پولینڈ کی مملکت، جس کے بیشتر حصے پر روس قابض تھا، بحال کرنا چاہتا ہے۔ پھر نپولین نے الیکساندر کو خلافتِ عثمانیہ کے خلاف من مانی کرنے کی اجازت دینے سے انکار کردیا اور اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ ہوئی کہ نپولین نے ڈیوک آف اولڈن برگ کو، جو الیکساندر کا قریبی رشتے دار تھا، تخت وتاج سے محروم کردیا تھا۔ (ولیم لینگر: انسائیکلو پیڈیا آف ورلڈ ہسٹری)

9- ڈریسڈن: (مشرقی) جرمنی کا صنعتی شہر۔ اس زمانے میں یہ سیکسنی ریاست کا صدر مقام تھا۔ نپولین یہاں مئی کے اوائل میں پہنچا تھا۔ یہاں وہ اپنے نئے اتحادیوں۔۔ امپراطور آسٹریا، شاہ پرشیا (جسے متوقع جنگ میں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا تھا)، شاہ سیکسنی اور بعض دیگر چھوٹے موٹے حکمرانوں کے ساتھ تین ہفتے مقیم رہا۔

10- پوزین (Posen) پولینڈ کے صوبے پوزنان (Poznan) کا صدر مقام۔ پوزین جرمن نام ہے۔ پولستانی صوبے کی طرح شہر کو بھی پوزنان کہتے ہیں۔ 1296 تک پولینڈ کے بادشاہ یہیں قیام پذیر رہے تھے۔

11- ٹورن (Thorn): پولستانی شہر تارون (Torun) کا جرمن نام۔

12- ڈان سگ (Danzig): پولستانی نام گدنسک (Gdinsk) ہے۔ اسے انگریزی میں (Gdansk) لکھا جاتا ہے۔ بحیرہ بالٹک کے ساحل پر واقع ہے اور پولینڈ کا بحری اور صنعتی مرکز ہے۔ کمیونسٹوں کے خلاف 1980 میں Solidarity کے نام سے جو تحریک شروع ہوئی اور جس کی وجہ سے بعدازاں مشرقی یورپ بشمول روس کا نقشہ تبدیل ہوگیا، اسی شہر سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ ہٹلر نے بھی اس شہر پر حق جتایا تھا۔ نتیجہ؟ دوسری جنگ عظیم برپا ہوگئی۔

13- کونگش برگ (Konigsberg): شمال مغربی روس کی ایک بندرگاہ۔ کسی زمانے میں مشرقی پرشیا کا صدر مقام تھا۔ آج کل اس کا نام کالینن گرات (Kaliningrad) ہے۔

نوٹ: اوپر کے تمام شہر جن علاقوں میں واقع ہیں، وہ کسی زمانے میں پرشیا (جرمنی) کا حصہ تھے۔ اسی لیے طالسطائی ان کے جرمن نام لکھتا ہے۔

14الف۔ نیمین: (Niemen): مغربی روس کا ایک دریا۔ پچھلی صدی تک یہ روسی سلطنت کی مغربی سرحد کا کام دیتا تھا۔ روسی اسے میمل (Memel) کہتے ہیں۔ انگریزی میں اسے Neman لکھا جاتا ہے۔

14ب۔ اس زمانے میں ہندوستان پر قبضے کے لیے انگریزوں اور فرانسیسیوں میں چپقلش چل رہی تھی۔

15- برتھیئے (Louis Alexandre Berthier) (1753 تا 1815): نپولین کا ایک جرنیل۔

16- مسکوی (Muscovy): ریاست ماسکو۔ بارھویں سے سولھویں صدی تک قائم رہی۔ روس کا قدیم نام بھی یہی تھا۔

17- سیکسن (Saxon): شمالی جرمنی کی ریاست سیکسنی (Saxony) کا باشندہ۔ انگریز زیادہ تر اسی اور دوسرے دو جرمن قبائل اینگلز (Angles) اور Jutes کی اولاد ہیں اور انگریزی زبان بھی انھیں قبائل کی بولیوں سے نکلی ہے۔

18- لیجن ڈ آنر (Legion d' honneur): فرانس کا سلسلۂ اعزازات، جو نپولین نے 1802 میں شروع کیا۔ اس کے پانچ درجے ہیں: نائٹ آف گرینڈ کراس، گرینڈ آفیسر، کمانڈر، آفیسر اور Chevalier۔ اس کا گرینڈ ماسٹر صدر فرانس ہوتا ہے۔

19- ولنا (Vilna): سابق سوویت یونین کی ریاست اور اب آزاد ملک لتھوانیا کا صدر مقام۔ آج کل اس کا نام ولنی اوس (Vilnius) ہے۔ کسی زمانے میں پولینڈ میں شامل تھا۔ 1795 میں روس کے قبضے میں آیا۔

20- تینوں افواج کے کمانڈر انچیف: فوج اول کا کمانڈر انچیف بارکلے ڈ تولی (1761 تا 1818) فرانسیسی نژاد سکاٹ تھا۔ اس کے آباؤ اجداد لتھوانیا چلے آئے۔ یہ وہیں پیدا ہوا۔ 1810 سے 1813 تک وزیر جنگ رہا۔ سمولنسک پر فرانسیسیوں کا قبضہ ہو جانے کے بعد اس کی جگہ کوتوزوف کمانڈر انچیف مقرر ہوا۔ عظیم ترین روسی شاعر الیکسانڈر پوشکن اس کا بہت مداح تھا۔

جنوبی فوج کا کمانڈر انچیف باگ راتیاں (جلد اول میں حواشی ملاحظہ فرمائیں) تھا۔ آسٹریا کی سرحد کے قریب ریزرو فوج تشکیل دی جا رہی تھی۔ اس کا کمانڈر انچیف ایک اور روسی جرنیل تورماسوف تھا۔

21- آراک چیف: جلد اول میں حاشیہ دیا جا چکا ہے۔

22- پرنس سالتی کوف (Saltykov): ایک روسی جرنیل۔ بہ اعتبار منصب فیلڈ مارشل۔

23- کاؤنٹ لوغستوں (Lauriston): 1812 میں نپولین کا روس میں سفیر۔ توپ خانہ سکول میں نپولین کا ہم سبق تھا۔ 1815 میں نپولین کے خلاف ہو گیا۔ لوئی شانزدہم نے اسے مارکوئیس کا خطاب دیا اور مارشل کے عہدے پر ترقی دی تھی۔

24- پرنس کوراکن (Kurakin): فرانس میں روسی سفیر۔

25- ڈیوک آف باسانو: نپولین کی حکومت کا ایک اطالیہ نژاد عہدیدار۔

26- موغا (Joachim Murat) (1767 تا 1815): فرانسیسی مارشل۔ اسے نپولین نے نیپلز کا بے اختیار بادشاہ (1808 تا 1815) بنائے رکھا، لیکن وہ اپنے آپ کو سچ مچ کا بادشاہ سمجھتا رہا۔ نپولین نے 1800 میں اس کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی۔ مزید تفصیل کتاب اول کے حصہ دوم میں دیکھیں۔

27- مارشل داؤو (Louis Nicolas Davout, Prince of Eckmuhl): نپولین کی فوج کا مارشل۔ (تفصیل چوتھی کتاب حصہ اول حاشیہ نمبر 13 پر دیکھیں۔)

28- مملوک رستن: نپولین مصر سے واپسی پر اپنے ساتھ ایک شخص، جو بعد میں اس کا معتمد بنا، بطور باڈی گارڈ ساتھ لایا تھا۔ غالباً اس کا تعلق شاہی مملوک خاندان سے تھا۔ ''جنگ اور امن'' کے تمام انگریزی تراجم میں اسے ''مملوک رستن'' ہی لکھا گیا ہے۔ اگرچہ طالسطائی کو عربی اور فارسی دونوں زبانیں آتی تھیں لیکن ''رستن'' نام کسی غلط فہمی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ایرانی نام ''رستم'' ہو۔

29- ہسی بوٹ: پنڈلیوں تک پھندنے دار اونچے بوٹ۔ ان کا آغاز جرمنی کی ریاست ہسے (Hesse) سے ہوا۔

انیسویں صدی میں یہ سارے یورپ کی فوجوں میں مقبول ہو گئے۔

30- باتیں کرنے لگا: نپولین نے اس اور اس سے اگلے باب میں بالاشیف کے سامنے جو تقریریں کی ہیں، ان کے ماخذ فرانسیسی مورخ تیئغ (Thiers) اور روسی مورخ میخائیلووسکی۔ دانیلیوسکی کی تحریریں ہیں۔ تاہم طالسطائی نے انھیں نپولین کی نخوت پسندی کو منظر عام پر لانے کے لیے نہایت چابک دستی سے استعمال کیا ہے۔ (ماڈ)

31- پومیرانیا: وسطی یورپ کا ایک پرانا ملک۔ آج کل اس کا کچھ حصہ پولینڈ اور کچھ (مشرقی) جرمنی میں شامل ہے۔

32- اودر: (Oder): مشرقی یورپ کا ایک دریا۔ چیکوسلوکیا کے پہاڑی خطے سے نکلتا ہے اور بحیرہ بالٹک میں جا گرتا ہے۔ پولینڈ اور (مشرقی) جرمنی کے مابین کچھ دور سرحد کا کام بھی دیتا ہے۔ پولینڈ میں اسے اودرا کہا جاتا ہے۔

33- دستولا: پولینڈ کا ایک دریا۔ گدنسک کے قریب بحیرہ بالٹک میں گرتا ہے۔ پولینڈ میں اسے ویسیوا کہا جاتا ہے۔

34- باڈن: (Baden): جنوب مغربی جرمنی کی ایک (سابق) ریاست۔

35- ترکوں سے صلح: کوتوزوف نے چند فتوحات حاصل کرنے کے بعد مئی 1812 میں بخارسٹ (رومانیہ) میں ترکوں کے ساتھ صلح نامے پر دستخط کیے تھے۔

36- مولداویا (Moldavia): بحیرہ اسود، رومانیہ اور یوکرین کے مابین علاقہ۔ اس کا کچھ حصہ رومانیہ میں اور باقی روس کی ایک (سابق) ریاست مولداویا میں، جو اب ایک آزاد ملک بن چکا ہے، شامل ہے۔

37- ولاکیا: رومانیہ کا ایک صوبہ۔ 1387 سے 1859 تک ترکوں کے قبضے میں رہا۔

38- فن لینڈ: شمالی یورپ کا آزاد جمہوری ملک۔ اسے 1919 میں روس سے آزادی ملی تھی۔

39- خلیج بوتھنیا۔ بحیرہ بالٹک کا انتہائی شمالی بازو۔ سویڈن اور فن لینڈ کے مابین واقع ہے۔

40- شٹائین (Baron H.F.K. von Stein): (1757 تا 1831): پہلے جرمن ریاست پرشیا کا وزیر تھا۔ نپولین نے اسے وہاں سے نکلوا دیا۔ وہ الیکساندر کی دعوت پر 1812 میں روس چلا آیا اور نپولین کے خلاف اتحاد بنانے کی سعی کرتا رہا۔ تفصیل کے لیے تتمہ حصہ دوم حاشیہ 5 دیکھیں۔

41- آرم فیلٹ (Count G.M. Armfelt): (1757 تا 1814): سویڈن کا ممتاز جرنیل۔ بعد میں اس نے روس کی ملازمت اختیار کر لی اور فن لینڈ کا نظم و نسق چلاتا رہا۔ سپیرانسکی کے زوال میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔

42- بے نگ سین: (Count L.A. Bennigsen): (1745 تا 1826): ولنا ضلع (اوپر حاشیہ نمبر 19 اور حصہ اول کا باب سوم ملاحظہ فرمائیں) کا جاگیردار۔ جون 1807 میں پرشیا کے مقام فریڈلانٹ (آج کل یہ روس میں شامل ہے اور اس کا نام پرادنسک ہے) پر جن روسی فوجوں نے فرانسیسیوں سے شکست کھائی اور معاہدۂ تلزٹ کی راہ ہموار کی، اس کا کمانڈر یہی بے نگ سین تھا۔ زار الیکساندر نے اس پر صحیح معنوں میں کبھی اعتبار نہ کیا کیونکہ یہ زار پاول اول کے قتل کی سازش میں ملوث تھا۔

43- ونٹ ٹسنگے (Baron F.T. Wintzigerode): (1770 تا 1818): جرمنی کی ریاست ہیسے کا باشندہ۔ 1793 سے روس کی ملازمت میں تھا۔ چونکہ نپولین نے اس کے آبائی وطن کو اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا، اس لیے ٹیکنیکل

اعتبار سے وہ ''فرانس کا بھگوڑا شہری'' تھا۔

44- پفوہل (Pfuhl) جرمن نژاد روسی جرنیل۔ جنگی ترکیبوں کا ماہر۔

45- برناڈوٹ (J.B.J. Bernadotte): نپولین کا سویڈی جرنیل۔ 1810 میں سویڈن کے تخت کا وارث منتخب ہوا۔

46- دوینا (Dvina): شمال مغربی اور مغربی روس کا ایک دریا۔

47- دنیپر (Dnieper): مغربی روس کا دریا۔ بحیرہ اسود میں گرتا ہے۔ سمولنسک اسی کے کنارے پر واقع ہے۔ لمبائی کے اعتبار سے یورپ کا تیسرا طویل ترین دریا ہے۔

48- سرحدیں... دوبارہ بحال کردوں گا: یعنی پولینڈ کی از سر نو تشکیل کردوں گا۔

49- بیسی ایئر (J.B. Bessiers): (1768 تا 1843): ڈیوک آف استغیا اور فرانس کا مارشل۔ اوسٹرلٹس کی جنگ میں فرانسیسی گھڑسوار فوج کا کمانڈر تھا۔

50- کولین کورخ: (دوسری کتاب کے حصہ سوم میں یہ حاشیہ دیا جاچکا ہے۔)

51- ہسپانیہ میں فرانسیسی ہزیمتیں: خود نپولین تو شمالی اور مشرقی یورپ میں مصروف رہا اور ہسپانیہ میں فرانسیسی فوجیں انگریزوں سے پٹتی رہیں تا آنکہ ڈیوک آف ونگٹن کی زیر قیادت انگریزی فوج نے 1812 میں مرکزی ہسپانیہ کے تاریخ شہر سلامانکا اور اگست میں دارالحکومت میڈرڈ پر قبضہ کرلیا۔

52الف۔ براستہ پولتاوا: مشرقی یوکرین کا تاریخی شہر اور صنعتی مرکز: سترھویں صدی میں یہاں قازق چھائے رہے۔ روس کے زار پیٹر اعظم نے یہاں 1709 سویڈن کی فوجوں کو شکست دی تھی اور یوں ایک لحاظ سے جدید روسی مملکت کی بنیاد رکھی تھی۔ نپولین نے اس بارے میں بالاشیف سے سوال پوچھا اور بالاشیف نے اس کا جوترکی بہ ترکی جواب دیا، اس کے متعلق ماڈ کا خیال ہے کہ تاریخ میں ایسی کوئی شہادت نہیں ملتی۔

52ب۔ چارلس دوازدہم (1682 تا 1718) سویڈن کا بادشاہ تھا۔ اس نے 09-1707 کے دوران میں روس پر حملے کرنے کی حماقت کی جس کے نتیجے میں سویڈن کا ایک عظیم طاقت کی حیثیت سے خاتمہ ہوگیا۔

53- سیوغے (Sevres): شمالی فرانس کا ایک شہر جہاں اعلیٰ قسم کے چینی کے ظروف، جو سیوغے ظروف کہلاتے ہیں، بنتے ہیں۔

54- ورٹم برگ (Wurttem berg): جنوب مغربی جرمنی کی ڈچی۔ یہاں مراد وہاں کے نواب خاندان سے ہے۔ آج کل اسے اور باڈن کو ملا کر جرمنی کی باڈن/ورٹم برگ ریاست بنائی گئی ہے۔

55- وائمر (Weimar): (مشرقی) جرمنی کا شہر۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں جرمنی کا ثقافتی مرکز۔ جرمنی کے مشہور عالم ادیبوں گوئٹے اور شلر کی اسی شہر سے نسبت تھی۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد نئی جرمن جمہوریہ کا آئین اسی شہر میں مرتب ہوا اور اس رعایت سے یہ جمہوریہ وائمر جمہوریہ کہلائی۔ شہر کی رعایت سے یہاں کے ڈیوک بھی وائمر کہلاتے رہے۔

56- مولداویا کی فوج: کوتوزوف مارچ 1811 میں اس کا کمانڈر انچیف مقرر ہوا تھا۔

57- دریسا: ایک روسی گاؤں۔ دریائے دوینا اور ایک ندی کے سنگھم پر واقع ہے۔ یہاں قلعہ بند کیمپ قائم کرنے کا مقصد اس

سڑک کی، جو پیٹرز برگ جاتی تھی، حفاظت کرتا تھا۔

58- سپاہ دوم: اس کا کمانڈر انچیف باگ راتیان تھا۔

59- پولستانی صوبے: سمولنسک کے مغرب میں واقع صوبجات پولستانی صوبے تھے اور انھیں کئی سال قبل روس میں شامل کیا گیا تھا۔

60- زار یوچ: زار کا ولی عہد زار یوچ (لفظی معنی: زار کا بیٹا) کہلاتا تھا۔

61- پاؤلوچی (Marquis F.O. Paulucci): اطالوی جزیرے سارڈینیا کا باشندہ۔ 1809 میں فرانسیسیوں کی ملازمت چھوڑ کر روسیوں کے ساتھ آملا۔ کچھ عرصہ روس کی فوج اول کا چیف آف سٹاف رہا۔

62- وول ٹسوگن (Baron L.J. Wolzogen): (1774 تا 1845): پرشیا کا ایک جرنیل اور پفوہل کا ترجمان۔ 1807 سے 1815 تک روسی فوج کے جنرل سٹاف میں شامل رہا۔

63- ٹول (K.F.Toll): (1778۔1842): جرمن نژاد روسی جرنیل۔ 1812 میں روسی فوج کا کوارٹر ماسٹر جنرل تھا۔

64- جینا (Jena): (صحیح تلفظ یے نا ہے): (مشرقی) جرمنی کا صنعتی شہر۔ دریائے سالے (Saale) کے کنارے واقع ہے۔ یہاں کی یونیورسٹی (مؤسسہ 1558) نے اٹھارویں صدی میں، جب فختے (Fichte)، ہیگل، شیلنگ (Schelling)، شلر اور شلیگل (Schlegel) اس میں پڑھاتے تھے، زبردست شہرت حاصل کی تھی۔

65- اورشٹٹ: (Auerstadt): (مشرقی) جرمنی کا ایک قصبہ:

نوٹ: متن میں جس مہم کا حوالہ دیا گیا ہے، وہ دو لڑائیوں پر مشتمل تھی۔ نپولین نے یہ دونوں لڑائیاں بیک وقت جینا اور اورشٹٹ میں پرشیا کے خلاف لڑیں۔ نپولین کامیاب ہوا اور پرشیا اس کے زیرنگیں آ گیا۔

66- سویسیانی (Swieciani): مغربی روس کا ایک قصبہ۔

67- تیرہ جون: ماڈ اور روز میری اینڈ منڈز کے تراجم میں تیرہ جولائی لکھا گیا ہے۔ باب 18 میں بھی یہی اختلاف پایا جاتا ہے۔

68- سالتانوف (Saltanov): روس کا ایک قصبہ: یہاں جون 1812 میں روسیوں کی فرانسیسیوں سے جھڑپ ہوئی تھی۔

69- تھرموپلی (Thermopylae): وسطی یونان کا ایک درہ۔ یہاں 480 قبل از مسیح میں یونانیوں اور ایرانیوں میں جنگ ہوئی تھی۔ اس جنگ میں یونانیوں کو شکست ہوئی اور فوج کا بیشتر حصہ دم دبا کر بھاگ گیا۔ تاہم یونانی ریاست سپارٹا (Sparta) کے بادشاہ نے اپنی اور ایک دوسری شہری ریاست تھیسپیا (Thespiae) کی بچی کھچی سپاہ کی مدد سے مقابلہ جاری رکھا۔ تمام لوگ مارے گئے لیکن باقی یونانیوں کے لیے مثال قائم کر گئے اور یونانی ایرانیوں کے خلاف مدتوں صف آرا رہے۔

70- کاؤنٹ اوسترمان طالسطائی: روسی جرنیل اور فوج اول کا کور کمانڈر۔

71- وتبسک (Vitebsk): سابق روسی ریاست اور اب آزاد ملک بائیلو رشیا کی دریائی بندرگاہ۔ دریائے دوینا کے کنارے پر واقع ہے۔

72- سینٹ پیٹر (پطرس): حضرت عیسیٰ کے حواری۔ انھیں روایتاً روم کا پہلا بشپ سمجھا جاتا ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ انھیں تقریباً 67 میں شہید کیا گیا اور روم میں دفن کیا گیا تھا۔ حضرت عیسیٰ کے بعد وہ عیسائیوں کے سب سے بڑے رہنما کے طور پر ابھرے۔

73- ایامِ صیام: سینٹ پیٹر کا یوم 29 جون کو منایا جاتا ہے۔ اس سے دو ہفتے قبل روزے رکھے جاتے ہیں۔

74- صبح تین بجے: یورپی ممالک میں گرمیوں میں سورج بہت جلد طلوع ہوتا ہے۔ شمالی روس اور سویڈن میں صبح تین بجے دھوپ چمک رہی ہوتی ہے لیکن لوگ سوئے رہتے ہیں اور وقت پر ہی بیدار ہوتے ہیں۔

75- مجلس کلیسا (Synod): کسی مسلک (Church) کے ارکان کی خصوصی کونسل۔ مذہبی مسائل پر غور و فکر کرنے کے لیے اس کے اجلاس باقاعدگی سے منعقد ہوتے ہیں۔

76- چھوٹا پادری (Deacon): چرچ آف انگلینڈ، رومن کیتھولک اور یونانی (بشمول روسی) آرتھوڈوکس مسالک میں جو شخص گرجے میں مذہبی رسوم سرانجام دیتا ہے، اسے پادری (priest) کہتے ہیں۔ ڈیکن اس سے نچلے درجے پر ہوتا ہے۔

77- منصبی رومال (Stole): کامدار ریشمی سکارف۔ عبادت کے دوران میں ڈیکن بائیں کندھے پر لیکن پادری اور بشپ دونوں کندھوں پر ڈالتے ہیں۔

78- اتوارِ تثلیث (Trinity Sunday): ایسٹر کے بعد آٹھواں اتوار۔

79- عمالیق: بائبل کے مطابق حضرت اسحاق کے دو بیٹے تھے: حضرت یعقوب اور عیسو۔ عیسو کا ایک پوتا عمالیق تھا۔ اس کی اولاد عمالیقی کہلائی۔ جب حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو مصر سے نکال لائے تو ان کا عمالیقیوں سے جھگڑا ہو گیا۔ حضرت موسیٰ اپنا عصا لے کر پہاڑ پر جا کھڑے ہوئے۔ جب تک وہ اپنا عصا اوپر اٹھائے رکھتے، بنی اسرائیل کا پلہ بھاری رہتا، جونہی وہ عصا نیچے کرتے، عمالیقی غالب آنے لگتے۔ بنی اسرائیل نے بڑی مشکل سے عمالیقیوں کو شکست دی۔ (پرانا عہد نامہ، خروج، باب 17)

80- مدیانی: بائبل کے مطابق یہ ایک قدیم عربی قبیلہ تھا اور حضرت ابراہیم کے بیٹے مدیان سے اپنا سلسلۂ نسب جوڑتا تھا۔ جس شخص کی بیٹی صفورہ سے حضرت موسیٰ نے بھیڑ بکریاں چرا کر شادی کی، اس کا تعلق اسی قبیلے سے تھا (پرانا عہد نامہ، خروج باب دوم)۔ اس قبیلے کی بعد میں بنی اسرائیل سے ٹھن گئی، وہ ''ٹڈی دل'' کی طرح آتے اور غزہ تک یہودیوں کی فصلیں اور جانور سب کچھ لوٹ کر لے جاتے (پرانا عہد نامہ، قضاۃ، باب ششم)

81- جدعون (Gideon): بنی اسرائیل کے ایک غریب گھرانے کا فرد تھا۔ پھر خداوند کی اس پر نظر کرم ہوئی۔ اس نے نرسنگا پھونکا، اسرائیلی اس کے گرد جمع ہونے لگے اور آخر کار وہ مدیانیوں کو شکست دینے میں کامیاب ہوا۔ (پرانا عہد نامہ، قضاۃ، باب ششم)

82- جولیت (Goliath): بائبل کے مطابق ایک فلستی (فلسطینی) پہلوان۔ اس کا قد چھ ہاتھ ایک بالشت تھا۔ اس کے سر پر پیتل کا خود ہوتا تھا۔ اس کی زرہ پانچ ہزار مثقال وزنی تھی۔ اس کے ''بھالے کی چھڑ ایسی تھی جیسے جولاہے کا

شہتیر۔" اس کے آہنی نیزے کے پھل کا وزن چھ سو مثقال تھا۔ اس نے اسرائیلیوں کو للکارا کہ وہ اپنا بہترین جنگجو اس کے خلاف بھیجیں۔ اگر وہ جیتا تو اسرائیلی ان کا پانی بھریں گے، اگر وہ ہار گیا، پھر فلستی اسرائیلیوں کے خادم بن جائیں گے۔ اس کے مقابلے میں حضرت داؤدؑ میدان میں اترے اور اس پر غالب آئے۔ (پرانا عہد نامہ، سموئیل باب 17)۔ قرآن مجید (سورہ بقرہ، رکوع 33) میں اس کا نام جالوت آیا ہے۔

83- 666: ماڈ کی رائے میں 666 کی میزان حاصل کرنے کے لیے le کی e کا، جو Empereur سے پہلے اڑا دی جاتی ہے، شمار کرنا ضروری ہے۔ پیئر quarante-deux کے ساتھ گڑبڑ کرتا ہے، وہ اس کا مطلب مہینوں کی بجائے سال لیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیتا ہے کہ نپولین اگست تک بیالیس سال کا نہیں ہوگا (مغرب میں آدمی کی عمر میں اس کی تاریخ پیدائش کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص یکم جنوری 1981 کو پیدا ہوتا ہے، وہ 1995 میں سارا سال چودہ سال کا ہی رہے گا، صرف یکم جنوری 1996 کو اور اس کے بعد ہی اس کی عمر پندرہ سال گنی جائے گی۔) وہ فرانسیسی میں اپنے نام کے ہجے Besuhof کرتا ہے، حالانکہ کتاب چہارم، باب 1، میں اسے Besouhof لکھا گیا ہے۔

84- سینٹ جارج: اس نام کا کوئی شخص تھا بھی یا نہیں، اس کے بارے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ یورپ سے جو لوگ صلیبی جنگیں لڑنے مشرق وسطیٰ آیا کرتے تھے، ان کا دعویٰ تھا کہ اسے رومی شہنشاہ Diocletianus کے، جو 284 تا 305 برسر اقتدار رہا، عہد حکومت میں "شہید" کیا گیا تھا۔ انگریز اس کا چلن عام کرنے میں بہت پیش پیش رہے اور انھوں نے بالآخر اسے اپنا محافظ (patron) سینٹ تسلیم کر لیا۔ بعد میں غالباً روسی بھی اس کے معتقد ہو گئے۔

85- سینٹ جارج کا نیا محافظ: نکولائی رستوف، جسے تمغہ سینٹ جارج ملا تھا۔

86- Champignon: کھمبی (musbroom)

87- Toadstool: سانپ کی چھتری۔ کھمبی اور سانپ کی چھتری دونوں خودرو ہوتے ہیں۔ کھمبی کھانے میں لذیذ لیکن سانپ کی چھتری زہریلی ہوتی ہے۔ (یورپ کے کسان آج کل کھمبیاں خود بھی اگاتے ہیں۔)

88- فرانسیسی بولنا: ماڈ کا کہنا ہے کہ اونچے طبقے میں فرانسیسی اتنی جڑ پکڑ چکی تھی کہ اکثر روسی شرفا کو روسی نہ بولنا آتی تھی اور نہ لکھنا۔ ادھر عوام کا یہ حال کہ انھیں روسی کے علاوہ کوئی دوسری زبان آتی ہی نہیں تھی۔

89- کریملن (Kremlin): روسی لفظ، Kreml، جو تاتاری زبان سے آیا تھا، کی فرانسیسی شکل۔ روسی زبان میں اس کا مطلب "قلعہ" ہوتا ہے۔ یہاں اس سے مراد ماسکو کا "قلعہ" ہے، (جو اصلاً قلعہ نہیں، چار دیواری ہے اور اس کے اندر بے شمار عمارتیں ہیں) (نوٹ نمبر 34 دیکھیں)۔ اسے 1156 میں تعمیر کیا گیا تھا اور اس میں مسلسل توسیع ہوتی رہی ہے۔ 1712 سے 1918 کے مابین کے زمانے کے ماسوا، جب پایہ تخت پیٹرز برگ منتقل ہو گیا تھا، یہ ہمیشہ روسی حکومت کا صدر دفتر رہا ہے۔ اس میں دیگر عمارتوں کے علاوہ دو عظیم الشان کلیسا بھی داخل ہیں۔ حاشیہ نمبر 90 دیکھیں۔

90- کلیسائے مریم (Church of Assumption): حضرت مریم کے بہشت میں داخلے کو Assumption کہا جاتا

ہے۔اس واقعے کی یاد میں 15 اگست کو گرجوں میں خاص تقریب منعقد کی جاتی ہے۔اس واقعے کی یاد میں کلیسا بھی تعمیر کیے گئے ہیں۔''انھیں کلیسائے مریم'' یا Church of Assumption کہا جاتا ہے۔

حضرت جبرئیل جس روز حضرت عیسیٰ کے تجسد کے متعلق خوش خبری دینے حضرت مریم کی خدمت میں حاضر ہوئے، اسے انگریزی میں Annunciation کہتے ہیں اور اس کی تقریب 25 مارچ کو منائی جاتی ہے۔ اس واقعے کی یاد میں بھی کلیسا تعمیر کیے جاتے ہیں۔حاشیہ نمبر 89 میں جن دو کلیساؤں کا ذکر کیا گیا ہے، ان کے نام یہی ہیں۔زار محل سے کریملن میں واقع ''کلیسائے مریم'' میں گیا ہے۔

-91 توپ زار (Tsar-cannon): ایک بہت بڑی توپ۔1488 میں ڈھالی گئی تھی اور کریملن میں محفوظ کر دی گئی ہے۔

-92 کواس (Kvass): بیئر سے ملتا جلتا روسی مشروب۔رائی یا جو سے بنتا ہے۔

-93 بسکٹوں کی پلیٹ: طالسطائی نے اپنے ناول ''جنگ اور امن'' کے بارے میں ایک مضمون تحریر کیا تھا۔(یہ مضمون اس ترجمے کے آخر میں شامل ہے۔مترجم) اس میں اس نے دعویٰ کیا تھا کہ اس نے اپنی کتاب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ اس کے ثبوت میں شہادتیں پیش کر سکتا ہے لیکن جب ایک نقاد پرنس ویازیمسکی نے اس واقعے کے بارے میں ثبوت مانگا (پرنس ویازیمسکی کا خیال ہے کہ الیکساندر اتنا شرمیلا اور قاعدے قانون کا پابند تھا کہ وہ اس قسم کی حرکت کر ہی نہیں سکتا تھا۔)، تو طالسطائی آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گیا اور کوئی حوالہ پیش نہ کر سکا۔البتہ ایک کتاب میں کہا گیا ہے کہ الیکساندر نے ہجوم میں تقسیم کرنے کے لیے پھل بھیجے تھے۔ممکن ہے طالسطائی کے ذہن میں یہی حوالہ ہو۔(ماڈ)

-94 سلابودا محل: ماسکو کا ایک شاہی محل۔اس محل میں اس روز جو کچھ ہوا، اس کی تفصیل موقعے کے ایک گواہ سرجی گلنکا کی ''یادداشتوں'' سے اخذ کی گئی ہے۔(ماڈ)

-95 مجلس عوام (States General = Les Etats-generaux): اصل میں یہ انقلاب سے قبل فرانس کی (نام نہاد) مجلس قانون ساز کا نام تھا۔

-96 عمرانی معاہدہ: ایک معاہدہ، جس کے تحت ذمے دار حکومت کی ضمانت کے عوض میں عوام اپنی بعض آزادیوں سے دستبردار ہو جاتے ہیں۔انگریز فلسفیوں ہوبز (Hobbes) اور لوک (Locke) کے مطابق حکومت آمرانہ بھی ہو سکتی ہے لیکن روسو کا اصرار ہے کہ حکومت کے لیے عوامی تائید ضروری ہے۔

حصہ دوم

-1 تورانی (Scyhian) یا سیتھی: سیتھی نسلاً ہند یورپی باشندے تھے۔پہلے یہ ایشیائے کوچک اور بعد میں بحیرہ اسود کے کنارے آباد ہوئے۔مزاجاً وہ خانہ بدوش تھے اور زیادہ تر خانہ بدوش ہی رہے۔وہ گھڑ سواری اور تیر اندازی میں بہت ماہر تھے اور اسی مہارت کے بل بوتے پر وہ یونانیوں اور ایرانیوں کے حملے پسپا کرتے رہے۔تیسری صدی عیسوی میں وہ گوتھوں (Goths) کا مقابلہ نہ کر سکے اور بالآخر نابید ہو گئے۔مولوی عبدالحق نے اپنے ڈکشنری میں سیتھیوں کو

تورانی کہا ہے۔

-2 فرانسیسی زدہ روسی (Frenchified Russian): ماڈ کا خیال ہے کہ طالسطائی جولی کی فرانسیسی زدہ روسی کے ذریعے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جولی کی حب الوطنی سراسر مصنوعی ہے تاہم اس کا کیا کیا جائے کہ اس زمانے کی نوجوان روسی خواتین کو واقعی روسی نہیں آتی تھی۔ خود پوشکن کی تاتیانا، جو" دلی طور پر روسی" ہے، جب Onegin کو خط لکھنے بیٹھتی ہے تو فرانسیسی ہی استعمال کرتی ہے۔

-3 شیڈ: ٹانگوں کے بغیر عینک، جو دوسری عینک کے اوپر چڑھالی جاتی ہے۔

-4 پوتیمکن (Prince Grigory Alexandrovich Potemkin): روسی جرنیل اور سیاست دان۔
پوتیمکن امپراطورہ کیتھرین کا معتمد، چہیتا اور شریکِ خلوت تھا۔ اس کے علاوہ پوتیمکن کی ایک اورداشتہ تھی۔ اسے وہ اپنی "بھتیجی" کہا کرتا تھا۔ جب امپراطورہ کیتھرین نے طالسطائی کے نانا پرنس نکولائی ولکونسکی سے کہا، جسے "جنگ اور امن" میں پرنس بلکونسکی کے روپ میں پیش کیا گیا ہے، کہا کہ وہ پوتیمکن کی "بھتیجی" سے شادی کر لے، اس نے پٹ جواب دیا: "اس نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں اس کی رکھیل سے بیاہ کرلوں گا؟" (اے این ولسن)

-5 زبوف: امپراطورہ کیتھرین کا ایک درباری۔ پرنس آندرے کی بیوی لسا (مرحومہ) کاؤنٹس زبووا کا ذکر بہ لطائف الحیل کرتی رہتی تھی اور خوب مذاق اڑاتی تھی۔ کتاب اول کے حصہ اول کا آخری باب دیکھیں۔

-6 آل پاچ نے گردن کو جھٹکا دیا: "روسیوں کی یہ عادت ہے کہ وہ حیرت، مایوسی، ملال یا ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کے لیے گردن کو دائیں بائیں جھلاتے یا جھٹکاتے ہیں۔" (ماڈ)

-7 داروگوبژ: ایک روسی قصبہ۔ سمولنسک سے صرف چند میل دور مشرق میں واقع ہے۔

-8 اسوایاژ: سمولنسک کے قریب ایک اور روسی قصبہ۔

-9 بشل (bushel): خشک اور مائع اشیا ماپنے کا پیمانہ۔ ایک بشل 2219ء36 مربع انچ یا آٹھ گیلن کے برابر ہوتا تھا۔
بشل تب استعمال ہوتا تھا جب اشیا تولتے نہیں بلکہ ماپتے تھے۔

-10 کوارٹر: کوارٹر کو عام طور پر کوارٹ (quart) کہا جاتا ہے۔ ایک کوارٹر چوتھائی گیلن یا 32/1 بشل کے برابر ہوتا تھا۔ آج کل کوارٹرز، بشل اور گیلن سب متروک ہو چکے ہیں۔ مائع اشیا کے لیے لٹر (ایک گیلن میں تقریباً 55ء4 لٹر آتے ہیں) اور خشک اشیا کے لیے کلوگرام استعمال ہوتے ہیں۔

-11 ڈریگون (Dragoon): بعض یورپی ممالک کی گھڑسوار فوج۔ اس کے افراد سرتاپا مسلح ہوتے تھے۔

-12 کارپ (Carp): خاصی بڑی مچھلی۔ دریاؤں اور جھیلوں میں پائی جاتی ہے۔

-13 پلوٹارک (Plutarch)۔ (تقریباً 46 تا 120)۔ ایک یونانی عالم اور مصنف۔ وہ روم اور ایتھنز دونوں کا شہری تھا۔ اس کی کتاب Parallel Lives میں، جس کے انگریزی ترجمے سے استفادہ کر کے شیکسپیئر نے متعدد ڈرامے تحریر کیے، یونانی اور رومی سیاست دانوں اور جرنیلوں کے تئیس جوڑوں کے حالات زندگی اور کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔

-14 "L' homme de beaucou p de merite": متعدد یا عظیم خوبیوں کا مالک شخص۔ ماڈ کا خیال ہے کہ اس

سے مراد Joseph de Maistre ہے۔ یہ شخص 1803 سے 1821 تک پیٹرز برگ میں جزیرہ سارڈینیا (جو آج کل اطالیہ میں شامل ہے لیکن اس زمانے میں آزاد مملکت تھا) کا سفیر تھا۔ طالسطائی نے پیٹرز برگ کی مختلف محافل کا جو نقشہ کھینچا ہے، اس میں اس نے Maistre کی کتب Correspondence diplomatique اور Soirees de St. Petersbourg سے خاصی مدد لی ہے۔ Maistre کے خیالات وافکار جس طرح خود طالسطائی کی سوچ پر اثر انداز ہوئے، اس کا جائزہ مشہور برطانوی مورخ اور فلسفی اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے سابق پروفیسر برلن (Sir Isaiah Berlin) نے، جو روس کی ریاست لتویا (جو اب آزاد ملک بن چکی ہے) میں پیدا ہوئے تھے، اپنے شہرہ آفاق کتابچے The Hedgehog and the Fox میں لیا ہے۔ (1978 میں برلن کا یہ کتابچہ ان کی کتاب Russian Thinkers میں شامل کر دیا گیا۔)

15- جون: ماڈ اور روز میری ایڈمنڈز کے تراجم میں 24 اور 29 جولائی لکھا گیا ہے۔

16- آراک چیف وغیرہ۔ روسی حکومت کے عہدیدار۔ ان پر جلد اول میں حواشی دیے جا چکے ہیں۔

17- autocrat: مطلق العنان حکمران۔ مولوی عبدالحق کے مطابق روسی زار کا لقب Autocrat of all the Russians ہوتا تھا۔

18- جوکندے (Joconde): فرانسیسی مصنف لافانتیں (Jean de la Fontaine) (1621 تا 1695) کی منظوم کہانی۔ اس نظم میں اس نے جنسی مناظر بے دھڑک بیان کیے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ لافانتیں آخر عمر میں مذہب کی طرف مائل ہو گیا تھا اور اس نے اس نظم کو اپنی تصنیف ماننے سے انکار کر دیا تھا۔

19- پلاتوف (General M.I. Platov): (1751 تا 1818): قازق دستوں کا سربراہ۔ مشہور روسی جرنیلوں سواروف اور کوتوزوف کے ساتھ جنگوں میں شریک ہو چکا تھا۔

20- ڈان (Don): جنوب مغربی روس کا دریا۔ اسے نہر کے ذریعے دریائے والگا سے ملایا جا چکا ہے۔

21- تین ہفتے: "وقت کی گنتی میں طالسطائی نے شاذ ہی کوئی غلطی کی ہو گی لیکن یہاں اس سے یہ سہو ہو گیا۔ سمولنسک پر پانچ اگست کو بمباری ہوئی اور اس روز (معمر) پرنس اچھا بھلا تھا۔ پندرہ اگست کو اس کا انتقال ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ تین ہفتے صاحب فراش نہیں ہو سکتا تھا۔" (ماڈ)

22- جونی پر (Juniper): ایک قسم کی سدا بہار جھاڑی۔ اس کا تیل دوا کا کام دیتا ہے اور جن (شراب) میں ڈالا جاتا ہے۔

23- پاول پیوترووچ یا پاول اول: کیتھرین اعظم اور پیوتر فیدرووچ کا بیٹا۔ 1796 سے 1801 تک روس کا حکمران رہا۔ الیکسانڈر اسی کا بیٹا تھا۔

24- پیوتر فیدرووچ یا پیوتر سوم: پیٹر (روسی پیوتر) اعظم کا نواسہ۔ اپنی خالہ الزبیتھ کے انتقال پر 1762 میں روس کا زار بنا۔ وہ خود تو بالکل مٹی کا مادھو تھا لیکن اس کی جرمن بیوی سوفیا بہت تیز طرار عورت تھی۔ اس نے اس کی سادگی سے فائدہ اٹھا کر اسے چھ ماہ بعد فوجی انقلاب کے ذریعے معزول کرا دیا اور خود کیتھرین دوم کے نام سے حکمران بن گئی۔ کچھ ہی دنوں کے بعد پیوتر سوم پراسرار حالات میں ہلاک ہو گیا (عام خیال یہی ہے کہ اسے خود کیتھرین نے مروایا

تھا)۔ تاہم کسانوں نے یہ ماننے سے انکار کردیا کہ پیوتر سوم ہلاک ہو چکا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھا کر کئی جعلی پیوتر میدان میں آگئے۔ ان میں ایک قازق بھی تھا جس کا نام پوگا چیف تھا۔ اس نے 1773 اور 1775 کے مابین یورال اور وسطی والگا کے علاقوں میں بغاوتوں کی رہنمائی کی۔ 1812 میں سمولنسک کے علاقے میں بھی کسانوں نے خاصے ہنگامے کیے۔

-25 زیرِ سطح لہریں (undercurrents): وہ خیالات، خواہشات، آرا یا ارادے جن کا کھلے بندوں اظہار نہیں کیا جاتا اور جن کے وجود کا بھی عام طور پر کوئی خاص علم نہیں ہوتا لیکن وہ لوگوں کے سوچ بچار اور رویوں کو متعین ضرور کرتے ہیں۔

-26 ظاہری وجہ: بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ باگوچارانوو اور اس کے گردونواح کے دیہات کے کسان بلا سبب اپنا گھربار چھوڑ کر بھاگنے لگے تھے لیکن انسان ہمیشہ اپنے حالات بہتر بنانے کی آرزو کرتا ہے اور اس کے لیے وہ کہیں بھی جانے کو تیار رہتا ہے۔ پھر روس کا Serfdom کا نظام تو اتنا ظالم تھا کہ اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کسان بڑے سے بڑا خطرہ مول لینے کے لیے تیار ہو جاتے ہوں گے۔ چنانچہ جب معمر پرنس انتقال کر گیا اور فرانسیسی فوجوں کی آمد کی وجہ سے سمولنسک کے علاقے میں ابتری پھیل گئی، باگوچارانوو کے کسانوں نے بھی اسے اپنے لیے ایک موقع تصور کیا اور پرنس ماریا کا حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ مارکس کے نظریے (کہ انقلاب سرمایہ دار معاشرے کے مزدور لائیں گے) کے برعکس روسی کسانوں نے جس طرح کمیونسٹ انقلاب بپا کیا، اس کی وجہ بھی اسی روسی نظام (جو انیسویں صدی کے اواخر میں بے شک سرکاری طور پر ختم کر دیا گیا) کے مہلک اثرات ہی ہوں گے۔ یہ الگ بات ہے کہ کمیونزم نے بھی کوئی خاص کمال نہ دکھایا اور 1991 میں روسیوں نے اس کا بھی دھڑن تختہ کر دیا۔

-27 کمیون (Commune): مختصر انسانی (اکثر اوقات دیہاتی) جمعیت۔ اس کے ارکان کے مفادات مشترکہ ہوتے ہیں اور ان کی ملکیتیں بھی عموماً مشترک ہوتی ہیں۔

-28 مراکشی چمڑا (morocco): ایک قسم کا بکری کا نرم نفیس چمڑا۔ پہلے مراکش میں بنتا تھا۔ اب عام بنتا ہے بلکہ مصنوعی بھی بنتا ہے۔ زیادہ تر جوتے بنانے اور کتابوں کی جلدیں باندھنے کے کام آتا ہے۔

-29 جاگیردار کا مکان: یورپی ممالک میں جاگیردار کی اراضی کو Manor اور اس کے مکان (ایک قسم کا محل جس میں محض جاگیردار ہی رہائش اختیار نہیں کرتا تھا بلکہ اس کی ضروریات کا سامان تیار کرنے والے مثلاً بڑھئی، لوہار، جولاہا وغیرہ بھی وہیں رہتے تھے اور اسی مکان کے ایک حصے میں ان کی ورکشاپیں ہوتی تھیں) کو manor house یا صرف manor کہا جاتا تھا۔ یہ یورپ کی زبانوں کا مشترک لفظ ہے اور لاطینی لفظ manere (رہائشی جگہ) سے مشتق ہے۔

-30 شادی سے انکار: (روسی) آرتھوڈوکس چرچ میں عورت کو اپنے بھائی کے برادر نسبتی یا بہن کے دیور اور جیٹھ سے شادی کی اجازت نہیں ہے۔ اگر نتاشا کی پرنس آندرے سے شادی ہو جاتی، تو پرنس ماریا رستوف کے ساتھ بیاہ نہ کر سکتی۔ (ماڈ)

-31 ہز سیرین ہائی نس (His Serene Highness): اصلاً یہ الفاظ بعض یورپی ممالک کے شاہی خاندانوں کے بعض افراد کا ذکر کرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ (The Concise Oxford Dictionary of Current

English)

-32 روٹی اور نمک: روسیوں کا دستور ہے کہ جو شخص کسی نئی جگہ رہائش اختیار کرتا ہے، اس کی تواضع ''روٹی اور نمک'' سے کی جاتی ہے۔ تاہم عملاً روٹی اور نمک کی جگہ اکثر کیک اور چاندی کی پلیٹ میں سفید باریک چینی پیش کی جاتی ہے۔ (ماڈ)

-33 سن کی پتی: ''روسیوں میں یہ عام رواج تھا کہ اگر کان میں درد ہوتا، وہ اس میں سن کی پتی ٹھونس لیتے۔'' (روز میری ایڈمنڈز)۔

-34 مادام دَ گانلی (Stephanie Felicite, Madame de Genlis) (1746 تا 1830): فرانسیسی ادیبہ۔ اٹھارہ سال کی عمر میں کاؤنٹ دَ گانلی سے شادی ہوئی۔ 1870 میں Duchess of Chartres کی مصاحبہ مقرر ہوئی۔ اس عرصے میں وہ ڈچس کے خاوند کی داشتہ اور اس کے بچوں کی ''گورنس'' بنی رہی۔ بچوں کو پڑھاتے پڑھاتے اس نے ان کی دلچسپی کی کہانیوں کی چند کتب تحریر کیں۔ پھر وہ باقاعدہ رومانی ناول نگار بن گئی۔ اس کی کتابوں کی تعداد نوے (90) ہے۔ کوتوزوف کی طرح نپولین بھی اس کا مداح تھا اور اس نے اس کی پنشن بھی مقرر کی تھی۔

-35 بخارسٹ (Bucharest): روس کے پڑوسی ملک رومانیہ کا دارالسلطنت۔ اہل رومانیہ اسے بوکورشتی (Bucuresti) کہتے ہیں۔

-36 رست چک (Rustchuk): رومانیہ کا ایک قلعہ۔ اس زمانے میں ترکی کے قبضے میں تھا۔

-37 کارپشکا تچی گی رن (Kar pushka Tchigirin): ماسکو کا گورنر جنرل رستوپ چن اپنے خبرناموں میں اس فرضی کردار کو حب الوطنی کے ترجمان کی حیثیت سے پیش کرتا تھا۔

-38 پوشکن (Vasili Lvovich Pushkin): (1768۔1830): یہ پوشکن عظیم ترین روسی شاعر الیکساندر پوشکن کا چچا تھا۔ شعر سازی میں اسے بڑا ملکہ حاصل تھا اور زیادہ تر اپنی طنزیہ نظم ''خطرناک ہمسایہ'' کی وجہ سے جانا جاتا ہے جس کا پوشکن نے اپنے منظوم ناول "Eugene Onegin" میں ذکر کیا ہے۔

-39 Charon: (کیرن) یونانی دیومالا میں مردوں کی روحیں زیرزمین (Hades میں) چلی جاتی ہیں۔ رستے میں ایک دریا Styx آتا ہے۔ کیرن ملاح ہے اور وہ اپنی کشتی میں روحوں کو یہ دریا پار کراتا ہے۔

-40 Gallicism: کسی فرانسیسی ترکیب یا محاورے کا دوسری زبان میں استعمال۔ (پرانے زمانے میں فرانس کو Gaul کہا جاتا تھا اور اسی سے یہ لفظ بنا ہے۔)

-41 جون آف آرک (فرانسیسی Jeanne D' Arc): (1412 تا 1431): فرانسیسی ہیروئن۔ اس نے بارہ ہزار جوانوں کی مدد سے انگریزوں (جو فرانس کے بعض علاقوں پر قابض تھے) کا ناطقہ بند کر دیا اور انھیں اور لینز کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ بعد میں کچھ فرانسیسیوں نے ہی اسے پکڑا اور انگریزوں کے پاس بیچ دیا۔ انگریزوں نے اسے جادوگری اور بدعت کے الزام میں زندہ جلا دیا۔ 1920 میں اسے سینٹ کا درجہ دیا گیا۔

-42 ایمزن (Amazon): یونانی دیومالا کے مطابق نسائی جنگجوؤں کی ایک قوم جو بحر اسود کے نزدیک ستھیا میں رہتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ یہ عورتیں اپنے دائیں پستان کٹوا دیتی تھیں تاکہ تیر کمان چلانے میں آسانی رہے، اسی لیے

Amazon(a=بغیرmazos=پستان) کہلاتی تھیں۔

-43 بیلایاتسرکوف(Belaya Tserkov): یوکرین کا ایک قصبہ۔ دارالسلطنت کیف کے قریب جنوب میں واقع ہے۔

-44 مادام دَسوزا:(Adelaide Marie-Emilie de Souza):(1761 تا 1836): فرانسیسی ناول نگار۔ اس کا پہلا خاوند Count of Flahaut انقلاب فرانس کی بھینٹ چڑھ گیا اور مادام دَسوزا نے تصنیف وتالیف میں پناہ ڈھونڈ لی۔ اس نے دوسری شادی پیرس میں پرتگال کے مدارالمہام مارکوئیس آف دَسوزا سے کی۔

-45 ویازما: ماسکو اور سمولنسک کے مابین ریلوے جنکشن۔ بارودینو، جہاں روسیوں اور فرانسیسیوں کے مابین بعد میں گھمسان کا رن پڑا، مشرق میں اس کے بالکل قریب ہے۔

-46 کاؤنٹ ونٹ ٹسنگے روڈے: کاؤنٹ ونٹ ٹسنگے روڈے پیٹرز برگ جانے والی شاہراہ کی حفاظت کرنے پر مامور تھا۔ 30 جولائی کو اس کی فرانسیسیوں کے ایک دستے سے مڈھ بھیڑ ہوئی اور فرانسیسی پٹ گئے۔ تاہم اصل فاتح ونٹ ٹسنگے روڈے نہیں بلکہ وہ جرنیل تھا جو روس کی عقبی سپاہ کی کمان کر رہا تھا۔ (ماڈ)

47الف۔ لے پخ(Franz Leppich): لے پخ ولندیزی باشندہ تھا۔ اس نے رستوپ چن کو شیشے میں اتار لیا اور اسے قائل کر لیا کہ وہ ایک ایسا غبارہ تعمیر کر سکتا ہے جو فرانسیسیوں کی مت مار دے گا۔ اس نے 1811 میں نپولین کو اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کی تھی لیکن نپولین اس کی چالوں میں نہ آیا اور اس نے اسے اپنی سلطنت کی حدود سے باہر نکال دیا، تاہم روسی اس کے ہتھے چڑھ گئے۔ حکومت نے اس منصوبے پر بہت بڑی رقم صرف کی اور وقت بھی برباد کیا لیکن حاصل کچھ بھی نہ ہوا۔ نومبر 1812 میں آزمائش کے دوران میں غبارے سے گیس رسنے لگی اور لے پخ ایسا غائب ہوا کہ اس کا کہیں سراغ نہ ملا۔

47ب۔ لابنوئے پلیس:(Lobnoye Place): ماسکو میں وہ جگہ جہاں مجرموں کو کوڑے لگائے یا پھانسیاں دی جاتی تھیں۔ پہلے یہ ریڈ سکوائر میں واقع تھی۔ ماڈ کے مطابق اس کے لفظی معنی "پیشانی کا مقام" ہیں اور یہ آرامی زبان کے لفظ gulgutha (متی کی اردو انجیل میں اسے گلگتا لکھا گیا ہے اور انگریزی میں اسے Golgotha تحریر کرتے ہیں) کا مترادف ہے۔ آرامی لفظ گلگتا کے معنی "کھوپڑی" ہیں اور یہ اس پہاڑی کا نام ہے جس کی شکل کھوپڑی سے ملتی جلتی تھی اور جہاں مسیح کو "صلیب پر چڑھایا گیا تھا۔" لاطینی میں اس کا ترجمہ Calvaria، جو انگریزی میں Calvary بن گیا، کیا گیا ہے۔

-48 موژیسک(Mozhaisk): بارودینو کے قریب روسی قصبہ۔ ماسکو کے مغرب میں واقع ہے۔

-49 مورچہ: یہاں تمام انگریزی تراجم میں لفظ Redoubt ("ایک الگ تھلگ اور محفوظ جگہ جس میں فوجی سپاہی چھپ سکتے یا پسپا ہو کر واپس آ سکتے ہیں") استعمال ہوا ہے۔ چونکہ یہ لفظ یورپ کی اکثر زبانوں (فرانسیسی، اطالوی، لاطینی وغیرہ) میں مختلف شکلوں میں استعمال ہوتا ہے، اس لیے ہو سکتا ہے کہ روسی میں بھی موجود ہو۔ مولوی عبدالحق کی ڈکشنری میں اس کا ترجمہ "گڑگچ" یا "مورچہ" اور فیلن کی ڈکشنری میں "رن گڑھ، مورچہ" یا "سد قلعہ" دیا گیا ہے۔ لفظ کا پورا مفہوم کسی میں بھی موجود نہیں۔ "مورچہ" عام فہم ہے، اس لیے میں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

-50 بارودینو (Borodino) یا صحیح تر برودینو (روسی میں اگر وہ O اکٹھے ہو جائیں تو عام طور پر پہلا O الف یا زبر کی آواز دیتا ہے): ماسکو اور سمولنسک کے مابین ایک قصبہ۔

-51 خاکہ: بارودینو کا یہ خاکہ یا نقشہ طالسطائی نے خود بنایا تھا۔ وہ ستمبر 1867 میں دو دن اس علاقے میں مقیم رہا۔ اس نے ہر جگہ دیکھی بھالی اور ان کسانوں سے، جو اس زمانے کو یاد کر سکتے تھے، باتیں کیں۔ اس نے دستیاب وسائل کا بھی بغور مطالعہ کیا اور پھر یہ خاکہ ترتیب دیا۔ بارودینو سے اس نے اپنی بیوی کے نام ایک خط تحریر کیا اور اس میں لکھا: ''میں بارودینو کی لڑائی جس طرح بیان کروں گا، کسی نے اسے اس طرح بیان نہیں کیا۔'' (ماڈ)

-52 پونیاتوسکی (Poniatowski): نپولین کی فوج کا ایک پولستانی جرنیل۔

-53 یواروف (Uvarov): ایک روسی جرنیل۔

-54 گورکی: یہ گورکی چھوٹا سا گاؤں ہے اور انیسویں صدی میں بھی گورکی ہی کہلاتا تھا۔ مشہور گورکی موجودہ روس کا دوسرا بڑا شہر ہے اور ماسکو کے مشرق میں دریائے وولگا اور اوکا کے سنگم پر واقع ہے۔ انیسویں صدی میں اس کا نام نژنی نوگورد (Nizhnny Novgorod) تھا۔ کمیونسٹوں نے اسے گورکی بنادیا۔ اب پھر اس کا اصل نام بحال کر دیا گیا ہے۔

-55 آئبیریائی مادرِ خداوند: حضرت مریمؑ کا ایقونہ۔ آئبیریا روسی علاقے قفقاز (کاکیشیا) کا قدیم خطہ ہے۔

-56 جرمن زیادہ تر پروٹسٹنٹ ہیں، اس لیے وہ روسی طرز کی عبادت میں شریک نہیں ہو سکتے تھے۔

-57 مارین (S.N. Marin): مارین الیکساندر اول کا ایڈی کانگ اور کوتوزوف کا معاصر تھا۔ اس کی ادبی شہرت کا سبب یہ تھا کہ وہ پیروڈی اور مزاحیہ نظمیں لکھتا تھا۔ جی۔ وی۔ گیراکوف فوج میں کپتان، عسکری سکول میں استاد اور حب الوطنی کے موضوع پر متعدد انتہائی گھٹیا کتابوں کا مصنف تھا۔ اس کا بہت مذاق اڑایا جاتا تھا۔ مارین نے اس کے متعلق جو نظم لکھی تھی، وہ ایک قسم کی پیشین گوئی تھی:

تم ہمیشہ لکھتے رہو گے،
اپنے قارئین کو بور کرتے رہو گے
ان کا دم گھٹ جائے گا (مگر تم باز نہیں آؤ گے)۔
تم کورکو لیکچر پلاتے رہتے ہو۔
ان پر حکم چلاتے رہتے ہو۔
تم رہو گے کیپٹن کے کیپٹن ہی۔ (ماڈ)

-58 اندھیرے میں روشنی کی کرن تھی: یہاں تمو خن لفظوں کے ساتھ شعبدہ بازی کر رہا ہے۔ روسی میں روشنی کو Svet کہتے ہیں جب کہ کوتوزوف کے خطاب ہز سیرین ہائی نس کے لیے لفظ Svetleyshiy (most serene) استعمال ہوتا ہے۔ (ماڈ)

-59 کلاؤس وِٹس (Karl von Clausewitz): (1780 تا 1831): نامور عسکری نظریہ ساز اور مورخ۔ (اس نے

1812 کی جنگ کے بارے میں ایک کتاب بھی تحریر کی تھی۔) وہ پرشیا کا جرنیل تھا، لیکن اب اس نے روس میں ملازمت اختیار کر لی تھی۔

60- ویسٹ فالیا (West Phalia: جرمن West Fallen): سابقہ جرمن ریاست پرشیا کا صوبہ۔

61- جنگ کا مقصد قتل ہے: ماڈ کا خیال ہے کہ پرنس آندرے نے اس باب میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، وہ مہم کے مقاصد سے لگا نہیں کھاتے، بلکہ وہ طالسطائی کے اپنے خیالات کے زیادہ قریب ہیں۔ طالسطائی نے بعد کے سالوں میں جنگ کی جو مطلق مذمت کی، یہ اس کا پیش خیمہ ہیں۔

62- سلامانکا: ہسپانیہ کا صوبہ اور شہر۔ یہاں 10 جولائی 1812 (موجودہ کیلنڈر) کو انگریز جرنیل ڈیوک آف وِلنگٹن نے انگریزی، پرتگالی اور ہسپانوی افواج کی معیت میں فرانسیسی کمانڈر مارشل مارغ موں کو شکست دی تھی۔

63- امپراطورہ کا تحفہ: اس واقعے کی خود دَبوسے کی یادداشتوں سے تصدیق ہو جاتی ہے لیکن طالسطائی نے اسے جس انداز سے پیش کیا ہے، وہ طنزیہ ہی نہیں بلکہ اس میں کچھ زیادتی کا عنصر بھی شامل ہے۔ طالسطائی کا زور اس بات پر ہے کہ نپولین جنگ کے بارے میں بے چینی محسوس کر رہا تھا اور یہ ٹھیک بھی ہے (اس کا نسوار کی ڈبیا منگوانا اس کی علامت ہے)، تاہم بعض باتیں جس طرح بڑھا چڑھا کر پیش کی گئی ہیں (مثلاً ''دَبوسے نے 'درباری پھرتی' سے سرپوش ہٹا دیا ''ہر اطالوی کی طرح نپولین میں بھی یہ خداداد ملکہ موجود تھا''۔ الخ ''تمام لوگ پنجوں کے بل چلتے باہر نکل گئے''۔ اس آخری دعویٰ کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں۔ نپولین نے کبھی یہ نہیں چاہا تھا کہ اس کے افسر پنجوں کے بل چل کر اس کے حضور آئیں یا باہر جائیں)، انھوں نے اس سارے منظر کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ (ماڈ)

64- پوپ سکسٹس چہارم (1414 تا 1484)۔ پوپ سکسٹس (Sixtus) کے نام سے موسوم ہوا، اطالوی میں اسے سستین (Sistine) کہا جاتا ہے۔ پوپ سکسٹس چہارم آرٹ کا بہت دلدادہ تھا۔ اس کے زمانے میں روم کا مشہور ترین گرجا (Sistine Chapel)، جس کی چھت اور دیواروں پر مائیکل انجلو نے تصاویر بنائی تھی، تعمیر ہوا۔ لیکن اس کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ وہ بہت ''اقربا پرور'' تھا۔ اس نے اپنے بھتیجے کو، جو بعد میں جولیس دوم کے نام سے پوپ بنا، جائز و ناجائز طریقے سے آگے بڑھانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔ ''اقربا پروری'' کے لیے یورپی زبانوں کا لفظ (nepotisma = بھانجوں، بھتیجوں کی طرفداری کرنا) (اطالوی) neptisme (فرانسیسی) اور nepostism (انگریزی) اس کی اس روش کے باعث معرض وجود میں آیا۔ طالسطائی نے متن میں حضرت مریم کی جس تصویر کا ذکر کیا ہے، اس کا نام Sistine Madonna (میڈونا، حضرت مریم کو کہتے ہیں) ہے اور اسی پوپ کی فرمائش پر بنی تھی۔

65- فریڈلانٹ: (Friedland) کسی زمانے میں یہ مقام پرشیا (جرمنی) میں شامل تھا، آج کل یہ روس کے قبضے میں ہے اور اس کا نام پراودنسک ہے۔ یہاں 14 جون 1807 کو نپولین کی سپاہ اور روسی فوج کے، جس کی کمان بے نگ سین کر رہا تھا، لڑائی لڑی گئی۔ روس ہار گیا اور یوں معاہدۂ ٹلزٹ کی راہ ہموار ہو گئی۔

66- ڈیوک آف ایلچانگاں: فرانسیسی مارشل (1769 تا 1815): اس کا نام Michel Ney تھا۔ ماسکو سے پسپائی کے بعد فرانسیسی فوج کے عقبی دستوں کی کمان اس کے پاس تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کی قیادت کی وجہ سے فرانسیسی سپاہ

مکمل تباہی سے بچ گئی۔ جب نپولین کے واٹرلو میں شکست کھانے کے بعد فرانس میں بادشاہت دوبارہ بحال ہوئی، اس پر غداری کا الزام لگایا گیا اور اسے گولی سے ہلاک کر دیا گیا۔

-67 پرنس پونیاتوسکی (Prince Poniatowski): نپولین کا ایک پولستانی کمانڈر

-68 وائسرائے: موغا یعنی شاہ نیپلز۔ موغا (Murat) اور موغاں (Morand) دو مختلف اشخاص ہیں۔

-69 گاؤں: بارودینو۔

-70 چھ ستمبر 1812: نپولین کی یہ تاریخ نئے کیلنڈر کے مطابق ہے۔ روسی پرانے کیلنڈر سے کام لیتے تھے، اس کے لیے اس روز اگست کی پچیس 25 تاریخ تھی۔

-71 پیٹر اعظم (روسی میں پیوتر اعظم): (1672۔1725): روسی زار (1682 تا 1725): روس کا عظیم ترین حکمران تصور کیا جاتا ہے اور اسی کے عہد میں روس یورپ کے ایک عظیم ملک کے طور پر منصۂ شہود پر آیا۔ اس نے ایک طرف ترکوں اور ایرانیوں سے پنجہ آزمائی کی اور دوسری طرف پولتاوا کے مقام پر سویڈن کی افواج کو شکست فاش دی، یوں اس نے روس کی سرحدیں بحیرہ بالٹک سے بحیرہ کیسپین تک پہنچا دیں۔ ہر روسی حکومت ایران یا پاکستان کے ذریعے گرم پانیوں تک پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارتی رہی ہے، اس کا خواب سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا۔ ''روسی تاریخ'' کا باب بھی دیکھیں۔

-72 سینٹ بارتھومولیو: حضرت عیسیٰؑ نے جن بارہ اشخاص کو اپنے حواری مقرر کیا تھا، ان میں سے ایک سینٹ بارتھومولیو (عبرانی نام برتلمائی) تھا۔ (نیا عہد نامہ، مرقس 18:3)۔ اسے انگریزی میں نیتھائیل بھی کہا جاتا ہے۔ اس کا یوم 24 اگست کو منایا جاتا ہے۔

73و74- چارلس نہم (فرانسیسی شاغل) اور قتل عام: چارلس نہم 1550 میں پیدا ہوا۔ وہ صرف دس سال کی عمر میں فرانس کا بادشاہ بن گیا لیکن اصل اختیارات اس کی ماں کے پاس تھے۔ ماں بیٹے دونوں کو پروٹسٹنٹ (فرانس میں اکثریت رومن کیتھولک لوگوں کی تھی اور اب بھی ہے) مذہب کے پیروکاروں (جنھیں فرانسیسی میں Huguenot کہا جاتا تھا) سے اللہ واسطے کا بیر تھا۔ 24 اگست 1572 کو جب سینٹ بارتھومولیو کا یوم منایا جا رہا تھا، ان کے ایما پر فوجیوں اور غصیلے لوگوں کے ہجوم نے پیرس میں تین ہزار پروٹسٹنٹوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ صوبوں میں جو لوگ ہلاک ہوئے، وہ ان کے علاوہ تھے۔ خود چارلس نہم تو دو سال بعد مر گیا لیکن یہ داغ اس کی پیشانی سے کبھی دھل نہ سکا۔

-75 پنچ (Punch): ایک قسم کا مشروب، جو عام طور پر گرم پانی، چینی، لیموں اور مختلف قسم کے مصالحوں کی آمیزش سے بنایا جاتا ہے۔

-76 لودی وغیرہ: نپولین نے شمالی اطالیہ میں آسٹروی فوجوں کو 1796 میں لودی اور 1800 میں مارینگو کے مقام پر شکست دی تھی۔ 1806 میں اس نے جرمن قصبے جینا میں پرشیا کی دھنائی کی اور آسٹریا کے خلاف اپنی آخری لڑائی میں، جو واگرام (آسٹروی قصبہ) کے مقام پر ہوئی، فتح حاصل کی تھی۔ آرکولا کی لڑائی بھی فرانس اور آسٹریا کے مابین ہوئی تھی اور یہاں 1797 میں نپولین کامیاب رہا تھا۔

77- tableaux vivants: یہ tableau vivant کی جمع ہے۔ فرانسیسی میں اس کا لفظی مفہوم "زندہ تصویر" ہے۔ یہ دراصل ایک قسم کا مختصر ڈرامہ ہوتا ہے۔ اس میں کردار رنگا رنگ کپڑے پہن کر سٹیج پر آتے ہیں، وہ کرتے کراتے کچھ نہیں، بس تصویر کی طرح چپ چاپ ساکن کھڑے رہتے ہیں۔

78- پیوتر ایوانووچ: یعنی پرنس باگ راتیاں

79الف۔ ڈیوک آف ورٹم برگ: زار پاول اول کا برادر نسبتی اور زار الیکساندر کا ماموں۔ ورٹم برگ (Wurtemberg) جنوب مغربی جرمنی میں واقع ہے۔ یہاں کی ڈچی کا آغاز 1495 میں ہوا۔ 1806 میں یہاں بادشاہ قائم ہوئی اور وہ 1918 تک قائم رہی۔ اب یہ جرمن ریاست باڈن ورٹم برگ کا حصہ ہے۔

79ب۔ دختوروف: انکسار پسند روسی جرنیل۔ طالسطائی نے اپنے اس ناول کی کتاب چہارم کے حصہ دوم (باب 15) میں اس کی بہت تعریف کی ہے۔

80- موغا کو قیدی بنالیا گیا ہے: یہ خبر غلط نکلی، قیدی موغا نہیں بلکہ جنرل بونامی (Bonnamy) بنایا گیا تھا۔ اس نے جب ایک روسی سپاہی کی سنگین اپنی چھاتی پر دیکھی، وہ چلا کر بولا: "میں بادشاہ ہوں۔" اسے صحیح سلامت کوتوزوف کے پاس پہنچا دیا گیا۔ غلط خبر ایک میجر نے، جو جبلی طور پر حراست کی خبر گلا پھاڑ پھاڑ کر سنا رہا تھا، پھیلائی تھی۔ (ماڈ)

81- سینٹ ہیلینا (St Helena): ایک جزیرہ۔ افریقی ممالک انگولا اور نیمیبیا کی سرحد کے تقریباً سامنے جنوبی بحر اوقیانوس میں واقع ہے۔ کل رقبہ سینتالیس مربع میل ہے۔ نپولین نے اپنی زندگی کے آخری چھ سال اسی جزیرے پر انگریزوں کی حراست میں گزارے تھے۔ یہ جزیرہ ابھی تک برطانیہ کے قبضے میں ہے۔

82- کانگرس: نپولین کا اشارہ کانگرس آف ویانا کی طرف ہے۔ 1814 میں نپولین کو انگریزوں اور اس کے اتحادیوں نے ہسپانیہ میں پے در پے شکستوں سے دوچار کیا اور وہ فرانس کی طرف واپس آیا تو پیرس کے لوگوں نے بھی اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ اتحادیوں کے اصرار پر اسے اطالیہ کے جزیرے ایلبا جلاوطن کر دیا گیا۔ اس کی اسی جلاوطنی کے دوران میں یورپی ممالک کے نمائندوں کی ویانا میں کانگرس منعقد ہوئی۔ اس کانگرس میں متعدد چھوٹے چھوٹے ممالک کے علاوہ آسٹریا، پرشیا، برطانیہ، فرانس اور یورپ کے نمائندے شریک ہوئے۔ روس کی نمائندگی زار الیکساندر نے بذات خود کی۔ یہ کانگرس ستمبر 1814 سے جون 1815 تک جاری رہی اور اس میں مختلف ممالک کے مختلف علاقوں پر حقوق تسلیم کر لیے گئے۔

83- میثاق مقدس (Holy Alliance): روس کے زار الیکساندر نے اس نام کا ایک معاہدہ 26 ستمبر 1815 کو تیار کیا تھا۔ اس پر ابتدا میں آسٹریا کے امپراطور فرانسس اول اور پرشیا کے شاہ فریڈرک ولیم سوم نے دستخط کیے۔ انگلستان کے شاہ جارج چہارم، ترکی کے سلطان اور پوپ نے تو اسے ماننے سے انکار کر دیا لیکن یورپ کے باقی ممالک کے حکمرانوں نے بھی بعد میں اس پر دستخط کر دیے۔ اس معاہدے کے تحت یورپی حکمرانوں نے اپنے تعلقات "عیسائیت کے اصولوں" کے مطابق استوار کرنا تھے۔ مورخین کے مطابق یہ معاہدہ مبہم اور سرے سے بیکار تھا۔ بعد میں انگریزوں اور ان کے تین اتحادیوں (روس، آسٹریا اور پرشیا) نے نپولین کی واپسی کو روکنے کے لیے "چار فریقی معاہدہ" (Quadru ple

(Alliance) (بیس نومبر 1815) کیا اور یوں میثاق مقدس کو بالکل بیکار بنا دیا۔

84- بواریائی وغیرہ: بواریا بویریا کے باشندے بواریائی، ورٹم برگی کے ورٹم برگی اور میکلن برگ کے میکلن برگ تھے۔ یہ اس زمانے میں آزاد ریاستیں تھیں، آج کل جرمنی میں شامل ہیں۔

85- نیپلی: نیپلز کے باشندے۔ نیپلز 1270 سے 1860 تک آزاد مملکت تھا۔ آج کل یہ اطالیہ کا حصہ ہے۔ نیپلز اطالیہ کا خاصا بڑا شہر اور بندرگاہ بھی ہے۔

بلجی: بلجیم کا باشندہ۔ بلجیم فرانس کے شمال میں چھوٹا سا ملک ہے۔

رائن لینڈ: (مغربی) جرمن کا تاریخی خطہ۔ یورپ کی بعض بہترین (انگوری) شرابیں یہیں بنتی ہیں۔ جرمنی کے بڑے بڑے کارخانے بھی، خاص طور پر فولاد کے، اسی علاقے میں ہیں۔

پیدمونتی: پیدمونت (Piedmont): شمالی مغربی اطالیہ کا ایک خطہ۔

سوستانی: سوئٹزرلینڈ کا باشندہ۔ جنیوی: سوئٹزرلینڈ کے شہر جنیوا کا باسی۔ جنیوا بھی ایک زمانے میں خودمختار ریاست تھی۔

تسکانی: اطالیہ کے علاقے تسکنی (Tuscany) کا، جسے اطالوی میں تسکانا (Toscana) لکھا جاتا ہے، باشندہ ہے۔ یہاں 1569 سے 1860 سے آزاد ڈچی قائم رہی۔ اس کے مشہورترین شہر فلورنس اور پیسا (یہاں خمیدہ مینار واقع ہے) ہیں۔ اطالیہ کے اتحاد کے بعد یہاں کی زبان سارے ملک کے لیے ذریعۂ تعلیم اور سرکاری زبان قرار پائی۔

بریمن۔ ہیمبرگ: جرمنی کی بندرگاہیں۔ یہاں بھی ڈچیاں قائم تھیں۔

کالیش (Kalisch): وسطی پولینڈ کا شہر۔ آج کل اسے Kalisz لکھا جاتا ہے۔

حصہ سوم

1- مغالطہ (sophism): منطق کی ایک اصطلاح (اردو میں اسے سفسطہ بھی لکھا جاتا ہے): وہ استدلال، جو بظاہر تو بہت خوش نما اور معقول معلوم ہوتا ہے لیکن غور سے دیکھا جائے بالکل بودا اور غلط نظر آئے گا۔

2- اخیلیوس (Achilles): اخیلیوس ہومر کی مشہور نظم Iliad کا نیم داستانی کردار ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کا عظیم ترین لڑاکا سپاہی تھا اور کوئی شخص بھی اسے شکست نہیں دے سکتا تھا۔ اس پر نہ تلوار اثر کرتی تھی اور نہ تیر۔ جب وہ ابھی بچہ ہی تھا کہ اس کی ماں Thetis نے، جو سمندری پری تھی، خواب میں دیکھا کہ اس کا بیٹا لڑائی میں مارا جائے گا۔ چنانچہ وہ اسے نہلانے دریا Styx پر، جس کے متعلق یہ مشہور تھا کہ اس میں جو نہایا، سوامر ہوا، لے گئی۔ اس نے اسے دریا میں غوطہ دیا لیکن اس کی ایڑی، جسے اس نے ہاتھ سے پکڑ رکھا تھا، خشک رہ گئی۔ اس نے ٹرائے کی لڑائی میں اپنے سب سے بڑے مخالف جنگجو ہیکٹر (Hector) کو بھی ہلاک کر دیا لیکن پیرس کے ہاتھوں اپنی اسی خشک ایڑی پر، جو اس کے جسم کا واحد فانی حصہ تھا، مسموم تیر لگنے سے مارا گیا۔

3- بیریزینا (Berezina): روس کا ایک دریا۔ کل لمبائی 380 میل۔

4- فلی (Fili): ایک گاؤں۔ اس زمانے میں یہ ماسکو سے چار میل دور تھا۔

5- strategy اور tactics: جنگی چالیں۔ ان دونوں الفاظ کا مطلب یہ ہے: میدان جنگ میں فوج کو کہاں کہاں متعین کیا جائے اور کون کون سے ہتھیار کہاں کہاں فراہم کیے جائیں تاکہ حریف پر غلبہ حاصل کیا جائے۔ سٹرٹیجی کمانڈر انچیف یا اس کا سٹاف بناتا ہے اور ساری فوج کے لیے ہوتی ہے۔ tactics مقامی کمانڈر مقامی حالات کے مطابق اختیار کرتا ہے۔

6- یرمالوف (Yermolov): روسی فوج کا ایک جرنیل۔

7- ساراگوسا (Saragossa): ہسپانیہ کے اسی نام کے صوبے کا صدر کا مقام۔ ہسپانوی زبان میں اس کا نام ضراغوضا (Zaragoza) ہے۔ آٹھویں سے بارھویں صدی تک یہ شہر اور صوبہ مسلمانوں کی تحویل میں رہے۔ عیسائیوں نے سب سے پہلے یہی خطہ مسلمانوں سے چھینا تھا اور یہیں جدید ہسپانیہ کی بنیاد رکھی تھی۔ 08-1809 کی جنگ کے دوران میں فرانسیسیوں نے ''اس شہر کا دو ماہ تک محاصرہ کیے رکھا اور انھیں اس پر قبضہ کرنے کے لیے ایک ایک مکان میں لڑنا پڑا۔'' (ماڈ)

8- کنجشک پہاڑیاں: (Sparrow Hills) ماسکو کے قریب ایک پہاڑی مقام۔ اسی طرح تین پربت (تین پہاڑیاں) بھی ایک مقام کا نام ہے۔

9- فرانسیسی میں اشعار: ماڈ نے اس کے بعض اشعار اپنے حواشی میں نقل کیے ہیں:

Je suis ne Tartare,	میں پیدا تاتار ہوا تھا
Je voulais elre Romain	میں بننا رومی چاہتا تھا
Les Francais m' a pelerent barabar,	فرانسیسی مجھے وحشی کہتے ہیں
Les Russes — Georges Dandin	روسی — یوغیٔ داں دیں

نوٹ: یوغیٔ داں دیں مشہور فرانسیسی ڈرامہ نگار مولیئر کے اسی نام کے ڈرامے کا مزاحیہ کردار ہے۔

10- سوسائٹی آف جیزس (Society of Jesus): رومن کیتھولک مذہب کا ایک فرقہ۔ اسے ایک ہسپانوی پادری سینٹ اگناشس لویئلا (St Ignatius Loyola) نے 1534 میں قائم کیا تھا۔ اس کا بنیادی مقصد تحریک اصلاح مذہب کی، جو مارٹن لوتھر نے شروع کی تھی، مخالفت کرنا اور رومن کیتھولک مسلک کی حمایت کرنا تھا۔ اس فرقے کو عسکری خطوط پر استوار کیا گیا تھا اور اس نے نئی دنیا اور برصغیر پاک و ہند میں عیسائیت کی تبلیغ کے سلسلے میں بہت کام کیا۔ رفتہ رفتہ یہ فرقہ اتنی طاقت حاصل کر گیا کہ مختلف حکومتوں کے لیے خطرے کا باعث بن گیا تا آنکہ پوپ کلیمنٹ چہاردہم نے 1773 میں اس پر پابندی لگا دی لیکن 1814 میں اسے دوبارہ کام کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ پوپ کے پابندی لگانے کے باوجود یہ فرقہ روس اور پرشیا میں باقاعدہ کام کرتا رہا اور کیتھرین اعظم تو اس کی فعال محافظ بن گئی۔ تاہم 1813 میں اسے ماسکو اور پیٹرزبرگ سے نکال دیا گیا اور 1820 میں سارے روس سے اس کا

قلع قمع کر دیا گیا۔
اس فرقے کے ارکان کو جزوئیٹ (Jesuit) یا یسوعی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ تاویلوں کے بڑے ماہر ہوتے تھے۔ چنانچہ تاویل باز یا ریاکار شخص بھی جزوئیٹ کہلاتا ہے۔

-11 Un Jesuite a robe courte (Jesuit in walking dress): (لفظی ترجمہ: چلتے پھرتے لباس میں یسوعی) یعنی وہ یسوعی فرقے کا باقاعدہ پادری نہیں تھا، لیکن اس کی تعلیمات کی تبلیغ ضرور کرتا تھا۔ عیسائیت میں رسمی مذہبی تقریب میں کسی شخص کو پادری بنایا جاتا ہے۔ تاہم وہ شخص جو تبلیغ اور دیگر مذہبی امور کا کام باقاعدہ پادری بنے بغیر کرتا ہے، اسے Layman (بے قاعدہ مذہبی رہنما) کہا جاتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موسویوالغ اسی قسم کا رہنما تھا کیونکہ اس کا لباس پادریوں کا نہیں بلکہ عام لوگوں کا (چلتا پھرتا لباس) تھا۔

-12 قلبِ مقدس: (1) رومن کیتھولک مذہب میں حضرت عیسیٰ کے دل کو قلبِ مقدس (Sacred Heart) تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے ان کی قربانی کی علامت قرار دیا جاتا ہے اور اس سے نیاز مندی جتلائی جاتی ہے۔ (2) بعض اوقات قلبِ مقدس خود حضرت عیسیٰ کی علامت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔

-13 abbe: فرانس میں پہلے خانقاہ کے سربراہ کو abbe (ایبے) کہا جاتا تھا لیکن اب یہ لفظ بطور لقب ہر پادری کے لیے استعمال ہوتا ہے اور یہاں بھی اس سے مراد پادری ہی ہے۔

-14 مقدس باپ (Holy Father): پوپ

-15 واسلچی کوف (Vasilchikov) و پلاتوف (Platov): دو فوجی افسر۔

-16 وارانیژ (Vornezh): ماسکو کے جنوب میں صوبہ ہی نہیں، بلکہ شہر بھی ہے۔ نکولائی رستوف اور پرنس ماریا کا عشق یہیں پروان چڑھتا ہے۔

-17 آرچ بشپ اوگستن: اپنے زمانے کے مشہور مبلغ اے۔ وی۔ ونوگ رادسکی (Vinogradsky) (1766 تا 1818) کا راہبانہ نام۔

-18 ہوف مینز ڈراپس (Hoffman's drops): ایک دوا جو کسی زمانے میں روس میں بہت استعمال ہوتی تھی۔ اس میں چالیس فیصد ایتھر سلفوری کس (ether sul phuricus: ایک قسم کی بے رنگ سیال شے) اور ساٹھ فیصد الکحل ہوتی ہے۔ (ماؤ)

-19 گوبلاں پردے: یہ پردے جنھیں انگریزی میں tapestry کہتے ہیں، بہت بھاری ہوتے تھے اور ان پر طرح طرح کی تصاویر یا تو چسپاں کر دی جاتی تھیں یا پھر بنائی کے دوران میں بُن دی جاتی تھیں۔ گوبلاں (Gobelin) پیرس کا ایک کارخانہ تھا اور اس کے پردے بہت مشہور ہوئے تھے۔ عام طور پر ان پردوں سے دیواریں ڈھانپی جاتی تھیں۔ انگلستان کی کاؤنٹی ڈاربی شائر کے دیہی محل ہارڈوک ہال (Hardwick Hall) کی دیواروں پر یہ پردے اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ پردے اس محل کی اولین مالکہ Boss of Hardoick نے اپنے ہاتھوں سے بنائے اور اس پر نقش و نگار کشید کیے تھے۔

-20 آرڈر (Order): چند افراد کا گروہ، جنھیں بادشاہ وقت یا حکومت غیر معمولی خدمات سرانجام دینے پر خاص اعزازی سلسلے میں داخل کر لیتی ہے۔ ان افراد کو خاص قسم کا امتیازی نشان (insignia) پہننے کی اجازت ہوتی ہے۔ برطانیہ کا Order of Merit (O.M.) سب سے زیادہ مشہور ہے۔ ایک وقت میں صرف چوبیس اشخاص اس کے ارکان رہ سکتے ہیں۔

-21 گرہ باندھ دی: چیزوں کو یاد رکھنے کے لیے کسی کپڑے میں گانٹھ باندھنے کا رواج کم از کم پنجاب کے دیہات میں اب بھی موجود ہے۔

-22 خداوند کے ڈھنگ: کاؤنٹس کے ذہن میں شادی کے متعلق روسی کلیسا کے احکام در آئے ہیں۔ اگر پرنس آندرے کا انتقال ہو جاتا ہے، پھر نکولائی رستوف کا راستہ صاف ہو جاتا ہے اور وہ پرنسس ماریا بلکونسکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اوپر حصہ دوم کا نوٹ نمبر 30 دیکھیں۔

-23 Patriarch (بطریق، اسقف): ایسٹرن آرتھوڈوکس چرچ میں سکندریہ، انطاکیہ، قسطنطنیہ، یروشلم، ماسکو، سربیا اور رومانیہ کے بشپ اسقف کہلاتے ہیں۔ Patriarch's Pond ماسکو کے ایک محلے کا نام ہے۔

-24 بویار Boyar: روسی زار طبقۂ اشراف کے جن افراد کو اپنے معاونین مقرر کرتے تھے، انھیں بویار (روسی Boyarin) کہتے تھے۔ روسی میں یہ لفظ قدیم ترکی زبان کے لفظ boila (خطاب) سے بنایا گیا تھا۔ ماڈ کا کہنا ہے کہ یہ لوگ پیٹرز اعظم کے زمانے میں اپنے اس استحقاق سے محروم ہو گئے تھے، چنانچہ یہ بھی لفظ متروک ہو گیا تھا لیکن نپولین کو اس کا کوئی علم نہیں تھا۔ یوں اس کا بویاروں کو بلانے کا حکم عجیب لگتا ہے۔

-25 نذر آتش کر دیتا ہے: روسی عام طور پر شہد کی مکھیوں کے چھتے درختوں کے تنوں کو کھوکھلا کر کے ان کے اندر بناتے تھے اور جب ان کی صفائی کرنا ہوتی تھی تو پرانے چھتے کو جلا دیا جاتا تھا۔ (ماڈ)

-26 ریڈ سکوائر (Red Square): ماسکو کا مشہور چوک۔ یہ شہر کے عین وسط میں واقع ہے اور آدھ میل سے زیادہ لمبا ہے۔ کریملن اسی چوک میں واقع ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چوک کا نام زاروں کے عہد سے چلا آ رہا ہے، کمیونسٹوں کی اختراع نہیں۔

27 بازار: مغربی زبانوں میں بازار کے معانی ''شاپنگ ایریا'' ہیں جو مختلف گلیوں اور سڑکوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ متن سے معلوم ہوتا ہے کہ ماسکو کا کوئی خاص شاپنگ ایریا ''بازار'' کے نام سے موسوم تھا۔

-28 سر منڈے: جن قیدیوں کو جیل سے رہا کیا جاتا تھا، ان کے سر مونڈ دیے جاتے تھے۔ (ماڈ)

-29 یارڈ پورٹر: ایک قسم کا دربان۔

-30 سفید نوٹ: اس زمانے میں کاغذی روبل کی قیمت روپہلی روبل سے کم ہوتی تھی۔ ''ایک روپہلی روبل ساڑھے تین کاغذی روبلوں کے برابر ہوتا تھا۔'' (ماڈ)

-31 چائنا ٹاؤن (روسی: Kitay-gorod): ماسکو کا محلّہ تھا۔ (ماڈ)

-32 ولادی میر (Vladimir): ایک قصبہ۔ ماسکو کے مشرق میں واقع ہے۔ ولادی میر (905-1015) روس کا پہلا

عیسائی حکمران تھا۔

-33 سینٹ نکولا یا نکولس (چوتھی صدی عیسوی کا باشندہ)۔ روس، ملاحوں اور بچوں کا محافظ سینٹ۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایشیائے کوچک کے قصبے مائرہ (Myra) کا بشپ تھا اور دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اس کے بعض تبرکات اطالیہ کی بندرگاہ باری کے سینٹ نکولا گرجے میں محفوظ ہیں۔ روایات کے مطابق اس نے تین غریب بچیوں کو سونے کے تحائف دیے تھے تاکہ وہ اپنے اپنے جہیز خرید سکیں۔ اس سے چھ دسمبر کو، جو اس کا یوم ضیافت ہے، تحائف دینے کی رسم چلی۔ اب یہ تحائف 25 دسمبر کو دیے جاتے ہیں۔ عیسائی کرسمس کے روز اپنے بچوں کو جو تحائف دیتے ہیں، ان کے متعلق وہ انھیں باور کراتے ہیں کہ یہ رات کو ایک نورانی داڑھی والے بزرگ چھوڑ گئے تھے۔ یہ بزرگ اصلاً یہی سینٹ نکولا ہے۔ امریکہ اور برطانیہ میں اسے Santa Claus کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ اس کی کوئی وضاحت نہیں کرتا۔ (میکملن انسائیکلوپیڈیا)

-34 (le Kremlin): ''طالسطائی ہمیں یہ بتانا چاہتا ہے کہ روس کے متعلق فرانسیسیوں کی معلومات ناقص اور سطحی تھیں۔ مثلاً یہاں وہ کہتا ہے کہ موغا کریملن کو، جس کی خشتی دیواریں 1367ء کو اٹھائی گئی تھیں، قلعہ تصور کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ قرون وسطیٰ میں یہ واقعی قلعے کا کام دیتا ہو لیکن اس کی ساخت کچھ اس قسم کی تھی کہ یہ توپ خانے کی گولہ باری کے خلاف مدافعت نہیں کر سکتا تھا۔ کتاب چہارم، حصہ دوم، باب نہم میں نپولین کو کریملن کا دفاع مضبوط بنانے کے سلسلے میں جو ہدایات دیتے دکھایا گیا ہے، اس کا ذکر بھی طنزیہ انداز سے کیا گیا ہے۔ 1812 میں کریملن کی فصیل محض ایک احاطے کا، جس کے اندر محلات، گرجے، عدالتیں اور سرکاری عمارتیں واقع تھیں، حصار کرتی تھی۔'' (ماڈ)

-35 پہلے بھی: L' russe Besuhof وغیرہ کا سارا قصہ، کتاب اول، باب 19 میں تفصیل سے آ چکا ہے۔

-36 ساتویں ستمبر کا واقعہ: بارودینو کی لڑائی: اس زمانے میں روس میں مروج تقویم کے مطابق بارودینو کی لڑائی 26 اگست کو ہوئی تھی۔ مغربی تقویم (جو اب ساری دنیا میں رائج ہے) کے مطابق اس روز ستمبر کی سات تاریخ تھی، اس لیے غام بال اسے 7 ستمبر کا واقعہ قرار دیتا ہے۔

-37 Chevalier of Legion de Honneur: لیجن ڈآنر کے سلسلۂ اعزازات کے لیے کتاب سوم کا حصہ اول کا حاشیہ نمبر 18 دیکھیں۔

-38 کواس (Kvass): بیئر سے ملتا جلتا روسی مشروب۔ رائی یا جو سے بنتا ہے۔

-39 واگرام: یہ قصبہ آسٹریا کے دارالسلطنت ویانا کے شمال مشرق میں واقع ہے۔ یہاں فرانسیسیوں اور آسٹرویوں میں پانچ اور چھ جولائی 1809 کو لڑائی ہوئی تھی۔ نپولین نے آسٹروی فوجوں کو عبرت ناک شکست دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اس لڑائی میں جتنی توپیں استعمال ہوئیں، آج تک کسی لڑائی میں نہیں ہوئیں۔ (میکملن انسائیکلوپیڈیا۔ ایڈیشن 1988)

-40 لا مسکووا (La Moskowa): فرانسیسی بارودینو کو لا مسکووا کہتے تھے۔

-41 تالما وغیرہ: تالما (Talma) المیہ ڈرامے لکھتا تھا، دوشینوا (La Duchenois) ایکٹرس تھی، پوتیے (Potier) مزاحیہ اداکاری کرتا تھا اور سوغبوں (Sorbonne) پیرس کی مشہور یونیورسٹی ہے۔

42- مارکیز (marquise): مارکوئیس (کاؤنٹ اور ڈیوک کے مابین نوابی خطاب) کی بیوی یا بیوہ۔ انگریز اسے marchioness کہتے ہیں۔ کپتان نے مارکیز اور اس کی دختر کا جو واقعہ بیان کیا ہے، بعینہ وہی فرانسیسی ادیب موپساں کے ناول Bel-Ami کا موضوع ہے۔

43- (Sauer kraut) ساور کروٹ: ایک قسم کا گوبھی کا جرمن اچار۔ یہ گوبھی کے قتلے ان کے اپنے ہی پانی میں جوش دے کر اور خمیر اٹھا کر بنایا جاتا ہے۔

44- ''تروئستا (Troitsa): سرجی ایوو تروئتسکی (یا تثلیثی) خانقاہ۔ اسے سینٹ سرجی نے قائم کیا تھا۔ یہ ماسکو سے چوالیس میل دور مشرق میں واقع ہے۔ جس قصبے میں یہ واقع ہے، آج کل اس کا نام زگورسک (Zogorsk) ہے۔'' (ماڈ) (کتاب چہارم کے حصہ اول کا حاشیہ نمبر 2 بھی دیکھیں)

چوتھی کتاب

حصہ اول

1- دونوں امپراطوریں: امپراطورہ ماریا فیودرونا زار پاول اول کی بیوی اور زار الیکساندر اول کی والدہ تھی۔ امپراطورہ ایلساویتا الیکسیونا الیکساندر اول کی بیوی تھی۔ مؤخرالذکر جرمن ریاست ''باڈن کی شہزادی تھی اور اس نے شادی کے بعد اپنی روسی حب الوطنی کو پروان چڑھایا تھا۔'' (ماڈ)

2- سینٹ سرجی (انگریزی میں (St Sergius): (1314 تا 1392): روسی راہب۔ اس نے ماسکو کے قریب رادونیژ جنگل میں ایک مقام پر، جسے اب زگورسک کہتے ہیں، خانقاہ قائم کی تھی۔ یہ خانقاہ قلیل عرصے میں روسی کا روحانی اور مشنری مرکز بن گئی۔ اس سے قبل اکثر روسی خانقاہیں تاتاریوں نے اپنے حملوں سے اجاڑ دی تھیں۔ یوں سینٹ سرجی روس میں خانقاہی نظام کا احیا کنندہ قرار دیا جاتا ہے۔ (کتاب سوم کے حصہ سوم کا نوٹ نمبر 44 دیکھیں)

3- وجع الصدر (angina of the Chest = angina pectoris): سینے اور بائیں بازو کا شدید درد جو قلب کی شریانوں میں خون کی پوری مقدار نہ پہنچنے کے سبب ہوتا ہے۔ آج کل بائی پاس (bypass) کے ذریعے اس کا علاج ممکن ہو گیا ہے۔

4- آسٹروی پرچم: وٹ گین شٹائین تھا تو جرمن لیکن وہ روسی فوج میں شامل تھا۔ اس نے روس کے ایک مقام پیوتر پول میں فرانسیسی فوج کو، جس کی قیادت جنرل اوودی نات کر رہا تھا، شکست دی تھی اور فرانسیسیوں سے چند آسٹروی پرچم چھین لیے تھے۔ یہ لڑائی اٹھارہ اور انیس جون 1812 کو ہوئی تھی، اس وقت تک آسٹروی روسیوں کا ساتھ چھوڑ کر فرانسیسیوں سے مل چکے تھے۔

5- ہوشعنا: عبرانی لفظ ہے (انگریزی میں hosanna)۔ یورپی زبانوں میں یونانی اور لاطینی کی وساطت سے آیا۔

لفظی معنی ''ہمیں بچائیں'' ہیں۔ خدا اور مسیح کی حمد کے لیے بطور نعرہ استعمال ہوتا ہے۔

6- روسی داؤد کا فلاخن: جولیت (کتاب سوم حصہ اول حاشہ نمبر 82 دیکھیں) نے جب اسرائیلیوں کو للکارا، کوئی بھی اس کے مقابلے کے لیے نہ نکلا۔ آخر حضرت داؤد نے سے دو دو ہاتھ کرنے کی ٹھانی۔ ''اور اس نے اپنی لاٹھی اپنے ہاتھ میں لی۔ پانچ چکنے پتھر'... اپنے جھولے میں ڈالے۔'' اور اس کا فلاخن اس کے ہاتھ میں تھا... فلستی (جولیت) نے... داؤد کو دیکھا اور اسے ناچیز جانا کیونکہ وہ محض لڑکا تھا اور سرخ رو اور نازک چہرہ کا تھا... داؤد نے اس فلستی سے کہا کہ تو تلوار، بھالا اور برچھی لیے میرے پاس آتا ہے... خداوند تلوار اور بھالے کے ذریعے سے نہیں بچاتا اس لیے کہ جنگ تو خداوند کی ہے اور وہی تم کو ہمارے ہاتھ میں کر دے گا... اور داؤد نے اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے ایک پتھر لیا اور فلاخن میں رکھ کر اس فلستی کے ماتھے پر مارا اور وہ پتھر اس کے ماتھے کے اندر گھس گیا اور وہ زمین پر منہ کے بل گر پڑا۔ سو داؤد اس فلاخن اور ایک پتھر سے اس فلستی پر غالب آیا اور اس فلستی کو مارا اور قتل کیا۔'' حضرت داؤد کے پاس تلوار نہیں تھی۔ انھوں نے جولیت کی تلوار پکڑی، اسی سے اسے قتل کیا اور اس کا سر کاٹ ڈالا۔ (انجیل، نیا عہد نامہ، سیموئیل 1۔ باب 17)

7- تاتارینووا (نقشہ دیکھیں): اپنے ضخیم ناول میں طالستائی نے تاریخوں کی بہت کم غلطیاں کی ہیں اور ماڈ کے مطابق یہاں اس سے یہ غلطی سرزد ہوگئی ہے۔ کوتوزوف نے یہ رپورٹ دراصل 25 اگست کو بھیجی تھی اور اس میں باگ راتیان، تچکوف اور کوتائی سوف کی ہلاکت کی، جو اگلے روز لڑائی کے دوران میں ہوئی تھی، پیش بینی کی گئی تھی، طالستائی نے زار کے یوم پیدائش (12 دسمبر) کو اس کے نام دن (30 اگست) سے بھڑا دیا۔ پھر کاؤنٹ رستوپ چن کا مراسلہ، جس میں اس نے کوتوزوف کے خط کا جواب یکم اور دو ستمبر کی درمیانی شب کو ملا تھا۔ (باب نمبر 24، کتاب سوم، حصہ سوم)، ذکر کیا ہے، 4 ستمبر تک پیٹرز برگ نہیں پہنچ سکتا تھا۔

8- یاروسلاول (Yaroslavl): ماسکو کے تقریباً شمال مشرق میں ایک روسی شہر۔ بہت قدیم تجارتی اور (اٹھارویں صدی سے) پارچہ بانی کا مرکز چلا آ رہا ہے۔ ماسکو سے فرار کے بعد رستوفوں نے یہیں قیام کرنا اور یہیں پرنس آندرے نے داعیٔ اجل کو لبیک کہنا ہے۔ پرنسس ماریا نے وارانیژ سے پانچ سو میل کا فاصلہ (وہ براستہ ماسکو نہیں جا سکے گی) طے کر کے یہاں پہنچنا ہے۔

9- ڈیانا (Diana): عصمت و عفت اور شکار کی حسین و جمیل کنواری رومی دیوی۔ اسے ماہتاب کی دیوی بھی کہا جاتا تھا۔

10- وسط ستمبر: وارانیژ ماسکو کے جنوب میں 175 میل دور ہے۔ وہاں تک خبر پہنچتے پہنچتے تین ہفتے لگ ہی گئے ہوں گے۔ آج سے ساٹھ سال قبل بھی ماڈ نے ان سڑکوں کی حالت ناگفتہ بہ بتائی تھی۔ ''وارانیژ کی سڑکیں آج بھی غیر معمولی طور پر خستہ و خراب ہیں۔''

11- وہ اب پورا ہو چکا تھا: ماڈ نے لکھا ہے کہ خود طالستائی پر اسی قسم کی واردات گزری تھی۔ نوجوانی کے ایام میں وہ کاکیشیا میں جوئے میں خاصی بڑی رقم ہار گیا تھا۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے اور اس نے اقرار نامہ لکھ کر دے دیا۔ بعد میں اسے معلوم ہوا کہ اس کے لیے اس رقم کی ادائیگی ممکن نہیں۔ اس نے خشوع و خضوع سے دعا کی اور اگلے ہی دن

اسے اپنے بھائی نکولس کا خط موصول ہوا کہ ایک چیچن (چیچن انگوش کا باشندہ۔ چیچن انگوش روسی فیڈریشن میں کاکیشیائی مسلم ریاست ہے اور آج کل روس سے آزادی حاصل کرنے کی تگ ودو کر رہی ہے۔)، جسے طالسطائی سے بہت انس تھا، اس اقرار نامے کو دوبارہ جیت چکا ہے اور نکولس کے ذریعے اسے بھیج رہا ہے۔

-12 مربی سینٹ: سینٹ سرجی۔ خانقاہ کا بانی۔ اوپر حاشیہ نمبر 2 میں ذکر آچکا ہے۔

-13 مارشل داؤو (Davout): ''آئی۔ این داؤو (1770۔1823) دراصل ''ڈیوک آف اور شٹٹ، (اور شٹٹ میں فرانسیسیوں نے 1806 میں پرشیا کو فیصلہ کن شکست دی تھی)، اور پرنس آف ایک موہل تھا۔ نظم وضبط کے معاملے میں وہ بہت سخت گیر تھا۔ اس کے ماتحت فوجی اس کا احترام تو کرتے تھے لیکن اسے پسند کوئی نہیں کرتا تھا۔ دوسرے مارشلوں میں وہ بے حد غیر مقبول تھا۔'' (ماڈ) زار الیکساندر اول کے ایلچی بالاشیف کی، جو نپولین سے ملنے گیا تھا، موغا کے بعد اس کی مڈھ بھیڑ اسی شخص سے ہوئی تھی۔ (کتاب سوم، حصہ اول، باب نمبر 5)

-14 فرولا اور لاورا (Frola and Lavra): ''فلورس (Florus) اور لاؤرس (Laurus) دو بھائی تھے۔ دونوں عیسائی تھے۔ انھیں روسی امپراطور Diocletion (جو 1284 تا 305 تک حکومت کرتا رہا اور جس نے عیسائیت اختیار نہیں کی تھی) ''نے شہید کر دیا تھا۔ یونانیوں اور روسیوں کی نگاہوں میں دونوں سینٹ ہیں اور کسان، جو انھیں غلط ناموں سے پکارتے ہیں، انھیں گھوڑوں کے محافظ سینٹ تصور کرتے ہیں۔'' (ماڈ)

-15 قمیص... باہر رکھتا ہوں: ''روسی کسان اپنی قمیصیں اپنی پتلونوں یا برجسوں کے اندر نہیں ٹانکتے، اوپر کھلی چھوڑ دیتے ہیں۔ تاہم وہ اپنی کمروں پر پٹیاں باندھ لیتے ہیں اور اس طرح انھیں بے قابو نہیں ہونے دیتے۔ اس کے برعکس فوجی سپاہی اپنی قمیصیں اپنی پتلونوں کے اندر ٹانکتے ہیں۔'' (ماڈ)

-16 عیسائی: روسی زبان میں کسان کو krest' yanin اور عیسائی کو Khristianin کہتے ہیں لیکن کاراتائیف کے تلفظ میں وہ گڈمڈ ہو جاتے ہیں اور کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ اپنے آپ کو کسان کہنا چاہتا ہے یا عیسائی۔ پچھلے باب میں بھی یہی ہوا تھا۔

حصہ دوم

-1 فلینک کوچ (flank march): فوج کا وہ کوچ، جو اصل راستے سے ہٹ کر کیا جائے۔
جب کوتوزوف ماسکو سے پسپا ہوا، تو اس نے ریازان روڈ اختیار کی تھی۔ پھر وہ دائیں طرف مڑ گیا اور پاکھراندی کے ساتھ ساتھ، جو دریائے مسکوا کی معاون ندی ہے، چلنے لگا۔ اس کی اس چال کا مقصد زرخیز جنوبی صوبوں اور تولا (ماسکو کے جنوب میں ایک قصبہ) میں اسلحہ ساز کارخانوں کا دفاع تھا۔ موغا کو دھوکا دینے کے لیے قازقوں کی دو رجمنٹیں ریازان روڈ پر ہی کوچ کرتی رہیں۔ چنانچہ موغا کو کچھ پتا نہ چل سکا کہ روسی فوج کہاں چلی گئی ہے۔ نپولین ان دنوں ماسکو میں مقیم تھا، اسے بھی چودہ ستمبر (روسی کیلنڈر) تک اس کا اتا پتا معلوم نہ ہو سکا۔ (ماڈ)

-2 فلی کونسل: مصنف نے اس کی تفصیل کتاب سوم حصہ سوم کے باب تین اور چار میں بیان کی ہے۔

-3 دریائے اوکا: سردیوں میں دریائے اوکا (نقشہ دیکھیں) عبور نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس کی سطح پر برف کی ہلکی تہہ جم جاتی ہے۔(ماڈ)

-4 لوغستوں (Lauriston): ماڈ کا کہنا ہے کہ نپولین کا ایلچی لوغستوں پانچ اکتوبر (23 ستمبر روسی کیلنڈر) کو صلح کی تجاویز لے کر کوتوزوف کی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا تھا، لیکن خط پر تاریخ خود ماڈ کے ترجے میں بھی 30 اکتوبر درج ہے۔ ماسکو سے فرانسیسیوں کا انخلا 7 اکتوبر کو شروع ہوا (کتاب چہارم حصہ دوم باب 11)۔ ولیم لینگر (انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ ہسٹری) کے مطابق نپولین 19 اکتوبر (موجودہ کیلنڈر) کو ماسکو سے روانہ ہوا تھا۔ خط پر تیس اکتوبر کی تاریخ کیوں درج ہوگئی، کسی نے بھی اس معمے پر روشنی نہیں ڈالی۔

-5 سرپوخوف (Ser pukhov): قصبہ۔ ماسکو اور تولا کے درمیان میں واقع ہے۔ دمتروف اور روزا بھی قصبے ہیں اور ماسکو کے آس پاس واقع ہیں۔

-6 تور بان: یوکرینی تاردار باجا۔

-7 پونیاتوسکی: فرانسیسی فوج کا پولستانی جرنیل۔

-8 1812:1813 کے روس پر تباہ کن حملے کے بعد جرمن اور کئی دوسرے اتحادی نپولین کا ساتھ چھوڑ گئے۔ نپولین کو اپنی فوجوں کو از سر نو منظم کرنا اور اپنے سابقہ اتحادیوں کے خلاف برسر پیکار ہونا پڑا۔ روسیوں کی امداد کے باوجود نپولین نے جرمنوں کو متعدد مقامات پر ذلت آمیز شکستوں سے دوچار کیا۔

-9 چالیس صدیاں: مصر کی چار ہزار سالہ تہذیب کے متعلق یہ نپولین کے اپنے الفاظ ہیں۔ اس کا ذکر آگے ذرا تفصیل سے آئے گا۔

-10 سیباس تیانی: نپولین کی فوج کا اطالوی جرنیل۔

-11 یاکوولیف (Yakov-lev): یاکوولیف روس کے اشراف میں سے تھا۔ اس کے ساتھ جو واردات گزری، اس کا ذکر اس کے بیٹے ٭ہرزن نے اپنی کتاب ''میری زندگی اور خیالات'' (1856) میں کیا ہے۔ (ماڈ کے مطابق طالسطائی نے یہ کتاب پڑھی تھی۔) یاکوولیف نے ماسکو سے نکلنے میں دیر لگادی۔ دریں اثنا فرانسیسی شہر میں داخل ہوگئے اور اس کا مکان شعلوں کی نذر ہوگیا۔ یاکولیف کا خاندان کوڑی کوڑی کا محتاج ہوگیا۔ یاکوولیف کو اطالوی زبان آتی تھی اور اسی زبان نے اسے فرانسیسی فوج کے ایک اطالوی افسر نے متعارف کرادیا۔ اطالوی افسر اسے فرانسیسی جرنیل

٭ ہرزن (Alexander Herzen): (1812 تا 1870): (ہرزن اصلاً جرمن نام ہے۔ جرمن زبان میں اسے ہیرتسن اور روسی میں گیرتسن کہتے ہیں): ہرزن سیاسی مفکر تھا اور اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے روسی حکومت کا معتوب رہا۔ 1834 اور 1842 کے دوران میں اسے مفصلات سے باہر نکلنے کی اجازت نہ ملی۔ 1848 میں وہ ملک ہی چھوڑ گیا اور زیادہ تر لندن اور پیرس میں مقیم رہا اور مختلف ناموں سے سیاسی جریدے شائع کرتا رہا۔ اس کی مشہور ترین کتاب Childhood, Youth and Exile جس کا ایک حصہ 1856 میں My Life and Thoughts کے نام سے شائع ہوا تھا، کلاسیک کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔

موغ تنئے کے، جسے وہ پیرس کے دنوں سے جانتا تھا، پاس لے گیا۔ اسے نپولین کی خدمت میں اس صورت میں پیش کیا گیا کہ اس کے کپڑوں پر میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں اور اس نے اپنا منہ ہاتھ بھی نہیں دھویا تھا۔ نپولین نے اسے اس شرط پر، کہ وہ اس کا مکتوب زار تک پہنچا دے گا، ماسکو سے بحفاظت نکلنے کی اجازت دی۔ جب وہ پیٹرز برگ پہنچا، اسے آراک چیف کے مکان میں نظر بند کر دیا گیا اور ایک مہینہ رکھا گیا۔ اس کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ اگر چہ اس کی رہائی باعزت اور غیر مشروط تھی، اسے پیٹرز برگ میں ٹھہرنے کی اجازت نہ مل سکی اور وہ صرف اپنے بھائی سے ملاقات کر سکا۔

12- طوطلمن (Tutolmin): ماسکو کا ایک بزرگ شہری اور ایک یتیم خانے کا مہتمم۔

13- Maison de ma Mere: ''میں یہ عمارت اپنی ماں کے نام منسوب کرتا ہوں۔'' طالسطائی نے یہ الفاظ ایک رسالے ''رشین آرکائیوز'' سے، جسے قابل اعتماد قرار نہیں دیا جا سکتا، لیے تھے۔ (ماڈ)

14- لقیط خانہ (Foundling Hospital): وہ بچے، جنھیں ان کے ماں باپ چھوڑ دیں اور ان کے حسب نسب کا پتا نہ چلے، foundlings کہلاتے ہیں۔

15- فین (Baron Agathon Fain): نپولین کا سیکرٹری۔ اس نے 1812 کی جنگ کے بارے میں 1827 میں کتاب تحریر کی تھی۔

16- Ete de St. Martin: یورپ اور شمال مشرقی امریکہ میں 18 اکتوبر سے 11 نومبر کا موسم معتدل سمجھا جاتا ہے۔ اسے فرانسیسی اپنے محافظ سینٹ مارتاں (چوتھی صدی کا ایک فرانسیسی راہب، اس کا یوم گیارہ نومبر کو منایا جاتا ہے) کے نام پر سینٹ مارتن کا موسم، انگریز اسے سینٹ لوقس (انجیل کے کچھ حصوں کا مصنف اور فنکاروں اور ڈاکٹروں کا محافظ سینٹ، اس کا یوم اٹھارہ اکتوبر کو منایا جاتا ہے) کا موسم اور امریکی انڈین سمر کہتے ہیں۔ ماڈ، روزمیری ایڈمنڈز اور این ڈونیگن نے اس کا ترجمہ ''بڑی بوڑھیوں کی گرمیاں'' کیا ہے۔

17- سینٹ ٹامس: حضرت عیسیٰ کے بارہ میں سے ایک حواری۔ (اردو انجیل میں اسے توما یا توام لکھا گیا ہے)۔ اسے ''تشکیکی توما'' ("Doubting Thomas") کہا جاتا ہے کیونکہ اس نے مسیح کو دیکھے بغیر ایمان لانے سے انکار کر دیا تھا۔ (نیا عہد نامہ، یوحنا، باب بیس، آیات 24۔29)

18- بوآغنے (Eugene de Beauharnais: (1781 تا 1824)): وائی کاؤنٹ بوآغنے (جو امریکی جنگ آزادی اور فرانسیسی انقلاب دونوں میں حصہ لے چکا تھا) کا بیٹا اور نپولین کا سوتیلا پسر (نپولین نے وائی کاؤنٹ بوآغنے کی بیوہ سے شادی کی تھی)۔ نپولین نے 1805 میں اسے اٹلی کا وائسرائے مقرر کیا۔ وہ نپولین کی روس کی مہم میں شامل تھا۔ اس کی ہمشیرہ نے نپولین کے بھائی سے شادی کی اور ان کا بیٹا بعد میں نپولین سوم کے نام سے فرانس کا بادشاہ بنا۔

19- میدین اور یخنوف: یہ دونوں قصبے کالوگا کے شمال مغرب میں اس سڑک پر واقع ہیں جو موژیسک سمولنسک روڈ (جسے نپولین نے بالآخر اپنی مغرب کی طرف پسپائی کے لیے اختیار کیا) سے خاصا جنوب میں گزرتی ہے۔ (ماڈ)

20- دستیل (Anne Louise Germaine Necker de Stael): (1766—1817): فرانسیسی ناول نگار،

نقاد اور ادیبوں کی سرپرست۔ اس کا باپ جو سوئٹزرلینڈ کا باشندہ تھا، مالیات کا ماہر، نپولین کا جانی دشمن اور انقلاب فرانس سے پہلے کی حکومت کے حامیوں کا مشیر تھا۔ مادام ڈ سیتل پیرس میں رہتی تھی۔ 1807 میں نپولین نے اسے ملک بدر کر دیا۔ 1812 میں اس نے چھ ہفتے روس میں گزارے اور بارودینو کی لڑائی کے اگلے روز فن لینڈ روانہ ہوگئی۔ پوشکن نے اس کی کتاب Dix annees d' exil (جلاوطنی کے دس سال) کی، جو 1821 میں اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی، خاصی تعریف کی ہے کیونکہ اس نے اس میں روس کا ذکر "احترام واحتیاط" سے کیا ہے۔ (ماڈ)

21- جنرل موتوں (General Mouton, Count of Lobau): اس اجلاس میں، جو تیرہ اکتوبر (روسی کیلنڈر) کو منعقد ہوا تھا، جنرل موتوں آخری مقرر تھا۔

22- "le Houra de L'Em pereur": امپراطور زندہ باد۔ یہ نعرہ فرانسیسی نہیں بلکہ دشمن پر حملہ کرتے وقت روسی لگایا کرتے تھے اور یہاں بھی قازقوں نے بلند کیا تھا۔

حصہ سوم

1- en quarte: چوتھائی ٹھاٹ: ٹھاٹ پٹابازوں اور شمشیرزنوں کے پینترے (چوٹ لگانے یا بچنے کا انداز) کو کہتے ہیں۔ شمشیرزنی میں چوتھائی ٹھاٹ کی ایک دفاعی پوزیشن ہوتی ہے۔ اس میں وہ اپنے اندرونی بائیں حصۂ جسم کو حریف کا ہدف بننے سے بچانے کے لیے اپنا ہاتھ سینے کے برابر اونچا کر لیتا ہے۔ ہاتھ کا انگوٹھا اوپر کی جانب اٹھا ہوتا ہے اور ناخنوں کا رخ بائیں طرف کیا جاتا ہے، جب کہ شمشیر کی انی (نوک) کا رخ حریف کی آنکھوں کی طرف ہوتا ہے۔

2- en tierce (تکنا ٹھاٹ): شمشیرزنی میں دفاعی پوزیشن۔ اس میں شمشیرزن اپنے باہری جسم کو حریف کا ہدف بننے سے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ اس میں ہاتھ کو سینے کے برابر اٹھا کر ہتھیلی کو نچلی یا پچھلی جانب کر لیا جاتا ہے اور شمشیر کی انی کا رخ حریف کی آنکھوں کی طرف کیا جاتا ہے۔

3- en prime: یہ بھی دفاعی پوزیشن ہے۔ اس میں شمشیرزن اپنے جسم کے اوپرے حصے کو بچانے کے لیے اپنا ہاتھ سر کے برابر لاتا ہے اور ہتھیلی الٹا لیتا ہے۔ شمشیر کی انی کا رخ نچلی جانب ہوتا ہے اور بازو کو (کہنی سے لے کر انگلیوں کی آخری پوروں تک) زمین کے متوازی جسم کے آر پار لایا جاتا ہے۔

4- 1813: یوں تو 1813 میں فرانسیسیوں نے خود نپولین اور اس کے دیگر جرنیلوں کی قیادت میں متعدد لڑائیاں لڑیں، چند ایک میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی اور چند ایک میں ناکامی، لیکن انھیں سب سے ذلت آمیز شکست روس، پرشیا اور آسٹریا کی متحدہ فوج نے جرمنی کے شہر لیپ زیگ (Leip zig) کے نواح میں سولہ سے انیس اکتوبر کی لڑائی میں دی۔ (نپولین خود اس لڑائی میں شریک نہیں تھا۔) اس لڑائی میں تیس ہزار سپاہی ہلاک ہوئے۔ کچھ بھاگ گئے اور باقیوں نے اسی طرح ہتھیار فاتحین کو پیش کیے، جس طرح جنرل نیازی نے ڈھاکہ میں پیش کیے تھے۔ (اسی لیے

طالسطائی کوطنز کا موقع ملا ہے۔)

5- کاکیشیا کے پہاڑی قبائل: کاکیشیا (قفقاز): بحیرہ اسود اور بحیرہ کیپین کے مابین کا علاقہ کاکیشیا یا قفقاز کہلاتا ہے۔کہا جاتا ہے کہ ایران، پاکستان، بھارت اور یورپ کے وہ باشندے، جو آریائی کہلاتے ہیں، اصلاً یہیں کے رہنے والے تھے۔ آج کل یہاں چالیس کے لگ بھگ زبانیں بولی جاتی ہیں اور مرحوم سوویت یونین کی کم از کم تین جمہوری ریاستیں — جارجیا، آرمینیا اور آذربائی جان — یہیں واقع ہیں۔ روس کا ان پر مکمل قبضہ آج سے تقریباً سو سال پہلے ہوا تھا لیکن اس سے پہلے اسے یہاں کے گوریلوں (گوریلا رہنماؤں میں سب سے نمایاں نام امام شامئیل کا ہے) کی زبردست مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ماڈ کے مطابق خود طالسطائی روسی فوج کے ساتھ 1851 تک 1853 تک ان کے خلاف لڑا تھا۔ ہسپانیہ کے گوریلے نپولین کے زمانے میں فرانسیسیوں کے خلاف لڑتے رہے تھے۔

6- مقدارِ حرکت (مومینٹم: Momentum): کوئی متحرک جسم جس حساب سے حرکت کرتا ہے، اسے اس کی مقدارِ حرکت یا مومینٹم کہا جاتا ہے۔ کسی جسم (body) کا مومینٹم اس کی کمیت (مقدار مادہ = mass) اور ولاسٹی (جسم کی کسی خاص سمت میں رفتار) پر منحصر ہوتا ہے۔ یعنی "کسی متحرک جسم کا مومینٹم اس کی کمیت (مقدار مادہ) اور ولاسٹی کے حاصل ضرب کے برابر ہوتا ہے۔"

فرض کریں ایک چیز کا وزن پچاس کلوگرام ہے اور وہ چیز دو میٹر فی سیکنڈ کے حساب سے حرکت کر رہی ہے۔ اس کا مومینٹم 2x50=100 کلوگرام میٹر فی سیکنڈ ہوگا۔

7- داویدوف: داویدوف جیتا جاگتا انسان تھا اور اس نے گوریلا کارروائیوں کے بارے میں کتاب بھی لکھی تھی لیکن ماڈ کے بقول اسے ناول میں دینی سوف کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔

8الف۔ پولستانی جرنیل کی ماتحتی: "دینی سوف نے اپنی خود مختاری برقرار رکھنے کے لیے جس ترکیب کا سہارا لیا ہے، اس کا ذکر داویدوف نے اپنی کتاب 'گوریلا کارروائیوں کی ڈائری' میں ایک واقعے کے بیان کے سلسلے میں کیا ہے۔" (ماڈ)

8-ب۔ ایسول لووائسکی: یہاں جو کچھ بتایا جا رہا ہے، حقیقت پر مبنی ہے۔ داویدوف (ناول میں دینی سوف) کی ابتدائی کامیابیوں کے بعد کوتوزوف نے اسے دو قازق رجمنٹیں دے دی تھیں۔ لووائسکی قازقوں کے جانے پہچانے اور مشہور خاندان ایلووائسکی کی عام شکل ہے۔ ایسول (esaul) قازقوں کا کیپٹن ہوتا تھا۔ (ماڈ)

Unbegaun نے اپنی کتاب Russian Surnames (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس: 1972) میں بتایا ہے کہ ایلووائسکی (Ilovaysky) عام طور پر پادری ہوا کرتے تھے۔

9- پلاستون (plastun): بحیرہ اسود کے اردگرد آباد قازقوں میں بعض لوگ ماہر نشانچی ہوتے تھے، انھیں پلاستون کہا جاتا تھا۔ یہ نشانچی گھوڑوں پر سوار نہیں ہوتے تھے۔ ان قازقوں میں بے شمار لوگ ماسکو کے اردگرد بھی آبسے تھے۔

10- مسکٹون (musketoon): ایک قسم کی چھوٹی دستی بندوق۔ اب کہیں استعمال نہیں ہوتی۔

11- پائیک (pike): ایک قسم کی لاٹھی جس کے سرے پر نوکیلا آہنی بلیڈ (پھل) لگا ہوتا تھا۔

12- دیازما کی لڑائی: نپولین کی سمولنسک کی جانب پسپائی کے دوران میں پہلی قابل ذکر لڑائی اکیس اور بائیس اکتوبر (دو اور

تین نومبر) کو ویازما میں لڑی گئی تھی۔ میلورادووچ کو اس میں شاندار فتح حاصل ہوئی تھی۔ کولین کورخ نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے: ''ہماری بدنظمی اور بدقسمتی کا آغاز اسی واقعے سے ہوتا ہے۔'' (ماڈ)

-13 ویسنایا(vesenya): بہار کے لیے روسی لفظ vesna ہے۔

-14 ramrod: ایک قسم کی پتلی سلاخ جو پرانی قسم کی بندوقوں میں بارود ٹھونسنے کے کام آتی تھی۔ آج کل اس سے بندوقوں کی نالیاں صاف کی جاتی ہیں۔

-15 کاراباخ: جنوبی کا کیشیا کا ایک خطہ۔ یہ خطہ اپنے گھوڑوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔ (ماڈ)

-16 چقماق (flint): ایک قسم کا پتھر۔ اسے فولاد سے رگڑ کر آگ پیدا کی جاتی تھی۔ پرانے انداز کی بندوقوں میں گولیوں کی جگہ بارود استعمال ہوتا تھا۔ اس بارود کو آگ لگانے کے لیے گھوڑے میں چقماق رکھا جاتا تھا۔ آج کل لائٹروں میں چقماق استعمال ہوتا ہے۔

-17 fugue: مغربی موسیقی میں جسے fugue کہا جاتا ہے، اس کا آغاز چھوٹی اور سادہ دھن سے ہوتا ہے۔ اس کے بعد راگ کی نوعیت کے ساتھ اسے معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ دوسرے گائیکوں یا سازوں کی آوازوں میں دہرایا جاتا ہے۔

-18 کہانی: طالسطائی نے اس کہانی کو 1872 میں پھیلا کر تحریر کیا اور اس کا نام ''خداوند کو صداقت کا علم ہوتا ہے لیکن وہ انتظار کرتا ہے'' رکھا۔ یہ اس کی ان دو کہانیوں میں شامل ہے جسے اس نے اپنی کتاب ''فن کیا ہے؟'' میں ''برے فن کے زمرے'' میں شمار نہیں کیا۔ اپنی باقی کہانیوں اور ناولوں کے متعلق اس کی رائے تھی کہ انھیں جلا دینا چاہیے۔

-19 ''سمجھ گئے؟'': ''اوائل شباب میں طالسطائی کو خوابوں میں بہت دلچسپی ہوا کرتی تھی۔ اس نے یہ نظریہ اپنا لیا کہ خواب خواہ کتنے ہی پیچیدہ اور طویل کیوں نہ ہوں، وہ ہمیشہ اس وقت دکھائی دیتے ہیں جب آدمی بیدار ہو رہا ہوتا ہے اور انھیں خارجی آوازیں، بوئیں یا تحسسات بجھاتے ہیں۔'' (ماڈ)

-20 کراسنایا(Krasnoe): روسی قصبہ۔ سمولنسک کے مغرب میں واقع ہے۔

-21 اورشا(Orsha): بائیلوروس (جو پہلے سوویت یونین میں شامل تھا اور اب آزاد ملک بن گیا ہے) کا قصبہ۔ آج کل یہ بڑا ریلوے جنکشن ہے۔

-22 شکست کیوں کھائی: کراسنایا کی لڑائی تین سے چھ نومبر (پندرہ سے اٹھارہ نومبر) 1812 تک ہوتی رہی۔ فرانسیسی افواج سمولنسک سے بیریزینا کی طرف فرار ہو رہی تھیں کہ وہ کراسنایا کے مقام پر روسیوں کے گھیرے میں آ گئیں۔ وہ بے پناہ جانی نقصان اٹھانے کے بعد یہ گھیرا توڑنے میں کامیاب ہوئیں اور نپولین کہیں ایک ہفتہ بعد دریائے بیریزینا عبور کرنے میں کامیاب ہوا۔

-23 ڈمیسٹغ (Joseph, Comte de Maistre): 1753 تا 1821: فرانسیسی نواب اور مصنف۔ انقلاب فرانس کے بعد اس نے جلاوطنی اختیار کر لی۔ وہ 1803 سے 1817 تک سینٹ پیٹرزبرگ میں سارڈینیا کا سفیر رہا۔ اس نے تاریخ کے علاوہ سینٹ پیٹرزبرگ کی محافل (Soirees) کے متعلق بھی ایک کتاب لکھی تھی۔

حصہ چہارم

-1 رشوت: یہاں خود طالسطائی نے حاشیے میں ''ولسن کی ڈائری'' تحریر کیا ہے۔ ''سر رابرٹ ولسن (1777 تا 1849) روسی فوج میں برطانیہ کا غیر سرکاری فوجی نمائندہ تھا۔ اس نے الیکساندر کو قائل کرنے کے لیے کہ کوتوزوف کو فوج سے چھٹی دے دینا چاہیے، چیف آف سٹاف بے نگ سین کے ساتھ سازباز کی تھی۔ طالسطائی نے 1862 میں 'روسی پیغامبر' میں ولسن کی ڈائری کے متعلقہ حصے پڑھ لیے ہوں گے۔'' (ماڈ)

-2 تازہ ترین کتاب: یہاں طالسطائی جس کتاب کا حوالہ دے رہا ہے، وہ باگدانووچ کی ''سال 1812 کی تاریخ'' ہے۔ اس کتاب کا ایک ذیلی عنوان یہ تھا۔ ''کوتوزوف کے کردار اور کراسنایا کی لڑائی کے غیر تسلی بخش نتائج کے بارے میں تاثرات۔''

-3 منفی اٹھارہ درجہ حرارت: یہ درجہ حرارت رایومر مقیاس الحرارت کے مطابق ہے۔ فارن ہائٹ مقیاس الحرارت کے مطابق یہ منفی آٹھ درجے ہوگا۔

-4 inertia force = vis inertiae: مادی اجسام (bodies) کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اگر وہ ساکن ہوں تو اپنی جگہ سے ہلیں گے نہیں اور اگر یکساں رفتار سے متحرک ہوں تو رکیں گے نہیں تاوقتیکہ ان پر کوئی خارجہ قوت اثر انداز نہ ہو۔ اسے فزکس کی زبان میں inertia (جمود) کہا جاتا ہے۔ inertia force (قوت جمود) وہ خیالی یا فرضی قوت ہے جو متحرک جسم پر اس کی قوت کے مساوی قوت سے لیکن مخالف سمت کی طرف اثر انداز ہوتی ہے۔ (یہ نظریہ فرانسیسی ماہر ریاضی وطبعیات Jean de Rond de' Alembert نے 1743 میں پیش کیا تھا۔) چونکہ فرانسیسیوں کو کوئی روکنے والا نہ تھا، وہ اپنے ہی زور پر آگے بڑھتے گئے، کچھ کشتیوں میں بیٹھ گئے اور کچھ برف سے ڈھکے دریا پر چڑھ گئے اور یوں ڈوب گئے۔

-5 گرینڈ ڈیوک اور ولی عہد: کونستانتن پاولوچ (1779 تا 1831) الیکساندر اول کا بھائی تھا۔ ''روس کو اوسٹرلٹس کی لڑائی میں جو ہزیمت اٹھانا پڑی، اس کی کچھ ذمے داری اس پر بھی عاید ہوتی ہے۔...وہ ذاتی طور پر خاصا دلیر آدمی تھا لیکن جنگ اور سیاست دونوں میں غلطیوں اور نااہلی کا مرتکب ہوتا رہا۔ ایک پولستانی خاتون سے شادی کرنے کے بعد وہ تخت پر اپنے حق سے دستبردار ہوگیا اور اس کا بھائی نکولس الیکساندر اول کا جانشین بنا۔'' (ماڈ) باب ''روس کی تاریخ'' میں ''دسمبری تحریک'' بھی دیکھیں۔

-6 آرڈر آف سینٹ جارج: ''ان تمغوں کا آغاز کیتھرین اعظم نے جنگ میں نمایاں کارکردگی کا اعتراف کرنے کے لیے 1769 میں کیا تھا۔ فرسٹ کلاس بہت اونچے درجے کا اعزاز تھا اور کبھی کبھار ہی دیا جاتا تھا۔'' (ماڈ)

-7 اوریل (Orel): ماسکو اور تولا کے جنوب میں روسی قصبہ۔ آج کل ریلوے جنکشن ہے۔

-8 سادہ: ''روسی اس لفظ کو اس شخص کے لیے، جس میں بناوٹ، تصنع اور ریاکاری نام کو بھی نہ ہو، استعمال کرتے ہیں۔'' (ماڈ)

9- دریائے رائن: (Rhine): یورپ کا اہم ترین دریا۔ ایک طرف یہ سوئٹزر لینڈ اور آسٹریا اور دوسری طرف جرمنی اور فرانس کے مابین حد بندی کا کام دیتا ہے، اور ہالینڈ میں سے گزرتا بحیرہ شمال (نارتھ سی) میں جا گرتا ہے۔ اس دریا کے اردگرد کے مناظر بالخصوص جرمنی کے شہروں منٹس (Mainz) اور بون کے مابین، اپنی خوبصورتی کے لیے شہرۂ آفاق ہیں۔ جنگلات اور باغات کی بہتات ہے اور اس کے کناروں پر بے شمار قلعے اور گڑھیاں ایستادہ ہیں۔ تاہم آج کل کارخانوں نے اس کا حسن خاصا گہنا دیا ہے۔

10- کولوسی ام (Colosseum): قدیم روم کا وسیع ترین بے چھت بیضوی تھیٹر (anphi theatre) یا سٹیڈیم: یہ پہلی صدی عیسوی میں تعمیر ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کی تعمیر میں سنگِ مرمر استعمال ہوا اور اسے سونے اور جواہرات سے مزین کیا گیا تھا۔ اس میں پچاس ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ رومی شہنشاہ اپنی فتوحات اور چھٹیوں کے جشن منانے کے لیے یہاں، شیروں، ہاتھیوں، ریچھوں اور دوسرے درندوں کو آپس میں لڑاتے تھے اور بعض اوقات انسانوں کو بھی ان سے مرواتے تھے۔ کچھ امتدادِ زمانہ کے ساتھ اور کچھ زلزلوں کے سبب یہ تقریباً تباہ ہو چکا ہے لیکن بچے کھچے آثار اب بھی عظمتِ رفتہ کی یاد دلاتے ہیں۔

تتمہ

حصہ اول

1- پھوتی اس (photius): نووگورد خانقاہ کا سربراہ تھا۔ "اس نے 1820 میں لوگوں کو میسنوں اور برّیت پسندوں، بائبل سوسائٹی اور دیگر تحریکوں کے، جو اس کے خیال کے مطابق لبرل ازم کو فروغ دے رہی تھیں، ارکان کا ناطقہ بند کرنے پر اکسایا تھا۔۔۔ پھوتی اس ریاضت کیش راہب تھا اور اس نے مختلف مذہبی صحیفوں کی مدد سے ایسی ایسی مایوس کن پیشین گوئیاں کہیں کہ ایکساندر پر خوف طاری ہو گیا۔ تاہم اس کا اثر و رسوخ زیادہ عرصہ قائم نہ رہا۔" (ماڈ)

2- شیلنگ (F.W.G. Schelling): (1775 تا 1854) اور فختے (J.G.Fichte): (1762 تا 1814) عینیت پسند جرمن فلسفی تھے اور لبرل ازم کا پرچار کرتے تھے۔ دونوں نے روسیوں کو کافی متاثر کیا تھا۔

3- شاتوبغیاں (Vicomte de Chateaubriand): (1768 تا 1868): جب نپولین کے زوال کے بعد فرانس میں کچھ عرصے کے لیے پرانی بادشاہت دوبارہ بحال ہوئی، تو وائی کاؤنٹ شاتوبغیاں نے اس میں وزارت اور سفارت کے فرائض سرانجام دیے۔ شاتوبغیاں اپنے زمانے کا جانا پہچانا رومانی مصنف بھی تھا۔ بارہ جلدوں پر مشتمل اس کی یادداشتیں اس کی وفات کے بعد شائع ہوئیں۔

4- پولینڈ کا آئین: 1814 اور 1815 میں ویانا کانگرس، جس میں یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے حکمران یا ان کے نمائندے شریک ہوئے، منعقد ہوئی۔ اس میں آسٹریا اور پرشیا کو بہت سے نئے علاقے ملے، ہالینڈ کی بادشاہت

بحال ہوئی، گرینڈ ڈچی آف وارسا پر روس کا حق تسلیم کیا گیا، اسے کنگ ڈم آف پولینڈ کا نام دیا گیا اور زار اس کا بادشاہ بن گیا۔ تاہم زار نے پولینڈ کو اپنا آئین دیا۔ اس کے تحت پولستانی ملک کی سرکاری زبان قرار پائی، پولینڈ کے اپنے ادارے وجود میں آئے اور علیحدہ فوج کی تشکیل ہوئی۔ تاہم 1830 کی بغاوت کے بعد پولستانیوں کے تمام حقوق سلب کر لیے گئے۔

5- اتحادِ مقدس (Holy Alliance): یہ اتحاد 1815 میں آسٹریا، پرشیا اور روس کے مابین قائم ہوا تھا۔ جس معاہدے کے تحت یہ عمل قیام میں آیا تھا، اس پر برطانیہ، ترکی اور یورپ کے ماسوا پوپ کے تقریباً تمام حکمرانوں نے دستخط کیے تھے۔ بظاہر یہ امن کے لیے وجود میں آیا تھا لیکن بہت جلد یہ جور واستبداد کا ذریعہ بن گیا۔

6- گالتسن (Prince Golitsyn): وزیر تعلیم وروحانی امور۔

7- شش کوف (Admiral Alexander Shishkov): (1754 تا 1841): ماہر بین الاقوامی قانون، مدبر اور صدر اکیڈمی آف سائنسز۔ اس کی وجہ شہرت یہ تھی کہ وہ روسی زبان کا کٹر مؤید اور فرانسیسی زبان اور طور طریقوں کا دشمن تھا۔

8- سمیونووسکی رجمنٹ: اس رجمنٹ نے 1820 میں اپنے سخت گیر جرمن کمانڈر کے خلاف بغاوت کر دی تھی، اس پر الیکساندر نے طیش کھا کر اسے توڑ دیا۔

9- حکمرانوں کی ناراضگی: انقلاب فرانس کے بعد غوبس پیئے (Robespierre) (1758 تا 1794) حکومت کا سربراہ بنا۔ اسی نے معرکہ تولوں کے بعد نپولین کو ترقی دے کر جرنیل بنایا تھا، لیکن اطالیہ کی مہم میں اپنی من مانی کرنے کے بعد نپولین اس کا معتوب بن گیا اور اس نے اسے ایک ماہ کے لیے جیل بھیج دیا۔ کبڑے کو لات راس آئی۔ 1795 میں شاہ پسندوں نے شورش بپا کی۔ نپولین اطالیہ کی بجائے پیرس میں موجود تھا، اس نے اس بغاوت کو فرو کرنے میں نمایاں کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور وہ "ری پبلک کا نجات دہندہ" قرار پایا۔ یوں اس کا مقام پہلے سے بھی بلند تر ہو گیا۔

10- ترکی میں ملازمت: ماڈ کے مطابق نپولین نے فرانسیسی حکومت کے ایک کمشن کو درخواست دی تھی کہ اسے قسطنطنیہ بھیج دیا جائے تاکہ وہ خلافت عثمانیہ کے توپ خانے کو نئے خطوط پر استوار کر سکے۔

11- روسی افواج: سوارف کی زیر کمان روسی افواج نپولین کی افریقہ روانگی کے ایک سال بعد اطالیہ اور سوئٹزرلینڈ میں فرانسیسیوں کے خلاف برسرپیکار ہوئیں اور انھوں نے متعدد مقامات پر کامیابیاں حاصل کیں۔

12- مالٹا: بحیرہ روم کا جزیرہ (رقبہ 122 مربع میل): بعد میں اس پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا اور انھوں نے جنگ عظیم اول کے دوران میں مولانا محمود الحسن دیوبندی کو یہیں نظر بند رکھا۔ نپولین نے اس پر 12 جون 1798 کو قبضہ کیا تھا اور یہیں وہ یکم جولائی کو مصر پہنچا تھا۔

13- سازش: ڈیوک آف آں غیاں، جس کا ذکر ناول کے پہلے باب میں آچکا ہے، فرانس کے شاہی خاندان بوغ بوں کا فرد تھا۔ اس پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ 1804 میں جن لوگوں نے نپولین کو، جب وہ فرسٹ قونصل تھا، قتل کرنے کی

سازش کی تھی، ان میں وہ بھی شامل تھا۔ سازش تو ناکام رہی (اور اسی ناکامی نے نپولین کو امپراطور کا خطاب اختیار کرنے کی ترغیب دی)، البتہ آں غیاں کو "غیر جانبدار علاقے" سے "اغوا" کرالیا گیا، اس پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔

14- لاکھوں کی رقوم: نپولین کی روس سے پسپائی کے بعد آسٹریا اور اس کے متعدد دیگر اتحادی اس کے خلاف ہو گئے اور انھوں نے روس کے اشتراک سے اس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ فرانسیسیوں کو متعدد مقامات پر شکستوں کا سامنا کرنا پڑا تاہم بعض لڑائیوں میں انھیں کامیابیاں بھی نصیب ہوئیں۔ اگرچہ نپولین کے مخالفین نے اسے صلح کی پیشکش کی اور اسے مطلع کیا کہ اگر وہ فرانس کی 1792 کی سرحدیں تسلیم کر لے، پھر اس کے خلاف مزید جنگ نہیں کی جائے گی۔ تاہم نپولین اپنی تازہ ترین کامیابیوں سے اتنا مخمور ہو چکا تھا کہ اس نے اس پیشکش کو مسترد کر دیا۔ اس کے مخالفین نے طبل جنگ بجا دیا اور مارچ 1814 کے دوران میں اسے سات مختلف مقامات پر شکست سے دوچار کر دیا۔ 30 مارچ کو مون مارتغ کے مقام پر جب اسے شکست ہوئی، اس کے مارشلوں اور جرنیلوں کے حوصلے ٹوٹ گئے اور انھوں نے اس کا مزید ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔ 31 مارچ کو اتحادی پیرس میں داخل ہو گئے اور نپولین غیر مشروط پر تخت سے دست بردار ہو گیا۔ اتحادیوں نے اسے ایلبا جزیرہ (یہ جزیرہ بحیرہ روم میں واقع ہے اور آج کل اطالیہ کا حصہ ہے) بھیج دیا۔ انھوں نے اسے بیس لاکھ فرانک کی رقم فراہم کی، ایلبا جزیرے پر اس کا اختیار تسلیم کیا اور اسے اپنا شاہی خطاب برقرار رکھنے کی اجازت دے دی۔

15- یہ لہر: جب نپولین کو ایلبا جزیرے پر بھیج دیا گیا، فرانس پر بوغ بوں خاندان کا اقتدار بحال ہو گیا اور مقتول لوئی شانز دہم کا ایک بھائی لوئی ہژدہم کے نام سے بادشاہ بن گیا۔ ادھر اتحادیوں نے ستمبر 1814 اور جون 1815 میں ویانا میں دو کانگرسیں منعقد کیں۔ ان کانگرسوں میں کئی معاملات میں اتفاق ہوا لیکن بعض میں اختلافات رونما ہونے لگے۔ ان اختلافات سے یہ اندیشہ لاحق ہونے لگا کہ اتحادی آپس میں برسرِ پیکار ہو جائیں گے۔ فرانس کے لوگ بھی بوغ بوں خاندان سے بیزار ہونے لگے۔ اتحادیوں کے اختلافات اور فرانسیسیوں کی بے اطمینانی کی خبریں نپولین تک پہنچ گئیں اور اس نے اپنے حمائتیوں کی ہلاشیری پر دوبارہ فرانس کا رخ کیا۔ وہ پندرہ سو آدمیوں کی معیت میں یکم مارچ 1815 کو کانز پہنچا۔ جو فوج اس کی سرکوبی کے لیے بھیجی گئی، وہ اس کے ساتھ مل گئی اور وہ بیس مارچ کو فاتحانہ انداز سے پیرس میں داخل ہو گیا۔ لوئی ہژدہم بھاگ گیا اور نپولین ایک بار پھر برسرِ اقتدار آ گیا۔ جب اتحادیوں نے یہ صورت حال دیکھی، انھوں نے اپنے اختلافات پس پشت ڈال دیے اور وہ دوبارہ فرانس کے خلاف صف آرا ہو گئے۔ جو یورپی ممالک اس اتحاد میں شامل ہوے، ان میں روس، آسٹریا، پرشیا اور برطانیہ بھی شامل تھے۔ فرانسیسیوں کو متعدد مقامات پر زک اٹھانا پڑی۔ نپولین لڑتے لڑتے بلجیم میں داخل ہو گیا۔ وہاں 18 جون 1815 کو واٹرلو کے میدان میں فرانسیسیوں اور اتحادیوں کے مابین جن کی سپاہ انگریزوں، ولندیزیوں اور جرمنوں پر مشتمل تھی اور جن کی کمان ڈیوک آف ولنگٹن کے ہاتھ میں تھی، زبردست معرکہ بپا ہوا۔ نپولین کی فوج کو شکست ہوئی۔ اس نے امریکہ فرار ہونے کی کوشش کی لیکن پکڑا گیا اور اسے جنوبی بحر اوقیانوس کے جزیرے سینٹ

ہیلینا جلاوطن کر دیا گیا۔ وہیں 5 مئی 1821 کو اس کا انتقال ہوا۔

16- انیسویں صدی میں بے شمار لوگ اس خیال کے حامی تھے کہ الیکساندر اول 1825 میں راہی ملکِ عدم نہیں ہوا تھا بلکہ اس نے سائبیریا میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور وہیں تارک الدنیا کی حیثیت سے 1866 میں وفات پائی تھی۔ (1927 میں جب اس کے سنگی تابوت کو کھولا گیا، وہ واقعی خالی تھا۔) ماڈ کے مطابق طالسطائی کا بھی یہی خیال تھا اور اس نے اپنی کہانی ''فیودر کزمچ'' میں، جو اس کی وفات کے بعد شائع ہوئی، یہی بات بیان کی ہے۔

17- 1812 کے واقعات کی یاد میں الیکساندر اول کو جو تمغہ دیا گیا تھا، یہ الفاظ اس پر نقش تھے۔

18- لے اوکون (Laocoon): ہیلن کی بازیابی کے لیے یونانیوں میں ٹرائے پر چڑھائی تو کر دی لیکن دس سال کی جنگ کے بعد بھی وہ شہر پر قبضہ کرنے میں ناکام رہے۔ جو مقصد وہ جنگ کے ذریعے حاصل نہ کر سکے، اسے انھوں نے عیاری سے پورا کرنے کی ترکیب سوچی۔ انھوں نے لکڑی کا دیو قامت گھوڑا بنایا، اس کے پیٹ میں اپنے چند سورما، جنھوں نے رات کی تاریکی میں شہر کے دروازے کھولنا تھے، داخل کیے اور خود اپنے جہازوں میں بیٹھ کر ساحل سے پرے ہٹ گئے۔ ٹرائے والے سمجھے کہ یونانی بھاگ گئے ہیں اور کھلونا پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ وہ گھوڑے کو گھسیٹ کر شہر کے اندر لے گئے اور اسے چوک میں کھڑا کر دیا۔ رات کو وہی ہوا جو یونانیوں نے سوچا تھا۔ یونانی گھوڑے کے پیٹ سے باہر نکلے اور انھوں نے شہر کے دروازے کھول دیے۔ یوں ان کے ساتھی ٹرائے پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

لے اوکون ٹرائے کے اپالو دیوتا کے مندر کا پجاری تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے ٹرائے کے لوگوں کو گھوڑے سے خبردار کر دیا تھا لیکن دو سمندری سانپ آئے اور انھوں نے اس ''جرم'' کی پاداش اسے اور اس کے دو بیٹوں کو ہلاک کر دیا۔

19- ایسا ہو گا نہیں: بہت عرصہ پہلے 1806 میں جب سونیا نے دلوخوف کے ساتھ شادی کی تجویز ٹھکرائی تھی، نتاشا نے اپنے بھائی سے کہا تھا: ''نکولائی، تم جانتے ہو۔ ناراض نہ ہونا۔ لیکن مجھے معلوم ہے کہ تم اس (سونیا) سے شادی نہیں کرو گے۔ مجھے معلوم ہے، مجھے کیسے معلوم ہوا، یہ صرف خداوند کو معلوم ہے، لیکن میں پورے یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ تم اس سے شادی نہیں کرو گے۔'' دوسری کتاب، حصہ اول، باب گیارہ۔

20- ضرورت سے زیادہ سادگی: ''جس قسم کی سادگی کا یہاں ذکر کیا گیا ہے، وہ وہی ہے جو طالسطائی کے گھر یاسنایا پولیانا میں (جسے ناول میں بالڈ ہلز بنا کر پیش کیا گیا ہے) ہمیشہ پائی جاتی رہی۔ اگر چہ زیب داستان کے لیے طالسطائی کے پُر تعیش گھر اور اس سادگی میں، جس کا وہ بعد کی زندگی میں پرچار کرتا رہا، جو تضاد لوگوں کو نظر آتا تھا، اس کے متعلق بہت کچھ لکھا گیا ہے، تاہم حقیقت یہی ہے کہ طالسطائی کو تعیشات نہ کبھی پسند آئے اور نہ وہ ان کے چکر میں کبھی پڑا۔ انگلستان کے اکثر جاگیرداروں کے دیہاتی محلوں کے مقابلے میں یاسنایا پولیانا کی کفایت شعارانہ سادگی بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔'' (ماڈ)

21- ڈیل (deal): صنوبر (pine) یا فر (fir) یا اسی قسم کے دیگر درختوں کی لکڑی کے تختے۔ انھیں معیاری سائز کے مطابق کاٹا جاتا ہے۔

وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے۔

-22 شرفا کا انتخاب: مقامی محکموں میں مختلف اسامیاں پر کرنے کے لیے یہ انتخابات وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے۔

-23 کاؤنٹس کا شکریہ: ”روس میں ڈنر کے اختتام پر میزبان خاتون کا شکریہ ادا کرنے کی روایت تھی۔ یہاں اگرچہ معمر کاؤنٹس میزبان نہیں تھی، اس کا شکریہ احتراماً ادا کیا گیا تھا۔“ (ماڈ)

-24 مالوینا: مالوینا (Malvina) کون تھی، اس کے متعلق کہیں سے معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ مارلن منرو کی طرح کی کوئی عورت ہو اور روس کی کسی لوک کہانی کی کردار۔

-25 آرشین (archine یا arshin): ناپ کا روسی پیمانہ۔ تقریباً 28 انچ (71 سینٹی میٹر) کے برابر ہوتا ہے۔ روسی میں یہ لفظ تاتاریوں کی وساطت سے ترکی سے آیا تھا۔

-26 گوسنر (Johann Gossner): گوسنر جرمن پادری اور سِرّیت کا عامل تھا۔ اسے 1817 میں بویریا سے جلاوطن کردیا گیا اور وہ روس چلا آیا۔ یہاں وہ 1820 تا 1824 بائبل سوسائٹی (پروٹسٹنٹ فرقے کی یہ جماعت مختلف ممالک میں بائبل چھپواتی، مختلف زبانوں میں تراجم کراتی اور تقسیم کرتی ہے) کا ڈائرکٹر رہا۔

-27 مادام تاتاوینووا (E.F. Tatawinova) مادام تاتاوینوا نے ایک سِرّی فرقے کی بنیاد رکھی تھی۔ اس فرقے کے ارکان درویشوں کی طرح رقص کرتے اور حال کھیلتے تھے۔ مادام تاتاوینووا کو 1837 میں ایک دور دراز خانقاہ میں بھیج دیا گیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا فرقہ ختم ہوگیا۔ (ماڈ)

-28 کرودے نر (Baroness Barbara Juliana Krudener): (1764 تا 1825): مادام کرودے نر سوویت یونین کی سابقہ ریاست (اب آزاد ملک) لتویا کے صدر مقام ریگا میں پیدا ہوئی۔ وہ جذباتی ناول نگار (اس کے ایک ناول کا نام Valeie ہے اور یہ 1803 میں شائع ہوا تھا) اور سِرّیت کی عامل تھی۔ الیکساندر اول سے اس کی ملاقات 1815 میں ہوئی تھی اور اس نے اسے بے حد متاثر کیا تھا۔

-29 ایکارٹش ہاؤزن (Eckartschausen): سِرّیت کا ایک جرمن عامل۔

-30 معاملات: جن معاملات کو پیئر پرنس تھیودرو کے حلقے کے مقاصد بنا کر پیش کررہا ہے، وہ تقریباً وہی تھے جو دسمبری تحریک کے رہنماؤں کے تھے (”روسی تاریخ“ کا باب دیکھیں)۔ ماڈ کا خیال ہے کہ دسمبری تحریک کے رہنماؤں کا فری میسنوں کے ساتھ، جن کا طالسطائی نے ”جنگ اور امن“ کی دوسری کتاب کے حصہ دوم کے تیسرے چوتھے ابواب میں تفصیل سے ذکر کیا ہے، گہرا یارانہ تھا۔

-31 اس کا انداز: ”اس عبارت کا حکومت مخالف لہجہ طالسطائی کے ابتدائی اور بعد کے خیالات میں تعلق قائم کرتا ہے۔“ (ماڈ)

-32 پوگاچیف (Emelyan Pugachev): پوگاچیف یورال کے قازقوں کا رہنما تھا۔ اس کی قیادت میں قازقوں اور کسانوں نے کیتھرین اعظم کے عہدِ حکومت میں حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ یہ بغاوت جو 1773 میں یورال میں شروع ہوئی تھی، بتدریج دریائے وولگا کے علاقے تک پھیل گئی۔ حکومت نے بڑی مشکل سے اس پر قابو پایا۔ 1775 میں پوگاچیف پکڑا گیا اور اسے گولی سے اڑا دیا گیا۔

33- ٹوگنٹ بنٹ (Tugendbund) مشہور جرمن فلسفی فختے نے اپنے ہم وطنوں میں وطنیت کا جذبہ ابھارنے کے لیے 1807 اور 1808 میں چند لیکچر (Addresses to German Nation) دیے۔ ان سے متاثر ہو کر چند اشخاص نے 1808 میں ایک سوسائٹی بنام ٹوگنٹ بنٹ (League of virtue = جماعت صالحین) تشکیل کی۔ اس کا مقصد لوگوں میں وطنیت کی روح پھونکنا، انھیں لبرل بنانا اور پرشیا کو نپولین کی مداخلت سے آزاد کرانا تھا۔ پرشیا کی حکومت نے 1809 میں اس پر پابندی لگا دی تاہم جماعت زیرزمین کام کرتی رہی۔ پرشیا تو 1813 میں نپولین کے چنگل سے آزاد ہو گیا مگر حکومت ٹوگنٹ بنٹ کے ارکان پر بدستور سختیاں کرتی رہی۔ ماڈ کے مطابق دینی سوف جرمن لفظ بنٹ (Bund = اتحاد) کو روسی لفظ بنت (bunt = ہنگامہ، فساد یا بغاوت) سے خلط ملط کر کے ذومعنویت پیدا کر دے گا۔

34- ڈائری: ''یہاں کاؤنٹس ماریا کی ڈائری سے جو اقتباسات دیے گئے ہیں، وہ کافی حد تک طالسطائی کی اپنی والدہ کی بچوں کے بارے میں یادداشتوں سے ملتے جلتے ہیں۔ یہ یادداشتیں ابھی تک محفوظ ہیں۔'' (ماڈ)

35- سموندی (Jean Charles Sismondi): (1773 تا 1842)۔ سوستانی مورخ۔ اس نے یورپی تاریخ کے متعلق متعدد کتابیں تحریر کیں۔ اس کی تصنیف Litterature du Midi de l' Europe(1813) کا اس زمانے میں بہت شہرہ ہوا اور انگریزی میں بھی ترجمہ کیا گیا۔

36- موںتس کیو (Charles Montesquieu): (1689 تا 1757)۔ فرانسیسی بیرن۔ اس نے عملی زندگی کا آغاز سیاست سے کیا لیکن آنکھیں خراب ہونے کی وجہ سے تحقیق و تصنیف کی طرف مائل ہو گیا۔ اس نے اپنی کتاب Lettres Persanes (1761) میں دو ایرانی مسافروں کی زبانی فرانسیسی معاشرے پر لطیف طنزیں کیں۔ Causes de la Grandeur des Romains et de leur Decandence(1734) اس کی بہترین تصنیف تصور کی جاتی ہے۔ تاہم اس کی ضخیم کتاب De l' Esprit des Lois) بہت مقبول ہوئی اور دو سال سے بھی کم عرصے میں اس کے بائیس ایڈیشن شائع ہوئے۔ وہ برطانوی آئین کو بہترین قرار دیتا تھا اور اس کی تصنیفات نے یورپی لوگوں کو بہت متاثر کیا۔

37- آپ اس سے ملے تھے؟: ''یہاں جس قسم کے ناواجب حسد کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ طالسطائی اور اس کی بیوی کے باہمی تعلقات میں ہمیشہ بدمزگی کا سبب بنا رہا۔'' (ماڈ)

38- پلوٹارک (Plurarch) (تقریباً 46 تا 120)۔ یونانی مورخ اور فلاسفر۔ اس کی مشہور ترین کتاب ''متوازی زندگیاں'' (Parallel Lives) ہے۔ اس میں اس نے چالیس یونانی اور رومی شخصیتوں کی کردارکشی کی ہے۔ وہ ایک یونانی اور ایک رومی شخصیت کو لیتا تھا اور دونوں کا باہمی موازنہ کر کے ان کی داستان حیات قلم بند کرتا تھا۔

39- سکیوولا (Mucius Sceavola): قدیم روم کا داستانی ہیرو۔ کہا جاتا ہے کہ روم کے ایک حریف حکمران لارس پورسینا (Lars Porsena) نے 509 ق م میں روم پر حملہ کر دیا۔ اس پر سکیوولا کو بہت غصہ آیا اور اس نے پورسینا کو قتل کرنے کا عزم باندھ لیا۔ وہ کسی طرح اس کے خیمے میں داخل ہو گیا اور اس نے غلطی سے اس کے سیکرٹری کو قتل کر

دیا۔ وہ پکڑا گیا اور اسے پورسینا کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس پر الزام یہ تھا کہ تین سو رومی نوجوانوں نے پورسینا کو قتل کرنے کی سازش کی ہے اور یہ بھی ان میں شامل ہے۔ اسے دھمکی دی گئی کہ اگر اس نے اس ساری سازش سے نقاب نہ سرکایا، اسے سخت ایذائیں دی جائیں گی اور موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ سکیوولا نے اپنا ہاتھ آگ میں ڈال دیا۔ ہاتھ جلتا رہا یہاں تک وہ بالکل بھسم ہو گیا۔ پورسینا اس کی دلیری سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اسے رہا کر دیا۔ اس کے بعد پورسینا نے رومیوں سے صلح کر لی۔ ''سکیوولا'' کے لغوی معانی ''کھبا'' (چپ دست) ہیں اور یہ روم کے ایک سرکردہ خاندان کا نام تھا۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نام کی توضیح کرنے کے لیے یہ افسانہ تراشا تھا۔

حصہ دوم

1- بادشاہوں کا الوہی اختیار یا حق (Divine right (authority) of Kings): ایک سیاسی نظریہ۔ اس کے تحت بادشاہ اپنے اعمال کے لیے صرف خدا کے سامنے جواب دہ تھے کیونکہ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ انھیں خود خدا نے لوگوں پر حکومت کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔ جہاں تک رعایا کا تعلق ہے، اس کا فرض بنتا ہے کہ وہ ان کے احکام کی بلا چون و چرا تعمیل بجالائے اور ان کے کسی فعل پر اعتراض نہ کرے بلکہ جو کچھ وہ کرتے ہیں، اسے صحیح تسلیم کرے۔ یہ نظریہ شروع تو قرون وسطیٰ میں ہوا تھا لیکن اسے صحیح فروغ سولھویں اور سترھویں صدی میں ہوا۔ انگلستان میں سٹوارٹ خاندان کے بادشاہ اور فرانس میں لوئی چہاردہم اس کے بالخصوص علم بردار تھے۔

2- گبن (Edward Gibbon): (1737 تا 1794) انگریز مورخ۔ اس کی مشہور ترین کتاب "The History of the Decline and Fall of Roman Empire" (1776 تا 1788) ہے۔

3- بکل (Henry Thomas Buckle): (1821 تا 1862): انگریز مورخ۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے انسانی تہذیب کی تاریخ لکھنے کے لیے اٹھارہ زبانیں سیکھیں اور بائیس ہزار کتب پر مشتمل لائبریری بنائی۔ تاہم اس نے جس عظیم کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اس کا صرف ایک حصہ "An introduction to the History of Civilization in England" (1857 تا 1861) کے نام سے شائع ہو سکا۔ اس کی کمزور صحت نے باقی کام مکمل نہ ہونے دیا۔

4- لوئی چہاردہم (Louis XIV): فرانس کے بوغ بوں خاندان کا عظیم ترین حکمران۔ وہ پانچ سال کی عمر میں تخت نشین ہوا اور اپنی وفات (1715) تک حکومت کرتا رہا۔ اس نے اپنے حریفوں کے خلاف ہسپانیہ، ہالینڈ اور جرمنی میں تین جنگیں لڑیں۔ پہلی دو جنگوں میں، جو 1672 تا 1678 اور 1688 تا 1697 کے درمیان میں لڑی گئیں، اسے زبردست کامیابیاں حاصل ہوئیں اور اس کی دھاک سارے یورپ میں بیٹھ گئی۔ وہ پہلے ہی مستبد ترین حکمران تھا اور ان فتوحات نے اسے بالکل ہی ''ہم چو ما دیگرے نیست'' بنا دیا اور وہ شاہوں کے الوہی حقوق (حاشیہ نمبر 1) پر شدومد سے اصرار کرنے لگا۔ تیسری جنگ (1701 تا 1713) میں اسے ذلت آمیز شکست ہوئی۔ رسی جل گئی، پر بل نہ گیا۔ اس کا رویہ پہلے سے بھی زیادہ استبدادی ہو گیا۔ وہ عورتوں کا بھی زبردست شکاری تھا۔ 1685 میں اس

نے اپنی پہلی بیوی کی وفات پر جو شاہ ہسپانیہ کی دختر تھی، اپنی ایک داشتہ سے شادی کر لی۔ تاہم اس میں ایک خوبی تھی۔ وہ فرانسیسی ادیبوں، مصوروں اور موسیقاروں کی دل کھول کر سرپرستی کرتا تھا۔ کارنیل، راسین، مولیئر اور بولیو جیسے شہرہ آفاق ادیب اسی کے دربار سے وابستہ تھے۔

-5 شٹائین (Baron Heinrich Friedrich Karl Stein): (1757 تا 1831): پرشیا کے بادشاہ فریڈرک ولیم سوم کا مالی مشیر۔ اس نے جو مالی اور دیگر اصلاحات کیں، وہ بعد میں پرشیا (اور جرمنی) کی عظمت کی اساس بنیں۔ اس نے زرعی غلامی کو ممنوع قرار دیا، طبقاتی اور جاگیرداری نظام ختم کیا، کسانوں کو زمین کا مالک بنایا، تجارت کو آزاد کیا اور اجارہ داریوں کا خاتمہ کیا، میونسپل حکومت کا نظام قائم کیا اور فوج میں اصلاحات کیں۔ نپولین نے اسے ملازمت سے نکلوا دیا، وہ آسٹریا چلا گیا لیکن جانے سے پہلے اپنی کتاب "Political Testament" چھپوا گیا۔ 1812 میں وہ سینٹ پیٹرزبرگ چلا گیا اور اسی نے نپولین کے خلاف متحدہ محاذ بنوایا۔ اس کے بعد نپولین کے خلاف جتنے اقدامات ہوئے، ان سب کے پیچھے اسی کا دماغ کام کرتا رہا تھا۔

-6 لوئی ہژدہم: (1755 تا 1824): لوئی ہژدہم لوئی شانزدہم کا، جو انقلاب فرانس کے بعد ہلاک کر دیا گیا تھا، بھائی تھا۔ انقلاب فرانس کے بعد وہ فرار ہو گیا اور مختلف ملکوں میں پھرتا پھراتا انگلستان پہنچ گیا۔ 1814 میں نپولین کے اتحادیوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد اسے فرانس کا بادشاہ بنایا گیا۔ اس نے انقلاب کے حامیوں سے چن چن کر بدلے لیے اور سابقہ مذموم شاہی روایات زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سے نپولین کی ایلبا سے واپسی کی راہ ہموار ہو گئی۔ نپولین کی واٹرلو میں شکست کے بعد وہ دوبارہ بادشاہ بنا لیکن اپنی حرکتوں سے باز نہ آیا اور مخالفوں کا ایک بار پھر قتل عام شروع ہو گیا۔ جب 1824 میں اس کا انتقال ہوا، فرانسیسیوں نے اطمینان کی سانس لی۔

-7 تالی غاں (Charles Maurice Talleyrand): (1754 تا 1838): فرانسیسی سیاست دان۔ اس نے اپنی عملی زندگی کا آغاز بحیثیت مذہبی رہنما کیا اور ترقی کرتے کرتے بشپ بن گیا۔ انقلاب فرانس کے بعد اس کا پوپ سے جھگڑا ہو گیا اور اسے رومن کیتھولک مذہب سے نکال دیا گیا۔ اب وہ سیاست میں سرگرم حصہ لینے لگا۔ چند ہی سالوں میں وہ انقلابی حکومت کا وزیر خارجہ مقرر ہو گیا۔ اس نے نپولین کو برسر اقتدار لانے میں بڑا اہم کردار ادا کیا اور نپولین نے اسے پرنس کا خطاب دیا۔ تاہم وہ نپولین کے روس پر حملے کے خلاف تھا۔ یوں دونوں میں ان بن ہو گئی اور وہ نپولین کے مخالف لوگوں کا سربراہ بن گیا۔ جب نپولین اقتدار سے محروم ہوا، وہ نئی حکومت میں وزیر خارجہ بن گیا۔ ویانا کانگرس میں اس نے کمال مہارت کا مظاہرہ کیا اور اتحادیوں سے فرانس کی 1792 کی سرحدیں منوانے میں کامیاب رہا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ڈھٹائی کی حد تک بدعنوان، بدکردار، خودغرض اور دروغ گو تھا لیکن اس کے ساتھ وہ بے حد عیار، چابک دست اور انسانوں کا نباض تھا۔ وہ اپنی سفارت کاری سے اپنے اور اپنے ملک کے مفادات کا دفاع کرنے میں کبھی ناکام نہ رہا۔

-8 ویانا میں مذاکرات: یہ مذاکرات 1814 میں ویانا کانگرس کے نام سے منعقد ہوئے تھے۔ ان میں یورپ کے تقریباً تمام ممالک کے حکمران یا ان کے نمائندے شریک ہوئے۔ (فرانس کی نمائندگی تالی غاں نے کی۔ اسے پہلے تو کسی

نے کوئی گھاس نہ ڈالی لیکن وہ اپنی فراست سے اپنے ملک کے حقوق منوانے میں کامیاب رہا۔) کانگرس میں دو گروپ بن گئے۔ایک کی رہنمائی روس اور پرشیا اور دوسرے کی آسٹریا اور برطانیہ کر رہے تھے۔فریقین میں جھگڑا ہوا ہی چاہتا تھا کہ فرانس پر نپولین کے دوبارہ قبضے کی خبر موصول ہوئی۔انھوں نے اپنے اختلافات بالائے طاق رکھے اور نئے فتنے سے عہد برآ ہونے کے لیے پھر متحد ہوگئے۔نپولین کی آخری شکست کے بعد 1815 میں دوسری ویانا کانگرس منعقد ہوئی اور اس میں یورپی ممالک کی از سر نو حد بندی کی گئی۔

-9 تیئر (Louis Adolphe Thiers): (1797 تا 1877): فرانسیسی سیاست دان اور مورخ۔وہ دو مرتبہ فرانس کا وزیر خارجہ اور ایک مرتبہ ملک کا صدر رہا۔اس کی دو ضخیم کتابیں "Historie de la Revolution Francaise" (10 Vol.1823-27) (''تاریخ انقلاب فرانس'') اور "L' Histoire du Consulat et de l' Empire" (20 Vol. 1845-62) (''قونصلیت اور امپراطوریہ کی تاریخ'') ہیں۔مؤخر الذکر میں زیادہ تر نپولین کے عہد حکومت کی داستان بیان کی گئی ہے۔دونوں کتابیں ضخیم ضرور ہیں لیکن نقاد انھیں عظیم تسلیم نہیں کرتے کیونکہ ان کے مطابق ان میں غلط بیانیوں کی بھرمار ہے۔

-10 لاں فئے (Pierre Lanfrey): (1828 تا 1877): فرانسیسی مورخ اور ری پبلیکن سیاست دان۔اس کی مشہور ترین کتاب "Histoire du Na poleaon" (5vol. 1867-75) ہے۔اس میں نپولین پر سخت تنقید کی گئی ہے۔

-11 گروینس (George Gottfried Gervinus): (1805 تا 1871): جرمن مورخ اور ادبی نقاد۔گوٹنگن اور ہائیڈل برگ یونیورسٹیوں میں تاریخ کا پروفیسر رہا اور 1848 میں قومی اسمبلی کا ممبر بھی منتخب ہوا۔1849 اور 1852 کے دوران میں اسی نے شیکسپیئر کے ڈراموں پر سیر حاصل اور معرکتہ الآراء تبصرے تحریر کیے (ان کا انگریزی ترجمہ 1862 میں شائع ہوا)۔ماڈ کے بقول طالسطائی کو نہ اس کی تاریخ کی کتابیں پسند آئیں اور نہ اس کے شیکسپیئر کے ڈراموں پر تبصرے۔

-12 شلوسر (Friedrich Christoph Schlosser): (1776 تا 1861) جرمن مورخ اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی میں تاریخ کا پروفیسر۔اس کی مشہور ترین کتاب ''یونیورسل ہسٹری'' ہے۔

-13 میٹرنش: تیسری کتاب، حصہ اول، حاشیہ نمبر 3 دیکھیں۔

-14 مادام دَ سٹیل: چوتھی کتاب، حصہ دوم، حاشیہ نمبر 30 دیکھیں۔

-15 تالی غاں: تیسری کتاب، حصہ اول، حاشیہ نمبر 5 دیکھیں۔

-16 فختے: (Johann Gottlieb Fichte): (1762 تا 1814): جرمن فلسفی۔اس نے فوق تجربی یا وجدانی عینیت (transcendental idealism) کے بارے میں اپنا نظریہ پیش کیا۔اس پر الحاد کا الزام لگا اور یونیورسٹی آف جینا سے، جہاں وہ فلسفے کے شعبے کا صدر تھا، نکال دیا گیا۔جرمنی میں نپولین کی فتوحات کے بعد اس نے ''جرمن قوم کے نام خطابات'' کا سلسلہ شروع کیا۔امن قائم ہونے کے بعد اسے برلن یونیورسٹی میں ریکٹر مقرر کیا گیا۔

-17 شاتوبغیاں: تتمہ، حصہ اول، حاشیہ نمبر 3 دیکھیں۔

-18 "le Contrat Social" ("عمرانی معاہدہ"): فرانسیسی مصنف روسو کی شہرہ آفاق کتاب۔ اس کتاب کا آغاز اس مقدمے سے ہوتا ہے کہ معاشرے کی اساس اس ابتدائی معاہدے پر قائم ہے جس کی رو سے انسان اس شرط پر، کہ اسے تحفظ فراہم کیا جائے گا، اپنا منشا سب کے منشا کے تابع بنا دیتا ہے۔ کتاب میں جمہوری نظام حکومت اور عام حق رائے دہی کی پرزور وکالت کی گئی ہے۔ اسی کتاب میں سب سے پہلے حریت، مساوات اور اخوت کا نظریہ پیش کیا گیا اور یہی تینوں الفاظ انقلاب فرانس کا نعرہ بنے۔

-19 ہرکولیس (Hercules): ایک داستانی ہیرو۔ یونانی میں اسے ہیراکلیز (Heracles) کہا جاتا ہے۔ یونانی دیومالا کے مطابق وہ قوی ترین شخص تھا۔ ابھی وہ دودھ پیتا بچہ تھا کہ اس نے ایک بہت بڑے سانپ کو، جو اس کے پالنے میں گھس آیا تھا، ہلاک کر دیا۔ دیوتاؤں نے اس کے ذمے بارہ مشکل ترین کام — ایک خوف ناک ببر شیر اور ایک نوسرے عفریت کو ہلاک کرنا، تیز ترین بارہ سنگھے اور ایک جنگلی سور کو پکڑنا، تین ہزار بیلوں کے اصطبل کو، جو اس میں تیس سال سے رہ رہے تھے، صاف کرنا، آدم خور پرندوں کو ہلاک کرنا، ایک خوبصورت لیکن پاگل سانڈ پر قابو پانا، انسانی گوشت پر پلنے والی گھوڑیوں کو قبضے میں لینا، مردنما عورتوں (amazons) کی ملکہ کی پیٹی لانا، تین اجسام والی بلا کو موت کے گھاٹ اتارنا، بارہ طلائی سیب تلاش کرنا اور زیر زمین مُردوں کی دنیا سے تین سرے کتے کو لانا۔ لگائے اور اس نے اپنی جسمانی طاقت سے یہ تمام کام سرانجام دیے۔

-20 لوئی یازدہم (Louis XI): (1423 تا 1483): فرانس کا بادشاہ۔ وہ بچپن سے حکمرانی کے خواب دیکھتا رہا تھا اور اس نے متعدد بار اپنے باپ کو تخت سے محروم کرنے کی سازشیں کیں۔ یوں اسے ملک بدر ہونا پڑا، تاہم وہ 1461 میں بادشاہ بن ہی گیا۔ اس نے اپنے متعدد حریفوں کو شکستیں دیں لیکن اس کی کامیابیوں میں اس کی فوجی مہارت کی نسبت اس کی عیاری کا زیادہ ہاتھ تھا۔ وہ انھیں آپس میں لڑاتا اور ان کے علاقوں میں بغاوتیں کراتا رہتا تھا۔ اس کا مشیر اعلیٰ ایک حجام تھا اور اس پر ہر وقت موت کا خوف سوار رہتا تھا۔ تاہم وہ فنون لطیفہ اور علوم کا بڑا قدر دان تھا اور اس نے تین یونیورسٹیاں قائم کیں۔

-21 bureau d' echange: وہ دفتر، دکان یا ادارہ جہاں ایک ملک کی کرنسی دوسرے ملک کی کرنسی سے تبدیل کی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ کام پہلے صرف بینک سرانجام دیتے تھے، اب دوسرے لوگوں کو بھی اجازت مل گئی ہے۔

-22 نپولین سوم: (1808 تا 1873): نپولین اول کا بھتیجا۔ نپولین کے اکلوتے بیٹے کی وفات (1732) پر وہ نپولین خاندان کا سربراہ بن گیا اور اپنے چچا کا تخت حاصل کرنے کی سازشوں میں مصروف ہو گیا۔ ایک بار تو وہ گرفتار ہونے سے بچ گیا اور امریکا بھاگ گیا۔ 1840 میں اس نے بولون کے مقام پر دوسری مرتبہ کوشش کی، اب کے وہ پکڑا گیا اور ایک قلعے میں تا حیات نظر بند کر دیا گیا۔ تاہم پانچ سال کی نظر بندی کے بعد وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور انگلستان چلا گیا۔ 1848 میں مزدوروں نے کامیاب انقلاب برپا کیا، وہ پیرس لوٹ آیا اور قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہو گیا۔ اسی سال وہ ملک کا صدر منتخب ہوا اور 1851 کے انتخابات میں وہ دس سال کے لیے صدر چن لیا گیا۔ لیکن 1852 میں اس نے اپنے آپ کو امپراطور قرار دے دیا۔ اس کا اہم ترین کارنامہ پیرس کی تعمیر نو ہے۔ اس نے زبردست

جنگیں بھی کیں۔ کریمیا اور اطالیہ میں تو اسے کامیابی ہوئی لیکن 1870 میں پرشیا میں اسے ذلت آمیز شکست ہوئی، وہ گرفتار ہوا، تاج و تخت سے محروم ہوا اور اس نے زندگی کے آخری سال جلاوطنی میں انگلستان میں گزارے۔

-23 بولون: پورا نام Boulogne-sur-Mer ہے۔ رود بار انگلستان کے ساحل پر فرانسیسی بندرگاہ۔

-24 کنفیڈریشن آف رائن (Confederation of the Rhine): 12 جولائی 1806 کو نپولین کی تحریک پر جرمنی کی متعدد ریاستوں کے حکمرانوں نے، جن میں بادشاہ، گرینڈ ڈیوک اور ڈیوک شامل تھے، یہ کنفیڈریشن بنائی تھی۔ یوں جرمنی کے بیشتر علاقے پر فرانس کی سیادت قائم ہوگئی۔

-25 کنونشن، ڈائرکٹری وغیرہ: انقلاب فرانس اور نپولین کے عہد حکومت کے مابین کا دور مندرجہ ذیل میں تقسیم کیا جاتا ہے:

(1) Estates-General اور آئین ساز اسمبلی (Counsituent Assembly): 5 مئی 1789 تا 30 ستمبر 1791: آئینی بادشاہت بحال رہی، تاہم اصل اختیارات اونچے درمیانے طبقے کے پاس تھے۔

(2) قانون ساز اسمبلی (Legislatif): یکم اکتوبر 1791 تا 21 ستمبر 1792: بادشاہت کچھ عرصہ جاری رہی تاہم بعد میں معطل کر دی گئی۔ اختیارات نچلے طبقے کو منتقل ہونے لگے۔

(3) قومی کنونشن (Convention Nationale): 21 ستمبر 1792 تا 25 اکتوبر 1795: یہ انقلاب کا نقطۂ عروج تھا۔ اس زمانے میں اقتدار زیادہ تر نچلے طبقے کے پاس تھا۔ کنونشن نے، جسے نیا آئین مرتب کرنے کے لیے بلایا گیا تھا، پہلے بادشاہت کا خاتمہ کیا اور پھر بادشاہ کو سزائے موت دی۔ اس زمانے میں بے پناہ کشت و خون ہوا اور کنونشن اس ظلم و ستم کی تائید کرتی رہی۔ تاہم بعد میں اس نے تشدد کے مرتکبین کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ اس نے بیرونی دشمنوں کے خلاف بھی مزاحمت کی۔

(4) ڈائرکٹری (Directoire): 26 اکتوبر 1795 تا 9 اکتوبر 1799: درمیانے طبقے نے دوبارہ اقتدار پر قبضہ کر لیا۔ ملک میں پارٹیاں بننے لگیں، فوج مضبوط ہونے لگی اور بالآخر اس کی مدد سے نپولین نے انقلاب برپا کر دیا۔ اس دورِ حکومت کو ری پبلکن کہا جاتا ہے۔

(5) قونصلیٹ (Consulat): 25 دسمبر 1799 تا 20 مئی 1804: اس زمانے میں اقتدار میں فوجی اور غیر فوجی دونوں شریک تھے، تاہم اصل اختیارات ایک ہی شخص — نپولین — کے پاس تھے۔ طرزِ حکومت برائے نام ری پبلکن تھا۔
(6) (پہلی) امپراطوریہ: 20 مئی 1804 تا 11 اپریل 1814 اور یکم مارچ 1815 تا 22 جون 1815: نپولین کا بحیثیت امپراطور عہد حکومت۔

-26 ''خوف ناک'' یا ''ہیبت ناک'' ایوان (Ivan the Terrible) یا ایوان چہارم: (1531-1584): روس کا پہلا حکمران، جس نے زار کا لقب اختیار کیا۔ استرخان، قازان اور سائبیریا اسی کے عہد حکومت میں روس کا حصہ بنے۔ اس نے امرا، جو بویار کہلاتے تھے، ماسکوٹوز اور نُوگورد اور دوسرے علاقوں کے شہریوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے اور غصے سے بے قابو ہو کر اپنے بیٹے کو بھی قتل کر دیا لیکن تین سال بعد یہی صدمہ اس کی موت کا باعث بنا۔ (''روسی تاریخ'' کا باب بھی دیکھیں)

27- چارلس اول: (1600 تا 1649) برطانوی بادشاہ۔ اس کی پارلیمنٹ سے ٹکر ہوگئی۔ دونوں فریقوں کی اپنی اپنی افواج تھیں۔ چارلس کی افواج پٹ گئیں۔ وہ پکڑا گیا اور اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

28- لوئی پانزدہم: (Louis XV): (1710 تا 1774): لوئی چہاردہم کا پڑپوتا (لوئی چہاردہم کا بیٹا اور بڑا پوتا اس کی زندگی کے میں ہی فوت ہو گئے تھے)۔ اس کے عہد حکومت میں فرانس انگریزوں سے بار بار پٹتا رہا اور انگریزوں نے اس سے کینیڈا، ویسٹ انڈیز کے جزائر اور کئی دیگر مقبوضات چھین لیے۔ ایک تو جنگوں کے اخراجات، اوپر سے لوئی پانزدہم کی شاہ خرچیاں وہ اپنی داشتاؤں پر روپیہ پانی کی طرح بہاتا تھا۔ اس نے پانچ سال میں اپنی ایک داشتہ کو اٹھارہ کروڑ لیور (ایک لیور آدھ سیر چاندی کے برابر ہوتا تھا) عطا کر دیے۔ نتیجہ؟ ملک دیوالیہ ہو گیا۔ خود شاہ چیچک میں مبتلا ہو گیا اور جب مرا، کسی نے اس کی موت پر آنسو بھی نہ بہایا ("le bien aime")

29- شاغل دہم (Charles X): (1757 تا 1836): لوئی پانزدہم کا پوتا۔ لوئی ہژدہم کے انتقال پر 1844 میں فرانس کا بادشاہ بنا۔ اس نے مطلق العنان بننا چاہا لیکن عوام نے بغاوت کر دی۔ اسے تخت چھوڑنا پڑا۔ (2 اگست 1830) وہ پراگ چلا گیا اور وہیں بیٹھے سے انتقال کر گیا۔

30- لوئی فلپ (Louis Philippe): (1773 تا 1850): فرانس کا ''عوامی'' بادشاہ، کہ اس کا تعلق شاہی خاندان سے نہیں تھا۔ وہ ڈیوک کا بیٹا تھا لیکن خاندانی خطاب ترک کر کے عام شہری بن گیا تھا اور یوں عوام میں بہت مقبول ہو گیا۔ جب شاغل دہم تخت سے دست بردار ہوا، اسے بادشاہ ''منتخب'' کر لیا گیا۔ اس کا شروع کا عہد حکومت بہت اچھا رہا اور عوام کی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔ پھر اس کے دماغ میں ''اصلی بادشاہ'' بننے کا خناس سمانے لگا اور وہ لوگوں کی تحریر و تقریر کی آزادیاں چھیننے لگا۔ چنانچہ اس کے خلاف بھی بغاوت ہوئی اور وہ 1850 میں ''مسٹر سمتھ'' کے فرضی نام سے انگلستان بھاگ گیا۔ اس کے عہد میں فرانس نے الجزائر پر قبضہ کرنا شروع کیا۔

31- دورو (Denis Diderot): (1713-1784): فرانسیسی مفکر اور مصنف۔ اس نے Eneylopedie (یہ قاموس العلوم 28 جلدوں پر مشتمل تھی اور چودہ سالوں میں مکمل ہوئی) کے ذریعے روشن خیالی کی تحریک کو آگے بڑھانے میں ہاتھ بٹایا۔

32- بوماغ شائی (Pierre Beaumarchais): (1732-1799) فرانسیسی ڈرامہ نگار۔ اس نے اپنی تخلیقات میں جاگیرداری نظام پر زبردست چوٹیں کیں۔

33- کربسکی (Prince Andrei Kurbsky): (تقریباً 1528 تا 1583) کربسکی خوف ناک ایوان کا سب سے بڑا مخالف تھا اور لتھوانیا میں اس کے دشمنوں سے جا ملا تھا۔ دونوں کے مابین خط کتابت کے ذریعے طویل مناظرہ ہوا تھا۔ روسی نقاد ڈی۔ ایس مرسکی کا کہنا ہے کہ خوف ناک ایوان کو پمفلٹ لکھنے میں کمال کا ملکہ حاصل تھا، بلکہ وہ اس میدان کا عبقری تھا۔

34- گودفغے (Godfrey of Bouillon)۔ (تقریباً 1061 تا جولائی 1100): گودفغے بلجیم کے ایک کاؤنٹ کا بیٹا تھا اور خاصا دلیر آدمی تھا۔ وہ پہلی صلیبی جنگ میں شریک ہوا اور بہت جلد عیسائیوں کا رہنما بن گیا۔ جب عیسائی

افواج نے بیت المقدس فتح کر لیا، گوڈفغے فلسطین کا بادشاہ قرار پایا۔

35- پطرس راہب (Peter the Hermit): پطرس راہب فرانس میں گیارھویں صدی کے تقریباً وسط میں پیدا ہوا۔ وہ کچھ عرصہ فوج میں رہا، پھر راہب بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ 1095 سے قبل زیارتوں کے لیے فلسطین گیا تھا۔ واپسی پر وہ یورپ کے مختلف ممالک میں گھومنے، عیسائی زائرین پر مسلمانوں کے "ظلم و ستم" کی داستانیں پھیلانے اور لوگوں کو فلسطین پر حملہ کرنے کے لیے بھڑکانے لگا۔ اس نے کوئی تین لاکھ کا ہجوم اکٹھا کر لیا۔ پوپ کی اشیر باد بھی مل گئی۔ ان میں سے پہلے گروپ کو بلغاریہ، دوسرے کو ترکی اور تیسرے اور چوتھے کو ہنگری میں شکست دی گئی۔ پطرس نے ہمت نہ ہاری۔ اب کے اس نے مختلف ممالک سے چھ لاکھ افراد پر مشتمل باقاعدہ فوج اکٹھی کی۔ بڑے بڑے جرنیل بھی اس فوج میں شامل تھے۔ اس پانچویں صلیبی فوج نے انطاکیہ کا محاصرہ کیا۔ یہ محاصرہ سات مہینے جاری رہا۔ جب کوئی کامیابی نہ ہوئی، اکثر لوگ واپس بھاگ گئے، ان میں پطرس بھی شامل تھا۔ واپسی پر اس نے خانقاہ بنائی اور 1115 کے قریب اسی میں انتقال کر گیا۔

36- منی سنگر (Minnesinger): (لفظی معنی "محبت کے گیت گانے والا"): بارھویں اور تیرھویں صدی میں جرمنی کے اونچے طبقے کے بعض اشخاص شاعر اور سنگیت کار ہوتے تھے۔ وہ باقاعدہ انجمنیں (guilds) بناتے، گیت لکھتے اور گا کر ایک دوسرے کا مقابلہ کرتے۔ چودھویں صدی میں کاریگروں کے طبقے کے شعراء (Meister Singers: ماہر شعراء) اپنا لوہا منوانے لگے اور منی سنگروں کا زوال شروع ہو گیا۔

37- لوتھر (Martin Luther): (1438-1546): مارٹن لوتھر (جرمن زبان میں اس کے نام کا تلفظ لوٹر ہے) ایک جرمن راہب تھا۔ وہ 1510 اور 1511 میں روم میں مقیم رہا۔ وہاں پوپ اور رومن کیتھولک مذہب کے دوسرے رہنما جن بدعنوانیوں اور افعالِ شنیعہ کے مرتکب ہو رہے تھے، انھیں دیکھ کر اسے سخت صدمہ پہنچا۔ وہ واپس جرمنی پہنچا، اس نے یہ سب باتیں کاغذ پر تحریر کیں اور یہ کاغذ ایک گرجے کے باہر لٹکا دیا۔ اس پر پوپ سخت ناراض ہوا اور اس نے لوتھر کو رومن کیتھولک مذہب سے نکال دیا۔ یوں یورپ میں تحریکِ اصلاحِ مذہب چل پڑی۔ چونکہ لوتھر اور اس کے ساتھی برائیوں کے خلاف پروٹسٹ (احتجاج) کرتے تھے، اس لیے انھیں پروٹسٹنٹ کہا جانے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ تحریک دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئی اور لوگوں میں مذہبی فساد ہونے لگے۔ حکومتیں بھی ان کی زد میں آ گئیں اور مختلف ممالک کے مابین جنگیں بھی ہوئیں۔ شمالی آئرلینڈ میں رومن کیتھولکوں اور پروٹسٹنٹوں کے مابین حال ہی تک فساد ہوتا رہا ہے۔

38- عازم میکسیکو: نپولین سوم نے آسٹریا کے امپراطور فرانز یوزوف (Franz Josef) کے بھائی فرڈی ننڈ میکسی میلین (1832 تا 1867) کو میکسیکو کا امپراطور بنوا دیا (وہ اپنی فوج کے ذریعے میکسیکو پر پہلے ہی قبضہ کر چکا تھا)۔ امریکہ کے احتجاج پر نپولین سوم نے اپنی فوج واپس بلا لی۔ پھر میکسیکو کے باشندوں نے بغاوت کر دی۔ انھوں نے میکسی میلین کی فوج کو شکست دی اور اسے قتل کر دیا۔

39- بسمارک (Prince Otto Bismark) پرشیا کا "آہنی چانسلر" (وزیر اعظم) اور ملک کا عملاً حکمران۔ اس نے

1866 میں آسٹریا کو زبردست شکست دی اور اس کے بہت سے علاقے ہتھیا لیے۔ اس نے جرمنی کی مختلف ریاستوں کو متحد کیا اور جدید جرمنی کی بنیاد رکھی۔

-40 بوہیمیا: آسٹروی امپراطوریہ کا صوبہ۔ بسمارک کی فوج نے سب سے پہلے اسی پر حملہ کیا تھا۔ آج کل یہ چیکوسلواکیہ میں شامل ہے (ویسے چیکوسلواکیہ اب خود دو ممالک میں تقسیم ہو چکا ہے)

-41 غیر نفوذ پذیری (impermeability): ٹھوس چیز میں سے مائعات گزر نہیں سکتے۔ اس خصوصیت کو ''غیر نفوذ پذیری'' کہا جاتا ہے۔ یہ لفظ فزکس اور ارضیات میں استعمال ہوتا ہے۔

-42 اٹیلا (Attila): (406 تا 453) اٹیلا، جس کا نام سن کر یورپ کے لوگوں میں آج بھی دہشت طاری ہو جاتی ہے اور جسے وہ ''خدائی تازیانہ'' کہتے ہیں، 434 میں ہن قوم کا، جو بحیرہ کیسپیئن سے دریائے ڈینیوب تک کے علاقے میں آباد تھی، بادشاہ بنا۔ اس نے شمالی ہنگری میں اپنا صدر مقام بنایا اور مختلف اقوام پر مشتمل زبردست فوج تشکیل دی اور قلیل عرصے میں اس کی سلطنت شمالی یورپ بشمول جرمنی سے چین تک وسیع ہو گئی۔ وہ جدھر جاتا، تباہی و بربادی اس کی جلو میں ہوتی۔ 447 میں اس نے بحیرہ اسود اور بحیرہ روم کے درمیان تمام علاقے کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور مشرقی رومی امپراطور کو خراج ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ 451 میں اس نے فرانس پر حملہ کر دیا لیکن شکست کھائی (اس لڑائی میں دو لاکھ آدمی کھیت رہے) اگلے سال اس نے اطالیہ کو روند ڈالا۔ پوپ نے بہت بڑی رقم دے کر روم کو تباہی سے بچایا۔ تاہم اٹیلا 453 میں اچانک انتقال کر گیا، ہنوں کا شیرازہ بکھر گیا اور یورپ نے اطمینان کی سانس لی۔

-43 کیپلر (Johannes Kepler): (1571 تا 1630): جرمن ماہر فلکیات اور جدید فلکیات کا باوا آدم۔ یہ بات تو پہلے ہی دریافت ہو چکی تھی کہ سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔ کیپلر کے تین قوانین اس نظریے کی مزید وضاحت کرتے ہیں۔

-44 نیوٹن (Sir Isaac Newton): (1644 تا 1727): ماہر ریاضی و فزکس۔ کششِ ثقل کا نظریہ اسی کی دریافت ہے۔

-45 کوپرنیکس (Nicolaus Copernicus): (1473 تا 1543) پولستانی ماہر فلکیات۔ پولستانی زبان میں اس کا نام Mikotaj Kopernik ہے۔ اس نے 1543 میں یہ ثابت کیا کہ نظام شمسی کا مرکز زمین نہیں، سورج ہے اور یہ کہ زمین اور دوسرے سیارے سورج کے گرد گھومتے ہیں۔

-46 بطلیموس: بطلیموس (Ptolemy) (تقریباً 90 تا تقریباً 168) بطلیموس یونانی مصری تھا۔ اس کا اصل نام Claudius Ptolemaeus تھا۔ سب سے پہلے اسی نے یہ نظریہ پیش کیا تھا کہ زمین کائنات کا مرکز ہے اور یہ کہ سورج، چاند، سیارے اور ستارے اس کے گرد گھومتے ہیں۔ مسلمانوں نے اس کی کتابیں عربی میں ترجمہ کیں اور انھی کی وساطت سے یورپ میں پہنچیں۔ بطلیموس فلکیات کے علاوہ جغرافیے کا بھی عالم تھا۔ کولمبس اسی کی کتاب Geographike Hyphegesis سے متاثر ہو کر نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہوا تھا۔

-47 یشوع: یشوع حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خادم نون کے بیٹے تھے۔ بائبل (پرانا عہد نامہ، یشوع) کے مطابق خداوند نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد یشوع کو یہودیوں کا سربراہ مقرر کیا اور انھیں حکم دیا کہ وہ اپنی

امت کو لے کر دریائے اردن کے پار جائیں کیونکہ خداوند نے بحیرہ قلزم سے دریائے فرات کے تک کا سارا علاقہ انھیں بخش دیا ہے۔ چنانچہ یشوع علیہ السلام اپنی امت کے ساتھ چل پڑے۔ جب وہ دریائے اردن کے قریب پہنچے، دریا میں سیلاب آیا ہوا تھا۔ یشوع علیہ السلام کے حکم پر بارہ کاہن، جو یہودیوں کے بارہ قبیلوں کی نمائندگی کرتے تھے، ''عہد کے صندوق'' لے کر دریا کے درمیان میں کھڑے ہوگئے۔ جونہی ان کے پاؤں ٹکے، دریا دو حصوں میں تقسیم ہوگیا اور بیچ کی زمین خشک ہوگئی۔ یوں یہودی باآسانی دریا پار کر کے گئے اور ''موعودہ'' سرزمین پر قابض ہوگئے۔

ضمیمہ

1- سالتی کووا (Darya Nikolaevna Saltykova):(1730_1801): سالتی کووا، جو عام لوگوں میں سالتی چیخا (Saltychikha) کے نام سے مشہور تھی، خاصی بڑی زمیندارنی تھی۔ اس کے چھ سو زرعی غلام تھے۔ وہ انھیں ظالمانہ سزائیں دیتی اور ایذائیں پہنچاتی تھی۔ یوں اس نے سات سال میں ایک سو اڑتالیس اشخاص کو ہلاک کر ڈالا۔ وہ کچھ عرصہ تو رشوتوں اور خاندانی اثر و رسوخ کے بل بوتے پر اپنے کرتوتوں کی سزا بھگتنے سے بچی رہی، تاہم 1776 میں اس کی شکایت امپراطورہ کیتھرین دوم تک پہنچی۔ سالتی کووا پر مقدمہ چلا جو کچھ سال جاری رہا اور آخرکار اسے سزائے موت ہوئی۔ بعد میں اس کی سزا میں تخفیف کر دی گئی۔ اس کی پہلے تو Pillory[1] میں کس کر عام لوگوں کے سامنے تشہیر و تذلیل کی گئی اور بعد میں اسے بقایا عمر کے لیے راہبات کی خانقاہ میں بھیج دیا گیا۔

2- ورانووکی ہاؤس: سقوطِ ماسکو کے بعد جنرل ولسن، بے نگ سین اور ارمالوف رستوپ چن کے ساتھ شہر سے تیس میل دور ورانووا میں اس کی جاگیر پر چلے گئے۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ نپولین اور فرانسیسیوں کو قطعاً خاطر میں نہیں لاتا، رستوپ چن نے اپنے ہاتھوں سے اپنے محل نما مکان کو آگ لگا دی۔ ولسن لکھتا ہے: ''کسی قسم کی بحث بیکار تھی کیونکہ اس کا ارادہ اٹل تھا''۔

3- سیبستاپول: بحیرہ اسود کے ساحل پر بندرگاہ (روسی اسے سیوستاپول کہتے ہیں) یہ سابق سوویت یونین کے علاقے کریمیا (روسی میں کرم، Krym، جو غالباً عربی الفاظ ''کرم'' اور ''کریم'' کی بگڑی شکل ہے) میں جو آج کل یوکرین میں شامل ہے، واقع ہے۔ (کریمیا میں تاتاری آباد تھے لیکن روسیوں نے کچھ کو جنگ کریمیا اور باقیوں کو 1944 میں جنگ عظیم دوم کے دوران میں باہر نکال دیا) کریمیا پر 1475 میں سلطنت عثمانیہ اور 1783 میں روسیوں کا قبضہ ہوا۔ 1854-1855 کے دوران میں اتحادیوں (برطانیہ، فرانس اور سلطنت عثمانیہ) اور روسیوں کے مابین جنگ کریمیا ہوئی۔ اس جنگ میں طویل محاصرے کے بعد سیبستاپول پر اتحادیوں کا قبضہ ہوگیا۔ طالسطائی اس جنگ میں شریک تھا۔

1- ایک قسم کا چوبی شکنجہ۔ اس میں سر اور ہاتھوں کے لیے سوراخ ہوتے تھے۔ اس میں خطاکار کو عام تذلیل و تشہیر کے لیے کس دیا جاتا تھا۔ یورپ کے تمام ممالک میں اس کا عام رواج تھا۔

کاؤنٹ لیونکولائی وچ طالسطائی (1828-1910) وسطی روس میں پیدا ہوا۔ بیاسی سالہ دورِ حیات میں اس نے اتنا تحریری سرمایہ چھوڑا جو نوے جلدوں میں سما سکا۔ اس نے "جنگ اور امن" جیسے عظیم رزمیے کے ساتھ "آنا کارینینا" جیسا ناول بھی اپنی یادگار چھوڑا جسے دنیا کی بہترین پریم کہانیوں میں شمار کیا گیا۔ اس کی کہانیاں، چھوٹے ناول، پھر ناول نگاری کو ترک کرنے کے بعد بطور مصلح اور نظریہ ساز اس کی تحریروں کا دفتر، سب اس داستان کے مختلف اجزاء ہیں جنھیں جوڑنے سے ایک ایسے شخص کی تصویر ابھرتی ہے جو اپنے تمام تر تضادات اور بوالعجبیوں سمیت آدمیوں میں جن کی سی طاقت کا مظہر تھا۔ جارج سٹائنر کے بقول "طالسطائی کا تقابل تو ہومر جیسے آفاقی رزمیہ نگاروں ہی سے ہو سکتا ہے۔"

شاہد حمید 1928 میں نکودر، جالندھر کے ایک گاؤں پرجیاں کلاں میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد لاہور آ گئے۔ گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی میں ایم اے کیا اور درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو گئے۔ پنجاب کے مختلف کالجوں میں پڑھایا اور 1988 میں گورنمنٹ کالج لاہور سے پروفیسر ریٹائر ہوئے۔ شاہد حمید ایک مایہ ناز مترجم ہیں۔ زمانہ طالب علمی ہی میں ڈیل کارنیگی کی ہردل عزیز کتاب "پریشان ہونا چھوڑیے، جینا سیکھیے" کا اردو ترجمہ کیا اور پھر دنیا بھر کے علم و ادب سے کتنی ہی عظیم کتابوں کا ترجمہ کر ڈالا۔ جین آسٹن کی "تکبر اور تعصب"، طالسطائی کی "جنگ اور امن"، دستوفسکی کی "کراموزوف برادران"، ہیمنگوے کی "بوڑھا اور سمندر" اور ایڈورڈ سعید کی "فلسطین کا مسئلہ" ان کے اردو تراجم کی چند مثالیں ہیں۔ شاہد حمید کی زندگی کا سب سے بڑا کام دو ہزار سے زیادہ صفحات پر مشتمل انگریزی اردو لغت ہے جو زیرِ طبع ہے۔ شاہد حمید 29 جنوری، 2018 کو لاہور میں وفات پا گئے۔

ناول کے بارے میں

لوگ اس چیز کو فراموش کر دیتے ہیں کہ یہ ناول رزمیہ انداز لیے ہوئے ہے اور رزمیے کسی جگہ ختم نہیں ہوتے، یہ دھارا تو بہتا ہی چلا جاتا ہے۔ طالسطائی کا تقابل تو ہومر جیسے لافانی رزمیہ نگاروں ہی سے ہوسکتا ہے۔

طالسطائی، یہ شخص تو کل کی مشرقی ہوا جیسا ہے جس کے مقابل آنکھیں کھولیں تو آنکھوں میں آنسو تیرنے لگتے ہیں اور انسان کچھ دیر کے لیے گونگا ہو جاتا ہے۔

کوئی انگریزی ناول نگار اتنا عظیم نہیں جتنا کہ طالسطائی۔ اس کا مطلب ہے کہ کسی نے انسانی زندگی کی گھریلو اور سورمائی جہت، دونوں کی ایسی مکمل تصویر نہیں دکھائی۔

عظیم ترین ناول نگار... 'جنگ اور امن' کے مصنف کو آپ اس کے علاوہ کیا لقب دے سکتے ہیں؟

طالسطائی کا لکھا ناول ادب پارہ نہیں زندگی کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔

ترجمے کے بارے میں

طالسطائی اور اس کے شاہکار سے گہری وابستگی اور برسوں کی کڑی ریاضت کے بغیر اس عظیم الشان ناول کا ترجمہ ممکن نہ تھا۔

شاہد حمید برسوں کی ریاضت اور بےلوث مشقت کے بعد یہ ترجمہ کرنے میں کامیاب رہے۔

دنیا کے اس سب سے بڑے ناول کا یہ ترجمہ کسی بھی زبان اور کسی بھی زمانے کے لیے قابل فخر سمجھا جائے گا۔

'جنگ اور امن' جیسے شاہکار کا کامل ترجمہ، جس میں تاریخ کے متعلق طالسطائی کے منتشر فلسفیانہ خیالات سمیت سبھی کچھ شامل ہو، ایک بڑا کارنامہ ہے۔

شاہد حمید نے یہ ترجمہ بڑے بڑے دعووں کے بغیر خالص علمی کسرنفسی کے ساتھ پیش کیا ہے لیکن ان کا یہ کارنامہ انھیں اردو کے بڑے مترجموں میں جگہ دلانے اور اردو دنیا کو ان کا شکرگزار بنانے کے لیے کافی ہے۔

اس (شاہد حمید) کے یہ ترجمے ایسے نہیں جیسے دوسرے ترجمہ کرنے والے کرتے ہیں۔ یہ ایک استاد کے ترجمے ہیں۔ ان کے لیے بڑی عرق ریزی سے تحقیق کی گئی ہے۔ یہ کام کوئی کمالیت پسند ہی کرسکتا ہے۔

میں نہایت فخر کے ساتھ ماسکو یونیورسٹی میں شاہد حمید کا 'وار اینڈ پیس' کا اردو ترجمہ لے گیا۔ روسی اردو سکالرز نے اسے بے حد سراہا۔

فکشن

ISBN 978-969-640-174-2

9 789696 401742 >

www.readings.com.pk

القا پبلیکیشنز
ریڈنگز کا اشاعتی ادارہ